فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد (۹)

ماہنامہ

فاران

اپریل ۱۹۵۷ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

آج ہمارا خطاب خاص طور سے اُن لوگوں سے ہے جو اس آخرت فراموش تہذیب، خود نما تمدّن اور مادہ پرست دور میں "دین دار" کہلاتے ہیں۔ اور یہ خطاب بجا طور پر انھیں زیب بھی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اُن پر فضل ہے کہ یہ حضرات دین کو صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ پسند بھی کرتے ہیں۔ اور اُن کی دلی تمنّا بھی یہی ہے کہ اللہ کے دین کو غلبہ اور سربلندی حاصل ہو۔ عالمِ انسانیت اور اسلام کو اسی طبقہ سے خیر و فلاح کی امیدیں وابستہ ہیں۔ انجیل کی اصطلاح میں یہ لوگ "زمین کا نمک" ہیں۔ اور شعر و ادب کی زبان میں ؎

یہ لوگ چمن ہیں، چمن کی بہار بھی!

یہ دیندار اور مذہبی لوگ کسی خاص جماعت، طبقہ اور ملک میں محدود نہیں ہیں۔ یہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اور شاید اُنہی کا وجود اور نیکیاں اس خدا فراموش دور میں اللہ تعالیٰ کے غضب کو تھامے ہوئے ہیں۔ ورنہ یہ دُنیا جحود و بغاوت اور عصیان و سرکشی کی اس حد تک قریب قریب پہنچ چکی ہے کہ آسمان سے پتھروں کی بارش ہو اور انسانوں کی بستیوں کی بستیاں عادؔ و ثمودؔ جیسی نافرمان قوموں کی طرح ایک افسانۂ عبرت بن کر رہ جائیں۔

اس اعترافِ خوبی و کمال اور مدح و مناقب کے بعد ان دین پسند حضرات سے ہم آج کی فرصت میں کچھ گزارشیں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد نہ کسی پر طنز و تعریض ہے اور نہ اپنی پاک بازی اور اسلام پسندی کا اظہار و اعلان مقصود ہے۔ دُوسروں کو ٹوکنے سے پہلے ہم خود اپنی کمزوریوں اور نفس کی دراز دستیوں کا اقرار کرتے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم اوروں کو دعوتِ احتساب دیتے ہوئے خود شرم و ندامت محسوس کرتے ہیں کہ حقیقت میں ہم اس منصب کے اہل نہیں ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ پُورا معاشرہ وبائے عام میں مُبتلا ہے۔ حالات اس نوبت پر پہنچ چکے ہیں کہ خود مریض دُوسرے مریض کو دوا اور پرہیز کی ہدایت کر رہا ہے اور اُسے ایسا کرنا ہی چاہئیے ـــــ بس قریب قریب یہی پوزیشن "نقشِ اوّل" کے لکھنے والے کی ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے نہ جانے کتنا

احتساب خود اپنے پر کیا ہے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم !!

کہہ کر زخموں کی دوا دارو اور مرہم پٹی ہی سے بے نیاز اور غافل ہو جاتے ہیں۔ ہم تو عزم رکھتے ہیں کہ جسم کے جتنے داغوں کی بھی دیکھ بھال ہو سکے، اُس سے غفلت نہ برتنی چاہیئے۔ اُکتاہٹ، مایوسی، بے نیازی اور بے دلی مردِ مومن کو زیب نہیں دیتی!

آپ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ کبھی کبھار غفلت کے سبب نماز قضا ہو جاتی ہے، تو آپ کو خاصہ ملال ہوتا ہے۔ مگر یہ سوچئے کہ آپ پر یہ کیفیت بھی کبھی واقعی طاری ہوئی ہے کہ "آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے"۔ یعنی اس حضوری کا احساس کہ آپ سچ مچ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنی احتیاج و التجا اور عجز و نیاز کو پیش کر رہے ہیں۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ آپ کے دوستوں اور عزیزوں میں اور خود آپ کے گھر میں کتنے لوگ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور جو نہیں پڑھتے اُن میں سے کتنوں کو نمازی بنانے کے لئے آپ نے جدوجہد کی۔ کیا اپنے بے نمازی دوستوں کی خفگی کے ڈر سے انھیں یہ تک محسوس ہونے دیا کہ اُن کا نماز نہ پڑھنا آپ کو پسند نہیں ہے۔ آپ کا لڑکا یا بھائی کسی دن اتفاق سے اسکول نہ جا سکے۔ تو آپ کو جتنا رنج اُس کے اسکول نہ جانے کا ہوتا ہے، کیا اُتنا غم اُس کے نماز قضا کر دینے کا بھی ہوتا ہے؟

آپ نماز میں تعدیلِ ارکان کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟ کسی دعوت یا جلسہ کا اہتمام کرنا یا کسی سے ملنے کے لئے جانا۔ یا کوئی اور ضروری کام درپیش ہو تو اُس وقت نماز پڑھتے ہیں آپ کی توجہ کا کیا عالم ہوتا ہے؟ آپ ڈاک کے لفافہ پر پتہ لکھتے ہیں تو اس میں کس قدر صحتِ کتابت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور پتہ لکھنے میں کیا انہماک ہوتا ہے اور کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ مگر کیا نماز ادا کرنے میں، لفافہ کا پتہ لکھنے کی برابر بھی آپ یکسوئی اور توجہ کو صرف فرماتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ روزہ بھی رکھتے ہیں اور طبیعت کے اضمحلال کے باوجود شب میں تراویح بھی پڑھتے ہیں۔ مگر آمدِ ماہِ صیام کے ساتھ جس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں وہ ماکولات اور مشروبات ہیں! کھانے پینے کے ذوق کی سیرابی کا اہتمام ایک طرف اور تقویٰ، پاکیزگی اور ذکرِ الٰہی کی تیاری دوسری طرف۔ ان دونوں میں آپ خود ہی موازنہ فرما سکتے ہیں کہ ان میں سے کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ روزہ دار کو روزہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ جو لوگ افلاس و ناداری کے سبب بھوکے رہتے ہیں، اُن بیچاروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس احساس کے بعد آپ کے اندر قدرتی طور پر ماہِ رمضان میں انفاق کا جذبہ دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں تیز تر ہو جانا چاہیئے۔ مگر ماہِ رمضان میں خود آپ کے کھانے پینے کے مصارف میں اتنی زیادتی ہو جاتی ہے کہ آپ کو بھوکوں اور فاقہ زدوں کی امداد کا خیال آتا بھی ہے تو اپنے بڑھے ہوئے بجٹ کو دیکھ کر یہ خیال عمل کے قالب میں ڈھلنے نہیں پاتا جس مہینہ میں آپ کو سراپا ایثار بن جانا چاہیئے تھا، اُس میں آپ سب مہینوں سے زیادہ آرام طلب، خوگرِ راحت اور کام و دہن کی لذت کے شوقین بن جاتے ہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیشک عورت اور خوشبو کو پسند فرمایا ہے اور آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دیا ہو۔ اُس کا اظہار اُس شخص کی ظاہری حالت سے بھی ہونا چاہیئے۔ مگر حضورؐ نے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا بھی تو کھلایا ہے۔ فقر کا یہ عالم کہ کئی کئی دن تک حریمِ نبوت اور کاشانۂ رسالت میں چولھا گرم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ حضورؐ کسی سائل کو

ناکام نہ پھیرتے تھے - یہاں تک کہ بعض اہلِ سوال سے یہ فرمادیا کہ تم میرے نام پر کسی سے قرض لے لینا میں اُسے ادا کردوں گا -
سرکار (روحی فداک) کی معاشرت اس قدر سادہ تھی کہ وہ سادگی رہتی دُنیا تک کے لئے ایک مثال بن کر رہ گئی ہے !

حضورؐ کی مقدس زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے ہے - سرکارؐ کی سیرت چاند، سورج سے زیادہ روشن ہے - ممکن ہے کہ آسمانوں پر بھی کہیں کہیں تاریکی ہو - مگر بزمِ رسالت میں ہر طرف نور و تجلی ہی ملے گی - آپ کہ حضورؐ کی اتباع کو ایمان کا سب سے بڑا تقاضا سمجھتے ہیں اور نام نامی سُن کر آپ کے ہونٹوں پر صلوٰۃ وسلام کے نغمے اُبھر آتے ہیں اور فرطِ عقیدت سے آپ کا چہرہ متغیّر ہوجاتا ہے ـــــ آپ اپنے پر خود احتساب کریں کہ حضورؐ کے اتباع میں کسی بھوکے اور نادار کی خاطر بھوکا رہنا تو الگ - کیا آپ نے کسی مفلس اور ضرورت مند کے لئے اپنے پان اور سگرٹ کے مصارف میں بھی کمی کی ہے - اور کیا کوئی ایسا مہینہ بھی آپ پر گزرا ہے کہ اپنی آمدنی کا آپ نے بیسواں حصہ بھی اہلِ حاجت پر صرف کردیا ہو ؟

آپ کو مال و دولت سے، جائداد اور عہدہ سے - شہرت اور ناموری سے، اور عیش و راحت کے اسباب سے جو انتہا درجہ کی دلچسپی ہے اور جس کے لئے آپ زمین و آسمان ایک کئے دیتے ہیں - کیا سفرِ آخرت کے لئے "زادِ راہ" مہیا کرنے والوں کے شوق و دلچسپی کا یہی معیار اور مطلوب ہونا چاہیئے - ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ تمنّائیں، خواہشیں اور اُن کے حصول کی کوششیں حرام ہیں - مگر کیا "حرام" سے اُونچا کوئی درجہ نہیں ہے - کیا آپ اپنی زندگی میں صرف "زہر" سے پرہیز کرتے ہیں اور "زہر" کے علاوہ ہر چیز نوشِ جان کرلیتے ہیں - نہیں، آپ ایسا نہیں کرتے - آپ کھانے پینے کی اُن چیزوں سے بھی بچتے ہیں جن میں "زہر" کا شائبہ تک نہیں ہوتا - مگر اُن کا استعمال آپ صحت کے لئے مُضر سمجھتے ہیں !!

آپ کی بیمار پرسی، تعزیت اور جنازوں میں شرکت کا دارومدار تعلقات، روابط اور قرابت داری پر ہے - جن مُسلمانوں سے آپ کی شناسائی نہیں ہے، اُن کے جنازوں کو دیکھ کر آپ گزر جاتے ہیں - آپ عام طور پر سلام بھی جاننے والوں کو کرتے ہیں اور اس "مفت" کے ثواب کو محض اپنی مزعومہ خودداری کے پندار میں ضائع کردیتے ہیں - جیسے کہ "افشوا السلام" کا حکم حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جیسے اہلِ ایمان کو دیا گیا تھا، آپ تک پہنچتے پہنچتے اس حکم کی نوعیت بدل گئی ہے !

کسی یتیم کے سر پر آپ نے دستِ شفقت پھیرا - کسی بیوہ کی غمگساری کی - کسی اندھے اور اپاہج کو سہارا دیا ؟ جاڑے کی رُت میں جب آپ مفلر، دستانے، اُوورکوٹ اور اُونی بنیان پہنے پھرتے ہیں - کیا کسی نادار کی تن پوشی کا بھی خیال آتا ہے کہ سردی میں اُس بیچارے پر جس کا کُرتہ بھی ثابت نہیں ہے، کیا گزرتی ہوگی ؟

آپ کو قرآن کی تلاوت کا بھی شوق ہے - مگر اس اپنے پُورے زمانۂ تلاوت کا جائزہ لیجیئے کہ قرآن پڑھتے میں کتنی بار آپ کی آنکھیں خدا کے خوف سے اشکبار ہوئی ہیں - کتنی مرتبہ خشیتِ الٰہی سے آپ کا دل ہلا ہے اور رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں - اس کو بھی سوچیئے کہ آپ کو جہاں نہ کسی قسم کے نفع کی توقع ہے اور نہ مضرت کا خطرہ ہے، وہاں آپ کس بیباکی کے ساتھ اعلانِ حق فرماتے ہیں - مگر جہاں آپ کی کچھ امیدیں وابستہ ہیں اور جس جگہ حق بات کہنے سے آپ پر آنچ آتی ہے، وہاں آپ کا جذبۂ حق گوئی کیا روش اختیار کرتا اور کن تاویلوں اور مصلحتوں کی پناہ ڈھونڈتا ہے ؟

آپ "آخرت" پر یقیناً ایمان رکھتے ہیں اور آخرت کے اچھے ہونے کی ہر نماز میں دعا بھی مانگتے ہیں - مگر جس طرح کسی عدالت میں مقدمہ کی پیشی سے پہلے کسی ملزم کی حالت میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے اور اُس کے پیشِ نظر ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا ہے کہ نہ جانے حاکمِ عدالت کیا فیصلہ سنادے ـــــ کیا اللہ کے دربار میں حاضری اور اعمال کی بازپرس کا اس سے دس گنا کم

خوف بھی آپ کے اندر موجود ہے ؟
کیا قبر کی تاریکی کے خوفناک تصور سے آپ کی نیند اچاٹ ہوئی ہے - کیا میزانِ عدالت میں اعمال وزن کئے جانے کے ڈر سے آپ کے کھانے پینے اور عیش و تفریح کے مشاغل میں کوئی کمی آئی ہے ؟ کیا جہنم کے عذاب کے خوف نے آپ کو رُلایا ہے ؟ دن میں نہیں، ایک مہینہ میں، بلکہ سال بھر میں، کے بار آپ کو موت یاد آئی ہے ؟
آپ کو یقیناً مسلمانوں کی بدعملی دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے - لیکن اپنے مشاغل کا جائزہ لے کر بتائیے کہ آپ نے خود اپنے محلّہ کے مُسلمانوں میں سے کس کس کے پاس جاکر تبلیغ کا حق ادا کیا ہے ؟ آپ نے اپنے وقت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی اس اہم کام میں صرف کیا ؟ کسی دن اس کے لئے زحمت اٹھائی ؟ اگر کبھی کسی سے کچھ کہنے کی توفیق بھی نصیب ہوئی تو اُس کی بے نیازی اور عدم توجہی کو دیکھ کر آپ نے پھر اُس طرف کا رُخ نہیں کیا - حالانکہ اپنے ذاتی کاموں میں آپ اتنی جلد مایوس نہیں ہوجاتے اور امید بندھی ہی رہتی ہے کہ شاید اگلی بار کامیابی ہو جائے !
اگر آپ اسلام پسند شاعر، ادیب، مقرر، افسانہ نگار یا انشاء پرداز ہیں تو دل کو ٹٹولئے کہ ہر علمی و ادبی پیشکش پر شہرت کا، ہردلعزیزی کا، اور یہ کہ لوگ داد دیں اور تعریفیں کریں - اس کا کتنا داعیہ آپ کے دل میں نہ میں کروٹیں لیتا رہا - آپ کے اخلاص کے ہم منکر نہیں ہیں - آپ پر نفاق کا خدانخواستہ ہم شبہ نہیں کرتے - عرض کرنا صرف یہ ہے کہ اس "اخلاص" میں کوئی دوسرا جذبہ اور داعیہ بھی شریک تھا - یا نہیں ؟
سختی کے ساتھ اس کا جائزہ لیجئے کہ خود آپ کی زندگی، سیرت، اعمال و مشاغل اور حالات سے کتنے لوگوں نے دینی "تاثر" قبول کیا ہے ؟ اگر آپ کے اندر دینی حرارت تھی تو یہ کیسی حرارت تھی جس نے اپنے ماحول تک کو ذرا سا بھی گرم نہیں کیا - کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کی زندگی کے آتشدان میں اُوپر اُوپر تو کجلائی ہوئی چنگاریوں سے گرم دھواں نکل رہا ہو اور اُن کے نیچے برف کے ٹکڑے رکھے ہوں !
پوری ذمہ داری اور انصاف کے ساتھ اس کا فیصلہ کیجئے کہ آپ کی تقریر اور تحریر سے آپ کے جس دینی شغف، فکر و عمل کی پاکیزگی اور خلوص و للّٰہیت کا پتہ ملتا ہے - کیا آپ واقعی اپنے عقیدت مندوں، قدر شناسوں اور تعریف کرنے والوں کے "حُسنِ ظن" کے مصداق ہیں - اور لوگوں نے آپ کے وعظ و تقریر سُن کر اور آپ کے مضامین پڑھ کر جو کچھ آپ کو سمجھا ہے کیا آپ کی زندگی اُس کے عین مطابق ہے ؟
آپ بیشک اللہ کے دین کا غلبہ چاہتے ہیں - آپ اس کے لئے دعائیں بھی کرتے ہیں - اور اپنے اندر اضطراب اور بے چینی بھی پاتے ہیں کہ سارے عالم میں اسلام کا بول بالا ہو اور صرف اسلام ہی غالب ہو کر رہے ! یہ تمنّا بہت مبارک اور اس کے لئے دعائیں اور زیادہ بابرکت ہیں - مگر آپ نے کیا کبھی سُنا ہے کہ کسی کسان نے بیج بونے کی صرف تمنّا اپنے دل میں پیدا کر کے دعا کی ہو اور اُس کے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر آپ ہی آپ فصل اُگ آئی ہو ! آپ اگر کسی کافرانہ ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں تو سوچئے کہ وہاں آپ اللہ کے دین کو قائم رکھنے اور غالب کرنے کے لئے کیا جدوجہد کر رہے ہیں - کفر کے ساتھ آپ کا رویّہ مصالحانہ اور دوستانہ ہے یا معاملہ اس کے برعکس ہے - یعنی آپ کفر کی مشین کے پُرزے بن کر کام کر رہے ہیں - یا اس مشین سے الگ تھلگ ہیں — !
اور اگر آپ مُسلمانوں کے ملک میں رہتے ہیں تو نظامِ حق کے قیام کے لئے آپ نے کیا جدوجہد کی ہے ؟ دامے، درمے،

قدمے، سخنے، اس جد وجہد میں آپ نے کس قدر حصّہ لیا ہے، آپ کا اب تک رول کیا رہا ہے؟ اور جو خدا کے بندے نظامِ حق کے قیام کی خاطر عملاً دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ اُن کی آپ نے حوصلہ افزائی اور رفاقت کی ہے، یا اُن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں اور کانٹے بچھائے ہیں؟

آپ کی نمازیں، اوراد و وظائف اور مذہبی شغف اپنی جگہ تسلیم، بلکہ لائقِ احترام۔ مگر یہ سوچیے کہ آپ کے برتاؤ سے نظامِ حق کے قیام کی مہم کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ آپ کی روش نے اُن لوگوں کے ہاتھ مضبوط کئے جو کسی عنوان اسلام کو حدودِ نظم ونسق میں داخل ہونے دینا ہی نہیں چاہتے۔ یا اُن جرأت آزماؤں کی طاقت کو کمزور بنایا جو دینِ حق کے غلبہ کے سوا اور کوئی تمنا اور اُمنگ ہی اپنے اندر نہیں رکھتے!

اس کا بھی اندازہ لگائیے کہ فسق و فجور اور منکرات کو دیکھ کر آپ کے دل کے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے یا آپ انھیں گوارا کرنے کی طرف طبیعت مائل ہے! آپ کے اندر جرأت اور توانائی کس قدر ہے، بدی کو مٹانے کے لئے آپ کس حد تک جا سکتے ہیں؟

کیا آپ بندوں کے حقوق کا کم سے کم اتنا خیال رکھتے ہیں کہ راستہ میں کیلیں، کانٹے، یا چبھنے والے پتھر دکھائی دیں تو انھیں ہٹا دیں۔ ریل میں سفر کر رہے ہوں، اور جگہ کی تنگی ہو تو کسی کھڑے ہوئے مسافر کو جگہ دینے کے لئے خود ذرا سکڑ کر بیٹھ جائیں۔ کیا آپ کی خودداری اس کو گوارا کر سکتی ہے کہ قلی آپ کا سامان اٹھاتے میں اضطراب اور دقت محسوس کر رہا ہو تو آپ سامان اٹھانے میں اس کی مدد کر دیں!

آپ خود ہی سوچئے کہ مسجد کے اندر آپ کا کتنا دل لگتا ہے اور نماز پڑھتے ہی آپ کہیں اس طرح تو مسجد سے نہیں بھاگ چھوٹتے جیسے کوئی پرندہ قفس کا در کھلتے ہی گھبرا کر اُڑ جاتا ہے۔ امام قرأت کو ذرا طویل کر دے تو آپ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یا آپ کے تیوروں سے ذوق وشوق کا اظہار ہوتا ہے؟

آپ جن محفلوں میں بیٹھتے اٹھتے یا آتے جاتے ہیں۔ اُن میں آپ اہلِ محفل کے ذوق، رجحان اور اُفتادِ طبع کی کتنی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین واخلاق کا کوئی ایسا تذکرہ آپ چھیڑنے کی شاذونادر ہی جرأت کرتے ہیں۔ جس سے اُس مقبولیت پر جو دوستوں میں آپ کو حاصل ہے، حرف آتا ہو!

ایک طرف خود آپ کی تمنائیں اور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف دین کے تقاضے اور مطالبے ہیں۔ آپ کو جائزہ اس کا لینا ہے کہ آپ کی توانائیاں اور صلاحیتیں ان میں سے زیادہ تر کس کے کام آ رہی ہیں! آپ نے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی خواہشوں کو قربان کیا ہے، یا خود دینی مطالبوں کو آپ کی خواہشوں اور آرزوؤں پر قربان ہونا پڑا ہے!

حالات کس طرح بدلیں گے؟

جن باتوں کی طرف اوپر اشارے کئے گئے ہیں۔ اُن کا جائزہ کوئی دوسرا لے ہی نہیں سکتا۔ یہ تو خود ہمارے کرنے کا کام ہے۔ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ خود اپنا احتساب اور اس کے بعد کمزوریوں کو دور کرنے کی جدوجہد، یہ ہونی چاہیے ایک مخلص مسلمان کی روش! اپنی ذات پر نقد واحتساب کے وقت شیطان کے فریب اور نفس کے جیلوں سے پوری طرح باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ ظالم تو برائیوں اور کمزوریوں کے لئے ایسی ایسی نازک اور باریک تاویلیں سجھا دیتا ہے کہ آدمی پہلے سے بھی زیادہ پست ہو جاتا ہے!

دُنیا کے حالات بدلنے کے لئے آسمان سے فرشتے نازل نہیں ہوں گے اور نہ اجرام فلکی اس فرض کو انجام دینگے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت رہی ہے کہ جو لوگ اپنے کو بدلنے کا سرے سے کوئی داعیہ ہی اپنے اندر نہ رکھتے ہوں۔ اور اس کام کے لئے کوئی عملی اقدام نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنی قوتِ قاہرہ کے زور سے حالات میں انقلاب پیدا کر دے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو انبیاء کرام اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ مگر اُن مقدس ترین انسانوں کی زندگیاں گواہ ہیں کہ انہوں نے اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور دُنیا میں انقلاب لانے کے لئے کیسی کیسی دردناک مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے فرض سے غافل نہیں رہے! (علیہم السلام)

ایک آلپن اور ایک دھاگے کی تیاری بھی محنت اور لگن چاہتی ہے۔ آپ سے جو عظیم الشان فریضہ متعلق ہے۔ اُس کا تو تقاضا یہ ہے کہ ایثار و قربانی کا جذبہ آپ کی زندگی کی تمام دُوسری صفات پر غالب ہو جائے! حالات کی تبدیلی کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جو دُنیا کے حالات کو بدلنے کا داعیہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے خود بدل جائیں!

حق کی راہ یقیناً دُشوار ہے مگر چلنا تو اسی راہ میں ہے۔ سچّائی کا پیالہ تلخ اور ناخوشگوار سہی مگر نوشِ جاں تو اسی کو کرنا ہے! اس ذمہ داری کو جب آپ اُٹھا چکے ہیں۔ تو پھر پس و پیش کیسا؟

باطل کی جڑیں بہت کمزور ہیں مگر آپ ہمت ہی نہیں کرتے! حق کو غالب اور سربلند ہی ہونا ہے۔ لیکن آپ کہ حق کی نمائندگی کا دم بھرتے ہیں جرأت سے کام ہی نہیں لیتے!

دُنیا میں یقیناً بہت کچھ تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ مگر آپ اپنے سوزِ دل و جاں کی شمعیں روشن کر دیں تو تاریکیوں کی مجال ہے کہ وہ دم بھر کے لئے بھی ٹِک سکیں!

اللہ تعالیٰ کی زمین کے جائز وارث آپ ہیں۔ مگر آپ کی غفلتوں نے اس ورثہ کو غاصبوں کے قبضہ میں دے دیا ہے۔ دُنیا کی قیادت کے آپ مستحق ہیں۔ مگر اس اپنے حق کو آپ نے خود ہی چھوڑ رکھا ہے۔ خدا کے لئے اپنے منصب کو پہچانئے۔ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیجئے۔ اور باطل کے مقابلہ میں اس عزم کے ساتھ —— حق کی سربلندی یا موت —— صف آراء ہو جائیے، بس پھر فوز و فلاح اور کامیابیوں کی ایسی ایسی راہیں کھلیں گی کہ فتحِ مصر و مدائن کی یاد تازہ ہو جائے گی!

دُنیا میں جہاں کہیں بھی فساد پایا جاتا ہے، اُس کے مٹانے کی ذمہ داری اُسی اُمت پر عائد ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے "خیر الامم" اور "خاتم الامم" بنا کر اُٹھایا ہے۔ "خدائی فوجدار" ایک طنز ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ ساری کائنات کے لئے سچ مچ "خدائی فوجدار" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی کافرانہ ماحول کی کروڑوں انسانوں کی آبادی میں بھی ایک مسلمان پایا جاتا ہو، اُسے حق کی غربت و بے سرو سامانی سے دل شکستہ اور کفر و باطل کے غلبہ سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ مردِ مومن جہادِ زندگی میں سپر انداز تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام کے پرچم اور حق کے جھنڈے کو وہ تیروں کی بوچھاروں میں بھی مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے رہے گا، ہاتھ کٹ جائیں گے تو اپنے دانتوں کی گرفت میں پرچمِ اسلام کو لے لے گا۔ یہاں تک کہ اس کا سر قلم ہو جائے۔ بس پھر اُس پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنا حق ادا کر چکا۔

بارِ الٰہا! جو تیرے بندے نظامِ حق کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اُن کے اعمال میں جہاں کہیں کھوٹ پائی جاتی

ہے اُسے اخلاص سے بدل دے، اُن میں اگر اختلاف ہے تو اُسے یا تو مٹا دے یا اسے رحمت بنا دے!

یا اللہ! مسلمانوں کی پراگندگی کو جمعیت سے اور اُن کی پریشاں حالی اور شکستہ دلی کو نشاط و اطمینان سے بدل دے۔

یارب قادر و قیوم! اہلِ نفاق کے شر سے اُمتِ مسلمہ کو بچا۔ اسلامی حکومتوں کی زمامِ اقتدار اُن کو سونپ، جن کی زندگیوں میں اسلامی اخلاق جھلکتے ہوں اور جو اسلام کی سربلندی چاہتے ہوں۔

یا اللہ! مسلم عوام کو اُن لوگوں سے نجات دے جو سازشوں کے ذریعہ اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کرتے ہوں۔

یا اللہ! اپنے دین کو قوت، سربلندی اور غلبہ عطا فرما!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم!

ماہر القادری

۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء

ضروری اعلان

ماہ جون میں "فاران" کا عظیم الشان توحید نمبر انشاء اللہ شائع ہو رہا ہے جس کی ضخامت تین سو صفحات سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ یہ نمبر خریدار صاحبان کی خدمت میں رجسٹری کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔ لہٰذا پاکستان کے خریدار صاحبان دفتر "فاران" میں اور بھارت کے خریدار صاحبان — دفتر "الحسنات" رام پور (یوپی) میں آٹھ آنے کے ٹکٹ جلد سے جلد بھیج دیں۔

جو صاحبان رجسٹری کے ٹکٹ نہ بھیجیں گے، اُن کو سادہ ڈاک سے "توحید نمبر" ارسال کیا جائے گا اور وہ کسی سبب سے ضائع ہو گیا تو دفتر "فاران" اُن کو دوبارہ "توحید نمبر" مہیا نہ کر سکے گا۔

(مینیجر)

سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے

اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ

کسی کے عشق کی داستان لکھ دینا آسان ہے۔ کیوں کر عشق ہوا۔ عشق کے ہاتھوں کیا کیا دیکھنا نصیب ہوا۔ مثلاً حسن و جمال اور ناز و ادا کا دیکھنا تھا کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ کسی بات کا ہوش نہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے دوست کا خیال ہے اور دوست کی یاد۔ جنوں کی نوبت پہنچی تو گھر اور بستی چھوڑ کر جنگل بیابان کو نکل گئے۔ اور بادیہ پیمائی شروع کر دی۔ کانٹے پیروں میں چبھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے قاقم و سنجاب پر چل رہے ہیں۔ تپتی ہوئی ریت گلاب کے پھولوں کا فرش معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بے شمار باتیں، جو دیکھنے اور سُننے میں آتی ہیں، بیان کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیا آج تک کوئی شاعر یا حکیم نکتہ داں عشق کی تعریف کا بھی حق ادا کر سکا؟ کیا عشق کی کیفیات و واردات کے ناپنے کا پیمانہ ہمارے پاس موجود ہے؟ عاشق کے دل پر دوست کی جُدائی میں کیا گزرتی ہے، رشک کیا قیامت ڈھاتا ہے، دوست کی اداؤں کا دل پر کیسا اثر ہوتا ہے۔ پھر جس پر دل آیا ہے اُس کے آگے دنیا جہان کے دوسرے حسینوں کی اداؤں اور اُن کے حُسن و جمال کا دل پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ ایک شخص پکار رہا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مَیں!

دیکھنے والا اُس کے جسم کی حرکت، اس کے چہرہ کا رنگ دیکھتا اور اس کی آواز سُنتا ہے، مگر کیا اُس جذبۂ دلی اور کیفیتِ قلبی کو بھی دیکھ سکتا ہے جس سے یہ شعر زبان پر آیا ہے؟ اور یہ تو عام عشق و محبت کی باتیں ہیں۔ ذرا اُس شخص کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جو "عشقِ رسولؐ" پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ جہاں عشق کی تعریف بھی بدل جاتی ہے اور نوعیت بھی۔ کیفیات و واردات کی اثر انگیزی بھی اور اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی بدل جاتے ہیں۔

عشقِ رسولؐ سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے! خدا کی معرفت بلکہ خوشنودئ خدا بھی اسی پر موقوف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی عشقِ رسولؐ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بھلا ایسی عظیم الشان چیز کا بیان کیا آسان ہے! پھر اس کے ساتھ یہ دکھلانا کہ اقبالؔ جو ایک بلند پایہ فلسفی ہیں۔ اکثر فلاسفہ کی طرح، مائل بہ تشکیک و الحاد ہونے کی بجائے ایسے گرویدۂ اسلام اور عاشقِ رسولؐ کیسے ہوئے کہ اپنے تمام تفلسف اور عقلیت کو ایک متاعِ حقیر کی طرح حضور سرورِ کائنات کے قدموں پر لا ڈالا! وہ کیا اسباب تھے جو اِس قلبِ ماہیت کا باعث ہوئے۔ اس کے لئے اقبالؔ کی پُوری زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کی طفلی، اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول کا اثر۔ کن شخصیتوں سے اثر قبول کیا۔ مطالعہ کتب کی نوعیت اور خود اُن کے ذاتی مشاہدات، غرضکہ پُوری سوانح حیات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ اُن کی تصانیف کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کر کے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ حضورِ اکرم کی کن صفات نے اُن کا دل موہ لیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آگ اُن کے سینہ میں کب لگی، کس طرح تیز ہوتی گئی۔ اور کب اس حد کو پہنچی کہ جب انہوں نے اپنے تمام فلسفہ کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ ؏

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!

عاشقانِ رسولؐ نے طرح طرح سے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اور بہتر سے بہتر اسلوبِ بیان اور اچھے سے اچھے الفاظ میں ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسان بن ثابتؓ اور کعب بن زہیرؓ سے لے کر حکیم سنائی، مولانا روم، خاقانی، جامی، شہیدی اور غالب تک سبھی نے بقدرِ ہمت اس فضائے بیکراں میں اپنے طائرِ فکر کی جولانیاں دکھلائی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر ایک کو اس کام کی نزاکت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اگرچہ محبت کی باتیں عقل و خرد کی باتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، مگر عشقِ رسولؐ ایسے توازن کا مطالبہ کرتا ہے کہ شریعت اور محبت میں تصادم نہ ہونے پائے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُس تعریف کو پسند فرمایا ہے جو واقعیت پر مبنی ہو۔ یہاں تک کہ حضرت کعبؓ کے قلم سے حضورؐ کی شان میں "سیفٌ مِن سیوفِ الھند" نکل گیا۔ تو رحمۃ للعالمین نے اس کی بھی اصلاح فرما دی۔ کہ "سیفٌ من سیوف اللہ" کہنا چاہیئے۔ اسی نزاکت کے پیشِ نظر عرفی نے کہا تھا کہ ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است ... آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن ... نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اور غالب کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اس لئے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اقبالؔ اس مرحلۂ دشوار سے گزرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر عشق نہ بوالہوسی کا نام ہے اور نہ یہ خللِ دماغ اور فتورِ عقل ہے بلکہ ایک وجدانی کیفیت، روحانی مسرت اور ایک بلند مقصد کے لئے عقل و حواس اور شعور کی تمام قوتوں کے ساتھ بے چینی اور والہانہ تڑپ اور اس کے حصول کے لئے ہمہ تن وقف ہو جانے کا نام عشق ہے۔ اقبالؔ کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ رسولِ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ساری دُنیا کے لئے شمعِ ہدایت و وسیلۂ کامیابی سمجھتے ہیں اور اس لئے اُس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت چاہتے ہیں۔ اور دُنیا کو اس سے واقف کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ دیکھنا ہوگا کہ حضورؐ کی جن صفات کو وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح و کامرانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، اُن صفات سے اُن کا تاثر کس نوعیت کا ہے اور انہوں نے اپنے تاثرات کو کن الفاظ اور کیسے اسالیب کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فارسی اور اردو کے دوسرے نعت گو شعرا اور اقبالؔ کے اندازِ بیان میں کیا فرق ہے۔ غرضکہ اس قدر گوناگوں دشواریاں تھیں مگر اس موضوع پر لکھنا افادی حیثیت سے خالی نہ تھا، اس لئے باوجود ان تمام دشواریوں کے میں نے اپنا خیال ترک نہیں کیا۔ اور اپنی امکانی کوشش سے کام لے کر اقبالؔ کے "عشقِ رسولؐ" کا ایک مرقع، نہیں ایک تصویر بلکہ تصویر بھی نہیں کہہ سکتا ایک ناتمام سا خاکہ تیار کیا ہے جس کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں!

عشقِ رسولؐ کی ابتدا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ہی "محمد الرسول اللہ" کے اقرار سے ہوتی ہے۔ خدا اور اُس کے فرشتے حضورؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ نیز قرآن پڑھیئے تو اول سے آخر تک ذکرِ رسولؐ سے معمور ہے۔ کہیں حضورؐ کے اخلاق کی تعریف کی جاتی ہے۔ کہیں آپؐ کی جان کی قسم کھائی جاتی ہے۔ کہیں آپؐ کی حفاظت کا ذمہ لیا جاتا ہے۔ کہیں آپؐ کے علوِ مرتبت کو بیان کیا جاتا ہے۔ کہیں دلجوئی و دلداری کی جاتی ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ کی رُو سے یہ تمام باتیں اس کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی

رسول اللہ کا ذکر پسند ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ کے چاہنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ اس پر شاہد ہے۔ ملائکہ بھی عاشقِ رسول ہیں حضور پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔ اور صحابہ کرامؓ کے عشق کا تو کہنا ہی کیا! اگر کسی ایک صحابی کے عشق کا حال بیان کرنا چاہوں تو ایک دفتر چاہیئے۔ اسی طرح قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک عاشقانِ رسولؐ برابر ہوتے رہے ہیں۔ اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ بلکہ مسلمان نے تو ہمیشہ اسی چیز کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا۔ ایسا سرمایہ کہ جانِ عزیز کے عوض بھی حاصل ہو تو ارزاں ہے۔ اور آج بھی جبکہ مسلمان اخلاقی و دینی اعتبار سے پستی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اپنے آقا و مولاؐ (فداہ ابی وامی) کا ویسا ہی دیوانہ ہے۔ اقبال اسی حقیقت کو ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں ؎

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟ بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟ رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں!
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں!

اور جبکہ ایک طرف خدا فرماتا ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اور دوسری طرف خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ کوئی مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو ماں باپ سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ تو اللہ نے جتنی زیادہ بصیرت کسی کو دی ہے وہ اتنا ہی زیادہ حضورؐ سے محبت کرتا ہے۔

عشق کسی کے جمال و کمال یا جود و نوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا براہ راست اس سے متمتع ہونے ہی سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ع

بسا کیں دولت از گفتار خیزد!

مبارک تھے وہ لوگ جنہوں نے اس پیکرِ حسن و جمال اور اس سراپائے کمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور اس کے فیوض و برکات سے اپنے دامنِ جاں کو بھر لیا۔ مگر وہ لوگ بھی کم خوش نصیب نہیں جو اس کی تعریف سن کر اس کے شیدائی ہو گئے۔ آخر اویسؓ قرنی نے حضورؐ کو کب دیکھا تھا! اور کیا اس ہستی کو نادیدہ کہہ بھی سکتے ہیں، جس کے محامد و فضائل انسان تو انسان خود اللہ بیان کرتا ہے۔ اور قرآن کا حرف حرف جس کی صورت و سیرت کا آئینہ دار ہے، جس کے انوارِ اخلاق سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا ہے۔ کیا آفتاب بادل کی نقاب چہرہ پر ڈال لینے سے غائب ہو جاتا ہے؟ کیا دنیائے منور اس کی موجودگی کا پتہ نہیں دیتی؟ پھر وہ آفتاب کیونکر غائب ہو گیا جس کے انوار سے آج بھی کرۂ ارضی کا چپہ چپہ روشن ہے۔ جس کی سیرت و اخلاق کے آثار و انوار سے آج بھی دنیا معمور ہے بلکہ سچ پوچھیے تو دنیا میں اگر کہیں اجالا ہے تو اسی کے جمالِ جہاں آرا کا ہے ورنہ سائنس و تہذیبِ جدید کی روشنی نے اندھیروں کے پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے!

حضورؐ کے سیرت نگاروں نے صحابۂ کرامؓ کے بیانات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ جسمانی حسن و جمال میں بھی اس مقام پر تھے کہ جہاں آج تک کوئی نہ پہنچا۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:-

"ما رایتُ احسنَ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانّ الشمسَ تجری فی وجہہ!

میں نے حضورؐ سے زیادہ حسین کوئی نہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آپ کے چہرے میں آفتاب گردش کر رہا ہے۔

یا جیسا حضرت حسانؓ فرماتے ہیں ؎

خلقتَ مبرأً من کلِ عیبٍ　　کانّکَ قد خلقتَ کما تشاءُ

آپؐ تمام عیبوں سے پاک پیدا کئے گئے ہیں۔ گویا آپ جس طرح چاہتے تھے اسی طرح تخلیق کئے گئے۔

وَاَحسَنَ مِنکَ لَم تَرَ قطُّ عینی　　اَجمَلَ مِنکَ لَم تَلِدِ النساءُ

آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کہیں نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت فرزند کسی عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔

حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں۔　　(فاران سیرت نمبر)

یہ بیانات بالکل صحیح بلکہ چودہ سو برس میں جس قدر حضورؐ کے حُسن و جمال کی تعریف آپؐ کے عاشقوں نے کی ہے وہ سب درست۔ مگر ان شواہد کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے جبکہ خود خدا حضورؐ کو سراجاً منیرا کے لقب سے یاد فرماتا ہے۔ اور اگر انسانی شہادت ہی کی ضرورت ہے تو پھر حضورؐ کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہو سکتی ہے! وَقَطَّعنَ اَیدِیَھُنَّ وَقُلنَ حاشَ لِلّٰہِ مَا ھٰذا بَشَراً اِنْ ھٰذا اِلّا مَلَکٌ کَرِیم۔ (انہوں نے حیرت میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور زنانِ مصر نے کہا حاشَ لِلّٰہ یہ تو انسان نہیں معلوم ہوتا، یہ تو کوئی بڑے درجہ کا فرشتہ ہے) والی آیت کی تفسیر کے ذیل میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ لَو رَاَینَ حُسنَ محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم لَقَتَلنَ اَنفُسَھُنَّ اَو قالت کذا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ "اگر زنانِ مصر حضورؐ کے جمال کو دیکھ لیتیں تو حُسنِ نبویؐ کی تاب نہ لا کر بجائے ہاتھ کاٹنے کے حیرت میں اپنے آپ ہی کو قتل کر لیتیں۔" (تفسیر روح المعانی)

خیر یہ تو مضمون کی مختصر تمہید تھی۔ بحث اقبالؔ کے "عشقِ رسولؐ" سے ہے۔ لہٰذا اب اصل مضمون سے گفتگو کی جاتی ہے۔

اقبالؔ کے عشقِ رسولؐ کے اسباب کو مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر۔
۲۔ ابتدائی تعلیم اور ماحول۔
۳۔ اُستاد کی صحبت۔
۴۔ غالبؔ اور حالیؔ کا اثر۔
۵۔ وسیع مطالعۂ کتب اور ذاتی مشاہدات۔

بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمدؒ بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ یہاں تک کہ اپنی نیکی اور پرہیزگاری ہی کی وجہ سے اپنے شہر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، دُنیا کے کاموں میں اُن کا جی بہت کم لگتا تھا بلکہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور دین کی باتیں سُننے کا شوق تھا۔ اسلام کی محبت اُن کے دل میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ دُنیا کے کاموں سے جتنا وقت بچتا اُس میں یا بزرگوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتے یا نیک لوگوں کی صحبت سے استفادہ۔ مولانا رومؒ کے بھی بڑے عاشق تھے۔ مثنوی کے اشعار بڑے لطف سے پڑھا

کرتے تھے۔ صوفی منش آدمی تھے۔ مگر اُن کا تصوّف ایسا نہ تھا کہ زندگی کے روزمرہ کے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر گوشہ نشین ہو جاتے یا کسی خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ساری عمر اپنی محنت سے روزی کمائی اور "دل بہ یار و دست بہ کار" پر عامل رہے۔ ساتھ ہی صابر و قانع اور بڑے سادگی پسند تھے۔ اُن پر مذہب کا رنگ کتنا گہرا تھا وہ ذیل کے واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

"اقبال ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دن اُن کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں اقبال آخر انگریزی کی تعلیم پا کر کیا کرے گا! اسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے۔ جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا خیال پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال اسکول جانے کی بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے۔" (حیات اقبال صہ ۱۲)

اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں اپنے والد بزرگوار کی خدا ترسی، غریب نوازی اور دینداری کا واقعہ لکھا ہے کہ:۔

"ایک دن ایک گدائے مُبرم ہمارے دروازہ پر صدا لگا رہا تھا اور کسی طرح ٹلتا نہ تھا۔ میں نے غصہ میں آکر ایک لکڑی اُس کے سر پر ایسی ماری کہ جو کچھ مانگ کر لایا تھا وہ بھی اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جوانی کے نشہ میں عقل صواب و ناصواب نہیں دیکھتی۔ میرے اس فعل سے باپ کو بڑا رنج ہوا۔ چہرہ افسردہ ہو گیا۔ دل سے آہیں نکلنے لگیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میرا دل کانپ گیا۔ فرمانے لگے کہ کل روزِ حشر جب حضورؐ کی اُمت حضورؐ کے گرد جمع ہو گی۔ غازیانِ ملّتِ بیضا بھی اور حکمتِ دیں کے حافظ بھی اور شہید بھی کہ جو دین کی حجت ہیں، زُہّاد بھی اور عاشقانِ دلفگار بھی۔ عالم بھی اور شرمسار گنہگار بھی۔ سب موجود ہوں گے۔ اور اُس اجتماعِ امت میں اِس گدائے دردمند کا نالہ بلند ہو گا تو اے صراطِ مُستقیم سے دُور اُفتادہ سرکش! اُس وقت اگر حضورؐ نے پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ کہ اللہ نے تجھ کو ایک مسلمان نوجوان دیا تھا تو یہ آسان کام بھی نہ کر سکا کہ اس کو آدمی بنا دیتا۔"

پھر بیٹے سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

اند کے اندیش و یاد آور پسر	اجتماعِ اُمتِ خیرُ البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر	لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن	پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفٰےؐ	گل شو از بادِ بہارِ مصطفٰےؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت	بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

اے بیٹے! ذرا اُمتِ خیرالبشر کے اُس اجتماع کا خیال کر اور پھر میری سفید ڈاڑھی اور اُس پر امید و بیم کی وجہ سے جسمِ لرزاں کو دیکھ! باپ پر ایسا نازیبا ظلم روا نہ رکھ اور غلام کو آقا کے آگے رُسوا نہ کر۔ تُو شاخِ مصطفٰےؐ کا ایک غنچہ ہے۔ مصطفٰےؐ ہی کی بادِ بہاری سے پھول بننے کی کوشش کر۔ (حضورؐ کے خُلقِ عظیم سے بہرہ ور ہونا چاہیئے) اسی طرح انہوں نے بیان کیا ہے کہ:۔

"جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے

گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی اور ایک دن صبح کو جب میں حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

اقبال نے اپنے ذیل کے شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

(اقبالِ کامل ص۳)

جب اقبال اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخل ہونے لگے تو اُن کے والد نے اُن سے عہد لیا کہ تعلیم میں کمال حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگی خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دیں گے۔ اقبال کی والدہ بھی اُن کے والد کی طرح ایک دیندار خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی اقبال کی تربیت و نگہداشت دین ہی کے اسلوب پر کی۔ اقبال نے "والدہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے اُس میں کہتے ہیں ؎

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات　　تھی سراپا دین و دُنیا کا سبق تیری حیات

غرضکہ اسلام اور رسولِ اسلام سے محبت اور اولیاء کرام سے عقیدت اقبال کے آبا کا خاصہ رہا ہے، یہی چیز اُن کے والدین کا فطری جوہر تھی اور یہی اقبال کو بھی وراثتاً ملی۔ بلکہ اقبال تک آتے آتے یہ شراب دو آتشہ و سہ آتشہ ہو گئی۔ "التجائے مسافر" میں اپنے ماں باپ کی اس تربیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

ابتدائی تعلیم اور ماحول

اقبال کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا اور اُس زمانے کے مکتبوں میں عربی، فارسی، اردو، خاصکر قرآن و دینیات ہی کی تعلیم ہوتی تھی۔ پھر ہائی اسکول میں داخل ہوئے تو مولوی میر حسن جیسے متبحر اُستاد ملے۔ جو پُرانی وضع کے پکّے با اصول دیندار آدمی تھے۔ شاگرد کی ذہانت، طبّاعی اور خداداد قابلیت کو تاڑ گئے اور اُس کو عربی و فارسی کے علاوہ اسلامیات اور حکمت و فلسفہ کی تعلیم بھی دی اور اُس پر ایسی کوشش اور توجہ صرف کی کہ ذرہ کو آفتاب بنا کر چمکا دیا۔ چنانچہ اقبال اپنی نظم "التجائے مسافر" میں اُستاد کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی　　رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی　　بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ ہے کہ خداوندِ آسمان و زمیں　　کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

مولوی میر حسن صاحب کو درس و تدریس کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ہر وقت پڑھنے والے کتابیں کھولے موجود رہتے۔ مولوی صاحب درس دے رہے ہیں، طالب علم سوالات کر رہے ہیں، بحث مباحثہ ہو رہا ہے، غرضکہ علم ہی کے چرچے اور دین ہی کے تذکرے تھے۔ اس علمی و دینی ماحول نے اقبال کی آتشِ شوق کو اور بھی تیز کر دیا۔ یہاں تک کہ انھیں کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ یا مطالعۂ کتب میں محو رہتے یا کسی گہرے تفکر میں ڈوبے ہوئے۔ اقبال کی خوش قسمتی دیکھئے کہ اُن کے فلسفے کے اُستاد اور وہ بھی مسلمان نہیں ایک یورپین عیسائی، فارسی و عربی کے علاوہ اسلامیات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

غالب اور حالی کے اثرات

اقبال نے شروع میں اگرچہ رسماً اصلاحِ سخن مرزا داغ دہلوی سے لی۔ مگر اُن کی طبیعت کو فطری مناسبت مرزا غالب سے تھی۔ وہی فارسی تراکیب جو غالب کا طرۂ امتیاز تھا، اقبال کے ہاں بھی اُسی کثرت سے موجود ہیں۔ وہی بلندیٔ فکر، وہی ندرتِ خیال اور نازک خیالی جو غالب کا سرمایۂ ناز ہے۔ اقبال کے کلام کی بھی وہی خصوصیات ہیں۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غالب نے نعتِ رسولؐ کا بھی کیسا باغ لگایا ہے اور اس ناواقفیت کا سبب یہ ہے کہ غالب کی بہترین نعت فارسی میں ہیں۔ اور فارسی کا اس ملک میں رواج نہیں رہا۔ دو ایک نمونے ملاحظہ فرما لیجئے۔ مہرنیمروز میں حمد کے بعد "زمزمۂ نعت" کے عنوان سے صفحے کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اتنا کچھ لکھنے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ اسی طرح دوسری تصانیف کو بھی بہتر سے بہتر نعت لکھ کر زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے اور نعت جس جوش کے ساتھ کہتے ہیں اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو حضور رسالت مآبؐ سے والہانہ عقیدت تھی۔ مثلاً ؎

ز نازِ نہاں پردہ برزدہ — ز ذاتِ خدا منجرے سرزدہ
نمائے دیرینۂ کردگار — بوئے ایزد از خویش ......
تن از نور پالودہ سرچشمہ — دلے ہیچ مہتاب در چشمہ
جمالش دل افروزِ روحانیاں — خیالش نظر سوزِ یونانیاں
بہ پیوند پیرایۂ خاکیاں — بہ دم حرزِ بازوئے افلاکیاں

آبِ حیواں بروشناسیِ خاکِ راہش زندہ را زندۂ جاوید سازد۔ عیسیٰ بہ ہمدمیِ بادِ دامنش جاں در تنِ مردہ اندازد۔ بہ طرفِ چمنے کہ دراں چمنش بہ مجوبی نشاندہ اند خضر سبزۂ بیگانہ و بر شمعِ انجمنے کہ دراں انجمنش بہ مہمانی خواندہ اند ارنی گوئے طورِ پروانۂ۔ کودکانِ کویش را از انجم مرغانِ رشتہ بر پا در دست کہ ہموارہ در طیراند و ہمچناں بر جائے مانند۔ اردویش را از افلاک توسنانِ رام زیرِ راں کہ پیوستہ بیک ہنجار دوند و از خطِ دائرہ بدر نروند۔ پویندگانِ جادۂ شرعش را سبزۂ باغِ بہشت چوں سایہ ہمپائے و نخلۂ طوبیٰ چوں خضر پیش رو تا ہر قدر براں جادہ عرضِ رہروی دادہ باشند بسایۂ رہ بُریدہ باشند و بر سبزہ گام نہادہ باشند ... ...

پیش از ہمہ خلق از خدا بہ تشریفِ ہستی نام دار و بعد از خدا بر ہمہ خلق بخداوندی سزاوار۔ ستم زدگان را بداد داور و غم زدگاں را بیاد یاور۔ آسمانیاں آستانیاں، سروشاں سُفتہ گوشاں، خاک نشینانِ درش از سپہر برترش منشورِ فرمانروائی راچناں خوار داشتہ اند کہ پنداری سطرِ نقشِ پائے مور پنداشتہ اند۔ حاملانِ عرش را اندوہے کہ در عالمِ فرضِ محال نیز نشانش نیست، اگر ہست جز رشکِ طالعِ جبیں سایانِ سنگِ آستانش نیست ؎

مُطاعِ آدم و عالم محمدؐ عربی — وکیلِ مطلق و دستورِ حضرتِ باری
عدو کشتے کہ ز چاکِ کنارِ توفیقش — دو دیدہ تا دلِ خسرو جراحت کاری
شہنشہے کہ دیوانِ دفترِ جاہش — بہ جبرئیل نویسند عزت آثاری
افادۂ اثرش بر قوائمِ افلاک — بشکلِ رعشہ براندامِ آدمی طاری
افاضۂ کرمش در حقائقِ آفاق — بسانِ روح در اعضائے جانور ساری

دو نیمہ گشتنِ پیکرِ ماہ دو ہفتہ از تنگیٔ حوصلۂ معجزہ خواستاراں بودہ است ورنہ در ہر سرانگشتش نیروئے بر زدنِ روزگاراں بودہ است ......

حضورؐ کے دُوسرے معجزات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ معجزات:۔

"از آثارِ بزرگیٔ صورت آں بزرگِ معنی و صورت است کہ صورت آشنایاں را از بہرِ مشاہدۂ تجلیاتِ الٰہی در عالمِ صورت ضرورت است ورنہ خواجہؐ را جز بہ چشمے کہ جز خدا را نہ بیند، نتواں دید و جز بہ دلے کہ جز خدائے نہ داند، نتواں دانیست"

ایک نعتیہ غزل اور سُن لیجئے ؎

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ است

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ او ز کمانِ محمدؐ است

دانی، اگر بہ معنیٔ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است

ہر کس قسم بد انچہ عزیز است می خورد
سوگندِ کردگار بہ جانِ محمدؐ است

واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جُنبشے ز بنانِ محمدؐ است

ور خود ز نقشِ مُہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

غالبؔ ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم!
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

غالبؔ کی نظم ونثر سے نعت کے یہ نمونے اس لئے دیئے ہیں کہ ہمارا یہ خیال ہے کہ جہاں غالبؔ کی دوسری شاعرانہ خصوصیات نے اقبالؔ کو متاثر کیا ہے وہاں غالبؔ کی نعت گوئی سے بھی وہ ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ نیز ہمارے دعوے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ "جاوید نامہ" کی سیر آسمانی میں جہاں مرزا غالبؔ سے ملاقات ہوتی ہے تو مرزا کی زبان پر اُس وقت بھی یہ ترانہ ہوتا ہے کہ ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست!

غالبؔ کے بعد جس شخص کا اثر اُنہوں نے قبول کیا ہے، وہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ وہی دردِ قوم، وہی یادِ ماضی اور عظمتِ رفتہ کے احیاء کی تڑپ۔ وہی قوم کی پستیٔ اخلاق و زبوں حالی کا رونا۔ اور قوم کے مستقبل کی فکر جو حالیؔ کے ہاں ہے وہی اقبالؔ کے ہاں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جہاں ان کو حالیؔ کی دُوسری باتوں نے متاثر کیا ہے وہاں اُن کی عشقِ رسُولؐ میں زمزمہ سنجی نے بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں:۔

"خواجہ حالیؔ مرحوم کے مسدّس کے تو وہ عاشق تھے، میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا، اُسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ مسدّس حالیؔ ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سُنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن اُس سے مسدّس

سُننے کی خواہش کرتے، حضورؐ سرورِ کائنات کی تعریف میں وہ بند جو "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" سے شروع ہوتے ہیں اور وہ اشعار جو مسدس کے آخر میں ہیں (اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے) اُنھیں بطورِ خاص مرغوب تھے، اُن کے سُنتے ہی اُن کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے۔ اسی طرح اگر کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔" (مکاتیب اقبال)

غرضکہ والدین کی تربیت، اُستاد کی تعلیم اور ماحول کے اثر نے اُن کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق بنا دیا۔ اور غالب، حالی اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام نے اس آگ کو اور تیز کر دیا۔ مگر اس وقت تک اُن کا عشق بھی اعتقادی تھا اور نعت گوئی کا انداز بھی تقریباً دوسرے نعت گو شعراء کا جیسا ہی تھا۔ مثلاً اپنی نظم "بلال" میں لکھتے ہیں ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسٰی پر
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اُس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا — خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

یا غزل ؎

سراپا حُسن بن جاتا ہے جس کے حُسن کا عاشق — بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟
پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر — ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی اُن کو جمال اپنا — بہت مدّت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

یا ترانۂ ملی ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اگرچہ ان اشعار میں بھی دوسرے شعراء کے مقابلہ میں کسی قدر امتیازی شان کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی اُن کو جمال اپنا!
بہت مدّت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

تاہم زیادہ تر قدیم انداز ہے، مگر بعد میں جب ان کا مطالعۂ علم وسیع ہوتا گیا اور خصوصاً علوم اسلامیہ کا مطالعہ۔ چنانچہ انہوں نے یورپ کے زمانۂ قیام میں اسلام پر لیکچر بھی دیئے اور اسلامی تعلیم کے فلسفے کا تحقیقی مطالعہ کر کے وہ مقالہ بھی لکھا جس پر اُن کو میونچ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ اس کے ساتھ ہی جب یورپ کے حالات کو دیکھ کر اُن کے دل میں بیداریٔ قوم اور احیاءِ دینِ اسلام کا جذبہ پیدا ہوا تو انہوں نے قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کا خاص طور پر مطالعہ کیا تاکہ قوم کے سامنے ایک لائحہ عمل رکھ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم اور دوسرے مذاہب کو جانچنے اور اُن سے اسلامی تعلیمات کا مقابلہ کرنے کا بھی موقع ملا تو اُن کا عشقِ رسولؐ اور عشقِ اسلام ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ وہ عشق جو پہلے محض تقلیدی تھا آخر کار حقیقی عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اب وہ بقول مولانا عبدالمجید سالک ؎

"حضورؐ کی ذاتِ والا کو ساری کائنات سے افضل مانتے تھے اور ہر مسلمان مانتا ہی ہے۔ لیکن تمام مسلمانوں کے ماننے اور اُن کے ماننے میں فرق یہ تھا کہ مسلمان "اعتقاد" کہتے ہیں کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

لیکن حضرتِ علامہ تحقیقاً اس عقیدے کو تسلیم کرتے تھے اور جب اس پر گفتگو کرتے تو القا و الہام، مقامِ نبوت، انسانیتِ کاملہ، توازنِ جذبہ و ادراک اور حریتِ انسانی کے مسائل پر نفسیاتِ جدید کی رُو سے ایسی سیر حاصل بحث فرماتے کہ کسی مخالف کو بھی حضورؐ کے انسانِ کامل ہونے میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی "

اصل میں اقبال نے یورپ پہنچکر جب اُس مہذب دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُن کو بڑی مایوسی ہوئی - اُس آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے پیچھے فسق و فجور اور معصیت و خدا فراموشی کے وہ اندھیرے ان کو نظر آئے کہ روح کانپ گئی اور مظلوم انسانیت کے لئے آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں - بڑی فکر اس بات کی ہوئی کہ کیا یورپ کے زہر کا تریاق ہے بھی یا نہیں - کیا دُنیا اسی طرح جہنم کدہ بنی رہے گی - کیا انسان اسی طرح انسان کا شکار ہوتا رہے گا - اور اس مایوسی اور بے چینی کی حالت میں جب انہوں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو اُن کو صبحِ امید کے آثار نظر آنے لگے - اور بالآخر اُن کے وسیع و عمیق مطالعہ نے اُن پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ ان تمام مصیبتوں کا حل اور ان جملہ امراض کا علاج اسلام اور صرف اسلام ہے - اب وہ کھُلے بندوں اسلام کے محامد و محاسن اور یورپ کے نقائص و معائب بیان کرتے ہیں - مثلاً :-

یورپ میں کیا دیکھا ؎

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی!

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی!

یورپ کی حالت کیا ہے ؟

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہُنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

ہر دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

یورپ کی سیاست کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

می کند بندِ غلاماں سخت تر
حرّیت می خواند او را بے بصر!

گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید!

سلطنت را جامعِ اقوام گفت
کارِ خود را پختہ کرد و خام گفت

در فضایش بال و پر نتواں گشود
با کلیدش ہیچ در نتواں گشود

گفت با مرغِ قفس اے دردمند
آشیاں در خانۂ صیاد بند

ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ | او نباشد ایمن از شاہین و چرغ
از فسونش مرغ زیرک، دانہ مست | نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست
حریت خواہی بہ پیچاکش میفت | تشنہ میرو بر لب تاکش میفت
الحذر از گرمی گفتار او | الحذر از حرف پہلو دار او
چشمہا از سرمہ اش بے نور تر | بندۂ مجبور از و مجبور تر!
از شراب ساتگینش الحذر | از قمار بد نشینش الحذر

یہ سیاست غلاموں کی قید کو اور سخت کرتی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ کم عقل اس کو آزادی سمجھتے ہیں ہنگامۂ جمہوریت کی شوراشوری بھی دیکھی - ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت کا نقاب ڈالا گیا ہے! اس سیاست کی ہوائیں پر نہیں کھولنے چاہئیں - اس سے کوئی بھی مشکل آسان نہیں ہو سکتی - پرندے سے کہتی ہے غم نصیب! صیاد کے گھر میں آشیانہ بنا - جو کوئی دشت و چمن میں آشیانہ بناتا ہے، شاہین و عقاب سے محفوظ نہیں رہتا - اس کے افسوں سے مرغ زیرک دانہ مست ہو کر نالہ کرنا بھول جاتا ہے - اگر تو حریت چاہتا ہے تو اس کے دام پُر پیچ میں نہ پڑ - پیاسا مرجانا پسند کر مگر اس کے انگوروں سے دُور رہ - اس کی گرمی گفتار اور حرف پہلو دار سے خدا کی پناہ! آنکھیں اس کے سرمہ سے اور بھی بے نور ہیں اور بندۂ مجبور اس کے ہاتھوں اور بھی زیادہ مجبور ہے ؎

از شراب ساتگینش الحذر! | از قمار بد نشینش الحذر!

مغربی تہذیب کیا ہے؟

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

یورپ کی معاشرت ؎

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے | ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرے کا کمال؟ | مرد بیکار و زن تہی آغوش

حکمت فرنگ ؎

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

ایک جگہ اسلامی تعلیمات کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں ؎

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست | چشم او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام | حکمتش خام است و کارش ناتمام
امتے بر امتے دیگر چرد | دانہ ایں می کارد آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است | از تن شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری ست | پردۂ آدم دری سوداگری ست

ایں بنوک، ایں فکرِ چالاکِ یہود | نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نگردد ایں نظام | دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

افسوس یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں۔ اُس کی آنکھ اللہ کے نور سے نہیں دیکھتی۔ حلال و حرام کا فرق نہیں جانتا۔ اس کی حکمت خام ہے اور اس کا کام ناتمام۔ ایک قوم دُوسری قوم کو کھا رہی ہے۔ ایک بوتا ہے اور دوسرا اُس کے حاصل کو اُگوا لیتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھین لینا ایک طرف اُن کے جسم سے جان تک نکال لینا حکمت ہے۔ غرضکہ تہذیب نو کا شیوہ آدم دری ہے اور آدم دری کا پردہ تجارت کو بنایا ہے۔ ان بنکوں نے جو یہود کی فکرِ چالاک کا مظہر ہیں آدمی کے دل سے نور چھین لیا ہے جب تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا دانش و تہذیب سودائے خام ہے!

یورپ کی عورت ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت | ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت!
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن | کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن | ہے عشق و محبّت کے لئے علم و ہنر موت!

غرضکہ رنگ و نسل کے امتیازات، گورے کالے کا فرق۔ وطنیت و قومیت کے بتوں کی خوں آشامی، مساوات کا فقدان۔ اُخوت ناپید، انسان کا انسان بدترین دشمن، سُود خواری، نفع اندوزی، لُوٹ کھسوٹ، آپادھاپی، اسی دُنیا کو سب کچھ سمجھنا۔ حیات بعد الموت سے انکار، تن کی فکر روح سے غفلت، ہمدردی، ایثار، مروت اور غمخواری سے بے تعلقی، عورت کی آزادی یہ اور اسی قسم کی بے شمار انفرادی و اجتماعی خرابیاں یورپ کی تہذیب اور اُس کی معاشرت میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس سے پہلے خود اپنے ملک میں ہندو، سکھ اور دُوسری اقوام کے حالات کا اچھی طرح مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جب اسلامی تعلیمات پر غور کیا تو معاملہ اور ہی نظر آیا۔ اسلام کے ہمہ گیر، جامع اور عیر فانی اصولِ مساوات، حُرّیت، اُخوت اور اُس کا سیاسی و معاشی نظام۔ اس کے تہذیب، تمدّن اور عمرانی زندگی کے اصول اور پھر صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی زندگی اور وہ پاکیزہ و بے عیب معاشرہ، اُن کی نگاہِ تصور کے سامنے آیا تو اُن کو یقینِ کامل ہو گیا کہ اسلام ہی کے اصول پر عمل پیرا ہونے میں دُنیا کی نجات ہے اور یہی نظامِ زندگی دُنیا کے لئے دار الامان کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے مطالعہ علمی اور مشاہدۂ عینی کے تاثرات کو سب سے پہلے اپنی دو مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے ذریعہ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ دُنیا کے لئے یہ ایک چیلنج بھی تھا۔ اور دعوتِ عمل بھی تھی۔ چیلنج اس طرح کہ اگر اس سے بہتر دستورِ حیات کسی کے پاس ہے تو اُس کو پیش کیا جائے۔ اور دعوت اس لئے کہ اگر اس سے بہتر کوئی دستور العمل نہیں ہے تو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کی خاطر اسے قبول کیا جائے۔ اور اس طرح دُنیا کے موجودہ خلفشار کو دُور کر کے دُنیا کو امن و سلامتی اور خوشحالی سے دوچار ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی قوم کو بھی یاد دلایا ہے کہ وہ اس نسخۂ کیمیا کو جس نے مسِ خام کو کندن بنا کر دکھا دیا تھا۔ طاقِ نسیاں سے اُتار کر اپنی زندگی کو پھر اس کے ذریعہ آراستہ کرے!

اسلام نے افراد کو جماعت کا بہترین رُکن بننے کے لئے کیا ہدایات دی ہیں۔ یہ ہدایات انھوں نے "اسرارِ خودی" میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اپنے آپ کو پہچاننا۔ بلند مقاصد کی تولید اور اُن کے حصول کی جدوجہد کے ذریعہ ہمیشہ

مصروفِ عمل رہنا۔ نفیٔ خودی، ترکِ آرزو اور زندگی کی دشواریوں سے فرار اختیار کرنے کو مذموم اور سوال کو حرام قرار دینا کہ اس سے خودی ضعیف ہوتی ہے، خودی کو عشق کے ذریعہ محکم بنانا تاکہ وہ نظامِ عالم کے قوائے مخفیہ و ظاہرہ کو مسخر کر سکے۔ تربیت خودی کے لئے اطاعتِ قانونِ الٰہی اور ضبطِ نفس کا مکمل نصاب یعنی کلمۂ طیبہ کی حقیقت کا سمجھنا۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا سختی سے پابند ہونا کہ ان میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد نیابتِ الٰہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا کہ یہ انسانیت کی معراج ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اعلاء کلمتہ الحق قرار دینا، اور اس بلند و پاکیزہ مقصد کے تحفظ و بقا کے لئے جہاد کرنا اور جہاد کے علاوہ ہر قسم کی جنگوں کو حرام قرار دینا ارکانِ اسلام کی پابندی کے ذریعہ وقت کی قدر، نظم و ضوابط اور توجہ الی اللہ اور اطمینانِ دل کا بہترین سبق دینا۔ وغیرہ۔

اجتماعی و ملّی زندگی کے متعلق اسلام کی برکات کو "رموزِ بے خودی" کے ذریعہ بیان کر کے اسلام کے بتائے ہوئے آئین کو حیاتِ ملی کے لئے بہترین ضابطہ قرار دیا ہے۔ اور اس ضمن میں مختلف اسلامی اصولوں پر تبصرہ کر کے اپنے پیش کردہ نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

> "ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان مثنویوں کے ذریعہ حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی۔
> (مکاتیب اقبال صـ۲۴)

اسلام نے فرد و ملت کے ربطِ باہم پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔ "شیطان جماعت سے دور رہتا ہے" ؎

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ — ہست شیطاں از جماعت دور تر

اور جس طرح جماعت بغیر فرد کے وجود میں نہیں آتی، فرد بھی جماعت کے بغیر زندہ و پایندہ نہیں ہو سکتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد کی عزت قوم سے ہے اور ملت کا نظام افراد سے۔ فرد جماعت میں مل کر قطرۂ ناچیز سے قلزمِ بیکراں ہو جاتا ہے۔ جب تک تنہا رہتا ہے، مقاصد سے غافل رہتا ہے اور اس کی قوتیں منتشر رہتی ہیں۔ جب قوم سے وابستہ ہو جاتا ہے تو قوم اس کو ضبط و نظم سے آشنا کر کے ہر طرح کی غلامی سے آزاد کر دیتی ہے۔ جب وہ حلقۂ آئینِ جماعت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو خوئے رم چھوڑ کر اپنے ہی حسن و جمال کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اپنے ہی اصول و روایات پر فریفتہ اور اپنے ہی نظریات کا دلدادہ رہتا ہے۔ دوسروں کی اداؤں پر دل کو فدا کرنے کی بجائے قوم کے آئینے میں اپنی ادا دیکھتا اور خود کا گرفتار ہو جاتا ہے!

اسلام نے فرد کو اعلیٰ مقاصد کے لئے جماعت میں گم ہونے کی تعلیم دی ہے اور فرد کی خودی اور اس کی تربیت و استحکام کی غرض و غایت ہی یہ بتلائی ہے کہ ایک بہترین جماعت وجود میں آئے جو "کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْص" کا مصداق ہو۔ فرد جماعت میں مل کر قطرہ سے دریا اور برگ گل سے چمن ہو جاتا ہے تو جماعت بھی ایسے افراد کی بدولت، جو اپنی تمام انفرادی و شخصی صلاحیتوں کے ساتھ جماعت میں گم ہوتے ہیں۔ محکم اور قوی ہوتی ہے ؎

در جماعت خود شکن گردد خودی! | تا ز گلبر گے چمن گردد خودی!
فرد تا اندر جماعت گم شود | قطرۂ وسعت طلب قلزم شود!

اور جماعت میں مل کر افراد کی حالت کیا ہو جاتی ہے؟ ؎

مردماں خوگر بیک دیگر شوند | سُفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
در نبردِ زندگی یارِ ہم اند | مثلِ ہمکاراں گرفتارِ ہم اند
محفلِ انجم ز جذب باہم است | ہستیٔ کوکب زکوکب محکم است

جماعت کا قیام تو اختلاطِ افراد سے ظہور پذیر ہو جاتا ہے مگر اس کی تعمیر و تکمیل کسی زندہ عقیدے یا قانون کے ذریعہ مربوط ہو کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ملّتِ اسلامیہ کی تکمیلِ تربیت نبوت کے ذریعہ ہوئی ہے۔

اسلام نے توحید و رسالت پر ایمان کی بنیاد رکھی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا دامن چھوٹا اور ایمان کی عمارت زمین پر آرہی۔ توحید کے ذریعہ انسان تمام مکروہات سے محفوظ رہتا ہے۔ مایوسی، خوف اور حزن و ملال کیونکر باقی رہ سکتا ہے جبکہ یقین ہو جائے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس سے غلطی یا زیادتی سرزد نہیں ہوتی۔ جو سمیع و بصیر بھی ہے اور ہمہ داں و قادرِ مطلق بھی اور جب تک ہم اس سے وابستہ ہیں ناکامی و نامرادی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا اور ہماری کوششوں کا ثمرہ ہم کو مل کر رہے گا۔ اقبال نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست | زندگانی محکم از لاتقنطوا ست
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر | از نبیؐ تعلیمِ لاتحزن بگیر
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود | قلبِ او از لاتخف محکم شود

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ اور لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللهَ مَعَنَا سے اُنہی کو تقویت و طمانیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے جو پرستاران توحید ہیں۔ ورنہ حزن و ملال، مایوسی و خوف کا علاج مشکل ہے۔ اس لئے اقبال فرماتے ہیں ؎

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس عقیدے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے اسلام ہی نے موجوداتِ فطرت کی تسخیر کا سبق دیا ہے۔ کیونکہ جب چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریا اور فطرت کی دوسری چیزیں قابلِ پرستش سمجھ لی جائیں گی تو ان کے تجزیہ و تسخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے توحید نے جہاں انسان کو ہر قسم کی پرستش سے نجات دلائی وہاں قوائے فطرت کو مسخّر کرنے پر بھی جرأت کے ساتھ آمادہ کیا۔ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسان کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ:-

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ!

اس کے علاوہ بھی بے شمار آیتیں قرآنِ پاک میں موجود ہیں۔ جن کے ذریعہ انسان کو تسخیرِ موجوداتِ فطرت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے!

رسالت کے ذریعہ اسلام نے اُن تمام نظریات اور اصول کے ممکن العمل ہونے کو بھی ثابت کیا جو اُس نے پیش کئے۔ اور نوعِ انسانی کے لئے باعثِ خیر و برکت ہونے کو بھی اس لئے کہ اسلام کے رسولؐ نے اُن پر خود عمل کر کے دکھلایا اور اُن کی زندگی ہی میں

ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا کہ چشمِ فلک نے ایسا نہ پہلے کبھی دیکھا نہ آئندہ کبھی دیکھ سکے گی۔ اقبال نے ذیل کے اشعار میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے ؟ — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا ؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں — "بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا" ؟
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تم سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے — جہانگیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

یہ معاشرہ اسلام کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی و روحانی اصول پر قائم ہوا تھا۔ انسان کے لئے سراپا رحمت و رافت اور فلاح و برکت تھا۔ اور جانشینانِ رسول اللہ نے اپنی زندگیوں کو حضورؐ کے اسوۂ پاک کے سانچہ میں ڈھال کر دنیا کا نقشہ بدل دیا تھا۔ جب تک کسی نظریہ کے پیچھے زندہ و پائندہ شخصیت کارفرما نہ ہو، وہ نظریہ تاریخ کے اوراق کی زینت تو ہو سکتا ہے مگر دنیا میں انقلاب نہیں لا سکتا۔ اور کوئی زندہ و پائندہ سوسائٹی محض نظریات و اصول کے ذریعہ وجود میں نہیں آ سکتی۔ جب تک کہ وہ نظریات عمل کے ذریعہ افراد کے کردار و گفتار میں متشکل ہو کر اپنی نفع بخشی ثابت نہ کر دیں۔ نیز حضورؐ رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل رکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حریت، مساوات اور اخوتِ نوعِ انسانی کی بنیاد رسالتِ محمدیہؐ ہی کے ذریعہ رکھی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عالمِ انسانی کی فلاح و بہبود انہی حقائق سہ گانہ کی تشکیل و تعمیم میں مضمر ہے۔ اور انہی صفات کی وجہ سے اسلام زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت

اسی حریت، مساوات اور اخوت کی بناء پر اسلام کے اصول پر قائم ہونے والی سوسائٹی جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر ساری دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام ساری دنیا کے لئے پیامِ امن و راحت بن کر آیا ہے نہ کہ محض مسلمانوں کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں اسلام کے خدا کو رب العالمین، رسولؐ کو رحمۃ للعالمین کہا ہے، وہاں اپنے آپ کو بھی "ھدًی و ذکریٰ للعالمین" کہا ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ اپنے اصول اور تعلیمات کی جامعیت و ہمہ گیری کی وجہ سے زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے تو اس کے نزدیک رنگ و نسل اور ملک کا امتیاز بھی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست — رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست	مرز بوم او بجز اسلام نیست
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم	در دل او یاوہ گردد شام و روم

اسی طرح زماں کی قید سے آزاد ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست	اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست
از اجل ایں قوم بے پرواستے	اُستوار از نحنُ نزّلنا ستے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است	از دوامِ او دوامِ ذاکر است

خدا فرماتا ہے۔ نحنُ نزّلنا الذکرَ وَ اِنّا لَہٗ لحافظون ط ہم نے ہی ذکر (قرآن) نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ضامن ہیں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ ذکر کی حفاظت سے ذاکر کی حفاظت لازم آتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان نہ ہو اور قرآن ہو۔ قرآن ہے تو مسلمان بھی ہے ؎

تا خدا اَن یُطفؤا فرمودہ است	از فسردن ایں چراغ آسودہ است

جب خدا نے قرآن میں فرما دیا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا چراغ کفار اپنی پھونکوں سے نہیں بجھا سکیں گے تو پھر اس چراغ کے بجھنے کا اندیشہ کس کو ہو سکتا ہے! اور یہ حفاظت کوئی بے وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ صرف یہی اُمت ہے جو تخلیقِ عالم کے مقصد کو پورا کر سکتی ہے ؎

اُمتے در حق پرستی کاملے	اُمتے محبوبِ ہر صاحبدلے
حق بروں آورد ایں تیغِ اصیل	از نیامِ آرزو ہائے خلیل
تا صداقت زندہ گردد از دمش	غیرِ حق سوزد ز برقِ پیہمش
ماکہ توحیدِ خدا را حجتیم!	حافظِ رمزِ کتاب و ملتیم!

ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے آئین بھی ضروری ہے اور ایک ایسی ملّت کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی جو آخری اُمت ہے اور قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بن کر آئی ہے، آئین بھی ایسا ہی جامع، ہمہ گیر اور لازوال ہے جو انسان کے ہر شعبۂ حیات کے لئے مکمل ہدایات کا حامل ہے۔ اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہنمائی کرتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:-

"تو جانتا ہے تیرا آئین کیا ہے، یعنی اس آسمان کے نیچے تیری عزت کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب جو قرآنِ حکیم ہے۔ جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔ حیاتِ انسانی کے لئے نسخۂ اسرار ہے، جس کی قوت سے ناپائدار پائدار ہو جاتے ہیں۔ جس کا حرف حرف ریب و تبدل سے محفوظ ہے۔ جس کی آیات شرمندۂ تاویل نہیں ہیں۔ جس کے زور سے جام پتھر سے لڑ جاتا ہے۔ غلام جس کے پاس آتے ہیں تو آزاد ہو کر جاتے ہیں۔ جس سے ظالم نالاں ہیں۔ جو نوعِ انساں کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ جس کا حامل رحمۃ للعالمین ہے۔ جس کی بدولت رہزن، راہبر بن گئے، اور وحشیوں نے اُس ایک چراغ کی روشنی سے علوم کی سینکڑوں تجلیاں اپنے دماغ

میں بھرلیں۔ قرآن کیا ہے؟ خواجہ کے لئے پیغامِ مرگ اور بندۂ بے نوا کا دستگیر۔ جب قرآن کا نقش اس عالم میں قائم ہوا تو کاہن وپاپا کے نقوش باطل ہوگئے۔ جو دل میں ہے برملا کہتا ہوں کہ یہ کتاب نہیں ہے اور ہی کوئی چیز ہے۔ جب دل میں اُترتا ہے تو دل کی حالت اور ہوجاتی ہے اور جب دل بدل جاتا ہے تو جہان بھی بدل جاتا ہے۔ یہ خدا کی طرح عیاں بھی ہے اور نہاں بھی، زندہ و پائندہ اور گویا بھی۔ اس میں مغرب کی تقدیر بھی پوشیدہ ہے اور مشرق کی بھی۔ اور انسان کے خیال میں برق کی سرعت پیدا کرتا ہے ؎

توہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟   زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے، تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او   درفتد با سنگ جام از زورِ او
می بَرد پابند و آزاد آورد   صید بنداں را بہ فریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃ للعالمیں
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند   از کتابے صاحبِ دفتر شدند
دشت پیمایاں ز تابِ یک چراغ   صد تجلی از علوم اندر دماغ
چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
مثلِ حق پیدا و ہم پنہاں است ایں   زندہ و پائندہ و گویاست ایں

اندرو تقدیرِ ہمۂ غرب و شرق
سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی و استحکام کے لئے ایک مرکزِ محسوس بھی ضروری ہے اور ایسی ملّت کیلئے جو وحدتِ مقصد اور وحدتِ نصب العین میں یکتا و یگانہ ہے مرکز بھی ایک ہے اور ایسی بلند روایات کا حامل جو اس ملّت کے شایانِ شان ہے۔ یعنی بیت الحرام جو توحید کا سرچشمہ اور ملّتِ ابراہیمی کی جائے ولادت ہے۔ اقبال اس مرکز کی تعریف کرتے ہیں ؎

قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
از حسابِ او یکے بسیار ہیت   پختہ از بندِ یکے خود داریت
تو زِ پیوندِ حریمے زندۂ!   تا طوافِ او کنی پائندۂ

در جہاں جانِ اُمم جمعیت است — در نگر سرِّ حرم جمعیت است

اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کا نصب العین بھی ایک ہی ہے، وحدتِ نصب العین میں اس کی بقا، کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی کی تبلیغ سے ملّت کی رگوں میں زندگی کا خون رواں ہے۔ اگر وحدتِ مقصد نہ ہو تو افراد میں ربطِ حقیقی نہیں پیدا ہو سکتا اور ربطِ حقیقی کے بغیر ہجومِ افراد تو ہو سکتا ہے مگر ملّت نہیں ہو سکتی۔ اور جبکہ نصب العین ایک، اور اتنا بلند یعنی "حفظ و نشرِ توحید" تو ایسی ہر جماعت دُنیا میں حقیقی جمعیت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اقبال اوّل مدّعا کی تعریف کرتے ہیں ؎

مدّعا رازِ بقائے زندگی — جمعِ سیمائے قوائے زندگی
چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود
مدّعا مضرابِ سازِ ہمت است — مرکزے کو جاذبِ ہر قوّت است
دست و پائے قوم را جنباند او — یک نظر صد چشم را گرداند او

اس کے بعد ملّتِ اسلامیہ کے مدّعا و مقصد کی تعریف کرتے ہیں ؎

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی — مہر را تابندگی رخشندگی
صد نوا داری چو خوں در تن رواں — خیز و مضرابے بتارِ او رساں
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

اسلام نے توسیعِ حیاتِ ملّی کے لئے موجوداتِ فطرت کی تسخیر پر بڑا زور دیا ہے۔ قرآن میں انسان کے علوِ مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے جا بجا ارشاد ہوا ہے کہ چاند، تارے، سورج، پہاڑ، دریا، برق و باراں انسان کے لئے مسخّر کر دیئے گئے ہیں۔ اور انسان کو وہ صلاحیتیں دے دی گئی ہیں کہ اُن سے کام لے کر ہر چیز کو تسخیر کر سکتا ہے۔ اور یہ بات اسلام نے اس وقت کہی کہ جب دُنیا قوائے فطرت کی تسخیر کی بجائے اُن کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی آرام پسند زندگی سے اگر اس حقیقت کا ثبوت نہیں ملتا کہ اس قوم نے قرآن کے اس حکم کی تعمیل میں کبھی تسخیرِ موجودات کی ہوگی تو قرآن کی اصلی تعلیم اور تاریخ کے حقائق سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔ بقولِ اقبال اسلام تو یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اور یہ تسخیر کسی مادّی منفعت، آسائشِ تن اور نفسانی کامرانی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے معرفتِ خودی اور عرفانِ الٰہی وابستہ ہے ؎

بندۂ حاضر کند تقبیرِ غیب — می شود دیباچۂ تسخیرِ غیب
ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس — سینۂ او عرصۂ تیر است و بس
از کُنِ حق ماسوی شد آشکار — تا شود پیکانِ تو سنداں گزار
رشتۂ باید گرہ اندر گرہ — تا شود لطفِ کشودن را فرہ

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر　　تختۂ تعلیم اربابِ نظر
اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ　　عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را　　دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است　　امتحانِ ممکناتِ مسلم است

گیر او را تا نگیرد او ترا
ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

ثابت و سیارۂ گردوں وطن　　آں خداوندانِ اقوامِ کہن
ایں ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند　　پیش خیز و حلقہ در گوشِ تو اند
جستجو را محکم از تدبیر کن　　انفس و آفاق را تسخیر کن
تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظُرِیؐ　　پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری

آج مہذّب دُنیا اور اُن کی دیکھا دیکھی مغرب زدہ مسلمان بھی اسلام کو ہدفِ طعن بناتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھا ہے اور اُس کو سوسائٹی میں کوئی درجہ نہیں دیا۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز پر اسلام کو خصوصیت سے دوسرے مذاہب پر تفوق حاصل ہے اُسی پر اس کو مطعون کیا جائے! یورپ کے لئے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ع　ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے ست

مگر اپنے بھائیوں کی خیرہ چشمی و کور باطنی کو کیا کہیں! کہنا پڑتا ہے کہ:-

ع　سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست!

اسلام نے عورت کا مقام بھی متعین کیا ہے اور اس کی حدودِ عمل بھی متعیّن کی ہیں اور سوسائٹی میں اتنا بلند مقام دیا ہے کہ آج تک کسی مذہب نے نہیں دیا۔ عورت کو بالکل آزاد چھوڑ کر فلم ایکٹریس، رونقِ محفل اور بیسوا بنا دینا عورت کو عزّت بخشنا نہیں ہے بلکہ ذلّت کے اسفل السافلین میں پہنچا دینا ہے۔ اس لئے اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عورت کو ایسی عزّت نہیں بخشی ہے۔ نیز عورت کو عورت ہی رکھا ہے مرد بننے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

پوششِ عریانیٔ مرداں زن است　　حسنِ دلجو عشق را پیراہن است

یہ قرآن ہی کے ارشاد "ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ" کا ترجمہ ہے۔ عورتیں مردوں کا لباس ہیں۔ مردوں کے بہت سے عیوب کا پردہ عورتوں ہی سے رہتا ہے۔

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات　　ذکرِ او فرمود با طیب و صلوات

یہ حضورؐ کی حدیث مبارک کی طرف اشارہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے میں تمہاری دُنیا میں سے نماز، خوشبو اور عورت کو محبوب رکھتا ہوں۔ غور کیجئے حضورؐ کے اس ارشاد سے عورت کا مقام کتنا بلند ہو جاتا ہے ؎

مسلمے کو را پرستارے شمرد　　بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد

اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی نادان شخص عورت کو کنیزِ خانہ سمجھتا ہے تو وہ حکمتِ قرآنی سے بہرہ ور نہیں ہے ؎

ملت از تکریمِ ارحام است و بس　　ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ -

اور جس صلۂ رحمی کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو توڑتے ہیں۔ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ لوگ خسارے میں ہیں۔

برد مدایں لالہ زارِ ممکنات	از خیابانِ ریاضِ اُمّہات
حافظِ رمزِ اخوت مادراں	قوتِ قرآن و ملت مادراں
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں	زیرِ پائے اُمّہات آمد جناں

حضور کا ارشاد ہے کہ جنت ماؤں کے پیروں تلے ہے۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ - اقبال نے اسلام کی اس تعلیم کو زندہ عملی صورت میں حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حیات طیبہ میں دیکھا ہے، اس لئے خواتین اسلام کو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ	مادراں را اُسوۂ کامل بتولؓ

اسرار خودی اور رموز بے خودی کے بعد اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں اسلام کے اصول و نظریات ہی کی نئے نئے پیرایوں میں تعریف و تشریح کی ہے۔ مثلاً اسلام نے جنگ کا کیا معیار مقرر کیا ہے؟

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن	نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

نماز کیا ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے	ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مومن کی شان کیا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم	رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش	خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن!
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں	جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن!
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن	گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت	یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی	ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے	دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم	دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز	آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات	مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

ایک جگہ مومن سے خطاب کرتے ہیں ؎

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ	اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری!

کافر و مومن کا فرق بتاتے ہیں ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

کافر ہو تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

غرضکہ اب اُن کو یقین کامل ہو گیا کہ اسلام کے سوا دُنیا کا کوئی دوسرا نظام انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ صرف اسلام ایسا مذہب ہی جو مکمل ضابطۂ حیات رکھتا ہے، ایسا ضابطہ جو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہو کر پوری نوعِ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس انکشافِ حقیقت سے اُن کو اسلام کے ساتھ والہانہ گرویدگی پیدا ہو گئی اور اسی گرویدگی نے ترقی کر کے پیغمبرِ اسلام کے عشق کی صورت اختیار کر لی۔ اب نہ اسلام کے ساتھ اُن کا محض اعتقادی تعلق رہا نہ پیغمبرِ اسلام کے ساتھ بلکہ دونوں کے ساتھ حقیقی عشق ہو گیا۔ جس کی بنیاد سالہاسال کی تلاش و جستجو اور تحقیق پر ہے۔ اس یقین کے بعد اُن کی صرف ایک خواہش تھی۔ وہ یہ کہ اسلام کے اصول کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ اُن کو ایک ایک گھر میں نہیں ایک ایک شخص تک پہنچایا جائے۔ اور اس کو وہ نوعِ انسان کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا " اسلامی دار الاشاعت " قائم ہو جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچائے۔ ایک ایسی لائبریری ہو جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں جمع ہوں اور ایک ایسا ادارہ ہو جس کے ذریعہ علومِ اسلامی کا احیاء کیا جا سکے۔ اُن کے خطوط سے جو انہوں نے اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو لکھے ہیں اور اُن کے احباب کی شہادتوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض تحریرات کے ضروری اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ ایک خط حضرت علامہ مصطفےٰ المراغی شیخ جامعہ ازہر کے نام عربی میں لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

" ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کے ہو۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں۔ اور اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم اُن کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شور و شغب سے دُور ایک گوشہ میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں۔ جو اُن کے لئے ایک علمی، اسلامی مرکز ہو۔ اور اُن کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پُرانی کتاب موجود ہو اور اُن کی رہنمائی کے لئے ایک ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل اور صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو اور انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو۔ تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں اُن کی مدد کرے، تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعہ تمدنِ اسلام کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔" (مکاتیبِ اقبال ص ۲۵۱)

ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔

" میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے، خدا کے فضل و کرم سے، میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ نہ اختیار

کرے - حال میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا - فرانسیسی خوب جانتا تھا مگر اسلام سے بالکل بے خبر تھا - اس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے "
(مکاتیب اقبال صـ ۱۵۵)

ایک دوسرے خط میں سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں :-

" اس وقت بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے - اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا - موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا - ہندوستان کی جمعیتہ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے - ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلباء کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہ اسلامی کو حقیقت معلوم ہو" (مکاتیب اقبال صـ ۱۴۳)

مسٹر نیاز احمد --- ایم اے دہلی) کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" میرے خیال میں آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ آپ کو اسلام، اُس کی مذہبی اور سیاسی تاریخ، اُس کے کلچر اور اُس بحران کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں مغرب کے افکار جدید کے اسلامی زندگی اور افکار پر اثر نے پیدا کر دیا ہے - آپ عیسائیوں کے تبلیغی طرز سے زیادہ اسلام پر کتابیں لکھ کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں - اسلام میں تنخواہ دار مبلّغین کی انجمنیں کبھی نہیں تھیں، تبلیغ کا کام انفرادی کوشش اور سرگرمی پر موقوف رہا ہے - افریقہ کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا ایسے مسلمانوں کی انفرادی کوششوں کا مرہون منت ہے جن کے پاس اس خدمت کے ظاہری وسائل موجود نہ تھے - ہندوستان میں بھی اشاعت اسلام کا کام شخصی اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے " (مکاتیب اقبال صـ ۲۶)

حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کو لکھتے ہیں :-

" جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے - ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یورپ جانا بے سود ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب   اُسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں!

مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجئے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوّف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کرکے محمد عربی کی اصلی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے - پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمتِ اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے " (مکاتیب اقبال صـ ۳۹۸)

پروفیسر جی، ایس چٹرجی لکھتے ہیں :-

"اقبال کی قوتِ تفکر نے اُسے مشرق اور عالمِ اسلام کے اُن مصائب کے اسباب و علل سے آگاہ کیا اور اس کی عاقبت بیں نظروں نے اُن امراض کا مداوا اور اس پستی و زبوں حالی سے نجات پانے کا اُن کو راستہ بتادیا - چنانچہ اس دور میں اس کے مُنہ سے بجائے ہندی ترانہ کے اسلامی ترانہ ادا ہوا اور وطنیت کی محدود فضاؤں سے نکل کر وہ عالمگیر قومیت کی پیام رسانی کرنے لگے اقبال کے نزدیک اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے جو انسان کی تقدیر اور اس کی ناقابلِ فتح روح کے تمام امکانات پر حاوی ہے۔" (اقبال نامہ ص ۱۳)

اقبال نے اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ذیل کے اشعار میں کیا ہے ؎

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے ۔۔۔ وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی !

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ۔۔۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی !

غرض کہ اب اُن کا عشق اُس طفلِ سادہ کا جیسا نہیں ہے جو چاند اور سورج کو دیکھ کر اُن کی طرف ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اور اُن کو اپنی آغوش میں لینے کی سعیٔ بے حاصل کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے بلکہ اب اُس بالغ نظر انسان کا عشق ہے جو چاند اور سورج کا اس لئے دلدادہ ہے کہ ان کو نظامِ عالم میں بڑا دخل ہے، اگر وہ نہ ہوں تو دُنیا خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے!

بعض پچھلے شعراء نے عشقِ رسُولؐ کے ترانے اس انداز میں گائے ہیں کہ اُن سے اُن کی وارفتگی کا اظہار تو ہوتا ہے مگر یہ بہت کم پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ سرورِ کائنات کی سیرت کا اُنھوں نے کیا اثر قبول کیا ہے۔ یہ انداز کچھ موجودہ دور کے شعراء کی داد کا سا ہے کہ واہ واہ کا شور تو زمین سے آسمان تک پہنچ گیا۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ شعر کی کونسی خوبیوں نے اس تحسین و آفرین کیلئے مجبور کیا ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کا اظہارِ عشق اُس شاعرِ سخن شناس کا سا ہے جو شعر کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھ کر واہ وا اور سبحان اللہ کہتا ہے اور ساتھ ہی شعر کے محاسن کی طرف بھی لطیف اشارہ کر جاتا ہے۔ یعنی محض عقیدہ نہیں بلکہ حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس دُنیا پر ابرِ رحمت بن کر برسی ہے اور ایسی برسی ہے کہ ایک بار دُنیا کی تمام کلفتیں دُور ہوگئی ہیں۔ اور آج بھی اگر اخلاقی روشنی کہیں نظر آتی ہے تو وہ اُسی آفتابِ عالمتاب کی ضیاباری کے آثارِ باقیہ ہیں۔ نیز وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر دُنیا پھر حضورؐ کی لائی ہوئی ہدایت پر عمل پیرا ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ کر آفتابِ اسلام کی ضیا پاشیوں سے دُنیا پھر منوّر ہو سکتی ہے، اس لئے وہ دُنیا کو اس تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مُسلمانوں کو وہ خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں کہ وہ اُٹھیں، اوّل خود عمل کر کے دکھلائیں، پھر اس تعلیم سے دُنیا کے گوشہ گوشہ کو روشناس کرادیں۔ یعنی ؎

مصلحت دید من آن است کہ یاراں ہمہ کار ۔۔۔ بگزارند و خمِ طرّۂ یارے گیرند

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی محبت تو ہر صاحبِ عقل و بصیرت کو ہونی چاہیئے۔ عقل و بصیرت کے ہوتے ہوئے بھی کسی کو محبت نہ ہو تو حیرت کی بات ہے! اسلام سے محبت کا باعث اُس کے وہ نظریات ہیں جن کا اجمالی ذکر ابھی ابھی کیا جاچکا ہے اور رسُولِ اسلام سے محبت اس لئے کہ اُن کے ہاتھوں دُنیا کو وہ کتاب ملی جو اس جامع و ہمہ گیر تعلیم کی حامل ہے۔ اور یہی نہیں کہ اُس ذاتِ اقدس نے کتاب دُنیا کے سامنے لاکر رکھ دی۔ یا اُس کے معانی و مطالب لوگوں کو سمجھا دیئے بلکہ اُس کے ایک ایک

حرف کو اپنے اعمال و کردار کے ذریعہ زندہ و فعّال صورت میں بھی دکھلا دیا۔ لہٰذا یہ کتاب اس کے اخلاق کا آئینہ اور اُس کی سیرت کا مرقع بھی ہے۔ جہاں دُوسرے مذاہب کی نہ کتابیں محفوظ ہیں اور نہ حاملانِ کتب کے حالاتِ زندگی محفوظ ہیں۔ وہاں اسلام کی کتاب بھی محفوظ ہے اور اُس کے پیغمبرؐ کے حالاتِ زندگی بھی محفوظ ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اسلام کی کتاب آئینِ حیاتِ انسانی بھی ہے اور مرقعِ اخلاقِ پیغمبرِ اسلام بھی اور پیغمبرِ اسلام صاحبِ کتاب بھی ہیں اور اپنی سیرت کے اعتبار سے کتاب بھی۔ اور یہی نہیں بلکہ جہاں آپ کی سیرت دُنیا نے قرآن کے حرفوں میں مرقوم دیکھی وہاں آپ کے اصحابؓ کی زندگیوں میں متحرک و انقلاب آفریں بھی دیکھ لی۔ پھر وہ سیرت ایسی جامعیتِ کبریٰ کی مالک کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جو اُس آفتابِ عالمتاب کی روشنی سے محروم ہو۔ انفرادی زندگی ہو خواہ اجتماعی، خانگی ہو خواہ شہری سب کے لئے برابر روشنی پہنچ رہی ہے۔۔۔ معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات اور عمرانیات کے علماء جمع ہوں اور آپ کی زندگی اور سیرت کے ایک ایک باب اور ایک فصل کو روایت و درایت اور جدید سے جدید اصولِ تحقیق و تنقید کی روشنی میں پرکھیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اس کی اکملیت وجامعیت اور پاکیزگی و لطافت کے لئے دل وجاں سے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوں گے، اقبال نے بھی اپنی ہمہ گیر صلاحیتوں کی عینک سے کتاب و سنّت کے آئینوں میں جب اُس محسنِ کائناتؐ کے حُسن و جمال کو دیکھا تو ہزار دل وجان سے اُس کے مطیع و فرمانبردار اور والہ و شیدا ہو گئے اِتنوا باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد جو ذات سب سے زیادہ محبّت، عقیدت و ستائش اور اطاعت و فرمانبرداری کی مستحق ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی ہے ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

جمال اختر ہاشمی

اسلام اور وحدت و اخوت

عرب کے بے آب وگیاہ ریگستان میں نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اس طویل سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے خود فرمایا کہ "الیوم اکملت لکم دینکم" اور رسالت کی آخری قسط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور تبلیغ سے مکمل ہو گئی، اور خداوند تعالیٰ نے انسانی معاشرہ کو وہ "شعور حقیقی" کلام پاک کے ذریعہ عطا کر دیا جو خالقِ کائنات نے انسانی معاشرہ کو مستحکم بنانے اور شر و فساد سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ناگزیر سمجھا۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمیں یہ معلوم ہے کہ انسانی معاشرہ اُس وقت تک دورِ اول یا Premitive age سے نکل کر اتنا باصلاحیت ہو چکا تھا کہ اس پیغام کو سمجھ سکے اور اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ مگر کفر و طغیان کے سیلاب نے ان جامع احکام میں اپنی موت دیکھی اور ایک زوردار ٹکر کے بعد اسلام کا جمہوری نظام، بادشاہی یا سلطانی میں بدل گیا۔ اسلام کے عقائد پر طرح طرح کے نئے حملے شروع ہو گئے۔ سیاسی نظام میں توریثی بادشاہت نے تعلیمی و دینی حلقوں میں وراثت کے لئے زمین ہموار کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینِ خالص و سادہ کی جگہ "پُر اسرار جذب وکشف" نے لے لی۔ اور اب خدا تک پہنچنے کا روشن طریقہ مختلف پیروں اور مُرشدوں کی "روحانی توجہ" کا رہینِ منت بن گیا!

تاریکی کے اس دَور میں علماء و صلحاء کی ایک جماعت ہمہ تن اس بات کے لئے کوشاں رہی کہ اسلام کی اصل رُوح کو برقرار رکھے اور یہ انہی بے نفس اور بے غرض افراد کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ تقریباً چودہ صدیوں کے بعد آج بھی اسلام اتنا ہی خالص و سادہ اور تابندہ ہے جتنا کہ پہلے کبھی تھا ــــ!

ہماری جدوجہد

اسلامیانِ ہند کی جدوجہد آزادی سے کون ناواقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس ملک کے توحید پرستوں کو ایک طرف انگریز سے جو حاکم تھے اور مغرب کے جدید ترین علوم و فنون سے پوری طرح آراستہ تھے، نبرد آزما ہونا پڑا۔ تو دوسری طرف ہندوؤں سے جو تعداد، سرمایہ اور تنظیم میں ہم پر سبقت رکھتے تھے نمٹنا پڑا۔ الحمدللہ کہ اس کڑی آزمائش میں ہم اپنی روایتی شان کو برقرار رکھ سکے اور اس کے تحت ہم ایک اسلامی مملکت کو دُنیا کے سیاسی جغرافیہ میں جگہ دلوا سکے!

پاکستان کیا ہے؟ کیا یہ ایک ملک ہے؟ میں کہوں گا، جی نہیں! بظاہر تو یہ ایک ملک ہی معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک نظریہ کا نام ہے۔ ایک نظریہ جو آج سے چودہ سو برس پہلے دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ کوئی شخص خواہ وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر وہ مسلمان ہے تو مسلم قوم کا ایک جزو ہے۔ اور رنگ ونسل کی بناء پر نہ وہ دوسرے سے برتر ہے اور نہ دُوسرا اس سے برتر ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمان ایک قوم ہیں۔ جنہیں ہندوستانی، پاکستانی، افغانی، عربی اور ترکی کہنا صرف تعارف کے لئے تو ممکن ہے۔ لیکن یہ قوت جامعہ نہیں بن سکتی۔ موجودہ دَور میں اس حقیقت کو صرف ایک جگہ کے مسلمانوں نے تسلیم کیا ہے۔ اور وہ ہندوستان و پاکستان کے مسلمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان اس عام جدوجہد آزادی میں دُوسری جگہ کے

سلمانوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا دوسری جگہ کے مسلمان اس پیغام کو بھول گئے ہیں؟ جی نہیں
یسا نہیں ہے! اگر ایسا ہوتا تو مصر میں اخوان المسلمون اور انڈونیشیا میں دار السلام نام کی پارٹیاں وجود میں نہ آتیں۔ ہاں ایک
ت یہ ضرور ہے کہ دوسرے ملکوں کے مسلمان حکمران اپنے ملک کے لوگوں سے اس بات کے متمنی ہیں کہ وہ اسے بھول جائیں۔ کیونکہ اس
یقت کا وجود خود اُن کے اقتدار کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جائے گا۔ اگر قومیت کی اساس مذہب ہو تو بیچارے سوئیکارنو اور
ال ناصر کی جگہ دُنیا میں کہاں ہوگی؟ سوئیکارنو اور جمال ناصر جیسے ٹھاٹ کے لوگ پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ جو اس ملک کے
ا م حکومت اور معاشرے کو مغربی تہذیب کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اور جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق کی بالکل ضد
اقع ہوئی ہیں۔ اُن کے سوٹ ہی صرف افرنگی نہیں ہیں۔ اُن کے دل و دماغ بھی "افرنگی" ہیں —!

جی ہاں! پاکستان کا وجود اسی ایک نظریہ کا مرہون منت ہے کہ "عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے"۔
ر کیا تعجب ہے کہ اس کی مخالفت میں باستثنائے چند ساری دُنیا متحد نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ پہلے بھی کتنی سلطنتوں کے
ئے پیغامِ مرگ ثابت ہو چکا ہے اور اس زمانہ کی سلطنتیں بھی تو وطنی اور مُلکی امتیازات پر قائم ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ یقیناً
ن کے لئے بھی پیغامِ مرگ ثابت ہو سکتا ہے۔ جہاں جہاں بھی "جاہلیت" پائی جاتی ہے، وہاں "اسلام" کی مخالفت کا پایا جانا
ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر تاریکی، روشنی کی حریف ہے —!

پاکستان کے مقابلہ میں طاغوتی طاقتوں کا اتحاد در حقیقت طاقتوں اور سلطنتوں کا اتحاد نہیں ہے۔ نظریات کا اتحاد ہے۔
وہ تمام نظریات جو کچی بنیادوں پر لیکن چمکدار دیواروں سے بنے ہیں۔ اسلام کے مقابلہ میں متحد نظر آتے ہیں۔ دُنیا کو انہوں نے
کئی ناموں سے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور کر بھی رہے ہیں۔ کہیں یہ قومیت ہے، کہیں رنگ و نسل، کہیں یہ سرمایہ
کا اتحاد اور کہیں مزدور کی حکومت ہے۔ مگر مقصد سب کا ایک ہے۔ "اپنی برتری زیادہ سے زیادہ انسانوں سے کیونکر منوائی
جائے"۔ اور اس زمانہ میں جبکہ "توحید نوعِ انسانی" کے عقدے مد اقتضائے وقت کی بناء پر اُبل پڑے ہیں انھیں اپنی ان کمزوریوں
کا احساس بُری طرح ستا رہا ہے، اُن کا یہ اتحاد عین فطرت کے تقاضوں کے تحت ہے۔ گو اپنے مخصوص مقاصد کے تحت آپس میں
لڑ بھی لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے مقابل وہ ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ فلسطین کی یہودی حکومت بننے کے لئے روس اور امریکہ کا ووٹ
اور اُس کی ابتدائی ترقی کے لئے مشرقی یورپ کے اسلحہ اور امریکہ کے آدمی کام آئے۔ یہ مثالیں کتنی عجیب لیکن کتنی سچی ہیں۔
توریت مقدس میں آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق کیا سچّی پہچان بتائی گئی ہے:-

"اُس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اُس کے خلاف ہوگا"

اور سارے طوفان کے مقابلہ کے لئے پاکستان کا مسلمان تنہا ہے۔ اُس نے نظریۂ توحید کو اپنایا ہے۔ تاکہ اپنی مملکت
کو ایک مثالی مملکت بنا سکے۔ ایک ایسی مثال جو دُنیا کے لئے قابلِ تقلید ہو۔ اس کام کا بیڑا اُن اسلام پسند افراد نے اٹھایا ہے
جو دُنیا کو امن و سلامتی کی وہ صحیح راہ دکھانا چاہتے ہیں۔ جس پر چل کر انسانیت ایٹم اور ہائیڈروجن کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکے۔
لیکن کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟

اسلام کی جامع تعلیمات

ادیان اور مذاہب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ دُنیا کے سب مذاہب صرف افراد
کے ذاتی اخلاق پر زور دیتے ہیں۔ معاشرہ کی تنظیم کا تخیل اوّل تو خال خال نظر آتا ہے، اور آتا بھی ہے
تو اتنا مبہم کہ عمل ممکن نہیں۔ مگر اسلام، جہاں فرد کی ساری زندگی کے مختلف ادوار اور اُتار چڑھاؤ میں اُسکی نگرانی

کرتا ہے - وہاں معاشرہ کی تنظیم اور اُس سے بڑھ کر مملکت کے فرائض اور لائحہ عمل سب کچھ بتا دیتا ہے - اسلام نے فرد کے لئے، جماعت کے لئے، یہاں تک کہ حکومت کے لئے ہدایت کا ازلی و ابدی منشور دیا ہے - ایک ایسی شاہراہِ عمل بتائی ہے جس کے رہرو کو کسی بات کا کھٹکا نہیں !

عیسائیت و یہودیت اسرائیل کی بھیڑوں کے واسطے تھی تو ہندو مت چاند اور سورج کے بیٹوں کے لئے مخصوص رہی - اگر کمیونزم کو بھی ایک مذہب تسلیم کیا جائے تو کمیونسٹ ہونے سے پہلے روس کے جدید دیوتاؤں (لینن وغیرہ) کی برتری عقیدہ کے طور پر تسلیم کرنی ضروری ہوگی - لیکن اسلام؟ صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے :-

"میں نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا اور قبائل و شعوب میں تقسیم کیا تا کہ تم پہچانے جا سکو - بیشک اللہ کے سامنے سب سے مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"

رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں ہے، ہر شخص جو مسلمان ہے وہ دوسرے مسلمان کے برابر ہے - خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو کہیں کا رہنے والا ہو - کوئی رنگ رکھتا ہو - زبان و رنگ اور نسل کے بتوں کو صرف اسلام ہی نے توڑا ہے !

یہ جو دنیا میں لڑائی اور فساد ہے - اسلحہ اور سامانِ حرب کی تباہ کاریاں ہیں - وہ انہی دیوتاؤں کی سربلندی کے لئے ہیں - اور اگر یہ دیوتا ہی نہ رہیں تو پھر معاشی اور سیاسی بنیادوں پر ایک دوسرے کو غلام کس لئے بنایا جائے گا ؟

یہ غربت اور جہالت، بیماری اور مفلسی کی تباہ کاریاں کیوں ہیں ؟ اس لئے کہ معاشرہ کا ایک مخصوص طبقہ سوسائٹی کے تمام نہیں تو اکثر و بیشتر ذرائع پر قابض ہے - بنکوں کا نظام خواہ وہ فرد کا ہو یا مملکت کا اگر ختم ہو جائے تو یہ روپیہ کہاں جائے گا ؟ انہی افراد کو واپس تقسیم ہو جائے گا - اور بنکوں کے نظام کے خلاف دنیا میں کوئی آواز ہے تو اسلام کی ہے جو سود لینا اور دینا، دونوں کو شدید ترین جرائم قرار دیتا ہے — !

"زمین اُس کی جو اُسے چلائے" - اسلام کا یہ اٹل قانون صدیوں سے دنیا کے زرعی مصلحین کے لئے مشعل کا کام دے رہا ہے - کسان کے لئے کیا مصیبتیں ہیں ؟ زمیندار اور جاگیردار کا ظلم، سود در سود کی لعنت اور اگر یہ دونوں نہ رہیں - مزدور کے لئے کیا دقت ہے ؟ سرمایہ دار کی حرص، مہاجن کا قرض - اور اگر ان دونوں سے اُسے نجات مل جائے تو پھر غربت کہاں ہوگی ؟ اور کیا ایک دن وہ نہ آجائے گا کہ ہم عید کے دن فطرہ کی رقم لے کر ساری کراچی میں گشت کرتے پھریں گے مگر فطرہ لینے والا کوئی نہ ملے گا - جیسا کہ اس سے پہلے مسلم اسپین میں ہو چکا ہے اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں عرب کی حالت بھی ایسی ہی تھی — !

حکم ہے کہ "ہر مسلمان عورت اور مرد پر حصولِ علم فرض ہے" ہر مملکت اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اپنے یہاں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کرے - اسلام نے اس کے متعلق جو حکم دے رکھا ہے وہ بالکل واضح اور عام ہے - افراد کی مالی حالت مستحکم ہوتے ہی انھیں اپنے بچوں کو "ذریعہ معاش" بنانے (یعنی چھوٹی عمر میں کام پر لگانے کا جس کا آج کل عام رواج ہے) کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی — !

جرائم کی روک تھام کی طرف ہر حکومت اور مملکت کی توجہ ہوتی ہے - مگر جرم کا باعث کیا ہے ؟ جرائم مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں — ! ڈاکہ، چوری، گرہ کٹی وغیرہ - چوری کی اوّلین وجہ ناداری اور افلاس ہے جس کی گنجائش اسلامی معاشر

میں یوں نہیں ہے کہ اسلامی خزانہ عامرہ ہر شخص کی ابتدائی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ دوسری وجہ غلط تربیت ہے۔ جس کی گنجائش مذہبی تعلیم، اچھی تربیت اور روشن خیالی کے بعد باقی نہیں رہتی۔ ایک تیسری وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ بعض اشخاص کا فطری میلان ہی چوری کی طرف ہوتا ہے۔ خواہ انہیں ضرورت ہو یا نہ ہو۔ چوری بغرض تفریح ہی سہی۔ مگر کریں گے ضرور۔ ایسے شخص کا ہاتھ کاٹ دینے کے علاوہ کوئی علاج ہی نہیں۔ کھانے کو اسے پھر بھی دیا ہی جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کچھ کرکے کھانے کے بجائے لوگوں کی جیبیں ہی کاٹنی ہیں تو بہتر ہے کہ لوگوں کی جیبوں سے اس کا گزارا بھی ہوتا رہے۔ چوری کی ایک اور بڑی اہم وجہ چوری کے مال کا بک جانا ہے۔ اگر چوری کا مال نہ بک سکے تو چوری کی کم سے کم وارداتیں ہونگی۔ اسلامی معاشرہ میں چوری کے مال فروخت ہونے کی گنجائش احتساب کے بعد نہیں رہ سکتی ــ!

ہمارے معاشرے میں عیش پرستی اور ہوسناکی کے جراثیم اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ بعض دفعہ حیرت ہونے لگتی ہے کہ اب تک ہم لوگ عذاب الٰہی سے بچے ہوئے کیونکر ہیں۔ اس کے اسباب تو بہت سے ہیں۔ مگر خاص طور پر آج کل کی تہذیبی ترقی کو اس میں بہت زیادہ دخل ہے۔ فحش لٹریچر۔ سینما بینی، عریاں تصویریں اور افسانے، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ ملنا جلنا۔ فیشن پرستی اور رقص و موسیقی۔ یہ تمام محرکات ہمیں اس بات کے لئے ابھارتے ہیں کہ ہم بے راہ روی اختیار کریں۔ نیز غلط تربیت اور اخلاقی پابندیوں کی کمزوری بھی اس رجحان کا باعث ہے ــ الحمد للہ اسلام ان سب باتوں کا سختی سے مخالف ہے۔ آجکل کا قانون نہ صرف ان باتوں کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اور ہوا دیتا ہے۔ اگر مرد و عورت کا اختلاط اپنی مرضی سے ہو تو کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ اور اگر جرم ہے بھی تو سزا اتنی معمولی کہ نہ مجرم کے لئے باعثِ تربیت ہے اور نہ دوسروں کے لئے باعثِ عبرت! اس کے مقابلہ میں اسلام ایسی عبرتناک سزا دیتا ہے کہ اس کے نام سے بڑے بڑے "بدکار" تھرا جاتے ہیں ــ!

کہا جاتا ہے کہ شراب تمام جرائم کی ماں ہے، اور صحیح بھی ہے۔ جب انسان اپنے ہوش ہی سے گزر گیا تو اچھے برے کی تمیز کیا رہے گی۔ شراب آجکل پانی کی طرح استعمال ہوتی ہے۔ اور شراب نہ صرف اس کی قیمت مہیا کرنے کے لئے چوری کی طرف اکساتی ہے، بلکہ ساتھ ہی خون کی گرمی عیاشی اور فحش کاری کی طرف بھی راغب کرتی ہے۔ اسلام نے اس لئے شراب کو قطعاً حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔ سزا بھی ایسی رکھی ہے کہ کوئی شخص اس کی طرف رغبت ہی نہ کر سکے!

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جائزہ لیا ہے کہ اسلام کس طرح جرم کو پابند بنا کر رکھتا ہے۔ جہاں وہ مجرم کو سزا دیتا ہے، وہاں جرم کے اسباب و علل کی بھی کڑی نگرانی اور روک تھام کرتا ہے۔ وہ ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیتا کہ لوگ جرم کی طرف مائل ہو سکیں۔ اور اگر کوئی اس کا مرتکب ہوا تو سزا ایسی ہے کہ دوبارہ کبھی ہمت ہی نہ ہو۔ یا اکثر حالات میں تو یہ صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے کہ دوبارہ اس جرم کو کر سکے ــ!

آپ نے دیکھا کہ اسلام کس طرح انسان کی ہر ضرورت اور مسئلہ کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام زمانہ کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے اسلام کو بس "انفرادی زندگیوں" تک ہی محدود رکھنا چاہیئے۔ "اجتماعیات" میں اسلام کو لانا ٹھیک نہیں۔ مگر یہ ان لوگوں کی جو اسلام کا صحیح حل نہیں رکھتے، غلط اندیشی، غلط بینی اور فکر کی کجی ہے۔ "اجتماعیات" کے مسائل کا فطری حل "اسلام" کے سوا اور کسی "نظریہ" سے ممکن ہی نہیں۔ ع

اسلام ہے ہر درد کا ہر دکھ کا مداوا!

تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور مقصدِ وجودِ پاکستان کیا ہے؟ صرف یہی کہ ہم چند کروڑ انسانوں نے انسانی قانون کے بجائے خدا کا قانون اپنے اُوپر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر اس مقصدِ عظیم میں ہم کامیاب ہو گئے تو یہ ایک انقلاب کا پیش خیمہ ہوگا۔ جو شاید آنے والی نسلوں کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہو سکے، اس طرح اسلامی قانون کو اپنا کر ہم نے دُوسروں کے مقابلہ میں اپنے اُوپر زیادہ ذمہ داری لے لی ہے۔ یہ دُنیا جو نہایت تیزی سے تباہی اور بربادی کی طرف بھاگ رہی ہے۔ اس کو بچانا صرف ہمارا کام ہے اور اس کی واحد تدبیر ایک ایسی فلاحی مملکت (Welfare state) کا وجود میں لانا ہے جو دُوسروں کے لئے قابلِ قبول ہی نہیں باعثِ تقلید بھی ہو۔ اس بارِ گراں سے ہم اس طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں جب اس نظریہ کو اپنانے کا حق ادا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریۂ توحید دوسروں کے لئے چاہے صرف فلسفہ مابعد الطبیعات کا ایک نکتہ یا علمِ کلام کا ایک مسئلہ ہو۔ مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم پاکستانیوں کے لئے یہ ہماری تحریک کی ابتداء اور انتہا اور پوری جدوجہد کا ماحصل ہے۔ یہ وہ بُنیادی پتھر ہے جس پر ہماری مملکت کی بُنیادیں قائم ہیں۔ اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ صرف اسی پر قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے ہر فرد کو اور بحیثیتِ مجموعی سب کو اپنی زندگیوں کو ڈھالنا اور سنوارنا ہے۔ اللہ کرے ہم اس مقصد کے حصول میں کامیاب ثابت ہوں۔ (آمین)

شبنم رومانی

شبنمِ عقیدت

شبنم سا دیوانہ شاعر اور مدحِ سرکارؐ
محفل والو! اس کو پہنا دو پھولوں کے ہار

دنیا ہے یا پاپ کی منڈی پیارے ہے یا بیوپار
سچی تیری کالی کملی جھوٹا سب سنسار

کالے بادل کوئل ہی کو مست نہیں کرتے
ہم بھی ہیں اک زلفِ سیہ کی الفت میں سرشار

اہلِ محبت راہِ وفا میں مر کے امر کہلائے
اے نادانو! تم ہی سوچو جیت ہوئی یا ہار

ہر بستی اپنی بستی ہے، ہر دیس اپنا دیس
توڑ دو ہر اوہام کی سرحد، ڈھا دو ہر دیوار

مردِ مسلماں شعلہ و شبنم، سوز بھی ہے اور ساز
لچکے تو اک پھول کی ڈالی، چمکے تو تلوار

ابوظفر نازش رضوی

رجز

کہہ دو اغیار سے الجھیں نہ مسلمانوں سے
چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے

دیں کا نام دو عالم میں ہے اب تک روشن
شمعِ توحید کے دل سوختہ پروانوں سے

آج بھی لرزہ براندام نظر آتے ہیں
پاسباں دیر کے کعبہ کے نگہبانوں سے

اہرمن زادوں سے مرعوب نہ ہونگے مومن
اہلِ یزداں نہ دبیں گے کبھی شیطانوں سے

حق کی آغوش میں آئیں گے پھر اصنام پرست
شورِ تکبیر پھر اُٹھنے کو ہے بتخانوں سے

خیبر و خندق و بدر و اُحد و جنگِ حُنین
آج اسلام ہے زندہ اِنہیں افسانوں سے

آج وہ پیکرِ تہذیب بنے بیٹھے ہیں
پست کل تک نظر آتے تھے جو حیوانوں سے

کہہ دو تثلیث کے حامی سے ہے پھر اُٹھنے کو
قُل ھُوَ اللہُ اَحَد کا ترے کاشانوں سے

ناقۂ عزم کو پہنچا سرِ منزل نازش
تیز گامی کا سبق سیکھ حُدی خوانوں سے

فردوسِ تغزّل

تسکین قریشی

کوئی خاموش ہے کوئی نالہ بلب اپنا اپنا جنوں، اپنی اپنی طلب!

اللہ اللہ یہ مستیٔ شوقِ طلب جتنا سرشار ہوں اُتنا ہی تشنہ لب

عشق کی کاہشیں دل سے جاتی ہیں کب اب بھی آنسو نکل آتے ہیں بے سبب

باہمہ جرأتِ شوق و جوشِ طلب ہے مقامِ محبّت، مقامِ ادب

اب محبت میں ہم تم بھی شامل نہیں اب محبّت کا ہے خود محبّت سبب

حُسن سے بھی نہ دل کی خلش چھپ سکی ہر تبسّم ہے اِک نالۂ زیرِ لب

دل نہ شامل ہو جب سازو آواز میں نغمۂ حُسن بھی نغمۂ بے طرب

پھر یہ دُوری ہے کیا؟ یہ تغافل ہے کیوں تُو سراپا کشش، میں مجسّم طلب

اتنا بے خود بھی تسکیں کو جانو نہ تم

ہے تو دیوانہ، لیکن سمجھتا ہے سب

جگر مرادآبادی

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ موت بھی جرم زندگی بھی گُناہ

شاھد صدیقی

اِس کو دعویٰ تعمیر، اُس کو دعویٰ تعمیر اور اس کشاکش میں بڑھ رہے ہیں ویرانے

نظر حیدرآبادی

مئے رنگیں کا پیا ہوتا یہ میخانے کہاں جاتے نگاہِ یار مل جاتی تو پیمانے کہاں جاتے

جگر لخت لخت

(غنی احمد غنی)

وہ طرزِ جنوں اپنی خود مجھ کو پسند آئی
کی جب مرے دامن نے کانٹوں کی پذیرائی

جب اُس کے تصوّر نے چپکے سے پکارا ہے
محسوس ہوا ایسا بول اُٹھی ہے تنہائی

بیدادکشِ غم ہی کچھ اس کو سمجھتا ہے
آسان ہو رو لینا مشکل ہے شکیبائی

رہ رہ کے جگر میں اک شعلہ سا لپکتا ہے
رہ رہ کے بھڑکتی ہے شمعِ شبِ تنہائی

تا چند بہاروں پر احساں گل و لالہ کے
کانٹوں میں بھی پیدا کر ذوقِ چمن آرائی

کیا شے ہے غنی آخر امیدوں کی کشتی بھی
موجوں سے بھی ٹکرائی، ساحل کو بھی چھو آئی

پیرزادہ محمد ادریس تابش - شجاع آبادی

پھر نئے سر سے گلستاں میں بہار آجائے
پھر خزاں دیدہ شگوفوں پہ نکھار آجائے
تُو رہِ عشق میں اتنی تو کشش پیدا کر
کہ ترے سامنے خود منزلِ یار آجائے

فضل الرحمٰن مبتلا - غازی پوری

رُکنے والے نہیں اب اُجالے
تیرگی اپنا زور آزمالے
آج گلچیں بھی ہے کشمکش میں
پھول توڑے کہ دامن سنبھالے
ذوقِ آرائشِ آشیاں میں
ہم نے خود بال و پر نوچ ڈالے
کون اب فرصتِ بے خودی کو
ہوشمندی کے سانچے میں ڈھالے

صبا جائسی

راہِ اُلفت میں یونہی مشکل مقام آتے رہیں
ہاں مگر تیری نگاہوں کے پیام آتے رہیں
بربطِ غم کو چھیڑنے والو! اپنے مضراب کی خبر لینا

برقی چریاکوٹی - ایم اے، ایل ایل بی وکیل

لاکھ چپکے سے چھیڑا گیا سازِ دل
پھر بھی پہچان لی میں نے آوازِ دل
نغمگیں آتشیں اور حیات آفریں
کون سی شے ملی ہے بہ اندازِ دل
پردہ در ہو رہے ہیں حجابات بھی
کھُل رہا ہے نگاہوں سے کُل رازِ دل

☆

روحِ انتخاب

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میری تعریف میں زیادہ مبالغہ مت کرو۔ جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو حد سے زیادہ بڑھادیا۔ میں تو اللہ کا بندوں میں سے ایک ہوں۔ اس لئے مجھے "عبد اللہ ورسولہ" کہا کرو۔ ایک مرتبہ آپ تشریف لائے تو سب صحابہ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جیسے عجمی آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم کو کھڑا نہ ہونا چاہیئے۔ (شفاء قاضی عیاض) آپ اپنے اصحاب میں بالکل ملے جلے رہتے تھے۔ اور مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی تھی، وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ حضورؐ نوکروں کے کام میں شریک ہوجاتے اور اُن کو اپنے پاس بٹھالیتے!

آپ نے فرمایا۔ بھوکوں اور مسکینوں کے لئے کوشش کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ قائم اللیل اور صائم النہار کے برابر درجہ رکھتا ہے۔ اخنس بن شریق نے ابوجہل سے کہا کہ اے ابوالحکم! تجھ سے میں ایک بات پوچھتا ہوں، اس جگہ ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا شخص ہماری بات سُننے والا نہیں ہے۔ تُو مجھے سچ سچ بتادے کہ آیا محمدؐ (روحی فداک) سچا ہے یا جھوٹا۔ ابوجہل نے جواب دیا۔ واللہ! بیشک محمدؐ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور اس نے کبھی غلط بیانی نہیں کی!

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگوں نے آپؐ سے کہا کہ مشرکین کے لئے بددعا کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مریضوں کی عیادت کیلئے دُور دراز محلّوں میں تشریف لے جاتے تھے، جب کسی سے ملتے پہلے خود سلام کرتے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے آپؐ سے مصافحہ کیا اور آپؐ نے اس کے ہاتھ کھینچنے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ آپؐ احتراماً اپنے اصحاب کا نام نہ لیتے بلکہ کسی کنیت سے مخاطب فرماتے اور محبت آمیز پسندیدہ ناموں سے اُن کو یاد کرتے تھے۔ آپؐ کسی کا قطع کلام نہیں کرتے تھے بلکہ اگر کوئی ناز یبا بات کہتا تو آپ اُسے منع فرمادیتے یا اٹھ کر کھڑے ہوجاتے۔ تاکہ وہ خود ہی رُک جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آٹھ برس کا تھا جب آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برابر دس برس تک خدمت نبوی میں رہا مگر اس طویل مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی آپؐ نے اُف تک نہیں کی اور نہ یہ فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا؟ اور وہ کام کیوں نہ کیا۔ آپ کی زبان سے کبھی کوئی فحش اور بیہودہ کلمہ نہیں نکلا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے بارہا فرمایا کہ اگر میرے پاس کوہ احد کے برابر سونا ہو تب بھی مجھے خوشی اس وقت ہو کہ میں تین دن گزرنے سے پہلے ہی وہ سب تقسیم کردوں اور میرے پاس سوائے اس کے جو میں ادائے قرض کے لئے اٹھا رکھوں اور کچھ باقی نہ رہے!

حضرت عبد اللہ ابن حارثؓ کا قول ہے کہ میں نے کسی شخص کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوش خلق نہیں دیکھا۔ آپ کا قول ہے "پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کا مالک ہو"!

آپؐ کی زندگی یتیمی اور بیکسی کی حالت سے شروع ہوئی مگر جب آپ کی وفات ہوئی تو تمام ملک عرب کے فرمانروا تھے۔ ان تمام حالات اور تمام مدارج زندگی میں آپ کی سادہ معاشرت یکساں طور پر نظر آتی ہے ۔ (تاریخ اسلام۔ حصہ اول۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

ماہرالقادری

آواز

فیروز ہنس مکھ نوجوان تھا۔ طبیعت بڑی ملنسار پائی تھی۔ اسکول میں کوئی تقریب ہوتی تو اس میں اس قدر دلچسپی اور انہماک کے ساتھ حصّہ لیتا جیسے اس تقریب کی کامیابی کی ساری ذمہ داری اُسی کے سر آپڑی ہے۔ کرکٹ کا وہ درمیانہ درجہ کا کھلاڑی تھا۔ اور ہاکی کی فرسٹ الیون ٹیم میں شامل تھا۔ ایک عیب اُس میں نہ ہوتا تو وہ ہاکی کا ممتاز ترین سینٹر فارورڈ ہوتا۔ وہ یہ کہ گیند لینے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف گیند پاس کرنے کی بہت ہی کم کوشش کرتا۔ اُس کی آخر تک یہی کوشش رہتی کہ وہ کسی اور کی مدد کے بغیر تن تنہا گول بنا کر اپنی مشاقی، چابکدستی اور مہارت کے جھنڈے کھیل کے میدان میں گاڑ دے۔ خودستائی اور خود اعتمادی کے ملے جُلے جذبے! جن کے صحیح تناسب کا تعین شاید کوئی بڑے سے بڑا ماہر نفسیات بھی نہیں کر سکتا ــــ!

اسکول کے بعد فیروز کالج میں پہنچا تو اس کی سوشل دلچسپیاں اور بڑھ گئیں۔ کالج میں ڈرامے ہوتے تو اُن میں وہ پیش پیش رہتا ایکٹنگ سے لے کر اسٹیج کی تیاری تک کے تمام مرحلوں میں فیروز کی دلچسپیاں شریک کار رہتیں۔ اداکاروں کا تلفظ وہ درست کراتا۔ گیتوں کی دُھنیں بٹھانے میں اُس کی پسند ناپسند کا دخل ہوتا اور اسٹیج کے پردوں کی ترتیب میں اُس سے مشورہ لیا جاتا۔ جس کو ڈراموں اور کھیل تماشوں سے اتنی دلچسپی ہو، اُسے بہت زیادہ ہنسوڑ اور پھکڑ ہونا چاہیئے۔ مگر فیروز بڑا خوددار اور باوقار نوجوان تھا۔ چھچھوری باتوں سے اُسے نفرت تھی، ڈرامہ کھیلنے والے لڑکے فرصت کے اوقات میں ناچتے گاتے۔ تھرکتے، ٹھمکوں اور تھالیوں سے طبلہ کا کام لے کر خوب اُودھم مچاتے اور خوش فعلیاں کرتے۔ مگر فیروز اس دھما چوکڑی سے کنّی کاٹ جاتا۔ اُس نے اپنے محلہ کی لائبریری کی مجلسِ انتظامیہ سے محض اس وجہ سے علیحدگی اختیار کر لی کہ "How To Kiss" نام کے ایک فحش ناول کو لائبریری سے وہ نکلوا دینا چاہتا تھا۔ مگر لائبریری کے کرتا دھرتاؤں کی اکثریت نے فیروز کی اس تجویز کو ردّ کر دیا ــــ!

کالج کے ڈراموں کی سادگی میں اب رفتہ رفتہ رنگینی بلکہ یوں کہیئے شوخی کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فیروز کو "آرٹ" کا اس قدر پاؤں پھیلانا کھلنے لگا! ایک بار کالج میں ایک ڈرامہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ کھیل کا نام تھا:۔

"دریا کے اُس پار"

اس میں ایک لڑکی کا پارٹ کالج کے سب سے زیادہ خوبصورت لڑکے "مہتاب" کو دیا گیا۔ پیش مشقی (ریہرسل) کا آخری دن تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد مہتاب کو زنانہ لباس پہنایا جا رہا تھا کہ اتنے میں "میک اَپ رُوم" سے شور اُٹھا۔ پھر چانٹوں اور لات گھونسوں کی آواز آنے لگی۔ بینچوں، کرسیوں اور شیشوں کے توڑے جانے کی آواز نے اس شور کو خوفناک بنا دیا۔ آن کی آن میں، سارا کھیل ہی بگڑ گیا ــــ!

کالج کے منتظمین نے لاکھ جتن کئے کہ یہ خبر کالج سے باہر نہ جانے پائے۔ مگر شہر میں خبر پھیل کر رہی۔ عام شہرت تھی اور گھر گھر چرچا تھا کہ مہتاب نام کے لڑکے کو جسے زنانہ لباس پہنایا جا رہا تھا۔ کسی من چلے نے چھیڑ دیا اور اس پر بات بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ دو ٹولیوں میں

ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ اس خبر کو یار لوگوں نے نمک مرچ لگا کر جو تیز اور چٹپٹا بنا یا ہے، تو نہ پُوچھئے وہ کہاں جا کر کیا بنی اور کس زبان نے اُسے کس طرح ادا کیا۔ "ہزار مُنہ ہزار باتیں"۔ یہ ضرب المثل یونہی شہرت نہیں پاگئی۔ اس میں اصلیت ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہ روزانہ کا تجربہ ہے کہ دُوسروں کی عیب چینی ہی سے محفلوں میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور ایسی باتوں سے سچ مچ کانوں میں رس پڑتا ہے!

اس واقعہ نے نہ جانے کتنی پچھلی باتوں کو زندہ کر دیا۔ یہ تک مشہور ہو گیا کہ بسنت پر جو ـــ خوبصورت بلا ـــ ڈرامہ کالج میں کھیلا گیا تھا۔ اُس میں ہیرو نے جو غزل پڑھی تھی، جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

تمہاری چٹکیوں نے نیل اتنے دل پہ ڈالے ہیں

کہ جن کو گنتے گنتے دُکھ گئی ہیں اُنگلیاں میری

تو یہ شعر کالج کی بعض لڑکیوں کی کاپیوں پر لکھا دیکھا گیا اور کسی کسی کے پرس سے تو اُس نوجوان کا فوٹو پکڑا گیا۔

فیروز "آرٹ اور کلچر" کی بڑھتی ہوئی رعنائیوں کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا کہ اعتدال، سلامت روی اور سادگی کی حدیں ٹوٹ کر رہیں گی، اس واقعہ کا اُس نے شاید سب سے زیادہ اثر لیا۔ شدید ردِ عمل، اس حد تک کہ وہ ڈرامہ سے بالکل کنارہ کش ہو گیا۔ اور اُس کی کنارہ کشی کو کالج والوں نے ایسا محسوس کیا جیسے اس غبارے سے ساری ہوا ہی نکل گئی۔ ساتھیوں نے اُس کی خوشامد کی اور پروفیسروں نے اُسے سمجھایا۔ مگر فیروز کسی طرح نرم نہ پڑا ـــ!

اب وہ گہرے سوچ میں رہنے لگا، جیسے وہ اس واقعہ کے بعد ایک دم فلسفی ہو گیا ہے، مطالعہ کا وہ چھٹپن ہی سے شوقین تھا۔ اب یہ شوق اور تیز ہو گیا۔ اُس نے "Sins of The world" سے لے کر "فلسفۂ اخلاق" تک کو پڑھ ڈالا۔ ایک سال تک وہ کالج کی سوشل دلچسپیوں سے بالکل الگ تھلگ تو نہ رہ سکا مگر ہاں! بچا بچا سا رہا ـــ!

نوجوانی، کالج کا دلچسپ ماحول۔ شوخ و شنگ ساتھیوں کی چہلیں، بالآخر ایک پک نک پارٹی میں اُس کی توبہ ٹوٹ ہی کر رہی! اُس نے ہارمونیم پر ایک گیت گایا۔ اور دوستوں کے اصرار پر:۔

"چھُونے نہ دُوں گی شریر بجریوں سے دل بھر دوں گی"

کو نرت کے ساتھ ادا کیا۔ وہ نہ گایک تھا اور نہ نرت کار۔ گانے والوں کا گانا سُن کر اور اُن کی نرت دیکھ کر، اُس کی ذہانت نے نقل اُتار لی تھی۔ اس "نقالی" سے یار دوستوں کی محفلوں میں گرمی پیدا ہو جاتی۔ دوستوں کو ہنسا کر آدمی کو بڑی خوشی ہوتی ہے!

کالج کے "کلچرل ایسوسی ایشن" کی نگرانی جن پروفیسر صاحب کے سپرد تھی، اُن کے پاس فیروز کا آنا جانا رہتا تھا۔ اب تک وہ کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ بیوی بچے آگئے تو شہر کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ فیروز ایک دن پروفیسر صاحب کے یہاں گیا اور دروازے پر دستک دی۔ ایک عورت نے کواڑ کی اوٹ سے اُس کے سوالوں کا جواب اس قدر اکھڑ پن اور رُکھائی سے دیا کہ فیروز زینہ میں ایک پل کے لئے بھی نہ ٹِک سکا۔ عورت کے لہجہ میں دُرشتی بلکہ خشونت تھی۔ فیروز کو پسینہ سا آگیا جیسے کسی نے اُسے دُھتکار دیا ہو۔ عورت نے جواب اُس کے ہر سوال کا دیا۔ مگر لب و لہجہ میں خاصہ کھُردرا پن تھا کہ سُننے والے کے دل میں، جواب دینے والی کی طرف سے رتی بھر لگاوٹ پیدا نہ ہو ـــ!

بات آئی گئی ہو گئی۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ دو مہینہ بعد کالج میں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ فیروز کو اس سلسلہ میں پروفیسر صاحب سے ضروری ہدایتیں لینی تھیں۔ کالج میں اُن سے ملاقات نہ ہو سکی، اُن کے گھر پر جاتے ہوئے وہ ہچکچا تا تھا کہ کہیں آج بھی پروفیسر مکان پر نہ ہوں، اور اُس اکھڑ مزاج عورت سے بات چیت کرنی پڑے۔ وہاں جانا ہر حال ضروری تھا۔ کالج سے سائیکل پر روانہ ہوا ـــ

راستہ میں چوراہے سے مڑتے ہوئے سائیکل کی چین اتر گئی۔ اُسے جیسے تیسے درست کیا تو آگے چل کر ایک کیل ٹائر میں چبھی اور ٹیوب کے پھٹنے کی آواز آئی۔ آن کی آن میں ہوا نکل گئی۔ اُسے اپنے سے زیادہ سائیکل پر جھنجلاہٹ آرہی تھی کہ عین ضرورت اور کام کے وقت یہ ظالم دغا دے گئی۔ اس جھنجلاہٹ سے پھٹا ہوا ٹیوب جڑ تھوڑی سکتا تھا۔ اگر جھنجلاہٹ اور خفگی سے بگڑے ہوئے کام بن جایا کریں تو پھر خفگی، عتاب، جھنجلانا اور بگڑنا لوگوں کا محبوب ترین شغل بلکہ آرٹ بن کر رہ جائے!

فیروز نے سائیکل کو ایک جاننے والے حجام کی دکان کے قریب تختہ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اور پیدل چل کر پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچا۔ اُس نے دروازہ پر دستک دی۔ جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ بس کواڑوں میں ذرا سی جنبش ہو کر رہ گئی۔ جس طرح تانگہ والے اپنے گھوڑے کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہیں۔ فیروز نے اسی انداز میں دروازے کی کواڑ پر کھلے ہوئے ہاتھ سے پھر دستک دی۔ اندر سے ایک مہین سی آواز آئی:-

"پروفیسر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں"۔

فیروز نے اس پر دریافت کیا کہ وہ مکان پر کس وقت مل سکیں گے۔ اس کا جواب بڑے نرم و شیریں انداز میں دیا گیا۔ دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ فیروز ڈرتے ڈرتے پروفیسر صاحب کے یہاں آیا تھا۔ کہ وہ نہ ہوئے اور اُس دن کی طرح اُسی عورت سے بات چیت کی نوبت آگئی تو اپنے کان کے پردوں پر وہ درشت لہجہ کی خراشیں لے کر وہاں سے جائیگا۔ مگر آج تو اُس کے سامعہ نے موجِ کوثر و تسنیم کا لطف اٹھایا تھا۔ وہ راستہ بھر عورت کے لہجہ کی نرمی، آواز کے لوچ اور جملوں کی بے ساختگی اور شیرینی کے تصوّر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ "جس کی آواز ایسی ہو اُس کی صورت کیسی ہوگی"؟ اس سوال کے دل میں پیدا ہوتے ہی وہ کچھ پشیمان سا ہو گیا۔ جیسے اُس کے ضمیر نے فوراً چٹکی لی ہو!

کالج میں مشاعرہ ہوا اور بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ پردہ نشین خواتین کے لئے پردہ کا بھی خاص طور پر انتظام تھا۔ چکیں، چلمنیں، پردے ــــ مگر بس دیکھنے ہی کے پردے تھے۔ کالج کے طلباء بار بار اس طرف جاتے اور جی بھر کے نظارہ کرتے۔ نوجوان شعراء، رنگین اشعار اور پھر ترنّم! اس ماحول میں جذبات پر جو بھی گزر جائے، تھوڑا ہے ــ!

مشاعرے کے بعد اُن طلباء کو جو اس تقریب کے انتظام میں سرگرم کار تھے، پنڈال ہی میں رک جانا پڑا۔ صبح سویرے اٹھ کر اُنھیں فرش، شامیانے، پردے، گلدان وغیرہ بھجوانے تھے۔ فیروز اور دوسرے طلباء نے اسٹیج کے قالینوں پر ہی بستر جما لئے۔ اتنی بہت سی شوخ و شنگ "جوانیاں" جہاں جمع ہو جائیں تو نیند کہاں آسکتی ہے ــــ گفتگو کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اُن کی باتیں:-

بھئی! مجمع نے سب سے زیادہ داد تو اکرام مرزاپوری کو دی۔ مگر حقیقت میں غزلیں سب سے زیادہ اچھی اُس سانولے رنگ کے دبلے پتلے شاعر کی تھیں۔ کاش اُسے ترنّم سے پڑھنا بھی آتا ــــ یار! بزمی رومانی اپنی نظم "پہلی ملاقات" جب پڑھ رہے تھے تو میں نے زنانہ کی طرف دیکھا۔ ایک خوبصورت لڑکی بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی ــــ اسلم! تمہارے سر کی قسم آج مشاعرے میں وہ وہ صورتیں دیکھی ہیں کہ میں اپنی نگاہوں کو مبارکباد دے رہا ہوں۔ سارے شہر کا حسن کھنچ کر ہمارے کالج میں آگیا تھا ــــ اور ہاں! بھائیو! آج ایک عجیب تجربہ ہوا۔ وہ جو ہمارے پروفیسر مسٹر نصیر ہیں۔ اُن کے گھر میرا کئی بار آنا جانا ہوا۔ وہاں دو عورتوں سے پردے کی آڑ سے بات چیت کا موقع ملا۔ ایک کی آواز میں درشتی اور خشونت پائی، دوسری کی آواز نرم و شیریں۔ میں نے دونوں کے ناک نقشہ اور چہرے مہرے کے بارے میں اُن کی "آوازوں" کے اعتبار سے کچھ تصورات قائم کئے تھے۔

مگر آج کے مشاعرے میں اُنھیں دیکھ کر پتہ چلا کہ میں نے جو نقشہ جمایا تھا - معاملہ اُس کا بالکل اُلٹ نکلا - خوبصورت تو دراصل وہ عورت ہے، جو اپنی آواز کو بات کرنے میں پھٹے بانس کی طرح بنا لیتی ہے - وہ اُس کی صراحی دار گردن، وہ کتابی چہرہ، وہ چمپئی رنگت، بس ذرا ہونٹ موٹے ہیں - اور ہاں! اتنے لانبے پلک تو میں نے آج تک دیکھے ہی نہیں - اور دوستو! وہ دوسری عورت جس کے لہجہ میں نرمی اور شیرینی ہے، پستہ قد، آنکھیں جیسے واسکٹ کے بٹن - خم کھائی ہوئی چپٹی ناک - گندمی رنگت - چیچک کے داغوں نے اُسے عجیب طرح کا مٹیالا سا بنا دیا ہے! (فیروز سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ اس گفتگو کو سنتا رہا اور ایک گہرے سوچ میں پڑ گیا)

صبح سویرے طلباء نے اُٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور ناشتہ کیا - ناشتہ میں انہوں نے خوب چہلیں کیں - چھین جھپٹ - قہقہے، ہنسی مذاق، کسی نے جھپٹا مار کر حلوے کا دونا ہتھیا لیا - کسی نے ثابت پوری کا ہاتھ سے چورا کیا اور ایک ہی لقمہ میں چٹ کر گیا - کسی نے چائے میں شکر ڈالتے ہوئے دو تین چمچے شکر ہی پھانک لی - ایک نے دوسرے کی قمیص کے دامن سے ہاتھ پونچھے تو دوسرے نے اچار کا مسالہ اُس کے گال پر لگا دیا - ایک شریر لڑکے نے رات کے مشاعرے کی نقل اُتاری - سب سے زیادہ لطف بوڑھے شاعر کی نقل اُتارنے میں آیا - لڑکے نے اسٹیج پر گاؤ تکیہ پر ٹیکا لگا کر پہلے اگالدان میں پان کی پیک تھوکی - پھر چشمہ کو ناک سے اُتار کر مجمع کا جائزہ لیا - اُس کے بعد جیب سے کاغذ نکالا تو کاغذ کے ساتھ ایک روپے کا نوٹ بھی لپٹا ہوا چلا آیا - شعر پڑھنے میں آواز الگ کپکپا رہی تھی اور ہاتھ الگ کانپ رہا تھا - وہ اس کا مجمع کو سلام کرنے میں جُھک جُھک جانا - وہ کمر کی لچک، گردن کا گھماؤ اور ہاتھوں کی جھریوں کا تناؤ! نقل میں اصل سے زیادہ لطف آیا - کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ تک یہ محفل گرم رہی ——!

اس کے بعد دن گیارہ بجے تک لڑکے کام میں لگے رہے - فیروز نے سب سے زیادہ کام کیا تھا - اُس کا بدن تھک کر چُور ہو گیا تھا - وہ ہارے ہوئے جُواری کی طرح اپنے گھر کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا - ہر تجربہ اور انکشاف کے بعد اُس پر خاص قسم کا ردِ عمل ہوتا، جیسے اُس کی زندگی سچ مچ کسی نئے موڑ پر مڑ رہی ہے!

اُس کے مکان کے قریب محلہ کے چھوکرے ایک بندر کا پیچھا کر رہے تھے - بندر نے بہت کچھ غرفش کی اور بھبکیوں سے لڑکوں کو مرعوب کرنا چاہا - مگر لڑکے بھلا داب کب کھانے والے تھے - لونڈوں کی ایک پلٹن تھی جو ہنومان جی کا تعاقب کر رہی تھی - فیروز گلی کے نکڑ پر کھڑا ہی تھا کہ ایک لونڈے نے بندر کے پتھر مارا - اور بندر جو پلٹا ہے تو فیروز درمیان میں آ گیا اور اُس کے پاجامے کے پائنچے کو بندر نے تار تار کر دیا - ہلکی سی خراش بھی اُس کی سیدھی ٹانگ پر آ گئی - کرا کس نے اور بھرا کس نے! دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے - جیون ایک گورکھ دھندا اور سنسار اچنبھا ہی اچنبھا ہے - اس دنیا میں سب سے مشکل اُن کی ہے جو دلِ حسّاس رکھتے ہیں - نزاکتِ احساس ایک نعمت بھی ہے اور عذاب بھی ہے!

فیروز اپنے مکان کے دروازہ پر پہنچا - تو اُس کے بڑے بھائی کا کوئی ملنے والا کواڑوں کے قریب کھڑا تھا - اور اندر سے اُس کی بھاوج باتیں کر رہی تھی - اس منظر کو دیکھ کر اس کے تیور ایکا ایکی خشمناک ہو گئے - وہ تیزی کے ساتھ لمبی لمبی ڈگیں بھرتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا - اُس کی بھاوج بھی تھوڑی سی دیر میں دروازے سے چل کر اُس کے پاس آ گئی ——!

" مسیتا کہاں مر گیا ؟ " فیروز نے غضبناک لہجہ میں اپنی بھاوج سے سوال کیا -

" وہ باورچی خانہ میں مسالہ پیس رہا ہے " بھاوج نے جواب دیا -

"بھابی جان! جب لڑکا گھر میں موجود تھا، تو آپ کو اُس آدمی سے باتیں کرنی نہیں چاہیئے تھیں۔ ہاں! وہ گھر میں نہ ہوتا تو دوسری بات تھی۔ آپ کو یہ نزاکتیں سمجھنی چاہئیں۔ بھابی جان!"

(عورت بات کاٹتے ہوئے) "یہ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے۔ جو اس طرح کی نصیحتیں مجھے کی جا رہی ہیں۔ پردے کی آڑ سے کسی شریف آدمی سے بات کر لینے میں آخر برائی کیا ہے؟"

(فیروز برافروختہ ہو کر) "بہت بڑی برائی ہے۔ اس میں نہ جانے کتنے فتنے اور خطرے ہیں۔ خطرے ..... خط ..... "

(اتنے میں فیروز کا بڑا بھائی امتیاز آجاتا ہے۔ اور اس کو دیکھتے ہی عفت بولنے لگتی ہے:-

"اپنے چھوٹے بھائی کی تو خبر لو۔ ان کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ مجھے آج عجیب طرح کی نصیحتیں کر رہے ہیں۔"

اس پر فیروز کے غصہ کا پارہ اور چڑھ جاتا ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر بول پڑتا ہے:-

"ہاں میں نے بھابی جان کو نصیحت کی تھی، یہ ہمارے خاندان کی عزت اور ناموس کا معاملہ ہے۔ مجھے سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔ میں اب کھل کر کہتا ہوں کہ غیر آدمی ہمارے دروازہ پر آئے تو اُس سے بات چیت گھر کے ملازم کو کرنی چاہیئے۔ وہ نہ ہو تو بھابی جان اُس کی باتوں کا جواب اس طرح دیں جیسے وہ پرلے درجہ کی روکھی اور بے مروت ہیں۔ جھنجلاہٹ کے انداز میں۔ جس طرح کوئی کسی سے بات کرنا نہ چاہتا ہو۔ اور مجبوری کے سبب اُس نے اس ناخوشگواری کو گوارا کر لیا ہو۔ بھابی جان! آپ نامحرموں سے باتیں کرنے میں بالکل اُجڈ اور اکھڑ بن جایئے۔"

"تو میں بدتہذیب بن جاؤں"۔ عفت نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں! یہ اچھا ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں یہی اچھا ہے کہ سننے والا آپ کے بارے میں بدتہذیب بلکہ پھوہڑ ہونے کا تصور لے کر جائے، بجائے اس کے وہ کچھ اور خیال قائم کرے۔"

"فیروز کیا تم نے بھنگ دھنگ پی لی ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور کس سے کہہ رہے ہو۔ یہ تم کس وہم اور خبط میں مبتلا ہو گئے ہو۔" فیروز کے بڑے بھائی نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"بھائی جان! حقیقت کو وہم اور اصلیت کو خبط سمجھ کر خدا کے لئے اُس کا مذاق نہ اڑایئے۔ میں آپ دونوں کا چھوٹا ہوں مگر جو کچھ میں آپ لوگوں سے کہہ رہا ہوں، وہ بڑے تجربہ کی بات ہے۔ اتنی بڑی بات کہ جس کی کوئی قیمت نہیں۔ کاش! لفظ میری دلی کیفیات کے متحمل ہو سکتے!"

"آخر غیر مرد سے شائستہ اور نرم لہجہ میں بات کرنے سے ہو کیا جاتا ہے؟" عفت نے فیروز کو ٹوکا۔

"سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ہو چکا ہے بھابی جان! آپ مجھ سے عمر اور عقل میں بڑی ہیں۔ مگر اس معاملہ میں میرا تجربہ آپ کی عمر اور عقل سے بہت آگے ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی صرف یہ بات کسی دلیل کے بغیر خدا کے لئے مان لیجئے۔ ہر بات کھول کر بیان نہیں کی جاتی۔ یہ معاملہ ہی بڑا نازک ہے۔ تلوار سے تیز اور بال سے باریک!" فیروز نے کہا۔

"اور یہ تمہارا پاجامہ ..... یہ کیا!" فیروز کے بڑے بھائی نے طنز اور حیرت کے لہجہ میں کہا۔

"یہ بھی ایک ناگہانی حادثہ ہے۔ ایک بندر کے کرتوت ہیں ......"

فیروز کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ میاں بیوی دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ بلند کیا۔ اور فیروز کا بڑا بھائی امتیاز بولا۔

"یعنی ..... بندر نے آپ کا پاجامہ پھاڑ ڈالا۔ کیا خوب! واہ رے! ابوالہول ..... ماشاء اللہ! چشم بددور، کیا

عجب ہے کہ کسی دن (بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہمارے عزیز بقراط صفت بھائی یہ آکر کہہ دیں کہ آج دو بلیوں نے میرے خوب کان کھینچے اور ایک بگلہ میری ٹوپی اُتار کرلے گیا!"

فیروز اس پر جھلا کر بالاخانہ کی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ فضا بڑی تلخ ہوگئی تھی۔ اُس نے وہاں سے چلے جانے میں ہی بھلائی دیکھی۔

عفت نے شوہر سے کہا کہ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز میاں کے دماغ میں کچھ خلل پیدا ہوگیا ہے۔ دو تین ہفتہ سے میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ بہکی بہکی باتیں کررہے ہیں۔ کئی دن ہوئے اپنے کمرے میں تن تنہا آپ ہی آپ گفتگو کررہے تھے۔ ایک دن سیتا فلمی گانا گاتے ہوئے تھرک رہا تھا، اس کے دو تھپڑ رسید کردیا۔ اور ہاں کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ آپ جو تصویروں کا البم لائے ہیں، اُس کی ایک تصویر کو فیروز نے سیاہی پھیر کر بگاڑ دیا۔ کل صبح میں چٹنی بنا رہی تھی۔ میرے چٹنی بناتے بناتے تین چار کچی مرچیں فیروز چبا گئے!"

بیوی کی باتیں سُن کر امتیاز گہری فکر میں ڈوب گیا۔ اُس کے تیوروں پر گردِ ملال سی چھاگئی۔ ایک خاص تاثر کے ساتھ بیوی سے بولا:۔

"عفت! اباجان مرحوم ہم چھ بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ فیروز ہی کو چاہتے تھے۔ اس کے اسکول جانے کے لئے قرض لے کر ٹم ٹم بنوائی۔ فیروز اباجان کی محبت کی نشانی ہے۔ اسی نسبت سے مجھے بھی وہ بہت عزیز ہے۔ مگر... (آہ! زیرلبی کے ساتھ)...... (کچھ سوچ کر) آج تیرہ تاریخ ہے نا! (عفت سر ہلاتی ہے) آج شام میں جج صاحب کی کمپنی باغ میں پارٹی ہے۔ میں اُس میں جانا نہیں چاہتا تھا کہ ایسی پارٹیوں اور دعوتوں کی تہ میں کچھ اغراض چھپے ہوتے ہیں۔ مگر اب میں ضرور جاؤں گا۔ یہ جو اپنے قاضی عزیزالدین ہیں، اُن کا بھانجہ احمد یار ولایت سے دماغی امراض میں اسپیشلسٹ ہوکر اسی سال آیا ہے وہ اس پارٹی میں ضرور ہوگا۔ میں وہاں اس سے فیروز کے بارے میں مشورہ کروں گا۔ اللہ مالک ہے! خدا کرے تمہارا یہ وہم غلط ثابت ہو!"

امتیاز شام کو ایٹ ہوم میں پہنچا۔ وہاں مہمانوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ شہر کی شاید ہی کسی پارٹی میں اتنے لوگ جمع ہوئے ہوں۔ بیرے، خانساماں اور بوائے پوری مستعدی کے ساتھ دوڑتے پھر رہے تھے۔ پھر بھی لوگوں کو شکایت تھی کہ "سروس" ٹھیک نہیں ہورہی ہے۔ فیروز اس پارٹی میں صرف ڈاکٹر احمد یار سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے ٹاؤن ہال اور اس کے اطراف میں ادھر اُدھر بہت کچھ گھوم پھر کر دیکھا مگر ڈاکٹر صاحب کہیں نظر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ دن چھپنے لگا اور مہمانوں کی واپسی شروع ہوگئی۔ امتیاز میزبان سے رخصت ہوکر کمپنی باغ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی آکر رُکی اور وہ منہ میں پائپ لگائے، دھوئیں اُڑاتے ہوئے نیچے اُترے۔ امتیاز سے علیک سلیک ہوئی۔ اُس نے کہا کہ بھئی ڈاکٹر صاحب! میں صرف تم سے ملنے کے لئے آج کی پارٹی میں آیا تھا۔ کس کشمکشِ انتظار میں یہ وقت گزارا ہے میں نے! ڈاکٹر صاحب نے پوچھا خیر تو ہے۔ بھابی جان تو خیریت سے ہیں، بچے تو اچھے ہیں۔ امتیاز نے جواب دیا کہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنا ہے!"

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب میزبان سے مل کر آگئے۔ امتیاز کمپنی باغ کے دروازے پر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں موٹر میں بیٹھے۔ اس طرح کہ کلینر پچھلی سیٹ پر، یہ دونوں آگے۔ ادھر موٹر چلی اور اُدھر امتیاز نے ڈاکٹر صاحب سے اپنے

بھائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ مطب میں پہنچکر ڈاکٹر صاحب نے امتیاز سے بہت سے سوالات کر ڈالے ـــ یہ کہ تمہارے خاندان میں کوئی شخص جنون میں تو مبتلا نہیں ہوا۔ فیروز نشہ تو نہیں کرتا۔ بچپن سے اب تک کے اُس کی زندگی اور صحت کے خاص خاص حالات کیا رہے ہیں؟

امتیاز نے ڈاکٹر کے سوالات کے جواب اس ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ دیئے جیسے مجسٹریٹ کی عدالت میں کوئی گواہی دیتا ہے۔ وہ بولا۔ ہمارے والد کے ایک دُور کے رشتہ کے چچا تھے اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں اُن کا دماغ کچھ چل سا گیا تھا۔ کڑاکے کے جاڑوں میں ٹھنڈے پانی سے اور مئی جون کی گرمی میں اوٹتے ہوئے پانی سے نہاتے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے اپنے اکلوتے لڑکے کو عاق کر دیا اور ساری جائداد اپنی سالی کے لڑکے کے نام لکھ دی۔ فیروز کوئی آٹھ سال کا ہوگا۔ جب اس کو ڈبل نمونیہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ پوچھتے ہیں وہ نشہ تو نہیں کرتا۔ بھائی! اس نے آج تک سگرٹ تک نہیں پی۔ میرا تو گمان غالب یہی ہے کہ خشک مذہبیت بلکہ یوں کہیئے ملائیت نے اُس کے دماغ کو متاثر کر دیا ہے۔ بچپن میں دو تین سال تک فیروز اللہ مغفرت کرے ہمارے بڑے ماموں کی تربیت میں رہا ہے اور اُن کی مذہبیت کا یہ عالم تھا کہ ہمارے گھر آکر جس کمرے میں ٹھہرتے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر کمرے کی ایک ایک تصویر نکلوا کر دم لیتے۔ زنانی سواریوں کو لے کر کہیں باہر جاتے تو تانگہ اور یکّہ پر دوہری دوہری چادریں اپنے ہاتھ سے پیٹتے۔ کہا کرتے تھے جب تک مسلمان عورتیں پردے میں رہیں گی، مسلمانوں کی ساکھ باقی رہے گی، وہ بے آبرو نہ ہوں گے۔"

"خوب تھے آپ کے ماموں صاحب!"۔ ڈاکٹر صاحب نے پائپ میں کش لگاتے ہوئے کہا۔

امتیاز نے دوسری باتوں کے علاوہ آج کے واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر کے گوش گزار کیا۔ ڈاکٹر نے ڈائری دیکھتے ہوئے کہا "کل تو مجھے صبح سے رات تک فرصت نہ مل سکے گی۔ پرسوں صبح نو بجے میں تمہارے گھر آؤں گا۔ فیروز کو اُس وقت تک گھر ہی پر روکے رکھیئے"۔

ڈاکٹر صاحب نے تیسرے دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔ دو راتیں اور پورا ایک دن باقی تھا۔ اس عرصہ میں امتیاز اور عفت دونوں نے فیروز کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ اُس کے دماغ میں فتور آگیا ہے! واہمہ کیسی کیسی غلط باتوں کی کڑی سے کڑی ملا دیتا ہے!

فیروز نے پانی پی کر گلاس کو گھڑونچی پر ٹیڑھا رکھ دیا۔ میاں بیوی دونوں یہ سمجھے کہ یہ دماغ کے عدم توازن کا سبب ہے۔ چائے بناتے میں چلائے دانی سے تھوڑی سی چائے ٹرے میں گری تو اُسے بھی فیروز کے خلل دماغ سے تعبیر کیا گیا۔ اُسکے ازار بند کا اتفاق سے لٹک جانا، منجن کی شیشی کو کھلا ہوا چھوڑ دینا، معمول کے خلاف گرم پانی کی ایک بالٹی کی جگہ دو بالٹیوں سے نہانا ـــ ان سب باتوں کو بیچارے فیروز کے جنون کا مظہر سمجھا گیا!

شام کو فیروز اپنی سائیکل پر سوار ہو کر بڑے بازار کے نکڑ سے گزرا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو سپاہی ایک غریب ٹھیلے والے کو پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ وہ منت سماجت کر رہا ہے مگر سپاہی اُسے ملاجیاں سُنا رہے ہیں۔ فیروز نے سائیکل سے اُتر کر ٹھیلے والے کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تو سپاہی بگڑنے لگے۔ گالی گفتار تک کی نوبت آگئی۔ فیروز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہاں تک کہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ وہ دو یہ اکیلا۔ مگر کالج کا کھلنڈرا صحت مند نوجوان پھر مظلوم کی حمایت اور مدافعت نے اُس میں اور جرأت پیدا کر دی تھی۔ وہ ہاتھ دکھائے ہیں اُس نے کہ سپاہیوں کو دانتوں

پسینہ آ گیا - اُن کی لال ٹوپیاں اُڑی اُڑی پھرتی تھیں - ایک سپاہی کی کنپٹی پر چوٹ بھی آئی - لہو میں اُس کا کلّہ بھر گیا - سیٹیاں بجنے لگیں - لوگ جمع ہو گئے - کچھ اور سپاہی بھی آ گئے - فیروز گرفتار ہو گیا ـــ!

فیروز ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا - فیروز نے اقرار کیا کہ میں نے سپاہیوں پر ہاتھ اٹھایا - مگر پہل اُن کی طرف سے ہوئی - گالیوں میں بھی اور مار پیٹ میں بھی!

فیروز کے بھائی امتیاز نے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ پیش کرتے ہوئے اپنے وکیل سے یہ کہلوایا کہ ملزم کا بہت دنوں سے دماغ خراب ہے - لہٰذا اُس کے بیان کا کوئی وزن نہیں! اس پر فیروز عدالت میں چیخنے لگا " میرا دماغ خراب ہی میرا! اور ڈاکٹر نے میرے دماغ کی خرابی کا سارٹیفکیٹ بھی تصنیف فرما دیا - میں کہتا ہوں کہ یہ ڈاکٹر پاگل اور سٹری ہے - اپنے بڑے بھائی کو تو کیا کہوں - سوائے اس کے کہ اللہ انھیں عقلِ سلیم عطا فرمائے ـــ ایں! میرے ساتھ آخر یہ کیا مذاق کیا جا رہا ہے - یا اللہ! میں یہ کیا سُن رہا ہوں! (مجسٹریٹ اس پر مُسکراتا ہے اور مجسٹریٹ کو مسکراتا دیکھ کر فیروز اور زور سے چیخنے لگتا ہے) آپ بھی مسکرا رہے ہیں - اس لئے کہ میں پاگل ہوں اور پاگل ہوائی تباہی باتیں کیا کرتے ہیں - جب کسی عدالت کے مجسٹریٹ ہی مسخرے ہو جائیں تو

پھر کسے رہنما کرے کوئی

اُسی دن شام سے کچھ دیر پہلے فیروز کو دماغی مریضوں کے ہسپتال میں کشاں کشاں لے جاتا ہوا دیکھا گیا - اُسے جب اندر لایا گیا تو ایک نیم پاگل لوہے کے جنگلے سے جھانکتے ہوئے بولا:- ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

فیروز نے اس پر کھسیا کر کہا " اچھا! تو تم نے بھی شاید اپنی کسی رشتہ دار عورت کو نامحرم مردوں سے بات کرتے ٹوکا ہوگا - اسی کی یہ سزا مل رہی ہے تم کو ......!"

اس پر تمام لوگوں نے ایک قہقہہ بلند کیا - امتیاز کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آئی - مگر اس کے ساتھ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں!!

فاران کا عظیم الشان

توحید نمبر

- شرک و بدعت کے بُت کدوں میں "نعرۂ توحید" کی گونج۔
- عجمی صنم کدوں میں دینِ خالص کا غلغلہ۔
- ایک ایک مقالہ ایمان افروز۔
- علم و تحقیق کی وہ راہیں جو صراطِ مستقیم سے جا کر ملتی ہیں۔
- اُردو ادب میں ایک انقلابی اقدام اور مثالی نمونہ

مندرجہ ذیل علماء اور اہلِ فکر کے مقالے آچکے ہیں:۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ـــــ مولانا مفتی محمد شفیع ـــــ مولانا قاری محمد طیب ـــــ مولانا امین احسن اصلاحی ـــــ مولانا ظفر احمد عثمانی ـــــ مولانا ابوالحسن علی ندوی ـــــ مولانا محمد اسمٰعیل (گوجرانوالہ) مولانا محمد ناظم ندوی ـــــ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ـــــ مولانا عبدالمجید ارشد ـــــ مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی) ـــــ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ـــــ مولانا محمد اویس ندوی ـــــ مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری ـــــ مولانا محمد مجیب اللہ ندوی ـــــ مولوی ابو منظور شیخ احمد ـــــ محترمہ عطیہ خلیل عرب ـــــ

عرب کے سب سے بڑے انشاء پرداز

علامہ البشیر براہیمی (الجزائری) اپنی علالت کے باوجود "توحید نمبر" کے لئے مقالہ تحریر فرمارہے ہیں۔ شاعروں کے نادر منظومات کے علاوہ ماہر القادری مُدیر "فاران" کا "نقشِ اول" بھی ہوگا۔

ضخامت تین سو صفحات۔ سرورق رنگین و دلکش۔ قیمت تین روپے (محصولڈاک آٹھ آنے) مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ چھ روپے آٹھ آنہ ہی میں "توحید نمبر" دیا جائے گا۔ (اس میں رجسٹری کی فیس بھی شامل ہے)

ہندوستان میں:۔ منیجر دفتر "الحسنات" رامپور (یوپی)

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

ہماری نظر میں

ماہنامہ "تجلی" کا خاص نمبر

ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند) ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ - سالانہ چندہ پانچ روپے (رنگین سرورق)۔ دفتر "تجلی" دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)، پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- شیخ سلیم اللہ صاحب ۲/۱۸ بی ۵/۲۰ ناظم آباد - کراچی -

"مولانا مدنی مدظلہ کا مزاج انتہا پسند اور شدت آمیز ہے، وہ جب جنگ آزادی لڑ رہے تھے تو کہا کرتے تھے کہ انگریز کے خلاف اگر مجھے کتوں اور خنزیروں سے بھی تعاون حاصل کرنا پڑے تو کروں گا۔ حالانکہ انگریز کی نفرت اور پسپائی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتی -...... تحریک آزادی میں آپ نے ولایتی مال کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں یہ اصول بنا لیا تھا کہ جس میت کا کفن کھدر کا نہ ہوگا، اُس کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں گا۔ نماز جنازہ جیسے خالص اُخروی معاملہ میں اُن کا یہ طرزِ فکر جس قدر شدت پسندانہ تھا وہ تو تھا ہی لیکن آزادی کے بعد بھی اسی پر جمے رہنا جب کہ لٹھا خود ہندوستان میں بہتیرا بن رہا ہے، اُن کی انتہا پسندی کا شاہکار ہے۔"

"قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی مولوی محمد طاہر صاحب کا چند سال ہوئے انتقال ہوا تو بھی مولانا مدنی نے نماز جنازہ پڑھانے کی یہی شرط رکھی کہ کھدر کا کفن ہو۔ اس پر قاری محمد طیب صاحب نے شدید ناگواری محسوس کی اور دیوبند میں جو سب سے بہتر لٹھا مل سکا، اُس کا کفن بھائی کو دیا اور مولانا مدنی سے نمازِ جنازہ نہیں پڑھوائی۔"

(خاص نمبر ماہنامہ تجلی)

جس عالم دین کے سوچنے کا یہ انداز اور جس کی شدت پسندی اور دینی فراست کا یہ عالم ہو، اُس کی روش سے خیر و سلامت روی اور صحت و اعتدال کی قدریں جتنی بھی مجروح ہو جائیں، تھوڑی ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کی طبیعت کی یہی ضد، مزاج کی انتہا پسندی اور فہم و فراست کی اعجوبیت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر آئی ہے۔ اور "حضرت شیخ العرب والعجم" نے اپنی "شوخیٔ فکر" کے وہ وہ شگوفے چھوڑے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر کبھی قہقہہ لگانے اور کبھی خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے!

مولانا عامر عثمانی نے اس "خاص نمبر" سے پہلے بھی مولانا مدنی اور اُن کے حواریوں کے فتووں اور تحریروں پر اس قدر وزنی دلائل کے ساتھ تنقید کی تھی کہ اس کا جواب دینے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی اور اب کی بار تو اُن کے مدلّل مگر پُر جوش نقد و محاکمہ نے "مذہبی سنیخت" کے اُن تمام حصاروں کو توڑ دیا ہے، جس میں بیٹھ کر یہ حضرات بیچارے مودودی پر خواہ مخواہ ناوک فگنی کرتے رہتے ہیں۔

مولانا مودودی نے فقیہانہ نہیں، ناصحانہ انداز میں، جو ہمیشہ سے مصلحین کا مسلک رہا ہے، مسلمانوں کی بے عملی پر تنذیر کا پہلو اختیار کیا تھا اور انھیں عمل پر اُبھارا تھا۔ اس کو مولانا مدنی نے "ایمان و عمل" کی فقیہانہ اور متکلمانہ نزاع میں اُلجھا کر

مودودی صاحب پر خارجیت کا فتویٰ لگا دیا! مولانا عامر عثمانی نے مظلوم مودودی کے موقف کو واضح کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے، اُسکی ایک ایک سطر بصیرت افروز ہے۔ انشاء سے لے کر استدلال تک اور فکر سے لے کر اظہار تک روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔

دُوسرا مقالہ مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کا بھی اسی موضوع پر ہے۔ جو ہر اعتبار سے وزنی، سنجیدہ اور باوقار ہے۔ حق کی حمایت میں اللہ تعالیٰ فکر کو کس قدر بلند، ذہن کو کتنا رسا اور نگاہ کو کس قدر عمیق بنا دیتا ہے۔ اس کا ثبوت اس مقالہ سے ملتا ہے!

تیسرا مقالہ "مولانا مودودی اور تصوف" جناب مولوی ابو منظور شیخ احمد کے قلم کا شاہکار ہے۔ اس مقالہ کو پڑھ کر دُنیا کی قدر ناشناسی پر دل دُکھا کہ کیسے کیسے جوہر قابل ہیں جو گمنامی اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں!

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

اس مقالہ میں دلائل وشواہد اور اقتباسات کے ذریعہ فاضل مقالہ نگار نے ثابت کیا ہے کہ اگر "تصوف" تزکیہ نفس اور احسان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو مولانا مودودی اپنے زمانہ کے بہت بڑے صوفی ہیں!

"تجلی" کا یہ "خاص نمبر" اس قابل ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچایا جائے۔

نذر ونیاز اور فاتحہ، عرس وغیرہ پر ایک خط کے جواب میں مولانا عامر عثمانی نے جو کچھ لکھا ہے[1] - اُسے پڑھ کر اُن کی اصابت رائے اور دینی بصیرت پر ایک اور شہادت مل گئی - کتاب وسنّت پر جس کی نگاہ ہوگی - وہ حق کے معاملہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہو سکتا - اور عقیدت واحترام اُسے اظہار حق سے باز نہیں رکھ سکتے!

اس "خاص نمبر" سے اس ٹریجڈی کا بھی منکشف علم ہوا کہ دفتر "تجلی" کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی - خود "صاحب تجلی" کی زبان سے سُنیئے:-

> "کچھ دنوں سے میرے ساتھ جو در پردہ فریب وعناد برتا جا رہا ہے، اُس میں اللہ نے اعدا کو کامیابی نہیں دی - تو اب غنڈہ گردی کی نوبت آئی، اللہ انھیں نیک ہدایت دے! باطل کی فطرت ہی یہ ہے کہ استدلال اور علم وعقل کے میدان میں شکست کھا کر وہ مکر ودغا، منافقت اور دھاندلی اور زور وقوت کے اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے ... ."

اللہ تعالیٰ مُدیر تجلی کی حفاظت فرمائے کہ وہ سخت خطروں میں گھرے ہوئے ہیں - اس کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ قرطاس وقلم کی علمی معرکہ آرائی کو شکست خوردہ ذہنیت اس حد تک بھی پہنچا سکتی ہے ـــــ افسوس!

---

[1] اسی "خاص نمبر" میں منصور حلاج پر مدیر تجلی کی رائے پڑھ کر حیرت ہوئی کہ "شرک وبدعت" کے خلاف اس شدومد کے ساتھ جہاد کرنے والا، منصور کا اس قدر مدح سرا! تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ منصور حلاج نے اگر بہ صحت ہوش و حواس "انا الحق" کہا تھا تو اس نے لغو ترین حرکت کا ارتکاب کیا اور اگر اُس کے ہوش وحواس درست نہیں تھے تو دیوانوں اور فاترالعقل کی حرکتوں کو سراہنا کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ "انا الحق" والے منصور کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی لاشریک عظمت کی خاطر ایک ہزار صوفیوں سے ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ کہ "غیرت عبدیت" اسے کسی طرح برداشت ہی نہیں کر سکتی! (م-ق)

وہ کتابیں جن میں ایمان اسلام اور اخلاق کے موتی بکھرے ہوئے ہیں

مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے منگائیے

مشکوٰۃ شریف کا اُردو ترجمہ عربی کے اصل متن کے ساتھ - حدیث شریف کی گیارہ کتابوں (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، موطا، مسند امام احمد، شافعی، بیہقی اور دارمی) کا بیش بہا انتخاب ہے - قیمت فی حصہ مجلد آٹھ روپے - جملہ قیمت کامل تین حصے (مجلد) چوبیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

تجرید بخاری اُردو صحیح بخاری کی تین ہزار تین سو چھیتر احادیث سے علامہ حسین بن مبارک نے دو ہزار ایک سو اسّی احادیث کا انتخاب فرمایا جن میں مکرر احادیث شامل نہیں ہیں - تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق احادیث اس مجموعہ کی زینت ہیں ——
قیمت مجلد پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

شمائل ترمذی (اُردو ترجمہ مع شرح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و خصائل اور رات دن کے معمولات کا بے نظیر مرقع! ایک ایک حدیث حرزِ جان اور معمولِ زندگی بنانے کے قابل - ایمان افروز اور زندگی بخش - قیمت مجلد آٹھ روپے - (علاوہ محصولڈاک)

تبلیغ دین امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "اربعین" کا اُردو ترجمہ - جس میں اسلامی تعلیمات کی حکمتیں، ظاہری و باطنی فوائد، عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں - اس کے مطالعہ سے اسلامی فکر میں جلا پیدا ہوتی ہے -
قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

اسبابِ زوالِ اُمت علامہ امیر شکیب ارسلان کی شہرۂ آفاق اور معرکہ آرا تصنیف کا اُردو ترجمہ - فکر و عمل کی شاہراہ میں یہ کتاب رہنما کا فرض انجام دیتی ہے، موجودہ صدی کی ممتاز ترین علمی تصنیف - قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ - (علاوہ محصولڈاک)

حجۃ اللہ البالغہ (اُردو ترجمہ) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مقبولِ عام تصنیف جس کا شہرہ عرب و عجم میں ہے، اسلامی علوم کا شاہکار - فکر و نظر کو دینی انداز پر ترتیب دینے والی کتاب - اصل عربی کے مقابل آسان اُردو ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ - قیمت ہر دو جلد بیس روپے - ایک جلد دس روپے (علاوہ محصولڈاک)

مجموعہ تفاسیر فراہیؒ مولانا حمید الدین فراہی کی اس بلند پایہ تالیف کو مولانا امین احسن اصلاحی نے اُردو قالب عطا کیا ہے - انتہائی شگفتہ اور دل نشین ترجمہ - تفسیری حقائق و معارف کا ایمان افروز ترجمہ - قرآنی مشکلات کے حل کے لئے بہترین کلید - صفحات ۵۲۷ صفحات - کپڑے کی عمدہ جلد - قیمت چودہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

حقوق الزوجین مولانا مودودی کی یہ تصنیف فقہی اور دینی فکر کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہے - معاشرے کی بہت سی گھریلو اُلجھنوں کا قابلِ عمل حل - قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

اخلاقی کہانیاں از افضل حسین (ایم اے، ایل ٹی) بچوں کے لئے چار کتابوں کا سیٹ - کردار سازی میں یہ کتابیں بہت مددگار ہیں - قیمت ایک روپیہ دس آنے (علاوہ محصولڈاک)

حدیثِ دفاع :- میجر جنرل اکبر خاں کی معرکہ آرا کتاب جس میں جنگی نقطۂ نگاہ سے غزوات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت پانچ روپے علاوہ محصولڈاک۔

سیرتِ خاتم الانبیاء :- مولانا مفتی محمد شفیع کی مشہور تالیف جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک دس سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک۔

فقہی اختلافات کا حل :- مولانا اصلاحی کی یہ کتاب پڑھ کر فکر و نظر میں تفقہ کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ علاوہ محصولڈاک۔

محمد بن عبدالوہاب :- اس عظیم مصلح کیساتھ اہلِ بدعت نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی کی یہ کتاب اس ظلم کے خلاف مؤثر احتجاج ہے، غلط فہمیوں کے ایک ایک پردہ کو چاک کیا گیا ہے، قابلِ قدر تحقیق قیمت دو روپے بارہ آنہ علاوہ محصولڈاک۔

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل :- دورِ حاضر کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز موضوع پر نہایت ہی سنجیدہ، پُر مغز اور مطمئن کرنے والی کتاب۔ جناب نعیم صدیقی اس کے مصنف ہیں۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک۔

سنّتِ رسول :- عرب کے مشہور عالم مصطفےٰ اسباعی کی بلند پایہ کتاب کا اردو ترجمہ۔ حدیث کی حمایت میں بڑی کامیاب تصنیف قیمت دو روپے چار آنے۔ علاوہ محصولڈاک۔

دفترِ بے معنی :- نعیم صدیقی کے قلم کی شوخیاں اپنے شباب پر۔ بڑی معنی خیز طنزیں۔ کتاب اٹھانے کے بعد آپ پڑھ کر دم لیں گے قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک۔

اشتراکیت اور اسلام :- مولانا مسعود عالم ندوی نے بڑی بڑی غلط فہمیوں کو اس کتاب میں بے نقاب کر دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ اشتراکیت اور اسلام اپنے مزاج کے اعتبار سے کس قدر مختلف اور متضاد واقع ہوئے ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنہ۔

تحقیقاتی عدالت میں :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ اس تاریخی مقدمہ میں اس مردِ مجاہد نے جو تین بیان دیئے ہیں وہ دعوت و عزیمت کی ایک مکمل تاریخ انقلاب ہے۔ تینوں کتابوں (تینوں بیانوں پر مشتمل) کی قیمت دو روپے دس آنے (علاوہ محصولڈاک)

تازیانے :- علامہ زین القضاۃ احمد بن محمد کی عربی کتاب المنبہات کا دلنشین اردو ترجمہ۔ پند و موعظت سے ایک ایک سطر معمور۔ قیمت مجلد تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)

الاخوان اور اس کی دعوت :- عرب دنیا کی مخلص ترین دینی جماعت "اخوان المسلمون" کا جاننا ہو تو اسی جماعت کے بانی اور مرشد حضرت حسن البناء شہید کی یہ ولولہ انگیز کتاب ضرور پڑھیے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (علاوہ محصولڈاک)

زرِ گل :- کوثر نیازی کا پہلا مجموعہ کلام۔ جس کی تمام ادبی حلقوں میں دھوم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ جوان جذبات کا اسلامی پیرایہ میں دلکش اظہار۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ۔ علاوہ محصولڈاک۔

پردہ :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شاہکار تصنیف۔ جس نے مغرب زدہ حلقوں میں تہلکہ بپا کر دیا ہے۔ اپنے موضوع پر بے مثل کتاب۔ قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک۔

الجہاد فی الاسلام :- مولانا مودودی نے یہ کتاب لکھ کر مغرب کے قانونِ جنگ کو چیلنج کیا ہے۔ فاضل مصنف نے معذرت خواہانہ انداز نہیں بلکہ پوری جرأت کیساتھ "جہاد" کے جواز پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ موضوع جہاد پر حرفِ آخر۔ قیمت نو روپے۔

پاکستانی عورت دوراہے پر :- مولانا امین احسن اصلاحی اس کتاب کے مصنف ہیں۔ پاکستان میں مغربی زندگی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے خلاف پہلا قلمی جہاد۔ اندازِ بیان اتنا شگفتہ و دلآویز کہ پڑھیے اور جھومیے۔ ہر شریف گھرانے میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

ماہنامہ

جلد (۹) نمبر (۲)

فاران

مئی ۱۹۵۷ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

یہ حقیقت کتنی ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو، مگر اس کے اعتراف سے گریز اور صرفِ نظر بھی ممکن نہیں کہ آج دُنیا میں سب سے زیادہ اضطراب اور انتشار مسلم ممالک میں پایا جاتا ہے۔ گردشِ روزگار کی سب سے زیادہ عنایت مسلمانوں ہی کے حال پر ہے اور انقلابات کی براہِ راست زد انہی پر پڑ رہی ہے، جو اسلام کے نام لیوا ہیں!

قریب قریب ہر مسلم مملکت شدید ترین سیاسی بحران میں مبتلا ہے، کسی سلطنت کی حالت کٹی ہوئی پتنگ کی سی ہے کہ خود اس میں کوئی طاقت نہیں رہی، اُس کا اُڑنا اور گرنا ہَوا کی موجوں کے رحم وکرم پر موقوف ہے، کسی کا جہاز منجدھار میں پھنسا ہوا ہے، کسی کی کشتی ساحل سے قریب ہے، مگر موجوں کے تھپیڑے ہیں کہ اُسے ڈگمگائے دے رہے ہیں، کسی کے باغ میں خود باغبانوں نے آگ لگا دی ہے اور دھوکا یہ دے رکھا ہے کہ یہ "آتشِ گُل" کی نمود ہے۔ کہیں صیادوں اور باغ کے رکھوالوں کے درمیان نزاع برپا ہے، جس نے چمن کے ایک ایک گوشہ میں برہمی پیدا کر رکھی ہے۔ کہیں کرسیاں لڑ رہی ہیں، کسی جگہ قیادت سے قیادت دست و گریبان ہے۔ کہیں یہ حالت کہ:۔

اُدھر اُدھر پھول کِھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ!

اور کہیں:۔

چور بنے ہیں چوکیدار!

جہاں بظاہر سکون نظر آتا ہے وہاں بھی "سطح ہموار" ایک دھوکا ہے، سطح کے نیچے نہ جانے کتنے گرم و تند طوفان کروٹیں لے رہے ہیں! غرض اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ عالمِ اسلام آج ایک ضغطہ کے عالم میں ہے!

غالب! دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود   ہفت آسیا بگردش و ما درمیانِ اُو

اُمتِ مسلمہ پر کوئی شک نہیں بڑے بڑے سخت وقت آئے ہیں، ابنِ علقمی، میر جعفر اور میر صادق جیسے غداروں نے مسلم حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا پارٹ ادا کیا ہے، مسلم فرمانرواؤں کی بے دانشی، غفلت اور سب سے بڑھ کر اُن کی عیش پسندیوں اور بدکاریوں نے حالات کو ابتر بنایا ہے! مگر ہوتا یہ رہا ہے کہ کہیں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا تو کسی جگہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ کسی مقام پر لٹیروں کا راج تھا تو دوسری جگہ امانت دار اور صالح افراد زمامِ حکومت سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک ملک کی ابتری اور پریشان حالی کی، دوسرے ملک کی خوش انتظامی اور امن و آسائش سے تلافی ہوجاتی تھی۔ زخم تھے تو اُن کے ساتھ مرہم بھی تھے۔ باغ میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے نہیں تھے۔ کہیں پھولوں کے تختے، اور سبزہ زار بھی تھے۔ کہیں کے حالات کو دیکھ کر جی جلتا تھا تو کسی جگہ کے احوال و کوائف سے آنکھیں ٹھنڈی اور جی خوش بھی ہوتا تھا!

مگر آج اُمتِ مسلمہ شرق سے لے کر غرب تک پریشان اور مضطرب الحال ہے:۔

جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم!

پوری قوم کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے، ہر مسلم حکومت میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ اگر مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ کسی کے سامنے نہ ہو، تو وہ ہم مسلمانوں کی حالت دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ اس قوم نے عروج و عزت اور مسرت و اقبال مندی کا شاید ایک لمحہ بھی نہیں دیکھا۔ اس ملت کو تو ہمیشہ ٹھکرایا جاتا رہا ہے اور اس میں سدا نکمے اور ناکارہ لوگ ہی پیدا ہوتے رہے ہیں ــــ!

"اسلام" جسے دُنیا میں غالب ہو کر ہی رہنا چاہیئے، وہ ہماری کمزوری اور بداعمالیوں کے سبب مظلومیت کے دَور سے گزر رہا ہے، بدھ کا فلسفہ جسے دنیا قریب قریب فراموش کر چکی تھی اور جس کا ذکر شاذ و نادر ہی سُننے میں آتا تھا، اُس تک کا "احیاء" ہو رہا ہے۔ اور مسیح مُردوں میں جان ڈالی جا رہی ہے، مگر ہم مسلمان کے اعمال و کردار کو، اللہ اور رسولؐ سے ہماری بے وفائی اور دین سے بیزاری کو دیکھ کر، دُنیا، اسلام کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور ہم نے اس سب سے زیادہ نامی و متحرک اور فعال ترین دین کو جامد اور معطل بنا کر رکھ دیا ہے!

اللہ تعالیٰ کی وہ مغضوب قوم جس پر مسکنت و ذلت ڈال دی گئی ہے، ملتِ اسلامیہ کے مقابلہ میں وہ تک اُبھر رہی ہے اور بالشت بھر کی اسرائیلی حکومت نے تمام عرب حکومتوں کے احوال و کوائف کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ پوری مسلم قوم ذلت و مظلومیت کی وبا میں مبتلا ہے۔ مسلمانوں کے خاندان اور قبیلے ہوں یا ملک اور حکومتیں، سب پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ دُنیا کے پردے پر کسی خطہ اور کسی گوشہ سے بھی، مسلمانوں کے حالات کی کوئی ایسی خبر سُننے میں نہیں آتی، جسے "مژدہ" اور "نوید" کہہ سکیں۔ یا جس کے سُننے سے دل کو خوشی اور سکون حاصل ہو! جہاں سے بھی خبر آتی ہے پریشانی اور بحران و انتشار ہی کی آتی ہے۔ سامعہ کے لئے سامانِ جراحت اور دل و دماغ کے لئے ایک اندوہناک حادثہ بن کر!

ایک وہ خوش نصیبی اور اقبال کی یاوری کا دَور کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم پر ساون کی گھٹا کی طرح برستی تھی اور ایک یہ زبوں حالی اور بدتوفیقی کا زمانہ کہ اس کے قہر و عتاب کے خوفناک سائے ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں اور یہ تاریکی گہری ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ قصور کس کا ہے، ہمارا یا اللہ میاں کا (معاذ اللہ، خاک بدہن گستاخ!) بے انصافی اور بے وفائی کدھر سے ہو رہی ہے؟ پیمانِ وفا کس نے توڑا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے، ظلم کا صدور اس کی ذات سے ناممکن ہے (سبحان اللہ عما تصف
اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تو ہر کافر و دیندار کے لئے یکساں ہے اور اُس کا ابرِ کرم سبزہ زاروں پر ہی نہیں، چٹیل میدانوں اور
بنجر زمینوں پر بھی برستا ہے۔ گل و لالہ اور سرو و سمن ہی نہیں، خاروخس اور جھاڑ جھنکار بھی اُسی کی ربوبیت کے سہارے
نشو و نما پا رہے ہیں، اور موحد و مشرک اور نافرمان اور فرمانبردار سب اُسی کے در سے پل رہے ہیں ــــ مگر مسلمان کو تمام
مخلوقات میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی "مخلوق" ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کے دین کا حامل اور اُس کے
کلمہ کا ناشر اور علمبردار بھی ہے۔ اس لئے ربوبیت عامہ کے علاوہ، اللہ تعالیٰ کے کرم خاص کا بھی اُسے مستحق ہونا چاہیئے
اسی طرح دین متین کے اس حامل اور علمبردار سے جب کوتاہی، غفلت اور نافرمانی ظہور میں آئے۔ تو اللہ کے انصاف کا عین
تقاضا ہے کہ دُوسرے نافرمان لوگوں کے مقابلہ میں اسے سزا بھی دُہری دی جائے! ایک عام نافرمانی کی۔ دُوسری سزا
اُس فرض کی ادائیگی میں غفلت برتنے اور اُس امانت میں خُرد بُرد کرنے کی، جو اُسے سونپی گئی تھی!

ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور اپنی عبدیت کا اعلان تو ضرور کرتے ہیں، اور یہ اقرار و اعلان بھی خدانخواستہ
نہ رہے تو پھر ہم مسلمان ہی کہاں رہ سکتے ہیں۔ مگر ہمارا حال اُس نافرمان غلام کا سا ہے، جس نے اپنے آقا کے حکم کی
خلاف ورزی اور سرتابی کو اپنا وتیرہ بنا لیا ہو۔ جو اپنے آقا کی بات اس کان سُنے اور اُس کان اُڑا دے۔ اور اُس کی
اطاعت سے جس نے مُنہ موڑ لیا ہو! ـــ ہمیں اللہ کے دین کی علمبرداری کا دعویٰ ہے، مگر ہمارے کرتوت ایسے ہیں کہ دین
کے عَلم ہمارے ہاتھوں سرنگوں ہوئے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے اعمال و کردار سے اللہ کا دین رسوا ہو رہا ہے!

ہم سے بڑا حق ناشناس اور کمینہ کوئی نہیں اگر ہم اللہ سے شکوہ کریں کہ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

یہ ہماری بیچارگی، پامالی، ذلّت اور نکبت خود ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جو بویا تھا اُسے کاٹ بھی رہے ہیں
ہمارا کیا ہوا ہی ہمارے سامنے آ رہا ہے! ـــ از ماست کہ برماست ـــ! ہماری غلط اندیشی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے
بوئیں تو ببولیں اور اُن پر کانٹے دیکھ کر، شکوہ کر رہے ہیں کہ ان پر تو انگور اور انجیر لگنے چاہیئے تھے۔ ہم خود اپنے کو بدلنے
کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی "سنّت" کو بدل دے!

مُسلم عوام "بڑے آدمیوں" اور "اُونچے لوگوں" کا ذکر تو بعد میں آتا ہے، معاشرے کی تباہی سب سے زیادہ ہم
عوام مُسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ لوگوں کی جیبیں کون کاٹتا ہے؟ پانی میں دُودھ کی ملاوٹ کون
کرتا ہے؟ سلائی کی مشینوں پر کپڑا کون بچاتا ہے؟ سینماؤں کے دروازوں پر پولیس کے ڈنڈے کون کھاتا ہے؟
فٹ پاتھ پر جُوا کون کھیلتا ہے؟ قحبہ خانوں کی گہما گہمی کس کے دم سے قائم ہے؟ مسجدوں میں جُوتے کون چُراتا ہے؟
رشوت دے کر فائدے کون اُٹھاتا ہے؟ پرائی بہو بیٹیوں کو کون تاکتا اور گھورتا ہے؟ خدا کی قسم کھا کر اور ہاتھوں پر
قرآن اُٹھا کر دھوکے کون دیتا ہے؟ سٹہ کا کاروبار کون کرتا ہے؟ چلتی عورتوں پر آوازے کون کستا ہے؟ عورتوں کے
اغوا کے واقعات کس سے ظہور میں آتے ہیں؟ مالی فائدہ کے لالچ میں سوسائٹی کے ربے سے بُرے لوگوں کو ووٹ کون دیتا
ہے؟ عدالتوں میں جھوٹی گواہی دینے کی کسے عادت ہے؟

یہ ہم عوام مسلمانوں ہی کی زندگی کے سیاہ اوراق ہیں۔ یہ ہمارے ہی کیرکٹر کی چند جھلکیاں ہیں، یہ ہمارے کردار ہی کی طرف چند اشارے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس درجہ گھناؤنی اور نفرت انگیز ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے ہی میں کھلمنساہت اور شرافت ہے، آوے کا آوا اور گھان کا گھان ہی بگڑا ہوا ہے!

ہم آخرت کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ مگر عمل یہ ہے کہ جیسے یہی دنیا اور اس کی لذتیں ہی سب کچھ ہیں۔ لوٹو جتنی لذتیں لوٹی جائیں۔ منفعتیں حاصل کرو جتنی بھی کر سکو؟ دنیا طلبی اور لذت اندوزی کا جہاں تک تعلق ہے، ہمارا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کا ایک ہی جیسا اندازِ حیات اور طرزِ زندگی ہے!

فسق و فجور اور لغزش و گناہ کی منزل میں ہم مسلمان کا فرون، مشرکوں، دہریوں اور مادہ پرستوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں، جو وہ کرتے ہیں، وہی ہم کرتے ہیں، جو اُن کے مشاغل ہیں وہی ہمارے ہیں۔ جب ایسے لچھن اور یہ کرتوت ہوں تو پھر دُنیا میں اپنی ذلتوں اور پامالیوں پر یہ شکوے اور شکایتیں کیسی؟ اس دُنیائے آب و گل اور جہانِ کون و حوادث میں شیطان کے کام کو سب سے زیادہ آسان ہم نے کر دیا ہے۔ اسلام خود شرماتا ہے کہ کیسے نافرمان لوگ مجھ سے منسوب ہو گئے ہیں۔ اور ایمان پناہ مانگتا ہے کہ میں کیسے بے عملوں اور بے وفاؤں میں گھر گیا ہوں!

جس طرح مریض ڈاکٹروں اور طبیبوں سے آس لگائے رہتے ہیں کہ اُن کی توجہ سے خطرناک سے خطرناک مرض بھی جاتا رہے گا، اسی طرح بگڑا ہوا معاشرہ علمائے کرام سے توقع رکھتا ہے کہ یہ معاشرے کو کسی نہ کسی حد تک سنبھال لیں گے مگر علماء کی اکثریت خود اپنی دُنیا بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ اور یہ دُنیا داروں سے زیادہ دُنیا کی ہوس رکھتے ہیں۔ اور آخرت سے غافل ہیں۔ ان کی محفلوں اور مجلسوں میں اور تو سب کچھ یاد آتا ہے مگر خدا یاد نہیں آتا۔ دربارداری اور "سرمایہ داروں" کو خوش رکھنے کے فن میں یہ حضرات یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ دوسرا کام ان سے یہ آتا ہے کہ کہیں اللہ کے دین کا کام ہو رہا ہو، تو اُس میں روڑے اٹکائیں۔ صاحبانِ عمل و اخلاص پر تہمتیں جوڑیں اور اپنے کاروبار کے مندے پڑنے کے ڈر سے دین کے مخلص خدمت گزاروں کو عوام مسلمانوں کی نگاہ میں مشتبہ اور بے وقعت بنادیں!

درازدستئ ایں کوتہ آستیناں بیں!

یہ "بڑے لوگ"! اب رہی مسلم سلطنتوں اور ملکوں کی ابتری، تو اس کے ذمہ دار وہ "بڑے لوگ" ہیں۔ جن کا ایک ایک فرد "خداوندِ نعمت" بلکہ "مالکِ رقابِ اُمم" بنا بیٹھا ہے۔ بالشت برابر اسرائیلی حکومت قائم ہوئی اور جم گئی۔ اُس کا وزن محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اس حکومت کے چلانے والے مخلص، ایثار پیشہ اور اپنی قوم کے غم خوار ہیں۔ مگر کروڑوں کی آبادی اور ہزاروں میل کے رقبہ کی اسلامی حکومتیں ہیں کہ جن کی دُنیا میں کوئی ساکھ نہیں، سکہ اُن کا بے وقعت ہے۔ سفارت خانے اُن کے بے اثر ہیں۔ وہ کسی حکومت سے اپنا جائز حق نہیں منوا سکتے۔ غیر حکومتیں نہ اُن کی دوستی کو اہمیت دیتی ہیں اور نہ اُن کی دشمنی کی پروا کرتی ہیں!

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مسلم حکومتوں کے کرتا دھرتا مخلص ہونے کے بجائے غرض پرست ہیں۔ اُن کا سارا وقت اسی جوڑ توڑ میں صرف ہوتا ہے کہ ملک تباہ ہوتا ہو بلا سے ہو جائے مگر اُن کی "کرسیاں" سلامت رہیں — پارٹیوں کے توازن کا گُر چلتے ہوئے انگریز اُن کے کان میں پھونک گیا ہے۔ اور یہ اسی اچھر سے برابر کام لئے جا رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو آپس میں لڑانا اور اُن میں پھوٹ ڈالنا۔ بس اسی "آرٹ" کے سہارے

اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے، ظلم کا صدور اس کی ذات سے ناممکن ہے (سبحان اللہ عما تصفون) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تو ہر کافر و دیندار کے لئے یکساں ہے اور اُس کا ابرِ کرم سبزہ زاروں پر ہی نہیں، چٹیل میدانوں اور بنجر زمینوں پر بھی برستا ہے۔ گل و لالہ اور سرو و سمن ہی نہیں، خار و خس اور جھاڑ جھنکار بھی اُسی کی ربوبیت کے سہارے نشو و نما پا رہے ہیں، اور موحد و مشرک اور نافرمان اور فرمانبردار سب اُسی کے در سے پل رہے ہیں ــــ مگر مسلمان کو تمام مخلوقات میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی "مخلوق" ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کے دین کا حامل اور اُس کے کلمہ کا ناشر اور علمبردار بھی ہے۔ اس لئے ربوبیتِ عامہ کے علاوہ، اللہ تعالیٰ کے کرمِ خاص کا بھی اُسے مستحق ہونا چاہیئے۔ اسی طرح دینِ متین کے اس حامل اور علمبردار سے جب کوتاہی، غفلت اور نافرمانی ظہور میں آئے۔ تو اللہ کے انصاف کا عین تقاضا ہے کہ دُوسرے نافرمان لوگوں کے مقابلہ میں اسے سزا بھی دُہری دی جائے! ایک عام نافرمانی کی۔ دُوسری سزا اُس فرض کی ادائیگی میں غفلت برتنے اور اُس امانت میں خُرد بُرد کرنے کی، جو اُسے سونپی گئی تھی!

ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور اپنی عبدیت کا اعلان تو ضرور کرتے ہیں، اور یہ اقرار و اعلان بھی خدانخواستہ نہ رہے تو پھر ہم مسلمان ہی کہاں رہ سکتے ہیں۔ مگر ہمارا حال اُس نافرمان غلام کا سا ہے، جس نے اپنے آقا کے حکم کی خلاف ورزی اور سرتابی کو اپنا وتیرہ بنا لیا ہو۔ جو اپنے آقا کی بات اس کان سُنے اور اُس کان اُڑا دے۔ اور اُس کی اطاعت سے جس نے مُنہ موڑ لیا ہو! ــــ ہمیں اللہ کے دین کی علمبرداری کا دعویٰ ہے، مگر ہمارے کرتوت ایسے ہیں کہ دین کے عَلم ہمارے ہاتھوں سرنگوں ہوئے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے اعمال و کردار سے اللہ کا دین رسوا ہو رہا ہے!

ہم سے بڑا حق ناشناس اور کمینہ کوئی نہیں اگر ہم اللہ سے شکوہ کریں کہ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

یہ ہماری بیچارگی، پامالی، ذلت اور نکبت خود ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جو بویا تھا اُسے کاٹ بھی رہے ہیں! ہمارا کیا ہوا ہی ہمارے سامنے آ رہا ہے! ــــ از ماست کہ بر ماست ــــ! ہماری غلط اندیشی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے بوئیں تو ببولیں اور اُن پر کانٹے دیکھ کر، شکوہ کر رہے ہیں کہ ان پر تو انگور اور انجیر لگنے چاہیئے تھے۔ ہم خود اپنے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی "سنّت" کو بدل دے!

مُسلم عوام

"بڑے آدمیوں" اور "اُونچے لوگوں" کا نمبر تو بعد میں آتا ہے، معاشرے کی تباہی سب سے زیادہ ہم عوام مُسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ لوگوں کی جیبیں کون کاٹتا ہے؟ پانی میں دُودھ کی ملاوٹ کون کرتا ہے؟ سلائی کی مشینوں پر کپڑا کون بچاتا ہے؟ سینماؤں کے دروازوں پر پولیس کے ڈنڈے کون کھاتا ہے؟ فٹ پاتھ پر جوا کون کھیلتا ہے؟ قحبہ خانوں کی گہما گہمی کس کے دم سے قائم ہے؟ مسجدوں میں جوتے کون چُراتا ہے؟ رشوت دے کر فائدے کون اُٹھاتا ہے؟ پرائی بہو بیٹیوں کو کون تاکتا اور گھورتا ہے؟ خدا کی قسم کھا کر اور ہاتھوں پہ قرآن اُٹھا کر دھوکے کون دیتا ہے؟ سٹہ کا کاروبار کون کرتا ہے؟ چلتی عورتوں پر آوازے کون کستا ہے؟ عورتوں کے اغوا کے واقعات کس سے ظہور میں آتے ہیں؟ مالی فائدہ کے لالچ میں سوسائٹی کے سب سے بُرے لوگوں کو ووٹ کون دیتا ہے؟ عدالتوں میں جھُوٹی گواہی دینے کی کسے عادت ہے؟

یہ ہم عوام مسلمانوں ہی کی زندگی کے سیاہ اوراق ہیں۔ یہ ہمارے ہی کیرکٹر کی چند جھلکیاں ہیں، یہ ہمارے کردار ہی کی طرف چند اشارے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس درجہ گھناؤنی اور نفرت انگیز ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے ہی میں بھلمنساہت اور شرافت ہے، آوے کا آوا اور گھان کا گھان ہی بگڑا ہوا ہے!

ہم آخرت کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ مگر عمل یہ ہے کہ جیسے یہی دنیا اور اس کی لذتیں ہی سب کچھ ہیں۔ لوٹو جتنی لذتیں لوٹی جائیں۔ منفعتیں حاصل کرو جتنی بھی کر سکو؟ دنیا طلبی اور لذت اندوزی کا جہاں تک تعلق ہے، ہمارا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کا ایک ہی جیسا انداز حیات اور طرز زندگی ہے!

فسق و فجور اور لغزش و گناہ کی منزل میں ہم مسلمان کا فرد، مشرکوں، دہریوں اور مادہ پرستوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں، جو وہ کرتے ہیں، وہی ہم کرتے ہیں، جو اُن کے مشاغل ہیں وہی ہمارے ہیں۔ جب ایسے لچھن اور یہ کرتوت ہوں تو پھر دنیا میں اپنی ذلتوں اور پامالیوں پر یہ شکوے اور شکایتیں کیسی؟ اس دنیائے آب و گل اور جہانِ کون و حوادث میں شیطان کے کام کو سب سے زیادہ آسان ہم نے کر دیا ہے۔ اسلام خود شرماتا ہے کہ کیسے نافرمان لوگ مجھ سے منسوب ہو گئے ہیں۔ اور ایمان پناہ مانگتا ہے کہ میں کیسے بے عملوں اور بے وفاؤں میں گھر گیا ہوں!

جس طرح مریض ڈاکٹروں اور طبیبوں سے آس لگائے رہتے ہیں کہ اُن کی توجہ سے خطرناک سے خطرناک مرض بھی جاتا رہے گا، اسی طرح بگڑا ہوا معاشرہ علماء کرام سے توقع رکھتا ہے کہ یہ معاشرے کو کسی نہ کسی حد تک سنبھال لیں گے مگر علماء کی اکثریت خود اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ اور یہ دنیا داروں سے زیادہ دنیا کی ہوس رکھتے ہیں۔ اور آخرت سے غافل ہیں۔ ان کی محفلوں اور مجلسوں میں اور تو سب کچھ یاد آتا ہے مگر خدا یاد نہیں آتا۔ دربارداری اور "سرمایہ داروں" کو خوش رکھنے کے فن میں یہ حضرات یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ دوسرا کام ان سے یہ آتا ہے کہ کہیں اللہ کے دین کا کام ہو رہا ہو، تو اُس میں روڑے اٹکائیں۔ صاحبانِ عمل و اخلاص پر تہمتیں جوڑیں اور اپنے کاروبار کے مندے پڑنے کے ڈر سے دین کے مخلص خدمت گزاروں کو عوام مسلمانوں کی نگاہ میں مشتبہ اور بے وقعت بنا دیں!

درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں!

یہ "بڑے لوگ"! اب رہی مسلم سلطنتوں اور ملکوں کی ابتری، تو اس کے ذمہ دار وہ "بڑے لوگ" ہیں۔ جن کا ایک ایک فرد "خداوندِ نعمت" بلکہ "مالکِ رقابِ اُمم" بنا بیٹھا ہے۔ بالشت برابر اسرائیلی حکومت قائم ہوئی اور جم گئی۔ اُس کا وزن محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اس حکومت کے چلانے والے مخلص، ایثار پیشہ اور اپنی قوم کے غم خوار ہیں۔ مگر کروڑوں کی آبادی اور ہزاروں میل کے رقبہ کی اسلامی حکومتیں ہیں کہ جن کی دنیا میں کوئی ساکھ نہیں، سکہ اُن کا بے وقعت ہے۔ سفارت خانے اُن کے بے اثر ہیں۔ وہ کسی حکومت سے اپنا جائز حق نہیں منوا سکتے۔ غیر حکومتیں نہ اُن کی دوستی کو اہمیت دیتی ہیں اور نہ اُن کی دشمنی کی پروا کرتی ہیں!

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مسلم حکومتوں کے کرتا دھرتا مخلص ہونے کے بجائے غرض پرست ہیں۔ اُن کا سارا وقت اسی جوڑ توڑ میں صرف ہوتا ہے کہ ملک تباہ ہوتا ہو بلا سے ہو جائے مگر اُن کی "کرسیاں" سلامت رہیں — پارٹیوں کے توازن کا گُر چلتے ہوئے انگریز اُن کے کان میں پھونک گیا ہے۔ اور یہ اسی اچھر سے برابر کام لئے جا رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو آپس میں لڑانا اور اُن میں پھوٹ ڈالنا۔ بس اسی "آرٹ" کے سہارے

اُن کی کرسیاں قائم رہیں۔ جو ایک بار کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر مرتے دم تک کرسی سے ہٹنا نہیں چاہتا!

افسوس ہے کہ بڑے بڑے اہل اور لائق لوگوں کی ذہانتیں اپنے عہدوں کی عمر بڑھانے کی بھاگ دوڑ میں صرف ہو رہی ہیں۔ جو ذہانت اور ہوشمندی ملک اور قوم کی تعمیر میں کام آنی چاہیئے تھی، وہ اپنے ذاتی اغراض کے کام آ رہی ہے!

تھوڑی بہت غرض ہر شخص رکھتا ہے اور نفس ہر کسی کے ساتھ لگا ہوا ہے، مگر ایسی بھی غرض دوستی اور نفس پرستی کیا کہ اپنی خواہش اور غرض کے لئے قوم اور ملک کے وقار کو بے دریغ بھینٹ چڑھا دیا جائے! اور ملکی مسائل کو دیکھنے کے لئے صرف ایک ہی عینک اور امورِ مملکت کو جانچنے اور پرکھنے کی ایک ہی کسوٹی ہو۔ اور وہ ہیں اپنے "ذاتی اغراض"!

اپنی غرض جہاں پوری ہوتی نظر آئے، وہاں ہر گناہ، ثواب۔ ہر خطا درست اور ہر سازش عین مصلحت و حکمت!

اس پارٹی سے اُس پارٹی کو لڑوا دیا۔ اس کو شہ دی، اُس کی پیٹھ تھپکی۔ فلاں کو "پرمٹ" کا لالچ دیا۔ کسی کو "عہدے" کا فریب دے کر شیشہ میں اُتارا۔ کسی کو سائی، کسی کو بدھائی!

جن ملکوں اور سلطنتوں میں اُوپر کے لوگوں کے یہ رنگ ڈھنگ اور کرتوت ہوں۔ وہاں جو کچھ بھی ہو جائے، تھوڑا ہے!

ان "خداوندانِ نعمت" کو سب سے زیادہ خوف "اسلامی نظامِ حکومت" سے لگتا ہے۔ اس کے قیام میں انھیں اپنے جاہ و اقتدار کی موت نظر آتی ہے۔ اس لئے اُن کی ساری کوششیں اسی میں صرف ہوتی ہیں کہ "نظامِ حق" کو پاؤں جمانے کا موقع نہ مل سکے!

امریکہ اور انگلستان تو ایک طرف رہے اگر روس کا نظامِ حکومت تک قائم ہو جائے تو بھی یہ "بڑے لوگ" اسلام کے مقابلہ میں اسے قبول کر لیں گے! "اسلامی نظام" کو یہ "صاحب لوگ" اپنے لئے "موت کا فرشتہ" سمجھتے ہیں، اسی لئے اُس کے ٹالنے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے!

جمال ناصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، اُس نے اپنے اقتدار کو جمانے اور اپنی آمریت کو بڑھانے کے لئے تین کام کئے ہیں:-

ایک یہ کہ جمہوریت کو ختم کیا۔

دوسرا کام یہ کیا کہ "اسلام پسندوں" اور نظامِ حق کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو پیس کر رکھ دیا۔

تیسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے اور دُنیا کی توجہ کا رُخ پھیرنے کے لئے "نہر سویز" کے مسئلہ کو کھڑا کر دیا۔

"نہر سویز" کے مسئلہ ہی کے یہ تلخ ثمرات ہیں کہ مصر، شام اور اُردن میں کمیونسٹوں کو غلبہ حاصل ہوتا جا رہا ہے۔ اور سُرخ پرچم کا منحوس سایہ جہاں تہاں نظر آ رہا ہے!

جمال ناصر کی ذہنیت کے لوگ جن جن مسلم حکومتوں اور ملکوں میں موجود ہیں، وہ اسی طرح کی ابتری پھیلا رہے ہیں! جمہوریت اور اسلام کی قدریں اُن کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہیں۔ اور دستور و قانون کو پامال اور بے آبرو کرنے میں اُنھیں کوئی باک نہیں ہوتا۔ ہر تعمیری کام کو التوا میں ڈالنے اور ہر مفید منصوبہ کو ٹالنے کی کوشش!

ساری دوڑ دھوپ اس کے لئے کہ اُن کے اقتدار کے اردگرد مضبوط حصار قائم ہوجائے اور اُن کی "بلند بامی" پر کسی عنوان آنچ نہ آنے پائے!

یہ ایک سرسری جائزہ ہے مسلم حکومتوں کا!

یہ وہ حقائق ہیں جن کی صحت میں وہی شخص شبہ کرسکتا ہے، جو عقل و بصیرت سے کورا ہو!

اُٹھیے! جو لوگ دینی غیرت، قومی حمیت اور عزتِ نفس کھوچکے ہیں، وہ ملک و ملت کے انتشار و اضطراب سے کوئی اثر نہیں لیتے، اُن کو تو اپنی عیش کوشی، ذاتی اغراض اور شخصی مفادات سے کام ہے!

اس ذہنیت کے لوگ چڑھتے سورج کے پجاری اور مارتے کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی اصول اور کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ جس کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار ہے، یہ اُسی کی ہمنوائی کرتے ہیں اور اُسی کے غاشیہ بردار بن جاتے ہیں ـــــ!

اس کردار اور مزاج کے افراد ہر مسلم ملک میں پائے جاتے ہیں۔ "جی حضوریوں" کا یہ وہ ذلیل طبقہ ہے، جو جابروں اور ظالموں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور جس کی نیازمندی وقت کے فرعونوں اور ہامانوں کے کبر و غرور کو غذا پہنچاتی ہے!

ہمارا خطاب اُن دردمند لوگوں سے ہے، جو اس گئے گزرے زمانہ میں بھی خدا کا خوف، رسولؐ کی محبت، دین کا شغف اور ملت کا درد رکھتے ہیں۔ ہم نے ملتِ اسلامیہ کے حالات کا جو جائزہ لیا ہے، اُس سے ہمارا یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ قوم کی زبوں حالی اور پراگندگی کو دیکھ کر لوگوں کے دل ٹوٹ جائیں اور دل و دماغ پر افسردگی و نومیدی طاری ہوجائے ـــــ!

افسردگی اور نومیدی کا ہم سے بڑا دشمن شاید ہی کوئی ہوگا۔ "فاران" کے صفحات اس کے شاہد ہیں کہ ہمارا قلم ہمیشہ "زمانہ ستیز" رہا ہے۔ ہمارا تو مشن ہی یہ ہے کہ حق کا ایک ذرّہ بھی جہاں کہیں ہے وہ باطل کے الوند و البرز کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔ جس دن "حق" باطل سے دبنے لگے گا بس وہی قیامت کا دن ہوگا ـــــ!

یہ دردناک تفصیلات ہم نے اس غرض سے پیش کی ہیں کہ اہلِ حق جہاں بھی ہیں اور جس حال میں بھی ہیں، وہ چونک جائیں، ہوشیار ہوجائیں، کمر ہمت باندھ لیں۔ وہ اس بات کو سوچیں اور محسوس کریں کہ کس کس محاذ پر، کس ساز و سامان اور کس حکمت و تدبیر کے ساتھ باطل سے نبرد آزما ہونا ہے۔ معاشرے کے اس "بگاڑ" کو سدھارنے کے لئے کس عزم، ہمت، ثابت قدمی اور جانفشانی کی ضرورت ہے، جب وبائے عام ہوتی ہے تو دردمند طبیبوں کی نیند اور کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے۔ اسی جذبہ کو لے کر اُٹھ کھڑے ہونا ہے!

اسلامی معاشرہ اور نظامِ حق جب تک قائم نہ ہوگا، اللہ کا دین غالب نہیں ہوسکتا۔ پس جس کسی کو اللہ اور رسولؐ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کا پاس ہو، وہ اس قافلہ میں شامل ہوجائے۔ جس کے پیشِ نظر

اللہ کے کلمہ کی بلندی ہے! اس راہ کی موت بھی مدرسوں اور خانقاہوں کی زندگی سے اچھی ہے!
مسلمانوں کو "ان کنتم مومنین" کی شرط پورا کرنے کے لئے آمادہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ "انتم الاعلون" بھی پورا ہو جائے۔ یہ ہو گیا تو یوں سمجھو کہ انسانیت کے دن پھر گئے۔ امن و سلامتی کا نصیبہ جاگ اٹھا۔ دنیا کو غاصبوں اور غلط کاروں سے نجات مل گئی۔ اور خلافت الٰہی اس کے مستحق وارثوں کی طرف لوٹ آئی!

زلفِ گیتی کا ہر اک پیچ نکل جائے گا
تو جو بدلے گا زمانہ بھی بدل جائے گا

ماہر القادری
۲۱ اپریل ۱۹۵۷ء

ضروری اعلان

- ماہ جون کا شمارہ "توحید نمبر" ہو گا۔ جس کی ضخامت تین سو صفحات سے کسی طرح کم نہ ہو گی، سادہ ڈاک سے اگر یہ نمبر بھیجا گیا، تو گم ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے ادارہ "فاران" نے خریدار صاحبان کی خاطر یہ زحمت قبول کی ہے کہ خریدار صاحبان کی خدمت میں رجسٹری کے ذریعہ "توحید نمبر" بھیجا جائے، جس طرح "سیرت نمبر" بھیجا گیا تھا۔ لہذا خریدار صاحبان آٹھ آنہ کے ٹکٹ دفتر "فاران" کو جلد سے جلد بھیجدیں۔ بھارت کے خریدار صاحبان دفتر "الحسنات" رام پور (یوپی) کو ٹکٹ روانہ فرما کر دفتر ہذا کو ضرور مطلع فرما دیں۔
- جن صاحبان کے ٹکٹ دفتر میں وصول نہ ہوں گے اُن کی خدمت میں **توحید نمبر بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔** اس وی پی میں صرف ڈاک کے اخراجات شامل ہوں گے۔
- جن خریدار صاحبان نے چھ روپے تیرہ آنہ کا وی پی وصول کیا ہے، اُن کو مزید ٹکٹ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔
- خط و کتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے، جو آپ کے پتہ کی چٹ پر درج ہوا کرتا ہے۔

ایجنسیاں

- جن ایجنسیوں کو "فاران" کی متعدد کاپیاں جاتی ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ "توحید نمبر" (قیمت تین روپے) کی جتنی کاپیاں مطلوب ہوں اُس کی اطلاع ۱۵۔ مئی تک ضرور دے دیں۔ تاکہ مانگ کا اندازہ کر کے "توحید نمبر" چھپوایا جائے۔

(مینیجر "فاران")

ایک "عقیدتمند" کے قلم سے

حیاتِ سُلیمانی

ادھر اُردو رسالوں کے جو شخصیات نمبر نکلے ہیں۔ اُن میں "مُعارف" کے سلیمان نمبر کا کیا درجہ ہے۔ اس کا فیصلہ اُردو ادب کے نقّاد اور کتابوں کے تبصرہ نگار حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ اس پر کسی صاحب نے اب تک مفصّل تبصرہ کیا ہے یا نہیں۔ اس کی ترتیب و تکمیل میں جن اربابِ قلم نے حصّہ لیا ہے، وہ بجائے خود بڑی شخصیتوں کے مالک اُردو کے مصنف، ادیب اور صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں۔ مثلاً مولانا عبد الباری ندوی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ جناب مالک رام ایم اے، مولانا عبد الماجد دریا بادی، وغیرہ۔ موخر الذکر تو وہ بزرگ ہیں۔ جن کو دار المصنفین کے یومِ تاسیس سے برابر علمی تعاون، نظری و فکری اشتراک سید صاحب کو حاصل رہا ہے۔ اور جو آج بھی اس ادارہ کے رکن، اس کی مجلسِ کارکن کے صدر، اس کے رفقاءِ دار المصنفین کے علمی مشیر و رہنما ہیں۔ خود اس رسالہ کے مرتب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کس سے کم ہیں۔ جن کے قلم کی شگفتگی، روانی، سلاست اور اس کے ساتھ ان کا علم و مطالعہ وسیع تجربہ۔ سید صاحب کی دیرینہ رفاقت و شاگردی، تصنیفی صلاحیت، ادبی ذوق نہ صرف دار المصنفین کے قیام و بقاء و ترقی کا ضامن ہے بلکہ ساری ندوی برادری کے لئے قابلِ فخر ہے۔

یوں تو اس نمبر کے سارے مضامین اپنی جگہ بہت بلند، معیاری اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ لیکن ایک مضمون جو سید صاحب کے سوانح و حالات پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے قلم سے ہے، وہ بڑی محنت، جانفشانی اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے۔ اور اس میں سید صاحب کی زندگی کے تمام پہلو اجمال کے ساتھ آگئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے حیاتِ شبلی کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور اس کی ہو بہو نقل کی ہے۔ اگر اسی مضمون کو اس کے بعد والے مضمون کے ساتھ جو اخلاق و عادات پر ہے، اِن لارج کر دیا جائے، تو سید صاحب کی زندگی اور کارناموں پر اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ان گوناگوں خصوصیات کے باوجود بھی یہ نمبر سیرتِ سلیمانی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر خدا نخواستہ اسی پر قناعت کر لی گئی تو سید صاحب پر بڑا ظلم ہو گا۔ یہ محض ایک نمبر ہے، جس کی ادب میں صرف وقتی قدر و قیمت (value) ہوتی ہے۔ فارسی زبان کے مستشرق براؤن کا انتقال ہوا اور لوگوں نے اُن ... علمی تعلقات و روابط کی بناء پر جو اُن کو مولانا شبلی خود اُن سے اور دار المصنفین سے تھے۔ اُن کے نام پر معارف کا خاص نمبر نکالنے کی فرمائش کی۔ تو شذراتہی میں سید صاحب یہ مصرعہ لکھ کر خاموش ہو گئے کہ۔ ؏

نمی روید برلے ہے کہ کارواں رفتہ است!

اُن کے زمانۂ قیام بھوپال میں جب مولانا شروانی کا انتقال ہوا، تو گو ایک مہینے کے معارف کا حجم بڑھا کر اس کی

ن کے لئے وقف ضرور کردیا گیا - لیکن اس کا شروانی نمبر نام نہیں رکھا گیا - اس میں شروانی صاحب پر سید صاحب کے قلم سے بھی ایک مضمون
ے - لیکن سید صاحب کے انتقال کے بعد وہی پامال راستہ اختیار کیا گیا - جس پر چلنے کا ننگ انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا - اور
ان کے نام پر ایک خاص نمبر نکال ہی دیا گیا - یہ بھی ٹھیک تھا - اگر اسی پر اکتفا نہ کر لیا جاتا - اور اُن کی یادگار کا سلسلہ جاری رہتا
ثلاً جس طرح سید صاحب نے مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کی تکمیل کی - سیرۃ النبی کو شائع کیا - اُن کے خطوط دو دو جلدوں میں جمع کئے -
ن پر ایک طویل مقدمہ لکھا - اُن کا فارسی کلام اکٹھا کیا - کلیاتِ فارسی شبلی کے نام سے شائع کیا - پھر اُن کا سارا اُردو کلام
ئع کیا - اور اُن کی شاعرانہ حیثیت ، اور اُن کی اُردو شاعری پر مضمون لکھا - پھر مولانا کے تمام علمی و ادبی اور تنقیدی و مذہبی
تاریخی و سوانحی ، قومی و فلسفیانہ مضامین ، مقالات کے الگ الگ مجموعے شائع کئے ، اُن کے خطبات کی ایک جلد شائع کی - جو مولانا
شبلی کے علمی ، تعلیمی و قومی تقریروں کا مجموعہ ہے - شعر العجم کے ایک ناتمام مسودہ کو جس میں قصیدہ و غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ
صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر نقد و تبصرہ ہے - اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا - اور اس طرح فارسی شاعری اور فارسی ادب و
زبان سے ذوق رکھنے والوں کے لئے شعر العجم کی ایک اور جلد بہم پہنچا دی -

پھر جب ملک میں تنقید کا ذوق بڑھا اور تنقیدی کتابوں کی مانگ شروع ہوئی - تو مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا وہ حصہ
جس میں کلام کے حُسن و قبح اور عیب و ہُنر اور شعر کی حقیقت اور اصولِ تنقید کی تشریح کی گئی ہے الگ سے انتخاباتِ شبلی کے
نام سے شائع کیا - جو بے حد مقبول ہوا - سید صاحب کی مشہور کتاب لغاتِ جدیدہ بھی درحقیقت مولانا شبلی ہی کے ایک ناتمام
کام کی تکمیل ہے ، آپ کو یاد ہوگا کہ جب انہوں نے اپنا سفر نامہ روم و مصر و شام شائع کیا - تو اُس کے آخر میں عربی کے جدید
مروج الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دے دی تھی - وہی بڑھ کر لغاتِ جدیدہ بن گئی - جس کو سید صاحب نے امرتسر کے ندوۃ العلماء
کے اجلاس میں بطور ایک علمی کارنامہ کے پیش کیا تھا - اور علماء نے ان کو بڑی داد دی تھی - یہ کتاب آج نئی عربی کی تحصیل و
مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہترین گائڈ ہے - اور سید صاحب کی مقبول ترین کتابوں میں نہیں بلکہ اولیات میں داخل ہے -

سیرۃ النبیؐ یا دائرۃ المعارف النبویہ کا جو خاکہ مولانا شبلی نے سیرۃ کی پہلی جلد میں پیش کیا تھا ، اُس کی تعمیل میں معجزات ،
منصبِ نبوت ، عبادات و اخلاق پر الگ الگ عریض و ضخیم جلدیں اپنے قلم سے لکھیں - اور نہایت اہتمام سے شائع کیں - اور ملک
نے اس اہم اور دینی خدمت کے انجام دینے پر اُن کو خراجِ تحسین پیش کیا - اور علماء و خواصِ امت نے ان کو بے حد پسند کیا - اور مؤلف کو
داد دی - اور مولانا مناظر احسن صاحب جیسے بزرگوں نے ان پر ریویو لکھا - اس سلسلہ کی صرف دو دو جلدیں شائع ہونے سے رہ گئیں -
ایک معاملات کی - جو زیرِ تحریر تھی - مگر شاید مکمل نہ ہو سکی - اور دوسری وہ جلد جس میں سیرتِ نبویؐ سے متعلق یورپین تصنیفات
کی غلطیوں کی تصحیح اور یورپین مستشرقین سے مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں جو غلطیاں ہوئیں - اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے اخلاق و عادات و زندگی یا مسائلِ اسلام پر انہوں نے جو نکتہ چینیاں کی ہیں اور جن کی وجہ سے سارے یورپ میں ذاتِ اقدس
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ، اُن کا تشفی بخش جواب دینا تھا - جو تنہا ایک شخص کا نہیں پورے ایک
تصنیفی بورڈ کا کام تھا -

اس کے علاوہ ہمارے خیال میں ایک جلد اور بھی لکھنے سے رہ گئی ہے - جس میں قرآن مجید کی تاریخ ، اس کے وجوہ اعجاز ، اور
حقائق و اسرار سے بحث ہوتی - کاشکہ سید صاحب کی صحت نے اجازت اور اُن کی عمر نے وفا کی ہوتی - تو یہ تینوں جلدیں بھی بتدریج
منظرِ عام پر آجاتیں - پھر بھی جتنا کچھ ہو گیا ہے ، اردو فارسی تو کیا خود عربی میں بھی سیرۃ نبویؐ پر متکلمانہ انداز کا اتنا قیمتی اد

وسیع لٹریچر نہیں مل سکتا۔ سید صاحبؒ کچھ نہ کرتے تو بھی یہ عظیم الشان دینی خدمت اُن کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دینے اور بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کے لئے کافی تھی!

اس سلسلہ کی سید صاحب کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک خطباتِ مدراس اور دوسری رحمتِ عالم۔

یُوں تو راس کماری سے پشاور تک تمام پڑھے لکھے مسلمانوں کو سید صاحب سے عقیدت تھی۔ جہاں جاتے تھے دُھوم مچ جاتی تھی، اور ہر شہر میں اُسی طرح اُن کا استقبال ہوتا تھا۔ جس طرح اُن کے اُستاد مولانا شبلی کا ہوتا تھا۔ اور اُن کے علم و کمال کا شہرہ سُن کر اُن کی تقریر سُننے کے لئے لوگ بڑے شوق و عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن صوبہ مدراس کے مسلمانوں کو اُن سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی۔ بلکہ وہ ان کو اپنا رشد و امام سمجھتے تھے۔ اور اپنی دینی و مذہبی تقریبوں اور جلسوں میں خاص طور سے ان کو مدعو کرتے تھے۔ اور ان کی عالمانہ و فاضلانہ تقریروں کو گوشِ دل سے سُنتے تھے۔ اور اُن سے اثر لیتے تھے۔ مدراس کے اِنہی دیندار اور عقیدت کیش مسلمانوں کی فرمائش پر ۱۹۲۵ء میں سیرۃ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر، مختلف نشستوں میں آٹھ لیکچر دیئے تھے۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت، آپ کی جامعیت، کاملیت اور آپؐ کی پاک و مطہر زندگی کے عملی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہی خطبات ہیں جن کو بعد میں خطباتِ مدراس کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ جس کو پڑھ کر بہت سے لوگ سیرتِ نبویؐ کے مقرر اور لیکچرار ہو گئے۔ ہندوستان کے مشہور سحر بیان خطیب نواب بہادر یار جنگ کی اس موضوع کی تقریروں کا مواد بہت کچھ اسی کتاب کا رہینِ منت تھا۔ اُس کے ورق کے ورق اُن کو زبانی یاد تھے۔ اور بے تکلف بولتے چلے جاتے تھے اور اس کا اُن کو خود بھی اعتراف تھا۔ اس سے بریلوی، دیوبندی، مقلد، غیر مقلد، اہل حدیث و اہلِ فقہ، اربابِ تسنن و اہلِ تشیع سب نے فائدہ اُٹھایا۔ یہ خطبات دار المصنفین کی سیرتِ نبویؐ کی چھ سات ضخیم جلدوں کا خلاصہ اور عطر ہیں۔ جن میں سیرتِ نبویؐ کا کوئی پہلو تشنۂ تفصیل نہیں رہ گیا ہے۔ سید صاحب، صاحبِ کشف و کرامات تو نہیں تھے۔ اور نہ ساری عمر کبھی اس کا دعویٰ کیا۔ لیکن ان خطبات میں الہامی رنگ منعکس ہے۔ ان میں غضب کی روانی، برجستگی اور آمد ہے۔ جس کے ایک ایک فقرے اور جملے میں روح القدس کا فیض جھلکتا ہوا نظر آتا ہے!

دوسری کتاب "رحمتِ عالم" ہے۔ اُسی قلم اعجاز رقم نے جس نے ہزاروں صفحوں پر مشتمل کئی ضخیم جلدوں میں سیرۃ نبویؐ لکھی ہے اور دادِ تحقیق دی ہے۔ سادہ، آسان، اور عام فہم زبان میں مکتب اور ابتدائی مدرسوں کے بچّوں کے لئے سیرۃ نبوی پر یہ چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے۔ جس میں شروع سے آخر تک ایک لفظ بھی مشکل اور عسیر الفہم نہ ملے گا۔ اس کا پہلا ایڈیشن چار ہزار کی تعداد میں نکلا تھا۔ جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اور اس کی ساری آمدنی سید صاحب نے ندوہ کو دے دی۔ وہ ایسا مقبول ہوا کہ حیدرآباد، بہار، یوپی، پنجاب و سرحد کے اکثر ابتدائی مدرسوں کے نصاب میں داخل ہو گیا۔ اس وقت بازار میں غالباً اُس کا نواں یا دسواں ایڈیشن ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت، افادیت اور جاذبیت کی بہت بڑی شہادت ہے!

اُن کی مشہور کتاب "ارض القرآن" بھی جیسا کہ شاہ معین الدین صاحب نے ان کی علمی و دینی خدمات کے ذکر اور اُن کی کتابوں کے تبصرہ کے سلسلہ میں اسی سلیمان نمبر میں خود مصنّف کے حوالہ سے لکھا بھی ہے۔ کہ اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جُدا ہے۔ لیکن درحقیقت سیرۃ النبیؐ ہی کا دیباچہ ہے۔ جو بڑھ کر مستقل ایک کتاب بن گیا۔ اس کو انہوں نے اپنے زمانۂ قیام پونہ میں اُستاد کی زندگی ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل شاید اُستاد کی وفات کے بعد ہوئی۔ اس کی دو جلدیں

یں - پہلی جلد میں ایک طویل مقدمہ ہے - جس میں عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم ماخذوں سے بحث کی گئی ہے - اس کے بعد
رب قدیمہ کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ اور کلام مجید میں جن اقوام و قبائل اور مقامات کا ذکر ہے ان کی تاریخی و اثری
تحقیق ہے - اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید اور اثری انکشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام
جارت اور ان کے مذاہب پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے - اس موضوع پر اردو میں پہلی اور غالباً آخری کتاب ہے - جس پر
اج تک ایک حرف کا اضافہ نہ ہو سکا - سید صاحب کی یہ کتاب ایسی ہے کہ حق تھا اگر عرب ممالک کی یونیورسٹیاں اس پر ان کو
اکٹریٹ کی ڈگری دیتیں - اور ایک ہندی نژاد عالم کا زبردست کارنامہ تصور کرتیں - اور عرب مصنفین و اہل قلم اس کو عربی میں
منتقل کر کے عرب ممالک میں شائع کرتے اور اس کے مصنف کو خراج تحسین پیش کرتے !

عرب کی تاریخ، اس کا جغرافیہ، اس کی زبان، اس کا لغت، اس کا کلچر، اس کے علوم و فنون سید صاحب کا خاص
موضوع رہا ہے - اس پر انہوں نے اردو میں بہت بیش قیمت لٹریچر فراہم کر دیا ہے - ان کی "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں
کی جہاز رانی" اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں، جو علی الترتیب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی
طرف سے شائع ہوئی ہیں - یہ درحقیقت سید صاحب کی تقریروں کے مجموعے ہیں، جو ان اداروں کے اہتمام میں مختلف نشستوں
میں الہ آباد اور بمبئی میں اہل علم کے مجمعوں میں کی تھیں - جو بے حد پسند کی گئیں اور بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دی گئیں -

عربوں کی جہاز رانی کی طرف سید صاحب سے پہلے شاید ہی کسی کا ذہن منتقل ہوا ہو - اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے
کہ عرب ظہور اسلام سے بہت پہلے اپنے زمانہ کے بہت بڑے بحر پیما اور جہاز راں تھے - اس کے بعد جب اسلامی فتوحات
کا سیلاب عرب سے افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں اور یورپ کے برفستانی علاقوں کی طرف بڑھا - تو ان کے سمندر عربوں کے
بحری بیڑوں کا جولانگاہ بن گئے - ان کی اس زمانہ میں وہی حیثیت تھی جو آج برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی ہے -
انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ فن جہاز رانی کو ترقی دی - اس پر کتابیں لکھیں، سمندروں کا جائزہ لیا - اور ڈھیل کے
بہت سے نامعلوم خطوں کو دریافت کیا - اور بہت سے نئے سمندروں کا پتہ چلایا -

یہ رسالہ جو سید صاحب مرحوم نے خاص اپنے اہتمام میں معارف پریس میں آرٹ پیپر پر چھپوایا تھا - اس کے بعد پھر
اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی، اس بیش قیمت رسالہ کا نیا ایڈیشن شائع کرنا بھی جانشینان سید کے فرائض میں داخل ہے -
جس کے لئے بمبئی کی اسلامک ایسوسی ایشن سے اجازت حاصل کرنا مشکل نہیں ہے !

عربی یا اردو میں ممتاز عرب جہاز رانوں، عرب جغرافیہ دانوں، اور عرب سیاحوں کے حالات پر بھی سید صاحب نے
ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی - جس کے کچھ حصے الضیاء، لکھنؤ میں شائع بھی ہوئے تھے - ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کتاب مکمل ہوئی یا
نہیں - بہر حال اس کو بھی از سر نو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے !

"اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" مولانا شبلی کا مشہور رسالہ ہے - جو اورنگ زیب کے ہندو معترضوں کے جواب
میں لکھا گیا ہے - اوران کے ایک ایک الزام کو رفع کیا ہے - لیکن پھر بھی وہ اپنے موضوع پر بہت زیادہ مکمل نہیں ہے - رقعات
عالمگیری کی ترتیب و طبع و اشاعت کا جو سلسلہ سید صاحب نے شروع کیا تھا، اس کا مقصد درحقیقت مولانا شبلی کے اسی
مجمل رسالہ کی تفصیل تھی - جو افسوس ہے کہ ملک کی عام ناقدردانی اور سرد مہری کے باعث پہلی جلد سے آگے اس کا کام نہ
بڑھ سکا - یہ جلد اورنگ زیب کی شاہزادگی سے لے کر تخت نشینی کے اہم رقعات و خطوط پر مشتمل ہے - اس پر ایک طویل

مقدمہ بھی ہے، جس کو اُن کے رفیقِ کار اور عزیز پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے آنرز نے لکھا ہے۔ جو مقدمہ رقعات عالمگیر کے نام سے الگ سے شائع بھی ہوگیا ہے۔ اس میں اورنگ زیب کی تخت نشینی تک کے حالات مع برادرانہ جنگ کی مکمل جزدی تفصیلات کے آگئے ہیں۔ شاہ جہاں کا اس سلسلہ میں جو عجیب و غریب طرز عمل رہا ہے۔ اُس پر بھی پوری روشنی ڈالی گئی ہے!

یہ مقدمہ مولانا شبلی کے اس مجمل رسالہ کے بعد عالمگیر کے متعلق اُردو میں مستند ترین کتاب ہے، جو اُنہی کے رقعات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور دارالمصنفین کی اوّل درجہ کی کتابوں میں اس کا شمار رہا ہے۔ عالمگیر کا عہدِ حکومت ۵۰ سال سے بھی زیادہ ممتد اور بڑا پُر آشوب اور ہنگامہ خیز رہا ہے۔ آئے دن ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں ہوتی تھیں اور وہ ان کا شدت کے ساتھ استیصال کرتا تھا۔ بنارس میں بغاوت ہوئی، شیعہ حکومتیں الگ اُس کو پریشان کئے ہوئے تھیں۔ آخر عمر میں اس کے بڑے لڑکے نے بھی جس کو ولی عہد سلطنت اور اس کا جانشین ہونا تھا۔ بغاوت کردی تھی۔ اس کو بغیر کسی رورعایت کے گوالیار کے قلعہ میں قید کردیا تھا۔ اس پورے دور میں اُس نے ہزاروں خطوط و فرامین اور توقیعات لکھے ہوں گے، جن کا جمع کرنا اور اُن کی روشنی میں اس کے عہدِ حکومت کی تاریخ مرتب کرنا ایسا کام ہے جس کے پورا کرنے کی مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ کے لائق جانشینوں سے توقع کی جاسکتی ہے!

سید صاحب کی مشہور و معروف کتابوں میں ایک کتاب خیام بھی ہے۔ جو اُن کی علمی اور تصنیفی زندگی کا ایک اہم اور یادگار کارنامہ ہے، اس کی داد اُن کو ہندوستان تو الگ رہا۔ ایران و کابل اور یورپ تک کے علماء و فضلاء نے دی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر حکومت افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے تھے، اُن میں ایک گرانقدر تحفہ خیام بھی تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے پانسو روپیہ انعام دیا تھا۔

یہ کتاب بھی درحقیقت مولانا شبلی کے معترضوں، ناقدروں اور نکتہ چینوں کے جواب میں لکھی تھی، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ پنجاب کے محمود شیرانی اور ان کے رفقاء پروفیسر اقبال وغیرہ نے رسالہ اُردو اورنگ آباد میں شعرالعجم پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اس سلسلہ کا ایک مضمون "شعرالعجم اور خیام" کے عنوان سے تھا۔ سید صاحب نے معارف میں اس کے جواب میں ایک طویل مضمون لکھا اور آخر میں برہمی کے انداز میں یہ لکھ دیا کہ شعرالعجم واقعات کی کھتونی نہیں حسن و عشق کا افسانہ ہے،

پھر دسمبر ۱۹۳۰ء میں اورنٹیل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں خیام پر ایک مقالہ پیش کیا۔ جس کو ارباب نظر نے مقالہ نگار کی توقع سے کہیں بڑھ کر پسند کیا۔ اور اس کی قدر کی۔ انہی دونوں مقالوں نے بڑھ کر بعد میں اس کتاب کی صورت اختیار کرلی۔ اب تک خیام ساری دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے متعارف تھا۔ اور مولانا شبلی نے بھی موضوع کے اعتبار سے شعرالعجم سحابی استر آبادی، ابو سعید ابوالخیر وغیرہ مشہور رباعی گو شعراء کے سلسلہ میں ایک باکمال رباعی گو شاعر ہی کی حیثیت سے اس کو پیش کیا ہے اور خیام کی طرف یورپ کے اعتنا کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔ سید صاحب مرحوم نے اس کتاب میں بالکل پہلی مرتبہ ایک فلسفی، حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے خیام کو پیش کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ وہ رندِ شاہد باز نہیں، بلکہ ایک دیندار مسلمان اور ہیئت و ریاضی اور حکمت کے علاوہ مذہبی علوم میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ اور ایک شاعر سے کہیں زیادہ عالم، حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا۔

یہ کتاب سید صاحب کی وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر اور تحقیق کا شاہکار ہے، جس کی صحیح عظمت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے!

مولانا شبلی عربی زبان کے بہت اچھے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ لیکن انہوں نے اس کو مستقلاً اپنا ذریعہ اظہار خیال نہیں بنایا۔ اپنی ساری عمر میں صرف دو کتابیں عربی میں لکھیں۔ ایک تو سیرت نبوی ہی سے متعلق تھی۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لئے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں لکھی تھی۔ اس کا نام بدء الاسلام تھا۔ جس کا بعد میں فارسی میں بھی ترجمہ ہو گیا تھا۔ دوسری کتاب الانتقاد ہے۔ جس کی تقریب یہ ہے کہ الہلال مصر کے مشہور عیسائی ایڈیٹر جرجی زیدان نے پانچ جلدوں میں تمدنِ اسلامی کی تاریخ لکھی تھی۔ جس میں اس نے اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ مگر اس کو ایسے اسلوب سے پیش کیا تھا کہ بادی النظر میں وہ حسن نظر آتا تھا۔ لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چھپا رہتا تھا۔ جس کی تہ تک پہنچنا بڑا مشکل کام تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا زہر عالم اسلامی میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ مصر و ہندوستان کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اس کے فریب میں آ گئے تھے۔ بلکہ اردو میں بغیر کسی نوٹ اور تحشیہ کے اس کا ترجمہ بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

مولانا شبلی پہلے بزرگ تھے، جنہوں نے اس کی طرف توجہ کی، اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے اس پر ایک زبردست تنقید لکھی، اس رسالہ کی تکمیل میں بھی سید صاحب مرحوم نے اپنے استاد کا ہاتھ بٹایا۔ اور اس میں بنو امیہ کی علمی سرپرستی کا باب جو طبع ہند کے صفحہ ۴۷ سے ۵۳ تک ہے۔ سید صاحب کے قلم سے ہے۔ اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشاء پردازانہ ہے۔ مولانا شبلی عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے۔ جاحظ کی البیان والتبیین اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی تھی۔ سید صاحب نے بھی اسی رنگ میں یہ چند صفحے اس طرح لکھے کہ آج تک استاد و شاگرد کی تحریروں میں کوئی امتیاز نہ کر سکا!

سید صاحب کو ابتداء میں کسی کے مخصوص طرز و اسلوب میں لکھنے کا بڑا ملکہ تھا۔ جب وہ الہلال کلکتہ کے اسٹاف میں تھے، تو اس میں الہلال ہی کے رنگ میں مضامین لکھتے تھے۔ چونکہ الہلال میں مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مضامین بھی مولانا ابوالکلام ہی کے ہیں۔ اور اس طرح سے سید صاحب کے کتنے ہی مضامین ان کی جانب منسوب ہو گئے۔ "واقعۂ محزنۂ کانپور" پر "مشہدِ اکبر" کے عنوان سے جو ولولہ انگیز مضمون ۱۹۱۳ء میں الہلال کے ادارتی کالموں میں شائع ہوا تھا اور جس کی پاداش میں بنگال گورنمنٹ نے الہلال کو بند کر دیا تھا، وہ حضرت سید صاحب ہی کے قلم کا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے حسب ذیل مضامین بھی سید صاحب ہی کے ہیں جو غلطی سے مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف منسوب ہو گئے ہیں[1]:

الجزیہ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن۔ حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق۔ قصص بنی اسرائیل۔ تیسرا مضمون جو

---

[1] یہ کام تو مولانا ابوالکلام آزاد کے کرنے کا تھا کہ وہ اعلان فرماتے ـــــ کہ فلاں فلاں مضامین جو میرے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں، وہ میرے نہیں ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے لکھے ہوئے ہیں ـــــ حیرت ہے کہ یہ باتیں قرطاس و قلم تک آ چکی ہیں مگر مولانا آزاد پھر بھی اس اعلان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ (م۔ ق)

حبشہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ وہ الہلال کی کئی اشاعتوں میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں سید صاحب نے خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ سید صاحب کی یادگار میں "مقالات الہلال" کے نام سے ان مضامین کا بھی ایک مجموعہ شائع کیا جا سکتا ہے!

حیاتِ شبلی

ان عظیم الشان علمی وادبی اور تعلیمی کارناموں اور خدمات کا انجام دینے اور سینکڑوں متفرق علمی وفقہی و تاریخی وادبی مضامین لکھنے اور اپنے استاد کے سارے ناتمام کاموں کی تکمیل کے بعد بالکل آخری عمر میں حیاتِ شبلی کی تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور استاد کی وصیت بھی تھی کہ دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے، تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا اور یہ عجیب اتفاق ہے جیسا کہ شاہ معین الدین ندوی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا بھی ہے کہ ان کو اس کی تالیف کا اسی وقت موقع میسر آیا جب وہ دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت پا چکے تھے! حیاتِ شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی شاندار تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا —!

یوں تو حیاتِ شبلی لکھنے کی بہت سے لوگوں نے خواہش ظاہر کی، ان میں سب سے زیادہ پیش پیش "حیات النذیر" کے مصنف منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جس طرح انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی لائف لکھی ہے۔ اسی طرح مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں۔ اس کے متعلق انہوں نے خود مولانا شبلی کو لکھا۔ پھر سید صاحب کو گھیرا۔ لیکن یہ سعادت ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ اولاً تو وہ اس کے اہل نہیں تھے۔ دوسرے مولانا شبلی کی سیرت لکھنے کے لئے جس صلاحیت، قابلیت، وسعتِ نظر اور علوم عربیہ و فنونِ کلامیہ اور ادب و تاریخ پر جیسی اطلاع و واقفیت کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی تمام خوش سلیقگی، سنجیدگی اور اردو فارسی کا علم رکھنے کے باوجود اس سے محروم تھے۔ اس لئے مولانا کا خیال تھا اور بالکل صحیح تھا کہ وہ ان کی سوانح عمری کے فرض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ خود حیات النذیر بھی جیسا کہ حیاتِ شبلی کے دیباچہ میں ہے کہ انہوں نے نہیں لکھی تھی۔ اس کے طرزِ انشاء سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود صاحبِ سوانح نے اپنے حالات ان کو املا یا قلم بند کرا دیئے تھے۔ یہی خدمت وہ غالباً مولانا شبلی سے بھی لینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بھلا اس کے لئے کب تیار ہو سکتے تھے۔ سید صاحب نے مولانا سے ان کی سفارش کی مگر یہ سفارش بھی کارگر نہ ہو سکی!

حیاتِ شبلی لکھنے کی نوبت زندگی کے تمام ضروری کاموں سے فراغت کے بعد آئی۔ لیکن سید صاحب کو ہمیشہ اور ہر آن اس کا خیال رہا۔ اور کبھی اس سے خالی الذہن نہیں رہے۔ سیرتِ نبوی کی مصروفیت اور صاحبِ سوانح کے خاندانی و ابتدائی حالات کی ناواقفیت کے سبب اس کام کو پہلے مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے نہ صرف شاگردی، ہم وطنی، بلکہ برادری کا بھی تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سید صاحب کے حسبِ ایماء مولانا کے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ مکاتیبِ شبلی کے بہت سے متفرق حالات و واقعات کو ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیا۔ ان اوراق کو سید صاحب نے مولانا شروانی اور مولانا نے مرحوم کے دوسرے احباب و تلامذہ کو دکھایا تو ان میں زندگی کی روح نظر نہیں آئی۔

پھر اس کام کو مولانا کے پرانے شاگرد مولانا اقبال سہیل کو سپرد کیا۔ چنانچہ انہوں نے جیسا کہ سید صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے، مولانا عبدالسلام ندوی کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور بہت سے علی گڑھ کے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی۔ یہی مضمون ہے جو بعد میں "سیرتِ شبلی" کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں دو برس تک مسلسل نکلتا رہا۔ پہلا مسودہ جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے بے روح تھا۔ اور دوسرا علی گڑھ

کے حالات تک آ کر رہ گیا۔ اس کے بعد مولانا سہیل کو نہ زمانہ کے مکروہات نے فرصت دی، نہ وہ سید صاحب کے حسب خواہ اس کی تکمیل کر سکے!

بالآخر سید صاحب نے دوسری جنگ عظیم کے عین بحران یعنی سنہ ۱۹۴۲ء میں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس طرف پورے انہماک و یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو گئے۔ مولانا شبلی کے جن جن احباب و اعزاء و تلامذہ سے اس کام میں مدد ملنے کی توقع تھی ان سب لوگوں سے انہوں نے رابطہ قائم کیا۔ اور مدد حاصل کی۔ اور حیات شبلی کے دیرینہ کام کو جو قدرت نے اسی عمر اور زمانہ کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ اس طرح پورا کر دیا کہ وہ مولانا شبلی کی تنہا سوانح عمری ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کی وفات سنہ ۱۹۱۴ء تک ایک تہائی صدی کی، ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، اصلاحی، سیاسی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ بن گئی ہے۔ اس کا مقدمہ جس میں اودھ اور مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی، علوم اسلامیہ کے درس و اشاعت کی تاریخ آ گئی ہے۔ جس کو سید صاحب نے تاریخ و تذکرہ کی سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کیا ہے، بجائے خود ایک مستقل کتاب اور سید صاحب کے ذوق تحقیق اور تاریخ دانی کا شاہکار ہے۔ اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی مفصل ذہنی و دماغی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اتنا تاریخی مواد شاید ہی کسی سوانح عمری میں اکٹھا کیا گیا ہو۔ اور یقیناً مولانا شبلی کی روح کو اس سے بڑی مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔!

ہے تو درحقیقت وہ مولانا شبلی کی سوانح عمری اور ان کے علمی کارناموں کی مفصل تاریخ، لیکن وہ خود سید صاحب کی غیر شعوری طور پر آپ بیتی بھی بنتی چلی گئی ہے، ان کی فراغت تعلیم کے بعد سے شاید ہی شبلی کا کوئی کارنامہ رہا ہو۔ جس میں وہ شامل نہ رہے ہوں۔ ندوہ کی علمی و تعلیمی و تبلیغی خدمات میں تو ان کی حیثیت شاگرد کی نہیں، برابر کے رفیق کار کی ہو گئی ہے۔

اسی طرح مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کی تکمیل و اہتمام کا ایک سلسلہ تھا۔ جو ان کی ساری عمر جاری رہا۔ اور جس کا انہوں نے نفس واپسیں تک خیال رکھا۔ سید صاحب کے ناتمام کاموں کی تکمیل اور ان کی علمی یادگاروں کے محفوظ رکھنے کی، بعد کے لوگوں میں بھی اسی طرح کی لگن ہونی چاہیئے۔ سید صاحب کو انتقال کئے ہوئے تین برس سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ ان کے جانشین ان کی یادگاریں اب تک ان کی کوئی چیز شائع نہ کر سکے، شاید یہ حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ معارف کا ایک سلیمان نمبر شائع کر کے اپنی ساری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے۔!

سید صاحب کے مضامین کے اب تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دو تو ان ہی کی زندگی میں شائع ہوئے۔ ایک "نقوش سلیمانی" جس کو انہوں نے اپنے اہتمام میں معارف پریس میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس وقت تک انہوں نے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف تقریبوں اور کانفرنسوں میں جو تقریریں کی تھیں، یا جو تحریریں ان کے قلم سے نکلی تھیں۔ وہ سب اس میں آ گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آ سکی۔

دوسرا مجموعہ بغیر کسی خاص لحاظ اور ترتیب کے "مضامین سید سلیمان" کے نام سے بہار کے ایک بزرگ ابو سلمہ محمد شفیع صاحب نے شائع کیا تھا۔ ان کے سلسلۂ مضامین کا ایک اور مجموعہ جو سفر افغانستان کے متعلق ہے، وہ بھی ان کی زندگی ہی میں نہایت ہی حسین کتابت و طباعت و تقطیع کے ساتھ حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔ مضامین کا ایک مجموعہ ان کے وصال کے بعد سید ابو عاصم صاحب کے اہتمام میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔ ملک کے مشاہیر علماء، مصنفین، قائدین، رجال سیاست اور احباب و اعزاء کی وفات پر وفیات کے عنوان سے یا بہ سلسلۂ شذرات وہ معارف میں جو کچھ لکھتے تھے، وہ سب اس میں

قرینہ کے ساتھ جمع کردیا گیا ہے۔ ہے تو وہ درحقیقت اُن کے غم آگیں جذبات و احساسات و تاثرات کا ایک دلدوز مرقع۔ جس میں مرنے والوں پر انہوں نے اشکِ غم بہائے ہیں۔ لیکن وہ تاریخ و تذکرہ کی ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی طرح تاریخ و تذکرہ کی اچھی خاصی کتاب بن گئی ہے۔ جس میں مرنے والوں کی زندگی، اور اُن کے کارناموں اور خدمات کی بقید سنین و شہور پوری تفصیل آگئی ہے۔ اس کا نام تو سید صاحب مرحوم کچھ اور رکھنا چاہتے تھے، لیکن سید ابو عاصم اور بعض دوسرے اہلِ علم بزرگوں نے "یادِ رفتگاں" اس کا نام تجویز کیا اور سید صاحب نے اس کو منظور فرمالیا۔ ہاں مولانا تھانوی کی وفات پر حکیم الامتہ کے آثارِ علمیہ کے عنوان سے اُن کی علمی و دینی، مذہبی خدمات پر انہوں نے جو مضمون معارف میں لکھا تھا۔ اُس کو اُن کے مسترشد جناب غلام محمد صاحب۔ (حیدر آباد دکن) نے اپنی سیرتِ اشرف نام ایک چھوٹی سی کتاب میں پورا نقل کردیا ہے اور شاید حیدر آباد سے کسی صاحب نے الگ سے بھی شائع کیا ہے، اس کے علاوہ اُن کے مضامین کا کوئی مجموعہ اور کہیں سے شائع ہوا ہو تو ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اگر تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو اُن کی کچھ اور مطبوعہ چیزوں کا بھی پتہ لگ سکتا ہے۔ مگر یہ سب کام دار المصنفین کے باہر ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں دار المصنفین کی خدمات کے منظرِ عام پر آنے کے منتظر ہیں ۔۔ !

اُن کے خطوط کے بھی دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تو اُن کی زندگی ہی میں، اور ایک اُن کے انتقال کے بعد۔ پہلا "برید فرنگ" ہے۔ جو سید ابو عاصم صاحب کے اہتمام میں کراچی کے مکتبۃ الشرق سے شائع ہوا ہے۔ اس میں سید صاحب کے سفرِ یورپ کے سارے خطوط جو انہوں نے وہاں کے زمانۂ قیام میں اپنے احباب و اعزاء اور ملک کے دوسرے اکابر اور بزرگوں کے نام لکھے تھے۔ اس میں جمع کردیئے گئے ہیں۔ دوسرا مجموعہ وہ ہے جو اُن کے لائق شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی نے اُن کے انتقال کے تھوڑے ہی دنوں بعد شائع کیا تھا۔ اس میں اُن کے نام کا ایک ایک خط اور ایک ایک رقعہ آگیا ہے جس کو مرتب نے حرزِ جان بنا کر رکھا تھا، لیکن یہ اتفاق دیکھئے کہ اس کے شائع ہونے کے شاید ایک ہی آدھ مہینہ کے بعد خود شاگرد بھی اُستاد سے جا ملا، افسوس! رحمہما اللہ تعالیٰ !

مولانا مسعود عالم ندوی کو بعض دینی امور و مسائل میں شدید اختلاف کے باوجود سید صاحب سے بڑا قلبی تعلق تھا، اگر وہ زندہ ہوتے تو سید صاحب کے سوانح حیات لکھنے کی ہم انہی سے درخواست کرتے اور اُس کے وہ ہر طرح سے اہل بھی تھے، خود سید صاحب کو اُن کی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد اور اُن کی ذات پر بڑا ناز تھا، لغاتِ جدیدہ کا نیا ایڈیشن معارف پریس سے متوسط تقطیع پر شائع کیا تو اس کا مقدمہ انہی کی فرمائش سے مولانا مسعود عالم مرحوم ہی نے لکھا تھا یہ شرف جہاں تک ہماری یاد کام کرتی ہے اُن کے تلامذہ و رفقاء کار میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ لغاتِ جدیدہ کیساتھ مولانا مسعود عالم کی یہ قلمی یادگار جو مقدمہ کی صورت میں ہے ہمیشہ زندہ اور اُستاد و شاگرد کے باہمی علمی تعاون اور غیر معمولی تعلق کو برابر یاد دلاتی رہیگی ۔۔ !

اس طویل گزارش سے مقصود اربابِ دار المصنفین بالخصوص جانشین سید جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین کو سید صاحب کی علمی یادگاروں کی جمع و ترتیب اور حیاتِ سلیمانی کی تالیف و تدوین کی طرف توجہ دلانا ہے جس کا انہوں نے سلیمان نمبر میں وعدہ بھی کیا ہے کہ یہ کوئی مفصل و جامع تذکرہ نہیں بلکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ حیاتِ سلیمانی میں پیش کی جائیگی، اور یہ واقعہ بھی ہے جیسا کہ انہوں نے خود بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی جیسی جامع کمالات ہستی کے حالات کا احاطہ جو تقریباً نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس میں ضیاء بار رہی ہو اور جس کے قلم نے اسلامی علوم و فنون کے دفتر کے دفتر کھنگال ڈالے ہوں اور جس کے کارناموں سے دین و ملت کا ایک ایک گوشہ معمور ہو، چند سو صفحات میں ہو بھی نہیں سکتا تھا، یہ ضرور ہے کہ سلیمان نمبر کے مضامین سے سید صاحب رحمۃ اللہ کی زندگی اور اُن کے کمالات کے اہم رُخ اور اُن کی شخصیت کے بعض ایسے جلوے جو عام نگاہوں سے مستور تھے نظر کے سامنے آگئے، اور اس نقطۂ نگاہ سے مرتبِ اعلیٰ خدمت کا اتنا ہی ایک طرح کی احسان فراموشی اور ادبی جرم ہے۔ معارف کا سلیمان نمبر اردو رسالوں کے شخصیات نمبروں میں ایک خاص امتیاز کا حامل، اُردو ادب کے خزانہ میں ایک بیش قیمت اضافہ، اور مرتب کی ادبی صلاحیتوں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس سے حیاتِ سلیمانی کے لئے بڑی سے بڑی توقعات قائم کی جاسکتی ہیں ۔۔ !!

آہ! یہ فتنۂ بے حجابی!

ایک دردمند دل کی پکار

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں عورتوں کی بے حجابی، آزادی اور مغرب زدگی کا طوفانِ بدتمیزی جس تیزی کے ساتھ آرہا ہے۔ اُسے دیکھ کر حساس اور غیرت مند دلوں کو جس قدر اذیت ہوتی ہے، اس کا لفظوں میں اظہار نہیں ہوسکتا۔ یہ ہی نہیں ہے کہ چہروں سے صرف برقعے اور نقاب اُتر رہے ہیں۔ رونا تو اس کا ہے کہ یہ بے نقابی "تبرج جاہلیت" تک پہنچ رہی ہے بلکہ پہنچ چکی ہے۔ حالات کی زبونی اب یہ رخ اختیار کر رہی ہے کہ بعض اونچے درجہ کی بیگمات کی محفلوں میں "دُختِ رز" بار پا چکی ہے!

اسلامی معاشرہ کے قیام کی سب سے بڑی ذمہ داری پاکستان کے کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے اربابِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے مگر مقامِ گریہ و ماتم ہے کہ یہ "بڑے لوگ" نہ صرف یہ کہ اپنے فرض سے غافل اور بے پروا ہیں بلکہ یہ فتنے اُن کے دم قدم سے پروان چڑھ رہے ہیں!

قصر و ایوان کا سایہ نچلے طبقہ پر بھی پڑ رہا ہے اور قدیم ضرب المثل "الناس علیٰ دین ملوکہم" کی صداقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے شریف گھرانوں تک میں تعلیم اور درس و تدریس کے لئے نامحرم لڑکوں اور لڑکیوں کو خلط ملط کے مواقع میسر آتے ہیں اور پردے ہی پردے میں شیطان اپنا کام کئے جا رہا ہے! وہ لوگ جو اس دَور میں واقعی شریف کہے جاتے ہیں، اُن کا یہ حال ہے کہ اپنے لڑکوں، لڑکیوں، بھائیوں اور بہنوں کی دُنیوی ترقی کی تو انتہائی تمنا اور اُس سے شغف رکھتے ہیں۔ مگر ان نونہالوں کی سیرتوں کی طرف سے غافل ہیں۔ کہ اُن کو دین و اخلاق کے کن سانچوں میں ڈھلنا ہے۔ اور زمانہ کی بُری ہواؤں سے اُنھیں کس طرح بچانا ہے؟

اگر ان فتنوں کی اس وقت روک تھام نہ کی گئی اور پاکستان کے معاشرے پر چند سال اسی طرح اور گزر نے دیئے گئے تو پھر پاکستان مغرب زدگی، بے حجابی اور بد اخلاقی میں فرانس، اور انگلستان کی سطح تک پہنچ جائے گا۔ مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں دینی قدروں اور اسلامی اخلاق کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے، اور اسلام پسندوں کو وہاں کے جابر و مستبد حاکموں نے بالکل بے اثر کر کے رکھ دیا ہے، (در خاک بدہن گستاخ) اس وقت تو ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ مصر میں شاید اسلام کے لئے کوئی مستقبل ہی نہیں ہے!

پاکستان کی دینی جماعتوں کو ہم مسلسل اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں۔ مگر اب تک اسلام پسند حضرات نے اس "فتنہ" کی شدت اور تباہ کاری کو اُتنا محسوس نہیں کیا، جتنا محسوس کرنا چاہیئے تھا۔ یہ بھی کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ آتش فشاں کو اہلِ نظر چنگاریوں اور انگاروں کا ایک الاؤ سمجھ رہے ہیں۔ اور اس خیال سے مطمئن ہیں کہ جب چاہیں گے پانی کے چند

مشکیزوں سے اس الاؤ کو بجھا دیں گے! یہ ان لوگوں کی بھول، خوش اندیشی اور سادہ دلی ہے!

مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی اور عریانی کے مسئلہ میں تمام اسلامی فرقے اور دینی جماعتیں دو رائیں نہیں رکھتیں اُس کی برائیوں اور آشوب سامانیوں کا سب کو احساس ہے، پس ضرورت ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں یک دل و یک جان ہو کر اس فتنہ کے خلاف عملی جد و جہد کریں۔ پانی ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا۔ آگ ابھی دروازوں تک آئی ہے! مسلمانوں کی اکثریت میں ابھی تک اللہ کے فضل سے احساسِ غیرت اور دینی حمیت باقی ہے۔ اصلاح و انقلاب کے ابھی تک تو کافی مواقع موجود ہیں۔ اس فتنہ پر ضرب لگنے سے پورا نظامِ جاہلیت ہل جائے گا اور اس ایک "منکر" کے مٹنے سے بے شمار فواحش و منکرات کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں گی ــ!

جناب محمد عباس صاحب جن کا ایک مکتوب یہاں درج کیا جا رہا ہے، ایک غیرت مند مسلمان ہیں۔ وہ کئی مہینے سے ہمیں لکھ رہے ہیں کہ "بے حجابی، مغرب زدگی، اور عریانی" کے خلاف ہم منظم تحریک شروع کریں۔ مکتوب نگار کے اس "حُسنِ ظن" پر جو وہ ہماری ذات سے رکھتے ہیں، ہمیں بڑی ندامت محسوس ہوتی ہے، کاش! ہم اس کی قدرت و استطاعت رکھتے اور اخلاقی اعتبار سے بھی ہم اپنے کو اس کا اہل سمجھتے ــ!

یہ مکتوب ایک غیرت مند دل کی آواز نہیں فریاد ہے، کاش! یہ فریاد نہ صرف یہ کہ سُنی جائے بلکہ بہت سے دلوں پر اثر انداز بھی ہو سکے، اور مکتوب نگار کا دل جس آگ سے سلگ رہا ہے اس کی چنگاریاں اوروں تک بھی اُڑ کر پہنچ سکیں!

بے اثر ہیں سینکڑوں نغمے نہ ہو گر دل میں سوز ایک نالہ سے بدل سکتا ہے رنگِ انجمن!

اللہ کرے کہ "یہ نالۂ پُرسوز" رنگِ انجمن کو بدل دے! (م۔ق)

(القاب و آداب اور ہدیہ سلام و رحمت کے بعد)

دردمندوں سے کہیں ضبطِ فغاں ہوتی ہے

چُپکے چُپکے تیرے بیمار کراہیں کیوں کر!!

ہمارے ملک میں فرنگیت اور فسق و فجور کی رَو بڑھتی چلی جا رہی ہے اور وہ کچھ ہو رہا ہے جو انگریز کے غیر اسلامی دورِ حکومت میں بھی نہ ہوتا تھا۔ اسلامی قوانین اور اصول کے خلاف عوام کو چلانے کی منظم کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور اُن کو انگریزی دورِ حکومت سے کہیں زیادہ پامال کیا جا رہا ہے سب سے زیادہ افسوسناک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ فرنگیت کی تبلیغ اور اس کو رواج دینے کی اس منظم کوشش کا نشانہ ہماری عورتیں بنائی جا رہی ہیں۔ ہر ممکن زور لگایا جا رہا ہے کہ اسلامی تہذیب، اخلاق کے اُس آخری قلعہ کو بھی مسمار و منہدم کر دیا جائے جہاں ہر طرف سے لپا ہو کر اُس نے پناہ لی تھی۔ طرح طرح سے تدبیریں کی جا رہی ہیں کہ اُس گہوارہ کو بھی گندہ کر کے رکھ دیا جائے جہاں ایک مسلمان بچّہ سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور جہاں اُسے مذہب، اخلاق، آدمیت اور اجتماعی برتاؤ کا پہلا سبق ملتا ہے۔ آسمان سے أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ کی صدائیں اُٹھ رہی ہیں۔ میں تو آج تک یہی سمجھتا تھا کہ "رَجُلٌ رَشِيدٌ" بس وہی ایک اس دور میں تھا جو ۲۰۔ اپریل ۱۹۳۸ء

کو ہم سے ناراض ہو کر اسم با مسمٰی محی الدین عالمگیر کی مسجدِ شاہی کے قرب میں رُوپوش ہو گیا تھا، لیکن "فاران" کے مسلسل مطالعہ سے الحمد للہ (علیٰ احسانہٖ) آپ کی شخصیت میں اس قحط الرجال میں بھی ایک رجلِ رشید مل ہی گیا۔

پاکستان اس لئے نہیں بنا تھا کہ اُس میں دخترانِ ملت کی عصمت کی ہولی کھیلی جائے، میرے محترم! آپ ان تمام رُوح فرسا واقعات کو ہم سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ لیکن للہ ان فاسد عناصر کو ہمارے معاشرے میں سے نکالنے کی طرف کچھ تو قدم اُٹھائیے، بے حیائی کے طوفانِ بدتمیزی کا آپ کی حمیت و غیرت کب تک چپ چاپ نظارہ کرتی رہے گی، اُٹھئے خدا کے لئے منظم طریقہ پر آپ بھی کسی ایسے شجرِ طیبہ کی بنیاد رکھیے۔ جس کی جدوجہد سے یہ تمام شیطنت پُرامن طریقہ سے ختم ہو سکے۔ میں اپنا فرضِ کفایہ ادا کر چکا، اب آپ اپنا فرضِ منصبی ادا فرمائیے۔ قوم کو بے حیائی اور عُریانی کے پُر معاصی طوفان سے بچانے کی کچھ عملی کوشش کیجئے۔ اور رجلِ رشید مرحوم و مغفور کی یہ نصیحت ہر وقت دخترِ ملت اور ہر سرپرست دخترانِ ملت کو سنا دیجئے اور اس پر انھیں عمل پیرا کرا کے دم لیجئے ؎

اگر پندے ز درویشے پذیری ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

اُٹھیئے! پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے استحکام کی خاطر اُٹھئے!! اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو! ع

بحق دل بند و راہِ مصطفٰے رو!

آپ اگر اس کام کو عملی طور پر انجام دینے کے لئے کوئی جماعت تشکیل دینے کی خدانخواستہ وسعت نہ رکھتے ہوں تو جماعتِ اسلامی اور جمعیت العلماء جیسی اسلامی جماعتوں کی خاص توجہ اس طرف مبذول کرانے کی سعی بلیغ فرمائیں۔ انشاءاللہ جماعتِ اسلامی وغیرہ آپ کی صدا پر ضرور لبیک کہیں گی! جزاکمہ اللہ تعالیٰ فی دارین خیرا۔ والسلام!

(خادم عباس عفی عنہ)

فاران کا آئندہ شمارہ (جون ۵۷ء)

توحید نمبر

ہوگا

الجھاوے!

یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے؟

پاکستان کے وہ "بڑے لوگ" جنہیں ہر طرح کی طاقت و اختیار رکھنے کے باوجود کسی "معروف" کو قائم کرنے اور کسی "منکر" کو مٹانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی، اُنہی کی سرپرستی میں "ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ" قائم ہوا ہے۔ اور انہی کے ظلِ عاطفت میں یہ ادارہ اب تک چل رہا ہے اور جب تک اربابِ اقتدار اس کے وجود کو مفید سمجھیں گے، یہ بدستور کارگزار رہے گا!

کوئی شک نہیں کہ اس ادارہ کے بعض ارکان کی جدتِ خیال اور تنویرِ فکر نے علم و تحقیق کی قابلِ لحاظ خدمات انجام دی ہیں اور اس انسٹی ٹیوشن نے چھوٹے پیمانہ پر ایک "بیت الحکمت" (اکاڈمی) کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ —— یہ اس ادارہ کا روشن و تابناک پہلو ہے، جس کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں!

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار پاکستان میں مصطفےٰ کمال پاشا کے تجدد اور تفرنج کو بروئے کار لانے کی تمنا رکھتے ہیں! اُن میں بہت کچھ سیاسی اختلافات موجود ہیں۔ حصولِ اقتدار اور بقاء مناصب کی نزاع بھی اُن کے درمیان برپا رہتی ہے مگر دین میں جو رُخصتیں اور اباحتیں وہ چاہتے ہیں، اس بارے میں اُن کے مابین توافق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ "ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ" بعض دینی مسائل میں بڑی حد تک اپنے سرپرستوں اور محسنوں کے افکار و خیالات کی ترجمانی، اشاعت اور پُشت پناہی کرتا رہتا ہے۔ اور یہ بات ہم اس بناء پر کہہ رہے ہیں کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے بعض علماء اس ادارہ سے وابستہ ہونے کے بعد جن دینی افکار کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس وابستگی سے قبل اُن کے سوچنے اور ظاہر کرنے کا یہ طرز نہ تھا۔ اس انقلابِ فکر اور تبدیلی مزاج کی دو ہی صورتیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں کہ یا تو ان "بڑے لوگوں" کے افکار و خیالات کی جدت نے واقعی ان علماء کی قدیم فکر کو متاثر اور مغلوب کر دیا ہے یا پھر ... ... —

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است، احتیاج است احتیاج

والا معاملہ ہے، اس لئے — ع

اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات اُن کی!

یہ "بڑے لوگ" علماء حق پر "مُلّا" کی پھبتیاں چُست کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے اس موقف کو معنیٰ و مستحکم

بنانے کے لئے ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے ''اقبال اور مُلّا'' پیش کردی - یہ ''بڑے لوگ'' ناچ رنگ، لہو و لعب اور گانے بجانے سے شغف رکھتے ہیں اور اُن کی یہ کوشش ہے کہ پاکستان کے عوام بھی اسی رنگ میں پُوری طرح رنگ جائیں، اس کے لئے دین و شریعت ہی کے نام پر ''اباحتوں'' کی کچھ نہ کچھ کمک پہنچنی ضروری تھی - سو اس ضرورت کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ایک عالم نے ''اسلام اور موسیقی'' لکھ کر پُورا کردیا ---!

نکاح و طلاق، تعددِ ازدواج، یتیم پوتے کا ورثہ - اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں ''ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ'' مغربیّ فکر کی ترجمانی بلکہ نمائندگی کرتا رہتا ہے - ہم یہ نہیں کہتے کہ ادارۂ مذکور کی تمام باتیں ہوائی بتائی ہوتی ہیں - وہ یقیناً اپنے افکار کی پشت پر دلیلیں بھی رکھتا ہے - اُن میں نکتہ سنجی، ذہانت اور گہرائی بھی ہوتی ہے - مگر یہ درخت آخر برگ و بار وہی لاتا ہے، جو مغرب زدہ طبقہ کو بھاتے ہیں ---!

فروری ۵۸ء کا مجلہ ''ثقافت'' ہمارے سامنے ہے، اس میں ''عجیب زاویہ نگاہ'' کے عنوان سے مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی کا ایک مضمون ہے، جس میں بعض اکابر علماء اور صوفیاء کے اُن اقوال کو پیش کیا گیا ہے جو بہت سے پہلوؤں سے محلِ نظر ہی نہیں بلکہ اُن میں سے بعض تو سخت قابلِ اعتراض ہیں - اور اُن کا اس طرح ڈنکے کی چوٹ اعلان و اظہار احتیاط اور دینی مصالح کے خلاف ہے!

ان اقوال میں --- ندائے غیب و استغاثہ بغیر اللہ - تصورِ شیخ، صلحاء کی قبروں پر چادر چڑھانا اور قبے بنانا، یہاں تک کہ ''صلوٰۃ غوثیہ'' جیسی باتوں کا ذکر ہے - فاضل مضمون نگار نے ان اقوال کو پیش کرکے علماء پر یہ طنز کی ہے کہ جب تم فلاں فلاں بزرگ کو قابلِ احترام سمجھتے ہو اور اُن کے اقوال سے سند لاتے ہو - تو پھر اُن کے اِن اِن اقوال و اعمال کو بھی درست مانو اور اُن پر عمل کرو - یعنی جب ملّا علی قاری اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کے معترف ہو تو ملّا علی قاری اور شیخ محدث دہلوی نے جو حضرت شیخ جیلانی سے صلوٰۃ غوثیہ کی روایت کی ہے، تو تم بھی سنتِ مغرب کے بعد دو رکعت نفل پڑھ کر بغداد شریف کی طرف رُخ کرکے گیارہ قدم چلو اور ہر قدم پر ''یا غوث الثقلین اغثنی وامددنی'' کہتے جاؤ --- (معاذ اللہ)

اس قسم کے اقوال و اعمال پر نقد و نظر اور احتساب و محاکمہ اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے، عرض کرنا یہ ہے کہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی کے اس مضمون کے کیا اثرات اور نتائج مترتب ہوں گے اور یہ مقالہ کیا پارٹ ادا کرے گا؟ اس سے اصلاحِ خیال ہوگی۔ عقائد کی کچھ خرابیاں دُور ہوں گی، تزکیۂ نفس کی کوئی سبیل پیدا ہوگی، اسلام، ایمان اور توحید کے تقاضوں کی تکمیل ہوسکے گی؟؟

مسلمانوں میں ایک تو وہ نوجوان تعلیم یافتہ ہیں کہ جو مادہ پرستی اور مغرب زدگی کی طرف ڈھلے ہوئے ہیں اور دین سے بیزاری کی طرف مائل ہیں، دُوسرا گروہ اُن نوجوانوں کا ہے جو اللہ کے فضل سے اسلام پسند ہیں اور دین سے شغف اور دلچسپی رکھتے ہیں - نوجوانوں کا یہ طبقہ شرک و بدعت سے متنفّر ہے اور ''خانقاہی تعلیم'' سے اُنس اور لگاؤ نہیں رکھتا - ماہنامہ ''ثقافت'' کا یہ مقالہ اِن اسلام پسند نوجوانوں میں انتشارِ فکر و خیال پیدا کرنے کا فرض انجام دے گا - اب یہ انتشارِ فکر و خیال جو صورت بھی اختیار کرلے اور جس حد تک بھی پہنچ جائے!

اب سے چار سال قبل جب پاکستان میں عوام کتاب و سنت کی بُنیاد پر دستور سازی کا مطالبہ کر رہے تھے - تو

"ارباب اقتدار" نے کچھ کرایہ کے مضمون نگار اور اہلِ قلم اس کام پر متعین کر رکھے تھے کہ وہ طرح طرح کے شگوفے چھوڑ کر اور فقہی اختلافات کو اُبھار کر مسلمانوں میں انتشارِ فکر پیدا کریں۔ وہ دَور گزر گیا اور ارباب اقتدار کی تمناؤں اور منصوبوں کے علی الرغم ایک ایسا دستور بن کر رہا، جس میں بہت سی خرابیوں، رخنوں اور چور دروازوں کے باوجود بہر حال اسلامی اسپرٹ موجود ہے، اب اس دَور میں "عجیب زاویہ نگاہ" جیسے مضامین انتشارِ فکر و خیال کی راہیں کھول رہے ہیں!

دعوتِ فکر

دین کی اصل اساس "کتاب و سنت" ہے، ہر کسی کے قول و فعل کو اسی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل سند اور حجت ہے، کتاب و سنت کی بنیاد پر دین کی عمارت قائم و دائم ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حق گو، حق شناس، حق نگر بلکہ سراپا حق ہیں۔ مگر معیارِ حق رسول اللہ ہی کی ذاتِ گرامی ہے، سلفِ صالحین زرِ خالص تھے مگر "کسوٹی" نہ تھے۔ کسوٹی ذاتِ رسالت مآبؐ ہے کہ جو مہبطِ وحی الٰہی تھی اور جس کی اطاعت منصوص ہے، بلکہ حضورؐ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی نامعتبر قرار پاتی ہے!

تفاسیر، فقہ اور اخلاق و تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کا حرف حرف کتاب و سنت کی طرح حق اور واجب الاطاعت ہو اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کی طرح کسی غیر نبی کی زندگی کو عصمت نصیب ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی مانند کسی دوسرے کے ہر قول و فعل کی اتباع کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بعد صحابہ کرام کی پاک زندگیاں ہمارے لئے مثالی زندگیاں ہیں مگر کوئی صحیح الفکر انسان یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ مسلمان جب صحابہ کرام کی عقیدت، محبت بلکہ پیروی کا دم بھرتے ہیں تو ان کو ہر زمانہ میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے۔ مسلم خواتین کو جب یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ تم اپنی زندگیوں میں حضرت رابعہؒ بصری کی سیرت کی جھلک پیدا کرو تو مسلمان عورتوں کو ساری عمر کنواری رہ کر زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ جو کوئی "کشاف" سے آیاتِ قرآنی کی شرح میں سند لاتا ہے تو اُسے علامہ زمخشری کے مسلکِ اعتزال کو بھی قبول کر لینا ضروری ہے۔ جو شخص فلاں صوفی کی بزرگی کا قائل ہے، تو اُسے چاہیئے کہ اُن بزرگ کے اتباع میں "صلوٰۃ معکوس" بھی پڑھا کرے۔ حضرت امیر خسروؒ کے معتقدین کا فرض ہے کہ وہ ستار جیسے کسی باجہ کی ایجاد کی سعادت حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم مزامیر ہی کو فروغ دیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے ماننے والوں کو "تصورِ شیخ" کا نظریہ کسی چون و چرا کے بغیر قبول کر لینا چاہیئے۔! وھلم جرّاً۔

اس نوع کے مطالبے، اس قسم کی باتیں اور اس طرز کی نکتہ آفرینیاں چاہے گرمیٔ محفل کے لئے کتنی ہی مناسب و موزوں کیوں نہ ہوں مگر علم و تحقیق اور دین و دانش کی نگاہ میں یہ ایک قہقہہ سے زیادہ وزن نہیں رکھتیں!

متقدمین اور متاخرین علماء اور صلحاء نے اپنے ملفوظات اور تحریروں کے بڑے اچھے نمونے چھوڑے ہیں، مگر یہ نہیں ہے کہ اُن کی زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تنقید و تحقیق سے بالاتر ہے اور اُن کے کسی قول و عمل پر گفتگو ہو ہی نہیں سکتی۔ سمع و اطاعت کی یہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کو نہیں دی جاسکتی اور نہ کبھی دی گئی ہے!

تفاسیر، فقہ، اخلاق و تصوف، تاریخ و کلام کی کتابوں میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں کہ جو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ اور اُن کو بلا دریغ رد کیا جاسکتا ہے۔ اور خود وہ کتابیں اس واقعیت کی شاہد ہیں کہ پچھلوں نے اگلوں کی باتوں پر جرح و تنقید کی ہے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا ہے، اگر امتِ مسلمہ پر مسلسل جامد عقیدت کا غلبہ رہتا تو حق کبھی واضح نہ ہونے پاتا۔!

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علم و انشاء اور فکر و اظہار کی صلاحیتیں دی ہیں۔ اُنھیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے۔ دلیلوں، مثالوں، تشبیہوں اور استعاروں کی کمی نہیں ہے۔ ہر بات کہی اور لکھی جاسکتی ہے، وہ پھیل بھی سکتی ہے۔ اُس سے کچھ لوگ متاثر بھی ہوسکتے ہیں۔ کوئی ہٹ دھرمی پر ہی اتر آئے تو ہر لغزش کے لئے دلیلوں کا انبار لگا یا جاسکتا ہے۔ مگر خدا سے ڈرنے والے اربابِ فکر، اہلِ قلم اور علماء کی تحریریں اور تقریریں مسائل کو اُلجھاتی نہیں، سُلجھاتی ہیں۔ اس دَورِ انکار و الحاد میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ قلم کی ذرا سی شوخی اور زبان کی ادنیٰ سی لغزش بعض وقت نہ جانے کتنے فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے —!

پروفیسر اسرار احمد

ادبی مطالعہ

ادب درحقیقت جذبات و احساسات کو موزوں اور دلآویز الفاظ میں بیان کردینے کا نام ہے۔ ادب تقریر اور خطاب کی صورت اختیار کر سکتا ہے، شعر و شاعری کے لباس میں نمودار ہو سکتا ہے۔ ادب کا سب سے اہم کام ہماری زندگی کی قدروں کا تعین ہے، اس کے علاوہ ادب ہمارے جمالیاتی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس میں ہم آہنگی اور معیاری لطافت پیدا کرتا ہے۔ ادب ہمارے شعورِ اخلاقی کو تازگی اور قوت بخشتا ہے۔

اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ادب ہماری زندگی کا ایک ہمہ گیر قانون ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ پر کم و بیش اثر انداز ہوتا ہے۔ بقول ہنری ہڈسن کے ادب اُن کتابوں کے مجموعہ پر مشتمل ہوتا ہے، جو اپنے موضوع اور ابلاغ کے لحاظ سے ہمہ گیر انسانی دل چسپی سے متعلق ہوں اور جن میں مسرت آفرینی اور حُسنِ ادا دونوں کا سامان مہیا کیا گیا ہو۔ اسی مقام سے ایک ادب پارہ اور معلوماتی مقالہ جدا ہو جاتے ہیں۔ معلوماتی مقالہ علم و فضل کا ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ اس میں سیاست، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کی گراں قدر معلومات مہیا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ ہر شخص کی دل چسپی کا مرکز نہیں بن سکتا۔ اس کی علم افزائی مسلّم ہے۔ لیکن مسرت آفرینی سے وہ یکسر محروم ہوتا ہے۔ بلاشبہ اس سے وہ لوگ تو مسرت بھی حاصل کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو علمی چیزوں سے مسرت حاصل کرنے کا عادی بنا چکے ہیں۔ لیکن معاشرے میں ایسے آدمیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں ایسے حضرات خال خال ہی پائے جاتے ہیں!

اس کے برخلاف ایک ادب پارہ عالم اور عامی دونوں کو محظوظ کر سکتا ہے اور ان دونوں کی مسرت میں اضافہ کر سکتا ہے۔ یہ مسرت آفرینی ساری کی ساری اس کی جمالیت پر منحصر ہوتی ہے، گویا ادب جمالیاتی عناصر حیات کو خوبصورت عبارت میں ڈھال دینے کا نام ہے، اپنے جمالیاتی عناصر کی اس اہمیت کے لحاظ سے ہم اس کو نہ تو بالکل بازاری یا عامی بنا سکتے ہیں اور نہ خالص علمی اصول و ضوابط کے بار سے اس کو گرانبار کر کے مغلوب بنا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کو ہر عامی تک پہنچنا چاہیئے۔ اور ایسی زبان میں پہنچنا چاہیئے جس کو وہ بلا دقت سمجھ سکے اور لطف اٹھا سکے۔ گویا وہ بجائے اس کے کہ ایک عامی کی ذہنی سطح کو کچھ بلند کرنے کی کوشش کریں، ادب کو اس کے ذہن کی پستی تک اتار لانا چاہیئے۔ میرے خیال سے یہ نہ تو عوام دوستی ہے، نہ ادب دوستی، بلکہ دونوں کے ساتھ کھلی دشمنی ہے!

ادب کو بازاری سطح پر لے آنا کسی طرح دانش مندی کا فعل نہیں ہو سکتا۔ خواہ جذبات و احساسات کے لحاظ سے، خواہ زبان و طرزِ ادا کے لحاظ سے، ادب کو بازاری سطح سے بلند ہی رہنا چاہیئے۔ ادب کو اگر ہم بالکل نیچی سطح پر لا کر ڈال دیں گے تو اس کی بنیادی خوبی اور اہم ترین اجزائے ترکیبی ختم ہو جائیں گے، جمال آفرینی جو ادب کی بنیاد ہے سرے سے مفقود ہو جائے گی، بہتر صورت یہ ہے کہ عوام کو ذہنی معیار کے لحاظ سے تھوڑا سا بلند اٹھانے کی کوشش کریں۔ تاکہ پستی و ذلت سے عوام بھی نجات

حاصل کرلیں اور ہمارا ادب بھی ذلت وخواری سے محفوظ رہے!

اس گفتگو سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم ادب کو ایک ایسی عالمِ بالا کی چیز بنادیں کہ عوام باوجود اپنی پوری کوشش اور ہماری کاوش کے اس قابل نہ ہوسکیں کہ اس کو سمجھ سکیں اور اس سے لطف اٹھاسکیں - میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ادب معیار کے لحاظ سے کم سے کم اس سطح پر رہنا چاہیئے جہاں تک ہمارے عوام اپنی صلاحیتوں اور اکتساب کے لحاظ سے پہنچ سکیں اور ادبی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ لے سکیں - بلاشبہ ہمارا تمام ادب ایک ہی درجہ کا نہیں ہوسکتا، آپس میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے خود بخود درجات قائم ہوجائیں گے، ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ ادب میں افراط وتفریط کے معیار کی نشان دہی کردیں اور یہ بتادیں کہ یہ دونوں چیزیں غیر محمود اور نامعقول ہیں - ہمارا ادب بہر صورت ان دونوں چیزوں کے درمیانی درجات میں محدود رہنا چاہیئے - یعنی نہ تو بالکل بازاری سطح پر اتر آئے اور نہ چند مخصوص حلقوں کی اجارہ داری بن جائے - لیکن اس کو اتنی بلندی پر ضرور ہونا چاہیئے کہ جو شخص وہاں تک رسائی حاصل کرنا چاہے اس کو پنجوں کے بل کھڑے ہوکر تھوڑا سا اونچا اٹھنا پڑے -

ایک قابلِ قدر تحریر ہمیشہ زندگی میں سے اسی طرح پھوٹ کر باہر نکلتی ہے - جس طرح کسی پودے میں سے کوئی نئی کونپل پھوٹ کر ظاہر ہو - اور اسی طرح کی تحریریں ہمیں زندگی کے اہم، گہرے اور قریبی مسائل سے دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں - ادب انسان کی زندگی کی وہ یادداشت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے سارے اہم تجربات محفوظ کرلیتا ہے، اور پھر جو کچھ اس نے محسوس کیا، تجربہ کیا - عمل کیا، اور عمل سے جو کچھ ذہنی طور پر نتائج نکالے، وہ سب خوبصورت اور دلکش زبان میں دوسروں کی دلچسپی کے لئے نشانِ راہ کے طور پر ایک کتاب کی صورت میں دنیا میں چھوڑ جاتا ہے - گویا یہ ایک مقدس ورثہ ہے جو اس کے بعد آنے والی نسلیں اس سے حاصل کرتی ہیں!

وہ مختلف داعیات جو ادب آفرینی کا سبب بنتے ہیں، بہت سے ہیں - ان میں سے بعض محسوس طور پر کام کرتے ہیں اور کچھ غیر محسوس طور پر - جو محسوس طور پر کام کرتے ہیں - حسب ذیل ہیں :-

۱ - ذاتی جذبات و احساسات کے اظہار کی قوی خواہش -

۲ - اپنے گرد وپیش کے لوگوں کی حرکات و سکنات میں گہری دلچسپی -

۳ - حقیقی دنیا اور تصوراتی دنیا سے ہمارا شغف - حقیقی دنیا جیسی کہ ہم دیکھتے ہیں اور تصوراتی دنیا جیسی کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور جس کا نقشہ ہم اپنے ذہن کے ذریعہ سے مرتب کرتے ہیں!

۴ - طرزِ اظہار میں ہماری قدرتی دلچسپی، بات کو نئے اور اچھوتے ڈھنگ سے کہنے کا شوق -

جو داعیات کہ غیر محسوس طریقہ سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں ان کو احاطۂ تحریر میں لانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہماری تحت الشعوری قوتیں ساری کی ساری معلوم نہیں ہوجاتیں، اس کے لئے ابھی ہمیں کچھ مدت تک انتظار کرنا پڑے گا، ماہرینِ نفسیات ان پوشیدہ قویٰ کا کھوج لگانے میں لگے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی یہ حقائق بھی برافگندہ نقاب ہماری جستجو کی نگاہوں کے روبرو جلوہ فرما ہوجائیں گے -

ادب کے موضوعات

موضوعاتِ ادب اتنے ہی مختلف النوع ہیں جتنی ہماری زندگی کی نیرنگیاں - ان موضوعات کو علیحدہ علیحدہ تقسیم کرنا گویہت مشکل ہے - اس لئے کہ یہ ایک دوسرے کی حدود میں در آتے ہیں اور

آپس میں گتھے ہوئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہمیں سمجھنے سمجھانے کی سہولت کے لئے اُن کی تقسیم کرنی پڑتی ہے۔ خواہ وہ کسی قدر ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مغربی نقاد مسٹر ہڈسن نے ان کی چار اہم قسمیں مقرر کی ہیں۔ یہاں ہم اُنہی کا اعادہ کرتے ہیں:۔

۱۔ انسان کے ذاتی تجربات ایک انسان کی حیثیت سے۔
۲۔ انسان کے تجربات ایک فرد کی حیثیت سے۔
۳۔ افراد کے تعلقات اپنے دُوسرے ہم جنسوں سے۔
۴۔ مناظرِ فطرت کی بیرونی دُنیا اور اس سے انسان کی وابستگی اور تعلق۔
۵۔ فنکار کی اپنی ذاتی تخلیقی مساعی اور مخصوص طرزادا جس کا کہ وہ خود موجد ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا موضوعات پر کچھ لکھنے کے لئے مختلف عناصر ترکیبی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ عناصر اہم اجزائے ترکیبی کا کام دیتے ہیں۔ ان میں پہلا اور اہم ترین عنصر تخئیل کا ہوتا ہے۔ دراصل ادب کی بُنیاد دو ہی چیزوں پر قائم ہے، تخئیل اور بیان۔ یعنی وہ خیالات جو شاعر بیان کر کے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اور وہ زبان جس کے ذریعہ سے وہ ابلاغ کا کام لینا چاہتا ہے۔

ادب میں تیسرا اہم عنصر جذبات کا ہے۔ یعنی وہ جذبات جو کسی چیز کو دیکھ کر اُس کے دل میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور جن کو وہ قاری تک پہنچاتا ہے۔ تاکہ اس کی ہمدردی اور تحسین کا مستحق ہو سکے۔ فن کار اپنے جذبات کے اظہار سے اُسی قسم کے جذبات قاری کے دل میں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ جذبات جس قدر اُسکے اپنے شدید اور قوی ہوتے ہیں، اتنی ہی شدت اور قوت سے وہ دُوسروں کے دلوں میں نفوذ کر جاتے ہیں۔ کمزور جذبات دوسروں کے دلوں کو متاثر نہیں کر پاتے۔ بغیر شدتِ جذبات اور خلوصِ اظہار کے کلام بہت کمزور اور کم تاثیر رہ جاتا ہے اور جتنی تاثیر میں کمی ہوتی ہے اُتنی ہی کلام کی زندگی میں کمی واقع ہو جاتی ہے!

ان تمام اجزاء کے علاوہ ایک اور اہم جزو بھی ہے۔ جو اگر موجود نہ ہو تو باوجود تخئیل کی بلند پروازی، احساس کی شدت، جذبات کی فراوانی اور تجربات کی کثرت کی تخلیق بالکل بے جان رہتی ہے اور اس کی تکمیل بہر وجوہ نہیں ہو پاتی۔ یہ اہم جزو "حُسنِ ترتیب" کا ہے۔ اگر مواد کو ترتیبی اصول، توازن و توافق، حُسنِ تاثر کے انداز میں نہ ڈھالا جائے تو حُسنِ صورت پر ایک بڑا داغ نمایاں رہتا ہے۔ اس عنصر کو دُوسرے الفاظ میں "حُسنِ طراز" کہہ سکتے ہیں۔

ہر ادب کا ادیب کی ذہنیت اور شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اسی وجہ سے ہمیں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی ادب پارے کو پڑھتے وقت ادیب کی انفرادیت اور شخصیت کے متعلق معتد بہ معلومات حاصل کر لیں اور اس کو دورانِ مطالعہ میں ملحوظِ خاطر رکھیں، اس لئے کہ فن کار اپنی پُوری شخصیت و انفرادیت کو دورانِ تخلیق میں اپنے فن پارے میں سمو دیتا ہے، اس کے ہر ہر جزو سے فن کار کی ذات جھانکتی نظر آتی ہے۔ اور درحقیقت وہ تخلیق عظیم ہو ہی نہیں سکتی جس میں کہ فن کار کی ذات جذبات و احساسات کے رنگ میں بہ نفس نفیس شامل نہ ہو گئی ہو۔ تصنیف اسی قدر عظیم ہو گی جس قدر مصنف کی ذات اس میں سما گئی ہو گی۔

فن میں نابغہ کاری مصنف کی ذاتی ابتکار، فکر، تازگیٔ ادراک پر ہی منحصر ہوتی ہے - ایک نابغہ کار مصنف زندگی کے مختلف نئے نئے زاویوں سے دیکھتا ہے اور جب اپنے تجربات کو بیان کرتا ہے تو بیان میں حُسنِ جدت اور لطف ابتکار پیدا کر دیتا ہے اور یہی چیز مصنف اور تصنیف کی عظمت کا باعث بن جاتی ہے - اور دونوں کو حیاتِ جاوداں بخش دیتی ہے اور یہی چیز اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ ادیب نے جو کچھ کہا ہے خود محسوس کر کے اور ذاتی تجربہ کے بعد لکھا ہے اور یہ کہ اُس نے ہر چیز کو شدید تر احساس سے محسوس کیا ہے! زیادہ باریک بین نگاہوں سے دیکھا ہے - اور اپنی ذہانت و فطانت سے معاملات کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ کر زیادہ خوبصورت الفاظ و عبارت میں دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے - اور اپنی غیر معمولی قوت جاذبہ کے تحت ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم بھی اسی کی طرح دیکھیں اور محسوس کریں - ایک عظیم فن کار کی شخصیت اپنے قاری کے ذہن پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ قاری اپنی شخصیت کو بعض اوقات بالکل فراموش کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، جیسے قطرہ دریا میں مل کر گم ہو جائے -

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک اور نہایت اہم چیز کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے - یہ اہم چیز "خلوص" ہے - اس سے مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ محسوس کرے اس پر ارادتاً کسی قسم کا رنگ چڑھانے کی کوشش نہ کرے، نہ تو احساس میں کوئی ردوبدل کرے اور نہ اس کی ترجمانی میں - بعض اوقات رائے عامہ انسان کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ صحیح طریقہ سے جو کچھ محسوس کرتا ہے اُس کو اپنی حسب منشاء ادا نہیں کر سکتا - اسی طرح طرزِ ادا میں بھی اس کو رواج زمانہ کے مطابق حک و اصلاح کرنی پڑتی ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ادیب کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے کی تلقین کر رہا ہوں - میرا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی حدود کا پابند رہ کر فن کار کو چاہیئے کہ وہ جو کچھ محسوس کرے، یا تجربہ کرے اس کو اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں بیان کرے اُس کے ذہن پر یہ خیال سوار نہ رہے کہ فلاں عظیم فن کار نے یہ طرز اختیار کیا ہے، اس لئے میں بھی اس کی پیروی کروں - پیروی اکثر و بیشتر فن پارے کو کم اصل اور کم قدر بنا دیتی ہے - یعنی اگر کسی قدیم چیز کے بغیر کوئی چیز تخلیق کر لینے کا امکان نظر آئے تو مناسب حد تک پیروی اور تتبع کو زنجیرِ پا نہ بنائے رکھنا چاہیئے - مناسب ضرورت کی حد تک اس روایت سے اگر مُنہ موڑ لیا جائے تو مفید ہی ثابت ہوگا - لیکن یہ ضرور ہے کہ اُپج اور ابتکار کے شوق میں ذرا ذرا سی بات پر روایات کے تار و پود کو بکھیر دینا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا - کسی اچھی چیز کو اس سے بہتر نعم البدل کے لئے ہی ترک کیا جا سکتا ہے - بقول ہنری ہڈسن کے "ہم اس طرح سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو آزادانہ اور خلوص کیساتھ اپنے مافی الضمیر کو بے کم و کاست اظہار کر دیتے ہیں کیوں زیادہ مداح پیدا کر لیتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ جو کہ یقیناً زیادہ تعلیم یافتہ، مہذب، ذہین اور کہنہ مشق ہوتے ہیں لیکن اپنے دل کی بات کو براہ راست نہیں کہتے - اور طرزِ اظہار میں والہیت پیدا نہیں کر سکتے، قدردانوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور بہت جلدی فراموش کر دیئے جاتے ہیں" [1] بلکہ موصوف نے اپنی کتاب میں یہ بھی فرمایا ہے کہ جب کسی ادب میں خلوص اور راست گوئی کی قدردانی نہ ہو تو یقین کر لینا چاہیئے کہ اب وہ ادب بڑی تیزی سے تنزل کی طرف جا رہا ہے - یہاں اگر جان رسکن کا بھی ایک قول درج کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا - کہتا ہے "اُپج یا ابتکار جس کی اس قدر لوگ کوشش کرتے ہیں کوئی اچھوتا پن یا خالص ایجاد نہیں ہوتی بلکہ خلوص اور حقیقت نگاری کا ہی دوسرا نام ابتکار یا اوریجنیلیٹی (originality) ہے" غرضکہ ایک فنکار کے تجربات کی دُنیا خواہ بہت وسیع ہو یا مختصر اس کو انہیں باتوں کے متعلق لکھنا چاہیئے جن کو اُس نے تفصیل سے دیکھا، سُنا اور برتا ہے - جن میں رہ کر اُس نے اپنی زندگی گزاری ہے، جن کے متعلق اُس نے خود سوچا ہے اور اپنے ذاتی نتائج نکالے ہیں *

---

[1]- Introduction to The study of Literature By W. H. Hudson.

آہ! یہ عذرِ گناہ

قولِ فیصل

"فاران" پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی (گوجرانوالہ) کی کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث" پر "فاران" میں تنقید کی گئی تھی، اور جو باتیں ہمارے نزدیک سراہنے اور مان لینے کے قابل تھیں، اُن کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اور جو باتیں اس کتاب میں کھٹکتی تھیں اُن کی نشاندہی کردی گئی تھی۔ اس تنقید پر مولانا موصوف نے ایک خط مدیر "فاران" کو بھیجا جسے "فاران" میں ہم نے اپنے نوٹ کے ساتھ پورے کا پورا شائع کردیا۔ جن حضرات کے پاس "فاران" کے پچھلے پرچے محفوظ ہوں، وہ ہماری تنقید اور محولہ بالا مکتوب کو ایک بار اور ضرور پڑھ لیں تاکہ یہ قضیہ بالکل واضح ہوجائے!

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفی نے اپنی کتاب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک مضمون کی عبارت کا اقتباس نقل فرمایا تھا۔ اسی پر ہم نے گرفت کی تھی۔ کہ مولانا مودودی کی اصل تحریر میں کتر بیونت کی گئی ہے، جس نے مودودی صاحب کے مفہوم ہی کو بالکل اُلٹ دیا ہے۔ ہم نے یہ بالکل دوٹوک بات کہی تھی، ہر شخص "جماعتِ اسلامی کے نظریہ حدیث" میں دیئے ہوئے اقتباس کا مولانا مودودی کے اصل مضمون سے مقابلہ کرکے فیصلہ کرسکتا ہے کہ فاضل مصنف نے نفسِ عبارت کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے!

انسان سے غلطی یا بھول چوک ہوجائے تو آدمی کی بڑائی اس میں ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلے، یا کم سے کم یہ کرے کہ خاموش ہوجائے، غلطی کرنے والا جب صفائی پیش کرنے کی پوزیشن اختیار کرلیتا ہے تو معاملہ اور بگڑ جاتا ہے۔ وہ جتنی صفائی پیش کرتا اور عذر تراشتا ہے، اُتنی ہی اُس کی پوزیشن کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل سلفی مدظلہ نے "اعتراف و سکوت" کے بجائے اس تیسری صورت کو اختیار فرمایا۔ مولانا مودودی کی اصل تحریر میں جو کتر بیونت کی، اُس کی ایک طرف تو ذمہ داری بیچارے کاتب کے سر ڈالی اور دوسری طرف مدیر "فاران" کی ذہانت پر طنز کیا کہ مدیر "فاران" کو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ یہ کاتب کا تسامح ہے۔ فاضل مصنف نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ماہنامہ "رحیق" میں ہماری تنقید پر ایک تبصرہ شائع فرمایا۔ جس میں ہم پر اُلٹا خیانت کا الزام لگایا۔ اس مضمون کو پڑھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اتنے اُونچے لوگ اپنی بات کی پچ کے لئے اتنے نیچے بھی اُتر سکتے ہیں۔

یہ سلسلہ "فاران" کے دو شماروں میں چل کر ختم ہوگیا۔ بات بڑھانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی، مگر قدرت کے اس غیر متوقع ایماء اور سلسلہ جنبانی کو کیا کیجیے کہ جس کتاب (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث) پر یہ سارا ہنگامہ گرم تھا، اس کے کاتب کا خط ہمیں اچانک وصول ہوا، مکتوب نگار کا اصرار ہے کہ اُن کا خط "فاران" میں شائع کیا جائے تاکہ اُن کی پوزیشن صاف ہوجائے!

محمد صدیق صاحب خوش نویس کا یہ خط کسی تبصرہ کے بغیر شائع کیا جارہا ہے، اس باب میں یہ خط "قولِ فیصل" اور "حرفِ آخر" ہے!

(م، ق)

محمد صدیق خوش نویس

خضری محلہ
اندرون شیرانوالہ دروازہ
لاہور

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ فاران کراچی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ۔ فاران کی تازہ اشاعت میں "مدیر فاران کے نام" کے عنوان سے محترم مولانا محمد اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ کا ایک مکتوب، اور آپ کا اُس پر تبصرہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں انہوں نے اپنی کتاب "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں تفہیمات کے حصہ اول کے ایک اقتباس کی صحت کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے اور اسے بڑے معصومانہ انداز سے کاتب کے سر منڈھنے کی کوشش کی ہے۔ غیر ذمہ دار اخبار نویس حضرات کو تو "کاتب کی غلطی" اُن کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں کی خفت مٹانے میں عام طور پر ڈھال کا کام دے جاتی ہے۔ اور وہ اکثر اس کی آڑ میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن علمائے کرام کو یہ مشغلہ زیب نہیں دیتا کہ کسی شخص کو بدنام کرنے اور لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کے لئے اُس کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر، سیاق و سباق سے الگ کر کے، یا اپنے مفید مطلب بنا کر اور من مانے نتائج اخذ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی غلطی تو خود کریں اور جب کوئی اللہ کا بندہ اس پر گرفت کرے تو اس کی ذمہ داری غریب کاتب پر ڈال دی جائے!

لکھنے والے حضرات شاید از خود یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ کاتب کو تو خدا کے حضور میں جواب دہی نہیں کرنا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہو سکتا تو میں سکوت اختیار کر لیتا۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں ایمان رکھتا ہوں کہ اللہ کے ہاں کوئی کسی کا ذمہ دار نہیں۔ لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ، اور وکلھم اٰتیہ یوم القیٰمۃ فرداً۔ ہر شخص اللہ کے ہاں فرداً فرداً جواب دہ ہوگا۔ اس لئے میں نے اپنے فرض منصبی کو محسوس کرتے ہوئے اصل واقعہ کو بیان کرنا ضروری سمجھا ہے۔ کیونکہ زیر بحث کتاب کی کتابت میں نے کی ہے اور پھر اس حیثیت سے میرا یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا ہے کہ اس کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہے جو اپنی دینی و ملی خدمات کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے بلکہ اقامتِ دین کے لئے جد و جہد کرنے اور پاکستان میں اسے عملاً نافذ کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کرنے والی ایک منظم تحریک کا محرک اور قائد بھی ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر میں خاموشی اختیار کروں تو نہ صرف یہ کہ مجھے اندیشہ ہے بلکہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کتمانِ حق کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاؤں گا!

اس کتاب کی کتابت کے لئے مولانا محترم کی خاص طور پر ہدایت تھی کہ کسی اچھے اور صحیح نویس کاتب کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ یہ مقالہ اس سے پہلے "الاعتصام" لاہور میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔ جب مجھے اصل مسودہ دیا گیا تو احتیاطاً میں نے "الاعتصام" کے وہ پرچے بھی منگوا لئے تھے جن میں یہ مضمون چھپا تھا تاکہ اگر کسی جگہ مسودہ پڑھنے میں دقت ہو تو ان پرچوں سے مدد لے سکوں، کتابت کے بعد کاپیوں کی تصحیح اس اہتمام سے کی گئی کہ جناب حافظ عبد الرحمٰن صاحب ناظم مکتبہ سلفیہ، جناب مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی اور خود مولانا محترم نے بھی ان کی تصحیح میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، بلکہ دو بارہ سہ بارہ ان پر نظر ثانی کی گئی۔ اس قدر احتیاط و اہتمام کے باوجود محترم مولانا کا یہ ارشاد کہ "میرا دامن اس سے آلودہ نہیں بلکہ وہ کاتب کی غلطی ہے" حد درجہ افسوسناک ہے ؏

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

میں ایک اہلِ حدیث خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ صرف یہ کہ میں نے خود مولانا محترم سے علمِ حدیث پڑھا ہے

بلکہ میرے خاندان کے دیگر افراد نے بھی اس سلسلہ میں مولانا محترم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، اس لحاظ سے میرے اور میرے خاندان کے نزدیک مولانا کی ذات قابلِ صد احترام ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی کے دیگر اکابر کی تصانیف کی کتابت میں متواتر بارہ سال تک کرتا رہا ہوں اور اُن کی ایک ایک کتاب کے کئی ایڈیشن میرے قلم سے نکل چکے ہیں اور نہ صرف یہ کہ میں نے مولانا مودودی صاحب کی جملہ تصانیف کے ایک ایک لفظ کی کتابت کی ہے بلکہ اُن کا بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا ہے اور اُن کی تحریک اور نظریات سے بخوبی واقف ہوں، اس لحاظ سے میرے نزدیک دونوں بزرگ واجب الاحترام ہیں۔ ان کے علاوہ میری فنّی زندگی کا بیشتر حصہ اُن بلند پایہ مصنفین کی علمی و تحقیقی تصانیف کی کتابت میں گزرا ہے جو تلفظِ الفاظ، اُن کی ماہیت، اعراب، کامے، فل اسٹاپس وغیرہ تک کا اہتمام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اس فن کے اصول و کوائف سے میں کماحقہ واقف ہوں تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اقتباسات کی عبارت واوین کے درمیان دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھی جاتی ہے اور میں نے آج تک کبھی یہ حماقت دانستہ یا نادانستہ طور پر بھی نہیں کی کہ نفسِ مضمون کو اقتباسات کے ساتھ خلط ملط کر دوں۔ مولانا محترم کا یہ ارشاد کہ ــــ "تفہیمات حصہ اوّل سے جو اقتباس دیا گیا ہے اُس کی اُوپر کی سطر اقتباس کا حصہ نہیں، کاتب نے غلطی سے اسے اقتباس کے ساتھ ضم کر دیا ہے۔ اصل اقتباس "میں سمجھتا ہوں" سے شروع ہوتا ہے، اسے میری گزارشات کے ساتھ لکھنا چاہیئے تھا" ــــ مجھ غریب کے ساتھ سراسر زیادتی پر مبنی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ مولانا کا ارشاد بجا ہے، لیکن کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اگر یہ "اوپر کی سطر" اقتباس کا حصہ نہیں تو اس سطر کا صحیح مقام کہاں ہے؟ اگر اس سطر کو من وعن (کما ھو بالفاظہ) اسی سیاق و سباق میں مولانا محترم اپنی "گزارشات" میں کہیں کھپا سکیں تو میں اپنی اس کوتاہی اور غلطی کو بسر و چشم تسلیم کرنے کو تیار رہوں اور اُن سے بصمیم قلب معافی مانگ لوں گا ــــ!

مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور دیگر اکابر علماء دیوبند نے، جن کے زہد و تقویٰ کے چرچے اس برِّ عظیم ہند و پاکستان کے کونے کونے میں ہیں، مولانا مودودی کی تحریروں کا مثلہ جس بے رحمی سے کیا ہے اور لوگوں کو اُن سے متنفر کرنے کے لئے جو جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، میں اُن کی حقیقت سے بخوبی واقف ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ؎

اذا کان رب البیت بالطبل ضارباً

فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

میرا خیال تھا کہ علماء اہل حدیث اس نازک معاملہ میں کافی حد تک محتاط ہیں اور وہ ہمیشہ دھونس اور دھاندلی کے بجائے دلائل و براہین کے میدان کے سپاہی رہے ہیں۔ لیکن اب شاید انہوں نے حدیث "الحرب خدعة" کا استعمال اس معاملہ میں بھی جائز سمجھ لیا ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

خدا شاہد ہے کہ میں نے اس کتاب کی کتابت میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کیا اور کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ تین اکابر علمائے دین اس کی تصحیح کے لئے میرے سر پر موجود تھے۔ البتہ صفحہ ۲۳ میں ایک فقرہ ایسا تھا کہ جو میرے نزدیک

بالکل خلافِ واقعہ تھا۔ اس پر مولانا محترم کو توجہ دلانا ضروری سمجھا۔ یہ فقرہ اصل مسودہ میں یوں تھا۔ "کوثر نیازی گوجرانوالہ آئے، جلسہ میں شورش ہوئی، جلسہ نہ ہو سکا" چونکہ میں خود اس جلسہ میں شریک تھا، جلسہ متواتر دو گھنٹے تک جاری رہا۔ کوثر نیازی صاحب کی تقریر کے دوران میں چند آدمیوں نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی، رضا کاروں نے انھیں نکال باہر کیا۔ اور اس کے بعد کوثر نیازی نے باطمینان اپنی تقریر ختم کی۔ اور پھر جلسہ برخاست کیا گیا۔ میں نے اس حقیقت سے مولانا کو آگاہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس فقرہ میں ترمیم کر دی کہ "مجھے تو یہ اطلاع ملی تھی کہ جلسہ نہ ہو سکا" بہرحال انہوں نے "جلسہ نہ ہو سکا" کی بجائے "جلسہ بمشکل ہو سکا" کر دیا۔ اب یہ بات خود مولانا ہی کو معلوم ہے کہ اُن کا یہ ظنِ مجرد جزءِ واحد پر اعتماد کا نتیجہ تھا یا حزبی تعصب کا کرشمہ بھی۔ بہرحال اس ایک فقرہ میں خود مولانا ہی سے ترمیم کرانے کے سوا میں نے پوری کتاب من و عن مطابقِ اصل نقل کر دی تھی ——!

آخر میں میں مولانا اُستاذِ محترم سے اس جسارت و جرأت کی معافی چاہتا ہوں اور بصد ادب و احترام عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک تلخ فریضہ تھا جسے ادا کرنا میرے لئے ناگزیر ہو گیا تھا۔ اُن کی اس گرانقدر تصنیف کا میرے دل میں بہت احترام ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب کے مضمون اور "مسلک اعتدال" پر آپ نے جو بھرپور تنقید لکھی ہے اور دلائل و براہین سے اخبار آحاد کی حجیت ثابت کرنے میں جو کارنامہ آپ نے انجام دیا ہے، اس قابل ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور مولانا اصلاحی صاحب اس طرف توجہ دیں۔ کیونکہ اس پر تبصرہ کے لئے دراصل یہی دونوں بزرگ موزوں ہیں۔ ہم ان بزرگانِ ملّت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس "سنجیدہ" تنقید پر اپنے خیالات کا اظہار فرما کر تلاشِ حق میں ہماری مدد فرمائیں۔ اس لئے کہ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مفید بحث ہماری علمی معلومات میں بھی اضافہ کا موجب ہو گی۔

اگر میری یہ گزارشات آپ کے موقر جریدہ میں جگہ پانے کے قابل ہوں تو براہِ کرم ان کو اپریل کے شمارہ میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں۔ اور ساتھ ہی یہ درخواست کروں گا کہ اس کا ایک پرچہ مجھے بھی مندرجہ بالا پتہ پر بھیج دیجئے گا۔

والسلام مع الاحترام۔ (اس خط کی کتابت ہو چکی تھی کہ کاتب صاحب کا دُوسرا مکتوب وصول ہوا جو درج ذیل ہے:۔)

آدابِ القاب کے بعد —— میرا خیال تھا کہ ماہنامہ "رحیق" کے فاضل مدیر مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف اور "جماعت اسلامی کے نظریہ حدیث" کے ناشر حافظ عبدالرحمٰن صاحب گوہڑوی اس معاملہ میں مداہنت نہیں فرمائیں گے، کیونکہ کاپیوں کی تصحیح میں اور کتاب کی نوک پلک درست کرنے اور اسے ہر لحاظ سے کامیاب بنانے میں مولانا محترم کے علاوہ ان ہر دو حضرات کی مساعی کو بھی کافی دخل ہے، ان دونوں بزرگوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ کاتب اس معاملہ میں بالکل بے گناہ ہے لیکن فاران میں مولانا محترم کے مکتوب پر جو تبصرہ مدیر فاران نے کیا ہے اس کے جواب میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے رحیق میں پھر اپنی اس لغزش کو "کاتب کی بدحواسی" قرار دے کر بیچارے کاتب کو بدحواس کرنے کی کوشش فرمائی ہے، میں حیران ہوں کہ فاضل مدیر رحیق اس معاملہ میں خاموش کیوں ہیں، احقاقِ حق و ابطالِ باطل کیلئے اُن کا قلم کیوں حرکت میں نہیں آتا؟ دیگر علمائے کرام کی طرح شاید انہوں نے بھی یہ فرض کر لیا ہے کہ مولانا مودودی کی مخالفت میں یہ فریضہ بھی اُن سے از خود ساقط ہو گیا ہے یا یہ کہ اس غلطی کو غلطی کہنے کیلئے انھیں بہت بڑی ہمت و جرأت درکار ہے۔ جناب شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اہلِ حدیث حضرات کو عموماً اور اپنے تلامذہ کو خصوصاً "مودودی کے مقلد"۔ "اندھی عقیدت" اور "مداہنت" وغیرہ کے الفاظ سے متہم کیا کرتے ہیں، حالانکہ یہ مرض خود اہلِ حدیث جماعت میں بدرجہ اتم موجود ہے ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

میں محترم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کی خدمت میں مودبانہ گزارش کروں گا کہ وہ اس معاملہ میں محض تماشائی نہ بنے رہیں بلکہ اپنے رہوارِ قلم کو مہمیز دے کر اس کی باگ اس طرف موڑ دیں جہاں بیچارہ کاتب اپنے ناکردہ گناہ کی بدولت "گوئے چوگاں" بنا ہوا ہے۔

روشن صدیقی

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ازل، محرابِ ایوانِ محمدؐ
ابد، شمعِ شبستانِ محمدؐ

تشکر ہے بہ ہر انداز محدود
ہے لامحدود احسانِ محمدؐ

وہ عبدیت ہو یا ختمِ نبوّت
ہر اک عظمت ہے شایانِ محمدؐ

مکان و لامکاں روشن ہیں جس سے
وہ ہے مشکوٰتِ فیضانِ محمدؐ

ترحّم! مسندِ خلقِ عظیم
تفضّل! فرشِ ایوانِ محمدؐ

جفا کارانِ مکہ سرنگوں ہیں
ہے عفوِ عام فرمانِ محمدؐ

کوئی بدلہ نہیں ظلم و ستم کا
مگر لطفِ فراوانِ محمدؐ

اِدھر کانٹے بچھائے جا رہے ہیں
اُدھر گل ریز دامانِ محمدؐ

پناہیں ڈھونڈتے ہیں دشمنِ جاں
پناہِ کل ہے دامانِ محمدؐ

مساکین و یتامیٰ کی یہ قسمت
کہ ہیں خاصانِ خاصانِ محمدؐ

نشانِ عظمتِ نوعِ بشر ہیں
غلامانِ غلامانِ محمدؐ

بچھائے چشم و دل ارض و سما نے
جہاں پہنچا ہے فرمانِ محمدؐ

خراماں زندگی کا کارواں ہے
ردائے صبحِ صادق گل فشاں ہے

تری عقدہ کشائی کے تصدق
ہر اک مشکل کو آساں کر دیا ہے

زہے رحمت کہ فیضانِ نظر نے
بہائم کو بھی انساں کر دیا ہے

جو تھے غارت گرِ تہذیب اُن کو
تمدّن کا نگہباں کر دیا ہے

حیا و شرم کی پاکیزگی سے
مزیّن حسنِ ایماں کر دیا ہے

جمالِ زندگی بخشا ہے جس کو
مسیح و خضرِ دوراں کر دیا ہے

جو ذرّے پردۂ ظلمت میں گم تھے
اُنھیں مہرِ درخشاں کر دیا ہے

جنہیں خدّام کہتا تھا زمانہ
اُنھیں مخدومِ دوراں کر دیا ہے

غرورِ خواجگی کا سر جھکا کر
غلاموں کو بھی سلطاں کر دیا ہے

بنا کر بے نیازِ ساز و ساماں
امیرِ ساز و ساماں کر دیا ہے

ہٹا کر جبر اوہامِ کہن کو
اندھیرے میں چراغاں کر دیا ہے

بنا کر محنت و دولت کو یکدل
بڑی مشکل کو آساں کر دیا ہے

خزاں بنیاد ویرانوں کو تُو نے
گلستاں در گلستاں کر دیا ہے
وہ شمعیں آندھیوں میں جل رہی ہیں
جنہیں تُو نے فروزاں کر دیا ہے
بڑھا کر احترامِ صنفِ نازک
نگہبانِ دل و جاں کر دیا ہے
سکھا کر شیوۂ تہذیبِ مستور
ادب آموزِ ایماں کر دیا ہے
بشر کو دولتِ اخلاص دے کر
امینِ حُسنِ یزداں کر دیا ہے
بہشتِ سرمدی کی راحتوں کو
شریکِ دردِ انساں کر دیا ہے
بنایا ہے اُسے خیرِ مجسّم
جسے تُو نے مسلماں کر دیا ہے

تجھے دیکھا تو وجدان و یقیں نے کلامِ خالقِ اکبر کو سمجھا
خلوصِ بندگی کی روشنی میں جلالِ مسجد و منبر کو سمجھا
ہوئے روشن در و بامِ مدینہ تو والصبح اذا اسفر کو سمجھا
جمالِ اسوۂ کامل کو دیکھا تو مفہومِ لقد یسّرنا کو سمجھا
مسلماں جنّت و کوثر کا حاصل دلِ بیزار و چشمِ تر کو سمجھا
سراپا حُسنِ لامحدود ہے تو حیاتِ عشق کا مقصود ہے تو

وہی چشم و چراغِ زندگی ہے
کہ جس کو روشنی تجھ سے ملی ہے
مکمّل امتزاجِ دین و دنیا
یہ مشکل تجھ سے آساں ہو گئی ہے
حقیقت ماورائے خیر و شر ہے
کہ خیر و شر لباسِ آدمی ہے
سراپا درد جس کی زندگی ہو
وہ شایانِ حیاتِ سرمدی ہے
محبت، حُسنِ خاصانِ خدا کا
محبت جلوۂ پیغمبری ہے

محبت، بے غرض سب سے محبت
تری تعلیم کا حاصل یہی ہے
جسے پاسِ حقوقِ آدمی ہو
وہی راز آشنائے بندگی ہے
جسے قابو رہا دست و زباں پر
حضورِ حق مسلماں بھی وہی ہے
نہیں کچھ اسود و احمر پہ موقوف
مکرّم ہے وہی جو متّقی ہے
جسے آرام کی خو ہو وہ محتاج
جو ہے دلدادۂ محنت غنی ہے
جسے کہتے ہیں تقدیرِ الٰہی
وہی حُسنِ عمل کا نام بھی ہے
خدا کا آسرا ایمان روشن
توکّل خلق پر شرکِ جلی ہے
بہت کھوئے گئے راہِ طلب میں
کمالِ ترک سے منزل ملی ہے
جسے کوئی تمنّا ہو نہ حسرت
حریمِ ناز کے قابل وہی ہے
قرارِ جاں ہو ذکر و فکر جس کو
وہی درد آشنا مردِ ولی ہے
بہ ہر صورت زمیں کی بادشاہی
عبادِ حق کے قدموں پر جھکی ہے
جسے معروف و منکر کا رہے ہوش
وہ شایانِ خودی و بے خودی ہے
محبت بے غرض سب سے محبت
تری تعلیم کا حاصل یہی ہے
زمانہ تیرے گُن گاتا رہے گا
ترا احسان یاد آتا رہے گا

قرآن

عامر عثمانی

رات ہنگامِ تہجد کسی دیوانے نے گر کے سجدے میں خدا سے یہ کہا رو رو کر
اے کہ تو خالقِ کونین ہے بے ہمتا ہے ابنِ آدم کو نہیں تیری مشیت سے مفر
کیا یہی تیری مشیت ہے کہ دنیا میں کبھی اب نہ آزاد ہو شیطان کے پنجہ سے بشر
دین و ایماں کے سفینوں کو کنارا نہ ملے اور پڑتے ہی رہیں قلزمِ باطل میں بھنور
ہائے یہ جلوہ گہِ ناز، یہ تیری دنیا ہر قدم کفر و بغاوت ستم و فتنہ و شر
تیری قدرت کا یہ شہکار، یہ باغی انساں کفر آمادہ، خطا کوش، ستمگر، خودسر
مشرق و مغرب و قطبین، زمین و گردوں یورشِ لشکرِ طاغوت سے ہیں زیر و زبر
ایک پُر ہول اندھیرا ہے فضاؤں پہ محیط گُم ہے ظلمات کے طوفان میں ہر راہگزر
کچھ تو فرما! کہ زمانہ کے یہ احوال ہیں کیوں؟ راز کیا ہے کہ نہیں تیرے تغافل پہ اثر؟
مجرموں کو نظر انداز کرے گی کب تک تیری تقدیر و مشیت کی بہم اسرار نظر

کیا اندھیرے میں بھٹکتا ہی رہیگا انساں؟
کیا کبھی رات کے پہلو سے نہ پھوٹے گی سحر؟

●

آئی آواز کہ سجدے سے ذرا سر تو اٹھا ہم بھی دیکھیں تری فریاد و فغاں کے تیور
حیف اے عاجز و درماندہ و ناداں انساں تیرا یہ ترش تکلّم! یہ زبانِ خودسر!
تیرا یہ جوشِ تہی مایہ! یہ طرزِ بیباک! ہم پہ کچھ بھی نہیں اس نازشِ بیجا کا اثر
جنسِ ناکارہ ہے جو نازِ ہو محرومِ نیاز سیپ ہی سیپ ہے تیرا صدفِ بے گوہر
سُن! کہ ہم دیں گے نہیں تیرے سوالوں کا جواب کیا کریں دے کے، ترے پاس سماعت نہ بصر!
جس کو بخشا گیا قرآن سا شہکارِ عظیم حیف اُس کو نہ ہو اسرارِ مشیت کی خبر
دے دیا جس کو محمدؐ سا گرانمایہ رسُول وہ یہ چاہے کہ ملے اور کوئی پیغمبر؟
شرم اے بندۂ ناشکر! غلامِ بے حس! تُف ہے اے دیدۂ بے غیرت و محرومِ بصر
جا! اُٹھا گوشۂ نسیاں سے ہماری وہ کتاب جس کا جُزدان ہی غفلت سے تری خاک بسر
جس میں ہیں گفتہ و ناگفتہ سوالوں کے جواب جس میں مرقوم ہے ہر مسئلۂ جن و بشر
جس کا ہر لفظ ہے آئینۂ رازِ کونین! جس کے آغوش میں آسودہ ہے ہر شب کی سحر

اُس کے آئینہ میں قسمت کے خد و خال کو دیکھ
دوش و فردا کے قوانین کو پڑھ حال کو دیکھ

☆

غالب کے ایک شعر پر

شعر و سخن کے جہاں بہت سے روشن و تابناک پہلو ہیں، وہاں اس تصویر کا دھندلا رُخ بھی ہے غیر مُسلم شعراء کا تو ذکر ہی کیا ہے، مُسلمان شاعروں نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں، جو دینی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض ہیں، غالبؔ کے اسی قسم کے ایک شعر:-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

پر مولانا حکیم سید سعید احمد اسعدؔ ٹونکی مرحوم نے منظوم طنز کی ہے، اس نظم کے لئے ہم اپنے مخلص دوست جناب بسملؔ سعیدی ٹونکی کے شکر گزار ہیں۔ یہ نظم اس حیثیت سے ایک "علمی یادگار" کہی جا سکتی ہے۔ کہ یہ اب سے تقریباً ستر سال پہلے کی کہی ہوئی ہے:-

●

دیوانِ میرزا میں عفی عنہ دبنا — فرصت بہت ملی مجھے فکر و عبور کی
اُردو میں بعدِ مومنؔ اُنھیں پایا فخرِ فن — پائی نہ بُو کہیں بھی تو سُقم و قصور کی
ہاں اُن کی مستیوں کے گزاف ایسے چند شعر — حُجت ہیں اُن کی غفلت و سہو و فتور کی

"واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی"

ملتے وہ ہم کو تو ہم ادب سے یہ پُوچھتے! — خفاش کو خبر ہے کب اسرارِ ہور[1] کی
ہے یاد ایک جرم میں ملزم ہوئے تھے آپ — بگڑی تھی شان جیل میں عیش و سرور کی
پی سکتے خود نہ تھے تو پلا سکتے خاک آپ — واں سُوجھتی تھی آپ کو کب اتنی دُور کی
واعظ غریب محبسِ دُنیا میں قید ہے — پائے گا مے، رہائی پہ روزِ نشور کی
اُس دن سے خود پیئے گا، پلائے گا بھی مُدام — فارغ دلی میں دولتِ حور و قصور کی

ممنوع قید میں ہو شرابِ نجس تو پھر
قدرت ہو کیا کسی کو شرابِ طہور کی

[1] آفتاب

دوٗ غزلیں

عبدالمجید حیرت

اخلاص، اک ہنر ہے، جو سر کر سکے کوئی
کرنے کا ہے یہ کام، اگر کر سکے کوئی

ایسی بہشت لے کے کوئی کیا کرے جہاں
دوٗ دن بھی زندگی نہ بسر کر سکے کوئی

اس دَور میں کہ عشق و ہوس میں نہیں تمیز
اے کاش! قدرِ اہلِ نظر کر سکے کوئی

پوُچھے نہ کوئی بات، تو اس کا نہیں علاج
موقع ملے، تو عرضِ ہنر کر سکے کوئی

بیٹھا رہے بلائے شبِ غم لئے ہوئے
جب تک بھی انتظارِ سحر کر سکے کوئی

یہ عذرِ قحطِ بادہ حقیقت سہی مگر
ایسا بھی کیا کہ لب بھی نہ تر کر سکے کوئی

بیمارِ غم کو آج بھی امید ہے یہی
شاید علاجِ دردِ جگر کر سکے کوئی

حق بات سے جنہیں ہو خدا واسطے کا بیر
کیسے انہیں اُدھر سے اِدھر کر سکے کوئی

اس قرب پر تو اور بھی حیرت کی بات ہے
دل میں اگر کسی کے نہ گھر کر سکے کوئی!

شفقت کاظمی

ربطِ باہم کا جو امکان نہ پایا ہم نے
دل سے آخر تجھے اے دوست بھلایا ہم نے

ہم سے ہیں آہ وہی آج گریزاں کہ جنہیں
دلربائی کا ہر انداز سکھایا ہم نے

کیوں تری آنکھ پشیماں ہے مٹا کر ہم کو
اپنی قسمت میں جو لکھا تھا وہ پایا ہم نے

اُن سے تجدیدِ محبت کی ضرورت کیا تھی
مفت سوئے ہوئے فتنے کو جگایا ہم نے

ایک تسکین کی صورت تھی کہ مفقود رہی
ورنہ کیا کیا تری اُلفت میں نہ پایا ہم نے

پھر جلائے نہ کبھی دل میں امیدوں کے چراغ
یوُں ترے بعد ترا سوگ منایا ہم نے

☆

روحِ انتخاب

وہ کشتیاں جلا کر اس تحریک میں آئے تھے اور آ کر پھر انہوں نے اُن راہوں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا، جن کو چھوڑا تھا - وہ مردِ درویش تھے اور دُنیا کی آسودگی سے بے نیاز تھے، اللہ نے اُنھیں وہی موت دی جس پر ہر وہ شخص رشک کرے جو اس کی قدر جانتا ہے - انہوں نے اُنہی لوگوں کی شایانِ شان زندگی گزاری اور موت پائی جو کشتیاں جلانے والوں کے شایانِ شان ہوا کرتی ہے - جب وہ بیمار ہو کر بستر پر لیٹے تو اُن کے سرہانے کوئی عزیز نہ تھا - جب انہوں نے جان دی، تو وہ اپنے مقصد کے ساتھیوں کے درمیان گھرے ہوئے راہِ حق کی منزلیں لمحہ بہ لمحہ طے کر رہے تھے — اُن کے ساتھی موٹروں اور ٹرکوں میں سفر کرتے رہ گئے، لیکن چودھری صاحب کا قدم ہمیشہ سب سے آگے رہا - وہ فرشتوں کی گود میں آسمانوں کی منزلیں طے کر گئے - وہ ہم سب سے آگے نکل گئے - اُن کی زندگی قابلِ رشک تھی - اُن کی موت بھی قابلِ رشک ہی ہوئی - کون ہے جو اپنی دعا میں یہ نہ کہے کہ الٰہی! مجھے چودھری صاحب جیسی موت دے جو تیری ہی راہ میں، تیری ہی منزل میں، تیری ہی مرضی کے مطابق کلمہ بلند کرتے رہے

اب وہ ہمارے درمیان نہیں، ہم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے، سُن نہیں سکتے، لیکن دل کی خوش فہمیوں کا یہ حال ہے کہ وہ محسوس کرتا رہتا ہے گویا اب بھی وہ ہمارے درمیان ہیں - کہیں دَورے پر گئے ہیں، اور نہ جانے کس وقت اچانک آ جائیں - کدھر سے آ نمودار ہوں، اور کہیں "اسعد صاحب! خیریت تو ہے، دورہ طویل ہو گیا" - اب بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں ہمارے درمیان کام کر رہے ہیں - پروفیسر عبدالحمید صاحب سے انہوں نے خواب میں بہت ناراضگی کا اظہار کیا کہ "بھائی حمید صاحب! آپ نے سب جگہ مشہور کر دیا کہ چودھری علی احمد خاں کا انتقال ہو گیا - دیکھئے! تو میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں - کہاں انتقال ہوا ہے؟ آپ نے تسنیم میں لنبا چوڑا مضمون لکھ کر میرے بارے میں جگہ جگہ مشہور کر دیا کہ میں مر گیا ہوں" اور یہ واقعہ ہے کہ اب بھی لگا ہے گا ہے جب میں دفترِ حلقہ کے ساتھ والے کمرے میں ہوتا ہوں تو میرے دل میں بے نام سا احساس ہوتا ہے کہ ابھی قریبی کمرے سے کوئی آواز آئے گی!

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

(سوانح و تاثرات چودھری علی احمد خاں
مرتبہ :- اسعد گیلانی)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

یہ اُڑتی سی خبر طیور کی زبانی نہیں، ذوی العقول انسانوں کی زبانی سُنی گئی ہے کہ لاہور اور کراچی کے ڈاک خانہ والے بڑے پریشان ہیں کہ "مسلم لیگ" کی ڈاک آخر کس کو تقسیم کریں۔ اس لئے کہ اس ایک ـــ مسلم لیگ ـــ نام کی دو دو جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہی پرانی "مسلم لیگ" ہے، جس کو ایک شاعر نے دعا دیتے ہوئے کہا تھا کہ:-

اے نورِ نظر سلمک اللہ تعالیٰ

اور دوسری "مسلم لیگ" وہ ہے جس کی نام رکھائی کی خدمت علامہ مشرقی نے انجام دی ہے!

تقسیم ہند سے پہلے خاکساروں کی جماعت "چپ وراست" میں مشہور بلکہ ممتاز تھی۔ قائد اعظم ہوں، گاندھی جی ہوں، مہاسبھا کے پردھان ہوں یا جمعیۃ العلماء کے صدر۔ اس جماعت کو "سلامی" دینے سے کام! پریڈ کرنے اور سلامی دینے میں خاکساروں کو یدِطولیٰ ہی نہیں "قدِطولیٰ" بھی حاصل تھا۔ اور اس معاملہ میں کافر و مسلم کی بھی کوئی تخصیص اور تمیز نہیں تھی۔ سلامی دینے کے لئے بس کسی کا مشہور ہونا ضروری تھا۔

"جماعت سازی" کی تاریخ میں یہ مثال بھی اپنا آپ ہی جواب ہے کہ جس لیڈر نے کسی جماعت کو بنایا ہو، وہی جھنجلا کر یا حالات سے مایوس ہو کر، اُس جماعت کو زندہ دفن کر کے "آنجہانی" بلکہ "مرحوم و مغفور" بنادے!

خیر یہ تو تقسیم ہند سے پہلے کی باتیں ہیں، پاکستان بننے کے بعد اس مُردے میں پھر جان ڈالی گئی اور اس جماعت کے عجیب و غریب لیڈر کی ایک ہی پھونک میں:-

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا! کہ برسوں کا مُردہ کھڑا ہو گیا!

اب کی بار اس جماعت نے "اسلام لیگ" کا روپ دھار کر اور نیا چولا بدل کر وردیوں کو پہنا اور بیلچوں کو سنبھالا۔ اور "چپ وراست" کی صدائیں کانوں میں آنے لگیں! کئی سال تک یہ نام اور کام چلتا رہا۔ مگر چند مہینے ہوئے کہ "اسلام لیگ" کے لیڈر کو اتنی دور کی سوجھی کہ اتنی دور کی شاید ہی کسی کو سوجھی ہو گی! اس سوجھ بوجھ نے دنیا کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے ـــ!

دن دہاڑے، کھلے خزانے، ڈنکے کی چوٹ، "مسلم لیگ" کے نام پر چھاپہ مار کر اور اس نام کو ہتھیا کر "مرکزِ عالی" سے فرمان واجب الاذعان صادر ہوا کہ۔ آج سے ماہدولت نے "اسلام لیگ" کا نام بدل کر "مسلم لیگ" رکھ دیا۔ "آسمان پر تھگلی لگانا" یا "آسمان سے تارے توڑ لانا اور ہتھیلی پر سرسوں جمانا"۔ یہ ضرب المثل اور کہاوتیں اب تک سُنی ہی سُنی تھیں مگر ان کو پورا ہوتے دیکھ بھی لیا۔

"مسلم لیگ" والے بیچارے تاؤ کھا رہے ہیں اور بھنّا رہے ہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ ابھی تک تو اس کا توڑ ان کی سمجھ میں آ نہیں سکا ـــ!

یہ جو کچھ ہوا سو ہوا ہی، علامہ مشرقی کے ذہن نادرہ کا رکتا نہ تزین شاہکار یہ ہے کہ پاکستان کے صدر مسٹر سکندر مرزا (با لقابہ) کو وہ مشورہ دے رہے ہیں بلکہ نصیحت کر رہے ہیں کہ پاکستان میں کسی ایک سیاسی جماعت کو بھی باقی نہ رہنے دو۔ تمام جماعتوں کو توڑ تاڑ کر، اور ان کا تیا پانچہ کر کے "کوس لمن الملکی" بجاؤ اور "جمہوریت" کی ارتھی کا پوری طرح کریا کرم کر دو، کتنا صائب مشورہ ہے، اے جزاک اللہ! کیا اچھی تُلی رائے ہے، اے سبحان اللہ! بلائیں لینے اور واری ہو جانے کو جی چاہتا ہے اس مشورے کے دینے والے کے۔ اس فکر و نظر اور دل و دماغ کے لوگ صدیوں میں جا کر کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سمجھ اور بدھی کا تھوڑا سا حصہ بس "ماسٹر تارا سنگھ" کو نہ جانے کہاں سے ہاتھ آ گیا ہے — ورنہ:۔

این دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

علامہ اقبال نے مسلمان عورت کو نصیحت کی تھی کہ:۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر! کہ در آغوش شبیرے بگیری!

مگر پاکستان کی "بیگمات" نے اس نصیحت کو بالکل اُلٹ کر کے دکھا دیا۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمیں تو "گریٹا گاربو" بن کر "پنہاں" نہیں "آشکارا" ہونا ہے۔ پوری جلوہ سامانیوں اور رنگ آرائیوں کے ساتھ۔ اور اپنے آغوش میں اُن نونہالوں کو پرورش کرنا ہے جو منٹو کے افسانوں اور بلبل چودھری کی "سنگیت" کا موضوع بن سکیں! ہمارے ساونت، جیالے اور سورما نوجوان اب میدانِ جہاد میں نہیں کرکٹ کے فیلڈ میں اپنے جوہر دکھا کر دنیا سے اپنا لوہا منوائیں گے!

جو مرد، ان "بیگمات" کی تمناؤں کا ساتھ دے رہے ہیں، وہی خیر سے علامہ اقبال کے کلام اور پیام کے سب سے بڑے شیدائی اور فدائی ہیں! آہ! مظلوم اقبال!

چھاجوں مینہ پڑ رہا تھا، دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ یعنی انگریزوں کی زبان میں "بلی اور کتے برس رہے تھے"۔ مکان کے کرایہ دار نے مالک مکان سے شکایت کی کہ آپ کا مکان بُری طرح ٹپک رہا ہے اور اب تو مکان کی یہ حالت ہے کہ کمروں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہے، مجھ غریب کی مُرغیاں ڈوبی جا رہی ہیں۔

مالکِ مکان نے اس پر قدرے جھنجلا کر، مگر پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ جواب دیا:۔

"تو آپ مُرغابیاں کیوں نہیں پالتے۔"!

کالیستھ کا ایک لڑکا اپنے قصبہ سے باہر کسی دوسرے شہر میں فارسی تعلیم حاصل کرنے کیلئے گیا تھا، اُس کے چند دن کے بعد اپنے باپ کو خط لکھا، اس کے باپ کا نام تھا "چھیدی لال"۔ پتہ کی عبارت تھی:۔

بخدمت قبلہ گاہی "سُوراخی سُرخ"!

ڈاکیہ کالستھوں کے محلہ میں اس خط کو لئے گھوم رہا تھا۔ آخر ایک بوڑھے کالستھ نے اس معمہ کو حل کیا کہ یہ اپنے "چھیدی لال" کے لڑکے کا خط ہے!

ایک محفل میں شعر و سخن کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا:۔

"بھائیو! یہ تو بتاؤ یہ فانی بدایونی کہاں کے رہنے والے تھے"!

ایک دولت مند آدمی کے یہاں قدیم مخطوطات کا ذخیرہ تھا۔ مہمانوں کو قلمی کتابیں دکھا رہے تھے، مصاحف کی باری آئی تو بولے:۔

"یہ دیکھئے! یہ قرآن دو ہزار سال پہلے کا لکھا ہوا ہے"۔

ماہ جون ۱۹۵۷ء میں

"فاران" کا عظیم الشان

توحید نمبر

آرہا ہے

- جس سے غلط عقیدوں کی اصلاح ہوگی۔
- جو شرک و بدعت کے بتوں پر ضرب کاری لگائے گا۔
- جس سے علم و تحقیق کی ایمان افروز راہیں کھلیں گی۔
- اردو ادب میں ایک انقلابی اقدام اور مثالی نمونہ۔

لکھنے والے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ مولانا مفتی محمد شفیع۔ مولانا قاری محمد طیب۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد اسمٰعیل سلفی۔ مولانا محمد ناظم ندوی۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ مولانا عبدالحمید ارشد۔ مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی) مولانا محمد اسحٰق سندیلوی۔ مولانا محمد اویس ندوی۔ مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری۔ مولانا محمد مجیب اللہ ندوی۔ مولوی ابو منظور شیخ احمد۔ مولانا ابوالبیان حماد۔ محترمہ عطیہ خلیل عرب۔

عربی کے سب سے بڑے انشاء پرداز

علامہ البشیر براہیمی الجزائری نے اپنی علالت کے باوجود "توحید نمبر" کے لئے مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس کے ترجمہ کا کام علامہ موصوف مولانا محمد عادل قدوسی کے سپرد فرما گئے ہیں۔

ان گرانقدر مقالوں کے علاوہ شاعروں کے نادر منظومات بھی ہوں گے اور ماہر القادری مدیر فاران کا "نقش اول" بھی۔

ضخامت تین سو صفحات۔ سرورق رنگین و دلکش۔ قیمت تین روپے (محصول ڈاک آٹھ آنے)

مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ (چھ روپے آٹھ آنے) ہی میں یہ معرکہ آرا توحید نمبر دیا جائے گا (اس میں رجسٹری کی فیس شامل ہے)

ہندوستان میں:- منیجر دفتر "الحسنات" رام پور (یو پی)

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

غلام علی

ایک اہم مکتوب

۴۔ رمضان المبارک لاہور۔

مکرمی ومحترمی جناب ماہر صاحب ـــ ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ !

مزاج گرامی! جنوری کے "فاران" میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی کتاب پر آپ کا تبصرہ اور پھر مارچ میں اُن کا مکتوب نگاہ سے گزرا۔ میرا ارادہ اسی وقت ہوا تھا کہ آپ کی خدمت میں ایک عریضہ ذرا مفصل ارسال کروں، مگر میں بیمار ہوکر دیہات چلا گیا اور اب رمضان میں واپس ہوا ہوں، تعجب ہے کہ مولانا مودودی نے ۲۲ سال قبل پرویز صاحب کے اُس وقت کے خیالات کو سامنے رکھ کر جو بات کہی تھی، مولانا اسمٰعیل نے اُسے بگاڑ کر اس انداز سے نقل کر دیا ہے، جس سے پڑھنے والا خواہ مخواہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے یہی بات کہی ہوگی اور آجکل کے پرویز کے متعلق کہی ہوگی۔ پرویز صاحب کے موجودہ مسلک کے بارے میں مولانا مودودی کی رائے ڈھکی چھپی نہیں ہے، زمانہ قریب میں اُس کے اظہار کا انھیں بارہا اتفاق ہوا ہے، سمجھ میں نہ آسکا کہ ان تازہ آراء سے صرفِ نظر کرکے مولانا اسمٰعیل صاحب نے خاص طور پر سنہ ۳۵ء ہی کی رائے کو نقل کرنا کیوں ضروری خیال فرمایا۔ مزید تعجب اس امر پر ہے کہ جب اس کی جانب مولانا موصوف کو توجہ دلائی گئی تو فرماتے ہیں کہ "سنہ ۳۵ء میں پرویز صاحب کے منکرِ حدیث نہ ہونے کا ثبوت کیا ہے اور جو تجزیہ اُن کا مولانا مودودی نے کیا ہے اس کی ذمہ داری پرویز صاحب لیتے بھی ہیں یا نہیں ؟" مولانا اسمٰعیل صاحب مزید فرماتے ہیں کہ "مولانا مودودی کا یہ تجزیہ اگر درست ہے تو مضحکہ خیز جہالت ہے اور اسے گمراہی نہ سمجھنا علم و دیانت کے ساتھ ذلیل ترین مذاق ہے" مولانا موصوف نے عالمانہ جلال میں جو اندازِ گفتگو اختیار فرمایا ہے۔ اُس کے بارے میں تو مجھ جیسا عامی کیا لب کشائی کر سکتا ہے، البتہ نفسِ مسئلہ کے بارے میں ایک دو امور کی وضاحت میں ضروری خیال کرتا ہوں ـــ !

آج سے ۲۰۔۲۵ سال قبل پرویز صاحب ایک منکر حدیث کی حیثیت سے متعارف نہیں ہوئے تھے، اُس زمانہ میں وہ دبی زبان اور معصومانہ انداز میں متعلمانہ مضامین اور مستفسرانہ مراسلات لکھا کرتے تھے، اور وہ "ترجمان" کے علاوہ "معارف" اور بعض دوسرے دینی اور علمی جرائد میں بھی چھپا کرتے تھے، پرویز صاحب کے جس مسلک پر مولانا مودودی نے اظہار رائے کیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری صاحب کی کتاب "تعلیماتِ قرآن" سنہ ۳۷ء میں چھپی تھی، جس میں بنیادی نقطہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی رہنمائی اور فلاح کے لئے صرف قرآن کافی ہے، مولانا مودودی نے اسی وقت "ترجمان" میں اس پر مفصل تنقید کرکے اس کی خامیوں کو واضح کیا تھا۔ اور منصب رسالت اور اطاعت رسول کی دینی اہمیت کو بیان کیا تھا۔ اس تنقید پر پرویز صاحب نے ایک طویل مراسلہ مدیر "ترجمان" کے نام بھیجا تھا، جس میں انہوں نے بعض امور میں مدیر "ترجمان" سے اور بعض میں صاحبِ "تعلیمات" سے اختلاف ظاہر کیا تھا اور بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت طلب کی تھی۔ اس مراسلے کے جواب

میں مولانا مودودی نے وہ مضمون لکھا تھا۔ جس کا اقتباس مولانا اسمٰعیل صاحب نے نقل کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ مولانا مودودی نے ۲۲ سال قبل جو رائے زنی کی تھی وہ بھی پرویز صاحب کے خاص اس مسلک کو نگاہ میں رکھ کر کی تھی جو انہوں نے اپنے مراسلہ میں ظاہر کیا تھا۔ "تعلیماتِ قرآن" پر تنقیدی مضمون، پرویز صاحب کا مراسلہ اور مدیر "ترجمان" کا جوابی مضمون، یہ سارا مواد آج بھی تفہیمات میں وہیں یکجا موجود ہے، جہاں سے مولانا اسمٰعیل نے اقتباس لیا ہے، میں پرویز صاحب کے مراسلے کے چند جملے یہاں نقل کئے دیتا ہوں :-

"اگرچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حضورؐ کے فیصلے بھی اس ذیل میں رکھے ہیں جو رسالت کی حیثیت لئے ہوئے نہ تھے (غالباً اُن کی مراد وقتی فیصلوں سے ہوگی) اور صاحب "تعلیمات" نے بھی امارت کو جو رسالت سے الگ کیا ہے تو غالباً اسی بناء پر۔ لیکن میں تو حضورؐ کے قضایا متعلقہ دین کو عین تبلیغ رسالت ہی میں سمجھتا ہوں، اور واجب الاتباع۔۔۔۔۔۔ جہاں تک نبی کریمؐ کا تعلق ہے، امور دین میں حضورؐ کی اطاعت کیا بحیثیت رسُول اور کیا بحیثیتِ امیر، قیامت تک کے لئے ہے۔ اُس میں نہ اس وقت تک کسی کو منازعت کا حق تھا، نہ آج ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ "خلیفہ ان کونسل" کی حیثیت بھی واضع قوانین کی نہیں ہوگی، بلکہ جہاں تک اصولِ قانون کا تعلق ہے وہ تو کتاب و سنّت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منضبط ہوچکے۔ اب ان اصول کو نافذ کرنا یا ان کی روشنی میں جزئی امور میں قواعد مرتب کرنا یہ اس مجلس کا فریضہ ہوگا۔۔۔۔۔۔ آخر میں اتنا گزارش کرنا ضروری ہے کہ چونکہ میں نے اس میں آپ کو مخاطب کیا ہے، اس لئے وہی امور پیش کئے گئے ہیں جن میں مجھے آپ کے جواب کے بعد مزید اطمینان کی ضرورت نظر آئی۔ رہے وہ امور جن سے اتفاق ہے یا صاحبِ "تعلیماتِ قرآن" سے جن امور میں اختلاف ہے، انھیں دہرانا تحصیلِ حاصل سمجھا گیا ہے اور یہ گزارشات بھی محض تطمینِ قلبی ہیں"

دلوں کی حالت تو علیم بذات الصدور ہی جان سکتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کے اقتباساتِ بالا کو پڑھ کر کیا آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیس سال قبل کے پرویز اور آج کے پرویز میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے، کیا اُس وقت پرویز صاحب، حافظ جیراجپوری صاحب سے اپنے اختلاف کا صاف اظہار نہیں کر رہے تھے، حالانکہ آج پرویز صاحب اور اُن کے ہمنوا جیراجپوری صاحب کو اپنا رئیس الطائفہ گردانتے ہیں۔ پرویز صاحب کے اُس وقت کے بعض نظریات بھی یقیناً محلِّ نظر تھے (خود مولانا مودودی صاحب نے اُن کی غلطیوں کی نشان دہی اُسی وقت کردی تھی) لیکن کیا ازروئے انصاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ انکارِ حدیث کا جو شوخ رنگ آج پرویز صاحب کی تحریروں میں موجود ہے، وہ اُس وقت بھی موجود تھا؟ مولانا مودودی نے جو بات اُس وقت پرویز صاحب کے بارے میں کہی تھی اُسے تو خیر "مضحکہ خیز جہالت" اور "علم و دیانت کے ساتھ ذلیل ترین مذاق" قرار دے دیا گیا۔ لیکن علم و دیانت کے احترام و توقیر کی آخر یہ کونسی اچھوتی قسم ہے کہ جس کی زد سے ہر غلط کار کو پیدائشی ضالّ اور مضلّ ہی قرار دیا جائے۔ کیا پرویز صاحب کی موجودہ گمراہی اور بے راہ روی ثابت کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں مادر زاد منکرِ حدیث اور معاندِ سنّت ثابت کیا جائے؟ واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب، اور اُن کے متبعین آج جس مقام پر ہیں، کل وہ اس سے کوسوں دُور تھے۔ یہ حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دوسروں کے تضادات کو ثابت کرتے پھر رہے ہیں۔ حالانکہ خود اُن کے

حال کے آئینہ میں انھیں اپنے ماضی کی بہت سی تصویریں ایسی دکھائی جا سکتی ہیں، جنہیں دیکھ کر وہ دم بخود رہ جائیں مگر اتنا فالتو وقت ہر شخص کے پاس کہاں ہے؟

مولانا اسمٰعیل صاحب نے یہ بات بھی خوب فرمائی ہے کہ جو تجزیہ پرویز صاحب کا مودودی صاحب نے کیا ہے معلوم نہیں پرویز صاحب اس کی ذمہ داری لیتے بھی ہیں یا نہیں؟ میں مولانا اسمٰعیل صاحب سے باادب پوچھتا ہوں کہ ۱۹۳۵ء کے تجزیہ کو آپ چھوڑیئے، پرویز صاحب کے جو تجزیئے آپ، مولانا مودودی اور دوسرے علماء کرام آئے دن کرتے رہتے ہیں کیا ان کی ذمہ داری پرویز صاحب قبول فرماتے ہیں؟ وہ تو آج بھی باصرار اور بتکرار یہ فرماتے ہیں کہ میں تو کتاب وسنت کا شیدائی ہوں اور انکارِ حدیث کا الزام مجھ پر ناروا بہتان ہے۔ میرے محترم! پرویز صاحب کی جانب سے توثیق وتسلیم کا سوال نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ جو تجزیہ بھی کیا جائے وہ بجائے خود مبنی بر انصاف وحقیقت ہے یا نہیں اور ہمارے اور پرویز صاحب کے علاوہ ایک تیسرا غیر جانبدار آدمی بھی اُسے صحیح اور منصفانہ قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟

مولانا مودودی کے اقتباس کے بارے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے یہ تو واضح کر دیا کہ کچھ کاتب کی غلطی ہے، کچھ مولانا مودودی کا مفہوم وخیال ہے، جسے اختصار اور ترجمانی کے بعد دوسرے الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے (گویا کچھ سہوِ کتابت ہے، کچھ کلام مُدرج ہے اور کچھ روایت بالمعنیٰ ہے) لیکن ان سب علل کے جمع ہو جانے کے بعد مضمون جس طرح غتربود اور مدعا جس طرح خبط ہوا ہے، اُسے میں صرف ایک مثال سے واضح کئے دیتا ہوں، اور یہ مثال اس عبارت سے متعلق ہے جسے مولانا اسمٰعیل خود "اصل اقتباس" قرار دے کر اس کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ مولانا مودودی نے چکڑالوی اور جیراجپوری گروپ سے پرویز صاحب کا تقابل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اُن کا (یعنی پرویز صاحب کا) مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے" مولانا اسمٰعیل صاحب نے مقراضِ اختصار کو حرکت میں لاتے ہوئے اس فقرہ کو یوں کر دیا۔ "اُن کا مسلک حق سے بہت زیادہ قریب ہے" اور خط کشیدہ حصہ حذف کر دیا۔ کیا کوئی انصاف پسند انسان اس سے انکار کر سکتا ہے کہ دونوں فقروں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں کہوں کہ "سکھر کراچی کی بہ نسبت لاہور سے قریب تر ہے"۔ اور کوئی شخص میرے قول کا خلاصہ یوں نقل کر دے کہ "سکھر لاہور سے قریب تر ہے"۔ ظاہر ہے کہ میری بات کی ایسی تلخیص سُن کر ہر ذی فہم آدمی اُلجھن اور حیرت میں مبتلا ہو جائے گا۔

میں اپنی گزارشات ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کروں گا کہ اپنے مولانا اسمٰعیل صاحب کی کتاب کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں، اُن سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ تالیف لطائف ونوادر سے بھی خالی نہیں۔ مثلاً صرف مولانا سید سلیمان مرحوم سے درگزر فرما کر عام ندویوں کو (بشمول مصنف سیرت النبی مولانا شبلی) قریب قریب منکرینِ حدیث کی صف میں لا کھڑا کرنا ایک سنگین لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

مجھے جماعتِ اسلامی یا اہلِ ندوہ کی وکالت نہیں کرنا ہے مگر میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ منکرینِ حدیث یا حدیث کا اپنے اندازِ فکر سے استخفاف کرنے والوں کے ساتھ ساتھ جماعتِ اسلامی اور ندوہ والوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک کر "انکارِ حدیث" کے باڑے میں بند کرنے کی کوشش کا نتیجہ کہیں یہ تو نہ نکلے گا (کہ کچھ اہلِ حدیث حضرات کو چھوڑ کر) عامۃ المسلمین منکرینِ حدیث سے متوحش ومتنفر ہونے کے بجائے اُن سے اور زیادہ قریب اور مانوس ہونے لگیں گے اور منکرینِ حدیث بھی بجا طور پر یہ کہہ سکیں گے کہ ؎

گر کافری است ایں، بخدا سخت کافرم!

۱؎ یعنی اُن کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں ہیں، لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم

ہماری نظر میں

کتاب الآثار | مرتب کردہ:- حضرت امام محمد ابن حسن شیبانی رحمتہ اللہ علیہ - ترجمہ معہ فوائد :- ابو الفتح محمد صغیر الدین - ضخامت ۲۳۶ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت آٹھ روپے۔

ملنے کا پتہ :- محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، مقابل مولوی مسافر خانہ - کراچی -

یہ کتاب اُن احادیث و آثار کا مجموعہ ہے جو امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی روایت سے اُن کے جلیل القادر شاگرد امام محمد شیبانی رحمتہ اللہ علیہ نے نقل کئے ہیں۔ جن کی تعداد نوسَو کے قریب ہے - یہ کتاب فقہ کے سینکڑوں مسائل پر مشتمل ہے۔ اصل حدیث یا اثر کے عربی متن کے محاذ میں اُردو ترجمہ ہے - جس سے اُردو جاننے والے پُوری طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں — !

فقہ حنفی کی یہ خصوصیت ہے کہ دینی مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "آخری عمل" کو زیادہ ترجیح بنایا گیا ہے، کوئی شک نہیں تفقہ فی الدین میں امام ابو حنیفہؒ اپنی آپ نظیر تھے - اور حُسنِ اتفاق سے اُن کو شاگرد بھی ایسے ملے جن سے یہ اندازِ تفقہ اور نکھر گیا !

"کتاب الآثار" میں کہیں کہیں بعض مسائل میں کھٹک بھی پیدا ہوئی مگر صرف دل کی "کھٹک" کی بناء پر ہم اُن کو رد کرنے کی جسارت بیجا نہیں کر سکتے - ہاں! اُن کے مقابلہ میں زیادہ قوی حجت اور دلیل (حدیث واثر سے) مل جائے تو پھر ان کو ترک کرنے میں ہم صرف اس لئے باک نہیں کریں گے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں۔ "تقلید" میں شدّت اور غلو مناسب نہیں۔ ہر چیز کو اُسی کی حد میں رکھنا چاہیئے !

اس کتاب پر "مقدمہ" مولانا عبد الرشید نعمانی نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ فقہ حنفی کے موصوف پُرجوش مبلغ اور مقلد ہیں اور یہ جوش اُن کے اس مقدمہ میں جگہ جگہ جھلکتا ہے !

محمد سعید اینڈ سنز نے "کتاب الآثار" کا اُردو ترجمہ چھاپ کر، دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے - اب رہے فقہی اختلافات، تو یہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، مگر یہ دین کی اصل نہیں ہیں - ان پر علمی گفتگو تو ہو سکتی ہے مگر نزاع برپا نہیں کرنی چاہیئے - اور "تقلید" میں "اطاعت" کا رنگ پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے کہ دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی انسان کی اطاعت "منصوص" نہیں ہے — !

اسلام اور مسلمان - جلد اول، حصہ اول | از:- صولت علی خاں - ضخامت ۴۸، صفحات بڑا سائز قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ :- مصنف سے (اسٹینڈرڈ الیکٹرک ہاؤس، مقابل میونسپل آفس، کراچی — !

نواب صولت علی خاں رام پوری ایک خاموش قومی کارکن اور حق پسند وحق گو مسلمان کی حیثیت سے تو مخصوص حلقہ میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مگر اُن کی اس کتاب کو پڑھ کر پہلی بار اس کا علم ہوا کہ موصوف ایک مفکر اور صاحب نظر انشا پرداز بھی ہیں۔ اپنی اس تصنیف کے مقدمہ میں انہوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ "تاریخ اسلام" نہیں، بلکہ "تاریخ مسلمین" تھیں، وہ کہتے ہیں کہ "تاریخ اسلام" کا اصلی ماخذ قرآن مجید ہی ہوسکتا ہے!

کتاب کے پہلے حصہ میں حقیقتِ عالم، ذات وصفاتِ خالق، ربوبیت اور ارتقاء جیسے نازک اور لبیط مسائل سے فاضل مصنف نے بحث کی ہے، اور استدلال اور اظہار وبیان میں بڑی دقت نظر اور تعمقِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ ڈارون کے نظریہ تنازع للبقاء کی تو انہوں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ انہوں نے وزنی دلیلوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ نظامِ کائنات "تنازع" سے نہیں بلکہ "توافق" سے چل رہا ہے!

"وحدتِ وجود" کے بارے میں اُن کی یہ رائے ہے:۔

> "نظریہ وحدتِ وجود ذاتِ بے کیف وکم کو کیف وکم میں تبدیل کرکے ممکن العلم اور قابلِ تمثیل بنانے کی ناکام کوشش کا دوسرا نام ہے۔ جو عباسی عہد میں عجمی فلسفوں کے ساتھ مسلمانوں میں رائج ہوا۔ اور جو اسلامی توحیدِ بے کیف وکم سے بالکل مختلف چیز ہے، دراصل مسلمانوں میں اسلامی زندگی کے زوال کی ابتداء وحدتِ وجود کی ابتداء سے ہوئی اور اسلامی زندگی کے زوال کی انتہا اُن مجلسوں پر ہوئی جن میں مسلمانوں کو اس طرح کے کلام پر وجد آنے لگا:۔
>
> خود زدی بانگ انا الحق خود سر دار آمدی۔
>
> خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔
>
> فارغم از کبر واز حرص وہوا　　من خدایم، من خدایم، من خدا　　(معاذ اللہ)

اس کتاب میں بعض قرآنی آیات کی تشریح سائنٹیفک انداز میں کی گئی ہے، اس لئے کہیں کہیں "تفسیر بالرائے" کا رنگ آگیا ہے، بعض مقامات ہیں بھی بہت نازک! تخلیقِ عالم، ولادتِ آدم وحوا، جمادات، نباتات اور حیوانات کا تدریجی ارتقاء، یہ مسائل شرح وبیان میں آکر محلِ غور ہو ہی جاتے ہیں۔ سلامتی قرآن کے دیئے ہوئے اجمالی علم وخبر ہی پر ایمان لانے میں ہے!

بہرحال "اسلام اور مسلمان" اہل فکر ونظر کو چونکا دینے والی کتاب ہے، فاضل مصنف کو "من صنّف فقد استھدف" کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

جدید انشاء فارسی | مرتبہ:۔ پروفیسر اسرار احمد خاں (ایم اے) اور پروفیسر عبدالغفور خاں (ایم اے) ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نفیس پبلیکیشنز ۲ لوئر مال لاہور

یہ کتاب فارسی کی درمیانی جماعتوں (Intermediate Classes) کے لئے مرتب کی گئی ہے، اس میں رودکی سے لے کر سید محمد جمال زادہ تک کے حالات سلیس فارسی میں ملتے ہیں۔ اس لئے طلباء کے علاوہ فارسی سے ذوق رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ معلومات آفریں ثابت ہوگا۔ اس کے بعد فارسی نثر کے اقتباسات دیئے

گئے ہیں اور آخر میں "ضرب الامثال" درج ہیں - جن کا رنگ یہ ہے :-

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا :-	غریقے دست اندازد بہ کاہے
دو ملاؤں میں مرغی حرام :-	دیگِ شراکت بجوش نمی آید
دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا :-	ازیں جا ماندہ وازاں جا راندہ
جتنی چادر ہو اُتنے پاؤں پھیلاؤ :-	آب بقدرِ ظرف باید گرفت

چودھری علی احمد خاں

مرتبہ :- اسعد گیلانی - ضخامت ۳۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب - مجلد، خوبصورت رنگین گردپوش کے ساتھ - قیمت چار روپے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور -

یہ کتاب چودھری علی احمد خاں مرحوم کے سوانح حیات اور اُن کے دوستوں، عزیزوں اور قدر دانوں کے تاثرات پر مشتمل ہے، "شرکتِ احبابِ مرحوم" (لاہور) کی زیرِ نگرانی یہ کتاب مُرتب ہوئی ہے، جس کے ارکان حسبِ ذیل ہیں:
اسعد گیلانی (لائل پور) پروفیسر عبدالحمید ایم اے (گوجرانوالہ) شیخ قمرالدین (لاہور) اور محمد صدیق الحسن گیلانی (راولپنڈی) — کتاب کی ترتیب :-
نگاہِ اولیں — مقدمہ — سوانح — الم نامے — تحریریں — تاثرات — نگاہِ واپسیں !

چودھری علی احمد خاں مرحوم بدنام ترین محکمہ پولیس کے ایک افسر تھے - مگر قبولِ حق کی صلاحیت اُن میں موجود تھی، دین سے شغف پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی تو اچھی خاصی باعزت ملازمت چھوڑ کر، بہت ہی معمولی سے قصباتی ہوٹل بلکہ یوں کہیئے نان بائی کی دکان کو روزگار کا ذریعہ بنالیا - اُن کی زندگی میں اسلامی انقلاب سب سے زیادہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں نے پیدا کیا، پھر وہ باضابطہ جماعتِ اسلامی میں شامل ہوگئے اور ایک مثالی کارکن بن کر کام کیا !

چودھری صاحب مرحوم نے جماعتِ اسلامی میں آنے کے بعد سچ مچ ایک مردِ مجاہد کی طرح زندگی بسر کی - انتظامی صلاحیت اُن میں تھی، تقریر و تحریر کا ملکہ اپنی ذاتی کوشش سے انہوں نے پیدا کرلیا تھا - مشقت اور سادہ زندگی کے وہ خوگر ہوگئے تھے، خدمتِ خلق کا یہ عالم کہ پنجاب میں جب سیلاب نے تباہی مچائی اور انہوں نے جماعتِ اسلامی کی زیرِ ہدایت سیلاب زدگان کی امداد کے لئے کام کرنا شروع کیا تو اُن کے گھر سے خط آیا کہ تمہارا بچہ بلال احمد بیمار ہے - چودھری صاحب نے اس پر دل کڑا کرکے کہا :-

"یہاں سینکڑوں اور ہزاروں بلال احمد موت و حیات سے کشمکش کررہے ہیں،
میں اُن کو چھوڑ کر کیسے آؤں "

اور بالآخر اُن کے جگر کا ٹکڑا موت کی نذر ہوگیا !

چودھری علی احمد خاں کی دو بیویاں تھیں، مگر اس پر بھی اُن کی خانگی زندگی بہت خوشگوار تھی - بیویوں کے درمیان وہ انصاف برتتے تھے، انہوں نے ذاتی مطالعہ کے ذریعہ اپنی استعداد و قابلیت کو علم کی اُونچی سطح تک پہنچادیا تھا، خدمتِ دین کے بعد اُن کو سب سے زیادہ دلچسپی کتابوں سے تھی، اور یہ دلچسپی بھی دین ہی کے لئے تھی -

علامہ اقبالؔ کی شاعری کے دل وجان سے عاشق تھے۔ مگر ایک بحث میں اظہارِ حق سے بھی نہ چوکے۔ فرمایا:-

"اقبالؔ کے پاس ایک جذبہ تھا وہ اس نے دیا، عمل اس کے پاس تھا ہی نہیں وہ دیتا کہاں سے"!

جناب اسعد گیلانی نے یہ کتاب ترتیب دے کر دین واخلاق اور علم وادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے، کتاب کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ کئی مقامات پر ہماری آنکھیں بے اختیار آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔

(صفحہ ۲۹) "وہ اپنی برادری کے دوسرے بچوں کی طرح اگرچہ بہت زیادہ چاک چوبند تھے"۔ "چاق چوبند" لکھنا چاہیئے تھا گاؤں میں "چاک" آسودہ حال کے معنی میں ضرور بولتے ہیں۔ مثلاً "فلاں کسان خوب چاک ہے"۔

(صفحہ ۵۳) "بے نیل ومرام واپس ہوا"۔ "واؤ" کا استعمال قطعاً نادرست ہے۔ لکھے پڑھے لوگ "بے نیلِ مرام" بولتے اور لکھتے ہیں۔

(صفحہ ۱۷۶) "کڑکتی دھوپ پڑ رہی تھی"۔ جاڑوں کی شدت کو "کڑاکے کے جاڑے" کہتے ہیں، تیز دھوپ کو "چلچلاتی دھوپ" بولتے ہیں۔ (صفحہ ۲۶۸) "اس زمانہ میں مجھے یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی"۔ "اس زمانہ میں یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی" لکھنا تھا!

کتاب اپنے موضوع پر خوب نہیں خوب تر ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد دل بول اٹھتا ہے کہ اس دور کے مسلمان کم سے کم "چودھری علی احمدؒ" ہی بن جائیں تو اللہ کے دین کو غلبہ حاصل ہو سکتا ہے!

میزانِ شعر از:- آغا شیدا کاشمیری۔ ضخامت ۳۰۴ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور

اس کتاب میں:-

نقشِ فریادی ـــ دستِ صبا:-	از	فیض احمد فیضؔ۔
تلخیاں ـــ ...	"	ساحر لدھیانوی۔
جلال وجمال ...	"	احمد ندیم قاسمی۔
نشاطِ رفتہ ...	"	ڈاکٹر عندلیب شادانی

پر تنقید کی گئی ہے۔ نیاز فتحپوری کی "مالہ وما علیہ" کے بعد غالباً یہ دوسری کتاب ہے جس میں ناقد نے وضاحت سے بتایا ہے کہ فلاں شعر میں زبان، بیان اور معنی کا یہ نقص پایا جاتا ہے۔ مگر نیاز کی کتاب سے "میزانِ شعر" ہر اعتبار سے بلند اور وسیع ہے!

مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں (ص ۲۶)

اس شعر پر صرف یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے:-

"دوسرے مصرعہ میں تمہیں کے بجائے "تجھے" چاہیئے تھا۔ "تجھے" اس اعتبار سے غلط تھا کہ ساری نظم میں محبوب کو لفظ "تم" سے خطاب کیا ہے"۔

اعتراض بالکل درست ہے، شعر میں واقعی شتر گربگی پائی جاتی ہے۔ مگر اس طرف فاضل ناقد کی نگاہ نہیں گئی کہ "دعاؤں کا پیار کرنا" بھی تو ایک عجیب سی بات ہے!

ناقد نے فیض کے اس شعر کی :-

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی ۔۔۔ مے بہ اندازۂ خمار نہیں (ص ۲۸)

تعریف کی ہے کہ "یہ شعر مجھے بے حد پسند ہے" اُن کی اس پسندیدگی پر حیرت ہے! کیونکہ اس شعر میں مصرعۂ ثانی ہی جاندار ہے۔ اور اس کا سارا کریڈٹ غالب کے اس مشہور مصرعہ :-

نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے !

کو جاتا ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں "نظریں بکھیرنا" محلِ غور ہے۔ شعر کے تیور اس قسم کے ہیں کہ ساقی کی زلفوں کی طرح "نظریں بکھیرنے" کی التجا کی جا رہی ہے !

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا ۔۔۔ کھو گیا سورشِ گیتی میں قرینہ اپنا (ص ۴۶)

اس شعر پر ناقد نے جو اعتراض وارد کیا ہے کہ "عمل اپنا" زبردستی کی ٹھونس ٹھانس ہے۔ درست ہے۔ مگر مصرعہ اولیٰ میں "قرینہ کا کھو جانا" بھی تو مہمل ہے !

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے ۔۔۔ دستِ قدرت کو بے اثر کر دے (ص ۵۱)

"سامنے کی بات ہے، بیان میں کوئی ندرت نہیں" تنقید درست ہے۔ مگر یہ بھی تو کہئے کہ مصرعہ ثانی کو مصرعہ اولیٰ سے آخر ربط کیا ہے؟ اور محبوب نے یا ساقی نے چشمِ میگوں کا رُخ عاشق یا میخوار کی طرف کر بھی دیا تو اس سے "دستِ قدرت" آخر بے اثر کیوں ہو جائے گا ؟

فیض کی نظم "رقیب" (صفحہ ۵۵ - ۵۶) کی فاضل ناقد نے بہت تعریف کی ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے تو ضرور اچھے ہیں مگر مجموعی طور پر یہ نظم تحسین کیا توجہ کی بھی مستحق نہیں۔

کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے ۔۔۔ جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

"آنکھوں کی عبادت کرنے کا" اس شعر میں آخر کیا قرینہ پایا جاتا ہے ؟

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں ۔۔۔ تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

"تجھ پہ اٹھی ہیں" اس میں کوئی لطف نہیں۔ اور شعر میں سارا کھیل لفظوں کے دروبست اور لطفِ بیان ہی کا ہے!

یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے !

"حرمان" میں "واوِ عطف" کے بعد اعلانِ "نون" وجدان پر یہاں گراں گزرتا ہے!

اس نظم کے یہ دو شعر :-

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت ۔۔۔ شاہ راہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے!

یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے ۔۔۔ فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے!

تو اتنے گھٹیا درجہ کے ہیں کہ کوئی شاعر سوتے میں بھی ایسے پست شعر نہیں کہہ سکتا۔ یہی باتیں شعر میں قرینہ اور سلیقہ سے کہی جا سکتی تھیں !

خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے ۔۔۔ سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم (ص ۶۰)

"سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم" یہ آخر بات کیا ہوئی ؟ ناقد نے شعر کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا !

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے — شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی — دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے (صـ ۵۲)

جناب شیدا کاشمیری کی اس پر تنقید ملاحظہ ہو:۔

"تیرگی کے بعد "ہے" حشو ہے، تیسرے مصرعہ میں "انداز" کا الف تقطیع میں گرتا ہے۔ چوتھے مصرعہ میں "نشہ" بے تشدید شین باندھا گیا ہے، حالانکہ "ش" مشدّد ہے۔"

حالانکہ "اس انداز" میں "الف" تقطیع سے نہیں گر رہا ہے "الف" کا اس طرح ادغام عروض کی رُو سے بالکل جائز ہے۔ غالب کا شعر ہے:۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد — ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

"اب اس" اور "اس انداز" دونوں میں "الف" ایک ہی طرح استعمال ہوا ہے۔ تقطیع میں "ابس" اور "سنداز" آئے گا، جو درست ہے، جائز ہے اور شاعروں کے معمول میں داخل ہے — "نشہ" کا "ش" بے شک مشدّد ہے مگر اردو میں "نشہ" کو تشدید کے بغیر بولتے ہیں۔ اس لئے جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح شعر میں نظم بھی کر سکتے ہیں۔ اقبال کا شعر ہے:۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

نہ جانے کس کا شعر ہے مگر بچپن میں سنا تھا، ہے کسی پرانے استاد کا۔ اس کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے:۔

یارو! مجھے معاف کرو میں نشہ میں تھا!

"نشہ" کا بغیر تشدید کے شعر میں استعمال نطق و سماعت اور وجدان کو ذرا بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ عربی میں "مضطر" کی "ر" مشدّد ہے مگر اردو شاعری میں اور عام بول چال میں بغیر تشدید کے اس کا رواج اور چلن ہے!

فیض کے پہلے شعر میں جو معنوی نقص ہے، اس پر گرفت کرنی تھی اور وہ ہی رہ گئی۔ "شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹنے" اور "تیرگی کے امنڈتے چلے آنے" میں آخر کیا ربط ہے! اور رات کی رگ رگ سے اگر لہو پھوٹ رہا بھی ہو تو لہو کی سرخی سے تیرگی میں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ کمی واقع ہوگی!

گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر!

"جال بننا، سوئیٹر بننا، ازار بند بننا تو سنا تھا۔ گیت بُننا نہیں سنا تھا۔"

اس قسم کی "طنزوں" میں ہے تو مزاح کا رنگ، مگر ان میں واقعیت اور صداقت بھی پائی جاتی ہے! آخر لغو قسم کی تشبیہوں اور استعاروں پر کوئی کہاں تک سنجیدگی کو باقی رکھے!

وہ دُور بادلوں کے ایوانِ مرمریں میں — اک ساقیٔ دل آرا ساغر اڑا رہا ہے (صـ ۲۰۹)

احمد ندیم قاسمی کے اس شعر پر شیدا صاحب کی تنقید کتنی پُرلطف ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کو ماضی میں بٹیر لڑانے کا شوق تھا۔ لہٰذا ساغر جونہی ہاتھ آیا وہ سمجھا بٹیر آیا اور اس نے لڑانا شروع کر دیا۔ کس سے لڑانا شروع کر دیا؟ یہ الٹا سوال رہنے دیجئے۔"

کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے، نوجوان شاعر اس کتاب کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر، نارواجدتوں اور اظہار و بیان

کی لغزشوں سے بچ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ صرف پروپیگنڈے نے بعض "شاعروں" کو وہ مقام دے رکھا ہے، جس کے وہ کسی طرح مستحق نہیں ہیں مگر اس غبار کو آخر ایک دن چھٹنا ہوگا اور اس غبار کے چھٹتے ہی لوگ دیکھ لیں گے اس منزل میں جن کو "شہسوار" بنا دیا گیا تھا وہ دراصل "پیادے" ہیں ــــ!

سالگرہ نمبر "نئی نسلیں"

مرتبہ:۔ م۔ نسیم اور طیب عثمانی۔ ضخامت دوسو صفحات (سرورق رنگین) قیمت ایک روپیہ۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر "نئی نسلیں" کاشانہ، یحییٰ گنج لکھنؤ

ماہنامہ "نئی نسلیں" تین سال سے تعمیری و پاکیزہ ادب پیش کر رہا ہے۔ اور اپنے طرز کا یہ منفرد اور ممتاز مجلہ ہے۔ اب اس کا سالگرہ نمبر آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس کے علمی مقالے، تنقیدی مضامین، افسانے غزلیں اور نظمیں، سب کی سب بامقصد ہیں۔ جاندار ہیں اور پاکیزہ ہیں۔ اس شمارے کے مرتبین نے پرچہ کی ترتیب و تزئین میں بڑی خوش ذوقی اور پاکیزہ مزاجی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ سالگرہ نمبر عوام کے "فلم زدہ مذاق" کو اعتدال پر لانے کی ایک ایسی مثبت کوشش ہے، جس کے اثرات انشاء اللہ ظاہر ہوکر رہیں گے ــــ!

"نئی نسلیں" اپنے نام کی خصوصیات کا مظہر ہے۔ اس کے سالگرہ نمبر کے مطالعہ سے نہ جانے کتنے شاعروں، ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے فکر، نظر اور دل و دماغ کی اصلاح ہوگی۔ ملّتِ اسلامیہ کی نئی پود کے لئے تو یہ "سالگرہ نمبر" تربیت کا فرض انجام دے گا ــــ!

نظموں میں بعض سطحی نظمیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ "اسلامی ادب" کو دوسری تعمیری خصوصیتوں کے علاوہ، شعریت اور ادبیت کے لحاظ سے بھی جنت نگاہ اور فردوسِ گوش ہونا چاہیئے۔ اسلامی ادیبوں اور شاعروں کو اس طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے!

"سالگرہ نمبر نئی نسلیں" اس کا مستحق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ نظامِ حق کے داعی ہر محاذ پر باطل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت ان کی رفاقت فرمائے!! (آمین)

سالنامہ "سائنس"

نگران:۔ پروفیسر محمد سعید الدین پرنسپل، مشیر ڈاکٹر سید محمد محسن محشر عابدی۔ چیف ایڈیٹر احمد علی خاں تنویر، ایڈیٹر مظفر فاروقی۔ جائنٹ ایڈیٹر محمودہ بیگم۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد دکن (بھارت)

طلبا ءِ عثمانیہ یونیورسٹی سائنس کالج کے سائنسی و ادبی میگزین "سائنس" کا سالنامہ بڑی آب و تاب سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس میں سائنس پر معلومات آفریں مضامین ہیں، افسانے ہیں۔ غزلیں، نظمیں اور تنقیدی مقالے ہیں۔

یہ رسالہ ترتیب و تنوع کے اعتبار سے مرتبین کی خوش ذوقی کا زندہ ثبوت ہے۔ دل و دماغ اور عقل و عشق کی تفریح و آسودگی کے لئے اس سالنامہ میں کافی ساز و سامان مہیا کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر اور تماشائی دونوں اس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اسی لئے کچھ ہلکی چیزیں بھی اس میں شامل کی گئی ہیں۔

تصاویر متعدد ہیں۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ خوب ہے۔ اس سالنامہ کا ایک ایک صفحہ اردو زبان کی جامعیت، ہمہ گیری اور اس کی مقبولیت کا اعلان کر رہا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں جہاں بھی

اُردو زبان کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے، وہ علم و دانش کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے! مگر:-

کیا مٹائے گا کوئی اس کو مٹانے والا !!

دل میں آنکھوں میں، خیالوں میں نہاں ہے اُردو

بھارت کے الیکشن اور مُسلمان

از:- محمد اعظم (عثمانیہ) قیمت آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد دکن۔

اس کتابچہ میں وضاحت کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ بھارت کے مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا دین اور دُنیا کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں ہے۔ اور مُسلمان بھارت کی کسی سیاسی پارٹی کے غاشیہ بردار بن کر فائدے میں نہیں رہ سکتے۔ کہ اس طرح وہ پانی میں نمک کی طرح گھُل کر رہ جائیں گے!

اللہ کا خوف جس دل میں ہو، وہ کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی حق کا اعلان کرتا ہے کہ۔ ع

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

اور جب دل مصلحت شناس ہو جائے تو پھر کتاب و سنت اور ارشاد و تصوف کے مدعی ایسی کمزوری کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کہ جیسے یہ سخت مایوسی اور احساسِ کمتری کا شکار رہیں۔ اور اب غیروں ہی کے سہارے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں ــــ!

یہ کتابچہ جرأت مندانہ تنقید کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ جس پر مصنف اور ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں!

تحفہ گیارھویں

مرتبہ:- علی احمد زاہد جبل پوری۔ ضخامت ۲۴ صفحات (مفت مل سکتی ہے)
ملنے کا پتہ:- معرفت ڈاکٹر احسان الٰہی علوی، ڈینٹل سرجن، آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

کتاب کے شروع میں حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختصر حالات ہیں۔ اس کے بعد قرآنی آیتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی نذر حرام ہے۔ پھر فقہ حنفیہ کی معتبر کتابوں کے حوالے درج ہیں:-

(۱) جو نذریں اموات کے واسطے ہوں اور از روئے تقرب کے وہ باطل اور حرام ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیر۔ دُرِ مختار)

(۲) نذر عبادت ہے اور مخلوق عبادت کے لائق نہیں۔ اگر نذر ماننے والے کا یہ خیال ہو کہ میت کو اختیارات حاصل ہیں تو یہ عقیدہ صریحاً کفر ہے (بحر الرائق)

اس کتابچہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ تو توحید و سنت کے مبلغ اعظم اور شرک و بدعت کے مٹانے والے تھے۔ اُن کے ماننے والے جو حضرت شیخ کے نام کی دہائی دیتے اور اُن کی "گیارھویں" کرتے ہیں، یہ کتاب و سنت کے اور خود حضرت شیخ کے مسلک اور تعلیم کے خلاف ہے!

جناب علی احمد زاہد جبل پوری کا دُوسرا رسالہ "ماہ صفر المظفر کے آخری بدھ" کے رد میں ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے! یہ رسالہ بھی مصنف سے مفت مل سکتا ہے ــــ!

میلاد محمدی یہ رسالہ شعبۂ تبلیغ محمدی مسجد، آرٹیلری میدان ایم اے، کراچی سے مل سکتا ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس حالات کا ذکر اور نعت و مناقب کا بیان کرنا تو بہت بڑی سعادت کا موجب ہے۔ مگر مسلمانوں میں "میلاد" کی جو رسم چل پڑی ہے اس کی کوئی اصل اور سند نہیں ہے۔ یہ میلاد سب سے پہلے ۶۰۴ھ ہجری میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ سو سال بعد ایک مجہول شخص عمر بن محمد نے ایجاد کیا تھا۔

اہل حدیث کا مذہب یہ رسالہ بھی شعبۂ تبلیغ اے ایم اے کراچی نے شائع کیا ہے، جس میں اہل حدیث کے مذہب کے بنیادی عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے جو عوام میں اہل حدیث (وہابیوں) کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بلکہ اہل بدعت کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں۔

اس منشور کے بعد جو "نظم" درج ہے وہ بالکل بے جوڑ ہے!

مسائل قربانی مولفہ۔ حکیم شمس الدین احمد قریشی۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔ قیمت دو آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت والتبلیغ، ٹیکسلا۔

اس کتابچہ میں قرآنی آیات اور احادیث سے" قربانی کے جواز کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مسٹر پرویز نے اس مسئلہ میں کیسی کیسی غلط بیانیوں اور فریب کاریوں سے کام لیا ہے۔

صفحہ ۵ پر "والعبث" کتابت کی غلطی کے سبب "والبعث" چھپ گیا!

ایک وزنی، اہم اور تاریخی لفظ......

کیوں؟

ایک سیب کے ٹہنی سے گرنے پر نیوٹن (NEWTON) نے اسے استعمال کیا۔

★ تو دُنیائے علوم میں تہلکہ مچا دینے والی ـــــ کششِ اتصال ـــــ کی دریافت کا باعث ہوا۔

جب بھاپ نے دیگچی کے ڈھکنے کو اُٹھایا تو اسٹیفن (STEPHON) نے بھی یہی لفظ استعمال کیا۔

تو دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ـــــ اسٹیم (STEAM) بھاپ ـــــ کی طاقت کے دریافت کا سبب بنا۔

اور آج ہم بھی یہی لفظ دُہراتے ہیں

کیوں

آپ "باوقار تنظیم" کراچی کی پہلی پرافٹ شیئرنگ اسکیم میں حصہ لیں۔

اس لئے کہ :۔

- یہ اسکیم "شرکتِ نفع و نقصان" کے معروف کاروباری اصولوں پر مبنی ہے جو "عام کمیٹیوں" کے برعکس "طالع آزمائی"، "لاٹری" یا "جوئے" سے قطعاً پاک ہے اور اس میں کوئی عنصر غیر اسلامی نہیں ہے!
- اس اسکیم میں آپ پانچ روپے ماہانہ بچاتے ہوئے مقررہ مدت میں پانچسو روپے کی کثیر امدادی رقم ایک دفعہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔
- اس کے علاوہ آپ کو وہ بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے منافع سے اس اسکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔
- اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضبط نہیں ہوتا خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔
- اشد مجبوری یا ناگزیر حالات میں آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ پورے کا پورا ایگریمنٹ واپس بھی کیا جا سکتا ہے۔
- بوقت ضرورت آپ اپنے ادا کئے ہوئے روپے پر قرضِ حسنہ بھی لے سکتے ہیں۔
- اگر آپ چاہیں تو اپنے حقوقِ ممبری کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کرا کر اس سے اپنا ادا کیا ہوا روپیہ وصول کر سکتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ـــــ آپ ایک ایسی تنظیم کیساتھ تعاون کرتے ہیں جو اقتصادی اور معاشی میدان میں اسلامی اصولوں کو فروغ دینے کے لئے باطل کے نظامِ معیشت سے برسرِ پیکار ہے، کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں ہم تمدنی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کو اسلام کے تصورِ حیات کے مطابق ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں وہاں اپنے تجارتی، صنعتی اور معاشی نظام کو بھی سُودی لین دین، لاٹری، جوئے اور طالع آزمائی کی مذموم لعنتوں سے حتی الوسع پاک کرنے کی کوشش کریں ـــــ "باوقار تنظیم" ـــــ اس سلسلہ میں ہمارا پہلا قدم ہے، آئیے، آپ بھی اس اسکیم میں شامل ہو کر اور ہمارے ساتھ شانہ بشانہ چل کر اس پاکیزہ جدوجہد اور اس نیک مقصد میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

تفصیلات مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیجئے :۔

باوقار کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی ۱

فاران

کراچی

پاکستان

توحید نمبر

ماہر القادری

فاران

توحید نمبر

جلد ۹ —— نمبر ۳

جون ۱۹۵۷ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

مقامِ اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ

سالانہ ... چھ روپے

فی پرچہ ... آٹھ آنے

قیمت توحید نمبر

تین روپے آٹھ آنے

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اوّل

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے زیادہ اہمی ”توحید“ کا ذکر فرمایا ہے۔ یہی وہ ”محور“ ہے جس کے اردگرد اسلام، ایمان اور اخلاق کے تمام تقاضے گردش کرتے ہیں۔ ”توحید“ اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد میں اگر فرق آگیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح ہو گیا۔ تو پھر ایمان، اسلام اور عبادت و تقویٰ سب کے سب نامعتبر قرار پاتے ہیں اور یہ وہ خسارہ اور نقصان ہے جسے نہ رسولؐ کی محبت پُر کر سکتی ہے اور نہ کسی ولی کی عقیدت! اور نہ کوئی نیکی اس کا بدل ہو سکتی ہے!

انبیاء کرام کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی، انسانوں کے سامنے خالق کائنات کی توحید۔ معبودیت، اور اس کے ”الٰہ“ ہونے کے عقیدے کو پیش کریں۔ چنانچہ نفوسِ قدسیہ بعثت سے لے کر نفسِ واپسیں تک ”توحید“ ہی کا درس دُنیا کو دیتے رہے۔ یہی نقطۂ توحید اُن کی دعوت کا آغاز بھی تھا، وسط بھی تھا اور نقطۂ اختتام بھی تھا!

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو بھی حکم دیا تھا کہ بیشک بات یوں ہی ہے کہ کوئی ”الٰہ“ نہیں سوائے میرے، سو بندگی کرو میری!

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صرف اسی پر بس نہیں کیا کہ ”مجھے اللہ مانو اور میری بندگی کرو“ بلکہ اُس نے بار بار طرح طرح سے عنوان بدل کر اور مثالیں دے کر، یہ بھی فرمایا کہ مجھ جیسا کوئی نہیں۔ میری خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ میرے سوا نہ کوئی کسی کی مشکل کھول سکتا ہے، نہ کسی کو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے، میں ہی خالق ہوں۔ رازق ہوں، حاجت روا

مشکل کشا ہوں۔ میں کسی کو کچھ دینا چاہوں تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں کسی کو نہ دوں تو کوئی اُسے دلوا نہیں سکتا۔ ہر جاندار کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے۔ کائنات میں بلا شرکتِ غیرے متصرف میں ہوں۔ میری ہی ربوبیت کے سہارے دونوں جہاں پل رہے ہیں اور میری ہی قدرتِ کاملہ کونین کے نظام کو چلا رہی ہے۔ "حی" صرف میں ہوں کہ میری ذات کے سوا ہر حی اور ہر شے ہالک اور فانی ہے۔ "قیوم" صرف میری ذات ہے! پانی میں برساتا ہوں۔ رزق میں دیتا ہوں۔ کھیتیاں میں اُگاتا ہوں۔ دریا میرے حکم سے رواں دواں ہیں۔ ہوائیں میرے حکم سے چلتی ہیں۔ چاند سورج میرے حکم کے تابعدار ہیں۔ غرض تمام کائنات میں میری اور صرف میری حکومت اور خدائی ہے۔ اور اس میں میرا کوئی شریک، ساجھی اور ہاتھ بٹانے والا بھی نہیں ہے! عزتیں اور ذلتیں سب کو میرے در سے ملتی ہیں۔ عالم الغیب والشہادہ صرف میری ذات ہے کونین کی تمام مخلوق میری محتاج ہے۔ اور ہر کوئی میرے ہی در کا فقیر اور بھکاری ہے! خالق میں ہوں، میرے سوا کوئی انسان ایک مکھی اور بھنگے تک کو پیدا نہیں کر سکتا!

یہ ہے "توحید" کے اجمال کی تفصیل، جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اور بار بار پیش فرمائی ہے! اس عقیدہ توحید کا نہ صرف یہ کہ اقرار کرنا اور اُس پر ایمان لانا ضروری ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس اقرار و ایمان کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیئے! دعا اور عبادت میں، دفعِ بلا اور طلبِ نعمت میں، استمداد و استعانت میں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح کسی بندے سے چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معاملہ کیا جائے گا تو اس سے "توحید" کا عقیدہ مجروح ہوگا۔ اور ظروف و احوال اور کیفیات کے اعتبار سے "شرک"، یا "شبہ شرک" کا ارتکاب لازم آئے گا!

عرب کے مشرکین خدا کے وجود کے منکر نہ تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق بھی مانتے تھے، مگر وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں "سفارشی" سمجھ کر اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے۔ جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ یعنی بتوں کے روبرو سجدہ ریزی، اُن کی دہائی دینا، اُن سے مدد چاہنا، اُن کو کائنات میں متصرف اور دخیل سمجھنا۔ ان مشرکانہ حرکات کے ساتھ اُن کا "خدا کو ماننا" اللہ کے یہاں مقبول نہ ہو سکا، اور اُن کو مشرک قرار دیا گیا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

اور پوجتے ہیں جو اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو نہ کچھ فائدہ دیویں اُن کو نہ کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں "یہ سفارشی ہیں اللہ کے پاس"۔ کہہ۔ کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟ سو وہ پاک ہے ان سب سے جن کو یہ شریک بتاتے ہیں!

دوسری آیت میں کفارِ قریش کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:۔

وَمَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ زُلْفٰى!

پوجتے ہیں ہم اُن کو صرف اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ سے نزدیک کر دیں!

یہ بت جن کی کفارِ قریش پرستش کیا کرتے تھے۔ جن سے مرادیں مانگتے تھے اور جن کے ناموں کی دہائی دیتے تھے۔ اُن کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے

کہ مشرکین نے نیک اور برگزیدہ اشخاص (رجال صالحین) کے ناموں پر بتوں (ودّ، سواع، یغوث، نسر، اساف، نائلہ) کے نام رکھ لئے تھے!

"البدایہ والنہایہ" میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۷۴) نے راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے:-

وداً رجلاً صالحاً وکان محبباً فی قومہ فلما مات عکفوا حول قبرہ -

(ودّ ایک مرد صالح تھا، جو اپنی قوم میں محبوب تھا، جب وہ مرگیا تو اس کی قبر کے اردگرد لوگ گھومنے (طواف کرنے) لگے!

اس روایت میں تفصیل ملتی ہے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو بہکایا اور ان لوگوں نے آگے چل کر ودّ کی تمثال کی پوجا شروع کردی۔ یہاں تک کہ:-

حتیٰ اتخذوہ الٰہاً یعبدونہ من دون اللہ !

(یہاں تک کہ لوگوں نے اُسے "الٰہ" بنا لیا اور اللہ کے سوا اُسے پوجنے لگے)

پھر آگے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ومقتضی ھذا السیاق ان کل صنم عندہ عبدۃ طائفۃ من الناس -

(اس سیاق عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بُت انسانوں کے گروہوں سے تھے)

اس تصریح سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفارِ قریش جن مشہور بتوں کی پرستش کرتے تھے، اُن کے نام شروع شروع میں اولیاء اور صلحاء کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ اور ان بتوں کی پرستش کے پیچھے صالحین کی ارواح کی پوجا اور اُن سے طلب و استمداد کا تصور بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھا!

اہلِ بدعت کی طرف سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دنیا میں جو ایک دوسرے سے امداد طلب کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے کے پاس اپنی حاجت لے جاتا ہے، اُس سے عرض معروض کرتا ہے، جب ایسا کرنا شرک نہیں ہے، تو پھر انبیاء اور اولیاء اور صلحاء سے طلبِ امداد شرک کیوں ہونے لگا! اس لئے کہ "شرک" تو یہ ہے کہ کوئی کسی کو "خدا یا بالذات قادر، مختار اور معطی" سمجھ کر اُس سے امداد چاہے۔ بندوں میں بالذات قدرت نہیں ہے، اللہ کی عطاء کی ہوئی قدرت ہے۔ تو اللہ کی دی ہوئی قدرت کی بناء پر انسانوں سے استمداد و استعانت شرک نہیں ہے!؟

یہ نہایت فریب آمیز مغالطہ ہے۔ جو اہلِ بدعت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اُن کے تمام علم کلام کی بُنیاد ہی اسی "ذاتی" اور "عطائی" کی تقسیم اور تفریق پر ہے۔ یہ وہی استدلال ہے جو نمرود بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس سے فرمایا:-

"...... رَبِّیَ الَّذِی یُحْیِی وَیُمِیْتُ"

میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جِلاتا ہے (یعنی جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے)

تو اس کے جواب میں نمرود نے کہا:-

"...... اَنَا اُحْیِی وَاُمِیْتُ!" میں بھی مارتا اور جِلاتا ہوں (یعنی زندگی اور موت میرے اختیار میں بھی ہے)

اہلِ بدعت کی طرح نمرود نے بھی "ذاتی اور عطائی" قدرت کے لفظی مغالطہ کو اپنے استدلال کی بُنیاد بنایا۔ اور یہ انتہی

احمقانہ بات ہے کہ اس کا جواب دینا خود انسانی عقل کی توہین ہے۔ اس لئے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جاہلانہ اور احمقانہ استدلال کی تردید کئے بغیر اپنی گفتگو کا رُخ دُوسری طرف موڑ دیا۔

قَالَ اِبْرٰهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ!

ابراہیم نے کہا۔ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ہکا بکا رہ گیا!

اہلِ بدعت کے اس مغالطہ کی تردید خود اُن آیتوں سے ہوتی ہے، جو اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ مشرکینِ عرب اپنے "بتوں" کو (اور یہ ذہن میں رکھئے کہ صلحاء و اولیاء کے ناموں پر ان بتوں کے نام رکھے گئے تھے) "خدا" نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ ان "بتوں" کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا "شفیع" اور ذریعہ تقرب خیال کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس فعل اور عقیدہ کو "شرک" سے تعبیر کیا۔ اور وہ اس لئے کہ وہ تعظیم میں، دفعِ بلا اور طلبِ رزق و منفعت میں ان "بتوں" کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے، جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہیے!

کہا جا سکتا ہے کہ لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں میں کسی کو کچھ دینے، کسی کی عرض و معروض سُننے اور کسی کی امداد کرنے کی طاقت کہاں ہے؟ بیشک نہیں ہے۔ مگر جب مشرکینِ عرب ان بتوں کو "الٰہ" نہیں سمجھتے تھے، تو پھر ان کے اس فعل کو "نادانی اور حماقت" کہنا چاہیے تھا۔ اہلِ بدعت کے خود تراشیدہ نظریہ کی بناء پر تو کفارِ قریش کے اس فعل کو "شرک" نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے "شرک" فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول ہی حق ہے!

قرآن کریم کی آیتیں واضح طور پر بتاتی ہیں کہ غیر اللہ کو "الٰہ" نہیں۔ بلکہ مخلوق اور بندہ سمجھتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ تعظیم، پرستش اور دُعا و استمداد کا وہ معاملہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کا حق ہے، "شرک" ہے!

آج بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جا رہا ہے، جو مشرکینِ عرب "بتوں" کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:۔

"اگر تو مشرکینِ عرب کے عقائد اور اُن کے اعمال اور اُن کے حالات کی پُوری پُوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس زمانہ کے عوام و جہلاء کو دیکھ لے کہ وہ قبروں اور استھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جو اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی۔ اور اُن کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی، خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔ (اردو ترجمہ)

جس طرح "توحید" ایمان کا جوہر، اسلام کی روح اور اخلاق و عبادت کی جان اور مغز ہے کہ اس کے بغیر ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور معتبر نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے "شرک" کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے!

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِیْمًا۔ (النساء)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لئے چاہتا ہے

معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا۔ اس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا۔ اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

ایک طرف "توحید" کی اہمیت قرآن پاک بتاتا ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی "غیر اللہ" کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ روا رکھنا چاہیئے۔ تو وہ "شرک" ہے۔ دوسری طرف "شرک" کی یہ خوفناک مذمت کہ ہر بڑے سے بڑا گناہ معاف ہو سکتا ہے، مگر "شرک" معاف نہیں ہو سکتا۔ یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے!

"توحید" کی اس عظیم الشان اہمیت اور "شرک" کی اس قدر خوفناک مذمت کے بعد ایک صاحب ہوش انسان اور ایک مسلمان کا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟ یہی کہ وہ نہ صرف یہ کہ کھلے ہوئے شرک سے بچے، بلکہ اس کے دواعی، محرکات، ترغیبات اور مشابہت و مثال سے بھی اجتناب کرے!

"زہر" زندگی کا قاتل ہے۔ تو ہر وہ انسان جس کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ ہر اُس چیز سے جس میں زہر کے چھو جانے کا وہم بھی ہوتا ہے، اجتناب کرے گا۔ چاہے وہ چیز دیکھنے میں کتنی ہی خوش رنگ اور ذائقہ میں کتنی ہی مزیدار کیوں نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جس کو اپنا ایمان عزیز ہو گا اور وہ یہ جانتا ہو گا کہ "شرک" سے ایمان کی موت واقع ہو جاتی ہے، تو وہ "شرک" کے وہم و شائبہ سے بھی دُور رہے گا۔ اور "شرک" کے معاملہ میں کسی تاویل، نکتہ، لطیفہ اور لفظی ہیر پھیر کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اور نہ اس کو دلیل بنائے گا!

وَاَخْرَجَ احمد عن معاذ بن جبل، قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ!

امام احمد نے ذکر کیا کہ معاذ ابن جبل نے روایت کی کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہے تجھے قتل کیا جائے یا جلایا جائے مگر تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا!

پس جس دل میں "توحید" گھر کر گئی اور رچ گئی ہو گی، وہ غیر اللہ کی عقیدت و احترام میں "توحید" کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا۔ اور اس سے کوئی ایسا قول و فعل صادر نہ ہو گا۔ جس سے "توحید" پر ذرہ برابر بھی حرف آتا ہو۔ اور "شرک" سے اتنی بھی مشابہت پیدا ہوتی ہو۔ جتنی اُردو پہ سفیدی!

اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہی تعلیم دی ہے۔ اسی لئے "غیر اللہ" کی قسم کھانے کو شرک قرار دیا گیا۔ کہ "قسم" میں جس شدتِ عظمت کا احساس مضمر ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی مخصوص رہے!

اخرج الترمذی عن ابن عمرؓ قال سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
یقول من حَلَفَ بغیر اللّٰہ فقد اَشرک! (مشکوٰۃ، باب الایمان والنذور)

ترمذی نے ذکر کیا کہ روایت کی ابن عمرؓ نے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ جس نے قسم کھائی غیر اللہ کی سو اُس نے شرک کیا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو "ملک الاملاک" (بادشاہوں کا بادشاہ) کہنے سے منع فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی

حاکمیت اور شہنشاہی سے مشابہت کا پہلو نکلتا ہے!

قربان جائیے اس موحد اعظم (علیہ السلام) اور "مشرک و بدعت" کے ماحی و قاطع (روحی لہ الفداء) کے کہ جس نے "جو اللہ چاہے اور جو محمدؐ چاہیں" تک کے کہنے سے روکا ہے!

اخرج فی شرح السنۃ عن حذیفۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقولوا ماشاء اللہ وشاء محمدٌ وقولوا ماشاء اللہ وحدہٗ۔ (مشکوٰۃ۔ باب الاسامی)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یوں نہ بولا کرو "جو چاہے اللہ اور جو چاہے محمدؐ" بلکہ یوں بولا کرو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے"۔

مشکوٰۃ شریف کی ایک اور حدیث ہے:۔

اخرج مُسلمٌ عن ابی ھریرۃ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یقولَنَّ احدُکم عبدی وامتی کلکم عبیدُ اللہ وکُلُّ نسائِکم اِماءُ اللہِ وَلَا یقلِ العبدُ السیِّدہٗ "مولایَ" فَاِنَّ مولاکم اللہ۔

مُسلم نے ذکر کیا کہ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یوں نہ بولے کہ "میرا بندہ اور میری بندی" تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں سب اللہ کی بندی ہیں۔ اور غلام بھی اپنے آقاؤں کو "میرا مولا" (مالک) نہ کہے۔ کیونکہ تم سب کا "مولا" (مالک) اللہ ہے!

ایک طرف "توحید" کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدّت احتیاط، اور دوسری طرف وہ لوگ جو اپنے "عاشقانِ رسول" ہونے کا دم بھرتے ہیں، اُن کی "توحید" کے معاملہ میں بے پروائی، تساہل اور ڈھیل کا یہ عالم ہے کہ ایسے ایسے نکتے تراشتے اور لطیفے اختراع کرتے ہیں، جن سے "توحید خالص" غبار آلود بلکہ مجروح ہوتی ہے!

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ!

کے ترجمہ میں "ی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"تم کہو اے میرے بندو .... (یعنی محمد رسول اللہ کے بندو)

حالانکہ پورا قرآن ان اہلِ بدعت کی اس "نکتہ شناسی" کی نفی کرتا ہے!

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ ....

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم و نبوّت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہیگا کہ تم ربانی بنو!!

جس کے دل میں "توحید" کا مزہ اور اُس کی اہمیت کا صحیح احساس ہوگا، کیا وہ اس قسم کے خطرناک نکتے تراش سکتا

ہے۔ ایسے لطیفے شعر و شاعری کی دُنیا میں تو زیب دیتے ہیں مگر "قرآن کے ساتھ یہ مشاعرانہ سلوک" روا نہیں رکھا جاسکتا۔ (معاذ اللہ)

اسی ذہنیت کے لوگوں نے ــــ مشکل کشا، غریب نواز، داتا اور گنج بخش ــــ جیسے القاب، جن کے اطلاق کی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ صلحاء اور بزرگوں کے لئے تراش لئے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو اس قسم کے شعروں پر ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے ‌ ‌ ‌ جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (توبہ!)

جھومتا ہے، اور ؎

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام ‌ ‌ ‌ رکھ لیا خواجہ غریب نواز (استغفر اللہ)

جیسے مشرکانہ شعروں پر "صدائے احتجاج و نفرت" بلند نہیں کرتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس نکتہ پر وجد کرتے ہیں کہ

؎ احد میں اور احمد میں نقطہ ہے "میم" کا پردہ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "احمد بے میم" اور عرب کو "عرب بے ر" کہتے ہیں۔ اُن کے شعروں میں، تقریروں اور تحریروں میں، جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو "توحید خالص" کو مشتبہ اور مُلتبس بناتی ہیں، اور "شرک و بدعت" کے لئے گنجائش نکالتی ہیں!

انبیاء کی دعائیں

"وحی" اور "نبوت و رسالت" اتنا بڑا شرف ہے کہ اس شرف کے مقابلہ میں دُنیا کے تمام اوصاف مل کر بھی اس شرف کی برابری نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا تمام اُمت، قوم یا پوری انسانی سوسائٹی میں اپنے ایک "بندے" کو نبوت و رسالت کے لئے منتخب فرمانا اور اُس پر ایسے مخفی طریقہ سے وحی کرنا کہ جس کا "نبیؐ" کے سوا نہ کوئی احساس کر سکتا ہے اور نہ تحمل! اس سے بعض لوگ دھوکا کھا کر "نبی" سے اُلوہی صفات منسوب کر سکتے ہیں کہ "عقیدت و احترام" کے دوراہہ پر شیطان کے لئے غالی معتقدین اور توہم پرست، نیاز مندوں کو گمراہ کر دینا بہت آسان ہے!

اس لئے قرآن پاک کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس نے انبیاء کے حالات بالکل سادہ الفاظ میں پیش کئے ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ زور اُن کی "عبدیت" اور "بشریت" پر دیا گیا ہے۔ خود انبیاء کرام کی زبانی اس کی نفی کرائی گئی ہے! کہ وہ کائنات میں کوئی اختیار رکھتے ہیں، یا لوگوں کے نفع و نقصان کے مالک ہیں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں:۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ۔

مَیں تیرے لئے معافی ضرور چاہوں گا اور مالک نہیں مَیں تیرے نفع کا اللہ کے یہاں کسی چیز کا!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے کہلوایا:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔

تو کہہ مَیں مالک نہیں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا مگر جو اللہ چاہے!

یہاں تک کہا گیا:۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۔

تو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں ہوں، اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ (بھی کیا ہونے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوا کر :-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ....“

تو کہہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے، اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔

”ذاتی“ اور ”عطائی“ کی جاہلانہ اور گمراہ کن تفریق کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا۔ جب نبیؐ کے پاس بھی اللہ کے دیے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر اور کس کے پاس ہو سکتے ہیں!

جب نفع و نقصان کا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مالک نہیں ہے اور انبیاء کرام تک اس معاملہ میں اپنے عجز و عدم اختیار و قدرت کا اظہار کرتے ہیں، تو پھر نبی اور رسول سے بڑھ کر ایسا کون ”اللہ کا پیارا اور چہیتا“ ہے، جسے ہم اللہ کے دیے ہوئے خزانوں کا مالک، انسانوں کے نفع و نقصان کا مختار اور احوالِ کائنات میں متصرف مان لیں! اگر کوئی انبیاء، اولیاء، اور صلحاء امت کے بارے میں ایسے عقائد رکھتا ہے، تو اللہ کی کتاب کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کرتا ہے اور قیامت کے دن انبیاء اور اولیاء سے اُس کی عقیدت، عشق و محبت اور نیازمندی کے یہ دعوے اُس کے منہ پر مار دیے جائیں گے!

یہ بھی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین تمنا تھی کہ بیت المقدس کے بجائے ”کعبہ“ کو اُمتِ مسلمہ کا قبلہ قرار دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس تمنا اور آرزو کو پورا فرما دیا۔ مگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا ”قیاس مع الفارق“ کی بدترین مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”رضا“ کا پابند تھا، یا جو آپ کی رضا ہوتی تھی۔ وہ ضرور بالضرور پوری ہو کر رہتی تھی۔ بندے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی ”رضا“ اور ”تمنا“ کا پابند نہیں ہے!

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ج فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ)

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ایسے فاسق لوگوں سے ہرگز راضی نہ ہوگا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب و مقرب، اطاعت گزار بندے تھے۔ حضورؐ نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا۔ حضورؐ کا قدم صراطِ مستقیم سے بال برابر ادھر اُدھر نہیں ہوا۔ آپ کی اکثر و بیشتر دعائیں بھی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتا تھا کہ قبولیت و اجابت تو نطقِ محمدی کی راہ دیکھتی رہتی تھیں۔ اس شرف و اجتہاد کے باوجود قرآن یہ بھی بتاتا ہے :-

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۔ (التوبہ)

اے نبی! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی اُن کے معاف کر دینے کی درخواست کروگے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا!

یہ آیت "مشرکانہ عقائد" پر ضرب نہیں، شاہ ضرب (master stroke) لگاتی ہے۔ یہ آیت کسی ذرا سے بھی اشتباہ کے بغیر دو ٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اوقات انبیاء کرام اور ان میں بھی امام الانبیاء اور افضل الرسل تک کی درخواست اور دعا قبول نہیں ہوتی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور درخواست تک کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں یہ عالم ہو، تو پھر دنیا کے پردے پر کون ایسا انسان اور عالمِ برزخ میں کون ایسی روح ہے۔ جس سے ہم استغاثہ کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کا کہا ٹال ہی نہیں سکتا۔ اور یہ جس بات پر اَڑ جائیں بس اُسے پورا ہی کر کے رہیں گے! جو کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے وہ درحقیقت عبد اور معبود کے رابطہ اور تعلق سے ناواقف ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی اور بے نیازی کے بارے میں بڑا سطحی اور پست تصور رکھتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ کی بدولت عرب کی پوری آبادی کو ہدایت نصیب ہوئی۔ اور جب سرکارؐ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو عرب کے طول و عرض میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی پرستش نہ ہوتی تھی! قیامت تک جس کسی کو بھی رشد و ہدایت ملے گی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع اور فرمانبرداری میں ملے گی، جہاں حضورؐ کی اتباع نہیں، وہاں ہدایت کی روشنی نہیں۔ مگر ہدایت کا دینا اور سیدھی راہ پر لانا اور چلانا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضۂ اختیار سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔

تُو راہ پر نہیں لاتا جس کو تُو چاہے بلکہ اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے! اور وہی (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئیں گے!

اگر انبیاء اور صلحاء کی ارواح سے استغاثہ جائز ہوتا۔ تو قرآنِ پاک میں کوئی ایک آیت تو اس کے جواز میں نازل ہوتی، یا کم سے کم کسی قرآنی آیت سے اس کا کوئی اشارہ ہی نکلتا ہوتا۔ انبیاء کرام کی دعائیں قرآنِ پاک میں مرقوم اور مسطور ہیں۔ ان میں کسی نبی نے اپنے پچھلے گزرے ہوئے نبی اور رسول کو مصیبت کے وقت نہیں پکارا۔ نہ اُن سے اللہ کے حضور دعا کرنے کی درخواست کی۔ انتہا یہ ہے کہ کسی قرآنی دعا میں "بحقِ فلاں" اور "بجاہِ فلاں" یا یہ کہ "یا اللہ! تو فلاں نبی کے وسیلہ سے ہماری دعا قبول فرما" تک نہیں ملتا!

حضرت نوح علیہ السلام براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں:-

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝

اور نوح، جب اس نے پکارا اس سے پہلے! پھر قبول کر لی ہم نے اُس کی دعا، سو بچا دیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو بڑی گھبراہٹ (پریشانی) سے!

حضرت ایوب علیہ السلام مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝

اور ایوب جس وقت پکارا اُس نے اپنے رب کو مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا!

حضرت یونس علیہ السلام بھی اپنے رب ہی سے غم کے اندھیروں میں فریاد کرتے ہیں :-

فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ !

پھر پکارا ان اندھیروں میں (یونسؑ نے) کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے،

اور میں تھا خطا کاروں میں سے ۔ !

اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تنزیہہ کامل اور ایسی عصمت جہاں سرے سے بھول چوک اور نسیان و ذہول کا امکان ہی نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سزاوار ہے۔ حضرت یونسؑ سے بہ تقاضائے بشریت تھوڑی سی بھول ہوگئی کہ وحی کا انتظار کئے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پر اللہ کے اس فرمانبردار بندے اور مقدس نبی نے اپنے اللہ سے معافی طلب کی۔

حضرت زکریا علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اپنی تمنا پیش کرتے ہیں :-

وَزَكَرِیَّآ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ -

اور زکریا کو (دیکھ) جب پکارا اس نے اپنے رب کو، اے رب ! نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا

اور تو ہے سب سے بہتر (والی اور) وارث ۔ !

یہ تو چند دعائیں ہیں۔ جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ قرآن میں جہاں بھی کسی نبی کی دعا اور مصیبت کے وقت فریاد و استغاثہ کا ذکر آیا ہے، تو ہر نبی نے براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ان نفوس قدسیہ کو اللہ تعالیٰ کا یہی حکم تھا۔ وہ دنیا کو اسی کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی فریادرس اور مشکل کشا ہے اور نہ مصیبت کو ٹال دینا کسی کے بس میں ہے ۔ !

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ - وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ -

اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے !

دعا کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگیں اور اسی کو پکاریں اور اس طرح پکاریں کہ اس دعا، پکار، فریاد و استغاثہ میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی شرکت اور میل نہ ہو :-

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ -

سو پکارو اللہ کو خالص کر کے واسطے بندگی کے، چاہے منکرین برا ہی کیوں نہ مانیں !

خدا چیلنج دیتا ہے کہ میرے سوا بیکس کی پکار کو بھلا اور کون پہنچ سکتا ہے اور میرے سوا اس کے دکھ درد کو کون دور کر سکتا ہے ۔ !

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ !

بھلا کون پہنچتا ہے بیکس کی پکار کو، جب اس کو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے اس کی مصیبت کو !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے ۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر اس عقیدہ میں کہیں ایسی شدت اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو جائے کہ جس سے توحید پر حرف آتا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی :-

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاۤ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۔

اے ایمان والو! جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اُس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی!

اس آیت میں "...... وَلَا شَفَاعَةٌ" (اور نہ سفارش چلے گی) میں اس قسم کے "عقیدۂ شفاعت" کی تردید منظور ہے۔ جیسے بادشاہوں کے یہاں امیر، وزیر اور ان کے مصاحب اور مقربین سفارش کیا کرتے ہیں کہ جو اپنی چرب زبانی سے بادشاہ سلامت کو متاثر کردیتے ہیں، یا کسی دباؤ کی وجہ سے بادشاہ اُن کی سفارش ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

اللہ کے دربار میں اُس کی اجازت اور حکم کے بغیر کسی کو لب کشائی کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی!

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۔

کون ہے جو اُس کے جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے!

احادیث میں ملتا ہے کہ جب قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم کو "مقام محمود" اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔ تو آپ سجدے میں گر جائیں گے اور اس کے بعد حضورؐ کو شفاعت کی اجازت ہوگی!

یہ "شفاعت" وزیروں اور امیروں کی "سفارش" شاہانِ بے خبر کے درباروں جیسی نہیں ہے۔ یہ "شفاعت" ایک مطیع و فرمانبردار اور اللہ کی مرضی پر چلنے والے نیک بندے کی، خدائے علیم و خبیر کے حضور ہے!

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہیں

ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب اور جتنا علم مناسب سمجھا۔ وحی کے ذریعہ انبیاء کرام کو عطا فرمایا ہے۔ اور یہ وہ علم ہے جسے قرآن "اظہارِ غیب" اور "اطلاعِ غیب" کہتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔

مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کردے۔ غیب کی باتوں کی اطلاع دینے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرلیتا ہے!

یہ علم جو انبیاء کو عطا کیا گیا ہے "اظہارِ غیب"، اور "اطلاعِ غیب" ہے۔ مگر اس "اطلاع و اظہار" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز انبیاء کرام کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی۔ اور اُن کو ہر بات کا علم حاصل ہوجاتا ہے! اس عقیدہ کی خود قرآن نفی کرتا ہے:۔

فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۔ (النمل) ۱۔

کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ جس کی تجھ کو اُس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے خبر لے کر!

ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ کہہ رہا ہے کہ "میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں، جس کی آپ کو خبر نہ تھی"۔ اور ملک سبا کے حالات کا علم نہ رکھنے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آجاتی۔ کہ۔ سارے جہان کے حالات کا علم رکھنا، نبوت کا لازمہ ہرگز نہیں ہے!

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۔

پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں اُن سے ڈرا۔ وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں قومِ لوط کی طرف !

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان و منزلت کا کوئی ٹھکانا ہے کہ نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام خود "ملتِ ابراہیمی" پر تھے، اُن کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو نہیں پہچان سکتے اور دل میں خوف محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرشتے بتلاتے ہیں کہ آپ خوف نہ کیجئے، ہمیں تو لوط کی بدکار قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ صحیحین میں بھی ایک واقعہ ملتا ہے کہ جبریل علیہ السلام آدمی کی شکل میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب کرتے رہے۔ اور جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو حضورؐ کو بتایا گیا کہ یہ جبریلؑ تھے۔ !

اگر حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے نافرمان بیٹے کے انجام کی خبر ہوتی تو آپ اُس کے بچانے کی تمنا نہ کرتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے، مگر برسوں تک اپنے پیارے اور چہیتے بیٹے یوسفؑ کی خبر نہ معلوم کرسکے۔ کہ اُن کا نورِ نظر کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یہاں تک کہ اس غم میں پُتلیاں سفید ہوگئیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود سیدنا آدم علیہ السلام کا واقعہ اُن کے "غیب" پر مطلع ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اگر آپ کو مستقبل کا علم ہوتا اور شیطان کے دل کی بات جان لیتے۔ تو شیطان لعین کے دھوکے میں نہ آتے۔ !

"غیب" اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے۔ اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے کو "عالم الغیب" فرمایا ہے! اور کسی تشابہ اور ابہام کے بغیر دو ٹوک انداز میں کہا ہے:۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۔

کہہ نہیں جانتے وہ جو ہیں آسمانوں اور زمین میں۔ غیب کو، مگر اللہ! اور نہیں خبر رکھتے کب اُٹھائے جائیں گے !

"غیب" کی عمومی نفی کے بعد، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے خود آپؐ کے عالم غیب ہونے کی نفی کرائی:۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۖۛ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔

کہہ میں نہیں اختیار رکھتا اپنی جان کے کسی نفع اور نقصان کا مگر جو کچھ اللہ چاہے۔ اور جو میں جانتا غیب تو بیشک بہت سی لے لیتا بھلائی اور نہ چھوتی مجھے کوئی برائی۔ میں تو فقط ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔ اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بے شمار واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ "عالم الغیب" نہ تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی، تو کتنے دن تک حضورؐ مضطرب رہے! یہاں تک کہ

وحی الٰہی نے حضرت صدیقہؓ کی پاکبازی کا اعلان کر کے اس تہمت کا قلع قمع کر دیا۔ اور وحی کے بعد حضورؐ کے قلب مبارک کو چین آیا۔ حضور عالم الغیب ہوتے تو اس افواہ سے مضطرب ہونے کی ضرورت کیا تھی! اور آپؐ صحابہ سے فرما سکتے تھے کہ میں نبی ہوں اور نبی پر تمام مشرق و مغرب کے احوال و مقامات منکشف ہوتے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ عائشہ اس تہمت سے پاک اور بری ہیں — اجو صحابہ حضورؐ کی بیان کی ہوئی "وحی" پر ایمان لاتے تھے، وہ آپؐ کے ذاتی علم یا "عطائی غیب" سے بتائی ہوئی حقیقت پر بھی یقین کر لیتے!

مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ سُن کر، آپؐ صحابہ کرام سے بیعت لینا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہ محض افواہ تھی۔ اگر حضورؐ عالم الغیب ہوتے، تو افواہ کے سُنتے ہی فرما دیتے کہ یہ خبر غلط ہے۔ عثمانؓ مکہ میں زندہ ہیں۔ صحابہ کرام کی اتنی بڑی جماعت تک کو اصل واقعہ کا کشف نہیں ہوتا اور وہ بھی اصل حقیقت سے بے خبر اور لاعلم رہتے ہیں!

مشکوٰۃ کے باب "اعلان النکاح" میں ہے کہ ایک شادی میں کچھ چھوکریاں دف بجا رہی تھیں اور شہداء بدر کا ذکر کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کہنے لگی:۔

وَفِینَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ۔

ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے!

حضورؐ نے اس پر تنبیہ کے انداز میں فرمایا:۔

دعی ھٰذا وَقُولی بِالَّذِی کُنْتِ تَقُولِیْن۔

یہ بات چھوڑ دے اور وہی کہہ جو کہتی تھی!!

اَخْرَجَ البخاری عن اُمِّ العلاء الانصاریۃ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَا اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَمَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یَفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔

بخاری نے ذکر کیا کہ نقل کیا اُمّ العلاء انصاریہ نے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، پھر قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا۔ حالانکہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور (کیا معاملہ ہوگا) تمہارے ساتھ!!

اور قرآن پاک میں تو یہاں تک فرما دیا گیا ہے:۔

وَمِمَّنْ حَوْلَکُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۚ وَمِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ (قف) مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ (قف) لَا تَعْلَمُھُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ۔

تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہلِ مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ اُنھیں تُو نہیں جانتا۔ ہم اُنھیں جانتے ہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ تعالیٰ یہ خطاب فرما کر کہ "ان (منافقین) کو تُو نہیں جانتا، ہم جانتے ہیں" کیا معاذ اللہ رسولؐ کی شان کو گھٹانا چاہتا ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کے احوال کا جاننا اور مستقبل کے تمام واقعات کی خبر رکھنا، "نبوت و رسالت" کے فرائض میں داخل ہی نہیں ہے! خود قرآن کہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیات طیبہ

واقعات شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ "عالم الغیب" نہ تھے - یہ ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے - یہ شان تو اللہ تعالیٰ کی ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام جزئیات کا اُسے علم ہے! اور یہ "زمانوں" کی تقسیم تو ہم حادث و فانی انسانوں کے لئے ہے - اللہ کے لئے ہر زمانہ "حال" ہی حال ہے!

کیا شان ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

کوئی شک نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشخاص کے متعلق اور بعض آنے والے حالات کے بارے میں خبریں بھی دی ہیں اور پیش گوئیاں بھی فرمائی ہیں اور وہ "حق" ثابت ہوئی ہیں - قیامت کے آثار و علائم اور مستقبل میں اُمت کے لئے پیش آنے والے بعض فتنوں کی بھی حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم و بصیرت کی بناء پر خبر دی ہے! اور یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو علم نہیں دیا گیا - مگر خود قرآن اور احادیث آپؐ کے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کرتی ہیں - اور ایسے واقعات بھی بتاتی ہیں جن سے "غیب" کے اثبات کے مقابلہ میں "نفی" ثابت ہوتی ہے!

معجزات و کرامات حق ہیں مگر......!

انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بیشک معجزات عطا فرمائے تھے - جو انبیاء کے معجزات میں شک کرتا ہے، اُس کا ایمان معتبر نہیں!

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے معجزہ سے جادوگروں کے سحر کو باطل فرماتے ہیں - مگر اس سے یہ اصول اور کلیہ وضع کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے کہ دُنیا کے پردے پر جہاں کسی پر کوئی جادو کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس سے واقف ہو جاتے ہیں - اور جو کوئی انھیں مدد کے لئے پکار رہے تو وہ اللہ کے دیئے ہوئے معجزے سے جادو اُتار دیتے ہیں - اس کی نہ قرآن میں کوئی دلیل ملتی ہے، نہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے! یہاں تک کہ توریت و انجیل میں بھی ایسی بات بیان نہیں کی گئی -

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے معجزات عطا فرمائے تھے کہ آپ خدا کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیا کرتے تھے، اور مُردوں کو جِلا دیتے تھے!

وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ!

مگر آپ کے واقعہ "رفع" کے بعد سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے اپنے مُردے کے جِلائے جانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ نہیں کیا - اور نہ صحابہ نے آنکھیں دُکھنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُہائی دی کہ آپ تو مادرزاد اندھوں کو اچھا کر دیا کرتے تھے، دُکھتی ہوئی آنکھوں کا اچھا کر دینا آپ کے لئے کیا مشکل ہے!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ جب صحابہ کو سفر میں اور جنگوں (سرایا) میں کوئی مصیبت پیش آتی ہو، یا جو صحابہ کرام باہر کی بستیوں میں رہتے تھے، وہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتے ہوں - تو اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارتے ہوں - اور اُن کا یہ عقیدہ رہا ہو کہ ہم جہاں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں گے، آپ ہماری فریاد کو سُن لیں گے!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر کتنا سخت وقت آن کر پڑا تھا، اُن کا مکان روضۂ رسولؐ سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا، تاریخ و آثار میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ حضرت عثمانؓ نے ان جان لیوا مشکلات میں حضورؐ کے نام کی دہائی دی ہو۔ یا وہ صحابہ کرام جو اس کشمکش سے سخت بیزار تھے، انہوں نے ہی قبرِ رسولؐ پر آکر حالات بدلنے کے لئے حضورؐ سے استغاثہ کیا ہو۔!

کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلِ بیت کرام پر قیامت گزر گئی، مگر ان نفوسِ قدسیہ میں سے کسی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امداد کے لئے پکارا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دہائی دی!

جسے ہم معجزہ کہتے ہیں، قرآن کی اصطلاح میں اُسے "آیت" کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خود زندگی اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی "آیت" تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ اور تمام انسانیت کے لئے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو "آخری معیار" قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو معجزات بھی عطا فرمائے! اس معجزہ (تکثیر) کا آپ سے بارہا ظہور ہوا کہ تھوڑی چیز آپؐ کی معجز نمائی سے "بہت" ہو جایا کرتی تھی، لیکن اس کی کوئی روایت صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں ملتی کہ صحابہ کو جب رزق، پانی اور دوسری اشیاء کی تنگی ہوتی ہو۔ تو صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے "خیر کثیر" عطا فرمایا ہے، آپؐ ہماری قلتِ اشیاء کو کثرت سے بدل دیجئے!

انبیاء کرام کے معجزات کی یہ نوعیت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، معجزات ظہور میں آتے ہیں۔ اور جب نہیں چاہتا، اُن کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بارہا پانی میں، دودھ میں، کھانے میں اور پھلوں میں غیر معمولی برکت ہو ہو گئی ہے! اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ آپؐ کی جگر گوشہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔ مگر رضا الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم ہے! غزوۂ خیبر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ حضورؐ لعاب دہن لگاتے ہیں اور دکھتی آنکھیں آن کی آن میں اچھی ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف یہ شانِ اختیار اور دوسری طرف یہ مجبوری اور بے اختیاری کی یہ کیفیت کہ خود آپؐ پر جادو کا اثر ہوتا ہے اور آپ اُسے دور نہیں فرما سکتے!

شبِ اسراء میں "طئے زمان و مکان" کا یہ عالم کہ ایک رات میں افلاک، سدرہ و عرش اور عالم وراء الوراء اور لامکان تک کی سیر کر آئے، دوسری طرف بعض غزوات میں یہ کیفیت ہے کہ صحابہ کرام کے پاس پوری سواریاں نہیں ہیں۔ گرمی کی شدت ہے، زمین تپ رہی ہے۔ بعض بعض نے تو اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے ہیں۔ حضورؐ ان حالات کو دیکھتے ہیں۔ اور دل دکھتا ہے، مگر راضی برضا ہیں۔ ورنہ اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو "طئے ارض" کے معجزہ کے زور سے اسلامی لشکر کو آن کی آن میں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے۔ اور صحابہ کرام سفر کی صعوبتوں سے بچ جاتے!

احادیث میں یہ معجزہ بھی ملتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک خفیہ مشورت ہوتی ہے، جس کا انکشاف مدینہ میں بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف حدیث کی کتابیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ حدیبیہ، مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت واقع نہیں ہوتی، صرف افواہ سن کر آپؐ صحابہ سے

بیعت لینا شروع کر دیتے ہیں، اور کئی دن تک اصل حقیقت سے رسول اللہ اور صحابہ باخبر نہیں ہو پاتے!

حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام ہی کے واقعہ کو لے لیجئے کہ ایک طرف تو آپ پیراہن یوسفؑ کی خوشبو بہت دور سے سونگھ لیتے ہیں اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ برسوں تک حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس غم میں آپ کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں!

جو لوگ اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہر کہے کو مان لیتا ہے اور وہ قبر و برزخ سے لوگوں کی مشکل کشائی کرتے رہتے ہیں۔ اور مخلوق کے درد و مصیبت کو دور کرنا ان کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، کاش! سورۂ یوسفؑ میں تدبر و تفکر کی ان کو توفیق نصیب ہوئی ہوتی!

حضرت یعقوب علیہ السلام برسوں تک شدید حزن و ملال میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی اور مشیت و حکمت اپنے مقرب و برگزیدہ بنی کے اس اضطراب، بے چینی، اور غم و اندوہ کی پروا نہیں کرتی، یہ حزن و ملال اسی وقت دور ہوتا ہے جب اللہ کی مشیت کو منظور ہوتا ہے۔ جب انبیاء کرام تک رضائے الٰہی کے مقابلہ میں اتنے بے اختیار ہوں۔ تو وہ کون ایسا ولی اور اللہ کا پیارا ہے، جو انبیاء کرام سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں مقرب اور محبوب ہے اور مشیت الٰہی جس کے اشاروں پر چلتی ہے! (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر سینکڑوں میل دور کے ایک مقام کو منکشف فرما دیا تھا۔ آپ نے "ساریہ! الی الجبل" کا نعرہ مدینہ سے بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ساریہؓ کو حضرت عمرؓ کی یہ آواز سنوا دی —— یہ کرامت ہے، اور حق ہے! مگر اس کرامت سے کیا یہ اصول وضع کیا جانا قرین صواب ہے کہ مملکت اسلامیہ کا ایک ایک گوشہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا! اور اسلامی فوجوں کو جب اور جہاں کہیں بھی کوئی خطرہ پیش آتا تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بیٹھ کر اسے دیکھ لیا کرتے تھے اور وہیں سے فوج کے کمانڈروں کو کرامت کے ذریعہ مطلع فرما دیا کرتے تھے! اور کیا اس واقعہ کے بعد سے صوبوں کے گورنروں اور حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان گفتگو دور دور ہی سے کرامت کے ذریعہ ہو جایا کرتی تھی۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ کے میدانوں سے خبر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو آپ انتہائی مضطرب رہتے تھے۔ اور بعض گورنروں کی جب شکایتیں آپ تک پہنچی ہیں، تو آپ تحقیق حال کے لئے سینکڑوں میل کے دشوار گزار سفر کی صعوبت برداشت فرما کر صوبہ کے صدر مقام پہنچے ہیں ——!

ایک طرف تو "بر طارم اعلیٰ نشینم" کا یہ عالم کہ سینکڑوں میل کا واقعہ فاروق اعظمؓ پر منکشف ہو جاتا ہے اور دوسری طرف۔ ؎

"گہے بر پشت پائے خود نہ بینم"

کی یہ کیفیت کہ کوئی خنجر لے کر آپ کے قتل کرنے کے لئے آتا ہے اور آپ کو اس کے ارادے کی، آمد کی اور اس کے خنجر کی خبر نہیں ہو پاتی ——!

عبدیت اور بشریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" اور اس کے لوازم سے جب بحث کی جاتی ہے تو اہل بدعت بہت چراغ پا ہوتے ہیں کہ یہ "وہابی" اس عنوان سے حضورؐ کی شان گھٹاتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل اپنا جیسا بشر سمجھتے ہیں!

اس بحث کے آغاز سے قبل ایک مثال عرض کی جاتی ہے۔ قارئین کرام اس پر ضرور غور فرمالیں۔ کہ بعض سیدھی اور سچی باتیں بھی بعض اوقات آدمی کو بہت کچھ کھٹکنے لگتی ہیں۔ اس مثال سے اسی قسم کے خدشوں اور وسوسوں کا ازالہ مقصود ہے!

کسی بادشاہت میں بادشاہ نے اپنے ایک مقرب، ندیم اور پسندیدہ آدمی کو صوبہ کا والی اور حاکم مقرر کر دیا ہے۔ یہ حاکم بادشاہ کا پوری طرح فرمانبردار اور نیاز مند ہے، کچھ لوگ جو اس حاکم سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں، یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس حاکم کو تو بادشاہ نے ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا ہے! بس جو کچھ یہ حاکم چاہتا ہے، وہی یہ کر رہتا ہے۔ خود بادشاہ سلامت اس والی کے رضا جو ہیں۔ حقیقی بادشاہ نے اپنے تمام اختیارات اس حاکم کو عطا کر دیئے ہیں، کسی ملکی مسئلہ پر یہ حاکم اڑ بیٹھے اور ضد کرنے لگے تو بادشاہ سلامت کو اس کی منظوری کرنی پڑتی ہے! یہ حاکم بادشاہ کا دراصل انتہائی محبوب ہے اور محب اور محبوب میں اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا۔ جو محبوب کی مرضی، وہی محب کی مرضی! عشق و محبت میں۔ ع

من تو شدم تو من شدی

کا معاملہ ہوتا ہے!

ملک کے دوسرے ارباب فکر اور اہل کار جو بادشاہ اور حاکم صوبہ کے فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور ملکی سیاست اور بادشاہت کے مسائل کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ صوبہ کے حاکم کی شان میں اس طرح کا غلو، خود نظام سلطنت میں ابتری پیدا کر دے گا اور بادشاہ اور عمال اس عقیدہ کے بعد قریب قریب ایک ہی سطح پر آجائیں گے ــــ تو اس عقیدت کے غلو کے جواب میں اگر وہ یہ کہیں:-

”بھائیو! ایسا نہ کہو، یہ صوبہ کا حاکم تو بادشاہ سلامت کا نوکر اور چاکر ہے۔ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی تو آخر یہ کھاتا پیتا انسان تھا۔ اس وقت اس کی یہ حیثیت کہاں تھی؟ بادشاہ کی جوتیوں کے طفیل اس کو یہ عزت اور منصب ملا ہے! اور تم جو عقیدت اس حاکم کے بارے میں رکھتے ہو، اس کا علم اگر اس حاکم کو ہو جائے تو وہ اسے کسی عنوان پسند نہ کرے گا۔ بلکہ اپنے عقیدت مندوں پر الٹا خفا ہوگا۔ بادشاہ سلامت خود مختار حاکم ہیں۔ ہوشیار اور معاملہ فہم ہیں، وہ اس حاکم کی ہر بات کو مان کس طرح سکتے ہیں! اُن پر اُن کے کسی ماتحت کا زور چل کیسے سکتا ہے؟ اور اُن کے دربار میں تو یہ حاکم ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ بالکل چاکروں اور غلاموں کی طرح! بادشاہ سلامت چاہیں تو اس حاکم کو بھرے دربار سے نکلوا دیں، بادشاہ کو سب کچھ اختیار ہے۔ جس کو عزت دی ہے، اس سے چھین بھی سکتا ہے ــــ! اور ہاں! فلاں فلاں معاملہ میں تو اس حاکم کی درخواست کو جہاں پناہ نے رد کر دیا ــــ آقا پھر آقا ہے، نوکر پھر نوکر ہے!“

یہ الفاظ اگر سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھے جائیں۔ یعنی کسی کو ان کا پس منظر نہ معلوم ہو کہ کس ”مبالغہ آمیز عقیدت“ کے جواب میں یہ کہے گئے ہیں، تو بعض پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ ”والی صوبہ اور حاکم علاقہ کی شان میں سوءِ ادب یا کم سے کم خفت کا پہلو اختیار کیا گیا ہے“

مگر جب کسی کے سامنے اس قضیہ کا پس منظر ہوگا کہ بعض لوگوں نے اپنی کم فہمی کے سبب حاکمِ صوبہ کو بادشاہ کا مدِ مقابل ٹھہرا دیا تھا اور وہ ایسی ایسی مبالغہ آمیز باتیں حاکم کی شان میں کہتے تھے، اُس کے جواب میں یہ کچھ کہا گیا، تو اس عبارت میں اسے کوئی کھٹک محسوس نہ ہوگی، کہ مقصود "حاکمِ صوبہ" کی خفت اور اہانت نہیں ہے۔ بلکہ حاکمِ صوبہ کو بادشاہ سلامت کے مدِ مقابل جو ٹھہرایا جا رہا تھا، اُس کی تردید مقصود ہے!

شرک و بدعت کے رد میں بعض موحدین کو یہی اندازِ بیان اختیار کرنا پڑا ہے۔ جس کو اہلِ بدعت "اہانتِ رسولؐ" کے عنوان سے اور اُس پر طرح طرح کے حاشیے چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے فدائی اور جاں نثار تھے اور حضورؐ کی معمولی سے معمولی سنّت کو بھی جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی پوری زندگی "احیاءِ سنّت" ہی کی جدوجہد میں گزری! اور اُن کی یہی تمنّا، آرزو اور کوشش رہی کہ مسلمان "سنّتِ رسولؐ" کو اپنی زندگی کا نصب العین، محور، اور غایت و مقصود بنا لیں۔ —— ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض موحدین علماء سے لفظوں میں بے احتیاطی ضرور ہو گئی ہے! بات قرینہ اور خوبصورتی کے ساتھ محتاط انداز میں کہنی چاہیے تھی۔ ان بزرگوں کی پوری زندگی میں ہم سُنّتِ رسولؐ کو جلوہ گر پاتے ہیں۔ اس لئے اُن سے "اہانتِ رسولؐ" جیسا غارت گرِ ایمان جرم منسوب نہیں کر سکتے! اُن کے دینی شغف اور دُوسرے حالات کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات کی نیت بخیر تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ مطہرہ پر اسی لئے تو عمل کرتے تھے کہ حضورؐ کی محبّت اور عقیدت اُن کے دلوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی ہمیں اعتراف ہے کہ لفظوں کی بے احتیاطی اور بدسلیقگی کے سبب خود اُن کے مشن کو اس لئے نقصان پہنچا، کہ مخالفین نے اس لفظی اُونچ نیچ اور اظہارِ بیان کی بے اعتدالی کو نمک مرچ لگا کر عوام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اُن کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ تختۂ گل پر جو کیچڑ کے چھینٹے پڑ گئے تھے، فریقِ مخالف نے اِن کو اتنا نمایاں کیا کہ جیسے یہ پھولوں کا تختہ نہیں ہے، بلکہ سارے کا سارا گھورا اور تمام کا تمام مزبلہ ہے!!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اہلِ بدعت نے "مُحَمَّدٌ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی براہ راست زد "توحید" کے عقیدہ پر جا کر پڑتی ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مالکِ کون و مکان"۔ "احمد بلا میم" اور "عالم الغیب" سے لے کر:۔

وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰے ہو کر　　　　(معاذ اللہ)

تک کہہ دیا ہے! اور اس اپنی عقیدت اور عشقِ رسولؐ پر یہ لوگ ناز بھی فرماتے ہیں! حالانکہ وہ "عشقِ رسول" جس سے عقیدۂ توحید مجروح ہوتا ہو، نہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک معتبر ہے! اسی قسم کی "محبت" قدر و ستائش کی جگہ ناپسندیدگی بلکہ عتاب کا باعث ہوگی!

قرآن پاک ہی نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے، اسی بناء پر ہم اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ اور اُن سب کی عزت و احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے قلوب تمام انبیاء کرام کی عقیدت، احترام اور محبت سے معمور ہیں۔ تمام انبیاء جن میں نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہیں، جیسے ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ...گھر کے بھائی ہوتے ہیں!

قرآن پاک میں انبیاء کرام کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی چند جھلکیاں اوپر پیش کی جا چکی ہیں، اُن میں اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ ترین بندوں کی "بشر" اور "عبد" کی حیثیت ظاہر کی گئی ہے۔ اور "عبد" بھی کیسے؟ اللہ تعالیٰ کے انتہائی فرمانبردار اور اپنے معبود کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرنے اور اُس سے ڈرنے والے! اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو شرفِ وحی سے بھی نوازا تھا! اور اُن کو معجزات بھی عطا کئے تھے۔ مگر اس تمام اکرام و اعزاز اور تقرب کے باوجود وہ "بشر" اور "بندے" ہی تھے ــــ!

قرآن پاک میں جگہ جگہ انبیاء کرام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے اُن کی "الوہیت" کی نفی ہوتی ہے اور اُن کی "بشریت" اور "عبدیت" کا ثبوت ملتا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے واپس آئے ہیں، تو آپ نے دیکھا کہ قوم گئوسالہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ اس پر آپ کو خیال ہوا کہ آپ کے بھائی اور جانشین حضرت ہارون علیہ السلام سے شاید اصلاحِ حال میں کچھ کوتاہی ہوئی، اس پر آپ نے غضب میں آ کر:-

وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا۔ لگا کھینچنے اُس کو اپنی طرف۔ وہ بولا کہ میرے ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھ کو گنہگاروں میں ــــ!

حضرت ہارون علیہ السلام کے اس جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوتا ہے کہ شدتِ غضب میں جو اپنی ہوائے نفس کے لئے نہیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لئے یہ غضب اور غیرت تھی، اُن سے پوری نیک نیتی کے باوجود بے اعتدالی ہوگئی ہے، تو آپ نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی:-

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝

(موسیٰ نے) کہا۔ اے میرے رب مجھے معاف کر اور میرے بھائی کو۔ اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا فرمائے تھے، ضرب کلیمی کے اثر سے سمندر پھٹ گیا تھا۔ اور فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دنیوی زندگی میں حضرت کلیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے کلام فرمایا۔ یہ تمام شرف و مجد اپنی جگہ درست اور بجا! مگر وہ بہرحال "عبد" اور "بشر" ہی تھے۔ سارے جہان کے احوال و کوائف آپ پر روشن نہیں تھے۔ اسی بنا پر آپ نے اپنے بھائی ہارونؑ کے بارے میں ایک ایسا خیال قائم کیا تھا۔ جو واقعہ کے مطابق نہ تھا۔ جس کی تفصیل ابھی اوپر گزر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی تنزیہی عصمت جس میں ذہول و نسیان کا شائبہ تک نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے!

حضور خاتم النبیینؐ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآن پاک میں بار بار "عبد" کہا گیا ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ــــ!

(سب تعریف اللہ کو جس نے اُتاری اپنے بندہ پر کتاب !)

واقعہ معراج کا ذکر فرمایا تو اُس میں بھی:۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ - پاک ذات ہے، جو لے گیا اپنے بندہ کو !

فرمایا گیا۔ یعنی حضورؐ کی "عبدیت" کا اظہار اور اعلان !

واقعہ معراج اتنا بڑا شرف تھا کہ کسی نبی اور رسول کو یہ شرف اور تقرب عطا نہیں فرمایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دیکھا۔ آپؐ کو کیا دکھایا گیا۔ قرب کی منزلیں کس طرح طے کیں۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ! اس لئے ایسے عظیم الشان اور محیر العقول واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کا اعلان کیا کہ لوگ واقعہ معراج سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور صاحب معراج کی "عبدیت" کا عقیدہ تر و تازہ رہے۔ اور کسی مشرکانہ تصور سے یہ عقیدہ دبنے نہ پائے۔ پھر خود آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے آپؐ کے "بشر" ہونے کا اعلان کرایا گیا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ -

تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم ("بجز اس کے" کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے)

اس آیت میں بھی "مِثْلُکُمْ" غور طلب ہے۔ رسول اللہ سے صرف یہی نہیں کہلوایا گیا کہ "اَنَا بَشَرٌ" (میں بشر ہوں) بلکہ "بشریت" کے ساتھ اس کا اظہار ضروری سمجھا گیا کہ "مِثْلُکُمْ" (تم جیسا بشر ہوں) تاکہ آپؐ کی "بشریت" میں کسی الوہی صفت کے تشابہ کا بھی امکان نہ رہے !

اس آیت میں ذرا سا بھی ابہام اور تشابہ نہیں۔ یہ ایک محکم آیت ہے۔ جس کے ایک سے زیادہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ اب کوئی قرآنی تحریف پر ہی تُل جائے اور "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کو "اِنَّ مَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" (یعنی میں تم جیسا بشر نہیں ہوں) بنا دے، تو ایسے ظالم گستاخ، اور محرف قرآن کو ہم لائقِ خطاب ہی نہیں سمجھتے !

ہمارا ایمان ہے کہ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے کوئی بشر حضورؐ کی برابری نہیں کر سکتا ! آپؐ انبیاء کے سردار اور رسولوں کے پیشوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد ہر عزت و عظمت کی سزاوار سرکار ہی کی ذات ہے ! حضورؐ کے نعلین مبارک سے جو ذرّے چھو جائیں، خدا کی قسم وہ ذرّے ہماری روحوں سے زیادہ لطیف اور مبارک ہیں ! مگر ان تمام صفات و کمالات کے باوجود آپؐ ہیں "بشر" ہی۔ الوہی صفت کے آپؐ حامل نہیں۔ بلکہ بشری صفات کے حامل ہیں ! اور اس پر قرآن اور احادیث گواہ ہیں۔ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بشر" نہیں مانتا یا آپؐ کو "بشر" کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے، وہ اللہ کے کلام کو جھٹلاتا ہے ! یا کم سے کم اُسے اشتباہ و تشکیک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یا اُسے اس بات کا زعم اور دعویٰ ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں رسول اللہ کی حقیقت کو وہ زیادہ جانتا ہے ! (معاذ اللہ)

حضورؐ کی تمام زندگی قرآن کے اس اعلان "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی شاہد ہے۔ اللہ نے چاہا تو رات کی رات میں لامکان تک کی سیر کرا دی ! اور جب نہ چاہا تو تاریخ و سیر میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضورؐ جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرماتے ہیں تو عبد اللہ ابن اریقط جو مسلمان بھی نہ تھا، اُس کی خدمات مدینہ کے سفر میں راستہ بتانے کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ اور شب معراج میں فلک الافلاک کی سیر کرنے والا، کئی دن کی مسافت کے بعد قبا پہنچتا ہے اور اس سفر میں ایک غیر مسلم دلیلِ راہ ہوتا ہے !

اللہ نے چاہا تو یہ بھی ہوا کہ سراقہ بن جعشم نے ہجرت کے وقت راستہ میں حضورؐ کا تعاقب فرمایا - اور جب حضورؐ کے قریب پہنچنے کا ارادہ کیا تو گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور سراقہ زمین پر گر پڑا - اور ایک بار تو گھوڑے کے پیر بھی زمین میں بُری طرح دھنس گئے - دوسری طرف یہ واقعہ بھی تاریخ و سیر میں ملتا ہے کہ غزوۂ احد میں عبداللہ بن قمیہ کی تلوار حضورؐ کے مغفر پر پڑی تو دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں پیوست ہو گئیں - اور چہرۂ مبارک سے خون جاری ہو گیا - دونوں واقعات اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سراقہ کے گھوڑے کو زمین میں دھنسا دیا - مگر غزوۂ احد میں ابن قمیہ کی تلوار نے آپ کو زخمی کر دیا اور اس تلوار کی زد کو روکنا اللہ کی مشیت اور حکمت کو منظور نہ تھا - حضورؐ یہ تو نہیں چاہتے تھے کہ خود زخمی ہو جائیں اور تیر اندازوں صحابہ کی غفلت کی وجہ سے مسلمانوں کی شکست ہو جائے! یہی وہ مقدرات تھے جن کا رد کرنا حضورؐ کے قبضۂ اختیار میں نہ تھا - اس لئے کہ آپؐ "عبد" اور "بشر" تھے !!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کے جادو اور زہر کا بھی اثر ہو جاتا ہے - آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم وفات پاتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں - ظاہر ہے کہ آپؐ کے اختیار میں ہوتا تو لختِ جگر کو بھلا مرنے دیتے - اور بیٹے کے غم میں یہ اشکباری بشری فطرت کا عین تقاضا تھی !

"الآن کما کان" تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ! کہ وہاں کسی تغیر و حادثہ کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا - بشر کو اللہ تعالیٰ نے جسم عنایت فرمایا ہے، لہذا اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شباب اور اس کے بعد ادھیڑ عمر اور قدرے بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے، مسلم (جلد اوّل) کی روایت ہے :-

> "ایک بار حضورؐ نے بیماری کی حالت میں نماز عشاء پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کا ارادہ کیا - جب چلنے لگے تو غش آگیا - جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے دریافت کیا کہ مسجد میں لوگوں نے کیا نماز پڑھ لی ؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ نہیں - آپؐ کا انتظار کر رہے ہیں - کئی مرتبہ اسی طرح ہوا" اور وہ اس لئے کہ آپ "بشر" تھے !

"بشر" اور "عبد" ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے - اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے دعا مانگتے ہیں کہ بندوں کی فریاد کو وہی پہنچ سکتا ہے ! دلوں کے چھپے ہوئے خطروں کو وہی جان سکتا ہے اور دل کی دھڑکن کو وہی سُن سکتا ہے ! جو حیّ و قیوم ہے، جس کی ذات کو فنا نہیں - جس کو نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند ! اور نہ دُنیا کے کارخانے کے چلانے سے اُسے تھکن محسوس ہوتی ہے - نہ جس پر بیماری کا کوئی اثر ہوتا ہے - جو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہے - جس سے کونین کا ایک ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے ! ہمہ شما کا کیا ذکر، انبیاء اور صلحاء بھی اُس کے محکوم، تابعِ فرمان اور اُس کی رضا کے چاہنے والے ہیں - اور اُس کی مشیت کے آگے دم بخود ہیں !

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک مستند واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے -

> "مصعب بن عمیرؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے اُن کو شہید کر دیا - اور غُل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی - اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے - بدحواسی میں اگلی

صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان)، اس کشمکش میں آ گئے اور اُن پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہؓ چلاتے ہی رہے کہ میرے باپ ہیں۔ لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا، مسلمانو! خدا تم کو بخش دے! (صحیح بخاری غزوہ احد)

بحوالہ سیرت النبی جلد اوّل)

یہ صحابہ کرامؓ ہیں، حضورؐ کے تربیت یافتہ! خود حضورؐ موقعۂ واردات پر موجود ہیں۔ مگر صحابہ کی بے خبری اور لاعلمی کے سبب ایک مسلمان کی شہادت واقع ہو جاتی ہے! حضورؐ بھی صحابہ کرام کو متنبہ نہیں فرماتے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر حضورؐ کو اس کشمکش کا علم ہوتا تو صحابہ کو روکنا اور ٹوکنا آپؐ پر فرض ہو جاتا۔ جب صحابہ کرام جو انبیاء کے بعد اُمت میں سب سے افضل ہیں، اُن کا یہ عالم ہو کہ نظروں کے سامنے کے آدمی کو کشمکش میں نہ پہچان سکیں! تو ہم کسی ولی، قطب، غوث اور ابدال کے بارے میں یہ "حسن ظن" قائم کر لیں کہ اُس پر ساری دُنیا کے احوال و کوائف ہمہ وقت منکشف رہتے ہیں۔ اور اُس کو جہاں سے بھی پکارا جائے وہ پکارنے والے کی پکار سُن لیتا ہے۔ اور اُس کی مصیبت کو دُور کر دیتا ہے!

اس تفصیل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھیے:-

اخرج الشیخان عن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبدہٗ فقولوا عبد اللہ ورسولہ

مشکوٰۃ کے باب المفاخرہ میں لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے ذکر کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا۔ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا حضرت عیسیٰؑ بن مریم کو نصاریٰ نے بڑھایا۔ سو میں تو اُس کا بندہ ہوں، (میرے بارے میں) یہی کہو کہ "اللہ کا بندہ اور اس کا رسول"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ:-

"میرے مرتبہ کو نہ گھٹانا"

اس لئے کہ پچھلی امتوں کے احوال آپؐ کے سامنے تھے۔ کہ انہوں نے بعض انبیاء کے مرتبہ کو گھٹایا نہیں تھا۔ بلکہ حد سے زیادہ بڑھا دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی نبی کا اُمتی اپنے نبی کے رتبہ کو گھٹاتا ہے۔ اُس کا ایمان ہی کب سلامت رہتا ہے، خوف الحاد اور بے دینی سے نہیں ہے کہ وہ تو ظاہر ہو جاتی ہے! محلِّ خوف وہ "عقیدت" ہے، جو اُس شخص کو جس سے عقیدت ہوتی ہے، بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ ایسی عقیدت خوفناک اور پُر خطر اس لئے ہے کہ عقیدت مند اتنا کچھ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے اور جس کی محبت اور عقیدت میں کیا ہے اُس کی خوشنودی مجھے حاصل ہو گی!

نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت، آپ کے معجزات اور آپ کے "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" ہونے سے دھوکا کھا گئے، اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کے بندے اور بشر ہونے کی حقیقت کو بھلا بیٹھے!

یہاں تک کہ انھیں ابن اللہ بنا دیا۔ اور یہ شرک کرنے کے بعد بھی وہ "موحد" ہونے کے دعویدار ہیں۔ اور اس حسن ظن بلکہ غلط فہمی اور جہالت وحماقت کا شکار ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں "ابن اللہ" کا عقیدہ رکھنا "توحید" کے منافی اور مخالف نہیں ہے!

ایک اور حدیث ہے، جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انی لا ارید ان ترفعونی فوق نزلتی التی انزلنیہا اللہ تعالیٰ انا محمد بن عبد اللہ عبدہ ورسولہ۔ (رواہ رزین)

(بیشک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھ کو زیادہ اس رتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے۔ میں تو وہی محمدؐ ہوں بیٹا عبد اللہ۔ اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ)

جس مسلمان کو حضورؐ کے ارشاد اور فرمان ونصیحت کا پاس ہوگا، اس کے قلم، زبان اور کسی دوسرے عمل سے ایسی بات ظاہر ہو ہی نہیں سکتی، جو "محمد بن عبد اللہ" کو "ارباب من دون اللہ" بنادے!

حضورؐ کا یہ فرمانا کہ:۔

"انی لا ارید ان ترفعونی فوق نزلتی ....."

(بے شک میں نہیں چاہتا کہ تم بڑھاؤ مجھ کو زیادہ میرے رتبہ سے .....)

اور یہ ارشاد:۔

"لا تطرونی" (مجھ کو میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ)

کتنی نفسیاتی حکمتوں کا حامل ہے۔ اور اس سے شرک آمیز عقیدت کی جڑ کٹتی ہے! اس "عبد کامل" کے قربان جائیے کہ جس نے اُمت کو گمراہی اور ضلالت کے فتنوں سے بچانے کے لئے کیسے کیسے خطروں، ذہن ونفس کی چوریوں اور شیطان کے فریب سے خبردار فرما دیا ہے!

یہ حدیثیں دو حقیقتوں کو سامنے لاتی ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ حضورؐ کی مدح ومنقبت اور توصیف ونعت اس انداز میں کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ جس سے کسی دوسرے نبی کی منقصت نکلتی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ حضورؐ "سید الانبیاء" ہیں۔ مگر اس قسم کے اشعار:

آج یوسفؑ بھی اُن کی غلامی میں ہیں
لوٹ لے دیکھا زلیخا ہمارا نبیؐ

خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کا سبب نہیں ہوسکتے! بلکہ بارگاہ رسالت سے ان کو رد ہی کر دیا جائے گا۔ شاعری میں اس قسم کے شعروں کی اچھی خاصی تعداد ملتی ہے!

۲۔ دوسری حقیقت اور حکمت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہیں۔ اس لئے دنیا کے جس بڑے سے بھی بڑے انسان پر آپ کو فضیلت دی جائے گی۔ تو اس "فضیلت" اور "انداز نعت وتوصیف" پر:۔

"لا تطرونی" (مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ)

کے اشتباہ اور ممانعت و قدغن کا اطلاق نہیں ہو سکتا - کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مجد و شرف حضورؐ ہی کے لئے سزا وار ہے - اور ایسی تعریف جس میں حضورؐ کو تمام مخلوقات سے افضل کہا جائے "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہو سکتی" - "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی" وہی نعتِ رسولؐ اور توصیف ہوگی جس میں حضورؐ کو حدِ شریعت سے بڑھا کر مرتبۂ الوہیت کے برابر پہنچا دیا جائے! اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری صفات اور پیمبرانہ کمالات میں "الوہیت" کا رنگ پیدا کیا جائے!

قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے یہ کہلوایا جاتا ہے:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ -

(اے نبی!) کہہ کہ میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا، مگر جو اللہ چاہے!

اب اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انداز میں تعریف کرتا ہے کہ ساری مخلوقات آپ کے در سے پل رہی ہے، آپ کائنات کے مالک و مختار ہیں - آپ حاضر و ناظر ہیں، آپ ہر امتی کے حال پر نگاہ رکھتے ہیں - آپ پریشان حالوں کی فریاد سنتے اور ان کی مشکلوں کو کھولتے ہیں، تو وہ آپ کو "حد سے زیادہ بڑھاتا" ہے - اور ایسا کرنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے!

قرآن کریم کی متعدد آیتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہیں ہے! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:۔

"ہم نے بعض رسولوں کا تم سے ذکر کیا اور بعض رسولوں کا ذکر ہی نہیں کیا"

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ - (النساء)

یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی، ہم نے اُن رسولوں پر وحی نازل کی، جن کا ذکر اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا - (یعنی تمہیں جن کے احوال کی اطلاع نہیں دی)

قرآن پاک تو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض رسولوں کے حالات تک کی اطلاع نہیں دی مگر اس کے خلاف کوئی اگر حضورؐ کو "عالم الغیب" کہے یا یہ کہ "ماکان و ما یکون" کا علم آپؐ کو دیا گیا ہے اور کائنات کے احوال کی کوئی اگلی پچھلی بات آپؐ سے چھپی ہوئی نہیں ہے - تو یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو:۔

"حد سے زیادہ بڑھانا"

جس کی ممانعت آئی ہے! تو جو لوگ "عشقِ رسولؐ" کے نام پر حضورؐ سے الوہی صفات منسوب کرتے ہیں - اُن کا یہ "عشق" خود اُن کی ذات کے لئے آخرت میں وبال بن جائے گا - اور اس قسم کے فاسد عقائد سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براءت اور بیزاری کا اظہار فرمائیں گے! یہ "عشق" کی عجیب و غریب قسم ہے کہ "محبوب" کچھ کہتا ہے اور عشاق کچھ اور کہتے ہیں بلکہ اُس کے کہنے کا اُلٹ کر کے دکھلاتے ہیں - محبوب کے حکم کی خلاف ورزی کر کے، اُس سے دعویٰ محبت کرنا - محبت نہیں نفس کا فریب اور شیطان کا پھونکا ہوا افسوں ہے!

یہ "عطائی" اور "ذاتی" کی بحث و تفریق، جس کی طرف چند صفحے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بڑی دھوکے میں ڈالنے والی چیز ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء، اولیاء اور شہداء کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ کائنات میں جس طرح چاہیں تصرف کریں -

قبر و برزخ میں ہزاروں میل سے لوگوں کی فریاد سن کر اُن کی مصیبتوں کو ٹال دیں - کون و مکان کا کوئی ذرّہ اُن سے پوشیدہ نہ ہو۔
رزق، اولاد، دولت، جاہ و منصب کے وہ بانٹنے اور عطا کرنے والے ہوں - تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک
"ذاتی خدا" ہے، بہت سے "عطائی خدا" بنا دیے ہیں - حالانکہ اللہ تعالیٰ کی غیرتِ تفرید و توحید اس "شرک" کو کسی
عنوان گوارا نہیں کر سکتی !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا :-

"کہ مجھے میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ"

"عبدیت" اور "بشریت" کا کتنا واضح اقرار اور کھلا ہوا اعتراف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہی ایسی ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں - ہر بڑے سے بڑے انسان اور اللہ تعالیٰ کے مقرب سے مقرب بندہ کی ذات صفت اور کمالات کی ایک حد ہے ! اور سب سے نمایاں اور روشن حد تو "بشریت" اور "الوہیت" کی حد ہے کہ اس کو "توڑنا" نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس "حد شکنی" سے خوش ہو سکتے ہیں - صحابہ کرام سے بڑھ کر عاشقِ رسولؐ اور سرکارؐ کا قدر شناس اور کون ہو سکتا ہے - انہوں نے حضورؐ کی مدح و توصیف میں ایسا مبالغہ نہیں کیا، جس سے یہ "حد" ٹوٹتی ہو - اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں ہوں کہ انہوں نے انتہائی عقیدت و محبت کے باوجود اس "حد" کو چھوا تک نہیں - بلکہ اس "حد" کی حفاظت کرتے رہے !

عیسائی، ہندو اور بودھ جتنے مشرکین اور کفار زمین کے پردے پر پائے جاتے ہیں، اُن کا فسادِ عقائد اس بات میں مشترک ہے کہ انہوں نے اپنے نبیوں، پیشواؤں اور رشیوں، منیوں کو مبالغہ آمیز عقیدت سے "الٰہ" بنا دیا ہے انہوں نے "بشریت" اور "الوہیت" کی حد کو توڑ دیا ہے - وہ ان بڑے لوگوں کو "خدا" نہیں کہتے مگر اُن کی عقیدت اُن سے "الوہی صفات" منسوب کر دی ہیں - "کالی ماتی" کو کائنات میں تصرف کرنے کا ذرّہ برابر اختیار نہیں ہے مگر ہندو "کالی کی جے" پکارتے ہیں - مسلمانوں کا تو بس ایک ہی "نعرہ" اور "جیکارا" (slogan) ہے، اور وہ ہے "اللہ اکبر"، مسرت کے وقت، مصیبت کے عالم میں، جنگوں اور معرکوں میں اُن کی زبان سے "اللہ اکبر" بلند ہوتا ہے تاریخ میں، سیر میں، احادیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ کرام نے "اللہ اکبر" چھوڑ کر یا اُس کے ساتھ ساتھ "یا رسول اللہ" کا بھی نعرہ بلند کیا ہو ! وہ ایسا نعرہ بلند کیسے کر سکتے تھے، جب کہ وہ توحید و رسالت کی حد کو جانتے اور پہچانتے تھے، اور اُن کا اس بات پر یقینِ جازم اور ایمانِ کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کی فریاد اور پکار کو نہیں سن سکتا تکبیر اُسی کے نام کی بلند ہونی چاہیے - جو کائنات میں "سب سے بڑا" (اکبر) ہے ؟ اور جو سمیع و بصیر، علیم و خبیر، علیٰ کلِّ شیئٍ قدیر ہے !

اہلِ بدعت نے "نعرۂ تکبیر" کے توڑ پر "نعرۂ رسالت" اختراع کیا ہے، کہ وہ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں "یا رسول اللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہیں ! — یہ ہے :-

"وہ حد سے بڑھ جانا"

جس کی حضورؐ نے ممانعت فرمائی تھی - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ارشاد کی مخالفت کر کے کوئی سعادت حاصل نہیں کر سکتا ! اور ایسی "عقیدت" اُن لوگوں کے منہ پر مار دی جائے گی !

"نعرۂ رسالت" کے مقابلہ میں "نعرۂ حیدری" (یا علیؑ) حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے! ایسا ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔ کہ اہلِ بدعت نے "توحید" کے معاملہ میں ہمیشہ ڈھیل اور بے پروائی سے کام لیا ہے اور یہ ذہنیت "مشرکانہ عقیدت اور بدعت و احداث" کے مسئلہ میں، ہر دور میں یکساں رہی ہے!

عبدیت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات، آپ کے "روح اللہ" ہونے اور آپ کی معجزانہ ولادت سے دھوکا کھا کر، حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں اس قدر غلو کیا کہ جناب مسیح کو "ابن اللہ" بنا دیا۔ اُن کی اس گمراہی سے آنے والی انسانی نسل کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر فرمایا، وہاں انبیاء کے "عبد" اور "بشر" ہونے کا بار بار ذکر کیا۔ اور نبیوں اور رسولوں کی زندگی کے ایسے واقعات بیان کئے، جس سے اُن کی عبدیت اور بشریت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی یہ شان تھی کہ انگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ دستِ مبارک میں کنکریاں کلمہ پڑھنے لگیں۔ درخت کو اشارہ کیا تو وہ چلنے لگا۔ بھوکا پیاسا اونٹ رحمتِ عالم کو دیکھ کر اس طرح بلبلانے لگا، جیسے وہ اپنی بھوک پیاس کی فریاد کر رہا ہے! طشت میں ہاتھ ڈال دیا تو انگشتانِ مبارک سے پانی کی دھاریں نکلنے لگیں، صاحبِ معراج، رحمۃ للعٰلمین، سراجِ منیر، کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ، دنیا میں بہت بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے لیکن پوری تاریخ انسانی میں "انسانِ کامل" ایک ہی پیدا ہوا۔ جس عمل پر اطاعتِ رسولؐ کی چھاپ نہ ہو، وہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام فضائل و مناقب اپنی جگہ مسلّم! مگر ان فضائل و معجزات کو دیکھ کر لوگ دھوکا نہ کھا جائیں۔ اس لئے خود قرآن میں آپؐ کی بشریت اور عبدیت کا بہ تکرار اظہار کیا گیا۔ اور آپؐ کی زبانی کہلو لیا گیا کہ:-

"میں کسی بھلائی اور بُرائی پر قدرت نہیں رکھتا"

نمازوں میں "محمدؐ" کے ما بعد "وعبدہٗ" پڑھا جاتا ہے! اور پانچوں وقت ایک مسلمان کے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے "بندے" ہیں اور بندے اور اللہ میں سب سے زیادہ نمایاں امتیاز "احتیاج" ہے۔ کہ بندہ کسی مقام رفعت و تقرب پر بھی پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا! بندگی اور احتیاج لازم و ملزوم ہیں! اور جو اللہ تعالیٰ سے خود احتیاج رکھتا ہو کیا وہ تمام کائنات کے انسانوں کی احتیاج کا

معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ میں (معاذ اللہ) اُنیس بیس کا فرق ہے۔ اور آپؐ کی ذات اور صفات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے بس کچھ ہی نیچی ہیں! ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ ہیں! مگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مقابلہ میں یہ آپ کی علوِ مرتبت اور افضلیت کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ پس گفتگو میں، تقریر و تحریر اور شاعری میں کوئی ایسا رمز و کنایہ، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفت، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مماثل یا مشابہ ٹھہرتی ہوں۔ آپؐ کی صفات میں "الوہیت" کا امتزاج پایا جاتا ہو۔ دینی نقطۂ نگاہ سے رد کر دینے کے قابل ہیں۔ اور ایسی باتوں سے نہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور نہ رسولؐ کی خوشنودی!!

زیارتِ قبور قرآنِ کریم میں "زیارتِ قبر" کا کوئی حکم، اشارہ اور ایماء تک نہیں ملتا۔ اور نہ کسی نبی اور صالح

اُمتی کا کوئی ایسا واقعہ مذکور ہے کہ فلاں نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کیا تھا۔ یا نبی کے کسی صحابی نے نبی کے وفات پانے کے بعد اُس کی قبر کی مجاورت کی تھی!

اگر قبروں کی زیارت دین کی کوئی بہت بڑی اور ناگزیر ضرورت ہوتی تو اس کا ذکر قرآن پاک میں ضرور آتا! "زیارتِ قبور" دین کا کوئی ایسا رُکن اور شعار کبھی نہیں رہا کہ جس کے ترک کر دینے سے کوئی دینی قباحت یا اعتقاد کی خرابی لازم آئے۔ ورنہ اس کا کسی نہ کسی عنوان سے قرآن ضرور ذکر کرتا!

کتاب اللہ کے بعد دین کا ماخذ سنّتِ رسول اللہ ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت منصوص ہے! کتاب و سنّت ہی کی اساس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے "اسوۂ حسنہ" کو دُنیا کے لئے نمونہ اور مثال (model) قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے جس منزل میں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔ بس وہی صراطِ مستقیم ہے!

حدیث میں ملتا ہے:-

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِى الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔

میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا۔ سو اب قبروں کی زیارت کیا کرو۔ کہ یہ چیز دُنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کو یاد دلاتی ہے!

شروع شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کی ممانعت فرمادی تھی۔ اور اس ممانعت کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عرب بُت پرستی کے عادی تھے، وہ کفر و شرک سے نکل کر نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ حضورؐ کو اندیشہ تھا کہ ممکن ہے بعض طبیعتیں "قبروں" کی زیارت میں کسی ایسی بے اعتدالی کا ثبوت دیں جو اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض ہو۔ ممانعتِ قبور کی مدّت کا تعین مشکل ہے کہ کتنے زمانہ تک یہ ممانعت باقی رہی، پھر حضورؐ نے زیارتِ قبور کی اجازت دے دی۔ اور اُس کی غرض کسی رمز و کنایہ کے بغیر بالکل واضح اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا بھی دی۔ یہ کہ قبروں پر اس لئے جاؤ کہ وہاں جانے سے (۱) دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو اور (۲) آخرت کی یاد آئے!

حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ قبروں پر پھول اور چادریں چڑھاؤ۔ اور اہلِ قبور سے اپنے لئے اللہ کے حضور دُعا کرنے کے لئے درخواست کرو۔ یا اُن سے استمداد و اعانت چاہو اور وہاں سے فیض حاصل کرو۔ اس قسم کا کوئی حکم، ایماء اور اشارہ تک حضورؐ کے کسی قول اور فعل سے نہیں ملتا!

ایک طرف حضورؐ نے زیارتِ قبور کی غایت بتادی اور دُوسری طرف خود اپنی "قبر" کے بارے میں اُمت کو تنبیہ کیا:-

اخرج النسائی عن ابی هريرة قَالَ سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقولُ لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِىْ عِيْدًا وَصَلُّوا عَلَىَّ فَاِنَّ صلواتكم تبلغنى حيث كُنْتُمْ!

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ میری قبر کو "عید" مت بناؤ۔ اور درود بھیجو مجھ پر اس لئے کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، چاہے تم کہیں بھی ہو!

"عید" کہتے ہیں میلہ لگانے کو، اور اسے سب لوگ جانتے ہیں کہ میلوں ٹھیلوں میں کیا کیا ہوتا ہے اور میلے کس طرح جمتے اور لگتے ہیں۔!

ایک طرف یہ فرمایا کہ "میری قبر کو" عید " نہ بناؤ"۔ دوسری طرف یہود و نصاریٰ پر لعنت کی گئی کہ ان بدبختوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو "سجدہ گاہ" بنالیا تھا۔

اخرج الشیخان عن عائشۃ اَنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الذی لم یقم منہ لعن اللہ الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد !

بخاری اور مسلم نے بروایت حضرت عائشہؓ نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے اُٹھے نہیں، فرمایا کہ لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا — !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل اُمت کو جس فتنہ سے متنبہ فرمایا، وہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ نے فرطِ عقیدت اور غلو احترام کے سبب اپنے نبیوں اور پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا تھا۔ اور اُن کا یہ فعل قابلِ لعنت ہے! مساجد میں لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ فرش اور پردوں کا انتظام کرتے ہیں۔ پھر رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ یہی باتیں اگر کسی نبی اور ولی کی قبر پر کی جائیں، تو ایسا کرنے والوں نے اس قبر کو گویا "مسجد" بنالیا۔ اور اس فعل کے کرنے والے پر حدیث میں لعنت آئی ہے !

ایک اور ارشاد نبویؐ :-

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسُرُج ۔ (مشکوٰۃ باب المساجد)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت کی اللہ نے اُن عورتوں کو جو زیارت کریں قبروں کی اور ان لوگوں پر لعنت خدا کی جو بنائیں قبروں پر مسجدیں اور روشن کریں (قبروں پر) چراغ !

اس حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر چراغ جلانے والوں کے لئے "لعن اللہ" (اللہ نے لعنت کی، یا اللہ کی لعنت ہو) کی خوفناک وعید دی گئی ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "قبر" کے ساتھ ہر قسم کی مشرکانہ وابستگی اور دلچسپی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ فرمایا:-

اخرج مسلم عن جابر قال نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یُجصّص القبرُ وان یُبنیٰ علیہ وان یُقعد علیہ !

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے، قبر پر گچ کیا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے اور اُس پر بیٹھا جائے !

اس حدیث میں قبر کو پختہ بنانے اور اُس پر عمارت قائم کرنے کی صریح لفظوں میں ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اور "ان یقعد علیہ" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "قبروں پر چڑھ کر بیٹھنے سے روکا گیا ہے"۔ اس لئے کہ قبروں کے اُوپر چڑھ کر بیٹھنے کا کبھی رواج نہیں رہا۔ اور یہاں حدیث کا سباق و سیاق بتارہا ہے کہ "ان یقعد علیہ" کا مطلب یہ ہے کہ قبروں پر مُراقب ہو کر اور مجاور بن کر بیٹھنا ممنوع ہے!

ایک دوسری حدیث میں قبروں پر گچ کرنے، اُن پر کچھ لکھنے اور اُن پر پاؤں رکھ کر چلنے یعنی روندنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اخرج الترمذی عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبور وان یکتب علیہا وان توطأ۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر گچ کرنے سے، اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے!

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ہیں۔ اور دوسری طرف اہلِ بدعت کا قبروں کے ساتھ سلوک دیکھئے۔ کہ اپنے ایک ایک فعل سے فرمانِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہیں!

حضورؐ نے اپنی قبر کو "عید" بنانے سے منع فرمایا تھا۔ اور یہاں اہلِ بدعت نے حضورؐ کے غلام جو حضورؐ کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں ہیں، اُن کی قبروں کو مسجد، عید اور شمع و چراغ سے شبستان بنا دیا ہے!

قبروں پر میلے ہیں گانا بجانا اور کھیل تماشے ہیں۔ طواف اور سجدے ہیں۔ مجاورت اور مراقبے ہیں۔ مزاروں سے حاجت مندوں کی عرضیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہاں آ آ کر مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ گاگر، پنکھے اور صندل کے جلوس نکلتے ہیں، کوئی قبر پہ ماتھا ٹیک کر عرض معروض کر رہا ہے۔ کسی نے بارہ دری کے ستون کو تھام رکھا ہے، اور صاحبِ مزار کی دُہائی دے رہا ہے! کوئی دروازہ کے پاس جہاں دھمال صاحب رقص فرما رہے ہیں۔ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اور صاحبِ مزار کے جلال و جبروت کے خوف سے اندر حاضر ہونے کی ہمت نہیں کرتا! مجاور مزار کے چراغوں کی زائرین کو.... راکھ چٹا چٹا کر نذرانے وصول کر رہے ہیں۔ عقیدت مندوں کے سروں پر مور کے پنکھوں کو گھمایا، گلے میں کلاوا باندھا، چند الائچی دانے ہاتھ پر دھرے، اور مٹھی گرم کر لی۔ سجادہ نشین صاحب مندروں کے مہنتوں کی طرح چڑھاوے وصول کرتے ہیں! اور راوی اُن کے لئے سدا چین ہی چین لکھتا ہے۔۔

قبور و مزارات کے اس پورے نظام کو کیا اسلام سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے؟ ان خرافات کے لئے کوئی دلیل کوئی سند، کوئی ثبوت، نقلی، عقلی، روایت سے درایت سے؟ اگر یہ حرکتیں شرک و بدعت نہیں تو پھر شرک و بدعت کسے کہتے ہیں؟

ہر بدعت گمراہی ہے!

صحیح مسلم کی حدیث ہے:۔

"اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَخَیْرَ الْھُدٰی ھُدَی مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔

(بہترین کلام خدا کی کتاب ہے، اور راستوں میں بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے۔ اور بدترین باتیں (دین میں) نئی نکلی ہوئی باتیں ہیں۔ اور (دین میں) ہر نئی نکلی ہوئی بات گمراہی ہے!

اس حدیث میں ہر "بدعت" کو گمراہی کہا گیا ہے۔ اس میں بدعت کی قسمیں نہیں کی گئیں۔ کہ یہ تو (۱) بدعتِ سیئہ ہے اور یہ (۲) بدعتِ حسنہ ہے۔ حضورؐ نے "کُلُّ بِدْعَۃٍ" فرما کر ہر "بدعت" کے "ضلالت" ہونے کی تصدیق فرمادی ہے!

ایک دوسری حدیث میں "اہلِ بدعت" کے لئے کتنی خوفناک وعید آئی ہے:۔

اخرج الشیخان عن سھل بن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
إنّي فرطكم على الحوض من مرّ عليّ شرب ومن شرب لم يظمأ ابداً ليردن
عليّ اقوام اعرفهم ويعرفونني ثم يحال بيني وبينهم فاقول إنهم منّي فيقال
انك لا تدري ما احدثوا بعدك فاقول سحقاً سحقاً لمن غيّر بعدي -

سہل بن سعد نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حوضِ کوثر
پر تم سب سے پہلے جاؤں گا، جو کوئی حوضِ کوثر کی طرف آنکلے گا اور جب (آبِ کوثر)
پیئے گا تو اُسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی - البتہ میرے پاس آئیں گے کئی فرقے کہ میں اُن کو پہچانتا ہوں گا
اور وہ مجھ کو پہچانتے ہونگے، پھر ایک پردہ حائل ہو جائے گا - میرے اور اُن کے درمیان
تو میں کہوں گا یہ تو میرے ہیں - اس پر کہا جائے گا کہ تو نہیں جانتا، انہوں نے کیا کیا
نئی نئی باتیں نکالی تھیں تیرے بعد، تب میں کہوں گا کہ دُوری ہو، دُوری ہو - اُس کیلئے
جس نے میرے دین کو متغیر کر دیا!

"بدعت" دین میں نئی بات نکالنے کو کہتے ہیں، ایسی بات جس کا کتاب وسنّت تو کجا آثارِ صحابہؓ تک میں
اُس کا پتہ نہ ہو - جو لوگ "بدعتیں" نکالتے یا اُن پر عمل کرتے ہیں، وہ "ترکِ بدعت" سے گھبراتے ہیں - اور انھیں
خوف لگتا ہے کہ فلاں رسم اور طریقہ کو ہم نے چھوڑ دیا - تو اس سے نہ صرف یہ کہ ہم بہت بڑی سعادت سے محروم
ہو جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ بھی ہوگا - اور جو کوئی اُن کی طرح بدعتوں میں مبتلا نہیں ہے، یا اُن پر
نکیر کرتا ہے، وہ بدبخت تو ہے ہی، مگر ساتھ ہی بدعقیدہ بھی ہے!

بدعت اور اجتہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے، بدعت ضلالت ہے اور "اجتہاد" دین کی ضرورت ہے -
اس لئے مجتہد کو نیک نیتی اور دین کی خیر خواہی کے سبب غلطی پر بھی اجر ملتا ہے!

"لاوڈ اسپیکر" کے بارے میں علماء کی اکثریت نے اجتہاد کیا کہ نماز اور جمعہ کے خطبہ میں اسے استعمال کیا جا سکتا
ہے، اس "اجتہاد" سے دین کا کوئی اصول نہیں ٹوٹتا اور نہ کوئی "لاوڈ اسپیکر" کے عدم استعمال کو دین کی کسی کوتاہی
کے مترادف سمجھتا ہے! اس اجتہاد کے مقابلہ میں قبروں پر چادر چڑھانا "بدعت" ہے، کہ قبریں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، چادریں بھی اُن کے پاس تھیں - اگر یہ کوئی نیک کام یا
دینی ضرورت ہوتی، تو اس کے بتانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام گریز نہ فرماتے! اسی طرح
اموات کا تیجا، دسواں اور چالیسواں بھی بدعت ہے - کہ کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ اور سیرتِ اہلِ بیت میں
اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا!

"بدعت" پر یہ جو دلیل لائی جاتی ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون، ریل، ہوائی جہاز، یہ سب بدعتیں ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا - اس دلیل میں کوئی وزن نہیں - بلکہ یہ دلیل کہنے والے کے
سطحِ ذہن کا آتا پتا دیتی ہے کہ حضرت اس قدر عقلمند (؟) واقع ہوئے ہیں -!
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے زمانے کے بعد آلات، اسلحہ اور دوسری چیزیں ایجاد

ہوں تو اُن کو استعمال نہ کرنا ! پھر اِن "ایجادات" سے دین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا ! اس لئے یہ "بدعت" کا ہیکو نہ بن سکیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں تمام صحابہ کرام ٹھیک وہی لباس نہیں پہنتے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے، حضورؐ نے زندگی بھر میں شاید ایک بار پاجامہ پہنا ہے، سرکارؐ ہمیشہ تہمد استعمال فرماتے تھے، مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پاجامہ پہننے کے عادی تھے، سُنّت ستر عورت کا ڈھکنا اور ایسا لباس پہننا ہے، جس سے استکبار و غرور نہ ظاہر ہو، حضورؐ نے کسی خاص لباس کی قید نہیں لگائی !

حجاج بن یوسف ثقفی نے جو مصحف مقدس (قرآن کریم) پر اعراب لگائے تھے، تو اُسے جو کوئی "بدعت" کہتا ہے وہ نہایت درجہ بلید الذہن ہے۔ اور اگر وہ "بدعات" کے جواز کے لئے جان کر ایسی نکتہ آفرینی کرتا ہے تو وہ اس طرح دین میں بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھولتا ہے ! اور جس چیز (بدعت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" کہا ہے، اُس کو سندِ جواز دینے کے لئے وہ تاویلیں کرتا اور حیلے تراشتا ہے ! اس ذہنیت اور فکر و مزاج سے اللہ کی پناہ !

حجاج بن یوسف کے زمانہ میں قرآن پاک لکھا لکھایا موجود تھا۔ اُس کی تلاوت کرنے والے، تجوید کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے، تو حجاج نے بس یہ کیا کہ جو "اعراب" زبان سے ادا ہوتے تھے، اور اُن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی تھی، انھیں قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اور یہ اُس نے زیادہ تر عجمی مُسلمانوں کی سہولت کے لئے کیا، تاکہ تلاوتِ قرآن میں انھیں زحمت پیش نہ آئے اور وہ غلطیاں کرنے سے بچ جائیں ! یہ دین میں ایک سہولت تھی — !

نماز کے لئے وقت کا پہچاننا ضروری ہے، اس سہولت کے لئے گھڑیوں سے استفادہ کیا جاتا ہے ! نماز کے لئے وقت کے پہچاننے کا حکم کتاب و سنّت سے ثابت ہے ! اس حکم کی تعمیل میں ایک ایجاد سے فایدہ اُٹھایا جاتا ہے اور یہ نہ بدعت ہے نہ احداث فی الدین ہے ! اس فعل سے دین و شریعت میں ذرہ برابر کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا !

تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعمة البدعة" کو ایک کلیہ بنا کر بدعت کے حسنہ ہونے کا جو ایک نکتہ پیدا کیا گیا ہے، خود یہ نکتہ آفرینی "بدعت" کی بدترین مثال ہے ! تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑھی جاتی تھی۔ اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ مگر حضورؐ نے باجماعت تراویح پر مداومت نہیں فرمائی۔ یہ پورا سلسلہ مسنون تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طریقہ مسنونہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ یہ لغوی معنیٰ میں "نعمة البدعة" ہے۔ شرعی اصطلاح والی وہ "بدعت" نہیں ہے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا ہے !!

قبروں پر عرس کرنا اور میلہ لگانا "نعمة البدعة" اس لئے نہیں ہے کہ کتاب و سنّت بلکہ آثار صحابہ تک اس کے لئے کوئی سند نہیں ملتی ! بلکہ حضورؐ نے اپنی قبر کو "عید" بنانے سے منع فرمایا ہے ! لہٰذا قبروں پر عُرس عید و جشن اور نذر و نیاز کا یہ پورے کا پورا نظام "بدعت" ہے۔ کہ اس کے لئے سنن و آثار میں کوئی دلیل نہیں بلکہ ایسی باتوں کی مخالفت ہی ملتی ہے !

"نعمة البدعة" کے لغوی معنیٰ کو ایک کلیہ قرار دے کر، دین میں ہر اضافہ، زیادتی اور احداث کو جائز

ور "حسنہ" قرار دینا - حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے متبعِ سنت جلیل القدر صحابی پر کتنی بڑی تہمت ہے، جو لگائی جا رہی ہے!
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں متعدد صحابہ وفات پاتے ہیں، مگر کسی وفات پائے ہوئے صحابی کا نہ تیجا ہوتا ہے نہ دسواں اور چالیسواں، اور نہ اُن کی قبروں پر عرس کیا جاتا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس قسم کی کسی رسم کا حدیث و سیرت کی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا - دین و شریعت میں یہ سب بعد کے لوگوں کے اضافے ہیں - بدعتیاں ہیں - خرافات و بدعات ہیں - قبروں پر عرس اور نذر و نیاز کی بعض صورتوں اور ہیئتوں میں "شرک" کی بقدر فرا آمیزش پائی جاتی ہے - جن کو برا سمجھنا اور اُن سے دُور رہنا تو ایمان و توحید اور اتباعِ سنت کا تقاضا ہے ہی - مگر قوت حاصل ہو تو انھیں روک دینا بھی چاہیئے!
"بدعات" پر ہر زمانہ میں نکیر کی گئی ہے - متقدمین کی کتابوں میں تو اہلِ بدعت سے میل جول رکھنے تک کو ناپسند کیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ اُن کی صحبت میں رہ کر "بدعات" کو دیکھتے دیکھتے اُن کی "نفرت" دل سے یا تو جاتی رہتی ہے یا کم ہو جاتی ہے، ایمان و اسلام کا تقاضا ہے کہ بدعت و شرک اور منکرات کو دیکھ کر دل میں جھنجلاہٹ اور نفرت پیدا ہو اس احساسِ غیرت کا باقی، زندہ اور فعال رہنا ضروری ہے!
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو "اہلِ بدعت" کی تعظیم و توقیر کی ان لفظوں میں ممانعت فرمائی ہے :-

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام -

جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت (بدعتی) کی تعظیم و توقیر کی، وہ دراصل
اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار ہوا - !

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر قائم نہیں رہتی - اس میں اضافے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں! اگلی امتوں نے شرک و بدعات اور احداث فی الدین کے ذریعہ دین کو مسخ کر دیا تھا - "بدعت کوئی ایسی ہلکی اور معمولی برائی نہیں ہے، جسے نظر انداز کر دیا جائے، یہ تو اپنی فطرت اور مزاج سے "ضلالت" ہی "ضلالت" واقع ہوئی ہے!
دین میں "نئی بات" (بدعت) نکالنا کوئی معمولی برائی اور ہلکی خرابی نہیں ہے! "بدعت" اس بات کی دلیل ہے کہ خاک دہن گستاخ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو اس بات کے بتانے سے بخل کیا یا آپؐ نے خیانت فرمائی - امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے "بدعت" پر انہی لفظوں میں نکیر کی ہے!
ایصالِ ثواب جائز ہے! کسی شخص نے کسی بزرگ کے یومِ وفات پر اُن کے نام سے فقراء اور حاجت مندوں کو کچھ دے دیا، اور اُس دن اُن کی قبر پر بھی ہو آیا اور فرطِ محبت سے قبر پر سے پتے اور کنکریاں وغیرہ صاف کر کے ایک کپڑا ڈال دیا، چلو چھٹی ہوئی! مگر چھٹی کیسے ہو سکتی ہے اور معاملہ اسی نوبت پر جا کر ختم کیسے ہو سکتا ہے! کہ "بدعت" کا معمولی شائبہ بھی بنائے فاسد علی الفاسد کے اصول پر :-

تا ثریا می رود دیوار کج

بن کر رہتا ہے، بعد کے آنے والوں نے اُن بزرگ کے "یومِ وفات" کو ضروری قرار دے لیا - قبر پر نہ صرف یہ کہ چادریں چڑھنے لگیں، بلکہ اُن کے جلوس نکلنے لگے، پھر اس قبر کے کچھ لوگ متولی، سجادہ نشین اور خدام و مجاور مقرر ہوئے - اور معاملہ مزار کے چراغاں اور قبر کے "غسلِ مبارک" (؟) سے لے کر نارنج رنگ، سجدہ و طواف اور استمداد و استغاثہ تک پہنچ گیا -

صحابہ کرام ان معاملات میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ ایک شخص نے اپنے کسی عزیز بچہ کی ختنہ پر کچھ لوگوں کو بلایا، اس پر صحابہ نے اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں "ختنہ" کے لئے نہ کوئی اعلان ہوتا تھا اور نہ لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا!

نفل نماز پڑھنا ایک ثواب کا کام ہے، مگر چونکہ نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہیں رہا۔ اس لئے ایک شخص کو نمازِ عید سے قبل دوگانہ پڑھتے دیکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسے ٹوکا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ نماز کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، جس کی وجہ سے مجھ پر عذاب ہوگا۔ حضرت علیؓ نے اس پر فرمایا:-

إنَّ اللہ لا یثیبُ علیٰ فعلٍ حتیٰ یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یحث علیہ فتکون صلواتک عبثاً والعبث حرامٌ فلعلہ تعالیٰ یعذبک
بمخالفتک لنبیہ -

جب تک کسی کام کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے نہ ملے، اللہ تعالیٰ اس پر ثواب نہیں دیتا۔ تیری نماز (اس لئے) ایک بے معنی اور عبث کام ہوگا اور عبث کام کا کرنا حرام ہے۔ کیا عجب ہے کہ پروردگارِ عالم اپنے نبیؐ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس نماز کے سبب تجھے عذاب دے!

"بدعت" پر شدید وعید اس لئے آئی ہے کہ "بدعت" سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے کچھ ایسی باتیں بیان کرنے سے رہ گئیں، جن کے کرنے سے آخرت میں بڑا ثواب حاصل ہوگا اور روحانیت میں ترقی ہوگی! یہ احساس کس قدر گمراہ کن ہے!! ـــ توبہ!

ابوبکر شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک شخص مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ کے قریب کھڑا ہوا کچھ عرض معروض کر رہا تھا۔ حضرت امام زین العابدین ابن حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے اسے منع فرمایا۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"لا تتخذوا قبری وثناً"

(میری قبر کو "بت" نہ بنانا)

جُہلا کے قول و عمل کا کوئی وزن اور اعتبار نہیں - اہلِ حق نے "بدعات" پر ہمیشہ نکیر کی اور سختی کیساتھ ٹوکا ہے! قرآن کی تلاوت کرنا، باعثِ اجر و ثواب ہے، قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کی جائے، تو اس میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مگر اس میں بھی:-

اختلف الفقہاء فی حکم قرأۃ القرآن عند القبر، فذھب الی استحبابھا الشافعی ومحمد بن الحسن، لتحصل للمیت برکۃ المجاورۃ ووافقھما عیاض والقرانی من المالکیہ ویری احمد، انہ لا بأس بھا، وکرھھما مالک وابوحنیفہ لانھا لم ترد بھا السنہ!

فقہا نے قبر کے پاس تلاوتِ قرآن کے بارے میں اختلاف کیا ہے! شافعی اور محمد بن الحسن اس کے استحباب کے قائل ہیں تاکہ میت کو مجاورتِ تلاوت کی برکت حاصل ہو اور (قاضی) عیاض اور قرانی

نے جو مالکیہ ہی سے ہیں، ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ہے، اور امام احمد کا خیال ہے کہ
اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے اسے مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ
اس کے متعلق کوئی سنّت موجود نہیں ہے !

"تلاوتِ قرآن" جیسے بے ضرر، بلکہ باعثِ ثواب فعل کے بارے میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی احتیاط کا یہ
عالم ہے کہ وہ قبروں کے پاس تلاوتِ قرآن کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ سنّت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی! جن
لوگوں کے سامنے اُن کے اکابر اور سلفِ صالحین کے یہ امثال و نظایر اور طریقِ فکر ہو، وہ "بدعات" میں مبتلا
ہو جائیں، تو اس سے زیادہ بے دانشی اور بدتوفیقی اور کیا ہو سکتی ہے ؟

"گیارھویں شریف" جسے شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اور "چھٹی شریف" جسے حضرت خواجہ معین الدین
اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور ایسی دوسری رسموں، تقریبوں اور تیوہاروں پر جو علماءِ اہلِ حق،
حامیانِ سُنّت اور ماحیانِ بدعت کی طرف سے نقد و احتساب نکیر اور گرفت کی جاتی ہے، تو اس سے ان بزرگوں
کا رتبہ ذرا بھی نہیں گھٹتا۔ بلکہ اُن کا مُوقف اور واضح ہو جاتا ہے! کہ اُن سے جن "بدعات" کی نسبت کی گئی ہے، اُن کے
نہ کرنے کی نہ انہوں نے تلقین کی اور نہ ایسی خلافِ شرع باتوں کو وہ پسند فرماتے تھے !

اگر بزرگانِ دین کے ولادت و وفات کے "یوم" منانے کو اسلام میں پسندیدہ سمجھا جاتا، تو انبیاءِ سابقین ایک
دُوسرے کا یوم ولادت و وفات ضرور مناتے! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی قول اور عمل ضرور ملتا کہ
آپؐ نے اپنی ازواج مطہرات حضرت خدیجہؓ، حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، اپنے عم محترم حضرت سید الشہداء حمزہؓ،
اپنے چچا زاد بھائی حضرت جعفرِ طیار اور اپنی صاحبزادیوں (زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ) میں سے کسی کا یوم ولادت و
وفات منایا، یا منانے کی ہدایت فرمائی !

خود حضورِ رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یوم ولادت و وفات آپؐ کے بعد صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار
نے نہیں منایا۔ خیر القرون میں ان رسموں اور تقریبوں کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ "مولود" جو مسلمانوں میں مروج ہے، اس کا
بانی مبانی سلطان ملک شاہ سلجوقی ہے، جس نے بغداد میں ۴۸۵ ہجری میں پہلی مرتبہ محفلِ "مولود" منعقد کی۔
تو یہ مروجہ "مولود" نہ سُنّتِ رسُول ہے، نہ اسوۂ صحابہ اور نہ طریقِ سلفِ صالحین ہے! بلکہ یہ "سُنّتِ ملوک" ہے
تو جس کو رسُول کی سُنّتِ مطہرہ اور صحابہ کا اسوہ پسند ہو گا، وہ اُس کی پیروی کرے گا۔ اور جس کو بادشاہوں کی "سُنّت"
محبوب ہو گی، وہ اس کے احیاء و بقاء کو باعثِ سعادت سمجھے گا!۔

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی !

یہاں گفتگو "مروجہ میلاد" سے ہے، جہاں تک حضورؐ کی سیرت کے تذکرہ و بیان اور اُس کی نشر و اشاعت کا
تعلق ہے، اُس کو زیادہ سے زیادہ عام ہونا چاہیئے۔ "سیرت النبیؐ" کے جلسوں کا انعقاد ہونا ضروری ہے کہ ان سے
ایمان تازہ اور اتباعِ رسُول کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ اور کائنات میں "محمدؐ" بس ایک ہی پیدا ہوا۔
جس کی تعریف زمین و آسمان میں ہوتی ہے، کروڑوں آدمی اُس کا نام نمازوں میں لیتے ہیں۔ اذان و تکبیر میں اس انسانِ
کامل کا نام بلند ہوتا ہے۔ اور پورے چودہ سو سال کی مدّت میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ دُنیا اور ذکرِ محمدؐ سے

خالی رہی ہو۔ اس لئے کہ خود اللہ نے آپؐ کے ذکر کو بلند فرمایا ہے:۔

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

اور جس کے ذکر کو اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کس کی مجال اور طاقت ہے جو اُس کے ذکر کو پست کردے!

گفتگو اس میں ہے کہ "ذکرِ رسول" کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، جس سے بے اعتدالیوں کے لئے راہیں نکلتی ہوں، اور ایسی باتوں کو ضروری ٹھہرا لیا گیا ہو، جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ مثلاً محفلِ میلاد شریف میں "قیام" ایک نارو ا جدت ہے، جس کا کوئی ثبوت، کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ یا ائمہ فقہا کے قول و فعل سے نہیں ملتا۔ بلکہ حدیث میں کھڑے ہو کر تعظیم دینے کو عجمی لوگوں کے ناپسندیدہ طریقہ سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

اخرج ابو داؤد عن ابی امامہ قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُتكئاً على عصا فقمنا له فقال لا تقوموا كما يقوم الاعاجم بعضهم بعضاً۔

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لکڑی پر ٹیک لگائے ہوئے باہر تشریف لائے، آپؐ کی تعظیم کے لئے ہم کھڑے ہو گئے (اس پر) آپ نے فرمایا کہ نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے کھڑے ہو جاتے ہیں عجمی لوگ! ایک دوسرے کو تعظیم دینے کے لئے!

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں اپنی تعظیم کے لئے صحابہ کرام کا کھڑا ہونا ناپسند نہیں تھا، تو حضور کو یہ بات کس طرح پسند ہو سکتی ہے اور آپؐ کی خوشنودی کا سبب بن سکتی ہے کہ آپؐ کی ولادت کا جب محفلوں میں ذکر آئے تو سامعین تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں، محفلِ میلاد میں "قیام" کی رسم عجمیوں سے لی گئی ہے اور یہ عجیب منطق اور طرزِ استدلال و تفکر ہے کہ جو لوگ اس "عجمی بدعت" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ تھی، برکت و ثواب کا سبب اور موجب سمجھتے ہیں، وہ تو کہلائیں "عاشقانِ رسولؐ" اور جو خدا کے نیک بندے اور حضورؐ کی سُنّت کے متبع "قیام" پر جو عجمی بدعت ہے، گرفت کریں، وہ کہلائیں "بے ادب اور رسولؐ کی شان کو گھٹانے والے"! یہ کس قدر کھلی ہوئی ناانصافی، ظلم اور غلط اندیشی ہے!

قرآن پاک میں "میلادِ آدمؑ" کا ذکر آیا ہے۔ اگر ذکرِ ولادت پر قیام کرنا برکت و ثواب کا باعث ہوتا تو جن آیتوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق و پیدائش کا ذکر ہے، اُن کو تلاوت کرتے ہوئے حضورؐ اٹھ کھڑے ہوتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کا ذکر قرآن میں سب سے زیادہ تفصیل سے آیا ہے، اگر انبیاء کرام کے ذکرِ ولادت کے وقت "قیام" کرنے میں کوئی بھلائی ہوتی، تو قرآن کی ان آیتوں کی تلاوت کے وقت جن میں مسیح علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے!

صحابہ کرام سے زیادہ عاشقِ رسولؐ اور حضورؐ کا فدائی اور جاں نثار اور کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کبھی نہیں کیا کہ "ذکرِ ولادتِ رسولؐ" کے وقت تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے ہوں۔ تابعین تبع تابعین اور ائمہ فقہ میں کسی نے "قیام" نہیں فرمایا!

محفلِ میلاد کا "قیام" وہ بدعت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی

بھلائی بتانے سے رہ گئی - اور صحابہ کرام بھی اس نیکی پر مطلع نہ ہو سکے - اور تابعین اور ائمہ فقہ پر بھی "تعظیم رسول" کے یہ اسرار نہ کھل سکے، صدیوں کے بعد جا کر یہ "نیکی اور سعادت" کچھ لوگوں پر ظاہر ہوئی - اور اسے تعظیم رسول اور عشق نبی کی نشانی اور علامت ٹھہرا دیا گیا ۔۔۔ ہائے "عشق رسول" کی یہ مظلومیت ۔۔۔ !

عشق و محبت کا صحیح تقاضا !

عشق کا تقاضا کیا ہوتا ہے ؟ یہی اور صرف یہی کہ عاشق اپنی مرضی اور خواہشوں کو محبوب کی رضا میں گم کر دے، "عشق" محبوب کی قدم بہ قدم اور حرف بہ حرف اطاعت کا نام ہے - جو بات محبوب کو پسند ہو، وہی محب کو پسند ہو - ع

عاشقی چیست ؟ بگو بندۂ فرماں بودن !

اگر کوئی شخص "عشق" کا تو مدعی ہو، مگر محبوب کے احکام کی پروانہ کرے ! اور اپنے دل اور خواہش سے ایسی باتیں نکال لے، جو محبوب کو پسند نہ ہوں، تو ایسا "عشق" کیا معتبر کہا جا سکتا ہے ؟ عشق نافرمان اور سرکش ہو ہی نہیں سکتا !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے اعلان فرمائیں :-

"..... کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا ! "

(.... لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعاً وَّلَا ضَرّاً .....)

اس کے مقابلہ میں "عاشقانِ رسول" (؟) اپنے قول و عمل سے اس کا ثبوت دیں کہ حضور ! آپ فرماتے ہیں - "کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا" - مگر ہم تو آپ کو تمام کائنات کے نفع و نقصان کا مختار سمجھتے ہیں، آپ ہی کے در سے ساری دنیا کو رزق، اولاد، صحت اور مال و متاع تقسیم ہوتا ہے، آپ مالک کون و مکان اور دونوں جہاں کے مختار اور رکھوالے ہیں !

آپ فرماتے ہیں :-

وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ، مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ - (مشکوٰۃ، باب البکاء والخوف)

(قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ)

مگر ہم "عاشقانِ رسول" تو آپ کے اس ارشاد کے رد پر آپ کو "عالم الغیب" کہتے اور سمجھتے ہیں ! اور آپ کی ذات کے لئے "علم غیب" ثابت کرنا ہمارا سب سے زیادہ دل پسند موضوع ہے ۔۔۔ !

آپ نے فرمایا :-

"تم میں کوئی یوں نہ بولے کہ میرا بندہ (عبدی) یا میری بندی (امتی) تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں بھی سب اللہ کی بندی ہیں !" (مشکوٰۃ - باب الاسامی)

مگر ہم "عاشقانِ رسول" نے آپ کے اس حکم کی "تعمیل" (؟) اس مخالفت کے ذریعہ کی ہے کہ اپنے نام "عبد المصطفیٰ" اور "عبد الرسول" رکھ لئے ہیں -

حضورؐ نے فرمایا کہ "میری قبر کو "عید" (میلہ) نہ بنانا، وثن (بت) نہ بنانا" اور :-

حضورؐ نے "قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے"۔

مگر ہم "عاشقانِ رسولؐ" ایک ایک پیر، فقیر اور ولی کی قبر کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں، جس سے آپؐ کے ایک ایک قول کی نفی ہوتی ہے۔ قبروں پر میلے ہم لگاتے ہیں۔ چراغاں ہم کرتے ہیں۔ کھانے کی دیگیں پکا پکا کر ہم لٹاتے ہیں۔ چادریں ہم چڑھاتے ہیں۔ مُرادیں ہم مانگتے ہیں، مزاروں کا طواف ہم کرتے ہیں۔ صاحبِ قبر کے نام کی دُہائی ہم دیتے ہیں۔ قبریں ہماری تجارت اور آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ قبریں ہمارے مشائخ کی جائیدادیں اور دفینے ہیں ــــ اور:

"حضورؐ نے قبروں کو "گچ" کرنے (پختہ بنانے سے) منع فرمایا"

اور ہم آپؐ کے عاشقوں (؟) اور جاں نثاروں (؟) نے چونے اور اینٹوں پر ہی بس نہیں کیا بلکہ سنگِ مرمر اور سنگِ رخام تک قبروں پر لگا دیا ہے اور کسی کسی قبر پر تو چاندی اور سونے کے پتر منڈھ دیئے ہیں۔ اور اطلس و مخمل کے پردے لٹکا دیئے ہیں۔

اور "حضورؐ نے ہر "بدعت" کو "ضلالت" فرمایا اور ہر ضلالت کو "جہنم" سے نسبت دی۔"

مگر ہم آپؐ کے حلقہ بگوشوں اور جاں نثاروں نے "نعمت البدعۃ" کو آڑ بنا کر "بدعات" کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہمیں جیسی دلچسپی "بدعت" کے ساتھ ہے، اتنی دلچسپی اور کسی چیز سے نہیں ہے۔ عُرس، تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں، مدار کی چھڑیاں، سدّو کا بکرا، کسی کا توشہ، کسی کی سہ منی نیاز، کسی کی صحنک، کسی کے کونڈے، کسی کے نام کی گاگر، کسی کا پنکھا۔ کسی کی نیاز حلوے مانڈے پر، کسی کی فاتحہ شربت اور کھیر پر، اور کسی کی بالائی اور حلیم پر! قبروں کو غسل دے کر اُن کا پانی ہم تبرک کے طور پر پیتے ہیں۔ قبروں پر جلنے والے چراغوں کی، یعنی جس فعل پر آپؐ نے لعنت بھیجی ہے، اُن چراغوں کی راکھ ہم چاٹتے ہیں!

اور وہ جو حضورؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل سے فرمایا تھا:۔

"اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا چاہیے، تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے"۔

(مشکوٰۃ باب الکبائر)

تو حضور آپؐ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر اپنے مزاج اور طبیعت کو کیا کریں کہ "شرک" کے معاملہ میں ہم کچھ بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ اور اس میں جتنی بھی "ڈھیل" ہو جائے ہمیں نہیں کھلتی، آپؐ کو "احمد بلا میم" کی اصطلاح اور ترکیب ہماری ہی ذہنِ نادرہ کی تخلیق ہے، ہم آپؐ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ جہاں کہیں سے بھی ہم آپؐ کو پکاریں، آپؐ ہماری پکار کو سُن لیتے ہیں۔ اور آپؐ ہی نہیں، ایک ایک وفات پائے ہوئے پیر اور ولی کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مخلوقات کی دستگیری کرتے ہیں اور اپنے ماننے والوں اور عقیدت کیشوں کے احوال کی اُن کو خبر رہتی ہے ــــ (ان عقائد و اعمال سے اللہ تعالیٰ کی کروڑ بار پناہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، حکم اور فرمان کی اس بے دردی کے ساتھ مخالفت اور خلاف ورزی کرنے کے بعد "عشقِ رسولؐ" کا دعویٰ! ایک ایسا تضاد ہے کہ جس کی مثال دُنیا کے پردے پر شاید ہی کہیں مل سکے! کتنا بڑا دھوکا ہے جو "عشق و محبت" کے نام پر شیطان نے اُن لوگوں کو دے رکھا ہے۔ جو "مشرکانہ اعمال و رسوم اور بدعات" سے انتہائی شغف رکھتے ہیں اور جن کا مشن ہی یہ ہے کہ یہ خرافات فروغ پائیں۔ اور ان خرافات کے فروغ کو وہ اپنے "مسلک" کی بہت بڑی فتح سمجھتے ہیں!!

وہابیت اور دیوبندیت!

مکہ میں جب اسلام پھیلنا شروع ہوا تو کفارِ قریش نے مسلمانوں کے لئے ایک طنز آمیز لقب "صابی" تراشا تھا۔ جس کے معنی "بے دین" کے تھے۔ یعنی جس کافر کو اللہ ہدایت دیتا اور وہ اسلام قبول کر لیتا تو کفارِ قریش طنزاً غیظ و غضب کے لہجہ میں کہتے کہ "فلاں شخص "صابی" ہوگیا!"

اہلِ بدعت نے بھی خدا کے اُن غیرت مند بندوں کے لئے جو "شرک و بدعت" کو کسی عنوان برداشت ہی نہیں کر سکتے، "وہابی اور دیوبندی" کے لقب تراش لئے ہیں۔ اور جب کوئی اُن کی خرافات پر ٹوکتا ہے تو اُسے "وہابی اور دیوبندی" کہہ کر مطعون کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے بیچارے عوام کے دلوں میں اپنے پروپیگنڈے کے زور سے یہ بات اُتار دی ہے کہ "وہابی اور دیوبندی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کیا کرتے ہیں۔ اور اولیاء اللہ کے دشمن ہیں"!

اہلِ بدعت نے ان "وہابیوں اور دیوبندیوں" کی کتابوں کے بعض غیر محتاط جملوں اور غیر معتدل عبارتوں کا اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اس تصویر کے تمام روشن اور تابناک پہلو عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اور یہ چند "چھائیاں" پوری تصویر پر چھا گئی ہیں۔ حالانکہ "اہلِ حدیث (وہابیوں) اور دیوبندیوں" کا مشن اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دُنیا کو "کتاب و سنت" کی دعوت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کی طرف انسانیت کو بلائیں، وہ خود اپنی ذات سے بھی اتباعِ سنت کی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ اور "وہابیوں" کا تو اس معاملہ میں یہ حال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کی ذات سے "اطاعت" و "اتباع" ہی نہیں۔ بلکہ "تقلید" تک کی نسبت انھیں گوارا نہیں!

مقامِ حیرت ہے کہ جو ہر بات کے لئے کتاب و سُنت سے سند طلب کرتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بناء پر :-

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ۔

(جس نے کوئی کام کیا اور اس کام کرنے کا میرا حکم نہیں ہے، وہ مردود ہے)

ہر اُس "بدعت" و "احداث" اور "جدت" کو ٹھکرا دیں، جس کے لئے سُنتِ رسُول میں دلیل نہ ملتی ہو۔ اُن کو تو "رسُول اللہ کے مرتبہ کو گھٹانے والا" کہا جائے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کے مقابلہ میں دوسروں کی نکالی ہوئی بدعتوں، جدتوں اور نئی نئی باتوں ہی کو دین سمجھتے ہوں، وہ دعویٰ کریں "عشقِ رسُول" کا! ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئیے!

اگر "دیوبندیت اور وہابیت" شرک و بدعت کے ردّ و مخالفت اور سُنتِ رسُول کے بقاء و احیاء اور تمسک کا نام ہے، تو پھر یہ بڑی اچھی چیز ہے! اور اسلام میں شروع ہی سے یہی "فکر" کارفرما اور فعال رہی ہے!

حجرِ اسود جس کی پاکیزگی سب کے نزدیک مُسلّم ہے، جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لب ہائے مبارک سے چُوما ہے اور کروڑوں صالحین اور اولیاء اللہ نے اُس کو چُھوا اور بوسہ دیا ہے، اُسے مخاطب کر کے حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

رایت عمر یقبل الحجر ویقول لاعلم انک حجر ما تنفع ولا تضر ولولا انی رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ما قبلتک!

(عابس بن ربیعہ نے کہا) میں نے عمرؓ کو حجر اسود چومتے دیکھا کہ وہ کہتے جاتے تھے کہ میں جانتا ہوں تو پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس درخت کے نیچے صحابہ کرام سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر خود قرآن کریم میں آیا ہے،

"لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ"۔

یہ درخت برکت کا کتنا بڑا اثر اور نشان بن سکتا تھا، مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس درخت کے پاس کثرت سے آنے جانے لگے تھے، اور خطرہ ہو گیا تھا کہ عقیدت کا غلو کہیں مسلمانوں کو کسی بے اعتدالی میں مبتلاء نہ کر دے اور آنے والی نسلیں اس درخت کو "نشانِ تعظیم" نہ بنا لیں، حضرت عمرؓ نے اس درخت ہی کو سرے سے کٹوا دیا!

کیا حضرت عمرؓ "وہابی اور دیوبندی" تھے؟ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ کو گھٹانا چاہتے تھے؟ کیا فاروقِ اعظم انبیاء کے آثار و نشان کی برکت سے واقف نہ تھے؟ — فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کے رکیک تصورات کا ذہن میں لانا جہالت ہی نہیں معصیت ہے، سنتِ رسول کی اتباع اور حفاظت میں عمر فاروقؓ کا قدم کسی سے پیچھے تو کیا ہوتا بلکہ کچھ آگے ہی تھا۔ عشقِ رسول کے تقاضوں کو ان کی برابر پہچاننے والے صحابہ کرام میں بس دو ایک ہی ہوں گے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا "شجرِ بیعت الرضوان" کو کٹوا دینا، اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ بزرگوں کے آثار و نشانات اور ان سے جو مادی چیزیں نسبت رکھتی ہیں، وہ "توحید" کے مقابلہ میں اضافی ہیں، کسی بزرگ اور ولی کے "اثر و نشان" سے اگر فتنہ اور غلو پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور "توحیدِ خالص" کے تقاضوں پر اس کی زد پڑ رہی ہو۔ تو پھر اس "اثر و نشان" کا چھپا دینا ہی اولیٰ اور مناسب ہے!

شرک و بدعت اور مبالغہ آمیز عقیدت کے رد اور توحید کی حمایت میں یہی فاروقِ اعظمؓ کی فکر ہے۔ جو ہر دور کے صالحین اور علماء حق کے قول و عمل میں کارفرما رہی ہے! خاص طور سے امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے علماء اور صاحبِ عزیمت اسلامی مفکرین کے افکار حمایتِ توحید اور ردِ شرک و بدعت کے معاملہ میں "فکرِ فاروقیؓ" ہی کی صدائے بازگشت ہیں! (اللھم کثر امثالھم)

"دیوبند" کے مدرسہ کو قائم ہوئے بہت سے بہت نوّے ۹۰ سال ہوئے ہوں گے اور ان کے مشہور اکابر جن سے "دیوبندیت" منسوب کی جاتی ہے، ان کو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ نہیں ہوا، اسی طرح جسے "وہابیت" کہا جاتا ہے اس کی عمر دو سو، سوا دو سو سال کی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے نہ دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور نہ اکابرِ دیوبند سے بیعت ہیں اور نہ "اہلِ حدیث" (جن کو اہلِ بدعت "وہابی" کہتے ہیں) کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جب بھی بدعت و شرک کا رد اور توحید کی حمایت کرتے ہیں۔ تو ان کی باتوں کو بے وزن اور ہلکا کرنے کے لئے مبتدعین کی طرف سے "وہابی" اور "گلابی وہابی" اور "دیوبندی" کی پھبتیاں چست کی جاتی ہیں! حالانکہ توحید و سنت کی حمایت اور شرک و بدعت کا رد ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس مضمون میں قرآن کریم کی کتنی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں پیش کی جا چکی ہیں، جو شرک و بدعت کے رد میں روشن برہان ہیں!

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے علماء اور اربابِ فکر ملیں گے، جنہوں نے "شرک و بدعت" کے ان فتنوں پر گرفت کی ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ نے آٹھ سو سال پہلے لکھ کر فرمایا:-

انهم وضعوا هذه الاصنام والاوثان على صور انبيائهم واكابرهم وزعموا انهم — يعني اشتغلوا العبادة هذه التماثيل فان اولئك الاكابر تكون شفعاء هم عند الله تعالى ونظيره في هذ الزمان اشتغال كثير من الخلق بتعظيم قبور الاكابر على اعتقاد انهم اذا عظموا قبورهم، فانهم يكونون شفعاء هم عند الله !

یعنی جن بُت پرستوں نے اصنام و اوثان اپنے انبیاء و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم اُن کی عبادت میں مشغول ہوں گے، تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، اس کی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہی! اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے!

عرس، فاتحہ، نذر و نیاز، دسواں، بیسواں، چالیسواں، مولود شریف کا قیام، اور قبر کے ساتھ جو معاملات کئے جاتے ہیں۔ دین میں ان کا کوئی درجہ ہوتا تو فقہ کی کتابوں میں ان کا ذکر ضرور آنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں ان تمام باتوں کے ذکر سے خالی ہیں اور اگر کہیں ذکر آیا ہے تو ان باتوں کی مخالفت ہی میں آیا ہے، چند مثالیں :-

- جو نذریں اموات کے واسطے ہوں، از روئے تقرب کے وہ باطل اور حرام ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری، دُرِ مختار)
- نذر عبادت ہے، اور مخلوق عبادت کے لائق نہیں۔ اگر نذر ماننے والے کا یہ خیال ہے کہ میّت کو اختیارات حاصل ہیں تو یہ عقیدہ صریحاً کفر ہے۔ (بحر الرائق)
- غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا یا غیر اللہ کی نذر ماننا شرک ہے! (تفسیر عزیزی)

ان معاملات میں صحیح دینی پوزیشن یہ ہے کہ کسی شہر میں رہ کر کسی بزرگ کی قبر پر کوئی ساری عمر میں ایک بار بھی (زیارت کیلئے) نہ جائے تو اُس سے اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی بازپرس نہ کرے گا۔ اور قبر پر نہ جانے سے اُس کے دین و ایمان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص الٹے ہاتھ سے پانی پیئے گا تو "مخالفتِ سنت" کا وبال اس کے سر آئے گا — کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستحب نہیں، فرض اور منصوص ہے اور کسی فرض کی تعمیل اور تکمیل سُنّتِ رسُول کی اتباع کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام و فرائض کی تعمیل کرانے کے لئے انسانوں کے سامنے نہیں آتا۔ اس فرض کو رسُول انجام دیتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اللہ کے اس حکم کی اس طریقہ اور اس ہیئت و انداز سے تعمیل ہوگی۔ سنتِ رسُول کوئی اضافی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصل دین ہے! دین و دُنیا کی تمام سعادتیں کتاب و سُنت ہی سے وابستہ ہیں۔ اگر کوئی شخص رات میں سوتے ہوئے اُس انداز اور ہیئت سے سوتا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرمایا کرتے تھے تو اُس کی یہ شب خوابی نیکی میں گزرے گی!

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

"صراطِ مستقیم" نام ہی اُس شاہراہ کا ہے، جہاں حضور کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں!

جب کوئی عرس، نذر و نیاز، اور اہلِ قبور سے استغاثہ پر گرفت کرتا ہے تو اہلِ بدعت کی طرف سے طنز کی جاتی ہے " ایسا کہنے والے اولیاء اللہ کو نہیں مانتے "۔ یہ " اولیاء اللہ کو ماننا " بھی عجیب مغالطہ آمیز کلیہ ہے! " اولیاء اللہ کا ماننا " کیا خدا اور رسُول کے " ماننے کی طرح " کلمۂ شہادت " کا کوئی جزو ہے۔ کہ جس کے بغیر ایمان ہی مستند نہیں ہوتا۔ اولیاء اللہ کا ماننا، اس کے سواء اور کیا ہے کہ اُن کے اعمالِ صالحہ کے سبب ہم اُن سے محبت رکھیں اور اُن کی صالح زندگی سے اثر قبول کرے اپنے کو بھی صالح، اللہ کا فرمانبردار بندہ اور رضائے الٰہی کا جویا بنائیں!

" ماننے " اور " نہ ماننے " میں جو ایمان و کفر ثابت ہوتا ہے، اُس کا انسانوں میں تعلق صرف انبیاء کرام کی ذات سے ہے، اُن میں ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے، اور خود انبیاء کرام میں نہ ایک دوسرے پر تنقید ہے، نہ مناقشت اور مسابقت۔ نہ اُن میں کوئی جدال و نزاع ہے! یہی وہ مقام ہے جہاں سے " نبوت و رسالت " کا امتیاز، علم و تزکیہ کی سربلندی مقابلہ میں نمایاں نظر آتا ہے!

انبیاء کرام جیسی طہارت و عصمت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرامؓ جو عدول تھے۔ اُن میں خونریز جنگیں ہوئی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی ولی تھے اور امام بخاری قدس سرہٗ بھی ولی تھے، مگر امام بخاریؒ نے امام ابو حنیفہؒ پر خوب کس کر تنقید کی ہے، ایک گروہ امام ابو حنیفہؒ پر " قلتِ فہمِ حدیث " کی طنز کرتا ہے اور دوسری جماعت امام بخاریؒ کی " قلتِ نفقہ " کو موضوعِ گفتگو بناتی ہے۔ ایک گروہ کے " قطب العالم " دوسرے گروہ کے نزدیک اور دوسرے گروہ کے " اعلیٰ حضرت مجدد مأتہ " پہلے گروہ کے نزدیک انتہائی مبغوض ہیں۔

اولیاء، صلحاء اور علماء حق پر گرفت کوئی اچھی بات نہیں ہے، کہ یہ بڑی محرومی کی دلیل ہے مگر یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنے سے ایمان جاتا رہتا ہے! اولیاء کرام اور صلحاء سے خوش گمانی اور محبت و عقیدت ہی رکھنی چاہیئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کتاب و سنت کے اتباع اور دین کی خیر خواہی میں گزاری ہیں۔ مگر ظاہر ہے وہ انبیاء کرام کی طرح نہ معصوم تھے اور نہ مطاع تھے، اس لئے اگر اُن کا کوئی قول و فعل کتاب و سنت سے مطابقت نہ کرتا ہو۔ تو دین کی خیر خواہی اور کتاب و سنت کے اتباع کا یہ تقاضا ہے کہ اُسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ —— یہ ہے " اولیاء اُمت کو ماننے " کی صحیح دینی پوزیشن!

عیسائیوں نے اپنی ہوائے نفس سے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو " ابن اللہ " بنا دیا۔ یہ عقیدہ اُن کے ایمان کا نہ صرف یہ کہ جزو ہے، بلکہ اُن کے ایمان کی اساس ہے! تو اس " خیالی ابن اللہ " کو جو کوئی " عبد اللہ " کہتا ہے۔ اُسے حضرت عیسیٰؑ کا " نہ ماننے والا " اور " توہین کرنے والا " سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قابلِ اعتراض (معاذ اللہ) قرآن پاک ہے کہ جس نے کھُل کر مسیح کے " ابن اللہ " ہونے کی تردید کی ہے! اُن کے اس عقیدے کے نہ ماننے کے سبب عیسائی تمام مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ کا دشمن، مخالف، اور توہین کرنے والا سمجھتے ہیں!

اسی پر قیاس کر لیجئے کہ اہلِ بدعت نے بھی اپنے تصورات کے زور سے رسُول اللہ اور اولیاء کرام کے لئے " مناصب و مقامات " وضع کرلئے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ " مشکل کشا اور حاجت روا ہیں "۔ حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ کے حکم سے رزق دیتے ہیں۔ کوئی کہیں سے اُن کو پکارے تو وہ ہر پکارنے والے کی پکار سُن لیتے ہیں —— ! وھلم جراً۔

جب کوئی اہلِ بدعت کے ان " مزعومہ تصورات " اور خود تراشیدہ عقائد " کی تردید کرتا ہے، تو وہ شور مچانے لگتے

کہ یہ دیکھو! رسول اللہ کی شان گھٹائی جارہی ہے! اولیاء اللہ کے ساتھ یہ دشمنی ہورہی ہے! حالانکہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی تخفیف ہے اور نہ اولیاء کرام کے ساتھ عداوت ہے! بلکہ یہ اہلِ بدعت کے تراشے ہوئے عقاید کی تردید ہے —!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد حضرت حسنین رضی اللہ عنہما نے اُن کی کوئی ضریح نہیں بنائی، اور نہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام زین العابدینؒ نے اور اُن کے بعد اُن کی اولادِ اطہار نے اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کوئی تعزیہ نکالا، نہ سڑکوں پر ماتم کیا، نہ مہندی، جھولے اور دُلدُل کا گشت کرایا۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی بدعات ہیں! مگر جو کوئی اس فرقہ کا ان بدعات میں اُن کا ساتھ نہیں دیتا، تو وہ اُسے اہلِ بیت کا نہ ماننے والا اور اُن کے درجہ کو نہ پہچاننے والا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان "بدعات" اور عجمی اختراعات اور کھیل تماشوں سے اہلبیت کرام کی محبت اور عقیدت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہے! اسی طرح اہلِ بدعت عرس، نذر و نیاز اور قبور پر ہونے والی بدعات پر نکیر کرنے والوں کو "اولیاء اللہ کے نہ ماننے والوں" اور "اُن کا رتبہ گھٹانے والوں" میں شمار کرتے ہیں! یہ سب کچھ ان لوگوں کی خام خیالیاں اور غلط اندیشیاں ہیں۔ انہوں نے عقاید و تصورات کے جو بُت تراش رکھے ہیں، اُن پر کوئی ضرب لگاتا ہے تو اس "بت شکنی" پر وہ واویلا مچانے لگتے ہیں۔ کہ یہ تو کعبہ کی بُنیادیں ڈھائی جارہی ہیں! ع

چُوں نہ دید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

"بدعت" سنت کی ضد ہے اور کوئی "اہلِ سُنّت" بدعات سے شغف نہیں رکھ سکتا۔ فاسق و فاجر کو توبہ نصیب ہوسکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کو اچھا نہیں سمجھتا اور اپنے کئے پر پشیمان سا ہی رہتا ہے، یا کم سے کم فخر نہیں کرتا۔ مگر بدعتی کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ وہ "بدعت" کو دین کی بھلائی اور خیر خواہی سمجھتا ہے! اُسے "بدعات" میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، اور ان خرافات پر وہ اُلٹا فخر کرتا ہے!

اس باب کو ختم کردینے سے پہلے اس بات کا اظہار کردینا ضروری سمجھا گیا کہ ہم نے جگہ جگہ ایک گروہ کو "اہل بدعت" جو کہا ہے، بعض حضرات کو غالباً گراں گزرے کہ یہ "جدال احسن" کی راہ نہیں ہے! اس کے جواب میں گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا "بدعات" ہوں، اُن کو "بدعتی" اور "اہلِ بدعت" نہ کہیں تو آخر کیا کہیں؟ جس کو جس چیز سے شغف ہوگا اور جس کے لئے وہ جدوجہد کرے گا، اُس کو اُسی سے منسوب بھی کیا جائے گا۔ پھر خود یہ حضرات اپنی مخصوص محفلوں ہی میں نہیں، پبلک جلسوں میں اپنے کو "قبر پرست" اور "اہلِ بدعت" کہتے ہیں۔ پس جس نام اور لقب کو انہوں نے خود قبول کرلیا ہے، ہم نے اُسی لقب سے انھیں یاد کیا ہے!!

مغالطے

اہلِ بدعت کا خاصہ ہے کہ جب شرک آمیز عقائد اور بدعات پر اُنھیں ٹوکیئے تو وہ چراغ پا ہوجاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے "محبوبوں" کو تم اس قدر بے اختیار سمجھتے ہو؟ ان لوگوں نے غالباً "مجازی محبوں (lovers) اور محبوبوں" (beloveds) کے انداز پر اللہ اور رسول اور اولیاء اللہ کے روابط کو قیاس کیا ہے۔ اس کا اظہار اپنے شعروں میں وہ اس طرح کر بھی چکے ہیں ؎

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب — یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا!!

یہ تو مجازی طرزِ بیان ہے کہ "ہم تم دوست دوست! جو تمہارا مال، سو ہمارا مال، محبوب و محب میں غیریت اور اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا۔" مگر اللہ اور رسولؐ کے بارے میں اس قسم کے مجازی تعلقات اور دوستانہ روابط کا تصور بھی ایمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے! مجازی محبت میں "محب" محبوب کی نہ صرف یہ کہ نازبرداری کرتا ہے بلکہ اس سے ڈرتا اور اس کا دباؤ مانتا ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح کوئی بات "محبوب" کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے! کیا اللہ تعالیٰ (رسولؐ کا محب)، بھی رسول اللہ (اللہ کے محبوب) سے معاذ اللہ خوف کھاتا ہے اور آپؐ کی محبوبیت کا دباؤ مانتا ہے؟ حالانکہ قرآن و احادیث بتاتی ہیں کہ حضورؐ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے اور مغفرت چاہنے والے تھے، اور دن رات اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں لگے رہتے تھے، اور ایک بندۂ قانت" اور "عبدِ شکور" کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

"وسوف یعطیک ربک فترضیٰ"!

سے یہ نکتہ نکالنا کہ اللہ تعالیٰ دنیوی محبوں کی طرح اپنے محبوب (رسولؐ) کی رضا کا پابند ہے۔ یا آپؐ کی رضاجوئی میں لگا رہتا تھا، اللہ تعالیٰ کے حضور میں شدید ترین گستاخی اور بے ادبی ہے! یہ آیت تو صاف بتاتی ہے کہ "فترضیٰ" (تو راضی ہو جائے گا) یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے! یہ کوئی نازبرداری یا دباؤ نہیں ہے! حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو "توحید" کے معاملہ میں اس قدر بے پروا واقع ہوئے ہیں اور اُن کو اسی میں لطف آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر کے اللہ اور رسولؐ کو ایک ہی سطح پر لے آئیں۔ اور عبد و معبود کا یہ فرق و امتیاز کسی نہ کسی حیلہ سے مٹے نہیں تو کم سے کم مشتبہ ہو جائے!

"اہلِ بدعت" نے "وسیلہ" کا جو ایک تصور قائم کر رکھا ہے، اُس کے ثبوت میں وہ قرآنِ کریم کی یہ آیت:-

"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ" (مائدہ)

بے تکلف پڑھ دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی مختصر ترین تفسیر "جلالین" سے لے کر تفسیر کبیر امام رازیؒ تک میں "الوسیلہ" کے معنی "خدا کی اطاعت اور اُس کی مرضی کے اعمال سے اُس کا تقرب حاصل کرنے کے" بیان کئے گئے ہیں۔ مفسرین کے ذہن میں "الوسیلہ" کے یہ معنی نہیں آئے کہ اس لفظ سے اللہ کے حضور میں انسانی شخصیتوں کا وسیلہ، ذریعہ اور وساطت مراد ہے! یہ آیت اعمالِ صالحہ پر مسلمانوں کو اُبھارتی ہے! اور یہی اس آیت کا مقصود، مفہوم اور شرح و تفسیر ہے —!

...... اغناھم اللہ ورسولہ" جو قرآن پاک میں آیا ہے، اُس سے "اہلِ بدعت" استناد کرتے ہیں کہ "دیکھا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غنی بنا دیا کرتے تھے! خود قرآن اس پر شاہد ہے!" جہاں تک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے، اس کا صاف، سیدھا اور واقعات کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مدینہ میں غلہ کی فراوانی ہوئی، وہاں کے باشندوں کے عام مالی حالات درست ہو گئے۔ اس سے مومنین صادقین کے ساتھ منافقین بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے اور عام مسلمانوں میں ملے جلے رہنے کے سبب غنائم سے بھی منافقین فائدہ اٹھاتے تھے، یہ ہے "اغناھم اللہ ورسولہ" کی صحیح تفسیر، اور واقعہ کے مطابق ترجمانی! اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دنیا کے پردے پر

جس کسی کو بھی آسودگی، فراغت اور مال و دولت ملتا تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے۔ یا قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کو غنا و آسودگی دینے کا منصب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو سپرد فرما دیا ہے! یہ مفہوم نہ اس آیت سے نکلتا ہے نہ مفسرین نے ایسا سمجھا ہے ـــ!

حضورؐ کی بعثت سے قبل دُنیا کو غنی اور آسودہ بنانے کی خدمت کس نبی کے سپرد تھی؟ کیا قرآن میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے؟؟

تاریخ و سیر کے واقعات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کے پاس مال ہوتا تھا تو عطا فرماتے تھے اور نہیں ہوتا تھا تو نہیں دیتے تھے۔ ایک بار ایک سائل آیا، حضورؐ سے سوال کیا، آپؐ نے امہات المومنین کے گھروں میں معلوم کرایا کہ کچھ دینے کے لئے ہو تو سائل کو دے دیا جائے، پتہ لگا کہ پانی کے سوا حریم نبوت میں کچھ نہیں ہے۔ اس لئے آپؐ نے اس سائل کو دُوسرے صحابہ کے پاس بھیجدیا!

پھر "۔۔۔۔ اغناھم اللہ ورسولہ" کی تفسیر میں کیا یہ بھی کہیں ملتا ہے کہ صحابہ کرام نے فقر و احتیاج کے عالم میں، اپنے گھروں میں بیٹھ کر یا دُور بستیوں میں رہ کر رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ "یا رسول اللہ! ہماری محتاجی دُور فرما کر ہمیں غنی بنا دیجئے"۔ جب صحابہ کرام کو ہم فقر و فاقہ اور دُنیوی مشکلات میں مبتلا پاتے ہیں، تو اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہم کس طرح قائم کرلیں کہ فلاں بزرگ کے پاس اللہ کے دیئے ہوئے خزانے ہیں اور وہ اُن میں تصرف فرما کر جس کو جب چاہیں مالا مال کردیں ـــ!

اہلِ بدعت نہ صرف یہ کہ "توحید" کے معاملہ میں بے پروا واقع ہوئے ہیں، بلکہ آیتوں اور حدیثوں سے ایسے نکتے نکالنا۔ جن سے "عبد و معبود" کے مابین امتیاز اور فرقِ مراتب زیادہ سے زیادہ مشتبہ ہو، اُن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (Hobby) ہے ـــ!

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ (الانفال)

کی تفسیر میں یہ لوگ کیا کیا "نکتے" نکالتے اور کیسے کیسے حاشیئے چڑھاتے ہیں!

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں سے کافروں کا مقابلہ ہوا۔ تو حضورؐ نے اپنی مٹھی میں ریت لے کر "شاھت الوجوہ" پڑھا اور ریت کفّار کی طرف پھینک دی، اور وہ کنکریاں اور ذرّے کافروں کی آنکھوں میں جا پڑے!

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے فوق العادۃ فعل کے بارے میں فرما رہا ہے کہ ہم نے تم میں یہ قوت پیدا کردی تھی، ورنہ تم اپنے کسب و اختیار سے یہ کام نہ کرسکتے تھے، یہ آیت تو "توحید خالص" پر ایک نہایت روشن دلیل ہے، اللہ نے بدر میں چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ریت کے ذرّے پھنکوا دیئے، جس نے کافروں کو بدحواس اور پریشان کرنے میں مؤثر کام سرانجام دیا۔ دُوسری طرف احد میں اللہ نے نہ چاہا تو آپؐ سے کسی معجزہ اور فوق العادۃ فعل کا صدور نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ آپؐ زخمی ہوگئے! یہ آیت تو اس لئے نازل کی گئی تھی کہ "شاھت الوجوہ" پڑھ کر ریت پھینکنے کے اس معجزہ کے سبب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی الوہی اور خدائی تصرف کہیں منسوب نہ کردیں۔ اسی آیت کا پہلا جزو یہ ہے:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ!

(پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا)

بدر میں صحابہ کرام کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی، ساز و سامان اور اسلحہ کی قلت تھی، مگر پھر بھی مسلمان اللہ کے فضل سے کفار پر غالب آئے، یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین صحابہ کو مخاطب کر کے اپنا احسان جتایا کہ:-

"تم نے انھیں (یعنی کافروں کو) قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا"

یہاں بھی صحابہ کے اختیارات و قدرت کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت، مشیت اور قدرت کا اظہار فرما رہا ہے!

اہل عرب کے درمیان جو شدید مخالفتیں صدیوں سے چلی آ رہی تھیں۔ وہ بعثت نبوی کے بعد دور ہو گئیں، خاص طور سے اوس و خزرج کی دیرینہ عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا، اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ اس "تالیفِ قلوب" اور "دلوں کے جوڑ دینے" کو اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں ظاہر فرماتا ہے:-

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ (الانفال)

اور الفت ڈال دی اُن کے دلوں میں، اگر تُو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا، تو نہ الفت ڈال سکتا اُن کے دلوں میں، لیکن اللہ نے الفت ڈالی اُن میں!

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو ٹوک لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ دلوں کا جوڑ دینا ہمارا کام ہے، اہل عرب کے دل آپ نے نہیں جوڑے، آپ زمین کے تمام خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی عرب کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے تھے، اُن کے دلوں کو تو ہم نے جوڑا ہے اور اُن کے درمیان ہم نے اخوت اور مودت پیدا کی ہے!

حیرت ہے کہ لوگ قرآن کریم میں اس قسم کی محکم آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبیوں، ولیوں، پیروں، اور شہیدوں کو کائنات میں متصرف سمجھتے ہیں، اس قسم کی بیسیوں قرآنی آیات صاف طور پر بتاتی ہیں کہ قدرت و اختیار کا سررشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اُس کے حکم کے بغیر کسی نبی اور رسول نے ایک سانس بھی اپنے اختیار سے نہیں لی۔ اُس کو جب منظور ہوتا تھا، انبیاء کرام سے معجزے صادر کرا دیتا تھا۔ اور جب منظور نہ ہوتا تھا تو انبیاء کرام کی تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود کچھ نہ ہو سکتا تھا۔!

غیر اللہ سے استعانت کے جواز میں "اہل بدعت" جب قرآن کریم کی آیت:-

"استعینوا بالصبر والصلوٰۃ"

سے استدلال کرتے ہیں، تو اُن کے ذہن و فکر کی اس کجی پر بڑا دکھ ہوتا ہے! آپ نے کبھی سنا اور دیکھا ہے کہ کوئی شخص "صبر اور نماز" سے اعانت طلب کرتا ہو، کہ یا ایھا الصبر (اے صبر!) اور یا ایھا الصلوٰۃ (اے نماز!) تم میری مدد اور دستگیری فرماؤ۔ اگر کوئی ایسا فعل کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں، اور ایسا کرنے کو اُس نے اس آیت کے مفہوم کے حکم کی تعمیل سمجھ رکھا ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا مذاق اڑاتا ہے! اللہ تعالیٰ ایسے فعلِ عبث کی تعلیم دے کس طرح سکتا ہے!

اس آیت کا سیدھا اور صاف مفہوم یہ ہے کہ صبر اختیار کرو گے اور نماز پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائیگا۔ اس سے حلِ مقصد اور کشائشِ مشکلات ہو گی!

ظاہری لفظوں کے "تشابہ" سے اس قسم کے لطیفے اور نکتے پیدا کرنا، فراستِ مومن کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے — ؟
"من انصاری الی اللہ" میں "انصاری" کا لفظ آجانے سے کیا یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی واقعی اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے انصار و اعوان اور مددگاروں کی ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے اور "انصار اللہ" اللہ کی مدد کیا کرتے ہیں — ! (معاذ اللہ)

یہ تو قرآن کی آیتوں کیساتھ اہلِ بدعت کا رویہ اور سلوک ہے، اسی طرح احادیث نبوی سے اپنے مزعومہ اور خود تراشیدہ عقائد کی تائید کرانا چاہتے ہیں:—

"وَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللہُ یعطی"

پڑھ کر کس زور شور سے اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام خزانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیئے ہیں، حقیقی معطی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، رسول اللہ اس عطا کے قاسم (بانٹنے والے) ہیں!

اصل حدیث کی ابتدائی عبارت نہ جانے کیوں حذف کر دی جاتی ہے، پوری حدیث یہ ہے:—

"من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین و انما انا قاسم و اللہ معطی"

جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اُس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے!

حدیث کے الفاظ خود بول رہے ہیں اور عبارت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے یہاں "عطا" سے مال اور رزق و دولت کی تقسیم ہرگز مراد نہیں ہے! حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:—

قولہ "انما انا قاسم" - قال التورپشتی رحمۃ اللہ علیہ - اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ وانما انا قاسم الی ما یلقی الیہم من العلم والحکمہ وبقولہ واللہ یعطی ای انہم یہتدی بہ الی خفیات العلوم فی کلمات الکتاب والسنہ وذلک انہ لما التفقہ فی الدین وما فی نیہ من الخیر!

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت عطا فرماتا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکمت صحابہ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے۔ اسی کو حدیث میں "تفقہ فی الدین" کہا گیا ہے اور یہی وہ "فہم" ہے، جو کتاب و سنت کے نکات و معانی کی طرف ہدایت و رہنمائی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو حکمت عطا فرمائی تھی، وہ احادیث کی کتابوں میں محفوظ اور مرقوم و مسطور ہے۔ اور کوئی شخص نبوی تعلیم و حکمت سے بے نیاز ہو کر، دین میں فلاح و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حدیث سے یہ مفہوم ہرگز ہرگز نہیں نکلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے خزانے بخش دیئے ہیں۔ اور آپ اُن کو تقسیم فرمایا کرتے ہیں!

اہلِ بدعت "اوتیت بمفاتیح خزائن الارض" سے جو دلیل لاتے ہیں، یہ پوری حدیث یہ ہے:—

وعن ابی ھریرۃ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت بجوامع الکلم ونصرت بالرعب وبینھا انا نائم رایتنی اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت یدی" (متفق علیہ)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں، اور رعب کیساتھ میری مدد کی گئی ہے اور جب میں سو رہا تھا تو مجھے دکھایا گیا کہ مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے!

ایک طرف یہ حدیث، دوسری طرف قرآن کی یہ آیت:۔

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ"

اے نبیؐ! تم کہدو کہ میرے پاس اللہ کے (دیئے ہوئے) خزانے نہیں ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ جو حدیث قرآن کی مخالف ہوگی اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا، اور وہ بھی کسی فقہی مسئلہ میں نہیں بلکہ بنیادی اعتقاد میں۔ اس آیت میں "خزائن اللہ" آیا ہے، صرف "خزائن" نہیں کہا گیا۔ یعنی اس آیت میں "اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانوں" کی بھی نفی کی گئی ہے۔ "ذاتی" اور "عطائی" کی تاویل کے لئے بھی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے!

مگر حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہے، ہاں! قرآن کی مخالف اُس وقت ہوگی، جب اس کے وہ معنی لئے جائیں جو "اہلِ بدعت" لیتے ہیں۔ اور عام طور پر اہلِ بدعت اسی حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں کی کنجیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردی ہیں۔ حالانکہ قرآن جس کی نفی کرتا ہو، حدیث اُس کا اثبات کرے، ناممکن ہے!

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر اپنے اُمتیوں کے قبضہ و تسلط اور حکومت کی طرف اشارہ اور پیشین گوئی ہے! جو عالم مثال میں آپؐ کو دکھایا گیا تھا۔ خود حضورؐ کے دَورِ مبارک میں بھی عرب پر آپؐ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا بھی دَور گزرا ہے کہ اُس وقت کی دُنیائے معلوم کا بہت بڑا رقبہ اُمتیانِ نبیٔ آخر کے زیرنگین تھا، اور تاریخ کے ہر دَور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ اور اس دَورِ انحطاط میں بھی آج لاکھوں میل کے رقبہ پر مسلمانوں کا تسلّط، قبضہ اور حکومت ہے! جن میں کم و بیش تیس کروڑ انسان بستے ہیں۔

مشکوٰۃ کی حدیث کے اس ٹکڑے:۔

"و اُحلّت لی الغنائم و اُحلت لی الارض مسجداً و طہورا"

(اور میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں، اور زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی)

"اُحلّت لی" (میرے لئے حلال کئے گئے) میں وہ تمام غنائم شامل ہیں، جو آپؐ کے اُمتی جہاد کے ذریعہ حاصل کریں گے اور "زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی" میں وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے، جو حضورؐ کے اُمتی قیامت تک اپنے سجدوں سے معمور کریں گے، اسی طرح "او تیت بمفاتیح خزائن الارض" میں عرب کے علاوہ وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے، جو آپؐ کے اُمتیوں کے قبضہ میں آیا اور قیامت تک آتا رہے گا!

اگر یہ حدیث خواب کا واقعہ نہ ہوتی تو بھی اس کے یہی معنی لئے جاتے کہ کتاب اللہ سے ٹکراؤ نہ ہو۔ مگر حضورؐ کا یہ فرمانا۔ "و بینھا انا نائم رایتنی" (جب میں سو رہا تھا، تو مجھے یہ دکھایا گیا) اس نے معاملہ کو آسان تر بنا دیا۔ اس پر شاید یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ انبیاء کرام کے خواب سچے (رویائے صادقہ) ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کو آنے والے واقعات عالم مثال میں دکھلائے جاتے ہیں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا۔ کہ وہ انھیں سجدہ کر رہے ہیں، اور یہ مثالی واقعہ اس طرح سچا ہو کر رہا۔

وَرَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا -

شاید کہا جائے کہ یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا، تو وہ اُس وقت کمسن تھے نبوت جب تک کہاں ملی تھی - اسی کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ خواب میں جو شے حضورؐ کو نظر آئی، اس کی خود حضورؐ نے تاویل فرمائی ہے:-

"عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رایت ذات لیلۃ بیما یری النائم کا نا دار عقبۃ بن رافع فاتینا برطب من رطب ابن طاب فاولت ان الرفعۃ فی الدنیا والعاقبۃ فی الآخرۃ وان دیننا قد طاب"۔

(میں نے ایک رات اُس حالت میں، جس حالت میں سونے والا دیکھا کرتا ہے، دیکھا کہ گویا میں عقبہ بن رافع کے گھر میں ہوں، اور ہمارے سامنے رطب (تازہ کھجور) لائے گئے، تو میں نے اُس کی یہ تاویل کی کہ ہمارے لئے دُنیا میں رفعت ہے اور آخرت میں انجام (اچھا) ہے اور ہمارا دین مکمل اور احسن ہو گیا)

حدیث میں آیا تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے اور غلہ پر ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء کی مقدار کو کثیر و وافر کر دیا - مگر اہلِ بدعت اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے نام کی جو فاتحہ دی جاتی ہے اور اُس میں کھانا اور شربت وشیرینی سامنے رکھ کر جو ہاتھ اُٹھا کر دعا پڑھتے اور ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اس کا جواز اس حدیث سے نکلتا ہے - مگر خدا کے بندو! اس حدیث سے یہ کہاں ثابت ہے کہ حضورؐ نے غلہ، طعام اور پھلوں پر ہاتھ اُٹھا کر کسی کی روح کو ثواب پہنچایا تھا - واقعہ کیا ہے اور اس سے مفہوم کیا پیدا کیا جا رہا ہے؟

اسی طرح یہ حدیث کہ حضورؐ کہیں سے گزر رہے تھے، دو قبروں پر آپ نے ہری شاخیں گاڑ دیں - اور فرمایا کہ ان قبروں پر عذاب ہو رہا تھا، یہ شاخیں جب تک ہری رہیں گی، اہلِ قبر کے لئے دعائے مغفرت کریں گی! مگر اس حدیث سے یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا جائز ہے - حضورؐ نے ان قبروں پر پھول کب چڑھائے تھے! اور یہ جو بزرگانِ دین کی قبروں پر عقیدت مند پھول چڑھاتے ہیں، تو اُن کی کیا یہ نیت ہوتی ہے کہ اُن کے ایسا کرنے سے اُن بزرگوں کے عذابِ قبر میں تخفیف ہو جائے گی، اس قسم کا واہمہ بھی کسی زائر کے ذہن و قلب میں نہیں گزرتا اور نہ گزرنا چاہیئے - پھول تو عقیدت و تکریم کی نیت سے چڑھائے جاتے ہیں - جس کی کوئی سند کتاب و سُنت، آثارِ صحابہ بلکہ ائمہ فقہ کے کسی قول تک سے نہیں ملتی، لہٰذا یہ فعل "بدعت" ہے! اور گمراہی ہے!

یہ ہے اُن "عاشقانِ رسولؐ" (؟) اور "حامیانِ سُنت" (؟) کا سلوک جو احادیث کے ساتھ کرتے ہیں - اور یہ ہیں اُن کے استدلال، تفکر و تعمق اور تفقہ فی الدین کے چند نمونے!!

اہلِ بدعت "غیر اللہ" سے استمداد کے جواز میں حصن حصین کی یہ روایت استدلال میں پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ سے مروی ہے کہ جو کوئی راستہ بھول جائے، وہ یوں پکارے:-

"اعینونی یا عباد اللہ"

طبرانی کے الفاظ یہ ہیں:-

"ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی، یا عباد اللہ! اعینونی۔"

(جو کوئی عون (استمداد) چاہے، تو اسے یوں کہنا چاہیئے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔
اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو)

یہ حدیث اس لئے حجت نہیں بن سکتی کہ اس میں انقطاع و نکارت کی علتیں پائی جاتی ہیں۔ اور اس حدیث کا ایک راوی عتبہ بن غزوان مجہول الحال ہے! قرآن شریف میں کتنی محکم آیتیں ایسی ہیں، جن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو مصیبت کے وقت پکارنے سے منع کیا گیا ہے! احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ حضورؐ سے جو دعائیں مروی ہیں، ان میں بھی اللہ تعالیٰ ہی سے براہ راست عرض معروض کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی کسی پریشانی، اضطراب اور مصیبت میں اللہ کے سوا کسی دوسرے سے مدد نہیں چاہی! ان کا یہ معمول نہیں رہا!

کتاب و سنت کے بے شمار واضح احکام و شواہد کے مقابلہ میں:۔

"یا عباد اللہ! اعینونی"

والی تنہا روایت "حجت" کس طرح بن سکتی ہے، جبکہ یہ روایت صحت کے درجہ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اور اس میں علتیں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پایۂ صحت سے گری ہوئی ایک روایت، جس سے قرآن کی متعدد آیتوں اور سینکڑوں حدیثوں کی مخالفت ہوتی ہو، کس طرح قبول کی جا سکتی ہے!

"اہلِ بدعت" کی طرف سے کبھی کبھار یہ لطیفہ بھی سننے میں آتا ہے کہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اگر بزرگانِ دین کو یہ پسند نہ ہوتا تو وہ ایسا کاہیکو ہونے دیتے؟ یہ ایسی بات ہے کہ اس پر ہنسیئے بھی اور روئیے بھی! اس دلیل کی بنیاد پر سب سے بڑا اعتراض تو حضرت مسیح علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے کہ آپ کی امت نے آپ کو "ابن اللہ" بنا ڈالا! اسے آپ نے نہیں روکا، اس لئے یہ اس کی دلیل ہوئی کہ نصاریٰ کے اس مشرکانہ فعل سے آپ ناخوش نہ تھے، بلکہ رضامند تھے! (استغفر اللہ)

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے، اور خیر و شر کا ایک معرکہ اس کے حکم سے گرم ہے! اس میں بڑی نازک حکمتیں اور باریکیاں چھپی ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے، عادل ہے، جو کچھ وہ کر رہا ہے، ٹھیک عدل کے مطابق کر رہا ہے، یہ بات تو خود نبیوں، اور ولیوں کی عدم قدرت اور مجبور و بے اختیار ہونے کی دلیل ہے، کہ ان کی تمام جدوجہد، کوششوں اور دعاؤں کے باوجود بعض اوقات انسانوں کے حالات نہ سنبھل سکے، یہاں تک کہ عذاب الٰہی نے نافرمان قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا!!

تاریخی تجزیہ!

اس عنوان پر گفتگو کرنے سے قبل ہم اس بات کو واضح کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ وہ "تصوف" جو کتاب و سنت کے مطابق ہے اور "تزکیہ نفس" جس کا موضوع ہے، اس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اور صوفیاء کرام نے جو کتاب و سنت کے مطابق زندگیاں گزاری ہیں، دین کی تبلیغ کی ہے اور لوگوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ اور ان کے دلوں کے آبگینوں کو اجالا ہے، ان کی عقیدت سے ہمارا دل معمور ہے (اللہ کی ان پر رحمتیں ہوں) اب رہے صوفیاء کرام کے بعض اعمال و اقوال اور طریقے تو ان کے جانچنے کے لئے اللہ نے جو "کتاب و سنت" کی کسوٹی بنا دی ہے! اسی پر ان کو پرکھ کر دیکھا جائے گا۔ اور یہ کسوٹی جو بتائے گی، وہی حق ہوگا۔

[illegible] میں کوئی فرقہ کسی صحابی کے نام سے منسوب نہیں ہے، حالانکہ صحابہ کی تعداد لاکھوں کے لگ بھگ تھی۔

اُن میں بڑے رتبہ اور شان و جلالت کے بھی صحابی تھے، جن کے علم و تفقہ اور تقویٰ کا بھی مقام ممتاز اور بلند تھا۔ جب کسی صحابی اور اہلِ بیت کے کسی فرد نے کوئی فرقہ نہیں بنایا۔ تو ہم اس الزام سے حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کو قطعاً بری اور پاک سمجھتے ہیں کہ آپ نے مسلمانوں میں کسی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہو! علیؓ کی ذات دین کی جامع تھی، دین کو معاذ اللہ منفرق کرنے والی نہ تھی!

تین خلافتوں کا زمانہ حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کرام نے دیکھا ہے۔ اس عرصہ میں اُن کی طرف سے کسی اعتقادی اور دینی اختلاف کا اظہار نہیں ہوا۔ اور ہم فاتح خیبر جیسے شجیع، حق شناس، حق گو اور بلند کردار انسان سے یہ کمزوری ہرگز ہرگز منسوب نہیں کر سکتے کہ آپ اتنی طویل مدت تک مخصوص دینی عقائد، منفرد اسلامی فکر اور کوئی خاص فلسفۂ اخلاق و روحانیت چھپائے بیٹھے رہیں!

"شیعانِ علیؓ" کسی ایسی جماعت کا نام ہرگز ہرگز نہ تھا، جس کے دینی عقائد عام مسلمانوں سے مختلف تھے جمل و صفین کی جنگوں میں جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جھنڈے کے تلے مخالف گروہوں سے لڑے، اُن کو "شیعانِ علیؓ" کہتے تھے۔ ہم اگر اُس زمانہ میں ہوتے تو ہم بھی علیؓ مرتضیٰ کے پرچم تلے آپ کی مدافعت اور حمایت میں جنگ کرتے، اس لئے ہم بھی اپنے کو "شیعانِ علیؓ" ہی سمجھتے ہیں!

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ کسی ایسے مسئلہ پر نہیں کی کہ جو توحید، نبوت، معاد و آخرت اور اسلام کے بنیادی عقائد کا کوئی اختلافی مسئلہ ہو۔ حضرت علیؓ نے اپنے مخالف گروہوں اور اُن کے قائدین پر یہ الزام نہیں لگایا کہ تمہارے عقائد فاسد ہیں! اور میں صحیح عقائد پیش کرتا ہوں، یا تمہاری نمازیں اور روزے کتاب و سنت کے مطابق نہیں رہے، میں نے ان غلطیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے!

حضرت علیؓ نے دین و شریعت اور اخلاق و روحانیت کا کوئی ایسا فلسفہ یا طرزِ فکر پیش نہیں کیا، جو جمہور صحابہ سے مختلف اور منفرد تھا۔ حضرت علیؓ نے کوئی فرقہ نہیں بنایا اور نہ کوئی ایسا جداگانہ فلسفۂ روحانیت و اخلاق پیش فرمایا، جس سے دوسرے صحابہ ناواقف تھے، صحابہ کرام، اہلِ بیت اور خود حضرت علیؓ، سب کے سب ایک ہی معلم اخلاق (روحی فداہ) کے شاگرد تھے۔ حضورؐ کی تعلیم سب کے لئے عام تھی، اور کھلی ہوئی تھی۔ تعلیم کے اخذ کرنے میں تو ذہنوں کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے کم اور زیادہ اور فوق و تحت کا فرق ہو سکتا ہے۔ مگر زبانِ وحی ترجمان نے علم و حکمت کے سلسلہ میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ یہ بات تو کیمیا گروں کو زیب دیتی ہے کہ وہ کچھ چٹکلے سینہ بہ سینہ رہنے دیں۔ نبی کی نہ تو زندگی راز ہوتی ہے اور نہ اُس کی تعلیم "پُر اسرار" ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کتابِ مبین" کو "بلاغِ مبین" کے ساتھ پیش فرمایا!

اسلام میں سب سے پہلا فتنہ جو ظاہر ہوا وہ "سبائی فتنہ" تھا۔ عبداللہ بن سبا ایک یہودی، شہر صنعا کا رہنے والا، اس فتنہ کا بانی مبانی تھا۔ اسلام کے عروج کو دیکھ دیکھ کر اُس کے سینہ پر سانپ لوٹتے تھے، یہ شخص مسلمانوں میں شامل ہو کر اُن کا شیرازہ بکھیرنے اور جمی ہوئی بساط کو اُلٹنے کی خفیہ تدبیریں کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو آلِ رسولؐ کا حامی، خیر خواہ اور اُن کا عقیدت مند ظاہر کیا اور اس قسم کے عقیدے کہ حضرت محمد رسول اللہ بھی،

حضرت عیسیٰؑ کی طرح دنیا میں ضرور آئیں گے"، مسلمانوں میں پھیلانے شروع کئے!

"سبائی فتنہ" کے بعد جو پہلا گمراہ فرقہ مسلمانوں میں ظاہر ہوا، وہ خوارج کا فرقہ تھا۔ جن کے بعض عقائد مسلمانوں کے جمہور سے یکسر مختلف تھے، یہ کم بخت حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ کو دین سے خارج سمجھتے تھے ـــــ! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور کئی بار اُن کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا ۔ یہ فرقہ اور اس کے عقائد مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکے! مسلمانوں کے جمہور نے اس گمراہ فرقہ سے اپنی برأت ظاہر کی، اور آج دُنیا میں اُن کی تعداد بہت ہی کم پائی جاتی ہے! خوارج میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، جو بد نصیب متشدد ہیں، وہ تو "صرف ایک رکعت نماز صبح اور ایک رکعت شام کے قائل ہیں" اور ان میں سے بعض پوتیوں، نواسیوں اور بھتیجے اور بھانجے کی بیٹیوں سے نکاح کو حلال سمجھتے ہیں! اور کہتے ہیں کہ سورۂ یوسفؑ قرآن کا جزو نہیں ہے (ان گمراہ عقائد سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ!)

"سبائی فتنہ" کو ذہن میں رکھئے، اور آگے بڑھئے، علوی خلافت کے دور میں بعض لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی الوہیت کا اعلان کیا - اور آپ نے ایسا کہنے والوں کو دردناک سزائیں دیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے:-

يهلك فيَّ رجلان محبٌّ مفرطٌ يقرظني بما ليس فيَّ ومبغضٌ يحمله شنآني على ان يبهتني!

میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوں گے، ایک غلیۂ محبت سے، ایسی تعریف میری کرے گا، جو بات مجھ میں نہیں ہے اور دوسرا عداوت رکھنے والا کہ اس کو میری عداوت نے آمادہ کیا اس بات پر کہ مجھ پر بہتان باندھے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد کسی صحابی اور خلیفہ کے بارے میں کوئی غلو نہیں کیا گیا۔ اسلام میں عقائد کے سب سے پہلے فتنہ کا ظہور "عقیدت" کے غلو سے ہوا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات و صفت میں کیا گیا، حضرت علی کا دامن اس سے بالکل پاک ہے، یہی وہ طرزِ فکر ہے جو باطنیہ، اسماعیلیہ اور قرامطہ کے قالبوں میں ڈھلتی چلی گئی! اور مشرکانہ تصورات و بدعات اور عجمی فلسفے کے انبار پر انبار لگتے چلے گئے!

چند جھلکیاں:-

- عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں اور معتقدوں نے کہا کہ حضرت علیؓ "معبودِ حقیقی" ہیں اور وہ شہید تھوڑی ہوئے ہیں، ابن ملجم نے تو ایک شیطان کو قتل کیا تھا۔ جس نے آپ کی شکل میں روپ دھار لیا تھا۔ حضرت علیؓ بادلوں میں پوشیدہ ہیں، بادل کی گرج آپ کی آواز ہے اور بجلی کی کڑک آپ کا کوڑا ہے!
- اسی مکتبۂ فکر کے ایک فرقہ مفضلیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت علی کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے وہی نسبت ہے جو مسیح علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے ہے، اور جس کسی کا اتحاد ذاتِ لاہوت سے ہو وہ نبی ہے!
- فرقہ بیزغیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیوں میں ہوا ہے، وہ یہ ہیں:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عباسؓ۔ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عقیلؓ (رضی اللہ عنہم)
- فرقہ بیزغیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت جعفر "الٰہ" تھے اور وہ اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آتے تھے!

- فرقہ جناحیہ اس کا قائل ہے کہ روح الٰہی، حضرت آدم و شیث علیہما السلام اور تمام نبیوں کے اجسام سے درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی، حضرت پیغمبر آخر الزماں تک آئی اور پھر حضورؐ سے حضرت علیؓ، حضرت حسنینؓ اور محمد بن الحنفیہؒ تک پہنچی!
- فرقہ باقریہ۔ امام باقرؒ کو "حی لایموت" مانتے ہیں اور اُن کے "امام منتظر" ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں!

یہ ہے وہ "مشرکانہ طرز فکر" اور "عجمی عقائد" جو مسلمانوں میں عقیدت و محبت کے نام پر داخل ہوئے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ ان عقائد کا مرکز حضرت علیؓ اور اہل بیت کی ذات کو بنایا گیا ہے۔ حالانکہ علی مرتضیٰ اور ائمہ اہل بیت کا دامن بے غبار ہے۔ اور ان پر کسی مشرکانہ عقیدہ اور بدعت کی ذرہ برابر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی! جس طرح نصاریٰ نے "ابن اللہ" کے مرکزی تصور کے ارد گرد، پورا فلسفہ اور مکمل علم کلام کھڑا کر دیا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ اور ائمہ اہل بیت اطہار کو مرکز عقیدت قرار دے کر، پورا علم کلام تصنیف کیا گیا۔ جس کی چند جھلکیاں اوپر گزر چکی ہیں!

یہ بات بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ تصوف کے تمام سلسلے نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے منتسب ہیں اور آپ پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔ ان سلسلوں میں اکابر صوفیا گزرے ہیں، جنہوں نے کوئی شک نہیں دین کی اور خاص طور سے تزکیۂ نفس کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں! (رحمہم اللہ تعالیٰ)

اس اعتراف کے بعد ہمیں یہ بھی کہنا ہے کہ طریقت کے سلسلوں کے اس انتساب نے اس تصور کو بھی مسلمانوں میں ابھارا کہ ولایت، طریقت، روحانیت اور تصوف کی مرکزیت، رہنمائی اور قیادت کا منصب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد عہد خلافت میں یہ تصور اور یہ امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ اور جس طرح دوسرے اکابر صحابہ سے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے، اسی طرح حضرت علیؓ کے پاس بھی دین حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ یہ تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ عمرؓ اور عبد اللہ ابن مسعودؓ تو دین کے ظاہری احکام کی تعلیم دیتے ہیں اور علیؓ دین کے اسرار اور باطن کی تعلیم دینے پر مامور ہیں! اور ولایت کے لئے حضرت علیؓ کی ذات سے روحانی انتساب ضروری ہے! اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور اس دور کے دوسرے ائمہ حدیث و فقہ جن کا زمانہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریب تھا۔ وہ طریقت کے کسی سلسلہ میں منسلک نہیں ہیں۔ اگر ولایت، روحانیت اور تزکیۂ نفس کے لئے یہ انتساب اور انسلاک ضروری ہوتا تو ائمہ فقہ و حدیث بھلا اس برکت و سعادت سے محرومی گوارا کر سکتے تھے، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی یہ تفریق قرن اول میں نہ پائی جاتی تھی!

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اس تفریق کے آثار بعد میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، عارفان باللہ اور اولیاء کرام کے جن کتابوں اور تذکروں میں نام اور احوال درج ہوتے ہیں، اُن میں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ جیسے اکابر صلحاء امت کے نام نظر نہیں آتے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ و طہارت کی کوئی حد و نہایت ہے، پھر آپ کا کتاب و سنت سے شغف بلکہ اُس میں مہارت اور تعمق "نور علیٰ نور!" اور "تفقہ فی الدین" کی استعداد اور صلاحیت میں تو امام موصوف اپنی آپ نظیر تھے! ان تمام دینی اوصاف کے باوجود اگر ابو حنیفہ ولی عارف باللہ اور صاحب روحانیت نہ تھے تو پھر پوری امت میں نہ کوئی ولی گزرا! اور نہ کوئی صاحب عرفان و روحانیت پیدا ہوا!

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے احادیث نبویہ کے صحیح ترین مجموعہ کو مدون کر کے تمام امت اسلامیہ

پر احسان کیا ہے، جو خدا سے ڈرنے والے تھے، سنتِ رسولؐ کے سب سے بڑے جامع، ناشر، مبلغ اور متبع تھے، جن کے اندر کمال درجہ کا تقویٰ اور صالحیت پائی جاتی تھی، اُن تک کا نام "ولایت و عرفان" کی فہرستوں میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی اس "تفریق" اور امتیاز نے عقائد و اعمال کو اچھوتا نہیں رہنے دیا۔ غضب خدا کا منصور حلاج اور سرمد جیسے مجہول لوگوں کو تو اسرارِ باطن کا ماہر اور عرفان و شہود کا نمائندہ سمجھا جائے، مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ جیسے صلحاء اور اتقیا اور دین و شریعت کے محافظین کو علمائے ظاہر میں شمار کیا جائے! اور معرفت و روحانیت کے باب میں انھیں کونا سمجھا جائے۔

تاریخ کے ان حقائق کو بھی ذہن میں رکھئے کہ فرقہ باطنیہ نے انتہائی عیاری اور چالاکی کے ساتھ ظاہر و باطن کی تقسیم کو اُبھارا، قرآنی احکام کے بارے میں یہ کہا کہ اصل عمل ان احکام کے باطن پر ہونا چاہیئے۔ اور باطن کی تربیت کے لئے امام معصوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے جاتے ہیں! پھر اس عقیدہ کو پھیلایا گیا کہ کچھ نفوسِ قدسیہ اور معصوم ائمہ دُنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو کر عالمِ غیبوبت میں رہتے ہیں۔ اور غاروں اور سردابوں سے احکام نافذ کرتے اور رُوحانی تربیت فرماتے ہیں۔ اور "نماز" سے مراد تو امام کو پکارنا ہے، اور "زکوٰۃ" وہ ہے جو امام کو دی جائے اور "حج" امام کی خدمت میں حاضر ہونا ہے!

آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کو "الٰہ" اور معبود کہا گیا۔ پھر "امام" سے جو اوصاف منسوب کئے گئے، اُس نے "نبوت" کے مقابل "امامت" کا ایک تصور پیدا کر دیا۔ پھر "باطن و روحانیت" کے مقابلہ میں دین و شریعت کو کمتر اور گھٹیا ٹھہرایا گیا، اس مشن نے، تعلیم نے اور تحریک نے توحید، نبوت اور شریعت پر ضرب لگائی اور ذہن و فکر کو بہت بڑے خلجان اور فتنہ میں مبتلا کر دیا!

"لاہوت اور ناسوت کا اتحاد، روح اور نور کا انسانی قالبوں میں منتقل ہونا، الوہیت کا باطن پر ظہور تجلّی کے لباس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ طرزِ بیان، یہ اندازِ فکر، کشف و وجدان کا یہ اظہار، یہ اصطلاحیں اور یہ زبان رفتہ رفتہ پھیلتی چلی گئی اور معاملہ چند اقوال اور ملفوظات تک ہی محدود نہیں رہا، مبسوط کتابیں اس نہج پر تصنیف ہوئیں اور لوگوں نے انھیں اسرار کا گنجینہ، معارف کا خزینہ، باطن کا دفترِ بے پایاں، کشف و شہود کے نگینے اور عرفان و تجلّی کے آئینے سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔!

حدیث و فقہ میں جس طرح جرح و تعدیل سے کام لیا گیا اور نقد و احتساب کیا گیا جس کے سبب ہر چیز نکھر کر سامنے آگئی، فقہ میں شاگردوں نے اپنے اُستادوں اور اماموں سے اختلاف کیا صرف حق کی بناء پر، کہ اُن کو اپنے اُستاد کی رائے یا اجتہاد، یا تاویل و استنباط قریبِ صواب نظر نہ آیا۔ تصوّف میں افسوس ہے کہ فقہ و حدیث کی طرح نقد و احتساب کو روا نہیں رکھا گیا، اگر اہلِ تصوّف میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمد شیبانیؒ جیسے جری نقاد پیدا ہوتے رہتے، تو یہ آئینہ بے غبار رہتا! اور اس گلکدہ کے خار و خس اور جھاڑ جھنکار چھٹتے رہتے!

"وحدت الوجود" اگر اسلام و ایمان کا کوئی بنیادی عقیدہ ہوتا تو کتاب و سنت میں اس کا ذکر آتا اور اس سے تزکیۂ نفس کی ضرورت پوری ہو سکتی تو بھی سنّت و آثارِ صحابہؓ اُس کے ذکر و بیان سے خالی نہ ہوتے، یہ مسئلہ دراصل دین کا نہیں بلکہ طبیعات کا مسئلہ ہے، جس طرح یوں کہتے ہیں کہ "کائنات میں ایک توانائی کام کر رہی ہے۔" تو "وحدتِ توانائی" دین کا مسئلہ نہیں ہے! مگر اس کو کیا کیجئے کہ "وحدت الوجود" کو اس قدر تنوع اور رنگا رنگ انداز میں پیش کیا گیا کہ "وحدت الوجود"

تصوف کا ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا!

بعض صوفی علماء سے کوئی شک نہیں کہ "وحدت الوجود" کی قابلِ قبول شرحیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورج نکلتے ہی ستارے نظر نہیں آتے، اگرچہ ستارے غائب نہیں ہوتے، مگر سورج کے سامنے وہ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اور لاشئے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کے مقابلہ میں کائنات اسی طرح ہیچ اور لاشئے ہے، جیسے سورج کے آگے ستارے! اگر "تصوف کے مسائل میں تشریح و افہام کا یہی سادہ انداز رہتا تو پھر کوئی اُلجھن پیش نہ آتی۔ مگر دوسرے نازک مسائل اور خاص طور سے "وحدت الوجود" کی شرح میں جو پیچیدہ اور دقیق و نازک زبان اور انداز اختیار کیا گیا، اُس نے خاصے اُلجھاوے پیدا کر دیئے اللہ تعالیٰ نے "متشابہات" کی چھان بین اور اُن کے پیچھے پڑنے سے روکا تھا۔ مگر بعض صاحبانِ وجد و حال نے چھانٹ چھانٹ کر اُن نازک ترین اور پیچیدہ وادق مسائل پر گفتگو کی، جو "متشابہات" کا مزاج رکھتے ہیں۔ اسلامی ادب میں یہ اندازِ بیان حوصلہ افزائی کا مستحق نہ تھا، مگر آنے والوں نے اس اندازِ بیان کے موجدوں کو معارف و حقائق کے بحرِ بے پایاں کا شناور بتایا۔ اور کہا کہ یہ وہ اہلِ کشف و شہود تھے، جن پر باطنی علوم کے تمام پردے چاک ہو گئے تھے!

زبان و اصطلاح کے بعد بعض اشغال و اوراد اور رسوم میں بھی اس کی جھلک آئی، اگرچہ شیخ نصیر الدین چراغ دھلوی رحمتہ اللہ علیہ جیسے محتاط صوفیوں نے جرأت کے ساتھ یہ فرمایا:۔

"مشائخ کا فعل حجت نہیں۔"

مگر عقیدت نے اُس پر عمل کس قدر ہونے دیا؟

جو لوگ "بدعت" اور "عجمی فلسفہ الٰہیات" سے شغف اور دلچسپی رکھتے تھے، اُن کے لئے تصوف کے طرزِ بیان اور بعض مشائخ کی اختیار کی ہوئی رسوم و طریق سے رخصتوں، اباحتوں اور بے اعتدالیوں کے لئے سندِ جواز ہاتھ آگئی!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو "الٰہ و معبود" کہا گیا تھا، کیا اُس کی جھلک اُن کے لقب "مشکل کشا" میں نہیں ملتی؟ یہ لقب عجمیوں کی اختراع ہے، اسی لقب اور ترکیب کی پیروی میں "داتا" اور "غریب نواز" جیسے القاب تراشے گئے! انبیاء عظام اور صحابہ کرام میں سے کسی کے نام کے ساتھ اس قسم کے القاب و خطابات آپ کو نہیں ملیں گے!

باطنیوں کا وہ عقیدہ کہ بعض نفوسِ قدسیہ دنیا والوں کی نگاہوں سے غائب ہو کر چھپ جاتے ہیں اور اپنے مقاماتِ غیوبت سے دنیا کی باطنی تربیت اور دستگیری فرماتے ہیں —— اس عقیدہ نے اہلِ بدعت میں اس طرح رواج پایا کہ جگہ جگہ شہروں میں "شاہ ولایت" صاحبان کے مزار بنے ہوئے ہیں، جن کے بارے میں یہ عقیدہ تراش لیا گیا ہے کہ اس شہر کا انتظام اور نظم و نسق ان "شاہ ولایت" صاحب سے متعلق ہے؟

وہاں ائمہ کی عصمت کا عقیدہ، یہاں مشائخ اور پیروں کے احترام و عقیدت کے آداب اس طرح سکھائے گئے:۔

"کسی پیر کو خلافِ شریعت اور بُری بات میں مبتلا دیکھو تو بھی اس سے حسنِ ظن رکھو، اُس سے بد عقیدہ نہ ہو" اور

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

پھر قبروں کے ساتھ وہ مشرکانہ آداب و رسوم اور بدعات وابستہ ہوتی چلی گئیں، جو انسانوں کو "الٰہ و معبود" بنانے والے

"ذہن و فکر" کا مقصود تھا ـــــ!

اس فکر و عقیدہ نے کیسے کیسے روپ دھارے ہیں، بعض لوگ اپنے خطوں کے شروع میں "ہو العلی" - "ہو القادر" اور "ہو المعین" لکھتے ہیں۔ کوئی پوچھے یہ کیا ہے؟ تو اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کہ "علی" - "قادر" اور "معین" تو اللہ کے نام ہیں۔ مگر کیا وہ اللہ سے بھی اپنے دلوں کی چوری چھپا سکتے ہیں کہ ان لفظوں میں اُنھوں نے "صنعتِ ایہام" سے کام لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ حضرت علی، شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین اجمیری کے ناموں کی بھی رعایت رکھی گئی ہے ـــــ!

شاعری میں یہ فتنہ اس طرح رونما ہوا کہ کفر کو اسلام پر، صومعہ اور بُت کدہ کو کعبہ پر، شراب کو آبِ زمزم پر۔ برہمن کو شیخ پر، رند کو زاہد پر، زنار کو تسبیح پر ترجیح دی گئی اور ڈنکے کی چوٹ کہا گیا ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

اور ؎ نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم!

بعض ایسے شعراء جن کی شاعری میں رندی و ہوسناکی رچی ہوئی ہے اور جسے پڑھ کر ذہن میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ طبیعت مستی و ہوس کی طرف مائل ہوتی ہے، انھیں "لسان الغیب" اور "عارف باللہ" کا خطاب دیا گیا۔ غرض

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا، کجا نہم!

تک معاملہ پہنچ گیا!

دعوتِ فکر "توحید نمبر" اتمامِ حجت بن کر منظر عام پر آیا ہے۔ اگر کچھ جبینیں اسے پڑھ کر شکن آلود اور کچھ چہرے خشم آلود ہو جائیں تو ہم معذور ہیں، کسی کی ناخوشی اور سرگرانی کے خوف سے ہم حق بات کو چھپا نہیں سکتے!

قبولِ حق کا معاملہ تو قلوب کی استعداد اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، کیا عجب ہے کہ "توحید نمبر" کے مضامین کچھ لوگوں کی اصلاح کا سبب بن جائیں!

جو حضرات تحقیق کا ذوق اور انکشافِ حق کی تڑپ رکھتے ہیں، اُن کی خدمت میں ہماری مخلصانہ اور ہمدردانہ گزارش ہے کہ جن مسائل کا "نقشِ اول" میں ذکر آیا ہے اور جو اس شمارۂ خاص میں پھیلے ہوئے ہیں، اُن میں سے کسی ایک مسئلہ کو وہ تحقیق کے لئے منتخب فرما لیں۔ مثلاً "مزاروں کے عرس" کا مسئلہ ہے، اس کی وہ تحقیق کریں، اور مخالف و موافق جماعتوں میں سے کسی ایک کی بھی کوئی کتاب نہ پڑھیں۔ بلکہ براہِ راست کتاب اللہ میں، احادیث میں، سیرت النبی میں، اسوۂ صحابہ اور ائمہ فقہ و حدیث کے حالات میں، اس مسئلہ کا پتہ لگائیں کہ کہیں اس کا وجود ملتا ہے؟ کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی اثر اور کسی کا قول، اس کے جواز میں پایا جاتا ہے؟ اس تحقیق میں اگر سال دو سال بھی صرف ہو جائیں، تو اہلِ تحقیق کو صبر سے کام لینا چاہیئے، یہ مسئلہ واضح ہوتے ہی پھر اُن کے ہاتھ میں ایسی کنجی آ جائیگی۔ جس سے اس قسم کے تمام مسائل کے قفل کھٹ کھٹ کھلتے چلے جائیں گے۔ اور حق واضح ہو جائے گا!

"شرک و بدعت کا معاملہ کوئی "فرقہ وارانہ" معاملہ نہیں ہے۔ شرک و بدعت کو ہر دور میں اہلِ حق نے قابلِ رد

وملامت ہی سمجھا ہے! "شرک" جسے قرآن "ظلمِ عظیم" کہتا ہے، اور جس گناہ کی خوفناکی کا یہ عالم ہے کہ اُس کو اللہ کی شانِ غفاری نے معاف نہ کرنے کا اعلان کیا ہے اور "بدعت" جسے اللہ کے آخری نبیؐ نے "ضلالت" کہا ہے۔ اُن کا رد کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت اور مسلمانوں کے ساتھ انتہائی خیر خواہی ہے، اگر اس کوشش کو کوئی فتنہ سمجھتا ہے، تو وہ انبیاء کرام پر معاذ اللہ "فتنہ ساز" ہونے کی تہمت لگاتا ہے! جن کا مشن ہی شرک، و بدعت کا استیصال، اللہ کی توحید کی تبلیغ اور دینِ خالص کے قیام کی دعوت تھی!

جس طرح نجاست اور طہارت کے درمیان اعتدال کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح "شرک و بدعت" اور "توحید وسنت" میں کوئی درمیانی راہ نہیں نکالی جا سکتی! "توحید" پر ایمان کا دارومدار ہے، یہی اسلام کی اوّلین اساس ہے۔ اس بنیاد پر بال برابر بھی آنچ آئے تو ایمانی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ مدافعت کے لئے تیار ہو جائے!

"توحید نمبر" میں جو مسائل آئے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ ایک مفروضہ اور قیاس کے طور پر اُن کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہو، یہ مسائل مسلمانوں میں موجود ہیں، ان پر نکیر کرنی ہی چاہئیے! مشرکانہ رسوم و بدعات میں رواداری یا سکوت شیطان کا بہت بڑا فریب ہے!

یا اللہ! ہم سچے دل سے اقرار کرتے ہیں کہ تو "ایک" (واحد و احد) ہے، تجھ جیسا کوئی نہیں۔ تیری ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں، تیری ذات حلول و تجسم سے پاک ہے، حلّالِ مشکلات، کارساز، بگڑی کا بنانے والا۔ فریاد کا سننے والا، روزی دینے والا، ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والا، تُو اور صرف تُو ہے! عام و خاص، غریب و امیر، بادشاہ و گدا، جاہل و عالم، اولیاء اور انبیاء سب تیرے محتاج ہیں! جس کو جو کچھ ملتا ہے تیرے در سے ملتا ہے، تیرے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ تیری اور صرف تیری قدرت ہے کہ تو مخلوقات اور کائنات کے رتّی رتّی بھر حال کی ہر لحظہ خبر رکھتا ہے! عالم الغیب والشہادہ تو ہے! سمیع و بصیر اور علیم و خبیر تُو ہے!

رب العالمین! ایسی توفیق عطا فرما کہ ہمارا جینا اور مرنا خالص تیرے لئے ہو، ہماری ساری تمنّائیں، آرزوئیں اور ارادے تیری مرضی کے تابع ہو جائیں! ہمیں غیرت مند بنا، غیرت اس کی کہ شرک کے ادنیٰ سے شائبہ کو بھی ہم گوارا نہ کر سکیں! تیرے نبیؐ کی سُنّت اور اسوۂ حسنہ ہماری زندگیوں کا موضوعِ فکر ہی نہیں، معیارِ عمل بھی بن جائے! سُنّت کے مقابلہ میں "بدعت" کو دیکھ کر ہمارے اندر اُسے مٹا دینے کا جذبہ پیدا ہو اور ہم سخت کرب و اضطراب محسوس کریں!

یا اللہ! ہم میں اخلاص پیدا فرما کہ ہم کسی نیک کام پر تیرے سوا کسی سے نہ تو قدرشناسی اور اجر و ستائش کی تمنّا رکھیں اور نہ کسی سے خوف کریں، تیرے ذکر سے قلوب حلاوت و اطمینان محسوس کریں!

یا اللہ! جب ہم قیامت میں تیرے حضور حاضر ہوں، تو اس پیشانی پر تیری غلامی اور بندگی کے سوا اور کسی آستانہ کے غبار کا ایک ذرّہ بھی لگا ہوا نہ ہو!

بارِ الٰہا! اسلام کو اور مسلمانوں کو عزت و سربلندی عطا فرما! سازشیوں اور غدّاروں سے ملّتِ اسلامیہ کو نجات دے، اور ملّت کا سربراہ کار اُن کو بنا جو تیرے دین کو سربلند کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں!

یا اللہ! تیری بندگی کو ہم صرف تیرے ہی لئے خالص رہنے دیں، اُس میں کسی اور کی غلامی اور محکومیت شریک

نہ ہونے پائے! جو تجھ سے بندگی اور ربوبیت کا معاملہ ہے، وہ دُنیا میں اور کسی سے نہ ہو! ہم صرف تیری چشمِ کرم کے امیدوار، تیرے در کے سوالی، تیرے آستانہ کے فقیر اور تیرے کوچے کے بھکاری ہیں! ہم تیرے سوا ہر کسی کی بندگی اور معبودیت سے بغاوت کا اعلان کرتے ہیں! پرستش اور بندگی کے لائق صرف تیری ذات ہے! تیری خدائی میں، ربوبیت میں، معبودیت اور قدرت و اختیار میں کوئی شریک و سہیم نہیں، تیرے حکم کے آگے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں! ذلت اور عزت کا دینے والا تو ہے، اور دُنیا کا کارخانہ صرف تیرے حکم سے چل رہا ہے!!

اے وہ کہ تیرے جلال و خشیت سے نبی اور رسول لرزاں اور ترساں رہتے تھے، ہم تجھ سے تیرے عفو و کرم اور رحمت کے طالب ہیں، دُنیا میں بھی اور دین میں بھی!

بہ ما منگر، بر کرمِ خویش نگر!!!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم!

ماہر القادری

۲۳/ شوال ۱۳۷۶ھ

(۲۵/ مئی ۱۹۵۷ء)

ترجمہ: مولانا ظفر احمد عثمانی

(البرہان المؤید ملفوظات حضرت سید احمد کبیر احمد رفاعیؒ)

توحیدِ خالص

توحید خالص یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ کرے، کیونکہ وہ یکتا ہے (صمد ہے، سب اُسی کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں) جب تم نے "یا اللہ!" کہا، تو اللہ کو اسم اعظم سے یاد کیا۔ مگر تم اُس کی عظمت و ہیبت سے ہنوز محروم ہو کیونکہ تم نے اپنی شان کے موافق کہا ہے، اس نام کی شان کے موافق نہیں کہا!

اے عزیز! خدا کی قسم قربِ الٰہی میں نہ وصال ہے، نہ جُدائی، نہ حلول ہے نہ انتقال، نہ حرکت ہے نہ سکون، نہ چھونا ہے نہ پاس ہونا، نہ مقابلہ ہے نہ برابری، نہ سامنا ہے نہ مماثلت، نہ ہم شکل ہونا ہے نہ ہم جنس ہونا۔ نہ کوئی جسم ہے نہ کوئی تصور، نہ تاثر ہے نہ تغیر و تبدل، یہ تو سب کی سب تیری صفات ہیں۔ حق سبحانہٗ تیری ان صفات و کیفیات سے منزہ ہے، یہ تو اسی کی بنائی ہوئی ہیں۔ پھر وہ ان کے ذریعہ سے یا ان کے اندر کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے، یہ تو خود اسی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ ان سے ظاہر نہیں ہوا، وہ ان شکلوں، صورتوں، اور معانی سے پاک اور منزہ ہے! نہ وہ ان میں چھپا ہوا ہے نہ ان سے ظاہر ہوا، نہ کسی کا فکر اُس تک پہنچا، نہ کسی کی نظر نے اُس کا احاطہ کیا!

گفتگو کا دائرہ حقیقت کے بیان سے قاصر ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرو۔ اشارہ کے طور پر صفاتِ الٰہی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، یہ محض سمجھانے کے لئے ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان صفات کی جو حقیقت تم سمجھے ہو، اللہ تعالیٰ کی صفات ویسی ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی جاتی ہیں اور جو کچھ اس کی تعریف کی جاتی ہے وہ صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جن کمالات کا مستحق ہے، اُن کو ثابت کیا جائے، اور عیبوں سے اس کو پاک سمجھا جائے مگر درحقیقت وہ جس عظمت کا مستحق ہے، وہ تو علم اور عقل و فہم کے ادراک سے بہت دُور ہے! ولا یحیطون بہ علماً لوگوں کا علم اس کو محیط نہیں ہو سکتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

اے اللہ! میں آپ کی پوری تعریف نہیں کر سکتا، بس آپ ویسے ہی ہیں جیسا آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے!

دوستو! کیا کہا جائے، کیا بیان کیا جائے؟ خدا کی قسم! زبانیں گونگی، عقلیں حیران اور دل سوختہ ہیں، حیرت اور دہشت کے سوا کسی کے پاس کچھ نہیں ہے

دُور بینان بارگاہ الست ! غیر ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست !

در طریقت آنچہ می آید بدست • حیرت اندر حیرت اندر حیرت است!

زدنی فیک تحیرا۔ اے اللہ! اپنے بارے میں میری حیرت کو اور زیادہ کیجئے کہ یہ حیرت ہی مطلوب ہے، جس کو میسّر

نہیں وہ محروم ہے ۔ ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آبِ حیات ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشا!

دوستو! ہم کو ظاہری توحید پر محض رحمت کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ تم دعوتِ توحید کے جھنڈے تلے آجاؤ۔ چونکہ نرمی کرنا مقصود ہے، اس لئے تمہاری ظاہری طاعت اور دعویٔ توحید پر اکتفا کیا گیا، تاکہ تم اُلٹے نہ لوٹ جاؤ! اسی لئے ظاہری دعویٔ توحید کی بناء پر تمہارا نام مسلم رکھ دیا گیا، اس کی حقیقت کا مطالبہ نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تو تمہاری طاقت سے باہر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنانے، پس جب شہادتِ توحید کا تم سے مطالبہ کیا گیا ہے، اسلام سے تمہارا وہی حصہ ہے، اسی سے تم منکرین کے زمرہ سے نکل گئے! اگرچہ ابھی تک حقیقی مومنوں کے زمرہ میں داخل نہیں ہوئے:۔

قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا!

یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، فرما دیجئے تم ایمان نہیں لائے ہاں یوں کہو کہ تابعدار بن گئے!

یہ گمان نہ کرنا کہ کسی کو توحید کی حقیقت کا ادراک ہوگیا ہے۔ بس ہر شخص کی توحید اُس کے درجہ کے موافق ہے، جس کو کشفِ الٰہی سے جتنا حصہ ملا ہے، وہی توحید سے اس کا حصہ ہے۔ ورنہ حقیقتِ توحید کو کون پاسکتا ہے! متناہی غیر متناہی کا احاطہ نہیں کرسکتا! حادث قدیم کا ادراک نہیں کرسکتا۔ بس جو کچھ ہے کشفِ الٰہی کی عطائیں ہیں + اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں نہ کہا جاتا:۔

وقل رب زدنی علما۔

یہ دعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھاتا رہ!

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و معرفت میں برابر ترقی ہوتی رہتی تھی، جب حضورؐ جیسی کامل ہستی بھی برابر ترقی میں ہے، تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے جو یہ دعویٰ کرسکے کہ میں نے قربِ الٰہی کے تمام مراتب اور وصول کے تمام درجات طے کرلئے اور ایسی غایت پر پہنچ گیا ہوں جس کے آگے کوئی درجہ اور مرتبہ نہیں رہا۔ اور یہ تمام گفتگو محض لفظی دلائل اور سمجھانے کے عنوانات ہیں۔ ورنہ جن حقیقت شناسوں کو حقیقت کی کچھ خبر ہے، اُن کے پاس تو وہ براہین اور دلائلِ قطعیہ ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان لفظی دلائل اور متکلمانہ عنوانات کی کچھ ضرورت نہیں، وہ اپنی حقیقتِ حال سے جانتے ہیں کہ اُن کا سرِ طیہ عجز ہے اور انتہا یہ ہے کہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بندہ کے لئے اپنے پروردگار کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچانے۔ جس نے اپنے کو پہچان لیا اُس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا۔ جس نے یہ جان لیا کہ میں خدا کا ہوں (یہ ہے اپنا پہچاننا) وہ اپنا سب کچھ خدا پر قربان کردے گا (یہ ہے خدا کو پہچاننا) جو اپنے نفس سے اور تمام اغیار سے الگ ہوگیا جس نے طبیعت کے کروفر، ساز و سامان، تکبر و عجب پر لات ماردی، وہ جہل کی قید سے چھوٹ گیا اور عارف ہوگیا، معرفت کی حقیقت یہ نہیں کہ اُونی جبہ ہو، سر پر کلاہ ہو، اونچے کپڑے ہوں، بلکہ معرفت یہ ہے کہ خشیت و غم کا جبہ ہو۔ سچائی کا تاج ہو۔ توکل کا لباس ہو۔ اگر ایسا ہو تو بس تم عارف ہوگئے! عارف کا ظاہر شریعت کی چمک سے اور باطن محبتِ الٰہی کی آگ سے خالی نہیں ہوتا۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است! کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است!

وہ حکم کے ساتھ ٹھہر جاتا ہے اور راستے سے ہٹنے نہیں پاتا - اس کا دل وجد کی چنگاریوں پر لوٹتا رہتا ہے، اس کا وجد ہیجان ہے، اس کا سکون یقین ہے (جس کے حاصل کرنے کا طریقہ اتباع سنت اور کثرت ذکر ہے) ذکر اللہ کی پابندی کرو، کیونکہ ذکر وصال کا مقناطیس ہے - قرب کا ذریعہ ہے (اور قرب ہی سے توحید کامل ہوتی ہے) جو اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے اور جو اللہ سے مانوس ہو گیا وہ اللہ تک پہنچ گیا - مگر ذکر اللہ عارفین کی صحبت و برکت سے دل میں جمتا ہے! کیونکہ آدمی اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے (اگر ذاکرین عارفین سے میل جول رکھیگا ذکر و معرفت سے حصہ پائے گا اور غافلوں کی صحبت میں رہے گا، غفلت میں گرفتار رہیگا) اس علم سے کیا فائدہ جس پر عمل نہیں؟ اور اس عمل سے کیا نفع جس میں اخلاص نہیں -؟ اور اخلاص کٹھن راستہ کے کنارہ پر ہے، اب بتا تجھے عمل کے لئے کون اُبھارے گا؟ ریا کے زہر کا جو تیرے اندر بھرا ہوا ہے کون علاج کرے گا؟ اور اخلاص حاصل ہو جانے کے بعد تجھے بے خوف وخطر راستہ کون بتلائے گا؟ جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے،۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون!

امام شافعیؒ نے اُن تمام باتوں کو جو توحید کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں، اپنے اس ارشاد میں جمع کر دیا ہے کہ خالق جل شانہ کے متعلق جس کی معرفت ایسے موجود پر ختم ہو گئی جس تک اس کا ذہن پہنچ سکتا ہے، وہ مشبّہ[1] ہے، اور جس کی معرفت خالص عدم تک پہنچکر ساکن ہو گئی وہ معطّل ہے اور جس کے دل کو ایسے موجود پر قرار ہوا جس کی معرفت سے عاجز ہونے کا دل نے اقرار کر لیا تو یہ موحد ہے!

دوستو! اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے عیوب اور اُن کی جیسی صفات سے پاک سمجھو! اس قسم کی باتوں سے اپنے عقائد کو محفوظ رکھو کہ معاذ اللہ وہ عرش پر اس طرح قرار پکڑے ہوئے ہے، جیسا ایک جسم دوسرے جسم پر قرار پکڑتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کا عرش میں حلول کرنا لازم آتا ہے اور وہ اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی اس کا احاطہ کر سکے، اور مکان

---

[1] مشبّہ وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ پیر اور منہ وغیرہ ہے، ہماری ہی طرح سنتا، دیکھتا، بیٹھتا، کھڑا ہوتا، اُترتا، چڑھتا ہے - معطّل وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے نہ مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے، نہ اُن صفات کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں - بلکہ جن صفات کمال کا ذکر قرآن میں آیا ہے اُن کی تفسیر بھی نفی سے کرتا ہے - مثلاً کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عاجز نہیں - علیم کا مطلب یہ ہے کہ جاہل نہیں، رحیم کا مطلب یہ ہے کہ ظالم نہیں، یہ نہیں مانتا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم و قدرت و رحمت ثابت ہے - موحد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو موجود مانتا اور اُس کے لئے صفات کمال کو ثابت کرتا ہے! مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ بیان کر سکتا ہوں، نہ سمجھ سکتا ہوں، بس دلائل عقلیہ و نقلیہ سے صانع عالم کے وجود اور وحدت اور صفاتِ کمال کا قائل ہوں، اور دلیل سے دُنیا بھر کو قائل کر سکتا ہوں - مگر ذات و صفات کے تعلق کی حقیقت یا کیفیت نہیں بتلا سکتا، کیونکہ انسان خود اپنی حقیقت اور اپنی ذات و صفات کے تعلق کی کیفیت نہیں بتلا سکتا - خدا کی ذات و صفات کی حقیقت تو وہ کیا بتلائے گا؟

مکین کو محیط ہوتا ہی ہے۔"یعنی خدا امکان سے پاک ہے) خبردار! اللہ تعالیٰ کے لئے جہت اور مکان وغیرہ ثابت نہ کرنا۔ نیز اجسام کی طرح اس کے لئے نزول وعروج کے قائل نہ ہونا۔ کتاب وسنت میں اگر کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں، تو اسی کتاب وسنت میں دوسری نصوص بھی موجود ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرح نزول وعروج واستقرار وغیرہ سے پاک ہونا بتلاتی ہیں۔ اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ سلف صالحین کی طرح یوں کہا جائے کہ ہم ان متشابہات کے ظاہر پر ایمان لاتے ہیں اور مراد کے علم کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو جہت اور کیفیت اور مخلوقات کے عیوب سے پاک سمجھتے ہیں۔ ہمارا کام متشابہات کو پڑھ لینا اور خاموش رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو اُن کی تفسیر کا حق نہیں۔ متشابہات کو محکم پر محمول کرنا چاہیئے، کیونکہ کتاب اللہ میں اصل وہی آیات ہیں جو محکم ہیں۔ متشابہ محکم کا معارض نہیں ہوسکتا۔ (محکم وہ آیات ہیں جن کا مطلب واضح ہے۔ اعتقاد اُن ہی کے موافق رکھنا چاہیئے۔ اگر متشابہات ظاہر میں اُن کے خلاف ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ حقیقی مراد اُن کی بھی محکم ہی کے موافق ہے گو ہم نہ سمجھے ہوں، کیونکہ متشابہات کے متعلق خود قرآن کا فیصلہ ہے کہ اُن کی اصلی مراد کو اللہ ہی جانتا ہے!)

استماع الملاهی والجلوس علیها وضرب المزامیر والرقص کلها حرامٌ! (جامع الفتاوٰی)
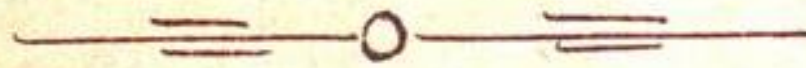
(لہو ولعب سُننا، اور ایسی محفل میں بیٹھنا اور مزامیر کا بجانا اور رقص کرنا، یہ سب باتیں حرام ہیں)

☆

علامہ محمد البشیر الابراہیمی رئیس جمعیۃ العلماء الجزائر
ترجمہ - مولانا محمد عادل قدوسی

اسلامی توحید کی حقیقت

تمام آسمانی مذاہب میں اسلام کو جو امتیازی درجہ حاصل ہے وہ اس کے توحید خالص کے نظریہ کی بناء پر ہے، بلکہ درحقیقت خاتم الانبیاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی سب سے بڑی حکمت ہی توحید خالص کا خدائی پیغام تھا- کیونکہ پچھلے انبیاء کے مذاہب اُن کی زندگی کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتے تھے- اُن کی اُمتیں اُن کے بعد جس طرح چاہتیں اپنی خواہشات کے مطابق نئے نئے عقائد ایجاد کر لیتی تھیں یہاں تک کہ اُن کے انبیاء کی پیش کردہ توحید اُن کے من گھڑت عقائد کے ہجوم میں مغلوب ہو جاتی تھی، اور اُن کی عقلوں پر بُت پرستی چھا جاتی تھی-

یہ امر بدیہی ہے کہ توحید و شرک دو متضاد چیزیں ہیں- جو کبھی ایک انسان کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتیں- اگر اس میں توحید داخل ہو جاتی ہے تو شرک بالکل نکل جاتا ہے- اور اگر شرک داخل ہو جاتا ہے تو توحید بالکلیہ نکل جاتی ہے! سابقہ اُمتوں کا جنہیں حق تعالیٰ نے آسمانی رسالت وہدایت سے نوازا تھا، یہی حال رہا! علیٰ ہذا-

اس دُنیا کے بعض حصوں میں اور باشندگانِ عالم کے بعض فرقوں میں یہ سلسلہ جاری رہا ہے! کہ کبھی کبھی کہیں توحید کی شمع روشن ہو گئی، پھر بُت پرستی کے تصادم سے یہ شمع بجھ گئی ہے! بُت پرستی عوام کے ذہنوں کو جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے، اس لئے کہ وہ اس دُنیا میں قوت وطاقت کے محسوس مظاہر کی عبادت کا نام ہے! اور انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ محسوس طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے! اسی بناء پر شیطان نے آسانی سے انسان کے دماغ میں چاند، سورج نفع بخش جانوروں اور درختوں اور عظیم الشان انسانی ہستیوں کی پرستش کا تصور قائم کر دیا- اور صدیاں گزر گئیں جب سے انسان برابر اس مسئلہ کے متعلق گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سرگردان وحیران چلا آ رہا ہے! کاش وہ اپنی اسی حالت پر مطمئن اور قانع ہو جاتا، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ شکوک واوہام کا شکار رہا ہے! وہ بُت پرستی کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس کے فائدہ بخش یا ضرر رساں ہونے میں متردد بھی رہتا ہے، کیونکہ انسان کا عقلی شعور بالکلیہ فنا نہیں ہوتا ـــ بلکہ خواہشات نفسانی اس پر صرف ایک عارضی پردہ ڈال دیتی ہیں اور کبھی کبھی وہ بیدار اور متنبہ ہوتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ بعض قوموں کے سمجھدار اشخاص نے صرف عقل ہی کے ذریعہ اللہ کی توحید کو سمجھا اور تسلیم کیا ہے!

حق تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ایک ایسی جامع شریعت عطا فرما کر جو انسانوں کے دینی و دُنیوی مفادات اور اُن کے جسمانی و روحانی تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہو، عالم کے تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا- یہ جامع شریعت ہی اسلام ہے- جس کے دو خاص وصف ہیں- ایک یہ کہ وہ ایک جامع و عالمگیر مذہب ہے، دوسرے یہ کہ وہ آنے والے ہر زمانے اور ہر ملک کے ساتھ مطابقت وعمل کی پوری صلاحیت رکھتا ہے!

روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن لے کر آئے اور قرآن وہ خدائی کلام ہے، جس کے کسی سمت سے بھی باطل اُس کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا، یہی وہ مقدس کتاب ہے جو اصولِ اسلام اور شریعت اسلامیہ کی جامع ہے، یہی کتاب دعوت دینے والوں اور اسے تسلیم کرنے والوں سب کے لئے ایک قطعی حجت ہے اور یہی کتاب تمام فرائض و احکام الٰہیہ کے اصول بیان کرنے والی ہے!

پس قرآن ہی اسلام کی کتاب ہے، اور جب تک روئے زمین پر کوئی مسلم باقی ہے، وہ بھی باقی رہے گی، حق تعالیٰ نے اسے فصیح عربی زبان میں نازل فرمایا ہے، تاکہ اولاً اسے یاد کیا جائے پھر اسے سمجھا جائے، اور پھر اس پر عمل کیا جائے! قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص پر یہ تینوں چیزیں لازم ہیں۔ ورنہ بے سمجھے اور بے عمل کئے صرف اس کا یاد کر لینا چنداں مفید نہیں۔ نہ اس سے یاد کرنے والے کا نفس روشن و پاک صاف ہو سکتا ہے، اگرچہ اس کی محض تلاوت بھی داخلِ عبادت ضرور ہے!

علیٰ ہذا، اس پر عمل کئے بغیر صرف اس کا یاد کر لینا اور سمجھ لینا بھی کافی نہیں بلکہ اس طرح اس شخص پر قرآن پر عمل کرنے کی مزید حجت قائم و ثابت ہو جاتی ہے! الحاصل درجۂ کمال یہ ہے کہ بہ یک وقت ان تینوں حقیقتوں کو جمع کر لیا جائے، یعنی قرآن کریم کی تلاوت، اُس میں تدبر و تفکر اور اس پر عمل!

اسلام پورے کا پورا خاص مقاصد و اغراض کا مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ احکام حکمتوں پر مبنی ہیں! قرآن کریم اپنے سمجھنے والے کی تربیت اُن ہی حکمتوں پر فرماتا ہے جس کی بناء پر وہ خود بھی ہدایت پاتا ہے اور دوسرے کی بھی ہدایت کرتا ہے! اور اپنے اعمال کی بنیاد اسلام کے عام مقاصد پر رکھتا ہے اور احکام اسلام کو قرآن کریم کی بیان کردہ حکمتوں پر مبنی قرار دیتا ہے!

یہ امر واضح ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں، جو پانچ مشہور عبادات و فرائض کا مجموعہ ہیں، لیکن یہ ارکان ذاتی و شخصی ہیں۔ یعنی خدا کی طرف سے صرف مکلف کی ذات سے ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے! اگر وہ ان پر عمل نہ کرے تو صرف اُسی کی ذات سے اُن کا محاسبہ کیا جائے گا، اس کے ساتھ کسی دوسرے سے محاسبہ نہ ہوگا۔ بجز اُس سرپرست کے جس نے اس شخص کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کی ہو یا اُسے ترکِ فرائض سے روکنے میں کمی کی ہو!

باقی وہ ارکان جن پر مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت سے اسلام کا مدار ہے۔ وہ چار ہیں:۔

عبادات اور احکام سے متعلقہ عقائد۔ فضائل و آدابِ اسلام

یہ چاروں ارکان اُسی وقت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں، جب پورا اجتماعی معاشرہ ان پر عمل پیرا ہو۔ اور یہ اس کے تمام افراد میں شائع و منتشر ہو جائیں۔ اور سب باہم مل جل کر انھیں آپس میں نافذ کریں۔ جیسے کہ کسی مکان کی تعمیری بندش کے پتھر اُس کی تعمیر و استحکام کا باعث ہوتے ہیں!

ہم اولاً عقائد سے ابتداء کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی اصل بنیاد ہیں۔ جس پر تمام مذکورہ ارکان قائم ہیں۔ پس اگر عقائد درست ہیں تو ارکان بھی درست رہیں گے، اور اگر عقائد میں فساد و خلل برپا ہوا تو ارکان بھی محتاج رہیں گے!

عقیدہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا فرمان اس کی توحید اُس کی ذات میں تمام صفاتِ حسنہ اور کمالات کو مرکوز اور نقائص و عیوب سے اس کے بالکلیہ مبرا سمجھنے کا تصور قلب میں پوری طرح مرتسم و منقش ہو جائے، عقیدہ کے باب میں عقلِ انسانی

کو کچھ دخل نہیں ہے، بلکہ عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قطعی تصریحات قرآنیہ کو سمجھے اور ہر مسئلہ کو اس کی حدود تک محدود رکھے، کیونکہ عقل کا ادراک آنکھ کے ادراک کی طرح محدود ہی ہوتا ہے اگرچہ اس سے کچھ زیادہ وسیع کیوں نہ ہو!

عقائد کے باب میں سب سے بہتر اور محقق حقیقت وہ قطعی نصوص ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اور قرآن کریم نے اللہ کی تمام صفاتِ کمالیہ کو اور عیوب سے اس کی تنزیہ و تقدیس کو وضاحت سے بیان فرما دیا ہے! اور اس صراحت کے بعد پھر ہمیں کسی اور چیز کا مکلف نہیں فرمایا۔ اور نہ کسی ایسی مخفی حقیقت کا مکلف فرمایا ہے جو ہماری عقول کی رسائی سے بالاتر ہو۔ بلکہ اپنے وجود کو پہچاننے کے لئے فطری طریقے بتائے ہیں، جن میں سب سے اہم طریقہ یہ ہے کہ موجوداتِ عالم کے وجود سے اس کے موجد اور مخلوقات کے وجود سے اس کے خالق کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے، جس نے قرآن کے اس طرز استدلال کو اختیار کیا، وہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت اس کی توحید خالص، آفرینشِ عالم، رزق رسانی، عدم سے وجود میں لانے اور موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنے میں اس کی انفرادیت کے عقیدہ میں اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ گیا اور یہی توحید کا کمال ہے!

ایک محتاط مومن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ کو ایسا ہی ایک مانے جیسا کہ اس نے خود قرآن کریم میں اپنی توحید بیان فرمائی ہے، اس میں زیادتی کرے نہ کمی، کیونکہ اس باب میں کمی بیشی سب یکساں ہے! اور جتنا قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اس پر قائم رہنا ہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے!

معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف انسانی عقل توحید کی اصل حقیقت تک اس کی رسائی کے لئے بالکل ناکافی ہے توحید کے مسئلہ میں اصل بنیاد اور مرجع صرف نقل ہے، اور نقل حق تعالیٰ کا قطعی و یقینی کلام ہے، اس مسئلہ اور تمام غیبی امور میں عقل کا کام صرف صحیح فہم اور صحیح نظر ہے اور بس کیونکہ عقل کا ادراک محدود ہے! وہ اپنی قوتِ ادراک کی اس قوت سے جو خدا نے اسے عطا فرمائی ہے تجاوز نہیں کر سکتی، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان نازک امور کو بتانے کے لئے انبیاء کرام کو امتوں کی طرف بھیجا، اگر رسول نہ بھیجے جاتے تو اس ذی عقل بنی نوع انسان پر حجت بھی قائم نہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور کتب سماوی کے ہمارے پاس بھیجے جانے سے ہم پر اللہ پر ایمان لانا حجت ہو گیا!

بیشک بعض اقوام مثلاً یونان کے حکماء فلاسفہ نے امور ما بعد الطبیعہ کی تحقیق کی ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس عجیب و غریب منظم و مرتب عالم کے خالق کے وجود کے قائل ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جیسا چاہیئے تھا اس کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اور وہ ہستی جس قدر و منزلت کی مستحق تھی، اس کا احساس نہ کر سکے، اور اس خالق کو جن اوصاف کمال سے متصف کرنا اور جن نقائص و عیوب سے مبرا کرنا ضروری تھا وہ اس حد تک نہ جا سکے۔ کیونکہ ان کی عقلیں انتہائی تیزی اور تموّج کے باوجود اس درجہ تک نہ پہنچ سکیں۔ بلکہ صرف توحید کے حقائق کے ارد گرد گھومتی رہیں۔ اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وہ توحیدِ الٰہی جس تک بغیر آسمانی وحی کی ہدایت کے محض عقل کی رسائی ہوتی ہے، وہ شرک کی بعض مخفی اقسام سے ملوث رہتی ہے، جسے محض انسانی عقلیں توحید خالص سے جدا نہیں کر سکتیں!

قرآن کریم کی بیان کردہ توحید کی دو قسمیں ہیں۔ توحید الوہیت اور توحید ربوبیت۔ پہلی قسم کا مفہوم یہ ہے کہ

اس امر کو دل سے تسلیم کرنا کہ تخلیق عالم، رزقِ کائنات، ان کے زندہ کرنے اور فنا کرنے، اور اپنی حکمت، اپنے منشا اور اپنے علم کے اقتضاء کے مطابق اس تمام کائنات میں مطلق و مکمل تصرّف کا حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو حاصل ہے —!

دُوسری قسم کا منشا یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے اور کسی کو واجب و فرض بتانے کے احکام کے قانون بیان کرنے کا حق صرف اسی ذاتِ مطلق کو خلق، امر اور حکم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو سزاوار ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:—

قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَلَالًا وَّحَرَامًا۔
قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ!

اے محمدؐ! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اللہ نے تم پر جو رزق اُتارا ہے تم نے خود ہی اُسے حلال و حرام بنا لیا۔ اُنھیں خبردار کر دیجئے کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم از خود اللہ پر بہتان تراشتے ہو!

توحید کی اس قسم میں اس اُمت میں سے بہتوں کے قدم ڈگمگا گئے اور اُن کی عقلیں بھٹک گئیں، پس وہ کسی صریح آیت قرآنی یا صحیح حدیث نبوی سے دلیل حاصل کئے بغیر اپنی طرف سے حلت و حرمت میں تساہل برتنے لگے۔ ہم نے حدیث نبوی کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کی اجازت سے شارع قرار پائے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کی صراحت فرمائی ہے:—

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، بلکہ آپؐ کا ہر ارشاد وحی الٰہی ہوتا ہے جو آپؐ پر الہام کیا جاتا ہے!

ایک دُوسری نوعیت سے توحید کی تین قسمیں ہیں:—

توحیدِ ذات — توحیدِ صفات — توحیدِ افعال۔

پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے۔ کوئی مخلوق اس کے مشابہ ہے، نہ اس کے شریک ہے، نہ اس کے مانند۔ ہے، وہ بجائے ایک کے دو ہونے سے بھی ایسا ہی پاک ہے جیسا کہ اپنے مثل و شبیہ اور شریک سے منزہ ہے۔ وہ اپنی ان صفات میں بھی یکتا ہے جو اس نے اپنے لئے بیان فرمائی ہیں۔ اور جو اس کی ذات کی قدامت کے ساتھ ساتھ دائمی و ابدی ہیں۔ اُنھیں ہم بالکل ایسا ہی تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ اُس نے خود وضاحت فرمائی ہے! کیونکہ اُن کی حقیقت اس کے حدِ بیان و وضاحت سے تجاوز نہیں کر سکتی اور وہ حقیقت جو ایک حد میں منحصر کر دی گئی ہو، عقل انسانی کی اس میں کمی یا بیشی کے تصرّف کا ہرگز اختیار نہیں!

مثلاً حق تعالیٰ فرماتا ہے:—

صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَة

اللہ کا رنگ ہو اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے!

اس میں ہمیں قرآن کریم میں وارد ہونے والے جملوں پر ہی حصر کرنا چاہیئے۔ اس میں مزید تصرف کر کے لفظ

"صبغہ" (رنگ) سے "صابغ" اسم فاعل (رنگنے والا) بنا کر اللہ پر اپنی طرف سے اس کا اطلاق نہیں کرنا چاہیئے!

نیز حق تعالیٰ اپنے افعال میں منفرد اور یکتا ہے، پس کائناتِ ارضی و سماوی میں جو عمل بھی ہوتا ہے جس میں سے بعض ہمارے علم میں ہوتے ہیں بعض نہیں، اس کے متعلق ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ ان تمام حاضر و غائب ہونے والے امور میں یکتا و منفرد مطلق ہے اس تصرف و عمل میں اُسے کسی شریک و مددگار کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی!

مذکورہ تیسری قسم ہی وہ قسم ہے جس میں بہت سے مسلمان گمراہ ہوگئے ہیں، چنانچہ ہم انہیں اللہ کے ساتھ مخصوص افعال کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مثلاً بارش برسانا، بعض مخلوقات کو رزق کی بعض خاص اقسام پہنچانا۔ بعض مخلوقات پر بعض خاص مصائب و امراض نازل کرنا۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو کمزور عقیدہ والوں کے دلوں میں شرک کو راہ دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام مشتبہ و مشکوک امور سے حق تعالیٰ کو بالکلیہ پاک و منزہ سمجھنے اور کائنات میں ہر ہونے والے امر کو اس کائنات کے صرف مالکِ حقیقی ہی کی طرف منسوب کرنے سے اللہ کی توحید مکمل، خالص اور پاک صاف ہوسکتی ہے، کہ حق تعالیٰ اس کی طرف انسانوں کی غیر توحیدی نسبتوں سے کہیں بلند و بالاتر اور منزّہ ہے! رہا بندوں کے افعال کا اُن کی ذات سے منسوب کیا جانا، سو یہ نسبت بندوں کے ان اعمال کے مکلف ہونے کی حیثیت سے ہے!

الغرض توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان الوہیت کی خصوصیتوں کو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کی ذات کے لئے ثابت اور تنہا اسے ہی ان خصائص سے متصف ماننے پر ایسا ٹھوس اعتقاد رکھے جس کی ایک صحیح نظر اور خالص غیر تقلیدی ایمان تائید کرے! تمام عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر اللہ، دعا، الوہیت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ دعا بذاتِ خود ایک مستقل عبادت، یا یوں کہیئے کہ عبادت کا مغز ہے، جیساکہ حدیث شریف میں بیان فرمایا گیا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ کسی بھلائی کے حصول یا برائی کے دفعیہ کے لئے جو بھی دعا کی جائے وہ صرف خدا ہی سے کی جائے!

یہی خدا کا دروازہ وہ دروازہ ہے جس سے لوگوں میں غیر شعوری طور پر شرک داخل ہوگیا۔ چنانچہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں سے بھی طالبِ دعا ہوتے تھے، یا اللہ کو ترک کرکے دوسرے نئے معبود کو مانتے تھے، چنانچہ قرآن کریم کی کثیر آیات میں ان ہی پر لعنت ملامت کی گئی ہے، جب اسلام آیا اور قرآن کریم نے بندوں پر خدا کے اس حق کی صراحت کردی کہ وہ صرف اسی ایک ذات کو واحد مانیں، تو اُس وقت سے شرک کی تمام قسمیں فنا ہوگئیں۔ ان ہی میں شرک فی الدعاء بھی شامل ہے۔ اُسی وقت سے ایمان والوں کی عقلوں پر خالص توحید کا غلبہ ہوگیا! چنانچہ وہ کسی مضرت کے دفعیہ یا بھلائی کی طلب کے لئے صرف اپنے ایک خدا ہی سے مدد طلب کرنے لگے، اسی طرح آیت ذیل میں حق تعالیٰ کی بتائی ہوئی تہذیب کے مطابق وہ تمام عبادتوں میں توحید کامل کا احترام ملحوظ رکھنے لگے:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ!

اے محمدؐ! آپ اعلان کردیجیئے کہ میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت سب کچھ صرف جہانوں کے پروردگار (خدائے واحد) ہی کے لئے ہے۔ جس کا کوئی دوسرا شریک نہیں، مجھے خدا کی طرف سے اسی عقیدہ کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں!

بعد میں جونہی مسلمان قرآنی ہدایات سے دُور ہوتے چلے گئے اور قرآن و حدیث کے سمجھنے سے دُوری اور اُن پر عمل ترک

کر دینے کی بناء پر گمراہی کے سوتے اُن کے عقائد میں خلط ملط ہوتے چلے گئے، اسی دعا کے دروازہ سے اُن میں بتدریج شرک بھی داخل ہوتا چلا گیا - اور وہ اللہ کے ساتھ اُس کی بعض مخلوق کو بھی پکارنے لگے، جو اپنی ذات کے نفع نقصان تک پر قادر نہ تھے، چہ جائیکہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے، یا اُن سے دفع ضرر کر سکتے!

حالانکہ دعا کی آیات میں پیہم اس کا ذکر ہے کہ دعا خاص اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں اس کی مخلوق میں سے کسی کو بھی اس کا شریک بنانا کسی طرح جائز نہیں ہے، آیات ذیل اس پر روشنی ڈالتی ہے:-

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا -

بلاشبہ مسجدیں صرف خدا ہی کو پکارنے کے لئے ہیں، اس لئے اُن میں خدا کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ پکارو!

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ -

اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں -

ایک جگہ ارشاد ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ، ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ!

اللہ کو چھوڑ کر جن دوسروں سے لوگ مانگتے ہیں، بلاشبہ وہ سب ملکر بھی صرف ایک مکھی تک کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور اگر اُن سے کوئی مکھی کوئی چیز لے اڑے تو وہ اس سے اسے چھین بھی نہیں سکتے، ایسے طالب دعا اور ان کے مطلوب و معبود دونوں انتہائی کمزور و بے بس ہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے:-

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ، لَهُ الْمُلْكُ، وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ - اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ -

یہی خدا تمہارا پروردگار ہے، اسی کی تمام حکومت ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسرے معبودوں کو تم پکارتے ہو، وہ کسی ادنیٰ چیز کے بھی مالک نہیں ہیں، اگر تم اُنھیں پکارتے ہو تو وہ تمہاری پکار تک نہیں سُنتے اور بالفرض اگر سُن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے، پھر قیامت کے دن یہی معبودانِ باطل صاف انکار کر دیں گے کہ ہم ان اپنی پرستش والوں کے شرک سے بری الذمہ ہیں ——!

اس باب میں بکثرت آیات قرآنی وارد ہوئی ہیں - اور وہ سب یہ بتاتی ہیں کہ دعا خالص عبادت ہے اور جس سے تم نے اپنی مراد مانگی، اس کی پرستش کی اور مومن صرف اپنے خالق ہی کی پرستش کرتا ہے!

اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ (اصطلاح اسلام میں) دعا صرف اس بھلائی کی طلب کے لئے ہوتی ہے جسے کوئی مخلوق

نہ دے سکتی ہو۔ یا کسی ایسے شر کو دفع کرنے کے لئے ہوتی ہے جسے مخلوق دفع نہ کر سکتی ہو۔ خواہ یہ مخلوق کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی مخلوق کو جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ جسمانی طاقت، وافر عقل، کثیر مال وجاہ، کثیر لشکر اور مددگار عطا کئے گئے ہوں، پھر بھی یہ مخلوق اپنی بیماری یا موت کو نہیں ٹال سکتی، نہ کسی ایک بچہ تک کو پیدا کر سکتی ہے! تو بھلا وہ دوسرے کو کیسے فائدہ پہنچا سکتی ہے!

باقی انسان جو باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، وہ عالم اسباب تک محدود رہتی ہے، اور وہ خدا کی طرف سے مال یا اقتدار وغیرہ جیسی جن نعمتوں کے خود مالک بن گئے ہوں، صرف اُن میں ایک دُوسرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ جیسے کہ دولتمند فقیر کو مال دے دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس مال کا مالک ہوتا اور اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ رہے عالم اسباب کی گرفت سے باہر جو نعمتیں ہیں، اُن میں صرف خدائے واحد ویکتا ہی تصرف فرما سکتا ہے، دوسرا کوئی نہیں۔

الوہیت کے خصائص میں سے مطلق علم غیب بھی ہے، پس اس غیب مطلق کو صرف خدا ہی جانتا ہے، جیسے جنت دوزخ ہماری نسبت سے غیب ہے اور جیسے فرشتگان وشیاطین کے عالم۔ روح کی حقیقت اور بہت سے وہ حقائق، جن کی طرف آیاتِ قرآنی اور احادیث نے اشارہ کیا ہے اور جو موت کے بعد پیش آنے والے ہیں، سب کے سب غیبِ مطلق ہیں۔ انسانی عقل ان کی پوری حقیقت یا اُن کے جزو تک بھی نہیں پہنچ سکتی! کیونکہ یہ حقائق اس جنس سے ہی بالا ہیں جن کا عقل ادراک کر سکتی، یا انھیں سمجھ سکتی ہے!

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

خدا ہی عالم غیب ہے، اس کے غیب پر کوئی دُوسرا مطلع نہیں ہو سکتا، بجز اُن خاص رسولوں کے جن سے راضی ہو کر خدا نے انھیں کچھ علم عطا فرما دیا ہو!

دُوسری جگہ ارشاد ہے:۔

عالِمُ الغیب والشھادہ ــــ خدا ہی مغیبات وموجودات کا جاننے والا ہے!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا اللہ ــــ غیب پر بجز خدا کے کوئی دوسرا مطلع نہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَیَعْلَمُ الْغَیْبَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ!

خدا ہی غیب کو جانتا ہے، وہی واقف ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے، کوئی دوسرا متنفس یہ نہیں جانتا کہ وہ خود کل کیا کام کرے گا۔ اور جس جگہ مرے گا!

بیشک بعض قرآنی آیات یہ بتاتی ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے بعض رسولوں کو اپنی بلیغ حکمت ومصلحت کے تحت بعض غیبی باتوں کی اطلاع دے دیتا ہے، لیکن بعض ناواقف لوگ جن کی عقلیں نور قرآنی سے منور نہیں ہو سکیں، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام غیبی امور پر مطلع تھے، لیکن وہ قرآن جس کی سمجھ سے وہ محروم کر دیئے گئے ہیں۔

علی الاعلان ان کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ اپنے نبی کریم کو ادب سکھاتے ہوئے یہ تعلیم فرماتا ہے:۔

قُلْ لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ!

اے محمدؐ! صاف صاف کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں خدا جو چاہے صرف وہی ہو سکتا ہے!

وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ، اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ۔

اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بکثرت بھلائی ہی بھلائی حاصل کر لیتا، کوئی نقصان رساں بات مجھے پیش ہی نہ آتی، میں تو صرف (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں اور بس!

دوسری جگہ یہ تعلیم دی گئی ہے:۔

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ، وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔

اے محمدؐ! کہہ دیجئے کہ اے اہلِ قوم! میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب ہی جانتا ہوں۔ اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، میں تو صرف اپنی طرف نازل ہونے والی وحی کا اتباع کرتا ہوں اور بس!

یہ نادان لوگ جو دین میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کرنے کی مصیبت میں مبتلا ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کا یہ بدعتی باطل عقیدہ مقامِ نبوّت کی تکمیل ہے، بھلا کبھی باطل بھی حق کی تکمیل ہوا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَہْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔

حق کو چھوڑ کر دین میں غلو مت کرو۔ اور اس قوم والوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو اس سے قبل گمراہ ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے دوسرے بہتوں کو بھی گمراہ کر دیا اور اس طرح راہ مستقیم سے بھٹک گئے ـــــ!

درحقیقت مومن کا ایمان اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوتا، جب تک وہ الوہیت اور نبوّت کے مقامات میں امتیاز نہ کرے اور ہر مقام کو کسی کمی بیشی کے بغیر اس کی جائز و مناسب عظمت و جلال کا درجہ نہ دے اور ہر دو مقامات کے درمیان حدِ فاصل کو متعین کرنے کے لئے جو لفظ شرعی وارد ہیں صرف انہی پر اکتفا کرکے ان سے آگے نہ بڑھے! ذیل کی آیت میں ان ہر دو مقامات کے فرق کو واضح کیا گیا ہے:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔

اے محمدؐ! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تم ہی جیسا ایک بشر ہوں صرف میری طرف (خدا کی طرف سے) وحی بھیجی جاتی ہے!

دوسری آیت وہ ہے کہ جب کفارِ قریش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجز کرنا چاہا اور اپنے ایمان لانے کو اس شرط پر محول کر دیا کہ یہ سفیہ لوگ آپؐ سے جو غیر طبعی معجزات چلتے ہیں، آپ وہ انھیں دکھا دیں، تو حق تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا

کہ انھیں درج ذیل جواب دے کر اُن کے اس باطل ارادہ کو ختم کر دیں ـــــ !

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا -

اے محمدؐ ! معجزہ کا مطالبہ کرنے والے ان کفار سے کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار پاک و منزہ ہے اور میں صرف ایک بشر اور خدا کے قاصد کے سوا اور کچھ نہیں ـــ !

الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک "قسم" بھی ہے - پس اسلام میں شرعی قسم وہ ہے جو حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ اور اس کی صفاتِ عالیہ پر کھائی جائے، کیونکہ حق تعالیٰ نے اسلام میں قسم کو انسانی حقوق کو متعین کرنے والی اور اُن کے باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والی بتایا ہے ! اس لئے یہ لازمی ہے کہ قسم صرف خدا ہی کے نام کی ہو، کیونکہ کوئی دو جھگڑنے والے خواہ باہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں، بہرحال اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کی قابلِ احترام حقیقتوں کی تعظیم میں ہرگز اختلاف نہیں رکھتے، اگر کہیں اسلام انھیں ان کی نظر میں قابلِ عظمت موجودات کی قسم کھانے کو جائز قرار دے دیتا تو یہ بجائے کسی صلح کے مزید جھگڑوں کا باعث بن جاتا - کیونکہ وہ کسی ایک باعظمت چیز پر کبھی متفق نہ ہو سکتے ! کیونکہ ہر فریق کے نزدیک ایک جدا ہی قابلِ عظمت ہستی ہوتی جسے وہ فریق ثانی کی اختیار کردہ ہستی پر ترجیح دیتا - اس طرح یہ فتنہ اور اختلاف دائمی شکل اختیار کر لیتا - چنانچہ صحیح حدیث میں اپنے بزرگوں کے نام پر قسم کھانے کی ممانعت آئی ہے !

ارشادِ نبویؐ ہے :-

مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ ـــــ جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر قسم کھائی اُس نے کفر کا عمل کیا !

ایک دوسری صحیح حدیث میں وارد ہے :-

مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ أَوْ لِيَصْمُتْ

اگر کسی کو قسم کھانی ہو تو وہ صرف خدا کے نام کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے !

الوہیت کی خصوصیات میں سے جانوروں کے وہ ذبیحے بھی ہیں، جو بطور عبادت خدا کے لئے ذبح کئے جائیں، جیسا کہ وہ ذبیحے جسے حاجی منیٰ یا مکہ میں تقربِ خداوندی کے لئے ذبح کرتے ہیں - یا وہ شرعی نذریں جنہیں مسلمان کسی بیمار کی شفایابی یا گم شدہ کی واپسی کے لئے مان لیتے ہیں - پس یہ سب کی سب صرف خدا کے لئے ہوتی ہیں - تاکہ محتاج فقراء اُن سے مستفید ہوں - عرب زمانہ جاہلیت میں جانوروں کے خون، مذکورہ اغراض کے تحت، اپنے بُتوں اور دیوتاؤں کے تقرب کی غرض سے اُن کے نام پر بہاتے تھے ! مگر اسلام نے اسے حرام اور شرک قرار دے دیا - حق تعالیٰ کے اس ارشاد :-

وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ - ـــــ اور وہ جانور جنہیں غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو !

سے یہی مقصود ہے - امتدادِ زمانہ سے بت پرستی کی رسمیں پھر لوٹ آئیں - اور بعید تاویلات کے غلافوں میں لپٹی ہوئی پھر مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو گئیں - یہاں تک کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ذبیحے کرنے لگے اور اسے ان اولیاء کے تقرب کا ذریعہ سمجھنے لگے - اور انھیں اس کا علم و احساس تک نہ رہا کہ ان کا یہ ذبیحہ بھی غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبیحہ کی قسم میں داخل ہے - اور اگرچہ اسے بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا ہو، پھر بھی اس غیر اسلامی نیت کی وجہ سے اس ذبیحہ کا کھانا بھی جائز نہیں ہے - کیونکہ بسم اللہ کا نمبر اولاً عقیدہ کی درستی کے بعد آتا ہے اور نفر باقی اور عبادتی ذبیحہ صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے ! نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

إِنَّمَا الاعمالُ بالنیاتِ ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کا دارومدار قلبی نیتوں پر ہوتا ہے!

ذبیحہ کی یہ قسم خالص اللہ کے لئے نہیں ہے، جیسا کہ ہمیں عوام وجہال کے افعال سے اس کا بخوبی علم ہو چکا ہے، نبی کریم علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے فرماتے ہیں:-

انا اغنی الشرکاء عن الشرک ـــــ میں الوہیت کے شرکا سے بہت بے نیاز ہوں!

مسلمانوں میں یہ بلا اُن کے دین کے حقائق سے ناواقفیت اور قرآنی ہدایت سے دُوری کی بناء پر داخل ہو گئی۔ حالانکہ اسلام پورا کا پورا ایک مذہب ہے، اس کے الگ الگ حصے بخرے نہیں ہو سکتے! پس کامل مسلمان وہی ہے جو بیان کردہ وصف کے مطابق اولاً اللہ کی خالص توحید کو مانتا اور اپنے عقیدے میں ہر گمراہی سے بچتا ہو، پھر مسنون و شرعی طریقہ پر اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور بدعتوں سے محترز رہتا ہو۔ کیونکہ سب بدعات بالکلیہ گمراہی ہیں۔ صحیح حدیث میں وارد ہے:-

وَکُلُّ محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ

دین میں ہر نئی بات کا اضافہ بدعت کہلاتا ہے اور ہر بدعت عین گمراہی ہے!

پھر عبادات کے بعد اللہ کے دیگر احکام کی خود بھی پابندی کرے اور حتی الوسع سعی کر کے دوسروں سے بھی پابندی کرائے۔ پھر تمام اسلامی صفات سے خود کو آراستہ کرے اور دوسروں کو بھی اس طرف بلائے، اور انھیں اس کے خلاف سے روکے۔ حق گوئی میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا مطلق خیال نہ کرے، پھر اس تمام پروگرام میں بھی شرط یہ ہے کہ اس کے یہ تمام افعال خاص خدا ہی کے لئے ہوں!

اب یہ شخص کامل مسلمان اور قرآن کریم کی صراحت کردہ صفات کا جامع مومن صادق کہلائے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں مذکور ہے:-

الٓمٓ - ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین - الخ

یہ وہ کتاب ہے جس کی صداقت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہی متقیوں کی رہنما ہے۔

لَیْسَ البرّ ان تولّوا وُجوھکم قبَلَ المشرق والمغرب ولٰکن البرّ من آمنَ باللہ والیوم الآخر!

بھلائی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت میں مشرق ومغرب کی طرف اپنا منہ پھراؤ، بلکہ بھلائی یہ ہے کہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاؤ!

اِنَّمَا المؤمنون الَّذِینَ اِذا ذکراللہ وجلت قلوبھم وَاِذا تُلیتْ علیھم آیاتہ زَادتھُمْ ایماناً!

بیشک مومن وہ ہیں کہ جب (اُن کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل اس کے خوف سے کانپ اُٹھیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو اُن کے ایمان میں اضافہ ہو جائے!

وعبادُ الرحمان الَّذِینَ یمشون علَی الارض ھونا وَاِذا خَاطبھم الجاھلون قالوا سَلامًا وَالَّذِینَ یبیتون لِرَبِّھِمْ سُجّدًا وقیامًا ـــــ!

اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور اگر جاہل لوگ کبھی انہیں بُری طرح
مخاطب کریں تو وہ جواب میں اُن کے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں ! اور جو خدا کی عبادت
میں راتیں گزارتے ہیں — !

یہ آیتیں ان ایمانی شعبوں پر مشتمل ہیں جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

الایمان بضع وسبعون شعبۃ اعلاھا لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی
عن الطریق - والحیاء شعبۃ من الایمان -

ایمان کے ستر سے کچھ اُوپر شعبے ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے
ادنیٰ راستہ سے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے ! اور حیا بھی ایمان کا ایک جزو ہے -

صحابہ کرام رضی جو ایمان باللہ اور توحید خالص کے اعتبار سے اُمتِ محمدیہ میں کامل مومن تھے، اپنے خدا کو قرآنی توحید
کے مطابق ایک مانتے تھے ، یہی حال تابعین اور تبع تابعین کا رہا - لیکن جب سے ہم میں یونانی فلسفہ اور اس کے عقلی
استدلالات نے دخل پایا ، مسلم علماء بھی اس فلسفہ سے متأثر ہو گئے ! اور وجود باری تعالیٰ پر فلسفیانہ طریق سے
استدلال کرنے لگے ، حتیٰ کہ جمہور یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کی معرفت کے لئے صحیح طریق استدلال یہی ہے اور جس قدر
مسلمان اس فلسفہ میں منہمک ہوتے چلے گئے ، اسی قدر قرآن کی بتائی ہوئی توحید سے دُور ہوتے چلے گئے !
مسلمانوں میں آج جو عقائد کی کتابیں رائج ہیں اُن میں سے اکثر اسی فلسفہ کے قواعد پر مبنی ہیں - اللہ کی اس سادہ
فطرت پر مبنی نہیں جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے !

ان کتابوں کے اثر سے توحید ان چند فلسفی اصطلاحات والفاظ کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے، جو اس مقصد کے لئے
وضع کئے گئے ہیں اور جنہیں تین قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے :-

۱- وہ جن کا انتساب اللہ کی طرف واجب ہے !
۲- وہ جن کا انتساب ناممکن ہے !
۳- وہ جن کا انتساب جائز ہے !

اس طرح یہ فلسفی توحید صرف لفظی توحید ہو کر رہ گئی ہے - لیکن توحید کی وہ روح اور اس کی وہ بلند حقیقت جسے قرآن
کریم نے بیان کیا ہے، ایمان اور عملِ صالح کے ثمرات صرف اسی سے مرتب ہوتے ہیں -

والعصر اِنَّ الانسان لفی خسر اِلَّا الذین آمنوا وعملوا الصالحاتِ وتواصوا
بالحق وتواصوا بالصبر -

زمانہ کی قسم ہے کہ بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے بامراد و کامران صرف وہی ہوں گے جو
ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو امر حق اور اعلاءِ
کلمۃ اللہ میں تکالیف پر صبر کرنے کی تلقین کی -!

☆

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

توحید

انسان سراپا احتیاج، مجسم صورتِ سوال اور ہمہ تن کاسۂ گدائی ہے! اس کی ضرورتیں بے پایاں اور گویا غیر محدود ہیں اس کے جسمانی اور روحانی مطالبے اور تقاضے حد سے بڑھے ہوئے، اس کی فطرت حریص اور غیر قانع ہے، اس لئے وہ کسی ایسی ہستی کے سہارے نہیں جی سکتا، جس کی طاقت و اختیار، جس کی بخشش ورزاقی، جس کی اطلاع وواقفیت، خواہ وہ کتنی وسیع ہو، لیکن محدود ہے!

انسان اپنی فطرت میں شیشہ سے زیادہ نازک اور حباب سے زیادہ کمزور ہے، وہ اپنے وجود و بقا کے لئے صدہا چیزوں کا محتاج ہے اور اس عالم میں ہزاروں موجودات اس کی زندگی کے دشمن ہیں - اس کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جو کائنات پر فرمانروائی کرتا ہو، عناصر پر جس کا قبضہ ہو، اشیاء کے خواص و اثرات اس کی مٹھی میں ہوں - وہ ان کا پیدا کرنے والا بھی ہو - اُن کو نظم و ضبط میں رکھنے والا بھی ہو - اور اُن کو سلب کر لینے، تبدیل کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہو - اُس کے دستِ قدرت میں کبھی رعشہ اور اُس کے پایۂ حکومت میں کبھی لغزش و اضطراب نہ ہو - کہ ایک خفیف ارتعاش اور ایک ادنیٰ لغزش و اضطراب آفاق وانفس کی اس کارگہ شیشہ گری کو برباد اور اضداد و منافقات کے اس کارخانہ کو ٹکرا کر درہم برہم کر سکتا ہے! اس کا علم حاضر اور محیط ہو - وہ ہمہ وقت ہوشیار و بیدار ہو - سہو ونسیان غفلت اور نیند کا خمار کبھی کبھی اس کے پاس نہ آ سکے! کہ مخلوقات بے شمار اور اُن کی ضرورتیں بے حد و حساب اور ایسی مخفی ہیں کہ اُن کو خود خبر نہیں، وہ طفلِ شیر خوار سے زیادہ پرورش و نگرانی کا محتاج اور محبت و شفقت کا مستحق ہے اس کو ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے جو ماں باپ سے زیادہ شفیق ہو - لیکن اُس کی شفقت میں رحمت و حکمت دونوں ہوں کہ اس کی تربیت کے لئے دونوں ناگزیر ہیں — !

اگرچہ اس عالم خارجی و داخلی (آفاق و انفس) میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہستی سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔ اور آفاق و انفس کی بکثرت نشانیاں اور دلائل اس حقیقت کی طرف رہبری کرتے ہیں - جیسا کہ خود فرمایا :—

> سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق ط اولم یکف بربک انہ علی کل شیئ شہید (حم السجدہ ع ۶)

ہم اُن کو اپنے نمونے دکھائیں گے دنیا میں اور خود اُن کی جانوں میں یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت کھل جائے کہ وہ حق ہے - کیا تمہارا رب ہر چیز پر گواہ ہونے کے لئے کافی نہیں - اس لئے عبادت و بندگی کی مستحق اُسی کی ذات ہے!

لیکن اس عالم میں موہوم نفع وضرر کا چشمۂ سراب اس طرح متموّج ہے کہ انسان کی نظر بار بار دھوکا کھاتی ہے! اور اپنی جیسی صدہا مجبور وبے اختیار ہستیوں کو نافع وضار اور قادر ومختار سمجھ کر اپنا الٰہ ومعبود بنا لیتا ہے اور یہ طلسم بعض اوقات زندگی بھر نہیں ٹوٹتا ـــ!

اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اُن کی اپنی ذات وصفات کا سب سے بڑا اور یقینی علم بخشا۔ اور اس عالم کی حقیقت اُن پر اس طرح منکشف کی کہ اُن کو اس کے متعلق کبھی دھوکا نہیں ہو سکتا۔

وکذٰلک نُرِیۡ ابراھیم ملکوت السمٰوات والارض ولیکون من الموقنین۔ (الانعام۔ ۹)

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا جلوہ دکھلاتے ہیں اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں!

ان انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ ایک ہی پیغام دے کر بھیجا گیا:۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحیٓ الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔ (الانبیاء۔ ۲)

اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اس طلسم نظر کو توڑنے کے لئے (جس میں ہر زمانہ کے کوتاہ نظر گرفتار ہو جاتے ہیں) دو طریقے اختیار کئے:۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بار بار بیان کیا کہ شرک وجہل کے زہر کے لئے اس سے بڑھ کر تریاق نہیں۔ شرک، جہل، خدا سے بیگانگی اور غیر اللہ کی گرفتاری ومشغولی کا اصل سبب، خدا شناسی، اس کی صفات وافعال سے بے خبری، یا غفلت ہے، اسی لئے فرمایا:۔

وَمَا قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعا قبضتہ یوم القیٰمۃ والسمٰوات مطویٰت بیمینہ ط سبحٰنہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ (الزمر۔ ۷)

اور وہ نہیں سمجھے اللہ کو جتنا کچھ وہ ہے اور زمین ساری مٹھی میں ہے اس کی قیامت کے دن اور آسمان لپیٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے کہ اُس کا شریک بتلاتے ہیں!

(۲) اللہ کے سوا تمام ہستیوں اور مخلوقات کی اصل حقیقت اور اُن کی صحیح حیثیت بیان کر دی تاکہ نگاہ سے پردہ ہٹ جائے اور روشنی میں دیکھ لیا جائے کہ وہ در اصل کیا ہیں اور کسی کے لئے اور خود اپنے لئے وہ کس حد تک مفید وکارآمد ہو سکتے ہیں اور اُن کے ساتھ عبودیت وبندگی کا معاملہ، اُن سے نفع وضرر وکاربرآری کی توقع، اُن کی حمایت وسرپرستی پر بھروسہ، اُن کے علم وآگاہی پر اعتماد اور اُن کے سہارے جینا کہاں تک درست اور قرینِ عقل ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کے سلسلہ میں ان حضرات نے بڑی اصولی اور انقلاب انگیز باتیں کہیں جن سے زندگی کا رُخ اور ذہن وقلب کی سمت بدل جاتی ہے۔ مثلاً وہ صمد ہے، یعنی تمام کائنات اور عالم کا ہر ذرّہ اپنے وجود ومتعلقاتِ وجود میں اس کا محتاج ہے اور وہ قطعاً کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں۔ خلق وپیدائش کے سوا دُنیا کا یہ پورا کارخانہ ہی وہی تنہا

چلا رہا ہے اور آسمان سے لے کر زمین تک اُسی کی حکومت اور اسی کا انتظام ہے۔ الا له الخلق والامر۔ (اعراف) سُن لو اُسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے پیدا فرمانا۔ یدبر الامر من السماء الی الارض (الم السجدہ ع ۱) کام کا انتظام کرتا ہے آسمان سے زمین تک۔ اور اس سلطنت میں اس کا کوئی معاون و شریک نہیں۔ وقل الحمد لله الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الذل وکبره تکبیرا (الاسراء - ۱۲) کہو سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ اس کا کوئی ساجھی ہو سلطنت میں اور نہ کوئی مددگار ذلت کے وقت پر اور اس کی بڑائی کرو بڑا جان کر۔ وما لهم فیهما من شرک وما له منهم من ظهیر (السبا ۳۶) اور نہ (مشرکین کے معبودوں کا) آسمانوں اور زمین میں کچھ ساجھا ہے اور نہ ان میں سے (اللہ کا) کوئی مددگار ہے۔ صرف اسی کی سلطنت لامحدود، قدرت غیر متناہی، دریائے کرم بے پایاں اور خزانے غیر مختتم ہیں۔ ولله خزائن السموات والارض (المنافقون ع ۱) اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے۔ یداه مبسوطتان ینفق کیف یشاءُ (المائدہ) اس کے دست کرم دراز ہیں خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ یرزق من یشاءُ بغیر حساب (جس کو چاہتا ہے بغیر حساب دیتا ہے) اس لئے حریص انسان کی جھولی وہی بھر سکتا ہے اور اس کی تشفی وہی فرما سکتا ہے صرف اسی کو ظاہر و پوشیدہ اور راز دل کا علم ہے اور صرف اسی کی ذات ہمہ دان و ہمہ بیں ہے، عالم الغیب والشہادہ (پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے) یَعلَمُ خَائِنَةَ الاَعیُنِ ومَا تُخفِی الصدور (وہ آنکھوں کی چوری اور سینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے) اس لئے صرف اس کے علم و آگاہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور دل کی مخفی خواہشوں اور زندگی کی غیر محسوس ضرورتوں کو وہی جان سکتا ہے اور وہی پورا کر سکتا ہے! وہی انسان کی حفاظت فرماتا ہے اور اس کے پہرہ دار انسان کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں!

لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِنۢ بَیۡنِ یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله (الرعد - ۲) اس کے پہرے والے ہیں، بندے کے آگے اور پیچھے اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے۔ پھر وہ نزدیکوں سے زیادہ نزدیک اور یگانوں سے زیادہ یگانہ ہے۔ وہ انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اور مرنے والے سے اس کے تیمارداروں سے زیادہ نزدیک ہے!

نحن اقربُ الیه من حبل الورید (ق - ۲) ونحن اقرب الیه منکم ولکن لَّا تبصرون (الواقعہ ۳) وہ ہر شخص کی دعا و التجا کو ہر وقت اور ہر جگہ سُنتا ہے، اس کے اور بندے کے درمیان کوئی دیوار اور آڑ نہیں، نہ اس کے یہاں اظہار مدعا کے لئے کسی ذریعہ اور سفارش کی ضرورت۔ واذا سالک عبادی عنّی فانی قریب۔ اُجیب دعوة الدّاع اذا دعانِ فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون (البقرہ ۲۳) اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں، قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہیئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لاویں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آویں۔ پھر اس کی محبّت و شفقت حد سے بڑھی ہوئی، ماں باپ کی محبت محض اس کی ربوبیت اور رحمت کا ایک کرشمہ اور ایک ادنیٰ نمونہ ہے!

پھر وہ ہمیشہ زندہ اور بیدار ہے، کیونکہ وہ زمین اور آسمان کو سنبھالے ہوئے اور اُن کے زمام انتظام و ضبط و نظام کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، اس لئے کسی وقت اس کے یہاں غفلت و نسیان نہیں۔

الله لا اله الّا هو الحیّ القیّوم لا تاخذہٗ سِنَةٌ ولا نوم

اس کے مقابلہ میں انہوں نے اللہ کی تمام مخلوقات کے لئے وہ تمام اوصاف ثابت کئے جو ان صفات الٰہیہ کے

مقابل و ضد واقع ہوئے ہیں اور جن کا مجموعہ بندگی و بیچارگی اور ضعف و عجز ہے :-

لہٗ دعوۃ الحق ؕ والذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشیءٍ الّا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہُ وما ھو ببالغہ ؕ وما دعاءُ الکٰفرین الّا فی ضلٰل ۔ (الرعد۔ ۲)

اسی کا پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے اُن کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آ پہنچے اُس کے مُنہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اُس تک اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے !

یا ایھا الناس ضُرب مثل فاستمعوا لہٗ ؕ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہٗ ؕ وان یسلبھم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہ ؕ ضعُف الطالب والمطلوب ۔ ما قدروا اللہ حق قدرہٖ ؕ ان اللہ لقوّیٌ عزیز ۔ (الحج۔ ۱۰)

اے لوگو ایک مثل کہی گئی ہے سو اس پر کان رکھو ، جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ، ہرگز نہ بنا سکیں گے ایک مکھی اگرچہ سارے جمع ہو جاویں اور اگر کچھ چھین لے اُن سے مکھی ، چھڑا نہیں سکتے وہ اس سے بودا ہے چاہنے والا اور جن کو چاہتا ہے ۔ اللہ کی قدر نہیں سمجھے جس سے ان کی قدر ہے بیشک اللہ زورآور ہے زبردست !

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت ۔ اتّخذت بیتاً ؕ وانّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون ۔ (العنکبوت ۔ ۴)

مثال ان لوگوں کی جنہوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی جیسے مکڑی کی مثال بنا لیا اُس نے ایک گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو سمجھ ہوتی !

ذٰلکم اللہ ربکم لہ الملک والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیرٍ ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ، ولو سمعوا ما استجابوا لکم ؕ ویوم القیٰمۃ یکفرون بشرککم ؕ ولا ینبئک مثل خبیرٍ یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ ج واللہ الغنی الحمید ۔ (فاطر ۔ ۲۔۳)

یہ اللہ ہے تمہارا رب ، اسی کے لئے بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں اگر تم اُن کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سُنیں اور اگر سُنیں تو تمہارے کام کو نہ پہنچ سکیں اور قیامت کے دن تمہارے شریک ٹھہرانے سے منکر ہوں گے ۔ اے لوگو ! تم ہو محتاج اللہ کی طرف اور اللہ بے پروا ہے سب تعریفوں والا !

واتخذوا من دونہ آلھۃً لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون ولا یملکون لانفسھم ضرًّا ولا نفعًا ولا یملکون موتًا ولا حیٰوۃً ولا نشورًا ۔ (الفرقان ۔ ۱)

مشرکین نے اللہ کے سوائے ایسے معبود ٹھہرائے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے اور خود مخلوق ہیں اور جو اپنے ہی لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جن کو موت و زندگی اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کی بھی کوئی قدرت نہیں ہے ۔

قرآن مجید اس مضمون کی آیات سے لبریز ہے - اس کے برخلاف کہیں ان بندگان خدا کی قدرت وطاقت اُن کے اختیارات وتصرفات، اُن کی طاقت یا نفع وضرر کا ذکر نہیں - جس سے قرآن مجید کا رجحان صاف سمجھ میں آتا ہے - !

جہاں تک اللہ کے آسمان وزمین اور بڑی بڑی اشیاء کے خالق و مالک، اور پروردگار رہنے، بڑے بڑے واقعات کے ظہور میں لانے، عالم کا فرمانروائے مطلق اور بادشاہِ حقیقی ہونے کا تعلق ہے مشرکین عرب اور دُنیا کے عام مشرکین کو اس سے قطعی انکار اور اس بارہ میں کبھی کوئی شبہ نہ تھا - جیسا کہ قرآن مجید نے بار بار تصریح کی ہے - مشرکین عرب کو اللہ کی بہت سی صفات وافعال خلق وصنعت، قدرت واختیار، علم وارادہ، غلبہ وتسخیر، عظمت وکبریائی، طاقت وجبروت، اور رحمت وربانیت کا اعتراف واعتقاد تھا - قرآن مجید میں جابجا اس کی شہادتیں موجود ہیں - اس موقع پر سورۂ مومنون کی مندرجہ ذیل آیات کافی ہوں گی :-

قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون - سیقولون للّٰہ ط قل افلا تذکرون ہ قل من رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظیم - سیقولون للّٰہ ط قل افلا تتقون ہ قل من بیدہٖ ملکوت کل شیئٍ وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون - سیقولون للّٰہ - قل فانّٰی تسحرون - (المومنون - ۵)

کہو کس کی ہے زمین اور جو اس میں ہیں، بتاؤ اگر تم جانتے ہو، کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، کہو پھر تم سوچتے نہیں، کہو کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا - بتائیں گے اللہ کو، کہو پھر تم ڈرتے نہیں، کہو کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا - بتائیں گے اللہ کو، کہو پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑتا ہے!

یہ مشرکین نہ صرف نظری وعملی طور پر اللہ تعالیٰ کے ان صفات کے قائل تھے، بلکہ عملاً اپنے ایمان کا ثبوت بھی دیتے تھے - مصیبت کے وقت اللہ ہی کو پکارتے تھے اور دعا کرتے تھے - قرآن مجید نے ان کی دعا وتضرع کا کئی جگہ ذکر کیا ہے! لیکن اس سب کے باوجود وہ مستند ومعیاری مشرک تھے - اُن سے جہاد کیا گیا اور کہا گیا :-

وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہٗ للّٰہ !

اس شرک کی حقیقت کیا تھی، اس کا آغاز کس طرح ہوا - اور اس کی انتہا کیا ہے؟ اس کی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زبان سے سنئے - الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں :-

عقیدۂ اثبات خدا تعالیٰ وآنکہ خدا خالق آسمان وزمین است و مدبّر حوادث عظام است وقادر بر ارسال رسل و مجازی عباد براعمال ایشاں ومقدر حوادث عظام است و قادر قبل از وقوع آں وآنکہ فرشتگان بندگان مقرب خدا اند ومستحق التعظیم اند نیز درمیان ایشاں ثابت بود و اشعار ایشاں دلالت میکنند، اما جمہور مشرکین دریں عقائد شبہات بسیار ناشی از استبعاد آں امور وعدم الفت

خدا تعالیٰ کے اثبات کا عقیدہ اور یہ کہ خدا آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، بڑے بڑے حوادث کا منتظم و مدبّر ہے - پیغمبروں کے بھیجنے پر قادر اور بندوں کو اُن کے اعمال پر جزا وسزا دینے والا، بڑے بڑے واقعات وحوادث کا اندازہ دان اور اُن کا مقرر کرنے والا اور اُن کے وقوع سے پہلے بھی قدرت رکھنے والا ہے! اور یہ کہ فرشتے خدا کے مقرب بندے ہیں اور تعظیم کے مستحق ہیں یہ سب اُن کے یہاں (مشرکین عرب

بادراک آں بہم رسانیدہ بودند وگمراہی ایشاں شرک بود وتشبیہ
وتحریف وانکار معاد واستبعاد در رسالت آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم وفاش بودن اعمال قبیحہ ومظالم درمیان یکدیگر
وابتداع رسوم فاسدہ ومندرس ساختن عبادات۔

شرک آں است کہ غیر خدا را صفات مختصۂ خدا اثبات
نمائند مثل تصرف در عالم بارادہ کہ تعبیر ازاں بکن فیکون میشود۔
یا علم ذاتی از غیر اکتساب بحواس ودلیل عقلی ومنام والہام
ومانند آں یا ایجاد آں کراہت تنگدست یا بیمار وشقی گردد۔
ورحمت فرستاں بر شخصے تا بسبب آں رحمت فراخ معیشت
وصحیح بدن وسعید باشد وایں مشرکان در خلق جواہر وتدبیر
امور عظام ہیچ یک را شریک نمی دانستند وچوں خدائے
تعالیٰ برکارے ابرام فرماید۔ ہیچ یک را قدرت ممانعت
اثبات نمی کردند، بلکہ اشراک ایشاں در امور خاصہ بہ بعضے
بندگان بود گمان می کردند کہ مانند آنکہ بادشاہ عظیم القدر
بندگان خاص خودرا باطراف ممالک می فرستد وایشاں را
در امور جزئیہ تا وقتے کہ حکم صریح بادشاہ صادر نشدہ است
مختار ومتصرف میدارد، وخود بتدبیر امور جزئیہ بندگان
نمی پردازد وحوالۂ سائر بندگان بقہرمان میکند وشفاعت
قہرمان درباب خادمان ومتوسلان ایشاں قبول می نمائید
ہمچنیں ملک علی الاطلاق جد مجدہ بعضے بندگان خودرا خلعت
الوہیت دادہ است ورضا وسخط ایشاں در سائر بندگان
اثر می کند، پس واجب می دانستند تقرب بآں بندگان
خاص تا شائستگی قبول ملک مطلق حاصل شود وشفاعت
بلائے ایشاں در مجازی امور درجہ پذیرائی یابد وبملاحظہ
ایں امور سجدہ بسوئے ایشاں وذبح برائے ایشاں وحلف
بنام ایشاں واستعانت امور ضروریہ بقدر کن فیکون ایشاں تجویز
می نمودند وصورت ہا از سنگ وصفر وروئیں مثل آں تراشیدہ قبلۂ
توجہ بآں ارواح ساختند وجاہلاں رفتہ رفتہ آں سنگہا را بذات
خود معبود انگاشتند وخلط عظیم راہ یافت ــــ!

کے یہاں) ثابت ومسلّم تھا اور اُن کے اشعار اس پر دلالت
کرتے ہیں لیکن جمہور مشرکین کے ان عقائد میں کثرت سے
شبہات پیدا ہو گئے تھے، جو اُن امور کو مُستبعد سمجھتے اور اُن کے
مفہوم سے بیگانہ ہو جانے کے سبب سے تھے، اُن کی گمراہی
شرک تھی اور تشبیہ اور تحریف اور قیامت کا انکار اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مُستبعد سمجھنا۔ اعمال بد اور
مظالم کا آپس میں رواج، بُری رسوم وعادات کی ایجاد اور
عبادات کی تخریب!

شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ان صفات کو ثابت کیا جائے
جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً عالم میں اپنے ارادہ سے
تصرف کرنا جس کو کن فیکون سے ادا کیا جاتا ہے، یا علم ذاتی
جس میں حواس کے ذریعہ سے، یا دلیل عقلی اور خواب والہام وغیرہ
کے ذریعہ حصول علم کو دخل نہیں یا کسی بیمار کی شفاء کو وجود میں
لے آنا، یا کسی شخص پر اس طرح لعنت کرنا اور اس سے ناخوش
ہونا کہ اس نفرت وناراضی کی وجہ سے وہ تنگدست یا بیمار
بدنصیب ہو جائے اور کسی شخص پر اس طرح رحمت بھیجنا کہ اس
رحمت کے سبب سے وہ خوشحال تندرست اور خوش قسمت
ہو جائے اور یہ مشرکین جواہر واجسام کی خلقت میں اور
بڑے بڑے امور کی تدبیر وانتظام میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک
نہیں جانتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ جب خدا کسی کام کا فیصلہ فرما
لیتا ہے تو کسی کو روکنے اور منع کرنے کی قدرت نہیں، اُن کا
شرک جو کچھ تھا وہ بعض بندوں کے خصوصی معاملات میں تھا۔
ان کا گمان تھا کہ جس طرح ایک بڑا شان وشوکت کا بادشاہ
اپنے مخصوص غلاموں اور تابعداروں کو مختلف اطراف ممالک
میں بھیجتا ہے اور اُن کے جزئی معاملات میں جب تک، کہ
بادشاہ کا فرمان صریح صادر نہ ہو مختار اور تصرف کا مجاز
قرار دیتا ہے۔ اپنے غلاموں کے چھوٹے چھوٹے معاملات
کا انتظام والنصرام خود نہیں کرتا اور اپنے تمام غلاموں کو
اس مختار کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنے اس مختار کی

سفارش اُن کے خادموں اور متوسلین کے بارے میں قبول کرتا ہے، اسی طرح بادشاہ جل مجدہٗ نے اپنے بعض بندوں کو خلعتِ الوہیت سے سرفراز فرمایا ہے، اُن کی رضامندی و ناراضی باقی بندگانِ خدا کے حق میں اثر کرتی ہے، پس انہوں نے اس بناء پر ضروری سمجھا کہ اوّل ان بندگانِ خاص سے قرب حاصل کیا جائے تاکہ بادشاہ مطلق کی قبولیت کی لیاقت پیدا ہو اوران کی سفارش ان معمولی بندوں کے کاروبار میں درجۂ قبولیت حاصل کرے، ان باتوں کا لحاظ کرکے انہوں نے ان بندگانِ خاص کے سامنے سجدہ کرنا، اُن کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا، اُن کے نام کی قسم کھانا اور ضروری کاموں میں اُن کی قدرتِ کن فیکون سے مدد چاہنا جائز قرار دیا۔ اور پتھر پیتل اور لوہے کی مورتیں تراش کر اُن کو ان ارواح کی طرف کا قبلہ بنایا جاہلوں نے رفتہ رفتہ ان بتوں کو بذات خود معبود سمجھ لیا اور بڑی گڑبڑ پیدا ہو گئی !

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جانشینوں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ سے بندوں کا قوی ترین اور قریب ترین تعلق اور وابستگی پیدا کریں:۔

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء۔

اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرکے اس کے واسطے بندگی سب سے کٹ کر اور یکسو ہو کر ابراہیم حنیف کی راہ پر۔

اللہ اور اللہ کے بندوں کے درمیان کوئی حجاب اور روک نہ رہے، الفت و اُنس، محبت و عشق، محویت و شغل، قصد و عمل، سعی و جہد، رجوع و انابت، اطاعت و عبادت، التجا و تضرع، سرگوشی و مناجات، خوف و طمع، غرض قلب و دماغ سب کا قبلہ اُسی کی ذات ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے تابعینِ برحق کی تمام مساعی کا مرکز اور سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ اسی کے لئے اُن کا جہاد ہے، ان کی ہجرت ہے، ان کی تبلیغ ہے، اور اسی راہ میں اُن کی زندگی اور موت ہے !

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین۔ (انعام۔ ۳)

بیشک میری نماز اور حج و قربانی اور میری زندگی و موت سب اللہ کے لئے ہے جو سارے عالموں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھ کو حکم ہے اور میں سب سے پہلے حکم بردار ہوں !

اور اس مقصد میں باذن اللہ تعالیٰ وہ اپنے حلقہ اور متبعین کی جماعت میں پورے طور پر کامیاب رہتے ہیں۔ وہ دلوں اور دماغوں کو غیر اللہ کی مشغولیت اور گرفتاری سے اور جسموں کو غیر اللہ کی حکومت و قانون سے آزاد کر دیتے ہیں لیکن جاہلی اثرات وقتاً فوقتاً اس کے خلاف بغاوت کرتے رہتے ہیں اور شرک، انسانوں میں دب دب کر ابھرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود اُن کے نام لینے والوں اور اُن کی اُمت اور متبعین کہلانے والوں کا حال وہ ہو جاتا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے:۔

وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون (یوسف۔ ۱۲)

بہت لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ ساتھ ہی ساتھ شرک بھی کئے جاتے ہیں۔ !

رفتہ رفتہ اللہ سے بے تعلقی اور غیر اللہ سے تعلق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ عملاً کیفیت وہ ہوجاتی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے:-

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ ۔ (البقرہ - ۲)

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بنا لیتے ہیں اللہ کے برابر اور، دل کو اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ سے ـــ !

غیر اللہ سے دلچسپی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ:-

واذا ذکر اللہ وحدہٗ اشمأزت قلوب الذین لایؤمنون بالآخرہ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون ۔

جب نام لیجئے اللہ کا رُک جاتے ہیں اُن کے دل جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب نام لیجئے اس کے سوا اوروں کا تو وہ کھل جاتے ہیں اور بہت مسرور ہوتے ہیں !

پھر اس عقیدہ کے ماتحت غیر اللہ کے نام پر وہ تمام اعمال کئے جاتے ہیں جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ذبح، نذر، سجود، دعا وغیرہ اور رفتہ رفتہ زندگی کا رشتہ اللہ سے ٹوٹ کر غیر اللہ سے بندھ جاتا ہے۔ قلب کی جہت بدل جاتی ہے، انبیاء کی بعثت کا مقصد فوت ہوجاتا ہے اور اسلام پر جاہلیت غالب آجاتی ہے !

ہر زمانہ کے مجددین و مصلحین اور علماء حق نے اس صورتِ حال کے خلاف جہاد کیا۔ ہندوستان میں جہاں اسلام کی بنیاد مختلف تاریخی اسباب کی بناء پر ہمیشہ سے کمزور رہی ہے اور جو دنیا کے چند بڑے مشرکانہ مذاہب و اقوام کا مرکز و وطن ہے۔ اسلام کا چشمۂ صافی زیادہ مکدر ہونے لگا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ یہ چشمۂ حیواں اس ظلمات میں اس طرح گم ہوجائے کہ کسی خضر طریق کو بھی اس کا نشان نہ ملے۔

الف ثانی مجددؒ نے جب اپنا سفر تجدید شروع کیا تو انبیاء کے کار نبوت کی عین ترتیب کے مطابق پہلا قدم یہیں سے اٹھایا، جہانگیر کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار آپ کی تاریخ تجدید کا روشن عنوان ہے۔ اپنے مکاتیب میں نہایت واضح اور جامع چھچے تُلے الفاظ میں توحید کی تشریح فرمائی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس کے تنہا مستحق عبادت ہونے کے دلائل بیان کئے جو آپ کے رسوخ فی العلم کا نمونہ ہیں۔ شرک کے مراسم و مظاہر کی تردید فرمائی۔ رسوم جاہلیت، اعمال مشرکانہ، تقلیدِ کفار سے اپنے متبعین و معتقدین کو سختی سے منع فرمایا کہ تجدید کا کام اس کے بغیر شروع ہی نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ مکمل ہو !

بالخصوص طریقت کا حاصل و مقصود اور تصوف کا خلاصہ و مطلوب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ سے ایسا تعلق پیدا ہو جس میں کبھی کوئی فرق ہی نہ ہو۔ ایسی حضوری جس میں کبھی غیبت اور ایسی یکسوئی جس میں کوئی کشمکش ہو، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آفاق و انفس کی تمام اشیاء کے متعلق نفع و ضرر، قدرت و اختیار کا خیال زائل نہ ہوجائے، اور قلب و دماغ ان کی محبت و عظمت اور اُن سے خوف و طمع رکھنے سے کامل طور پر آزاد نہ ہوجائیں۔ اور وہ کسی معنی میں بھی مقصود و مطلوب، مرغوب و مرہوب، اور معظم و محبوب اور بالخصوص الٰہ و معبود نہ رہیں۔ یہی مقام اخلاص ہے جس کی طرف انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جانشین رہنمائی فرماتے ہیں۔ مجدد صاحب

رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں جا بجا اس کی دعوت دی ہے اور اس کی وضاحت فرمائی ہے:-

مخدوما بعد از طے منازل سلوک و قطع مقامات جذبہ معلوم شد کہ مقصود ازیں سیر و سلوک تحصیل مقام اخلاص است کہ مربوط بفنائے الہہ آفاقی و انفسی است۔

(مکتوبات ۳۴ بنام شیخ محمد خیری)

— مخدوم من! سلوک کی منزلوں کے طے کرنے اور جذبہ کے مقامات کو قطع کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس سیر و سلوک کا مقصود مقام اخلاص کا حاصل کرنا ہے جو وابستہ ہے آفاقی و انفسی معبودوں کے فنا کے ساتھ!

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"راس امراض باطنیہ و رئیس علل معنویہ گرفتاری قلب است بما دون حق سبحانہ و تعالیٰ، و تا ازیں گرفتاری بتمام آزادی میسر نشود سلامتی محال است چہ شرکت را در آن حضرت جل سلطانہ بار نیست اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِص۔ کیف کہ شریک را غالب ساختہ باشد، نہایت بے حیائی است محبت غیر حق را سبحانہ، بر نہجے غالب ساختن کہ محبت او تعالیٰ در جنب آں معدوم گردد یا مغلوب "الحیاء شعبۃ من الایمان"۔۔۔۔

باطنی بیماریوں کی جڑ اور معنوی امراض کی اصل قلب ماسوی اللہ کے ساتھ گرفتاری اور مشغولی ہے جب تک اس گرفتاری سے مکمل طور پر آزادی میسر نہ آئے سلامتی محال ہے۔ کیونکہ اللہ جل سلطانہ کی بارگاہ اور حضور میں کسی کی شرکت کی کسی طرح گنجائش نہیں۔ قرآن کی آیت ہے۔ یاد رکھو خالص پرستش و اطاعت اللہ ہی کا حق ہے، چہ جائیکہ شریک کو غالب بنائیں بڑی بے حیائی ہے کہ غیر اللہ کی محبت کو اس درجہ غالب بنا لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے پہلو میں معدوم یا مغلوب ہو جائے!

غرض جس کا دل توحید سے آشنا ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر بھروسہ کرے گا۔ مصیبت میں اسی کو پکارے گا اور آسودگی و خوشحالی میں اُسی کا شکر بجا لائے گا۔ اور نیاز و تذلل اور عبدیت و سرفگندگی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے نہ رکھے گا!

اے الٰہ من و الٰہ ہمہ
اے پناہِ من و پناہِ ہمہ
(خسروؒ)

☆

مولانا امین احسن اصلاحی

عقیدۂ توحید کا اثر ہماری عملی زندگی پر

عقیدۂ توحید صرف ایک نظریاتی حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ یہ نظریاتی سے زیادہ ایک عملی حقیقت بھی ہے۔ اسلام میں صرف خدا کو مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُن صفات کے ساتھ اُس کو ماننا ضروری ہے جو صفات اُس نے خود اپنی گنائی ہیں۔ علاوہ بریں ان صفات کو صرف مان لینا ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ ان صفات سے بندوں پر خدا کے جو حقوق قائم ہوتے ہیں اُن کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا بھی ضروری ہے، اگر معاملہ صرف ذات و صفات کے مان لینے ہی تک محدود رہے تب تو عملی زندگی اس سے بہت کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی، اس سے اگر کوئی علمی گرماگرمی پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ مناظرہ و مجادلہ کی مجلسوں سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن جہاں سے خدا کے حقوق اور عملاً اُن کو ادا کرنے کا سوال سامنے آتا ہے وہاں سے یہ مسئلہ براہِ راست ہماری عملی زندگی سے متعلق ہو جاتا ہے اور پھر اس سے جو مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ صرف انسان کی انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ اس کی اجتماعی زندگی میں بھی ایک ہلچل سی برپا کر دیتے ہیں ۔۔۔!

اسلام کے عقائد میں سے کوئی عقیدہ بھی ایسا نہیں ہے جو صرف اقرار کر لئے جانے کے لئے ہو، بلکہ اس سے اصلی مقصود وہ اثر ہے جو اس کے اقرار سے انسان کے سیرت و کردار اور اس کے اعمال و اخلاق پر پڑنا چاہیئے، اگر یہ اثر نہ پڑے تو یہ چیز دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو آدمی کو اپنے اُس عقیدہ کا پورا پورا شعور نہیں ہے، اس نے جو بات مانی ہے اس کے مضمرات اور اس کے لازمی مطالبات سے وہ بالکل ہی بے خبر ہے، یا شعور تو ہے لیکن نفاق اور بزدلی کے سبب سے وہ اس کے مضمرات سے انجان ہی بنا رہنا چاہتا ہے!

ایک آدمی کے اندر عقیدہ توحید کا اگر شعور ہو تو اس کی زندگی پر چند اثرات پڑنے لازمی ہیں۔

اس عقیدہ کے شعور کا پہلا اثر جو انسان پر پڑتا ہے وہ اس کائنات کے اندر خود اس کے اپنے مرتبہ و مقام کا انکشاف ہے، انسان جب تک توحید سے آشنا نہیں ہوتا، اس وقت تک اور تو اور خود اپنے متعلق اس کے نظریات و خیالات بالکل اُلجھے ہوئے رہتے ہیں۔ بہت سے سوالات، جن کا قطعی اور واضح حل زندگی کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے اور جن کے حل کئے بغیر نہ تو کوئی قدم صحیح سمت میں اُٹھایا جا سکتا ہے اور نہ اوہام و آلام سے رہائی حاصل کی جا سکتی ہے، یا تو اس کے لئے وہ سرے سے لاینحل معمہ بن کر رہ جاتے ہیں یا وہ ان کا کوئی غلط حل ہی قبول کر لیتا ہے۔ وہ روزی کہاں سے پاتا ہے۔ مگر روزی رساں کسی اور کو سمجھ لیتا ہے، زندگی اور موت کسی کے اختیار میں ہے اور وہ مارنے والا اور زندہ کرنے والا کسی کو بنائے بیٹھا ہے۔ بخشنے والا اور چھیننے والا ہاتھ کوئی اور ہے اور وہ دستِ سوال کسی اور کے سامنے پھیلائے ہوئے ہے! معبود کوئی اور ہے اور یہ ماتھا کسی اور کے آستانہ پر رگڑ رہا ہے، حد یہ ہے کہ جو چیزیں خود اس کی خدمات اور اس کی حاجت براری کے لئے پیدا

کی گئی ہیں اور جو کسی بھی نفع یا ضرر پر کوئی اختیار نہیں رکھتی ہیں، بسا اوقات وہ ان کے متعلق طرح طرح کے اوہام میں مبتلا ہو کر اُن کے آگے نذریں اور چڑھاوے پیش کرتا اور ان سے التجائیں اور خوشامدیں کرتا ہے، یہ مرعوبیت اس پر اس کائنات کی صرف بڑی بڑی چیزوں ہی سے نہیں طاری ہوتی بلکہ وہ ذہنی پستی کی ایسی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی جھاڑی، کسی درخت اور کسی چکنے پتھر کو ایک معتقد ہستی مان کر اُنہی کے آگے ڈنڈوت کرنے لگ جاتا ہے!

صرف توحید ہے جو آدمی کو اوہام کی ان تاریکیوں سے نکالتی ہے - وہی آدمی پر یہ راز کھولتی ہے کہ صرف ایک ہی ذات ہے جس کے اختیار میں تمام خلق و تدبیر ہے اور جس کے دستِ تصرف میں تمام آسمان و زمین ہیں - اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت، اور اسی کے قبضۂ قدرت میں بخشنا اور چھیننا ہے - جو چیز بھی آتی ہے اسی کے حکم سے آتی ہے، اور جو چیز بھی لوٹتی ہے، اُسی کی طرف لوٹتی ہے - اس کے سوا سب فانی ہیں - باقی رہنے والی صرف اسی کی ذات ہے - وہی تنہا اس کائنات کا حکمران ہے، باقی سب اس کے آگے مجبور و محکوم ہیں!

یہ عقیدہ جب پُورے شعور کے ساتھ آدمی کے اندر راسخ ہو جاتا ہے تو وہ بہ یک وقت اپنے اندر دو متضاد حالتیں محسوس کرتا ہے، ایک تو عجز و سرفگندگی کی اور دوسری استغنا اور بے نیازی کی - وہ اپنے رب کے آگے تو بالکل عاجز اور اپنے آپ کو اس کا یکسر محتاج پاتا ہے، لیکن ساتھ ہی دُوسروں سے اپنے آپ کو بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی بھی محسوس کرتا ہے - ایک کا آستانہ اُس کو تمام آستانوں سے بے پروا اور ایک کا ڈر اس کو تمام خطروں اور اندیشوں سے بالکل بے فکر کر دیتا ہے!

اس عقیدہ کا شعور انسان پر دوسرا اثر ڈالتا ہے - وہ یہ ہے کہ آدمی ماسوا اللہ کے ہر باطل زور و اثر کے مقابل میں باغی بن جاتا ہے، وہ اپنے رب کی مرضی اور اس کے حکم کے مقابل میں کسی کے زور و اختیار اور کسی کے تصرف و استبداد کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا - اس کی غیرت و حمیت اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اُس کے رب کی راہ میں اُس کا مزاحم بن کر کھڑا ہو - وہ اپنے عزیز سے عزیز دوست اور کسی عزیز سے عزیز رشتہ دار کے لئے بھی یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ خدا کی عبادت و اطاعت سے اُس کو روکے اور اگر کوئی اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کو عزیز اور رشتہ دار سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی راہ کا ایک پتھر خیال کرتا ہے اور اس کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کو ہٹانے میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی تو وہ خود کترا کر اپنی راہ بدل لیتا ہے!

انسان سے سب سے زیادہ قریب اس کا اپنا نفس ہے، لیکن اس کی خواہشیں بھی اگر اس کا رُخ موڑنا چاہتی ہیں، تو وہ اپنے نفس کو بھی ایک سنگ گراں سمجھتا ہے اور اس کو راہ سے ہٹا کے ہی دم لیتا ہے - اس کے بعد دوسرے درجہ میں اُس کا اپنا کنبہ اور خاندان ہے، وہ اگر اس راہ میں روک بنتے ہیں تو وہ ان کو بھی خدا کے لئے چھوڑ دیتا ہے، قوم اور قبیلہ کے بھی وہ حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ مالکِ حقیقی کے مقابل میں اس سے اپنی کوئی بات منوائیں - وہ کسی بڑے سے بڑے جبار، کسی بڑے سے بڑے سلطان اور کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا - اگر وہ دیکھتا ہے کہ یہ اس سے خدا کی اطاعت کے مقابلہ میں اپنی اطاعت کا مطالبہ کر رہے ہیں - اگرچہ اس بغاوت کی سزا میں اس کو آروں سے چیر ڈالا جائے، یا آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا جائے، وہ حکمرانِ حقیقی کے حکم کے آگے نہ کسی مُردہ خدا کی پروا کرتا اور نہ کسی زندہ خدا (؟) کو خاطر میں لاتا ہے - اور اگر وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلہ میں مجبور دیکھتا ہے تو خود کو اُن کے حوالے کر دینے کے بجائے وہ اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ اُن کے ہاتھ نہیں بلکہ اپنی جان اپنے رب کے حوالے کر دے!!

اس عقیدہ کا تیسرا مظہر اُس وقت ظہور میں آتا ہے جب اس کا شعور رکھنے والے بہت سے افراد ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس وقت اُن کی سعی اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے ایک ہی مالکِ حقیقی کی حکمرانی اپنے اپنے دلوں اور اپنے اپنے نفوس پر قائم کی ہے، اسی طرح وہ اس کی حکمرانی اس زمین کے اُوپر بھی قائم کریں، جس پر وہ بس رہے ہیں۔ یہ توحید کا اجتماعی اور سیاسی مظہر ہے۔ اور حقیقت میں رہنے اور بسنے کے قابل اس کرۂ ارضی کا وہی حصّہ ہے، جس پر خدا کی حکمرانی اور بادشاہی قائم ہو۔ اگر کسی سرزمین پر توحید کے ماننے والے موجود ہوں۔ وہ با اختیار اور آزاد بھی ہوں اور اپنا ایک سیاسی و اجتماعی نظام بھی رکھتے ہوں۔ لیکن یہ نظام اللہ کی حاکمیت کی اساس پر قائم نہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ توحید کے مدعی تو ہیں۔ لیکن یا تو ان کے اندر توحید کا شعور نہیں ہے یا یہ منافق ہیں۔ کہ جس چیز کے ماننے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اس کے اجتماعی تقاضے کو پورا کرنے کی اپنے اندر ہمّت نہیں پاتے ۔۔۔!!

بھلا طریقت کا شریعت سے کیا تقابل؟ ان دونوں میں مساوات کہاں سے آئی! شریعت تو ایسی قطعی وحی سے ثابت ہوتی ہے، جس میں شک و ریب کی بالکل گنجائش نہیں، اس کے احکام میں نسخ و تبدیل نہیں، تاقیام قیامت یہ احکام باقی رہیں گے۔ شریعت کے تقاضے پر عمل کرنا تمام عوام و خواص کے لئے ضروری و لابدی ہے۔ طریقت کی یہ مجال نہیں کہ وہ شریعت کے احکام کو اُٹھا دے اور اہلِ طریقت کو تکالیفِ شرعیہ سے آزاد کر دے ۔۔۔!

(خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ)

الوصایا النبویہ
مولانا سید علوی مکی مالکی
ترجمہ :- مولانا ظفر احمد عثمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتیں

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قلت یا رسول اللہ اوصنی قال اوصیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ، قلت زدنی قال، علیک بتلاوۃ القرآن وذکر اللہ فانہ ذکر لک فی السماء ونور لک فی الارض۔ قلت - زدنی قال - علیک بطول الصمت فانہ مطردۃ للشیطان وعون لک علی امر دینک قلت - زدنی قال - ایاک وکثرۃ الضحک فان کثرت الضحک تمیت القلب و تذھب بنور الوجہ - قلت - زدنی قال قل الحق وان کان مُرّا ، قلت - زدنی قال - لا تخف فی اللہ لومۃ لائم - قلت زدنی قال - لیحجزک عن الناس ماتعلم من نفسک - اخرجہ البیہقی واحمد والطبرانی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم واللفظ لہ وقال صحیح الاسناد !

ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا - میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ہر کام کو زینت بخشنے والا ہے - میں نے عرض کیا - کچھ اور فرمائیے - فرمایا - تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ کی پابندی رکھو کہ اس سے عالم بالا میں تمہارا تذکرہ ہوتا رہیگا - اور زمین میں تم کو (خاص) نور حاصل ہوگا - میں نے عرض کیا کچھ اور فرمائیے - فرمایا - خاموش زیادہ رہا کرو - کیونکہ خاموشی شیطان کو بھگانے والی اور دین کے کاموں میں تمہاری مددگار ہے میں نے عرض کیا - کچھ اور فرمائیے - فرمایا - زیادہ ہنسنے سے بچو - کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مُردہ ہوجاتا اور چہرہ کی رونق جاتی رہتی ہے - میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، حق بات کہو - اگرچہ تلخ ہو - میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرو - میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، کہ جو کچھ تم اپنے بارے میں جانتے ہو وہ تم کو لوگوں (کے درپے ہونے) سے روک دے ! (اس حدیث کو حافظ بیہقی اور امام احمد اور طبرانی و ابن حبان نے روایت کیا ہے نیز حاکم نے بھی اور یہ الفاظ حاکم ہی کی (روایت کے) ہیں، انہوں نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے -

شرح :- تقوی کمالِ ایمان کو کہتے ہیں - جو شخص اللہ سے ڈرے گا، دینی احکام کو بھی بجا لائے گا - اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہے اُن سے بچے گا - اسی سے ایمان کامل ہوتا ہے - اور اسی سے دنیا بھی سنورتی ہے - اور دین بھی - آج جو مسلمانوں میں جرائم کی کثرت ہے کہ روزانہ اخبارات میں اغوا، قتل، چوری - ڈکیتی، رشوت، ذخیرہ اندوزی، دغا، فریب وغیرہ کے واقعات

چھپتے رہتے ہیں - اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں سے خوفِ خدا اور اندیشۂ آخرت اٹھ گیا ہے - مسلمانوں نے آجکل یہ سمجھ لیا ہے کہ بس کلمہ پڑھ لینا کافی ہے، عمل کی کچھ ضرورت نہیں - اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ کی مدد اُن کے ساتھ نہ ہوگی ، اللہ تعالیٰ کی مدد صبر و تقویٰ کے بعد نازل ہوا کرتی ہے -

بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یأتوکم من فورهم هذا یمددکم ربکم بخمسة آلاف من الملٰئکة مسومین - ولو ان اهل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون - !

بیشک اگر تم صبر و استقلال اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن دفعتاً تم پر حملہ کردے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا - جو خاص نشان لگائے ہوں گے - دوسری جگہ ارشاد ہے اور اگر یہ بستی والے ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو یقیناً ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں (نازل کرتے اور رحمت کے دروازے) کھول دیتے - لیکن انہوں نے جھٹلایا - (کہ ایمان اور تقویٰ کی ضرورت نہیں، ہماری محنت اور تدبیر ہی سے سب کام بن جائیں گے) تو ہم نے اُن کے اعمال (بد) کے سبب اُن کو پکڑ لیا — !

چونکہ تقویٰ پر دُنیا و آخرت دونوں کی فلاح موقوف ہے اس لئے قرآن میں بھی اس کی بکثرت تاکید ہے - اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی وصیت فرمائی ہے - مسلمانوں کو تقویٰ کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ بغیر اس کے ان کی دُنیا درست ہو سکتی ہے نہ دین - نہ خدا کی مدد ساتھ ہو سکتی ہے نہ دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے !

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ جو وصیت میں کرتا ہوں اُس کو غور سے سُنو ! ہر صبح اور ہر شام یہ دعا کیا کرو - یاحی یا قیوم برحمتک استغیث - ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے - اصلح لی شانی کله ولا تکلنی الی نفسی طرفة عین - اے حی و قیوم ! میں تیری رحمت کی دہائی دیتی ہوں میری حالت کو درست کر دیجئے - اور مجھے ذرا سی دیر کو بھی میرے نفس کے حوالے نہ کیجئے !) اس کو ابن السنی اور نسائی اور بزار نے صحیح سند سے روایت کیا ہے اور حاکم نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے)

ہمارے اکابر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے متعلقین و احباب کو اس دعا کی تعلیم فرمایا کرتے تھے - جب کوئی مشکل درپیش ہو اس دعا کو صبح و شام کم از کم ستّر بار پڑھا جائے ، زیادہ جتنی ہمت ہو — !

ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں - میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ! مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا ، جب کوئی گناہ تم سے ہو جائے اس کے پیچھے نیکی بھی کر لیا کرو - وہ اس گناہ کو مٹا دے گی - میں نے کہا یا رسول اللہ ! لا الٰہ الا اللہ بھی نیکیوں میں شمار ہے ؟ فرمایا - یہ تو سب نیکیوں میں افضل ہے - اس کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے -

یہاں گناہ سے مراد صغیرہ ہے ، کبیرہ نہیں - کیونکہ کبیرہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتا - لیکن ہم تو صغائر میں بھی بکثرت مبتلا ہوتے ہیں اس لئے ہر مجلس اور گفتگو کے بعد لا الٰہ الا اللہ[1] کہہ لینا چاہیئے - تاکہ گناہ مٹ جائیں -

---

[1] اور جب مسلمان کسی لغزش اور خطا کے بعد لا الٰہ الا اللہ کہیگا تو اس کلمہ کے دہراتے وقت اس کے دل میں لامحالہ ندامت کا احساس بھی پیدا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار کرتے ہوئے اُسے شرم بھی آئے گی - اسی کا نام "توبہ" ہے اور یہی احساس ندامت اُسے گناہوں کی کثرت پر نہیں کمی کی طرف لے جائیگا - (م-ق)

(۴) حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد اس دعا کو نہ چھوڑنا۔

اللّٰھمّ اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک۔

اے اللہ! میری مدد کیجئے اپنی یاد پر اور شکر پر اور اچھی طرح عبادت کرنے پر۔

اس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اس دعا کا مہتم بالشان ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے اپنی محبت کا اظہار کرکے اس کی وصیت فرمائی ہے، حدیث سے نمازوں کے بعد دعا کا بھی ثبوت ہوگیا۔ جو تمام مسلمانوں میں ہر نماز کے بعد معمول ہے ــــ!

(۵) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت فرمائی کہ جب سونے کی جگہ میں جاؤ (یعنی سونے کا قصد کرو) تو سورۃ الحشر پڑھ لیا کرو۔ اگر تم (اس رات میں) مرگئے تو شہید مروگے۔ اس کو ابن السنی نے عمل الیوم واللیلۃ میں روایت کیا ہے۔

ایک روایت میں بجائے سورۃ الحشر کے اواخر سورۃ الحشر ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشھادہ سے ختم سورۃ تک پڑھنے کا بھی ثواب آیا ہے!

(۶) حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت فرمائی کہ جب (سونے کے لئے) خواب گاہ کا ارادہ کرو تو یہ دعا پڑھا کرو:۔

اللھم اسلمت نفسی الیک وفوضت امری الیک ووجھت وجھی الیک والجأت ظھری الیک رغبۃ ورھبۃ الیک لا ملجاء منک الا الیک آمنت بکتابک الذی انزلت وبنبیک الذی ارسلت۔

اے اللہ! میں اپنی ذات کو آپ کے حوالہ کرتا ہوں اپنے ہر کام کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اپنے چہرہ کا رُخ آپ کی طرف پھیرتا ہوں، آپ ہی سے پشت پناہی چاہتا ہوں۔ آپ ہی سے امید رکھتا ہوں اور آپ ہی سے ڈرتا ہوں، آپ سے بھاگنے کی اور پناہ کی جگہ آپ کے سوا کوئی نہیں۔ آپ کی اس کتاب پر ایمان لایا جو آپ نے نازل کی ہے اور آپ کے نبی پر بھی ایمان لایا جن کو آپ نے بھیجا ہے ــــ!

حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم رات ہی کو مرگئے تو فطرت (اسلام) پر مروگے اور اگر صبح کو اچھے خاصے اٹھ گئے تو خیر و برکت پاؤگے۔ اس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور بین القوسین کا مضمون جمع الفوائد سے ماخوذ ہے۔

(۷) حضرت غامر بن علیہ بن حرملۃ عنبری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا، اللہ سے ڈرتے رہو، اور جب تم کسی مجلس میں بیٹھو، پھر وہاں سے کھڑے ہوجاؤ اور لوگوں کو ایسی باتیں کرتے سنو جو تم کو پسند ہوں، تو اس مجلس میں پھر آؤ۔ اور اگر ان کو ایسی باتیں کرتے سنو جو تم کو ناگوار ہوں تو اس مجلس کو چھوڑدو۔ اس کو امام احمد اور ابن سعد نے روایت کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے پیچھے بھی اچھی باتوں اور اچھے کاموں میں مشغول پاؤ اُن کو اپنا جلیس بناؤ اور جن لوگوں کو اپنے پیچھے بُری باتوں اور بُرے کاموں میں مشغول پاؤ اُن کو اپنا ہم نشین نہ بناؤ، اُن سے الگ رہنا ہی اچھا ہے !

(۸) حضرت معاذ بن جبل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا اپنے دین میں (اور دین کے کاموں میں) اخلاص پیدا کرو۔ تھوڑا عمل بھی کافی ہو جائے گا۔ (اس کو ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں اور ابن ابی حاتم اور بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بتایا ہے)!

یہ حقیقت ہے کہ اخلاص کے بغیر کوئی عمل بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتا اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل بھی وزنی ہو جاتا ہے۔ حضرات صحابہؓ کو جو اولیاء امت پر فضیلت ہے، وہ زیادہ عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اخلاص کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ میرے صحابی کا ایک مد (آدھ سیر) دوسروں کے اُحد پہاڑ کی برابر سونا خیرات کرنے میں افضل ہو۔ اخلاص کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عمل میں غیر خدا کا قصد نہ کیا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمل سے صرف رضاء حق مطلوب ہو اور کچھ مقصود نہ ہو، وبینہما درجات۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اخلاص اور ریا کا مدار مقصد پر ہے اگر ریا کا قصد نہ ہو تو اخلاص حاصل ہو۔ وسوسۂ ریا مُضر نہیں۔ کیونکہ وسوسہ پر بندہ کا اختیار نہیں۔ ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ (از افادات مولانا کھفلوی رحمۃ اللہ علیہ)

(۹) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا۔ نماز کو درستی کے ساتھ ادا کرو۔ زکوٰۃ دیا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ حج اور عمرہ کیا کرو، اپنے باپ ماں کی خدمت کرو۔ (قرابت داروں سے) صلہ رحمی کرو۔ مہمان کی خاطر کیا کرو۔ نیک کاموں کا امر کرو۔ بُرے کاموں سے روکتے رہو۔ اور حق کے ساتھ چلتے رہو جدھر وہ جائے۔ (اس کو حاکم نے روایت کیا اور صحیح بتایا)

(۱۰) حضرت ابوہریرہ اور ابوالدرداء دونوں فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی کہ سفر ہو یا حضر (کسی حال میں) ان کو نہ چھوڑیں۔ (۱) ہر مہینہ میں تین دن کا روزہ — (۲) چاشت کی دو رکعتیں۔ (۳) اور سونے سے پہلے وتر کی نماز پڑھ لینا۔ (اس کو امام بخاری ومسلم و ابوداؤد اور ترمذی ونسائی نے روایت کیا ہے)

اس حدیث کی شرح رحمۃ القدوس ترجمہ بہجۃ النفوس میں ملاحظہ ہو، قابل دید ہے !

(۱۱) حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں۔ مجھے میرے حبیب (سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے چند بہترین خصلتوں کی وصیت فرمائی ہے۔ (۱) دُنیوی امور میں، اپنے سے فوق کو نہ دیکھوں، بلکہ اپنے سے کمتر کو دیکھوں، (۲) مساکین سے محبت کروں، اُن کے قریب رہا کروں۔ (۳) صلہ رحمی کروں اگرچہ قرابت دار اعراض ہی کرتے ہوں۔ (۴) اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کروں — (۵) ہمیشہ حق کہوں اگرچہ اپنے خلاف ہی ہو۔ اگرچہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔ (۶) لاحول ولا قوۃ الا باللہ

کی کثرت کیا کروں، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک (بڑا) خزانہ ہے - اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں!

(۱۲) ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا - اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو - اور اللہ کے لئے اس طرح کام کرو جیسا تم اس کو دیکھ کر کام کر رہے ہو - اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو اور ہر پتھر ہر درخت کے پاس اللہ کو یاد کرو (تاکہ سب تمہارے واسطے گواہی دیں) اور جب کوئی برا کام صادر ہو جائے تو اس کے پہلو میں (ساتھ ساتھ) نیک کام بھی کر لو — پوشیدہ گناہ کے ساتھ پوشیدہ طور پر نیکی کرو اور علانیہ کے ساتھ علانیہ طور پر - اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے

اپنے کو مُردوں میں شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت کو یاد رکھو، ہر وقت موت کے لئے تیار رہو ع

شاید ہمیں نفس، نفسِ واپسیں بود!

(۱۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا، اے ابن جیدہ! غصہ نہ کیا کرو، کیونکہ غصہ ایمان کو ایسا خراب کر دیتا ہے جیسا شہد کو ایلوا، اس کو حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے -

مراد بیجا غصہ ہے، جس کی شریعت سے اجازت نہ ہو اور جہاں شریعت نے غصہ کرنے کی اجازت دی وہاں غصہ کرنا جائز ہے، مگر وہاں بھی حدود کی رعایت ضروری ہے - حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں!

(۱۴) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کچھ وصیت کیجئے اور مختصر کیجئے - فرمایا، لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے امید قطع کر لو اور طمع و حرص سے بچتے رہو کہ یہ نقد احتیاج ہے، (حریص آدمی محتاج ہی ہے گو بظاہر دولت مند ہو) اور ایسی بات اور ایسے کام سے بچو جس پر بعد میں معذرت کرنی پڑے (معافی چاہنی پڑے) اس کو حاکم اور بیہقی اور احمد نے روایت کیا ہے!

(۱۵) اسود بن اصرم حارثی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا تمہیں اپنی زبان پر قابو ہے؟ میں نے کہا اگر مجھے اپنی زبان پر بھی قابو نہ ہوا تو کس چیز پر قابو ہوگا؟ فرمایا تم کو اپنے ہاتھوں پر قابو ہے؟ میں نے کہا اگر میں اپنے ہاتھوں پر بھی قابو نہ رکھوں تو کس چیز پر قابو رکھوں گا؟ فرمایا - تو بس اپنی زبان سے اچھی بات کے سوا کچھ نہ نکالو اور اپنے ہاتھ کو نیکی کے سوا کسی کام کی طرف نہ

سبحان اللہ کس خوبی کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے کہ پہلے بتا دیا کہ انسان کی زبان اور ہاتھ پیر اس کے اختیار میں ہیں، ان سے جو گناہ ہوتے ہیں اختیار سے ہوتے ہیں، بے اختیار نہیں ہوتے، پس انسان اپنے اختیار سے کام لینا اور زبان، ہاتھ اور پیروں کو گناہوں سے بچانا چاہیئے - اور معلوم ہے کہ زیادہ گناہ ان ہی سے ہوتے ہیں - جس نے ان کو بچا لیا اس نے گویا اپنے کو پوری طرح گناہ سے بچا لیا -

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ وسلم

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت!

سید ابوالاعلیٰ مودودی

چار اہم سوالات

اور اُن کے جوابات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں "توحید نمبر" کے لئے ہم نے چار سوالات بھیجے تھے، اپنی شدید معروفیات اور گرانیٔ صحت کے باوجود مولانا موصوف نے جوابات عنایت فرمائے، جو ترتیب وار درج کئے جاتے ہیں۔ (م۔ ق)

(۱) کیا "بدعت" کی دو قسمیں ہیں (۱) حسنہ اور (۲) سیئہ! بعض صاحبان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعم البدعۃ" سے بدعت کے "حسنہ" ہونے پر دلیل لاتے ہیں۔ حدیث شریف میں کس قسم کی "بدعت" کو ضلالت کہا گیا ہے؟

جواب:۔ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اس کی کوئی قسم حسنہ نہیں ہے، بلکہ ہر بدعت سیئہ اور ضلالہ ہی ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ کل بدعۃ ضلالۃ۔ البتہ لغوی اعتبار سے محض نئی بات کے معنی میں بدعت، حسنہ بھی ہو سکتی ہے اور سیئہ بھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح باجماعت کے بارے میں نعمت البدعۃ ھذا کے الفاظ جو فرمائے تھے اُن میں بدعت سے مراد اصطلاحی بدعت نہیں بلکہ لغوی بدعت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسے بدعت کی ایک قسم "حسنہ" قرار دینے کے لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا!

اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے بدعت کا شرعی مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔ پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا نماز تراویح باجماعت کا طریقہ رائج کرنا اس مفہوم کے اعتبار سے بدعت کی تعریف میں آتا بھی ہے؟

عربی زبان میں بدعت کا لفظ قریب قریب اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس میں لفظ "جدت" ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ایک نئی بات جو پہلے نہ ہوئی ہو۔ یا جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لفظ اس وسیع مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، نہ اس مفہوم میں ہر نئی چیز یا ہر نئے کام اور طریقے کو گمراہی قرار دیا گیا ہے! شرعی اصطلاح میں بدعت سے مُراد یہ ہے کہ جن مسائل و معاملات کو دینِ اسلام نے اپنے دائرے میں لیا ہے، اُن میں کوئی ایسا طرزِ فکر یا طرزِ عمل اختیار کرنا جس کے لئے دین کے اصلی ماخذ میں کوئی دلیل و حجت موجود نہ ہو۔ اس تعریف کی رُو سے وہ مسائل و معاملات، یا مسائل و معاملات کے وہ پہلو جن میں دین نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کرتا۔ جن کے متعلق صاحب شریعت نے خود فرما دیا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ بدعت و سنت کی بحث سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کے بدعت ہونے یا نہ ہونے کا سوال صرف انہی امور میں پیدا ہوتا ہے، جن میں انسان کی رہنمائی کرنا دین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے احکام دیئے ہیں یا اصولی ہدایات عطا فرمائی ہیں! خواہ وہ عقائد اور خیالات و تصورات

کے باب سے تعلق رکھتے ہوں، یا اخلاق سے، یا عبادات اور مذہبی رسوم سے، یا معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت اور دوسری اُن چیزوں سے جنہیں عام طور پر دُنیوی معاملات سے موسوم کیا جاتا ہے، ان امور میں جب کوئی ایسی بات کی جائے گی جس کے ماخذ کا حوالہ خدا کی کتاب اور اُس کے رسُول کی تعلیم وہدایت میں نہ دیا جا سکتا ہو۔ یا جس کے حق میں دین کے ان ماخذِ اصلیہ سے کوئی معقول دلیل نہ پیش کی جا سکتی ہو، تو وہ بدعت ہوگی، اور اگر وہ کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہو تو اس پر محض بدعت کا نہیں بلکہ فسق اور معصیت کا اطلاق ہوگا !

بدعت کے شرعی مفہوم کی اس تشریح کے بعد یہ بات محتاجِ کلام نہیں رہتی کہ اس معنی میں جو چیز بدعت ہو اُس کے حسنہ ہونے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا، وہ تو لازماً سیئہ ہی ہوگی اور اس کو سیئہ ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دین نام ہے اُس نظام کا جو خدا اور اُس کے رسُول کی تعلیم وہدایت پر مبنی ہو۔ اور اس نظام میں بہرحال ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی جو اس تعلیم وہدایت پر مبنی نہ ہو۔ ایسی کوئی چیز جب بھی اس میں داخل ہوگی، اس نظام کے مزاج اور اس کی ترکیب کو بگاڑ دے گی۔ پھر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بگاڑنے والی چیز حسنہ بھی ہو — !

اب دیکھئے کہ حضرت عمرؓ نے جس چیز کو "اچھی بدعت" کہا تھا۔ کیا وہ واقعی اُسی معنی میں بدعت تھی جس میں کوئی شے اصطلاحِ شرع میں بدعت قرار پا سکتی ہے ؟

جہاں تک نفس تراویح کا تعلق ہے، یعنی رمضان میں نماز عشاء کے بعد قیام لیل، وہ تو صرف جائز ہی نہیں، مندوب اور مسنون بھی ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے، اس کو دوسرے دنوں کے قیام لیل سے زیادہ اہمیت دی ہے اور خود اس پر عمل فرمایا ہے۔ جہاں تک اس کے جماعت کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے، اس پر بھی حضور کے زمانہ میں اور حضورؐ کے علم میں عمل ہوا ہے اور آپؐ نے اسے جائز رکھا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ مسجد نبوی میں مختلف مقامات پر مختلف لوگ رمضان میں رات کے وقت نماز پڑھتے تھے ! جس کو جتنا قرآن یاد ہوتا وہ اُتنا ہی پڑھتا، اور کسی کے ساتھ ایک، کسی کے ساتھ پانچ، کسی کے ساتھ سات، یا کم وبیش مقتدی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر جہاں تک ایک جماعت میں سب کو جمع کر کے ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھانے کا تعلق ہے، اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی مرتبہ عمل فرمایا ہے۔ ترمذی۔ ابوداؤد اور دوسری کتب سُنن میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایک رمضان کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ کہ مہینہ ختم ہونے میں سات دن باقی تھے کہ رات کے وقت حضورؐ نے ہم کو نماز پڑھائی، یہاں تک کہ ایک تہائی شب گزر گئی، پھر ایک دن چھوڑ کر ایک روز آدھی رات تک پڑھائی اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر پھر ایک روز سحری کے وقت تک پڑھاتے رہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک اور رمضان کا حال بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے دو یا تین دن مسلسل نماز تراویح پڑھائی، پھر تیسرے یا چوتھے روز جب لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نماز پڑھانے کے لئے نہ نکلے، اور بعد میں اس کی وجہ یہ بیان کی کہ کہیں یہ فرض نہ قرار دے دی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ تو مسنون تھا۔ اب جس چیز کو نئی بات کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس طریقہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ اس چیز کو بدعت اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضورؐ نے ہمیشہ جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھانے کی وجہ صرف یہ بیان فرمائی تھی کہ کہیں یہ لوگوں پر فرض نہ قرار دے دی جائے، یہ وجہ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ آپؐ کے نزدیک یہ طریقہ رائج ہونا اور تمام حیثیتوں سے

تو پسندیدہ تھا۔ البتہ فرض قرار پا جانے کا اندیشہ اس میں مانع تھا۔ کہ آپؐ اسے رائج فرمائیں، حضورؐ کی وفات کے بعد اس اندیشہ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیونکہ کسی دوسرے شخص کا عمل کسی چیز کے شریعت میں فرض ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے اس منشا کو پورا کر دیا جو آپؐ کی اس توجیہ میں مضمر تھا۔ یعنی یہ کہ یہ طریقہ رائج تو ہو مگر مشروع اور مسنون طریقہ کی حیثیت سے، نہ کہ فرض کی حیثیت سے، اس پر بعض لوگوں کو جب بدعت ہونے کا شبہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے رد کیا کہ "یہ اچھی بدعت ہے"۔ یعنی یہ نئی بات تو ہے، مگر اس نوعیت کی نئی بات نہیں ہے جسے شریعت میں مذموم قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے بالاتفاق اس طریقہ کے رواج کو قبول کیا۔ اور ان کے بعد ساری امت اس پر عمل کرتی رہی۔ ورنہ کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اسے رائج کرنے کا ارادہ حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوتا! اور صحابہ کی پوری جماعت بھی آنکھیں بند کرکے اسے قبول کر لیتی ـــــ؟

(۲) مشائخ و صوفیاء کے بعض تذکروں میں یہ ملتا ہے کہ فلاں صاحب نے فلاں بزرگ کی قبر پر مراقبہ اور چلہ کیا؟ اور یہ بھی کہ فلاں بزرگ کا یہ قول اور تجربہ ہے کہ فلاں قبر پر اللہ سے دعا مانگنا قبولیت کا سبب ہوتا ہے؟ اس کی دین میں کیا اصل ہے ــــ؟

جواب:- اوّل تو دین میں اصل چیز کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے، نہ کہ بزرگوں کے اقوال و افعال۔ دوسرے خود بزرگوں کے اقوال و افعال کے متعلق جو مواد تذکروں میں ملتا ہے وہ بھی ایسا مستند نہیں ہے کہ اس کی بناء پر یہ اطمینان کیا جا سکے کہ واقعی ان بزرگوں کے اقوال و افعال وہی تھے، جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو ماخذ مان کر ان کی پیروی کرنا میرے نزدیک سخت بے احتیاطی ہے۔ محفوظ طریقہ وہی ہے جو ہمیں قرآن و حدیث سے ملتا، جس کے دورِ صحابہ اور دورِ تابعین میں رائج ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور جس کو امت کے محدثین اور فقہا نے منقح اور مدوّن کرکے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص دین کی یقینی اور قابلِ اعتماد راہ پر چلنا چاہتا ہو۔ اس کو اس محفوظ طریقہ سے تجاوز کا کبھی خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ باہر جو کچھ ہے وہ کم از کم خطرے سے تو خالی نہیں ہے۔ اب اسی معاملہ کو لیجئے جس کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے۔ جو تذکرے ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگوں نے یہ کام کیا ہے، ان کی روایات کا حدیث کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت کے مقابلہ میں بھی آخر کیا پایہ ہے؟ کس سند کی بناء پر یہ اعتماد یا گمان غالب ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟ فرض کیجئے کہ حقیقت میں انہوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ اس صورت میں ان بے سند روایات کی پیروی کرکے ہم آخرت میں کس چیز کا سہارا لے کر جواب دہی کر سکیں گے؟ اگر عاقبت کی ہمیں فکر ہو اور ہم خود اپنی خیر چاہتے ہوں تو یہ کام کرنے سے پہلے ہم کو دین کے محفوظ طریقہ کی طرف رجوع کرکے اطمینان کر لینا چاہیئے کہ وہاں کسبِ فیض یا قبولیتِ دعا کے لئے یہ راستہ بتایا گیا ہے یا نہیں۔ صحابہ نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ مبارک پر کبھی چلہ کھینچا یا مراقبہ کیا؟ تابعین نے کبھی کسی صحابی کی قبر پر یہ کام کیا؟ فقہا و محدثین میں سے کسی نے اس کو مشروع طریقہ بتایا؟ سب سے بڑھ کر خود اللہ میاں نے قرآن میں کہیں یہ تعلیم دی کہ قبروں پر حصولِ فیض یا استجابتِ دعا کے لئے جاؤ؟ یا اللہ کے رسولؐ نے اس طریقِ کار کی طرف کوئی اشارہ کیا؟ ان ذرائع سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہو تو اطمینان کے ساتھ یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ بالکل غلط

ہی سہی، مشتبہ تو ماننا ہی پڑے گا - ایسا مشتبہ کام کر کے کیا ہیں۔ یہ خطرہ مول نہ لوں گا کہ شاید آخرت میں وہ غلط ثابت ہو اور میں اللہ تعالیٰ کو اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکوں کہ جب دین کی حقیقی راہ معلوم کرنے کے قابلِ اعتماد ذرائع موجود تھے تو میں مشتبہ ذرائع کی طرف کیوں گیا ؟

(۳) کسی بزرگ کی قبر پر جا کر اس طرح کہنا کہ اے ولی اللہ! آپ ہمارے لئے اللہ سے دُعا کریں ؟ کیا درست ہے ؟

جواب: - کسی بزرگ سے اپنے حق میں دعائے خیر کی درخواست کرنا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے - آدمی خود بھی اللہ سے دعا مانگ سکتا ہے، اور دوسروں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ میرے لئے دعا کرو - لیکن وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر یہ درخواست پیش کرنا، معاملہ کی نوعیت کو بالکل ہی بدل دیتا ہے - قبر پر یہ بات کہنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں - ایک یہ کہ آپ اپنے دل میں، یا چپکے چپکے ایسا کہیں - اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ ان بزرگ کی سماعت کی شان وہی کچھ سمجھ رہے ہیں جو اللہ کی ہے کہ :-

اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ -

تم اپنی بات آہستہ کہو یا زور سے، وہ تو دلوں کا حال بھی جانتا ہے !

دُوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ زور زور سے اُن ولی اللہ کو پکار کر یہ بات کہیں - اس صورت میں اعتقاد کی خرابی تو لازم نہ آئے گی، مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانا ہو گا - ہو سکتا ہے کہ آپ پکار رہے ہوں اور وہ نہ سُن رہے ہوں - کیونکہ سماعِ موتیٰ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا سماع تو ممکن ہو، مگر اُن کی روح اس وقت وہاں تشریف نہ رکھتی ہو - اور آپ خواہ مخواہ خالی مکان پر آوازیں دے رہے ہوں - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی روح تشریف فرما تو ہو مگر وہ اپنے رب کی طرف مشغول ہوں، اور آپ اپنی غرض کے لئے چیخ چیخ کر اُن کو الٹی اذیت دیں - دُنیا میں کسی نیک آدمی سے دعا کرانے کے لئے آپ جاتے ہیں تو مہذب طریقہ سے پہلے ملاقات ہوتی ہے، پھر آپ عرض مدعا کرتے ہیں، یہ تو نہیں کرتے کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر بس چیخنا شروع کر دیا - کچھ پتہ نہیں کہ اندر ہیں یا نہیں ہیں - ہیں تو آرام میں ہیں یا کسی کام میں مشغول ہیں - یا آپ کی بات سننے کے لئے خالی بیٹھے ہیں - اب غور کیجئے کہ وفات یافتہ بزرگوں کے معاملہ میں جب ہمارے لئے اُن کے احوال معلوم کرنے اور اُن سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے - تو اُن کے مکانوں پر جا کر اندھا دھند چیخ پکار شروع کر دینا آخر کس معقول آدمی کا کام ہو سکتا ہے ! دعا کروانے کا یہ طریقہ اگر قرآن و حدیث میں سکھایا گیا ہوتا، یا اس کا کوئی ثبوت موجود ہوتا کہ صحابہ کے عہد میں یہ رائج تھا - تب تو بات صاف تھی - بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کام کیا جا سکتا تھا - لیکن جب وہاں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا تو آخر ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی ایک صورت تو صریحاً صفاتِ الٰہی کے تصوّر سے ٹکراتی ہے - اور دوسری صورت علانیہ غیر معقول نظر آتی ہے !

(۴) یہ جو دعاؤں میں "بجاہ فلاں" اور "بحرمتِ فلاں" کا اضافہ ملتا ہے - اس کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟ سُنّتِ رسُول کیا بتاتی ہے، صحابہ کا کیا معمول رہا ہے ؟ اور اس طرح (بجاہ - بحرمت) دعا مانگنے سے کوئی دینی قباحت تو لازم نہیں آتی ؟

جواب: - دعا میں اللہ تعالیٰ کو کسی کے جاہ و حرمت کا واسطہ دینا، وہ طریقہ نہیں ہے جو اللہ اور اُس کے رسُول پاک سے

ہم کو سکھایا ہو۔ قرآن تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس تخیل سے بالکل خالی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے صحابۂ کرام میں سے بھی کسی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ انہوں نے اس طرح خود دعا مانگی ہو، یا کسی کو اس طرح دعا مانگنے کی تعلیم دی ہو۔ اب میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں میں یہ تخیل کہاں سے آگیا کہ رب العالمین کے حضور دعا مانگتے وقت اُسے کسی بندہ کی جاہ و حرمت کا حوالہ دیں۔ یا اس سے یہ عرض کریں، کہ اپنے فلاں بندے کے طفیل میری حاجت پوری کر دے میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا کرنا ممنوع ہے، میں صرف دو باتیں کہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ایسا کرنا اس طریقے کے مطابق نہیں ہے جو رب العالمین نے خود ہمیں دعا مانگنے کے لئے سکھایا ہے۔ اور اس طریق دعا سے بھی مطابقت نہیں رکھتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے براہ راست شاگردوں کو بتایا تھا۔ اس لئے اس سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حضورؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام آخر یہی بتانے کے لئے تو آئے تھے کہ خدا اور بندوں کے درمیان ربط و تعلق کی صحیح صورت کیا ہے اور جب انہوں نے اس کی یہ صورت نہ خود اختیار کی، نہ کسی کو سکھائی، تو جو شخص بھی اسے اختیار کرے گا وہ معتبر چیز کو چھوڑ کر غیر معتبر چیز اختیار کرے گا۔ دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے تو اس طریق دعا میں بڑی کراہیت محسوس ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے معنی سے صرف نظر کرلے اور اس میں کراہیت کا وہ پہلو محسوس نہ کرے جو مجھے نظر آتا ہے۔ میں جب اس طرز دعا کے مضمرات پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے کچھ ایسی تصویر آتی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑی سخی داتا ہستی ہے، جس کے دروازہ سے ہر کہ و مہ کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ جس کا فیض عام ہے جس کا دربار کھلا ہے، جس سے ہر مانگنے والا مانگ سکتا ہے۔ اور کسی پر اس کی عطا و بخشش بند نہیں ہے۔ ایسی ہستی کے حضور ایک شخص آتا ہے اور اس سے سیدھی طرح یہ نہیں کہتا کہ اے کریم و رحیم! میری مدد کر۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اپنے فلاں دوست کی خاطر میری حاجت پوری کردے، مانگنے کے اس انداز میں یہ بدگمانی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی صفت رحم و کرم کی وجہ سے کسی کی دستگیری کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے دوستوں اور چہیتوں اور مقربوں کی خاطر احسان کر دیا کرتا ہے! ان کا واسطہ نہ دیا جائے تو گویا آپ اس کے ہاں سے کچھ پانے کی امید نہیں رکھتے۔ اور بجاہ فلاں کہہ کر مانگنے میں تو معاملہ بدگمانی سے بھی آگے نکل جاتا ہے! اس کے معنی تو یہ ہوئے گویا آپ اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فلاں بڑے آدمی کا متوسل آیا ہوں، میری درخواست کو کسی بے وسیلہ آدمی کی سی درخواست سمجھ کر نہ ٹال دیجئے گا۔ اگر یہ اس طرز دعا کے مضمرات نہ ہوں تو مجھے سمجھا دیا جائے، بڑی خوشی ہوگی کہ میرے دل کی کھٹک اس معاملہ میں نکل جائے گی۔ لیکن اگر اس کے واقعی مضمرات یہی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا صحیح تصور رکھتا ہو وہ ایسا طرز دعا اختیار کرنے کا خیال بھی کیسے کر سکتا ہے!

(مولانا مودودی نے اپنے دوسرے خط میں تحریر کیا ہے کہ "پچھلے مضمون میں الٰہی بحق فلاں اور بجاہ فلاں کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کے ساتھ ہدایہ[1] کی یہ عبارت بھی شامل کر دیں:۔

ویکرہ ان یقول الرجل فی دعائہ بحق فلان وبحق انبیائک ورسلک لانہ لاحق للمخلوق علی الخالق۔

اور یہ مکروہ ہے کہ آدمی اپنی دعا میں بحق فلاں، بحق انبیاء و رسل کہے، کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے!

---

[1] فقہ حنفی کی یہ مستند ترین کتاب ہے (ایڈیٹر)

عملی شرک

.... اِنِّی کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۔ (ابراہیم)

(اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اس سے بری الذمہ ہوں)

یہاں پھر شرکِ اعتقادی کے مقابلہ میں شرک کی ایک مستقل نوع، یعنی شرکِ عملی کے وجود کا ایک ثبوت ملتا ہے، ظاہر بات ہے کہ شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی نہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، اور نہ اس کی پرستش کرتا ہے، سب اس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں، البتہ اس کی اطاعت اور غلامی، اس کے طریقہ کی اندھی یا آنکھوں دیکھی پیروی ضرور کی جارہی ہے، اور اسی کو یہاں شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب جواب میں فرمائیں کہ یہ تو شیطان کا قول ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے! لیکن ہم عرض کریں گے کہ اول تو اس کے قول کی اللہ تعالیٰ خود تردید فرمادیتا۔ اگر وہ غلط ہوتا، دوسرے شرک عملی کا صرف یہی ایک ثبوت قرآن میں نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد ثبوت پچھلی سورتوں میں گزر چکے ہیں اور آگے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو ارباب من دون اللہ بنائے ہوئے ہیں (آلِ عمران۔ ۷) جاہلیت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ پیروؤں نے انھیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام) خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنے والوں کے متعلق یہ فرمانا کہ انھوں نے اپنی خواہشِ نفس کو خدا بنالیا ہے (الفرقان۔ رکوع ۴) نافرمان بندوں کے متعلق یہ ارشاد کہ وہ شیطان کی عبادت کر رہے ہیں (یٰس۔ رکوع ۴) انسانی ساختہ قوانین پر چلنے والوں کو ان الفاظ میں ملامت کہ اذنِ خداوندی کے بغیر جن لوگوں نے تمہاری شریعت بنائی ہے، وہ تمہارے "شریک" ہیں۔ (الشوریٰ رکوع ۳) یہ سب کیا اس عملی شرک کی نظیر نہیں ہیں، جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، ان نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کوئی شخص غیر اللہ کو عقیدتاً خدائی میں شریک ٹھہرائے، اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدائی سند کے بغیر یا احکامِ خداوندی کے علی الرغم، اس کی پیروی اور اطاعت کرتا چلا جائے، ایسا پیرو اور مطیع اگر اپنے پیشوا اور مطاع پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی عملاً یہ روش اختیار کر رہا ہو، تو قرآن کی رُو سے وہ اس کو خدائی میں شریک بنائے ہوئے ہے، چاہے شرع میں اس کا حکم بالکل وہی نہ ہو، جو اعتقادی مشرکین کا ہے!

(تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ ابوالاعلیٰ مودودی)

مولانا قاری محمد طیب

علمِ غیب

کتاب و سنت اور عقل و نقل کی روشنی میں

مسئلہ علم غیب کے سلسلہ میں سب سے پہلا مرحلہ اس کی تعریف کا ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں۔ سو اس سلسلہ میں خاتم المحققین حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ علم غیب کی تعریف کرتے ہوئے فتح العزیز میں تحریر فرماتے ہیں :-

"زیرا کہ من (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) عالمِ غیب نیستم و ادعاء این علم نمی کنم چنانچہ سابق ازیں معبودان شما از جنیاں می کردند۔ بلکہ پروردگارِ من عالم الغیب است و غیر اورا ایں علم حاصل نیست زیرا کہ غیب نام چیزیست کہ از ادراک حواس ظاہرہ و باطنہ غائب باشد نہ حاضر۔ تا بمشاہدہ ماہ آں دریافتہ شود و اسباب و علامات آں نیز در نظر عقل و فکراں در نیاید تا بہ ہدایت استدلال دریافتہ شود۔ (فتح العزیز پارہ تبارک الذی ص ۱۷۲)

(کیونکہ میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) عالم غیب نہیں ہوں۔ اور اس علم کا ادعا نہیں کرتا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے (فرضی معبود) جنات کیا کرتے تھے۔ بلکہ میرا پروردگار، عالم الغیب ہے، اس کے سوا کسی کو یہ علم حاصل نہیں۔ کیونکہ غیب نام اس چیز کا ہے جو ظاہری اور باطنی حاسّوں کی دریافت سے غائب ہو۔ اُن سے مستحضر نہ ہو سکے۔ کہ اسے مشاہدہ سے دریافت کر لیا جائے، نیز اس کے اسباب و علامات بھی عقل و فکر کی نظر میں نہیں آسکتے۔ کہ استدلال ہی سے وہ حاصل ہو جائے)

امام راغب آیت کریمہ یقذفون بالغیب کے تحت لکھتے ہیں :-

قولہٗ و یقذفون بالغیب من مکان بعید اَیْ من حیث لا یدرکونہ ببصرھم ولا بصیرتھم!

اللہ تعالیٰ کے قول و یقذفون بالغیب میں غیب کے معنی یہ ہیں کہ نہ اس کی ادراک بصر (حاسۂ نگاہ) سے کر سکیں گے نہ بصیرت یعنی کسی اندرونی حاسہ سے کر سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ بصیرت اندرونی وجدان ہے جو عقل و فکر اور سوچ بچار یا کشف و انکشاف سے بنتا ہے اس لئے حاصل یہ نکلا کہ غیب وہ ہے جو انسان کی اپنی کسی بھی ادراکی قوت سے خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے۔ پھر وہ کیسے حاصل ہو؟ سو اُس کے بارے میں خود امام راغب ہی لکھتے ہیں کہ :-

والغیب فی قولہ تعالیٰ یومنون بالغیب مالا یقع تحت الحواس ولا تقتضیہ
بداھۃ العقول وانما یعلم بخبر الانبیاء علیھم السلام (مفردات راغب صفحہ ۳۷۳)

اور غیب اللہ تعالیٰ کے قول یومنون بالغیب میں وہ ہے کہ جو نہ حواس کی گرفت میں آسکے نہ
عقلی تقاضوں سے دریافت ہوسکے بلکہ وہ صرف انبیاء کی خبر سے جانا جائے!

بہرحال یہاں تک غیب کی تعریف یہ نکلی کہ حواس وعقل اور کشف و انکشاف سے بالاتر ہو۔ صرف پیغمبر کی خبر سے دریافت ہوتا ہو۔ لیکن غیب کے یہ معنی ظاہر ہے کہ ہمارے اعتبار سے ہی ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی اطلاع کا تعلق ہم ہی سے ہے۔ لیکن اگر خود پیغمبر کے بارے میں سوال ہو کہ انھیں یہ علم کیسے حاصل ہوا تو ظاہر ہے کہ پیغمبر کے لئے خود اسی پیغمبر کی خبر کو ذریعہ علم کہنا تو لایعنی بات ہوگی، اسلئے قدرتی طور پر یہی کہا جائے گا کہ علم غیب کے لئے جو وسائل امت کے حق میں منفی ہیں، یعنی عقل ونظر اور فکر و بصیرت وغیرہ کہ اُن سے اُمت کو علم غیب حاصل نہیں ہوسکتا، وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے۔ کہ انبیاء کو بھی اُن وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبر میں خدا کی خبر ذریعۂ علم غیب بنے گی۔ جس کو وحی کہتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ علم غیب کا ذریعہ مخلوق کے لئے صرف وحی ہے۔ جو پیغمبر پر براہ راست ہوتی ہے۔ اور اُمتی کو اس کی نقل بواسطہ پیغمبر پہنچتی ہے اور اس طرح نبی اور اُمتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہوسکتے ہیں۔ خود اپنی کسی ادراکی طاقت عقل و نظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہوسکتے۔۔!

اب آگے یہ سوال کہ خدائے برحق غیب پر کس طرح مطلع ہے؟

تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ بلا کسی سبب اور بلا کسی وسیلہ کے خود بخود اُس پر مطلع ہے، اس کا علم وسائل کا محتاج نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی خود ہر کمال کا سرچشمہ ہے اور ساتھ ہی محیط الکُل بھی ہے، تو وسیلہ آئے تو کہاں سے آئے۔ مثلاً اگر اس کا علم کسی بیرونی ذریعہ سے حاصل شدہ مانا جائے تو اُس سے باہر ہے کون، جو اُسے علم پہنچائے، وہ خود ہی سب کا باہر کہ اس کا لامحدود احاطہ کے ہوتے ہوئے باہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس کا احاطہ ہر جہت میں لامحدود ہے۔۔۔ واللہ بکل شیئ محیط۔ نیز اس کے علمی احاطہ سے کوئی چیز باہر رہتی ہی نہیں۔ کہ باہر کسی علمی وسیلہ کی بود و نمود ہو۔ واحاطہ بکل شیئ علماً اگر اس سے اوّل کوئی وسیلہ علم مانا جائے تو اس سے پہلا ہے کون۔ جو اسے علم سکھائے، کہ وہی سب کا اوّل ہے، اُس کے بعد اگر کسی کو وسیلہ مانا جائے، تو اس کا بعد ہے کب کہ کوئی اس کے بعد آئے۔ کیونکہ وہی سب کا بعد اور آخر ہے۔ اس کے اُوپر کوئی وسیلہ علم مانا جائے تو اُس سے اُوپر کون ہے۔ کہ اُس پر علم کا اثر ڈالے کہ وہی سب سے اُوپر ہے اور اس کے اندر ذات سے الگ کوئی استعداد اور قوت مانی جائے جو علم قبول کرے، تو اس کے اندر غیر ذات ہے کون، جو باہر کا علمی اثر قبول کرے، کہ وہی سب کا اندرون اور باطن ہے!

هو الاول لیس قبلہ شیئ وھو الاخر لیس بعدہٗ شیئ وھو الظاھر لیس فوقہ شیئ
وھو الباطن لیس دونہ شیئ۔

وہی اوّل ہے اُس سے قبل کوئی شے نہیں۔ وہی آخر ہے اس کے بعد کوئی شے نہیں۔ وہی ظاہر ہے
اُس سے اُوپر اور نمایاں کوئی شے نہیں۔ وہی باطن ہے اس کے اندر کوئی شے نہیں!

غرض اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جو اوّل، آخر، ظاہر و باطن ہے! جس میں صفات کمال بھری ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کی

ذات سے صادر ہو رہی ہیں۔ منبع کمال خود ذات ہے، ذات کو صفات کمال سے عروج نہیں ہے بلکہ صفات کمال کو ذات سے عزت ملی ہے کہ وہ اُس سے اسی طرح پھوٹ رہی ہیں جیسے سورج سے شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ پس جیسے سورج کی عزت کرنوں سے نہیں بلکہ کرنوں کی عزت ذات سے ہے۔ کہ اس سے وابستہ ہیں۔ ایسے ہی علمی اور عملی کمالات سے اسے عزت نہیں ملی بلکہ ان کمالات کی عزت اس لئے ہے کہ وہ ذات عزت کے آثار ہیں۔ اور اس سے سرزد شدہ ہیں!

پس ذات خول نہیں ہے کہ صفات اس میں پانی کی طرح بھری ہوئی ہیں۔ بلکہ صمد ہے، ٹھوس ہے کہ ہر کمال ذات کا جوہر ہے۔ جو ذات سے سرزد ہو رہا ہے، اس لئے غیب اُس کی ذات کا جوہر ہے۔ کسی خارجی، داخلی یا اُوپر نیچے کے وسیلے یا سبب سے حاصل شدہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذات خود بذاتہٖ عالم الغیب ہے تو علم غیب اصل میں ذاتِ حق کی چیز ہوئی کسی غیر کی نہ ہوئی۔ کیونکہ جو غیر بھی غیب پر مطلع ہوگا وہ اُس کے واسطہ سے ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ علم کا کسی واسطہ سے آنا ہی اُس کی دلیل ہے۔ کہ وہ علم اپنا نہیں۔ جیسے بلا واسطہ از خود ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ علم اپنا ہے، اس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ علم غیب صرف حق تعالیٰ کی چیز ہے، وہیں علم غیب کی جامع تعریف بھی نکل آئی کہ:۔

علم غیب وہ ہے جو بلا واسطہ اسباب ہو، جب بھی وہ بلا واسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہ ہوگا۔ بلکہ علم غیب کی ہوبہو حکایت اور من وعن نقل ہوگی۔ اور سب جانتے ہیں کہ علم کے عادی وسائل میں سے وحی الٰہی بھی ایک وسیلہ ہے، بلکہ اوّلین وسیلہ ہے، جس کے توسط سے عالم بشریت کے علم کی ابتدا ہوتی ہے!

کشف ہو یا الہام، فراست ہو یا وجدان، سب بعد کے وسائل اور وحی کے دست نگر توابع میں سے ہیں۔ خود اصل نہیں۔ اس لئے عادتاً حصولِ علم کا سب سے پہلا، سب سے زیادہ، قطعی اور یقینی وسیلہ یہی وحی الٰہی ہے! جس کے ذریعہ سے انسان علم سے آشنا ہو کر عالم کہلاتا ہے۔ پس جیسے سمع، بصر، عقل وخرد، حدس وتجربہ، کشف والہام، علم کے کھلے اور چھپے ذرائع ہیں۔ جن کے راستہ سے عالم الغیب والشہادۃ اس ظلوم وجہول انسان کو علم سے سرفراز فرماتا ہے۔

ایسے ہی وحی بھی ایک رفیع المنزلت اور لطیف ترین وسیلہ علم ہے، جو صرف انبیاء علیہم السلام جیسے لطیف الاجسام، لطیف الارواح لطیف القلوب اور لطیف الاسرار مقدس گروہ کو عطا ہوتا ہے اور وہ اُس کے واسطہ سے علومِ الٰہیہ، مرضیاتِ خداوندی اور شرائع ربّانی کو جذب کرتے ہیں! یا اُن کی پاکیزہ ارواح غیب کے عالم کی طرف رُخ کرتی ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل اور تمام علوم و کمالات کا سرچشمہ ہے۔ وہاں انھیں حقائق اور ملکوت کا رُوحانی مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ اُن سے علم اخذ کر کے دُنیا کو دیتی ہیں۔ جس سے دُنیا میں علم کی روشنی پھیلتی ہے اور جن وبشر عالم کہلائے جانے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وحی کے سوا دُوسرے وسائل کسبی ہیں، جنھیں مشق ومحنت اور ریاضت ومجاہدہ سے حاصل کر کے حصولِ علم کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن وحی الٰہی نبوت کے بغیر نہیں ہوتی اور نبوت محض ایک موہبتِ الٰہی ہے جو بہ انتخابِ خداوندی منتخب افرادِ بنی آدم کو دی جاتی ہے۔ اس لئے وحی بھی ایک موہبتِ ربّانی ہے جو بلا کسب ومجاہدہ محض عطاءِ الٰہی سے مخصوص نفوس قدسیہ کو دی جاتی ہے!

اللہ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ

اس لئے وحی کا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے جس میں شک کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہوتی کہ اُن کی بُنیاد انتخابِ الٰہی اور عطاءِ ربّانی کی طاقتوں پر ہے۔ جس میں زوال واضمحلال کی کوئی صورت نہیں۔ اور وحی کے سوا ہر وسیلہ علم سے حاصل شدہ یقینی اور غیر یقینی دونوں جہتوں میں منقسم ہو سکتا ہے کہ اُس کی بُنیاد خود بشری قوت پر ہوتی ہے۔ جو کمزور بھی ہے اور ممکن الزوال بھی ہے!

لیکن اس کسب اور وہب کے فرق سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وحی اور غیر وحی دونوں علم کے وسائل ہیں۔ جو عادتاً بنی آدم کو دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض وسائل بلا استثناء ہر انسان کو حسب لیاقت عطا ہوئے، جیسے سمع، بصر اور عقل و خرد وغیرہ، اور بعض مخصوص طبقات کو ملے ہیں۔ جیسے کشف و الہام وغیرہ۔ اور بعض اخص خواص طبقہ کو دیئے گئے۔ جیسے وحی خداوندی جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ہم علم غیب کی تعریف کی روشنی میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ اس کے معنی بلا واسطہ سبب علم کے ہیں۔ اس لئے پیغمبروں کی خبر سے ہمیں اگر وہی علم حاصل ہو جو اُن کو ہوتا ہے۔ تو وہ علم غیب نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک عادی سبب یا واسطہ سے پہنچا اس لئے اسے حکایت و بیانِ علم غیب کہا جائیگا حقیقی علم غیب نہیں کہا جائیگا۔ کیونکہ علم وحی کے وسیلہ سے پہنچا ہے اور علم غیب وہ ہے جو عادی اسباب کے واسطہ سے سامنے نہ آئے!!

اس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے معنی لغت میں تو کسی مخفی شے کے جان لینے کے ہیں۔ لیکن شریعت میں علم غیب کا لفظ لغت نہیں بلکہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی چھپی ہوئی یا غائب اشیاء کے جان لینے کے نہیں بلکہ اُس علم کے ہیں جو عادی وسائل کے واسطہ کے بغیر خود بخود حاصل ہو۔ یعنی وہ اسباب عادیہ سے غائب ہو اور جو اُن کے ذریعہ نمایاں نہ ہو۔

مثلاً۔ ہم حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوسات کا علم حاصل کریں تو اسے علم غیب نہیں کہا جائے گا۔ گو علم سے پہلے یہ محسوسات ہم سے غائب اور مخفی تھیں اور بلحاظ لغت اُن کے علم کو علم غیب کہنے کی گنجائش ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اصطلاحی علم غیب نہ ہوگا۔ کیونکہ ان محسوسات کا علم ہم نے اُن اسباب کے ذریعہ حاصل کیا جو عادتاً اس علم کے حصول کے قدرتی اسباب ہیں۔ یا مثلاً ہم نے سوچ بچار، عقل و تدبر اور فکر و نظر سے چند نامعلوم نتائج معلوم کر لئے جو بلاشبہ ہمارے لحاظ سے غیب تھے۔ لیکن نہیں کہا جائے گا کہ ہمیں علم غیب حاصل ہو گیا۔ کیونکہ ان نتائج کا ادراک ہمیں فکر و نظر اور سوچ بچار کے وسیلہ سے ہوا۔ جو اس علم کے حاصل کرنے کے طبعی اسباب مانے جاتے ہیں اور اسباب طبعیہ کے توسط سے جو علم حاصل ہو اسے اصطلاح میں علم غیب نہیں کہا جاتا!

یا مثلاً تجربہ سے ہمیں بہت سی مخفی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو ناتجربہ کاروں کو معلوم نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی ان مخفیات کے علم کو علم غیب نہیں کہیں گے۔ کیونکہ تجربہ خود آلاتِ علم میں سے ہے، جو عادتاً تجرباتی علوم کے لئے بطور سبب اور وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے۔

یا مثلاً اہل اللہ اور اولیائے کرام کو کشف و الہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے جو یقیناً ایک مخفی امر تھا تو لغتاً تو اُسے علم غیب کہہ سکیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا۔ لیکن شرعاً علم غیب نہ کہیں گے۔ کیونکہ کشف و الہام بھی بہر حال حصولِ علم کا ایک قدرتی اور عادی وسیلہ ہے۔ جو مخصوص افراد کو دیا جاتا ہے اور وہ اُس کے ذریعہ بڑے بڑے اسرار پر مطلع ہو جاتے ہیں!

بہر حال علم کے حسّی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے، اُن سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علمِ غیب نہیں کہا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علمِ غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلا توسط اسباب از خود ہو۔ تو حاصل یہ نکل آیا کہ علم غیب بجز ذاتِ بابرکاتِ خداوندی اور کسی کے لئے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا۔ وہ عطاء الٰہی ہوگا۔ اور مذکورہ وسائل میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطہ سے ہوگا، خواہ

وحی سے ہو یا کشف الہام سے، تجربہ سے ہو یا حواس سے ہو، یا عقل و خرد سے۔ یعنی ظاہری وسائل کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے ـــ!

اس لئے علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے اور یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی بھی بشر کو علم غیب حاصل نہیں۔ جبکہ کوئی بھی غیر اللہ بلا توسط اسباب خود بذاتہٖ عالم نہیں ہو سکتا۔ خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء۔ ملائکہ ہوں یا ارواح قدسیہ۔ یہ الگ بات ہے کہ انبیاء اور بالخصوص سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات کے علوم سے بدرجہا زائد اور فائق ہے۔ لیکن پھر بھی وہ حاصل شدہ علم بہرحال وحی سے ہے، جو اسباب عادیہ میں سے علم کا ایک سبب اور اعلیٰ ترین سبب ہے۔ اس لئے کسی پیغمبر پر بھی عالم الغیب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے علم غیب کو حصر کے ساتھ جگہ جگہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف منسوب اور اُسی کے ساتھ مخصوص بتلایا ہے۔ فرمایا:۔

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ۔

تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے سو منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

...　　...　　...

لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ۔

وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ ـــ!

اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات ہر آسمانوں کی اور زمین کی اور اور اُسی کی طرف رجوع ہے!

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ۔

اور اُسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ اُن کو کوئی نہیں جانتا، اُس کے سوا ـــ!

...　　...　　...

وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ

اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو بُرائی کبھی نہ پہنچتی۔

پہلی آیت میں مثبت انداز میں اِنَّمَا کے ساتھ علم غیب کا اثبات صرف اللہ کے لئے کیا گیا جو حصر کا کلمہ ہے، دُوسری میں نفی عام کے بعد استثنائے کلمہ سے علم غیب کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا جو حصر کی ترکیب ہے۔ تیسری آیت میں تقدیم خبر تاخیر مبتدا کے ساتھ مرجع الامر اور عالم الغیب، صرف ذاتِ حق کو بتلایا گیا جو حصر کا اسلوب ہے۔ اور چوتھی آیت میں سید الاولین والآخرین نے حکماً اور مامور ہو کر اپنے سے علم غیب کی نفی فرمائی اور جب آپ کو ہی علم غیب نہیں جو کمالات بشری کے منتہا اور خاتم ہیں۔ تو مخلوقات میں کون رہ جاتا ہے جس کے لئے یہ کمال ثابت کیا جائے!

اس لئے نتیجتاً علم غیب کا استحقاق اور ثبوت حصر کے ساتھ صرف حق تعالیٰ کے لئے ہی رہ جاتا ہے اور حاصل یہ نکل آیا کہ عطائے علم حقیقی علم غیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ قرآنی تصریحات کے مطابق علم غیب صرف اللہ رب العزت کو ہے اور کسی کو نہیں!

اس سے دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ علم غیب کا لفظ مختصیات اور مغیبات ہی کے ساتھ خاص نہ ہوگا، جبکہ اس کے معنی ہی مخفی شے کے جاننے کے نہیں، بلکہ بلا سبب بالذات جاننے کے ہیں، خواہ وہ چھپی ہوئی ہو یا کھلی ہوئی۔ اس لئے آسمان و زمین کا جاننا، ذروں اور ستاروں کا علم اور ستارے کی محسوسات کا علم بھی علم غیب ہو سکتا ہے، اگر بلا توسط اسباب عادیہ ہو یعنی عطاء غیر نہ ہو۔ بلکہ ذاتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ بالذات ہر شے کا ادراک کماہی حق تعالیٰ کے سوا دُوسرے کو نہیں۔

کیونکہ اس کا علم کسی وسیلہ اور ذریعہ کا محتاج نہیں، بلکہ ذاتی ہے، اس لئے جو اپنے ذاتی علم سے جو چیز بھی جانتا ہے اُسے علم غیب کہیں گے، خواہ وہ شے معلوم لغوی غیب ہو یعنی مخفی ہو یا لغوی شاہد ہو یعنی مشاہد ہو۔ غرض نہاں و عیاں سب کے علم کو علمِ غیب کہیں گے، جبکہ وہ بالذات ہو، نہ کہ محض مخفی شئے کے علم کو علم غیب کہا جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کسی شئے کا غیب یا مخفی ہونا ہمارے لحاظ سے ہے نہ کہ حق تعالیٰ کے لحاظ سے کہ اس کے سامنے تو ہر چیز ہمہ وقت حاضر اور عیاں ہے، اگر چھپی ہوئی اور اوجھل شئے کے جاننے کا نام علم غیب ہوتا تو حق تعالیٰ کو کسی وقت بھی عالم الغیب نہ کہہ سکتے وہاں کوئی چیز بھی غیب یعنی مخفی اور اوجھل ہے ہی نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ ذاتِ حق میں علم غیب کے معنی مخفیات کے علم کے نہیں بلکہ بالذات علم کے ہیں جو اسباب عادیہ کے واسطہ کے بغیر اور ان سے بالاتر ہو کر محض ذات سے ہو اور ذات ہی علوم کے منشاء انکشاف ہو اور یہ صرف اُسی کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے!

بخلاف بشر کے کہ بہت سی مخفیات اور امور غائبہ کے بعد بھی اُس سے غائب ہی رہتی ہیں، جیسے جنت و نار، عرش و کرسی لوح و قلم وغیرہ کا قطعی علم اور حتمی عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ اشیاء ہم سے غائب ہیں۔ اس لحاظ سے لغوی توسعات اگر عالم الغیب کہلایا جا سکتا تھا تو صرف انسان نہ کہ ذاتِ حق۔ لیکن جبکہ شرعاً علم غیب کے معنی بھی یہ نہیں کہ مخفی کو جان لیا جائے، بلکہ یہ ہیں کہ اشیاء کو بلا توسط وسائل ذاتی طور پر جانا جائے تو اس لحاظ سے اللہ کے سوا کوئی غیر اللہ عالم الغیب نہیں ہو سکتا۔ صرف خدا ہی کو عالم الغیب کہنے کا حق ہوگا۔ اس لئے اس کی عمومی شان فرمائی گئی:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ
وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ۔

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا۔ سب سے بڑا برتر۔ برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے
اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے، رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو۔

بس وہ غیب و شہادۃ کو بطور علم غیب کے جانتا ہے، یعنی بلا توسط اسباب بذاتہ اس پر مطلع ہے۔ خواہ اُس کے یہ معلومات ہماری نظر سے چھپی ہوئی ہوں یا ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں۔ بس غیب و شہود ایک تو معلوم کی صفت ہے۔ وہ لغت ہے یعنی آنکھ، ناک، کان وغیرہ حواس سے اوجھل چیز تو غیب ہے اور ان مدرکات کے سامنے آئی ہوئی چیز مشہود ہے۔ اور ایک غیب صفت علم کی ہے، وہ اصطلاح شریعت ہے جس سے مراد حسب معروضۂ سابق وہ علم ہے جو حواس ظاہرہ و باطنہ اور عادی اسباب علم سے بالاتر ہو کر خود ذات میں موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ذات بجز اللہ کے دوسری نہیں کیونکہ اس کا علم خود اپنا اور اپنی ذات سے ہے، کسی کا دیا ہوا یا کسی کے واسطہ سے نہیں۔ کہ اسے وسیلہ اور سبب کی ضرورت پڑے۔ اس کے سوا جسے بھی کچھ علم ہے جو اُس کے دینے سے ہے از خود نہیں اور اس کا دینا ہی بالواسطہ علم کا آنا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی عطا یا اسباب ظاہرہ سے ہوگی جیسے حواس ظاہرہ یا اسباب باطنہ سے ہوگی، خواہ وہ اسباب خفیہ ہی ہوں جیسے عقل و کشف، الہام اور وحی۔ چنانچہ شق اوّل کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ
وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔

اور اللہ نے تم کو نکالا، تمہاری ماں کے پیٹ سے۔ نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو۔ اور دیئے تم کو کان، آنکھیں
اور دل تاکہ تم احسان مانو۔!

شق ثانی کی نسبت فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَا۔ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے، تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور ایمان۔ ولیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اُس سے راہ سمجھا دیتے ہیں جس کو ہم چاہیں اپنے بندوں میں سے۔ اور بیشک تو سیدھی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ !

دوسری جگہ فرمایا:-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۔ !

یہ خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو۔ اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلموں کو کہ کون پرورش میں لے مریم کو اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے !

بہرحال ذاتی علم کی نفی جیسے عام انسانوں سے کی گئی جو ماؤں کے پیٹ سے نکالے ہوئے ہیں، ایسے ہی سید الاولین والآخرین سے ہی کی گئی اور عطائی علم کا اثبات جیسے عام بشر کے لئے آیت اولیٰ میں کیا گیا ہے جیسے اپنے جعل اور اپنے خلق کی طرف منسوب کے صرف اپنی عطا فرمایا گیا، ایسے ہی سید الاولین والآخرین کے علم کو بھی اپنی ہی عطا کہا گیا۔ اور اپنے جعل کی طرف منسوب کیا گیا۔ ق اتنا ہی ہے کہ وحی عطاءِ محض ہے، جو بلا کسب و ریاضت کے ہے، کیونکہ رسالت کے تابع ہے اور رسالت کو حیث یجعل سالتہ فرما کر موہبتِ الٰہی قرار دیا گیا ہے ! اور سمع و بصر یا فوادی حرکت کسبی ہے، جس میں غور، بچار، تجربہ، حدس، اور سارے اکتسابی ائل آجاتے ہیں۔

لیکن قدر مشترک دونوں میں یہ ہے کہ انسان خواہ مشاہدات کا علم حاصل کرے یا مخفیات کا۔ چونکہ وہ اسباب عادیہ کے تابع ہے وہ حسی ہوں یا معنوی، اس لئے اُس کا علم ذاتی نہ ہوگا، عطائی ہوگا اور عطائی علم چونکہ اسباب عادیہ کے تحت تھے۔ اس لئے ں کے حامل کو "عالم الغیب" نہ کہیں گے، ہاں حق تعالیٰ کا علم ان چیزوں کے متعلق خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا لغتہً چھپی ہوئی ں۔ علم غیب ہوگا ـــ کہ سارے اسباب سے بالاتر محض ذاتی ہے جس میں عطائی ہونے کا شائبہ تک نہیں !

اس لئے عالم غیب صرف اللہ کی ذات بابرکات ثابت ہوتی ہے جسے عالم الغیب والشہادۃ کہہ کر علی الاطلاق، م غیب منوایا گیا ہے، پس جہاں غیب و شہادۃ کو تقابل کے ساتھ لایا گیا ہے، وہاں یہ شہادۃ و غیب علم کی صفت نہیں ہوگی بلکہ لومات کی صفت ہوں گی، جو علم الٰہی میں آئی ہوئی ہیں۔ جن کو لغتہً شاہد و غائب کہیں گے۔ لیکن جہاں غیب خدائے ق کے علم کی صفت بن کر آیا ہے۔ وہاں وہ لغت نہیں بلکہ اصطلاح ہوگا۔ جس کے معنی وہی بلا توسط اسباب ذاتی علم کے ں گے، جو از خود کسی کی عطا سے نہ ہو۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا گیا:-

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔

اور کوئی چیز نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں ـــ !

یہاں غائبہ اشیار معلومہ کو کہا گیا ہے جو صرف ہمارے اعتبار سے غائب ہیں، اور نہ اُس پروردگار کے لحاظ سے کوئی چیز غائب نہیں۔ سب اُس کے سامنے حاضر ہے — !

لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ

غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں اور نہ زمین میں، اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو نہیں کھلی کتاب میں!

قرآن کی اس تصریح کے باوجود کہ کوئی چیز بھی اُس سے کسی وقت بھی غائب نہیں، ہر چیز ہمہ وقت اُس کے سامنے حاضر ہے۔ کہ اس کا علم ہی حضوری ہے حصولی نہیں، پھر بھی اُسے عالم الغیب کہا جا رہا ہے، تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ عالم الغیب ہونے کے معنی اشیار غائبہ کے جان لینے کے نہیں بلکہ تمام اشیار کو ذاتی طور پر جاننے کے ہیں۔ جس میں اسباب و وسائل کا ادنیٰ دخل نہ ہو۔ جس سے واضح ہے کہ یہ غیب کسی غائب کی صفت نہیں جو لغت ہے بلکہ اسباب سے بالاتر اور بالذات کے معنی میں ہی جو اصطلاح شریعت ہے۔ اس لئے کوئی بشر باصطلاح شریعت اور بمعنیٰ مذکور عالم الغیب بن ہی نہیں سکتا۔ کہ اُس کے لئے علم غیب کلی یا جزئی کا سوال پیدا ہو۔ بلکہ غیب بایں معنی (علم بالذات) خاصۂ خداوندی ہو گا کہ اُسے کسی نے معاذ اللہ وحی والہام سے یہ باتیں نہیں بتائیں۔ نہ اُس نے کسی تجربہ یا حدس سے یہ علم فراہم کیا۔ کہ یہ سب صورتیں علم بالوسائل کی ہیں۔ علم بالذات کی نہیں۔ اور ان تمام طرق علم میں علم سے پہلے جہل رہنا ضروری ہے، جس سے ذاتِ حق بری اور منزّہ ہے!

بہرحال یہاں تک علم غیب کے معنی اور اس کے شرعی حکم کے بارے میں کتاب وسنّت کی تشریحات پیش کی گئیں، جن سے علم غیب کا شرعی نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اب آگے علم غیب کے اس معنی کی تشریح و توضیح اور اس سلسلہ میں کئے گئے شبہات کی مدافعت کی ضرورت رہ جاتی ہے، جنہیں سطور ذیل میں ملاحظہ کیا جائے — !

علم غیب کی تشریح اور متعلقہ شہادت کا رد

علم غیب کے مسئلہ میں جامع ترین ہدایت نامہ آیت اظہار غیب ہے، جس میں مختلف پہلوؤں سے علم غیب کا حکم، اُس کے اجزار ترکیبی اور اُس کے راستے سے نہ صرف حق تعالیٰ کی وحدانیت ہی کا ثبوت پیش کر دیا گیا ہے، جس سے علم غیب کی تخصیص اُس کی ذات بابرکات کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے! بلکہ دفاعی طور پر آیت کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلّی نفی اور اس سے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ہر ایک ذہنی خلجان کا جواب بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ آیت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے علم غیب کے مسئلہ کا جامع حکم اور معجزانہ بیان ہے۔ جس سے اس دائرہ کے تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ ارشاد حق ہے:۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا — !

اور غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ

پیغمبر کو، تو اس پیغمبر کے آگے پیچھے پہرہ چوکی بٹھلا دیتا ہے و محافظ فرشتے بھیجتا ہے اور خلقی قوتوں کی ناکہ بندی کر دیتا ہے) تاکہ اللہ جان لے (واضح کردے) کہ رسولوں نے (رسول ملکی نے نبی تک اور رسول بشری نے اُمت تک) اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن تمام باتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو ان (رُسل) کے پاس ہے۔ اور اُس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے!

ترجمہ سے آیت کا مفہوم ظاہر ہے، غور اس پر کیجئے کہ اس معجزانہ کلام میں حق تعالیٰ کو یکہ وتنہا، بلا شرکت غیرے عالم الغیب ثابت کرنے کی بناء اس پر رکھی گئی ہے کہ وہی تنہا بلا شرکت غیرے اطلاع دہندۂ غیب ہے۔ اسی کے بتانے اور ظاہر کرنے سے کسی کو غیب کی اطلاع ہو سکتی ہے، ورنہ کوئی صورت نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ کسی شئے کا پتہ دینے والا وہی ہو سکتا ہے جس کے علم میں وہ شئے ہو اور پتہ لینے والا وہی ہو سکتا ہے جو اُس شئے اور اس کے علم سے خالی ہو۔ ورنہ اگر پتہ دینے والا اس سے بھرپور نہ تھا تو اس نے پتہ کس چیز کا دیا؟ اور پتہ لینے والا اگر اس سے خالی نہ تھا تو اُسے لینے اور دوسرے کے آگے اپنے احتیاج ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لئے حق تعالیٰ کا اطلاع دہندۂ غیب ہونا اُس کے عالم الغیب ہونے کی دلیل نکلتا ہے۔ گویا ابتداءِ آیت میں کلمۂ "عالم الغیب" ایک دعویٰ ہے اور "فلا یظہر" اس کی دلیل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ اطلاع وہی اسی کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ آیت کا نظم اور انداز بیان بتلا رہا ہے تو عالم الغیب ہونا بھی لامحالہ اُسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیئے جو آیت کا مدعا ہے!

پس آیت کے مفاد کا حاصل یہ نکلا کہ وہی یکہ وتنہا عالم الغیب ہے اور وہی بلا شرکت غیرے اطلاع دہندۂ غیب ہے غور کیا جائے تو اس دعوے اور دلیل کو قرآن نے ایسے اعجازی اسلوب بیان سے ادا کیا ہے کہ اس دعوے پر جس قدر بھی شبہات وسوالات وارد ہو سکتے تھے، ان سب کا جواب اور دفعیہ بھی اسی آیت کے کلمات میں مہیا کر دیا ہے۔ کہیں باہر سے جواب لینے کی ضرورت نہیں۔!

(۱) مثلاً شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اطلاع دہندۂ غیب ہونے کی تخصیص حق تعالیٰ کے ساتھ کس طرح قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔ جبکہ بہت سی اُن اشیاء سے بھی ہم غیبی علوم پر مطلع ہو سکتے ہیں، جن کا عالم الغیب ہونا تو بجائے خود ہے سرے سے باشعور ہونا بھی ضروری نہیں، جیسے کتابوں کے اوراق، رسائل واخبارات کے پرچے۔ ریڈیو، لاسلکی اور گراموفون وغیرہ کی مشینوں سے بھی کتنے ہی مخفی معلومات اور شرعی وطبعی حقائق کی ہمیں اطلاع ہوتی رہتی ہے۔ تو کیا ان اشیاء کو عالم الغیب کہنے کی اس لئے جرأت کی جائے گی کہ وہ غیبی علوم کی اطلاع دہی کرتی ہیں اور کیا غیب کی یہ اطلاع دہی خاصہ خداوندی باقی نہ رہے گی؟ سو اس شبہ کا مسکت اور قاطع جواب اس آیت کے کلمۂ "فلا یظہر" میں دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اظہار یا اطلاع غیب اختیاری فعل ہے، جو کسی صاحب اختیار ہی سے سرزد ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ روئی کے کاغذ اور لوہے کی مشینیں با اختیار اشیاء نہیں ہیں کہ ارادہ سے اطلاع دہی کا فعل کر دکھلائیں۔ یعنی یہ اشیاء وسائل اطلاع ہیں، اطلاع کنندہ نہیں۔ کہ اُن کی غیر ارادی اور غیر شعوری نشاندہی کو اطلاع غیب کہا جائے۔ چہ جائیکہ اُن کے بارے میں غیب دانی کا کوئی سوال پیدا ہو۔ اس لئے ان مثالوں سے حق تعالیٰ کی اطلاع دہندگیٔ غیب کی خصوصیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا!

(۲) مگر اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر اطلاع کنندۂ غیب کے لئے با اختیار اور باشعور شخصیت ہونا ہی ضروری ہے کہ اس کے بغیر اُس پر عالم الغیب کا اطلاق کسی طرح نہیں آسکتا تو اس سے اُن با اختیار اشخاص کا عالم الغیب ہونا

لازم آئے گا جو اپنے ارادہ و اختیار سے غیبی باتوں کی اطلاع دیتے ہیں۔ گو وہ اس غیب کا خود کوئی شعور نہیں رکھتے۔ مثلاً
حدیث نبویؐ میں فرمایا گیا ہے کہ:-

رب حامل فقہ غیر فقیہ — کتنے ہی حاملانِ فقہ خود فقہ سے نابلد ہوتے ہیں!

اندریں صورت یہ غیبی علوم کی اطلاع و خبر رسانی پھر حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ رہی، جو اس آیت کا سب سے
مقصد اور مفاد تھا۔ سو اس شبہ کو زائل کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس اطلاع غیب کی آیت کو اپنے ذاتی نام (اللہ)
سے شروع کرنے کے بجائے اپنی صفت عالم الغیب سے شروع فرمایا۔ تاکہ پہلی ہی نظر میں واضح ہو جائے کہ اطلاع
دہندہ غیب وہی ہو سکتا ہے جو خود بھی غیب دانی کی صفت سے متصف اور عالم الغیب ہو۔ نہ کہ محض اطلاع کنندہ
ذریعہ خبر رسانی ہو۔

الغرض وحی الٰہی میں مہبطِ وحی یعنی نبیؐ کے ذاتی تفکر اور تجربہ اور سعی و جستجو کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور نہ خطرات و وسا
کی مخفی قوتیں (شیاطین) ذرہ برابر دراندازی کر سکتی تھیں کہ اُن پر پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا تھا۔ قبولِ وحی کے لئے نبی کی
فطرتِ ملکی مہبط بن جاتی تھی جو صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ جو علم کا قطعی اور غیر مشتبہ واسطہ اور وسیلہ ہے۔ لیکن
پھر وسیلہ ہی ہے، اس لئے وسائل سے حاصل شدہ علم کے حامل کو "عالم الغیب" نہیں کہہ سکتے کہ "عالم الغیب" ص
اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ جس کا علم عطائی نہیں، ذاتی ہے! علم کا اطلاع دہندہ نہیں کہا جائے گا کہ حق تعالیٰ کی ا
دہیٔ غیب میں کسی قسم کے شرک کا واہمہ پیدا ہو۔ پس علم غیب کی اطلاع دہی کی شان صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص
جبکہ وہی عالم الغیب بھی رہا۔ اور وہ اطلاع دہندۂ غیب بھی —!

(۳) ہو سکتا تھا کہ اس پر کوئی یوں کہے کہ اگر اطلاع دہیٔ غیب کے لئے خود کا غیب سے باخبر ہونا ضروری ہے تو یہ شان
غیر اللہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ منجم، جفار، رمال، کاہن، طبیب، پامسٹ وغیرہ بہت سی پیشین گوئیاں کر
مستقبل کی خبریں اپنے علم و مہارت اور ظن و تخمین سے دیتے ہیں اور وہ بسا اوقات پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ نیز اولیا
اپنے کشف و فراست سے بہت سے غیبی حقائق و اسرار پر مطلع ہو کر دوسروں کو مطلع کر دیتے ہیں۔ اور وہ اکثر و بیشتر صحیح
واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ جو اُن کے غیب داں ہونے کے ساتھ ساتھ اطلاع دہندۂ غیب ہونے کی بھی بیّن دلیل
تو پھر اطلاع غیب اور علم غیب کی تخصیص ذاتِ حق کے ساتھ کہاں باقی رہی؟

اس شبہ کا جواب بھی فلا یظھر ہی کے کلمہ میں موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت کی رُو سے غیب
خدا کی اطلاع کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان خبر دینے والوں میں سے کسی کو بھی یہ باتیں خدائی اطلاع یعنی
سے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ یہ لوگ فنی طور پر قواعدِ فن سے استدلال کر کے ان معلومات تک پہنچتے ہیں۔ جو ظن و
حدود سے آگے نہیں بڑھتیں اور سب جانتے ہیں کہ ظنی امور جیسے اتفاقی طور پر واقعہ کے مطابق ہو سکتے ہیں، ایسے
خلاف واقعہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ کہ اُن میں نہ قطعیت کی شان ہوتی ہے نہ یقینی ہونے کی۔ اس لئے جب تک انھیں
میزان میں تول کر اُن کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، وہ یقین کے قابل نہیں ہوتے۔

ایسے ہی اولیاء اللہ کا کشف، اُن کے ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے نہ کہ اطلاع حق کا نتیجہ۔ اس لئے وہ شر
نہیں ہوتا کہ اس سے اشتباہ و التباس کلیتہً رفع نہیں ہوتا۔ جس سے وہ کتاب و سنت کی طرح قطعی یقین کے لائق

جب تک وحی الٰہی پر پرکھ کر اُس کا کھرا کھوٹا معلوم نہ کر لیا جائے۔ اس لئے اُن کی پیشین گوئیوں کو بھی جو اُن کے کسب و محنت کے ثمرہ کے طور پر خود اُن ہی میں سے نکلی ہوئی ہیں نہ کہ اطلاعِ حق سے ظاہر شدہ ہیں، نہ علمِ غیب کہیں گے نہ اطلاعِ غیب۔ چہ جائیکہ خود اُن پر عالم الغیب یا اطلاع کنندۂ غیب کا اطلاق کیا جائے۔ پس عالم الغیب اور اطلاع دہندۂ غیب ہونا صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات کی خصوصیت رہ جاتی ہے جس میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں ہو سکتا!

(۴) اگر اس پر یہ شبہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا علم تو بہرحال اطلاعِ خداوندی سے حاصل ہوتا ہے، جس سے وہ غیب پر مطلع ہو کر دوسروں کو اطلاع دیتے ہیں اور ساتھ ہی اُن کا یہ علم ظنی بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ قطعی ہوتا ہے کہ وحی سے زیادہ قطعی اور یقینی اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

اس لئے وہ تو کم از کم اصولِ مذکورہ پر اطلاع دہندۂ غیب اور عالم الغیب کہلائے جانے کے ضرور مستحق ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں یقیناً عالم الغیب کی صفت حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص باقی نہیں رہتی، جو اس آیت کا مفاد اور منشار تھا۔ سو اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے علیٰ غیبہٖ کے لفظ سے فرما دیا ہے۔ یعنی علیٰ غیبہٖ کے کلمہ سے غیب کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اور بالفاظِ دیگر غیب کو اپنی ذاتی چیز بتلا کر واضح فرما دیا کہ وہ اطلاع دہندۂ غیب اور عالم الغیب اس لئے ہے کہ اس نے کسی سے اطلاع پا کر غیب کی اطلاع نہیں دی اور وہ کسی کے بتائے سکھائے سے غیب دان نہیں ہوا۔ بلکہ غیب اس کی اپنی ذاتی چیز ہے اور وہ بذاتہٖ عالم الغیب ہے۔ بخلاف انبیاء و رسل کے کہ وہ اگر غیب کی باتیں اُمت کو بتاتے ہیں، تو نہ اس لئے کہ یہ غیب اُن کی ذات میں تھا یا وہ از خود اُس پر ازل سے مطلع تھے۔ بلکہ اللہ کے بتانے اور سکھانے پر انہوں نے غیبی حقائق پر اطلاع پائی اور اطلاع دی، اس لئے انبیاء کرام کو "عالم الغیب" نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا یہ علم بالواسطہ ہے، گو قطعی اور یقینی ہے، اس لئے علیٰ غیبہٖ کے کلمہ سے واضح ہو گیا کہ ذاتِ خداوندی غیب دان اور اطلاع دہندۂ غیب اس لئے ہے کہ غیب اس کی ذاتی چیز ہے اور وہ غیب پر بذاتہٖ مطلع ہے۔ جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں — !

(۵) لیکن اس پر بھی اگر کوئی خفیف العقل یہ کہے کہ اگر علمِ غیب کے لئے بالذات ہونا ضروری ہے جو بلا کسی واسطے کے اور بغیر کسی کی اطلاع کے از خود ذات سے اُبھرے تو ہمارے محسوسات اور معقولات کا علم بھی علمِ غیب ہونا چاہیئے، کیونکہ حواسِ خمسہ، آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد سے دیکھ کر، سُن کر، سونگھ کر، چکھ کر اور چھُو کر جو کچھ علم ہمیں ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی ذات سے ہم میں اُبھرتا ہے۔ جس میں کسی دوسرے کی مدد شامل نہیں ہوتی۔ ہم ہی دیکھتے، سُنتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہماری آنکھ کان سے نہیں دیکھتا، سُنتا، کہ اس کے دیکھے سُنے کو ہم اپنا علم بنا لیں۔ یا خالص عقلی انکشافات میں خود ہماری ہی عقل و قوتِ فکریہ یا قوتِ خیالیہ ایک علم کا انکشاف کرتی ہے، جو کسی سے مانگ کر نہیں لایا جاتا۔ نہ کسی دوسرے کی عقل ہم میں گھُس آتی ہے۔ جس سے ہمیں یہ علم ہوا ہو۔ بلکہ یہ خود ہماری ہی عقل کی تگ و دو ہوتی ہے۔ اس لئے یہ علم ہمارا ذاتی علم ہوا، جو از خود ہے از غیر نہیں۔ اس لئے اسے علمِ غیب کہنا چاہیئے، اور اس کی اطلاع دہی کو اطلاعِ غیب!

سو اس وسوسہ کا جواب کلمہ فلا یظھر اور کلمۂ رَصَدًا کے مجموعہ میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ عقل و سمع یا سوچ بچار کا علم اطلاعِ خداوندی سے نہیں، بلکہ تخلیقِ خداوندی سے ہے اور خلقی شعور یا خلقی سوچ بچار کو اطلاعِ خداوندی نہیں کہتے کہ علمِ غیب کا سوال پیدا ہو۔ بلکہ سوچ سوچ کر کوئی بات پیدا کر لینا خود اس کی دلیل ہے کہ

وہ ہم میں نہیں تھی، کہیں سے لائی گئی ہے، اگر وہ ہم میں ہوتی تو اس میں اس کاوش اور دماغ سوزی کی ضرورت نہ پڑتی، بلکہ اُسے ہمارے ذہن میں ہر وقت موجود رہنا چاہیئے تھا، جیسے خود ہماری ذات کا علم ہمیں سوچ سوچ کر لانا نہیں پڑتا ہر وقت ہم میں قائم رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہماری ذات ہی چونکہ عارضی ہے۔ اس لئے وہ علم بھی عارضی ہو، دوامی نہ ہو۔ جس پر علم غیب کا شبہ ہو — !

دوسرے یہ کہ محسوسات اور معقولات کا علم گو بظاہر ذات کی قوتوں سے اُبھرنے کی وجہ سے ذاتی جیسا نظر آتا ہے مگر یہ قوائے ذات جبکہ خود ذات کی اپنی قوتیں نہیں، بلکہ ذات میں ودیعت شدہ ہیں کہ ودیعت رکھنے والا جب چاہے رکھ دے اور جب چاہے نکال لے، اس لئے وہ گھٹتی بڑھتی اور آتی جاتی رہتی ہیں، تو اُن سے حاصل شدہ علم بھی اپنا یا اپنی ذات کا نہیں کہلایا جائے گا۔ اُسے بھی ودیعت شدہ ہی کہا جائے گا کہ جب چاہے ودیعت کرنے والا اسم میں ڈال دے اور جب چاہے نکال لے۔ چنانچہ اس سمع وبصر اور فواد کے علم کی انسانی عمر کی ابتداء میں بھی اس سے نفی کی گئی ہے۔ کہ لا تعلمون شیئاً[1]۔ اور انتہا میں بھی نفی کی گئی ہے کہ لکیلا یعلم[2] بعد علم شیئاً جس سے واضح ہے کہ اس ابتداء وانتہاء کے درمیان گھڑی ہوئی محدود مدت کے لئے یہ عقل وحس کا علم آجاتا ہے اور آخر میں اول کی طرح رخصت ہوجاتا ہے، جو اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ علم انسان کا اپنا نہیں جسے ذاتی کہہ کر اُس پر علم غیب کا لیبل چپکا دیا جائے — !

پھر اگر یہ حواس وعقل انسان میں دوامی بھی ہوتے تب بھی اُن کے واسطہ سے حاصل شدہ علم بالواسطہ ہی ہوتا جو علم غیب نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ابتداء مضمون میں اُس کے اصطلاحی معنی عرض کئے جا چکے ہیں۔ اور جبکہ یہ وسائل بھی خود ذات اور نفس کے قبضے کے نہیں جنہیں ہماری ذات نے اپنے اندر خود وضع کر لیا ہو، بلکہ جہاں سے ہماری ذات نے جنم لیا ہے، وہیں سے یہ قویٰ اور وسائلِ ادراک وشعور بھی آئے ہیں۔ تو خود وسائل بھی بالذات نہ رہے، بلکہ بالواسطہ ہوگئے۔ اس لئے ترتیب یوں ہوگئی کہ ان سے حاصل شدہ علم تو عقل وحس کے واسطہ سے ہوا اور عقل وحس وغیرہ ذات کے واسطہ سے ہوئے اور خود ذات خالق کے واسطہ سے نمودار ہوئی۔ تو یہ علم بہ واسطہ ہم تک پہنچا، سوا ایسے واسطہ در واسطہ علم کو اپنا علم یا ذاتی علم کہنے کی جرأت وہی کرے گا جسے علم وعقل سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ چہ جائیکہ اس علم پر علم غیب کا عنوان قائم کیا جائے — !

یہی وجہ ہے کہ وحی کے وقت ان تمام ظاہری وسائلِ علم فکر وخیال اور حدس وتجربہ وغیرہ نیز تمام قوائے

---

[1] اشارہ ہے آیت کریمہ واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون، کی طرف جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور اُس نے تم میں سننے دیکھنے اور سمجھنے کے آلات رکھے !

[2] اشارہ ہے آیت کریمہ ثم یردّ الی ارذل العمر لکیلا یعلم بعد علم شیئاً۔ کی طرف۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ انسان پھر (انجام کار) لوٹا دیا جائے گا ایک ذلیل ترین عمر کی طرف، تا کہ جاننے کے بعد کچھ بھی جانکار نہ رہے !

حسیہ، سمع و بصر، ذوق و مذاق وغیرہ، اور پھر تمام جذباتِ طبیعیہ، شہوت و غضب اور سرور و حزن وغیرہ پر پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا تھا۔ کہ نزولِ وحی کے وقت اُن کی آمیزش سے وحی کا علم قطعی مشتبہ نہ ہونے پائے۔ بلکہ ان طبعی وسائل سے حاصل شدہ معلومات بھی جو پہلے سے قوتِ حافظہ میں محفوظ ہوتی ہیں، یا عام طبعی عادات و اخلاق جو خلقتاً طبیعت میں بطور جوہرِ نفس کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، وحی کے وقت سب پیچھے ہٹا دیئے جاتے تھے۔ اور انھیں وحی اُترنے کے اوقات میں سبقت کرنے اور آگے بڑھنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ زبان کی حرکت تک کے بارے میں یہ فرمایا گیا:۔

لا تحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه ثم ان علینا بیانه

(اے پیغمبر) اپنی زبان نہ ہلایئے کہ (وحی کو یاد کرنے میں) جلدی کرنے لگیں، ہمارے ذمہ ہے اُس کا (آپ کے سینہ میں) جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) پڑھوا دینا، پھر اُس کو کھول دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔!

(۶) یہاں پہنچکر ایک خلجان یہ دامنگیر ہوتا ہے کہ عالم الغیب صرف خدا ہی کی ذات سہی۔ اور یہ بھی مسلّم کہ تنہا وہی اطلاع دہندۂ غیب بھی ہے، اُس کے سوا نہ کوئی عالم الغیب ہے نہ اطلاع دہندۂ غیب، خواہ وہ رسول بشری ہو یا رسول ملکی۔ لیکن جبکہ اللہ نے خود بھی انھیں اپنے غیب پر مطلع کر دیا جیسا کہ یہ آیت اس کا واضح اعلان کر رہی ہے تو نفسِ علم میں تو کم از کم اللہ تعالیٰ سے مماثلت ہو گی۔ جس کا علم "ماکان و مایکون" پر حاوی ہے۔ تو اس آیت کی رُو سے "علم ماکان و یکون" اللہ کی طرح رسولوں کے لئے بھی ثابت ہوا۔ گو یہ فرق بھی مسلّم سہی کہ اللہ کا علم ذاتی ہو اور رسولوں کا عطائی یا ایک کا علم اصطلاح میں علمِ غیب کہلائے اور ایک کا مطلق علم مگر مقدار علم میں تو کم از کم خالق و مخلوق کی مساوات لازم آ گئی، حالانکہ مساوات سے بڑھ کر اور کیا شرک ہو سکتا ہے اور وہ بھی علم میں کہ بقیہ ساری صفات اسی اعلیٰ صفت کے تابع ہیں، اس میں برابری نتیجۃً ساری ہی صفات میں برابری ہے۔ پس یہ آیت جس شرک دفع کرنے کے لئے آئی تھی اسی شرک کے اثبات کا اس طرح ذریعہ بھی بنا دی گئی۔ بلکہ اُوپر سے کئی آیتوں کی تردید بھی اسی سے لازم آ گئی۔ ایک طرف افمن[1] یخلق کمن لا یخلق کی تردید ہو گئی اور دوسری طرف لیس[2] کمثله شیء کی تکذیب لازم آ گئی۔ (العیاذ باللہ)

تو اس عظیم خلجان کو اسی آیت کریمہ کے لفظ "مِنْ رَسُولٍ" نے دفع کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس استثنائی ترکیب میں اطلاعِ غیب کے سلسلہ میں کسی پیغمبر کا نام نہیں لیا کہ فلاں فلاں کو غیب پر مطلع کیا گیا۔ کہ اس سے ان مقدسین کی ذوات مستحق اطلاعِ غیب سمجھی جاتیں، بلکہ "مِنْ رَسُولٍ" کا لفظ لا کر وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ اطلاعِ غیب کی مستحق اور متقاضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصفِ رسالت ہے۔ بالفاظِ دیگر اس اطلاعِ غیب کا تحمل صرف وصفِ رسالت ہی کر سکتا ہے، کسی بشر کی ذات یا وصفِ بشریت حتیٰ کہ بشریت کے دوسرے اُونچے اُونچے کمالات تقویٰ و طہارت، زہد و قناعت اور صلاح و رشد وغیرہ میں سے

---

[1] کیا خالق اور مخلوق برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی کبھی نہیں۔
[2] کوئی چیز اس کی مانند نہیں ہو سکتی۔ (برابر تو کیا ہوتی)

بھی کوئی وصف نہیں کر سکتا، خلاصہ یہ کہ جیسے علم غیب اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں کوئی غیر اللہ شریک نہیں، ایسے ہی اللہ کی جانب سے غیب پر مطلع ہونا رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں کوئی غیر رسول شریک نہیں۔ پس اطلاعِ غیب کا استحقاق ذاتِ رسول کے ساتھ نہیں، بلکہ وصفِ رسالت اور عہدہ و منصبِ نبوت کے ساتھ مخصوص نکلا، جو لفظ "مِن رَّسُولٍ" کا طبعی تقاضا ہے۔ ورنہ اس موقع پر مِن رَّسُولٍ کا لفظ لانا عبث اور بے معنی ہو جاتا!

اور ظاہر ہے کہ رسول کی رسالت کا موضوع اور مقصد اصلاح خلق اللہ اور بندگانِ خدا کی رہنمائی اور تربیت و تکمیل ہے۔ اس لئے وصفِ رسالت کا فطری تقاضا وہی علومِ غیب ہو سکتے ہیں جو ہدایت و اصلاح میں کار آمد ہوں۔ جن علومِ غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو تو خود وصفِ رسالت ہی اُن سے کنارے کنارے رہیگا۔ مثلاً مغیبات میں سے قیامت کے وقت اُس کی تاریخ و سنہ یا اُس کی مدت کے قرب و بُعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ اسی آیت کی ابتداء میں رسول سے اس علم کی نفی کرائی گئی ہے کہ:-

قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا

تُو کہہ میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے یا کر دے اُس کو میرا رب ایک مدت کے بعد!

یا وہ مفاتیحِ غیب پر مطلع نہ ہوں، یا اُن بے شمار کائناتی حوادث و جزئیات کا اُنھیں علم نہ ہو، جو روزمرّہ دُنیا میں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں بکثرت اس کی تصریحات موجود ہیں۔ تو یہ اُن کے حق میں نہ صرف یہ کہ ادنیٰ نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی اُن کے وصفِ رسالت کا ایک طبعی اقتضاء ہے، جیسے یوں کہا جائے کہ فلاں دیکھنے والے کو ہم نے سب کچھ بتا دیا ہے، یا فلاں سُننے والے کو ہم نے سب کچھ پتہ دے دیا ہے۔ تو اس کا صاف مطلب یہی ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو دیکھنے کی چیزوں کا اور سُننے والے کو سُننے کی چیزوں کا پتہ دیا ہے۔ کیونکہ یہ دیکھنے اور سُننے کا عنوان اپنے ہی مناسب حال معلومات کا تقاضا کر رہا ہے، پس دیکھنے والے سے اگر سُننے کی باتوں کی اور سننے والے سے اگر دیکھنے کی باتوں کی نفی کی جائے تو یہ اس دیکھنے سُننے کے وصف ہی کا تقاضا ہوگا، نہ کہ اپنی طرف سے کوئی اضافہ۔ ورنہ اس وصف کا لایا جانا ہی عبث اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا، جس سے بُلغاء کا کلام بری ہوتا ہے۔

اسی طرح کلامِ الٰہی کے اعجازی نظم میں جبکہ "مِن رَّسُولٍ" کی قید کے ساتھ وصفِ رسالت کا عنوان لا کر یہ کہا گیا کہ ہم نے رسُول کو غیب پر مطلع کر دیا ہے، تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اس وصفِ رسالت اور منصبِ رسالت سے متعلق امورِ غیب بتلائے ہیں۔ خلق کی تکوین و تدبیرِ امر کی باتیں نہیں بتلائیں، کہ وصفِ رسالت کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ جیسے اس آیت میں لفظ "مِن رَّسُولٍ" کا تقاضا یہ ہے کہ اطلاعِ غیب کا متقاضی اور مستحق رسالت کا وصف ہے اور یہ کہ اطلاعِ غیب منجانب اللہ رسُول ہی کو ہونی چاہیئے، نہ کہ غیرِ رسول کو، ایسے ہی لفظ "مِن رَّسُولٍ" ہی اس کا بھی متقاضی ہے کہ وہ اطلاع کردہ غیب وصفِ رسالت کے حسبِ حال بھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رسالت کے حسبِ حال غیب وہی ہو سکتا ہے، جو شرعی احکام اور اُنھیں مؤثر بنانے والے حوادث سے تعلق رکھتا ہو، نہ کہ اگلے پچھلے دُنیا کے روزمرہ کے تمام حوادث اور جزئی جزئی قصوں سے متعلق ہو۔ پس وصفِ رسالت ایسے غیر متعلق علوم کا متقاضی نہیں ہے!

اس سے صاف نکل آیا کہ "من رسول" کے لفظ کا فطری تقاضا اور قواعد فن کا اقتضاء یہ ہے کہ رسول جمیع غیب پر مطلع نہ ہوں بلکہ اطلاع خداوندی سے صرف اُتنے ہی غیب سے باخبر ہوں جو ہدایت و رہنمائی کے لئے ضروری ہو۔ خواہ وہ حوادث کا علم ہو یا احکام کا، تکوین کا ہو یا تشریع کا۔ اس لئے خدا و رسول کے علم کی برابری کا تخیل خواہ وہ کسی بھی نوعیت سے ہو اور خواہ اس پر ذاتی کا عنوان رکھا جائے یا عطائی کا لیبل چسپاں کیا جائے، لفظ "مِن رَّسُولٍ" کے تقاضوں کے خلاف بلکہ ان تقاضوں کی تردید کرنے کے مرادف ہے، جس کا منصوبہ وہی باندھ سکتا ہے جو قرآنی اسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بےخبر ہو۔ اس لئے خدا و رسول میں یہ علمی مساوات کا تخیل اور رسول کے لئے علم ماکان ومایکون کا منصوبہ اس آیت سے ہادر ہوا ہو جاتا ہے جو اسی آیت کو آڑ بنا کر قائم کیا گیا تھا۔!

(۶) ہاں اتنی بات باقی رہ جاتی ہے جو دلوں میں کھٹک سکتی ہے کہ یہ مسلّم کہ رسول علم غیب کلی پر مطلع نہیں، جس سے علمِ الٰہی کے ساتھ اُن کے علم کی برابری کا وسوسہ دلوں میں گزرے، لیکن جس قدر بھی علم انہیں دے دیا گیا ہے، کم از کم اتنے حصّہ میں تو جزئی کا علم، خدا کے علم کے مماثل ٹھہر گیا، اور یہ کہہ دیا جانا درست ہو گیا کہ فلاں فلاں امور میں جتنا علم خدا کا ہے، اُتنا ہی رسول کا بھی ہے۔ حالانکہ اولاً تو اس عنوان ہی سے شرک کی بو آتی ہے اور ساتھ ہی اتنے حصّہ علم میں مخلوق کا خالق سے استغنا بھی لازم آتا ہے۔ درحالیکہ مخلوق کو کسی آن اور کسی مرحلہ پر بھی خالق سے برابری یا غنا میسّر آنا ممکن نہیں، ورنہ مخلوق کی عبدیت و محتاجگی اور خالق کا غنا و صمدیت ختم ہو جائے، جو محال عقلی بھی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اور محال شرعی بھی ہے، کیونکہ آیتِ ذیل کھلی تردید ہے!۔

یاایہا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ہو الغنیّ الحمید۔

اے لوگو! تم محتاج ہو اللہ کی طرف اور اللہ غنی حمید ہے!

تو قرآن حکیم نے اس کھٹک کو بھی فلا یظہر ہی کے کلمہ سے رفع دفع کر دیا ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ تعلیم غیب کو اظہار غیب اور اطلاع غیب کے عنوان سے تعبیر فرمایا، عطاء غیب سے نہیں۔ جس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ رسولوں کو علم کا یہ حصّہ بعینہٖ سپرد نہیں کر دیا جاتا، صرف اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ نکلے کہ رسولوں کا یہ علم ذاتی تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ علمِ غیب کہلائے، عطائی بھی نہیں بن سکتا بلکہ صرف اطلاعی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو اظہار کے معنی لغت ہی میں عطاء کے نہیں کہ اظہارِ غیب کو عطاء غیب کہا جائے اور رسولوں کے علم کو عطائی علم کا عنوان دیا جائے۔ دوسری یہ کہ عطاء علم کے معنی مخلوق میں اس لئے بھی نہیں بن سکتے کہ عطاء دے دینے کو کہتے ہیں اور دے دینے کی حقیقت کسی شے کو اپنے سے جدا کر کے منتقل کر دینے کے ہیں! اپنے پاس رکھ کر اُس کی اطلاع کر دینے کو عطاء نہیں کہتے۔ اور ظاہر ہے کہ علم حق تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے، اس کا حق تعالیٰ سے جدا ہو کر منتقل ہو جانا محال ہے، ورنہ بصورت منتقلی وہ صفتِ ذات باقی نہیں رہ سکتی۔ جو عقلاً اور شرعاً محال ہے!

پس حق تعالیٰ بلاشبہ مُعطی اور عطا کنندہ ہیں۔ مگر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کی حد تک جو ذات کے اندر نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات یا ذاتیات کے حق میں معطی نہیں ہیں۔ کہ اپنی ذات دوسرے کو دے کر خدا بنا دیں اور خود معاذ اللہ خدا نہ رہیں۔ یا اپنی صفات اسے دے دیں اور خود معاذ اللہ معرّیٰ عن الصفات رہ جائیں، اسے فلاسفہ اور بندگانِ عقل گوارا کریں تو کریں

بندگانِ خدا کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔ ہاں ذات اور ذاتیات کی اطلاع فرما دینا اُن کی شانِ کریمی سے بعید نہیں۔ سو اطلاع کی صورت میں اطلاع کردہ شے اُن سے جدا نہیں ہوتی اور دوسرے تک بعینہٖ نہیں پہنچ جاتی، بلکہ اُس شے کی مثال اور تصویر پہنچتی ہے، جس کے معنی یہ نکلے کہ اطلاعی علم حکایتِ علم ہوتا ہے، عین علم نہیں۔ عین علم اصل عالم کی ذات ہی میں قائم رہتا ہے۔ کیونکہ عین علم یا اصل علم کے معنی یہ ہیں کہ عالم میں اُس کی جڑ اور اس کا منشاء قائم ہے۔ اور وہ اس کی ذات کا جوہر اور عین ہو۔ جو بلا وسیلہ اور بلا توسط اسباب خود بخود اُس میں موجزن، ہمہ وقت اس کے سامنے حاضر اور اُس میں سے اُمنڈتا رہتا ہے! جس میں نہ نسیان کا دخل ہے، نہ بھول چوک کا خلل، نہ کہیں سے اُسے لانے کی ضرورت ہے، نہ منتقل کرانے کی۔ جیسے کوئی اپنی ذات کو نہیں بھول سکتا، ایسے ہی اپنی خو بُو اور اپنی صفاتِ نفس کو بھی نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ بھول چوک ہمیشہ باہر سے حاصل شدہ چیزوں میں ہوتی ہے، جو اپنی اور اپنے قبضہ کی نہ ہو۔ خود اپنی اندرونی چیزوں میں نہیں ہوتی، یہی شان خالق کے علم کی بھی ہے کہ وہ ذات میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ یعنی خود ذات ہی منشاءِ انکشاف ہے! جس سے علم اس کی ذاتیات میں سے ہے!

ظاہر ہے کہ مخلوق کے علم کی یہ شان کبھی نہیں ہوسکتی، اگر مخلوق کا علم بھی اُس کا اپنا اور خانہ زاد ہوتا، یعنی اُس کی ذات ہی منشاءِ انکشاف ہوتی جس سے یہ علم ہمیشہ اُس کے سامنے حاضر رہا کرتا تو اس میں بھول چوک، نسیان و ذہول اور خطاءِ فکری و اجتہادی کبھی ممکن نہ ہوتی، حالانکہ وہ نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے اور انبیاء علیہ السلام تک کے حق میں شاذ صورتوں میں وقوعی امکان کے ساتھ ممکن ہے۔ جس سے واضح ہے کہ خالق کی طرف سے مخلوق میں علم اس طرح نہیں آسکتا کہ اپنے اصل چشمہ سے جُدا ہو کر یہاں پہنچ جائے اور مخلوق کا جوہرِ ذات بن جائے!

اس لئے یہی ایک صورت متعین ہو جاتی ہے کہ رسولوں کو جو علم بھی ہو وہ بعینہٖ ذاتِ حق سے منتقل ہو کر اُن میں نہ آئے بلکہ علم کے مخفی وسائل و اسباب (جیسے وحی و الہام) کے راستہ سے اُس کی حکایت اور شباہت اُن میں ڈال دی جائے۔ جو علم خداوندی کا عکس و ظل اور پرتو ہو اور اس طرح یہ پاکباز بندے اور اُن کے مصفّا قلوب نورِ علم سے منور ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے طلوعِ آفتاب کے بعد مثلاً شفاف آئینہ منور اور روشن ہو جاتا ہے، لیکن اصل نور آفتاب کی ذات ہی کے ساتھ قائم رہتا ہے، صرف اس کی ضیاء اور چمک یا اس کا عکس آئینہ پر پڑتا ہے۔ جس سے وہ روشن نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی یہ چمک دمک آئینہ کی ذاتی چیز نہیں بن جاتی۔ کہ وہ اُسے سورج سے جُدا کرکے اپنے پاس رکھ لے اور کسی حال میں اپنے سے جُدا نہ ہونے دے۔!

پس انبیاء علیہم السلام کے آئینۂ قلوب میں جس قدر بھی علم آتا ہے وہ ذاتِ حق سے منتقل اور جُدا ہو کر نہیں آتا کہ یہ محال ہے، بلکہ اطلاعِ حق سے اس کا پرتو اور ظل اُن میں سما جاتا ہے۔ جس سے اُن کے قلوب جگمگا اُٹھتے ہیں مگر یہ علمی چمک دمک بحالتِ اطلاع بھی ذاتِ حق ہی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ جیسا کہ وہ قبل از اطلاع ذاتِ حق کے ساتھ قائم تھی۔ اس لئے حضور کی ذات بابرکات اس علم خاص کی حد تک بھی خود منشاءِ انکشاف نہیں ٹھہرتی کہ وہ کُل کا کُل ہر وقت آپؐ کے سامنے رہتا ہو اور آپ علم شرائع کی حد تک گویا حاضر و ناظر ہوں۔ اس لئے کبھی کبھی "انسا" یعنی کسی آیت کا ذہن سے فراموش کردیا جانا) یا کسی ماحول کے باہمی نزاع سے کسی علم کا قلبِ مبارک سے اُٹھا لیا جانا بھی واقع کر دیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ رسولوں کو جتنا علم دیا جاتا ہے، وہ بھی جوہرِ ذات نہیں ہو جاتا کہ کبھی زائل نہ ہوسکے، یہ الگ بات ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے القا فرمودہ علم رسولوں سے کبھی زائل نہیں ہونے دیتے۔ یہ نسیان حرازی یا رفعِ علم کی چند مثالیں محض

اس لئے واقع کی جاتی ہیں کہ علم سے نابلد لوگ رسولوں کو اس القاشدہ علم میں بھی خدا کا شریک یا اُس سے بے نیاز نہ سمجھ بیٹھیں۔ بلکہ اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے حضورؐ پر شریعت کے مختلف مُہمات و مسائل کی وحی الگ الگ اور وقتاً فوقتاً کی گئی ہے۔!

یہ صورت نہ تھی کہ آپؐ کو نبوّت کے مقامِ رفیع پر پہنچا کر بیکدم اور اچانک ذاتِ پاک نبوی کو منشارِ علم بنا دیا گیا ہو اور ضرورتوں یا حوادث کے وقت خود بخود آپؐ کے اندر سے علم اُبھر آتا ہو! اگر یہ صورت ہوتی تو تیئیس ۲۳ برس تک تدریجی وحی نازل نہ ہوتی اور مسائل پوچھے جانے کے وقت آپؐ وقتاً فوقتاً یُوں نہ فرماتے کہ "مجھ پر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا" نیز آپؐ کبھی بھی کسی حکم کی وحی کے انتظار میں بار بار چہرۂ مبارک اُٹھا کر آسمان کی طرف نہ دیکھتے، جیسا کہ تحویلِ قبلہ کے بارے میں آپؐ نے کئی بار ایسا ہی کیا!

بہرحال حضورؐ کا یہ علمِ خاص (علم شرائع و احکام) بھی علمِ غیب نہیں ہے۔ اس لئے خدا و رسُولؐ میں اس علم خاص کی نوعیت کی حد تک بھی مساوات یا شرکت کا خیال باندھ لینا کہ یہ مخصوص علم جو خدا کو ہے وہی رسُولؐ کو ہے۔ فرق صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔ محض ایک خیالِ فاسد رہ جاتا ہے، جس کی کوئی سند کتاب و سُنّت سے نہیں نکلتی!

پس قرآنی کلمہ "فلا یظھر" نے اس جزوی مساوات کے شبہ کو بھی رد کر دیا اور واضح ہوگیا کہ مسئلہ علم میں کسی نہج سے بھی خدا و رسُولؐ میں کوئی مساوات یا شرکت نہیں، علم ہمہ وقت صرف اللہ تعالیٰ کو ہے!

اس حقیقت کی مزید تائید اس آیت کے جملہ واحاط بما لدیھم سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر رسُولؐ کی طرف اللہ کا یہ علم بعینہٖ منتقل ہو جاتا تو رسُولؐ کا یہ علم خدا کے علمی احاطہ سے نکل جاتا۔ حالانکہ اطلاع غیب کے بعد احاطہ کا لفظ بولا جانا اس کی واضح دلیل ہے کہ رسُولؐ جس علم پر مطلع ہیں اور اُن کے پاس جو بھی علمی سرمایہ ہے، وہ اب بھی بدستور خدا ہی کے علمی احاطہ میں ہے، اُس سے باہر نہیں، ظاہر ہے کہ کسی چیز کا کسی کے احاطہ میں گھِرا ہوا ہونا اُس کے اپنے ہاتھ میں ہونے اور اپنے قبضہ میں رہنے کی دلیل ہے، اگر اپنے پاس سے جُدا ہو جائے تو اُسے اندرونِ احاطہ نہیں کہہ سکتے!

پس اس اطلاعی علم میں (جس کا شرعیات یا متعلقاتِ شرعیات سے تعلق ہے) یہ محدود مساوات کا باطل تخیّل — اَحاطَ بما لدیھم سے بھی رد ہو جاتا ہے، پس اس مساوات کے شبہ کا جواب اولاً فلا یُظھر سے دیا گیا کہ یہ علم سرے سے منتقل شدہ ہی نہیں کہ مساوات کا سوال پیدا ہو، بلکہ صرف اطلاعی ہے اور پھر اَحاطَ بما لدیھم سے دیا گیا۔ کہ اطلاع کے بعد بھی وہ اُسی علیم وخبیر کے احاطہ میں گھِرا ہوا اور اُسی کے قبضہ ہی میں آیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس علم کو نہ رسُولؐ کا ذاتی علم کہہ سکتے ہیں، نہ عطائی۔ بلکہ صرف اطلاعی کہیں گے!

پس کہاں رسُولؐ کے لئے مدعیانِ عشقِ رسُولؐ کی طرف سے علم کلّی اور علم ماکان وما یکون کے بلند بانگ دعاوی اور کہاں قرآن کا یہ اعلان کہ وہ علم بہ نسبت علمِ الٰہی کے علمِ جزوی ہے اور وہ بھی صرف اطلاع کی حد تک ہے۔ جو ذاتِ حق سے کسی طرح جُدا نہیں کہ مخلوق میں بعینہٖ چلا آئے!

اس مرحلہ پر پہنچکر ممکن ہے کہ کوئی خارج از عقل انسان، خدا اور رسُولؐ کے علم میں برابری ثابت کرنے کے لئے یہ کہنے کی جراٴت کرے کہ جتنے علم پر خدا نے رسُولؐ کو مطلع فرمایا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا سارے کا سارا علم یہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو۔ تو اس صورت میں صورتِ مساوات پھر وہی پیدا ہو جاتی ہے، جس کو رفع دفع کیا گیا تھا۔ سو اس وسوسہ کے دفعیہ

کے لئے اسی آیت میں "اَحَاطَ بِمَا لَدَیْھِمْ" کے بعد "وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا" کا بھی اضافہ فرما دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل ہے کہ جو علم رسول کے پاس ہے، وہ تو اس کے احاطہ میں ہے ہی، اس کے علاوہ بھی ہر ہر چیز اور ہر ہر ذرّہ گن گن کر اس کے ع
میں ہے۔ اگر خدا کا سارا علم وہی ہوتا جس پر رسول کو مطلع کیا گیا تھا تو مساوات کے تخیّل کے دفعیہ کے لئے اَحَاطَ بِمَا لَدَ
ہی کا جملہ کافی تھا۔ اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد کُلَّ شَیْءٍ کے لفظ سے احصاء اور ذرّہ کے علمی احاطہ کا اعلان کیا جانا اس کی کھلی دلیل ہے کہ یہ کُلَّ شَیْءٍ کا علم اس مَا لَدَیْھِمْ کے علم کے علاوہ ہے جو رسول کی اطلاع میں آیا ہوا ہے، جسے غیر مَا لَدَیْھِمْ کہنا چاہیئے۔ پس ایک مَا لَدَیْھِمْ کا احاطہ ہے اور ایک کُلَّ شَیْءٍ کا احاطہ ہے ایک کا دوسرے پر عطف کیا ہوا ہے جو قواعد عربیہ کی رُو سے باہمی تغائر اور مغائرت کی دلیل ہوتی ہے۔ تو اس سے واضح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مَا لَدَیْھِمْ کا علم اور ہے، جس پر رسول مطلع ہیں۔ اور کُلَّ شَیْءٍ کا علم اس کے علاوہ بھی ہے۔ رسولوں کی اطلاع میں لایا جا چکا ہے اور پھر وہ لامحدود بھی ہے۔ جس میں ذرّہ ذرّہ شمار اور گنتی کے ساتھ علم ازلی میں آیا ہوا کیونکہ اسے کُلَّ شَیْءٍ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے احاطۂ کلّی صرف خدا ہی کے علم کا ثابت ہوتا ہے اور علم خد
رسول میں اس جناتی مساوات کا اب کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ جس کے داخل کرنے کی باطل سعی کی جاتی ہے، بلکہ علم خداوندی مشرکانہ تصور سے بالاتر ثابت ہو جاتا ہے!

اس موقع پر یہ خلجان ہو سکتا ہے کہ اطلاعِ غیب جبکہ رسول کے ساتھ مخصوص ہوئی اور رسالت کا مفہوم چاہتا ہے کہ غیب دوسروں کو بھی پہنچے، یعنی رسول اُس کی تبلیغ کریں، تو پھر اطلاعِ غیب محض رسولوں تک کہاں محدود رہی اور اس کی تخصیص کے ساتھ کہاں باقی رہی، جبکہ رسول کی اطلاع سے ہم بھی اُس پر مطلع ہو گئے۔ پس اس طرح آیت میں استثناء کی یہ تخصیص بے
رہ گئی، جو رسول کے ساتھ کی گئی تھی۔ سو اس کا جواب بھی اسی فَلَا یُظْھِرُ کے کلمہ ہی سے نکل آتا ہے، اور وہ یہ کہ اظہارِ غیب
اطلاع غیب کو استثنائی ترکیب کے ساتھ رسولوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اُمت کو اس غیب کی خبر اُس
یعنی وحی و الہام کے ذریعہ نہیں ہوتی، جس سے رسول کو ہوتی ہے۔ کیونکہ اُمت اوّلاً نبی کو اُن کی نشانیوں سے نبی مان کر پھر اُ
خبر کو تسلیم کرتی ہے، تو اُمت کا یہ علم استدلالی ہو جاتا ہے اطلاعی نہیں رہتا!

پس رسول اور اُمتِ رسول اس حد تک تو مشترک ہیں کہ دونوں کو علم غیب نہیں۔ یعنی بالذات دونوں علم نہیں رکھتے کہ خاصۂ الوہیت ہے اور رسول و اُمتِ رسول ظاہر ہے کہ دونوں از جنسِ بشر ہیں۔ تو اُن میں خاصۂ الوہیت آ جانا کیسے
ہے؟ البتہ اس میں الگ الگ اور باہم ممتاز ہیں کہ یہ علم رسول تک تو اطلاعِ خداوندی یعنی وحی و الہام سے پہنچتا ہے، ج
حفاظت کے لئے پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا ہے اور اُمت تک یہ علم استدلال سے آتا ہے کہ فلاں ذات بدلائل قطعیہ رسول
اور رسول کی خبر واجب التسلیم ہے اور واجب القبول ہے۔ البتہ رسول تک اس غیب کی اطلاع کا سلسلہ چونکہ مخفی او
ہے، اس لئے یہاں پہرہ چوکی بھی علم کے تمام مخفی وسائل پر جو انسان کے اندر ہوں بٹھلایا جاتا ہے۔ تاکہ وحی الٰہی غیر مشتبہ طر
رسول تک پہنچے۔ مگر اُمت کو یہی خبر چونکہ ظاہری وسائل سے پہنچتی ہے اور پیغمبر سے لے کر ہم تک اطلاع دہندہ سب
ہیں، جو خبر کی سند کے سلسلہ میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے یہاں پہرہ چوکی استدلالی رنگ کا ان ظاہری وسائل یعنی
سند اور طریق پر بٹھلایا گیا کہ راوی ثقہ ہوں، معلوم الحال ہوں، عادل ہوں، متقن ہوں، اور پھر ہر دور میں اتنے ہوں کہ عاد
عقلاً اُن کا جھٹلا دیا جانا محال اور فطرت کے خلاف ہو۔ پس اُمت کے اس اخبارِ غیب کی سند کا کم از کم متواتر ہونا

اگر یہ غیبی حکایت بلا اشتباہ پہنچے اور واجب القبول بن سکے۔ سو اصل اطلاعی غیب جو سارے علوم شرعیہ کی جڑ بنیاد ہے، یعنی قرآن کریم حضورؐ تک تو باطنی تواتر کے ساتھ انتہائی تحفظ سے پہنچا کہ جس میں بعض بعض آیتوں کے ساتھ علاوہ جبریل علیہ السلام کے ستر ستر ہزار فرشتوں کا لشکر ہوتا تھا، جو مِل کر اُس کی حفاظت کرتے تھے، جس میں تمام غیبی موانع یعنی جنات و شیاطین وغیرہ پر پہرہ چوکی بٹھلایا ہوا تھا، اور ہم تک یہی قرآن ظاہری تواتر کے ساتھ پہنچا کہ ہر ہر قرن میں دس بیس نہیں، ہزاروں ہزار مستند حفاظ سینوں میں لے کر اس کی روایت اور کتابت سے اُس کی حفاظت کرتے رہے، جن میں تمام ظاہری موانع اور انسانی تلبیس کے ممکن سے ممکن پردے اصولِ روایت کی رُو سے چاک ہوتے رہے اور کسی دراندازکو موقع نہ مل سکا کہ اُس کے الفاظ یا معنی میں کوئی ادنیٰ تحریف یا تلبیس کر سکے۔ وہاں رسولوں کو معصوم کہا گیا کہ عصمت ہر دراندازسے حق کو بچاتی رہے، یہاں اُمت کو مجموعی حیثیت سے "محفوظ" رکھا گیا کہ بحیثیت مجموعی اس سے حق منقطع نہ ہو اور یہ حق کا سرچشمہ (قرآن حکیم) بہرحال اپنے الفاظ و معانی اور اپنی شئون و کیفیات کیساتھ کلیتہً محفوظ رہے!

یہی قرآن کی اوّلین شرح اور تفسیر یعنی حدیث رسولؐ جو ناگزیر ہے، اس کا کوئی حصّہ تواتر سے ثابت ہے کوئی شہرت سے کوئی ندرت وغیرہ سے ثابت ہے اور کوئی غرابت سے، سو اُس کے درجات ثبوت ہی کی قدر، اُس کی قبولیت اور حجیت کے مراتب ہیں۔ جو فن میں محفوظ ہیں اور اس طرح قرآن اور حدیث اپنے اپنے درجہ میں کلیتہً اُمت میں محفوظ ہیں۔ جن پر ظاہری اور باطنی پہرے چوکی لگے ہوئے ہیں کہ کسی درانداز کو اُن کی تبدیل و تحریف کا موقع نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اُمت کی تیرہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے درانداز برساتی کیڑوں کی طرح بارہا اُبھرے اور مختلف رُوپوں میں نمایاں ہوئے۔ مگر بالآخر موسم نکل جانے پر خود ہی اپنی موت مرگئے، جن کا آج نشان پا تک نہیں ملتا۔ اور قرآن و حدیث اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ زندہ اور درخشندہ ہیں اور تا قیامت رہیں گے!

اس پاک و صاف مسئلہ میں بظاہر اب شبہات کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی اس موقع پر ممکن ہے کہ کسی شبک دماغ اور حیلہ جُو کو جسے توحید سے زیادہ شرک سے لگاؤ ہو، یہ وسوسہ گزرے کہ آیت اظہار غیب کی ان ساری مدافعتوں کے باوجود وہ شرک جسے علمی شرک کہا جا رہا ہے، پھر بھی جُوں کا تُوں موجود ہے۔ کیونکہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو علم الٰہی کے دوام و استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ عالم الغیب کا یہ علم غیب دوامی نہ ہو بلکہ وقتاً فوقتاً ذات کو ہوتا ہو اور تدریجی طور پر ذات کے سامنے آتا رہتا ہو (جیسا کہ بعض جہلاء فلاسفہ اس طرف گئے بھی ہیں)

اندریں صورت ذات پر کچھ اوقات ایسے بھی آنے ممکن ہوں گے، جن میں علم کا کوئی حصّہ ذات سے اوجھل ہو اور اُس کے سامنے نہ آئے۔ مگر یہ حصہ عالم سے تو گم ہو نہیں سکتا، کیونکہ عالم کی عمارت پُورے ہی علم پر کھڑی ہوئی ہے۔ ایک حصّہ بھی گم ہو تو ساری کائنات درہم برہم ہو جائے اس لئے سارے کا سارا علم کائناتِ عالم میں ہمہ وقت رہنا ضروری ہے۔ جس میں یہ حصہ بھی شامل ہے اور یہ حصہ جو معاذ اللہ ذاتِ حق سے اوجھل ہے جبکہ صفت ہے اور صفت ذات سے الگ ہو کر پائی نہیں جا سکتی۔ تو لامحالہ ذاتِ حق کے علاوہ کسی اور ذات کے ضمن میں پائی جائے گی۔ تو علم غیب میں ذاتِ حق کا شریک نکل آیا۔ اگر شریک مستقل نہیں تو کم از کم ہنگامی اور عارضی شریک تو ضرور پیدا ہو گیا۔ معاذ اللہ!

اس لئے اس آیت کی رُو سے یہ دعویٰ کس طرح قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے کہ اللہ کا علم دوامی ہے اور کسی لمحہ بھی اُس کا کوئی علمی شریک نہیں ہو سکتا؟ جبکہ آیت میں کوئی ایک کلمہ بھی اس علم کے دوام و استمرار پر دلالت

کرنے والا موجود نہیں ــــ !

تو اس وسوسہ کو بھی آیت کے کلمہ "عالم الغیب" نے دفع کر دیا ہے، کیونکہ اس موقع پر آیت نے حق تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کو فعل کے صیغہ سے ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ صفت کے صیغہ سے ذکر کیا ہے، یُوں نہیں کہا گیا کہ "یَعلم الغیب" (وہی جانتا ہے غیب کو) بلکہ یوں کہا گیا "عالم الغیب" (وہی جاننے والا ہے غیب کا) کیونکہ فعل زمانی ہوتا ہے جو کسی نہ کسی زمانہ ہی کے ساتھ مقیّد اور مخصوص ہو کر پایا جاتا ہے، ماضی کا فعل ہے تو وہ مستقبل میں نہیں ہوتا اور مستقبل ہے تو ماضی اس سے خالی ہوتا ہے اور حال ہے تو ماضی و مستقبل دونوں اُس سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ غرض فعل ہمہ وقت نہیں ہوتا، کسی وقت ہوتا ہے اور کسی وقت نہیں۔ یعنی جس وقت کا وہ فعل ہے اُسی وقت میں پایا جائے گا دُوسرے اوقات میں نہیں۔ اس لئے اگر علم غیب کے اثبات کے لئے فعل ماضی کا صیغہ لا کر یُوں کہا جاتا کہ "اُس نے غیب جان لیا" تو مستقبل میں علم غیب ثابت نہ ہوتا اور اگر مستقبل کا عنوان دے کر یوں کہا جاتا کہ "وہ غیب کو جان لے گا" تو ماضی میں اُس کا عالم الغیب ہونا نہ نکلتا اور اگر حال کا عنوان رکھ کر یوں کہتے کہ "وہ جانتا ہے غیب کو" تو فی الحال تو وہ عالم الغیب ثابت ہو جاتا مگر ماضی و مستقبل دونوں اس فعل سے خالی ثابت ہوتے اور علم غیب دوامی نہ ثابت ہوتا۔ اس لئے فعل کے بجائے صفت کے صیغہ سے علم غیب کا اثبات کیا گیا جو کسی زمانہ کے ساتھ مقیّد اور مخصوص نہیں ہوتی، بلکہ ذات کے ساتھ وابستہ اور تا قیام ذات دوامی ہوتی ہے ـــ !

اصطلاحی الفاظ میں اس حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ علم غیب کے اثبات کے لئے جملہ فعلیہ نہیں لایا گیا جو تجدّد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے بلکہ جملہ اسمیّہ استعمال کیا گیا ہو جو استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے اور فرمایا گیا "عالم الغیب" "وہ جاننے والا ہے غیب کا" یعنی ماضی و مستقبل اور حال کی قید سے بالاتر ہو کر وہ ہمہ وقت غیب کا جاننے والا ہے، جس سے علم غیب کا دوام واضح ہو گیا۔ کہ وہ ازل میں بھی عالم الغیب ہے اور ابد میں بھی ہے اور اس پر کوئی لمحہ ایسا نہیں آسکتا کہ وہ عالم الغیب نہ ہو اور اُس لمحہ میں کسی ہنگامی شریک کی گنجائش نکلے جو اس بوجھ کو اٹھائے۔ اس لئے وہ اپنے علم لامحدود میں دواماً و استمراراً، ازلاً و ابداً عالم الغیب اور اس ذاتی صفت میں ہمہ وقت وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، نہ اس کا کوئی شریک مستقل ہے نہ شریکِ عارضی و ہنگامی !

بہرحال قرآن حکیم نے اپنے اعجازی نظم اور معجزانہ اسلوب بیان سے مسئلہ علم غیب کو نکھار کر صاف کر دیا ہے اور اس میں کسی شرک پسند کے لئے مشرکانہ واہموں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ بالخصوص آیت اظہار غیب اس بارے میں ایک جامع ترین ہدایت نامہ ہے، جس نے اس مسئلہ کو ہر قسم کے زمانی، مکانی، ذاتی، عرضی، دوامی اور ہنگامی شرکاء سے بری کر کے اور اللہ کی علمی توحید کو ہر شک و شبہ سے پاک کر کے مسئلہ کے ہر مثبت اور منفی پہلو کو کھول دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً اُس نے :-

(۱) لفظ "عالم الغیب" سے ابتداء کر کے اللہ کے عالم الغیب ہونے کا اعلان کیا۔

(۲) پھر اُسے "اطلاع دہندہ" غیب بتا کر علم غیب کو اس کا خاصہ ثابت کیا۔ جس سے ہر غیر اللہ سے علم غیب کی نفی ہو گئی ـــ !

(۳) پھر "علیٰ غیبہٖ" کے لفظ سے علم غیب کو اس کا ذاتی علم ثابت کیا۔ جس سے ہر مخلوق کے حق میں ذاتی علم کی نفی ہو گئی !

(۴) پھر تلقین غیب کو "اطلاع غیب" کا عنوان دے کر غیر اللہ کے لئے صرف اطلاعی علم ثابت کیا۔ جس سے عطائی علم کی بھی مخلوق سے نفی ہو گئی، تاکہ خالق کی ذات کسی بھی حصۂ علم سے خالی نہ سمجھی جائے!

(۵) پھر حق تعالیٰ کے علم غیب کے اثبات کے لئے فعل کے بجائے صفت کا صیغہ (عالم الغیب) استعمال کر کے علم خداوندی کو ازلی ابدی اور دوامی و استمراری ثابت کیا، جس سے غیر اللہ کے علم دوامی کی نفی ہو گئی اور مخلوق کا علم ہنگامی اور عارضی ثابت ہوا۔

(۶) پھر "اظہار غیب" کے کلمہ سے اُسے غیب کی اطلاع دینے میں فاعل مختار ثابت کیا، جس سے تمام وسائل علم غیب کے اطلاع دہندۂ غیب ہونے کی نفی ہو گئی ـــ!

(۷) پھر ظہور غیب کو "اطلاع خداوندی" کے ساتھ مقید اور اُس میں منحصر ثابت کر کے ہر استدلالی علم کو علم غیب ہونے سے خارج کیا، جس سے فنی طور پر مستقبل کی باتیں بتلانے والوں کے غیب داں ہونے کی نفی ہو گئی!

(۸) پھر کلمہ "مِن رَّسُولٍ" کے اقتضا سے رسول کے لئے علمِ کلی کی نفی ہو گئی۔ اور بشر کے لئے علم مَا کانَ وَمَا یکون کا سوال ختم ہو گیا ـــ!

(۹) پھر اسی مِن رَّسُولٍ کے کلمہ سے رسول کے لئے علم جزئی ثابت کر کے خدا و رسول کے علم کا فرق واضح کیا کہ خدا کا علم محیط اور کلی ہے اور رسول کا اس کے لحاظ سے جزئی اور محدود[5] جس سے خدا و رسول کے علم میں مساوات کا تخیل منفی ہو گیا ـــ!

(۱۰) پھر اس علم کو پیغمبر کے حق میں اطلاعی کہہ کر "مِن رَّسُولٍ" ہی کے کلمہ سے اُمت کے حق میں اسے "رسالاتی" علم ثابت کیا، جس سے اُمت کے حق میں اُس کے اطلاعی علم ہونے کی بھی نفی ہو گئی، بلکہ یہی غیبی علم اُس کے حق میں استدلالی ہو گیا ـــ!

(تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ)

غرض آیت کریمہ کے بلیغ بیان اور اس کے ایک ایک لفظ سے علم غیب کا مثبت اور منفی پہلو دونوں ساتھ ساتھ نکھرتے چلے گئے ہیں۔ اثباتی پہلو سے تو ذات حق کے لئے اس علم کے تمام مراتب و شئون تخصیص کے ساتھ ثابت ہوتے گئے ہیں اور منفی پہلو سے غیر اللہ سے اس علم کے تمام شئون و مراتب منفی ہوتے گئے ہیں۔ اور اس طرح یہ اعجازی آیت مسئلہ علم غیب کے تمام مہمات اور اُس کے تمام مالہ وما علیہ کا جامع ترین بیان ثابت ہوتی ہے، جس سے توحید خداوندی کا یہ اہم ترین رکن (علم غیب) ہر ایک شرک آمیز تصور اور منافی توحید توہم سے منزّہ و مقدّس اور بے غُبار ہو کر نمایاں ہو گیا۔ فللہ الحمد والمنۃ!

ان قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین والآخرین کے لئے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ما کان وما یکون کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل اور بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ التفات ہے ـــ!

---

[5] رسول کا علم جزئی اور محدود اللہ تعالیٰ کے علم کی نسبت سے ہے۔ مگر اُمت کا مجموعی علم بھی رسول کے علم سے کوئی نسبت نہیں رکھتا ـــ!

مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ تمام کائنات جن و بشر اور روح و ملک میں سب سے زیادہ، سب سے وسیع تر اور بے نظیر و بے مثال علم حضرت اعلم الاولین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے۔ عالم میں نہ اتنا بڑا عالم باللہ اور عارفِ حق پیدا ہوا، نہ ہوگا۔ اگر کوئی حضور کے اس علم کی عظیم وسعت و کثرت اور زیادت و جامعیت میں شک کرے اور آپ کے اعلم الخلائق ہونے میں اُسے تامل ہو تو وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔ لیکن اس یقینی اور ناقابل تامل علم عظیم کی وسعت ثابت کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ رسولوں کو خدا کہا جائے۔ مخلوق کو خالق کے برابر کر دیا جائے اور انھیں ذرہ ذرہ کا عالم اور ماکان وما یکون کا جاننے والا کہہ کر اُن کے علومِ ہدایت و اصلاح میں زید، عمر، بکر کی خانگی جزئیات دُنیا بھر کے انسانوں کے تمام ذہنی وساوس و خطرات اور حوادث عالم کے روزمرہ کے تمام افسانے اُن کے علم کا جزو قرار دے دیئے جائیں۔ کہ اس سے نہ صرف سلیم طبائع ہی انکاری ہیں، بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انکار و اعراض فرما رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ جزئی جزئی قصے اور دُور از کار معلومات آپ کے ظرفِ علم میں بھرے جائیں ـــ!

چنانچہ حضورؐ نے اپنے پاکباز صحابہ کو ہدایت فرمائی کہ لوگوں کی کمزوریاں میرے سامنے لاکر نہ رکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا سے سلیم الصدر رخصت ہوں۔ گویا اس قسم کی معلومات سے قلب مبارک خود کنارہ کش رہنا چاہتا تھا، جو اصل مقصد نبوت سے تعلق نہ رکھتی ہوں اور اُوپر سے قلب کی یکسوئی اور جمعیۃ میں خلل انداز بھی ہوں۔ بلکہ "دُنیا سے سلیم الصدر رخصت ہونے" کے جملہ سے اور بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس قسم کی معلومات رُخصتی کے آخری لمحات میں بھی حضورؐ کو گوارا نہیں تھیں۔ کہ وہ ذہنِ مبارک میں آئیں، جنھیں زبردستی مدعیانِ عشقِ رسولؐ ان آخری لمحات میں حضورؐ کی مرضی کے خلاف حضورؐ کے لئے تجویز کرنے سے نہیں شرماتے ـــ!

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن ایک منقش مصلےٰ بچھا دیا تو آپ نے اسے اُٹھا دیا اور فرمایا کہ "اس کے گل بوٹوں نے مجھے مشغول کر لیا (یعنی نماز کی یکسوئی اور دل جمعی میں فرق آگیا) جس سے واضح ہے کہ اس قسم کی جزئیاتی معلومات و محسوسات کو جن کا ارشاد و ہدایت سے کوئی تعلق نہ ہو، آپؐ اپنے خزانۂ خیال میں جمع فرمانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے، اس لئے کہ شانِ رسالت کے لئے موزوں اور مناسب بھی یہ تھا اور یہی اس شانِ اقدس کا فطری تقاضا بھی تھا۔ کہ آپ کو صرف اُنہی مقاصد و احکام کا علم دیا جائے جو بنی نوع انسان کے لئے حصولِ سعادت کا ذریعہ اور شقاوت سے بچاؤ کا وسیلہ ہوں اور خود آپ کے نفسِ طیبہ کے لئے ہمہ وقت ترقی اور قربِ خداوندی کی بیشی کا ذریعہ ہوں۔ اب اگر انبیاء علیہم السلام کو علومِ شرعیہ کے علاوہ علومِ طبعیہ، علومِ ریاضیہ، علومِ فلسفیہ، علومِ منطقیہ، مثل سائنس، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ، شعر و شاعری، سحر و ساحری، کہانت، نجوم اور زید، عمر، بکر کے گھریلو قصے معلوم نہ ہوں تو علم کی یہ تحدید اُن کے لئے نقص نہیں بلکہ عین کمال اور اُن کی پاک فطرتوں کا عین مقتضا ہے ـــ!

چنانچہ حدیث نبوی میں خبر دی گئی ہے کہ آپ نے کسی موقع پر ایک ہجوم دیکھا جو کسی شخص کے اردگرد جمع تھا۔ پوچھا یہ کیسا مجمع ہے؟ عرض کیا گیا کہ رَجُل عَلاَمَہ۔ ایک بڑا عالم ہے جس پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور وہ علم کی باتیں لوگوں کو بتلا رہا ہے۔ فرمایا۔ کیسا علم؟ عرض کیا گیا کہ شعر اور انساب کا علم۔ تو ارشاد فرمایا:۔

علم لا ینفع وجهل لا یضر انما العلم آیة محکمة او سنة قائمة او فریضة عادلة!

یہ وہ علم ہے کہ نہ تو اس کا جاننا کچھ نافع ہی ہے اور نہ اس کا نہ جاننا ہی کچھ مُضر ہے، علم تو (حقیقتاً) آیت محکمہ (قرآن) یا سنت قائمہ (حدیث) یا فریضۂ عادلہ (جو ان دو جیسا ہو یعنی اجتہاد، مجتہد یا اجماع) ہے!

اس سے واضح ہے کہ نبوت کی نگاہ میں نہ ہر علم مطلقاً نافع ہی ہے اور نہ ہر علم علی الاطلاق مطلوب۔ ورنہ علم کی تقسیم نافع اور مُضر کی طرف لغو اور فضول ہو جاتی۔ درحالیکہ قرآن حکیم نے بھی اس تقسیم کو قبول فرمایا اور اس پر متنبہ کیا ہے، سحر و ساحری کے بارے میں فرمایا:-

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ!

شعر و شاعری کو اپنے رسول سے دور رکھتے ہوئے گویا اس کے مُضر ہونے کی طرف اشارہ فرمایا کہ:-

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ!

اور ہم نے اسے "شاعری" نہیں سکھائی اور وہ اس کے لئے مناسب (یعنی شایان شان) بھی نہیں ہے!

ظاہر ہے کہ جس علم کو حق تعالیٰ اپنے رسول کے لئے غیر موزوں بتلائے اور جس کے مُضر ہونے کی صراحت فرمائے اُس کا شوق رسولِ پاک کے ذہنِ مبارک میں کیسے آسکتا تھا اور اس پاک ظرف میں یہ دُور از کارِ نبوت معلومات کیسے ڈالی جا سکتی تھیں! بہر حال اس قسم کے غیر رسالاتی علوم بلا شبہ ظرفِ نبوت میں پہنچکر اُلجھن ہی کا باعث ہوتے کہ مقصد سے بے تعلق تھے اس لئے قابلِ قبول نہ ٹھہرے، تو ان سے ظرفِ نبوت کا خالی رہنا ہی نبوت کا کمال ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کا نقص۔ اندریں صورت اللہ کے اس عظیم الشان رسول کے لئے علم ماکان وما یکون ثابت کرنے کی لاحاصل سعی کرنا اُن کے وصفِ رسالت کے تقاضوں کو بے اثر دکھلانا ہے جو وصفِ رسالت کی توہین ہے نہ کہ تعظیم!

اس لئے اگر نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم خود ہی اپنے سے علم غیب کی کلی نفی اور علم کلی کا صاف اور واضح انکار فرمائیں اور مامور من اللہ ہو کر فرمائیں تو یہ نفی ایک حقیقت ہوگی نہ کہ تواضع و انکسار۔ چنانچہ قرآن کی زبان میں آپ نے فرمایا اور مامور من اللہ ہو کر فرمایا:-

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ -

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے، اور نہ میں جانوں غیب کی بات اور نہ میں کہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا حکم آتا ہے!

وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ

اور میں تو صرف (کھلے طور پر) ڈرانے والا ہوں!

اس میں اپنے سے علم غیب کی علی الاطلاق نفی ہے، جس میں کلی کی قید ہے نہ جزئی کی۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ میں کچھ بھی علم غیب نہیں رکھتا۔ جس کی وجہ آگے ذکر فرمائی گئی ہے کہ میرا منصب انذار اور انجام کی ہلاکت اور عذاب خداوندی سے ڈرانا ہے۔ جس کے لئے علم غیب کی ضرورت نہیں، صرف اُن امور کے علم کی ضرورت ہے، جن کو اس ڈرانے میں دخل ہو اور

وہ اس انذار و تبشیر میں مؤثر ثابت ہوں۔

اس لئے اب ان عرض کردہ آیات و روایات یعنی کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر علم کی تقسیم یُوں نہ ہوگی کہ اللہ کا علم ذاتی اور رسول کا علم عطائی یعنی نوعی فرق کے ساتھ دونوں کا برابر گویا ایک حقیقی خدا اور ایک مجازی خدا۔ یا بقول عیسائیوں کے ایک اِلٰہ مجرد اور ایک اِلٰہ محمدؐ، معاذاللہ۔ بلکہ یوں ہوگی کہ ایک علم علمِ غیب ہے یعنی علم ذاتی جو بلا وسیلہ و اسباب ذات سے ابھرے اور بالذات ہو بالغیر نہ ہو۔ یہ علم کلیتہً حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ کو اس علم کا نہ کلی حاصل ہے، نہ جزو، نہ کلّی نہ جزوی!

دُوسرا علم اطلاعی اور حکائی ہے جو وسائل سے حاصل شدہ ہو یعنی علم غیب نہ ہو، وہ بندوں کو ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ قطعی یقینی اور غیر مشتبہ وسائل سے ہو۔ جس میں کسی شک و شبہ یا التباس کی گنجائش نہ ہو۔ جیسے وحی خداوندی، جسے آیت اظہار غیب میں اطلاع خداوندی کہا گیا ہے، تو یہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اگر ظنی وسائل سے ہو، جس سے اشتباہ و التباس کلیتہً مرتفع نہ ہو جیسے کشف و الہام تو یہ اولیاء کو بھی ہو سکتا ہے!

اور اگر طبعی وسائل سے ہو، جیسے عقل و خرد، ذوق و تجربہ اور فکر و تدبّر وغیرہ تو یہ اذکیاء و عقلاء کو بھی ہو سکتا ہے اور اگر حسّی وسائل سے ملے، جیسے سمع و بصر اور عام حواس، تو یہ عام انسانوں کے لئے بھی ممکن ہے، پس یہ سب قسمیں وہی اطلاعی علم کی ہوں گی۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وحی کا علم وہبی ہے جو محض موہبتِ الٰہی سے ملتا ہے، کسبی و اکتسابی نہیں۔ کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے وحی حاصل کر لیا کرے اور نبی ہو جایا کرے۔ اور غیر وحی کے تمام علوم کسبی ہیں، جنہیں خود اپنی توجہ اور محنت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان سب علوم میں علم اعلیٰ وہی ہوگا۔ جو وحی الٰہی سے ہوگا۔ اس لئے نبی کے لئے وجہ افضلیت یہی علم ہوگا نہ کہ وہ کسبی اور اکتسابی علوم و فنون جو ہر انسان اپنی محنت سے حاصل کر سکتا ہے ــــ!

رسُولِ پاک کے لئے اس قسم کے علم کا دعویٰ رکھنے والے اپنے دعوے میں مخلص ہوں اور بزعمِ خود محبت رسُول میں غرق ہو کر خوش اعتقادیوں سے ہی وہ یہ دعویٰ کرتے ہوں۔ سو اُن کی نیت اور جذبہ پر حملہ مقصود نہیں۔ مگر یہ گذارش ضرور ہے کہ یہ دعویٰ خواہ کتنا ہی جوشِ عقیدت و عظمت اور ولولۂ شوق و محبّت سے کیا گیا ہو۔ مگر ہم مسلمان صرف عقائد و احکام ہی میں آسمانی ہدایات کے پابند نہیں بنائے گئے، بلکہ عشق و محبّت کے جذبات اور اظہار عقیدت و محبّت میں بھی شرعی حدود و قیود کے پابند کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ہم سے عقلی محبّت مطلوب ہے، جس کا نام ایمان ہے۔ طبعی محبّت مطلوب نہیں جو غیر اختیاری اور بے شعور محبت ہے، اوّل کا تعلق عقل و شعور سے ہے اور ثانی کا جذبات سے۔ بحالتِ صحتِ شعور و حواس ہمیں اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم ایک اصولی اور شعوری محبّت کو محض جذباتی محبت بنا کر شرعی آداب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے لگیں۔ اور اپنے کو عارف باللہ اور علیٰ بصیرت بنانے کی جگہ بے شعور اور جذباتی ثابت کرنے لگیں۔ یا بتکلف جذباتِ عشق کی آڑ لے کر تمام شرعی حدود و قیود اور تہذیب نفس کی تمام دینی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں ــــ!

بہرحال مدعیانِ عشق میں تو ممکن ہے کہ مدحِ رسُول کی یہ دفعہ مل جائے کہ علم رسُول، علم خدا کے برابر ہے، لیکن خود خدا کے کلام میں اس دفعہ کا کوئی وجود نہیں اور کسی ایک آیت میں بھی رسُولِ کریمؐ کے عالم الغیب ہونے یا عالم مَا کانَ

وما یکون ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا - اور کیا گیا ہے تو اس علم کی کلّی نفی کا- جیسا کہ ان مذکورہ اوراق سے کافی روشنی میں آچکا ہے- حتیٰ کہ کسی صریح حدیث میں بھی یہ دفعہ نہیں مل سکتی- البتہ یہ ممکن ہے کہ حدیث کے کسی متشابہ کلام کی آڑلی جائے اور محض اپنے دعوے کی لاج رکھنے کی سعی کی جائے- چنانچہ اس کے لئے سب سے زیادہ نمایاں کرکے حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو پیش کیا جاتا ہے- جو مشکوٰۃ میں روایت کی گئی ہے، شاید اسی کے ایک ذومعنی لفظ سے حضورؐ کے علم کلّی کا تخیل قائم کیا گیا ہے- مضمون حدیث کا حاصل یہ ہے کہ :-

" ایک دن سرورِ دوعالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ دیر سے کھلی - قریب تھا کہ آفتاب طلوع ہوجائے اور نماز صبح قضا ہو جائے کہ آپؐ گھبرائے ہوئے باہر تشریف لائے اور مختصر سی نماز پڑھا کر لوگوں کو بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور دیر سے آنے کی وجہ ارشاد فرمائی کہ نماز تہجد میں مجھے اونگھ سی آگئی، بدن بوجھل ہوگیا تو اچانک میں نے اپنے رب کو نہایت ہی پاکیزہ صورت میں خواب میں دیکھا اور یہ حق تعالیٰ نے مجھے تین دفعہ خطاب فرماکر پوچھا کہ اے محمدؐ! ملاءِ اعلیٰ کس چیز میں جھگڑتے ہیں ؟ میں نے تینوں دفعہ لا ادری کہہ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا- آخر جناب باری عزاسمہٗ نے اپنی ہتھیلی (جیسی ہتھیلی اُس کی شان کے مناسب ہو) میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دی- تاآنکہ میں نے اُن کے پوروؤں کی ٹھنڈک سینہ کے درمیان محسوس کی "

فتجلّٰی لِی کلُّ شیءٍ عَرفتُ

توہر چیز مجھ پر منکشف ہوگئی اور میں پہچان گیا!

یہی کلُّ شیءٍ کا مبہم کلمہ ہے جو علم غیب کلّی کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا جاتا ہے!

لیکن اوّل تو قرآن حکیم کی اتنی صاف و صریح اور غیر مبہم تصریحات کے ہوتے ہوئے جو پیش کی گئیں ایک خبر واحد کے ایک مبہم جملہ کو اُن کے خلاف پیش کرنا اور قطعیات کو ظنی کے تابع بنانا مطلب برآری کے سوا اور کس عنوان کا مستحق ہوسکتا ہے؟ دوسرے عقیدہ کے لئے نصِ قطعی کی ضرورت ہے، ظنی سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا، جو ایمان کا جزو بنایا جائے اور اُس کے خلاف کو کفر کہا جائے، پھر یہ کہ ظنی ہی طور پر اگر کسی نصِ ظنی سے کوئی شرعی نظریہ قائم کیا جائے تو کم از کم نص کے الفاظ کو قطعی الدلالت اور متعین المراد ہونے چاہئیں- جس کے مفہوم اور مراد میں بھی کئی کئی احتمالات ہوں تو اُس کی بنیاد پر تو کسی نظریہ کی بھی عمارت نہیں اٹھائی جاسکتی، چہ جائیکہ عقیدہ کی عمارت کھڑی کی جائے!

(۱) سو اوّل تو کل شیءٍ سے ذرّہ ذرّہ اور ما کان وما یکون مراد لئے جانے کی کوئی دلیل نہیں- بالخصوص جبکہ اطلاعِ غیب کی آیت کے کلمہ مِن رَّسُولٍ سے ابھی واضح ہوچکا ہے کہ شرعیات اور اُن کے متعلقات کے علم کے سوا باقی معلومات وصفِ رسالت کا مقتضا ہی نہیں ہیں کہ یہاں دُور از کار اشیاء کا علم کل شیءٍ کے عموم میں داخل کیا جائے، اس لئے کل شیءٍ سے موضوعِ رسالت ہی کی کل اشیاء مراد لی جائیں گی اور وہ وہی اشیاء ہوسکتی ہیں جن کا اس حدیث میں حضورؐ سے سوال کیا گیا - (یعنی ملاءِ اعلیٰ کے جھگڑنے کی چیزیں) اور آپؐ نے اُن سے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی- مقام کا تقاضا ہے کہ وہی کُل اشیاء آپ پر منکشف ہوئیں

اور آپ کو اُن کی کامل معرفت حاصل ہوگئی۔ جس کا سبب حق تعالیٰ کا یدِ قدرت آپ کے سینۂ مبارک کے درمیان رکھ دینا ہوا، جو تصرف تھا حضورؐ کی روحانیت میں اور وہ بھی انتہائی قرب کے ساتھ۔ کیونکہ ہاتھ رکھ دینا کمالِ قرب کی انتہا ہے ۔۔۔!

یہ تصرف ایسا ہی تھا جیسا کہ پہلی وحی میں۔ جبکہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ظاہر ہوکر آپ سے تین مرتبہ اقراء کہا اور آپ نے تینوں دفعہ ما انا بقاریٔ فرماکر اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا تو انہوں نے تین مرتبہ حضورؐ کو سینہ سے لگا کر دبایا اور سخت دبایا۔ جس کا تعب آپ کو محسوس ہوا۔ یہ درحقیقت ملکیت کے ساتھ آپ کو انتہائی طور پر قریب کرکے بلکہ ملاکر روحِ پاک میں تصرف کرنا تھا! جس کا اثر علم و انکشاف کی صورت میں ظاہر ہوا اور آپ نے اقراء کے جواب میں قراءتِ وحی شروع فرمادی۔ اور حقیقتِ حال کا انکشاف ہوگیا۔

ایسے ہی یہاں بھی حق تعالیٰ نے تین بار اختصام ملاءِ اعلیٰ کا سوال فرمایا اور آپ نے تینوں بار لاعلمی کا اظہار کیا۔ تو براہِ راست یدِ قدرت سے انتہائی قرب بخش کر بلکہ اپنے سے ملاکر تصرف فرمایا۔ جس سے وہ لاعلمی ختم ہوگئی۔ علومِ مقصودہ کا انکشاف ہوگیا۔ اور اس سوال کے جواب اور جواب کے تمام مضمر علوم کی استعداد آپ میں دفعتاً پیدا ہوگئی، جنہیں زبان و بیان سے آپ نے کھولنا شروع فرمادیا۔ گویا جتنی باتوں کا سوال کیا گیا تھا آپ کو اُنہی کے کل مضمرات کا انکشاف ہوا اور اسی کو کلِ شیئ سے تعبیر فرمایا گیا پس اس کل شیئ کے مفہوم کو ذرہ ذرہ پر محیط مان کر علم ما کان وما یکون مراد لیا جانا ایک بے دلیل دعویٰ ہے، جس کی اس روایت میں کوئی سند نہیں ۔۔۔!

(۲) لیکن اگر مذکورہ شرعی قاعدہ اور قرآنی اصول کو (کہ حضورؐ کے لئے ما ینبغی لہٗ یعنی مناسبِ شانِ نبوت ہی علوم مراد لئے جائیں) نظر انداز کرکے محض حدیث کے الفاظ ہی پر جمود کیا جائے، اور کلِّ شیئ کو ذرہ ذرہ کے لئے عام ہی مانا جائے۔ تو پھر اس پر بھی غور کرلینا چاہئیے۔ کہ تجلّی کے معنی علم کے نہیں بلکہ کسی چیز کے پرتو اور عکس وظل کے سامنے کردینے کے ہیں جیسے فلما تجلّٰی ربہ للجبل میں تجلّی کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ حق تعالیٰ نے شجرہ مبارکہ پر اپنے نورانی ظل و عکس سے جلوہ گری فرمائی اور اپنی کسی شان کو نمایاں فرمادیا، ورنہ ظاہر ہے کہ کسی مادی ظرف میں اُس کی لطیف و خبیر ذات کا بعینہٖ اُتر آنا قطع نظر اُس کی بے انتہا لطافت اور پاکیزہ شان کے لائق نہ ہونے کے یہ ممکن بھی کب ہے کہ محدود میں لامحدود سما جائے، جیسے آئینہ میں آفتاب کے اُتر آنے کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اس چھوٹے سے ظرف میں یہ زمین سے گیارہ کروڑ گنا بڑا نورانی جسم خود اُتر آیا۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کا عکس یا پرتو اُس میں آگیا۔ مگر مجازاً کہا یہی جاتا ہے کہ آفتاب آئینہ میں اُتر آیا ۔۔۔!

اسی طرح تجلّی اشیاء کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا کہ اچانک عالم کی کُل اشیاء مجھ پر منکشف ہوگئیں یعنی اُن کی صورتِ مثالی میرے سامنے آگئی، سو اسے کشف کہیں گے، علم نہیں کہیں گے اور اگر علم کا لفظ بھی بولا جائے گا تو مناسبِ مقام اس کے معنی بھی انکشاف اور کشف ہی کے ہوں گے۔ کیونکہ جس چیز کا کشف ہوا اُس کا علم تو پہلے سے تھا، ہم نے اگر سورج کو آئینہ میں دیکھا تو یہ علم نہیں کیونکہ علم تو سورج کا پہلے سے

ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام نے اگر شجرہ کے پردہ میں اللہ کو دیکھا تو یہ رویت انکشافی تھی علم نہ تھا کہ علم تو پہلے سے تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث کسوف شمس میں ہے کہ بحالت نماز حضورؐ نے جنت و دوزخ دونوں کو دیوار قبلہ میں دیکھا تو یہ وہی جنت و دوزخ کی صورت مثالی کا انکشاف تھا۔ علم نہ تھا۔ علم تو ان دونوں کا پہلے ہی سے حضورؐ کو تھا،

بہرحال اس تجلی مثالی کا نام کشف ہے، علم نہیں، اور کشف آنی ہوتا ہے کہ اچانک سارا عالم سامنے آجائے۔ مگر جب وہ کشفی حالت رفع ہو تو وہ بھی اوجھل ہو جائے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کا ضغطہ قبر (قبر کا آپ کو دبانا) حضورؐ پر منکشف ہوا جو وقتی حال تھا۔ بعض اہل قبور کا عذاب آپؐ پر منکشف ہوا۔ جو ایک ہنگامی حال تھا بعد میں نہیں رہا۔ یہ نہیں کہ آپؐ اُسے ہر وقت دیکھتے ہی رہے، یا جہان بھر کی تمام قبروں کے حالات حضورؐ پر ہمہ وقت منکشف رہتے تھے!

بہرحال کشف، احوال و مواجید میں سے ہے جو ہمہ وقت نہیں رہتا۔ بخلاف علم کے کہ وہ رنگ نفس بن کر پائدار ہوتا ہے۔ پس حق تعالیٰ کے ید قدرت کے تصرف کا یہ قدرتی اثر تھا کہ قلب نبوتِ اکرم چمک اٹھا اور اُس میں کائنات کی ساری اشیاء اپنی مثالی صورتوں کے ساتھ اچانک زیر نظر آگئیں۔ لیکن یہ تجلی مقصود نہ تھی۔ صرف تصرفِ حق کی خصوصیت تھی۔ اس سے مقصد اصلی قلب نبوت کو چمکا کر وہ علوم اُس میں پیدا کرنے تھے، جن کا سوال حق تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ کہ فیم یختصم الملاء الاعلیٰ (ملاء اعلیٰ والے کس چیز میں جھگڑتے ہیں) چنانچہ وہ روشن ہوئے تو اُسی کو آپ نے فرمایا وعرفت، یعنی میں حقیقتِ حال پہچان گیا۔ اور اس کے بعد ہی آپ نے اس سوال کے جواب پر اپنے بیان سے روشنی ڈالنی شروع کر دی!

اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہی ہے، جیسے کہ کوئی شخص کتاب کا مطالعہ کرنے کے لئے چراغ جلائے اور سارا گھر روشن ہو جائے۔ اور مقابل کی ہر چیز نظر آنے لگے۔ لیکن یہ انکشاف اشیاء خانہ چراغ جلنے کی خاصیت ہوتی ہے، خود ان اشیاء کا سامنے لانا اور دیکھنا مقصود نہیں ہوتا۔ مقصود اصلی مطالعہ کتاب ہوتا ہے، تاکہ مسائل کا علم ہو، ٹھیک اسی طرح تصرّفِ خداوندی جو قلبِ مبارک پر ہاتھ رکھنے کی صورت سے ہوا، چراغ روشن کرنے کے مشابہ ہے۔ جس سے شفاف لطیفۂ نبوتِ اکرمؐ چمک اٹھا۔ اُس چمک میں اشیاء کائنات کا یکدم متجلی اور منعکس ہو جانا گھر کی چیزوں کے روشن ہو جانے کے مشابہ ہے اور اس روشنی میں مطالعہ کتاب جو اصل مقصد ہے۔ سوال خداوندی کا جواب ذہن میں آجانے کے مشابہ ہے۔ اس لئے حدیث میں تجلیٰ اشیاء سے تو کشف مراد ہے، جو خود مقصود نہیں اور معرفت سے علوم مقصودہ کا کھل جانا مراد ہے۔ جو اس تصرفِ الٰہی کا اصل مقصود تھا۔ پس کُل اشیاء کائنات کا اچانک آپ کے سامنے کھل جانا کشف تھا، علم نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ کشف اگر ساری کائنات کا بھی ہو جائے تو وہ آنی اور دفعی ہوتا ہے جس میں استقرار نہیں ہوتا، گویا وہ ایک حال ہوتا ہے، جو آتا ہے اور چلا جاتا ہے، بسا اوقات اہلِ حال، اہل اللہ پر ایسے واردات کا ورود دفعتہً ہوا ہے کہ کُل کا کُل عالم فرش سے عرش تک اور اس سے بھی اُوپر کے اور بڑے بڑے جہان اُن پر اچانک منکشف ہو کر سامنے آگئے جیسا کہ فتوحات مکیہ میں رئیس الصوفیاء حضرت شیخ اکبرؒ[1] نے خود اپنے مکاشفات کے سلسلہ میں

---

[1] مگر انہی شیخ اکبر کے کشفی مسائل لفظ و بیان میں آکر اس قدر نازک، دقیق اور متشابہ ہو گئے ہیں کہ اہل شریعت صوفی اُن پر وارد ہونے والے اعتراضات کو رفع کرتے کرتے تھکے جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ایک پیچ کھلتا ہے اور دو پیچ اور پڑ جاتے ہیں، اس کے برخلاف "انا الحق" والے صوفی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ "ایمان" لرز اٹھتا ہے، اللہ کی رحمت نازل ہو مجدد الف

ایسی خبریں دی ہیں کہ اُن پر دُنیا و مافیہا اور فرش سے تا عرش منکشف ہوا۔ لیکن نہ اُنھیں عالم الغیب کہا جاتا ہے، نہ عالم ماکان ومایکون کہ یہ علم نہیں بلکہ اجمالی مشاہدہ ہے۔ جس میں کُل کائنات اچانک سامنے آجاتی ہے اور فوراً ہی یہ مشاہدہ ختم ہوجاتا ہے اگر ہم ہوائی جہاز پر سوار ہو کر دلّی کے اُوپر پرواز کریں اور یہ کہیں کہ اس وقت کُل دلّی ہمارے سامنے ہے تو دعویٰ صحیح ہے۔ مگر نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے دلّی کی جزئی، جزئی تفصیل کے ساتھ دیکھ لی اور ہماری نگاہیں اُس کے ایک ایک گھر میں گھُسیں اور اُس کے ذرّہ ذرّہ کا مشاہدہ کرآئیں۔ اور جتنی بھی مشاہدہ میں آئیں وہ مشاہدہ صفتِ نفس بن گیا اور مرتے دم تک قائم رہا۔ یہی صورت پورے عالم کے کشف کلّی کی ہوتی ہے کہ اس وقت یہ دعویٰ صحیح ہوتا ہے کہ اس کی کُل اشیاء سامنے آگئیں مگر یہ ایک دفعی اور اجمالی مشاہدہ ہوتا ہے، جس میں نہ استقرار ہوتا ہے نہ جزئی، جزئی کی تفصیل اس لئے اسے علم نہیں کہتے چہ جائیکہ علم غیب اور وہ بھی علم غیب کلی، اسی قسم کے انکشاف غیب کے بارے میں روح المعانی میں غیب کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

> ومن ھنا قیل الغیب مشاھدۃ الکل بعین الحق فقد یمنح العبد قرب النوافل فیکون الحق سبحانہ بصرہ الذی یبصر بہ وسمعہ الذی یسمع بہ ویرتقی من ذالک الی قرب الفرائض فیکون نوراً فھناک یکون الغیب لہ شھوداً والمفقود لدینا عندہ موجوداً ومع ھذا لایسوغ لمن وصل الی ذالک المقام ان یقال فیہ انہ یعلم الغیب۔ قل لا یعلم من فی السموٰات والارض الغیب الا اللہ۔ (روح المعانی جلد اول ص۱۱۴)

> اور ایسے ہی مواقع پر کہا گیا ہے کہ غیب مشاہدۂ کُل کا نام ہے جو عین حق سے ہو، چنانچہ کبھی بندہ پر احسان کیا جاتا ہے کہ اُسے نوافل کے ذریعہ قربِ خداوندی عطا کیا جاتا ہے تو حق تعالیٰ ہی اُس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہی اُس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سُنتا ہے، پھر اس سے ترقی کرکے جب وہ فرائض کے ذریعہ قربِ الٰہی پاتا ہے تو نورِ مجسم بن جاتا ہے اور اس وقت یہ غیب اس کے لئے مشہود ہوجاتا ہے اور جو چیزیں ہم سے مفقود ہیں۔ اس کے سامنے موجود ہوجاتی ہیں (گویا اشیاء کائنات اُس کے مشاہدہ میں آجاتی ہیں) لیکن مگر اس کے باوجود جو بھی اس مقام پر پہنچے، اُس کے لئے یہ گنجائش نہیں ہے کہ اُسے عالم الغیب کہا جائے ارشاد حق ہے کہ "اے پیغمبرؐ! فرما دیجئے کہ کوئی بھی زمین میں ہو یا آسمان میں غیب نہیں جانتا۔ بجز اللہ کے"

اس سے واضح ہے کہ اس قسم کا مشاہدۂ کُل علم ہی نہیں۔ چہ جائیکہ علم کلی ہو اور نہ ایسے صاحب کشف پر عالم الغیب کا اطلاق ہی آسکتا ہے، بلکہ یہ ایک دفعی انکشاف ہے جو غیر نبی کو بھی بطفیل انبیاء میسّر آسکتا ہے!

بہرحال "تجلّی لی کُلّ شیئ" میں تجلّی سے کشف مراد ہوگا جو تجلّی کی حقیقت ہے۔ اب اگر کُلّ شیئ سے اس خاص دائرہ کی کل اشیاء کا کشف مراد لیا جائے۔ جن کا حق تعالیٰ نے سوال فرمایا تھا تو یہ مسائل کا کشف ہوگا۔ جسے فنی اصطلاح میں کشفِ الٰہی کہتے ہیں۔ کہ حقائق شرعیہ منکشف ہوجائیں۔ اور اگر کُلّ شیئ سے کائنات کی تمام اشیاء کا کشف مراد لیا جائے تو کشف کونی ہوگا مگر ان میں افضل ترین کشف مسائل کا ہے۔ جو مقصود ہیں نہ کہ اشیاء کائنات کا جو بذاتہٖ مقصود

ہی نہیں - پس اول تو اس حدیث سے کشف کو نبی پر زور دینا اور کشف الٰہی سے باوجود اس کے ممکن ہونے کے یکسو ہوجانا مرتبۂ نبوت کی عظمت اور جلالت قدر سے قلیل المعرفتی کی علامت ہے - اور اوپر سے اس تجلی کشفی سے علم غیب پر استدلال کرنا اور وہ بھی علم ماکان ومایکون پر کلماتِ حدیث کو ان کے مواضع سے ہٹا دینا ہے، جو تحریف کے ہم معنی ہے، کیونکہ تجلی کے معنی نہ لغت میں علم کے آتے ہیں نہ شریعت کی یہ اصطلاح ہے — !

پھر کشف تو کشف " وہ علم بھی انبیاء کے لئے مدار افضلیت نہیں بن سکتا جو خصائصِ نبوت میں سے نہ ہو - یعنی غیر نبی کو بھی ہو سکتا ہو - اور بعض تجربیاتی اور طبیعیاتی قسم کے امور - جیسے کھجوروں کے پیوند باندھنے کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا :-

انتم اعلم بامور دنیاکم (مسلم)

(اپنی دنیا کے امور کے بارے میں تم ہی سے زیادہ جانتے ہو)

ظاہر ہے کہ جس علم میں امتی کو نبی سے زیادہ جاننے والا فرمایا جائے وہ علم یقیناً خصائصِ نبوت میں سے نہیں ہو سکتا - ورنہ نبی کے واسطے کے بغیر کسی امتی کو کبھی مل ہی نہ سکتا - پس ایسے علوم و فنون پر نہ نبوت کی بنیاد ہے اور نہ وہ اس مقدس اور پاکباز طبقے کے لئے سببِ فضیلت ہیں، ان کے پیغمبرانہ کمالات کی بنیاد علوم شرائع واحکام ہیں - تکوینی علوم اس مقصد کی ضرورت کی حد تک بقدر ضرورت دیئے گئے ہیں - بنیادِ نبوت نہیں ہیں کہ ان کے گھٹنے بڑھنے سے نبوت میں کوئی فرق آجائے !

پھر اس حدیث "تجلی لی" کے ساتھ اگر ان بے شمار روایات ونصوص کو بھی ملا لیا جائے جن میں حضورؐ نے خود ہی اپنے سے بہت سے معلومات کی نفی فرمائی ہے، تو پھر اس حدیث "تجلی لی" سے حضورؐ کے لئے علم محیط ثابت کرنے کی وہی جرأت کریگا جو علم کے حصہ کی بھی جرأت ہی رکھتا ہو - مثلاً آپ مدینہ کے بہت سے منافقین کو نہیں جانتے تھے، جیسے قرآن نے فرمایا :-

لا تعلمهم نحن نعلمهم

آپ نہیں جانتے ہم انھیں جانتے ہیں !

آپ علم شعر نہیں جانتے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا :-

وَمَا عَلَّمْنَاہُ الشعر وما ینبغی له

ہم نے انھیں (پیغمبر کو) نہ شعر کی تعلیم دی اور نہ یہ ان کے مناسبِ شان ہی ہے !

حتیٰ کہ آخر عمر شریف تک بھی یہ فن آپ کے علم میں نہیں لایا گیا - کیونکہ آیت بالا نے صرف اس علم ہی کی آپ سے نفی نہیں کی بلکہ آپ کی شانِ اقدس کے لئے اس کی ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا - اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ نامناسب اور خلافِ شان باتوں کی آپ کو کسی وقت بھی تعلیم دی جاتی -

آپ کا کسی میت کے بارے میں سوال فرمانا کہ یہ کب مرا ہے، آپؐ کا بعض قبروں میں عذاب کا مشاہدہ کرکے یہ فرمانا کہ یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں ؟ لاعلمی کا اظہار ہے - فتح خیبر کے موقع پر آپؐ کے سامنے زہر آلود کھانا پیش کیا گیا اور لاعلمی کے سبب آپؐ نے اسے زبان پر رکھا اور کچھ اثر بھی اندر پہنچا - جس نے عمر بھر تکلیف پہنچائی - اس قسم کی تمام معروف چیزوں کے بارے میں آپؐ کا قرآنی زبان میں یہ فرمانا کہ :-

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یومنون !

اگر میں عالم الغیب ہوتا تو خیر کثیر جمع کر لیتا اور مجھے برائی نہ چھو سکتی - میں تو صرف ایک ڈرانے والا اور بشارت سنانے والا ہوں ایمان والوں کے لئے !

یہ آیت ظاہر ہے کہ محکم اور دوامی ہے منسوخ شدہ نہیں - اور واقعات میں نسخ ہو بھی نہیں سکتا - اس لئے یہ آیت تا قیامت یہی اعلان کرتی رہے گی کہ آپؐ کو علم غیب نہ تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت تک آپؐ کو علم غیب نہیں ہوگا - ورنہ اگر اس آیت کے نزول کے بعد قیامت سے قبل قبل اس کے خلاف کوئی بھی واقعہ پیش آتا تو خود قرآن اسے بیان کرتا اور اس آیت کا کوئی محمل تلاش کیا جاتا - لیکن ایسا نہیں ہوا - تو اس کا یہ قطعی ثبوت ہے کہ آپؐ کا عالم الغیب نہ ہونا قیامت تک کے لئے ہے !

اگر یہ کہا جائے کہ علم غیب ذاتی علم کو کہتے ہیں تو اس نفی سے زیادہ سے زیادہ ذاتی علم کی نفی نکلی - کہ میں بالذات علم نہیں رکھتا - مگر اس سے بالغیر علم کی نفی نہیں نکلی - تو ہو سکتا ہے کہ آپؐ ان غیبی امور کو بتعلیم الٰہی جانتے ہوں - بالذات نہ جانتے ہوں تو آپؐ کا عالم الغیب ہونا بھی ثابت ہو گیا اور آیت کے خلاف بھی نہ ہوا - اس لئے مستقبل کا یہ علم اس آیت کے خلاف نہیں -

جواب یہ ہے کہ :-

اولاً تو قرآن نے جب صراحتاً علم غیب کے عنوان ہی کو آپ کے لئے نہیں رکھا اور اس عنوان ہی کی مستقلاً نفی کر دی تو اسی عنوان کا آپ کے لئے ثابت کرنا قرآنی عنوان کا معارضہ ہے جو انتہا درجہ کی گستاخی اور شوخ چشمی ہے -

دوسرے یہ کہ اس شبہ کو خود یہ آیت ہی رد کر رہی ہے - کیونکہ اس میں غیب سے لاعلمی کا ثمرہ، یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مجھے اذیت و کلفت کبھی نہ چھوتی - لیکن سب جانتے ہیں کہ اذیت و مصائب نے آپ کو چھوا - تو نتیجہ ظاہر ہے کہ آپ ان مصائب سے لاعلم رہے - ورنہ پیش بندی فرما لیتے - اور ظاہر ہے کہ . . . . مصائب کا چھونا مطلقاً لاعلمی سے ہو سکتا ہے - یہ نہیں کہ اگر آپؐ بالذات عالم ہوتے تب تو مصائب نہ چھو سکتے - مگر چونکہ بالعرض عالم تھے تو مصائب نہ رک سکیں - کیونکہ مصائب کا دفعیہ نہ ہو سکنا لاعلمی پر مبنی ہوتا ہے - جس میں ذاتی اور عرضی کی کوئی قید نہیں - نہ کہ علم کی خاص نوعیت کی نفی پر -

حاصل یہ نکلا کہ بالذات تو مجھے علم ہے ہی نہیں کہ میں عالم الغیب کہلاؤں - اور مصائب کی پیش بندی کر لوں - تمام مصائب کے بارے میں یہ علم مجھے بالعرض بھی نہیں کہ تمام مصائب کا پہلے سے کوئی بند و بست سوچ لوں - یعنی ہر ہر مصیبت کے بارے میں مجھے پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی - کہ میں پہلے سے پیش بندی کر لیا کروں،

حاصل وہی علم کلی اور علم ماکان وما یکون کی نفی نکلا - کہ اس قسم کی روزمرہ کی جزئیات اور زمانہ کے حوادث سب کے سب میرے علم میں نہیں، نہ حال کے نہ مستقبل کے، نہ ذاتی طور پر نہ عرضی طور پر، بجز اس کے کہ حق تعالیٰ جب مناسب جانیں اور جس حد تک مناسب جانیں - مجھے اطلاع فرما دیں !

مگر ساتھ ہی ان کونی جزئیات کی لاعلمی سے کوئی ادنیٰ نقص بارگاہِ نبوت میں لازم نہیں آتا، کیونکہ ان امور کا جاننا نبوت کی غرض و غایت نہیں ہے -

اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی جزئیات کا علم وفات کے وقت دے دیا گیا تھا، جیسا کہ کہا جاتا ہے، اور اس طرح حضورؐ کو عالم ماکان وما یکون ثابت کر کے گویا اپنے نزدیک نبوت کی عظمت بیان کی جاتی ہے، تو پہلا سوال تو یہ ہے کہ اس دعوے کی دلیل کتاب و سنت سے کیا ہے ؟ اور جب نہیں تو دعویٰ خارج اور ناقابلِ سماعت ہے !

دوسرے یہ کہ یہ ماکان وما یکون کے تمام امور جو عین وفات کے وقت دیئے گئے، اگر ان کا منصب نبوت سے کوئی

تعلق تھا تو ایسے وقت میں اُن کا دیا جانا جبکہ کارِ نبوت اور عملِ تبلیغ ختم ہو رہا ہے عبث اور بے نتیجہ ہی نہیں بلکہ بعد از وقت ہو جانے کی وجہ سے خلافِ حکمت بھی ہے۔ جس سے اللہ و رسولؐ بری ہیں۔ اس لئے نہ یہ عقیدہ ہی بن سکتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی نصِ قطعی موجود نہیں، بلکہ ہے تو اس کے مخالف ہے۔ جیسا کہ بکثرت ایسی نصوص پیش کی جا چکی ہیں۔ اور نہ یہ کوئی شرعی نظریہ ہی ہو سکتا ہے، جبکہ کسی نص سے وہ ماخوذ اور مستنبط بھی نہیں۔ اور نہ ائمہ اجتہادی میں سے کوئی ادھر گیا ہے کہ اسے اجتہادی نظریہ مان لیا جائے۔ اور ساتھ ہی جن امور کی لاعلمی سے دُنیا میں تکالیف پہنچ جانا ممکن تھا اور وہ پہنچ بھی گئیں، اُن کا عین وفات کے وقت دیا جانا جبکہ ان واردشدہ اور اثر انداختہ مصائب کا وقت بھی گزر چکا تھا اور اب اُن سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، لاحاصل اور بعد از وقت نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ کیا اس قسم کے خلافِ عقل و نقل دعوے کرنے والے حق تعالیٰ کے حکیمانہ کاموں کو بھی مشتے از جنگ کا مصداق بنانا چاہتے ہیں — نعوذ باللہ من ذٰلک الھفوات!

یہ لوگ چلتے ہیں نبوت کی تعظیم کے نام سے اور اُتر آتے ہیں حق تعالیٰ کی توہین پر، جس سے نبوت کی توہین پہلے ہو جاتی ہے!

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا -

لیکن اس کے ساتھ جب ان روایات کو بھی سامنے رکھ لیا جائے، جن میں صراحتاً بہت سے امور کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ نہ وفات سے قبل آپؐ کے علم میں تھے اور نہ وفات کے بعد آپؐ کے علم میں آئے، نہ قیامت کے دن تک بھی آپ کے علم میں آئے اور بعض قیامت کے میدانوں میں بھی علم میں نہ آ سکے، تو پھر یہ دعویٰ کہ حضورؐ کو علم محیط وفات کے وقت دے دیا گیا تھا، محض افترا علی اللہ اور افترا علی الرسول ہی ہو گا۔

مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ:-

"میں شفاعت کبریٰ کے وقت مقامِ محمود پر پہنچ کر اللہ کے اتنے محامد اور محاسن بیان کروں گا جو نہ کسی نے اب تک بیان کئے ہوں گے اور نہ آئندہ کوئی کرے گا۔ اور وہ اس وقت بھی میرے علم میں نہیں، اُسی وقت میرے قلب پر القا کئے جائیں گے۔"

جس سے واضح ہے کہ ان محامد الٰہیہ کا علم آپؐ کو وفات کے وقت بھی نہیں دیا گیا۔ کیا یہ مَا یکون میں داخل نہیں ہے؟ جس کے علم کی آپؐ خود اپنے سے نفی فرما رہے ہیں۔

یا مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ:-

"حوضِ کوثر سے ملائکہ بعض لوگوں کو کوڑے مار مار کر ہٹائیں گے، اور میں کہوں گا اُصیحابی، اُصیحابی" یہ تو میرے لوگ ہیں میرے ہیں، تو جواباً ملائکہ کہیں گے انک لا تدری ما احدثوا بعدک (آپ کو پتہ نہیں ہے کہ انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا نئی بدعتیں ایجاد کی تھیں)"

اس سے واضح ہے کہ ان مبتدعین کے کرتوت کا علم آپؐ کو وفات کے وقت تک نہ تھا جو یقیناً مَا یکون میں شامل ہے۔ اسی طرح مثلاً آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور آپ اپنی دانست میں اُن تک کو جہنم سے نکال لائیں گے جن کے دلوں میں ادنیٰ، ادنیٰ مثقال ذرہ کے برابر بھی ایمان ہو گا۔ اور یہ سمجھ کر مقامِ شفاعت سے واپس ہوں گے کہ اب ایمان والا جہنم میں کوئی باقی نہیں رہا جس کی شفاعت کی جائے۔ تب حق تعالیٰ دو لپیں (دو مٹھیاں) بھر کر اَن گنت انسانوں کو جہنم سے

نکالیں گے۔ ان کے گلوں میں تختیاں ڈال دی جائیں گی۔ جن پر عُتَقَاءُ اللہ لکھا ہوا ہوگا۔ یعنی اللہ کے آزاد کردہ لوگ۔ اس سے واضح ہے کہ ان لوگوں کا ایمان اس درجہ مخفی ہوگا کہ اللہ کے سوا اسے کوئی بھی حتیٰ کہ سید الاولین والآخرین بھی نہ جان سکیں گے۔ اس سے نمایاں ہوگیا کہ بعض ایسے امور بھی ہیں کہ وقت وفات تو بجائے خود ہے عرصات قیامت میں بھی آپؐ انھیں نہ جان سکیں گے، بلکہ اس مخلوق کے جہنم سے نکال لئے جانے کے بعد آپؐ کو علم ہوگا کہ ان میں بھی ایمان کی کوئی رمق موجود تھی۔ اسی طرح آپؐ کا یہ ارشاد کہ:۔

"لوگوں کی کمزوریاں میرے سامنے لا کر مت رکھو، میں چاہتا ہوں کہ تم سب سے ٹھنڈے سینہ سے رخصت ہوں۔"

جس پر صحابہؓ جیسے حقیقی عشاق نے عمل کیا۔ اور حضورؐ کی مجلسِ مبارک اور صحابہ کی زبان مبارک ہر غیبت سے پاک رہی، تو کیا عین وفات کے وقت ایسی کمزوریوں کا علم ظرفِ نبوت میں ڈال دیا گیا ہوگا کہ معاذ اللہ آپ عین رخصت کے وقت صحابہ سے ٹھنڈے سینہ رخصت نہ ہوں اور دل تنگی یا غم والم اور ضیق لے کر جائیں، جس سے بچنے کا پوری عمر شریف میں اہتمام فرمایا۔ بلاشبہ یہ ایک فاسد تخیل ہے جو نادان دوست ہی باندھ سکتا ہے، جسے نہ قرآن کی پروا ہو، نہ حدیث کی، نہ رسول پاک کے مزاجِ پاک کی ورنہ اس حدیث کا سیدھا مفہوم یہ ہے اور یہی ہو بھی سکتا ہے کہ اس قسم کے امور وفات کے وقت بھی سامنے نہیں لائے گئے۔ حتیٰ کہ حوضِ کوثر پر پہنچکر بھی سامنے نہیں آئے، بعض امور کا علم ملائکہ کے فرمانے سے اور وہ بھی لوگوں کی ذاتیات کے بارے میں نہیں، بلکہ عقائد کے بارے میں، جو بدعات کی صورت سے لوگوں نے دین میں ایجاد کرلی تھیں۔

بہرحال عقل ونقل دونوں اس پر کھلے بندوں اپنی پوری عدالت کے ساتھ شاہد ہیں کہ سید البشر کو اگرچہ ساری مخلوقات سے زیادہ علم تھا مگر علم محیط نہ تھا۔ جو خاصہ خداوندی ہے، نہ وفات سے قبل نہ وفات کے بعد۔ نہ برزخ میں نہ عرصاتِ قیامت میں۔ ہاں آپؐ کو علم تھا امورِ دین کے بارے میں، یعنی اصلاح بشر کے سلسلہ کا کوئی قانون اور کوئی اصول ایسا نہ تھا جو آپ کو عطا نہ کردیا گیا ہو۔ کیونکہ آپ خاتم النبیین اور عالمی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دنیا کی ہر قوم کے لئے آپؐ مصلح اور مربی تھے۔ اسلئے اصولاً اقوام عالم کی جتنی ذہنیتیں ہوسکتی تھیں اُتنے ہی رنگ کے قوانین اصلاح بھی ہوسکتے تھے اور آپ جبکہ ان ساری رنگ برنگ ذہنیتوں اور صد الوان مزاجوں کی قوموں کے لئے مصلح بنا کر بھیجے گئے تھے، تو اُن کے حسب حال الوانِ ہدایت کا بھی آپؐ کو جامع ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے ہدایت وارشاد کے سلسلہ کا کوئی اصولی قانون اور کلی ضابطہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کے آپ جامع نہ ہوں۔ پس علم محیط اگر مانا جائے گا تو انواع ہدایت وارشاد کا اور قوانین شریعت کا۔ نہ کہ انواع کائنات، اقسام تجربیات، اصنافِ طبیعیات وریاضیات اور عالم کے حوادث وجزئیات وغیرہ کا۔ کیونکہ انبیاء کی بعثت محسوسات کے دکھلانے یا ان میں صنعت گری کا عمل جاری کرانے کے لئے نہیں ہوتی کہ یہ سب معلومات طبعی اور تجرباتی ہیں۔ جو بہ تقاضائے وقت خود ہی طبائع میں اُبھر آتی ہیں اور طبائع کو اُن کی طرف مائل کردیتی ہیں۔ نبوت کے آنے یا اس کے تبلیغ کرنے پر موقوف نہیں —!

آج اور آج سے پہلے دنیا کی اقوام نے مادیات میں ترقی کرکے بڑے بڑے تمدن پیدا کئے اور آج کی مغربی اقوام نے تو تمدن کو مشینی بنا کر انتہائی عروج پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن ان کی ایجادات کا استناد کون سی نبوت کی طرف ہے۔ اور کس نبی کے حکم سے انہوں نے برق وبخار کی یہ مشینیں تیار کی ہیں؟ اگر نبوت کا کوئی فیضان ان مادہ پرستوں کے قلوب پر ہوتا تو اُن کے تمدن کی صورت ہی کچھ اور ہوتی اور وہ اس طرح دنیا کے حق میں کھلے مُفسِد اور نمایاں فاسد ثابت نہ ہوتے!

بہر حال ان چند کلمات سے علم غیب کے معنی اس کا شرعی حکم، اس کے موضوع کی پوری وضاحت اور اس پر کئے گئے خدشات وشبہات کا کافی وشافی ردّ کتاب وسنت سے واضح ہوگیا، اور نمایاں ہو گیا کہ علم غیب یعنی یعنی علم ذاتی اور علم کلّی یعنی علم ماکان ومایکون، خاصۂ خداوندی ہے۔ جس میں کوئی بھی غیر اللہ اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ حضرت سید الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلّم کا علم تمام عالمِ بشریت عالم ملکیت اور عالمِ ارواح سے فائق اور بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہے، مگر علم الٰہی سے آپؐ کے علم کو کیا نسبت! یہی نصوص شرعیہ کا مقتضا، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ ہے! پس ہر مداح اور ہر عاشق رسولؐ کو اس علمی توحید کا اقرار اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے! اس لئے مسئلۂ علم غیب کے بارے میں اس قسم کے مبالغہ آمیز دعووں کو بہ نام عشق رسولؐ اتنا سہل اور غیر اہم نہ سمجھ لینا چاہئیے۔ جیسا کہ سمجھا جا رہا ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ عقیدہ سے ہے، اس لئے کلیتہً رائے، ذوق، جذبات اور طبعی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف کتاب وسنت کی تصریحات اور ائمہ اہلِ سنت والجماعت کی تشریحات میں محدود ہو جانا چاہئیے۔ واللہ الموفق!

وبوسہ دادن قبر را وسجدہ کردن آنرا وکلہ نہادن حرام وممنوع است ودر بوسہ دادن قبر والدین روایت فقہی نقل می کنند وصحیح آنست کہ **لایجوز**۔

(قبر کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا، رُخسار رکھنا حرام وممنوع ہے اور والدین کی قبر کو بوسہ دینے کے بارے میں فقہی روایت نقل کرتے ہیں۔ مگر ٹھیک بات یہ ہے کہ (یہ بھی) جائز نہیں ہے!

(مدارج النبوۃ۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ)

☆

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔

توحید الوہیت

جن وانس کی تخلیق کی غایت صاف وسلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے:-

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ !

عبادت کے معنی ہیں "توحید"۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی "توحید" کے ہیں۔ گویا محاورہ قرآن میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے معنی ہوں گے نوحدک ونطیعک اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے۔ جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا[1] (پارہ ۵ ع ۳)

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود ورب نہیں۔ یا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ۔ اور یہ عبادت اسی توحید وتقویٰ واطاعت پر مشتمل ہے!

حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ نے بھی انہی الفاظ سے کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا!

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اور مشرکین سے اپنی برأت اس طرح ظاہر فرمادی۔ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ[2]! انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرمادی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔[3]

---

[1] تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو۔

[2] میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے!

[3]۔ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہلِ فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ :-

"تم صرف اللہ ہی کو پوجو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں !"

اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوت الی التوحید کو ختم فرما دیا۔ آپ کو ارشاد ہوا :-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (پ ۹ ع ۱۹)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر !

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیائے اولین و آخرین کا اجماع ہے۔ جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا :-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ - (پ ۱۷ - ع ۲)

ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو !

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ :-

"اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے"۔

ابوجہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلائیے وہ کلمہ کیا ہے۔ ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لئے تیار ہیں"۔

فرمایا۔ "دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ۔

یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا کہنے لگے۔ " أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ - یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے" (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موحد اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہے۔ یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے۔ اور مشرک غیر اللہ کو بھی الٰہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوسِ قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں، کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں !

وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (پ ۷ ع ۱۵)

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں، بنی نوع انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا الٰہ یا معبود قرار دیا۔ اپنے نفع کے لئے ان کی مرضی کا

اتباع کیا۔ یعنی اپنا نافع و ضار سمجھا۔ باعتقاد نفع و ضرر اُن کی تعظیم کی۔ وقت حاجت اُن سے فریاد رسی چاہی۔ اُن سے استعانت کی، اُن کو پکارا، اُن سے التجا کی۔ استغاثہ کیا۔ رجا و خوف کا تعلق اُن سے رکھا۔ اُن کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصّہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے اُن کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلّت کی نسبت اُن سے جوڑی۔ اُن کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیاء کرام نے انھیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انھیں للکارا کہ ؎

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی   بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی!

تو ان مشرکین نے از راہ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا:۔

أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ؟ (پ ۸ ع ۱۶)

کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا، إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰)

یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا!

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مقر تھے، اُس پر ایمان رکھتے تھے، اُن کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے۔ لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (پ ۲۵ ع ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۔ رزاق بھی وہی ہے، محی و ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی۔ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (پ ۱۱ ع ۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے!۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ (پ ۱۸ ع ۵) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے۔ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۔ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ، قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (پ ۱۸ ع ۵) زندگی گزارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے ہدایتِ رب کا محتاج نہ جانتے تھے!

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوایا ہے:۔

لقد علمت ما انزل هؤلاء الا رب السموات والارض بصائر (پ ۱۵ ع ۱۲)

تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے ذرائع ہیں۔ اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ انی اخاف الله رب العالمين ۔ نیز رب انظرنی اور رب بما اغويتنی ؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا۔ یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی و ابدی نہیں مانتے تھے۔ اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا۔ سوائے ثنویہ کے دنیا میں

کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکینِ مکہ توحیدِ ربوبیت تک کے مقر تھے، وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت وحاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک ومحکوم جانتے تھے، چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے:۔

لبیک لا شریک لک الا شریک ھو لک تملکه وما ملک۔

اے اللہ! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر
وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شئے کا مالک نہیں!

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک وحاکم قرار دے رہے ہیں۔ اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعترافِ وجودِ باری اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انھیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا؟ اُن کے تمام نیک اعمال کیوں حبط اور برباد قرار دیئے گئے؟ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا یہ "ایمان باللہ" کیوں ان کی جان ومال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود "اعداء اللہ" کیوں قرار پائے؟ اُن کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ اُن کا شمار "ہالکین" میں کیوں ہوا؟ اُن کو بے عقل حیوان بلکہ اُن سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ اُن کے متعلق کیوں فرمایا؟

اس کا جواب تم اُوپر پڑھ چکے ہو، وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے۔ اشراک فی العبادۃ! ہر قوم اور ہر اُمت کے لئے ایک نبی مبعوث ہوا، اور اُس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی:۔

ولقد بعثنا فی کل اُمّۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ۔!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افرادِ عبادت الٰہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افرادِ ربوبیت کے مقر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود مانو! لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل ہو جاؤ! اس کے معنی ومقتضیٰ پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سراً وعلانیتہً قلبی وقالبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، یا پرستش کی کوئی سی شکل، صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہو۔ اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے، تم اللہ ہی کے فقیر ہو۔ ذل و افتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو! جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو۔ اُن سے نفع وضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو۔ اللہ تمہارے لئے بہرحال کافی ہے! اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ۔ تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کر رہنا چاہیئے!

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ!

با خلق آشنا نہ شود مبتلائے تو	بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو
میخواہم از خدا بدعا صد ہزار جان	تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سُن کر کہا:۔

"دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ اس کا انکار نہیں کرتے۔ اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے، بلکہ اُن کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں۔ اللہ ہی کو مالک

و حاکم و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں۔ ہم ان کو محض اپنا "شفیع" (وکیل اور سفارشی) جانتے ہیں، ہم اُن کی عبادت اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا "شفاعت" اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں۔ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللّٰهِ (پ۱۱ع۶) اُن کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی و خفگی سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (پ۲۳ع۱۵)

یہی اُن کا کذب، کفر اور شرک تھا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (پ ۶) سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے یہ معبود کون تھے، جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے، اُن کی تحقیق کی رُو سے بت پرستوں (عابدانِ اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں، کیونکہ انبیاء میں **سب سے پہلے** نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ اور جب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبدوا اللّٰه واتقوه واطیعون (پ۱۹ع۹) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب و روز کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ:-

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔

"تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ وَد کو اور سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا۔"

اب ان کے یہ معبودانِ باطل ود و سواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے، اُن کی موت کے بعد اُن کے بیٹھنے کی جگہ پر اُن کے نشان قائم کئے گئے، اُن کا بھی وہی نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعا رہے ہیں، روزِ حشر بھی **مقبول الشفاعت** رہیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:-

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (پ۱۱ع۷)

یعنی لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم! نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے!

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کی بت پرستی کا منشا و اولیاء، انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں کو اُنہی کی صورت پر تراشا۔ اور انھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیازان کے سامنے جھکاتے تھے، اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست، اور نبی پرست تھے۔ اب ذرا فخر رازیؒ کی عبارت بھی سن لو، جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے:-

انهم وضعوا هذه الاصنام والاوثان على صور انبيائهم واكابرهم وزعموا انهم متى اشتغلوا لعبادة هذه التماثيل فان اولئك الاكابر تكون شفعاء هم عند الله تعالى ونظيره فى هذا الزمان اشتغال كثير من الخلق بتعظيم قبور الاكابر على اعتقاد انهم اذا عظموا قبورهم فانهم يكونون شفعاء لهم عند الله۔[1]

یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے تو یہ اکابر اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، اس کی نظیر اس زمانے میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے، اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے۔

اوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انھیں خوب ذہن نشین کر لو۔

(۱) زمانۂ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے، حق تعالیٰ نے اُنھیں "مشرک" قرار دیا ــــ!

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجب شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں ہے، بلکہ ان کی عبادت اس لئے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے، یہ شرک ہے)

(۳) جو افعالِ عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائے گا۔ اور اس کا دعوئے اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بت پرستوں کی نظیر قرار دیا ــــ!

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر اُن کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر اُن کو بالاستقلال عالم میں متصرف جان کر پوجنا تو بدرجہ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی کشادگی چاہنا۔

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ صـ۵۵۲ سورۂ یونسؑ تحت آیہ هؤلاء شفعاءنا عند الله ــ!

قضاء حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔
مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو "مقرب" و "شفیع" اور نافع و ضار جان کر اُن کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور:-

(۱) اُن سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے، یعنی اُن کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے!

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ اُن کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، اُن سے منتیں مانگتے تھے، اُن کے لئے جانور ذبح کرتے اور اُن کے ارد گرد پھرتے یا طواف کرتے تھے، گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اس کو خالق و رازق، محی و ممیت، مدبر زمین و آسمان مانتے تھے۔ ومایؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ندا، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ سب افعالِ عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب، واحد و احد ہے تو پھر ان افعال کا تعلق صرف اُسی سے ہونا چاہیئے اور کسی غیر سے نہیں۔ اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً (پ ۵ ع ۳) یہی ہے افراد عبادت للہ فاعبد اللہ مخلصاً لہ الدین الا للہ الدین الخالص[1] (پ ۲۳ ع ۱۵) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اور اسی لئے اُنھیں تہدید کی گئی تھی۔ کہ فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔ یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ند، ہمسر نہیں، پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کر کے اُن کو معبود قرار دے کر اُنھیں حق تعالیٰ کا ہمسر بناتے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب، ندا و دعا، نذر و نیاز، ذبح و نحر، طواف و عکوف کے ذریعہ حاصل کر دگے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قریب" کر دیں گے اور تمہارے شفیع بن جائیں گے، قطعاً باطل ہے!

ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذاً من الظالمین ط (پ ۱۱ ع ۱۶)

مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان، پھر اگر تو ایسا کرے تو تُو بھی اُسی وقت ظالموں میں ہو جائے گا!

جلبِ منفعت و دفع مضرت کے لئے غیر اللہ کو زور زور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو اُن سے عرض کرنا اور اس طرح اُن کی پرستش کرنا، بڑے ظلم و ستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد، نفع و نقصان سب کچھ ہے، اُس پروردگار کو چھوڑ کر، اُس سے مُنہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ذلت و فقر کی نسبت اُن سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر۔ اس سے بڑھ کر دُنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے، شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے۔
ان الشرک لظلم عظیم (پ ۲۱ ع ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے "دون اللہ" اور "غیر اللہ" کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے، اس لئے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اُس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں، یہ صریحاً غلط ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:-

---

[1] سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیئے۔ یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے!

(۱) علمِ اصول کا یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ "العبرت بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد" یعنی اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں۔ سب اُن میں داخل ہیں، خواہ ولی، نبی ہو، یا جن اور پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِہٖ لکھتے ہیں کہ قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملئکۃ والمسیح وعزیر۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیحؑ وعزیرؑ۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی ویسی ہی زجر و توبیخ کی ہے، جیسی کہ بُت پرستوں کی کی ہے۔ اس عمومِ الفاظ کے اعتبار سے صاحبِ جلالین نے اکثر مقامات پر دُون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے!

(۲) جیسا کہ ہم نے اُوپر تصریح کی ہے، کفّار نے اپنے بُت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تراشے تھے اور اُن کی بُت پرستی کا منشاء اُن ہی اکابر کی تعظیم تھی۔ لہٰذا وہ دراصل پتھروں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء اور صلحاء کو پوج رہے تھے!

غرض غیر اللہ و دُون اللہ سے مراد نہ صرف بُت ہی بلکہ انبیاء، اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وثن، نبی و ولی، پیر، شہید، جن، پری، سب حرمتِ عبادت میں مساوی ہیں اور اُن میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں، کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے، بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللازم باطل فالملزوم مثلہ!

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (پ ۹ ع ۱۴)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں، سو تم اُن کو پکارو! پھر اُن کو چاہیئے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء، انبیاء اور ملائکہ کو دفعِ مضرت وجلبِ منفعت کے لئے پکارا کرتے تھے۔ اس لئے اُن سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لئے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں۔ محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرتا ہے، اسی لئے مقاتلؒ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ:-

"مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود! اس لئے کہ وہ مِنْ دُوْنِ اللہ سے دعا کرتا ہے اور مِنْ دون اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود!

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ

رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا -

جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی، سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، نہ ان کے بدل ڈالنے کا - یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں !

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے - کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے برے کا مختار جان کر پکارتے ہیں، ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرارِ عباد - کیونکہ حق تعالیٰ سے امید و رجا رکھنا اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے، پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعیہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردود دین کے ماننے والوں کا کیا حال ہو گا !

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے :-

قل ادعوا الذین زعمتم انهم الهة من دونه کالملائکة والمسیح وعزیر، فلا یملکون فلا یستطیعون کشف الضر عنکم کالمرض والفقر ولا تحویلا ولا تحویل ذلک منکم الی غیرکم۔

دیکھو بیضاوی نے صراحت کر دی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر تک "کشفِ ضر" یعنی مرض و فقر و قحط یا مصائب و آفات کے رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں - جب ان ابرار کبار کا یہ حال ہو تو ان سے کم درجہ کے لوگوں کا کیا پوچھنا !

يَا اَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔

اے لوگو! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے، اس کو کان لگا کر سنو - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے - گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے - ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر - ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی، جیسی تعظیم کرنا چاہیئے تھی وہ نہ کی، اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے!

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ

إِلَّا فِي ضَلَالٍ (پ ۱۳ ع ۸)

سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے، اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آنے والا نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے!

یعنی پکارنا اسی کو چاہئیے، درد و مصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہئیے۔ جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو۔ عاجز و فقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے کیا حاصل؟ حق تعالیٰ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے۔ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لئے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا —!

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور بفحوائے اشد الناس بلاءً الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں۔) تو ان کا رخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا۔ ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے۔ ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کو جور و ستم سے عاجز اور تنگ آکر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کی کہ:-

أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ (پ ۲۷ ع ۸)　　میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجئے!

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و درماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور پکارا:-

رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (پ ۲۰ ع ۶)

اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھے بھیجدیں میں اس کا حاجت مند ہوں!

غم ناکم و از در تو با غم نہ روم　　جز شاد و امید وار و خرم نہ روم
از درگہ ہمچو تو کریمے ہرگز　　نومید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی:-

إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (پ ۱۷ ع ۶)

مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں!

یارب کرم تو گر نباشد مددم　　خونِ جگر از دیدہ رود تا ابدم!

اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و ماندہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ:-

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (پ ۱۷ ع ۶)

(حق تعالیٰ) آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک ہیں، میں بیشک قصوروار ہوں!

اور حضرت یونس ؑ ہی کے متعلق ارشاد ہے:-

فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (پ ۲۳ ع ۹)

اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتے!

دیکھو "لبث" کو لام تاکید سے موکد فرمایا گیا ہے اور مناط نجات تسبیح الٰہی کو قرار دیا گیا ہے، مگر کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، اُن کو پکارنے اور اپنا درد و غم ان کے سامنے رکھنے کو!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے - چنانچہ مروی ہے ----
اذا حزنه امر فزع الی الصلوٰۃ (رواہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و تہلیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے -
ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے:-

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے:-

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ!

جب دعا میں کوشش کرتے تو فرماتے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ - آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے:-

اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ!

اے اللہ مجھے بس تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے پل بھر کے لئے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر اور میرے سب کام درست کر دے! تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں!

عمیس کی صاحبزادی اسماء (جو حضرت عائشہ صدیقہ کی بہن تھیں) کو فرمایا - کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلا دوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہہ اللّٰهُ اللّٰهُ رَبِّیْ لَا اُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہ تھا - غیر وقت نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرض کے بار کے نیچے دبا جا رہا ہوں، متفکر اور پریشان ہوں، فرمایا، صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو:-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّیْنِ وَ قَهْرِ الرِّجَالِ!

ایک مرتبہ فرمایا:-

مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّ مِنْ كُلِّ ضِیْقٍ مَخْرَجًا وَّ رَزَقَهٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ!

یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع

پھر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے تو کہا کرے:۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ (کذا فی المشکوٰۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اوذی بنی ما اوذیت۔ یعنی جتنی اذیت مجھے پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم ابونا، یا نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو رفع کرتی ہے۔ جو "دافع رنج تم" ہے، "کاشف غم" ہے، جو "مجیب دعوت المضطرین" ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپؐ نے تعلیم فرمائی تھی کہ:۔

"یا غلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدہ تجاھک، واذا سألت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشیء لم ینفعوک الا بشیء کتب اللہ لک ولو اجتمعوا علی ان یضروک بشیء لم یضروک الا بشیء قد کتبہ اللہ علیک رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس)"

اے لڑکے اللہ کو یاد رکھ وہ تجھ کو یاد رکھے گا۔ اللہ کو یاد رکھ کہ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کچھ مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین) اور یہ یقین کرلے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا۔ اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائیں گے، قلم اٹھائے گئے اور خشک ہو گئیں کتابیں۔"

دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سبھوں سے توڑ کر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفیٰ باللہ وکیلاً!

از خدا خواہم و زغیر نخواہم بخدا!!
کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگرست!

کیا یہ آزادی، بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں۔ ان ہی کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسولؐ کی اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ:۔

یسأل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسأل الملح وحتی یسألہ شسع نعلہ اذا انقطع۔ (اخرجہ الترمذی عن انسؓ)

ہر کسی کو چاہیئے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنہیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے، مصائب میں انہی کو پکارتی ہے، آفات کے دُور کرنے کے لئے اُن ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اُوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ:۔

ینبغی لکل مؤمن ان یجعل ھذا الحدیث مرآۃ لقلبه وشعاره ودثاره وحدیثه فیعمل به فی جمیع حرکاته وسکناته حتی یسلم فی الدنیا والاخرۃ ویجد العزۃ فیهما برحمۃ اللّٰہ تعالیٰ۔

یعنی ہر مومن کو چاہیئے کہ اس حدیثِ نبوی کو اپنے قلب کے لئے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و زشتی، راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے لئے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دُنیا و آخرت میں تمام آفاتِ نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہاں میں عزت پائے!

درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدے سے پکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کرسکتے ہیں۔ یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے، تمام فقہاء نے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اُوپر دیا جاچکا ہے!

اولیاء اللہ کی قبروں پر جاکر اُن کو پکارنا، اس کی دو صورتیں ہیں:۔

(۱) قبر کے نزدیک جاکر اُن سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنئے، میری بلا کو ٹال دیجئے۔ میری حاجت کو روا کیجئے"۔ یہ استغاثہ و استعانت، دعا اور طلبِ حاجت ہے، خواہ قریب سے کی جائے یا دُور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اُوپر اس کا ثبوت دیا جاچکا ہے!

(۲) قبر کے نزدیک جاکر اُن سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے اور میری حاجت کو روا کرے"۔ یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا!

امام ابوحنیفہؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آکر کہہ رہا ہے کہ:۔

"ھل لکم من خبرٍ وھل عندکم من اثرٍ انی اتیتکم ونادیتکم من شھورٍ ولیس سوالی منکم الا الدعا، فھل دریتم ام غفلتم"

اے اہلِ قبور! کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو۔ کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے۔

یہ سُن کر امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا "ھل اجابوا لک"؟ کیا انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا

"نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا:۔

"سحقا لک وتربت یداک! کیف تکلم اجسادا لا یستطیعون جوابا ولا یملکون شیئا ولا یسمعون صوتا"

پھٹکار ہو تجھ پر! خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شئے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سُن سکتے!

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ "وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ "آپ ان لوگوں کو جو قبر میں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے۔"

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:۔

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر آکر اُن سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہلِ قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں۔

(۲) مُردے نہ سُن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا، مصیبتوں کا دُور کرنا، اُن سے کیا ہو سکتا ہے اور جب یہ نزدیک سے سُن نہیں سکتے تو دُور کی کب سُنیں گے؟ محققین حنفیہ سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اُس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی، بہترین توجیہ یہ ہے کہ:۔ یہ آپ کا معجزہ تھا، حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفارِ موتیٰ کو سُنا دی تھی۔ چنانچہ کفایہ میں ہے:۔

من اجوبتھم انہ صح ذلک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

کافی شرح وافی میں صراحت کی گئی ہے کہ:۔

والمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذا لا یتحقق بعد الموت!

یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں۔

اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں:۔

قولہ لان المقصود من الکلام۔ الافہام ای افہامہ فلانا والموت ینافیہ ای ینافی الکلام الاسماع والمیت لیس باھل السماع الاتری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتیٰ والی قولہ تعالیٰ وما انت بمسمع من فی القبور!

شرح مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لئے ثابت کرنا فرقۂ صالحیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے:۔

"الصالحیہ اصحاب الصالحی ومذھبھم انھم جوزوا قیام العلم والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر بالمیت ویلزمھم جواز ان یکون الناس مع اتصافھم بھذہ الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیا۔"

یعنی صالحیہ گروہ ہے صالحی کا اور مذہب اُن کا یہ ہے کہ انہوں نے میّت کے لئے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، اُن کے مذہب کی رُو سے تو یہ لازم آتا

ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں، وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں؟"
اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گور پرست مشائخ اسی فرقۂ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک!
یہاں غلط فہمی دُور کرنے کے لئے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دُور سے درود بھیجتا ہے اُس کو آپؐ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپؐ اس کو نہیں سُنتے، البتہ بزرگانِ دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایات مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپؐ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سُنتے ہیں۔ چنانچہ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ:۔

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی علیّ نائیا ابلغته۔"

یعنی جو درود بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اُس کو میں خود سُنتا ہوں، اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دُور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہِ راست نہیں سُنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا۔

اسی طرح ابن حجر مکی نے شرح ہمزیہ میں ذکر فرمایا ہے:۔

اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعاً حقیقیاً ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لایسمعہ الا بواسطۃ یدل علیہ احادیث کثیرۃ!

یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپؐ پر درود وسلام بھیجتا ہے۔ تو آپؐ اس کو حقیقت میں سُنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلاواسطہ۔ اور اگر کوئی دُور سے آپؐ پر درود وسلام بھیجتا ہے تو آپؐ اُس کو نہیں سُنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپؐ تک پہنچاتے ہیں[1]) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد سما گئی ہے اور یہ اُن کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ ایک حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ "حصن حصین میں حضرتؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اُس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعینونی یا عباد اللہ" "اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو۔" اس حدیث سے استناد کر کے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں۔ اعینونی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ، یا نقشبند! یا بدوی! یا شاذلی ہماری مدد کرو!

حصن حصین کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی (رواہ طبرانی)

[1] ان اللہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبد اللہ بن مسعود سے، رواہ النسائی وابو حاتم فی صحیحہ)

اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اُس پر علماءِ حق نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابنِ حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور ہیثمی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی (ابن بریدہ اور ابن مسعودؓ کے درمیان) چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہلِ اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے وہ مجہول الحال ہے، یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بناء پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کر کے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیں، تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباداللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لئے معین و مقرر ہیں۔ـــ!

اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حصن حصین میں ملتی ہے، جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے:۔

اذا اضاع لہ شیئاً او ابق فلیقل۔ اللّٰھم راد الضالۃ وھادی الضلالۃ انت تھدی من الضلالۃ اردد علیّ ضالتی بقدرتک وسلطانک فانھا من عطائک وفضلک ـــ!

یعنی جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اُس کا غلام بھاگ جائے تو یُوں دعا کرے۔
"اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تُو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے۔ واپس دلا دے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی۔

علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اُوپر کیا ہے، اُس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن باللہ۔ یہ معارض و مخالف ہے، حدیث اعینونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباسؓ موافق ہے نحوائے کلام مجید کے لہٰذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیئے!

ندا اور استعانت کی تائید میں اہلِ استمداد ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں۔ سوال خود پیش کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "یا رسول اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزیمہ، حاکم، بیہقی نے یہ روایت کی ہے:۔

اللّٰھم انی اسألک واتوجہ الیک بحبیبک المصطفٰے عندک یا حبیبنا یا محمدؐ انا نتوسل بک الی ربک فاشفع لنا عند المولی العظیم یا نعم الرسول الطاھر اللّٰھم شفعہ فینا بجاھہ عندک ـــ!

اس دعا میں یا محمدؐ! کی ندا ہے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسولؐ! یا غوث! پکارنا شرک نہیں، جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کرکے اہلِ استمداد نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا خواجہ! یا بدوی! یا شاذلی! یا نقش بند پکارنا جائز ہے!

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے :۔

(۱) مروی ہے کہ ایک اندھے نے حضور انورصلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپؐ میرے لئے حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تُو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینائی پر صبر کر، کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے! اس نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا ہی کیجئے۔ آپؐ نے خود دعا نہیں فرمائی۔ بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:۔

اللھم انی اسئلک واتوجه الیک بنبیک نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی فشفعه فی! (ترمذی)

یا اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعہ سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے، الٰہی! تُو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما!

نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی کہ اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہوگیا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابلِ استدلال نہیں۔ کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہا و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابلِ حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے! (قرآن اور تعمیرِ سیرت)

ترجمہ و ترتیب:-
مولانا مفتی محمد شفیع

بدعات و محدثات

حضرات صوفیائے کرام کی نظر میں

بدعات و محدثات کے ایجاد کرنے والے اور اُن پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ طریقت کی پناہ لیتے ہیں- اور اُنہی کی طرف منسوب کرتے ہیں- یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ طریقت و شریعت دو متضاد چیزیں ہیں- بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں، اہل طریقت اُن کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے- کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد دین و ایمان کی خیر نہیں- کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے- جب اُس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا- تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے!

اسی لئے مناسب معلوم ہوا کہ حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ کے ارشادات بدعات کی مذمت اور اتباع سنت کی تاکید میں بقدر کفایت جمع کر دیئے جائیں، تاکہ عوام اس دھوکہ سے بچ جائیں کہ مشائخ طریقت بدعات کو مذموم نہیں سمجھتے - یا اتباع سنت میں متساہل ہیں-

اس سلسلہ کے لئے علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الاعتصام صـ۱۰۶ جلد اوّل میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے- جس میں صوفیائے متقدمین کے ارشادات در بارۂ مذمت بدعات جمع کئے ہیں- ہمارے لئے اُن کا ترجمہ کر دینا کافی ہے-!

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں:-

"جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے، اُس کو حکمت نصیب نہیں ہوتی"

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ

آپ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دعا قبول فرمانے کا وعدہ کیا ہے- فرمایا:- اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ - مگر ہم بعض اہم کاموں کے لئے زمانہ دراز سے دعا کر رہے ہیں- قبول نہیں ہوتی اس کا کیا سبب ہے، آپ نے فرمایا- تمہارے قلوب مر چکے ہیں- اور مُردوں کی دعا قبول نہیں ہوتی اور موت قلوب کی دس سبب ہیں:-

اوّل یہ کہ تم نے حق تعالیٰ کو پہچانا- مگر اُس کا حق ادا نہیں کیا-!

دُوسرے تم نے کتاب اللہ کو پڑھا اور اُس پر عمل نہیں کیا-!

تیسرے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ تو کیا- مگر آپ کی سنت کو چھوڑ بیٹھے-

چوتھے- شیطان کی دشمنی کا دعویٰ کیا- مگر اعمال میں اُس کی موافقت کی-!

پانچویں۔ تم کہتے ہو کہ ہم جنّت کے طالب ہیں۔ مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتے!

اسی طرح پانچ چیزیں اور شمار کرائیں۔ غرض اس حکایت کی نقل سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ ترکِ سنت کو موتِ قلب کا سبب قرار دیتے ہیں!

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

حق تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ اخلاق و اعمال اور تمام امور اور سنن میں حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اور فرمایا کہ لوگوں کے فساد کا سبب چھ چیزیں ہیں:۔

اوّل یہ کہ عملِ آخرت کے متعلق اُن کی ہمتیں اور نیتیں پست اور ضعیف ہوگئیں۔

دُوسرے یہ کہ اُن کے لئے نفوس اُن کی خواہشات کا گہوارہ بن گئے!

تیسرے یہ کہ اُن پر طولِ اَمَل غالب آگیا، یعنی دُنیوی سامان میں قرنوں اور برسوں کا انتظام کرنے کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ عمر اُن کی قلیل ہے!

چوتھے یہ کہ انہوں نے مخلوق کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا پر ترجیح دے رکھی ہے!

پانچویں یہ کہ وہ اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے تابع ہوگئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی سنّت کو چھوڑ بیٹھے!

چھٹے یہ کہ مشائخ سلف اور بزرگانِ متقدمین میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش صادر ہوگئی، تو اُن لوگوں نے اُسی کو اپنا مذہب بنا لیا اور اُن کے فعل کو اپنے لئے محبت سمجھا۔ اور اُن کے باقی تمام فضائل و مناقب کو دفن کر دیا!

ایک شخص کو آپ نے نصیحت فرمائی کہ تمہیں چاہیئے کہ سب سے زیادہ اہتمام اللہ تعالیٰ کے فرائض و واجبات کے سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے کا کرو۔ اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں منع کیا ہے، اُس کے پاس نہ جاؤ۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عبادت کا وہ طریقہ جو اُس نے خود تعلیم فرمایا ہے، اُس طریقے سے بہت بہتر ہے، جو تم خود اپنے لئے بناتے ہو۔ اور یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے لئے اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے۔ جیسے بعض لوگ، خلافِ سنّت رہبانیت کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں!

بندہ کا فرض یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آقا کے حکم پر نظر رکھے، اور اسی کو اپنے تمام معاملات میں حَکم بنائے۔ اور جس چیز سے اُس نے روک دیا ہے، اُس سے بچے!

آجکل لوگوں کو حلاوتِ ایمان اور طہارتِ باطن سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ فرائض و واجبات کو معمولی باتیں سمجھ کر اُن کا اتنا اہتمام نہیں کرتے، جتنا کرنا چاہیئے!

حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

میں ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے بشر! تم جانتے ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے سب اقران پر فوقیت و فضیلت کس سبب سے دی ہے۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں واقف نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ تم میری سنّت کا اتباع کرتے ہو۔ اور نیک لوگوں کی عزت کرتے ہو، اور اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کرتے ہو۔ اور میرے صحابہؓ اور اہلبیت سے محبت رکھتے ہو!

حضرت یحیٰی بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
لوگوں کے تمام اختلافات کی اصل تین چیزیں ہیں - اور اُن تینوں کی تین ضدین ہیں - جو شخص ایک اصل سے علیحدہ ہے، اُس کی ضد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
وہ تین اصل یہ ہیں :-
ایک توحید اور اُس کی ضد ترک ہے۔
دوسرے سنّت اور اس کی ضد بدعت ہے۔
تیسرے طاعت، اُس کی ضد معصیت ہے۔ !

حضرت ابوبکر دقاق رحمتہ اللہ علیہ :-
حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہ جو حضرت جنیدؒ کے اقران میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اُس میدان میں گزر رہا تھا، جہاں چالیس سال تک اسرائیل قدرتی طور پر محصور رہے۔ اور نکل نہ سکتے تھے۔ جس کو وادی کہا جاتا ہے، اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ علمِ حقیقت علم شریعت سے مخالف ہے۔ اچانک مجھے غیبی آواز آئی :-

کل حقیقۃ لا تتبع الشریعۃ فہی کفر !
جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے !

حضرت ابو علی جوزجانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
بندہ کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ اُس پر خدا اور رسولؐ کی اطاعت آسان ہو جائے ! اور اُس کے افعال مطابق سنّت ہو جائیں - اور اس کو نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہو جائے - اور اپنے احباب و اخوان کے ساتھ اُس کو حُسن اخلاق کی توفیق ہو اور خلق اللہ کے لئے اُس کا نیک سلوک عام ہو - اور مسلمانوں کی غمخواری اس کا شیوہ ہو ! اور اپنے اوقات کی نگہداشت کرے، یعنی ضائع ہونے سے بچائے !
کسی نے آپ سے سوال کیا کہ اتباعِ سنت کا کیا طریقہ ہے ؟ فرمایا کہ بدعات سے اجتناب اور اُن عقائد اور احکام کا اتباع، جس پر علمائے اسلام کے صدرِ اوّل کا اجماع ہے اور اُن کی اقدار کو لازم سمجھنا !

حضرت ابوبکر ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
کمالِ ہمت اس کے تمام اوصاف کے ساتھ سوائے اہلِ محبت کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ درجہ اُن کو محض اتباعِ سنّت اور ترکِ بدعت کی وجہ سے حاصل ہوا - کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے زیادہ صاحبِ ہمت اور سب سے زیادہ ساعی الی اللہ تھے !
ہمت اصطلاح صوفیہ میں توجہ اور تصرف کو کہتے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی تخیّل کی قوّت کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کی طرف جمع کرے، اس جگہ ممکن ہے کہ یہی مراد ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تصرف اور ہمت اصطلاح کے استعمال کا صدور کہیں صراحتہً ثابت نہیں - اس لئے غالباً اس جگہ ہمت کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی دین کے کاموں میں چستی اور مضبوطی سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم !

حضرت ابوالحسن وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

بندہ اللہ تک صرف اللہ ہی کی مدد اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء فی الاحکام کے ذریعہ سے پہنچ سکتا ہے اور جو شخص وصول الی اللہ کے لئے سوائے اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے تو ہدایت حاصل کرنے کی خاطر گمراہ ہو گیا۔!

حضرت ابو محمد عبدالوہاب ثقفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

اللہ تعالیٰ صرف وہی اعمال قبول فرماتے ہیں۔ جو صواب و درست ہوں۔ اور صواب و درست میں بھی صرف وہی اعمال مقبول ہیں جو خالص اسی کے لئے ہوں اور خالص میں بھی صرف وہی مقبول ہیں جو سنّت کے مطابق ہوں ۔۔۔!

حضرت ابراہیم بن شیبان رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ بزرگ حضرت ابو عبداللہ مغربی اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب میں سے تھے، بدعات سے سخت متنفر اور مبتدعین پر سخت رد کرنے والے کتاب و سنت کے طریقہ پر مضبوطی سے قائم اور مشائخ ائمہ، متقدمین کے طرز کا التزام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن منازل اُن کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن شیبانؒ تمام فقراء اور اہلِ آداب و معاملات پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حجت ہے!

حضرت ابوعمر زجاجی رحمۃ اللہ علیہ

یہ عُبّاد و زہاد کے مشہور امام حضرت جنیدؒ اور سفیان ثوریؒ کے اصحاب میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:-

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اُن چیزوں کا اتباع کرتے تھے جن کو اُن کی عقلیں مستحسن سمجھتی تھیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو آپ نے اُن کو اتباع شریعت کا ارشاد فرمایا۔ پس عقل صحیح و سلیم وہی ہے جو مستحسنات شرعیہ کو اچھا اور مکروہات شرعیہ کو ناپسند سمجھے۔!

حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

میں نے تین سال مجاہدات کئے مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباع علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہوا۔ اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں مصیبت میں پڑ جاتا۔ بلاشبہ علماء کا اختلاف رحمت ہے، مگر وہ اختلاف جو تجرید توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں ہے اور اتباع صرف اتباع سنت کا نام ہے۔ کیونکہ علم سنت کے علاوہ دوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں۔!

ایک مرتبہ ایک بزرگ اُن کے وطن تشریف لائے۔ شہر میں اُن کی ولایت و بزرگی کا چرچا ہوا۔ حضرت ابو یزیدؒ نے بھی زیارت کا قصد کیا۔ اور اپنے ایک رفیق سے کہا کہ چلو اُن بزرگ کی زیارت کر آئیں۔ ابو یزید اپنے رفیق کے ساتھ اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ بزرگ گھر سے نماز کے لئے نکلے، جب مسجد میں داخل ہوئے تو جانب قبلہ میں تھوک دیا۔ ابو یزیدؒ یہ حالت دیکھتے ہی واپس ہو گئے اور اُن کو سلام بھی نہ کیا۔ اور فرمایا۔ یہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے، اس سے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کوئی ولی اللہ ہو!

امام شاطبیؒ اس واقعہ کو کتاب الاعتصام میں نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو یزیدؒ کا یہ ارشاد ایک

اصل عظیم ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تارک سنت کو درجہ ولایت حاصل نہیں ہوتا - اگرچہ ترک سنت، بوجہ ناواقف ہونے کے ہوا ہو — !

اب آپ اندازہ کریں کہ جو علانیہ ترک سنت اور احداث بدعت پر مُصر ہوں، اُن کو بزرگی اور ولایت سے کوئی دُور کا واسطہ بھی ہو سکتا ہے ؟

نیز ابو یزیدؒ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی شخص کی کُھلی کُھلی کرامات دیکھو- یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگے، تو اُس سے ہرگز دھوکا نہ کھاؤ - اور اُس کی بزرگی و ولایت کے اس وقت تک معتقد نہ ہو، جب تک کہ یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور جائز و ناجائز اور حفاظتِ حدود اور آدابِ شریعت کے معاملہ میں اُس کا کیا حال ہے — !

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

بندہ جو فعل بغیر اقتداء (رسول) کے کرتا ہے، خواہ وہ (بصورت) طاعت ہو یا معصیت، وہ عیش نفس ہے- اور جو فعل اقتداء و اتباع سے کرتا ہے- وہ نفس پر عتاب اور مشقت ہے- کیونکہ نفس کی خواہش کبھی اقتداء و اتباع میں نہیں ہو سکتی - اور اصل مقصود ہمارے طریق (یعنی سلوک) کا یہی ہے - کہ اتباع ہوا سے بچیں !

نیز فرمایا کہ ہمارے (یعنی صوفیائے کرام کے) اصول سات ہیں:-

۱- کتاب اللہ کے ساتھ تمسک -

۲- سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار

۳- اکلِ حلال (یعنی کھانے پینے اور استعمال کرنے میں اس کا لحاظ کہ کوئی چیز حرام و ناجائز نہ ہو)

۴- لوگوں کو تکلیف سے بچانا -

۵- گناہوں سے بچنا-

۶- توبہ — !

۷- ادائے حقوق — !

نیز ارشاد فرمایا کہ تین چیزوں سے مخلوق مایوس ہو گئی:-

۱- توبہ کا التزام !

۲- سنتِ رسول کا اتباع !

۳- مخلوق کو اپنی ایذا سے بچانا !

نیز کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ فتوت (عالی ظرفی) کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ اتباعِ سنت — !

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

بسا اوقات میرے قلب میں معارف و حقائق اور علوم صوفیاء میں سے کوئی خاص نکتۂ عجیبہ وارد ہوتا ہے اور ایک زمانہ دراز تک وارد ہوتا رہتا ہے- مگر میں اس کو دو عادل گواہوں کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا - اور وہ عادل گواہ کتاب و سنت ہیں — !

حضرت احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

جو شخص کوئی عمل بلا اتباعِ سنت کے کرتا ہے، اُس کا عمل باطل ہے!

حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

جو شخص ہر وقت اپنے احوال وافعال کو کتاب وسنت کی میزان میں وزن نہیں کرتا اور اپنے خواطر (واردات قلبیہ) کو متہم (ناقابلِ اطمینان) نہیں سمجھتا - اس کو مردان راہ تصوف میں شمار نہ کرو۔ نیز آپ سے بدعت کی حقیقت دریافت کی گئی، تو فرمایا - کہ احکام میں تعدی، یعنی شرعی حدود سے تجاوز کرنا - اور تہاون فی السنن یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع میں سستی کرنا - اور اتباع الآراء والاھواء یعنی اپنی خواہشات اور (غیر معتبر) آراء رجال کی پیروی اور ترک الاتباع والاقتداء یعنی سلف صالح کے اتباع واقتداء کو چھوڑنا اور کبھی کسی صوفی کو کوئی حالت رفیعہ بغیر امرِ صحیح کے اتباع کے حاصل نہیں ہوتی!

حضرت حمدون قصار رحمۃ اللہ علیہ :-

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگوں کے اعمال پر احتساب اور دار وگیر کسی شخص کے لئے کس وقت جائز ہوتی ہے؟ فرمایا - جب وہ یہ سمجھے کہ یہ احتساب اور امر بالمعروف مجھ پر فرض ہو گیا ہے - فرض ہونے کی صورت یہ ہی کہ جس کو امر بالمعروف کیا جائے، وہ اس کا ماتحت اور تحت القدرت ہو، یا یہ یقین ہو کہ وہ ہماری بات مان لے گا - وغیرہ ذالک - یا یہ خوف ہو کہ کوئی انسان بدعت میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا - اور اس کو یہ گمان ہے کہ ہمارے کہنے سننے سے اُس کو نجات ہو جائے گی!

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص سلف صالح کے احوال پر نظر ڈالتا ہے - اُس کو اپنا قصور اور مردانِ راہ خدا کے درجات سے اپنا پیچھے رہنا معلوم ہو جاتا ہے!

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ غرض اس کلام کی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ لوگوں کو سلف صالح کی اقتداء کی ترغیب دیں کیونکہ یہی حضرات اہلِ سنت ہیں -!

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ -

آپ کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ عارفین پر ایک حالت ایسی آتی ہے کہ وہ تمام حرکات واعمال چھوڑ کر تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہیں - حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ یہ اُن لوگوں کا قول ہے، جو اسقاطِ اعمال کے قائل ہیں - اور فرمایا کہ میں تو اگر ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں، تو اپنے اختیار سے اعمال (طاعات و عبادات) میں سے ایک ذرہ بھی کم نہ کروں - ہاں مغلوب ومجبور ہو جاؤں تو وہ دوسری بات ہے!

اور فرمایا کہ وصول الی اللہ کے جتنے راستے عقلاً ہو سکتے ہیں - وہ سب کے سب بجز اتباع آثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مخلوق پر بند کر دیئے گئے ہیں - (یعنی بغیر اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص ہرگز تقرب الی اللہ حاصل نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ کرے وہ کاذب ہے)

اور فرمایا کہ ہمارا یہ مذہب (یعنی سلوک وتصوف) کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کو حفظ نہ کرے اور حدیثِ رسولؐ کو نہ لکھے - اس معاملہ (یعنی تصوف) میں اُس کی اقتداء نہ کرنی چاہیئے - کیونکہ ہمارا علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے - اور فرمایا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابو عثمان جیسری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ معیت و صحبت تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک حُسنِ ادب۔ دوسرے دوامِ ہیبت، تیسرے مراقبہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت و معیت اتباع و سنت اور ظاہر شریعت کے التزام سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اولیاء اللہ کی صحبت ادب و احترام اور خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی وفات کے وقت آپ کا حال متغیر ہوا۔ تو صاحبزادہ نے بوجہ شدتِ غم و الم کے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ابو عثمانؒ نے آنکھ کھولی۔ اور فرمایا۔ بیٹا! ظاہر اعمال میں خلاف سنت کرنا یہ باطن میں ریا ہونے کی علامت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس پر قول و فعل میں سنت کو حاکم بنائے گا، وہ حکمت کے ساتھ گویا ہوگا۔ اور جو قول و فعل میں خواہشاتِ ہوا کو حاکم بنائے گا، وہ بدعت کے ساتھ گویا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان تطیعوا تھتدوا۔ یعنی اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤ گے۔!

حضرت ابو الحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

جس کو تم یہ دیکھو کہ تقرب الی اللہ میں وہ کسی ایسی حالت کا مدعی ہے جو اس کو علم شرعی کے حد سے نکال دے تو تم اُس کے پاس نہ جاؤ۔

حضرت بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اسلام کا زوال چار چیزوں سے ہے:۔

۱۔ لوگ علم پر عمل نہ کریں۔

۲۔ علم کے خلاف عمل کریں۔

۳۔ جس چیز کا علم ہو، اس کو حاصل نہ کریں۔

۴۔ لوگوں کو علم حاصل کرنے سے روکیں۔

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو اُن کا ارشاد ہے اور ہمارے زمانہ کے صوفیوں کا عام طور سے یہی حال ہوگیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا وہ شخص ہے، جو اُس کے اوامر کے اتباع میں سب سے زیادہ مجاہدہ کرتا ہو۔ اور اس کے رسول کا سب سے زیادہ متبع ہو!

حضرت شاہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

جو شخص اپنی نظر کو محارم سے محفوظ رکھے۔ اور اپنے نفس کو شبہات سے بچائے اور اپنے باطن کو دوام مراقبہ کے ساتھ معمور کرے اور ظاہر کو اتباعِ سنت سے آراستہ کرے اور اپنے نفس کو اکلِ حلال کی عادت ڈالے۔ تو اُس کی فراست میں کبھی خطا نہیں ہوسکتی۔

ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔ ظاہر شریعت جس باطنی حالت کا مخالف ہو، وہ باطل ہے۔

ابو العباس ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ: جو سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کے اقران میں سے ہیں، فرماتے ہیں:۔

جو شخص اپنے نفس پر آدابِ الٰہیہ کو لازم کرے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نورِ معرفت سے منور فرما دیتا ہے۔ اور کوئی

مقام اُس سے اعلیٰ واشرف نہیں ہے، کہ بندہ حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور اعمال و اخلاق میں اُن کا متبع ہو۔
نیز فرمایا کہ سب سے بڑی غفلت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے اوامر و احکام سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے آداب معاملہ سے غافل ہو!

ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔
علم کثرت روایت کا نام نہیں۔ بلکہ عالم صرف وہی شخص ہے جو اپنے علم کا متبع ہو اور اس پر عمل کرے۔ اور سنت نبوی کی اقتدار کرے۔ اگرچہ اس کا علم تھوڑا ہو۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ عافیت کیا چیز ہے۔ فرمایا:۔
"دین بلا بدعت و عمل بلا آفت وقلب بلا شغل و نفس بلا شہوت!"
دین بغیر بدعت کے اور عمل بغیر آفت کے یعنی بدعات و مخترعات کی آفتیں اُس میں شامل نہ ہوں اور قلب فارغ جس کو (غیر اللہ کا) شغل نہ ہو۔ اور نفس جس میں شہوت کا (غلبہ) نہ ہو!
اور فرمایا کہ حقیقی صبر یہ ہے کہ احکام کتاب و سنت پر مضبوطی سے قائم رہو!

حضرت بنان حمال رحمتہ اللہ علیہ:۔
آپ سے دریافت کیا گیا کہ احوالِ صوفیہ کی اصل کیا ہے۔ فرمایا۔ چار چیزیں:۔
اوّل۔ جس چیز کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ اُس میں اُس پر اعتماد و توکل کرنا (یعنی رزق)
دوم۔ احکامِ الٰہیہ پر مضبوطی سے قائم رہنا۔
سوم۔ قلب کی حفاظت (لایعنی تفکرات سے)
چہارم۔ کونین سے فارغ ہو کر توجہ محض ذاتِ حق کی طرف رکھنا!

حضرت ابو حمزہ بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔
جس شخص کو حق کا صحیح راستہ معلوم ہو جاتا ہے اُس کو اُس پر چلنا بھی سہل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کے لئے کوئی رہبر و رہنما بجز سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احوال، وافعال و اقوال میں متابعت کے نہیں ہے!

ابو اسحاق رقاشی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔
اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ میں حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہوں، یا نہیں۔ تو علامت اللہ تعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مطابعت کو سب کاموں پر ترجیح دے۔ اور دلیل اس کی حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:۔
قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ!

حضرت ممشاد دینوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔
آدابِ مرید کا خلاصہ یہ ہے کہ مشائخ کے احترام و عظمت کا التزام کرے اور اخوانِ طریقت کی حرمت کا خیال رکھے اور اسباب کی فکر میں (زیادہ) نہ پڑے اور آداب شریعت کی اپنے نفس پر پوری حفاظت کرے!

ابو علی روزباری قدس سرہٗ۔
آپ سے کسی نے ذکر کیا۔ بعض صوفیا، غنا و مزامیر سنتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے حلال ہے، کیونکہ ہم

ایسے درجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھ پر اختلاف احوال کا اثر نہیں ہوتا - آپ نے فرمایا کہ اس نے یہ تو سچ کہا کہ وہ پہنچ گیا ہے مگر
اللہ تعالیٰ تک نہیں، بلکہ جہنم تک !

ابو محمد عبد اللہ بن منازل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

جو شخص فرائض شرعیہ میں سے کسی فریضہ کو ضائع کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ سنن کی رضاعت میں مبتلا فرما دیتا ہے -
اور جو شخص سنن کی اضاعت میں مبتلا ہوتا ہے وہ بہت جلد بدعات میں مبتلا ہو جاتا ہے !

ابو یعقوب نہر جوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ :-

صوفی کا افضل ترین حال وہ ہے، جو علم شریعت سے زیادہ قریب ہو !

ابو عمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

جو حال علم کا نتیجہ نہ ہو، اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے !

حضرت بندار بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

اہل بدعت کی صحبت حق سے اعراض پیدا کر دیتی ہے !

ابو بکر طمستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

طریق تصوف کھلا ہوا ہے - اور کتاب وسنت ہمارے درمیان قائم ہے - اور فضیلت صحابہ کرام کی بوجہ سبقت
فی الہجرت اور صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلوم ہے - پس ہم میں سے جو شخص کتاب وسنت کا ساتھ دے - اور اپنے
نفس اور مخلوق سے جدا ہو جائے اور اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کرے، صرف وہی شخص صادق اور مصیب ہے

ابو القاسم نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

تصوف کی اصل صرف کتاب وسنت کا التزام اور بدعات وہوا سے اجتناب اور مشائخ طریقت کی عظمت و احترام
اور خلق اللہ کے اعذار پر نظر، اور اوراد پر مداومت اور تاویلات اور رخصتوں کا ترک ہے !

احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ یہ چالیس سے زائد مشائخ صوفیہ کے اقوال اس بارہ میں نقل کئے گئے ہیں - جو سمجھدار کے
لئے کافی سے زائد ہیں - اس لئے انہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے - ورنہ اس مقدس جماعت کے اکثر افراد سے اسی قسم کے اقوال منقول
ہیں - جن کے جمع کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے - حق تعالیٰ ان حضرات کی برکت سے اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائیں اور
بدعات ومخترعات سے بچائے اور اس ناکارہ کو بھی ان حضرات کے زمرہ میں محشور فرمائے - (آمین !)

مولانا محمد اسمٰعیل سلفی (گوجرانوالہ)

زیارتِ قبور

قبر کے متعلق جاہلی اور اسلامی تصوّرات

"قبر" گہری زمین کو کہتے ہیں۔ دفن میت کے لئے جو گڑھا کھودا جاتا ہے اس لئے اُسے بھی قبر کہتے ہیں۔ قرآن عزیز میں قبر کا ذکر مختلف مقاصد کے لئے آیا ہے۔ ثم اماته فاقبره (۸۰-۲۱) انسان کو اللہ تعالیٰ نے موت دی اور قبر بنانے کی تعلیم دی، یہاں تحدث بالنعمہ مقصود ہے، انسان کی لاش ذلت سے بچ گئی!

کہیں دوسرے واقعہ میں ضمناً ذکر آگیا ولا تقم علیٰ قبره (۹-۸۵) منافق کی قبر پر بھی آپ مت جائیں حتیٰ زرتم المقابر (۱۰۲-۲) یبعث من فی القبور (۲۲-۷) اذا القبور بعثرت (۸۲-۴) ان مقامات میں قبر کا ذکر تذکرتاً حادثہ کے طور پر آیا ہے، اس میں نہ اعزاز ہے نہ استخفاف!

ابتدائے آفرینش میں سب سے پہلا ناحق قتل ہابیل کا ہوا۔ قاتل حیران تھا کہ لاش کس طرح ٹھکانے لگائے، ایک کوّے کی رہنمائی سے علم ہوا کہ لاشیں اس طرح سنبھالی جاتی ہیں۔ اس واقعہ سے انسان کی عجلت پسندی اور کم علمی کا پتہ چلتا ہے۔ ہابیل ایک نیک آدمی تھا، نہ اُس کا قبہ بنانے کا حکم فرمایا نہ کسی دوسرے اعزاز کا اس کے ساتھ۔ وہ مظلوم بھی تھا!

اصحابِ کہف

اس کے قریب قریب اصحاب کہف کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان اللہ کی راہ میں ہجرت کے لئے نکلے، ظالم حکومت سے بچ بچا کر ایک غار میں پناہ لی، اُن پر غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی تحسبهم ایقاظا وهم رقود۔ وہ سوگئے، غار خطرناک تھا، لوگوں نے نشان کے لئے وہاں مسجد بنادی، اہلِ بدعت نے اسے کھینچ تان کر قبروں پر مسجد بنانے کے لئے جواز کی دلیل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ استدلال قطعاً بے محل ہے۔ جب نص قرآن کے مطابق اصحاب کہف پر متعارف موت طاری ہی نہیں ہوئی، زندہ آدمی سو رہے ہیں، قبر ہے نہ موت، اس لئے اسے اعزازی قبر سے تعبیر کرنا قطعاً غلط اور بے معنی ہے!

سابق انبیاء علیہ السلام

قرآن حکیم میں انبیاء کے قصص کا تذکرہ ضروری تفصیل سے فرمایا گیا، ان میں اکثر کا انتقال زمین پر ہوا۔ اور یہیں دفن ہوئے، وما جعلنا هم جسدا لا یاکلون وما کانوا خالدین! وہ کھانا بھی کھاتے اور ہمیشہ زندہ بھی نہیں رہے۔ دنیا کا قانون یہی بنایا گیا۔ منها خلقنا کم وفیها نعیدکم ومنها نخرجکم تارة اخری "اسی زمین میں ہم نے تمہیں زندگی عطا کی، اسی میں تم دفن ہوگے، اسی سے تمہارا حشر ہوگا!

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اس لئے باوجود کسی کی صحیح قبر کا علم نہیں، کبھی اُن پر میلہ

نہیں لگا، کسی نبی سے منقول نہیں کہ وہ دوسرے نبی کی قبر پر زیارت کے لئے گیا ہو۔ یا اپنے امتیوں کو حکم دیا ہو۔ کہ اس کی قبر سے یہ معاملہ کیا جائے یا کسی دوسرے نبی کی قبر پر اس قسم کی نذر نیاز کی جائے، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اس باب میں واضح ہے کہ کسی قبر کو وہ کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شرائع میں بھی انبیاء علیہم السلام سے یہ رسم منقول نہیں!

قبل اسلام کی رسوم!

صحیح دین میں تو قبور کو کوئی غیر معمولی مقام نہیں دیا گیا۔ مگر عوام اور مخالفین انبیاء نے اس معاملہ میں جو غلطیاں کیں۔ اس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوتی ہے اور ان چور دروازوں کا پتہ چلتا ہے جو شیطان اور اس کے رفقاء نے ایجاد کئے مشرکین کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ زندگی میں انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق کی مخالفت کرتے رہے، جب یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کے بت بنانے شروع کر دیئے، ان کی تصویریں بنائیں، ان کی قبروں کو کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا۔ احادیث قیمہ سے قبور کے متعلق مندرجہ ذیل خرابیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اسے جاہلی زیارت سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا:-

۱- قبروں کو پختہ بنانا اور ان پر بلا ضرورت مال صرف کرنا!
۲- ان پر سجدہ کرنا، ان سے حاجات طلب کرنا!
۳- قبروں کے پاس مساجد اور عبادت گاہیں تعمیر کرنا، مجاورت کے طریق سے دنیا کمانا۔
۴- قبروں پر میلے لگانا، عرس کرنا اور ان پر اجتماعات منعقد کرنا اور اسے "عید" اور مسرت تصور کرنا!

احادیث سے جہاں ان بیماریوں کا علم ہوتا ہے، وہاں ان سے کراہت اور نفرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پرانی خرابیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے پہلی قوموں پر ان کا جو اثر ہوا اپنی امت کو اس سے بچانا چاہتے ہیں۔ امت کو ان غلط اثرات سے محفوظ فرمانا چاہتے ہیں۔ جو ان رسوم اور عادات کی وجہ سے پہلی قوموں پر ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قبور کے ساتھ اس طرح وابستگی مشرکانہ عقائد کا موجب ہے!

آنحضرتؐ کے ارشادات کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کو اہلِ کتاب پر کتنا رنج تھا، اسی وجہ سے آپؐ نے لعنت فرمائی۔ ان میں ایک سبب قبور کی زیارت کا مروجہ طریقہ بھی ہے:-

آنحضرتؐ کے ارشادات!

(۱) عن جابر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ وان یقعد علیہ وزاد "ان یکتب علیھا (احمد مسلم)

حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ آنحضرتؐ نے قبر پر چونہ لگانے اس پر بنا کرنے قبر پر بیٹھنے اور اس پر لکھنے سے منع فرمایا۔

(۲) عن عائشۃ ان ام سلمۃ ذکرت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنیسۃ وانھا بارض الحبشۃ وذکرت لہ مارات فیھا من الصور فقال رسول اللہ صلعم اولٰئک قوم اذا مات فیھم العبد الصالح او الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً وصوروا فیہ تلک الصور اولٰئک شرار الخلق عند اللہ (متفق علیہ)

ام سلمہؓ نے آنحضرتؐ کے پاس حبشہ کے ایک معبد کا ذکر فرمایا۔ جس میں بڑی خوبصورت تصویریں تھیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا، اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں اس کی تصویریں بنادیتے یہ لوگ اللہ کی بدترین مخلوق ہیں۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ آنحضرتؐ کی آخری علالت میں ہوا۔ اور ان احادیث سے ظاہر ہے کہ قبر کو پختہ نہیں بنانا چاہیئے۔ اس کے قریب کوئی عبادت گاہ نہیں بنانا چاہیئے۔ قبر پر کوئی عمارت قبر کے احترام کے لئے نہیں بنانی چاہیئے!

آنحضرتؐ کی نظر میں یہ فعل شرارت آمیز ہے۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ایسے لوگ شرار الخلق (تمام مخلوق سے بدتر) ہیں!

عن عطاء یسار قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد (رواہ مالک مرسلا ورواہ البزار عن زید عن عطاء عن ابی سعید الخدری مرفوعاً)

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اے اللہ! میری قبر کو وثن نہ بنانا۔ ان لوگوں پر خدا تعالیٰ از بس ناراض ہے جن لوگوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔ مالک نے اسے مرسل روایت فرمایا ہے۔ اور بزار نے ابو سعید خدری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے!

تواتر

اس مضمون کی احادیث آنحضرتؐ سے بتواتر مروی ہیں۔ بعض احادیث میں آنحضرتؐ نے ایسے لوگوں پر لعنت کی ہے:-

فقد تواترت النصوص عن النبی صلعم بالنھی عن ذالک والتشدید فیہ۔

(اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۵۶۹ مطبوعہ انصاری دہلی)

یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ابوحاتم، ترمذی، نسائی، منتقی وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، جندب بن عبد اللہ البجلی اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے!

حدیث کا مطلب صاف ہے کہ قبر کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا، قبر کو قبلہ کی طرح سامنے رکھنا شرعاً حرام ہے۔ جندب عبداللہ کی روایت میں ہے:-

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد فانی انھاکم عن ذالک (مسلم)

تم سے پہلے لوگ انبیاء اور صلحاء کی قبروں کو سجدے کرتے تھے، تم قبروں کو ہرگز سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تم کو اسی سے منع کرتا ہوں۔

اس حدیث میں انبیاء کے ساتھ صلحاء کا ذکر بھی آیا ہے اور سختی سے منع فرمایا کہ قبر کو سجدہ گاہ نہ بنایا جائے اسی قبور جن کی اس طرح پرستش کی جائے، آنحضرتؐ کی نظر میں وثن کے حکم میں ہیں۔

عن ابی مرثد الغنوی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجلسوا علی القبور ولا تصلوا الیھا (مسلم)

قبروں پر مت بیٹھو اور نہ ان کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو!

اگر قبر کا نشان مٹ جائے، زمین صاف ہو جائے تو نماز درست ہوگی، چنانچہ مسجد حنیف، حرم مکہ اور مسجد نبوی کے متعلق مروی ہے کہ ان میں سے بعض میں مشرکین کی قبریں تھیں اور بعض میں انبیاء علیہم السلام کی۔ لیکن اب وہ سب ناپید ہیں۔ اس لئے شرک کا شائبہ نہیں، ان مساجد میں نماز جائز ہے!

شریعت کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہ قبروں سے بالکل الگ رہے، نہ مسجد میں قبر ہو، نہ قبروں پر مسجد۔ قبر اور مسجد دونوں کے احترام کی نوعیت الگ الگ ہے۔ ان دونوں کو جمع نہیں کرنا چاہیئے!

قبروں کے پاس مسجد

عام طور پر مشہور مزاروں اور استھانوں کے پاس لوگ مسجد بناتے ہیں۔ اُن سے یہ ذہن پیدا ہوتا ہے کہ اس مسجد میں نماز افضل ہے، گویا قبر کی وجہ سے مسجد کو فضیلت حاصل ہوئی، خدا کے گھر کو فضیلت کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خالق کی طرف نسبت سے وہ فضیلت نہ حاصل ہو سکی جو مخلوق کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ دراصل مسجد اپنے مقام کے لحاظ سے اتنی ہی بے نیاز ہے، جس طرح خدا تعالیٰ مخلوق سے بے نیاز ہے اس لئے آنحضرتؐ نے قبروں کے پاس مسجد کی تعمیر کو بھی ناپسند فرمایا۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت جابرؓ کی روایت میں اس کی تصریح فرمائی۔ اذا مات فیھم الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً ۔ حضرت جابرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔ نھی ان یجصص القبور ان یبنی علیہ۔ قبر پر مسجد بنانا، قبر پر بنا کرنا، یہ فعل ممنوع ہیں۔ ایسی مساجد میں نماز مکروہ ہے، بلکہ اگر خیال ہو کہ اس مسجد میں قبولیت زیادہ ہوتی ہے یا اسی میں نماز دوسری مساجد سے افضل ہے، تو اس میں نماز نادرست ہوگی!

قبروں پر عرس اور میلے

قبر سے شارع کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ویرانی ہو، اس کے دیکھنے سے موت کا تصور آنکھوں میں پھر جائے۔ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یقین ہو۔ دنیا کی زیب و زینت سے بے رغبتی پیدا ہو۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہاں شہری انداز کی عمارتیں نہ ہوں، خوبصورتی اور شان و شوکت نہ ہو۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی گلکاریاں نہ ہوں! تاج محل ایسی عمارتیں دیکھنے سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، وہاں تو دنیا اور اہل دنیا کی ثروت اور اسراف ہی کا خیال ذہن پر غالب ہوگا!

قبروں پر شور و شغف، میلے اور ہنگامے بھی اس مقصد کے منافی ہیں، اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول لا تجعلوا بیوتکم قبوراً ولا تجعلوا قبری عیداً وصلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم (نسائی، ابوداؤد)

آنحضرتؐ نے فرمایا، گھروں کو قبرستان نہ بناؤ (نوافل گھر میں پڑھو) میری قبر پر میلا مت لگاؤ۔ تمہارا درود تم کہیں بھی پڑھو، مجھے پہنچ جاتا ہے!!

بُت پرستوں کی زیارت

اہل کتاب آسمانی تعلیمات کے پابند تھے، ان میں قبر پرستی کا رواج کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور توحید کا مسئلہ تمام شرائع میں مشترک ہے، قبر پرستی اور مشرکانہ زیارت آسمانی تعلیمات اور توحید انبیاء کے منافی ہے! مگر سابقہ احادیث سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب آسمانی تعلیم سے انحراف کر چکے تھے اور اوہام پرستی کی بدولت ان میں قبر پرستی، مشائخ پرستی، استھانوں پر عرس اور اجتماعات ان میں رواج پا چکے تھے!

بُت پرست قوموں میں قبر پرستی کا رجحان اتنا زیادہ معلوم نہیں ہوتا، جس قدر ہونا چاہیئے۔ اس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بتوں پر قناعت کی وجہ سے قبروں پر زیادہ اعتماد نہیں رکھتے تھے، جو لوگ کھڑے بزرگوں کے پُوجنے کے عادی ہوں وہ لیٹے ہوئے بزرگوں کی پرستش کیوں کریں۔ جب کھلے اور ظاہر بزرگوں کی عبادت ممکن ہو تو قبروں میں غائب اور مستور خداؤں سے کیوں ربط پیدا کیا جائے!

اصل مرض!

بُت پرستی اور قبر پرستی میں اصل مرض یہی کہ مشرک غائب خدا پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ اسے یقین نہیں آتا کہ غیر مرئی اور نہ دیکھنے والا معبود اُس کی ضرورتیں کیونکر پوری کر سکیگا۔ وہ بڑے خلوص اور دل سوزی سے محسوس کرتا ہے کہ کائنات کا اتنا بڑا نظام نظروں سے غائب اور اکیلا خدا کیسے چلائے گا۔!

اجعل الالٰه الاها واحداً ان هذا لشی عجائب (سورہ ق)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام الٰہ کو ایک بنا دیا، یہ بڑے تعجب کی بات ہے!

ماسمعنا بهذا فی الملة الآخرة ان هذا الا اختلاق !

ہم نے تو یہ توحید کسی پہلے مذہب میں نہیں سنی، یہ تو قطعاً جھوٹ ہے!

اسی لئے زندوں کا توسّل، مردوں کا توسّل، قبروں کی سیڑھیاں، بتوں کے واسطے گھڑے گئے۔ تاکہ نظر کے سامنے کوئی تو سہارا ہو، کچھ تو نظر آئے، مستقل نہ سہی غیر مستقل ہی سہی۔ اس قسم کے عطائی الٰہ کچھ زیادہ ہو جائیں تو بلا سے۔ خدا کی حکومت سیکریٹریٹ سے کیوں بے نیاز ہو؟

ساری یہ مصیبت علم بالغیب سے پیدا ہوئی۔ انبیاء غائب خدا کی دعوت دیتے ہیں، ارباب توسّل کی تسکین ظاہری شفاء اور عطائی بزرگوں کے سوا ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ تشنگی کبھی قبروں سے پوری کی جاتی ہے کبھی بتوں سے!

بُت پرستوں نے ان کھڑے کھلے مرئی بتوں سے ایک تسکین حاصل کی، اس لئے اُن کو قبروں کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مگر شرک کی ذہنیت میں ایک گونہ مساوات پائی جاتی ہے، اس لئے قبر پرستی کے تھوڑے بہت آثار اُن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سورۂ نجم کی تفسیر میں ابن جریرؒ فرماتے ہیں ابن عباسؓ مجاہد اور ابو صالح لات کی تاکو مشدد پڑھتے تھے اور فرماتے:-

فان رجلا یلت السویق للحاج فمات فعکفوا علی قبرہ فعبدوہ (ابن جریر پ ۲۷ ص ۳۵)

یہ بزرگ حاجیوں کو ستّو بھگو کر پلایا کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو اُن کی قبر پر لوگوں نے اعتکاف کیا اور اُس کی پرستش کی!

حافظ ابن کثیر نے یہی قول ربیع بن انس سے نقل فرمایا ہے۔ ابن کثیر ص۵۳۲ جلد۴۔ علامہ بدر الاسلام عینی شرح صحیح بخاری ص۱۷۰ جلد ۹، تفسیر مظہری ص۱۱۶ جلد ۹۔ صاحبِ روح المعانی نے بروایت ابن المنذر ابن جریج سے نقل فرمایا ہے۔

انہ کان رجل بن ثقیف یلت السویق بالزیت فلما توفی جعلوا قبرہ وثنا (روح المعانی ص۵۵)

اور جب یہ پیر ستو شاہ فوت ہو گئے تو عمرو بن یحییٰ نے کہا کہ یہ ولی پتھر میں سما گئے ہیں، مرے نہیں۔ لوگوں نے پتھر کی عبادت شروع کر دی۔ اور اس پر ایک مکان بنا دیا۔ (روح المعانی ص۵۵ الاصنام کلبی)

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں بھی بت پرست تھوڑا بہت قبر پرستی کا شوق فرما لیا کرتے تھے!

اسلام نے ایمان بالغیب کی برکت سے ان ساری پرستشوں کا قلع قمع فرما دیا اور خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو اس طرح ذہن نشین فرمایا کہ اہلِ ایمان کو نہ کسی بت کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ قبر کی، وہ اپنے اعمال یا اپنی بے بضاعتی کا واسطہ لے کر براہ راست بارگاہ الٰہی میں پیش ہوئے اور کامیاب ہوئے!

اذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (بقرہ)

جب میرے بندے میری بابت دریافت کریں تو کہہ دو میں قریب ہوں جب کوئی مجھے بلائے میں سنتا ہوں ادعونی استجب لکم۔ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا!

مومن اس غائب خدا پر ایمان لانے کے بعد ان تمام بناوٹی وسیلوں سے بے نیاز ہو گئے، جن میں ظاہر بین بت پرست اور قبر پرست مبتلا ہو چکے تھے!

پختہ قبر

آج کی طرح قدیم قبر پرستی میں بھی عقیدت مندی کے ساتھ دکانداری کو بھی دخل تھا، نیک اور صالح حضرات کی جگہ اسخواں فروشوں نے لی اور چند ہفتوں یا مہینوں میں ایک خانقاہ نے اچھی خاصی دکان کی صورت اختیار کر لی۔ اور بیوپاریوں نے از بس فائدہ بخش بزنس شروع کر لیا۔

شارع حکیم نے پختہ قبروں کو ممنوع قرار دے دیا۔ جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں گزر چکا، بلکہ اگر قبر پر تعمیر ہو چکی ہو تو اسے گرانے کا حکم فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کو حکم فرمایا:۔

ان لا تدع تمثالا الا طمستہ ولا قبرا مشرفا الا سویتہ۔

تمام بت مٹا دو اور تمام اونچی قبریں برابر کر دو!

حضرت علیؓ نے اپنی حکومت میں اس عہد کو قائم رکھا اور ابو الہیاج اسدی کو اس پر مقرر فرمایا۔

قبور کے متعلق اس بے اعتدالی کا یہی اثر ہے کہ بعض مقامات پر بدکردار عورتوں تک کی قبریں معبد بنی ہوئی ہیں ان پر چراغ جلائے جاتے ہیں، مجاور وہیں سے روٹی کما لیتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

واحب ان لا یبنیٰ ولا یجصص فان ذالک للزینۃ والخیلاء ولیس الموت موضع واحد منہما ولم ار قبور المہاجرین والانصار مجصصۃ (قال الراوی) عن طاؤس ان رسول اللہ صلعم نہی ان تبنی القبور او تجصص (قال الشافعی) وقد رایت

من الولاۃ من یھدم بمکۃ ما یبنی فیھا فلم ار الفقھاء یعیبون - (الام للشافعی ص۲۴۶ ام جلد۱)
مجھے پسند ہے کہ قبر پر نہ بنا کی جائے، نہ چونہ لگایا جائے، عمارت، زینت، یہ تکبر کا نشان ہی اور موت کے لئے ان میں سے کوئی بھی مناسب نہیں اور انصار اور مہاجرین کی قبروں کو میں نے پختہ نہیں دیکھا، طاؤس فرماتے ہیں آنحضرتؐ نے قبر پر بناء اور تجصیص سے منع کیا۔ شافعی فرماتے ہیں۔ میں نے امراء کو دیکھا وہ قبروں کو گراتے تھے اور اہل علم اسے معیوب نہیں سمجھتے تھے ۔۔۔ !

امام مالکؒ فرماتے ہیں:۔

اکرہ تجصیص القبور والبناء علیھا وھذا الحجارۃ اللتی یلبنی علیھا۔

میں قبر کو گچ کرنا ناپسند کرتا ہوں اور اس پر عمارت بنانا اور پتھر وغیرہ لگانا بھی !

چند آثار مزید اس معنی میں ذکر فرمائے:۔

قال سحنون فھذہ آثار فی تسویتھا فکیف بمن یرید ان یلبنی علیھا (ص۱۸۹)

سحنون فرماتے ہیں ان آثار کا مطلب یہ ہے کہ قبر اس کے برابر ہونی چاہیئے، جو اس پر عمارت بنانا چاہے اُن کا کیا حال ہو گا !

علامہ شامی ارشاد فرماتے ہیں:۔

واما البناء علیہ فلم ار من اختار جوازہ - (شامی ص۹۳۷ جلد۱)

میری نظر میں کوئی ایسا آدمی نہیں، جس نے قبر پر عمارت کو جائز کہا ہو !

اس کے بعد حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل فرماتے ہیں:۔

وعن ابی حنیفۃ یکرہ ان یلبنی علیہ بناء من بیت او قبۃ ونحو ذالک لما روی جابر نھی رسول اللہ صلعم۔ (ص۹۳۷ جلد۱)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ قبر پر قبہ یا مکان بنانا منع ہے۔ جیسے صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

علامہ کاسانی البدائع والصنائع میں فرماتے ہیں:۔

وکرہ ابو حنیفۃ البناء علی القبور وان یعلم بعلامۃ وکرہ ابو یوسف الکتابۃ (ص۳۲۰ ج۱)

امام صاحب نے قبر بناء کو منع فرمایا۔ اور ابو یوسف نے کتابت کو !

مسنون زیارت

جاہلی زیارت اور اس کے متعلق آنحضرتؐ کے ارشادات آپ ملاحظہ فرما چکے، اب مسنون زیارت اور اس کے مقاصد پر غور فرمائیے:۔

عن ابن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الاخرۃ - (ابن ماجہ، مسلم، ابو داؤد، ابن حبان حاکم، ترمذی !

آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے روکا تھا، اب ان کی زیارت کرو۔ اس سے دُنیا کی رغبت کم ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے!

علامہ کاسانی حضرت جابرؓ کی روایت بیان فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:۔

کان ذالک من باب الزینۃ ولاحاجۃ بالمیت الیہا ولانہ تضییع المال بلا فائدۃ فکان مکروھا البدائع والصنائع۔ (ص۳۲۰ ج ۱)

قبر پر عمارت اور چونہ وغیرہ لگانا زینہ ہے اور میّت کو اس کی ضرورت نہیں، اس سے بے فائدہ مال برباد ہوتا ہے، اس لئے یہ مکروہ ہے۔ شامی کی عبارت میں یہ صراحتاً موجود ہے!

اس لئے قبرستان میں کوئی ایسی چیز بنانا جس سے دُنیا کی زیب و زینت ظاہر ہو بالاتفاق ائمہ ناجائز ہے، قبرستان ویران ہونا چاہیئے۔ جن قبور پر عمارات بنائی گئی ہیں، فقہا کے نزدیک اُن سے زیارت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا مسنون زیارت کے لئے ضروری ہے کہ اس سے زہد نمایاں ہو اور آخرت یاد آئے۔ علماء اور اہل اللہ کی قبروں پر جو یہ قبے اور عمارتیں بنائی گئی ہیں، شریعت کی رُو سے یہ قطعاً پسندیدہ کام نہیں ہے، بلکہ باتفاق ائمہ نادرست ہے!

مسنون دعا

جب قبر کی زیارت کرے تو قبر پر سلام کہے اور جنازہ کی طرح میّت کے لئے دعا کرے:۔

السلام علیکم اھل دیار قوم مومنین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون!

اس کے سوا اور ادعیہ کے جملے آنحضرتؐ سے مروی ہیں، جو اہلِ سنت سے مخفی نہیں!

قبر پرستی کب شروع ہوئی؟

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے قبر پرستی کا زیادہ رواج یہود اور نصاریٰ میں تھا۔ مشرکین میں بھی شرک کی یہ قسم موجود تھی لیکن کم۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو النعل بالنعل (الحدیث)، تم پہلے لوگوں کے قدم بقدم چلوگے جس طرح جُوتے کے تلے باہم برابر ہوتے ہیں۔ قبر پرستی کا رجحان تیسری صدی میں شروع ہوا۔

امام شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے انصار اور مہاجرین کی قبروں کو دیکھا اُن پر کوئی عمارت نہیں تھی، وہ بالکل سادہ تھیں۔ امام کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا، اس وقت جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کے مشاہد سادہ تھے۔ اہلِ علم کی کثرت تھی، اس جہالت کا رواج ممکن ہی نہ تھا!

اسلام کی فتوحات جب دُور تک پہنچیں، فارس اور روم کے علاقے فتح ہوئے، اسلامی تعلیمات نے مفتوحہ اقوام کو متاثر کیا، مفتوحہ اقوام کی عادات اور رسوم نے بھی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ اسلام میں تصوف، دُنیا سے بے رغبتی، اللہ تعالیٰ پر توکل، اس کے قانون، اسباب کی پابندی کا نام تھا۔ مسلمان پُوری کوشش اور محنت کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل فرماتے وہاں خانقاہی نظام تھا۔ اور نہ عقیدہ مندی کا یہ غلو!

یہود و نصاریٰ، مصری اقوام اور ہندوستان کے اثرات جب اسلامی تعلیمات سے آمیز ہوئے تو اس لئے خانقاہی نظام کی صورت پیدا ہو گئی، کم کھانا، دم کشی، چلّے کرنا، مرید اور شیخ کے آداب کا ایک معیار، اس نئے تصوف کے

اجزائے ترکیبی قرار پائے، شیخ کا تصور، وظائف کے مخصوص شرائط، بھوکے رہنا، نفس کشی، بعض قویٰ کو معطل کر دینا اور بعض اعضا کو ضائع کر دینا، یہ سب اسی خانقاہی تصوف کے کرشمے تھے۔ جو یہودی فقرا اور ہندوستان کے سادھوؤں سے اخذ کئے گئے۔ معمولی تبدیلیوں سے انھیں اسلام کا ہم رنگ بنا دیا گیا، ان مشقوں میں کچھ فائدے بھی تھے، کچھ نفسیاتی اثرات بھی۔ جس نے ایک فن کی شکل اختیار کر لی، قبر پرستی کی موجودہ صورت اسی خانقاہی نظام، اسی پس منظر کی پیداوار معلوم ہوتا ہے!

شیخ اور پیر کے ساتھ بے پناہ عقیدت نے شیخ کو خدا اور رسولؐ کا نائب بنا دیا گیا، اس پر تنقید ناجائز قرار دی گئی ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

خانقاہی نظام میں یہ خوبی تھی کہ اس میں اطاعت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا تھا، حسن بن صباح کی ساری باطنی تحریک کا مدار ہی جذبۂ اطاعت پر تھا۔ اسی جذبۂ اطاعت کا یہ غلو تھا کہ شیخ اور پیر کی کسی خلاف شریعت قول و فعل پر بھی لب کشائی کی اجازت نہ تھی، بس سنو، دیکھو اور اطاعت کرو!

یہ عیب آج بھی خانقاہی نظام کا لازمی جزو ہے، قبر پرستی اور انسان پرستی کے خلاف آپ کتنے ہی دلائل دیں کتاب و سنت سے شواہد و براہین لائیں مگر یہ لوگ کتاب و سنت کے مقابلہ میں اپنے مشائخ اور اصحاب سلسلہ کے اقوال و اعمال کو ترجیح دیتے ہیں اور طرح طرح کے نکتے پیدا کرتے ہیں!

وقت کا تعین تو مشکل ہے، کیونکہ مرض بتدریج آیا ہے، لیکن چھٹی ساتویں صدی ہجری میں یہ بیماری زوروں پر تھی۔ نام نہاد صوفیوں کے کئی گروہ اپنی دکانیں سجائے ہوئے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا مقابلہ رفاعی فرقہ کے ایک فقیر سے ہوا۔ جس نے حکومت اور اس کے عمال کو متاثر کر رکھا تھا۔ اس سے شیخ الاسلام نے کہا کہ آپ بھی آگ میں کود جائیں، میں بھی کودتا ہوں جس کو آگ نہ جلائے، وہ سچا ہوگا، شیخ نے فرمایا کہ آگ میں کودنے سے پہلے میں اور تم دونوں نمک اور سرکہ سے غسل کریں گے۔ اس شرط پر وہ فقیر صاحب رہ گئے اور شیخ الاسلام کامیاب رہے۔ شیخ نے یہ پورا مکالمہ اپنے رسالۃ الصوفیہ والفقراء میں لکھا ہے!

چراغ جلانا

قبر پر عمارت جس طرح شرک کے دواعی سے ہے، اسی طرح چراغ جلانا بھی ممنوع اور شرک کے دواعی سے ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:-

لعن اللہ زوارات القبور والمتخذین علیہ السراج!

اس سے ظاہر ہے عرب قبروں پر چراغ جلاتے تھے، اس سے آنحضرتؐ کو روکنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسے ناپسند فرمایا۔ اور جس فعل پر حضورؐ "لعنت" فرمائیں، اس کی دینی مضرت اور اخروی خسران کی بھلا کوئی انتہا ہے!

قبر پر پھول چڑھانا

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کی ذہنی کیفیت عجیب ہے، جو چیز یورپ سے آئے اسے تو آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں اور اسلام کے مسائل سامنے آجائیں تو از سر تا پا بحث بن جاتے ہیں!

یورپ میں رواج ہے کہ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ان حضرات میں دینی شعور تو کم ہے، مگر یہ حضرات اہل مغرب کی

تقلید سوچے سمجھے بغیر کر رہے ہیں۔ جہاں جاؤ قبروں پر پھول چڑھ رہے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ اس سے میت کو کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے چراغ کی روشنی سے میت کو روشنی نہیں مل سکتی، پھول کی خوشبو سے میت کو کوئی فائدہ نہیں لیکن چونکہ یورپ سے یہ سنت (؟) آئی ہے، اس لئے بابو لوگ اس پر ضرور عمل کریں گے۔ عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ ان رسوم کو جذبات سے بالاتر ہو کر دانشمندی سے ان پر غور کیا جائے، اب بڑھتے بڑھتے یہ رسم یہاں تک عام ہو گئی ہے کہ بادشاہوں اور وزراء کے دوروں میں مرنے والوں کی قبروں پر پھول چڑھانا خیرسگالی کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ رسم ان حلقوں میں خالص دنیاداری بن چکی ہے۔ لیکن خانقاہی حلقوں میں اسے دین اور شریعت سمجھا جاتا ہے!

عوام جن کی نظر سنت کے ذخائر اور تاریخ پر نہیں ہے، وہ کربلا، نجف، اور بغداد وغیرہ شہروں میں مزارات پر قبے دیکھ کر یہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ قبے یقیناً شرعی احکام کے ماتحت بنے ہوں گے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے!

انہی مزارات کو دیکھ کر امام حاکم صاحب مستدرک نے فرمایا:۔

هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من الشرق والمغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف !

(مستدرک حاکم ص۳۷۰ ج ۱)

قبر پر لکھنے کے خلاف تمام اسانید صحیح ہیں، مگر ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مشرق سے مغرب تک ائمہ کی قبروں پر لکھا گیا ہے اور یہ خلف نے سلف سے لیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل نہ آنحضرتؐ سے ثابت ہے، نہ صحابہ سے، بلکہ بعد کے لوگوں نے ایسا کیا، جن کا قول و فعل حجت نہیں، حدیث کا ناسخ ہونا تو بڑی بات ہے، آنحضرتؐ کا ارشاد تو آنحضرتؐ کے ارشاد ہی سے منسوخ ہو سکتا ہے۔ (امام ذہبی تلخیص مستدرک میں فرماتے ہیں:۔

قلت ما قلت طائلا ولا نعلم صحابيا فعل ذالك وانما شيئ احدثه بعض التابعين فمن بعدهم ولم يبلغهم النهى۔ (ص۳۷۰ ج ۱)

امام حاکم نے کوئی کام کی بات نہیں فرمائی۔ یہ فعل کسی صحابی نے نہیں کیا، یہ بعض تابعین اور ان کے بعد والوں کی ایجاد ہے۔ جن کو آنحضرتؐ کی نہی کا علم نہیں ہوا!

روضہ نبویہ علیٰ صاحبہا الف صلوٰۃ و تحیہ

آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد جسم اطہر کو حجرہ مقدسہ میں دفن کیا گیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی یہیں دفن ہوئے حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد حضرت عائشہؓ نے حجرہ میں ایک دیوار بنا کر قبور کا حصہ الگ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجرہ مبارکہ کی مرمت کرائی، اس وقت قبریں اپنی حالت پر کچی تھیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں مغربی دیوار گر گئی۔ خلیفہ نے ابن مزاحم کو حکم دیا۔ حجرہ صاف کرایا گیا اور دیوار بنا دی گئی۔ اس وقت حجرہ شریفہ مربع تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے حکم دیا کہ حجرہ مسجد میں شامل کرایا جائے۔ مدینہ منورہ کے علماء اسے ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قبور مسجد میں نہ آئیں۔ بلکہ الگ رہیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے شمال کی طرف ایک زاویہ بڑھا کر حجرہ کی مربعہ عمارت کو مخمس

کردیا - قبلہ جنوب کی طرف ہے - خیال تھا کہ زاویہ شمال کی طرف ہونے سے قبر شریف کو سجدہ نہیں ہو سکیگا - ابن قیمؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

فاجاب رب العالمین دعاءہ — واحاطہ بثلاثۃ الجدران
حتی غدت ارجاءہ بدعاءہ — فی عزۃ وحمایۃ وصیان

آنحضرتؐ کی دعا کا اثر اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ حجرہ مقدسہ میں تین دیواریں بنادی گئیں اور اس کے اطراف اہل شرک کے سجدوں سے محفوظ ہو گئے - شمال کی طرف صرف کونہ ہے جسے سجدہ کرنا ممکن نہیں !

اس کے بعد حجرہ کی ہمیشہ ترمیم ہوتی رہی - آنحضرتؐ کے آثار کو قائم رکھنے کے جذبہ کی وجہ سے اکثر مرمت پر کفایت کی گئی - علامہ علی بن عبد اللہ سمہودی نے "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰی" میں اسے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے !

حجرہ مسجد میں شامل ہونے کے بعد حجرہ پر پختہ اینٹوں کی جالی لگادی گئی - حجرہ کی چھت مسجد کی چھت سے مل گئی - اس کے منصور بن قلاوون صالحی ۶۷۸ھ نے جالی کی جگہ لکڑی لگادی، لکڑی کا جنگلہ نیچے سے مربع تھا اوپر سے مثمن (آٹھ کونہ) کردیا گیا - اسے قبہ زرقاء کہتے تھے - یہ کمال الدین بن احمد بن برہان عبد القوی کے مشورہ سے کیا گیا - مگر اس وقت کے اہل علم نے اسے ناپسند کیا - چنانچہ جب کمال الدین کو معزول کیا گیا تو عوام نے اسے قبہ سازی کی پاداش سمجھا !

جب یہ خستہ ہو گیا تو ملک ناصر حسن بن محمد قلاوون نے اس کی مرمت کی - پھر ۷۶۵ھ میں ملک اشرف بن حسین شعبان نے کی اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا - یہاں تک کہ موجودہ گنبد خضراء کی تعمیر عمل میں آئی - ان ترمیمات کا مفصل تذکرہ علامہ سمہودی نے قریب ایک سو صفحات میں کیا ہے !

یہ تغیرات ملکی اور تعمیری مصالح کی بناء پر ہوتے رہے، ان کی بنیاد حضورؐ کے کسی ارشاد یا وصیت کی بناء پر نہیں تھی اور نہ صحابہ کرام کے آثار میں کوئی اثر اس کے ثبوت میں پایا جاتا ہے - گنبد خضریٰ کی عمارت کو دوسری قبروں کے گنبدوں اور قبوں کے لئے دلیل بنا کر پیش کرنا عقل ونقل کسی اعتبار سے درست نہیں - قبہ مبارک کے یہ تغیرات کوئی شرعی سند نہیں ہیں !

محققین علماء احناف نے قبروں کے ساتھ اس معاملہ کو صراحتاً ناجائز فرمایا ہے، چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے فرمایا :-

"مسئلہ قبور اولیاء بلند کردن وگنبد برآں ساختن وعرس وامثال آں وچراغاں کردن ہمہ بدعت است بعضے ازاں مکروہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر شمع افروزاں نزد قبر وسجدہ کنندگان را لعنت گفت وفرمودہ قبر مرا عید ومسجد نکنید ودر اں مسجد سجدہ نکنید وروز عید برائے مجمع در سال مقرر کردہ شدہ ورسولؐ کریم علی رضی اللہ عنہ را فرستاد کہ قبور مشرفہ را برابر کند ہر جا کہ تصویر بیند محو کند — !" (ارشاد الطالبین صہ ۲۰)

انبیاء کی قبروں کو اونچا کرنا، اُن پر گنبد بنانا، عرس کرنا، چراغ جلانا، بدعت ہے - ان میں بعض بدعات مکروہ تحریمی ہیں - آنحضرتؐ نے قبر پر چراغ جلانے والے اور سجدہ کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے - اور فرمایا - نہ میری قبر پر میلہ لگے - نہ اس پر مسجد بنائی جائے، نہ ایسی مساجد میں نماز ادا کی جائے - نہ کسی مقررہ تاریخ میں وہاں اجتماع کیا جائے — !

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ اونچی قبروں کو برابر کردیں اور جہاں تصویر دیکھیں اُسے مٹا دیں!

زیارت کے آداب

عام قبروں کی زیارت مسنون ہے، قبر پر جائے تو دعا مسنون پڑھے۔ دعاء مسنون کے جس قدر الفاظ آنحضرتؐ سے منقول ہیں، اختلاف کے باوجود اُن میں ایک چیز قدر مشترک ہے۔ اُن میں صاحب قبر کے لئے دعا کی گئی ہے، صاحب قبر سے کچھ نہیں مانگا گیا۔ اس ادب کا ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اپنے یا کسی دوسرے کے لئے دعا کرنا عبادت ہے، جب یہ دعا کسی دوسرے سے کی جائے گی تو یہ اُس کی عبادت ہوگی، آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے "الدعاء مخ العبادۃ" دعا عبادت کا مغز ہے، ایک حدیث میں آیا ہے "الدعاء ھو العبادۃ" دعا ہی عبادت ہے۔ اللہ کے سوا غیر کی عبادت کرنا بھی حقیقتاً شرک ہے!

عبادت اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے۔ اس میں اس کے ساتھ نہ کوئی ولی شریک ہو سکتا ہے نہ کوئی نبی۔ جس نے کسی نبی سے دعا کی یا ولی سے، اُس نے اُسے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا۔ اس لئے قبر کی زیارت کے وقت صاحب قبر کیلئے اگر اللہ سے دعا کی تو یہ عبادت ہوگی، ایسا کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور اگر اس نے خود صاحب قبر سے دعا کی اُس سے کچھ طلب کیا، یہ شرک ہوگا، اُس کے تمام اعمال ضائع ہوں گے!

بلکہ صحیح مذہب یہ ہے کہ قبر کو مقام تقرب بھی نہ سمجھے۔ وہاں یہ سمجھ کر دعا کرنا کہ یہاں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے یا جلدی قبول ہوتی ہے، یہ بھی غلط ہے۔ ایک اثر مشہور ہے۔ کہ امام شافعیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی قبر کو قبولیت کا مقام سمجھتے تھے۔ یہ اثر غلط ہے، اس کی کوئی سند حضرت امام شافعیؒ تک نہیں پہنچتی!

زیارت کا ایک یہی صحیح طریقہ ہے کہ مسنون دعا پڑھے اور مقبور کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے۔ جس طرح جنازہ میں دعا کی جاتی ہے۔ اصحاب قبور نہ کچھ دے سکتے ہیں، نہ لے سکتے ہیں۔ ان سے کچھ مانگنا عبث بھی ہے اور گناہ بھی!

غلط بیانیاں

قبر پرستوں سے عام طور پر سنا گیا ہے:۔

اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا با ھل القبور!

جب تمہیں کسی کام میں حیرانی ہو تو اہل قبور سے مدد مانگو۔

اسے حدیث کہہ کر ذکر کیا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث نہیں، محدثین نے صراحتاً فرمایا ہے یہ جھوٹی بات ہے ھو کلام موضوع مکذوب باتفاق العلماء۔ (اقتضاء الصراط صـ۵۸۵) اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ جھوٹی بات ہے!

شاہ ولی اللہ صاحب اس روایت کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"ایں حدیث قول مجاوران است برائے اخذ نذر ونیاز بر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم افتراء کردہ اند" (بلاغ المبین صـ۵۳)

یہ حدیث نذر نیاز جمع کرنے کے لئے مجاوروں نے آنحضرتؐ پر اختراع کیا ہے!

احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں! محدثین اور محققین صوفیہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اعتقادی مسائل میں بناوٹی روایات سے استدلال کرنا لاعلمی کی دلیل ہے!

اسی طرح کی ایک روایت اہلِ بدعت نے اور گھڑی ہے۔ فاعینونی یا عباد اللہ (اللہ کے بندو میری مدد کرو)

یہ الفاظ بھی کسی صحیح حدیث میں نہیں ملے، ابو العلی بحران وغیرہ میں الفاظ قریب قریب اس طرح مرقوم ہیں:۔

اذا نفلتت دابۃ احدکم بارض فلاۃ فلینادیا عباد اللہ احبسوا علی فان اللہ فی الارض حاضراً یحبسہ!

جب تمہارے جانور جنگل میں گم ہو جائیں تو آواز دو کہ اللہ کے بندو! اسے روک لینا، اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ حاضر ہو گا جو انھیں روک لے گا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس حدیث کو مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ناواقف آواز دے، اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ وہاں موجود ہو گا جو اس جانور وغیرہ کو روک لے گا!

اس میں تصوّر اولیاء سے استعانت کا کوئی ذکر نہیں!

امام شافعیؒ سے منقول ہے اصابنی ضیق فدعوت عند قبر ابی حنیفہ (اقتفنار ص۵۹۶)

یہ بھی امام شافعی پر افتراء ہے، اولاً امام شافعیؒ جب بغداد آئے تو حضرت امام کی قبر چنداں مشہور رہی نہ تھی۔ دوم شافعیؒ حجاز سے آئے تھے وہاں ایسے لوگوں کی قبریں موجود تھیں جو حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے بدرجہا افضل تھے۔ وہاں صحابہ کرام کی قبریں موجود تھیں، امام شافعیؒ نے تنگ دستی کا یہ علاج وہاں کیوں نہ کیا۔ سوم یہ نسخہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ حضرت ابو یوسف امام محمد امام آخر وغیرہم رحمہم اللہ کو کیوں نہ ملا، ان لوگوں نے اپنے استاد کی قبر پر کیوں دعائیں نہ کیں۔ امام شافعیؒ کو حجاز میں یہ نسخہ مل گیا۔ اور قریب ترین تلامذہ شب و روز کے خادم اس سے محروم!

اصحاب بدر کا عرس

عام قبر پرست حضرات اپنی تقریروں میں فرمایا کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ بدر کے شہداء کے مزاروں پر ہر سال جایا کرتے تھے!

مجھے یہ روایت نہ صحاح میں ملی ہے نہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس کا تذکرہ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے حضرات اصحاب القبور نے اس میں کچھ جعل سازی سے کام لیا ہے!

بدر کی جنگ میں قریباً ستّر آدمی صنادید قریش سے تلوار کے گھاٹ اترے، جنہیں امیّہ کے سوا ہر ایک کو کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ چودہ کے قریب صحابہؓ اس معرکہ میں کام آئے۔ لیکن ان کو کہاں اور کیسے دفن کیا گیا، اس کی حقیقت صحیح طور پر معلوم نہیں!

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سال کے سال پابندی کے ساتھ شہدائے بدر کی قبور پر تشریف لے جاتے تو احادیث و آثار میں اس کی تفصیل ہونی ضروری تھی۔ اور سب سے بڑی بات قابلِ غور و توجہ تو یہ ہے کہ صحابہؓ کرام میں اس معمول کا پایا جانا ضروری تھا کہ یہ نفوسِ قدسیہ حضورؐ کی ایک ایک سنت پر عمل کرتے تھے اور حرزِ جان بناتے تھے! بدر یوں بھی مدینہ سے کافی دُور ہے۔ ایسے سفر نہ حضورؐ کی عادت تھی اور نہ دینی مصروفیات اس کی اجازت دیتی تھیں!

شہدائے اُحد

شہدائے اُحد کے متعلق ثابت ہے کہ آنحضرتؐ اُحد تشریف لے گئے اور یہ درست بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اُحد

مدینہ منورہ کا ایک حصہ ہے، اُس کی راہ جنت البقیع کی طرح ہوگی، یہ کوئی سفر نہیں ہے اور یہ زیارت بھی ہر سال نہیں فرمائی۔ بلکہ صرف ۱۱ھ ہجری میں آنحضرت تشریف لے گئے، ان شہیدوں کے لئے دعا فرمائی۔ صحیح بخاری میں ہے:-

عن عقبۃ بن عامر قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی قتلیٰ احد بعد ثمان سنین کالمودع للاحیاء والاموات۔ ۱۱ھ

عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں آنحضرتؐ نے شہداء پر ۱۱ھ ہجری میں نماز پڑھی، ایسا سماں تھا جیسے حضرتؐ زندوں اور مُردوں کو وداع فرما رہے ہوں۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں تین جگہ مرقوم ہے، کتاب الجنائز میں ایک دفعہ اور کتاب المغازی میں دو دفعہ، الفاظ میں بھی معمولی سا اختلاف ہے —!

اس حدیث سے چند امور ظاہر ہیں:-

۱- حضورؐ یہ زیارت ہر سال نہیں فرماتے تھے- بلکہ یہ واقعہ صرف ۱۱ھ ہجری میں ہوا۔
۲- اس کی حیثیت وداعی حادثہ کی سی تھی، یعنی اس کے بعد آنحضرتؐ زیارتِ شہدائے احد کیلئے تشریف نہیں لے گئے
۳- آنحضرت نے وہاں خطبہ دیا- ایسے خطبے حضورؐ غیر معتاد امور پر ہی خطبہ دیا کرتے تھے!

یہاں صلوٰۃ کے معنی صرف دعا سمجھے جائیں تو زیادہ مناسب ہے، پانچسال کے طویل عرصہ کے بعد قبر پر نماز پڑھنا احناف ناپسند فرماتے ہیں، کیونکہ اسی عرصہ میں میّت کا تفسّخ یقینی ہے، شہید معرکہ پر شوافع نماز جنازہ کو ناپسند فرماتے ہیں- صحیح احادیث کا تقاضا بھی یہی ہے، قرین قیاس بھی ہے کہ آنحضرت نے ۱۱ھ ہجری میں وداعی دعا فرمائی!

قبوری حضرات نے ممکن ہے اسی واقعہ کو عرس سمجھ لیا ہو- مگر ظاہر ہے کہ ان روایات میں عرس کی گنجائش نہیں- اور خیال ہے کہ اسی واقعہ کو بدر پر چسپاں کردیا ہو، ہمارے قبوری حضرات کے دلائل کا یہی حال ہے

چہ دہ گر بیا لاچہ دہ گزیہ زیر!

خواب اور کہانیاں

قبوری حلقوں میں سب سے زیادہ اعتماد غیر مستند قصّوں اور خوابوں پر کیا جاتا ہے، یہی تار عنکبوت ہے- جس پر ان حضرات کو ہمیشہ اعتماد رہا معلوم ہے نہ خواب شرعی حجت ہے نہ قصّے اور کہانیاں! ائمہ سنّت کا یہ حال ہے کہ وہ احادیث کے ذخیرہ میں سند کے بغیر کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے- پھر احادیث میں عقائد کے لئے متواتر اور یقینی ذخائر سے استدلال فرماتے ہیں- اعمال میں بھی ضعاف، شواذ اور منکرات پر توجہ نہیں دیتے، اور نہ ان حضرات کا یہ حال ہے کہ عقائد کے مقابلہ میں جھوٹے قصوں اور مزخرف خوابوں سے دل کو تسکین دیتے ہیں- ائمہ اصول نے صراحت فرمائی ہے کہ امت کے خواب شرعاً حجت نہیں اور نہ ان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے!

پھر اس قسم کے قصّے اور کہانیاں اور خواب یہود، نصاریٰ، ہنود اور ان کے علاوہ مشرک قوموں کے پاس یہ ذخیرہ بکثرت موجود ہے، اگر استدلال کی یہ راہ کھول دی گئی تو بُت پرستی، آتش پرستی کا ثابت کرنا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا- قادیان کی نبوت اور خلافت کا انحصار بھی خوابوں پر ہے!

دانیال کی نعش - امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں اور شیخ الاسلام نے اقتضاء الصراط میں ذکر فرمایا کہ

حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب تستر فتح ہوا تو ہرمز کے خزانہ میں ایک نعش تھی۔ جسے قحط کے ایام میں باہر نکالا جاتا تھا تو بارش ہو جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے ہم نے دن کے وقت تیرہ قبریں نکالیں، رات کے وقت انھیں دفن کر کے سب قبریں برابر کر دیں تاکہ کوئی ان قبروں کو پہچان نہ سکے اور پرستش شروع نہ ہو جائے!

جہاں تک اہل حق پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تعلق ہے وہ زندوں پر بھی ہوتی ہے، مُردوں پر بھی۔ دانیال پر بھی ہو سکتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ تمام انبیاء اور صلحاء اُس کی رحمت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ بلکہ ہم ایسے گنہگار بھی اُس کی رحمت کے سہارے پر جی رہے ہیں۔ جہاں تک قبر پرستی کے لئے استدلال کا تعلق ہے، دانیال سے نہ اُس وقت کسی نے استغاثہ کیا، نہ اب درست ہے، بلکہ حضرت عمرؓ نے اس قبر کو اس قدر مخفی فرما دیا کہ نہ اُس وقت کوئی اُسے معلوم کر سکا، نہ آج ہی کسی کو معلوم ہے، اُسے گم کر دینا دلیل ہے کہ صحابہ قبر کے ساتھ استعانت و استغاثہ کے تعلق کو ناجائز سمجھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے ایسا ہوا، ایک صحابی نے بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی، اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے مشرکانہ افعال کے خلاف صحابہ کا اجماع ہے ورنہ جب وہ کسی چیز کو ناپسند فرماتے تھے تو حضرت عمرؓ سے بھی کھلے طور پر کہہ دیتے تھے؟

اس موضوع پر ایک آیت کو بھی مسخ کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے:-

یا ایھا الذین آمنوا لا تتولوا قوما غضب اللہ علیھم قد یئسوا من الاخرۃ کما یئس الکفار من اصحاب القبور۔

اے ایمان والو اُن لوگوں سے مت دوستی کرو جن پر خدا تعالیٰ ناراض ہوا، وہ اللہ کی رحمت سے اسی طرح بے امید ہیں جس طرح قبروں والے کافر (موت کے بعد) اللہ کی رحمت سے بے امید ہیں۔!

آیت کا مطلب صاف ہے "من" بیانیہ ہے، اصحاب القبور الکفار کا بیان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں تو ایمان کی امید ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اور بھی اسباب ہیں جن سے امید ہو سکتی ہے، موت کے بعد اہل کفر کے لئے کوئی امید گاہ نہیں، جو لوگ مسلمان کہلا کر کفار سے وابستہ رہیں انھیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بے امید ہو جانا چاہیئے۔ اس میں قبر پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں، تمام مفسرین نے آیت کا مفہوم اسی انداز سے بیان فرمایا ہے۔

قرآن عزیز تو ان امراض کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے، وہ شرک کی کیوں اجازت دے گا، آیت فلا تجعلوا للہ اندادا و انتم تعلمون (البقرہ)، کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے انداد کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں چوتھی قسم میں قبر پرست حضرات کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں!

چہارم پیر پرستاں گویند چوں مرد بزرگے کہ بسبب کمال ریاضت و مجاہدہ مستجاب الدعوات و مقبول الشفاعت عند اللہ شدہ بود از ایں جہاں میگذرد روح اورا قوت عظیم و وسعتے بس فخیم بہم میرسد، ہر کہ صلوٰۃ اورا برزخ سازد۔ یا در مکان نشست و برخاست او یا بر گور او سجود و تذلل تمام نماید روح او بسبب وسعتے و اطلاق بر آں مطلع شود

ودر دنیا و آخرت درحق او شفاعت نماید۔ (ص ۱۵۱ جلد ۱۔ تفسیر عزیزی)

پیر پرست کہتے ہیں کہ بزرگ آدمی کثرتِ ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے اس کی دعائیں اور سفارش اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اس دنیا سے رخصت کے بعد اس کی روح میں بے حد قوت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے، جب اس کی صورت کو برزخ بنایا جائے یا اس کی نشست گاہ اور قبر پر عجز و انقیاد سے سجدہ کیا جائے، اس کی روح کو وسعتِ علم کی بنا پر اطلاع ہو جاتی ہے۔ اور دنیا اور آخرت میں اس کے حق میں سفارش کرتی ہے، اس قسم کی استمداد اور رعایت کو شاہ صاحب "ندّ" سمجھتے ہیں اور اسے شرک تصور فرماتے ہیں۔!

اللہ اور مخلوق کے درمیان اس قسم کے وسائل اور سفارش ضروری سمجھنا خدا تعالیٰ پر بدگمانی کے مرادف ہے۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

(من ظن ان له ولداً او شریکا او ان احداً یشفع عنده بدون اذنه او ان بینه وبین خلقه وسائط یرفعون حوائجهم الیه وانه نصب لعباده اولیاء من دونه یتقربون بهم الیه ویتوسلون بهم الیه ویجعلونهم وسائط بینهم وبینه فیدعونهم ویخافونهم ویرجونهم فقد ظن به اقبح الظن واسوءه۔ (الهدیٰ ص۱۴۱ ج ۲)

جو یہ خیال کرے کہ اللہ کی اولاد ہے یا اس کا کوئی شریک ہے یا اس کے پاس کوئی بلا اجازت شفاعت کر سکتا ہے یا مخلوق اور خالق کے درمیان ایسے واسطے ہیں جو مخلوق کی ضرورتوں کو اللہ تک لے جاتے ہیں، یا اللہ کے سوا کچھ اولیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ اور ان لوگوں کے درمیان وسیلہ اور قرب کا کام دیتے ہیں اور خالق اور مخلوق میں واسطہ بنتے ہیں، اُن سے دعا کرتے ہیں، ڈرتے ہیں اور اُن سے امید کرتے ہیں، جس کا یہ خیال ہو اُس نے اللہ تعالیٰ پر بدگمانی کی!

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مسلکاً حنفی ہیں، مشرباً صوفی ہیں۔ حدیث پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، تمام طبقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے انھیں گہری عقیدت ہے، علم و فضل، زہد و تقویٰ، انابت الی اللہ کے لحاظ سے اُن کا مقام اپنے اقران میں بہت اونچا ہے (رحم اللہ ورفع درجتہ) ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی کہے کہ خدا و رسول اس عمل پر گواہ ہیں، کافر ہو جائے گا۔ اولیاء معدوم کو موجود نہیں کر سکتے، موجود کو معدوم نہیں کر سکتے، ان کی طرف ایجاد یا اعدام، رزق دینے، اولاد دینے، مصیبت اور بیماری دور کرنے کی نسبت کرنا کفر ہے، ارشاد ربانی ہے، اے محمدؐ! کہہ دو میں اپنے لئے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، نہ اس کے سوا کسی سے مدد طلب کرے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ہے کہ اے اللہ ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ایاک میں حصر ہے، اولیاء اللہ کے لئے کوئی نذر درست نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے، اگر کوئی ایسی نذر مانے تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ معصیت سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہیئے۔ اور قبروں کا طواف درست نہیں، کیونکہ طواف نماز کے حکم میں ہے اور یہ بیت اللہ کا حق ہے۔ زندہ اور مردہ ولیوں اور نبیوں

سے دعا کرنا درست نہیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے۔ دعا ہی عبادت ہے، پھر ارشاد خداوندی ہے، مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے!

اور جو لوگ یہ وظیفہ کرتے ہیں۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ یا خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للہ، یہ کہنا جائز نہیں شرک اور کفر ہے!

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ ان الذین تدعون من دون اللہ عباد امثالکم (جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ وہ تمہاری طرح بندے ہیں) یہ آیت صرف بُت پرستوں کے لئے نہیں، کیونکہ من دون اللہ میں عموم ہے، احکام میں الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔!

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ اگر کوئی کلمۂ توحید کے ساتھ علی ولی اللہ، ابوبکر ولی اللہ کو ملائے تو اُسے تعزیر لگائی جائے گی اسی طرح ذکر اور وظیفہ کے طور پر یا محمدؐ یا محمدؐ کہنا ناجائز ہے۔ (ص۱۹ ترجمہ ارشاد الطالبین" فارسی میں ہے، اختصار کے لئے اُردو میں ترجمہ کر دیا۔ اور ملخص بھی کر دیا گیا ہے۔!

قرآن مجید سے شرک اور دعوت لغیر اللہ کے لئے استدلال عجیب ہے۔ لیکن جب قوموں کے ذہن بگڑتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ عجائبات کا ظہور اُن سے ممکن ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے قبوری حضرات کا ہے، وہ قرآن عزیز سے شرک اور کفر کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں۔!

کتاب وسنّت کا کام تو کفر و شرک اور بدعات کو مٹانا ہے، نہ کہ اُن کو قائم کرنا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی "شرک" کے خلاف اعلانِ جہاد تھی۔ حضورؐ ہی کی محبت اور اتباع کا یہ تقاضا ہے کہ ہم قبروں کے ساتھ وہی سلوک کریں، جس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جن باتوں کی نہی فرمائی ہے، اُن سے باز رہیں!

جن کو ہم اولیاء اللہ سمجھتے ہیں، وہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے سبب" اولیاء اللہ" بنے ہیں۔ پس کتاب وسنّت سے جس کام کی مخالفت ہوتی ہو، اس کا کیا جانا اولیاء اللہ کی محبت کے منافی ہے! کتاب وسنّت کی جس دینی فعل و عمل پر چھاپ نہ لگی ہو، وہ معتبر نہیں۔ اور اس قسم کے تمام افعال، عشق و محبت کے تمام زبانی وعدوں کے باوجود، آخرت کے خسران اور رسوائی کا باعث ہوں گے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب وسنت پر عامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

محترمہ عطیہ خلیل عرب

"الوسیلہ" کا حقیقی مفہوم

بَل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق !

یہ انتہائی غمناک والمناک وافسوسناک حقیقت ہے کہ وہ مسلمان جو توحید و رسالت پر یقین رکھتے ہیں، انہی میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو مشرکانہ رسوم اور بدعات کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ اپنی اس جہالت و ضلالت ہی کو "دین" سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس لئے نہ تو وہ حق کی جستجو کے لئے جد و جہد کرتے ہیں اور نہ انھیں تو۔ کی توفیق نصیب ہوتی ہے !

عوام کی اس جہالت اور گمراہی کے بہت کچھ ذمہ دار وہ مدعیانِ علم و خبر ہیں، جو "کتاب اللہ" کی آیات بیّن من گھڑت تاویلیں کرنے اور من بھاتا مطلب نکالنے تک سے نہیں چوکتے !

عوام کو سب سے زیادہ فریب :-

"...... وابتغوا الیہ الوسیلہ"

کے نام پر دیا جاتا ہے۔ کہ یہ دیکھو ! اللہ تعالیٰ قرآن میں حکم دیتا ہے کہ "وسیلہ تلاش کرو"۔ پس انبیاء، شہداء اور اولیاء کے "وسیلہ" کے بغیر خدا تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی "وسیلہ" کا عقیدہ پھیل کر، قبروں پر جا کر مرادیں مانگنے، اُن پر چادر چڑھانے، طواف کرنے، اولیاء اللہ کو حاضر و ناظر جاننے، اُن کے ناموں کی دہائی دینے اور انھیں مصیبت کے وقت استمداد کے لئے پکارنے" کی مشرکانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے !

اس مضمون میں اسی آیت کی شرح و تفسیر مقصود ہے، تاکہ اہلِ بدعت نے جس آیت کو سب سے زیادہ اپنی ہوائے نفس کی کمین گاہ بنا رکھا ہے، اُس کی معنوی تحریف اور غلط استدلال کا تار و پود بکھر جائے۔ اور لوگ سمجھ لیں کہ اس آیت کریمہ کا اصل منشاء اور مقصود و مدلول کیا ہے !

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ ——— (المائدہ)

خط کشیدہ جزو آیت سے اہلِ بدعت و بدعقیدہ لوگ پیر پرستی اور غیر اللہ کو خدا تک رسائی کا ذریعہ بنانے کے لئے بزعم خود وجہ جواز پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں یہاں اور جہاں بھی "الوسیلہ" استعمال ہوا ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے جو یہ لوگ لیتے ہیں ——— !

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "الوسیلہ" کے لغوی معنی کیا ہیں ؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب امام راغب اصفہانی کی لغت ہے۔ "مفردات راغب اصفہانی" میں اس لفظ "الوسیلہ" کی لغوی تشریح ملاحظہ ہو:-

(وسل)، الوسیلة التوصل الی الشیٔ برغبة وھی اخص من الوصیلة لتضمنھا لمعنی الرغبة

قال تعالیٰ: ابتغوا الیہ الوسیلۃ وحقیقۃ الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ، مراعاۃ سبیلہ
بالعلم والعبادۃ وتحری مکارم الشریعۃ وھی کالقربۃ والواسل الی اللہ الراغب الیہ
یعنی کسی شے تک رغبت سے پہنچنا اور یہ وسیلہ وصیلہ (بالصاد) سے صرف بمعنی رغبت کے خصوصیت
رکھتا ہے ارشاد باری تعالیٰ (وابتغوا الیہ الوسیلۃ) سے مراد صراط مستقیم پر علم، عبادت اور
مکارم شریعت (اعمالِ صالحہ) کے باوصف گامزن رہنا ہے۔ اس لئے قربت کے معنی صحیح ہیں
اور "الواسل" کے معنی اللہ سے رغبت وقرب رکھنے والا ہیں ـــ!

مفسر گرامی علامہ محمد بن جریر الطبری فرماتے ہیں:۔

(وابتغوا الیہ الوسیلۃ) یقول: اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بما یرضیہ والوسیلۃ الفعیلۃ
من قول قائل توسلت الیہ بکذا بمعنی تقربت الیہ

یعنی اللہ سے ایسے اعمال کے ساتھ تقرب چاہو جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں "الوسیلہ" علی وزن "فعیلہ"
ہے مثلاً کوئی کہے میں اس سے قریب ہوا تو وہ توسل تقرب ہی کے معنی میں استعمال ہوگا، اس کی دلیل میں
عنترہ کا شعر ہے ؎

ان الرجال لھم الیک وسیلۃ ان یاخذوک تکحلی وتخضبی!

(لوگ تیرا قرب حاصل کرنے کے لئے تجھے لینا چاہتے ہیں، اس لئے تو سرمہ اور مہندی سے بناؤ سنگھار کرلے)
اس کی تائید میں دوسرا شعر ہے:۔

اذا غفل الواشون عدنا لوصلنا فعاد التصافی بیننا والوسائل

چغلخوروں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہم ملنے کا سامان کریں گے اور پھر ہمارے درمیان تقرب و اخلاص لوٹ آئیگا!
آگے لکھتے ہیں:۔

وبمعنی الذی قلنا قال بعض اھل التاویل ذکر من قال ذالک - حدثنا بشار، سفیان
عن ابی وائل ابتغوا الیہ الوسیلۃ القربۃ فی الاعمال، وحدثنی سفیان، ابی طلحۃ،
عطاء الآیۃ - فی المسئلۃ القربۃ وعن قتادۃ ای تقربوا الیہ بطاعۃ والعمل بما یرضیہ
عن ابی حذیفۃ قال حدثنا شبل عن ابن ابی نجیح عن مجاھد وابتغوا الیہ الوسیلۃ
قال القربۃ -

یعنی ہماری طرح بعض اہل تاویل نے بھی یہی معنی مراد لئے ہیں - چنانچہ بشار، سفیان سے اور سفیان
ابووائل سے راوی ہیں کہ "الوسیلہ" سے مراد قربت ہے اعمال صالحہ سے - اور اسی طرح سفیان
ابوطلحہ سے اور وہ عطا سے راوی ہیں کہ اس آیت میں "وسیلہ" کے معنی قربت کے ہیں!
اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے - آپ فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت
اور اس کی خوشنودی کے کام کرکے اس سے تقرب حاصل کرو، اور ابوحذیفہ، شبل سے اور وہ ابن ابی نجیح
سے اور حضرت مجاہد سے "وسیلہ" کے معنی "القربۃ" ہی روایت کئے ہیں - (تفسیر ابن جریر الطبری ص۵۵)

تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ:۔

(یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ) ای خافوا اللہ بترک المنہیات (وابتغوا الیہ) ای لا الیٰ غیرہ (الوسیلۃ) الوسیلۃ الفعیلۃ من توسلت الیہ اذا تقربت الیہ والوسیلۃ القربۃ التی ینبغی ان تطلب وبہ قال ابو وائل، الحسن، مجاھد قتادۃ السدی وابن زید وروی عن ابن عباسؓ وعطاء وعبد اللہ بن کثیر قال فی تفسیرہ ھذا الذی قالہ ھاؤلاء الائمۃ لاخلاف بین المفسرین فیہ۔ والوسیلۃ ایضاً درجۃ فی الجنۃ مختصۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (البخاری)

یعنی ممنوعات ومکروہات کو چھوڑ کر خدا سے ڈرو، خدا کے سوا اور کسی سے نہیں۔ الوسیلہ علی وزن فعیلہ ہے۔ گویا توسلتُ الیہ میں اس سے قریب ہوا بمعنی تقرب۔ اس لئے کہ "الوسیلہ" کے معنی "القربۃ" ہیں اور اللہ سے قربت ایسی نعمت ہے جسے ضرور مانگنا چاہیئے۔ اور اسی طرح حضرت ابو وائل، حضرت حسن، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ سے مروی ہے۔ اور السدی اور ابن زید، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عطاء روایت کرتے ہیں کہ الوسیلہ سے مراد اعمال صالحہ سے قرب خداوندی حاصل کرنا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ الوسیلہ کے اس معنی میں ان ائمہ مفسرین کو اتفاق ہے کسی ایک کو بھی اس تفسیر میں اختلاف نہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ ورضی عنہم (اس کے ساتھ ساتھ الوسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل بھی ہے جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم ہے، اس دعا میں آت محمدن الوسیلۃ سے مراد جنت کا یہی درجہ ہے)

تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی میں ہے۔ وابتغوا الیہ الوسیلہ: ای القربۃ بالعمل۔ یعنی الوسیلہ سے مراد عمل سے قربت حاصل کرنا ہے!

علامہ ابن جریر الطبریؒ اور علامہ ابن کثیرؒ وعلامہ رازیؒ کی طرح سلف وخلف کے تمام مفسرینؒ "الوسیلہ" کے اس معنی پر اتفاق رکھتے ہیں کہ "الوسیلہ" سے اعمال صالحہ کے ذریعہ تقرب خداوندی حاصل کرنا ہے!

ائمہ سلف میں امام ابن تیمیہؒ نے خاص طور پر مقالہ (الواسطۃ بین الخلق والحق) اپنے دیگر رسائل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ کے تحریر کرنے کا سبب یہی تھا کہ دو شخص آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا، خدا اور بندہ کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ ضروری ہے۔ اور دوسرا اس کے خلاف تھا۔ چنانچہ یہ مسئلہ امام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امام ابن تیمیہؒ کے جواب کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"اگر اس شخص کی مراد یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ ضرور ہونا چاہیئے، جس سے بندوں کو یہ معلوم ہو کہ خدا کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال کو پسند فرما کر اپنے فرمانبردار بندوں پر انعام ورحمت کی بارش کرتا ہے اور کن نافرمانیوں اور بد اعمالیوں سے بندے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نیز اللہ کی ذات والا صفات کو کیا کیا نام زیبا اور شایان شان ہیں۔ ان تمام امور کی معرفت ادراک سے عقل انسانی عاجز ودرماندہ ہے، اس لئے کسی ذریعہ یا واسطہ کی ضرورت پیش آتی ہے، چنانچہ اس

قادر مطلق نے ہر دور میں اپنے رسول یعنی فرستادہ بندے دنیا میں بھیجے اور اس کے رسولوں پر ایمان لاکر عمل کرنے والے بلاشبہ راہِ ہدایت پر ہیں۔

واما سؤال السائل عن القطب والغوث والفرد فهذا قد يقوله طوائف من الناس ويفسرونه بامور باطلة فی دین الاسلام مثل تفسير بعضهم ان الغوث هو الذی يكون مدد الخلائق بواسطة فی نصرهم ورزقهم فهذا اجنس قول النصارى فی المسيح بن مريم عليهما السلام والغالية فی علی رضی الله تعالیٰ عنه فهذا اكفر صريح ......

دوسرے سائل کا یہ سوال کہ آیا کسی غوث، قطب اور فرد کے بغیر بھی خدا تک رسائی ممکن ہے، تو یہ چیز اب عام ہو گئی ہے، بعض لوگ اس طرح بے بنیاد اور باطل امور کو اسلام کا جزو بنا لیتے ہیں بعض لوگ غوث کو ایسی طاقت مانتے ہیں جس کی وساطت سے امداد خلائق ہوتی ہے اور یہ ہی غلو ہے جس نے ابن مریم کو ابن اللہ بنا دیا۔ اور اس غلو سے حضرت علیؓ کو بھی نصیریوں نے یزدانی طاقتیں دے رکھی ہیں۔ نعوذ باللہ! یہ سراسر کفر ہے۔

ومن انكر هذا بن فهو مرتد كافر۔ اور جس نے توسل کے ان دو معانی سے انکار کیا وہ کافر ہے[1]! (ذیر بحث میں تفصیل کر دی گئی ہے)

من جعل بينه وبين الله الوسائط يتوكل عليهم ويدعوهم ويسألهم كفر اجماعاً۔

یعنی جس نے اپنے اور خدا کے درمیان کسی کو ذریعہ بنا کر اس پر بھروسہ کیا، اس کو پکارا اور اس سے حاجت طلب کی تو اس نے بالاجماع کفر کیا۔ (الجواب الکافی)

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے مطابق اعمال سے اس کا قرب حاصل کرو۔ ابن زیدؒ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی! (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

فيطلبون القرب من الله بالاخلاص وطاعة فيما يرضيه، وترک ما نهاهم عنه واعظم القرب التوحيد الذی بعث الله به انبيائه ورسله واوجب عليهم العمل به والدعوة اليه۔ وهو الذی يقربهم الی الله۔ ومن التوسل اليه باسمائه وصفاته كما قال تعالیٰ ولله الاسماء الحسنیٰ فادعوه بها وكساورد فی الاذكار الماثورة۔ من التوسل بها فی الدعوات اللهم انی اسئلک بان لک الحمد وغير ذالک من الاعمال الصالحة الخالصة اللتی لا يشبه الشرک فالتوسل الی الله بما يحبه ويرضاه لا بما يكرهه ويابآه من الشرک الذی نزه به نفسه عنه بقوله (سبحٰن الله عما يشركون)

قرب خدا وندی اخلاص، طاعت اور ایسے اعمال سے مانگتے ہیں جن سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ ایسے اعمال جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔ اور خدا سے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی وحدانیت کا اقرار ہے کہ اس نے

---

[1] اعمالِ صالحہ اور حضورِ اقدس کا روزِ محشر میں وسیلۂ شفاعت!

اس پیغام کے ساتھ اپنے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا، اس کا اُن کو حکم دیا اور یہی وہ ذریعہ ہے جو اُن کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ توسل کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اس کے ناموں اور صفات کے وسیلہ سے پکارو۔ یہی اس نے حکم دیا ہے اور جیسا کہ بعض ادعیہ ماثورہ میں ہے کہ اللھم انی اسئلک بان لک الحمد (اس دعا میں خدا کے سامنے اس کی تعریف کا وسیلہ لیا گیا ہے) اس کے علاوہ خدا سے قرب کا ذریعہ وہ نیک اعمال ہیں جو خالص اللہ کے لئے کئے گئے ہوں اور جن میں شرک کا شائبہ نہ ہو!

خدا کا قرب ان ہی اعمال سے حاصل کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ جن سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہو۔ خاص طور پر شرک، جس سے اس نے اپنی ذات کو پاک رکھا ہے (سبحان اللہ عما یشرکون)

نہ صرف مفسرین و ائمہ کرام بلکہ مزاج شناس رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی قرآن کریم کے معانی میں انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ اس کے باوجود فرماتے ہیں۔ ای سماءٍ تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم۔ "کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اگر میں کتاب اللہ سے وہ معنی بیان کروں جو میں نہیں جانتا" اور ان اہلِ بدعت کی یہ جرأت کہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں!

تفاسیر اور اقوال ائمہ سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے کہ الوسیلہ کا جو لفظ قرآن پاک میں آیا ہے، اس سے مراد "اعمال صالحہ" کے ذریعہ قرب خداوندی حاصل کر کے اس کی رحمتوں کا سزاوار بننا ہے۔ اہل بدعت الوسیلہ سے جو یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی ولی، قطب اور پیر کو قرب خداوندی کا ذریعہ بنایا جائے یا مشکل کشا اور حاجت روا مانا جائے تو یہ اُن کی اختراعِ نفس اور بدترین قسم کی "تفسیر بالرائے" ہے۔ جس سے ایک طرف تو اس آیت کی معنوی تحریف ہوتی ہے اور دوسری طرف شرک و بدعت کے لئے میدان ہموار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)

"الوسیلہ" قرآن کی روشنی میں

اہلِ بدعت ایک طرف اگر صرف اس ایک آیت وابتغوا الیہ الوسیلہ کا بزعم خود سہارا لے کر اور قرآن کریم میں معنوی تحریف کرنے کے بعد کسی ولی، قطب یا شہید کی ذات مراد لیتے ہیں، جس سے لامحالہ شرک فی الذات والصفات (باری تعالیٰ)، قبر پرستی و پیر پرستی کی راہیں کھلتی ہیں اور غیر اللہ کی نذر و نیاز، عرس، مزامیر اور مشرکانہ اشعار سے محفلِ سماع کا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف سارے کا سارا قرآن کریم ہے، جس کی شانِ نزول ہی شرک و بدعات کا قلع قمع کرنا اور بندوں کا صرف خدا سے عابد و معبود کی حیثیت سے رشتہ قائم کرنا ہے۔ بعثت نبوی ہے کہ آپؐ کی ساری زندگی شرک و بدعات کے خلاف دعوت و تبلیغ سے اقوال و اعمال سے، سیرت و کردار سے، جہاد میں گزری ——— ولقد ارسلنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ اس "طاغوت" سے مراد صرف پتھر کے صنم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شے یا ذات ہے جس کو رب العالمین کے سوا معبود مان لیا گیا ہو!

کیا "الوسیلہ" سے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ توحید کے پرستار ایک بار پھر ہزارہا "پرستیوں" میں مبتلا ہو گئے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے خراج وصول کرنے والے بزرگوں کی قبروں کی آمدنی پر جی رہے ہیں، لات و منات کی جگہ مقبروں اور تعزیوں نے لے لی ہے اور ان عقائد کے حاملوں کے اعمال و کردار میں، اقوال و گفتار میں زمانۂ جاہلیت کے

مشرکین سے کس درجہ شرمناک مشابہت پائی جاتی ہے!

زمانۂ جاہلیت کے مشرکین بھی ذات باری تعالیٰ کے منکر نہ تھے، لئن سالتھم من خلق السموات والارض لیـ
اور وہ بتوں کو قرب خداوندی کا وسیلہ بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ موجو
میں قبر پرستی اور پیر پرستی کے لئے اہل بدعت بھی یہی غرض بتلاتے ہیں۔

اہل بدعت کی اس غلط فہمی کا ازالہ تو خود قرآن کریم ہی کی آیات سے ہو جاتا ہے:۔

(الف) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَائِھِمْ غَافِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَاءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کٰفِرِیْنَ! (الا...)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہو جو پکارے اللہ کے سوا کسی ایسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو روزِ قیامت تک، اور اُن کو خبر نہیں اُن کے پکارنے کی۔ اور جب لوگ جمع ہوں گے، تو اُن کے پوجنے کے سبب اُن کے وہ دشمن ہوں گے!

(ب) قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا (الرعد)

کہہ، پھر کیا تم نے بنا رکھے ہیں اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے بُرے کے!

(ج) لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (الرعد)

اُسی کو پکارنا سچ ہے، اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں اُس کے سوا، وہ کام نہیں آتے اُن کے کچھ بھی! مگر جیسے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اُس کے منہ تک آ پہنچے اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اُس تک۔ جتنا پکارنا ہے کافروں کا وہ سب گمراہی ہے!

(د) ذالکم اللہ ربکم لہ الملک والذین تدعون من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلہ ایھم اقرب ویرجون رحمۃ ویخافون عذابہ ان عذاب ربک کان محذورا۔

الوسیلہ کے اس غلط مفہوم کے خلاف سارا قرآن کریم موجود ہے!

بفرض محال اگر "الوسیلہ" کا یہی مفہوم جائز، روا اور حقیقی ہوتا تو کوئی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی ر...
صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی ولی، قطب، غوث کی ذات کو افضل و ارفع قرار نہیں دے گا۔ اور نہ کوئی اف...
نزدیک آپ سے بڑھ کر معزز و مقرب اور محبوب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں یہ مرتبۂ بلند اگر کسی کو ملتا تو وہ ح...
عبد اللہ علیہ السلام ہی کی ذات گرامی ہوتی۔ لیکن ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

۱- قل لا املک لکم ضرا ولا رشدا قل انی لن یجیرنی من اللہ احد ولن اجد من دونہ ملتحدا۔
۲- قل لا اقول لکم عندی خزائن الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الیّ۔
۳- لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء۔
۴- قل انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔

(۱) تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا برا اور نہ راہ پر لانا تو کہہ مجھ کو نہ بچائیگا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اسکے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ!
(۲) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس غیب کے خزانے ہیں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اسکی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے!
(۳) اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی!
(۴) کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم - حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے۔ تو پھر جس کو امید ہو اپنے رب سے ملنے کی، سو وہ کرے نیک کام اور شریک نہ کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔ (کہف - آخری رکوع)

ان آیات کی روشنی میں سرورِ کائنات و فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات و محبوب رب العالمین کو نفع و نقصان دینے کی قدرت نہیں (آخری آیت میں آپؐ کی بشریت، توحید باری تعالیٰ کی دعوت اور اعمال صالحہ کی تلقین و شرک فی العبادت سے پرہیز کا اظہار ہے) تو پھر کس پیر، قطب اور ولی کی کیا ہستی ہے جو کسی کی مشکل کشائی یا حاجت روائی کرسکیں ؟؟

تقرب و محبوبیت، افضلیت و اکملیت کے باوصف آپؐ کے عمل و خوف کا یہ عالم احتیاط و فروتنی کی یہ حالت کہ جہاں کسی مقام پر بھی ربوبیت سے رسالت کی حدود کا ٹکراؤ دیکھ پائیں تو خشیت الٰہی سے لرز کر فرمائیں:-

اجعلتنی للہ ندا؟ لا تقولوا ما شاء اللہ وشاء محمد بل قولوا ما شاء اللہ وحدہٗ!

یعنی ایک شخص کے یہ کہنے پر کہ "اللہ چاہیں اور آپ چاہیں" حضورؐ نے عتاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ کیا تم نے مجھے شریک بنا دیا؟ یوں مت کہو کہ "جو اللہ اور محمدؐ چاہے" بلکہ یوں کہو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے"!

ایک متوازن سے متوازن انسان بھی اپنی تعریف سن کر خوش ضرور ہوتا ہے۔ خواہ زبان سے اظہار نہ کرے۔ لیکن رحمۃ للعالمینؐ کا یہ تقویٰ کہ اگر آپؐ کو جان نثار ان توحید انت سیدنا کہیں تو فرمائیں بل السید ھو اللہ - گویا ذات کی حد تک تو اپنی عظمت و تعریف برداشت ہے۔ ورنہ شرک فی الصفات کے خوف سے اتنا غلو بھی گوارا نہیں!

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ المسیح بن مریم علیہما السلام انما انا عبدہٗ ورسولہٗ!

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سألت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ (المشکوٰۃ)

تم کو کچھ بھی مانگنا ہو خدا سے مانگو اور جب بھی مدد چاہنا ہو تو خدا ہی سے مدد چاہو!

اس لئے کہ خدا کے سوا کسی کو بھی مشکل کشا یا حاجت روا سمجھنا خدا کی خدائی میں اس کو شریک کرنا ہے - اور شرک لظلم عظیم کے ساتھ ساتھ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک، ایک اٹل فیصلہ ہے۔ اس "ذنب لا یغفر" سے بچنے کے لئے شرک کی بعید تر مشابہت سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے کہ یہی

ایمان اور توحید کا تقاضا ہے!

اسی طرح اگر کسی کے مزار پر عرس منانے، چراغاں کرنے اور نذر و نیاز کی اجازت ہوتی، تو اس کے لئے بھی صرف حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روضۂ اقدس ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ فتنۂ قبور کی خطرناکی اور غلو فی الانبیاء و الصالحین کے نتائج حضورؐ کے پیشِ نظر تھے اس لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپؐ نے تاکید فرمائی کہ "لا تجعلوا قبری عیداً" میری قبر کو عید (میلہ) نہ بنا لینا!

انہی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے آپؐ نے یہ دعا فرمائی: "اللّٰھم لا تجعل قبری وثناً یعبد" الٰہی میری قبر کو بُت نہ بنانا کہ اُس کی پرستش کی جائے۔ "وثن" کا معنوی اطلاق ہر اُس شے پر ہو سکتا ہے جسے خدا کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ حضورؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا:-

ایاکم والغلو فانما اھلک من کان قبلکم الغلو۔ (الحدیث)

خبردار! غلو سے ہمیشہ بچنا اس لئے کہ تم سے قبل جو لوگ تھے وہ اس غلو سے تباہ کیے گئے!

آج نافرمانی کا یہ عالم ہے کہ ہماری نظروں سے ایسے اشعار بھی گزرتے ہیں جن کی نقل سے بھی ہاتھ لرزتے ہیں ؎

ہمارے سرورِ عالم کا رتبہ کوئی کیا جانے — خدا سے ملنا جو چاہے محمدؐ کو خدا جانے

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر — اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

نعوذ باللہ من ذالک! اس مشرکانہ ذہنیت کے لوگوں کی اس مبالغہ آمیزی سے خود سرورِ کائناتؐ کی روحِ پاک کو کس قدر اذیت ہوگی۔ "ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً ـــــ لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم المسیح" کی نافرمانی کے لئے اس سے بڑی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس غلو فی الانبیاء نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ اور عزیر علیہ السلام کو بھی خدا کا بیٹا بنا کر نصاریٰ اور یہود کو قہرِ الٰہی کی نذر کیا اور یہی غلو مسلمانوں کو بھی تباہی کے گڑھے کی طرف لئے جا رہا ہے!

"الوسیلہ" کا یہی مفہوم اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی لیا کرتے تو وہ بھی تقویٰ، صالحیت، عبادات، سب چھوڑ کر حضورؐ اقدس ہی کی ذاتِ گرامی کو قربِ خداوندی کا ذریعہ بنا لیتے۔ اور روضۂ اقدس کی مجاوری اُن کا پیشہ ہوتا۔ لیکن آثارِ صحابہؓ میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ان مقدس ہستیوں کے اتقاء اور اتباعِ سنت پر سختی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت ہی کٹوا دیا جس کے سایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ صلح حدیبیہ لی تھی اس میں محض شرک کا خوف کار فرما تھا۔ اس لئے کہ بعض لوگ قصداً اس درخت کے سایہ میں نماز پڑھنے جانے لگے تھے ـــ!

معرور بن سوید فرماتے ہیں: "میں نے ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ کے راستہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا۔ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ عرض کیا گیا۔ یا امیر المومنین! یہاں ایک مسجد ہے، جہاں رسول اللہؐ نے نماز پڑھی تھی۔ یہ لوگ بھی وہاں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:-

وانما ھلک من کان قبلکم بمثل ھذا یتبعون آثار انبیائھم و یتخذونھا کنائس و بیعاً!

تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ اپنے انبیاء کے آثار کی بھی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ان کو عبادت گاہ (کلیسا اور معبد یہود) بنا کر چھوڑا ۔!

ایک بار حضرت عمرؓ ہی نے بھرے مجمع میں دعا فرمائی :۔

اللھم انا کنا اذا جدبنا توسلنا بنبینا فتسقینا وانا نتوسل لعم نبینا فاسقنا فیسقون (بخاری)

الٰہی ! پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم اپنے نبی کے توسل سے پانی مانگتے تھے اور تو ہمیں سیراب کر دیا کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے عم محترم (عباس بن عبد المطلبؓ) کے توسل سے پانی مانگتے ہیں تو انہیں سیراب کر ! چنانچہ بارش ہو گئی ۔ (بخاری)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبی کریمؐ کی حیات طیبہ میں تو صحابہ کرام نے آپ کا وسیلہ لیا، مگر بعد وفات نہیں لیا۔ اس کی تائید میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"اللہ سے کسی کا وسیلہ لینا جائز نہیں۔ اس کو اس کے نام و صفات سے پکارو۔ بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ الٰہی بحق فلاں نبی یا فلاں فرشتہ میری حاجت روائی کر۔" (در مختار)

خانوادۂ نبوی کے چشم و چراغ سیدنا زین العابدین الحسن بن حسینؓ نے ایک شخص کو دعا و سلام کی غرض سے قبر اقدس کے پاس جانے سے منع فرما رکھا :۔

الا احدثکم حدیثا سمعتہ عن ابی عن جدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبری عیداً - ولا تجعلوا بیوتکم قبوراً فصلاتکم تبلغنی حیث کنتم !

کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے جد محترم سے روایت کی ہوئی حدیث بیان کی ہے ۔ کیا میں تمہیں نہ بتا دوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ۔ میری قبر کو میلہ نہ بناؤ ۔ اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنا لو۔ تمہارا درود و سلام تم جہاں بھی رہو، مجھے پہنچتا رہے گا !

در اصل زمانۂ جاہلیت میں غلو فی الانبیاء و الصالحین نے بت پرستی اور قبر پرستی عام کی تھی اور یہی غلو فی الاولیاء و الصالحین آج بھی بعض مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جا رہا ہے ۔ !

"الوسیلہ" کا مفہوم اور اولیاء اللہ !

ہم نے جن اولیاء کرام کے نام سنے اور تصانیف دیکھی ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی "الوسیلہ" کا یہ مفہوم لے کر شرک و بدعت کا دروازہ نہیں کھولا اور نہ وہ مقدس بزرگ ان اہل بدعت کے ذمہ دار ہیں ۔ فتح الغیب میں شیخ عبد القادر جیلانی فرماتے ہیں :۔

"اپنی تمام حاجتیں اللہ کے حضور پیش کرو اور تمام خلقت سے منہ موڑ کر اس کے آگے جھک جاؤ ۔ اپنے دلوں کو غیر اللہ سے پاک رکھو اور اس کے سوا کسی سے نفع نقصان کی امید نہ رکھو۔" (الفتح الربانی)

اس کے علاوہ غنیۃ الطالبین شیخ جیلانی کی مشہور کتاب ہے، اس میں بھی بدعتوں سے احتراز کی سخت تاکید پائی جاتی ہے ۔ !

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے یہاں بھی ولایت و بیعت کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"مشرکین مکہ بتوں کو روحوں کی توجہ کا مرکز قرار دیتے تھے اور آج مسلمان قبروں کو سمجھتے ہیں۔" (فوز الکبیر)

"انبیاء و اولیاء ہمہ بندگان خدا اند و ہیچ تصرفے در کارخانہ جات الٰہی نہ دارند نہ در حیات نہ بعد ممات۔" (البلاغ المبین)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:۔

"رفع شر یا دفع بلا کے لئے غیر اللہ کو پکارنا اور اُن کو صاحب اختیار سمجھنا شرک ہے" (تفسیر عزیزی)

"استغاثۃ المخلوق بالمخلوق کاستغاثۃ المسجون بالمسجون۔" (بایزید بسطامیؒ)

"استمداد و استعانت از اہل قبور بہر ہیچ کہ باشد جائز نیست۔" (فتاویٰ)

"انبیاء و اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا، طواف کرنا، اُن سے مراد مانگنا، نذر و نیاز کرنا، یہ سب ناجائز حرام و ناجائز ہے۔" (مالا بد منہ)

منھم الذین یدعون الانبیاء والاولیاء عند الحوائج والمصائب باعتقاد ان ارواحھم حاضرۃ تسمع الندا وتعلم الحوائج وذالک شرک قبیح وجھل صریح قال اللہ تعالیٰ ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ! (توشیح بحوالہ فاران)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد سلطان العارفین قاضی حمید الدین ناگوری فرماتے ہیں

"وہ لوگ جو انبیاء اور اولیاء کو حاجتوں اور مصائب میں اس اعتقاد کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اُن کی روحیں حاضر ہوتی ہیں اور پکارنے والوں کی ندا سنتی ہیں، اُن کی حاجتیں جانتی ہیں، تو یہ شرک قبیح اور جہل صریح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں، اُن سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا؟"

اسی طرح دیگر اولیاء اللہ نے شرک فی الذات والصفات باری تعالیٰ کو حرام قرار دیا ہے اور اُن کے اقوال و اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے ہمیشہ قرآن و سنت کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور ردّ شرک و بدعت کے ساتھ توحید کی علمبرداری کرتے ہوئے اُن کی ساری کی ساری زندگیاں عبادت، تقویٰ، اور ریاضت سے تزکیہ نفس میں گزر گئیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

معلوم یہ ہوا کہ "الوسیلہ" کا غلط مفہوم لے کر اُن مُنتر کا نہ رسوم کو اولیاء اللہ کی خوشنودی کے لئے ادا کرنا ان مقدس ہستیوں پر سراسر تہمت جوڑنا ہے، بلاشبہ ان صالحین کی ارواح کو بھی اس لغو سرائی سے اذیت ہوتی ہوگی کہ:۔

بہ گرداب بلا افتاد کشتی — مدد کن یا معین الدین چشتی

حقیقت میں دیکھو تو خواجہ خدا ہے — ہمیں در پہ خواجہ کے سجدہ روا ہے

شیئاً للہ چوں گدائے مُستمند — المدد خواہم ز خواجہ نقشبند!!

نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات ونستغفرہٗ!

قرآن پاک کی یہ آیت کس طرح دو ٹوک فیصلہ کرتی ہے :۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔!

یعنی اے پیغمبر! جب میرا کوئی بندہ تم سے میرے متعلق دریافت کرے کہ (وہ کیونکر مجھ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے) ، تو تم اس کو بتا دو کہ میں تو اُس کے پاس ہی ہوں (دُور نہیں کہ رسائی کے لئے کسی ذریعہ اور مشقت کی ضرورت ہو) اور میں اُس کی پکار سن کر قبول کرتا ہوں۔

اس آیت کے بعد غیر اللہ سے استمداد، استعانت اور استغاثہ کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ وہ اقرار ہے جو خدا اور بندے کے درمیان خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہتے ہی صرف ایک ذات کو استعانت و استمداد کا مستحق اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے غیر اللہ کے خوف اور بندگی کا طوق انسانیت کی گردن سے اُتار دیتا ہے۔ اور اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا صحیح لطف آتا ہے۔!

اس سے بڑھ کر نا شکری اور ظلم کیا ہوگا کہ اس قادر مطلق کے ساتھ اُس کے بندوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرایا جائے۔ مالکم کیف تحکمون ۔ قرآن کریم موجود ہے اور انسان عقل سے بھی محروم نہیں ہوا ہے۔ اگر متاع ہوش و خرد بھی غیر اللہ کی نذر نہ کی گئی ہو تو "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان" کی تمثیل قرآن کریم میں نظر آتی ہے۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَنَجَّیْنٰہُ وَاَھْلَہٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ ۔ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَکَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ۔ الخ
وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا۔ الخ

ان انبیاء کی مثالوں سے اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو پکارنے والوں پر حجت تمام کر دی ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰہِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُرَکَآءَ، اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ○

یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام ہستیاں جو زمین و آسمان میں ہیں، سب اللہ ہی کی تابعدار اور فرمانبردار ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) معبودوں کو پکارتے ہیں، تم جانتے ہو وہ کس کی پیروی کرتے ہیں (یقین و بصیرت کی نہیں) وہ تو محض وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں، کہہ دو (ہر بات میں) اپنی اٹکلیں دوڑاتے پھرتے ہیں!

وَمَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ ۔ حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟

عالم اسلامی میں آج کتنے مسلمان ایسے ہیں جو کلمۂ حق لا الٰہ الا اللہ کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہوں، کوئی پیر پرستی میں مبتلا ہے، تو کوئی نجومیوں اور اشتہاری پامسٹوں کے ہاتھوں توہم پرستی سے ایمان فروشی کر رہا ہے، کسی کو مفاد پرستی سے فرصت نہیں، تو کوئی اقتدار کے نشے میں نفس پرستی کر رہا ہے اور موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے!

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا !!

مولوی محمد مجیب اللہ ندوی

عقیدت کا غلو اور اُس کے نتائج

ماہر صاحب نے میرے لیے جو موضوع منتخب کیا ہے، وہ بہت نازک بھی ہے، اور وسیع بھی۔ اس پر لکھنے کے لئے وسعتِ علم اور دقتِ فکر کے ساتھ پختہ اور مشاق قلم کی بھی ضرورت تھی اور ان میں سے کوئی چیز راقم کو معیارِ مطلوب کے مطابق حاصل نہیں ہے، مگر اپنی کم بضاعتی کے باوجود دو وجہ سے اس پر لکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایک تو اس لئے کہ شاید اس کے ذریعہ کچھ بندگانِ خدا کی ذہنی اور عملی اصلاح ہو جائے اور یہ چیز قیامت میں میرے لئے کچھ اجر و ثواب کا سبب بن جائے دوسرے اس موضوع سے کچھ طبعی مناسبت بھی ہے۔

اس مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ راقم کی تعلیم و تربیت جن بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی، اُن میں سے کسی نے بھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ دین کا کوئی مسئلہ میں اُن کی شخصیت کے گرد سمجھوں۔ یا محض اُن کی تقلید کی بناء پر اُسے مان لوں۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ اصل ماخذ کی طرف رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، سنت، اور اسوۂ صحابہ میں جن باتوں کا سراغ نہیں ملتا، اُن کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اور اُن سے نفرت ہوتی ہے، خواہ ظاہری طور پر اُن کے اُوپر دین کے کتنے موٹے پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اور وہ باتیں کتنے ہی بڑے شخص کی طرف کیوں نہ منسوب ہوں ـــ !

اُردو زبان میں عقیدت اُس غیر معمولی محبت اور دل کے لگاؤ اور جھکاؤ کو کہتے ہیں جو کسی چیز یا کسی انسان کی عظمت و محبت کے نتیجہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کی اصل "عقد" ہے۔ جس کے معنی کسی کو چیز کو کسی کے ساتھ باندھ دینے یا وابستہ کر دینے کے ہیں۔

اسلامی شریعت میں خریدار اور دکاندار آپس میں خرید و فروخت کا جو معاملہ کرتے ہیں، اس کو عقدِ بیع کہا جاتا ہے۔ یعنی دونوں اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے بندھ جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے ذریعہ باہم زندگی گزارنے کا جو عہد کرتے ہیں، اُس کو عقدِ نکاح کہا جاتا ہے۔ گویا دونوں اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہم آپس میں بندھ گئے اور ایک دوسرے کے پابند ہو گئے!

اسی سے عقیدہ کا لفظ نکلا ہے، جو آدمی کے دل کو کسی خیال یا کسی حقیقت پر باندھ دیتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اُردو میں یہ لفظ عربی کے اصل معنی میں کچھ مزید اضافہ کے ساتھ بولا جاتا ہے!

مذہبی تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب بھی انسان کو کسی ممتاز انسان یا کسی دوسری مخلوق کے ساتھ عقیدت پیدا ہوئی ہے تو اُس نے انسان کو انسان یا اس مخلوق کو مخلوق نہیں رہنے دیا ہے، بلکہ اُس نے خالق کے صفات

میں سے کسی نہ کسی صفت میں اُسے ضرور شریک کرلیا ہے۔ الوہیت میں تو شرک کسی زمانہ میں نہیں رہا۔ مگر صفاتِ الٰہی یا ربوبیت کا جامہ ہمیشہ اس نے ممتاز مخلوقات کو پہنانے کی کوشش کی ہے۔ عرب کی بُت پرستی، عجم کی ثنویت، عیسائیوں کی تثلیث اور ہندوؤں کی اجرام و اصنام پرستی، سب میں آپ کو یہی عظمت و عقیدت اور محبت کا غلو کارفرما نظر آئیگا۔ یہی عظمت کا مُفرط احساس ہے جو آنحضرتؐ کو (معاذ اللہ) ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰےؐ ہوکر

کہتی ہے۔ اور یہی عقیدت کا غلو ہے جو رسُول اللہ کو اللہ تعالیٰ سے بھی آگے بڑھا دیتی ہے۔ ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (توبہ!)

یہ عقیدت کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ کیسے گمراہی اور اس کے بعد شرک کی صورت اختیار کرلیتی ہے؟ یوں تو اس کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ مگر اس کے دو خاص سبب کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ایک محبت میں غلو۔!

۲۔ دُوسرے عظمت میں غلو!

محبت آدمی کو شرک فی العمل میں مبتلا کرتی ہے اور عظمت شرک فی الربوبیت کی طرف لے جاتی ہے۔ غیر اللہ کی محبت و عظمت ابتداء میں شرک نہیں ہوتی مگر اس کے غلو کا نتیجہ ہمیشہ شرک ہی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

ابتداء میں جب انسان کے دل میں اجرام سماوی کی عظمت پیدا ہوئی تو وہ یک بیک اُن کے آگے سربسجود نہیں ہوگیا۔ بلکہ ایسا آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوا۔ اسی طرح انسان جب کسی ممتاز انسان سے محبت کرتا ہے اور اس کی عظمت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، تو ابتداء میں اُس سے اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتا ہے، پھر دل میں اُس کے خدا کا مقرب اور محبوب ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے، اب وہ اُس کی مرضی کو خدا کی مرضی اور اُس کے حکم کو خدا کا حکم سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اُس میں مزید غلو پیدا ہوتا ہے اور اب اس کو وہ مظہرِ الٰہی تصور کرنے لگتا ہے۔ اب اس مرحلہ پر آکر خدا کا یقین اُس کے دل سے یا تو نکل جاتا ہی یا اگر ہوتا ہے تو وہ یقین اس کے لئے محرکِ عمل نہیں بنتا۔ عملاً وہ خدا کو انگلستان کے بادشاہ سے زیادہ بااختیار نہیں سمجھتا۔ وہ اُس کی مرضی چاہتا تو ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ اس بارگاہ میں ہم بغیر ان واسطوں اور ذریعوں اور مظاہر کے نہیں پہنچ سکتے۔!

چنانچہ اب وہ اپنی ساری نیازمندیاں انہی بے دست و پا واسطوں اور بے قوت ذریعوں کی خوشنودی کے لئے وقف کردیتا ہی۔ اس کے دل میں اب اُنہی کا خوف ہوتا ہے اور اُن ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھتا ہے، اس لئے اُن سے دعائیں کرتا ہے، اُن کے آستانوں اور قبروں پر نذر و نیاز پیش کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے ذریعہ وہ خدا کی مرضی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ غرض یہ کہ تعبد و تذلل اور دعا و طمع کا جو حق صرف خالق کے ساتھ مخصوص ہے، اس کا مظاہرہ مخلوق کے ساتھ کیا جاتا ہی!

آج ہندو قوم اپنے دیوتاؤں رامؔ اور کرشن جی کی تصویروں اور شبیہوں کے ساتھ جو معاملہ کررہی ہے، وہ عظمت پرستی اور غیر معمولی محبت کے نتائج ہیں۔

اہلِ فارس میں ثنویت اس لئے رواج پاگئی کہ انہوں نے اسباب کو مسبب کا درجہ دے دیا۔

عیسائیوں کی تثلیث، عظمت پرستی اور محبت میں غلو کا نہایت روشن ثبوت ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہوں کے ساتھ جس نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں، اس میں عقیدت کے غلو کا پورا پورا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے ان کو پیار محبت سے روح اللہ کہا تھا۔ انہوں نے ان کو خدا بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غیر اللہ کی ایسی محبت کو جو خدا کی محبت کے تابع نہ ہو، کسی ممتاز مخلوق کی ایسی عظمت اور تکریم جس کے ذریعہ اس کے بارے میں ماورائی تصوّر پیدا ہو، بالکل ناجائز قرار دیا ہے۔ بلکہ اس نے اس سلسلہ میں ان منافذ کو بھی بند کر دیا ہے جس کے ذریعہ محبت اور عظمت گمراہی کی راستہ نکال لیا کرتی ہے!

عیسائیوں کے غلو فی المحبت اور غلو فی العظمت کا تذکرہ کرکے قرآن نے بار بار یہ تنبیہ کی:-

"لا تغلو فی دینکم" دین میں غلو نہ کرو!

مگر اس کے باوجود آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بزرگوں، پیروں، اور ان کی قبروں کے بارے میں جو تصوّر رکھتا ہے اور ان کے سامنے جن اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے، یہ سب اسی محبت و عظمت کے نتائج اور عقیدت میں غلو کا براہ راست سبب ہیں ---!

مسلمانوں میں یہ چیز کس طرح گھس آئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع تو ہے۔ مگر اس کے لئے ایک لمبی فرصت درکار ہے جو حاصل نہیں ہے، اس لئے چند باتیں عرض کر دی جاتی ہیں:-

مسلمانوں میں اجرام سماوی کی عظمت تو کسی زمانہ میں پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی وہ ان کے آگے سربسجود ہوئے۔ مگر انسانوں کی عظمت و عقیدت نے ان میں بے شمار گمراہیاں اور ضلالتیں پھیلائی ہیں اور جو مسلمان ان گمراہیوں میں مبتلا ہیں ان کی اکثریت فرائضِ اسلامی سے غافل اور ان کی ادائیگی میں کوتاہ ہوتی ہے۔ مگر ان مراسم کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی کوتاہی اور غفلت نہیں برتتی، جو اُس نے ان برگزیدہ ہستیوں کے لئے مخصوص کر لی ہیں۔ شب برات، گیارھویں، رجب کے مراسم وہ ضرور پورے کریں گے، خواہ انھیں قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ وہ عرس اور زیارت کے لئے دہلی، اجمیر، کلیر، ردولی اور پھلواری کے سفر میں سینکڑوں روپے صرف کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔ مگر ادائے زکوٰۃ اور سفر حج کا خیال اُن کو بہت کم آئے گا۔ حتیٰ کہ بعض تو عرس و زیارت کی شرکت کو سفر حج سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:-

> میرے ایک عزیز ایک کارخانہ کے منیجر اور بڑے صاحبِ دولت ہیں۔ چشتی فریدی سلسلہ میں بیعت ہیں، ہر سال وہ اجمیر تشریف لے جاتے ہیں اور وہاں کی چھوٹی اور کبھی بڑی دیگ کا خرچ برداشت کرتے ہیں۔ میرے والد مرحوم نے اُن سے ایک دن کہا، آپ پر تو حج فرض ہے۔ آپ ایک سال اجمیر جانے کے بجائے حج ہی کر آتے، انہوں نے ایک آہ سرد بھری اور کہا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو ایک واقعہ سناؤں، انہوں نے اس کے بعد والد کو یہ واقعہ سنایا:-
>
> ایک بزرگ تھے جنہوں نے اپنی حلال کمائی سے بچا بچا کر سفر حج کے لئے کچھ روپیہ جمع کیا۔ جب سفر خرچ کے لئے روپیہ جمع ہو گیا اور انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی تو اتفاق

سے روپیہ چوری ہو گیا۔ اُن کو بڑا رنج ہوا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا۔ جب حج کا زمانہ ختم ہو گیا تو کسی دوسرے بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ اس سال کس کا حج مقبول ہوا ہے، آپ نے ان صاحبان کا نام لیا جو روپے چوری ہو جانے کی وجہ سے زیارتِ حرمین کے لئے نہ جا سکے تھے"!

یہ واقعہ بیان کر کے انہوں نے کہا کہ میں ہزاروں روپے اجمیر وغیرہ جا کر خرچ کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ بغیر سفر کئے ہوئے ہی اُن کے طفیل میں میرا حج قبول فرما لے!

یہ محض ایک واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ مسلمانوں کے اس پورے طبقہ کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ جن کے دل میں بزرگوں کی عظمت اور اُن کی عقیدت بطور عقیدہ گھر کر چکی ہے، وہ اُن کی خوشنودی کے آگے خدا کی ناراضگی مول لیتے ہیں اور فرائض کو ترک کر کے مباحات ہی نہیں بلکہ مکروہات تک پر عمل کرتے ہیں۔ اور اس کو ثواب سمجھتے ہیں!

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ عیسائیوں کے غلو کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ صوفیاء کی اولاد کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اگر خواہی نمونہ ایں فریق ملاحظہ کنی امروز اولادِ مشائخ و اولیاء تماشا کن کہ در حق آبائے خود چہ ظنون دارند و تا کجا کشیدہ بردہ اند وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"! (تفہیمات الٰہیہ ص۲۳)

اگر اس حلقہ کا نمونہ دیکھنا ہو تو اولیا و مشائخ کی اولاد کو دیکھو کہ وہ اپنے آباو اجداد کے بارے میں کیا کیا خیالات فاسدہ رکھتے ہیں اور اُن کو کس مرتبہ تک پہنچاتے ہیں۔ عنقریب یہ ظالم جانیں گے کہ کس کس کروٹ وہ لوٹائے جاتے ہیں!

شاہ صاحب نے محض مشائخ و صوفیا کی اولاد کا تذکرہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کے زمانہ میں یہ چیز زیادہ عام ہو۔ موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کی اولاد کے ساتھ اُن کے خلفاء متوسلین بھی اس عقیدت کے غلو میں شریک ہیں۔ اہلِ تقویٰ اور متبع سنت مشائخ و صلحا کی عزت و تکریم یقیناً موجبِ ثواب اور اُن کی صحبت باعثِ خیر و برکت ہے۔ مگر ان صلحا کے متوسلین جس انداز سے ان کی عظمت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، وہ دین میں ایک فتنہ ہے، اس سے پہلے بھی یہ ذہنیت فتنہ بنی ہے اور آج بھی بن رہی ہے!

عام متوسلین کا حال یہ ہوتا ہے کہ مشائخ سے آزادانہ طور پر وہ کوئی سوال نہیں کرتے، یا نہیں کر سکتے۔ حالانکہ صحابہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلف سوال کرتے اور آپ جواب عنایت فرماتے تھے! اُن کا تذکرہ کریں گے تو اُن کے نام کے بجائے القاب و آداب سے خطاب کریں گے، حالانکہ آنحضرتؐ کا تذکرہ بھی ہمیں اُن کے نام کے ساتھ بتایا گیا ہے نہیں بلکہ آپؐ کی عبدیت کا دن میں کئی بار اعادہ بھی کرایا جاتا ہے!

اشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

اس میں آپؐ کی عبدیت کو رسالت پر مقدم رکھا گیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوق کا اصل مقام عبدیت ہے!

خدا کا شکر ہے کہ وہ اب حج کر آئے ہیں اور اپنے اعمال میں بہت کچھ تبدیلی کر لی ہے!

یہ حضرات صحابہؓ کا ذکر، اسلاف کا تذکرہ، اپنے حلقہ کے علاوہ دوسرے حلقہ کے بزرگوں کا ذکر بے تکلف نام لے کر کریں گے، مگر یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ اپنے شیخ کو شیخ، یا مولانا کہہ کر اُن کا نام بھی لے لیں۔ حضرت شیخ، چھوٹے حضرت، بڑے حضرت، اعلیٰ حضرت، یا دطن کی نسبت سے اُن کو یاد کریں گے۔ بسا اوقات سننے والے کو اس تلمیح کے سمجھنے میں کئی منٹ لگ جاتے ہیں۔ اور کتنے بیچارے، تو سمجھ بھی نہیں پاتے ہوں گے!

ان بزرگوں کے اقوال کو، خواہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، بطور سنت و حجت پیش کریں گے۔ اس موقع پر اُن کا اسلامی احساس نہ جانے کیوں کند ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اپنے مشائخ کی عقیدت میں اُن کا احساس انتہائی تیز اور نازک ہوتا ہے۔ رسالہ اور مضمون نگار کا نام یاد نہیں، مگر کچھ دن ہوئے ایک عالم دین نے وطن کی محبت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک بزرگ کا یہ کشف نقل کیا تھا۔

"ایک بزرگ نے .... اپنا کشف بیان فرمایا کہ گنگا کے پانی میں نورانیت محسوس ہوتی ہے"

مقصد یہ تھا کہ گنگا کی جو عظمت ہندوؤں کے دل میں ہے، اس کا ثبوت بزرگوں کے اقوال سے بھی ملتا ہے، اُن بزرگ نے نہ جانے کس موقع پر اور کن حالات میں یہ بات کہی تھی، یا کہی بھی تھی کہ نہیں۔ اس پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ بہرحال اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، کیا وہ گمراہی کا پیش خیمہ نہیں ہے۔ اگر وہ بزرگ موجود ہوتے تو شاید وہ مضمون نگار کو اس بات پر ضرور ٹوکتے!

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ایک واقعہ سن لیجئے:۔

اعظم گڑھ میں کچھ لوگوں نے اُردو کی ترویج و اشاعت کا کام شروع کیا اور وہ لوگ مولانا تھانویؒ کے ایک متوسل جو ریٹائرڈ جج ہیں، اُن کے پاس بھی گئے۔ اور اُن سے اس میں مدد کی درخواست کی، انہوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی، اس کے بعد ایک صاحب کو الگ بلا کر لے گئے اور فرمایا:۔

"بھائی میری رائے میں اُردو کا کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس لئے کہ اس زبان میں حضرت (یعنی مولانا تھانوی) کی کتابیں ہیں"

قرآن کی زبان کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مٹ نہیں سکتی، مگر دوسری کسی زبان کے بارے میں یہ بات کہنی یقیناً ذہنی کجی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ آج اگر مولانا تھانویؒ موجود ہوتے تو وہ اس مبالغہ آمیز توجیہ کا سننا پسند نہ فرماتے۔!

استاذ الاستاذ جناب سید سلیمانؒ ندوی فرماتے تھے کہ ایک بار اُن کی یہ خواہش ہوئی کہ مولانا تھانویؒ کی تفسیر کو آسان زبان میں منتقل کر دیں، تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اُن کے اس ارادہ کی اطلاع جب مولانا کے ایک ممتاز خلیفہ کو ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سے سید صاحب کو باز رکھنے کی کوشش کی کہ "مولانا کے یہ الفاظ الہامی ہیں، اس لئے اس میں تبدیلی نہ ہونی چاہیئے" [۱]

---

[۱] سید صاحب نے یہ واقعہ علماء کے ایک مجمع میں بیان کیا تھا۔ اور خود بھی اظہار افسوس کیا تھا!

حاشا و کلا میں نے یہ واقعات بزرگوں کی توہین کے لئے نہیں بلکہ یہ دکھانے کے لئے پیش کئے ہیں کہ عظمت کا غلط تصور آدمی کو کتنی ذہنی گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، اُن کا دامن شرک کی چھینٹوں سے یقیناً پاک ہے۔ مگر اُن کی اس طرح کی بے اعتدالی نہ جانے کتنے اللہ کے بندوں کو شرک تک پہنچا دے گی۔ میرا خیال ہے کہ آج اگر مولانا اشرف علی تھانوی رح زندہ ہوتے تو وہ ضرور ان باتوں پر ٹوکتے۔ جس نے زندگی بھر شرک و بدعت کے مٹانے کی سعی کی ہو، آج اس کے بعض متوسلین اس کی عظمت و عقیدت کے ذریعہ خطرناک بے اعتدالی کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے علماء جنھوں نے شرک ہی نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی بدعتوں کے مٹانے کی کوشش کی، ان خرافات کے رد میں مناظرے کئے، آج وہاں کا یہ حال ہے کہ لوگ دعا کے لئے روپے بھیجتے ہیں۔ اور بخاری کا ختم کر کے دعا کی جاتی ہے، مصر کے لئے بھی ختم بخاری کے بعد دعا کی گئی تھی۔ جس ادارہ کے بزرگوں نے مقررہ وقت پر قرآن خوانی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اب وہاں ختم بخاری کی بدعت جاری کی جائے، کس قدر تعجب کی بات ہے۔ مگر آج اس کے خلاف کوئی آواز اس لئے نہیں اٹھ سکتی کہ بعض بزرگوں کے زیر پرستی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ جن کی عظمت نے زبانوں پر مہر سکوت لگا دی ہے —!

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کے بہت سے مسائل میں اپنے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا تھا۔ اور اس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے۔ مگر آج سیکولر حکومت جس نے مسلمانوں کے پرسنل لاء کی بھی جان نہ بخشی ہو، اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس ادارہ کے بعض ذمہ دار اکابر وعظ و پند ہی نہیں، بلکہ مسلسل جد وجہد کے ذریعہ مسلمانوں کو روک رہے ہیں۔ اُن کے وابستگان میں کتنے لوگ ہیں جو اس بے اعتدالی کو سمجھتے ہیں، مگر اس کے خلاف نہ تو آواز اٹھا سکتے ہیں، نہ ان کو ٹوک سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کی عظمت مانع ہے، مگر اسلامی ملکوں میں اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جو مختلف تحریکیں چل رہی ہیں، اُس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش یہی اہل عقیدت کا گروہ ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے —!

اس عقیدت اور عظمت پرستی نے دُنیا کی دُوسری قوموں کے ذہن و دماغ پر جو اثرات ڈالے ہیں اور جس طرح اُن کو گمراہ کیا ہے، اس کا ذکر چھوڑیئے۔ اس نے مسلمانوں کو صراط مستقیم سے ہٹا کر علم و عمل کی ایسی پُرپیچ وادی میں چھوڑ دیا ہے، بظاہر اس سے ان کا نکلنا دشوار معلوم ہوتا ہے —!

یہ گمراہ کن عظمت و عقیدت مسلمانوں میں جس راہ سے سب سے زیادہ آئی، وہ تصوف[1] کی راہ ہے۔ آپ صحابہ کرام رضوان، تابعین اور تبع تابعین اور محدثین کے حالات پڑھیئے، مفسرین کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ ممتاز فقہا کے تراجم دیکھئے ان کی زندگی آئینہ کی طرح صاف و شفاف اُن کے اقوال و افعال واضح اور روشن ہیں، اُن کی حکیمانہ باتیں قرآن و

---

[1] فاضل مضمون نگار کا "تصوف" سے مطلب یقیناً "عجم زدہ تصوف" ہے، یعنی وہ تصوف جس میں عجمیت شامل ہو گئی ہے، ورنہ وہ تصوفِ خالص جو "تزکیہ نفس" کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور جو کتاب و سنت سے متجاوز نہیں ہو اُس سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں —! (م - ق)

سنت سے تعلق پیدا کرنے والی ہوں گی، اُن کی کتابیں ازدیاد ایمان کا سبب ہوں گی - اُن کی باتوں سے اُن کی بڑائی ضرور معلوم ہوگی اُن کی سیرت کے پڑھنے سے دل میں اُن کی تکریم ضرور پیدا ہوگی - مگر ذہن میں اُن کے بارے میں کوئی ماورائی تصور یا خرق عادت عقیدہ نہیں بیٹھے گا - یہی وجہ ہے کہ اُن کی ذات کو کبھی بدعت و شرک کے لئے استعمال نہیں کیا گیا - اور اگر استعمال کیا گیا تو اُن کو بھی اسی راہ میں لا کر -

مگر تصوف میں جب سے فلسفہ کی آمیزش ہوئی ہے، اُس وقت سے آج تک اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں - یا بزرگوں کے جو ملفوظات اور مکتوبات جمع کئے گئے - جن میں اکثر فرضی ہیں، اُن میں مستثنیات کو چھوڑ کر اکثر میں ایک طرف اگر کتاب و سنت کی تعلیم کی وضاحت اور اس کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں کی صراحت ملے گی تو اسی کے ساتھ کچھ ایسی ذومعنی خرقِ عادات اور انتشارِ فکر پیدا کرنے والی باتیں بھی ملیں گی، جن سے آدمی غلط راہ اختیار کر سکتا ہے - اور ایسا ہوا ہے! ان بزرگوں کی نیت و عمل دونوں بخیر تھے - مگر تزکیۂ نفس کے سلسلہ میں فلسفۂ یونان، یوگ اور اشراقیات کی آمیزش سے جو فلسفۂ تصوف تیار ہوا - اس میں ساری توجہ بنیادی اعمال پر کم، کیفیات و واردات پر زیادہ رکھی گئی - اس لئے فرضی ملفوظات، مکتوبات اور کتابوں کے ذریعہ بھی عقیدت مندوں نے گمراہی پھیلائی اور اُن کے مولفین و مصنفین کی ذات کو بھی کیفیات و واردات کا ایک مجموعۂ طلسم بنا دیا - اُن کی زندگی کا عملی پہلو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور صرف وہ پہلو سامنے رہ گیا جو خرق عادت اور عظمت و جلالت کے واقعات سے پُر تھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدعت و گمراہی اور شرکِ جلی و خفی کے بے شمار مظاہر و مناظر پیدا ہو گئے!

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جن کا علم و عمل، ورع و تقویٰ، جن کا جذبۂ اتباعِ سنت، جن کے وعظ کا اثر ضرب المثل ہے، جن کا قول ہے کہ گھر کے باہر اگر توحید ہو اور اندر شرک، تو یہ نفاق ہے! مگر کیا آج اُن کی عظمت محض چند کرامات، خرق عادت واقعات اور گیارھویں کے فاتحہ تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے! کیا اُن کی طرف مواعظ و ملفوظات کا ایک طومار نہیں منسوب کر دیا گیا ہے، جن میں اُن کو نبی سے بھی بڑھایا گیا ہے -

اسی طرح شیخ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، بختیار کاکی، زکریا ملتانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے تقدس و بزرگی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے - مگر کیا یہ ایک واقعہ نہیں ہے کہ عقیدتِ فاسدہ اور عظمت پرستی نے اُن کے مزارات کو خانۂ کعبہ اور مسجد نبوی کی عظمت عطا کر دی ہے؟

امام غزالیؒ کی کتاب و سنت سے شغف اور زہد و تقویٰ پر کون شبہ کر سکتا ہے - مگر اس کے باوجود فلسفۂ یونان اور فلسفۂ تصوف کے جو اثرات اُن کی خالص دینی کتابوں تک میں ہیں، اُن پر امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہم نے حرف گیری کی ہے - امام ابن تیمیہؒ تو اُن کے بارے میں بسا اوقات بہت سخت رائے دیتے ہیں!

انہوں نے نبوت کی حقیقت اور استدلال کی نوعیت پر جو کچھ لکھا ہے، اس پر امام ابن تیمیہؒ نے سخت تنقید کی ہے[1] - شرح صدر کی تشریح میں بعض اہل تصوف جو موشگافی کرتے ہیں اور جس کا کچھ اثر امام غزالیؒ کی کتابوں میں جھلکتا ہے اُس کے بارے میں شاہ ولی صاحب لکھتے ہیں :-

---

[1] راقم نے معارف میں کتاب الرد علی المنطقین پر جو تبصرہ لکھا تھا اُس میں متعدد مثالیں دی گئی ہیں!

"خدا سے قربت حاصل کرنے کا صحیح راستہ وہ ہو جس پر انبیاء علیہم السلام چلے ہیں۔ لیکن دورۂ شرح صدر میں عام تعمقات اور طاعات شاقہ مثلاً صوم وصال، صوم دہر، ہر رات ایک قرآن ختم کرنا، اس قسم کے اور بھی دقیق مسائل جو احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں مذکور ہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی عظمت و جلالت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اُن کے تذکرہ میں صاحب تذکرۃ الاولیاء جن کی علمی و عملی فضیلت بھی مسلّم ہے لکھتے ہیں:۔

"ایک دن کتّے کے بھونکنے پر آپ نے لبیک لبیک کہی، جب مرید نے وجہ دریافت کی تو فرمایا:۔

"گفت قوت و دمدمۂ سگ از قہر حق تعالیٰ دیدم و آواز قدرت حق تعالیٰ شنیدم و سگ را در میان ندیدم لاجرم لبیک لبیک جواب دادم۔"

(کتّے کی آواز اور اس کی قوت میں میں نے حق تعالیٰ کا قہر دیکھا اور خدا تعالیٰ کی آواز سنی اس دید و شنید میں میں نے کتّے کو درمیان میں نہیں پایا اس لئے لاچار لبیک لبیک سے جواب دیا)

ایک بار آپ نے فرمایا "تیس سال تک جماعت میں اس طرح شرکت کی ہے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی اور اگر کبھی نماز میں دنیا کا خیال آ گیا تو نماز قضا کر دی ہے! اور اگر دوزخ و بہشت کا خیال آ گیا ہے تو سجدۂ سہو کیا ہے۔"

ایک بار فرمایا کہ "قرآن سے فاتحہ اور قل ہو اللہ کے علاوہ کچھ اور نہ سیکھنا چاہیئے!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے رونے کی آواز سنتے تھے تو نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ نماز میں بسا اوقات اُن کا خیال فوج کی ترتیب کی طرف چلا جاتا تھا۔ اور پھر ساری نماز اسی حالت میں ختم ہو جاتی تھی۔ مگر نہ آنحضرت نے کبھی نماز قضا کی اور نہ حضرت عمرؓ نے کبھی سجدۂ سہو کیا۔ غور کیجئے، جنت و دوزخ کا خیال عین خدا کی مرضی اور ناراضگی کا خیال ہے۔ مگر ان کے خیال سے سجدۂ سہو کیا جاتا ہے!

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کو سیکھنا اور پڑھنا چاہیئے، اس لئے کہ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے! آنحضرت، صحابہؓ اور پوری اُمت کا اس پر تعامل ہے۔ مگر وہاں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کے سیکھنے اور پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے!

ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان اقوال کی تاویل کریں مگر جو تاویل بھی کی جائے گی وہ مزید ایک غلطی اور گمراہی کا سبب بنے گی۔ میرا یقین ہے کہ یہ باتیں جنیدؒ بغدادی کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ وہ پابند شریعت اور متبع سنت تھے۔ اور اگر واقعی ان باتوں کی نسبت اُن کی طرف صحیح ہو تو بغیر کسی تاویل کے اُن کو غلط کہنا چاہیئے۔ مگر تصوف کا مزاج ہی ایسا بنا ہے کہ اُلٹی سے اُلٹی بات بھی وہاں حقائق و دقائق کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی کے قول سبحانی ما اعظم شانی کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے؟ شیخ منصور کے انا الحق کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ مگر آج تک تاویل پر تاویل اور اُن کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے!

آج شیخ ابن عربی کی جو کتابیں خصوصاً فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ جو تصوف کی جان ہیں۔ اُن میں جو باتیں

صراحتہً شریعت کے بالکل خلاف نظر آتی ہیں، اُن کی طرف کیوں نظر نہیں اٹھتی - اگر اٹھتی ہے تو پھر اُن کی عظمتِ عقیدت اُن پر تنقید کرنے سے کیوں مانع ہوتی ہے، کیا وہ کتاب و سنّت سے زیادہ قابلِ اعتماد اور قابلِ احترام ہیں؟

امام ابن تیمیہؒ ان کو بڑے سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور وہ اپنی دینی غیرت و حمیت کے سبب معذور تھے اس بارے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے - مگر ان باتوں کی کیا تاویل ہوسکتی ہے - اگر ان کی تاویل بھی ہوسکتی ہے تو پھر دنیا میں ہر غلطی کی تاویل ہوسکتی ہے!

خالق و مخلوق کے درمیان امتیاز و فرق کو دُور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"وجود تو ایک ہی حقیقت ہے، اس میں کثرت کہاں - اور شئے تو اپنی ضد آپ نہیں ہوتی، پس مرتبہ وجود میں عین ذات ہے - نہ رب ہے نہ عبد ہے"

انہوں نے الولایۃ اعلیٰ من النبوۃ کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کی نقل تفصیل سے تو نہیں کی جاسکتی - دو تین باتیں ملاحظہ ہوں - اپنی ولایت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جب ۵۸۶ھ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل کی ذوات مجھے دکھائے تو میں ایک مقام و مشہد میں قائم کیا گیا - اس جماعتِ انبیاء میں سے کسی نے مجھ سے گفتگو نہیں کی مگر ہود علیہ السلام نے تمام انبیاء کے جمع ہونے کی وجہ بیان کی کہ شیخ ابن عربی کو قطبیت کی مبارک باد دیں اور یہ کہ شیخ قائم ولایت خاصہ مقیدہ ہیں"

ولایت کی اس افضلیت پر غور کیجئے کہ نبی ولی کو بشارت دے رہا ہے اور اسی کے ساتھ واقعۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت المقدس کی امامت کو سامنے رکھئے - حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام خلیل کیوں ہوا - اس کی توجیہ یوں فرماتے ہیں:-

"حق تعالیٰ وجودِ ابراہیمؑ میں داخل ہوگیا ہے - خواہ بہ صورت روحانی یا جسمانی، دُنیوی ہو یا اُخروی"

کیا ان تصورات میں اور ہندوؤں کے عقیدہ میں کوئی فرق ہے کہ سری کرشن، بھگوان کے اوتار ہیں - یہ تو میں نے چند اقتباسات بطور نمونہ دے دیئے ہیں - ورنہ اس طرح کی باتیں تصوف کی کتابوں سے جمع کی جائیں تو ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے!

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین، ممتاز محدثین، مفسرین اور فقہا میں ایک سے ایک متقی و برگزیدہ لوگ گزرے ہیں - مگر اُن کی ذات دو وجہ سے فتنہ نہیں بن سکی:-

۱- ایک تو یہ کہ انہوں نے رموز و اشارات کے بجائے واضح گفتگو کی!

۲- دُوسرے یہ کہ انہوں نے جرح و تعدیل کا جو معیار مقرر کیا تھا، اس پر وہ ہر شخص کے اقوال و افعال ہی کو نہیں بلکہ اُس کی ایک ایک نقل و حرکت کو جانچتے تھے!

مشہور ہے کہ ایک محدث نے ایک محدث کی حدیث اس لئے قبول نہیں کی کہ وہ اپنے گھوڑے کو خالی برتن دکھا

پکڑ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جب جانور کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں تو پھر ان کی بات کا کیا اعتبار۔
کسی نے کسی کو بازار میں کھاتے دیکھ لیا اور حدیث کی روایت اُن سے ترک کردی۔ باپ نے بیٹے کو غیر ثقہ اور بیٹے نے باپ کو غیر ثقہ کہا۔ ابو داؤد نے اپنے لڑکے سے روایت کرنے کو روک دیا تھا۔ اور یہ سختی صرف سماع حدیث تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ اس معیار پر اُن کی پوری زندگی بھی پرکھی جاتی تھی۔ اور جہاں جو خوبی یا خامی نظر آتی تھی اُس کی نشان دہی کردی جاتی تھی۔ رجال کی کتابیں اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہیں!

ان کی اسی وضاحت اور معیار جرح و تعدیل کی وجہ سے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہونے پائی اور نہ اُن کی طرف، اور اگر ہوئی تو انہوں نے اُس کی نشاندہی کردی!

مگر اہلِ تصوف کے ارد گرد جو ماحول پنپتا ہے، وہ محض عظمت و عقیدت کی بنیاد پر پنپتا ہے، وہاں نقد و جرح کا گزر نہیں ہے، وہاں محض تعدیل و توثیق ہونی چاہیئے۔ جرح و تنقید سے وہاں ایمان سلب ہو جاتا ہے، وہاں صرف بات مانی اور منوائی جاتی ہے۔ چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں ظواہر اور کمیات پر کم، اور کیفیات اور واردات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے! اس لئے مجموعی طور پر اس سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد آدمی عظمت و عقیدت کے ایک ایسے رشتہ میں بندھ جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کو یہ معلوم کرنے کی قطعی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ کعبہ کی طرف جا رہا ہے یا ترکستان کی طرف ــــ! ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

یہ شعر ساتویں آٹھویں صدی کے سلسلۂ تصوف کی نہیں بلکہ اس صدی کے سلسلۂ تصوف کی بھی تصویر کشی کرتا ہے! جب تک تصوف کا یہ مزاج اور تصور نہ بدلے گا۔ جس طرح وہ آج سے پہلے ذہنی گمراہی اور عملی بدعت و خرافات کا سبب بنا ہے، آئندہ بھی بنتا رہیگا۔ چنانچہ اکبر کی گمراہی اور اس کے دینِ الٰہی کی ایجاد کا ایک بڑا سبب علومِ تصوف اور اہلِ تصوف کی دقیقہ سنجیاں بھی ہیں، خاص طور پر شیخ ابن عربی کی تشریحات:۔

> "ایک بار اکبر پر "حالتِ عجیب" اور "جذبۂ عظیم" طاری ہوا۔ وہ اس وقت شکار میں تھا، شکار موقوف کرکے اجمیر پہنچا، وہاں سے فتحپور سیکری آیا۔ شیخ تاج الدین کو بُلایا، اور ملا عبدالقادر کے بیان کے مطابق رات بھر شطحیات و ترہات صوفیاء کے سُننے میں مشغول رہا، شیخ تاج الدین نے فصوص الحکم سے فرعون کے ایمان کا مسئلہ پیش کیا اور نہ جانے کیا کیا سمجھایا"۔!

انہی تاج الدین کا لقب تاج العارفین ہے۔ ان کے بارے میں ملا عبدالقادر نے یہ لکھا ہے کہ "چنداں مقید بہ شرعیات نہ بود" مگر اپنی شدت کے باوجود ملا صاحب نے یہ بھی لکھا کہ:۔

> "لائق دقائق در علم تصوف و در علم توحید ثانی شیخ ابن عربی"۔ (جلد ۲ ص۲۵۸)

اسی طرح اگر دارا شکوہ کی گمراہی پر غور کیا جائے تو سرمد سرمست کی آوارہ مزاجی کو اس میں بڑا دخل نظر آئے گا۔ جن کے ساتھ وہ رات رات بھر خلوت نشین رہتا تھا۔!

یہ تفصیلات میں نے اس لئے پیش کی ہیں اور اس کے لئے قدیم وجدید مثالیں اس لئے دی ہیں تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ مسلمانوں میں جو مبتدعانہ و مشرکانہ باتیں رواج پا گئی ہیں، وہ زیادہ تر عظمت و محبت کی غلط کاری اور عقیدت میں غلو کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور اس ذہنیت کے پیدا کرنے میں تصوف کو بڑا دخل ہے! گو کہ اس میں بعض دوسرے عوامل نے بھی حصہ لیا ہے، خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان میں تصوف کے ساتھ ایرانی[1] شیعیت اور ہندو اثرات نے بھی کام کیا ہے اور ان دونوں عناصر کو زیادہ تر تیموری بادشاہوں کے جذبۂ احسان شناسی اور اسلامی علوم سے ان کی ناواقفیت کی بناء پر عام مسلمانوں کے قلب و دماغ پر چھاپا مارنے کا موقع مل گیا۔ وہ مسلمانوں کو اُن کے بنیادی عقیدے سے تو نہیں پھیر سکے، مگر اُن کے اندر مذہبی عقیدت کی راہ سے بہت سی ایسی بدعتیں اور گمراہیاں پیدا کر دیں۔ جن سے مسلمان آجتک دوچار ہیں ـــــ!

ہندوؤں کا مذہبی تصور تو بنیادی طور پر غیر اللہ کی عقیدت کا ایک مرقع ہے، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ عقیدت پیدا ہی ہوئی ہے اُن کے ساتھ کچھ ماورائے طبعی خیالات کے منسوب کرنے کی وجہ سے۔ اسی طرح سے شیعیت کا سارا دارومدار ہی عقیدت پر ہے۔ اُن کی عقیدت نے حضرت علیؓ کو نبوت کے مرتبہ سے آگے بڑھایا۔ ائمہ معصومین کو نبوت کا مرتبہ دیا۔ چنانچہ ائمہ معصومین کی روایت کی اُن کے نزدیک وہی حیثیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت وحدیث کی ہو!

ان دونوں عناصر کا سنگم یہاں تیموری شہزادے تھے۔ ایرانی شیعیت کا تحفہ تو سب سے پہلے ہمایوں اپنے محسنوں کا بدلہ چکانے کے لئے لایا اور اُس نے یہاں ایسا اثر جمایا کہ تیموریوں کا اثر اس کے آگے کم ہو گیا اور ہندو اثرات کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، اُن سے تو ان کو دن رات سابقہ ہی رہتا ہوگا ـــــ!

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ تیموری[2] بادشاہوں نے اپنی تمام دینی کوتاہیوں کے ساتھ بزرگوں کی عقیدت اور بے راہرو صوفیوں سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا۔ اکبر ایک طرف دینِ الٰہی وضع کرتا اور پوجا پاٹ بھی کرتا ہے، دوسری طرف پاپیادہ اجمیر بھی جاتا ہے۔ شہزادہ سلیم کا نام سلیم اسی لئے پڑتا ہے کہ شیخ سلیم چشتی کی دعا سے یہ پیدا ہوا تھا۔

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ملیں گی۔ غرض یہ چیز شیعیت اور ہندو ازم کے ذریعہ اُن میں آئی اور اُن کے اثر سے عام مسلمانوں میں پھیلی! الناس علی دین ملوکھم!

اب ایک نظر قرآن وسنت پر ڈال لیجئے کہ اُن میں غیر اللہ کی الوہی عظمت و عقیدت کو کن کن گوشوں سے مٹایا گیا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام کے تصور عبادت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لغت میں عبادت روندنے اور پامال کرنے کو کہتے ہیں۔ عرب اس راستہ کو جو بار بار روندا گیا ہو طریق "معبد" کہتے ہیں۔ اسلام نے اس مفہوم کو ذرا اور وسعت دی ہے گو اس میں لفظ کا اصل مفہوم شامل ہے!

اسلام میں عبادت، اطاعت کے ساتھ اُس اظہار تذلل، فروتنی اور دل کے جھکاؤ کو کہتے ہیں، جو غایت محبت میں پیدا ہو۔ امام راغبؒ کہتے ہیں:۔

---

[1] ایرانی شیعت کی قید میں نے قصداً لگائی۔ اس سے میری مراد صفویوں اور ان کے بعد کی شیعیت ہے!
[2] باستثنائے عالمگیرؒ۔

العبودیۃ اظہار التذلل والعبادۃ ابلغ منہا غایۃ التذلل

عبودیت اپنی پامالی اور عاجزی کے اظہار کا نام ہے اور عبادت میں اس سے بھی زیادہ
یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ یعنی غایت فروتنی!

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ شرع میں عبادت کمالِ محبت کو کہتے ہیں۔ امام بغوی کہتے ہیں کہ "عبادت اطاعت کے ساتھ جھکاؤ اور جھکاؤ کے ساتھ خوف" کو کہتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص دل کی پسندیدگی اور اس کے جھکاؤ کے بغیر عبادت کرتا ہے تو وہ عبادت نہیں کہی جائے گی۔ اسی طرح اگر محبت کے بغیر اس کی اطاعت کرتا ہے تو وہ عبادت عبادت نہیں ہو گی۔ بالکل اسی طرح اگر اس کے دل میں خدا کی عظمت کے مساوی کوئی عظمت پیدا ہو جائے یا کسی غیر اللہ کا خوف اس کے دل میں بیٹھ جائے تو بھی اس کی عبادت ناقص ہو گی۔ امام ابن تیمیہ عبادت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب عظمت و محبت کے ساتھ تذلل نہ پایا جائے، عبادت مکمل نہیں ہوتی:-

بل یجب ان یکون اللہ احب الی العبد من کل شیئ وان یکون اللہ عندہ
اعظم من کل شیئ بل لایستحق المحبۃ والذل التام الا اللہ تعالیٰ فکل
ما احب بغیر اللہ فمحبتہ فاسدۃ وما عظم بغیر امر اللہ کان تعظیمہ
باطلا۔! (رسالہ عبودیت صفحہ)

ضروری ہے کہ بندے کے نزدیک خدا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ اور اسی طرح ہر چیز سے زیادہ اس کی عظمت اس کے دل میں ہو۔ بلکہ محبت اور مکمل عاجزی اور پوری درماندگی کا مستحق صرف خدا ہی ہے۔ پس جو محبت خدا کی محبت کے بغیر ہو وہ فاسد محبت ہے اور جو عظمت خدا کے حکم کے بغیر ہو وہ باطل ہے۔!

اس مفہوم کے ساتھ قرآن نے عبادت کو خدا کے لئے خاص کیا ہے اور ہر مسلمان سے پنج وقتہ نماز میں اسی کا اقرار کرایا جاتا ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین!

اسی بناء پر ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قرآن میں جہاں عبادت کا حکم آیا ہے، وہاں عبادت سے مراد توحیدِ باری[1] ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ خدا کی عبادت پوری عظمت، محبت اور اظہارِ تذلل کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ عزت و توقیر اور محبت دوسروں کی بھی کی جا سکتی ہے، مگر اسی قدر جتنی کہ شریعت نے اجازت دی ہے۔ خدا کے سوا[2] کسی ذات کو یہ مرتبہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی ہو۔ اس کی سفارش شفیعدی جب بجا اس کا تقرب وواسطہ خدا

---

[1] توحید کے معنی صرف خدا کو خالق سمجھنے یا ایک ماننے کے نہیں ہیں بلکہ اس کو اس تصور کیساتھ ماننے کا نام توحید ہے کہ وہ اپنے پورے اختیارات اور قوت وقدرت کیساتھ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ الا لہ الخلق والامر!

[2] رسول کی مرضی، ان کی محبت اور ان کی شفاعت سے یہاں بحث نہیں ہے بلکہ یہاں توحید کا مفہوم بیان کرنا مقصود ہے!

کا تقرب و واسطہ بن جائے۔ مشرکین عرب جو بتوں کی نیاز مندی اور اُن کے استھانوں پر نذر و نیاز کرتے تھے، اُن سے جب کہا گیا کہ وہ معبود اکو[1] مانتے ہو تو پھر خالص اُسی کی عبادت اور طاعت بھی کرو، تو وہ کہتے تھے کہ ہم عبادت تو خدا ہی کی کرتے ہیں، ان دیوی دیوتاؤں کو تو صرف تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا ہے!

ما نعبدھم الا لیقربون الی اللہ زلفیٰ!

ہم ان کی عبادت محض تقرب الٰہی کے لئے کرتے ہیں!

ان کا یہ جواب بظاہر کتنا معصوم اور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ واسطے کے بغیر تو دنیا کا کوئی معمولی سے معمولی کام بھی نہیں ہوتا، خدا کی اس بلند بارگاہ تک ہم ان واسطوں کے بغیر کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اگر آپ جائزہ لیں تو اس برصغیر میں لاکھوں مسلمان ایسے ملیں گے کہ جب اُن کو اُن کی گمراہیوں اور بدعتوں پر ٹوکیں گے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ ہم تو خدا تک اُن کے ذریعہ اپنی درخواست بھیجتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ جواب محض اپنی بدعملی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہوتا ہے۔ عملاً اُن کی ساری نیاز مندی انہی واسطوں کے ساتھ ہوتی ہے، وہ جس ذوق و شوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ ان ذریعوں اور واسطوں کے سامنے جاتے ہیں، اُس خضوع و خشوع اور ذوق و شوق کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں ایک دن بھی نہ جاتے ہوں گے!

اگر ان کا یہ جواب تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا اسلام میں اس تصوّر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ہم ان واسطوں کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، یا ہر اچھا شخص وہاں سفارشی ہو سکتا ہے۔ قرآن نے اس کی بار بار وضاحت کی ہے :-

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان -

جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو اُن کو بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ جب بھی وہ پکارے!

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، امن یجیب المضطر اذا دعاہ

ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا باذنہ!

میں رگ گلو سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ پریشان حال کی دعا کون سنتا ہے جب وہ خدا کو پکارتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں اجازت کے بغیر کسی کی سفارش فائدہ نہیں پہنچا سکتی!

اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ :-

قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا

اولٰئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب

ویرجون رحمۃ ویخافون عذابہ!

---

[1] قرآن نے متعدد جگہ ان کے اقوال نقل کئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے منکر نہیں تھے!

کہہ دو کہ جن کو تم خدا کے سوا کچھ سمجھتے ہو اُن کو بلا دُ تو سہی، سو وہ نہ تو تمہاری تکلیف کو دور کر سکیں گے اور نہ ان کو اس کے بدلنے کا کچھ اختیار ہے۔ یہ جن کو پکارتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی خوشنودی کی تلاش میں ہیں کہ اُن میں کون زیادہ مقرب بارگاہ بنتا ہے اور وہ خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے بارے میں کہا تھا کہ:-

لاستغفرن وما املک من اللہ من شیئ!

میں آپ کی مغفرت خدا سے چاہوں گا مگر میں آپ کے بارے میں خدا کے یہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا!

تاکہ یہ تصور مٹ جائے کہ خدا کا مقرب ترین خدا کی خدائی میں دخیل ہے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا گیا کہ:-

قل لا املک لنفسی نفعاً لا ضراً

میں اپنے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں!

یہ موضوع کچھ ایسا ہے کہ قلم اس کے جس پہلو پر چل پڑتا ہے تو چلتا ہی جاتا ہے، اس لئے اس احساس کے باوجود کہ قلم اصل موضوع سے ہٹنے نہ پائے کہیں کہیں ہٹ ہی گیا ہے۔ اس کے لئے میں ناظرین سے معذرت خواہ ہوں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایسی عظمت و محبت جو کسی مخلوق کی عقیدت کے غلو میں مبتلا کر دے جو کسی درجہ میں بھی خدا کی عظمت و محبت کی جگہ لے لے، اسلام اس سے روکتا ہے!

محبت پہلے محبت کو لیجئے۔ قرآن و حدیث میں بے شمار آیات جن میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ محبت صرف خدا کی ہونی چاہیئے۔ دوسروں سے محبت کی جاسکتی ہے مگر وہ محبت خدا کی محبت کے تابع ہونی چاہیئے۔ مشرکین عرب خدا سے محبت رکھتے تھے، مگر اُن کی محبت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ خدا سے بھی محبت کرتے تھے، دوسری طرف بتوں کی محبت بھی اُن کے دلوں میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے تھی۔ اُن کی اس روش کے خلاف مومنین کی روش کو سراہا گیا:-

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ (بقرہ۔ ۱۹)

بعض لوگ جو خدا کے علاوہ کسی کو شریکِ خدا ٹھہرا لیتے ہیں، وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیئے۔ اور جو لوگ مومن ہیں وہ قوی محبت صرف خدا سے رکھتے ہیں!

اس میں لفظ "انداداً" قابلِ غور ہے۔ "ند" کے معنی کسی کو کسی کے برابر قرار دینے کے ہیں، یعنی محبت یا کسی امر میں خدا کے مثل کسی کو قرار نہیں دینا چاہیئے۔ مگر مشرک اس کے مثل قرار دیتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:-

"خدا اور غیر خدا کو محبت میں برابر کر دینا، خواہ وہ کوئی ہو، یہ مشرکین کا کام ہے"۔

علامہ رشید رضا اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انداد کے معنی جمہور مفسرین کے یہاں اصنام اور اوثان سے زیادہ عام ہیں۔ اس میں

وہ ممتاز لوگ بھی شامل ہیں، جن کے احکام کے آگے لوگ بے چون وچرا جھک جایا کرتے ہیں اور اس پر آگے کی آیت دلالت کرتی ہے اذ تبرأ الذین اتبعوا ان الذین اتبعوا تو مراد یہ ہے کہ انسان اپنے انداد سے وہ طلب کرے جو خدا سے طلب کرنا چاہیئے یا اس سے وہ احکام قبول کرے جو خدا کی طرف قبول کرنا چاہیئے۔"

حدیث میں آتا ہے کہ تین باتیں جس میں ہوں، اس نے ایمان کی لذت پائی۔ اُن میں ایک یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول[1] کی محبت ماسوا اللہ کی محبت پر غالب ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی سے محض خدا کے لئے محبت کرے۔ تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر میں لوٹنا پسند نہ کرے!

آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جو اُسے کفر کے راستہ پر ڈال دے۔ اسی لئے حدیث میں بار بار "الحب فی اللہ والبغض للہ" کی تاکید آئی ہے۔ یعنی غیر اللہ سے جو محبت بھی کی جائے وہ خدا کی محبت کا طفیل اور صدقہ ہو، وہ محبت بالذات اُس مخلوق سے نہ ہو کہ وہ محبت خدا کی محبت کی مقابل نہ بن جائے یا اُس کی محبت خدا کی محبت کی جگہ لے لے۔ اس لئے قرآن نے محبت کے سلسلہ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ:

قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ! (توبہ۔۲)

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندے ہونے کا تمہیں خوف ہے اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو جائیں تو خدا کے حکم کا انتظار کرو!

یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ یہ بات صحابہ کرام کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے!

سفیان بن عینیہ سے کسی نے پوچھا کہ ان لوگوں کا حال کیا ہو گا جو اپنی خواہشوں سے شدید محبت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا تم کو قرآن کی یہ آیت بھول گئی:

واشربوا فی قلوبھم العجل۔ اُن کے دل میں بچھڑے کی محبت پلادی گئی۔

ابن عینیہ نے اپنے اس مختصر سے جواب میں غیر اللہ کی محبت کی ایک پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ مصریوں کے دل میں گئو سالہ پرستی گھر کر چکی تھی۔ بنی اسرائیل جو دُنیا میں توحید کے علمبردار تھے، مصر میں رہتے تھے۔ اُن کے دل میں بھی گائے کی محبت سرایت کر گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو پھر توحیدِ خالص کا سبق ہی یاد نہیں دلایا۔ بلکہ اُن کو مصر کی فضا سے نکال کر شام کی طرف لے گئے۔ لیکن بنی اسرائیل نے راستہ میں کچھ لوگوں کو بُت پرستی کرتے دیکھا۔ گائے کی محبت پھر اُن کے دل میں عود کر آئی اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا "اجعل لنا الٰھاً کما لھم"!

---

[1] رسول کی محبت کو اس آیت کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ یعنی رسول کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو اس پر بڑی سخت تنبیہ کی - فرمایا۔

قال ھولاء متبر ما ھم فیہ وباطل ما کانو یعملون قال اغیر اللہ ابغیکم وھو فضلکم علی العالمین - (اعراف)

یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں یہ برباد کر دیا جائے گا اور یہ بے بنیاد باطل کام کر رہے ہیں۔
اور کہا کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کسی کو معبود تجویز کر دوں ؟

اس اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر شرف تکلّم کے لئے بلائے گئے - بنی اسرائیل کو موقع ملا - انہوں نے فوراً ایک گائے کا بچھڑا بنا کر اس کی نیاز مندی شروع کر دی - اُن کی اس گئو ماتا کو قرآن نے :-

واشربوا فی قلوبھم العجل - اُن کے دل میں گئو سالہ پرستی پلا دی گئی ہے !

سے تعبیر کیا ہے !

غرض یہ ہے کہ غیر اللہ کی محبت جو خدا کی محبت کے مقابل بن جائے، اسلام میں وہ ناپسندیدہ ہے - یہ محبت دو طرح کی ہوتی ہے - ایک محبت طبعی[1]، دوسرے محبت اختیاری - مثلاً بیوی بچوں کی محبت ، ماں باپ کی محبت ، ذوق و خواہشات کی محبت - ان سب چیزوں سے محبت کی جا سکتی ہے - مگر اس میں غلو کا نتیجہ بے عملی، پھر بد عملی اور اس کے بعد شرک فی العمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے ! یعنی یہ محبت شرعی اعمال میں پہلے غفلت، اور غفلت کے بعد اس کے خلاف کرنے کی جرأت پیدا کرتی ہے - اور آخر میں وہ خدائی احکام کی جگہ لے لیتی ہے !

اختیاری محبت سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی خارجی سبب یا عظمت کی بناء پر کسی سے محبت کرنے لگتا ہے - مثلاً اُستاد کی محبت ، بزرگوں اور صلحاء کی محبت ، انبیاء کی محبت ، ان میں سے ہر ایک سے محبت کا حکم دیا گیا ہے ، مگر ان سب کیلئے حدود مقرر ہیں ، اگر ان حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا گیا تو دل میں اُن کی طرف سے وہی عقیدت پیدا ہوتی ہے جو گمراہی اور فتنہ کا سبب بن جاتی ہے اور جس سے آہستہ آہستہ تصورِ توحید میں رخنہ پڑتا ہے !

عظمت

عقیدت کا دوسرا سبب کسی انسان کی غیر معمولی عظمت ہے ، عظمت و کبریائی خدا کی مخصوص صفت ہے ، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے - ولہ الکبریاء فی السموات والارض - حدیث میں آتا ہے :-

العظمة ازاری والکبریاء ردائی فمن نازعنی واحداً منھما عذبتہ

عظمت میرا جامہ اور کبریائی میری چادر ہے ، ان میں سے ایک کو بھی کوئی ہاتھ لگائے گا تو میں اس کو عذاب دوں گا !

قرآن و سنت میں جہاں کبر و غرور کی ممانعت آئی ہے کہ یہ خدائی میں شرک ہے - وہیں غیر خدا کی ایسی تعظیم و عقیدت سے بھی روکا گیا ہے - جس کا ڈانڈا خدا کی عظمت و عقیدت سے مل جاتا ہے !

قرآن و سنت میں ادب و لحاظ کی ترغیب دی گئی ہے - مگر جس ادب و لحاظ اور عزت و توقیر میں ادنیٰ شائبہ بھی عظمت پرستی یا یادگار پرستی کا تھا ، اس نے اس کو ختم کر دیا ہے - اوپر ذکر آ چکا ہے کہ دنیا کی بیشتر قوموں کی گمراہی کا

---

[1] طبعی محبت سے مراد یہ ہے کہ فطری طور پر ہر آدمی میں ان چیزوں کی محبت ہوتی ہے !

سبب عظمت و محبت ہی میں افراط و تفریط ہے۔ خاص طور پر عیسائیوں نے اس میں سب سے زیادہ غلو سے کام لیا تھا۔ اس لئے قرآن نے بار بار ان کو تنبیہ کی کہ۔

لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللّٰہ الا الحق انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللّٰہ و کلمتہ۔

اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور خدا کی شان میں غلط بات مت کہو۔ عیسیٰ بن مریم محض خدا کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔

دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی عظمت میں اتنا غلو نہ کرو کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہرا دو۔ حضرت عیسیٰؑ کی عظمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ خدائی میں شریک ہیں، بلکہ اُن کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ خدا کے رسول اور اُس کا حکم لے کر آئے ہیں۔ دینی تاریخ کا یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اہلِ دین نے ہمیشہ انبیاء، صلحاء اور بزرگوں کی مفرط تعظیم کی ہے اور ان کی عقیدت میں غلو کیا ہے تو اُن کے بارے میں ماورائے بشریت خیالات پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان خیالات کی وجہ سے شرک و بدعت کے بے شمار مظاہر وجود میں آگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمتِ محمدیہ کو ہمیشہ یہ تنبیہ کی کہ وہ مدح و ستائش اور تعظیم و تکریم کے سلسلہ میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کریں جس سے یہ مترشح ہو کہ آپؐ خدا کی مشیت اور مرضی میں کچھ دخیل ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:۔

لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسی بن مریم وانما انا عبد فقولوا عبد اللّٰہ ورسولہ۔

مجھے اتنا نہ بڑھاؤ جتنا عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا۔ میں خدا کا بندہ ہوں تو مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

لا تطرونی کما اطرت الیہود والنصاری

میرے بارے میں اتنا مبالغہ نہ کرو جتنا یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے بارے میں کیا ہے!

قرآن نے عظمت کے اسی غلط تصور کو مٹانے کے لئے ان مواقع پر جہاں آپؐ کی عظمت و تکریم کا اظہار ہوتا ہے ہمیشہ آپ کو عبد اور رسول کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔ جس سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہوتا ہے کہ کوئی بندہ کتنا ہی بلند رتبہ اور خدا کا مقرب کیوں نہ ہو، وہ بہر حال عبد ہی رہتا ہے، معبود نہیں ہو سکتا۔ اس کی بلندی اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دائرۂ عبدیت سے نکل کر معبودیت تک پہنچ گیا ہے، بلکہ اس کی بلندی اس وجہ سے ہے کہ اس کا رشتۂ عبودیت مضبوط سے مضبوط تر ہے!

واقعہ معراج آپؐ کی بلندیٔ مرتبت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ مگر اس موقع پر آپ کو خدا نے اسریٰ بعبدہ کے لفظ سے کیا۔ شرح صدر خدا کی ایک مخصوص نعمت ہے، جو آپؐ کے لئے خاص ہے، رفع ذکر آپ کی رفعت کا ایک خاص نشان ہے، جس کا ذکر خدا نے ورفعنا لک ذکرک کے لفظ سے کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ تصور بھی بٹھا دیا کہ یہ بلندیٔ مرتبت خدا کا عطیہ ہے، اس لئے عطیۂ خداوندی کا شکر بجا لاؤ۔ فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب۔

آپؐ کی نماز اور قرأت قرآن کا ذکر قرآن میں بطور رفعت شان ہے، مگر الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

لما قام عبد اللہ یدعوہ ۔ جب خدا کا بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کو پکارنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے!
آپؐ کی زبان سے خدا نے بار بار اعلان کرایا۔

قل انما بشر مثلکم یوحی الی ۔ کہدو کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے (اور تم اس فضل سے محروم ہو)

ایک مسلمان کے ذہن میں دن میں کئی بار یہ تصور بٹھایا جاتا ہے۔ ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

بنو عامر کا وفد خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ تو ان میں سے بعض نے کہا کہ آپؐ ہمارے سید و آقا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ سید تو خدا ہے۔ ان لوگوں نے پھر کہا۔ آپؐ ہم سب سے افضل و برتر ہیں۔ فرمایا کہ:-

قولو بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان !

یہ کہو مگر کہیں شیطان تم کو اپنا وکیل نہ بنا لے!

ایک دفعہ آپؐ کو کسی نے ان الفاظ سے مخاطب کیا:-

"اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند!"

آپؐ نے سُنا تو فرمایا "لوگو! تقویٰ اختیار کرو۔ شیطان تم کو گمراہی میں نہ ڈال دے!"

انا محمد بن عبد اللہ ورسولہ واللہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی اللہ عزوجل — !

میں محمدؐ بن عبد اللہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں پسند نہیں کرتا کہ مجھے تم میرے اس مرتبہ سے زیادہ بڑھاؤ جو خدا نے میرے لئے مقرر کیا ہے!

اکثر نیک لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہوتی ہے۔ ان کی دعا سے نظام کائنات میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف بدعقیدہ قومیں بلکہ بعض اہل توحید مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس غلطی پر بار بار متنبہ کیا اور بتایا کہ اس کائنات میں مشیت صرف خدا کی ہے۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی ممتاز کیوں ہو، اس کی مرضی اور مشیت کو اس کارخانۂ رنگ و بو میں کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے اس بارے میں بار بار وضاحت کی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔ آپؐ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:-

ایک شخص نے ایک بار کہا کہ "ماشاء اللہ وشاء محمد" یعنی خدا جو چاہے اور آپؐ جو چاہیں۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا۔ قولو ماشاء اللہ ثم شاء محمد۔ (یہ کہو کہ خدا جو چاہے اور اس کے بعد محمدؐ جو چاہیں)

اس میں آپؐ نے حرف عطف یعنی واؤ کے ساتھ وشاء محمد کہنے سے منع فرمایا کہ اس میں مساوات پائی جاتی ہے۔ اس کے بجائے آپؐ نے "ثم" کہنے کی ہدایت فرمائی۔ جس سے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے۔

ایک شخص نے کہا کہ "ماشاء اللہ وماشئت" آپؐ نے سُنا تو فرمایا:-

اَجعلتنی للہ نداً قل ما شاء اللہ وحدہ۔

کیا تم مجھے خدا کا مثل ٹھہراتے ہو۔ صرف خدا کی مشیت کا اظہار کرو!

اسی بنا پر آپؐ نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا۔ خواہ قرآن اور رسولؐ ہی کی قسم کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس سے غیر اللہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی قسم کھائے تو خدا کی قسم کھائے۔ ورنہ خاموش رہے۔ آپؐ نے غیر اللہ کی قسم کو شرک قرار دیا۔

من حلف بغیر اللہ اشرک!

ایک بار آپؐ گزر رہے تھے، ایک شخص آپؐ کو دیکھ کر اس قدر مرعوب ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپؐ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا کہ:۔

"ڈرو نہیں، میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔ جو گوشت خشک کر کے کھایا کرتی تھی!"

اس معمولی سے وصف کی نسبت اپنی طرف اس لئے کی کہ یہ واضح ہو جائے کہ خوف و رعب خدا سے ہونا چاہیئے، اپنے جیسے انسان سے نہیں۔

یہ ہدایات اس ذات کے بارے میں دی گئی ہیں۔ جس کی محبت ایمان کا جزو اور جس کی عزت و تکریم نجات کا ذریعہ ہے۔ لیکن آپؐ نے ایسا اس لئے کیا کہ اس سے پہلے انبیاء کی مفرط محبت، غالی عظمت اور عقیدت نے شرک کی راہیں پیدا کر لی تھیں۔ بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان ہدایات کے باوجود نبوت محمدی اور صلحاء و اخیار کی عقیدت و عظمت کے سلسلہ میں وہ گمراہیاں مسلمانوں میں رواج پا گئیں جن کے مٹانے ہی کے لئے یہ ہدایات دی گئی تھیں!

یادگار پرستی اسی عظمت پرستی اور عقیدت کیشی کا ایک نتیجہ یادگار پرستی ہے، آدمی جب کسی انسان کو بڑا ممتاز سمجھ لیتا ہے اور اس کی عقیدت اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے تو وہ اس کی یادگار قائم کرتا ہے۔ ابتداء میں یہ چیزیں محض ایک یادگار ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ یادگار، یادگار پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگلی قوموں نے اپنے پیشواؤں کی وفات کے بعد یادگار قائم رکھنے کے لئے اُن کی شبیہیں اور تصویریں بنائیں۔ اُن کی یادگاریں رکھیں اُن کی قبروں پر نذر و نیاز کی رسمیں ایجاد کیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کو عبادت گاہ اور سجدہ گاہ بنا دیا۔ اور اب اُن کی ساری نیازمندی اور سجدہ ریزی انہی کے گرد ہونے لگیں۔! یہ یادگار پرستی، قبر پرستی اور تصویر کشی ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کی اور بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، خاصکر مسلمانوں میں۔ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جامۂ مبارک اور موئے مبارک کی یادگار قائم ہے، کہیں نعلین مبارک سر پر رکھ کر اُن کے سامنے عقیدت کیشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ یادگاریں صرف آنحضرتؐ کے متروکات ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں بزرگوں اور صلحاء کے آثار و متروکات بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں بیشتر فرضی ہیں۔ اگر واقعی ان متروکات کی نسبت آپؐ کی طرف صحیح ہو تو وہ قابل احترام ہیں مگر بہر حال ان کا احترام آپؐ کے حقیقی متروکات کتاب و سنت سے زیادہ یا اُن کے حدود سے باہر تو نہ ہونا چاہیئے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمام یادگاروں سے روک دیا ہے، جس سے آدمی کی توجہ خدا کی عظمت کے بجائے یا اس کے ساتھ کسی دوسری مخلوق کی عظمت کی طرف مبذول ہو جائے۔ اس دنیا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے باعظمت کون انسان ہو سکتا ہے۔ مگر آپؐ نے اپنی بھی اس طرح کی یادگار قائم کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے!

اسی بنا پر آپؐ نے تصویروں اور شبیہوں کے رکھنے ہی سے نہیں قبروں کے پختہ کرنے سے منع فرمایا۔ آپؐ نے اپنے تمام متروکات کو صدقہ قرار دیا تاکہ لوگ اس کو پرستش کے لئے یادگار نہ بنالیں۔ اور یہ چیز دنیا میں فتنہ بن جائے۔ اگلی امتوں نے اپنے انبیاء اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ اور عید گاہ بنالیا تھا۔ اس لئے آپؐ نے بار بار تاکید فرمائی:۔

لا تتخذوا قبری مسجداً ۔ میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔

دوسری روایت میں ہے کہ:۔

لا تتخذوا عیداً ۔ میری قبر کو "عید" نہ بنانا۔

آپؐ کو اس کا اس قدر خیال تھا کہ وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے فرمایا:۔

"تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بنالیتے تھے۔ دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنالینا"

وفات سے چند گھنٹے پہلے آپؐ نے فرمایا کہ:۔

"خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا!

آپؐ نے فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبر نہ بنالینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گھر قبروں کی طرح نہ ہوں۔ جہاں ذکر، عبادت اور دعا ممنوع ہے۔ آپؐ نے قبروں کے سلسلہ میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ ایک "مسجد" دوسرے "عید"۔ مسجد کا مطلب یہ ہے کہ وہ افعال جو مسجدوں کے لئے مخصوص ہیں، ان کا مظاہرہ قبروں پر نہ ہونے لگے۔ اور عید کے لفظی معنی بار بار لوٹنے کے ہیں۔ پس ہر وہ مقام عید ہے، جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ عید ہے جس میں بار بار کوئی خاص کام کیا جاتا ہے۔ ہر وہ اجتماع عید ہے جو بار بار پیش آتا ہو۔

گویا آپؐ نے قبروں پر مکانی، زمانی اور صوری ہر طرح کی عید سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے اسی وجہ سے ان چیزوں سے بھی روک دیا ہے جو قبروں کے عید و یادگار بن جانے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مثلاً قبروں پر چراغ جلانا، منتیں مانگنا، دعا کرنا۔ کسی قبر کو سامنے کرکے نماز پڑھنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ کہ قبر کی عظمت کا کوئی تصور نماز پڑھنے والے یا دیکھنے والے کے ذہن میں نہ بیٹھ جائے!

چنانچہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں بڑے بڑے حادثات پیش آئے، قحط پڑے، وبائیں پھوٹیں، مگر ایک صحابی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے قریب جاکر نہ دعا مانگی اور نہ آپ کو واسطہ بنایا!

بیشتر ائمہ اسلام قبر نبویؐ کے پاس بھی درود و سلام کے علاوہ دعا مانگنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جو ائمہ اسکی اجازت بھی دیتے ہیں، وہ یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ قبر شریف سامنے نہ ہو۔ اس یادگار پرستی کو کس کس طرح مٹایا گیا ہے اس کے سلسلہ میں چند واقعات اور ملاحظہ ہوں:۔

مشرکین عرب ایک درخت کی تعظیم کرتے تھے۔ اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ مسلمانوں نے دیکھا تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ اگر ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی درخت ہوتا تو اچھا تھا۔ آپؐ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا:۔

"اللہ اکبر! تم نے تو وہی بات کہہ دی جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہی تھی:۔

اجعل لنا الٰھاً کما لھم الھۃ ۔ ہمارے لئے بھی ایک بُت بنا دیجئے جیسے کہ کفار کے لئے بُت ہیں !

ظاہر ہے کہ صحابہ کرام نے درخت کی کسی تعظیم کی بناء پر ایسا نہیں کہا تھا ۔ مگر آپؐ نے اس خیال پر بھی سخت ناراضگی کا اظہار کیا، اس لئے کہ آنے والوں کے لئے یہ یادگار بن جاتی ۔ اور ان کے دلوں میں اس کی وہ عظمت و عقیدت قائم ہوجاتی جو بدعت اور گمراہی بلکہ شرک کا سبب بنتی ہے ۔۔۔ !

انہی ارشادات کی بناء پر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اس طرح کی کسی یادگار کے قائم کرنے سے منع کرتے تھے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے کچھ شاگردوں نے ذکر و عبادت کے لئے کوئی جگہ مقرر کرلی اور وہاں جمع ہونے لگے ۔ ابن مسعودؓ کو علم ہوا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ :-

"کیا تم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہدایت پر استوار ہو ۔ یا تم گمراہی کی راہ پر جا رہے ہو۔"

مقصد یہ تھا کہ اصحاب نبیؐ نے تو ایسا کیا نہیں ۔ حالانکہ وہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ، دین سے واقف اور اس کے شیدائی تھے ۔ اس کے باوجود انہوں نے اس طرح سے ذکر و عبادت نہیں کی ، پھر تم کو کیا حق ہے ؟

غور کیجئے کہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی ۔ ذکر و عبادت کے لئے کسی مقام کا تعین کوئی معصیت نہیں ہے ۔ لیکن اگر صحابہ کے زمانہ میں یہ چیز قائم ہوجاتی تو پھر یہ مقام ایک مستقل فتنہ بن جاتا ۔ اس وجہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے روک دیا ۔

جس درخت کے سایہ میں آنحضرت صلعم نے صلح حدیبیہ میں بیعت لی تھی ۔ اس لوگ متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کو آنے لگے تھے ۔ حضرت عمرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو اس کو کٹوادیا ۔ اسی طرح لوگوں نے ان مقامات پر جا جا کر عبادت کرنی شروع کردی ، جہاں جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی ۔ تو حضرت عمرؓ نے اس سے لوگوں کو روکا اور فرمایا

"کیا تم اپنے نبیؐ کے آثار کو مسجدیں بنالینا چاہتے ہو ؟"

صحابہؓ کے زمانہ میں جو لوگ ان مقامات پر عبادت کے لئے جاتے تھے ، یقیناً ان کا مقصود جذبۂ اتباعِ سنّت اور برکت اندوزی ہی رہا ہوگا ۔ لیکن کتاب و سنّت کی تعلیم کی روشنی میں حضرات صحابہ کی دُور بین نگاہیں ان گمراہیوں کو دیکھ رہی تھیں ۔ جو ان یادگاروں کے ذریعہ پیدا ہوجاتی ہیں ۔ اس لئے انہوں نے بالکل ہی اس سے روک دیا ۔

حدیث میں ان باتوں سے بھی روک دیا گیا ہے ، جن میں غیراللہ کی عظمت کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا تھا ۔ عرب میں عام طور پر غلاموں کو ان کے مالک "عبدی" "میرا بندہ" اور غلام اپنے مالکوں کو "ربی" کہا کرتے تھے ۔ چونکہ انسان کسی انسان کا عبد اور کوئی انسان کسی انسان کا رب نہیں ہے ۔ اس لئے آپؐ نے ایسے لفظ کے استعمال سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ لوگ اپنے غلاموں کو عبدی کے بجائے "فتائی" "میرے بچے یا میرے جوان ، اور غلام اپنے آقاؤں کو ربی کے بجائے مالک کہیں ۔

ایک صحابی کی کنیت ابوالحکم تھی ۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ خدمتِ نبویؐ میں آئے تو آپؐ نے ان سے پوچھا "حکم (فیصلہ کرنے والا) تو خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے ۔ پھر تم کو کیوں ابوالحکم کہا جاتا ہے ؟" انہوں نے عرض کیا کہ

میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھی کو ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں وہ قبول کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے لوگوں نے مجھے یہ لقب دے دیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "تمہارے بچوں کے نام کیا ہیں؟" بولے شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپؐ نے فرمایا "تمہاری کنیت آج سے ابو شریح رہے گی۔"

ان تفصیلات کی روشنی میں آپ ان عقیدتوں اور عظمتوں کو دیکھیں۔ جن کا اظہار صلحاء اور اخیار کے متوسلین ان کی زندگی میں اپنی مجلسوں اور غائبانہ تذکروں میں کرتے ہیں۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں، مزاروں، خانقاہوں اور ان کے متروکات، ملفوظات اور ان کی یادگاروں کے سلسلہ میں روا رکھتے ہیں۔

حالی نے بہت صحیح کہا ہے:-

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبیؐ سے بڑھائیں!
مزاروں پہ دن رات چادر چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

مولینا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام میں توحید اور مدعیانِ اسلام کی توحید

عقیدۂ توحید شرفِ انسانیت کی بنیاد ہے۔ انسان کو کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کیلئے اور ان فرائض و واجبات سے جو اس پر خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے عائد ہیں، عہدہ برا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ توحید پر یقین رکھتا ہو۔ ایک "مسلم" کی زندگی کا محور یہی ہے۔ اور یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے اخلاق و اعمال کی وہ تمام نہریں پھوٹتی ہیں جو انسان کی زندگی کو پر بہار بناتی اور مرنے کے بعد اسے نعیم جنت سے ہمکنار کرتی ہیں۔

جو مردِ مومن توحید کا صحیح و کامل اعتقاد رکھتا ہو، وہ یقین رکھتا ہے کہ زندگی اور موت کا سررشتہ خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے۔ رزق کے خزانوں کی کنجی کا مالک وہی ہے، نفع و ضرر اس کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ لہٰذا گردن صرف اسی کے سامنے جھکائی جاسکتی ہے اور حکم اسی کا مانا جاسکتا ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت اسی کی فرمانبرداری میں مضمر ہے۔ اور یہی معنی ہیں "اسلام" کے۔ گویا اسلام اور عقیدۂ توحید لازم و ملزوم ہیں۔

عقیدۂ توحید انسان کو صرف اس کی انفرادی زندگی ہی میں کامیاب و کامران نہیں بناتا بلکہ وہ ایک ایسی مثالی سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جہاں سب انسان برابر ہوں، سب کو حقوقِ انسانیت یکساں حاصل ہوں۔ سب ایک کنبہ بن کر محبت و یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے ہوں، ایک ہی قانون کے آگے سر جھکاتے ہوں، سب کا مطمحِ نظر ایک ہی ذات والاصفات کی رضا ہو، اور سب کی زندگی کا محور اسی خدائے واحد کا قانون ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا خدا کے ایک مقدس پیغمبر نے مصر کے قید خانہ میں ان الفاظ میں اعلان کیا:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ	کیا متفرق بہت سے خدا اچھے یا ایک برتر و غالب خدا؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی عظیم و رفیع عمارت کا سنگِ بنیاد اسی عقیدۂ توحید کو قرار دیا اور فرمایا:

بُنِیَ الاسلامُ علیٰ خمسٍ شھادۃِ ان لا الٰہَ الا اللّٰہُ وان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ	اسلام کی عمارت کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (پہلی) یہ کہ گواہی دیجائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "الٰہ" نہیں اور محمد اسکے بندے اور رسول بھی ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ کلمہ شہادت میں اللہ کی وحدانیت اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کے ساتھ ساتھ آپ کی عبدیت کی تصریح ہے۔ اس کی ایک خاص ضرورت تھی۔ توحید باری کے عقیدہ میں دنیا کی تمام اقوام نے ٹھوکر کھائی ہی تھی، اہل کتاب بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے۔ انبیاء کرام کے مافوق العادت فضائل و کمالات اور خوارق و معجزات کو دیکھ کر، اور ان کی عقیدت و محبت میں سرشار ہو کر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اگر

تو خدا کے بیٹے یا خدا کے اوتار، یا خدائی اوصاف میں شریک ضرور ہیں۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسلام گمراہی کے اس دروازہ اور فتنہ کے سرچشمہ کو بند کرتا۔ چنانچہ "رسولہ" کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے "عبدہ" کی وضاحت فرما کر یہ حقیقت آشکارا کر دی گئی کہ خدا کا یہ آخری پیغمبر سب نبیوں کا سردار اپنے تمام اعلیٰ کمالات رسالت کے باوجود بہرحال خدا کا بندہ ہی ہے۔ اس کی خدائی میں کسی درجہ میں بھی شریک نہیں۔ گویا کلمۂ شہادت کا دوسرا جزو پہلے جزو کی تاکید و توثیق ہے۔

قرآن کریم نے جس قدر زور و قوت، جس قدر وضاحت و صراحت اور جس قدر اعادہ و تکرار کے ساتھ اس عقیدۂ توحید کو بیان فرمایا ہے کسی دوسرے کو بیان نہیں فرمایا۔ اگر ان تمام آیات کو جمع کیا جائے جو توحید باری سے متعلق ہیں تو ثلث قرآن سے کم نہ ہوں۔

قرآن کریم نے صرف عقیدہ توحید کے بیان ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے مختلف قسم کے دلائل و براہین بھی بیان فرما دیئے ہیں اور انسانوں کی مختلف النوع طبیعتوں کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر طرح اس عقیدہ کو ان کے دماغ میں مرتسم اور دلوں میں پیوست کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے

دلیل نقل:۔

ہر قوم و ملت کا طریقہ ہے کہ اپنے بزرگوں کی روایات کی قدر کرتی ہے، ان کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہے۔ خصوصاً وہ بزرگ جنہوں نے سوسائٹی میں انقلاب برپا کر دیا ہو، جنہوں نے قوم کو اخلاقی پستی کے غار سے نکال کر بلندی کی معراج پر پہنچا دیا ہو، اور غلامی کا طوق ان کی گردنوں سے نکال کر جہاں بانی کی باگ ان کے ہاتھ میں دیدی ہو۔ جن کو وہ قوم خدا کا پیغمبر، بلکہ اس سے بھی زیادہ سمجھتی ہو۔ قرآن کریم نے پہلے مجملاً فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کی طرف یہی وحی نازل کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا صرف میری ہی عبادت کرو

پھر تاریخ عالم کی ان تمام قوموں کے، جن کے شاندار یا ناکام ماضی کی داستانیں لوح تاریخ پر ثبت ہیں نام لے لے کر بتایا کہ ان سب اقوام کے مصلحوں اور ہادیوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت کا پیغام سنایا اور اسی کی عبادت کی طرف بلایا۔ اس سلسلہ میں پوری تفصیل کے ساتھ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک سب ہی ممتاز پیغمبروں کا ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا کہ جب توحید باری کی دعوت تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت ہے تو آؤ اسی کو بنیاد اتحاد بناؤ۔ اگر توحید کو قطعیت و جامعیت کے ساتھ قبول کر لو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اسلام کے دوسرے اصول و احکام بھی تسلیم کرنے ہی پڑیں گے کیونکہ وہ سب توحید کامل کے لوازم میں سے ہیں اور توحید کی ان کو مانے بغیر تکمیل نہیں ہو سکتی۔

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا

آؤ وہ بات مان لو جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفق علیہ ہے اور وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

دلیل عقل:۔

قرآن کریم نے بتایا کہ عقیدہ توحید روایت سے ہی نہیں درایت سے بھی ثابت ہے، نقل صحیح ہی کا نہیں، عقل سلیم کا بھی یہی تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں فلسفہ زدہ دماغوں کو مطمئن کرنے کیلئے قرآن کریم نے یہ دلیل پیش فرمائی:۔

اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ ۔ لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۔

(الانبیاء ۲)

کیا انھوں نے زمین میں اللہ کے سوا وہ معبود بھی ٹھہرائے ہیں جو ان کو موت کے بعد دوبارہ زندگی دیں۔ اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاتے لہٰذا اللہ عرش کا مالک ان الزامات شرک سے جو یہ اس پر لگاتے ہیں پاک ہے۔

اس دلیل کی تشریح یہ ہے کہ عبادت، ذلت و بے چارگی کے کامل طور پر اظہار کا نام ہے، اور کمال ذلت و بے چارگی کا اظہار اسی ذات کے سامنے مناسب ہے جو کمال عزت و قدرت سے متصف ہو اور ہر قسم کے نقص و عیب سے مبریٰ ہو۔ اب اگر بالفرض زمین و آسمان میں دو خدا تسلیم کر لئے جائیں تو پوچھا جائے گا کہ عالم کے تصرف و تدبیر میں دونوں میں رائے کا اتفاق رہتا ہے یا کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے، اگر کہا جائے کہ ہمیشہ اتفاق ہی رہتا ہے۔ تو یا تو ایک تنہا کام نہیں چلا سکتا بلکہ مل جل کر دونوں چلاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ دونوں ناقص ہیں، اور اگر ایک بھی تنہا کام چلا سکتا تھا تو دوسرا زائد ٹھہرا اور ایک زائد و بے کار خدا کو خدا ماننا ہی بیکار ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ دونوں مفروضہ خداؤں میں کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے تو یا تو ایک مغلوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہو گا۔ اس صورت میں یہ مغلوب ناقص ہوا اور خدائی کا اہل نہ رہا یا دونوں برابر کی قوت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے اور ہر ایک اپنی رائے اور ارادہ کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا۔ اس صورت میں تمام کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا جو کمال عزت و قدرت کا مالک ہے ایک ہی ہے اور اسی کی بارگاہ عظمت و جلالت میں انسان جو اشرف المخلوقات ہے سر تسلیم و تعظیم خم کر سکتا ہے

دلیل وجدان :۔

مگر چونکہ اہل عقل دنیا میں کم ہیں اور عقلاء وقت کی عقول میں باہم تصادم بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے قرآن حکیم نے انسان کے وجدان کو پکارا اور فطرت انسانی کے مطالعہ کی دعوت دی۔ چنانچہ فرمایا گیا :

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ

(یونس - ۳)

وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے خشکی اور تری میں چلنے پھرنے کا سامان کیا پھر جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہوتے ہو اور وہ موافق ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں اور تم اس سے خوش ہوتے ہو تو اچانک تیز و تند ہوا کے جھکڑ چلنے شروع ہو جاتے ہیں اور سمندر کی موجیں تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور تم کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب گھر گئے تو ایسے نازک وقت تم مخلصانہ فرمانبرداری کے جذبہ کے ساتھ اللہ ہی کو پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اے اللہ اگر تو نے ہمکو اس مصیبت سے نجات دیدی تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہونگے لیکن جب تمکو اللہ نجات دیدیتا ہے تو پھر اچانک دنیا میں ناحق خونریزی شروع کر دیتے ہو۔

یعنی انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب تک وہ آرام و اطمینان اور عیش و راحت کی حالت میں رہتا ہے اسے خدا یاد نہیں آتا۔ وہ اپنی فارغ البالی اور خوشحالی کو اپنی کوششوں کا نتیجہ سمجھتا ہے اور اسباب سے آگے بڑھ کر مسبب الاسباب تک اسکی نظر نہیں پہونچتی اور اگر خدا کی طرف دھیان بھی کرتا ہے تو بہت سے شرکا و شفعاء و دستکار کی فوج کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں ظاہری اسباب کے سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں اور موت کا فرشتہ سامنے کھڑا نظر آنے لگتا ہے تو اس کا وجدان خفتہ یکایک بیدار ہو جاتا ہے اس کی فطرت کا زنگ آلود آئینہ یکایک چمک اٹھتا ہے اور وہ جذبۂ اطاعت خداوندی کے کامل اخلاص، دل کی پوری توجہ اور زبان کی پوری طاقت سے پکار اٹھتا ہے۔

"اے خدا! اے بے سہاروں کے سہارے میری کشتی کو بھی ساحل مراد پر لگا اور مجھے ہلاکت کے اس طوفان اور مصائب کے اس بھنور سے نجات دے۔ اگر تو نے مجھے اس مصیبت سے بچا لیا اور اپنے دامانِ امن

وعافیت میں پناہ دی تو میں باقی عمر تیری شکر گذاری میں صرف کردوں گا اور تیرے دروازہ
کو چھوڑ کر کسی دوسرے دروازہ پر قدم بھی نہ رکھوں گا۔"

خداوند علام الغیوب تو ماضی و مستقبل پر بیک وقت نظر رکھتا ہے۔ اسے کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔ مگر یہ اس کی ایک سنت ہے کہ وہ مضطرب دل سے نکلی ہوئی صدا کو رد نہیں کرتا خواہ وہ کافر ہی کے دل سے نکلے۔ مگر ہوتا یہ ہے، موت کی گرفت سے نکلتے ہی ظالم انسان پھر اپنے گناہوں میں سرشار ہو جاتا ہے، شر و فساد کا بازار گرم کر دیتا ہے، فتنہ و بغاوت کے ہنگامے اٹھا کھڑے کرتا ہے۔ سچے خدا سے منہ موڑ کر جھوٹے معبودوں سے رشتہ جوڑتا ہے اور اپنے تمام عہدوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالتا ہے۔

فطرت انسانی کی یہ ایک ایسی صحیح تحقیق ہے جو فاطر السموات والارض کے سوا کسی اور سے ممکن نہ تھی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ "توحید الہٰی" فطرت انسانی کا اصل تقاضہ ہے اور ضمیر و وجدان کی پہلی اور آخری پکار۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کفار عرب جو ہر صبح کو ایک نئے معبود کے آگے سر جھکاتے تھے اور جنہوں نے کعبہ میں بتوں کی ایک دوکان سجا رکھی تھی وہ بھی اصل معبود اور "الٰہ الالٰہ" خدائے واحد ہی کو مانتے تھے۔ دوسرے معبودوں کو وہ اس کے دربار کا شفیع اور اس کی بارگاہ کا مقرب قرار دیتے تھے اور دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ خدا پر ان کا اثر ہے اور وہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہے۔ چنانچہ کہتے تھے:

هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ — یہ تو خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ خدا نے کارخانۂ عالم کے مختلف کام ان چھوٹے معبودوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ یہ اگرچہ اس کے مملوک ہیں مگر کارخانہ عالم کے انتظامات میں اس کے شریک ہیں اور اپنی محدود خدائی قوتوں کے ساتھ خداوند اعلیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کی حاجت روائی و مشکل کشائی کرتے ہیں۔ چنانچہ حج کے موقعہ پر ان کا تلبیہ یہ ہوتا تھا:۔

لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ — حاضر ہوں اے خدا تیرا کوئی مستقل بالذات شریک نہیں لیکن ایسا شریک ہے جو تیرا اپنا ہی ہے اور تو اس کا مالک ہے اور اسکے اختیارات کا مالک ہے۔

مگر جب کسی سخت ترین مصیبت میں گھر جاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ بات ان ماتحت خداؤں کے حدود اختیارات سے باہر ہے، خدائے اعلیٰ واجل کے سوا کوئی ہماری مشکل کو حل نہیں کر سکتا تو آخر کار اسی کی طرف رجوع ہو جاتے تھے اور سب وسطاء و شفعاء نظر انداز کرکے اس کو پکارتے تھے مذکورہ بالا آیات کے شان نزول میں مفسرین نے ابو داؤد وغیرہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس حقیقت کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس روایت کا خلاصہ یہ ہے:۔

"فتح مکہ کے موقعہ پر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابۂ کرام کی فوج ظفر موج کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جس نے اپنے باپ کے دوش بدوش حضور کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مکہ سے فرار ہو کر ساحل سمندر پر پہونچا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دوسرے ملک کی راہ لی۔ تھوڑی دور چل کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ملاحوں نے کہا، مسافرو! سخت نازک وقت ہے اس وقت تمہارے معبود کسی کام نہ آئیں گے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتے ہو تو صرف خدائے واحد کو پکارو۔ یہ سنکر عکرمہ نے کہا یہ تو وہی بات ہے جو محمدؐ کہتے ہیں۔ اگر سمندر میں نجات کا انحصار اسی پر ہے تو بے شک خشکی میں بھی وہی نجات دے سکتا ہے۔ پھر کہا اے اللہ! میرا تجھ سے عہد ہے اگر تو نے مجھے اس مصیبت سے نجات دیدی تو میں محمدؐ کی خدمت میں

حاضر ہو کر اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دوں گا اور پھر میں انھیں معاف کرنے والا اور
کرم کرنے والا پاؤں گا ۔ چنانچہ عکرمہؓ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس نے
نجات پاکر اپنے عہد کو پورا کیا۔"

کفارِ مکہ کے شرک کی نوعیت تو یہ تھی۔ اب آیئے ہم مدعیانِ اسلام اور علمبرداران توحید کی توحید پر بھی ایک نظر ڈال لیں ۔ ممتاز فقہی مفسر علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ اپنی مشہور تفسیر "روح المعانی" میں ان آیات کے تحت لکھتے ہیں:-

فالآية دالة على ان المشركين لا يدعون غير الله تعالى في تلك الحال وانت خبير بان الناس اليوم اذا اعتراهم امر خطير وخطب جسيم في بر او بحر دعوا من لا يضر ولا ينفع ولا يرى ولا يسمع فمنهم من يدعو الخضر والياس ومنهم من ينادي ابا الخميس والعباس ومنهم من يضرع الى شيخ من مشائخ الامة ولا ترى فيهم احدا يخص مولاه بتضرعه ودعاه ولا يكاد يمر له ببال انه لو دعى الله تعالى وحده ينجو من هاتيك الاهوال فبالله تعالى عليك قل لي اى الفريقين من هذه الحيثية اهدى سبيلا واى الداعيين اقوم قيلا والى الله تعالى المشتكى من زمان عصفت فيه ريح الجهالة وتلاطمت امواج الضلالة وخرقت سفينة الشريعة واتخذت الاستغاثة بغير الله تعالى للنجاة ذريعة وتعذر على العارفين الامر بالمعروف وحالت دون النهي عن المنكر صنوف الحتوف

آیت دلالت کرتی ہے کہ اس حالت میں مشرکین سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں پکارتے اور تمہیں معلوم ہے کہ آج (اسلام کے مدعی) لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب انھیں کوئی سخت حادثہ یا بڑی مصیبت پیش آتی ہے، خشکی میں یا تری میں تو وہ ان کو پکارتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ ضرر ہے نہ نفع نہ وہ ان کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کی بات سن سکتے ہیں. کوئی حضرت خضر و الیاس (علیہ السلام) کو پکارتا ہے کوئی جناب ابوالخمیس و عباس کو آواز دیتا ہے کوئی کسی امام سے فریاد کرتا ہے کوئی کسی شیخ کے سامنے آہ و زاری کرتا ہے۔ ان میں تم کسی کو نہ پاؤگے جو اپنی فریاد و دعا اللہ کے ہی حضور میں پیش کرتا ہو اور کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ اگر وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا تو ان مصیبتوں سے نجات پائے۔ تو تمہیں قسم ہے خدا کی بتاؤ ان دونوں فریقوں میں سے کون اس حیثیت سے ہدایت سے زیادہ قریب ہے اور کس کی پکار زیادہ درست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے شکایت ہے ایسے زمانہ کی جس میں ہر طرف جہالت کے جھکڑ چل رہے ہوں اور ضلالت کی موجیں اٹھ رہی ہیں شریعت کی کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور غیر اللہ سے فریاد کو نجات کا ذریعہ قرار دے لیا گیا ہے اور حالت اس قدر نازک ہو گئی ہے کہ جاننے والوں کے لئے امر بالمعروف دشوار ہو گیا ہے اور نہی عن المنکر کے راستہ میں ہلاکتوں کے غار حائل ہیں۔

علامہ آلوسی بغدادیؒ نے مندرجہ بالا سطور میں مدعیان اسلام کی جس کفر شعاری کا رونا رویا ہے اس کی دبا ر تمام بلاد اسلامیہ میں عام ہے اللہ کی مساجد غیر آباد اور بے رونق ہیں اور مقابر اولیاء و صلحاء، موحدین (؟) کے سجدوں سے معمور، تمام عمر سفر حج کی توفیق نہیں ہوتی مگر بزرگان دین کے عرسوں میں شرکت کے لئے ہر سال شد رحال ضروری۔ خدا کے سامنے التجا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھتے مگر قبور اولیاء کے سرہانے درخواستوں اور عریضوں کے انبار موجود۔ عقل کی ظلمت، قلب کی غفلت اور وجدان کی موت کی انتہا ہے کہ سخت ترین احوال میں مصائب و ہوا کے ہجوم میں گھر کر اور حوادث و نوائب کے طوفان میں پھنس کر جب مشرکین مکہ جیسے کافر بھی خدائے واحد کی طرف رجوع ہو جاتے تھے آج ان مدعیان توحید کو خدا یاد

(باقی صفحہ ۳۶۱ پر)

مولینا محمد ادریس ندوی نگرامی

پیامِ توحید

اکابرِ اُمّت کی تصریحات!

خدا کی توحید کا اقرار و اعتراف اور اسی رنگ میں اپنی زندگی کو رنگ لینا ہر مسلمان کا اساسی اور بنیادی فریضہ ہے اسی لیے صلحائے اُمت نے ہر دور میں مسلمانوں کو اس فرض سے ہشیار کیا، ان کو توحید الٰہی کی دعوت بلایا اور شرک سے نفرت دلایا۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے رسالہ "الواسطۃ بین الحق والخلق" میں، علامہ امیر یمنی نے رسالہ تطہیر الاعتقاد میں اور علامہ مقریزی نے رسالہ "تجرید التوحید" میں بہت ہی مفید اور موثر انداز سے گفتگو فرمائی ہے۔ ذیل کی سطروں میں انہی تینوں رسالوں کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع پہنچائیں، ہم کو توحید کی لذت سے آشنا فرمائیں اور توحید کو صرف قال نہیں بلکہ ہمارا حال بھی بنائیں۔ آمین ——— م۔ق

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا اور اس کے بندہ کے درمیان کسی واسطہ کا ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں (یہ بات صحیح ہے کہ نہیں؟)

شیخ الاسلام نے فرمایا۔ اگر کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسا واسطہ ہونا چاہیے جو ہم تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائے تو یہ صحیح ہے، اس لئے کہ مخلوق کو اس بات کا کیا علم کہ اللہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے؟ اس کو کیا چیز پسند ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟ اور نہ یہ معلوم کہ اس نے اپنی اطاعت کرنے والوں کے لئے کیا کیا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں؟ اور نہ اس کی خبر کہ نافرمانوں کے لئے اس کے یہاں کیسا عذاب مقرر ہے؟ اسی قسم کی بہت سی چیزیں ہیں جنکو انسان خدا کے رسولوں اور نبیوں کے بغیر نہیں جان سکتا۔ پس یہ عقیدہ صحیح ہے اور پیغمبروں پر ایمان لانے والے ان کی پیروی کرنے والے ہی ہدایت پر ہیں، وہی اللہ کے مقرب ہیں، اللہ انہی کے درجات بلند فرمائے گا، اور دنیا و آخرت میں سرفراز فرمائے گا۔ اور جو لوگ پیغمبروں کے مخالف ہیں وہ رحمت پروردگار سے دور ہیں۔ اپنے رب سے گمراہ ہیں، ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (سورہ اعراف)

"اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس پیغمبران دین جو تم ہی میں سے ہونگے، جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے۔ جو شخص تقویٰ رکھے اور درستی کرلے تو ان لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے، نہ وہ غمگین ہونگے۔ اور جو ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتائیں گے ان سے تکبر کرینگے وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ

"پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو شخص

فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (سورہ طٰہٰ)

میری اس ہدایت کا اتباع کریگا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اسکو اندھا کر کے اٹھائیں گے وہ کہے گا کہ اے میرے رب آپنے مجھکو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا ایسا ہی تیرے پاس میرے احکام پہنچے تھے پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسے ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاوے گا۔

اہل دوزخ کے متعلق فرمایا :-

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (سورہ ملک)

جب اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، وہ کافر کہیں گے واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا سو ہم نے جھٹلا دیا اور کہدیا کہ خدا تعالیٰ نے کچھ نازل نہیں کیا تم بڑی غلطی پر ہو۔

سورۂ زمر میں ارشاد ہوا :-

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ (سورۂ زمر)

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے یہانتک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیات پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے۔ کافر کہیں گے ہاں۔ لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا۔

قرآن پاک میں اس طرح کی بہت سی آئتیں ہیں، مسلمان، یہود، نصاریٰ، ان کے سوا اور تمام مذہب و ملت والوں نے خدا اور بندہ کے درمیان رسولوں کو واسطہ تسلیم کیا ہے اور ان کے منکر کو کافر سمجھا ہے۔ قرآن پاک میں یہ حقیقت بار بار واضح کی گئی ہے کہ پیغمبروں کے جھٹلانے والے ہلاک ہوئے اور ان کی پیروی کرنے والے کامیاب و شادکام ہوئے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (سورہ الصّٰفّٰت)

اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے یہ قول ہمارا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے۔ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

ارشاد ہوا :-

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۔

بیشک ہم ضرور مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور اس دن مدد کرینگے جب کہ گواہ کھڑے ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے کہ عبد اور معبود کا واسطہ یعنی پیغمبر اس لئے ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ فرمایا :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اس واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خدا انکی اطاعت کیجائے۔

لیکن اگر واسطے سے مقصد یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ایسی ہستی ہو جس سے نفع و نقصان کے وقت مدد چاہی جائے (رزق، اولاد، بیماری، شفا، قرض وغیرہ کے معاملات میں اس سے بالذات مدد چاہی جائے) تو یہ شرک ہے۔ مشرکین کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس لئے کافر قرار دیا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے نفع و نقصان کا معاملہ ٹھہرایا تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا شفیع و ولی جانا تھا۔ ارشاد فرمایا:۔

مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ

بدون اس کے نہ تو تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

فرمایا:۔

وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ

اور ایسے لوگوں کو ڈرائیے جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ ہیں نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع۔

ارشاد ہوا:۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا (سورۂ بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ جنکو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ان کو پکارو تو سہی وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ یہ لوگ جنکو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے، وہ اسکی رحمت کے امیدوار ہیں اور اسکے عذاب سے ڈرتے ہیں واقعی آپکے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل۔

فرمایا:۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ۔ (سورہ سبا)

آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے ہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں نہ انکی ان دونوں میں شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور خدا کے سامنے سفارش کسی کے لئے نہیں آتی مگر اسکے لئے جسکی نسبت اجازت دی جائے۔

سلف کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ایک گروہ حضرت مسیحؑ حضرت عزیر اور فرشتوں کی پرستش کرتا تھا تو اللہ نے ان کے لئے فرمایا کہ فرشتے اور پیغمبر مصیبتوں کو دور نہیں کر سکتے ہیں، وہ لوگ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بنجاؤ خدائے تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بنجاؤ بوجہ اسکے کہ تم کتاب سکھاتے ہو بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو اور یہ نہ بتلائے گا

تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران)

کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے تو کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کھول کر بیان فرمادیا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنانا کفر ہے پس جس نے نبیوں اور فرشتوں کو ایسا واسطہ تسلیم کیا کہ ان کی عبادت کی جائے، انھیں پر توکل کیا جائے۔ نفع اور نقصان کے اوقات میں انھی کی طرف رجوع کیا جائے تو ایسا آدمی اجماعی طور پر کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۂ انبیاء)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنا رکھی ہے وہ پاک ہے بلکہ بندے ہیں معزز وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور اسی کے موافق عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے اعمال جانتا ہے اور بجز اسکے جس کیلئے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور ان میں سے جو شخص کہے کہ میں علاوہ خدا کے معبود ہوں تو ہم اس کو سزائے جہنم دینگے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

فرمایا:-

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (سورۂ نساء)

مسیح ہرگز اللہ تعالیٰ کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے اور مقرب فرشتے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار کریگا اور تکبر کرے گا تو خدا تعالیٰ ضرور سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

ارشاد ہوا:-

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۂ یونس)

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انکو ضرر پہنچا سکے اور نہ ان کو نفع پہنچا سکے اور کہتے ہیں کہ اللہ کے پاس یہ ہمارے سفارشی ہیں آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کی شرکت سے۔

فرمایا:-

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى۔ (سورۂ نجم)

اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی۔ مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جب حکم دے اور جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے۔

ارشاد ہوا:-

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورۂ بقرہ)

ایسا کون شخص ہے جو اسکے پاس سفارش کر سکے بدون اسکی اجازت کے۔

فرمایا:-

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ۔

(سورۂ فاطر)

اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے تو اس کا بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے تو اس کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں۔

ارشاد ہوا:-

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

(سورۂ زمر)

آپ کہئے پھر بھلا یہ تو بتلاؤ کہ خدا کے سوا تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ تعالیٰ مجھ پر عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو دور کر سکتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔

انبیائے کرام کے سوا علماء اور مشائخ دین کا بھی یہی حال ہے۔ کہ جس نے ان کو رسول اور رسولوں کی امت کے درمیان ایسا واسطہ تسلیم کیا کہ یہ امت تک رسول کے احکام پہنچاتے ہیں۔ اُمت کو تعلیم دیتے ہیں اور اس کی رہنمائی کرتے ہیں، پس اس نے بالکل درست عقیدہ قائم کیا۔ اور جس نے یہ سمجھا کہ یہ فقیر اور درویش اور مشائخ خدا اور بندے کے درمیان اس طور سے واسطہ ہے کہ مخلوق اپنی ضروریات کو ان کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ انہی کے توسط سے رزق وغیرہ دیتا ہے (یعنی جس طرح بادشاہ رعایا کے درمیان ایک جماعت ایسی ہوتی ہے کہ رعایا اپنی ضروریات کو اس امید پر کہ یہ جماعت بادشاہ سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کا ذریعہ اختیار کرنے میں نفع کی توقع ہے اس جماعت کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ بادشاہ سے عرض کرتے ہیں) پس جس نے علماء اور مشائخ کو ایسا واسطہ قرار دیا وہ گمراہ ہے' اس کو توبہ کرنا چاہیئے۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان جو جماعت واسطہ ہوتی ہے اس کے تین اسباب ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ جماعت بادشاہ کو لوگوں کے ان احوال کی خبر کرتی رہے جن سے وہ ناواقف ہے۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس جماعت کی ضرورت نہیں ہے' اس لئے کہ وہ عالم الغیب ہے کھلی اور پوشیدہ ہر چیز کو جانتا ہے' زمین اور آسمان کی کوئی شے اس سے چھپی نہیں ہے۔ لوگ مختلف آوازوں میں' مختلف زبانوں میں' مختلف ضرورتوں کو اس کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں اور وہ سب کو سُنتا ہے۔ اس لئے جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال سے اس وقت تک ناواقف رہتا ہے جب تک کہ بعض فرشتے یا انبیاء (یا بزرگان دین) اسے خبر نہ دیں' تو وہ بالاجماع کافر ہے۔

دوسرے یہ کہ بادشاہ کو نظام سلطنت کے سلسلے میں مددگار کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ تن تنہا بادشاہت کے سارے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہے کہ اپنے لئے رفقاء کار کو تلاش کرے۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ان امور سے اعلیٰ و اشرف ہے اُسے کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔ ارشاد ہوا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۔

(سورۂ سبا)

آپ فرمایئے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو' وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں اور نہ زمین اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ اس میں سے کوئی مددگار اللہ کا ہے۔

فرمایا:-

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

اور کہہ دیجئے تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ کوئی اس کی سلطنت میں شریک اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائیاں بیان کیا کیجئے۔

دُنیا میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس کا مالک، پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے پرواہ ہے اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ دنیاوی بادشاہوں کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ اپنے مددگاروں کے محتاج ہیں ان کے مددگار ان کی بادشاہی میں شریک ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی شریک نہیں وہ اکیلا ہے۔ بادشاہی اس کی ہے، تعریف اس کی ہے، وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

تیسرے یہ کہ بادشاہ خود اپنی رعایا کے ساتھ سلوک نہیں کرنا چاہتا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے بادشاہ کو کچھ خوف ہے یا ان سے کچھ اغراض وابستہ ہیں، ان کی تحریک پر بادشاہ رعایا کے ساتھ رحم وکرم کے برتاؤ پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز کا مالک اور رب ہے۔ جس قدر ایک ماں کو اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان سے کہیں زائد رحیم ہے۔ ہر چیز اسی کی مشیت سے ہوتی ہے۔ جو کچھ اس کی مرضی ہوئی وہ پوری ہوئی اور جو کچھ چاہے گا وہ ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو نفع پہنچانا چاہتا ہے تو کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھلائی کرے، اس کے لئے دعائیں کرے اور اس کے لئے شفاعت کرے۔ دیکھو ہر چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوئی، یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی ہو جو خدا سے برتر کو اس کی مرضی کے سوا کسی چیز پر مجبور کرے یا اس قدر علم رکھتا ہو کہ اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کو بتلانے کی ضرورت پڑے یا جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوف ہو یا کچھ توقعات وابستہ ہوں، شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے نہ ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورۂ بقر)

ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔

یہ چیز اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے وہ نہ تو بادشاہ ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے شریک ہیں اور نہ اس کے مددگار ہیں۔ اور ان کی شفاعت ہرگز نفع نہ دیگی۔ ہاں ان لوگوں کے حق میں ضرور نفع بخش ہوگی جن کی شفاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہو صاف صاف ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ نفع اور نقصان کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، بلکہ وہ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ فرمایا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ کَانَ مَحْذُوْرًا ۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے علاوہ قرار دیتے ہو ذرا ان کو پکارو تو وہ نہ تم سے تکلیف کے دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ قریب ہوتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل۔

اور شفاعت کو ایک قسم کی دعا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوق کی دعا ایک دوسرے کے لئے نفع بخش ہوتی ہے، لیکن شفاعت کرنے والے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کے حق میں شفاعت کرے، اور نہ ان لوگوں کی شفاعت کر سکتا ہے جن کے لئے صریحاً ممانعت ہو۔ مثلاً مشرکین کی شفاعت یا ان کے حق میں دعائے مغفرت کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا:-

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ۔ (سورۂ توبہ)

پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے دعائے مغفرت مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد یہ لوگ دوزخی ہیں اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے دعا مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے۔

منافقین کے حق میں فرمایا:۔

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ۔

ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ آپ ان کے حق میں استغفار کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مشرکین اور منافقین کے لئے استغفار سے منع فرما دیا ہے اور آگاہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف نہیں فرمائیگا۔

ارشاد فرمایا:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرے، اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں جس کو چاہے گا بخش دیگا۔

مقصود یہ ہے کہ جس نے اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان ایسا واسطہ تسلیم کیا جیسے بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہوتا ہے تو وہ مشرک ہے، مشرکین کہا کرتے تھے کہ یہ بت انبیاء اور صالحین کے مجسمے ہیں ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ یہی وہ شرک ہے جس کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے نصاریٰ پر رد کیا ہے۔ فرمایا:۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

بنالیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا، اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی! اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے۔

اللہ تعالیٰ نے توحید کو قرآن پاک میں خوب واضح فرمایا ہے اور شرک کے مواد کو اس طرح مٹا دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں باقی رہتا اور اس کے سوا کسی سے توقع نہیں قائم ہوتی اور اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اطاعت تو اللہ اور رسول دونوں کی ہے۔ لیکن خشیت صرف اللہ کی ہونا چاہیئے۔ ارشاد ہوا:۔

مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے پس ایسے ہی لوگ بامراد ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی توحید کی تشریح امت کے لئے فرمایا کرتے تھے اور ان کے دلوں سے شرک دور فرماتے تھے۔ کیونکہ یہی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا صحیح مطلب ہے۔

(۲)

علامہ امیر یمنی فرماتے ہیں:۔

جب میں نے دیکھا کہ یمن، شام، نجد، اور تہامہ نیز دیگر بلادِ اسلام کے دیہی اور شہری حلقوں میں لوگوں نے مخلوق خدا کو معبود اور مسجود بنا رکھا ہے۔

قبروں سے متعلق عجیب و غریب اعتقادات قائم ہیں۔ اکثر فاسق و فاجر جو نہ کتاب و سنت سے واقف، نہ حشر و نشر سے خائف کبھی ان کو اللہ کے سامنے رکوع و سجدہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ وہ علم غیب اور کشف و کرامات کے مدعی ہیں تو میں نے ضروری سمجھا کہ ان امور پر انکار کروں جن پر اللہ تعالیٰ نے انکار کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور اس چیز کو پوشیدہ نہ کروں جن کا اظہار خدائے برتر نے واجب فرمایا ہے۔ چند اصول ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ درحقیقت وہ دین کی بنیاد ہیں۔

اصل اوّل | جو کچھ قرآن پاک میں ہے وہ حق ہے، باطل نہیں ہے۔ سچ ہے، جھوٹ نہیں ہے۔ ہدایت ہے، گمراہی نہیں ہے۔ علم ہے، جہالت نہیں ہے۔ یقین ہے اس میں شک نہیں ہے۔ یہ وہ اصل ہے جسے مدار اسلام کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔

اصل دوم | تمام انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے بندوں کو صرف اللہ ہی کی عبادت اور صرف اسی کی پرستش کی دعوت دی اور سب سے پہلے جو پیغام انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا وہ یہی تھا کہ:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (سورۂ ہود) — اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

فرمایا:

اِنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ (احقاف) — تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔

اِنْ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ — تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

یہی مفہوم ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا۔ پیغمبروں نے اسی کلمہ کی دعوت دی، اور صرف زبان سے اس کا اقرار نہیں چاہا بلکہ انھوں نے اس کے معانی و مفہوم پر صحیح اعتقاد رکھنے کا مطالبہ فرمایا۔

اصل سوم | توحید کی دو قسمیں ہیں اول توحید ربوبیت، توحید خالقیت، توحید رزاقیت وغیرہ۔ یعنی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کو دنیا کا خالق، پالنے والا اور رزق دینے والا جاننا۔ مشرکین بھی اس چیز کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ان امور کے معترف تھے اور اللہ کے ساتھ کسی کو اس میں شریک نہ کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ — اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے کہ اللہ نے۔

فرمایا:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ — اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے نے پیدا کیا ہے۔

ارشاد ہوا:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ — آپ کہیئے کہ وہ کون ہے جو تم آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے، یا وہ کون ہے جو جانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے

الا ھم سیقولون اللہ فقل افلا تتقون ۔ | اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ تو ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تو اس سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں پرہیز کرتے۔

فرمایا:-

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○ (المومنون)

آپ کہہ دیجئے کہ یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں یہ کس کی ہیں؟ اگر تم کو خبر ہے؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کی ہے ان سے کہئے کہ پھر کیوں غور نہیں کرتے؟ آپ یہ بھی کہئے کہ ان سات آسمان کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی اللہ کا ہے، آپ کہئے کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے، آپ یہ بھی کہئے وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہو اور وہ پناہ دیتا ہو اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہو؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں آپ کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو گیا ہے؟

دیکھو فرعون اپنے کفر میں کس قدر سخت تھا۔ اس کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کی پروردگاری کا کس انداز میں اعتراف کرتا ہے۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۔ (بنی اسرائیل) | تو خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص اور زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں، جو بصیرت کے لئے ذرائع ہیں۔

ابلیس کہتا ہے:-

اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (سورہ مائدہ) | میں تو خدا پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔

توحید کی دوسری قسم عبادت ہے یعنی عبادت کی جسقدر قسمیں ہیں وہ صرف ذات خداوندی کے لئے مخصوص کرلی جائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کا شریک سمجھا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں کو اسی مسئلہ پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔ (النحل) | اور ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔

ارشاد ہوا:-

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (الاعراف) | عبادت کرو تم اللہ کی اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔

فرمایا:-

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ) | اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو

عبادت خداوندی کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے جو بہت ہی اہم اور ضروری ہیں ان کو ہم ذکر کرتے ہیں:

عبادت اعتقادی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں اس امر کا یقین موجود ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رب ہے، اکیلا ہے خلق وامر اسی کے لئے ہے، نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ وہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا ہے۔ اور اسی قسم کی جو چیزیں لازمہ الوہیت ہیں ان کا دل سے یقین کرنا یہ عبادت اعتقادی ہے۔

عبادت لفظی | اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے کلمۂ توحید کا اظہار کریں۔

عبادت بدنی | مثلاً نماز میں اٹھنا بیٹھنا، رکوع، سجود، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔

عبادت مالی | مثلاً اللہ کی راہ میں اس مقررہ رقم کو نکالنا جو شریعت کی جانب سے متعین ہے۔ یہ عبادتیں اور اسی قسم کی جو عبادتیں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص کر لینا یہی ہے توحید عبادت۔ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر سرورِ کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمامی انبیاء علیہم السلام نے اسی امر کی دعوت دی ہے۔

مشرکین کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض تو فرشتوں کی پرستش کرتے تھے، دکھ درد میں انہیں کو پکارتے تھے۔ بعض پتھروں کی پرستش کرتے تھے۔ (یہ پتھر حقیقت میں صلحاء کی یاد میں بنی ہوئی مورتیں تھیں) اور اپنی مصیبتوں کو دور کرانے کے لئے انہیں کی جانب رجوع کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور آپ کی زبان سے اعلان فرمادیا کہ ربّ ذوالجلال جس طرح اپنی ربوبیت میں فرید اور وحید ہے اسی طرح اپنی معبودیت میں بھی وہ کسی کو اپنا شریک اور ہمسر نہیں رکھتا ہے۔ فرمایا:

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ	سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے اور خدا کے سوا جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں
لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ (الرعد)	وہ انکی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے۔

توحید عبادت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ نہ ہو دعائیں مانگی جائیں وہ صرف اللہ سے مانگی جائیں، غم ہو یا مسرت ہو، تنگی ہو یا فراخی ہو، تمام حالتوں میں صرف اللہ ہی کو پکارا جائے مدد صرف اللہ ہی سے مانگی جائے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے۔ التجا اور آرزو ہو تو اللہ کی بارگاہ میں ہو، نذر و قربانی ہو تو صرف اسی کے نام پر ہو، رکوع، سجدہ، طواف جو کچھ ہو سب اسی ذاتِ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی خاطر ہو۔ اگر کسی نے ان امور کو خالق کے سوا مخلوق کے ساتھ برتا، وہ مخلوق زندہ ہو یا مردہ پس اس نے اس مخلوق کو اپنا معبود بنالیا۔ اب اگر وہ اللہ کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس کی عبادت کا دم بھی بھرتا ہے پھر بھی اس نے مشرکانہ عمل کیا تو اس کا یہ اقرار اس کے اس مشرکانہ فعل کی مکافات نہیں کر سکتا۔

اگر تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بندوں سے امداد چاہنا تو احادیث سے ثابت ہے۔ دیکھو حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے روز پہلے حضرت آدم علیہ السلام سے خواستگار ہوں گے، پھر حضرت نوح علیہ السلام سے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے۔ سب امداد سے عذر کریں گے۔ تب سرورِ کونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور مدد چاہیں گے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ بندوں سے امداد طلب کرنا بُرا نہیں ہے۔

ہم کہیں گے کہ تمہارا یہ شبہہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کس کو کلام ہے کہ اگر خدا کی ایک مخلوق کسی چیز پر قادر ہے تو اس میں اس سے امداد کی درخواست نہ کی جائے، اس قسم کی اعانت طلبی تو عالم اسباب کے لوازم میں سے ہے۔ دعا طلبی ہو یا دوا طلبی اس میں حرج نہیں۔ حرج تو اس اعتقاد میں ہے کہ دُعا اور دوا کا لازمی نتیجہ کارسازی اور کاربرآری ہے۔ حرج تو اس عقیدہ میں ہے کہ فلاں شخص کو یہ قدرت اور یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ہمارا کام ضرور ہی بن جائے گا۔ اور اگر ہم فلاں شخص کا دامن تھام لیں تو نعوذ باللہ ہم اللہ سے بے نیاز ہوگئے۔ یا اللہ ہمارے حسب منشا کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اعانت طلبی کی مثال ایسی ہے کہ ایک بوجھ ہم اکیلے نہ اٹھا دیں۔ دوسرے بھی ہمارا ہاتھ بٹا دیں۔ خود قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں قبطی اور اسرائیلی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

فَاسْتَغَاثَہُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِہٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّہٖ ۔ (القصص)

سو وہ جوان کی برادری میں تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابلہ میں جوان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عمرہ کی غرض سے تشریف لے جانے لگے تو دیکھو روحی فداہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کن الفاظ میں حضرت عمر فاروقؓ سے دعا کرنے کے لئے فرماتے ہیں۔

لَا تَنْسَنَا یَا اُخَیَّ مِنْ دُعَائِکَ ۔

اے بھائی مجھ کو اپنی دعا میں نہ بھولنا

اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ مومنین کے لئے استغفار کریں۔ اور ان کے لئے دعائے خیر کریں۔ ارشاد ہوا:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ۔ (الحشر)

اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

حضرت اُم سلیمؓ فرماتی ہیں۔

یَا رَسُوْلَ اللہِ خَادِمُکَ اَنَسٌ اُدْعُ اللہَ لَہٗ

اے رسول اللہؐ اپنے خادم انسؓ کے حق میں دعا فرمایئے۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے۔ اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ لوگ اہل قبر کے سامنے درخواست کرتے ہیں یا زندوں کے سامنے ان امور کے لئے دست سوال دراز کرتے ہیں جس پر وہ قطعی قادر نہیں ہیں! وہ تو خود اپنی ذات کے نفع نقصان کے مالک نہیں، موت و زندگی کے معاملات سے واقف نہیں۔ پھر بھی لوگ ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بیماروں کو شفا دیں، مردوں کو زندہ کردیں، کھیتوں کو سرسبز و شاداب کردیں، لوگوں کو نظر بد سے محفوظ رکھیں۔ یہ لوگ درحقیقت وہی ہیں جن کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَا اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (اعراف)

اور تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

پس یہ قبروں کے سامنے سر جھکانے والے اور گمراہوں سے اچھا اعتقاد رکھنے والے، انھوں نے درحقیقت وہ راستہ اختیار کیا ہے جو اہل شرک کا ہے۔ انھوں نے ان جاہلوں کے متعلق، اور قبروں کے متعلق وہ وہ اعتقادات قائم کئے ہیں جن کا اللہ کے سوا اور کسی ساتھ قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ قبروں کا طواف کرتے ہیں، ان سے منتیں چاہتے ہیں، ان کے نام پر قربانی کرتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ سجدہ بھی کرتے ہوں، حالانکہ یہ تمام چیزیں صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ کھلا ہوا شرک ہے اور اللہ تعالیٰ ہرگز شرک سے راضی نہیں ہے۔

اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔

(۳)

علامہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی نویں صدی ہجری کے ایک مشہور عالم ہیں۔ اپنی کتاب "تجرید التوحید" میں فرماتے ہیں:-

دنیا کی وہ قومیں جو شرک کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ عموماً شرک عبادۃ اور شرک ربوبیت میں مبتلا ہیں۔ شرک عبادۃ کا ان لوگوں پر غلبہ ہے جو بت پرست ہیں، فرشتوں اور جنوں کو اپنا معبود جانتے ہیں۔ زندہ اور مردہ مشائخ اور صالحین کے ساتھ پرستش کا معاملہ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا سے مقرب بنا دے۔ مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ یعنی ہم ان کے سامنے عقیدت اور نیازمندی کا اظہار صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تبارک و تعالیٰ کے دربار میں ہماری شفاعت کریں گے۔ اگر ان کے یہاں ہم کو تقرب حاصل ہو گیا تو بارگاہ ایزدی میں بھی نزدیکی نصیب ہوگی۔ جس طرح دنیا میں بادشاہوں اور رئیسوں کے یہاں وہی لوگ مقرب ہوتے ہیں جو ان کے دست

احباب، اعزا و اقربا اور ملازمین سے زیادہ ربط ضبط رکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ وہ عقیدہ ہے جس کی تردید اوّل سے آخر تک تمام پیغمبروں نے اور تمام آسمانی کتابوں نے کی ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے کو [illegible] اور اللہ کا دشمن بتایا گیا ہے۔ قومیں عموماً اسی شرک کی وجہ سے برباد ہوئی ہیں اس عقیدے کی خرابی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے ساتھ [illegible] دوسروں کی محبت بھی دلوں میں گھر کر گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ

ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

دوزخ میں مشرکین اپنے بتوں سے کہیں گے کہ:

تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (شورہ)

بیشک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو رب العالمین کے برابر کرتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بتوں کے درمیان برابری اس میں نہیں تھی کہ انھوں نے بتوں کو خالق اور پروردگار سمجھا ہو۔ اس لئے کہ مشرکین کو تو [illegible] تھا کہ رب اور خالق اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ ہاں یہ مساوات محبت اور عبادت کی تھی۔ ان کے دلوں میں معبود باطل کی جانب سے محبت اور پرستش [illegible] وہی جذبہ تھا جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہونا چاہیئے۔ پس جس نے اللہ کے سوا کسی دوسرے سے محبت، خوف اور امیدوں کا وہ تعلق پیدا کیا جو [illegible] ہی کے لئے مخصوص ہے تو یقیناً اس شرک کا مجرم ہوا جس کو اللہ معاف نہ فرمائے گا۔ ذرا غور کرو کہ جب اللہ اور غیر اللہ میں برابری کرنے والوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا، تو ان لوگوں کا حشر کیا ہوگا جنھوں نے غیر اللہ کو اپنے اوپر پورا قبضہ دے رکھا ہے۔ اللہ سے زیادہ ان کی محبت میں مست و سرشار ہیں [illegible] سے زیادہ ان سے ڈرتے ہیں اور اللہ سے زیادہ ان کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود وہ اپنے کو موحد [illegible] بھی جانتے ہیں۔ نہ صرف قرآن پاک نے بلکہ تمام آسمانی صحیفوں نے ان تمام لغویات کا انکار کیا ہے۔ ارشاد ہوا:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

دیکھو اس آیت قرآنی نے شرک کی گندگیوں سے علیحدہ کر کے انسان کو صرف ایک معبود حقیقی کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اب پرستش ہے تو اسی کی، امداد کی درخواست ہے تو اسی سے، اب اس بارگاہ عالی میں نہ شرک عملی ہو نہ شرک لفظی اور نہ شرک ارادی!

شرک عملی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہو جو مشرکانہ ہو مثلاً اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا جائے۔ حضور پرنور محمد صلی اللہ علیہ [illegible] ارشاد فرماتے ہیں:

لا ينبغي لاحد ان يسجد لاحد الا الله

اللہ کے سوا کسی کا سجدہ جائز نہیں

اسی طرح خانۂ کعبہ کے سوا کسی اور چیز کا (مثلاً مقابر اور مزارات) کا طواف کرنا، قبروں کو بوسہ دینا اور ان کا سجدہ کرنا، یہ سب امور مشرکانہ [illegible]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد

یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

فرمایا:

لعن الله زوارات القبور والمتخذين عليها المساجد والسراج

قبروں پر جانے والی عورتوں پر اللہ کی لعنت ہے اور ان لوگوں پر لعنت ہو جنھوں نے قبروں پر چراغ جلایا اور قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔

شرک عملی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے اظہارِ عجز و بندگی کی غرض سے سر کے بال منڈائے جائیں۔[1]

شرک لفظی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے جو اپنے اندر مشرکانہ بو رکھتا ہو۔ مثلاً حلف! کہ اللہ کے سوا اور کسی کی قسم کھانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

من حلف بغیر اللہ فقد اشرک (ابوداؤد) جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

اسی طرح اپنے بزرگوں اور مرشدوں کے سامنے کہتے ہیں، جو مرضی اللہ کی اور آپ کی، میرے لئے آسمان پہ اللہ ہے اور زمین پر آپ، سب برکتیں اللہ کی جانب سے ہیں اور آپ کی جانب سے ہیں۔ مجھے اللہ پہ اور آپ کی ذات پر بھروسہ ہے ــــ ذرا غور تو کرو۔ یہ الفاظ عموماً ہماری زبان سے نکلتے ہیں اپنے اندر اعتقادی حیثیت سے کس قدر فساد رکھتے ہیں۔

حضورؐ کے سامنے کسی نے کہا۔ جو کچھ آپ چاہیں اور اللہ چاہے۔ حضورؐ نے فوراً روک دیا اور ارشاد فرمایا کہ کیا تم مجھ کو اللہ کا شریک بنلاتے ہو یہ کہو کہ جو کچھ اللہ چاہے۔

شرک ارادی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کوئی کام کریں لیکن اس کام سے ہمارا مقصود بجائے اللہ کی خوشنودی کے کچھ اور ہو (مثلاً نمود، شہرت، وجاہت طلبی وغیرہ) مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ کسی کارِ خیر میں بجائے اللہ کی مرضی تلاش کرنے کے، ہماری نیت دنیا طلبی ہو تو یہ شرک کی وہ قسم ہے جسکا مرتکب درحقیقت مقامِ (ایاک نعبد ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) سے قطعی ناواقف ہیں۔

اس بات کو قطعی سمجھ لو کہ بندہ کی بندگی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک کہ اس کے اعمال اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے لئے خالص نہ ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ان اعمال کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی نصیب ہو۔

وہ لوگ جن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے لئے خالص اور سنت رسولؐ کے موافق ہیں، درحقیقت ان کا کردار، ان کی گفتار، ان کی بخشش، انکا غصہ ان کی محبت، سب کچھ اللہ ہی کے لیئے ہے وہ اپنے کسی عمل پر بندوں سے بدلہ کے خواہش مند نہیں ہیں اور نہ شکریہ کے خواستگار۔ انھوں نے اہل دنیا کو بالکل اہل قبر کی مانند سمجھ رکھا ہے، جو نفع و نقصان، موت زندگی کسی کی بھی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق شیخ الاسلام عارف باللہ حافظ ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں ایک واضح تقریر فرمائی ہے، اس کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا: "سر کے بال عموماً تین مقاصد کے ماتحت مونڈے جاتے ہیں (۱) حج میں یا عمرہ میں (۲) عام انسانی ضروریات کی بنا پر (۳) شرک و بدعت کی وجہ سے، جیسے کہ بعض مریدین اپنے پیروں کے نام پر سر منڈاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں (پیر، فقیر، شہید) کے لئے سر منڈایا ہے۔ ان الفاظ کا مفہوم وہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم نے فلاں کا سجدہ کیا۔ اس موقعہ پر سر کے بال کا منڈانا عجز و انکساری و خاکساری و فروتنی کا اظہار کرنا ہے۔ ائمہ شرک و گمراہی نے اس چیز کو اپنے لئے بھی ضروری قرار دیا کہ ان کے سامنے بھی، اظہار بندگی کی جائے۔ ان جاہل نفوس نے اللہ تعالےٰ کی بندگی کا درجہ بالکل گرادیا۔ طرح طرح کے مشرکانہ اعمال جاری ہوئے، غیر اللہ کے سجدے ہوئے، اُن کے نام کی قسمیں کھائی گئیں، ان کے لئے نذریں مانی گئیں، ان کے لئے سر کے بال منڈوائے گئے، ان کے نام پر قربانیاں کی گئیں، ان کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا گیا جیسے نماز میں خشوع و خضوع کیساتھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے خوف اور امید کا رشتہ مضبوط کیا گیا جو صرف اللہ کے لئے جائز ہے۔ حالانکہ یہ سب مشرکانہ اعمال ہیں اللہ ان سے پناہ میں رکھے۔" آمین

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً — ہم لوگوں کی آزمائش کریں گے کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

احسن عمل سے مراد خالص اور درست عمل ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو، اور درست وہ ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔ جو عمل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نہیں ہے وہ بجائے تقرب کے، اللہ سے دوری کا باعث ہوگا۔ وہ لوگ جن کے اعمال میں نہ اخلاص ہے، اور نہ وہ رسول اللہ کی سنت کے موافق ہیں، درحقیقت وہ لوگ خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔ انہی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

جو لوگ اپنے کردار سے خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ انکی تعریف کیجائے سو ایسے شخصوں کے متعلق یہ خیال کرو کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے، ان کو دردناک عذاب ہوگا۔

جن لوگوں کے اعمال تو مخلصانہ ہیں لیکن وہ سنت مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پابند نہیں ہیں وہ بڑی غلطی میں گرفتار ہیں۔ اس مرض میں زیادہ تر جاہل صوفیاء اور فقراء مبتلا ہیں، ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کی عبادت اسی طریقہ سے مطلوب و مقصود ہے جو طریقہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ (اور وہ اتباع سنت ہے)

وہ لوگ جن کے اعمال سنت کے مطابق تو نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت اللہ کے لئے خالص نہیں ہیں وہ بڑے گھاٹے میں ہیں۔ وہ جہاد اس لئے کرتے ہیں کہ بہادر کہلائیں، حج اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی شہرت ہو، تعلیم و تصنیف کا کام اس لئے کرتے ہیں کہ مؤلف اور مدرس کہلائیں۔ پس فی نفسہ یہ اعمال تو درست ہیں۔ مگر اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔

ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں۔

عبادت تو وہی مطلوب ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔ اور اس حق کو وہی لوگ ادا کرتے ہیں جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:-

اگر تو مشرکین عرب کے عقائد اور ان کے اعمال اور ان کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس زمانہ کے عوام اور جہلا کو دیکھ لو کہ وہ قبروں اور استھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی۔ اور ان کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔

(ملتقطاً۔ اردو ترجمہ)

ابو محمد امام الدین رام نگری

عقیدۂ توحید اور انسانیت

خدا کی ہستی اور اُس کی توحید کے عقیدے کو انسانی زندگی میں کس قدر اہمیت حاصل ہے، دُنیا نے اسے سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ اور اب مُسلمان بھی بڑی حد تک، اس حقیقت کی طرف سے غفلت اور جہول میں مُبتلا ہو گئے ہیں۔ خدا کی ہستی سے انکار انسان کو انسانیت سے دُور کر دیتا ہے اور یہی نتیجہ شرک کا ہوتا ہے۔ سچی انسانیت خدا کی ہستی اور اس کی توحید کے عقیدے پر موقوف ہے۔

انکارِ خدا کے مفاسد

انکارِ خدا کے مفاسد کا شمار نہیں ہے، خدا کا انکار انسان کو آوارہ مزاج بنا دیتا ہے، خدا کے منکر کے لئے سماج میں کوئی مرکزیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہر انسان خدا اور ہر انسان بندہ بن جاتا ہے۔ جس انسان کے ہاتھ میں بھی طاقت اور اقتدار کی لاٹھی آجاتی ہے، وہ انسانوں پر جانوروں کی طرح حکومت کرنے لگتا ہے۔ اور کمزور اور بے بس انسان جانوروں کی طرح اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ اقتدار و اختیار ایک انسان سے دُوسرے انسان کے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ایک با اقتدار انسان کے مرنے کے بعد دُوسرا انسان اس کے اقتدار پر قبضہ پا جاتا ہے یا قبضہ کر لیتا ہے۔ اور وہ انسانوں کو اپنے پسندیدہ راستہ پر ہانکنا شروع کر دیتا ہے۔ اور کبھی کوئی طاقتور اُٹھتا ہے اور صاحب اقتدار کے ہاتھ سے زبردستی عنانِ اقتدار چھین لیتا ہے اور انسانی گروہ پر حسب دلخواہ خدائی کرنے لگتا ہے۔

خداؤں کے تبادلے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی بندگی کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں اور انسانیت اسی طرح کُچلتی، پستی اور پامال ہوتی رہتی ہے۔ اس کو نہ کبھی سچی شرافت و عزت نصیب ہوتی ہے اور نہ سچا امن و اطمینان میسر آتا ہے۔ کبھی کوئی شریر انسان نمرود و فرعون کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، کبھی ہلاکو اور چنگیز کے روپ میں اور کبھی مسولینی، ہٹلر اور اسٹالن کی شکل میں، اور اُن کے ہاتھوں ملکوں اور قوموں میں ہمیشہ تباہی و بربادی اور ہلاکت و خونریزی کا بازار گرم رہتا ہے!

انسان پر انسان کی خدائی کی ایک پُر فریب صورت پارلیمنٹری اور مغرب زدہ جمہوری حکومت ہے۔ اس صورت میں بادشاہ اور ڈکٹیٹر کی بجائے انسانوں کا ایک منتخب گروہ خدائی کرتا ہے۔ اور اس خدائی کے اثرات و نتائج بھی کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو پہلی قسم کی خدائی کے۔ ہر نئے آنے والے گروہ کو یہ حق و اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اپنے سے پہلے گروہ کے راستہ کو غلط قرار دے دے اور انسانیت کو ایک بالکل ہی نئی راہ پر ہانکنا شروع کر دے۔ اس طرح راستوں کا اُلٹ پھیر ہوتا رہتا ہے اور انسانیت کو کبھی پریشانی اور سرگردانی سے نجات نہیں ملتی۔ زہر کے اس شجرِ خبیثہ سے برابر نئی نئی شاخیں اور کونپلیں پھُوٹتی رہتی ہیں جو نئے نئے زہریلے پھول اور پھل دیتی رہتی ہیں۔

شراب ایک روز انسانیت کے لئے زہر قرار دی جاتی ہے اور دوسرے روز تریاق بنا دی جاتی ہے۔ جوئے کی ایک قسم سے دل بھر جاتا ہے تو دُوسری صورتیں وضع کر لی جاتی ہیں۔ ایک قسم ممنوع ہوتی ہے تو دوسری قسمیں جائز بن جاتی ہیں۔ سود کی ایک صورت

کی مذمت کی جاتی ہے اور اُس کی جگہ بہت سی نئی صورتیں نکال لی جاتی ہیں۔ شادی ایک سے زیادہ خلافِ قانون قرار دے دی جاتی ہے اور حرام کاری کی ساری راہیں کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کسی دن ازدواجی زندگی ہر قید سے آزاد کر دی جاتی ہے، پھر اس کی غلطی تسلیم کی جاتی ہے اور سماج کو مقیّد ازدواجی زندگی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ عورتوں کی آزادی و مساوات کے نام پر اُن کو گھروں سے باہر لاکر کھیتوں اور کارخانوں میں مردوں کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بازاروں اور پارکوں میں پھرایا جاتا ہے۔ ہوٹلوں اور کلبوں میں اُن سے نچوایا اور گوایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو اسکولوں اور کالجوں میں نوجوانوں کے دوش بدوش بٹھایا جاتا ہے۔ اُن کو عشقیہ ادب کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور اُن کے سامنے انتہائی رنگین رومانی اشعار کی تشریح کی جاتی ہے اور اُن کے اندر وہ جنسی آگ بھڑکائی جاتی ہے کہ کنواریاں بیوی بننے سے پہلے ہی عملاً جنسی زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہو کر درسگاہوں سے نکلتی ہیں۔ اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔ اُن کو جنگی قواعد پریڈ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسلحہ دے کر محاذِ جنگ پر بھیج دیا جاتا ہے۔ اور فوجی کیمپوں اور خندقوں میں بھی حُسن و عشق کے رزم و بزم کا سلسلہ جاری رہتا ہے!

ان چیزوں کا نام رکھا جاتا ہے آزادیٔ نسواں، ترقیٔ نسواں، مساوات، خود کفیلی، پھر جب جنسی آوارگی حد سے زیادہ زور پکڑ جاتی ہے، نوجوان دن دہاڑے دوشیزاؤں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیتے ہیں۔ لڑکیاں شادی سے پہلے ہی مائیں بننے لگتی ہیں۔ بیویاں شوہروں کو چھوڑ کر عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگتی ہیں۔ عدالتوں میں دھڑا دھڑ طلاقوں کے دعوے دائر ہونے لگتے ہیں اور عائلی نظام پراگندہ ہونے لگتا ہے تو اصلاح و اخلاق کے وعظ شروع کر دیئے جاتے ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ انسانیت کے قیام و بقا کے لئے مردوں اور عورتوں کی زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا!

اس طرح کے واعظ سماج میں مقدّس خیال کئے جانے لگتے ہیں۔ ان کو مفکّر اور مصلح کا لقب دیا جاتا ہے اور اُن کی آواز بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ لیکن ترقی پسند گروہ ان مقدّس واعظین پر مُسکراتا ہے اور یہ فقرہ چُست کرتا ہے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

جہاں خدا ہی کا اقرار نہ ہو، وہاں خدا کی بازپرس اور اُس کے عذاب و عتاب کے خوف کا کیا ذکر۔ پوری انسانی زندگی بہیمانہ زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ دُنیا پرستی، نفس پرستی، خواہش پرستی اور مادیت پرستی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ظلم و فساد، بے ایمانی و بے انصافی، غداری و بدعہدی، جنگ و پیکار اور اس طرح کی تمام ناکردگیوں کو کردنی بنا دیا جاتا ہے!

شرک کے مفاسد

شرک یہ ہے کہ خدا کا اقرار کیا جائے، لیکن اس کے ساتھ اور بھی کم و بیش خداؤں کو مانا جائے۔ اُن کے متعلق بھی خدا کی طرح نفع و ضرر کا عقیدہ رکھا جائے اور خدا کی طرح ان کی بھی عبادت و بندگی کی جائے!

شرک کفر سے بھی زیادہ منافیٔ انسانیت ہے۔ وہ انسان کو انسانیت کے مجد و شرف سے بالکل محروم کر دیتا ہے، مُشرک انسانیت کے مقام سے اتنا گر جاتا اور اتنا پست و ذلیل ہو جاتا ہے کہ ہر طاقت اور اقتدار کے سامنے جھکنا اس کا مسلک و شعار بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ وہ ہر ہستی اور ہر شئے میں خدا کی نمود اور اس کی صفت دیکھنے لگتا ہے! وہ سورج کو دیکھتا ہے کہ زمین سے کتنا بلند اور روشن ہے۔ اور اس کی تابانی اور تپش کا یہ عالم ہے کہ کوئی آنکھ اُسے نگاہ بھر کر دیکھ نہیں سکتی!

چاند اور ستارے رات کی تاریکی میں ضیا بار اور روشن ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں نفع وضرر کے بہت سے خواص واثرات ہیں۔ اس لئے انسان نے ان کو معبود بنا لیا۔ آگ اور پانی کو دیکھا کہ ان میں بھی بڑی طاقت موجود ہے اور ان سے بھی انسان کے بہت سے منافع اور نقصانات وابستہ ہیں۔ آگ لوہے تک کو پگھلا کر پانی بنا دیتی ہے اور پانی کا سیلاب بڑی بڑی چٹانوں کو بھی اپنی رَو کے ساتھ بہائے جاتا ہے اس لئے ان کی بھی پُوجا شروع کردی۔ اس نظریہ نے پھیل کر جانور، درخت، دریا، انسان، غرض ہر چیز کو دائرۂ عبودیت میں داخل کر لیا ـــ!

شرک کی یہ پیاس بڑھتی ہی گئی، خدا کو مجسّم بنا کر سامنے لایا نہیں جا سکتا تھا۔ سورج، چاند، ستارے دسترس سے باہر تھے۔ اُن کو زمین پر اُتار لانا ممکن نہ تھا۔ فرشتے اور جن اور اَن دیکھی رُوحیں مرئی نہیں بنائی جا سکتی تھیں، اس لئے ان کی خیالی صورتیں تجویز کی گئیں۔ ان صورتوں کے بُت اور مجسّمے بنائے گئے۔ قوموں کے ممتاز انسانوں کو خدا کا اوتار اور مظہر کہا گیا اور اس طرح اُن کے ذریعہ جذبۂ پرستش کی تکمیل کی گئی ـــ!

اس عقیدے نے انسانیت کو خوب خوب ذلیل اور بے عزّت کیا ہے۔ انسانوں نے انسانوں ہی کو نہیں پُوجا ہے، انسانوں کے قدموں کے نقوش ہی نہیں پُوجے ہیں، مرد اور عورت کی شرمگاہوں کی شکلیں بنا کر بھی پُوج ڈالی ہیں۔ یہ اس تصوّر کے ماتحت کہ یہی تخلیقِ انسانیت کے مخرج ہیں۔ شیطان نے انسان کو کیسے کیسے فلسفے سکھائے ہیں اور کیسی کیسی پٹی پڑھائی ہے!

شرک اور کفر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں کی سرحدیں ایک دُوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ ایک خدا کے سوا جب دُوسری ہستیوں اور دُوسری چیزوں کو بھی خدا مان لیا جائے تو خدا کے اقرار اور انکار میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ جہاں سے غیر خدا کی خدائی کا اقرار شروع ہوتا ہے، ٹھیک اسی جگہ سے خدا کی خدائی کا انکار شروع ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ عقل وسائنس کا زمانہ ہے، عقل اور سائنس خدا کے انکار کو ضروری نہیں ٹھہراتیں۔ لیکن انسان نے اپنے جہل اور حماقت سے خود عقل اور سائنس کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور طے کر دیا ہے کہ عقل وسائنس کی رُو سے خدا کا عقیدہ محض وہم اور جاہلی زمانہ کا بقیہ ہے۔ ایسے زمانہ میں سورج، چاند، ستاروں، جانوروں، درختوں اور غیر مرئی ہستیوں کو کون خدا مانتا ہے۔ لیکن انسانی خدائی نے کامل ہمہ گیری کے ساتھ انسانیت پر اقتدار وتسلّط قائم کر لیا ہے۔ اب نمرود وشدّاد، فرعون وغیرہ جیسے انسان خدا نہیں ہوتے۔ اب اُن کی جگہ ملکوں اور قوموں کے لیڈروں، پارلیمنٹوں، صدروں، وزیر اعظموں اور ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے۔ جو خدا کی طرح انسانوں پر اپنے احکام وقوانین جاری کرتے ہیں۔

انسان خوشی اور ناخوشی سے، لالچ اور فریب سے، عقیدت ومحبت سے اپنے لئے خدا بناتے ہیں اور اُن کی اطاعت وبندگی کرتے ہیں۔ یہ خدائی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کے منتخب علماء وعقلاء۔ مدبّرین ومقننین اپنی انتہائی قابلیتیں صرف کرکے انسانوں کے لئے ایک دستورِ زندگی بناتے ہیں۔ لیکن آئے دن اُن میں تنسیخ وترمیم اور ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک برسرِ اقتدار پارٹی کے بعد دُوسری پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے اور ملک وقوم کی زندگی کو بالکل دُوسرے رُخ پر پھیر دیتی ہے۔ یہ چکّر چلتا رہتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کے بعد دُوسرا ڈکٹیٹر انسانی زندگی کا نظام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اور کل تک جس ڈکٹیٹر کے محاسن ومحامد کے کلمے پڑھے جاتے تھے اس کی نسبت کہتا ہے کہ وہ بڑا ہی ظالم، سفّاک اور انسانیت کُش تھا۔ ہماری پالیسی کو اُس کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح جو احکام وقوانین کل تک "حرفِ آخر" سمجھے جاتے تھے اُن پر خطِ تنسیخ پھیر دیا جاتا ہے۔ جو پارٹی کسی ملک میں انقلاب برپا کرتی ہے اُن میں سے ایک شخص کچھ لوگوں سے ساز باز کرکے تختِ اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے اور اپنے رفقائے انقلاب

میں سے جن لوگوں کو اپنے مفاد کے خلاف دیکھتا ہے اُن کو ملک و قوم کا دشمن قرار دے کر گولیوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔ جیلوں میں ٹھونس دیتا ہے، ملک کے کسی دُور دراز ارضی جہنم میں ڈال دیتا ہے اور اُن بیچاروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس شرک اور انسانی خدائی میں خود خدا کا یہ حال ہوتا ہے کہ اُسے مندروں، مسجدوں، خانقاہوں، گرجاؤں اور معبدوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اور خدا کے ماننے والے انسانوں پر یہ پابندی لگا دی جاتی ہے کہ تمہارا اور تمہارے خدا کا معاملہ تمہاری ذات تک محدود ہے۔ تم جس طرح چاہو اپنے دل میں خدا کو مانو۔ اور اپنے گھر میں جیسے چاہو خدا کو پوجو۔ لیکن گھر سے باہر نکلو تو خدا کو ساتھ لے کر نکلنے کی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ ع

یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ!

خدا کو انسان کی اجتماعیت کے معاملہ میں کوئی حصہ اور دخل حاصل نہیں۔ خدا کو اس طرح ماننا اس کے انکار کی کھلی ہوئی صورت ہے۔ جو لوگ اس طرح خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خدا کا علانیہ انکار اور اُس سے بغاوت کرتے ہیں۔ وما قدروا اللہ حق قدرہٖ!

سچی انسانیت اور عقیدۂ توحید اُوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انکارِ خدا کا عقیدہ ہو یا شرک کا، دونوں انسانیت کے لئے نہایت ذلیل کُن اور ہتک آمیز ہیں۔ ان عقیدوں میں انسانی عزت و شرافت کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ سچی انسانیت کا دارومدار عقیدتِ الٰہ اور عقیدۂ توحید الٰہ پر ہے۔ صرف خدا کو خدا ماننا اور اُسی کی عبادت و بندگی کرنا سچی انسانیت کی راہ ہے۔ سچی انسانیت یہ نہیں ہے کہ کچھ انسان خدا ہوں اور باقی اُن کے بندے۔ کچھ حاکم و فرمانروا ہوں اور باقی محکوم و فرمانبردار۔ کچھ انسان اپنے احکام و قوانین جاری کریں اور باقی انسان بندوں کی طرح اُن کے جاری کئے ہوئے احکام و قوانین کی پابندی پر مجبور ہوں —!

سچی انسانیت یہ ہے کہ ایک خدا حاکم و فرمانروا ہو۔ اُسی کے احکام و قوانین چلیں اور تمام انسان ان احکام و قوانین کے پابند ہوں۔ کسی انسان کو کسی انسان پر فوقیت و برتری حاصل نہ ہو۔ فوقیت و برتری اور عزت و شرافت کا ایک ہی معیار ہو۔ وہ معیار ہو خدا کے ساتھ وفاداری، خدا کی اطاعت و بندگی اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی، خدا ترسی اور اس کی رضا جوئی۔ جو ان چیزوں میں جتنا پیش پیش اور سرگرم ہو، وہ اتنا ہی شریف و معزز اور اعلیٰ انسان سمجھا جائے اور اس اعتبار سے اسے ملک و قوم اور حکومت میں مرتبہ، درجہ اور منصب حاصل ہو۔

اسی کا نام ہے حقیقی انسانیت، باقی سب صورتیں انسانیت کشی کی ہیں!

سچی آزادی اور عقیدۂ توحید آج کل آزادی، آزادی کا بڑا شور ہے۔ لیکن سچی آزادی عنقا ہے۔ شاید اس طرح انسانی آزادی کا خون انسانی تاریخ میں اب سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پابندیوں میں جکڑی ہوئی انسانیت مفلوج اور بے بس ہو کر دم توڑ رہی ہے!

انسان کو سچی آزادی اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے، جب صرف خدا کو خدا مانا جائے۔ انسانوں پر انسانوں کی خدائی نہ ہو۔ انسانوں پر انسانی اقتدار قائم نہ ہو۔ انسانوں پر انسانوں کو اپنا حکم چلانے کا اختیار نہ ہو۔ تمام انسان بالاتفاق یہ اصول تسلیم کر لیں کہ انسانوں پر انسانوں کے نہیں خدا ہی کے احکام و قوانین جاری ہونے چاہئیں!

جب تک یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے گا، زمین پر سچی انسانیت قائم نہیں ہو سکتی۔ انسانوں پر انسانی آئین و قوانین کی حکومت اور سچی آزادی دونوں متضاد چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں ــــ!

سچی مساوات اور عقیدۂ توحید

طاقت وحکومت اور اقتدار کے زور سے عام پروپیگنڈا کر کے مساواتِ انسانی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ حالانکہ سچی آزادی کی طرح سچی مساوات کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ سچی مساوات سے تو انسانیت اسی صورت میں بہرہ ور ہو سکتی ہے کہ اس تصور ہی کو ممنوع اور خلافِ قانون قرار دے دیا جائے کہ انسانوں کا کوئی فرد یا گروہ انسانوں پر اپنے احکام و قوانین کے ذریعہ حکومت و فرمانروائی کر سکتا ہے۔ اور اسے انسانی زندگی کا بنیادی عقیدہ قرار دے دیا جائے کہ پوری انسانیت پر خدا ہی کے احکام و قوانین چلنے چاہئیں ــــ!

سچی حریت و مساوات کی واحد راہ خدائے واحد کی اطاعت وحکم برداری ہے۔ یہ صرف عقیدہ کی بات نہیں ہے۔ ایک عقلی اور تجربی حقیقت بھی ہے۔ انسان جب خود انسانوں کے لئے دستور و قوانین بنائے گا تو مساواتِ عامہ کی رعایت کے احساس کے باوجود عدم مساوات سے کامل طور پر دستور و قوانین کو پاک رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ عوام کے مقابلہ میں حکومت کے کارفرما اور اہلِ مناصب طبقے کے لئے کچھ نہ کچھ ترجیحی قوانین ضرور بنائے گا۔ جن میں اس طبقہ کے حقوق واختیار کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہوگی ــــ چنانچہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی اصول و نظریہ کے دستور وآئین کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں صدر جمہوریہ، ڈکٹیٹر، بادشاہ، صوبہ کے گورنر وغیرہ کے لئے استثنائی اور ترجیحی قوانین ضرور ملیں گے۔ ان کی تنخواہوں، اور بھتّوں (Allowances) میں بھی اُن کی واقعی اور حقیقی ضروریات پر نظر نہ ہوگی۔ بلکہ اُن کے اس مصنوعی عہدہ و منصب کے اعتبار سے ان کا مشاہرہ اور بھتہ مقرر ہوگا۔ خواہ اس کے لئے دوسرے ملازمین کے جائز حقوق ہی دبانے پڑیں یا عوام پر ٹیکس ہی لگانے پڑیں۔ اسی طرح ان کے رہنے کے قصر وایوان، شان وشوکت اور عیش و آرام کے سامان میں غیر معمولی اہتمام سے کام لیا جائے گا۔ خواہ عوام کو ضرورت کے مطابق رہنے کے لئے مکان، پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن پوشی کے لئے کپڑے نصیب نہ ہوں۔ غرض مشاہرہ، بھتہ، مکان، خوراک، لباس، سواری، ہر چیز میں حکومت کے کارفرما اور سرکردہ طبقہ کو خصوصی حقوق حاصل ہوں گے ــــ!

عدم مساوات کا یہ وہ پودا ہے، جس کی جڑ اُوپر ہوتی ہے اور شاخیں نیچے کی جانب بڑھتی پھیلتی چلی آتی ہیں، چنانچہ یہ عدم مساوات بالائی اہلِ مناصب سے زیرین حکام میں۔ اور اُن سے پورے سماج میں پھیل جاتی ہے اور یا تو مساوات کا نام ہی نام رہ جاتا ہے یا کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا ــــ!

سچا انصاف اور عقیدۂ توحید

دُنیا میں آئین و قوانین کے بڑے بڑے دفاتر موجود ہیں۔ بڑی بڑی عدالتیں قائم ہیں۔ جن میں آئین و قوانین کے بڑے بڑے ماہرین اُونچی اُونچی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ لیکن سچا انصاف مفقود ہے۔ اس لئے کہ انصاف کی بنیاد ہی ناانصافی پر قائم ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی کہ انسان انسانوں کے خدا بن جائیں اور خدا کی تفویض کی ہوئی امانتِ اختیار کو اس کے نائندے بن کر استعمال کرنے کی بجائے مختارِ مطلق بن کر اس کا استعمال کریں ــ انسان خدا ہی کے معاملہ میں نامنصف بن جائے تو وہ انسانوں کے معاملہ میں کیسے منصف ہو سکتا ہے؟

جب کوئی برسرِ اقتدار انسان یا انسانوں کا کوئی برسرِ اقتدار گروہ انسانوں کے قوانین بناتا ہے تو ان قوانین کی تشکیل و تخلیق ہی میں بے انصافی موجود ہوتی ہے۔ اربابِ اقتدار کے لئے کچھ قوانین ہوتے ہیں اور باقی انسانوں کے لئے کچھ۔ اور جب یہ گھٹیا اور ناقص قسم کے غیر منصفانہ قوانین انصاف ناآشنا انسانوں کے ذریعہ استعمال میں آتے ہیں تو یہ اور بھی انصاف کش بن جاتے ہیں ــــ!

انصاف کے نام سے ایوانِ حکومت سے لے کر گلی و کوچہ، دفتر، کچہری اور عدالت تک میں بے انصافی کا دَور دورہ ہو جاتا ہے۔ بے انصافی کے قتیل تڑپتے، کراہتے اور نالہ و فغاں کرتے رہتے ہیں، لیکن کوئی شنوا نہیں ہوتا ۔۔۔!

انسانیت کے ساتھ سچّا انصاف خدائی آئین و قوانین ہی کے ذریعہ ممکن ہے، جن میں انسانی خود غرضی، افادیت پسندی اور اقتدار پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اور وہی حاکم اور منصف سچّا انصاف کر سکتے ہیں جو خدا اور خدا کی بازپرس پر ایمان رکھتے ہوں ۔۔۔!

سچا امن اور عقیدۂ توحید

آج ہر ظالم، ہر مفسد اور ہر امن شکن ملک اور قوم کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں وہی امن کی واحد علمبردار ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ امن و انصاف کی سب سے بڑی دشمن وہی قومیں ہیں جو امن و انصاف کا پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔ ان بدامن قوموں کے ہاتھوں ساری دُنیا کا امن تباہ ہے۔ کمزور قومیں جو آزادی چاہتی ہیں اور جو امن و سکون کی زندگی کے لئے تڑپ رہی ہیں، امن و امان کی جھُوٹی مدعی قوموں نے اُن کی عافیت تنگ کر رکھی ہے۔ غریبوں کو چین نہیں لینے دے رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک سے زیادہ دُنیا کے امن و امان کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ کمزور قومیں اپنے ملک میں بھی آزاد نہیں رہ سکتیں۔ اُبھر نہیں سکتیں، ترقی نہیں کر سکتیں۔ اگر وہ ادھر اُدھر سے اپنی حفاظت و بقا کا کوئی سامان کرتی ہیں تو طاقتور قوموں کی طرف سے توازن بگڑنے کا شور برپا کیا جاتا ہے، کوئی طاقتور قوم مغرب کے کسی جزیرہ میں بستی ہے۔ اور کوئی شمال کے کسی دور دراز کے خطۂ زمین میں، اور کوئی جنوب کے کسی دُور کے ملک میں۔ لیکن دُنیا کے کسی خطّہ میں کوئی کمزور اور چھوٹی سی قوم بھی اپنی فلاح و بہبود کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتی ہے تو طاقت کا توازن ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے اور بڑی بڑی اقتدار پرست قوموں کی فوجیں امنِ امان کے قیام کے نام سے نقل و حرکت میں آجاتی ہیں۔ بگڑتا ہے ان استعمار پسند قوموں کے اقتدار و قوّت کا توازن اور شور مچ جاتا ہے دُنیا کی قوّت کے توازن کے بگڑنے کا۔ دُنیا نام ہے دُنیا کے مفسد اور امن شکن قوموں اور ملکوں کا۔ اور امن نام ہے اُن کے وقار و تمکن کا ۔۔۔!

امنِ عالم کے بقا و تحفظ کے لئے دُنیا کی قوموں کی ایک مجلس بنائی گئی ہے۔ اس کی ایک جنرل کونسل یا مجلسِ عظمیٰ ہے۔ اور ان میں جو بڑی بڑی طاقتور اور با اقتدار قومیں ہیں، انہوں نے اپنی ایک بالادست مجلس بنالی ہے، اس کا نام سلامتی کونسل ہے، جسے حفاظتی کونسل بھی کہتے ہیں۔ اس کونسل کا ایک قانون یہ ہے کہ کسی اختلافی معاملہ میں متعلقہ قومیں ایک رائے ہوں۔ صرف ایک قوم کو اس سے اختلاف ہو۔ اور وہ ان کے فیصلے کے ماننے سے انکار کر دے تو وہ فیصلہ رد ہو جائے۔ کیا غیر مہذب اور جاہل دُنیا نے بھی کبھی حق و انصاف کا ایسا قانون وضع کیا تھا؟

یہی قومیں ہیں امنِ عالم کی علمبردار۔ اور محافظِ امن، یہ مجلس بھی در اصل ان مفسد قوموں نے دُنیا کے امن و امان کے تحفظ و بقا کے لئے نہیں بنائی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو جنگ سے خود اپنے اقتدار و تمکن اور اپنے امن و امان کے لئے خطرہ ہے۔ ان کو یہ ڈر ہے کہ دُنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں کہیں اُن کے اقتدار سے نکل نہ جائیں اور اُن کے اقتدار کی فلک بوس عمارتیں منہدم نہ ہو جائیں۔ لیکن جب انہی قوموں کے مفاد و مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی اُبھرتی ہوئی قوم کو کچل دیں تو وہ خود اپنی ہی بنائی ہوئی مجلس کے قوانین و ضوابط کو پوری بے رحمی اور بے حیائی کے ساتھ توڑ کر رکھ دیتی ہیں اور اُن کی ہمنوا قومیں پوری بے شرمی اور بیباکی کے ساتھ اُن کے اس قانون شکن اور دشمنِ امن اقدام کے رُوکنے میں ڈھیل اور حیلے حوالے سے کام لینے لگتی ہیں ۔۔۔!

ان خرابیوں کی تہ میں جو فساد کام کرتا رہتا ہے اُن پر بے خدا اندھی قوموں کی نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ فساد در اصل خدا کے انکار یا خدا کے ساتھ شرک کا نتیجہ ہے، خدا کی اطاعت و بندگی سے آزاد قومیں اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہیں کہ وہ انسانیت، انسانی شرافت اور حق و انصاف ہی سے آزاد ہو جائیں ـــ!

دُنیا میں حقیقی امن اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب دُنیا کی قومیں خدا کو مانیں اور اُسی کے آئین و احکام کو انسانی زندگی کا دستور اور ضابطہ تسلیم کرلیں۔ جب دُنیا کی تمام قومیں ایک ہی خدا کو مانیں گی۔ ایک ہی اقتدار کو تسلیم کریں گی۔ ایک ہی دستور و آئین کی پابند ہوں گی اور خدا کی باز پُرس اور اس کی جزا و سزا کے عقیدے کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیں گی تو کوئی قوم کسی قوم کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی نہ کرے گی اور دُنیا میں سچے امن و انصاف کی بُنیاد قائم ہوجائے گی ـــ!

مجلسِ اقوام کو ایک بے لاگ اور منصفانہ دستور و آئین کی ضرورت ہے۔ جس میں نہ کسی قوم کو غیر منصفانہ فوقیت دی گئی ہو، نہ کسی قوم کو غیر منصفانہ طور پر دبانے کی گنجائش ہو۔ ایسا دستور اور آئین صرف خدائی دستور و آئین ہوسکتا ہے جو خدا کے اقتدار و حاکمیت پر مبنی ہو۔

اگر دُنیا کی دُوسری قومیں خدائی دستور و آئین پر رضامند نہ ہوں تو صرف وہ قومیں جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور جو خدا کی توحید اور اس کے دستور و آئین کے ماننے ہی کی بنا پر اپنے کو مسلمان کہتی ہیں، اپنی حکومت اور اپنی پوری زندگی خدائی دستور و آئین کو نافذ کریں۔ اور خدائی حکومت اور اسلامی زندگی کا دُنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ دیکھ لیں گی، کہ دُنیا کی دُوسری قومیں کس طرح خدائی آئین و ضوابط اور اسلامی زندگی اختیار کرنے کے لئے بہ رضا و رغبت آمادہ ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ اعترافِ حق کے ساتھ خدائی دستور و آئین کو قبول نہ کریں گی جب بھی وہ اس کی نقل کرنے پر مجبور ہوجائیں گی۔ اور اس صورت سے دُنیا کے فساد اور انسانیت کے بگاڑ میں بڑی حد تک کمی ہوجائے گی اور انسانیت روز روز کے فساد اور بدامنی کے گرداب سے نکل کر امن و امان کا ڈانواں ڈولتا ساحل صحیح پالے گی ـــ!

اسلام انسانیت کا عالمگیر نظام ہے

اسلام انسانیت کا عالمگیر نظام ہے۔ اس کا مقصد ہی دُنیا میں انسانیت پیدا کرنا۔ انسانیت کو فروغ دینا اور اسے پروان چڑھانا ہے۔ اس کی پُوری تاریخ شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ اور جہاں اور جب اسلامی قوانین و ضوابط پر عمل ہوا ہے انسانیت سارے دُکھوں اور دردوں سے نجات پا گئی ہے۔ اور سچی انسانیت کا نمونہ وجود میں آگیا ہے۔ انسانیت کو جو کچھ مطلوب ہے۔ یعنی سچی آزادی، سچی مساوات، سچا انصاف، سچا امن۔ وہ سب اسلام کے دامن میں انسانیت کو بدرجۂ اتم یکجا فراہم مل سکتا ہے!

دعوتِ محمدی کے ظہور کے زمانہ میں دُنیا کی حالت

انسانیت کو تباہ کرنے والے جتنے عقائد و اعمال ہوسکتے ہیں دعوتِ محمدی کے زمانے میں وہ سب موجود تھے اور دُنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں موجود تھے۔ کسی ملک اور کسی قوم میں سچی انسانیت موجود نہ تھی۔ مثلاً:۔

(۱) دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو صرف ایک خدا کو ماننے والی ہو۔ پُوری دُنیا میں شرک کا دَور دورہ تھا۔ انسان بندہ تھا اور ہر مخلوق معبود تھی۔ سورج، چاند، ستاروں، فرشتوں، جنوں، رُوحوں سے لے کر جانوروں اور درختوں تک کی پُوجا ہوتی تھی۔ اور مختلف ملکوں میں انسان خدا کا مظہر اور اس کا نمائندہ بن کر انسانوں سے خدا کی عبادت و بندگی نہیں بلکہ اپنی پُوجا بھگتی کراتا تھا۔ یونانیوں کے

تین خدا تھے۔ پیٹر، مزدا اور بکسش۔ مصریوں کے بھی تین خدا تھے۔ اوزیسس، آیسس اور ہورس۔ ایرانی دو خدا مانتے تھے۔ یزداں نیکی کا خالق تھا اور اہرمن بدی کا۔ عیسائیوں نے خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی ماں کو خدا ٹھہرا لیا تھا۔ ہندوستان میں خدا کا توحیدی تصور موجود تھا۔ لیکن خدائی تین خداؤں کی مانی جاتی تھی۔ برہما، وشنو اور مہیش کی۔ پھر انہی تین خداؤں تک پوجا اور پرستش موقوف نہ تھی۔ بے شمار دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کی پوجا ہوتی تھی۔ انہی معبودوں میں مرد اور عورت کے جنسی اعضاء کی شکلیں بھی تھیں۔ اور آج بھی ہندوستان کے ہر شہر و دیار میں ان کے مظاہر عام ہیں ـــ!

(۲) جب دُنیا میں کہیں توحید کا وجود ہی نہ ہو۔ ایک سے زائد خدا کی عبادت و بندگی ہو رہی ہو تو ایک خدا کے آئین و قوانین کا کیا ذکر؟ اُس زمانہ میں تو دُنیا جمہوریت اور حقوقِ عامہ کے تصور سے بھی ناآشنا تھی۔ انسانوں پر انسانوں کے احکام و قوانین چل رہے تھے ـــ!

(۳) انسانیت کو دُنیا کے کسی ملک اور کسی خطہ میں بھی حریت و آزادی نصیب نہ تھی۔ تمام دُنیا میں شخصی اور خاندانی حکومتیں قائم تھیں۔ ایک انسان کہیں بادشاہ اور راجہ بن کر اور کہیں شہنشاہ اور مہاراجہ بن کر ملک اور قوم پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی زبان اور مرضی ہی قانون تھی۔ اُس کے مُنہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو دینی تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ کوئی اس کی نافرمانی کا تصور تک دل میں نہ لا سکتا تھا۔ بادشاہ اور راجہ کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا جاتا تھا۔ اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکے جاتے تھے۔ اور اُسے سجدہ کیا جاتا تھا۔ گویا وہ بادشاہ اور راجہ ہی نہیں معبود بھی تھا۔

(۴) جہاں حریت و آزادی ہی کا فقدان ہو، وہاں مساوات کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ دولت و ثروت، عزت و شرافت، عیش و راحت، اختیار و اقتدار، غرض ایسی تمام چیزیں مٹھی بھر انسانوں کا ورثہ تھیں۔ یہ مٹھی بھر انسان تھے بادشاہ، راجہ، اُن کے اہلِ خاندان اور عمائد اور زیادہ سے زیادہ اُن کے قبیلہ و خاندان کے لوگ ـــ!

ہندوستان میں ایک انسانیت چار ٹکڑوں میں بانٹ دی گئی تھی۔ جن کو برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس ملک میں جانور مقدس اور قابلِ پرستش تھے۔ مگر شودر کتے اور سُور سے بھی زیادہ ذلیل تھے۔ کتے اور سُور اچھوت نہ تھے۔ مگر ان انسانوں سے کوئی چھو جاتا تو وہ ناپاک ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کے ایک وسیع تر فرقہ کو آج بھی اس غیر مساواتی تقسیم پر اصرار ہے! اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور ملک کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ گنگا اُلٹی بہتی رہے۔ انسان انسان برابر نہ ہوں، کچھ انسان پاک سمجھے جائیں اور کچھ پیدائشی ناپاک، یہ طے ہے کہ ناپاکوں کے لئے انسانیت و پاکیزگی کا دروازہ قدرتی طور پر بند ہے۔ وہ کسی طرح انسانیت اور پاکیزگی کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتے ـــ!

نوعِ انسانی کے اندر یہ تفریق و تقسیم اور طبقہ بندی ہندوستان کے ساتھ خاص نہ تھی۔ روم، مصر، یونان، فارس، غرض دُنیا کے جتنے مانے ہوئے مہذب اور تمدن یافتہ ملک تھے، سب میں یہ تقسیم اور طبقہ بندی موجود تھی۔

(۵) جس دُنیا میں ایک خدا کے بجائے بہت سے خداؤں کو مانا جاتا ہو۔ انسان خدا بن کر انسانوں پر خدائی کر رہا ہو۔ ہر بادشاہ، راجہ اور فرمانروا کی زبان قانون کا سرچشمہ ہو۔ عوام کی کوئی آواز نہ ہو۔ انسانی مساوات مفقود ہو۔ تفریق اور طبقہ بندی قانونِ قدرت کا حکم رکھتی ہو۔ اس دُنیا کے متعلق قانونی مساوات یا قانونی انصاف کا تصور ایسا ہی ہوگا جیسے یہ سوچنا کہ قمری مہینہ کے آخری عشرہ میں بھی پوری رات چاندنی ہوگی یا رات میں بھی آفتاب شعاعیں بکھیر رہا ہوگا۔

اونچے طبقہ کا کوئی آدمی نیچے کے طبقہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا معمولی تھی۔ لیکن اگر نچلے طبقہ کا آدمی، اونچے طبقہ کے

کسی شخص کے ساتھ گستاخی بھی کرتا تو وہ گشتنی قرار دیا جاتا۔ اور نیچے کے طبقہ کا کوئی شخص اُونچے طبقہ کے ایک آدمی کو مار ڈالتا تو اس جرم میں اس طبقہ کے متعدد آدمی قتل کر دیئے جاتے۔ یہ تھا قانونِ انصاف!

بعثتِ محمدی - دعوتِ اسلام کا آغاز

تاریخ کے اُس جاہلی اور تاریک دور میں:۔

(۱) جب دُنیا خدا کی توحید کو فراموش کر چکی تھی۔

(۲) جب انسان خود انسانی عظمت و شرافت کو بھلا چکا تھا۔

(۳) جب دُنیا میں انسانی آزادی کا نام باقی نہ تھا۔

(۴) جب انسانیت مساوات کے نام سے نا آشنا ہو چکی تھی۔

(۵) جب دُنیا میں انصاف ناپید تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپ نے دُنیا کو اسلام کی دعوت دی۔ اسلام کا بُنیادی کلمہ تھا۔ لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی معبود اور حاکم نہیں۔ کتنا مختصر اور سادہ پیغام تھا۔ لیکن یہ انسانیت کا شاہ کلید تھا۔ یہی چند لفظوں کا ایک چھوٹا سا کلمہ انسانیت کے سارے دُکھوں اور دردوں کا نسخۂ شفا تھا۔ خدا کی وحدانیت ہی کا اعلان نہ تھا۔ یہ اعلان تھا۔

۱۔ کائنات کی سب سے بڑی سچائی کا۔

۲۔ انسانیت کی حقیقی عظمت و شرافت کا۔

۳۔ انسانی حریت و آزادی کا۔

۴۔ اُخوت و مساوات کا۔

۵۔ حقیقی عدل و انصاف کا۔

۶۔ عالمگیر اصولِ امن کا۔

دُنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ میں خدا کی طرف سے پیغامبر اور ہادی آئے تھے۔ اور ہر پیغمبر اور ہر رہنما کی پکار تھی لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ انما الٰھکم الٰہ واحد۔ تم سب کا خدا خدائے واحد ہے۔ یہ دعوت مغرب و مشرق شمال و جنوب، ہر خطہ اور ہر ملک میں بسنے والی قوموں کی مشترکہ میراث تھی۔ لیکن تمام قومیں اس مشترکہ میراث کو گم کر چکی تھیں ۔۔۔!
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچھم والوں کے لئے بھی آئے تھے اور پورب والوں کے لئے بھی۔ اُتر والوں کے لئے بھی اور دکھن والوں کے لئے بھی۔ گوروں کے لئے بھی اور کالوں کے لئے بھی۔ آپ نے خدا کی طرف سے ہر ملک اور ہر قوم میں آنے والوں کے اس پیغام کو زندہ کیا۔ دُنیا کے تمام انسانوں کی گم شدہ میراث اُن کے سامنے رکھ دی۔ محمد رسول اللہ کا یہ تمام دُنیا پر اور دُنیا کی ساری قوموں پر ایک احسانِ عظیم تھا ۔۔۔!

محمد رسول اللہ کے اس بنیادی پیغام نے انسانیت کی کایا پلٹ کر دی۔ اس کا لُٹا ہوا سُہاگ اسے واپس مل گیا۔ اس کا تاریک چہرہ چمک اٹھا۔ انسانیت کے سارے دُکھ درد دُور ہو گئے۔ انسانیت نکھر گئی۔ اس کی رگوں میں صحت و توانائی کا نیا خون گردش کرنے لگا۔ انسانیت کی:۔

(۱)۔ غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ اب انسان خدا کے سوا کسی کا غلام نہ تھا۔ انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ تھی۔ انسان خدا کے سوا کسی کا محکوم نہ تھا۔!

۲- انسانوں میں نہ کوئی بڑا رہا نہ کوئی چھوٹا - اونچ رہا نہ نیچ - چھوت رہا نہ اچھوت، پوتر رہا نہ چانڈال - قوموں قوموں کا جھوٹا امتیاز مٹ گیا، مغرب و مشرق کا امتیاز مٹ گیا - گورے کالے، رنگ و نسل، ورن اور طبقہ کی تفریق و تقسیم باقی نہ رہی - ہر انسان انسان تھا، ایک دوسرے کے برابر کا انسان - سب کی حیثیت برابر تھی - سب کی عزت برابر تھی - سب کے حقوق برابر تھے - سب کے لئے ایک قانون تھا - اگر بڑائی اور چھوٹائی تھی تو صرف اس اعتبار سے کہ کون دل کی زیادہ سچائی کے ساتھ خدا کے قانون کی پابندی کرتا ہے - کون خدا سے زیادہ ڈرتا ہے - کون خدا کی رضا و خوشنودی کی طلب کی زیادہ فکر رکھتا ہے - کس کی زندگی بلحاظ اخلاق و عمل، بلحاظ سلوک اور برتاؤ، بلحاظ لین دین زیادہ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے - ان تمام چیزوں میں جو بڑھ کر تھا وہ زیادہ اونچا اور زیادہ قابلِ عزت تھا اور جو کم تھا وہ کم اونچا اور کم عزت کے لائق تھا - اور جس میں سرے سے یہ باتیں نہ تھیں وہ بالکل حقیر و ذلیل تھا -!

۳- انصاف سب کے لئے عام تھا، قانون کی پابندی میں کسی کے لئے کوئی رعایت نہ تھی - حاکمیت خدا کی تھی - باقی سب محکوم اور رعایا تھے خدائی حکومت کے بڑے سے بڑے سربراہ کار کو بھی جو خلیفہ اور امیر المومنین کہلاتا تھا، قانون کی نظر میں کوئی امتیاز حاصل نہ تھا، اسے کسی قسم کی استثنائی اور ترجیحی حقوق حاصل نہ تھے -

۱- نماز سب پر فرض تھی -
۲- زکوٰۃ سب پر فرض تھی اگر صاحبِ نصاب ہو -
۳- روزہ سب پر فرض تھا اگر معذور نہ ہو -
۴- حج ہر صاحبِ نصاب پر فرض تھا اگر کوئی شرعی امر مانع نہ ہو -
۵- حلال و حرام کی پابندی سب پر فرض تھی -
۶- شراب سب کے لئے حرام تھی -
۷- زنا سب کے لئے حرام تھا -
۸- جوا سب کے لئے حرام تھا -
۹- چوری سب کے لئے حرام تھی -
۱۰- سود سب کے لئے حرام تھا -
۱۱- خونِ ناحق سب کے لئے جرم تھا -
۱۲- ہر جرم کی سزا جو بڑے کے لئے تھی وہی چھوٹے کے لئے تھی - حکومت کا سب سے بڑا سربراہ کار اور سب سے بڑا سرکردہ بھی کسی جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہ تھا - اور نہ اس کے لئے قانون میں کوئی رعایت تھی -!

اسوۂ محمدی

(۱) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا پرستی اور نیک کرداری کا نمونہ تھے - آپ کی ذات قدسی صفات ہر گناہ اور معصیت سے پاک تھی - وہ معصوم اور سراپا خیر ہی خیر اور نیکی ہی نیکی تھے - آپ میں کوئی برائی اور بدی نہ تھی - آپ سے جو کچھ صادر ہوتا تھا وہ خیر ہی ہوتا تھا - لیکن خود ان کا حال یہ تھا کہ وہ جس نیکی اور خیر کا دوسروں کو حکم دیتے، اسی کی سب سے زیادہ خود پابندی کرتے، انہوں نے دنیا کو لا الٰہ الا اللہ، کی دعوت دی تو ان کی زندگی توحید پرستی کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک نمونہ تھی - دنیا کی تمام قوموں نے اپنے ہادی و پیشرو کو خدا بنا کر پوج ڈالا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے سب سے

زیادہ بڑھ چڑھ کر تے - پھر انسان اُن کو سب سے بڑا خدا بنا کر اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کیوں نہ پُوجنے لگتا؟ لیکن آپ نے اس ضلالت کے ہر دروازہ اور ہر رخنہ کو پوری سختی سے بند کر دیا۔ آپ نے دُنیا کو اپنے متعلق جو تعلیم دی اُس کا بنیادی کلمہ ہے۔ "اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ" "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور رسول ہیں۔ یعنی خدا کی خدائی میں محمدؐ کا کوئی حصہ اور ساجھا نہیں ہے۔ اُن کی اوّلین حیثیت خدا کے بندے کی ہے۔ وہ پہلے خدا کے بندے ہیں، اس کے بعد خدا کے رسول۔ اور یہی اُن کی حیثیت کی آخری حد ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی۔ اے محمدؐ! تم کہہ دو کہ میں تمہارے جیسا ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی بھیجی جاتی ہے۔ یعنی میں خدا کا رسول ہوں۔

آپؐ نے اپنی ہر ہر ادا سے خدا کے حضور اپنے عجز و بندگی کا اظہار کیا۔ آپؐ رات کو اس کثرت سے نماز پڑھتے کہ آپؐ کے پائے مبارک ورم کر آتے۔ نماز میں خوفِ خدا سے اس طرح روتے کہ آپؐ کے اندر سے آگ پر جوش مارتی ہوئی دیگ کی سی آواز آتی۔ آپؐ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور ہر کام خدا کا نام لے کر شروع کرتے۔ آپؐ مختلف وقتوں میں خصوصاً رات کی تنہائیوں میں خدا سے کس عاجزی اور بے چارگی کے ساتھ دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آپؐ کی ایک دعا کے کچھ لفظوں کا ترجمہ یہ ہے:-

> "میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جُو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں۔ جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں، جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتے ہیں۔ تجھ سے مانگتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ مانگتا ہے۔ اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے سامنے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو" (کنز العمال)

جب آپؐ رات کی نماز میں اتنی مشقت کرتے کہ پاؤں ورم کر آتے اور آپؐ سے کہا جاتا کہ خدا نے تو آپ کو کسی گناہ کے بغیر ہی یہ بشارت دے دی ہے کہ آپؐ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے گئے پھر آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ تو فرماتے۔ "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟" غرض ہر طرح آپ نے دُنیا پر یہ واضح کر دیا کہ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ! میں بھی خدا کا بندہ ہوں، اُس کی خدائی کا شریک نہیں ہوں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسروں کو خدا کی حکمبرداری کی تعلیم دی تو سب سے زیادہ سختی کے ساتھ خود خدا کے احکام کی پابندی کا نمونہ پیش کیا۔ آپؐ کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی خدا کے حکم کے خلاف نہ ہوتی تھی۔ آپؐ بولنے اور دیکھنے اور سُننے تک میں خدا کے حکم کی پابندی کرتے تھے۔ آپؐ کی پوری زندگی خدا پرستی اور خدا کی حکمبرداری کا نمونہ تھی۔ کسی نے آپؐ کی بیوی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی سیرت و کردار کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب دیا۔ "کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟" مطلب یہ تھا کہ آپؐ کی پوری زندگی خدا کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن مجید کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو مساوات کی تعلیم دی۔ تو خود اس کا نمونہ اس طرح پیش کیا کہ اپنے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اور اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اُن کے عقد میں دے دیا۔ حضرت بلال اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہما بھی آزاد کردہ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو اپنے گھر والوں ہی میں شامل کر لیا تھا۔ یہ دونوں بزرگ آپؐ کے خاندان اور آپ کی قوم کے بڑے بڑے عالی مرتبہ صحابہ کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ آپ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرح پیار اور محبت کرتے تھے۔ غلاموں کی دعوت قبول فرماتے اور وہ جو روکھا سوکھا کھانا پیش کرتے اُسے خوشی سے کھا لیتے۔ لونڈیوں کی درخواست پر اُن کے ساتھ جاتے اور اُن کے مالکوں سے اُن کی طرف سے سفارش فرماتے۔ اپنے صحابہ کے ساتھ چلتے تو اُن میں اس طرح مل جل کر چلتے کہ جو آپؐ سے ناآشنا ہوتا اُسے پتہ نہ چلتا کہ ان میں خدا کے رسولؐ کون ہیں۔ صحابہ کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ صدر و پائیں کا خیال نہ فرماتے۔ حالانکہ جہاں تک عقیدت و احترام کا تعلق تھا، جس عقیدت و احترام کا ثبوت آپؐ کے صحابہ نے دیا کسی پیغمبر اور کسی رہنما کے پیروؤں نے نہ دیا ہوگا۔ لوگ آپؐ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے لیکن سجدہ خدا کے سوا کسی کے لئے جائز نہ تھا۔ آپؐ نے مسئلہ سمجھا کر صحابہ کو اس سے منع فرما دیا۔!

صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہو جانا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ لیکن جب مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ بننے لگی تو آپ بھی صحابہ کے ساتھ مٹی اور پتھر ڈھوتے تھے۔ اور جب جنگِ خندق کے موقع پر مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جانے لگی تو صحابہ کے ساتھ آپؐ نے بھی خندق کھودنے میں حصہ لیا۔ ایک سفر میں جب ایک جگہ پڑاؤ ہوا اور کھانا پکنے لگا تو لکڑیاں لانے کا کام آپؐ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور صحابہ کے باصرار روکنے پر بھی لکڑیاں آپؐ جمع کر لائے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عفو و درگزر اور امن پسندی کی تعلیم دی تو آپؐ نے اپنے بڑے بڑے جانی دشمنوں کو بھی قابو پانے کے بعد معاف فرما دیا۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے ساتھ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ دھوپ کے موسم میں ایک باغ کے سایہ میں مقام ہوا۔ آپ صحابہ سے الگ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ ایک دشمن موقع پاکر آپ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی۔ اُس نے تلوار درخت سے اُتار لی۔ آپؐ کو بیدار کر کے پوچھا "بتاؤ اب تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟" آپؐ نے کامل اعتماد علی اللہ کے ساتھ جواب دیا "اللہ" اس جواب میں ایسا اثر تھا کہ دشمن نے تلوار نیام میں کر لی۔ اتنے میں صحابہ بھی آگئے۔ لیکن دشمن بعافیت واپس چلا گیا اور حضورؐ نے اُس سے کچھ تعرض نہ فرمایا۔ حضورؐ کی موجودگی کے باعث جاں نثار صحابہ کی پیشانی تک شکن آلود نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو و درگزر اور امن پسندی کا ایک بے مثال نمونہ فتح مکہ کے موقع پر پیش کیا۔ قریش مکہ بیس اکیس برس تک آپ کی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ اور دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ انہوں نے آپ کو اور آپ کے صحابہ کو تین برس تک مکہ کی ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں نظر بند رکھا تھا۔ آپ کے قتل کی کوشش کی تھی۔ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مدینہ منورہ پر بار بار فوجی حملے کر کے چاہا تھا کہ اسلام کو اور آپ کو نیست و نابود کر دیں۔ لیکن جب آپ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور اہل مکہ میں تاب مزاحمت باقی نہ تھی تو آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ:۔

۱۔ جو شخص ہتھیار ڈال دے، اُس کے لئے امن ہے۔

۲۔ جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ رہے اس کے لئے امن ہے۔

۳۔ جو شخص ابو سفیان کے مکان میں چلا جائے اس کے لئے امن ہے۔ حالانکہ ابو سفیان دشمنوں کے سردار تھے اور شکست

کھانے کے بعد ابھی ایک روز پہلے مسلمان ہوئے تھے ۔۔۔!

داخلۂ مکہ کے بعد خدا کے رسولؐ کا فاتحانہ دربار منعقد ہوا ۔ بیس۲۰ برس تک مسلسل عداوت و دشمنی سے پیش آنے والے جنگی مجرم کی طرح حاضر دربار تھے ۔ آپؐ نے اُن سے سوال کیا کہ "تمہارا کیا خیال ہے کہ آج تمہارے ساتھ کیا ۔ سلوک کیا جائے گا ؟" لوگوں نے جواب دیا ۔ "ہم جانتے ہیں کہ آپؐ اچھے بھائی اور اچھے بھائی کے بیٹے ہیں ۔ ہم آپ سے اچھے ہی سلوک کی اُمید رکھتے ہیں ۔"

دشمن تھے ، لیکن آپؐ کی فطرتِ کریمانہ سے نا آشنا نہ تھے ۔ آپؐ نے دشمنوں کی توقع سے بھی کہیں بڑھ کر جواب دیا ۔

فرمایا " جاؤ تم آزاد ہو ۔ آج تم پر کسی قسم کی ملامت و سرزنش نہیں ۔ لا تثریب علیکم الیوم !

جن لوگوں نے بیس برس تک آپؐ کی رسالت و نبوت کا انکار کیا تھا اور اسلام کے مٹانے میں اپنی ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا تھا ، وہ آپ کے اس اخلاقِ کریمانہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُن کی اکثریت اسی وقت اسلام قبول کر کے آپ کے خادموں اور اطاعت گزاروں کے حلقہ میں داخل ہو گئی ۔ پھر اُن کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہ اسلام کے جتنے سخت دشمن تھے ، اس سے کہیں زیادہ اسلام کے مخلص جاں نثار اور خدا کا رہن گئے ۔ لا الٰہ الا اللہ کی کنجی سے اُن کے ذہنوں کے قفل کھُل گئے ۔ اور سینے نور سے معمور ہو گئے ۔۔۔!

(۵) ۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنے خاندان اور اپنے صحابہ کا تو کیا ذکر ہے ، آپ نے اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کے معاملہ میں کسی رعایت کو روا نہیں رکھا ۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے ساتھ جو آپ کے مخالف اور بدترین دشمن تھے ، جب کبھی کوئی معاملہ پیش آیا اور حق یہودی کے ساتھ تھا تو آپ نے یہودیوں کے موافق فیصلہ فرمایا ۔ آپؐ کی اسی انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ یہودی اپنے ججوں سے زیادہ آپ پر بھروسہ کرتے تھے ۔ اور اپنے مقدمے آپ کی خدمت میں لایا کرتے تھے ۔ اور کبھی کسی فریق کو آپ کے فیصلے کے خلاف شکایت پیدا نہیں ہوئی ۔

عقیدۂ توحید اور اسلام

انسان نے جب سے اس زمین پر قدم رکھا ، ایسا زمانہ کبھی نہیں آیا جب انسانوں میں خدا کا تصور اور عقیدہ موجود نہ رہا ہو ۔ اور ہر دور میں اکثریت و اہمیت اسی گروہ کو حاصل تھی جو خدا کا عقیدہ رکھتا تھا ۔ اگر کسی زمانہ میں کوئی شخص اور ایسا فرقہ پیدا بھی ہوا جو خدا کا منکر تھا تو اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس نے انسانیت کے لئے کوئی اخلاقی کارنامہ انجام دیا ۔ جن لوگوں نے انسان کو انسانیت کی تعلیم دی ، انسان کو انسان بنایا ۔ دُنیا میں نیکی پھیلائی اور انسانی اخلاق و کردار کو بلند کیا ، وہ سب خدا کے ماننے والے تھے ۔ قرآن مجید کا یہ عام دعویٰ ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے معلم و رہنما آئے ، اُن سب نے انسانوں کو خدا کی ہستی کے عقیدے اور اسی کی عبادت و بندگی کی تعلیم دی ۔ موجودہ اقوامِ عالم میں بھی زیادہ تعداد انھیں قوموں کی ہے جو خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتی ہیں ۔ لیکن خدا کو ماننے والی دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی نہ کسی درجہ میں شرک میں مبتلا نہ ہو ۔۔۔ ہندوستان کا آریہ فرقہ ایک خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ مگر وہ بھی خدا کی طرح روح اور مادہ کو ازلی اور غیر مخلوق مانتا ہے ۔ جب وہ ان دو صفتوں میں خدا کے ساتھ روح اور مادہ کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید بھی شرک فی الصفات سے ملوث ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ لیکن اسلام کا عقیدۂ توحید بالکل خالص اور بے آمیز ہے ۔ اسلام کہتا ہے لا ابتداء اور لا انتہا اور غیر مخلوق صرف خدا کی ذات ہے ، وہ تمام چیزوں کا خالق ہے ۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب اُس کی مخلوق ہے ۔ قرآن مجید نے لا الٰہ الا اللہ کی کس طرح تفسیر و تشریح کی ہے ۔ اور عقیدۂ توحید کو کس طرح نکھارا اور اُجاگر کیا ہے ، اسے قرآن ہی کے لفظوں میں دیکھیے ۔

۱- اللہ خالق کل شیٔ ۔ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔

۲- اللہ علی کل شیٔ قدیر۔ اللہ ہر چیز پر اقتدار رکھتا ہے۔

۳- بدیع السموات والارض - آسمانوں اور زمین (سب کا) وہی پیدا کرنے والا ہے۔

۴- لہٗ ملک السموات والارض - آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت خدا ہی کے لئے ہے۔

۵- لہٗ مقالید السموات والارض - آسمانوں کی اور زمین (کے اختیار) کی کنجیاں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔

۶- لیس کمثلہ شیٔ - خدا کے جیسی کوئی چیز نہیں۔

۷- لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ اس تک نگاہیں نہیں پہنچتیں اور وہ نگاہوں تک پہنچ جاتا ہے۔

۸- ان اللہ اعلم غیب السموات والارض انہ علیم بذات الصدور۔ اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی باتوں کا بھی جاننے والا ہے، نیز وہ دلوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔

۹- اللہ اعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور۔ اللہ تمہاری آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی جو تم اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہو۔

۱۰- سبّح للہ ما فی السموات وما فی الارض - آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں - یعنی زبان حال سے اس کی پاکی بیان کرتی ہیں۔

۱۱- عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں - نزول قرآن کے زمانے میں یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیرؑ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا تھا۔ مشرکین میں بہت سی قومیں فرشتوں کے متعلق عقیدہ رکھتی تھیں کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں، اس لئے قابلِ پرستش ہیں۔ قرآن نے جا بجا ان عقائدِ باطلہ کی تردید کی ہے:-

"انما اللہ المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ۔"

مسیح عیسیٰ (نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے) وہ مریمؑ کے بیٹے اور خدا کے رسول تھے۔

"انما اللہ الہ واحد سبحٰنہ ان یکون لہ ولد۔"

ایک خدا ہی معبود ہے، وہ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔

"لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ ولا الملٰئکۃ المقربون۔"

مسیح اور مقرب فرشتے اس بات میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتے کہ وہ خدا کے بندگی گزار ہوں۔

۱۲- بعض قوموں کا عقیدہ ہے کہ خدا انسانوں کی شکل میں جنم لیتا ہے - قرآن مجید نے اس کی تردید کی:-

"لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔"

خدا نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا - اور نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے۔

یعنی یہ خدا کی شان کے قطعی منافی ہے کہ وہ کسی مرد کے نطفہ میں منتقل ہو کر کسی عورت کے رحم میں آئے اور انسانوں کی طرح جنم لے - وہ اس گندگی سے بالکل پاک ہے۔

۱۳- بہت سی قومیں سورج، چاند اور ستاروں کو پوجتی تھیں - قرآن نے کہا۔

الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات والارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب

وکثیر من الناس ــــ !

"کیا تم نے غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوق ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بکثرت انسان خدا کو سجدہ کرتے ہیں"

یعنی اپنی اپنی خلقت کے مطابق سب خدا کے سامنے جھکے ہوئے اور اس کی بندگی بجا لا رہے ہیں۔ لیکن سب کی جنس اور خلقت جُدا جُدا ہے، اس لئے اُن کی بندگی کی صورتیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

(۱۴) سورج اور چاند کے متعلق جن کی پرستش زیادہ عام تھی، یہاں تک فرمایا۔

"وسخر لکم الشمس والقمر دائبین۔"

سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک طریقے پر چل رہے ہیں۔

اس بات کو اور عام کیا:۔

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا نے سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔

یعنی آسمان و زمین کی ساری ہی چیزیں انسان کی خادم ہیں۔ اس کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کی مخلوق میں کوئی شئے اس لائق نہیں کہ وہ انسان کی معبود ہوں اور انسان اُن کی پوجا پرستش کرے!

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

خدائی حکومت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سارے عرب میں اسلام پھیل چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پورے ملکِ عرب پر خدا کے رسُول کے ذریعہ خدائی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہم اُسے خدائی حکومت اس لئے نہیں کہتے کہ عرب میں کہیں حکومت کا پائے تخت تھا، وہاں کوئی قلعہ تھا جس میں کوئی شاہی تخت رکھا ہوا تھا۔ جہاں خدا کا دربار آراستہ ہوتا تھا اور خدا تختِ سلطنت پر رونق افروز ہو کر فرمانِ سلطانی کا نفاذ کیا کرتا تھا۔ نہیں کہیں کوئی قلعہ نہ تھا۔ شاہی قصر و ایوان بھی نہ تھے۔ تخت و تاج بھی نہ تھے، وہی مدینہ کا شہر تھا۔ وہی مسجد نبویؐ تھی جس کا فرش کچی زمین کا تھا اور چھپّر کھجور کی پتیوں کا۔ یہی خدائی حکومت کا دربار خانہ تھا۔ حکومت کرنے والا ہاتھ بھی انسانی ہی ہاتھ تھا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ اور جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہی خدائی حکومت کے صدر یا سربراہ کار تھے۔ جن کو خلیفۂ رسُول کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ پیوند لگے ہوئے پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر مسجد نبوی میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہیں سے ایرانی اور رومی شاہنشاہیوں کے مقابلے کے لئے مجاہدین کی فوجیں روانہ ہوتی تھیں۔ یہیں سے تمام عرب کے لئے احکام صادر ہوتے تھے۔ یہی مسجد عدالت کا کام بھی دیتی تھی۔ اسی میں بیٹھ کر خلیفۂ رسُول مقدمے فیصل کیا کرتے تھے۔ آپ کی شانِ حکومت و خلافت یہ تھی کہ جس طرح خلیفہ ہونے سے پہلے اپنے غریب پڑوسی کی بکریوں کا دُودھ دُوھ دیا کرتے تھے اسی طرح اب بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مدینہ کے ضعیفوں اور معذوروں کے گھروں پر جا کر اُن کی ضرورتیں پُوری کیا کرتے تھے۔ مسکینوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ غرض خدائی حکومت کے حاکمانہ فرائض انجام دینے والے انسان ہی تھے۔ لیکن ہم اس حکومت کو خدائی حکومت کیوں کہتے ہیں؟ ہاں بلاشبہ وہ خدائی حکومت تھی، اس لئے کہ اگر وہ انسانی حکومت ہوتی تو اُس کے پایہ تخت کے لئے اس زمانہ کے موافق قلعہ

تعمیر ہوتا - اس کا حکمران ایران و روم اور دوسری سلطنتوں کے فرمانرواؤں کی طرح شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ایوان و محل میں رہتا۔ تاجِ شاہی زیبِ سر کرتا - تختِ زرین پر جلوہ افروز ہوتا - اس کے حشم و خدم ہوتے - نقیب اور چوب بردار ہوتے - اس کا دربار آراستہ ہوتا - درباری ہاتھ باندھے، آنکھیں نیچی کئے اس کے سامنے حاضر ہوتے، اس کا قانون قانون ہوتا - اس کی مرضی فرمان واجب الاذعان ہوتی - اس کا ہر حکم واجب العمل ہوتا - اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی طرف بہ حرف تعمیل ہوتی - کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوتی - لیکن خلیفہ کو قانون بنانے، اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حکم دینے اور اپنا قانون چلانے کا مطلق اختیار نہ تھا - اس کی ایسی بات کے سننے، ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے ایک شخص بھی تیار نہ تھا - زبان خلیفہ کی تھی اور دماغ بھی خلیفہ کا تھا - لیکن قانون خلیفہ کا نہ تھا - مرضی خلیفہ کی نہ تھی - قانون تھا خدا کا - اس کی تشریح و توضیح تھی خدا کے رسول کی - خلیفہ صرف خدائی دستور و قوانین کے نافذ اور جاری کرنے والے تھے - خلیفہ بھی پورے خدائی دستور و آئین اور اس کے ایک ایک قانون کے اسی طرح پابند تھے جس طرح عرب کا ایک غریب دیہاتی - خلیفہ کو کسی پر کوئی ترجیح و فوقیت حاصل نہ تھی -

حضرت ابوبکرؓ کا خود یہ حال تھا کہ جب ان کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور انہوں نے بحیثیت خلیفہ کے مسجدِ نبوی کے منبر سے پہلی تقریر کی تو خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا :-

> "لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں - حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں - اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو - اور برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کردو"

تقریر کے آخر میں فرمایا :-

> "میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو - لیکن جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت نہیں ہے"

ہم اسی کو خدا کی حکومت کہتے ہیں - کیا ایسی حکومت واقعی خدائی ارضی حکومت نہیں ہے؟

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، خلیفہ کے بدلنے سے حکومت کا دستور و آئین نہیں بدلا - اس لئے کہ دستور و آئین انسانی نہ تھا - خدائی تھا - وہ نہیں بدل سکتا تھا - حکومت کی پالیسی بھی نہیں بدلی - دوسرے خلیفہ کی زندگی بھی وہی تھی جو پہلے خلیفہ کی تھی - وہی پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے، وہی مسجدِ نبوی - وہی کھجور کے پتوں کی چٹائی کا فرش - حکومتوں کے سفراء آتے تھے اور خدائی حکومت کا صدر اور سربراہ کار اسی شان سے ان سے ملتا تھا - وہی خداترسی اور وہی خدمتِ خلق جو اس کے پیش رو کا طرۂ امتیاز تھی!

وہ روم و فارس کے محاذِ جنگ پر فوجیں روانہ کرتے - میدانِ جنگ میں قیادت کرنے والوں کو ہدایتیں بھیجتے - یتیموں، بیواؤں، بوڑھوں، معذوروں کے گھروں پر جا کر ان کی ضرورتیں پوری کرتے - راتوں کو جاگ کر نمازیں پڑھتے تھے اور خدا کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے تھے!

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے - سب کی خلافت و حکومت کا قانون وہی خدا کا قانون تھا - وہ بھی خدائی قانون کی پابندی میں عوام سے پیش پیش تھے - ان کو بھی ہر شے سے زیادہ خدا کی رضا و خوشنودی کی طلب تھی - وہ حکومت کو اپنی ملک نہیں خدا کی امانت سمجھتے تھے - سرکاری خزانے سے صرف اتنا لیتے تھے جتنے میں ان کا اور متعلقین کا پیٹ بھر سکے - اور تن پوشی ہو سکے - وہ بھی غریب انسانوں کی طرح - اس سے زیادہ ایک پائی بھی اپنی اور اپنے متعلقین پر

خرچ کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس طرح بھی ایک کوڑی سرکاری خزانے سے نہ لی۔ کمایا پہنا اپنا اور بارہ[۱۲] برس تک خدائی حکومت کی خدمت انجام دی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس تنگ حالی کے ساتھ بسر کرنے کے لئے سرکاری خزانے سے جو وظیفہ لیا۔ اس کے متعلق بھی مرتے وقت وصیت کر گئے کہ میری جائیداد سے وہ رقم ادا کر دی جائے۔ یہ خدائی حکومت نہ تھی تو کیا تھی؟ تاریخ میں ایسی انسانی حکومت انسان نے کب دیکھی؟ اگر کسی تاریخ سے ایسی حکومت کا سراغ مل سکے تو ہمیں بھی اس کا نام بتاؤ۔

عقیدۂ توحید کے ثمرات

انسان فرشتوں کی طرح معصوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود عقیدۂ توحید نے انسانوں کی کس قدر کایا پلٹ کر دی تھی؟ ایک بار دو شخص ایک زمین کا جھگڑا لے کر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے۔ ہر شخص کا دعویٰ تھا کہ زمین اُس کی ہے!

خدا کے رسول نے دونوں کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھو تم میں جو شخص اپنے دعوے کو ثابت کرے گا، میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں گا۔ لیکن اگر زمین واقعی اس کی نہیں ہے اور اُس نے اپنی چرب زبانی سے اپنا حق ثابت کر دیا تو قیامت کے روز میرا فیصلہ اسے خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ یہ سُن کر دونوں فریق خوفِ خدا سے رو پڑے اور دونوں کہنے لگے۔ اے خدا کے رسول! زمین فریق ثانی کو دے دی جائے۔

ایک عورت سے بدکاری ہو جاتی ہے۔ وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود حاضر ہو کر درخواست کرتی ہے کہ مجھے بدکاری کی سزا دی جائے۔ نہ کوئی مدعی ہے اور نہ کوئی گواہ۔ اسے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا لے جائے مگر خدا کی بازپرس کی فکر اسے چین نہیں لینے دیتی۔ اور بالآخر اُسے سزا دے دی جاتی ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا تنہا واقعہ نہیں ہے، کئی عورتوں اور مردوں کے ایسے واقعات احادیث میں موجود ہیں۔ اول تو ایسے واقعات پیش ہی شاذونادر آتے تھے۔ لیکن معاشرے میں اَن دیکھے خدا کی ہستی کا ایسا شدید یقین پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ آخرت کی بازپرس سے بچنے کے لئے وہ خوشی خوشی دُنیا کی جانی سزا تک قبول کر لیتے تھے۔

ایک شخص قتل کا مجرم ہے۔ مدعی اُسے پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے لاتا ہے۔ مجرم کو خود اعتراف جرم ہے۔ مگر اس کے چھوٹے بھائی کے نام اس کے باپ کی ایک وصیت ہے۔ وہ مہلت کی درخواست کرتا ہے کہ باپ کی وصیت پوری کر آئے۔ ایک صحابی اس کے ضمانت کرتے ہیں۔ وہ گھر جاتا ہے اور وقت مقررہ پر واپس آ کر حاضر ہو جاتا ہے۔ مدعی اُس کی سچائی سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ خون معاف کر دیتا ہے۔ خدا اور اُس کی توحید کا عقیدہ خدائی حکومت کے قانون کا کتنا احترام عوام کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے؟

(۲) ایک ایسا معاشرہ اور ایسا نظامِ حکومت وجود میں آ گیا تھا کہ عوام ہوں یا حکومت کا اعلیٰ سربراہ کار۔ سب کی زندگی کی بنا ایک خدا کے عقیدے پر تھی۔ جو زمین و آسمان اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ساری کائنات کا مالک ہے۔ اور جس کے علم اور رسائی کا حال یہ ہے کہ وہ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے بھید تک کو جانتا ہے۔ اس لئے اب زندگی کی کوئی کل ایسی نہیں جو سیدھی نہ ہو گئی ہو۔ اب کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ کوئی کسی کو دبائے۔ کسی پر زیادتی کرے۔ یا کسی کی آزادی کو کچل سکے۔ اب سب کی حیثیت ایک سی ہے۔ سب آزاد ہیں۔ سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب خود خلیفہ اور امیر جو نظامِ حکومت اور معاشرہ میں سب سے اونچی پوزیشن کا مالک ہے، عوام کی آزادی کا احترام کرتا ہے۔ اور جہاں دیکھتا ہے کہ کوئی صاحبِ اقتدار عوام کی آزادی کی بے حرمتی کر رہا ہے، صاحبِ اقتدار کی سرزنش کرنے میں ذرا نہیں جھجکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب، شام، عراق، فارس اور مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ شام کے دورہ سے مدینہ واپس آ رہے ہیں، راستہ میں بھی جا بجا رُک رُک کر پتہ لگا رہے ہیں کہ حکومت اور حکام سے کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟ ایک چھوٹا سا خیمہ نظر آتا ہے۔ اس کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا ملتی ہے۔ پوچھتے ہیں:-

"تمہیں کچھ معلوم ہے عمر کا کیا حال ہے؟"

بڑھیا کہتی ہے۔ "ہاں شام سے چل چکا ہے۔ خدا اُسے غارت کرے، آج تک مجھ کو اُس سے ایک حبہ نہیں ملا"۔

حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"بڑی بی! عمرؓ کو اتنی دُور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

بڑھیا کہتی ہے۔ "پھر اس نے اتنی بڑی مملکت اور اتنے بندگانِ خدا کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لے رکھی ہے؟"

حضرت عمرؓ اس سے معافی مانگتے ہیں اور اس کے گزارے کا معقول انتظام کر دیتے ہیں۔

قانون خلیفہ اور امیر کا نہیں، خدا کا چل رہا ہے۔ اس کے متعلق خلیفہ اور امیر ہی سے کیوں نہ بھول چوک ہو۔ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خلیفہ کو ٹوک دے۔ حضرت عمرؓ ایک تقریر میں عورتوں کے زیادہ مہر باندھنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ ایک بڑھیا قرآن شریف کی ایک آیت کا حوالہ دیتی ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ مہر باندھنے کی آزادی دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "بیشک ایک بڑھیا کا علم عمرؓ سے زیادہ ہے"۔

ایک بار مالِ غنیمت میں کچھ کپڑا آتا ہے۔ وہ مسلمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو بھی اُس میں سے اُتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا دُوسرے مسلمانوں کو۔ آپ اس کپڑے کا کُرتا پہن کر مسجد میں خطبہ دینے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک معمولی شخص اُٹھتا ہے۔ کہتا ہے:-

"عمرؓ جب تک میرے سوال کا جواب نہ دے دو۔ میں تمہاری بات نہیں سُن سکتا"۔

آپ فرماتے ہیں۔ "پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟"

کہتا ہے۔ "تم جس کپڑے کا کُرتا پہنے ہوئے ہو، وہ ملا تو تمہیں بھی ہم سب کے برابر۔ اس سے ہمارا کُرتا تو نہیں بنا تمہارا کیسے بن گیا؟

حضرت عمرؓ اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ سے فرماتے ہیں۔ "اٹھو۔ معترض کو جواب دو"۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"اس کُرتے میں میرے حصّہ کا کپڑا بھی شامل ہے"۔

سائل کہتا ہے۔ "ہاں اب میں تمہاری بات سنوں گا"۔

ایک دفعہ ایک شخص نے کسی معاملہ میں حضرت عمرؓ سے کہا۔ "عمرؓ! خدا سے ڈرو"۔

وہ شخص بڑی بیباکی کے ساتھ بار بار اس جملہ کو دُہراتا رہا۔

دُوسرے شخص نے اسے ٹوکا، کہا۔ "بہت ہو چکا۔ اب بس بھی کرو"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ان کو کہنے دو۔ اگر یہ مجھے نصیحت نہ کریں تو ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اور اگر میں ان کی نصیحت قبول نہ کروں۔ تو مجھ میں کوئی اچھائی نہیں"۔

یہ خدا اور اس کی وحدانیت کے عقیدہ کا ثمرہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ کسی اور نظامِ زندگی نے بھی ایسے حکمران پیدا کئے؟

ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا۔ "لوگو! اگر میں دُنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کروگے؟"
ایک شخص فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور نیام سے تلوار کھینچکر بولا۔ "تمہارا سر اڑا دوں گا۔"
حضرت عمرؓ نے امتحاناً سوال کیا۔ "میری شان میں ایسے الفاظ کہتا ہے؟"
اُس نے کہا۔ "ہاں تمہاری شان میں۔"
حضرت عمرؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ فرمایا۔ "خدا کا شکر ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو عمرؓ کو بھی سیدھا کر سکتے ہیں۔"
خدائی حکومت کا سربراہ کار لوگوں کے جذبۂ آزادی کو کچلتا نہیں، بلکہ اسے اس طرح اُبھارتا اور اُسے جِلا دیتا ہے۔

(۳) جہاں سچی آزادی ہوگی وہاں خود بخود سچی مساوات پیدا ہو جائے گی۔ جبلہ بن ایہم غسانی شام کے سرحدی علاقہ کا بادشاہ تھا۔ وہ عیسائی سے مسلمان ہو گیا تھا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا گوشہ ایک معمولی آدمی کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اُسے طمانچہ مارا۔ اُس نے بھی طمانچہ کا جواب طمانچہ سے دیا۔ جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی آپ نے فرمایا۔ "تم نے جو کچھ کیا اس کا یہی جواب تھا۔"
جبلہ کو حضرت عمرؓ سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے کہا۔ "ہم وہ ہیں کہ ہمارے ساتھ گستاخی کی سزا قتل ہے۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ہاں اسلام سے پہلے ایسا ہی تھا۔ مگر اسلام میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔"
جبلہ غیر اسلامی ماحول کا پروردہ اور پروان چڑھا ہوا تھا۔ وہ چپکے سے بھاگا اور پھر عیسائی ہو گیا۔ ایسے ہزار جبلہ عیسائی ہو جائیں، کسی کی خاطر سے خدائی قانون نہیں بدل سکتا کبھی نہیں بدل سکتا!
حضرت عمرو بن العاصؓ بڑے خاندانی آدمی تھے۔ مسلمانوں میں بھی اُن کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ مصر کے فاتح اور گورنر تھے۔ اُن کے بیٹے حضرت عبداللہؓ بھی بڑے مرتبہ کے صحابی تھے۔ انہوں نے ایک بار ایک شخص کو ناحق کوڑوں سے پیٹ دیا۔ حضرت عمرؓ نے مجمع عام میں حضرت عمروؓ بن العاص کے سامنے حضرت عبداللہؓ کو اسی شخص کے ہاتھ سے کوڑے لگوائے۔ جس کو انہوں نے مارا تھا۔ باپ بیٹے اُف نہ کر سکے —!
ایک بار ایک شخص نے خود حضرت عمروؓ بن العاص پر دعویٰ کیا کہ انہوں نے مجھے ناحق سو کوڑے مارے ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار اور عوام موجود تھے۔
حضرت عمرؓ نے مدعی سے کہا۔ "اٹھو، اور تم بھی ان کو سو کوڑے مارو۔"
حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا۔ "اگر ایسا کیا گیا تو حکومت کے عمال بددل ہو جائیں گے۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "نتیجہ جو بھی ہو، لیکن کیا یہی جائے گا۔"
حضرت عمروؓ بن العاص نے دو سو اشرفیوں پر مدعی سے معاملہ طے کیا۔
انسانی تاریخ میں اس طرح پہلی بار دُنیا مساواتِ انسانی سے روشناس ہوئی۔ اور یہ عقیدۂ توحید کا ثمرہ تھا۔ ملحوظ رہے کہ یہ بیسویں صدی کا واقعہ نہیں ہے۔ واقعہ ہے ساتویں صدی عیسوی کا، جسے آج کی نام نہاد انسانیت پسند دُنیا دَورِ ظلمت و بربریت کہتی ہے!

(۴) مساوات اور عدل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ سورج ہوگا تو اُس کے ساتھ لازماً دھوپ بھی ہوگی۔ سورج کے بغیر

ڈھونپ نہیں ہوسکتی۔ مساوات نہ ہو اور عدل و انصاف کا وجود ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ ایک خدا کے عقیدے کی بنیاد پر وجود میں آئی حکومت عرب۔ شام، فارس اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ انصاف اتنا سستا اور عام تھا، جس کا آج کی دنیا میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت کی عمارتیں اتنی عالیشان اور بارعب نہ تھیں کہ غریب مدعی ان کو دیکھ کر ہی دہل جائے۔ نماز پڑھنے کی مسجدیں ہی عدالت کا کام دیتی تھیں، جن سے غریب سے غریب انسان مانوس ہوتا تھا۔ عدالت کے دروازہ پر کسی قسم کی چوکی یا چہرہ تھا۔ وکیلوں کا سرے سے سسٹم نہ تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بے تکلف منصف اور جج کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ ججوں کو حکومت کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ غریبوں کے ساتھ خاص طور پر نرمی سے پیش آئیں، تاکہ وہ بغیر رعب و داب کے اپنا معاملہ پیش کرسکیں ۔۔۔!

جن مقدمات پر آج کی مہذب دنیا میں ہفتوں، مہینوں اور برسوں صرف ہوجاتے ہیں۔ اور سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ان مصارف کے نہ ہونے سے انصاف ہی حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اُس زمانے میں گھنٹوں اور دنوں میں بغیر کسی صرف کے لوگ انصاف پا جاتے تھے۔ پبلک میں بھی آج کی طرح بددیانتی، بے ایمانی اور جعل سازی نہ تھی۔ گواہ بھی عموماً سچے ہوتے تھے۔ سیدھے سادے طور پر مقدمات پیش ہوتے تھے۔ ثبوت اور صفائی کی عموماً سچی شہادتیں گزرتی تھیں۔ اور آسانی سے مقدموں کے فیصلے ہو جاتے تھے ۔۔۔!

مساوات کا یہ حال تھا کہ امیرالمومنین کو بھی جو حکومت کے سب سے بڑے سربراہ کا اور آج کے صدر مملکت کے برابر منصب رکھتے تھے مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اور وہاں بھی اُن کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک جائز نہ تھا ۔۔۔!

ایک دفعہ حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت عمرؓ پر دعویٰ دائر کیا۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ جواب دہی کے لئے گئے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت حاکم عدالت تھے۔ انہوں نے ازراہِ احترام حضرت عمرؓ کے لئے جگہ خالی کردی۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "زید! یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے۔" یہ کہہ کر مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اور حضرت عمرؓ کو مدعی کے دعوے سے انکار تھا۔ ایسی صورت میں قانون تھا کہ مدعی، مدعا علیہ سے قسم لے۔ چنانچہ حضرت ابی نے حضرت عمرؓ سے قسم کا مطالبہ کیا۔ حضرت زید نے حضرت عمرؓ کے مرتبہ کا لحاظ کرکے کہا: "امیرالمومنین کو قسم سے معاف رکھو۔" حضرت عمرؓ بہت رنجیدہ ہوئے۔ کہا:-

"جب تک تمہاری نظروں میں عمرؓ اور ایک عام آدمی برابر نہ ہوں، تم ججی کے منصب کے لائق نہیں سمجھے جاسکتے۔"

اسلام میں شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے ابوشحمہ نے شراب پی۔ حضرت عمرؓ نے اُن کو اپنے ہاتھ سے اسّی کوڑے مارے۔ وہ اس مار کو برداشت نہ کرسکے۔ اسی کے صدمہ سے مرگئے۔

جس حکومت کے سب سے بڑے سربراہ کا یہ رویہ ہو اُس حکومت میں بھلا کسی کے ساتھ بے انصافی کیسے ہوسکتی ہے؟

حق و انصاف کی یہ روح پورے معاشرے میں پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بار۔ اسلامی حکومت کی ایک غیر مسلم رعایا نے حضرت عمرؓ کی عدالت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر مقدمہ دائر کیا۔ حضرت علیؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے اور حضورؐ کے داماد تھے۔ لوگ عموماً اُن کا نام لینے کے بجائے عزت کے خیال سے اُن کو ابوالحسن کہہ کر پکارا کرتے

تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے کہا۔

"ابوالحسن! اپنے مدعی کے برابر بیٹھ جاؤ"۔

یہ سُن کر حضرت علیؓ کے چہرہ پر ناگواری کا اثر رونما ہوا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "شاید آپ کو میری ہدایت ناگوار گزری۔ حالانکہ اسلام کا قانونِ مساوات یہی ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کو ایک نگاہ سے دیکھا جائے"۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ "میری ناگواری کا سبب یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے میرے مدعی کے مقابلہ میں میرے احترام کا اظہار کیوں کیا؟ آپ کو چاہیئے تھا کہ "ابوالحسن" کہنے کی بجائے مجھے "علی" کہہ کر مخاطب فرماتے"۔

سچی انسانیت کے یہ جتنے نمونے اُوپر گزرے ہیں، یہ سب ایک خدا اور اس کی بازپرس اور جزا و سزا پر سچے یقین کے ثمرات و نتائج تھے۔

ایک ایسے زمانہ میں جب ساری دُنیا میں انسانیت کے جوہر ناپید تھے۔ اور ایک ملک میں جس کی حالت تمام دُنیا سے زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ ایسا پاکیزہ اور ہمہ گیر انقلاب اسی عقیدۂ توحید کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ آج کی بگڑی ہوئی دُنیا کو اسی عقیدۂ توحید اللہ کی ضرورت ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر سچی انسانیت قائم ہو سکتی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی)

بدعت توحید کی ضد ہے

توحید ایک سادہ سا لفظ ہے، جس کے مفہوم و مراد کو ہر عام و خاص جانتا ہے۔ لیکن اگر علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی سادہ سا لفظ اپنی حقیقت اور ثمرات و مقتضیات کے اعتبار سے تمام دنیائے انسانیت کے لئے اتنا عظیم، ایسا اہم اور اس قدر گرانمایہ ہے کہ اسی پر اُس کی دنیا اور عقبیٰ، آغاز اور انجام، حیات اور معاد، حتیٰ کہ تمدن و معاشرت کی اصلاح و فساد اور زندگی کے تمام شعبوں کی بھلائی بُرائی کا دار و مدار ہے۔ علم و اعتقاد کا اگر یہ سرچشمہ خشک ہو جائے تو انسان کے پاس خیر، فلاح اور ہدایت و حقیقت تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ شاید اسی لئے رب العزت نے ازل کے دن اپنے بندوں سے سوال کیا تھا کہ "الست بربکم" ؟ اور بندوں نے کہا تھا کہ "بلیٰ!" ہاں تو بیشک ہمارا رب ہے۔ یہ عہد حافظوں سے اگرچہ محو ہو گیا۔ لیکن انسان کے تحت الشعور اور فطرت میں ایک پیاس، ایک تحریک، ایک داعیہ بن کر سما گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں، ہر قوم اور ہر مذہب نے، کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کیا۔ اور عملاً بے شمار خداؤں کو پوجنے کے باوجود بنیادی اور نظری طور پر یہی مانا کہ بڑا خدا ایک ہی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے خدا اُسی کے قائم مقام ہیں۔ یا اس کی مختلف صفات کے نمائندے ہیں۔ یا انھیں امورِ عالم حصہ وار سپرد کر کے بڑا خدا آرام کر رہا ہے۔ وغیر ذالک!

ممکن ہے بہت پرانے زمانہ میں بعض قومیں کسی قلیل مدت تک معبود کے تصور سے عاری رہی ہوں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی انسانی شعور نے ذرا آنکھیں کھولیں اور فطرت کے تہ نشین داعیوں اور تقاضوں کو ابھرنے اور بر پرزے نکالنے کا موقع ملا۔ اُسی وقت یہ قومیں آپ سے آپ بلا کسی خارجی تحریک کے انسان سے مافوق کسی طاقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آئیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہر فرد نے کسی اقتدارِ اعلیٰ اور قوی تر ہستی کا تصور قائم کر کے اس کی پرستش کے کچھ طریقے مقرر کر لیے!

تاریخ سے کتابی اور سطحی واقفیت رکھنے والے حضرات تو شاید ہمارے اس دعوے پر حیرت کریں۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں تقریباً تمام ہی قومیں پتھر کے بُتوں، گوشت پوست کے انسانوں اور سورج، دریا، آگ اور اسی طرح کی دیگر اشیاء کو معبود مانتی رہی ہیں۔ اور آج دورِ ترقی میں بھی مسلمانوں کے سوا کم و بیش ہر قابلِ ذکر قوم توحید کے برعکس عقائد رکھتی ہے۔ اور عملاً متعدد خداؤں کی قائل ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کا گہرا علم رکھتے ہیں اور ظاہری افعال کا علمی و نفسیاتی تجزیہ کر کے اُن کے پیچھے کام کرنے والے عوامل داعیات کا پتہ چلانے کی اہلیت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فطرت اور عقل کے بنیادی تقاضہ کے تحت تمام ہی قومیں اس حقیقت کو محسوس کرتی رہی ہیں کہ مالک الکل اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکم مطلق کسی ایک ہی ہستی کو ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ عقل و علم کی کجی، شعور و وجدان کی طفولیت اور آسمانی ہدایت و تنویر سے محرومی کے باعث وہ نہ تو اس فطری رجحان کو کسی واضح عقیدہ کی شکل میں ظاہر کر سکیں نہ وہ یہ جان سکیں کہ صرف ایک معبود کو تسلیم کرنے کی صورت میں وہ کونسا طریقۂ عبادت ہو سکتا ہے جو اس تسلیم اور خیال و عقیدے کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ ان کی عقل اور علم کی حد تک ایک واحد مرکزی ہستی کے لئے جن صفات کا پایا جا

ضروری تھا۔ ان صفات کے لئے انہوں نے الگ الگ مظاہر اور نشانات مقرر کر لئے اور علیحدہ علیحدہ اُن مظاہر اور نشانات کو پُوجا۔ ہر مظہر اور نشان کو پُوجتے ہوئے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی گمان کرتی رہیں کہ ہم اصل معبود کو پُوج رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اگر کسی عقیدے اور تخیل کی ترجمانی کے لئے ایسے افعال و اطوار اختیار کرے جو حقیقتاً اس عقیدہ و تخیل کی ضد اور نقیض ہوں تو یہ عقیدہ و تخیل دُھندلا پڑتے پڑتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ اور خواص کے قلب و دماغ میں اس کا موہوم سا نقش باقی بھی رہے تو کم سے کم عوام کے دل و دماغ میں یہ برائے نام بھی باقی نہیں رہتا۔ عوام اپنے اعمال میں عموماً رسم و روایت اور بے مغز تقلید و اتباع کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فطرت کے تقاضے اور انبیاء کرام کی تعلیمات کے باوجود غلط اور باطل طرزِ عبادت نے توحید کے نقش کو اس طرح مٹا دیا کہ جب رسُول نے اُن سے کہا کہ ایک ہی خدا کو مانو تو اظہار حیرت کرتے ہوئے بولے کہ یہ تو ہمارے سارے معبودوں کو ذلیل کر کے ایک ہی خدا کو سارے حقوق دیئے دیتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ حیرت اور اعراض توحید کے عقلی و جبلی انکار اور شعور کی تردید پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ عملاً متعدد معبودوں کو پُوجتے رہنے اور رسم و رواج کے رنگ میں رنگے جانے کا سطحی نتیجہ تھا۔ جہالت و بے شعوری کا ثمرہ تھا۔

آج کی دُنیا کو دیکھئے، جو قومیں بے شمار بُتوں کو پُوجتی ہیں اور کتنے ہی انسانوں کو معبود بنائے ہوئے ہیں اور کتنے ہی خیالی دیوتاؤں کی پُجاری ہیں، اُن کے رہنماؤں اور عالموں سے آپ کلام کریں تو وہ ہرگز ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ کارخانۂ عالم پر دو یا دو سے زیادہ برابر کی طاقت والے دیوتاؤں کی خدائی ہے، بلکہ وہ اصل اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی آمرِ مطلق تسلیم کریں گے۔ لیکن چونکہ سب سے بڑا خدا اور اس کی متعدد طاقتیں اور صفات آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں۔ اس لئے اُس خدا اور اُس کی صفات پر اچھی طرح دھیان جمانے اور جس صفت سے مدد لینے کی ضرورت پڑے، اُسی صفت پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کے لئے ہم نے بُتوں کو ظاہری نشان اور مظہر بنا لیا ہے۔ بعض انسانوں اور خیالی دیوتاؤں کے بارے میں وہ یہ کہیں گے کہ بجائے خود بھگوان تو ہم کسی کو نہیں مانتے۔ ہاں فلاں بزرگ میں بھگوان نے اپنی فلاں صفت ڈال دی اور فلاں دیوتا کو فلاں طاقت سپرد کر دی۔ گویا اصل کے اعتبار سے تو معبود ایک ہی ہے، مگر واسطے اور انتظامی آسانیوں کے اعتبار سے یہ لوگ دسیوں معبود بنائے ہوئے ہیں — !

جو قومیں خوش فہمی سے اپنے کو عیسائی کہتی ہیں ("خوش فہمی" اس لئے کہ درحقیقت نہ یہ اس تعلیم کو مانتی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تھی، نہ یہ تعلیم اپنی صحیح شکل میں آج موجود ہے)، اُن کا بھی یہی حال ہے کہ علمی و منطقی اعتبار سے قائل تو وہ تثلیث کی ہیں۔ لیکن کسی بھی عیسائی عالم سے گفتگو کیجئے، وہ شرک کا اقرار اور توحید کا انکار ہرگز نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی تثلیث کا سرا کھینچ تان کر توحید ہی سے ملائے گا۔ اور باوجود مشرکانہ عقائد و اعمال کے بنیادی ذہن اُس کا یہی ہو گا کہ مستقل بالذات مختارِ مطلق اور تمام اقتدار و قوت کا مرکز تو صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے — !

ایسا کیوں ہے؟ انسان کی عقل و شعور اور فطرت کس لئے توحید کا میلان رکھتے ہیں؟ کھُلی مشرک قومیں کس لئے توحید کا انکار نہیں کرتیں؟ ان سوالوں کا واحد جواب یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے لئے کسی ایک ہی ہستی کو خالق و مالک ماننا اور تمام قوت و قدرت کو اسی سے منسوب کرنا عینِ فطرت اور عینِ شعور اور عینِ عقل و فہم ہے۔ عقل چاہے کیسی ہی نکتہ سنجیاں کرے، منطق چاہے کتنی ہی پلٹیاں کھالے، فلسفہ چاہے کیسے ہی گوشے نکال لے۔ لیکن ناچار اس پہاڑ کی طرح اٹل حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ معبودِ حقیقی اور تمام اختیار و اقتدار کا مالک اور پروردگار ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسلام کے اپنی مکمل اور آخری شکل میں آنے سے پہلے تو یہ ممکن بھی تھا کہ خود ایجاد معبودوں کے پجاری اور خود تراشیدہ طرقِ عبادت کے متوالے توحید سے برملا انکار کر دیں۔ لیکن اسلام نے آکر انسان کو اُس کی فطری مانگ کا ٹھیک ٹھیک احساس دلایا۔ تہ نشیں داعیہ کو ایک حسین و جمیل نظریہ اور اصول کی شکل میں پیش کیا۔ ٹھوس علمی و عقلی

دلائل فراہم کئے۔ اور قرآن کی تنہا ایک ہی دلیل اتنی اثر انگیز، قوی اور آہن و فولاد سے زیادہ مستحکم ثابت ہوئی کہ انسانی عقل و علم اور مشاہدہ و تجربہ کے لئے اس کی تردید ناممکن ہو گئی۔ خدا نے سادہ لفظوں میں کہا کہ اگر ایک سے زیادہ رب ہوتے تو کارخانۂ عالم زیر و زبر ہو جاتا۔ یہ سادی سی مختصر دلیل انسانی عقل و علم کی تمام بساط پر آسمان کی طرح چھا گئی۔ تجربہ نے قدم قدم پر بتایا کہ بقائے عالم کے لئے ایک ہی شہنشاہ اور مالک الملک کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے اور بھی مضبوط دلیلیں دنیا کے سامنے رکھیں اور دنیا کو ماننا پڑا کہ توحید کی صداقت و حقانیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب ایک اور بھی ہے جو اگرچہ عقلی و قیاسی قسم کا نہیں بلکہ اس کو سمجھنے اور ماننے کا مدار انسانی قلب و روح کی صلاحیت پر ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا خطاب اہلِ ایمان ہی سے ہے اس لئے اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سورۂ اعراف رکوع ۲۲ میں ہے:-

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے اُن کی اولادیں نکالیں اور خود اُنہی کو اُن کا گواہ بنا دیا (اُن سے پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا۔ بیشک! (یہ کام اللہ نے اس لئے کیا کہ تم حشر کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے (تیرے رب ہونے سے) بے خبر تھے۔

یہ واقعہ عالمِ مثال کا ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزِ اول سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ہی انسانوں سے یہ عہد لیا گیا[1]۔ اور الفاظِ قرآنی کو کسی خاص تعدادِ انسانی پر بھی بقول بعض محمول کیا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ توحید کا اعتراف و اقرار فطرتِ انسانی کا جزو ہے۔ پہلی صورت میں تو کسی توجیہ کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر انسان اس میں شامل ہے، البتہ دوسری صورت میں یہ توجیہ کرنی پڑے گی کہ جس طرح بھوک، پیاس، نیند، عقل اور صورتِ نوعیہ وغیرہ انسان کے اندر ایک دوسرے میں متوارث ہوتی چلی جاتی ہیں، اسی طرح اس عہد الست کا اثر بھی قیامت تک متوارث ہوتا چلا جائے گا۔ یہ توجیہ محض تاویل کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ انسان کی تاریخ اس پر ناقابلِ تردید شہادت مہیا کرتی ہے۔ قدیم سے قدیم تر جس زمانہ کا حال ہمیں تاریخ بتاتی ہے اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب، پس ماندہ، بے علم اور ترقی سے ناواقف انسان بھی آپ سے آپ کسی نہ کسی معبود کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ مانا کہ عقل کی نارسائی اور نفس کی فریب انگیزی کے باعث یہ پوجا توحید کی ضد اور شرک پر مشتمل تھی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کی کیا گنجائش ہے کہ اُن کے جذبۂ عبودیت فطرت ہی کی پکار تھا۔ فطرت نہ ابھارتی تو آخر کونسی طاقت انہیں مجبور کر رہی تھی کہ تلاشِ رزق، جستجوئے آرام و راحت اور دیگر مشاغلِ دنیاوی کے ساتھ ساتھ وہ خواہ مخواہ پوجا پاٹ میں وقت ضائع کریں۔ اور بے وجہ خود کو کسی ایک یا چند معبودوں کے آگے پست و ذلیل بنائیں۔ آخر کس نے اُن سے کہا تھا کہ سورج، بادریا یا پتھر کے مجسموں کو پوجنا شروع کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اور محض اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ جس طرح بھوک، پیاس، طلبِ آرام، نیند اور

---

[1] اسی روایت کی تصدیق و تائید امام احمدؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر میں درج ہوئی ہے مجھے ذاتی طور پر یہی تشریح محقق معلوم ہوتی ہے اور دوسری تشریح کی کوئی دلیل مجھے معلوم نہ ہو سکی بجز اس کے کہ تمام انسانوں کو بیک وقت عالمِ مثال میں حاضر کر لینا عقول کے لئے متعذر سا ہے، حالانکہ اس طرح کے معاملات میں عقلِ انسانی کی استعداد پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ (ع-ع)

جنسی میلان فطرت کے ایسے داعیئے ہیں کہ ان کے لئے کسی خارجی محرک اور معلم کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جذبۂ عبودیت، اور خواہش نیاز مندی بھی فطرت ہی میں داخل ہے، جس کے لئے کسی بیرونی محرک و معلم کی احتیاج نہیں۔ احتیاج ہے تو صرف اس بات کی کہ اس جذبہ کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیم و تفہیم کو قبول کیا جائے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے جو کم فہم لوگ سطحی بین لوگ عہد الست کے بارے میں کرتے ہیں یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ ازلی عہد انسان کے حافظہ میں محفوظ نہ رہا تو اس سے کیا حاصل ہوا؟ اور کیوں اللہ نے یہ عبث کام کیا؟

یہ اعتراض اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ یہ عہد حافظوں میں مرتسم کرنے کے لئے لیا ہی نہیں گیا تھا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ نے توارث و تناسل میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ جو واقعات باپ کے حافظہ میں محفوظ ہوں وہ کل یا بعض اولاد کے حافظوں میں بھی منتقل ہو جائیں بلکہ اس عہد کا منشاء توحید اور جذبۂ پرستش کو انسان کی فطرت کا جزو بنا دینا تھا۔ اور اس کے اندر پروردگار کی تلاش و تجسس کا رجحان، استعداد اور داعیہ پیدا کر دینا تھا۔ کسی واقعہ کا حافظہ سے محو ہو جانا ہی اس کی بے اثری پر کافی دلیل نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو جوانی میں یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ آج ہم جس زبان کی ہر کتاب کو فر فر پڑھ ڈالتے ہیں، اُس زبان کی الف بے ہمیں بچپن میں کس نے، کب اور کس طرح سکھائی۔ انھیں نہ وہ ماحول یاد ہوتا ہے، جس میں انھیں حرف شناسی کے ابتدائی سبق ملے۔ نہ اس سے متعلق کوئی اور تفصیل حافظہ میں محفوظ ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی موجودہ حرف شناسی اور زبان دانی اور علم و فن کی بنیاد اولین چھٹپنے کی یہی تعلیم تھی اور اسی تعلیم نے اُن میں یہ ملکہ پیدا کیا کہ ضخیم کتابیں بلا تکلف پڑھ ڈالیں۔ اب کیا کوئی نادان یہ احمقانہ دعوی کر سکتا ہے کہ یہ حافظہ سے محو شدہ ابتدائی تعلیم بیکار اور عبث رہی۔ یا کوئی پڑھا لکھا آدمی محض اس لئے اپنے پڑھے لکھے ہونے سے انکار کر سکتا ہے کہ اسے اپنے بچپن کے معلم کا نام اور حرف شناسی کا زمانہ اور کیفیت اور ماحول اور کچھ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ یاد رہے نہ رہے لیکن حرف شناسی کا جو ملکہ اور شعور پیدا ہو چکا ہے وہ بالکل کافی ہے۔

بس یہی کسی نہ کسی حد تک ملتی جلتی ہوئی مثال عہد الست کی ہے۔ وہ حافظوں میں ثبت کرنے کے لئے نہیں لیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے تھا کہ انسان کی جبلّت و فطرت میں ایک ملکہ، ایک استعداد اور ایک مستقل پیاس، ایک طلب، ایک داعیہ، ایک تحریک ہمیشہ کے لئے جاگزیں کر دے اور دیگر عناصر فطرت اور اجزائے جبلّت کی طرح یہ بھی قیامت تک فطرت کا جزو بنا رہے۔

اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔

اللہ کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:۔

مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔

ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی (وغیرہ) بنا دیتے ہیں۔

اصل فطرت یہی ہے کہ انسان ایک خدا کو مانے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عقل و علم کی نارسائی کے باعث انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ماننے کے صحیح طریقے اور آداب اور مقتضیات کو آپ سے آپ سمجھ سکے۔ اس کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ برابر پورا کرتے رہے اور آخر کار ایک آخری نبی کو مکمل شریعت اور دین دے کر بھیجدیا۔ کہ قیامت تک کے لئے تمام عالم انسانی اس دین کے بتائے ہوئے طریقوں پر چل کر بندگی کا صحیح حق ادا کر سکے۔

توحید خالص ان تمہیدی سطور کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جب تمام ہی قومیں کسی نہ کسی نوعیت میں توحید کی صداقت وحقانیت کی صراحتاً یا اشارۃً قائل ہیں تو کیا اُن کی اور مسلمانوں کی توحید ایک ہی ہے یا الگ الگ؟ کیا توحید کی حد تک سب کو ایک ہی صف میں سمجھا جائے گا یا کچھ فرق کیا جائے گا۔

تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ توحید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو فرق و اختلاف اور تقسیم کی گنجائش ہی نہیں رکھتی۔ لیکن لفظی مفہوم کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے تو ان دو قسموں کا نام توحید ربوبیت اور توحید الوہیت رکھا ہے لیکن میں بات کو زیادہ عام فہم بنانے کے لئے ان کا نام توحید لفظی اور توحیدِ حقیقی رکھتا ہوں۔

توحید لفظی تو یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک مانے اور بس۔ یعنی وہ یوں کہے کہ تمام اقتدار و قوت کا مالک ایک ہی ہے اور اس کے مثل اور برابر کوئی نہیں۔ بس بات اتنے پر ختم کر دے یا زیادہ سے زیادہ یہ مان لے کہ وہی رزق دینے والا ہے، مارنے والا ہے، جلانے والا ہے۔ اس طرح کی چند صفات مان کر خاموش ہو جائے اور نہ تو جملہ صفات الٰہیہ کا اقرار کرے نہ اُن مقتضیات اور ثمرات پر توجہ دے جو خدا کو مالک وخالق اور رزاق و رب ماننے کا لازمی نتیجہ ہیں ـــ یہ ہے توحید لفظی۔ یہی توحید ہے جس کے غیر مسلمین قائل ہیں۔ اور یہی وہ توحید ہے جو اگرچہ لفظاً توحید کہی جاتی ہے۔ لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے کفر وشرک پر منتہی ہوتی ہے اور اس توحید کے قائلین عموماً وہ کچھ کرتے اور کہتے ہیں جو توحیدِ حقیقی و اصلی کے فوائد و منافع کو پامال کرنے والا اور شرک وکفر کے مضرات و فسادات کو نشو و نما دینے والا ہوتا ہے!

قرآن وحدیث میں لفظی توحید کی پوری صراحت ہے اور بہت صفائی سے بتا دیا گیا ہے کہ اس طرح کی توحید نہ خدا کو مطلوب ہے نہ اس سے توحیدِ حقیقی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ توحید لفظی کے قائلین کا حال اللہ نے ایک جگہ یوں بیان کیا:۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ○
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ○ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○
قُلْ مَنْۢ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ ○

(اے محمدؐ) اگر تم ان سے پوچھو کہ بتاؤ زمین و آسمان اور ساری چیزیں کس کی ہیں۔ اگر تمہیں معلوم ہو۔ تو کہیں گے اللہ کی! ـ تو ان سے کہو تم پر نصیحت کیوں کارگر نہیں ہوتی؟ پوچھو سات آسمانوں اور عرشِ اعظم کا مالک کون ہے؟ کہیں گے اللہ! کہہ دو پھر تم کس لئے نہیں ڈرتے۔ پوچھو تمام کائنات کی ملکیت و حکومت کس کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہ کون ہے جو دوسروں کو پناہ دیتا ہے لیکن اس کے بالمقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ کہیں گے اللہ! تو کہہ دو پھر آخر تم پر کیا جادو چل گیا ہے (کہ گمراہ ہوئے جاتے ہو)

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ
اگر اُن سے پوچھو کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے کہ خدا نے۔

گویا وہ لوگ اللہ کی مالکیت اور حاکمیت اور خالقیت وغیرہ کے تو قائل تھے لیکن پھر بھی وہ راہِ راست سے اس درجہ ہٹے

ہوئے تھے کہ گویا سحر زدہ ہوں۔ جو صاف اور سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط اور ٹیڑھی راہ چلے جا رہے ہوں۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم إِلَّا هُمْ مُشْرِكُونَ ۝

ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اکثر لوگ مشرک ہوتے ہیں۔

دوسری قسم توحید حقیقی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ انسان خدا کو بایں معنی ایک ملنے کہ تمام صفاتِ کمالیہ کا وہی متصف ہے اور اسی کی علمداری نہ صرف مادّی کائنات کے ہر گوشے پر ہے بلکہ انسان کے جذبات و خیالات، روح، شعور اور لطیف سے لطیف تر عناصر پر ہے اور اس کے اقتدارِ مطلق اور حاکمیت جامعہ کے جو بھی تقاضے اور مطالبے ہیں وہ سب کے سب نہ صرف دل و زبان سے واجب القبول ہیں بلکہ انھیں عملی زندگی میں رہنما بنانا اور افعال و اعمال سے اُن پر یقینِ کامل کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے، وہی ہر چھوٹے بڑے معاملہ کا منصف، ہر مسئلہ کا حل کرنے والا، ہر کھلی چھپی بات سے باخبر، ہر عیب و صواب کا واقف کامل اور ہر مقام پر ہر وقت ہر زمانے میں حکمراں ہے!

توحید کی یہی قسم ہے جو اللہ کو مطلوب ہے اور اسی کے ماننے والے اس کے نزدیک مومن ہیں۔ جیسا کہ قرآن و حدیث میں اسے باوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن و حدیث میں ایسی لفظی تقسیم نہیں ملتی جیسی ہم نے یا بعض علمائے سلف نے کی ہے۔ کیونکہ توحید تو فی الاصل ایک ہی ہے۔ اور جس نامکمل، ناقص اور بے نتیجہ تخیل کو انسانوں نے توحید کا نام دے لیا ہے، وہ توحید نہیں شرک ہے۔ لیکن ہم نے تقسیم محض سمجھانے اور بات کو واضح کرنے کے لئے کی ہے تاکہ اللہ کو جو توحید مطلوب ہے اُس کی وضاحت ہو اور جو توحید مطلوب نہیں ہے اس کی تردید ہو جائے۔

توحید حقیقی کی وضاحت کے لئے اللہ نے قرآن میں بہت سی صریح و واضح آیات نازل فرمائیں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح و توضیح اتنے تکرار اور کثرت سے کی کہ شاید ہی کسی اور آیت کی کی ہو۔ آپ نے شرکِ جلی ہی کو واضح نہیں فرمایا بلکہ شرکِ خفی کو بھی موقع بہ موقع بیان کرتے رہے اور زندگی کے کسی بھی گوشہ میں مشرکانہ خیالات و عقائد کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ فرمایا:۔

يَسْئَلُ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى شِسْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ فَإِنَّهُ إِنْ لَمْ يُيَسِّرْهُ لَمْ يَتَيَسَّرْ ۔

چاہیئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی ہر حاجت خدا ہی سے مانگے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی، جب وہ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ اللہ اگر میسر نہ فرمائے تو جوتے کا ایک تسمہ بھی میسر نہیں آسکتا۔

غور کیجئے، کتنی پاکیزہ اور بے میل توحید کا سبق رسول اللہ دے رہے ہیں، انہوں نے اُمت کو ایک حقیر سی شے ۔ جوتے کے تسمہ کی مثال دے کر یہ تعلیم دی کہ خزانے، جائدادیں اور مہتم بالشان چیزیں ہی خدا کی عطا کردہ نہیں ہیں بلکہ دنیا کی حقیر سے حقیر تر چیز بھی اسی کی مرضی سے میسر آسکتی ہے ورنہ اس کی مرضی نہ ہو تو جوتے کا تسمہ جیسی حقیر چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ اس کی ہزاروں مثالیں آپ کو اپنے چاروں طرف بکھری نظر آسکتی ہیں۔ ایک شخص ہے جو دونوں وقت قیمتی اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں گیہوں کی ایک روٹی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن دوسرا شخص ہے جو گیہوں کی ایک روٹی ہی کے لئے خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بھی بعض اوقات اُسے بھوکا سو جانا پڑتا ہے۔ آدمی غور کرے تو اللہ کے انعامات اور جود و سخا کی انتہا نہیں۔ کبھی جس کو نمونہ ہو اُس سے پوچھئے

کہ ایک سانس لینے میں وہ کس درجہ اذیت برداشت کرتا ہے۔ اور ہوا کی ایک معمولی سی مقدار کو اپنے پھیپھڑوں تک پہنچانے کے لئے اُسے کتنی عظیم تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ ہوا ہے جسے تمام انسان بلا ادنیٰ مشقت کے ہر لحظہ اپنی زندگی کے کام میں لاتے ہیں۔ اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ ان کا ہر سانس اللہ جل شانہٗ کی عطا اور انعام ہے۔ وہ جب چاہے اسی سانس کو انسان پر بارِ عظیم بنا سکتا ہے لہٰذا انصاف اور علم و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بڑی سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز تک اُسی کے تصرف و اختیار میں ہو اور اس کے حصول میں دُنیاوی ذرائع اور اسباب محض بہانے کا درجہ رکھتے ہیں، اصلی مُعطی اور بخشندہ وہی ہے، مالک الملک ذوالجلال والاکرام۔

توحید کی نزاکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے واضح ہوتی ہے:۔

مَنْ صلّٰی یُرائی فقد اَشرک ومن صام یُرائی فقد اَشرک ومن تصدّق یُرائی فقد اَشرک۔

جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔

جانتے ہیں آپ یہ کس کے الفاظ ہیں ــــ؟ اُس صادق و مصدوق کے جس کے لئے اللہ جل شانہٗ نے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ فرمایا۔ جس کا ہر فرمودہ ریب و شک سے بالاتر اور عین صداقت ہے۔ غور کیجئے فکر و نظر کی کن گہرائیوں تک توحید کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور کس آخری درجہ تک اجتناب عن الشرک مطلوب ہے۔ براہ راست کسی مخلوق کو صفاتِ الٰہیہ میں سے کسی صفت کے ساتھ متصف کرنا تو درکنار صرف اتنی سی بات بھی شرک قرار دی گئی کہ آدمی عبادت کرتے ہوئے دکھاوے کی نیت رکھے۔ گویا وہ اپنی عبادات کا صلہ مقبولیت و شہرت اور عقیدت و نیازمندی کی شکل میں مخلوق سے طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر دل میں دکھاوے کا خیال پایا جانا ہی حکمِ شرک کے لئے کافی سمجھا گیا اور کیوں نہ سمجھا جاتا جب کہ اللہ نے شروع ہی میں یہ تعلیم بندوں کو پہنچائی کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ حصر جلی و رمز پر مشتمل یہ الفاظ یقیناً اس کے طالب تھے کہ شرک کے شائبہ تک کو مٹا دیا جائے اور توحید خالص و حقیقی کی بنیاد پر اُمتِ اسلامیہ کی تعمیر ہو۔

. . . . کہ عربی میں عبد غلام کے معنی میں آتا ہے۔ اور اَمۃ لونڈی کے معنی ہیں۔ یہ دونوں لفظ اسلام سے پہلے اور اس کی آمد پر اہلِ عرب میں عموماً مستعمل تھے۔ لیکن رسول اللہ فرماتے ہیں:۔

لا یقولنّ احدکم عبدی و اَمتی کلکم عبید اللّٰہ وکل نسائکم اماء اللّٰہ ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتای وفتاتی۔

تم میں سے کوئی بھی ہرگز کسی کو عبدی اور اَمتی نہ کہے کیونکہ تم سب اللہ کے عبد ہو اور سب عورتیں اللہ کی باندیاں ہیں۔ ہاں تمہیں کہنا چاہیئے غلامی (میرا غلام) اور جاریتی (میری کنیز) اور جوان مرد اور جوان عورت

ظاہر ہے کہ اپنے معروف معنی کی وجہ سے کوئی بھی عرب عبدی اور اَمتی اُن معنی میں نہیں بولتا تھا جن معنی میں انسان کو اللہ کا عبد اور اَمۃ کہا جاتا ہے۔ لیکن صدقہ اس شانِ توحید اور تنزیہہ مکمل کے کہ لفظی تشابہ بھی پسند نہیں فرمایا اور فساد و تخریب کی جڑیں کاٹ دیں۔

توحیدِ خالص کے اثبات اور شرک کے بطلان پر قرآن و حدیث سے صدہا دلیلیں لائی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو توحید کے قائل اور شرک کو بُرا سمجھنے والے ہیں۔ اس لئے اور کچھ کہنے کی بجائے ایک حدیث پر کلام کے اس پہلو کو ختم کرتے ہیں۔ یہ حدیث ابن حبان اور حاکم اور ترمذی وغیرہم نے روایت کی ہے۔ اس سے ہر مسلمان اندازہ کر سکتا ہے

کہ اسلام کو صرف اتنا ہی مطلوب نہیں کہ آپ اللہ کو ایک اور خالق و مالک اور رازق و رب مان کر امور دنیا میں غرق ہو جائیں۔ بلکہ وہاں تو اس کی تمام صفات کاملہ کا اعتراف و ایقان مطلوب ہے۔ تاکہ آپ کو زندگی کے کسی بھی گوشہ سے اس کے اقتدار و تصرف کو خارج کر دینے کی گنجائش نہ ملے۔ اور کسی بھی عنوان سے آپ اس کے سوا کسی کو با اختیار و حکمران تصور نہ فرما سکیں۔ اہلِ توفیق اگر اس حدیث میں بیان کردہ اسمائے حسنہ کو حفظ کر لیں گے تو ان کے پڑھتے رہنے کی بڑی منفعت اور برکت علماء و اتقیاء نے لکھی ہے۔

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ الْوَكِيْلُ الْقَوِىُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِىُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِىْ الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ الْمُحْيِىْ الْمُمِيْتُ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِىْ الْمُتَعَالِىْ الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُوْفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِىُّ الْمُغْنِىْ الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْهَادِىْ الْبَدِيْعُ الْبَاقِىْ الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ۔

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں۔ جو انھیں یاد کرے گا جنت میں جائیگا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق بندگی نہیں۔ وہ نہایت مہربان بہت رحم والا۔ وہ شہنشاہ ہے پاک ہے۔ ہر نقصان و زیاں سے بری ہے۔ امان دینے والا پناہ میں لینے والا ہے، زبردست ہے دباؤ والا ہے، صاحب عظمت بنانے والا، نکال کھڑا کرنے والا۔ صورت بنانے والا بے حد بخشش والا۔ بہت غلبہ والا، بہت دینے والا روزی عطا کرنے والا۔ فیصلہ کرنے والا، باخبر، تنگی اور فراخی کرنے والا۔ پست و بلند کرنے والا۔ عزت و ذلت بخشنے والا۔ سننے والا دیکھنے والا۔ اٹل فیصلہ والا، انصاف کرنے والا۔ بھید جاننے والا، خبردار، بردبار، عظمت والا۔ مغفرت کرنے والا۔ تھوڑے عمل پر بہت دینے والا۔ بلند مرتبہ، بڑائی والا۔ حفاظت کرنے والا۔ حصہ بانٹ کر دینے والا حساب کرنے والا، بزرگی والا، بے مانگے عطا کرنے والا، نگراں، جواب دینے والا۔ وسعت والا، حکمت والا بڑی محبت والا، مجد و شرف والا۔ اٹھانے والا۔ گواہ، ثابت، کارساز، زور آور، مضبوط، دوست اور مددگار، تعریف کا مستحق، ہر چیز کا شمار رکھنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا۔ معدوم کو پھر موجود کرنے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، سدا زندہ، مخلوق کی ہستی کو منضبط رکھنے والا، ہر کمال بالفعل رکھنے والا۔ شرف والا، یکتا، یگانہ، بے نیاز، قدرت والا، ہر شئے پر قابض، آگے اور پیچھے کرنے والا، سب سے مقدم اور سب سے بعد باقی رہنے والا۔ سب پر عیاں اور نگاہوں سے اوجھل۔

ہر شئے کا ذمہ دار، بہت بلند، بڑا محسن، توبہ کی توفیق بخشنے والا اور قبول کرنے والا۔ بدلا لینے والا معاف کرنے والا، بڑی رحمت والا، ساری کائنات کا مالک جلال و بخشش والا، انصاف کرنے والا جمع کرنے والا سب سے بے نیاز، دوسروں کو غنی بنانے والا۔ روکنے والا، نقصان پہنچانے والا، نفع پہنچانے والا۔ خود بخود ظاہر، ہدایت دینے والا، بغیر نمونہ کے بنانے والا۔ ہمیشہ رہنے والا، تمام مخلوقات کی فنا کے بعد اُن کے مال کا مالک، درست راہ بتانے والا، ضبط کرنے والا۔

غور فرمائیے کہ کیا یہ کثیر اسمائے صفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ یونہی عبث بیان فرمائے؟ کیا ان کا یہ منشاء نہیں ہے کہ کائنات میں جو بھی اسباب و نتائج اور وسائل و ثمرات نظر آتے ہیں ان سب میں اللہ ہی کی کارسازی اور قدرت کارفرما ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مالک الملک کائنات کو تخلیق کرکے ایک طرف ہو گیا اور مخلوق کو من مانی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ نہ یہ کہ رزق حیات و موت اور اسی نہج کے چند مہتم بالشان امور تو اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھے باقی جملہ قوتیں مخلوق میں تقسیم کر دیں۔ بلکہ وہ ہر زمان اور ہر مقام پر انسان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں، رنج و راحت میں، کامیابی و خسران میں، ذلت و عزت میں، غربت و امارت میں پوری طرح متصرف اور کارپرداز ہے!

بدعت! توحید کی ضد اگرچہ شرک ہی لیکن انسان کی عقل اور علم کو اتنی رسائی نہیں کہ وہ نبی صادق کی توضیح و تنبیہ کے بغیر پوری طرح یہ سمجھ سکے کہ کون سے امور ہیں جو شرک تحت آتے ہیں اور کون سے معتقدات باوجود مشرکانہ نظر نہ آنے کے فی الحقیقت مشرکانہ ہوتے ہیں۔ "ریا" ہی کو دیکھ لیجئے۔ یہ اپنی ظاہری شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک ناقص اور عیب دار فعل نظر آتا ہے جس کا مرتکب اکثر حالات میں انکار توحید کا وہم بھی نہیں کرتا اور یہ تصور تک نہیں کرتا کہ وہ شرک کی غلاظت سے آلودہ ہو رہا ہے۔ لیکن زبانِ صادق و مصدوق نے اُسے متعدد بار شرک سے تعبیر کیا۔

یہی معاملہ بدعت کا بھی ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں، پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ انسان کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی نازل فرمایا۔ اور زندگی کی کارفرمائی کے لئے جتنے گوشے ممکن ہو سکتے ہیں اُن سب کے لئے کچھ اصول، کچھ طریقے اور کچھ قوانین مقرر فرما کر اعلان کر دیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ گویا مملکتِ عالم کے لئے جس دستورِ جاودانی کی ضرورت تھی اسے تمام و کمال اللہ جل شانہ نے انسان کو عطا کر دیا اور اسکی گنجائش نہیں چھوڑی کہ قیامت تک اس پر کوئی اضافہ یا اس میں کچھ کمی کی جاسکے! رسول اللہ نے بالفاظ صریح بار بار اسکی تصدیق کی:۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا (وفی روایۃ فی دیننا) ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ!

جس شخص نے ہمارے اس امر میں (اور ایک روایت میں "فی دیننا" کے الفاظ ہیں) کوئی نئی چیز نکالی وہ ناقابلِ قبول ہے!

دوسری جگہ کہا:۔

وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ!

خبردار! بدعت سے بچتے رہنا پس یقیناً ہر بدعت گمراہی ہے!

ایک اور جگہ بتایا کہ دین میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے انتہائی غضب کا مستحق ہوگا۔ ایک اور جگہ

بتایا کہ جب کسی جگہ ایک بدعت اختیار کی جاتی ہے تو اس کے عوض وہاں سے ایک سنت اللہ تعالیٰ اُٹھا تا ہے، گویا دوہری محرومی، ایک تو بدعت کا گناہ دوسرے سنت کی برکت سے محرومی!

کسی کو اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نئی عبادت، کوئی جدید طریق پرستش، کوئی خود ایجاد اصل و فرع دین میں بڑھا سکے۔ صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ جن امور و مسائل کے لئے وضاحت و صراحت کے ساتھ کھلے احکام بیان نہیں کئے گئے اُن میں دین کے دیگر اصول و احکام کی روشنی میں اجتہاد غور و فکر اور استنباط کرو۔ احکام کے اسباب و علل پر نظر رکھو۔ قیاسِ صحیح سے کام لو اور جو عبادات و وظائف کسی خاص شکل میں متعین کر دیئے گئے ہیں اُن میں ہرگز تبدیلی مت کرو۔ چنانچہ اجتہاد و استنباط کی مثال تو وہ فقہ ہے جو اُمت کے علماء و ماہرین نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مدوّن کی اور عبادات و وظائف کی مثالی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں کہ اُن کے لئے جو تعداد جو تفصیل جو اوقات جو شرح مقرر کر دی گئی ہے اُس میں تبدیلی کی سرمو گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فجر میں دو کی بجائے چار یا ظہر میں چار کی جگہ چھ فرائض پڑھے جائیں۔ روزہ کو مغرب کی بجائے عشاء کے وقت افطار کیا جائے۔ حج میں افعال کی ترتیب و کیفیت بدل دی جائے، یا زکوٰۃ کی شرح میں من مانے تغیر کر دیئے جائیں۔ اب رہے وہ امور جو بجائے خود ممنوع و مکروہ نہ ہوں مگر انہیں قرونِ مبارکہ میں اختیار نہ کیا گیا ہو، تو کسی خاص سبب اور تقاضے کے پیش آجانے پر اُن میں بطور ذریعہ و وسیلہ اختیار تو کیا جا سکتا ہے لیکن اُنہیں عباداتِ مستقلہ کی شکل دینا اور اُن پر اصرار و شدت جائز نہیں ہے!

بدعت کی حقیقت کو سمجھنے میں سطحی فہم رکھنے والوں کو ایک اور دشواری پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہر نئی بات بدعت ہے تو بے شمار امور ایسے ہیں جو آنحضورؐ کے دورِ مبارک میں نہیں تھے، نہ قرآن و حدیث میں اُن کی وضاحت ہے۔ لیکن بعد کے مسلمان انہیں اختیار کئے ہوئے ہیں اور تمام علماءِ اسلام اُن کی حلت بلکہ ضرورت و اہمیت پر متفق ہیں۔ مثلاً دینی کتابیں لکھ کر چھاپنا اور فروخت کرنا۔ مدرسے بنا کر اُن میں مہتمم اور تنخواہ دار مبلغین رکھنا۔ انجمنیں بنانا، دفاتر کھولنا، وغیرہ ذالک!

یہ اشتباہ فی الحقیقت دین اور احکامِ اسلامیہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، ایسا دستور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں تمام ممکن جزئیات بیان کر دی گئی ہوں، دستور تو اصول و کلیات سے بحث کرتا ہے اور مطلوب و غیر مطلوب افعال و عقائد کی تشریح بیان کر دیتا ہے۔ اب یہ عوام الناس کا کام ہے کہ اپنے افعال و عقائد کو اس کی روشنی میں جانچیں اور اُن مقاصد کو پورا کریں جن کا دستور طالب ہے۔ قرآن و حدیث نے علم کی اشاعت کا حکم جاری کیا۔ اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ ہر دور کے وسائل و ذرائع کے مطابق اس حکم کی تعمیل کریں اور بہتر سے بہتر انتظام کے ذریعہ مقصدِ اشاعت کو پورا کئے جائیں۔ کتابیں چھاپنا تو ایک طرف اگر ریڈیو یا کسی اور ایجاد کو اس مقصد کا ذریعہ بنائیں گے تب بھی کوئی خرابی واقع نہ ہو گی۔ کیونکہ ان وسائل و اسباب کی حیثیت نہ ایجاد فی الدین کی ہے نہ بجائے خود یہ عبادت ہیں۔ بلکہ ان کو اختیار کرنا ایک مقصدِ نیک کے حصول کی خاطر ہے۔ جس کی پاکیزگی و خوبی قرآن و حدیث نے صراحتہً بیان کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا بلّغوا عنّی ولو آیۃ دوسروں تک پہنچاؤ خواہ میری ذرا سی بات ہی ہو۔ اب ایک شخص کو اختیار ہے کہ لوگوں کو حدیث سنانے اونٹ پر بیٹھ کر جائے یا ریل پر۔ فرش پر بیٹھ کر سنائے یا تخت پر۔ کوئی بھی ایسا طریقہ جس میں دین کے کسی اور حکم کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اُس کے لئے جائز ہو گا اور بدعت نہ کہلائے گا۔

ان تمہیدی سطور کے بعد اب سمجھئے کہ بدعت توحید کی ضد کیسے ہے۔ بہت سیدھی سی بات ہے کہ قانون بنانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اہلِ ملک کچھ متعین لوگوں کو اس کام پر لگاتے ہیں۔ یا غیر جمہوری نظاموں میں تنہا بادشاہ یا بادشاہ اور وزیر وغیرہ قانون بناتے اور نافذ کرتے ہیں۔ ملک بھر میں ہرگز کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے کوئی قانون نکالے۔

دین کے بارے میں جب ہم نے یہ مان لیا کہ وہ اللہ کا ایک مکمل دستور ہے اور کائنات کا خالق و مالک اور مختارِ کل ہونے کے باعث اللہ ہی اس کا مستحق بھی ہے کہ دستور بنائے اور حدود مقرر کرے تو یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو قانون کی ایک بھی نئی دفعہ تراشنے کا اختیار نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ گویا خود کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں خدائی قوت و اقتدار کا شریک سمجھے گا۔ اسی کا نام شرک ہے!

دوسرے پہلو سے یہ شرک کفر تک بھی پہنچتا ہے اور وہ یوں کہ دین میں دو ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ جو اللہ سے قربت حاصل کرنے اور اس کی رضا اور انعام پانے کا ذریعہ ہیں۔ دوسری وہ جو اس سے دُور ہونے اور اس کا قہر و عتاب حاصل کرنے کا سبب ہیں۔ انسان کے پاس تو ایسی عقل و بصیرت بھی نہیں کہ وہ ہزار پردے میں نہاں ذوالجلال والاکرام کی مرضیات کو پا سکتا۔ وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ ربِ اکبر کن اعمال و عقائد اور کن طریقوں سے خوش یا ناراض ہو سکتا ہے اور کن افعال پر انعام اور کن افعال پر عتاب دے سکتا ہے۔ اس علم و خبر کا واحد ذریعہ وہی دین ہے جسے اللہ جل شانہ نے اپنے نبیؐ صادق کے ذریعہ انسانوں تک پہنچایا۔ اس دین میں وہ تمام طریقے اور اصول کھول کر بیان کر دیئے گئے جن سے اللہ خوش یا ناراض ہوتا ہے۔ کوئی کسر اس میں نہیں چھوڑی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے کام میں کسر کا کیا امکان۔ تب کوئی شخص اگر بالکل نیا کام نکالتا ہے۔ جس کے لئے دین میں کوئی حکم نہیں دیا گیا اور سمجھتا ہے کہ اس سے اللہ کا تقرب اور ثواب آخرت حاصل ہو گا تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا دین ناقص ہے جس میں حصولِ تقرب کا یہ طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ نیز وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو وہ طریقے معلوم نہ تھے جو اسے خوش کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ جبھی تو اُس نے میرے اس نو ایجاد طریقہ کو بیان نہیں کیا وہ اس کا بھی مدعی ہے کہ خدا کا آخری اور سب سے افضل رسولؐ بھی حصولِ تقرب اور وصولِ ثواب کا وہ طریقہ نہیں پا سکا جسے میں نے پا لیا ہے، و نعوذ باللہ من ذالک!

حق یہ ہے کہ اعمالِ خیر سے ثواب کا حاصل ہونا کوئی حسابی یا سائنسی فارمولا نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جس طرح دو اور دو لازماً چار ہوں گے یا جس طرح پانی آنچ پا کر لازماً بھاپ بن جائے گا اسی طرح انسان عملِ خیر کر کے لازماً ثواب حاصل کرے گا۔ بلکہ قرآن و حدیث اس پر شاہد اور اصحاب و اتقیا کا قول و عمل اس کا گواہ ہے کہ اعمالِ خیر تو صرف تعمیلِ حکمِ الٰہی کے درجہ میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن کی حیثیت اُن الطاف کے شکریہ کی سی ہے جو اللہ جل شانہ نے انسان پر بطور احسان کر رکھے ہیں۔ جن اخروی انعامات کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ خیر پر فرمایا ہے وہ انسان کو تبھی ملیں گے جب اس کے اعمالِ خیر اللہ کے یہاں مقبول بھی ہو جائیں۔ نہ مقبول ہوں تو ہزار سال کی عبادتیں بھی بے کار اور فضول ہیں!

اب غور یہ کرنا چاہیئے کہ کونسا طریقہ ہے جسے اختیار کر کے یہ امید ہو سکتی ہے کہ اللہ ہمارے اعمال مقبول فرمائے گا۔ واحد جواب یہی ملے گا کہ خود کو سراپا بندۂ حکم بنا لینا اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کو مضبوطی سے پکڑنا اور اس کے فرائض کو بغیر کمی بیشی کے قولاً اور عملاً تسلیم کر لینا مقبولیت کی امید دلا سکتا ہے۔ اپنا کوئی نیا طرزِ عبادت نکال کر یہ ثابت کرنا کہ اللہ کی بتائی ہوئی عبادتیں کافی نہیں ہیں، اللہ کے قہر و غضب کو بھڑکانے کا باعث ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ غلو فی الدین خواہ وہ دین میں افراط کے ذریعہ ہو یا تفریط کے ذریعہ بے حد ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ۔ اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو۔

رسول اللہ نے تین بار فرمایا:-

هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ — حد سے بڑھنے اور غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:-

اِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فَاِنَّمَا اَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْغُلُوُّ - خبردار! غلو سے بچے رہنا۔ تم سے پہلے بہت سوں کو غلو نے برباد کیا۔

بدعت خواہ اس معنی میں ہو کہ حصولِ ثواب کے نئے طریقے ایجاد کئے جائیں جنہیں نہ اللہ اور رسول نے بتایا نہ اصحابؓ نے اختیار کیا۔ یا اس معنی میں ہو کہ اللہ اور رسول نے اعمال و اعتقاد کی جو حدیں اور صورتیں متعین کر دی ہیں اُن میں آدمی خواہ نخواہ باریکیاں اور نکتے نکالے، یا جن احکام، اشیاء، اور بندگانِ ذی مرتبہ کے جو مراتب، جو اقتدار، جو درجات متعین فرما دیئے ہیں اُن میں اضافے کرتا چلا جائے۔ دونوں ہی صورتیں بربادی و خسران کی ہیں!

اب میں آگے بڑھنے سے پہلے ناظرین کی خدمت میں چند معروضات پیش کروں گا۔ اگر آپ بعض ایسے اعمال و عقائد کے حامل ہیں جو میرے سابقہ اور آنے والے بیان کی روشنی میں بدعت ٹھہرتے ہیں تو آپ مکدر اور ناراض نہ ہوں بلکہ انصاف کے ساتھ یہ غور فرمائیں کہ دین نہ میری جائداد ہے نہ آپ کی۔ دین میں کسی اضافے یا کمی کا نہ مجھے اختیار ہے نہ آپ کو — یہ بھول جایئے کہ میں اس دیوبند کا رہنے والا ہوں جہاں کے علماء بہت سی رسوم رائجہ کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی نظرانداز کر دیجئے کہ وہابی یا اہلِ حدیث یا غیر مقلد وغیرہ کے کیا جھگڑے ہیں — صرف یہ دیکھئے کہ دین تو قرآن و سنّت کا نام ہے اور قرآن و سنّت سے علم و عقل کی روشنی میں جو احکام و اصول نکلتے ہیں وہی ایک مسلمان کے لئے واجب القبول ہیں اور جو طریقے اور رسمیں رائج ہیں وہ جس حد تک قرآن و سنّت کے خلاف ہوں اُسی حد تک ترک و احتراز کے لائق ہیں۔ محض یہ بات کہ بعض طریقے نہ صرف عوام بلکہ بعض خواص میں بھی رائج و مقبول ہو گئے ہیں اور اُن کی ابتداء کرنے والوں میں بعض بڑے بڑے نیک عمل لوگ شامل ہیں، اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اسے دین سمجھ لیا جائے۔ بلکہ دین وہی ہے جس کی تائید قرآن و سنّت سے ہو اور کوئی دینی اصول اس سے ٹوٹتا نہ ہو۔ میں مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ خالص افہام و تفہیم کے طور پر بعض خلافِ دین امور کا ذکر کروں گا۔ جنہیں کچھ مسلمانوں نے جزوِ دین بنا لیا ہے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میری بات کو رد کر دینا اور اپنے عقیدے پر اڑے رہنا میری دنیا و آخرت کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں، بلکہ اگر میری بات فی الواقع صحیح ہے تو نقصان ضد کرنے والے ہی کو ہو گا۔ میں تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اُس اللہ کی آیات اور اُس صادق و مصدوق سرورِ کونین محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جنہیں آپ واجب الاطاعت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ خالی الذہن ہو کر خلوص، ایمانداری اور بردباری کے ساتھ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ جن اعمال و عقائد پر آپ والہ و شیدا ہیں، اُن میں کسی طرح کا سقم و نقص تو نہیں ہے۔ وہ رضائے الٰہی کی بجائے عتابِ الٰہی کے تو سزاوار نہیں ہیں — پھر یہ بھی یقین فرمایئے کہ یہ گزارش میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا۔ بلکہ خود حضور علیہ التحیات والتسلیم نے فرمایا ہے:-

فانّه من یعش منکم فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنّتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیه بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔

تم میں سے جو زندہ رہیگا وہ کثیر اختلاف دیکھے گا پس ایسی حالت میں تمہیں چاہیئے کہ میری سنّت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنّت کا سہارا لو اور اُسے دانتوں سے پکڑ لو اور خبردار

نئے نئے کاموں سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔
کیا آج کے دور میں اختلافات کا کچھ شمار رہ گیا ہے؟ کیا ٹھیک یہی دور نہیں جب حضورؐ کے اس فرمان کی تعمیل کی جائے؟

صحابہؓ کا طرزِ عمل

یہ بات ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جن بدعتوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے وہ ایسی نہیں ہوں گی جن پر احکامِ ظاہری کے لحاظ سے ہر شخص ممنوع و منکر ہونے کا فتویٰ لگا سکے۔ ممنوعات و منکرات کی توضیح تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعدد مقامات پر کردی۔ بلکہ بدعت سے مراد وہی امور ہو سکتے ہیں جو بظاہر باعتبارِ شکل و شباہت دینی امور معلوم ہوں لیکن دین میں اُن کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ ایسے ہی امور انسان داخلِ دین کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسے ہی امور سے حصولِ ثواب کی غلط توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس حقیقت کو خوب سمجھا اور ایسی احتیاط برتی کہ حق ادا کردیا۔ نمونے ملاحظہ ہوں:-

نمازِ فجر و عصر کے بعد امام کے داہنے یا بائیں مڑ کر کچھ دیر بیٹھنا امرِ معروف ہے۔ رسول اللہ سے بروایاتِ صحیحہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اب عبد اللہ ابن مسعودؓ جیسے صحابیٔ جلیل کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

لا یجعل احدکم للشیطان شیئاً من صلوٰته یریٰ ان حقاً علیه ان لا ینصرف الا عن یمینه لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کثیراً ینصرف عن یسارہ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

تم میں سے کوئی شخص شیطان کو اپنی نماز میں حصہ دار نہ بنالے بایں طور کہ وہ صرف داہنی طرف مڑنے کی پابندی کرے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ کو بار بار بائیں طرف مڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

مشہور عالمِ دین ملا علی قاری اپنی شرح میں اس کے تحت لکھتے ہیں:-

من اصرّ علیٰ امرٍ مندوبٍ وجعلهٗ عزماً ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان من الاضلال فکیف من اصرّ علیٰ بدعةٍ ومنکرةٍ۔

جس نے کسی امرِ مستحب پر اصرار کیا اور مضبوطی سے اس پر جما اور رخصت پر عمل نہیں کیا پس یقیناً اس ذریعہ سے شیطان اُسے گمراہ کرنے پہنچ گیا۔ (پس جب امرِ مستحب کا یہ معاملہ ہو تو) اُس شخص کا کیا حال ہوگا جو بدعت یا منکر پر اصرار کرے۔

آپ اگر یہ کہیں کہ ملا علی قاری کی بات ہم نہیں مانتے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں مگر ابنِ مسعودؓ کے بارے میں تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ خود اُن کا یہ قول بتارہا ہے کہ جو فعل بجائے خود مستحب ہو لیکن رسول اللہ نے اُس کی پابندی نہ کی ہو۔ اُسے بھی پابندی کے ساتھ کرنا گویا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس فعل کو ضروری سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دین میں جس چیز کو جو درجہ دیا گیا ہے اُسے اس سے زیادہ درجہ دینا بھی اسی طرح بُرا ہے جس طرح کم درجہ دینا۔ پھر اس میں یہ بھی غور کیجئے کہ نیت اور عقیدے کا ذکر ابن مسعودؓ نے نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ داہنی طرف مڑنے کو عقیدتاً ضروری سمجھنے والا اور دوسروں کو اس عقیدے کی تعلیم دینے والا گمراہ ہے۔ ایسے شخص کو تو کافر کہا جانا کیونکہ وہ گویا بائیں طرف مڑنے کو گناہ ٹھہرا رہا ہے اور بائیں طرف مڑنا آنحضورؐ سے ثابت ہے۔ لہٰذا نعوذ باللہ اُس نے حضورؐ کو بھی گنہگار ٹھہرایا۔ ایسا نہیں بلکہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے مجرد اس طرزِ عمل ہی کو شیطنت ٹھہرایا ہے کہ امام ہمیشہ داہنی طرف مڑا کرے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی بھی ایسا کام نکالنا جو

عوام کے نزدیک تقرب الی اللہ اور ثواب کا ذریعہ ٹھہرے۔ حالانکہ قرآن و سنت سے اس کا اشارۃً بھی حکم نہ ملا ہو قطعاً بدعت ہے خواہ نکالنے والے کی نیت اسے ضروری قرار دینے کی نہ ہو۔

یہی ابن مسعودؓ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ایک بار اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ ذکر و عبادت کے لئے ایک جگہ مقرر کر کے جمع ہوتے ہیں تو غصہ فرمایا اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! کیا تم رسول اللہ کے اصحاب سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ یا گمراہی کی طرف دوڑ رہے ہو! دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تو میں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو؟ —— نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ رک گیا۔ غور کا مقام ہے۔ ذکر الٰہی جیسا مقدس فعل لیکن ابن مسعودؓ جیسا عظیم الشان صحابی اس پر خفا ہے۔ صرف اس لئے کہ دین کے رنگ میں رنگی ہوئی مصفا ترین بصیرت خوب دیکھتی ہے کہ جو طریقے ابتداء میں نہایت خلوص و للّٰہیت سے نکالے جاتے ہیں۔ وہی کچھ عرصہ بعد کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ شیطان اللہ کے مومن بندوں کو نبیؐ کی سنت اور اللہ کے فرائض سے دور لے جانے کے لئے کیسے کیسے خوبصورت حربے استعمال کرتا ہے۔ وہ جن لوگوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ دُنیاوی متاع کی چمک دمک پر مائل ہونے والے نہیں، ان کے لئے دین ہی کی نوعیت اور رنگ کے جال بُنتا ہے۔ دام ہمرنگِ زمین بچھاتا ہے اور بہت کم اللہ کے بندے اس کے کید سے بچ پاتے ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ ذکر اللہ کے لئے ایسی اجتماعی شکلیں اختیار کی جائیں جن کی تعلیم عملاً یا قولاً رسولؐ اللہ نے نہیں دی!

ترمذی میں حضرت نافعؓ سے روایت ہے کہ:۔

ان رجلاً عطس الی جنب ابن عمر قال الحمد للّٰہ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ قال ابن عمر انا اقول الحمد للّٰہ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ ولیس ھٰکذا علّمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علّمنا ان نقول الحمد للّٰہ علیٰ کل حالٍ (مشکوٰۃ)

ایک شخص عبداللہ ابن عمر کے پہلو میں کھڑے ہوئے چھینکا اور کہنے لگا الحمد للہ والسلام علیٰ رسول اللہ۔ ابن عمر نے فرمایا یہ بات تو میں بھی کہتا ہوں۔ لیکن رسول اللہ نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا ہے بلکہ یوں سکھایا کہ ہر حال میں الحمد للہ کہیں۔

اندازہ کیجئے۔ والسلام علیٰ رسول اللہ جیسا پاکیزہ جملہ لیکن ابن عمر نے اسے بھی پسند نہیں کیا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ چھینک کے بعد صرف "الحمد للہ" کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور اسی پر اکتفا کرنا دین کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو آپ نے رسول اللہ ہی سے سمجھا تھا اور یہ بات اُن کی نظر میں تھی کہ جس جگہ رسول اللہ نے لفظ "نبی" استعمال فرمایا تو وہاں کسی کو "رسول" کہنے کا بھی اختیار نہیں!

ہو سکتا ہے کوئی یوں کہے کہ اس حدیث کے بعد صاحب مشکوٰۃ نے "ھٰذا حدیث غریب" لکھا ہے اور صاحب مشکوٰۃ جب ایسا لکھتے ہیں تو بقول شیخ محدث دہلوی تو اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کسی طرح کا طعن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ فی الحقیقت صاحب مشکوٰۃ کے نہیں ہیں بلکہ خود ترمذی کے ہیں۔ اور ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ ترمذیؒ ان الفاظ کو صاحب مشکوٰۃ کے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ بارہا صحیح حدیث کے بارے میں بھی وہ فنی نقطۂ نظر سے ایسا کہہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کو غریب اس وجہ سے کہا کہ اس کے رُواۃ میں ایک راوی زیاد بن ربیع منفرد ہیں، لہٰذا

اصطلاحاً اس پر "غرابت" کا اطلاق ہوا۔ ورنہ یہ راوی ہر لحاظ سے معتبر اور بخاری کے رواۃ میں سے ہیں اور حدیث صحیح ہے۔

حضرت عمرؓ کا یہ عمل کسے معلوم نہیں کہ آپ نے اُس درخت کو کٹوا ڈالا تھا، جس کے نیچے رسول اللہ نے بیعت لی تھی اور جس کی زیارت کرنے لوگ آنے لگے تھے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس درخت کا وجود عوام الناس میں بدعت و شرک پیدا کرے گا۔ پھر یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ سفرِ حج سے لوٹتے ہوئے جب راہ میں ایک ایسی مسجد پڑی جس میں رسول اللہ نے نماز ادا فرمائی تھی تو لوگ اس کی طرف دوڑے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اے لوگو! اہلِ کتاب انہی باتوں کی وجہ سے برباد ہوئے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا"۔

اللہ اکبر! نگاہِ عمرؓ کتنی دُور دیکھ رہی تھی ——! آپ آج اپنی آنکھوں سے بصیرتِ عمرؓ کا نظارہ فرمالیں۔ جنبی تو بڑی چیز ہے۔ نبی کی خاکِ پا جیسے بزرگوں کی قبروں اور درگاہوں کا حال دیکھئے۔ جہلا ہی نہیں پڑھے لکھے بھی آپ کو ملیں گے کہ خاک کے تودوں پر سرنیاز خم کئے ہوئے ہیں اور جس فرقِ مقدس کے آگے کبھی فرشتوں نے سجدہ گزارا تھا وہی فرقِ مقدس مٹی کے ڈھیروں کے آگے جھکا ہوا ہے۔ صحابہؓ جیسے عظیم مومن و مسلم اور رسول اللہ جیسے رسولِ اکرم کی محبت و عقیدت، —— لیکن پھر بھی حضرت عمرؓ نے ایک تہہ نشین خطرے اور فتنے کو اس فعلِ حسن کی گہرائیوں میں دیکھ لیا۔ وہ فاروقؓ تھے —— فارقِ حق و باطل —— انہی کے لئے زبانِ صادق و مصدوقؐ نے کہا تھا کہ لوکان بعدی نبی لکان عمرؓ (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوسکتا تو عمرؓ ہوتا) ورضی اللہ عنہ!

بدعت اور ایجاد فی الدین سے جلیل القدر صحابہؓ کو کتنا گریز تھا اس کے لئے اور بیسیوں آثار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مجھے چونکہ ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرکے آگے چلتا ہوں۔

قبر پرستی

قرآن و سنت کے صریح احکام کے بالکل برعکس رواج پاجانے والی بدعات میں غالباً سب سے بدتر لیکن سب سے عام بدعت قبر پرستی ہے جو کافی مقبول ہوچکی ہے اور جس کی بہت سی صورتیں شرکِ جلی میں داخل ہیں۔

ہمارے سامنے آج تک ایک بھی دلیل ایسی نہیں آئی جس سے معلوم ہوسکتا کہ مروجہ قبر پرستی قرآن یا حدیث کے کس حکم یا اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں تو غور و فکر اور مطالعہ کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ قبر پرستی کی تمام تر عمارت محض جہل، نادانی، نفس پرستی اور اندھی تقلید پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کے غور و فکر کے لئے چند نصوص پیشِ خدمت ہیں:-

مسلم اور ترمذی میں ہے:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتجلسوا علی القبور ولاتصلوا الیھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قبروں پر مت بیٹھو اور ان کی طرف رُخ کرکے نماز نہ پڑھو۔

اگر کسی کو اس سے یہ غلط فہمی ہو کہ یہاں تو قبر پر چڑھ کے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں دیکھا یا سنا گیا کہ لوگ قبروں پر چڑھ کے بیٹھتے ہوں۔ لہٰذا حضورؐ کے حکم کو اس معنی میں لینا گویا رسول اللہ پر یہ الزام رکھنا ہے کہ آپؐ عبث باتیں بھی فرمایا کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ) ظاہر ہے کہ منع اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو زیرِ عمل آتی ہو۔ زیرِ عمل یہی چیز آتی رہی ہے کہ لوگ قبروں کے پاس بیٹھتے اور اس بیٹھنے کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ باقاعدہ درگاہیں بنی ہیں اور وہاں نیاز مندیوں کے مختلف پیرائے اختیار کئے گئے ہیں۔ اسی سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے!

حیرت کی بات ہے کہ لوگ حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ کو سجدے کئے جانے کی دلیل سے قبروں کو اور غیر اللہ کو سجدہ

کرنے کی دلیل لاتے ہیں۔ حالانکہ رسولؐ اللہ نے سجدہ کرنا تو درکنار قبروں کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے تک کو منع فرما دیا کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے اور قبر کو سجدہ کرنے کا ابہام ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہ کہا جائے کہ نماز تو چونکہ قبلہ رُخ ہو کر پڑھنی چاہیئے۔ اس لئے قبر کی طرف نماز پڑھنے کو منع فرمایا۔ یہ حکمِ رسولؐ بلاشبہ اُسی صورت میں ہے جبکہ قبر قبلہ کی طرف واقع ہو رہی ہو۔ ورنہ کون دیوانہ مسلمان ہوگا جو قبلہ کے سوا کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا۔

مسلم اور ترمذی میں ہے:۔

قال علی رضی اللہ عنہ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہٗ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہٗ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کیا میں تمہیں اُس مہم پر نہ بھیجوں جس پر رسولؐ اللہ نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو مٹائے بغیر نہ رہو اور کسی اُونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو!

یہ میں نہیں کہہ رہا امام الاتقیا خلیفۂ چہارم رسول اللہ کے داماد حضرت علیؓ فرما رہے ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:۔

لما نزل برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طفق یطرح خمیصۃً علی وجہہ واذا اغتم کشفہا عن وجہہ، فقال وھو کذالک "لعنۃ اللہ علی الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد" یحذر ما صنعوا ولولا ذالک ابرز قبرہٗ غیر انہ خشی ان یتخذ مسجداً۔

جب جانکنی کا عالم رسولؐ اللہ پر طاری ہوا تو آپ نے چہرے پر چادر کھینچ لی۔ جب سانس گھٹتا چادر ہٹا دیتے۔ اسی عالم میں فرمایا "یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا"۔ گویا کہ آپ اُمت کو اس طرح کی حرکتوں سے ڈرا رہے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود رسولؐ اللہ کی قبر شریف بھی کھلی رکھی جاتی۔ لیکن اسی خوف سے کہ اُسے عبادت گاہ بنا لیا جائے گا، بند رکھا گیا!

اندازہ کیجئے۔ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے رسولؐ اللہ کو کتنی نفرت و کراہت تھی۔ بہت ہی کم آپؐ کسی کے لئے "لعنت اللہ" کہا کرتے تھے۔ لیکن اس فعل کے کرنے والوں پر حضورؐ عالمِ جانکنی میں کس دلسوزی سے لعنت بھیج رہے ہیں۔ پھر انبیاء کی قبور کا جب یہ معاملہ ہو تو اُن لوگوں پر کس قدر لعنت برسے گی جو انبیاء سے بہت کم درجہ بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنائے ہوئے ہیں!

ذرا ملاحظہ کیجئے۔ غیر انبیاء کی قبروں کا ذکر بھی حدیثِ رسولؐ میں ملتا ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت اُمِ حبیبہ اور اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسولؐ اللہ کے حضور کیا جس میں انہوں نے تصاویر دیکھی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:۔

ان اولئک اذا کان فیہم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہٖ مسجداً وصوروا فیہ تیک الصور اولئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیامہ۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان میں کوئی مردِ صالح مر جاتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں

اور صالحین کی تصویریں نقش کرلیتے ہیں۔ یہی لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔

دیکھا آپ نے۔ آج کی درگاہ سازی و قبر نوازی سے کتنی مطابقت رکھتی ہے یہ حدیث؟ اور سنیئے۔ موطا امام مالک کی روایت ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنا دینا جسے پُوجا جائے۔ اللہ کا سخت غضب آئے اُس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالے!

مُسلم کی ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے۔ قولِ رسُولؐ ہے:۔

اَلَا وَاِنَّ من کان من قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد۔ اَلَا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذالک!

خبردار رہو۔ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا تھا۔ خبردار تم ہرگز قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں!

روکنے اور منع کرنے کا وہ کونسا صریح اسلوب ہے جو اس سلسلہ میں سرورِ کونین نے اختیار نہیں فرمایا۔ تنبیہ و تنذیر کے جو واضح ترین الفاظ تھے بار بار استعمال کئے۔ پھر بھی اگر مسلمان اس پر توجہ نہ کرے تو سوچئے روحِ پاکؐ پر کیا گزرے گی اور آخرت میں اُس کے ساتھ کیا معاملہ رہے گا۔ اور لیجئے۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، موطا امام احمد سبھی میں یہ روایت ہے کہ:۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یقعد علیہ وان یبنیٰ علیہ!

منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو گچ کرنے (چونے کنکریٹ وغیرہ سے پُختہ کرنے) سے اور اُس پر بیٹھنے سے اور اُس پر عمارت بنانے سے!

اور دیکھئے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:۔

اِنَّ مِن شر الناس من تدرکھم الساعۃ وھم احیاء والذین یتخذون القبور مساجد۔

بدترین ہیں وہ لوگ جن کی زندگی میں قیامت برپا ہوگی اور بدترین ہیں وہ لوگ جو قبروں کو مسجدیں بنالیں گے!

اور ملاحظہ کیجئے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد کی روایت ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج!

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لعنت بھیجی رسُول اللہ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور اُن پر بھی جو قبروں کو مسجدیں بنالیتے ہیں اور اُن پر چراغ جلاتے ہیں۔

گویا عورتوں کے لئے نفسِ زیارت ہی قابلِ لعنت ہے خواہ وہ وہاں کوئی مشرکانہ فعل کریں یا نہ کریں۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ محولہ بالا روایتوں میں "مسجد" سے مراد گنبدوں اور میناروں والی اصطلاحی مسجد ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قبروں کو ایسی جگہ نہ بنالو جہاں عبادت کی قسم سے کوئی عمل کیا جائے۔ یا میلہ لگایا جائے۔ چنانچہ یہ تشریح حضورؐ ہی کے قول سے ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مسجداً وطھوراً — میرے لئے تمام روئے زمین مسجد اور پاک بنادی گئی!

ظاہر ہے کہ مسجد سے مراد یہی ہے کہ جہاں چاہوں اللہ کی عبادت کر لوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مسجد نام کی خاص عمارت ہی میں عبادت ہو سکے۔ گھر، جنگل، ریگستان۔ ہر جگہ نماز اور ہر عبادت ادا ہو سکتی ہے۔ اور فرمایا:۔

لا تجعلوا قبری عیدا۔ میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا۔

کفار عرب کے کئی بتوں مثلاً ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے بارے میں تو بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ تشریح منقول ہے کہ یہ سب قوم نوحؑ کے نیک لوگ تھے جنہیں بعد میں بت بنا کر پوجا گیا۔ مشہور بت لات کے بارے میں ابن جریر نے مجاہد جیسے جلیل القدر عالم و فقیہ کی روایت بیان کی ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو لوگوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ گویا پہلے ہی سے اہلِ کفر میں نیک لوگوں کو ان کی موت کے بعد پوجنے کی بیماری چلی آ رہی ہے۔ اور یہی بیماری آج کثیر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اتنی جرأت تو ان سے نہ ہو سکی کہ باقاعدہ بت تراش لیتے۔ لیکن بزرگوں کی قبروں، بعض حالتوں میں جعلی قبروں تک کے ساتھ معاملہ پرستش اور بندگی ہی کا ہے!!

قبروں پر میلے اور عرس

ایک طرف تو اس حدیث کو دیکھئے جس میں تین مسجدوں کے سوا کسی بھی مسجد یا مزار یا درگاہ کی طرف باقاعدہ سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب تو یقیناً نہیں ہے کہ ہر طرح کے سفر ہی کو رسول اللہ نے منع فرما دیا۔ بلکہ باتفاق علماء اس کا یہ مطلب ہے کہ تقرب الی اللہ اور ثواب کی نیت سے صرف تین مساجد ہیں جن کی طرف سفر کرنا جائز ہے۔ مسجدِ اقصیٰ۔ مسجدِ حرام، مسجد نبوی۔ ان کے علاوہ تقرب الی اللہ کی نیت سے سفر نا جائز ہے!

دوسری طرف وہ قول رسول اللہ دیکھئے، جسے ابھی نقل کر آیا ہوں یعنی "میری قبر کو عید نہ بنا لینا"

"عید" کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنا۔ ہر وہ جگہ عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ اور وقت عید ہے جس میں کوئی کام بار بار کیا جاتا ہے۔ ہر وہ مجمع عید ہے جو بار بار اکٹھا ہوتا ہے۔ روایات صحیحہ گواہ ہیں کہ صحابہؓ اور تابعین اور ائمہ دالقیاس نے رسول اللہ کے حکم کی تعمیل کی اور قبر رسول کو عید نہیں بنایا۔ وہاں کے لئے اوقات متعینہ میں جمع ہونا یا تنہا جانا جائز نہیں سمجھا۔ صحابہ میں سے بعض بغیر تعین وقت اور بغیر پابندی کے جاتے تو قبر پر کھڑے ہو کر صرف سلام کہتے۔ کیونکہ سلام کا حکم رسول اللہ نے دیا تھا اور بعض صحابہ بہت دور ہی سے سلام کہہ لیتے!

یہ تو تھا تعلیم رسول اور تعلیم صحابہؓ کا حال۔ اب ذرا ہمارے زمانہ کے عرسوں اور سالانہ میلوں کا حال دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ کثیر مسلمان کس ذوق و شوق سے سال بسال قبروں کے میلوں میں جاتے ہیں اور لاتعداد خرافات و منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

قبروں پر دعا

قبروں پر جا کر اہلِ قبر سے کچھ مانگنا تو کھلا شرک ہے ہی لیکن قبروں پر جا کر براہ راست اللہ سے مانگنے کی فضیلت و خصوصیت بھی قرآن و سنت میں کہیں نہیں ملتی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ملتا کہ قبروں کے پاس دعا مانگنا نسبتاً بہتر اور وجہ برکت ہو۔ جتنی بھی روایات ہیں ان میں صرف مردوں کے لئے دعا ہے یا بعض ایسے الفاظ ہیں جو عبرت کا فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً :۔

السلام علیٰ اھلِ الدیار من المومنین و المسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون
نسأل لنا ولکم العافیۃ (مسلم)

سلام پہنچے ان بستیوں کے مومن اور مسلم بسنے والوں کو۔ ہم انشاء اللہ تم سے مل جانے والے ہیں۔ ہم اپنے اور تمہارے لئے عافیت کے طالب ہیں۔

السلامُ علیکم دارَ قومٍ مومنینَ انتم لنا فرَطٌ ونحنُ بکم لاحقون۔ اللّٰھم لاتحرمنا اجرھُم ولاتفتِنّا بعدھُم۔ (ابن ماجہ)

اے مومنو! تم پر سلامتی ہو۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے پیچھے آنے والے ہیں۔ خدایا ہمیں اُن کے ثواب سے محروم نہ کر اور ہمیں ان کے بعد فتنہ میں نہ ڈال!

ان دعاؤں میں مقصد اصلی مرحومین کے لئے دعا ہے اور اپنے لئے خیر و فلاح کی طلب ضمناً ہے۔ ہمارے زمانہ میں مرحومین کے لئے دعا کا طریقہ تو ختم ہوا اور اُلٹی گنگا یہی کہ بزرگوں کی قبروں پر جاتے ہیں اور اُن کے لئے دعا تو اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کی نجات و مغفرت پر ہم ایمان لا چکے ہیں۔ خود اپنے لئے دعا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب کی برکت و فضیلت سے دعا پُر اثر ہو جائے گی۔ ایسا سمجھنا غلط اور خلافِ شرع ہے کیونکہ قرآن و سنت میں اس کے لئے کوئی تعلیم نہیں۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ گھڑ دیا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب کبھی مجھ پر کوئی سختی آن پڑتی ہے تو میں امام ابو حنیفہ کی قبر پر آ کر دعا کرتا ہوں۔ اور سختی دُور ہو جاتی ہے۔ یہ محض جھوٹی روایت ہے جو نہ تو روایت کے مسلّمہ اصولوں پر صحیح اُترتی ہے نہ عقل و قیاس کے مطابق ہے۔ امام شافعیؒ تو اپنی تحریروں میں قبروں کی تعظیم و تکریم مکروہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے حجاز، یمن، عراق و شام اور مصر وغیرہ میں کتنے ہی صحابہ اور تابعین کی قبریں دیکھیں لیکن کبھی کسی قبر کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ حالانکہ صحابہ تو ظاہر ہے امام ابو حنیفہؒ سے بدرجہا افضل و برتر تھے۔ حق یہ ہے کہ امام شافعیؒ جب بغداد میں تشریف لائے تو نہ وہاں کسی قبر پر لوگ دعا کے لئے آتے تھے نہ یہ طریقۂ ناقص اُس دَور میں مروج تھا ــــ!

بعض لوگ مشہور بزرگ معروف کرخیؒ کی قبر کے متعلق کسی بزرگ کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ وہ قبولِ دعا کے لئے تریاق اور مجرب ہے اور خود معروف کرخیؒ نے اپنے بھتیجے کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر پر آ کر دعا کیا کرے۔ نیز بعض نیک لوگوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صلحاء اور انبیاء کی قبروں پر آ کر دعائیں کیا کرتے تھے۔ اور دعائیں قبول ہو جاتی تھیں۔ نیز بعض فقیہوں نے قبر پر قرآن خوانی کا جواز لکھا ہے۔ یا بعض لوگوں نے اپنے تجربے بیان کئے کہ فلاں شیخ کے مزار پر ہم نے دعا کی اور مقبول ہوئی یا بعض علماء اور زاہدین قبروں پر دعائیں کرتے اور جھکتے دیکھے گئے۔ لہٰذا یہ لوگ جاہل اور تارکِ شریعت نہیں ہو سکتے ــ!

اس طرح کی حجتیں لانا دین و شریعت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک دعا کے مقبول ہونے کا تعلق ہے تو کوئی بھی فیصلہ کُن طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کس لئے مقبول یا رد ہوئی۔ دعا گھر کے کونے میں بھی مقبول ہوتی ہے اور قبرِ رسولؐ تک پر نامقبول ہو جاتی ہے۔ دعا کافروں اور مشرکوں اور سخت گناہ گاروں کی بھی قبول ہوتی ہے اور کفّار بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں عمل کی وجہ سے یا فلاں گرجا کی برکت سے دعا قبول ہوئی۔ ہندوؤں میں بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں مندر یا فلاں استھان یا فلاں گھاٹ پر دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کافروں اور مسلمانوں سب کی قبول و رد کرتا ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور اگر کسی قبر پر دعا کرنے سے فوری قبولیت حاصل ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ مقبولیت اس قبر یا صاحبِ قبر کی برکت سے ہے بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وقت ہی اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا رکھا تھا اور اس وقت کسی بھی جگہ یہ دعا مانگ لی جاتی قبول ہوتی۔

رہا بعض بزرگوں کا قول۔ تو اوّل تو اس قول کی روایتیں ہی مستند نہیں ہیں۔ دوسرے کسی شخص کا بزرگ ہونا اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اُس کا ہر اجتہاد درست ہی مان لیا جائے۔ اگر وہ مجتہد کا درجہ رکھتا ہے تو یوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اِن

اجتہاد پر کوئی گناہ نہیں ہوا۔ بلکہ ایک درجہ میں اجتہاد کا ثواب ہی ملا۔ لیکن جو لوگ محض تقلید میں اسے اختیار کرتے ہیں، وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ مقلد کے لئے یہ مسئلہ اجتہادی نہیں بلکہ غلط اجتہاد کی پیروی ہے! قول کے بعد فعل کا نمبر ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ کسی بزرگ کا خصوصی فعل شریعت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہر دور میں قبروں کی تعظیم اور اس پر دعا کی مخالفت کرنے والے بہت علماء رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کچھ علماء و صلحاء تعظیم و دعا کو درست بھی کہیں تو یہ مسئلہ اختلافی ہوا اور اختلافی مسائل میں اللہ تعالیٰ کا کھلا حکم ہے کہ:-

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔

جب تم کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کی روشنی میں فیصل کرو۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ دعا کا قبول کیا جانا الگ بات ہے اور فعل ممنوع کی سزا الگ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کافر مصیبت یا دشمن کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اللہ اس کی دعا قبول کر لیتے ہیں۔ تو کیا اس قبولیت کے باوجود اس کے یہ کافرانہ افعال مستحق سزا نہ ہوں گے۔ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ اسی طرح قبر پر جا کر اگر کوئی مسلمان دعا کرتا ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے تو غلط اعتقادی اور ممنوع طرزِ عمل اختیار کرنے کا عذاب تو بہرحال ملے گا۔۔۔!

پھر بعض دعاؤں کا قبول ہونا بھی عذاب الٰہی کی ایک شکل ہوتا ہے۔ آدمی اپنے نزدیک جو چیز مفید سمجھتا ہے وہ مانگتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہی چیز اس کے لئے مصیبت و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے مثلاً ایک شخص ثعلبہ نے آنحضورؐ سے درخواست کی کہ میرے لئے کثرتِ مال و اولاد کی دعا فرمائیں آنحضورؐ نے فرمایا۔ ایسی خواہش مت کر تجھے نقصان رہیگا۔ لیکن اس نے ضد کی اور آپؐ نے دعا فرمادی جو مقبول ہوئی۔ مگر یہی چیز اس کے لئے تباہی کا باعث بن گئی۔ چنانچہ جب مال ملا تو اس نے زکوٰۃ تک سے انکار کر دیا۔ ایسی ہی مثالیں آپ اپنے اردگرد دیکھ سکتے ہیں۔ اولاد کی دعا قبول ہوتی ہے تو بعض حالتوں میں یہی اولاد ماں باپ کے لئے ہزاروں پریشانیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ وعلیٰ ہٰذا۔

زیارتِ قبور

قبروں کی زیارت کا بیشک حضورؐ نے اذن دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ موت کو یاد رکھو، موت کو یاد رکھنا ظاہر ہے کہ بجائے خود مقصد نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت کو یاد رکھے گا تو اچھے اعمال کی طرف راغب ہوگا، برائیوں سے بچے گا اور دنیا کی زندگی میں محو نہیں ہوگا۔ مسلم میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:-

"میں نے اللہ سے اپنی والدہ کی مغفرت کی اجازت چاہی تو منع فرمادیا گیا۔ مگر ان کی قبر کی زیارت کا اذن مانگا تو مل گیا"

—دوسری روایت مسلم ہی میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور اس قدر روئے کہ جو اصحاب ساتھ تھے وہ بھی رونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں نے اپنی والدہ کے لئے مغفرت طلب کی تو انکار فرمادیا۔ لیکن قبر پر آنے کی اجازت دے دی۔ لہٰذا قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔۔۔!

حضورؐ کے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ پھر یہ دیکھئے کہ آج کتنے لوگ موت کو یاد کرنے قبروں پر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس علتِ حکم ہی کو فراموش کر دیا اور محض صالحین کی قبروں پر تقرب الی اللہ اور برکت و سعادت کے لئے میلے لگانے لگے۔ اور موت کی عبرت انگیز ویرانی و خموشی کو راگ رنگ، شور و شر اور فسق و فجور میں بدل دیا۔ وَا حسرتا! زیادہ سے زیادہ مذکورہ فعلِ رسولؐ سے یہ نظریہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کسی عزیز و قریب یا دوست کی قبر پر بطور محبت جانا جائز ہے تو اس میں بھی کچھ اعتراض نہیں لیکن

یہ محض رسمی چیز نہ بن جانی چاہیئے۔ نہ اسے اجتماعی شکلیں دینا درست ہے!

راگ رنگ قوالی

"سماع" کے نام سے جو خرافات و منہیات رواج پا گئی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ قرآن و حدیث اور تعاملِ صحابہ اور قیاسِ صحیحہ سے تو ان کے جواز پر کوئی دلیل ملتی ہی نہیں۔ بس بعض بعد کے صلحا کے عمل کو بنیاد بنا کر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور اس میں اتنے بڑھ گئے کہ صریح محرمات و منکرات کا ارتکاب کیا جانے لگا۔ اوّل تو پچھلے بعض بزرگوں نے جو "سماع" اختیار کیا یہ اُن کا ذاتی فعل تھا جو ہرگز حجت نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے بہت سخت شرائط اس کے لئے رکھیں، جن کی تفصیل اُن کے قول و عمل میں ملتی ہے۔ آج یہ شرائط قطعاً نظر انداز کر دی گئیں۔ اور محض لغویت و مزخرفات اختیار کر لی گئیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون صحیح العقل مسلمان ہو سکتا ہے جو خلوص کے ساتھ قرآن و سنت کا مطالعہ کرے اور پھر آج کل کے عرسوں، توالیوں اور ناچ گانوں کی اہمیت و تقدس کا وہم بھی کر سکے!

بدعت کی کسوٹی

میرا ارادہ تھا کہ مروجہ بدعات میں جو زیادہ مشہور و مقبول ہیں ان میں سے ایک ایک پر مفصل گفتگو کروں گا۔ لیکن ایک تو یہ کہ فاضل مُدیر فاران کے اصرار کے باوجود میں عدیم الفرصتی کے باعث مناسب وقت پر مضمون شروع نہ کر سکا۔ اور آغاز اُس وقت کیا جب اُن کا یہ خط آ گیا کہ مضمون فوراً بھیجو۔ دوسرے میرا قلم اس چیز نے روکا کہ یہ صرف مضمون ہے، کتاب نہیں۔ فاران میں آخر اوروں کے بھی تو مضامین آنے ہیں۔ اگر میں نے الگ الگ بدعتوں کو لیا تو پوری کتاب بن جائیگی۔ صرف قبروں ہی کے معاملہ پر آپ دیکھیئے کتنے صفحے صرف ہو گئے۔ حالانکہ اس میں میں نے سب گوشے اور بسیط مطالب بیان نہیں کئے۔ پھر بدعتیں اتنی کثیر ہیں کہ سب کو ایک ہی مضمون میں جمع کرنا اور ہر ایک کی خرابی الگ الگ بیان کرنا دفتر چاہتا ہے۔ لہٰذا جدا جدا بیان کرنے کے عوض میں مناسب سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنّت کی روشنی میں ایسی کسوٹی آپ کے سامنے رکھ دوں جس پر آپ کسی بھی قول و فعل کو پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ بدعت ہے یا امر جائز۔ مردود ہے یا مقبول۔ وما اللہ التوفیق!

لغت میں لفظ "بدعت" کے معنی ہر اُس کام کے ہیں جو نیا نیا کیا گیا ہو۔ اور اس سے پہلے اس پر عمل نہ ہوا ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد صرف وہ نئے کام ہیں جنہیں دین کا جزو بنایا جا رہا ہو۔ یہ اتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ معاند یا احمق کے سوا کوئی اس سے اعراض نہیں کر سکتا۔

آدمی جو بھی کام کرتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ مقصد اور منشاء ضرور ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مقصد دُنیا کی کوئی منفعت و مصلحت ہے یا آخرت کی۔ اگر دُنیا کی ہے تو شریعت کو اس سے کوئی دشمنی نہیں۔ بس وہ تو اتنا کہتی ہے کہ حلال و حرام کی جو حدیں اللہ و رسُول نے متعین فرما دی ہیں وہ نہ توڑیں اور آپ ان حدوں میں رہتے ہوئے جس طرح چاہیں منافعِ دُنیاوی اور راحت و عزت حاصل کریں۔ مثلاً آپ نے ریل کا سفر کیا۔ ظاہر ہے کہ رسُول اللہ کے دَور میں ریل نہیں تھی۔ لہٰذا از روئے لغت ریل کا سفر بدعت ہوا۔ مگر اس کا مقصد خالص دُنیاوی ہوتا ہے اور قرآن و سنّت کے کسی لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اہلِ کفر کی ایجادات سے دُنیاوی فائدہ نہ اُٹھاؤ۔ بلکہ اس کے برعکس اہلِ کفر کی مصنوعات کا استعمال خود فعلِ رسُول سے ثابت ہے۔ لہٰذا شریعت کے نزدیک یہ بدعت نہ ہوگی۔ اسی طرح دیگر امور میں جو کسی حکمِ شرعی کے خلاف نہ ہوں اور باعتبار امورِ مباحہ کے لغتاً بدعت ہوں۔ ان پر شریعت کو کچھ اعتراض نہیں۔ ہاں اگر ان سے کوئی حکمِ شرعی ٹوٹتا ہو تب بے شک شریعت اُن پر معترض ہوتی ہے۔ مثلاً بینک کا کاروبار ہے۔ آنحضُور کے دَور میں یہ کاروبار اپنی موجودہ شکل میں نہیں تھا۔ اور آج یہ دُنیاوی منفعت کے لئے رائج کر لیا گیا ہے۔ لیکن شریعت نے سود کے لئے جو احکام بیان کئے یہ کاروبار چونکہ اُن کو جھٹلاتا ہے۔

اس لئے شریعت کے خلاف ٹھہرا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا مقصد دُنیادی نہ ہو بلکہ اُخروی ہو۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا حکم قرآن و سنت میں موجود ہے یا نہیں اور صحابہؓ و ائمہ نے اسے قرآن و سنت کے کسی لفظ یا جملہ سے اخذ کیا ہے یا نہیں۔ اگر دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت موجود ہے۔ تو اس کام کے شرعی ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اور اگر کوئی صورت موجود نہیں ہے تو دیکھا جائے گا کہ جس مقصد اور سبب کی خاطر یہ کام کیا جا رہا ہے وہ مقصد اور سبب رسول اللہ کے دور میں بھی موجود تھا یا نہیں۔ نیز اگر موجود تھا تو رسول اللہ اور اُن کے اصحاب کے لئے عملاً اس کام کو کر لینے میں کوئی رکاوٹ حائل تھی یا نہیں۔ اگر وہ مقصد و سبب اُس دور میں بھی موجود تھا اور اس کے حصول کے لئے آج جو کام کیا جا رہا ہے، اس زمانہ میں بھی کر لینا ممکن تھا تو یقیناً کہا جائے گا کہ یہ کام بدعت شرعی میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر بعض بدعت پسندوں کے اس طرزِ عمل کو لیجئے کہ وہ کسی ایک یا چند نمازوں کے بعد سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھنے کو نہ صرف اچھا سمجھتے ہیں بلکہ اس کی پابندی کرتے ہیں اور جو اُن کی تقلید نہ کرے اُسے وہابی وغیرہ کہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن کا یہ عمل دُنیاوی مقاصد کے لئے ہے یا دینی مقاصد کے لئے۔ ظاہر ہے کہ دُنیاوی فائدہ تو اس میں ذرّہ برابر نہیں۔ یہ لوگ ثواب اور برکت ہی کے مقصد سے یہ فعل کرتے ہیں۔ جو اخروی غائت میں داخل ہے اور تقرب الی اللہ کے سوا اس کا کوئی نفع متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ مقصد تو دورِ مبارک میں نہ صرف موجود تھا۔ بلکہ اسی مقصد اور سبب کیلئے آنحضور مبعوث ہوئے تھے اور یہی دین کا مقصد و حاصل ہے۔ علاوہ ازیں کوئی مانع بھی ایسا موجود نہ تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حضورؐ اور آپ کے اصحاب بعد نماز فاتحہ اور سورۂ اخلاص کی پابندی نہ کر سکتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قول و فعل سے نہ تو حضورؐ نے اس کی تعلیم دی نہ صحابہ نے اس پر عمل کیا۔ لہٰذا لازماً یہ بدعت ہے اور اس کو افضل و مقدس سمجھنے والا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کے تقرب اور حصولِ ثواب کے جن ذرائع سے میں واقف ہوں اُن کا علم رسول اللہ کو بھی نہ تھا۔ نعوذ باللہ۔ اندازہ کیجئے رسول اللہ تو جمعہ کو متعین کر کے روزہ رکھنے کو بھی منع فرماتے ہیں کہ اس طرح لوگوں میں یوم جمعہ کے لئے ایسے فضائل متصور کر لئے جائیں گے جو اس میں نہیں ہیں اور مدعیانِ اسلام نئی نئی عبادتیں گھڑ کے اُن پر خود جمتے اور لوگوں کو جماتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ کی جو تعریفیں رسول اللہ سے منقول ہیں اُن کا اقتضا صرف یہ ہے کہ مسلمان وقتاً فوقتاً انھیں پڑھتا رہے اور دُوسروں کو بتائے کہ ان سورتوں کو پڑھا کریں مگر کسی وقت کے ساتھ انھیں خاص اور پابند کر دینا ایجاد و بدعت شمار ہو گا۔ کیونکہ جن مواقع پر ان کی پابندی اور دوام منقول نہیں اُن مواقع پر پابندی کرانا گویا آزادی اور رخصت کا وہ حق سلب کرنا ہے جو اللہ و رسولؐ نے مومنین کو دیا ہے۔ اس حق کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے!

دوسری مثال مولود کی ہے۔ جو یوم پیدائش پر سال بہ سال نہایت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ مثال اس لحاظ سے بڑی نازک ہے کہ جب اس کے بدعت ہونے پر کلام کیا جائے تو بدعت پسند حضرات عوام کو جذباتی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو صاحب یہ ذکرِ رسولؐ کو بھی منع کرنے لگے۔ حالانکہ ذکرِ رسولؐ سے تو منع کافر ہی کر سکتا ہے۔ ذکرِ رسولؐ اپنی جگہ مسلّم۔ لیکن یہ یوم پیدائش پابندی سے منانے کا طریقہ اور منکرات و مکروہات سے آلودہ نمائشی محفلیں منعقد کرنے کا رواج کسی طرح شریعت کی میزان میں پورا نہیں اُترتا۔ بزرگوں کا یوم ولادت منانا اگر برکت اور ثواب کا کام ہوتا تو ضرور آنحضور انبیائے سابق کا یوم پیدائش منایا کرتے۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تو ضرور مناتے!

حدیث ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ فوجد الیہود صیاماً یوم عاشورا فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماھذا الیوم الذی تصومونہ فقالو ھذا یوم عظیم انجی اللہ موسیٰ وقومہ وغرق فرعون وقومہ فصامہ موسیٰ شکراً فنحن نصومہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحن احق بموسیٰ منکم فصامہ وامر الناس بصیامہ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ پس آپؐ نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُن لوگوں نے بتایا کہ یہ عظمت والا دن ہے اس میں اللہ نے موسیٰؑ کو اور اس کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا۔ پس موسیٰؑ نے بطور شکر کے روزہ رکھا تھا۔ پس ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ تو کہا رسولؐ اللہ نے ہم موسیٰؑ کے معاملہ میں تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ پس آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔

اس کے ساتھ دوسری حدیث دیکھئے:۔

عن ابی موسیٰ قال کان یوم عاشورا یوماً یعظمہ الیہود وتتخذہ عیداً فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموا انتم!

ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ یہودیوں کے نزدیک یوم عاشورہ ایک معظّم دن تھا اور وہ اس دن عید منایا کرتے تھے۔ پس رسولؐ اللہ نے کہا (مسلمانوں سے) کہ تم روزہ رکھو!

ان حدیثوں کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے روزہ بطور شکر ایک دینی فعل تھا۔ لہٰذا آنحضورؐ نے اسے قبول کرلیا۔ لیکن بطور شکر سال بسال عید منانا قبول نہیں کیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس طریقہ میں کوئی بھلائی نہیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ کا یوم نجات اور غرقابی فرعون بداہتہً خوشی منانے کے لئے بہت کافی وجہ ہے۔ کم سے کم نفسِ ولادت سے تو اس کا مرتبہ زیادہ ہے اس لئے کہ برخلاف حضرت موسیٰؑ کا فرعون جیسے جبار وقہار پر فتح پانا اور فرعون کا غرق ہوجانا صراحتہً خاص اور اہم واقعہ ہے جس پر خوشی منائی جانی عقلاً نامناسب نہیں۔ مگر جس چیز کے بارے میں رسولِ خدا کو معلوم ہو کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں وجہ قربت نہیں بن سکتی اور عوام کے لئے اس میں فتنہ کے جراثیم پوشیدہ ہیں۔ اسے آپؐ کیسے اختیار کرسکتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ میں نے اختیار کیا تو یہ اُمّت کے لئے سنّت بن جائے گا۔ اور دین کے اعتبار سے بے نتیجہ بلکہ فتنہ پرور باتوں کو سنّت بنانا ایک سچے نبیؐ کے لئے ممکن نہیں ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ تو چونکہ خود ہر نبی سے بلند مرتبہ تھے۔ اس لئے آپؐ نے کسی نبی کا یوم ولادت نہیں منایا۔ چلئے مان لیا۔ لیکن کیا صحابہؓ بھی انبیاء سے افضل تھے؟ کیا حضورؐ کے نزدیک اگر یوم پیدائش منانا برکت وسعادت کا ذریعہ ہوتا تو آپؐ صحابہ کو اس کا حکم نہ دے سکتے تھے؟ پھر آنحضورؐ کے بعد خود صحابہ کو بھی اتنی دینی فہم نہ ہوئی کہ آنحضورؐ کا یوم ولادت منا لیا کریں!

ایک یہ گوشہ نکالا جاتا ہے کہ ہم تو میلاد بطور وسیلۂ خیر کرتے ہیں، تاکہ لوگ دین کی طرف مائل ہوں، اس خیال ونیت کا ثبوت اگر عمل سے ملتا تو جیر بات وزنی تھی۔ مگر حال تو یہ ہے کہ میلاد کی محفلوں میں آیت قرآنی اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْن کی بھی دل کھول کر نافرمانی کی جاتی ہے۔ کتابیں بھی غیر مستند پڑھی جاتی ہیں۔ قیام بھی کیا جاتا ہے، جو خلافِ شرع اعتقاد کا نتیجہ ہے۔

اور دن، تاریخ کی ایسی پابندی کی جاتی ہے کہ روزہ، نماز قضا ہو مگر یہ قضا نہ ہو۔ حالانکہ صلی اللہ اگر اس خاص مہینہ میں پیدا ہوئے تو وصال بھی آپؐ کا اسی مہینہ میں ہوا ہے، تو یہ مہینہ مسرت کے ساتھ شدید ترین عبرت کے اسباب بھی اپنے اندر رکھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہالک اور فانی ہے!

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ یوم ولادت منانے کا مقصد جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ آنحضورؐ اور صحابہ اور تابعین سب کے دور میں موجود رہا ہے اور کوئی رکاوٹ بھی ایسی نہیں رہی کہ یہ حضرات اس عمل کو نہ کر سکتے۔ جب انہوں نے نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ یہ فعل بدعت ہے!

ہاں کسی بڑے شاعر یا ادیب یا لیڈر کا یوم پیدائش منانا چونکہ خالص دُنیاوی معاملہ ہے اور تقرب الی اللہ اور ثواب و برکت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے شریعت کی اصطلاح میں اسے بدعت نہیں کہیں گے۔ البتہ جو اسراف اور تضیع اوقات اور ممنوع افعال اس میں کئے جائیں انھیں شریعت ممنوع قرار دے گی!

دوسری صورت لیجئے کہ سبب تو موجود تھا، مگر عمل میں رکاوٹ تھی۔ اس کی مثال قرآن اور دینی کتابوں کو چھاپنا ہے ظاہر ہے کہ قرآن کی اشاعت و نشر کا مقصد دورِ مبارکؐ میں بھی موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح علوم دینیہ کو پھیلانے کا مقصد جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اس زمانے میں پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، لہٰذا چھپائی نہیں ہو سکی اب پریس ہے لہٰذا چھپائی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو محض تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ برکت و ثواب اور نشر و اشاعت کی خاطر چھاپیں تب بھی باوجود دینی ہونے کے یہ فعل بدعتِ شرعی شمار نہ ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ یہ عمل دورِ مبارکؐ میں نہ ہوا اور مقصدِ عمل اُس وقت بھی موجود تھا۔ لیکن اس عمل پر اُس وقت قدرت ہی نہ تھی۔ اور چھپائی کا عمل بجائے خود کسی حکم شرعی کے خلاف نہیں ہے۔ یہ معاملہ ثواب کی خاطر کتابیں چھاپنے اور پوسٹر وغیرہ شائع کرنے کا ہے!

تیسری صورت یہ ہو کہ ایک نیا کام ہم نے جس مقصد کے لئے شروع کیا ہے، وہ اگرچہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن وہ جس سبب کے لئے کیا جا رہا ہے وہ سبب ہی دورِ مبارک میں موجود نہ تھا۔ مثلاً آنحضورؐ کے بعد صحابہ کا قرآن جمع کرنا اور صحابہؓ و تابعین کا حدیث کی کتابیں ترتیب دینا۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں سے حفاظتِ دین اور تحفظِ مذہب مقصود ہے۔ یہ مقصود اپنی جگہ بلاشبہ حق اور دینی ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کے جمع و تدوین کے اسباب آنحضورؐ کی زندگی میں موجود نہیں تھے۔ آپؐ کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ جمع و تدوین ضروری معلوم ہوئی۔ لہٰذا یہ وہ شرعی بدعت نہیں ہے جسے حدیث میں "ضلالت" کہا گیا ہے!

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو سبب دورِ مبارک میں نہیں تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا وہ سبب بجائے خود مسلمانوں ہی کی کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مثلاً خطبۂ عید بعد نمازِ عید مشروع ہے۔ اب بعد میں اگر مسلمانوں کا یہ حال ہوگیا کہ نماز ختم ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور خطبہ نہیں سُنتے تو یہ سبب اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا جائیگا کہ خطبہ نماز سے پہلے دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ سبب قدرتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بے حسی اور بدعملی سے پیدا ہوا ہے!

بدعت کو پہچاننے کی یہ کسوٹی اگرچہ اس وقت ہمارے الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے، لیکن فی الحقیقت

یہ ہماری ایجاد کردہ نہیں بلکہ قرآن و سنت کے بخشے ہوئے دین نے اسے بنایا ہے ۔ آخر آپ بھی تو یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ کے معاملہ میں رسول اللہ کا علم ہم لوگوں سے ہزاروں گنا زیادہ اور یقینی تھا ۔ وہ آخری نبی تھے جسے دُنیا کے سامنے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرکے تمام ممکنہ ذرائع کھول کر رکھ دینے تھے ۔ اور وہ اس نے رکھ دیئے ۔ ہماری عقلوں کو اتنی دسترس کہاں کہ ہم اللہ کی رضا یا ناراضی کے بارے میں رسول اللہ کی تعلیم سے قطع نظر کرکے کوئی یقینی فیصلہ کرسکیں —— ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے ۔ ہم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ فجر کی نماز صرف دو رکعت اور مغرب کی تین کیوں ہے ۔ باقی وقتوں میں چار رکعت کس لئے ہیں ۔ عشاء کے بعد کس غرض سے وتر رکھے گئے ہیں ۔ زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فیصد کیوں ہے دو یا تین فیصد کیوں نہیں ۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ قرآن اور رسول اللہ نے جو حکم فرمایا اُسے پورا کریں ۔ ایک غلام کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آقا کے احکام میں حذف و اضافہ کرے ۔ بدعت کو صریح طور پر بالتکرار منع کیا گیا ۔ اور ہم ہیں کہ اس منع کرنے والے کی صداقت و رسالت پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنی طرف سے نئے اعمال نکالتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ خوش ہوں گے ۔ اللہ کی رضا ملے گی ۔ برکت حاصل ہوگی ۔ جب رسول اللہ کے رسول اور خداشناس ہونے پر ہم ایمان لے آئے تو خود بخود یہ بات لازم آجاتی ہے کہ خدا کا قرب اور ثواب و برکت حاصل کرنے کے لئے جو اعمال ہوسکتے تھے وہ حضورؐ نے قول و عمل سے واضح فرمادیئے اور جن اعمال کو اختیار نہیں فرمایا ۔ حالانکہ اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا ۔ وہ یقیناً مفیدِ ثواب و برکت نہ ہوں گے !

خیال آتا ہے کہ بدعت پسند حضرات حضرت عمر فاروقؓ کے ایک جملہ کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں ۔ وہ جملہ نماز تراویح کی باقاعدہ جماعت کے بارے میں ہے ۔ الفاظ یہ ہیں " نعمت البدعتہ ھٰذہٖ ! (کیسی اچھی ہے یہ بدعت) یہ الفاظ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمائے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ یہ جو آپ نے پورے رمضان میں پابندی سے تراویح باجماعت کا سلسلہ مسجد میں شروع کرادیا ہے ، یہ تو بدعت معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکل حضورؐ کی زندگی میں نہیں تھی —— !

اس جملہ سے یہ دلیل پکڑی جاتی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ۔ سیئہ اور حسنہ ۔ حدیثوں کا مورد بدعاتِ سیئہ ہیں اور بدعاتِ حسنہ پسندیدہ و محبوب ہیں ۔ جیسا کہ خود حضرت عمرؓ کے قول سے معلوم ہوا ۔ بظاہر بات بڑی ظاہر فریب ہے لیکن جب تجزیہ کیجئے تو تلبیس کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ حدیث کی ایک ایک کتاب اُٹھا کر دیکھئے ۔ کسی جگہ آپ کو نہیں ملیگا کہ شریعت نے بدعت کی دو قسمیں کی ہوں ۔ جتنی بھی حدیثیں آپ نے بدعت کے بارے میں ابھی پڑھیں اور جتنی ان کے علاوہ ہیں سب میں " بدعت " بغیر کسی اضافت کے مطلقاً بولا گیا ہے اور مطلق کو مقید یا عام کو خاص کرنے کے لئے جب تک مضبوط قرینہ نہ ہو ، کسی کو تقیید یا تخصیص کی اجازت نہیں ۔ بدعت کی تقسیم بعد کے لوگوں نے کی ہے اور اس لئے کی ہے کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بدعت کا پہلو تو معمولی سا ہوتا ہے اور دینی نفع کا پہلو ذرا زیادہ ہوتا ہے ۔ ایسے امور کو بعض لوگوں نے بدعتِ حسنہ کا نام دے لیا ۔ مثلاً بعض بزرگوں نے اپنی خاص طبیعت اور مزاج کے تحت یہ محسوس کیا کہ معرفت و تصوف کے اشعار ان پر بہت اثر کرتے ہیں ، لہٰذا انہوں نے خوش آواز لوگوں سے انھیں سُننا شروع کیا ، اور اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ " سماع " بدعت ہے ۔ لیکن اس سے اُن کی رغبت الی اللہ زیادہ بڑھی اور تزکیۂ نفس کے لئے اسے اپنے حق میں زیادہ مؤثر پایا ۔ لہٰذا " بدعتِ حسنہ " قرار دے لیا ۔ ہوسکتا ہے خاص ان کے حق میں

یہ بدعت باوجود ممنوع ہونے کے عتابِ الٰہی کا سبب نہ بنے۔ کیونکہ انہوں نے پورے اخلاص سے اسے اختیار کیا تھا۔ اور کسی طرح کی خرافات کو اس میں داخل نہیں کیا تھا۔ نہ نفسانی لذت حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ نیز اُن کی زندگی چونکہ اعمالِ خیر اور عبادت و زہد سے لبریز تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ بمصداقِ قرآن اُن کی نیکیاں اس بدعت کو اللہ کی بارگاہ میں قابلِ نظر اندازی بنا دیں۔ لیکن ہمہ شما کو یہ ہرگز جائز نہیں کہ اُن کی تقلید کرے اور سماع کی بدعت کو — جو ہر حال میں بدعت ہے — فعلِ حسنہ تصور کر لے۔

بہرحال بدعتِ حسنہ شرعی اصطلاح میں کوئی چیز نہیں ہے اور حضرت عمرؓ نے جو بدعت کا لفظ فرمایا وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کام کو پوری طرح مفید اور نفع بخش اور بہتر جان کر اختیار کر رہے ہوں اور اس پر کچھ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ کام مفید نہیں ہے بلکہ نقصان دہ ہے۔ تب آپ ان لوگوں کو جواب دیں کہ اچھا نقصان دہ ہی سہی مگر اس کا نقصان بڑا مفید ہے۔!

ظاہر ہے یہ متضاد قسم کا جملہ آپ نے اپنے اُس یقین کی بنا پر کہا ہے جو آپ کو اس کام کے مفید و بہتر ہونے پر ہے!

اس دلیل کو اگر کوئی نہ مانے تو دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ لفظ "بدعت" شرعی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ہی لفظ ہم بعض دفعہ لغوی معنی میں بولتے ہیں اور بعض دفعہ اصطلاحی معنی میں۔ موقع محل خود بتا دیتا ہے کہ لفظ کس معنی میں بولا گیا ہے۔ حضرتِ عمرؓ کے بارے میں آپ کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہ کے حد درجہ کے تابعِ فرمان اُن کی سنت کے شیدا۔ اُن کی ادا ادا کے متوالے، اُن کے دین پر ثابت قدم نہایت عظیم صحابی تھے۔ جن کی تعریف میں نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کی زبانِ صداقت نظام نے بہت کچھ کہا ہے بلکہ متعدد بار وحی بھی اُن کی رائے کے موافق نازل ہوئی ہے۔ اُن کی زبان سے اگر کبھی کوئی ایسا جملہ نکلے جس کے دو معنی ہو سکیں تو عقل اور انصاف کا تقاضا کیا یہ ہے کہ وہ معنی مراد لئے جائیں جو رسول اللہ کے صریح اقوال کے مخالف محسوس ہوتے ہوں، یا وہ معنی مراد لئے جائیں جن سے مخالفت نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا اور ایمان ہوگا وہ یہی مفہوم مراد لے گا جو رسول اللہ کے اقوال کی تردید نہ کرتا ہو۔ چنانچہ اس قولِ عمرؓ میں لفظ "بدعت" اگر شرعی معنی میں لیا جائے تو اقوالِ رسولؐ کی تکذیب مترشح ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہ نے تو بدعت کو مطلقاً بالکلیہ مردود ٹھہرایا اور حضرت عمرؓ گویا یوں کہہ رہے ہیں کہ نہیں تمام بدعتیں مردود نہیں ہیں بلکہ بعض بدعتیں محمود و مقبول بھی ہیں!

کیا حضرت عمرؓ جیسے جلیل صحابی کی طرف ایسے معانی کا گمان منسوب کرنا اہلِ علم و عقل گوارا کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے۔ تب قرینہ خود بخود پیدا ہو گیا کہ بدعت کو لغوی معنی میں لو۔ یعنی اپنی مجموعی شکل و ہیئت کے اعتبار سے تو بے شک جماعتِ تراویح کی باقاعدگی اور پابندی اور اس سے متعلق روشنی وغیرہ کا اہتمام ایک ایسا کام تھا جو نیا تھا لیکن شرعی اعتبار سے یہ نیا نہ تھا۔ بلکہ شریعت ہی کا اقتضا اور منشا تھا اور شریعت ہی اس کے لئے دلیل و شہادت مہیا کر رہی تھی!

اصحابِ سنن کے ہاں یہ روایت ملتی ہے کہ تراویح کا باجماعت پڑھنا، تنہا پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ آنحضورؐ نے شروع رمضان میں دو یا تین راتوں کو تراویح جماعت سے پڑھی تھی۔ اور رمضان کے آخری حصہ میں بھی متعدد بار پڑھی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ جب آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اور آخر تک ٹھہرا رہتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔ پورے مہینہ باجماعت تراویح نہ پڑھنے کا سبب بھی خود حضورؐ ہی نے بیان فرما دیا کہ — میں اس خیال سے نماز کے لئے برآمد نہیں ہوا کہ کہیں وہ تم پر فرض نہ ہو جائے! گویا تشریف نہ لانا اور باجماعت پابندی سے نہ پڑھنا اس لئے نہیں تھا کہ اس میں کوئی قباحت تھی۔ بلکہ اس لئے تھا کہ کہیں میرے دوام و استقلال سے لوگ اسے فرض و واجب کا درجہ

نہ دے میٹھیں!

اب اندازہ فرمایئے کہ حضرت عمرؓ نے اگر رسول اللہ کے وصال کے بعد تراویح باجماعت کو مہینہ بھر پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا تو شرعاً یہ کیونکر بدعت ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی حیثیت سے شرعی مفہوم میں نیاپن نہیں ہے۔ ہاں لغتاً یہ نیا ہے! اس کے علاوہ خود رسول اللہ نے فرمایا "علیکم بسنتی وسنتہ الخلفاء الراشدین المھدیین" اس لئے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا کوئی طریقہ کوئی اجتہاد، کوئی عمل بدعت شرعی ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کے طریقہ پر چلنا تو حکم رسول کا اتباع و انقیاد ہے۔ ان کی جو رائے دیگر اصحاب نے درست مان لی وہ تمام اُمت پر لازم ہوئی اور جس سے کسی ایک یا چند اصحابؓ نے اختلاف کیا۔ اُس میں اگرچہ ہمیں اُن کی رائے ترک کر کے دوسرے صحابی کی رائے مان لینے کا اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی رائے باطل یا بدعت پر محمول تھی! و رضی اللہ عنہ۔

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا یہ جملہ اہلِ بدعت کے لئے واقعتہً بھی کوئی حجت اپنے اندر رکھتا ہے تو کیا وہ حضرت عمرؓ کے دیگر اقوال و افعال کو بھی حجت مانیں گے؟ اگر مان لیں تو ہمارا اور اُن کا اختلاف ہی ختم ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ ہی تو وہ ہیں جنہوں نے شجرۃ الرضوان کو کٹوایا اور کسی بھی چور دروازہ سے چھوٹی سی بدعت کو داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ حضرات دیگر اقوالِ عمرؓ اور اسوۂ فاروقی کو لائقِ حجت نہیں سمجھتے۔ تب انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اُن کے ایک بے ساختہ اور متبادر جملہ کو بطور سند لائیں!

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو تو بیشک یہ حق تھا کہ رسول اللہ کے کسی حکم عام میں کسی خاص دلیل سے کوئی استثنا نکال لیں۔ اُن کی دین شناسی، اصابتِ رائے اور تفقہ پر محض اُن کا اسوہ ہی نہیں بلکہ سب سے مضبوط شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی "بدعت" کو تمام صحابہ کا بخوشی قبول کر لینا بھی اس بات کی شافی دلیل ہے کہ یہ بدعت شرعی بدعت تھی ہی نہیں۔ آخر صحابہ کے کردار اور کمالِ ایمان سے کون واقف نہیں۔ وہ دین کے معاملہ میں کیا حضرت عمرؓ سے دب کر خلافِ حق کوئی فیصلہ قبول کر سکتے تھے۔ ایسا کوئی بے سواد ہی سوچ سکتا ہے۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ صحابہ کے لئے جان دے دینا آسان تھا مگر خلافِ شریعت فیصلہ کو بخوشی قبول کر لینا ممکن نہ تھا!

بتایئے صحابہ کے بعد ایسا کون ہے جسے یہ اختیار دیا جا سکتا ہو کہ رسول اللہ کے کسی حکم عام میں بغیر دلیل شرعی کے اپنی رائے سے تخصیص کرے یا مستثنیات نکالے۔ کون ہے جس کی بصیرت، تفقہ، بالغ نظری، دینداری، تقویٰ، اصابتِ رائے اور حبِ رسولؐ پر خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر تصدیق ثبت ہو۔ کوئی نہیں۔ ہرگز کوئی نہیں۔ لیس علیہم بسلطان پھر کیسے بلاسند کے نئے طریقوں کو جزوِ دین سمجھا جائے۔ کہ کوئی صالح و عابد اُمتی خدا کے آخری رسولؐ سے زیادہ دین کا علم اور مرضیاتِ الٰہی کا وجدان و ادراک رکھ سکتا ہے!

اجتہاد و بدعت

دین میں نئی باتیں نکالنے سے ممانعت کی دلیلوں کا کوئی توڑ نہ پا کر بعض حضرات اپنی بعض بدعات کے لئے روایات تلاش کر کے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان روایات سے ہم نے فلاں کام نکالا اور اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے فقہی جزئیات کی۔ گویا اجتہادی مسائل جس طرح بدعت نہیں جزوِ دین ہیں اسی طرح ہمارا استنباط بھی بدعت نہیں جزوِ دین ہے!

بات قدرے جی لگتی ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ کیا ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ

ہر عام و خاص احادیث و آیات سے اپنے علم و عقل کے مطابق مفہوم اور مطالب نکال لیا کرے۔ خواہ اس کے نکالے ہوئے مطالب ماہرینِ علم و فن کے فیصلوں کے خلاف پڑتے ہوں یا دین کے متفقہ احکام سے ٹکراتے ہوں۔ اگر اسی کا نام انہوں نے اجتہاد سمجھا ہے تو انھیں اپنی عقل کا علاج کرانا چاہیئے۔ اجتہاد کچھ مذاق نہیں ہے۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ کسی بھی علم و فن کے اصولوں سے فروعات کا نکالنا اور ایک جزئی کو دوسری جزئی پر قیاس کرنا اُنہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو اس علم و فن پر پُورا عبور اور دسترس رکھتے ہوں۔ اور یہی عقل و انصاف کا نہ صرف تقاضا ہے بلکہ اس کے ماننے پر انسان مجبور بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہر علم و فن فاسد و باطل ہو جائے گا —— تب دین و شریعت جیسے مہتم بالشان علم کے باب میں یہ کون سمجھدار کہہ سکتا ہے کہ اس میں اجتہاد و قیاس کے لئے شرائط و قیود نہیں ہیں۔ شرائط ہیں اور ضرور ہیں۔ چنانچہ اہلِ علم نے جانچ تول کر صرف اُنہی حضرات کو مجتہد مانا جن میں شرائطِ اجتہاد پائی جاتی تھیں اور یہی مجتہدین تھے جنہوں نے زندگیاں کھپا کر قرآن و سنّت کے اصول و کلیات سے فروعات کا استنباط کر کے اسلام کا عظیم الشان قانون و دستور مدوّن کیا۔ ان کے بعد اگرچہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہیئے جبکہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی لازماً ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن اُنہی لوگوں کو اس کا حق دیا جا سکتا ہے جو اپنے کارناموں اور قول و فعل سے یہ ثابت کر دیں کہ اُن میں شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا تو سمجھنا چاہیئے کہ کسی شخص کا خواہ مخواہ یہ دعویٰ کرنا معتبر نہیں ہے کہ اس نے اجتہاد کے ذریعہ کوئی نیا نظریہ یا اصول یا عمل قرآن و سنّت سے نکالا ہے۔ جب تک وہ اپنا شرائطِ اجتہاد سے متصف ہونا عملاً ثابت نہ کر دے ورنہ جس چیز کو وہ اجتہاد کہہ رہا ہے اُسے تک بندی اور ہوائی قلعہ اور ثمرہ ہوائے نفس کہا جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبر پرستی اور راگ رنگ اور عرس و قوالی اور فاتحہ خوانی اور نذر لغیر اللہ اور اسی طرح کے امورِ رائجہ پر اجتہاد و قیاس کا دعویٰ کرنے والے شرائطِ اجتہاد سے تو کیا اُن شرائط سے بھی پُوری طرح متصف نہیں ہیں جو ایک اچھے مسلمان کے لئے قرآن و سنّت نے بیان کئے ہیں۔ یا بعض اگر اُن میں عملاً اچھے مسلمان ہیں بھی تو علم و فن میں اپنی مہارت و دسترس کا کوئی ثبوت انہوں نے دُنیا کے آگے پیش نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اُن کے ایسے اجتہادات کیونکر قبول کر لئے جائیں۔ جو نہ تو قرآن و سنّت کی میزان میں پورے اُترتے ہیں نہ مجتہدینِ سلف نے اُن کی تائید کی ہے۔ نہ عقلِ سلیم اُنھیں مانتی ہے!

یہ تو ایک خرابی ہوئی۔ دُوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو بالکل بوگس روائتیں لاتے ہیں جو حدیث کی معتبر کتابوں میں نہیں ہیں۔ یا معتبر کتاب میں ہیں بھی تو ماہرینِ فنِ روایت نے ان کی کمزوری اور خطا واضح کر دی ہے۔ یا پھر صحیح روایت سے ایسے مطالب و معانی پیدا کرتے ہیں کہ جو قطعاً من گھڑت ہوتے ہیں اور دوسری صحیح روائتیں اُن کے خلاف ہوتی ہیں!

—— چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک کتاب میں ہم نے دیکھا کہ جوازِ قبر پرستی کے سلسلہ میں روایت بیان کی گئی کہ:۔

"بعض علماء نے کہا ہے کہ جو کوئی رسُول اللہ کے مزار پر یہ آیت پڑھے اِنَّ اللّٰہ وملائکتہٗ یصلّونَ علی النبیّ" اور پھر ۷۰ مرتبہ "صلی اللہ علیک یا محمدؐ" کہے تو ایک فرشتہ پکار کر اس سے کہتا ہے کہ اے شخص تجھ پر خدا کا درود ہو۔ اس کے بعد اس شخص کی جو مراد ہو گی پُوری ہو گی۔"

یہ روایت ہی اوّل تو ناقابلِ اعتبار ہے، باعتبارِ سند بھی اور باعتبارِ عقل و قیاس بھی۔ سند کا تو یہ حال ہے کہ اس کے راوی ایک شخص ابن ابی فدیک ہیں۔ جو تابعی تک نہیں۔ اور انہوں نے جس سے روایت لی ہے وہ مجہول الحال شخص ہے۔ اور عقلاً یوں کہ

اول تو خیر القرون کے علماء سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ دوسرے یہ روایات اُس حدیث صحیح کے بالکل خلاف ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اُس پر اللہ دس دفعہ درود بھیجتا ہے۔ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ستّر مرتبہ درود بھیجنے والے کے لئے اللہ کی طرف سے سات سو درود ہوں لیکن ابی فدیک کی روایت بتاتی ہے کہ ستّر مرتبہ درود کے بدلے اللہ سے صرف ایک درود ملا!

ایک جگہ یہ روایت دیکھی کہ:۔

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی معاملہ کسی طرح تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اہلِ قبور سے مدد حاصل کرو۔"

سَو فیصدی جھوٹی روایت ہے۔ علماء جس کے کذب پر متفق ہیں۔

ایک یہ روایت دیکھی کہ:۔

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا میں قیامت کے دن اس کا شفیع و شہید ہوں گا۔"

یہ روایت ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور میں ملتی ہے جسے ابن ابی فدیک سے نقل کیا گیا ہے۔ ہم ابھی کہہ چکے کہ یہ شخص تابعی تک نہیں اور انہوں نے یہ حدیث حضرت انسؓ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ حالانکہ جب تک ابن ابی فدیک اور حضرت انسؓ کے درمیانی سلسلۂ روایت کا پتہ نہ چلے ہرگز روایت معتبر نہیں ہو سکتی۔ کسی مستند کتاب حدیث میں اس روایت کو نہیں لیا گیا اور لوگ ہیں کہ اس سے قبر پرستی کی ترکیب نکال رہے ہیں۔

ایک یہ روایت سنی کہ:۔

"فرمایا رسول اللہ نے جس شخص نے میری اور میرے پدر ابراہیم خلیل اللہ کی زیارت ایک ہی سال کے اندر اندر کی۔ میں اس کے لئے جنّت کا ذمہ دار ہوں۔"

یہ بھی ایجادِ بندہ۔ قطعاً بے بنیاد!

یہ ناقابلِ اعتماد روایتوں کی مثالیں ہیں۔ ایک دو معتبر روایات سے قیاس و اجتہاد بھی دیکھئے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ:۔

"ام سلیم نے رسول اللہ کی گرسنگی (بھوکا ہونا) کی خبر پا کر دو روٹیاں دوپٹہ کے پلّو میں باندھیں —— یہ قصہ لمبا ہے۔ خاتمہ یہ ہے کہ "حضورؐ نے ان روٹیوں کو ملیدے کی طرح تڑوایا اور برتن میں جو کچھ گھی لگا ہوا تھا وہ اس میں ٹپکا دیا۔ پھر حضورؐ نے از قسمِ دعا کچھ الفاظ اس پر پڑھے اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلانا شروع کیا۔ اسّی آدمیوں نے پیٹ بھر کھایا اور ام سلیم کے گھر بھر نے کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس روایت سے ایک سلیم العقل اور انصاف پسند مسلمان اس کے سوا کیا مطلب اخذ کر سکتا ہے کہ یہ منجملۂ معجزات ہے جو رسول اللہ سے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ آمنّا و صدقنا۔ جو پل بھر میں آسمانوں کی سیر کر آیا۔ اس کے لئے ایسے معجزے اللہ نے بہتیرے دیئے۔ مگر بدعت پسند حضرات کو دیکھئے کہ وہ اس سے کھانے پر فاتحہ پڑھنے کا اجتہاد فرماتے ہیں! ویا للعجب!

غور کا مقام ہے کہ آنحضورؐ نے کھانے پر فاتحہ نہیں پڑھی۔ بلکہ دعائیہ الفاظ ادا کئے اور آپ کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ

دعا کو قبول فرما کر کھانے میں معجزانہ برکت عطا کر دے گا۔ یہ امید پوری ہوئی اور کتنے ہی بھوکوں کے پیٹ بھر گئے۔ ہمارے فاتحہ خواں حضرات کھانے پر فاتحہ پڑھتے ہیں نہ کہ کوئی دعا۔ پھر مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے نہ کہ کھانے میں اضافہ۔ قیاس واجتہاد کی آخر کوئی تک بھی ہو۔ سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مساکین وغرباء کو رسول اللہ بھی کھانا کھلاتے تھے اور اتنا کھلاتے تھے کہ کوئی کیا کھلائے گا۔ صحابہ بھی غرباء پروری میں کم نہ تھے۔ اور سورۂ فاتحہ رسول اللہ اور ان کے اصحاب کو یاد بھی تھی۔ اور اس کے فضائل بھی وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کھانوں پر اسے پڑھا ہو اور اس کا ثواب مُردوں کی روحوں کو پہنچایا ہو۔

ایک اور روایت جوازِ فاتحہ کی سنئے:-

"مشکوٰۃ میں غزوۂ تبوک کے بارے میں مروی ہے کہ جب لوگ بھوکے ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ سے دعا کرانی چاہی۔ تب حضورؐ نے دسترخوان بچھوایا اور کہا کہ آجاؤ جس کے پاس جو کچھ ہے لے آؤ۔ اس پر کوئی مٹھی بھر جوار، کوئی مٹھی بھر کھجور، کوئی روٹی کا ٹکڑا۔ غرض جس کے پاس کھانے کی قسم سے جو کچھ تھا لے آیا۔ معمولی سا ذخیرہ جمع ہوا۔ حضورؐ نے اس پر دعا فرمائی اور کہا بھر لو اپنے برتن۔ تمام لشکر نے اپنے برتن بھر لیے اور خوب کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس حدیث کے متن میں "دعا بالبرکۃ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی حضورؐ نے فاتحہ نہیں برکت کی دعا پڑھی۔ اب عقل وقیاس کی کونسی قسم سے یہ فاتحہ کے لئے دلیل بن سکتی ہے۔ فی الحقیقت یہ روایت تو دعا یا کسی بھی سورۂ قرآنیہ کے پڑھنے پر دلیل نہیں کیونکہ یہ فعلِ رسول از قسم احکام وعبادات نہیں بلکہ قبیلِ معجزات میں سے ہے۔ معجزہ انبیاء کی خاص چیز ہے۔ اسی لئے تمام کتبِ معتبرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کسی مشہور صحابی کو آپ نہیں دیکھیں گے کہ اس نے حضورؐ کے اس فعل کو حجت بنا کر کھانوں پر دعا یا فاتحہ یا کوئی سورۂ قرآنی پڑھنی شروع کر دی ہو۔

ایک اور نمونہ دیکھئے:-

"بخاری ومسلم میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میری والدہ نے ایک برتن میں کھجور، کھانا اور گھی اور دہی کا مرکب بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ حضورؐ نے اس پر کچھ پڑھا جو کچھ اللہ کو منظور تھا۔ پھر حضرتؐ دس دس آدمیوں کو بلاتے گئے۔ تین سو کے قریب آدمیوں کو کھلایا پھر مجھ سے کہا کہ اے انسؓ! اپنا بادیہ اٹھالے۔ میں نے اٹھایا تو حیران ہو گیا کہ اب بھی اس میں کھانا اس سے زیادہ موجود تھا جتنا پہلے تھا۔"

اس حدیث سے بھی مروجہ فاتحہ کا ذرّہ برابر تعلق نہیں۔ معجزات کے باب میں جو شخص حضورؐ کی اُلٹی سیدھی نقل کرتا ہے اُسے صاحبِ علم تو کیا ہوشمند بھی کہنا مشکل ہے۔

ایسے ہی ایک حدیث قبروں پر پھول وغیرہ چڑھانے کے سلسلہ میں بطور دلیل لائی جاتی ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ کسی قبر سے گزر رہے تھے تو آپ نے کسی درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر قبر پر کھیری یا گاڑ دی۔ جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس قبر کی میت پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ ٹہنی مُردے کے لئے دعائے مغفرت کرے گی!

مجھے مستحضر نہیں کہ یہ روایت کس کتاب میں ہے۔ نہ لکھنے والے نے کوئی حوالہ دیا ہے۔ میں اس روایت کو جوں کا توں

صحیح مان کر بھی اہلِ عقل سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے کسی بھی پہلو قبور اولیاء پر پھول چڑھانے کا جواز نکلتا ہے۔؟ یہ روایت تو بتاتی ہے کہ حضورؐ نے پھول نہیں ٹہنی گڑھوائی تھی۔ آپ ٹہنی کی بجائے پھولوں کی بات کرتے ہیں۔ حضورؐ نے عذاب سے نجات دلانے کے لئے یہ عمل کیا تھا۔ آپ ان بزرگوں کی قبر پر بطور عقیدت و نیاز مندی پھول چڑھا رہے ہیں۔ جن کے متعلق آپ عذاب کا وہم بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اور فرض کیجئے آپ اپنے عزیز واقرباء ہی کی قبروں پر ان کے عذاب کو ہلکا کرنے کے لئے پھول چڑھانے لگیں تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ آپ بھی خود کو رسول اللہ کی طرح مقبول بارگاہِ الٰہ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ کے دستِ مبارک کے ڈالے ہوئے پھول عذاب ہلکا کر دیں گے۔ آپ کے نزدیک گویا میت کے عذاب کو ہلکا کرنے کی تاثیر دستِ رسولؐ میں اور دعائے رسولؐ میں نہیں تھی۔ بلکہ خود ٹہنی ہی میں تھی۔ اور آپ ٹہنی نہ ملنے کی وجہ سے پھول چڑھا رہے ہیں۔ کہ پھولوں میں بھی عذاب کم کرنے کی خاصیت ہے! — اللّٰھم حفظنا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ مزاروں پر پھول چڑھانا، منتیں ماننا، چادریں چڑھانا، کھانوں پر فاتحہ پڑھنا سب عجمی تہذیب و تمدن کے انعامات ہیں۔ جنہیں آپ نے اپنے دین کے سانچے میں ڈھال لیا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن پر آپکو انعامِ آخرت دے گا۔ زہے خوش خیالی!

اجتہاد کا ذکر چھڑا ہے تو ایک اور مفید بات بیان کردوں۔ اہلِ بدعت ویسے تو دُرِ مختار اور اس نہج کی دیگر کتبِ فقہ کے احکامات و روایات کو خاطر خواہ لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر کوئی بات اپنے مطلب کی مل جائے تو انہی کتابوں سے حجت پکڑنے لگتے ہیں۔ مثلاً دُرِ مختار وغیرہ میں انہیں یہ روایت نظر آئی کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ عید کی نماز کے بعد عین عیدگاہ میں نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ نے اسے نہ روکا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں نہیں منع کرتے۔ حضرت علیؓ نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے کہیں میں بھی ان لوگوں میں نہ شمار کر لیا جاؤں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جھڑکا ہے۔ (ارایت الذی ینھیٰ عبداً اذا صلیٰ (کیا دیکھتے ہو اُسے جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے) — اہلِ بدعت کے لئے یہ روایت تو وحی آسمانی بن گئی۔ اور عملِ ایزادِ حجت ٹھہر گیا۔ لیکن انہیں اگر مجمع البحرین کی وہ عبارت دکھائی جائے جس سے حضرت علیؓ کا نقطۂ نظر اور عقیدہ اس مذکورہ طرزِ عمل کے برعکس معلوم ہوتا ہے تو ہرگز نہ مانیں گے۔ عبارت دیکھئے:۔

ان رجلاً یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰۃ العید فنھاہ علیؓ فقال الرجل یا امیرالمؤمنین انی اعلم ان اللہ لا یعذب علی الصلوٰۃ فقال علیؓ وانی اعلم ان اللہ لا یثیبہ علی فعل حتی یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث علیہ فیکون صلوٰتک عبثاً و عبث حراماً۔

ایک شخص نے عید کے دن ارادہ کیا کہ نمازِ عید سے پہلے کچھ نماز پڑھے۔ اسے حضرت علیؓ نے روکا اس نے کہا یا امیرالمومنین! میں جانتا ہوں کہ اللہ نماز پڑھنے پر عذاب نہیں دیگا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اور میں جانتا ہوں کہ اللہ کسی ایسے فعل پر ثواب نہیں دیتا کہ جسے نہ تو رسول اللہ نے خود کیا ہو نہ اس کا ایماء فرمایا ہو۔ پس تیری نماز فعلِ عبث ہوگی۔ اور فعلِ عبث حرام ہے!

اہلِ بدعت کچھ کہیں لیکن طالبانِ حق ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ اعمال کے مستحقِ اجر و ثواب ہونے کے متعلق اس جلیل القدر صحابی کا کیا زاویۂ نظر تھا۔ جس سے اہلِ طریقت تمام رشتہ ملنے ولایت جوڑتے ہیں اور جسے رسول اللہ نے بابِ العلم کہا ہے

اور جس کا زہد و اتقا مشہورِ زمانہ ہے۔ ہم بدعت کے مردود اور نا قابلِ اجر ہونے پر متعدد صفحات میں جو بات سلیقے سے نہ کہہ سکے اسے امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے چند لفظوں میں کس قدر سلیقہ، صفائی اور قطعیت کے ساتھ بیان فرما دیا۔ کرم اللہ وجہ!

اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہ قرآن میں ایک دو جگہ نہیں بہت آیتوں میں خدا کے سوا کسی کو "اربابا من دون اللہ" بنانے پر تنبیہ اور وعید آئی ہے۔ پیرایہ بدل بدل کر اللہ نے شرک سے منع فرمایا ہے:۔

مثلاً:۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (سورۂ یونس)

اور مت پکارو! اللہ کے سوا کسی کو کہ نہ کوئی تجھے نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ پس اگر تُو نے پکارا تو یقیناً تو ظالموں میں سے ہے!

یا مثلاً:۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (سورہ سبا)

کہہ دے اے محمدؐ بھلا پکارو تو اللہ کے سوا اُن کو جن کے بارے میں تمہیں خوش فہمیاں ہیں۔ نہیں قدرت ہے انھیں آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر۔

اب اگر اس طرح کی آیتیں سنا کر اہلِ بدعت سے گزارش کی جاتی ہے کہ مرحوم یا زندہ بزرگوں سے دعا کرنا ظلم و شرک ہے، اس سے باز آئیے۔ یہ لاحاصل ہی نہیں دوزخ میں پہنچانے والا فعل ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں تو اُن کے لئے نازل ہوئی ہیں جو بُتوں کو پُوجتے تھے، کافر تھے، مشرک تھے، ہم نعوذ باللہ بُتوں کو کہاں پُوجتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ آیات میں آخر بُتوں کا ذکر کہاں ہے وہاں تو من دون اللہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا۔ تو کیا اللہ کے سوا صرف بُت ہیں۔ مرحوم یا زندہ بزرگ اللہ میں داخل ہیں (نعوذ باللہ) وہ کہتے ہیں ہم پُوجتے کب ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک پُوجا بس یہ ہے کہ اُن کے آگے سجدہ کیا جائے، اُن کی نماز پڑھی جائے۔ حالانکہ میں آپ کو قولِ رسولؐ ہی سے بتاؤں کہ پُوجا صرف یہی نہیں ہے بلکہ پُوجا یہ بھی ہے کہ جس چیز کو آپ کے بزرگ حلال یا حرام کہیں اُسے آپ قرآن و سنّت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حلال یا حرام مان لیں۔ دیکھئے قرآن میں آتا ہے:۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥

اُنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور فقراء کو اور مسیح ابن مریم کو خدا ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک ہی خدا کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے اُن کے شرک سے!

حضرت عدی بن حاتم جو ایک عیسائی تھے اور بعد میں ایمان لائے۔ انہوں نے جب یہ آیت سُنی تو رسول اللہ سے عرض کیا کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور درویشوں کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ حضورؐ نے جواب دیا عبادت تو نہیں کی۔ مگر ان علماء و فقراء نے بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا اور اہلِ کتاب نے ان کی بات مان لی۔ اسی طرح انہوں نے بعض

حلال چیزوں کو حرام کر دیا اور اہلِ کتاب نے اسے قبول کر لیا۔

کیا یہ روایت صراحتہً نہیں بتاتی کہ "ارباباً من دون اللّٰہ" بنالنے کا مطلب صرف پُوجنا نہیں بلکہ حرام وحلال کے معاملہ میں خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر کسی کی بات کو حق اور قابلِ تسلیم سمجھنا بھی پُوجنے ہی میں داخل ہے۔ عقل کا واضح تقاضا بھی یہی ہے کہ جب حلت وحرمت کا مکمل اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے تو جسے بھی اس اختیار کا حامل سمجھ لیا جائے وہ اس سمجھنے والے کے نزدیک گویا خدا ہی ہوگا۔ چاہے وہ الفاظ کی حد تک اسے خدا نہ مانتا ہو۔ آج آپ عام طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے شیوخ اور مرشدین کی ہر بات کو بلا چون وچرا حق مان لیتے ہیں۔ خواہ قرآن وسنّت کے صریح خلاف ہو۔ پیر قوالی سُننے، طبلہ، ہارمونیم بجانے اور عرس کرنے کو قولاً اور عملاً کارِ خیر ٹھہرائے گا۔ اور مُریدین آمنّا وصدقنا کہہ دیں گے۔ حالانکہ یہ چیزیں قرآن وسنّت سے حرام ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ نذر ونیاز، ٹوٹکا ٹونا سکھایگا۔ باطل عقائد کا سبق دے گا، یہ مان لیں گے۔ زبان ہی سے نہیں دل سے۔ کوئی لاکھ انھیں سمجھائے، آیات واحادیث سنائے، ائمہ وفقہا کے ارشادات پیش کرے۔ مگر توبہ، یہ سب کو اس دلیل سے ٹھکرادیں گے کہ ہمارے اتنے بڑے پیر بھلا کیسے گناہ کا کام کرسکتے ہیں؟ یہ "ارباباً من دون اللّٰہ" بنالینا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شرک نہیں تو شرک کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ گمراہی نہیں تو گمراہی کسے کہتے ہیں؟

حق فرمایا صادق ومصدوق فداہُ امی وابی نے:-

اِنَّ لِقَلبِ ابنِ آدمَ بِکُلِّ وادٍ شُعبۃً فَمَن اَتبعَ قلبَہٗ الشُّعبَ کُلَّھا لم یُبالِ اللّٰہُ باَیِّ وادٍ اَھلکَہٗ ومن توکّلَ علی اللّٰہِ کفاہُ الشُّعبَ۔ (مشکوٰۃ)

یقیناً آدمی کے دل کی ہر سمت راہ ہے۔ پس جو شخص اپنے دل کو سب راہوں پر چلاتا ہے تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ جس راہ میں چاہے ہلاک کردے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے سب راہوں کی کفایت کرنے والا ہے۔

یعنی دُنیا میں فکر ونظر اور حرکت وعمل کی بے شمار راہیں ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے گوناگوں وسائل ہیں۔ مطلب برآری اور حصولِ مقصد کے اَن گنت اسباب وذرائع ہیں۔ آدمی اگر ہوائے نفس اور عقل کے تابع ہو کر ہر طرف دوڑے، ہر قسم کے وسیلے اختیار کرے، ہر طریقہ کو حصولِ مقصد کے کام میں لائے۔ حلال وحرام، درست ونادرست اور ثواب وعذاب کی کچھ پروا نہ کرے، تو اللہ بھی اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور گمراہی اُسے آگھیرتی ہے۔ پھر وہ راہِ گمراہی پر ہی جہاں تہاں برباد وہلاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ مناسب وجائز حد تک جد وجہد کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھے، اس سے امید باندھے اور اسی کی طرف رجوع ہو تو اللہ بہ آسانی اُسے کامیاب کر دیتا ہے اور وہ رنگ برنگی راہوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر قبروں اور پیروں سے امیدِ کارسازی رکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ مُرادیں حاصل کرنے کے لئے وہ جائز وناجائز کی ذرا پروا نہیں کرتے اور جس قبر کے بارے میں شہرت سُن لی کہ وہاں مرادیں ملتی ہیں، بس اسی کی طرف دوڑے۔ خدائے ذوالجلال مومنین کا حال یہ بتلاتا ہے کہ:-

اِنَّمَا یُؤمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ (سجدہ-۱۳)

ہماری آیات پر ایمان وہ لاتے ہیں جنہیں اگر سمجھایا جائے اور ہماری آیات یاد دلائی جائیں تو سجدے میں گر پڑیں اور اپنے لائقِ تعریف رب کو یاد کرنے لگیں!

لیکن بدعت پسند حضرات — خواہ وہ کسی ملک، کسی شہر، کسی قریہ کے ہوں، خواہ میرے ہی شہر کے ہوں، خواہ پردہ دار ہوں یا فاحش، خواہ صوفیت کے جامہ میں ہوں یا علم و تفقہ کے لباس میں — اُن کا حال یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی سُن کر رب العزت کے جلال و کبریائی کے احساس سے اثر پذیر اور متاثر ہونا تو کُجا وہ برملا اپنے پیروں، مرشدوں اور بزرگوں کی "آیات" مقابلہ میں لاتے ہیں اور زبان و عمل دونوں سے اُن کا یہ اعتقاد مترشح ہوتا ہے کہ اللہ کی آیات ہمارے فلک رسا بزرگوں کی "آیات" سے کچھ زیادہ ضروری نہیں ہیں!

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم)

آدمیوں کی اپنی کارگزاریوں اور کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا!

جی بے اختیار چند اور آیاتِ قرآنیہ نقل کرنے کو چاہتا ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ۔ (سورہ لقمان)

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے باب میں جھگڑتے ہیں۔ حالانکہ نہ اُن کے پاس علم ہے نہ ہدایت نہ کتابِ روشن۔ اور جب اُن سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اُسے مانو تو کہہ دیتے ہیں۔ نہیں ہم تو وہی مانیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو جمے ہوئے پایا ہے۔ بھلا اور اگر شیطان اُنھیں دوزخ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو پھر بھی!

اسی سورۃ میں ذرا آگے ہے:-

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

اگر روئے زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندر کو روشنائی بنا لیا جائے اور سات سمندر اور بھی روشنائی کے طور پر موجود ہوں، نہیں تمام ہو سکتیں اللہ کی باتیں۔ بے شبہ اللہ ہے بڑی قوت والا۔ زبردست حکمت والا!

ذو الجلال والاکرام۔ اللّٰھمّ لا اُحصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک۔ اللّٰھمّ لک الملک ولک الحمد۔ اللّٰھمّ حفظنا من کل بلاءٍ ومن شرّ الوسواس الخنّاس الذی یوسوس فی صدور النّاس من الجنّۃ والناس۔

یہ آیاتِ قرآنیہ زیبِ سخن کے لئے نہیں اس غرض سے نقل کی گئی ہیں کہ برادرانِ اسلام ان پر خلوصِ نیت سے غور کریں۔ جو لوگ کارسازی و عطا کے لئے نعوذ باللہ اللہ رب العزت کو ناکافی سمجھ کر مردہ یا زندہ بزرگوں کو پکارتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں سے آس لگاتے ہیں۔ ڈھکوں، گنڈوں اور نجوم و سحر کے چکر میں پھنستے ہیں۔ کیا انھیں اللہ قدیر و توانا کی اُن لامتناہی قوتوں کا شعور و یقین ہو سکتا ہے۔ جن کو اگر لکھا جائے تو تمام روئے زمین کے درخت قلم بن کر سات سمندروں کی روشنائی سے اُنھیں پورا نہیں لکھ سکتے۔ یہ حضرات تو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ باتیں خاکم بدہن محض تفریحاً فرما دی ہیں اور بندوں کیلئے

ان میں کوئی سبق، کوئی نصیحت، کوئی تعلیم نہیں!

غلو کا جنوں

توحیدِ حقیقی کی حقیقت و لذت سے بے خبر اور اسلام کی روح سے ناواقف لوگ کسی طرح اُن حدوں میں رہنا گوارا نہیں کرتے جو اللہ نے اپنے رسول کے واسطے سے صریح و جلی طور پر متعین فرمادی ہیں۔ وہ صالحین و اتقیا کو انسانیت کے مراتب و خصوصیات سے بڑھا کر الوہی صفات سے متصف کرتے ہیں اور جب صالحین کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب کے سردار اور افضل البشر ہیں۔ انھیں تو یہ حضرات بالکل خدا ہی بنا ڈالتے ہیں۔ سراپا واہی عقیدے، کھلّم کھلا مشرکانہ عقائد، لغو و مکروہ واہیے۔ مبتدعین کی کتابیں دیکھئے اور صوفیوں کی محفلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے اور عرس و قوالی کی نعتیں سُنئے۔ کیا نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بڑھایا ہوگا جو مبتدعین نے رسول اللہ کو بڑھایا —— اور لطف یہ کہ یہ بڑھانا اور غلو کرنا اس مقصد سے نہیں کہ حضورؐ کی پیروی اور فرمانبرداری میں بھی شدت و غلو کیا جائے۔ بلکہ عمل میں تو یہ حضرات اکثر و بیشتر متساہل اور تارک ملیں گے۔ غلو اور افراط صرف ہوائے نفس کے تحت کرتے ہیں۔ لذتِ سخن اور گرمیِ گفتار کے لئے کرتے ہیں۔ دل پسند افعال کے جواز کے لئے کرتے ہیں۔ رسول اللہ اُن کے نزدیک عالم الغیب بھی تھے۔ قادر بالذات بھی تھے۔ حاضر و ناظر بھی تھے۔ بلکہ آج بھی یہ سب کچھ ہیں۔ سبحانہ تعالیٰ عما یشرکون۔ ان کے گوناگوں مشرکانہ عقائد کی تفصیل میں جانے کے بجائے آیئے چند نصوص میں آپ کو دکھاؤں:-

سب سے پہلے کلمۂ شہادت ہی کو دیکھئے کہ جس پر مدارِ ایمان ہے:-

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہی ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اسکے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ عبد کو یعنی بندہ ہونے کو پہلے بیان کیا گیا، رسول ہونے کو بعد میں۔ گویا ہر مسلمان رسول اللہ کی عظمت و فضیلت جاننے سے پہلے یہ حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لے کہ محمدؐ صرف ایک بندہ ہی ہیں۔ اللہ کے عبد۔ الوہی قوت و عظمت میں اُن کی کوئی شرکت نہیں۔

پھر قرآن میں متعدد بار صراحت و وضاحت کی انتہائی ممکنہ حدوں تک حضور کی عبدیت و بشریت کو بیان کیا گیا:-

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف)

کہہ دے (اے محمدؐ) میں تو ایک بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہیں بتاؤں تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔

یہی تنبیہ و توثیق سورۂ فصلت میں کی گئی۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ!

یہ انہونی بات ہے کہ ایک بشر کو اللہ کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت دے پھر یہ بشر لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے اللہ کے سوا۔

گویا یہاں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر دیا گیا کہ جس کے بعد کسی بھی نبی کے لئے مافوق البشر سمجھے جانے کی گنجائش ہی نہیں۔ اور سورۂ ابراہیم میں جملہ انبیائے سابق کے قول کو بھی اسی حقیقت کی وضاحت کے لئے بیان فرمایا گیا:-

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔

رسولوں نے اُن سے کہا کہ ہم تو صرف بشر ہیں تمہاری طرح، ہاں اللہ اپنے جس بندے پر چاہے احسان فرماتا ہے (یعنی اللہ نے احسان فرما کر ہمیں نبوت عطا کی۔

آخر ان آیات سے زیادہ صریح اور کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا کہ ہر نبی اور رسول فقط بشر ہوتا ہے۔ ما فوق البشر اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ اور جو معجزہ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا اور احسان ہے، نہ کہ بجائے خود نبی کے اقتدار و قوت کی دلیل۔ کن واضح اور بے ریب لفظوں میں اللہ نبی سے کہلواتا ہے:۔

قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (اعراف)

(اے محمدؐ) کہہ دے میں اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں لیکن جو کچھ اللہ چاہے اور اگر میں غیب کا حال جانتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے برائی کبھی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ڈرانے والا ہوں اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ ایمان دار لوگوں کو۔

بعینہٖ یہی شروع کے الفاظ سورۂ یونس میں وارد ہوئے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے ضرر ہے اور پھر نفع۔ سورۂ جن میں فرمایا گیا:۔

قُلْ إِنَّمَآ أَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ أُشْرِكُ بِهٖٓ أَحَدًا ۝ قُلْ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۔

کہہ دے میں تو بس اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا۔ کہہ دے میرے قبضہ میں نہیں تمہارا نقصان اور تمہیں راہ پر لانا۔

یہ تو چند آیات قرآنیہ ہوئیں۔ ذرا خود ارشاداتِ رسولؐ کو بھی دیکھئے۔ نسائی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ:۔

"کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اے رسول اللہ! اے وہ کہ ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے ہو! اور سردار اور سردار کے بیٹے ہو...... !"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی حضورؐ نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:۔

یا ایہا الناس قولوا بقولکم ولا یستہوینکم الشیطان انا محمد عبد اللہ و رسولہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی اللہ عزوجل۔

اے لوگو اپنی معمولی باتیں کرو اور تمہیں شیطان بہکا نہ دے۔ میں محمدؐ ہوں اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم لوگ مجھے اُس درجہ سے بڑھا دو جو درجہ اللہ نے مجھے دیا ہے!

دیکھ لیجئے۔ کہنے والوں نے کوئی خلافِ واقعہ بات نہیں کہی تھی۔ کوئی شرک نہیں کیا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس سے بھی روکا اسے بھی شیطان کی دراندازی خیال فرمایا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ غلو پسندی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے اور بے قید و بے محل قصیدہ پڑھنے والا مزاج و ذہن کس افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے!

بخاری و مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم انما عبدٌ فقولوا عبد اللہ ورسولہ

دیکھو مجھے حد سے نہ بڑھانا جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو حد سے بڑھا دیا۔ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

مشکوٰۃ میں بخاری سے ایک حدیث منقول ہے کہ:-

"کچھ چھوکریاں حضور کے سامنے آپس میں کہنے لگیں کہ ہمارے بڑے بوڑھے بدر میں مارے گئے ایک چھوکری نے کہا ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے" اس پر رسول اللہ نے فرمایا:-

دعی هٰذہ وقولی بالذی کنتِ تقولین!

یہ بات چھوڑ دو بلکہ وہی باتیں کرو جو تم پہلے کر رہی تھیں۔

یعنی اور باتیں کہے سنے جاؤ یہ "کل کی بات جاننے" والا کلام چھوڑ دو۔ حالانکہ ہو سکتا تھا ان چھوکریوں نے یہ جملہ اس مفہوم میں بولا ہو کہ نبی چونکہ مرنے کے بعد کا حال بتا رہے ہیں اس لئے گویا وہ آئندہ کی بات بتا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے الفاظ علم غیب کے موہم تھے اس لئے حضور نے روک دیا۔

اور دیکھئے۔ مشکوٰۃ ہی میں بخاری سے نقل کیا ہے:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اللہ کی میں اللہ کا رسول ہونے کے باوجود نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اللہ کا کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا۔

حد ہے اس وضاحت و تصریح کی کوئی؟ ممکن رہا مومن کے لئے رسول اللہ کو عالم الغیب یا حاضر و ناظر یا اور کسی حیثیت میں مافوق البشر ماننا؟

قال اللہ تعالیٰ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو۔ (انعام)

اللہ نے فرمایا کہ اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی نہیں جانتا انھیں کوئی بھی اس کے سوا۔

یہ تو چند آیات و احادیث ہیں۔ قرآن و احادیث دونوں ہی سے ناقابلِ انکار طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نہ عالم الغیب تھے نہ خدا کی طرح حاضر و ناظر۔ نہ معجزات میں آپ کی ذاتی قدرت کو دخل تھا۔ نہ آپ اپنے طور پر کسی کو ہدایت نصیب کرتے یا نفع و نقصان پہنچانے یا بخشنے پر قادر تھے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ اور جو شخص انھیں عالم الغیب کہتا ہے۔ وہ بقول حضرت عائشہ صدیقہ بڑا بھاری بہتان باندھتا ہے (بخاری)۔ حدیث کی سب سے مستند اور مقبول کتابیں بخاری اور مسلم اٹھا کر دیکھئے۔ ملیگا کہ آنحضور انسانوں کی طرح کبھی بھولتے بھی تھے۔ بعض خبروں کے منتظر بھی رہتے تھے۔ اصحاب سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ دنیاوی امور میں آپ کے خیال کا کبھی کبھار وہ نتیجہ نہیں نکلا جو حضور سمجھتے تھے۔ جس پر آپ نے فرمایا۔ "انتم اعلمون باموردنیاکم"!

مبتدعین کی جسارت کی انتہا ہے کہ صریح آیات و احادیث پر تو توجہ نہیں کرتے اور دور دراز باتیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مثلاً وہ روایت انھیں نظر پڑ گئی جس میں حضور نے ایک حبشی کہہ کر لست کا حل کم فرمایا ہے۔ یعنی "تم میں سے

کون میری مانند ہے۔ میں تم جیسا نہیں ہوں۔" بس پھر کیا تھا، ساری آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صریحہ و صحیحہ پس پشت ڈال دی گئیں اور کہا گیا کہ دیکھا حضورؐ خود فرما رہے ہیں کہ میں تم جیسا نہیں۔ اور اس "تم جیسا نہ ہونے کا" مطلب ان کی نگاہ میں یہ ہوا کہ اب جتنی چاہے صفاتِ الوہیہ اور ما فوق البشر قدرتیں حضورؐ کے لئے فرض کرتے چلے جائیں۔ اگر عرض کیا جائے کہ اس کا یہ مشرکانہ مطلب نہیں ہے بلکہ آنحضورؐ کا فضیلتِ آخروی کے علاوہ قوائے انسانیہ میں نسبتاً ممتاز ہونا سب پر ظاہر و باہر ہے، اسی امتیاز و فرق کی طرف حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے اور خدا کے رسولِ خاص ہونے کی بنا پر ان کے ساتھ اللہ کا معاملہ سب سے جداگانہ ہونا بھی چاہیئے۔ تب یہ کہیں گے کہ نہیں صاحب آپ غلط کہتے ہیں!

خیر ہماری بات چھوڑیئے۔ آیتِ قرآنی دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں امہات المؤمنین سے خطاب فرماتے ہیں:-

یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ۔

اے نبی کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

اگر آنحضورؐ کے "لستُ کاحدکم" کا مطلب یہی ہے کہ حضورؐ کے لئے اب ہر فوق البشر قوت و قدرت کے اثبات کا دروازہ کھل گیا تو امہات المومنین، ازواجِ مطہراتؓ کے لئے بھی اس کا دروازہ کھول دیجئے۔ ان کو بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر مانیئے۔ وہ تو حدیث ہی تھی یہ قرآن ہے۔ (ونعوذ باللہ من ذالک)

میں ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے رُک جاتا ہوں۔ تاہم جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہی اتنا کافی ہے کہ اگر اس پر خلوص اور دیانت سے توجہ کی جائے تو کتنی ہی برائیوں اور غلط عقیدتگیوں سے پناہ مل سکتی ہے۔ مجھ کم حیثیت اور بے بضاعت کی نہیں اس آمرِ مطلق اور حاکمِ حقیقی اور مالک و خالق کی سنئے جو فرماتا ہے کہ:-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔ (روم)

سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی راہ پر۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آپہنچے جس کا ٹلنا اللہ کی طرف سے مقدور نہیں ہے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس امت کا آغاز جس چیز سے سنورا ہے اسی سے اس کا آخر بھی سنورے گا۔ آج کے ہمہ گیر بگاڑ کو سنوارنا ہے تو اپنے اپنے گروہی معتقدات اور عصبیتوں کو چھوڑ کر قرونِ مبارکہ کی طرح قرآن و سنت کی طرف آیئے اور قرآن و سنت ہی کو عقیدہ و عمل کا مبنیٰ بنایئے!

بدعت کے عظیم نقصانات

آپ اسلام کی تاریخ پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلم قوموں سے بارہا عظیم نقصان پہنچا ہے لیکن خود "اسلام" کو اُن سے ذرّہ برابر نقصان نہیں پہنچا۔ یہ حقیقت آپ اس وقت ٹھیک طرح سمجھیں گے جب غلط خیال اپنے دماغ سے نکال دیں کہ اسلام اور مسلمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یا یہ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ اس غلط خیال کو صراحتاً تو کوئی بھی سمجھدار ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن عملاً دیکھا جا رہا ہے کہ مدت سے عوام میں ان دونوں کے مقام و منصب اور حقیقی فرق کا صحیح شعور نہیں ہے اور بعض پڑھے لکھے تک اپنی تحریروں میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ گویا اسلام قرآن و سنت اور اجماع و قیاس تک محدود نہیں ہے، بلکہ بعض اولیاء اور اتقیاء کے ذاتی رجحانات و عادات بھی اس کا جزوِ لازم ہے۔ یا یہ کہ کوئی عابد و زاہد شخص اگر بعض اعمال کر گیا ہے تو ان اعمال کو قرآن و سنت پر پیش کئے بغیر بھی اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی

کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یا اگر کسی مسلمان بادشاہ نے کچھ اسلامی قوانین رائج کئے تو اس کے تمام ہی رائج کردہ قوانین ورطریقوں کو قرآن وسنّت کی مطابقت کے بغیر اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط خیال کو عام کرنے میں اس سیاسی اصطلاح کو بھی دخل ہے جو مسلمانوں کی ہر سلطنت کو "اسلامی سلطنت" کہہ دینے کی شکل میں رائج ہوئی۔ بہرحال یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام الگ چیز ہے اور مسلمان الگ۔ اسلام ایک نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے جو قرآن وحدیث اور اس سے مستنبط کی ہوئی مستند کتابوں میں تحریر ہے اور مسلمان وہ ہے جس نے اس نظام و دستور پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ مدعی اگر اس ایمان کے عملی تقاضے پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور جو امور اس دستور میں جرم و گناہ کے خانہ میں درج ہیں۔ انھیں اختیار کر لیتا ہے تو یہ قصور خود اس کا ہے، اور محض اس بنیاد پر کہ وہ اسلام قبول کرنے کا دعویدار ہے۔ اس کے جرم وگناہ کو نیکی اور بھلائی کے خانہ میں نہیں لکھا جائے گا۔

یہ سیدھی سی بات سمجھ لینے کے بعد یہ جاننا بالکل آسان ہے کہ اہلِ کفر نے مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر جو تاخت کی اور اُن کی سلطنتیں چھینیں اور جان و مال برباد کیا اور اُن پر طرح طرح کے ظلم توڑے تو بے شک وہ مسلمانوں کا نقصان تھا۔ لیکن نفسِ اسلام پر اس کی زد نہیں پڑی۔ نفسِ اسلام کا نقصان تو یہ تھا کہ اہلِ کفر اس کے اصولوں یا جزئیات و فروعات میں کچھ غیر اسلامی نظریات و فروعات اس طرح خلط ملط کر دیتے کہ انھیں اسلامی دستور سے الگ ہی نہ کیا جا سکتا۔ اور جس طرح دیگر اہلِ کتاب کے دین غلط و صحیح کا ایسا مجموعہ بن گئے کہ ان کی تنقیح ممکن ہی نہیں رہی ایسا ہی یا اس سے کچھ کم حال اسلام کا بھی ہو جاتا۔ لیکن اہلِ کفر ایسی کوئی خرابی پیدا نہ کر سکے۔ اور اس کی وجہ جہاں یہ تھی کہ اسلامی مزاج براہ راست اہلِ کفر سے کوئی نظریہ یا اصول قبول کرنے کو تیار نہ تھا وہیں یہ بھی تھی کہ اسلامی ماہرین و مجاہدین نے دستورِ اسلامی کی تدوین اور تحفظ کے اتنے مضبوط اور محکم طریقے اختیار فرمائے تھے کہ کسی غیر مسلم قوم کے لئے ان میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی ممکن ہی نہ تھی۔

ہاں نقصان اگر اسلام کو پہنچا ہے تو یا تو اُن مسلمانوں سے جنہوں نے میدانِ تکلّم کی شہسواری کے شوق میں عجمی فلسفے، طرزِ فکر، رجحان و مزاج، اسٹائل آئیڈیالوجی اور افراط و غلو کو اسلام میں لاگھسایا۔ یہ حضرات چونکہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ بہت سے ان میں عبادت گزار اور عالم اور صاحب جبہ و دستار بھی تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی متکلمانہ زور آزمائیوں سے اسلام کو کتنے ہی محاذوں پر فائدہ بھی پہنچا اور مسلمان ان کی وجہ سے باطل پرستوں کے مقابل میں سرخرو بھی ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی کچھ غیر اسلامی نظریات اور نکات اور طریقے اُن کے ذریعہ اسلام میں اس طرح گھس آئے کہ وہ کثیر مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی ہی ٹھہرے اور اُن کے اثرات دین کی جڑوں میں پھیلتے چلے گئے۔

یا پھر دینِ خالص کو نقصان اُن لوگوں سے پہنچا ہے جو علم و عمل کے اعتبار سے خاصے اچھے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع اور علمی اعتبار سے ناقص اجتہاد کے تحت کچھ نئی عبادتیں نکالیں۔ کچھ نئے طرقِ طاعت بنائے۔ کچھ نئے معمولات بشکلِ دین اختیار کئے۔ یہ لوگ چونکہ عملاً نکوکار اور عابد و زاہد تھے۔ اس لئے عوام نے ان کی نکالی ہوئی بدعتوں کو دین سمجھ کر قبول کر لیا اور بہت سے اُن خواص نے بھی انھیں قبول کیا جو یا تو قرآن وسنّت کا گہرا علم نہ رکھتے تھے۔ یا ان حضرات سے خصوصی عقیدت ان کے دل میں تھی۔ بہرحال بدعتیں چلیں اور جیسا کہ نفسیات کا تقاضا ہے لوگوں نے ان میں سے نئے نئے سوتے اور گوشے اور راستے نکالے۔ بدعت جو اسلام کی نگاہ میں قانون شکنی اور

بغاوت کے انداز کی شے ہے، اپنا مزاج بھی جرموں ہی جیسا رکھتی ہے۔ ایک جرم کرنے کے بعد آدمی دوسرا جرم بھی نسبتاً آسانی سے اور تیسرا پورے ڈھٹائی سے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بدعت اختیار کرنے کے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی کی طرف پیش قدمی کرنا عوام اور بعض خواص کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ شیطان کی شعبدہ گری ایک طرف بے عملی بلکہ بدعملی کے قبیح اثرات دوسری طرف۔ کم علمی مستزاد اور عجمی ماحول و تمدن کے عوامل نور علی نور۔ نتیجہ وہی ہوا جو آج سب کے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے اسلام ہی کے نام پر گمراہی کو سینوں سے لگایا۔ اندھیرے کو اجالا سمجھا، سانپ کو مچھلی جانا۔

اصل یہ ہے کہ جن متکلمین کا میں نے اشارۃً ذکر کیا۔ ان کا پہنچایا ہوا نقصان نسبتاً کم اور مبتدعین کا اس سے بہت زیادہ تھا۔ بلکہ گہرائی میں جایئے تو متکلمین کے غیر اسلامی نظریات و مباحث بھی بدعت ہی کی قسم سے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن کیساتھ "علمی" کا لفظ بڑھا دیجئے۔ یعنی "بدعتِ علمی"۔ حاصل یہ کہ بدعتِ علمی کے علمبرداروں کا نقصان تو پھیلاؤ میں کم رہا۔ کیونکہ دقیق اور عالمانہ مسائل سے اس کا تعلق تھا اور علماء کے طبقہ میں ایسے لوگوں کا فقدان نہ تھا جو تجزیہ و تنقید کے ذریعہ غلط اور صحیح، اسلامی اور غیر اسلامی کو الگ الگ کر کے نہ دکھا سکیں۔ لیکن مبتدعین کا نقصان چڑھتے ہوئے دریا کی طرح پھیلا۔ کیونکہ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں اور عقیدت و نیازمندی اُن کے معمولی شعور و فہم پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ جس کے بعد دلیل اور علم کی قوت بہت مشکل سے بہت دیر میں اُن پر کارگر ہوتی ہے!

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً بدعات کی کثرت اور بدعات کی تعلیم دینے والی کتابوں کی اشاعت نے اسلامی قوانین میں اس طرح بدعات کو آمیز کر دیا کہ صحیح اور غلط کا جدا کرنا محال ہو گیا۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ قرآن و حدیث کو مسخ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور سلف صالحین نے علم و فن اور اجتہاد و تفقہ کا جو آئینہ خلف کو دیا ہے وہ بے غبار اور بہت مضبوط تھا۔ مگر اس آئینہ سے فائدہ اٹھانا اور قرآن و سنت کو معیار و مستدل بنانا گنے چنے خواص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ باقی امت بدعت کا ہدف بن گئی۔ جنہیں دین کی کچھ فہم تھی وہ کم بگڑے جو نافہم تھے وہ زیادہ بگڑ گئے۔ اس بگاڑ کا ایک نقصانِ عظیم تو یہ ہوا کہ اسلام کی تحریک اور دعوتِ اقامتِ دین انبیاء و صحابہ کی راہِ عزیمت پر چلنے کے بجائے اُن غلط راہوں پر مڑ گئی جن میں رہبانیت تقشف، اور لاحاصل شور و غوغا اور بے روح و عبث رسوم و رواج کی بہتات ہے۔ بدعتوں نے سنتوں کو نگل دیا۔ ریلے نے اخلاص کو کھا لیا۔ دین میدانِ عزیمت و جہاد سے سمٹ کر مارگاہوں، خانقاہوں، قبروں اور محفلوں میں آ گیا!

دوسرا عظیم نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلم اقوام کی رائے اسلام کے بارے میں بگڑتی چلی گئی۔ اور جو کشش اس کے اصول و احکام میں تھی اور جس کی وجہ سے یہ حیرت انگیز رفتار سے پھیلا تھا، وہ نہ صرف معطل ہو گئی، بلکہ اس کی جگہ بدگمانی اور کراہت نے لے لی۔ ظاہر ہے کہ دیگر اقوام کے عوام کو اس کی فرصت اور اہلیت کہاں کہ وہ براہِ راست قرآن و سنت اور دین کی مستند کتابوں سے صحیح اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور کیوں کریں؟ دنیا کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی قوم کے دینی اعتقادات و اصول کا اندازہ اس کے ان اعمال و افعال سے لگاتی ہے، جو اس میں بطور مراسم مذہبی رواج پائے ہوئے ہوں۔ اور اعتقادات و اصول ہوتے بھی حقیقت میں اسی لئے ہیں کہ اعمال و افعال میں اُن کا ظہور ہو۔ دنیا نے جب عرسوں، قوالیوں، قبر پرستیوں، درگاہ سازیوں اور اسی نوع کی متعدد چیزوں کو مسلمانوں میں دینی حیثیت سے رائج پایا تو گمان کر لیا کہ یہ سب اسلام ہی کے احکام و اصول کا ظہور ہے۔ اور اس غلط گمان کو تقویت اس نے دی کہ جو لوگ ان اعمال میں مبتلا تھے وہ زبان و بیان سے نمائندگیِ اسلام کے مدعی بھی تھے اور ان میں سے بہتسوں کا ظاہر بھی ایسا تھا کہ سطح بیں نگاہیں انھیں ترجمانِ اسلام سمجھنے پر قدرتاً مجبور تھیں۔ چنانچہ

نفسِ اسلام کے بارے میں دُنیا کو غلط فہمیاں ہوئیں۔ اور وہ توحیدِ خالص اور تعلیم مصفّا جو اسلام میں وجہ کشش تھی، شرک و بدعت کی بدنمائی اور کثافت میں دب گئی۔ اسلام کا شکوہ، وقار، تقدّس اور جاذبیت مجروح ہو گئی۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام کے پھیلاؤ اور اشاعت کے رُک جانے میں بڑا ہاتھ خود مسلمانوں کی بداعمالیوں اور غلط کوشیوں کا ہے۔ لیکن جو بداعمالیاں مسلمانوں نے دین کی آڑ لے کر نہیں بلکہ خالص دنیادارانہ طور پر کیں، اُن سے دیگر اقوام کی رائے خود مسلمانوں کے حق میں چاہے کتنی ہی خراب ہو گئی ہو، مگر نفسِ اسلام کے متعلق نظری طور پر اُنھیں بدگمانیاں نہیں ہوئیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ مذہب کی برائیاں نہیں اہلِ مذہب کے اپنے کرتوت ہیں۔ اِن برائیوں کا سہرا مذہب کے سر نہیں اہلِ مذہب کے سر ہے۔ اس کے برخلاف دین کے نام پر عبادت و طاعت کے رنگ میں کی جانے والی برائیوں نے اُنھیں نفسِ اسلام ہی سے بدگمان کیا اور اسلام سے اُن کی دُوری صرف تعصب اور جذباتی عناد کے تحت نہیں رہ گئی بلکہ اسے عقلی و شعوری دلائل بھی مل گئے ـــ!

دیگر اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں ہی کے عقائد و نظریات کو بدعات نے بایں طور فاسد کیا کہ بیچارے کم علم عوام کے مخلص افراد اگر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ احکامِ اسلامی کو جامۂ عمل پہنانے کی طرف مائل ہوئے تو اُن کی استعداد کے مطابق جو دینی لٹریچر اُن کے ہاتھ آیا اس میں پہلے ہی سے صحیح کے ساتھ غلط اور اسلام کے ساتھ بدعت کی آمیزش تھی۔ اور جو وعظ محراب و منبر سے انھیں سنائے گئے اُن میں بھی بدعت کی تعلیم کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھی۔ اب اُن بیچاروں کے پاس یہ قابلیت کہاں کہ تجزیہ و تنقیح کر کے اسلام و غیر اسلام کو جدا کر سکیں۔ معصومیت و خلوص کیساتھ رطب و یابس کو قبول کرتے چلے گئے۔ اور بدعت کا زہر اُن کے ذہن و قلب، مزاج اور اعمال و افعال میں پھیلتا چلا گیا ـــ!

ریا کے بارے میں آپ جان چکے کہ رسول اللہ نے اس کا اندراج شرک کے خانہ میں کیا ہے۔ بدعت اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے دکھاوے اور نمود اور گرمیِ محفل کو پسند کرتی ہے۔ یہ چیزیں ریا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ گویا بدعت کے خمیر ہی میں شرک ہے اور ابتداء میں شرکِ خفی ہوتے ہوئے یہ بہت جلد شرکِ جلی کی منزل میں پہنچ لیتی ہے۔ شجرِ بدعت کے برگ و بار دیکھئے۔ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے ان پر شرک کی تعریف صادق نظر آئے گی ـــ!

منکرات و محرماتِ شرعیہ کا مرتکب مسلمان تو ممکن ہے کہ کسی وقت توبہ و استغفار کی طرف مائل ہو جائے۔ کیونکہ وہ بہرحال گناہ کو گناہ ہی سمجھ رہا ہے۔ اور اس کے اعتقادات مسخ و فاسد نہیں ہوئے ہیں۔ مگر بدعت پسندوں کے لئے توبہ کا امکان بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا ہیں وہ تو اُن کی نظر میں عین ہدایت ہے اور اُن کے اعتقادات مسخ و فاسد ہو چکے ہیں ـــ!

اَللّٰھُمَّ احفظنا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

ایصالِ ثواب کیلئے قرآنِ پاک کا ختم

صدق جدید مورخہ ۱۱ جمادی الاول کے آخری صفحہ پر کسی صاحب نے دریافت کیا ہے کہ "میت کیلئے ختم قرآن کا دستور و معمول کیسے اور کب سے قائم ہوا ہے؟" اس کی نسبت گزارش ہے کہ اس رواج کی تاریخ قیام کا پتہ لگانا تو بظاہر مشکل ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ یہ چیز خیر القرون کے بعد کسی زمانہ میں رواج پذیر ہوئی، اسی بناء پر ہمارے علماء کرام نے اس کو بدعت قرار دیا ہے، بدعت وہ عقیدہ یا عمل ہے جو کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ یا عمل صحابہ میں سے کسی کے خلاف ہو، اور اسے حکم شریعت یا داخلِ شریعت سمجھا جائے، بشرطیکہ وہ احکام شریعت کے تحفظ کا لازمی ذریعہ یا ارکانِ دین یا واجبات دین میں سے کسی کا موقوف علیہ اور ذریعہ حصول نہ ہو اور شبہ و تاویل کی حیثیت سے ہو، انکار اور تکذیب کے طور پر نہ ہو کیونکہ امور دین کا انکار و تکذیب کفر ہے، بدعت نہیں!

اور بیہقیؒ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بدعت کی یہ تعریف نقل کی ہے کہ محدث کی دو قسمیں ہیں، جو نئی چیز کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے خلاف ہو وہ بدعتِ ضلالہ ہے اور جو نئی چیز ان میں سے کسی کے خلاف نہ ہو وہ بدعت غیر مذموم ہے (فتح الباری) اور امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ سنت لغت میں طریقہ کو کہتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اہل نقل و اثر جو آثار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہؓ کے متبع ہیں، وہی اہلِ سنت ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ اس طریق کے پیرو ہیں جس میں کوئی نئی بات داخل نہیں ہوتی اور نئی باتیں اور نئے طریقے حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے بعد نکلے ہیں اور بدعت اس فعل کو کہتے ہیں جو پہلے نہیں تھا بعد میں نکلا، اور بدعات زیادہ تر شریعت سے متصادم ہوتی ہیں یا جب بدعت پر عام عمل درآمد ہو تو شریعت میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور اگر کوئی ایسی بات ہو جو شریعت سے مخالف نہیں ہے اور نہ اس پر عمل درآمد کرنے سے شریعت میں کوئی نقص یا زیادت لازم آتی ہے تو ایسی بدعت سے بھی بزرگان سلف کراہت کرتے اور عموماً ہر قسم کے بدعتی سے نفرت کرتے تھے (تلبیس ابلیس)

اب میت کے لئے ختم قرآن کی غرض سے جمع ہونے کے باب میں علمائے حق کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

امام بزازیؒ المتوفی ۸۲۷ھ فتاویٰ بزازیہ ص ۸۱ جلد ۴ مطبوعہ مصر کتاب الحظر والاباحت میں فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) اہلِ میت کا تین دن تک لوگوں کی ضیافت کرنا اور لوگوں کا اسے کھانا مکروہ ہے، کیونکہ ضیافت خوشی کے لئے مشروع ہے۔ اسی طرح میت کیلئے پہلے دن یا تیسرے دن یا ایک ہفتہ کے بعد کئی دن تک اور عیدوں کے دن کھانا پکانا یا خاص موسموں میں قبر پر کھانا لے جانا اور قرآن پڑھنے کے لئے خواہ ختم کے لئے ہو یا سورۃ انعام یا سورۂ اخلاص پڑھنے کے لئے صالحین اور قاریوں کو جمع کرنا اور دعوتِ طعام کرنا یہ سب مکروہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ کراہیت اسی بناء پر ہے کہ دین میں ایک نئی چیز داخل کر لی گئی ہے!

اسی فتاویٰ بزازیہ کی کتاب الوصیۃ جلد ۶ ص ۴۳۹ میں ہے کہ اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ میرے بعد میری قبر پر کوئی قاری قرآن پڑھے یا یہ کہ میری قبر کو پختہ کیا جائے یا اس پر قبہ بنایا جائے تو یہ وصیت باطل ہے!

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ مدارج النبوت کتاب الجنائز طبع نولکشور مطبوعہ ۱۲۸۱ھ کی جلد اول ص ۴۲۱ اور مطبوعہ ناصری دہلی کے ص ۴۶۶ میں فرماتے ہیں:-

"وعادت نبود کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سر گور و نہ غیر آں، و ایں مجموع بدعت است، نعم برائے تعزیت اہلِ میت و جمع تسلیہ و صبر فرمودن ایشاں راسنت و مستحب است، اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم و ارتکاب تکلفاتِ دیگر و صرفِ اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است و حرام!

انہی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ نے شرح سفر السعادت میں قریباً یہی عبارت زیب رقم فرمائی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد لوگ (یعنی صحابہ کرامؓ) ختم قرآن وغیرہ کے لئے جمع نہیں ہوتے تھے (شرح سفر السعادۃ ص ۲۷۳)

اور امام ابن الحاج مالکی رحمۃ اللہ کتاب المدخل میں رقم فرما ہیں کہ صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ لوگ اپنی رسم کے مطابق خاص لحن سے قرآن پڑھواتے ہیں اور قاریوں کو جمع کرتے ہیں - اس کے بعد فرماتے ہیں:-

وتلک القبائح والمفاسد موجودة فی اجتماع للثالث والسابع وتمام الشهر وتمام السنة وفی ای موضع فعل ذالک فیه من بیت او قبر او غیرهما کل ذالک یمنع وکذالک یحذر مما احدثه بعضهم من فعل التهلیلات لموتاهم وجمعهم الجمع الکثیر لذالک! (المدخل مطبوعہ مصر جلد ثالث ص ۲۷۹)

اور یہ تمام مفاسد و قبائح ہر اس اجتماع میں پائے جاتے ہیں جو میت کی رحلت کے تیسرے یا ساتویں دن یا مہینہ یا سال بھر کے بعد منعقد کرنے کا رواج ہے، یہ افعال کسی جگہ بھی کئے جائیں، گھر ہو یا قبر یا ان دونوں کے سوا کوئی اور مقام، ہر جگہ ممنوع ہیں، اسی طرح اس بدعت سے بھی بچنا چاہیئے جو بعض لوگوں نے احداث کرلی ہے کہ اپنے اموات کے لئے لا الٰہ الا اللہ پڑھواتے ہیں اور اس کے لئے کثیر اجتماع ہوتا ہے!

امام ابن الحاجؒ دوسری جگہ مسلمانوں کو سلف صالح کا طریقہ اختیار کرنے کی ان الفاظ میں ہدایت فرماتے ہیں:-

انه لم یکن من فعل من مضیٰ وهم السابقون والقدوة المتبعون ونحن التابعون فیسعنا ما وسعهم والخیر والبرکة والرحمة فی اتباعهم وفقنا الله لذالک بمنّه

ہمارے اسلافِ کرام کا یہ طریقہ نہ تھا، حالانکہ وہی سبقت کرنے والے پیشوا ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے، ہم تو محض ان کی متابعت کرنے والے ہیں ہمارے لئے اسی حد تک کسی فعل کی گنجائش ہے جہاں تک ان کے لئے تھی اور خیر برکت اور رحمت انہی کے اتباع میں ہے، حق تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و احسان سے اُن حضرات کے اتباع کی توفیق ارزانی فرمائے!

یاد رہے کہ امام ابن الحاجؒ نے آگے چل کر یہ بھی فرمادیا ہے کہ اگر کوئی مجمع کے بغیر اپنے طور پر کلمۂ توحید وغیرہ پڑھ کر میت کو اس کا ثواب پہنچائے تو ممنوع نہیں بلکہ کار خیر ہے!

(الصدیق - ملتان)

ابو منظور شیخ احمد
(ناندیڑ دکن)

قبر پرستی

"قبر" سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عام طور پر اس دو گز زمین کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں مُردہ دفن کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدیہی و یقینی بات ہے کہ دنیا میں ہمیشہ توحید و رسالت اور آخرت ہی کا نہیں بلکہ وجودِ باری تک کا انکار کیا گیا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس کے منکر ہیں۔ مگر موت کا انکار نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ قیامت تک اس کا انکار کرنے والا کوئی پیدا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جہاں چار گھر بھی زندہ انسانوں کے بنے ہوئے ہوں وہاں مُردوں کے مکانات بھی بنیں۔ چنانچہ ہر خورد و کلاں، ہر غریب و امیر، ہر عالم و عامی اور ہر ولی و نبی کی قبریں زندہ انسانوں کے مسکونہ مکانات کے پہلو بہ پہلو بنتی چلی گئی ہیں اور کوئی بستی ان دونوں قسم کے مکانات سے خالی نہیں پائی جاتی۔ مگر ہر طبقہ اور ہر مرتبہ و مقام کے مُردہ انسانوں میں سے خصوصیت کے ساتھ صوفیاء و اولیاء کی قبریں زیادہ اعتنا کے لائق قرار پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کی طرح صوفیا و اولیا بھی موت کا مزہ چکھتے ہیں اور زمین میں دفن ہوتے ہیں اور اُن پر دوسروں کی طرح منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور دوسروں ہی کی طرح قبر بھی بنا دی جاتی ہے۔ مگر اس جماعت کے بھی چند خاص خاص افراد کی قبروں پر عامۃ الناس کی توجہ زیادہ سے زیادہ مرکوز ہونی شروع ہوتی ہے اور چند ہی دنوں میں کہیں محض اینٹ پتھر اور چونے گچ اور کہیں نہایت قیمتی پتھروں سے قبر پختہ کر دی جاتی ہے۔ اور دوسری قبروں کے مقابلہ میں دیکھتے دیکھتے یہ قبریں نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہیں۔

پھر قبر کے اطراف ایک کٹہرا تیار ہوتا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کہیں معمولی عمارت اور کہیں نہایت مضبوط قبے تعمیر ہو جاتے ہیں۔ یہ قبے کہیں کہیں تو اتنے بلند و بالا اور ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ باقاعدہ آثارِ قدیمہ میں داخل کر لئے جاتے ہیں پھر اُن میں فنِ تعمیر کی ایسی ایسی نادرہ کاری پائی جاتی ہے کہ محض آثارِ قدیمہ و فنِ تعمیرات سے دلچسپی لینے والوں ہی کیلئے نہیں بلکہ ہر آیند و روند کی توجہات کا مرکز بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس طرح ایک ایک قبر کئی کئی ایکڑ زمین کو مستقل طور پر گھیر لیتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ گنبد کے آس پاس دوسری عمارتیں بننے لگتی ہیں، اور چھوٹی موٹی سی نو آبادی بس جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ قبریں عوام کی توجہات کا ایسا بڑا مرکز و مرجع بنتی ہیں کہ جوق درجوق لوگ وہاں کھنچے چلے جاتے ہیں۔ توجہات کی اس درجہ مرکزیت و مرجعیت کے بعد ناممکن ہے کوئی طبقہ ایسا پیدا نہ ہو جو ان توجہات کو کنٹرول کرے اور اس مرجعیت و مرکزیت سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ قبروں کی خدمت کا منصب سنبھال بیٹھتے ہیں اور "خادم"، "جاروب کش"، "مجاور" اور "سجادہ نشین" وغیرہ مختلف القاب سے پکارے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسے ایسے اعزازات حاصل ہوتے ہیں کہ کسی کو ان کی عملی زندگی اور ان کے عام مشاغل پر نظر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ محض قبر کی نسبت یا اس کی خدمت ہی انھیں سب کچھ بنا دیتی ہے۔ اُنھیں ہر زائر و سیاح سے بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ لینے کا حق ہوتا ہے۔ اور قبر کی نسبت یا خدمت کا نام لے کر لوگوں سے چندہ مانگنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات

اُن کی مالی حالت پوری بستی کے لوگوں سے بہتر ہوتی ہے اور نہایت عیش و آرام سے گزرنے لگتی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے اتنے ہی پر اکتفا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے وہ قبر کی نسبت کے ساتھ ساتھ صاحبِ قبر سے بھی کوئی نہ کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں، یا کسی نہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ ہو جاتے ہیں تاکہ دُنیوی اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ روحانی و دینی پیشوائی کا مقام بھی حاصل ہو جائے اور "رُوحانیت" کے پردہ میں اتنا کچھ مل جائے جتنا عام دُنیا داروں کو بھی بمشکل ملا کرتا ہے ۔۔۔ !

چنانچہ عوام الناس ہی کے ذریعہ معزز و مکرّم نہیں بنے ہیں بلکہ مُسلم حکومتیں بھی اُن پر اتنی نظرِ عنایت فرماتی رہی ہیں کہ انھیں بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں ملی ہیں۔ اور اُن میں سے کتنے ایسے ہیں کہ مذہبی و روحانی مشیخت تو خیر، اُن کی دُنیوی ریاست اور مادّی منفعت کو دیکھ کر بڑے "دُنیا دار" بھی حرص و طمع کی نگاہ سے دیکھتے ہیں! اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی اُن سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے !

اچھا اب قبر کے پاس تشریف لے چلیں۔ مگر کتنی ہی قبریں ایسی ہیں کہ اصل قبر سے فرلانگ دو فرلانگ اُدھر ہی آپ کو اپنی جوتیاں چھوڑنی پڑیں گی۔ آپ چاہے عام قبروں پر سے جوتیوں سمیت ہی کیوں نہ گزر جائیں۔ مگر یہاں آپ اپنی جوتیاں قبر کے پاس بھی نہیں لے جا سکتے۔ ارے! یہاں تو چاروں طرف جھنڈے ہی جھنڈے اور نشان ہی نشان نظر آتے ہیں ۔۔۔! جی ہاں! چاہے سینکڑوں غریب غرباء کے بدن جاڑے کے دنوں میں لباس کی کمی کے باعث ٹھٹھر رہے ہوں اور ان میں کوئی اکڑ کر اپنی جان ہی دے دے۔ بہر حال سینکڑوں گز کپڑا یہاں نشانوں میں صرف ہوتا رہتا ہے !

آپ احاطۂ گنبد کے صدر دروازہ سے لے کر مزار شریف تک "نہ جائے گا اس در سے کوئی بھی خالی" اور "نیست کعبہ در دکن جز درگہ بندہ نواز" وغیرہ کی قسم کے سینکڑوں فقرے اور اشعار بھی پڑھتے جائیے ۔۔۔ اندر چلئے۔ سبحان اللہ! یہاں کی پوری فضا عود، لوبان اور دوسری خوشبوؤں سے کس درجہ معطّر ہے اور مزار شریف پر کتنے قیمتی غلاف چڑھے ہوئے ہیں اُفوہ! اس درجہ قیمتی کپڑے تو صرف شاہانِ سلف نے پہنے ہوں گے یا پھر موجودہ دَور میں امیر امراء کے گھرانوں میں پہنے جاتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ غرباء و مساکین نے تو انھیں خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا ۔۔۔ خیر! وہ خواب میں دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ وہ یہاں بیداری میں تو دیکھ سکتے ہیں۔

اور مزار پر پھول بھی کس کثرت سے چڑھائے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلستانوں اور پھلواریوں کو لا کر یہاں اُلٹ دیا گیا ہے ارے! یہ زائر صاحب تو چوکھٹ ہی کو بوسہ دے رہے ہیں اور یہ کیا؟ یہ صاحب تو قبر کے گرد بھی گھوم رہے ہیں۔ ارے! یہ تو قبر کو بھی چوم رہے ہیں۔ کبھی سر رکھ دیتے ہیں اور کبھی آنکھیں۔ ارے! یہ تو عجیب عجیب بے معنی حرکات بھی کر رہے ہیں۔ خدانخواستہ انھیں کچھ جنون تو لاحق نہیں ہو گیا ہے؟ خیر! یہ حرکات بے معنی ہیں یا با معنی اور یہ صاحب مجنون ہیں یا عقلمند۔ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہیگا۔ آپ نے قبر کے اُوپر کاغذوں کے لٹکتے ہوئے پُلندے نہیں دیکھے بس۔۔ ارے! یہ تو باقاعدہ درخواستیں اور التجائیں ہیں۔ کسی میں لکھا ہے کہ روزگار دلوایئے۔ کسی میں تحریر ہے کہ اولاد دیجئے۔ کسی میں مقدمہ جتوا دینے اور مرض کو دُور کر دینے کی فرمائش ہے۔ کسی میں آفات و بلیات کو ٹال دینے اور بد قسمتی کو خوش قسمتی سے بدل دینے کا مطالبہ ہے ۔۔۔ یہ صاحب تو اُلٹے پاؤں دروازہ کی طرف جا رہے ہیں ۔۔۔ جی ہاں! جاتے ہوئے مزار کی طرف پشت ہوتی ہے نا! ۔۔۔ اور اِدھر دیکھئے یہ بیچاری اللہ کی بندی قبر کی طرف رُخ کئے سجدہ ہی میں پڑی ہوئی ہے۔ اب چلئے یہاں عورتوں کی گزر بھی ہے !

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان مزاروں پر کیسی کیسی ہفتہ واری اور ماہانہ اور بالعموم سالانہ ایک میلہ لگتا ہے، ان میلوں

کی شان صاحب قبر کے شایانِ شان مذہبی جلسوں اور سیاسی تقریبات سے بھی کچھ اونچی ہوتی ہے۔ آرائش و زیبائش، اہتمام و انتظام، شان و شوکت اور وسعت و کثرت کے لحاظ سے یہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان موقعوں پر ہزاروں، لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جو نہ معلوم کن کن جیبوں سے نکل کر کن کن طریقوں سے آتا اور چلا جاتا ہے۔ عام بولی میں ان میلوں کو "عرس" کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی عربی زبان میں "شادی" کے ہیں۔ ایک شخص اس خوشی کے موقع پر انفرادی طریقہ سے جتنا کچھ خرچ کر سکتا ہے اور کرتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ پھر جب سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں افراد اجتماعی طور پر عرس کریں تو جو کچھ بھی خرچ ہو جائے وہ کم ہی ہے۔ یہ اعراس کہیں کہیں ایک دن کے لئے اور کہیں کہیں آٹھ آٹھ دس دس دن کے لئے منعقد ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے اشتہارات اور پوسٹروں سے لے کر دعوت ناموں تک تمام وسائلِ نشر و اشاعت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور یوں بھی ان کی تشہیر کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ خود ہی ان تاریخوں کو جانتے ہیں۔ جن میں اُنھیں کسی مزار پر حاضر ہونا ہے!

اس کے لئے وہ سال سال بھر سے پیسہ پیسہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پیسہ نہ ہو تو قرض دام کرتے ہیں اور بسا اوقات تن کے کپڑے اور برتنے کی چیزیں تک گرو رکھ دیتے ہیں۔ اپنے ضروری سے ضروری کاموں کا ہرج کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں سب سے زیادہ ضروری کام کے لئے جانا ہوتا ہے۔ اپنے مصارفِ سفر کا بندوبست کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس مصرف کا بندوبست نہ ہوا تو پھر آمدنی کے سارے راستے ہی بند ہو جائیں گے۔ اور ٹھیک وقت پر مزار شریف کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

اس جمِ غفیر میں آپ ہر خورد و کلاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سمجھدار بھی ہیں اور بے سمجھ بھی۔ آوارہ و بدمعاش بھی ہیں اور سیدھے سادے بھولے بھالے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ معذور بھی ہیں اور بیمار بھی۔ ڈاڑھی والے بھی ہیں اور ڈاڑھ منڈے بھی۔ نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی۔ غریب بھی ہیں اور امیر بھی۔ خوش حال بھی ہیں اور بدحال بھی۔ کوئی تو چیتھڑے لگاتے ہوئے آگیا ہے اور منہ سے پھونک پھونک کر آگ جلا رہا ہے، تاکہ روٹی کی ٹکیہ پکائے اور پیٹ کی آگ بجھالے۔ یہاں کی رنگا رنگی تو بس دیکھنے ہی کے لائق ہے!

ارے! اس جمِ غفیر میں عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لائی ہیں۔ اور نہ معلوم کہاں کہاں سے آئی ہیں۔ ارے! یہ تو اچھی خاصی برقع پوش معلوم ہوتی ہیں۔ مگر انھیں یہاں برقع کا ہوش نہیں —— جی! یہاں عقیدت کا جوش ہے! برقع کا کسے ہوش ہے! —— لیجئے! یہ بی بیاں تو خوب بے پردہ ہو کر پھر رہی ہیں —— جی! یہاں سارے زائرین قبر ہی کے زائرین نہیں ہیں۔ زائرینِ حسن بھی ہیں۔ عورتیں یہاں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ کندھے سے کندھا ہی نہیں ملتا۔ نظروں سے نظریں بھی ملتی ہیں اور دل سے دل بھی ملتے ہیں۔ آپ کو یہاں اگرچہ سب کچھ ملے گا مگر قبر اور صاحبِ قبر کی نسبت کے باعث آپ اس کا تصور آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب کچھ قبر کے اندر نہیں ہو رہا ہے جسے آپ دیکھ نہ سکیں یہ تو باہر ہی باہر ہے۔ اس لئے اگر واقعات و حقائق کی شہادت ایک مسلمہ شہادت ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ کھلم کھلا نظر بازی بلکہ عشق بازی بھی ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ اس پر "روحانیت" اور "مذہبیت" کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے یہ باتیں "مخلوقِ راز" ہی تک عام طور پر محدود رہتی ہیں ——!

مگر چھوڑیئے مکروہ باتوں کا ذکر بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے عرس کا نظام نامہ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ دیکھئے ——! ارے! اس میں یہ صندل، مالیدہ، چڑھاوا، نشان، فاتحہ، نیاز اور اسی قبیل کی بیسیوں عجیب باتیں موجود ہیں —— جی! یہ عجیب ہوں تب بھی ان پر تعجب نہ کیجئے اور عجیب و غیر عجیب کا فیصلہ ابھی سے کیوں کیجئے گا۔ کچھ نیچے دیکھئے —— ہاں! اس میں مجلسِ سماع کا

ذکر ہے ... مشہور قوالوں کے نام ہیں — مگر اور بھی کچھ ہے ؟ — جی ! کچھ گانے اور ناچنے والیوں کے نام بھی لکھے ہیں — یہاں ناچ گانا صاحب مزار کی روح کو خوش کرنے کے لئے ہوگا، یہ طریقت، جذب و سوز اور کیف و عرفان کی دنیا ہے۔ یہاں "شریعت" کے قانون نہیں چل سکتے !

اچھا ! ادھر دیکھئے۔ ہزاروں جانور ذبح کئے جا رہے ہیں۔ ان جانوروں کا تقدس بھی واقعی کیا چیز ہے ؟ کتنے ہی جانور صاحب قبر کے نام پر پُن کرکے چھوڑ دیئے گئے ہیں، جنہیں ہاتھ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ جس کھیت میں جا پڑیں، کھیت والے کے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ وہ جہاں سے پانی پی لیں وہاں برکت ہی برکت ہوگی۔ کتنے ہی جانور اس لئے ذبح کئے جا رہے ہیں کہ اُن کو ذبح کرنے کی منت مانی گئی تھی۔ اُن کو ذبح کرتے ہوئے چاہے جس کا نام لیا جائے مگر وہ ذبح ہو رہے ہیں ایک خاص طریقہ پر۔ خاص جگہ، خاص وقت میں، یہاں تک کہ اس طریقہ سے ہٹ کر، اس جگہ کو چھوڑ کر، اس وقت کو ٹال کر کوئی شخص انھیں ذبح کرنے پر آمادہ نہیں۔ پھر جانوروں کی خریداری سے لے کر اُن کے گوشت کی تقسیم اور کھانا پکنے اور خرچ ہو جانے تک کے آداب اور بے ادبیوں کی اقسام حد و شمار سے باہر ہیں — !

مزار شریف پر چلئے۔ اوہ ! وہاں تو بڑی بھیڑ لگی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی الگ الگ صفوں کا امتیاز مفقود ہے — خیر ! جو کچھ اندر ہو رہا ہے، اُسے آپ نہ دیکھ سکیں تو یہی بہتر ہے ! دروازہ سے لگ کر کھڑے ہو جایئے، کم از کم ہر آیند و روند کی حرکات و سکنات ہی دیکھ لیجئے۔ اور اگر اس نظارے سے آپ تھک گئے ہیں تو عجیب و غیر عجیب اور جائز و ناجائز کی بحث کو چھوڑیئے۔ اور چپ چاپ لوٹ آیئے مگر ان قبروں کو ضرور دیکھ لیجئے، جن میں کوئی جسم دفن نہیں ہے۔ محض قبروں کی شکل دے کر انھیں کسی بزرگ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے [1]

زائرین بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ مصنوعی قبریں ہیں۔ مگر اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان قبروں پر بزرگانِ دین کا نام لینے سے اُنھیں دین میں بزرگی کا مقام حاصل ہو گیا ہے، اس لئے وہ ان کے بھی گرویدہ ہیں اور یہاں آپ وہ سب چیزیں پائیں گے جنہیں آپ "عجیب" قرار دے رہے تھے، تاہم اگر ان عجائبات سے آپ کے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہونے لگی ہے تو اب اپنے گھر آ جایئے — !

سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، کیا یہ سب یونہی ہے ؟ کیا اس کے کوئی وجوہ و اسباب نہیں ؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا عمل بھی پایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی عقیدہ و ایمان کا مظہر نہ ہو ؟ کیا آپ کسی ایسی سرگرمی کا پتہ دے سکتے ہیں جس کا کوئی داعیہ، جس کا کوئی نظریہ، جس کا کوئی محرک سرے سے موجود ہی نہ ہو ؟ کیا آپ کسی ایسی حرکت کے قائل ہیں جو مقصد و ارادہ اور نیت کے بغیر ہی ہو جایا کرتی ہے ؟ ظاہر ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے قلبی عقیدہ و ایمان کا مظہر ہوتا ہے، انسان کی سرگرمیاں، اپنے داعیات، نظریات اور محرکات کا آپ پتہ دیتی ہیں۔ انسان کی حرکات و سکنات اس کے قصد و ارادے اور نیت ہی پر محمول کی جاتی ہیں۔ بلا قصد و ارادہ سرزد ہونے والی حرکات و سکنات میں نہ تو اہتمام ہوتا ہے نہ اصرار نہ استقلال ہوتا ہے نہ دوام۔ بفحوائے حدیثِ نبویؐ انسان کے تمام اعمال کا دار و مدار اس کی نیت ہی پر

---

[1] دکن میں ان مصنوعی قبروں کو عامۃ الناس "چھلّہ" بولتے ہیں۔

ہوتا ہے۔ پس چند مخصوص اولیاء و صوفیا کی قبروں کے ساتھ یہ غیر معمولی برتاؤ جن اعتقادات و ایمانیات پر مبنی ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اللہ تعالیٰ پوری کائنات اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کا خالق ضرور ہے۔ مگر اُس نے اتنی بڑی کائنات کے لئے تدبیر امر، تقسیم رزق، مالکیت، حاکمیت و اقتدار اور انسانی ضروریات کی بہم رسانی کے انتظام میں دوسری بہت سی ہستیوں کو اپنا شریک بنا رکھا ہے۔ وہ حاکم ہے لیکن اتنا بڑا حاکم کہ اُسے کبھی یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی حکومت و سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں خود دخل دے اور دوسروں کو بالکل بے دخل کر دے۔ اُس نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں لیکن وہ اُس کا پیغام پہنچا دیتے اور اپنی تعلیم کے مطابق خود عمل کر کے دکھا دینے کے بعد دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ اختیارات نہیں دیئے جاتے کہ وہ خدا کی سلطنت میں کسی درجہ میں بھی مداخلت کریں۔ یا از خود دخیل ہو جائیں۔ رہ گئے پیغمبروں کے ساتھی تو بہرحال وہ پیغمبروں کو دیکھنے والے اور اُن کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ انھیں بھی یہ منصب نہیں ملتا کہ خدائی سلطنت کا کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ البتہ بعض صوفیاء و اولیاء کو جو اللہ کے خاص چہیتے اور اس کے نظر کردہ ہوتے ہیں، یہ منصب سونپا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی سلطنت کا کام چلائیں اور اس کی صفات میں جزءً یا کلاً شریک ہو جائیں۔ بادشاہ کائنات کی سلطنت میں اُن کا وہی مقام ہوتا ہے جو دُنیا کی سلطنت میں وزیروں، گورنروں اور چھوٹے بڑے حاکموں کا ہوا کرتا ہے۔ انھیں بہت سے اختیارات دیئے جاتے ہیں اور تصرفات پر انھیں قدرت بخشی جاتی ہے۔ خدا کی سلطنت کا ایک ایک علاقہ اور ایک ایک صوبہ اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ سارے معاملات انہی کے دربار سے طے پاتے اور سارے قضیئے انہی کے ہاں فیصل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خدا کے اذن یافتہ ہیں اس لئے انھیں بہت ہی کم معاملات اُوپر پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ شاید کسی معاملہ کو اُوپر لے جانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں خود اللہ تعالیٰ اس سے راضی و خوش رہتا ہے۔ اگر کبھی ناراض بھی ہو جاتا ہے تو محبوب و معشوق کی بات تو ہر طرح گوارا ہی کرنی پڑتی ہے۔ پھر اتنی عظیم الشان سلطنت کا تنہا انتظام از خود سنبھالنے کی زحمت سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں اور پیاروں کو بھی اختیارات سونپ دیئے ہیں ـــــ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے اکثر بگڑ بھی جاتے ہیں مگر عشق کے میدان میں اس قسم کی باتیں تو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ یہ انداز معشوقانہ ہوتا ہے اس لئے عاشق نہیں بگڑتا۔ بلکہ اُس کے دل میں عشق کی آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے جب دُنیا میں اُن کے تعلقات اتنے مضبوط اور گہرے ہوتے ہیں تو آخرت تو دُنیا کی کھیتی کا حاصل ہی ہے اس لئے وہاں ان کا ہر عقیدت مند بخشا جاتا ہے۔ اور محض اُن کے دامن سے وابستہ ہو جانا ہی بخشش کیلئے کافی ہے۔ عاشق و معشوق کے اصل تعلقات کی شان تو دُنیا سے کہیں زیادہ آخرت ہی میں ظاہر ہو سکے گی ـــــ یہ حضرات اگرچہ دوسروں کی طرح وقت مقررہ پر مر جاتے

ہیں۔ مگر در اصل یہ مرتے نہیں ہیں بلکہ دُنیا سے بیزار ہو کر صرف پردہ کر جاتے ہیں یا خدا سے مل کر بہت سی خدائی طاقتوں کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر اُن کا جسم دُوسروں کی طرح زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے مگر چونکہ وہ دُنیا میں سخت سے سخت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنی روح کو خوب طاقتور بنا لیتے ہیں، اس لئے انتقالِ مکانی کے بعد اس کے تصرف کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جب دُنیا میں ان لوگوں کی روح اتنی ہلکی اور لطیف ہوتی تھی کہ اس پر جسم کا دباؤ باقی نہ رہا تھا یہاں تک کہ ہوا پر اُڑنا، پانی پر چلنا اور چند ثانیوں میں فاصلۂ طویلہ طے کر جانا اس کے لئے ایک معمولی بات تھی تو پھر بعدِ وفات اس کے کرشموں کا کیا ٹھکانا ہے؟

روح تو امرِ رب ہے، پھر ایک ولی اللہ کی روح، جس کی صفائی و طہارت اور قوت و شہامت ناقابلِ تصوّر ہے، جب جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر وہ وہ کرامات دکھاتی ہے کہ دُنیا دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ خدا کا حکم بن کر جب اپنے زیرِ اثر علاقہ میں نافذ ہوتی ہے تو اس کے سارے معاملات اسی روح سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر دُور و نزدیک کی بات سُنتی ہے، قریب و بعید ہر معاملہ دیکھتی ہے۔ حاجتیں پُوری کرتی ہے مُرادیں بر لاتی ہے، تقسیمِ رزق، عطاءِ اولاد، شفاءِ امراض، دفعِ بلیات، دُنیوی امارتوں اور ریاستوں کی اکھیڑ پچھاڑ۔ غرض کوئی معاملہ اُس کے دائرۂ تصرفات سے باہر نہیں رہ جاتا۔ وہ بگڑتی ہے تو بستیوں کو ویران کر دیتی ہے اور خوش ہوتی ہے تو خوشحالی کا دَور آ جاتا ہے۔ اس کی رضا و نارضامندی ہی سب سے اہم، اقدم اور فیصلہ کن مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کی طرف رجوع بہر حال ضروری ہے۔

یُوں تو سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیسوں دن اور دن کا ہر لمحہ وہ اپنے کام سے غافل نہیں رہتی مگر خاص طور پر اُس تاریخ سے دُو چار دن پہلے اور بعد، جس میں وہ جسمِ اقدس سے نکل کر حقیقی معنی میں امرِ ربّی بن گئی تھی، پُوری جلالی و جمالی صفات کے ساتھ قبر پر جلوہ فرما ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہی دنوں میں قبروں پر بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی حاجتیں پُوری کرنے اور اپنی بدقسمتی، خوش قسمتی کے فیصلے لے کر پلٹتے ہیں۔

ان خاص مواقع پر جو کچھ معتقدین سے ظہور میں آتا ہے وہ تو اس لئے ہے کہ آبا و اجداد سے یہ طریقے اور رواج منقول ہیں۔ جو چیز اُوپر سے آتی ہے اس کے تقدس میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ آخر قرآن و حدیث آج کچھ نئے نہیں ہو گئے ہیں۔ وہی قرآن کی باتیں اور وہی حدیث کی روایتیں پہلے زمانے کے لوگوں کے سامنے بھی تھیں جو آج ہمارے سامنے ہیں اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ان چیزوں کو جاننے اور ماننے والے تھے، لہٰذا یہ سب کچھ تو بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ جو ہوتا آیا ہے اور آج ہو رہا ہے!

اگر ان مزاروں کے سامنے آداب نہ بجا لائے جائیں تو پھر دُنیا میں کونسی چیز لائقِ ادب رہ جاتی ہے۔ اگر یہاں بھی بے ادبیاں ہوں تو پھر دُنیا میں کس چیز کا ادب کیا جائے! اگر یہاں وہ چیزیں بھی ہوتی ہیں جو قبروں کی دُنیا سے باہر عام پر نامناسب اور معیوب سمجھی جاتی ہیں تو بہر حال یہ بھی انہی حضرات کا فیض ہے کہ ان تکلفات بارده سے چھٹکارا دلوایا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو کون بُرے

نام سے یاد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ در اصل یہ ان درباروں کی توہین ہے۔ ان درباروں سے جو چیز وابستہ ہو جاتی ہے اس کو برا کہنا صرف بُردوں کا کام ہے، ورنہ جو چیز کان نمک میں پہنچتی ہے، نمک بن جایا کرتی ہے اس نمک کا ذائقہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی۔ ان بزرگوں کی شان تو یہ ہے کہ جن قبروں میں وہ دفن ہیں وہ تو خیر رحمتِ الٰہی کا مہبط ہی ہوتی ہیں۔ مگر کسی پتھر کے ڈھیر پر بھی ان کا نام لے دیا جائے تو وہاں سے بھی فوائد و برکات کا بحرِ ذخار ابل پڑتا ہے۔ خدا نے جو شریعت اپنے بندوں کے لئے اُتاری ہے، وہ ہے تو لائق اتباع مگر خصوصیت و عمومیت میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔ پیغمبروں کو اس کا اتباع اس لئے ضروری ہے کہ وہ پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ خود اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں۔ مگر اولیاء و صوفیا کی ایک خاص جماعت کو وہ امتیاز خصوصی بخشا جاتا ہے کہ شریعت کا اتباع و غیر اتباع ان کے لئے بالکل یکساں ہے۔ ان میں سے اگر کچھ لوگ متبع شریعت ہوتے بھی ہیں تو وہ اپنے ابتدائے سلوک کے مرحلہ میں ہوا کرتے ہیں! مگر بعد میں وہ مرفوع القلم ہو جاتے ہیں اور بعض تو یوم پیدائش ہی سے مرفوع القلم ہوتے ہیں!

چنانچہ وہ اگر عورتوں کے ناچ گانے سے دلچسپی لیتے ہیں تو یہ ایک پردہ ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں پر پڑا ہوتا ہے ورنہ حوروں کے تصور سے ان کا کوئی لمحہ خالی نہیں جاتا۔ اور سازوں کی آوازوں میں وہ ہمیشہ مولا کی آواز سُنا کرتے ہیں۔ وہ دُنیا ہی میں جنت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ اس لئے دُنیا و آخرت کی تقسیم کرنے والے اُن کی کسی بات کو پا نہیں سکتے۔ اور یہی سبب ہے کہ جو لوگ ان کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضر ہوتے ہیں اُنھیں بھی اتباع شریعت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اگر نماز روزہ سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں تو محض اس لئے کہ خدا سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق باقی رہے ورنہ اہل اللہ سے تعلق قائم رکھنا خود اللہ سے تعلق قائم رکھنے کے مترادف ہے!

اس تعلق کے بعد اگر کوئی شخص پوری شریعت سے بھی منحرف ہو جائے تب بھی ڈرنے کی بات نہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اللہ کے ہاں سفارشی بن کر کھڑے ہوں گے بلکہ ان کی بات رکھنا اللہ پر واجب ہوگا، کہیں دُنیا میں ایسے عاشق بھی پائے جاتے ہیں جو خاص اپنے ہی معشوقوں کی ناراضی مول لے لیں۔ اہل اللہ نے تو پہلے اللہ سے عشق کیا مگر بالآخر وہ خود معشوق بن کر رہ گئے!

ایسے محبوبانِ ربانی کے مزارات کیا دوسروں کی طرح کچے اور کھلے ہونے چاہئیں؟ اُن کی عظیم المرتبت ہستیوں کے شایانِ شان تو یہی بات ہے کہ نہایت عالیشان قبے اُن کے مزارات پر بنیں۔ تاکہ ان کی عظمتِ شان بھی باقی رہے اور زائرین و معتقدین کو بھی اُن کے سایہ میں آرام لینے اور راحت پانے کا موقع مل جائے۔ پھر جب یہ مزارات اس قدر مرجع خلائق بن جائیں تو اُن کے سجادہ نشینوں کا وجود بھی آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ بڑے ہیں یا نہیں۔ مگر بڑوں کی نسبت تو اُنھیں یقیناً بڑا بنا دیتی ہے۔ اور مسلم حکومتوں کی یہ انتہائی قدر شناسی اور عقیدت مندی تھی کہ انھوں نے ان مزاراتِ مقدسہ کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں وقف فرمائیں۔ ان تمام

چیزوں کو جو لوگ بُرا کہتے ہیں وہ "وہابی" ہیں۔ اس بات کی تحقیق کون کرے کہ ان کو وہاب سے نسبت ہے یا عبدالوہاب سے یا عبدالوہاب کے بیٹے سے۔ بہرحال ہیں یہ بے ایمان۔ بھلا اہل اللہ سے کٹ کر اللہ سے جُڑنا بھی کوئی معنی رکھتا ہے؟" (ان تصورات اور معتقدات سے لاکھ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ)

یہ ہیں وہ خیالات و اعتقادات جو قبر پرستی کا اصل سبب ہیں۔ یہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ اگر آپ اس کے کسی جُزئیہ کو بھی الگ کر دیں تو شاید اس عمارت کی پُوری اینٹیں ہی کھوکھلی ہو کر رہ جائیں اور پھر یہ عمارت بھی ایک خاص بُنیاد پر قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے اصول و فروع درست ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے حق و باطل کا ایک معیار متعین کرنا چاہیئے۔ جہاں تک غیر مسلم قوموں کا تعلق ہے اُن میں یہ معیار کبھی متفق علیہ نہیں رہا ہے۔ کیونکہ خدائی ہدایت پر ایمان نہ لانے کے سبب اُن کا ہر وادی میں بھٹکنا قدرتی بات ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان، مسلمان ہونے کی حیثیت سے معیارِ حق و باطل کے تعین میں کبھی مختلف الخیال نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہے دُنیا کے کتنے ہی گوشوں میں بکھرے ہوئے ہوں اور علم و ایمان کے کسی درجہ پر ہوں اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن ہے۔ اور اس کے بعد رسُول کی سنّت۔ ان دونوں بھاری چیزوں[1] کے بعد اگر کوئی چیز اُن کے نزدیک لائقِ توجہ یا لائقِ پذیرائی ہو سکتی ہے تو صلحاء و علماءِ اُمّت کے صرف وہ اقوال و افعال جو کتاب و سنّت کے عین مطابق یا روحِ اسلامی سے قریب تر ہوں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو چاہے کسی بات کو ساری دُنیا کہتی ہو اور کوئی کام ساری دُنیا میں کیا جاتا ہو مسلمان کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اتنی بھی نہیں ہے جتنی مٹی کے ایک ذرہ یا گھاس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے بلکہ وہ تو اپنے مشن کے لحاظ سے مامور ہی اس بات پر ہے کہ ہر خلافِ کتاب و سنّت چیز کی تردید کرے اور عملاً ہر منکر کو مٹانے اور ہر معروف کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتا رہے، یہاں تک کہ اس راہ میں اپنی جان دے دے!

اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جن اعتقادات و نظریات کی بناء پر مسلمان قبر پرستی میں مُبتلا ہیں وہ سب سے باطل ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے خیالات و اعتقادات صرف اس شخص کے دل و دماغ میں راہ پا سکتے ہیں جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی، یا کی تو اپنے مزعومات و مفروضات کی تائید و سند کے لئے، ورنہ قرآن نے اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ حق و باطل کو ممیز کر کے رکھ دیا ہے اور دُنیا میں پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کو اتنی خوبی اور حکمت کے ساتھ صاف کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص پُورا قرآن نہ سہی اس کا کوئی ایک حصّہ بھی طلبِ ہدایت کے لئے پڑھ لے تو اس کے دل و دماغ میں اس قسم کے خیالات و اعتقادات کے در آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم قرآن کی کون کون سی آیات اور کون کونسی سورتیں اپنے مدعا کی توضیح میں پیش کریں۔ قرآن کی تعلیم اتنی صاف اور آسان ہے کہ ہر مرتبۂ عقل کا انسان بخوبی اسے جذب کر سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ پُورا قرآن ہی سامنے رکھ دیں اور یہ مخلصانہ گزارش کر دیں کہ خالی الذہن ہو کر چشمۂ ہدایت سے سیرابی حاصل کرنے کی نیت سے قرآن پڑھیے ورنہ پیشگی قائم کئے ہوئے نظریات و اعتقادات لئے ہوئے (خصوصیت سے جبکہ اُن کے ساتھ انتہائی تعصب موجود ہو) اگر قرآن پڑھا جائے گا تو دراصل قرآن کی آیتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ بلکہ اپنے ہی خیالات و نظریات کی تلاوت ہوگی۔ تاہم چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں:-

---

[1] اِنی ترکت فیکم الثقلین (الحدیث)

سورۂ فاطر رکوع ۲ میں ہے:-

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ○ اِنْ تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ ○

اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اگر تم اُن کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سنیں اور اگر سن لیں تو تمہارا کہنا نہ کر سکیں۔ قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھ کو ایک باخبر شخص کی طرح کوئی نہیں بتلائے گا!

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں بے جان معبودوں کا ذکر نہیں ہو رہا ہے بلکہ جاندار اور ذی شعور ہستیوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ پکار کا نہ سننا، سن لیں تو جواب دینے یا کام بنا دینے کا اختیار نہ رکھنا اور شرک سے انکار کر دینا لکڑی پتھر کی مورتیوں کے افعال نہیں ہیں۔ اُنھیں کے متعلق اللہ نے صاف خبر دی ہے کہ اُنھیں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ انھیں جو لوگ طلب حاجات کیلئے پکارتے ہیں اللہ نے ان کے اس فعل کو "شرک" قرار دیا ہے اور خبر دی ہے کہ قیامت میں وہ اس شرک کا انکار کریں گے۔ شرک کے انکار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس فعل کے شرک ہونے کا انکار کریں گے۔ کیونکہ خدا خود جس فعل کو شرک ٹھہرائے اُس کا انکار کسی کے بس میں نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبردستی کے بنائے ہوئے معبود اس فعل سے اپنی برأت ظاہر کریں گے۔ وہ کہیں گے نہ ہم نے انھیں یہ فعل کرنے کا حکم دیا تھا اور نہ ہمیں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے پیچھے کس نے ہمیں کیا کچھ بنا رکھا ہے۔ اللہ نے یہ خبر اس لئے دی ہے کہ جو لوگ غلط امیدوں کے سہارے اپنی زندگی گزار رہے ہیں اُن کو پیشگی متنبہ کر دیا جائے تاکہ قیامت کے دن وہ اپنی امیدوں کے طلسم کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر پچھتانے کی بجائے ابھی سے اپنی غلط فہمیوں کو دور کر لیں۔ اور صحیح رویہ پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا آخری فقرہ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ مقصود بیان یہ ہے کہ خدائے خبیر سے بڑھ کر صحیح خبریں تمہیں کون بتا سکتا ہے۔ پس جو کچھ اللہ نے بتا دیا ہے اس سے کم یا زیادہ پر ایمان لانا پہلے درجہ کی حماقت ہے۔ علم و خبر کا سرچشمہ تو وہی ہے۔ جب وہیں سے تم کو وہ خبریں نہیں مل سکتیں جنہیں تم مان رہے ہو تو بے خبری کے اندھیرے میں جو کچھ تم کرو گے، اس کا نقصان تمہیں کو اُٹھانا پڑے گا۔

اسی سورۂ فاطر میں آگے ارشاد ہوتا ہے:-

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَیْنٰھُمْ کِتٰبًا فَھُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْہُ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ○ (رکوع ۵)

کہہ دو کہ ذرا اپنے شریکوں کو تو دیکھو جنہیں اللہ کو چھوڑ کر تم پکارا کرتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ آخر انہوں نے زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں اُن کا کوئی ساجھا ہے یا پھر ہم نے اُن کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی سند پر قائم ہیں۔ بات یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو کچھ وعدہ کر رہے ہیں وہ محض دھوکہ ہے۔

یعنی یہ اپنے رویہ کے حق میں عقلی و نقلی کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے ہیں تو بتلائے کیوں نہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں اُن کے اپنے معبودوں کا کیا حصہ رہا ہے یا پھر یہی بتا دیں کہ ہم نے آخر کہاں کس جگہ اور کب یہ حکم دیا ہے کہ چونکہ ہماری

سلطنت چند با اختیار ہستیوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک تمہاری پکار کا مستحق ہے لہذا انھیں پکارا کرو۔ جو لوگ عقلی و نقلی دلائل سے بے نیاز ہو کر بے بنیاد عقیدے اور طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور آپس میں یہ جو کچھ وعدے وعید کرتے ہیں وہ صرف دھوکا ہے — !

یہی مضمون سورۂ احقاف کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرمایا:-

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ۝

کہہ دو ذرا دیکھو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کو پکارا کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ انھوں نے آخر زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی علمی روایت پیش کرو۔ اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو پکارے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہیں کر سکتیں۔ بلکہ اُن کی دُعا سے بھی وہ بے خبر ہیں جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔

ان آیات سے حسب ذیل حقائق بداہتہً ثابت ہیں:-

(۱) "عبادت" محض نماز روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ دُعا بھی عین عبادت ہے۔ جو شخص نماز روزہ خدا کے لئے کرے۔ لیکن مشکل کشائی، فریاد رسی اور قضاء حاجات کے لئے اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکارے، وہ خدا کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کرنے کا مجرم ہے۔

(۲) یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے کہ خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو پکارا جائے کیونکہ کوئی اور ہستی کسی کی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں ہے، اور جواب دینا تو ایک طرف کسی کو کسی کی پکار کی خبر تک نہیں ہوتی۔ حد یہ ہے کہ یہاں جن جن ہستیوں کو لوگوں نے معبود بنا ڈالا انھیں جب قیامت کے دن اس کی اطلاع ہوگی تو اس پر ان کا خوش ہونا تو درکنار اُلٹے وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں لوگوں کا یہ طرزِ عمل اتنی شدید ضلالت ہے جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا !

(۳) عقائد و اعمال کی بنیاد ہمیشہ عقلی و نقلی دلائل پر قائم ہونی چاہیئے۔ ظنیات و توہمات یا خالی خولی جذباتی باتیں لائق توجہ تک نہیں ہیں، چہ جائیکہ انہی پر مستقلاً اپنے عقائد و اعمال کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ پس جب یہ معلوم و مسلّم ہے کہ تخلیق کائنات میں اللہ نے کسی اور کو شریک نہیں کیا ہے اور نہ اس نے قرآن میں یا اس سے پہلے کی کسی کتاب میں شرک فی الدعا یا شرک فی العبادت کا حکم دیا ہے تو پھر لوگوں کو خود سوچنا چاہیئے کہ اُن کی ضلالت کا انجام کیا ہوگا۔

یہ اولیاء پرستی دراصل اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ انھیں نفع و نقصان پر قدرت حاصل ہے اور اُن کے یہ اختیارات کچھ ایسے عالمگیر و ہمہ گیر ہیں کہ وہ اپنی کارروائیوں میں خود خدا کے اذن کے بھی پابند نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر خدا

کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو یہ آڑے آتے اور بندوں کو اس سے بچا لیتے ہیں۔ اور فائدہ پہنچانا چاہے تو ان کی رضامندی کے بغیر وہ بندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہی عقیدہ ان کی رضامندی و ناراضی کو اصل معیار قرار دیتا ہے اور کچھ پروا نہیں کی جاتی کہ خدا کس عمل سے خوش اور کس سے ناخوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بکثرت جگہ اس عقیدہ کی پُر زور تردید کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔ (زمر رکوع ۴)

کہہ دو ذرا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو تم اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو کیا وہ اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اگر وہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ تم کہہ دو کہ میرے لئے تو اللہ کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

سورہ جن میں فرمایا:۔

قُلْ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (رکوع ۲)

کہہ دو کہ میں تمہارے کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ تمہاری کسی بھلائی کا۔ تم کہہ دو کہ مجھ کو خدا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں!

جو لوگ اولیاء کو اس درجہ نفع و نقصان پر قادر نہیں مانتے کہ خدا کے اذن کے وہ پابند ہی نہ ہوں، انھیں شفاعت کا عقیدہ ایک اور رُخ سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کو نفع و نقصان کے اختیارات دیئے گئے ہوں یا نہ دیئے گئے ہوں۔ بہر حال یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں اور جیسا کہ دُنیوی سلطنتوں میں ہوا کرتا ہے۔ بسا اوقات ان سفارشیوں کو اصل حاکم سے زیادہ قدر و منزلت اور تعظیم و عبودیت کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیونکہ انہی کی اچھی بُری سفارشوں پر حاکمِ اعلیٰ کے سارے فیصلوں اور اس کی ساری کارروائیوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بھی جگہ جگہ تردید کی ہے:۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (انعام رکوع ۶)

اس کے سوائے نہ ان کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی سفارشی!

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۔ (انعام رکوع ۸)

اللہ کے سوائے نہ اس کا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی!

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (سجدہ رکوع ۱)

اس کے سوائے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ (مومن رکوع ۲)

ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کا کہا مانا جائے!

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (زمر رکوع ۱)

جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز تجویز کر رکھے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ہم اُن کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مرتبہ میں ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ اللہ اُن کے درمیان تمام مختلف فیہ معاملات کا فیصلہ کر دے گا۔ اللہ کسی ایسے شخص کو راہ راست نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو!

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَـيْــــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔ (زمر رکوع ۵)

کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے۔ کہو کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ تم کہہ دو کہ سفارش کا اختیار تو تمامتر اللہ ہی کو حاصل ہے!

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَاللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (یونس۔ رکوع ۲)

یہ اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کر رہے ہیں وہ نہ ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔ اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ پاک اور بالا و برتر ہے!

"شُفَعَآءُ" کا عقیدہ رکھنے والے احمقوں کا آخری حسرت ناک انجام دیکھئے:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰۗؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ (انعام رکوع ۱۱)

بیشک تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا جو کچھ ہم نے تم کو دنیا میں دیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آئے۔ اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے!

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ ... مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (اعراف رکوع ۶)

جس روز وہ انجام سامنے آجائے گا تو وہی لوگ جو اس کو بھولے ہوئے تھے کہنے لگیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیجدیا جائے تاکہ جو کچھ پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقہ پر کام کرکے دکھائیں۔ بیشک ان لوگوں نے اپنا نقصان خود کیا اور ان کی ساری افترا بندیاں آج گئی گزری ہوگئیں۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ○ (روم رکوع ۲)

جس روز قیامت برپا ہوگی تو مجرم سخت ناامید ہوجائیں گے۔ ان کے شریکوں میں کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا اور یہ لوگ اپنے شریکوں سے منکر ہوجائیں گے۔

"شفاعت" کا یہ عقیدہ چونکہ دوسروں کیلئے علم غیب کے حاصل ہونے کے عقیدہ کو مستلزم ہے اس لئے قرآن نے اس کی بھی نفی کردی ہے:۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ط (انعام رکوع ۷)

اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ط (نمل رکوع ۵)

کہہ دو کہ سوائے خدا کے زمین و آسمان کی کوئی ہستی غیب کا علم نہیں رکھتی۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ○ (اعراف رکوع ۲۳)

اے محمدؐ! تم کہہ دو کہ مشیت خدا کے بغیر میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا اگر میں عالم الغیب ہوتا تو یقیناً بہتیرا نفع اپنے لئے حاصل کرلیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا!

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ط (احقاف رکوع ۱)

اے محمدؐ! تم کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ کہہ دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے بھی اپنی زبان مبارک سے یہی کچھ ارشاد فرمایا ہے ایک حدیث میں ہے:۔

وَاللَّهِ لَا أَدْرِي وَأَنَا رَسُولُ اللَّهِ مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ۔ (مشکوٰۃ باب البکاء والخوف۔ بحوالہ بخاری بروایت ام علا)

خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ خود میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا درآنحالیکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

یہ اولیاء پرستی بالعموم دو شکلوں میں ظہور کرتی رہی ہے، ایک یہ کہ خدا پرستی کو بالکل ترک کرکے اولیاء پرستی ہی کو عین خدا پرستی تصور کرلیا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ ساتھ اولیاء پرستی بھی چلتی رہتی ہے، چنانچہ ان دونوں تصورات کو رد کرنے کے لئے کہیں اللہ تعالیٰ نے تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر) فرمایا ہے اور کہیں مِنْ دُونِ اللَّهِ کے بجائے مَعَ اللَّهِ (اللہ کے ساتھ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورہ مومنون کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے۔ جس کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے!

سورۂ نمل کے پانچویں رکوع میں توحید کے دلائل دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بار بار اس سوال کو دہرایا ہے کہ:-

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ ہے۔

چنانچہ ان آیات کے منجملہ ایک آیت یہ ہے:-

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

وہ کون ہے جو مجبور اور بے قرار آدمی کی دعا قبول کر لیتا ہے جبکہ وہ اسے پکارنے لگتا ہے اور پھر اس کی مصیبت دور کر دیتا ہے۔ اور تمہیں زمین میں نیابت کا شرف بخشتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ ہے؟ مگر تم لوگ بہت کم نصیحت مانتے اور اسے بہت کم یاد رکھتے ہو!

یہی غلط ذہنیت ہے جو زندہ اور مردہ بزرگوں کی تعظیم و تکریم میں غلو کرواتی اور بالآخر ان کی پرستش و عبودیت تک لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے کہیں زیادہ مردوں کی پرستش کی جاتی ہے اور یہ عقیدہ قائم کر لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تصرفات بڑھ اور اونچے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی عقیدہ سے اہلِ قبور کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جاتا ہے جو زندہ بزرگوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہلِ قبور کی پرستش کی بھی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل کے دوسرے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں۔ بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں۔ زندہ نہیں ہیں اور ان کو کچھ معلوم نہیں کہ انھیں کب اٹھایا جائیگا!

ان دونوں آیتوں میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ نہ تو فرشتے اور شیاطین ہیں اور نہ لکڑی پتھر کی مورتیاں بلکہ صرف اصحابِ قبور ہیں کیونکہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر "اموات غیر احیاء" کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ رہ گئیں لکڑی پتھر کی مورتیاں، تو ان کے لئے شعور و عدمِ شعور کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ بعث بعد الموت ہی ان سے متعلق ہے۔ لہٰذا الذین یدعون من دون اللہ سے صرف وہ غیر معمولی انسان مراد ہیں جن کی وفات کے بعد غالی معتقدین انھیں داتا، مشکل کشا، فریاد رس، بندہ نواز، غریب نواز، گنج بخش، دستگیر اور نہ معلوم کن کن القاب سے ملقب کر کے ان سے اپنی جملہ ضروریات وابستہ کر لیتے ہیں اور پھر انھیں اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت یا مصیبت کے وقت پکارنے لگتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں بھی مردہ بزرگوں کی پرستش کا مرض بہت عام تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ اساف، نائلہ، لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ دراصل انسان تھے۔ جنہیں بعد کے پجاریوں نے بت بنا ڈالا اور خدائی کی صفات سے متصف کر دیا۔ آیت کریمہ۔ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ (یعنی انہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑ بیٹھنا اور نہ ود، سُواع اور یغوث اور یعوق اور

نسر کو چھوڑنا۔ سورہ نوح رکوع ۲) کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے جو الفاظ بخاری میں مروی ہیں وہ یہ ہیں:۔

كلها اسماء رجال صالحين من قوم نوح عليه السلام فلما هلكوا اوحى الشيطان الى قومهم ان انصبوا الى مجالسهم التي كانوا يجلسون فيها انصابا وسموها باسمائهم ففعلوا فلم تعبد حتى اذا هلك اولئك ونسخ العلم عبدت۔

یہ سب نوح علیہ السلام کی قوم کے بزرگوں کے نام تھے۔ جب وہ لوگ مرگئے تو شیطان نے اُن کی قوم کو یہ بات سمجھائی کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے وہاں کچھ نشان کھڑے کر لو اور اُن کے نام ان بزرگوں کے نام پر رکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس وقت تو ان کی عبادت نہیں ہوئی مگر جب یہ لوگ مرگئے اور علم جاتا رہا تو اُن کی عبادت ہونے لگی!

اس روایت سے حسب ذیل امور بلا کسی تاویل و ابہام کے خود بخود ثابت ہوتے ہیں:۔

۱۔ رجال صالحین ہمیشہ پوجے جاتے رہے ہیں۔

۲۔ صالحین کو معبود بنانا قطعی طور پر "وحی شیطانی" کا نتیجہ ہے۔ اس کو وحی الٰہی یا مرضیات الٰہی سے ذرہ برابر تعلق نہیں ہے!

۳۔ صالحین کی نشست گاہوں، عبادت گاہوں اور رہائش گاہوں پر یادگاری نشان کھڑے کر دینا بھی صریحاً لغو فعل ہے!

۴۔ استھانوں اور انصاب و نشانات کو بزرگوں کے نام سے موسوم کرنا بھی "وحی شیطانی" ہی کا نتیجہ ہے!

۵۔ صالحین کی عبادت اُن کی زندگی سے زیادہ اُن کی وفات کے بعد ہوتی رہی ہے!

۶۔ مُردہ بزرگوں کی پرستش محض جہالت کا کرشمہ ہے۔ اس کو علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے:

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی بخشی ہوئی اعلیٰ درجہ کی بصیرت سے خوب جانتے تھے کہ رجال صالحین تو دراصل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسرے لوگوں کو صالحیت کا سبق دیتے ہیں۔ مگر کمزور ذہن اُن کی صالحیت کا اُلٹا اثر قبول کیا کرتے ہیں۔ اور اُن کی صالحیت رفتہ رفتہ الوہیت و معبودیت سے متصف کر دی جاتی ہے، اس لئے آپؐ نے مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ اور عبارتوں میں اپنی اُمت کو قبروں کے ساتھ غیر معمولی اعتنا و اہتمام برتنے سے بار بار منع فرمایا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے باب دفن المیت میں بحوالہ مسلم حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:۔

نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے۔ اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

مشکوٰۃ کے اسی باب میں بحوالہ ترمذی حضرت جابرؓ ہی سے منقول ہے کہ:۔

نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَأَ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، اُن پر لکھنے اور ان کو روندنے سے منع فرمایا۔

ان دونوں حدیثوں پر غور کیجئے۔ بظاہر قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر قبے اور گنبد تعمیر کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کے فوائد و مصالح بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر حضورؐ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس اہتمام کا

آغاز ہوگیا - تو یہ اہتمام احترام تک، اور احترام، سجدہ وطواف اور عبادت تک پہنچکر رہے گا۔ اس لئے آپؐ نے بالفاظ صریح اس سے منع کر دیا تاکہ ان راہوں کا سدّ باب ہی ہو جائے جہاں سے شرک دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور آگے چل کر خرافات وبدعات کا ایک طوفان اٹھا دیتا ہے۔ رہ گیا قبروں پر بیٹھنا اور ان پر لکھنا تو ظاہر ہے کہ خالی خولی بیٹھنے یا صرف صاحب قبر کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ لکھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ طلب حاجات کے لئے یا مراقبہ و مجاہدہ کی خاطر یا مجاور وخادم بن کر وہاں نہ بیٹھنا چاہیئے۔ اور آیات و احادیث یا ایسے اشعار اور فقرے، جن میں صاحب قبر کی حمد وستائش نہایت مبالغہ کے ساتھ کی گئی ہو۔ لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سارے افعال بآسانی شرک وبدعت تک منتج ہوتے ہیں۔ اور مقصود دراصل اسی راہ کو بند کرنا ہے۔ چنانچہ قبروں کو پختہ کرنا تو ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونچی قبریں تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔

ابو الہیاج اسدی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے فرمایا:-

”کیا میں تم کو ایسے کام کے لئے نہ بھیجوں جس کے لئے خود مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا اور وہ یہ ہے کہ تم کسی مورت کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو۔“

(مشکوٰۃ باب دفن المیت بحوالہ مسلم)

یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر قبے اور عالیشان عمارتیں بنانا تو درکنار صحابہ کرام کسی قبر پر معمولی ساخت میانہ یا سائبان تک دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن کی قبر پر ایک شامیانہ لگا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ ”یا غلام انزعہ انما یظلہ عملہ“ (اے لڑکے! اس کو الگ کردے، ان پر تو ان کا عمل سایہ کررہا ہے)

ان شروعات کا راستہ جن جن مفاسد وقبائح تک پہنچتا ہے، ان کی نسبت بھی حضورؐ کے احکام نہایت صاف و صریح ہیں۔ مثلاً فرمایا:-

لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا - میری قبر کو ”عید“ نہ بناؤ۔ (مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی بحوالہ نسائی بروایت ابوہریرہؓ)

ایک اور جگہ ہے:-

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ - اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا کہ پوجی جائے۔

(مشکوٰۃ- باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ- بحوالہ مالک بروایت عطاءؒ)

قبروں کا بت بنا کر پوجا جانا تو ایک صاف وصریح بات ہے جس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ البتہ لفظ ”عید“ کچھ تشریح طلب ہے۔ ”عید“ عربی لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو عود کرے یعنی بار بار آئے۔ چونکہ خوشی اور جشن کا روز سال بہ سال آتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی عید کہا جاتا ہے۔ عید بلا تعین روز و تاریخ نہیں آتی بلکہ اس کی ایک تاریخ معین ہوتی ہے، جس میں لوگ جمع ہوکے اظہار خوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی دعا منقول ہے کہ انہوں نے کہا تھا:-

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا -

اے اللہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما تاکہ وہ ہمارے لئے، ہمارے اگلے پچھلے سب لوگوں کے لئے ایک خوشی کا دن قرار پائے۔

یہود ونصاریٰ اپنے بزرگوں کی قبروں پر سال بہ سال جمع ہوتے اور میلے لگایا کرتے تھے۔ سرکار رسالت مآبؐ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ اس طرح روز وتاریخ معین کرکے میری قبر پر اجتماع نہ کرو جیسا کہ خوشی اور جشن کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ پھر دوسری حدیث میں وہ

۱

غرض بھی واضح فرمائی ہے، جس کے لئے یہ میلے ٹھیلے اور اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، یعنی قبر کو بت بنا کر پوجنا۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جب حضورؐ ہی نے اپنی قبر پر میلوں اور اجتماعات کو پسند نہ فرمایا اور نہ پسند کیا کہ قبر مبارک ایک بُت بن کر رہ جائے، جس کی پرستش ہوتی رہے، یہاں تک کہ اس کے لئے خدا سے دعا بھی مانگی، تو پھر دوسروں کو یہ حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے کہ اُن کی قبریں بت بنا کر پوجی جائیں اور سال بسال نہایت شان و اہتمام کے ساتھ وہاں میلے لگتے رہیں۔

اس امر واقعی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ حضورؐ افضل المرسلین و خاتم النبیین ہیں اور پوری کائنات میں خداوند قدوس کے بعد آپ ہی کی ہستی بزرگ ترین ہستی ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کی عبادت جائز ہوتی اور مزاروں پر سالانہ اجتماعات کسی درجہ میں بھی محمود و مقصود یا کم از کم جائز ہوتے تو حضورؐ کی قبرِ مبارک اس کی اولین مستحق تھی۔ مگر جب حضورؐ نے خود اپنی ذات کے لئے بھی اس کی نفی فرما دی تو پھر کسی دوسری قبر کے لئے اس کا تصوّر تک کرنا ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے ہے! رہ گئے اس کے لئے جواز و استحباب کرنے کی کوشش کرنے والے یا اسے ضروری اور لازم قرار دینے والے۔ سو حضورؐ کے صریح ارشادات کی روشنی میں اُن کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیئے!

حضورؐ کے بعد پوری امّت میں سب سے افضل صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے۔ لیکن کسی صحابی کے متعلق یہ سُننے میں نہیں آیا کہ اُن کی قبر کو بھی بُت بنا کر پوجا گیا ہے اور "عرس" کے نام سے وہاں سالانہ اجتماع منعقد ہوتا رہا ہے۔ پس پوری امت میں سے چند مخصوص اولیاء و صوفیاء کی قبروں کے ساتھ یہ سارا معاملہ بیّن طور پر انتہائی فسادِ عقیدہ کا مظہر ہے۔ جس سے ہر متبعِ شریعت مسلمان کو توبہ کرنی چاہیئے ـــ!

قبروں کی عبادت کا ایک جزو اور نہایت اہم جزو یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی حضورؐ کے ارشادات نہایت واضح ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا:-

لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ۔

اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ (مشکوٰۃ۔ باب مساجد و مواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین)

یہی ارشاد حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے بھی منقول ہے، جسے بخاری و مسلم کے علاوہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ کے مذکورہ بالا باب میں مسلم کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ وَصَالِحِیْھِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذٰلِکَ!

خبردار رہو۔ تم سے پہلے کے لوگ اپنے انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ پس تم کہیں قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا، میں تمہیں اس فعل سے منع کرتا ہوں!

یہاں یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ کرنا تو ایک طرف خود امام الانبیاءؐ نے اپنی زندگی میں اپنی ذاتِ بابرکات کے لئے بھی سجدہ کو جائز نہیں رکھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اونٹ آیا اور اُس نے حضورؐ کو سجدہ کیا۔ اس پر اصحاب نے کہا کہ:-

یَسْجُدُ لَکَ الْبَھَائِمُ وَالشَّجَرُ فَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَکَ۔

"جانور اور درخت آپؐ کو سجدہ کرتے ہیں، پس ہم تو آپؐ کو سجدہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:۔

اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَ اَکْرِمُوْا اَخَاکُمْ۔

عبادت صرف اپنے رب کی کرو، رہ گیا تمہارا بھائی تو اس کا صرف اکرام کیا کرو۔

ملاحظہ کیجیے مشکوٰۃ باب عشرت النساء بحوالۂ امام احمد بروایت حضرت عائشہؓ - اس حدیث میں عبادت اور اکرام کا فرق بھی بتا دیا گیا ہے اور رب کے مقابلہ میں دوسرے سارے انسانوں کو "بھائی" کہہ کر یہ امر بھی ذہن نشین کرا دیا گیا ہے کہ ان میں باہمی کتنا ہی فرق مراتب ہو بہرحال وہ عبدیت کے رشتے سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اُن کا اکرام تو جائز ہے لیکن اس میں غلو کرکے عبادت تک نوبت پہنچا دینا فی الجملہ حرام ہے!

جو قبریں سجدہ گاہ تک کا مرتبہ حاصل کر چکی ہوں۔ ناممکن ہے کہ لوگ اُن پر دُور دراز سے سفر کر کے، سفر کا ساز و سامان ساتھ لئے نہایت اہتمام کے ساتھ حاضری نہ دیں۔ چنانچہ اسفارِ زیارت کا رواج عہدِ جاہلیت میں بھی تھا اور آج بھی اس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ حضورؐ نے اسے ممنوع قرار دیتے ہوئے صاف فرمایا کہ:۔

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ ھٰذَا۔ (مشکوٰۃ۔ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین بروایت ابو سعید خدری)

مطلب یہ ہے کہ زیارت کے واسطے کسی استھان یا مکان متبرک کو سفر کر کے جانا درست نہیں ہے۔ اس قسم کا سفر صرف تین مسجدوں کے لئے جائز ہے۔ ایک مسجدِ حرام یعنی کعبہ شریف۔ دُوسری مسجدِ اقصیٰ۔ تیسری مسجد نبویؐ۔ اس حدیث سے اسفارِ زیارت کی نوعیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے!

جو لوگ ان تمام تنبیہات کے باوجود "زیارتِ قبر" کے نام سے "عبادتِ قبر" کرتے ہیں وہ دیدہ و دانستہ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں مرد و عورت دونوں یکساں ہیں لیکن زائرین کے مقابلہ میں زائرات کے لئے اعتقادی و اخلاقی فتنوں میں مبتلا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے، اس لئے خصوصیت کیساتھ اُن پر حضورؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "لعن اللہ زائرات القبور"۔ احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "لعن اللہ زوارات القبور"!

اُوپر کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قبر پرستی اور اولیاء پرستی بالیقین "شرک" کی تعریف میں داخل ہے۔ لہٰذا اب شرک کی اہمیت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے:۔

سورۂ لقمانؑ کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمانؑ کی جو نصیحتیں نقل فرمائی ہیں، اُن میں ایک فقرہ یہ ہے:۔

یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ بیٹا! اللہ کا شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے[1]

---

[1] حضرت لقمانؑ چونکہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے اس لئے اس کی فہم و ذکا کے مطابق انہوں نے شرک کو صرف ظلمِ عظیم کہہ کر چھوڑ دیا مگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے ایک ایک فرد کو بلا لحاظ خورد و کلاں و بلا لحاظ عام و خاص جو نصیحت فرمائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ (مشکوٰۃ باب الکبائر بحوالہ احمد بروایت معاذ بن جبلؓ) یعنی اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا ڈالا جائے!

قرآن میں "ظلم" بالعموم گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس شرک اس لحاظ سے ایک بڑا گناہ قرار پاتا ہے۔ لیکن قرآن ہی بتاتا ہے کہ اس گناہ کی حیثیت دوسرے گناہوں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے گناہ چاہے وہ بجائے خود کتنے ہی بڑے ہوں لائق معافی ہیں۔ لیکن شرک بالکل ناقابلِ معافی جرم ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ○

یقیناً اللہ اس امر کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے۔ ہاں اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں انھیں وہ جس کے لئے چاہے گا معاف کردے گا۔ کیونکہ جس نے اللہ کا شریک قرار دیا اُس نے ایک بڑا گناہ افترا کیا۔۔۔! [1]

حضرت لقمانؑ کی نصیحت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اِثم عظیم فرمایا ہے اور اس پر لفظ "افترا" ایزاد کیا ہے۔ جو جھوٹ تصنیف کرنے کا ہم معنی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دوسرے گناہ تو کسی نہ کسی عارضی سبب سے سرزد ہوا کرتے ہیں لیکن شرک کی سرے سے کوئی علت ہی نہیں۔ یہ محض انسان کے توہم پرستانہ ذہن کی خلاقی ہے۔ آیت شریفہ میں مَا دُونَ ذَٰلِكَ گناہوں کی معافی کا جو اعلان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک سے بچا رہے۔ باقی دوسرے گناہ خوب دل کھول کر کئے جائیں۔ بلکہ در اصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک کو ایک بہت معمولی گناہ نہ سمجھا جائے۔ یہ تو تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، یہاں تک کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ گناہ قطعی طور پر ناقابلِ معافی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا یکسر غلط ہونا پوری طرح واضح ہوتا ہے جو شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں بلکہ ان کا سارا وقت فقہیانہ جزئیات کی ناپ تول ہی میں صرف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن شرک اُن کی نگاہ میں اتنا ہلکا فعل ہے کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ طرح طرح کی تاویلوں اور تحریفوں سے شرک کو توحید کا لباس پہنانے میں بھی تامل نہیں کرتے اور تحریف کا کمال یہ ہے کہ شرکِ خفی کو شرکِ خفیف تک بناڈالتے ہیں۔

اِسی سورۂ نساء میں چند رکوع آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ○　　(رکوع ۱۸)

یقیناً اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ البتہ اس کو چھوڑ کر دوسرے گناہ جس کے لئے چاہے گا معاف کردے گا۔ جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔۔!

---

[1] ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون بدیں الفاظ نقل کیا گیا ہے:۔

يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ لَقِيتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً ۔ (مشکوٰۃ باب الاستغفار بحوالہ ترمذی بروایت حضرت انسؓ)

یعنی اے ابن آدم! جب تُو مجھ سے ملے تو چاہے زمین بھر گناہوں کا بوجھ لئے ہوئے ہو مگر مجھ سے اس حالت میں ملے کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دے تو یقیناً میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے آؤں۔۔!

یعنی دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں بھی آدمی وقتی طور پر راہِ ہدایت سے انحراف کر جاتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت کیچڑ سے بھری ہوئی چکنی زمین پر چلنے والے کی لغزش کی سی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ایک مشرک راہِ ہدایت سے ہٹ کر اتنی دُور نکل جاتا ہے کہ ضلالت کے جنگل ہی میں سرگشتہ و حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور راہِ ہدایت اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اُس کی سرگشتگی اُس کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو نہایت بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔ سورۂ حج میں ہے:-

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (رکوع ۴)

جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے، وہ گویا آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کی ہڈیاں پس کر رہ جائیں گی!

یہ تو شرک کا دُنیوی انجام ہے۔ رہ گیا اُخروی انجام تو سورۂ مائدہ میں فرمایا کہ:-

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ (رکوع ۱۰)

جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے، اُس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانا آگ ہے، ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں!

یہی شرک ہے جس کے متعلق سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے کم و بیش اٹھارہ ۱۸ پیغمبروں کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (ملاحظہ فرمائیے رکوع ۱۰) یعنی اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا!

ہم پوچھتے ہیں کہ شرک کے متعلق اس سے زیادہ تصریحات اور کیا ہو سکتی ہیں؟ جب انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ جماعت کے اعمال بھی شرک کی وجہ سے قابلِ ضبط قرار پا سکتے ہیں۔ تو وہ دُوسرے کون ہیں جنہیں "شرک" کے بعد اپنے اعمال کی کوئی جزا ملنے یا شرک کی سزا سے بچ رہنے کا اطمینان حاصل ہے۔ شرک تو ظلمِ عظیم ہے۔ اور ایسے تمام ظالموں کے لئے اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اب نہیں معلوم اللہ کے ارشاد کے مقابلہ میں کس کے "ارشادات" ظالموں کو کہیں سے مدد پہنچنے کا یقین دلا رہے ہیں؟

—————(۲)—————

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قبر پرستی، اولیاء پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات شرک یا قریب بہ شرک یا شرک کی طرف لے جانے والے وسائل و ذرائع ہیں تو پھر قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں خود مسلمانوں کے اندر اس کا کثرتِ شیوع اس حد تک کیسے پہنچ گیا کہ آج شاید کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ایسا نہیں جو اس کی پرچھائیں سے محفوظ رہا ہو۔ سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ـــ یعنی پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ علمِ دین کی کمی اور انتہائی کمی کی وجہ سے ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے بہت سے تاریخی،

۱

نفسیاتی اور داخلی و خارجی اسباب بھی ہیں۔ جن کی طرف ہم یہاں مختصراً اشارہ کئے دیتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی پچھلی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجہ میں نہیں پھیلا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر عمومی حالت یہ رہی ہے کہ بالکل ایک غیر منظم طریقہ سے کہیں کوئی صاحبِ علم آ گئے، جن کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے۔ کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا، جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا اور کہیں کوئی نیک نفس اور رضدار سیدہ بزرگ تشریف لے آئے، جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ بلکہ بہت سے تاریخی تذکرے تو اس امر کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ بہت سے غیر مسلم، اسلام کے ابتدائی مقتضیات تک کو جانے بوجھے بغیر محض خوارق و کرامات کے مشاہدہ سے مسلمانوں میں آ شامل ہوتے رہے ہے۔ اس حالت میں ضروری تھا کہ جو لوگ مسلمان ہوتے چلے گئے اُن کے فکر و عمل میں وہ پورا انقلاب لایا جاتا جو اسلام میں مطلوب ہے۔ کیونکہ تاریخ و نفسیات پر اور بالخصوص اسلام و جاہلیت کی کشمکش پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی دوسرے مذہب سے نکل کر اسلام میں آ جانا جتنا آسان ہے۔ اعتقادات و خیالات سے لے کر رسوم و اعمال تک کے ایک ایک گوشہ میں پوری طرح اسلامی روح کو جذب کرنا اتنا آسان نہیں ہے!

اس کے لئے باقاعدہ تعلیم و تربیت اور ایک مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اور خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ دین اور سعیٔ اصلاح اس پر شاہد ہے کہ جاہلیت سے نکل کر آنے والے لوگوں کو اسلام کے معیارِ مطلوب تک پہنچانے کے لئے آپ نے مستقل اور مسلسل کتنی توجہ فرمائی اور اس کے باوجود عرب کے ابتدائی معاشرے میں کبھی کبھار جاہلی فکر اُبھر آتی تھی ۔۔۔ یہ منظم اور انتھک جدوجہد کی ضرورت اُس ملک اور اس معاشرہ میں اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے، جہاں مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ خیالات و توہمات دل و دماغ میں خوب گہرے اُترے ہوئے ہوں۔ اور مشرکانہ اعمال و رسوم انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے سرزمینِ ہند جو حیثیت رکھتی ہے اس سے کون واقف نہیں!

پس یہ نہایت ضروری تھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کے استحکام کا اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہتمام کیا جاتا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء نے اپنے مدرسوں اور تعلیمی خدمات کے ذریعہ اور صوفیاء نے اپنی خانقاہوں اور اپنے سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں* مگر ایک طرف تو اُن کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے کہ نہایت وسیع پیمانہ پر دائرہ اسلام میں آنے والے لاکھوں کروڑوں افراد کی مکمل اصلاح کر دیتے۔ دوسری طرف اُن کی کوششوں اور کاوشوں کے اثرات فطرتاً اونچے اور متوسط طبقہ ہی پر پڑ سکتے تھے۔ اور انہی طبقوں نے کم و بیش فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن عوام الناس توحید کے تقاضوں سے بے خبر اور آبائی عقائد و اوہام میں مبتلا رہے!

اسلام پھیلانے والے بزرگوں کی مساعی جمیلہ کو پوری طرح کامیاب بنانے کے لئے عین ضروری تھا کہ وقت کی حکومتیں اُن کے ساتھ تعاون کرتیں، اور دوسرے مذاہب سے نکل نکل کر آنے والے تمام مسلمان فرداً فرداً نہ سہی، کم از کم اپنی ایک معتد بہ اکثریت کے ساتھ انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اسلام میں پوری طرح جذب ہو جاتے۔ اسلامی حکومت تو غیر مسلموں کے لئے دعوتِ اسلام کا ایک بہترین عملی مظہر اور مسلمانوں کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک منظم ادارہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے مسلم حکمرانوں کا کام یہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اسلام کی توسیع کی اور نظامِ تعلیم و نظامِ قانون و سیاست

* اور مسلمانوں کے فکر و عمل میں جتنی روشنی پیدا ہو سکی اور ترقی کرتی گئی، وہ انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

کے ذریعہ اسلام کے استحکام کی کوشش کرتے مگر یہاں جو لوگ فتح و ظفر کے جھنڈے اڑاتے درۂ خیبر سے آگے بڑھے اور اندرونِ ملک چاروں طرف پھیل گئے، وہ خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور اسلام بھی اُس وقت لائے تھے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، اور شام وغیرہ) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی ہی کو زیادہ تر اپنا نصب العین بنا لیا اور دُنیوی عیش و تنعم ہی کو بہت کچھ سمجھ بیٹھے - اس صورتِ حال میں ان کی حکومتیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معیاری ادارہ نہیں بن سکتی تھیں اور نہ بنیں — !

یہ حکومتیں اسلامی دعوت و تبلیغ کا کام تو کیا انجام دیتیں جن اللہ کے بندوں نے یہ کام شروع کر رکھا تھا اور جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں - اُن کے ساتھ تعاون تک نہ کیا بلکہ کتنے ہی وقتوں اور موقعوں پر وہ اپنے سارے وسائل و ذرائع اور اپنے سارے حاکمانہ اختیارات کے ساتھ اُن کی راہ میں حائل ہوئیں اور ان بیچاروں کو درباری اثر و رسوخ اور شاہی اقتدار کا سخت مقابلہ کر کر کے اپنا کام جاری رکھنا پڑا - چنانچہ اس سلسلے میں وہ سخت سے سخت مظالم کا تختۂ مشق بنے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتے رہے، اگرچہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہونے والے سارے ہی مسلمان بادشاہ نااہل و ناکارہ اور فاسق و فاجر نہیں تھے - ان میں شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودی اور ایسے ہی بعض دوسرے فرمانروا بھی گزرے ہیں، جنہوں نے نیکی اور پاکیزگی کے لحاظ سے تاریخ میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے - لیکن ان کی دینداری اوّل تو شخصی دینداری تھی، دوسرے اُنہوں نے شرک کو مٹانے اور توحید کی بُنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے تعلیم و تربیت اور تنفیذِ قوانینِ الٰہیہ کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں کی روز افزوں آبادی میں اُن کے ایک ایک فرد کے اندر شرک کے جراثیم کو پُوری طرح ہلاک کر دینے کے لئے کافی نہیں تھیں - پھر موروثی شاہی نظام اس کے پُوری طرح کامیاب ہونے میں بھی مانع تھا - کیونکہ آئے دن اچھے اور بُرے افراد کا اَدل بدل ہر اصلاحی کوشش پر اثر انداز ہوتا اور یہ کوششیں اپنے پُورے نتائج تک پہنچنے بھی نہ پاتیں کہ اس طرح ختم کر دی جاتیں گویا یہاں دین کی خدمت اور اصلاحِ حال کا کوئی کام کیا ہی نہیں گیا، اس لئے شرک اپنے پَر پُرزے نکالتا ہی رہا اور اس کی سمیت سے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کا ذہن متاثر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک وہ دَور بھی آگیا کہ "شرک" کو باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی !

یہ مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ اکبر کا دَور تھا جس میں اگر کائناتی قیامت نہ آئی نہ سہی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دینِ اسلام پر قیامت آگئی - یہ شخص اَن پڑھ تھا اور اس کے درباری و مصاحب سخت گم کردہ راہ - اس کے منحوس دَور میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے دائرہ میں شرک اپنے عالم آشوب ناز و انداز کے ساتھ پُورے کبر و افتخار کا مظاہرہ کرتے ہوئے داخل ہوا بلکہ سرے سے دینِ اسلام ہی پر خطِ تنسیخ پھر گیا - اور بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ۔

"بادشاہ ظل اللہ ہے، مہدی ہے، صاحبِ زماں ہے، امام عادل ہے، مجتہد العصر ہے،
کسی کا پابند نہیں، اُس کا حکم سب پر بالا ہے"

چنانچہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی - اور وہ اپنی عقل کو بھی معصوم سمجھنے لگا - ایک صاحب تو یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو خدا کا عکس ہی ٹھہرا دیا - بس پھر کیا تھا ایک نئے دین کی نیو پڑ گئی - اس نئے دین کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "دینِ الٰہی" رکھا گیا - اور اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا - جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دینِ اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام" سے توبہ کرنی پڑتی اور ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا -

بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی جسے وہ پگڑی میں لگاتے۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری دی جاتی تو اس کے سامنے سجدہ بجا لایا جاتا۔ درباری علماء و صوفیاء بے تکلف سجدہ فرماتے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیتہ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردہ میں چھپاتے، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ حضرت مریمؑ کو بھی معبود بنایا گیا۔ اور ستاروں کی پرستش بھی کی گئی۔ خود اکبر نے مشرک عورتوں سے شادیاں کیں، جس کی وجہ سے قصرِ شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لئے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے، اور بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام ہوا۔۔۔ ہندو تہوار دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی۔ اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام زبان پر آتا تو "جلّت قدرتہ" کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیو ڈالا جاتا اور گلٔے کی تعظیم کی جاتی۔۔۔!

اب آپ ایک طرف اکبری حدودِ سلطنت اور حکومت کی اسلام دشمنی پر نظر کیجئے اور دوسری طرف ان کروڑوں مسلمانوں کا تصور کیجئے جو لاکھوں مربع میل زمین میں پھیلے ہوئے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اور پھر اندازہ لگائیے کہ جب ایک عظیم الشان شاہی حکومت کفر و شرک کی علمبردار ہو تو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی باقاعدہ دینی تعلیم و تربیت اور ان کی مکمل ذہنی اصلاح کے لئے ان چند علماء و صوفیاءِ حق کی کوششیں کس حد تک مفید ہو سکتی ہیں جو حکومت کے ذرائع و وسائل سے نہ صرف محروم ہو کر بلکہ اس کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے متفرق طور پر اپنا کام کر رہے ہوں!

کم و بیش ربع صدی تک "دین الٰہی" کی قاہرانہ سرپرستی کرکے جب اکبر دنیا سے رخصت ہوا تو جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تعزیر و سیاست میں اس کا عدل عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن خود دینِ اسلام پر اس نے اتنا بڑا ظلم کیا کہ محض سجدۂ تحیتہ نہ کرنے کے جرم میں خدا کے ایک صالح و مصلح بندہ کو اس نے جیل میں بھیجدیا۔

جہاں تک اقامتِ توحید، ازالۂ شرک، احیاءِ سنت اور ابطالِ بدعت کا تعلق ہے، نہ صرف شخصی زندگی میں بلکہ حکومت کے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کے ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں اس کی مکمل جد و جہد کرنے والی مغل حکمرانوں میں صرف ایک ہی شخصیت تھی اور وہ ہے حضرت عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت۔ عالمگیر نے مشرکانہ خیالات و نظریات کی اصلاح کرنے اور مشرکانہ رسوم و رواجات کو دیس نکالا دینے کے لئے نصف صدی تک جہاد کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی حکومت بھی موروثی حکومت تھی۔ اس لئے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے نااہل اور بدکار جانشینوں نے ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

آپ اس وقت سے لے کر مسلم حکومت کے خاتمہ تک تختِ دہلی پر بیٹھنے والے بادشاہوں کے حالات و خیالات کا مطالعہ کریں۔ تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان پر ایک قیامت کی سی تاریکی مسلط تھی۔ اس زمانہ میں نہ صرف اعتقادی خرابیاں پرورش پاتی رہیں بلکہ اخلاقی بے حیائیوں اور بے راہ رویوں کا بھی وہ طوفان اٹھا کہ اس نے مسلمانوں کے پورے نظامِ اجتماعی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اس زمانہ میں فرج و شکم کی جس جس طرح پوجا کی گئی اور سلاطین و امراء نے بدکاریوں اور بداخلاقیوں کے جس جس طرح مظاہرے کئے اس کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں پڑھ کر ایک مسلمان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دنیوی فوائد و لذائذ ہی کو معبود بنا رکھا ہو، انھیں شرک و توحید کی بحث سے کیا تعلق رہ سکتا ہے۔

اگر قبر پر چادر چڑھ رہی ہوں تو کیا مضائقہ ہے، اگر اولیاء پوجے جا رہے ہوں تو کیا برائی ہے۔ اگر مشرکانہ بدعات کا زور ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر شرک نے پھیل کر پوری زندگی کو لپیٹ میں لے لیا ہے تو اس سے ان کا کیا نقصان ہے۔ چنانچہ یہی صورت حال تھی جس پر قانونِ الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا اور ایک غیر مسلم قوم نے چیرہ دست ہو کر اپنی حکومت کے لادینی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے نہ صرف مذہب کے دائرہ کو سیاست سے الگ کر لیا۔ بلکہ اپنے نظام تعلیم و تربیت، اپنے نظام تہذیب و تمدن اور اپنے نظام معیشت و معاشرت کے تسلط سے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کو دین سے بیگانہ بنا ڈالا۔

پھر جب اس قوم کا تسلط ختم ہوا اور یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو جس حصہ ملک پر ہنود حکمران ہو گئے وہ تو بہرحال شرک سے پاک نہیں ہو سکتا۔ مگر جس حصہ پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی، وہاں بھی انتہائی منظم اور باقاعدہ اصلاحی کوششوں اور ہر طرح کی قربانیوں کے باوجود، نو دس سال ہو گئے ابھی وہ اصلاح مکمل نہیں ہو سکی۔ جس کے نتیجہ میں شرک اور اس کے لوازمات کو پوری طرح ملک بدر کر دیا جائے، کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو گمراہیاں صدیوں تک پلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں انھیں قدامت کی وجہ سے خواہ مخواہ تقدس اور بزرگی کا مقام حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ان کی اصلاح کا کام بھی اسی مناسبت سے نہایت مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے ۔۔۔!

ان گمراہیوں کی شراب کو جس چیز نے دو آتشہ بلکہ ہزار آتشہ بنا دیا وہ بندۂ زر علماء اور دنیا پرست صوفیاء کا وجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ان گمراہیوں کی حمایت کرنے، شرک پر توحید کا پردہ ڈالنے، بدعت کو سنت بنانے اور مشرکانہ طور طریقوں کو سند جواز دینے کے لئے موجود نہ رہتے تو مسلمانوں کو غلط کار حکمرانوں اور غیر اسلامی حکومتوں سے جتنا نقصان پہنچا اس کا آدھا حصہ بھی نہ پہنچتا۔ انہوں نے عوام کو بھی گمراہ کیا اور حکومتوں کو بھی غلط راستہ پر ڈال دیا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جہاں چند علماء و صوفیاء حق دینِ اسلام کی اقامت و حمایت میں جانیں لڑا رہے ہیں وہیں ایسے مولوی اور صوفی بھی موجود رہے جو "جی حضوری" بن کر اہلِ جاہ و منصب اور اربابِ اقتدار و حکومت کی غلط بینی و غلط کاری میں ان کے ساتھ رہے، انہی کی سازشوں سے اہلِ حق پر بڑی بڑی آفتیں آئیں اور وہ سخت سے سخت مصیبتوں میں گرفتار ہوئے، اگر یہ ظالم ضلالتوں سے صرف رواداری برتتے یا گمراہوں اور غلط کاروں کا صرف ساتھ دینے پر اکتفا کرتے تو یہ بھی کسی بڑے مفسدہ کا موجب نہ تھا۔ مگر انہوں نے عوام اور اہلِ حکومت دونوں کے اندر اپنا تقدس قائم کرنے اور ان کو ان کی ضلالتوں پر مطمئن کر دینے کے لئے قرآن و حدیث کو بھی خوب خوب استعمال کیا۔ اور چونکہ یہ عوام اور اہلِ حکومت کے رہنما نہیں رہے ہیں بلکہ ان کا کام صرف ان کی چشم و ابرو کی طرف دیکھنا اور ان کی شہوات و مرضیات کا اتباع کرنا ہی رہا ہے اس لئے جو جو کچھ وہ کہتے اور کرتے رہے۔ یہ قرآن و حدیث کی رو سے اسے جائز بتاتے رہے۔ اور آیات و حدیث کو توڑنے مروڑنے اور انھیں اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا اور جہاں اس کی بھی گنجائش نظر آئی، وہاں ضعیف و موضوع روایات اور من گھڑت کہانیوں کا سہارا ڈھونڈا اور اس کا بھی ایسا انبار لگایا کہ حق کا علم ہی اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کہیں باطل کو حق کا رنگ دیا گیا اور کہیں حق و باطل کو ایسا گڈمڈ کر دیا گیا کہ لوگوں کے لئے حق کی صورت پہچاننا مشکل ہو گیا ۔۔۔!

اس قماش کے لوگوں کے تمام کارناموں کو چھوڑ کر اگر صرف ان کی تحریری و تصنیفی کاوشوں پر نظر کی جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے لے کر بڑی بڑی کتابوں بلکہ قرآن کی تفسیروں تک انہوں نے اتنا زبردست لٹریچر مہیا کر دیا ہے کہ کج جو بات کسی جاہل کے منہ سے نکلتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی غیر معقول اور بیہودہ ہو اور جو کام جاہل لوگ کرتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی غلط

اور بے ڈھنگا ہو، اس کی تائید و تصویب میں بآسانی پچاسوں تحریریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہی تحریریں لوگوں کا مرجع ہیں۔ اور چونکہ ان تحریروں میں قرآن و حدیث کا نام بھی بار بار آتا ہے، اس لئے لوگوں کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل ہے کہ جو کچھ وہ کہہ اور کر رہے ہیں وہ ہرگز قرآن و حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

یہ بڑی ہی افسوسناک صورت حال ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ عربی ادب کی ایک خاص حد تک تحصیل و تکمیل کریں، قرآن و حدیث کے وسیع ذخیرہ پر خوب گہری نظر رکھیں۔ اس ذخیرہ میں جہاں جہاں معنوی تحریفیں اور تاویلیں کی گئی ہیں اُن کی تہ تک پہنچیں، اختلافات میں محاکمہ کرکے جانب راجح کو اختیار کریں۔ شرعی احکام کی حکمتوں اور باریکیوں کو سمجھیں اور حدود شرعیہ کے نکتوں کو پائیں۔ پھر اگلوں کی تاریخ پر بھی وسیع نظر ڈالیں اور ان کے تمام اقوال و افعال میں حق و ناحق اور مناسب و نامناسب کو بھی ممیّز کرتے چلے جائیں۔

یہ سب کچھ اہل علم کا کام ہے اور جب اُنھیں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکلتی چلی جائے جو "با زمانہ بساز" کے نظریہ پر عامل ہوں اور دُنیا پرستانہ اور مطلب جویانہ ذہنیت لے کر میدان میں اتر آئیں تو عوام کو امن کہاں ملے گا۔ اُن کی گمراہیوں کا دائرہ پھیلے گا اور خوب پھیلے گا۔ اُس کے سکڑنے اور کم ہونے کی آخر صورت کیا ہے؟

ان مولویوں نے کتابوں اور رسالوں کا جو ڈھیر لگا دیا ہے اور اس میں کتاب و سنت کی کھلی کھلی معنوی تحریفات سے عوام کے مطلب کی جو جو باتیں چھانٹی ہیں، وہ تو بے شمار ہیں۔ مگر ہم محض ناظرین کی سرسری واقفیت کیلئے اپنے موضوع کی حد تک چند باتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ایک ہی چاول سے اندازہ کیا جاسکے کہ پوری دیگ میں کیا ہے؟

موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے۔ جب انھوں نے قرآن کھولا تو اس کی ابتدائی آیتوں ہی میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ انھیں یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ یہ لفظ تو ان پورے معتقدات کی جڑ ہی پر ایک کاری ضرب لگا رہا ہے جو عامۃ الناس میں شائع و ذائع ہیں اور جن کی بنیاد پر انہوں نے مشرکانہ اعمال و رسوم کی ایک نئی شریعت ایجاد کر رکھی ہے۔ چنانچہ مفسّر صاحب نے اس کانٹے کو راہ سے نکالنے یا کم از کم اسے بے ضرر بنا دینے کے لئے قرآن میں غور و خوض کرنا شروع کیا۔ اور چند عقلی و تجربی دلائل کی کمک بھی ساتھ لے گئے۔ پھر اس سے بھی کام نہ چلا تو مغالطے دینے اور جذباتی انداز میں گفتگو کرکے لوگوں کو عقلی و نقلی دلائل سے بے پروا کرنے کی کوشش کی۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں حصر موجود ہے اور عربی کا ہر مبتدی اس کا ترجمہ اُردو زبان میں یہی کرسکتا ہے کہ "اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" اگرچہ "ہی" کے حصر کو اڑا دینے کے بعد راستہ کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر ترجمہ کی تحریف کے باوجود متن توجّوں کا تُوں رہتا ہے، اور اس میں تحریف ممکن نہیں، اس لئے مفسّر صاحب نے تفسیر کا ایک اور راستہ اختیار کیا اور وہ یہ ہے کہ اہل اللہ سے مدد مانگنا در اصل اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اہل اللہ غیر اللہ نہیں ہوتے فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی حاجات میں اُن سے مدد مانگنا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ دیکھو! قرآن میں فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ۔ (یعنی قوت سے میری مدد کرو) آیا ہے۔ یہ ذوالقرنین کا قول ہے۔ جب اُس جیسے زبردست اور طاقتور بادشاہ کو بھی دوسروں کی مدد ضروری ہوتی تو ہم جیسے کمزوروں کو اللہ والوں کی مدد کیوں ضروری نہیں؟

اس کے بعد وہ "عقلی و تجربی دلائل" پر آئے اور کہا کہ کوئی شخص اگر جنگل میں بھٹک جائے تو کیا وہ لوگوں کو نہیں پکارے گا۔ کہ بھائیو! میری مدد کرو۔ بس اسی طرح ہم بھی بھٹکے ہوئے ہیں، اس لئے پکارتے ہیں کہ "یا غوث! یا خواجہ! ہماری دکھ پہنچ!" ——

جب ان "قیمتی ہولائل" پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو مغالطہ دینے کی سوجھی اور ارشاد فرمایا کہ تم جس طرح پانی لانے کے لئے ملازم کو پکارتے ہو اور ملازم کی یہ مدد جائز ہے تو اولیاء اللہ کو پکارنا اور اُن سے مدد مانگنا کیوں ناجائز ہوا۔ یہ سب کچھ کہہ جانے کے باوجود مفسّر صاحب کی تسلّی نہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عوام کو نقلی و عقلی باتوں سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف جذباتی باتوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں اس لئے انہوں نے کہا کہ جو لوگ اولیاء اللہ کو نہیں مانتے وہ ایسے اور ایسے ہیں۔ اولیاء کا درجہ اتنا اتنا بلند ہے اور خدا تک براہِ راست رسائی تم جیسے کمینوں کا کام نہیں ہے، اس لئے اِن کے واسطے سے پہنچو اور اِن تک پہنچ جانا خدا ہی تک پہنچ جانا ہے۔ وغیرہ وغیرہ —!

حالانکہ ان تمام باتوں میں ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اسباب طبعی کا تعلق ہے اُن سے کام لینا اور اس کام کے دوران میں ایک دوسرے کی مدد کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور اسی پر سانس لینے اور زندہ رہنے کا دار و مدار ہے۔ لیکن فوق الطبعی اسباب کو پیدا کرنا اور اس سے کام لینا بالکل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور اس کے لئے اسی سے مدد مانگنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص پیاس کی حالت میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لئے پکارتا ہے تو وہ اسی لئے پکارتا ہے کہ خادم اُس کی آواز سننے اور پکارنے والے کو یقین ہے کہ اس کا خادم پانی لانے پر قادر ہے۔ لہٰذا اُس کا پکارنا اور یقین کرنا بالکل درست ہی کیونکہ یہ سب سلسلۂ اسباب کے تحت ہے جس پر سارا نظامِ عالم قائم ہے۔ لیکن اگر وہ پانی کے لئے کسی ولی کو پکارے جو اس سے سینکڑوں ہزاروں میل دُور کسی قبر میں دفن ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان ولی صاحب کو سمیع و علیم سمجھتا ہے۔ اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ عالمِ اسباب پر اُن کی فرمانروائی قائم ہے، جس کی وجہ سے وہ مافوق الطبعی طور پر سلسلۂ اسباب کو پیدا کرنے اور اُسے حرکت دینے پر قادر ہیں اور یہی شرک فی الصفات ہے، جو کسی طرح جائز نہیں —!

اور ایک پانی ہی کیا۔ زمین و آسمان اور اُن کی درمیانی اشیاء میں سے کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کے طبعی و مافوق الطبعی اسباب کا سررشتہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ مگر طبعی اسباب سے کام لینے اور اُس میں ایک دُوسرے کی مدد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دی ہے اور اسی کا نام زندگی یا حیات ہے، اس لئے وہ تو بالکل جائز ہے، مگر اس سے ہٹ کر مافوق الطبعی طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا یا اُس کے ساتھ کسی جاندار یا بے جان چیز کو متصرف فی الخلق سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا بالکل ناجائز ہے۔ ایاک نستعین میں حصر اسی دُوسری چیز کے لئے ہے نہ کہ پہلی چیز کے لئے۔ یہی پہلی چیز ہے جس کو عمل میں لانے کا ہر انسان محتاج ہے، چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا ہی طاقتور اور اپنی صفات میں کتنا ہی برگزیدہ ہو۔

یہی چیز تھی جس کے لئے ذوالقرنین نے فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ کہا تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد کے زندہ لوگوں سے اپنے زیرِ تعمیر بند کے استحکام کے لئے جسمانی محنت و مشقت کی مدد مانگی تھی۔ اس نے یہ نہیں کیا تھا کہ بند کی ضرورت محسوس ہوئی تو گزرے ہوئے زمانے کے لوگوں کو قبروں سے بلانا شروع کر دیا۔ یا اُن کو اس لئے پکارنے لگا کہ وہ مافوق الطبعی اسباب کو حرکت دے کر ایک کرشمہ یا کرامت کے ذریعہ اُس کے لئے ایک عظیم الشان بند بنا کر دے دیں۔

رہ گیا عبد و معبود کا تعلق تو عبد خواہ کتنے ہی اُونچے مقام پر پہنچ جائے اور اس سے معبود کا اور معبود سے اُس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور مضبوط ہو وہ عبد ہی رہتا ہے، اس کے اندر معبودیت یا الوہیت کا کوئی شائبہ تک نہیں آنے پاتا۔ اس عقیدہ پر خود وہ کلمۂ شہادت ہی دال ہے جسے ادا کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ اس میں اللہ کے سوا کسی کے اِلٰہ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ آپ لفظ اِلٰہ کے لغوی معانی کی تحقیق کریں تو آپکو

معلوم ہوگا کہ اس میں حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی اور نفع نقصان پہنچانے کے تمام مافوق الطبعی تصورات موجود ہیں۔ پھر حضورؐ پر جس حیثیت سے ایمان لانا اور اس کی بار بار گواہی دیتے رہنا فرض ہے وہ یہی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول تو ہیں لیکن آپ سب سے پہلے اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے ساتھ انتہائی برگزیدگی کا تعلق رکھنے کے باوجود آپؐ میں الوہیت کی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی ــــ!

اب فرمائیے کہ کلمہ کی رُو سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیئے اس کے برخلاف عقائد رکھتے ہوئے کلمہ پڑھتے رہنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ بھٹکے ہوئے ہیں تو خدا نے ہدایت کا راستہ روشن کر کے رکھ دیا ہے، اُس پر چلئے۔ اسے چھوڑ کر اور ہدایت یافتہ اسلاف کو پکار کر تو آپ اور زیادہ بھٹکے جا رہے ہیں ــــ!

لطف یہ ہے کہ مفسر مذکور نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن کی تفسیر میں محض استعانت بغیراللہ ہی کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ لگے ہاتھوں فاتحہ وغیرہ قسم کی بہت سی چیزوں کا بھی اسی شان کے ساتھ ذکر فرمادیا۔ اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں قرآن کی بسم اللہ ہی ایسی ایسی "نکتہ آفرینیوں" سے کی گئی ہو، وہاں پورے قرآن کی تفسیر کا کیا رنگ ہوگا ــــ!

ایک اور مثال لیجئے :۔

عامۃ الناس میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ مرنے کے بعد بڑی زبردست قوت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ساری دُنیا کی باتوں کو جانتے، ساری آوازوں اور دعاؤں کو سُنتے، تمام حرکات و سکنات کو دیکھتے، اُن کے حضور پیش کی جانے والی تمام درخواستوں کو پڑھتے اور ہر کارروائی کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ وہ نذر دینے والوں سے خوش اور منت پوری نہ کرنے والوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور دفع مضرات و دفع بلیات اور عطاء و بخشش کے بڑے وسیع اختیارات رکھتے ہیں۔ اس خیال کی تائید و تصویب کے لئے جب قرآن پر نظر ڈالی گئی تو وہ اس آیت پر جا کر ٹھہری :۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝[1]

بس کہہ دیا گیا کہ دیکھو! یہ حیات بعد مرگ کا کتنا کھلا اثبات ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ان بزرگوں کو اَحْیَاءٌ (زندہ لوگ) فرمایا ہے۔ اور وہ بھی اتنی تاکید کے ساتھ کہ "اُنھیں مردہ نہ کہو"۔ پس معلوم ہوا کہ زندہ نہ سمجھنا تو ایک طرف اُنھیں زبان سے مُردہ تک کہنا جائز نہیں۔ جو شخص "مردہ" کا لفظ زبان سے نکالتا ہے وہ سخت گستاخ اور بے دین ہے۔ پھر یہ حیات، انتقال مکانی کے بعد کی ہے اس لئے وہ حیاتِ دُنیوی کے مقابلہ میں اتنی اعلیٰ و اشرف ہے کہ اس دُنیا کا کوئی شخص اُس کا تصور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لئے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تَشْعُرُوْنَ (تم سمجھ نہیں سکتے) رہ گئی یہ بات کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے۔ جو فی سبیل اللہ قتل کئے جائیں۔ تمام اولیاء و بزرگانِ دین کا عموم اس سے نہیں نکلتا تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا کہ کافر کے ہاتھ سے قتل ہونے والا انسان جب یہ مرتبہ حاصل کرتا ہے تو بھلا عشقِ الٰہی کی تلوار سے قتل ہونے والا یہ مرتبہ کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ بلکہ غور کیجئے تو اس قسم کے لوگ ہی عام شہداء سے بہت بلند و بالا ہیں[2]

[1] اس آیۂ مقدسہ کی شرح و تفسیر کے لئے اسی شمارہ کا "نقشِ اوّل" ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے (ایڈیٹر)

[2] غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست ۔ غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست

در روز قیامت ایں باو کے ماند ۔ ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

اگرچہ آیت کی یہ تفسیر ہی عامۃ الناس کے عقیدہ کو خوب مضبوط کر دیتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ کچھ ڈھیلی ڈھالی اور ناکافی سی ہے۔ کیونکہ بزرگانِ دین کی حیاتِ برزخ سے جس جس طرح الوہیت کی صفات کو وابستہ کیا گیا ہے اس کے لئے مزید تائید کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ کسر بھی پوری کر دی گئی۔ کہا گیا کہ بزرگانِ دین طرح طرح کے سخت مجاہدوں سے اپنی روح کو دنیا میں زندہ طاقتور بنا لیتے ہیں کہ انتقالِ مکانی کے بعد ان کی روح بلندی میں پرواز کرتے کرتے امرِ رب ہی بن جاتی ہے۔ پھر وہ جو کچھ کرتی ہے، خدا کا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۔

یعنی لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ روح تو امرِ رب ہے!

نیز آدم کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے چند مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں:-

اِذْ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ۔

یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں!

حالانکہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں سب سے اولین قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بَلْ اَحْيَاءٌ کی تفسیر میں شہداء و اولیاء کی حیات سے متعلق جتنی باتیں چاہے کہہ لیجئے۔ لیکن اس کو الوہیت کی صفات سے متصف نہ کیجئے۔ یہی تو شرک ہے، جس کی تردید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ قرآن کی پوری دعوت ہی توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر ہے۔ اس لئے اس کی کسی آیت کی ایسی تفسیر ہرگز جائز نہیں جو اس کی پوری تعلیم اور اس کے سارے اصول و کلیات کے خلاف ہو بلکہ اس قسم کی تفسیری کوشش دراصل معنوی تحریفیں ہیں۔ رہ گئیں آیات قُلِ الرُّوْحُ اور اِذْ نَفَخْتُ ۔ تو جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے، اس میں لفظ "روح" ہی کے متعلق اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد جان ہے یا کچھ اور؟

ابنِ عباس، قتادہ، حسن بصری وغیرہم نے روح کے معنی وحی یا وحی لانے والا فرشتہ بیان کئے ہیں۔ تاہم اس سے مراد جان ہی ہو تب بھی اس کے لئے مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ میرے رب کے حکم سے ہے نہ کہ خود امرِ رب ہے۔ لفظ مِنْ کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہی حال دوسری آیت کا ہے۔ اس میں اول تو یہ نہیں فرمایا کہ "میں اپنی روح پھونک دوں" بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں"۔ دوسرے اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ انسانی روح صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے اور اسی عکس یا پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکال بیٹھنا کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جزو پا لینے کا ہم معنی ہے۔ اتنی بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم ہی پر خطِ نسخ پھیر دیتی ہے۔ قرآن نے اپنی تعلیم مبہم و مغلق بنا کر پیش نہیں کی ہے۔ اگر کہیں اختصار سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ توضیح و تفصیل بھی کر دی ہے۔ اور اس کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو اس کے پیش کردہ تصورِ الٰہ پر غلط طریقے سے اثر انداز ہوتی ہو۔ یہ تو خود لوگوں کی اپنی ہی مشرک پرستانہ ذہنیت اور اس ذہنیت کو تقویت دینے والی فتنہ جویانہ نیت ہے۔ جس کے زیرِ اثر توحید کی تعلیم دینے والی کتاب میں شرک کے جراثیم کلبلاتے نظر آتے ہیں۔!

مزید ایک مثال سنئے:-

عوام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ دوسری تمام بخششوں کی طرح عطاءِ اولاد کے لئے بھی اولیاء اللہ نہ صرف خدا سے دعا کرتے ہیں بلکہ خود بھی اسے بخشنے پر قادر ہیں۔ چنانچہ اس کا اظہار ان کی زبانوں ہی سے نہیں بلکہ باقاعدہ ان کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ جو وہ

درخواستوں کی شکل میں مزارات اولیاء پر لٹکاتے ہیں۔ اِن میں صاف صاف اہلِ قبور سے خطاب کیا جاتا ہے کہ "ہمیں اولاد دیجئے"۔ اب کیسے ممکن تھا کہ جن مولویوں کا سارا مفاد ہی عوام کے عقائد و اعمال سے وابستہ ہو، وہ اسے بھی سندِ جواز نہ دیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے انہوں نے قرآن میں ٹوہ لگائی اور تلاش و تفحص کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ اگر وہ طلبِ ہدایت کے لئے قرآن پڑھتے تو کسی مقام کی دو چار آیتیں ہی اُن کی ہدایت کے لئے کافی تھیں۔ مگر وہاں سرے سے طلبِ ہدایت ہی مقصود نہ تھی۔ وہاں تو مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کہیں سے کوئی اشارہ ہی ایسا نکل آئے جس سے اُن کے "پیارے عوام" کے عقائد کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت ہو سکے۔ چنانچہ وہ بیسیوں ایسی آیات پر سے گزرے جن میں نہایت صاف و صریح الفاظ کے ساتھ اُن کے عقائد کا ابطال اور صحیح عقائد کا اثبات موجود ہے۔ اللہ نے پھیر پھیر کر حقائقِ واقعیہ کو بیان فرمایا ہے۔ مگر اُن کے پھرے ہوئے ذہن میں کوئی بات اُتر نہ سکی — جب قرآن کے مجموعی مضامین و مطالب میں اپنے مفیدِ مطلب بات کے پانے سے وہ مایوس ہوگئے تو پھر لفظ لفظ اور حرف حرف کو دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ اگر کوئی رائی بھی کہیں مل سکے تو وہ اپنے نحوی اور صرفی علم کی مدد سے اسے پہاڑ بنا دیں۔ بالآخر اُن کی نگاہ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں آیت:۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝

پر جا کر ٹھہر گیا اور جب انہوں نے غور کیا تو لفظ لِاَهَبَ پر پہنچ کر وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ اُنہوں نے کہا دیکھو! یہ ہے دلیل اس بات کی کہ اولیاء اللہ کو عطاءِ اولاد پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہاں فرشتہ نے اولاد کی بخشش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لہٰذا مسجودِ ملائک انسان اور انسانوں میں بھی نہایت بزرگ و برتر ہستیوں کے لئے بھلا یہ کیسے ناممکن ہے کہ وہ اولاد جیسی چیز نہ دے سکیں —!

حالانکہ اس معاملہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ فرشتہ نے "بخشنے" کا فعل محض مجازی طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ:۔

"میں آپ کے رب کا بھیجا ہوا ہوں"

آیت مذکورہ کا سیاق و سباق دیکھئے! اللہ تعالیٰ خود اس فرشتہ کے متعلق فرماتا ہے کہ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (مریم کے پاس فرشتہ کو ہم نے بھیجا) مریم علیہا السلام بے شوہر بچہ پیدا ہونے پر تعجب کا اظہار کرتی ہیں تو فرشتہ کہتا ہے:۔

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (آپ کا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے)

فرشتہ کا یہ قول اُس کے زیرِ بحث قول کو قطعی طور پر مجاز کا رنگ دے رہا ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے کارِ تخلیق میں فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو اپنا شریک بنا رکھا ہے؟

خدا کے ماننے والوں میں نہ کوئی انسان ایسا پایا گیا ہے اور نہ کبھی پایا جائے گا جو خدا کے خالق واحد ہونے اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کے مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہو۔ جب انسان اور فرشتے اس کے مخلوق ہیں تو مخلوق ہی کو کارِ تخلیق میں شریک کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر حق تعالیٰ جل شانہٗ خود فرماتے ہیں:۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۝

(ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بنادیں)

یہی واقعہ سورۂ آلِ عمران کے پانچویں رکوع میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ایک فرشتہ نہیں بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت حضرت مریم کے پاس آئی تھی اور اس لئے آئی تھی کہ مریم کو لڑکے کی بشارت دے۔ سرگروہ کی حیثیت سے

جب ایک فرشتہ حضرت مریمؑ سے مخاطب ہوا تو کہا کہ :-

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

ایسا ہی ہوگا ۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے ۔

کیا یہ کُنْ فَیَکُوْنُ کی شان بھی اللہ کے سوا کسی اور کے لئے مختص ہے ؟ کیا اس میں بھی اُس نے فرشتوں اور انسانوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے ؟ اگر بات یہ نہیں ہے تو ماننا چاہیئے کہ فرشتہ لڑکا دینے کے لئے نہیں بلکہ صرف بشارت دینے کے لئے آیا تھا ۔ مگر جب وہ انسانی شکل میں متمثل ہو کر حضرت مریمؑ کے سامنے آگیا تو اُس نے بشارت کی تقویت کے لئے لڑکا بخشنے کا فعل مجازی طور پر اپنی طرف منسوب کر لیا ۔ پورا قرآن تو خیر خود اس لفظ لِاَهَبَ کا سباق و سباق ہی اس ذرا سے مجاز کو حقیقت کی طرف لے جانے کے سارے راستے بند کر دیتا ہے ۔

اس سلسلہ میں سورۂ اعراف کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہوگا ۔ فرمایا ہے :-

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے ۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی ۔ پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے مگر جب اللہ نے اُن کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے ۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں !

ان آیات پر "تفہیم القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ نے جو حاشیہ لکھا ہے اُس کا حسب ذیل پیراگراف بار بار پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لائق ہے ۔ فرماتے ہیں :-

"ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ عرب کے مشرکین تھے اور اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لئے تو خدا ہی سے دُعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دُوسروں کو شکریہ کا حصہ دار ٹھہرا لیتے تھے ۔ بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہے ۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں ۔ حمل کے زمانہ میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں ۔ اس پر بھی زمانۂ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موحّد ہیں ۔ اُن کے لئے جہنم واجب تھی اور ان کے لئے نجات کی گارنٹی ہے ۔ اُن کی گمراہیوں

پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر ان کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالیؔ مرحوم نے اپنی مسدس میں کیا ہے:۔

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جُھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے!"

یہ نمونہ تو تھا قرآن کی "تفسیر" کا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قبروں اور قبر والوں کے تعلق سے جو رسمیں رائج ہیں اُن کے کوئی اصطلاحی نام تو قرآن و حدیث میں نہیں ملتے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُن کے ایسے نام تجویز کر دیئے جائیں جو نفسِ قابلِ اعتراض بھی نہ ہوں اور شرکِ جلی کی تعریف میں بھی نہ آسکیں۔ چنانچہ مولویوں نے یہ فنّی خدمت بھی خوب انجام دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

آپ اُن تمام کھانوں سے واقف ہی ہوں گے جو خاص خاص تاریخوں میں، بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ، مخصوص آداب و قواعد کے تحت مسلمانوں کے ہاں پکائے جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک باقاعدہ نظامِ فکر و عمل ہے۔ اس کے الگ الگ اجزاء کو لیجئے تو خواہ مخواہ ان کے تعیّن و عدمِ تعیّن اور جواز و عدمِ جواز کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس مجموعہ کا ایک مختصر اور مفید نام **فاتحہ** رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ کوئی بُرا اور بے معنیٰ ہے۔ ایک اچھا اور بامعنی لفظ ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام بھی ہے اور سورۃ بھی وہ جو جسے خود قرآن نے سبع المثانی کہا ہے۔ یعنی سات ایسی آیتیں جو بار بار دُہرائی جانے کے لائق ہیں۔ اس کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ!

یعنی سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بھلا اس پر اعتراض کی گنجائش ہی کیا ہے۔ لیکن آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ لفظ "فاتحہ" کے معنی اور خود سورۂ فاتحہ سے عقیدہ و عمل کے اس پورے نظام کو کوئی دُور و قریب کا تعلق نہیں ہے جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اب آپ اگر "فاتحہ" کے قائلین سے یہ فرمائیں کہ تم جو نمازیں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو یا غیر از نماز کہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے ہو، اسی کو کافی سمجھو اور اس کے سوا "فاتحہ" کے نام سے کچھ نہ کرو تو ان میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ مگر اس کے باوجود "فاتحہ" کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے، اس کو یہ ایک لفظ اعتراض کی زد سے نکال لیتا ہے۔

رہ گئی فاتحہ کی غرض تو اس کے لئے بھی کوئی ویسا ہی بامعنی بلکہ شرعی تصوّرات سے قریب تر کوئی لفظ چاہیئے تاکہ مقصد کی پاکیزگی ثابت ہو جانے کے بعد عمل کی پاکیزگی خود بخود ثابت ہو جائے۔ چنانچہ فاتحہ کی غرض کو "ایصالِ ثواب" کا نام دیا گیا۔

جس کے معنی ہیں "ثواب پہنچانا" جہاں تک مُردوں کو ثواب پہنچانے کا تعلق ہے، اس کی تو بعض شکلیں خود حدیثِ نبوی میں موجود ہیں اور ائمہ فقہ بھی قائل ہیں کہ بدنی اور مالی عبادات کا ثواب پہنچ سکتا ہے، پس عقیدہ و عمل کی بہت سی خرابیاں اس لفظ کے پیچھے جا چھپیں اور کسی فقیہ کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ "ایصالِ ثواب" کو ناجائز کہہ دے۔ مگر اس سلسلہ میں جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اُن کو چھوڑ کر صرف دو باتیں قابلِ توجہ ہیں :۔

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن و حدیثِ نبوی میں ایصالِ ثواب کی بہترین صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ آدمی اپنے ساتھ اپنے اسلاف کو بھی دعواتِ خیر میں شریک رکھے۔ دعاء خیر سے زیادہ بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایصالِ ثواب کے لئے بدنی یا مالی عبادت کی اجازت دی بھی ہے تو وہ بھی کبھی کبھار۔ یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ آدمی اسے معمول ہی بنا لے اور فرائض تک سے بے پرواہ ہو کر اس کام میں اپنی قوت اور دولت کا ایک بڑا حصہ خرچ کرے پھر یہ "ایصالِ ثواب" کے نام سے کئے جانے والے لمبے چوڑے کاموں کی اصل علت کیا ہے؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے اصل مستحق ہمارے وہ اعزاء و اقرباء یا دوست احباب ہیں جن کی وفات ہمارے سامنے ہوئی ہے اور جن کے حالات سے ہم واقف رہے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کم از کم ہمارا گمان یہ ہو کہ وہ ثواب کے محتاج یا مستحق ہیں۔ مگر جن بزرگوں نے خود اپنی نیکی اور پرہیزگاری سے اپنے لئے ثواب کا بہت کچھ سرمایہ اکٹھا کر لیا ہو بلکہ اُن کی بزرگی یہاں تک تسلیم کر لی گئی ہو کہ وہ "ایصالِ ثواب" کرنے والوں کے نزدیک الوہیت تک میں شریک ہو گئے ہوں۔ جس کی بنا پر وہ اُنھیں پکارتے اور اپنی حاجات میں مدد مانگتے ہیں تو انھیں "ثواب" پہنچانے کا کیا مطلب ہے؟ آخر کوئی یہ بھی تو سوچے کہ ثواب کس قسم کے لوگوں کی طرف سے کس قسم کے لوگوں کو پہنچایا جا رہا ہے؟ کیا آپ کے خزانہ میں ثواب اتنی بڑی مقدار میں جمع ہے کہ آپ کو اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور آپ مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا زائد از ضرورت ثواب دوسروں کو پہنچا دیا جائے؟ اور پہنچے بھی وہ آپ کی طرف سے حضرت پیرانِ پیر اور خواجہ اجمیری وغیرہ جیسے بزرگوں کو؟

یہی حال قبر پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات کا بھی ہے۔ "قبر پرستی" کو "زیارتِ قبر" کا شرعی نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ "زیارتِ قبر" نہیں "عبادتِ قبر" ہے۔ قبروں پر حاضری دینے کی اصل غرض کو توسّل اور اکتسابِ فیض وغیرہ جیسے الفاظ کے خوشنما پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ کسی ولی کی قبر پر حاضری دے کر یہ سمجھنا کہ چھوٹے صاحب تک رسائی ہو چکی ہے۔ اب وہ کہیں بڑے صاحب کے ہاں پہنچا نے، اُن کے ہاں ہماری سفارش کرنے اور ہمیں اُن کا مقرب بنانے کا اختیار رکھتے ہیں یا اُس قبر کو فیض کا ایک بحرِ ذخار سمجھ بیٹھنا۔ جہاں سے ہر حاجت مند کو اپنی ہر چھوٹی بڑی مادّی و روحانی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان مل جایا کرتا ہو۔ بے ریب و شک ایک مشرکانہ عقیدہ ہے نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی اور نہ حقیقت کی تبدیلی کو نام کی تبدیلی کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ توسّل کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے ذواتِ صالحہ کو وسیلہ بناتے ہوئے دُعا کی جائے[۱] جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ

---

[۱] واضح رہے کہ اس مسئلہ میں جواز، عدمِ جواز اور سکوت کے لحاظ سے علماء محققین کے تین مسلک ہیں اور تینوں کے دلائل میں حسبِ مراتب کچھ نہ کچھ وزن پایا جاتا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ کے تمام اطراف سے پوری آگاہی حاصل کرنا چاہیں اُنھیں خود مطالعہ و تحقیق سے کام لینا چاہئے۔ ہم نے محض برسبیل ذکر یہاں جواز کے پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

إِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا (اے اللہ! ہم اپنے نبی کے چچا سے تیرے دربار میں توسّل کرتے ہیں یا ہم اپنے نبی کے چچا کو تیرے پاس وسیلہ بناتے ہیں) مگر اس کا التزام کر لینا صحیح نہیں ہے۔[ل] کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو خدا وسیلہ کے بغیر کسی دعا کو قبول ہی نہیں کرتا۔ یا اس پر مخلوق کا کوئی حق ہے کہ جس کا واسطہ بار بار دلایا جا رہا ہے اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

رہا اکتسابِ فیض کا معاملہ تو اس کی حقیقت اُن تصوّرات سے خود بخود نکھر کر سامنے آ جاتی ہے جو شریعت نے اپنے پیروؤں کو دیئے ہیں۔ ہر مسلمان کو سلفِ صالحین کے حالات و خیالات اور اُن کی باقیات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس کے مطابق خود اتباعِ شریعت اور ارتقاءِ روحانیت میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ اس حال میں اگر وہ کسی مردِ صالح کی قبر پر جائے تو اسے یقیناً روحانی بالیدگی اور قلبی نورانیت حاصل ہوگی اور یہی آخری حد ہے جہاں تک ایک مسلمان حدودِ شریعت میں رہ کر جا سکتا ہے! (قلبی نورانیت اور روحانی بالیدگی کا سبب یہ ہوگا کہ زائر*

اگر یہی چیز "اکتسابِ فیض" ہے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر جانور، غلّے اور دُوسری اشیاء کے ساتھ جن منتوں، مُرادوں اور قربانیوں وغیرہ کا ہنگامہ قبروں پر جاری ہے، اُس پر "اکتسابِ فیض" کا اطلاق نہ لفظی حیثیت سے ہو سکتا ہے نہ معنوی اعتبار سے۔ تاہم اس خاص فعل کے لئے بھی مولویوں نے چند اصطلاحات عوام کو دے رکھی ہیں۔ "بھینٹ" کا لفظ چونکہ ایک ہندی لفظ ہے اور مندروں اور استھانوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے آپ کسی مسلمان کی زبان سے یہ لفظ نہ سُن سکیں گے، البتہ اسی چیز کے لئے جو الفاظ انھیں علماء کے دربار سے مل گئے ہیں وہ ہیں نذر، نیاز وغیرہ۔

دیکھئے! کس قدر بے ضرر اور معصوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ لغوی و معنوی اعتبار سے اُن کا استعمال غیر اللہ کے لئے بہت کچھ محلِ نظر ہے مگر نذر تو نذرانہ اور تحفہ کے معنی میں مستعمل ہی ہے اور نیاز کے لفظ کو بھی لوگ ایک دوسرے کے لئے بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اس میں کراہت، نفرت اور حرمت کی وہ شدت نہیں ہے، جو بھینٹ، چڑھاوا اور نذر لغیر اللہ وغیرہ الفاظ میں پائی جاتی ہے!

مگر یہ تو محض ایک فعل ہے، ایسے کتنے ہی مختلف افعال کا ارتکاب سال بہ سال قبروں پر ہوتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پورے بکھیڑے میں دولت، قوت اور محنت کا صَرف کہاں تک جا پہنچتا ہے اور گانے بجانے اور ناچ رنگ تک کی رنگینیاں اس میں کس طرح جلوہ دکھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ہنگامہ کا، جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کی بہار دیکھی جا سکتی ہے، کوئی ایسا مختصر اور جامع نام ہونا چاہیئے جس کے پسِ پردہ احکامِ شریعت کی دل کھول کر توہین و تذلیل کی جا سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ نام کیا ہے؟ جاترا نہیں بلکہ "عُرس"۔ کیونکہ "جاترا" اُس

* اس قبر پر موت اور آخرت کو یاد کرے گا۔ اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوگی اور یہ سبب ہوگی دل کی نورانیت اور روح کی بالیدگی کا! — (ایڈیٹر)

ل قرآن پاک میں جتنی دعائیں ملتی ہیں اُن میں "توسّل" کہیں نہیں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ماثورہ دعائیں اُمّت تک پہنچی ہیں اُن میں بھی براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا اور التجا کی گئی ہے کسی کا توسّل اس میں نہیں ہے اور صحابہ کرام بھی اپنی دعاؤں میں "توسّل" کا التزام نہیں کرتے تھے۔ ان درجنوں قرآنی دعاؤں اور سینکڑوں احادیث و آثار سے ثابت شدہ دعاؤں کے مقابلہ میں ایک دو "حدیث و آثار" میں "توسّل" بھی اگر ملتا ہی تو ایک محتاط مسلمان کا رجحان "شذوذ" کے مقابلہ میں "کثرت" کی طرف ہی ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ "الوسیلہ" کے موضوع پر محترمہ عطیہ خلیل عرب کا مقالہ اسی "توحید نمبر" میں ضرور پڑھ لینا چاہیئے! (ایڈیٹر)

وقت تک کرتے تھے جب تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اب اس کی جگہ "عرس" کرتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی معنویت کے اعتبار سے فی الواقع لائق داد ہے۔ "عرس" عربی میں شادی بیاہ کو کہتے ہیں اور شادی بیاہ لازماً ایک خوشی کا کام ہے لہذا خوشی اور جشن کے موقع پر جو کچھ انسان کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے وہ سب قبروں کے عرس میں از خود حلال ہو گیا۔ رہ گیا یہ شبہ کہ بزرگوں کے یوم وفات کو شادی کا دن کس معنی میں قرار دیا گیا ہے تو ہمارے علماء کرام کی باریک بیں اور نکتہ چیں نگاہوں نے اسے بھی دُور کر دیا۔ جب ان کے سامنے وہ حدیث آئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر میت صالح ہوتی ہے تو فرشتے سوال و جواب کے بعد اس سے کہتے ہیں نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ (سوجا، جس طرح دلہن سوتی ہے) بس انہوں نے فرما دیا کہ لو دیکھو! یہی ہے عرس۔ چونکہ اولیاء اللہ اُس دن عروس کی طرح سو جاتے ہیں۔ اس لئے اُس دن یا اُس سے آگے پیچھے جو کچھ اُن کی قبروں پر ہوتا ہے، وہ عرس ہے!

اس تحقیق انیق پر بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر اس سے کلام بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لئے ہم اشارۃً دو ہی باتیں عرض کئے دیتے ہیں:-

ایک یہ کہ صالحین کو دُلھن کی سی میٹھی، پیاری اور گہری نیند محض اس لئے نصیب ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو عمل صالح سے دُلہن کی طرح آراستہ کیا تھا، آخر اُن کی خوشی میں آپ کے شریک ہونے کا کیا موقع ہے؟ آپ بھی جائیے اور ویسی ہی زندگی اختیار کرنے کی کوشش کیجئے۔ قبروں پر ہنگامے بپا کرنے اور میلے لگانے سے تو صالحیت نہیں پیدا ہو سکتی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر صالحین اپنے یوم وفات ہی میں گہری نیند سو گئے ہیں تو ان سے اپنی حاجات طلب کرنے اور انھیں اپنا معبود بنانے کا کیا موقع باقی رہا؟ کیا معبود بھی سو جایا کرتے ہیں؟ اگر معبود سو جائیں اور دُلہن کی سی نیند سو جائیں تو وہ اپنے عابدوں اور نیاز مندوں کا کیا بنا سکیں گے؟ اور اگر ان کی نیند بیداری ہی کی مترادف ہے تو پھر سونے کا کیا مطلب ہے؟

مگر کسی مسلمان کی زبان پر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لئے معبود، خدا اور اِلٰہ وغیرہ کے الفاظ نہیں آ سکتے، اس لئے ان صالحین امت کے ساتھ وہ سب کچھ معاملات رکھنے کے باوجود جو صرف اللہ ہی کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، انھیں معبود، خدا اور اِلٰہ نہیں کہا جاتا۔ معبود بھی اور معبود نہ کہلائے، اِلٰہ بھی ہو اور اِلٰہ نہ ٹھہرے۔ یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے جسے کوئی بے علم اور نادان شخص حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ خود اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیجئے کہ تو اولیاء اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے یا اُنھیں اپنا خدا بنا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش، دیہاتی اَن پڑھ آدمی بھی اس کا انکار کر دے گا۔ اور آپ کا منہ نوچنے اور آپ کو پتھر مارنے کے لئے دوڑے گا۔ اس لئے حسب دستور مولویوں ہی نے اس مشکل کو حل کر دیا اور وہ یہ ہے کہ اولیاء و صالحین کو خدا اور معبود بنانا کیا ضرور، ان کے ساتھ معاملہ تو وہی رکھو جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ مگر انھیں غوث، قطب، دستگیر، گنج بخش، بندہ نواز، مشکل آسان، اولیاء اللہ، اہل اللہ وغیرہ سے اُوپر نہ لے جاؤ۔ ان الفاظ کی تاویل آسان بھی ہے اور اس سے تمہاری مسلمانی پر حرف بھی نہیں آتا ورنہ ذرا تجاوز کر جاؤ تو ہر فقیہ تمہیں مشرک ٹھہرائے گا اور خواہ مخواہ کی پریشانی مول لینی پڑے گی!

ناظرین اندازہ فرمائیں کہ عقائد باطلہ و فاسدہ کی تائید و حمایت کے لئے اگر علماء سوء اس طرح کمربستہ نہ رہتے تو بھلا اسلام میں شرک بیچارا کہاں بار پا سکتا اور مسلمانوں میں اس کے اثرات اتنی کثرت و وسعت کے ساتھ کیوں رونما ہوتے!

یہ تو نمونہ ہے ان علماء کی کاوش کا جو کسی نہ کسی طرح شریعت کے دائرہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ مگر اُن سے کہیں زیادہ نقصان جس طبقے سے پہنچ رہا ہے وہ ایسے جاہل اور جھوٹے صوفیوں کا طبقہ ہے جنہوں نے شریعت اور طریقت کو ایک دُوسرے سے بلکہ متضاد قرار دے لیا ہے۔ ان کے نزدیک ظاہر و باطن کے گوشے ایک دُوسرے سے بالکل الگ ہیں اور دونوں کو چوں

کے قانون بھی جدا جدا ہیں۔ حتیٰ کہ ایک قانون میں جو چیز حلال ہے وہ دوسرے میں بالکل حرام۔ اور ایک میں جو چیز قطعی حرام ہے وہ دوسرے میں بالکل حلال بلکہ فرض اور کارِ ثواب۔ چونکہ یہ طبقہ مسلمانوں ہی میں شامل رہنا چاہتا ہے، اس لئے وہ شریعت کا نام لینے اور قرآن و حدیث کی باتیں کرنے پر بھی مجبور ہے مگر راہِ فرار اتنی کشادہ ہے کہ جب اور جس طرف سے چاہے نکل بھاگے۔ شریعت کی پابندیوں کا ذکر کیجیے تو وہ طریقت میں جا پناہ لے گا۔ مگر طریقت بھی بہرحال ایک قانون ہے اور قانون کی بندش بہرحال اس کے ہوائے نفس پر سخت گراں ہے، اس لئے وہ وہاں سے بھی نکل بھاگے گا اور حقیقت تک جا پہنچے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کا وہی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے اور اس کلمہ سے فرار اسلام ہی سے فرار ہے۔ اس لئے وہ مقامِ حقیقت پر کھڑا ہو کر پکارے گا کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہیں "کچھ نہیں سوائے اللہ کے"۔ جب اس کے سامنے قرآن کھول کر آئیے اور اس کے مزعومہ معنی کی تردید کرنے بیٹھیے تو وہ سینہ اور سفینہ کی بحث چھیڑ دے گا۔ کہے گا کہ یہ اوراق کیا لئے بیٹھے ہو۔ جو کچھ ہمارے لوحِ دل پر نقش ہے اور جو ہم تک سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر پہنچا ہے وہ تو کچھ اور ہی ہے!

اس گروہ کی تحریریں اور تقریریں در اصل ہفوات و ہزلیات کی ایک پوٹ بلکہ ایک بحران زدہ بیمار کے ہذیانات ہیں۔ قبر پرستی اور اولیاء پرستی کے لئے ان لوگوں نے وہ وہ طوفان اٹھائے ہیں کہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا ڈالا۔ وہ قبر پر پیشانی رکھ دیں گے مگر کہیں گے کہ تم اندھے ہو! تم کیا جانو کہ ہم کس کو سجدہ کرتے ہیں۔ در اصل کعبہ سامنے آ گیا تھا اس لئے ہم نے فوراً خدا کے آگے اپنی جبیں رکھ دی۔ وہ عرسوں میں عورتوں کا ناچ دیکھیں گے اور نظارہ بازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" (مجاز حقیقت کا پل ہے) تم کو کیا خبر کہ ہم اس حسن میں کون سے حسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ رات دن سازوں کے مشغلہ میں مگن ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ ان سازوں میں ہم خدا کی آواز سن رہے ہیں۔ وہ شراب تک پی جائیں گے مگر کہیں گے کہ یہ در اصل شرابِ طہور کی یاد ہے، بلکہ خود شرابِ طہور ہے! (جی! کیوں نہیں؟ دوسروں کو تو شرابِ طہور آخرت میں ملے گی مگر ان خدا رسیدہ بزرگوں" کو دنیا ہی میں دی جا چکی ہے) وہ بدکاری تک کر گزریں گے۔ مگر کہیں گے کہ خدا کی مشیت کے بغیر دنیا میں پتہ تک حرکت نہیں کر سکتا!

ظاہر ہے کہ اس طرز کے لوگوں کی بکواس کا جواب کسی ہوشمند انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اس لئے ہم اسے یہیں ختم کیے دیتے ہیں مگر ناظرین سے ضرور عرض کریں گے کہ جب گمراہی کے آنے اور پھیلنے کے اتنے بے شمار راستے ہیں تو آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اگر آپ دیکھیں کہ مسلمانوں میں مشرکانہ اعمال و رسوم کا خوب چرچا ہے اور یہ کہاں سے ہوتا آیا ہے!

—— (۳) ——

ہماری اوپر کی ساری بحث صرف "قبر پرستی" کے رد میں ہے۔ اسی لئے ہم نے اپنے مضمون کا سر عنوان "قبر پرستی" قرار دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم قبور اور اہلِ قبور کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے ہی کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں۔ دوسرے تمام مسئلوں کی طرح شارع نے اس مسئلہ میں بھی واضح حدود مقرر فرمائے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دیں۔ اچھا۔ اب آیئے دربارِ رسالت میں چلیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان کو قبروں اور قبر والوں سے کس قسم کا اور کتنا تعلق رکھنا چاہیئے:۔

فرمایا ہے:۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ!

میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا سو اب قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ چیز دنیا سے
بے رغبت کرتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے!
(مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور بحوالہ ابن ماجہ بروایت ابن مسعودؓ)

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ حضورؐ نے ابتداء میں زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حکمتِ تشریع اسی کی مقتضی تھی ایک کام خواہ وہ بجائے خود صحیح اور مفید ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے ساتھ غلط اعتقادات اور غلط رسوم و رواجات کا جوڑ لگ گیا ہے تو جب تک اعتقادات کی بخوبی اصلاح نہ ہو جائے، اس سے منع کرنا چاہیئے۔ یہ ممنوعیت عارضی ہوتی ہے۔ مگر ضروری بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس روک کے بغیر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں مزید مفسدوں کا شکار نہ ہو جائے اور اگر یہ بات نہ بھی ہو تب بھی فسادِ عقیدہ کے باعث دوسرے طریقوں سے اس کی اصلاح دیر طلب ہو جایا کرتی ہے، چونکہ عہدِ جاہلیت کے عرب قبر پرستی میں مبتلا تھے اس لئے اُن کے عقائد کی مکمل اصلاح تک حضورؐ نے قبروں کے پاس جانے سے انھیں روک دیا۔!

۲۔ جب حضورؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ لوگوں کے ذہن و فکر کی اس حد تک اصلاح ہو چکی ہے جہاں تک انھیں اسلام پہنچانا چاہتا ہے تو پھر آپؐ نے یہ عارضی روک ہٹالی اور فرمایا کہ زیارتِ قبور کیا کرو۔ یہ اجازت بھی ہے اور حکم بھی۔ کیونکہ اس سے دینی فکر کو قوت اور دینی جذبات کو حرکت ملتی ہے لہذا جو چیزیں معینِ مقصد و مفید مقصد ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بازنہ رہنا چاہیئے۔۔۔!

۳۔ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد مسلمان کی اعلیٰ صفات ہیں اور چونکہ زیارتِ قبور ان میں اس کی مددگار ہے اس لئے مسلمان کو اسے اختیار کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیارتِ قبور میں لازماً یہی مقصد پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ جن زیارتوں میں یہ مقصد سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہوتا وہ حدودِ شرع سے صریحاً متجاوز ہیں اور حسبِ مراتب شرک، قریب بہ شرک یا بدعت وغیرہ کی موجب ہیں۔۔۔!

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریمؐ اپنی والدہ صاحبہ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ حضورؐ کی یہ حالت دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کی مغفرت کے لئے دعا کرنے کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرمایا۔ پھر میں نے زیارتِ قبر کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی لہذا تم لوگ قبروں پر جایا کرو کیونکہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ یہ کہ بفحوائے آیت کریمہ:۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

نبی کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ اُن کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہو کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ (سورۂ توبہ رکوع ۱۴)

کسی مشرک کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اگرچہ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ بی بی آمنہ کے لئے شرک کے سوا کسی اور سبب سے دعائے مغفرت کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ مثلاً یہ ان کا انتقال حضورؐ کی بعثت سے پہلے ہو چکا تھا، ان کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت دی جاتی تو عہد جاہلیت میں مرنے والے تمام لوگوں کے لئے اس کی اجازت کا دروازہ کھل جاتا۔ درآنحالیکہ ان تمام لوگوں کے کفر و ایمان کا صحیح فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکوں اور مجہول الحال لوگوں کے لئے خصوصیت کیساتھ نام لے کر دعائے مغفرت کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا!

۲۔ یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھ کر بھی موت کو یاد کر سکتا ہے اور اسے عبرت حاصل ہو سکتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ مدینے کے قبرستان سے گزرے تو فرمایا کہ السلام علیکم یا اھل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر ط

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! زیارتِ قبر کے وقت میں کیا پڑھا کروں، آپؐ نے جواب دیا کہ یہ پڑھا کرو۔ السلام علی اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین و انا انشاء اللہ بکم لاحقون ط۔

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ اقدس لوگوں کو قبرستان میں جاکر پڑھنے کے لئے یہ دعا تعلیم فرمایا کرتے تھے:۔

السلام علیکم اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون نسئل اللہ لنا ولکم العافیہ ط

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زیارتِ قبر کے موقع پر پڑھنے کے لئے ایک خاص دعا خاص الفاظ کے ساتھ خود حضورؐ نے سکھائی ہے اس لئے یہ مسنون ہے اور ہر زائر کو پڑھنی چاہیئے۔ اگرچہ دعا کے الفاظ میں تھوڑی سی ردّ و بدل موجود ہے۔ لیکن سب میں زیارتِ قبر کے مقصد کی اصل روح جاری و ساری ہے اور اس کے پڑھنے سے زیارت کا اصل مقصد بدرجۂ کمال حاصل ہو جاتا ہے!

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ حضورؐ والا جس رات میرے ہاں رہتے، آدھی رات کے وقت جنت البقیع تشریف لے جاتے اور یہ دعا فرمایا کرتے:۔

السلام علیکم دار قوم مومنین واتاکم ما توعدون غدا مؤجلون وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون اللھم اغفر لاھل البقیع ط۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ حضورؐ زیارتِ قبور کی کثرت فرماتے اور کم و بیش ہر ہفتہ قصداً زیارت کے لئے جاتے۔[1]

۲۔ یہ کہ زیارتِ قبور کے لئے رات کا وقت اور خصوصاً وہ وقت جبکہ تمام لوگ سو چکے ہوں اور بستیوں پر سناٹا چھا گیا ہو۔ ایک موزوں ترین وقت ہے۔ کیونکہ اس وقت زیارت کا مقصد بدرجۂ اتم پورا ہوتا ہے اور قلب بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہے!

حضرت محمد ابن نعمانؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ہر جمعہ کو والدین کی زیارت کی، اس کو بخش دیا جائے گا اور

---

[1] یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ حضورؐ کا زیارتِ قبور کیلئے تشریف لے جانا استمداد اور طلب برکت کیلئے ہرگز نہ تھا اور نہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ قبروں پر طلب برکت، اکتسابِ فیض اور استمداد کیلئے جایا کرو۔ حضورؐ کا قبروں پر جانا اہلِ قبور کیلئے دعاء مغفرت کیلئے تھا اور اس لئے بھی کہ "موت" یاد آئے! اور اپنے فانی و ہالک اور اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا یقین پختہ تر ہو بلکہ تازہ ہوتا ہے (ایڈیٹر)

اس کو نیکوں کے زمرہ میں لکھا جائے گا ۔۔۔!

اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

۱۔ آدمی پر اس کے متوفی عزیزوں اور دوستوں کا زیادہ حق ہے کہ وہ ان کی زیارت کیا کرے ۔ خصوصاً وہ لوگ جو تعلقات میں قریب تر رہے ہوں۔

۲۔ زیارت کے لئے کسی دن کو مخصوص کر لینا بُرا نہیں ہے ۔ اس کے لئے جمعہ کا دن اپنی افضلیت کی وجہ سے بہت موزوں ہے!

۳۔ زیارتِ قبر ایک ایسی نیکی ہے جس سے خود زائر کی مغفرت متوقع ہے ۔ کیونکہ بار بار موت کو یاد کرنے سے اس کے اندر دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صفت اُسے بے راہ اور بے عمل نہیں بننے دیتی!

اب ہم زیارت کے لئے چار قسم کے لوگوں کی قبروں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں:۔

۱۔ عوام کی قبریں

اگرچہ زیارتِ قبور کی جو غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اس کی رُو سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم سب کی قبریں یکساں ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ غریبوں اور عام لوگوں کی قبروں کی زیارت کر کے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے وہ دُوسروں کی قبروں سے کم ہی حاصل ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ وہاں بے کسی و بے بسی، خستہ حالی و پریشاں حالی اور فنائیت کی ایک مکمل تصویر بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے ۔ اور آس پاس کوئی ایسی چیز بھی موجود نہیں ہوتی جو خیالات کو مرکوز کرنے اور توجہ کو قائم کرنے میں مانع ہوتی ہو ۔ اور اگر یہ زیارت حضورِ انور کے اپنے عمل کے مطابق رات کے سناٹے میں کی جاتی رہے تو آخرت کی فکر کرنے اور حالات بعد الموت پر توجہ دینے کی اچھی خاصی تربیت بھی ہوتی چلی جاتی ہے!

اگر آپ کو ابھی تک اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے تو ایک مرتبہ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ۔ رات کو سوتے سے اُٹھیئے اور چپکے سے قریب کے کسی قبرستان میں چلے جائیے ۔ آپ کو پہلا خیال یہی آئے گا کہ یہ تو شہرِ خموشاں ہے ہی لیکن زندہ انسانوں کی بستی بھی تھوڑی دیر کے لئے قبرستان ہی بنی ہوئی ہے اور اسی لئے نیند کو موت کی بہن کہا بھی جاتا ہے ۔ مگر یہ گھروں میں سونے والے صبح جاگیں گے اور پھر وہی زندگی کا ہنگامہ جاری ہو جائے گا ۔ جو روزانہ دن میں جاری رہتا ہے ۔ لیکن قبروں کے سونے والے اس لیل و نہار کے ہنگامہ سے گزر چکے ہیں اور اپنی مدتِ حیات ختم کر کے اس طرح ہمیشہ کے لئے سو گئے ہیں کہ بس اُنھیں اسرافیل کا صور ہی جگائے گا ۔

اُس وقت آپ کے ذہن پر موت کی یاد اور آخرت کی فکر کے سوا کوئی اور چیز غالب نہ آ سکے گی ۔ آپ مختلف قبروں کو دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ کچھ تو کچّی ہیں اور کچھ بوسیدہ ۔ بہت سی قبروں کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے[1] اور کتنی قبریں ہیں جو دُوسری قبروں پر بنتی چلی گئی ہیں ۔ کچھ قبریں پختہ بھی ہیں تو اُن میں تزک و احتشام اور شان و اہتمام موجود نہیں ہے ۔ یہ مشاہدہ آپ کے قلب میں بڑی رقّت پیدا کرے گا اور اگر یہاں آپ کے دوست احباب اور اعزاء و اقربا بھی دفن ہیں تو اُن میں سے ایک ایک کی یاد آپ کو تڑپائے گی اور دُنیا سے بیزاری پیدا کرے گی ۔

پھر آپ حضورؐ کی سکھائی ہوئی دعا پڑھیں گے تو یہ محسوس ہوگا کہ گویا آپ دُنیا سے چلنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔

اسی طرح زیارت کی کثرت ہو تو یہ قلبی کیفیات زیادہ سے زیادہ بڑھتی چلی جائیں گی ۔ آپ قبروں کے پاس حضورؐ کی بتائی ہوئی

---

[1] امیر مینائی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں ۔۔۔ پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے!

کے ساتھ دوسری دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر ان میں وہ روح زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیئے جو حضورؐ کے بتائے ہوئے الفاظ میں موجود ہے۔!

۲۔ سلاطین و امراء کی قبریں

سلاطین و امراء کی قبروں کی زیارت بھی کچھ کم مفید نہیں ہے[1] اگرچہ ان لوگوں کی قبریں بہت ہی کم کہیں کچی اور سادہ حالت میں ملتی ہیں۔ ورنہ تقریباً تمامتر قبریں نہایت پختہ ہیں۔ اور ان پر نہایت عالیشان قبے بنے نظر آتے ہیں۔ جن میں فنِ تعمیر کی خوبیاں اور نادرہ کاریاں نمایاں ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین و امراء کی شان و شوکت مرنے کے بعد قائم ہے مگر اس کے باوجود اُن کی دُنیوی شان و شوکت کے مقابلہ میں یہ شان و شوکت بالکل مختلف نظر آتی ہے اور اس لئے دلوں پر اس کا اثر بھی بہت مختلف ہوتا ہے!

مثلاً ایک طرف مقبروں کی عظمت و بلندی آپ کو محوِ حیرت کرے گی مگر دوسری طرف خود صاحبِ قبر کی بے بسی اور خاموشی پر آپ کو حسرت بھی ہوگی، اُن کے مقبروں کی عظمت و شوکت چاہے جیسی کچھ ہو مگر قبر والوں کی عظمت و شوکت تو ختم ہو چکی ہے اور اُن کا نام صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے۔ اب نہ ان کا حکم و اقتدار چلتا ہے نہ کوئی اپنے کو اُن کی رعایا تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ نہ اُن کی دربارداریاں ہیں نہ عیش کوشیاں۔ اگر وہ نیک اور عادل تھے تو اُن کی یہی صفت اس بات کے لئے کافی ہے کہ ان کا نام ادب سے لیا جائے۔ اور دل میں اُن کی عزت و محبت پیدا ہو اور اگر وہ فاسق اور ظالم تھے تو خواہ اُن کے مقبرے کتنے ہی عالیشان ہوں اُن کو کوئی شخص اچھے الفاظ میں یاد نہیں کر سکتا۔

بادشاہوں اور امیروں کے مزارات پر پہلا خیال اُن کے دُنیوی ٹھاٹھ باٹ ہی کا آتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر دُنیا کے متاعِ غرور ہونے کا کتنا شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ آج ان کے مزاروں پر کہیں کوئی حاجب و دربان نہیں پایا جاتا جو زائرین کو ادب قاعدے سکھاتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ لاہور میں جہانگیر کے مقبرہ پر حاضر ہوں تو کیا آپ کو اس کا خیال نہ آئے گا کہ دُنیوی جاہ و جلال کے زمانہ میں اس کے ہاں ادب قاعدہ کی انتہا یہ تھی کہ حاضرین کو اس کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی آدمی پر مصیبت کے پہاڑ لا گراتی تھی۔

یہی جہانگیر تھا جس نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجدد و مصلح بزرگ کو اپنے ہاں طلب کیا تھا اور انہوں نے اپنے عقیدہ کی رُو سے اسے سجدہ نہ کیا تھا تو اُن پر برقِ غضب چمک گئی تھی۔ اور اُن جیسا گوشہ نشین فقیر دیکھتے دیکھتے جیل کی چاردیواری میں پہنچا دیا گیا تھا۔

آج یہی زبردستی کے مسجود ہیں کہ زمین بوس اور خاموش ہیں۔ اور انھیں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کا دربار کہاں ہے اور آپ کس حال میں ہیں؟

---

[1] سلاطین و امراء کی قبروں پر اس نیت سے جانا کہ ان کے لئے دُعائے مغفرت کی جائے اور ان کی قبروں کو دیکھ کر دُنیا کی بے ثباتی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یقیناً فائدہ سے خالی نہیں۔ مگر امیروں اور بادشاہوں کی قبروں پر جو اُونچے گنبد، شاندار قبے اور دیدہ زیب مجر تعمیر کئے گئے ہیں، انھیں دیکھ کر زائر کو موت شاذ و نادر ہی یاد آتی ہے، وہ تو گنبد کی شان و شوکت، دیواروں کی مینا کاری اور تابوت کے نقش و نگار ہی میں کھو کر رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تاج محل اور جہانگیر کے مقبرہ پر جا کر لوگ "پک نک" مناتے ہیں اور بجائے اس کے کہ موت کی یاد تازہ ہو اور دُنیا کی خرافات سے بے رغبتی پیدا ہو، دُنیا کی تفریحات کے جمگھٹ وہاں

آپ آگرہ تشریف لے جائیں اور شاہجہاں کی قبر پر جانا ہو تو تاج محل کی خوبی و خوبصورتی کو دیکھ کر آپ چاہے جتنی حیرت اور مسرت کا اظہار کریں مگر خاک میں سونے والے کے لئے تو بہرحال حسرت کے چار آنسو ہی بہا سکیں گے۔ آپ کو ہی یہ خیال آئے گا کہ شاہجہاں نے اپنی بیوی کی محبت میں چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرکے دُنیا کی ایک بے نظیر عمارت ہی کیوں نہ بنادی ہو اور خود بھی اپنی بیوی کے پہلو میں کیوں نہ سو رہا ہو۔ مگر دُنیا کے حجلۂ عیش سے اس کو آخر کیا اور کس قسم کی مناسبت ہو سکتی ہے؟ کیا اس وقت آپ کی دیدۂ عبرت سے دو آنسو بھی نہ ٹپک سکیں گے؟

اگر آپ خلد آباد (ضلع اورنگ آباد دکن) میں حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر جائیں تو شاید سب سے زیادہ سبق آپ یہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو دُنیا میں کچھ نہ ملا ہو۔ اگر وہ فقیر و درویش بن کر رہیں تو یہ بڑا کمال نہیں ہے۔ مگر جن کو دُنیا کی ہر چھوٹی بڑی نعمت ملی ہوئی ہو اور دُنیا کے سارے فوائد و لذائذ اُن کے قدموں میں لوٹ رہے ہوں۔ مگر وہ اُن سے بے رغبت ہوں اور فکرِ آخرت انھیں فقر کی دولت سے نوازدے تو وہ بڑے صاحب کمال ہیں ؎

باده ها خوردن و ہشیار نشستن سہل است

گر بدولت برسی مست نگردی مردی!

حضرت موصوف کے مزار پر اُن کی پاکیزہ زندگی کے اوراق آپ کے ذہن میں تیزی سے پلٹتے چلے جائیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ جس شخص کو اکبر و جہانگیر کی سلطنت سے بھی کہیں زیادہ وسیع اور بڑی سلطنت ملی ہوئی تھی (اور جس کے سامنے اس کے آباؤ اجداد کے خدائی ٹھاٹھ باٹ کے نمونے بھی موجود تھے) وہ عمر بھر فقر کے نشہ میں ایسا سرشار رہا کہ "فقر او از تربتش پیدا ستے" اُس نے یہ بھی نہ چاہا کہ اس کی قبر کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے[1]

اگر آپ رنگون جائیں اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جانا ہو جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی قبر کا صحیح نشان تک موجود نہیں ہے۔ اُس وقت اگر آپ ذوق مرحوم اور دوسرے شعراء کے اُن قصیدوں کو ذہن میں رکھ لیں جو اُس کی شان میں کہے گئے ہیں اور خود اس کے دلّی سے نکل کر رنگون پہنچنے اور مرنے تک کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ یاد کرلیں تو دُنیا کی بے ثباتی کا ہی نہیں، دوسرے متعدد سبق آپ حاصل کر سکتے ہیں[2]

علامہ اقبال جب کابل میں بابر کے مزار پر گئے تو فرمایا ؎

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید ایں جا   کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است!

---

[1] ۱۳۴۱ھ میں عثمان علی خاں سابق فرمانروائے دکن نے عالمگیر کے مزار کو سنگِ مرمر سے پختہ کروا دیا ہے، مگر قبر کا درمیانی حصہ کھلا چھوڑا گیا ہے اور قبر بھی اُونچی نہیں بنائی گئی۔ قبر کی چار دیواری اتنی مختصر اور محدود ہے کہ پانچ سات آدمی ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اور اس چار دیواری پر چھت بھی نہیں ہے!

[2] ظفر نے کہا تھا۔   شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو   ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے!

اتفاق دیکھیے کہ اس کی موت بھی اسی کی پسند کے مطابق واقع ہوئی۔ دلّی میں تو سات پشت خاندان زیرِ زمین آباد ہے۔ کابل میں بابر، سکندرہ میں اکبر، لاہور میں جہانگیر۔ آگرہ میں شاہجہاں، دکن میں عالمگیر، یہ غریب مرا تو کہاں؟ رنگون میں۔ جلّ شانہ وعلا جلالہٗ!

چونکہ بابر ہندوستان پر چڑھائی کرنے کے باوجود ہندوستان میں نہیں مرا اور اس وقت ہندوستان "طلسم فرنگ" میں گرفتار اور افغانستان آزاد تھا۔ اس لئے معاً انھیں بابر کی خوش نصیبی کا خیال آگیا۔ مگر یہ ایک ضمنی بات تھی اور بادشاہت کے تصور سے فقر کا تصور پیدا ہونا لازمی تھا۔ اور خود علامہ اقبال فقیر اور فقر دوست تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ذات کی نسبت فرمایا:۔

درونِ دیدہ نگہ دارم اشکِ خونیں را ۔۔۔ کہ من فقیرم و ایں دولت خداداد است!

سلطان محمود غزنوی کے مزار پر گئے تو سلطان کا ذکر ان الفاظ میں کیا:۔

برقِ سوزاں تیغِ بے زنہارِ او ۔۔۔ دشت و در لرزندہ از یلغارِ او
زیرِ گردوں آیت اللہ را یتش ۔۔۔ قدسیاں قرآں سرا بر تربتش

پھر اپنے ذاتی تاثرات ان الفاظ میں بیان فرمائے:۔

شوخیٔ فکرم مرا از من ربود ۔۔۔ تا نبودم در جہانِ دیر و زود
رخ نمود از سینہ ام آں آفتاب ۔۔۔ پرد گیہا از فروغش بے حجاب
مہر گردوں از جلالش در رکوع ۔۔۔ از شعاعش دوش می گردد طلوع!
وا رہیدم از جہانِ چشم و گوش ۔۔۔ فاش چوں امروز دیدم صبح دوش

پھر شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قصرہائے او قطار اندر قطار ۔۔۔ آسماں با قبہ ہائش ہمکنار
نکتہ سنجِ طوس را دیدم بہ بزم ۔۔۔ لشکرِ محمود را دیدم بہ رزم
روح سیرِ عالمِ اسرار کرد ۔۔۔ تا مرا شوریدۂ بیدار کرد

یعنی غزنی کے قطار در قطار قصروں اور آسمان سے ہمکنار ہونے والے قبوں کو دیکھنے کے باوجود اُن کی نظر انہی چیزوں میں اٹک کر نہیں رہ گئی بلکہ اُن کی چشمِ تصور نے فردوسی کو بزم میں اور محمود کو رزم میں بھی دیکھا اور روح نے عالمِ اسرار کی ایسی سیر کی کہ انھیں بیدار کر دیا۔ پھر غزنی کے ویرانے میں پہنچے تو پہلے "مکرِ ایام" سے پناہ مانگی اور پھر خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

مردِ حق آں بندۂ روشن نفس ۔۔۔ نائبِ تو در جہاں او بود و بس
او بہ بند نقرہ و فرزند و زن ۔۔۔ گر توانی سومنات او شکن
ایں مسلماں از پرستارانِ کیست؟ ۔۔۔ در گریبانش یکے ہنگامہ نیست!
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش ۔۔۔ او سرافیل است و صورِ او خموش!

احمد شاہ ابدالی کی قبر پر گئے تو فرمایا:۔

ملتے را داد ذوقِ جستجو ۔۔۔ قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او
از دل و دست گہر ریزے کہ داشت ۔۔۔ سلطنت ہا برد و بے پروا گزاشت

سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو شہید کے مقبرہ پر تشریف لے گئے تو شہادت کے تصور کو تازہ کیا اور دوسروں کے اندر بھی اس کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لئے رود کاویری کے نام سلطان شہید کا ایک پیغام نظم کیا۔ جس میں حیات، موت اور شہادت کی حقیقت سمجھائی۔ یہ نظم طویل ہے اور پوری کی پوری پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے (ملاحظہ کیجئے جاوید نامہ، آں سوئے افلاک) اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

سینہ داری اگر در خوردِ تیر | در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر!
زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات | از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟ | یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش
بندۂ آزاد را شانے دگر | مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست! | مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد | زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد!
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک | آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک!
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر | مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر!
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است | جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است!
آنکہ حرفِ[1] شوق با اقوام گفت | جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

غرض بے شمار مزاروں پر بے شمار کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اور آپ ان سب سے سبق لے کر وہی کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ کی زندگی ایک مسافرانہ زندگی بن کر رہے اور دُنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے دل نہ لگے!

۲۔ علماء و صلحا کی قبریں علماء و صلحاء دراصل قوم کے رہنما ہوتے ہیں اور انہی کی علمی و دینی خدمات سے دنیا میں اسلام کا چراغ روشن رہا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہیگا۔ ان کی قبروں کی زیارت تذکرِ آخرت اور تصورِ موت کے ساتھ یہ سبق بھی دیتی ہے کہ آدمی کو آخرت کا سامان کرنے کے لئے اس دُنیا میں کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ اور سلفِ صالحین نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نمونہ چھوڑا ہے۔ اگر وہ نامعلوم الاسم ہوں تو اجمالی سبق بہر حال حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُن کے نام معلوم ہوں اور نام کے ساتھ ساتھ اُن کے کام سے بھی آدمی کو ضروری واقفیت حاصل ہو تو یہ بہت زیادہ مفید[2] ہے۔ اور اگر زائر کو ان کے ساتھ اعتقادی اخلاقی اور روحانی نسبت بھی حاصل ہے تو اس نسبت میں جتنی زیادہ مضبوطی اور گہرائی ہوگی اُتنا ہی زیادہ یہ زیارتیں زائر کو متاثر کریں گی۔ علامہ اقبال کو حکیم سنائی غزنوی سے گہری عقیدت تھی کیونکہ علامہ اقبال مولانا روم کو اپنا پیر سمجھتے تھے۔ اور حکیم صاحب موصوف خود مولانا کے اکابر میں سے تھے جن کا ذکر مولانا نے اپنی مثنوی میں ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علاوہ ازیں

---

[1] پہلے مصرعہ میں حضور سرورِ کائنات مراد ہیں اور دُوسرے مصرعہ میں حدیث **الجہاد رہبانیۃ الاسلام** کی طرف اشارہ ہے!

[2] فاضل مقالہ نگار کی رائے صائب ہے اور قرینِ حق و صواب ہے۔ مدیرِ "فاران" کو اس سلسلہ میں صرف ایک ضروری بات کی طرف متوجہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کہ آجکل اولیاء اور صلحاء کی قبروں پر عام طور پر لوگ نذر و نیاز گزارنے اور استمداد کی نیت ہی سے حاضر ہوتے ہیں۔ عرس کے علاوہ بعض قبروں پر دن رات میلہ سا لگا رہتا ہے، ان حالات میں جناب شیخ احمد صاحب جیسے صحیح عقیدے کے لوگ قبروں پر جاتے ہیں تو انھیں وہاں "حاضر" (؟) دیکھ کر اہلِ بدعت یہی سمجھتے ہیں کہ جن معتقدات اور مُرادوں کو لے کر ہم "مزارِ اقدس" پر آئے ہیں اسی کام کے لئے یہ صاحب بھی گئے ہیں۔ ان ولیوں اولیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت اگر اس "فتنہ" میں اضافہ کر رہی ہو، تو کیا کیا جائے! انھم فتنۃ بر! (ایڈیٹر)

علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی کتابوں کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے جب انھیں ۱۹۳۲ء میں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کا موقع ملا تو وہ مزار کے پاس جاتے ہی بے اختیار ہو گئے اور سرہانے کھڑے ہو کر دیر تک زور زور سے روتے رہے۔ خود علامہ[1] نے اپنی مثنوی "مسافر" میں اس روحانی نسبت کو خوبی سے نظم کیا ہے۔ شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی | از نوائے او دلِ مرداں قوی
آں حکیمِ غیب، آں صاحب مقام | تُرک جوشِ رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا، او ز پنہاں، در سرور | ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود | فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق | او ز حق گوید، من از مردانِ حق

در فضائے مرقدِ او سوختم
تا متاعِ نالۂ اندوختم

جہاں تک اسفارِ زیارت کا تعلق ہے، آپ زیارت ہی کے لئے بالقصد سفر نہ کریں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیر و سیاحت یا اپنی دیگر ضروریات سے آدمی جہاں جہاں جا سکے وہاں چاہے تو قبروں پر بھی کبھی ہو آئے یا کبھی کبھار قرب و جوار میں چلا جائے۔ جہاں التزام و اہتمام، یا وقت و دولت کا بڑا صرف موجود ہو وہاں چاہے ابتداءً مقصد صحیح اور نیت نیک ہی رہے مگر اس میں اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ کہیں فسادِ عقیدہ یا فسادِ عمل میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے ایک محتاط و متقی انسان کو احتیاط و تقویٰ ہی کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اور شدِّ رحال والی حدیث کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ——!

مزاروں کے پاس آپ دعائے مسنونہ کے ساتھ کوئی اور دعا خدا سے مانگ سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت تاثر کے باعث قبولیت دُعا کا زیادہ امکان ہوتا ہے مگر صاحب مزار سے یہ نہ کہیئے کہ آپ میرے لئے خدا سے دُعا مانگیں۔ اگرچہ بعض علماء کرام نے اس فعل کو حدِ جواز میں لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے اس میں سخت کلام ہے اور میں ان علماء کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جنھوں نے اس فعل کو "بدعت" قرار دیا ہے[2] کیونکہ اوّل تو اموات پر سلام بھیجنے کی اجازت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ ہر قسم کی آوازوں اور دعاؤں کو سنتے بھی ہیں۔ اور اگر سنتے بھی ہیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مطابق انھیں کچھ کرنے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ عالم برزخ

[1] علامہ اقبال مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ دین کی بلاشبہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اور وہ عقائد کے اعتبار سے بھی بہت صحیح الایمان تھے۔ مگر اُن کے ہر قول و فعل کو فقیہ یا محدث کے قول و فعل کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال نے اپنے کلام میں موضوع حدیثوں تک کو نظم کر دیا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے۔ ؎

مسیح و خضر سے اُونچا مقام ہے تیرا!

حالانکہ کوئی ولی کسی نبی سے بلند نہیں ہو سکتا۔ یہ اقبال کے "مزلات" میں (ان پر نگاہ رہنی چاہیئے۔ (ایڈیٹر)

[2] علامہ آلوسی بغدادی، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہم اللہ اور بہت سے علماء سلف و خلف کی یہی رائے ہے!

ہمارے لئے غیب کا حکم رکھتا ہے اور ہم وہیں تک جا سکتے ہیں جہاں تک حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس کے آگے استنباط و اجتہاد یا استنتاج و استدلال سے کسی چیز کا تعین ہمارے علم و یقین کے دائرہ سے باہر ہے پس جبکہ حضورؐ سے اس کی اجازت منقول نہیں ہے اور نہ صحابہ، تابعین اور ائمہ اسلام نے کبھی ایسا کیا تو ہمیں بھی اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ معاملہ بہرحال مشتبہ ہے اور بندۂ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو ہر قسم کے اشتباہات سے پاک رکھے، دوسرے یہ کہ اموات قبر کے عذاب و ثواب سے دوچار ہیں۔ اگرچہ ہمیں ہر ولی و صالح کے ساتھ بلکہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ساتھ بھی حسن ظن رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اُن کے کاموں اور حالات کو پیش نظر رکھیں تب بھی ہم ظنِ غالب سے آگے نہیں جا سکتے یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کہ ان کی صالحیت و ولایت کیا درجہ و مقام رکھتی ہے، کیونکہ وہی نیتوں کا جاننے والا اور غیب و شہادت کا عالم ہے!

حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت سعدؓ بن معاذ کی تدفین عمل میں آئی تو حضورؐ نے تسبیح و تکبیر کہی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس نیک بندے پر قبر تنگ ہوگئی تھی۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کشادہ فرمادی۔ انہی سعد بن معاذ کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ان کی وفات پر عرش حرکت میں آگیا تھا۔ اُن کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور اُن کے جنازے میں ستّر ہزار فرشتے شریک تھے۔ مگر اُن کی قبر پہلے تو تنگ ہوگئی، اس کے بعد کشادہ کردی گئی!

اس سے اندازہ فرمایئے کہ کون یہ جان سکتا ہے کہ کون کس حال میں اپنی قبر کے اندر پڑا ہے۔ ہمیں بلاشک اولیاء و صالحین سے حُسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ مگر بہرحال ہر ایک کی صحیح حالت صرف خدائے علیم و خبیر ہی کے علم میں ہے اس لئے ہمیں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے!

اگر آپ اولیاء و صالحین کی ذات کو وسیلہ بناتے ہوئے خدا سے دعا کریں تو اس کے جواز و عدم جواز میں بھی اختلاف ہے اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے، دونوں گروہوں کے دلائل میں خاصہ وزن پایا جاتا ہے، اس لئے صحیح مسلک یہ ہے کہ کبھی کبھار ایسا کرلیا جائے تو ناجائز نہیں ہے۔ مگر اس کا التزام نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بغیر توسّل کے خدا کسی کی دعا سنتا ہی نہیں اور یہ خیال بالبداہت غلط ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ!

اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں!

مزارات کے پاس خواہ وہ عوام کے ہوں یا سلاطین و امراء کے یا اولیاء و صالحین کے، تلاوتِ قرآن کرنا میرے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ چاہے صرف حصولِ ثواب کی خاطر کی جائے یا صاحبِ مزار کے ایصالِ ثواب کے لئے۔ مگر تلاوتِ قرآن یا کسی بدنی عبادت کے ایصالِ ثواب میں ائمہ اسلام کا اختلاف ہے۔ امام اعظم اور امام احمد بن حنبل اسے درست بتاتے ہیں اور امام مالک و امام شافعی نادرست! تاہم نفس تلاوتِ قرآن خود ایک ایسا فعل ہے جو نزولِ رحمت کا موجب ہے۔ اس لئے خواہ کوئی شخص قصداً ایصالِ ثواب نہ کرے مگر اہلِ قبور اللہ کی رحمت سے محروم نہیں رہ سکتے!

۴۔ غیر مسلموں کی قبریں

اگر غیر مسلموں کی قبریں دیکھنے کا اتفاق ہو تو وہ دعا نہ پڑھی جائے جو مسلمانوں کے قبرستان میں پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ سلام و دعا کا یہ طریقہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہاں صرف

اپنی موت کو یاد کرے اور آخرت کی طرف دھیان دینے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر اکتفا کرے۔ اور اگر غیر مسلموں کی زندگیوں میں کوئی عبرت کا پہلو موجود ہے، تو اس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے! علامہ اقبال نے نپولین کی قبر پر ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز	جوشِ کردار سے کھُل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع	کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر	سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر	جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس	عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"

ایک غیر مُسلم کی قبر دیکھنے سے ایک بندۂ مومن کے سینہ میں جو جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں، اس نظم میں علامہ نے اُن کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اور غیر مُسلم سبھی یہاں "جوشِ کردار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر مردانِ خدا کا "جوشِ کردار" ایک دُوسری ہی چیز ہے کہ میدانِ جنگ میں اُن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے۔ اس لئے جوشِ کردار رکھنے والوں کو اپنے عمل کی راہ سوچ لینی چاہیئے۔ اور جلد سرگرمِ عمل ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ "فرصتِ کردار" تھوڑی ہے اور قبر کی رات لمبی۔ مُسلم و غیر مُسلم سب کی آخری منزل تو وہی "وادیٔ خموشاں" ہے، جس کی طرف سب گئے ہیں اور روز چلے جا رہے ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

(فاضل مضمون نگار کے اس گرانقدر مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قبروں پر عُرس وغیرہ کے نام سے جو کچھ ان دنوں ہو رہا ہے، اُن میں سے بعض چیزیں تو "شرک" کی تعریف میں داخل ہیں اور بعض خطرناک قسم کی بدعات ہیں۔ مسلمانوں کو ان سب سے قطعاً اجتناب کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ کسب فیض و برکت کے لئے!)

(م۔ق)

اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کیلئے نذر و نیاز

نذر لغیر اللہ

مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر ہمارے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے، وہ "نذر لغیر اللہ" ہے۔ مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، اُن کے لئے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح اُن کی تعظیم و تکریم کرتے تھے:۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (پ۸ ع ۳)

"اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کئے ہیں، ان لوگوں نے اُن میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا"۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ (پ۱۴ ع ۱۲)

یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ قسم ہے خدا کی تم سے تمہاری اس افترا پردازیوں کی ضرور باز پرس ہوگی!

حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ کفار اپنی کھیتی اور مواشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے، جنہیں وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ اُن کے اس ظلم اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرماتے ہیں!

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہوگیا ہے کہ ہمیں یہاں اس کی تحقیق ضرور نظر آتی ہے۔ ہر زمانے کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے۔ وہ وہی بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو اُن سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کہی تھی اور اُس پر عمل کیا تھا۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (پ۱ ع ۱۴)

نذر و نیاز لغت میں وعدہ کرنا ہے، نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کرلینا ہے، جو لازم نہیں تھی،

نذرت نذرًا اذا اوجبت علی نفسک شیئًا تبرعًا من عبادت او صدقۃ او غیر ذلک (نہایہ)

تمام فقہا نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے، چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی اور سوا ان کے دوسرے علمائے شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ (پ ۳ ع ۵)

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے!

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ "او نذرتم، النذر عقد الضمیر علی شیٔ والتزامہ" یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے!

جب نذر عبادت[1] ہوئی تو غیر اللہ کے لئے اس عبادت کا بجا لانا شرعاً صریح شرک ہے، عوام الناس بزرگوں کی جو نذر دیا کرتے ہیں، وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں۔ یا تو کسی مقصد کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے، یا پھر کسی بلا کا ٹالنا۔ گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں۔ اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذ بھی روا نہیں کہ وہ ذاتِ مقدس بھی اخذ رشوت سے پاک ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

لا تنذر وا فان النذر لا یغنی من القدر شیئاً و انما یستخرج بہ من البخیل (متفق علیہ)

یعنی نذر نہ مانو اس لئے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی۔ اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔

طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے، جس کا ماننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پلتے ہیں"

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں، اُن سے پوچھنا چاہیئے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصالِ ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے۔ غور کرو، تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیئے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیئے۔ اس کو چھوڑ کر تمہیں دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامنگیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم انھیں ثواب پہنچاؤ۔ اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا۔ پیروں اور شہیدوں کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو۔ ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو۔ کیا تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور عافیت سے رہیں گے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا۔ زمانے کے لگد کوب سے نجات ملے گی۔ اگر تم اس غرض سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیرؒ کی گیارھویں یا کنڈہ، بری دستر خوان یا سرمنی) تو مشرکین کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو۔ ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو۔ اور یہ کھلا شرک ہے، اس کی تشریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شارح درر کے اس بیان پر غور کرو:۔

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلاں لیغنی بہ و بیاً او نبیاً ان رد غائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذھب والفضۃ او الطعام والشراب

---

[1] مقابلہ کرو شامی جلد ۲ ص ۱۳۹۔ والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق!

او الزیت کذا فهذا باطل بالاجماع لانه نذر مخلوق وهو لا یجوز، لان النذر عبادة والعبادة لا یکون لمخلوق والمنذور له میت والمیت لایملک وانه ان ظن ان المیت یتصرف فی الامر کفر الا ان قال یا الله انی نذرت لک ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بباب السیدۃ النفیسة او الامام الشافعی ونحوه فیجوز حیث یکون فیه نفعاً للفقراء والنذر الله !

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی کو مخاطب کر کے) اگر میرا غائب واپس آجائے، یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت بر آئے تو آپ کے لئے اتنا سونا یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کروں گا۔ سو یہ باطل ہے بالاجماع۔ اس لئے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں۔ جس کے لئے نذر مانی ہو وہ میّت ہے اور میّت کسی چیز کی مالک نہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میّت کو کاموں میں اختیار حاصل ہو تو وہ کافر ہو جائے، ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ! میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سیدہ نفیسہ[1] فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا، یا امام شافعیؒ کے دروازہ والوں کو کھانا دوں گا" تو یہ جائز ہے کیوں کہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی"

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں:۔

۱۔ عوام کالانعام جو نذر اپنے پیروں، بزرگوں کی حاجت برآری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجماع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ۔

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں، اس لئے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے لئے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں۔ مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکا دے رہے ہیں، انھیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے۔ بلکہ انھیں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی ولی یا نبی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی ـــــ کیونکہ لاوفاء لنذر فی معصیۃ۔ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں، اور ظاہر ہے کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عباداتت ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ:۔

من نذر ان یطیع الله فلیطعه ومن نذر ان یعصیه فلا یعصه !

" جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیئے کہ اطاعت کر کے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے "

(قرآن اور تعمیر سیرت، از ڈاکٹر میر ولی الدین)

---

[1] یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے!

ا ح ۱ مگر یہ سیدہ نفیسہ اور شافعیؒ کے دروازے کے فقیر کیا چیز ہیں؟ قبروں اور آستانوں کے دروازوں پر فقراء کا جمع ہونا ہی غضب ہے۔ (م-ق)

مولانا عبدالحمید ارشد

اَللّٰہُ وَاحِدٌ لَا شَرِیْکَ لَہٗ!

اسلام کیوں آیا؟

دنیا عقیدۂ "توحید الٰہ" سے بیگانہ ہو کر، بدکرداری اور بداخلاقی کی عمیق ذلت و پستی میں جا گری تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے بر وقت دستگیری فرمائی، اسلام آیا تاکہ پھر سے اس سچے عقیدے توحید الٰہ کی بنیاد پر اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کی تعمیر مکمل کرے۔ دنیا دو فریقوں میں بٹ گئی۔ اسلام ماننے والے اور نہ ماننے والے۔ نہ ماننے والوں نے اس بنا پر نہیں مانا کہ آبائی تقلید اور شیوخِ ضلال کی پیروی میں اس بُری طرح سے مُبتلا تھے کہ عقل و ہوش کے جملہ تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے خود ساختہ معبودوں کی غلامی کی نجاستوں کے وہ اس حد تک خوگر ہو گئے تھے کہ "توحید الٰہ" کے بے نظیر شرف و فضیلت کو نہ پا سکے۔ اور ماننے والوں نے اسلام کو اس بنا پر مانا کہ فی الحقیقت کفر و شرک انسانیت کے لئے ایک شرمناک ذلت ہے۔ اور عقیدۂ توحید الٰہ جلّ شانہٗ سب سے بڑی صداقت ہے جو انسان کی سعادت و نجات کی ضامن ہے!

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اسی عقیدۂ وحدانیت الٰہ پر قائم رہ کر اپنی سیرت و کردار کو اسی کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے اخلاق و اعمال کا بلند نمونہ پیش کریں۔ اور اسلام کے نظامِ حق کو دنیا میں غالب و برتر رکھنے کے لئے اپنے جملہ امکانی وسائل و مساعی کو بروئے کار لائیں۔ مخلصوں نے اپنے اپنے وقت میں اس فریضہ کو بوجہ احسن انجام دیا۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔ لیکن نہایت تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ برائے نام ماننے والوں کا ایک گروہ اٹھا اور اس نے اسلام کے بنیادی عقیدہ "توحید الٰہ" پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ اور اپنے آباء و شیوخ کی قبروں کی پرستش شروع کر دی، اور بدعات و رسومات کا شکار ہو گئی۔ اور مخلوق کی پوجا میں لگ گئی۔ ایک دوسرے گروہ نے اسلام کے "نظامِ عدل و انصاف" کی وفاداری میں تذبذب کا ثبوت دیا۔ اور عملی اسلام سے روگرداں ہو گئے۔

اس مضمون میں پھر سے سب دنیا والوں کو اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (ایک اللہ کی بندگی کرو۔ کیونکہ، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ — لائق پرستش و بندگی — ہے نہیں) کی مومنانہ دعوت عقل و برہان اور دلیل سے دی گئی ہے۔ کوئی ہے جو اس پر غور کرے!! اللہ ہدایت دے، آمین!!

اللہ ایک ذو واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں

ارشادِ ربانی ہے :-

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝

دلوگو!، تم سب کا معبودِ برحق، حاجت روا اور کارساز، حاکم و بادشاہِ حقیقی ایک اللہ،
اللہ، فقط اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی بھی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ بڑا مہربان بے حد رحم
فرمانے والا ہے! (سورۂ بقرہ آیت ۱۶۳)

"اِلٰہ" کا لفظ الوہیت و خدائی کے تمام صفاتِ کاملہ کو شامل و حاوی ہے۔ "اِلٰہ برحق" صرف وہی ہوگا جو اقتدار و اختیار کے بلند ترین درجہ پر فائز ہوگا۔ اور تخلیق و تکوین کی بے مثال طاقت و قوت کا سرچشمہ اور مصدرِ فیوض و برکات اور سرچشمۂ کمالات و فضائل اور جامع محاسن ہوگا اور جملہ عیوب، قبائح اور رذائل سے مبرّا اور منزّہ ہوگا۔ وہ ہر حال میں جملہ مخلوقات کی حالت سے باخبر اور اُن کے دُکھ درد اور راحت و آرام اور اُن کی ضرورتوں اور حاجتوں سے واقف اور اُن کے پورا کرنے پر قادر ہوگا اور ان کمالاتِ علمی و عملی (فعلی) کے باعث استحقاقِ عبادت و بندگی اور طاعت و فرمانبرداری اور اہلیتِ فرمانروائی و شہنشاہی بھی رکھتا ہوگا۔ سو ہم ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ ایسی ذاتِ برتر بجز اللہ رحمٰن و رحیم کے اور کوئی نہیں۔ وہی اکیلا ان صفاتِ کاملہ اور کمالاتِ فاضلہ سے متصف ہے اور جملہ عیوب و نقائص سے مبرّا اور تمام فضائل و محاسن کا جامع ہے!

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ
سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى ، سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى

اللہ ایک ہے عقلِ صحیح اور شرعِ الٰہی اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ذات و صفات اور افعالِ الٰہیہ میں ایک ہے، بے مثل و بے مثال اور بے چون و بے چگوں، نرالا اور واحد و لاشریک لہٗ۔ یگانہ و یکتا اور سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ نہ ذات میں اُس جیسا کوئی دُوسرا ہے نہ صفتوں میں اس کا کوئی ہمسر اور مماثل اور نہ اپنے خدائی کاموں میں کوئی اس کا معاون و شریک ہے۔ لہٰذا استحقاقِ عبادت و بندگی میں بھی وہ یکہ و تنہا مستحقِ عبادت و پرستش اور پرستارانہ تعظیم و اجلال کا حقدار ہے! فرمانروائی اور شہنشاہی اور کارسازی و حاجت روائی اور بندہ پروری اُسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان الٰہی خصوصیات میں کسی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ فرشتہ، نبی یا ولی کو بھی ادنیٰ شائبۂ اشتراک نہیں ہے۔ ذرّہ ذرّہ اس کی وحدانیت و صمدیت پر گواہ اور اس کے تفرّد و یگانگت پر شاہد عدل ہے۔ ہم بھی اس سچی گواہی میں باقی فرمانبردار مخلوق کے ساتھ پُوری ایمانداری اور یقین و طمانیت کے ساتھ شامل ہیں اور ڈنکے کی چوٹ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا اعلانِ حق کرتے ہوئے پُوری خوشی اور شادمانی محسوس کرتے ہیں۔ اور جس رسُولِ برحق کے ذریعہ ہمیں یہ بے بہا دولت ــــ دولتِ توحید نصیب ہوئی ہے، اُس کی رسالت و نبوت کا اقرار بھی پُوری شرحِ صدر اور کمال فرح و انبساط کے ساتھ کرتے ہوئے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کی شہادتِ حقہ کا واضح اعلان کرتے ہیں ـــ!

اسلام جس کی بدولت یہ دونوں صداقتیں، یہ بیش بہا نعمتیں ــــ نعمتِ توحید و رسالت ہمارے حصہ میں آئی ہیں واقعی اللہ تعالیٰ کا واحد و تنہا دینِ حق ہے اور اس قابل ہے کہ وہی دُنیا بھر میں سربلند و سرفراز رہے۔ ہمیں

اُس کی سربلندی اور برتری کے لئے ہر امکانی جد وجہد کے لئے ہر وقت تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید ہمارے شاملِ حال رہے اور ہم دنیا و آخرت کی کامیابیوں اور سعادت مندیوں سے سرفراز و کامگار رہوں:۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

اے ہمارے پروردگار! صبر و ثبات سے ہمیں مالا مال کر دے، اور ہمارے قدم (دینِ حق پر اور محاربۂ اعدائے اسلام کے وقت) جمادے اور ہمیں قومِ منکرینِ حق پر فتحیاب فرما! (آمین)

(سورۂ بقر۔ آیت ۲۵۰)

سب سے بڑی صداقت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ وہ سب سے بڑی صداقت ہے جو تمام صداقتوں، نیکیوں اور سعادت مندیوں کا واحد سرچشمہ اور منبع خیر و برکت اور مصدر فیوض و انعاماتِ الٰہیہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے سچے متبعین، صدیقین، شہداء، صالحین، اولیاء، اصفیاء، علماء، فقہاء، عباد اور زہاد نے جو کچھ پایا ہے اسی سچی توحید کی بدولت پایا ہے۔ اور کفار و منکرین، منافقین، ملحدین اور اہلِ بدعت جو حقیقی خیر و برکت سے محروم ہیں، وہ بھی اسی وجہ سے کہ حقیقی اور مخلصانہ عقیدۂ توحیدِ الٰہ جلّ شانہٗ سے خالی اور اس سعادتِ کبریٰ سے تہی دامن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور جملہ اہلِ ایمان کو اس صداقتِ کبریٰ اور نعمتِ عظمیٰ پر ابدالآباد تک ثابت قدم، قائم و دائم رکھے۔ آمین!

جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کا متفقہ دعوتِ حق ہے:۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

لوگو! ایک اللہ جل شانہٗ کی بندگی کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا معبود، کارساز و حاجت روا قطعاً نہیں۔ (سورۂ ہود، آیت ۵۰ و دیگر مقامات)

ہست اللہ ربِّ ما واحد	ذوالمنن، ذوالجلال والماجد
ہست توحیدِ اُو شہادتِ حق	ہم محمدؐ رسولِ او برحق
ذاتِ پاکش نہ مستعدِ فنا است	ہر کجا جلوۂ از و پیدا است
حُسنِ رُو لیش چو پرتوے افگند	زو دو عالم شد است بہرہ مند
ذاتِ اُو مجمعِ کمالات است	خالق الارض والسموات است
حضرتِ حق یگانہ و یکتا است	مالکِ مُلک، داورِ اعلا است
نعمتش را چو نیست پایانے	کے تو نیم مدح شایانے
ہیچ کارے زغیرِ اُو ناید	جبّہ سائی بہ پیشِ اُو شاید

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و یکتائی کے دلائل بے شمار ہیں۔ جن کا ضبط کرنا مخلوق کی طاقت و وسعت سے بالاتر ہے۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر، اپنے فہم کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی تائید و امداد سے چند ایک دلائل کا مختصراً ذکر کئے دیتے ہیں۔

دلیلِ اوّل:۔ خالق و پروردگارِ عالم ایک ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زائد ہوں تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اُن میں سے ہر ایک مستقلاً تخلیق و ربوبیتِ عالم پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بس ایک ہی اُن میں سے خالق ٹھہرے گا اور دوسرا بیکارِ محض۔ کیونکہ سارا کام وہی اکیلا سرانجام دے گا، دوسرے کے لئے نہ کوئی کام رہے گا اور نہ اُس کی ضرورت رہے گی۔ یعنی عالم میں کام اور ضرورتیں

تو ایک ہی سے پوری ہو جائیں گی۔ دوسرے کے لئے جب کام نہیں ہو گا تو اس کی ضرورت بھی نہیں ہو گی، اور مخلوق اس سے مستغنی ہو گی۔ لہٰذا وہ بیکارِ محض ہو گا۔ ظاہر ہے کہ خالق و پروردگارِ عالم تو بے کارِ محض نہیں ہو سکتا۔ اور مخلوق اس سے کسی وقت مستغنی نہیں ہو سکتی۔ اور جو بیکارِ محض ہو گا اور مخلوق اس سے مستغنی ہو گی وہ خالق و پروردگارِ عالم یا الٰہ کائنات نہیں ہو سکتا۔

پس الٰہ وہی واحد موجودِ برحق ہو گا جو سارے عالم کا بالفعل مستقلاً خالق و پروردگار ہے اور یہی مقصود ہے۔ عرفِ عام اور لسانِ شرع میں اس "الٰہ واحد و برحق" کا اسمِ ذات "اللہ" ہے۔ اس کے صفاتی نام — رحمٰن و رحیم اور سمیع و بصیر اور علیم و خبیر وغیرہ ہیں —!

اور اگر شقِ دوم اختیار کی جائے کہ ان میں سے ہر ایک عالم کی تخلیق و ربوبیت پر مستقلاً اور تنہا قادر نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے اشتراک سے یہ کارروائی انجام دیتے ہیں۔ یا اپنے سے بالاتر کسی اور ہستی کی امداد سے عالم کا کاروبار چلاتے ہیں۔ جو بھی صورت فرض کی جائے، تو ان میں سے کوئی بھی الٰہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عاجز اور محتاج ہے اور الٰہ عاجز و محتاج نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جس چیز کا وہ محتاج ہو گا وہ اس سے بالاتر اور فائق تر ہو گی۔ یعنی محتاج، کمتر اور محتاج الیہ فائق تر ہو گا۔ اور جس صورت میں وہ "مفروضہ دو الٰہ" ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے تو دونوں ایک دوسرے سے (مِن وَجہٍ) کمتر اور (مِن وَجہٍ) فائق تر ہوں گے۔ محتاج ہونے کی حیثیت سے کمتر اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے فائق تر ہوں گے اور چونکہ یہ دونوں حیثیتیں ہمہ گیر اور مستقل ہوں گی (کہ کوئی کام بھی ایک دوسرے کے اشتراک کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو گا) لہٰذا ہر ایک کا عجز اور احتیاج بھی مستقل ہو گا۔ پس بدیں وجہ ان میں سے کوئی بھی "الٰہ" یعنی مختارِ مطلق اور مستقل فی الخلق والربوبیت نہیں ہو گا۔ ساتھ ہی لازم آئیگا کہ ایک ہی چیز دوسری چیز سے[1] (بصورتِ تعددِ آلِھَہ) ایک ہی وقت میں، ہر لحاظ سے مستقلاً کمتر بھی ہو اور فائق تر بھی۔ اور محتاج ہونے کی حیثیت سے مؤخر ہو اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے مقدم اور ان دونوں حیثیتوں کے بیک وقت اجتماع سے اجتماعِ ضدین بلکہ اجتماعِ نقیضین (یعنی تقدمِ شئے بر شئ و عدمِ تقدمِ شئے بر آں شئ) لازم آئے گا۔ جو عقلاً و شرعاً صریح البطلان ہے۔ نیز فوقیت و تقدمِ شئ بر ذات و نفسِ خود[2] لازم آئے گا۔ جو بداہتہً باطل ہے!

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں اپنے کاروبار میں اپنے سے بالاتر ایک تیسری ہستی کے محتاج ہیں جو منفرد و یگانہ ہے تو لازم آئے گا کہ "الٰہ" وہی بالاتر واحد و یگانہ ہستی ہے۔ نہ کہ اس کے ماتحت وہ محتاج ہستیاں۔ اور الوہیت میں نائب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وہ بالاتر واحد ہستی ہر لحاظ سے خلق و ربوبیت میں کامل و مستقل ہے۔ اس کا کوئی کام نائب کے لئے ادھورا اور نامکمل نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ اس کا احتیاج لازم آئے گا اور فرض یہ کیا گیا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی محتاج

---

[1] - یعنی ایک "مفروضہ الٰہ" "دوسرے مفروضہ الٰہ" سے کمتر بھی ہو اور بالاتر بھی۔ تعالیٰ اللہ عن ذٰلک علوًا کبیرًا۔

[2] - ایک سے زائد ایسے الٰہ فرض کر لینے سے جو ایک دوسرے کے محتاج ہوں اور باہم اشتراک و تعاون سے خلق و ربوبیت کا کاروبار چلا رہے ہوں لازم آئے گا کہ اُن میں سے ہر ایک محتاج بھی ہو اور محتاج الیہ بھی اور محتاج ہونے کی حیثیت سے متاخر ہو اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے متقدم (خواہ یہ تقدم و تاخر رُتبۃً ہو) پس ان میں سے ہر ایک اپنے متقدم سے بھی متقدم ہو گا جس سے تقدمُ الشئ علیٰ نفسہٖ لازم آتا ہے۔ جو ظاہر البطلان ہے!

نہیں (کیونکہ اگر وہ موجودِ بالاتر بھی نائبوں کا محتاج ہو تو پھر وہی محتاج و محتاج الیہ والا چکر چل جائے گا جس کا باطل ہونا ابھی ابھی بیان کیا گیا ہے) لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ واحد و بالاتر موجود ہی اپنے سارے کاروبارِ خلق و ربوبیت میں مستقل اور منفرد ہے۔ نہ شریکوں کی اسے حاجت ہے اور نہ نائبوں کا وہ محتاج۔ اور نہ اس شرکت و نیابت کی وہ اجازت دیتا ہے۔ اور نہ اسے برداشت کرتا ہے بلکہ سرے سے اس کا امکان ہی نہیں۔ اور وہ ذاتِ منفرد شرائعِ انبیاء کرام علیہم السلام میں "اللہ" کے مبارک اور معزز و گرامی اسمِ پاک سے موسوم و متعارف ہے۔ (اور دوسرے نام بھی لوگوں نے اپنی اپنی زبان میں اس ذاتِ منفرد و یگانہ کے لئے اطلاق کئے ہیں۔ لیکن اہلِ علم اس کے لئے وہی اسمائے حسنہ استعمال کرتے ہیں جو اس نے انبیائے کرامؑ کے ذریعہ بتائے ہیں)

خلاصہ:۔ اگر ایک سے زائد "اِلٰہ" (یا خدا) فرض کئے جائیں تو اگر ان میں سے کوئی ایک بھی خلق و ربوبیتِ عالم میں مستقل ہوگا تو "اِلٰہ" بس وہی ہوگا، باقی فالتو اور محض بے کار رہیں گے اور اگر ان میں سے کوئی بھی مستقل و منفرد نہیں ہوگا تو ہر ایک محتاج و عاجز ہوگا۔ اور ان میں سے کوئی بھی صورت ہو (بے کار ہو یا عاجز) تو وہ اِلٰہ نہیں ہوگا ——
لہٰذا "اِلٰہ" وہی منفرد ذاتِ اقدس ہے جو نہ محتاج و عاجز ہے اور نہ بیکار۔ بلکہ خلق و ربوبیت میں واحد و مستقل ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اور وہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ الحمد للہ۔

اس دلیل کو ہم "برہانِ استقلال" کہتے ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۝

وہی (عقلاً) متعین ذاتِ برحق اللہ ہے جو تم سب کا (مستقلاً) پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا "اِلٰہ" (یا پروردگار) نہیں ہے۔ وہی ہر ایک چیز کا (مستقلاً اور تنہا، بلا شرکتِ غیرے) پیدا کرنے والا ہے۔ پس تمہیں بندگی و غلامی بھی اسی ایک کی کرنی چاہیئے اور وہی ہر ایک چیز کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا ہے۔ (سورۃ الانعام، ۱۰۲)

دلیل دوم:۔ اگر دو یا زیادہ اِلٰہ فرض کئے جائیں تو زمین و آسمان اور باقی سب مخلوقات کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا اور یہ ساری دنیا فساد و بربادی کا پورا پورا منظر پیش کرتی۔ اس لئے کہ "اِلٰہ" وہ ہوتا ہے جو سب مقدورات پر کامل قدرت رکھتا ہو۔ اب دنیا کا ہر کام جب ایک "اِلٰہ" سے متعلق ہو گیا اور اس کے دائرۂ اختیار و قدرت کے تحت آ گیا تو واجب الوقوع ہو گیا اب دوسرے "اِلٰہ" کی طرف اس کی نسبت مستحیل ہو گئی۔ کیونکہ تحصیلِ حاصل کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن ہر ایک "اِلٰہ" چونکہ ہر لحاظ سے دوسرے "اِلٰہ" کے ساتھ قوت و قدرت اور ارادہ وغیرہ امور میں برابر ہے (کہ اگر کم ہو تو پھر وہ اِلٰہ نہیں ہوگا) لہٰذا (بصورتِ تعددِ آلہہ) ہر ایک اِلٰہ لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ دنیا کے سب خدائی کام اس کی قدرت و ارادہ سے متعلق ہوں اور اس طرح وہ اپنی خدائی کا مظاہرہ کر سکے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز بھی موجود نہ ہو سکے۔ کیونکہ جب دو یا زیادہ "اِلٰہ" اس کے ایجاد و تخلیق کی طرف بیک وقت متوجہ ہوں گے تو ایک کی مراد و مطلوب ہونے کی وجہ سے اس چیز کا دوسرے کی مراد ہونا محال ہو جائے گا۔

اس لئے کہ امکان ہی کے باعث اس سے ارادۂ موجد متعلق ہو رہا تھا اب جبکہ کسی ایک موجد (یعنی اِلٰہ) کا ارادہ وقدرت

اس سے متعلق ہو رہا ہے تو اس کا وجود ضروری (اور واجب لغیرہٖ[1]) ہو گیا۔ اور یہاں چونکہ اس چیز سے دو یا زائد اِلٰہ کا ارادہ و قدرت متعلق ہو رہا ہے تو ضروری ہے کہ وہ بیک وقت ان سب کی مراد ہو۔ لیکن ایک کی مراد اور مقدور ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے کی مراد و مقدور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک ہی مقدور پر بیک وقت دو مستقل قدرتیں وارد نہیں ہو سکتیں۔ (ورنہ تحصیلِ حاصل لازم آئے گا جو عبث بلکہ محال ہے)

اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ چیز بیک وقت ایک سے زائد اِلٰہ کی مراد ہو اور مراد نہ بھی ہو، اُن کی محتاج ہو اور اُن سے مستغنی بھی ہو۔ موجود ہو اور غیر موجود بھی۔ بدیں وجہ کہ ایک اِلٰہ کے ارادۂ ایجاد سے مانع ہے اور وہ دوسرا پہلے کے تعلقِ ارادہ سے مانع ہے، ایک دُوسرے کے راستہ میں مستقل حائل ہیں۔ پس لازم آئے گا کہ کوئی چیز بھی اس مستقل کشمکش کے باعث موجود نہ ہو۔ کسی کو ترجیح حاصل نہیں ہے کہ اس کی مراد پوری ہو اور دُوسرے کی پُوری نہ ہو۔ کیونکہ "اِلٰہ" ہونے کی وجہ سے وہ ہر دو (یا وہ سب) طاقت و قوت اور ارادہ و اختیار میں برابر فرض کئے گئے ہیں اور ترجیح کی صورت میں راجح و غالب اِلٰہ ہوگا، مرجوح و مغلوب اِلٰہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایک سے زیادہ اِلٰہ کی صورت میں اجتماعِ نقیضین (وجودِ اشیاء و عدمِ اشیاء بیک وقت) لازم آئے گا اور اجتماعِ نقیضین کو ارتفاعِ نقیضین لازم ہے، جو سراسر باطل ہے اور یہی وہ فساد ہے جو اللہ جلّ شانہٗ کے سوا کوئی بھی دُوسرا اِلٰہ فرض کر لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ آسمان و زمین اور کائناتِ عالم پُوری خوبی و حکمت کے ساتھ موجود ہیں تو لامحالہ یہ سب ایک اللہ جلّ قدرہٗ کی حکیمانہ صنعت ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور نہ کسی کے لئے اس مداخلت کا امکان ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔۔۔!

اس دلیل کا نام "بُرْهَانِ تمانع" ہے!

اس دلیل کو اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ کائناتِ عالم کی تدبیر اگر ایک سے زائد مُدبّر (یعنی اِلٰہ) سے متعلق ہوتی تو لازم آتا کہ کوئی بھی تدبیر اور کوئی بھی کام پُورا نہ ہوتا۔ کیونکہ اُن میں سے ہر ایک دُوسرے کی تدبیر میں حائل ہوتا۔ جب ایک کی تدبیر ہوتی تو دُوسرے کی تدبیر کی نہ ضرورت ہوتی اور نہ اس کا امکان ہوتا۔ اس لئے کہ "اِلٰہ" کی تدبیر کامل ہوتی ہے۔ اس میں کسی لحاظ سے کمی نہیں ہوتی، تاکہ دُوسرے کی امداد و تعاون سے اُس نقصان کی تلافی کی جاتی۔ کسی کو ترجیح بھی نہیں کہ وہ تدبیر کرتا اور دُوسرا فارغ رہتا۔ نیز ترجیح کی صورت میں راجح اِلٰہ ہوتا نہ مرجوع۔ لہٰذا یہ دونوں مستقل تدبیریں (بصورتِ تعدّدِ اِلٰہ) ایک دوسرے کے تعلق سے (کائناتِ عالم کے ساتھ) مانع ہوتیں۔ اور اس طرح کوئی بھی تدبیر متعلق نہ ہو سکتی اور دنیا میں کوئی چیز بھی موجود نہ ہوتی کہ تدبیر خالق کے بغیر مخلوق کے وجود کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ عالم اپنی پُوری وسعتوں کے ساتھ موجود و مشاہد ہے۔ جس میں ایک زبردست علیم و خبیر اور صنّاع و مدبّر کی حکیمانہ تدبیر اس کے ذرّہ ذرّہ سے نمایاں طور پر تاباں و درخشاں ہے۔ وہی مُدبّر و حکیم اللہ جلّ شانہٗ ہے اور بس۔ ارشاد ہوتا ہے:-

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ
یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

---

[1] یعنی ایسی چیز جو تخلیقِ خالق اور ایجادِ مُوجِد کی وجہ سے اُس کی ہستی ضروری ہو گئی ہے۔ خواہ فی نفسہٖ بعد اپنی جگہ وہ ممکن الوجود ہے کہ اس کی ہستی و نیستی قبل از ایجادِ مُوجِد برابر ہے۔

یقیناً تم سب کا پروردگار ایک اللہ ہے۔ جس نے یہ سب آسمان و زمین (اپنی حکمت سے)
چھ دنوں میں پیدا کئے ہیں۔ پھر تدبیر و انتظام جملہ امور فرماتے ہوئے (شہنشاہانہ نرالی شان
کے ساتھ) "عرشِ عظیم" پہ انوار و تجلیاتِ الوہیت کی خصوصی پرتو ڈالی۔ (سبحان اللہ)
(اس شانِ جلال و کبریائی کے ساتھ، کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کے حضور میں کسی کی
سفارش کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان خصوصی صفاتِ جلیلہ سے متصف بس اکیلا اللہ ہے۔ تمہارا
پروردگار۔ پس خاص اُسی کی بندگی کرو (ان حقائق کے سمجھنے کے بعد) سو کیا اب بھی عبرت و نصیحت
نہیں حاصل کرو گے۔ (سورہ یونس۔ ۳)

(کیا اب بھی کفر و شرک سے باز آ کر ایک اللہ جل شانہ کی وحدانیت و ربوبیت مختصہ کا تہ دل سے اعتراف نہیں
کرو گے؟ لازماً ایسا اعتراف ڈنکے کی چوٹ کر دینا چاہیئے۔ اللہ توفیق دے)

ایک شبہ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ "اِلٰہ" میں چونکہ فہم و تدبّر اور رواداری لازماً ہوگی تو عین ممکن ہے کہ دو (یا دو
سے زیادہ) "اِلٰہ" تخلیقِ عالم پر اتفاق کر لیں اور اس کی تفاصیل بھی باہم اتفاق، مصالحت اور مسالمت
سے طے کر لیں یا پھر تقسیمِ کار کے طور پر اپنا اپنا دائرۂ عمل اور دائرۂ تخلیق و تکوین متعین کر لیں اور اس طرح تصادم کی کوئی صورت
نہ ہونے دیں اور کاروبارِ عالم درہم برہم اور اس میں فساد برپا نہ ہو!

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امکان بوجوہ ذیل باطل ہے:۔
اوّلاً۔ یہ کہ اس میں "خالق اور اِلٰہ" کا مخلوق اور عبید پر قیاس کیا گیا ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔ کیونکہ مخلوق
اور عباد کا سارا کاروبار ہی تعاونِ باہمی اور اتفاق و اتحاد سے چلتا ہے۔ لیکن "خالق و اِلٰہ" کو اس پر قیاس نہیں کیا
جا سکتا۔ اس لئے کہ بندہ ضعیف اور محتاج ہے اور "اِلٰہ" مستغنی اور بے نیاز، قادر و توانا ہوتا ہے۔ جو محتاج ہوگا وہ
"اِلٰہ" نہیں ہوگا۔ بلکہ جس کا محتاج ہوگا وہ (محتاج الیہ) اس سے فائق و برتر ہونے کی وجہ سے اِلٰہ ہوگا۔ اور اس صورت میں
چونکہ ہر ایک انتظام و تخلیق میں دوسرے کے تعاون کا بصورتِ اتفاق یا تقسیمِ کار محتاج ہے کہ اس کے بغیر یہ کارخانۂ عالم
موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح سے موجود ہو بھی جائے (جس کا امکان کم ہے) تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔ تو
ہر ایک اُن آلِھَہ میں سے محتاج ٹھہرا اور محتاج الیہ بھی۔ جس سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک اِلٰہ ہو بھی اور اِلٰہ نہ بھی ہو جس
سے اجتماعِ ضدین بلکہ اجتماعِ نقیضین لازم آتا ہے!

ثانیاً:۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اتفاق یا تقسیمِ کار کے بغیر تخلیق و تکوینِ اشیاء اور تدبیرِ امورِ عالم
سے عاجز ہے اور عاجز "اِلٰہ" نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عجز کو احتیاج لازم ہے اور بصورتِ احتیاج محتاج الیہ فائق و
مقدم ہوگا۔ پس ہر ایک فائق و مقدم بھی ہوگا اور متاخر و کمتر بھی۔ اور یہ قطعاً باطل ہے!

ثالثاً:۔ اس لئے باطل ہے کہ ایسا اتفاق یا ایسی تقسیمِ کار (ذات و صفاتِ "اِلٰہ" سے خارج ایک چیز ہے، اور
تصادم سے بچنے کے لئے تخلیقِ عالم کے وقت، بنا بر ضرورت، ارادہ کو اس سے متعلق کر کے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔
پس لازم آئے گا کہ "اِلٰہ" کاروبارِ الوہیت میں اپنی ذات و صفات کے سوا غیر کا اور اپنے افعال کے سرانجام دینے میں ایک
خارجی چیز کا ضرورت مند ہو۔ اور اپنی ذات میں کامل نہ ہو۔ ناقص ہو۔ اور یہ ظاہر البطلان ہے۔ کیونکہ اِلٰہ ہوتا ہی وہ ہے جو

اپنی ذات و صفات میں کامل اور اپنے افعالِ حکیمانہ میں کسی خارجی چیز کا قطعاً محتاج نہیں ہوتا۔

اسی اساس پر آپ اور معقول دلائل بھی استخراج کر سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مفروضہ اتفاق یا تقسیم کار "اِلٰہ" کے حق میں قطعاً غلط اور باطل ہے۔ نیز اس سے یہ لازم آئے گا کہ جب تک اتفاق کرنے سے "اِلٰہ" اور مدبّرِ عالم بن ہی نہ سکے حالانکہ "اِلٰہ" اور اس کی صفاتِ الوہیت و تدبیر اور ربوبیت ازلی، ابدی ہوتی ہیں۔ اشیاء خارجیہ یا شرائط کے ساتھ وابستہ اور اُن پر موقوف نہیں ہوتیں!

ساتھ ہی تقسیم کار کی صورت میں لازم آئے گا کہ پُورے عالم کا اُن میں سے کوئی بھی "اِلٰہ" و مدبّر نہ ہو۔ بلکہ مقرر حصہ کا اِلٰہ ہو۔ گویا خدائی بھی تقسیم ہو جائے گی، اور پُوری خدائی کسی کے حصّے میں نہیں آئے گی۔ اور یہ "ناقص اور ادھورا اِلٰہ" اِلٰہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ "اِلٰہ" کو کامل ہونا چاہیئے۔ نیز ہر ایک کے دوسرے حصّہ میں تصرّف کرنے سے عاجز ہوگا اور عاجز "اِلٰہ" نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں)

ان سب دلائلِ قاطعہ سے ثابت ہے کہ اِلٰہ کائنات ایک اور فقط ایک ــــ واحد و لاشریک اور یگانہ و یکتا اور وہ اَللّٰہ جلّ شانہ ہے کہ اُس نے خود اپنا یہی نام بتایا ہے اور انبیاء و مرسلین نے بھی اس کو اسی مقدّس ذاتی نام سے یاد فرمایا ہے۔ یا بہ اختلافِ لغات، وحی کے ذریعہ بعض دُوسرے مقدّس ناموں سے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے صفاتی ناموں سمیع و بصیر، رحمٰن و رحیم اور علیم و خبیر وغیرہ سے بھی لوگوں کو واقف کرایا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ "اِلٰہ" کے مفہوم و مدلول ہی میں جملہ صفاتِ کمال مثلاً وحدت و یکتائی، اعلیٰ ترین علمی و عملی کمال، قدرتِ کاملہ، جود و سخا اور استغناء وغیرہ شامل ہیں۔ لہٰذا اِلٰہ برحق ایک ہی ہو سکتا ہے۔

اور وہ ہے "اللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ"!

دلیلِ دوم میں ہم نے جس قدر تفصیلات بتلائی ہیں وہ سب دُوسرے مضامینِ کثیرہ سمیت ذیل کی آیت کریمہ میں اعجازی حکمت کے ساتھ سمو دی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ج فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ (سورۃ الانبیاء۔ ۲۲)

اگر آسمان و زمین میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا دُوسرے اِلٰہ (ایک یا زیادہ) ہوتے تو یہ ارض و سما (مع سب کائنات) تباہ و برباد ہو چکے ہوتے۔ (لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا تو ثابت ہوا کہ "اِلٰہ" ایک ہے یعنی اللہ جل شانہٗ) سو عرش کا مالک اللہ تعالیٰ ان الزامات سے پاک ہے جو یہ مشرک لوگ اُن سے اُسے متصف کرتے ہیں!

دلیلِ سوم:۔ اگر ایک سے زائد "اِلٰہ" ہوں تو لامحالہ اُن کی اپنی اپنی مخلوق اور اپنا اپنا عالَم امر و تدبیر ہوگا۔ اس لئے کہ بادشاہ بغیر رعیت کے اور "اِلٰہ و خالق" بغیر محکوم و مخلوق کے متصوّر نہیں۔ اب اس صورت میں تصادم سے بچنا محال ہے۔ کیونکہ ہر ایک "اِلٰہ" اپنی الوہیت کی وسعت و قدرت کے پیشِ نظر لازماً اس بات کا متقاضی ہوگا کہ دوسرے کے امورِ خلق و تدبیر میں مداخلت کرے اور سب مخلوق و جملہ عوالم کو بلا شرکتِ غیرے اپنے تصرّف کے تحت لائے اور اپنے قبضہ اقتدار میں رکھے۔ ترجیح و غلبہ کسی کو نہیں کیونکہ دونوں ہم مرتبہ "اِلٰہ" فرض کئے گئے ہیں، اتفاق

واتحاد اور تقسیم کار کی بات بھی نہیں چل سکتی، کیونکہ ایسی کوئی بھی مفاہمت محض ضرورت اور خوفِ تصادم کی بناء پر کی جاتی ہے اور "اِلٰہ" کو نہ ضرورت لاحق ہو سکتی ہے اور نہ خوف دامنگیر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان میں ایسی ٹکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ پاش پاش ہو جائے اور پھر کبھی نہ بن سکے، لیکن ایسے فساد سے عالم بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اِلٰہِ کائنات اور مدبّر و خالقِ جملہ عوالم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ وھٰذا ہو المقصود!

مدّت دراز تک زمین و آسمان اور باقی کائنات کو عمدہ تدبیر سے قائم رکھنا اور پوری کامیابی سے نظامِ عالم کو چلاتے رہنا اور پھر قیامت کے وقت اس موجودہ سلسلہ کو درہم برہم کر کے ایک نیا عالم (عالمِ آخرت) قائم کرنا اور مجرمین و مومنین کا امتیاز فرما کر سب کو ان کے حسبِ قدر اعمال کے مطابق سزا و جزا دینا خود اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ یہ سب تصرّف اور یہ سب حکم ایک ہی اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے ہے اور وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے!

ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ۚ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ○ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

اللہ تعالیٰ کی وحدت اور اس کی قدرتِ کاملہ کی زبردست نشانیوں میں سے ایک نشانی آسمان اور زمین کا اس کے حکم سے قائم رہنا ہے۔ پھر جب وہ ربِّ تعالیٰ تم کو زمین کے اندر سے باہر آنے کے لئے ایک ہی بار پکار دیں گے تو تم جھٹ ہی نکل کھڑے ہو گے۔ آسمانوں اور زمینوں میں جو مخلوقات ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے اور وہ سب کے سب (چار و ناچار) اس کے فرمانبردار ہیں۔ (نافرمان بندے بھی اس کے تکوینی حکموں کے سامنے بے بس ہیں) اور وہی ہے وہ قادر و توانا جو پہلی مرتبہ ساری مخلوق کو پیدا فرماتا ہے، پھر وہی ان کو (قیامت کے دن) دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ اور آسمان و زمین میں اس کی شان بہت بلند ہے۔ اور وہ بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا ہے! (سبحان اللہ) (سورۃ الروم ۲۵ تا ۲۷)

قیامت اور اس کی بربادیوں کو دو اِلٰہ کے تصادم کا نتیجہ کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جب قیامت کو مانا جائے گا تو اس کی وہ سب ضروری تفصیلات بھی ماننی پڑیں گی جو کتبِ الٰہیہ اور شرائعِ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان تفصیلات پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت میں صرف تخریبی پہلو نہیں۔ بلکہ تعمیری پہلو بھی نمایاں طور پر، ساتھ ہی ساتھ ملحوظ ہے۔ ایک عارضی نظام کو ختم کر کے ایک مستقل اور پائیدار نظام قائم کیا جائے گا۔ اور استحقاق کے مطابق ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزاء اور سزا ملے گی۔ جنہیں کو سزا ملے گی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو نہیں مانا تھا اور اس کے دینِ حق ــــ اسلام ــــ کی پیروی نہیں کی تھی۔ اور اہلِ ایمان کو جو عقیدۂ توحید اور جملہ سنّت پر قائم رہ کر تعلیماتِ الٰہیہ کے پیرو کار رہتے ایسے بڑے بڑے انعامات اور صلے ملیں گے جن کا تصور بھی اس دنیا اور اس زندگی میں نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ جزا اور وہ سزا دونوں

مستقل، پائیدار اور ایک مکمل عادلانہ اور حکیمانہ نظم ونسق کے ساتھ جاری رہیں گی - پس بدنظمی، بے انصافی، جور وستم، ظلم واستبدادیت یا تخریب وفساد کا وہاں گزر بھی نہیں ہوگا، ہر ایک چیز پوری حکمت وعدالت کے معیار پر پوری اُترے گی، پُرانی عمارت کی جگہ جو مفسدوں اور مجرموں کی پیہم بدکرداریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گرائے جانے اور بدل دینے کی متمنی ہوگی، ایک نئی عمارت (جہانِ آخرت) قائم کردی جائے گی - لہذا یہ تخریب برائے تخریب و زور آزمائی نہیں اور نہ اقتدار کی کشمکش ہے - بلکہ اس دُنیائے فانی کے اندر ہر شخص نے جو بھی نیک وبد اعمال کئے ہیں، اُن کے ٹھوس نتائج بھگتنے کے لئے یہ فانی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اس کی جگہ آخرت کی دوامی بساط رکھ دی جائے گی - لہذا یہ تخریب "تعمیرِ نو" کی ابتداء اور اس کا سنگ بنیاد ہے، سو یہ قیامت اور اس کے مختلف مراحل ومنازل خود اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قاہرانہ قوت وجبروت، اور اس کی رحمت ورافت اور بطش وقدرت کے بہت سے قوی دلائل پر مشتمل ہیں -

ارشادِ الٰہی ہے -

مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا کَانَ مَعَہٗ مِنْ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَھَبَ کُلُّ اِلٰہٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ فَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ (سورۃ المومنون - ۹۱-۹۲)

اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اپنی اولاد نہیں بنایا (کہ اس کا امکان ہی نہیں) اور اس کے ساتھ کوئی بھی دُوسرا "اِلٰہ" یعنی خدا نہیں ہے (اگر کوئی دُوسرا اِلٰہ ہوتا) تب تو ہر ایک اِلٰہ اپنی اپنی مخلوق کو لے کر (دُوسرے کے مقابلہ کے لئے) (میدان میں) چلا آتا اور ایک دُوسرے پر غلبہ پانے کے لئے چڑھ آتا - ایسی باتوں سے جو کفار ومشرکین بیان کرتے ہیں (کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد یا شریک ٹھہراتے ہیں) اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اطہر بالکل پاک اور مبرا ہے - اللہ تعالیٰ چھپی اور ظاہر باتوں کو یکساں طور پر جاننے والا ہے - وہ مشرکوں کے شرک اور گھڑے ہوئے شریکوں سے بہت ہی بلند اور بالاتر ہے - (سبحان اللہ)

اس دلیل کے لئے "برہانِ وحدتِ اقتدارِ اعلیٰ" کا نام موزوں ہے -

دلیل چہارم:- "اِلٰہ" واجب الوجود ہے، اور واجب الوجود ایک ہے، ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا - لہذا "اِلٰہ" ایک ہے - ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا -

صغریٰ اس طرح ثابت ہے کہ اگر "اِلٰہ" واجب الوجود یعنی خود بخود موجود، قدیم اور ازلی وابدی نہ ہو تو پھر ممکن الوجود ہوگا کہ اس کی ہستی کسی دوسرے کی عطا کردہ ہوگی - تو اس صورت میں وہ اس غیر کا محتاج ہوگا اور اس سے کمتر، پس "اِلٰہ" وہی ہوگا جس نے اُسے ہستی عطا کی ہے اور اس سے فائق ہے - یہ کمتر اِلٰہ نہیں ہوسکتا - پس ثابت ہوا کہ "اِلٰہ" کے لئے ضروری ہے کہ واجب الوجود ہو -

کبریٰ اس طرح ثابت ہے کہ اگر "واجب الوجود" ایک سے زیادہ فرض کیا جائے تو لازم آئے گا کہ ان کے اندر "وجوبِ وجود" میں اشتراک کے علاوہ کوئی ایسی چیز بھی موجود ہو جو ان دونوں کی شخصیتوں کو علیحدہ علیحدہ متمیز کرتی ہو تاکہ اُن کی دوئی اور کثرت (برخلافِ وحدت) ثابت ہو - اب یہ "مابہ الامتیاز" ان کے "مابہ الاشتراک" سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہوگی اور

اصل حقیقت میں داخل ہوگی۔ پس لازم آئے گا کہ الٰہ مختلف اجزاء (یعنی مشترکہ اور ممیّز) سے مرکّب ہو اور اپنی ترکیب میں ان اجزاء کا محتاج ہو۔ اور چونکہ جزو عینِ کُل نہیں بلکہ غیر ہوتا ہے لہذا غیر کا محتاج ہوا۔ اور اپنی اسی ترکیب میں اسے کسی ترکیب دہندہ کی بھی ضرورت ہوگی جو درحقیقت اس کا خالق ہوگا۔ بلکہ ممکن الوجود اور حادث ہوگا۔ لہذا ثابت ہوا کہ "واجب الوجود" ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا!

جب یہ دونوں مقدمات (صغریٰ وکبریٰ) ثابت ہوگئے تو ان سے بدیہی نتیجہ بھی ثابت ہوگیا کہ "الٰہ" ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ الٰہ برحق بس اللہ جل شانہٗ ہی ہے۔ وہو المراد۔ الحمدللہ!

اس دلیل کو ہم "برہانِ حکمت" یا "برہانِ فلسفۂ حقّہ" کہتے ہیں۔

دلیل ششم:۔ مشرکین کے مختلف طبقات حسب ذیل چیزوں کو پوجتے ہیں:۔

اشجار و احجار، اصنام، کواکب، دیوی، دیوتا، جن، شیطان، اہواء و خواہشات، جاہ و اقتدار، سیم و زر، مورتیوں، پہاڑوں، ندیوں، دریاؤں، سمندروں، آبشاروں، تیرتھوں، سورج، چاند، ستاروں، نور و ظلمت، آگ، فرشتوں، نبیوں، ولیوں، قبروں، شہیدوں، زندہ اور مردہ پیروں، پیشواؤں، حاکموں اور بادشاہوں، فیشن، ملک، وطن، حکومت، قوم، اپنا من اور اپنا نفس، نظریات و افکار، نفسیاتی لذتوں اور خواہشوں، بھوت یا پری، زر، زن، زمین، رواج و دستور۔ رسومات و توہمات، اولاد اور کنبہ وغیرہ وغیرہ!

ان کے علاوہ بعض لوگ اور بعض قومیں گائے، بیل، ریچھ، بندر اور شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ بعض دوسرے درندوں، پرندوں اور چرندوں اور بعض خاص مقامات اور استھانوں وغیرہ کی پوجا کرکے شرک و کفر کا ارتکاب کرتی ہیں!

بعض نااہل قبروں، گدیوں، گدی نشینوں، روضوں، تعزیوں، جھنڈوں وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں۔ نذر و نیاز طواف، قربانی وغیرہ مراسم عبودیت ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ اور بعض اہل قبور کو پکارتے اور عالم الغیب مانتے ہیں۔ بعض مخلوق کو کارساز اور حاجت روا گردانتے ہیں۔ بعض مشرک جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے پسند کے مطابق یا باپ دادا اور اگلوں کی تقلید میں بعض خاص خاص چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے سجدے کرتے ہیں۔ ہاتھ جوڑتے ہیں۔ قربانیاں کرتے ہیں۔ اُن کی نذریں مانتے ہیں۔ اُن سے شفا کے طالب ہوتے ہیں۔ یا اُن سے مرادیں طلب کرتے ہیں۔ بعض مشرک اوثان و اصنام کے علاوہ تماثیل و تصاویر کی پوجا کرتے ہیں!!

ان سب سے زیادہ عجیب حالت اُن گور پرستوں کی ہے جو باوجود ادعائے ایمان و اسلام اور کلمۂ توحید و شہادت محض زبانی پڑھنے کے گور پرستی اور بدعت و شرک میں مبتلا ہیں۔ قریب و بعید سے اُن کو پکارتے ہیں۔ اُن کو سجدے کرتے ہیں یا جھک کر چوکھٹ چومتے ہیں۔ اُن کو حاضر و ناظر یا مجیب الدعوات بیان کرتے ہیں۔ (خواہ زبان سے نہیں، اُن کا عمل ہی یہ ظاہر کر رہا ہو کہ حاجت روائی کے لئے اُسے پکارتے ہیں) حاجتیں اُن سے مانگتے ہیں۔ اُن کی نذریں ادا کرتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور دوسری بدعات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا اُن کو ایک حد تک عالم الغیب اور حاجت روا اور لائق پرستش سمجھتے ہیں۔ (اللہ محفوظ رکھے)

زیارتِ قبور اہلِ صلاح برائے استغفار و تذکرِ موت بشرطیکہ پابندیٔ سنت و اجتناب از شرک و بدعت مستحب و مسنون ہے۔ لیکن شدِّ رحال، میلہ یا عرس مروّجہ کی کوئی بھی صورت ہو کیہ خلافِ سنت ہے!

ایک اور گروہ بھی اُن سے کمتر تباہ حال نہیں ہے اور وہ ہے جو سیاسی تہذیب اور پولیٹکل شرک میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ فرنگی نظام، فرنگی تمدن، اور فرنگی سیاست کو باوجود دعائے مسلمانی، قرآنی نظام حق و انصاف۔اسلامی تمدن اور الٰہی سیاست کے بجائے، برضا و رغبت اختیار و پسند کئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی ذہنی پستی سے ہم کو محفوظ فرمائے (آمین!)

بد بختوں کا ایک وہ گروہ بھی مشرکوں میں شامل ہے، جو خدائے پاک کا منکر ہو کر مادہ، نیچر، طبیعت، دہر، زمانہ اور سائنس کی آڑ میں مختلف مظاہرِ قدرت اور مناظرِ فطرت کا پرستار ہے۔ اُن میں نیچری اور دہری، فلاسفہ اور سائنس والوں کا روپ دھار کر مادہ پرستی کے لئے راستہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ مشرکوں کا عیّار ترین گروہ ہے جو علم و فلسفہ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور اپنی ہفوات و کفریات کی ترویج میں لگا رہتا ہے!

مبتدعین کے بعض انتہا پسند طبقات بھی بتدریج کفر و شرک کی سرحد تک جا پہنچتے ہیں۔ اُن میں گور پرستوں اور اپنے آباء و شیوخ کے نام و نسبت سے دُنیا کا دھندہ کرنے والوں اور دین کے نام پر سیم و زر سمیٹنے والوں کو اس طبقہ کی صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے!

بعض مشرکین خیالی اور وہمی چیزوں کے پجاری اور توہمات و خرافات کا شکار رہتے ہیں۔ بعض مفروضہ، مخفی ارواح اور پُر شبہ خیالی قوتوں کے پرستار رہتے ہیں!

یہ سب طبقاتِ شرک و ضلال ہیں۔ ان سب کے مقابلہ میں بس ایک طبقہ اہلِ ایمان کا ہے، جو ایک اللہ کو اپنا مولا و آقا یقین کرتا ہے اور جملہ عبودیت و پرستاری اور اس کے لوازمات و مبادیات کو اُسی کے لئے مخصوص گردانتا ہے۔ جو کچھ مانگتا ہے اُسی سے مانگتا ہے، خوشی اور غم، یُسر اور عُسر ہر حالت میں صرف اُسے پکارتا ہے اور اسی سے استغاثہ کرتا ہے۔ اور بس اسی سے استمداد و استعانت کرتا ہے اور اس کے نظامِ حق کا اعتقاداً و قولاً و عملاً وفادار رہتا ہے!

مخلص مومن کامل موحد ہوتا ہے اور وہ بس اللہ جل شانہٗ کا ہی پرستار ہوتا ہے، ذات و صفات، کاروبارِ خدائی، کارسازی و حاجت روائی، علم غیب اور استحقاقِ عبادت و شہنشاہی میں اُسے واحد و یگانہ اور متفرد و یکتا یقین کرتا ہے۔ اور قوتِ ایمانی اور توفیقِ الٰہی کی بدولت وہ طاعت و عبودیت میں سرگرم عمل ہوتا ہے۔ ایسا مردِ مومن نظامِ دینِ حق — اسلام — کا سچا وفادار اور اس کے نفاذ کی خاطر مجاہدانہ کارناموں کے لئے ہر وقت تیار اور باطل سے ٹکرانے کے لئے بے تاب ہوتا ہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ کا دین سر بلند ہو اور چار دانگ عالم میں اس کا نور جگمگائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل و کرم سے ہمیں بھی ایمان و عرفان کا یہی بلند مقام مرحمت فرمائے۔ آمین!

اب ہم دلیل کی ترتیب کی طرف آتے ہیں۔ مذکورہ بالا طبقات اہلِ شرک و ضلال جن جن چیزوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی پرستش و بندگی کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی "الٰہ" رب، خالق، کارساز و حاجت روا نہیں۔ بلکہ ہر ایک دوسری مخلوق کی طرح حادث (موجود بعد العدم) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا محتاج اور عوارضاتِ مختلفہ سے گزر کر بالآخر فنا سے دوچار ہونے والا ہے۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ اکیلا ہی ہماری اور سب مخلوقات کی بندگی کا مستحق ہے۔ چونکہ وہی اکیلا "الٰہ" "رب" "خالق و رازق" "کارساز و حاجت روا" "منعم و متفضّل" اور "دائم و باقی" ہے!

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (سورہ الرحمٰن ۔ ۲۶ ۔ ۲۷)

دُنیا پر بسنے والے سب فنا ہونے والے ہیں ۔ اور بس تیرا بزرگ اور صاحبِ عزت و عظمت پروردگار ۔ اللہ جل شانہٗ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے !

ان خود ساختہ معبودوں نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی کتاب نازل کی ہے اور نہ کوئی اپنا رسول بھیجا ہے ۔ اور نہ کوئی دلیلِ عقل و نقل اُن کی خدائی پر آج تک قائم ہو سکی ہے ۔ بلکہ قدم قدم پر اُن کا عجز و نیاز اور اپنے خالق و مالک ۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف احتیاج بالکل واضح اور نمایاں ہے ۔ پس مشرکوں کا اُن کو "خدائی مسند" پر بٹھلانا "مدعی سُست گواہ چُست" کے مصداق جھوٹ اور افترا پردازی کے سوا کچھ نہیں ۔ بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے سچے شاہد اور عادل و گواہ ہیں !

جن گنے چُنے فرعون منش متکبرین نے نشۂ اقتدار میں اپنی خدائی کا خرافہ کھڑا کیا ۔ جلد ہی اُن کی خدائی کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹا اور دُنیا نے اُن کی تباہی اور ملعونیت کا عبرت ناک منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ آج کے فراعنہ کا حشر بھی اپنے پیشرووں سے کچھ مختلف نہیں ہو گا !

جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اُن کے سچے متبعین ۔ مومنین صالحین ۔ ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی عبدیت کا اعلان فرماتے رہے اور اس "مقصدِ عظیم" کے لئے ہر تکلیف، دُکھ اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے سہتے رہے، اور ہر مخالفت کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے عَلَمِ حق کو بلند کئے رکھا اور دینِ توحید ۔ دینِ اسلام ۔ پر کوئی آنچ نہیں آنے دی ۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی سچی شہادت دی ہے ! بدیں وجہ وہ مکرم ہستیاں انتہائی توقیر و احترام کی مستحق ہیں ۔

جزاھم اللہ عنا وعن سائر المسلمین جزاءً لا ینقطع ابدًا ۔

ہم اُن کی سچی اطاعت و پیروی میں "دینِ حق" ۔ "دینِ توحید اللہ جل شانہٗ" پر قائم اور ثابت قدم رہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان داعیانِ حق کے اتباع اور اُن کے "سُننِ حق" کی پیروی پر استقامت عطا فرمائے ۔ آمین !

ان "دعاۃِ توحید" کو "اِلٰہ" یا "ولد اللہ" (ابن اللہ) کہنا یا "عالم الغیب" قرار دینا یا کارساز و حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا اور کاروبارِ الوہیت میں اُن کے حصے بخرے مقرر کرنا یا اُن کو دائرہ عبدیت و بشریت سے نکالنا اور نورِ ذاتِ الٰہ کا حصہ[1] قرار دینا وغیرہ وغیرہ ہذیانات و خرافات، یہ سب عقیدہ توحیدِ اللہ جل شانہٗ کے سراسر منافی، کفر و شرک کی باتیں ہیں ۔ اور خود اُن کی اپنی تعلیمات اور ہدایت کے بالکل خلاف اور ان کی لائی ہوئی خدائی کتابوں کے سراسر برعکس و منافی ہیں سب !

لہٰذا ان مشرکین و مبتدعین اور ملحدین کی کوئی بات بھی عقل و نقل، روایت و درایت سے ادنیٰ مطابقت نہیں رکھتی ۔

---

[1] ہاں عقیدہ بشریت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کو "نورانی بشر" یا "سراجِ منیر" کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن نشین رہے کہ نبی صلعم کا یہ نور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اطہر کا وہ نورِ ازلی و ابدی نہیں جو وحدت غیر منقسمہ ہے ۔ بلکہ یہ مخلوق نور ہے، نورِ ایمان، نورِ نبوت و حکمت، نورِ علم و عرفان، نورِ اخلاق وغیرہ !

اور جن کی طرف یہ خدائی کی نسبت کرتے ہیں وہ خود اس سے دست بردار ہیں اور اس سے برابر اور مسلسل اپنی برأت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آئندہ بروزِ قیامت بھی علیٰ رؤس الاشہاد وہ ان سے بیزاری کا اظہار فرمائیں گے۔ پس حقیقت میں یہ مشرکین و مبتدعین وغیرہ اپنی خواہشات کے پرستار اور شیطان کے پجاری ہیں۔ نہ انھیں اللہ کی حرمت و تعظیم کا کچھ خیال ہے اور نہ نبیؐ اور ولی کا احترام و توقیر ملحوظ خاطر ہے۔ نہ یہ اللہ تعالیٰ کا ادب کرتے ہیں اور نہ نبی اور ولی کا۔ بس ان کے سامنے اپنے باطل مزعومات اور من گھڑت توہمات کی ترویج کا ایک ہی مقصد ہے۔ جس کے لئے وہ اُن محترم ہستیوں کے نام اور ایک خاص "خانہ ساز معیارِ ادب" کو محض آڑ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تاکہ اس طرح وہ اپنے لئے اَرۡبَاباً مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (خدا تعالیٰ سے ورے ورے خانہ ساز خدا) بننے کا راستہ ہموار کر سکیں۔ اور پھر اس دنیا میں مزے لوٹیں۔ اور داد و ستد اور نذر و نیاز کے ذریعہ دولت کے انبار اکٹھے کریں اور اپنی خواہشات کی پوجا کریں۔ اور کرائیں!

مبتدعین کا ایک بہت بڑا گروہ خانہ ساز پیری، مریدی، نیابت و خلافت، ملّائیت و رہبانیت اور گدّی نشینی کی چالوں سے اس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اہلِ ایمان و تقویٰ کو ان کی عیاریوں سے پوری طرح واقف ہو کر عامۃ المسلمین کو آگاہ کرنا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عقائد و اعمالِ سلف صالحینؒ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور تعلیم و تعلّم کا انتظام کرنا چاہیئے ــــ!

اس سلسلہ میں متبعینِ کتاب و سنّت علماء اور صلحاء اپنے علم و صلاحیت کو ظاہر فرمائیں۔ اور بے دینی کے اس سیلاب کے بروقت سدّباب کا انتظام کریں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے!

اللہ تعالیٰ مشرکین، مبتدعین، ملحدین، منافقین، جملہ کفّار و اشرار اور فسّاق و فجّار کے شر سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ و مصون رکھے۔ آمین ــــ!

ایک اور گروہ متفرنجین (فرنگ زدہ) لوگوں کا ہے۔ جو یورپ کی اندھی تقلید میں اس پستی تک جا پہنچا ہے کہ اسلام کا نام لیتے ہوئے بھی اسلام کا وفادار نہیں۔ اور بعض "اسلامی مسلّمات" تک میں شک و شبہ اور تذبذب کا شکار ہے۔ ان لوگوں کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ "نظامِ اسلام" کے قیام و نفاذ میں جہاں تک ممکن ہو، روڑے اٹکائے جائیں۔ تاکہ جس سیرت و کردار کے وہ (یورپ کی تقلید میں) خوگر ہو چکے ہیں۔ اس کے بدلنے کے لئے کسی طرف سے بھی کوئی دباؤ نہ پڑنے پائے۔ اہلِ ایمان کو مردانہ وار میدان میں آکر مومنانہ کردار اور عزائم سے انھیں شکست دینے کے لئے بروقت اقدام کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت ان کے ساتھ ہوگی ــــ!

ان سب تفصیلات کی اساس پر ہم جملہ طبقاتِ شرک و ضلال کے علی الرّغم، علیٰ رؤس الاشہاد اعلان کرتے ہیں اور شہادت دیتے کہ اللّٰہ جَلَّ مَجۡدُہٗ وَعَزَّ قَدۡرُہٗ واحد و یگانہ، لَاشَرِیۡکَ لَہٗ ہے۔ اُس کا دین، اُس کی نصرت و تائید سے ہم انشاء اللہ تعالیٰ قائم کر کے رہیں گے۔ مومنو! مبارکباد، مبارکباد۔ یہ "برہانِ شہادتِ کائنات" ہے ــــ!

دلیلِ ہفتم: ــــ بالاختصار یہ ہے کہ فطرتِ کائنات میں یہ چیز ودیعت ہے کہ وہ ایک اللہ کا اقرار کرے۔ شیوخ و آباء اور ماحول اور سوسائٹی اگر بد ہوں تو ان کے بُرے اثرات سے یہ فطری خوبی (عقیدۂ توحید) غیر فطری بدی (کفر و شرک و ضلالت) سے بدل جاتی ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اصل فطرت پر قائم رہے تو خداداد عقل و فہم اور بصیرت سے

اُسے یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ جلّ شانہٗ واحد ولا شریک لہٗ ہے۔ یہ برہانِ فطرت ہے!

"الٰہ" کا مفہوم و مصداق ہی وہ ذاتِ احد و یگانہ ہے جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو اور جو علم و قدرت اور ربوبیت کے جملہ کمالات سے متصف ہو، اور ایسی ذاتِ اقدس و اطہر اللہ جل شانہٗ ہی ہے۔ دوسرا کوئی بھی نہیں۔ ذرہ ذرہ اُس کی وحدانیت کی گواہی دے رہا ہے۔ دُنیا بھر کے قلم اور سات سمندروں کی سیاہی بھی اس کے دلائل و شواہدِ وحدانیت کی تحریر و ضبط کے لئے کافی نہیں۔ دلائل کی فراوانی اور پختگی کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سبحان اللہ!!

وَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

ہر گیاہے کہ از زمیں روید وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید
برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفترے است معرفتِ کردگار

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرض الموت کے وقت جب آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ سیف الدین عبد الوہاب قدس سرہ نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمایئے، تو آپ نے فرمایا:۔

علیک تقوی اللہ عزوجل ولا تخف احداً سوی اللہ ولا ترج احداً سوی اللہ وکل الحوائج الی اللہ عزوجل ولا تعتمد الا علیہ واطلبہا جمیعاً منہ ولا تثق باحدٍ غیر اللہ عزوجل، التوحید، التوحید۔ (فتوح الغیب)

(اللہ سے ڈر اور اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ کر، اور اللہ کے سوا کسی اور سے کوئی اُمید نہ رکھ۔ اور اپنے سب کام اللہ تعالیٰ ہی کو سونپ! اپنی تمام حاجتیں اُسی سے طلب کر، جو کچھ مانگنا ہو، اُسی سے مانگ! اُس کے سوا کسی اور کی مدد پر بھروسہ نہ رکھ، وہ بڑی عزت والا اور بڑے جلال والا ہے۔ توحید کو لازم طور پر اختیار کر۔ توحید کو۔)

☆

مولینا محمد ناظم ندوی
(پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور)

شرک کیا ہے؟

شرک کیا ہے، جس سے تمام سچے اور غیر محرّف سماوی ادیان نے منع کیا ہے اور جس کے خلاف انبیاء علیہم السلام نے جہاد کیا، اور ہر نبی نے اپنے اپنے زمانہ میں اس سے لوگوں کو متنبہ کر کے باز رکھنے کی سعی کی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام وسیع رحمتوں، عفو و درگذر و بے پایاں مغفرت کے باوجود جرم شرک کو معاف نہ کرنے کا اعلان فرمایا، ہر گناہ کو اگر اللہ چاہے گا تو معاف فرما دے گا مگر شرک کو معاف نہیں کرے گا۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر دون ذلک لمن یشاء

شرک عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی لغت میں شریک اور شرکت کرنا ہیں، لیکن شریعت سماوی کی اصطلاح میں شرک نام ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غیر کو شریک کرنے کا، کوئی مخلوق خواہ وہ نبی ہو یا ولی، بزرگ ہو یا شیخ طریقت، فرشتہ ہو یا جن یا اجرام سماوی۔ جیسے دمکتا آفتاب، چمکتا ہوا چاند یا ٹمٹماتا ہوا ستارہ یا زمین کے عظیم الشان مظاہر قدرت، جیسے موجیں مارتا ہوا سمندر، آبادیوں کو برباد کرنے والا رُخ بدلتا ہوا دریا، خوفناک سر بفلک پہاڑ، ہیبتناک غار، لق و دق میدان، بڑے بڑے سایہ دار درخت، زہریلا اژدہا، دودھ دینے والی گائیں یا کوئی دوسری عظیم الشان مخلوق! ان میں سے کسی کو تدبیر عالم میں موثر حقیقی سمجھنا یا انسانوں کی موت و حیات، بیماری و شفا، رزق و افلاس میں براہ راست دخیل ماننا شرک ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ "خلق" پیدا کرنا، "تکوین" بنانا، رزق دینا، احیاء (زندہ کرنا) اماتہ (مارنا) ابداع تندرستوں کو شفا دینا یا مرادیں پوری کرنا، یا حاجت روائی کرنا وغیرہ صفات کمال پر قوائے طبعی و اسباب مادی کے توسط کے بغیر براہ راست متصرف و قادر ہے، اور تدبیر عالم کے باب میں عالم کی مخفی قوتیں اس کے دست تصرف میں ہیں۔ اور وہ محض اپنے ارادہ و عزم سے جو چاہے کر سکتا ہے یہ سب شرک ہے۔

شرک کا آغاز کس طرح ہوتا ہے

نیکوں کی باتیں نیک اور پاکوں کی باتیں پاک ہوتی ہیں۔ صلحاء اور عبادت گذار بندے بلا شبہ اللہ کے مقرب ہوتے ہیں، ان میں سب سے بلند و ارفع مقام انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور پیام الٰہی و دعوت و رسالت کی تبلیغ میں ان کی تائید الٰہی ہوتی ہے، ان سے خوارق عادات اور معجزے ظاہر ہوتے ہیں، ان کی زندگی ممتاز، ان کا طریق عمل پاک، ان کی سیرت بے داغ اور دوسروں کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اولیاء کرام و بزرگان دین کا حال ہے۔ عبادت و ریاضت سے ان کے قلوب مصفیٰ، زہد و تقویٰ سے ان کے نفوس مزکیٰ ہوتے ہیں، ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ ان کی بہت سی پیشین گوئیاں سچی ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے کشف صحیح ہوتے ہیں۔ جب لوگ انبیاء علیہم السلام کے معجزات، اولیاء کے کشف و کرامات وغیرہ دیکھتے ہیں تو لوگوں پر حیرانی و ذہول کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور انھیں ایسے برگزیدہ افراد سے حسن ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد رفتہ رفتہ یہ عقیدت و محبت اپنے جلو میں احترام و تقدس کے ہزاروں مراسم و آداب ساتھ لاتی ہے اور کچھ لوگ ایسی برگزیدہ و پاک ہستیوں کو انسان سمجھنا اور عام انسان کی طرح انھیں مخاطب کرنا گستاخی اور سوء ادب سمجھتے ہیں۔ یہ جذبۂ احترام تدریجاً تقدیس و عبادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے معجزات یا کشف و کرامات کی حکایات سن کر انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ عالم کی تمام مخفی طاقتیں براہ راست ان کے دست

تصرف میں ہیں۔ وہ چاہیں تو اپنے عزم وارادہ کی بے پناہ طاقت سے غریب کو امیر اور گدا کو شاہ بنا سکتے ہیں، وہ مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں اور بیماروں کو شفا دے سکتے ہیں اور بے اولادوں کی خالی گودوں کو اولاد سے ہری بھری کر سکتے ہیں اور ان کی ہر مراد پوری کر سکتے ہیں وہ قوائے طبعی اور اسباب مادی کے توسط کے بغیر اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ چونکہ ایسے افراد کو تدبیر عالم میں دخیل و مؤثر سمجھا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تقرب کا ذریعہ ان بندگان خدا یا مخلوقات خدا کی پرستش میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔ مشرک اللہ کی عبادت کے منکر نہیں ہوتے بلکہ ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات اس قدر ارفع اور بلند ہے کہ ان کی عبادت، ان کی نیازمندی اور ان کی عبدیت کا اخلاص اس کی بارگاہ تک نہیں پہونچ سکتا لہٰذا ان برگزیدہ ہستیوں ہی کے ذریعہ اس کا تقرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے مشرکین کے قول کو اس عقیدہ باطل کی تردید کے لئے نقل کیا ہے۔

وما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ — ہم ان کی (معبودان باطل) اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے بہت قریب کر دیں۔

ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ یقین جاگزیں ہوتا ہے کہ ان برگزیدہ ہستیوں کو بغیر راضی کئے ہوئے ان کے اعمال قبول نہیں ہو سکتے۔ نہ ان کی دعائیں قبول ہو سکتی ہیں نہ ان کی عبادتیں، نہ ان کی مرادیں پوری ہو سکتی ہیں نہ ان کی نذریں کیونکہ یہ کارگاہِ عالم ان کے نزدیک ایسی شہنشاہیت ہے جس میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں اور ان سب کا ایک شہنشاہ ہے۔ اس شہنشاہ نے اپنے ماتحت بادشاہوں کو خلعتِ ملوکیت سے سرفراز کیا ہے اور انھیں بہت سے اختیارات دیدیئے ہیں، اب یہ شہنشاہ کسی فرد کی کوئی درخواست بغیر اپنے ماتحت کی سفارش کے نہیں سنتا۔ لہٰذا ان کو راضی رکھنا اور ان کی انتہائی تعظیم بجا لانا ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح مشرکین کا عقیدۂ باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے اپنی ریاضت وعبادت، زہد وتقویٰ سے اللہ کو راضی کر لیا ہے اور اس نے انھیں خلعتِ الوہیت سے سرفراز کیا ہے اور تدبیر عالم میں وہ براہ راست دخیل ہیں۔ عالم کی مخفی قوتیں ان کے دست تصرف میں ہیں اور نفع ونقصان پہونچانے پر قدرت رکھتے ہیں تدبیر عالم کے ساتھ عبادت کا تصور لازم وملزوم ہے، کیونکہ جس ہستی کو مدبر عالم مانا جائے گا، جس کے ہاتھ میں نفع وضرر کی کلید ہوگی اس کی عبادت ناگزیر طور پر کی جائے گی۔ شرک کا سرچشمہ یہی باطل عقیدہ ہے۔ اس باطل عقیدہ سے شرک کے تمام مظاہر پیدا ہوئے اور زمانہ قبل اسلام میں شرک وکفر عام ہوا یہود ونصاریٰ نے حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو اسی تقرب ومحبوبیت کی بنا پر اللہ کا بیٹا کہا اور خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ کو ان کے معجزات اور بن باپ کی پیدائش کی وجہ سے اللہ کا درجہ دیا بلکہ عین اللہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں اولیاء اور صوفیائے کرام کے متعلق بعض نام نہاد مسلمانوں میں اسی قسم کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اور ان کی قبروں پر اسی عقیدۂ باطل اور غلو محبت کی وجہ سے سجدہ تک کیا جاتا ہے۔ اور ان سے مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ خود رسول کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ لوگ بشر نہیں سمجھتے اور بشر کہنے والوں کو گستاخ، بے ادب اور آداب رسالت سے بے خبر کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ کے ہاتھ میں عالم کی تمام مخفی طاقتیں ہیں۔ اور ایک من چلے شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے (معاذ اللہ)

انسانوں کو اللہ کے برابر سمجھنے والوں کے علاوہ دنیا میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اجرام سماوی کو ذی شعور، ذی عقل اور ذی فہم سمجھتے ہیں۔ ان کی عبادت کرنے والوں کو مصائب سے بچا سکتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں نفع دے سکتے ہیں۔ یہ ستارہ پرست اب بھی پائے جاتے ہیں، افریقہ اور ہندوستان وپاکستان میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آفتاب وماہتاب اور دوسرے سیاروں کی

عبادت کرتے ہیں۔

اجرام سماوی میں سب سے بڑا سیارہ آفتاب ہے۔ آفتاب کو اللہ تعالیٰ نے حرارت و نور کا سرچشمہ بنایا ہے، اس کی گردش سے لیل و نہار، صبح و شام بنتے ہیں، اس کے قرب و بعد سے موسمی تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گرما، سرما، بہار و خزاں کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی حرارت سے کھیتیاں اُگتی اور پکتی ہیں، پودوں میں پھول، درختوں میں پھل آتے ہیں، غرضکہ زمین پر اس کے بیشمار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسان نے جب ان امور کو محسوس کیا تو وہ خالق آفتاب کے بجائے خود آفتاب کو قابل تعظیم و تقدیس سمجھ بیٹھا، اس کا عقیدہ ہوگیا کہ جو عالم میں تغیرات و انقلابات کا اتنا بڑا سرچشمہ ہے وہ یقیناً اپنے پجاریوں کی مصیبت کے وقت کام آئے گا اور اس کی مرادیں پوری کرے گا۔ چنانچہ ستارہ پرستوں نے اس کی عبادت کو مذہب کا جزو قرار دیا اور طلوع و غروب کے وقت اس کے سامنے رکوع کرکے اور ہاتھ جوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔

اسی طرح ماہتاب کو بھی دیوتا سمجھا گیا۔ کیونکہ یہ دلکش و دلفریب سیارہ نہ صرف اندھیری راتوں میں اپنے نور سے اجالا کرتا ہے بلکہ اس کے بھی ہمہ گیر اثرات محسوس کئے گئے ہیں۔ سمندر میں مد و جزر کا ماہتاب کے گھٹنے اور بڑھنے سے تعلق ہے۔ خاص خاص قمری تاریخوں میں سمندر میں مد و جزر ہوتا ہے۔ ساحل سمندر اور جزیروں کے باشندوں کو مد و جزر کا ہر ماہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ ابتداءً جب انسان نے چاند کی مخصوص تاریخوں میں بار بار ہر ماہ ایک ہی قسم کا عمل دیکھا اور سمندر کی طغیانی سے اسے جانی و مالی نقصان ہوا تو اس نے ایک طرف سمندر کو اور دوسری طرف چاند کو راضی کرنے اور اس کے شر سے بچنے کے لئے چاند کی پرستش شروع کردی اور چاند کے نام پر بڑے بڑے مجسمے اور ہیکل تعمیر کئے۔ سومناتھ کا مندر اسی عقیدہ ماہتاب پرستی کا مظہر تھا۔ یہ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر چاند کی پرستش کے لئے بنایا گیا تھا۔ جس میں چاند کے نام پر ایک عظیم الشان بت تھا۔ سنسکرت میں "سوم" چاند کو کہتے ہیں۔ اور "سوم وار" کا دن بھی اسی چاند کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہے جیساکہ ہفتہ کے دوسرے نام بھی سات ستاروں کی طرف منسوب ہیں۔ اتوار جو سنسکرت میں ایدت وار ہے، "ایدت" آفتاب کو کہتے ہیں اور یہ دن آفتاب کی طرف منسوب ہے۔ اور اسی طرح سنیچر وغیرہ۔ انگریزی میں SUNDAY و MONDAY بھی آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب ہیں۔

اسی طرح پہاڑ کی بلند چوٹی کو دیوتا کا درجہ دیا گیا، بڑے بڑے دریاں کی عظمت کا راگ الاپا گیا۔ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور جانوروں کے منفعت بخش ہونے کا کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن حضرت انسان نے ان سب کو رفتہ رفتہ مقدس بنالیا اور ان کی عبادت کی جانے لگی

قرآن حکیم نے سب سے پہلے توحید کی دعوت دی لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا اعلان کیا اور تیرہ برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی میں اسی توحید کی تبلیغ فرمائی۔ اس ساری مدت میں نماز کے سوا کسی دوسرے حکم پر اس تفصیل کے ساتھ قرآن حکیم نے اور رسول اللہ نے زور نہیں دیا، "ایاک نعبد و ایاک نستعین" (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) کو ہر نماز میں دہرا کر اس عملاً مسلمانوں کی زندگی کا جز بنایا گیا۔ اور غیر اللہ سے ہر قسم کا غیر مرئی رشتہ توڑ دیا گیا۔ ماسوا اللہ کے ہر ایک کے عجز و ضعف اور اللہ کے مقابلہ میں اس کی بے چارگی اور درماندگی کی تلقین کی گئی۔ لا دافع لمن وضعہ اللہ ولا واضع لمن رفعہ اللہ۔ اللہ جس کو پست کرے اس کو کوئی بلند کرنے والا نہیں اور اللہ جس کو بلند کرے اسے پست کرنے والا نہیں۔ نفع و نقصان، راحت و تکلیف، امارت و غربت، خوش حالی و تنگدستی، صحت و بیماری، زندگی و موت کا تعلق صرف قضا و قدر سے وابستہ کرکے تمام معبودان باطل اور غیر اللہ کے متعلق اس غلط عقیدہ کو مٹادیا کہ وہ کسی کو بطور خود کسی قسم کا نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یا ان کے ہاتھ میں تدبیر عالم کی مخفی طاقتیں ہیں۔

لہٗ مقالید السمٰوٰت والارض "اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں"۔ بغیر اللہ کی اجازت اور اذن کے کسی کو اللہ کے سامنے گفتگو کرنے کی مجال تک نہیں ہوگی لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا "یہاں تک کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت وسفارش کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔ ومن ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ "اور کس کی مجال ہے کہ اللہ کے حضور میں شفاعت کر سکے مگر اس کے اذن و اجازت سے" انبیاء علیہم السلام بلکہ صلحاء و اتقیاء بھی شفاعت کریں گے لیکن بطور خود نہیں بلکہ اللہ کی اجازت کے بعد۔

قرآن حکیم نے شرک کی تمام اساس کو کھود کر گرا دیا۔ حضرت عُزیرؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی ابنیت کو کفر قرار دیا، تثلیث کو کفر و شرک کہا۔ آفتاب و ماہتاب کو انسانوں کا چاکر بتا کر اس کی بیچارگی اور اس کے مخلوق ہونے کا اعلان کیا۔ ولا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الواحد القہار۔ "نہ آفتاب کو سجدہ کرو نہ ماہتاب کو بلکہ صرف ایک اللہ کو سجدہ کرو جو بڑی قوت والا ہے"۔ کسی انسان کی ایسی تعظیم سے جو عبادت کے حدود میں داخل ہو جائے رسول اللہ[2] نے منع فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کرامؓ کی مجلس میں تشریف لاتے تو صحابۂ کرام تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ آپ نے فوراً تعلق احترام اور عبادت انگیز تعظیم کے درمیان فرق پر متنبہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ میرے لیے تم اس طرح کھڑے نہ ہو جس طرح عجمی اپنے بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جس طرح خشوع و خضوع اور عبدیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بادشاہوں کی تعظیم کرتے ہیں تمہیں ایسے مظاہرے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایک صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ! عجمی اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کو کیوں نہ سجدہ کریں؟ آپ نے فرمایا "نہیں ایسا نہ کرو۔ اگر کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ! ہم ملنے کے وقت کیوں[3] نہ جھک کر آپ سے ملیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، تم صرف مصافحہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے تمام رخنہ کو بند فرمادیا کہ مبادا یہی احترام و اکرام کا جذبہ رفتہ رفتہ امت محمدیہ میں سجدۂ تعظیمی کی شکل اختیار کر لے اور تدریجاً غیر اللہ کی عبادت کی جانے لگے۔

عبادت و ریاضت، تقویٰ و طہارت، شرافت و مروت، غمخوارگی و امداد، اتحاد و تنظیم، اخوت و برادری، اور عدل عمرانی و مساوات انسانی اور دوسرے تمام صفات حمیدہ اسی توحید کی تفصیلی تعلیمات کے نتائج ہیں اور اسی شجر کے ثمرات ہیں۔ جب تک مسلمان صحیح توحید کے حامل رہے۔ دنیا کی عظیم الشان قوت بنے رہے اور جب سے اسلامی توحید کو پس پشت ڈال کر عجمی اور غیر اسلامی فلسفہ الٰہیات میں الجھ گئے، توحید کا چہرہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور بہت سے مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو گئے۔

قبروں پر مسلمان خواتین کا جھرمٹ
اور ان پر مجاوروں کی وہ دزدیدہ نگاہی
(ماہر)

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری [3] ابوداؤد

مولوی عبدالرحمٰن حماد
(استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد)

انسانی زندگی پر توحید کے اثرات

حیات و کائنات کے بارے میں مختلف نظریات اور تصورات ہیں، جن کے اثرات بھی نوع انسانی پر مختلف انداز سے مترتب ہوتے ہیں۔ اور سب نظریات میں ایک ہی نظریہ ایسا ہے جس کی صداقت و حقانیت پر کائنات و پروردگار کائنات، ملائکۂ مقدسہ، ارباب دانش و بینش، اور عالم آب و گل کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (خود اللہ تعالیٰ نے بنفس نفیس اس حقیقت نفس الامری کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اس گواہی میں اللہ کے فرشتوں کے ساتھ وہ بندگان الٰہی بھی شامل ہیں جن کو علم و عرفان اور عقل و وجدان کی نعمت اللہ نے ودیعت فرمائی ہے۔ اور اُن تمام کی شہادت اس امر واقعہ پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے درمیان کچھ اس طرح عدل و انصاف اور اعتدال و توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے کہ ہر مخلوق کی فطرت کے ساز سے بے ساختہ یہ نغمۂ جانفزا پھوٹ نکلتا ہے کہ اللہ رب العزت کے سوا کائنات کا پروردگار اور معبود و مسجود کوئی دوسرا نہیں ہے، نہ صرف اتنی ہی بات کہ عبودیت و پرستش کی مستحق تنہا خدائے واحد کی ذات بزرگ و برتر ہے۔ بلکہ یہ بھی حقیقت ثابتہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہی مملکت عالم پر بلاشرکت غیرے سلطانی و فرمانروائی کر رہی ہے، کائنات پر غلبہ و قبضہ اللہ ہی کا ہے، عزت و قدرت اسی کو سزاوار ہے، اور تخلیق عالم اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی کی مرہون منت ہے۔ یہ ہے وہ نظریۂ حق جسے نظریۂ توحید کہا جاتا ہے۔ اور اس نظریہ کے علاوہ باقی تمام نظریات باطل، غلط اور خود ساختہ ہیں اور ان کی پشت پر نہ کوئی دلیل عقلی ہے اور نہ ثبوت نقلی۔ اور اس کے مقابلہ میں تصور توحید پر آفاق و انفس میں اس قدر دلائل واضح اور براہین ساطعہ موجود ہیں کہ ان کا انکار صرف وہ کور باطن ہی کر سکتا ہے جسے روز روشن پر بھی شب دیجور کا وہم و گمان ہونے لگتا ہے ؎

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

یہ عقل باختگی اور دانش فروشی نہیں تو اور کیا ہے کہ آدمی اپنے وجود فانی کا تو قائل ہو جائے اور اس ذاتِ باقی کا صاف انکار کر دے جس نے اسے خلعت وجود سے سرفراز کیا ہے۔ مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوگا اگر ان تصورات کی جانب بھی مختصراً اشارہ نہ کر دیا جائے جو خالق کائنات کے بارے میں نوع انسانی کے گمراہ طبقوں نے گھڑ لئے ہیں۔

ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ کائنات بے خدا ہے۔ کسی نے اسے بنایا نہیں، خود ہی بن گئی ہے، خود ہی چل رہی ہے اور ایک دن خود ہی ختم بھی ہو جائے گی۔ کچھ لگے بندھے قوانین ہیں جن سے ہنگامۂ کون و فساد کی گرم بازاری ہے۔ مخلوقات پیدا ہوتے رہتے ہیں، مرتے رہتے ہیں، آغاز حیات کا انجام مرگ مفاجات ہے اور موت کے بعد کسی کے سامنے اعمال کی جواب دہی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس سے زیادہ مہمل بات اور خیال باطل آخر کیا ہو سکتا ہے کہ مشاہدۂ صنعت کے باوجود صانع کا انکار کر دیا جائے۔ دنیا کا ہر انسان یہ بخوبی جانتا ہے کہ ہوائی جہاز سے لے کر ایک معمولی سوئی تک کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی پھر دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ کیسے بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر نے وجودِ

باری تعالیٰ کے انکار پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی ظاہر و باہر حقیقت ہے جس کا انکار کوئی شخص با قائم ہوش و حواس نہیں کرسکتا۔ کائنات کی خارجی شہادت کے علاوہ ہر آدمی کا ضمیر و وجدان بھی ہر آن بہت سے داخلی براہین فراہم کرتا رہتا ہے کہ باری تعالیٰ کے وجود کو ایک بدیہی واقعہ کی طرح تسلیم کیا جائے۔ انبیاء کرام کو انکار خداوندی کے نظریۂ باطل پر کس قدر حیرت ہوتی رہی ہے اس کا اندازہ اس آیت کریمہ سے کیا جاسکتا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ط

ان کے پیغمبروں نے کہا کیا اس اللہ کے بارے میں بھی کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمہیں اسلئے (اپنے رسولوں) کی معرفت حق کی دعوت دے رہا ہے کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کردے، اور ایک مقرر مدت تک مہلت عطا فرمائے۔

جو بدخود غلط لوگ اپنے خالق کے وجود کا انکار کرنے کی حماقت میں مبتلا ہوتے ہیں انہی کو مادہ پرست، دہریے اور ملحدین کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ اسی قسم کے منکرین خدا سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ چند ملحدین، امام اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو وجود باری کے مسئلہ پر مناظرہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت امام نے ملحدین کا چیلنج قبول تو کر لیا مگر تین دن بعد مناظرہ کی تاریخ مقرر فرمائی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر منکرین خدا حضرت امام کے پاس پہونچ گئے۔ مناظرہ شروع کرنے سے قبل امام موصوف نے ان ملحدوں سے دوران گفتگو میں یہ فرمایا کہ دوستو! مناظرہ کے آغاز سے پہلے میں ایک دلچسپ واقعہ تمہارے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میں کل شام کو تفریح کے لئے ساحل سمندر پر گیا ہوا تھا وہاں میں نے ایک عجیب و غریب ماجرا دیکھا، اور یہ اپنی نوعیت کا ایک نرالا واقعہ تھا، ساحل پر میں ٹہل رہا تھا کہ سمندر میں کچھ شور ہوا میں نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا سا درخت سمندر کی سطح پر نمودار ہو رہا ہے، پھر وہ خود ہی کٹتا اور مختلف ٹکڑوں میں بٹتا جارہا ہے، اس کے بعد وہ کشادہ تختوں میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ پھر وہ تختے ایک خاص تناسب کے ساتھ باہم جڑتے جارہے ہیں۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچھا خاصا جہاز میرے سامنے تیار کھڑا ہے۔ جہاز کو مکمل ہوئے کچھ زیادہ عرصہ گزرا بھی نہیں تھا کہ ساحل پر مختلف قسم کے ساز و سامان اور اسباب کا ڈھیر لگ گیا۔ پورا سامان خود ہی جہاز میں منتقل ہو گیا اور وہ جہاز بغیر کسی ملاح کے خود بخود چل پڑا اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گیا۔

یہ واقعہ سنکر تمام منکرین خدا حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے بول پڑے۔ امام صاحب آپ کی عقل و دانش کا بڑا شہرہ ہم سن رہے تھے۔ لیکن آج آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کہ اگر ایک بچہ بھی انھیں سن پائے تو بے ساختہ ہنس دے۔ کیا آج تک کبھی ایسا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ جہاز خود ہی تیار ہو جائے۔ اپنی بناوٹ کی ابتدا سے آخر تک سارے مراحل خود ہی طے کر لے اور ساز و سامان لاد کر خود ہی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جائے؟ یا تو آپ کا دماغ چل گیا ہے یا آپ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ حضرت امامؒ نے سنجیدگی سے ارشاد فرمایا۔ میرے بھولے دوستو! تمہاری عقل جب یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی ہے کہ ایک جہاز آپ سے آپ تیار ہو سکتا ہے تو پھر وہی تمہاری عقل یہ عظیم جھوٹ کیسے تمہاری زبان سے کہلواتی ہے کہ اس عالم کا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ زمین و آسمان، مہر و ماہ، انجم و کہکشاں اور عالم کا پورا کارخانہ بغیر کسی خدا کے نہ صرف یہ کہ وجود میں آگیا ہے بلکہ باقاعدگی اور باضابطگی کے ساتھ چل بھی رہا ہے، اپنے خالق و معبود کا انکار کر کے کیا تم افلاس فکر و نظر اور اپنی عقل کے دیوالیہ پن کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہو؟

حضرت امامؒ کے اس انداز استدلال سے ملحدین کے حجابات نظر اٹھ گئے اور ان سبھوں نے امام موصوف کے دست حق پرست پر الحاد و زندقہ سے توبہ کر لی اور پرستاران توحید کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔

ہر انسان کی فطرت میں حقیقت توحید کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سمو دیا ہے کہ وہی اس امر واقعہ سے روگردانی کر سکتا ہے جس نے اپنی فطرت ہی کو ہوا و ہوس اور جحود و عناد سے مسخ کر لیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا تھا اسی وقت عالم مثال میں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے اللہ نے ان کے سامنے برملا اس حقیقت کا اعلان فرما دیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور سب بندوں سے توحید پر قائم رہنے کا وعدہ اور اقرار بھی لیا تھا۔ اس طرح گویا سلطان کائنات نے اپنے خلیفۂ ارضی سے حلف وفاداری اٹھوایا تھا۔

مشہور مفسر قرآن حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک آیت کریمہ کی تشریح کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُس واقعہ کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے:۔

وَعَنْ اُبَیِّ ابْنِ کَعْبٍ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ قَالَ جَمَعَهُمْ فَجَعَلَهُمْ اَرْوَاحًا ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ فَتَكَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَیْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِیْثَاقَ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ فَاِنِّیْ اُشْهِدُ عَلَیْكُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ وَاُشْهِدُ عَلَیْكُمْ اَبَاكُمْ اٰدَمَ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا اِعْلَمُوْا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ غَیْرِیْ وَلَا رَبَّ غَیْرِیْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِیْ شَیْئًا اِنِّیْ سَاُرْسِلُ اِلَیْكُمْ رُسُلِیْ یُذَكِّرُوْنَكُمْ عَهْدِیْ وَمِیْثَاقِیْ وَاُنْزِلُ عَلَیْكُمْ كُتُبِیْ قَالُوْا شَهِدْنَا بِاَنَّكَ رَبُّنَا وَاِلٰهُنَا لَا رَبَّ لَنَا غَیْرُكَ وَلَاۤ اِلٰهَ لَنَا غَیْرُكَ فَاَقَرُّوْا بِذٰلِكَ وَرُفِعَ عَلَیْهِمْ اٰدَمُ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ فَرَاَی الْغَنِیَّ وَالْفَقِیْرَ وَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّیْتَ بَیْنَ عِبَادِكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْكَرَ وَرَاَی الْاَنْۢبِیَآءَ فِیْهِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَیْهِمُ النُّوْرُ خُصُّوْا بِمِیْثَاقٍ اٰخَرَ فِی الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ اِلٰی قَوْلِهٖ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ كَانَ فِیْ تِلْكَ الْاَرْوَاحِ فَاَرْسَلَهٗ اِلٰی مَرْیَمَ عَلَیْهَا السَّلَامُ فَحُدِّثَ عَنْ اُبَیٍّ اَنَّهٗ دَخَلَ مِنْ فِیْهَا رَوَاهُ اَحْمَدُ۔

(ترجمہ) حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ (اور جب تیرے پروردگار نے......) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روز ازل، ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو جمع کیا پھر ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا پھر انھیں مثالی صورتیں دے کر اُن سے کہلوایا، چنانچہ وہ بول پڑے، پھر ان سے اللہ نے اپنی کبریائی و یکتائی کا قول و قرار لیا اور اولاد آدم کو خود ان کی اپنی جانوں پر گواہ بنایا۔ گواہ بناتے ہوئے ان سے پوچھا۔ کیا میں تم سب کا پروردگار نہیں ہوں۔ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا، ہاں کیوں نہیں، تو ہی ہمارا پالنہار ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا دیکھو میں تمہارے اس اعتراف حق پر ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ بنا رہا ہوں۔ مبادا تم روز قیامت یہ کہہ کر مکر جاؤ کہ ہمیں اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جان لو کہ نہ میرے سوا کوئی تمہارا معبود ہے اور نہ میرے علاوہ کوئی تمہارا پروردگار ہے۔ لہٰذا تم کسی کو میرا شریک نہ ٹھہراؤ۔ تمہارے دنیا میں بھیجے جانے کے بعد مختلف اوقات میں تمہاری ہدایت کے لئے میں اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو بھیجا کروں گا اور وہ تمہیں یہ قول و قرار جو اب تم نے مجھ سے کیا ہے یاد دلاتے رہیں گے اور تمہاری رہنمائی کے لئے میں اپنی کتاب بھی نازل کروں گا۔ یہ سن کر سبھوں نے فوراً یہ جواب دیا۔ الٰہنا ہم اس امر پر گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے اور نہ کوئی ہمارا معبود ہے۔ چنانچہ پوری نوع انسانی نے اللہ کی توحید کا اقرار کر لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مختلف درجات و طبقات کے لوگ نظر آئے مالدار بھی تھے، نادار بھی تھے، حسین و جمیل افراد بھی تھے اور معمولی شکل و صورت والے انسان بھی تھے، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں جو یہ فرق و تفاوت دیکھا تو باری تعالیٰ سے گذارش کی۔ مالک! تو نے اپنے تمام

بندوں کو یکساں کیوں نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے اسی لئے میں نے بندوں کے درمیان فطری طور پر امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انسانوں کے اس ہجوم میں انبیاء کرام کو بھی دیکھا جو روشن چراغوں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ اور ان سے نبوت و رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی عہد بھی الگ سے لیا گیا تھا اور اسی کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ الآیۃ۔ اور گروہ انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی موجود تھے ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہ السلام کی طرف بھیجا اور وہ ان کے منہ کی طرف سے داخل ہو گئی تھی۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔"

الحاد و دہریت کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہوتا ہے کہ انسان خدا کا بندہ بننے کے بجائے بندوں کا خدا بن جاتا ہے اور زندگی گذارنے کے لئے خود ہی دستور و قانون بنانے لگتا ہے یہ خالص جاہلیت کا نظریہ ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات آپ سے آپ تو نہیں چل رہی ہے اس انجن کا چلانے والا ہے تو ضرور مگر ایک نہیں بلکہ ان گنت الٰہ اور بیشمار خداوندگان تقسیم کار کے اصول پر نظامِ عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس خیالِ باطل کی بنا پر انسان کی زندگی اوہام و خرافات کا شکار ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور وہ جس کسی میں بھی نفع و نقصان محسوس کرتا ہے اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ چاہے وہ اجرام سماوی ہوں یا اصنام خاکی۔ اور یہ مشرکانہ نظریہ ہے جسے قبول کر لینے کے بعد مسجود ملائک، لکڑی، کاغذ اور پتھر کے بتوں سے لے کر سانپ بچھو، قبور و مزارات اور اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی میں اپنی قیمتی زندگی تباہ کر لیتا ہے اور وہ مراسم و بدعات کے نرغے میں کچھ اس طرح گھر کے رہ جاتا ہے کہ پھر اسے عمر بھر الجھنوں سے نجات نہیں ملتی اور اس کا سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے۔ نظام کائنات میں جو ربط و ضبط، نظم و جزم اور ہم آہنگی و یکسانی نظر آتی ہے وہ خود عقیدہ توحید کی تائید اور شرک کی تردید میں ایک مستقل دلیل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مشرکانہ تصور پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں یہ دلیل پیش فرمائی ہے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ اگر ان دونوں یعنی زمین و آسمان میں ایک معبود کے بجائے کئی معبود ہوتے تو وہ دونوں کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایک درس گاہ کے دو ناظم، ایک کارخانے کے دو منتظم اور ایک جہاز کے دو کپتان جب نہیں ہو سکتے تو سلطنت کائنات کے دو فرمانروا کیسے ہو سکتے ہیں۔ دو بالفرض ایک خدا کے بجائے کئی خدا ہوتے تو ان کی تدابیر و ارادہ میں تصادم ہوتا ایک چاہتا کہ سورج پورب سے طلوع ہو، اور دوسرا اُسے پچھم کی طرف سے نکلنے کا حکم دیتا۔ اس طرح وہ دونوں آپس ہی میں ٹکرا کے خود بھی ختم ہوتے اور عالم کو بھی فنا کر دیتے۔ جو ذات زوال آمادہ ہو وہ خدا نہیں اور جو خدا ہے اُسے کبھی فنا نہیں۔ زندگی کا دھارا ازل سے ایک ہی رُخ پر اور ایک ہی انداز سے بہہ رہا ہے اور وہ خود اس حقیقت کبریٰ کا ترجمان ہے کہ یہ عالم بے خدا نہیں، پروردگار اپنی ذات و صفات کے ساتھ موجود ہے اور وہ صرف ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق ایک اور غلط خیال یہ ہے کہ وہ موجود بھی ہے اور معبود بھی ہے، لیکن اُسے دنیا اور دنیا والوں کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ایک بار اس نے کارخانہ عالم چلا دیا ہے اور خود گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ نظامِ عالم خود بخود چلتا رہے گا اور کبھی رُکے گا نہیں۔ آخرت اور جنت و دوزخ کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنے اعمال کی جزا اور کرموں کا پھل پانے کے لئے، مختلف جنم لیتا رہتا ہے اور مختلف روپ دھارن کرتا رہتا ہے۔ یہ عقیدۂ تناسخ ہے جس کا بطلان بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔ عقل سلیم اس امر کو کیسے باور کر سکتی ہے کہ ایک ہی وجود کبھی انسان کبھی حیوان، کبھی درخت اور کبھی پتھر بن جائے۔ اور ایک جنم میں ماں بیٹے کا رشتہ جن کے درمیان قائم رہا ہو وہ دونوں اگلے جنم میں میاں بیوی بن جائیں۔ اس سے زیادہ لچر اور بے ہودہ عقیدہ شاید ہی کسی نے گھڑا ہو۔

ایک تصور یہ ہے کہ باپ بیٹا اور روح القدس تینوں مل کر ایک خدا کے پیکر بن گئے ہیں۔ یہ عقیدہ تثلیث ہے جو اقانیم ثلاثہ کے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے، ایک میں تین اور تین میں ایک والی مہمل بات وہی نادان کہہ سکتا ہے جس کی عقل و دانش بھی ایک تہائی سے زیادہ باقی نہ رہ گئی ہو۔

ایک اور رائے خدا کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہے تو صرف ایک ہی لیکن اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا دیوتاؤں اور دیویوں کی شکل میں پیدا کر لئے ہیں تاکہ اس کا بارِ گراں ہلکا ہو جائے۔ اور اس نے دنیا کے امور اپنے ماتحت خداؤں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ چنانچہ یہ سارے خدایگانِ کوچک، خدائے خدایگان کی ہدایت کے مطابق کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں۔ اس عقیدہ سے اللہ کی بے بسی، بے چارگی اور فقر و احتیاج کا تصور جنم لیتا ہے۔ اور جو ہستی بے کس و محتاج ہے وہ آخر کیسے خدائی کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ (معاذ اللہ)

ایک اور غلط فہمی جس میں بعض مسلمان تک مبتلا ہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور وہ بالکل اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اپنے بندوں سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ صرف نماز، روزہ، پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کی حد تک اللہ سے وابستگی رکھیں، باقی زندگی کے دوسرے معاملات میں انھیں آزادی ہے کہ وہ اپنے لئے جو طریقہ پسند کریں اختیار کر لیں۔ اُن کا طرزِ عمل گویا اس فکر و خیال کا نمایاں مظہر ہوتا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کے حوالے کرو۔ ایسے لوگ بہ یک وقت، رحمان اور شیطان دونوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز اور خوف و ناخوف کی تمیز کئے بغیر اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق من چاہی زندگی گذارتے ہیں اور عبادات کے علاوہ کسی اور معاملہ میں اللہ اور رسولؐ کی ہدایات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ نظامِ باطل کے زیر سایہ بڑے اطمینان کے ساتھ نہ صرف نماز روزہ اور دوسرے ارکان عبادت کی پابندی کرتے ہیں بلکہ تسبیح و تہلیل، دلق و سجادہ اور وظائف و اوراد کے مشاغل میں بھی کوئی فرق و کوتاہی نہیں ہونے دیتے۔ بایں ہمہ اُن کو کسی وقت بھی اس امر کا احساس نہیں ہو پاتا کہ ان پر سلطان کائنات کی فرمانروائی کے بجائے غیر اللہ کی حکمرانی ہے۔ اسی غلط فہمی کے باعث آج دنیا کی بہت سی مسلمان حکومتیں اسلام کے اصول سلطنت سے آزاد ہو کر کاروبار مملکت چلا رہی ہیں اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہیں کر رہی ہیں۔ دین و سیاست کی جدائی اور مذہب و حکومت کی دوئی کا تصور نتیجہ ہے اسی غلط عقیدہ کا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے صرف عبادات کافی ہیں زندگی کے دیگر امور میں اسے دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق مذکورہ آراء و تصورات کے علاوہ اور جس قدر بھی نظریات ہیں وہ سب انہی خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ توحید کیا ہے؟ اور اسے انبیاء کرام کس شکل میں پیش کرتے رہے ہیں؟ اسلام کا نظریہ توحید مختصر الفاظ میں یہ ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نوعِ انسانی سے فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بالکل بے نیاز ہے، اس نے کسی کو جنا بھی نہیں اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے اور کوئی بھی اسکی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں شریک و سہیم نہیں ہے۔

تمام انبیاء کرام اس نظریہ توحید پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ یہ ساری کائنات جو بنی آدم کے گرد و پیش پھیلی ہوئی ہے وہ، اور خود ذاتِ بشری بے خدا نہیں ہے۔ اللہ ہی نے سب کو وجود بخشا ہے، سر و سامان عطا کیا ہے، زندگی کی ضروریات بخشی ہیں، مادی وسائل و اسباب بھی دیئے ہیں، اور روحانی ہدایت و اخروی سعادت کا انتظام بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے اکیلا اور تنہا ہے۔ اپنے کاموں میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہی سب کا پروردگار ہے اور متصرف و مختار ہے، جلاتا وہی ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے آتی ہے، نفع و نقصان کا اختیار اس کے سوا کسی کو نہیں۔ رزق کے خزانے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، انقلاب عالم اور حالات کا اتار چڑھاؤ اسی کی مشیت کا مرہونِ منت ہے۔ یہ کائنات ایک منظم سلطنت ہے، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کا حاکم و فرمانروا ہے، تمام اختیارات کا منبع اسی کی ذات والاصفات ہے۔ انسان فطری اور پیدائشی اعتبار سے ہی اللہ کی رعیت ہے۔ جس قدر اختیار اللہ نے انسان کو بخشا ہے وہ بغرض آزمائش ہے۔ عقیدۂ توحید سے انسانی زندگی پر خوش آئند و خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عقیدہ توحید کو قبول کرنے اور زندگی کو منطبق

سانچے میں ڈھالنے سے انسان کو طمانیتِ قلب کی وہ دولت نصیب ہو جاتی ہے جس کا تصور بھی کسی دوسرے عقیدہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بدولت زندگی کی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں اور دل کی بے چینیاں ختم جاتی ہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک مرکزِ محبت کا ذوق طلب ودیعت کر دیا گیا ہے۔ صرف عقیدہ توحید ہی سے اس ذوق کو مکمل آسودگی ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید کا قائل کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ نسل و رنگ، خاندان و قبیلہ، فرقہ و قوم اور وطن و مرز بوم کی تنگنائیوں میں وہ کبھی محصور نہیں ہوتا بلکہ سارے دنیا کو اپنا وطن اور تمام انسانوں کو ایک ہی برادری کے افراد تصور کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان میں جرأت، غیرت، خودداری اور عزتِ نفس کا جوہر پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی میں بھی نفع و نقصان پہونچانے کی ذرا بھی مقدرت نہیں ہے۔ خودداری کے ساتھ تواضع و انکسار کا پیوند بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے لیکن عقیدۂ توحید کا کمال ہے کہ شخص واحد میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ موحد اپنے ہر کمال کو خدا کی دین سمجھتا ہے اور اس پر پھولتا نہیں عقیدۂ توحید فلاح و نجات کے لئے چونکہ نیک عملی، پاکیزگیٔ نفس اور رفعتِ کردار کو ضروری ٹھہراتا ہے اس لئے موحد صرف گفتار کا غازی نہیں ہوتا بلکہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے۔ فسخِ عزائم اور ناکامیوں سے موحد کبھی مایوس و دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک ان دیکھی بالاتر قوت موجود ہے جو اس کے ارادوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عقیدۂ توحید کا قائل حوصلہ مند، اولوالعزم اور صبر و توکل کا پیکر ہوتا ہے۔ اور اس کے ضمیر و ایمان کو نہ کچلا جا سکتا ہے اور نہ خریدا جا سکتا ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ؛ چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ؛ ہمیں است بنیادِ توحید بس

موحد کے پاؤں پر چاہے اشرفیوں کے انبار لگا دیں یا اس کے سر پہ تلوار چلا دیں لیکن خدا کے سوا کسی سے اس کو نہ خوف ہوتا ہے نہ امید۔ الغرض توحید اسلام کا سرچشمہ اور طغرائے امتیاز ہے ؛

بقیہ اسلام میں توحید

نہیں آتا! ایسے اضطراب و اضطرار کے وقت بھی ان کے دل کی صدا بے اختیار "یا شیخ فلاں المدد!" ہی ہوتی ہے۔ کوئی علامہ آلوسی کے اس سوال کا جواب دے کہ ایّ الفریقین اھدیٰ سبیلا! دونوں گروہوں میں سے کون راہِ ہدایت سے زیادہ قریب ہے؟

علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں ایک حکایت لکھی ہے کہ مصر کے کچھ لوگ سمندر کے سفر کیلئے روانہ ہوئے راستہ میں طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور جہاز جھونٹے کھانے لگا۔ چاروں طرف سے فریاد و زاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں، کوئی پکارتا یا سید بدوی" کوئی چیختا یا سید رفاعی" کسی کی زبان سے نکلتا" یا شیخ عبد القادر جیلانی"! ایک صاحب ایمان اہل دل بھی اتفاق سے جہاز میں موجود تھے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ بھی دعا کیجئے۔ اس درخواست کے جواب میں انھوں نے ہاتھ اٹھا کر چیخنا شروع کیا:

یارب اغرق اغرق ما بقی احد یعرفک — اے خدا ان سب کو غرق کر دے کیونکہ ان میں کوئی تیرا پہچاننے والا باقی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو گمراہی سے بچائے اور راہِ ہدایت پہ چلائے! (آمین)

مولانا مفتی محمد شفیع
(موسس و شیخ الجامعہ دار العلوم کراچی)

بدعت اور اُسکی خرابیاں

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق آخر زمانہ میں فتنوں کی کثرت ہونے والی تھی، وہ ہوئی اور ہم جیسے ضعیف القوۃ، ضعیف الہمۃ، ضعیف الایمان لوگوں کی نوبت اس دور میں آئی جبکہ دنیا کو فتنوں نے گھیر لیا ہے، روز و شب نئے نئے فتنوں کی بارش ہے۔

لیکن جیسے فتنوں کا زمانہ مشکلات کا خارزار ہے ویسے ہی اس زمانہ میں صحیح طریق سنت پر قائم رہنے اور دوسروں کو قائم رکھنے کے فضائل بھی بے حد و بے قیاس ہیں۔ حدیث میں ہے:

العبادۃ فی الھرج کھجرۃ الیّ (رواہ مسلم (مشکوٰۃ)) فتنہ کے زمانہ میں عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہجرت کر کے میرے پاس آجائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فساد امت کے زمانہ میں میری سنت کو زندہ کرے اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے:

ایک حدیث میں ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں سنت کے مطابق نیک عمل کرنے والے کا ثواب پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب رکھتا ہے، اور وہ پچاس آدمی آج کے نہیں بلکہ صحابہ کرام میں سے پچاس آدمی۔ اور جس وقت بدعات و منکرات دنیا میں پھیل جائیں اس وقت اہل علم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان کو اس وقت اپنے علم کا اظہار کرنا چاہیئے اور جو ایسا نہ کرے اس پر سخت وعید فرمائی ہے (کما اخرجہ الآجری فی کتاب السنۃ عن معاذ بن جبل و سیأتی تمامہ) چنانچہ ہر زمانہ، ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں کے طوفان میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے صحیح طریقہ کو روشن کیا اور بدعات و محدثات کی تلبیس کو روک دیا۔ لیکن آج کل جن فتنوں کا طوفان ہے ان میں ایک طرف لادینی، انکارِ خدا، انکارِ رسالت، انکارِ حدیث، انکارِ ختم نبوت کے وہ فتنے ہیں کہ جن کی ضرب براہ راست اسلام کی بنیادوں پر پڑتی ہے۔ راقم الحروف نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دینی تعلیم و تبلیغ اور فتویٰ و تصنیف و تالیف کے مثبت کام کے ساتھ جو کچھ بھی ہو سکا وہ انہی فتنوں کا مقابلہ کیا جو اعتقادی بدعات ہیں۔ عملی بدعات و محدثات کے سلسلہ میں اب تک کوئی خاص کام نہ ہو سکا۔

حال میں ایک محترم دوست نے اپنے ماہنامہ کے لئے بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیوں پر مشتمل ایک مقالہ لکھنے کے لئے مجھے فرمایا اور خلاف عادت کچھ ایسے اصرار سے فرمایا کہ اپنی بے شمار ذمہ داریوں، مصروفیتوں اور اس پر طبعی ضعف کے باوجود وعدہ کر لینے کے سوا چارہ نہ رہا، کچھ لکھنا بھی شروع کیا لیکن صبح سے رات کے بارہ بجے تک تمام اوقات مشغول، وقت کہاں سے لاؤں؟ مگر ان حالات میں جو کچھ بھی ہو سکا، حاضر ہے۔

بدعت و سنت کی جنگ میں ایک لمحۂ فکریہ

بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیاں از روئے قرآن و سنت آگے آتی ہیں لیکن اس جگہ ایک بات ہر وقت پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص سنت کے اتباع اور بدعت کی مخالفت کی دعوت دیتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا منشاء بجز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت، اور اس کے دین کی حفاظت، اور کچھ نہیں۔ اسی طرح جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہے، منشاء اس کا بھی اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی رضا حاصل کرنا ہی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بدعت کو وہ بھی گمراہی کہتا اور برا سمجھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ علم صحیح نہ ہونے کی وجہ سے، وہ کسی بدعت کو بدعت

نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عبادت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان کی خیر خواہی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے ہمدردی و خیر خواہی کے لہجہ میں مسلمانوں کو حقیقت الامر سے واقف کیا جائے۔ تشدد، طعنہ زنی، الزام تراشی کے طریقوں سے کلی اجتناب کیا جائے کہ ان سے کبھی کسی اصلاح نہیں ہوتی۔ بدعتی اور وہابی کے طعن آمیز خطابات سے پرہیز کیا جائے۔ اور کسی کے کلام کو توڑ مروڑ کر اس کے منشاء و مقصد کے خلاف اس پر الزام لگانا کھلا بہتان ہے جس کے حرام ہونے میں کسی کو تردد کی گنجائش نہیں۔ آخرت کے حساب کو سامنے رکھتے ہوئے ان حرکات سے باز رہا جائے۔

اس مختصر سی گذارش کے بعد اصل مقصد پر آتا ہوں اور چونکہ اصل خرابی ناواقفیت اور بدعت کو بدعت نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اس لئے پہلے بدعت کی تعریف اور پھر اس کی حقیقت لکھتا ہوں۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بدعت کی تعریف

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے۔ اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقہ عبادت کو بدعت کہتے ہیں جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہے نہ فعلاً نہ صراحۃً نہ اشارۃً۔ بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوی کی کتاب "الطریقۃ المحمدیہ" اور علامہ شاطبی کی کتاب "الاعتصام" سے لی گئی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لئے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیت ثواب نہیں کئے جاتے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہوں، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً، صراحۃً یا اشارۃً وہ بھی بدعت نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کام کی ضرورت عہد رسالت میں موجود نہ تھی، بعد میں کسی دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیدا ہو گئی وہ بھی بدعت میں داخل نہیں جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ اور تعلیمی، تبلیغی انجمنیں اور دینی نشر و اشاعت کے ادارے اور قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے صرف و نحو اور ادب عربی، فصاحت و بلاغت کے فنون یا مخالف اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لئے منطق و فلسفہ کی کتابیں، یا جہاد کے لئے جدید اسلحہ اور جدید طریق جنگ کی تعلیم وغیرہ اگر یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں بھی موجود نہ تھیں۔ مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لئے نہیں کہتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اس عہد مبارک میں موجود نہ تھی، بعد میں جیسے جیسے ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء امت نے اس کو پورا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کر لیں۔

اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا۔ بلکہ یہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث فی الدین نہیں بلکہ احداث للدین ہے، اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے احداث للدین کی نہیں۔ یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بضرورت زمان و مکان کوئی نئی صورت اختیار کر لینا ممنوع نہیں۔ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں زمان مابعد میں یکساں ہے ان میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا۔ اور یہ از روئے حدیث ممنوع و ناجائز ہو گا۔

مثلاً درود و سلام کے وقت کھڑے ہو کر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنے کیلئے کھانے پر مختلف سورتیں پڑھنے کی پابندی۔ نماز جماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی کئی بار دعا مانگنے کی پابندی، ایصال ثواب کے لئے تیجہ، چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب و

شعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی نمازیں اور ان کے لئے چراغاں وغیرہ اور پھر ان خود ساختہ چیزوں کو فرض و واجب کی طرح سمجھنا، ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ درود و سلام، صدقہ و خیرات، اموات کو ایصال ثواب، متبرک راتوں میں نماز و عبادت، نماز کے بعد دعا، یہ سب چیزیں عبادات ہیں، ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہد صحابہ میں بھی تھی ۔ ان کے ذریعہ ثواب آخرت اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذوق و شوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہو سکتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو ان سب سے زائد تھا ۔ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو صحابہ کرام سے زیادہ ذوقِ عبادت اور شوقِ رضائے الٰہی حاصل ہے ۔ حضرت حذیفہ ابن یمان فرماتے ہیں :

کل عبادۃ لم یتعبد ھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبد وھا، فان الاول لم یدع للآخر مقالاً فاتقوا اللہ یامعشر المسلمین وخذ وا الطریق من کان قبلکم ۔

یعنی جو عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی وہ عبادت نہ کرو کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں، اے علماء خدا سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقہ کو اختیار کرو ۔ اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے ۔ (الاعتصام الشاطبی ص ۳۱ ج ۲)

بدعت کے ناجائز و ممنوع ہونے کی عقلی وجوہ !

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ سب کام عہد صحابہ کرام میں عبادت کی حیثیت سے جاری تھے تو ان کے ایسے طریقے اختیار کرنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اختیار نہیں کئے ان کا فلسفہ اور حکمت کیا ہے ۔ کیا یہ مقصد ہے کہ ان عبادات کے یہ نئے طریقے معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو معلوم نہ تھے، آج ان دعویداروں پر انکشاف ہوا ہے اس لئے اُنھوں نے اختیار نہیں کئے، یہ لوگ کر رہے ہیں ۔

دین میں کوئی بدعت نکالنا رسول اللہ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے ۔

اور اگر کہا جائے کہ ان کو معلوم تھے مگر لوگوں کو نہیں بتلایا، تو کیا یہ معاذ اللہ ان حضرات پر دین میں بخل و خیانت اور تبلیغ رسالت میں کوتاہی کا الزام نہیں ہے، اسی لئے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ رسالت میں خیانت کی کہ پوری بات نہیں بتلائی ۔

بدعت نکالنا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ دین عہد رسالت میں مکمل نہیں ہوا ۔

ایک طرف تو قرآن کا یہ اعلان الیوم اکملت لکم دینکم ۔ یعنی میں نے آج تمہارا دین مکمل کر لیا ۔ دوسری طرف عبادات کے نئے نئے طریقے نکال کر عملاً یہ دعویٰ کہ شریعت اسلام کی تکمیل آج ہو رہی ہے ۔ کیا کوئی مسلمان جان بوجھ کر اس کو قبول کر سکتا ہے ؟ اس لئے یقین کیجئے کہ عبادات کا جو طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی بہتر اور دلکش نظر آئے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اچھا نہیں، اسی کو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ لم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا ۔ جو کام اس زمانہ میں دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں کہا جا سکتا ۔ انھوں نے ان طریقوں کو معاذ اللہ نہ تو ناواقفیت کی بنا پر چھوڑا تھا، نہ سستی اور غفلت کی بنا پر، بلکہ ان کو غلط اور مضر سمجھ کر چھوڑا تھا ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جو ثانی فاروق اعظم سمجھے جاتے تھے انھوں نے یہی مضمون اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے ۔

آج اگر کوئی شخص مغرب کی نماز میں تین کے بجائے چار رکعت اور صبح کی دو کی بجائے تین یا چار پڑھنے لگے، یا روزہ مغرب تک رکھنے کے

بجائے عشاء کے بعد تک رکھے تو ہر سمجھدار مسلمان اسکو بُرا، غلط اور ناجائز کہے گا، حالانکہ اس غریب نے بظاہر کوئی گناہ کا کام نہیں کیا کچھ تسبیحات زیادہ پڑھیں اکچھ اللہ کا نام زیادہ لیا۔ پھر اس کو بالاتفاق بُرا اور ناجائز سمجھا گیا صرف اس لئے نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے اور سکھلائے ہوئے طریقۂ عبادت پر زیادتی کر کے عبادت کی صورت بدل ڈالی اور ایک طرح سے اس کا دعویٰ کیا کہ شریعت کو آنحضرت صلعم نے مکمل نہیں کیا تھا اس نے کیا ہے۔ یا معاذ اللہ آپؐ نے ادائے امانت میں کوتاہی اور خیانت برتی ہے کہ یہ نئے اور مفید طریقہائے عبادت لوگوں کو نہیں بتلائے۔

اب غور کیجئے کہ نماز کی رکعات تین کے بجائے چار پڑھنے میں اور نمازوں، دعاؤں، درود وسلام کے ساتھ ایسی شرطیں اور طریقے اضافہ کرنے میں کیا فرق ہے؟ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے منقول نہیں حقیقت یہ ہے کہ عبادات شرعیہ میں اپنی طرف سے قیدوں شرطوں کا اضافہ شریعت محمدیہ کی ترمیم اور تحریف ہے۔ اس لئے اس کو شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔

بدعت تحریف دین کا راستہ ہے!

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر عبادات میں اپنی طرف سے قیدیں شرطیں اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی اجازت دیدی جائے تو دین کی تحریف ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی پتہ نہ لگے گا کہ اصل عبادت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی تھی کیا اور کیسی تھی۔ پچھلی امتوں میں تحریف دین کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر کی بتلائی ہوئی عبادات میں اپنی طرف سے عبادات کے نئے نئے طریقے نکالے اور ان کی رسم چل پڑی کچھ عرصہ کے بعد اصل دین اور ایجاد اشیاء میں کوئی امتیاز نہ رہا۔

شریعت اسلام میں نفل فرض کو جدا کرنے کا اہتمام!

شریعت اسلام نے چونکہ ہر فتنہ کے دروازہ کو بند اور فساد دین کے راستے کو روکا ہے اسی لئے اس کا بھی خاص اہتمام فرمایا کہ فرائض اور نوافل میں پورا امتیاز رہے۔ حقیقت کے اعتبار سے بھی اور صورت کے اعتبار سے بھی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا تو یہ معمول رہا کہ مسجد میں صرف فرض نماز جماعت سے ادا فرمائے، باقی نوافل اور سنتیں بھی گھر جا کر پڑھتے تھے۔ اور جن نمازوں کے بعد سنت یا نفل نہیں ہے ان میں اگر نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے تو بصورت نماز قبلہ رخ نہیں بیٹھتے بلکہ داہنی یا بائیں جانب پھر کر بیٹھتے ہیں تاکہ دور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ نماز فرض ختم ہو چکی ہے اب امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اختیاری چیز ہے۔ اصل سنت تو یہی ہے کہ نوافل اور نفلی عبادات سب تنہائی میں، اپنے گھروں میں ادا کی جائیں۔ اور اگر مسجد میں ہی سنتیں پڑھنی ہوں تو بھی مسنون طریقہ یہ ہے کہ جماعت فرض کی ہیئت کو ختم کر دیا جائے۔ صفیں توڑ دی جائیں۔ لوگ آگے پیچھے ہو کر سنتیں پڑھیں۔ اسی طرح روزہ شرعاً صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ لیکن چونکہ رات کو سب لوگ عادۃً سوتے ہیں اور سونے کی حالت میں بھی کھانے پینے سے آدمی ایسا ہی رکا رہتا ہے جیسا روزہ میں، اس لئے سحری کھانا مسنون قرار دیا گیا تاکہ سونے کے وقت جو صورت روزہ کی ہو گئی تھی اس سے امتیاز ہو جائے اور روزہ ٹھیک صبح صادق کے بعد سے شروع ہو۔ اسی لئے سحری کھانا بھی بالکل آخر وقت میں مستحب ہے، اسی طرح غروب آفتاب کا یقین ہو جاتے ہی روزہ فوراً افطار کرنا چاہیئے، دیر کرنا مکروہ ہے تاکہ روزہ کی عبادت کے ساتھ زاید وقت کا روزہ میں اضافہ نہ ہو جائے۔

آج بھی یہ سب چیزیں بحمد اللہ مسلمانوں میں جاری ہیں مگر جہالت و ناواقفیت سے ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبری ہے اصبح اور عصر کی نماز کے بعد عام طور پر ائمہ مساجد قبلہ کی جانب سے مڑ کر تو بیٹھ جاتے ہیں مگر اس پر نظر نہیں کہ یہ مڑنا کس غرض سے تھا کہ عملاً اس کا اعلان کر دیں

کہ اب فرض ختم ہو چکے، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے، مگر یہاں پوری جماعت کو پابند کر لیا ہے کہ جب تک تین مرتبہ دعا جماعت کے ساتھ نہ کر لیں اس وقت تک سب منتظر رہیں۔ پھر ان دعاؤں میں بھی خاص خاص چیزوں کی ایسی پابندی ہے جیسے کوئی فرض ہو جب تک وہ خاص دعائیں نہ پڑھی جائیں عوام یوں سمجھتے ہیں کہ نماز کا کوئی جزو رہ گیا۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور شریعت اسلامیہ کی احتیاط کی صریح مخالفت ہے، دعاؤں اور وظیفوں کو نماز فرض کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ وظیفے اور دعائیں بھی گویا نماز کا جزو ہیں جو امام یہ دعائیں اور وظائف تمام مقتدیوں کو ساتھ لے کر نہ پڑھے اس کی نماز کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔

بدعت حسنہ اور سیئہ صحیح حدیث میں ہے کہ "کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار" یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے، کسی بدعت اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ لغوی معنی میں نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعت حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عہد مبارک میں نہیں تھی بعد میں کسی ضرورت کی بناء پر ان کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ میں اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم و فنون، کہ اصل بنیاد تعلیم و تدریس اور مدرسہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے آپ نے خود فرمایا: انما بعثت معلما یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، لیکن جس طرح کے مدارس کا قیام اور ان میں جس طرح کی تعلیم آج کل بضرورت زمانہ ضروری ہو گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی آج ضرورت پیش آئی تو احیائے سنت کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ جو تعریف بدعت کی اوپر لکھی جا چکی ہے اس کی رو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں، لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعت حسنہ[عـــه] ہی کہا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تراویح کی یکجا جماعت کو دیکھ کر اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا: نعمت البدعۃ ھذہ یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے۔ کیونکہ ان کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی اس لئے "حقیقۃً اور شریعۃً" تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا جو بعد میں حضورؐ کی تعلیم کے مطابق کیا گیا۔ اس لئے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام بھی نیا تھا اس کو نعمت البدعۃ فرما دیا۔ بدعت حسنہ کا اس سے زائد کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ من ابتدع بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللہ تعالیٰ یقول "الیوم اکملت لکم دینکم" فما لم یکن یومئذ دینا لا یکون الیوم دینا۔ (اعتصام ص۴۳ ج۱)

فاروق اعظمؓ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعت حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لئے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں۔ بعض سخت حرام قریب شرک کے ہیں، بعض مکروہ تحریمی، بعض تنزیہی۔

قرآن و حدیث اور آثار صحابہ و تابعین و ائمۂ دین میں بدعات و محدثات کی خرابی اور ان سے اجتناب کی تاکید پر بیشمار آیات وردایات ہیں، ان میں سے بعض اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

عـــه صرف لغوی اعتبار سے، ورنہ حدیث میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے، وہاں "ہر بدعت" کو گمراہی کہا گیا ہے (ایڈیٹر)

بدعت کی مذمت قرآن و حدیث میں | علامہ شاطبی نے کتاب "الاعتصام" میں آیات قرآنیہ کافی تعداد میں اس موضوع پر جمع فرمائی ہیں۔ ان میں سے دو آیتیں اس جگہ لکھی جاتی ہیں۔

(۱) ولا تکونوا من المشرکین ○ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون۔

مت ہو مشرکین میں سے جنہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اپنے دین کو اور ہو گئے فرقے اور پارٹیاں۔ ہر ایک پارٹی اپنے طرز پر خوش ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ اس سے مراد اہل بدعت کی پارٹیاں ہیں۔ (اعتصام ص۶۵ ج۱)

(۲) قل ھل ننبئکم بالأخسرین اعمالاً الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسبون صنعاً

آپ فرمائیے کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ کون لوگ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں، وہ لوگ جن کی سعی و عمل دنیا کی زندگی میں ضائع اور بیکار ہو گئی اور وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا عمل کر رہے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ نے تفسیر اخسرین اعمالاً اہل بدعت سے کی ہے اور بلاشبہ اس آیت میں اہل بدعت کی حالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خود تراشیدہ اعمال کو نیکی سمجھ کر خوش ہیں کہ ہم ذخیرہ آخرت حاصل کر رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ان کے اعمال کا نہ کوئی وزن ہے نہ ثواب بلکہ الٹا گناہ ہے۔

روایات حدیث بدعت کی خرابی اور اس سے روکنے کے بارہ میں بے شمار ہیں ان میں سے بھی چند روایات لکھی جاتی ہیں۔

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من احدث فی امرنا الیس منہ فھو رد (اعتصام بحوالہ بخاری)

جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے!

(۲) اور مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔

امابعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدیٰ ھدی محمد و شر الأمور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ اخرجہ مسلم وفی روایۃ النسائی کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ فی النار۔ (اعتصام ص۶۶ ج۱)

حمد و صلوٰۃ کے بعد سمجھو کہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ اور طرز عمل محمد (صلعم) کا طریقہ اور طرز عمل ہے۔ اور بدترین چیز نو ایجاد بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ہر نو ایجاد عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ بھی یہی خطبہ دیا کرتے تھے اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اپنے خطبہ میں الفاظ مذکورہ کے بعد یہ بھی فرماتے تھے۔

انکم ستحدثون ویحدث لکم فکل محدثۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ (اعتصام ص۶۶ ج۱)

تم بھی نئے نئے کام نکالو گے اور لوگ تمہارے لئے نئی نئی صورتیں عبادت کی نکالیں گے خوب سمجھ لو کہ ہر نیا طریقہ گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۳) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من دعا الی الھدیٰ کان لہ من اجر

جو شخص لوگوں کو صحیح ہدایت کی طرف بلائے تو ان تمام لوگوں کے

مثل اجور من یتبعہ لاینقص ذالک من اجورھم شیئا ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل آثام من یتبعہ لاینقص ذالک من آثامھم شیئا۔

عمل کا ثواب ملے گا جو اس کا اتباع کریں بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اس پر ان سب لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس کا اتباع کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

بدعات کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے والے اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے اس کے انجام بد پر غور کریں کہ اس کا وبال تنہا اپنے عمل ہی کا نہیں بلکہ جتنے مسلمان اس سے متاثر ہوں گے ان سب کا وبال بھی ان پر ہے۔

(۴) ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ہمیں خطبہ دیا جس میں نہایت مؤثر اور بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل ڈر گئے۔ بعض حاضرین نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آج کا وعظ تو ایسا ہے جیسے رخصتی وصیت ہوتی ہے تو آپ ہمیں بتلائیں کہ ہم آئندہ کس طرح زندگی بسر کریں؟" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ لولاۃ الامر وان کان عبدا حبشیا فانہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ، وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور حکام اسلام کی اطاعت کرنے کی۔ اگرچہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بڑا اختلاف دیکھیں گے۔ اسلئے تم میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو اختیار کرو اور اسکو مضبوط پکڑو۔ اور دین میں نو ایجاد طریقوں سے بچو کیونکہ ہر نو ایجاد طرز عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی۔

(اعتصام)

(۵) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ۔

"جو شخص کسی بدعتی کے پاس گیا اور اس کی تعظیم کی تو گویا اس نے اسلام کو ڈھانے میں اس کی مدد کی۔" (اعتصام الشاطبی ص۸۳ ج۱)

(۶) اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"اگر تم چاہتے ہو کہ پل صراط پر تمہیں دیر نہ لگے اور سیدھے جنت میں جاؤ تو اللہ کے دین میں اپنی رائے سے کوئی نیا طریقہ نہ پیدا کرو۔" (الاعتصام)

(۷) آجری کی کتاب "السنۃ" میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا احدث فی امتی البدع وشتم اصحابی فلیظھر العالم علمہ فمن لم یفعل فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔

(اعتصام ص۸۶ ج۱)

جب میری امت میں بدعت پیدا ہو جائیں اور میرے اصحاب کو برا کہا جائے تو اس وقت کے عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کریگا تو اس پر لعنت ہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔

عبداللہ بن حسن نے فرمایا کہ میں نے ولید بن مسلم سے دریافت کیا کہ حدیث میں اظہار علم سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اظہار سنت"۔

(۸) حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

"مسلمانوں کے لئے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں" ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اس پر

ترجیح دینے لگیں جو ان کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں۔ سفیان ثوری نے فرمایا کہ یہ لوگ اہل بدعت ہیں۔

(۹) اور حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ:

"خدا کی قسم آئندہ زمانہ میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص اس بدعت کو ترک کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سنت چھوڑ دی" (اعتصام ص۹۱ ج۱)

(۱۰) حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کہ:

"اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو، پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو اس چیز کو اختیار کرو جو از روئے سنت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو"

(۱۱) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

"آئندہ لوگوں پر کوئی نیا سال نہ آئے گا جس میں وہ کوئی بدعت ایجاد نہ کریں گے اور کسی سنت کو مردہ نہ کر دیں گے یہاں تک کہ بدعتیں زندہ اور سنتیں برباد ہو جائیں گی" (اعتصام ص۹۵ ج۱)

(۱۲) حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ

"بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ نماز میں مجاہدہ کرتا جائے اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے"

نیز حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ "صاحب بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کر دے گا"

(۱۳) حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ:

"کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں جب تک کہ وہ سنت کے مطابق نہ ہو"

(۱۴) ابو عمرو شیبانی فرماتے ہیں کہ

"صاحب بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوتی (کیونکہ وہ اپنے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا تو توبہ کیسے کرے)"

(۱۵) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا یہ کلام حضرت امام مالکؒ اور تمام علماء وقت کے نزدیک ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے!

سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سننا وولاۃ الامر من بعدہ سننا الاخذ بہا تصدیق لکتاب اللہ واستکمال لطاعۃ اللہ وقوۃ علی دین اللہ لیس لاحد تغییرہا ولا تبدیلہا ولا النظر فی شیئ خالفہا من عمل بہا مہتد ومن انتصر بہا منصور ومن خالفہا اتبع غیر سبیل المومنین وولاہ اللہ ما تولی واصلاہ جہنم وساءت مصیرا

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں ان کو اختیار کرنا کتاب اللہ کی تصدیق اور اطاعت الٰہی کی تکمیل اور اللہ کے دین میں قوت حاصل کرنا ہے۔ نہ ان میں تغیر کرنا کسی کے لئے جائز ہے، نہ بدلنا اور نہ اس کے خلاف کسی چیز پر نظر کرنا جو ان پر عمل کرے گا ہدایت پائے گا جو ان سنتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنا چاہے گا اس کی مدد ہو گی اور ان کے خلاف کرے گا مسلمانوں کے راستہ سے مخالف راستہ اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کو اسکی تجویز (اختیار) پر چھوڑ دے گا اور پھر جہنم میں چلا جائے گا، اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔

مولانا محمد اسحٰق (ندوۃ العلماء)

توحید اور مسلمانوں کی مروّجہ رسمیں

اسلام کا جوہر اور جزوِ اعظم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف لفظ توحید سے دیا جا سکتا ہے۔ توحید کامل اسلام اور صرف اسلام کا حصہ ہے۔ اور یہی وہ شے ہے جس پر اللہ کے ہر نبی اور اللہ کی ہر کتاب نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کو دیکھو۔ کیا تعلیماتِ الٰہیہ اور دعوتِ نبویہ میں یہ سب سے زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی؟ حق یہ ہے کہ پورے دین کا ماحصل "توحید" ہے۔ اور نوعِ انسانی کا کمال اسی پر موقوف ہے۔

ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ ہم موحد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور خزانۂ توحید کے امین ہیں۔ آیئے! اپنے نفوس کا جائزہ لیں کہ ہم نے اس امانت میں خیانت تو نہیں کی ہے؟

اقسامِ توحید لیکن اس تفتیش سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اسلام ہم سے جس توحید کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ کو چھیڑنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ علمِ دین کی کمی اور ماحول کے اثرات نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے بلکہ ان کی اکثریت کو اس سے بے خبر بنا دیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ لفظِ توحید کا اسلامی مفہوم بس اتنا ہی ہے جتنا باعتبار لغت اس سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو ایک سمجھنا۔ اگر صرف اتنا ہی مفہوم توحید کی حقیقت قرار دیا جائے تو اس بارے میں اسلام کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ میرے علم میں دنیا کے موجودہ مذاہب میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو اس قدر توحید کا مدعی نہ ہو۔ قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین عرب بھی اتنی توحید کے قائل تھے۔ وہ بھی اللہ العالمین صرف ایک ہی ذات کو سمجھتے تھے اور اس کی ذات میں کسی کو شریک نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے معبودوں کو بھی اس سے فروتر اور اس کا بندہ جانتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے قرآن حکیم نے انھیں مشرک فرمایا ہے۔ اور آج ہم بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب کو بھی دین توحید نہیں سمجھتے۔ اگر توحید کا اسلامی مفہوم اتنا ہی ہوتا جتنا اپنی ناواقفیت کی وجہ سے آج ہم سمجھ رہے ہیں تو ان اہل عرب کو قرآن مجید مشرک کیوں فرماتا اور آج کے بہت سے مدعیان توحید کو ہم اہل شرک میں کیوں شمار کرتے؟

ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی توحید لغوی توحید سے بالاتر ہے۔ اس کا مفہوم لغوی توحید سے جداگانہ وسیع تر اور اعلیٰ ہے۔

فطری توحید رب العالمین کو یگانہ و یکتا تسلیم کرنا فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ انسان فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے

کہ اُس کی سب احتیاجات کا تعلق صرف ایک ہی ذات سے ہے۔ اسی تقاضے کا ظہور ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدے سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ معمولی سی بات ہے کہ ہم بازار کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہماری ضروریات ایک ہی جگہ سے پوری ہوں۔ ایک افسر کی ماتحتی کو ہر ملازم بہت سے افسروں کی ماتحتی پر ترجیح دیتا ہے۔ کسی معاملہ میں اگر ایک شخص کی خوشامد کافی ہو جاتی ہے تو متعدد آدمیوں کی خوشامد سے آدمی احتراز کرتا ہے۔ اسی قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جن کا مشاہدہ روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اس نفسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ انسان کا فطری میلان یہ ہے کہ اس کی احتیاجات کا تعلق صرف ایک ہی محتاج الیہ سے ہو۔

احتیاج عبادت کا سب سے قوی محرک ہے۔ انسان معبود اسی ہستی کو بناتا ہے جسے اپنا حاجت روا سمجھتا ہے۔ وہ فطرتاً چاہتا ہے کہ وہ ایک ہی ہو۔ فطرت اسے یہاں تک پہنچا دیتی ہے لیکن اس سے آگے لے جانے سے قاصر رہتی ہے اگر خارجی اثرات اسے کمزور نہ کر دیں تو ہر فرد انسان اس حد تک ضرور قائل ہو گا کہ معبود برحق ایک ہی ہے۔ لیکن نبوی تعلیم سے محرومی اور خارجی اثرات فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں اور آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آیۂ کریمہ اور حدیث نبوی میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:۔۔۔

فطرة الله التی فطر الناس علیها ما کل ولد یولد علی الفطرة فابواه یهودانه
او ینصرانه او یمجسانه

(اللہ کی فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ہر بچہ دین فطرت (اسلام) پہ پیدا ہوتا ہے۔
مگر اس کے والدین (خارجی اثرات) اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں)

فطرت باوجود کمزور و مغلوب ہو جانے کے بالکل مردہ نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی زبان سے بھی توحید کا دعویٰ سنتے ہیں جن کی پوری زندگی شرک و بت پرستی کی گندگی میں آلودہ ہے۔

اسلامی توحید

کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا بالکل طبعی چیزیں ہیں لیکن انبیاء کرام نے بتایا کہ کیا چیز کھانا چاہئے اور کیا نہیں، کس چیز کا پینا جائز ہے اور کس کا ناجائز۔ اور سونا کب مباح ہے اور کب حرام۔ اسی طرح انبیاء و مرسلین نے اس فطری توحید کی تفصیل فرمائی۔ حیات انسانی پر اسے منطبق کیا اور ہمیں بتایا کہ اس اجمالی عقیدے کے اندر ایک عالم پوشیدہ ہے۔ اس کی سب سے زیادہ تفصیل معلم اعظم سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ جو شخص محض فطری توحید کو رضائے الٰہی کے لئے کافی سمجھتا ہے وہ گویا بعثت انبیاء کو بے مقصد قرار دیتا ہے

فطری توحید تخم ہے اور اسلامی توحید وہ شجرۂ طیبہ ہے جو صرف تعلیمات محمدیہ (علیہ آلاف تحیۃ) کی آبیاری سے پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا کسی نے ثمر بے شجر دیکھا ہے؟ محض فطری توحید کو اختیار کر کے ان بہترین ثمرات کی توقع کرنا جو اسلامی توحید کے شجرۂ طیبہ کے ساتھ مخصوص ہیں کیسی شدید غلطی ہے۔

اسلامی توحید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے باہر نہیں رہتا۔ اسلام اس شخص کو موحد کہتا ہے جس کی پوری زندگی اور اس کے ہر شعبہ میں توحید کا اثر ظاہر ہو۔ اور اس کی زندگی کا ہر حصہ شرک سے پاک ہو اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے ایک مختصر تمہید کی حاجت ہے۔

عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شخص جو عبادت کرتا ہے خواہ اللہ تعالیٰ کی یا غیر اللہ کی۔ وہ تھوڑا سا غور کر کے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے جب آپ عبادت کرتے ہیں تو دو کیفیتیں آپ کے ذہن پر طاری ہوتی ہیں۔

(۱) آپ معبود کے سامنے اپنی انتہائی پستی و ذلت کا اظہار کرتے ہیں۔ لفظ "انتہائی" میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ باب عبادت کی کنجی ہے۔ آدمی اپنے باپ کے سامنے بھی اپنی پستی کا اظہار کرتا ہے۔ حکومت اور دوسری قوتوں کے مقابلے میں بھی تذلل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ذلت و پستی کے اس اظہار اور معبود کے سامنے اس کے اظہار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اپنی انتہائی پستی و ذلت کا اظہار انسان معبود کے سوا کسی کے سامنے نہیں کرتا۔ یہ ایک وجدانی چیز ہے۔ جسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ایک مرتبہ بھی عبادت کی ہو۔

(۲) یہاں ایک دوسرا سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ انسان ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہر شخص اپنے وجدان سے معلوم کر سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایک مرتبہ بھی عبادت کی ہو۔

ہم حکام کی تعظیم کرتے ہیں کیونکہ ان میں ہمارے لئے نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت و طاقت ہے۔ ہم علماء و مشائخ کی تکریم کرتے ہیں کیونکہ ان میں علم و پاکیزگی کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اپنے والدین کا احترام بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لئے کہ انھیں اپنے وجود کا سبب اور اپنا بہت بڑا محسن جانتے ہیں۔ اسی قسم کی مثالیں تلاش کرنے پر بکثرت مل جاتی ہیں جو اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہیں کہ انسان کسی کی تعظیم اسی وقت کرتا ہے جب وہ اسے اپنے سے قوی تر سمجھتا ہے یا (۲) اپنا حاجتوں کا پورا کرنے والا جانتا ہے یا (۳) اپنا محسن خیال کرتا ہے۔

ابھی مثال کی طرف سے توجہ نہ ہٹائیے۔ غور کیجیے کہ حکومت یا علماء و مشائخ یا والدین کی جتنی تعظیم ایک سمجھدار اور صحیح العقیدہ شخص کرتا ہے کیا وہ عبادت کے حدود میں داخل ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ان اشخاص میں مندرجہ بالا تینوں اوصاف کا قائل تو ہے مگر اس درجہ میں نہیں جس درجہ میں وہ ان اوصاف کو معبود میں تسلیم کرتا ہے۔ یہ مثال ہمارے وجدان کی آنکھیں کھول دیتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان اوصاف کمال کے دو درجے ہیں ایک درجہ ادنیٰ ہے جسے ہم مخلوق کے لئے بھی ثابت کرتے ہیں اور ایک درجہ اعلیٰ ہے جسے ہم صرف خالق و معبود کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حکومت کو بھی ایک قسم کی قدرت و طاقت حاصل ہے لیکن اسے قادر مطلق کی قدرت عظیمہ سے کوئی نسبت و مشابہت بھی نہیں ہے۔ زید عمرو بکر سے بھی ہماری احتیاجات پوری ہوتی ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس حاجت روائی کو حق تعالیٰ کی شان حاجت روائی سے وہ نسبت بھی نہیں جو ذرّہ کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ انسان کے احسان کا انکار ناشکری ہے مگر ایسے محسن حقیقی کے احسانات سے کیا نسبت؟ دونوں میں مقدار اور کمیت ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ نوعیت کے لحاظ سے بھی کوئی مشابہت و نسبت نہیں ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے اس کا انکار کیسے کریں لیکن مخلوق کے علم کو ملک علام کے علم کے ساتھ نہ کیفیت میں کوئی مشابہت نہ کمیت میں ہے۔ عبد و معبود کا یہ فرق اس قدر روشن اور جلی ہے کہ جاہل سے جاہل آدمی بھی وجدانی طور پر اسے محسوس کرتا اور اپنے اعتقاد کے مطابق اس پر عمل کرتا ہے

تمہید قدرے طویل ہو گئی مگر اسلامی توحید کے منور چہرے سے نقاب کشائی میں یہ اعانت کرے گی۔ اسلام جس توحید کا داعی ہے وہ صرف ذات حق تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کی دعوت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ذات اور صفات

دونوں کے اعتبار سے یگانہ و یکتا سمجھو۔ دوسرے مذاہب کی توحید صرف ذات یا زیادہ سے زیادہ بعض صفات تک محدود ہے۔ ان کی توحید ناقص بلکہ درحقیقت توحید کے لقب کی مستحق ہی نہیں ہے۔ کتاب مبین کا ارشاد ہے۔

لیس کمثلہ شیٔ

(اس کے (اللہ کے) مثل کوئی بھی نہیں ہے)

نہ اس کی ذات کے مثل کسی کی ذات ہے نہ اس کی کسی صفت کے مثل کسی میں کوئی صفت پائی جا سکتی ہے۔ وہ جس طرح اپنی عظیم الشان ذات کے لحاظ سے بے نظیر و بے مثال ہے۔ اسی طرح ہر صفت کے لحاظ سے بھی یکتا و یگانہ بے نظیر و بے مثال ہے۔

یہ ہے مفہوم اس توحید کا جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ اس حقیقت کا مستحکم یقین اور اعتقاد راسخ مسلمان ہونے کے لئے لازم و ضروری ہے۔ لیکن اسلام کا مطالبہ صرف اس عقیدے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ کا سرچشمہ درحقیقت یہی عقیدۂ توحید ہوتا ہے۔ حیات موت کو، پسند کرتی ہے۔ نور کو ظلمت ناگوار ہے صلح فساد کے خلاف ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ توحید شرک کو گوارا کرے؟ توحید الٰہ العالمین کا یقین مستحکم فطرتاً اس کا طالب ہوتا ہے کہ مسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کے حدود حکومت سے خارج نہ ہو۔ حیاتِ مسلم کے ہر حصہ پر اس کا سکہ رواں ہو اور اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور مخفی سے مخفی گوشہ میں بھی اشراک باللہ کا منحوس سایہ نظر نہ آئے۔ اسلام کے اس وسیع مطالبہ کا مختصر عنوان یہ ہے کہ وہ توحید اعتقادی توحید عملی اور توحید حالی کا طالب ہے۔ یہ جامع تقسیم پوری انسانی زندگی کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ رب العالمین کا مطالبہ ہے:۔

وماکان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون

(کسی انسان کی یہ مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب حکمت و نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہے کہ میرے بندے بن جاؤ۔ لیکن ان حضرات کی یہ دعوت ہوتی ہے کہ اللہ والے بن جاؤ۔ کتاب الٰہی پڑھنے پڑھانے کا یہی اقتضاء ہے)

توحید اعتقادی

یہاں اس واقعہ کا اظہار بہت مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس میں کسی کو شریک ماننے والے دنیا میں قلیل ہیں۔ لیکن انھیں مفقود نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ جو لوگ شرک میں مبتلا ہیں۔ ان کی غالب اکثریت حق تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو شریک کرتی ہے۔ اس لئے اسلامی توحید اعتقادی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس بات کا پختہ اور غیر متزلزل یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی کسی صفت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جس طرح اس کی ایسی کوئی دوسری ذات نہیں پائی جا سکتی اسی طرح اس کی کوئی صفت بھی کسی دوسری ذات میں نہیں ہو سکتی قرآن حکیم اور سنت سید المرسلین کا بھی یہی مطالبہ ہے لیکن مقام حیرت و عبرت ہے کہ آج حقیقت ان لوگوں سے بھی مخفی ہو گئی ہے جو توحید کامل کے تنہا علمبردار ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ

(تم پہلے لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی پیروی کرو گے)

یہ پیشین گوئی اس زمانہ میں پوری ہو رہی ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات میں سے بکثرت میرے ذاتی مشاہدات ہیں۔ سنئے اور عبرت حاصل کیجئے:۔

اسلام کے نام لیواؤں کا ایک اچھا خاصہ گروہ ایسا بھی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان "عبداللہ" نہیں سمجھتا بلکہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حق تعالیٰ نے صورت محمدی میں ظہور فرمایا تھا۔ یہ باطل اور لغو عقیدہ کھلا ہوا شرک اور کفر ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور سنت کے سب سے بڑے دعویدار ہیں۔ اور جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر اور اللہ تعالیٰ کا بندہ کہے اسے خارج از اسلام ورنہ کم از کم اہلسنت والجماعۃ سے خارج سمجھتے ہیں۔

اس عقیدے کا باطل اور خلاف اسلام ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ قرآن حکیم نے بار بار سید عباد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت وعبدیت کا صاف وصریح اعلان فرمایا ہے۔ ارشاد حق ہے:۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم اله واحد

(آپ فرما دیجئے) کہ بے شک میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ میرے اوپر وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے)

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا

(آپ فرمایئے) کہ میرا پروردگار پاک ہے اور میں تو صرف ایک انسان اور اللہ کا رسول ہوں)

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف بھیجا)

چند آیات بطور نمونہ نقل کر دی گئیں ورنہ کتاب مبین میں یہ مضمون کثرت وتکرار اور صراحت ووضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہ اسلام کا ایک بدیہی مسئلہ ہے جس پر دلیل قائم کرنے کا مطالبہ ایسا ہی ہے۔ جیسے روز روشن میں آفتاب کے وجود کی دلیل طلب کی جائے۔

مندرجہ بالا مشرکانہ عقیدہ باطلہ غالباً ہندوانہ ماحول اور ویدانت فلسفہ کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زیادہ تر ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو حقیقی تصوف سے ناآشنائے محض ہیں۔ لیکن صوفیائے کرام کی شکل بنا کر ہندوانہ یوگ کو تصوف قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے مشائخ یہود ونصاریٰ کی طرح دوسرے مذاہب کے بہت سے باطل عقائد و خیالات کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ باطل عقیدہ بھی ہندوانہ عقیدہ اوتار کا دوسرا جنم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے بلند وبرتر ہے۔ شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ عالی میں جو مرتبہ قرب ورفعت سید کونین کو حاصل رہے۔ وہ نہ کسی فرشتہ کو حاصل ہے نہ کسی نبی کو۔ معلم اعظم اور اعنا‌ذہ

کو ملک علام نے اپنے خزانۂ علم سے اس قدر وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ سید العالمین کے مرتبہ علیا پر بھی فائز ہو گئے۔ مخلوقات الٰہیہ میں دولت علم کا سب سے بڑا خزانہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پاس ہے۔ لیکن باوجود اس کے سید الاولین والآخرین حق تعالیٰ کے بندے ہی ہیں۔ ان کے علم کو عالم الغیب والشہادہ کے علم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ مخلوق اور خالق عبد اور معبود کسی چیز میں بھی شریک نہیں ہو سکتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا اور آنحضور کے علم شریف کو ہی کل معلومات پر محیط و لامحدود سمجھنا حق تعالیٰ کی صفت علم میں آنحضور کو شریک بنانا ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جو اس باطل کو حق کے ساتھ آمیز کرتے رہتے ہیں اور اسلام میں اس مشرکانہ عقیدے کی گنجائش نکالتے ہیں۔ بعض تو یہ غضب کرتے ہیں کہ بہت سے اولیاء اللہ کو بھی اسی طرح عالم الغیب سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم نے خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے اس باطل عقیدے کی تردید کرائی ہے:-

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء

(اگر میں عالم الغیب ہوتا تو بہت فائدہ اٹھا لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔)

یہ آیت ایک مثال ہے۔ ورنہ اس مضمون کی آیتیں بکثرت ہیں۔

۔ احتیاجات کا پورا کرنا، نفع یا نقصان پہنچانا، ان سب امور کا حقیقی تعلق حق تعالیٰ جل شانہ کی صفت ربوبیت سے ہے۔ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے وہی رب العالمین ہے اور اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ بطور نمونہ دو ایک آیتیں درج ذیل ہیں:-

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون

(یہ تمہارا دین ہے جو ایک ہی ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی عبادت کرو)

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملٰئکۃ (الآیۃ)

(بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب تو اللہ ہے۔ پھر اس بات پر جم گئے۔ ان کے پاس (مرتے وقت) فرشتے آتے ہیں) (الآیۃ)

سلطان دارین داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کو دعوت توحید دیتے ہیں۔ اس کا حصہ قرآن کی زبان میں یہ ہے:-

ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ

(اور اسی بات کو اختیار کر لو کہ) اللہ کو چھوڑ کر ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائیں)

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی، ولی، شہید، فرشتہ، جن وغیرہ کسی مخلوق کو نفع نقصان کا مالک و مختار کارساز (حاجت روا) سمجھنا اسے رب قرار دینا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ لیکن مقام رنج و الم ہے کہ سلطان الموحدین کی غلامی پر فخر کرنے والوں میں ایسے افراد اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو کارساز حاجت روا اور نفع و نقصان کا مالک و مختار سمجھتے ہیں۔ اپنے اسلام کی لاج رکھنے کے لئے عُبد و معبود میں یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی قدرت ذاتی ہے اور اولیاء اللہ کی عطائی۔ یعنی رب العالمین نے فلاں فلاں اولیاء اللہ یا انبیاء

کو فلاں فلاں احتیاجات پوری کرنے کا یا فلاں قسم کے نفع و نقصان کا مکمل اختیار عطا فرما دیا ہے۔ اب وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ یہ بعینہ وہی عقیدہ ہے جو اکثر مشرکین عرب رکھتے تھے اور جس کی تردید قرآن مجید نے بار بار فرمائی ہے۔ سلطان کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ہر مخلوق سے بلند ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آنحضور کو اعلان کا حکم دیتا ہے:۔

قل لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا الا ما شاء الله

(آپ فرما دیجئے کہ مجھے اپنے نقصان و نفع کا کوئی اختیار نہیں ہے مگر جو اللہ چاہے)

قل انی لا املك لکم نفعا ولا رشدا

(آپ فرما دیجئے کہ مجھے تمھیں نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں ہے)

اس ارشاد حق کے بعد کسی دوسرے کے متعلق خواہ وہ ولی ہو یا نبی یا اور کوئی اس باطل عقیدے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

یہ مشرکانہ عقیدہ باطل بھی غالباً ہندوانہ ماحول اور شیعوں سے اختلاط کا نتیجہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے عقائد رکھتے ہیں۔

سعدی علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر ہے

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

شیخ نے اس شعر میں اہلسنت والجماعت کے عقیدہ شفاعت کی ترجمانی کی ہے۔ شفاعت برحق اور اس کا عقیدہ بھی حق۔ لیکن اس کے بارے میں بھی مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں شدید غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے جو شرک تک پہنچ گئی ہے۔

ان لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اولیاء اللہ کا ایسا دباؤ ہے کہ وہ ان کی شفاعت قبول کرنے پر معاذ اللہ مجبور ہے۔ عام طور پر اسے محبت کا دباؤ سمجھا جاتا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات شفاعت کے بارے میں مختار مطلق ہیں۔ بلکہ جنت انھیں دے دی گئی ہے جسے چاہیں اس میں بھیج دیں۔ یہ عقیدہ سراسر باطل اور خلاف اسلام ہے۔ جزا و سزا و آخرت کا کامل اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے ثابت کرنا حق تعالیٰ کی صفت

مالك یوم الدین

(اللہ تعالیٰ) مالک یوم جزا

میں اسے شریک کرنا ہے۔

مندرجہ بالا مفہوم میں عقیدۂ شفاعت درحقیقت یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا نقش ثانی ہے۔ اسلامی عقیدہ شفاعت کو اس سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس باطل عقیدے کی بار بار تردید کی ہے۔ اور صحیح عقیدۂ شفاعت کی تعلیم دی ہے۔ ایک دو آیتیں سن لیجئے

ومن یشفع عندہ الا باذنہ

(بغیر اس کی (اللہ کی) اجازت کے اس کے سامنے کون شفاعت کرسکتا ہے)

لا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمٰن عھدا

(کوئی شفاعت کا اختیار نہ رکھے گا۔ مگر صرف وہ جس نے رحمٰن سے اجازت لی ہوگی)

بے شک شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور ان کے طفیل میں اولیاء اللہ اور بزرگان یہ سب روز قیامت شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن ان کی شفاعت حق تعالےٰ کی اجازت کی محتاج ہوگی اور اسی کے بعد ہوگی۔ شہنشاہ حقیقی ان کی شفاعت قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ اسے ایسی شفاعت کو قبول کرنے نہ کرنے کا کامل اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو حق شفاعت اس لئے عطا فرمائینگے کہ اپنی بارگاہ میں ان کا مقرب ہونا مخلوق پر ظاہر فرمائیں اور ان کے درجات و مراتب میں ترقی عطا فرمائیں یہ انھیں لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے جن کے متعلق مالک حقیقی کی اجازت ہوگی۔ بغیر اذن الٰہی یہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکیں گے۔

ضمناً شفاعت کے متعلق ایک اور باطل عقیدے کی تردید یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے جو غالباً شیعوں کی صحبت کا اثر ہے۔

کربلا کے المناک واقعہ کو عوام اہل سنت نے دوسروں سے متاثر ہو کر اسے ایک دوسرا ہی رنگ دے دیا ہے مشہور یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اُمت کی مغفرت کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آنحضور کے دونوں نواسوں کی قربانی پیش کرنے کی شرط رکھی تھی۔ رحمۃ للعالمین اس سے انکار کیسے فرما سکتے تھے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی قربانی باب جنت کی کنجی ہے۔ جس نے اُمت محمدیہ کے لئے اسے کھول دیا اور جہنم کا دروازہ اس کے لئے بند کردیا۔ اس کے لئے محضر کی ایک من گھڑت روایت بھی شہادت ناموں میں لکھ دی گئی۔ اس باطل عقیدہ کفارہ کی جڑیں مسیحیت میں ملیں گی۔

شفاعت کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کے بعد اس عقیدہ کا مہمل، باطل اور گمراہ کن ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔

یہ عقیدہ اگرچہ شرک میں داخل نہیں ہے لیکن انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس لئے ضمناً اس کا تذکرہ کردیا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور اس کے احاطۂ علم سے کوئی شے بھی باہر نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو بھی ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ بعض صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ اعتقاد کھلا ہوا شرک ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔

آئندہ صفحات میں جن مشرکانہ رسوم و اعمال کا تذکرہ کرنا ہے۔ ان کی بنیاد کسی نہ کسی مشرکانہ عقیدہ پر قائم ہے۔ اس لئے توحید اعتقادی پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوا۔ عمل پر غور کرنے کے بعد اس کے متعلقہ کو معلوم کرلینا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

توحید عملی انسانی تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ان کی نوعیت اور ان کی عملی شکلوں میں اختلاف ہے

جو برتاؤ والدین کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بیوی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ بھائی بہنوں کے ساتھ وہ طریقہ نہیں برتا جا سکتا جو دوست احباب کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ارباب حکومت سے ملنے کا طریقہ تاجروں سے ملاقات کے طریقے سے مختلف ہوتا ہے۔ طرز عمل کا یہ اختلاف نوعیت تعلق کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔ کس قدر بدذوق اور بدسلیقہ ہے وہ شخص جو اس اختلاف کو نظر انداز کر دے۔ کیا رائے ہے آپ کی اس شخص کے متعلق جو اپنے والدین کے ساتھ وہی طرز گفتار اختیار کرے جو وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے؟ ایسے رکیک الحرکات آدمی کی صورت دیکھنا بھی شاید آپ گوارا نہ کریں۔

حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی ایک خاص نوعیت ہے۔ وہ خالق ہے ہم مخلوق، ہم عبد ہیں وہ معبود، وہ مالک ہے ہم مملوک۔ کیا ہمیں اس قسم کا تعلق اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے بھی ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ جو طرز عمل ہم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ساتھ اختیار کرتے ہیں وہ کسی اور کے ساتھ اختیار کرنا جائز نہیں ہے عملی زندگی کا ہر قدم اسی اصول کی روشنی میں اٹھانا اور اس کے ہر جزو کو اسی رنگ میں رنگ دینا توحید عملی ہے۔ اس کی خلاف ورزی یقیناً شرک ہے۔ کاش امت محمدیہ (علیہ الف الف تحیۃ) اس سے محفوظ رہتی۔ لیکن صد افسوس کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مسلمانوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس مہلک مرض میں مبتلا ہے اور ایسے رسوم و اعمال کی پابند ہے جو صریحاً توحید کے منافی اور نجاست شرک میں آلودہ ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔

عالم میں عجائبات بکثرت ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اگر آپ کو دیکھنا ہو تو کسی بزرگ کے مزار پر چلے جائیے۔ اگر آپ میں شعور دینی کا کوئی حصہ بھی موجود ہے تو آپ متحیر و ششدر ہو کے رہ جائیں گے کہ یا اللہ یہ کون مخلوق ہے جو ایک طرف توحید کی مدعی ہے اور دوسری طرف مزاروں کے سامنے سجدے بھی کر رہی ہے۔ ان پر چڑھاوے بھی چڑھا رہی ہے۔ صاحب مزار سے دعائیں بھی مانگ رہی ہے۔ اپنی حاجتیں ان کے سامنے پیش کر کے نذریں اور منتیں مان رہی ہے۔ غرض جو کچھ مندروں میں ہوتا ہے۔ وہ سب آپ وہاں بھی ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ فرق یہ ہے کہ مندروں میں بت پرستی کرنے والے اپنی بت پرستی کے معترف ہیں۔ مگر مزار پرستی اور اولیاء پرستی کے شرک صریح کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو توحید کامل کے دعویدار اور سلطان الموحدین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دعاء کے معنی ہیں پکارنا۔ یہ پکارنا حاجت روائی کے لئے ہو یا دفع مصیبت کے لئے یا امداد و اعانت کے لئے یا عنایت و توجہ حاصل کرنے کے لئے، سب صورتیں دعا میں شامل ہیں اور حدیث نبوی ہے:

الدُّعاءُ مُخُّ العبادة

(دعاء عبادت کا مغز ہے)

دوسری روایت میں ہے:-

الدّعاء هو العبادة

(دعا ہی عبادت ہے)

اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو مندرجہ بالا مقاصد میں سے کسی مقصد سے پکارنا یا بالفاظ دیگر غیر اللہ سے دعا کرنا

اس کی عبادت کے مرادف ہے۔ کس قدر حیرت انگیز اور افسوسناک ہے یہ بات؟ کہ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے) کا قائل اس شرک صریح کے گندہ نالے میں غوطہ لگائے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک بزرگ کے بقول احتیاج شیروں کو "روباہ مزاج" بنا دیتی ہے۔ مشہور مثل ہے "صاحب الغرض مجنون" کون ہے جسے احتیاجات نہ ہوں اور کتنے ہیں جو اس جنون سے بالکل مامون ہوں۔ اس کے بعد شرک میں مبتلا کا خطرہ بھی قوی ہو جاتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے اسی توحید دعائی پر بار بار زور دیا ہے اور حق تعالیٰ کی صفت ربوبیت کی خوب وضاحت فرمائی ہے۔ کیونکہ اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی دوسرے سے دعا کرنا اسے حق تعالیٰ کی صفت ربوبیت میں شریک کرنا ہے۔ اور اشراک باللہ کی یہ قسم سب سے زیادہ عام ہے۔ چند ارشادات الٰہیہ پر اکتفا کرنا توضیح مدعا کے لئے کافی ہے۔

قل انما ادعو ربی ولا اشرک بہ احداً

(کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں (دعا کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ (عبادت و دعا میں) کسی کو شریک نہیں کرتا)

آیت میں "دعا" کو ذات حق جل شانہ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو یعنی غیر اللہ سے دعا کرنے کو شرک فرما کر اس سے براءت کا اظہار فرمایا گیا۔ لفظ "انما" انحصار کی صراحت کر رہا ہے۔ اسی طرح لفظ "احداً" کا عموم بھی قابل غور ہے۔ انبیا، اولیا، شہدا، جن، ملائکہ کسی سے بھی دعا مانگنا شرک صریح ہے۔ یہاں تک کہ سرور کونین سلطان دارین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دعا مانگنا داخل شرک ہے۔

ومن یدع مع اللہ الٰھاً آخر لا برھان لہ بہ فانما حسابہ عند ربہ انہ لا یفلح الکافرون

(اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو بھی پکارتا ہے (یعنی دعا و عبادت میں شریک کرتا ہے) اس کے پاس (اس شرک کی) کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہوگا۔ بے شک کفر کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے۔

یہود و نصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ

(انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب بنا لیا ہے)

کلام خیر الانام میں اس کی تفسیر یہ وارد ہوئی ہے کہ وہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو تحلیل و تحریم کے بارے میں بالکل خود مختار سمجھتے تھے۔ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اسی قسم کے شرک میں مبتلا ہے۔ یعنی خدا پرست کے بجائے پیر پرست بنا ہوا ہے۔ پیر صاحب کیسے ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہوں، مرید کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ عبادت کا ایک خاص طریقہ ہے۔ جس پر عمل کرنا بعض صورتوں میں ہر مسلمان کے لئے ضروری ہوتا ہے کلمہ توحید پر ایمان رکھنے والا یہ بھی سمجھتا ہے کہ ہر قسم کی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح دن کی روشنی طلوع آفتاب کا یقینی اور بدیہی نتیجہ ہے۔ اسی طرح اس کلیہ سے یہ جزئیہ بھی بداہتہً سمجھ

میں آتا ہے کہ قربانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن ان لوگوں کی عقل و خرد کی تعزیت کن الفاظ میں کی جائے جو پیروں اور شہیدوں کے نام پر قربانیاں کر کے اپنے جذبۂ توحید کو کند چھری سے ذبح کرتے ہیں۔ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ کے نام پر قربانی کرنا تو اس قسم کے لوگوں میں عام ہے۔ لیکن بعض دوسرے حضرات کے نام بھی اس سلسلہ میں آجاتے ہیں۔ ایک آدھ ایسے بھی ہیں جنہیں ولی اللہ بھی نہیں سمجھتے مگر ان کے نام پر مرغ وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں۔ بعض تو ظاہری پردہ بھی اٹھا دیتے ہیں یعنی جانور کو مزار پر لے جا کر قربان کرتے ہیں۔ مندروں میں جو بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اس میں اور اس میں ظاہری فرق بھی نہیں باقی رہتا۔

دین سے جہالت، فسق، ہوا پرستی، مشرکانہ ماحول ان چیزوں نے مل کر اس موحد قوم کے ہر شعبۂ زندگی میں شرک کی آمیزش کردی ہے۔ معاشرت کی ابتدا شادی سے ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ ایک مبارک معاہدہ ہے لیکن مسلمانوں نے اسے بھی نحوست شرک میں آلودہ کردیا۔ دنوں اور تاریخوں کے سعد و نحس ہونے کا اعتقاد دراصل ستارہ پرستی کا ایک بچہ ہے جو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ اور تعجب ہے کہ موحدین نے اسے لے پالک بنا لیا ہے۔ اس باطل عقیدے کا اثر یہ ہے کہ تقریب سے پہلے منجم یا جوتشی سے دن تاریخ کے سعد و نحس ہونے کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے مگر نجومی کا کام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس سے زائچہ بنوایا جاتا ہے۔ جس میں اس کی ساری زندگی کے متعلق پیشین گوئی ہوتی ہے۔ ان افعال قبیحہ کو بھی شرک نہ کہا جائے تو شرک کس چیز کا نام ہے۔ حدیث نبوی میں بڑی شدت کے ساتھ نجومیوں سے خبریں پوچھنے کی ممانعت آئی ہے۔ معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ منجم سے آئندہ واقعات پوچھنا اسے عالم الغیب سمجھنے کے مرادف ہے اور یہ اشراک باللہ کے ہم معنی ہے۔

رخصتی کے وقت بعض اوقات امام ضامن باندھا جاتا ہے۔ یعنی "امام" کو دلہن دولھا کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں انھیں حاضر و ناظر اور ہر قسم کی امداد پر قادر سمجھا جاتا ہے۔ یہ کھلا ہوا اشراک باللہ ہے امامت کا عقیدہ بھی خالص شیعی عقیدہ ہے۔

شادی بیاہ میں بعض اور بھی رسمیں بعض مقامات میں ہوتی ہیں جو حدود شرک میں داخل ہیں۔ ان کی تفصیلات بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

استقرا کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے توحید عملی کو بہت نظر انداز کیا ہے۔ چند اعمال و رسوم کا تذکرہ کامل استقرا پر مبنی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے اعمال و رسوم آپ کو ملیں گے جو حدود شرک میں داخل ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کی قسمیں کھانا۔ ٹونے ٹوٹکے کرنا، چیچک کو دفع کرنے کے لئے سیتلا پوجا کرانا اور اسی قسم کے بیسیوں مشرکانہ اعمال ہیں جن میں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مبتلا ہے جن میں جہلا بھی ہیں اور پڑھے لکھے بھی۔ مزید افسوس اس پر ہے کہ تعلیم یافتہ ان مشرکانہ اعمال کی گندگی پر دور از کار تاویلات کی مٹی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس محال کو بھی ممکن فرض کر لیا جائے کہ اس قسم کے اعمال فساد عقیدہ سے محفوظ ہیں تو بھی شرک عملی کا سیاہ داغ ان کی پیشانی پر لگا رہے گا۔ دین توحید تو صورت شرک کو بھی حقیقت شرک کی طرح ملعون قرار دیتا ہے۔

توحید حالی محبت، تسلیم و رضا، خوف، اعتماد یہ سب ہمارے نفس کے کیفیات و حالات ہیں جو اضافی پہلو بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق کسی دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ محبت کے لئے کسی محبوب کا وجود ضروری ہے۔ اعتماد کسی پر ہوتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

یہ اور انھیں کے مثل بعض دوسری نفسی کیفیتیں دوگونہ تعلق رکھتی ہیں یعنی ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے اور خالق سے بھی۔ مثلاً محبت ہمیں اپنے والدین سے بھی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی۔ لیکن وجدانی طور پر ہم ان دونوں تعلقات میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ ان کا ایک درجہ مخلوق کے لئے ہے اور ایک درجہ خالق کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ مخصوص درجہ خالق ہی کے ساتھ مخصوص رہے کسی دوسرے کو نہ دیا جائے۔ اسی چیز کا نام توحید حالی ہے۔ مثلاً والدین، اولاد، اقارب، احباب، مال و دولت، وطن و مسکن ہر چیز کی محبت طبعی ہے۔ شریعت اس محبت پر کوئی ملامت نہیں کرتی لیکن اس محبت کی ایک حد ہے اس سے تجاوز حدود توحید سے تجاوز ہے۔ کیونکہ اس سے بلند درجہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ہے ارشاد ربانی سنئے :- من الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونہم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حبا للہ

(بعض اشخاص اللہ کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو اس کے مثل سمجھتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہئے۔ اور اہل ایمان کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھتے ہیں)

کوئی الیکٹرانی پیمانہ دنیا میں موجود نہیں ہے جس سے ناپ کر بتایا جا سکے کہ فلاں قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت مخلوق کی محبت سے زائد ہے یا کم لیکن اس کے لئے عملی پیمانہ موجود ہے جس سے ہر شخص اپنے دل کا امتحان کر سکتا ہے جب مخلوق و خالق کی رضا کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا اور محبت الٰہی کا اقتضا یہ ہے کہ مالک و محبوب حقیقی کی رضا کو اختیار کیا جائے اور ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ خواہ اس راستہ میں اقربا و احباب کی طرف سے منہ موڑنا پڑے یا اپنی جان و آبرو سے تعلق توڑنا پڑے۔ اگر دل میں یہ جذبہ نہیں تو بلاشبہ توحید حالی حاصل نہیں ہے۔

دلوں کا حال علام الغیوب جانتا ہے۔ ہم ظاہر بین تو صرف ظاہر کو دیکھ کر دل کے متعلق اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ "توحید حبی" کی جنس گراں مایہ آج اس قدر کمیاب ہو چکی ہے کہ بہت تلاش و جستجو سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس کے سب سے بڑے دکاندار مشائخ تھے جن کی آتش دل کی چنگاریاں دور دور تک دلوں میں آگ لگا دیتی تھیں۔ مگر ان میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں شعلۂ طور کی تجلی کے بجائے آتش نمرود کی تپش محسوس ہوتی ہے۔ احکام شرعیہ کی خلاف ورزی ان کا شعار، سنت نبویہ سے سرکشی ان کی طبیعت ثانیہ۔ شرک و بدعت کے جذام میں مبتلا ہیں، اور دوسروں تک اسے متعدی کرنے کے در پے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے دلوں میں محبت الٰہی کے بجائے محبت دنیا نے گھر کر لیا ہے۔ یہ حال صوفیا و مشائخ کے ایک بڑے گروہ بلکہ ان کی اکثریت کا ہے۔ لیکن سب کو ایسا ہی سمجھنا سخت غلطی ہے۔ آج بھی ایسے حضرات اس طبقہ میں موجود ہیں۔ جن کے مقدس چہروں کا دیکھنا ہی محبت الٰہی کی فطری چنگاری کو ہوا دیتا ہے اور ایمان میں قوت و طاقت پیدا کرتا ہے۔

محبت الٰہی کا تذکرہ بھی مومن کو محبوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس لذیذ حکایت کی یہ معمولی سی طوالت غالباً کسی کے لئے بار خاطر نہ ہوگی۔ بات ختم کر رہا تھا کہ دو ایک "اپ ٹو ڈیٹ" قسم کے شرک یاد آ گئے جو اگرچہ شرک اعتقادی اور عملی میں داخل ہیں لیکن ان کی بنیاد اسی محبت سے پڑتی ہے۔

پہلی چیز تو وطن پرستی ہے جو بلا تکلف خدا پرستوں کے نیشن میں بھی داخل ہو گئی ہے۔ وطن کی محبت ایک طبعی شئے ہے اور اس کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ یہاں تک انکار نہیں ہے بلکہ اس طبعی اقتضا کی خلاف ورزی پر شریعت اسلامیہ بھی نکیر کرتی ہے۔ لیکن ان سب کی ایک حد ہے، اس وقت دنیا نے وطن کو ایک معبود بنا لیا ہے۔ اس کی تقدیس۔ اس کے لئے اخلاق و انسانیت کے ہر اصول کو قربان کر دینا۔ اس کی محبت کا درجہ دین و مذہب وغیرہ ہر چیز کی محبت سے فائق سمجھنا۔ اس کے لئے احکام الٰہی سے منہ موڑنا۔ یہ سب امور کیا اسے معبود کا درجہ نہیں دے دیتے ہیں؟ اور کیا یہ شرک نہیں ہے؟ اسلام میں حب وطن بہت مستحسن ہے بلکہ مامور بہ ہے۔ لیکن وطن پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان بھی اس مغربی شرک کو اپنی زندگی کا جزو بنا چکا ہے۔ ادھر مختلف اسلامی ممالک سے مغربی ممالک کے خلاف جنگ کی خبریں آئیں۔ آنکھیں دیکھنے کو اور کان سننے کو ترس گئے کہ کہیں فی سبیل اللہ کا لفظ دکھائی یا سنائی دیتا۔ للہیت کی روح کے بجائے ہر طرف وطنیت کی روح کارفرما نظر آئی۔

ایک دوسرا بت بے ایمان کے ایک صنم تراش نے تراشا تھا۔ انسانیت کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی فی نفسہ قابل قدر و محبت شئے ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اسے بھی معبود کا درجہ دے دیا ہے۔ اختلاف انسانیت کی محبت سے نہیں ہے بلکہ اس محبت و عظمت میں غلو اور افراط سے ہے جو درحقیقت ایک فلسفیانہ تخیل اور عمل دو چیزوں کا ایسا عجیب مرکب ہے جس کے اجزاء کے درمیان کوئی کشش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے پرستار جب خیالی دنیا سے عملی دنیا کی طرف آتے ہیں تو خود اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اسلام کا موقف ظاہر ہے۔ انسانیت نوازی اس کے نزدیک فرض لیکن انسانیت پرستی اس کے نزدیک خلاف فطرت اور شرک ہے جس کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

محبت کی طرح اعتماد کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک درجہ مخلوق کے لئے ہے اور دوسرا رب العالمین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس تخصیص کو باقی رکھنا توحید فی الاعتماد ہے جس کا اصطلاحی نام دین قیم میں توکل ہے۔ ارشاد حق ہے:

وعلی اللہ فلیتوکل المومنون

(اہل ایمان کو صرف اللہ پر توکل و اعتماد کرنا چاہئے)

خوف طبعی مخلوق سے بھی ہوتا ہے اور اسلام اس کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کی ایک حد ہے جس کے آگے خوف کا وہ درجہ ہے جس کے متعلق فرمان باری ہے:- وایای فارھبون

(اور صرف مجھ سے ڈرو) بقیہ کیفیات کو انھیں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

یہ چند اشارات ہیں جن پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ توحید حالی خود ایک مستقل موضوع ہے جو شرح و بسط چاہتا ہے۔ بشرط توفیق اس پر پھر کسی وقت روشنی ڈالوں گا۔ آخر میں ایک جامع آیت نقل کرتا ہوں جو توحید کے سب ابواب کا خلاصہ۔ مومن کی زندگی کا مکمل دستور العمل۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ جل شانہ کا مطالبہ ہے:

ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

(بے شک میری نماز۔ عبادت۔ زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے)

کاش! سمجھدار مسلمان اس دعوت کی طرف متوجہ ہوتے اور اسے اپنا مقصد حیات بنا لیتے۔

اذانِ بت کدہ

نغمہ و فریاد — اصلاح و انقلاب — نقد و احتساب

لکھے ہیں یہ اشعار، مگر خونِ جگر سے!

- اسد ملتانی
- عاصی کرنالی
- شفیق جونپوری
- ساقی جاوید
- پروفیسر ضیاء احمد بدایونی
- ابو البیان حماد
- صابر القادری
- عامر عثمانی
- دلدار سعیدی
- فوق جامی
- بسمل سعیدی
- راغب مرادآبادی
- عبد الحمید ارشد
- رعنا ظفر
- ابو العرفان مست انصاری
- محمد عبد العزیز شرقی
- شبنم رومانی
- ابر احسنی گنوری
- ابو المجاہد زاہد
- ماہر القادری

اسد ملتانی

کیا یہی توحید ہے؟

لب پہ تو اللہ کی تعریف ہے تمجید ہے
اور عمل دیکھیں تو خود ایمان کی تردید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

جنکو ورد سورۂ اخلاص کی تاکید ہے
اُن کو بھی کفار ہی سے خوف اور اُمید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

خود ہوائے نفس کی بے تکلف پیروی
اور خدائے پاک کے احکام پر تنقید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

جا رہی ہے کیا قلم تعلیمِ قرآں کے خلاف
آیۂ قرآں سے جس تقریر کی تمہید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

خسروانہ رنگ میں ہوتا ہے اسکا اہتمام
خواہ وہ تقریبِ غم ہو خواہ جشنِ عید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

تو ہو کوشاں دینِ حق کی سربلندی کیلئے
اور باطل قوتوں سے طالبِ تائید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

زندہ مردانِ خدا سے بے نیازی کا سلوک
اور مُردوں سے تجھے امداد کی اُمید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

سجدہ قبروں پر نظر دنیا پہ دل نذرِ بتاں
دین کی تنقیص میں اغیار کی تقلید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

کعبۂ دل میں بسائے جا رہے ہیں بت نئے
جاہلیت کے پرانے دور کی تجدید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

اب مسلماں کو نہیں لاتقنطو کا بھی یقیں
کفر سے مرعوب ہی اسلام سے نومید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

وحدتِ ملت ہوئی ہے پارہ پارہ اے اسد
انتشارِ فکر کی سو سو طرح تائید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

عاصی کرنالی

"توحید"

زخمۂ توحید سے جنبشِ تارِ حیات —!
اس سے یقیں کی نمود، اس سے خودی کا ثبات

عشق جلال آفریں، حُسن جمال آفریں
اس سے بشر کی حیات سلسلۂ معجزات

اس سے نگاہِ عمرؓ فاشِ کنِ رمزِ دیں!
اس سے دلِ مرتضےٰؓ جلوہ گہِ نورِ ذات

اس سے فضا تاب ہے وادیٔ بدر و حُنین
اس سے شفق رنگ ہے دامنِ موجِ فرات

اس کے اُفق سے طلوع نورِ جبینِ حرم
اس کی شعاعوں سے ماند قشقۂ لات و مَنات

اس کی بہاروں میں مست بندۂ مومن کا دل
اس کی فضاؤں میں چُست مردِ مسلماں کا ہات

اس کی تجلّی میں گم ظلمتِ ذہن و خرد!
اس کے تصور سے حل نکتۂ ذات و صفات

وحدتِ فکر و عمل، ہے اسی طوبیٰ کا پھل
غیرت و عزم و یقیں، ہیں اسی ڈالی کے پات

شیطنتِ عصرِ نو، جُرم و بغاوت کی رَو!
شورِ "انا" سے ہے پُر انجمنِ کائنات

آہ اس احساس سے تلخ مرے روز و شب
کام و دہن میں مرے، زہر ہے قند و نبات

وسوسۂ آدمی، ذہن کی غارت گری!
عقل کی پوشیدہ چوٹ، نفس کی دُزدیدہ گھات

شرک کی اُفتاد بھی، فتنۂ ایجاد بھی!
فکر کا الحاد بھی، کھاتے ہیں ہم جس سے مات

موجۂ توحید میں ساری خرافات غرق
ایک خُدا کا خیال، لاکھ بتوں سے نجات

شفیق جونپوری

حمد

خدا کی حمد سے آغاز ہر مقام کیا
کہ جس نے مجکو سخن فہم و خوش کلام کیا

اسی نے نطق سے انسان کو شرف بخشا
اسی نے حرف و معانی کا اہتمام کیا

فلک کو سدرہ و طوبیٰ و عرش و لوح و قلم
زمین کو ادب حرم دے کے نیک نام کیا

زمیں کی پیاس بجھانے کے واسطے کیا کیا
فضا میں ابرِ بہاری کا انتظام کیا

فلک کو چاند ستاروں نے روشنی بخشی
زمیں کو سنبل و ریحاں نے خوش مقام کیا

وہ نورِ خاص جبینِ ابوالبشرؑ کو دیا
ملائکہ نے بھی آدم کا احترام کیا

بشر کو اپنی خلافت کا مرتبہ دیکر
فیوضِ نامتناہی کو اور عام کیا

شفق سے دامنِ گردوں کو کر دیا رنگین
زمین کو خونِ شہیداں سے لالہ فام کیا

تجلیِ رخ و گیسو کو تھا جو شوقِ ظہور
تو کائنات کو پابندِ صبح و شام کیا

بقدر جلوۂ رخسار و زلفِ محبوباں
نگاہِ اہلِ نظر کو اسیرِ دام کیا

جمالِ خارِ مغیلاں دیا بیاباں کو
چمن کی گود میں پھولوں کو مشک فام کیا

بسایا وادی و کہسار کو غزالوں سے
نسیمِ صبح کو گلشن میں خوش خرام کیا

بتا کے جن و بشر کے وجود کی غایت
لیعبدون پہ مقصد کا اختتام کیا

ہزار شکر جہنم کی آگ کو اس نے
شفیق جیسے گنہ گار پہ حرام کیا

خالق و کردگار

ہمیشگی ہی اگر مادے کی ہے تسلیم
تو کردگار ازل سے کشیدگی کیا ہے

زمین آگ کا گولا تھی فرض کرتا ہوں
مگر زمین کی ہستی پہ آگہی کیا ہے

زمین آئی کہاں سے سوال کرتا ہوں
مکونات کے آغاز کی خودی کیا ہے

ہوئی نہ عقل کی تسکین خدا کو چھوڑ کے بھی
خدا نہیں ہے تو یہ نظمِ زندگی کیا ہے

چلا کہاں سے زمانے کا کاروانِ وجود
اور ابتدا ہے تو عنوانِ آخری کیا ہے

جب ابتدا کا پتہ ہے نہ انتہا کی خبر
تو فلسفی بھی حقیقت شناس ہی کیا ہے

زمیں پہ لالہ و گل کی بہار کیا معنی
یہ آسماں پہ ستاروں کی روشنی کیا ہے

یہ ڈالیوں پہ عنادل کے چہچہے کیسے
چمن میں غنچہ و گل کی شگفتگی کیا ہے

کہیں تو خشک ہیں چشمے کہیں رواں لہریں
زمین کا ابھی کیا رنگ تھا ابھی کیا ہے

بغور دیکھئے ترتیب فصل و موسم کی
خزاں کے بعد یہ آمد بہار کی کیا ہے

یہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے گھونسلے کیسے
یہ شاخِ گل پہ سلیقے کی زندگی کیا ہے

ہے اک شعور پہ مبنی وجود ہر شے کا
جو دھوپ ہے تو درختوں کی چھاؤں بھی کیا ہے

خود اپنی ذات سے ہوتی ہے معرفت اسکی
حقیقتِ بشری کیا ہے آدمی کیا ہے

ساقی جاوید بی۔اے

مرقد پرستی

یہ سلگتی تربتیں یہ "آستانے" یہ مزار!
یہ چرس پیتے مجاور، اونگھتے خدمت گزار
کفر کا اٹھتا دھواں، الحاد کا اڑتا غبار
زہد کے نیلام گھر، تقدیس کے جلتے دیار

سینکڑوں مدفن ہزاروں تعزیئے پوجے گئے
جانے کتنی خانقاہوں کے دیئے پوجے گئے
جانے کتنی "چادروں" کے حاشیئے پوجے گئے
کتنے "پنجے" خیر و برکت کے لئے پوجے گئے

مرقدوں پر سجدہ ریز انبوہ پجاری الاماں
قبر کے مُردوں کی یہ پروردگاری الاماں

خیر و برکت کا صحیفہ طاق میں رکھا رہا
نقشِ ہستی پردۂ اوراق میں رکھا رہا

عصمتوں کی منڈیوں کے بیوپاری دہر میں
سینکڑوں "تکیوں" کی یہ تحویلداری دہر میں
آج بھی الحاد کے سکے ہیں جاری دہر میں
آدمی کا دل ہے ظلمت کی پٹاری دہر میں

ہر لحظہ اک وقت کا ناسور ہے کس سے کہیں
شیشۂ تقدیس چکنا چور ہے کس سے کہیں
دل یہاں خود اک صلیبِ نور ہے کس سے کہیں
کن اندھیروں میں سحر محصور ہے کس سے کہیں

مرنے والوں سے مرادیں مانگنے آتے ہیں لوگ
کس عقیدت سے جہنم کی طرف جاتے ہیں لوگ

کون سازِ وقت کی آواز سنتا ہے یہاں
آدمی کا ذہن انگارے ہی چنتا ہے یہاں

پھر زمانہ ایک زنجیرِ کہن دیتا ہوا —
وقت پینے کیلئے خونِ چمن دیتا ہوا —
آدمی کو پھر بلاوا اہرمن دیتا ہوا
کعبۂ تقدیس کو خونیں کفن دیتا ہوا

رہروانِ حق مگر کچھ آج بھی بیدار ہیں
کچھ اجالے رات سے آمادۂ پیکار ہیں
پھر اُفق پر کچھ نمودِ صبح کے آثار ہیں
کچھ نگاہیں اے زمانے نقش بر دیوار ہیں

رکھنے والوں نے ادا اک یاد رکھی کفر کی
"پیر و مرشد" نے بھی اک بنیاد رکھی کفر کی

پھر چراغِ زیست کی ہم لو بڑھاتے ہیں یہاں
انجم و مہتاب بن کر جگمگاتے ہیں یہاں

مرقدوں کے پوجنے والو۔ حرم کا واسطہ
اس نبیؐ پاک کے نقشِ قدم کا واسطہ
انقلابِ چین و روما و عجم کا واسطہ
جاگتی صبحوں کے سیلِ یم بہ یم کا واسطہ

تا بکے یہ دل لگی توحید سے، اسلام سے
صبح کی تم کو امیدیں ہیں غروبِ شام سے

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ایم-اے

غیر اللہ کو سجدہ

آئے سفر سے ایک صحابیؓ باوفا
سجدہ کیا رسول علیہ السلام کو
لیکن نہ تھی پسند یہ تعظیم کی ادا
اللہ کے پیمبرؐ عالی مقام کو
پوچھی جوان سے وجہ تو بولے کہ بارہا
دیکھا ہے رومیوں میں خواص و عوام کو
کرتے ہیں سجدہ وہ بہ کمالِ فروتنی
مذہب کے ہادیان و سران عظام کو
میرا بھی دل ہوا کہ نبیؐ کے حضور میں
لاؤں بجا خصوص سے اس رسم عام کو
فرمایا یہ طریق نیایش ہے عاجزی
مشروع ہے اگر تو خدائے انام کو
گر غیر حق کے واسطے یہ شیوۂ نیاز
ہوتا روا شریعت حقہ میں نام کو
کرتا میں عورتوں کو ہدایت کہ سجدہ ریز
ہوں اپنے شوہروں کے حضور احترام کو

ابو البیان حمّاد

نغمۂ توحید

کلیدِ گلشنِ فردوس و دولتِ جاوید
رضائے باری تعالیٰ تصورِ توحید

دلیل و حجتِ توحید، انجم و ناہید
مہ و ثریا و پروین و اختر و خورشید

ہمیں نصیب جو ہو جائے اپنے رب کی دید
وہی ہے عید ہماری، وہی ہماری عید

گوارا کر نہ سکے جو نظام باطل کو
وہی ہے رمز شناسِ حقیقتِ توحید

وہ سب خدا کے مطیع و فقیر بندے ہیں
نبی ہو یا کہ ولی یا سکندر و جمشید

اُمید و بیم نہیں ماسوا سے کچھ بھی جسے
اسی کے ساتھ ہے اللہ کی نصرت و تائید

حسینؓ ابن علی نے کٹا کے سر اپنا
سکھایا اہلِ زمانہ کو نکتۂ توحید

کبھی بدل نہیں سکتے حقائقِ ابدی
عبث ہے بحثِ لاطائلِ قدیم و جدید

دل و دماغ صنم خانۂ ہوا و ہوس
مگر زبان سے ہر بار دعویٔ توحید

ہے اجتناب ضروری رسوم بدعت سے
زبسکہ لعنتِ بدعت ہے شرک کی تمہید

سفینہ اس کا بھنور سے نکل نہیں سکتا
جو نا خدا سے تو راجی خدا سے نا اُمید

جو بُت شکن تھا کبھی بُت فروش ہے وہ اب
ہے کفر و شرک کا مُنّاد، حاملِ توحید

کسی پہ اسکو بھلا تبصرہ کا کیا حق ہے
جو اپنی ذات ہی پہ خود ہو مستقل تنقید

ہے جس کا گوہرِ مقصود مرضیٔ مولا
فرشتے اس کی اداؤں کی کرتے ہیں تقلید

چراغِ دودۂ چشم براہیم! بتکدہ ہے جہاں
سنبھال تیشۂ حق اور ایک ضربِ شدید

ابو البیان زمانہ ہزار دشمن ہو
میں بتکدوں میں سناؤنگا نغمۂ توحید

ماہر القادری

ندائے حق

اے کہ انسان تجھے خلق کیا ہے کس نے
مرتبہ بڑھ کے ملائک سے دیا ہے کس نے

اور مخلوق ہے جتنی بھی، وہ سب تیری غلام
بخشا یہ کس نے تجھے عزت و عظمت کا مقام

فہم و ادراک کی سونپی ہے امانت کس نے
کی عطا عقل و خرد کی تجھے دولت کس نے

نطق کو کس نے عطا طاقتِ گویائی کی —
دیدۂ کور کو دیں نعمتیں بینائی کی!

بندہ کہہ کر تری توقیر بڑھائی کس نے
راہ منزل پہ پہونچنے کی دکھائی کس نے

یہ نہ سوچا کہ ہے طاقت بھی کوئی لامحدود
عبد کی شان یہ تھی اُس کو سمجھتا معبود

تو نے اپنوں میں جسے چاہا خدا مان لیا
وقتِ مشکل اُسے حاجات روا جان لیا

ہوش اتنا بھی نہیں ہے تجھے دیوانۂ عقل
عقل رکھکر بھی بنا پھرتا ہے بیگانۂ عقل

ہم نے بخشا تجھے تسلیم و رضا کا پیکر
ہم کو ہی بھول گیا آج ہمارا ہو کر

تجھ میں مومن بھی ہیں مشرک بھی ہیں کفار بھی ہیں
کچھ ہیں وہ، ہم سے ہی جو برسرِ پیکار بھی ہیں

اس لئے تجھ سے مسلمان شکایت ہے ہمیں
اپنے محبوب کی اُمت سے محبت ہے ہمیں

ایک بندہ تھا تجھی میں سے ہمارا محبوبؐ
جس کو ہر لحظہ ہماری ہی رضا تھی مطلوب

اس کے کردار پہ کونین کی عظمت قرباں
اس کی توقیر کی دیتا ہے شہادت قرآں

ہم نے بھیجا اُسے یوں تیری ہدایت کیلئے
تو مرا جاتا تھا غیروں کی اطاعت کے لئے

تیرا ہادی، ترا رہبر، وہ مکمل انسان
زندگی جس کی سراپا تھی، ہمارے فرمان

جانتا تھا کہ ہے کیا رشتۂ محبوبؐ و حبیب
تھا یقیں یہ بھی کہ کونین کی عظمت ہے نصیب

حق سے نہ قدم پھر بھی ہٹائے اس نے
بندگی کے تجھے آداب سکھائے اس نے

ایک بندے سے کبھی خود کو نہ بڑھ کر سمجھا
اپنے کردار سے تجھ کو بھی یہی درس دیا

چھوڑ کر ہم کو اٹھائی نہ کسی سمت نگاہ
جب بھی مانگی ہے کبھی، ہم سے ہی مانگی ہے پناہ

بارہا یہ بھی بتایا تجھے، یہ اہلِ قبور!
کوئی طاقت ہی نہیں ان میں یہ خود ہیں مجبور

ان کی تعظیم کو جھکنا ہے سراسر بدعت
ان سے کچھ مانگنا مومن کے لئے ہے ذلت

تو نے چاہا جہاں، پھیلا دیا بس دستِ سوال
ہم نہ چاہیں تو بھلا دے کوئی کیا اسکی مجال

ہم سے منہ موڑ کے غیروں کی پرستش کی ہے
قابلِ عفو نہیں تو نے وہ لغزش کی ہے

اپنے ہاتھوں سے ہوا اوہام پرستی کا شکار
اُس پہ یہ آرزو، ہو بندۂ مومن میں شمار

جتنے غفار ہیں ہم، اُتنے ہی قہار بھی ہیں
ہر جزا اور سزا کے تری مختار بھی ہیں

ہے ہمارے ہی کرم پر تری ہستی موقوف
ہم جو چاہیں ترے ہر عضو کو کردیں ماؤف

اب بھی ہے وقت ہمارے غضب و قہر سے ڈر
بدعت و شرک کو چھوڑ اور رہِ حق سے گزر

تو اگر تابعِ فرمان ہمارا ہو جائے
حشر میں پھر تری بخشش کا سہارا ہو جائے

عامر عثمانی

اذانِ بُت کدہ!

عشق و وفا کی راہگذر میں زیرِ قدم جب کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ محبت ساتھ مرا دیکر پچھتائے

جشنِ چراغاں کرنے والو! تم نے یہ کیسے دیپ جلائے
اور گھٹے کمیاب اجالے اور بڑھے ظلمات کے سائے

رنج میسّر ہو یا راحت، فتح ملے یا سر کٹ جائے
لیکن یارب شوقِ طلب پر غفلت کا الزام نہ آئے

کس کو ہم مجرم ٹھیرائیں، کس کو دیں الزام کہ ہم نے
اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی عظمت کے ایوان گرائے

خوب ہے اے اربابِ محبت ذکر و بیانِ عظمتِ ماضی
لیکن غازی وہ ٹھیرے گا جو ماضی کو حال بنائے

شیوۂ اہلِ عزم و یقیں ہے طوفانوں سے ٹکر لینا
اس کو مجاہد کون کہے گا سیل کی رو پر جو بہہ جائے

راہِ وفا کا رہرو ہوں میں، کانٹوں پر چلنا ہے مجھکو
کربِ بلا سے ڈرنے والا ہرگز میرے ساتھ نہ آئے

اُس مذہب کا باغی ہوں میں جو اپنے اربابِ ہمم کو
رزم گہہ جلوت سے اٹھا کر گوشۂ خلوت میں لیجائے

نغمہ و نَے کے متوالوں کو صاحبِ وجد و حال تو دیکھا
لیکن ان "خاصانِ خدا" سے رزم کے میدان خالی پائے

غیروں نے جو بھڑکائے تھے اُنکو بجھایا ہم نے، لیکن
جو اپنوں نے بھڑکائے ہیں اُن شعلوں کو کون بجھائے

راہ نوردو! آ سکتے ہیں جانبازی کے سخت مراحل
یوں مت جانا راہِ وفا میں لاش بھی ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے

فضلِ خدا سے رشتہ توڑے، کفرِ جلی سے ناطہ جوڑے
دیر سے بیٹھا ہے اک صوفی قبرِ ولی پر آس لگائے

چھوڑ گئی تثلیث کو پیچھے تیز قدم توحید ہماری
ہم نے مٹی کے ڈھیروں پہ ماتھے ٹیکے پھول چڑھائے

اے غمخوار و یہ مت پوچھو کیوں پیہم رنجور رہتا ہوں
دل پہ عجب عالم طاری ہے بن روئے آرام نہ پائے

غم لینا اور ہنس کر لینا، سر دینا اور شوق سے دینا
کوئی یہ باتیں کیا سمجھے گا جب تک دل پر چوٹ نہ کھائے

قبروں پر جب میلے دیکھے تب یہ بات سمجھ میں آئی
بن جاتے ہیں ناداں انساں کس آسانی سے چوپائے

عامرؔ مثلِ نشۂ بادہ گمراہی بھی ایک نشہ ہے
جن کو اپنا ہوش نہیں ہے کیسے انھیں کوئی سمجھائے

محمد سعیدی

قطعہ

بن جائے پھر حرم نہ عقیدت کا بتکدہ
مجھ کو یہ خوف چشمِ عقیدت نگر سے ہے

سر پہ اٹھائے پھر نہ وہ خانقاہ کو
تقدیس کچھ حرم کی نہ دیوار و در سے ہے

سجدے یہ احترام کے سب بے جواز ہیں
سجدوں کا احترام شریعت کے در سے ہے

ہے اہلِ کاروانِ طریقت یہ وہ مقام
گمراہیوں کا خوف جہاں راہبر سے ہے

فوق جامی

اسلام کے نئے بت ساز

اے خدا رکھے ترقی اس قدر کی قوم نے
بن گئے آئینۂ حیرت بتانِ مکر و فن

ہو رہی ہیں ارتقا کی منزلیں طے پے بہ پے
جام و بادہ، رقص و نغمہ، اختلاطِ مرد و زن

پردۂ فرسودہ گر باقی نہیں تو کیا ہوا
ہیں مگر نامِ خدا باقی رسوماتِ کہن

یہ کھلے بازار پھرنا دخترانِ قوم کا
دید سے شرمندہ جس کی اہلِ مغرب کا چلن

ان بزرگانِ مقدس کی کروں تعریف کیا
مغربیت پر ہے جن کی دورِ پیری خندہ زن

رہبرانِ قوم کی توصیف ہو کیونکر بیاں
نام سے اسلام کے پڑتی ہے ماتھے پر شکن

مسجدیں ویران ہیں آباد میخانے ہوئے
عیش و مستی کے بھنور میں غرق ہے سارا وطن

یہ بزرگانِ طریقت صوفیانِ پاکباز
سی رہے ہیں روز ناموسِ شریعت کا کفن

کنجیاں رکھتے ہیں اپنے ہاتھ میں جنت کی یہ
زیرِ دامن ان کے ہیں فردوس کے سرو و سمن

حکم پر قرآن و سنت کے عمل کرتے نہیں
ان کی ملت ان کا مذہب ہے رسوماتِ کہن

شرک و بدعت کے فسانے خانقاہوں میں ہیں عام
اور مجالس میں غرض کی بت نوازی کا چلن

کیا تعجب ہے یہی حالت رہی گر قوم کی
بت گری کرنے لگے اک روز دستِ بت شکن

بزمِ ابراہیم کی زینت بتانِ آذری!
خوب ہے وحدت پرستوں کا شعارِ کافری

یہ محرم کے تماشے اور یہ جشنِ شب برات
گیارہویں کی مجلسیں یہ مقبروں پر اژدہام

نت نئی بدعت پرستی امتِ مرحوم کی
زینتِ عرسوں کا میلوں کا یہ تزک و احتشام

یہ مزاراتِ مقدس یہ بزرگوں کے نشاں
جانتی ہے جن کو دنیا ایک پاکیزہ مقام

زمزمے قوالیوں کے اور یہ ڈھولک کا شور
لوگ جن پر ناچتے ہیں مست ہو ہو کر مدام

رہ گئے قبروں کے پتھر سجدہ ریزی کے لئے
ہو چکا رخصت دلوں سے مسجدوں کا احترام

مانگی جاتی ہیں مزاروں سے مرادیں رات دن
بن چکی ہیں قبلۂ حاجات قبریں لاکلام

بت پرستی گر کرے کوئی تو کافر بن گیا
پوجنا قبروں کا مسلم کیلئے ہے نیک کام

سر بتوں کے سامنے غیروں کا جھکنا کافری
اور مسلمانوں کے سجدے سجدہ ہائے احترام

مقبروں میں ہو پرستش روز غیر اللہ کی
خانقاہوں میں چھلکتے ہیں مئے بدعت کے جام

خوب ہے یہ اہلِ دیں کی پیرویٔ آذری
خوب ہے اولادِ ابراہیم کا دینی نظام

دین کی تعلیم جنسِ خام ہو کر رہ گئی
حق پرستی کفر کا پیغام ہو کر رہ گئی

بسمل سعیدی

شہ پارے

○

مستغنیٔ احکامِ شریعت ہو لوں
وابستۂ اوہامِ طریقت ہو لوں
چھوٹیں گے نہ اب حضرتِ مرشد کے قدم
بہتر ہے کہ اللہ سے رخصت ہو لوں

○

صوفی نے کہا خستہ ہو درگاہ کا حال
اے روحِ مزار! اک نظرِ فیض کمال
مُلّا نے کہا ہوتی نہ یہ حالتِ دیں
گر روح کو ہو سکتی تصرف کی مجال!

○

ملتی ہے جب اک شوخ و فشنگ ان کو سرِ راہ
محشر بقدم، سیمتن، آوارہ نگاہ —!
مُلّا کو نظر آتا ہے اس میں ابلیس!
صوفی کو نظر آتا ہے اس میں اللہ!

○

بربادیٔ اسلام الٰہی توبہ
اُس صبح کی یہ شام الٰہی توبہ
قرآن سے آغاز ہو قوالی کا
قرآن کا انجام الٰہی توبہ

○

قرآن کو مجروحِ قوانین نہ کر
اللہ کے احکام کی توہین نہ کر
تو شوق سے تابعِ مذہب رہے
مذہب کو مگر تابعِ آئین نہ کر

○

ایمان کی ہر سانس میں ڈھل جاتا ہے جہل
ایقان کی رگ رگ میں مچل جاتا ہے جہل
ثابت نہیں کر سکتے اُسے جہلِ علوم
جب دین کے آغوش میں پل جاتا ہے جہل

راغب مراد آبادی

○

قبروں پہ شب و روز یہ میلے ٹھیلے
یہ پھول چنبیلی کے یہ کھلتے بیلے
پیرانِ ریائی سے خدا سب کو بچائے
ایماں سے مسلماں کے یہ برسوں کھیلے

○

دل سوزِ نہاں سے ہو چکے ہیں خالی
اک کھیل ہے اب ذکر ہو یا قوالی
ہُو حق کا یہ غوغا نہیں اس گلشن میں
اک آگ بھڑک رہی ہے ڈالی ڈالی

○

پیرانِ ریائی کے نہ پوچھ حالات
دل کش ہے اگر صبح تو دلچسپ ہے رات
معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں
حضرت ہی کے دم سے ہیں یہ ساری برکات

○

منبر پہ بصد عجز و نیاز آتے ہیں
رو رو کے نکاتِ خلق سمجھاتے ہیں
لیکن یہ خدا پرست، تسبیح بدست!
خلوت میں کچھ اور شغل فرماتے ہیں

عبد الحمید ارشد

ترانۂ توحید

خداوندا! تو ہستی ربِ عالم، واحد و یکتا
نداری ہیچ ہمسر، نے ترا باشد کسے ہمتا

جہانے ساختی از آب و گِل بہرِ ظہورِ خود
چہ حکمت!! حکمتِ کامل، چہ صنعت! صنعتِ زیبا

جہاں روشن شُد است از پرتوِ حُسنِ دل افروزت
کجا شمس و قمر باشد؟ کجا حُسنت جہاں آرا!

توئی خلّاقِ عالم، صانعِ کامل، شہنشاہے
سزاوارِ جہانبانی توئی در پستی و بالا!

تعالی اللہ! رُخِ پاکِ تو حُسنِ دلاویزت
ہمہ عالم شُدہ حیراں، ہمہ عالم بود شیدا

نمی یارد کسے ہرگز، برآرد حاجتِ کس را
توئی حاجت روا، مشکل کُشا، بر ہر کسے بالا

ندارد ہیچ شرمے، ہیچ غیرت مُشرکِ احمق
کہ سازد غیرِ تو معبود، خواند غیرِ تو آقا

ببیں آں بدعتی را کو زبد ذوقی و بد بینی
بخواند غیرِ حق تا او برآرد حاجتِ او را

نہے احسان فرمودی کہ بہرِ محوِ کفر و شرک
فرستادی رسولِ خود محمدؐ گوہرِ والا

تعالیٰ دادۂ او را ز فضلِ بے حسابِ خود
کہ عاجز از نظیرش عالمِ زیرین و ہم بالا

ہم از برکتِ توحیدِ تُست ایں نعمتِ وافر
ہمیں قرآنِ پاکِ ما، امام المرسلینؐ ما

الٰہی! ارشدِ مسکیں ندارد غیرِ تو آقا
توئی آقائے من، مولائے کُل، بے مثل و بے ہمتا

ابو البیان حماد

"آثارِ توحید"

یہ جہانِ رنگ و بو، یہ عالمِ کون و فساد
آہن و سنگ و زجاج و آب و آتش، خاک و باد

تاجدارِ کشورِ خاور، وہ روشن آفتاب
مسند آرائے تجلی گاہِ انجم، ماہتاب

چرخِ نیلی فام، سقفِ پُرشکوہ و زرنگار
بے عمود و بے ستون و بے وسیلہ استوار

ابر و باد و موج و طوفاں، ساحل و دشت و جبل
یاسمین و سنبل و ریحان و نسرین اور کنول

سرو و شمشاد و صنوبر، بانؔ و گلنار و چنار
نکہتِ گل، صوتِ بلبل، جزر و مد، یہ جوئبار

نور و ظلمت، دھوپ چھاؤں، اختلافِ روز و شب
صورتوں کا فرق، یہ نیرنگِ اشکالِ عجب

یہ فضا یہ ہستیٔ ارض و فرازِ آسماں
عرش و کرسی، سدرہ و طوبیٰ، مکان و لامکاں

آبشاروں کا ترنم، نغمۂ جوئے رواں
رقصِ طاؤس، پپیہے کی سُریلی پی کہاں

بجلیوں کی یہ چمک اور صاعقہ کی یہ کڑک
سبزۂ نو کی لہک، پھولوں کی بھینی یہ مہک

دن کا ہنگامہ، سکوتِ شام، تاروں کے گہر
رات کا پُر ہول سناٹا، تباشیرِ سحر

گردشِ ایام، اعصار و قرون و ازمنہ
امتیازاتِ قبائل، اختلافِ السنہ

ناچتی گاتی ہوائیں، گنگناتی ندیاں
نغمۂ بادِ سحر، فصلِ بہارِ گلستاں

خاموشی کی راگنی، یہ چاندنی کی نغمگی
جگنوؤں کی روشنی اور یہ گلوں کی تازگی

یہ تحیر آفریں نقش و نگارِ کہکشاں
اور یہ قوسِ قزح، اور اس کی یہ رنگینیاں

سازِ فطرت کی مدھر تانیں، فضا کے یہ گیت
غلبۂ دینِ مبیں، باطل کی ہار اور حق کی جیت

زمزمے جھرنوں کے، نغمے آبشاروں کے سرود
اور صلواتِ ملائک، چاند تاروں کے درود

سب گواہی دے چکے اللہ کی توحید پر
کیوں نہ پھر آمادہ ہو انسان بھی تجدید پر

---

[۱] عرب کا ایک مشہور درخت جسے شعرائے عرب اپنے کلام میں ویسے ہی استعمال کرتے ہیں جیسے شعرائے عجم سرو و صنوبر کو۔

رعنا ظفر

شرک و بدعت کی گرم بازاری

چل رہی ہیں شرک و بدعت کی ہوائیں چار سُو
گھومتے پھرتے ہیں پیرانِ ریائی کو بہ کو!
عام ہے بدعات و بے دینی کی اب تو گفتگو
ملّتِ اسلام کی خطرے میں ہے پھر آبرو

راز سے توحید کے آج اک جہاں بیگانہ ہے
اب حقیقت سے زیادہ عظمتِ افسانہ ہے

ایک دنیا سر بہ خم قبروں پہ آتی ہے نظر
ہے دلوں پر ان کے پیروں کی کرامت کا اثر
کیا خبر ان کو کہ یہ بھی ہے شریعت سے مَفر
جو موحّد ہیں نظر رکھتے ہیں وہ اللہ پر

بُجز خدا کے کوئی بھی مالک نہیں قادر نہیں
غیب کا عالم نہیں اور حاضر و ناظر نہیں!

سر عقیدت سے مزاروں پر جھکانا بھی ہے شرک
منتوں والا نیا چادر چڑھانا بھی ہے شرک
اور قبروں پر چراغوں کا جلانا بھی ہے شرک
"المدد یا شیخ" کا نعرہ لگانا بھی ہے شرک

حشر[1] میں مشرک کی بخشش ہو نہیں سکتی کبھی
شرک سے ہوتی ہے توحید و رسالت کی نفی

مُسلم و مُشرک کی ہیں راہیں جُدا منزل جدا
اُس کا ہے صرف اک خدا اسکے ہزاروں ہیں خدا
دل سے قائل ہے یہ ارشاد رسول اللہ کا
خواہشوں پر نفس کی قائم ہے اُس کا سلسلہ

جو موحد ہے وہ ایسے کام کر سکتا نہیں
بھول کر ترکِ رہِ اسلام کر سکتا نہیں

---

[1] ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ (قرآن مجید)

ابوالعرفان مست انصاری

سفیدی پہ سیاہی

رخسار سے ہے گردِ مزارات ہویدا!
سجدوں کی جبینوں سے جھلکتی ہے سیاہی
اے "اشہد ان اللہ" کے پیرو یہ بتا دے
رخسار و جبیں دیتے ہیں اب کس کی گواہی

سجدے بھی کیے خاک مزاروں کی بھی چاٹی
بتلاؤ تو کیا ہیں یہی احکامِ الٰہی!
جو بات تمہاری ہے شریعت سے الگ ہے
دو دن بھی نہ فرمانِ محمدؐ سے نبھاہی

مسجد سے تمہیں عار مزاروں سے عقیدت
اللہ کرے دُور دلوں سے یہ سیاہی
غیرت کی ہے یہ بات بڑے شرم کی جا ہے
ہو شرک کا سالار محمدؐ کا سپاہی!!

کیا کیا نہ مزاروں پہ ان آنکھوں نے دکھایا
توبہ ہے الٰہی مری توبہ ہے الٰہی
سرشارِ عقیدت تجھے یہ بھی نہیں معلوم
ہوتی ہے ذرا سے میں سفیدی پہ سیاہی

ابوالمجاہد زاہد

اشارے

رموز کون و مکاں کو ٹٹولنے والا
مزہ تو جب ہے کہ خود بے نقاب ہو جائے

خدا کی راہ پر آنا پڑے گا مجبوراً
ابھی کچھ اور یہ انساں خراب ہو جائے

سنور رہے ہیں نئے سر سے گیسوئے افکار
اب اپنی خیر منائے تمدنِ گمراہ

نکھر رہا ہے حیاتِ نظام نو کا جمال
نہ رنگ ہے نہ وطن ۔ لا الٰہ الا اللہ

---

(۱)

اے ناصیہ سائے در باطل برخیز
یک حرف بگویم بسوئے ما بنگر
آسودگیٔ امن و اماں گر خواہی
لا تدع مع اللہ الٰہاً آخر

(۲)

رنگ و نسل و وطن کے دلکش لفظ
ہیں اساس تباہیٔ عالم
بہر امنِ جہاں ضروری ہے
وحدتِ رب و وحدتِ آدم

پسند آئی مجھے بات اک مفکر کی
خدا کرے کہ تری بھی سمجھ میں آ جائے

یہی ہے "کشف" ترا آج کے زمانے میں
کہ تو حقیقتِ توحید ہی کو پا جائے

ستیزہ کار ہیں تاریکیاں اجالوں سے
گماں کے پنجۂ بیداد میں حقیقت ہے

تو اس فضا میں اگر نام حق بلند کرے
مرے عزیز! یہ تیری "بڑی کرامت" ہے

بہت ہی خوب ہو یہ وجد و حال کی دنیا
بہت ہی سامعہ پرور ہے بزمِ قوالی

مرے عزیز! مگر تو نے یہ بھی سوچا ہے
یہ بیخودی ہے کہ ہے بیخودی کی نقالی

بجھا رہا ہے جو ایمان کے چراغوں کو
وہ "بھوت" تیرے "فتیلوں" سے جل نہیں سکتا

سوار ذہنیتوں پر ہے آج جو "آسیب"
وہ تیری "چلہ کشی" سے تو ٹل نہیں سکتا

جو برق تابِ عزائم کو مضمحل کر دے
اسے حیات کا پیغام میں نہیں کہتا

سبق پڑھائے جو انساں کو ترکِ دنیا کا
اسے تصوف اسلام میں نہیں کہتا

یہ جوگیانہ طریقے یہ راہبانہ شعار
یہ زندگی سے ہے اے بےخبر گریز و فرار

محمد عبد العزیز شرقی

سرمستِ بادۂ مئے توحید سیدنا بلال رضی

سرمستِ بادۂ مئے توحید ایک دن
کوڑوں سے پٹ رہے تھے سرِ رہگذر کہیں
تھا جرم ان کی وردِ زباں ہے احد احد
اور وہ منات و لات کو پوجتا نہیں
ہر تازیانہ ذکرِ خدا سے تھا ہمنوا!
یہ دردِ عشق بھی ہے عجب لذت آفریں
کہنے لگا بہ طنز وہاں اک ستم ظریف
تم جس پہ جان دیتے ہو وہ پوچھتا نہیں
سرخیلِ عاشقانِ نبیؐ نے دیا جواب
سن لو مری یہ بات کہ ہو عقل کے قریں
جاتے ہو تم جو مٹی کا برتن خریدنے
ٹھنکا کے دیکھ لیتے ہو کچا نہ ہو کہیں
تم تو حقیر شئے کو بھی لو دیکھ بھال کر
مولیٰ مرا خریدے یونہی کیا مرے تئیں

شبنم رومانی

تلقین

اے بحث کے اماموا!
اک مردِ باوفا کی تعلیم یاد رکھو
نقطہ کبھی نہ ہوگا تقسیم یاد رکھو
رسّی خدا کی تھامو!
اے بحث کے اماموا!

اے غازیانِ ہستی!
اسرارِ کیف و مستی زاہد پہ فاش کیوں ہیں
کل تک جو بت شکن تھے اب بت تراش کیوں ہیں
اتنی مہیب پستی!
اے غازیانِ ہستی!

قرآں سے منہ نہ موڑو!
کیوں بٹ گئے ہو تم بھی فرقوں میں ٹولیوں میں
کیوں گر پڑے ہو تم بھی غیروں کی جھولیوں میں
تقلیدِ غیر چھوڑو!
قرآں سے منہ نہ موڑو!

رشتہ خدا سے جوڑو!
ایمان کرینگے غارت ابلیس کے یہ چیلے
مُردوں کی یہ تجارت قبروں کے یہ جھمیلے
ان بدعتوں کو چھوڑو!
رشتہ خدا سے جوڑو!

دیکھو وہ دور افق میں
توحید کا سویرا اک جال بن رہا ہے
دل اپنی دھڑکنوں کا پیغام سن رہا ہے
دیکھو وہ نور افق میں!
دیکھو وہ دور افق میں!

ابر احسنی گنوری

"توحید"

پاسباں عقل کی ایماں کی اماں ہے توحید
قابل فخر ہے عزت کا نشاں ہے اس میں

راز تخلیق ہی سوچو تو نہاں ہے اس میں
آدمیت کی جہاں میں نگراں ہے توحید

عبد و معبود کا رشتہ ہے اسی سے محکم
مرتبے روز نئے اس سے بشر پاتا ہے

اہرمن نام سے اس کے ہی لرز جاتا ہے
وجہ عظمت ہے یہی عظمتِ یزداں کی قسم

انبیا آئے اسی کے تو پیامی بن کر
ایک خالق کے سوا کوئی بھی مسجود نہیں

جز خداوند جہاں میں کوئی معبود نہیں
کاش رہ جائے عقیدہ یہ دوامی بن کر

وہ خدا خالق کل۔ مالک و مختار جہاں
اپنے بندوں کی ہر اُمید جو بر لاتا ہے

جو برے وقت میں انسان کے کام آتا ہے
دل میں رہنے نہیں دیتا کوئی باقی ارماں

جو بڑے پیار سے کہتا ہے طلب ہم سے کرو
کوئی کر ہی نہیں سکتا ہے تمہاری امداد

کوئی سن ہی نہیں سکتا ہے تمہاری فریاد
ہم خوشی بخشتے ہیں کسب طرب ہم سے کرو

ہم اسے چھوڑ کے غیروں سے کریں جا کے سوال
تعزیوں سے ہوں تمنا طلبی کے دھندے

سجدے قبروں کو؟ یہ اعمال ہیں کتنے گندے
آدمیت کا ہے کیا اس سے زیادہ بھی زوال؟

صاف قرآن میں اللہ کا اعلان ہے یہ
سب نبی اور ولی ہیں مرے در کے محتاج

اور ہم ان کی ہی مخصوص نظر کے محتاج
ہم ہیں سچے کہ خدا صاف سی پہچان ہے یہ

اس پہ دعوٰی ہے ہمارا کہ مسلمان ہیں ہم
شرک کا نام زمانے سے مٹانے والے

رشتہ اللہ سے بندوں کا ملانے والے
دینِ برحق کے زمانہ میں نگہباں ہیں ہم

بت پرستوں پہ ہمیں کہئے فضیلت کیا ہو
شرک کی دونوں کیا کرتے ہیں یکساں تاویل

حکم شیطاں کی کیا کرتے ہیں دونوں تعمیل
اہل تثلیث پہ طعنوں کی ضرورت کیا ہے

کرنہ تذلیل حمیت کی ذرا جوش میں آ
تیرا ایمان ہے قرآن و احادیث رسولؐ

تیرے کردار سے اللہ و پیمبر ہیں ملول
اے مسلمان خدا کے لئے اب ہوش میں آ

بت پرستی تو مسلماں کو سزاوار نہیں
دین اسلام کی ذلت تجھے منظور ہے کیوں

اپنے خالق سے بغاوت ترا دستور ہے کیوں
تو موحد ہے موحد کا یہ کردار نہیں

ماہر القادری

آہ ـــــ یہ مناظر!

ہر طرف خیمے لگے ہیں، دُور تک بازار ہے / یہ نمائش ہے کوئی میلہ ہے یا تہوار ہے

کوئی بارات اس جگہ اُتری ہے باصد کر و فر / میں یہ سمجھا شامیانوں کی قطاریں دیکھ کر

یہ نفیری کی صدائیں، یہ کٹوروں کی کھنک / یہ دھوئیں کے پیچ، یہ پھولوں کے گجروں کی مہک

نیم وا بُرقعے نگاہوں پر فسوں کرتے ہوئے / شوقِ نظارہ کو ہر لحظہ فزوں کرتے ہوئے

ہے یہ تقریبِ عقیدت، عُرس ہے اک پیر کا / کام کرتی ہے یہاں کی خاک بھی اکسیر کا

اک طوائف گا رہی ہے سامنے درگاہ کے / کیا مزے ہیں حضرت قبلہ سہاگن شاہ کے

ساز پر کچھ چھوکرے قوالیاں گاتے ہوئے / گٹکری لیتے ہوئے، ہاتھوں کو بچکاتے ہوئے

رقص فرمانے لگے، کچھ صاحبانِ وجد و حال / یہ کرامت شیخ کی ہے، یا ہے نغمہ کا کمال

عورتوں کی بھیڑ میں نظارہ ٹھوکر کھائے ہے / اس ہجومِ رنگ و بو میں کب خدا یاد آئے ہے

مقبرے کی جالیوں پر عرضیاں لٹکی ہوئیں / یہ درِ منزل ہے جہاں ہیں نیکیاں بھٹکی ہوئیں

ان میں لکھا ہے ہماری جھولیاں بھر دیجئے / دردِ دل سن لیجئے، مشکل کشائی کیجئے

آپ اگر چاہیں تو ٹوٹے آئینوں کو جوڑ دیں / آندھیوں کو روک دیں طوفان کے رُخ موڑ دیں

آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے اختیار / میرا گلشن بھی بہت دن سے ہے بے فصلِ بہار

پھول بٹتے ہیں کہیں، اور دیگ لٹتی ہے کہیں / دل مچلتا ہے کہیں، اور سانس گھٹتی ہے کہیں

یہ ملیدے، یہ بتاشے، یہ مٹھائی کے طباق / یہ عقیدت کا تموّج، یہ وفورِ اشتیاق!

باتوں باتوں میں یہاں خدام دے جاتے ہیں جل
یہ اگر کی بتیاں، لوبان، صندل، عود و گل

یہ چراغوں کی قطاریں، جگمگاتے بام و در
جس طرف بھی دیکھئے سامانِ تفریحِ نظر

چادریں چڑھتی ہوئیں، ڈھولک بھی ہے بجتی ہوئی
یہ موحّد ہیں جو پوجا کر رہے ہیں قبر کی

کوئی سجدہ میں جھکا ہے، کوئی مصروفِ طواف
تھام رکھا ہے کسی نے دونوں ہاتھوں سے غلاف

رو رہا ہے کوئی چوکھٹ ہی پہ سر رکھے ہوئے
ہیں کسی کے ہاتھ بہرِ التجا اٹھے ہوئے

بدعتوں کے باب میں وہ کب کسی گھر بند ہیں
جن کے سینوں میں عقیدت کے سمندر بند ہیں

دیکھتا ہی رہ تماشائی زباں سے کچھ نہ بول
چادروں کی دھجیاں بکتی ہیں یاں سونے کے مول

ہُن برستا ہے یہاں چاندی اُگلتی ہے زمیں
آخرت کی یاد اس جا پاؤں رکھ سکتی نہیں

زائروں کے خود مجاور ہی جھکا دیتے ہیں سر
مور کے پنکھوں کے سایہ میں کلاوے باندھ کر

ہے یہ تعلیمِ نبیؐ، فرمانِ قرآنِ کریم
ہے ہر اک بدعت ضلالت، شرک ہے ظلمِ عظیم

بدعتوں ہی بدعتوں کی ہر طرف شیشہ گری
اس طرح تردید، فرمانِ رسول اللہ کی

مُدعی توحید کے اور شرک سے یہ ساز باز
اک طرف قبروں پہ سجدے دوسری جانب نماز

التجا، فریاد، استمداد غیر اللہ سے
یہ نہیں ہے شرک تو پھر شرک کس کا نام ہے

تا بکے یہ کھیل دُنیا کو دکھایا جائے گا
مضحکہ توحید کا کب تک اُڑایا جائے گا

مطبوعہ:- ادبی پریس- رابسن روڈ- کراچی

پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

رحمن پرنٹنگ پریس کراچی

فاران کراچی

پاکستان

ماہرالقادری

جلد ۹ ماہنامہ نمبر ۴

فاران

جولائی ۱۹۵۷ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اس تمدن پرور دنیا میں، جسے عالمِ اسباب بھی کہا جاتا ہے، فرد کو، جماعتوں کو اور حکومتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، کسی کی طرف خود دوستی کا ہاتھ بڑھانا، یا کسی کے ربط و تعاون کے اقدام پر لبیک کہنا، دین و سیاست کے معیار اور فکر و دانش کے نقطۂ نگاہ سے کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں کوئی حکومت بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتی، چند افراد کے لئے تو ایسا کرنا ممکن ہے کہ وہ جوگی اور سنیاسی بن کر جنگلوں اور غاروں میں چلے جائیں اور وہاں پھل پھلار کھا کر اور چشموں کا پانی پی کر زندگی گزار دیں، مگر ایک "حکومت" تو راہب نہیں بن سکتی۔ اُسے تو قدم قدم پر دوسری حکومتوں اور ریاستوں سے تعاون کے مواقع پیش آتے ہیں۔ اپنی مصلحتوں اور مفادات کے اعتبار سے کسی حکومت سے جڑنا اور کسی مملکت سے کٹنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کسی حکومت کے چیلنج کا جواب جنگ کے میدانوں میں دیا جاتا ہے، اور کسی سے صلح و دوستی کی کانفرنسوں میں معانقہ کیا جاتا ہے!

آج دنیا کی سیاست پر —— امریکہ اور روس —— یہ دو طاقتیں چھائی ہوئی ہیں۔ واشنگٹن اور ماسکو میں جو پالیسیاں مرتب ہوتی ہیں۔ اُن کا اثر ایک ایک ملک اور حکومت کی سیاست پر جا کر پڑتا ہے، یہاں تک کہ "ارضِ حرم" بھی ان نیلی اور سُرخ پرچھائیوں سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جو ہل چل مچی ہوئی ہے۔ اس میں امریکہ اور روس کے سیاسی مفادات کا بہت کچھ ہاتھ ہے، کسی نے اسرائیلی حکومت کو شہ دے رکھی ہے اور کسی کی بساطِ سیاست کا جمال ناصر مہرہ بنا ہوا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں روس اور امریکہ کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے کام اور مقصد سے غافل نہیں ہیں ——!

سیاست کی دنیا میں نہ محبت اور مروّت کوئی چیز ہے اور نہ حق شناسی اور عدل و انصاف کے تقاضوں کا وہاں خیال

کیا جاتا ہے۔ "مفادات اور صرف مفادات" اہلِ سیاست اسی پیمانہ سے ہر مسئلہ کو ناپتے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو عدل و انصاف کو خود ہی روندتا ہے اور پھر خود ہی عدل و انصاف کی دہائی دیتا ہے۔ اپنے مفاد کے لئے طاقت استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو یہ سیاست باز خونخوار شیر بن کر ہر ظلم و زیادتی کر گزریں اور پانسہ پلٹ جائے تو پھر امن و صلح اور نرمی و آشتی کے واعظ اور مبلّغ بن جائیں۔ کسی محاذ پر گرگ، کسی جگہ گوسفند، کہیں شعلہ، کہیں شبنم! یہی اہلِ سیاست خوفناک سے خوفناک ہتھیار بھی بنواتے ہیں اور پھر خود ہی اسلحہ کی تخفیف اور تحدید کے لئے کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں!

روس جو مصر کی پشت پناہی کر رہا ہے، تو اُسے مصریوں سے کیا واقعی محبت ہے؟ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ روس کا یہ اپنا مفاد ہے، جس نے مصر کی پشت پناہی کا روپ دھار لیا ہے۔ اسی طرح امریکہ کو کیا اُردن کی آزادی اور خوش حالی عزیز ہے؟ یہاں امریکہ کے مفادات نے شرق اُردن کی غمخواری کا بھیس بدل رکھا ہے!

سیاسی مفادات کی اس شوراشوری اور گرم بازاری میں ایک حکومت کے اربابِ کار کی فراست کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے ملک کے مفاد کے لحاظ سے ایسی پالیسی اختیار کریں کہ جس سے روس اور امریکہ — یہ دونوں طاقتیں قریب قریب برابر کی حلیف اور دوست بنی رہیں۔ مگر یہ پالیسی اُسی وقت بروئے کار آسکتی ہے جبکہ اُس حکومت کے اربابِ اقتدار صاحبِ فراست، انتہائی مخلص، بے غرض اور ایثار پیشہ اور آپس میں متحد ہوں۔ اور وہ حکومت اپنی ساکھ اور طاقت بھی رکھتی ہو۔ اتنی طاقت کہ بین الاقوامی دُنیا میں اُس کا وزن محسوس کیا جائے۔ جس حکومت کے چلانے والے پرلے درجہ کے خود غرض، نفس پرست اور ایک دوسرے کے حریف و رقیب ہوں اور جس ملک میں ذاتی مفادات اور شخصی اغراض کی کشمکش نے خلفشار پیدا کر رکھا ہو، اُسے لامحالہ موجودہ دُنیا کی کسی ایک بڑی طاقت کی طرف جھکنا پڑے گا۔ اور اس جھکاؤ اور میلان کا لازمی یہ نتیجہ ہوگا کہ ایک طاقت حلیف بن جائے گی اور دوسری حریف —!

بھارت کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ دس سال کے بعد کہیں جاکر اُس کا جھکاؤ روس کی طرف ظاہر ہو پایا ہے۔ ورنہ اب تک اُس کے مخلص اور صاحبِ فراست اربابِ کار نے روس اور امریکہ دونوں طاقتوں سے تعلقات قائم رکھے ہیں۔ اور ان تعلقات سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ بھارت کے نیتاؤں کا یہ کمالِ فراست و تدبّر ہے کہ پاکستان کے مقابلہ میں اُس نے امریکہ سے دُگنی امداد حاصل کی اور دُنیا کی نگاہوں میں باعزت اور خود دار بھی بنا رہا۔ ایک پاکستان ہے کہ اُس نے بھارت کے مقابلہ میں بہت کم فائدہ اُٹھایا، مگر امریکہ کی غاشیہ برداری اور استعماری طاقتوں کے پاکٹ میں چلے جانے کی بدنامی اس کے حصہ میں آئی۔ اور عرب ممالک تو پاکستان سے اسی لئے خفا ہیں کہ وہ پاکستان کو مغربی طاقتوں کا خوشہ چیں سمجھتے ہیں —!

دُوسرا ملک ترکی ہے، جو دُوسری جنگ عظیم کے وقت سے اب تک امریکہ کا دوست، معاہد اور حلیف ہے، مگر ترکی نے اپنی اس دوستی اور نیازمندی کی امریکہ سے بھاری قیمت وصول کی ہے۔ اربوں ڈالروں کی امداد ترکی نے امریکہ سے حاصل کر کے اپنے کو صنعتی، زرعی اور فوجی اعتبار سے مستحکم بنا لیا ہے۔ امریکہ نے سب سے کم قیمت پاکستان کی نیازمندی اور دوستی کی عطا کی ہے —!

قرض ہی نہیں، بھیک تک لینے میں سلیقہ، حکمت اور رکھ رکھاؤ درکار ہے۔ ایک بھکاری رکھ رکھاؤ کے ساتھ آتا ہے اُسے روپیہ دو روپیہ دینے کے بعد اُلٹا سلام کیا جاتا ہے۔ دُوسرے بھکاری کو گالیاں دیتے اور ملاحیاں سُناتے ہوئے

پیسہ دو پیسہ ذلت و حقارت کے ساتھ زمین پر پھینک دیا جاتا ہے ۔ !

ابتری اور انتشار

روس، امریکہ اور برطانیہ پاکستان کے رتی رتی بھر حال سے واقف ہیں۔ فٹ پاتھ اور چائے خانوں سے لے کر قصر و ایوان کے حالات و کوائف پر یہ حکومتیں نظر رکھتی ہیں۔ کہ عوام کے کیا رجحانات ہیں؟ کون پارٹی کیا کر رہی ہے؟ اربابِ حکومت کے کیا عزائم اور منصوبے ہیں اور وہ اُن کو بروئے کار لانے کے لئے زمین کس طرح ہموار کر رہے ہیں؟ لیاقت علی خاں مرحوم کے قتلِ ناحق کی جو افواہیں ہم عوام تک پہنچی ہیں، کیا اُن کے پس منظر سے اِن بدیسی حکومتوں کا محکمۂ جاسوسی بے خبر ہو سکتا ہے؟ یہ ہمارے "سابق آقا" اور "حال کے ہمدرد اور کرم فرما" پاکستان کی تمام شخصیتوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں؟ جی ایم سید کو "سندھی کلچر" کی مجنونانہ عصبیت کی شہ پر کہاں تک لے جایا جا سکتا ہے؟ سلیری صاحب کی "پنجابیت" کے جنون سے کیا کیا کام نکل سکتا ہے؟ دولتانہ اور کھوڑو کی ہوسِ اقتدار کو کس مقصد کی تکمیل میں کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟ ڈاکٹر خان جیسے بخوض شخص کو کون میدانِ سیاست میں لایا ہے اور ری پبلکن پارٹی کس کے اشارے سے وجود میں آئی ہے اور اس کے بل بوتے پر کون کیا کرنا چاہتا ہے؟ جماعتِ اسلامی نے اقامتِ دین کے لئے کس کس عنوان سے جدوجہد کی ہے۔ پاکستان میں اُس کی کتنی طاقت (strength) ہے اور اُس کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے کون لوگ کس طرح آلۂ کار بن سکتے ہیں؟ سردار نشتر عوام میں کتنے مقبول ہیں اور وہ اسلام اور ملت کے لئے کہاں تک قربانی دے سکتے ہیں؟ غیر ملکی سیاست دانوں کو یہ بھی علم ہے کہ علامہ مشرقی کی پشت پناہی کہاں سے ہو رہی ہے؟ اور کراچی میں "گرانی" کے خلاف جو "مصنوعی مہم" جاری ہے، اس "کٹھ پتلی" کا تار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور یہ جو "آئین کو معطل کر دینے" اور "تمام سیاسی پارٹیوں کو توڑ دینے" کی آوازیں آ رہی ہیں، یہ کس کی "تمنائے آمریت" کی صدائے بازگشت ہے؟

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون "بڑے آدمی" پاکستان کے انتشار کو اپنے اقتدار کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور کون "بڑے لوگ" اس خیال میں مگن ہیں کہ پاکستان میں جس قدر زیادہ انتشار پھیلے گا، اتنی ہی اُن کے اقتدار کی عمر دراز ہوگی اور اُن کی پوزیشن کو استحکام نصیب ہوگا۔ روس، برطانیہ اور امریکہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ رشوت کا جال نیچے سے لے کر اوپر تک کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے، کس کے شبستانِ عیش میں بادہ و شاہد کا کیا رنگ رہتا ہے؟

ایک طرف حکومتِ امریکہ، جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد سے بات کرتی ہے، جن کے بارے میں اس کا یقین ہی نہیں مشاہدہ ہے کہ اختلافات کے باوجود بھارت کی اکثریت کا ان لیڈروں کو اعتماد حاصل ہے۔ ایسے لیڈر جن کی پشت پر عوام کی اکثریت ہو، ہر طاقت اور حکومت سے آنکھ ملا کر بات چیت کر سکتے ہیں۔ اُن کی خوشی اور ناخوشی کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ مگر ایک پاکستان کے بعض "بڑے آدمی" ہیں، جن میں سے کسی کسی کو عوام کے شاید چند ہزار آدمیوں کی بھی تائید حاصل نہیں ہے۔ انھیں خود بھی اپنی نامقبولیت اور غیر ہر دلعزیزی کا احساس ہے۔ ایسے غیر عوامی لیڈروں کا امریکہ اور کوئی دوسری طاقت کیا وزن محسوس کر سکتی ہے؟ اُن میں خود بھی اتنی جرأت اور اعتماد نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی بات کو منوانے کے لئے اصرار کر سکیں۔ پس ایسے "بڑے لوگوں" کے ذریعہ جس بڑی طاقت سے بھی معاہدہ ہوگا، وہ دوستی اور مساوات کا معاہدہ نہیں بلکہ نیازمندی کا معاہدہ ہوگا ۔۔۔ !

یہ جو راجہ غضنفر علی خاں کے دل میں ایکا ایکی ملک و ملت کا درد اٹھا ہے اور وہ مسلم لیگ کے اسٹیج سے برسوں کے بعد نمودار ہوئے ہیں۔ ہمارے "بدیسی کرم فرماؤں" کے پاس اُن کا سارا کچا چٹھا موجود ہے کہ ان حضرت نے طہران۔ انقرہ اور دلی میں کیا کیا گل

کھلائے ہیں۔ مسٹر اصفہانی جن کا نام زبان پر آتے ہی" تجارت کی شعبدہ بازی" مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے، ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈال چکے ہیں۔ وہ نہ جانیں کیا شوشہ چھوڑنا چاہتے ہیں کہ مداری کیا چھپاتا کیا نکالتا ہے! غرض " سفید فام ڈپلومیٹ" اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس لیڈر کی کیا ذہنیت ہے۔ وہ کیا عزائم رکھتا ہے۔ اُس کا ذاتی کردار کیا ہے۔ پبلک میں اُس کا کتنا رسوخ ہے وہ اگر بک سکتا ہے تو کتنے داموں میں اُسے خریدا جا سکتا ہے؟

پاکستان میں جو کشمکش ہے، خلفشار اور ابتری ہے، اُس سے کون واقف نہیں ہے، زندگی کا ایسا کونسا شعبہ ہے جس میں ہل چل مچی ہوئی نہیں ہے۔ گرانی کا وہ عالم کہ پناہ بخدا! رشوت کی وہ گرم بازاری کہ توبہ ہی بھلی! صوبائی عصبیت کا وہ زور کہ ؎

نظر کی نامسلمانی سے فریاد!

پاکستان میں پچھلے دَور بھی بڑے خراب اور اذیت کوش گزرے ہیں۔ یہاں جمہوریت اور اسلام کی قدروں کو بہت کچھ پامال کیا گیا ہے۔ مگر موجودہ دَور میں پچھلے دَور کی تمام بُرائیوں کے ساتھ غنڈہ گردی اور ہلڑ کی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے، وہ ملک کے مستقبل کے لئے انتہائی تشویش اور خطرہ کا باعث ہے۔ بہت ہی گھٹیا قسم کے لوگوں کی اُوپر تک پہنچ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اس رسوخ اور رسائی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں ــــ !

ڈھاکہ میں جب نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور اُس وقت اسلام پسندوں کے جلسہ میں جو مخلوط انتخاب کی مخالفت میں منعقد ہوا تھا۔ جس طرح کی غنڈہ گردی ہوئی تھی اور مسلمانوں کی ڈاڑھیاں نوچی گئی تھیں، اُس کی صدائے بازگشت کراچی کے ایک جلسہ میں سُنی گئی۔ کہ اسٹیج سے کسی لیڈر نے مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہا۔ مجمع نے اس پر احتجاج کیا اور ری پبلکن پارٹی کے رضاکاروں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس ایک دم لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ یہ اوّلیت اور خصوصیت ری پبلکن پارٹی ہی کے جلسہ کو حاصل ہے کہ اُس کے رضاکار لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جلسوں میں آتے ہیں اور عوام کے احتجاج کا جواب ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے دیا جاتا ہے، آخر ایسی شرپسند حرکتوں کا کیا حشر ہو گا؟ اگر خدانخواستہ جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چل نکلا تو بات کہاں جا کر پہنچے گی اور ملک کے امن و امان کی کیا گت بنے گی ــــ ؟

اس ری پبلکن پارٹی کو عوام نے نہیں" اقتدار" نے جنم دیا ہے۔ یہ" عالم بالا" کے اشارے اور ایماء سے وجود میں آئی ہے اس کے کرتا دھرتا سب کے سب عہدہ و منصب کے بھوکے اور ارباب" اقتدار" کے" جی حضوری" ہیں جو اس پارٹی میں شامل ہو کر یا تو عہدہ و منصب چاہتے ہیں، یا پرمٹ اور تجارتی لائسنس! ملک و ملت کا کوئی مفاد اُن کے سامنے نہیں ہے! اُن کی ضمیر فروشی کا یہ عالم ہے کہ لاہور سے ڈھاکہ پہنچتے پہنچتے اپنی رائے اور فیصلہ کو بدل دیتے ہیں! اس کردار اور ذہنیت کے لوگوں کو سیاسی ہنگامہ آرائی کی شہ ملتی رہی یا اُن کے ہاتھوں میں اقتدار آ گیا تو پاکستان کے حالات سنبھلیں گے یا بگڑیں گے؟

روس، امریکہ اور برطانیہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ پاکستان کے عوام" اسلام" کے سوا اور کسی نظریۂ حیات کو نہیں چاہتے۔ مگر یہاں کے" بڑے لوگ" اسی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں کہ پاکستان میں" اسلامی نظام" نافذ نہ ہونے پائے۔ اسلامی نظام سے انھیں اس قدر کد کیوں ہے؟ اس کا حال یا تو اللہ جانتا ہے یا وہ خود جانتے ہیں۔ مگر ہم تو ظاہری حالات کو دیکھ کر یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ ان حضرات کو" اسلامی نظام" کے نفاذ و قیام میں اپنے اقتدار کا زوال نظر آتا ہے۔ اُن کو اچھی طرح پتہ ہے کہ اسلامی نظام کے سربراہ کاروں میں جو اوصاف (qualifications) ہونے چاہئیں اُن سے وہ یکسر عاری ہیں۔ لہٰذا اُن کی کمزوریوں پر اسلام کے علاوہ کوئی دُوسرا نظام سیاست اور نظریۂ حیات ہی پردہ ڈال سکتا ہے ــــ !

"مخلوط انتخاب" کے منظور کرانے میں ان بڑے لوگوں نے جو زمین آسمان ایک کردیئے ہیں اور دھونس، دھاندلی اور لالچ سے جس جس طرح کام لیا ہے، وہ جمہوریت و انصاف کی ایک سنگین ٹریجڈی ہے! "اسلامی نظام" کو روکنے کے لئے یہ پہلا "سنگِ گراں" ہے۔ جو اس راہ میں نصب کیا گیا ہے۔ "مخلوط انتخاب" کی تجویز منظور ہونے کے بعد ہی سے مشرقی پاکستان میں وہ تمام عناصر زور پکڑ گئے ہیں، جو پاکستان کی سالمیت اور اسلام کی وحدت کے حریف ہیں۔ "مخلوط انتخاب" نے کمیونسٹوں اور مہاسبھائی ہندوؤں کی ہمتیں بڑھائی ہیں۔ "کاگماری" کا اجلاس اسی غیر اسلامی ذہنیت کی صدائے بازگشت تھا — مشرقی پاکستان کی خود مختاری کا مطالبہ "مخلوط انتخاب" کے بطن سے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس ایک مسئلہ نے مشرقی پاکستان میں ہوا کے رُخ ہی کو بدل دیا، وہاں کی بساطِ سیاست ہی اور سے اور ہو گئی —!

جس ملک میں اربابِ اقتدار اور عوام کے درمیان "نظریاتی کشمکش" پائی جاتی ہو۔ وہاں سکون و مسرت کی ایک صُبح بھی طلوع نہیں ہو سکتی۔ وہاں سدا خلفشار اور برہمی و انتشار کا چکر چلتا رہے گا۔ اُس جگہ کوئی تعمیری کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کشمکش کے ختم ہونے کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو پاکستان کے عوام "اسلامی نظام" کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں۔ یا پھر یہاں کے صاحبانِ جاہ و منصب عوام کی فکر و رائے اور پسند سے ہم آہنگ ہو جائیں —!

ہونا کیا چاہیئے؟ کیا کروڑوں انسانوں کا اپنے مطالبہ سے دست بردار ہو جانا سہل ہے۔ یا چند مُٹھی بھر "بڑے آدمیوں" کا اپنے نظریہ کو بدل کر، عوام کا ہم خیال ہو جانا آسان ہے! سمندر کی بے شمار موجیں ساحل کی ریت میں گم ہو جائیں، یا ساحل کی ریت موجوں میں گھُل مِل جائے۔ ان میں کونسی بات آسان تر ہے، عملی اور معقول ہے —!

پاکستان عوام کی قربانیوں سے بنا ہے، انہوں نے برسوں ایک مخصوص نظریہ اور نصب العین کے تحت "پاکستان" کے لئے جدوجہد کی ہے، عوام نے اتنی بڑی قیمت دے کر پاکستان کو حاصل کیا ہے کہ اتنی بڑی قیمت کسی خطۂ ارض کے لئے کسی قوم کو نہیں دینی پڑی — تو اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ صرف چند "بڑے آدمیوں" کی مرضی کی خاطر اپنے اس نظریہ اور نصب العین سے دست بردار ہو جائیں، جس کی حفاظت کے لئے انہوں نے اپنے خون اور جانوں کے حصار باندھ دیئے ہیں! پُوری قوم کی قوم "اسلامی نظریہ حیات" کو چھوڑ کر "ارتداد" کس طرح قبول کر سکتی ہے؟ یہ اُن کے دین و ایمان کا سوال ہے!!

عوام اور خواص کی اسی نظریاتی کشمکش کے سبب پاکستان کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسی چیز نے بین الاقوامی دُنیا میں اُس کی ساکھ کو گرا دیا ہے، یہی سبب ہے کہ "کشمیر" پر پاکستان کا حق تو سب کے نزدیک ثابت اور مسلّم ہے، مگر پاکستان کی حلیف اور معاہد طاقتیں تک کشمیر کے مسئلہ میں "صنعتِ ابہام" میں گفتگو کرتی ہیں! اگر پاکستان میں سیاسی انتشار نہ ہوتا، عوام اور اربابِ اقتدار نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے موید، موافق بلکہ دست و بازو ہوتے، تو کشمیر پر پاکستان کا "حق" اس طرح سیاسی حکمت عملیوں کا کھلونا بن کر نہ رہ جاتا۔ ہندوستان کے پاس اتحاد و یک جہتی کی طاقت ہے، اس لئے دنیا کی تمام طاقتیں اظہارِ حق میں بھی ہندوستان کی طاقت کے دباؤ کا لحاظ رکھتی ہیں۔ ہمارے یہاں انتشار اور اختلاف کی کمزوری ہے، اس سے ہمارا "حق" بھی ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ جن کو ہم اپنا طرفدار سمجھتے ہیں وہ تک کشمیر کے مسئلہ میں طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں۔ متحدہ اقوام کے نمائندے جب بھی حالات کا جائزہ لینے کے لئے پاکستان اور ہندوستان آئے ہیں، تو کشمیر کے مسئلہ کو انہوں نے کچھ اس طرح "گومگو" بنا دیا ہے کہ اُن کی روش، طرزِ بیان اور اندازِ گفتگو سے بھارت ہی کو فائدہ پہنچا ہے —!

دس سال کی مدت میں یہ پانچویں وزیر اعظم ہیں، جو برسر اقتدار آئے ہیں۔ پاکستان میں کرسیوں کی ادلا بدلی اس تیزی کے ساتھ ہوتی رہی ہے کہ فرانس کے علاوہ اس کی اور کہیں نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ یہاں عجیب عجیب غیر متوقع انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ درجنوں "سابق عزت مآب" "کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ وہ "بڑے لوگ" ہیں کہ جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں رہا، ان کے آستانوں کا اہل غرض طواف کرتے رہے۔ لیکن عہدے چھننے کے بعد لوگ انھیں دیکھ کر کترا جاتے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے، چند گنتی کے لوگ ایسے نکلیں گے جن میں خود "بڑائی" موجود تھی۔ ورنہ اکثر و بیشتر لوگوں کو عہدوں اور کرسیوں نے "بڑا آدمی" بنایا ہے۔ کرسیاں چھنتے ہی ان کی "بڑائی" بھی جاتی رہی۔ اور اس ملمع کے اترتے ہی اصلیت ظاہر ہو گئی،—!

پاکستان کو سیاسی حالات کے جلد جلد تغیر و انقلاب نے بھی نقصان پہنچایا ہے۔ غیر ملکی حکومتیں بڑی تشویش میں ہتی ہیں کہ آخر کس پارٹی اور کن شخصیتوں سے معاہدہ کریں اور کن کو اپنے اعتماد میں لیں، اس لئے کہ کیا ٹھیک ہے کہ کب کس ارٹی کا ستارہ گردش میں آجائے اور کس کرسی نشین کو کب کرسی چھوڑنی پڑے! باہر کی حکومتیں ایسے سیاستدانوں کو اپنا ازدار بناتی ہیں اور اُن کی دوستی پر بھروسا کرتی ہیں۔ جن کے اقتدار کی عمر طبعی ہو اور جن کو عوام کی تائید اور پشت پناہی اصل ہو—!

اُوپر جو کچھ کہا گیا ہے اور خاص طور سے شخصیتوں کا نام لے کر جو تنقید کی گئی ہے، یہ ایک ناگوار فرض ہے جو ہم نے ادا کیا ے۔ اس طرح ہم نے خود اپنے زخموں کو چھیڑا ہے، حالات کی ابتری کو دیکھ کر ہم سے نہ رہا گیا۔ کسی طرح ضبط ہی نہ ہو سکا۔ اور ں کی چوٹیں کاغذ پر منتقل ہو کر رہ گئیں۔ مقصود اصلاح حال اور لوگوں کو چونکانا ہے۔ ہم عوام اور خواص کو دعوت دیتے یں کہ وہ ہماری تحریر کو خوردبینوں سے پڑھیں، پرکھیں اور جانچیں۔ ہم سے اظہارِ حقیقت میں اگر کہیں اُونچ نیچ ہو گئی ہو تو یں مطلع فرمادیں! اور ہماری کہی ہوئی باتیں درست ثابت ہوں تو ہماری اس خامہ فرسائی کی داد و ستائش یہی ہے کہ صلاح حال کی طرف پورے خلوص سے توجہ کی جائے! تاریخ بتاتی ہے کہ جب دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہوا ہے تو چور اور کو تو بہ کر کے متقی اور پرہیزگار بن گئے ہیں۔ اور اُن کے مستقبل نے ماضی کی ایک ایک غلطی اور کوتاہی کی تلافی کر کے وڑی ہے—!

...ستان کا مستقبل!

ہمارا وجدان کہتا ہے کہ پاکستان کا مستقبل اب "اسلام پسندوں" کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان کے تاریک افق کو یہی ستارے طلوع ہو کر انشاءاللہ تابناک بنائیں گے، پاکستان نے ال کے بہت سے دور دیکھ لئے۔ اب اللہ نے چاہا تو وہ اُس "بہار" کو بھی دیکھے گا، جس کے لئے یہ چمن ظہور میں ہے! اسلامی نظام کی راہ کوئی کب تک روکے رہے گا۔ خود غرضی نے جب برسوں راج کیا ہے تو کیا اخلاص کو خدمت وقعہ نہ ملے گا، اسی آنے والے مبارک دور سے ہم "فتح مکہ" کی آس لگائے بیٹھے ہیں ؎

بدر وحنین آج بھی دیتے ہیں یہ پیام
مکہ نہ ہو جو فتح تو ہجرت ہے ناتمام

وہ دن بھی انشاءاللہ آکر رہے گا کہ غیر ممالک میں پاکستان کے نمائندے رقاص بن کر نہیں بلکہ نیکی اور پاکیزگی

اخلاق کے مبلغ بن کر جائیں گے! پاکستان کی گھریلو زندگی پر عائشہؓ و فاطمہؓ کے مقدس آنچلوں کا سایہ ہوگا۔ تبرج جاہلیت کا یہاں نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ ہر طرف بھلائی اور نیکی کا چلن ہوگا۔ یہاں کے ذرّے دنیا کے لئے شمع ہدایت ہوں گے! اور صفحہ ارض اور ورقِ روزگار پر یہ حکومت اللہ تعالیٰ کی ایک "آیت" بن کر چمکے گی!

بارِ الٰہا! ان تمناؤں کے ایک ایک حرف کو قبولیت کا شرف بخش اور ان جلتی ہوئی آنکھوں کو نظامِ حق کے نظارے سے طراوت اور خنکی عطا فرما!

(آمین، یارب العالمین!)

ماہر القادری

۲۲ جون ۵۶ء

توحید نمبر

کی پلیٹیں ہم نے پریس میں اس خیال سے رکھوا دی تھیں کہ ممکن ہے اس کے دوسرے ایڈیشن کے چھاپنے کی ضرورت پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے اس قیاس اور اندازے کو واقعہ کی شکل دے دی اور چند دن ہی میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔

توحید نمبر کا دوسرا ایڈیشن کرنافلی سفید کاغذ پر چھپ کر تیار ہو چکا ہے۔ پچھلے ایڈیشن کی کتابت کی جو غلطیاں معلوم ہو سکیں، اُن کی بھی تصحیح کر دی گئی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ شرک و بدعت کے رد میں فاران کا توحید نمبر "قول فیصل" بن کر منظر عام پر آ[یا]
شائقین توحید نمبر کو حاصل کرنے میں تاخیر نہ فرمائیں کیونکہ دوسرا ایڈیشن بھی تیزی کیسا[تھ]
فروخت ہو رہا ہے۔

عبدالباری ایم اے

توحید کی پہلی درسگاہ ــــ اَلبَیتُ العَتیق

مختلف زاویوں سے

عتیق کیسے؟

"بیت" گھر کو کہتے ہیں، اور "عتیق" عتق سے مُشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں اصل کا خالص ہونا۔ جمال شرافت نجابت، آزادی و کہنگی (مصباح اللغات) عتیق کے معنی کہنہ و پُرانا۔ آزاد شدہ و آزاد کردہ غلام۔ (غیاث اللغات) "البیت العتیق" کے معنی خانۂ کعبہ (مصباح اللغات) غیاث اللغات میں اس سے زیادہ واضح تشریح یوں ملتی ہے:۔ "یعنی کعبہ و معنی لفظی آں خانۂ قدیم بیت اوّل برائے عبادت آدم علیہ السلام مقرر بود و بعد طوفانِ نوحؑ ابراہیم علیہما السلام تجدید آں کردند۔ و عتیق بمعنی کریم و معزز ہم آمدہ است۔ یا آنکہ آزادست از دست خراب کردن ظالمان۔" بیضاوی میں بھی لکھا ہے کہ "البیت العتیق" اس کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ صدمۂ طوفان سے محفوظ رہا۔ انگریزی میں قدیم اور بہت پُرانے کے لئے لفظ "Antique" ہے، جو غالباً اسی عتیق کا بگڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی آفرینش کے وقت سے کوئی خاص الخاص گھر بنا اور مرورِ زمانہ کے اثر یا صدمۂ سیلاب وغیرہ کی وجہ سے اس عمارت کی تجدید ہوتی رہی۔ ذیل کی سطور میں ہم اسی اجمال کی تفصیل و دلائل پیش کرتے ہیں:۔

سورۃ الحج میں بیان ہوا ہے:۔

"وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ــ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ"۔

(اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کردی اور حکم دیا کہ ہمارے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور ہمارے گھر کو صاف و پاک کرنا۔ طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے۔ اور لوگوں میں حج کیلئے پکاردو ــــ پھر وہ دُور کریں اپنی میل کچیل اور پُوری کریں اپنی نذریں اور قدیم گھر کا طواف کریں)

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں بیان ہوا ہے:۔

"وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ"۔

(اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد کیا کہ ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں، مجاوروں، رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک و صاف کرو)

ظاہر ہے طواف، عکوف، رکوع و سجود عبادت میں سے ہیں۔ اور طائفین، عاکفین اور رکع السجود پہلے سے تھے، جن کے لئے
اس بیت کو آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے جو پہلے سے موجود تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ سے وہ گھر بیت عتیق
کہلایا جاتا ہے تو شبہ نہیں کہ گھر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے تھا، اس لئے قدیم تھا۔ "طَهِّرْ، طَهِّرَا" اور "لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا" کے الفاظ
بتا رہے ہیں کہ معابد جدیدہ جو اس قدیم عبادت گاہ کے بالمقابل قائم ہو گئے تھے اور شرک کی آلودگیوں کے اڈے تھے۔ وہاں حج
نہ کریں بلکہ اسی پرانے گھر میں حج ادا کریں۔ اور اسے اوثان سے پاک کریں۔ جنہیں بت پرستوں نے رکھ دیا تھا۔ یعنی اس میں
سوائے اللہ کی عبادت کے کوئی دوسرا کام نہ ہو۔ اسی طرح قرآن کریم میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ "ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ" (الحج)
اور "هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ" (مائدہ) یعنی قربانی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بیت عتیق کعبہ تک پہنچے۔ اس کی جگہ کوئی دوسری نہیں۔
رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ "وَكُلُّ فِجَاجِ مَكَّةَ مَنْحَرٌ وَطُرُقُهَا مَنْحَرٌ" (مکہ کے تمام راستے اور گلی کوچے منحر ہیں، یعنی قربانی کی جگہ)
قربانی کی جگہ کعبہ اور اس کا گرد و پیش ہے۔ اور مروہ کعبہ کے گرد و پیش میں ہے اور وہی دراصل قربانی کی جگہ تھی۔ مگر امت کا دائرہ
وسیع ہو گیا تو قربانی کی جگہ میں بھی وسعت ہو گئی۔ پھر یہ فقرہ کہ "إِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ" (البقرہ)
(جبکہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس بیت کے قواعد کو اٹھا رہے تھے) غور طلب ہے۔ قواعد جمع ہے "قاعدہ" کی۔ "قَاعِدَةُ التِّمْثَالِ"
وہ بلند چبوترہ (Plinth) ہے، جس پر مجسمہ نصب کیا جائے۔ القواعد من البیت کے معنی ہوں گے مکان کا چبوترہ یا
چاروں طرف کی بنیادیں۔ "يَرْفَعُ" کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اس بیت کے قواعد پہلے سے تھے جنہیں یہ بلند کر رہے تھے!

اب ایک حدیث بھی ملاحظہ ہو۔ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے بروز فتح مکہ فرمایا:۔

إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ۔ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ مکہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے حرم تھا۔ کیونکہ یہاں آسمان و زمین کے بنانے کے وقت کا ذکر ہے۔

دوسری حدیث ابوذرؓ سے مروی ہے۔ فرمایا ابوذرؓ نے:۔

قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الْأَرْضِ أَوَّلًا قَالَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ۔ قَالَ قُلْتُ ثُمَّ
أَيٌّ۔ قَالَ الْمَسْجِدُ الْأَقْصٰى۔ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمْ بَيْنَهُمَا قَالَ أَرْبَعُوْنَ سَنَةً۔

ابوذرؓ نے کہا۔ اے رسول اللہ! کون مسجد پہلے دنیا میں قائم ہوئی۔ کہا، مسجد حرام (یعنی کعبہ)۔ ابوذرؓ نے کہا
میں نے کہا، پھر کون؟ کہا، مسجد اقصیٰ۔ (یعنی بیت المقدس)، کہا میں نے اے رسول اللہ! اس میں کیا
تفاوت ہے؟ کہا چالیس برس۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جب آدمؑ نے مسجد کعبہ بنائی تو ان کو حکم ہوا بیت المقدس جانے کا اور وہاں مسجد بنانے کا۔ تو
انہوں نے حکم کی تعمیل کی، تیسری حدیث بھی ملاحظہ ہو۔ جو صحیح بخاری میں مروی ہے:۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَوَّلُ مَا اتَّخَذَ النِّسَاءُ الْمِنْطَقَ مِنْ قِبَلِ أُمِّ إِسْمٰعِيْلَ۔ حَتّٰى وَضَعَهُمَا عِنْدَ دَوْحَةٍ فَوْقَ زَمْزَمَ
فِيْ أَعْلَى الْمَسْجِدِ وَلَيْسَ بِمَكَّةَ يَوْمَئِذٍ أَحَدٌ۔ فَانْطَلَقَ إِبْرَاهِيْمُ إِذَا كَانَ عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لَا يَرَوْنَهُ
اسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ الْبَيْتَ ثُمَّ دَعَا بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ وَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ رَبِّ إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ
(اِلٰی) غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ لَا تَخَافُوا الضَّيْعَةَ
فَإِنَّ هٰهُنَا بَيْتَ اللّٰهِ يَبْنِيْ هٰذَا الْغُلَامُ وَأَبُوْهُ۔ وَكَانَ الْبَيْتُ الْحَرَامُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً — ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے۔

(کہا ابن عباسؓ نے عورتوں نے پٹکا ادلاً امّ اسمٰعیلؑ سے سیکھا - یہاں تک کہ اُتارا ان دونوں کو ایک بڑے درخت کے
پاس زمزم پر مسجد کے اُوپری حصے میں - اور مکہ میں ان دنوں کوئی نہ تھا - تب روانہ ہوئے ابراہیمؑ یہاں تک کہ پہنچے ثنیہ
کے پاس (اعلائے مکہ کا نام ہے جہاں اہلِ مکہ کا مقبرہ ہے) جہاں سے اسے وہ تیرے محترم گھر کے پاس - تاکہ وہ
صلوٰۃ قائم کریں، تب فرشتہ نے اُس سے کہا کہ تم لوگ ہلاکت سے نہ ڈرو - یہاں خدا کا گھر جسے یہ غلام اور اس کا باپ
بنائے گا - اور بیت الحرام زمین سے اونچے ٹیلے کی طرح تھا)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؓ و اسمٰعیل علیہما السلام کو مکہ لے گئے تو مسجد مکہ تھی، خواہ چبوترہ وکرسی ہی کی شکل میں کیوں نہ رہی ہو - لیکن اس وقت وہاں آبادی نہ تھی - لوگ حج کر کے چلے گئے تھے!

حج کے معنی لغت میں ارادہ کرنے کے ہیں اور "عمرہ" کے معنی زیارت کرنے اور آباد کرنے کے ہیں - اسلامی شریعت کی اصطلاح میں "حج و عمرہ" ان خاص مراسم و عبادات کی ادائیگی کے لئے سفر کرنے کو کہتے ہیں جو بیت الحرام سے مخصوص ہیں اور جن کے باعث کعبہ کی آبادی ہوتی ہے - یہی وہ خاص عبادت ہے جو سوائے بیت الحرام کے اور کسی مقام پر ادا نہیں کی جا سکتی - حالانکہ تمام روئے زمین خدائے تعالیٰ نے ہی بنائی ہے - ایسا قومی اجتماع کسی مقام پر نہیں ہو سکتا - جہاں اگر مادی تمدن کے لوازم تو موجود ہوں مگر کوئی روحانی وقار نہ ہو - اس لئے اس مبارک مقصد کے لئے وادی غیر ذی زرع کو منتخب کیا گیا - جس سے اسلام کی بہترین روایات وابستہ ہیں - جس کا ذرّہ ذرّہ خدا کے نام پر مرمٹنے والوں کا شاہد ہے!

مکہ معظمہ کو توراۃ میں بلفظ (حُرما) بیان کیا گیا ہے - حُرما زبانِ عبرانی میں "وقف" کو کہتے ہیں - چونکہ وہ مسجد حضرت آدمؑ کی تھی، اس کے پہلے کوئی مسجد نہ بنی تھی، اس لئے بلفظ حُرما مشہور ہوئی - اب بھی حرم کہلاتی ہے - یعنی اس میں سوائے اللہ کی عبادت کے سب بات حرام ہے - اسی طرح "الشھر الحرام" ہے - اہلِ عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ذیقعد، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لئے مختص و وقف تھے، اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لئے خاص کیا گیا تھا - ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارتگری ممنوع و حرام تھی، تاکہ زائرینِ کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں - اسی لفظ سے احرام (احلال کی ضد) بھی ہے - "احرام" اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لئے پہنا جاتا ہے - اسے احرام اسی لئے کہتے ہیں کہ اسے باندھتے ہی آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام و ممنوع ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں اور وہ اس وقت سے کسی خاص مقصد کے لئے اپنے کو وقف کر دیتا ہے - ان چار حرام مہینوں پر سورۃ التوبہ سے مزید روشنی پڑتی ہے اور البیت العتیق کی تائید بھی ہو جاتی ہے:-

"اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
مِنْھَا اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ ط ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ"

(حقیقت تو یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے - اللہ کے نوشتہ میں بارہ ہی ہے، جن میں سے چار مہینے حرام ہیں - یہی ٹھیک ضابطہ ہے)

زبردست نشانی ہے یہ، چار مہینے ابراہیمؑ سے بھی پہلے سے جاری تھے، سوال ہے کہ اگر جاری تھے تو کس لئے اور کہاں؟ حج ہی کے موسم میں اسی "البیت العتیق" - البیت المحرّم، کے پاس!

آدمؑ کا زمانہ:- "وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا" (حالی)

البیت العتیق کا ابراہیمؑ سے بہت پہلے موجود ہونا قرآن کریم سے اس طرح ثابت ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ (آل عمران)

بیشک پہلا گھر جو انسان کے لئے وقف کیا گیا وہ وہی ہے جو بکہ میں واقع ہے۔ اسے سرچشمۂ خیر و برکت اور تمام جہان والوں کے لئے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا!

مقصود یہ ہے کہ پہلا عبادت خانہ یا معبد کعبہ ہی ہے۔ اس کے پہلے کوئی معبد نہ تھا۔ معبد سب لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ کسی کی ملک نہیں ہوتا۔ ہر شخص اس میں عبادت کرتا ہے۔ خدا کے الفاظ ہیں کہ سب کے لئے یہ وضع کیا گیا تھا۔ یعنی وقف تھا یہی شان مسجد کی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ پہلا معبد تھا تو ضروری ہے حضرت ابراہیمؑ سے پہلے رہا ہو!

توراۃ میں بیان ہوا ہے کہ اولادِ نوحؑ عرب سے چل دی۔ "اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہاں بس گئے ۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے، بنائیں۔ اور یہاں اپنا نام کریں۔" (پیدائش ۱۱: ۲-۴) برج یا منارہ بطور نشانِ معبد تھا۔ چنانچہ جب یہ شہر بابل اور مندر تیار ہوا۔ اور اصنام پرستی بڑھتی چلی گئی تو وہیں حج بھی ہونے لگا۔ بت پرست وہیں قربانی وغیرہ بھی کرنے لگے اور ارکانِ حج بھی کرنے لگے۔ نمرود کے زمانہ تک بڑا زور شور رہا۔ یہاں تک کہ ابراہیمؑ کا زمانہ آیا۔ پھر انہوں نے ہجرت کی اور سورۃ الحج دالاحکم قرآنی انہیں ملا۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسجدِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بھی اور وہاں حج ہوا کرتا تھا۔ لیکن اصنام پرستوں نے بابل میں ایک مندر بنا لیا تو حج کعبہ میں فتور پڑ گیا۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ بموجب ہدایت اللہ لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ شرک کو چھوڑ دیں۔ آلودگیوں کو دور کریں اور حج پرانے ہی گھر میں کریں۔ ابراہیمؑ کے وطن اُر کے کتبات میں (جو کھدائی میں ملے) تقریباً پانچ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں جن کے سامنے مراسم عبادت بجا لائے جاتے تھے، ہر شہر کا الگ الگ رب البلد ہوتا تھا!

قرآن کریم میں ہابیل قابیل کا قصہ یوں مذکور ہے:۔

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّکَ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۔

پڑھ ان پر آدمؑ کے دونوں بیٹوں کی خبر ٹھیک ٹھیک جب چڑھایا (قریب کیا) ان دونوں نے چڑھاوا تو قبول ہوا ایک کا اور دوسرے کا مقبول نہ ہوا۔ تو ایک نے کہا۔ میں تجھے قتل کروں گا۔ تب کہا کہ خدا متقین ہی کا قربان (ہدیہ) قبول کرتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ:۔

اَلْقُرْبَانُ مَا یَتَقَرَّبُ بِھَا اِلَی اللّٰہِ مِنْ ذَبِیْحَۃٍ اَوْ غَیْرِھَا ۔

یہی معنی مصباح اللغات میں بھی ملتے ہیں۔ "قربان ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے۔ چاہے ذبیحہ ہو یا کچھ اور" ظاہر نصوص سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں بھائیوں نے قربان، کسی ایک ہی مقام پر رکھا۔ ورنہ حسد و بغض نہ ہوتا، جو قتل کی واردات کا باعث ہوا۔

پیدائش باب چہارم میں ہابیل و قابیل کا قصہ یوں لکھا ہے کہ ہابیل بکریاں چراتے تھے اور قابیل کھیتی کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد قابیل اپنی پیداوارِ زمین سے اللہ کے لئے صدقہ لایا۔ اور ہابیل بھی پہلوٹھے بچے اپنی بکریوں کے اور ان کی چربی لایا۔

لیکن خدا ہابیل کے صدقہ (ہدیہ) سے خوش ہوا اور قابیل کا صدقہ (ہدیہ) مقبول نہ ہوا - اس حکایت سے بھی مستنبط ہوتا ہے ک
کوئی مکان علیحدہ تھا، کوئی معبد تھا جہاں صدقات پہنچائے گئے !

پیدائش کے اسی باب میں یہ بھی ملتا ہے کہ قابیل سے خداوند نے کہا کہ " اگر تُو بھلا کرے تو کیا مقبول نہ ہوگا ؟ اور اگر تو بھلا نہ کر
گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے " یعنی اگر تو اچھا کرے گا تو صعود ہے (الیہ یصعد الکلم الطیب - قرآن) اور اگر بُرا کرے
تو دروازہ پر کارِ بد بیٹھا پڑا رہے گا - اس سے آستانہ کا مفہوم مستنبط ہوتا ہے - کوئی مکان خاص عبادت کے لئے تھا - دروازہ
ذکر بلا مکان کے نہیں ہوتا - اسے آستانہ خداوندی کہا جا سکتا ہے - یہ بھی بیان ہوا ہے کہ " تب قائن (قابیل) نے خداو
سے کہا کہ میری سزا میری برداشت سے باہر ہے، دیکھ میں تیرے حضور میں روپوش ہو جاؤں گا " (پیدائش ۴: ۱۳-۱۴) " سو قائن
خداوند کے حضور سے نکل گیا " (پیدائش ۳: ۲۳) حالانکہ خدا ہر جگہ ہے، کہاں نہیں ہے ؟ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ضرور کو
عبادت کا گھر تھا، جس کے آستانہ پر ہدیہ و نذر چڑھائے جاتے تھے، جس کے حضور سے نکل کر قابیل چلا گیا !

یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قربانی حضرت آدمؑ کے وقت ہی سے فرض تھی - اور اُس وقت سے تا زمانہ موسیٰؑ ایک مذبح (بمنز
معبد یا مسجد) بنا لیا تھا - یسعیاہ ۶۰: ۷ کے الفاظ بھی غور کے قابل ہیں " وے میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے
جائیں گے اور میں اپنے شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا " یہاں قربان گاہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مذبح بتلایا ہے - اس سے معلوم
کہ وہ قربان گاہ ہی جہاں کی قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے - اور اسی جگہ کو قدیم سے قربان گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے - ا
کے بعد فقرہ " شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا " بالکل " جعل اللہ الکعبۃ بیت الحرام قیاماً للناس " کا مفہوم ادا کرتا ہے
(اس طرح قرآن کریم پہلے نوشتوں کی تصدیق کرتا ہے) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو شوکت کا گھر بنایا ہے، تاکہ یہ قبلہ ہو اور مخلوق آ
وہاں قیام کرے !

" اوّل بیتٍ وُّضع للنّاس " کے الفاظ نشاندہی کرتے ہیں کہ بیت عتیق ضرور ابو البشر آدمؑ کے وقت سے تھا کیونکہ " النا
میں ان کی شمولیت کیوں نہ سمجھی جائے جبکہ دین کا وجود وہیں سے شروع ہوا ! نہ کہ محض ابراہیمؑ کے وقت سے ! جس کی تائید قرآن
کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ -

اللہ نے آدمؑ و نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ، و آلِ عمرانؑ کو تمام عالم پر برگزیدہ کیا -

اور " کان النّاسُ اُمّۃً واحدۃً " (البقرہ) " ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے " انسان کی زندگی کا آغاز پور
روشنی میں ہوا ہے - آدمؑ کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ صحیح راستہ کونسا ہے - پھر پیدائش باب ۱۱: ۱ میں درج ہے کہ تمام زمین پر ایک
زبان اور ایک ہی بولی تھی " - اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ مرکزی معبد بھی ایک ہی رہا ہوگا، کم از کم سال میں ایک مرتبہ موسم حج کے لئے - د
کرنے یہی توحید کی پہلی درسگاہ رہی ہوگی ----- !

مورخ ابن اثیر کی تاریخ الکامل سے پتہ چلتا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو حضرت آدمؑ نے اپنی وفات سے قبل اپنے
تیسرے بیٹے شیث کو خلافتِ الٰہیہ میں اپنا جانشین بنا دیا تھا - حضرت شیثؑ نے کعبۃ اللہ کی عمارت کو تعمیر کیا - دنیا کے
دار السلطنت میں اولین ایوان تھا، جس کو ہم فطری حکومت کا " حرم امن " تسلیم کر سکتے ہیں - آئینۂ عرب کے حوالے سے یہاں تک
پتہ چلتا ہے کہ اُسے مربع صورت کی چار دیواری بنائی تھی - پیدائش ۴: ۲۶ میں ہے کہ شیثؑ کے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا - جس

نام انوش رکھا (جب شیث ۱۰۵ برس کے تھے) اُس وقت سے لوگ یہواہ کا نام لے کر دعا کرنے لگے۔ (یعنی خدا کا نام پڑھنا شروع [illegible]

[illegible]) اور یہی مقصد تھا بیت عتیق کا۔ جیسا کہ قرآن و حدیث کے اشارات سے پتہ چلتا ہے:-

رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم)

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللہَ (البقرہ) وَاِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَیْتِ وَالسَّعْیُ بَیْنَ الصَّفَا

وَالْمَرْوَۃِ وَرَمْیُ الْجِمَارِ لِاِقَامَۃِ ذِکْرِ اللہِ۔ (حدیث)

دیکھئے "لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ"۔ "فَاذْکُرُوا اللہَ"۔ اور لِاِقَامَۃِ ذِکْرِ اللہِ"۔ حج کے اصل اغراض کی کیسی نقاب کشائی کرتے [ہ]یں۔ اسی طرح سورۃ المائدہ کے ان الفاظ کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ "جَعَلَ اللہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ" (اللہ نے مکانِ محترم [کع]بہ لوگوں کے لئے، اجتماعی زندگی کے لئے، قیام کا ذریعہ بنایا) سورۃ المائدہ کے نوٹ نمبر ۱۱۳ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کی [وض]احت ان الفاظ میں کی ہے:-

"عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرہ سے سارا ملک کھنچکر اس طرف آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے۔ شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا"!

البیت العتیق کی یہی مرکزی حیثیت شروع سے رہی ہوگی!

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے کوئی مسجد تھی، جہاں خدا کا نام لیا جاتا تھا۔ [صد]قات وغیرہ جمع ہوتا تھا اور حج ہوتا تھا، یہ سب دین کے فرائض کی شکل میں سمجھے جاتے رہے ہوں گے!

[نو]ح کا زمانہ

جس صالح نظامِ زندگی پر حضرت آدمؑ اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے، اُس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں رونما ہوا:-

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ (الاعراف)

یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی نہ اللہ کی عبادت سے اسے انکار تھا۔ نوحؑ کو آدمؑ ثانی بھی کہا گیا ہے:-

"جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَہٗ ھُمُ الْبٰقِیْنَ" (الصافات)

ان کے دور میں سلطنت کا ربانی نظریہ زیادہ منظم صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ البتہ جب شرک کی گمراہی کے سبب ربانی [سلطن]ت سے بغاوت اُن کی قوم کا مستقل فیصلہ تھا تب طوفان آیا۔ جو لوگ طوفان سے بچ کر زندہ رہے وہی خلافت کے مستقبل [کے] امین قرار پائے۔ نوحؑ کی اچھی نسل کو بچا لیا گیا۔ اور وہی آج تک اس دنیا کے پھلنے پھولنے کا ذریعہ بنی۔ توراۃ میں طوفانِ نوحؑ [کے] بعد کا ذکر ہے کہ "فقط ایک نوحؑ بچا، یا وہ جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے (پیدائش ۷-۲۲-۲۴) اور تب نوحؑ نے خداوند کے لئے [ایک] مذبح بنایا اور سب پاک چوپایوں اور پاک پرندوں میں سے تھوڑے سے لے کر اس مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں"۔ (پید]ائش ۸:۲۰) یہ تو طوفان کے بعد کا ذکر ہے۔ جب اس وقت انہیں مذبح کا احساس ہوا تو کیا طوفانِ نوحؑ سے قبل جبکہ وہ صحیح راہ

دکھانے ہی کے لئے۔ شرک کو دُور کرنے ہی کی خاطر (جیسا قرآنی آیات رہنمائی کرتی ہیں) مبعوث ہوئے تھے۔ مذبح (معبد) کا خیال نہ آیا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے وہی آدمؑ کے وقت کا معبد (بیت اللہ) تھا۔ جہاں قابیل و ہابیل اپنی اپنی نذر لے کر گئے تھے۔ اب طوفان سے خرابی آگئی تھی، اس لئے اُنہوں نے بھی اس کی تجدید و مرمت کی!

تالمود کا بیان ہے کہ بچپن میں نمرود کے ڈر سے ابراہیمؑ پوشیدہ طور پر پرورش پانے کے بعد دس برس کی عمر میں نوحؑ اور اُن کے لڑکے سام بن نوحؑ کے پاس تربیت کے لئے بھیج دیئے گئے تھے۔ اور وہاں ۳۹ برس تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، پچاس برس کی عمر میں ابراہیمؑ اپنے مربّی نوحؑ کے پاس سے اپنے والد آذر کے پاس گئے۔ پھر نمرود سے مناظرہ کے بعد کنعان کو ہجرت کی۔ اور تین برس بعد نوحؑ کی وفات ہوگئی۔ ایک معتبر تاریخ یہود "سفر الیشیا" میں مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے نوحؑ اور سام بن نوحؑ کے گھر میں پناہ لی تھی!

معبد اس وقت مذبح کہلاتا تھا، جیسا اُوپر بتایا جا چکا ہے۔ کیونکہ عبادت اس زمانہ میں قربانی تھی (جیسا ہابیل و قابیل کے قصہ میں دیکھا) اور اب چونکہ عام عبادت نماز ہے، اس لئے معبد کو مسجد کہتے ہیں۔

توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ سام بن نوحؑ علیون کے معبود کے کاہن اور امام تھے!

"علیون"۔ عبرانی زبان میں حجاز کا نام ہے۔ عربی کا اس کا نام "عالیہ" بھی ہے، جو علیون کا ترجمہ ہوا۔ ملکِ عرب اُنہی کے حصہ میں تھا، وہیں اُن کا مسکن تھا، اُن کی اولاد سے اس کا معمور ہونا اس پر دلیل بھی ہے، حضرت اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کے قصہ سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے رفعِ نزاعِ میراث کے واسطے اُن کو سام بن نوحؑ کے پاس جو اس وقت زندہ تھے، مکہ روانہ کیا تھا، اور مقصود یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ وہیں رہیں (شادی بھی وہیں بنو جرہم میں کی) اور بعد وفات سام وہاں کے امام ہوں گے۔ سام بن نوحؑ کا وہاں رہنا یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ مقام حج تھا!

مکہ کی تحقیق

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی نام قرآن کریم نے لیا ہے:-

"اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ"

توراۃ کے زبور ۸۴:۴ و ۶ میں ذکر ہے کہ "مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں، وہ سدا تیری تعریف کریں گے۔" "وہ وادیٔ بکہ سے گزر کر اُسے چشموں کی جگہ بنا لیتے ہیں۔"

عربی بائبل میں یہ الفاظ ہیں۔ "طُوْبٰی لِلسَّاکِنِیْنَ فِیْ بَیْتِکَ اَبَدًا یُسَبِّحُوْنَکَ۔"

"عَابِرِیْنَ فِیْ وَادِی الْبُکَاءِ۔ یُصَیِّرُوْنَہٗ یَنْبُوْعًا۔"

انگریزی بائبل میں یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں:-

"Blessed are they that dwell in thy house: they will be still praising thee."

"Who passing through the valley of Baca make it a well."

یہاں خدا کے گھر کا ذکر ہے جہاں کے باشندوں کو مبارک بتلایا گیا ہے، جو ہمیشہ خدا کی تسبیح و ستائش کرتے ہوں گے، دیکھئے لفظ "بکا" اُردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بکا اسم معرفہ (Proper Noun) ہے جو کسی زبان میں نہ بدل سکا۔ انگریزی میں اسے کیپٹل بی (Capital B) سے بھی لکھا گیا ہے، جو گرامر کے مطابق اُترتا ہے۔ عربی اور اُردو میں لفظ وادی بھی آیا ہے!

مقابلتہً قرآن کریم کے الفاظ سورۃ ابراہیم کے ملاحظہ کیجئے:-

رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِی بِوَادٍ غَیْرِ ذِی زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ !

یہاں بھی وادی اور بیتک المحرم کا ذکر ہے۔ اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ کے آباد ہونے والی بخاری کی حدیث میں مذکور ہے:۔

"فَلَمَّا بَلَغَتِ الْوَادِیَ سَعَتْ" (یعنی جب ہاجرہ اس وادی میں پہنچیں تو وہاں بیتابانہ دوڑیں)

زبور کی مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور قربان گاہ اسمٰعیلؑ کی نسبت اپنا شوق اور اپنی حسرت ظاہر کی ہے۔ اور یہ مکہ حضرت داؤدؑ کے وطن سے دُور بھی ہے۔ کہ وہاں تک سفر کرکے جائیں !

معلوم ہوا کہ زبور کا لفظ بکا وہی "بَکَّۃ" ہے جو قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ لفظ بَکَّۃ بمعنی زحمت، زحم و ازحام سے مشتق ہے۔ تباکّ ہجوم کرنے کو کہتے ہیں۔ (بحوالہ مصباح اللغات) اس لفظ کا اطلاق مکہ پر اس لئے ہوا کہ اس مقام پر عوام الناس کا اجتماع بہت ہوتا تھا۔ (آئینہ عرب) ابن ہشام نے بھی سیرت میں بیان کیا ہے کہ "اِنَّ بَکَّۃَ اسْمُ الْبَطْنِ مَکَّۃَ۔ لانعلم یتباکون فیھا" بالکل یہی مفہوم قرآن کریم کے ان الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے۔ "اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ" (البقرہ) خیال کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے تیرتھ یا مرکز قرار دیا تھا۔۔۔!

(۲) وجہ تسمیہ کے بارے میں ابن ہشام نے ایک دوسرے قول کا بھی ذکر کیا ہے۔ "اِنَّمَا سُمِّیَتْ بِبَکَّۃَ اِلَّا اَنَّھَا تبک اعناق الجبابرۃ اذا احدثوا فیھا شیئاً" اس مفہوم کی تفصیل کے لئے آگے لفظ "حطیم" کی تشریح ملاحظہ ہو:۔

(۳) قدیم زمانہ میں "باس"، "باسہ" اور "بساسہ" کہتے تھے مگر اب "مکہ" کہتے ہیں (بحوالہ آئینہ عرب) عربی میں "باس" کے معنی ہیں بہادری، خوف اور عذاب کے۔

(۴) اگر اسے "بکیٰ" بمعنی میت پر رونا اور "بکّی" بمعنی دوسرے کو رُلانا اور عبرانی زبان کے "بکّۃ" بمعنی رونا سے متعلق سمجھیں تو یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت آدمؑ وہاں اپنے معاصی پر گریہ وزاری کرتے رہے ہوں گے اور وہاں اُن کا "بیت الحزن" رہا ہوگا (ممکن ہے اسی خوف خدا اور عذاب سے تعلق مندرجہ بالا باس کا بھی رہا ہو) اسی لئے اس مقام کو "بکّۃ" کہا گیا !

اسی لفظ سے ملتا جلتا اور اسی مفہوم کا حامل ایک لفظ توراۃ میں آیا ہے۔ "ربقہ کی دایہ دبورہ مرگئی اور وہ بیت ایل کی اترائی میں بلوط کے درخت کے نیچے دفن کی گئی۔ اور اس بلوط کا نام "الون بکوت" رکھا گیا۔ (پیدائش ۳۵: ۸) یہ بکوت (انگریزی بائبل میں Bachuth) عبرانی لفظ ہے۔

(۵) اگر لفظ "مکّۃ" پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عبرانی و عربی دونوں زبانوں میں "مکّۃ" کے معنی ہلاکت کے ہیں۔ (مکّ التّیٔ ہلاک کرنا۔ مصباح اللغات) عجب نہیں کہ بعد ہلاکت ہابیل کے اس مقام کا نام آدمؑ نے مکّہ رکھ دیا ہو۔ یا اسی بناء پر بعد میں رکھ دیا گیا ہو کہ ابتدائے ہلاکت و موت وہیں سے ہوئی ! یا پھر اسی "بکی" سے مشتق "مبکی" (رونے کی جگہ) رہا ہو اور مرورِ زمانہ سے مبکی سے مکّہ ہوگیا ہو !

(۶) مکہ کی وجہ تسمیہ ایک اور بیان کی جاتی ہے۔ کہ جب آدمؑ (ابو البشر) اس وادی غیرذی ذرع میں آئے تو انہوں نے اپنی اولاد کو اولاً علم فلاحت کی تعلیم دی کہ مناسب غذا بہم پہنچے، چونکہ تکمیل فلاحت کے لئے تقدیر ازمنہ اور ادوار ضرور ہے۔ اس لئے آپ نے تعلیم ریاضی کی بناء ڈالی۔ پھر ہیئت و نجوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر قمر و دیگر کواکب کی طرف اور قمری مہینوں اور ہفتہ کے دنوں کو متعین کیا۔ جس پہاڑ پر یہ سب کارخانہ (observatory) رہتا تھا، اس کا نام (دہر ہیاریخ) یعنی جبل القمر رکھا۔ حضرت آدمؑ اسی جبل القمر پر رہتے تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکّہ کے

پہاڑوں میں تھا۔ تقریباً یہی باتیں تاریخ الحکماء میں فانسطین یونانی نے لکھی ہیں۔ (بحوالہ البشریٰ از عنایت رسول چریاکوٹی)

تاریخ یہود کے "سفر ہیاشار" میں لکھا ہے کہ ہابیل کے قربان پر ایک تجلی ہوئی (شعلہ یا آگ آئی) جس میں وہ غائب ہو گیا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ جب ہابیل کے قربان پر تجلی ہوئی اور وہ تھا حرام کے پاس تو حضرت آدمؑ وغیرہ نے اس کا نام کوہ فاران رکھا۔ کیونکہ "فاران" کے معنی تجلی ہیں۔ توراۃ میں مکہ کے میدان کو بھی فاران لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر جب اس خطہ میں عربی جاری ہوئی تو اس کا نام "جبل النور" (اور جبل الرحمتہ) ہوا۔ اسی جبل القمر کو اہلِ فارس "مہ کدہ" کہتے ہیں۔ جس سے مکہ کی یہ توجیہ ہاتھ آئی۔ (بحوالہ البشریٰ از عنایت رسول چریاکوٹی) اگر یہ توجیہ مانی جائے تو یہ بہت بعد کی ہوگی۔ بہرحال اگر قمر کی پرستش بھی ہونے لگی۔ اور روحانیت ماہ کو دہاں سے بڑا تعلق بھی ہو گیا تو یہ سب شرک کی آلودگیوں کے نتائج تھے۔ جیسا کہیں آر کی کھدائی سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آر کا رب البلد ننار (چاند دیوتا) تھا۔ اگر ان سارے بیانات میں کچھ بھی حقیقت ملتی ہو تو وہ بھی اسی بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ایک قدیم مسجد حضرت آدمؑ ہی کے وقت سے تھی۔ چنانچہ منجملہ مناسک حج وہی سادہ، بن سِلا لباس جو نسلِ انسانی کے پدرِ اعظم حضرت آدمؑ کا تھا، تجویز کیا گیا۔ تاکہ ایک ہی لباس میں تمام دنیا کے انسان ایک سطح پر نظر آئیں۔ اور حج کے لئے وہی مقام چنا گیا جہاں دنیا کی سب سے پہلی عبادت گاہ بنائی گئی تھی ۔۔۔!

(۷) بکۃ کے علاوہ قرآن کریم نے مکہ کا لقب "اُم القریٰ" بتایا ہے۔ جس سے اس مقام کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ "اُم القریٰ" کے معنی ہیں "قریٰ کی ماں" اور قریٰ جمع ہے "قریۃ" کی۔ ظاہر ہے جس طرح بچوں سے پہلے ماں ہوتی ہے اسی طرح ساری بستیوں سے پہلے یہ بستیوں کی ماں رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ولِتُنذِرَ اُمَّ القریٰ وَمَنْ حَوْلَھَا" (الانعام) اس طرح اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلی آبادی مکہ معظمہ کے مقام پر ہوئی۔ جہاں خانہ بدوش قوموں نے قیام کیا اور بربریت و توحش کو چھوڑ کر عمران و تمدن کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ کم از کم بخاری کی حدیث سے اتنا ضرور پتہ لگتا ہے کہ حضرت ابراہیم بیت اللہ بنانے کے ارادہ سے حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس وادی غیرذی ذرع پہنچے تو وہ اس وقت تیر کی نوک بنا رہے تھے۔ اور زوجۂ اسمٰعیلؑ نے انھیں بتایا۔ "طَعَامُنَا اللَّحْمُ وشَرَابُنَا الماءُ"۔ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس وادی غیرذی زرع میں اس وقت صرف گلہ بانی اور شکار پر قناعت ہو رہی تھی۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے یہ دعا مانگی۔ "رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ"۔ (البقرہ)

یہی منبع ہے نورِ حق کی دریا بار موجوں کا — کہ مرکز ہے یہی اک اُمتِ وسطیٰ کی فوجوں کا

یہی نافِ زمیں ہے اور یہی مرکز ہے عالم کا — مقدر ہے یہیں پر اجتماع اولادِ آدم کا

(شاہنامہ اسلام از حفیظ)

مورخین نے جابجا تصریح کی ہے کہ چونکہ اہلِ عرب کعبہ کے مقابل آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں۔ بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں ہی کا ایک شہر تھا، (حالانکہ اس وقت تو کعبہ کے گرد و نواح میں کئی کئی منزلہ عمارتیں ہیں)

زمانہ جاہلیت میں بھی کعبہ ان کا سب سے بڑا معبد تھا۔ یہ اسی کا احترام تھا کہ حج کے مہینوں میں تمام فتنے سرد پڑ جاتے تھے۔ چنانچہ عرفات کے اجتماع میں خطیب سب کو صلح اور صلۂ رحم کی دعوت دیتا تھا۔ اسی وجہ سے عرب مکہ کو "صلاح" اور "اُم الرحم" بھی کہتے تھے، پہلے قرآن کریم میں ایک آیت پیش کی جا چکی ہے کہ حرام جیسے حضرت آدمؑ ہی کے وقت سے تھے۔ یہ امر بھی واضح ہے

کہ جب ہابیل وہاں قتل ہوئے اور نماز و حج فرض ہوا تو خدا نے وہاں خونریزی بھی حرام کر دی ہو!

(۸) ایک کتاب "خیر الکلام فی احوال العرب والاسلام" میں یہ بھی ملا کہ یونانیوں نے مکہ کو "مکوریا" کے نام سے یاد کیا ہے معلوم ہوتا ہے یہ "مکوریا" محض "ام القریٰ" کا بگڑا ہوا لفظ ہے!

تجدید کے منازل

ابن خلدون کہتا ہے کہ خلیلؑ نے جب ہاجرہ اور اُن کے بیٹے ذبیح اللہ کو چٹیل میدان میں تنہا چھوڑا تو حضرت ذبیح اللہؑ نے وہیں ایک مکان بنایا اور اس کے گرداگرد ایک دیوار کھینچ دی اور اس کو اپنی بھیڑوں کی رہنے کی جگہ بنایا، پھر جب اُن کے والد آخری مرتبہ شام سے اُن کی ملاقات کو آئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ اس احاطہ کے مقام پر کعبہ بناؤ اور حج کے واسطے لوگوں کو آواز دو۔ اسی مقام پر حضرت ذبیح اللہ اور ہاجرہ اور جو لوگ اُن کے ساتھ قبیلۂ جرہم سے آئے تھے، مقیم رہے۔ یہاں تک کہ وہیں حضرت ذبیح اللہؑ اور اُن کی والدہ نے رحلت فرمائی اور قریب حجر اسود کے دفن ہوئے!

پھر بنو جرہم نے اس کی تجدید کی، پھر بنو عمالقہ نے اس کی مرمت کی، ان کے بعد جب خزاعہ کے قبیلہ پر قریش کو غلبہ ملا تو قصی بن کلاب نے کچھ جدید مکانات اصل تعمیر کے گرداگرد بنائے۔ خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت نہ کواڑ، اور نہ چوکھٹ اور نہ بازو تھے، قصی نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی۔

چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا دروازہ سطح صحن سے کافی اونچے پر بنایا گیا تھا۔ اور اس کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا۔ چنانچہ سیلاب کے صدمہ سے دیواریں پھٹ جاتی تھیں، یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا دروازہ سطح صحن سے کافی اونچے پر بنایا گیا تھا اور سیلاب ہی کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ لہذا آنحضرتؐ کی ولادت سے ۳۵ ویں سال اکابرین قریش میں یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے۔

حسنِ اتفاق سے جدہ کی بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچکر جہاز کے تختے خرید لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا، جس کا نام باقوم تھا۔ ولید اُس کو ساتھ لایا اور تمام قریش نے مل کر اس کی تعمیر شروع کی، حرم شریف کی دیواریں اونچی بلند کر کے چھت بنائی، جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا۔ جھگڑا چکانے کے لئے آنحضرتؐ نے حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ کر ہر قبیلہ کے سردار کو چادر پکڑا دی، جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اُٹھا کر نصب فرما دیا۔

پھر حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک جدید دیوار خانۂ کعبہ کے گرد بنائی گئی اور کچھ مکانات توڑ دیئے گئے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تعمیر میں کچھ اضافہ کیا۔

پھر ۶۴ھ (مطابق ۶۸۳ء) میں یزید بن معاویہ اور ابن زبیر کی لڑائی میں آگ لگی، کیونکہ ابن زبیر نے وہاں پناہ لی تھی۔ اور یزید کے لشکر نے روغن جلا کر اس پر پھینکا۔ جس سے خانۂ کعبہ جل گیا۔ پھر دو معمار ایران اور روم سے بُلائے گئے اور انہوں نے پہلے سے کہیں بہتر طور پر اُسے درست کیا۔ مگر چونکہ صحابہ نے اس کے مقام (. . . . . SIZE) کی بابت اختلاف ڈال دیا اس لئے پھر گروا دیا گیا۔ اور دوبارہ ٹھیک اسی حد پر جہاں حضرت خلیلؑ نے بنایا تھا، تیار کرایا۔

پھر ولید بن عبدالملک نے کچھ ترمیم کی اور اُس میں سنگ سفید کے ستون قائم کئے۔ پھر ابو جعفر منصور عباسی نے کچھ جدید مکانات گرداگرد حرم شریف کے تعمیر کرائے، معتضد باللہ عباسی نے شمال کی طرف باب الزیادۃ تک، پشت کی طرف ابراہیم کی جدید عمارت

تعمیر کرا کے احاطہ حرم شریف کو بڑھایا۔ ۹۸۰ھ میں سلیمان خاں بادشاہ قسطنطنیہ نے عمارت حرم شریف کو از سرِ نو بکمال پختگی و خوبی تعمیر کرانا شروع کیا۔ جو اُس کے بیٹے سلطان مراد خاں کے عہد حکومت میں ختم ہوئی۔ یہی تعمیر اس وقت موجود ہے۔ البتہ ۱۹۵۵ء میں شاہ سعود نے مزید ترمیم و توسیع کے لئے ایک بڑی رقم اپنے بجٹ میں منظور کی ہے!

بیت اللہ کی پاسبانی آدمؑ کے بعد اُن کے بیٹے شیثؑ، پھر نوحؑ اور اُن کے بیٹے سامؑ متولی ہوئے، پھر ابراہیمؑ کے ساتھ ساتھ اُن کے بیٹے اسمٰعیلؑ تجدید میں سہیم کار رہے۔ بعد میں خود ہی اللہ کے گھر کے محافظ بنے۔ حضرت اسمٰعیل مصری، بابلی، فلسطینی اور عربی زبان کے ماہر کامل تھے!

حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، اُن کے مرنے پر اُن کے نانا مضاض ابن عمرو نے یہ منصب حاصل کیا۔ اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسمٰعیلؑ سے نکل کر جرہم کے خاندان میں چلی گئی۔ اور صدیوں اُن میں رہی۔ مگر جب خزاعہ اور جرہم کی لڑائی ہوئی تو خزاعہ نے جرہم کو مکہ سے نکال دیا۔ جس کی بابت مضاض کہتے ہیں ؎

وَنَحْنُ وُلَاۃُ البیتِ من بعد نابت — نطوف بذاک البیت والامر ظاهر

فاخرجنا منها الملیک بقدرۃ — کذاک بین الناس تجری المقادر

(ہم ہی نابت کے بعد خانۂ کعبہ کے متولی تھے۔ ہم ہی اس کا طواف کرتے تھے، اور یہ بات ظاہر ہے، مگر خدا نے ہم کو وہاں سے نکال دیا۔ اور اسی طرح تقدیریں آدمیوں میں جاری ہوتی ہیں!)

اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسمٰعیلؑ پر نظرِ التفات فرمائی تو قصی کے وقت میں خانہ کعبہ کی تولیت تقریباً ۴۴۰ء میں اُن کو عطا فرمائی۔ جس کا قصہ یوں ہے کہ ایک دن قصی بن کلب قریشی نے خزاعہ کے آخری دربان ابو غبشان کو خوب شراب پلائی اور خانۂ کعبہ کی کنجیاں اس سے ایک مشک شراب پر مول لے لیں۔ جب ابو غبشان کو ہوش آیا تو سخت نادم ہوا۔ اُس وقت سے عرب میں مثل ٹھہر گئی۔ "اخسر من ابی غبشان" اس کا ذکر ایک شاعر یوں کرتا ہے ؎

باعت خزاعة بیت اللہ اذ سکرت — بزق خمر فبئست صفقة البادی

باعت سدانتها بالنزور وانصرفت — عن المقام وظل البیت والنادی

(خزاعہ جو نشہ میں آیا تو خدا کے گھر کو ایک مشک شراب پر بیچ دیا۔ پس کس قدر اُس کی بیع بُری ہے۔ اُس نے اپنی سدانت (دربانی کعبہ) کو تھوڑی سی مقدار پر بیچ ڈالا اور مقام و سایہ خانہ کعبہ سے پلٹ گیا اور محروم ہوگیا)

قصی نے اولادِ فہر کو جا بجا سے طلب کیا اور مکہ میں آباد رہنے کی ترغیب دی، اور قریش (فہر اور اولادِ فہر) کی عزت سارے ملک میں مسلّم ہوگئی۔ قصی کی رائے کو قریش مبارک سمجھتے تھے۔ پھر اُس نے دار الندوہ خانہ کعبہ کے سامنے بنوایا۔ اور حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کا ذمہ لیا۔ اس کے لئے اُس نے قریش پر کچھ خراج مقرر کر دیا تھا، جسے وہ ہر سال ادا کر دیا کرتے تھے!

اس تولیت کے متعلق عثمان بن طلحہ کا سلسلۂ نسب قصی کی اولاد عبد الدار سے جا ملتا ہے۔ خانۂ کعبہ کی کنجی اسی خاندان عثمان بن طلحہ میں اب تک چلی آتی ہے۔ عثمان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے کنجی اپنے بھائی شیبہ کو بوقت وفات دی۔ شیبہ کی اولاد میں وہ کنجی رہی اور اسی بناء پر صاحب مفتاح شیبی کہلاتا ہے!

رشک و حسد کی کرشمہ سازیاں اللہ کا یہ مبارک گھر، مادی و روحانی برکتوں کا یہ مرکز و سرچشمہ تو تھا ہی بڑا قابلِ رشک گھر، پھر جیسے جیسے اس کی دربانی کرنے والے خلوص سے دور ہو کر نفس پرستی و دولت کی فراوانی

کے چکر میں پھنس گئے۔ دوسروں کے جذبات رشک وحسد نے تیزی دکھائی۔ ہر طرف شرک کی آلودگیاں مختلف شکلوں میں دکھائی دینے لگیں۔ جس صالح نظامِ زندگی پر حضرت آدمؑ اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے، اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوحؑ کے دور میں رونما ہوا۔ اور اصل گمراہی شرک کی گمراہی تھی۔ اور اسی بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ اسی لئے طوفان آیا۔ پھر دوبارہ خرابی رونما ہوئی اور بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اُر کے کتبات میں پانچ ہزار خداؤں تک کے نام ملتے ہیں۔ جن سے لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات کو متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں۔ اور تمام مراسمِ عبادت انہی کے آگے بجالائے جاتے تھے!

بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یغوث، یعوق اور نسر، آدمؑ کے بیٹوں کے نام تھے، یہ لوگ بڑے پرہیزگار، عابد اور زاہد تھے۔ جب یہ مرگئے تو شیطان نے لوگوں سے کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر ان کی مورت بنائی جاتی۔ جس سے ان کی یادگار قائم رہتی۔ جب انہوں نے مورتیں بنالیں تو ان کو رائے دی کہ مسجد کے آگے ان کو رکھو۔ تاکہ جب ان کو دیکھو تو وہ لوگ بھی یاد آجائیں! اس کے بعد اُن کو ان مورتوں کی عبادت کرنے کی رائے دی۔ جاہلوں نے یہ بھی کرنا شروع کیا، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وَدّ مرد کی صورت پر بنایا گیا تھا سواع عورت کی صورت پر۔ یغوث شیر کی صورت پر۔ یعوق گھوڑے کی صورت پر۔ نسر گِدھ کی صورت پر (بحوالہ آئینۂ عرب)

حالانکہ صفا ومروہ کی پہاڑیوں سے اسمٰعیلؑ کی روایات کی وابستگی تھی، جس کے سبب یہ شعائر اللہ کی حیثیت رکھتے تھے، مگر بعد مرورِ ایام ان دونوں پر زمانہ جاہلیت میں دو بت نصب کردیئے گئے تھے، اساف اور نائلہ۔ جن کی بہت زیادہ عبادت کی جانے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ان دونوں بتوں پر ہر قسم کی قربانی بھی ہونے لگی اور سفر سے واپس ہونے کے وقت گرد ونواح کے قبائل ان کو بوسہ دینا لازمی سمجھنے لگے۔ ان آلودگیوں کا یہ اثر ہوا کہ عہدِ اسلام میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنے سے عام مسلمان پرہیز کرنے لگے۔ انصار ان دونوں سے آگے بڑھ کر احرام باندھتے اور طواف نہ کرتے تھے۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" تاکہ اُن کا یہ غلط خدشہ دور ہوجائے!

عرب میں بُت پرستی کا بانی عمرو بن لحی تھا، جرہم کو مکہ سے نکال کر خود حرم کا متولی ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ شام گیا، وہاں کے لوگوں کو بُت پوجتے دیکھا، تو پوچھنے لگا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں۔ قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ چنانچہ عمرو وہاں سے چند بُت لاکر کعبہ کے آس پاس قائم کردیئے، کہا جاتا ہے کہ اُسی نے لاکر (بعض خزیمہ بن مدرکہ مضر کے پوتے، عدنان کے پڑپوتے کی طرف منسوب ہے) ہبل کے بُت کو کعبہ کی چھت پر سامنے والی دیوار کی منڈیر پر منصوب کیا تھا، یہ بہت لمبا تھا۔ اور یاقوتِ احمر سے بنا ہوا تھا۔ انسان کی صورت کا تھا۔ اور بُت پرستوں کا خدائے اعظم تصور کیا جاتا تھا۔ تمام قبائل اُس کی عظمت کے آگے سرنگوں ہوتے تھے، قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے، چنانچہ جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے ہبل ہی کا نعرہ لگایا تھا۔ ہبل کے سامنے سات تیر رکھے ہوئے تھے، جن پر "لا" (نہیں) اور "نعم" (ہاں) لکھا ہوا تھا۔ ہر کام کے لئے ان تیروں کے ذریعہ قرعہ ڈالا جاتا تھا!

قربانیاں اور ہدیہ جو ان بتوں کو چڑھائے جاتے تھے، اُن کو وزائم (وذیمہ کی جمع) کہتے تھے۔ "غبغب" ایک بڑا بھاری پتھر تھا۔ جس پر اونٹ کی قربانی ہوا کرتی تھی۔ ذبیحہ کا خون اُس پر بہنا مبارک تصور کیا جاتا تھا۔ رجب کے مہینہ میں بھی بتوں کے لئے ایک قربانی کرتے، جس کا نام "عتیرہ" رکھا تھا۔ فرع کی قربانی بھی کرنے لگے تھے، فرع اونٹنی کے پہلے بچّہ کو کہتے ہیں، وہ نذر کیا کرتے تھے، کہ جب میرے پاس اس قدر اونٹ ہوجائیں گے تو پہلا بچّہ جو پیدا ہوگا اسے قربانی کروں گا۔ ذبح کرنے سے

پہلے اُسے زینت دیتے اور کپڑے پہناتے ۔ صدر اسلام میں مسلمان بھی ایسا ہی کرتے تھے (بحوالہ آئینۂ عرب) مگر بعد میں منسوخ کر دیا گیا ۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "لَا فَرَعَ وَلَا عَتِيرَةَ" بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عرب اپنے معبودوں پر آدمیوں کی بھی قربانی کیا کرتے تھے، جیسا کہ آنحضرتؐ کے جد امجد عبد المطلب نے نذر کی تھی ۔ کہ اگر دس بیٹے پیدا ہوئے تو ایک کو ضرور ہی راہِ خدا میں قربان کروں گا ۔ جب دس پورے ہو گئے تو اُن پر قرعہ ڈالا ۔ چھوٹے بیٹے عبد اللہ (آنحضرتؐ کے والد) کے نام پر قرعہ تو نکلا مگر اُن کی قوم اور دیگر رشتہ داروں نے عبد اللہ کے ذبح کرنے سے منع کیا ۔ اس لئے اُن کے عوض سو اونٹ نحر کئے گئے ۔ اسی کا حوالہ حدیث میں ہے کہ "أَنَا ابْنُ الذَّبِيحَيْنِ" (میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں ۔ ایک عبد اللہ کا دوسرے اسمٰعیلؑ) غرضکہ بت پرستی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ :-

وہ کعبہ جو خدائے واحد و قہار کا گھر تھا — وہ کعبہ جو خدائے مالک و مختار کا گھر تھا
وہی کعبہ جسے پیغمبروں کی سجدہ جگہ کہئے — وہی کعبہ جسے تقدیس کا نورِ نگہ کہئے
وہ کعبہ جو خدا کے بت شکن بندوں کا معبد تھا — جسے پاکیزہ رکھنا فطرتِ انساں کا مقصد تھا
اسی کعبہ کو یاروں نے صنم خانہ بنا ڈالا — دلوں سے ظالموں نے نقشِ وحدت کا مٹا ڈالا
نہ سوجھا فرق کوئی اُن کو خدا میں اور پتھر میں — کہ رکھے تین سو اور ساٹھ بت اللہ کے گھر میں
عرب میں جس قدر انساں تھے اُن سے سوا بت تھے
یہ خلقت تھی خدا کی اور خلقت کے خدا بت تھے

(شاہنامہ اسلام از حفیظ)

عرب مشرکین میں بھی ایک مخصوص طریق عبادت کا نام صلوٰۃ تھا ۔ جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے ۔ "وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً (الانفال) بیت اللہ کے پاس اُن کی صلوٰۃ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے" !

اس سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے اکثر لوگ حج کے موقع پر کعبے کے گرد طواف برہنہ کرتے، اور اس معاملہ میں اُن کی عورتیں مردوں سے زیادہ بیباک و بے حیا تھیں، اُن کی نگاہ میں یہ ایک مقدس مذہبی فعل تھا ۔ اور نیک ہی سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے ۔ اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لئے اُن کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے ۔ اس پر قرآن کریم نے سورۃ الاعراف میں صاف طور پر استدلال کیا ہے کہ ان کا یہ خیال غلط تھا ۔ "إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۔ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ——— بلکہ قرآن تو تاکید کرتا ہے ۔ "يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" (الاعراف)

چونکہ عرب کا مرکز کعبہ تھا اور وہیں آلودگیاں آ گئی تھیں اس لئے تمام قبائل میں جلد بت پرستی کا رواج ہو گیا ۔ سب سے قدیم بت منات تھا، مدینہ کے لوگ (اوس و خزرج) اسی پر قربانی چڑھاتے تھے ۔ واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے اور اُن کو اصنام کعبہ کی صورت میں تراش کر اُن کی عبادت کرتے تھے ۔ چنانچہ خانہ کعبہ سے جب دور ہوئے تو ایک پتھر جس کو دوار کہتے تھے نصب کر دیتے اور اُس کے گرد اس طرح طواف کرنے لگے، جس طرح خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے ۔ (غالباً اسی طرح کی بگڑی ہوئی شکل ہندوستان کے اہل ہنود میں پھیری کی رسم اکثر دیکھنے میں آتی ہے) غرضکہ اس طرح دیکھتے دیکھتے کئی متقابل کعبے وجود میں آ گئے ۔۔۔ !

بابل کے مندر کا حال تو دیکھ چکے، جہاں قربانی و حج ہونے لگا تھا اور نمرود کے زمانہ تک بڑا زور شور رہا۔ یہاں تک کہ ابراہیمؑ کا زمانہ آیا۔ زوزنی نے کہا ہے کہ عرب کے بعض قبیلوں نے اپنی خاص عبادت گاہیں بنالی تھیں۔ مثلاً غطفان نے ایک مکان بالکل خانۂ کعبہ کے مشابہ بنالیا تھا۔ جس کا نام بس رکھا تھا۔ اسی کا حج کرتے اور بڑی تعظیم و تکریم سے وہاں جاتے تھے۔ جس طرح کعبہ کو حرم کہتے ہیں اس کو بھی حرم کہتے تھے۔ جب زہیر بن جناب کلبی اور غطفان میں مقابلہ ہوا اور اس نے غطفان کو شکست دی تو اس کے ساتھ ان کی عبادت گاہوں کو بھی منہدم کر دیا۔ (اصبہانی)

غطفان کے قبیلہ میں ایک درخت "طلح" تھا، جسے "عزیٰ" کہتے تھے، اس کے لئے ایک مکان بنوا دیا تھا۔ جس کے دروازہ پر دربان بٹھائے گئے تھے، لوگ اس کی عبادت کرتے تھے، آنحضرتؐ نے خالد بن ولید کو بھیجکر مکان گروا دیا اور درخت کو جلوا دیا۔ بنو خثعم نے بھی ایک مکان بنوایا تھا جسے کعبہ کہتے تھے، اصلی نام اس کا "ذوالخلصہ" تھا۔ اس لئے کہ جو بت اس میں رکھا ہوا تھا اس کا یہ نام تھا۔ اس لئے کہ وہاں خلصہ (ایک خوشبودار درخت) بہت پیدا ہوتا تھا!

ایک معبد اور تھا جسے شغیدہ کہتے تھے، یہ جبل احد کے قریب واقع تھا۔ جس کا عرب حج کیا کرتے تھے!

اسی طرح ربیعہ کا معبد "ذوالکعبات" تھا۔ وہ لوگ اس کا طواف کیا کرتے تھے!

تاریخ الکامل لابن اثیر سے پتہ چلتا ہے کہ فہر کے وقت میں یمن کا حاکم حسان ایک فوج لے کر مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو گرا کر اس کا ملبہ یمن لے جائے اور وہاں کعبہ تعمیر کرے۔ فہر نے اپنے بھائیوں کیساتھ خود اس فوج کا مقابلہ کیا، حسان کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا، تین سال کی قید کے بعد آزاد کر دیا گیا۔ مگر جاتے وقت راستہ ہی میں مر گیا!

یمن کے مشرق میں نجران کے علاقہ میں ۵۰۰ء تک عیسائیت پھیل چکی تھی۔ اور نجران کے عیسائی حبشہ والوں کے حلیف بن گئے تھے، نجران میں ابن المسیح بن دارس بن عدی کا قبہ دار مندر تھا۔ جو تین سو کھالوں سے بنایا گیا تھا۔ عرب اس کو کعبۂ نجران کہتے تھے۔ کیونکہ اس کی زیارت کو اس طرح جایا کرتے تھے جیسے کعبہ کی زیارت کو جاتے۔ اگر کوئی شخص وہاں پناہ لیتا تو اسے پناہ دیتے۔ اگر کوئی کسی سے ڈر کر آتا تو اسے امن دیتے، اگر بھوکا ہوتا تو سیراب کرتے۔ کوئی حاجت لاتا تو اسے پورا کرتے۔ اور اگر روپے پیسے مانگتا تو اسے دیئے جاتے، اس کی بابت اصفہانی نے لکھا ہے کہ یہ گرجا گھر تھا۔ جسے کعبہ کی صورت پر بنایا تھا اور جس کی تعظیم بھی کعبہ کی تعظیم جیسی کرتے تھے! نجران کے عیسائی حبشہ والوں کے حلیف بن گئے تھے، یمن کے یہودی سردار ذونواس نے نجران پر حملہ کیا اور عیسائیوں کو شکست دے کر ایک خندق کھدوا کر آگ میں جھنکوا دیا۔ اس واقعہ کے بعد حبشہ والوں نے یمن پر چڑھائی کی، ذونواس اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے یمن پر قبضہ جما لیا۔ یہ واقعات ۵۲۲ء تک ظہور پذیر ہو چکے تھے، شاہ حبشہ اصحمہ کا دوسرا نائب وائسرائے ابرہہ یمن کا عامل تھا، اس کی خواہش تھی کہ عرب مکے کے کعبہ میں چڑھاوے نہ چڑھایا کریں اور مکہ معظمہ کا حج اس طرح موقوف ہو جائے، اس کے بجائے نجران کے کعبہ میں آیا کریں جو وہاں پہلے سے موجود تھا، نفسِ شیطان نے اسے یہ پٹی پڑھائی:-

یہ مکے میں جو کعبہ ہے اُسے جب تک نہ ڈھاؤ گے
اٹھا کر سنگِ اسود کو یہاں جب تک نہ لاؤ گے

چنانچہ ۵۷۰ء میں (ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ یہ قصہ اصحاب فیل آنحضرتؐ کی پیدائش سے دو ڈھائی ماہ قبل واقع ہوا۔ آپؐ ہی کی برکت سے اہل مکہ اس فتنے سے محفوظ رہے) عبدالمطلب کی سرداری کے زمانہ میں ذی الحجہ یا محرم کے مہینہ میں ابرہہ تقریباً ساٹھ ہزار کی فوج لے کر مکہ کے کعبہ کو مسمار کرنے کی غرض سے بڑھا!

اس واقعہ کو ایک قدیم شاعر عبداللہ بن زبیری اپنے قصیدہ میں یوں بیان کرتا ہے:-

وَاسْئَلْ اَمِیْرَ الْجَیْشِ عَنَّا مَا دَئٰ   وَلَسَوْفَ یُنْبِیْ الْجَاھِلِیْنَ عَلِیْمُھَا

سِتُّوْنَ اَلْفًا لَمْ یَؤُبُوْا اَرْضَھُمْ !   بَلْ لَمْ یَعِشْ بَعْدَ الْاِیَابِ سَقِیْمُھَا

(ذرا پوچھو کہ فوج کے سردار نے کیا کچھ دیکھا - جسے خبر ہے وہ بے خبروں کو بتلا دے گا کہ ساٹھ ہزار میں سے کوئی بھی اپنے ملک کو زندہ نہ گیا تھا اور اگر کوئی مرتا پڑتا واپس گیا بھی تو وہ بھی نہ بچا تھا !)

معاذ اللہ ! آفتِ سماوی سے سارا لشکر ہلاک ہو گیا، بلکہ سب کے لاشے مکہ سے آٹھ میل کی دوری پر سڑ رہے تھے، ابرہہ کا سارا کید خاک میں مل گیا اور بیت عتیق، خانہ کعبہ، اللہ کا گھر محفوظ رہا - عربوں میں یہ سال "عام الفیل" کے نام سے مشہور ہوا - اور قرآن کریم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ سورۃ الفیل میں ہے ـــ !

بالآخر فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے شرک کی ساری آلودگیوں کو ایک ایک کر کے دور کیا، یہاں تک کہ ۹ھ میں جب حج مع شرائط استطاعت فرض ہوا تو یہ بھی اعلان ہوا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کے اندر داخل نہ ہونے پائے گا - اور کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کر سکیگا - توراۃ کے یسعیاہ ۳۵ : ۷ میں بھی ہے کہ "وہ جو ناپاک ہے اس پر سے گزر نہ کرے گا"۔

حطیم کیا ہے؟ غیاث اللغات میں "حطیم" کے معنی شکستہ دیتے ہیں۔ "حُطام" - ریزہ گیاہ خشک و ریزہ ہر چیز - و کنایہ از اندک مالِ دُنیا - مراد ازاں مالِ دُنیاست چہ مالِ دُنیا بمقابلہ درجاتِ اُخروی - یا بعوض انسان کہ اشرف المخلوقات ست حکم ریزۂ کاہ دارد ـــ !

مصباح اللغات میں "حَطْمَۃ" کے معنی توڑنا دیے ہیں۔ "الحطم" - سب کچھ چٹ کر جانے والا - "حُطام الدنیا" - دنیاوی ساز و سامان "حطیم" - دیوار کی وہ جگہ جو رکنِ زمزم اور مقام ابراہیم کے درمیان ہے، یہ اس دیوار کو کہتے ہیں جو کعبہ کے حجرِ اسود کو مغربی جانب سے گھیرے ہوئے ہے - ابن دُرید لکھتا ہے کہ عرب جاہل اس دیوار کی قسم کھایا کرتے تھے - جو جھوٹا ہوتا اس کو یہ دیوار دبا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، اسی لئے اس کو "حطیم" کہنے لگے ـــ !

روایت ہے کہ رسول اللہؐ کو شقِ صدر معراج کی رات بمقام حطیم ہوا تھا - جب کفار نے رسول اللہ کے بیت المقدس تک معراج کے سلسلہ میں جانے کو جھٹلانا شروع کیا اور جانچنے کے لئے نشانات پوچھنے لگے، تب وہ حطیم ہی میں کھڑے ہوئے تھے - اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو آپ کے سامنے کر دیا - عمارت کو دیکھتے جاتے اور سارے نشانات واضح طور پر کفار کو بتلاتے جاتے تھے - جیسا کہ ذیل کی حدیث سے واضح ہے :-

عَنِ الشَّیْخَیْنِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ - قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَمَّا کَذَّبَتْنِیْ قُرَیْشٌ حِیْنَ اُسْرِیَ بِیْ اِلٰی بَیْتِ الْمَقْدِسِ قُمْتُ فِی الْحِجْرِ فَجَلَّی اللّٰہُ لِیْ بَیْتَ الْمَقْدِسِ - فَطَفِقْتُ اُخْبِرُھُمْ عَنْ اٰیَاتِہٖ وَ اَنَا اَنْظُرُ اِلَیْہِ -

یہ بھی ایک شرحِ صدر تھا - اور شرحِ صدر وہ مقامِ رفیع ہے۔ جس کے لئے موسیٰ کو خود التجا کرنی پڑی۔ "قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ" (طٰہٰ)

الغرض حطیم کے پاس پہنچ کر جو کچھ ہوتا ہے اُس کے معنی یہی ہیں کہ حجاج اللہ کی اطاعت کے لئے ایکدم شکستہ و منکسر ہو کر، عجز و انکسار میں سرشار اپنے کو ایکدم گرا کر اللہ کے گھر جائیں ـــ !

حجر اسود کا فلسفہ :- اسی دیوارِ حطیم کے گھیرے میں وہ حجرِ اسود ہے، جس کی خاطر قبیلوں میں جھگڑا ہوتے ہوتے رسول اللہ نے

بچا لیا تھا۔ یہی وہ پتھر ہے جس کی بابت حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "تو ایک پتھر ہے، نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے۔" پھر بھی اُسے بوسہ تک دیا جانے لگا! آخر کیا بات تھی کہ رسولؐ اللہ نے اُسے اتنا اونچا درجہ دے رکھا تھا؟ کیا یہ محض ایک "ٹوٹا ہوا تارا ہے" جیسا ایک انگریزی کتاب "مریکل آف مین" (Miracle of Man) میں لکھا ہوا ہے؟ آخر کیا بات ہے کہ اس حجر کو بیت عتیق میں اس قدر نمایاں مقام حاصل ہے؟ اسی فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تاریخ مکہ موسوم بہ "اعلام بیت الحرام" میں ہے: "فَقَالَ اِبرَاهِيمُ لِاسمٰعِيل عليهما الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ يَا اسمٰعِيلُ ابغنی بحجرٍ اضعه حتیٰ يکون علماً للناس يبتدؤن منه الطواف" (پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لادو تا کہ میں ایسی جگہ نصب کردوں کہ لوگ جان جائیں اور وہیں سے طواف شروع کریں۔ (سیرت النبی جلد ۱۔ از شبلیؒ)

عبداللہ بن عباسؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ "نزل الحجر الاسود من الجنّة" چونکہ یہ حدیث مرفوع کی حیثیت رکھتی ہے (یعنی ایسی حدیث جس کی سند نبی کریمؐ تک متصل ہو) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ پتھر اُن احجارِ جنت سے ہوگا جنہیں اوّلاً آدمؑ نے پہلی مسجد یا پہلی عبادت گاہ (اِنَّ اَوَّلَ بیتٍ وُّضِعَ للناس لَلَّذِی بِبَکَّةَ ") میں لگایا ہوگا۔ بلکہ امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں لکھا ہے کہ علماء نے بیان کیا کہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا۔ پہلی بار ملائکہ نے بنایا۔ یہ حضرت آدمؑ کے وقت میں ہوا ہوگا۔ اور بناء ابراہیمی کو اس کے بعد لکھا ہے۔ اس سے اس بات کا سراغ لگتا ہے کہ یہ پتھر قدیمی یادگار ہے۔ جو بکہ کی عبادت گاہ میں رہا ہوگا، جو اس وقت نشیب میں وادی غیر ذی زرع میں ایک ٹیلہ کی طرح مُرتفع تھا۔ (حدیث دیکھئے۔ وَکَانَ البیت الحرام مُرتفعاً مِنَ الارض کالرَّابیَةِ) جب ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ ہاجرہ کو اس وادی میں چھوڑ گئے تھے، پھر جب آخری بار ملنے گئے اور مسجد حرام کی تجدید کرنے لگے تو اس ملبہ سے ایک پتھر کو بطور یادگار لگا دیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ پتھر محض یادگار تھا یا اس میں کوئی اور راز تھا؟

توراۃ کے اوراق اُلٹنے سے کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے ـــــ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کا دستور تھا کہ میدان میں جس جگہ کو عبادت گاہ مقرر کرتے وہاں ایک لمبا بن گھڑا پتھر ستون کی طرح کھڑا کر دیتے تھے! جیسے اب بھی مسلمان کھلی جگہ نماز پڑھتے ہوئے اپنی چھڑی وغیرہ گاڑ لیا کرتے ہیں، جسے "سُترہ" کہتے ہیں۔ (رحمۃ للعٰلمین حصہ اوّل)

"اور یعقوبؑ صبح سویرے اُٹھا اور اس پتھر کو جسے سرہانے دھر لیا تھا لے کر ستون کی طرح کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا اور اس جگہ کا نام "بیت ایل" (خانۂ خدا) رکھا۔" (پیدائش ۲۸: ۱۸)

کتاب خروج ۲۴: ۴ میں بیان ہے کہ موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لئے اسی طرح کے بارہ[12] ستون قائم کئے گئے اور ایک قربان گاہ بنائی گئی۔ پیدائش ۳۱: ۴۴۔ ۴۵ میں ایک تفصیلی خاکہ اس طرح مندرج ہے۔ "تب لابن نے یعقوبؑ کو جواب دیا۔ پس اب آکہ میں اور تو دونوں مل کر آپس میں ایک عہد باندھیں اور وہی میرے اور تیرے درمیان گواہ رہے، تب یعقوبؑ نے ایک پتھر لے کر اُسے ستون کی طرح کھڑا کیا۔ اور یعقوبؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ پتھر جمع کرو۔ انہوں نے پتھر جمع کر کے ڈھیر لگا دیا۔ اور وہیں اس ڈھیر کے پاس انہوں نے کھانا کھایا۔ اور لابن نے اس کا نام (کلدانی اور ارامی زبان میں) یجر سا ہدوتا رکھا (یعنی حجر شہادت۔ شہادت کا ڈھیر) اور یعقوبؑ نے (عبرانی لفظ) "جلعید" (یعنی شہادت کا ڈھیر) رکھا۔ اور لابن نے کہا یہ ڈھیر آج کے دن میرے اور تیرے درمیان گواہ ہو۔ اسی لئے اس کا نام "جلعاد" رکھا گیا۔ یہاں چار باتیں نمایاں ہیں۔ (۱) عہد باندھنا (۲) درمیان گواہ (۳) پتھر بحیثیت گواہ (۴) اور اس ذات (یعنی خدا) کی قسم کھانی ـــــ

یہاں بیان شدہ پتھر کا ستون، پتھر کے ڈھیر بطور شہادت ویسے ہی ہیں جیسے مٹی کنائی میں شہادت کے تودے (witness pillars)
اور جنگوں کی حدبندی کی شہادت کے لئے پتھروں کے ڈھیر (Boundary pillars) چھوڑے جاتے ہیں۔ مگر توراۃ کا
"حجرِ شہادت" عہد نامہ کے سلسلہ میں ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر پتھر کیوں شہادت کے لئے منتخب ہوا؟ اس فلسفہ کا راز ذیل
کی عبارت سے افشا ہوتا ہے:۔

"اور یشوع نے سب لوگوں سے کہا کہ دیکھو یہ پتھر ہمارا گواہ رہے، کیونکہ اس نے خداوند کی سب باتیں
جو اس نے ہم سے کہیں، سنی ہیں۔ اس لئے یہی تم پر گواہ رہے۔ تا نہ ہو کہ تم اپنے خدا کا انکار کر جاؤ۔
(یشوع ۲۴: ۲۷)

ظاہر ہے کہ جب اور جس حیثیت سے کائنات کا ذرہ ذرہ حق کی شہادت دے سکتا ہے تو یہ پتھر پھر کیوں نہ دے!
جب اسرائیل (یعقوبؑ) مرنے کے قریب آئے تو "اپنے کو سنبھال کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور کہا کہ خدا جس کے سامنے
میرے باپ ابرہام اور اضحاق نے اپنا دورہ کیا، وہ خدا جس نے ساری عمر آج کے دن تک میری پاسبانی کی (پیدائش ۴۸)
اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ یعقوبؑ وغیرہ کا وہی مذہب تھا جو ابراہیمؑ کے دور میں تھا۔ لہذا یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اس قسم کا
عہد نامہ، گواہی اور حجرِ شہادت اور قسم وغیرہ بھی شروع ہی سے مروّج رہے ہوں گے!

قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے سے عہد نامہ کے مفہوم کی تائید ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً:۔

"وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ" (البقرہ)

سورۃ یٰس میں اللہ تعالیٰ کس زبردست عہد نامہ کی یاد دہانی ان الفاظ میں کراتا ہے:۔

"أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۔ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۔ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ"

(اے اولادِ آدم کیا ہم نے تم سے عہد نہیں کیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلم کھلا
دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے۔)

اسی عہد نامہ کا اشارہ سورۃ البقرہ، الاعراف، الحجر اور ابراہیم کے مختلف مقامات پر پُر زور طریقہ پر ملتا ہے۔ ان مختلف
مقامات کے حوالوں میں دو معاہدے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک آدمؑ، اُن کے زوج اور اولاد کے متعلق جو خدا نے کیا۔
دوسرا معاہدہ خدا نے ابلیس شیطان کے ساتھ کیا۔ آدمؑ اور اُن کے زوج کو شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے سے منع کیا گیا تاکہ
اُن کا شمار ظالموں میں نہ ہو جائے۔ مگر شیطان نے بہکا دیا۔ اور اُن کو جنت سے نکال باہر کیا گیا۔ اسی طرح ابلیس نے سجدہ
نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ کافروں میں شمار ہوا۔ اور وہ بھی جنت سے نکال باہر کیا گیا۔ پھر دونوں پارٹیوں سے اللہ تعالیٰ
نے معاہدہ کیا اور ایک مہلت دی۔ شیطان کو قیامت تک کے لئے ملعون و رجیم کہا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ شیطان کا داؤں
اللہ کے مخلص بندوں پر نہ چل سکے گا۔ وہ انہی پر اپنا قبضہ جما سکتا ہے جو اللہ کی عبادت اور صراطِ مستقیم چھوڑ کر شیطان
کی پیروی کریں گے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شیطان اپنی صفائی بیان کر دیتا ہے کہ میں نے تو محض اپنی طرف بلایا تھا اور تم نے میری
طرف آنا قبول کیا۔ اس لئے ملامت کے قابل میں نہیں ہوں۔ بلکہ اپنے ہی نفس کو ملامت کرو۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اولادِ
آدمؑ کے لئے انبیاء آئیں گے۔ اور تاریخ الکامل لابن اثیر میں تو اُن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔

جو لوگ ان کے کہنے پر عمل کریں گے، تقویٰ و صالح زندگی اختیار کریں گے، اُن کے لئے کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں گے اور استکبار کریں گے وہ اصحاب النار ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ سے ابراہیمؑ کے ساتھ عہد نامہ کی شرائط پر گفتگو ہو رہی تھی اور ابراہیمؑ کو اُن کے رب نے چند باتوں میں آزما کر فرمایا میں تم کو انسانوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا۔ "وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (البقرہ) اور میری اولاد کے متعلق کیا حکم ہے؟ جواب دیا ان میں جو ظالم ہوں گے انھیں میرا عہد نہیں پہنچتا) ابھی اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ شجرِ ممنوعہ کے پاس جانا بھی ظالم ہونے کا باعث قرار پا سکتا ہے۔ اسی طرح۔ "لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ" (الانبیاء) زبور میں پند و نصیحت کے بعد ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے)

دُوسری طرف "ابلیس" اَبْلَسَ سے ہے بمعنی بے خبر ہونا۔ شکستہ دل ہونا۔ غمگین ہونا۔ من رحمۃ اللہ مایوس ہونا۔ (مصباح اللغات) اسی لئے شیطان کا نام ابلیس پڑا۔ اسی طرح شیطان کا لفظ شَطَنَ سے ہے، بمعنی مخالفت کرنا۔ حق وغیرہ سے دُور ہونا۔ لہٰذا شیطان کے معنی سرکش و نافرمان کے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے دربار سے ابلیس (شیطان) اسی بناء پر راندۂ درگاہ ہو کر نکالا گیا۔!

جب قرآن کریم میں عہد نامہ کا ذکر موجود ہے تو شہادت بھی ملنی چاہیئے۔ یہاں دو عہد نامے دیکھے گئے جو بیک وقت ایک ہی دربار میں طے پائے۔ اور چونکہ انسان کے ساتھ سب سے اوّل اور قدیم معاہدہ زمین کی خلافت کا ہوا۔ دُوسرے والے معاہدہ کو ہم شہادت میں لے سکتے ہیں جو بیک وقت ہوا۔ اور یوم الدین تک کے لئے قرار پایا۔

قرآن کریم میں شہادت کی بہترین مثال اس موقع کے لئے "وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ، وَطُورِ سِينِينَ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ" میں موجود ہے، جس میں چار مختلف ادوار کی شہادت۔ تین، زیتون، طور، سینا کے پہاڑ اور بلدِ امین (شہر مکہ) کو قرار دیا گیا۔ اس میں پہلی شہادت کا اشارہ حضرت آدمؑ ہی کے دَور کی طرف ہے۔ اور تین کے پہاڑ کو شاہد بنایا گیا ہے۔ جو حجر شہادت سے موزونیت رکھتا ہے!

شہادت اور قسم کا ایک ہی مفہوم ہے۔ بعض مرتبہ تمدنی ضروریات اور بعض دیگر حالات مجبور کرتے ہیں کہ آدمی اپنی پوری بات کو تاکید و توثیق کے ساتھ پیش کرے، یہی ضروریات و حالات کبھی کبھی اس بات کے داعی ہوتے ہیں کہ اس تاکید میں پوری شدت اور اس توثیق میں کامل استحکام ہو۔ اس کے لئے طریقہ یہ تھا کہ بالعموم معاہدوں اور قسموں کی تکمیل عبادت گاہوں کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اس طرح قسم میں مذہبی تقدس کا رنگ پیدا ہوا۔ اس طرح کی قسموں اور معاہدوں پر گویا اللہ تعالیٰ کی گواہی ثبت ہو جاتی تھی، اور اُن کے توڑنے میں اس کی خفگی کا اندیشہ تھا۔ (اقسام القرآن از فراہیؒ)

تاریخ شاہد ہے کہ قدیم قوموں کو جب کوئی اہم ضرورت پیش آتی تو اپنے معبدوں اور استھانوں کے پاس اکٹھی ہوتیں اور وہیں اپنے دیوتاؤں کے سامنے معاہدہ کرتیں۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا حال بھی یہی تھا۔ خانۂ کعبہ اُن کا سب سے بڑا معبد تھا۔ اور جب اُن کو کوئی معاہدہ کرنا ہوتا تو وہ اسی معبد کے پاس آتے اور گویا خدا کے سامنے اپنے معاہدے مرتب کرتے (اقسام القرآن از فراہیؒ)

پھر شرک کی آلودگی کی وجہ سے کبھی یوں بھی ہونے لگا کہ کسی استھان کے پاس اکٹھا ہو کر معاہدہ کر لیتے کہ جن استھانوں پر وہ قربانی کرتے تھے اُن کو خدا کا شریک اور خدا کے دربار میں اپنے لئے سفارشی سمجھتے تھے۔ ادائے رسم کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو (۱) قربانی کر کے اُس کا خون چھڑکتے یا خانۂ کعبہ کو چھوتے، یا پھر (۲) یہ کرتے کہ کسی خوشبو میں اپنے ہاتھ سب ڈالتے اور پھر اس سے خانۂ کعبہ کو چھوتے۔ اس کی مثال بعثت سے کچھ پہلے بنی عبد مناف کے حلف میں ملتی ہے، جس میں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ بھی شریک تھے۔

اسی خوشبو کی وجہ سے یہ لوگ "مطیبین" کے نام سے مشہور ہوئے، ان سب سے مقصود محض شہادت کے مفہوم کو تقویت دینا تھا۔ یہ طریقہ اختیار کر کے صورتِ حال کو آنکھ کے سامنے رکھ دیتے تاکہ قلب پر اس کا اثر پڑے۔" (اقسام القرآن از فراہیؒ)

اہلِ عرب زمانۂ جاہلیت میں ہر طرح کے اختلافِ عقائد کے باوجود (بیت اللہ) کی تعظیم میں بالکل متفق تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کا اوّلین گھر جو لوگوں کے لئے تعمیر ہوا، یہی ہے۔ یہاں تک کہ عرب کے نصرانی بھی اس گھر کی قسم کھاتے تھے، مثلاً عدی بن زید جاہلیت میں نصرانی تھا، تاہم کہتا ہے۔" سعی الاعداء لا یالون شراً ۔ علیک وربّ مکۃ والصلیب "۔ (اعداء سرگرم سازش ہیں اور تمہارے خلاف کوئی شرارت اٹھا نہ رکھیں گے۔ مکہ کے رب اور صلیب کی قسم) (اقسام القرآن از فراہیؒ)

جاہلیت کی یہ بات اسلام میں بھی باقی رہی۔ فرزدق کا شعر ہے ؎

اَلَم تَرَنِی عاھدتُ رَبِّی وَاِنَّنِی بین رتاج قائماً وَّمقامِ

علیٰ حلفۃ لا اشتم الدھر مسلماً وَلاخارجاً من فی زورِ کلامِ

(کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے بابِ کعبہ اور مقام کے مابین کھڑے ہو کر اپنے رب سے کچھ عہد کیا ہے کہ کسی مسلم کو گالی نہ دوں گا اور نہ اپنے منہ سے کوئی جھوٹی بات نکالوں گا) (اقسام القرآن از فراہیؒ)

عرب کی قسموں میں ایک یہ بھی تھی۔" لَا وَرَبِّ ھٰذَا الْبَیْتِ " (اس مکان یعنی خانہ کعبہ کے مالک کی قسم) غرضکہ یہ تھے مختلف نقشے قسم و شہادت کے جو زمانہ قدیم سے رائج تھے۔ اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرانے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کا اظہار اور قسم کی پختگی اور قطعیت کا اعلان ہوتا ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ نے اپنے آخری خطبہ میں تمام اہم امور و فرائض کے بعد ذکر فرمایا۔" اَلَا ھَل بَلَّغتُ ۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ " (آگاہ میں نے پہنچا دیا، اللہ تو گواہ ہے) آپؐ جب کبھی کسی بستی میں جاتے تو ایک دعا پڑھتے " وَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ...... وَرَبِّ الرِّیَاحِ وَمَا ذَرَیْنَ "۔ (آسمان و زمین کا رب گواہ ہے اور ہواؤں اور وہ جو کچھ اڑاتی ہیں ان کا رب گواہ ہے) آپؐ نے ابن اللتبیہ ازدی کو تحصیل صدقہ کے لئے عامل بنایا۔ انہوں نے کچھ ہدیئے قبول کرلئے آپؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا۔ اور ان کی ذمہ داریوں کو یاد دلانے کے بعد آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا۔" اَللّٰھُمَّ ھَل بَلَّغتُ " (خداوندا کیا میں نے پہنچا دیا؟) آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ کو گواہ ٹھہرانے کی مثال حضرت ابراہیمؑ کے ایک واقعہ میں یوں ملتی ہے۔" ابرام نے سدوم کے بادشاہ سے کہا کہ میں نے خداوند تعالیٰ۔ آسمان و زمین کے مالک کی طرف ہاتھ اٹھایا ہے کہ میں نہ تو کوئی دھاگا، نہ جوتی کا تسمہ، نہ تیری کوئی اور چیز لوں گا" (پیدائش ۱۴: ۲۲-۲۳) انگریزی بائبل میں ہاتھ اٹھایا کہا گیا ہے اور اردو بائبل میں " قسم کھائی ہے " لکھا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھانے کا مفہوم شہادت کا اشارہ یا گواہ ٹھہرانا تھا ــــ!

تفسیر جواہر میں حجرِ اسود کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ یہ پتھر زمین پر اللہ کا داہنا ہاتھ ہے۔ مناسکِ حج کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حجرِ اسود کو بوسہ دے کر، ہاتھ لگا کر یا محض ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ ہی کر دینا اسلام کے اوّل اور قدیمی عہد کو از سرِ نو تازہ کرنا ہے (بحوالہ مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ) اور وہ بھی کہاں؟ اللہ کے بیتِ عتیق میں اس مقام پر جہاں حجرِ شہادت نصب ہے۔ اسی شاہد حجر کی طرف اشارہ کر کے جس نے بنی آدم کے ساتھ اللہ کے معاہدہ کو اسی مقام پر بچشم دیکھا اور سنا۔ اس طرح عہد کی توثیق اور حق کی راہ میں قربان ہونے کا اقرار بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے پہلو سے بھی غور کیجئے۔" یَدُ اللّٰہِ فَوقَ اَیْدِیْھِم " کا مفہوم بھی اس معاہدہ کی تجدید میں نظر آ رہا ہے۔ ہو بہو یہ منظر اس وقت بھی تھا جبکہ رسول اللہؐ نے ۳۵ برس کی عمر میں اس پتھر کو چادر میں رکھ کر اپنے ہاتھ

سے عمارت میں لگایا تھا، اور ہر قبیلہ کا سردار اپنے ہاتھ سے چادر پکڑے ہوئے تھا!

یہ حجرِ شہادت شاہد تھا کہ اللہ نے شیطان کے استکبار کو بُرا سمجھا اور نفسانی ضد، ہٹ دھرمی، شکوک وشبہات اور وساوس کی بدولت انکارِ حق کا نام استکبار وکفر رکھا گیا۔ ابلیس اکڑا رہا اور سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اسی حجرِ شہادت کے پاس جو حطیم کی دیوار سے گھرا ہوا ہے جب حجاج پہنچتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ "واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون" (مرسلات) اور اُن سے کہا جائے کہ جھکو تو جھکتے نہیں۔ بلکہ اطاعتِ حق کے لئے شکستہ ومنکسر ہو کر گزرتے ہیں اور باطل کے مقابلہ میں حق کے عہد کو ہاتھ بڑھاکر تازہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اس قدیم پتھر نے اللہ کے معاہدہ کو جو ابو البشر آدم کے ساتھ ہوا دیکھا اور سنا، اسی لئے یہ حجر اتنا قابلِ احترام اور چُومے جانے کے لائق ہو سکا!

رہ گیا نام اسود (یعنی سیاہ) تو اس کی وجہ تسمیہ قرآن کریم سے اس طرح مُستنبط ہوتی ہے:-

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا تَکْفُرُوْنَ۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰہِ۔ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ۔

جس دن بعض لوگوں کے منہ سفید ہوں گے اور بعض کے سیاہ، تو جو لوگ سیاہ رو ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اب اپنے کفر کی سزا میں عذاب کے مزے چکھو۔ اور جو لوگ سفید رو ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے!

کیا ابلیس کے لئے نہیں کہا گیا۔ "وکان من الکافرین"۔ (وہ کافروں میں ہو گیا) زبردستی کے ساتھ اکڑے رہنے پر اسے ملعون ورجیم ومن الصّٰغرین کہہ کر جنت سے نکالا گیا۔ کیا سخت دل ہونے کو پتھر یا حجر نہیں کہتے؟ ان ساری صفات کی بناء پر حجرِ اسود نام اس کے لئے زیادہ موزوں نہیں، خواہ رنگ سیاہ ہو یا نہ ہو۔ اسود، ابیض کا ضد ہے۔ ابیض حق کے لئے ہے تو اسود[1] اس کا عکس ہے!

الغرض یہ حجرِ اسود بیتِ عتیق کی قدامت پر صاف شہادت دے رہا ہے کہ بیشک دُنیا میں پہلا عبادت خانہ کعبہ ہی ہے۔ جو "امّ القریٰ" بکہ میں تھا، جو زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت سے بلد محرّم تھا۔ اور جہاں اسی وقت سے چار مہینے حرام تھے اور آدم کی مسجد مکہ محض چبوترہ و کرسی ہی بلکہ ایک ٹیلہ ہی کی شکل میں تھی۔ جس وقت حضرت ابراہیم، اسمٰعیل اور اُن کی والدہ کو پہنچانے گئے، جبکہ سام بن نوح حجاز کے امام تھے، اس حجرِ شہادت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا کہ ہابیل وقابیل نے اپنی اپنی قربانی اسی بیتِ عتیق میں چڑھائی۔ حضرت شیث کے وقت یہی اوّلین ایوان اور فطری حکومت کا حرم امن تھا۔

پھر انوش کے وقت سے لوگ یہوواہ کا نام لے کر اسی حرم میں دعا کرنے لگے۔ مکہ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آدم کا بیت الحزن بھی یہیں رہا ہو گا۔ الحاصل اس مقدم ترین عہد نامہ کی تکمیل کی غرض سے جو اللہ تعالیٰ اور ابو البشر آدم کے درمیان ابلیس کے عہد نامہ کے بالمقابل ہوا، یہ بیت عتیق اور شوکت کا گھر، ساری جد وجہد کا مرکز بنا اور اسی بیت عتیق میں اس قدیم حجرِ شہادت نے بھی اپنا مقام حاصل کر لیا۔ حالانکہ بذاتِ خود وہ ایک پتھر ہی ہے، نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر!

---

[1] مگر کسی چیز کا "سیاہ رنگ" ہونا یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، کسی پتھر کا رنگ ہی کالا ہو تو اُسے "حجرِ اسود" کہہ سکتے ہیں۔ (م۔ق)

حاجی محمد عزیز اللہ بی اے، بی ایل۔

اسلامی توحید

دُنیا میں جس قدر مذاہب اور ادیان پائے جاتے ہیں، اُن میں ہر مذہب والا توحید کا مدعی ہے، لیکن اسلام سے دُوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی آتش پرستی میں پڑ کر اور کسی نے اصنام پرستی میں اپنے کو ملوث کر کے اور کسی نے آفتاب و ماہتاب کو پُوج کر، کسی نے سمندروں اور دریاؤں کو معبود سمجھ کر اور کسی نے احبار و رہبان کو تصرف کرنے والا جان کر مختلف طور پر ایسی ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ اُن کا دعویٰ توحید بجائے خود باطل ہو کر رہ گیا۔ صرف ایک اسلام ہی وہ پاک و مقدس مذہب ہے جس نے نتھری ہوئی توحید پیش کی ہے اور اس مسئلہ کو اس طرح واضح و مدلل کیا ہے کہ تمام ادیانِ عالم اس سے یکسر خالی ہیں ــ !

وجود باری تعالیٰ جس طرح کشتی سے ملاح کا پتہ چل جاتا ہے اور دھواں دیکھ کر آگ کا علم ہو جاتا ہے، آفتاب نکلنے پر دن ہو جانے کا یقین ہو جاتا ہے، اسی طرح کائنات کا ہر ذرہ اپنے خالق کا پتہ دے رہا ہے۔ ایک صحابی نے کیا خوب کہا ہے۔ وفی کل شیٔ لہ آیۃ، تدل علی انہ واحد۔ یعنی دُنیا کی ہر چیز میں قدرت کی ایک نشانی ہے اور ہر چیز خدا کی وحدانیت اور وجود کی گواہی دے رہی ہے !

ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون ــ !

آسمان اور زمین کا بنانا اور رات و دن کا بدلتا آنا اور کشتی جو لے کر چلتی ہے دریا میں، جو چیزیں کام آویں لوگوں کو۔ اور جو اُتارا اللہ نے آسمان سے پانی پھر جلایا اس سے زمین کو مر گئے پیچھے، اور بکھیرے میں اس میں سب قسم کے جانور اور پھیرنا ہواؤں کا اور ابر جو حکم کا تابع ہے درمیان آسمان اور زمین کے اُن میں نمونے ہیں عقلمند لوگوں کے لئے (ترجمہ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ)

آج دُنیا میں انکار و دہریت کا کافی زور ہے اور اس مسئلہ میں نئے نئے انداز سے ریسرچ ہو رہا ہے۔ لیکن آخر ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح خدا کے اقرار کے بغیر چارہ نہیں ہے !

انبیاء سابقین کی دعوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ہر ایک نے توحید ہی کی دعوت دی۔ قرآن اس پر شاہد ہے :۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون !

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کسی کی بندگی نہیں ہے سوا میرے سو میری بندگی کرو۔ (ترجمہ شاہ صاحب)

بلکہ قرآن پاک نے ہر رسول کی دعوت کو تفصیل سے بیان کیا ہے:-

والیٰ عاد اخاھم ھودا قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ - والیٰ ثمود اخاھم صالحاً قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ، والیٰ مدین اخاھم شعیبا قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ -!

یعنی حضرت ہود علیہ السلام وحضرت صالح علیہ السلام وحضرت شعیب علیہ السلام ہر ایک نے اپنی اپنی قوم کو یہی وعظ سنایا کہ ایک اللہ کی پرستش کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے!

اسلامی تصریحات

اسلام نے توحید باری تعالیٰ کو تمام طاعتوں کی اصل قرار دیا ہے، اس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہے۔ ایک حدیث قدسی میں یوں وارد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے، جو بندہ میرے پاس اس حال میں آئیگا کہ زمین و آسمان اس کے گناہوں سے بھرے ہوں گے مگر توحید پر قائم رہ کر شرک سے بچا ہو گا تو اس سے میں اتنی ہی رحمت لے کر ملوں گا اور جو بندہ زمین و آسمان بھر کر نیکیاں لے کر آئے گا اور اس کے ساتھ شرک بھی کرتا رہا ہو گا اور توحید سے تہی دامن ہو گا تو اتنا ہی غضب و غصہ لے کر ملوں گا۔ اسی لئے حضور سرور کائنات کا فرمان ہے:-

اذا سئلت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن اللہ ولو اجتمعت الانس والجن علیٰ ان ینفعوک لن ینفعوک الا ما قد کتبہ اللہ تعالیٰ ولو اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یضروک لن یضروک الا ما قد کتبہ اللہ تعالیٰ -

یعنی جب تمہیں سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اپنے اللہ سے مانگو اور جب کبھی کسی معاملہ میں مدد چاہتی ہو تو اپنے اللہ سے چاہو اور یہ یاد رکھو کہ اگر تمام انسان و جن اور ساری طاقتیں مل کر تم کو ذرہ برابر نفع دینا چاہیں تو ہرگز ذرا سا بھی نفع نہیں دے سکتے۔ مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور تمام انسان اور جن اور کل قوتیں مل کر تم کو ایک ذرہ کے برابر نقصان دینا چاہیں تو ہرگز ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے -!

قابل غور بات

سب سے پہلے ہر مسلمان کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے کہ جس توحید پر وہ قائم ہے اس میں کوئی کھوٹ تو نہیں ہے ورنہ سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے اور قیامت کے دن اپنے اللہ کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہیگا وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون - یعنی بہت سے ایسے ہیں جو باوجود دعویٰ ایمان کے مشرک ہیں اور شرک کسی حال میں قابلِ معافی نہیں ہے۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء - یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ ہر گناہ معاف فرما سکتا ہے -!

کفار عرب کی توحید

جن کافروں کے لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے وہ اللہ تعالیٰ کو کائنات ارضی و سماوی کا خالق جانتے تھے۔ ولئن سألتھم من خلق السمٰوات والارض لیقولن اللہ -

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ ان کافروں سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کئے ہیں تو ضرور یہ کہیں گے کہ اللہ جل مجدہ نے پیدا کئے ہیں، اسی طرح کل کائنات کو اللہ کی ملکیت تصور کرتے تھے، نیز اللہ ہی کو اپنا رب سمجھتے تھے اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہر چیز کے ہونے کا یقین کرتے تھے۔ جیسا کہ آیات ذیل سے ثابت ہوتا ہے:-

قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون سیقولون للہ۔

تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس کے بیچ ہے۔ اب کہیں گے اللہ کو۔

قل من رب السمٰوات السبع ورب العرش العظیم سیقولون للہ۔

تو کہہ کون ہے مالک ساتٓ آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا بتا دیں گے اللہ کو۔

قل من بیدہٖ ملکوت کل شیئٍ وھو یجیر ولا یجار علیہ سیقولون للہ۔

تو کہہ کس کے ہاتھ میں حکومت ہے ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی نہیں بچا سکتا اب بتا دیں گے اللہ کو !

آسمان سے پانی برسانے والا اور روزی رساں بھی سارے کفار اللہ ہی کو یقین کرتے تھے :۔

ولئن سألتہم من نزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد موتہا لیقولن اللہ

اور جو تو پوچھے اُن سے کس نے اُتارا آسمان سے پانی پھر جلا دیا اس نے زمین کو اس کے مرے پیچھے تو کہیں گے اللہ نے ــــ !

سمجھنے کی بات اُوپر کے مضمون سے یہ معلوم ہوا کہ کفار عرب اللہ کو خالق، رازق، رب، آسمان و زمین کا مالک سمجھتے تھے پھر بھی اُن کو کافر ہی کہا گیا اور اُن کی ہدایت کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔ آخر وہ کونسی بات تھی، جس کی بناء پر زمرہ کفر سے نہیں نکالا گیا۔ وہ بات یہ تھی کہ تعظیم، پرستش کے اور نذر و نیاز کے جو طریقے اللہ کے آگے برتے جاتے تھے، وہی غیر اللہ کے آگے بھی برتتے تھے، مثلاً خدا کو سجدہ کیا جاتا ہے، رکوع کیا جاتا ہے، اُس کو نذر و نیاز کی جاتی ہے، اُس سے ہی مدد چاہی جاتی ہے، اور مصیبت کے وقت میں اُسی کو پکارا جاتا ہے۔ اُسی کے نام کی دہائی دی جاتی ہے، نفع و نقصان کا مالک خدا ہی کو جانا جاتا ہے۔ وغیرہ۔ یہی امور عرب کے کافر غیر اللہ کے سامنے بھی کر لیتے تھے۔ اور جب اُن کو منع کیا جاتا کہ رکوع و سجود، طواف، استغاثہ، اُٹھتے بیٹھتے اُسی کے نام کی رٹ لگانا یہ امور صرف اللہ کے لئے ہیں، غیر اللہ کے سامنے قطعی حرام ہیں تو جواب میں یوں کہتے :۔

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ــــ !

(ہم تو اس لئے غیر اللہ پرستی کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں گے !

ہم کو بھی بار بار غور کرنا چاہیئے کہ اُٹھتے بیٹھتے اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام تو زبان پر نہیں ہے ؟ نفع و نقصان کا مالک خدا کے سوا کسی کو جانتے ہیں ؟ خدا کے سوا کسی اور کی نذر و نیاز کرتے ہیں ؟ اپنے خالق و مالک کے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ کا طواف کرتے ہیں ؟ اور آڑے وقت اپنے رب کے سوا کسی اور کی دہائی دیتے ہیں ؟ کسی زندہ یا مردہ کے سامنے جاکر استغاثہ کرتے ہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ہم میں اور حضورؐ کے زمانہ کے ابو جہل جیسے کافروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بہت جلد توبہ کر کے صحابہؓ کا سا ایمان پیدا کرنا ضروری ہے، جس پر نجات اُخروی و دُنیوی کا دارو مدار ہے۔ اللہ ہم سب کو صحیح ایمان نصیب کرے اور توحید پر چلائے اور توحید ہی پر مارے اور قیامت کے دن موحدین کے ساتھ حضور پاک کے جھنڈے تلے جمع کر دے۔ آمین !

☆

ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی
(پروفیسر شعبہ فارسی و عربی یونیورسٹی الہ آباد)

شیخ الرئیس ابن سینا اور اس کا فلسفہ

ابن سینا صفر ۳۷۰ھ اور بعض کے نزدیک ۳۷۵ھ میں بمقام افشنہ جو بخارا کے متعلقات میں سے تھا، پیدا ہوا۔ پانچ سال کے بعد اس کو اس کا باپ بخارا لے گیا، وہاں اس نے علم و ادب سیکھنا شروع کیا، لوگوں کا خیال ہے کہ ابن سینا دس سال کی عمر میں ادب اور لغت کی تعلیم سے فارغ ہو گیا تھا اور یہ کہ اسی زمانہ میں فرقہ اسماعیلیہ کا ایک مصری داعی بخارا میں آیا تو ابن سینا اس کی فلسفیانہ باتیں عقل اور نفس اور علم ہندسہ اور علم حساب ہند کے سنا کرتا تھا، اور اس کی بعض باتوں کو قبول کرتا اور بعض کو چھوڑ دیتا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ یقینی امر ہے کہ یہ سمجھ بوجھ اس پختہ کاری کا نتیجہ ہے جو ابن سینا کو بعد میں حاصل ہوئی لوگوں نے یہ خیال کر لیا کہ ابن سینا نے دس سال کی عمر میں ہی یہ سب جان لیا تھا!

غالباً ابن سینا کا سب سے زیادہ مشہور استاد ابو عبداللہ ناتلی ہے، وہ بخارا میں آیا تو ابن سینا کے والد نے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ ابن سینا کو منطق اور ریاضی سکھانے کا کام اپنے متعلق کرے۔ خود ابن سینا کا یہ قول ہے کہ "میں (ناتلی کے ساتھ) مجسطی کی طرف جھکا، جب اس کے مقدمات سے فارغ ہو گیا اور اشکال ہندسیہ کی طرف پہنچا تو مجھ سے ناتلی نے کہا۔ تم خود ان اشکال کو پڑھ کر حل کر لیا کرو، پھر اس پڑھے ہوئے کو میرے سامنے بیان کیا کرو۔ ناتلی خود کتاب نہیں اٹھاتا تھا اور میں اس کتاب کو حل کیا کرتا تھا، ہوا یہ کہ بہت سی مشکل باتوں کا علم اس کو اس وقت ہوا جب کہ میں نے ان کو اس کے سامنے پیش کر کے سمجھایا۔ پھر ناتلی مجھ سے جدا ہو کر کارنج چلا گیا۔" اور اس نے علم طبیعی اور علم الٰہی کے متون و شروح کا مطالعہ کیا۔ پھر علم طب کی طرف راغب ہوا اور اس فن کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور معالجہ کیا، علم وسیع کرنے کے لئے، مال کمانے کے لئے نہیں۔ اور اس کے پاس فن طب کے افاضل اور بڑے لوگوں نے آمد و رفت جاری رکھی۔ اس سے طب کے فنون اور معالجات جو تجربہ سے حاصل ہوئے تھے، سیکھنے لگے، اس وقت ابن سینا کی عمر سولہ سال تھی!

اتفاقاً امیر نوح بن نصر سامانی ایسا بیمار ہوا کہ اطباء اس کے علاج سے عاجز آ گئے۔ ابن سینا نے اس کا علاج کیا اور اس کو شفاء ہو گئی، اس لئے اس کے دربار میں ابن سینا کو بڑی عزت و عظمت حاصل ہو گئی، ابن سینا نے امیر نوح بن نصر سے اس کے بڑے کتب خانہ میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کر لی۔ اب کیا تھا وہاں اس کو بڑی اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ابھی ابن سینا پورے اٹھارہ سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے ان سب علوم سے، جن کے حاصل کرنے کے لئے وہ مشقت کرتا تھا، فراغت حاصل کر لی۔ اور ابن سینا طب اور فلسفہ سے الگ ہو کر حکومت کی خدمت میں مشغول ہوا۔ جیسا کہ اس سے اس کے باپ نے کہا تھا۔ پس وہ ہمدان میں شمس الدولہ کا وزیر ہو گیا۔ لیکن فوج نے شمس الدولہ پر حملہ کر کے اسے حکومت سے دست بردار ہو جانے پر مجبور کیا۔ شمس الدولہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے تاج الدولہ نے ابن سینا پر خیانت

کی تہمت لگائی اور اُسے وہاں ایک قلعہ میں قید کردیا - لیکن ابن سینا اصفہان کی طرف بھاگ گیا - ابن سینا نے ان سب زمانوں میں تالیف و مطالعہ کا کام جاری رکھا -

ابن سینا اپنی صحت کی طرف سے بے پرواہ و غافل تھا - جس سے اُس کا جسم کمزور ہوگیا - وہ قولنج میں مبتلا ہوگیا تو اپنی دوا خود کرتا تھا - لیکن اپنی صحت کی محافظت نہ کرتا تھا، اس لئے وہ صحت یاب تو ہوجاتا تھا اور صحت کے بعد پھر بیماری پلٹ آتی تھی - آخر وہ اپنی بیماریوں کے اثر سے بمقام ہمدان سنہ ۴۲۸ھ مطابق سنہ ۱۰۳۷ء میں ۵۸ سال کی عمر میں انتقال کرگیا - !

ابن سینا کی شخصی خصوصیات

ابن سینا کی خصوصیات شخصیہ کا تعلق اُس کی عجیب و غریب ذکاوت سے اور اس کی سیاسی تدابیر سے ہے - اس کی ذکاوت نے اُسے بچپن ہی میں فلسفہ اور علم کو گھیر لینے پر قادر بنادیا - اُس کا سیاسی تدبر بھی اس سے ظاہر ہے کہ وہ سرکاری عہدوں اور منصبوں پر برابر ترقی کرتا رہا - یہاں تک کہ وزارت کے مرتبہ کو حاصل کرلیا - وہ فارابی کی طرح نہیں تھا کہ لوگوں کے اجتماع سے بھاگتا اور لوگوں کی ملاقات کو ناپسند کرتا - وہ تو سیاست میں ڈوبا رہتا تھا - اور مجمع کی بھلائیوں اور برائیوں میں گھسا رہتا تھا اور اسی طرح اس کی شخصیت دورنگی تھی، لوگوں کے ساتھ وہ فلسفی، پرہیزگار، دیندار تھا اور اپنی ذات کے ساتھ وہ لذات و شہوات کا دلدادہ تھا - اور ابن سینا محض فلسفی نہ تھا بلکہ عالم اور طبیب بھی تھا، اس کا فلسفہ اس امر میں اُس کا معاون ہوگیا کہ وہ طب اور معالجہ میں فائق و کامل ہوجائے اور اس کے علم و تجربہ نے اُس کے فلسفہ میں ماہر ہونے میں اعانت کی، اور ابن سینا شاعر واسع الخیال تھا - جس سے اُس نے فلسفہ میں ایک نیا کشش والا مادہ بڑھادیا - اور اُس نے اپنے لئے ایک ادبی اسلوب تجویز کیا، جس میں اُس نے فلسفہ کو عمدہ و اصح طریقہ پر چلایا !

ابن سینا درجہ اوّل میں طبیب تھا اور دوسرے درجہ میں عالم طبیعی تھا - صرف تیسرے درجہ میں فلسفی تھا !

خالص فلسفہ میں وہ فارابی کے درجہ تک نہیں پہنچا - ہاں فلسفہ کو اُس نے فارابی کی وساطت سے سمجھا اور اُس میں وسعت پیدا کی - کیونکہ اُس کی تالیف کا دائرہ بہت وسیع ہے، فلسفہ اسلامیہ کی تاریخ میں ابن سینا کا حقیقی درجہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں فلسفہ اور علم کا تنظیم کرنے والا تھا، جس طرح ارسطو فلسفہ یونانیہ کا منظم اور اس کے علوم کا ظاہر کرنے والا تھا - اسی وجہ سے وہ معلم ثالث اور شیخ الرئیس کے لقب کا مستحق قرار پایا ! اور یہ عجیب و بعید نہیں - کیونکہ وہ اپنے زمانہ میں کامل فلسفی اور زبردست مفکر تھا - اس کا اثر مشرق میں محدود نہیں رہا، بلکہ مغرب تک پہنچا اور ابن سینا کی بدولت مغرب نے طب کا اور فلسفہ کا بہت حصہ جانا اور موضوعات فلسفیہ کا لکھنا معلوم کیا - اور ابن سینا کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترھویں صدی عیسوی تک برابر پڑھائی گئیں - اور ابن سینا کے زمانہ سے اور اس کے اثر سے اس سریانی ثقافت کو مغلوب کردیا جو بسا اوقات فلسفہ یونانی کو عرب کے سامنے بدنما شکل میں ظاہر کرتی تھی !

ابن سینا کی شخصیت کے متعدد اطراف تھے اور اس کا اثر اس کی کتابوں اور رسالوں میں ظاہر ہے، اُس کی کتابیں بہت ہیں اور مختلف انواع کی ہیں، لغت میں اس نے تالیف کیا - شعر نظم کیا، طب میں، ریاضیات میں، طبعیات اور فلسفہ میں کتابیں لکھیں - !

طب میں ابن سینا کی کئی کتابیں اور رسالے ہیں - سب سے زیادہ مشہور کتاب "قانون" ہے، اس میں "فسیولوجیا (وظائف الاعضاء) اور علم الامراض اور حفظان صحت کے مباحث ہیں - پھر معالجہ کے وسائل، پھر ہر ہر عضو کے امراض کا بیان پھر علاج اور اُس کی ترکیب کا بیان ہے !

یہ دشوار امر ہے کہ ہم اس کے فلسفہ کی تقسیم اس کے مباحث کے اعتبار سے کریں، کیونکہ اُس کی مشہور کتابیں فلسفہ کے کُل فنون پر مشتمل ہیں۔ اس لئے ہم ان کتابوں کو اُن کی شہرت کے اعتبار سے ذکر کرتے ہیں:۔

(۱) **شفاء**۔ یہ علوم فلسفہ کی انسائیکلوپیڈیا ہے (دائرہ معارف فلسفیہ) منطق اور طبعیات اور ریاضیات اور الٰہیات کو جامع ہے، اور یہ ابن سینا کی فلسفی کتابوں میں سب سے زیادہ حجم والی ہے۔

(۲) **نجات**۔ یہ شفاء کا اختصار ہے، اس میں فلسفہ کی تین انواع ہیں۔ (۱) منطق (۲) طبعیات (۳) الٰہیات۔ یہ کتاب باعتبار شمول اور وضوح اور اسلوب کے شفاء سے بڑھی ہوئی ہے۔

(۳) **تسع رسائل**۔ اس میں ۹ رسالے ہیں۔ (۱) طبعیات کے مباحث مخصوصہ باجسام (۲) اجرام علویہ کا بیان (۳) انسانی قوتیں اور اُن کے ادراکات، جن کا تعلق عقل اور حواس سے ہے (۴) الحدود۔ یعنی بعض ایسے الفاظ کی تعریفات جو فلسفہ میں آتے ہیں (۵) حکمت کی اور اس کی فروع کی تقسیم (۶) اثبات النبوۃ (۷) معانی الحروف الہجائیۃ۔ یہ رسالہ اپنے موضوع میں رمزیہ ہے (۸) رسالۃ فی العہد۔ یہ رسالہ تہذیب نفس کے بیان میں ہے (۹) رسالہ فی علم الاخلاق۔

(۴) **رسائل ابن سینا**۔ یہ دوسرا مجموعہ ہے جو بمقام لندن ۱۸۹۲ء میں طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں رسالہ حی بن یقظان (یہ ایک خیالی قصہ ہے، ایک شخص بیت المقدس سے سیاحت ارض کرتا ہے اور عجیب شہروں اور اُن کے عجائبات کا حال بیان کرتا ہے) اور رسالۃ الطیر اور رسالۃ الاشارات و التنبیہات اور رسالۃ القدر اور رسالۃ العشق ہیں۔

(۵) **مختلف تالیفات**۔ ابن سینا کا قصیدہ منطق میں۔ چند رسالے منطق کے، ایک قصیدہ نفس کے متعلق۔ جو ایک مجموعہ میں جس کا نام منطق المشرقیین ہیں چھپا ہے۔ اور ان کے سوا ——!

فلسفۂ ابن سینا کا اجمالی بیان

ابن سینا کسی فلسفی کے مذہب کا پابند نہ تھا۔ اس نے قدماء سے جو اس کو پسند آیا اخذ کیا، افلاطون وارسطو سے بھی لیا۔ فارابی کی لکھی ہوئی باتوں میں سے زیادہ تر اخذ کیا۔ پھر افلاطونیہ جدیدہ سے بھی مستفید ہوا۔ ابن سینا نے ارسطو طالیسی ہونے کا ارادہ کیا، تو اس نے ارسطو کی کتابوں کی شرح کی۔ عرب کے شارحین میں وہ سب سے اچھا شارح ہے۔ اور فارابی کے فلسفہ کو اُس نے شروع کیا اور اس کو افلاطونیہ جدیدہ کی رایوں سے الگ کرنے کی کوشش کی! اور چونکہ ابن سینا نے کوئی ایسا نظام جو اس کے فلسفہ کا شامل ہو، مقرر نہیں کیا، اس لئے ہم اس کے فلسفہ کی تفصیل اس طرح کرتے ہیں جس طرح خود اُس نے تفصیل کی ہے۔ وہ چار قسم، منطق، ریاضیات، طبعیات، الٰہیات ہیں۔ ہم ایک پانچویں قسم فلسفہ عملیہ میں زیادہ کرتے ہیں۔ "سیاست واخلاق"۔

(۱) **منطق**۔ ابن سینا منطق کی ضرورت فلسفہ حاصل کرنے میں ان لوگوں کے لئے ضروری سمجھتا ہے، جن کا صحیح میلان فلسفہ کی طرف نہیں ہے، یا وہ سلیقہ سے فکر صحیح حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، مگر وہ لوگ اس کی استطاعت رکھتے ہیں ان کا تحصیل حکمت میں منطق سے مستغنی ہو نا ممکن ہے، جس طرح کہ خالص بدوی علم نحو سے (عربی بولنے میں) مستغنی ہے، کیونکہ اس میں طبعاً وہ سلیقہ موجود ہے جو بولنے میں خطاء لفظی سے بچاتا ہے!

منطق، ابن سینا کے نزدیک مادّہ سے خالی ہے۔ (بخلاف علم طبعی کے کہ ناممکن ہے اس کا پایا جانا یا متخیل ہونا مگر مادہ کے ساتھ متصل ہو کر) اور وہ (منطق) ایسا آلہ ہے جو ذہن کو خطاء سے تصوّر اور تصدیق میں بچانے والا ہے اور حق اعتقاد کی طرف اس کے اسباب اور اس کے راستوں کو مہیا کر کے پہنچانے والا ہے ——!

منطق میں ابن سینا کے جو اقوال ہیں اُن کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک مشہور علم کے عام قواعد ہیں۔ جنہیں ابن سینا نے جمع اور مرتب کیا ہے، ہاں بعض رایوں سے جنہیں ہم خاص سمجھتے ہیں اور وہ کتاب نجات میں مذکور ہیں، ہم فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(ا) کسی علم کا جان لینا دوسرے علوم کے حاصل کرنے میں معاون ہوتا ہے، مثلاً جو شخص ریاضیات کا ماہر ہو جاتا ہے، اُس کو فلکیات کا سیکھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔

(ب) حدود (تعریفات) کا اشیاء کے لئے وضع کرنا باریکی کا اور اُن اشیاء کے جوہر و ماہیات کو جاننے کا مقتضی ہے۔ یہ غلط ہے کہ ہم کہیں مثلاً کہ تلوار ایسا لوہا ہے جو کاٹ دیتا ہے، اور کرسی ایسی لکڑی ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں ہم نے تلوار اور کرسی کی صرف ایک حالت پر نظر کی۔ اس قسم کے اقوال "اسم ناقص" ہی ہیں "حد تام" نہیں ہیں۔ اسی طرح ہمارا یہ قول کہ آفتاب ایسا ستارہ ہے جو دن میں نکلتا ہے "حد ناقص" ہے، کیونکہ دن کا نام دن جب ہی ہوتا ہے جب اُس میں آفتاب نکلتا ہے، اور ابن سینا کی رائے ہے کہ جب ہم کسی چیز کی حد بنانے کا ارادہ کریں تو ہمیں لازم ہے کہ ہم تعریف میں اس چیز کی ذات اور جنس اور فصل اور اُس کی ماہیت کو لائیں تاکہ ذہن اس چیز کے غیر کی طرف نہ پھر جائے، جس کا قصد تعریف کا واضع کرتا ہے!

(۲) **ریاضیات**:۔ ابن سینا کے نزدیک ریاضیات کی چار قسمیں ہیں (۱) علم العدد۔ وہ شامل ہے جمع اور تفریق اور عمل جبر و مقابلہ کو (۲) ہندسہ۔ وہ مشتمل ہے علم مساحت کو اور علم الحیل (میکانیک) کو اور علم جراثقال اور علم اوزان اور علم مکیال (پیمانہ) اور علم مناظر و مرایا کو اور پانی کے منتقل کرنے کے علم کو۔ (۳) علم ہیئت۔ اور اس کے فروع سے زیچ و تقویم ہے (۴) علم موسیقی۔ اور اس کے فروع سے عجیب و غریب آلات کا بنانا ہے، جیسے ارغن (ایک باجہ کا نام ہے جسے ہندوستان میں ارگن باجہ کہتے ہیں۔)

(۳) **علم طبیعی** (طبیعات)، علم طبعی علم نظری ہے اور اُس کا موضوع اجسام موجودہ ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وہ تغیر میں واقع ہیں اور اس حیثیت سے کہ وہ اقسام حرکات و سکونات سے موصوف ہیں۔ ابن سینا کے نزدیک اس علم کا مدارِ بحث امورِ ذیل پر مشتمل ہے:۔

(الف) اجسام اور ان کے توابع حرکت پر زمان و مکان و جزو اور نہایۃ ولا نہایۃ۔

(ب) عالم اور وہ یہ کہ ایک ہے، پھر فلک اور اُس کی حرکت مستدیرہ پھر اجسام اولی اور تخلخل و تکاثف (خلاء و ملاء) پھر حرارت و برودت کا اثر اجسام میں۔

(ج) نفس اور اس کی قوتیں اور اس کا علوم کو حاصل کرنا اور ادراک و تخیل۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن سینا طبیعات کے حصہ میں اس پر بحث کرتا ہے کہ نفس جسم کے مرنے سے نہیں مرتا پھر بطلان تناسخ پر اور وحدت نفس پر۔ حالانکہ یہ مباحث حصۂ الٰہیات کے زیادہ مناسب ہیں!

ابن سینا علم طبیعی کے فروع آٹھ قرار دیتا ہے، جس سے وہ اُس کے موافق ہو جاتا ہے جو ارسطو سے منقول ہے۔ اور وہ آٹھ یہ ہیں۔ اجسام کے امور عامہ جیسے مادہ و صورت و حرکت طبعیہ وہ چیزیں ہیں جن پر ارسطو کی کتاب الکیان مشتمل ہے، پھر احوال ان اجسام کے جو عالم کے ارکان ہیں، جیسے سماوات اور جو چیزیں ان میں ہیں اور عناصر اربعہ جیسا کہ ارسطو کی کتاب السماء و العالم

میں ہے، پھر کون وفساد اور تولید اور نشو و استحالات جیسا کہ ارسطو کی کتاب الکون والفساد میں ہے - پھر عناصر اربعہ کے احوال اور اُن کے قوانین عام حرکات و تخلخل و تکاثف خصوصاً جن کا تعلق ابر و بارش اور شہاب اور رعد و برق اور ہالہ اور آندھی اور زلزلہ اور دریاؤں اور پہاڑوں سے ہے، جیسا کہ ارسطو کی کتاب الآثار العلویہ میں ہے -

پھر معادن جیسا کہ یہ بھی کتاب الآثار العلویہ میں ہے، پھر نباتات جیسا کہ کتاب النبات میں ہے - پھر کائنات حیوانیہ کا حال جیسا کہ کتاب طبائع الحیوان میں ہے، پھر معرفت نفس و علم اُن ادراک کرنے والی قوتوں کا جو حیوانات میں اور خصوصاً انسان میں ہیں اور یہ کہ انسان کا نفس جسد کی موت سے نہیں مرتا اور وہ جوہر روحانی الٰہی ہے جیسا کہ کتاب النفس اور کتاب الحس والمحسوس میں ہے - ان کے تابع اور بہت فروع ہیں، جیسے طب اور احکام نجوم اور علم فراست اور سحر اور تعبیر رویاء و طلسمات و علم کیمیا وغیرہ —!

اور جب ہم خاص نفس کی بحث پر آتے ہیں تو ہم ابن سینا کو دیکھتے ہیں کہ جس امر کو فارابی نے قبول کیا ہے، اُس میں ابن سینا نے وسعت ظاہر کی ہے، اس لئے ابن سینا کے نزدیک نفس کے اساسی قوتوں میں قوتِ غاذیہ ہے جو اجسام غریبہ کو اس کے اجسام مشابہ کی طرف منتقل کرتی ہے، جس میں کہ وہ عمل کر رہی ہے تاکہ جسد کے جو اجزاء تحلیل ہو چکے ہیں اُن کے بجائے دوسرے اجزاء اسی قسم کے آجائیں اور قوتِ منمیہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ اس جسد کے جس میں کہ وہ ہے بڑھنے میں معاون اس چیز کے ساتھ ہو جو اس جسد کی طبیعت کے مناسب ہو - اور قوتِ مولدہ ہے - یہ قوت اس امر میں معاون ہوتی ہے کہ وہ جسد جس میں یہ قوت ہے ایک دوسرا جسد اپنے مثل پیدا کرلے —!

پھر نفس کے لئے دو اور قوتیں ہیں - ایک تو وہ قوت محرکہ جو نفس کو مرغوب خواہش کی طرف یا غضب کی طرف اُبھارتی ہے - یا وہ قوت فاعلہ جس کی وجہ سے انسان حرکت کرتا - کام کرتا یا چلتا پھرتا ہے - دوسری قوتِ مدرکہ ہے، جس کی دو قسم ہیں - ایک تو وہ جو باہر سے حواس کے ذریعہ سے ادراک کرتی ہے، حواس یہ ہیں :- بصر - سمع - شم، ذوق، لمس - بصر کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ ابن سینا کی وہ پختہ رائے ہے جس کا ہمارے علم میں ابن سینا سے پہلے کوئی قائل نہیں ہوا، پہلے پہل اسی کو یہ بات سوجھی، اُس نے اس پر دلیل قائم کی اور دوسروں کو بھی اُدھر بلایا - اور وہ یہ ہے کہ ابن سینا سے پہلے جو فلسفی گزرے وہ اس کے معتقد ہوئے کہ دیکھنے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ آنکھ سے شعاع نکل کر دیکھے ہوئے جسم پر پڑتی ہے - لیکن ابن سینا بصر کی تعریف یوں کرتا ہے کہ وہ ایک قوت ہے کہ جو عصبہ مجوفہ میں رکھی گئی ہے، وہ رنگ دار اجسام کی اُن شکلوں کی صورت کو ادراک کرتی ہے جو کہ رطوبت جلیدیہ میں منقوش ہو جاتی ہیں - جن کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اجسام شفافہ بالفعل میں صاف اجسام کی سطحوں تک پہنچتی ہیں - اور ابن سینا نے متقدمین کی رایوں پر تنقید کی ہے اور ہندسی برہان اس بات پر قائم کی ہے کہ جبکہ دو جسم حجم میں برابر ہوں، لیکن وہ دونوں آنکھ سے اس طرح دور ہوں کہ دوری کی مسافت مختلف ہوں - یعنی ایک کی دوری دوسرے سے زیادہ ہو تو وہ جسم جو زیادہ دور ہوگا آنکھ سے دیکھنے میں بہ نسبت اس جسم کے جو کم دور ہے، حجم میں چھوٹا ہوگا —!

دوسری قسم وہ قوتیں ہیں جو باطن سے ادراک کرتی ہیں، ان میں سے بعض صور محسوسات کا ادراک کرتی ہیں اور بعض معانی محسوسات کو - محسوسات کے صور کو پہلے حواس ادراک کرتے ہیں، پھر اُن کو نفس کی طرف پہنچا دیتے ہیں - اس کی مثال یہ ہے کہ بکری جب بھیڑیئے کو دیکھتی ہے تو بھیڑیئے کی شکل اور ہیئت اور رنگ بکری کے حواس کے وسیلہ سے بکری کے نفس تک پہنچتا ہے، تو بکری جانتی ہے کہ وہ بھیڑیا اپنے وصف کے ساتھ ہے - بکری اس کے علاوہ بھیڑیئے سے ایک اور چیز کو ادراک کرتی ہے - وہ کیا ہے -

بکری کا بھیڑیئے سے ڈرنا اور بھاگنا۔ سو یہ ادراک معنوی ہے، ابن سینا کا عقیدہ ہے کہ یہ ادراک حواس ظاہرہ کی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ قویٰ باطنہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ابن سینا ادراک مختلفہ کے قویٰ (قوت فنطاسیا، یعنی حس مشترک، خیال اور قوت مصورہ و وہمیہ و حافظہ) کے مراکز کو تجاویف دماغ میں بیان کرتا ہے!

پھر نفس ناطقہ انسانیہ (عاقلہ) ہے اور اس کی دو قسم ہیں۔ قوتِ عاملہ۔ قوت عالمہ۔ ان دونوں کو عقل کہتے ہیں۔ قوت عاملہ وہ قوت ہے جو بدن کے لئے محرک ہے، حتیٰ کہ وہ افعال کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کو متمیز کرتا ہے۔ اور اُن کے وقتوں کو پہچانتا ہے، مثل رونے اور دیکھنے اور شرمندہ ہونے کے۔ اور حتیٰ کہ وہ صناعات مختلفہ کے لئے مستعد ہوتا ہے، مثل طب اور نجاری اور کتابت کے۔ اور یہی قوت انسان کے کاموں میں لوگوں کے عرف کے موافق فیصلہ کنندہ بھی ہوتی ہے، جیسے ہمارا یہ ادراک کہ جھوٹ بُری چیز ہے اور یہ کہ احسان پسندیدہ امر ہے۔ اس قوت کا نام "عقلِ عملی" ہو سکتا ہے!

قوتِ عاملہ فقط قوۃِ نظریہ ہے، اس کی غایت صور مجردہ و معانی مطلقہ کا ادراک و اکتساب ہے۔ اس کی بدولت ہمیں صحیح معارف و معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس قوت کا نام "عقلِ نظری" ہو سکتا ہے۔ نفس ناطقہ کا علوم کو حاصل کرنا دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی دوسرے شخص سے جو ان کو جانتا ہے حاصل کرے، دوسرے یہ کہ بغیر کسی معلم کے اپنی ذات سے، "حدس" سے ان کو حاصل کرلے۔ اور اس امر میں لوگوں کی حالت اُن کی استعداد کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ استعداد کے اعتبار سے وہ شخص قوی ہوتا ہے جس کی عقل میں یہ استطاعت ہے کہ وہ مبادی عقلیہ اور معارف انسانیہ کو عقل فعال سے بلا واسطہ حاصل کرلے، یہ نبوت کی ایک قسم ہے، بلکہ نبوت کی اعلیٰ درجہ کی قوت ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس قوت کا نام "قوت قدسیہ" (الٰہیہ) رکھا جائے۔ یہ قوت قویٰ انسانیہ میں اعلیٰ درجہ کی ہے۔

ابن سینا کی تقسیم کے اعتبار سے طبعیات میں مباحث ذیل باقی رہ گئے:۔

حدوثِ نفس۔ بطلان قول بالتناسخ۔ وحدتِ نفس۔ ان مباحث کو ہم نے الٰہیات کی بحث میں لانے کے لئے متاخر کردیا۔ کیونکہ یہ بحثیں الٰہیات کے مناسب ہیں!

(۳) علم الٰہیہ۔ (الٰہیات) الٰہیات کا لفظ ارسطو کے زمانہ کے بعد مستعمل ہوا ہے، اس کو افلاطونیہ جدیدہ کے فقہائے نے وضع کیا جبکہ انھوں نے فلوطین (متوفی ۲۷۰ء) کی بعض رایوں کو ارسطو کی طرف اس کتاب میں منسوب کیا۔ جس کا نام انھوں نے "اوثولوجیا" یا "تیولوجیا" رکھا۔ یہی لفظ ترجمہ ہو کر الٰہیات یا علم الٰہی کے نام سے عرب میں منتقل ہوا۔ اور اس علم کا نام علم ماوراء الطبیعۃ اور فلسفہ اولیٰ بھی ہے۔

الٰہیات دو قسم کے موضوع کو شامل ہے:۔

(الف) وجود کے مبادی عامہ جیسے وحدت و کثرت اور علت و معلول اور قوت و حرکت۔ پھر علوم مختلفہ کے مبادی جیسے مبادی طبعیات و ریاضیات کے! اور الٰہیات کے اس قسم کا نام "علم وجود مطلق" ہو سکتا ہے اور یہی مقصود اوّل ہے۔ علم ماوراء الطبیعۃ سے جس کا نام فقہاء نے علم الٰہی رکھا ہے!

(ب) اللہ میں، اور اس کی ربوبیت کے اثبات میں اور اس کی صفات میں اور اس کے خلق و ابداع کے دلائل میں نظر کرنا۔ پھر نظر کرنا وحی میں اور ملائکہ میں اور عالم کے کل حوادث کا ربط اُس کے ارادہ و قدرت و اختیار سے۔ اور ظاہر کرنا اس کی عنایت کا افراد کے ساتھ۔ پھر نظر کرنا امر معاد (حشر) اور حساب (قیامت کے دن جزا و سزا) میں اور راحت بہشت

وعذاب جہنم میں، پھر نفس میں اور اس کی ہمیشگی میں اور یہ کل بحثیں اپنے وجود میں متاخر اور فلسفہ صحیحہ کے مدلول سے بعید ہیں، ان کو جدید افلاطونیوں نے سریانی جماعت کی طرف پہنچایا اور انہوں نے ان باتوں کو عرب میں پہنچایا - اسلئے ضرورت ہے کہ ان میں کلام کریں تاکہ ہم اسلام میں فلسفہ پہنچنے کے ڈھنگ کو سمجھ سکیں - اور جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ابن سینا کے نزدیک عموماً جو الٰہیات کا باب ہے اس کی تفصیل کریں تو اس کی تفصیل حسب ذیل پاتے ہیں:-

(الف) واحد (اللہ) و وجود - بیشک اللہ تعالیٰ باتفاق رائے کل جماعات ایسا نہیں ہے کہ کسی معلول کے وجود کا مبداء ہو - اور کسی دوسرے معلول کے وجود کا مبداء نہ ہو، بلکہ علی الاطلاق وہ وجود اور معلول کا مبداء ہے!

اور "موجود" (یعنی عالم اور سب کچھ جو عالم میں ہے) کے اقسام وصفات و لواحق ہیں - وہ کثیر ہوتا ہے اور مکان میں ہوتا ہے اور چیز کو پُر کرتا ہے کیونکہ اس کے ابعاد (طول و عرض و عمق) ہوتے ہیں - اور اس کے لئے مادّہ وصورت ہوتی ہے اور ابن سینا ہمیشہ ارسطو کا اس قول میں متبع ہے کہ مادّہ کا صورت سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے اور باوجودیکہ صورت (نظری طریقہ پر) ہیولے (مادہ اولیٰ) سے مقدم ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ صورت کی ذات موجود بالقوۃ (یعنی موجود خالی مادّہ سے ہے) ہے وہ تو موجود بالفعل مادّہ کے ساتھ متعلق ہونے کے وقت ہوتی ہے!

اور استحقاق وجود میں اوّل موجودات (یعنی سب موجودات میں سے سب سے افضل اور وجود کا احق) جوہر مفارق (یعنی ہر وہ شئے جس کا پایا جانا بذاتہ مادّہ سے خالی ہو کر ممکن ہو جیسے انسانیت اور سفیدی اور گرمی) غیر مجسم ہے پھر صورت - (خالی مادہ سے بطریق نظر) پھر جسم (مادہ متلبس بہ صورت) پھر ہیولے (مادہ اولیٰ صورت سے خالی نظری طور پر) اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام پر ابن سینا افلاطون سے کسی قدر متاثر ہے!

(ب) قدیم وحادث - ہر وہ چیز جس کے وجود کے لئے کوئی علت ہو، وہ محدث ہے - اور قدیم وہ ہے جس کے وجود کے لئے کوئی علت نہ ہو، پھر قدیم کی دو نوع ہیں - ایک قدیم بالذات - اور وہ وہ ہے جس کے لئے خارج میں کوئی علت نہ ہو - جو اس کے وجود کا مقتضی ہو، سو اللہ کے سوا کوئی قدیم بالذات نہیں ہے - صرف اسی کی ذات قدیم بالذات ہے - دوسری نوع قدیم بالزمان ہے اور وہ وہ شئے ہے کہ جس سے پہلے کوئی ایسا زمانہ نہیں ہے جس میں وہ شئے نہ رہی ہو - کوئی شئے سوائے مجموعہ عالم کے قدیم بالزمان نہیں ہے - اب معلوم ہو کہ حکماء کے نزدیک عالم اللہ سے متاخر بالذات ہے یعنی اللہ کا وجود عالم کے وجود کے لئے علت ہے اور عالم کا وجود اللہ کے وجود کا معلول (مسبب) ہے - لیکن عالم اللہ سے متاخر زمانا نہیں ہے - (اس لئے کہ فلسفیوں کے زعم میں اللہ کا وجود عالم کے وجود کو مقتضی بالایجاب بغیر تراخی زمان کے ہے) اور وہ چیزیں جن کی ذاتیں عالم میں موجود ہیں وہ سب حادث ہیں جیسے درخت یا فلاں درخت یا پہاڑ یا فلاں پہاڑ - اور جیسے زید و عمرو و خالد و فلاں و فلاں -

اور ایسا ہی ہم اعتقاد کرتے ہیں کہ صرف اللہ کی ذات قدیم مطلق ہے، اس کے وجود کے لئے کوئی علت نہیں ہے - اور کوئی ایسا زمانہ پہلے نہیں ہوا جس میں وہ موجود نہ رہا ہو - اور عالم اللہ کے بہ نسبت حادث ہے کیونکہ اللہ عالم کے وجود کی علت ہے لیکن عالم قدیم ہے بہ نسبت ان اشیاء کے جو بعد میں پائی گئیں (بہ نسبت پہاڑ و درخت و آدمی وغیرہ کے) لیکن وہ سب اجسام جن کو تم عالم میں دیکھتے ہو وہ محدث (حادث) ہیں!

(ج) واجب وممکن:- واجب الوجود وہ ہے جس کا وجود ضروری ہو - اور ممکن الوجود وہ ہے جس کا وجود غیر ضروری ہو -

واجب الوجود بذاتہ وہ ہے جس کا وجود اس کی ذات کا مقتضی ہو کسی اور سبب کی وجہ سے نہ ہو، وہ اللہ ہے اور واجب الوجود بغیرہ وہ ہے جو اپنے وجود میں اللہ کا محتاج ہو وہ عالم ہے۔ اشیاء کی ذوات جب تک موجود نہیں ہوتیں ممکن الوجود رہتی ہیں، جب موجود بالفعل ہو جاتی ہیں تو واجب الوجود بغیرہ بن جاتی ہیں۔ مثلاً میز اس وقت تک ممکن الوجود ہے جب تک نجار (بڑھئی) اس کو نہ بنائے مگر جب اس نے میز کو بنا دیا تو وہ واجب الوجود بغیرہ (یعنی بالنجار) ہو گئی۔ اور واجب الوجود بذاتہ (اللہ) واحد (ایک ہی) ہے کیونکہ اس کا غیر اس کے لئے سبب نہیں ہو سکتا۔ اور وہ بسیط (غیر مرکب) ہے۔ اس لئے کہ اس کی ذات کے لئے یا اس کے وجود کے لئے مبادی اور اسباب کا ہونا غیر ممکن ہے اور وہ کامل ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہو۔ کیونکہ ایسی علتیں نہیں ہیں جو اس کو منتقل کر سکیں یا بدل سکیں۔ اور وہ حق ہے، اس لئے کہ ہر شئے کی حقیقت اس کا وجود ہی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی ضد ہو، کیونکہ کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو اس کے نوع سے ہو اور اس کے مشابہ ہو اور اسی لئے وہ تام الوجود ہے۔ اور وہ موجود ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اس کے لئے وجود ہے اور ہر موجود یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود ہے، پس موجود اول واجب الوجود ہے، جس کے وجود پر برہان قائم ہو چکی ہے اور یہ عالم ممکن الوجود ہے، کیونکہ اس کے لئے اسباب کا ایسا سلسلہ ہے جو واجب الوجود تک منتہی ہوتا ہے جیسا کہ اس پر دلائل قائم ہیں، پھر بہت سے ایسے قرائن ہیں جو واجب الوجود (اللہ) کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ اور واجب الوجود کے لئے ایسے صفات نہیں ہیں جو اس ذات پر زائد ہوں اور نہ اعراض ہیں جو اس کی ذات پر محمول ہوں، بلکہ وہ عقل محض ہے اور اپنی ذات کا عاقل ہے اور معقول لذاتہ ہے اور وہ عاشق و معشوق ہے اور لذیذ و متلذذ ہے، پھر اس کی قدرت و حیات و ارادہ نہ متعارض ہیں نہ اس کی ذات پر امور زائدہ ہیں، لیکن یہ سب تجزی قبول نہیں کرتے اور یہ سب ذات واحد حق ہیں، اور اب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہم ابن سینا کی رائے علم اللہ کے بارے میں اور اس بارے میں کہ وہ علم بالکلیات (مبادی یا اسباب کا علم) ہے نہ علم بالجزئیات (اشیاء و حوادث کا علم۔)

ہم انسان صرف ان چیزوں کو جانتے ہیں جو ہمارے حواس کے تحت میں واقع ہوتی ہیں اور ان کو حادث ہونے کے بعد ہی جانتے ہیں۔ پھر یہ حادث ہونے کے بعد ہم میں تغیر پیدا کر دیتی ہیں، وہ یہ کہ ہم ان چیزوں سے جاہل ہونے کے بعد ان کے عالم ہو جاتے ہیں یا وہ چیزیں ہمیں لذت یا حزن یا زیادتی یا کمی عطا کرتی ہیں، یہی علم جزئی ہے اور یہ انسانی علم ہے۔ لیکن اللہ کا علم اس کے برخلاف ہے، اللہ کا علم ایک اور نوع سے علم کلی ہے کہ وہ اسباب و مبادی کا علم سابق ہے اور اسی وجہ سے اللہ کا علم اشیاء کے حدوث کا سبب ہے، حالانکہ خود حدوث اشیاء ہمارے ان کے جاننے کا سبب ہے، ایک مثال میں اسے سمجھو، ہم کو کسوف (چاند گرہن) اس کے حادث ہونے اور آنکھ سے دیکھنے کے بعد علم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان قواعد عامہ کو جن سے تمام انواع کسوف عالم میں حادث ہوتے ہیں کسوف کے حادث ہونے سے پہلے سے بلکہ ازل سے یکبارگی جانتا ہے۔ لیکن ابن سینا کے نزدیک وہ اس کسوف کو جو فلاں دن حادث ہوا فلاں دن فلاں مقام میں دیکھا گیا نہیں جانتا۔ کیونکہ اگر وہ اس کو جانے تو اس کا علم ہمارے علم کی طرح ناقص ہو اور یہ لازم آئے کہ ہماری طرح قبل اس کسوف کے حادث ہونے کے وہ اس کے حدوث سے حاصل ہو — !

باقی رہا ایک اعتراض، وہ یہ کہ اللہ کو جو کسوف کا علم ہے اور علم نجوم و ہیئت کا فلکی حساب داں کو جو اس کا علم ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے کہ فلکی کو فلاں کسوف کا علم حاصل ہوتا ہے اس کے حساب لگانے اور واقعات مختلفہ اور معادلات کثیرہ مرکب اور خاص قمر پر اعتماد کرنے کے بعد۔ اور اللہ تعالیٰ تو

ان کو فات کے حادث ہونے کی ان قوانین کے مطابق جن کو اللہ نے مقرر کیا ہے ۔ علت ہے ۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ کا علم کلی مطلق اور ہمارا علم جزئی نسبی ہے ۔۔۔ !

الحرکتہ الکلیہ ۔ ابن سینا علت بتانا چاہتا ہے حرکت مطلقہ کی جو عالم میں ہے اور حرکت کواکب کی جو ان کے افلاک میں ہے اور کل افلاک کی حرکت کی نظام مخصوص پر ۔ اس لئے اس بیان کو یوں شروع کرتا ہے ۔ بیشک آسمان ایسا ذی حیات ہے جو اللہ عزوجل کا فرماں بردار ہے اور اس کے لئے ایک نفس ہے جو اس کو حرکت مستدیرہ متحرک کرتا ہے باوجود اس کے ہو سکتا ہے کہ یہ حرکت طبیعیہ ہو کیونکہ اس کا رُخ کسی غایت وغرض کی طرف ہوتا ہے ، جس کی طرف وہ مشتاق ہوتا ہے اور طبیعت کا شوق امر طبیعی ہے اور وہ جسم کے لئے ذاتی کمال ہے ، پھر خاص ہر فلک کے لئے محرک خاص ہے جو اس سے قریب ہے ، جو صرف اس لئے خصوصیت رکھتا ہے اور وہ معشوقات (یعنی اغراض) جن کی طرف کواکب اپنی حرکات میں متوجہ ہوتے ہیں وہ نہ اجسام ہیں نہ ایسے نفوس ہیں جو اجسام میں موجود ہیں بلکہ وہ نفس مفارق (جو مادہ سے متصل نہیں ہیں) ہیں ۔

عنایت الٰہیہ ۔ جو شخص نظام عالم میں غور کرتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ عالم کا صانع مدبر ہے ۔ حکیم ہے عالم ہے اس نظام خیر کا جس پر یہ وجود ہے اور کمال بحسب امکان کا ۔ یہی معنی ہے عنایت کا ۔ عنایت کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کے نظام کو بدل دیتا ہے ، ہمارے خوش کرنے کے لئے یا ناخوش کرنے کے لئے ۔ مثلاً بارش جو کسی مقام میں کسی زمانہ میں ہوتی ہے وہ ان قوانین طبیعیہ کے مطابق ہوتی ہے جنہیں صانع حکیم نے مقرر کیا ہے ۔ رہا اس بارش ہونے سے ہمارا نفع پانا یا نقصان اُٹھانا یا اس سے تنگ ہونا ، سو یہ امر عارضی ہے جو بذاتہ مقصود نہیں ہے ۔ غرضکہ عنایت کا معنی ہے قوانین طبیعیہ کا عالم میں دقیق ترین ممکن نہج پر جاری ہونا ۔ افراد و قبائل کا اہتمام اس کا معنی نہیں ہے ۔ اور کوئی شے نہ شر مطلق ہے نہ خیر مطلق ہے بلکہ وہ ہماری نسبت سے شر اور خیر ہے ۔ مثلاً نابینا ہونے کے لئے کچھ اسباب طبیعیہ ہیں اور یہ امر ہمیشہ آنکھ میں ہوتا ہے ، جس طرح قوتِ شنوائی کا مفقود ہونا کان میں ہوتا ہے ! پس نابینائی اور ناشنوائی دونوں امر طبعی ہیں ولیکن وہ دونوں اپنے عضو میں عیب کی چیز ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں عارضے ان دونوں عضو کو اس عمل کے کمال سے مانع ہیں جس کے واسطے وہ دونوں بنائے گئے ہیں ، لیکن جو ان میں مبتلا ہے وہ خصوصاً اور اس کے گھر کے لوگ عموماً ان کو شر شمار کرتے ہیں ۔۔۔ !

نفس ۔ اس کا نزول اور اس کا خلود ۔ نفوس جزئیہ (افراد کے نفوس) ابن سینا کے نزدیک مختار یہ ہے کہ یہ نفوس ان ابدان کے تعدد کے ساتھ جو زمین میں پیدا ہوتے ہیں متعدد ہوتے ہیں اور یہ نفوس اُن کے مناسب بدن کے وجود کے بعد موجود ہوتے ہیں ، پس نفس کی مملکت یہ بدن ہے جس میں نفس حکمرانی کرتا ہے اور اس میں تصرف کرتا ہے اور بدن نفس کا آلہ بنتا ہے ، جس میں نفس کے مختلف قویٰ جلوہ گر ہوتے ہیں ۔۔۔ !

اور ابن سینا نے ان بابوں کو جو نفس کا جسد کے ساتھ متصل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں اپنے قصیدہ عینیہ میں جو عمدہ ادبی رمز پر مشتمل قصیدہ ہے جمع کیا ہے ، لیکن اس میں وہ کسی خاص رائے کا پابند نہیں ہے وہ افلاطون کی رائے کو (کہ نفس جب ملاء اعلیٰ میں مجرد مطلق ہوتا ہے تو وہ نور الوہیت کا مشاہدہ کرتا ہے جب وہ ذات الوہیت میں تامل کرنے سے ایک لحظہ یا زائد غفلت کرتا ہے تو سزا کے طور پر وہ ملاء اعلیٰ سے اُتار کر آدمی کے جسد سے متعلق کر دیا جاتا ہے) فلوطین کی رائے کے ساتھ جمع کر دیتا ہے ، فلوطین بنیادی طور پر افلاطون کا ہم خیال ہے ۔۔۔ !

پھر وہ اس کی حکمت کو دریافت کرتا ہے اور اس غایت سے شک کرتا ہے جس کے لئے نفس اُترا یا اُتارا گیا جسد کی طرف۔ پھر اس پر زور دیتا ہے کہ جسد سے متعلق ہونے پر نفس جن امور ارضیہ کو جان سکتا ہے وہ بہت ہی کم بلکہ لاشئے کے درجے میں ہے جبکہ ہم کسی انسان کی عمر (وہ مدت جسے زمین میں گرا ہوا نفس پورا کرتا ہے) کی نسبت زمین کی عمر سے کریں — !

قصیدہ عینیہ رمزیہ شیخ الرئیس ابن سینا الفیلسوف فی ہبوط النفس

(۱) ہبطت الیک من المحل الارفع — ورقاء ذات تعزز و تمنع

تیری طرف بلند ترین مقام سے اترا — وہ کبوتر (نفس) جو صاحب شرف و حفاظت تھا۔

(۲) محجوبۃ عن کل مقلۃ عارف — وھی التی سفرت ولم تتبرقع

وہ پہچاننے والوں کی آنکھ سے آڑ میں تھا — حالانکہ وہ چہرہ کھولے ہوئے تھا نقاب پوش نہ تھا۔

(۳) وصلت علی کرہ الیک وربما — کرھت فراقک وھی ذات تفجع

باوجود نفرت کے وہ تیری طرف پہنچا حالانکہ اکثر تیری جدائی کو ناپسند کرتا تھا اور درد مند تھا

(۴) انفت وما انست فلما واصلت — الفت مجاورۃ الخراب البلقع

اُس نے عار کیا اور مانوس نہ ہوا پھر جب ملاقات کی تو ویران چٹیل میدان کی قرب سے اسے الفت ہوگئی!

(۵) واظنھا نسیت عھودا بالحمی ! — ومنازلا بفراقھا لم تقنع

میرا گمان ہے کہ وہ محفوظ مقام کے وعدوں کو اور ان منزلوں کو کہ جن کی جدائی پر وہ راضی نہیں ہے بھول گیا۔

(۶) حتی اذا اتصلت بھاء ھبوطھا — فی میم مرکزھا بذات الاجرع

یہاں تک کہ جب اُس نے اپنے ہبوط کے ہا کو میم میں اپنے مرکز کے، جو کہ ریگ کے تودہ والی جگہ میں ہے، ملا دیا۔

(۷) علقت بھا ثاء الثقیل فاصبحت — بین المعالم والطلول الخضع

اُس نے اس میں ثقیل کی ثا کو چسپاں کر دیا تو وہ نشانات اور پست کھنڈروں کے درمیان ہوگیا!

(۸) تبکی وقد نسیت عھودا بالحمی ! — بمدامع تھمی ولما تقلع

وہ روتا ہے حالانکہ وہ محفوظ مقام کے وعدوں کو بھول گیا ہے "بہنے والے اشکوں سے جو تھمتے نہیں ہیں"!

(۹) وتظل ساجعۃ علی الدمن التی ! — درست بتکرار الریاح الاربع

اور وہ نغمہ سرائی کرتا ہے گھر کے ان بقیہ آثار پر جو بار بار چاروں ہواؤں کے چلنے سے مٹ چلے ہیں!

(۱۰) اذ عاقھا الشرک الکثیف وصدھا — قفص عن الاوج الفسیح المربع

اچانک گھنے جال نے اس کو باز رکھا اور پنجرے نے اسے بلند کشادہ پر بہار مقام سے روک دیا!

(۱۱) حتیٰ اذا قرب المسیر الی الحمی ! — ودنا الرحیل الی الفضاء الاوسع

حتیٰ کہ جب مقام محفوظ کی طرف جانا قریب ہوا اور کوچ وسیع ترین فضا کی طرف نزدیک ہوا۔

(۱۲) سجعت وقد کشف الغطاء بصرت — مالیس یدرک بالعیون الھجع

تو وہ کبوتر نغمہ سرا ہوا اور پردہ دُور کر دیا گیا تو اس نے وہ دیکھا جس کا ادراک سوتے والی آنکھوں کو نہیں ہوتا۔

(۱۳) وغدت مفارقۃ لکل مخلف ‏ ‏ عنہا حلیف الترب غیر مشیع

وہ مخالف ہو جاتا ہے اُس کا جو اُس کا ساتھ چھوڑ دیے اس کے ساتھ نہ چلے مٹی کا دوست بن جائے (یعنی جسم)

(۱۴) وغدت تغرد فوق ذروۃ شاہق ‏ ‏ والعلم یرفع کل من لم یرفع

اور وہ کبوتر (نفس) بلند مکان کی چوٹی پر گانے لگا اور علم اس کو بلند کر دیتا ہے جو بلند نہیں ہوتا!

(۱۵) فلای شیئ اہبطت من شامخ ‏ ‏ سام الی قعر الحضیض الاوضع؟

(سوال) کس وجہ سے وہ کبوتر (نفس) اونچے بلند مقام سے پست نیچے جگہ کے گڑھے میں گرا دیا گیا؟

(۱۶) ان کان ارسلہا الالہ لحکمۃ ‏ ‏ طویت عن الفطن اللبیب الاروع

اگر اللہ نے اس کو کسی حکمت کی وجہ سے بھیجا جو سمجھدار عقلمند تیز طبع آدمی سے پوشیدہ ہے

(۱۷) فہبوطہا ان کان ضربۃ لازم ‏ ‏ لتکون سامعۃ لما لم تسمع

تو اگر اس کا اُترنا ضروری امر تھا! ‏ ‏ تاکہ وہ اس چیز کا سننے والا ہو جائے جسے نہیں سُنا

(۱۸) وتکون عالمۃ بکل خفیۃ ‏ ‏ فی العالمین، فخرقہا لم یرقع

اور وہ ہو جائے ہر پوشیدہ امر کا جاننے والا ہر ہر عالم میں، تو اس کے شگاف کی اصلاح نہیں کی گئی!

(۱۹) وھی التی قطع الزمان طریقہا ‏ ‏ حتیٰ لقد غربت بغیر المطلع

اس کے راستہ کو زمانہ نے کھوٹا کر دیا (کاٹ دیا) نتیجہ یہ ہوا کہ جائے طلوع کے غیر میں اس کا غروب ہوا۔

(۲۰) فکانہا برق تألق بالحمی ‏ ‏ ثم انطوی، فکانہ لم یلمع

تو گویا وہ ایسی بجلی ہے جو سبزہ زار میں چمکی پھر غائب ہو گئی سو یوں سمجھو کہ وہ چمکی ہی نہیں!

اس قصیدہ کے آخر کے چھ شعر میں جسد آدمی میں نفس کے ہبوط کے نظریہ پر تنقید ہے اور اس کی حکمت کے متعلق سوال ہے اور اس نظریہ کو تسلیم نہ کرنے کا ذکر اور اس نظریہ کے فاسد ہونے پر برہان ضمناً مذکور ہے!

جسد سے جدا ہونے کے بعد نفس کے لئے کیا حادثہ ہوتا ہے؟

ابن سینا کہتا ہے کہ "بدن کی موت سے نفس نہ مرتا ہے نہ اصلاً فساد کو قبول کرتا ہے" کیونکہ نفس کی حقیقت بدن کی حقیقت کا غیر ہے، بدن مرتا ہے اور فاسد ہوتا ہے (تحلیل ہوتا ہے اور اس کی صورت بدل جاتی ہے) نفس کا بدن سے کوئی مادی تعلق بھی نہیں ہے کہ بدن میں جو چیز حادث ہو نفس اس سے متاثر ہو!

"پھر یہ نفس جب اس جسد سے جدا ہو جاتا ہے، جس میں تھا تو وہ دوسرے جسد میں داخل نہیں ہوتا"۔ اور اسی بناء پر ابن سینا "تناسخ" کا منکر ہے (تناسخ یہ ہے کہ ایک نفس کئی جسد میں منتقل ہوتا رہے)

نفوس اپنے ابدان سے مفارقت کے بعد کہاں پہنچتے ہیں؟

ابن سینا ان نفوس کے لئے جو اپنے ابدان سے الگ ہو جاتے ہیں، سعادت اور شقاوت کا حال ثابت کرتا ہے۔ جو دو مختلف طریقوں سے سمجھے جاتے ہیں:-

(الف) ابن سینا نے پڑھنے والے کو مخاطب کر کے کہا "تجھے یہ جان لینا ضروری ہے کہ معاد (قیامت اور جسمانی حشر) شرعاً مقبول ہے اور اس کا ثبوت طریق شریعت اور خبر نبوت کی تصدیق ہی سے ہوتا ہے۔ اور اس شریعت حقہ نے جسے ہمارے

نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عطا فرمایا ہے، حال سعادت و شقاوتِ بدنی کا بسط و تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

(ب) اور ابن سینا اپنے خطاب کے بعد کہتا ہے۔ " اور معاد کی ایک صورت وہ ہے جس کا ادراک عقل اور قیاس برہانی سے ہوتا ہے۔" وہ وہ سعادت و شقاوت ہے جو نفوس کے لئے ثابت ہیں۔ اگرچہ ہمارے اوہام اُن کے تصور سے قاصر ہیں۔ اور حکماء الٰہیین کی رغبت اس سعادت (نفسانیہ) کے حاصل کرنے کی سعادت بدنیہ کے حاصل کرنے کی رغبت سے بہت بڑھی ہوئی ہے، اب تم سمجھ گئے کہ ابن سینا یہ اعتقاد کرتا ہے کہ شریعت معاد بدنی و نفسانی دونوں کی قائل ہے۔ لیکن فلسفی علماء (انہی میں ابن سینا بھی ہے) صرف معاد نفسانی کے معتقد ہیں اور ابن سینا یہ سمجھتا ہے کہ سعادتِ حقیقیہ جس کی طرف نفس اپنے معاد میں رجوع کرتا ہے وہ لزومی طور پر سمجھی جاتی ہے ـــــ!

نفس ناطقہ (عاقلہ) کا کمال جو اس کے ساتھ خاص ہے، یہ ہے کہ وہ عالم عقلی ہو جائے کہ اس میں کل کی صورت منقش ہو اور صورت نظام معقول کی جو کل میں ہے اور خیر کی جو فائض ہے کل میں۔ ابتداء کرے مبداء کل سے، چلے جواہر شریفہ کی طرف پھر روحانیت مطلقہ کی طرف، پھر اس روحانیت کی طرف جو ابدان سے کسی قسم کے تعلق کے ساتھ متعلق ہے۔ پھر اجسام علویہ کی طرف ان کی ہیئتوں اور قوتوں کے ساتھ، پھر اسی طرح برابر جاری رہے، یہاں تک کہ اپنے نفس میں کل وجود کی ہیئات پوری کرلے تو وہ بن جائے عالم معقول برابر کل عالم موجود کے۔ مشاہدہ کرے حسن مطلق و خیر مطلق و جمالِ حق کو اور اس کے ساتھ متحد ہو جائے۔

یہ تعریف اس پر دال ہے کہ معاد ابن سینا کے نزدیک معاد شخصی فردی نہیں ہے بلکہ وہ معاد کلی مطلق نفس کلیہ کے لئے بحیثیت نفس ہونے کے ہے، زیادہ واضح عبارت میں یہ کہا جائے کہ معاد ابن سینا کے نزدیک لوگوں کا جنت یا دوزخ میں اجتماع (دینی معنی میں) نہیں ہے بلکہ وہ نفوس جزئیہ کا اُن کے بدنوں سے جدا ہونے کے بعد ایک عالم میں متحد ہونا ہے، یہی وہ نظام شامل ہے جو جمیع کائنات میں مسلط ہے ـــــ!

(۵) **فلسفہ عملیہ:**۔ ابن سینا عالم تھا اور اُس نے زندگی اور سیاست کے جھمیلوں کو برتا تھا۔ اس لئے یہ انوکھی چیز نہیں ہے کہ فلسفۂ عملیہ میں اُس کے پاس حکیمانہ نظام اور صحیح رائیں ہوں اور ہمارے لئے یہ اچھا ہے کہ ہم ابن سینا کے فلسفۂ عملیہ کے تین فنون پر کلام کریں۔ سیاست۔ اخلاق۔ تصوّف۔

سیاست:۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ابن سینا نے سیاست کو فارابی سے حاصل کیا۔ مگر اُس نے بہت کچھ اس میں اضافہ کیا۔ جو اس کو وسیع تجربہ سے حاصل ہوا تھا اور فارابی کو اُس کے معلوم کرنے کا موقع نہیں ملا۔

(الف) **لوگوں کا درجہ میں متفاوت ہونا**۔ ابن سینا کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو عقول و آراء میں متفاوت بنایا ہے۔ اور اگر سب آدمی بادشاہ ہوتے تو سب کے سب فنا ہو جاتے اور اگر سب معمولی حالت میں ہوتے تو سب ہلاک ہو جاتے اور اگر سب دولت مندی میں برابر ہوتے تو کوئی کسی کی خدمت نہ کرتا۔ اور اگر سب فقیر و نادار ہوتے تو سب تکلیف و مصیبت سے مرجاتے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ کچھ لوگ غنی ہیں، لیکن عقل و ادب سے خالی ہیں اور کچھ لوگ عقل والے ہیں لیکن اُن کے پاس مال نہیں ہے اور بعض لوگ بادشاہ ہیں جو مرض یا مصائب میں مبتلا ہیں، اس لئے جس کے پاس جو فوائد ہیں اُن پر وہ قناعت کرتا ہے اور دُوسرے کو جو نعمت حاصل ہے اُس میں وہ دُوسرے کی اطاعت کرتا ہے ـــــ!

سیاست کی طرف آدمیوں کی حاجت :- گو کہ بادشاہوں کو سب آدمیوں سے زیادہ سیاست کی حاجت ہے، کیونکہ رعیت کا انتظام اُن کے سپرد ہوتا ہے - ان کے بعد حکام اور دولت مندوں کو، کیونکہ ماتحتوں اور خادموں سے اُن کا تعلق ہوتا ہے - لیکن فقیر نادار بھی سیاست اور حسن تدبیر کا محتاج ہے - بلکہ ممکن ہے کہ بعض حالتوں میں وہ بادشاہوں سے زیادہ اس کا حاجت مند ہو - کیونکہ بادشاہوں کے خدام و معاونین ہوتے ہیں جو اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور جاہ سے بھی اُن کا کام چلتا ہے، مگر فقیر کو اپنے معاش اور مقام اجتماعی میں صرف اپنی ذات پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نفس انسانی، نفسِ انسانی کی حیثیت سے سیاست کی طرف حاجتمند ہوتا ہے، دولت مند کی دولت مندی اور مرکزِ اجتماعی سے قطع نظر کرکے - !

انسان کی حاجت زوجہ کی طرف :- ہر انسان کو وہ عامی ہو یا بادشاہ، خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی حاجت پڑتی ہے کہ وہ خوراک کا ذخیرہ جمع کرکے رکھے، کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ کھانے پینے کے سوا دوسرے مقاصد میں اپنا زیادہ وقت لگائے، بخلاف اس حیوان کے جس کو زندگی میں سوا کھانے پینے کے کوئی فکر نہیں ہے، اس لئے تم دیکھتے ہو کہ وہ حیوان کھانے پینے کی تلاش اُسی وقت کرتا ہے جبکہ اُسے بھوک پیاس لگتی ہے !

لہٰذا انسان کو مکانوں کی ضرورت ہوئی، جس میں وہ خوراک کا ذخیرہ اور دوسرے اسباب زندگی کو سینت کر رکھے، اب اب اس کو اپنے ایسے مددگار کی ضرورت محسوس ہوئی - جو اس کے اسباب زندگی کے ذخائر کی اُس کے گھر میں رہ کر حفاظت کرے اور اس نے سمجھا کہ نوکر سے اس کی امید نہیں کہ وہ خیر خواہی کے ساتھ گھر اور سامان کی حفاظت کرے، اسلئے اُس نے زوجہ اختیار کیا، جسے اللہ نے مرد کے لئے سکون کا ذریعہ بنایا - بیوی رکھنے کا یہ سبب ہے ! اور جبکہ زوجہ اختیار کرنا اولاد پیدا ہونے کا سبب اور بقاءِ نسل کی علت ہے، اس لئے مرد کو ذخیرۂ خوراک رکھنے اور خدام و معاونین بنانے کی زیادہ ضرورت ہوئی، اب وہ رعیت والا ہو گیا، محتاج ہوا رعیت کے انتظام میں حُسنِ تدبیر اور سیاست کی طرف - اس میں بادشاہ اور عامی اور خادم و مخدوم اور غنی و فقیر سب برابر ہیں !

ب) اپنے نفس کی سیاست :- سب سے پہلے انسان کو اقسام سیاست میں سے اپنی ذات کی سیاست شروع کرنی چاہیے کیونکہ اس کی ذات سب سے زیادہ اُس کے قریب اور سب سے اس کے نزدیک معزز ہے اور سب سے زیادہ اس کی توجہ کا مستحق ہے اور جب وہ اپنی ذات کی سیاست خوبی سے کرلے گا تو اُس سے اُوپر شہر کی سیاست سے عاجز نہ ہوگا - ہر انسان کو یہ جاننا چاہیئے کہ اس کے پاس عقل ہے، جس پر یہ واجب ہے کہ وہ نفس کا سیاست کرنے والا بنے اور نفس بُرائی پر اُبھارا کرتا ہے - جب یہ جان لے تو ضروری ہے کہ اپنے نفس کے سب عیبوں کو تلاش کرے اور اُن کی اصلاح کرے اور ضروری کہ فوراً اصلاح کرے ٹال مٹول نہ کرے، کیونکہ اگر عرصہ تک اسے ڈال رکھے گا تو اس کی جڑ مضبوط ہو جائے گی اور اس کی اصلاح دشوار ہوگی - اور اس وجہ سے کہ انسان اپنے نفس سے دھوکے میں رہتا ہے اس کیساتھ چشم پوشی کرتا ہے، اس لئے واجب ہے کہ کوئی دوست سمجھدار امین بنائے جو اس کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہو کہ اس کو اُس کے اچھے حال کو اچھا اور بُرے حال کو بُرا دکھلائے - اور بادشاہوں کو اپنے نفوس کی سیاست کی بہ نسبت عام لوگوں کی زیادہ حاجت ہے، کیونکہ وہ اور آدمیوں سے بڑے مرتبہ میں ہونے کی وجہ سے اپنی لغویات کی طرف نگاہ ڈالنے کی پروا نہیں کرتے، نہ اُن پر پشیمان ہوتے ہیں - اور نہ آزادی

اور عظمت کی کمی سے باز آتے ہیں (ہاں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی عقل بڑے پایہ کی ہوتی ہے اور اُن کے طریقے بہتر ہوتے ہیں، وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں) اُن کے بُرے مصاحب اُن کے کاموں کو اچھے ہوں یا بُرے (اُن کی ناراضی سے بچنے کے لئے اور ان کو ہمیشہ راضی رکھنے کے لئے اور اُن سے فائدہ طلب کرنے کے لئے) اُن کی نظر میں مزین کر کے دکھاتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بادشاہوں کے روبرو نصیحت اور اصلاح کی جرأت کریں — !

اور جو شخص اپنے نفس کی اصلاح کا ارادہ کرے اُس پر واجب ہے کہ لوگوں کے اخلاق کا جائزہ لے اور اپنے اخلاق سے اُن کو ملائے اور یہ سمجھے کہ سب لوگ برابر ہیں، پھر لوگوں کے اخلاق میں جس کو اچھا پائے اسے عمل میں لائے اور جسے بُرا سمجھے اس سے پرہیز کرے اور اس کو چاہئے کہ اپنے نفس کے لئے انعام اور سزا مقرر کرے، جس دن وہ بھلائی کرے یا کوئی فضیلت یا عزت کا کام کرے تو اپنے نفس کو خوش کرے اور اس کو کچھ لذتوں سے محفوظ کرے اور جب کوئی بُرا کام کرے یا کسی امر میں کوتاہی کرے تو نفس کو ڈانٹے اور تنبیہ کرے اور اس کو بعض خوشی اور لذات سے روک دے حتیٰ کہ وہ دوبارہ نرم اور صالح بن جائے!

(ج) **انسان کی سیاست اس کی آمدنی اور خرچ میں:-** ہر انسان کو اپنی روزی کے مہیا کرنے میں کوشش کی ضرورت ہے لیکن اس میں آدمی کی دو قسم ہیں۔ ایک وہ جو اپنی غنا پر (جو ترکہ سے یا تجارت سابقہ وغیرہ سے حاصل ہوئی ہے) قناعت کرنے والا ہے۔ دُوسری وہ جو محتاج ہے تجارت یا صنعت کے ذریعہ سے کمانے کی طرف۔ لیکن صنعت بہ نسبت تجارت کے زیادہ قابلِ اعتماد اور پائدار ہے کیونکہ مال کے جاتے رہنے سے تجارت ٹوٹ جاتی ہے، لیکن صناعات کی آمدنی مال نہ رہنے پر بھی باقی رہتی ہے، اور شرفاء کی صناعات کی تین قسم ہیں:-

(۱) ایک وہ جو عقل سے تعلق رکھتی ہے اور وہ رائے کا درست ہونا اور تدبیر کی خوبی ہے (جیسے بادشاہوں اور وزیروں اور حاکموں کی صنعت)

(۲) دُوسری وہ جس کا تعلق علم و ادب سے ہے اور وہ کتابت و بلاغت اور علم فلک اور طب ہے۔ (اور یہ صناعت اہلِ علم کی ہے)

(۳) تیسری وہ جس کا تعلق شجاعت سے ہے (جیسے شہسواروں اور جنگجویوں کی صنعت)

اور چاہیئے کہ انسان اپنی معاش شریفانہ طریقہ سے حاصل کرے جو ذلت اور زیادہ طمع اور بے آبروئی اور عزت کو برباد کرنے سے صاف ہو۔ اور مناسب ہے کہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ تم خیرات میں خرچ کرو اور کچھ وقت ضرورت کے لئے جمع کرو۔ مال خیرات میں خرچ کرنے کے لئے کچھ شرطیں ہیں، وہ یہ کہ اس میں جلدی کرو اور چھپا کر خیرات کرو اور اسے کم سمجھو اور برابر کرتے رہے اور اس کے مستحق کو عطا کرو — !

اپنے اخراجات میں میانہ روی کو پیشِ نظر رکھو، نہ فضول خرچی نہ بخل کرو اور بخل سے بہت دُور رہو، کیونکہ عوام فضول خرچی کی مدح کرتے ہیں اور بخل کی مذمت کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات آدمی کسی امر کو اپنی جاہ کے مناسب کرتا ہے حالانکہ اس کی مصلحتیں رائے عامہ پر ہیں۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ ان کی موافقت بعض ان امور میں وہ کرے جنہیں وہ لوگ پسند کرتے ہیں جبکہ اُس میں شدید اسراف اور مال کا ضائع کرنا نہ ہو — !

(د) **مرد کی سیاست اُس کی بیوی کے حق میں:-** نیک سیرت عورت مرد کی شریک اُس کی ملکیت میں ہے اور اُس کے مال میں اُس کی منتظم ہے اور اُس کے سفر کی صورت میں اُس کی قائم مقام ہے، اور بہترین عورت وہ ہے

جو عقلمند، دیندار، باحیا، ذہین، محبت والی، بچہ جننے والی ہو، زبان دراز نہ ہو، مطیع ہو، خیر خواہ ہو امانت دار ہو، مجلس میں باوقار ہو۔ اپنی ہیئت میں باعظمت اور قد میں باہیبت ہو، اپنے شوہر کی خدمت میں چست و چالاک ہو۔ انتظام اچھا کرتی ہو اور شوہر کے قلیل عطیہ کو کثیر سمجھتی ہو اور اپنی خوش اخلاقی سے اس کی پریشانیوں کو دور کرتی ہو اور اپنے عمدہ برتاؤ سے اس کے غموں میں تسلی بخش مبنی ہو ـــ!

عورت کے حق میں مرد کی سیاست کی بنیاد یہ ہے کہ عورت اس سے ڈرتی ہو اور اس کی اطاعت کرتی ہو۔ اور مرد کی ہیبت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی عزت کرے اور اپنے دین اور انسانیت کی حفاظت کرے اور وعدہ وعید میں راستباز ہو۔ اور اپنی عورت کی عزت کرے کہ وہ اس کی ہمیشہ محبت کرنے والی رہے اور اس کے مال کی نگراں ہو۔ اور جس قدر عورت کی شان بڑی اور قدر عظیم ہو گی، اسی قدر اس کے مرد کی بڑائی اور اس کے درجہ کی عظمت سمجھی جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ مرد اپنی عورت کے لباس اور سامان زینت کو عمدہ بنائے، اور پردہ میں سختی کرے اور اس کو غیرت میں نہ ڈالے، پس اس کے سامنے کسی غیر عورت کی خوبیاں نہ ذکر کرے، نہ اس کے بارے میں بہت باتیں بنایا کرے۔ اور مرد پر واجب ہے کہ اپنی عورت کو کام میں لگائے رکھے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کرے، گھر کا انتظام کرے، نوکروں پر حکومت کرے، کیونکہ اگر عورت بیکار رہے گی تو سیر سپاٹے اور بننے سنورنے میں لگ جائے گی!

(۷) **مرد کی سیاست اس کی اولاد کے حق میں:** بچہ کا حق اس کے باپ پر یہ ہے کہ اس کا نام اچھا رکھے، پھر اس کے لئے ایسی دودھ پلانے والی رکھے جو احمق نہ ہو، نہ عیب دار ہو، اس لئے کہ دودھ کا اثر بچہ میں پہنچتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے جب بچہ کا دودھ چھوٹ جائے تو اس کو اچھے اخلاق پر لگائے اور بری عادتوں سے دور رکھے، قبل اس کے کہ یہ عادتیں اس میں پختہ ہوں، کیونکہ اس کے بعد اس کی درستگی دشوار ہے اور اس کے لئے باپ ڈرانے اور رغبت دلانے اور مانوس کرنے اور پریشان کرنے اور تعریف کرنے اور ڈانٹنے سے حسب ضرورت کام لے۔ اگر ضرورت سمجھے تو تکلیف دہ مار مارے لیکن تھوڑی مقدار میں اور وہ بھی سفارشیوں کو تیار کرنے کے بعد (تاکہ وہ سفارشی باپ کو بچہ کے مارنے سے روکیں) اس لئے کہ پہلی مار جب تکلیف دہ ہو گی تو وہ آئندہ مار کو بھی سخت سمجھے گا اور اس سے ڈرے گا اور اگر ہلکی ہو گی جو تکلیف نہ دے گی تو باقی مار کو بھی ایسی ہی سمجھے گا اور اس کی پروا نہ کرے گا!

اولاد کی تعلیم: جب بچہ تعلیم کے قابل ہو جائے تو وہ قرآن سیکھنے اور حروف کے نقش بنانے میں لگا دیا جائے اور دین کے شعائر اور کچھ ایسے اشعار اس کو یاد کرائے جائیں جن میں علم کی مدح اور والدین کی فرمانبرداری اور نیکی کرنے کی خوبی اور مہمان داری کی تعریف اور بری خصلتوں کی مذمت ہو۔

یہ ضروری امر ہے کہ لڑکے کا معلم عقلمند، دیندار، تعلیم اطفال کا واقف، باوقار ہو، بچوں کے سامنے ہنسی، دل لگی زیادہ نہ کرے، بدمزاج ترش رو نہ ہو، بلکہ شیریں زبان، عقلمند، بامروت، پاکیزہ، خوش طبع ہو، بڑے لوگوں کی خدمت انجام دے چکا ہو۔ بادشاہوں کے اخلاق اور ہر ہم کھانے پینے اور گفتگو کرنے اور رہن سہن کے آداب سے واقف ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ لڑکے کے ساتھ اس کے مکتب میں اور لڑکے ایسے شریف، خاندانی لوگوں کے ہوں، جن کے اچھے طریقے مشہور ہوں، کیونکہ لڑکے دوسرے لڑکوں سے اس قدر طریقے سیکھ لیتے ہیں جو استاد سے نہیں سیکھتے۔ کیونکہ اگر ایک معلم ایک ہی لڑکے کو تعلیم دیتا رہیگا تو استاد اور شاگرد دونوں ایک دوسرے سے اکتا جائیں گے۔ اور جب اس لڑکے کے ساتھ

اور لڑکے بھی ہوں گے تو وہ نہ اُکتائے گا اور علم کے لئے اُسے اُمنگ ہوگی، اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے درمیان میں پسندیدہ مباحثہ ہوگا اور اس کی طبیعت گفتگو میں کھل جائے گی اور رہن سہن کی خوبی پیدا ہوگی - اس کے بعد وہ لڑکا لغت کے اصول اور خطوں اور خطبوں کے کچھ نمونے اور حساب سیکھے - پھر اتالیق پتہ چلائے کہ کس صنعت کو اس کی طبیعت قبول کرے گی اور اس کی استعداد اس پر قوی ہوگی، اس لئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس صنعت کو لڑکا چاہے اُس کا پُورے طور پر حاصل ہونا ممکن و مناسب ہو - اس لئے لڑکے کے سرپرست کو چاہیئے کہ جب کسی صنعت کو اختیار کرنے کا ارادہ ہو تو لڑکے کی طبیعت کا اندازہ کرے اور اُس کی ذکاوت کو جانچے، پھر کچھ عرصہ اس صنعت میں اس کی آزمائش کرے - پھر جب وہ صنعت میں آگے بڑھے تو اس کا والد اُسے اس امر پر آمادہ کرے کہ وہ بذاتِ خود اس فن میں ترقی پیدا کرے، کیونکہ جب اُسے اپنی محنت کا مزہ ملے گا تو اس میں وہ جان توڑ کوشش کرے گا، جب وہ کام کا عادی ہو جائے گا تو اس میں برابر لگا رہے گا !

ہم نے بہت دیکھا ہے کہ دولت مندوں کی اولاد اپنے بڑوں کے اموال پر بھروسہ کر لیتی ہے اور خود کمانا چھوڑ دیتی ہے، پس جب لڑکا اپنے ہنر سے کمانے لگے تو مناسب ہو کہ اُس کی شادی کر دی جائے اور اس کا گھر الگ بنا دیا جائے !

آدمی کی سیاست اُس کے نوکروں کے حق میں :- خدّام انسان کے لئے راحت کا راستہ آسان بنا دیتے ہیں، کیونکہ اس کا کام انجام دیتے ہیں اور اُس کا بہت وقت آرام کرنے یا علم طلب کرنے یا کمانے وغیرہ کے لئے بچا دیتے ہیں اور اس کے بجائے خود تمام مقامات و تکلیف کی جگہ پہنچتے ہیں، اس لئے تم پر ضروری ہے کہ اس پر اللہ کا شکر کرو کہ اُس نے خادموں کو تمہارا مطیع بنا دیا اور اُن کی خبر گیری کرتے رہو، اُن کے ساتھ نرمی کرو اور سخت برتاؤ نہ کرو - اس لئے کہ وہ بھی بشر ہیں، اُن کو بھی اور آدمیوں کی طرح تکان اور ماندگی اور اُکتانا اور سستی کا عروض ہوتا ہے - اُن کو بھی حاجتوں کے تقاضوں اور اُن کے اجسام کی خواہشوں سے وہ صورت پیش آتی ہے جو ایسی حالت میں اور آدمیوں کو پیش آتی ہے -

جب تم کوئی خادم رکھنا چاہو تو پہلے اس کی آزمائش اور جانچ کر لو اور اس کے حالات کا پتہ چلا لو - اگر یہ نہ ہو سکے تو اندازہ اور فراست سے کام لو - اور بے ڈھنگی صورتوں اور غیر متناسب جسموں سے علیحدہ رہو - کیونکہ اخلاق اعضاء کے مناسب ہوتے ہیں - عیب داروں سے پرہیز کرو اور زیادہ عقل اور چالاکی والے پر اعتماد نہ کرو - اور تھوڑی عقل جو حیا کے ساتھ ہو اُس کو اس زیادہ تیزی پر فضیلت ہے جو چھچھورپن کے ساتھ ہو - پھر خادم کو وہ خدمت سونپو جس کو وہ خوبی کے ساتھ کر سکے اور خادم پر زیادہ اعتراض نہ کرو، کیونکہ اس سے تمہاری تنگ دلی اور بے صبری سمجھی جائے گی، اور کسی خادم کو برخاست نہ کرو کیونکہ ایسا کرنے میں تمہیں دُوسرے خادم کی حاجت پڑے گی، اور تمہیں کیا معلوم کہ نیا خادم پرانے سے اچھا ہوگا، بلکہ خادم کو راضی کرنے کے لئے یہ ظاہر کرو کہ وہ فی نفسہٖ امانتدار ہے اور وہ تیرے پاس آئندہ زندگی بسر کرے گا تو وہ خادم تیری خدمت تہ دل سے کرے گا، کیونکہ خادم اُس وقت تک خیر خواہی اور جاں نثاری نہیں کرتا جب تک کہ اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اپنے مالک کا شریک اُس کی نعمت میں ہے - اور جب تک کہ وہ اپنی برخاستگی سے بے خوف نہ ہو جائے اور اگر خادم کوئی لغو بات کرے تو کسی قدر اس کی توبیخ کر دو، لیکن اگر کوئی سخت معصیت کا مرتکب ہو یا کوئی جرم شنیع کرے تو جلد اُس سے چھٹکارا حاصل کرو، تاکہ وہ دُوسرے خادموں کو خراب نہ کرے !

اخلاق :- ابن سینا کے دو چھوٹے اچھے رسالے علم اخلاق میں ہیں، ایک کا "رسالۃ العہد" نام ہے، اس میں وہ ذکر کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے عہد کیا ہے اپنے نفس کے تزکیہ کا - بقدر اس قوت کے جو اللہ نے اُسے عطا فرمایا ہے تاکہ وہ اُسے

قوت سے فعل کی طرف عوالم عقل سے ایک عالم بنائے، جس میں مادہ سے مجرد ہئیت اور نفس کے کمال کا علم و حکمت کی جہت سے حاصل کرتا ہو۔ پھر وہ اس نفس پر جو اپنے کمالِ ذاتی سے ترقی پانے والا ہے، متوجہ ہو اور اس کی حفاظت کرے نفوس مادیہ کے ان ہئیات انقیادیہ کے آلودہ ہونے سے جو اسے معیوب کر دے۔ پھر ابن سینا ان فضائل کا ذکر کرتا ہے، جن سے اپنے نفس کو متصف کرنا چاہتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ فضائل کی تعریف میں افلاطون کی اس رائے کی اتباع کرتا ہے کہ فضیلت دو نقیضوں کے درمیان کی ایک درمیانی حالت ہے، مثلاً عدالت ظلم اور ظلم سہنے کی درمیانی حالت ہے اور شجاعت، بزدلی اور تہور کے درمیان میں ہے۔ اور وہ صفات جن کو اپنی ذات میں وہ پسند کرتا ہے وہ راز کا چھپانا اور علم اور تقریر اور ذہین ہونا اور رائے کی پختگی اور دور اندیشی ہے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح ہم فضائل عقلیہ کو سمجھتے ہیں! اس موقع پر فضائل نفسیہ بھی ہیں مثلاً صدق و وفا و رحمت، وحیا و تواضع وعفت و قناعت و سخاوت و شجاعت۔ یہ صفات اپنے اضداد کے ترک کو طبعاً مقتضی ہیں مثل کذب و بے قراری و چغل خوری وغیرہا کے۔ اور ابن سینا کی رائے ہے کہ فضائل حاصل کی جانے والی چیزیں ہیں (جیسا کہ سقراط کا قول ہے) اور ہر انسان کو فطرتاً ایسی قوت ہے جس سے اچھے کاموں کو کرتا ہے اور اسی قوت سے بُرے کام بھی ہوتے ہیں اور کل اخلاق اچھے ہوں یا بُرے، سب مکتسب ہوتے ہیں، انسان خُلقِ جمیل کو حاصل کرتا ہے یا خلق قبیح سے بالا مادہ منتقل ہوتا ہے، اس طرح پر کہ اپنے نفس کو ایک مدت تک خلقِ جمیل کا عادی بنائے اور ہم کو یہ جان لینا ممکن ہے کہ اخلاقِ فاضلہ یا ذمیمہ دوسروں کی طرف بھی ان پر عادی بنانے سے منتقل ہو جاتے ہیں،

پھر ابن سینا کا دوسرا رسالہ علم اخلاق میں بُنیادی طور پر "رسالۃ العہد" سے باہر نہیں ہے، لیکن کچھ امور اس میں زیادہ ہیں جن میں غالباً وہ افیغورس (ابیقور) سے متاثر ہے، اس لئے کہ وہ اپنے نفس کے لئے اس لذتِ معینہ کو جو ہر نفس کو قوی کرے جائز قرار دیتا ہے، پھر سب کو مالی مساوات کی تعلیم دیتا ہے ان بھائیوں کے لئے اور شرکاء کے لئے جو مال کے حاجت مند ہوں اور تدبیر کرے کہ اس کے نزدیک موت کا بڑا خطرہ نہ ہو (یہ بروديکوس سفسطائی کی رائے ہے) اور اس رسالہ میں ابن سینا عباداتِ بدنیہ کو ہمیشہ کرنے کی اور سُننِ الٰہیہ کی تعظیم کی اور احکام شرعیہ میں کوتاہی نہ کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔

فارابی کے فلسفہ اور ابن سینا کے فلسفہ کے درمیان میں مختصر موازنہ

۱ - فارابی نے ارسطو طالیسی ہونے کا قصد کیا لیکن وہ افلاطونیہ اور افلاطونیہ جدیدہ کی رایوں کے فلسفہ میں زیادہ داخل ہو گیا۔ اور ابن سینا نہ ارسطو کا پابند ہوا نہ کسی اور کا، بلکہ ہر فلسفی کی اس رائے کو لے لیا جو اس کے پسند آئی اور بہت سی چیزیں اس میں اپنی طرف سے زیادہ کیں۔

۲ - فارابی اعلیٰ درجہ کا نظری فلسفی تھا، علوم عقلیہ میں ماہر تھا اور ابن سینا مقام اول میں عالم تھا، فارابی کا فلسفہ مجردہ مطلقہ تھا، ابن سینا کا فلسفہ مادی تھا، فارابی نے "مابعد الطبیعۃ" کا زیادہ اہتمام کیا اور ابن سینا نے طبیعیات کا۔

۳ - یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارابی نے خاص لوگوں کے لئے کتابیں لکھیں۔ اسی لئے اس کی کتابیں مختصر اور مشکل ہیں اور ابن سینا نے اپنی تالیفات میں ادبی اور جاذب اسلوب اختیار کیا ہے، وہ اپنی تحریر میں بسط و تفصیل کرتا ہے اور مثالیں بیان کرتا ہے۔

۴ - باوجود اس امر کو یقین کرنے کے کہ ابن سینا کا "مجموعہ فلسفہ" فارابی سے ماخوذ ہے یہ ماننا پڑے گا کہ ابن سینا نے اپنی قدرت اور اپنے اسلوب اور توسع سے ایسا فلسفہ بنا دیا کہ وہ لوگوں میں مقبول اور شائع ہو گیا۔

۵ - ابن سینا فلسفہ عملیہ میں بڑھ گیا۔ کیونکہ زندگی کی پیچیدگیوں سے اسے پالا پڑا تھا۔ اچھائیاں، برائیاں دیکھی تھیں اور

فارابی نے تو عبادت و گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ مجمع سے کنارہ کش تھا۔ ہر ایک کے حال کا اثر اس کے فلسفۂ عملیہ (سیاست و اخلاق) میں ظاہر ہے!

(الف) فارابی نے سمجھا کہ لوگ مرتبہ عقلیہ میں مختلف ہیں۔ ابن سینا نے اسے مان لیا اور حیات اجتماعیہ کے ہمیشہ باقی رہنے کیلئے اسے ضروری ٹھہرایا!

(ب) فارابی نے معرفت خالق کے وجوب سے بیان شروع کیا ہے اور ابن سینا نے اس کو چھوڑ دیا ہے (لیکن اس نے اپنے ایک اخلاقی رسالہ کے آخر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے) لیکن اس نے مقدمہ کے بعد وجوب سیاست انسان بہ نفس خود سے بیان شروع کیا ہے، کیونکہ انسان کا نفس سب سے زیادہ اس کے قریب ہے!

(ج) فارابی نے انسان کی تین قسم قرار دی ہیں۔ برابر والے۔ رؤساء۔ ماتحت لوگ۔ اور ان کے معاملہ کے لئے ایک سیاست عقلی بنائی ہے۔ جو ان کی استعداد عقلی اور صفات نفسیہ پر مبنی ہے، اور ابن سینا نے انسان کی صرف دو قسم بنائی ہے۔ رؤساء، ماتحت لوگ (ہر فرد بشر اپنے ماتحت کے اعتبار سے رئیس ہے اور اپنے بالادست کے اعتبار سے ماتحت ہے) اور ان کی سیاست کا عملی طریقہ تجویز کیا ہے۔ ہر فرد پر واجب ہے کہ اپنے سے اوپر والوں سے بھی اور اپنے ماتحتوں سے بھی فائدہ حاصل کرے اور اس کے لئے بعض بڑی باتوں اور مبادی خلقیہ نفسیہ سے چشم پوشی کرے!

(د) فارابی نے زوجہ و اولاد و خدام کی سیاست پر کلام نہیں کیا، کیونکہ اس نے نہ نکاح کیا نہ خادم رکھا۔ اور ابن سینا نے تو اس کو سیاست کا ضروری باب قرار دیا ہے!

(ھ) فارابی اور ابن سینا دونوں نے آمدنی اور خرچ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور دونوں نے ان کے قاعدے تقریباً یکساں بیان کئے ہیں۔

(و) دوستوں اور دشمنوں اور حاسدوں اور خیرخواہوں کے متعلق کلام کرنے میں منفرد ہے اور ابن سینا نے چھوڑ دیا ہے، اس لئے کہ وہ عقلی طریقوں سے اصلاح بشر میں اس قدر اہتمام نہیں کرتا جس قدر کہ طریقۂ نفسیہ عملیہ کا اہتمام کرتا ہے!

بیشک فارابی سیاست مدنیہ سے تمام زندگی کے اصلاح اجتماعی کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ ابن سینا یہ سمجھتا ہے کہ اجتماع میں تفاوت مرتبوں اور طریقوں میں ضروری ہے۔ اس لئے وہ قصد کرتا ہے کہ وہ تفاوت اجتماع کی مصلحت کے لئے قائم رہے قطع نظر کرکے ہر اصلاح ممکن و غیر ممکن سے!

اس میں شک نہیں کہ فارابی اور ابن سینا انہی دونوں نے فلسفۂ عربیہ کو اہل عرب میں پہنچایا اور باوجودیکہ ان کے بعد ان کے فلسفہ کو سخت مقابلہ کا سامنا ہوا، مگر وہ زندہ و قوی رہا، یہاں تک کہ مغربی فلسفیوں نے اسے لیا اور اس کی بدولت پورے ازمنۂ وسطیٰ میں تفکیر کی بلند چوٹی پر مشرق و مغرب میں پہنچ گئے —!

☆

ہم نے بنایا

عروج زیدی

جلووں کو دل افروزِ نظر ہم نے بنایا
شعلوں کو جوابِ گُلِ تر ہم نے بنایا

ہر اشک میں رقصاں ہیں محبت کے شرارے
قطروں کو جِلا دے کے گُہر ہم نے بنایا

خود ساختہ ہے چاکِ گریباں، ہمیں تسلیم
پھولوں کو بھی کیا چاکِ جگر ہم نے بنایا

اے عزمِ جواں! منزلِ مقصود مبارک
تاروں کو بھی اب گردِ سفر ہم نے بنایا

بیگانۂ آغوشِ سکوں تھی تری دُنیا
ماحول کو فردوسِ نظر ہم نے بنایا

ساحل کی طرف ایک نظر بھی نہ اُٹھائی
ہر موجۂ طوفاں کو بھنور ہم نے بنایا

اب عشق ہے اور حُسن کے پُر کیف نظارے
اتنا اُسے گستاخ نظر ہم نے بنایا

اشعار کے پردے میں عروجؔ اپنی غزل کو
اک سلسلۂ عرضِ ہنر ہم نے بنایا

اشعار

کوثر اعظمی

کیا جانیے میں کس کا اب والہ و شیدا ہوں
اک ذات ہے ان دیکھی لیکن نہیں ان جانی

لالہ و گل، سمن و سرو، نسیم و نکہت
کون گلشن میں ہے جو آپ کا غماز نہیں

زمیں سے تا بفلک سینکڑوں نظارے ہیں
بس اک نظر ورنہ ستو اشارے ہیں

واردات و محسوسات

شفقت کاظمی

جفائے یار، بانداز دلبری نہ رہی — مرے نصیب میں شاید کوئی خوشی نہ رہی

اِدھر مریضِ شبِ غم نے موند لیں آنکھیں — اُدھر فلک پہ ستاروں میں روشنی نہ رہی

ہماری موت محبت کی موت تھی شفقت — ہمارے بعد رہ و رسم عاشقی نہ رہی

کیا وہ دنیا سے نامراد گئے — دل میں لے کر جو تیری یاد گئے

تیری بیداد تھی عزیز جنہیں — اب وہ تیرے وفا نہاد گئے

ہم کو لینا تھا کیا زمانے سے — نامراد آئے نامراد گئے

کیا غرض اہلِ بزم کو شفقت — آپ محزوں اُٹھے کہ شاد گئے

درپردہ مجھ سے اُن کو ضرور التفات ہے — ظاہر میں بے رُخی ہے تو یہ اور بات ہے

اُٹھتی ہے تو کبھی تو حریفوں کے حال پر — اے چشمِ یار! یہ بھی مقدر کی بات ہے

قائم ہے اپنی ذات سے دنیا کا سلسلہ — ہم کو ثبات ہے تو جہاں کو ثبات ہے

یوں ترکِ رسم و راہ محبت سے فائدہ — شفقت تجھے وہ یاد نہ آئیں تو بات ہے

نو شگفتہ

ماہر القادری

ستارے کروٹیں بدلا کئے سحر کے لئے — یہ اہتمامِ تجلّی مری نظر کے لئے

جلا دیے ہیں سرِ شام آنسوؤں کے چراغ — کہ شاید آج وہ زحمت کریں اِدھر* کے لئے

ترا تبسّم رنگیں ہو اور بھی شاداب — یہی بس ایک سہارا ہے چشمِ تر کے لئے

ذرا چمن کی ہوا دیکھ، طائرِ نوخیز! — دُعائیں مانگ ابھی سے بال و پر کے لئے

کسی کو طُور میسّر، کسی کو عرش نصیب! — جُدا جُدا ہے تجلّی، نظر نظر کے لئے

متاعِ درد بھی غارت گروں کی نذر ہوئی — رکھا ہی کیا ہے یہاں سعیِ چارہ گر کے لئے

نیازِ عشق کی یہ آزمائشیں کب تک — کہ سجدے درد نہ بن جائیں میرے سر کے لئے

چلی چمن سے یہ کہتی ہوئی نسیمِ سحر — کہ زادِ راہ ضروری نہیں سفر کے لئے

رُوحِ انتخاب

جو شخص اپنے دل میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ لمبی عمر حاصل کرے گا اور دیر تک اُس کو موت نہ آئے گی، ایسے شخص سے دین کا کوئی کام بھی سرانجام نہیں ہو پاتا۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ ابھی بہت دیر تک زندہ رہوں گا۔ جس وقت چاہوں گا دینی کام کرلوں گا، اب تو ذرا چین و آرام سے گزار لوں۔ اور جو شخص اپنی موت کو قریب خیال کرتا ہے، وہ ہر وقت اسی کے خیال میں مشغول رہتا ہے۔ اور یہی بات تمام سعادتوں کی اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ جب تو صبح کو اُٹھے تو یہ خیال نہ کر کہ میں شام تک زندہ رہوں گا، اور شام کو اپنے دل میں یہ خیال نہ کر کہ صبح کو زندہ اُٹھوں گا۔ زندگی سے زادِ مرگ مہیا کر، اور تندرستی سے زادِ بیماری حاصل کر۔ اس واسطے کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ کل حق تعالیٰ کے نزدیک تیرا کیا نام ہوگا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کوئی شے مول لی کہ ایک ماہ تک کام آتی رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسامہ سے کچھ تعجب نہیں کہ اس نے مہینہ بھر کے لئے کوئی شے مول لی۔ اِنَّ اُسَامہ تطویل الاَمل (یعنی اُسامہ درازی عمر کی امید رکھتا ہے) اور فرمایا مجھے قسم ہے اُس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جب میں پلک جھپکاتا ہوں تو خیال کرتا ہوں کہ آنکھ کھلنے سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔ اور جب میں آنکھ کھولتا ہوں تو جانتا ہوں کہ آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی میری موت واقع ہو جائے۔ اور جو لقمہ مُنہ میں ڈالتا ہوں، خیال کرتا ہوں کہ موت کے سبب سے یہ میرے حلق ہی میں نہ جائے گا۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے فرمایا — اے لوگو! اگر تم عقلمند ہو تو اپنے آپ کو مُردہ خیال کرو۔ اس لئے کہ مجھے قسم ہے اُس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جو اُس نے جو وعدہ کیا ہے تم سے وہ پُورا ہو کر رہیگا اور تم اُس سے بچ نہ سکو گے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب قضائے حاجت سے فراغت پاتے تو اسی وقت تیمم کر لیتے۔ صحابہؓ عرض کرتے حضورؐ پانی قریب ہے، آپؐ فرماتے، شاید میں پانی تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی روز بروز بُوڑھا ہوتا ہے اور دو چیزیں اس میں ہیں، وہ جوان ہوتی جاتی ہیں۔ ایک تو مال کی حرص، دُوسرے زندگی کی آرزو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ کیا تم جنت میں جانا پسند کرتے ہو؟ عرض کیا، ہاں! فرمایا، آرزو کو کم کردو اور موت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھو! اور حق تعالیٰ سے شرم کرو، جیسا شرم کرنے کا حق ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔ جوانی کو ضعیفی سے پہلے۔ تندرستی کو بیماری سے پہلے، تونگری کو محتاجی سے پہلے، اور فراغت کو شغل سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے! فرمایا، دُو نعمتیں ایسی ہیں جن کے سبب سے اکثر لوگ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ ایک تندرستی، دُوسری فراغت!

حضورؐ نے فرمایا۔ الکیسُ من دانَ نفسہ وعمل لما بعد الموت۔ عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو رام کرلیا اور موت کے بعد (کی زندگی) کے لئے عمل کیا!

(کیمیائے سعادت — علامہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

ہماری نظر میں

اسلامی ادب نمبر ماہنامہ "مشیر" کراچی

نگراں۔ مرزا عبدالغفور بیگ۔ مرتبہ۔ محمد حمید اللہ صدیقی۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات
قیمت ڈھائی روپے ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ۔ کراچی۔

ماہنامہ "مشیر" کا "اسلامی ادب نمبر" جسے در اصل "پاکیزہ ادب کا ڈائجسٹ" کہنا چاہیئے بڑے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کا اداریہ (سبدِ گل) جناب حمید اللہ صدیقی نے لکھا ہے، جس سے ادبِ اسلامی کی تحریک کا ایک سرسری تعارف ہو جاتا ہے۔

تنقیدی مضامین میں محمد نجات اللہ صدیقی کا مقالہ "اسلام اور فنونِ لطیفہ" خاصہ وزنی اور جاندار ہے، نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے، جس میں مرزا "مظہر جانِ جاناں" سے لے کر قرۃ العین فرید تک نظر آتے ہیں۔

ٹالسٹائی، دوستوسکی، چیخوف، ایرک رائی، ایڈگر ایلن پو اور جوہن پیٹر ہیبل جیسے مشاہیر کے افسانوں کے ترجموں نے "ترجمہ" کے حصہ کو وقیع و شاندار بنا دیا ہے۔

اوریجنل افسانوں کا انتخاب بھی دلچسپ ہے، بہرحال "اسلامی ادب نمبر" مجموعی طور پر کامیاب ہے۔

اس "شمارہ خاص" کا نام اگر "تعمیری ادب نمبر" ہوتا تو اسلامی افسانہ نگاروں کی فہرست میں چیخوف اور پریم چند اور اسلامی شاعروں میں بلراج کومل جیسے ناموں کو دیکھ کر کھٹک اور الجھن پیدا نہ ہوتی۔

"اسلامی ادب نمبر" کے مرتبین سے سب سے بڑی بھول یہ ہوئی ہے کہ شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی، ابو الکلام آزاد، عبد الماجد دریا بادی، ابو الاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی جیسے بلند پایہ اہلِ قلم اور اربابِ فکر کی تحریروں کے نمونے اس میں شامل نہیں کئے گئے۔ کیونکہ "ادب" صرف تنقید، افسانہ اور غزل و نظم ہی کا نام نہیں ہے! جب "اسلامی ادب" کے نامنے "ادب" کے بارے میں یہ تصورات رکھتے ہوں۔ تو ع

پھر کسے رہنما کرے کوئی!

سالنامہ تعمیر انسانیت

مرتبہ۔ کوثر نیازی۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ۔ دفتر "تعمیر انسانیت" موچی دروازہ لاہور

ماہنامہ "تعمیر انسانیت" کا یہ دوسرا سالنامہ ہے۔ جس نے اہلِ ذوق کی توقعات کی خاطر خواہ پذیرائی کی ہے، نظمیں، غزلیں، افسانے اور مقالے سب کے سب دلچسپ ہیں، نسیم حجازی کے ڈرامے نے سالنامہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کس قدر نفسیاتی انداز میں کمیونسٹوں کے عزائم کو بے نقاب کیا ہے، غزلوں اور نظموں کے انتخاب میں ادارے نے فراخدلی سے کام لیا ہے بعض چیزیں چھانٹ دینے کے قابل تھیں۔ ادارہ کی یہ سعی جستجو مستحق تبریک ہے کہ اقبال سہیل مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام انہوں نے حاصل کر کے سالنامہ میں شائع کیا ہے، اس شمارہ خاص میں سب سے زیادہ کامیاب اور دلچسپ "افسانوں" کا حصہ ہے۔

"تعمیر انسانیت" کا یہ سالنامہ مقصدی ادب کا ترجمان ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ اشاعت و قبولیت کا مستحق ہے۔!

خاص نمبر ماہنامہ پرچم

مرتبہ:- شاکر عروجی - ضخامت ۲۰۰ صفحات - قیمت دو روپے - ملنے کا پتہ :- دفتر پرچم، فتح آباد لائلپور -

ماہنامہ پرچم کا یہ "خاص نمبر" نظم و نثر کے رنگا رنگ مضامین سے مزین ہے - اساتذہ، طلباء، بچوں اور خواتین کے لئے ذوق و دلچسپی کی بھی مضامین میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

شاکر عروجی کی اپنی نظم جو "خاص نمبر" کا سر آغاز ہے - غالباً عجلت میں کہہ کر کاتب کے حوالہ کردی ہے۔

سب تری ذات کا عرفاں ہو مری ذات ہی کیا　　لب فریاد پہ جز حرف مناجات ہے کیا !

یہاں "عرفاں" کا نہیں "پرتو" کا محل تھا۔

ہے ترا نور ہی صبحوں کو چمکنے والا　　بن تو ہوں محض اندھیروں میں بھٹکنے والا

"صبحوں کو چمکانے والا" ہونا چاہیئے تھا، یا ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، اور "صبحوں میں چمکنے والا" کی جگہ "صبحوں کو چمکنے والا" چھپ گیا ہو !

سانس رک جائے تو اک سانس میں مر جائے بشر　　تیری ہستی نہ پنہ دے تو کدھر جائے بشر

"پناہ" کو "پنہ" نظم کر کے شاعر نے اہل ذوق کے وجدان پر ظلم کیا ہے !

ہے ہر کام زمانے میں ادھورا مجھ سے　　آدمیت کا بھی منشا نہ ہو پورا مجھ سے

"رہا ہر کام" سے شعر کی چول سیدھی بیٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کلام موزوں میں "شعریت" کا دور دور پتا نہیں !

خلق کو جس سے کہ عار آئے وہ خلقت ہوں میں　　الغرض دہر میں سامان ندامت ہوں میں

"سامان" کی جگہ "تصویر" یا اور کوئی مناسب لفظ ہونا چاہیئے تھا۔ "خلقت" کو "مخلوق" کے معنی میں استعمال کرنا بھی نامانوس اور عجیب ہے !

سر دانش ہے نگوں، خم ہے فراست کی کمر　　کہاں قدرت، کہاں، بیچارگیٔ نوع بشر !

"خم ہے فراست کی کمر" اس میں کس قدر تکلف اور آورد پائی جاتی ہے۔ اور دونوں جگہ "کہاں" میں "الف" دبنے سے شعر کی نغمگی اور روانی کا الگ خون ہو رہا ہے !

روزنامہ "زمزم" کا خاص نمبر

ادارہ:- منظور احمد رحمت، ڈاکٹر مسعود احمد نقوی - ضخامت ۴۰ صفحات، ملنے کا پتہ:- دفتر "زمزم" شاہی بازار، بہاولپور -

خاص نمبر کے ان عنوانات سے اس کے متنوع اور دلچسپ ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

"دیکھتا چلا گیا" — "دل میرا جلے" — "مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں" — "چند تصویر بتاں" — "سب کا اقبال" — "ریڈیو طفلستان" — "بچوں کے افسانے" — "ہمارے قلمی معاونین" — !

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مقالہ "خاص نمبر" کی جان ہے۔ تنہا اسی مقالہ کے لئے اس شمارہ کو خریدا جا سکتا ہے !

"پیارا پیارا ٹھہراؤ" (صفحہ ۳۵) "کھرا پن" (صفحہ ۳۵) "مطر گستی" - (صفحہ ۳۶) "خدا و ناخدا کے درمیان گڑیا نوں کی تو لتا ہوا" (صفحہ ۳۶) "قدوس کی چلتی پھرتی لاش سالہا سال سے بھسم ہو رہی ہے" (صفحہ ۳۶) یہ انداز نگارش - "فری اسٹائل" قسم کا ہے، جو "وجدان" پہ بہت گراں گزرتا ہے — !

مقالوں کے علاوہ متعدد غزلوں، نظموں اور تصویروں سے "خاص نمبر" مزین ہے — !

مطبوعہ:- ادبی پریس - رابسن روڈ - کراچی
پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

علامہ گیلانیؒ
(۴ جون ۱۹۵۶ء)

- ــــــــ فکر و نظر کی وسعت، علمی جامعیت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے۔
- ــــــــ اُن کی ژرف نگاہی نے ہر بساط علم و فن پر نکات و تحقیقات کے وہ گل کھلائے جو سدا بہار ہیں۔
- ــــــــ انھوں نے تنہا تصنیف و تالیف کا اتنا کام کیا جتنا یورپ میں ادارے اور انجمنیں کرتی ہیں۔

غرض ــــ ع "وہ اپنی ذات سے اِک انجمن تھے"

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ــــــــ مرحوم کے قدرشناسوں کی خدمت میں

ان کی وفات کے ٹھیک ایک سال بعد

افادات گیلانی نمبر

کی شکل میں ایک یادگاری تحفہ جون ۱۹۵۷ء میں پیش کر رہا ہے۔ جو الفرقان میں شائع شدہ علامہ مرحوم کے ان اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو مستقل کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔

اس نمبر میں مولانا مرحوم کا ایک تقریباً سوا سو صفحے کا طویل مقالہ ہے جو بجائے خود ایک قیمتی کتاب اور ان کی جامعیت و ذہانت کی بہترین یادگار ہے ــــ ایک اُن کے اُس مقالہ کی تلخیص ہے جو الفرقان کے "مجدد الف ثانی نمبر" کی زینت بنا اور اہل علم کی نظر میں مصنف کا عظیم کارنامہ قرار پایا ــــ اس کے علاوہ بعض سلسلہ وار مضامین کی اہم اقساط ــــ اور شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے مرحوم کی شخصیت پر ایک دلآویز، بصیرت افروز اور جامع مقالہ "نقوش و تأثرات" کے عنوان سے ــــ!

ضخامت کم و بیش ۲۰۰ صفحات ــــــــ قیمت ۲ روپے (علاوہ محصول ڈاک ۸/)

نوٹ:- سال بھر کے لئے الفرقان کی خریداری قبول کرنے والے حضرات سے سالانہ چندہ پانچ روپے کے علاوہ اس نمبر کی کوئی قیمت نہیں لی جائیگی البتہ رجسٹری فیس کے ۸/ چندہ کے علاوہ لازمی طور پر آنے چاہئیں۔ پاکستانی حضرات سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ۔ لاہور کے نام منی آرڈر روانہ کریں اور رسید کے ساتھ ہمیں اطلاع دیں۔

منیجر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ ماھنامہ نمبر ۵

فاران

اگست ۱۹۵۷ء ـــــ ایڈیٹر ـــــ ماہرالقادری۔

سالانہ چندہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفترِ فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اس ساڑھے آٹھ سال کی مدت میں ہندوستان کے داخلی مسائل کے بارے میں ہم نے اتنا کم لکھا ہے کہ جو نہ لکھنے کے برابر ہے، ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو قوموں اور حکومتوں کے درمیان کشیدگی اور تلخی پیدا کرنا، یا باقی رکھنا پسند کرتے ہوں، اختلافِ عقائد و مسلک کے باوجود دنیا کے تمام بسنے والے، انسانی رشتہ میں منسلک ہیں اور اس رشتہ کا بہرحال احترام باقی رہنا چاہیئے! آدمی دنیا میں لڑنے کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے غمخواری اور میل ملاپ کے ساتھ رہنے کے لئے آیا ہے!

اسلام نے تو پڑوسی کے حقوق کو بڑی اہمیت دی ہے، چاہے وہ "غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اور مہمان کے بارے میں یہ حکم دیا ہے:-

"اکرموا لضیف لو کان کافراً"

(مہمان کی عزت کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو)

علم انسانی حقوق کی رعائت کو اس درجہ تک پہنچا دیا گیا ہے -

"الخلق عیال اللہ"

(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے)

اور ظاہر ہے کہ کنبہ والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور بھائی چارہ ہی کا سلوک کرنا چاہیئے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد جو المناک اور دردانگیز واقعات پیش آئے اُن کا ہم ذکر نہیں چھیڑتے اور نہ اس تصفیہ کو دہراتے ہیں کہ زیادتی کس نے کی اور عزت و آبرو اور جان و مال کا نقصان کس قوم کا زیادہ ہوا؟ سنہ اُنیس سو سینتالیس کے آخر کے چھ مہینوں کو ہم بحرانی دور سمجھ کر چھوڑے دیتے ہیں اور ۱۹۴۸ء سے پاک و ہند کے داخلی حالات کا سرسری جائزہ لینا شروع کرتے ہیں کہ اس وقت دونوں حکومتیں اچھی طرح جم چکی تھیں اور عوام پر ان کا پورا کنٹرول تھا

۱۹۴۸ء کے آغاز میں شہر کراچی میں ایک فساد ہوا جسے ہم سیاست بازوں کی طرح "ہندو مسلم فساد" کہہ کر اصل حقیقت پر پردہ ڈالنا نہیں چاہتے، اس فساد میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کیا تھا اور اس لئے یہ "دو قوموں کا باہمی فساد یا بلوہ" نہ تھا۔ بلکہ یک طرفہ فساد تھا جس میں ہندوؤں کا جانی نقصان تو برائے نام ہوا۔ مگر مالی نقصان کافی ہوا یہ فساد زیادہ طول نہ پکڑ سکا اس زمانہ میں مسٹر کھوڑو سندھ کے وزیراعظم تھے، انھوں نے انتہائی سختی کے ساتھ اس فساد کو دبا دیا، یہ آگ بھڑکتے ہی بجھا دی گئی اور کراچی کا سینٹرل جیل مسلمان قیدیوں سے پٹ گیا اور فسادیوں اور خطاکاروں کے ساتھ بیچارے بے گناہ مسلمان بھی اس لپیٹ میں آگئے!

کراچی کے اس فساد اور کسی ایک آدھ جھڑپ کے علاوہ پاکستان میں غیر مسلموں پر پھر کوئی زیادتی نہیں ہوئی اور شورش پسند

عنام حکومت کی غیر جانبدارانہ پالیسی کے سبب ہندوؤں کو چھیڑنے کی اس کے بعد جرأت نہ کرسکے :- ہم حکومت پاکستان کی اس منصفانہ روش اور عام مسلمانوں کے حسن سلوک پر فخر کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہیں، اور اس عام انسانی بھائی چارے کا انہیں احساس ہے، جو امن داشتی کی بنیاد ہے۔ حقوق انسانی کے معاملہ میں مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کا ثبوت دیا ہے اور ان کی تاریخ کے سب سے زیادہ زریں اوراق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ حکومت پاکستان اور اس کے مسلم عوام نے تاریخ کے ان اوراق میں ایک اور سنہرے باب کا اضافہ کردیا۔

اس کے برخلاف ہندوستان میں سینکڑوں فسادات تو اس نوعیت کے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی دکانیں اور مکان نذرِ آتش کئے گئے ہیں، ہندوؤں نے کہیں کہیں اس آگ میں مسلمانوں کو زندہ جلا دیا ہے۔ مسلم خواتین کی بے آبروئی ہوئی ہے اور سب سے زیادہ ظلم وستم یہ کہ اس غارت گری اور خونریزی میں حکومت غیر جانبدار بھی نہیں رہی۔ بہت سے مقامات پر مقامی عہدیداروں نے مہا بھائی سورماؤں اور سنگھی ویروں کے مشوروں سے مسلمانوں کی غارت گری کا پلان بنایا ہے، کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے ہمت کرکے جوابی مدافعت کی تو ہزاروں غارت گروں کے چھکے چھڑا دیئے۔ حملہ آوروں کو ہارتا دیکھ کر بھارت کی پولیس کو غیرت آئی اور اس نے اپنی گولیوں سے مسلمانوں کے سینے چھلنی کردیئے اور اِن تمام مظالم اور ستم آرائیوں پر مستزاد یہ کہ زیادہ تعداد میں یہی مظلوم وستم رسیدہ مسلمان پکڑے گئے اور ان مجبوروں کو الٹا بانیٔ فساد قرار دیا گیا!

یہ تو ان بڑے بڑے فسادات کی دردناک روداد ہے جو اخبارات میں آچکی ہے اور آتی ہی رہتی ہے۔ اب رہیں اکّا دکّا وارداتیں۔ تو یہ تئے دن ہوتی رہتی ہیں ان کی تو اب شاید کوئی اہمیت ہی نہیں رہی اور ہندوستان کے غریب ومجبور مسلمان اس کے عادی بھی ہوگئے ہیں کہ بھارت میں جب رہنا ہے تو ان زیادتیوں سے کسی طرح مفر نہیں، ایسی ذلتیں تو انہیں بہرحال سہنی ہی پڑیں گی مثلاً یہ کہ کوئی خوش پوشاک مسلمان ہندوؤں کے محلے سے گزر رہا ہے، ہندو لونڈوں نے اس پر آوازے کسے، گالیاں دیں اور اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو اس مسلمان کو بڑے آدمیوں نے پیٹ ڈالا اور وہ بیچارہ پٹ پٹا کر کپڑے جھاڑتا ہوا چلتا بنا۔ کوئی مسلمان پھل پھلاری بیچتا ہوا گزرا، اس کے پھل دن دہاڑے لوٹ لئے، اس نے تھانہ میں رپٹ کی تو الٹا اس غریب ہی کو دھر لیا کہ تم ایسی افواہوں سے شہر میں بدامنی پھیلانا چاہتے ہو — ہندوؤں نے ڈھیلے خود پھینکے نام لگا دیا مسلمانوں کا کہ ان کی طرف سے یہ ڈھیلے آئے ہیں، اب اس ناکردہ گناہی کی سزا میں مسلمان تھانہ کو بندھے چلے جارہے ہیں — ذبح ہوتی بھینس، ہندوؤں نے شور مچا دیا "گئو ماتا" کی مسلوں نے ہتھیا کرڈالی اور پولیس نے دسیوں کلمہ گویوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں —

"ہولی" آتی ہے تو ہندوستانی مسلمان سہمے سہمے اور بچے بچے رہتے ہیں، پھر بھی یہ ہوتا ہی رہتا ہے کہ کسی مسلمان پر رنگ ڈال دیا، کسی کی داڑھی پر گلال مل دیا اور کسی پر کیچڑ اچھال دی۔ کوئی قسمت کا مارا احتجاج کی جرأت کر بیٹھے تو مار پیٹ سے لے کر حوالات کے حبس بیجا تک کی ذلتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں!

جب سے پاکستان بنا ہے اس دس سال کی مدت میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ پاکستان میں ہندوؤں کے کسی رشی منی اور اوتار کی شان میں ایک لفظ بھی بے ادبی یا توہین کا کہا یا لکھا گیا ہو، یہ اس ملک کے اخلاق ورواداری کا حال ہے جس پر "مذہبی جنون" کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ مگر جس ملک کو "سیکولر اسٹیٹ" ہونے کا دعویٰ ہے، وہاں مسلمانوں کے کسی معمولی محدث، فقیہہ اور امام کی نہیں بلکہ ان کے آقا و پیشوا نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور انسانیت کے محسنِ اعظم (روحی فداہ) کی بار بار توہین کی گئی ہے ہندوؤں کے راج میں یہ وہ زخم مسلمانوں کے کلیجے میں لگتا ہے، جس کی اذیت لفظوں میں کسی عنوان ظاہر ہی نہیں ہوسکتی! مسلمانوں نے اس ناقابلِ تلافی ظلم پر احتجاج کیا تو اترپردیش کے مہامنتری سمپورنانندجی نے الٹا مسلمانوں ہی کو ڈانٹا!

؎ خواستم پیکاں برآرم از جگر، نشتر شکست

پاکستان میں کوئی ایسا نیا قانون نہیں بنا جس سے ہندوؤں کے "پرسنل لاء" پر زد آ کر پڑتی ہو۔ مگر بھارت کی سیکولر اسٹیٹ میں ان لوگوں کو نوکریوں سے علیحدہ کیا جا رہا ہے جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں۔ اس قانون کا شکار سب سے زیادہ غریب ہندوستانی مسلمان ہو رہے ہیں "تعددِ ازدواج" کے خلاف یہ قانون سازی مسلمانوں کے "پرسنل لا" پہ جبر و تعدی اور دست درازی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قانون سے روزگار سے لگے ہوئے بعض مسلمانوں کو بے روزگار بنانا مقصود ہے اور سب سے بڑی غرض یہ پیشِ نظر ہے کہ اس طرح مسلمانوں کی "افزائشِ نسل" میں روک پیدا ہو جائے گی۔ گائے کی قربانی کو اس قانون کے بننے سے پہلے ہی ممنوع قرار دیا جا چکا ہے۔

اُردو کو صرف اس تصوّر کے تحت مٹایا جا رہا ہے کہ اس زبان کو ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت بولتی ہے اور اس زبان میں ان کے دینی علوم محفوظ ہیں۔ ایسی دورنگی آج تک نہ دیکھی نہ سنی کہ حکومت کے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ اُردو بھی بھارت کی ایک زبان ہے۔ مگر خود لکھنؤ کے قصرِ ایوان سے سمپورنا نند جی اُردو کو یو۔پی تک کی زبان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں! اس راز کو کون کھول سکتا ہے کہ نہرو جی جو بھارت کے سب سے بڑے نیتا ہیں اور مہامنتری ہیں، جن کا وہاں کی سیاست پر سب سے زیادہ غلبہ اور اثر ہے، اُردو زبان کے معاملہ ہی میں وہ اس قدر مجبور و بے اثر کیوں ہو کر رہ گئے ہیں کہ اُردو زبان کو اس کا جائز اور واجبی حق بھی نہیں دلا سکتے۔ یا پھر کہیں ہاتھی کے دانتوں والا معاملہ تو نہیں ہے کہ جو "کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور"۔ بدگمانی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ مگر اتنے کھلے ہوئے واقعات کے ہوتے ہوئے۔ آخر کب تک "حسنِ ظن" کا فریب کھائے جائیں!

پھر حکومت ہند کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد جن کو پٹیل اور ٹنڈن کی سطح سے ہمیشہ اونچا سمجھا گیا ہے اور جو گاندھی جی کے دست بازو رہے ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ اُردو کے مسئلہ میں بیس بائیس لاکھ آدمیوں کے دستخطوں کا محضر کئی سال سے دبائے بیٹھے ہیں، اور لب نازک سے کچھ ارشاد ہی نہیں فرماتے ـــ بھارت میں جمہوریت ہے مگر اس کا سارا فائدہ ہندوؤں کو پہنچ رہا ہے! اس کے "سیکولرازم" سے بھی وہاں کی اکثریت ہی متمتع ہو رہی ہے!

ہندوستان میں تقسیم کے بعد سے کئی سال تک وہاں کے مسلمانوں کی "وفاداری" کو ہندو جنتا ہی نے نہیں، اربابِ اقتدار تک نے چیلنج کیا ہے، یہ شور تقریباً دو سال سے دھیما پڑا ہے اگرچہ اس کی صدائے بازگشت اب بھی سننے میں آ جاتی ہے۔ مگر پاکستان میں یہاں کے ہندوؤں کی وفاداری کے قضیہ کو چھیڑ کر انھیں پریشان نہیں کیا گیا، نہ ان کو دھمکیاں دی گئیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں سے یہاں تک کہا گیا کہ مکّہ اور مدینہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دو، ہندوستان میں رہنا ہے تو "خالص ہندوستانی" بن کر رہو۔ عربی تہذیب سے محبت کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ لیکن پاکستان میں کسی متعصب سے متعصب مولوی اور مُلّا نے بھی یہاں کے ہندوؤں کو یہ دھمکی نہیں دی کہ ہردوار، اجودھیا، گوکل، بندرابن اور کاشی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھو اور اپنی قدیم بھارتی تہذیب سے اپنا سمبندھ توڑ لو اور "اسلامی تہذیب" اختیار کر لو! یہاں پاکستان میں ہندوؤں کو طرح طرح سے یقین دلایا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے عہد اور بعض دوسرے مسلمان بادشاہوں کے دور کی تاریخی مثالیں دے دیکر سمجھایا گیا ہے کہ "اسلامی حکومت" غیر مسلموں کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے۔ اسلامی دستور وحشت کرنے کی چیز نہیں ہے یہ مقدس دستور تو غیر مسلموں کے احترامِ حقوق اور تحفظ جان و مال کی معتبر ترین ضمانت ہے۔ مسلمان ایسی گھٹیا چالیں نہیں چلا کرتے کہ اپنی حکومت پر لیبل تو لگالیں "لادینی" کا اور دینی عصبیت کو ملک کے قانون، معاشرے اور نظم و نسق پر مسلط کر دیں۔ مسلمان کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے دوغلے پن کی باتیں اسے نہیں آتیں!

مگر پاکستان کے ہندوؤں نے "اسلامی دستور" کی کھل کر مخالفت کی اور اسلام کے خلاف اپنے دل کی کھوٹ اور کپٹ کا خوب خوب اظہار کیا۔ لیکن اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی پاکستان کے ہندوؤں کی وفاداری کو نہ یہاں کے عوام نے چیلنج کیا اور نہ حکومت نے! مشرقی پاکستان والوں میں زبان اور مخلوط انتخاب کے فتنے ہندوؤں کے کھڑے کئے ہوئے ہیں مقصد یہی کہ پاکستان مضبوط اور متحد نہ ہونے پائے اور اس ملک کا شیرازہ سدا بکھرا ہوا رہے۔ ہندوستانی ہائی کمشنر کے ایوان میں پاکستان کے ہندو لیڈروں کی مسکوٹیں ہوتی ہیں، اور

کلکتہ ان کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جہاں سے وہ ہر طرح کی ہدایت اور کمک حاصل کرتے ہیں۔ ان کی یہ حرکتیں یقیناً احتساب کی مستحق ہیں، مگر وہ احتساب سے بچے ہوئے ہیں۔ اگر پاکستان کے مسلمان اس کا ہزارواں حصہ بھی کر گزرتے تو ان پر جو مصیبتیں نازل ہوتیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا نے "سیکولر راج" اور "دینی حکومت" کے فرق کو دیکھ لیا کہ کہاں تنگ نظری اور سنگدلی ہے اور کہاں عالی حوصلگی رواداری، وسعتِ نظر اور کشادہ دلی ہے۔

ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کا وہاں کے مسلمان لیڈروں سے کوئی ربط نہیں ہے اور پاکستان کے ہائی کمشنر نے ہندوستان میں انتہائی احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ مگر پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر نے سفارتی تعلقات کی آزادی کو اپنے مقاصد کے لئے ہمیشہ استعمال کیا ہے، ہندوستانی ہائی کمشنر کے ایماء سے پاکستان کے ہندو لیڈروں کو ہدایتیں ملتی ہیں اور یہ لے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ ہندوستانی ہائی کمشنر ہدایا اور تحفوں کے ذریعہ پاکستان کے مسلم عہدیداروں تک کو پرچانا اور رام کرنا چاہتے ہیں!!

مرکزی حکومت پاکستان کے سابق وزیر مسٹر منڈل نے حکومت سے جو غداری کی ہے وہ عالم آشکارا ہے اور ہندوستان کے مسلمان وزیروں نے جس وفاداری کا ثبوت دیا ہے وہ بھی سب پر روشن ہے۔ مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم نے تو اپنی قابلیت وطن دوستی اور وفاداری کے جھنڈے گاڑ دیئے! بریگیڈیر عثمان ہندوستانی فوج ہی کے اعلیٰ افسر تھے جن کا خون معرکۂ کشمیر میں کام آیا۔

پاکستان پر تہمت دھرنے اور الزام تراشنے میں ہندوستان کے اونچے لیڈر اتنے دلیر اور بے باک ہیں کہ اب سے چند سال قبل ہندوستان نے اپنے روپیہ کی قیمت جب کم کی اور پاکستان نے بدستور رہنے دی۔ اس پر ہندوستان کے ذمہ دار لیڈروں نے الزام لگایا کہ پاکستان نے ہندوستان کی کرنسی کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ اپنے سکہ کی قیمت کو کم (ڈی ویلیو) نہیں کیا۔ کیسی دھاندلی اور ناانصافی ہے کہ پاکستان سے اس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مالیات اور کرنسی کی پالیسی میں ہندوستانی حکومت کے سود و زیاں کی رعایت رکھے، اور ہندوستان اپنے سکہ کی قیمت گھٹائے تو پاکستان کو بھی لازمی طور پر اپنے سکہ کی قیمت کم کر دینی چاہیئے۔

بھارت نے غیر ملکوں سے کس قدر اسلحہ اور مالی امداد حاصل کی ہے اور کس کس حکومت سے عہد و پیمان باندھے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی پر عمل کیا ہے اور وہ اس لئے کہ بھارت ایک آزاد اور خود مختار حکومت ہے وہ اپنی داخلی خارجی پالیسی پر عمل کرتی ہے اور ایسا کرنے میں وہ کسی کی پالیسی اور ہدایت کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کے لئے کسی دوسری حکومت سے مشورہ کرنے کی پابند نہیں ہے۔ پاکستان کے ارباب کار نے بھارت کی خارجہ پالیسی پر نکتہ چینی نہیں کی کہ تم نے فلاں حکومت سے معاہدہ کیوں کیا؟ تم روس سے اپنے تعلقات کیوں بڑھا رہے ہو؟ یا بھارت کے غیر ملکوں سے اسلحہ اور مالی امداد لینے سے توازنِ طاقت برقرار نہ رہ سکے گا۔ اس کے برخلاف بھارت نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ہمیشہ تنقید و طنز کا نشانہ بنایا ہے، پاکستان کسی بیرونی ملک سے اسلحہ منگاتا ہے تو نہرو جی فرماتے ہیں کہ اس سے توازنِ طاقت پر اثر پڑتا ہے۔ پاکستان کے معاہدہ بغداد میں شامل ہونے پر بھی ہندوستانی حکومت نے کیا کیا دے کی ہے، پاکستان کیا بھارت کا باجگزار ہے کہ وہ جب کسی بیرونی حکومت یا حکومتوں سے کوئی معاہدہ کرے تو پہلے بھارت کے نیتاؤں سے پوچھ لیا کرے کہ:۔

"اے! بھارت کے نیتاؤ! اور مہا پرشو! تمہارا سیوک پاکستان فلاں حکومت سے معاہدہ کر رہا ہے تمہارا اس معاملہ میں کیا بچار ہے! یہ کام کیا جائے یا نہ کیا جائے؟"

حکومتِ پاکستان کی وہ صلح صفائی کی روش کہ اس نے بھارت کو ایک آزاد اور خود مختار حکومت سمجھ کر اس کی خارجہ پالیسی پر حرف گیری نہیں کی اور بھارت کا چھیڑ چھاڑ اور جدال و نزاع کا یہ انداز کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اس طرح نکتہ چینی کرتا ہے کہ جیسے پاکستان اپنے خارجی معاملات میں قطعاً آزاد نہیں ہے اور یہ عجیب قسم کا انصاف اور دھاندلی ہے کہ ہندوستان جتنی چاہے

امداد غیر ملکوں سے حاصل کرے، تو اس سے نہ تو توازنِ طاقت بگڑتا ہے اور نہ بین الاقوامی معاملات میں کوئی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ مگر پاکستان کے ایسا کرنے سے توازنِ طاقت بھی بگڑ جاتا ہے اور انٹرنیشنل معاملات بھی پیچیدہ اور نازک ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ناانصافی ہٹ دھرمی اور زیادتی بہت دنوں تک چل سکے گی؟؟!

کشمیر کے مسئلہ میں بھارت نے کیا کیا پینترے بدلے ہیں؟ اور مجلسِ اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کو کس کس طرح ٹھکرایا ہے؟ اور اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اپنے کو حق پر سمجھتا ہے، پاکستان پر الزام یہ لگایا گیا ہے کہ وہ "حملہ آور ہے"! پنڈت نہرو کی بات بڑی کرنے کے لئے ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کئے لیتے ہیں کہ پاکستان "حملہ آور" ہی ہے! مگر اس کے "حملہ آور ہونے سے کشمیریوں کا حقِ خود ارادیت" تو ضائع نہیں ہو جاتا! اُن بیچاروں کو تو اس کا حق بہر حال حاصل ہے کہ وہ اپنے بارے میں آزادی کے ساتھ فیصلہ کر سکیں کہ آیا وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ یا کسی کے ساتھ بھی الحاق نہیں چاہتے! کشمیر میں استصوابِ رائے عامہ سے جو بھارت کترا رہا ہے، یہ اس کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں نہرو جیسے بڑے آدمی کا یہ کہہ دینا کہ اس سے ہندوستان میں "ہندو مسلم فساد" کو شہ ملے گی۔ کتنے پست مگر خوفناک ارادے کا اظہار ہے۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟؟

بھارت میں مسلمانوں پر معیشت اور روزگار کی راہیں جان بوجھ کر بند کی جارہی ہیں، مسلم طلباء یونیورسٹیوں میں تو اعلیٰ درجوں میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے ہیں مگر سرکاری ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں اُن کو ناکام کر دیا جاتا ہے۔ ایک طرف ان بیچاروں پر معاشی دباؤ پڑ رہا ہے اور دوسری طرف ان کے کلچر اور دینی روایات کو مٹانے کی کوششیں تیزی کے ساتھ جاری ہیں!

بالکل سامنے کی باتیں یہ ہیں کہ کتنی مسجدیں اس امن و امان کے دور میں ہندوؤں نے چھین لی ہیں۔ انگریز کے راج میں کان پور کی مسجد کی ذرا سی دیوار کے ڈھائے جانے پر مسلمانوں کے شور و احتجاج سے زمین و آسمان گونج اٹھے تھے اور اب ان کی مسجدیں مندروں میں تبدیل کر دی جاتی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اُن بیچاروں کو فریاد بھی نہیں کرنے دی جاتی۔

؎ گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے

ہندوستان میں مسلم مدرسوں اور مسلم کالجوں کے نام تک بدلے جا رہے ہیں، اس لئے کہ اُن سے "فرقہ واریت" ظاہر ہوتی تھی مگر ہندو درس گاہوں (سناتن دھرم کالج، دھرم سماج کالج ....) کے ناموں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی! "فرقہ واریت" تو بس "اسلام" اور "مسلم" کے نام اور کام میں ہے اور یہ "یک طرفہ سیکولرازم" اسی کو مٹانے کے لئے ہر ڈھکی اور چھپی تدبیر سے کام لے رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نظم و نسق میں کیا کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں، جمعہ کی چھٹی ختم کر کے اتوار یوم تعطیل مقرر کیا گیا۔ کورٹ کی ممبری کے لئے مسلم کی شرط اڑا دی گئی، نصاب، دینیات مسلم طلباء کے لئے لازمی نہیں رہا۔ مگر ہندو یونیورسٹی بنارس میں کسی تغیر و تبدل کو ضروری نہیں سمجھا گیا!

بھارت کے ہندو نیتاؤں کی یہ پالیسی وہاں کے مسلمانوں کے حالات پر جس طرح اثر انداز ہوئی ہے اس کی ایک جھلک تو یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتوں نے ہندوؤں سے شادیاں کی ہیں، اس طرح ان کی حمیت و غیرت کو سب سے پہلے کچلا گیا ہے، انگریز کے زمانہ میں ایسے واقعات پیش آتے تو خون خرابہ ہو جاتا اور یہ تو عوام کا حال ہے، خواص کی مرعوبیت اور پست ہمتی کی یہ حالت ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد جنھوں نے برسوں کلکتہ میں لاکھوں مسلمانوں کی عیدین کی نماز میں امامت کی ہے، جو مفسرِ قرآن ہیں، جن کی پُر جوش تحریریں پڑھ کر یہ توقع ہوتی تھی کہ حق و باطل کے معرکہ میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کی یاد کو وہ تازہ کر دیں گے۔ ان کے دورِ وزارت میں ایسی کتابیں تعلیمی نصاب میں شامل کی گئی ہیں جن میں کھلی ہوئی بت پرستی کی تعلیم دی گئی ہے۔ جن میں اسلامی تاریخ کے واقعات کو مسخ

کیا گیاہے۔ مسلمان طلبار کو پرارتھنا میں شامل ہونا پڑتا ہے اور کہیں کہیں گاندھی جی کی تصویر یا گنیش جی کی مورتی کو ڈنڈوت بھی کرنی پڑتی ہے ـــــ "امام الہند" اور آرٹ گیلریوں کا افتتاح فرمائیں۔ ہائے اتنی دردناک ٹریجڈی! کیا غلامی میں اتنے بڑے آدمیوں کے ضمیر بھی بدل جاتے ہیں!

ابھی تازہ حادثہ پیش آیاہے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب سرکاری طور پر معائنہ کے لئے کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ راستہ میں دیوبند پڑتا تھا، صدر جمہوریہ ہند کی آمد آمد کی خبر سن کر حضرت شیخ الوب دالعجم مولانا حسین احمد مدنی نے دارالعلوم دیوبند کے طلبار کو ہدایت فرمائی کہ وہ سڑک پر جھنڈیاں لے کر پہنچ جائیں اور صدر حکومت کا خیر مقدم کریں! ڈیڑھ ہزار طلبار کا یہ ہجوم غیر معمولی بات تھی راجندر پرشاد صاحب نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں، معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ ہیں، پھر اُن سے خواہش کی گئی کہ وہ کسی دن دارالعلوم کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمائیں۔ اور یہ وہ مثل ہوئی کہ:۔

"آ بیل! تو مجھے مار"

صدر جمہوریہ نے اس گذارش کو شرفِ قبولیت بخشا تاریخ مقررہ پر تشریف فرمائی ہوئی اور اکابر دیوبند نے اپنے عالی مرتبت مہمان کی راہ میں دیوبند کے شرف و مجد، اور اعلیٰ روایات کو پوری کشادہ دلی کے ساتھ بچھادیا اور اپنی نیاز مندی کا طرح طرح سے اظہار کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی مدظلہٗ کی نگاہ میں باطل صرف "انگریز" تھا وہ چلا گیا۔ اب تو ہندوستان میں "حق" کا چلن ہے "حق" کی حکومت ہے۔ "اہلِ حق" اس حکومت کے سربراہ کار ہیں۔ لہٰذا ـــــ

"لن نسمع ولن نطیع"

(نہیں سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے)

کا دور گزر گیا، اب تو "سمعنا واطعنا" کا زمانہ ہے "ترکِ موالات" کا مستحق انگریزی راج تھا، ہندو راج تو مسلمانوں کا محسن اور اسلام کی پشت پناہ رہاہے۔ اس لئے وہ ہر طرح کے اشتراک و تعاون بلکہ "اظہارِ نیاز" کا مستحق ہے افسوس!

ابتلار و آزمائش کے اس سخت دور میں جن سے عزیمت و جرأت اور ثباتِ قدم کی توقع تھی جب اُنہی کے قدم ڈگمگا جائیں اور وہ اظہارِ عزیمت اور جرأت کے بجائے "اظہارِ نیاز" کی سطح پر آجائیں تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتاہے کہ چند سال کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی اخلاقی جرأت، دینی حمیت اور "[illegible]" کی کیا درگت بنے گی۔ اس تصور سے خدا جانتاہے دل لرز لرز جاتا ہے!

ہم نے اوپر جو کچھ کہاہے، وہ اتنی عام، مشہور و متواتر اور ثابت شدہ روایتیں اور حقیقتیں ہیں کہ جو کسی ثبوت و شہادت کی محتاج نہیں ہیں۔ ہوسکتاہے کہ زورِ بیان نے کسی جملہ میں مبالغہ کا تھوڑا بہت رنگ پیدا کردیا ہو مگر ہم نے کوئی ایک بات بھی بے اصل اور بے بنیاد نہیں کہی۔

ہندوستان میں سبھی ہندو، سنگھیوں اور مہاسبھائیوں کے سمان کٹھور دل نہیں رکھتے ان میں سی آر داس آنجہانی کی طرح وسیع القلب اور راجگوپال آچاریہ کی طرح انصاف پسند ہندو بھی ہیں، اُن کے سامنے راجہ ہرش جیسے کے عدل و انصاف کی شاندار روایت بھی ہے ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ کرشن جی نے کوروں پانڈوں کی لڑائی میں حق کا ساتھ دیا تھا!

بھارت کے ہندو بڑی عقیدت کے ساتھ ہر سال دسہرہ کا تہوار مناتے ہیں، ان کا یہ تہوار انصاف اور ظلم اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کی یادگار ہے! "راون" اور اس کے بھائی کمبھ کرن" کے پتلے جلاکر وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ظلم کا آخر یہ حشر ہوتا ہے، اور پاپ کی ناؤ زیادہ دن تک نہیں چل سکتی۔ ظلم کو تھوڑی سی نمود تو حاصل ہوسکتی ہے مگر اسے ثبات نہیں! بلبلہ کی سی زندگی کہ پانی کی سطح پر ابھرا کچھ دیر متحرک رہا اور پھر ٹوٹ گیا!

اپنی ان تاریخی روایات کو ذہن میں رکھ کر وہ یہ سوچیں کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ کیا واقعی ظلم نہیں ہورہا ہے! اور ان پر زندگی تنگ نہیں کی جارہی ہے اور انگریز کے زمانہ میں معاشرے میں جو حیثیت مسلمانوں کی تھی کیا وہ اس حیثیت سے بھی پست تر نہیں

ہوگئے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر اور دل مطمئن ہو جائے کہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر ایشور کے غضب سے اپنے دیس اور راج کو بچانے کی خاطر صورت حال کو بدلنے کی کوشش کریں۔ ہندوؤں سے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے!

ہم مانتے ہیں کہ آج پاکستان میں انتشار و ابتری ہے، یہاں غرض کے بندوں کی حکمرانی ہے، اس لئے پاکستان کمزور ہے۔ مگر یہاں سدا یہی حالت تو نہ رہے گی، حالات انشاء اللہ بدلیں گے اور ضرور بدلیں گے، اس "خزاں" کے بعد "دورِ بہار" بھی آئے گا اور یہ وہ مبارک دور ہوگا۔ جب یہاں کی زمامِ حکومت ان نیک لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اپنے نفس کی خواہشوں اور لذتوں پر قوم و ملت کے مفاد کو ترجیح دیں گے۔ جن کا مطمحِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہوگا اور جو رقاص و میخوار نہیں مجاہد و نیکوکار ہوں گے! جو اسلامی اخوت کے تقاضوں کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے، اور جن کے دل کا گوشہ گوشہ اپنے بھارتی مظلوم بھائیوں کی غمخواری سے لبریز ہوگا۔ اور اس وقت ظلم اپنا انجام دیکھ لے گا!

ایک تو وہ "یوم الجزاء" ہے، جس کا تعلق روزِ حشر سے ہے کہ ہر جان کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر بھی فیصلے کر دیا کرتا ہے اس فیصلہ کا دن انشاءاللہ قریب آ رہا ہے۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ماہر القادری
۲۶ جنوری ۵۰ء

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

فلسفۂ جلال و جمال

انسانی زندگی کے اتنے مختلف پہلو ہیں کہ ان تمام کا جائزہ لینا تو درکنار ابھی تک ان میں سے بہت سے نامعلوم ہیں۔ماہرین نفسیات اس گتھی کو سلجھانے میں برابر لگے ہوئے ہیں۔لیکن فطرتِ انسانی بھی اس قدر گریز پا واقع ہوئی ہے کہ اگر ایک پہلو گرفت میں آتاہے تو دوسرا دبے پاؤں گرفت سے نکل جاتاہے اور ہمارا ماہرِ نفس پھر اپنی جگہ پر حیران کا حیران رہ جاتاہے۔آج کی صحبت میں ہمیں زندگی کے دو اہم پہلو "جلال و جمال" پر مختصر سی گفتگو کرنی ہے۔جلال و جمال دراصل ہماری زندگی کا تانا بانا ہیں جن سے ہماری زندگی کا لباس تیار کیا جاتاہے یہ جلالی اور جمالی کیفیت فی الحقیقت ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہے۔ہم ہر مرئی چیز کو دیکھ کر غیر مرئی کا تصور کرکے جمالی کیفیت محسوس کرتے ہیں یا جلالی۔یہ تاثر و تاثیر کا تسلسل ہماری زندگی کے لمحات کا کسی وقت بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔یعنی ہم زندگی سے نہ جلال کو خارج کرسکتے ہیں نہ جمال کو۔اپنی اپنی مناسب حدود میں ان دونوں کا ہی موجود رہنا ہماری زندگی میں توازن و توافق اور ہم آہنگی پیدا کرسکتاہے۔ان میں سے جو بھی اپنی مناسب حد سے گزر جائے گا۔زندگی کو غیر متوازن اور خارج از آہنگ بنادے گا"جلال و جمال" ایک دوسرے اپنی جگہ پر رہتے ہیں۔مدد دیتے ہیں۔جلال حد سے بڑھنے لگے تو جمال آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیتاہے اور جمال زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو جلال سدِ راہ ہوجاتاہے اس طرح دونوں کے درمیان توازن برقرار رہتاہے اور ہم زندگی میں افراط و تفریط سے بڑی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔

ہمارے مزاج کے جمالیاتی عناصر ہماری زندگی میں حسن اور کشش پیدا کرتے ہیں۔زندگی کی فضا میں لطیف نغمے بکھیرتے ہیں اس خلا میں خوبصورت اور نظر فریب رنگ بھرتے ہیں۔تلخیوں کو بڑی حد تک گوارا بنادیتے ہیں اور ہمیں اس قابل بنادیتے ہیں کہ ہم اس بارگراں کو اپنے ناتواں کاندھوں پر آسانی سے اٹھاسکیں اگر جمالی کیفیات مزاجی ترکیب میں نہ ہوتیں تو زندگی وبالِ دوش ہوکر رہ جاتی۔ایک ایسا بارگراں بن جاتی کہ ہر شخص اسے اپنی پہلی فرصت میں اٹھاکر پھینک دیتا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں غالب کا ہمنوا ہوکر پکار اٹھتا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

زندگی میں جب جمالی عناصر بہت کم ہوجاتے ہیں تو زندگی بے کیف اور ویران سی ہوجاتی ہے۔انسان مایوس، تنوطی اور زندگی سے بیزار ہوجاتاہے اور آرزو کرتاہے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ہر طرف اس کو تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔روشنی کی کوئی کرن امید بن کر اس کی نگاہوں کو نور نہیں بخشتی اسی قسم کے لمحات میں انسانی زندگی کو ناقابلِ حل معمہ اور مرگِ مسلسل کہنے پر مجبور ہوجاتاہے۔فانی مرحوم آخیر عمر میں جمالی کوائف کے فقدان کی وجہ سے ہی زندگی سے سخت بیزار اور مایوس ہوگئے تھے چنانچہ فرماتے ہیں

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ　　　　زندگی نام ہے مرمر کے جیئے جانے کا

لیکن جب زندگی کے لمحات میں ذوقِ جمال کی کارفرمائی ہوتی ہے تو باوجود اس کے کہ محبت رگ رگ سے لہو کھینچتی ہے لیکن زندہ رہنے کی تہمت کو خوشی سے برداشت کر جاتے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوقِ جمال ہمیں حوادثِ روزگار اور غمہائے حیات کو برداشت کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں فانیؔ مرحوم ایسے ہی جمالی تاثرات سے مسحور ہو کر فرما گئے ہیں ؎

مری ایک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے　　　　محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

جیئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی　　　　ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

اصغرؔ گونڈوی مرحوم تو اس سے بھی زیادہ واضح اور پر اعتماد الفاظ میں فرما گئے ہیں ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا　　　　جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

ذوقِ جمال ہمیں اپنی ہی ذات سے محبت کرنا سکھاتا، بلکہ دوسرے انسانوں سے بھی تعلقِ خاطر پیدا کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ انسانوں سے آگے بڑھ کر کائنات کی ہر چیز کے لئے ایک گونہ کشش اور دل بستگی کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ اس کے فیض سے ستاروں کی ٹھنڈی چمک سے لطف اٹھاتے ہیں۔ سبزہ زاروں کی لطافت میں کھو جاتے ہیں۔ پھولوں کے رنگ و بو سے وجد میں آجاتے ہیں، چشموں کے نغموں سے مسحور ہو جاتے ہیں، شبنم کی تازگی اور چاندنی کے نور سے روح میں بالیدگی محسوس کرتے ہیں غرضکہ زندگی میں جو کچھ دلچسپی، کشش اور رنگینی کی رومان آفرینی ہے وہ اس ذوقِ جمال کی مرہونِ منت ہے۔ ذوقِ جمال اور جذبۂ اُنس ہماری فطری وحشت کو بڑی حد تک کم کر دیتے ہیں، ہمیں جنگ و جدال اور خونریزی سے روکتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق خوشدلی سے ادا کرنے پر اکساتے ہیں۔ دوسروں کی تکالیف کو ہمارے لئے ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔ کمزوروں کی مدد پر ابھارتے ہیں، ناداروں کی حاجت روائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ غرضکہ زندگی میں حسن و رعنائی، توازن و اعتدال، سکون و آسودگی پیدا کرنا اسی ذوقِ جمال کا کام ہے۔

لیکن ہماری زندگی میں ہر جگہ متضاد عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ خوشی کے ساتھ غم۔ راحت کے ساتھ تکلیف، ہنسی کے ساتھ رونا۔ پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا وجود زندگی کے ادنیٰ اور عام مظاہر ہیں۔ لیکن خوشی کی حفاظت کے لئے غم کا ہونا ضروری ہے۔ راحت سے لطف اٹھانے کے لئے تکلیف ناگزیر ہے پھول کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے خلشِ خار لازمی ہے۔ مولانا جامیؔ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎ بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید۔ یعنی ایک پھول حاصل کرنے کے لئے سیکڑوں کانٹوں کی چبھن برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کانٹا نہ ہو تو پھولوں کی حفاظت کون کرے۔ پھول کی نزاکتیں اس بات کی تاب کہاں لا سکتی ہیں کہ وہ اپنی حفاظت خود ہی کریں۔ اسی طرح ہر نازک اور حسین چیز کی حفاظت کا سامان قدرت نے خود ہی پیدا کر دیا ہے ہمارے انسانی معاشرے میں بھی حسن، نزاکت، لطافت اور نرمی عورت کو بخشی گئی ہیں اور اس کو جمال کا مظہر قرار دے کر اس کی حفاظت کا کام مرد کی صلابت تہور اور غیرت کے سپرد کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس فطری تقسیمِ کار سے جو روگردانی اور بغاوت کرتا ہے اپنی زندگی تباہ کرتا ہے اور سوائے نقصان کے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ زندگی میں جلالی عناصر کا سب سے اہم فریضہ یہی قرار پایا ہے کہ وہ جمال کی حفاظت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ مریض ذہنیت کے لوگ اس کا غلط استعمال کر ڈالیں یا سرے سے اس کے وجود ہی کے درپے ہو جائیں اور اس کو معدوم کر دیں اور اس کا رنگ و روپ بگاڑ دیں اور رعنائی کو ختم کر دیں

اس کے علاوہ جلالی قوتوں کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہے کہ جمالی قوی کو اپنی مناسب حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں تاکہ زندگی کا توازن باقی رہے اور اس میں کمزوری و ناتوانی پیدا نہ ہو کیونکہ کوئی چیز کتنی ہی بھلی اور مفید کیوں نہ ہو اپنی حد سے بڑھ جائے تو زندگی کے اعتدال کو خراب کر دیتی ہے اور ایسی کوتاہیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔

درحقیقت جلال کے بغیر جمال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس طرح نیکی کا تصور بدی کے حوالے سے۔ روشنی کا تصور تاریکی کے ذریعے سے۔ اسی طرح جمال و جلال کا تصور بھی ایک دوسرے کے حوالے اور مناسبت سے ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی کسی کائنات کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں جمال ہی جمال ہو اور جلال کا وجود نہ ہو۔ نزاکت ہی نزاکت ہو صلابت نہ ہو۔ دنیا اگر آبگینوں سے ہی بھر دی جاتی اور سنگ و خشت پیدا نہ کئے جاتے تو زندگی آبگینوں کی ہی طرح نازک ہو کر رہ جاتی۔ ذرا سی چوٹ اور ہلکے سے صدمے سے چور چور ہو جاتی۔ علامہ اقبال مرحوم نے ضرب کلیم میں جلال کی ضرورت کو بڑے حکیمانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی ۔۔۔ کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر ۔۔۔ نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

جہاں جمال کی خواہش انسانی فطرت میں شامل کر دی گئی ہے وہیں جلالی قوتوں کی ضرورت بھی اس کو فطری طور پر بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ قوت و قدرت کی خواہش انسان میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر حصول کے بعد نئے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ہی یہ خواہش ختم ہوتی ہے رسل (RUSSELL) نے اس سلسلے میں ایک جگہ خوب لکھا ہے کہ "ہر انسان اگر اس کے بس میں ہو تو خدا بن جائے اور یہی جذبہ ہے جو کہ آپس میں تعاون و توافق پیدا نہیں ہونے دیتا اس لئے کہ ہم میں سے ہر شخص کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ معاشرتی تعاون میں ہمارا مقام خدا کا اور دوسروں کا مقام مخلوق یا بندوں کا سا ہو۔ اسی وجہ سے آپس میں مقابلہ اور رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے اور مجبوری حکومت کے اقتدار اور استیلاء کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسی جذبے کے تحت لوگ حکومتوں سے بغاوت کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً خون خرابے ہوتے رہتے ہیں اور یہیں سے زندگی میں اخلاقی قدروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاکہ اخلاقی دباؤ اس انتشار اور لاقانونیت کو روک سکے اور اسی وجہ سے اخلاقی پابندیوں کے کمزور ہوتے ہی دھاندلی اور بے اصولی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے اور اصولی اور باضابطہ زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے"[1]

انسان کی فطرت میں ایک مضبوط اور شدید داعیہ شوکت و تجمل کے حصول و اظہار کا بھی ہے اور اس جذبے کی تسکین کے لئے حصولِ طاقت لازمی ہے۔ طاقت کے بغیر یہ چیز کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی تسکین کے لئے بھی اس کو طاقت حاصل کرنے کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے بلکہ رسل کا تو یہ بھی خیال ہے کہ شوکت و تجمل کے اظہار کا جذبہ معاشی فلاح و بہبود سے بھی زیادہ زوردار ہے اور یہ کہ ضروریاتِ زندگی کے علاوہ جو کچھ مال و دولت انسان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے ہوتا ہے کسی معیشی ضرورت کے لئے نہیں ہوتا۔ معیشی ضروریات تو بہت تھوڑی دولت سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ آدمی دولت کی فراوانی صرف ایک آرام دہ مکان کے حصول کے لئے نہیں حاصل کرنا چاہتا بلکہ ایک شاندار محل تعمیر کرنے کے لئے اس کے درپے ہوتا ہے تاکہ اپنے ہم جنسوں پر فوقیت حاصل کر سکے اور اس طرح اپنے جذبۂ انا کو تسکین دے سکے۔ دوسروں کی جھونپڑیوں سے

---

[1] POWER, A NEW SOCIAL ANALYSIS - BY RUSSELL

اس محل کا مقابلہ کرکے پھولا نہ سمائے۔ یہیں سے مارکس کا یہ فلسفہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ معاشرتِ انسانی میں سب سے اہمیت معاشیات کو حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ معاشی اعتبار سے سب لوگ برابر کر دیئے جائیں تو سوسائٹی میں صرف ایک طبقہ رہ جائے گا۔ معاشی پہلو تو زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو ہے خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ اگر اس پہلو میں لوگ برابر ہو بھی جائیں تو دوسرے پہلوؤں میں درجات میں فرق پیدا ہو جائے گا اور معاشرت میں اس لحاظ سے مختلف طبقات پیدا ہو جائیں گے۔ دوسرے ذرائع سے لوگ علمی، معاشرتی، ثقافتی برتری حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی اس کوشش میں یقینی کامیاب ہو جائیں گے اس لئے کہ انسان پیدائش سے ہی مختلف صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ اس پیدائشی فرق کو کون مٹا کر ایک سطح پر لا سکتا ہے اشتراکیت طبقات کو مٹا دینے کی سب سے بڑی دعویدار بن کر آئی تھی۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ بھی قصۂ ماضی بن کر رہ گیا۔ آپ اس کے عملی کردار کو روس میں دیکھ سکتے ہیں۔ مٹھی بھر اشتراکی ارکان نے ملک کی پوری سیاست پر قبضہ جما رکھا ہے اور جو چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں۔ سیاسی طاقت ہاتھ میں آجانے کی وجہ سے سارے ملک کے تمام ذرائع و وسائل بھی ان کے قبضہ میں ہیں۔ عوام اسی طرح بے بس اور لاچار ہیں جس طرح دوسری قسم کے معاشرے یا حکومت میں ہیں۔ اشتراکیوں کے خونی انقلابات برپا کرنے سے عوام کی زندگی میں کوئی بنیادی اور قابلِ قدر تبدیلی نہ ہو سکی۔ بلکہ اب تو اس قدر سخت شکنجوں میں ان کو کسا جا رہا ہے کہ غریب چیخ اٹھتے ہیں کہ ؎

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی		یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

اس کے علاوہ رسل کا یہ دعویٰ بھی مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ انسان ضروریاتِ زندگی کے علاوہ دولت کو صرف اظہار تجمل و فوقیت کے لئے حاصل کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سی روشن مثالیں ایسی مل سکتی ہیں جنھوں نے دولت حاصل کی لیکن قطعی شان و شوکت کو زندگی میں داخل نہ ہونے دیا۔ عیش و عشرت کی زندگی گزاری تو پوشیدہ طریقے سے، نیک کاموں میں خزانے لٹا دیئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ غرضکہ زندگی کی دوسری مسرتیں حاصل کیں لیکن فوقیت اور برتری کے جذبات کی تسکین کے لئے کوئی کوشش نہ کی۔ اورنگ زیب کی کتنی واضح مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے جان کی بازی لگا کر حکومت حاصل کی۔ لیکن زندگی فقیرانہ ہی گزاری۔ زندگی کے کسی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے ہی دراصل توازن خراب ہوتا ہے اور ذہن انسانی کی دراصل یہی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ ہر چیز کو مناسب مقام دینے سے قاصر رہ جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرف ضرورت سے زیادہ جھک جاتا ہے اسی وجہ سے انسان کے اپنے بنائے ہوئے معاشرتی قوانین تھوڑے عرصے کے بعد ہی ناقص ثابت ہوتے ہیں اور زندگی کی ہمہ گیری اور نیرنگی کا زیادہ عرصے تک ساتھ نہیں دے پاتے۔ یہیں سے خدائی قوانین اور ضوابط کی ضرورت اور افادیت کی اہمیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ زندگی گزار چکے ہیں اور گزارتے ہیں جنھوں نے از خود فقر و فاقہ کو اپنی زندگی پر مسلط کر رکھا ہے اور وہ اپنی زندگی سے بڑے مطمئن اور خوش ہیں۔ اس مثال سے یہ ثابت ضرور ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی کے بہت سے گوناگوں مطالبات ہیں اور ان کے بہت سے پہلو ہیں اس لئے سارا زور کسی ایک پہلو پر صرف کر دینا کم عقلی اور بے بصری ہے۔ انسان کی شخصیت انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے اسی وقت مکمل ہوگی جب کہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کو نظر میں رکھا جائے۔ اس کی تربیت کی جائے اور اس کے مطالبات جائز و معتدل حدود تک پورے کئے جائیں اسی طرح حیاتِ انسانی میں اکمال و ارتقاء کی نمو اور جذبہ کو حسنِ اعتدال کے ساتھ بروئے کار لایا جا سکتا ہے ورنہ زندگی یک رُخی نامکمل اور تشنہ رہے گی۔

طاقت جو کہ جلالی جذبات کو قوت سے فعل میں لاتی ہے اس کی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً دولت کی طاقت۔

علم کی طاقت، فوجی طاقت وغیرہ ہم کسی قسم کی طاقت کے حصول کو ناجائز قرار نہیں دے سکتے۔ بشرطیکہ اس کا استعمال جائز، مناسب اور بلند اخلاقی حدود کے اندر ہو۔ اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ غریبوں اور کمزوروں کو نہ ستایا جائے ان کو ذلیل پست نہ خیال کیا جائے۔ ان کی آزادی کو سلب نہ کیا جائے۔ بلکہ اخلاقی شرائط کی پابند ہو کر طاقت لازمۂ حیات قرار دیجا سکتی ہے اور مجھے پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ طاقت کے استعمال کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے فطرتِ انسانی کے جمالیاتی مظاہر بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ انسان کا ذوقِ جمال اگر صحیح طریقے سے تربیت یافتہ ہو تو یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ خود تو زرنگار محلات میں رہے اور اس کے چاروں طرف گندی جھونپڑیاں پڑی ہوں۔ خود ریشم اور مخمل پہنے اور اس کے ملازم، عزیز، دوست، اور پڑوسی، چیتھڑے لپیٹے پھریں۔ اس کا ذوقِ جمال اس کو مجبور کرے گا کہ اس کا گردوپیش بھی صاف ستھرا ہو خواہ اسے اپنے محل کے نقش و نگار میں۔ اپنے لباس کی چمک دمک میں کچھ کمی ہی برداشت کرنی پڑے۔

ہر خواہش جو انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اس کی تکمیل کے ذرائع اپنی پوری قوت کے ساتھ تلاش کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو طاقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن طاقت کو طاقت کے لئے حاصل کرنے اور طاقت کو کسی نیک مقصد کے لئے حاصل کرنے میں بڑا فرق ہے مثلاً سیاسی طاقت کو لے لیجئے کہ جو شخص سیاسی طاقت کو کسی اچھے مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہے گا وہ جماعتی منشور اور تنظیم کا ہر حال میں پابند رہے گا۔ لیکن جس کا مقصد ذاتی مفاد ہوگا۔ وہ کسی اور چیز کا وفادار نہیں ہو سکتا اس کو جس طرف ذاتی فائدہ نظر آئے گا۔ بڑی دیدہ دلیری اور بے خیالی سے اسی طرف چلا جائے گا۔ خواہ لوگ اس کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ ایسا شخص اپنے ضمیر کا بھی گلا دبا دیتا ہے۔ جہاں دوسروں کی نہیں سنتا وہاں اپنے دل کی آواز سننا گوارا نہیں کرتا۔ ایسا انسان کسی اخلاقی ضابطے اور تنظیمی اصول کا بھی پابند نہیں ہو سکتا۔ تھالی کا بینگن ہوتا ہے کہ ہر طرف لڑھک جاتا ہے درا صل طاقت کے حصول کا جواز اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ طاقت کسی اچھے کام کی نیت سے حاصل کی جائے خواہ اپنی ذات کے لئے ہو یا اپنی قوم کے لئے طاقت اگر اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جائے تو خطرناک ہو جاتی ہے۔ بقول رسل کے اس مقصد (طاقت سے نیک کام لینا) کو حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ آجکل ہمدردی کی کمی اور حصولِ برتری کے جذبات کی خدمت ہے۔ یہ دونوں خرابیاں یا تو مذہب کی تبلیغ کے ذریعہ سے دور کی جا سکتی ہے یا اخلاقی قدروں کے بروئے کار لانے یا پھر ان معاشی اور سیاسی حالات کو دور کرنے سے جو مغائرت پیدا کرنے اور فوقیت کے جذبے کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔[۱]

یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا اگر میں اسلام کے نظریۂ قوت کے متعلق کچھ نہ لکھوں۔ قرآنِ کریم نے انسانی فطرت کو صحیح طریقے پر واضح کرتے ہوئے زندگی کے دونوں اہم اجزا رجلال و جمال کی پوری اہمیت کو واضح کر دیا ہے۔ اس میں زندگی میں جمال پیدا کرنے کی ہدایتیں بھی دی گئی ہیں اور جلال و قوت پیدا کرنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ احادیث نے بھی ان دونوں چیزوں کے حصول کی تائید و حمایت کی ہے۔ خوبصورت چیزوں کو پسند کرنا۔ لباس و رہائش میں ستھرائی کا خیال رکھنا۔ غذا میں مناسب خوبی کا اہتمام کرنا ان تمام چیزوں کا جواز موجود ہے۔ اس سلسلے میں نبی کریمؐ کا یہ قول خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ دنیا میں مجھے خوشبو، گھوڑا اور عورت بہت مرغوب ہیں۔ یہ تینوں چیزیں آسودگی، تجمل، ذوقِ جمال کی تسکین اور حصولِ قوت

---

[۱] POWER ; A NEW SOCIAL ANALYSIS — BY RUSSELL

کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بھی ہیں جن کے ذریعہ سے مسلمانوں کو قوت حاصل کرنے اور کفار و مشرکین سے جہاد کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ ایک جگہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانو! اپنے جنگی گھوڑے اور ہتھیار ہر وقت تیار رکھو تاکہ دشمن پر تمہارا رعب قائم رہے۔ گویا جلال و جمال کے مناسب امتزاج سے زندگی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔

اسلام کے نظریۂ جلال و قوت کو پہلے مولانا روم نے اس کے بعد علامہ اقبال نے بڑی وضاحت اور انتہائی شغف سے لکھا ہے انھوں نے شاہین کو مسلمان کے جلالی پہلو کا مظہر قرار دیا ہے۔ بقول بہادر خاں مرحوم کے "اس سے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگسِ خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز و فضا پیما ہے۔ اقبال کے کلام کا رنگ شاہبازی سکھاتا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ مسلمان کا مقام صحبتِ مرغ چمن نہیں بلکہ وسعتِ ارض و سما ہے" اقبال کے نزدیک علم و فراست بھی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و سپر سے آراستہ نہ ہو ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرطِ اوّل مردِ غازی کی تیغ و سپر سے موانست ہے فرماتے ہیں ؎

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم　　　که از تیغ و سپر بیگانه سازد مردِ غازی را

اقبال کو زندگی کی نرم روی پسند نہیں ہے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان طوفانی زندگی گزاریں۔ تن آسانی کی زندگی کو وہ زہرِ قاتل سمجھتے ہیں۔ وہ موجوں سے لڑ کر اپنا راستہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کشتیٔ حیات کو موجوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتے ؎

میارا بزم بر ساحل که آنجا　　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز　　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ایک جگہ مسلمان کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

دیکھئے ان مندرجہ بالا چار عناصر میں سے دو جلالی ہیں دو جمالی۔ اس طرح گویا علامہ نے ایک مسلمان کی زندگی میں جلال و جمال کو بالکل برابر کا حصہ دیا ہے۔ اسی وجہ سے ایک معیاری مسلمان کی زندگی نہایت متوازن اور معتدل بن جاتی ہے۔ کسی پہلو میں افراط و تفریط کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ علامہ اقبال زندگی کے جلالی نقطۂ نظر کی وجہ سے ان صوفیوں کی زندگی کو پسند نہیں کرتے جو زندگی میں جد و جہد کرنے کی بجائے اس سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ میدانِ عمل میں آئیں اپنی خانقاہ کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جاتے ہیں۔ زندگی کے ہنگاموں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اپنی روزی بھی خود کمانے کی فکر نہیں کرتے اور مریدوں کی بخشی ہوئی خیراتی روٹیوں پر گزارا کرنا گوارا کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خانقاہیت کے تخیل کا بانی افلاطون کو قرار دیا جاتا ہے اسی وجہ سے علامہ نے افلاطونیت کو "مذہب گوسفنداں" سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ مرحوم نے ایک جگہ ایسے ہی صوفیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　　بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی　　　اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

ایک عقیدت مند کے قلم سے

حیاتِ شبلی اور مولانا سہیل

اقبال سہیل مرحوم کے ایک معتقد مضمون نگار نے علی گڑھ کے اُردو ادب میں " ذکر سہیل " کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، اس میں انھوں نے سید سلیمان تو سید سلیمان، ان کے استاد شبلی تک پر ان کو فوقیت دی ہے۔ مثلاً یہ کہ " شبلی اپنی تنقیدوں میں لطافت ذوق کا ثبوت تو ضرور دیتے ہیں۔ لیکن سہیل کے یہاں مذاق بلند کے ساتھ وسعت نظر، ترتیب و تنظیم اور تشریح و تحلیل بھی ملتی ہے "۔ یعنی شبلی کے یہاں یہ چیزیں مفقود ہیں اور اپنی تنقیدی کتابوں اور مضامین میں، کہیں ان سے کام نہیں لیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولانا سہیل اگر زندہ ہوتے تو اوّلاً اپنا موازنہ ان سے پسند نہ فرماتے۔ دوسرے ان کے متعلق یہ سوء ادبی تو سہیل کے لئے حد درجہ ناقابل برداشت ہوتی، شبلی کے متعلق ان کا کیا عقیدہ تھا، وہ شبلی کو کیا سمجھتے تھے، شبلی کے کمالات کے متعلق ان کی کیا رائے تھی، اس کا اندازہ تو سیرت شبلی کے ناتمام اوراق ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ جس کو مضمون نگار نے بطور تحدی کے، حیات شبلی کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ کاش کہ مولانا شبلی پر اتنی سخت تنقید کرتے وقت وہ سیرت شبلی کے انہی اوراق کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیتے۔ انھوں نے مولانا شبلی کی تحریروں میں جن چیزوں کے فقدان کی شکایت کی ہے انہی کا وہ اپنی تصنیفات اور مضامین میں لحاظ رکھتے تھے، ان کی وسعت نظر کے اور تو اور سر سید علیہ الرحمۃ تک قائل تھے اور اپنی سوانح عمری کے لئے سب سے پہلے ان کی نظر اردو زبان کے اسی وسیع النظر اور دقیقہ رس مصنف پر پڑی تھی۔ لیکن اس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور یہ فرض اسی کی مجلس علم و ادب کے دوسرے کامل الفن بزرگ مولانا حالی کو انجام دینا پڑا، جہاں تک ترتیب و تنظیم کا تعلق ہے۔ مولانا شبلی اپنے دور میں اس کے بادشاہ تھے ان کی ساری تصنیفات۔ ان کی خوش سلیقگی، حسنِ نظم اور کمال ترتیب کا مظہر ہیں۔ جن میں موضوع سے متعلق بہترین مواد جو ممکن ہو سکتا تھا انھوں نے اکٹھا کر دیا ہے اور اس اعتبار سے وہ اپنے تمام معاصرین اور ہم چشموں میں بدرجہا بلند ہیں جنھوں نے ان کی موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کی پانچوں جلدیں پڑھی ہیں، کیا کبھی ان کو یقین آ سکتا ہے کہ ان میں تشریح و تحلیل کی کمی ہے، شعر العجم کی چوتھی جلد میں فردوسی کی شاعری اور اس کی مشہور مثنوی شاہنامہ پر انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے کیا اس پر ایک حرف کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے؟ انھوں نے شعر العجم کی تمام جلدوں میں تشریح و تحلیل کا ایسا حق ادا کر دیا ہے کہ ان کے سامنے مولانا آزاد کی نگارستان فارس اور براؤن کی ہسٹری آف پرشین لٹریچر تک ہیچ ہو گئیں اور اس کا اعتراف خود براؤن نے اپنی کتاب میں کیا ہے؛ بہر حال ہم کو اس وقت شبلی کے ساتھ مضمون نگار نے جو بے انصافی کی ہے اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا نہیں ہے اور پھر یہ کام ہم سے کہیں بہتر خانقاہ نشینانِ شبلی انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے اس مضمون میں حیات شبلی مصنف مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو زیادتی

کی ہے اس پر ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ گو یہ فرض بھی رفقائے دارالمصنفین ہی کا ہے، جنھوں نے ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل، ان کے تصنیفی مشن کی تبلیغ اور ان کے نظریات و افکار کی ترجمانی کی ذمہ داری لی ہے۔ لیکن چونکہ سید صاحب اپنے نظر و فکر کی وسعت کے اعتبار سے کسی ایک ادارہ یا کسی ایک مدرسۂ فکر کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے اس لئے ان پر کچھ لکھنے، اور ان کے معترضین و منتقدین کی نکتہ چینیوں اور اعتراضات کے دفاع کا حق ہر اس شخص پر ہے جو ان سے عقیدت رکھتا ہے یا ان کے علم و ادب کا شیدائی ہے جس نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر یہ مضمون انجمن ترقیٔ اُردو کے ادبی آرگن میں جس کے مرتب و نگراں آل احمد سرور جیسے ناقد فن ہیں شایع نہ ہوتا تو ہم اس کی طرف اعتنا بھی نہ کرتے لیکن چونکہ بعض حلقوں میں اس سے سید صاحب کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے اس لئے اس کا ازالہ ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے حسنِ بیان اور اپنے طرزِ ادا کو چمکانے کے لئے سہیل کی ناتمام سیرت شبلی سے مکمل جملے اور فقرے بغیر حوالہ کے مستعار لئے ہیں۔ ــــــ یہ شوخ نگاری اس بزرگ کی شان میں کی گئی ہے جو اُردو زبان کا مسلمہ ادیب، دارالمصنفین کا صدر نشین اور شبلی کے علوم و معارف کا حامل، سیرت شبلی کا جامع، سیرت عائشہؓ، حیات امام مالکؒ اور خیام جیسی درجنوں کتاب کا مصنف اور معارف جیسے علمی مجلّہ کا مرتب تھا، جس نے قرآن حدیث اور فقہ و کلام تو الگ رہے، نفسِ اردو زبان پر متعدد مضامین لکھے، ادبی جلسوں کی صدارت کی، ان میں خطبے دیئے، اردو زبان کی ترقی و بقاء کے لئے مختلف تجاویز، تبصرے اور اسکیمیں پیش کیں! مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جس کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں اس کو ڈی لٹ کی ڈگری پیش کی ایسے جامع و ہمہ گیر مصنف اور صاحب طرز ادیب کے بارے میں کس دیدہ دلیری کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے حسن بیان کے لئے کلکِ سہیل کا محتاج تھا اور اس نے سہیل کے جملے اور فقرے مستعار نہ لئے ہوتے تو ان کی کتاب میں جان پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی اس کتاب میں جہاں جہاں حسن انشاء اور ندرت بیان ہے۔ وہ تمام تر سہیل کا شرمندۂ احسان ہے ؎

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مولانا شبلی کی شاگردی کی نسبت کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولینا سہیل میں کوئی وجہ اشتراک تھی ہی نہیں دونوں کی دنیا الگ الگ تھی، ایک محض شاعر اور ادیب تھا اور دوسرا سب کچھ تھا مفسر تھا، متکلم تھا، فقیہ تھا مورخ تھا، جغرافیہ دان تھا محقق تھا، مصنف تھا، ادیب تھا، انشاء پرداز تھا، نقاد تھا، لغت و ادب کا امام تھا، انشاء پردازی کی قوت اللہ نے اوسکو جو ودیعت کی تھی اس لئے، اس نے اسلامی علوم و فنون کی خدمت و اشاعت کا کام لیا، اس نے اُردو زبان میں جو کتابیں لکھیں وہ اپنے موضوع پر منفرد ہی نہیں بلکہ فارسی و عربی کسی مشرقی زبان میں ان کی مثال نہیں مل سکتی اس بعض کتابوں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، یوں تو اس کی ساری کتابیں قابلِ قدر ہیں۔ لیکن ایک کتاب "خیام" جو اس نے پروفیسر اقبال اور محمود شیرانی کی شعر العجم کی تنقید کے جواب میں لکھی تھی، وہ ہے جس کی داد ہندوستان سے لے کر ایران و کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی کے موقعہ پر حکومت افغانستان نے ایران کو جو علمی و ادبی تحائف پیش کئے ان میں ایک سید سلیمان ندوی کی مایہ ناز کتاب "خیام" بھی تھی۔ ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک خط لکھا کہ "عمر خیام" پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی و مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، "نادر شاہ نے ملک افغانستان کے نظام و نصاب تعلیم کی اصلاح کے لئے، پنجاب سے ڈاکٹر اقبال کو، علی گڑھ سے سر راس مسعود کو اور

ندوۃ العلماء لکھنؤ سے سید سلیمان ندوی کو مدعو کیا، وہاں کے زمانۂ قیام میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا اور اس میں انجمن کی طرف سے ان کو ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا، افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ صاحب نے ایک نظم پڑھی، سید صاحب کے متعلق اس میں یہ اشعار تھے۔

چہ کلکش بمعنی طراز ندہ شد   خیالات شبلی ازو زندہ شد
چہ درشاہراہ حقائق شناخت   معارف ازو رونق تازہ یافت
مضامین او جملہ محکم بود   نگارش بکلکش مسلّم بود

یوں تو سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ آپس میں خط و کتابت بھی تھی۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی پر معارف میں تبصرہ بھی کیا تھا، اور ایک حد تک دونوں ایک دوسرے کے فضل و کمال اور علم و دانش کے بھی معترف تھے۔ جلسوں اور کانفرنسوں اور ادبی محفلوں میں بھی یکجائی ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے پڑھنے اور تجربہ کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، جو سفر افغانستان میں پیش آیا اور بحمداللہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی شخصیتوں اور غیر معمولی قابلیتوں سے یکساں متاثر ہوئے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار ایک موقع پر ان الفاظ میں کیا۔

"وہ مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے۔ جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں، اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"

یہ سید صاحب جیسے فاضل و محقق کے متعلق ایشیا کے سب سے بڑے شاعر، حکیم و فلسفی کے تاثرات ہیں، اس سے آپ سید صاحب کے ادبی و علمی کمالات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کے مشہور صاحب طرز ادیب جناب رشید احمد صدیقی نے "خیام" کے سلسلہ میں جہاں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب عالمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی اور عالمانہ بصیرت کی تعریف کی ہے۔ وہاں ان کی ادبی پرکھ کی بھی داد دی ہے اور لکھا ہے کہ خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا، کہ معرکہ کی ایک تصنیف تو اردو میں دیکھنے میں آئی جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ خراج تحسین پیش کر رہا ہے، جس کی ادبیت کا لوہا بڑے بڑے لوگ مانتے ہیں، جن کے دامن تربیت میں آل احمد سرور جیسے ادیب و نقاد پرورش پا کر نکلے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی رسالہ میں ایک مرتبہ اردو کالج کراچی کے ایک لکچرار عبدالقیوم صاحب کا ایک مضمون "حالی بحیثیت سوانح نگار" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جو تمام تر حالی کی منقبت پر مشتمل ہے، اس مضمون میں اردو کی بہترین سوانح عمریوں کے سلسلہ میں جہاں حیات شبلی کا ذکر آیا ہے، بے اختیار اس کے زبان قلم سے یہ جملہ تراوش کر گیا ہے، کہ حیات جاوید کے بعد اردو ادب میں حیات شبلی ایک پر از معلومات سوانح عمری ہے اس کی اشاعت نے اردو میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، سید سلیمان نے ایک ہزار صفحات میں بہت سا قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے اور مشرقی بزرگوں اور علما نوادروں کی ایک طویل اور مسلسل تاریخ سمو دی ہے

حیدرآباد کے ایک پروفیسر کی نظر سے یہ کتاب گزری تو اس نے لکھا کہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر مالی ہے

وہ تاج فضیلت چھین لیا۔ جو حیاتِ جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔

ابھی حال میں دلی کے مرکزی ریڈیو اسٹیشن سے اردو کی بہترین سوانح عمریوں پر جو تقریریں نشر ہوئی تھیں ان میں ایک تقریر حیات شبلی پر بھی تھی جس کو مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے شیوہ بیان اور صاحب طرز ادیب نے لکھ کر پیش کیا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ اردو میں اب تک جو بہترین سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، مثلاً حیات سعدی، یادگار غالب، الفاروق، المامون، حیات جاوید، نظام الملک طوسی، حیات وقار وغیرہ وغیرہ ان میں ایک حیات شبلی بھی ہے۔ جس پر اردو زبان کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

ان ہی ماجد صاحب نے جو خود بھی اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں، اپنے ایک مضمون "نقوش سلیمانی" مندرجہ معارف سلیمان نمبر میں ان کے ادب و انشاء کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے "سید اور جو کچھ بھی ہوں (اور یقیناً وہ بہت کچھ تھے بھی) ان کے اس مرتبۂ امتیاز سے کوئی انھیں محروم نہیں کر سکتا کہ وہ ایک ادیب صاحب طرز تھے، طرز ان کا شگفتہ و لطیف، ایک انشا پرداز تھے، شوخ و ظریف، نقاد تھے، گہری نظر رکھنے والے، سخن سنج تھے۔ کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے نکھنوی نہ تھے پر لکھنوی ہی تھے، اپنے استاد شبلی نعمانی ہی کی طرح بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر"

خود سہیل کو سید کے فضل و کمال اور ادب و انشاء کا کس حد تک اعتراف تھا، اس کے ثبوت کے لئے ایک تہنیت نامہ کے یہ چند اشعار درج ہیں جو انھوں نے سید صاحب کے ایک طویل علالت کے بعد صحت یاب ہونے کے سلسلہ میں فی البدیہہ کہا تھا اور خود ہی پڑھ کر ایک مجلس میں جس میں شہر کے معززین، وکلاء اور ارباب علم و ہنر شریک تھے۔ سنایا بھی تھا۔

کیست در ہند کنوں جز تو کہ در بزم کمال " کاشف عقدۂ اسرار بدنیاں آمد

نوکِ کلکِ تو زبس لعل و گہر می پاشد ہند را برزن و بازار بدخشاں باشد

مرجع علم و ادب ہستیٔ دہموار ترا کرم داور و ادا رنگہباں آمد

اینک از مرقد استاد صدا می آید

کہ بہار آمد و بیمار بہ اماں آمد

اب ہم مضمون نگار کے اس الزام کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس نے مولانا سید سلیمان ندوی پر عائد کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو ہم مولانا سید سلیمان ندوی کے آفتاب کمال کے پیش نظر یہ شعر لکھ کر اپنے حق سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

لیکن ہم ذرا تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں کہ اس الزام کی کیا حقیقت ہے اور کیا درحقیقت مولانا سید سلیمان اس قدر درماندہ اور عاجز تھے کہ انھوں نے محض اپنے طرز ادا کو چمکانے کے لئے سیرت شبلی کے بہت سے جملے اور فقرے نقل کر لئے اور اس کا حوالہ دینا مناسب نہ سمجھا، جہاں تک ان کی زبانی کسی واقعہ کے سننے اور نقل کرنے اور پھر اس کا حوالہ دینے کا تعلق ہے انھوں نے اس سلسلہ میں پوری کتاب میں کہیں کوتاہی نہیں کی ہے، جو بھی واقعہ ان کی زبان سے نقل کیا ہے، اس کا وہاں حوالہ ضرور دیدیا ہے، اور اس طرح کے واقعات تین چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے لیکن جہاں تک محض طرز ادا کو چمکانے کے لئے ان کے فقروں اور جملوں کے نقل اور مستعار لینے کا تعلق ہے تو وہ صریح تہمت و افترا اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ کوئی معمولی سے معمولی اہل قلم بھی جس کو لکھنے پڑھنے کا کچھ بھی شعور رہے یہ ننگ گوارا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسا شبلی کا آغوش پروردہ صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز جس کے

قلم کا ایک ایک فقرہ لعل و گوہر سے بھی زیادہ گراں ارز ہے جس کے محققانہ اسلوب نگارش کا آج بھی اہل علم و اہل تحقیق کی ایک معتد بہ جماعت تتبع کر رہی ہے جس کے جواہر پاروں کا خزانہ نقوش سلیمانی ہے، جو مکاتیب شبلی، مکاتیب مہدی کلام شاد، حیات عشق کا مقدمہ نویس، کلام اکبر کا ناقد، شعلۂ طور کا افتتاحیہ نگار، اور الہلال کلکتہ کا شعلہ نگار اہل قلم تھا، جس کی زبان کا ایک ایک لفظ سننے کے لئے دنیا گوش بر آواز اور جس کے قلم کا ایک ایک حرف پڑھنے کے لئے شائقین ادب ہمہ تن چشم انتظار رہتے تھے۔ وہ شذرات نہیں لکھتے تھے بلکہ نثر میں شاعری کرتے تھے، اور ان کے شعر منثور کو ارباب ذوق مزے لے لے کے پڑھتے تھے۔

اگر انھوں نے حیات شبلی میں کوئی واقعہ سہیل ہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے تو ایسا کسی عجز و درماندگی کی بنا پر خدانخواستہ نہیں کیا ہے، بلکہ انتہائی احتیاط اور کمال دیانتداری کی بنار پر کیا ہے اور یہ کوئی عیب نہیں۔ ایک محتاط مصنف کا حسن ہے اور پھر یہ خود سیرت شبلی کے مرتب کے لئے قابل فخر بات ہے کہ اس کے چند اوراق کو حیات شبلی کے مصنف نے قابل استناد سمجھا اور اس کی روائیتوں کو من وعن اسی کے الفاظ میں اپنی زندگی کی آخری اہم کتاب میں نقل کر دیا۔ ورنہ کون جان سکتا تھا کہ مولانا کے ایک مقامی اور ہم برادری شاگرد نے بھی جس کی شاگردی کا مولانا شبلی کی کسی تحریر سے ثبوت نہیں ملتا، سیرت شبلی لکھنے کی کوشش کی، لیکن اپنے طبعی لاابالی پن کی وجہ سے وہ اتمام کو نہ پہونچا سکا

"سیرت شبلی" کے عنوان سے شبلی پر جو مضمون الاصلاح میں نکلا، وہ تھا تو درحقیقت ۱۵ نمبروں میں، لیکن سید صاحب قبلہ کی نظر سے اس کے چھ ہی نمبر گذرے اور انہی چھ نمبروں کا سید صاحب نے حیات شبلی میں حوالہ دیا اور انہی سے انھوں نے مولانا شبلی کے خاندانی حالات، بچپن اور جوانی اور علی گڑھ کے زمانہ قیام کے بہت سے واقعات کہیں اپنے الفاظ میں اور کہیں انہی کے الفاظ میں نقل کئے ہیں۔ جن کے لئے کتاب میں بار بار حوالہ دینے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر مولانا کے بعد کے علمی و تعلیمی و ادبی قومی و سیاسی کارناموں اور خدمات کے مقابلہ میں یہ چنداں کچھ وقیع اور اہم بھی نہیں تھے۔ اس لئے ان پر وہ زور قلم کیا صرف کرتے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بالکل غلط ہے کہ چھیوں نمبروں کے سارے واقعات و حالات من وعن نقل کر دیئے ہیں۔ الاصلاح کے وہ چھ نمبر کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں اور ہم نے ان کو دیکھا ہے۔ ان میں شبلی کے واقعات زندگی کے لکھتے وقت جو حک و اضافہ سید صاحب نے فرمایا ہے اس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور اس طرح کا اخذ و استنباط بالکل جائز ہے اور ہر مصنف اور مضمون نگار کرتا ہے اور اس کو کوئی ادبی اور تصنیفی جرم نہیں سمجھا جاتا، اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا شبلی کے خاندانی حالات و ابتدائی واقعات زندگی کا جاننے والا، اور ان کو قرینہ سے مرتب کرنے والا مولانا عبدالسلام ندوی کے بعد، مولانا اقبال سہیل کے سوا، مولانا برادری میں تھا کون۔ جس کو یہ خدمت سپرد کی جاتی۔ مگر سید صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ اعانت کچھ دنوں کے بعد مستقل فتنہ بن جائے گی، اور سہیل کے معتقدین و منتسبین اس کو ان کا ادبی جرم قرار دیں گے۔

پہلے ابتدائی حالات، اور مکاتیب شبلی کے مستند ترین ذخیرہ سے کچھ متفرق واقعات عبدالسلام ہی نے قلمبند کئے تھے اور انہی کا مبیضہ اٹھا کر مولانا سہیل کو دیدیا گیا تھا۔ اور بقول سید صاحب اسی مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے مولانا سہیل نے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ظاہر ہے کہ اس کو جوں کا توں نقل کر کے سید صاحب ایک بزم کی کتاب کو ان کے جذبات کی رعایت سے رزم نامہ نہیں بنا سکتے تھے انھوں نے حیات شبلی میں جہاں سرسید اور شبلی کی کشمکش کا ذکر اور شبلی کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے وہاں نہایت فیاضی سے علی گڑھ کے فیوض و برکات کا اعتراف

بھی کیا ہے۔ جو غیر شعوری طور پر شبلی پر اثر انداز ہوئے اور شبلی ان سے اثر پذیر ہوئے، سرسید کے فیض صحبت سے کتاب میں کہیں انکار نہیں کیا گیا ہے۔ جس کا شاید علامہ سہیل اپنے سیاسی رجحانات کی بنا پر اعتراف نہیں کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کیا وہ شبلی کے مقابلے میں سرے سے سرسید کی فضیلت کے قائل ہی نہیں تھے، وہ اپنی اس رائے میں بالکل منفرد تھے اور آخر تک اس میں کوئی تبدیلی انھوں نے گوارا نہیں کی، علیگڑھ، مسٹر بیک، سرسید کی سیاسی پالیسی، ان کا مستقل موضوع سخن تھا اور اس پر وہ خوب خوب داد سخن دیتے تھے۔ بلکہ اس میں حد انصاف سے بھی گزر جاتے تھے جس کو سہیل کے حوارئین تو پسند کرتے تھے لیکن سید صاحب جیسا ذمہ دار مصنف اس سے کیسے ہم آہنگ ہو سکتا تھا، انھوں نے سرسید اور شبلی کی کشمکش کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن اس حد تک جہاں تک تاریخ نے ساتھ دیا ہے، اور جہاں سے جذبات کی سرحد شروع ہوتی ہے اس سے قطعی احتراز کیا ہے، اور ایک غیر جانبدار مورخ سے اسی کی توقع کی جا سکتی ہے انھوں نے جو واقعہ بھی ان سے نقل کیا ہے وہاں ان کا حوالہ ضرور دیدیا ہے۔ دوسرے ماخذ اور کتابوں کا حوالہ تو مولانا شبلی اور ان کے مدرسۂ فکر اور کلیات انشاء خاص چیز ہے بلکہ اولیات میں داخل ہے۔ جس کا اس سے پہلے رواج نہیں تھا اور اب اس کا عام طور سے اتباع کیا جاتا ہے۔ سید صاحب کوئی واقعہ یا کوئی اقتباس کسی کی کوئی تحریر بغیر حوالہ کے نقل کیسے کر سکتے تھے، یہ ضرور ہے کہ ابتدائی حالات جو چند صفحوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان میں ہر جگہ حوالہ نہیں دیا ہے۔ نہ چنداں اس کی ضرورت تھی، اس لئے کہ دیباچہ میں ایک مستقل سرخی "معاونوں کا شکریہ" کے تحت سید صاحب نے ان تمام علمی معاونوں کا شکریہ ادا کیا ہے، جن سے ان کو اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مدد ملی، یا جنھوں نے مولانا شبلی کے متعلق، مولانا شبلی کے عہد کے اخبارات و رسائل کے فائل اور بہت سی تحریریں فراہم کیں ان کی زندگی کے متعلق واقعات نقل کر کے بھیجے، ان میں مولانا اقبال سہیل کا نام بھی ہے جن کی تحریر سے اعظم گڈھ کے محض علمی واقعات اور مولانا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں ان کو بڑی مدد ملی، اب اس کے بعد آپ ہی انصاف کیجئے کہ مزید حوالہ کی کیا ضرورت تھی، اور پھر ابتدائی حالات اور زندگی کے متفرق واقعات کے جمع کرنے میں مولانا سہیل کے ساتھ، مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے، اور اس سلسلہ میں سید صاحب نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا ہے بلکہ مولانا سہیل نے مولانا عبدالسلام ہی کے بے روح مسودہ کو سامنے رکھ کر علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے کچھ واقعات کا اضافہ کیا ہے جو انھوں نے مولانا سے خود، یا اپنے بزرگوں سے سنے تھے، یا جن سے براہ راست ان کا تعلق رہا ہے۔

اب ہم ذیل میں وہ واقعات لکھتے ہیں، جو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی زبانی اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔

صفحہ ۹۳ پر سفر حج کا واقعہ ان کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ۱۸۹۶ء میں علامہ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا

الرمح لا املأ کفی بہ   واللبد لا اتبع تزوالہ

نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا   اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی شرح مولانا بیان کرنے لگے تو فرمایا کہ سفر حج میں ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی کا طریقہ عملاً سکھایا۔ تب جا کر اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ اہل عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں پکڑتے بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لئے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں تاکہ حریف کے جسم میں نیزہ کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے۔ صفحہ ۱۸۲ پر ایک اور واقعہ ان کی

زبانی نقل کیا ہے کہ جس زمانہ میں مولانا اپنی مشہور و معروف کتاب الکلام لکھ رہے تھے ایک دن ایک صحبت میں انھوں نے اقبال صاحب سے فرمایا کہ تم وجود باری پر کوئی مضبوط عقلی دلیل دے سکتے ہو۔ انھوں نے متداول عقلی دلیلیں پیش کیں جن کو مولانا نے رد کر دیا اور کہا کہ متکلمین کی یہ فلسفیانہ دلیلیں وجود باری کو ثابت کرنے کے لئے بہت کمزور اور ضعیف ہیں جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وجود باری کا اقرار بالکل فطری ہے اور وہ کسی دلیل منطقی کا محتاج نہیں ہے اس کے قرآن پاک نے جو شہادتیں پیش کی ہیں، وہی درحقیقت مفید یقین ہیں، اور ان پر ایمان لانا چاہئے۔ صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹ پر مولانا شبلی سے متعلق دو روائتیں اقبال صاحب سہیل ہی کے حوالے سے نقل کی ہیں جو ان کی تحریر مندرجہ الاصلاح سے لی گئی، ایک یہ کہ سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور اس کے لئے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، جب ان سے ان کی توقع پوری نہ ہوئی تو ان کی نگاہ مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین فراہی پر پڑی جو اس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے، اور جنھوں نے سرسید کی خاص فرمائش سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمیدالدین صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ اور جب سرسید نے باصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔

دوسری روائت یہ ہے کہ سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہیں تھے اس لئے قبولیت کے لئے دعا مانگنے کو فعل عبث قرار دیتے تھے۔ علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے انھوں نے اس موضوع پر، سرسید کے مضمون الدعا والاستجابۃ کی تردید میں ایک رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک بہادر نے جو بڑے سخت قسم کے مذہبی آدمی تھے، نہائت عمدہ ریویو لکھا، اور افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں، وہ تو دعا غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو اس کی حمائت میں کھڑا ہو۔

یہ دونوں اہم روائتیں نقل کر کے ان پر حاشیہ لکھا ہے کہ یہ دونوں روائتیں مولوی اقبال احمد خاں سہیل ایم اے علیگ کی تحریر سے لی گئی ہیں جو سالہا سال علی گڑھ میں رہ چکے ہیں اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین دونوں کے شاگرد تھے اور مولانا حمیدالدین کے ساتھ کئی سال رہے تھے، اس سے بڑھ کر سید صاحب کی تصنیفی دیانت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح آگے چل کر ایک اور واقعہ ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کو مولانا سہیل نے خود مولانا شبلی سے سنا تھا کہ سرسید کی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے اور چاہتے تھے کہ مولانا شبلی لکھیں اور مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے۔ آخر میں سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے اور مولانا ان کو بجنسہٖ لکھتے رہے، لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قرعہ فال مولانا حالی مرحوم کے نام نکلا، اور انھوں نے ان پر اس اخلاص اور عقیدت سے کتاب لکھی کہ سرسید کو زندۂ جاوید کر دیا، وہ نہ صرف ان کی سوانح عمری ہے، بلکہ ان کے خیالات و عقائد و نظریات کی تاریخ اور ان کے تعلیمی مشن کی مکمل روداد ہے سرسید کو زندہ رکھنے میں جہاں مدرسۃ العلوم علیگڑھ کو دخل ہے حالی کی اس غیر فانی کتاب کو بھی بڑا دخل ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اقبال سہیل مرحوم کی ذہانت، نکتہ سنجی اور شاعرانہ صلاحیت اپنی جگہ مسلّم! مگر علامہ سید سلیمان ندوی جیسے فاضل اجل پر انھیں ترجیح دینے کی سعی خود سہیل کی شخصیت پر ظلم ہے کہ اس قسم کی مبالغہ آرائیوں کو اہل نظر اور ارباب بصیرت مضحکہ خیز سمجھتے ہیں

اور

آبگینہ کو کوہِ گراں سے ٹکرانے کا انجام معلوم!

نیّر بانو

”آواز“

فاران کے تازہ پرچہ میں آپ کا افسانہ آواز پڑھا اس افسانہ میں مجھے دو ایک باتیں کھٹکی ہیں۔ افسانہ کے مرکزی خیال فتنہ آواز۔ کو آپ نے جس رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس میں مجھے کلام ہے۔ اس افسانہ میں دکھایا گیا ہے کہ عورتوں کی آواز کس قدر فتنہ و فساد کا باعث ہو سکتی ہے۔ گویا در پردہ یہ نصیحت یا سبق دیا گیا ہے کہ وہ نامحرموں سے بات چیت کرنے میں پرہیز کیا کریں۔ یا کم از کم گفتگو کا شائستہ انداز نہ اختیار کریں اور ملازم یا بچوں کو گفتگو کا ذریعہ بنائیں۔ دوسری طرف مردوں پر کسی اخلاقی بندش کا ذکر نہیں جیسے ان کے لئے کوئی رکاوٹ یا ممانعت آئی ہی نہیں۔ ان کے لئے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کی آوازیں سن کر خیال و گمان کی جس وادی میں بھٹکنا چاہیں بھٹکتے رہیں یہ تو ان کا حق ہے۔

افسانہ کی بنیاد گفتار کی اخلاقیات پر رکھی گئی ہے مگر پڑھنے کے بعد یہ افسانہ قاری کے ذہن پر کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑتا افسانہ کا ارتقا فطری رفتار پر نہیں ہوا۔ اٹھان اچھی تھی مگر اسے غلط سمت موڑ دیا گیا۔ جس سے اس کے فن اور حسن میں کمزوری آگئی۔ بندشِ گفتار کو جائز ثابت کرنے کے لئے جو شدت اختیار کی گئی ہے وہ سطحی ہے اس میں حقیقت اور گہرائی نہیں جیسے زبردستی کی بات ہو۔ پھر بات بھی نہیں بنی درمیان میں آکر ہیرو کا کردار ایسا بے جان سا ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ ہمدردی کی بجائے اس پر رحم آنے لگتا ہے۔ جیسے ایک بر خود غلط قسم کے واعظ کی شخصیت اس کے وعظ و نصیحت کے اثر و نفوذ کو غارت کر دیتی ہے اس کا اپنا ذہنی انقلاب ابھی کچا ہی تھا وہ دوسروں میں کوئی انقلابی کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ مریضانہ کیفیات کا غماز ہے۔ محض آواز سن کر ہوائی قلعہ تعمیر کرنا ذہنی صحت کی علامت نہیں۔ اسے فتنہ آواز کے سدباب کے لئے بھاوج (یا عورتوں) کو بات چیت کی ممانعت کرنے کی بجائے۔ اسلامی آداب گفتگو کی تعلیم دینی چاہیئے تھی ساتھ ہی اپنے ہم جماعتوں اور مردوں کو سمجھانے بجھانے اور ان کی صفائی قلب کی مہم کا آغاز کرنا چاہیئے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو افسانہ جاندار اور کامیاب ہو جاتا۔ افسانہ کے پلاٹ میں اس انجام تک پہنچنے کی پوری پوری گنجائش تھی۔ بجائے عورتوں کے گلے گھونٹنے کے اپنے ہمجنسوں کو اس خیالی تعیش سے باز رکھنے کی کوشش میں کسی مرحلہ پر سر پھٹول کی نوبت آسکتی تھی پاگل خانہ جیل خانہ بھی دکھایا جا سکتا تھا اسلامی ادب کی یہ روایت تو قائم ہو چکی ہے کہ وہ مقصدی ہوتا ہے اور مقصد کسی نہ کسی شکل میں اسلامی تعلیمات ہوتی ہیں کسی دینی یا اخلاقی قدر کو شعر و افسانہ کی زبان میں زندہ کردار کا روپ دیکر پیش کر دیا جاتا ہے دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ یہ کردار کیا محض تخیل کا کرشمہ ہیں یا حقیقی زندگی میں بھی ان کی جلوہ نمائی ممکن ہے یہ حقیقت حق کے سچے اور گہرے ادراک پر مبنی ہے

افسانہ کے متعلق تو جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ چکی اب کچھ بر سبیل تذکرہ سہی۔ سبیل نکل آئی ہے۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت مل جائے۔ تقریب فتنہ آواز ہی سہی۔

انتہا پسندی اور مبالغہ کا دوسرا نام شاعری ہے۔ دین میں شاعری کی گنجائش نہیں ہوئی۔ اسلام میں تو شاعری قطعی

ممکن نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ آواز اسلام کا حقیقی اور بنیادی مسئلہ ہے یا اضافی اور اخلاقی ۔ اگر اضافی اور اخلاقی ہے تو ایک حد تک مبالغہ میں جانے کی گنجائش نکل سکتی ہے ۔ لیکن اگر ایسا نہیں تو اس میں مبالغہ آرائی یا قطع برید درست نہیں ۔ بہتری اسی میں ہے کہ بنیادی مسائل کو جوں کا توں عین منشار خداوندی اور رسولِ خدا کے عمل کے مطابق رہنے دیا جائے ۔

اوّل تو نامحرم مردوں سے ضروری بات چیت نہ ممنوع ہے نہ حرام ۔ کسی بھی ضرورت کے لئے کلام جائز ہے امہات المؤمنین کے لئے بات چیت میں قول معروف کو لازم قرار دیا گیا تھا یعنی وہ اپنے کلام لہجہ کو مصنوعی طریقہ سے لوچدار بنانے سے روکا گیا ۔ یہ خاص محتاط انداز گفتگو ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان تھا ۔ ان کی بزرگی احترام اور شرف کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی بات چیت میں اس کا اہتمام رکھیں ۔ باقی امت کی عام عورتوں میں ہر طبقہ اور ہر قسم کی عورتیں شامل ہیں ہر وقت آواز پر کنٹرول اور احتیاط ملحوظ رکھنا ان کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ان کے لئے یہ احتیاط بلند اخلاقی کی دلیل اور پسندیدہ ہے مگر فرض نہیں ۔ دوسرے قول معروف کا مطلب سیدھے سبھاؤ صاف سادہ بات چیت اور قدرتی انداز گفتگو ہے جسے مصنوعی طریقے سے دلفریب بنانے کی کوشش نہ کی گئی ہو ۔ معروف کے تحت نہ تو زبان بندی کی گنجائش نکلتی ہے نہ اس کی تعبیر ناشائستہ کلام اور اجڈ اکھڑ لب و لہجہ ہے

(۲) عورتوں پر ملازموں کے ذریعہ بات چیت کی پابندی لگانا ایک غیر ضروری اور تکلیف دہ امر ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں اس امر کی مثال نہیں ملتی کہ انھوں نے اپنی امتی عورتوں کو اس قسم کی تاکید کی ہو ۔ تمام مومنین و مومنات بلاتکلف آپس میں بات چیت کرتے تھے یہ اور اسی قسم کے تمام تکلفات امرا اور رؤسا کی محلسراؤں میں ایجاد ہوئے اور جاگیرداروں نے قائم رکھے ۔ امت پر اسوۂ نبوی کا اتباع لازم ہے اور کسی کا نہیں ۔ ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے یعنی جو عورت اسلام قبول کرے وہ اپنے ہونٹ تو سی لے اور وسیلہ گفتگو ملازم کا بندوبست کرے اور اگر نوکر رکھنے کا مقدور نہ ہو؟

ان نظریات کے مطابق اسلام کی ہدایات پر ایک عام اور معمولی عورت پوری نہیں اتر سکتی یا یہ کہ اسلام میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی آبادی کی اسی بچاسی فیصدی عورتیں اس کی پوری پوری پیروی کر سکیں ۔ خوشحال کھاتے پیتے گھرانوں کی تربیت یافتہ مہذب خواتین ہی ان پابندیوں سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہیں ورنہ نامحرم مردوں سے قدم قدم پر بات چیت کے موقعے نکلتے ہیں ۔ یہاں لگے ہاتھوں نامحرموں اور اجنبیوں سے راہ و ربط اور گفتگو کی چند مثالیں بھی بیان کردوں گھروں کے اندر جمعدار ، دھوبی ، سقہ آتا ہے ان سے کام لینا ہوتا ہے ، سفیدی اور مرمت نکلتی رہتی ہے ۔ گھروں سے باہر گھریلو خرید و فروخت کے سلسلہ میں گوشت سبزی دال ترکاری کپڑا لتا جوتا خریدنا پڑتا ہے ۔ بیماری کی حالت میں ڈاکٹروں کمپاؤنڈروں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ سفر کا ارادہ کرو تو تانگہ والے ، بس والے ریل کے قلی ، بکنگ کلرک ، آس پاس کھڑے مسافروں سے معاملہ کرنا ہوتا ہے ۔ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں استادوں سے صلاح و مشورہ کے موقع آتے ہیں دینی ضروریات کے لئے اپنے بھائیوں سے ہزار بار کلام کی نوبت آتی ہے بہت سی عورتیں خود بھی دکانداری اور خدمتگاری کرتی ہیں ۔ یہ محض ظاہری احوال کا فرق ہوتا ہے ۔ حقیقت میں ان کی نسائیت اور ان کا دین اسلام کی نگاہ میں اتنا ہی محترم ہے جتنا خوشحال گھرانے کی شریف زادی کا ایک معمولی عورت کہاں تک موٹی برت پر عامل رہ سکتی ہے اگر نامحرموں سے بات چیت نہ کرنا ایک عمومی حکم ہو تو تمام عورتیں گئیں جہنم میں ۔

عورتوں پر بے جا تشدد اور پابندیوں کے طوق وسلاسل لادنے میں مرد لوگ اس قدر فراخدل کیوں ہو جاتے ہیں کچھ پابندیاں اپنے دل اور نگاہ پر بھی تو لگائیں۔ اگر کسی عورت کی آواز قدرتاً نرم اور لوچدار ہو تو یہ اس کا قصور نہیں۔ بس کسی شامت کی ماری کی آواز سن لی اور لگے دل میں اس کے متعلق تصورات باندھنے اور نگاہوں میں اس کے سراپا کو ناپنے اور تولنے، آوارہ نگاہ اور مریض دل ایک مرد مسلم کے لئے کون سا تقویٰ اور شرافت کا معیار ہے۔ اگر ان دلوں کو صحت و صفائی کی تعلیم دی جائے تو ان کی بہنوں کو طوق وسلاسل پہنانے میں شاعرانہ حد تک مبالغہ آرائی کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ہدایت ربانی کے چند مختصر اور سادہ فطری اصول ہی اسلامی معاشرہ کی صحت و پاکیزگی کی ضمانت بن جائیں۔

عورتوں میں ان غیر فطری بندشوں کے خلاف ایک طرف تو احتجاجی اور منتقمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے کمزور طبیعتوں پر جو دین، اخلاق اور تعلیم کے اعلیٰ درجوں پر نہیں ہیں مریضانہ ذہنیت پرورش پاتی ہے۔ اللہ کی نظر میں مرد عورت یکساں ہیں۔ اس نے ایمان، عمل اور اخلاق میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی صرف ضابطۂ حیات مقرر کرتے وقت تھوڑا سا فرق کیا ہے اس لئے نہیں کہ عورتوں کا درجہ ادنیٰ ہے بلکہ ان کی جسمانی کمزوروں کے پیش نظر جنس مخالف سے ان کی حفاظت کی غرض سے نہ تو مردوں کو کھلی چھٹی ملی ہے کہ وہ جو چاہیں سوچتے رہیں اور زیادتی کر جائیں۔ انہی کو اس کا حق ہے نہ عورتوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے

آجکل جب کہ عالم نسواں میں ایک عام ذہنی بیداری کی لہر جاری ہے نسوانی مسائل کو ان کی عمومی حالت ہی میں پیش کرنا قرین مصلحت اور انسب ہے۔ جب وہ دین پر مائل ہو جائیں۔ ان کے دل اس تعلیم کی فضیلت کے قائل ہو کر ان کو تسلیم کر لیں تو اعلیٰ اخلاق کے باقی مدارج کا حصول بھی سہل ہو جائے گا۔ قانون منوایا جا سکتا ہے مگر اخلاق کے لئے تو اپیل ہی کی جائے گی اوّل تو عورتیں پہلے ہی دین سے بیگانہ ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ اخلاقی تعلیمات کو مبالغہ کا رنگ دے کر پیش کرنا حکمت دین کے بھی خلاف ہے ایک طرح ویسے بھی محض تکلیف ہی ہے۔ دعوتی سرگرمیوں کی راہ بھی کھوٹی ہوتی ہے۔ کسی پڑھی لکھی سمجھدار خاتون سے یہ توقع کرنا کہ وہ دنیا میں زندگی گزارنے کی تمام عملی سہولتوں اور آسانیوں سے دستکش ہو کر اس قسم کی مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ رسوم وقیود کو قبول کرے گی۔ انسانی فطرت کا گہرا اور سچا مطالعہ نہیں۔ ایک مروج طریقہ پر دوسرے طریقہ کی فضیلت اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے، جب کہ وہ نسبتاً اعلیٰ پاکیزہ اور روزمرہ زندگی کو آسان، سادہ بنانیوالا اور سہل العمل ہو۔

مسلمان عورت کی موجودہ زندگی ہمارے سامنے ہے کیا کوئی پورے ایمان اور دیانت سے کہہ سکتا ہے کہ اس کے لیل ونہار ایسے خوشگوار اور قابل رشک ہیں کہ اسلام سے برگشتہ یا غیر مسلم خواتین اس زندگی اور اس کے متعلقات کو شوق اور رغبت کے ساتھ اختیار کرنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی غور کر سکیں گی۔ اسلام جس غیر فطری زندگی سے نجات دلانے آیا تھا انھیں غیر فطری رسوم وقیود کو اسلام کے نام پر پیش کرنا اسلام کی خدمت نہیں۔

مدیرِ فاران ہماری دینی بہن نے بڑے اخلاص کے ساتھ دینی خیر خواہی کے مدنظر مدیرِ فاران "کے افسانہ "آواز" پر یہ تنقید کی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ اس تنقید کا "جواب" نہیں ہے اس "تنقید" نے بعض ضروری باتوں کی طرف ہماری توجہ کا رخ کر دیا ہے۔ بس انہی کا اظہار مقصود ہے۔

افسانہ "آواز" کی ٹکنیک" پر جو گرفت کی گئی ہے۔ اس کی مدافعت میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ موضوع گفتگو افسانہ

کی ٹھیک ٹیک ہے ہی نہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ بے حیائی کی بات جس طرح عورت کے لئے بری ہے اسی طرح مرد کے لئے بھی بری ہے! اور نصیحت کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ دونوں ہی کو ٹوکیں! گناہ گار مرد اور گناہگار عورت دونوں کو برابر کی سزا ملے گی، اور لغزش وخطا کے معاملے میں مرد عورت دونوں مستحق عقوبت اور مستوجب احتساب ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر سوسائٹی اور معاشرے میں "عورت" کو خاندان کا "ننگ وناموس" سمجھا گیا ہے! اس کے لئے سامنے کی مثال یہ ہے کہ ایک ہی گھرانے کے بھائی اور بہن اگر کسی اسکول میں پڑھتے ہوں اور کسی دن رات کو بھائی گھر واپس نہ آئے تو گھر والوں کو یقیناً بڑی تشویش اور پریشانی ہوگی، لیکن، اگر لڑکی رات کو گھر نہ لوٹے تو گھر والوں پر ایک قیامت گزر جائے گی اور گھر والے شرم وغیرت کے مارے زمین میں گڑ جائیں گے! کسی بھائی کا گھر سے فرار اور اس کی بہن کا بھاگ جانا، دونوں بالکل ایک ہی نوعیت نہیں رکھتے، ان میں بہت بڑا تفاوت ہے: اور اس تفاوت اور فرق کو ہر کوئی جانتا ہے!

انسانی معاشرہ مرد کے مقابلہ میں عورت سے زیادہ حیا، شرم اور غیرت کی توقع رکھتا ہے اور ایسی توقع عورت پر کوئی "ظلم" یا "بیجا پابندی" نہیں ہے، بلکہ اس تصور میں عورت کی عظمت اور انفرادیت اور عصمت وپاکیزگی شریک ہے۔ کسی عورت کی شرم وحیا کا اظہار مقصود ہو تو یوں نہیں کہتے کہ "فلاں عورت کنوارے لڑکے کی طرح شرمیلی ہے" مگر کسی مرد کی حیا اور شرمیلے پن کو ظاہر کرنا ہو تو اس کا اظہار ان لفظوں میں کیا جاتا ہے:-

"فلاں مرد کنواری لڑکیوں کی طرح شرمیلا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو "غض بصر" کا حکم دیا ہے اور عورتوں پر "جلباب" (پردہ پوشی) کی پابندی لگائی ہے، جو مردوں کی پابندی کے مقابلہ میں سخت تر ہے! اور اس سے عورت کی عصمت وپاکیزگی کی زیادہ سے زیادہ حفاظت مقصود ہے۔ عورت سے اسلام نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے مقامات زینت کو چھپائے مگر مردوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنے "شانوں" اور "سینوں" کو ڈھکا ہوا رکھیں! یہ امتیاز بتاتا ہے کہ فتنہ کہاں ہے؟ اور زیادہ حفاظت وپردہ پوشی کے قابل "جوہر لطیف" اور "صنفِ نازک ہے"؟

اسلام نے معاشرت اور رہن سہن میں مرد کے مقابلہ میں عورت پر بلاشبہ زیادہ سخت پابندیاں لگائی ہیں اس سے عورت کی عصمت وعفت کی حفاظت وصیانت مقصود ہے! مثلاً مرد کو اجازت ہے کہ وہ خوشبو لگا کر بلا تکلف باہر آجا سکتا ہے اس پر کوئی پابندی نہیں، مگر جو عورت (پھیلنے والی) خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہے تو اسے حدیث میں بدکار کہا گیا ہے! یعنی عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا "قوت شامہ" کے ذریعہ فتنہ کا سبب بن سکتا ہے

امہات المومنین کو ہدایت فرمائی گئی تھی:-

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ؏

(. . . . سو تم دب کر (یعنی نرم لہجہ میں) بات نہ کیا کرو جس کے دل میں روگ ہے وہ (تمھاری نرم گفتگو کے سبب) کوئی آرزو (اپنے دل میں) پیدا کرلے! ہاں قاعدے کے مطابق کلام کیا کرو)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو انسانوں کے مزاج وطبع اور جذبات ونفسیات کا خالق ہے عورتوں کے "انداز گفتگو" اور "طرز کلام" پر پابندی عائد کر رہا ہے اور یہ آیت خود اس کی شاہد ہے کہ "مرد اور عورت کی آواز" کا بالکل ایک جیسا معاملہ نہیں ہے "عورت" کی آواز فتنہ کا سبب ہو سکتی ہے تو ایک مسلمان عورت جس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی یہ واضح ہدایت ہوگی وہ نامحرم مرد سے

کے وقت ہی گفتگو کرے گی اور اس میں بھی اس کا لحاظ رکھے گی کہ اس کا انداز گفتگو سننے والے کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کرے!

اس آیت کی تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں کی ہے۔

" بلاشبہ عورت کی آواز میں قدرت نے طبعی طور پر ایک نرمی اور نزاکت رکھی ہے، لیکن پاکباز عورتوں کی شان یہ ہونی چاہیئے کہ حتی المقدور غیر مردوں سے بات کرنے میں بہ تکلف ایسا لب ولہجہ اختیار کریں کہ جس میں قدرے خشونت اور روکھاپن ہو، جو کسی بد باطن کے قلبی میلان کو اپنی طرف جذب نہ کرے۔"

اگر اس آیت کو امہات المومنین کے لئے ہی مخصوص تسلیم کر لیا جائے تو یہ آیت ایک قاری کے ذہن پر یہ حقیقت کھول دیتی ہے کہ ازواج النبی جو تمام مسلمانوں کی مائیں تھیں "جب ان تک کے "طرزِ کلام" پر اللہ تعالیٰ نے پابندی لگائی ہے، تو پھر دوسری عورتیں جن کو نامحرم مرد اپنی" ماں سمجھتے ہیں اور نہ احترام و تقدیس کی کوئی قوی نسبت ان سے وابستہ ہے،" ان کی آواز کی نرمی اور لوچ سے تو بہت کچھ فتنے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آئت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

" اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو آداب سکھاتا ہے اور چونکہ تمام عورتیں انہی کے ماتحت ہیں، اس لئے یہ احکام سب مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، پس فرمایا کہ تم میں سے جو پرہیزگاری کریں وہ بہت بڑی فضیلت اور مرتبہ والی ہیں، مردوں سے جب تمہیں کوئی بات کرنی پڑے تو آواز بنا کر بات نہ کرو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے انھیں طمع پیدا ہو، بلکہ بات اچھی اور مطابق دستور کرو، عورتوں کو غیر مردوں سے نزاکت کے ساتھ خوش آوازی سے بات کرنی منع ہے۔ گھل مل کر صرف اپنے شوہروں ہی سے کلام کر سکتی ہیں۔ (اردو ترجمہ)

معاشرے کی حالت حد سے زیادہ بگڑ چکی ہے "اخلاق" کی آخری پناہ گاہ مسلمانوں کے گھرانے ہی رہ گئے ہیں اس لئے پردہ نشینانِ حرم پر ان "فتنوں" کی اہمیت خاص طور سے واضح کی جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی بستی میں چوری کی وارادات زیادہ ہو رہی ہوں تو "چوروں" کو نہیں مال والوں کو نصیحت اور تنبیہ کی جائے گی کہ وہ اپنے روپے پیسے کی حفاظت کریں اور ہر طرح چوکس رہیں۔"

دینی نقطۂ نگاہ کسی اخلاقی بے راہ روی اور گناہ کے بارے میں اس طرح سوچنا کہ دینی نقطۂ نگاہ سے مرد اور عورت کا گناہ برابر ہوتا ہے۔ یہ انتہائی خطرناک رجحان ہے۔ نفسیاتی طور پر اس میں بڑی پیچیدگیاں، الجھنیں، نزاکتیں اور خطرے ہیں بس اس خصوص میں اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ یہ "حرف برہنہ گفتن" کا محل نہیں ہے

ہم نے اپنے افسانہ (آواز) میں کوئی فقہی مسئلہ بیان نہیں کیا تھا۔ بلکہ افسانوی انداز میں پڑھنے والوں کی توجہ کو چونکا دیا تھا کہ "عورت کی آواز" غیر محرم کے حق میں "فتنہ ہے۔" فتنہ بن سکتی ہے اور فتنہ بنتی رہتی ہے افسانہ میں مبالغہ کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔" مگر اس کی صورت ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص فرانس کو جا رہا ہو اور کوئی اسے نصیحت کرتے ہوئے کہے۔

"میاں، وہاں بدکاریوں کی کثرت ہے وہاں کی "ہوا" سے بھی بچ کر رہنا۔"

اس ہدائت میں کہ "ہوا سے بھی بچ کر رہنا" بے شک مبالغہ پایا جاتا ہے، مگر اس مبالغہ کی "ہو بہو" تقلید اور تعمیل مقصود نہیں ہے

بلکہ اس ہدایت سے مقصود فرانس کی "بدکاریوں" سے آگاہ کرنا ہے، یعنی یہ کہ وہاں انتہائی احتیاط کے ساتھ رہنا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا!

"دیدار" کے بعد "گفتار" ہی وہ "فتنہ" ہے، جو نامحرم مرد و عورت کو برائی پر ابھارتا ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمان عورت کو اپنی "آواز" کی بھی حفاظت کرنی چاہیئے! اور جس عورت کو اس کا احساس ہو کہ اس کی آواز میں فطری طور پر زیادہ دلکشی اور لوچ ہے تو اس کی آواز کا "لوچ" "نامحرم" مردوں سے بات چیت کرنے میں جتنا کم صرف ہو اتنا ہی اچھا ہے!

جس طرح "وبا کے زمانہ" میں لوگ "پانی" "تک چھان کر اور گرم کر کے پیتے ہیں۔ اور طاعون میں ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں "موزے" چوبیس گھنٹوں پہنے رہتے ہیں، اور ڈاکٹر اور حکیم وبا کے زمانے میں "رخصتیں" دینے کے بجائے اور پابندیاں عائد کر دیتے ہیں اسی طرح دورِ حاضر میں بداخلاقی کی جو عام وبا پھیلی ہوئی ہے "تو یہ زمانہ "رخصتوں" کے بجائے "شدت" اور "پابندیوں" کا ہے اس وقت حکمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اخلاق کے بندھن ڈھیلے کرنے کے بجائے انھیں اور کس دیا جائے۔!

پروفیسر اقتدار احمد ساحر

توحید خالص

کائنات کا خالق و مالک خدا ہے وہ ازلی و ابدی مدبر و متصرف ہے۔ اس کے ننانوے نام ہیں جن میں اللہ اسم ذات بقیہ صفاتی ہیں۔ ان صفتوں کے سوا بے شمار صفات اور خوبیوں بے حد و حساب کمالوں والا ہے اس کی صفاتِ مخصوصہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حیات۔ ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوم۔ وہ زندہ ہے۔ تمام چیزوں کو زندگی بخشنے والا۔ جب چاہتا ہے مار دیتا ہے اور فنا کر دیتا ہے یحیٰ و یمیت۔ وہ جس طرح ازل سے ہے اسی طرح ابد تک رہے گا۔ ھو الاول والآخر وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ کل شیءٍ ہالک الا وجہہ وہ اپنی زندگی میں، ہوا، پانی، غذا یا کسی اور چیز کا محتاج نہیں۔ وہ اس صفت اور دوسری صفات مخصوصہ کی وجہ سے۔ نیز کنہ و حقیقت کی وجہ سے دوسری کسی چیز کے مثل و مشابہ نہیں۔ لیس کمثلہ شیءٌ۔ اس کی کنہ کا ادراک عقول نہیں کر سکتیں۔ نہ دنیا میں اس کا دیدار آنکھیں کر سکتی ہیں۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ لیکن آخرت میں اس کا دیدار ہوگا۔ وجوہ یومئذٍ ناضرہ الیٰ ربہا ناظرہ۔

۲۔ علم۔ وہ عالم و علیم ہے۔ ان اللہ بکل شیءٍ علیم۔ اس کا علم کلی و تفصیلی، حقیقی و حتمی، یقینی و اذعانی ہے اس کے علم میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ اس کا علم ہمیشہ سے کامل ہے، ہمیشہ کامل رہے گا۔ اس کی صفت ہمیشہ سے ہے۔ ہمیشہ رہے گی اس کا علم شہودی ہے کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ عالم الشہادۃ لیکن جو چیزیں دوسروں کے لئے پوشیدہ اور غیب ہیں اس نسبت سے وہ عالم غیب بھی ہے۔ عالم الغیب والشہادۃ۔ یہ علم غیب بھی اسی کے لئے مخصوص ہے۔ لا یعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللہ۔

۳۔ قدرت۔ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نیست سے ہست۔ ہست سے نیست۔ عدم سے وجود۔ وجود سے عدم پر اسے قدرت ہے

۴۔ ارادہ و مشیئت۔ اللہ مرید۔ صاحب ارادہ ہے کوئی کام اضطراری یا مجبوری کے طور پر نہیں کرتا وہ ہر کام کو اپنے ارادے اور مشیئت سے کرتا ہے فعال لما یرید۔ اسی طرح اس کا حکم قصد و ارادے کے ساتھ ہے یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید

۵۔ تکوین و تخلیق۔ کرنا اور پیدائش اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا وہ ہی خالق ہے اسے ہر وقت اور ہر طرح کی قدرت حاصل ہے خالق کل شیءٍ۔ ھو الخلاق العلیم۔ وہ پیدائش میں کسی چیز کا محتاج نہیں اس نے بغیر مادہ کے ہر چیز کو پیدا کیا۔ اگر مادہ کوئی چیز ہے تو اسے بھی اسی نے پیدا کیا۔ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون۔ ان اشیاء کے سوا اعمال کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔ اللہ خلقکم وما تعملون۔

۶۔ رزاقیت۔ وہ ہمیشہ سے صفت رزق رکھتا ہے وہ رازق و رزاق ہے۔ وما من دابۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقہا۔ ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔ جب مخلوق نہ ہوگی۔ جب بھی وہ رازق رہے گا۔ جب مخلوق نہ تھی جب بھی

وہ رازق تھا۔ لیکن مخلوق کو اس کی صفت رزق کا اس وقت علم ہوا جب مخلوق پیدا کی اور اسے رزق دیا۔

۷۔ سمع ۔ اِنَّ اللّٰہَ سمیعٌ علیمٌ ۔ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ہلکی پھلکی اور باریک سے باریک اور دھیمی سے دھیمی آواز کو سنتا ہے وہ بڑی سے بڑی آوازوں شوروں اور غلوں میں ہر آواز کو علیحدہ علیحدہ سنتا ہے وہ سماعت میں اعضاء و آلات سماعت یا ہوا اور ایتھر وغیرہ کا محتاج نہیں۔ وہ دور یا پاس کی آواز یکساں سنتا ہے۔

۸۔ بصر۔ وہ بصیر ہے ہر پاس اور دور یا پاس کی آواز یکساں دیکھتا ہے اسے اعضاء و آلات بصارت کی احتیاج نہیں۔ اسے حجابات یا آڑیں مانع نہیں۔ اس کے دیکھنے میں اندھیرے یا اجالے میں فرق نہیں پڑتا۔ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْر۔

۹۔ کلام۔ وہ متکلم ہے۔ باتیں اور کلام کرتا ہے۔ اذ قلنا للملائکۃ ۔ وقلنا یا آدم۔ وکلم اللّٰہ موسیٰ تکلیما تمام کتب آسمانی اس کا کلام اور قدیم۔ غیر مخلوق ہیں۔ اسے کلام کرنے میں آلات و اعضاء کلام کی حاجت نہیں۔ لیکن اس کے کلام کرنے کے دو طریقے ہیں۔

ایک وحی ۔ دوسرا حجاب ۔ ماکان لبشر ان یکلمہ اللّٰہ الا وحیا او من وراء حجاب

توحید ۔ قل ھو اللّٰہ احد ۔ اللہ ایک ہے۔ اس کے یہی معنی نہیں کہ دو تین یا چند کے مقابلہ میں وہ بلحاظ عدد ایک ہے۔ بلکہ وہ اپنی ذات و صفات کے ساتھ ایک اکیلا ۔ منفرد و یکتا۔ بے مثل و بے نظیر ہے۔ نہ اس کا کوئی شبہ ہے نہ ضد (مقابل) نہ ند (شریک) لا شریک لہٗ۔

قرآن مجید توحید سے بھرا ہوا ہے۔ قرآن میں جو اللہ کی ذات و صفات کی خبر دی گئی ہے وہ توحید علمی و خبری ہے اور جو بندوں کو وحدہ لا شریک لہٗ کی طرف بلایا گیا ہے وہ توحید ارادی و طلبی ہے جو اوامر و نواہی اور التزام عبادت ہے وہ حق توحید ہے۔ جو اہل توحید کے ساتھ دنیاوی سلوک، عقبیٰ میں انعام و اکرام کا ذکر ہے وہ جزاء توحید ہے۔ جو اہل کفر و شرک پر عتاب و عذاب اور سزا کا ذکر ہے وہ اخراج از توحید کی سزا ہے۔

توحید کے پانچ مرتبے ہیں ۔ پہلا مرتبہ :۔ اللہ کے سوا کسی کو واجب الوجود نہ ماننا ۔ دوسرا مرتبہ:۔ تمام روحانی اور مادی عالم کا خالق اللہ ہی کو ماننا۔ تیسرا مرتبہ:۔ آسمان اور زمینوں کے درمیان ہر قسم کا تصرف، تدبیر، تغیر و تبدل اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ماننا۔ چوتھا مرتبہ:۔ اللہ کے سوا کسی کو مستحق عبادت نہ ماننا ۔ جانی۔ جسمانی، زبانی، مالی ۔ اور دلی عبادت کا اسی کو حقدار ماننا ۔ پانچواں مرتبہ:۔ توحید فی الحکم ہے۔

اب جو کوئی اللہ کو اس کی ان صفات کے ساتھ جو کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں، ایک مانتا ہے تو وہ موحد ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کو نہیں مانتا اور زبان و دل سے اس کے ایک ہونے کا اقرار و یقین کرتا ہے تو وہ موحد نہیں ہے یا ایسی صفات مانتا ہے جس سے نقص و عجز یا جہل لازم آتا ہے تو بھی وہ موحد نہیں ہے

جس طرح توحید کے پانچ مرتبے ہیں۔ اسی طرح شرک کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شرک جلی وہ یہ ہے کہ بلحاظ تعدد دو یا دو سے زیادہ خدا ماننا۔ دوسری شرک خفی۔ اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اشراک فی العلم یہ ہے کہ اللہ کا حاضر و ناظر ہونا اور ہر چیز کا تفصیلی و حقیقی علم اور علم غیب اپنے لئے مخصوص کیا ہے پس جو شخص یہ حضور و نظور یا ایسا علم بطور خود یا کسی کے عطیہ و بخشش سے کسی کے لئے مانے ۔ دوسری قسم ۔ اشراک فی التصرف یہ کہ زمین و آسمان اور ان کی درمیانی چیزوں میں تصرف، تغیر و تبدل جیسے موت و حیات بیماری و تندرستی خوشحالی و افلاس اپنے لئے خاص کیا ہے ۔ پس جو کوئی یہ حق کسی کو دے یا کسی میں مانے ۔ تیسری یہ کہ ہر قسم کی عبادت اور اس کے طریقے اپنی ذات سے مخصوص کئے ہیں۔ پس جو کوئی کسی اور کو اس کا حقدار مانے یا کسی کے لئے ایسے کام کرے یہ اشراک فی العبادت ہے۔ چوتھی قسم یہ کہ اللہ کے اپنا مالک ہونا ۔ بیماریوں اور غموں سے نکالنا۔ بندوں کو امداد دینا، حاجتیں پوری

کرنا حقدار شکر یہ ہونا بتایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس کے سوا کسی اور میں یہ قدرت نہیں ۔ ایسے تمام مواقع پر اسی کو اس کا حقدار سمجھ کر اسی سے حاجتیں چاہو اسی کی قسم کھاؤ ۔ پس جو شخص اس کے سوا کسی کو ایسا ملنے یا نہ مان کر دوسرے سے ایسے کام چاہے وہ بھی مشرک ہے اس کا نام اشراک فی العادت ہے اور شرک بہت بڑا گناہ ہے اللہ مشرک کو کبھی نہ بخشے گا ۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء ۔ پانچویں قسم اشراک فی الحکم ہے اس کا بیان آئندہ آتا ہے ۔

توحید فی الحکم و اشراک فی الحکم

اللہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے ۔ ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض ۔ قل اللہ الملک جمیعا ۔ الا ان للہ ما فی السموات وما فی الارض ۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مملوکہ و مخلوق کو جس طرح چاہے چلائے اس کے لئے جیسا چاہے قانون بنائے اس لئے کہ وہ حاکم بادشاہ اور مالک ہے ۔ الا لہ الخلق والامر ۔ ان الحکم الا للہ ۔ الیس اللہ باحکم الحاکمین ۔

دنیاوی حکومت :۔ حکومت دنیوی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی حکومت کا رقبہ وسیع ۔ طویل و عریض ہوتا ہے تو دور دراز ملکوں میں بادشاہ اپنا نائب مقرر کر دیتا ہے ۔ اس کی مثال غیر منقسمہ ہندوستان ، آسٹریلیا اور کینا ڈا وغیرہ میں ۔ ایسی صورت میں بادشاہ اپنے نائب کو فرمان شاہی اور کتاب و دستور حکومت دیتا ہے ۔ نائب اس دستور اور قانون کے مطابق رعایا کو چلاتا ہے نائب رعایا کو قانون پر چلانے کے لئے کہیں انعام و صلہ اور کہیں عفو و بخشش سے کہیں رحم و درگزر سے کام لیتا ہے ۔ سرکشوں پر سختی کرتا ہے جرمانہ اور سزا سے کام لیتا ہے ۔ لیکن یہ سب دائرۂ قانون کے اندر ہوتا ہے ۔ اسی کا نام تدبیر ، حکمت اور سیاست ہے ۔ اس دستور العمل میں اہم امور کے اصول اور بعض جزئیات بتا دیئے جاتے ہیں ۔ جیسے حقوق شاہی حقوق رعایا ۔ حقوق شاہی میں تسلیم ملکیت ۔ حق قانون سازی ۔ ٹیکس اور رعایا نہ ۔ حفاظت حدود ملک ۔ توسیع ملک ۔ حفاظت حدود و توسیع ملک کے لئے اصول جنگ ۔ سپاہی کی بھرتی ۔ کارگزار اور وفاداروں کا انعام و اکرام ۔ باغیوں اور دشمنوں کی سزائیں وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح رعایا کے باہمی معاملات کے لئے اہم اصول اور قانون ۔ لیکن نائب کو یہ حق نہیں ہوتا کہ بادشاہی اصول و قوانین کے خلاف خود قانون بنائے ۔ مگر جزوی طور پر مصالح کے لحاظ سے جزوی ترمیم کر سکتا ہے بشرطیکہ ان اصولوں اور قانون سے متصادم نہ ہوں ۔

حکومت الٰہیہ :۔ جب اللہ نے ہماری دنیا پیدا کی اور وہ اس کا خالق مالک ہے تو اس نے اس زمین پر اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے جس کا وہ حقیقت میں پہلے ہی سے بادشاہ تھا اور ہمیشہ رہے گا ۔ ایک نائب بنانا چاہا ۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ ۔ تاکہ آسمانوں اور دوسری زمینوں اور دوسرے جہانوں کی طرح یہاں بھی اس کی مخلوق اس کی بادشاہت کو جانے اور مانے ۔ پھر جو کوئی اس کے قانون پر چلے وہ انعام و صلہ پائے ۔ جو خلاف ورزی کرے یا اس کی بادشاہت تسلیم نہ کرے وہ سزا پائے ۔ چنانچہ اس نائب نے حکومت الٰہیہ قائم کی جب انسان زیادہ اور دور دراز ملکوں میں آباد ہو گئے تو وہاں دوسرے نائب بھیجے گئے ۔ انھوں نے ان ملکوں میں حکومتیں قائم کیں ۔ ان نائبوں اور ان کی حکومتوں میں سے بہت کا ذکر قرآن میں موجود ہے ۔ حضرت صالح علیہ السلام کی نسبت ہے واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد ۔ یاد کرو جب ہم نے تمھیں عاد کے بعد خلیفہ کیا ۔ حضرت ابراہیم ؑ انی جاعلک للناس اماما ہم تمھیں لوگوں کے لئے امام بنانے والے ہیں ۔ وجعلناھم آئمۃ یھدون بامرنا ۔ ہم نے انھیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ۔ حضرت یوسف علیہ ولما بلغ اشدہ آتیناہ حکما وعلما ۔ جب وہ سمجھدار ہو گیا تو ہم نے اسے حکومت دی اور ملک دیا ۔ حضرت سلیمان ؑ وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد مجھے ایسا ملک بخش جو اوروں کے لائق نہ ہو ۔ حضرت داؤد و سلیمان ؑ وکلا آتینا حکما وعلما ۔ ہم نے ہر ایک کو حکومت دی اور علم ۔ حضرت داؤد ؑ وشددنا ملکہ و آتیناہ الحکمۃ و فصل الخطاب ۔ ہم نے ان کے ملک کو پائیدار کیا اور حکمت و قوت فیصلہ دی ۔ موسیٰ علیہ السلام فوھب لی حکما

وجعلنی من المرسلین - مجھے حکومت دی اور رسول بنایا۔ غرضیکہ یہ سلسلہ نیابت و خلافت چلتا رہا۔ آخر میں نبی آخر الزماں آئے آپ نے ہجرت مدینہ کے بعد بارہ قبیلوں میں بارہ نمائندے (سفیر) مقرر فرمائے۔ پھر قبائل سے پھر یہود سے جنگی معاہدے فرمائے جو دستور اسلام اور کتاب یہود کے نام سے مشہور ہے اور بقول اہل یورپ یہی معاہدہ عمرانی تھا۔ جس سے بنیاد حکومت قائم ہوگئی اور یہی حکومت۔ حکومت الٰہیہ تھی۔ آپ کے بعد آپ کے خلفا ہوئے انھوں نے نیابت و خلافت رسول میں خدمت حکومت الٰہیہ کی اور ملک الٰہی کی جان و مال سے توسیع کی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کیا تھی؟ اس کا مقصد کیا تھا؟ قانون کون سا تھا خلیفہ کے کیا کام تھے؟ ان سب کے جوابات یہ ہیں کہ حکومت الٰہیہ کا مقصد دنیاوی مدعیان بادشاہت کے دعوئے شاہی کا استیصال کرکے خدا کی ملکیت و حکومت منوانا۔ قانون خداوندی پر لوگوں کو چلاتا رہتا کہ عدل و مساوات اور فلاح و بہبود رعایا ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے **انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ**۔ ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ تو خدائی حکم کے مطابق حکومت کرے۔ اور وہ آیات جو اوپر نقل ہوئیں۔ پس صرف اللہ ہی کے ہر حکم کو واجب التسلیم و واجب العمل مان کر اس پر عمل کرنا توحید کا پانچواں مرتبہ توحید فی الحکم ہے۔ ان پانچوں مرتبوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا توحید ہے اور ایسا کرنے اور ماننے والا شخص موحد ہے اور سب جانتے ہیں کہ حکم نہ مان کر کافر ہونے والا پہلا شخص ابلیس ہے۔ **ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین**۔

اشراک فی الحکم :- یہ شرک کی پانچویں قسم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو مالک و بادشاہ نہ ماننا یا ماننے کے بعد اس کے حکم کے مقابلہ میں دوسرے کے حکم کو صحیح ماننا مثلاً قانون الٰہی میں قتل نفس کے بدلے نفس۔ آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ چور کے ہاتھ کاٹنا زانی کا رجم بتایا گیا ہے اب جو شخص ان احکام کو نہیں مانتا اور دوسرے قانون کو مانتا ہے تو وہ باغی ہے۔ اسلام میں ایسی باغی و طاغی کو مشرک و کافر اور ایسے فعل کو اشراک فی الحکم کہا گیا ہے۔ ان کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے **ولا یشرک فی حکمہ احداً** اس کے حکم میں کسی کو شریک نہ کر۔ دوسری آیت میں اسی حکم ماننے کو عبادت کہا ہے۔ **ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا**۔ مضامین بالا کی آیات سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔

سزائے اشراک :- دنیاوی بادشاہوں میں باغی کی سزا قتل ہے۔ کبھی ان کا مال و اسباب بھی ضبط کر لیا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی ایسی ہی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ **قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ**۔ **ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون**۔ اور بہت سی آیتوں میں دوزخ کی سزا بتائی ہے۔ **انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض**۔

اب رہے وہ لوگ جو بعض احکام کو مانتے اور بعض کو نہیں مانتے وہ بھی باغی مشرک فی الحکم ہیں۔ **ویقولون نومن ببعض ونکفر ببعض**۔ **افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض**۔ یہی تو کافروں کا قول و فعل تھا اسی پر اللہ تعالیٰ نے حکم ماننے کو عبادت فرمایا اور فرمایا۔ **فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما**۔ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون**۔ ہم یہ بتا آئے ہیں کہ نائب و خلیفہ کے فرائض میں حفاظت ملک و توسیع سلطنت بھی ہے اس وجہ سے انہیں کبھی جارحانہ کبھی مدافعانہ جنگ کرنا پڑتی ہے اسی لئے جہاد فرض کیا گیا ہے۔

جہاد :- جہاد کا مطلب قیام حکومت الٰہیہ اور دنیاوی بادشاہوں کا استیصال قانون خداوندی کا اجرا حفاظت ملک و توسیع حکومت کے لئے مال و جان سے کوشش کرنا ہے۔ اس کے لئے چند شرطیں ہیں۔

شرط اول :- خلیفہ یا امام بنانا۔ جس کی سب سے اہم شرط اسلام یعنی موحد فی الحکم ہونا ہے۔ شرط دوم :- دنیاوی

بادشاہوں پر اسلام پیش کرنا۔ شرط سوم:۔ اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں جزیہ دینا۔ شرط چہارم:۔ پہلی شرطیں نہ ماننے پر جنگ۔ ان شرطوں میں یہ راز ہے کہ جب خلیفہ یا امام موحد ہوگا تو احکام الٰہی کے سوا کسی کے حکم کو واجب التسلیم نہ ماننے گا نہ ان پر عمل کرے گا بلکہ ہر ایک کو احکام الٰہی تسلیم کرانے اور ان پر عمل کرانے کی کوشش کریگا۔ شرط دوم تسلیم ہونے میں حکومت الٰہیہ تسلیم ہوگئی۔ شرط سوم جزیہ تسلیم ہونے میں خدا کی ملکیت و حکومت تسلیم ہونے کے بعد مسلمانوں کو شعائر اسلامی ادا کرنے کی اجازت ہوگئی۔ بعض احکام الٰہی کا اجرا ہو جاتا ہے۔ شرط چہارم جنگ میں کامیابی پر حکومت الٰہیہ قائم ہو جاتی ہے اور یہی مقصد اصلی ہے اسی وجہ سے خدا نے غازیوں اور شہیدوں کے مرتبے بڑھائے ہیں۔ جنت ان کا ادنیٰ انعام ہے۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ میں جہاد میں پھر زندہ ہوں پھر جہاد میں مروں۔ پھر زندہ ہوں، پھر جہاد میں مروں اور خدا کے سامنے جاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے غزوات و سرایا کئے خلفاء رسول اسی لئے خلیفہ کہلائے کہ انھوں نے احکام الٰہی پر عمل کرایا دنیاوی بادشاہوں سے جہاد کرکے حکومت الٰہیہ کی توسیع کی اب وہ لوگ جو جہاد کو مدافعانہ جنگ بتلاتے ہیں۔ دیکھیں کہ ایران و توران اور یورپ میں جہاد مدافعانہ تھے یا توسیع حکومت الٰہیہ۔ اسی وجہ سے ان کی خلافت، خلافت راشدہ کہلائی۔ اور جب دوسروں نے اپنے قانون رائج کئے اور دعویٰ خلافت کیا تو مسلمانوں نے خلیفہ تسلیم نہ کیا۔ اسی لئے حضور نے فرمایا تھا کہ تیس سال تک خلافت ہے، پھر دنیاوی بادشاہت۔ اور جب سے یہ صورت پیش آئی۔ حکومت الٰہیہ نہ رہی جب ہی سے اسلام کی ترقی رک گئی۔ بلکہ تنزل شروع ہوگیا اور آج یہ حالت ہوگئی ہے جسے بد سے بدتر بلکہ بدترین کہا جاتا ہے اور حقیقت ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ توحید فی الحکم کے بغیر توحید نامکمل ہے۔

زاہد صدیقی
(سابق مبلغ دیندار انجمن)

دیندار انجمن کی مُنافقانہ چال

صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کے دعاوی اور باطل عقائد کی تفصیل ناظرین ماہنامہ "فاران" کے فروری کے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ "فاران" میں شائع شدہ مضمون کو ہفت روزہ "ایشیا" اور سہ روزہ "نوائے پاکستان" نے بھی بالاقساط شائع فرما کر اس دینی خدمت میں حصہ لیا نیز اس انجمن اور بانی انجمن کے متعلق علماء کرام کے فتووں کا اختصار بھی "ایشیا" کے ۱۱ مارچ کے شمارہ میں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ دیندار انجمن کے بانی چن بسویشور صاحب کے گمراہ کن عقائد جو ان کی کتابوں کی عبارتوں سے پیش کئے گئے تھے۔ ان کی دیندار انجمن کی طرف سے تاحال کوئی مفصل تردید نہ ہوسکی اور نہ ہوگی۔ ہمارے کسی حوالے کو غلط ثابت کرسکے۔ البتہ انھوں نے ایک چال چلی کہ تمام جرائد کو ایک تردیدی بیان بھیجدیا جو لوگ ان کی اس منافقانہ چال کو سمجھ گئے انھوں نے اسے قابل اشاعت نہ سمجھا اور بعض حضرات نے ان کی منافقت کو اور زیادہ آشکارا کرنے کے لئے اسے اپنے تبصرے کے ساتھ شائع فرمایا۔ مدیر ایشیا نے ۲۰ مارچ کی اشاعت میں اراکین شوریٰ و عاملہ دیندار انجمن حزب اللہ پاکستان کے تردیدی بیان پر جن لفظوں میں تبصرہ کیا ہم بجنسہٖ اسے نقل کرتے ہیں:۔

> "ہم سے زیادہ اس بات کی خوشی کس کو ہوسکتی ہے کہ جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں وہ مسلمان ہی ثابت ہوں اور خواہ مخواہ ان کو کسی نئی دعوت کا ملزم قرار نہ دیا جائے۔ لیکن محض تردیدی بیان ہی اس قسم کے معاملات میں کافی نہیں ہوتا اس سے قبل بھی کئی مدعیانِ باطل مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے تردیدیں کرتے رہے ہیں۔ لیکن اصل حقیقت ان تردیدوں سے نہ بدلی مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے برملا کہا کہ وہ مدعیٔ نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں اور مدعیٔ نبوت کو کذاب اور دجال کہتے ہیں۔ لیکن اسی سانس میں وہ ایسی باتیں بھی کہتے رہے جن کی بنا پر ان کے متبعین کا سواد اعظم ان کو مدعی نبوت ہی قرار دیتا رہا۔ اسی طرح سوال ہے صدیق دیندار چن بسویشور کی تعلیمات اور دعاوی کا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا کہتے رہے ہیں۔ اس لئے انجمن کی طرف سے تردید معتبر نہیں بلکہ ان کے مرشد و مقتدا کی اپنی تحریر۔"

"ایشیا" کے بعد اسی قسم کا تردیدی بیان ماہنامہ "تاج" کے جون ۵۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا جس پر "تاج" نے ان کی منافقت کو سمجھاتے ہوئے نورا معتمد دیندار انجمن کو توجہ دلائی کہ "اس مراسلہ کی شق ۲ اور ۹ میں تضاد کی بو آتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ معتمد صاحب اس سلسلہ میں جلد وضاحت فرمائیں گے۔"

علماء کرام کے فتووں، پروفیسر برنی صاحب اور عاجز کے مضمون ویز "ایشیا" اور ماہنامہ "تاج" کے مندرجہ بالا تبصروں کے بعد دیندار انجمن کے تردیدی بیان پر تبصرہ کی اگرچہ ضرورت معلوم نہیں ہوتی لیکن جاننا ہوا کہ منافقین کی [illegible]

اس تردیدی بیان کو آڑ بنا کر اُمت میں گھسنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی تخریبی کاروائیاں جاری رہیں لہذا معتمد دیندار انجمن کی تضاد بیانی اور منافقانہ چال کی پول جن بسوشیور صاحب کی تحریرات پیش کر کے کھول دینا ضروری سمجھتا ہوں ملاحظہ فرمایئے یہ کہتے ہیں۔

ملا "الحمد للہ ہم مسلمان اہلسنت والجماعت حنفی المذہب ہیں" لیکن جن بسوشیور صاحب تحریر فرماتے ہیں سے

چھتری ہوں، ویش ہوں، شودر ہوں، برہمن ہوں میں
سکھ کایست ہوں، در حلقۂ بھگوان ہوں میں
قادیانی ہوں و لاہوری و نجدی ہوں میں
نیچری ہے مرا مذہب اس سے فرحاں ہوں میں
خارجی، معتزلہ اور ہوں میں اہلِ حدیث
اور سُنی بھی ہوں، در زمرۂ شیعاں ہوں میں

(اشعار از کتاب خادم خاتم النبیین مصنفہ جن بسوشیور صلا)

ناظرین خود فیصلہ کریں معتمد دیندار انجمن کس قسم کے مسلمان اہل سنت والجماعت حنفی المذہب ہیں!! جب کہ ان کے گرو اپنے آپ کو آریہ (اسلام دشمن) لنگایت (لنگ کے پجاری)، چھتری، ویش، شودر، برہمن، سکھ، کایست (مشرکین ہند) قادیانی (مدعی نبوت کا پیرو) لاہوری (مرزا غلام احمد قادیانی کو برحق ماننے والے)، نجدی (وہابی)، نیچری (منکرین معجزات) خارجی حضرت علیؓ کو کافر کہنے والے) معتزلی (گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہنے والے) شیعہ (حضرت صدیق اکبرؓ وصحابۂ کبار پر تبرا بھیجنے والے) وغیرہم کا ہم مذہب وہم مشرب لکھ رہے ہیں۔ کیا معتمد دیندار انجمن کی نظر میں اسی چوں چوں کے مربّے کا نام اسلام ہے؟

ملا معتمد دیندار انجمن نے لکھا ہے کہ "ہم ارکان و احکام اسلام کے نہ صرف پابند بلکہ گزشتہ ۴۲ سال سے مسلسل کفار ہند میں تبلیغ اسلام کر رہے ہیں" سوال یہ ہے کہ جن کی نظر میں اسلام کی مندرجہ بالا تعریف ہو ان کی نظر میں ارکانِ اسلام کیا ہونگے میں اپنے مفصل مضمون میں جن بسوشیور صاحب کی تصانیف سے ثابت کر چکا ہوں کہ وہ ارکان اسلام میں سے ایک ایک رکن کے انہدام میں مصروف رہے۔ رہا تبلیغ اسلام کا معاملہ! وہ بھی ظاہر ہے کہ ختم نبوت کا منکر، مرزا غلام احمد قادیانی کا پیرو، خارجی، معتزلی، نجدی، نیچری، معراج رسول اللہ کا منکر، قیامت اور حشرِ اجساد کا منکر، جنّت دوزخ کا منکر، تناسخ کا قائل، اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کو "گھن چکّر" اور جنت کو "بیکار خانہ" لکھنے والا اور ان عقاید باطلہ کی تبلیغ کرنے والا کس طرح مبلّغ اسلام کہلا سکتا ہے؟

ملا معتمد دیندار انجمن فرماتے ہیں کہ "ہم آنحضرت منبع انوار محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ کو خاتم النبیین مانتے ہیں اور آپ کے بعد کسی بھی نبی کا انتظار ہمارے اعتقاد میں گمراہ کن ہے" لیکن جن بسوشیور صاحب کی تصانیف کا کوئی صفحہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تعریف و توصیف سے خالی نہیں جن بسوشیور صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس مدعی کاذب کو مسیح موعود تسلیم کیا۔ بلکہ خود بھی دعوئے نبوت کیا اور ان کے متبعین بھی مدعی نبوت ہیں۔ چنانچہ جن بسوشیور صاحب کی ایک منظوم تصنیف مع تشریح بنام "مہر نبوت" کے صفحہ ۲۵ پر درج ہے کہ "نبیوں کے اسرار مجھ پر کھلنے کے دو اسباب ہیں، پہلا سبب یہ کہ فقیر ۱۹۰۸ء میں فتنۂ دجال سے کما حقہٗ واقف ہو کر جستجوئے مسیح میں تھا۔ ۱۹۱۴ء میں مسیح (مرزا غلام احمد قادیانی) کو پایا اور نہایت مخلصانہ طور پر اٹھائیس سال کی عمر میں ترک دنیا کر کے مزید حصولِ "علم دین" کے لئے قادیان پہنچا" فرمایئے معتمد صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود ماننا اور خود کو "مسیح گر" اور اپنے متبعین کو نوحؑ، موسیٰؑ، یحییٰؑ، گوتم، زرتشت لکھنا کیا یہ سب عقیدہ ختم نبوت کا انکار نہیں ہے؟

جب آپ نے صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کو اوتار، یوسف موعود، اور مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود مان کر بیعت کی تو اب آپ کس منہ سے اپنے آپ کو ختم نبوت کا قائل کہتے ہیں (کتابچہ مہدو اوتار میں تفصیل ملاحظہ ہو)

۱۲ معتمد دیندار انجمن نے لکھا ہے "کہ ہم آنحضرت کے بعد نہ صرف یہ کہ مدعیٔ نبوت کو کافر، کاذب، دجال سمجھتے ہیں بلکہ اپنے اعزاز و روحانی مراتب کو کسی مسلمان پر ایمانی حجت گرداننے والے ہر مدعی کو گمراہ اور زندیق سمجھتے ہیں"

ہم نے بیعت رضوان کے اصول پر حضرت مرشدنا مولانا سید صدیق حسین المعروف بہ صدیق دیندار چن بسویشور رحمتہ اللہ علیہ کامل فنا فی الرسول کے ہاتھ پر بیعت کی ہے یہ کسی فرقے یا حلقے کے ماننے یا منوانے کی بیعت نہیں بیعت کے الفاظ یہ ہیں "آج میں صدیق کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اقرار کرتا ہوں الخ ــ"

میں پوچھتا ہوں کہ آپ مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر کاذب دجال کیوں نہیں کہتے؟ اور صدیق دیندار چن بسویشور کو کیونکر مسلمان سمجھتے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ہزارہا جگہ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ خود کو مسیح موعود، محمد مصطفےٰ ابراہیمؑ وغیرہ وغیرہ لکھا۔ کیا مرزائے قادیان نے اپنی کتاب "ایک غلطی کا ازالہ" کے صفحہ ۲ پر یہ نہیں لکھا کہ

"حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے لفظ رسول، اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں چنانچہ میری نسبت یہ وحی اللہ ہے مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہِ (الآیۃ) اس وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی۔" نیز تریاق القلوب کے صفحہ ۱۰ و نزول مسیح کے صفحہ ۴۸ پر صاف صاف لکھا کہ "میں محمد مجتبیٰ ہوں اور احمد مختار ہوں"

آپ اخبار فاروق قادیان جلد ۲۵ نمبر ۱۵۔ ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء کے اس شعر سے کب تک "تجاہلِ منافقانہ" برت سکتے ہیں اور امت کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ ہاں تو مذکورہ شعر پہلے سن لیجئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"وہ آفتاب چمکتا تھا جو مدینے میں
ہے جلوہ ریز وہ اب قادیاں کے سینے میں"

مرزا غلام احمد قادیانی کے ان دعووں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اس کاذب کو کافر کہنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں جب کہ آپ کے گرو چن بسویشور نے ابن کذاب مرزا محمود کے صدہا باغیانہ اعلانات سننے کے باوجود اسے "مرد متقی" لکھا! کیا آپ کی نظر سے مرزا محمود کے یہ دلخراش اور توہین آمیز جملے نہیں گزرے کہ "یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر شخص ترقی کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑا درجہ پا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ محمد رسول اللہ صلعم سے بھی بڑھ سکتا ہے"

(بیان مرزا محمود مندرجہ الفضل ۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء صفحہ ۵)

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اپنے اعزاز و روحانی مراتب کو کسی مسلمان پر ایمانی حجت گردانتے والے ہر مدعی کو گمراہ اور زندیق سمجھتے ہیں" اگر آپ نے یہ دیانت دارانہ طور پر لکھا ہے تو آیئے ہم مرزا صاحب کی عبارتوں میں اس قسم کی صدہا ایمانی حجتیں آپ کو بتلا سکتے ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنے مخالفین کو دائرۂ اسلام سے خارج، عیسائی، یہودی مشرک، جہنمی بلکہ ولد الحرام اور ان کی بیویوں کو کتیاں "تک لکھ دیا۔ آئینہ کمالات اسلام مصنفہ مرزا قادیان تو آپ نے بھی پڑھی ہوگی کیا اس کے صفحہ ۵۴۷ پر آپ کو یہ عبارت نظر نہ آئی کہ

"کل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کی ہے مگر کنجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔"
(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۴۷)

نیز دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی یہودی مشرک اور جہنمی ہے۔"

(نزول المسیح ص۹۹۔ تذکرہ ص۳۲۷ ضمیمہ تحفۂ گولڑویہ ص۱۳۔ تبلیغ رسالت جلد ۹ ص۲۷)

(۲) سنیئے آپ کے مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

"جو شخص ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے۔ حرام زادہ کی یہی نشانی ہے۔" (انوار الاسلام ص۳۰)

فرمایئے معتمد صاحب مرزا قادیانی نے اپنے دعوؤں کو مسلمانوں پر ایمانی حجت گردانا یا نہیں؟ جھجکئے نہیں! ذرا صاف لفظوں میں اقرار کیجئے کہ اس قسم کی ایمانی حجت گردانے والا قادیانی۔ ہماری نظر میں گمراہ اور زندیق ہے۔

آپ نے تردیدی بیان میں مجھ پر کتر بیونت کا الزام بھی لگایا ہے! کاش آپ مندرجہ مضمون اقتباسات میں سے کسی ایک ہی اقتباس کو درج فرماکر "کتر بیونت" ثابت کر سکتے! کتر بیونت کا محض الزام مجھ پر دھرنے کے بعد آپ خود کس صفائی سے الفاظ بیعت نقل فرماتے ہوئے صدیق دیندار صاحب کے القابات جو آپ کے اعتقادات میں داخل ہیں حذف کر گئے کیا یہ کھلی چال بازی نہیں ہے آپ نے لکھا کہ:۔

"آج میں صدیق کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کرکے الخ۔"

حالانکہ دعوۃ الی اللہ کے آخری صفحہ پر جو بیعت نامہ چھپا ہوا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ آج میں مولانا صدیق دیندار "آخرین کے سردار مظہر الاوّل والآخر" کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے۔ الخ۔"

فرمایئے آپ نے "آخرین کے سردار مظہر الاوّل والآخر" کو کس خوف سے حذف کر دیا؟ کیا یہ کھلی بددیانتی نہیں ہے

ص۵ آپ نے لکھا کہ "اپنے مسلمان ہونے کے سلسلے میں ہم کسی کے فتوے یا سند کے محتاج نہیں ہیں" عرض ندمت ہے کہ آپ کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد کوئی مسلمان اس کا انتظار کرے گا کہ مفتیانِ کرام سے جاکر پوچھے کہ جن بسویشور پارٹی کو گروہ ملحدین "کہا جائے یا نہیں؟ آپ کی کفریات واقعی محتاج فتاویٰ و سند نہیں ہیں!

ص۱ آپ نے لکھا ہے کہ جن بسویشور صاحب کی عملی زندگی کو آپ نے دیکھا ہے۔ اس لئے ان سے آپ کی عقیدت متزلزل نہیں ہو سکتی۔

اگر واقعہ یہی ہے کہ آپ جن بسویشور کے ظاہری تقدس سے مرعوب ہو کر نیک نیتی سے ان کے گرد جمع ہوئے ہیں تو میری نظر میں، آپ کی حالت اور زیادہ قابل رحم ہے۔ شاید آپ حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ آپ پر واضح ہو جاتا کہ ہر مدعی باطل اور دشمن انسانیت "لباس تقدس" میں ظاہر ہوا۔ کاش آپ حضرات فتنۂ مقنع مبرقع، فتنۂ بابک خرمی، فتنۂ قرامطہ، فتنۂ حسن بن صباح و فتنۂ بہائیت وغیرہم کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتے۔ ان تمام فتنوں کے بانی صدیق جن بسویشور سے بھی زیادہ "دیندار" اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن انجام دنیا نے دیکھ لیا کہ ان اہل بیت کی محبت کے دعویداروں، احیائے سنت کا نعرہ بلند کرنے والوں، غریبوں کے غمخوار و اشاعت اسلام کے علمبرداروں کو جیسے ہی قوت ملی انھوں نے بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا، بستیوں کو اجاڑنا۔ مسجدوں کو گرانا۔ غلط عقائد کو بجبر ٹھونسنا اور منوانا شروع کر دیا۔ جب ہمارے پاس آپ کی ڈکیتیوں اور غنڈہ گردیوں کی مصدقہ اطلاعات پہنچ چکی ہیں (اور جن کا آپ انکار بھی نہ کر سکے)، تو پھر ہم آپ کی اس قسم کی چکنی چپڑی باتوں پر کیسے یقین کر سکتے ہیں کیا آپ واقعی اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ محلہ بیگم بیٹھ حیدر آباد میں ایک ساہوکار کے گھر دن دہاڑے لوٹ مار مچاکر ایک تجوری جس میں پانچ لاکھ کی نقدی، زیورات و جواہرات تھے آپ لے کر رفو چکر ہو گئے۔

نمبر ص۸، ص۹ اور ص۱۰ میں آپ نے پھر وہی کچھ دہرایا ہے کہ ہم سنی المشرب ہیں مبلغ ہیں وغیرہ وغیرہ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کون سا تصوف ہے جو نبوت کے دروازے کھولتا ہے اور مدعیانِ نبوت کو کافر قرار دینے سے روکتا ہے؟

مضمون کی طوالت کا اگر خوف نہ ہوتا تو آپ کے "فلک عشرۂ کاملہ" کے ایک ایک لفظ سے آپ کی عیاری مکاری اور چالبازی سے عوام کو واقف کراتا۔

آخر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ اس قسم کی منافقانہ روش اور عذاب کی زندگی چھوڑ دیجئے۔ اپنی آخرت کو جان بوجھ کر تباہ نہ کیجیے۔ اگر آپ کا دامن واقعی کفر و الحاد سے داغدار نہیں ہے اور آپ اسلام کے خلاف کسی سازشی پروگرام میں شریک نہیں ہیں تو "بے نقاب" میں عائد کردہ الزامات کی "دولفظی" تردید کی بجائے (جسے آپ کی ایک اور منافقانہ چال شمار کیا جا رہا ہے) ایسا کیجیے کہ دیندار انجمن کی طرف سے شائع شدہ کتابیں ۱ دعوۃ الی اللہ ۲ خادم خاتم النبیینؐ ۳ مہر نبوت ۴ امام الجہاد ۵ جامع البحرین ۶ شمس الضحیٰ ۷ غیب و شہادت کا پیغام ۸ معراج المومنین وغیرہ وغیرہ مدیر "فاران"، یا مدیر "ایشیا"، یا مدیر "نوائے پاکستان"، یا مدیر "تاج" کی خدمت میں برائے تبصرہ بھجوا دیجیے۔ وہ اس بحث سے الگ رہ کر غیر جانبدارانہ مطالعہ کے بعد مذکورہ بالا کتابوں سے قائم شدہ مجموعی تاثرات کو بلا کم و کاست چھاپ دیں گے۔ بس حقیقت آسانی سے واضح ہو جائے گی۔

اگر مذکورہ کتابوں میں کفر و الحاد کا خزانہ نہیں ہے تو پھر آپ انھیں علماء کرام کے سامنے پیش کرنے سے کیوں ڈرتے ہیں؟

برادرانِ اسلام: ان کی چال بازیوں سے ہشیار رہیئے اور ان سے صرف مذکورہ کتابیں پیش کرنے کا مطالبہ کیجیے۔ اللہ ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

ذیل میں صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کی تصانیف سے اصل عبارتیں بلا تبصرہ نقل کی جا رہی ہیں تاکہ ناظرین خود اندازہ قائم کریں کہ یہ لوگ کس قسم کے نظریات کے حامل ہیں۔

(۱) ابن کذاب بشیر الدین محمود کے متعلق چن بسویشور صاحب لکھتے ہیں۔

"اے خلیفۂ جماعت احمدیہ میں آپ کو ایک زمانے سے جانتا ہوں کہ آپ متقی مزور ہو۔" (حوالہ از کتاب خادم خاتم النبیینؐ صـ۲۳)

(۲) قادیان کا خط چن بسویشور کے خط کے جواب میں!

"مکرمی! وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

عرض یہ ہے کہ مجلس مشاورت کے بعد آئندہ سال کے پروگرام میں دکن کی طرف وفد بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔ بہر حال آپ کام کرتے رہیے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے اپنے وقت پر پورے ہوں گے۔ مزید برآں یہ عرض ہے کہ بوجہ مالی تنگی اس علاقہ کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔ کام کی رپورٹ براہ کرم ضرور بھیجا کریں اور مشکلات اور نتائج تبلیغ سے آگاہ فرماتے رہیں والتسلیم

دستخط عبدالرحیم نیرؔ نائب ناظر دعوۃ تبلیغ قادیان (مہر قادیان) حوالہ از خادم النبیین صـ۸۷)

(۳) **نبی کریم پر تہمت:**۔ "حضور نے جو تاریخ پیدائش میری بتائی ہے اور حالات بتلائے ہیں وہی اولیائے دکن (سادھوؤں) نے بتائے ہیں اور انھوں نے جو تاریخ پیدائش اور حالات بتلائے ہیں، وہی حضرت مرزا صاحب (قادیانی) کی کتب میں نظر آتے ہیں۔"

(حوالہ از کتاب خادم خاتم النبیین صـ۱۶)

(۴) **روحانیت کا اثر:**۔ "وہ لڑکی بہتر سے بہتر لباس پہنے ہوئے پھول اور عطر میں بسی ہوئی رات کے دو بجے میری چادر میں گھس کر لپٹ گئی اور منہ پر منہ رکھا۔" (خادم خاتم النبیین صـ۶۲)

(۵) **جنت بیکار خانہ:**۔ "جب دنیا میں گناہوں کا زور ہوتا ہے تو جنتی ارواح کو غیرت ہوتی ہے اللہ کے اذن سے بصورت اولیا آکر کام کرتے ہیں ورنہ یہ خیال کیا جائے کہ جنتی لوگ ہمیشہ جنت میں پڑے رہتے ہیں اس سے جنت نہ ہوئی "بیکار خانہ ہوا"۔

(حوالہ از معراج المومنین صـ۵۹)

(۶) **دعوئے محمد ثانی:**۔ "جب بعثت ثانی میں ان کے (یعنی قادیانیوں کے) باپ حضرت محمد مصطفیٰ (یعنی چن بسویشور)

تشریف لائے ان کو چھوڑ کر احمدیوں نے ولد اللہ کی حقیقت کو قائم رکھنا چاہا تو ان کو فتنوں میں مبتلا کر دیا گیا۔" (حوالہ از مہر نبوت ص۲۶)

(۷) **ایک سوال** :- چن بسوشیور صاحب پوچھتے ہیں۔ "ہے کوئی دنیا میں نبی ایسا جس کے دربار میں انبیاء جمع ہوں آدم سے لے کر عیسیٰ تک کل انبیاء، اور مچھ اوتار سے لے کر گوتم بدھ اوتار تک کل انبیاء جمع ہیں۔" (مہر نبوت ص۶۲)

(۸) **رام اور کرشن** :- "جماعت دینداران کو خطابات من جانب اللہ ملے ہیں دو سو سے زیادہ مرد میدان۔ اکثروں نے نبیوں کے منازل طے کئے وہ متعدد انبیاء کے ناموں سے پکارے گئے وہ دربار بروز محمد (چن بسوشیور کی خانقاہ جس کا نام خانقاہ سرور عالم ہے) میں جمع ہیں صرف رام اور کرشن اوتار ہی ایک درجن سے زیادہ ہیں۔" (حوالہ از شمس الضحیٰ ص۱۹)

(۹) **دعوئے نبوت** :- "جن کو اللہ نے یحییٰ، نوح، موسیٰ پکارا وہ میری بیعت میں ہیں۔ دستگیر صاحب میرے مرید کو اللہ نے نارد منی پکارا۔ مولوی سراج الدین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے معین الدین اور نرسوہ (مسیح) پکارا وہ میری بیعت میں ہیں یہ دن قیامت کے ہیں **واذا الرسل اقتت** کا وعدہ پورا ہو رہا ہے (دعوۃ الی اللہ ص۹۲)

(۱۰) **دعوئے الوہیت** :- "حدیث رویت اللہ میں آیا ہے کہ اللہ حشر کو تشریف لائے گا وہ غیر کی صورت میں ہے گا۔ اس سے مراد یہ کہ اللہ غیر مسلم کے نام و لباس سے آئے گا یعنی چن بسوشیور کے نام سے آئے گا۔ مسلمان نعوذ باللہ منک کہیں گے۔ واقعی میرے دعوے چن بسوشیور پر مسلمانوں نے بدعقیدہ اور گمراہ سمجھ کر نعوذ باللہ منک کہا۔ بندرہ سال کے بعد اب ان کے امام اور احمدیوں کے موعود یوسف کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہوں اس سے خوش ہیں اب مزید "انت ربنا" کہیں گے۔" (دعوۃ الی اللہ ص۱۶۱)

(۱۱) **نہ جہاد نہ ہجرت** :- "اب ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا ماضی موعودہ اور بشارتوں کی بنا پر گزر گیا مستقبل بھی موعودہ ہے وہ بھی گزر جائے گا آئندہ اس قسم کی تبلیغ ہجرت غزوات تیرہ سو سال تک نہیں ہوں گے۔" (شمس الضحیٰ دیباچہ)

(۱۲) **شفاعت** :- "قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ قیامت میں اللہ قاضی کی حیثیت سے آئے گا اور سزا و جزا کے فیصلے سنائے گا۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ بروز حشر حضور اکرم امت کی شفاعت فرمائیں گے یہ "بعثت ثانی" کی طرف اشارہ ہے اسلام میں ختم نبوت کا مسئلہ مسلم ہے اس لئے کوئی شخص حضور کے بعد دعوئے نبوت نہیں کر سکتا۔ اس لئے امت کی شفاعت آپ ہی کرینگے وہ بعثت بہ لباس دیگر ہوگی۔ یہی بعثت بروز محمد کہلائے گی۔ وہ قیامت کے نشان مسیح موعود (مرزا قادیانی) کے بعد ہوگی آپ قیامت کے مالک بن کر آئیں گے وہ وجود حضرت مولانا صدیق دیندار چن بسوشیور صاحب کا ہے۔" (شمس الضحیٰ ص۶۷)

(۱۳) **چن بسوشیور رحمۃ اللعالمین** :- "پہلی دفعہ آپ مخلوق پر رحم فرما کر رحمۃ اللعالمین بن کر تشریف لائے اور مخلوق کو ہر بلا سے بچایا اب دوبارہ آپ ہی تشریف لائے ہیں۔" (شمس الضحیٰ ص۱۸)

(۱۴) **تناسخ** :- "آہ! ایسی عظیم المرتبت شخصیت کہ جس کے احسانات کو عالم انسانیت کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا ساڑھے تیرہ سو سال بعد اپنا حقیقی چہرۂ انور دکھلا کر راہ سفر اختیار کر گئی" (شمس الضحیٰ ص۳)

(۱۵) **مسیح گر** :- "حسب بشارت گمنام مقام سے ایتوں میں ایک ایسی طاقت صدیق دیندار چن بسوشیور کو کھڑا کیا جو "مسیح گر" ہے (یعنی مسیح بناتا ہے مثلاً زرگر، آہنگر) اور وہ وجود رسولوں کو جمع کرنے والا ہے۔ . . . کوئی نوح ہے اور کوئی ابراہیم ہے کوئی یحییٰ اور کوئی نارد ہے۔ کوئی موسیٰ . . . کو ہر لیا اور کوئی بسوشیور۔" (دعوۃ الی اللہ ص۳)

(۱۶) **افسر انبیاء** :- "چن بسوشیور جن کا تخلص سالار تھا لکھتے ہیں۔

کہ نبیوں میں افسر بالا بھی ہوں میں،
اے سالار سالار اصلی بھی ہوں میں"

(مہر نبوت ص۶۲)

برادران! غور فرمایئے اس کاذب و مفتری نے کیسے کیسے دعوے کئے اور اس کے مرید اسے کیا سمجھتے ہیں۔ مرتے مرتے بھی کمبخت کفر سے باز نہ آیا چنانچہ اس کے مرید نے اپنی کتاب شمس الضحیٰ کے صفحہ پر اس کے مرنے کے وقت کے کلمات درج کئے ہیں کہ "حضور (جن بسو شیور) نے فرمایا میرا کام ختم ہوگیا۔ میں ایک طوفانی دورے پر جانے والا ہوں میں ہمیشہ آتا جاتا رہوں گا۔ اللہ بڑا گھن چکر ہے، وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ کسی کی سمجھ میں آگیا تو وہ خدا ہی نہیں"

ان سبز عمامہ گیروا کرتہ اور لمبے لمبے بال والوں سے ہشیار رہیئے ان کی بے دینی سے لوگوں کو واقف کرا کے ثواب دارین حاصل کیجئے۔ وما علینا الا البلاغ!

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مجید لاہوری

سنہ تو ٹھیک طرح یاد نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۳۱ء تھا جب سب سے پہلے مجید لاہوری مرحوم سے عربک کالج دلی کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ یہ زمانہ ان کی شہرت کے آغاز کا تھا۔ میں نے ادبی دنیا، ہمایوں اور شاہکار میں ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھی تھیں۔ اور ان کی ذہانت سے یہ توقع قائم کی تھی کہ نام نہاد "ترقی پسندوں" کے مقابلہ میں "تعمیر پسند شاعروں اور ادیبوں" کا جو گروپ ہے، مجید کی ذات اس گروپ کو تقویت پہونچائے گی۔ اس زمانہ تک انھوں نے مزاحیہ شاعری شروع ہی نہیں کی تھی سنجیدہ غزلیں اور نظمیں کہتے تھے۔ دلی میں وہ غالباً جناب حفیظ جالندھری کے یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر حفیظ صاحب ہی کے ساتھ انہیں میرٹھ نوچندی کے مشاعرے میں دیکھا۔

اس واقعہ کے تیسرے سال مجھے دہلی سے کراچی ایک مشاعرے میں آنا پڑا۔ رائے ونڈ جنکشن سے جو گاڑی بدلی تو اتفاق سے اس ڈبہ میں جگہ ملی جس میں مجید لاہوری بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ حاجی لق لق بھی تھے، کراچی تک کا یہ سفر بڑی ہنسی خوشی میں کٹا، چوبیس گھنٹہ باتوں باتوں میں گزر گئے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور قہقہہ مزاح کا ڈبہ میں ایک طوفان سا اٹھتا رہا، کراچی پہونچ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے شاعروں کو مشاعرے والوں نے مختلف مقامات پر ٹھہرایا تھا۔ پھر شب کو مشاعرے میں یکجائی ہوئی!

زمانہ گزرتا اور دن بیتتے چلے گئے، یہاں تک کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا ہندوستان تقسیم ہوا پاکستان بنا اور اس کے بعد جو کچھ ظہور میں آیا کس کے قلم میں طاقت ہے جو ان المناکیوں کو بیان کرسکے۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں مجھے بھی کراچی آنا پڑا۔ ان دنوں مجید لاہوری مرحوم روزنامہ "انصاف" میں کام کرتے تھے، پھر چند روز "روزنامہ جنگ" میں "حرف و حکایت" لکھنے لگے۔ اور اس آٹھ نو سال کی مدت میں انھوں نے اس قدر شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی، جو بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو بیسیوں برس کی مشق و ریاضت کے بعد بھی میسر نہیں آتی۔

چراغ حسن حسرت مرحوم سے کراچی میں مجید کا بہت یارانہ تھا بلکہ یوں کہئے کہ گاڑھی چھنتی تھی، حسرت ؎

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام ما

کی تصویر بلکہ تفسیر بن کر رہ گئے تھے، حسرت مرنے کو مر گئے مگر اپنے بعض ہم مشرب دوستوں کی زندگیوں پر "سرخوشی" کا گہرا نقش چھوڑ گئے۔ اسی بے اعتدالی کی بدولت مجید لاہوری کی صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگی پھر دل کے دورے پڑنے لگے اور آخر میں تو ان کے جسم کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنی انگلی سے اپنے جسم کو دباتے، دبانے سے جسم میں گڑھا پڑ جاتا اور بہت کافی دیر میں گڑھا ہموار ہوتا!

مجید لاہوری بڑے باغ و بہار آدمی تھے، جس جگہ بیٹھے لوگوں کو ہنسا کر اٹھتے۔ کس کس کے کیسے کیسے لطیفے یاد تھے، کچھ دوسروں سے سنے ہوتے، کچھ خود ان کے بنائے ہوتے کچھ طرز ادا سے اس میں سچ مچ جان ڈال دیتے، زیادہ وقت ہنسنے اور ہنسانے ہی میں گزرتا محفلیں اور صحبتیں ان کے دم سے جیسے چہچہانے لگتیں۔ چراغ حسن حسرت مرحوم کا اکثر ذکر کرتے، کہتے تھے کہ حسرت دھوبی، حجام، تانگہ والے،

یہاں تک کہ طوائف کو بھی "مولینا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بذلہ سنجی اور ٹھٹھول میں مجیدؔ مرحوم کسی حد کی پروا نہ کرتے، سب کچھ کہہ گزرتے، ان سے آخری بار ملاقات اسی سال مارچ میں لائل پور کے مشاعرے میں ہوئی، مشاعرے کے بعد لاہور جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر ہم آئے رات کافی بھیگ چکی تھی موسم خاصہ خنک تھا، پلیٹ فارم پر فراق گورکھپوری اور مجید لاہوری کے درمیان رنگین باتوں اور بے تکلفانہ مذاق کی جو "چھیڑ" چلی تو مولانا عبدالمجید سالک جی کڑا کر کے وہاں جمے رہے۔ مگر میں اپنی غیر سنجیدگی اور آزاد منشی کے باوجود وہاں سے دور جا کر کھڑا ہو گیا! بس پھر اس دن کے بعد ملنا نہ ہو سکا، اخبار میں ان کے مرنے کی خبر ہی پڑھی اور کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا، مرحوم سے میری بہت زیادہ بے تکلفی تھی مگر ان کے گھر کبھی جانا نہیں ہوا اخبار میں پتہ دیکھکر میٹھادر پہونچا اور وہاں تھوڑی سی دیر کی تلاش کے بعد اُن کا گھر مل گیا، فلیٹوں کے درمیان گلی میں فرش بچھا تھا اور اس پر دوسرے سوگواروں کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا جنازہ اٹھا تو عورتوں کی چیخوں نے سب کے دل ہلا دیئے، ملول سب تھے مگر میں نے روتا ہوا اُس مرد قلندر کو دیکھا، جو کراچی کے ہر جلسہ میں بڑی جرأت کے ساتھ نعرہ لگایا کرتا ہے کہ:۔

"کچھ "قادیانیوں" کے بارے میں بھی تو کہو"

طنز و مزاح کا جو "طوطیٔ ہزار داستان" تھا اس کے جنازے کو کندھا دیا اب بیاں کیا رکھا تھا، ایک جسد بے روح ایک پیکر خاموش! . . . . رہے نام اللہ کا!

مجید لاہوری کے طنز و مزاح میں بڑی شگفتگی ہوتی تھی، عوامی مسائل کو ظرافت کے پیرایہ میں بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے، ان کا قلم بعض اوقات نشتر کا کام کرتا مگر دیکھنے والے سمجھتے کہ یہ تو ہنسی ہنسی میں چٹکی لی ہے! "عوامی بولیوں" کی ترجمانی میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، اور ان کی مزاحیہ شاعری تو پھلجھڑی ہوتی تھی! افسوس ہے کہ ان کے "مزاح و ظرافت" کے سامنے ان کی سنجیدہ شاعری دب کر رہ گئی!

ان کا قلم کبھی کبھی بہک بھی جاتا تھا، اسلامی دستور اور دینی رجحانات پر انھوں نے چوٹیں کیں تو میں نے کئی بار ان سے سخت الفاظ میں شکوہ کیا وہ شرما سے گئے اور چپ سادھ لی اسی سال کے جاڑوں کی بات ہے کہ کاٹن ایکسچینج کی بلڈنگ میں مشاعرہ تھا، وہاں انھوں نے نظم سنائی، جس میں "مولوی گلشیر خاں کی حکومت" پر طنز تھی کہ اس انداز کی مذہبی حکومت جب قائم ہوگی، تو نگاہوں پر، فکر و خیال پر، رنگینیوں اور نظاروں پر پابندی ہو گی . . . . . . میں نے اس نظم پر ان کو ٹوکا!

کئی سال کی بات ہے کہ لاہور کے ایک نقاب پوش صحافی" ابو رشید وجدانی" کے نام سے حکومت کی تائید میں مضامین لکھا کرتے تھے انہی حضرت (؟) نے مجید لاہوری کو ایک خط لکھا جس میں "بکار سرکار" حکومت کی طرف سے کسی "پیش کش" کی طرف اشارہ تھا، مجید لاہوری نے مجھے یہ خط دکھایا میں نے کہا کیا ارادہ ہے؟ بولے کہ میں اس پیش کش کو ٹھکرا دوں گا!

مجید لاہوری کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے مر گئے اور ہمیں مرنا ہے مرنے والے کے ساتھ نہ اس کی شہرت جاتی ہے اور نہ دولت و منزلت! ان میں سے کوئی چیز نہیں یہ سب اس دنیا ہی میں رہ جاتی ہیں ساتھ جاتے ہیں اعمال! آہ! اس دن کے لئے ہم "زاد راہ" مہیا کر رکھیں جس دل نے دوسروں کی موت سے بھی عبرت حاصل نہ کی اس دلِ غافل سے اللہ کی پناہ!

دستور توحید

(سراج حیدر آبادی)

— ۱ —

مسلط تھی زمانے پر ابھی تاریکیٔ باطل
ابھی تھا کاروانِ زندگی آوارۂ منزل
سفینہ آدمیت کا نہ پہونچا تھا لبِ ساحل
ابھی تھے انتظارِ ناخدا میں صاحبانِ دل
حرا کی خلوتوں سے ناگہاں مہر مبیں نکلا
امانت لیکے حق کی غار سے باہر امیں نکلا

— ۲ —

یہی اعلان تھا دنیا میں حق کی پادشاہی کا
تمیزِ حق و باطل کا اوامر کا نواہی کا
سمجھنے کو تو مجموعہ ہے احکام الٰہی کا
مگر پنہاں اسی میں راز ہے عالم پناہی کا
اسی کی ضرب سے دنیائے باطل کپکپا اُٹھی
فضائے دہر اس کے نور ہی سے جگمگا اُٹھی

— ۳ —

اسی قانونِ فطرت سے ملی انسان کو عظمت
عطا کی ہے اسی نے "حسنِ تقویم" کی رفعت
اسی منشور کے دو رُخ ہیں گویا دوزخ و جنت
قبول و رد پہ اس کے منحصر ہے ذلت و عزت
زمانے میں حق و باطل کا اک معیار قائم ہے قرآں
مسلماں کے لئے صورت گرِ کردار ہے قرآں

— ۴ —

ضلالت کے اندھیروں کے لئے نورِ مبیں قرآں
ہدایت یافتہ دل کیلئے عین الیقیں قرآں
صداقت کے پرستاروں کو ہے حبل المتیں قرآں
عبارت مختصر تنزیلِ ربُّ العالمیں قرآں
اسی میں ربطِ عبد و رب کا ہر اک راز سا تر ہے
نبیؐ کے ہاتھ میں اللہ کی تجویزِ آخر ہے

— ۵ —

کلامِ حق ہے گویا نغمۂ بے ساز ہے قرآں
دلوں سے ہے مخاطب اور بے آواز ہے قرآں
سراسر فاش ہے اور سر بسر اک راز ہے قرآں
رسولِ ہاشمی کا اک کھلا اعجاز ہے قرآں
اسی میں روشنی بھی ہے اسی میں خیرگی بھی ہے۔
اُجالا بھی اسی سے ہے اسی سے تیرگی بھی ہے

— ۶ —

مسلماں کو سدا یہی دستور گر پیشِ نظر ہوتا
تو کیوں شیرازۂ دینِ پیمبر منتشر ہوتا
مسلماں آج بھی قرآن کی رہ پر اگر ہوتا
نہ ایسا در بدر رہتا نہ اتنا بے بصر ہوتا
سراجؔ اللہ نے سب کچھ دیا قرآن والوں کو
نویدِ اَنتُمُ الاَعلَون ہے ایمان والوں کو

جذب و جنوں

میکش اکبرآبادی

مرے غم کے لئے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا
یہاں تو ہو رہی ہے داستاں سے داستاں پیدا

یہ مسلک اپنا اپنا ہے یہ فطرت اپنی اپنی ہے
جلادو آشیاں تم، ہم کریں گے آشیاں پیدا

تو اپنا کارواں لے چل نہ کر غم میرے ذروں کا
انہیں ذروں سے ہوجائے گا پھر ایک کارواں پیدا

ہماری سخت جانی سے ہوا شل ہاتھ قاتل کا
سرِ مقتل ہی ہم نے کرلیا دارالاماں پیدا

ذرا تم نے نظر پھیری کہ جیسے کچھ نہ تھا دل میں
ذرا تم مسکرائے ہوگیا پھر اک جہاں پیدا

وہی ہے ایک مستی سی وہاں نظروں میں یاں دل میں
وہی ہے ایک شورش سی وہاں پنہاں یہاں پیدا

خان خلش

جو دل میں تیری محبت کا داغ رکھتا ہے
وہ ظلمتوں کے لئے شب چراغ رکھتا ہے

بفیضِ ابرِ بہار و بہ لطفِ پیرِ مغاں
ہر ایک رند شراب و ایاغ رکھتا ہے

اسی نے خاک کے ذروں کی قدر پہچانی
جو مہر و ماہ سے اونچا دماغ رکھتا ہے

کسی کو فکرِ تعیش کوئی اسیرِ ہوس
وہ دل کہاں کہ متاعِ فراغ رکھتا ہے

کھلا ہے یہ تصور کا گلستاں یارب
جو دل کو ہجر میں بھی باغ باغ رکھتا ہے

نہ پوچھ حالِ خلش کا کشش کے ہاتھوں یہ شکستہ خاطر و دل داغ داغ رکھتا ہے

محشر دھول نگری

حق بات کا بے ساختہ اظہار کیا ہے
یہ جرم وہ ہے جس کا خود اقرار کیا ہے

مردانِ خدامست نے ہر دور میں اے دوست
اعلانِ حقیقت کا سرِ دار کیا ہے

ہر صبح جگایا ہے مجھے تیری اذاں نے
ہر صبح تیری یاد نے بیدار کیا ہے

اظہارِ حقیقت کی جو چاہو وہ سزا دو
اس جرم سے مومن نے کب انکار کیا ہے

سو بار ترے چہرے پہ ڈالی ہیں نگاہیں
سو بار ان آنکھوں کو گنہگار کیا ہے

کچھ شیخ پہ موقوف نہیں انکی نظر نے
رندوں کو بھی مستِ مے اسرار کیا ہے

کچھ کم نہیں احسان یہ تہذیبِ نوی کا
قوموں کو بہم برسرِ پیکار کیا ہے

غیروں کا گلہ کیا کہ ہمارے ہی عمل نے
اسلام کو رسوا سرِ بازار کیا ہے

قمر مراد آبادی

ہیں ادا شناسِ جمال ہوں ہیں ہلاکِ فکرِ دگر نہیں
مجھے وہ نظر بھی عزیز ہے مرے حال پر جو نظر نہیں

جو مذاقِ درد ہی مٹ گیا تو ہیں زندگی کا کروں گا کیا
مجھے جان سے بھی ہے کچھ سوا وہ دعا کہ جس میں اثر نہیں

میری زندگی تو فسانہ ہے مری آرزو تو بہانہ ہے
انہیں اختیارِ زمانہ ہے مجھے اختیارِ نظر نہیں

تسکین قریشی

سوزوساز

شرحِ سوزِ حیات کیا ہوگی
دل بھر آتا ہے بات کیا ہوگی

غم نہ ہوگا تو لطف کیا ہوگا
موت ہوگی، حیات کیا ہوگی

لفظ و معنی جدا ہوئے ہیں کہیں
شرحِ ذات و صفات کیا ہوگی

تھی ہمارے اسیر ہونے تک
اب چمن میں وہ بات کیا ہوگی

ہے سحر ہی سے شام کا عالم
دن ہے ایسا تو رات کیا ہوگی

محبت جو سکونِ زندگی برباد کرتی ہے
تو لب خاموش رہتے ہیں نظر فریاد کرتی ہے

سکونِ دل کی خاطر آہ کی تھی یہ نہ سمجھے تھے
کہ یہ تو اور بھی دل کا سکوں برباد کرتی ہے

کہاں تک حسن ہی آخر کرے بربادیاں دل کی
محبت روز اک دُنیا نئی آباد کرتی ہے

کچھ ایسے نقش بھی راہِ فنا میں چھوڑ آیا ہوں
کہ دنیا دیکھتی ہے اور مجھ کو یاد کرتی ہے

دل ہی نہ رہا تو آرزو کیا
خود کھو گئے، اُن کی جستجو کیا

دیکھا تو مجھے، مگر نہ سمجھے
ہوتی ہے نگاہِ آرزو کیا

بے منزل و راہ جانے والے
سمجھا ہے اسی کو جستجو کیا

کر اور بلند مقصدِ عشق
اپنے لئے اُن کی آرزو کیا

ہے تیری طلب مگر تجھی سے
ہم کیا ہیں، ہماری آرزو کیا

رنگینیٔ دل تو دیکھ تسکیںؔ
یہ ماتمِ خونِ آرزو کیا

ایک شعر:-

ہر مطربِ ناداں کو نہ دے زحمتِ مضراب
یہ ساز ہے دل کا غلط آہنگ نہ ہو جائے

(ماہر القادری)

روحِ انتخاب

مذاہب میں جو تصورات مشترک نظر آتے ہیں، افسوس ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے ان کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے محض سطح پر نگاہ ڈال کر چند غلط مقدمات کو چند غلط طریقے سے ترتیب دے کر غلط نتائج نکال لیتے ہیں حالانکہ دراصل یہ اشتراک ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پتہ دیتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی اصل سے نکلے ہیں، ان تمام تصورات اور تعلیمات کا مبدا ایک ہے، کوئی ایک ذریعۂ علم ہے جس نے انسان کو مختلف ممالک، مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں ان مشترک صداقتوں سے روشناس کیا، کوئی ایک بصیرت ہے جو مشرق و مغرب کا بُعد رکھنے والے سینکڑوں ہزاروں برس کا فصل رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی اور اس بصیرت سے وہ سب کے سب ایک ہی قسم کے نتائج تک پہونچے، لیکن مذاہب جب اپنی اصل اور اپنے مبداء سے دور ہو گئے تو ان میں کچھ خارجی تصورات اور اجنبی معتقدات نے راہ پائی اور چونکہ یہ بعد والی چیزیں اُس مشترک مبداء اور مشترک بصیرت سے ماخوذ نہ تھیں بلکہ مختلف طبائع مختلف رجحانات اور مختلف علمی و عقلی مراتب رکھنے والے انسانوں کی طبع زاد تھیں اس لئے انھوں نے مشترک بنیادوں پر جو عمارتیں تیار کیں وہ اپنے نقشوں اور اپنی وضع ہیئت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں۔

پس حق اور صداقت کا اگر حکم لگایا جا سکتا ہے تو اس اصل مشترک پر جو تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہے نہ کہ ان مختلف تفصیلی صورتوں اور ہیئتوں پر جن میں موجودہ مذاہب پائے جاتے ہیں۔

پس حقیقت یہ ہے کہ "اسلام" مذاہب میں سے ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ نوعِ انسانی کا اصل مذہب یہی ہے اور باقی سب مذاہب اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں دُنیا کے دوسرے مذاہب میں جو کچھ "حق" اور "صدق" پایا جاتا ہے وہ اُسی اصل اسلام کا بچا کھچا اثر ہے جو سب کے یہاں آیا تھا اور اختلاف میں گم کر دیا گیا!

(تفہیمات ـــ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

ترجمان السنہ
جلد سوئم

تالیف مولانا محمد بدر عالم میرٹھی - ضخامت (سیرۃ النبی کا سائز) ۵۱۶ صفحات کتابت طباعت - کاغذ اور جلد دیدہ زیب قیمت مجلد بارہ روپے آٹھ آنے - غیر مجلد دس روپے ملنے کا پتہ ندوۃ المصنفین اردو بازار - دہلی (ہندوستان)

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ایک باعمل عالم دین ہیں وہ ایک طرف صاحب ارشاد و بیعت ہیں تو دوسری طرف ایک مفکر اہل قلم بھی ہیں - مزید سعادت یہ کہ موصوف کئی سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں - ترجمان السنہ کی یہ تیسری جلد انھوں نے اسی مقدس سرزمین پر مرتب کی ہے

احادیث نبوی کی اشاعت و حمایت میں مولانا بدر عالم میرٹھی نے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور مستحق تحسین و تبریک ہے - یہ بہت بڑی سعادت ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے اس سے قبل "ترجمان السنہ" کی دو جلدیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں - اور اب تیسری جلد اسی شان اور اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے - فجزاہ اللہ خیر الجزا

مولف کے دیباچہ "اعتراف و اعتذار" کے بعد کتاب کا آغاز "قضا و قدر" کے عنوان سے ہوتا ہے - جو نازک ترین بحث ہے - مگر فاضل مولف نے اس مسئلہ کو بہت کچھ سلجھا کر بیان کیا ہے اس باب کا کچھ حصہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہے اس کے بعد "فرقہ قدریہ" کی مختصر تاریخ ہے -

اس گرانقدر کتاب کی پہلی دو جلدوں میں آٹھ سو چوراسی احادیث - ترجمہ اور تشریح کے ساتھ آچکی ہیں اس تیسری جلد میں چار سو تئیس احادیث اسی شان اور ترتیب اور ہیئت سے درج ہیں کہ اوپر حدیث کا عربی متن ہے اس کے نیچے اردو کا بامحاورہ ترجمہ ہے اور پھر اس حدیث کی فاضل مولف نے شرح کی ہے ! احادیث کی شرح عقل و نقل کے اعتبار سے جامع اور دل نشین ہے - کسی کا دل بالکل ہی سیاہ ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ وساوس اور خلجان کے ازالہ کیلئے یہ شرح "تریاق" کا کام کرتی ہے - احادیث و تاریخ کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کا مختصر تذکرہ درج ہے - جو بہت خوب ہے ! "عصمت انبیاء" چند صفحات ہیں - مگر ایمان افروز ہیں - لائق مولف کی کسی رائے اور تشریح پر گفتگو کی جا سکتی ہے بلکہ اختلاف بھی ! مگر مجموعی طور پر ان کی فکر مذہب ہے

صفحہ ۱۰۸ پر "قال العزم" نظر آیا ہے "قال الحزم" ہونا چاہئے - یہ کتابت کی غلطی ہے - صفحہ (۱۲۷) پر "نظامی قابلیت" بھی کھٹکا کہ اردو میں "انتظامی قابلیت" بولتے اور لکھتے ہیں ــــ صفحہ ۱۲۹ پر سہو کتابت کے سبب ایک مصرعہ غلط چھپ گیا

؎ وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ایک "ن" کے چھوٹ جانے سے "یہاں" کی بجائے "یاں" مصرعہ کا مفہوم ہی الٹ گیا

صفحہ (۱۴۰) پر آپ چار چار رکعتیں پڑھتے مگر وہ کتنی لمبی لمبی رکعتیں ہوا کرتی تھیں اور کیسی دلفریب ہوتی تھیں "دلفریب" کا یہاں استعمال کسی طرح موزوں نہیں ! صفحہ (۱۴۷) پر یہ بدیہی مسئلہ آخر فارابی اور ابن سینا جیسے عقلاء کو حل نہیں ہوا ــــ یہاں "کو" نہیں "سے" لکھنا چاہئے" کہا

"عقلاسے حل کیوں نہیں ہوا"

کتاب کا آغاز غالب کے جس شعر کے ساتھ ہوتا ہے اس کا مصرعہ اولیٰ ہی ناموزوں درج ہوا ہے

؎ پھر جمع کر رہا ہوں جگر لخت لخت کو

اصل مصرعہ یوں ہے ـــــ

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

ندوۃ المصنفین (دہلی) اس گرانقدر دینی اور علمی پیشکش پر مبارکباد کا مستحق ہے

زادِ سفر (حصہ دوم)

مترجمہ ـــ محترمہ امۃ اللہ تسنیم ضخامت ۴۸۰ صفحات قیمت مجلد گردپوش کے ساتھ (کاغذ گلیز) چار روپے ملنے کا پتہ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔ زادِ سفر حصہ اول ضخامت ۳۹۲ صفحات قیمت غیر مجلد دو روپیہ مجلد گردپوش کے ساتھ تین روپے)

حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی مقبول اور شہرہ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا ترجمہ "زادِ سفر" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے ترجمہ انتہائی سلیس اور عام فہم ہے۔ جہاں ضرورت محسوس کی ہے فاضل مترجمہ نے وہاں ضروری نوٹ دیدئے ہیں۔ عنوانات کی تشریح نے اس کتاب کو اور زیادہ جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ دونوں حصے اپنی جگہ صحیفۂ اخلاق و پاکیزگی ہیں

(صفحہ ۲۳۰) ـــ اجتنبوا کثیرا من الظن (الحجرات) بہتیرے گناہوں سے بچو!

اس میں سہو کتابت کے سبب "گمانوں کی جگہ "گناہوں" چھپ گیا ہے

اس کتاب کی ایک ایک سطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات سے مزین ہے اس لئے پوری کتاب حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ یہ کتاب سبقاً سبقاً ہر گھر میں پڑھی جانی چاہیئے اور ہندوستان میں تو اس کی تلخیص ہندی زبان میں شائع ہونی چاہیئے۔ جنہیں آخرت کے لئے یہ کتاب واقعی بہترین زادِ سفر اور توشہ راہ ہے۔ عملی زندگی کی شاخ در شاخ راہوں میں سنت رسول ہی شمع ہدایت بنتی ہے۔ جو اس شمع سے محروم ہے۔ وہ ہدایت سے محروم ہے

ختم نبوت کامل (دوسرا حصہ)

از مولانا مفتی محمد شفیع۔ ضخامت ۴۸۰ صفحات مجلد گردپوش کے ساتھ قیمت چھ روپے ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی ع۲

یہ کتاب ہر اعتبار سے اپنے موضوع پر جامع و مانع ہے اور اس قابل ہے کہ قادیانیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک اسے پہونچایا جائے۔ کیا عجب ہے کہ ان میں سے بعض پر حق واضح ہو جائے اور وہ کفر و ارتداد کی گمراہی سے نکل کر ہدایت و ایمان کی روشنی میں آجائیں!

فاضل مصنف نے بڑے سلیقہ سے اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔ پہلے انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) کی زندگی کے تین دور دکھلائے ہیں کہ کس تدریج کے ساتھ یہ شخص اسلام و ایمان سے ارتداد کی منزل تک پہنچا ہے اور خود اپنی ہی بعض باتوں کو اس نے کس طرح جھٹلایا ہو اور ان میں کیسی کیسی معنوی تحریفیں کی ہیں

حضرت مفتی صاحب نے کتنی پکی بات کہی ہے

"مرزا کے ذاتی حالات و مقالات اور اخلاق و اعمال کو جمع کیا جائے۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ اگر بالفرض نبوت ختم بھی نہ ہو اور دنیا کا ہر مسلمان نبی بن سکے تب بھی مرزا جی کو نبوت کا حاصل ہونا محال ہے"

اور

"نبوت ایسی چیز نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو عطا کردے ایک نبی (خواہ وہ نبوت میں کتنا ہی بلند مرتبہ رکھتے ہوں) دوسرے کو نبی بنادیں۔ بلکہ یہ وہ منصب ہے جو بلا واسطہ خداوند قدوس کی جانب سے فائز ہوتا ہے"

ان چند جملوں نے مرزائے قادیان کے ادعائے نبوت کو کہیں کا بھی نہ رکھا

"ان الباطل کان زھوقا"

فاضل مصنف نے :-

"ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین"

کو صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال، مفسرین کی تفسیر اور لغت عرب کی مثالوں سے ثابت اور واضح کیا ہے کہ اس آیت کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کردیا ہے اور قیامت تک اب کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ اس کے بعد قادیانیوں کے پیدا کئے ہوئے اوہام و شبہات اور مغالطوں کے دندان شکن جواب دئے ہیں

اس کے بعد "ختم نبوت" کو (۱) قرآنی آیات (۲) احادیث رسول اور (۳) محدثین۔ مفسرین، فقہا، متکلمین اور صوفیا کے اقوال کے ذریعہ ثابت کرکے حقیقت کو بالکل اجاگر کردیا ہے

(صفحہ ۱۰۶) تفسیروں میں اس آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت یہ نقل ہے ——— "ولکن نبیاً ختم النبیین"

بعض اگلے مفسرین نے جسے "مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ" کہا ہے وہ دراصل حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا "صحیفۂ یادداشت" تھا۔ جس میں وہ قرآنی آیات کے ساتھ کہیں کہیں ضروری تشریح بھی لکھ لیا کرتے تھے؛ قرآن پاک کی قرأت متواترہ و متفقہ کے خلاف جہاں کہیں "صحیفۂ عبداللہ ابن مسعود" میں لفظوں کی کمی بیشی ملتی ہے اسے "قرأت قرآن" کہنا درست نہیں

صفحہ (۶۰۸) پر انبیاکرام کی "ستاروں" سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "آفتاب" سے جو تشبیہ دی گئی ہے اس سلسلہ میں اس شعر

رات محفل میں ہر ایک مہ پارہ گرم لاف تھا

صبحدم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

کا لکھنا موزوں نہیں تھا ——— "ہر ایک مہ پارہ گرم لاف تھا" کی مشبہ بہ انبیاء کرامؑ کی ذات قرار پاتی ہے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس شعر کو خارج کردینا چاہیے

بعض بہت ہی کمزور اور محل نظر احادیث کتاب میں آگئیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی عمر سات ہزار کی ہے —— (صفحہ ۳۶۴) حالانکہ دنیا کی عمر کا سات ہزار سال ہونا تاریخ، جغرافیہ اور اکتشافات اثری کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ یا یہ کہ حضرت آدم کے دونوں شانوں کے درمیان "محمد الرسول اللہ خاتم النبیین" لکھا ہوا تھا (صفحہ ۳۵۷) ابن عساکر۔ طبرانی، ابونعیم اور دیلمی وغیرہ سے احادیث لینے اور نقل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ بزرگ عند اہل محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے رطب و یابس سبھی کچھ جمع کردیا ہے کاش اس کتاب میں یہ کمزوری نہ ہوتی

مجموعی طور پر "ختم نبوت کامل" قادیانیت کے رد میں قول فیصل ہے اس سے مطالعہ سے "قادیانی نبوت" کا جھوٹا اور خانہ ساز ہونا ظاہر ہوجاتا ہے

تاریخ اسلام حصہ اول | از مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (ضخامت رسیرت النبی کا سائز) ۵۹۲ صفحات مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت بارہ روپے ملنے کا پتہ ——— نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ۔ کراچی

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم کے نام اور کام سے علمی دنیا واقف ہے۔ موصوف کی مرتبہ "تاریخ اسلام" قبول عام حاصل کر چکی ہے اب اسے خاصے اہتمام کیساتھ نفیس اکیڈیمی نے شائع کیا ہے اور ملک محمد دین صاحب مالک صوفی پنڈی بہاؤ الدین سے چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری نے "تاریخ اسلام" کی طباعت و اشاعت کے دائمی حقوق خرید لئے ہیں

"تاریخ اسلام" کے پہلے حصہ میں "فن تاریخ" کی عالمانہ بحث ہے یہ کتاب کا مقدمہ ہے کتاب کا پہلا باب ملک عرب۔ جاہلیت عرب اور دوسرے ممالک کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب "سیرت النبی" ہی پر ہے۔ باقی ابواب میں خلافت راشدہ کے احوال و کوائف پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے اور انداز نگارش رواں اور سادہ ہے۔ فاضل مورخ کی مورخانہ عمیق نگر کہیں کہیں اتھلی بھی ہو گئی ہے "تاریخ اسلام" کی ترتیب و تدوین میں مصنف نے ابن جریر۔ ابن اثیر۔ ابن خلدون۔ ابو الفداء۔ ابن سعد۔ سیوطی، امام بخاری، امام مسلم۔ امام ترمذی۔ ابن ہشام اور واقدی کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

"ایران کی شہنشاہی ظلم و فساد کا ایک مخزن بنی ہوئی تھی۔ چین و ترکستان خونریزی کا مامن نظر آتے تھے۔ صفحہ (۸۶)

"مخزن" اور "مامن" دونوں لفظوں کا یہاں استعمال وجدان کو کھٹکتا ہے

کتاب میں قیمت کے نیچے یہ نوٹ درج ہے ــــــ

"یہ کتاب صرف مکمل ہی مہیا کی جاتی ہے علیحدہ علیحدہ حصے فروخت نہیں کئے جاتے" اور تینوں حصوں کی قیمت چھتیس روپے ہے

"مسلمانوں میں جس طبقہ کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے اور جو ہندوستانی مسلمانوں میں پیش رو سمجھا جاتا ہے وہ سب کا سب سرکاری درسگاہوں اور کالجوں میں ہو کر نکلا ہوا ہوتا ہے" صفحہ (۱۲)

"ہو کر نکلا ہوا ہوتا ہے" نے اس عبارت کو کتنا پست بنا دیا ہے ــــ صفحہ (۱۳۸) اس قتل کا فعل انجام پذیر ہوگا" ــــ یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے

"دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے تار و پود کو توڑ کر رکھ دیا" صفحہ (۲۱۳) "تار و پود کا بکھرنا" بولتے ہیں ــــ "مسلمانوں نے ایسی چپقلش مردانہ دکھائی" صفحہ (۲۹۹) "چپقلش" اور پھر "مردانہ" اس پر مستزاد اس کا "دکھانا" ــــ

کتابت کی بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں ــ مثلاً ــــ

"ابن ام کلثوم" کو "ابن ام مکتوم" (صفحہ ۱۹۲) "رضاعی بہن" کو رضائی بہن (صفحہ ۲۲۸) "ساز و یراق" کو "ساز براق" صفحہ (۲۴۴) "ہلال ابن امیہ" کو "بلال ابن امیہ" صفحہ (۳۳) اور سورہ انفال کی جگہ سورہ انفعال (صفحہ ۳۶۹) ۔۔۔۔ لکھا گیا ہے

انسان کے کام میں تھوڑی بہت تو کسر رہ ہی جاتی ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ "تاریخ اسلام" مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ فن تاریخ اور دین کی وہ بہت خدمت انجام دے گئے ہیں۔ ناول و افسانہ اور سینما کے اس دور میں "تاریخ اسلام" زیادہ سے زیادہ پڑھے جانے کی مستحق ہے کہ تاریخ پڑھ کر عبرت بھی ہوتی ہے اور ولولہ بھی پیدا ہوتا ہے جس قوم نے اپنے ماضی کو بھلا دیا وہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھی

"تاریخ اسلام" "گاہے گاہے" نہیں بلکہ ہمیشہ مطالعہ میں رہنے کی چیز ہے

الاصحاب فی الکتاب (جلد اوّل)

از مولانا سید نور الحسن بخاری۔ ضخامت ۴۳۴ صفحات مجلد رنگین گرد پوش کیساتھ۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ سعید برادران۔ کچہری روڈ ملتان شہر

مولانا سید نورالحسن بخاری ان مصلحت پسند لوگوں میں سے نہیں جو رواداری کی خاطر اکابر دین پر سب و شتم گوارا کر لیتے ہیں۔ وہ مدت سے فتنۂ رفض کی روک تھام کر رہے ہیں۔ بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں۔ یہ کتاب موصوف کی غیرت دینی۔ جذبۂ ایمانی اور محبت کی بولتی ہوئی شہادت ہے

فاضل مصنف نے قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پاکؓ اور خاص طور سے خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شرف۔ اہمیت، اخلاص اور دینی شخصیت کو ثابت کیا ہے۔ موصوف نے بہت سے صفحات پر اس بات کو پھیلا کر لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پاتے ہی اگر (بخاک بدہن گستاخ) پانچ چھ کے علاوہ تمام کے تمام صحابہ اور خاص طور سے خلفاء ثلاثہ مرتد اور کافر ہو گئے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی ترقی "کافروں" اور "مرتدوں" کے ذریعہ ہوئی ہے اور قرآن جن کو "روشن چراغ" کہتا ہے وہ کیسے "سراج منیر" تھے کہ اپنے ماحول کو بھی روشن اور منور نہ کر سکے اور (معاذ اللہ) کیسے مرتد ہیں کہ "بجو خود تو مرتد ہیں لیکن اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیتے ہیں"۔ اور اسلام کے ایک ایک حکم کو اور حضورؐ کی ایک ایک سنت کو اس شدومد کے ساتھ قائم فرماتے ہیں کہ آج دنیا میں اسلام کی جو کچھ نمود دکھائی دیتی ہے وہ انہیں نفوس قدسیہ کی مخلصانہ جدوجہد اور بے غرض کوششوں کا ثمرہ ہے؟ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!

صحابہ کرام سے برأت بلکہ ان پر سب و شتم کو دین کا جزو بنا لینا۔ یہ سب کچھ مجوسی۔ سازش اور مزدکی ذہنیت کا ظہور ہے۔ اس ذہنیت نے جھوٹ اور افترا کے پہاڑ کھڑے کر دئے ہیں۔ مولانا بخاری صاحب نے ان پہاڑوں کو قرآنی آیتوں کے ایٹم بموں سے اڑا دیا ہے

پوری کتاب عقیدت و محبت سے لبریز ہے مگر ہر چند سطروں کے بعد "اشعار" کے آجانے سے اس کتاب کی علمی ثقاہت کو نقصان پہنچا ہے۔ اشعار کا نثر کے درمیان میں لانا عبارت کی تزئین اور تاثیر کا باعث ہوتا ہے۔ مگر اس میں اعتدال اور تناسب کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ فاضل مصنف سے ہم درخواست کریں گے کہ وہ آنے والی جلدوں میں اس انداز تحریر کو اگر بدل سکیں تو بدل دیں اور علمی کتاب کو مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" بنانے کی کوشش نہ فرمائیں۔

استدلال میں کہیں کہیں آورد، اور تکلف بھی خاصہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً یوسف علیہ السلام کا قصہ موضوع کتاب سے میل نہیں کھاتا اور پھر یہ پورا قصہ انسانوی بلکہ رومانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے

فاضل مصنف نے یہ کتاب لاہور سینٹرل جیل میں مرتب فرمائی ہے اس لئے اس میں سوز و گداز غیر ارادی طور پر شامل ہو گیا ہے۔ بعض اکابر علماء نے قید و بند میں ہی معرکہ کی کتابیں۔ تصنیف کی ہیں مولانا بخاری صاحب کو بھی اپنے اکابر کی اس سنت کو زندہ رکھنے کی توفیق بلکہ سعادت نصیب ہوئی

زرِ داغِ دل

از عبدالعزیز خالد۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات مجلد گرد پوش کیساتھ قیمت دس روپے ملنے کا پتہ۔ مکتبہ شعور مانڈی والا بلڈنگ پریڈی اسٹریٹ کراچی

جناب عبدالعزیز خالد کی تمثیلی نظموں کا مجموعہ خوشنما ٹائپ پر اس قدر اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے کہ اردو زبان میں اس اہتمام کے ساتھ شاذ و نادر ہی کتابیں چھپی ہیں۔ سرورق رنگین ہے جلد خوبصورت اور پائدار۔ ہر صفحہ پر سرخ جدول ٹائپ خوشنما اور کشادہ اور کاغذ دیدہ زیب ہے ہر نظم کے آغاز میں تصویر کے ذریعہ نظم کے بنیادی اور مرکزی تصور کو پیش کیا گیا ہے کتاب کی اس آرائش کا سہرا مشہور آرٹسٹ زوبی کے سر ہے

کتاب کا نام ہی پڑھنے والوں کو چونکا دینے والا ہے کہ داغ دل تو سنا تھا مگر یہ "زر داغ دل" کیا ترکیب ہے؟ ہم نے اس کے لئے لغت بھی دیکھا کہ اس ترکیب کا کچھ اتا پتہ مل جائے۔ مگر نہیں ملا اس ترکیب (زرِ داغ دل) کے معنی بہر حال ضرور ہوں گے۔ شاعر نے جان کر

اس میں کوئی نکتہ رکھا ہے اور اس کے دماغ اعجوبہ کار دور سے بلکہ بہت دور سے "کوڑی لایا ہے اور اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں ہے کہ اس کی یہ "جدت طرازی" عوام بلکہ خواص کے لئے مانوس ثابت ہوگی یا اس سے طبیعتوں کو توحش ہوگا

ہر نظم سے پہلے جو تصویر دی گئی ہے اسے سمجھنے کے لئے خاصی کاوش کی ضرورت ہے "زر داغ دل" کے مصنف کی طرح اس کے آرٹسٹ بھی خاصے جدت پسند بلکہ اعجوبہ کار واقع ہوئے ہیں اس کتاب میں ایک اعجوبگی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ پوری کتاب میں کہیں کوئی عدد (NUMBER) لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔ صفحوں کے نمبر بھی عبارت میں درج کئے گئے ہیں —— اس طرح ——

" صفحہ تین سو چونسٹھ —— صفحہ چار سو اکیس "

عروض میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ "جہاں تین حرکتیں پے درپے واقع ہوں وہاں درمیانی حرکت یعنی حرف کو ساکن کیا جا سکتا ہے اسے عروض کی اصلاح میں "تسکین اوسط" کہتے ہیں

مگر "تسکین اوسط" سے شعر کی خوبی میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ شعر کی نغمگی روانی اور بیساختگی میں کمی واقع ہو جاتی ہے یہ شعر کا حسن نہیں عیب ہے قدیم شاعروں نے تسکین اوسط کا برائے نام استعمال کیا ہے۔ انیس۔ غالب۔ مومن۔ امیر و داغ اور اقبال کے یہاں "تسکین اوسط" کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ بلکہ بعض نے عروض کے اس قاعدہ جائز کو چھوا تک نہیں جناب عبدالعزیز خالد اردو زبان کے پہلے شاعر ہیں۔ جنہیں "تسکین اوسط" بہت زیادہ محبوب ہے اور ان کی نظموں میں جگہ جگہ تسکین اوسط ملتا ہے

یہی ہے مرغوب خاطر سپہر کبود ⁂ جناب تاج سر موج ہو صدف بہ آب
نمود تاروں کی جلوہ ماہ کامل کا ⁂ یہ اہتمام مدارات دیدہ و دل کا

اس قسم کے "تسکین اوسط زدہ مصرعوں" کی خالد کی نظموں میں بھرمار ہے! اس طرح ان کی عروض دانی تو بیشک ثابت ہو جاتی ہے مگر اس اعجوبگی کے شوق میں اپنی نظموں میں انہوں نے جگہ جگہ گھٹن اور بھچاوٹ پیدا کردی ہے

"زر داغ دل" کی نظمیں پڑھ کر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاعر کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ جگہ جگہ تاریخی تلمیحات لائے ہیں اور ابن رشد ون گاگ راخیل و مصری وغیرہ جیسی شخصیتوں کے نام بھی پورے تمام کی تمام نظمیں تمثیلی (ڈرامائی) ہیں۔ بعض بعض نظم چونتیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے جس سے شاعر کی قدرت بیان اور پر گوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان نظموں میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں ان کے ناموں میں بھی جدت و ندرت کی رعایت رکھی گئی ہے —— مثلاً ——

نومرد —— نازاد —— باقور —— راخیل —— دلیلہ

"زر داغ دل" کی نظموں میں جہاں شگفتہ مصرعے آگئے ہیں طبیعت کو انشراح ہوتا ہے۔ جہاں "تسکین اوسط" آکر مصرعے لٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں طبیعت منقبض ہوتی ہے۔ جس جگہ الفاظ شاعر کے خیال کے متحمل نہیں ہو سکے اور شعروں میں اہمال پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں وجدان شدید گھٹن محسوس کرتا ہے۔ جہاں اشعار بالکل سپاٹ ہیں۔ وہاں ذوق بے مزہ ہو جاتا ہے۔ جہاں لفظ و معنی کی "اعجوبگی" ہے اس جگہ قہقہہ لگانے کو دل چاہتا ہے اور کہیں فکر و خیال کی شیشہ گری ہے کہ سراسیمگی سی طاری ہو جاتی ہے

کنار بحر یہ غواص منہ لٹکائے ہے ⁂ کہ بے دعا گہر شاہگاں نہیں ملتا
ہر ایک شے متحجر مہیب و دہشتناک ⁂ ستم کی طرح گراں درد کی طرح سناک
میں نہ چاہوں تو یہ پتھر کے نگاریں پیکر ⁂ آشنا ہو نہ سکیں لذت پیدائی سے
دشت و صحرا کے حسینوں کی حنابندی کی ⁂ وادی و کوہ میں مہتاب بکھیرے میں نے
آؤ پیشانی ایام پہ پھر ثبت کریں ⁂ سعی پیہم کے نشان عزم جواں کی تحریر

کہاں ؟ یہاں تو ستاروں کی آگ سے ہرست — فضا میں ایک چکا چوند ہے چراغاں ہے

اس میں شامل نہ ہو جب تک ترے ہونٹوں کی نبات — جام مہتاب سے میرے لئے صہبائے حیات

تاج داور نگ فقط معجزۂ مرمر و سنگ — عشق کے فیض سے پیدا دلِ مرمر میں گداز

رعب شاہی سے نگاہیں ادب آموز رہیں — کسی مژگاں پہ ستارے نہ لرزنے پائے

دست گلچیں کو ترستے رہے عارض کے گلاب — میگساروں کو بلاتی رہی ہونٹوں کی شراب

کتنی آہوں کی خزاں کتنی امنگوں کی بہار — کتنے نغموں کی تواں کتنی نگاہوں کا خمار

یہاں مصور حرمانِ آرزو بھی ہیں — گرہ کشائے حجاباتِ رنگ و بو بھی ہیں

قدح گسار و سیہ مست و بے سبو بھی ہیں — ہزاروں پیرہن چاک بے رفو بھی ہیں

اس آشیاں میں نظر بند خوش گلو بھی ہیں

کاش ! اسی قسم کے جاندار، متوازن اور شگفتہ شعروں کی "زرِ داغ دل" میں کثرت ہوتی ! مگر افسوس ہے کہ یہ رنگ کہیں کہیں نظر آتا ہے

ظہور زر نہیں فن کار کی ہنر مندی — سفارشات سے سوزِ نہاں نہیں ملتا (صفحہ ۱۱)

"ظہور زر" مہمل ترکیب ہے، دوسرے مصرع کا بھی یہی عالم ہے۔ نہ جانے شاعر کے ذہن میں کیا مفہوم ہے اور وہ لفظوں میں آکر گورکھ دھندا" بن گیا ہے

زوال شوق کا پیمانہ ہے شکیبائی — کمال بے سعیٔ جاوداں نہیں ملتا (صفحہ ۱۱)

"سعی" کی "ے" کو تشدید دے کر کھینچنے سے مصرعہ کا وزن پورا ہوتا ہے پھر یہاں "سعیٔ جاوداں" کا نہیں "سعیٔ پیہم" کا محل تھا

ہر آشنا کو ہے قحط الرجال کا شکوہ — غرامیات کے دلدادہ ہیں سخن پیشہ (صفحہ ۱۷)

"غرامت" کے معنی ہیں — "تاوان، جرمانہ" گھاٹے میں ہونا۔ خفت و پشیمانی اس شعر میں "غرامیات نے" شعر کو بوجھل ہی نہیں "ریگستان" بھی بنا دیا ہے

یہ زندگی ہے کہ تعزیر جرم ناکردہ — ہمارے باوا نے کھا کے دانۂ گندم (صفحہ ۲۵)

دوسرا مصرعہ کسقدر سپاٹ اور بے مزہ ہے

کوئی صدا نہ صدا کار کے کوئی آثار — کہ جیسے لیٹا ہوا بس گھولتا ہو سناٹا (صفحہ ۳۹)

"سناٹے کا لیٹے رہنا" اور لیٹ کر "بس گھولنا" شاعرانہ محسوسات و مشاہدات کیساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے ؟

عجیب ہے یہ مناظر بھی تم کو کھلتے ہیں — تمہاری چھلنی چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں (صفحہ ۴۳)

"چھلنی چھاتی" کیا چیز ہوتی ہے ؟

اسے میں مطلق برداشت کر نہیں سکتا — تجھے بھی ماروں گا گر آپ مر نہیں سکتا (صفحہ ۴۸)

"کیا اس کا نام شاعری ہے ؟ توبہ !

میرے شکستہ سفینہ کو تو کنارے لگا — میرے خدا تو تو سنتا ہے بیکسوں کی دعا (صفحہ ۵۳)

"تو تو" کا تنافر وجدان کے لئے کسقدر اذیت کوش ہے

میں تو اس کلبۂ احزاں میں نہیں جا سکتی

بڑبڑاتا ہے وہ کیا ؟ ...... شکوۂ اندوہ دنیا (صفحہ ۶۸)

یہ کیا انداز بیان ہے ؟ کوئی شاعرانہ لطف ! کسی کیفیت کا اظہار ؟

تو جو ہے چوروں کا سرخیلِ سفیرِ فلکی — میرے مسکن میں تجھے کونسی حاجت لائی (صفحہ ۶۸)

"تجھے کونسی حاجت لائی" ایک شاعر کے زبان و قلم سے ایسے لفظوں کی تراوش ہو ہی نہیں سکتی

ان کے الطاف حسین گرچہ ہوں دامن کشِ دل — فقر خوددار نہیں خوگرِ تسلیم و رضا (صفحہ ۷۰)

مصرعہ اولیٰ میں "حسین" بالکل حشو اور زائد ہے !

لیکن اس سعی سے آخر میرا لہنا کیا تھا — یہ گلوگیر خموشی یہ چٹانیں یہ گدہ (صفحہ ۷۱)

"لہنا" اب قطعاً متروک ہے "لینا" بولتے ہیں — "یہ گدہ" نے پورے شعر کو مرگھٹ بنا دیا ہے

ے پیکر نغمہ کہ ناطورہ نیسان بہار (صفحہ ۷۳)

بس خوشنما لفظ جوڑ دیے ہیں - ورنہ مفہوم کا دور دور پتہ نہیں

ے کیا کسی گنج گرانمایہ کا ہے مخزن راز (صفحہ ۷۶)

"گنج گرانمایہ" کا "مخزن راز" ہونا اہمال نہیں تو اور کیا ہے !

غریب شہر کی مانند سوختہ ساماں — ہجوم شوق کی یلغار اے معاذاللہ (صفحہ ۹۸)

"غریب شہر سے سوختہ سامانی" کی نہیں "بے سروسامانی" کی نسبت درست ہو سکتی ہے"

متاعِ آگہی جس کو کہیں اثاث البیت — جنوں کے ہاتھ سے ہے کب کا خوانِ یغمائی (صفحہ ۱۰۰)

"مصرعہ ثانی میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "اثاث البیت جنوں کے ہاتھوں کب کا خوان یغما بن چکا ہے" "ہاتھوں" کی جگہ ہاتھ اور "سے" لا کر پورا شعر کمزور اور بے لطف کر دیا !

وہ ایک شعلہ جوالہ جس کی حدت سے — مرے حواس جلے اور شباب راکھ ہوئے

"حواس کا جلنا" کچھ کم عجوبہ نہ تھا کہ "شباب راکھ ہوئے" نے خرابہ کر دیا "شباب" کی جمع پہلی بار نظر سے گذری

ے جو تم کو بادِ بیاباں سے یوں لگاؤ ہے (صفحہ ۱۰۲)

"لگاؤ" کے "واؤ" کو کھینچ کر پڑھنا ذوقِ سلیم پر کسقدر گراں گذرتا ہے

یہ انتہائے جنوں ہے جنوں سے بھی زائد
تمہیں تو بس کوئی احساس ہی نہیں شائد (صفحہ ۱۰۴)

"انتہائے جنوں" کا "جنوں" سے زائد ہونا آخر کیا بات ہوئی ؟

نفوذ کرتا ہے جب دل میں جذب استغراق — یہاں پر ایسے ہی لمحات کا بیان ہو گا (صفحہ ۱۱۳)

"استغراق کا جذب" پھر اس کا "نفوذ" اس میں کتنا تکلف پایا جاتا ہے

وہ مہ وشوں کا حسین کارواں کہ موجِ نسیم — وہ گلرخوں کا جواں قافلہ کہ سیل شمیم (صفحہ ۱۱۳)

"قافلہ" جواں اور بوڑھا بھی ہوتا ہے ؟ خوب ! شمیم جیسی لطیف شے کے ساتھ "سیل" کی اضافت و نسبت کتنی بری لگتی ہے

نہ بیز پردوں سے میلے کثیف جالوں سے — تمام تازگی روح بجھ سی جاتی ہے (صفحہ ۱۲۱)

"تازگی روح کا بجھنا" لبسِ ایجادِ بندہ" ہے - یہ اندازِ فکر و نگارش اس کتاب میں جگہ جگہ ملتا ہے - اس "صنعتِ خاص" کے خالق صاحب موجد معلوم دیتے ہیں

ایک او جلمہ بھی ہوتا ہو خود ستائی کا — خیالِ فکر کی جس کو کہیں قبائے صفات (صفحہ ۱۳۰)

یہ شعر "چیستاں" کے سوا اور کیا ہے؟

کمر دکوہ کو رعنائی و دلسوزی دی — سوسن و سنبل و ریحاں کی حنابندی کی (صفحہ ۱۴۹)

"کمر دکوہ" کو "دلسوزی" سے کیا واسطہ؟ بس ایک لفظ ذہن میں آیا اور فوراً جوڑ دیا

لذت خلد بریں کیف بہشت ارضی — معرض دردِ جراحت کے نئیم گزراں (صفحہ ۱۵۱)

مصرعہ ثانی صرف لفظوں کا گورکھ دھندا ہے

عورتیں حسن مشاہیر پہ مٹ جاتی ہیں — ان کو مسحور بنا دیتے ہیں ابطال عظیم (صفحہ ۱۵۵)

"ابطال عظیم" ایک پتھر ہے جو شاعر نے زمین شعر پر لڑھکا دیا ہے

مجھ سے تم میری ہواخواہی میں نفرت نہ کرو — گلشن عشق میں میں بھی جلوں اور تم بھی جلو (صفحہ ۱۵۶)

"میری ہواخواہی میں نفرت نہ کرو" آخر یہ کیا زبان ہے؟ اور اس سے کس مفہوم کا اظہار مقصود ہے

دوزخ ایک نام ہو اسخاط خداوندی کا — دل کو ڈستے ہوئے ارمان حنابندی کا (صفحہ ۱۷۷)

"اسخاط خداوندی" جیسی ثقیل ترکیب پر صبر بھی کر لیا جائے، مگر دوسرے مصرعہ کو کیا کہئے گا جو سرتاپا مہمل ہے یہ تو بجا ہے کہ دوزخ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور غضب و عتاب کا نام ہے۔ مگر "ارمان حنابندی" سے "دل کے ڈسنے" کی چول کو کس طرح ٹھیک بٹھایئے گا!!

اف کہ آہنگ ہے کتنا دلِ بیری کے قریں — زہر آلود تعفن کے اٹے شہروں میں (صفحہ ۲۵۳)

"دلِ بیری" کیا بات ہوئی؟ مصرعہ ثانی میں "کے اٹے" نہیں "سے اٹے" کا محل تھا۔ تعفن سے شہروں کا "اٹنا" بس "صاحب زرد داغ دل" ہی کا حصہ ہے! خالد صاحب کو گرد و غبار کی طرح شہروں پر "تعفن" کی تہیں جمی ہوئی نظر آتی ہوں

"زرد داغ دل" کی نظمیں بہت طویل ہیں جو شگفتگی اور روانی کی کمی کے سبب پڑھنے والوں کو تھکا دیتی ہیں بعض نظموں میں بہت سے مقامات پر تو "نثر" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے!

خالد بہت اونچے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا طائر فکر و خیال اونچا ہو ہو بھی گیا ہے۔ مگر اس "صعود" کے بعد جو "ہبوط" ہوتا ہے۔ وہ بڑا افسوسناک ہے۔ ان کے اندر ایک تڑپ اور ولولہ ہے۔ جو شعر کے قالب میں جہاں سلیقہ سے ڈھل گیا ہے۔ وہاں "سحر حلال" ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی نظمیں ایک جنگل کی طرح ہیں۔ جس میں شیر بھی دہاڑتے ہیں۔ گیدڑ بھی بولتے ہیں اور پرند بھی چہچہاتے ہیں۔ کہیں ٹیلہ۔ کہیں کھائی۔ کسی جگہ سبزہ اور کھردری چٹانیں

ایک طرف تو شاعری میں وہ اپنی عروض دانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف شعر کے سامنے کے عیوب کی بھی پروا نہیں کرتے یا ان کو اسکا احساس ہی نہیں ہوتا

ہے ترے ذہن کی جودت تو مسلم لیکن — اپنے افکار کو ایک نکتہ پہ مرکوز کرو (صفحہ ۱۶۷)

اس شعر میں "شتر گربگی" پائی جاتی ہے۔ جب "ترے" (واحد) سے خطاب کیا تھا تو "مرکوز کر" کہنا چاہئے تھا — پھر افکار "نکتہ" پر نہیں "نقطہ" پر مرکوز ہوتے ہیں

ایک شعر میں "مرہم" کو مونث باندھا ہے۔ حالانکہ "مرہم" بالاتفاق رائے مذکر ہے —

تیری گفتار میں ہے صبح وطن کی نرمی — جیسے جراح نے ناسور پہ مرہم رکھ دی

شاعری میں سارا کھیل لفظ و بیان کا ہے اور لفظوں کے صحیح طور پر برتنے کا فن انہیں بہت کم آتا ہے

یہ طرز خاص تو اقبالؔ ہی کا حصہ تھا کہ "فلسفہ" کے سنگ خارا کو شعر کے حسین قالب میں ڈھال دیا۔ خالد صاحب تو جگہ جگہ "فلسفہ" کے روڑے اور پتھر لڑھکا کر رہ گئے ہیں۔ مگر ان کا دعویٰ یہ ہے ——

جس طرح غالؔب و اقباؔل سے پہلے فن میں
اسدؔ و میر تقیؔ کا کوئی ہمسر نہ ہوا

اقباؔل کی ہمسری کے زعم نے غالؔب کی شاعرانہ صلاحیت کو بہت نقصان پہنچایا ان کے کلام کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن و دماغ کی سطح سخت ناہموار ہے

"زرد داغ دل" نے اردو زبان میں "سراسیمگی و الجھن" کا بے تنک اضافہ کر دیا ہے

ماہنامہ مہر نیمروز کراچی

مہر نیمروز "اسم بامسمّٰی ہے اور قابل اہل 'اہل علم و قلم کی ادارت" (ڈاکٹر سید عبداللہ)

مہر نیمروز "پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی ادبی سراغرساں بہت پسند آیا۔ قابل قدر کام ہے" (ڈاکٹر اعجاز حسین)

مہر نیمروز "قدر اول کے رسالوں میں ہے" (ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)

مہر نیمروز پہنچا۔ جی چاہتا ہے دل کھول کر ادبی سراغرساں کو داد دوں (ڈاکٹر اختر امام)

مہر نیمروز ایک سے ایک بہتر، ادبی سراغرساں نے تو جھنڈے گاڑ دیئے (نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی)

مہر نیمروز آفتاب آمد دلیل آفتاب (مالک رام ایم اے)

مہر نیمروز صاف ستھرا معیاری اور پاکیزہ رسالہ ہے قدیم و جدید کے امتزاج کا حامل (خلیل الرحمٰن اعظمی)

مہر نیمروز یاران نکتہ داں اور چہ دلاورا ست دلکش عنوانات ہیں سرخیاں الگ مقصد یکساں (ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی)

مہر نیمروز بے باک صداقتوں کا حامل ہے چہ دلاورا ست زبردست ادبی جرأت ہے (پروفیسر سعید منیر)

مہر نیمروز نے چونکا دیا اور لکھنے والوں کو سوچنے بچارنے پر مجبور کر دیا اور یہ بہادر ادبی سراغرساں کہیں ملجائے (سلام مچھلی شہری)

مہر نیمروز ایک بہت اچھا شعر ہے اور ادبی سراغرساں اردو کا شرلاک ہومز (خواجہ حسن ثانی نظامی)

مہر نیمروز دیکھا، نفاست خوش سلیقگی، ہر لحاظ سے، (سید وقار عظیم)

مہر نیمروز ایک نئی چیز ہے اور نئی داغ بیل ڈالنے کے حوصلہ کا حامل (سلیم اللہ فہمی)

مہر نیمروز واقعی خوبصورت ہے، کامیاب اور بلند معیار (مرزا ادیب)

مہر نیمروز میں نفاست ذوق، سادگی و پرکاری، خدمت خلوص کے جذبات نمایاں ہیں، اور نئی نرالی راہ تراشی (نثار احمد فاروقی)

مہر نیمروز معتدل قسم کا میدان کارزار ہے اور اس کی گرم فضا زندگی کی علامت (پروفیسر ارشد)

مہر نیمروز نے بے شمار اُجڑی ہوئی محفلیں اور صحبتیں تازہ کردیں (پروفیسر اشک)

مہر نیمروز بہت ہی دلچسپ، (رائے بہادر کنور سین بیرسٹر)

مہر نیمروز میں جدت سے کام لیا گیا ہے (بلونت سنگھ)

مہر نیمروز جیسے رسالے کا مدت سے انتظار تھا (ابراہیم جلیس)

ترسیل زر کا پتہ

ہندوستان میں:- شاہ محمد زید قادری خانقاہ سلیمانیہ، پھلواری شریف ضلع پٹنہ (ہند)

پاکستان میں:- شاہ محمد حسان قادری ۲۶-۶ سی-پی اینڈ برار سوسائٹی، ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد (۹) ماہنامہ نمبر (۶)

فاران

ستمبر ۱۹۵۷ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان کے افق پر شروع شروع میں تھوڑا سا اُجالا ہوا تھا اور وہ بھی بس سیمیا کی سی نمود تھی، اس کے بعد سے جو دھندلکوں کا سلسلہ چلا ہے تو سیاہیوں کی تہ بر تہ جمتی چلی گئی- اور اب پاکستان ان خوفناک ظلمتوں سے دوچار ہے جن میں روشنی کا در دریچہ نہیں، ہر طرف گہری تاریکی، مہیب سناٹا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، جیسے اس افق کو نور کی کرن نے چھوا ہی نہ تھا- اور دشمنوں کے منہ میں خاک گویا یہ ملک ظلمتوں کے لئے ہی وجود میں آیا ہے، اُجالا اس کی قسمت ہی میں نہیں لکھا، اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے پھرنا یہاں کے عوام کیلئے مقدر ہو چکا ہے-

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور ملک گیر ظلمت سے یہ کہہ کر صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ..... کہ:-

اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

"جبرِ مشیت و تقدیر" اپنی جگہ مسلم مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے "بڑے لوگوں" کے ضمیر کی شمعیں جس تدریج کے ساتھ بجھتی رہی ہیں، اسی رفتار کے ساتھ پاکستان تاریک سے تاریک تر ہوتا رہا ہے- اور آج پاکستان کی قسمت کے وہ لوگ مالک ہیں جو ظلمتوں کے نقیب اور اندھیروں کے سفیر اور تاریکیوں کے علمبردار ہیں- یہ "بزرگانِ سیاست" اور "مردانِ شعبدہ کار" پاکستان میں اجالا پھیلنے سے ڈرتے ہیں، کہ اس طرح خود ان کی شاطرانہ چالیں اور زندگیاں بے نقاب ہوتی ہیں- اس لئے انھیں اندھیرے سے محبت ہے، کہ یہ ان کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اس دھندلکے میں لوگ نہیں دیکھ سکتے کہ کون کیا پارٹ ادا کر رہا ہے- اور کس نے کیا روپ دھار رکھا ہے-؟

پاکستان پر کوئی شک نہیں بڑے سخت اور نازک وقت آئے ہیں- ایک مفلوج گورنر جنرل کی نیم آمریت اور مطلق العنانی کا منحوس دور بھی پاکستان نے دیکھا ہے- مگر اس وقت جن خطرناک الجھنوں میں پاکستان گھرا ہوا ہے، وہ تمام پچھلی مصیبتوں

سے بڑھ کر ہے۔ ہمیں مفاد پرست قیادت نے ایک ایسے خوفناک غار پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ جس کے ایک طرف آگ بھڑک رہی ہے اور دوسری طرف اتھاہ سمندر ہے۔

پاکستان میں وہ تمام طاقتیں نہ صرف یہ کہ ابھر آئی ہیں، بلکہ ان میں اتحاد ہو گیا ہے، جو پاکستان کی دشمن ہیں اور پاکستان کے مقصد وجود سے جن کو اختلاف رہا ہے، اور وہ برسوں سے اسی کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے۔ "مخلوط انتخاب" کی منظوری مشرقی پاکستان کے مرد سبھائی ہندوؤں کی سب سے بڑی فتح ہے۔ اور عوامی لیگ کی حکومت کے زمانے میں پاکستان اور اسلام کے خلاف دہاں کے ہندوؤں کو منظم ہونے کا موقع ملا ہے۔ "مخلوط انتخاب" کی زد براہِ راست پاکستان کے بنیادی نظریہ پر آکر پڑتی تھی۔ اس لئے کمیونسٹوں نے بھی "جداگانہ انتخاب" کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، اور کروڑوں پاکستانی مسلمانوں کی تمناؤں کے علی الرغم "ان سرخوں" کو کامیابی حاصل ہوئی۔ عوامی لیگ کی حکومت کے سایہ میں پاکستان کی ان دو دشمن طاقتوں ——— مہا سبھائی ہندوؤں اور کمیونسٹوں ——— کو ابھرنے اور منظم ہونے کا پورا پورا موقعہ ملا۔ "مخلوط انتخاب" کے منظور ہونے کے بعد ہوا کا رخ ہی بدل گیا! اس ساری مصیبت کے ذمہ دار ہمارے ارباب حکومت ہیں۔ جنھوں نے اپنے عہدوں اور کرسیوں کے لئے وہ خوفناک کھیل کھیلا، جس نے پاکستان کے مقصد وجود پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا

ان دو مصیبتوں سے ابھی پیچھا نہیں چھوٹا تھا کہ ایک تیسری بلا "نیشنل پارٹی" کے نام سے وجود میں آئی۔ جس کے نفسِ ناطقہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید اور میاں افتخار الدین ہیں! یہ دونوں بزرگ، (؟) کیا سیاسی ذہن رکھتے ہیں اور ان کا پچھلے زمانے میں کیا سیاسی رول رہا ہے؟ یہ کوئی راز نہیں ہے۔ ان باتوں کو سب لوگ جانتے ہیں! جی۔ ایم۔ سید وہ صاحب ہیں جن کو پاکستان سے خدا واسطہ کا بیر ہے، ان کے قلب و ضمیر نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا۔ وہ ہر اس تحریک، اور گٹھ جوڑ میں شامل ہونے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں جس کا مقصد پاکستان کو ختم کرنا ہو۔ اس شخص پر سندھی عصبیت، اس بری طرح مسلط ہے کہ اس کے لئے اسلامی قدروں کو بھی وہ پامال کر سکتا ہے

دوسرے حضرت (؟) میاں افتخار الدین صاحب ہیں جو مغربی پاکستان میں کمیونسٹوں کی پشت پناہ ہیں۔ "لیل و نہار" ہو۔ "پاکستان ٹائمز" ہو، "امروز" ہو، یہ تمام اشتراکی جریدے جس ادارے کے تحت چل رہے ہیں اس کی زمام کار انھی میاں صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ ایک طرف ان کی سرمایہ دارانہ بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ پاکستان میں جب کسی CRISIS کی بھنک یہ سن پاتے ہیں تو ہوائی جہاز میں بیٹھے اور یہ جا وہ جا! پھر آپ ان کو پیرس، لندن یا جنیوا میں پائیے گا! دوسری طرف حالات پُرسکون ہوں تو اسمبلی میں وہ وہ گرجدار تقریریں کرتے ہیں کہ جیسے یہ اسٹالن کی طرح لوہے کا کلیجہ اور فولاد کا دل رکھتے ہیں! اور پھر اس شخص کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لاکھوں روپیہ غیر ممالک سے تجارت کے ذریعہ کماتا ہے۔ حکومتِ چین سے لاکھوں ٹن کوئلہ جو پاکستان آیا ہے، اس کے دلال بھی میاں صاحب تھے۔ اور کوئلوں کی اس دلالی میں ان کے ہاتھ کالے نہیں رو پہلی اور سنہری ہو کر رہے ہیں۔

پاکستان کی بدقسمتی سے ایک بے وقوف مُلّا کو مشرقی پاکستان کے عوام میں رسوخ و اثر حاصل ہو گیا ہے اور یہ بھاشانی صاحب کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ "نیشنل پارٹی" وجود ہی میں اس وقت آئی ہے جب کمیونسٹوں نے بھاشانی صاحب کو اس "فتنۂ نوخیز" کے لئے اچھی طرح ہموار کر لیا ہے۔ اس نوبت پر ڈاکٹر خانصاحب

کا سیاسی رول ذہن میں رکھ کر ان کی اس نقل و حرکت پر غور کیجئے کہ وہ ڈھاکہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں صدر مملکت کے ساتھ قیام فرماتے ہیں۔ پھر وہ بھاشانی صاحب سے جاکر ملتے ہیں، اور ملنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے

"مولانا بھاشانی ایک دیانتدار اور مخلص آدمی ہیں، اور پاکستان کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنا کوئی دوسرا شخص۔

"نیشنل پارٹی" جیسی پاکستان دشمن جماعت کے سب سے بڑے لیڈر ـــ بھاشانی ـــ کو پاکستان کی وفاداری کے سرٹیفیکٹ کی ضرورت بھی تھی۔ اور یہ سارٹیفیکٹ ڈاکٹر خان صاحب نے مرحمت فرما دیا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ "نیشنل پارٹی" کا یہ ڈرامہ بھی "عالم بالا" کے اشارے سے کہیں نہ کھیلا جا رہا ہو۔ کیونکہ "کسی" کا ایما پاکر ہی سرحدی گاندھی کے یہ برادرِ بزرگ توڑ جوڑ کرتے اور لبِ نازک کو زحمتِ تکلم دیتے ہیں۔ اور یہ تو سامنے کی بات ہے کہ "نیشنل پارٹی" کے ذریعہ سہروردی صاحب کی طاقت کو کمزور کرنا مقصود ہے۔

سازشیں اخبارات پہلے رمز و اشارات اور استعاروں میں طنز و تنقید کیا کرتے تھے، مگر اب نوبت اس حد تک آپہنچی ہے کہ بعض سنجیدہ باوقار اور چوٹی کے اخباروں نے پاکستان کے صدر مملکت جناب سکندر مرزا بالقابہ کا نام لے کر تنقید کی ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے خوب کھل کر کہا ہے اور پھر اس پر دلائل و شواہد پیش کئے ہیں! ان اعتراضات کی ایوانِ صدر سے ابھی تک کوئی تردید نہیں ہوئی! ہم خاک نشین تو اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ یا تو "حضور صدر مملکت" انتہائی صبر و تحمل عفو و درگزر اور ترحم خسروانہ سے کام لے رہے ہیں یا پھر وہ اعتراضات اس قدر وزن رکھتے ہیں کہ چپ سادھ لینے ہی میں خیریت نظر آتی ہے۔

مفاد پرستی، غلط کاری اور خرابی کی انتہا ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم غیر مملکتوں سے گفت و شنید کے لئے باہر جاتے ہیں اور ان کے خلاف محلاتی سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہم مسٹر حسین شہید سہروردی کے حامیوں اور مدح خوانوں میں نہیں ہیں۔ ہم بہت سے معاملات میں سہروردی صاحب سے بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ مگر ان کی مخالفت میں ہم عواقب و نتائج کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ عرض کرنا یہ ہے کہ کسی سازش کا شکار ہو کر اگر اس نوبت پر سہروردی صاحب کو وزارتِ عظمیٰ سے دست کش ہونا پڑا تو پاکستان کی رہی سہی بین الاقوامی ساکھ بھی جاتی رہے گی اور غیر حکومتیں ہمارے نمائندوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں گی کہ ہم پاکستان کے کس آدمی سے معاہدہ کریں۔ کس کو اپنے دل کا بھید بتائیں، کس سے سیاسی روابط پیدا کریں، جبکہ پاکستان میں توڑ جوڑ کے ذریعہ ہر بڑی سے بڑی شخصیت کو ایوانِ اقتدار سے باہر "GET OUT" کیا جا سکتا ہے! سہروردی صاحب کے بارے میں ہمارا یہ اظہار خیال "اہون البلیتین" کے پیش نظر ہے۔ اس باب میں اتنا اشارہ ہی کافی ہے۔

پاکستان کا ہر بڑے سے بڑا آدمی آئینی طور پر اپنے عہدے اور منصب سے ہٹ سکتا ہے، اور اس کے ہٹائے جانے کے لئے تگ و دو کی جا سکتی ہے مگر اس کے لئے کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے؟ جو لوگ سہروردی صاحب کے درپے آزار ہیں وہ سیاست کے کسی بنیادی اختلاف یا ملک کی خیر خواہی کے لئے یہ سب کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ذاتی مفادات کی جنگ اور ہوا و ہوس کی نزاع ہے۔ یہاں مفاد سے مفاد ٹکرا رہا ہے؟ اور مفادات کے تصادم کا نتیجہ کسی ملک، حکومت اور قوم کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو ایک "شیطانی" چکر ہے جو کسی ملک میں

اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک مفاد پرستوں کے ہاتھوں سے زمام کار چھن نہ جائے۔

جائزہ

جب سہروردی امریکہ میں تھے تو عوامی لیگ کے لیڈروں نے بہت کچھ واویلا کی تھی کہ وزیر اعظم کے خلاف محلاتی سازشیں ہورہی ہیں؟ مگر ان "لیڈران کرم" سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جس وقت ڈھاکہ میں "مخلوط انتخاب" منظور کرانے کے لئے "محلاتی سازشیں" ہورہی تھیں اور سہروردی صاحب ان میں نہ صرف یہ کہ شریک تھے بلکہ بہت اہم رول ادا کررہے تھے۔ اس وقت "محلاتی سازشوں" کو آپ نے کس طرح گوارا کرلیا؟ جب تک محلاتی سازشوں نے آپ کے مفادات کا ساتھ دیا۔ آپ نے ہر فتنہ انگیزی پر "مرحبا" کہا مگر جب اپنے مفاد و اقتدار پر ضرب پڑتی دیکھی تو "محلاتی سازش" کا خوف آپ پر کابوس بن کر سوار ہوگیا۔ سچ کہا تھا کسی نے ؎

چاہ کن را چاہ درپیش

ملک کی اس ابتری اور سیاسی بحران اور عام انتشار کی سب سے زیادہ ذمہ دار "ریپبلکن پارٹی" ہے۔ جو کسی سیاسی مذہبی یا معاشی و معاشرتی نظریہ کی بنا پر وجود میں نہیں آئی بلکہ جس کو صرف ذاتی مفادات کے بطن نے جنم دیا ہے، جس میں ایسے ایسے مُرغانِ بادنما جمع ہوگئے ہیں جن کی زمانہ سازی، مفاد پرستی اور بے ضمیری نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔! یہ لوگ جب تک حکومت کی کرسیوں پر براجمان رہیں گے، پاکستان کا سفینہ مفاد پرستی کے خوفناک بھنور سے نکل ہی نہیں سکتا۔

ری پبلکن پارٹی کے ارکان اس کے سرپرست اور ارباب کار اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام میں اُن کی ساکھ باقی نہیں رہی، اس لئے یہ ٹولی "انتخاب" کے نام سے گھبراتی ہے۔ کیونکہ "انتخاب" میں اسے اپنے اقتدار کی موت دکھائی دیتی ہے لہٰذا اس پارٹی کا جہاں تک بس چلے گا انتخاب کو ٹالنے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گی، اسی پارٹی کے سب سے بڑے لیڈر ڈاکٹر خان صاحب نے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ کر یہاں "انقلابی کونسل" قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ اس پارٹی کے خوفناک عزائم کا آئینہ دار ہے کہ "زوالِ اقتدار" کی پرچھائیں بھی دکھائی دے جائے تو ملک میں انتشار بدامنی کا بہانہ بنا کر انتہائی اور آخری اختیارات استعمال کر دیئے جائیں! اللہ کرے خیر و خوبی کے ساتھ انتخابات تک کا وقت گذر جائے، یہی بڑے سے بڑے خطرے اور سازش کے ظہور کا زمانہ ہے کیونکہ عوام کے ناپسندیدہ اور نامقبول عناصر "یوم انتخابات" کو اپنے حق میں "روزِ سیاہ" اور "یوم قیامت" سمجھتے ہیں۔

پاکستان میں انتشار و ابتری کا یہ عالم ہے کہ یہ محلاتی سازشیں الگ اپنا کام کئے جارہی ہیں، ہم پر وزیر اعظم وہ مسلّط ہیں جنھوں نے اپنی لیگ کے نام سے "مسلم" کا لفظ خارج کردیا اور "اسلامی دستور" کے مخالفین میں جو سب سے پیش پیش تھے؟ یہ انھیں کی ذات عظمیٰ کا زمانہ ہے کہ پاکستان جس "دو قومی نظریہ" کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے، اس کو انھوں نے باطل قرار دے دیا۔ ہماری مالیات ان کے دستِ تصرف میں ہے، جو انگریز کے زمانہ میں فوجی کینٹینوں کے ٹھیکیدار تھے، وزارتِ خارجہ پر ان بزرگ کا قبضہ ہے، جن کو انگریز اپنا "فرزند دلبند" سمجھتے تھے، تجارتی لائسنسوں اور پرمٹوں سے لوگوں کے ضمیر الگ خریدے جارہے ہیں۔ رشوتوں کا سلسلہ دور دور تک پہنچا ہوا ہے اور جو داستانیں ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں، ان سے اگر "مبالغہ" کو منہا بھی کر دیا جائے، تو بھی واقعات کی سنگینی انتہائی افسوس و ملامت کی مستحق ہے، سرکاری عہدیداروں کی باقاعدہ سرپرستی میں رقص و سرود کے جلسے اسی دور میں ہوئے ہیں۔ عمرکوٹ میں ہندو زمینداروں اور

ساہوکاروں نے مسلمانوں کو ذلیل اسی عہد میں کیا ہے۔ شیعہ سنی فسادات کا سہرا اسی حکومت کے سر ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان میں آمریت اور مطلق العنانی کے خواب دیکھنے والے "کس بگاڑ" سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور ان کی تمناؤں کے پورا ہونے کے لئے کس قسم کی خرابیٔ حالات کی ضرورت ہے!!

ملک میں ہوش رُبا گرانی نے لوگوں کے حواس ٹھکانے لگا دیئے ہیں، بے روزگاری اور ناداری بڑھتی جا رہی ہے مگر ارباب حکومت کے شاہانہ اخراجات میں مجال ہے جو کمی آجائے، ایسی باتوں پر تو وہ لوگ غور کرتے ہیں جن کے دلوں میں عوام کا درد ہوتا ہے جنہیں خدا کا نہیں تو کم سے کم پبلک ہی کے احتساب کا ڈر لگا رہتا ہے۔ یہاں خدا کا خوف تو سرے سے تھا ہی نہیں، رہے عوام، سو ان کو "خداوندانِ نعمت" نے بھیڑ بکری سمجھ رکھا ہے، جب یہ ذہنیت ہو تو کسی "بڑے آدمی" کو اپنے کردار اور زندگی کی اصلاح کی فکر ہو تو کیونکر ہو! حکومت کے نشہ میں تھوڑی بہت مستی ضرور ہوتی ہے، مگر اتنی نہیں کہ آدمی "شاہِ بے خبر" ہی بن کر رہ جائے۔

ملک میں تعمیر و ترقی کا دور دور پتہ نہیں، ہر شعبہ میں تنزل و ابتری کے آثار نمایاں ہیں جو تعمیر و ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ اور جن سے ملک کی بھلائی کی توقع ہو سکتی تھی، انھیں آپس کی اکھاڑ پچھاڑ سے فرصت کہاں ہے؟ یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو آشیاں جلا کر سیرِ چراغاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

شراب جن کی گھٹی میں پڑی ہو۔ رقص و سرود جن کا محبوب ترین مشغلہ ہو، قمار بازی سے جنہیں انتہائی دلچسپی ہو انگریزی تہذیب جن کے مزاج و طبیعت میں رچ گئی ہو جن کی محفلوں میں خدا و رسول اور حدیث و قرآن کا بھولے سے بھی ذکر نہ آتا ہو۔ نامحرم چھوکریوں کی ہم نشینی کے بغیر جن کی راتیں خالی نہ رہ سکیں، ان سے اگر کوئی "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کے سنبھالنے کی توقع رکھتا ہے، تو وہ "جنت الحمقاء" میں رہتا ہے!

یہ جو ڈاکٹر خان صاحب نے "انقلابی کونسل" کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔ اس میں جمہوریت ہی نہیں، خود اسلام کے خلاف زبردست سازش کا داعیہ پنہاں ہے، اس طرح "اسلامی دستور" پر ہاتھ صاف کرنا مقصود ہے۔ جو ان "افرنگ زدوں" کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے!

اب تو حالات ابتری کی اس سطح تک پہنچ چکے ہیں کہ پاکستان میں عیسائی مشنریوں کو ہر طرح کی سہولتیں اور رعایتیں مہیا کی جاتی ہیں، مگر شہر کی آرائش کی خاطر بنی ہوئی مسجدیں بے دریغ ڈھا دی جاتی ہیں۔ نماز جو اسلام کا ستون ہے، اس کو کمزور کرنے بلکہ ڈھانے کے لئے حکومت کے ایک بے دماغ سکریٹری نے اردو میں نماز پڑھنے کا فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس پونے چودہ سو سال کی مدت میں اسلام کے خلاف جتنے فتنے ظہور میں آئے ہیں اور جتنی سازشیں ہوئی ہیں، ان سب فتنوں میں یہ "اردو میں نماز پڑھنے کا فتنہ" نتائج کے اعتبار سے شاید سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

دستور کی منظوری کے بعد قوانین کو اسلامی انداز پر ڈھالنے کے لئے لاء کمیشن کا تقرر جلد سے جلد ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کو ٹالا گیا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ سال کے بعد اس کمیشن کے ارکان کے ناموں کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ اور اس کی ہیئت ترکیبی بھی ایسی رکھی گئی ہے کہ آپس میں فکر و اجتہاد اور آراء کا تصادم ہو اور اسی نزاع میں برس ہا برس صرف ہو جائیں۔ لاء کمیشن کی وضع و ترکیب کا اس سے تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اس شخص کو بھی شامل کیا گیا ہے جو نہ قانونِ اسلام کا علم رکھتا ہے نہ قانونِ جدید سے واقف ہے، جس کا کام قرآن میں تحریف کرنا

اور سنتِ رسول کا مذاق اڑاتا ہے، اور جو حدیث و فقہ کو اسلام کے خلاف عجمی سازش کہتا ہے اور برسوں سے اپنے ان عقائد کی تبلیغ کر رہا ہے، ان "بڑے لوگوں" نے تہیہ کر لیا ہے کہ پاکستان میں کوئی تعمیری کام خیر و خوبی سے نہ ہونے دیں گے اور اسلامی نظام کی راہ میں تو اتنی رکاوٹیں پیدا کر دیں گے کہ اس نظام کا نفاذ عملاً ناممکن ہو جائے۔

پاکستان کے اربابِ اقتدار عوام کی طرف سے غافل نہیں ہیں، ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ عوام ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اور ان کو کن ناموں سے یاد کرتے ہیں اور لوگ موجودہ مصائب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب ہیں؟ عوام کے انہی خیالات و عزائم نے ان "بڑے لوگوں" کو پبلک سے انتقام لینے پر آمادہ کر دیا ہے۔ لہذا اسکیم یہ ہے کہ جس حیلہ، ترکیب، چال اور سازش سے بھی جمہوری قدروں کو پامال کیا جا سکے، اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔ یہی طریقہ عوام کو بے اثر اور بے دست و پا بنانے کا ہے!

حرفِ آخر۔ ہم کسی لاگ لپیٹ اور ابہام و اشاریت کے بغیر صاف لفظوں میں اس کا اعلان کرتے ہیں کہ موجودہ اربابِ قیادت کے طرزِ عمل نے ہمیں مایوس کر دیا ہے اور ان کی ذات سے ہم کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے۔ آخر کب تک فریب کھائے جائیں، کب تک اس خوش فہمی میں رہیں کہ یہ "بڑے لوگ" اب سمجھتے ہیں، اب سمجھتے ہیں!

ملک کو تباہی سے بچانا ہے تو "انقلابِ قیادت" کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ مگر ہم کمیونسٹوں کی طرح وہ "انقلاب" نہیں چاہتے جس کا آغاز شکست و ریخت سے ہوتا ہے۔ پاکستان کے کسی بھی خیر خواہ کو اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں انقلاب آئین کے ذریعہ آئے گا، اور حقیقت میں آئینی انقلاب ہی کے ذریعہ ہمارے تمام درد و غم اور دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ آئینی انقلاب بے شک وقت چاہتا ہے، یہ سفر قدرے طویل اور صبر آزما ہے۔ مگر دوریٔ منزل سے گھبرانا نہ چاہئے، صبر و ضبط اور ایثار و جفاکشی سے کام لینے کی ضرورت ہے، بس پھر منزل آسان ہے۔

پاکستان کے عوام اگر ان حالات کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ "انتخابات" کیلئے وہ پوری طرح منظم ہو جائیں، اور اپنے متفقہ احتجاج اور ناقابلِ شکست عزم سے ان لوگوں کو "انتخابات" کے لئے مجبور کر دیں جو "انتخابات" کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ بس پھر انشاء اللہ تعالیٰ ان کی فتح ہے، پہلے "انتخاب" میں جمہوریت دوستوں اور اسلام پسندوں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوگی۔ مگر اس طرح "انقلابی کونسل" قائم کرنے اور آمریت کے خواب دیکھنے والوں کے عزائم تو ناکام ہو جائیں گے، اور ملک میں سیدھی سچی جمہوریت کی بنیاد پڑ جائے گی۔

ہمارا ضمیر کہتا ہے کہ پاکستان کا مستقبل اسلام پسندوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس چمن میں ہمیشہ خزاں کا دور دورہ نہیں رہے گا۔ یہاں "بہار" انشاء اللہ آکر رہے گی۔ ہم تو اس مبارک زمانے کی توقع میں جی رہے ہیں۔ جب پاکستان میں نیکیوں کا چلن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا یہاں کسی اور کا حکم نہ چل سکے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سنت معیارِ عمل ہوگی۔ زمین سے آسمان تک برکتیں ہی برکتیں اور ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں خوشحالی ہی خوشحالی!

آخری بات یہ ہے کہ حالات کو بدل دینا ہمارے بس میں نہیں ہے، حالات کو بدلنے کی سعی اور جد و جہد

کے لئے ہم بے شک مکلف بنائے گئے ہیں۔ اپنا فرض ہمیں ادا کر دینا چاہیے۔ مگر اس جدوجہد میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا پیش نظر رہنی چاہیے۔ اس نامرادی اور کوتاہ دستی کی کوئی حد و انتہا ہے کہ جس ملک میں دس بیس لاکھ نہیں سات کروڑ مسلمان بستے ہوں، وہاں اللہ کا دین غالب نہ ہو سکے، کوتاہی ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ ہماری بے عملی اور جمود نے یہ روزِ بد دکھایا ہے۔ اس غفلت کے ہم ذمہ دار ہیں۔ آؤ! اپنی کوتاہیوں، غفلتوں اور فرض ناشناسیوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہوئے اقامتِ دین کی راہ میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت و رحمت کی کچھ کمی نہیں ہے۔ اور خدا کی قسم "اَنتُمُ الاَعلَون" کی بشارت تو بہت دنوں سے ہمارے انتظار میں ہے۔

ماہر القادری

۲۴ اگست ۵۷ء

اسعد گیلانی

اقامت دین کے لئے

راہِ سلوک

اقامتِ دین کیلئے

تصوف کی اصطلاح مسلم معاشرے کے اندر صدیوں کے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی فنِ دینداری کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ اپنے اندر مختلف اصطلاحی مفہومات سمیٹ چکی ہو اور اس لفظ کی نسبت کے ساتھ ہی انسان کے اطوار و عادات۔ لباس، وضع قطع۔ بول چال۔ نشست و برخاست تصورِ دین اور طریق عبادات کا کوئی مخصوص نقشہ ذہن میں آجاتا ہو۔ لیکن ایک عامی مسلمان دین و ایمان اور آخرت کی جڑ جس چیز کو سمجھتا ہے۔ جہاں آکر اس کا سارا تصور دین مرکوز اور مقصودِ عبادات منتہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے مالک حقیقی سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس تعلق کے تصور سے وہ ایک حلاوت اور ایک تسکین محسوس کرتا ہے۔ اس تعلق میں اضافہ اس کی دلی تمنا ہوتا ہے۔ اس تعلق کی نوعیت۔ اس کا اخلاص۔ اس کی گہرائی۔ اس کا زندگی پر اثر۔ انسانی کردار پر اس کے نقوش۔ معاملات میں اس کی جھلک۔ تعلقات میں اس کا پرتو۔ حق پناہی میں اس کی قوت کا عکس۔ باطل کی تردید میں اس کی رضا کے حصول کا تصور۔ غرض اس کی زندگی کا محور جس کے گرد اس کا نفس نفس گھومتا اور قوت حاصل کرتا ہے۔ وہ اللہ کی ذات کے ساتھ اس کا یہی شعوری تعلق ہے۔ اس تعلق کی نوعیت سے ہی انسانی کردار بنتے اور ان کی اقسام وجود میں آتی ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اقامت دین کے لئے جو "راہِ سلوک" پیش کی ہے۔ چونکہ اس کی اصطلاحات اور طور و انداز فنِ تصوف سے ملتے جلتے نظر نہیں آتے۔ لہذا اس سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں! اور بعض لوگ جرح و تنقید سے اصل حقیقت کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر تصوف "تعلق باللہ" کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو مولانا مودودی اس دور میں "تعلق باللہ" کے سب سے بڑے داعی ہیں۔

مولانا مودودی کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہم آج کے انسانوں کی خوش بختی ہے کہ ان کے لئے وہ تاریخ میں پڑھنے معلومات فراہم کرنے اور بیان کرنے کی چیز نہیں بلکہ غور سے سمجھنے، قریب دیکھنے اور رائے قائم کر کے مخالفت یا موافقت کرنے کی چیز ہے۔ وہ ایسی شخصیت نہیں ہے جو دنیا میں خاموشی کے ساتھ اگر اپنی ذات کے قریبی ماحول میں تگ و تاز کر کے کچھ دنیوی کامیابیاں یا صرف اپنے سمیٹ کر کسی مخصوص طبقہ میں معروف یا بدنام ہو کر رخصت ہو جانے والی ہے۔ جس دور تہذیب میں ہم رہ رہے ہیں اور عصر حاضر نے ہمارے چاروں طرف اپنا فکری اور تہذیبی جال پھیلا رکھا ہے اس دور تہذیب اور اس عصر حاضر کے خلاف مولانا نے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے۔ وہ اس کو ڈھانے، توڑ پھوڑ دینے اور مسمار کر کے اس کی تخریب سے ایک نئی تعمیر اٹھانے کا علی الاعلان اظہار کر رہے ہیں۔ اظہار ہی نہیں انھوں نے یہ کام عملاً شروع کر رکھا ہے۔ ایک صبر آزما اعصابی، علمی، عقلی، اخلاقی، مادی اور تہذیبی جنگ ہے۔ جو انھوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ بنی نوع انسان کی موجودہ نسل میں سے وہ پکار پکار کر اپنے ساتھی جمع کر رہے ہیں۔ انھیں سمیٹ کر اور منظم کر کے موجودہ چلتے ہوئے نظام پر پیہم یورش کر رہے ہیں۔ یہ ساری کارروائی برابر وہ ہمارے سامنے کئے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بڑا ہی غافل آدمی ہو گا جو

غیر جانبداری کا پردہ ڈال کر اس میدانِ جنگ کی طرف سے آنکھیں پھیرے۔ انھوں نے ساری موجودہ نسل کو عموماً اور مسلم معاشرے کے فرد فرد کو خصوصاً یہ کہہ کر آزمائش میں مبتلا کردیا ہے کہ میں اقامتِ دین کا کام کر رہا ہوں۔ وہ کام جسے انبیاء اور صلحاء کرتے آئے ہیں۔ اور جسے ہمارے آقاؐ اور سرکارؐ نے انجام دیا۔ اب کون مسلمان ہے جو ان کی ان باتوں سے غافل رہ سکتا ہے۔ انکے بارے میں دو میں سے ایک طرزِ عمل اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اگر وہ شخص غلط کہہ رہا ہے۔ تو پھر اس کا مقابلہ، اس کی مزاحمت، اس کی پیش قدمی کو روکنا ایک ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے دین و ایمان کے ساتھ کھیلے۔

اور اگر وہ صحیح کہہ رہا ہے تو پھر اس کی امداد، اس کی اعانت اور اس کی رفاقت اس کے محاذِ جنگ کا سپاہی بننا، اس کے شروع کئے ہوئے کام میں اپنا سب کچھ لگا دینا ایک ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ کسی صورت جائز نہیں ہے کہ دین کے خادم زخم کھا کھا کر گریں اور اس کی حمیت میں سرِ مو حرکت نہ ہو۔

اس لئے آج ایک مسلمان ہر معاملے میں غیر جانبدار رہ سکتا ہے۔ یعنی مولانا مودودی کے معاملے میں اگر اسے ذرا بھی حالات زمانہ سے آگاہی اور اپنے گرد و پیش کی خبر ہے وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ یا اسے ان کا دوست ہونا چاہئے جاں نثار دوست یا اسے ان کا دشمن ہونا چاہئے۔ متشدد دشمن۔ لیکن یہ طرزِ عمل، اس وقت تک دل و دماغ کے اطمینان اور قلب کی گہرائی سے نہیں ہو سکتا جب تک ان کی شخصیت اور ذات کا قریبی اور گہرا مطالعہ نہ کرلیا جائے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ جو عمل کرتے ہیں، اس میں کس حد تک خلوص، خدا ترسی اور مقصد کے عشق کی جھلک ہوتی ہے۔ اس کام میں ان کی استقامت کا کیا حال ہے۔ انھوں نے اس کام میں کیا کچھ لگایا ہے۔ کیا کچھ بچا کر رکھا ہے۔ مادی طور پر کیا کچھ صرف کردیا ہے۔ اور کیا کچھ پالیا ہے۔ ان کے عزائم کا کیا حال ہے؟ مصائب میں ان کی عزیمت کس درجہ کی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا اندر اور باہر کیا ہے۔ وہ قریب اور دور سے کیسے نظر آتے ہیں؟ یہ سب چیزیں ہیں جو ایک صاحب ہوش آدمی کو دیکھنی چاہئیں۔ اگر وہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہے۔

مولانا مودودی کی شخصیت ایک پہاڑ کی مانند ہے۔ پہاڑ کو آنکھیں کھول کر دور سے دیکھئے تو بھی وہ خوشنما اور خوش منظر ہوتا ہے۔ اس حوادثِ زمانہ میں بے ریا اور بے لاگ لپیٹ اپنے عزم کی مستحکم بنیاد پر کھڑا رہتا ہے۔ اور اگر اس کے قریب جاکر دیکھئے تو پھر جوں جوں اس کی قربت بڑھے گی۔ اس کی بلندی، عظمت اور اونچائی اور خوش منظری اور خوش نمائی بڑھتی چلی جائیگی مولانا مودودی کی یہ بہت بڑی عظمت ہے کہ ان کی قربت دوری سے کہیں زیادہ خوش منظر ہے۔ مولانا مودودی کی زندگی میں کہیں پردے لٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ کہیں پر بھی ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ انھیں ہر حال میں دیکھئے اور ہر رنگ میں یکساں پایئے۔ بناوٹ۔ تصنع۔ تکلف۔ خود نمائی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ان کی شخصیت کے گرد کوسوں دور تک پتہ نہیں ملتا۔ نہ وہ اپنی ذات کو کسی پر ٹھونستے ہیں نہ مرعوب کرتے ہیں، نہ علمی تفوق کا کوئی خفیف سا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ نہ مجلس میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کے۔ جو ان سے ملے، ہمدرد، غمگسار، مخلص اور راست گو ساتھی ہیں۔ ان کی چال ڈھال، بول چال، نشست و برخاست اور لب و لہجہ سے ایک مستحکم، باعمل اور راست فکر کردار کا اظہار ہوتا ہے اور آدمی تھوڑی سی بات چیت میں ہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص باتوں بہلانے والا اور اپنے گرد کوئی بناوٹی رکھ رکھاؤ رکھنے والا آدمی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے افکار عمل میں ڈھلنے کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ اور وہ پوری سادگی اور اخلاص کے ساتھ نہایت

زیرک اور تدبّر سے اپنے کاموں کا نقشہ بنانے والا ہے۔ اس کے کردار میں کوئی سنسنی خیزی نہیں ہے۔ البتہ معاشرے کے بگاڑ کی اس انتہا میں اپنی زندگی کو اسلامی اخلاق و حدود میں بے تکلفی سے کس کر رکھنے کا ایک سادہ عمل انسان کو تحیّر میں ضرور مبتلا کر دیتا ہے۔ جس نظام، فکر و اخلاق کو وہ دعوت اور تحریک کے طور پر لے کر اٹھے ہیں اس کے عملی نظام ہونے پر ان کی روزمرّہ کی زندگی خود ایک جیتی جاگتی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آئی ہیں کہ اسلامی نظام حیات پر بعض اعتراضات و شبہات کا جواب اگر مجھ جیسے کسی عام کارکن نے دیا ہے تو بسا اوقات سائل دل سے پورے طور پر مطمئن ہو گیا ہے۔ یہ اطمینان جو ایک شخص کی زبان کے الفاظ سے ایک معترض کے دل میں ٹھنڈک بن کر اتر جاتا ہے۔ دراصل اپنے اندر علمی اور لسانی فرق سے کہیں زیادہ قلب و نظر کی پاکیزگی اور فکر و عمل کی یکسانی سے پیدا ہوتا ہے۔

جس راہِ سلوک کو طے کر کے انھوں نے "تعلق باللہ" کی جس اہمیت کو عملاً پہچانا ہے اس تعلق نے ان کے اندر احقاق حق اور ابطال باطل کی عزیمت کا جوہر پیدا کر دیا ہے۔ دو چیزیں ہیں جن کا مطالعہ ان کے کام کو سمجھنے کے لئے مفید ہے۔ ان کا عملی کردار جو حق کے لئے سب کچھ سہ جانے کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور ان کی وہ راہِ سلوک اور اس کے خد و خال جس پر وہ چل رہے ہیں۔ تاکہ مالک حقیقی سے اپنا تعلق استوار کر سکیں۔ ان کے داعیانہ کردار کی چند جھلکیاں ان کی بعض مختصر تحریروں سے نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

"میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں۔ مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمہارے لئے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے اسے ادا کرو۔"

پھر دوسری جگہ لکھا ہے :۔

"میرے جرأت آمیز الفاظ سے آپ کو شاید یہ گمان گذرا ہو گا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔"

اپنی اولاد کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے :۔

"میں اپنی اولاد کو عیش کے لئے نہیں پالنا چاہتا۔ بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لئے پالنا چاہتا ہوں۔"

اپنے انقلابی مشن کا علم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے :۔

"میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں۔ اور انھیں کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ خداوند عالم سے علم صحیح اور عقل سلیم کے لئے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔ جس کے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہرحال خدا کے بھ[illegible] نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر جن کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔"

یہ کام وہ کس بے لاگ انداز میں کر رہے ہیں۔ اس کا ہلکا سا نقشہ اس اقتباس میں نظر آئے گا۔

"میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امتِ مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شئے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو، یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو، وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا، تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا۔ بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا۔ خواہ وہ دنیوی اعتبار سے حقیر ترین آدمی ہو۔ اور اگر وہ مجرّد شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے چھوٹے اپنے پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔"

پھر جس راہ میں انھوں نے قدم رکھا ہے اس میں جیل کے شب و روز اور پھانسی کے تختے بھی آجاتے ہیں۔ لیکن ان کی عزیمت بیماری میں معالج سے مشورے کی رعایت بھی ظالم سے طلب کرنا پسند نہیں کرتی۔

"آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے۔ لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہیں بس اس پر اکتفا فرمائیں۔"

جیل کے اندر سے اپنی بوڑھی والدہ کو خط کے ذریعے تسلی دیتے ہوئے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں:۔

"جس راستہ پر میں برسوں سے چل رہا تھا اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ میرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی تاخیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اس پر حیران ہوں کہ شیطان اور اس کی برادری نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کے وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں۔ یہ امید نہ رکھیے کہ یہ کشمکش جلدی ختم کر دی جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے۔ جس کے لئے میں پچھلے پندرہ برسوں سے کام کر رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے۔ اور بد سے بدتر نتیجے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

کیا ان الفاظ کے پیچھے وہ کردار نہیں بول رہا ہے جو دنیا میں حق کی گواہی کو زندگی کا واحد نصب العین بنا کر اٹھا کرتا ہے۔ اور جس کے لئے اس نے جان و تن کی بازی لگا دی ہے اور جس کے الفاظ میں حقیقت اور سچائی کا گہرا جذبہ ہے اور ایک عظیم کردار کی ترجمانی کرتا ہے۔

یہ کردار ایک خاص راہ پر چل کر اپنے مالک سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ راہِ اقامتِ دین کی راہ ہے۔ اس راہ کو مولانا مودودی "سلوکِ قرآنی" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس پر جان و دل سے لگ جائے جس پر اس کے مالک نے اسے بندۂ مومن کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ اتباعِ رسول کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ امتی وہی فریضہ انجام دے، جو رسول کریم نے انجام دیا اور اس طرح انجام دے کہ انھیں کے نقشِ قدم پر چلے۔ اسی طرح راہِ حق میں اقامتِ

دین کی خاطر مصائب برداشت کرے جس طرح رسول کریم نے برداشت کئے۔ پھر فہم قرآن کا اس سے بڑا نکتہ اور کوئی نہیں ہے کہ جو انقلابی کام قرآن نے انجام دیا۔ اور اپنے لانے والے کو جس انقلاب کی سربراہی کے لئے تیار کر دیا یا اسی انقلابی کو لے کر اٹھ کھڑا ہو۔ وہی جھنڈا بلند کرے اسی علم کو تھامے۔ بدر واحد کے معرکوں میں جان کھپائے۔ دشمنانِ دین کے نیزوں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں پر چل کر اپنے کام کو آگے بڑھائے۔ جب ایک بندۂ مومن یہ کچھ کرنے اور سہنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو سلوک کی بہت سی منازل خود بخود طے ہونے لگتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلوک کی فنی اصطلاحات اور مخصوص اذکار و اشغال کا کوئی مرتب اور منضبط سلسلہ نہ ہو لیکن اللہ کی طرف بڑھنے اور اس کے در پر حق بندگی ادا کر دینے کا کام اس طرح انجام پاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے کلام کا فہم حاصل کرنے کے بارے میں مشورے دیتے ہوئے تفہیم القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا۔ جب تک عملاً وہ کام نہ کرے۔ جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی۔ اور وقت کے علمبردارانِ کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشہ گوشہ سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافت الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس ۲۳ سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی۔ اور حق و باطل کی اس طویل اور جانگسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بنائے۔ اسے تو آپ پوری طرح اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں۔ اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے۔ اور بدر و احد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے۔ اور سابقین اولین سے لے کر مولفۃ القلوب تک سب ہی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے۔ جس کو میں "سلوکِ قرآنی" کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گذرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی۔ کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں۔ اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔"

مولانا مودودی کی اختیار کردہ اس راہِ سلوک پر چلتے ہوئے مالک حقیقی کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اسے ناپنے تولنے اور بڑھانے کے لئے جو طریقہ مولانا کے نزدیک کارگر ہے اسے انھوں نے اپنی ایک تقریر "ہدایات" میں بیان کیا ہے:۔

"اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو خواب کی بشارتوں اور کشف و کرامات کے ظہور اور اندھیری کوٹھری میں انوار کے مشاہدے کا انتظار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس تعلق کو ناپنے کا پیمانہ تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے قلب میں ہی رکھ دیا ہے۔ آپ بیداری کی حالت میں اور دن کی روشنی میں ہر وقت اس کو ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا اور اپنی مساعی کا اور اپنے جذبات کا جائزہ لیجئے اپنا حساب آپ لے کر دیکھئے کہ ایمان لا کر اللہ سے بیع کا جو معاہدہ آپ کر چکے ہیں اسے آپ کہاں تک نباہ رہے ہیں۔ اللہ کی امانتوں میں آپ کا تصرف ایک امین ہی کا سا تصرف ہے یا کچھ خیانت بھی پائی جاتی ہے۔ آپ کے اوقات اور محنتوں اور قابلیتوں اور اموال کا کتنا حصہ خدا کے کام میں جا رہا ہے، اور کتنا دوسرے کاموں میں؟ آپ کے اپنے مفاد اور جذبات پر چوٹ پڑے تو آپ کے غصے اور بے کلی کا کیا حال ہوتا ہے۔ اور جب خدا کے مقابلے میں بغاوت ہو رہی ہو تو اسے دیکھ کر آپ کے دل کی کڑھن اور آپ کے غضب اور بے چینی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ہیں جو آپ خود اپنے نفس سے کر سکتے ہیں اور اس کا جواب لے کر ہر روز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے۔ رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلیات تو آپ ان کے اکتساب کی فکر نہ کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت پا لینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذریات سے دلائے ہوئے ڈراوے اور لالچوں کے مقابلے میں راہِ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں، کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے۔ اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی کوئی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کی راہ پر چلتے رہنے سے ملتی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥

پھر راہِ سلوک میں ذاتی اصلاح تزکیہ نفس اور سعیِ خیر کے لئے جو طریق انھوں نے تجویز کیا ہے۔ اسے مولانا محترم نے ایک رفیق کے نام اپنے ایک مکتوب زنداں میں بیان کیا ہے۔

اِن اخلاقی کمزوریوں کے تین علاج ہیں۔ ایک مخلص دوستوں کی دعائے خیر۔ دوسرے صحبت خیر۔ اور تیسرے خود اپنی سعیِ خیر۔ دعائیں بھی آپ کے حق میں کرتا ہوں اور انشاء اللہ آپ کے دوسرے رفقاء بھی کریں گے۔ صحبت ایسے آدمیوں کی اختیار کیجئے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں اور ان لوگوں سے دور رہیئے جن کے اندر خدا سے بے خوفی کی علامتیں پائی جاتی ہوں۔ رہی تیسری چیز تو احتساب نفس سے زیادہ کارگر کوئی دوسری تدبیر اس مقصد کے لئے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے انسان کو ایک ایسی چیز عطا کی ہے جو اس کو بھلے اور بُرے کا فرق بھی بتاتی ہے۔ برائی پر اُسے ٹوکتی اور ملامت بھی کرتی ہے اور بھلائی کی طرف اس کو اُکساتی بھی ہے۔ ہمارے قدیم لٹریچر میں اس کو نفسِ لوامہ کہتے تھے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اس کو ضمیر کہتے ہیں۔ اگر انسان اس کو زندہ رکھے۔ اس کی ملامتوں پر توجہ کرے، اور جس جس چیز پر وہ ملامت کرتا جائے، اسے اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہے تو یوماً فیوماً اس کو ترقی ہوگی۔ لیکن اگر آدمی اس کو دبانے کی کوشش کرے جب وہ کبھی برائی پر ٹوکے تو تاویلیں کر کر کے اسے خاموش کرتا رہے۔ اور اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرتے کرتے اسے بالکل بے جان کر ڈالے۔ تو پھر آدمی کا اخلاقی و روحانی تنزل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسفل السافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں فرمائی گئی ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا پھر ضمیر بھی دو چیزوں کا محتاج ہے، ایک یہ کہ اس کو زیادہ سے زیادہ علم کی روشنی بہم پہنچائی جائے تاکہ وہ بھلائی اور برائی دونوں سے خوب واقف ہو۔ اس غرض کے لئے قرآن اور حدیث اور سیرت نبوی اور صالحین کی سیرتیں نہایت مفید ہیں۔ دوسرے یہ کہ آدمی اپنے ضمیر کو مقویات کھلاتا رہے اور اس کی مقویات ہیں فرض اور نفل نمازیں، فرض اور نفل روزے۔ زکوٰۃ اور صدقات و خیرات اور بندگانِ خدا کی خدمت اور راہِ خدا میں عملاً دوڑ دھوپ یہ مقویات اس کو کھلاتے جائیے اور ترقی کے آسمان پر چڑھتے جائیے۔"

یہ وہ سیدھا سادھا طریق تزکیہ ہے جو مولانا مودودی اپنے لئے اور اپنے رفقاء کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔ لیکن اس راہِ سلوک کی کچھ خاص مشکلات بھی ہیں اور اس کے خاص مقامات پر آدمی ٹھٹھک کر کھڑا رہ جاتا اور آدمی حیرانی و سرگشتگی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اس چیز کو کسی صاحب نے مولانا مودودی صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ اقامتِ دین کا کام جتنا کچھ کٹھن اور اپنے تقاضوں کے لحاظ سے عظیم الشان ہے۔ اس درجے کی قیادت ہم کہاں سے لاسکتے ہیں۔ جو صاحب وحی والہام ہو۔ پھر اس کام کو انجام دینے والے وہ مخلص مجاہدین کی جماعت کہاں سے میسر آسکتی ہے۔ جیسی کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت تھی۔ ان کا سا ایمان واخلاص کہاں سے آسکتا ہے۔ اگر ہم قرآن کے سیاسی نظریے پر کوئی گروہ قائم کر بھی لیں تو بھی اس میں وہ اخلاقی دور، روحانی اسپرٹ کہاں سے پیدا ہوگی، جو اسلامی نظامِ حیات کی صحیح نمائندگی کر سکے۔ مولانا مودودی نے اس رفیق کے خلجان اور حیرانی کا علاج تجویز کیا ہے۔ ان شبہات وخیالات کو اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے دھوکے قرار دیا ہے۔ اور ایک تفصیلی گفتگو کے ذریعہ ان کی نشاندہی اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان کر دی ہیں اس مضمون کا ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے۔

"آپ کے اس خلجان کی ابتداء غالباً اس مقام سے ہوتی ہے کہ آپ اقامتِ دین کا جب تصور کرتے ہیں تو معاً آپ کے سامنے دورِ نبوت اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ آجاتا ہے اس خیال سے آپ کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ وہ عظیم رہنما اور وہ بے نظیر کارکن آج کہاں ہیں جن کے ہاتھوں یہ کام اس وقت ہوا تھا۔ آپ اپنے دل کا جائزہ لے کر تحقیق کیجئے کہ جب یہ سوال آپ کے دل میں ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ کس قسم کے رجحانات آپ کے نفس کو اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں۔ آپ گہرا جائزہ لیں گے تو نمایاں طور پر دو رجحانات کی کشش آپ کو

خود محسوس ہوگی۔

ایک یہ کہ مایوس ہو جاؤ۔ اب نہ وہ رہنما اور وہ کارکن میسر آسکتے ہیں۔ نہ یہ کام ہو سکے گا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ پورے دین کی اقامت کا تصور ہی چھوڑ دو۔ جو کام نہیں ہو سکتا اس کے پیچھے پڑنے سے کیا حاصل۔ دین کی جزوی خدمات میں سے کوئی ایک خدمت اپنے ہاتھ میں لے لو۔ اور جیسی کچھ بُری بھلی بن آئے کرتے رہو۔ میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ اولین رجحان ہے جو اس مقام پر آدمی کے سامنے آتا ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پہلا دھوکا ہے جو شیطان ایک نیک نفس مسلمان کو دیتا ہے۔ تاکہ وہ اقامتِ دین کے نصب العین سے کسی طرح باز آجائے۔ اس لئے آگے کی کوئی بات سوچنے سے پہلے آپ کو چاہئے کہ اس فریب کو اول قدم ہی پر پہچان لیں۔ اور اگر آپ نیک نیتی سے ہیں تو پورے شعور اور عزم کے ساتھ اپنے ذہن میں پہلے اس کا اچھی طرح قلع قمع کر دیں۔

دوسرا رجحان جو اس کے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ یہ کام ہے بیشک ضروری اور فرض مگر اس کے لئے رہنماؤں اور کارکنوں میں وہی روحانی و اخلاقی اوصاف درکار ہیں جن کی بدولت عہدِ نبوی میں یہ کام ہوا تھا۔ لہٰذا پہلے ویسے بن جاؤ اور اس طرح کے آدمی بنا لو پھر اس کام میں لگو۔ یہ دوسرا دھوکا ہے جو پہلے دھوکے سے بچ نکلنے والے کو شیطان دیا کرتا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ یہ شخص اس نصب العین پر جم گیا ہے اور اس سے ہٹنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو پھر وہ اس کو فکر کی بجائے تدبیر کی ایک غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ بیشک دریا پار تو جس منزل کی طرف جانا چاہتا ہے، وہ ہے تو منزلِ مقصود ہی۔ مگر بے وقوف تیرنا سیکھے بغیر دریا میں اُترے گا۔ پہلے دریا سے باہر خشکی پر تیرنے کی مشق اچھی طرح کر لے۔ پھر دریا میں قدم رکھ۔ اس طرح وہ ناصح مشفق آدمی کو واقعی بے وقوف بنا دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس کے داؤں سے مات کھا جاتے ہیں وہ سب نہ صرف خود خشکی پر تیراکی کی مشق شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ جن جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتے ہیں ان کو بھی خشکی کا تیراک بنانے میں خوب مہارتِ فن دکھاتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ماہرینِ فن کو اکثر تو عمر بھر دریا میں اترنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اتر جاتے ہیں تو زمین پاؤں تلے سے نکلتے ہی یا غرق ہو جاتے ہیں یا دریا کے بہاؤ پر بہ نکلتے ہیں۔ کیونکہ دریا سے باہر خشکی پر تیراکی میں جو کمال پیدا کیا جاتا ہے وہ دریا کی روانی سے پہلا سابقہ پڑتے ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔

ان دونوں رجحانات کی غلطی کو اگر آدمی آغاز میں ہی محسوس کرلے تو وہ اس طریق تزکیہ و تربیت کو آپ سے آپ ترجیح دے گا۔ جسے ہم نے ترجیح دی ہے۔ لیکن اس راہ پر چند قدم چلتے ہی یکے بعد دیگرے کچھ دوراہے ایسے آتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر پہنچ کر آدمی کا دل چاہتا

ہے کہ دائیں یا بائیں مڑ جائے - اور اگر وہ نہ مڑے تب بھی آگے چلتے ہوئے بار بار اس کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی موڑ پر کیوں نہ مڑ گیا - بلکہ بسا اوقات یہاں تک جی چاہنے لگتا ہے کہ چلیے اور انھیں میں سے کسی موڑ پر مڑ جائیے - میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں سفر آغاز سے شروع کریں - اور ان میں سے ہر ایک موڑ کی کشش محسوس کر کے ذرا اس کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ادھر کیا ہے اور کیا چیز اس کی طرف مائل کرتی ہے -

ایک موڑ آتا ہے جب آدمی کے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ اس کام کیلئے بہر حال تزکیہ نفس ضروری ہے - اور تزکیہ نفس کے وہ طریقے جو مکہ اور مدینہ میں اختیار کئے گئے تھے کچھ واضح اور منضبط نہیں ہیں - اور بعد کے ادوار میں جن بزرگوں نے ان طریقوں کو منضبط کیا وہ صوفیائے کرام ہیں - اور ظاہر ہے کہ وہ سب بزرگانِ دین ہی ہیں - لہٰذا اس کام کے لئے جو تزکیہ مطلوب ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے تصوف کے معروف طریقوں میں سے کسی کو حاصل کرنا ناگزیر ہے - نئے طرز کے لوگوں میں تو شاید کم ہوں مگر مذہبی خانوادوں میں جن لوگوں نے آنکھیں کھولی ہیں ان سب کو اس موڑ کی کشش کم و بیش متاثر کرتی ہے - میں ان سب لوگوں سے جو اس کشش کو محسوس کرتے ہیں عرض کرتا ہوں کہ براہِ کرم اس مقام پر ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور و تحقیق کریں اور ذرا بے لاگ طریقے سے کریں - کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے - کہ اقامت دین اپنے وسیع و جامع تصور کے ساتھ ان بزرگوں کے پیش نظر تھی جن سے یہ صوفیانہ طریقے ماثور ہیں

اگر کوئی شخص تحقیق میں بے جا عقیدتوں اور موروثی تعصبات کو دخل نہ دے گا اور ٹھنڈے دل سے بے لاگ تحقیق کرے گا - تو اسے اس معاملے میں پورا اطمینان ہو جائے گا کہ اقامت دین کے لئے ہمیں اسی طریق تزکیہ پر اعتماد کرنا ہوگا - جو قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے - وہ اگر منضبط نہیں ہے تو آپ اسے منضبط کرنا چاہیے -

اس موڑ کو جو شخص پورے اطمینان کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے اسے ذرا آگے چل کر ایک اور مقام پر حیرانی پیش آتی ہے - سیرت نگاروں نے عہد صحابہ کی شخصیتوں کے جو مرقعے کھینچے ہیں وہ اس کی نگاہ میں گھومنے لگتے ہیں اور یہ دیکھ کر اس کا دل بھر بیٹھنے لگتا ہے کہ ان کتابی مرقعوں سے ملتی جلتی شخصیتیں تو کہیں نظر نہیں آتیں پھر بھلا یہ کام کیسے ہوگا - اس مقام پر آدمی ہر طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کہاں کوئی راستہ ملتا ہے جدھر جا کر وہ اپنی مطلوب شخصیتیں پا سکوں اور بسا اوقات شیطان یہاں پھر اس کو مشورہ دیتا ہے کہ بس اسی جگہ سے پیچھے مڑ جاؤ یا مایوس ہو کر یہیں بیٹھ جاؤ - اس مرحلے پر بھی ٹھہر کر آدمی کو اچھی طرح غور کرنا چاہئے اور ٹھنڈے دل سے تحقیق کر کے ایک رائے قائم کرنی چاہیے - میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی حیرانی و پریشانی آدمی کو لاحق ہوتی ہے حقیقتوں سے غفلت

کی بناء پر ہوتی ہے۔ وہ دو حقیقتیں اگر اس کی سمجھ میں آجائیں تو قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور آگے کا راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے نمونے وہ تلاش کرتا ہے وہ شخصیتیں نہ ایک دن میں بنی تھیں اور نہ آپ بن گئیں تھیں۔ وہ بنانے سے بنی تھیں، سالہا سال میں بنی تھیں۔ اور اگر بے لاگ تحقیق سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ گوشہ ہائے عزلت میں نہیں بنی تھیں۔ بلکہ قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق اقامتِ دین کی جد و جہد میں لگ جانے اور جاہلیت کے خلاف کشمکش کرنے سے ہی بتدریج بن سنور کر وہ اس مرتبے پر پہنچی تھیں جسے آپ سیرت کی کتابوں میں دیکھ دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ شخصیت سازی کے اس طریقہ کی پیروی کرنے سے وہی نتائج حاصل نہ ہوں۔ اس درجے کے نتائج نہ سہی، اس طرز اور اس نوعیت کے نتائج تو یقیناً حاصل ہونے ہی چاہئیں۔ بشرطیکہ صبر و اخلاص سے کام لے کر اس طریقے کی پیروی کی جائے۔ اور حکمت و تفقہ کے ساتھ اس کو ٹھیک سمجھ کر کی جائے۔

دوسری حقیقت جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ کتابی شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گذرے ہوئے زمانے کے جو نقشے صفحۂ قرطاس پر کھینچے جاتے ہیں۔ گوشت پوست کی دنیا میں بجنسہٖ وہ نقشے کبھی پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ لہذا جس شخص کو خیالی دنیا میں نہ رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کمزوریوں سے بالکل منزہ اور تمام مثالی کمالات کا مرقع بن سکیں گے۔ آپ حدِ کمال کو نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں۔ اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں۔ مگر جبکہ آپ کو عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزارہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن و سنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی ایک حدِ اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہو جانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لئے کافی ہو۔ جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو۔ یہ حدِ اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہئے اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہی ہونی چاہئے۔ لیکن بہرحال اس حد کو سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی عملی کام آدمی نہیں کر سکتا۔ صدرِ اول میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب بھی یکساں نہ تھے۔ اور نہ ان میں سے کوئی بشری کمزوریوں سے مبرا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظام جماعت میں ہونی چاہئے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دینِ حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں۔

اور ان کی کمزوریاں برروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع آئیں۔

ان سب الجھنوں سے بچ نکلنے کے بعد پھر آدمی کے دل میں یہ خلجان باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے جن رفقار کے ساتھ اقامت دین کا کام کر رہا ہے۔ وہ معیار مطلوب سے بہت کم ہیں اور ان کے اندر بہت سے پہلوؤں میں ابھی بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور ان کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے۔ جن سے یہ خامیاں دور ہوں تو مبارک ہے۔ یہ خلجان ۔ اسے مٹنا نہیں اور بڑھنا چاہئے۔ کیونکہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے۔ جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہو گئے کہ جو کچھ ہمیں بننا تھا وہ ہم بن چکے ہیں اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائے گی۔ اور ہمارا تنزل شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوس اور فرار پر آمادہ کرتا ہو تو یہ خلجان نہیں وسوسہ شیطان ہے۔ جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ پڑھئے اور اپنے کام میں لگ جائیے۔ اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ایسے وساوس سے دل کو پاک کئے بغیر آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لئے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ وہ آپ کے سامنے تحریک اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کر کے پیش کرے۔ اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کمزوری کو بڑھا بڑھا کر دکھائے۔ تاکہ آپ کسی صورت دل چھوڑ بیٹھیں"۔

(ترجمان القرآن صفحہ ۲۷۱ نومبر ۱۹۵۱ء)

یہ وہ اقامتِ دین کی سیدھی اور مستقیم راہِ سلوک ہے جس پر مولانا مودودی برسوں سے خود چل رہے ہیں۔ اور بے شمار بندگانِ خدا کو اس پر چلا رہے ہیں۔ ان چلنے والوں کے مختلف مقامات ہیں اور مختلف قلبی اور ذہنی کیفیات ہیں۔ ان سب کے سامنے مولانا نے اس راہ کی مختلف مشکلات کی وضاحت اور مختلف پیچیدہ مفادات اور دھوکہ دینے والے مظاہر اور دو راہوں کی نشاندہی کر کے ان کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔ یہ وہی راہِ سلوک ہے جس پر فنی اصطلاحات کی گرانباری اور منضبط اصول و قواعد کی قید و بندش کے بغیر بھی حضورؐ اور آپ کے رفقاء نے چل کر اللہ کا کام سر انجام دیا۔ اور اسی کام کو سر انجام دینے کے لئے مولانا مودودی اور ان کے ساتھ کوششیں کر رہے رہیں۔ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہونا۔ اس کے رسول پاکؐ کے اسوہ کا احترام و اطاعت کا قوی ترین جذبہ لے کر اپنے آپ پر فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کا پہرہ لگا دینا ساری عمر کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقام پر کھڑے ہو کر گذار دینے کا عہد کر لینا اور اس راہ میں تن من دھن سب کچھ کھپا دینے کا عزم کر کے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا، اللہ کی راہ میں اس کے دیئے ہوئے سارے سرمایہ جان و مال کو لٹا کر اس سے آخرت کے اجر کی توقع باندھنا، اور کسی قسم کے کبر و ریا کے بغیر بندگانِ خدا کی تعریف و مذمت سے بے نیاز ہو کر دیوانہ وار اسی راہ پر گامزن رہنا۔ اور اس راہ میں جان دینے

کی تمنائیں دل میں پالنا اور پرورش کرنا۔ بس اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے یہی خدوخال اور نشانات ہیں۔ اور ان خدوخال کی راہ پر چلنے والے راہرو کے لئے کسی کو یہ اطمینان دلانا تو مشکل ہے کہ وہ فنی اور اصطلاحی تصوف کے آداب و مدارج کا اہتمام کر رہا ہے یا نہیں۔ البتہ اس کا قلب یہ گواہی ضرور دے سکتا ہے کہ یہ راہِ سلوک دنیا اور آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور اس راہ کا مسافر تزکیہ نفس کی روشنی اور تعلق باللہ کے سلسلے میں چل کر منزل مقصود کو پا لیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی (شعبہ عربی و فارسی یونیورسٹی الہ آباد۔

ابوالعلاء المعری اور اسکا فلسفہ

(۱) معرّی کے حالات بطریق اختصار۔

معرّی کا نسب عرب کے قبیلۂ تنوخ سے ملتا ہے۔ یہ لوگ یمن میں سد مآرب کے جاری ہونے کے بعد چھٹی صدی عیسوی کے درمیان میں ملک شام کی طرف ہجرت کرکے چلے آئے تھے۔ معرّی کا خاندان معرہ میں با اقتدار اور دولتمند اور ذی علم اور صاحب حکومت تھا۔ معرّی کے دادا کا دادا معرہ کا اور اس کے بعد حمص کا قاضی ہوا۔ پھر معرّی کے چچا محمد کو عہدہ قضا سپرد ہوا۔ پھر معرّی کے باپ عبد اللہ (متوفی ۳۷۷ھ، ۹۸۷ء) عہدہ قضا پر فائز ہوا۔ اسی طرح معرّی کی ماں کا خاندان بھی حلب میں جلیل القدر اور مشہور تھا۔ اس خاندان میں بھی بہت سے ذی وجاہت اور ذی علم لوگ مشہور ہوئے۔

معرّی ابو العلاء احمد بن عبد اللہ بن سلیمان بن محمد کی ولادت ۲۷ ربیع الاول ۳۶۳ھ بروز جمعہ ہوئی۔ معرّی صرف ساڑھے تین سال کا تھا کہ مرض چیچک میں وہ مبتلا ہوگیا جس سے اس کی بائیں آنکھ جاتی رہی اور داہنی آنکھ میں سفیدی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پورے چھ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ بینائی سے بالکلیہ محروم ہوگیا۔

معرّی کا نشو ونما معرہ میں ہوا اور وہیں اس نے اپنے باپ سے کسی قدر علم ادب و لغت کی تعلیم پائی۔ اور یحییٰ ابن مسعر سے کچھ علم حدیث حاصل کیا۔ معرّی چودہ سال کا تھا کہ اس کے باپ کی وفات ہوگئی مگر معرّی برابر طلب علم میں مشغول رہا معرہ میں بھی اور دوسرے علمی مقامات مثلاً انطاکیہ، لاذقیہ اور طرابلس اور حلب میں بھی۔ وہ بیس سال کی عمر میں ۳۸۴ھ (۹۹۴ء) میں حلب سے معرہ واپس آیا۔ وہاں وہ بطور خود مطالعہ علوم میں مشغول رہنے لگا اور شعر گوئی کو کمائی کا ذریعہ بنایا۔ اس طریقہ سے اس نے کافی مال حاصل کیا مگر پھر اس نے کمائی کے اس طریقہ کو ناپسند کیا اور اس سے متنفر ہوگیا۔ اب اس نے اپنے شعر کو محدود کردیا۔ اپنے ادیب بھائیوں اور دوستوں کے خطوط میں یا بعض اقارب کی مرثیہ گوئی میں یا وجدانیات محضہ کے ظاہر کرنے میں۔ معرہ میں ابو العلاء کی زندگی کوئی راحت و آسائش کی زندگی نہ تھی۔ ایک وقف ضرور اس کے پاس تھا۔ جس سے تیس دینار سالانہ اس کو مل جاتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقف کو حلب کے حاکم نے اس سے ضبط کرلیا۔ اس وجہ سے ابو العلاء ۳۹۹ھ کے تین ماہ گزر جانے پر بغداد پہنچا۔ باوجودیکہ اس زمانے میں معرہ سے بغداد تک سفر کرنے میں عام طور پر ایک ماہ کا زمانہ لگتا تھا۔

خود معرّی کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ بغداد میں مستقل اقامت کا اس کا ارادہ تھا۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں کہتا ہے۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ نہ میں نے مال کثیر حاصل کرنے کے لئے سفر کیا نہ زیادہ لوگوں سے ملاقات کے لئے۔ بلکہ میں نے دار العلم میں اقامت کو ترجیح دیا تو میں نے بہترین مقام کو پالیا۔ جس میں زمانہ نے مجھے ٹھہرنے کا موقع نہ دیا۔"

اس میں شک نہیں ہے کہ ابو العلاء سے پہلے اس کی شہرت معرہ سے بغداد پہنچ چکی تھی۔ اس کے بغداد پہنچنے پر اس کی بڑی

عزت و قدر ہوئی۔ اس کی زیرکی اور وسعت علم کا سکہ لوگوں کے قلوب میں بیٹھ گیا۔ اس کے گرد طلبار کا ہجوم رہتا تھا۔ جو اس کے علم و فضل و ادب سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کی ہم نشینی کو علمار و فضلار غنیمت جانتے تھے۔ لیکن اس کو ایک ایسی مصیبت پیش آئی جس نے اس کو بغداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ شریف رضی نقیب الطالبین کے بھائی شریف مرتضٰے کے سامنے ایک دن متنبی شاعر مشہور کا ذکر ہوا۔ چونکہ شریف مرتضٰے متنبی کا مخالف تھا۔ اس نے متنبی کی برائی کی اور اس کے عیوب و نقائص ظاہر کرنے لگا۔ لیکن ابو العلار متنبی کا طرفدار تھا اور اس کو شعرائے متاخرین میں سب سے بلند پایہ سمجھتا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے مرتضٰے کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر متنبی کا صرف یہ قول ہوتا۔ لک یا منازل فی القلوب منازل" تو بھی اس کی فضیلت کے ثبوت کے لئے کافی ہوتا۔ یہ سن کر مرتضٰے کی آتش غضب بھڑک اٹھی حکم دیا تو خدام نے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ کر مجلس سے باہر نکال دیا۔ پھر مرتضٰے نے حاضرین مجلس سے کہا کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ اس اندھے کا متنبی کے اس قصیدہ کے ذکر سے کیا مقصود تھا۔ حالانکہ ابو الطیب متنبی کے اشعار اس سے بہتر موجود ہیں۔

اس نے متنبی کے اس قول کو جو کہ اس قصیدہ میں ہے قصد کیا تھا۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص

فہی الشہادۃ لی بانی کامل

اس حادثہ کے ساتھ دوسرے ایسے اسباب بھی پائے گئے جو بغداد چھوڑنے کے موجب بنے۔ مثلاً بغداد میں احوالِ سیاسیہ و اجتماعیہ کی خرابی اور معری کی ماں کے سخت بیمار ہونے کی خبر معلوم ہونا اور حاسد دشمنوں کا معری کی ایذا رسانی کے درپے ہو جانا۔ ان وجوہ سے مجبوراً معری کو بغداد سے الگ ہونا پڑا۔ حالانکہ بغداد میں اس نے فوائد حاصل کئے تھے۔ وہاں کے علمار، فضلار سے علوم حاصل کئے۔ ہندوستانی و فارسی مذاہب کے کچھ معتقدات معلوم کئے متفرق افراد سے بھی اور منظم جماعتوں سے بھی۔ مثلاً جماعت اخوان الصفا سے اور ان مجالس سے جو بغداد میں منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں ادبا و علمار و فقہا شریک ہوتے تھے۔ اور اپنے خیالات و آرا ظاہر کرتے تھے۔

معری نے بغداد سے رمضان ۴۰۰ھ کے عشرہ اخیرہ میں معرۃ جانے کے لئے کوچ کیا۔ راستہ ہی میں اسے ماں کی موت کی دردناک خبر معلوم ہوئی جس سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا اور اسی وقت سے اسے دنیا سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ جب وہ معرۃ پہنچا تو وہاں کی حالت بہت خراب پائی اور باوجودیکہ اسے بغداد میں سخت صعوبتوں کا سامنا پڑا تھا مگر معرۃ کی بدحالی محسوس کر کے اسے بغداد سے چلے آنے پر افسوس ہوا۔ اسی امر کے متعلق معری کہتا ہے ؎

یا لھف نفسی علی انی رجعت الی

ھذی البلاد وقد فارقت بغدادا

"مجھے افسوس ہے کہ میں ان بستیوں کی طرف بغداد چھوڑ کر واپس آیا۔"

اذا رایت امور الا توافقنی

قلت الایاب الی الاوطان اذی ذا

جب ناموافق امور کو میں دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ وطن میں واپسی سے یہ باتیں پیش آئیں

جب وہ معرہ پہنچا تو ۴۰۰ھ سے وہ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہوگیا اور صرف درس وتدریس سے تعلق رکھا۔ اس نے گوشت کھانا اور ہر اس چیز کو کھانا چھوڑ دیا جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً دودھ، انڈا اور شہد اور اس نے حسب بیان اکثر مورخین اپنا نام رہین المحبسین رکھا۔ محبسین سے اس کی مراد گھر اور نابینا ہونا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ مجالس ثلثہ کا رہین تھا۔ اس کا قول ہے۔

ارانی فی الثلاثة من سجونی

فلا تسأل عن النباء النبیث

میرا برا حال نہ پوچھو میں اپنے کو تین قید خانوں میں پاتا ہوں۔

لفقدی ناظری ولزوم بیتی

وکون النفس فی الجسد الخبیث

بینائی کا گم ہونا۔ اور خانہ نشینی کا لازم ہونا۔ اور نفس خبیث[3] کا بدن میں ہونا۔

معری کی زندگی کا نصف ثانی معرہ میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں اور تالیف وتدریس میں گزرا۔ اس کی زندگی کے آخری حصے میں اس کے اور نصر بن ابی عمران داعی فاطمی بمقام مصر کے درمیان حیوان کے گوشت وغیرہ کے ترک کے بارے میں خط وکتابت ہوئی۔ یہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ معری نے گوشت کھانا اور جانوروں سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں مثلاً دودھ، انڈا اور شہد کھانا بالکل ترک کر دیا تھا۔

داعی فاطمی مذکور معری سے اس کے متعلق صاف اور صریح جواب کا مطالبہ کرتا تھا۔ لیکن معری گول مول جواب دیتا تھا۔ کبھی اپنی محتاجی کا عذر پیش کرتا۔ کبھی حیوانات پر رحم کرنے کو وجہ بتاتا کبھی اس کے متعلق حکمار متقدمین کے طریقہ کو پسندیدہ ہونے کو وجہ ٹھہراتا۔ معری پست قامت نحیف الجثہ کمزور جسم کا تھا۔ چیچک کی وجہ سے چہرہ بدنما ہوگیا تھا۔ وہ آخر عمر میں اپاہج ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ مرض الموت میں وہ تین دن بیمار رہا۔ اور بمقام معرہ ربیع الاول ۴۴۹ھ کے نصف اول میں جمعہ کے دن اس نے عالم فانی سے رحلت کی۔ اس کے جنازہ کے ساتھ اجتماع کثیر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دوسو تو صرف حفاظ قرآن کریم اس کی قبر پر حاضر ہوئے اور اڑتالیس شاعروں نے اس کا مرثیہ کہا۔

(۲) ابو العلاء المعری کے زمانے میں مشرق ومغرب کی کیا حالت تھی

صلیبی لڑائیوں کے چھڑنے سے سوا سو سال پہلے معری کی ولادت ہوئی اور چالیس سال پہلے وفات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں سیاسی واجتماعی اضطراب مشرق ومغرب دونوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کا اثر معری کے کلام میں صاف طور پر پایا جاتا ہے (۱) الطائع (۳۶۳ - ۳۸۱ھ) اس خلیفہ کے زمانے میں آل بویہ کو بڑی قوت حاصل ہوئی اور عضد الدولہ بویہی بغداد پہنچا۔ بویہیوں نے الطائع کو گرفتار کرکے اس کی جگہ القادر کو خلیفہ بنایا۔ اس کی خلافت اکتالیس سال رہی۔ پھر القائم خلیفہ ہوا، وہ پینتالیس سال ۴۶۷ھ تک خلیفہ رہا۔ اس زمانے میں درحقیقت اقتدار بنی بویہ کو حاصل تھا۔ خلفار کا معزول کرنا اور مقرر کرنا انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنی دار الحکومت شیراز سے خلافت بغداد کا انتظام کرتے تھے۔ لیکن خلافت کا لقب اور اس کے رسوم انھوں نے بغداد کے کمزور خلفار کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے لئے ایسے جدید القاب

۳۔ الخبیث النبیث : الشریر ۱۲ -

تجویز کئے جس سے ان کی قوت وشوکت پر زیادہ دلالت پائی جاتی تھی۔ جب معز الدولہ احمد بن بویہ کا تسلط بغداد پر جمادی الاولیٰ ۳۳۴ھ میں ہوا تو خلیفہ المستکفی اس امر پر مجبور ہوا کہ وہ معز الدولہ کا استقبال کرے اور اس کو امیر الامراء کا لقب عطا کرے۔ معز الدولہ کے بھائی عضد الدولہ کا توشہنشاہ نام ہوا اور وہ خلافت کے جمیع امتیازات سے بہرہ مند ہوا۔ صرف خلافت کا لقب خلفاء کے لئے مخصوص رہا۔ بویہیوں کا زمانہ اضطراب سیاسی اور فتن دینیہ کے لحاظ سے خصوصاً عراق بدترین حالت میں تھا۔ لیکن اور شان وشوکت، آبادی اور ترقی ادب کی سرسبزی کے لئے مناسب تھا۔ اسی زمانے میں جماعت اخوان الصفاء کا ظہور ہوا۔ مگر معری کی وفات سے دو سال پہلے دولت بویہیہ کا زوال ہوگیا اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب بساسیری کے فتنے سے خلیفہ القائم بامر اللہ بہت عاجز و پریشان ہوگیا (بساسیری بویہی لشکر کا ایک امیر تھا) تو اس نے سلجوقیوں کے سردار طغرل بک سے مدد طلب کی۔ طغرل بک نے بغداد پہنچ کر بساسیری کو اور اس کے تابعین کو بغداد سے نکال باہر کیا۔ اب طغرل بک کا اقتدار بغداد میں قائم ہوگیا اور منبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا (۴۴۶ھ) اور دولت سامانیہ بخارٰی میں ماوراء النہر (جیحون) میں اشاعت اسلام اور نشر علوم میں مشغول تھی۔ ان کے یہاں دو ماہر فلسفی طبیب آئے (۱) محمد بن زکریا رازی (۲) الشیخ الرئیس ابن سینا۔ انھیں کے دور حکومت میں تاریخ طبری کے ایک حصہ کا فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور غزنہ (افغان) میں دولت غزنویہ قائم ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی ۳۸۸ھ - ۴۲۱ھ، ۹۹۹ء - ۱۰۳۰ء کو ہندوستان میں فتوحات عظیمہ حاصل ہوئیں۔ علم وادب کی طرف اس کی توجہ بہت تھی۔ اس کے یہاں ماہر ریاضی ابوریحان بیرونی اور مشہور فارسی شاعر ابوالقاسم فردوسی عظیم الشان ہستیاں تھیں۔

اندلس کی بہار کا زمانہ ختم ہوچکا تھا۔ باد سموم اس کی سرسبزی کو فنا کر رہی تھی۔ حکم بن عبد الرحمٰن الناصر (۳۶۶ھ) کی وفات کے بعد طوائف الملوکی شروع ہوگئی، فتنوں نے سر اٹھایا، چھوٹے چھوٹے سردار تھوڑی تھوڑی زمین میں اپنی مستقل حکومت قائم کرنا چاہتے اور اس کے لئے ان فرنگی حکام سے اکثر مدد طلب کرتے جو اندلس سے عرب کے نکال دینے کے لئے جو کچھ ان کے امکان میں ہوتا اسے خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

جوہر صقلی نے مصر کو فتح کرکے فاطمین کی حکومت قائم کی، پھر وہ حکومت محیط اٹلانٹک سے بحر احمر تک پھر حجاز اور سوریہ اور موصل تک وسیع ہوگئی۔ معری نے چار خلفاء فاطمین کا زمانہ پایا۔

ابو منصور نزار العزیز (۳۶۵-۳۸۶ھ، ۹۷۵ - ۹۹۶ء) یہ مصر میں پہلا فاطمی خلیفہ ہے۔ (۲) حاکم بامر اللہ (۳) الظاہر۔ (۴) المستنصر (۴۲۷ - ۴۸۷ھ) حاکم کے زمانے میں سوریہ میں مذہب درزی پھیلا۔ حاکم بامر اللہ نے ۳۹۶ھ میں دار الحکمتہ مذہب فاطمی کے تعلیم ونشر کے لئے مصر میں قائم کیا۔

اس زمانے میں یورپ میں بھی فتنہ واضطراب کچھ کم نہ تھا۔ اگر معری نے تین خلفائے بغداد کا اور چار خلفاء قاہرہ کا زمانہ دیکھا۔ تو اس نے روما کے بائیس پوپوں کا زمانہ بھی پایا۔ انگلستان، ڈنمارک، فرانس، اٹلی وغیرہ ممالک یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔

سوریہ ابو العلاء المعری کا وطن بھی اضطراب سے خالی نہ تھا۔ پہلے شمالی سوریہ کے ایک حصے میں حمدانیوں کی حکومت تھی۔ پھر حکومت مرداسیہ قائم ہوئی۔ یہ حکومت عربی بدوی تھی۔ گو اس کے پہلے بادشاہ اسد الدولہ ابو علی صالح بن مرداس (ت۔ ۴۲۰ھ) کے نزدیک معری کی بڑی قدر تھی۔ مگر معری اس سے خوش نہیں تھا۔ اس کی وجہ آئندہ معلوم ہوگی۔

۳- معرّی کے عناصر شخصیہ اور خصائص فنیہ

معرّی ایسے شخص میں عناصر شخصیہ کا اثر عظیم اس کی تفکیر اور آرا کی بنا میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عنصر شخصی بعض لوگوں میں قوی اور بعض لوگوں میں ضعیف ہوتا ہے۔ ہمارے شاعر ابو العلا میں یہ چیز نہایت قوی اور بخوبی ظاہر ہے۔ یہ معلوم ہے کہ معرّی پر جس طرح کی مصیبتیں بچپن سے لے کر آخر عمر تک آتی رہیں۔ اس کی بینائی جاتی رہی۔ وہ جسم کا دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ اس کی ماں باپ کی موت کا صدمہ اسے پہنچا۔ گو ماں کی موت کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مگر ایک اندھے اور کمزور شخص کے لئے جس کو عمر بھر بیوی بچوں سے بھی محرومی رہی، یہ حادثہ سخت حوصلہ شکن تھا۔ پھر ایسے شخص کے لئے جیسا مالدار ہونا چاہیے وہ ویسا مالدار کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ مال کی کمی رہی۔ ایسی پریشانیوں کی حالت میں اگر ہمیں معرّی کی لزومیات میں پریشانی اور ناگواری اور بد قسمتی کا گلہ اور تلخ کامی و نامرادی کا بیان اور زمانے کا شکوہ نظر آئے تو کیا عجب ہے اور یہ بھی کوئی نئی بات نہ سمجھی جائے گی کہ معرّی ہر طرف سے رخ پھیر کر نقد و تہکم میں لگ جائے اور اصلاح اجتماعی کی کوئی صورت نہ تلاش کرے۔ بلکہ اس کے برعکس ہر ممکن اصلاح سے ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جائے۔ بلکہ اصلاح کے قصد کرنے والوں کی طرف قصور و ضلال کی نسبت کرے۔

ا- نابینا ہونا اس کے لئے جانگداز صدمہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ اندھے کے لئے دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ حوائج ضروریہ میں دشواری ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ دوسروں کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔ گو معرّی اپنی عالی ہمتی سے یہ کہتا ہے :-

"میں نابینا ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جس طرح اور لوگ بینا ہونے پر اس کا شکر کرتے ہیں۔"

ہو سکتا ہے کہ معرّی کا یہ قول اور اسی طرح اس کے پیش رو اندھے شاعر بشار بن برد کا اسی قسم کا قول محض بہ تکلف بہادری ظاہر کرنے کے لئے ہو۔ اسی وجہ سے معرّی کبھی کبھی اس تجلد کے خلاف نابینائی کی شکایت پریشانی قلبی کی وجہ سے اپنے اشعار میں کرتا ہے۔ مثلاً

وما لی طرف الاسیر والسمری
لانی ضریر لا تضیئ لی الطریق
ارانی فی الثلاثۃ من سجونی
فلا تسأل عن النبأ النبیث
لفقدی ناظری ولزوم بیتی
وکون النفس فی الجسد الخبیث

ب- معرّی نابینائی کے باوجود جسم کا کمزور اور لاغر تھا۔ ان باتوں سے معرّی کا دنیا سے بے رغبتی، لوگوں سے کنارہ کشی اور شادی بیاہ سے اجتناب کی وجہ سمجھی جا سکتی ہے۔

ج- معرّی کے والد کے خاندان کا معرہ میں اور اس کی والدہ کے خاندان کا حلب میں معزز باقتدار اور دولتمند ہونا پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن خود معرّی محتاج اور قلیل المال تھا۔ مگر بعض مورخین کی یہ تصریح کہ معرّی محتاجوں اور بہت سے گزرنوں کی بہت مدد کرتا تھا۔ اس کی قلت مال کے منافی ہے۔ بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ معرّی بغداد سے معرّی واپس آیا اور اس کے ماننے والے بہت ہو گئے تو وہ خوش حال ہو گیا۔ لیکن لزومیات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معرّی بغداد سے واپسی کے بعد بھی مدت مدید تک تنگدستی میں مبتلا رہا۔ مثلاً یہ شعر ؎

سوّلت لی نفسی و هیما

تِ لقد خاب ذ اللّٰہ التسویل

میرے نفس نے مجھے بہکایا اور وہ بہکانا کامیاب نہیں ہوا۔

و اتّہامی بالمال کلفن ان یط

لب منی ما یقتضی التمویل

مال کا الزام لگانے نے مجھے یہ تکلیف دی کہ مجھ وہ چیز طلب کی جائے جو مالداری کو چاہتی ہے۔

ویقول الغواۃ : خوّلک اللہ

و کذ بتم بغیر التخویل

کج رو لوگوں کا کہنا ہے کہ خدا نے تجھے مالدار بنایا ہے۔ بغیر مالداری کے تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔

اسی طرح ان خطوط سے جو معرّی کے اور داعی فاطمی کے درمیان آتے جاتے رہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعر اپنی محتاجی کی شکایت زندگی کے آخر ایام تک کرتا رہا۔ اور باوجود اس کے حسب تصریح مورخین وہ ہمیشہ سائلین و محتاجین پر مال خرچ کرتا رہا۔ اس لئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا فقر اضافی تھا یعنی اس کے پاس کچھ مال رہتا تھا۔ اور اسی میں سے وہ غربا کی مدد کیا کرتا تھا۔

د ۔ دولت حمدانیہ کے ضعیف ہونے پر شمالی سوریہ میں جنگ کی وجہ سے ایسا سیاسی اضطراب ظاہر ہوا کہ معرہ میں بھی اس کا اثر محسوس ہوا۔ اور پریشانیوں میں سب رہنے والے مبتلا ہو گئے۔ ابوالعلا بھی اس میں تھا۔

ھ ۔ باوجود معرّی کے عظیم القدر ہونے کے اس کو نابینا ہونے کی وجہ سے معرہ میں بھی اور بغداد میں بھی کئی دفعہ ذلت و مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔ مثلاً ایک دفعہ شریف مرتضٰی کی مجلس میں وہ گیا۔ کسی شخص کو اس کا دھکا لگا۔ تو وہ شخص کہہ اٹھا "یہ کتّا کون ہے"۔

ایک دن معرّی نے عالم نحوی ابوالحسن الربعی کی مجلس میں جانے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے اندر جانے کی اجازت طلب کی تو ابوالحسن نے کہا۔ "اصطبل اندر آجائے" واضح ہو کہ اہل شام کی بولی میں اصطبل اندھے کو کہتے ہیں۔ یہ بات بھی ہے کہ معرّی کے علم و فضل کے درجے کی بلندی کی وجہ سے اس کے بہت سے حساد و اعدا پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے کبھی اس کو زندیق کہا کبھی ملحد ہونے کا حکم لگایا چونکہ وہ حکام دولت اور علماء مذہب اور عامۃ الناس پر بے لاگ تنقید کرتا رہتا۔ اس لئے اس کے لئے ایک نئی آفت کا ظہور عجیب چیز نہیں۔ گو صراحۃً اس کو ایذا نہیں پہونچائی گئی۔ یہ تو عناصر سلبیہ ہیں جن سے ابوالعلاء کی حکمت جاگزیں ہوئی۔ اب ہم ان عناصر ایجابیہ کو ذکر کرتے ہیں۔ جن کی بدولت اس حکمت کو فروغ ہوا۔

ا ۔ اس کا غضب کا حافظہ۔ نہ تو تاریخ عرب میں اور نہ میرے علم میں۔ تاریخ غیر عرب میں بھی کوئی شخص ایسا ہے۔ جو قوت حافظہ میں معرّی کا مثل ہو۔ لوگ تو اس کے متعلق ایسے عجیب و غریب امور بیان کرتے ہیں جو بالکل گپ معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال ہمیں تو یہ بیان کرنا ہے کہ معرّی نے اس زبردست حافظہ کی بدولت لغت عربیہ کا بہت بڑا حصہ اپنے تابو میں کر لیا اور اس کو اس نے اپنے اسجاع و قوافی اور خطوط و اشعار و رسائل میں استعمال کیا۔ علاوہ

اس کے وہ اس پر بھی قادر رہا کہ وہ بکثرت اخبار و اشعار اور معارف کو محفوظ کرے اور ان کو اپنی کتابوں میں درج کرلے یا ان پر اپنی رایوں کو مبنی کرلے۔

ب۔ اس میں تحلیل عقلی کی قوت۔ معرّی کا حافظہ صرف حفظ کا کام نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس میں نقد کی قوت بھی بہت تھی۔ وہ اپنی محفوظات میں توازن کی قوت بھی رکھتا تھا۔ قوت و ضعف کے موضوع کو دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جو اپنے والدین اور اساتذہ سے کسی زمانے میں حاصل کیا تھا۔ یا جو اتفاقاً اس کے ذہن میں آجاتا یا جسے وہ خود خیال کرکے ذہن میں قائم کرتا۔ ان سب میں توازن کرسکتا تھا اور قوت و ضعف کو سمجھ سکتا تھا۔

ج۔ اس کی جرأت۔ معرّی اپنی رایوں کے ظاہر کرنے میں جری تھا۔ خصوصاً لزومیات میں تو بعض لوگوں کی اہانت اور بعض معتقدات پر تہکم تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ ان چیزوں میں واقفیت قصد کرتا تھا۔ ذلیل باتیں نہیں سمجھتا تھا۔ وہ باوجود اس کے تقیہ فکریہ کی طرف بسا اوقات مائل ہوگیا۔ اور اپنی بعض رایوں کو ظاہر نہیں کیا۔

د۔ اس کی غیرت۔ معرّی بہت باغیرت اور ارادہ کا پکا تھا۔ اپنے نفس کو بے عزتی اور ذلت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا تھا اس نے کبھی کسی کے عطیہ کو قبول نہیں کیا۔ (سوا اس مال کے جسے اس نے ابتدائی حال میں شاعری سے کمایا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔) جس امر کو اس نے حق اعتقاد کیا اس پر پختہ رہا۔ مثلاً عقل کا تابع ہونا۔ عادتاً لوگ جن چیزوں کے سامنے مذہبی لوگوں کے اثر سے یا سوسائٹی یا حکومت کے دباؤ سے جھک جاتے ہیں۔ اس کو ان چیزوں کے قبول کرنے سے انکار تھا۔

ھ۔ اس کے علوم۔ شروع میں بیس سال کی عمر تک تو اس نے وہ علوم حاصل کیے جنہیں اس نے اپنے باپ سے اور اپنے استادوں سے سیکھا تھا۔ وہ لغت اور ادب اور فقہ کے علوم تھے۔ اس کے بعد اس نے بطور خود وہ علوم حاصل کیے جو اس کے زمانے میں رائج تھے۔ اس نے مذاہب اسلامیہ اور غیر اسلامیہ کے اور علم کلام کے معتقدات و دلائل سے واقفیت پیدا کی اور ان علوم عقلیہ سے بھی) جو اس کے زمانے میں عربی زبان میں منتقل ہو چکے تھے۔ بعض لوگوں کا یہ قول بالکل غلط ہے کہ معرّی نے بعض علوم ایک مسیحی راہب سے مقام لاذقیہ میں سیکھے تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معرّی زندیق تھا یا متقی۔ بعض لوگ اسے زندیق سمجھتے ہیں۔ زندقہ ہے انسان کا فرائض دینیہ سے استہزا اور ان کے ترک کو پسند کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ معرّی نے فروض شکلیہ خواہ وہ اسلام سے وابستہ ہوں یا دوسرے دینوں سے سختی سے مقابلہ کیا ہے۔ جب یہ بات ہے تو زندقہ کے علاوہ اس سے بھی سخت کوئی صفت اس کی طرف منسوب ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے اسے کافر باللہ قرار دیا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ اس کا تقویٰ کس درجہ کا تھا۔ اور وہ اپنے دینی فرائض کے ادا کرنے میں کیا نظریہ رکھتا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیشک معرّی میں دینی خشوع و خضوع پورے طور پر پایا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو اس کا کلام ؎

ردت الی ملیک الناس امری
فلم اسأل متی یقع الکسوف

میں نے اپنے امر کو اللہ کے سپرد کردیا میں نے یہ سوال نہیں کیا کہ کب گرہن واقع ہوگا۔

فکم سلم الجہول من المنایا

وعوجل بالحمام الفیلسوف

بہت سے نادان (جلد آنے والی) موت سے بچ جاتے ہیں اور فلسفی کو جلد موت آجاتی ہے۔

رب اکفنی حسرۃ الندامۃ فی اللہ

ثقیلی وانی بحال الندم

اے میرے پروردگار پشیمانی کی حسرت کو آخرت میں میرے لئے کافی بنا دے میں ہمیشہ پشیمان رہتا ہوں

معری نماز کا پابند تھا اس پر نماز جمعہ میں حاضر نہ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ معری کا یہ قصور قابل عفو ہے۔ اس لئے کہ اندھے آدمی کے لئے جبکہ مسجد جامع میں آنا اس کے لئے شاق ہو صحیح عذر ہے۔ معری کہتا ہے ؎

الحمد للہ قد اصبحت فی دعۃ

ارضی القلیل ولا اھتم بالقوت

خدا کا شکر ہے کہ میں آرام میں ہوں تھوڑے مال پر قانع ہوں روزی کے لئے فکر نہیں کرتا۔

ومشاھدٌ خالقی ان الصلوٰۃ لہ

اجل عندی من دری ویاقوتی

میرا پیدا کرنے والا شاہد ہے کہ اس کے لئے نماز پڑھنا میرے لئے موتی اور یاقوت سے زیادہ قیمتی ہے۔

یقولون : ھلا تشھد الجمیع التی

رجونا بہا عفوا من اللہ او قربا

لوگ سمجھتے ہیں کہ تو جمعہ کی نماز میں کیوں نہیں آتا جس سے کہ ہمیں اللہ سے معافی اور قرب کی امید ہے

وھل لی خیرٌ فی الحضور وانما

ازاحم من اخیارھم ابلا جربا

(میں کہتا ہوں) کہ جمعہ میں میرے حاضر ہونے سے کیا فائدہ ہے جبکہ میں اچھے لوگوں میں ایک خارشتی اونٹ (اپنے) کو بٹھا دوں۔

اور معری رمضان میں روزہ بھی رکھتا تھا۔ کیونکہ معری کے زیادہ ایام بحالت صیام گذرتے۔ معری کا قول ہے ؎

اعیش بافطار وصوم ویقظۃ

ونوم فلا صوما حمدت ولا فطرا

میں زندگی بسر کرتا ہوں افطار اور صوم اور بیداری اور سونے کے ساتھ پس نہ روزہ ہی تعریف کے قابل رکھتا ہوں، نہ افطار ہی خوبی کے ساتھ کرتا ہوں۔

معری جس طرح جمعہ و جماعت کی حاضری سے معذور تھا۔ اسی طرح حج نہ کرنے میں بھی مجبور تھا۔ کیونکہ وہ بوجہ عدم استطاعت مالی و جسمانی کے اس سے عاجز تھا۔ اس لئے حج اس پر فرض نہ تھا۔ وہ کہتا ہے ؎

ولم اقض فرضاً فی منیٰ و بلادھا
وکم عاجز قد زارھا متنفلا

میں نے فریضۂ حج منیٰ میں اور اس کے بستیوں میں ادا نہ کیا حالانکہ بہت سے عاجزوں نے بھی نفل حج ادا کیا
معری پر زکوٰۃ بھی فرض نہ تھی اس لیے کہ وہ مالک نصاب نہ تھا مگر وہ صدقہ نافلہ حتی الامکان اصحاب حاجت پر کیا کرتا تھا۔
رہا ارتکاب معاصی۔ تو ظاہر یہی ہے کہ وہ معاصی سے احتراز کرتا تھا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ عورتوں سے اس نے حلال طریقہ پر بھی تعلق نہیں رکھا۔ حرام کا کیا ذکر۔ اپنی زندگی میں اس نے کسی کو ضرر نہیں پہنچایا۔ ہاں دوسروں سے وہ ضرر برداشت کر لیتا تھا۔ اپنی جان اور مال سے مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ دنیوی تلوث سے وہ متنفر تھا۔ ان سب امور مذکورہ پر اس کے لزومیات سے بکثرت شواہد مل سکتے ہیں۔

ان امور پر نظر کر کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوالعلاء المعری متقی تھا۔ واللہ علم بحقیقۃ الحال۔
معری کے خصائص عامہ۔ اس کے خصائص عامہ اس کے کثرت معلومات اور عظیم علم و ذکا کی وجہ سے بہت ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ لغت پر قدرت۔ یہ اس کی خصوصیت ان بے شمار مفردات میں ظاہر ہوتی ہے جنہیں وہ اپنے کلام میں استعمال کرتا ہے اور الفاظ غریبہ اور صیغ نادرہ ہیں اور ان الفاظ فنیہ میں ظاہر ہوتی ہے جنہیں وہ اپنے اشعار میں مناسب مواقع میں رکھتا ہے۔ مثلاً اسمائے حیوانات و نباتات اور فلکیات کے اسماء اور الفاظ جغرافیہ مثل اسماء اماکن و قبائل اور کنیتیں اور اشخاص کے نام اور بعض عجمی الفاظ علم ہوں یا غیر علم۔ سن کے اس کا قول ؎

کلہ ملیک اللہ نکرات عبیدہ
وکذاک المونثات اماء

سب مراد اللہ کے بندے اور عورتیں لونڈیاں ہیں۔

فالھلال المنیف والبدر والفر
قد والصبح والثریٰ والماء

(اللہ ہی کے ہیں) ہلال بلند اور بدر اور فرقد (نام ستارہ) اور صبح اور مٹی اور پانی

والثریا والشمس والنار والنث
رۃ والارض والضحیٰ والسماء

اور ثریا اور آفتاب اور آگ اور نثرہ (نام ستارہ) اور زمین اور چاشت کا وقت اور آسمان

۲۔ فنون بلاغت میں اس کا تصرف۔ معری صناعات لفظیہ طباق اور توریہ و تسجیع میں تکلف کا مرتکب ہوتا ہے معری کی ترکیب محکم اور عمدہ ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو وہ لغوی ادیب عالم ہے۔ ہاں تکلف کی وجہ سے اس کی ترکیب کبھی کبھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور فہم مراد میں دقت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ادیب جب لفظی تکلف کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو معانی کے بعض حقوق ادا کرنے سے وہ قاصر ہو جاتا ہے۔

۳۔ معری کی وسعت معلومات۔ حقیقت میں لزومیات نحو اور ادب اور تاریخ اور ایام عرب اور متقدمین کے اخبار قرآن و حدیث و فقہ اور تمام علوم عربیہ اور علوم طبعی و فلسفہ کے بہت سے فنون کا مختصر انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ

المعارف) ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معری نے ان اشیائے مذکورہ کو جمع کیا اور یہ چیزیں اس زمانے میں جس طرح رائج تھیں اس طرح اس کو سمجھا پھر ان میں بحث کی اور عاقلانہ طریقہ پر ان کی تنقید کی۔ ان سب امور کی تفصیل اور ان پر استشہاد کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں ہے۔ من شاء الاطلاع علیھا فلیراجع الی مولفاتہ سقط الزند ورسالۃ الغفران واللزومیات۔

۴۔ تہکم اور نقد۔ معری تہکم اور نقد پر قدرت رکھتا تھا اور اس صفت کے لحاظ سے بہ نسبت فلسفی ہونے کے اس کا ادیب ہونا زیادہ ظاہر ہوتا ہے معری کا تہکم زیادہ تر عادات حاکمانہ اور عقائد موروثہ اور سیاسی لیڈروں کے متعلق ہے۔ اہل شریعت بھی اس کے تہکم سے نہیں بچے۔ معری کا قول ہے ؎

یا رب اخرجنی الی دار الرضی
عجلا فھذا العالم منکوس

اے میرے پروردگار مجھ کو دار رضا (جنت) کی طرف جلد نکال۔ یہ (دنیا) تو الٹی ہے۔

یبغون بالخسر الرباح وبالاذی
حسن الثواب فکلھم موکوس

لوگ خسارہ کے بدلے میں نفع تلاش کرتے ہیں۔ اور تکلیف پہنچا کر اچھا ثواب۔ یہ سب کے سب نقصان میں ہیں۔

واری ملوکاً لا تحوط رعیۃ
فعلام توخذ جزیۃ ومکوس

میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ رعایا کی حفاظت نہیں کرتے پھر کس بناء پر جزیہ اور ٹیکس لیتے ہیں۔

قالوا فلان جید لصدیقہ
لا یکذبوا ما فی البریۃ جید

لوگوں نے کہا کہ فلاں اپنے دوست کے لئے مخلص ہے۔ وہ جھوٹ نہ بولیں، دنیا میں کوئی بھی مخلص نہیں ہے۔

فامیرھم نال الامارۃ بالخنا
وتقیھم بصلاتہ متصید

امیر نے تو حکومت ظلم سے حاصل کی اور (عابد متقی) پرہیزگار اپنی نماز سے شکار حاصل کرنے والا ہے۔

کن من تشاء مھجنا او خالصا
فاذا رزقت غنی فانت السید

تم چاہے کچھ ہو دوغلے ہو یا خالص جب تمہیں دولتمندی مل گئی تو تم سید ہو۔

معرّی کا تہکم از قبیل ہزلیات نہیں ہے بلکہ وہ تلخ حقیقت ہے جو شعر کے سانچہ میں ڈھال دی گئی ہے۔ معرّی کی قدرت نقد پر بہ نسبت تہکم کے زیادہ فلسفیانہ ہے۔ وہ فلسفیوں کے اوہام کو اور متکلمین کے خلافیات کو عقل کی کسوٹی پر جانچتا ہے۔ واقعات کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تہکم اور نقد میں یہ فرق ہے کہ تہکم عادتاً ہزل واستخفاف پر منتج ہوتا ہے بخلاف نقد کے کہ اس کی غایت اظہار حقیقت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی نقد میں کچھ تہکم کا رنگ بھی آجاتا ہے۔ جیسا کہ معرّی کے یہاں یہ بات بہت ہے۔ ہندوستانی شعراء میں اکبر الہ آبادی مرحوم کے کلام میں بھی یہ رنگ غالب ہے۔

قال المعری۔ ان کان من فعل الکبائر مجبرا

فعقابه ظلم علی ما یفعل

کبائر کا مرتکب اگر مجبور (محض) ہے۔ تو اس کے فعل پر اس کا معذّب ہونا ظلم ہے۔

(۴) تاریخ فلسفہ میں معرّی کا کیا درجہ ہے

ابو العلاء المعری کو فلسفی کہہ دینا اسی طرح ممکن ہے جس طرح سوفسطائیوں کو اور خود سقراط کو فلسفی کہا جاتا ہے یہ تو ناانصافی ہے کہ ہم معرّی کو افلاطون وارسطو یا ابن رشد اور کانٹ کے درجے کا فلسفی قرار دیں۔ لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اس کو سقراط اور سینٹ اغطینوس اور غزالی اور توما الاکوینی وشوپنہور کے درجے میں فلسفی مانیں اور جبکہ یونانی فلسفہ کی پرانی کتابیں بہت سی نظم میں تھیں تو ہمیں حق ہے کہ ہم معرّی کی لزومیات کو فلسفہ کی کتاب کہیں۔

معرّی نے فلسفہ اسلامیہ (جو کہ اس کے زمانے میں رائج تھا) میں نقد وتبصرہ جاری کیا اور اس کی صحیح اور غیر صحیح رایوں سے افکار کو خبردار کیا۔ اس کی جرأت وحیرت اس معاملہ میں بہت زیادہ تھی۔ وہ حکم عقل کے مقابلے میں کسی رائے کی پیروی نہ کرتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس امر میں وہ سینٹ اغطینوس اور توما الاکوینی سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔
معرّی اپنے تفکیر میں واقعات پر نظر رکھتا تھا۔ خیال ووہم کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ بعض لوگوں نے معری کے ساتھ بے انصافی کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی رائیں سلبی تھیں۔ بعض عادات پر اس نے تنقید کی لیکن ان کے اصلاح کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ وہ چند امور میں ایجابی تھا اور بہت سے امور میں لاادریہ تھا۔ عورت کے بارے میں اس نے صاف ایجابی رائے ظاہر کی ہے۔ گو وہ رائے غلط ہے۔ اخلاق کے متعلق اس کی رائے کھلی ہوئی ایجابی ہے۔ دین میں اس کی رائے عملی تھی۔ یعنی وہ عمل صالح کو اور اعتقاد صحیح کو اور حسن معاملہ کو عبادات شکلیہ اور نزاعات فقہیہ پر ترجیح دیتا تھا۔ زندگی کے متعلق وہ بلاتردد ترک ازدواج اور ترک نسل اور ترک ایذاء حیوانات اور زہد خشک کی طرف دعوت دیتا تھا۔ اور معری نے جب بشر کی حالت میں غور کیا اور تاریخی واقعات کی چھان بین کی تو اس نے بشری طبیعت پر فاسد ہونے کا حکم لگادیا اور اصلاح بشر سے ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوگیا۔ کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ تمام مصلحین اصلاح نہ کرسکے تو وہ اصلاح سے مایوس ہوگیا۔

معرّی ہر امر میں اتباع عقل کی طرف ترغیب دیتا ہے اور صرف عقل کو ہادی اور باقی طریقوں کو ضلالت قرار دیتا ہے۔ مگر ماورائیات میں (یعنی ان امور میں جو ماوراء الطبیعہ سے تعلق رکھتے ہیں) وہ ان کی حقیقت تک پہونچنے سے اپنا عاجز ہونا بیان کرتا ہے۔ اور اس کو دوسروں کے لئے ناممکن بتاتا ہے اور ماورائیات میں فلسفیوں کی رائیں

ظاہر کر کے ان کے خیالات میں تناقض بیان کرتا ہے۔ حقائق امور ماورائیہ کے جاننے کو محال سمجھنا صرف معری کا قول نہیں ہے فیلسوف بروتاغوراس (ت ۱۱۴ ق م) اس کا قائل تھا۔ اور معری کے بعد ابن رشد اور کانٹ وغیرہ بھی اس امر کے قائل ہوئے اور اگر کوئی شخص مذاہب لا اوریین و طبعیین اور مرجیہ عقلیین متقدمین و متاخرین سے واقفیت حاصل کر لے تو جان لے کہ معری کا اس امر کو ناممکن جاننا ہی صحیح رائے اور صحیح فلسفہ ہے۔

معری کے فلسفہ کا ماخذ امور ذیل ہیں، اس کے عناصر شخصیہ اور خصائص فنیہ۔ اس کے زمانے کے احوال و انقلابات تاریخ عربی و ادب عربی۔ اسلام۔ مذاہب کلامیہ اور مذاہب فقہیہ۔ غیر اسلامی مذاہب مثلاً یہودیہ، نصرانیہ، مجوسیہ، صابئیہ۔ مذاہب فلسفیہ مثلاً اشراقیین مشائین۔ سفسطائین وغیرہ۔ ان چیزوں کا علم اسے مطالعے سے اور ان کے باہمی مجادلات سے جو اس زمانے میں سوریہ میں پھیلے ہوئے تھے حاصل ہوا۔ وہ مشرقی مذاہب جو تفلسف اور تدین سے ممزوج تھے۔ مثلاً بوذیہ (بدھ مت) اور تناسخیہ وغیرہ۔ ان امور سے اسے بغداد میں واقفیت حاصل ہوئی کیونکہ اس زمانے میں بغداد میں ان مذاہب کے علما کی آمد و رفت تھی۔

مذاہب باطنیہ۔ ان میں سے بعض کو بغداد میں جانا۔ جیسے مذہب جماعۃ اخوان الصفاء اور بعض کو معرہ میں واپسی کے بعد۔ جیسے مذاہب فاطمی جس کی ایک شاخ مذہب درزی ہے۔ اور حشاشین کا مذہب اور فرقہ نصیریہ کا مذہب۔ اس کے زمانے میں یہ مذاہب بہت پھیلے ہوئے تھے اور سوسائٹی پر ان مذاہب کا اثر ظاہر تھا۔ معری کی کتابوں میں ان مذاہب کا ذکر کم و بیش آتا ہے۔

(۵) معری کے فلسفہ کا بیان بطریق اختصار

معری نے نہ کوئی نیا فلسفی مذہب ایجاد کیا ہے۔ نہ اس کا قصد اس نے کبھی کیا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس نے کسی فلسفی مذہب کو پورے طور پر اختیار کیا اور نہ یہ کہ وہ کسی دینی مذہب کا پورا پیرو ہوا ہے۔ بلکہ جس مذہب کی جو بات اسے پسند آئی اسے تسلیم کر لیتا۔ زندگی کے مختلف ادوار میں اس کے خیالات میں بھی تنوع ہوتا رہا۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ غور و فکر نیز زمانے کے انقلابات اور عمر کے مقتضیات سے خیالات میں تغیر رونما ہوتا ہی رہتا ہے۔ بعض لوگ لزومیات میں مختلف قسم کے خیالات و معتقدات کو دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ معری متردد اور متشکک تھا۔ حالانکہ پہلے اس میں غور کرنا چاہیے کہ لزومیات کی جو موجودہ ترتیب ہے کیا اسی ترتیب سے معری نے اشعار کہے ہیں یا حسب حاجت شعر کہہ دیا۔ پھر جمع کی ترتیب حروف ہجا کے مطابق کی گئی۔

اس امر پر متعدد قرائن قائم ہیں۔ کہ لزومیات کی موجودہ ترتیب بعد کو ہوئی۔ پہلے اشعار مناسب موقع پر کہہ دیے جاتے تھے۔ کل اشعار دو چار ماہ یا دو چار سال میں نہیں کہے گئے۔ بلکہ بہت زمانے میں، معری کی نوجوانی سے بڑھاپے تک میں کہے گئے۔ قرائن حسب ذیل ہیں۔

(۱) اشارات تاریخیہ مثلاً ایک تاریخی مشہور واقعہ صالح بن مرداس حاکم حلب کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معرہ کی رہنے والی ایک نوجوان کنواری عورت شراب کی ایک دوکان کی طرف گذری۔ اس دوکان کے بعض لوگوں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی۔ اور زبردستی اس پر غالب آگئے۔ جمعہ کے دن وہ عورت معرہ کے جامع مسجد میں آئی اور نمازیوں سے اپنا واقعہ بیان کیا۔ ان لوگوں نے جوش غضب میں اس دوکان کو جا کر ڈھا ڈالا۔ معری اس کے متعلق کہتا ہے ؎

انت جامع یوم العروبة جامعاً
تقص علی الشہاد بالمصر امرھا

جامع (غالباً اس عورت کا نام) جمعہ کے دن جامع مسجد میں آئی۔ حاضرین کے سامنے اپنا واقعہ بیان کرنے لگی۔

فلو لم یقوموا ناصرین لصوتھا
تخلت سماء اللہ تمطر جمرھا

اب اگر لوگ اس کی فریاد پر اس کی مدد نہ کریں گے تو میرا خیال ہے کہ آسمان سے انگارے برسیں گے۔

فھدوا ابناء کان یاوی فناءہ
فواجر القت للفواحش خمرھا

اس لئے تم لوگ اس عمارت کو ڈھا دو جس کے صحن میں بدکار عورتیں بے حیائی کے لئے اپنے دوپٹے پھینک دیتی ہیں۔

فما العیش الا لجة باطلیة
ومن بلغ الخمسین جاز غمرھا

زندگی کیا ہے ایک فنا ہونے والا گہرا سمندر ہے اور جو پچاس سال کی عمر کو پہنچ گیا وہ اس کی گہرائی کو پار کر گیا

واقعہ مذکورہ ۴۱۸ھ میں رونما ہوا تھا۔ اس وقت معری کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ صالح بن مرداس کا ایک رومی وزیر تیودور نامی تھا۔ وہ اہل معرہ پر یہ اتہام لگاتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے خسر کو قتل کر ڈالا ہے۔ جب اہل معرہ بدکاری کے گھر کو منہدم کر دیا تو تیودور کو انتقامی جذبہ نے اس پر آمادہ کیا کہ اس نے صالح کو اہل معرہ کے برخلاف ابھارا۔ صالح نے تیودور کی باتوں پر اعتماد کر کے معرہ والوں پر تعزیری ٹیکس عائد کر دیا۔ اور ایک فوج کو معرہ کے منہدم کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔ اہل معرہ بحالت پریشانی اپنے شاعر ابو العلاء المعری کے پاس آئے اور اس کو سفارش کے لئے صالح کے یہاں بھیجا صالح نے ابو العلاء کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس کی سفارش سے معرہ کے منہدم کرنے سے باز آیا۔ لیکن ٹیکس نہ معاف کیا اس سے معری صالح سے ناخوش ہو گیا۔ معری کہتا ہے ؎

بعثت شفیعاً الی صالح
وذاک من القوم رای فسد

میں سفارشی بنا کر صالح کے پاس بھیجا گیا۔ مگر یہ رائے قوم کی غلط تھی۔

نجی المعاشر من براثن صالح
رب یفرج کل امر معضل

صالح کے چنگل سے جماعتوں کو اس پروردگار نے نجات عطا فرمائی جو ہر مشکل امر کو حل کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ معری نے یہ اشعار ایک ہی وقت میں یا اوقات متقاربہ میں کہے ہیں۔ کیونکہ ان اشعار کا تعلق واقعہ مذکورہ سے ہے۔ لیکن لزومیات مطبوعہ موجودہ میں ان اشعار میں ہزاروں اشعار حائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اشعار حسب موقع کہے گئے۔ اور موجودہ ترتیب حرف روی کے اعتبار سے بعد کو قائم کی گئی۔

(۲) لزومیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کسی شعر میں اپنی عمر پچاس سال بتائی ہے۔ اور اس کے بعد والے شعر میں چالیس سال بتائی ہے۔ اسی طرح موجودہ ترتیب کے اعتبار سے مقدم شعر میں اپنی کہولت کا ذکر کیا ہے اور موخر شعر میں اپنے شباب کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنے کی ترتیب اور ہے اور ترتیب جمع اور ہے۔

(۳) غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اشعار جو ترتیب موجودہ میں مقدم ہیں ان سے شاعر کی رائے کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ جو اس امر پر دال ہے کہ شاعر نے ان اشعار کو سن رسیدہ ہونے پر کہے ہیں۔ کیونکہ زیادہ عمر ہونے پر تجربہ کاری اور رائے کی پختگی عموماً حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اشعار جو ترتیب میں موخر ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عمر کی پختگی سے پہلے کہے گئے ہیں۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ اعتراض ساقط ہے کہ معری کے کلام میں تناقض و تردد ہے۔ مثلاً وہ اپنے اس قول میں نسل کے باقی رکھنے کی ترغیب دیتا ہے ؎

والنسل افضل ما فعلت بها
واذا استطعت بها فعن عقل

تمہارے کاموں میں سب سے بہتر کام نسل کا بڑھانا ہے۔ اور اس کے لئے دنیا میں تمہاری کوشش عقل کا مقتضا ہے۔

ایک دوسرے قول میں قطع نسل پر زور دیتا ہے۔ کہتا ہے ؎

اری النسل ذنبا للفتی لا یقاله
فلا تنکحن الدهر غیر عقیم

میں نسل کے بڑھانے کو انسان کے نا قابل معافی گناہ سمجھتا ہوں۔ پس تو ہرگز سوا بانجھ عورت کے عمر بھر کسی سے نکاح نہ کرنا۔

یہ اعتراض اس لئے ساقط ہے کہ جیسا کہ بیان ہو چکا، معری کی رایوں میں مختلف زمانوں میں تغیر ہوتا رہا جیسا کہ تمام مغربی و مشرقی فلسفیوں کی رایوں میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہا۔ اس لئے یہ تناقض نہیں ہے۔ معری کا فلسفہ امور ذیل پر مشتمل ہے

(۱) معری تقیہ فکریہ پر عامل ہے۔ وہ اپنی سب رایوں کو صراحتہً ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اپنے بہت سے اعتقادات کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ یا رمز و کنایہ یا تلمیح کے طریق پر ذکر کرتا ہے تاکہ عامۃ الناس نہ سمجھ سکیں۔ کیونکہ اسے وہ اپنے لئے بھی اور لوگوں کے لئے بھی مضر سمجھتا ہے۔ اسی تقیہ فکریہ کی وہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتا ہے ؎

اهوی الحیاة وحسبی من مصائبها
انی اعیش بتمویه وتدلیس

میں زندگی کی ہوس کرتا ہوں۔ حالانکہ اس کی مصیبتوں میں سے یہ مصیبت میرے لئے کافی ہے کہ میں مکاری اور ملمع سازی کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

فاکتم حدیثک لا یشعر بہ احد

من رھط جبریل او من رھط ابلیس

تو اپنی بات چھپا اسے کوئی نہ جانے، نہ جبریل کی جماعت میں سے نہ ابلیس کی جماعت میں سے

(یعنی فرشتوں اور جنوں کو بھی نہ معلوم ہو سکے)

(۲) معری کی لاادریۃ اور شک۔ معری کا اعتقاد ہے کہ امور کی ماہیات ہمارے ادراک سے محجوب ہیں اور دوسروں کے متعلق بھی وہ اسی کا قائل ہے ؎

وما یدری الفتی والظن جہل

وقضیۃ الملیک مغیبات

انسان نہیں جانتا اور گمان کرنا تو نادانی ہے۔ خدا کے فیصلے تو پوشیدہ ہیں

(۳) اتباع عقل۔ معری باوجودیکہ معرفت حقیقیہ سے انسان کو عاجز سمجھتا ہے۔ اس کا قائل ہے کہ انسان کو ہر فعل میں عقل کی اتباع ضروری ہے۔ تقلید سے اجتناب لازم ہے ؎

فلا تقبلن ما یخبرونک ضلۃ

اذا لم یوید ما اتوک بہ العقل

لوگ جو اپنی بے وقوفی سے تمہیں خبر سناتے ہیں۔ جب تک عقل اس کی تائید نہ کرے اسے قبول نہ کرو۔

(۴) تشاؤم یعنی بداندیشی اور برا شگون کا معری کے نزدیک بات میں غالب ہونا زیادہ ظاہر ہے۔ اور تشاؤم بنظر تحقیق فلسفہ میں سے نہیں ہے بلکہ وہ زندگی سے مایوسی اور ناامیدی ہے اور کسی شخص کا عادتاً اچھا شگون کرنا یا برا شگون کرنا نہ نظریاتی بنیادوں پر اور نہ مذہب فلسفی پر مبنی ہے بلکہ اسی نفسی خیالات پر مبنی ہے جو اس کی حیات عملیہ اور عامہ و خاصہ میں اسے پیش آتے ہیں اور انسان اپنی دونوں حالتوں یعنی تشاؤم و تفاؤل میں اپنی زندگی کے حالات مثلاً محتاجی یا دولت مندی اور تندرستی یا بیماری اور کامیابی یا ناکامی کے ساتھ متاثر ہوتا ہے اور انسان کو تشاؤم و تفاؤل کی طرف پھیر دینے میں انسان کے مزاج کو خاصہ دخل حاصل ہے۔

اور تشاؤم فلسفۂ شرقیہ میں اور بالخصوص بدھ مت کے فلسفہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ لیکن یورپ کے فلسفہ جدیدہ میں وہ بہت ہی نادر الوجود ہے۔ جیسا کہ شوپنہور کے نزدیک ہے مثلاً۔ معری کی تو یہ حالت ہے کہ وہ تشاؤم میں حد اعتدال سے متجاوز ہے اس کو زندگی میں صرف سیاہ رخ نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض اس کے سامنے سفید رخ پیش کیا جاتا تو اس سے وہ منہ پھیر لیتا۔ اس کے شعر مندرجہ ذیل میں ان باتوں پر غور کرو ؎

عرفت سجایا الدھر اما شرورہ

فنقد واما خیرہ فوعود

ترجمہ:۔ میں نے زمانے کے ڈھنگوں کو پہچان لیا اس کی خرابیاں تو نقد ہی نقد ہیں۔ اور اچھائیاں صرف وعدے ہیں۔

اذا کانت الدنیا کذالک فخلھا ؛ ولو ان کل الطالعات سعود

ترجمہ :- جب دنیا ایسی ہے تو چھوڑ دے ، اگرچہ کل ستارے سعد (مبارک) ہوں

رقدنا ولم نملہ رقاداعن الاذی

وقامت بما خضنا ونحن قعود

ترجمہ :- ہم نے سونا چاہا لیکن تکلیف سے نہ سو سکے ۔ اور اس نے وہ چیز پیدا کر دی جس سے ہم بیٹھے بیٹھے ڈوب گئے

فلا یرھبن الموت من ظل راکبا

انحدارا اتی التراب صعود

ترجمہ :- جو سواری پر سوار ہو وہ ہرگز موت سے نہ ڈرے ۔ اس لئے کہ مٹی میں نیچے اتر جانا ۔ (یعنی مرنے کے بعد قبر میں دفن ہونا) یہ درحقیقت بلند ہونا ہے ۔ (کیونکہ دنیا کی ذلتوں سے نجات ملے گی ۔

وکم انذرتنا بالسیول صواعق

وکم خبرتنا بالغمام رعود

ترجمہ :- اور بہتیرا بجلی کی کڑک نے ہمیں سیلاب سے ڈرایا اور ابر کے گرج نے اکثر ابر کی ہمیں خبر دی ہے اور جب وہ نظر پھیرتا ہے تو کسی چیز میں بھی اس کو سوا خرابی کے کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہاں تک کہ خود زندگی میں بھی اس کو خرابی ہی خرابی دکھائی دیتی ہے ۔ وہ کہتا ہے ؎

غلت الشرور ولو عقلنا صیّرت

دیۃ القتیل کرامۃ للقاتل

ترجمہ :- برائیاں بڑھ گئی ہیں اور اگر ہمیں عقل ہوتی تو مقتول کی دیت کے بجائے قاتل کے لئے انعام مقرر کیا جاتا ۔

وردت الی دار المصائب مجبراً

واصبحت فیھا لیس یعجبنی النقل

ترجمہ :- میں مصیبتوں کے گھر (دنیا) میں مجبوری کی حالت میں آیا ۔ اور اس میں ایسا ہو گیا کہ مجھے منتقل ہونا پسند نہیں ۔

اعانی شرورا لا قوام بمثلھا

وارناس طبع لا یھذ بہ العقل

ترجمہ :- میں ایسی برائیاں جھیلتا ہوں جن کا کوئی مصلح نہیں ہے اور طبیعت کی میل کچیل صیقل کرنے سے صاف نہیں ہوتی

الا انما الدنیا منحوس لاھلھا

فما فی زمان انت فیہ سعود

ترجمہ :- آگاہ ہو جاؤ کہ بیشک دنیا اس میں رہنے والوں کے لئے سخت منحوس ہے ۔ جس زمانے میں تم ہو

اس میں کچھ خوش قسمتی نہیں ہے۔

لو کنت رائد قوم ظاعنین الی
دنیاک ھذی لما الفیت کذابا

ترجمہ :۔ اگر میں کسی ایسی جماعت کا ناظم منازل ہوتا جو اس دنیا میں آنے والی ہوتی تو میں جھوٹ نہ بولتا

لقلت تلک بلاد نبتھا سقم
وماؤھا العذب سم للفتی ذابا

ترجمہ :۔ میں (دنیا سے ان کے پاس آکر) کہتا کہ ان مقامات کی پیداوار بیماری ہے۔ اور میٹھا پانی ایسا زہر ہے جو انسان کو پانی کر دیتا ہے

ھی العذاب فجدوا فی ترحلکم
الی سواھا وخلوا الدار اعذابا

ترجمہ :۔ وہ (دنیا) عذاب ہے۔ تم لوگ اس کے سوا اور مقام کی طرف کوچ کرنے کی کوشش کرو۔ اس گھر (دنیا) کا خیال ترک کر دو۔

اب بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ معری جو تشاؤم کا دلدادہ ہے۔ وہ لوگوں کو تفاؤل و تشاؤم کے ترک پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ تناقض کیسا۔ مگر درحقیقت اس میں تناقض نہیں ہے۔ معری کے نزدیک خیر و شر اور موت و حیات اور فقر و غنا سب چیزیں برابر ہیں۔ نہ کسی ایسی بھلائی سے جس کا ملنا اسے ممکن ہو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور نہ کسی ایسی برائی سے جو اسے پہنچ سکتی ہے غمگین ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ لوگوں کو تفاؤل و تشاؤم کے ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کہتا ہے ؎

لا تفرحن بفال ان سمعت بہ
ولا تطیر اذا ما ناعب نعبا

ترجمہ :۔ تم کسی فال کو سن کر ہرگز خوش نہ ہو۔ اور نہ جب کوا بولے تو بدشگونی سمجھو۔

فالخطب افظع من سراء تاملھا
والامر ایسر من ان تضمر الرعبا

ترجمہ :۔ اس لئے کہ ناگہانی امر زیادہ پریشان کن ہے، بہ نسبت اس خوشی کے جس کی تم امید رکھتے ہو۔ اور وہ امر (جس سے تم ڈرتے ہو) وہ زیادہ آسان ہے خوف کو دل میں جگہ دینے کے۔

أسررت اذ مر السنیح تفاؤلا
والفال من رائی لعمرک فائل

ترجمہ :۔ کیا تو مسرور ہوا جبکہ دائیں طرف سے آنے والا گذرا نیک شگون سمجھ کر۔ اور میری رائے میں فال تیری زندگی کی قسم کمزور چیز ہے۔ (دائیں طرف سے گذرنے کو مبارک اور بائیں طرف سے لوگ منحوس سمجھتے ہیں۔)

ارایت فعل الدھر افی امم مضت
قبلا وھرج میالل بقبائل ؟

ترجمہ :- تم غور کرو کہ زمانہ کا پہلے گزرنے والی قوموں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے - اور قبیلوں کی دوسرے قبیلے والوں سے کیسی مڈبھیڑ ہوئی ہے -

یہ تشاؤم شدید معری کے لئے اس سے مانع نہیں بنا کہ وہ لوگوں کو عمل خیر و اخلاق کریمہ پر آمادہ کرے - کیونکہ وہ خصوصی طور پر تشاؤم کا اہتمام نہیں کرتا تھا - جبکہ وہ اپنے ہاتھ کو مال و جاہ اور لذت دنیوی کے طلب سے جھاڑ چکا تھا - بلکہ اس نے چاہا کہ انسان اپنے نفس کو خلق بلند کا نمونہ اور عدل کی مثال بنائے - لوگوں سے اور لوگوں سے حاصل ہونے والی چیزوں سے مثلاً شکر یا توجہ یا خوش ہونے سے صرف نظر کرے -

تفکر علمی مادی :- معری کا اعتقاد ہے کہ فرائض دینیہ کے لئے شکل اور روح ہے - وہ شکل کے ترک کا داعی نہیں ہے لیکن روح کو شکل پر ترجیح دیتا ہے - وہ اسے ناپسند کرتا ہے کہ دین اور علم میں بے فائدہ بحث و جدال کی جائے - یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ فرض شکلی میں ایسا انہماک ہو کہ جس سے دوسرے فروض و حقوق دینیہ جس سے نفع اجتماعی ہوتا ہے - مثلاً زکوٰۃ و صدقات متروک ہو جائیں - وہ اس عبادت شکلیہ کو بے فائدہ سمجھتا ہے جس کا نتیجہ شر یا ضرر ہو سے

اذا رام کیدا بالصلوٰۃ مقیمھا ؟
فتارکھا عمدا الی اللہ اقرب

جو لوگوں سے سوال کرتا ہے تو وہ لوگ اسے محروم کر دیتے ہیں - اور اللہ سے سوال کرنے والا ناکام نہیں ہوتا -

معری معجزات و کرامات کا منکر تھا - انبیاء و رسل کے متعلق اس کے خیالات صحیح نہ تھے - فقہا و صوفیہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا - عقلی دلائل کو دینی براہین پر ترجیح دیتا تھا - انھیں وجوہ سے بعض علماء نے اس پر کفر و زندقہ کا حکم جاری کیا - یہ سب باتیں اس کے کلام کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہیں - اس مختصر تحریر میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے -

واذا اتتک مذمتی من ناقص
فھی الشھادۃ لی بانی کامل ؟

جب تجھ سے کوئی کم علم میری برائی بیان کرے تو یہ امر میرے کامل ہونے کی گواہی ہے -

{مشاہیر اور نامور شخصیتوں کے سوانح و حالات میں پڑھنے والوں کے لئے عبرت بھی ہوتی ہے اور بصیرت بھی - ان کی زندگیوں میں جہاں پاکیزگی، صالحیت، اور صحت اعتقاد و اصابت فکر پائی جاتی ہے، اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں - اور اٹھانا چاہئے - جہاں فساد اعتقاد، خرابی عمل اور انتشار فکر ہے اس سے اجتناب ضروری ہے -

فارابی، ابن سینا اور ابن رشد بہت بڑے مسلم فلسفی گذرے ہیں - ان کی علمی خدمات یقیناً شاندار ہیں مگر ان کے بعض افکار دینی نقطۂ نگاہ سے خطرناک ہی نہیں گمراہ کن بھی ہیں - اور ابو العلاء معری تو فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا! شاعر اظہار فکر و خیال میں یوں بھی آزاد اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں - اس لئے معری کے عقائد و افکار میں جہاں دین سے بیگانگی پائی جاتی ہے ان سے ہم برأت کا اظہار کرتے ہیں - "اقرار" میں ہم ان کے ساتھ ہیں لیکن "انکار" میں ہم اس کے ٭

٭ ساتھ نہیں ہیں - (ن - م - ر - ق)

محشر رسول نگری

پیغامِ بیداری

روحِ انصاف کی فریاد کناں آج بھی ہے
جس طرح پہلے تھی یہ مرثیہ خواں آج بھی ہے
وہی ناکامیٔ پیہم کا سماں آج بھی ہے
دلِ نادار میں احساسِ زیاں آج بھی ہے

• دورِ عشرت ہے وہی اور ستم کوشی ہے
• وہی غفلت ہے وہی عالمِ مدہوشی ہے
یہ سیاست ہے کہ ہنگامہ مکاری ہے
یہ تجارت ہے کہ سرمایہ کی عیّاری ہے
یہ معیشت ہے کہ افلاس ہے ناداری ہے
یہ تمدّن ہے، اخوت نہ رواداری ہے

• محفلِ عیش جمی رہتی ہے ایوانوں میں
• عصمتیں بکتی ہیں دولت کے شبستانوں میں
ہیں وہی خواب پریشاں، وہی تعبیریں ہیں
وہی اخلاق کی بگڑی ہوئی تصویریں ہیں
حق کے اظہار پہ اب تک وہی تعزیریں ہیں
بے گناہوں کے لئے آج بھی زنجیریں ہیں

• نئی رت آئی ہے یا رنگِ چمن بدلا ہے
• کون کہتا ہے کہ آئینِ وطن بدلا ہے
ذوقِ تسلیم نہیں، وحدتِ افکار نہیں
روحِ تقدیس نہیں عفتِ کردار نہیں
جذبۂ حق میں وہ بیباکیٔ اظہار نہیں
صفِ جنگاہ میں وہ عشق کی للکار نہیں

• عقل جذباتِ حق انگیز پہ غالب ہے ابھی
• مصلحت عشقِ جنوں خیز پہ غالب ہے ابھی
بے خبر! غیرتِ ایماں کے تقاضے کیا ہیں
تجھے معلوم ہیں قرآں کے تقاضے کیا ہیں
تلخیٔ گردشِ دوراں کے تقاضے کیا ہیں
شورشِ موجۂ طوفاں کے تقاضے کیا ہیں

• دیتے ہیں دعوتِ پیکار زمانے والے
• ہیں کہاں گردنیں باطل کی جھکانے والے
سطوتِ کفر ہے جس چیز سے لرزاں کیا ہے
تو نے سوچا بھی ہے وہ قوتِ پنہاں کیا ہے
جو نہیں وارثِ لولاک وہ ایماں کیا ہے
جس کی دنیا میں نہیں دھاک وہ عرفاں کیا ہے

• قوتِ ملتِ بیضا فقط اسلام سے ہے
• فوقیت اس کو جہاں میں اسی پیغام سے ہے

شفقت کاظمی

جذبات

دل ہے مانوس کنجِ تنہائی
مٹ چکا شوق محفل آرائی

شامِ غم جب کسی کی یاد آئی
بڑھ گیا اور رنجِ تنہائی

گھٹ چلی ہر نظر میں قدر اپنی
بڑھ چلا اعتبارِ رسوائی

اُن سے چھوٹی نہ سادگی کی ادا
باوجودِ شباب و رعنائی

تیرے حسنِ جنوں نواز کی خیر
کم نہ ہوں گے ترے تمنائی

جس قدر ہم نے بھولنا چاہا
اُس قدر ہم کو تیری یاد آئی

جن سے آباد تھی گلی تیری
کیا ہوئے اب وہ تیرے سودائی

شیب کی سختیوں سے اے شفقت
کس کو ہے یاد عیش برنائی کا

شکوے!

راسخ عرفانی

شراب ناب سے ساقی سے پیمانوں سے کیا شکوہ
جو محرومی ہو قسمت میں تو مے خانوں سے کیا شکوہ

خرد والو، پریشاں حال انسانوں سے کیا شکوہ
چلو چھوڑو یہ دیوانے ہیں۔ دیوانوں سے کیا شکوہ

نہ راس آئے اگر فصلِ بہاراں غنچۂ دل کو
تو پھولوں سے گلہ کیسا، گلستانوں سے کیا شکوہ

تری پُرکیف آنکھوں کے جنوں پرور اشاروں سے
جو زاہد بھی بہک جائیں تو مستانوں سے کیا شکوہ

جہاں سے اُٹھ گئے وہ پاسبان ناموس ملت کے
جو ننگِ قوم ہوں ایسے مسلمانوں سے کیا شکوہ

شکایت بھی ہوا کرتی ہے اپنوں ہی سے اے راسخ
جو بیگانے ہیں، بیگانے ہیں، بیگانوں سے کیا شکوہ

روحِ انتخاب

قرآن مجید کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس نے واقعات کے بیان میں حد درجہ اختصار کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کی عبارت ہر قسم کے حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص اس کے قصص اور دلائل پر غور کرنا چاہے اس کو پہلے معلوم کر لینا چاہئے کہ ان چیزوں کے بیان میں اس کی عام روش کیا ہے۔ یہاں ہم اس چیز کی طرف خاص اشارات کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید میں قصص دراصل عبرت اور تعلیم حکمت کے مقصد سے بیان ہوئے ہیں اور بعض اوقات انھیں کی لپیٹ میں ان تحریفات کی اصلاح بھی کر دی جاتی ہے جو اگلوں نے ان میں کر رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں تدبر کرنے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ اس امر کا اہتمام نہیں کرتا کہ ایک واقعہ کو ایک جگہ پوری وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کر دے۔ بلکہ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ ایک واقعہ کا کچھ حصہ ایک جگہ بیان کرتا ہے اور اسی کا کچھ حصہ دوسری جگہ ذکر کرتا ہے۔ اور بعض اوقات ان دونوں سے الگ ایک تیسری راہ بھی اختیار کرتا ہے وہ یہ کہ پورے قصہ یا اس کے کسی ایک حصہ کی طرف محض ایک سرسری اشارہ کر کے گزر جاتا ہے، حقیقت کے اعتبار سے یہ اسلوب بھی اسی عام اسلوب بیان کی ایک شاخ ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔ کیونکہ اس کی تہ میں بھی بلاغتِ بیان کا وہی اسلوب ملحوظ ہے کہ بات صرف اُتنی کہی جائے جتنے کے لئے موقعِ کلام مقتضی ہو، ہمارے علماء اس رمز سے واقف تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کا ایک اصول یہ ہے کہ قرآن کا ایک حصّہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔ پس جو چیز ایک جگہ مجمل ملے گی وہی چیز دوسری جگہ پوری تفصیل کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ قرآن مجید کی تفسیر میں یہ اصل الاصول ہے جو ہر غور کرنیوالے کے پیش نظر رہنا چاہئے!

دلائل کے بیان میں بھی قرآن میں ایجاز و بلاغت کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ قرآن ان کو صرف بہ طریق اشارہ ذکر کر کے گزر جاتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ دلیل کے اہم مقدمات کو تو بیان کر دیتا ہے۔ لیکن جو پہلو ظاہر ہوتے ہیں ان کو چھوڑ جاتا ہے، عقلی دلائل کے بیان کرنے کے معاملہ میں قرآن کا عام انداز یہی ہے، رہیں نقلی چیزیں تو قرآن جب ان کا حوالہ دیتا ہے تو عموماً صرف مشہور و مُسلّم پہلو کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ اور چونکہ اس باب میں مقصود اصلی عبرت و یاد دہانی اور بخشش و عذاب کے عام خدائی قوانین کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے تخویف و تہدید کا مضمون اکثر ان کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ قصص اور دلائل پر غور کرتے ہوئے ان دو بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ صحیح نتیجہ تک پہونچنا ناممکن ہوگا۔

(مولانا حمید الدین فراہیؒ)

ہماری نظر میں

قربانی کی حقیقت اور اس کی تاریخ

از:- مولانا حمید الدین فراہیؒ، ترجمہ:- مولانا امین احسن اصلاحی۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر انسانیت، گوجر گلی، موچی دروازہ لاہور۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ رحمۃ اللہ علیہ قرآنی علوم میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ امامت و اجتہاد کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا مرحوم نے عربی میں

"الرای الصحیح فی من ھو الذبیح"

کے نام سے ایک معرکہ آرا کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ ان کے قابل فخر تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی نے سلیس اردو میں کیا ہے۔ اور مکتبہ تعمیر انسانیت نے اس کتاب کو خاصے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے! مصنف مترجم اور ناشر سب کے سب اعلیٰ قدر سعی و اخلاص اللہ تعالےٰ کے یہاں اجر پائیں گے۔

اس کتاب میں تورات اور علمائے اہل کتاب کے اعتراضات سے قرآنی آیات اور روایات و اقوالِ سلف سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے حضرت اسحٰق علیہ السلام نہیں تھے۔ کمبخت یہودیوں نے توریت مقدس میں تحریفات کر کے اس حقیقت کو خواہ مخواہ مشتبہ اور ملتبس بنا دیا ہے۔ یہ کتاب اس تحریف اور اشتباہ والتباس کے تار پود بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔

قدیم مفسرین میں علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یہود کی روایات سے متاثر ہو کر حضرت اسحٰق علیہ السلام کو "ذبیح" ٹھہرا دیا علامہ فراہی قدس سرہٗ نے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کا جس بصیرت و فراست اور دقت نظر کے ساتھ رد فرمایا ہے بس وہ انھیں کا حصہ ہے۔

ترجمہ کی خوبی اور تاثیر کا اندازہ اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:۔

"ذرا تصور کیجئے کہ ایک صابر اور صاحب سوز و گداز انسان ہے جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اس محرومی سے اس کا دل تنگ ہو رہا ہے۔ اور وہ اپنے پروردگار سے اولاد کے لئے پرسوز دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما کر، اولاد کی نعمت سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے اس قبولِ دعا پر اس کے دل کا ریشہ ریشہ شکر کے جذبے سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا نام ہی

قبولِ دعار (اسمٰعیل) رکھ دیتا ہے۔ پھر تیرہ برس تک ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی پُرمحبت آغوش سے اس کو الگ نہیں کرتا۔ اکلوتا بیٹا ہے، دعائے سحر ہے۔ بڑھاپے کا چشم و چراغ ہے، اور صورت حال ایسی ہے کہ آئندہ اولاد کی کوئی امید نہیں ہے۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرو کہ ایسے بیٹے کے ساتھ ایسے باپ کی محبت کا کیا عالم ہوگا؟"

"............ وتلّہٗ للجبین"...... اور اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ (صفحہ ۸۹)

"تلّہٗ" کا ترجمہ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے "گرا دیا" اور ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے "پچھاڑ دیا" کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ "پیشانی کے بل گرا دیا" ترجمہ:۔ "پیشانی کے بل پچھاڑ دیا"۔ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے اور قرآنی مفہوم کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ "پچھاڑنے" میں۔ "مزاحمت" کی جھلک سی پائی جاتی ہے۔ اور یہاں عمودِ کلام "اَسْلَمَا" قرار پاتا ہے۔! مولانا امین احسن اصلاحی کی نگاہِ نکتہ بیں سے ترجمہ کا یہ نازک فرق پوشیدہ تو رہنا نہیں چاہئے تھا۔

یہ کتاب عوام و خواص سب ہی کے پڑھنے کی ہے، اس کے مطالعہ سے قرآنی فہم میں تیزی اور جودت پیدا ہوتی ہے! کاش! ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں اس قسم کی کتابیں بار پاسکیں۔!

متقدمین کی تصانیف کے ساتھ مولانا فراہی کی اس کتاب کو بے دریغ رکھا جاسکتا ہے۔!

اعجاز حدیث از۔ مولوی محمد صادق سیالکوٹی، ضخامت ۲۴۰ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ دائرۃ التبلیغ، پورہ ہیراں، سیالکوٹ شہر

جناب مولوی محمد صادق سیالکوٹی دسیوں کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں، اور ان کا قلم دین کی تبلیغ و مدافعت کے لئے وقف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم کے احکام اور مسلمانوں کی زندگی کے تمام دین و دنیا کے کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حدیث مقدس کی روشنی میں انجام پاتے اور پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ کتاب آسان، سلیس اور ہر اعتبار سے مفید ہے، ہر صفحہ اخلاق نبویؐ کے موتیوں سے مزیّن ہے۔ اس لئے پاکیزگیٔ کردار کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ مند ہے۔ شرک و بدعت کا رد بھی قوی دلائل سے کیا گیا ہے۔

سرورق پر اقبالؔ کے شعر کا مصرعہ اولیٰ غلط چھپ گیا۔ "را" کے چھوٹ جانے سے مصرعہ کا وزن باقی نہ رہ سکا۔ اصل مصرعہ یوں ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ——— مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ"

"جو چیز نشہ لائے اس کی کثرت بھی حرام ہے اور قلت بھی حرام ہے"۔ اس حدیث کا صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے:۔ جس کی کثیر (مقدار) نشہ لائے اس کی قلیل (مقدار) بھی حرام ہے۔

مقلدین (احناف) پر جو "انکارِ حدیث" کا الزام لگایا گیا ہے وہ سب سے کمزور بات ہے جو اس کتاب میں کہی گئی ہے۔ فقہی مسائل میں استخراج و استنباط اور قیاس و اجتہاد کا ماخذ ائمہؒ فقہ کے نزدیک کتاب و سنّت ہی تھا۔ "حدیث کی مخالفت" ان کا معاذ اللہ شعار نہ تھا۔ مقلدین اسی بنا پر ائمہؒ فقہ پر اعتماد کرتے ہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ ان بزرگوں نے کتاب و سنت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ہی مسائل بیان کئے ہیں۔

دین اور ادب

از۔ مولانا فضل الرحمٰن صدیقی جے پوری، ضخامت ۱۲۷ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ، سراج العلوم، مولوی گنج دھولیہ، (مغربی خاندیش)

مولانا فضل الرحمٰن صدیقی کے گیارہ، علمی، مذہبی، تاریخی اور ادبی مضامین کا یہ مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مولانا حامد الانصاری غازی نے تحریر فرمایا ہے۔ مضامین معلومات آفریں اور دلچسپ ہیں۔ جناب عبد اللہ ناصر (بمبئی) کے ظرافت آمیز اصلاحی اشعار ہر مضمون کے آغاز میں ملتے ہیں۔ کتاب کا ایک اقتباس:۔

"اہل ہند میں گرو بابا نانک جنم ساکھی بھائی بالا ص۱۴۷ سطر ۴ پر ایک شعر میں قرآن شریف کی عظمت اور منزلت کا یوں اقرار کرتے ہیں:۔

توریت، زبور، انجیل، اتری سن ڈٹھے وید ۔۔۔ رکھے قرآن کل جگ میں پروان ۲ ۲

ترجمہ:۔ توریت، زبور، انجیل کو ہم نے بغور دیکھا اور وید کو بھی۔ مگر دنیا کے لئے جو کتاب ہدایت کا موجب ہوسکتی ہے، وہ "قرآن شریف" ہے۔

"اس کتاب میں آگے چل کر گرو جی نانک نے ص۱۴۹ پر لکھا ہے کہ"

رہے کتاب ایمان دے بیچ کتاب قرآن

"یعنی اگر کوئی ایمان کی کتاب ہے تو وہ قرآن شریف ہے ....."

کاش سکھ قوم اس حقیقت کو پالیتی۔!!

(صفحہ ۲۷) "یہاں کے حکمرانوں نے بھی اپنے یہاں علم کا چرچا اور اس کی تشہیر میں اچھا حصہ لیا۔" "تشہیر" بری شہرت کو کہتے ہیں، نشر و اشاعت اور شہرت کے معنی میں۔ اس لفظ کا استعمال کسی طرح درست نہیں۔ (صفحہ ۳۱) "ابن جریر نے تفسیر طبری اسّی (۸۰) جلدوں میں قلم برداشتہ لکھ ڈالا ہے۔" "تفسیر" کو مذکر پڑھ کر وجدان تلملا کر رہ گیا۔ تو! یہ پھر مضمون نگار نے کس علم و اطلاع کی بنا پر یہ کمزور بات لکھی ہے کہ ابن جریر نے اپنی عظیم تفسیر کی تدوین میں نہ غور و خوض کیا اور نہ اس کے لئے دوسری کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ قلم اٹھا کر جو تفسیر لکھنی شروع کی تو بس لکھتے ہی چلے گئے۔!

صفحہ ۳۳ پر "حُدی خواں" کو "ہُدیٰ خواں" لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(صفحہ ۶۳) ان کو اپنی زبان دانی کا اس قدر دعوے تھا کہ کعبہ پر لٹکے ہوئے نادر اشعار کو وہ منٹوں میں اتار کر اس شخص کی تمام دماغ خراشیوں کو ایک لخت محو کر دیتے ———— یہ کس قدر کمزور اندازِ بیان ہے ———— صفحہ ۸۰ پر ابن شہاب زہری کو ابن شہاب زیدی لکھا ہے۔

دیندار بے نقاب ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت ۲۵ نئے پیسے (ہندستانی)
ملنے کا پتہ محمد سردار خاں، جنرل مرچنٹ، ہمنا آباد، دکن (بھارت)

جناب زاہد صدیقی دیندار انجمن کے مبلغ تھے۔ اپنی ناواقفیت کی بنا پر وہ کئی سال تک اس فتنے کا شکار رہے مگر جب ان پر حق واضح ہو گیا تو اس کے قبول و اظہار میں انھوں نے قطعاً پس و پیش نہیں کیا۔ ان کا مضمون "بے نقاب" کر کے، سے چند ماہ ہوئے 'فاران' میں چھپ چکا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس مقالہ نے "دیندار انجمن" کو چوراہے پر ننگا کر کے کھڑا کر دیا ہے۔

اس مقالہ میں مضمون نگار نے صدیق دیندار چن بسویشور بانیٔ دیندار انجمن کی کتابوں سے جو حوالے دیئے ہیں اس کے کسی ایک حوالہ کی بھی دیندار انجمن والے تردید نہیں کر سکے۔!

اس مضمون (بے نقاب) کو محمد سردار خان صاحب نے کتابی صورت میں چھپوایا ہے۔ اور افادۂ عام کے لئے کم سے کم قیمت رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے گا۔!

JAMAAT-E-ISLAMI PAKISTAN ضخامت ۹۲ صفحات (لانبا سائز) قیمت ایک روپیہ چار آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جماعتِ اسلامی، اچھرہ، لاہور۔

انٹرنیشنل بک ایگزیبیشن شکاگو (۵۷ ۱۹ء) میں پیش کرنے کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی تھی۔ اس کتاب میں جماعتِ اسلامی کے:۔

ادب .. .. Literature.
قیادت.. ... ... Leader Ship.
تنظیم ... ... Organisation.
نصب العین.. ... ... Ideal.
کارگزاریاں.. ... ... Achievements.
پروگرام ... ... Programme.

کا انگریزی زبان میں بڑے سلیقہ کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔ ٹائپ، طباعت اور کاغذ خوشنما اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ انگریزی طبقہ کے لئے یہ کتاب جماعت اسلامی کا "تعارف نامہ" ہے۔

جماعت اسلامی کے اکابر اور متاثرین و متفقین نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی مکمل فہرست مختصر تعارف کے ساتھ درج ہے۔ بعض اہم کتابوں کا تعارف تفصیل کے ساتھ کرایا گیا ہے۔ اس کتاب سے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض کتابیں اُردو زبان سے انگریزی، عربی، سندھی، پشتو، فرانسیسی، بنگالی، انڈونیشیائی۔ ہندی، ملیالم، گجراتی۔ تامل، تلگو، مرہٹی اور کنٹری چودہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں!

اللہ نے چاہا تو اقامتِ دین کی یہ تحریک آفاق گیر ہوکر رہے گی۔ اور تکفیر و تفسیق کی بوچھاروں میں بھی یہ قافلہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

مِلّتِ بیضاء

مرتبہ :۔ مولانا محمد حسین بلوچ، ضخامت ۴۸ صفحات (مفت)، صرف محصول ڈاک بھیجا جائے۔
ملنے کا پتہ :۔ مصنف سے، جامع مسجد کلاکوٹ، نزد پولیس چوکی لیاری، کراچی۔!

قربِ قیامت ہے اور فتنے گھانس پھونس کی طرح اُگ رہے ہیں، اس کتاب سے ایک اور فتنہ کا پتہ لگا۔ کراچی میں "ذکری جماعت" کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ جو اٹک (پنجاب) کے کسی شخص "محمد مہدی" کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ایک "نور" تھا۔ جس نے اب سے کئی سو سال پہلے ظاہر ہوکر دین کا راستہ بتلایا۔ اور یہ "نور" پھر روپوش ہوگیا۔!

ذکری جماعت والے "نماز" نہیں پڑھتے، ان کا کلمہ یہ ہے :۔

لَا اِلٰہ الا اللّٰہ نور پاک محمد مہدی رسول اللہ

یہ لوگ، ماہ صیام کے بجائے ذوالحجہ کے مہینے میں نو دن روزے رکھتے ہیں، اور کعبۃ اللہ کے بجائے کوہِ مراد (تربت) میں جاکر حج ادا کرتے ہیں۔

اِن کو "ذکری" اس لئے کہا جاتا ہے کہ "نماز" پڑھنے کے بجائے یہ لوگ "ذکر" کرتے ہیں۔

اس کتابچہ میں مکالمہ کے انداز پر ان گمراہ بلکہ کفریہ عقائد کا رد کیا گیا ہے۔ عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فتنوں کی ہوا اور بوباس سے بھی اہل ایمان کو محفوظ رکھے۔ (ان عقائد سے اللہ تعالیٰ کی کروڑ بار پناہ)

سالانہ رپورٹ ۵۵ - ۵۶ ۱۹ء

روئداد جلسہ سالانہ مع انتخاب مشاعرہ اِدارۂ علم و ادب علی گڑھ۔
مرتبہ :۔ محمد عمر خاں ثمر چھتاروی، ضخامت ۴۰ صفحات۔
ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ علم و ادب، چھتاری کمپاؤنڈ، رسل گنج، علی گڑھ۔

اِدارۂ علم و ادب علی گڑھ اپنی مالی دشواریوں کے باوجود اُردو زبان اور دین کی خدمت کر رہا ہے۔ اس کی سرپرستی میں شبینہ مکتب، ہونہار کلب اور دارالمطالعہ قائم ہیں۔ کام بہت ہی چھوٹے پیمانے پر سہی۔ مگر ہو تو رہا ہے اس ادارہ کا سالانہ اجلاس اور مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کی رپورٹ ہمارے سامنے ہے۔

اس رپورٹ کو پڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے کہ نواب احمد سعید خاں صاحب (چھتاری) اپنے شہر کے ادارہ کو صرف دس روپے ماہوار اِمداد دیتے ہیں - چندہ کی فہرست کا یہ حال ہے :-

منیر الدین صاحب مالک منیر شو فیکٹری ---- چندہ ایک روپیہ ماہوار

مولوی مقتدیٰ خاں شیروانی ---- چندہ آٹھ آنے ماہوار

جمیل احمد صاحب فرنیچر مارٹ ---- چندہ چار آنے ماہوار

ڈاکٹر محمد عثمان صاحب ---- چندہ چار آنے ماہوار

صرف دس سال کی مدت میں ہندوؤں کی حکومت کے ظلِّ عاطفت اور زیرِ سایہ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہوا ہے !!

ختم نبوت اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ

از - ابو احمد دستگیر، مبلغ اسلام ، ضخامت ۲۴ صفحات ، قیمت چھ آنے

ملنے کا پتہ :- ۱۰/۲۷ لالوکھیت ، کراچی -

دیندار انجمن کے مبلغ جناب ابو احمد دستگیر نے یہ کتاب لکھی ہے - چیلنج (Challange) کا اردو اِملا "چیانج" دیکھ کر پتہ لگا کہ مصنف دکن کے رہنے والے ہیں !

یہ کتاب فلسفیانہ انداز میں لکھی گئی ہے - اس فلسفہ پر "عجمی تصوف" کا بھی رنگ چڑھا ہوا ہے - اس لئے جگہ جگہ پر کتاب کی عبارت "لفظی شیشہ گری" بن کر رہ گئی ہے -

"انبیاء کے جدا جدا ہونے سے اُن اقوام میں بھی جدائی تھی - ان کے کتب ، ان کے قبلے ، ان کے عبادات ، ان کی شریعتیں جدا جدا تھیں ، کسی کو کسی سے واسطہ نہ تھا - یہ جملہ ادیان علحدہ تھے" :- (صفحہ ۸) حالانکہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی تھا ، اور وہ "اسلام" تھا اور ہر نبی "اسلام" ہی کا مبلغ اور علمبردار تھا -

"تمام انبیاء بصورت صحابہ دربار نبوی میں حاضر تھے" (صفحہ ۱۴) اس عبارت سے تناسخ کی بو آتی ہے - سوچنے کا یہ انداز ہی غیر اسلامی ہے -

"مابہ النزاع مسئلہ یہ ہوا کہ علمائے اسلام کہتے ہیں کہ روحانی انسان خاتم النبین کے بعد آرہے ہیں - یہ اولیاء اللہ، غوث، قطب، ابدال، مجددین ، ائمہ اور محدثین ہیں - اور یہ شریعت محمدیہ کے مطیع و متبع اور "شہداء علی الناس" امام الناس ہیں - اور علمائے جماعتِ قادیان امام الناس کے حقیقی مرتبہ و درجہ سے ناواقف رہ کر اور تکوینی رازِ تخلیق کی لاعلمی سے اور مقام نبوت کی حقیقت سے بے بہرہ ہو کر اپنے اس دعوائے نبوت پر مصر ہیں جو ختم نبوت کے انکار سے نہیں بلکہ مسیح موعود نبی اللہ کے دعوے کی حیثیت سے اس کو مرزا غلام احمد صاحب کے نام پر چسپاں کرنا ضروری و لازم سمجھتے ہیں - ختم نبوت کی حیثیت سے

...ر دو فریق میں صرف "خاتم" کی لفظی بحث ہے، جو تکوینی شہادتوں سے ہر دو معنوں پر محیط ہے"...... (صفحہ ۲۱)

"ختمِ نبوت" جو کفر و ایمان کی بحث ہے اُسے "ہر دو فریق میں صرف خاتم" کی لفظی بحث کہہ کر معاملہ کی اہمیت اور سنگینی کو اس قدر ہلکا اور بے وزن بنا دینا- "دیندار انجمن کے علم و کلام" کا شاہکار ہے- اور پھر یہ تک فرما دیا کہ "خاتم کی یہ لفظی بحث تکوینی شہادتوں سے ہر دو معنوں پر محیط ہے"-

حالانکہ "ختم نبوت" کی بحث لفظی نہیں ہے- بلکہ کفر و ایمان کی بنیادی نزاع ہے- مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک ایسی "نبوت" کا دعویٰ کیا تھا، جس پر ایمان نہ لانے والے کو وہ "کافر" کہتا ہے- اس لئے نبوت کا دعوے کر کے وہ خود "مرتد" ہو گیا- اور اس کی پوری "اُمت" گمراہ کافر اور خارج از اسلام ہے-! ابو احمد دستگیر صاحب "قادیانیت" پر "فلسفہ و تصوف" کے غلاف ڈال کر، جو اس کے اصل چہرے کو چھپا دینا چاہتے ہیں، یہ ان کی نادانی اور جہالت ہے- ان کا یہ فریب چل نہیں سکتا-

کتاب میں بعض کام کی باتیں بھی ہیں- مگر مجموعی طور پر یہ کتاب "فلسفہ و تصوف" کا "مرکب عجیب" ہے-

گلِ نخستیں

از- ابوالظفر نازش رضوی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، آرٹ پیپر پر خوشنما ٹائپ، دیدہ زیب طباعت خوبصورت سرورق- ملنے کا پتہ:- مصنف سے، ۱۳۷، ملتان روڈ، لاہور-

سلطان محمود غزنوی کے بعد جو فاتحین بھی ہندوستان میں آئے وہ اپنے ساتھ فارسی زبان لائے- تقریباً نو سو سال تک ہندوستان کی سرکاری اور دفتری زبان فارسی رہی- شاہی درباروں میں فارسی شعراء کی خاطر خواہ قدر دانی ہوتی تھی مشہور ہے کہ عبد الرحیم خاں خاناں نے سفر دکن میں کئی منزلوں تک ایک شاعر کو ہر منزل پر ایک ایک لاکھ روپیہ انعام میں دیا اور شاہ جہاں نے کلیم کو چاندی میں تلوایا- یہاں کی قدر دانی کی دھوم سن کر ایران کے بعض چوٹی کے شعراء نے ہندوستان کا رخ کیا- اور عرفی، نظیری، حسن سنجری اور علی حزیں جیسے نامی گرامی شعراء تو ہندوستان کی خاک ہی کا پیوند ہو کر رہ گئے-

دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

خود ہندوستان میں امیر خسرو، فیضی، غنیمت، غنی کاشمیری، واقف لاہوری، اور غالب جیسے بلند پایہ شعراء پیدا ہوئے- جو ایران کے شعراء کے مدمقابل ہیں- کہا جاتا ہے کہ:-

"ہندوستان میں فارسی شاعری ایک ترک لاچین (امیر خسرو) سے شروع ہو کر ایک ترک ایبک (غالب) پر ختم ہو گئی"-

یہ قول کوئی شک نہیں اپنے اندر بہت وزن رکھتا ہے- مگر واقعہ یہ ہے کہ عزیز صفی پوری، شبلی نعمانی، گرامی اور اقبال جیسے شعراء کے فارسی کلام نے اس سلسلۃ الذہب میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا-

اس ہمارے دور میں یعنی اب سے چھ سات سال پہلے تک دکن میں مولوی مسعود علی محوی اور نواب ضیا یار جنگ ضیا

موجود تھے۔ جن کا فارسی کلام متقدمین کی شاعری کو آئینہ دکھلاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان بزرگوں کی شہرت دکن تک محدود رہی۔

مسلمان بادشاہوں میں بابر کی تزک اور جہانگیر کی تزک ان کے ادبی ذوق کی زندہ شہادتیں ہیں۔ اور اورنگ زیب عالمگیر کے "رقعات" تو فارسی ادب کا شاہکار ہیں۔ ہم نے اب سے تقریباً پچیس سال قبل کابل کے مجلہ "انیس" میں عالمگیر کی ایک فارسی غزل بھی دیکھی تھی۔ جسے پڑھ کر پہلی بار اس کا علم ہوا کہ :-

"اورنگ زیب عزت تخلص می کرد۔"

ہندوؤں کو بھی فارسی زبان سے خاص شغف تھا۔ جس کے ثبوت میں ٹیک چند کی "بہار عجم" اور انشائے مادھورام پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہندوؤں میں فارسی کے بعض اچھے شعراء بھی ہوئے ہیں۔ بشیشور ناتھ منور لکھنوی کے نانا کا ایک شعر ہم تک پہنچا ہے ؎

یارم بخانہ آمد و جام شراب نیست ۔۔ درحیرتم کہ صبح زمید آفتاب نیست

افسوس ہے کہ ایران نے پاک و ہند کے فارسی شعراء کے خوبیِ کلام کا خاطرخواہ اعتراف نہیں کیا۔ یہاں کے اسلوب شعرگوئی کو وہ "سبک ہندی" (Indian Style) کہتے ہیں۔

وہ جو ترک لاچین (امیر خسرو) سے فارسی شعرگوئی کا سلسلہ چلا آرہا ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ابوظفر نازش رضوی کی شاعری ہے۔ ان کے کلام میں فارسی کی "شکریت" (حلاوت) پائی جاتی ہے، زبان بھی ایرانی تیور لئے ہوئے ہے۔ اور بیان میں لطف و تاثیر بھی ہے۔ ان کے بعض شعروں پر ایران کے قدیم شاعروں کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

زشانِ سرورِ عالم مباش بیگانہ ؛؛ کہ ناشناسِ نبیؐ برطریقِ بولہبی است

حزیں مباش و بیاموز رمز عشق از من ؛؛ کہ طور من عجمی و طریق من عربی است

شرف چہ زائرِ قبرِ رسولؐ راگویم ؛؛ خرام بر فلک، و پا سرِ زمیں دارد

جہانِ زندگی بے مہر و الفت تیرہ و تار است ۔۔ چراغِ مہر و الفت در حریمِ جاں فروزاں کن

سعدی کی مشہور غزل ہے :-

؎ زعشق تابہ صبوری ہزار فرسنگ است

اس زمین میں نازش کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے :-

اگرچہ صلح بہر حال بہتر از جنگ است ؛؛ بہ معرکہ سپر انداختن ولے ننگ است

زطفلگیست ہمیں کار و شغل سربازاں ؛؛ نظر بہ قبضۂ شمشیر و گوش بر ہنگ است

مجاہد تیغ در دست و کفن بر دوش می باشد ؛؛ کہ جاں بازانِ ملّت را ازیں ایں ساز و ساماں ست

زحال زارِ گل و غنچہ کس نشد آگاہ ؏ ؛؛ کہ باغباں زچمن غافل و صبا خفت است

شدم بہ مسجد و میخانہ بارہا دیدم ؏ ؛؛ کہ رند با ہمہ بیدار و پارسا خفت است

ایں معجزہ بیں کہ زانفاسِ خلیلی ؏ ؛؛ انبار گل از آتشِ نمرود بر آید ؏

کس نمی پرسد مرا در عالم بیچارگی ؛؛ غمگساراں دوستاں، دردآشنایاں راچہ شد

قاآنی کا مشہور قصیدہ ہے:-

یا زجاناں، یا زجاں بایست دل برداشتن ؎ رسم عاشق نیست بایک دل دو دل برداشتن

اس زمین میں ابوظفر نازش کا یہ شعر کتنا معرکہ کا ہے -

سینہ وقفِ زانوئے قاتل تہِ خنجر گلو ؎ لیک نتواں از رخِ قاتل نظر برداشتن

عزیز صفی پوری کا اس زمین میں کتنا اچھا شعر ہے ؂

نو عروسے را یکے آئینہ باشد کار و بس ؎ مرد را زیباست چار آئینہ در برداشتن

تعدد ازدواج کی تائید و حمایت میں اس سے بہتر کسی کا قول نظر سے نہیں گزرا۔

درد و غمت سرشتِ من عشق تو سرنوشت من ؎ بر تو عیاں چو آئینہ ایں ہمہ خوب و زشت من

بگزر از اکسیرہا و زکیمیا بیگانہ باش ؎ گردِ راہ ساقی و خاکِ در میخانہ باش

بارقیب آں ستم آرا بہ بزار آمد و رفت ؎ صرصرِ ناز بتاراج غبار آمد و رفت

بنازِ دلبری برقِ نظر انداختی رفتی ؎ سرِ محفل بہ یک انداز ہوشم باختی رفتی

برائے کنجِ ارم گوشۂ درت ندہم ؎ من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم

قسم بہ حضرتِ یزداں کہ حور و غلماں را ؎ برائے غازہ رخ خاکِ درگہت ندہم

مسرتِ ہمہ عالم اگر بہ من بخشی ؎ بایں عطائے تو سرمایۂ غمت ندہم

بہ مے در بہار توبہ شکن ؎ من نیم آں کہ استخارہ کنم

دوش ایں حدیثِ تازہ ز ساغر شنیدہ ایم ؎ گشتیم خاک و تا لبِ جاناں رسیدہ ایم

بچپن سے اُردو کے کسی شاعر کا یہ شعر سنتے آئے ہیں ؂

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل کے ؎ لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

درِ آئینہ چو دید جمال خود آں صنم ؎ حیراں بماند و گفت جوابت نہ دیدہ ایم

جنسِ وفا بہ سایہ تاج و نگیں مجو ؎ چیزے کہ بر فلک نبود از زمیں مجو

عطا کردی مرا دردِ فراواں ؎ چہ گنجِ شائیگاں بخشیدہ رفتی

نازش رضوی کی نظموں میں ملک الشعراء بہار کا رنگ جھلکتا ہے۔ اقبال کی نظم "عقل و دل" کا ترجمہ فارسی نظم میں اس خوبی سے کیا ہے کہ "ترجمہ" نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرا رخ:-

شعورِ بندگی در زندگی بہ ؎ جبین عجز را تابندگی بہ

یہ رباعی کا وزن نہیں ہے، غالباً علامہ اقبال کے تتبع میں نازش نے قطعہ کو "رباعی" کا عنوان دیا ہے

باصد جلال و کر و فر ؎ بر تختِ سیمائے سحر (صفحہ ۳۵)

"تختِ سیمائے سحر" میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے، "تخت" کے مقابلے میں تو "اوج" موزوں تر تھا۔

ہر راز خابد نام شد ؎ ہر مصلحت ناکام شد

بشنو تقیرِ عام شد ؛ ایست وقت امتحاں
برخیز اے پورِ جواں (صفحہ ۳۶)

شروع کے تین مصرعے بے جان سے ہیں! "ہرزاژ خا بدنام شد" میں صرف لفظوں کو جوڑ دیا ہے۔ "ہر بیہودہ گو کا بدنام ہوجانا" یہ بات آخر کیا ہوئی۔؟

من صاحب عرفانم، من بندۂ یزدانم ؛ ایں نعرۂ مستانہ در بزمِ تو بیہم زن (صفحہ ۴۳)

"در بزم خود" کہنا چاہئے! اس کے علاوہ بھی شعر میں کوئی لطف نہیں ہے۔

زاغہا محوِ بد آہنگی قطار اندر قطار ؛ باغباں در موسمِ گل خوشنوایاں راچہ شد (صفحہ ۵۷)

مصرعہ ثانی شگفتہ ہے، مگر مصرعہ اولیٰ میں "محوِ بدآہنگی" نے پورے شعر کے لطف کو غارت کر دیا۔

ساغر نوش کن و جرعہ بر افلاک فشاں ؛ دُردیِ مے بسرِ زاہدِ بیباک فشاں (صفحہ ۷۰)

"فشاندن" عموماً وہاں بولا جاتا ہے جہاں بلندی سے پستی کی طرف کوئی چیز جھاڑی یا چھڑکی جائے۔ ایسے موقع پر "جرعہ" یا "پیالہ" کو آسمان کی طرف "اچھال دے" کا محل تھا۔ اور اسی کی مناسبت سے فارسی کا "امر" لانا چاہئے تھا۔ زاہد "بیباک" میں "بے باک" حشو وزائد ہے۔ "بیباکی" زاہد کی صفت نہیں ہے! ہاں واعظ و ناصح کی صفت ہوسکتی ہے۔

آں جفا کار و ہم دلِ مضطر ؛ آسماں نیز مہربانِ من است (صفحہ ۹۱)

نومشقوں کا سا شعر ہے۔

تہذیب را مجسمہ یا بے ادب بود ؛ سر تا بہ فرق معجزہ یا بوالعجب بود (صفحہ ۱۲۶)

اس شعر کی "فارسیت" بہت مشتبہ ہے! مرزا غالب نے قتیل پر جو "بوئے کچوری می آید" کی طنز کی تھی، ہم اس طنز کی جرأت نہیں کر سکتے۔

آں بے خبر کہ واقفِ آدابِ عشق نیست ؛ حقا! کہ از قبیلۂ اربابِ عشق نیست (صفحہ ۵۸)

یہ شعر نظیری کے اس مصرعہ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

؎ کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست۔

زہیم دامِ صیاد است ایمن " " ؛ " " کہ شاہیں را بلند است آشیانہ (صفحہ ۶۱)

دوسرے مصرعہ میں توارد ہوگیا ہے۔ مشہور شعر ہے۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ ؛ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس شعر میں:۔

ہر دو در فکرِ خویش مشغول اند ؛ دست با کار و دل بیار خوش است (صفحہ ۱۰)

"دست با جیب" سے شاعرانہ لطف دوبالا ہوجاتا۔

زندہ شد افسانۂ مارِ سیہ بر گنجِ حسن ؛ عکسِ زلف و رخ چو در جامِ شرابِ اندافتی (صفحہ ۱۰۲)

یہ امام بخش ناسخ لکھنوی کا رنگ ہے جسے کبھی پسند نہیں کیا گیا۔!

بہ من مرنج و ملامت مکن کہ وقتِ وداع ؛ ز راہِ رشک نہ گفتم ترا خدا حافظ (صفحہ ۹۶)

شعر اچھا ہے اور "زراہِ رشک" نے شعر میں اور لطف پیدا کر دیا۔ مگر غالب کے اس مصرعہ کا کیا جواب ہے۔

؎ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

سرنامہ پر "ھو العلی الاعلیٰ" مرقوم ہے "ھو اللہ" یا "بسم اللہ" لکھنا چاہئے تھا کہ "ھو العلی الاعلیٰ" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام کی رعایت بھی پائی جاتی ہے، اہل توحید کو یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں مخلوق کے ناموں کی رعایت یا ایہام کا پہلو روا رکھیں۔

یقین ہے کہ فارسی کا ذوق رکھنے والے گلِ نختیں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور اس کی قدر کریں گے۔

مقالہ در مسئلہ وحدت الوجود | از۔ افادات شیخ مکی رحمۃ اللہ علیہ، بہ ترتیب و تصحیح و مقدمہ و تحشیہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی استادِ عربی فارسی الہ آباد یونیورسٹی ضخامت ۳۲ صفحات

قیمت چار آنے، ملنے کا پتہ:۔ منیجر اسرار کریمی پریس، جانسین گنج، الہ آباد

شیخ مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ:۔

"بجانب الغربی فی حل مشکلات محی الدین ابن عربی"

لکھا تھا جس میں شیخ اکبر کے معترضین کے اعتراضات کے جواب دیئے تھے۔ جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے اس رسالہ کو مرتب کیا۔ کتابت کی غلطیوں کو درست فرمایا، مشکل الفاظ کی شرح کی اور ضروری حواشی لکھے:

اصل کتابچہ فارسی میں ہے اور اپنے موضوع پر خوب ہے۔ مگر یہ مسئلہ (وحدت الوجود) اس قدر پیچیدہ اور نازک ہے کہ لفظ و بیان اس کی تشریح کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے اور گفتگو و شرح و بیان میں اکثر بات اور الجھ جاتی ہے۔

شیخ محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن نازک مسائل سے بحث کی ہے ان میں بعض باتیں بہت زیادہ خطرناک ہیں اور ان کی تحریر میں کشف و معرفت کے جہاں لالہ و گل ہیں وہاں سانپ بچھو بھی لپٹے ہوئے ہیں اور ایسی جرأت کون کریگا کہ سانپ بچھوؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے پھولوں پر ہاتھ ڈال دے۔

اسلامی کردار (حصہ اوّل) | مرتبہ:۔ پروفیسر عبد العزیز ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل صدر شعبہ اُردو، اسلامیات ایم۔ اے۔ او۔ کالج لاہور، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ نذر سنز پبلیشرز، سرکلر روڈ، عقب اردو بازار، لاہور۔

چالیس احادیث فاضل مرتب نے اس انداز میں ترتیب دی ہیں کہ میٹرک سے نیچے کی جماعتوں کے لڑکے بھی انھیں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ احادیث کا ترجمہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کیا گیا ہے۔ مفہوم کی وضاحت کے لئے مختصر اشارات بھی دیئے گئے ہیں۔ اور ہر حدیث کے ساتھ گرامر کے ضروری اور آسان قاعدے بھی درج کر دیئے ہیں۔

ترجمہ کا ایک نمونہ:۔

مَنْ اَحَبَّنِی کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ

جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

مَنْ	اَحَبَّ	نِیْ	کَانَ	مَعِیْ	فِیْ	الْجَنَّۃِ
جس نے	محبت کی	مجھ سے	ہوا (وہ)	ساتھ میرے	بیچ	جنّت کے

WHOEVER LOVES ME SHALL BE WITH ME IN THE PARADISE.

قواعد

ی (میرا) واحد متکلم		ضمیر متکلم	نا (ہمارا) جمع متکلم	
کتابی	میری کتاب		کتابنا	ہماری کتاب
رَبّی	میرا پروردگار		رَبّنا	ہمارا پروردگار

مضمون کی وضاحت کے لئے کہیں کہیں اسلامی حکائیتیں بھی آگئی ہیں۔ اس انداز پر حدیث کی یہ پہلی کتاب ہے جو مرتب کی گئی ہے، عربی دانی اور کردار سازی کے لئے اس کتاب کی افادیت مسلّم ہے۔

قطعات رئیس امروہوی

مرتبہ:۔ جون ایلیا۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات مجلد، دیدہ زیب، گرد پوش کیساتھ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ذہن جدید ۲۰/۳۰۸ پرس رام پارومل بلڈنگ، پنجابی کلب، کھارادر، کراچی۔ (ٹیلیفون 37433)

جناب رئیس امروہوی کا نام ہی خود ان کا تعارف ہے۔ ہندوستان میں ان کی شہرت عالم مراہقت میں تھی۔ اس پر شباب پاکستان میں آیا۔ روزنامہ جنگ میں ان کا قطعہ ہر روز ایک لاکھ آدمیوں کی نگاہوں سے تو گزرتا ہوگا۔ ان کی یہ پبلسٹی دس سال سے مسلسل ہو رہی ہے۔ اس مدت میں انھوں نے تین ہزار کے قریب قطعات کہے ہیں۔ جن کا انتخاب ادارہ "ذہن جدید" نے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ رئیس صاحب کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو منظر عام پر آئی ہے۔ اور اب یہ نو مولود ادارہ ان کی متعدد کتابیں شائع کرے گا۔

جناب رئیس امروہوی کی قدرت کلام اور پر گوئی کا وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو یا تو حسد میں مبتلا ہو یا پھر اس کی عقل میں فتور آگیا ہو۔ وہ چاہیں تو ہر منٹ میں کم سے کم ایک شعر کہہ سکتے ہیں۔ سو سو شعر کی مثنویاں اور قصیدے انھوں نے ایک ایک نشست میں کہہ لئے ہیں۔ شعر گوئی ان کی "عادت ثانیہ" بن گئی ہے۔ اور وہ اسے اہلکاروں کے "Routine-work" کی طرح انجام دیتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ باتیں کر رہے ہیں اور کاغذ اٹھایا اور اس پر کسی وقفہ اور تامل کے بغیر "جنگ" کے لئے قطعہ لکھ دیا۔ ان کے ہزاروں اشعار تو "متاع دیگراں" بن کر رہ گئے ہیں۔

اس پر گوئی اور زود گوئی بلکہ بداہت و ارتجال کے سبب ان کے کلام کو سپاٹ اور سطحی ہونا چاہئے تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس زود گوئی کے باوجود رئیس امروہوی کے کلام میں "ایک بات" ہے، بلکہ "ایک آن" ہے، وہ "آن" جس کے بارے میں حافظ شیرازی نے فرمایا ہے۔

بندۂ طلعتِ آں باش کہ "آنے" دارد!

کسی شاعر کے دماغ کو شعر ڈھالنے کی مشین کہہ دینا اس کی "ہجو ملیح" ہے۔ مگر رئیس امروہوی کے حق میں یہ ہجو "ستائش" بن گئی ہے۔ شعر و ادب کے معاملہ میں ان کا دماغ بے شک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ مگر اس سے جو چیز ڈھل کر نکلتی ہے وہ بے جان نہیں، "جاندار" ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر شروع ہی سے ان کا دماغ زود گوئی کا عادی نہ ہو جاتا اور رئیس صاحب تعمق و تفکر سے کام لیتے تو پھر یہ دریا جو جگہ جگہ اتھلا ہو گیا ہے، اتھاہ ہوتا!

اس کتاب کا دیباچہ (گفتنی) رئیس امروہوی کے چھوٹے بھائی جون ایلیا نے اور اس کا مقدمہ ان کے دوسرے بھائی سید محمد تقی صاحب مدیر روزنامہ "جنگ" نے لکھا ہے۔ جون ایلیا ایک خوش گو شاعر ہیں مگر ان کی نثر میں ناپختگی پائی جاتی ہے۔

"جس کے متضمنات و مظاہر کی نفسی اساس دوسری ثقافتوں کی اساس سے قطعاً مختلف و متبائن تو نہیں ہے"

"نظام ثقافی کی اس اساس کارفرما کا مخصص و تمایز پاکستانی ادب اور آرٹ کے لئے فصل تمیز کا حکم رکھتا ہے"

"یہ قطعات کا صرف ایک مرتب سلسلہ ہی نہیں بلکہ پاکستان کے تمدنی انفس و اعیان کی برہانی و وجدانی توجیہہ و تعبیر بھی ہے"

یہ اندازِ بیان وجدان کے لئے کس قدر وحشتناک ہے!

رئیس امروہوی کے قطعات میں طنز و مزاح اور اصلاح کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ سماج پر حکومت اور اربابِ حکومت پر اور خود عوام پر انھوں نے طنز کی ہے۔ مگر بڑے سلیقہ اور تہذیب و ادب کے ساتھ! ہوسکتا ہے کہ خود ان کی ذات بہت کچھ اصلاح کی محتاج ہو۔ مگر ان کی کوششِ اصلاح میں خلوص ضرور پایا جاتا ہے۔ اُس کمزور بینائی والے کی طرح جسے خود تو نشانِ منزل پوری طرح نظر نہ آتا ہو۔ مگر وہ دوسروں کی رہنمائی کے لئے چراغ لئے کھڑا ہو۔

ان قطعات میں شاعر کہیں نشتر چبھو رہا ہے، کہیں چٹکی لے رہا ہے، کہیں آہستہ آہستہ تلوے سہلا رہا ہے۔ ان میں قہقہے بھی ہیں اور ہچکیاں بھی ہیں۔ زبان سلیس و سادہ بلکہ ٹکسالی ہے۔ الفاظ کے صحیح طور پر برتنے کا رئیس کو خاصہ سلیقہ ہے۔ ان چند قطعوں کو پڑھئے اور لطف لیجئے۔

جلوۂ صبح بنارس، منظرِ شام اودھ ؛ یعنی ہر دولت کراچی کی بدولت مل گئی
ہر نظر صد حسن و جلوہ ہر قدم صد رنگ و بو ؛ ہم نے پاکستان مانگا تھا سو جنت مل گئی

اگرچہ آج بظاہر عوام ہیں آزاد ؛ مگر وہی ہے حکومت کا جبر و استبداد
ہم انقلاب کی کرتے تھے آرزو کتنی ؛ یہ انقلاب ہوا' انقلاب زندہ باد

مجھے تھی فکر نہایت کہ آکے یہ دیکھوں ؛ نئے نظام میں اقبال کی جگہ کیا ہے
نئے نظام میں دیکھا تو آکے یہ دیکھا ؛ کہ قوم شکوہ، حکومت جواب شکوہ ہے

یہ بحث تھی کہ فخر کراچی ہیں کون لوگ ؛ اک رہنمائے قوم پکارا کیا کہ ہم
ایک شوخ نازنیں بھی گزرتی تھی راہ سے ؛ پردہ الٹ کے اس نے اشارہ کیا کہ ہم

غزل پڑھ رہے تھے کہیں کوئی صاحب ؛ غزل میں قیامت کے سُر تال نکلے
میں سمجھا کہ یوپی کے ہیں کوئی شاعر ؛ مگر وہ بڑودے کے قوال نکلے

پے کمیشن کی خبر پڑھ کر کسی اخبار میں ؛ گر پڑا دفتر کا اک بابو قریب چیف کورٹ
سانس جب اکھڑی تو وہ بیچارہ یہ کہنے لگا ؛ فاتحہ میں میری پڑھنا پے کمیشن کی رپورٹ

یہ کراچی سندھ کا گہوارہ انگریزی کا گھر ؛ اور پھر اردو کا مرکز، کس طرح لب کھولئے
کرلیا ہے فیصلہ بندے نے بیچ اس شہر کے ؛ نیم اُردو، نیم سندھی، نیم انگلش بولئے

اِک مہاجر کو جو گولی مار میں مسکن ملا ؛ رو کے وہ بولا کہ مجھ کو اب نہ تم آزار دو
میں کراچی چھوڑ کے جنگل میں رہ سکتا نہیں ؛ مجھ کو مت لے جاؤ گولی مار۔ گولی مار دو

ہم پاک ریڈیو سے نہیں غیر مطمئن ؛ کانوں میں نثرِ نظم کا رس گھولتا تو ہے
اَے قوم! اس کی نغمہ سرائی کی قدر کر ؛ مانا کہ بے سُرا ہے مگر بولتا تو ہے

بڑھ رہا ہے قوم کے بچوں میں ذوقِ شاعری ؛ جس طرح سے شعر گوئی ان کا قومی فرض ہے
ہے یہی عالم تو ہر مولود پیدائش کے ساتھ ؛ سانس لیتے ہی پکارے گا کہ مطلع عرض ہے

آنگن میں رشیدہ کے جو طوفان اُمنڈ آیا ؛ کہنے لگیں رو رو کے یہ نورن سے بچاری
دریائے لیاری کے لئے مرتی تھی کم بخت ؛ دریائے لیاری کا مزہ دیکھ لیا ری!

یہ خوشد امن مری فرما رہی تھیں ؛ کہ امریکہ کی ایجادیں نئی ہیں ؎
کہا میں نے اَے بیگم کی امّاں ؛ اِک اٹیم بم کی موجد آپ بھی ہیں

ہوئی پوسٹ مینوں کی ہڑتال اگر ؛ تو بندے سے کیا خاک لیجائے گی
میں شاعر ہوں قاصد ہیں میرے ہزار ؛ نسیمِ سحر ڈاک لے جائے گی ؎

ہند والوں نے ترقی کی تو اس حد تک رئیسؔ ؛ سخت محنت سے اُگا ئے ساگ آلو کھیت میں
واہ رے! حکام پاکستان یہ ان کا کمال ؛ بو دیئے ہیں سیکڑوں انسان لالو کھیت میں

گر یہی حکام راشن کی عنایت ہے رئیسؔ ؛ محوِ حیرت ہوں کہ ہم سب کیا سے کیا ہو جائینگے
ترک گندم، ترک جو، ترکِ شکر، ترک برنج ؛ شہر والے رفتہ رفتہ اولیا ہو جائیں گے

کل رات اِک قیامتِ کبریٰ گزر گئی ؛ خفتہ نصیب ڈر سے نہ سوئے تمام رات
کوسا مہاجرین نے بادل کو رات بھر ؛ بادل مہاجرین پہ روئے تمام رات

باوجود انقلاباتِ جہاں ؎ ؛ تخت اور تاج آج بھی خوش بخت ہے
تخت کس صورت سے اُلٹے گا کوئی ؛ "تخت" جس صورت سے الٹو تخت ہے

ایک رشوت خوار نے یہ اپنے ساتھی سے کہا ؛ کارِ سرکاری میں تو جاہل بھی تھا ناداں بھی تھا
تو ہی غافل چند پیسوں پر قناعت کر گیا ؛ ورنہ رشوت میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

اللہ اللہ! خواتینِ کراچی کا جلوس ؛ واہ کیا منظرِ دلچسپ و دلیرانہ تھا
مرد سہمے ہوئے سمٹے ہوئے آتے تھے نظر ؛ اور انداز خواتین کا مردانہ تھا

آرزو آخر کریں کس چیز کی ؎ ؛ ذوق و شوقِ آرزو جاتا رہا۔
دو زبانیں ہو گئیں اس قوم کی ؛ اعتبارِ گفتگو جاتا رہا ؎

شکر رنجی ہے پاکستان سے کیا ؛ خفا ہے مصر ادھر اور چین ادھر تلخ

قیامت ہے کہ چلتی اتنی بے کیف ؛ تعجب ہے کہ مصری اس قدر تلخ

کس کے لئے ہے اے نگہ شوقِ اضطراب ؛ کس کے فراق میں دلِ مضطر تپاں ہے تو

مدت سے میرا چاند دکھائی نہیں دیا ؛ اے رویتِ ہلال کمیٹی کہاں ہے تو

اس مجموعہ میں بعض ایسے قطعات بھی شامل ہوئے ہیں جو چھانٹ دینے کے قابل تھے۔ مثلاً یہ قطعہ :-

نوچ کر کیوں رہنمائے قوم کو کھاتی ہے قوم ؛ رہنمائے قوم بریانی کا بکرا تو نہیں

ضیغمِ اسلام کو قربانیوں کا واسطہ ؛ ضیغمِ اسلام قربانی کا بکرا تو نہیں (صفحہ ۶۷)

یہ ایک اچھا خاصہ قطعہ ہے :-

اگر ہے کوششِ دیدار دلربا بھی گناہ ؛ تو نمبر بندۂ درگاہ کے گناہوں کی

قدم قدم پہ تصادم ہے پردہ داروں سے ؛ خطا معاف الٰہی مری نگاہوں کی تا (صفحہ ۱۱۵)

مگر اس میں "دلربا" کی جگہ کوئی اور موزوں لفظ آنا چاہئے تھا۔ شاعری میں لفظوں ہی کا سارا کھیل ہے۔ بعض اوقات ایک "لفظ" کی کھٹک کے سبب پورا شعر رباعی یا قطعہ وجدان کو کھٹکنے لگتا ہے۔

بتاؤں کیا کہ پاکستان آکر ؛ ترقی شیخ جی نے کی تو کیا کی

بظاہر بلبش دکم کی ہے یہ میزان ؛ گھٹا کی عقل گو داڑھی بڑھا کی (صفحہ ۱۱۹)

اس قطعہ کا تیسرا مصرعہ بہت کمزور اور غیر متوازن ہے۔

اپنے آقائے کہن کے گیت گا ؛ اے فرنگی کے غلام خانہ زاد

سازِ یورپ پر مسلسل رقص کر ؛ زندہ باد انگریز انگلش زندہ باد

"مرحبا! انگریز" ہوتا "تو زندہ باد" کی تکرار کی نوبت نہ آتی!

یہ جلوے نہیں ہیں مگر اک فریب ؛ یہ غمزے نہیں ہیں خرافات ہیں

تعجب سے سیمیں بروں کو نہ دیکھ ؛ یہ سب ریشمی پارچہ جات ہیں (صفحہ ۱۴۰)

اس قطعہ میں "سیمیں بر" کی جمع (سیمیں بروں) کھٹکتی ہے۔

اشک کو سیلِ آرزو ٹھہرا ؛ غم کو سرمایۂ حیات بنا

شکوہ سنجِ حیات غم کیوں ہے ؛ غم کو شادی کی کائنات بنا (صفحہ ۱۴۳)

سپاٹ اور بے مزہ قطعہ! "کو شادی کی کائنات" میں "ک" کی تکرار نے خاصہ تنافر پیدا کر دیا۔ تھوڑی بہت کور کسر تو ہر بڑے سے بڑے انسان کے کام میں رہ ہی جاتی ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی۔! انصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ رئیس امروہوی کے قطعات نے اردو شاعری میں اضافہ کیا ہے، "ادارۂ ذہن جدید" اس مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

علہ بدایوں میں ایک صاحب تھے علی حاتم وہ قریب قریب اسی انداز کی رباعیاں کہا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام گمنامی کی نذر ہو گیا۔ ان کی ایک رباعی کے تین مصرعے ذہن میں رہ گئے ہیں۔ اس میں تلمیحی اشارہ یہ ہے کہ بدایوں کے قریب ایک بستی شیخوپور ہے۔ جس کے زمیندار اور رؤسا فریدی شیخ ہیں، ان "شیوخ" کو سرکار انگریزی سے خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات ملے۔ اس پر علی حاتم نے کہا ؂

.... مجبور ہو جائے گا ؛ ہر تودۂ ریگ طور ہو جائیگا ؛ بھرمار اگر یہی خطابوں کی رہی ؛ شیخوپورہ، خانپور ہو جائیگا

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد (۹) ماهنامه نمبر۷

فاران

اکتوبر ۱۹۵۷ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران ۔ کیمبل اسٹریٹ ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی ایک تقریر میں بڑی جچی تُلی اور سچی بات کہی کہ ــــــــــــ

"پاکستان کی تمام سیاسی ٹولیوں میں "قدرِ مشترک" حصولِ اقتدار کی ہوس ہے۔ اور اس معاملہ میں انھوں نے اپنے استاد انگریزوں کو بھی منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ــــــــ"

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے وقار و عزت کو ان طالع آزما سیاسی لیڈروں نے فٹ بال کی گنید بنا رکھا ہے۔ جس کو جتنا بھی موقعہ ملا ہے اُس نے اپنے ذاتی اغراض کی خاطر پاکستان کے وقار کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی! برسوں سے حصولِ اقتدار کی اس جنگ کا چکر چل رہا ہے۔ حالات بگڑتے بگڑتے اب توبت یہاں تک آن پہونچی ہے۔ کہ پاکستان کے کھلے ہوئے دشمنوں نے طاقتوں کے توازن کے درمیان "پاسنگ" کی حیثیت اختیار کرلی ہے، اور آج پاکستانی سیاست میں پاکستان کے اِن دشمنوں کو وزن حاصل ہوگیا ہے۔ یہ "نیشنل لیڈر" چونکہ اپنا ایک متعین مقصد اور خاص نظریئے رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی سیاسی پارٹی سے بھی ساز باز کرتے وقت اپنے مقاصد اور سیاسی نظریوں سے غافل نہیں رہتے پاکستان کی دوسری پولٹیکل پارٹیوں کے خود غرض لیڈران "نیشنلسٹوں" کو خریدیں گے تو کیا، بلکہ ان کے "پاسنگ" کی قیمت پر وہ خود ہی بک جائیں گے۔ اس سودے بازی اور مول تول میں انھیں کامیابی ہو بھی رہی ہے۔

یہ نیشنل پارٹی   بظاہر کمزور اور بے اثر دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے۔ کہ پاکستان کے عوام کی حمایت وتائید اور پشت پناہی اِس "نوزائیدہ پارٹی" کو حاصل نہیں ہے۔ مگر یہ جماعت اتنی بے اثر بھی نہیں ہے۔ جتنا کمزور و بے اثر اسے سمجھا جارہا ہے۔ (۱) روس کے درپردہ اشارات (۲) بھارت کے نظریاتی مقاصد کا پرتو (۳) مشرقی پاکستان کے مہاسبھائی ہندؤں کے تخریبی عزائم (۴) پاکستان کے صوبہ پرست اور اسلامی نظریوں سے متوحش ــــــــ افراد کا تعاون اور

سے بڑھ کر (۵) پاکستان کے "قصرِ ایوان" کا ایمار ——— یہ وہ قوتیں اور سازشیں ہیں۔ جن کی پُشت پناہی "نیشنل عوامی پارٹی" کو حاصل ہے۔ یہ لوگ بیشک مٹھی بھر ہیں مگر زیادہ قوت کی ضرورت "تعمیر" کیلئے درکار ہوتی ہے، "تخریب" کے لئے تھوڑی سی قوت بھی بہت ہے۔ ایک ذرا سی چنگاری خرمنوں کو جلا کر خاکستر بنا سکتی ہے، کشتی میں ذرا سا چھید کشتی کو ڈبونے کے لئے کافی ہے! ڈائنامیٹ کی تھوڑی سی مقدار بڑی بڑی عمارتوں کو بھک سے اڑا دیتی ہے۔

مسلم لیگ نے کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے حالات کو بہت کچھ بگاڑا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے کئی سال تک اقتدار اس جماعت کے ہاتھوں میں رہا۔ مسلم لیگ کے ارباب کار اگر ایثار، قربانی اور ہوش و فراست سے کام لیتے تو پاکستان کو یہ برے دن کاہیکو دیکھنے پڑتے مگر ....

عیب مے جملہ گفتی ہنرش نیز بگو

یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے قول و عمل سے نہ سہی کم سے کم زبان و قلم سے تو اسلامی نظریوں کی حمایت کرتی رہی ہے۔ یہ اذیت کا شرف تو "عوامی لیگ" ہی کو پاکستان میں حاصل ہوا ہے کہ اس نے کھل کر "اسلامی دستور" کی مخالفت کی ہے۔ سہروردی صاحب کی تقریریں آئے دن اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ ان حضرت کے منہ سے "اسلام" کا نام شاذ و نادر ہی نکلتا ہے۔ سہروردی صاحب بیچارے بھی کیا کریں اپنے رجحان مزاج اور طبیعت کو وہ بدل بھی تو نہیں سکتے۔ جس چیز سے انھیں لگاؤ اور محبت ہی نہیں ہے اُس کا اظہار اُن کی زبان سے ہو تو کیونکر ہو۔ برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ (الاناء یترشح بما فیہ) یہ کیسے ممکن ہے کہ برتن میں ہو تو تیل اور ٹپکنے لگے دودھ! ببول کے درخت سے کانٹے ہی نکلیں گے۔ لالہ و گل تو نمودار ہونے سے رہے۔!

جو لیڈر اپنی جماعت (عوامی مسلم لیگ) کے نام سے لفظ "مسلم" کو خارج کر سکتا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ اس کے سیاسی اور مذہبی رجحانات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کا کیا طریق فکر اور کردار ہونا چاہیئے اسلام کی فلاح و بہبود کے لئے وہ کیا کر سکتا ہے؟

جناب شہید سہروردی صاحب کی بیباکی اور جرأت کا بہت شہرہ سُنا تھا۔ مگر پچھلے دنوں کے واقعات نے عوام کی اس "خوش فہمی" کو بھی رفع کر دیا اور عوام و خواص سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت کتنے پانیوں میں ہیں! وزارت اعظمیٰ ان کو اس قدر عزیز ہے کہ اس کی خاطر وہ پست سے پست تر سطح تک اتر سکتے ہیں۔ جب تک انھیں منصب نہیں ملا تھا وہ بہت دبنگ تھے مگر کرسیٔ اقتدار پر براجمان ہوتے ہی ان میں طرح طرح کی مصلحت کوشیاں اور کمزوریاں آگئیں! اب وہ ہر قیمت پر اپنی کرسی کی صحیح سلامتی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے انھیں چاہے اپنے وقار و خودداری کی مسلسل قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں! اسلام کی سربلندی کی تو ان کی ذات سے کبھی امید تھی ہی نہیں۔ ان کی ہوسِ اقتدار سے اب یہ خطرہ ہو چلا ہے کہ "جمہوری اقدار" کی بھی وہ خاطر خواہ حفاظت نہ کر سکیں گے۔ اوپر سے ان پر دباؤ پڑتا ہے تو وہ اس کی مقاومت نہیں کر سکتے۔ بلکہ دب اور جھک جاتے ہیں۔ اور یہ کمزوری ان میں عہدے کے لالچ نے پیدا کی ہے! سنگ خارا میں جب نرمی اور لچک پیدا ہو جائے تو کسی عمارت کے لئے اس کا ستون بننا خطرے سے خالی نہیں۔

عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے گٹھ جوڑ نے "جداگانہ انتخاب" کو رد اور "مخلوط انتخاب" کو منظور کر کے ملک و ملت کو جو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ہی سے پاکستان کے دشمنوں کو ابھرنے اور پر پرزے نکالنے کا موقع ملا ہے۔

نیا شگوفہ

مغربی پاکستان کے صوبوں کو توڑ کر "ون یونٹ" جن بڑے لوگوں نے بنایا تھا۔ ان کے پیش نظر کچھ سیاسی مقاصد اور ذاتی اغراض تھے! حکومت کی طرف سے "ون یونٹ" کا کتنا پر جوش بلکہ طوفانی پروپیگنڈا ہوا ہے۔

شاعروں سے "ون یونٹ" کی شان میں قصیدے پڑھوائے گئے۔ اہل صحافت نے اس "نسخۂ کیمیا" کو طرح طرح سے سراہا کہ اس کے وجود میں آتے ہی صوبہ پرستی اور نسل و رنگ کے تمام تعصبات مٹ جائیں گے اور "ون یونٹ" وہ وہ کرامتیں دکھائے گا کہ "الٰہ دین کے چراغ" سے بھی ایسی عجیب و غریب باتیں ظہور میں نہ آئی ہوں گی!

"ون یونٹ" کے بارے میں عوام سے کوئی استصواب نہیں کیا گیا، اوپر کے کچھ لوگوں کے ذہن میں ایک اسکیم آئی، اور اسے انہوں نے نافذ کرکے چھوڑا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" کس کی مجال تھی جو اس سے سرتابی کرتا! جن دردمندان ملک و ملت نے زبان کھولی بھی تو ان کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی۔

"ون یونٹ" بنا، پچھلے جمے جمائے نظام کو بدلا گیا۔ دفاتر اور محکموں میں ردوبدل ہوا۔ ہزاروں اہلکاروں کے عملہ کو ادھر سے ادھر جانا پڑا۔ راتوں رات نئی نئی عمارتیں بن کر تیار ہوئیں۔ اور یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہوگیا، اس میں کروڑوں روپیہ حکومت کو صرف کرنا پڑا۔ جب یہ سب کچھ ہوچکا، "ون یونٹ" چل بھی نکلا، پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کی جگہ لوگ خطوں کے پتوں پر "مغربی پاکستان" لکھنے لگے۔ اور علاقائی تقسیم کے تصورات "ون یونٹ" کی وحدت میں ضم ہونے لگے ———— تو

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

کا فتنہ اچانک ظہور میں آیا۔ اور ری پبلکن پارٹی نے محض اپنی کرسیوں کو بچانے کے لئے نیشنل پارٹی سے ساز باز کرکے "ون یونٹ" کے توڑے جانے کی تجویز اسمبلی میں منظور کرادی!

صوبے قائم بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ ان کو توڑا بھی جاسکتا ہے۔ کہ پاکستان کی صوبجاتی حدبندی کفر و ایمان کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ تبدیلیاں "وحی" کی بناء پر عمل میں آئی ہیں۔ ملک کے مفاد اور نظم و نسق کی بہتری کی خاطر صوبے ملائے بھی جاسکتے ہیں۔ کسی نئے پلان کے مطابق ان کی تشکیل جدید بھی ہوسکتی ہے۔ حدود ارضی کو گھٹایا اور بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ "ون یونٹ" کے بارے میں یہ مخالفانہ رویہ کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ اس بنے بنائے محل کو کیوں ڈھایا گیا؟ ایک چیز جو پہلے "تریاق" بتائی جارہی تھی وہ آن کی آن میں "زہر" کیسے بن گئی!

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ ری پبلکن پارٹی کو اسمبلی میں شکست سے بچنے کے لئے چند ووٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اس نے نیشنل عوامی پارٹی سے ساز باز کی۔ نیشنل پارٹی کے لیڈر چونکہ اپنے مقاصد میں مخلص ہیں۔ اس لئے انہوں نے تجارت کے لائسنسوں اور پرمٹوں یا عہدوں کی سودے بازی نہیں کی بلکہ اپنے "سیاسی نظریہ" کی کامیابی اس عنایت کی قیمت ٹھہرایا۔ ری پبلکن پارٹی کے سامنے حصول اقتدار کے سوا اور کوئی نظریہ اور مقصد نہیں ہے۔ اس لئے اس نے "نیشنل" پارٹی کی شرط کو مان لیا اور "ون یونٹ" کے خاص دارالخلافہ میں اس کے توڑنے جانے کی تجویز کثرت آراء سے پاس ہوگئی!

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ہم مانتے ہیں کہ "ون یونٹ" بنائے جانے میں جو عجلت اور شدت اختیار کی گئی تھی وہ نامناسب تھی۔ اور اس کے بنانے والوں کی نیتیں بخیر نہ تھیں، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ "ون یونٹ" میں شر کے ساتھ خیر کا عنصر بھی موجود تھا۔ اس تناسب کا تعین دشوار ہے کہ شر اور خیر میں کس کا کیا تناسب تھا۔ لیکن "ون یونٹ" کا نظم و نسق اچھے ہاتھوں میں اگر آجاتا تو پاکستان

کی وحدت و سالمیت کے لئے یہ بہت مفید ثابت ہوتا۔ "وحدت" تقسیم سے برحال اچھی ہے۔!

مگر "ون یونٹ" توڑے جانے کے منصوبے ہیں "خالص شر" پایا جاتا ہے۔ "خیر" کا یہاں دور دور تپا نہیں! چنانچہ اس کے نتائج کا ظہور شروع ہوگیا ہے ——— بعض والیان ریاست اپنی ریاستوں کے استقلال کا مطالبہ کر رہے ہیں ——— بھاولپور کے بعض عمایدنے بھاولپور کو خود مختار صوبہ بنانے کا مطالبہ پیش کر دیا ہے ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "پختونستان" کے پاکستان کش مطالبہ میں اس سے جان پڑ گئی ہے ——— بلوچستان میں عبدالصمد اچکزئی جیسے اسلام دشمن لیڈروں نے صوبجاتی تعصب کو جو بھڑکایا تھا اُن شعلوں کو اس تجویز نے اور ہوا دی ہے!

مانا کہ صدر مملکت اور وزیر اعظم نے "ون یونٹ" توڑے جانے کے خلاف اپنی رائے اور رجحان کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر اس کا قطعی فیصلہ تو پاکستان کی مرکزی اسمبلی ہی کر سکتی ہے۔! کون کہہ سکتا ہے کہ مرکزی اسمبلی کے اجلاس منعقد ہونے تک یہ سیاسی شعبدہ گر کیا موقف اختیار کر سکتے ہیں۔ اور خود اسمبلی ہیں "توڑ جوڑ" کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے "ون یونٹ" کی شکست نہ بھی ہوئی تو بھی مغربی پاکستان اسمبلی کی اس تجویز نے صوبائیت اور "تفریق" کا جو جذبہ ابھار دیا ہے۔ اس کی تلافی کس طرح ہوگی!

ہمیں یقین نہیں آتا کہ عالم بالا (؟) کے جس ایماء سے ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی ہے مستقبل میں وہ "ایماء" اس پارٹی کی پشت پناہی سے دست کش ہو جائے گا۔ "ری پبلکن پارٹی" آمریت کی آرزوؤں اور ان منصوبوں کا سب سے بڑا مظہر اور آلہ کار ہے۔ اس پارٹی کا کوئی منشور اور اصول نہیں۔ اس کے سامنے کوئی پروگرام نہیں۔ ہاں: اس کے پاس حصول اقتدار کی ہوسناکیاں ہیں اور اس کے لئے وہ ہر بے عنوانی دھاندلی اور فریب کاری کے لئے تیار ہے۔ یہ اپنے اقتدار کی بقاء و استحکام کی خاطر ہر پارٹی سے ساز باز کر سکتی ہے ہر نعرے (slogan) کا ساتھ دے سکتی ہے اور ہر اصول کو توڑ سکتی ہے۔ اس پارٹی کی آخر دم تک یہ کوشش اور تگ و دو رہے گی کہ کسی نہ کسی طرح "انتخابات" کی بلا اُس کے سر سے ٹل جائے۔ اور اگر "انتخابات" اس کے ٹالے نہ ٹل سکیں تو پھر "انتخابات" میں اپنے جاہ و اقتدار کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کرے گی۔

"ری پبلکن پارٹی" نے اپنی حکومت میں وزیروں اور نائب وزیروں کی جو کھیپ جمع کی ہے۔ اور جس میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس سے اس جماعت کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! کیا اس کردار اور ذہنیت کے لوگ اپنے دور اقتدار میں "انتخاب" خیر و خوبی کے ساتھ ہو جانے دیں گے۔!

"حرفِ آخر" وہ کرسی نشین جن کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ قوم کی تائید انھیں حاصل نہیں ہے۔ اور انتخابات میں ان کے اقتدار کے لئے سو فیصدی خطرہ موجود ہے۔ لہذا یہ لوگ ملک کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات کی آڑ لے کر یا کسی دوسرے خلفشار کا بہانہ بنا کر کیا عجب ہے کہ کسی "جرأت آزما اقدام" سے کام لیں۔ اور اس طرح وقت کے وقت سب کچھ تیاری ہونے کے بعد "انتخابات" کھٹائی میں پڑ جائیں! خدا کرے ہمارا یہ قیاس اور اندیشہ غلط ثابت ہو۔ مگر یہ اندیشے بے بنیاد نہیں ہیں! قوم کو مستقبل کے خطرات سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ اور اس مزاج، کردار اور ذہنیت کے "بڑے آدمیوں" کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھنی چاہیئے!

تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے۔ جو ابھی پیش کیا گیا ہے۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب اور خان

عبدالغفار خان دانستہ میدان سیاست میں لائے گئے ہیں۔ اور اس طرح ان کے لانے والوں کو "پختونستان" اور پٹھان قوم کی سربلندی کے نام پر اپنی پوزیشن کے لئے طاقت فراہم کرنا مقصود ہے۔ یہ "خان برادران" اسلام اور پاکستان کے بارے میں جو تصورات اور نظریئے رکھتے ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کے سیاسی معتقدات اور نظریوں کا ساتھی اسلام اور پاکستان کا مخلص ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو "پاکستان" کی مخالفت میں پیشقدمی اور ساور کرسے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ اور پاکستان کا انتشار اور اضطراب جن کی تمناؤں کے عین موافق ہے۔ اور جن کے دل کی دھڑکنیں پنڈت نہرو کی تمناؤں سے ہم آہنگ ہیں۔

حالات انتہائی افسوس ناک ہیں، مطلع بہت زیادہ ابرآلود ہے۔ خطرات کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ ایک ایک شعبہ فکر و عمل میں ابتری اور انتشار پایا جاتا ہے۔ جن سے تعمیر اور اصلاح حال کی توقع تھی۔ وہ اپنی دنیا بنانے اور اپنی کرسیاں سنبھالنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ پاکستان "خوان یغما" بنا ہوا ہے جس کے جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لے بھاگتا ہے۔ نہ جانے کتنے بڑے بڑے آدمیوں کے کھاتے انگلستان اور امریکہ کے بنکوں میں کھلے ہوئے ہیں۔ رشوت کا کاروبار زوروں پر ہے بڑے بڑے ذمہ دار لوگ اپنی پارٹیوں کے نام پر لاکھوں روپیہ کے چندے وصول کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے پرمٹوں اور لائسنسوں کی باقاعدہ سودے بازی ہوتی ہے۔ بین الاقوامی دنیا میں ہماری ساکھ روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری حق بات کا بھی دنیا میں کوئی وزن نہیں اور ہمارے حریفوں اور مخالفوں کی ناحق باتوں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔

حالات لاکھ ابتر و خراب سہی مگر مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایمان اور ناامیدی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ مایوسی تو کافروں کو زیب دیتی ہے۔ جو لوگ خدائے حیّ و قیوم کی عبادت کرتے ہوں وہ مایوس ہو ہی نہیں سکتے

تراچہ باک خدائے کہ داشتی داری

مگر صرف "پرامید" ہونے سے بھی عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی۔ امیدیں اور آرزوئیں قوت عمل کے بل پر پوری ہوا کرتی ہیں۔ حرکت میں برکت ہے۔ اس کارگاہ عمل میں اللہ تعالےٰ کی مشیت کا سب سے بڑا تقاضا۔ بلکہ ایمار یہ ہے کہ انسان ہر لفس مصروف عمل رہے۔ قرآن پاک میں دو ٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے۔ کہ جو قوم خود اپنی حالت کو نہیں بدلتی اللہ تعالےٰ بھی اس کے حالات کو نہیں بدلتا۔!

پاکستان کے حالات صرف تمنائیں کرنے اور دعائیں مانگنے سے نہیں بدلیں گے۔ دعا کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر دعا کے ساتھ ساتھ عمل و حرکت کی بھی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو قوم کو افراد کے کردار و عمل کا جائزہ لینا چاہیئے۔ کس نے کیا پارٹ ادا کیا ہے؟ جو افراد اپنے اعمال میں غیر مخلص ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کو معاشرہ میں کوئی عزت کا مقام اور منصب ہرگز نہیں ملنا چاہیئے۔ فساد و ابتری کی اصل و بنیاد ہی یہ ہے کہ مشتبہ کردار کے لوگوں اور غیر مخلص افراد کو قوم گوارا کر لیتی ہے۔ بلکہ ان کو منصب و اعزاز سونپے جانے پر بھی خاطر خواہ احتجاج نہیں کیا جاتا۔ اس چیز نے ناپسندیدہ افراد کی ہمتوں کو بڑھا دیا ہے۔ اور اس کردار کے لوگوں کو اس کا اطمینان رہتا ہے کہ وہ جب بھی چاہیں گے۔ قوم کو کوئی چلتا ہوا slogan دے کر اپنے لئے "زندہ باد" کے نعرے بلند کرالیں گے۔!

قوم نے دس سال کی اس طویل مدت میں مختلف جماعتوں اور لیڈروں کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کھوٹے اور کھرے پرکھے جا چکے ہیں۔ عوام اچھی طرح جان چکے ہیں کہ کس کے کیا عزائم اور احوال ہیں۔ اخلاص کہاں ہے۔ اور اغراض کا بندہ کون ہے؟ کس پارٹی کے پاس کیا پروگرام ہے۔ اور کون جماعت اپنے اصول پر قائم رہی ہے۔ اور کس پارٹی نے اپنے اصول بدلے ہیں۔؟

قوم اگر مخلص، خداترس، ایثار پیشہ اور نیک افراد کی قیادت قبول کر لے۔ تو ملک کے حالات کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ پاکستان میں انقلاب جمہوریت کی راہ سے آئے گا۔ یہ راہ اگرچہ طویل ہے مگر سلامتی کی راہ ہے!

وہ حکومت جس کے ارباب اقتدار کے حوصلوں میں "آمریت" کی آمیزش ہو گئی ہو، وہاں کے "بڑے لوگ" طبعی طور پر "جمہوریت" کے نام سے گھبراتے ہیں۔ پاکستان کے عوام بھی اسی افسوسناک صورتِ حال سے دوچار ہیں، عوام کی جیت اس میں ہے کہ وہ آئینی دباؤ کے ذریعہ ایسی صورت پیدا کر دیں۔ کہ کسی کے لئے بھی جمہوری تقاضوں سے گریز کا کوئی چور راستہ باقی نہ رہ جائے!

پاکستان میں جلد سے جلد انتخابات کا ہونا جمہوریت کی سب سے پہلی فتح ہوگی۔ یہ مانا کہ پہلے انتخابات میں پسندیدہ افراد بہت کم تعداد میں آئیں گے۔ مگر ملک میں جمہوریت کی داغ بیل تو پڑ جائے گی۔ اور "انقلابی کونسل" کے خواب دیکھنے والوں کی ہمتیں تو پست ہو جائیں گی! اگر پاکستان میں کوئی "جمال ناصر" جیسا مفسد اور ظالم پیدا نہ ہو گیا۔ اور یہاں کے حالات نارمل (NORMAL) رہے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ تیسرے الیکشن میں ملک کی زمام کار "نیک لوگوں" کے ہاتھ میں ہوگی!

حالات کا بدلنا عوام کی ہمت اور مردم شناسی پر موقوف ہے۔ انہوں نے "انتخابات" میں اگر پسندیدہ کردار کے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیا تو پھر پستیوں کو بلند ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ یہ ابر آلود مطلع دیکھتے ہی دیکھتے نکھر جائے گا!

تاریخ بتاتی ہے کہ بنو امیہ نے حالات کو کس قدر خراب کر دیا تھا۔ مگر صرف حضرت عمر ابن عبدالعزیز رض کے تخت حکومت پر آجانے سے زمین و آسمان ہی بدل گئے۔ اور دنیا نے ایک بار پھر خلافت راشدہ کی بہار اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ نبوت بے شک ختم کر دی گئی ہے۔ اور صحابیت کا شرف بھی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر کسی اور شرف، خوبی اور وصف و کمال پر قدغن نہیں لگائی گئی۔ اللہ تعالےٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا خزانہ کھلا ہوا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اندھیرے بہت پھیل چکے۔ اب ان کے سمٹنے کا وقت آ رہا ہے۔ اُجالے بہت دبے دبے رہے اب ان کے پھیلنے اور غالب ہو جانے کی گھڑی قریب ہے۔ حق و باطل کے درمیان کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ باطل نے بہت کچھ پھریرے اڑا لئے۔ اب حق کا دورہ شروع ہونے والا ہے۔ اسی صبح کے

طلوع کا سب کو انتظار ہے۔ دنیا انشاء اللہ دیکھ لے گی کہ اللہ کے نیک بندوں کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ اپنے نفس کی لذت و کبریائی میں نہیں بلکہ اللہ کی رضا، انسانیت کی بھلائی اور عوام کی فلاح و بہبود میں ۔۔۔ صرف کرتے ہیں۔

ماہر القادری
۲۷ ستمبر ۱۹۵۷ء

محمد اصغر شیخ مرحوم (مظفر آباد آزاد کشمیر)

روحانی بیماریاں

بدن کی طرح روح بھی بیمار ہوتی ہے۔ روح کی بیماریوں کا مرکز دل ہے۔ فِی قُلُوبِہِم مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے) فَیَطمَعَ الَّذِی فِی قَلبِہٖ مَرَضٌ (پھر لالچ کرے، جس کے دل میں کوئی روگ ہے) وَلِیَقُولَ الَّذِینَ فِی قُلُوبِہِم مَّرَضٌ (اور تاکہ کہیں وہ لوگ جن کے دل میں روگ ہے) روحانی امراض کی ایک مثال خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِہِم (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے) طُبِعَ عَلٰی قُلُوبِہِم (ترجمہ: پھر مہر لگ گئی ان کے دلوں پر) عَلٰی قُلُوبٍ اَقفَالُہَا (ترجمہ: ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں) تَعمَی القُلُوبُ الَّتِی فِی الصُّدُورِ (ترجمہ: سینوں میں دل اندھے ہوجاتے ہیں) رَانَ عَلٰی قُلُوبِہِم (ترجمہ: زنگ چھا گیا ہے ان کے دلوں پر) فَوَیلٌ لِّلقٰسِیَۃِ قُلُوبُہُم (ترجمہ: سو خرابی ہے ان کے لئے جن کے دل سخت ہیں) کَذٰلِکَ یَطبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلبِ مُتَکَبِّرٍ (ترجمہ: اسی طرح مہر کردیتا ہے اللہ ہر دل پر غرور اور سرکش پر) یعنی دلوں پر مہر لگ جانی۔ ان پر تالا لگ دیا جانا، ان کا اندھا، زنگ آلودہ اور سیاہ ہونا، یا دل کا متکبر و جبار بن جانا وغیرہ۔ روحانی بیماریوں کی اہمیت کے پیش نظر ان کے علاج کے لئے اطبا کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ (ترجمہ: پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر) اپنے پاس سے ہی نسخہ ہدایت دیتا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ القُرْاٰنِ مَا ہُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (ترجمہ: اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے مرض دور ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے) شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُورِ (ترجمہ: اور شفا دلوں کے روگ کی) ہُوَ لِلَّذِینَ اٰمَنُوا ہُدًی وَّشِفَاءٌ (ترجمہ: یہ ایمان والوں کے لئے ہدایت ہے اور شفا ہے) اطباء کو حکم ہوتا ہے کہ مفت علاج کریں اور کسی مریض سے اپنی فیس نسخہ، دوائی کی قیمت وصول نہ کریں لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا (ترجمہ: میں نہیں مانگتا تم سے کچھ مال) وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ (ترجمہ: اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کسی قسم کا اجر) اَمْ تَسْئَلُہُمْ اَجْرًا (ترجمہ: کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ بدلہ) لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا (ترجمہ: میں نہیں مانگتا اس پر کوئی بدلہ)

اس قدر مراعات و احتیاط کے باوجود اعداد و شمار اطبا کی زبانی ہی معلوم ہوئے ہیں کہ صحتیاب ہونے والوں کی اوسط تعداد بہت ہی کم ہے۔ یہ قلیل تعداد بے حد تعجب خیز ہے۔ لیکن جب آپ اس کے وجوہات پر غور فرمائیں گے تو آپ کا استعجاب رفع ہوجائے گا۔

(الف) مریض کو بیماری کا احساس قطعاً نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے تئیں تندرست خیال کرتا ہے۔ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثٰرِہِمْ مُّہْتَدُوْنَ (ترجمہ: ہم نے پایا اپنے باپ داداؤں کو ایک راہ پر اور ہم انہیں کے قدموں پر پھر ہیں راہ پائے ہوئے۔)

(ب) مریض الٹا روحانی طبیب کو بیمار بتلاتا ہے قُلْتُمْ مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ (ترجمہ: کیا نہیں اتاری اللہ نے کوئی چیز — تم تو بڑے بہکاوے میں پڑے ہوئے ہو۔)

(ج) روحانی مریض کی طبیعت کو رو باصلاح کرنے والی چیز عقل سلیم ہوتی ہے۔ جو بیماری کے غلبہ سے کبھی فی الجملہ زائل ہوجاتی ہے۔ اور کبھی بے حد کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا مریض ہذیان بکنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے طبیب کو

پاگل اور دیوانہ قرار دیتا ہے۔ جو دراصل بیماری کے غلبہ سے اس کی اپنی دیوانگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ كَذٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ (ترجمہ:۔ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے نہیں جو رسول آیا اس کو بھی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ) وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (ترجمہ:۔ اور ظالم لوگ کہنے لگے کیا تم ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کرتے ہو) یہ صورت خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ مریض طبیب کی بات تک سننا گوارا نہیں کرتا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ (ترجمہ:۔ اس قرآن کو نہ سنو بلکہ اس کے پڑھے جانے کے وقت ادھر ادھر کی لغو باتیں بیان کرو)

(۲)۔ ایسی ہی صورت کے اعتبار سے روحانی مریضوں کو استعارۃً مردے کہا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مردے کچھ نہیں سنتے فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ (ترجمہ:۔ تو مردوں کو سنا نہیں سکتا) سو جب تک ان میں زندگی کی کوئی رمق نہ عود کرے۔ ان کی بیماری علاج پذیر نہیں ہوسکتی لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (ترجمہ:۔ تاکہ اس کو توڈرائے جس میں زندگی ہو) ظاہر ہے کہ برعکس جسمانی مریض کے روحانی مریض کا صحتیاب ہوجانا ایک اعجاز ہے یعنی مردہ کا زندہ ہوجانا جس کی صورت شاذ ہوتی ہے۔ أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ (ترجمہ:۔ ایک شخص جو کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا)

(۳)۔ جسمانی مریض کو صرف بیماری کے دوران میں لیکن روحانی مریض کو ہمیشہ کے لئے ناموافق اشیا سے پرہیز لازم ہوتا ہے وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (ترجمہ:۔ اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا) مسلم کی ایک روایت میں ہے اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ اس میں مومن انسان کی حدود اللہ کے اندر پابند زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ لذائذ کا ترک کرنا نفس پر شاق گزرتا ہے۔ اس لئے مریض علاج و پرہیز نہیں کرتا

(۴)۔ فی زمانہ علاج اور زیادہ مشکل ہوچکا ہے۔ کیونکہ آسمانی اطباء سید الحکماء (محمد عربی) کے بعد ختم ہوچکے ہیں وَلٰكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ آپ کے بعد جن اطباء کو یہ کام تفویض کیا گیا تھا۔ انہیں حکم تھا کہ آسمانی اطباء کے نقش قدم پر چل کر علاج کے سلسلہ کو جاری رکھیں۔ عُلَمَاءُ كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ لیکن وہ کسی لحاظ سے بھی ایسے ثابت نہیں ہوئے۔ علاج کرنا تو درکنار آج بیشتر بیماریاں انہی کی پیدا کردہ ہیں عُلَمَاءُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ مِنْهُمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ یاد رہے کہ جسمانی بیماری کی آخری سرحد موت ہے۔ جس کے بعد جہاں تک مرض کا تعلق ہے۔ ہر تکلیف کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ لیکن روحانی بیماری کی تکلیف کا آغاز موت سے ہوتا ہے۔ اور اضطراب و کرب کا زمانہ ہر مرض کا اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ ہے۔ ظاہر ہے کہ تکلیف و عذاب کی رو سے روحانی بیماریاں بغایت خطرناک و ضرر رساں ہیں لہٰذا ان کے علاج سے غفلت برتنی اپنے ساتھ پوری دشمنی کا ثبوت دینا ہے يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي (ترجمہ:۔ کیا اچھا ہوتا جو میں اپنی زندگی ہی میں کچھ آگے بھیج دیتا۔ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا (ترجمہ:۔ کاش میں نے رسول کے ساتھ ساتھ راہ اختیار کی ہوتی) پھر وہ بیماری سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن بھی ہے جو

جس کی تکلیف ابدی و دوامی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی بیماری ہے تاکہ اس کے علاج کی کوئی صحیح
تدبیر کی جائے۔ ہم انشاء اللہ وہ بدترین مرض مع نسخہ شفا بتلاتے ہیں۔

بیماروں کو مژدہ

کہتے ہیں بیماری گھوڑے کی رفتار آتی ہے اور چیونٹی کی رفتار واپس جاتی ہے۔ یہ ایک نہایت صحیح ضرب المثل ہے جسمانی
بیماریوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بیماری دفع ہونے کے بعد مدت تک نقاہت موجود رہتی ہے۔ بعض دفعہ بیماری کا
ایسا شدید حملہ ہوتا ہے کہ عمر بھر صحت اپنے سابقہ انداز پر واپس نہیں لوٹتی۔ بلکہ اکثر بیماریوں کے بعد اعضاء مفلوج ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں۔ یا پہلے
کی طرح توانا و مضبوط نہیں رہتے۔ لیکن روحانی بیماریوں کی یہ کیفیت نہیں۔ اگر تشخیص مرض و علاج صحیح ہو تو بیماری رفع ہونے کے ساتھ ہی تمام
قوتیں عود کر آتی ہیں اور مریض ایک تندرست انسان سے زیادہ توانا اور طاقتور بن جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ ——
يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (ترجمہ: بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے —— اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیگا)
سو بیماروں کو ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیے۔ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (ترجمہ: اللہ تعالیٰ
کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک اللہ تمام گناہ بخش سکتا ہے۔

سب سے بڑھ کر خطرناک بیماری

قرآن شریف میں لکھا ہے وَمَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ
(ترجمہ: جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا۔ وہ گویا آسمان سے گر پڑا) یعنی مرض شرک سے روح اپنے
اصل مقام آسمان سے گر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی عضو کسی صدمہ سے اپنی جگہ سے ٹل جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اور صحتیابی کے لئے
ضروری ہوتا ہے کہ عمل جراحت سے وہ عضو اصل مقام پر لایا جائے۔ اگر بعد و دوری زیادہ ہو تو عمل جراحت سے وہ عضو اصل مقامات پر لایا جاوے
اگر معذوری زیادہ ہو تو عمل جراحت میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ مریض شرک کی بھی یہی صورت ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات ہیں۔
جو مریض کے علاج میں حائل ہوتے ہیں۔

ا۔ یہ ایک متعدی بیماری ہے جس کے جراثیم پشت در پشت نشوونما پاتے چلے جاتے ہیں اور تلف نہیں ہوتے إِنَّمَا
أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ (ترجمہ: شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں
نے ہم سے پہلے اور ہم ہوتے ان کی اولاد ان کے پیچھے

ب۔ بیماری مریض کی طبیعت ثانی ہو کر رہ جاتی ہے حتیٰ کہ وہ اسے فطری شے قرار دیکر بیماری سے تعبیر نہیں کرتا۔ اور بجائے
ارادہ شرعی کے خداوند تعالیٰ کے تکوینی ارادہ سے حجت پکڑتا ہے لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا
(ترجمہ: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادے) چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ مرض کا ذمہ دار اپنے نفس قرار دیتا
وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوں تو شفا وہی دیتا ہے۔) وَمَا أَصَابَكَ
مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ (ترجمہ: برائی تجھے پہونچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے۔)

ج۔ عقل سلیم جو ہر بیماری میں طبیعت کی اصلاح کرتی ہے۔ فی الجملہ زائل ہو جاتی ہے أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا
تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (ترجمہ: میں بیزار ہوں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا کیا تم
عقل سلیم نہیں رکھتے۔؟) اور غلط فاسد جہالت کا سخت غلبہ ہوتا ہے۔ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ
أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ (ترجمہ: اے نادانو! اللہ کے سوا اور کس کو تم بتاتے ہو جس کو میں پوجا ہوں) چنانچہ اطباء
ایسے مریض کو ابوجہل کہتے ہیں۔ یہ بیماری تمام قوتیں سلب کر لیتی ہیں اور جملہ اعضاء مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ترجمہ:۔ اور یہ لوگ اگر شرک کرتے تو البتہ ضائع ہو جاتا جو کچھ انہوں نے کیا تھا) ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں علاج سخت دشوار ہوتا ہے۔

د۔ اس بیماری کے جراثیم اتنے خطرناک ثابت ہوتے ہیں کہ دار الشفاء کو بھی آلودہ کر دیتے ہیں اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ (ترجمہ۔ جو لوگ شرک میں وہ پلید ہیں۔ پس وہ مسجد حرام کے نزدیک نہ آنے پائیں) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (ترجمہ۔ مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجد آباد کریں جب کہ وہ اپنے اوپر کفر کو تسلیم کر رہے ہوں۔
دار الشفاء کا تزکیہ (Purification) کیا جاتا ہے۔ تاکہ جراثیم تندرست انسانوں میں سرایت نہ کرنے پائیں۔ لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ (ترجمہ۔ شریک نہ کر نا میرے ساتھ کسی کو اور پاک رکھ میرا گھر) اگرچہ اطباء ایسے بیماروں کا علاج کرتے ہیں وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (ترجمہ: اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ سن لے کلام اللہ کا) لیکن انھیں نہایت تاکید ہوتی ہے۔ کہ بیماری کے جراثیم سے بچیں فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (ترجمہ:۔ سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے) یہی وجہ ہے کہ ایسے بیماروں سے انتہائی نفرت کی جاتی ہے اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (ترجمہ:۔ اللہ الگ ہے مشرکوں سے) بلکہ ایسے مریضوں کو ختم کر دینے کا حکم ہے۔ تاکہ وباء بڑھنے نہ پائے۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (ترجمہ:۔ مشرکوں کو جہاں سے پاؤ انھیں مارو) خاتم الاطباء علیہ السلام کے زمانہ میں ایسا ہی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خطرناک بیماری بالکل نیست و نابود ہو گئی اور کوئی بیمار باقی نہ رہا۔ سب انسان تندرست و صحت یاب تھے يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (ترجمہ۔ میری بندگی کریں گے کسی کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔
عرصہ تک یہی حالت رہی بعد میں جا کر غفلت کوش اطباء کی بے احتیاطی اور لاپروائی سے پھر بیماری پھوٹ نکلی۔
لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِّنْ اُمَّتِيْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَتَعْبُدَ قَبَائِلُ مِّنْ اُمَّتِي الْاَوْثَانَ (ترمذی)
اس پر طرہ یہ کہ معالج کوئی نہیں جنھیں طبیب ہونے کا دعویٰ ہے وہ علم طب روحانی ودینی سے نابلد ہیں

ام الامراض

اطباء نے اسے ام الامراض تبلایا ہے اور ان کا قول ہے کہ اس سے چھٹکارہ پانے سے ہر بیماری رفع ہو جاتی ہے کیوں کہ ہر بیماری کی اصل یہی ہے۔ دوسری تمام بیماریوں کی تکلیف عارضی ہے۔ لیکن اس کی مستقل و دائمی۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا
ترجمہ بے شک اللہ جس گناہ کو چاہے بخش سکتا ہے۔ سوائے اس کے جو کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے اس نے بہت شدید قسم کے گناہ کا طوفان باندھا اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (ترجمہ۔ بیشک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کے سوا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی) سید الحکماء نے فرمایا ہے حُرِّمَ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهٖ (بخاری) معلوم ہوا دوسرے امراض اتنے خطر ناک نہیں اگر خطرہ ہے تو اسی بیماری کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آسمانی طبیب پہلے اسی بیماری کے علاج کی فکر کرتا رہا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (ترجمہ۔ اور ہم نے مجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا۔ مگر اس کو یہی حکم دیا کہ کسی کی نہیں بندگی سوائے میرے سو میری بندگی کرو) روحانی اطباء کی تمام تر یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ ہر نوعیت

کے شرک سے مجتنب رہیں۔ یعنی شرک بالذات۔ شرک فی الصفات اور شرک فی العبادات میں مبتلا نہ ہونے پائیں اور ان کے دلوں پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا گہرا نقش بٹھا دیا جاوے۔ کہ ہر شخص زبان حال سے پکار اٹھے

آسمانی صحیفہ طب کا خلاصہ اور نچوڑ فقط اس قدر ہے کہ خدائے واحد کے ساتھ کسی قسم کا شرک روا نہ رکھا جاوے اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۝ (ترجمہ: ہم نے سنا ہے ایک قرآن عجیب کہ جو نیکی کی طرف ہدایت کرتا ہے سو ہم اس پر یقین لائے۔ اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز ہرگز شریک نہیں ٹھہرائیں گے) انسان کی پیدائش کا یہی مقصد اور اس کی تخلیق کی یہی علت بتائی ہے کہ صرف اللہ عزوجل کی عبادت کی جاوے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (ترجمہ۔ اور میں نے جن والنس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔) آپ جانتے ہیں کہ عالم ارواح میں ہی انسان اس حقیقت کا اعتراف کر چکا ہے کہ بجز اللہ تعالےٰ کے اور کوئی الٰہ اور معبود نہیں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی ترجمہ۔ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں ہے۔) اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ (ترجمہ میں تمھارا رب ہوں سو میری بندگی بندگی کرو) یہی روح کا اصلی مرکز ہے اور اسی مرکز کو چھوڑ دینے سے اشراک باللہ کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے تشریح کی جا چکی ہے۔ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (ترجمہ: جس نے اللہ کا کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا ایسا حال ہے جیسے وہ آسمان سے گر پڑا) اس آیت میں انسان کی اس پستی اور گراوٹ کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔ جب وہ صاحب عرش کو الٰہ واحد نہ تسلیم کرتے ہوئے اپنے جیسی یا اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے سرنگوں ہوتا ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ (ترجمہ: اور ہم یہ چاہتے تو اس کا رتبہ بلند کر دیتے۔ ان آیتوں کی بدولت مگر وہ تو خود پست ہو رہا اور اپنی خواہش کے پیچھے ہو لیا، تو اس کا حال کتے جیسا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ لقمان حکیم کو دنیا حکمت کا بادشاہ تسلیم کرتی ہے۔ قرآن نے بھی اس کی حکمت کی تصدیق فرمائی ہے۔

علاج وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (ترجمہ:۔ اور ہم نے لقمان کو حکمت دی) بہتر ہوگا اس کا نسخہ درج کر دیا جائے بہایت مختصر اور جامع ہے۔ شفا خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے فرماتے ہیں۔ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (ترجمہ:۔ اللہ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے) اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ پر یہ حقیقت فوراً منکشف ہو جائے گی۔ کہ اس بیماری کے متعلق لقمان کی بھی وہی تشخیص ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔ ظلم کے معنی وَضْعُ الشَّيْءِ عَلٰی غَیْرِ مَحَلِّهٖ ہوتے ہیں۔ یعنی روح اپنا اصلی مرکز چھوڑ چکی ہے۔ اس نے عہد و پیمان کیا تھا۔ کہ میں اپنے خالق کے سوا کسی کی عبادت نہ کروں گی۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی (ترجمہ۔ کیا میں تمھارا رب نہیں؟ بولے ہاں" لیکن وہ اپنی جیسی مخلوق کو معبود سمجھ کر نہایت پستی میں جا گری ہے۔ لفظ عظیم مرکز سے بُعد و دوری کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ علاج یہ تجویز فرماتے ہیں کہ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ یعنی ہر قسم کے اشراک باللہ کو ترک کیا جائے۔ تاکہ روح اپنے صحیح مرکز کی طرف عود کر سکے اور روحانی بیماری سے نجات حاصل ہو۔

—— پس جس مسلمان کے دل میں توحید کا مزہ ہو گا وہ کھلے ہوئے شرک سے ہی نہیں، اس کے مخفی داعیات، محرکات اور مشابہت سے بھی پرہیز کرے گا۔ "توحید" میں اگر خدا نخواستہ فرق آگیا تو پھر کسی کی عقیدت و محبت اور کوئی عمل نیک کام نہیں آ سکتا!

"توحید"
عبادت کی روح اور ایمان کی جان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا

قبر پرستی کا فتنہ

این رسالہ ایست نامیدہ بلاغ المبین کہ آیات کلام رب الانام و احادیث صحیحہ رسول علیہ السلام و آثار صحابۂ کرام و اخبار اولیائے عظام را اندر اں ترجمہ نمودہ اید با امید آنکہ ہادی حقیقی جل جلالہ، وعم نوالہ، بر امت حبیب خود رحمت فرمائید و فتنہ کہ از سبب مخالطت و موانست مشرکاں ہنود در عوام ایشاں شائع شدہ اکثرے را مصداق آیۃ کریمہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ گردانیدہ است محو و متلاشی نماید وَيُحِقُّ الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ وعدہ آں کریم آنست آں فتنہ مضلہ ظلمتے ست کہ قلوب قلوب بینا نرا نابینا ساختہ است و از نا یافتگی نور ملت بیضا حنیفی در مغاک ضلالت سر زیر و پا بالا انداختہ قولہ تعالیٰ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ یعنی کسیکہ شریک گرداند چیزے را با خدا پس گویا افتاد از آسمان ربایند اورا جانوراں پرندیا می اندازد اورا بادے در مغاک بعید یعنی دور از شنیدن آواز حق باید دانست کہ آں فتنہ علت گور پرستی است کہ پرستار آں را پیر پرست می گویند و ایں فعل شنیع را بہتر از عبادت مفروضہ و اوراد مسنونہ می پندارند چنانچہ عوض ہر عبادت در زعم ایشاں ایں عمل میتواند شد و بدل آں ہیچ عبادت دیگرے را نمی شمارند روزے کہ بنام بزرگے عرس می نمایند بر قبر آں بزرگ اژدہام می کنند و در آں روز رسیدن انجا اہم تر

اس رسالہ کا نام " بلاغ المبین " ہے۔ اس میں قرآن مجید کی آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے آثار اور اولیائے عظام رحمہم اللہ کے اخبار (وارشادات) کا ترجمہ اس امید پر لکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ، اپنے حبیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر رحمت نازل فرما کر اس فتنہ و فساد کو دور فرمائے جس نے ہندو مشرکوں کے میل جول کیوجہ سے عوام الناس مسلمانوں میں پھیل کر اکثر کو آیۃ کریمہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۝ (بہت سے لوگ اللہ پر ایمان لاکر بھی شرک کا کام کرتے ہیں) کا مصداق بنا دیا ہے۔ (نیز اس رسالے کو اسلئے لکھا گیا ہے) وَيُحِقُّ الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ (تاکہ اللہ تعالیٰ حق کو سچ کر دکھائے اور باطل کو جھوٹ کر دکھائے اگرچہ مجرم اس کو پسند نہیں کریں گے) اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے۔

یہ گمراہ کرنیوالا فتنہ ایک ایسی سیاہی و تاریکی ہے جس نے بینا دلوں کو نابینا کر دیا ہے اور دین حق کی روشنی نہ پانے کی وجہ سے گمراہی کے گڑھے میں سر کے بل پٹخ دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝ یعنی جو شخص کسی کو خدا کا شریک ٹھہرائے تو (اس کی مثال ایسی ہے کہ) گویا وہ آسمان پر سے گر پڑا پھر (یا تو) اس کو (راستہ ہی میں سے) پرندیں اچک لیں یا آندھی اس کو دور کسی گڑھے میں لیجا کر ڈالدے یعنی اسقدر دور

از بجا آوردن عبادت مفروضہ وتحصیلِ علوم دینی می دانند. و باز شناعت قبیحہ آنست کہ رجوع برائے ہر مہمات دنیاوی بسوئی آں قبوری آرند و تفرع والحاح واظہار نیازمندی آں قدر در آں جا از ایشاں ظاہر می شود کہ گاہے عشر عشیر آں در مساجد نماز بسوئ خدائے تعالیٰ حاضر و ناظر نکردہ باشند. دعا و ندا رمی کنند بنام صاحبِ قبر اولاد و رزق از و می طلبند. و تاب متوجہ شدہ عکوف در آنجا می نمایند و ملابس فاخرہ بر آں قبوری پوشانند و آنہا را بہ خوشبوئی ہا می آلایند و استعمال بخور می سازند و چراغاں و شمع و دیگر اسباب تزئینات مقابر ثواب دانستہ در آں جا صرف می نمایند. و بدیں صرافت تقرب آں بزرگ و خوشنودی روح وے می جویند. و دیگر بسیار افعال نسبت بر قبور بزرگا بعمل می آرند کہ از آں جملہ مشرکاں ہنود پیش اصنام خود ہا میکنند. چوں فتنۂ قبیحہ بدریافت رسید معلوم باید کرد در آیت کریمہ ومن یشرک باللہ کہ بالا مترجم گردید چہار مفہوم مذکور است اشراک[1] باللہ وخر[2] من السمار وخطف[3] الطیر والقار الریح فی مکانٍ سحیق. پس اشراک باللہ آنست کہ چیزے از صفات خاصہ او تعالیٰ کہ زندہ کردن و میرانیدن و اولاد بخشیدن و روزی رسانیدن و برخفیات و اسرار مطلع بودن وغیر آں بجز او تعالیٰ نسبت کردہ شود و دانستہ اید کہ ازیں کار ہا غیر او نیز تواند کرد و گرنہ ہیچکس نیست کہ گوید با خدا خدائے دیگر شریک است۔ و خرّ او از آسمان آنست کہ دین توحید چوں آسمان بلند مقام است کہ در آنجا سنت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمچوں آفتاب عالمتاب روشنی بخش دلہائے مسلمانان ہست و آثار صحابہ آنسرور مانند ستارگاں درخشاں رہنمائی ایشاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم یشتم اہتدیتم پس ہر کہ دین توحید گذاشت گویا از آسمان افتاد ازیں معنی

کہ آواز حق نہیں سن سکتا۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ فتنہ مرض گور پرستی ہے۔ ان قبر کے پجاریوں کو پیر پرست کہتے ہیں (اور قبر پرست لوگ) اس برے فعل (قبر پرستی) کو فرضی عبادت (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ) اور مسنونہ وظائف سے بھی افضل و بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک ہر عبادت کے بدلے بزرگوں کی قبر پر حاضری کافی ہو۔ دوسری عبادت کو اس کے مقابلہ میں بے حقیقت تصور کرتے ہیں۔ جس دن کسی بزرگ کا عرس کرتے ہیں تو ان بزرگ کی قبر پر میلہ مقرر کرتے ہیں اور وہاں حاضری دینے کو فرضی عبادات وحصول علوم دینی سے زیادہ افضل سمجھتے ہیں اور وہاں کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام دنیاوی مشکل کاموں کے حل کرنے کے لئے ان قبروں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قبروں کے پاس اسقدر گریہ وزاری، عاجزی وانکساری کرتے ہیں کہ کبھی اسکا عشر عشیر بھی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر کے سامنے نہیں کرتے۔ صاحب قبر کا نام لیکر پکارتے ہیں اور ان سے دعاء کراتے ہیں اور ان سے اولاد و روزی طلب کرتے ہیں۔ خلوص دل سے متوجہ ہو کر قبر پر چلہ کشی کرتے ہیں اور ان قبروں پر بہترین اور نہایت قیمتی غلاف وچادر چڑھاتے ہیں اور ان پر خوشبو لگاتے ہیں اور بخور یعنی اگر وصندل و لوبان وغیرہ جلاتے ہیں اور جھاڑ فانوس اور چراغوں سے مقبروں کی زیب وزینت کرنے کو ثواب سمجھکر بے دریغ خرچ کرتے ہیں اور اس فضول خرچی کے ذریعہ ان بزرگوں کا تقرب اور ان کی روح کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے کام ایسے کرتے ہیں جیسے ہندو مشرک اپنے بتوں کے سامنے کرتے ہیں۔ جب اس فتنہ (قبر پرستی) کی برائی معلوم ہوگئی تو یہ جاننا چاہیئے کہ آیت کریمہ ومن یشرک باللہ سے (جس کا ترجمہ پہلے لکھا جا چکا ہے) چار باتیں معلوم ہوئیں۔

نکتہ ایراد کَاَنَّمَا کہ حروف تشبیہ است بخوبی و لطافت مفہوم می شود

(۱) اشراک باللہ (۲) خر من السماء (۳) خطف الطیر (۴) الفار الریح فی مکان سحیق. پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا یہ ہے جو صفات اللہ تعالیٰ کی خاص ہیں جیسے زندہ کرنا، مارنا، اولاد و روزی دینا، مخفی و پوشیدہ باتوں کو جاننا وغیرہ، ان کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت کریں۔ اور یہ سمجھیں کہ یہ کام دوسرا بھی کرسکتا ہے۔ (شرک کے یہی معنی ہیں)
ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک کوئی دوسرا خدا ہے۔

آسمان سے گرنے سے یہ مراد ہے کہ دین توحید آسمان کی مانند بلند و بالا مقام ہے جہاں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی چمکتے ہوئے سورج کی طرح مسلمانوں کے دلوں کو روشن کرتی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار جگمگاتے ہوئے ستاروں کی مانند مسلمانوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ (جیسا کہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ (میرے صحابہ روشن ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اتباع کروگے ہدایت پالوگے۔

پس جس نے دین توحید (اسلام) کو چھوڑا گویا آسمان سے گر پڑا۔ اسی غرض سے لفظ کَاَنَّمَا (گویا) حرف تشبیہ لایا گیا تاکہ مضمون کی خوبی و باریکی اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

ماحصل مطالعہ ترجمان القرآن
(مولانا ابوالکلام آزاد)

مرتبہ میر محبوب علی

معاشرہ اسلامی کی ایک جھلک

سورہ توبہ کی آیت ۱۰۷ کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بازنطینی شہنشاہیت کے مدینہ پر حملہ کی تیاریوں کی اطلاع ملتی ہے۔ تو آپ پہلے ہی سے تیار ہو کر چل پڑتے ہیں جس کو غزوہ تبوک کہا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر بھی منافقین مختلف حیلہ بہانے کر کے شرکت جہاد سے رک جاتے ہیں منافقین کے علاوہ بعض اور شخصیتیں بھی اس جہاد میں شریک نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ان کے طرز عمل پر جو نتائج ظہور پذیر ہوئے۔ اور مسلم معاشرے نے کس طرح اطاعت رسول کا عملی ثبوت دیا۔ اس کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ جو عبرت و موعظت سے پر ہے حضور تبوک سے لوٹے منافقین حسب معمول جھوٹی قسمیں کھا کھا کر آپ کو یقین دلانے لگے حضور نے ان کے عذر قبول کر کے معافی دیدی اور دلوں کا حال خدا پر چھوڑ دیا۔ لیکن ان میں تین شخصیتیں ایسی نکلیں جنہوں نے عدم شرکت جہاد کو اپنی کاہلی و سستی ظاہر کیا جس پر حضور نے ان کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے فیصلہ پر انتظار کرنے کو کہا۔ ان تین شخصیتوں میں کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع۔ پہلی شخصیت ان تہتر سابقون انصار سے ہیں جنہوں نے عقبہ ثانیہ میں بیعت کی تھی۔ ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع دونوں بدری ہیں۔ جو جنگ میں جاں نثاری کا ثبوت دے چکے تھے۔ لیکن غزوہ تبوک میں کوتاہی ہوتی شریک نہ ہو سکے۔ حضور کے فیصلے سے ایسا ہوا کہ ان کا معاشرتی انقطاع ہو گیا۔ تمام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کی بیویوں نے بھی تعلقات ختم کر دیئے۔ چنانچہ اچانک انھوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ اور اطراف مدینہ کی پوری آبادی نے ان کی طرف سے رخ پھیر لیا ہے ان کے عزیز و اقارب تک ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے۔ آخر جب پورے پچاس دن اس حالت میں گذر گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں قبولیت توبہ کی بشارت ملی۔ حضرت کعب بن مالک نے اپنی سرگذشت تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے تمام جہادوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی۔ اور اس موقعہ پر بھی نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن ایک کے بعد ایک دن نکلتے گئے۔ اور میں اسی خیال میں رہا کہ اپنے معاملات نپٹا لوں تو نکلوں۔ یہاں تک کہ آج کل ہوتے ہوتے پورا وقت نکل گیا۔ اتنے میں خبر اڑی کہ آنحضور واپس آ رہے ہیں۔ تب میری آنکھیں کھلیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا آپ حسب معمول مسجد میں تشریف لائے اور جو لوگ کوچ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ آ آ کر معذرتیں کرنے لگے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگے۔ یہ اسّی سے کچھ اوپر آدمی تھے۔ انہوں نے جو کچھ ظاہر کیا آنحضرت نے قبول کر لیا اور ان کے دلوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ جب میری طرف متوجہ ہوئے تو مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ جھوٹی معذرت بنا کر کہہ دیتا جو کچھ سچی بات صاف صاف عرض کر دی۔ آپ نے سن کر فرمایا اچھا جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا اور بھی کسی کو ایسا حکم ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں مرارہ بن ربیع ہلال بن امیہ کو۔

اس کے بعد جب آنحضرت کا حکم ہوا کہ ہم تینوں سے کوئی بات چیت نہ کرے۔ تو سب نے منہ پھیر لیا۔ اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی گویا کل تک جس دنیا میں تھا اب وہی دنیا اجنبی ہو گئی۔ وہ دنیا ہی نہیں رہی تھی۔ میرے دونوں شریک ابتلا گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے تھے

لیکن میں سخت جان تھا اس حالت میں بھی روز گھر سے نکلتا تھا۔ مسجد میں حاضری دیتا جماعت میں شریک ہوتا اور پھر ایک گوشہ میں سب سے الگ بیٹھ جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ نماز کے بعد قریب جاکر سلام عرض کرتا اور پھر اپنے جی میں کہتا دیکھوں سلام کے جواب میں آپ کے لبوں کو حرکت ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ گوشۂ چشم سے کبھی کبھی دیکھ لیتے لیکن جب میری نگاہ حسرت اٹھتی تو رخ پھر جاتا

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں ہے

ایک دن شہر سے باہر نکلا تو قتادہ کے باغ تک پہنچ گیا۔ یہ میرا چچیرا بھائی تھا اور میں اپنے تمام عزیزوں میں اسے سب سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ میں نے سلام کیا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا میں نے ابو قتادہ سے کہا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اللہ اور اس کے رسول کی اپنے دل میں محبت رکھتا ہوں اس پر بھی اس نے میری طرف رخ نہیں کیا لیکن جب بار بار یہی بات دہرائی تو صرف اتنا کہا اللہ و رسولہ اعلم اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا بے اختیار آنکھیں اشکبار ہوگئیں وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں ملک شام کا ایک قبطی مل گیا۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا کوئی ہے جو کعب بن مالک تک پہنچا دے۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا تو اس نے غسان کا ایک خط نکال کر میرے حوالہ کیا اس خط میں لکھا تھا۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تم پر سختی کی ہے۔ تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمہاری قدر و منزلت کریں گے۔ خط پڑھ کر میں نے کہا یہ ایک اور نئی مصیبت آئی۔ گویا پچھلی بلائیں کافی نہ تھیں۔

جب اس حالت میں چالیس راتیں گذر چکیں تو آنحضرت کی جانب سے ایک آدمی آیا۔ اور حکم ہوا ہے تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ میں نے کہا طلاق دیدوں۔ کہا نہیں۔ صرف علیحدگی کا حکم ہوا ہے اس پر میں نے اپنی بیوی کو اس کے میکے بھجوا دیا جب دس دن اور گذر گئے تو پچاس راتوں پر صبح آئی میں اپنے چھت پر نماز پڑھ کر بیٹھا تھا۔ ٹھیک ٹھیک وہی حالت تھی جس کی تصویر اللہ کے کلام نے کھینچی ہے۔ زندگی سے تنگ آ گیا تھا اور خدا کی زمین بھی اپنی ساری پہنائیوں کیساتھ مجھ پر تنگ ہوگئی تھی۔ اچانک کیا سنتا ہوں کہ کوئی آدمی کوہ سلع پر سے پکار رہا ہے۔

"کعب بن مالکؓ بشارت ہو۔ تمھاری توبہ قبول ہوگئی۔

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

اب لوگ جوق جوق مجھے مبارک باد دینے کے لئے دوڑے۔ ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے ہوئے آیا لیکن بشارت کی آواز اس سے بھی زیادہ تیز تر ثابت ہوئی تھی۔ میں مسجد میں حاضر ہوا تو آنحضرت لوگوں کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ آنحضرت کا قاعدہ تھا کہ جب خوش ہوتے تو چہرہ مبارک چمکنے لگتا۔ جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔ ہم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی اس لئے ہمیشہ آپ کے چہرہ پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا اس وقت بھی چہرہ مبارک چمک رہا تھا۔ فرمایا کعب! تجھے آج اس مبارک دن کے ورود کی بشارت دیتا ہوں جو تیری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔ میں نے عرض کیا یہ بات آپ کی جانب سے ہوئی ہے یا اللہ کی وحی ہے۔ فرمایا اللہ کی وحی ہے (صحیحین) امام احمد بن حنبل کی نسبت منقول ہے کہ قرآن کی کوئی آیت اس قدر نہیں رلاتی تھی جس قدر یہ آیت۔ مسلمانوں کے لئے اس میں درس عبرت و موعظت ہے نیز اس سے معلوم ہوا کہ

(۱) خدمت حق میں تساہل ایک مومن کے لئے کیا سخت جرم ہے کہ ایسے مخلص اور مقبول صحابی بھی اس درجہ سرزنش کے مستحق ہوئے۔ اور تمام مسلمانوں کو ان سے قطع علائق کا حکم دیا گیا۔

(ب) مسلمانوں کی اطاعت و امتثال کا کیا حال تھا کہ جونہی انقطاع علائق کا حکم ہوا تمام شہر نے بیک دفعہ رخ پھیر لیا

چوری چھپے سے بھی کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی حتیٰ کہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو بھی یہ خیال نہ گذرا کہ ایک لمحہ کے لئے اس پر عمل نہ کریں یا کم از کم تعمیل میں تساہل ونرمی سے کام لیں۔ ابوقتادہ کا حال خود حضرت کعب کی زبانی سن چکے ہو۔ جب انھوں نے کہا کہ تم تو اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ کہ سچا مسلمان ہوں اللہ اور اس کے رسول دوست رکھتا ہوں پھر مجھ سے کیوں رخ پھیر لیا ہے تو ابوقتادہ نے صرف یہی کہا کہ "اللہ و رسولہ اعلم" ان تینوں لفظوں ہیں اس عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ یعنی مجھے تو سب کچھ معلوم ہے۔ جانتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو۔ لیکن اپنے جاننے کو کیا کروں جاننا تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ اس کا حکم تو یہی ہے کہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں اللہ اللہ کیسی سچی اطاعتِ رسول ہے۔ اور کیسا بہتر عمل ہے۔ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر)

(ج) پھر اس اطاعت کے لئے نہ تو کوئی مادی طاقت کام میں لائی گئی تھی نہ عمال حکومت کا ڈر تھا، نہ قانون عدالت کا۔ صرف ایک شخص کے لبوں نے حرکت کی تھی اور اتنی بات سب کو معلوم ہوگئی تھی کہ اسکی مرضی یہی ہے۔ پس اتنی بات کا معلوم ہوجانا اس کے لئے کافی تھا کہ سب کے دل مجسم اطاعت امتثال ہوجائیں کیا دنیا کی کوئی تاریخ ایسی ہمہ گیر اطاعت کے نمونہ پیش کر سکے گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔

(ح) پھر یہ بھی دیکھو کہ مسلمانوں کی باہمی اخوت ومحبت کا کیا حال تھا اس سختی کے ساتھ حکم رسولؐ کی تعمیل تو سب نے کی لیکن ساتھ ہی ان کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی نہ تھا۔ سب کے دلوں کی لگی یہی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے۔ جونہی مقبولیت توبہ کا اعلان ہوا۔ ہر ایک دوڑ رہا ہے کہ ان بلاکشانِ عشق کو سب سے پہلے میری زبان سے مژدہ مقبولیتِ توبہ ملے۔ کوہ سلع پر سے گھوڑا دوڑا کے آنے والے وہی مومن اول صدیق اکبرؓ ہی ہیں۔ ان واقعات میں عبرت وموعظت کے کتنے ہی پہلو ہیں۔ جو ہمیں دعوت فکر وعمل دے رہے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

ماہرالقادری

جمالیات

شعروادب میں!

"نقد واحتساب" سے علم وادب میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اور زبان وبیان ہی نہیں فکر وخیال تک پر صیقل ہوتی ہے علم وادب کی دنیا میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے اگر اس کو جوں کا توں چھپنے دیا جائے اور کسی بے اعتدالی اور ادبی بیچ پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو تو اس تسامح درگزر رواداری اور خاموشی مبینی کا یہ نتیجہ ہوگا کہ غلطیوں کے انبار لگ جائیں گے۔ بے اعتدالیوں کی تہ پرتہ جمتی چلی جائے گی۔ اور لغزشیں عادت بلکہ شاید "آرٹ" بن کر رہ جائیں گی۔

ناقد کا منصب اہم ہی نہیں نازک اور ذمہ دارانہ بھی ہے۔! جس طرح طبیب اور ڈاکٹر امراض کی تشخیص میں اپنی حذاقت، مہارت اور ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں اور مرض کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جسم میں یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس کے فلاں فلاں اسباب ہیں اسی طرح "ناقد" بھی علم وادب کی کمزوریوں پر انگلی رکھ کر بتلاتا ہے کہ یانی یہاں پر مرتا ہے اور اس جگہ یہ عیب پایا جاتا ہے۔ اسی کا نام "صحت مند تنقید" ہے جس کا ہر پہلو مثبت ایجابی اور تعمیری ہوتا ہے۔ یہ وہ تنقید اور چھیڑ چھاڑ نہیں ہے۔ جو استاد قسم کے شاعروں میں چوٹیں چلا کرتی ہیں، اور جس کے نتیجہ میں ذاتی رقابتیں تک ابھر آتی ہیں۔ "نقد ونظر" کی بلند دنیا میں نہ رقابتیں ہیں اور نہ عداوتیں ہیں۔ وہاں اپنی بات کی پیچ کے لئے ہٹ دھرمی کو گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہاں ہر بات حق وانصاف کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے۔ اور اس میں کسی کی رعایت نہیں کی جاتی "ناقد" ہر کسی کے سونے کو کسوٹی پر گھس کر دیکھتا ہے۔ اور جو کچھ کسوٹی بتاتی ہے۔ اس کے اظہار میں وہ کوتاہی نہیں کرتا۔!

اگر کوئی انسانی معاشرہ طبیبوں ویدوں اور ڈاکٹروں سے محروم ہوجائے تو طبی نقطۂ نگاہ سے ایسا معاشرہ مریض بن کر رہ جائے گا۔ اور امراض کا مداوا اور دوا دارو نہ ہونے سے نہ جانے کتنے امراض ابل پڑیں گے۔ بالکل یہی حال علم وادب کی اس سوسائٹی کا ہوگا جس میں "ناقدین" کا وجود نہ ملتا ہو۔ انسانوں کو انکی غلطیوں اور لغزشوں پر ٹوکنا معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہے۔

اگر لغزش زیادہ سنگین اور غلطی شدید تر ہو تو تنقید کے انداز میں شدت اور طنز بھی روا رکھی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ "مرض کی گرانی" کے ساتھ "دوا" کی تیزی بڑھتی جاتی ہے۔ "ناقد" کا قلم ہر جگہ مرہم ہی کا کام نہیں کرتا۔ اسے نشتر فصاد بھی بن جانا پڑتا ہے۔

یہ مضمون "نقد واحتساب" ہے چند ان لفظوں اور اصطلاحوں پر، جو ہمارے لٹریچر میں بڑی کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ مگر ان کی تعبیر میں لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ اور اگر "غلطی" کا لفظ کسی کو ناگوار معلوم ہو تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ لوگ ان لفظوں اور اصطلاحوں کے مفہوم کی تعبیر میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔

ادب

ہمارے سامنے ریاضی اور جغرافیہ کی کتابیں آتی ہیں۔ ہم انھیں پڑھتے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر ہم ان کو ادب نہیں کہتے۔ حالانکہ ان کتابوں میں الفاظ، جملے اور عبارت بھی ہوتی ہے۔ اور اس عبارت وتحریر میں مفہوم ومعنی بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو الفاظ جملوں اور عبارت کا مجموعہ ہو "ادب" نہیں کہی جاسکتی! ریاضی کی پوری

کتاب پڑھ کر بھی ہم اس میں "ادبیت" نہیں پاتے مگر کسی کے ایک دل کش جملہ کو سن کر طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ "ادبیت" دراصل اسی دلکشی تاثیر حسن ادا اور خوبیٔ اظہار کا نام ہے۔

آج ہو یہ رہا ہے کہ "ادب" کا اطلاق عام طور پر شعر افسانہ اور تنقیدی مضامین پر ہوتا ہے۔ یہ "ادب" کیساتھ بہت بڑا ظلم ہے جو نادانستہ طور پر کیا جا رہا ہے۔ "ادب" کی وسعتوں کو اس قدر سمیٹ دینا اور انھیں تنگ بنا دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک حقیقت "بے کنار" ہے کچھ لوگ اسے محدود بنا دینا چاہتے ہیں۔ تو یہ کوشش چاہے کتنی نیک نیتی کے ساتھ کیوں نہ ہو جبر ناروا ہی کہی جائے گی!

اور اب معاملہ اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ اگر کوئی شخص "کارل مارکس" کے فلسفہ سرمایہ و محنت پر مضمون لکھ دے تو وہ ادیب بھی ہے متنور الفکر اور روشن دماغ بھی ہے۔ مگر کوئی بے چارہ "زکاۃ" کے فلسفہ کو اپنے کسی مقالہ میں پیش کر دے تو اسے قدامت پرست اور تنگ نظر سمجھا جاتا ہے۔ اہل نظر اور ارباب علم و فن بڑی وسعت ظرف رکھتے ہیں۔ ان کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ یہ تو وہی عصبیت ہوئی جس کی تہمت مذہبی طبقہ پر لگائی جاتی ہے۔

تحریر و مضامین میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ کس نے کیا کہا اور کس طرح کہا۔ طرز ادا میں کتنی دلکشی جاذبیت اور تاثیر ہے، پڑھنے والا اس کا کیا اثر قبول کرتا ہے۔ مضمون اپنی تفصیل اور جزئیات میں پھیل کر مرکزی خیال سے دور تو نہیں ہو گیا، "استدلال" ہے تو اس میں کتنی قوت ہے۔ کسی کا رد کیا ہے۔ تو اس تردید میں اصابت اور مقبولیت کس قدر ہے۔ کسی کی تائید کی ہے۔ تو اس میں عقیدت اور عقلیت کا کتنا تناسب ہے۔ تحریر و مقالہ میں یہی باتیں دیکھنے کی ہیں اور اسی انداز و نہج پر تحریروں کو جانچ کر اور پرکھ کر ان کی افادیت اور عدم افادیت، اچھے اور بُرے ہونے کا تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ "تاریخ" کو بھی ادب میں شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ کوئی مورخ جب تک کہ وہ ادیب نہ ہو کامیاب مورخ بن ہی نہیں سکتا۔ ابن خلدون کے "مقدمہ تاریخ" کو ہم شہادت میں پیش کر سکتے ہیں، کہ وہ زبان و اظہار اور فکر و مفہوم کے اعتبار سے ادب کا شاہکار ہے۔ جسے فلسفہ تاریخ جاننا اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہو اسے "مقدمہ ابن خلدون" کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ایک بہت بڑے ادیب کا یہ قول وزن رکھتا ہے کہ جس کسی کے کتب خانے میں ابن قیم کی "زاد المعاد" ابن خلدون کا "مقدمہ تاریخ" اور شاہ "ولی اللہ" کی حجۃ اللہ البالغہ" ہو پھر اسے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔

اردو ادب میں شبلی نعمانی کی "سیرت النبی" اور "الفاروق" کو جو بلند مقام حاصل ہے۔ ان کے سامنے سیکڑوں ناول گرد ہیں۔ اور ہم یہ بات مذہب و عقیدت کے نقطۂ نگاہ سے نہیں۔ خالص ادبی زاویۂ نگاہ سے کہہ رہے ہیں۔ شبلی کی ان کتابوں میں تاثیر ہے۔ دلکشی ہے۔ جاذبیت اور دلچسپی ہے پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ نیکی کے فردوس اور پاکیزگی کی جنت کی سیر کر رہا ہے۔ جہاں فوارے۔ سچائی کے موتی برسا رہے ہیں اور برگ و گل سے نکوکاری کی مہک آ رہی ہے۔

اردو کے تذکروں میں عام طور پر افسانہ نگاروں ناقدوں ناول نویسوں اور شاعروں کا تو ذکر ہوتا ہے۔ مگر ان کا ذکر نہیں ہوتا جن کی تحریروں میں ادبیت کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں مگر انہوں نے اس ادبیت کو ناول اور افسانہ میں نہیں، ایمان و اخلاق اور نیکی و پاکیزگی کی ترجمانی میں صرف کیا ہے۔ اس غلط اندیشی کو کیا کہیے کہ "لیلیٰ کے خطوط" کا مصنف تو ادیب شمار کیا جائے۔ مگر الجہاد فی الاسلام اور "پردہ" کے مصنف کو نظر انداز کر دیا جائے صرف اس لئے کہ ایک نے "رومان" کو پیش کیا اور دوسرے نے مذہب و اخلاق کو!

"ادب" میں وہ ہر چیز شامل ہے جس میں "ادبیت" پائی جاتی ہے۔ اب چاہے وہ افسانہ اور ڈرامہ ہو یا خالص مذہبی مضمون!

ادیب ٹالسٹائی بھی تھا اور امام غزالی بھی تھے۔ مذہب و اخلاق کو ادب کی حدود سے باہر قرار دیدینا بہت بڑی علمی اور ادبی ناانصافی ہے۔

جمالیات

جمالیات کے ساتھ یہ تصور عام طور پر ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ اس کا تعلق انسانوں کے حسن و شباب جانداروں کی خوبصورتی، سبزہ و چمن، اور ساحل و آبشار کے مناظر عمارتوں کے گل بوٹوں، عکس و خطوط کی زیبائی اور نغمگی و خوش آہنگی سے ہے کوئی شک نہیں کہ جمالیات میں یہ تمام چیزیں شامل ہیں۔ اور جو کوئی اس قدر زاہد خشک ہوگیا ہے۔ کہ ان چیزوں میں اسے جمالیاتی نشاط نہیں ملتا۔ تو ایسے آدمی کا وجدان دراصل مدقوق ہو چکا ہے۔ اور اس آدمی کی پوزیشن اس برگِ خزان دیدہ کی سی ہے جسے چمن سے اڑ کر راستوں، جنگلوں اور ویرانوں میں چلا جانا چاہیئے۔

کوئی شک نہیں کہ احساسِ جمال کا تعلق "شباب" سے بھی ہے۔ شباب کے تصور سے جمالیات کا احساس ابھرتا ہے۔ اسی لئے شعراء نے جو جمالیات کے ترجمان بلکہ نقیب ہوتے ہیں کبھی کسی عجوزہ فرتوت کی کبھی تمنا نہیں کی بلکہ محبوب نوخیز اور معشوق چاردہ سالہ ہی کی آرزو کی ہے۔ اور یہ آرزو انتہائی دلکش و اثرانگیز اشعار کی تخلیق کا سبب بنی ہے۔

مگر "جمالیات" کے ان تصورات کے ساتھ اس حقیقت کو بھلایا جا رہا ہے۔ کہ نیکی، اخلاق اور ہر صفت کمال بھی جمالیات کا مظہر ہے۔ بلکہ یہ "مظاہر" ان مظاہر کے مقابلے میں زیادہ پائدار اور حسین ہیں۔ جن کا تمام تر تعلق محسوس پیکروں اور آنکھ کو نظر آنے والے اجسام و قوالب سے ہے۔

سانولی رنگت کو شعر و ادب کی زبان میں "ملیح" کہا جاتا ہے۔ اگر تاریکی اور سیاہی کا مزہ معلوم کیا جا سکتا تو وجدان کہتا ہے کہ اسے "شور" اور "نمکین" ہونا چاہیئے اس کے مقابلے میں صباحت اور تبسم کو "شکر" سے تشبیہ دیتے ہیں۔

کھول دی میں نے خود اپنے ہی تبسم کی شکر

تاریکی و سیاہی کی طرح اگر آجائے کا مزہ معلوم ہو سکتا ہے۔ تو حس لطیف کہتی ہے کہ اس "مزہ" کو شیریں ہی ہونا چاہیئے بالکل اسی طرح اگر بدی اور گناہ کا مزہ معلوم ہو سکتا تو اسے "تلخ" اور کسیلا ہی ہونا چاہیئے کہ انسان کا صحت مند ذائقہ اسے گوارا نہ کر سکے اس کے مقابلہ میں نیکی اور اخلاق کے "مزہ" میں مٹھاس کی چاشنی پائی جانی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بدی اور گناہ اگر مجسم ہو جائیں تو وہ کریہ منظر ہوں گے اور نیکی و اخلاق پیکر محسوس بن جائیں تو ان کو حسین دیدہ زیب اور خوب رو ہونا چاہیئے۔

ابھی اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک منطقی مغالطہ اور فلسفیانہ نکتہ آفرینی نہیں ہے۔ یہ بات وزن رکھتی ہے۔ اس کی اساس عقلی استدلال پر ہے آپ کے سامنے ایک نہایت ہی حسین خوب رو بلکہ پری جمال عورت آتی ہے۔ سرتا بقدم رعنائی و جمال، اتنی حسین کہ اسے خیام کی رباعی اور حافظ کی غزل کہہ سکیں مگر کوئی آپ سے یہ کہہ دے کہ اس حسین عورت نے اپنے خاوند کو قتل کر دیا ہے۔ تو اس عورت کے اس ارتکاب گناہ کے تصور کے ساتھ ہی آپ کو وہ "ڈائن" معلوم ہونے لگے گی۔ یہی وہ جمال اخلاق ہے۔ جو ظاہری حسن جسمانی جمال اور سرتا پا دیدہ زیبی پر غالب آجاتا ہے۔ یہ نور اعلیٰ نور اور حسن در حسن اور کمال بر کمال ہے کہ کوئی انسان جسم و اخلاق کے حسن و جمال سے بھی مزین ہو مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک طرف جسمانی صحت اور موزونی و خوبی میں اپنی مثال آپ تھے، اس قدر کہ

دونوں جہان آئینہ دکھلا کے رہ گئے
لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

اور دوسری طرف آپ نیکو کاری اور پاکیزگی اخلاق کے اعتبار سے ایک مثالی انسان تھے۔ اور اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ پوری انسانی

تاریخ میں "بڑے انسان" تو بہت گزرے ہیں مگر "انسان کامل" بس نبی عربی کی ذات تھی۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مقصود گزارش یہ ہے کہ ایک تو "جمال" وہ ہے جو پیکر محسوس بن کر نظر آتا ہے۔ اور آنکھیں اس کا مشاہدہ کرتی ہیں، اور ایک "جمال" اس کا نام ہے جسے انسان کا وجدان اور باطن محسوس کر سکتا ہے۔ جمال کے "ظاہر و باطن" کی یہ تقسیم و تجزی محض افہام و تفہیم کے لئے کی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "جمال" بسیط ہے جو کسی تقسیم و تجزی کو گوارا نہیں کر سکتا مٹھاس چاہے کسی پھل پھول اور چیز میں پائی جائے وہ "مٹھاس" ہی ہے۔ قالب بدل گئے تو کیا ہوا مٹھاس تو ہر قالب میں ڈھل کر مٹھاس، حلاوت اور شیرینی ہی رہی۔ یہاں تک کہ کلام بھی شیریں ہوتا ہے حالانکہ پھلوں اور غذا کی دوسری چیزوں کی طرح کلام و سخن کا مادی قالب نہیں ہوا کرتا۔

حسن و جمال" میں محبوبیت پائی جاتی ہے کہ دیکھنے والی نگاہ اُسے پسند کرے چاہے، اور اس کو محبوب سمجھے! عدل و انصاف، ایثار، ہمدردی، خلوص، پاکبازی اور نیکوکاری ان تمام صفات کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ صفات سب کے نزدیک محبوب و مطلوب ہیں۔ ان صفات میں چونکہ شان محبوبیت پائی جاتی ہے اس لئے یہ حسین و جمیل اور حامل خوبی و زیبائی ہیں۔ بس جو کوئی شاعر اور ادیب اپنے کلام اور مضمون میں اخلاق، نیکی، پاکبازی اور شرافت کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ وہ حقیقت میں جمالیاتی شاعر اور ادیب ہے۔

یہاں ایک مغالطہ کو رفع کر دینا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ جدید جو طبیعتیں سیدھی سادی بات کو نمک مرچ لگا کر اور سے اور بنا سکتی ہیں۔ ——— جرأت اور بہادری ایک انسانی صفت ہے۔ مگر اس صفت کے حسین و کریہہ اور خوب و ناخوب ہونے کا تمام تر تعلق اس "مقصد" سے ہے جو اس صفت کو بروئے کار لاتا ہے۔ ایک ڈاکو بھی غیر معمولی بلکہ حیرت انگیز جرأت دکھا سکتا ہے۔ اور ڈاکو عام طور سے جری ہوتے ہی ہیں۔ مگر چونکہ اس جرأت کا مقصد حسین و خوب نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ صفت ناخوب بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک جرأت مظلوم کی حمایت، حق کی سربلندی، اچھائی (معروف) کے قیام، برائی (منکر) کے استیصال اور وطن کی حفاظت کے لئے صرف ہوتی ہے۔ چونکہ مقصد نیک و پاکیزہ ہے۔ اس لئے یہ صفت حسین ہوتی ہے! تلوار چنگیز نے بھی چلائی تھی اور حیدرؓ اور خالدؓ نے بھی، جرأت ان سب کے سیرت و کردار کا نمایاں وصف ہے مگر کہاں چنگیز اور کہاں حیدرؓ و خالدؓ! کوئلہ اور ہیرے کے کیمیا وی عناصر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لیکن کوئلہ بھلا ہیرے کی برابری کر سکتا ہے۔ ؟

جو کوئی شاعر نیکی اور شرافت و اخلاق کو پیش کرتا ہے۔ وہ جمالیات کا حقیقی ترجمان ہے۔ اس قسم کے ادب سے انسان کے وجدان کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر وہ احساس لطیف ابھرتا ہے۔ جو بدی یعنی بدصورتی کو ناپسند اور نیکی یعنی حسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔

پیر حیدر القادری

جاہل صوفی اور انکی گمراہی

آج کل عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جاہل صوفی طریقت اور حقیقت کے ٹھیکیدار قبر پرستی و پیر پرستی اور محفل رقص و سرود اور منشیات کو تو جائز اور مباح قرار دیتے ہیں۔ لیکن احکام خدا و رسولؐ کا بجالانا اور دینی علوم حاصل کرنے کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہانتک کہ شریعت کی مخالفت کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور طریقت کو شریعت کی ضد بتلاتے ہیں۔ اور ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تصوف میں علم کی کچھ حاجت نہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ جب بندہ مولا کی محبت میں مستغرق ہوجاتا ہے تو اس پر نماز روزہ کی پابندی باقی نہیں رہتی اور نشہ آور اشیاء استعمال کرنے کو قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ بتاتے ہیں۔ یہ گمراہ لوگ اپنی چالاکی اور مکاری سے بھولے بھالے بندگان خدا کو صراط المستقیم سے ہٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ گمراہ لوگ علم جیسی نعمت کو جسے حاصل کرنا جناب ہادئی کونین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے اس کو دماغ سوزی بتاتے ہیں۔ اور عجیب قسم کے اشعار سناکر لوگوں کو بہکاتے ہیں۔ اور آیات قرآنی و احادیث کے معنی اور بزرگان دین کے اقوال کا مفہوم الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ آقائے کائنات کا ارشاد ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔

حضرتِ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ ؎

ہرگز دل من از علم محروم نہ شُد — کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد

ہفتاد و دو سال سعی کردم شب و روز — معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی میرا دل کبھی تحصیل علم سے محروم نہیں ہوا۔ پورے بہتر ۷۲ برس دن اور رات میں نے عمل کی تحصیل کی۔ پھر بھی بہت سے ایسے اسرار ہیں جو مجھ پر نہیں کھلے اور بالآخر مجھے یہی کہنا پڑا کہ ہمیں کچھ نہیں آتا۔ آپ غور فرمائیں کہ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؓ اور حضرت معین الدین چشتیؒ نے بھی علم شریعت کو نہایت محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا ہے اور تمام عمر اسی علم کی تبلیغ فرماتے رہے۔ قوت القلوب۔ عوارف، احیاء العلومؒ اور غنیۃ الطالبین تصنیف حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانی میں ہے کہ علم شریعت شرط ہے۔ طریقت اور تصوف کی۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے علم کو چھین کر نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ علمائے حق کے اٹھ جانے سے علم خود بخود اٹھ جائے گا۔ یہاں تک کہ جب ایک بھی عالم ربّانی باقی نہ رہے گا۔ تو لوگ جاہلوں کو اپنا امام و پیشوا بنالیں گے۔ ان سے مسائل پوچھیں گے۔ اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ پس خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

جمع الجوامع میں ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آخری زمانہ میں شیاطین بزرگوں کی صورتیں اختیار کرکے

لوگوں کو گمراہ کریں گے۔

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ کسی مرید کا صدق واخلاص صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ شریعت کا پورا متبع نہ ہو جائے۔ اور مخلوق سے پورے طور پر بے نیاز ہو کر امید منقطع نہ کرے۔ اس راہ کے مبتدیوں پر آفتیں اس لئے نازل ہوتی ہیں کہ ان کی نگاہ امید مخلوق پر لگی ہوتی ہے۔

خواجہ نقشبندؒ کا قول ہے کہ خدا کی مجاوری کرنا مخلوق کی مجاوری کرنے سے افضل ہے۔ اور یہ شعر ارشاد فرمایا ؎

تو تا کے گور مُردان را پرستی
بگرد دکار مردان کن درستی

یعنی تو کب تک مردوں کی قبر پرستی کرتا رہے گا۔ جا اللہ والوں کا اتباع کر کے اپنی آخرت درست کر۔

سلطان اولیاء حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کا قول ہے۔ کہ جو شخص دنیا اور آخرت میں سلامتی کا طالب ہے۔ اسے چاہیئے کہ صبر کو اپنا شعار بنائے۔ ہر حال میں راضی برضا رہے۔ مخلوق سے شکایت نہ کرے۔ اپنی حاجت کا سوائے اپنے پروردگار کے بذریعہ دعا وسوال یا زبان حال وقال کے اور کسی سے ذکر نہ کرے۔ ہر امر میں مشکل کشائی کی توقع اسی ذات سے رکھے۔ کیونکہ اس کی ذات تمام موجودات سے برتر واعلےٰ ہے۔

حضرت ابو یزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا نظر آئے جو تمہاری دانست میں بے شمار کرامتیں رکھتا ہے۔ یہانتک کہ ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ اور پانی کی سطح پر چل سکتا ہے۔ مگر جب تک یہ نہ دیکھ لو۔ کہ امر ونہی حدود شرعی کی حفاظت اور احکام اسلامی کی پابندی میں کیسا ہے۔ اس پر ہرگز اعتبار مت کرو۔

سید الطائفہ امام طریقت وحقیقت حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ تک پہنچنے کے بے شمار راستے ہیں۔ مگر یہ تمام مسدود ہیں۔ صرف ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقبولیت پائی جاتے۔

پس معلوم ہوا کہ یہ جاہل صوفی جو طریقت وحقیقت اور تصوف کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں اور شریعت کی پیروی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دراصل یہی لوگ اولیائے طاغوت ہیں۔ ورنہ اولیاء اللہ کے اقوال سے تو صاف ظاہر ہے۔ کہ شریعت کی پیروی انسان پر ہر حالت میں فرض ہے۔ اور علم شریعت شرط ہے طریقت وتصوف کو حاصل کرنے کے لئے۔ چنانچہ مفتوح الغیب میں ہے کہ "جو طریقت وحقیقت شریعت کے مخالف ہو وہ کفر اور الحاد ہے" یہ جاہل صوفی نہ تو اولیائے عظامؒ کی پیروی کرتے ہیں اور نہ خدا اور رسولؐ کے احکام کی پروا کرتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کہو کون ہے وہ شخص کہ اس کے ہاتھ میں تصرف ہے۔ ہر چیز اور وہ حمایت کرتا ہے۔ اور اس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کر سکتا جو تم جانتے ہو وہ بھی کہدیں گے کہ اللہ ہے۔ کہو پھر کہاں سے خبطی ہو جاتے ہو" (سورہ مومنون)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ مت بناؤ میری قبر کو عیدگاہ اور درود بھیجو مجھ پر اس لئے کہ درود تمہارا پہنچایا جاتا ہے۔ مجھ کو تم کہیں ہو۔ پھر کہا ابو ہریرہؓ نے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لعنت کی اللہ تعالےٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر۔ (مشکوٰۃ)

ابی الطفیلؓ سے مروی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے ایک کتاب نکالی۔ اس میں یوں لکھا تھا کہ لعنت کی اللہ تعالےٰ

نے اس شخص پر کہ ذبح کرے واسطے غیر اللہ کے۔ (مشکوٰۃ)

غرض یہ قبر پرست، پیر پرست، آثار پرست اور تصویر پرست وہ تمام کام کرتے ہیں جو پہلے مشرک کرتے تھے۔ اور جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو غضبناک ہو کر لغو اور بے معنی جواب دیتے ہیں۔ کہ یہ ملا لوگ تو یونہی بکواس کرتے پھرتے ہیں اور بڑے لطف و سرور کے ساتھ عربی کا ایک جملہ ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ "الصُّوفِی لَا مَذْهَبَ لَهٗ" یعنی صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔ غور فرمائیے کہ سلطان الاولیاء حضرت سیدنا محی الدین جیلانیؒ حنبلی تھے اور فتوی شافعی مذہب پر دیتے تھے اور سلطان الہند حضرت غریب نواز چشتیؒ شافعی تھے اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی شافعی تھے۔ اور حضرت خواجہ بہاؤ الدینؒ حنفی تھے۔

ان جاہل صوفیوں کو اتنا بھی تو علم نہیں کہ آخر وہ ہیں کس گروہ کے؟ اور قیامت کے دن کس جماعت میں سے اٹھیں گے؟

اللہ کے محبوب بندے اب بھی موجود ہیں جو احکام خداوندی اور سنت رسول اللہ صلعم اور طریق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اولیائے عظام رحمۃ اللہ علیہ اجمعین کے قدم بقدم صراط مستقیم پر چل رہے ہیں۔ اگر ایسی ہستیوں کا وجود ہم میں نہ ہوتا تو اسلاف کی بزرگی اور پارسائی بھی ان نام نہاد صوفیوں کی حرکات بد کی وجہ سے مشتبہ ہو جاتی جنہوں نے ان کے نام پر بٹہ لگانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور خلاف شریعت باتیں ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

غرضیکہ تمام مسلمانوں پر سنت نبویؐ کی پیروی اور امر و نہی پر استقامت واجب ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ یعنی ظاہر اور باطن دونوں طرح گناہ چھوڑ دو۔ پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ شریعت کے خلاف ہرگز کوئی کام نہ کریں۔ اور احکام خداوندی اور فرمان نبویؐ کی بجا آوری کے سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ اور شرک جو بدترین گناہ ہے جو کسی طرح بھی معافی کے قابل نہیں ہے۔ اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ اور بدعت میں پڑ کر دوزخ کا ایندھن نہ بنیں۔ پروردگار عالم معبود حقیقی ہر مسلمان کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جگر مرادآبادی

سوز و ساز

لب ترستے ہیں التجا کیلئے — ہاتھ اُٹھتے نہیں دعا کیلئے

عشق کی وسعتوں کے پیشِ نظر — حوصلہ چاہیئے وفا کیلئے

ایک جانِ عزیز کیا شے ہے — لاکھ جانیں ادا ادا کیلئے

ہم نے تنہائیوں میں کیا کیا لطف — ایک آواز بے صدا کیلئے

مجھ کو جو چاہو ناصحو! کہہ لو — کچھ نہ کہنا اسے خدا کے لئے

ماہر القادری

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں — غموں کی دھوپ سے آگے خوشی کے سائے ہیں

پلائے جا مرے ساقی! کہ ہوش باقی ہے — ابھی تو صرف مرے پاؤں لڑکھڑائے ہیں

یہ سوچ کر ہی مصیبت کے دن گزارے ہیں — کہ زندگی میں یہ مدت شمار کیا ہوگی

شفیق احمد

بہ طرزِ نو مجھے لکھنا ہے دل کا افسانہ — فگار ہوں نہ خدایا یہ انگلیاں میری

کلی کلی کو پیامِ حیات دیتا ہوں — کبھی صبا کبھی بلبل ہے ترجماں میری

نہ مجھ کو لے کی ضرورت نہ مجھ کو نے کی تلاش — ہر ایک رسم سے آزاد ہے فغاں میری

لا کمیشن

یہ کشورِ روم و رَے نہیں ہے
قیصر نہیں اس میں کَے نہیں ہے

اسلام کی ہے یہاں حکومت
گنجائشِ سود و مَے نہیں ہے

مذہب کی بہار بے خزاں میں
اُردی کا سماں ہے، دَے نہیں ہے

یہ نغمہ ہے صوتِ سرمدی کا
محتاجِ نوائے نَے نہیں ہے

کیا ذکر زمان اور مکاں کا
یا بحثِ کجا و کَے نہیں ہے

کیا بات نہیں ہے دینِ حق میں
اور کونسی اس میں شے نہیں ہے

کیا درس نہیں ہے مملکت کا
کیا حکمِ جہاد و فَے نہیں ہے

ملحوظ رہے کتاب و سنّت
آئین میں کیا یہ طے نہیں ہے

قانون کا جو بنا کمیشن
خوش فال و خجستہ پے نہیں ہے

جو عالمِ دیں بڑا ہے سب سے
کوئی بھی بجائے وَے نہیں ہے

ایک ایسا بدن ہے یہ کمیشن
رگ جس میں نہیں ہے پَے نہیں ہے

اک رُکن وہ ہے کہ جس کے نزدیک
سنت تو کوئی بھی شے نہیں ہے

غائب ہے حدیث میں تواتر
یہ سلسلہ پے بہ پے نہیں ہے

قول اور کا ہے کتاب میں بھی
دستور کی شکل طے نہیں ہے

قرآن پہ معترض ہیں اور پھر
ماتھے پہ نمودِ خوَے نہیں ہے

جو ہضم نہ ہو وہ منہ سے نکلے
کم فہم کی کیا یہ قَے نہیں ہے

اُٹھتے ہیں قدم انہی کی جانب
گو لب پہ بتوں کی جے نہیں ہے

سب رُکن ہوں کس طرح ہم آہنگ
جب ایک سی دُھن کی لَے نہیں ہے

اس باب میں بس ترے علاوہ
کچھ بھی تو نہیں ہے اے "نہیں ہے"

ہے نام درست "لا" کمیشن
"ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے"

قافیہ پیما

محسوسات

عروج زیدی

ہمارے نام کی راحت کسی کے پاس نہیں
نئی سحر کی بشارت کسی کے پاس نہیں

نہیں کہ دردِ محبت کسی کے پاس نہیں
کسی کے پاس ہے دولت کسی کے پاس نہیں

خوشی میں یادِ خدا ہو "الم" میں شکرِ خدا
یہاں یہ جذبۂ طاعت کسی کے پاس نہیں

جو چشمِ عفو کو مجبورِ التفات کرے
وہ روحِ اشکِ ندامت کسی کے پاس نہیں

وہ جس سے آتشِ نمرود گلکدہ بن جائے
اب اس یقین کی قوت کسی کے پاس نہیں

عمل میں حسنِ لطافت کو ڈھونڈنے والو!
یہاں نظر کی طہارت کسی کے پاس نہیں

غمِ حیات کا فیضان عام ہے لیکن
غمِ حیات کی لذت کسی کے پاس نہیں

عروسِ امن کا کس نے سہاگ لوٹا ہے
یہ سوچنے کی بھی فرصت کسی کے پاس نہیں

رہِ خرد سے گریزاں ہے آجکا انساں
دل ونظر کی رفاقت کسی کے پاس نہیں

یہاں تو دل ہی نہیں دردِ دل کا کیا مذکور
غرض تمہاری امانت کسی کے پاس نہیں

ہر ایک تیرگیٔ شب کا شکوہ سنج تو ہے
نئی سحر کی بشارت کسی کے پاس نہیں

غرض پرست زمانہ ہے خود غرض احباب
عروج! پاسِ مروت کسی کے پاس نہیں

صبا متھراوی

موجِ صبا

یہ دن بھی دیکھنا تھا گلشن کی زندگی میں
اُبھرا ہے سازشوں کا جذبہ کلی کلی میں

دیکھا یہ فرق تم نے دورانِ عشق ہی میں
ہم غم میں مسکرائے تم رو پڑے ہنسی میں

روحِ روانِ گلشن اے پاسبانِ گلشن
تیرا بھی ہاتھ نکلا گلشن کی برہمی میں

رہبر بنے ہیں رہزن یارب تری دہائی
منزل پہ لٹ رہا ہوں تاروں کی روشنی میں

اب دن میں بھی اندھیرے ہر سمت دیکھتا ہوں
میں تو چلا تھا یارب تاروں کی روشنی میں

کچھ پھول ہی چمن میں ایسے بھی تھے جنہوں نے
کانٹوں سے دوستی کی پھولوں کی دشمنی میں

اُسے بیرنگ صبحوں کا یہاں کیا اعتبار آئے
تری زلفوں کے سائے میں جو کچھ راتیں گزار آئے

مرا مسلک محبت اور محبت جاودانی ہے
مرے حصہ میں کیوں یارب حیاتِ استوار آئے

قفس والوں کی جانب سے بھی اک سجدہ چمن والو
چمن میں جب بھی آوازِ اذانِ نوبہار آئے

نظر جھکتی ہے سر جھکتا ہے لیکن دل نہیں جھکتا
ترے بے کیف سجدوں کا نہیں کیا اعتبار آئے

سنوارے جا رہا ہوں وقت کی الجھی ہوئی زلفیں
ترے بکھرے ہوئے گیسو کچھ ایسے سازگار آئے

کھلا نہیں ہے حریمِ وفا کا باب ابھی
ملا نہیں ہے محبت کو کچھ جواب ابھی

اُدھر تو آ تری آنکھوں کا آئینہ دیکھوں
کہ ان سے جھانک رہا ہے ترا شباب ابھی

تری نگاہ کی معصوم مستیوں کی قسم
شرابیوں نے یہ چکھی نہیں شراب ابھی

جبینِ حسن کی آیات کو اُبھرنے دو
پڑھی نہیں ہے کسی نے بھی یہ کتاب ابھی

نعتِ رسول

عبدالکریم ثمر

اے بہارِ چمنستاں اے شبابِ نو بہاراں
اے نسیمِ صبح گاہی اے فروغِ گلعذاراں

اے پناہِ بے پناہاں اے کفیلِ سوگواراں
اے رئیسِ بزمِ امکاں اے شکوہِ تاجداراں

اے پیمبرِ دو عالم اے بنائے آفرینش
اے شفیعِ روزِ محشر اے جلالِ برق و باراں

اے خراج لینے والے تب و تابِ قیصری سے
اے امیرِ کجکلاہاں اے انیسِ شہریاراں

ترے ہر قدم پہ ملتے ہیں نشان عظمتوں کے
اے سفیرِ عرشِ اعظم اے وقارِ ذی وقاراں

مرے دل کی وسعتوں کو ملے شوقِ والہانہ
اے رفیقِ دردمنداں اے قرارِ بے قراراں

ہے جہاں کی ہر سعادت ترے نام سے عبارت
اے انیسِ دلفگاراں، سر و برگِ غمگساراں

کیا روشناس تو نے مجھے سربلند ہونے
ہوں سلام تجھ پہ لاکھوں اے چراغِ کوہِ فاراں

حجت بدایونی

جو علمِ خدا میں پنہاں تھی ۔ ظاہر وہ حقیقت ہوتی ہے
یعنی کہ دو عالم پر نازل ۔ اللہ کی رحمت ہوتی ہے

اک نورِ حقیقت کو حق نے ۔ انسان کی صورت میں بھیجا
انساں کی طرف مائل ہونا ۔ انسان کی فطرت ہوتی ہے

پامال کئے گردوں کے طبق ۔ بیٹھے کو کیا مہتاب کے شق
ایسی بھی بھلا دُنیا میں کسی انسان کی قدرت ہوتی ہے

تکمیل شریعت فرما کر اِتمام کیا ہر نعمت کا
اس طرح زمانے میں پوری ۔ اللہ کی حجت ہوتی ہے

اللہ رے جمالِ ہوش رُبا ۔ ہر ایک نظر ، ہر ایک ادا
قرآن کی سورۃ ہوتی ہے قرآن کی آیت ہوتی ہے

حکمت کا وہم پرواز ہی کیا ۔ فطرت کا دمِ اعجاز ہی کیا
ناسوت کی اس معراج سے خود لاہوت کو حیرت ہوتی ہے

رُوحِ انتخاب

اللہ کی راہ میں اپنے خون سے حق کی گواہی دینے والو!

تم پر ہمیشہ اللہ کی سلامتی اور رحمت نازل ہو۔ سورج کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ وہ تمہاری قبروں پر اپنی کرنوں کے پھول نچھاور کرے اور چاند کے لئے یہ سرمایہ عزت ہے کہ وہ تمہارے مدفنوں پر چاندنی کی چادریں چڑھائے

میں تمھیں اس یقین کے ساتھ مخاطب کر رہا ہوں کہ تم اپنے مالک کے نزدیک زندہ ہو لیکن تمہاری زندگی کی حقیقت سے ہم مادی دنیا کی حدود میں پھنسے ہوئے لوگ باخبر نہیں ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا سلام، اور میرے دل کی بے تابی تم تک پہنچانے کا اہتمام کارکنانِ قضا وقدر ضرور ہی کردیں گے، اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ اس دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ اللہ کی راہ میں بہایا ہوا خون، اور اپنے زخمی حلقوم پیش کریں گے، تو مدتوں کے بعد پہنچنے والا یہ تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت کا باعث ہوگا۔ کوثر و تسنیم کے چشموں میں آپ کو غسل دیا جاتے گا۔ اور میزانِ عمل میں تل جانے کے لئے یہ خون محفوظ کر لیا جائے گا۔ جو ہر عمل سے بڑا عمل ہے اور ہر وزن سے بڑا وزن ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تو وہی راہ ہے جس کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جان دوں، پھر زندہ ہوں، پھر جان دوں۔ پھر زندہ ہوں۔ پھر جان دوں، حضور کی اس تمنا سے تم نے اپنا پورا پورا حصہ پالیا۔ اور اپنی اس کامیابی پر ساری دنیا کو گواہ بھی بنالیا۔

کتنے ہی مراحل ہیں جو اللہ کی راہ میں آتے ہیں اور ہر مرحلے کی آمد پر کچھ لوگ آگے بڑھتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے سامنے اس مرحلہ سے گذرنے کی مثال پیش کردیتے ہیں۔ گویا مکتبِ عمل کا ایک درس اپنے قافلے کے ساتھیوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ جو کمزور ہوتے ہیں وہ اس درس سے قوت پکڑتے ہیں۔ راہ ہموار محسوس کرتے ہیں، اور آگے بڑھتے ہیں۔ یہ کام ہر تحریک میں ہوتا ہے، اور قافلۂ فکر و عمل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن تم نے تو آگے بڑھ کر اس راہ کا آخری درس دے ڈالا۔ تم نے تو کتابِ عشق کو تمت تک پہنچا دیا۔ تم نے تو سارا نصاب ہی طے کرلیا، قافلے کی گھنٹیاں بجتی رہیں، مسافر آگے بڑھتے رہے۔ منزلِ عشق طے ہوتی رہی۔ راہیں ہموار ہوتی رہیں، ساتھی قطار اندر قطار حُدی پڑھتے ہوئے چلتے رہے۔ اور منزل کے نشانوں کی تلاش میں نظریں افق پر بھٹکتی رہیں لیکن تم نے تو سارے قافلے کو مات کردیا! اور آگے بڑھکر خود منزل کو گرفت میں لے لیا۔ تم تو سارے ہی کارواں کو پیچھے چھوڑ کر بہت دور آگے نکل گئے۔ اتنی دور کہ تمہارے قدموں کی گرد بھی مجھے کہیں سے مل جاتے تو اسے اپنے چہرے پر ملنا۔ اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا، میرے لئے باعثِ صد افتخار ہوگا۔

فرعونوں کی سرزمین میں یوسفؑ نے ایک اُسوۂ زندانی پیش کیا تھا تم نے اس اسوہ کو زندہ کردیا۔ موسیٰ کی قوم نے بچوں کی قربانی سے ایک مثال قائم کی تھی۔ تم نے اس مثال میں پھر روح پھونک دی۔ کچھ زرین حقائق تھے جو تاریخ کی گرد کے نیچے دبے جارہے تھے۔ تم نے اس تاریخ کو پھر دُہرا دیا۔ کچھ سامریوں نے اپنے اقتدار کا بچھڑا پوجنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے اپنے عمل کی ٹھوکر سے اسے پاش پاش کردیا۔ تاریخ کی گود راہ حق کی قربانیوں سے خالی ہوئی جارہی تھی۔ تم نے اسے پھر مالامال کردیا۔ انسانیت بڑھ بڑھ کر اغراضِ نفسانی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہی تھی اور حق بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ تم نے قربانیوں کا قبلہ پھر اللہ کی طرف پھیر دیا۔ مدت سے لوگ مٹی اور پتھر کے موذنوں پر حق کی اذانیں دینے کے عادی ہوتے جارہے تھے۔ تم نے بتادیا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر پھانسی کے پھندے کے ساتھ معلق، ہوکر سب سے اونچے موذنے پر اذان دعوتِ حق دینے والے ابھی دنیا سے محو نہیں ہوتے ہیں۔ تم نے تو دنیا کے حق پرستوں کو وہ سبق دیا ہے۔

کہ جو انہوں نے دیا تھا۔ جو اللہ کی راہ میں پکڑے گئے۔ پھر زمین کھودی گئی۔ پھر وہ کمر تک اس میں گاڑ دیئے گئے۔ پھر انھیں آروں سے چیر دیا گیا، اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں پر سے نوچ ڈالا گیا۔ کتنی تمثیلیں تھیں جن کے زندہ کردار تم بن گئے۔ کتنے جذبے تھے جن میں اضطراب بن کر تم دوڑ گئے۔ کتنی شکستہ رگیں تھیں جن کی جان تم بن گئے۔ کتنے بھٹکے ہوئے تھے جن کے لئے مشعل راہ تم بن گئے۔ تم نے تو انبیاء کے ساتھیوں کی یاد تازہ کردی اور بے یقینوں کو یقین دلایا کہ انسانوں کا وہ ماڈل قدرت نے ہمیشہ کے لئے توڑ نہیں دیا جو آج سے تیرہ سو سال پہلے صحابہ کے زمانہ میں ظاہر ہوا تھا۔

حضورِ حق سرخرو ہو کر پہنچنے والو! ———— تمہارے مادی جسموں کے بچھڑنے نے کتنی ہی آنکھوں کو بے خواب اور آنسوؤں کے چشمے بنا دیا ہے۔ اس لئے کہ مادی جسموں کا بچھڑنا بھی ایک حادثہ سمجھا جاتا ہے، بیوی بچوں اور عزیزوں کا سوگوار چھوٹ جانا بھی ایک غم انگیز بات کہا جاتا ہے۔ میں نے نہ تمہیں دیکھا، نہ ملاقات کی، نہ روابط باہمی پیدا کئے، اور شناسائی کے پیمانے سے اگر ناپا جائے تو تم میرے لئے ان لاکھوں اجنبیوں میں سے تھے جو روزانہ دنیا سے اپنے مالک کی طرف اپنا حساب دینے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، اور جن کی مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن میرے گلے نے بھی وہ گھٹن محسوس کی جس سے تمہیں ہزاروں میل دور مصر کی سرزمین میں دو چار ہونا پڑا تھا۔ اور میری آنکھوں نے بھی باوضو ہو کر تمہاری یاد کو ستایا۔ ہم روزانہ دنیا کے اس کمرۂ امتحان میں سے اٹھ اٹھ کر جانے والوں کو ان کا پرچہ امتحان چھینتے دیکھتے ہیں اور کم ہی ان سے اپنے پرچے کے حساب کم و بیش کا احساس کرتے ہیں، لیکن یہ تم نے کس انداز سے اپنا پرچہ امتحان دیا کہ ساری محفل کو اپنے پاس ہونے کا یقین دلا گئے۔ مجھے سرخیل شہدائے راہ حق خلیفہ راشد یاد آتے ہیں جن کے بارے میں اللہ کے حبیب نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ عزیمت جن کے گھر کی باندی تھی، جو اپنا سب کچھ راہ حق میں لگا کر بھی مطمئن نہ تھے۔ جو حضرت ابن عباسؓ کے اطمینان دلانے پر بھی بار بار فرماتے تھے کہ اگر برابر برابر بھی چھوٹ جاؤں تو خوش ہوں۔ اور فرماتے تھے کہ میری اور میری ماں کی تباہی ہے اگر اللہ نے میری مغفرت نہ فرمائی۔

میرے مکرم بھائیو! ایسے مقدس انسانوں کے قافلے میں شرکت کا فخر ہے جو تم کو حاصل ہو گیا ہے

میں نے سنا کہ جب تمہیں راہ حق کے اس اونچے موڑ تک لایا گیا جسے لوگ پھانسی کہتے ہیں، تو تمہارے چہروں پر تشکر و امتنان کی جھلک تھی۔ تم گویا وہ کچھ دیکھ رہے تھے جسے عین الیقین کہا جاتا ہے۔ تم نے اپنے آخری راہوار پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"اللہ انھیں معاف کردے جنھوں نے مجھ پر ظلم کیا"

"اللہ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے شہید کا مرتبہ عطا فرمایا"

"میرے خون کے ہر قطرے سے انقلاب پیدا ہوں گے ۔۔"

اس میں کیا شبہ ہے کہ تمہارا خون اسی راہ میں بہا جس راہ میں بدر والوں کا خون بہا تھا۔ بدر والوں کے خون کا ہر قطرہ انقلاب کا سیل بن کر اٹھا تھا۔ تمہارا خون بھی یونہی باطل کے لئے سیل بن کر اٹھیگا۔ سنا ہے کہ اطمینان و مسرت تمہارے چہروں کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھے۔ مجھے بھی بتاؤ کہ آخرت کے انعامات کی آخر وہ کون سی جھلک تھی جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کاش ان آنکھوں میں سے ہم جیسے بے یقین اور مقام شوق سے دور افتادہ لوگ بھی وہ جھلک دیکھ لیتے جس نے تم کو پھانسی کے تختہ پر گدگدا کر مسکرا دیا اور اس نظارہ کی محویت نے تمہیں بھلا دیا کہ تم کہاں کھڑے تھے۔

جب کسی خاندان کا کوئی فرد اونچا سرکاری عہدہ پاتا ہے۔ تو اس کا سارا خاندان فخر کرتا ہے۔ خوشیاں مناتا ہے اور مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ کم ظرفوں کو تو معمولی سی حیثیت پا لینے پر بھی آپے سے باہر ہوتے دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ عہدے چند سالوں کے لئے عارضی ہوتے ہیں۔

ایسی حکومتوں کی طرف سے ہوتے ہیں جن کی بے چارگی زمانے کی چند گردشوں سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے اور جو معتوب ہونے پر چھن جاتے ہیں لیکن تم نے تو خدا کی سلطنت میں مقام بندگی کا۔ سب سے بڑا عہدہ پایا ہے تمہارے اعزاز کا کیا عالم ہے تم تو ان میں سے ہو جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ "ان پر رو یا نہ رو لیکن جب تک ان کا لاشہ میدان جنگ میں پڑا رہا تیر فرشتے اپنے پروں سے سایہ کئے رہے" تمہارے خاندان والوں کو تو ان ہستیوں سے قربت کی نسبت ہے جن کو تو ابن موت و زیست سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرما دیا گیا ہے کہ انھیں مردے نہ کہو یہ زندہ ہیں البتہ تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔ تم جو راہ حق میں زندہ و پائندہ ہو گئے اور تمہاری زندگی اور پائندگی کو ملک الملک کے قانون کی رو سے زوال نہیں ہے ظاہر ہے کہ تمہاری زندگی کے اس نئے روپ پر تمہارے اس اعزاز پر تمہارے اس نئے مقام زندگی پر ان لوگوں کو رونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو یقین رکھتے ہیں کہ مالک الملک ہی سب سے بہتر وعدوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ جو اللہ کا ایک بندہ اللہ کی سلطنت میں پا سکتا ہے۔

لاکھوں انسان روزانہ مرتے ہیں، کروڑوں باطل خداؤں کی خدائی کا سکہ جمانے کے لئے جنگوں میں کام آتے ہیں اپنی اغراض کے لئے کشمکش کرتے ہوئے مر جاتے ہیں اس لئے کہ ایک بندھا ہوا ضابطہ ہے کہ دنیا میں ماں کی گود کے ذریعہ داخل ہونے والا قبر کی گود تک بہرحال پہنچے گا۔ دنیا کے اس عرصۂ حیات کی منزل کے یہ دو سنگ میل ازل سے ابد تک نصب ہیں۔ جن کے درمیان انسان اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہوا گزرتا ہے۔ اس معاملہ میں ہر ذی روح مساوی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان لاکھوں، اور کروڑوں میں سے کس کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ وہ اپنے ارادے سے اپنے مالک کی راہ میں بھی چلا، اور اس کی راہ میں جان دی۔ جان دینا اصل کام نہیں اس لئے کہ اسے واپس کئے بغیر چارہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے کس طرح واپس کیا، کس راہ میں واپس کیا، اور کس جذبے سے واپس کیا اس میں کیا شبہ ہے کہ ــــ آرے لکڑی اور رسی کے اونچے گھوڑوں کے شہسوارو! تم نے کروڑوں کے اندر اپنا ممتاز ہونا ثابت کر دیا۔ تم نے دنیا والوں کی عام پٹی ہوئی راہ چھوڑ کر وہ راہ اختیار کی جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے لیکن جو عرصہ سے ویران تھی۔ تمہارے قدموں کے نشانوں نے اس راہ کی رونق کو دوبالا کر دیا۔

تم ٹھنڈے ٹھنڈے قدم چل کر جنت تک پہنچنے کے تمنائیوں کو بہیز لگا گئے ہو۔ تم نے زیر لب حقائق کو وا شگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم نے استقامت کا لفظ بولنے والوں کو استقامت کا مفہوم سمجھا دیا ہے۔ تم نے راہ حق کی سب سے بڑی راز کی بات بر سر عام رکھ دی ہے اور معرفت حق کے اس نکتے پر انگلی رکھ دی ہے جس کو بھول جانے سے علم لوگوں کے لئے حجاب اکبر بن جاتا ہے۔

جس کو بھول کر لوگ علم و عمل کی رنگا رنگ بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اور وادیٔ عشق کو چھوڑ کر آوارگیٔ فکر و نظر کی وادیوں میں سرگرداں و پریشان رہے ہیں۔ تم نے میثاق ازل کو خون کی روشنائی سے لکھ کر تازہ کیا۔ اور اسے پورا کیا۔ اور پیچھے آنے والوں کو اسے پورا کرنے کا انداز بتا گئے۔ کچھ بے روح الفاظ تھے جو ہماری دعاؤں میں بار بار آتے تھے۔ کچھ سرد جذبے تھے جو زندگی کی حرارت سے نا آشنا تھے، کچھ خاموش ولولے تھے، جنھوں نے ابھی حقائق کا منہ نہ دیکھا تھا۔ کچھ سر بکف ارادے تھے جنھوں نے ابھی شدائد سے ٹکر کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ تم نے ان الفاظ کو مفہوم دیا۔ ان جذبوں کو حرارت دی۔ ان ولولوں کو گویا کیا اور ان ارادوں کو عزیمت سے آشنا کیا کتنے راہی تھے جو اس راہ پر صرف نقل سے مطمئن ہو کر اس کے ساتھ بڑھے چلے جا رہے تھے تم نے اچانک انھیں روکا، روک کر انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں کو ٹٹولیں، اور اپنی رگوں میں گرم گرم خون کی گردش کا اندازہ کر کے آگے بڑھیں۔

یہ خبر سن کر کہ تم راہ حق کے سب سے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے ہو تمہارے کتنے دور افتادہ ساتھی ہیں جنھوں نے پھندوں کیلئے اپنے حلقوم کا جائزہ لیکر دیکھا اور اس ترازو میں تولنے کیلئے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو جانچا ہے تم محسوس کرا گئے ہو کہ یہ جائزہ لئے بغیر جو راہی اس راستہ پر چل پڑتا ہے۔ وہ ایسا بے زاد راہ مسافر ہے جو سفر کی سختیوں سے بے خبر اور اس کے نشیب و فراز سے نا آشنا ہر وقت حوادث راہ کا ممکن شکار ہے۔ (اسعد گیلانی)

مختار رضا

اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

میٹرک پاس کرتے ہی خوش قسمتی سے اُسے سرکاری دفتر میں ملازمت مل گئی - اس زمانے میں جب کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے " ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ اُسے یہ نوکری نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی کیونکہ اب وہ اپنے بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہوگیا تھا۔

رشید کو اپنی ملازمت بے حد عزیز تھی۔ اس نے اپنی تمام اُمنگوں اور امیدوں کو نوکری کے دامن سے وابستہ کرتے ہوئے پوری مستعدی اور دیانت داری سے کام شروع کر دیا۔ تین چار کلرک دو چپراسی اور ہیڈ کلرک یہ تھا۔ دفتر کا مختصر سا عملہ۔ ہیڈ کلرک بڑا نیک دل اور شریف انسان تھا۔ اور اس کا برتاؤ اپنے عملے کے ساتھ پُر شفقت آمیز تھا۔ اس کے ساتھی کلرک بڑے زندہ دل نوجوان تھے دن بھر دفتر قہقہوں سے گونجتا رہتا۔

دفتر کی یہ محدود سی دنیا اس کے لئے کولمبس کی سی دنیا کی طرح نو دریافت اور حسین تھی۔ وہ بہت مسرور تھا۔ کوئی چھوٹا، موٹا کام ہو تو چپراسی خدمت سے کمربستہ اور پکنک یا سیر و تفریح کا کوئی اور پروگرام ہو تو دفتر کے ساتھی معیت کے لئے تیار رہتے دفتر کی عالیشان بلڈنگ اور قیمتی فرنیچر پر بھی ناز سا تھا۔ جیسے یہ اس کی ذاتی جائداد ہو۔

کبھی کبھار اُس کے اسکول کے زمانے کے دوست اس سے ملنے کے لئے دفتر آجاتے تو وہ دفتر کی ایک ایک چیز انھیں بڑے افتخار آمیز انداز میں دکھاتا۔ اور دفتر میں اپنی حیثیت جتانے کے لئے چپراسیوں پر خواہ مخواہ رعب ڈالنے کی کوشش کرتا بعض اوقات انھیں بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ دیتا۔

اس کے بے روزگار دوست جب اس کے ٹھاٹ دیکھتے تو بڑا رشک کرتے۔ اور حسرت سے کہتے " کیا نصیبا پایا ہے۔ یار تم نے! حکومت کرتے ہو حکومت یار" اور وہ ایسے موقعوں پر فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے نوکری سے بیزاری ظاہر کرتا "بھئی نوکری بغیر چارہ نہیں۔ کیوں کہ اور کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ ورنہ کب کے ان بندھنوں سے آزاد ہو گئے ہوتے۔ نوکری آخر نوکری ہے۔ آپ لوگ عیش اڑاتے ہیں۔ اپنی نیند سوتے ہیں اپنی نیند جاگتے ہیں" اور جی ہی جی میں اپنی نوکری پا جیسا کہ وہ بھی کبھی محسوس کیا کرتا تھا اپنی حکومت کے خیال سے بڑا خوش ہوتا تھا۔ دو سال اسی طرح ہنسی خوشی بیت گئے۔

آج سویرے ہی سویرے چپراسی نے اُسے اطلاع دی کہ ہیڈ کلرک صاحب اسے یاد فرما رہے ہیں۔ جب وہ ہیڈ کلرک کے کمرے میں داخل ہوا تو ہیڈ کلرک سر جھکائے خاص انداز سے فائلیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر دوسرے دفتر کا ہیڈ کلرک بیٹھا ہوا بڑے بے پروایانہ انداز سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ہیڈ کلرک نے اسے کچھ ہدایات دیں اور حکم دیا کہ فوراً DRAFT G. LETTER بنا کر "Put up" کرو۔

ہیڈ کلرک جلد جلد ہدایات دے کر دوسرے ہیڈ کلرک صاحب سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔ ہیڈ کلرک کی ایک دو ہدایتیں

رشید کی سمجھ میں نہ آئیں تھیں۔ اس لئے وہ اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ ہیڈ کلرک اُس کی طرف متوجہ ہو تو وضاحت طلب باتوں کو سمجھ لے۔ ہیڈ کلرک نے جب گردن گھمائی تو رشید کو منتظر کھڑا پایا۔ "کیوں؟ کیا بات ہے۔ تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟ میں نے تمہیں فوراً ڈرافٹ بنا کر لانے کو کہا ہے۔ ہیڈ کلرک نے خفگی آمیز لہجہ میں کہا۔

رشید " جی ... ... ڈرافٹ کا مضمون ذرا پھر سمجھا دیجئے۔ آپ کا یہی مطلب ہے نا کہ ... ...

ہیڈ کلرک " ہاں! تمہارا خیال درست ہے۔ "

رشید " اور یہ بھی پوچھنا ہے کہ ... ... "

ہیڈ کلرک ... ... اب تو میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا! جاؤ۔ جلدی سے ڈرافٹ بنا لاؤ "

رشید " مگر میں ... ... میں یہ نہیں سمجھا کہ ... ... "

ہیڈ کلرک " ابے گدھے! میں تمہیں کہاں تک (کہاں تک) سمجھاؤں ... ... کیا تم ... ... اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے ... ... "

رشید کے سر پر جیسے کسی نے پوری طاقت سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس کا سر گھومنے لگا اور کان شائیں شائیں کرنے لگے۔ وہ چلایا " آپ! ... آپ! ... مجھے ... ... گدھا اور نہ جانے کیوں اُس کا گلا رندھ سا گیا۔ اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے جی میں آیا کہ میز پر سے قلمدان اٹھا کر ہیڈ کلرک کے منہ پر دے مارے۔ اور خود بھاگ جائے ... پوری تیزی سے ... ... دور ... ... اتنی دور ... ... کہ جہاں کوئی انسان نہ ہو۔ اور تنہائی میں بیٹھ کر خوب روئے دھاڑیں مار مار کر روتے۔ اپنے بال نوچے۔ اپنے کپڑے تار تار کر دے۔ اور اپنے منہ پر طمانچے مارے مگر کس کے منہ پر دفعتاً یہ سوال اس کے ذہن میں گنبد کی آواز کی طرح گونجنے لگا۔

طمانچے کس کے منہ پر مارے جائیں۔ اپنے منہ پر یا ہیڈ کلرک کے منہ پر؟ "اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے اندر بہت سے جن اور دیو مل کر چلا رہے ہوں " ہیڈ کلرک کے منہ پر! ہیڈ کلرک کے منہ پر!!

یکایک اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ کنپٹیوں میں چنگاریاں سی رینگنے لگیں۔ اور مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔ اس نے بھر کر کہا۔ آپ نے مجھے گدھا ... مجھے گدھا ... کیوں کہا " اور اس کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ گدھے تو آپ ہیں ... مگر " اس نے سوچا وہ ایک اچھے بھلے بہترین آدمی کو گدھا کیسے کہہ دے " لیکن اس اچھے بھلے آدمی نے کتنی آسانی سے گدھا بنا دیا ہے مجھے " اس کی سوچ نے کروٹ بدلی تو پھر ... تو پھر ... میں " ابھی وہ اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ ہیڈ کلرک نے Get - out - [illegible] کہہ کر اس کی فکر کا گلا گھونٹ دیا۔ اور وہ خود بخود بے اختیار۔ ایک آٹومیٹک مشین کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہو رہی تھی اور حواس مختل تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات پر گہری دھند چھا گئی ہو۔ اور اس دھند میں گھری ہوئی کمرے کی ہر شے گھوم رہی ہے۔ دیواریں۔ فرش، میز کرسی اور وہ خود۔ اسے اپنے سینے میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے اس کا دل شعلوں کی زد میں آ گیا ہو اور اس میں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہوں۔ اس نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں سے ایک نے جب دوسرے پر فتح پائی تھی تو اس نے شکست خوردہ بادشاہ کو ایک پنجرے میں بٹھا کر ملک بھر میں اس کی تشہیر کی تھی۔ اس نے سوچا کہ فاتح بادشاہ ہیڈ کلرک ہے اور شکست خوردہ بادشاہ وہ خود ہے۔ جس کی کہ دنیا بھر میں تشہیر ہو رہی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ اس کے کان گدھے کے کانوں جیسے لمبے ہو گئے ہیں اور گلے میں پڑی ہوئی نکٹائی ایک آہنی زنجیر بن گئی ہے۔ جسے ہیڈ کلرک پکڑے ہوئے اسے بازار میں گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ اور پیچھے پیچھے بچے "گدھا! آہا گدھا" کا شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ اور نوجوان قہقہہ لگا رہے ہیں۔ جیسے ہیڈ کلرک نے اس کے کپڑے

اتار کر اُسے چوراہے میں ننگا کھڑا کر دیا ہو۔ اور لوگ اسی پر ہنس رہے ہوں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں ملیں۔ اور ارد گرد چوروں کی طرح دیکھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر قائم تھی۔ دفتر کے کچھ کلرک ایک میز پر جمع ہو کر مزے سے گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک دو اپنے کام میں مصروف تھے۔ چپراسی ایک کونے میں بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور وہ .... وہ بھی حسبِ معمول اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر .... پھر بھی کمرے کی فضا .... کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ ہوا سانسوں میں زہر سا گھول رہی تھی جیسے وہ دفتر نہ ہو جہاں وہ روزانہ بیٹھ کر کام کرتا تھا .... بلکہ .... شاید یہ جیل تھی .... جہاں وہ ایک مجرم کی حیثیت سے موجود تھا .... لیکن اس کا جرم کیا تھا؟ اسے یاد آیا کہ پرسوں اس نے کالو چپراسی کو "گدھا" کہا تھا۔ مگر کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ کینٹین سے چائے ذرا دیر سے لایا تھا۔ لیکن اتنے سے جرم پر اتنی بڑی سزا؟ یعنی میں نے اسے گدھا کہدیا۔ اُف میرے خدا! مجھ سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا" اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ اور میرے اس خطاب پر وہ کس طرح تلملایا؟ اس کی سفید داڑھی کے بال کس طرح ببول کے نوکیلے کانٹوں کی طرح تن گئے تھے۔ اور اس کے سانولے رخسار کس طرح تپتے ہوئے لوہے کی طرح دہکنے لگے تھے؟ اور اس کی شعلہ فشاں آنکھوں سے پانی کی بوندیں رسنے لگیں تھیں۔؟ افسوس! اس وقت میں نے اس کے جذبات کی ذرا پرواہ نہ کی تھی۔ حالانکہ میرا دل اس کی پر وقار داڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر پسیج گیا تھا۔ بے اختیار جی چاہا ــــ دوڑ کر اس کے آنسو پونچھ ڈالوں۔ اور اس سے التجا کروں کہ "بابا! مجھ سے گستاخی ہو گئی ہے معاف کر دو" مگر .... میں یہ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن میں ایسا کیوں نہ کر سکتا تھا۔ کس چیز نے مجھے اپنے گناہ کی معافی مانگنے سے روکا تھا۔؟ شاید میرے غرور نے! آہ میری آنکھوں پر غفلت کی پٹی کیسی بندھ گئی تھی۔ میں واقعی گدھا .... لیکن ہیڈ کلرک نے مجھے گدھا کیوں کہا؟ اسے یہ کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔؟ لیکن مجھے کالو کو گدھا بنانے کا کیا حق حاصل تھا۔ کالو۔ میں۔ ہیڈ کلرک۔ گدھا۔ کیا کالو گدھا ہے؟ نہیں! میں گدھا ہوں؟ بالکل غلط۔ ہیڈ کلرک گدھا ہے۔؟ ...... نہ ...... نہ ...... لیکن اس نے بھی گدھا کیوں کہا۔ مگر میں نے کالو کو ......

آہ! تو اس کا یہ مطلب ہوا۔ جو مجھے اس ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ میرے غرور و احساسِ برتری کی سزا ہے۔ میرے گناہ کی پاداش ہے۔ میرے اعمال کا خمیازہ ہے۔ اور شاید میری غفلت پر ایک ٹھوکر ہے۔؟ اُف! مگر یہ ٹھوکر کتنی دردناک ہے۔ یعنی آج مجھے گدھا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اوہ! میرے خدا! میں کتنا ذلیل ہوں۔ اے ربّ العزت! میں بہت شرمسار ہوں۔ فرطِ ندامت سے میرے حواس بے قابو ہو رہے ہیں مجھے کچھ سوجھتا نہیں۔ کہ کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ کیسے جیوں؟ اس ذلت کو کس طرح سہوں! تو رحیم و کریم ہے۔ میرا گناہ بخش دے۔ مگر ...... میں جو آج اپنی بے غیرتی پر اتنا مضطرب ہوں تو کیا میں نے کالو کی ہتک کرتے وقت اُس کے جذبات کی ہلچل۔ اس کی خودداری کی تڑپ۔ اُس کے ضمیر کی تلملاہٹ اور اس کی بے لبی کے آنسوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔؟ آہ تو پھر مجھے کالو سے معافی مانگنی چاہیئے۔ شاید ...... وہ مجھے معاف نہ کرے ...... مگر مجھے معافی ضرور مانگنی چاہیئے ...... نہیں تو ...... نہیں تو ...... میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔

وہ کرسی سے ایک جوش کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کالو کے پاس جا کر بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوا۔ "کالو بابا! مجھے معاف کر دو۔ پرسوں مجھ سے بڑی گستاخی ہوئی ہے" اور کالو حیرت سے رشید بابو کے چہرے کو تکنے لگا!

ہماری نظر میں

علیؓ اور ان کی خلافت
از: پیام شاہ جہاں پوری، ضخامت ۴۰۰ صفحات، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ، قیمت پانچ روپے، ملنے کا پتہ: ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کی اُمتِ مسلمہ کو بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ سو دو سو نہیں ہزاروں صحابہ اور تابعین جمل و صفین میں خاک و خون میں تڑپے۔ اور اُمت میں شدید تفرقہ نمودار ہوگیا چشم آفتاب نے یہ منظر بھی دیکھا ہے، کہ حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عمار ابن یاسرؓ ایک کیمپ میں اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مخالف کیمپ میں ہیں اور دونوں کیمپوں کے جانبازوں کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف کھنچی ہوئی ہیں۔

تاریخ میں ان دردناک واقعات کو پڑھ کر دل سخت کرب و اذیت محسوس کرتا ہے۔ اور دل سے یہ تمنا ہوک بن کر اٹھتی ہے کہ "کاش! یہ نہ ہوا ہوتا" مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہا۔ یہ وہی مقام صبر و رضا ہے۔ جہاں

جف القلم بما ھو کائن

پر ایمان لاتے بغیر اور کوئی چارہ نہیں! تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کی بہت سی باریک حکمتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بیچاری لکیریں کس طرح سمجھ سکتی ہیں کہ "نقاش" کس لکیر کو کیوں مٹاتا ہے۔ اور کس لکیر کو کس لئے باقی رکھتا ہے۔!

اسلامی تاریخ کے ان ابواب کو پڑھتے وقت طبیعت کو سخت وحشت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام کا معاملہ ہے۔ یہ سب کے سب آسمان ہدایت کے کواکب اور شمس و قمر تھے۔ ان کا شرفِ صحابیت ہی تنہا اس قدر وزنی ہے کہ ہم ایک معمولی صحابی کی خاک پا کے بھی برابر نہیں ہیں! ایسی حالت میں ہم کس کو کیا کہیں۔ ؟ ہمارا فیصلہ اور ہماری رائے بھی غلط ہو سکتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ مورخین سے بھی تسامح ہوا ہو۔ بعض واقعات ایسے دو رُخے اور پیچیدہ ہیں، کہ ان سے ایسے نتائج نکالنا جو سو فیصدی درست و صحیح ہوں بہت مشکل ہے۔

اس لئے بعض محتاط اہل علم کا یہ مسلک رہا ہے کہ وہ صحابہ کرام کے ان اختلافات کو اسی طرح رہنے دیتے ہیں، جیسے وہ کتابوں میں موجود ہیں۔ وہ ان کے بارے میں خود کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے۔ اور نہ "حَکَم" بننے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں قیامت کے دن سوال ہوگا۔ جمل و صفین کے معاملہ میں ہم سے پوچھ گچھ نہ ہوگی۔

مگر اس کو کیا کیجئے کہ "تاریخ" اپنا فرض انجام دینے سے باز نہیں رہ سکتی! واقعات کی تدوین ان پر غور و خوض اور پھر ان سے نتائج نکالنا اور محاکمہ کرنا یہ "تاریخ" کی فطرت میں داخل ہے —— جناب پیام شاہ جہانپوری نے ایک مورخ کی

بادشاہ لوگوں کو رشوتیں نہیں عطیے اور انعام واکرام دیا کرتا ہے ۔ ــــــ " اس لئے یہی تعداد درست سمجھنا چاہیئے۔ (صفحہ ۳۱۲) " اس لئے یہی تعداد درست سمجھنی چاہئے " یا " اس لئے اس تعداد کو درست سمجھنا چاہیئے " لکھنا تھا

جناب پیام شاہجہانپوری کی زبان سلیس اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے ۔ کتاب پڑھ کر ان کی مورخانہ بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ! حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات گرامی سے انھیں جو عقیدت ہے وہ کہیں کہیں مورخانہ نقد و محاکمہ پر غالب آگئی ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ کے حق میں ان کا قلم کہیں کہیں " اشترؓ کی تلوار " بن گیا ہے !

اس کتاب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے " نظام سلطنت " کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ اس باب سے بہت سوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا ! کتاب کے آخر میں فاتح خیبر کی ناکامی کے اسباب سے بھی بحث کی گئی ہے ۔

اسلامی تاریخ کے ان واقعات میں پڑھنے والوں کے لئے بہت کچھ عبرت و موعظت ہے ــــــ یہ کہ علم و فضل اور شجاعت و تقویٰ کے ہوتے ہوئے " تدبیر " کے پورے طور پر ٹھیک نہ ہونے سے ہوا کا رخ ہی بدل جاتا ہے ــــــ شیطان جب فریب دیتا ہے تو " اقامت حق " کے نام پر اسلامی جماعت ہی میں کچھ باغی اور سرکش پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اور علیؓ جیسے مجسم حق کو " کافر " کہنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں ــــــ حضرت علی جن کو " امام الاولیا " اور صوفیوں کا پیشوائے اعظم کہا جاتا ہے جب ہم ان کو مصیبتوں میں گھرا ہوا پاتے اور ان کی امیدوں کا خون ہوتا ہوا دیکھتے ہیں ۔ تو پھر ہم کس قطب ، غوث اور ولی کی روح سے مدد چاہیں ؟ کس کی قبر پر التجائیں کرجائیں ! نفع و ضرر کا مالک اللہ تعالےٰ کے سوا ، کوئی نہیں ہے ۔

تصویریں از ۔ اسعد گیلانی ۔ ضخامت ۹۰ صفحات ، مجلّد ، رنگین گرد پوش کے ساتھ ۔ قیمت تین روپے چار آنے

ملنے کا پتہ :- مکتبہ تعمیر انسانیت گوجر گلی ۔ موچی دروازہ لاہور ۔

جناب اسعد گیلانی کے انیس مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔ چند مضامین کے عنوانات ــــــ ایک ایڈیٹر ، ایک وزیر ــــــ یک زمانہ صحبت با اولیاء ــــــ مولانا مسعود عالم ندوی ــــــ میں اور میرا سایہ ــــــ شہدائے مصر کی یاد میں ــــــ مولانا مودودی گلی کوچوں میں ــــــ ابلیس معاش کی دھمکی پر

ہلکے پھلکے دلکش مضامین ، مگر صرف دل بہلانے کے لئے نہیں ــــ ہر مضمون میں ایک پیام اور ایک مقصد رکھتا ہے ۔ جس میں پڑھنے والوں کے لئے عبرتیں اور بصیرتیں ہیں ۔ انداز بیان دلنشیں اور اثر انگیز ! " ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد " کا سماں اور کیفیت !

اس کتاب کا ایک مضمون (شہدائے مصر کی یاد میں) اس شمارہ (درج انتخاب) میں نقل کیا گیا ہے ۔

" میں نے تشویش سے پوچھا (صفحہ ۱۲) " تشویش کے ساتھ پوچھا " لکھنا چاہیئے تھا ــــــ وہ مسلسل اپنے ذہن میں کھنگالتا رہا " (صفحہ ۱۳) یہ کیا انداز بیان ہے ــــــ یہ چیز ان سے آدمی یا کر اپنی ہڈی کا گودا تک بے لقینی کے حوالے کر دیتا تھا ۔ (صفحہ ۱۷) ــــــ " خالی ہڈی " یا ہڈی کا گودا بے یقینی کے حوالے کر دینے سے آخر کس تاثر کا اظہار مقصود ہے ۔ اس جملے میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے ــــــ " اس نے مسکین سی آواز میں بڑی جہاں دیدگی کے انداز میں کہا (صفحہ ۵۳) ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ــــــ یہ بہرحال واحد نسخہ یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں (صفحہ ۱۷) " واحد نسخہ " یہاں کتنا بے جوڑ لگتا ہے لکھنا یوں چاہیئے تھا ... بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو ہوگیا

حیثیت سے اس نازک ذمہ داری کا بار اپنے سر لیا ہے! اپنی اس کتاب کا پیش لفظ خود انہی نے لکھا ہے۔ جس میں فاضل مورخ نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔ کہ اکابر۔ مورخین سے نقل روایت میں جو بے احتیاطیاں ہوئی ہیں ان پر دہ نظر رکھتے ہیں اور انہوں نے متضاد اور ضعیف روایتوں کو نظر انداز کر کے مستند واقعات نقل کئے ہیں۔

لائق مصنف نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ۔

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

(۲) جنگ جمل غلط فہمی کی بنا پر وقوع میں آئی اور حق ظاہر ہونے پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ندامت ہوئی۔

(۳) حضرت علی اور امیر معاویہ کے مابین جو جدال و نزاع ہوئی۔ اس میں حق علی مرتضیٰؓ کے ساتھ تھا۔ اور امیر معاویہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خلافت راشدہ کے مقابلہ میں ملوکیت کی بنا ڈالی۔ اور انہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر ہر حربہ اور ہر حیز اختیار کی!

اور

"اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہ کے مقابلے میں اس اعتبار سے ضرور ناکام رہے کہ وہ شام اور مصر ان سے واپس نہ لے سکے ——— لیکن ان کی کامیابی میں اس اعتبار سے کوئی شک و شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنے عمل سے ایک مثالی اور صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کر دیا۔ (صفحہ ۳۹۱)

(۴) مروان کے جس خط کا تاریخ کی کتابوں میں ذکر ہے۔ اس کے بارے میں لائق مصنف کی یہ رائے ہے کہ یہ خط مفسدین کا بنایا ہوا تھا ——— اس رائے میں غالباً وہ منفرد ہیں مگر اپنی رائے پر وہ خاصی وزنی عقلی دلیلیں لائے ہیں۔

مصنف نے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت، علم و فضل بے نفسی، زہد و تقویٰ، امانت و سخاوت۔ خطابت اور فقہ و اجتہاد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ہمیں اتفاق ہے! کوئی شک نہیں حضرت علیؓ آپنی آپ مثال تھے

"مگر ابوطالب نے ان کی درخواستوں کو کبھی درخور اعتنا نہیں کیا (صفحہ ۲۴) "درخور اعتنا نہیں سمجھا" لکھنا چاہئے تھا

"حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ بارہ دن کم بارہ سال بنتا ہے" (صفحہ ۶۷) اس جملہ میں "بنتا ہے" ثقہ لوگوں کی زبان نہیں ہے

"جس نے لوگوں کو انگیخت کر کے حضرت عثمان کی شہادت پر آمادہ کیا (۱۱۶) "برانگیختہ" کا محل تھا ——— حضرت علی کی بیعت کروائی گئی (صفحہ ۱۲۹) "کروائی گئی" یہ بھی پسندیدہ زبان نہیں ہے۔

"انھیں لوگوں کے اثر و دباؤ سے کی جا رہی ہے (۱۲۹) "اثر" عربی اور "دباؤ" اردو لفظ ہے۔ جن کے درمیان واو عطف لانا درست نہیں۔ "اثر اور دباؤ" لکھنا تھا ——— صفحہ ۵۸ پر "جریر بن عبداللہ البجلی" کو عبداللہ الجلی" اور صفحہ ۸۱ پر "حرورا" کو "مرورا" لکھا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

مگر حضرت حسنؓ نے حضرت جعفرؓ کی قسم دی (حضرت علی کو جب کوئی حضرت جعفرؓ کی قسم دیتا تو آپ کا غصہ فرو ہو جاتا) (صفحہ ۳۰۶) یہ روایت موضوع معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا اور کسی کے نام کی قسم کھانے کی ممانعت آئی ہے ہم اکابر اہل بیت سے ایسی غلطی کے ارتکاب کی توقع نہیں رکھتے۔

(۵) امیر معاویہ نے) خصوصاً بڑے سرداروں کو رشوتیں دیں۔ (صفحہ ۳۶۲)

آپ بھلائی اور خیریت اسی میں ہے کہ آپ خاموش رہیں ۔ " حاضری اندازاً تیرہ ہزار تھی " (صفحہ ۹۶) اندازاً کے ساتھ "تیرہ ہزار" کا جوڑ ٹھیک نہیں ۔ " اندازاً " بارہ تیرہ ہزار لکھنا تھا۔

اس کتاب کا ایک ایک مضمون کام کا ہے ۔ مکتبۂ تعمیرِ انسانیت کی یہ پیش کش تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔

جمال کربلا

از جناب قریشی احمد آبادی ضخامت ۱۱۰ صفحات ، مجلد رنگین گرد پوش ، شاعر کے فوٹو کے ساتھ ، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ : حسینی انجمن سوداگر کی پول جمالپور " چکلہ " احمد آباد (گجرات)

یہ جمال قریشی کے سلاموں کا مجموعہ ہے ۔ جس پر " پیش لفظ " جناب اعجاز صدیقی ۔ مدیر شاعر نے ۔ اور دیباچہ جناب حبیب الرحمٰن غزنوی نے لکھا ہے ۔ پیش لفظ کی یہ عبارت کھٹکی ۔

" ... یہی نہیں بلکہ حق کی حمایت اور بندگی کے لئے شہدائے کربلا نے جس بلند کردار کا ثبوت دیا ۔ اس کردار کی کوئی معمولی جھلک بھی اس دور کے بعد سے اب تک دیکھنے میں نہیں آئی ۔ (صفحہ ۹)

اس طرح " پیش لفظ " لکھنے والے نے واقعہ کربلا کے بعد سے اب تک کی تمام شہادتوں اور قربانیوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا ۔ حالانکہ اس ہمارے زمانے میں " اخوان المسلمون (مصر) نے جس عظیم الشان عزیمت ، بے مثال جرأت اور حق گوئی کا ثبوت دیا ہے ۔ اس نے " واقعہ کربلا " کی یاد تازہ کردی ہے ۔ !

امتِ محمد ۔ کی مشکلیں ہوئیں آسان ——— تیری ایک ٹھوکر سے (صفحہ ۳۹) ٹھوکر کا بیاں کیا محل تھا

ع طلاطم غم کی یورشوں میں حیات ڈوبی ہوئی ملے گی (صفحہ ۴۰) صحیح املا " تلاطم " ہے (ط نہیں ت) " یورشوں میں حیات کا ڈوبنا " یہ کیا اندازِ بیان ہے ۔

ع تاریکیٔ بزمِ عالم بھی ظلمت سے تری ضو بار ہوئی
اے ماہ نبوت کیا کہنا ۔ اے مہرِ رسالت کیا کہنا ! (صفحہ ۴۱)

" بھی " حشو زائد ہے " تاریکیٔ بزمِ عالم " کو روشنی سے بدلنے کے لئے ہی تو مہرِ نبوت طلوع ہوا تھا ۔ اس لئے " بھی " زائد استعمال ہوا ہے

تسلیم و رضا کے مسلک میں بیعت کا سندیسہ ٹھکرا کر
کچھ اور بڑھا دی تھی تو نے اسلام کی زینت کیا کہنا (۴۲ صفحہ)

جس مصرعہ میں " تسلیم و رضا " مسلک اور بیعت جیسے خالص عربی الفاظ آئے ہوں ۔ ان کے ساتھ ہندی کا " سندیسہ " کھٹکنے جوڑ لگتا ہے ...... مصرعہ ثانی میں " زینت " بھی شعر کی معنویت سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔

اللہ اللہ سجدۂ عالی کا یہ حسن نیاز
ہو کے میداں کو بنایا کعبۂ ثانی حسین ۔ (صفحہ ۴۹)

عالی بالکل زائد لفظ ہے " سجدہ " کی کوئی صفت " عالی " اور اسفل " نہیں ہے ۔

آئینہ جہاں پر وہ ہولناک منظر
تھا حشر سے بھی بڑھکر تپتی زمیں پہ سرور (صفحہ ۴۹)

" آئینہ جہاں " یہاں بالکل بھرتی کی ترکیب استعمال ہوئی ہے ۔ مصرعہ ثانی کس قدر بیچکانہ ہے ۔

ے حضرتِ عثماں کا دل، فاروقِ اعظم کا خیال (صفحہ ۶۸)

قافیہ کے لئے ایک لفظ کی ضرورت تھی "خیال" ذہن میں آیا اور منظوم کر دیا!

جمال قریشی بہت نوعمر ہیں۔ اس نومشقی و ناپختگی کے دور میں انھیں اپنی نظمیں کتابی شکل میں پیش کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے تھی
ان کا کلام اس کی پیش گوئی کرتا ہے کہ اگر انہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی تو وہ مستقبل میں ایک خوش گو شاعر ہو کر رہیں گے۔ کاش! وہ منظرِ عام پر آنے کی عجلت نہ کریں!

علامہ اقبال کی کتابوں پر جس طرح لکھا ہوتا ہے۔ —— "جملہ حقوق اخذ و نقل و ترجمہ اور طباعت محفوظ"

اسی طرح جمال قریشی نے اپنی کتاب پر بھی یہ عبارت درج کرائی ہے۔ اس "خوش فہمی" کا کوئی جواب ہے!

اردو کی فریاد

از۔ درد سعیدی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مصنف سے، انجمن ترقی اردو (شاخ) ٹنڈو آدم (مغربی پاکستان)

جناب درد سعیدی ایک خوش گو تعمیر پسند انسان ہیں۔ جو اپنے دل میں اسلام اور ملت کا درد رکھتے ہیں۔ درد سعیدی کی زندگی عسرت اور پریشانیوں میں گزاری ہے اور قدر ناشناس ماحول نے اس جوہرِ قابل کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

درد سعیدی نے اپنی طویل نظم "اردو کی فریاد" کتابی صورت میں چھپوا کر شائع کی ہے۔ اور سندھ کے کسی صاحب —— نواب جام کامبو خاں مرحوم —— سے اس کا انتساب کیا ہے۔ اس پر تقریظ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے لکھی ہے۔

یہ نظم رواں اور شگفتہ ہے۔ جس میں اردو کی مختصر تاریخ ہی منظوم ہوگئی ہے۔ چند اشعار:۔

سیاست نے کھولی زباں میرے دم سے ٭ معیشت ہوئی نغمہ خواں میرے دم سے
میں ہر علم و فن کے خزانے لئے ہوں ٭ نئے اور پرانے زمانے لئے ہوں
یہ پنجاب و گجرات میرے نشیمن ٭ یہ سندھ اور بنگال میرے گھر آنگن
سخن پرورِ پاک و ہندوستاں ہوں ٭ میں اس براعظم کی واحد زباں ہوں
غرض جانتا ہے مجھے اک زمانہ! ٭ میں صدیوں کی تہذیب کا ہوں فسانہ

دوسرا رخ:۔

نظیر اکبر آباد کا رہنے والا ٭ وہ باتوں میں کچھ چٹکلے کہنے والا

"کچھ" حشو و زاید ہے

نسیم و حسن کی وہ زہرہ گدازی ٭ وہ حسن و محبت کی افسانہ سازی

"زہرہ گدازی" کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے۔ "شاید "افسانہ سازی" کیلئے" قافیہ کی ضرورت تھی

ڈھلی ہوں میں اکبر کی طرزِ بیاں میں ٭ چلے طنز کے تیر میری کماں میں

تیر "کمان سے" چلتے ہیں "کمان میں" نہیں چلتے۔

مجموعی طور پر یہ نظم اثر انگیز ہے۔ اور ایک ایک شعر سے شاعر کا خلوص جھلکتا ہے۔ ناطق لکھنوی مرحوم اور واقف مراد آبادی کی نظموں کے بعد اس انداز کی یہ تیسری نظم نظر سے گزری اور جی خوش ہو گیا۔

کاش! اس "فریاد" کو سمعِ قبول میسر ہو اور پاکستان و ہندوستان میں "اردو" کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

درد سعیدی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کو سب سے زیادہ سراہا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مولوی صاحب قبلہ نصف صدی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور ان کی پوری زندگی "اردو" کے لئے وقف رہی ہے۔ —— مگر افسوس ہے کہ کچھ دنوں سے انجمن ترقی اردو کے حالات میں شدید اضطرابات رونما ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے انجمن کے مخلص ارکان پریشان ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں ؟؟

مولوی صاحب عبدالحق قبلہ کا احترام اپنی جگہ مسلّم ۔ مگر کسی قومی انجمن کو شخصی احترام پر ہرگز قربان نہیں کیا جا سکتا۔

انیس کا تحقیقی مطالعہ

از۔ ظہیر احمد صدیقی (ایم۔ اے) ضخامت ۱۰۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائن، حامد بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ (انڈیا)

"موازنہ انیس و دبیر" کو انیس پر "حرف آخر" سمجھا جاتا ہے۔ اور واقعی یہ کتاب ہے بھی بڑی معرکہ آرا ! مگر جناب ظہیر احمد صدیقی کی اس تصنیف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نبوت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا کوئی اور فیضان بند نہیں ہوا۔

انیس کی زندگی اور شاعری پر فاضل و جواں بخت مصنف نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ انداز بیان میں دلکشی اور تنقیدی دلائل میں خاصہ وزن ہے۔ ان کی تحریر کا ایک اقتباس۔

> ہمارے ادیبوں کی ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ وہ جب کسی کی برائی کریں گے۔ تو اس کی شکل کو گرد و غبار میں چھپا دیں گے۔ اور جب تعریفوں پر آئیں گے تو اس کے چہرے کو پھولوں سے ڈھانپ دیں گے۔ نتیجہ یہ کہ چہرے کے نقوش عوام کی نظروں سے مخفی رہیں گے۔ ایک شاعر کی عظمت —— صرف اس کی تعریف ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی خامیوں کو ظاہر کرنے کے بعد بھی اس کی عظمت برقرار رہتی ہے۔ اردو شاعری میں اچھے شاعر بہت گذرے ہیں۔ مگر عظیم شاعر صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مگر انیس ہمارے ادب کا عظیم شاعر ہے جس نے اردو ادب کو ایک نیا مزاج بخشا۔ انیس میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی لیکن خوبیاں خامیوں کے مقابلہ میں زیادہ تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے یہ عام کلیہ غلط کر دیا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوا کرتا ہے مرثیہ کو اس نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ جہاں ہر کسی کی شاعری کا گزر نہیں۔

> ؎ یوں غیظ تھا عُمَر کی طلب سے دبیر کو

اس میں "عمرو" کو "عمر" لکھا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب عوام و خواص میں قبول حاصل کرے گی۔

روداد کل راجستھان اردو کنونشن جے پور

مرتبہ:۔ مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی، ضخامت ۱۷۰ صفحات (بڑا سائز) کتابت طباعت اور کاغذ دیدہ زیب، سرورق حسین و دلکش۔۔۔۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور

گزشتہ سال مارچ ۵۶ء میں جے پور میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ "کل راجستھان اردو کنونشن" منعقد ہوا تھا۔ جس کی روداد بڑے سلیقہ کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

اردو کی ہمہ گیری، قبولیت اور سردل عزیزی کی یہ دلیل ہے کہ اس کنونشن کا افتتاح ہز ہائی نس مہاراجہ جے پور نے فرمایا پنڈت رام کشور ویاس نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ بھارتی صاحبہ جے پور نے تقریر کی۔ اور راجہ امرناتھ اٹل نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

اس عظیم اجتماع میں نثر کے مضامین بھی پڑھے گئے۔ اور بہت بڑے پیمانہ پر مشاعرہ بھی ہوا۔ اس کتاب میں یہ تمام مضامین اور شعراء کرام کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ بعض مضامین بہت بلند پایہ اور معلومات آفریں ہیں۔ شاعروں ادیبوں اور کنونشن کے معاونین اور سرپرستوں کے درجنوں فوٹو بھی اس "روداد" کی زینت ہیں۔ علمی و ادبی نمائش میں جو گرانقدر ملفوظات پیش گئے گئے تھے۔ ان کی تفصیل بھی اس کتاب میں درج ہے۔ یہانتک کہ میر عماد اور میر پنجہ کش کی قلمی وصلیوں کا بھی ذکر ہے۔

اس کنونشن کے لئے جو چندہ ہوا تھا اس کی فہرست بھی نام بہ نام درج کردی گئی ہے۔ چندہ کی مجموعی رقم نو ہزار چھ سو اٹھاون روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ جس میں سب سے بڑا عطیہ نواب ممتاز الدولہ، مکرم علی خاں صاحب بہادر، والی پھاسو کا ہے۔ آخر میں اخراجات کا گوشوارہ درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنونشن کے جملہ اخراجات کے بعد آٹھ سو کی رقم باقی رہی۔ چند ہزار روپیہ میں اتنے بڑے کنونشن، مشاعرے اور علمی نمائش کا انعقاد، منتظمین کے سلیقہ اور حسنِ انتظام کی دلیل ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہندی کا کیس مضبوط کرنے کی غرض سے راجستھانی اور مغربی ہندی کے اعداد و شمار مدغم کردیئے گئے ہیں۔ اور "اردو" کا جو مستقلاً ایک زبان ہے گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ ورنہ اگر صحیح اور غیر جانبدار ہوکر "اردو" ہندی کی جانچ کی جاتے تو یقیناً "ہندی" کا تناسب ۴۲ فیصدی سے بہت گھٹ جاتے گا۔ اور "اردو" کا تناسب کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔ (صفحہ ۴)

یہ ہیں وہ سیاسی ہتھکنڈے جو اردو کو مٹانے کے لئے بھارت کے سیکولر راج میں استعمال کئے جارہے ہیں۔

صفحہ ۷۶ پر ایک مضمون نگار صاحب کا نام "غوث الاعظم" نظر آیا اور بڑی حیرت ہوئی۔ کیا عجب ہے کہ کوئی صاحب اپنا نام "رسول اللہ" بھی رکھ لیں! لوگوں کی مت ماری جاتی ہے۔ تو ایسے ہی "لطیفے" ظہور میں آتے ہیں۔

بعض شاعروں کے تخلص:۔

آرزو (لکھنوی نہیں جے پوری) —— اثر (ٹونکی) —— امجد (جودھپوری) —— برق (جے پوری)

تابش (مکن پوری) —— جگر (اجمیری) —— دل (راناوی) —— ساغر (اجمیری) —— سائل (جے پوری)

شاد (جے پوری) —— صائب —— ظفر —— نظر —— ماہر

یہ بھول جائیے کہ شاد، عظیم آباد کے، آرزو لکھنؤ کے، اور سائل دہلی کے تھے۔ اور جگر مراد آبادی اور امجد حیدر آبادی بھی اللہ کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں! اردو میں تخلص کی "تنگ دامانی" کا یہ عالم ہے۔

عورتوں کی مشکلات کا صحیح حل

از۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات (بڑا سائز) قیمت نو آنہ، ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ رشیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان شہر۔

حکومت پاکستان نے شادی بیاہ، طلاق و خلع اور مہر وغیرہ مسائل پر غور و خوض کے لئے ایک "عائلی کمیشن" مقرر کیا تھا جس کے ایک رکن مولانا احتشام الحق کیرانوی (جو اپنے کو "تھانوی" لکھتے ہیں) بھی تھے۔ اس کمیشن نے جو سوالنامہ پر رپورٹ پیش کی ہے وہ عوام و خواص کے سامنے آچکی ہے۔ "یہ رپورٹ" انشاء اللہ دفن ہو کر رہے گی کیونکہ امت مسلمہ دینی مسائل میں "تجدد پسندوں" کی "فیل و معقولات" کو قیمتاً تک قبول نہیں کرسکتی۔

اس رپورٹ پر بہترین تبصرہ مولانا امین حسن اصلاحی نے کیا تھا۔ اور ان "مغرب زدہ مفتیوں" اور "مصطفیٰ کمالی نعما" کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھدی تھیں۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے اپنا اختلافی نوٹ کمیشن کو بھیجا تھا۔ جو متعدد اخبارات میں شائع ہوچکا ہے

اور اب کتب خانہ صدیقیہ نے اسے — کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔

یہ تبصرہ خاصہ وزنی اور مدلل ہے۔ منکرین حدیث کے اوہام و شبہات کی حقیقت کو لائق تبصرہ نگار نے سلجھے ہوئے انداز میں واضح بلکہ بے نقاب کیا ہے۔ دین کی حمایت اور باطل کی تردید میں جہاں سے جو بھی "آواز" بلند ہوتی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مولانا احتشام الحق صاحب کو یہ نوٹ بروقت مرتب کر کے کمیشن کو دیدینا چاہیئے تھا۔ تاکہ کمیشن کی اصل رپورٹ کے ساتھ شائع ہوتا۔ مگر انہوں نے یہ "نوٹ" تاخیر سے بھیجا۔ جب کہ دوسرے علماء کے تبصرے پریس میں آچکے تھے۔ اسی کو کہتے ہیں۔

"مشت از بعد جنگ"

طب روحانی کامل

مؤلفہ:۔ مولانا محمد ابراہیم دہلوی　ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت　دو روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ:۔ رحمٰن برادرس تاجران کتب فریر روڈ کراچی۔

"عملیات" کی یہ ایک مقبول کتاب ہے۔ جس میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ اور قرآن پاک کی مقدس سورتوں سے دفع امراض و بلیات اور حصول نفع و مراد کے لئے کس عمل سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً

(۱) اگر کسی شخص کے پھوڑا یا پھنسی یا ناسور ہو گیا ہو اور وہ کسی طرح اچھا نہ ہوتا ہو۔ تو سات دن تک تین سو دفعہ یا قیوم پڑھ کر اس زخم پر دم کیا جائے۔ بفضلہ تعالےٰ اسی عرصہ میں زخم بالکل اچھا ہو جائے گا۔

(۲) اگر کسی جانور یا آدمی کو نظر ہو جائے، اس پر سات مرتبہ "سورہ العادیات" کا پڑھ کر دم کرنا بد نظر کے اثر کو زائل کرتا ہے۔

مؤلف نے ان "عملیات" میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ کہ کس "قول رسول" (حدیث) یا قول صحابیؓ (اثر) کی بنیاد پر انہوں نے فلاں "عمل" لکھا ہے۔

انسانیت حیوانیت کی راہ پر

از منشی عبدالرحمٰن خان　ضخامت ۳۶۰ صفحات، مجلد، خوبصورت گرد پوش کے ساتھ

قیمت:۔ چار روپیہ۔　ملنے کا پتہ:۔ ادارہ نشر المعارف چہلیک، ملتان شہر

جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب نے دین و اخلاق کی علمی خدمت کو اپنی زندگی بنالیا ہے۔ ان کی کوئی نہ کوئی تصنیف یا تالیف چند مہینے یا سال دو سال کے وقفہ کے بعد چھپتی ہی رہتی ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ کہ نفس پرستی، فحش نگاری، مجرم سازی، مہذب بے حیائی، جنسی عیاشی، شہوانی انداز کی بے راہروی، شائستہ درندگی، اقتدار کوشی، اور فرض نشناسی، سے جو دنیا دوچار ہے۔ یہ سب عصر حاضر کے خدا نا شناس تمدن اور آخرت فراموش تہذیب کی شیشہ گری ہے۔ آج کی انسانی سوسائٹی انسانیت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر "حیوانیت" کی راہ پر جا رہی ہے انسان رفتہ رفتہ درندہ بنتا جا رہا ہے۔

مصنف نے یورپ کی کتابوں اور اخباروں کے مستند اقتباسات دے کر اپنے اقوال پر دلیلیں فراہم کی ہیں۔ یورپ کی خانہ ساز "جمہوریت" کے، ستم رسیدوں کی لرزہ بر اندام مثالیں پیش کرنے کے بعد "اشتراکیت" کی سنگدلی اور بے رحمی کو بھی کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے۔ .... ایک اقتباس

"روس کا عظیم باپ "تاریخ کا سب سے بڑا قاتل" "اسٹالین" انسانوں کے قتل عام کا بہت شائق تھا اس کا عقیدہ تھا کہ جتنے زیادہ سر کردہ اشخاص قتل کئے جائیں اقتدار کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری خروشیف کے بیان کے مطابق اسٹالین نے جسے

بھی اپنا مخالف سمجھا اس کے خلاف جھوٹی شہادت تیار کرا کے اور خفیہ پولیس کی امداد سے اس کا اقبالی بیان حاصل کر کے اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اس طرح اس نے سیکڑوں رفیق۔ معتمد دوست افسر ہلاک کر ڈالے۔

"خروشیف کہتا ہے ------

جب ہم اسٹالین کے سامنے جاتے تھے۔ تو ہمیں یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ زندہ واپس آئیں گے یا نہیں"

صفحہ (۲۳) پر لیوپولڈ اسد کو "نومسلم انگریز" لکھا ہے، حالانکہ مسٹر اسد انگلستان کے نہیں آسٹریا کے رہنے والے ہیں ------ "چوہدری صاحب کچی گولیاں کھیلنے والے نہیں تھے" ---- محاورہ یوں ہے "کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے" اس لئے کہ بڑی عمر کے آدمی "گولیاں" نہیں کھیلتے۔ "گولیاں" تو بچپن یا آغاز شباب میں کھیلی جاتی ہیں۔

لائق مصنف نے بڑی دیانت کے ساتھ اُن کتابوں اور اخباروں کی فہرست درج کر دی ہے جن سے اس کتاب کی تدوین میں مدد لی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے "مجلہ" صدق جدید" سے سب سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے: (کتابوں اور جرائد کے عنوان "ماخذات" (صفحہ ۲۵۹) کو دیکھ کر حیرت ہوئی "ماخذ" کی جمع ہے "مآخذ" (یہ ماخذات "کیا چیز ہے)

کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ مسلم نوجوانوں کو اس کے مطالعہ سے یقیناً فائدہ ہوگا۔

حیاتِ سرورِ کائنات (حصہ دوم)

تالیف:۔ مُلّا واحدی، ضخامت تین سو پچاس (۳۵۰) صفحات (مجلّد) قیمت: ساڑھے تین روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر نظام المشائخ ۱۴۸ جیکب لائنز۔ کراچی۔

حیات سرور کائنات کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ اب اس کی دوسری جلد منظر عام پر آئی ہے۔ ... مضامین کی فہرست ______

سرور کائنات کی معاشرت ------ سرور کائنات کی گھریلو زندگی ------ نبی اور نبی کے قول و عمل کا مقام ------ رسول اور اولو الامر ------ غزوات اور سرایا پر ایک نظر ------ غلامی کا انسداد ------ اسلامی نظام معیشت ------ سرور کائنات کی جہانبانی ------ سرور کائنات کے معجزات ------ اسلام اور عورت ------ اسلام اور فرقہ بندی ------ اسلامی صدر تبلیغ ------ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ------ ختم نبوت ------ رحمۃ اللعٰلمین !

جناب ملا واحدی صاحب سلجھی ہوئی فکر، متوازن دماغ، پاک صاف زندگی اور درد مند دل رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں بھی ان اوصاف کی بہت کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ منجھی ہوئی ٹکسالی زبان، اسلوب نگارش سادہ اور رواں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ محبت رسول کی خوشبو سے ایک ایک لفظ مہکا ہوا۔ واقعات زیادہ تر وہی ہیں جو قاضی سلیمان منصور پوری کی تالیف "رحمۃ اللعٰلمین" اور شبلی نعمانی کی "سیرت النبی" میں پائے جاتے ہیں۔ مگر لائق مؤلف کے طرز بیان اور حسن ترتیب نے انھیں نیا پیرہن عطا کر دیا ہے۔ ملا واحدی صاحب "ختم نبوت" پر بھی دلیلیں لائے ہیں اور انھوں نے "حدیث رسول" کی بھی حمایت کی ہے۔ مگر ان کا انداز تحریر مناظرانہ نہیں ہے، بلکہ انتہائی صلح صفائی کا اسلوب ہے، مسٹر پرویز کے خود ساختہ نظریوں کی انہوں نے تردید کی ہے۔ لیکن کہیں ان کا نام نہیں لیا۔ اور نہ تحریر میں طنز کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ سب کچھ کہہ دیا۔ مگر اظہار و بیان میں درشتی نہیں آنے پائی۔

"اسلام محض نظریاتی دین نہیں۔ اسلام عمل اور مسلسل عمل کا دین ہے۔ اسلام اپنی ثنا و صفت بیان کرنے والوں درحقیقت لاسعید لال سے اپنی صداقت ثابت کرنے والوں سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا

اُن سے خوش ہوتا ہے جو اسلام کا مکمل نمونہ بن جائیں "

مُلّا واحدی صاحب نے کتنی سچی بات کہی ہے ۔ آج اسلام کے ثنا خوانوں کی کمی نہیں ہے ۔ مگر ان میں کتنے ہیں ۔ جن کی زندگیاں "اسلام کا نمونہ" ہیں ۔ قول و عمل کے اسی نفاق نے امت مسلمہ کو متفرق اور کمزور کر دیا ہے ۔

" جس اللہ نے بیوی کو دو بول پڑھکر ــــ حلال کیا ہے ۔ اسی اللہ نے علی الاعلان تعلق کے ذریعہ ، لونڈی کو بغیر بول پڑھوائے حلال کر دیا ہے ۔ علی الاعلان تعلق لونڈی کے ساتھ گویا نکاح ہے ۔

یہ جملے فاضل مولف کی قوت ایمانی اور فراست دینی کی شہادت دیتے ہیں ۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

" اشتراکی نظام میں کام کی قیمت ہے ، انسان کی قیمت اشتراکی نظام میں نہیں ہے ..... اشتراکی نظام میں فرد کچھ نہیں ۔ سرمایہ دار نظام میں فرد سب کچھ ہے ۔ لیکن اسلامی نظام میں انسان بحیثیت انسان معزز و مکرم ہے ۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَم ، ہم نے انسان کو واجب التکریم بنایا ہے ۔ اور جو اللہ کے اوامر و نواہی یعنی قوانین کا جتنا پابند ہے ۔ اتنا ہی زیادہ معزز و مکرم ہے ۔ "

ایک اور اقتباس ، جو کیا عجب ہے کہ " ضرب المثل " بن جائے ۔

" اسلام ماضی ہی کا مذہب نہیں ہے مستقبل کا بھی مذہب ہے ۔ "

صفحہ (۳) پر مولانا بدر عالم میرٹھی کو " مہاجر مکی " لکھا ہے ۔ حالانکہ مولانا موصوف کئی برس سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں ۔ اور غالباً حکومت سعودیہ کی طرف سے " اقامہ " بھی مل گیا ہے ۔

حضور اور ازواج مطہرات کے درمیان اللہ ایسا نظر آتا ہے ۔ جیسے بزرگ خاندان اپنے خُردوں کے درمیان بیٹھا نصیحت کر رہا ہو ۔ (صفحہ ۶۸)

اللہ تعالےٰ سے اس تشبیہہ و استعارہ (بزرگ خاندان) کی نسبت بہت کچھ کھٹکتی ہے ۔ دوسرے ایڈیشن میں اس جملہ کو بدل دینا چاہیئے ۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ڈرا ڈرا اور دوسرے انسان کا دشمن ہے ۔ (صفحہ ۱۸۹) اس جملہ کا Construction چست نہیں ہے ۔ کچھ اس طرح ہونا چاہیئے تھا ۔ ـــــ

" یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن بنا ہوا ہے ۔ اور ایک دوسرے سے ڈرا ڈرا رہتا ہے ۔ "

معجزات کے سلسلہ میں صفحہ ۲۴۲ پر جو معراج کا بیان ہے ۔ تو فٹ نوٹ میں حضورؐ کے آسمانوں کی سیر کرنے کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے تھا ۔ جو مستند احادیث سے ثابت ہے ۔

" اشرف المخلوقات کے شایان شان نہیں ہے کہ ڈھور ڈنگر کی طرح جہاں چاہے منھ مارتا پھرے (صفحہ ۲۷۳) جنسی بے راہ روی کے سلسلہ میں یہ عبارت آئی ہے ۔ اس لئے اگر جملہ یوں ہوتا ۔

..... کہ ڈھور ڈنگر کی طرح جہاں چاہے منھ مارتا اور کودتا پھاندتا پھرے " تو مفہوم کی ترجمانی بہتر انداز میں ہو جاتی ۔ کتاب میں دو تین جگہ ایک لفظ " ہڑمُڑ " نظر آیا ۔ جو دلی کے قدیم لوگ ضرور بولتے ہوں گے ۔ اس لئے یہ لفظ غلط نہیں ہے ۔ مگر خود یوپی والے اس لفظ سے نا آشنا ہیں ۔ لہٰذا کسی زیادہ مانوس اور مشہور لفظ سے اس کو بدل دیا جائے ۔ تو مناسب ہے ۔

قرآنی آیات میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں

صفحہ	غلط		صحیح	
صفحہ ۱۵۸	ظہر الفساد فی البر والبحر	صحیح	ظہر الفساد فی البر والبحر	("د" پر پیش ہونا چاہیے)
" ۲۳۰	یا نوحے	"	یا نوحُ	("م" نہیں "ح")
" ۲۳۱	یطبع	"	یطبعُ	("ی" نہیں "ب")
" ۲۳۱	یعمھون	"	یعمھون	("ی" کے نیچے نقطے)
" ۳۰۸	ان نکن	"	ان یکن	("ی" کے نیچے نقطے)
" ۳۲	الفی	"	اَلقی	("ف" نہیں "ق")
" ۲۳۶	نفستم	"	نفشتم	("ش" پر نقطے)

جلد بندی میں بعض اوراق کی ترتیب آگے پیچھے ہوگئی ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے کامیاب گرانقدر ہے اور اردو داں طبقہ میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔

چراغ ابدی از: مولانا محمد عزیز اللہ بیگ ہمرنگ اورنگ آبادی (بہ نظر ثانی حکیم محمد امامی بنگلوری) صفحات ۳۸۴ (مجلد گرد پوش کے ساتھ) (فہرست درج نہیں) ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو، میسور، بنگلور

قرآن پاک کے آخری پارہ کی یہ تفسیر اب سے تقریباً ۱۵۵ برس پہلے مولانا عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی نے لکھی تھی۔ جناب حکیم امامی بنگلوری نے اس تفسیر (چراغ ابدی) کو اپنے اہتمام سے نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے، موصوف نے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"میں نے جہاں کہیں زبان کی اصلاح کی ضرورت پیش آئی وہاں اصلاح دیگر نشانات و اشارات اور بعض جگہ اضافات سے بھی کام لیا ہے مطلب وہی ہے میں نے صرف زبان بدلی ہے"

کسی کتاب کی "زبان" بدل دینا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو "کارنامہ" ہے!

قرآن پاک کی ہر صورت سے پہلے اس کی تلاوت کے روحانی اور جسمانی فوائد کا ذکر ہے۔ اور کہیں کہیں "فوائد" طبی نسخے بن گئے ہیں تفسیر قدیم انداز پر لکھی گئی ہے۔

صفحہ (۷۹) ابصارہا خاشعۃ (ان کی آنکھیں بند ہو جائیں گی) "خاشعۃ" کا ترجمہ "بند ہو جائیں گی" محل نظر ہے "جھکی ہوئی ہوں گی" ہونا چاہیے تھا — صفحہ ۳۰۵ پر "سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں" کو "ان پٹ دوڑنے والے گھوڑے" لکھا ہے۔! صفحہ ۵، پر غالباً کتابت کی غلطی کے سبب "چوپاؤں" کی جگہ "چارپائیوں" چھپ گیا ہے۔

"شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں، ایک وقت میں شیخ حسین منصور کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور مراقبہ کیا، روح منصور کو اعلیٰ مقام میں دیکھا۔ پھر میں نے خدا سے التجا کی یہ کیا بھید ہے؟ کہ منصور نے بھی "انا ربکم الاعلیٰ" کہا۔ دراصل خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور فرعون نے بھی۔ تو ندا آئی فرعون کا دعویٰ خود بینی پر مبنی تھا۔ منصور نے مجھ سے عشق کیا۔ اور اپنے آپ کو گھٹایا۔ (صفحہ ۴)

الحمد للہ اس قسم کے جملوں نے اس تفسیر کو داغ دار بنا دیا ہے۔ منصور کے گستاخ نعرہ کی غیرت الٰہی گوارا نہیں کر سکتی!

یہ تفسیر بڑے اہتمام سے چھپی ہے۔ کتابت اور کاغذ ہر چیز دیدہ زیب ہے

*

دینی آیات

از۔ بابو ایس۔ ایم غزالی، ضخامت ۲۴۰ صفحات قیمت مجلد چار روپے چار آنے۔ غیر مجلد تین روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:۔ "مکتبہ "انگارے" یو۔ جی۔ سی۔ وکٹوریہ روڈ، کراچی

کتاب کے آغاز (میری عرض) میں مصنف لکھتے ہیں ——— امید ہے کہ پڑھنے والے حضرات میری ہر بات اور حرف تک کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اور عقلمندی کا ثبوت دیں گے (صفحہ ۶)

اس اقتباس سے اندازہ لگائیے کتاب لکھنے والے کی دماغی سطح اور طرز نگارش کا!

"خداوند کریم نے اپنے بندے کو، محبوب کو اور معشوق کو راضی رکھنے کے لئے۔ احسان کا بدلا چکانے کے لئے اور حق معشوقی پورا دے کر اپنا حق عاشقی ادا کرنے کے لئے تمام کائنات بنائی ——— (صفحہ ۸۱)

اللہ تعالےٰ کی ذات کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا مذاق ہو سکتا ہے۔ ؟ استغفر اللہ

دنیا اور کائنات کی ہر چیز، ہر نفس اور ہر شے فانی ہے، صرف ذات محمد مصطفےٰ ابدی ہے، خدا کے بعد ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ بمع اپنے ہم اعمالوں کے ——— (صفحہ ۸۷)

حالانکہ قرآن شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "میّت" تک کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ حضور پر بشر ہونے کی حیثیت سے "موت" واقع ہوئی تھی۔ اور جسد مبارک قبر میں دفن کیا گیا تھا۔

"ان کو کیا علم کہ یہی ذات گرامی "احمد" جب اپنے احمدی مقام سے خداوند کریم کے حکم کے مطابق اٹھ کر جائے گی۔ یعنی خداوند کریم اپنے "معشوق" "احد" کو جب دنیا کو چند سالوں یا مدت کے لئے ادھار دیگا۔ بخشنے کی لذت سے آشنا کرے گا۔ (صفحہ ۱۰۱)

کیا فکر ہے! توبہ! کیا انداز بیان ہے! استغفر اللہ! کیا انکشاف و تحقیق اور نکتہ شناسی ہے۔ نعوذ باللہ!

"یعنی خداوند کریم ایک عاشق کی طرح حقیقی معنوں میں لٹ گیا۔ (صفحہ ۱۰۴)

یہ تو چند نمونے پیش کئے گئے ہیں ورنہ اس کتاب میں تو ایسے ایسے چٹکلے دیکھنے میں آتے کہ جو کانوں نے آج تک سنے اور نہ آنکھوں نے دیکھے۔ کتاب کے شروع میں ہوش کی باتیں ملتی ہیں اس کے بعد جو صاحب تصنیف پر مجذوبیت طاری ہوتی ہے تو "ہذیانات" میں ترقی ہی ہوتی چلی گئی۔ ان کے قلم نے کیا کیا شوشے چھوڑے ہیں کیسے کیسے "اعجوبے" دکھاتے ہیں۔

دین کی مظلومیت کی انتہا ہے کہ اس کے شارح اور مفسر ایسے لوگ بن بیٹھے ہیں کہ جن کی نہ انشاء درست ہے اور نہ جن کی فکر صحیح ہے! اور جو چاہتے ہیں لکھ مارتے ہیں۔

"الفرقان" کا افادات گیلانی نمبر

مدیر مسئول۔ مولانا محمد منظور نعمانی، مرتب:۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات
قیمت:۔ دو روپے، ملنے کا پتہ:۔ "دفتر الفرقان" کچہری روڈ، لکھنؤ
پاکستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ:۔ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور کام علمی دنیا کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مرحوم کے قلم و زبان خدمت دین کے لئے دم واپسیں تک وقف رہے۔ انہوں نے ہزاروں صفحات اپنی علمی یادگار چھوڑے ہیں۔ علم و فضل کیسا تھ ساتھ صاحب جذب و سوز بھی تھے۔ لکھنے بیٹھتے تو معلومات کے انبار لگا دیتے۔ اور رطب و یابس سبھی کچھ جمع کر دیتے۔ اسی جذب و شوق کے عالم میں بعض اوقات موضوع سے کوسوں دور نکل جاتے .... اور شاید اس لئے

؎ نالہ پابندِ نے نہیں ہے۔!

قلم کی اس آزاد عنانی کے باوجود مولانا مناظر احسن قدس سرہ کی علمی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کی بعض تحریریں تو "نقشِ دوام" بن کر رہیں گی! ماہنامہ "الفرقان" تبریک و تحسین کا مستحق ہے کہ اس نے مرحوم کے بعض مضامین کے اقتباسات جمع کر کے ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا! اس نمبر میں فاضل مرتب کے مضمون کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی اور جناب نسیم احمد فریدی کے مقالے بھی خوب ہیں۔ کاش:۔ مولانا گیلانی کی سوانح حیات لکھنے کی کسی کو توفیق نصیب ہو۔

ہفت روزہ "الاعتصام" تحریک آزادی نمبر ۱۸۵۷ء

مدیر:۔ مولانا محمد اسحاق، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت:۔ آٹھ آنہ،
ملنے کا پتہ:۔ ہفت روزہ "الاعتصام" شیش محل روڈ۔ لاہور

سنہ اٹھارہ سو ستاون کی "تحریک آزادی" جسے "غدر" (Mutiny) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ کس طرح وجود میں آئی! کیا محرکات تھے! تحریک آزادی میں مجاہدین کا کیا حصہ تھا۔ علمائے اہل حدیث کے شوقِ جہاد نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے؟ حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کا "جہاد" ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی پر کس طرح سے اثر انداز ہوا؟ اس نمبر میں اس کی تفصیل ملے گی۔ بعض مضامین تاریخی حیثیت سے اونچے درجہ کے ہیں۔

لکھنے والوں میں مشاہیر اہل قلم کی خاصی تعداد ہے۔ "الاعتصام" کا یہ "تحریک آزادی نمبر" پڑھنے اور محفوظ رکھنے کی چیز ہے۔

سالگرہ نمبر "عفت"

ادارۂ تحریر:۔ عبدالوحید خاں، حمیدہ بیگم، رخشندہ کوکب، ضخامت ۷۲ صفحات (سرورق دیدہ زیب)
قیمت:۔ ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "عفت" اچھرہ۔ لاہور

ماہنامہ "عفت" اسلام پسند خواتین کا آرگن ہے۔ جو مسلمان عورتوں میں دین و اخلاق کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اس کا سالگرہ نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ جس کے مضامین ہلکے پھلکے دلچسپ اور صنفِ نازک کی نفسیات کے مطابق ہیں۔

بعض افسانے اس قدر بلند ہیں کہ ترقی پسند افسانہ نگار جن کے فن کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ان کے شاہکار افسانوں سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہی ہیں۔ ماہنامہ "عفت" کا سالگرہ نمبر ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ توقع ہے کہ اسے قبولِ عام حاصل ہوا ہوگا۔

"اخوان المسلمون نمبر" "المنیر"

مدیر:۔ مولانا حکیم محمد اشرف، ضخامت ۵۲ صفحات، ملنے کا پتہ:۔ "المنیر" ماڈل ٹاؤن۔ لائلپور۔

ہفت روزہ "الاعتصام" کا مقصد اشاعت ہی اعلاءِ کلمۃ الحق اور اقامتِ دین ہے۔ اس مجلہ کا "اخوان المسلمون نمبر" خاصے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں حسن البنا شہید، حسن الہضیبی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن جیسی بلند شخصیتوں کے مقالے شامل ہیں۔

اس دورِ مفاد پرستی اور عہدِ مادیت میں "اخوان" نے خاص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو عظیم الشان قربانیاں دی ہیں۔ انہوں نے اسلام پسندوں کے سرِ افتخار کو بلند کر دیا ہے! "اخوان" نہ ہوتے تو ایثار و قربانی اور جرأت و حق گوئی کی تاریخ میں خلا رہ جاتا!

"اخوان" کی جرأت و ایثار کا جیسے جواب نہیں اسی طرح جمال ناصر کی درندگی بہیمیت اور سنگدلی بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ حجاج اور ابن ہبیرہ جیسے ظالموں کے کارناموں کو ناصر کے مظالم نے گرد کر دیا۔ اسلام کو جتنا نقصان یہ جمال ناصر پہونچا رہا ہے اتنا نقصان اسلام کے دشمنوں نے بھی نہیں پہونچایا۔ "المنیر" جیسے پرچے "اخوان المسلمون" کا ذکر کرتے ہیں۔ تو لوگوں کو کچھ حالات معلوم بھی ہو جاتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر خاموشی سی چھائی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ "اخوان" کی تباہی نے مشرق وسطیٰ میں اسلام کو کس قدر نقصان پہونچایا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس "تحریک" کو پھر سے کھڑا کر دے۔ اور مصر و شام میں اللہ کے یہ نیک بندے غالب و منصور نظر آئیں۔ (آمین)

قرآنی سبق

از:- مولانا محمد جعفر ندوی پھلواروی، ضخامت ۸۰ صفحات (بڑا سائز) کتابت جلی کشادہ اور دیدہ زیب، طباعت و کاغذ خوب سے خوب تر! سرورق رنگین و حسین - قیمت - دو روپیہ-

ملنے کا پتہ:- ——— دارالاشاعت پنجاب - لاہور

جناب سید امتیاز علی تاج کے مشورہ اور تحریک سے یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ بچوں کو شروع ہی سے، قرآنی اخلاق سے مناسبت اور واقفیت ہوجائے۔ اور وہ کلام پاک کی سمجھ کر تلاوت کریں! اور ان کے دلوں میں یہ بات اتر جائے کہ قرآن کریم صرف "صحیفۂ تبریک" ہی نہیں ہے بلکہ مکمل "دستور حیات" اور ضابطہ اخلاق و عمل بھی ہے -!

قرآن فہمی کے لئے اپنے انداز پر یہ کتاب اپنا آپ جواب ہے۔ نہایت ہی آسان زبان، دل نشین انداز بیان، مثالیں ہیں تو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں، پند و نصیحت ہے تو اس میں نرمی و ہمدردی شامل ہے۔ "قرآنی اسباق کے موضوع ایسے منتخب کئے گئے ہیں۔ جو پرائمری کی بڑی جماعتوں اور مڈل کے طالب علموں اور بالغوں کی ذہنی استعداد سے اونچے نہ ہوں"

کتاب کا آغاز جس سبق سے کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ———

"قرآن سمجھ کر پڑھنا"

کتاب کا اختتام بھی کسی ایسے "موضوع" پر ہوتا.. .. .. مثلاً

"قرآن نے تمہیں کیا سمجھایا ——— قرآن نے تمہیں کیا دیا.. .. .."

اس صورت میں کتاب ختم کرتے وقت طالب علم کے ذہن میں قرآن کے "فہم و عمل" کی یاد تازہ ہوجاتی!

صحت کتابت کا انتہائی خیال رکھا گیا ہے۔ ایک نقطہ اور مرکز بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ صفحہ ۸۰ پر "اِنَّ المبذّرین" میں البتہ "ذ" پر "زبر" کی جگہ "زیر" لگ گیا ہے-!

ایک بات کھٹکی وہ یہ کہ "قرآنی سبق" کے آخری صفحہ پر جو کتابوں کی فہرست دی گئی ہے، اس میں ایک کتاب کا نام "شاہکار تصاویر" بھی ہے۔ جس کی مدح و تعارف میں لکھا گیا ہے کہ ———

"اس کتاب کے مطالعہ سے لڑکے اور لڑکیوں میں آرٹ کا صحیح ذوق پیدا ہوگا"

"قرآنی اخلاق" کے ساتھ "تصاویر کا ذوق" ایک بے جوڑ بات ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تباہی میں شریک
فتنۂ رخ ہی نہیں فتنۂ تصویر بھی ہے

"قرآنی سبق" کے ذریعہ بچوں اور بچیوں کی گھٹی میں "قرآنی اخلاق" حل کئے گئے ہیں۔ مولانا محمد جعفر ندوی نے دین و اخلاق اور علم و ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ناشر اور مصنف اس کتاب کی تصنیف و اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں-!

اعجاز القرآن فی تفسیر القرآن

مرتبہ:- مولوی قاری سید محمد عنایت علی میرٹھی، ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ بڑا سائز
قیمت: .. .. تین روپیہ آٹھ آنہ،
ملنے کا پتہ:- ادارۂ تبلیغ القرآن، ڈرگ روڈ کالونی - بلاک نمبر ا پلاٹ نمبر ۱۴۱، کراچی

جناب مولوی قاری سید عنایت علی صاحب نے اپنی زندگی کو "تجوید القرآن" کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اسی کام میں وہ برسوں سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ تالیف اپنے "موضوع" پر کامیاب ہے۔!

کتاب کے پہلے حصہ میں بیس فصلیں ہیں۔ جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

— فن تجوید کی تفصیلی تشریح — علم تجوید کی مفید معلومات — حروف مدہ اور حروف لین کے بیان میں مد اور قصر — مخارج — صفات حروف — اجتماع ساکنین — نون ساکن کی تعریف، لام جلا اور حرف کے پر پڑھنے کے بیان میں — حرف "را" کے قاعدے — قواعد نون ساکن و تنوین — میم ساکن اور میم و نون مشدد — ہائے ضمیر — وقف و ابتداء — وقف کے اقسام و قواعد — سکتہ اور آیات سجدہ — کلمہ پر وقف کرنے کے قواعد — فوائد متفرقہ ضروریہ — سورہ توبہ کے شروع تعوذ و تسمیہ کے پڑھنے اور نہ پڑھنے کے بیان میں — رسم عثمانی — لہجہ اور لحن !

کتاب کے دوسرے حصہ میں چند قرآنی سورتوں کو عربی متن کے ساتھ لکھ کر حروف کی "تجوید" کو واضح کیا گیا ہے مثلاً "اَعُوْذُ" ہے اس کے واؤ پر جزم اور اس سے پہلے "پیش" ہے۔ اس لئے اس کو ایک "الف" کی برابر کھینچ کر پڑھا جائے گا۔ (اسی کو "مد اصلی" کہتے ہیں)

- لفظ "اعوذ" کی "ذال" کو "زاء" کے مقابلہ میں نرمی اور نہایت لطافت کے ساتھ اس کے صحیح مخرج ادا کرنا چاہیئے، تاکہ ان دونوں حرفوں میں تمیز ہو سکے۔!

ایک تو وہ مسلمان ہیں جو قرآن سے شغف ہی نہیں رکھتے۔ مگر جو مذہبی لوگ کہلاتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو قرآن کو تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھتے ہیں

ہم میں سے کتنوں کو معلوم ہے کہ حرف "راء" اور "ل" کہاں "پُر" (مُفخّم) اور کہاں "باریک" (مُرقّق) پڑھے جاتے ہیں؟ حروف کے مخارج کیا ہیں؟ مد کی کیا مقدار ہے۔؟ "م" اور "ن" غنہ کے ساتھ کہاں پڑھا جاتا ہے وقف و ابتدا کے کیا قواعد ہیں۔!

"تجوید" کے اصولی اور ابتدائی قواعد کو نہ جاننا بڑی بد توفیقی ہے! "فن تجوید" کی کتابوں کو پڑھ کر اہل قرأت و تجوید کی اس ہمت اور دینی شغف کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ انہوں نے کس قدر محنت اور عرقریزی کے ساتھ اس عظیم فن کو مدون کیا ہے۔ جس قوم نے اپنے نبیؐ کے لہجہ تک کو محفوظ رکھا ہو۔ کیا وہ حضورؐ کے اقوال و اعمال کو بھول سکتی تھی؟ جو نادان اور گمراہ لوگ احادیث رسول کو "تاریخ" سے زیادہ وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ کس قدر ضلالت میں مبتلا ہیں۔!

"اعجاز القرآن" ایک فنی کتاب ہے۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں۔ جو کسی قاری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کریں اور کتاب کے مندرجات کی مشق کرتے رہیں۔ مگر اس کتاب کا مطالعہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ ہے۔ "تجوید" کے بعض موٹے موٹے اصول اور قاعدے معلوم ہو جاتے ہیں۔ فاضل مرتب کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجر جزیل عطا فرمائے۔!

دُرِّ یتیم | از:- احسان بی۔ اے۔ ضخامت ۵۱۲ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ سرورق رنگین
قیمت ——— چھ روپے آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- شوکت پبلیکیشنز ۸۸- الف ٹمپل روڈ- لاہور

اس کتاب[1] میں صدفِ رسالت کے دُرِّ یتیم، ساقیِ کوثر و تسنیم صاحب فیضِ عمیم سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی ولادت باسعادت سے لے کر حضور کے بچپن تک کے حالات ناول کے انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ جناب احسان (بی۔ اے) نے بڑے خلوص و عقیدت کے ساتھ اس کتاب کو لکھا ہے۔ اور اپنے اندازِ بیان سے خاصی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اس ناول کا وہ حصہ سب سے زیادہ جاندار اور پرشکوہ ہے۔ جس میں توریت و انجیل کے اقتباسات اور پیش گوئیوں کے "پس منظر" سے قصہ میں تاریخی عظمت پیدا کی گئی ہے۔

"یہ سڑک مٹیالے سانپ کی طرح بل کھاتی، ابو قبیس کی پسلیوں پر لپٹی ہوئی" (صفحہ ۱۷) ——— پہاڑ کی "چوٹی" تو ضرور ہوتی ہے۔ اس کی "پسلیاں" بھی ہوتی ہیں: یہ پہلی بار پڑھنے میں آیا۔ کیا عجب ہے کہ "پسلیوں" کی دیکھا دیکھی کوئی دوسرے صاحب "پہاڑ کی آنتیں" بھی لکھ ماریں ———

"زین عبائیں اور پھڑ پھڑائیں" (صفحہ ۲) "پھڑپھڑانا" جاندار کی صفت ہے۔ غیر ذی روح کے لئے اس صفت کا لانا وجدان پر گراں گزرتا ہے ———

"سورج کی نرم سنہری شعاعیں ... ... مقدس کعبہ کے غلاف پر اپنے کنوارے بوسے نچھاور کر رہی تھیں (صفحہ ۳۵) "کنوارے بوسے" جدت ہے مگر نامانوس ——— "رات بھر لنڈھائی ہوئی شراب کے کسل پر کروٹیں لے رہے تھے" (صفحہ ۳۵) یہ "کسل پر کروٹیں لینا" آخر کیا بات ہوئی۔ یہ کیا اندازِ بیان ہے ——— "جسم کے رونگٹے۔ صبح کی غیر مانوس سردی کی وجہ سے کھڑے ہو گئے تھے (صفحہ ۳۷) سرداران قریش کی تو ساری زندگیاں مکہ میں گزری تھیں تو پھر وہاں کی سردی ان کے جسموں کے لئے "غیر مانوس" کیوں ہونے لگی ——— "میں تو ان پتھروں کو جھنجھوڑ دینا چاہتا ہوں" (صفحہ ۳۸) "جھنجھوڑنا" کا اس طرح استعمال ذوقِ سلیم کو پسند نہیں آ سکتا ——— "اونچی اونچی فرازکو اُبھرتی ہوئی پتھریلی سڑک" (صفحہ ۳۹) "فراز کو ابھرتی ہوئی سڑک" آخر کیا بات ہوئی؟ ——— "ملاءِ اعلےٰ کی مبارکیں گونجتی" (صفحہ ۴۰) "مبارک بادیں" لکھنا چاہیئے تھا ——— "آنکھوں پر کھچی ہوئی ناک" (صفحہ ۵۰) غالباً "ستوان اور بلند و بالا بینی" کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے ——— توبہ

"جہانوں میں ؟ ک سا پیدا کر دیا تھا" (صفحہ ۵۶) "حرکت" کی جگہ "تحریک" کتنا نامانوس لگتا ہے ———

"ابن عبد اللہ اسی طرح برکہ کی آغوش میں آہستہ آہستہ آنکھیں جھپکتے رہے" (صفحہ ۷۵) "آنکھیں جھپکاتے رہے" لکھنا چاہیئے تھا ——— "تنی بڑی بڑی رقمیں سنتا ہیں" (صفحہ ۹) "رقمیں" نہیں سنائی جاتیں "قیمتیں" "سنائی جاتی ہیں" ——— اس شعوری اجتناب کی دبیز چادروں کی تہ میں گھٹ گھٹ کر ...

---

[1] اب سے تقریباً آٹھ سال قبل ماہر القادری کا ناول اسی موضوع پر اسی نام (دُرِّ یتیم) سے چھپ چکا ہے!

ہنگامے پوشیدہ تھے - (صفحہ ۸۱) یہ انداز بیان سراسر تصنع ہے - اور ترجمہ "سا معلوم ہوتا ہے ـــــــ "چہرہ اور سر رومال کے سایوں میں دھندلا سا ہو کر اپنی جزئیات کھو بیٹھا" (صفحہ ۹۸) "چہرے کی جزئیات" کیا ہوتی ہیں - ! یہ کیا فکر اور کیا انداز بیان ہے ! ـــــــ "طنابوں پر پھیلا تکتا" (صفحہ ۱۰۱) "پر" کی جگہ "کو" لکھنا تھا ـــــــ "اتنا کچھ کہ حلیمہ سعدیہ کی بھوک تڑپ کر اٹھی اور بھنا کر بیدار ہو گئی" (صفحہ ۱۲۲) "بھناتے" کا یہاں کیا موقع تھا ؟ ـــــــ "حلیمہ کو بڑی جلدی لگی ہوئی تھی" (صفحہ ۱۲۶) "جلدی پڑی تھی" لکھنا تھا - "جلدی" "سردی اور بھوک" کی طرح "لگتی" نہیں ہے -

"موتی سفید سرسراتی ہوئی جھاگ" (صفحہ ۱۳۰) "جھاگ" بالاتفاق مذکر ہے ـــــــ "دودھ میں جیسے شہد گھول دی" (صفحہ ۱۳۳) "جھاگ" بھی مونث اور "شہد" بھی مونث ! توبہ ـــــــ "جوان کے تھنوں میں تعجب انگیز فراوانی کے ساتھ بہہ رہا تھا - (صفحہ ۱۳۴) اول تو اس جملہ میں "تعجب انگیز فراوانی" ترجمہ سا لگتا ہے اور "پھر دودھ تھنوں میں نہیں بہتا" "تھنوں سے بہتا ہے" یا پھر دودھ تھنوں میں دوڑ رہا تھا" موزوں انداز بیان تھا - ـــــــ "یہ خیال ایک زبان سے دوسری سماعت اور دوسری زبان سے تیسری سماعت میں منتقل ہونے لگا (صفحہ ۱۳۶) نہایت ہی کمزور عبارت ـــــــ "اور مندر سے نکل جانے کے احکام موسلا دھار برسا دیتے" (صفحہ ۱۵۰) "احکام کا برسانا" اور پھر موسلا دھار برسانا" ایک اعجوبہ سے کم نہیں -

اس سے بھی کہیں زیادہ کڑوے جھوٹ بولتے تھے) صفحہ ۱۹۴) جھوٹ کی صفت "کڑوے" پہلی بار نظر سے گزری ـــــــ "باریک ہونٹ اور صراحی کی ایسی گول گاؤدم گردن - ان جزئیات پر خیمے کی چھت پر لگے ہوئے جوڑوں سے ـــــــ "تاشوں میں کٹ کر بکھری ہوئی روشنی (صفحہ ۱۹۷) لفظوں کا بے معنا گورکھ دھندا" ـــــــ "لیکن ایسی دھیمی دھیمی کاہلی اب بھی ان کے گدازے ہوئے جسموں میں سراسر رہی تھی" (۲۲۰ صفحہ) کاہلی سرسرایا کرتی ہے "عجیب انکشاف - پھر کاہلی کا "دھیما ہونا" اس پر مستزاد ! "اپنے گھوڑے کو بھی ایڑ بتائی (صفحہ ۲۶۷) "ایڑ لگائی جاتی ہے" بتائی نہیں جاتی ـــــــ "قافلہ کا ہر شخص ایک نکتہ پر سمٹ آیا" (صفحہ ۲۸۶) "نقطہ" کا محل تھا" اس کے کلیجے کے ارد گرد سکون اور سرور کے تنتے تیرنے لگے (صفحہ ۳۹۲) "سکون و سرور کے "تنتے" بھی ہوتے ہیں ! توبہ ! ـــــــ "کتنا سرور تھا ان چھوٹے ہاتھوں کے ہلکے میٹھے دباؤ میں" (صفحہ ۴۰۵) "دباؤ" کا "میٹھا" ہونا ـــــــ چہ خوب !!

"آمنہ اپنے خاوند کی قبر پر جا کر ایک آنسو نہیں روئیں" (صفحہ ۴۴۱) "ایک آنسو نہیں روئیں" اس خیال کو دوسرے لفظوں میں ظاہر کرنا چاہیئے تھا ـــــــ "ہلکی ہلکی تاریکیوں میں ارد گرد سونے والوں کے خراٹے تیر رہے تھے" (صفحہ ۴۴۸) آجکل ترقی پسند ادیب "تیرنا" جا و بیجا کثرت کے ساتھ استعمال کرتے رہتے ہیں - احسان صاحب نے بھی ان کی اس لفظ کے استعمال میں پیروی کی ہے ـــــــ "ایک مری جھرجھری لے کر پھر ساکن ہو گئی" (صفحہ ۴۴۸) جھرجھری کو "مری" یا "غیر مری" کہنا ایک عجیب سی بات ہے ـــــــ "دات محمدؐ کا بازو آمنہ کی گردن پر پڑا تھا" (صفحہ ۴۸۷) آخر یہ کیا انداز نگارش ہے ! ـــــــ

"انھوں نے اپنے ننھے سے دل کے ارد گرد کہیں کسی نامعلوم جگہ پر تکلیف کا احساس کیا" (صفحہ ۴۸۹) "معلوم" یہاں بالکل حشو و زاید ہے دل میں تکلیف کا کسی جگہ محسوس ہونا تھا - ورنہ دل کو "نامعلوم" کہاں رہنے دے گا

"دبی المیہ تبسم کی مسرت ان کی رگ رگ پر چھاگئی" (۱۹۳ صفحہ) "المیہ تبسم" کیا بات ہوئی؟ کہنا یوں چاہیئے تھا "وہ مسرت جس میں غم ملا جلا تھا" یا "الم آشنا مسرت"

"شدتِ گریاں سے برکہ کی زبان بند ہوگئی" (صفحہ ۵۱۱) "شدتِ گریہ" ہوگا۔ کتابت یا سنگسازی میں "گریہ" "غالباً غالباً گریاں" ہوگیا ——— "راستہ دو راستہ چھوڑدو" "سردار عبدالمطلب آرہے ہیں" "کی آوازیں عمومی شور کی سطح پر واضح بلبلوں کی طرح ابھرتی اور پھوٹتی رہیں" (صفحہ ۴۶۸) یہ کس قدر نومشقوں کا سا اندازِ بیان ہے۔ اس قسم کی عبارت کتاب میں جہاں بھی آگئی ہے وجدان کو بڑی وحشت ہوتی ہے۔ ناول نگار کو یہ خوش فہمی ہوگی کہ انھوں نے اس طرح بڑی "جدت فکر" سے کام لیا ہے۔ حالانکہ اس قسم کی عبارتیں اس ناول کے بدنما داغ ہیں۔ اس جملہ میں پہلے تو "عمومی شور" کی ترکیب دیکھیئے۔ پھر، لکھنا چاہیئے تھا "نمایاں" اور لکھ مارا "واضح"! اس سب پر مستزاد "بلبلوں کا پھوٹنا" محاورہ ہے "بلبلوں" کا ٹوٹنا! پھر "آوازوں" کی تشبیہ "پانی کے بلبلوں" سے قیاس مع الفارق کے سوا اور کیا ہے!

سب سے بڑی حیرت تو یہ دیکھکر ہوئی کہ۔

بلغ العلیٰ بکمالہ

جیسا مشہور اور زبان زد خاص و عام قطعہ جسے معمولی حرف شناس بھی جانتے ہیں کہ یہ سعدی شیرازی کا قطعہ ہے۔ اس کے نیچے خواجہ اجمیر لکھا ہوا ہے!

"حدی خواں" ——— "بدی خوان" (چھوٹی "د" کے ساتھ) اور "معشر قریش" ——— "محشر قریش" ("ح" کے ساتھ) جگہ جگہ لکھا ہوا نظر آیا، جن کو کتابت کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح صفحہ ۲۸۵ پر "سُعیر" کو "شعیر" ("ش" کے ساتھ) "شیما" کو "شمیہ" "بنو نضیر" (۴۵۲) کو "بنو نصیرہ" ("ص" کے ساتھ) املا کیا گیا ہے۔ یہ دلیل ہے لکھنے والے کے "کم سواد" ہونے کی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا باب کس قدر پُر زور ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ بہت کمزور بلکہ پھیکا ہے، پھر ولادت باسعادت کے بعد "محمد ابن عبداللہ" کو "گوشت کا ننھا سا لوتھڑا کہنا" (صفحہ ۴۲۱) کس قدر ناپسندیدہ اندازِ بیان ہے! اسے پڑھ کر بڑی اذیت ہوئی! اسی طرح جب حضور حلیمہ سعدیہ کے یہاں ——— جاتے ہیں۔ تو آپ کے حلیہ مبارک کی تفصیل کا یہ ٹکڑا۔

"پوپلا موٹا چہرہ"

بھی بہت کچھ کھٹکا!

"محمد سارا دن اپنے نانا کے تالاب پر کبوتروں اور بطخوں سے کھیلتا ہے" (صفحہ ۴۷۳) اس کا ماخذ آخر کیا ہے۔؟ اگر یہ ناول نگار کی محض خیال آرائی ہے۔ تو اسے سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ عظیم المرتبت بچہ (آپ پر درود و سلام ہوں) کا ذکر کر رہا ہے! احادیث میں تو یثرب کے تالاب میں حضورؐ کے تیرنے کا البتہ ذکر ملتا ہے کبوتروں اور بطخوں کے ساتھ سارا سارا دن کھیلنے کی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔

؎ "سعیر" پہاڑ کا نام ہے۔ اور "شعیر" عربی میں "جو" کو کہتے ہیں۔

عبدالمطلب کو "ابا حضور" اور حضورؐ کو "چھوٹے حضور" جو ناول میں جگہ جگہ کہا گیا ہے۔ اس نے عربی ماحول، عربی معاشرت، عربی زبان و محاورہ کی فضا کو ہی دگرگوں کر دیا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بعض جملے کہلوائے گئے ہیں۔ جو ناول نگار کے بنائے ہوتے ہیں۔ کاش لائق ناول نگاران "موضوعات" (Fabrications) سے دامن بچا جاتے۔!

"اور برکہ شوربے میں توڑی ہوئی مکی کی روٹیوں کا گرم گرم پیالہ لے کر آ گئی" (صفحہ ۴) کیا قریش مکی (مکا) کی روٹیوں کا "ثرید" بنایا کرتے تھے۔ ——— "اور انواع و اقسام کی مٹھائیوں کی دکانیں (صفحہ ۹۸) چودہ سو سال قبل مکہ معظمہ میں "انواع و اقسام کی مٹھائیوں کی دکانیں" ایک حیرت انگیز ریسرچ۔ (صفحہ ۱۲۲ پر پھلوں میں "آلوچوں" کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ "آلوچوں کا" ریگستانی زمین میں پیدا ہونا محل نظر ہے ——— "خوشبودار جڑی بوٹیاں، جنھیں بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد شام کی منڈی سے حاصل کیا تھا (صفحہ ۱۶۵) "خوشبودار جڑی بوٹیاں" شام میں نہیں یمن میں پیدا ہوتی تھیں۔ اور وہیں ان کی منڈی تھی۔

"ابھی ثریا کا جھومر نصف آسمان تک بھی نہیں پہونچا (صفحہ ۲۹) یہ جملہ خاندان بنو ہاشم کی کنیز برکہ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ کیا قریش کی عورتیں "جھومر" نام کے زیور سے واقف تھیں؟ ——— "حرب بن اُمیہ کی بیوی کے بھجنوں کی آواز نہ تھی" قریش کی مستورات اور پھر اُن سے زمزمہ نغمہ اور نشید کی جگہ "بھجنوں" کی نسبت! کتنی بے جوڑ بات ہے! ناول نگار کو ناول لکھنے سے پہلے قریش کے تمدن سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنی تھی۔!

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ ماہنامہ شمارہ ۵

فاران

نومبر ۱۹۵۷ء ایڈیٹر ماہر القادری

زرسالانہ ... ... چھ روپے

فی کاپی ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ - کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان نیرنگِ زمانہ اور گردش روزگار کا ایک مرقعِ عبرت بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں کی سیاست میں ایسے ایسے عجیب و غریب انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں کہ جن کا گذر کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔ اوپر کے لوگوں کے شخصی مفادات کا ایک چکر ہے۔ جو برسوں سے یہاں چل رہا ہے، اور اقتدار کی کرسیاں اسی چکر کے اِردگرد پھرکنی کی طرح گھومتی رہتی ہیں! وہ جو کسی فارسی شاعر نے کہا تھا۔

طاسِ حمام است ایں دُنیائے دوں
ہر زماں در دستِ ناپاکِ دگر

تو پاکستان میں "قلمدان ہائے وزارت" کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں۔ کس کس کی قسمت کے ستارے چمک چمک کر ڈوبے ہیں اور کیسے کیسے "عالی مرتبتوں" کو "نیاز مند" بننا پڑا ہے! کیسے کیسے "چاند" گہنائے ہیں۔ اور کس کس "موج" کو چراغِ سحر کی قسمت ملی ہے

ہمیں اُلفت رہی ہے سرائے فریب
کبھی برفراز و گہے بر نشیب

کا سچ مچ ہو بہو تصویر! شام کو سر پر تاج اور صبح ہوتے ہوتے تاج ہی نہیں بلکہ "دستار" بھی غائب ـــ
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں ہم!

یہاں پاکستان میں جس کسی کو بھی اقتدار ملا۔ اس نے اپنی "دنیا" بنانے کی کوشش کی۔ اور اس جوڑ توڑ میں لگا رہا کہ اس کے اقتدار اور عہدے کو "عمر خضر" نصیب ہو۔ اس مفاد دوستی اور غرض پرستی نے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ تعمیر کا دور دور پتا نہیں، تخریب ہی تخریب۔ بگاڑ ہی بگاڑ! ایسی ابتری اور وہ انتشار کہ پاکستان جو اب تک قائم ہے اسے ـــ اللہ تعالےٰ کی قدرت کا ایک زندہ معجزہ سمجھئے۔ ورنہ اس کے "خداوندوں" نے تو اس مملکت کا تیا پانچہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

پاکستان میں کرسیوں کی ادلا بدلی اوپر کے چند لوگ اپنی مرضی سے کر لیتے ہیں۔ عوام کو ان "بڑے آدمیوں" نے "اپنا نوکر چاکر" سمجھ رکھا ہے۔ جن کو ان "آقاؤں" اور "خداوندوں" کے معاملات میں بولنے چالنے اور دخل دینے کا سرے سے حق ہی حاصل نہیں ہے۔ کیسا ہی ناپسندیدہ اور نامقبول و غیر ہردل عزیز شخص "عوام" پر کیوں نہ مسلط ہو جائے "عوام" کو اسے چار و ناچار برداشت ہی کرنا پڑتا ہے۔

شہید سہروردی صاحب کے سیاسی نظریوں سے ہم بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہم اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ملک کے بگاڑ میں ان "حضرت" نے اپنے ذوق اور مفاد کے بقدر، خاصہ حصہ لیا ہے۔ لیکن ان سے ہمارا یہ اختلاف اظہارِ حق سے ہمیں باز نہیں رکھ سکتا کہ عین اس موقع پر جب کہ کشمیر کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں پیش ہے۔ اور سہروردی صاحب امریکہ جا کر وہاں کے اربابِ اقتدار سے اہم مسائل پر گفت و شنید کر کے آئے ہیں۔ اُن کا اس طرح ہٹا دیا جانا تشویشناک ہے۔!

سیاسی انقلابات کی یہ شعبدہ بازی ہماری "حلیف حکومتوں" کو ہمارے اکابر سے بدظن کر دیگی۔ کہ وہ کس پارٹی پر اعتماد کریں اور کس شخصیت کو اپنا حلیف اور معاہد بنائیں؟ سال کے سال اس قسم کے سیاسی بحران اور ردوبدل نے بین الاقوامی دنیا میں ہماری ساکھ کو بڑا نقصان پہونچایا ہے۔ دنیا کی نگاہ میں پاکستان "انقلابات کی دھوپ چھاؤں" بنا ہوا ہے۔ جس کی کسی پارٹی کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ اور نہ اس کے کسی مسلک اور پروگرام کا بھروسہ ہے۔ بے یقینی کی فضا، تذبذب کا ماحول! خوب و ناخوب کا کوئی پیمانہ نہیں! یہاں ہر چیز ذاتی اغراض کی ترازو سے تولی جاتی ہے۔ پاکستان میں بعض ایسے ایسے غلط کاروں اور شعبدہ بازوں کو اقتدار کی کرسیوں پر آنے کا موقعہ ملا ہے کہ ——— اگر ان کی ناشائستہ حرکتوں پر احتساب کیا جائے تو اُن کے لئے کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے۔ کہ شہر کے چوراہوں پر ان کے دُرّے لگائے جائیں
بین الاقوامی دنیا میں پنڈت نہرو کی بات کا وزن محسوس کیا جائے گا۔ جن کی وزارت اور شخصیت اپنی پشت پر قوم کے اعتمادِ مستقل کی بے پناہ قوت رکھتی ہے، یا پاکستان کے "وزیرِ اعظم" کی بات سنی جائے گی۔ جو

"شبے ماند، شبے دیگر نمی ماند"

کا مصداق ہے۔!

چند جھلکیاں

سہروردی صاحب ایک جماعت کے بانی اور قائد ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ قومی کاموں میں گزرا ہے، ان سے توقع تھی کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں ملک و ملت کی خدمت کر کے آنے والوں کے لئے ایک اچھی مثال قائم کر دیں گے۔ مگر ان کے زمانے میں حالات سنبھلے نہیں بلکہ اور بگڑے ہیں۔ مسٹر غلام محمد کے دور میں جب وہ وزیر تھے۔ تو انہوں نے فوجی حکومت اور ڈکٹیٹر شپ کی عوام کو دھمکیاں دیں۔ اور وزارتِ عظمیٰ کے منصب بلند پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے مہاسبھائی ہندوؤں اور کمیونسٹوں کی تمناؤں کا ساتھ دیکر، "مخلوط انتخاب" منظور کرا کے چھوڑا
ان کی "شوخ مزاجی" اور "رومان پسندی" کا یہ عالم ہے کہ امریکہ تشریف لے جاتے ہیں۔ تو ہالی وڈ کی ایکٹرسوں سے ملنے کے لئے خود ان کے شبستانوں میں جا کر حاضری دیتے ہیں۔ غضب خدا کا جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا وزیرِ اعظم اور دوسرے ملکوں میں جا کر عورتوں کے ساتھ "ڈانس" کا مظاہرہ کرے۔ پاکستان کی اتنی غلط نمائندگی سہروردی صاحب سے پہلے کسی وزیرِ اعظم نے نہیں کی۔

امریکہ ہو یا روس۔ برطانیہ ہو یا چین ہر حکومت سے دوستی کی جا سکتی ہے۔ ہم اس غلط منطق کے قائل نہیں ہیں۔ کہ روس سے دوستی ہو تو اسے "آزادی" اور روشن خیالی سے تعبیر کیا جائے۔ اور امریکہ سے سیاسی روابط قائم ہوں تو اسے غلامی اور تنگ نظری سمجھا جائے۔ پاکستان کے مفاد کے لئے تمام بین الاقوامی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر حکومت کو حلیف بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی حکومت سب سے کٹ کر اور روٹھ کر بالکل الگ تھلگ کیسے رہ سکتی ہے۔

سہروردی صاحب کی خارجہ پالیسی کو ہم کو بھاشانی صاحب کی طرح تمام تر رد نہیں کر سکتے۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ سہروردی صاحب نے امریکہ کے ساتھ روابط بڑھانے میں جس نیازمندی اور فروتنی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور باوقار وزیراعظم کو زیب نہیں دیتا۔ غیر حکومتوں سے دوستی اور معاہدہ کرنے میں اگر نزاکت حالات کے پیش نظر مکمل مساوات قائم نہ رہ سکے تو اتنی "گراوٹ" بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ جس کا مظاہرہ سہروردی صاحب نے امریکہ کے سفر میں کیا ہے۔ ان کے دور حکومت کا سب سے زیادہ سیاہ کارنامہ رشوت کی گرم بازاری ہے۔ جس کا سلسلہ اونچے اونچے ایوانوں تک پہونچتا ہے۔ امپورٹ لائسنسوں اور پرمٹوں کے کھلے خزانے ایسی خرید و فروخت پچھلے کسی دور میں بھی نہیں ہوتی۔

اس بات کو ہم ضرور مانتے ہیں کہ پنڈت نہرو کو سہروردی صاحب نے بہت کھری کھری سنائی ہیں۔ اور ان کا لہجہ کبھی مدھم نہیں ہونے پایا۔ انہوں نے اکثر و بیشتر مبارزت آمیز انداز میں گفتگو کی ہے۔ یہ اگر ان کا واقعی کوئی کارنامہ ہے تو وہ لفظوں کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پایا۔ کاش انگلستان اور امریکہ کے مقابل میں بھی ان کا لہجہ اونچا رہتا۔

پاکستان کے اس سیاسی انقلاب میں مسٹر گورمانی کو جو غیر متوقع طور پر اپنے منصب جلیل سے دستکش ہونا پڑا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قوت قاہرہ ایک ظالم کا زور دوسرے ظالم کے ذریعہ توڑتی رہتی ہے۔ وہ جو مشہور ہے کہ عرب کے دور جاہلیت میں وہاں کا ایک ایک نامور پہلوان سو سو پہلوانوں کی برابر ہوا کرتا تھا۔ تو ہمارے گورمانی صاحب بھی تن تنہا ایک ہزار سازشیوں کی برابر ہیں۔ اب کی بار سیاست کے اس پھکیت کھلاڑی کو بھی نیچا دیکھنا پڑا۔ مگر حضرت نچلے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کی طرح گورمانی صاحب ملکی سیاست سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ وہ ایک طالع آزما ذہین آدمی ہیں۔ اور جوڑ توڑ کے لئے ہر وقت کیل کانٹے سے لیس رہتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ صاحب کب کیا گل کھلا دیں۔ اور کیا شگوفہ چھوڑ دیں۔

گورمانی صاحب کے بیانات، اخباروں میں آتے رہتے ہیں۔ کرسی چھننے کے بعد ان کو جمہوریت اور عدل و انصاف کا احساس ہوا ہے۔ جب تک وہ صاحب اقتدار رہے۔ انھوں نے جمہوریت اور عدل و انصاف کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں دی۔ غلام محمد مرحوم کی غلط کاریوں میں ان کی مشورت شریک تھی۔ بلکہ یہ انھیں، نئے نئے نکتے سمجھاتے تھے۔

جائزہ

مسلم لیگ کو پاکستان میں کام کرنے کے اچھے سے اچھے موقع ملے۔ کئی سال تک اس ملک کی زمام اقتدار اسی جماعت کے دست تصرف میں رہی۔ مگر مسلم لیگ نے اپنے دور فرمانروائی میں وہ وہ کارستانیاں کیں۔ کہ پناہ بخدا! جو پبلک مسلم لیگ کے نام پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ مسلم لیگ کی پے در پے حماقتوں اور غلط کاریوں کے سبب اس سے بیزار ہوتی چلی گئی۔ مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست فاش نے اسے اور زیادہ بے وقار کر دیا!

مغربی پاکستان میں جب ری پبلکن پارٹی نئی نئی وجود میں آئی تھی اور مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان — صوبائی اسمبلی میں کشمکش برپا تھی تو اس وقت چوہدری محمد علی صاحب کی دو رُخی پالیسی نے مسلم لیگ کی ساکھ کو زبردست نقصان پہونچایا۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے "نظریوں کی" شکست کبھی قبول نہیں کی اور عوامی لیگ، ری پبلکن پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے غیر اسلامی اور قوم پرستانہ نظریوں کو وہ چیلنج کرتی رہی۔ اور ان کے مقابلہ میں جمی رہی! مسلم لیگ کے مسلک کی ثابت قدمی کا سہرا سردار عبدالرب نشتر کے سر ہے۔ جن کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے اس جماعت کے نام کو زندہ رکھا۔ اور انہوں نے نظریاتی طور پر مسلم لیگ کو اس کے موقف سے نہیں ہٹنے دیا۔

اور اس کا سب سے بڑا سبب نشتر صاحب کا اخلاص اور منصب و جاہ کی تمنا سے ان کا گریز ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی خاصی مقدار کو بھی حاصل کیا ہے۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ عزت و ذلت کا سررشتہ اللہ تعالےٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ جو لوگ وقتی کامیابی کے نشہ میں سرشار ہو کر اللہ تعالےٰ کو بھول جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ آخری دم تک اقبال مندی ان کا ساتھ دیگی، وہ ایسی باتیں کر کے بڑی کم ظرفی بے دانشی اور اوچھے پن کا ثبوت دیتے ہیں! بندہ کی خوبی اور عظمت، سرکشی اور طغیان و معصیت میں نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کے حضور عجز و نیاز پیش کرنے میں ہے۔ آسودگی و مسرت کے عالم میں شکر اور تنگی و مصیبت میں صبر، یہ ہونی چاہئے بندہ کی روش اور زندگی! ظالم اللہ تعالیٰ کی ڈھیل اور دی ہوئی مہلت کو اپنی تدبیر و ہوشمندی کی کامیابی سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر جب یہ مہلت ختم ہو جاتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالےٰ کی پکڑ پلک جھپکاتے میں بڑے بڑے فرعونوں اور نمردوں کی عظمت و جبروت کے تختوں کو اوندھا کر دیتی ہے! ہٹلر اور مسولینی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ان کا کیا طنطنہ اور دور دورہ تھا۔ مگر اللہ تعالےٰ کی قوت قاہرہ نے ایک ہی اشارے میں۔۔ ان کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا!

مسلم لیگ نے دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر مرکز میں جو وزارت بنائی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ سردار عبدالرب نشتر صاحب کی منظوری کے بعد ہی ہوا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ نشتر صاحب نے پوری خوش دلی اور انشراح کے ساتھ یہ منظوری نہیں دی۔ ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ موجودہ حالات میں مسلم لیگ کا وزارت بنا کر حکومت کی ذمہ داری قبول کرنا گویا آگ سے کھیلنا ہے —— ان شعلوں سے مسلم لیگ دامن بچا سکے۔ تو اس کے لئے یہ زیادہ اچھا ہے۔ مگر اپنے رفقاء اور ساتھیوں کے اصرار کو وہ نہ ٹال سکے۔

کوئی شک نہیں کہ بڑے نازک اور تشویشناک حالات میں مسلم لیگ نے عنان حکومت اور زمام اقتدار کو سنبھالا ہے حکومت کے ایک ایک شعبہ میں ابتری کا دور دورہ ہے۔ معاشرہ شدید قسم کے بحران و انتشار سے دوچار ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کو ارباب اقتدار کی بے دانشی اور مفاد پرستی کے سبب ابھرنے کا موقع مل گیا ہے یہ لوگ حالات کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی تمام کوششوں کا مقصود و مطلوب صرف یہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح موجودہ حکومت کو ناکام بنا دیا جائے۔ خاص طور سے کمیونسٹ جو انتشار و ابتری پھیلانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کی تخریبی سرگرمیاں اب تیز تر ہو جائیں گی!

پاکستان ایک جمہوری حکومت ہے۔ ہر فرد اور جماعت کو یہاں اظہار خیال کی آزادی ملنی چاہیئے۔ اور حکومت میں اتنا ظرف اور صبر و تحمل کا پایا جانا ضروری ہے۔ کہ مخالف گروہوں کی تنقید کو برداشت کر سکے۔ مگر مخالفین کی ایسی کوششوں سے جن سے ملک میں ابتری و انتشار پھیلتا ہو صرف نظر کسی طرح مناسب نہیں۔ عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کے شر پسندوں اور افترا پردازوں سے مواخذہ ضروری ہے۔ ابھی حال ہی میں عبدالغفار خان نے جو یہ شر پسند نعرہ بلند کیا ہے کہ۔

"پٹھانوں پر غیر پٹھان حکومت نہیں کر سکتا"

ایسے "نعرے" درگذر کے مستحق نہیں ہیں۔ شہری آزادی اپنی جگہ مسلم مگر اس کے کچھ حدود ہوتے ہیں۔ باغیوں غداروں اور تخریب پسندوں کو شہری آزادی کے نام پر کھلی ہوئی چھٹی نہیں دی جا سکتی۔

مسٹر چندریگر کی زندگی کا خاصہ حصہ قومی تحریکوں میں گزرا ہے۔ عوام کی ذہنیت اور معاشرے کے مسائل کا بھی ان کو

تجربہ ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے ملک کو جن حالات سے گزرنا پڑا ہے، اس سے وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ گذشتہ وزارتوں نے کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ ملک کے نظم و نسق کو کس نے کس طرح بگاڑا ہے۔ کس عہدے دار کا کیا کردار ہے۔ پاکستانی عوام سابقہ حکومتوں کی کن غلط کاریوں کی بنا پر ان سے بیزار رہے ہیں۔ اور ان کے رخصت ہو جانے پر عوام نے اس طرح اطمینان کا سانس لیا ہے جیسے انھیں ایک بڑی مصیبت سے نجات مل گئی۔ ان تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں مسلم لیگی ارباب اقتدار کو حالات درست کرنے کے لئے جد و جہد کرنی چاہیے۔ پچھلی غلطیوں کا نہ صرف یہ کہ اعادہ ہونے پائے بلکہ ان کی تلافی ہونی ضروری ہے۔ ملک کی بہتری اور بناؤ کے لئے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر کام شروع کر دیا جائے۔

مسلم لیگ کو پاکستان بننے سے قبل "اسلام" ہی کے نام پر کامیابی ہوئی تھی۔ اور اب بھی اس کے دنار رفتہ کو "اسلام" ہی کا نعرہ واپس لایا ہے۔ خود مسلم لیگ کی، پاکستان کی اور انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی قدروں کو متشکل کیا جائے! مسلم لیگ کے اکابر کو تمام داخلی اور خارجی مسائل میں کتاب و سنت اور اسوۂ صحابہؓ سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنی چاہئے۔ پختونستان کا شرپسند نعرہ ہو یا "سندی قومیت کا" تصور، ان تمام اصنام خیالی کو وحدتِ اسلامی کی ضرب ہی پاش پاش کر سکتی ہے۔

مسٹر چندریگر نے رشوت ستانی کو مٹانے کے لئے جو جرأت مندانہ اعلان کیا ہے۔ اس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں مگر انسداد رشوت ستانی کی پہلی شرط یہ ہے کہ "طبقہ اعلیٰ" کی سب سے پہلے تطہیر کی جائے اور رشوت خوروں اور خیانت کرنے والوں کے ساتھ کوئی رعایت روا نہ رکھی جائے۔ عمالِ حکومت جب اپنی آنکھ سے رشوت خور افراد کا حشر دیکھ لیں گے تو ان کو عبرت ہوگی۔

پچھلے دور میں آرٹ کی ترقی کے نام پر ناچ گانے کی جو سرپرستی ہوتی رہی ہے۔ اس سرپرستی سے حکومت کو ہاتھ اٹھا لینا چاہیئے۔ اس اخلاقی بگاڑ کو پاکیزگی سے بدل دینے کی ضرورت ہے۔ اوپر کے طبقہ میں اب حالات کی خرابی اس گراوٹ تک پہونچ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں تک شراب پیتی ہیں۔ اس فاسقانہ رجحان کو پوری قوت کے ساتھ چیک کرنا چاہئے۔ سب سے پہلے سرکاری دعوتوں سے اس اصلاح کا آغاز کیا جائے۔ اور سرکاری دعوتوں کو اختلاطِ مرد و زن اور شراب کے معاملہ میں بالکل سادہ و خشک Simple & Dry بنا دیا جائے

مسلم لیگ نے ون یونٹ اور جداگانہ انتخاب کے قیام کی شرطوں پر جو سمجھوتا کیا ہے۔ اس نے ملک کے یاس انگیز جمود میں اعتماد و اطمینان کی لہر پیدا کر دی ہے۔ اب تک حکومتیں ذاتی مفاد کی بنا پر بنتی رہی ہیں۔ اصول کی اساس پر یہ پہلی حکومت وجود میں آئی ہے۔ اگر شخصی مفاد اور ذاتی اغراض کو درمیان میں نہ لا کر اصول و مسلک کی اسی طرح فتح ہوتی رہی تو ملک کی ابتری استحکام سے بدل جائے گی اور عوام حکمرانوں سے نفرت کرنے کے بجائے ان سے محبت کرنے لگیں گے۔

حرفِ آخر

پاکستان کی مرکزی وزارت میں حال ہی میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کے بعض پہلو خاصے محلِ غور بھی ہیں۔ مثلاً یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ہمارے صدر مملکت سیاسی معاملات میں کافی دخیل ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کی آپس کی پھوٹ نے صدر مملکت کو مغلیہ سلطنت کے دور زوال کے "بادشاہ گردں" King makers کی طرح "وزارت ساز" بنا دیا ہے گورمانی صاحب سے انھیں نے استعفیٰ لیا۔ سہروردی صاحب کو صدر کے تیور دیکھ کر ہی اپنے منصب جلیل سے دستکش ہونا پڑا۔ اور ریپبلکن پارٹی نے مسلم لیگ سے جو سمجھوتا کیا ہے۔ اس میں بھی ان کا ایما شریک تھا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ری پبلکن پارٹی صاحب موصوف کے اشارے ہی سے وجود میں آئی ہے۔ اور اس پارٹی کی حیثیت ہمارے پریسیڈنٹ بہادر کے حاشیہ بردار کی سی ہے! جناب سکندر مرزا صاحب اپنے منصب عالی پر فائز رہنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ اپنی اس خواہش کی راہ میں جب بھی وہ کسی سیاسی طاقت کو سنگ گراں

بنتا ہوا پائیں گے۔ تو اس سنگِ گراں کو ہٹانے کے لئے وہ دخل در معاملات اور اپنے اختیارات کے استعمال سے شاید ہی باز رہ سکیں اور اپنے اختیارات کے استعمال میں وہ بہت دور تک جا سکتے ہیں رہی ری پبلکن پارٹی تو وہ صدرِ مملکت کے دستِ شفقت کی محرومی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس چیز نے پاکستان کے حالات کو بہت کچھ متذبذب بنا دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اوپر کا ہاتھ کس کَل کو کب اور کس طرف مروڑ دے۔ اور حکومت کی مشینری کس طرف چل پڑے

ری پبلکن پارٹی نے اس تھوڑی سی مدت میں جس فراخ دلی کے ساتھ اصول شکنیاں کی ہیں اور طرح طرح کے رنگ بدلے ہیں تو اس کی دو سالہ زندگی کے کارناموں (؟) پر نظر رکھتے ہوئے۔ اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ اس پارٹی نے اب صدقِ دل سے توبہ کر لی ہے۔ اور اب وہ اپنی گذشتہ بے اصولیوں کو نہیں دہرائے گی۔

خدا کرے ہمارے تمام قیاسات غلط ثابت ہوں، قصر دایوان کی سازشوں کا چکر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اربابِ اقتدار اپنے کو عوام کا "مخدوم" نہیں "خادم" سمجھیں۔ اب تک جو ہوتا رہا ہے۔ اس کا آئندہ اعادہ نہ ہو۔ بڑے لوگوں کی ہوسِ اقتدار بے کنار ہونے کے بجائے معتدل و محدود ہو جائے۔ کرسیوں کو لوگ موروثی جائداد نہ سمجھیں اور یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں جس طرح وہاں کے حکمراں جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی کسی غلطی کے سبب ملک اور عوام کے مفاد کو نقصان پہونچا ہے۔ عوام میں ان کی طرف سے بدظنی اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ تو وہ بہ رضا و رغبت اپنی کرسیوں کو اپنے سے زیادہ اہل اور عوام کے معتمد علیہ افراد کے لئے خالی کر دیتے ہیں۔ ——— اسی طرح پاکستان کے "بڑے لوگوں" میں بھی یہ کیرکٹر پیدا ہو جائے۔ تو سارے دلدر دور ہو جائیں۔ کرسی سے چمٹے رہنے کی ہوس نے تمام معاملات کو ابتر کر رکھا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگ یورپ کی بُری باتوں کی نقالی کر لیتے ہیں مگر وہاں کے لیڈروں کے قومی کیرکٹر کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔!

نئی وزارت اسلام کی ترقی اور پاکستان کی بقاء کیلئے جو تدبیر اختیار کرے گی، اور پروگرام بنائے گی۔ اس سے تعاون کے لئے ہماری ناچیز اور حقیر خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔ اور ہم تنہا ہی حاضر نہیں ہیں۔ پاکستان کی ہر دینی اور رفاہی جماعت اشتراک و تعاون کے لئے تیار ہے۔ خدا کرے اقامتِ دین کا کام مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے اتحادِ عمل کے ہاتھوں ہی پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔ اور یہ سعادت انہی "خوش باشوں" کے حصہ میں آ جائے۔ (آمین)

مورخ کا قلم رُکا ہوا ہے۔ سادہ اوراق اس کے سامنے رکھے ہیں۔ اور وہ منتظر ہے کہ اس "دورِ جدید" میں کیا ظہور میں آتا ہے۔؟؟!

ماہرالقادری

۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء

پنڈت بنواری لعل چتر دیدی

اسلام

"اسلام" کے بارے میں یہ ایک انصاف پسند ہندو کے تاثرات ہیں! پنڈت بنواری لعل "ماتھر چتر دیدی برہمن تھے" اٹاوہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے، حیدرآباد دکن میں ملازمت کی اور اپنی قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت معمولی درجہ سے ترقی پاکر محکمہ آبکاری کے مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) ہوگئے۔ پنڈت بنواری لعل آنجہانی محکمہ آبکاری میں ملازم تھے۔ مگر کسی "نشہ" کی چیز کو چھوا تک نہیں، یہاں تک کہ سگرٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے سوسائٹی میں وہ مقبول تھے۔

علم وادب کا انھیں ذوق تھا، اسلام کا مطالعہ انھوں نے فرقہ بندی اور عصبیت سے بلند ہوکر کیا۔ اس لئے وہ "سچائی" کو پاگئے اور انہوں نے پوری جرأت اور اخلاص کے ساتھ اس کا اظہار بھی کردیا۔ یہ مضمون "اعتراف حق" کی ایک دستاویز ہے۔

"اسلام" کے بارے میں جن لوگوں نے تعصب آمیز خیالات کا اظہار کیا ہے اور اسلام کو بے سروپا اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے، وہ دراصل ذہن و فکر کے اعتبار سے مریض تھے۔ اُس مریض کی طرح جس کا ذائقہ بگڑ گیا ہو اور اسے شہد میں تلخی محسوس ہوتو اس میں "شہد" کا نہیں اُس کی قوت ذائقہ کا قصور ہے کسی فرقہ اور ملت و مذہب کا پیرو کیوں نہ ہو، اگر اُس کی فکر صحیح ہے اور وہ ذوقِ سلیم رکھتا ہے۔ تو "اسلام" کے مطالعہ کے بعد اُس کے قریب قریب وہی خیالات ہوں گے۔ جن کا اظہار پنڈت بنواری لعل نے کیا ہے

(م۔ ق)

عظیم الشان رحمت الٰہی

اسلام ایک بہار پایدار کی طرح عطا ہوا۔ اک قانون محکم تھا جو انسان کو عطا ہوا۔ آفتاب کی ماہیت نہ جانے اور اس کی ممنون نہ ہو۔ مگر پھر بھی استفادہ شعاع ذرے سے ضرور بے حسی میں ہوتا ہے نور کور دکنے سے رُک نہیں سکتا۔ موج روانی سے باز نہیں آسکتی۔ ممنونیت احساسِ خوشی اور مسرت میں اضافہ کرتی ہے۔ انکار اس کے استفادہ سے محروم کرتا ہے۔ گہوارہ سے لے کر لب گور تک آفات ہیں۔ اگر کوئی خاص بدبخت

اور طریقہ معین نہ ہو تو بے اصول زندگی کی وہی حالت ہوگی۔ کہ دریائے مواج اور طغیانی زدہ میں کشتی بلا لنگر اور ناخدا کے

ایک بندے نے تو دوسرے کو اپنے زور سے غلام بنایا۔ اپنے حرص و طمع کے پُر کرنے کے لئے غریبوں کا خون چوس لی
اُن کو ان کے مقبوضات سے بے دخل کیا۔ نفس پرستی کے تخت، شراب خوری اور زنا رائج۔ بہائم کی طرح مین اور رما
میں تمیز نہ رہی۔ انسان اور حیوان میں فرق کیا رہ گیا۔ اگر وحشت باقی رہتی تو ترقی معدوم ہوجاتی۔ کیونکہ بندۂ نفس ا
ظالم اور بس چاردیواری، بداعمالی کے باہر نہیں نکل سکتا جو اس کے اعمال بدنے اس کے لئے حصن حصین کی طرح بنا
ترقی نہ رک جائے۔ اس لئے انسان کو بذریعہ مذہب ان آفتوں اور آلائشوں سے پاک کرنا مقصود تھا۔ اس شعور کو
انسان میں ہے بیدار کیا گیا۔

عظمتِ رُوم

یہ کیا تھی۔ صرف وطن پرستی۔ جس میں ہر قسم کی وحشیانہ حرکت روا تھی، اسیران جنگ پر عذاب و قی
فتح کے رتھوں کے کھینچنے پر مجبور کرنا۔ بھوکے شیروں سے قیدیوں کا لڑانا۔ فتوحات کرنا۔ او
لوٹ کر اپنا گھر بھرنا۔

آزادئ نفس

یہ آزادی اسلام نے دی۔ اس کا استدلال .... درج ہذا ہے۔ خطبۂ مکہ ملاحظہ ہو۔ اقبال گنا
سے رومن کیتھولک عیسائی گناہ کا کفارہ خیال کرتے تھے۔

اسلام نے تعلیم دی کہ صرف عمل ہی شئے ہے۔ اور بروز حشر کام آئے گا۔ حضرت رسالتماب نے فرمایا۔ اے عباس
اے صفیہ! اور اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! میں خدا سے تم کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ میرا عمل میرے لئے۔ اور تمھارا عمل
تمھارے لئے مفید ہے۔

مُعترضین

مُعترضین کی حالت قابلِ افسوس و رحم ہے۔ حکمتِ خدا پر بے سوچے سمجھے اعتراضات کئے گئے۔ احسانات جو خ
نے کئے وہ انسان بھول گیا۔ غاروں سے سر بفلک عمارتوں میں پہنچا۔ اس ضعیف البنیان کو برق تک پ
قوت دی گئی۔ پہاڑوں پر پہنچا۔ مگر یہ سب احسانات بھول گیا۔ جہالت اور کج فہمی معترض بنا، یا یہ کہ جان بوجھ کر حق
اور اپنے رسم و رواج کی صحت کی طرفداری میں آمادہ ہوا۔ اسلام ایک کوہِ صداقت تھا۔ سچے مذہب کو کسی امداد دنیا و
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کو تیغ و سنان مطلوب ہے نہ منطق کی زبان درازی اس کے اطراف سیلاب و طوفان آیا
کفار مکہ اور مہذب اقوام نے بہت کچھ حملے گئے۔ پر لہریں آئیں اور سر مار کر واپس ہوئیں۔ اس کی پیدا کردہ خوبیاں۔ ا
کی قدرت کے مناظر اور ان کی تہہ میں جو قانون کہ نافذ اور عامل ہے۔ اس کو وہ دل جو قفسِ مادہ میں محبوس ہے۔ محسوس
نہیں کر سکتا۔ یہ آسمان، ستارے، سیارے۔ اُن کا نظام۔ اُن کی شان۔ فوائد۔ اس کو کیا دکھائی دیں۔ جو مادی دنیا میں
پھنس گیا ہو۔ اُس کے اطراف مادہ ہے۔ اور زر۔ اس ماحول تک اس کی نظر محدود ہے۔ اور یہ نظریہ اس کا آخری حدِ نظر
دیدار معرفت کردگار کے لئے چشم بینا چاہیئے۔ یہ تو کور اور نابینا تھا۔ آخر اس کی طبیعت میں ایک نئی تحریک پیدا ہو
کہ کہیں سے فلسفہ حاصل کرے۔ اور اس حس کا نام شک ہے۔ اب بھی اعتقاد یا ایمان نے جگہ نہ لی حقیقت آشنا
نہ دیکھ سکا۔ شک نے سرگوشیاں کیں۔ علم نباتات۔ ریاضی۔ نجوم۔ ہئیت وغیرہ نے صرف ایک شاخ بنائی۔ مگر وہ
سب سے اعلیٰ اور ارفع تھا۔ وہ ان علوم ظاہری میں نہ مل سکتا تھا۔ انسان جانوروں سے کہیں زیادہ کمزور اور بد
مگر اس کو سب سے اعلیٰ قدرت نے بنایا ہے۔ عقل اور ادراک دے کر سب پر حاوی کیا گیا۔ مگر اس نے سب کو

حضرت رسالت مآب کی ذات اقدس پر ناجائز اعتراضات آغاز ہوئے۔ وہ ذات مقدس جس کا ہر فعل مثل روز روشن
ن تھا۔ اور معصومیت سے لبریز تھا۔ اچھے اور برے کاموں کی شناخت یہ ہے کہ رازداری نہ ہو۔ پردہ داری اور شے ہے
حضرت کے تمام سوانح ان کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔

قلب انسانی میں ایک مرض پیدا ہو چکا تھا۔ تشکیک نے صحیح دوا تجویز نہ کی۔ مگر کسی نہ کسی قسم کا فلسفہ غلط سوچ کر
ضی تشفی انسان نے دل کی ضرور کی۔ وہ سمجھا کہ دوا ملی۔ مگر دوا نہ تھی۔ صرف سراب یا دھوکا تھا۔ مریض عقل صحیح راستہ کے
ڈھنے میں عاجز اور معذور رہا۔ پائے لنگ دشوار اور سیدھے راستہ کو نہ پا سکا۔ اس کو گمراہی نصیب ہوئی۔ بجائے طے منازل
اس نے تصفیہ کر لیا۔ کہ منزل مقصود نہیں ہے۔ اور اس کا نام انکار ہے۔ جب مقصود نہیں تو قطع منازل لاحاصل ہے۔ یہ استدلال عقل فرسودہ
نے کیا۔ اور مزید جستجو سے دست برداری کر لی۔ اس کو دلیل مزید کی ضرورت نہ تھی۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب کو یہ خیال نہ رہا کہ مذہب
ضرورت ہے۔ اور مذہب منجانب اللہ دیا جاتا ہے۔ جس طرح اور نعمتیں۔ عقل انسانی کا جو نتیجہ یعنی مذہب اگر ہو تو وہ اس کے لئے
ر اس کے ہم خیال دو چار کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ مگر تمام عالم کے لئے نہیں۔ صرف ایک صداقت ہی ہے جو فانی نہیں ہوتی
محدود بلکہ عالمگیر ہو سکتی ہے۔ دنیا میں بہت سے عقلاء نے اس قسم کی بدعتیں کیں۔ مگر یہ تھوڑے دن بشکل مذہب رائج
ر پھر فنا ہو گئیں۔ اس کو مذہب کہنا غلط ہے۔ یہ صرف ایک طرز خیال تھا۔ ایک مکتب تخیل تھا۔

صداقت کا معیار یہ ہے کہ وہ بلا امداد بیرونی خود قوت رکھے اور پھیلے۔ اسلام کی امداد پر قوت حکومت یا زور شمشیر نہ تھا۔
ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چند رفقاء اور وطن سے دور جا کر جاگزیں ہوئے۔ بہت سے دنیا میں مذاہب نہیں عقائد
سلطنت و حکومت پھیلے۔ اور ان سلطنتوں کے ساتھ ان کی زندگی ختم ہوئی۔ اصلی صداقت کو طاقت کی ضرورت نہیں۔ اس میں
ندرونی قوت انتشار ہے۔ وہ نشر ہوتی ہے۔ اور فنا نہیں ہوتی۔ دنیا بدلے۔ سلاطین مٹ جائیں۔ خیالات بدل جائیں۔ مگر
ب اپنی روش پر ہے۔ اس کی رفتار متاثر نہیں ہوتی۔ وہ تغیرات سے بالا ہے۔ وہ اس دنیائے فانی کے سہارے نہیں چلتا۔
ت کی شان بھی اسی طرح دنیا کی امداد سے بے نیازی کی ہے۔ اس کا نشو و نما کسی حکومت کی آبیاری پر نہیں۔ اس کا انحصا
بالیدگی تلوار کے سایہ سے مستغنی ہے۔ اوامر قدرت سے وہ درخشاں اور تاباں ہے۔ سعی انسان سے اس کو زوال نہیں پہنچ سکتا۔
جماعت کے عروج کا منحصر یا پابند نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ ہے ظرف قبل اس کو دیکھے یا نہ دیکھے۔

زات

معجزات نبوی کے متعلق مجھ کو زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ امور یا واقعات مافوق العادت یا
جس کو معمولی واقعات سے تعلق نہ ہو اس کے دلائل سمجھ کر بیان کریں۔ میں معجزات نبی کا پورا قائل ہوں۔ ان کا وقوع
ہوا۔ میں اس سے بڑھ کر مانتا ہوں۔ آنحضرت صلعم کی پوری زندگی کو میں ایک مسلسل معجزہ اور بلا وقفہ کرامات خیال کرتا ہوں۔
قبل نبوت آپ کی پاک زندگی اور اس ماحول میں قابل صد تحسین ہے۔ فلسفہ کا مقولہ مسلمہ ہے کہ ماحول کا اثر دماغ پر منعکس
ہے۔ مگر یہاں غور طلب یہ ہے کہ آپ عرب میں پیدا ہوئے۔ جہاں شرک۔ بت پرستی اور تمام دنیا کے گناہ رائج الوقت تھے
ت کے لئے جب تشریف لے گئے وہاں بھی یہی حال تھا۔ مگر آپ تمام اثرات سے محفوظ تھے۔ جس طریقہ پر کہ کنول کا پھول پانی میں
پانی سے بالاتر رہتا ہے۔ آپ کا لقب **امین** اور آپ کی دیانت ضرب المثل تھی۔ بعد نبوت آپ کا صبر و تحمل، ضبط اور صرف ایک
حیات کی روشنی میں زندگی بسر کرنا کہ تمام مخلوق راہ راست پر آجائے۔ آپ کا استقلال اور اعداء سے طالب انتقام نہ ہونا
ن کی اصلاح کے لئے کوشاں ہونا جو آپ کے دشمن جان تھے۔ کبھی خوف و ہراس میں مبتلا نہ ہونا۔ ہمیشہ اطوار نیکو اور سلوک کو جاری رکھنا

بد دعا نہ کرنا، انتہائی انکسار اور عجز، غربت اور صدمات گرسنگی برداشت کرنا۔ تمول کی حرص سے پاک رہنا۔ ایک نسخہ اعلےٰ ترین، اور مذہب بے بہا کا ذریعہ بنا۔ باوصف اس کے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہ پائی تھی آپ کا اعتقاد ذات الٰہی پر تمام خالی از عجائبہ نہیں؟

نبی کریم کی زندگی خود ایک مسلسل معجزہ ہے۔ آپ کی ہستی تمام تخیل معمولی سے بالاتر ہے۔ آپ کا ہر فعل سراپا پابند و تابع — احکام مرضی الٰہی۔ سب سے بڑا معیار یہی ہے کہ عمل انسان ایسا ہو جس کو رازداری کی ضرورت نہ ہو۔ آپ کی ہی زندگی کو عز و امتیاز حاصل ہے۔ ہر روز کے واقعات، ہر لمحہ حیات کے حالات، روز روشن کی طرح عیاں اور روشن تھے۔ اور ہر فعل معصوم، روزانہ کاروبار مبنی بر صواب۔ ہر نفس آپ کا منور اور روشن۔ زندگی مثل آفتاب تاباں و درخشاں۔ فخر یا غرور سے پاک۔ بڑی سے بڑی آفت آپ کے قدم میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ ہر لحظہ آپ کی اعلےٰ ہستی زیادہ نمایاں ظاہر ہوتی رہی۔ آپ رحمت برائے عالمین تھے۔ آپ پیام الٰہی کے مظہر تھے۔ حکم الٰہی کے نشر کرنے والے۔ صداقت اور وحدت پھیلانے والے۔ راہ خدا میں وقف اور اگر ایسی ہستی برتر سے۔ معجزات ظاہر ہوں تو کوئی مقام استعجاب نہیں۔ ادراک۔ فہم۔ مشاہدہ اور تجربہ کے فہم سے یہ معجزات بالاتر ہیں۔ اس لئے انسان بدگمان ہوتا ہے۔ مگر محدود تجربہ مشاہدہ ہمیشہ واکثر غلط ثابت ہوا۔ اور جدید دریافت غلطی ثابت کر رہی ہے۔

عقل معمولی اسباب و علل تک محدود رہتی ہے۔ چنانچہ مولانائے رومی فرماتے ہیں

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند !　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند
سنگ بر آہن زنی بیروں جہد　　ہم بامر حق قدم بیروں نہد
آہن و سنگ از ستم بر ہم مزن　　کایں دو می زایند ہمچو مرد و زن
سنگ و آہن خود سبب آمد و لیک　　تو ببالاتر نگر اے مرد نیک
کایں سبب را آں سبب آورد پیش　　بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش
آں سبب را آں سبب عامل کند　　باز گاہے بے برد عاطل کند
وان سبب ہا کانبیاء را رہبر است　　آن سبب بازیں سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقل ما　　واں سببہا راست محرم انبیاء
انبیاء در قطع اسباب آمدند　　معجزات خویش بر کیواں زدند

اس سبب کو صرف نظر انبیاء دیکھ سکتی تھی۔ جو معمولی علم و عقل سے دور اور برتر تھی۔ جو چیز کہ تجربہ انسانی سے باہر ہو کیا اس کا وقوع خارج از امکان ہے۔؟ بہت سارے نئے امور روز معلوم ہو رہے ہیں۔ کیا ان کے وجود یا وقوع سے انکار ہو سکتا ہے۔ عقل انسانی اگر یہ تصور کرے کہ انسان اور خدائی قوت یکساں ہیں۔ تو یہ نظریہ غلط محض ہے۔ جب خدا کی قدرت بالاتر ہے۔ تو وہ اسباب و علل کی پابند نہیں رہ سکتی۔ وہ سبب دیگر اسباب کے خلاف عمل کر سکتا ہے۔ معجزات، براہین یا دلائل کے متعلق روایت بھی ایک امر قابل غور ہے۔ کسی مذہب نے کسی نبی یا ہستی کے متعلق اس قدر تنقیح و تنقید یا تحقیق نہیں کی جس طرح کہ اسلام نے ہر راوی کے اعتبار [illegible] روایت۔ اور پھر قابل قبول اور قابل اعتبار راویوں کی جانچ پڑتال کے بعد کسی روایت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اقوال۔ افعال۔ ہر طریقہ پر اسی طرح جانچے گئے۔ اور پھر عقل راوی یعنی وہ سمجھ سکتا تھا عاقل، دماغ اور قابل فہم تھا۔ غرض کہ جو واقعات کہ تسلیم کئے گئے ان کی صداقت کا پورا پورا اطمینان کر لیا تھا۔ ایسی صورت میں ایسی شہادت ناقابل اعتبار نہیں خیال کی جا سکتی۔ اور یہ معجزات اس اعتبار سے بھی پختہ ہیں۔ تاریخ کو ہم مانتے ہیں۔ اگر مورخ

واحد ہو۔ مگر قابل اعتبار ہو۔ پھر یہاں بے اعتباری کی کوئی وجہ نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ معجزہ خلاف تجربہ تھا، تو یہ تجربہ انسانی روز غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ پس غلط تجربہ پر استدلال خود غلطی ہے۔

سب سے بڑا معجزہ خود قرآن تھا۔ ہر ایک نبی کو وہ اعجاز عطا ہوا جو اس وقت مروج ہوا اور معجزۂ نبوت اس سے بالاتر ہو۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر تھا۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں طب تھا۔ عرب میں ادب تھا۔ شاعری تھی۔ اللہ پاک فرماتا ہے۔

" انھوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں۔ کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں۔ میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں۔ کیا اُن کو یہ نشانی کافی نہیں ہے۔ کہ ہم نے اُس پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

(عنکبوت)

یہ نہ مٹنے والا معجزہ ہے جو ہمیشہ قائم اور دائم رہے گا۔ اور معجزے وقتیہ تھے۔ اللہ پاک فرماتا ہے۔

" کہہ دے اے پیغمبر اگر تمام جن وانس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں۔ تو نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد پر کیوں نہ ہوں۔"

(بنی اسرائیل ۱۰)

اسی [illegible]ت سرمدی کا جواب شعرائے عرب نہ دے سکے جو ہر قبیلہ میں موجود تھے۔ انھوں نے جنگ کی محاربہ کیا۔ مگر جواب قرآن کی ہمت تک نہ ہوئی۔ یہ وہ کھلی ہوئی کتاب جو امیر غریب سب کے لئے ہے نہ ایک طبقہ مخصوص کے لئے۔ اس کا ثبوت مزید یہ ہے کہ ایک امی گروہ میں امی۔ ملک گرفتار جہالت اور غار حرا سے سرچشمہ علم ابل جاتا ہے۔ علم وحکمت کے پوشیدہ نکات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ نکات جن کی تردید نہ ہوئی نہ ہو سکے گی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

قرآن کے نزول کے پہلے اے پیغمبر نہ تو تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے۔ اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔

(عنکبوت ۵)

نبی کریم کا سب سے بڑا کارنامہ شاندار اور درخشاں یہ ہے کہ رُوئے زمین پر بُطلان کفر اور توحید سے دنیا کو معمور کرنا۔ روحانی ارتقاء پیدا کر دینا اور انسان کے اخلاق کو جو شیطانی تھے۔ فرشتوں اور ملائکہ کی عادات دلانا، اوہام پرستی کو معدوم کرنا۔ اُخوت مساوات تہذیب، تمدن۔ جمہوریت جس کا ضمنی نام ہے۔ سب کچھ سکھانا۔ عورتوں کو قعرِ مذلت سے نکالنا۔

امام غزالی فرماتے ہیں:۔

" نبوت انسانیت کے مرتبہ سے بالاتر ہے۔ جس طرح انسانیت۔ حیوانیت سے بالاتر ہے۔ وہ عطیہ الٰہی ہے۔ اور موہبت ربانی ہے۔ سعی اور کسبِ تلاش سے نہیں ملتی۔"

یہ واقعہ ہے کہ ایک حکیم مصلح بھی کوشش کرتا ہے۔ کہ بنی نوع انسان کی حالت بہتر ہو۔ مگر اس کی سعی خاص خطہ اور زمانہ کی پابند ہوتی ہے۔ نہ کہ عالمگیر۔ اس کے اقوال ذاتی ہوتے ہیں۔ اور معرضِ بحث میں آتے ہیں۔ اور ایک مدت زندگی کی اصلاح پر محدود ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ مگر نبی جو منجانب حکم خدا پہنچاتا ہے۔ اس کا حال برعکس ہے۔ اس کا

دائرۂ عمل تمام عالم تمام زمانہ اور تمام صیغہ جات زندگانی ہیں۔

فلاسفر اور نبی میں فرق

فلاسفر کا اثر محدود ہوتا ہے۔ اس کی زندگی پاک نہیں ہوتی۔ پیغمبر میں فضائل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کو اس تعلیم مذہب سے مقصود شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی۔ قیام سلطنت یا ذاتی مفاد نہیں ہوتا۔ صرف حکم خدا کی بجاآوری اور ہدایت مطلوب ہوتی ہے۔ اس کا پایہ بلند ہے۔ یہ تمام اوصاف حمیدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تھے۔ آپ کا مرتبہ سب سے افضل اور اعلیٰ تر

" بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر "

ہر ماہر فن کسی ایک فن کا ہی ماہر ہو سکتا ہے۔ نہ کہ تمام امور پر حادی۔ ایک سپہ سالار فوج کشی جانتا ہے۔ حکیم عالم خارجی سے بے پروا اور اپنے اصول سے واقف ہوتا ہے۔ شاعر تخیل میں مست رہ سکتا ہے۔ یہ صرف پیغمبر ہی ہے۔ جو علم معرفت۔ بہبود کام اور اخلاقی تفہیم، آخرت کی راہ، دنیا میں عمل نیک کو سب مفید امور بلاغرض سکھاتا ہے۔ خود اپنی مثال قائم کرتا ہے۔ اور اللہ کے احکام راز سے مطلع ہوتا ہے۔ زحمت دوسروں کی بھلائی کے لئے اٹھاتا ہے۔ اور یہ سب بے غرض۔ یہ اوصاف اسی نبی کریم میں تھے۔ جو نبی آخر الزماں سردار المرسلین تھے۔ نبوت سعی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ جس نے نبی کریم کو تمام چیزیں عطا کیں۔ ورنہ آج تعلیم یافتہ دنیا میں بہت قابل ہستیاں ہیں۔ اور وہ نبی نہیں ہو سکتی ہیں۔ انسان صدیوں تک ستارے سیارے۔ چاند، سورج میں برق، رعد، اور دوسرے قدرتی مناظر مہیب یا پُر رعب میں خدا کا دھوکا کھاتا رہا۔ مگر تعلیم نبوی نے جو خالص منجانب اللہ تھی۔ آن واحد میں اس کو صحیح نتیجہ پر پہنچایا کہ خدا ان کا خالق اور بالاتر ہے۔ اور حقیقت آشنا کرا دیا۔ اگر صرف تعلیم ذہنی انسان کو صحیح راستہ بتا سکتی تو وہ بہت مدت پیشتر آگاہ ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جو تعلیم ہوتی ہے۔ وہ خالص خدا کی طرف سے بلا درنگ۔ اور اس سے ذہن انسانی تعلیم کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ اس کی دسترس سے بالاتر ہے یہی ایک مثال کافی ہے۔ چونکہ اعتقاد انسانی پہلے سے غلط طریقہ پر مبنی تھا۔ اس لئے پہلے ابتداء نفی سے کی گئی یعنے یہ کہ پہلے "لا" نے خیالات ماضیہ کی تردید کر دی اور پھر اثبات کیا گیا۔ دنیا میں جمادات۔ نباتات سب کچھ کارنامہ قدرت موجود تھا منطقیانہ نظر تھی۔ پھر بھی ذہن انسانی صحت اور یقین کے ساتھ وجود خدا سے غافل تھا۔

خصائص عرب

وہ صحت نسب کے حامی تھے۔ کبھی محکوم نہ ہوئے۔ بہادر تھے۔ پُر جوش تھے، فیاض تھے، حق گو اور صاف باطن تھے۔ فصیح تھے، شاعری اس کی مثال ہے، ذلت پسند نہ تھے، مساوات اور جمہوریت اجزاء طبع تھے۔ عمل پسند تھے۔ کتابوں کے اثر سے اور فلسفہ کے جھگڑوں سے ان کے قلوب پاک تھے ۔۔ چون و چرا کے مباحث سے اُن کے دماغ بھرے نہیں تھے۔ ظرف قبول اور صلاحیت قبول تھی۔

مرتبۂ انسانی

قرآن پاک میں ہے: "ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سب نے اس بار کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔" (احزاب - ۹)

"جو کچھ زمین میں ہے۔ خدا نے (اے انسان) تمہارے لئے بنایا" (البقرہ - ۳)

• زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا" (حج - ۹)

اے انسان کو معبود اور مالک کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ اور ایسے انسان کی روحانی ہدایت کے لئے پیغمبر پاک کو مبعوث فرمایا گیا۔ اور اللہ تعالےٰ سے بندہ کو آشنا کرانا اسلام کا کام تھا۔

عمل نیکو خالد کو بنوخذیمہ کی طرف بھیجا تھا۔ ان کو حکم جنگ نہ تھا۔ انہوں نے تلوار سے کام لیا۔ آنحضرت نے جب یہ سنا تو آپ کھڑے ہوگئے اور کہا اے خدا! خالد نے جو کچھ کیا۔ میں اس سے بری ہوں۔ اور حضرت علیؓ کو روانہ فرمایا۔ جناب امیر نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ ایک ایک کے کا خون بہا دیا۔ اور اس پر رقم مزید دی۔

عورتوں اور بچوں کے لئے حکم جب کسی مہم پر فوج روانہ کی جاتی تو سردار فوج کو حکم سید المرسلین ہوتا تھا۔ کسی کہن سال کو۔ بچے کو۔ کم سن کو، عورت کو قتل نہ کرو"

"عہد کی پوری پابندی کرائی گئی"

اسیران جنگ کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ اسیران بدر کے ساتھ سلوک ملاحظہ طلب ہے۔ حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہوئی تو عزت و حرمت کے ساتھ مقیم گوشہ مسجد کیا گیا۔ اور یمن کو مع ساز و سامان واپس کیا گیا۔

مقاصدِ اسلام بنی نوع انسان کی اخوت۔ ترقی اور فرد سے جماعت کی ترقی زیادہ ملحوظِ اسلام رہی ہے۔ اسلام کا یہ منشا نہیں تھا کہ زندگی انسانی کو ہی صرف خوبرو ظاہر میں بنایا جائے، بلکہ حقیقی منشا تھا کہ انسان کو خوبی صورت و سیرت و سعادت دارین حاصل ہو۔ دوسرے اقوام کی اور ممالک کی سعی یہ رہی مگر یہ سعی صرف چند منتخب فرقے یا اشخاص تک محدود رہی۔ عمومیت کی صورت اس نے اختیار نہ کی حق عبادت یا علم مذہب صرف چند فرقوں کو حاصل تھا۔ ما بقی اس سے محروم رہے اور قعر مذلت میں گرفتار رہے۔ اسلام کی تعلیم اس کے منافی تھی۔ اس کا منشا تھا کہ ہر کس و شخص دور اور نزدیک اعلیٰ و ادنیٰ سب پر آفتاب کی یکساں شعاعیں نور افگن ہوں۔

سجدہ گاہ اولاً یہ دستور تھا کہ ہر رسم عبادت کی ادائی کے لئے دیواریں اور محصور مقام کی محتاجی تھی۔ عیسائی کلیسا کے محتاج، یہودی بیعہ کے اندر، بت پرست بتوں کے آگے۔ مگر اسلام نے یہ حکم دیا کہ کوہ، دشت، بن، میدان، ہر جگہ سے خدا کو پکارو اور اس کے سامنے سجدہ کرو۔

اصلاحات شرک کی بیخ کنی۔ اوہام پرستی کا اندفاع۔ سحر و طلسم کے منفی عقائد کو دور کرنا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ خدا اور بندہ کا تعلق ایک بادشاہ جابر رعیت کا ہے۔ درمیانی دیوتا شفاعت کر سکتے ہیں۔ یہ خیال غلط دور کیا گیا۔ شرک کو یہاں تک دور کیا گیا کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم شرک کرتے ہو کہتے ہو جو خدا چاہے۔ اور جو محمد چاہیں۔ آنحضرت نے صحابہ کرام سے فرمایا، کہ کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے پھر آپ جو چاہیں۔ عبد الشمس وغیرہ نام رکھنے میں شرک کا شائبہ ہے۔ اس لئے ممانعت کی گئی۔ غلاموں کو حکم ہوا کہ آقا کو رب نہ کہا کریں۔ تصویر کی ممانعت ہوئی۔ کہ رفتہ رفتہ تصویروں کی پرستش ہونے لگی ہے۔

وفات سے ۵ دن قبل رسول مقبول نے فرمایا۔ کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے۔ میں منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد بنانا۔ الغرض شرک کو دنیا سے دور کرنے کی تدبیر کی۔ اور حکم یہ دیا کہ تمام کام بخیال خوشنودی خالص اللہ اور تحت احکام کے جائیں نمائش کو، ریا کو، ممنوع کیا گیا۔

غیر مذاہب کے ساتھ تعلقات ۹ سنہ ھ میں عیسائیوں کے ساتھ عہد نامہ ہوا کہ:۔ پیغمبر نے بشپوں، پادریوں، اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں عبادات اور خانقاہوں میں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز جیسی تھی ویسی ہی برقرار رہے۔ نہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے یا منصب سے خارج کیا جائے۔ اور جب تک

وہ امن صلح اور پیمان کے ساتھ رہیں۔ اُن پر جبر و تعدی نہ کیجائے۔

خلافت فاروقی کے چوتھے سال میں خانقاہ سینٹ کیتھرائن کے راہبوں اور عیسائیوں کو پورے حقوق عطا کئے گئے۔ اور مزید ظاہر کیا گیا کہ اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا۔ تو وہ خدا کے عہد کو توڑنے والا۔ اور دین کو ذلیل کرنے والا متصور ہوگا۔

عیسائیوں کو کامل آزادی دی گئی مگر اُن سے یہ توقع نہیں کی گئی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے مقابلہ کریں۔ اس لئے کہ خراج گزاروں کو جنگ سے تعلق نہیں۔

غیر مسلم باشندوں کے حقوق

یہ غلط ہے کہ غیر مسلم باشندگان ممالک اسلام خطرے میں تھے **کتاب ہدایہ** "حفاظت جسم و جان از روئے انسانیت لازم قرار پاتی ہے"۔

مکرر اسی کتاب میں ہے:۔

یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کہ کسی ممالک کی جان کی حفاظت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس نے مذہب اختیار کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے مال پر دست اندازی کرنا سرے سے ناجائز ہے۔

کتاب ہدایہ۔ عصمت نفس کو اسلام کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ حفاظت نفس آدمیت کا تعلق اسلام سے نہیں۔ بلکہ انسان سے ہے۔ ... ... انسان فطرۃً ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت لازم ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ رعیتی حقوق کی بنیاد پیدائش کے لحاظ سے ہے۔ اور ہر شخص یہ حق رکھتا ہے۔

فوج کو احکام

خلیفہ نے فوج کو نصیحت کی:۔

جب تم خدا کی لڑائی لڑو مردانہ وار لڑو۔ اپنی فتوحات پر بچوں اور عورتوں کے خون کا دھبہ نہ لگاؤ۔ کھجور کا درخت نہ جلاؤ۔ نہ اناج کے کھیت جلاؤ۔ بار آور درخت نہ کاٹو۔ نہ مویشیوں کو ستاؤ۔ معاہدہ یا شرط جو کرو اس پر قائم رہو اور اپنے قول و فعل کو مطابق کر کے دکھاؤ۔

جمہوریت

۱؎ اسلامی شریعت کی بنا جمہوریت پر ہے۔ ابتدائی علامتیں اس کا نمونہ ہیں۔ انتخاب جمہوریت کا سنگ بنیاد ہے

۲؎ مساوات قائم کی گئی۔

انگلستان میں پادریوں کے لئے عدالتیں علیحدہ تھیں

چرچ کے لئے عدالتیں جداگانہ تھیں۔ اور نارمن لوگوں کے زمانہ سے جاری تھی۔ جج ان عدالتوں کے پادری ہوتے تھے۔ اور وہ لوگ پادریوں کے ساتھ خاص رعایت کرتے تھے۔ پادریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہنری بادشاہ دوم کے زمانہ تک یہ طریقہ رائج تھا۔ اور کنٹربری کے بڑے پادری اور بادشاہ سے جھگڑا رہا۔ بڑے پادری صاحب کو بہ حکم شاہی قتل کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چرچ کو اور مضبوطی حاصل ہوئی۔ اور پادری جو مرتکب جرائم ہوتے تھے وہ ان عدالتوں کے حوالہ دیئے تھے جہاں سزائے مستحقہ نہ ملتی تھی

اسلام نے ابتدا ہی سے یکسانیت کے عمل کا لحاظ کیا۔

مذہب عیسائی کی سعی کو حکومت پر غلبہ اور چیرہ دستی

۱۲۰۵ء میں پاپائے روم۔ نوسٹ سوئم کی دلی آرزو تھی کہ چرچ کی قوت بڑھائی جائے اور رومن چرچ روزانہ نئے حقوق کی مدعی ہو رہی تھی۔ جس سے سلاطین یورپ نالاں تھے۔ بالآخر شاہ جہاں انگلستان کے عہد میں یہ مخالفت آشکارا ہوئی۔ پوپ

نے حکم دے دیا۔ عام پرستش ممنوع رکھی گئی۔ کلب بند کر دیئے گئے۔ گھنٹے بجے موقوف ہوئے۔ مردے بلا فاتحہ دفن کئے جانے لگے۔ نومولود یا مردہ کے لئے دعا یا بپتسمہ بند کیا گیا۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کا حکم یا عمل کہیں بھی نظر نہ آئے گا۔

تقسیم بعد فتح خیبر

خیبر کی زمین برابر حصوں میں تقسیم ہوئی۔ نصف بیت المال، مہمانی، سخاوت کے مصارف کے لئے۔ باقی نصف مجاہدین پر مساوی حصہ سے تقسیم کی گئی۔ اور وہ رسول اللہ نے ایک حصہ عام لوگوں کی طرح لیا۔

یہودیوں کے ساتھ یہ شرط قائم ہوئی کہ قبضہ زمین پر اُن کا رہا۔ اور وہ پیداوار کے دو حصے کرتے تھے۔ ایک حصہ مسلمانوں کو دیتے تھے۔ مگر حق انتخاب حصہ یہود کو تھا۔

ایک آزاد کردہ غلام کو ترجیح

سنہ ۸ھ میں جب شام کی طرف فوج روانہ کی گئی تو زید بن حارثہ کو جو آنحضرت سرور کائنات کے آزاد کردہ غلام تھے۔ سپہ سالاری دی گئی۔ حالانکہ حضرت جعفر طیار برادر جناب امیر موجود تھے۔

ہم اسامتہ میں تمام مہاجرین شریک تھے۔ اسامتہ صاحبزادہ زید موصوف کی افسر مقرر فرمایا۔

پہلا خطبہ

داخلہ مکہ کے بعد رسول اللہ نے حسب ذیل خطبہ پڑھا۔

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی۔ اور تمام جتھوں کو توڑ دیا۔ ہاں تمام مفاخر انتقامات خون ہائے قدیم خونبہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حریم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آبرسانی اس سے مستثنےٰ ہیں۔

جنگ حنین کے بعد عمل جمہوریت

جنگ حنین کے اسیر محفوظ تھے۔ آنحضرت کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ کے قبیلہ سے سفارت آئی۔ اور انہوں نے کہا کہ اگر سلاطین عرب سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا " ان سے بہت کچھ امید ہوتی۔ اور اسیروں کی رہائی کی سفارش کی۔

آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ خاندان عبد المطلب کا جس قدر حصہ ہے۔ وہ تمہارا ہے۔ مگر رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آپ نے فرمایا۔ مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں۔ سب نے منظور کیا۔ اور چھ ہزار آدمی آزاد کئے گئے جمہور کی رائے پر معاملہ چھوڑا گیا۔

جمہوریت کی شاندار مثال

حضرت ابو بکر صدیق نے بیعت خلافت کے بعد جو خطبہ دیا اس کا ماحصل یہ ہے۔

اے لوگو! میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو۔ اور اگر بدی کا مرتکب ہوں تو مجھے ٹھیک بناؤ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تم میں سے زور والا میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے۔ جب تک کہ میں اس سے حق حاصل نہ کر لوں۔ اور تمہارے گروہ کا کمزور شخص اس وقت تک میری نظروں میں زوردار ہے جب تک کہ میں ——— اس کا حق اس سے نہ دلا دوں۔ تم میں سے کوئی شخص کوشش ترک نہ کرے۔ جو قوم اس کو چھوڑ دیتی ہے۔ خداوند کریم اسے ذلت میں مبتلا فرماتا ہے۔ جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا ہوں تم بھی میرے مطیع رہو۔

اور جس وقت میں اس امر سے باہر ہو کر نافرمانی کروں تو تم پر کبھی میری اطاعت واجب نہیں۔ سچے مذہب کی صحیح پیروی کی یہ مثال ہے جس سے بڑھ کر روئے زمین پر مثال نہیں مل سکتی۔

مساوات

غسان کا بادشاہ جبلہ بن ایہم حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان ہو کر آیا۔ اور مکہ کے لوگ شوق سے اس کو دیکھنے لگے۔ اس کے سر پر جواہرات کا مرصع تاج تھا۔ جب وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ قوم فزارہ کے ایک شخص نے اُس کی عبا پر پیر رکھدیا۔ جبلہ نے اس کو ایک تھپڑ مارا۔ اور وہ شخص حضرت عمر کے پاس فریادی ہوا۔ تو خلیفہ نے اس کو سزائے شرعی سے معاف نہ فرمایا۔ جبلہ نے طلبی پر اقرار کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس آدمی کو رضامند کرے یا وہ اس سے جبلہ کو بدلہ دلائیں گے۔ اور اس کو حکم دیں گے کہ وہ بھی اُسی طرح تھپڑ مارلے۔ جبلہ نے اعتراض کیا۔ کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور وہ بادشاہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے دونوں کو ایک کیا ہے۔ اور بجز نیک مزاجی پرہیزگاری اور کوئی ذریعہ حصول فضیلت نہیں ہے۔ وہ رات کو بھاگ گیا۔ اور پھر عرب کو نہ گیا۔ یہ مساوات تھی۔ کہ غریب اور امیر سب یکساں تھے۔

عمرو بن العاص کے بیٹے نے قبطی کو بے گناہ مارا۔ اس نے حضرت عمرؓ کے پاس فریاد کی۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کو مدینہ طیبہ میں طلب فرمایا۔ جس وقت وہ حاضر دربار خلافت ہوئے۔ خلیفہ ممدوح نے قبطی کو ایک کوڑا دے کر حکم فرمایا۔ کہ عمرو بن العاص کے فرزند کو مارے قبطی نے کوڑا مارا اور اس نے عمرو بن العاص پر بھی ہاتھ ڈالنے کا قصد کیا۔ مگر روک دیا گیا۔

اسلامی حکومت

نبی کریم صلعم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ اتحاد اخوت قائم ہوا۔ نماز۔ جماعت۔ سب انسان مساوی ہوں۔ زکوٰۃ مالدار مسلمانوں کے زائد مال سے کچھ رقم لے کر غریب مسلمانوں کو دیجاتی تھی۔ اسلام کی غرض یہ تھی۔ کہ کمزور کی امداد کی جائے۔ اور ہم سب کو ہم پلہ بنا دیا جائے۔ تقسیم غنیمت کا طریقہ یہ تھا۔ کہ آزاد غلام چھوٹے بڑے سب کو تقسیم ہوتی تھی۔ اور کل مال تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمر نے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور بیت المال قائم ہوا۔

خلیفہ

خلیفہ کے لئے چار شرائط تھے۔

۱۔ علم ۲۔ عدالت ۳۔ کفایت نیک رویہ اور قابل اعتبار ۴۔ عقل و حواس کی صحت و سلامتی

انتخاب بذریعہ شوریٰ ہوتا تھا۔ خلفاء راشدین نے اپنی نسل سے نامزدگی نہ کی۔

چنانچہ حضرت عمر نے اپنے فرزند عبداللہ کے متعلق ممانعت فرمادی کہ ان کو منتخب نہ کیا جائے۔ حضرت علی نے بھی ارشاد فرمایا کہ میں انتخاب حسن سے منع کرتا ہوں اور نہ حکم دیتا ہوں۔

عدل مساویانہ

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی قریش کو تردد ہوا۔ کہ اس بارے میں آنحضرت صلعم کی خدمت میں کون سفارش کرے گا۔ اسامہ بن زید مقرر ہوئے۔ سردار دوعالم نے ارشاد فرمایا۔ تم حدود اللہ کے منافی سفارش کرتے ہو۔ اور خطبہ دیا کہ جو گذشتہ اقوام میں جب بڑا آدمی چوری کرے تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس لئے وہ ہلاک ہوگئیں۔ اگر فاطمہ بنت محمدؐ چوری کرتی تو میں ان کا ہاتھ کاٹ لیتا۔

صفوان بن امیہ کی چادر ایک شخص نے اڑالی وہ گرفتار ہوا۔ ہاتھ کاٹنے کا حکم رسول خدا نے دیا۔ صفوان نے عرض کی کہ ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ سردار دوعالم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھا تھا۔ حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق نہیں ہے۔

علم

رسول اللہ نے فرمایا کہ "بہترین عبادت طلب علم ہے"۔
ارشاد ہوا کہ "ایک ساعت علم میں غور کرنا ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے"۔
"علم کو تلاش کرو اگرچہ وہ چین میں ہو"۔

عالم ہدایت

ہر قوم کے لئے ایک نبی مخصوص ہوا۔ مگر پیغمبر آخر الزمان تمام بنی نوع انسان کے لئے قرآن میں ہے۔
"اے محمدؐ ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔ (سبا) بابرکت ہے۔ وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا۔ تاکہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کردے　(فرقان)
تمام عالمیان کی جانب روئے سخن قرآن ہے۔

احسان مذہب

تمام قسم کی غلامی سے انسان کو آزادی مقصود تھی۔ قرآن پاک میں ہے۔
وہ اُن کو بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ اور برائی سے روکتا ہے۔ اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں۔ اُن سے اُتارتا ہے۔　اعراف ع ۔ ۱۹
ایسے رسول بھیجے جو نیکیوں کی خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں۔ تاکہ رسولوں کو اس کی وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ رہے۔ اس سے یہی ظاہر ہے کہ روئے سخن عام ہے۔

دعوت اسلام

طریقہ جو کلام اللہ نے ارشاد فرمایا۔ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے حکم یہ ہے۔
"تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر"
(نمل ــ ۱۶۰)

علی ہذا القیاس

"کتاب والوں اور اَن پڑھوں سے کہدے۔ کیا تم نے اسلام قبول کیا۔ اگر کیا تو ہدایت پائی۔ اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر صرف پیام پہنچانا ہے۔ اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے"　(آل عمران ۔ ۲۰)
"تو تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔ اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے"　(رعد ۔ ۴)
"تو (اے پیغمبر) تو نصیحت کر تُو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ اُن پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا۔ بیشک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور ہمیں پھر اُن کا حساب لینا ہے"　(... ... ... غاشیہ)

آزادی

کیا یہ زبردستی تھی اور کیا یہ مجبور کرنا تھا۔
قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا۔
"دین میں کوئی زبردستی نہیں ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی"　(بقرہ ع ۳۴)
"اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ جو چاہے قبول کرے۔ اور جو چاہے انکار کرے (کہف ع ۴)

سلجھاؤ کا طریقہ

اسلام کا حقیقی منشاء تھا کہ خدائے واحد نے انسان کو پیدا کیا ہے اس پر احسانات کئے۔ ورنہ ایک قطرہ پانی "انسان کیسے بن سکتا تھا" زراعت قدرت کی امداد پر منحصر ہے۔ زندگی اس کے کرم پر

پھوٹی نوع مذہب کے نام پر یا معاش کے خاطر یا منافرت ملکی یا اغراض یا اخلاقی پستی کے باعث ہم برسر پیکار تھے۔ یہ سب دیزنی مٹ جاتے۔ انسان انسان بنے۔ اخوت روئے زمین پر قائم ہو۔ سب ایک خدا کو مانیں۔ ایک معبود۔ ایک طریقہ عبادت۔ تاکہ اختلافات نہ رہیں۔ مسلک صحیح ہو۔ منافرت نہ رہے۔ مال وجان محفوظ رہے۔ قتل اور غارتگری نہ ہو۔ اکل حلال ہو۔ عورت صرف شہوت اور نفس پرستی کا ذریعہ نہ رہے۔ شاہ و گدا سب آرام سے رہیں۔ وہ تفریق جو دولت یا ثروت نے پیدا کی تھی۔ باقی نہ رہے۔ مظلوم کوئی نہ ہو۔ اس حلال کا رواج ہو یا آزادی کامل انسان کو ملے۔ عورتوں کو عزت اور وراثت میں ان کا حق ہے۔ اولاد حلال پیدا ہو۔ غرض کہ دنیاوی اور دینی سلجھاؤ کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ عقائد کی وجہ سے انسان مخالفت ناتمنا ہی کرتا ہے۔ عقائد کو درست کرنا نیک بنیاد وصلح وامن قائم کرنا تھا۔

طریقہ تبلیغ

قرآن کریم نے حکم دیا۔

"توان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کر جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔" (نساع ۹)

اس سے زیادہ نرمی اور ملاطفت کا حکم اور کیا ہو سکتا تھا۔

پیغمبر پاک نے جب حضرت معاذ بن جبل ابوموسیٰ اشعری کو یمن دعوت اسلام کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ نصیحت فرمائی کہ دین الٰہی کو آسان پیش کرنا۔ سخت بنا کر نہیں۔ لوگوں کو خوش خبری سنانا۔ نفرت نہ دلا۔

ثمامہ بن اثال کا واقعہ

ثمامہ یمامہ کے رئیس تھے۔ ثمامہ گرفتار ہوا۔ مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھے گئے۔ آنحضرت صلعم نماز کے لیے تشریف لائے۔ ثمامہ سے دریافت فرمایا کہ کیا رائے ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ میری رائے اچھی ہے۔ اگر قتل کروگے تو خون والے کو قتل کروگے۔ اور اگر احسان کروگے تو ایک شکرگزار پر احسان ہوگا۔ اگر فدیہ چاہتے ہو تو۔ جو طلب کروگے دیا جاوے گا۔ آنحضرت خاموش رہے۔ تین دن تک یہ حال رہا۔ تیسرے دن سرور کائنات نے حکم دیا کہ ثمامہ کو چھوڑ دیا جائے۔ وہ آزاد ہوئے۔ انہوں نے نخلستان میں جا کر غسل کیا۔ اور مسجد میں جا کر مسلمان ہو گئے۔

"اللہ کا حکم تھا کہ۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کو چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔" (ــ ع۱)

جبر و سختی کہاں تھی۔

"اسامہ بن زید"

اسامہ بن زید نے بہ حیثیت سپہ سالار لڑائی میں شرکت کی ایک کافر ان کی زد میں آیا۔ انہوں نے حملہ کیا اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ اسامہ نے اس کو فریب سمجھ کر کچھ خیال نہ کیا۔ اور نیزہ سے اس کو کام تمام کر دیا آنحضرت صلعم کو جب یہ خبر ملی تو آزردہ ہوئے۔ اسامہ نے عرض کیا۔ کہ اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا۔ تو رسالتمآب نے ارشاد فرمایا: اے اسامہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔

آزادی مذہب

بنو نضیر جب وطن ترک کر کے نکلے۔ تو اس شان سے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا۔ انصار کی اولاد جو یہودی مذہب پر تھے۔ اور یہودی ان کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ انصار نے ان کو روکا۔ آیت نازل ہوئی

"مذہب میں زبردستی نہیں ہے"

حضرت جویریہ اسیر جنگ ہوئیں۔ اُن کا باپ حارث آنحضرت کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا کہ میری لڑکی کنیز نہیں بن سکتی۔ یہ معاملہ جویریہ کی مرضی پہ چھوڑا گیا۔ آنحضرت نے زرفدیہ ادا کی اور حسب مرضی جویریہ سے شادی فرمائی بلا مرضی اور ادائی رقم شادی نہ کی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام اسیران جنگ رہا ہو گئے

حتی الامکان جنگ سے گریز کیا گیا

۶ھ ہجری صلح حدیبیہ۔ آنحضرت نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا۔ اسلحہ بجز تلوار کے ہمراہیوں کو ممانعت کی۔ یہ سب گئے۔ اہل قریش مخالفت پر آمادہ تھے۔ صلح کی گئی۔ شرائط یہ تھے۔

۱۔ مسلمان سال حال واپس جائیں
۲۔ آئندہ سال صرف تین دن تک قیام کر کے چلے جائیں
۳۔ غیر مسلحہ آئیں۔ صرف تلوار لائیں جو نیام میں ہو۔ اور نیام تھیلے میں ہو۔
۴۔ مکہ کے مقیم مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں اقامت کا ارادہ کرے تو اس کو نہ روکیں۔
۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کو جائے۔ اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں جا دے تو واپس نہ کیا جاوے گا۔
۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا۔ کہ جس کے ساتھ چاہیں شریک معاہدہ ہوں۔ اس موقع پا بوجندل سے رسول اللہ نے فرمایا۔ ابوجندل صبر اور ضبط سے کام لو خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی۔ اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے"۔

یہ تھا عہد و پیماں پر استقلال۔

اس صلح کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار مدینہ آتے تھے۔ عقائد اسلام سنتے تھے۔ اور اسلام قبول کرتے گئے۔

دعوت اسلام بہ سلاطین

قیصر روم، خسرو پرویز، ایران، عزیز مصر، بادشاہ حبش، رؤسائے عرب، رؤسائے شام، کے نام دعوت اسلام دی گئی۔ بادشاہ حبش نے اسلام قبول کیا۔ شاہ ایران۔ برافروختہ ہوا۔ قیصر روم دل میں قائل تھا۔

ارشاد نبوی در بارہ عفو

سلمۃ بن الاکوع نے تیر اندازی کر کے فوج غنیم کو بھگایا اور اونٹ چھین لیے۔ اور رسول اللہ نے عرض کی کہ دشمن کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں۔ اگر سو آدمی مل جائیں تو ہر ایک کو گرفتار کر کے لا سکتے ہیں۔ ارشاد گرامی ہوا کہ۔

جب قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو۔

خیبر

"خیبر کے موقع پر رسول اللہ نے حکم دیا کہ ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں۔ جو طالب جہاد ہوں"۔

کیا یہ لوٹ مار کی تعلیم تھی۔ ؟

حضرت علی کو حکم رسالت مآب ہوا کہ بہ نرمی اسلام اُن پر پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کیا گیا۔ یہود نے درخواست کی تھی کہ زمین اُن کے قبضہ میں رہنے دی جائے بلفعہ پیداوار دہ دیں گے۔ درخواست منظور ہوئی۔ بوقت تقسیم دو حصے غلہ کے کئے جاتے۔ اور یہود کو حق انتخاب تھا۔

عفو عام

جب خیبر کے بعد جو مکہ میں داخلہ کے بعد رسول اللہ نے فرمایا۔ ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ہر طرح کی اذیت اور مخالفت کے مرتکب سابق میں ہو چکے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ تم کو کچھ معلوم ہے کہ تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔ ان سب نے جواب دیا۔ تو شریف بھائی ہے۔ اور شریف برادر زادہ ہے۔ نبی کریم نے جواب دیا۔

تم پر کچھ الزام نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔ ایسے واقعات۔ ایذا رسانی۔ مخالفت اور حملہ آوری، سازش کے بعد یہ ارشاد سبحان اللہ سبحان اللہ

جہاد پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ ہر مہم کو غزوہ بتایا گیا۔ مگر یہ امور ملحوظ رہیں کہ جہاد اس وقت کیا گیا جب تمام اذیتوں اور تعاقب کی انتہا ہو چکی۔ ہجرت کے بعد بھی امن نہ ملا۔ حملہ ہوا یا حملہ کی تیاری کی گئی۔ یا یہ کہ اجازت حج کے لئے اہل قریش سے جنگ کی مجبوری ہوئی۔ غنیمت یعنی لوٹ کو تدریجی طور پر رد کیا گیا (دیکھو باب اصلاحات) اسیران جنگ کے لئے سلوک نیک تھا۔ جہاد جزو عبادت بن گیا تھا۔ نہ کہ غنیمت اور خونریزی کی خواہش۔ بقائے اسلام کے لئے اُس کی ضرورت تھی۔ اشاعت اسلام کے لئے ناگزیر تھی۔ اگر جہاد نہ ہوتا تو اسلام (خدانخواستہ) مٹ جاتا۔ جو شے محبوب ترین اور قیمتی تر ہوتی ہے۔ اُس کے لئے ترک قبائل۔ جائداد اور وطن کیا گیا۔ اور جس کو قبول کیا گیا جو برحق تھا۔ اور جس میں عافیت دارین تھی۔ اس کو اگر محفوظ حملہ سے کیا گیا تو ٹھیک اور امر زیبا تھا۔

تغیر اقوام

اللہ پاک فرماتا ہے کہ اللہ کسی مسلمان کی حالت میں تغیر نہیں کرتا۔ جب تک کہ تغیر اس میں نہ کریں جو ان سے متعلق ہے۔ یہ مسلمان یا کسی طبقہ سے متعلق نہیں۔ بلکہ بنی نوع انسان سے روئے سخن ہے۔ جو جیسا کرے گا۔ اس کو ثمرہ ملے گا۔

مفتوح کے ساتھ سلوک

دیگر اقوام فتح کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ نیک سلوک پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اسلام نے کایا پلٹ کی۔ اگر مفتوح مسلمان ہو گیا۔ تو اس نے مساوات حاصل کی۔ اگر غیر مسلم رہا تو جزیہ ٹیکس دے کر وہ آرام سے رہے۔

اسباب فتح اسلام

مسلمانوں کا عدل۔ مہربانی اور خدا ترسی تھے۔ نہ مسلمان کو گھر اور نہ دنیا میں کسی عزیز کی فکر تھی۔ اور شہادت کو بہترین چیز سمجھتا تھا۔ راہ حق میں مرنا جنت میں جانا تھا۔ وہ ظالم نہ تھا۔

اسامہ بن زید شام کو فوج لے کر چلے تو ابو بکر صدیقؓ نے فہمائش فرمائی۔

" بد دیانتی۔ بے وفائی۔ ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ لوگوں کے اعضا کاٹنے۔ بچے، سن رسیدہ، بڈھوں اور عورتوں کا قتل کرنے پھل دار درخت کاٹنے اور جلانے اور درختوں کو بے ثمرہ بنانے سے پرہیز کرنا۔ بکری، گائے، اونٹ، کو خدا کے لئے قربانی کرنے کے علاوہ، اور کسی وجہ سے ذبح نہ کرنا۔ اور عنقریب تم ایسے لوگوں کے پاس سے ہو کر گذرو گے۔ جنہوں نے خدا کی عبادت کے لئے عبادت گاہوں اور۔ خانقاہوں میں سکونت اور گوشہ نشینی اختیار کی ہے۔ انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا۔ اور ان کی عبادت گاہ اور خانقاہ سے معترض نہ ہونا "

مقصد رسالت اور مراتب

نبی کریم کے ذمہ تبلیغ و تبشیر خوش خبری سنانا۔ انذار (خدا کے جلال سے ڈرانا۔ انجام بد سے آگاہ کرنا۔ اور اتمام حجت کے لئے آمد تھی

آپ صرف قاصد نہ تھے۔ مبشر (خوش خبری سنانے والے) نذیر (ڈرانے والے)۔ سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحب خُلق عظیم، صاحب مقام محمود۔ مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ۔ (برگزیدہ) مبین (شرح اور بیان کرنے والے) معلم مزکی (پاک کرنے والے ——— داعی الی اللہ۔ حاکم۔ (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والے) ناہی (روکنے والے تھے

یکسانیت تعلیم

قرآن نے حکم دیا کہ

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے (ابراہیم۔۷)

اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوش خبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔ (سبا ۳)

یہ تعلیم مخصوص گروہ امرا یا ذات پات کے جھگڑے یا محدود قوم کے لئے نہ تھی۔ یکساں تھی۔

ترجمہ: عبدالمجید اصلاحی

اسلام کی حقیقت

"ماھوالاسلام" کے عنوان سے ایک قیمتی مقالہ مجلہ "المسلمون" قاہرہ کی جلد ۳ شمارہ ۶ میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار مصطفی احمد زرقا سوریا کے لا کالج (Law College) میں شریعت اسلامی کے استاد ہیں جن کے علمی، دینی، سیاسی، مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مقالہ کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے
مترجم

علماء اسلام اسلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک فطری دین ہے۔
فطرت سے مراد انسان کی وہ طبع سلیم ہے۔ جس کی رہنما عقل حکیم اسے محکمہ نظام اجتماعی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ جس میں انسان کی فکری، جسمانی اور روحانی ضرورتیں پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہیں اور اسے نیک، پاکیزہ، بلند اور پائیدار عملی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اس میں فرد اور اجتماع کا خیالی نہیں۔ عملی بقا اور تحفظ وجود میں آتا ہے۔ اور انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں قلب ونگاہ کی تیرگی میں گم ہونے کے بجائے زیورحسن سے آراستہ ہوتی ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ انسان جو اپنی عقل سلیم اور فطرت اعتدال پسند کو کام میں لاتا ہو۔ اگر ان خارجی عوامل اور بیرونی اثرات کی عملداری سے الگ، جو اس کے افکار و عادات میں ظہور فساد کے موجب بنتے ہوں۔ بعدازاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے کوئی ایسا صالح نظام حیات وضع کرے۔ جو عملی اعتبار سے کامل ترین نظام ہو تو پورا یقین ہے۔ کہ اس کے لئے وہ تجربوں کے بعد انہی بنیادوں تک پہونچے گا۔ جن بنیادوں کو اسلامی نظام زندگی لیکر آیا۔
یہاں ہماری گفتگو فروعی تفاصیل سے الگ ہوکر صرف اسلامی بنیادو کے متعلق ہوگی۔
اسلام جیسا کہ اس کا اساسی دستور قرآن حکیم اعلان کرتا ہے اللہ کی وہ آخری شریعت ہے۔ جو پیش رو رسولان الہٰی کے لائے ہوئے ہدیوں کا اعتراف اور ان اصلی اور بنیادی مرحلوں کی تکمیل کرتی ہے۔ جنھیں سابق الہٰی پیغاموں نے شروع کیا تھا۔ اس پہلو سے تمام ادیان سماویہ اسلام کی آغوش میں آجاتے ہیں۔ یہ وہ عام شاہراہ ہے۔ جہاں ادیان سابقہ کے اصلی خط وخال آکر ملتے ہیں۔ اور اپنے تمام کناروں کو اس میں ضم کئے ہوئے منزل مقصود تک پھیل جاتے ہیں۔

اسلامی بنیادیں

اسلام میں عقلی بنیاد اسلام کی نظر میں ہر اصلاح کی بنیاد یہ ہے۔ کہ انسان عقلی اعتبار سے اللہ کے وجود اس کی وحدانیت

اور صفات کی صحیح صحیح معرفت حاصل کرے۔ اس پر اور اُس دن پر کامل اعتقاد رکھے جب میں لوگوں کو ثواب و عذاب کیلئے مجتمع کیا جائے گا۔ اور ان کے لئے دائمی عذاب یا سرمدی مسرت کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ یہ اعتقاد اس لئے تھا کہ، دل و دماغ میں حاکم بالا دست کے روبرو انتہائی مسئولیت کا شعور پیدا ہو۔ اور ہر فرد معاشرہ اپنی جگہ خود اپنا محاسب اور نگراں ہوجائے۔

اس ضمن میں اسلام ایک ایسا عقیدہ پیش کرتا ہے۔ جو انتہا درجہ سادگی اور حسن کے ساتھ انسانی معاملات کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ ہر قسم کے الجھاؤ اور معمے سے پاک جسے عالم اور جاہل یکساں طور پر ایک ایسی دلیل کی تابناک روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔ جو خالص عقل و مشاہدہ پر مبنی ہے۔

کائنات عالم میں حدوث و عدم کے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ جن سے یہ حقیقت دریافت ہوسکتی ہے۔ کہ ایک ہستی ضرور موجود ہے۔ جو اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ عقل میں یہ بات آتی ہے کہ اثر کا تعلق موثر سے ضرور ہوتا ہے۔

اسی کائنات سے موجد کائنات کی صفات بھی سمجھی جاسکتی ہیں۔ یہ کائنات بڑی وسیع الشان کائنات ہے جس کی ایجاد قدرت کی محتاج ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قدیر ہے۔ کائنات کے اندر ایک فطری، ٹھوس اور محکم نظام کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ پتہ چلا کہ خالق کائنات علیم و حکیم ہے وغیرہ وغیرہ

اللہ تعالیٰ پر اعتقاد خود بخود عقیدۂ آخرت کو مستلزم ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ایک بے مقصد اور عبث ٹھہریں گے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝

ترجمہ۔ آیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے یہاں لوٹا کر نہیں لائے جاؤ گے؟

ذات الٰہی، صفات الٰہی، اور یوم آخر کے باب میں اسلام کا یہ عقیدہ ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کو خلق کی تمام مشابہتوں سے منزہ قرار دیا ہے مثلاً اللہ کوئی انسان نہیں، اس جیسا کوئی نہیں وہ بیٹا ہے اور نہ باپ۔

زمانہ ماقبل بعثت میں خالق و مخلوق کی حیثیتیں مخلوط اور گڈمڈ ہوچکی تھیں۔ خود ساختہ بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔ قرآن نے بت پرستی کی شدت سے مخالفت کی بتایا، کہ صنم نوازی اور بت پرستی عقل انسانی کا جسے اوہام و خرافات سے بالاتر ہونا چاہیے زبردست انحطاط ہے

ایک دوسرا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اسلام سے پیشتر پیشوایان مذہب اللہ اور مخلوق کے درمیان حائل ہوگئے تھے۔ انہوں نے پیروان مذاہب کی گردنوں پر دین کے نام پر اپنا تسلط جمالیا تھا۔ مذہب کو انہوں نے اسرار سربستہ اور زندہ طلسمات بنا کر رکھ دیا تھا تاکہ عوام مذہب کو بلاواسطہ نہ سمجھ سکیں۔

بنابریں عقل انسانی کو اسلام نے اس پہلو سے آزادی اور خود مختاری بخشی اور اعلان کیا کہ اللہ اور مخلوق کے درمیان کسی قسم کی کوئی وساطت نہیں۔ چنانچہ اسلام میں کسی فرد یا طبقہ کے لئے کسی نوعیت کا دینی اقتدار باقی نہیں رکھا گیا یعنی اسلام میں ایسے مردان دین کی مطلقاً گنجائش نہیں جو دین کو اپنے ساحرانہ عزائم کی خوراک بنائیں۔ اور دین کے نام پر عوام کی قسمتوں کے مالک و مختار بن بیٹھیں (جیسا کہ —— تھیاکریسی کا خاصہ ہے) اس کے برعکس اسلام ایک کھلا ہوا دستور ہے۔ جو عقلی اعتقاد، قانونی اور تشریعی، اصول و مبادی اور اخلاقی توجیہات کا حامل ہے۔

بغیر امتیاز مذہب و ملک کوئی بھی ایسے اختیار کر سکتا ہے۔ اور خود اپنی زندگی اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کی زندگی میں اسے نافذ

کرنے کی اس کی طرف سے جو سعی و کوشش ہوگی وہ اللہ کے یہاں بلا کسی توقف و تردد کے شرف قبولیت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اسلام کے اس اصول کی شدت یہ عالم ہے کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس شریعت کو لے کر آئے تھے۔ اس شریعت کے احکام پر عمل کرنے والے تھے۔ نصوص قرآنی کے بیان کے مطابق۔ آپ کی تمام تر دینی مہم تبلیغ اور دعوتی اقتدار تنفیذ کے لئے وقف تھا۔

خود نبی کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

انما انت منذر ولکل قوم ھاد انما علیک البلاغ

ترجمہ:- تم تو صرف ایک ڈرانے والے ہو۔ اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔ تم پر محض پہونچا دینا ہے۔

لیس لک من الامر شیٔ من اھتدی فانما یھتدی لنفسہ

ترجمہ:- معاملہ کا کوئی حصہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ جو کوئی راہ ہدی اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے۔

ومن اساء فعلیھا ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ

ترجمہ:- اور جو کوئی راہ سو پکڑتا ہے۔ تو اس کا وبال اسی پر ہے۔ حقیقت میں اللہ تعالےٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی فاطمہ کو مخاطب فرماتے ہیں۔

"محمد کی بیٹی فاطمہ! اللہ کے یہاں میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔"

اس طرح اسلام نے عقل انسانی کو آزادی بخشی اور دین کے نام پر سودا بازی کا دروازہ بند کر دیا۔ جسے جتنا شریعت کا علم ہوگا۔ اس پر اتنا ہی فرض ہوگا کہ بغیر اقتدار و تحکم جتاتے وہ ناواقفوں کو علم دین سکھائے۔ معلم و متعلم دونوں اللہ کے سامنے مسئولیت اور جواب دہی کے معاملہ میں یکساں اور برابر ہیں۔

علمی بنیاد چونکہ علم، عمران و اصلاح کی اساس و بنیاد ہے۔ اس لئے نصوص قرآنی اور احادیث رسول میں تحصیل علم کی ترغیب اور علماء کی رفعت و شان کا تذکرہ خصوصیت سے آیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

ترجمہ: کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں۔ اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہیں۔

کوئی بھی علم ہو۔ شریعت کا ہو۔ طبعی قوانین کا ہو، ہر مفید اور کار آمد علم کا سیکھنا ضروری ہے۔

تاریخ انسانی کا پہلا واقعہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین قیدیوں کا فدیہ جو قرأت و کتابت سے واقف تھے یہ قرار دیا کہ وہ ناخواندہ مسلمانوں کو لکھا پڑھا دیں۔ اور یہ بھی تاریخ کا اولین واقعہ ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء صحابہ پر ناخواندوں پر حصول علم کا فریضہ عائد کیا۔ دونوں کو ایک سال کا موقعہ دیا۔ اور فرمایا کہ کوئی بھی اپنے فرض سے کوتاہی اور غفلت برتے گا تو عذاب اخروی ایک طرف خود اس دنیا میں بھی سزا اور سرزنش کا مستوجب قرار پائے گا۔

اسلام کی ترقی جو کچھ ہوئی اس میں اسی عظیم الشان قانون کا ہاتھ تھا۔ جہاں جہاں اسلام کا نور تاباں پہونچا وہاں وہاں اس کے پہلو بہ پہلو شرعی اور طبعی علوم بھی پہونچے یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں میں دینداری کا احساس و شعور زندہ تھا۔ اور مسلمانوں میں جمود و تعطل اور اہمال و غفلت کی خو نے ہلاکت آفریں نہ پیدا ہوئی تھی۔

عبادتی بنیاد تعلق باللہ کی حفاظت تہذیب نفس اور روحانی نشوونما ارتقاء کے لئے اسلام نے متعدد عبادتیں فرض کی ہیں۔ مثلاً نماز روزہ وغیرہ۔ نماز کے شرائط میں ایک شرط صفائی اور ستھرائی کی بھی داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون میں نماز سے پیشتر اطراف جسم، چہرہ اور بعض حالات میں پورے جسم کا دھونا واجب ٹھہرایا۔ یہ عبادتیں جس طرح ظاہر کو پاکیزہ اور ستھرا بناتی ہیں اسی طرح باطن کو بھی مختلف آلودگیوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔

عبادت کا مفہوم صرف روزہ نماز ہی جیسے اعمال پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ عمل جو احکام الٰہی کی تعمیل میں کیا جائے عبادت ہے۔ حتیٰ کہ راہ سے ایک روڑے کو اس خیال کے تحت کہ بندگان خدا کو اس سے اذیت نہ پہونچے۔ ہٹا دینا بھی عبادت میں داخل ہے

اجتماعی بنیاد اسلام جس وقت آیا تھا۔ اس وقت طبقاتی نظام کا رواج تھا۔ حکومتوں سے لے کر افراد تک زبردست زیردست کے لئے خونخوار درندہ بنا ہوا تھا۔ قرآن نے انسانی مساوات کی تعلیم دی۔ اس طرح کسی خاص قوم یا رنگ یا نسل کے لئے کسی قسم کا کوئی شرف و امتیاز باقی نہ رہا۔ قرآن نے اس طرز کی تمام تفریقات سے بالاتر ہو کر فضل و شرف کا صرف ایک معیار متعین کیا ہے۔ وہ یہ کہ معاشرت میں افضل اور فائق تر وہی ہوگا جو علمی اور عملی فضائل کے اعتبار سے سب سے آگے ہو۔ قرآن مجید کا ارشاد گرامی ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

ترجمہ:۔ تم میں کریم تر وہ ہے جس کے دل میں سب سے زیادہ تقویٰ ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک ہے۔

من ابطاء بہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ

"جو عملی اعتبار سے سست ہو۔ اسے اس کا نسب تیز گام نہیں کر سکتا"

روم و عرب کے نزدیک عورت کا مرتبہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ کہ وہ گھر کا ایک اثاثہ ہے۔ بیچاری حقوق و میراث اور آزادیٔ رائے کی نعمت سے قطعاً محروم تھی۔ اسلام نے اسے مرتبہ بلند بخشا۔ اسے شادی اور انتخاب شوہر کی آزادی عطا کی اور اپنے مال و حقوق میں تصرف کرنے کی اجازت دی اس طرح اس نے مذکورہ پہلو کے اعتبار سے شوہر یا کسی فرد خاندان کے ناروا تسلط کو ختم کر دیا۔

قرآن نے مالداروں کے اموال میں بوقت ضرورت ٹیکسوں کے علاوہ زکوٰۃ فرض کی ہے۔ یہ زکوٰۃ فقراء و مساکین اور بہت سے عمومی مصالح میں کام آتی ہے۔ اس طرح اسلام نے اجتماعی کفالت کا بابرکت نظام قائم کیا۔ جس میں انفرادی ملکیت کا احترام کرتے ہوئے۔ محتاجوں کے لئے اجتماعی کفالت کا انتظام کیا۔ آج اگر اس نظام کو رائج کر دیا جائے تو عالم انسانی اپنے بہت سے دکھوں سے نجات پا جائے جو بعض جدید اقتصادی نظاموں نے عمل کے پیدا کر دئیے ہیں۔

تشریعی بنیاد خاص و عام تمام حقوق کو شامل قانون کی ایک ہمہ گیر عمارت قائم کرنے کے لئے اسلام تشریعی بنیادیں پیش کرتا ہے۔ جو پیش نظر مقصد و پروگرام کے لئے پوری طرح کافی ہیں۔ انہی تشریعی بنیادوں کے مبدء فیض سے اور دوسرے تفریعی مسائل کے لئے ایک عظیم الشان فقہ اسلامی وجود میں آئی۔ جو آج تک دنیا میں تشریع و قضا کا بیش بہا خزانہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے اندر لاتعداد قانونی نکتہ آفرینیاں اور بے شمار تشریعی اشارات موجود ہیں

نظریہ حکومت کے باب میں اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ جنگ کی آخری انتہا امن ہے۔ رسول کو قرآن کا خطاب ہے۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا (اگر وہ صلح کی جانب مائل ہوں تو تم مائل ہو جاؤ)

بین الاقوامی معاملات میں عدل و انصاف کی تنفیذ اسلام کی مسلم تعلیم موجود ہے۔ اس کے یہاں یہ اصول بھی ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے درمیان پیدا شدہ حکومتی اختلافات کو خواہ امن کی حالت ہو یا جنگ کی ہر موقعہ پر عدل و انصاف (قضاء) کے تحت رکھا جائے گا۔

جنگ میں اسلام نے عورتوں۔ بچوں، بے کسوں، مریضوں، ایسے مذہبی لوگوں کو جو عبادت و ریاضت کے لئے گوشہ نشین ہوں، قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ دشمن اگر انسانیت سوز حرکتیں کریں تو ان کے ساتھ معاملہ بالمثل کرنے کی بھی ممانعت وارد ہے۔

اخلاقی بنیادیں اسلام نے انسانوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کی بنیادی مہم سوسائٹی کے اندر ایک مفید اور باعث خیر و برکت عضو بننے کی ہے یہیں سے اس پر دو اور بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں۔

اولاً، محنت کش ہوں۔ اپنے کاموں کو ٹھوس اور محکم کریں۔ اپنے ہاتھوں میں اسباب قوت کا خزانہ جمع کریں۔

"رسول گرامی کا قول ہے۔

"اللہ تعالیٰ پیشہ ور مومن سے محبت رکھتا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جب کوئی شخص کام کرے تو اسے پایہ استحکام کو پہونچا دے" یعنی اسے ادھورا نہ چھوڑے)

"طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور زیادہ محبوب ہے"

ثانیاً، خیر پسند ہوں، اجتماعی مصالح کی خاطر کوشاں ہوں" لوگوں کو اپنا بھائی تصور کریں۔ ان اعتبارات سے جس قدر آدمی سوسائٹی کے لئے پسند ہوگا اسی قدر اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بلند ہوگا۔

رسول اکرم کا ارشاد گرامی ہے۔

"لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہوگا۔ جو اس کے عیال کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید ہوگا۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعصب سے روکا ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کو اندھا کرتا ہے۔

"ہماری جماعت سے وہ شخص خارج ہے۔ جو تعصب کا داعی ہو۔ وہ بھی خارج ہے جو عصبیت پر جنگ کرے۔ وہ بھی خارج ہے جس کی موت عصبیت پر ہو۔"

آپ نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور کلمہ حق کہنے میں جری اور بیباک ہوں۔

"سب سے افضل جہاد۔ ظالم بادشاہ کے روبرو کلمۂ حق کہہ دینا ہے" اسلام اپنی تشریعی اور اخلاقی سیاست میں ان امور کی تعلیم نہیں دیتا۔ جو فطرت انسانی سے متصادم ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسلام محض افکار نظریات کا ایک مجموعہ ہوتا۔ جو عمل کے لئے نہیں، بلکہ دماغی تفریح کا سامان ہے۔ اس نے اپنے تمام اوامر و نواہی میں فطری طبائع کا لحاظ رکھا ہے۔ اور انھیں اعتدال و تعمیر کی راہ پر لگانے کا اہتمام کیا ہے۔

بنابرایں اسلام نے نظریہ رہبانیت کا واشگاف انداز میں انکار کیا کیونکہ زن و مرد میں ازدواجی رشتے کی ضرورت ایک طبعی ضرورت ہے جسے روکا گیا۔ تو برے نتائج رونما ہوں گے۔

اسی بنیاد پر اسلام نے اسبات کی اجازت نہیں دی کہ اگر دائیں گال پر طمانچہ مارا جائے تو دوسرا بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ اولاً تو مجرم کو ادرشہ ملے گی۔ دوسرے جذبۂ انتقام، حضرات انسانی کا خاصہ ہے۔ جو اس جیسی تعلیم کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے اس کے برعکس عقوبت بالمثل کا قانون بنایا۔ اور سزا میں حد جرم سے تجاوز اور بری کو سزا دینے سے روکا۔ اس طرح اس نے قصاص کے اس طریقہ کو نیست و نابود کر دیا۔ جو خاندان و قبائل کو تباہ کر رہا تھا۔ اور مجرم کے بدلے بری عذاب کی چکی میں پیسے جا رہے تھے۔ اور ایک ایسا معتدل قانون پیش کیا جو عدالت کے زیر سایہ ایک طرف آتش انتقام کو سرد کرتا ہے۔ اور دوسری جانب ظلم و اعتداء کی روش پر تیشہ چلاتا ہے۔

اسلام زندگی کے تمام متضاد عناصر سے استفادہ کی تنظیم کرتا ہے۔ کیونکہ ہر دونوں مخالف عنصر اگر مناسب طور پر اور برمحل استعمال کئے جائیں۔ تو انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ مثلاً بعض اوقات آدمی اپنے خصوصی حقوق میں تسامح اور رواداری کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن عام حقوق کے تحفظ کی خاطر اسلام اسے روک دیتا ہے۔ اور تشدد سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ حفاظت حقوق میں اہمال و غفلت حیات ملی کے لئے عظیم مفسدہ ہے۔

اسی طرح عام حالات میں اسلام اوامر و نواہی کے اتباع کے التزام کی خاطر شدید احتساب سے کام لیتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں ایسی استثنائی تدابیر کو جائز قرار دیتا ہے جس کے پیش نظر ممنوع، اضطراری حالات کے ختم ہونے تک مباح ہو جاتا ہے۔

اور اوامر کی طرح عبادتوں کے اندر بھی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

یہ اسلام کا ایک اجمالی اور مختصر خاکہ ہے جس سے معلوم ہوگا۔ کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ جہاں عقل و فکر آزاد ہیں۔ نفس انسانی کی تطہیر و تزکیہ کا پروگرام ہے۔ تقلید و تعصب اور وساوس و مزخرفات کے خلاف بغاوت ہے۔ اخلاق و حریت کی بعثت جدیدہ ہے۔

اس موقعہ پر میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ آج اسلامی ممالک میں اسلام قطعاً صحیح اور کامل صورت میں رائج نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ فرزندان اسلام کے اکثر اعمال و مشاغل راہ اسلامی سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اسلام کی تصویر کامل ان کے اعمال و رجحانات میں نہیں۔ قرآن اور رسول کے اقوال و افعال میں محفوظ ہے۔

اسلام اشخاص کا نام نہیں بلکہ اصول و افکار اور ایک مکمل نظام کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کو اہل اسلام کے غلط اور غیر اسلامی اعمال کے واسطہ سے سمجھنا ظلم عظیم ہے۔ ان کے اعمال اسلام پر حجت نہیں بلکہ اسلام خود ان کے خلاف حجت ہے۔

بے پردہ ہونے کے بعد

(منفلوطی کا ایک شاہکار، آزاد ترجمہ کے پیراہن میں)

مترجم:۔ س، اندوی

میرے ایک دوست کو سفر یورپ کا شوق دامنگیر ہوا۔ وہ ہمارے جانے پہچانے دوست تھے، وہ یورپ میں چند سال رہے۔ پھر وہاں سے واپس آتے تو ہم انھیں پہچان بھی نہ سکتے تھے۔ ان میں اپنی کوئی خوبی اور کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔

وہ یورپ کو ایک نئی نویلی دلہن کی دلآویز خوبرویئوں کے ساتھ گئے تھے۔ مگر جب وہاں سے لوٹ کر واپس آتے تو ان کا چہرہ برسات کی راتوں میں بھیگی ہوئی ایک چکنی چٹان کے مانند پھیکا پڑ چکا تھا ۔۔ ۔۔ ۔۔

وہ یورپ ایک ایسا پاک و طاہر دل لے کر گئے تھے جو عفو و درگذر کا خوگر، عذر خواہی کا پیکر تھا۔ جب واپس آتے تو ان کے قلب کا نور و صفا نہت سے پردوں میں چھپ چکا تھا۔ اور ان کا غصہ زمین و ساکنان زمین پر، اور ان کا جذبۂ انتقام آسمان اور آسمان والوں سے کسی طرح کم ہونے ہی کو نہیں آتا تھا۔ وہ ایک بے نفس سادہ اور اطاعت گذار دل لے کر گیا تھا۔ جو دوسروں کو اپنا سے بہتر سمجھتا تھا، مگر جب وہ واپس آیا تو ایک بہکی ہوئی غیر مطمئن، غیر آسودہ طبیعت لے کر آیا۔ جو کسی چیز کو اپنے سے بہتر یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور نیچے کی طرف نظر بھی جھکانا گناہ سمجھتی تھی۔

جب وہ گیا تھا تو عقل و رائے سے لبریز ایک دماغ لے کر گیا تھا۔ مگر جب آیا تو پتھر کی ایک خولدار مورتی جیسا سر لے کر آیا۔ جس میں حکمت و دانائی کے بجائے گندی ہوا بھری ہوئی تھی ——— وہ جب گیا تھا تو روئے زمین پر اس کے لئے دین اور وطن سے زیادہ عزیز کوئی دوسری شے نہ تھی۔ مگر واپسی پر انھیں دونوں چیزوں سے حقیر تر چیز اس کی نظروں میں اور کوئی نہ تھی۔

پہلے میرا یہ خیال تھا کہ یہ نا نا نوش شکلیں اور یہ بوالعجبی کے ہوئے جس میں بیچارے یورپ سے اپنے وطن کی طرف لوٹنے والے نوجوان دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کچھ رنگ ہیں جو وہاں ان کے جسموں پر زبردستی تھوپ دیئے جاتے ہیں۔ جب ان پر مشرق کا آفتاب طلوع ہوگا تو یہ خود بخود اتر جائیں گے۔ یعنی مغربی تمدن کا اثر ان کے اوپر بس ایسا ہی ہے جیسے آئینہ میں صورت کا نقش۔ کہ جب آدمی سامنے سے ہٹا تو اس کا عکس بھی وہاں سے رخصت ہوا۔ اس لئے میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ میں اس دوست سے جدا ہو جاؤں۔ ساری عمر کا نہیں تو بچپن کا دوست ضرور تھا۔ بلکہ اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود اس سے نباہ کرتا رہا۔ تاکہ گذشتہ عہد رفاقت کا یادگار رشتۂ وفا ٹوٹنے نہ پائے اور آئندہ کی توقعات جو ایک اچھے دوست سے ہو سکتی تھیں ان پر بھی پانی نہ پڑے۔ چنانچہ اس وضعداری میں اس کی ایسی ایسی حماقتیں ایسی ایسی خرافات اور ایسی ایسی بدسلوکیاں، بداطواریاں برداشت

کرنا پڑیں۔ جن کے برداشت کی مجھ جیسے انسان میں کبھی طاقت نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ ایک رات بلائے بے درماں بن کر نازل ہوگئے۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کی صورت سے بھی بیزار ہوگئے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک دن حسبِ معمول جب میں ان سے ملنے کے لئے گیا تو انھیں بہت ہی محزون در بودہ پایا۔ جب سلام کیا تو ان جیسے عزیز دوست نے صرف اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ اس پر میں نے پوچھا کہ خیریت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ بات سے یں اس عورت کی طرف سے الجھن اور شدید روحانی اذیت محسوس کر رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کوفت سے کیوں کر نجات حاصل کروں۔ اور اگر یہی حالت رہی تو میرا انجام کیا ہوگا۔ اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ کون سی عورت۔ بھئی کچھ تو معلوم ہو، اس نے کہا، وہی جسے لوگ میری بیوی کہتے ہیں در میں اسے اپنے مقاصد اور اپنی تمناؤں کی راہ میں ایک خطرناک چٹان اور ایک کانٹا تصور کرتا ہوں۔

مگر آپ تو سیکڑوں آرزوئیں اور مقاصد رکھتے ہیں۔ کس مقصد آرزو کے بارے میں آپ گفتگو فرما رہے ہیں۔ (میں نے پوچھا) نہوں نے کہا کہ:۔ میری زندگی میں اس کے سوا کوئی تمنا نہیں کہ میں آنکھیں بند کروں پھر کھولوں تو ایک برقع بھی اس ملک کی عورت کے چہرے پر نظر نہ آئے۔ میں نے کہا:۔ کہ یہ تو آپ کے اختیارات کی بات نہیں ہے۔ اور نہ اس میں آپ کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔

مگر یقین مانیے کہ دنیا کے باکار لوگ پردہ کے بارے میں میری ہی طرح رائے رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کی بھی وہی خواہش اور دلی آرزو ہی جو میری ہے۔ دراصل اسی پردے کو اپنی عورتوں کے چہرے سے اتار کر انھیں مردوں کی محفل میں ٹھلانے اور مردوں کے ساتھ اسی طرح نشست برخاست اور خلاملا کرنے میں جس طرح کہ عورتیں باہم اٹھتی بیٹھتی اور آپس میں باتیں اور چہلیں کرتی ہیں۔ مشرقی انسان کی وہی طبعی کمزوری، اندیشے اور احساس کمتری حائل اور مانع ہے۔ جو اس کے لئے ہر نئے کام کی طرف قدام کرنے میں ہمیشہ سنگ راہ بنتی چلی آئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ میں اس کمزوری کی پرانی عمارت کا سب سے پہلا ڈھلنے والا بن جاؤں۔ جو قوم کی فلاح اور اس کی ترقی کی راہ میں ایک سد سکندری بن کر مدتہائے دراز سے حائل ہے۔ اور میرے ہاتھوں کام انجام پا جاتے جو آج تک میرے سوا کسی مدعی حریت اور ان کے شاگردوں سے نہ بن پڑا۔ چنانچہ اس مسئلہ کو میں نے جب اپنی بیوی کے سامنے رکھدیا۔ تو وہ توبہ تلا کرنے لگیں۔ اور انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے میں ان کے سامنے کوئی بڑی زبردست مصیبت کی خوفناک آفت کا پہاڑ پیش کر رہا ہوں۔

وہ کہنے لگیں کہ اگر میں مردوں کے حلقے اور محفل میں نکل آئی تو پھر عورتوں میں قیامت تک کے لئے منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں گی۔ کیونکہ ان کا سامنا کرتے ہوتے مجھے شرم وحیا دامنگیر ہوگی۔ حالانکہ اس میں شرم وحیا کی کونسی بات ہے۔ اصل چیز تو وہ ست وجمود اور بزدلی ہے جو اللہ نے اس ملک کی عورتوں کے سر چپک دی ہے کہ وہ اپنے گھروں کی چہار دیواری، اور اپنی اوڑھنیوں اور دوپٹوں کی لحد جیسی تاریکیوں میں بڑی منہ چھپاتے۔ دنیا جہاں سے روٹھے ہوئے علم و تمدن کی تابانیوں سے محفوظ رہتے۔ اور آنکھیں بند کئے ہوئے زندگی گذار دیں۔ اور اس چہل پہل والی پر رونق حرم سرا سے اٹھکر، آخرت کے قبرستان میں جا دفن ہوں۔ اس لئے میرے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ میں اپنے نصب العین پر عمل کرتے ہوئے اس جامد اور علاج دماغ کا علاج کر کے رہوں۔ اس کے نتیجہ میں خواہ وہ سر ٹوٹ جائے یا پھر شفایاب ہو کر رہے۔

میرے دوست نے کہا۔

اس کی ان باتوں کا اثر مجھ پر بڑا ہی اندوہناک قسم کا ہوا۔ اور مجھے اس سے ایک قلبی اذیت سی پہونچی۔ اس لئے میں نے اس کے حال پر ایک ترس کھانے والے دوست کی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ میرے دوست کیا تمہیں اپنی ان باتوں پر پورا یقین بھی ہے؟ اس نے کہا، ہاں، میں وہی حقیقت پیش کر رہا ہوں جس پر مجھے توکل اعتماد اور یقین ہے۔ اور میری روح پوری طرح اس سے مطمئن ہے۔ خواہ تمہارا یا دوسروں کا نفس اس سے مطمئن ہو یا نہ ہو۔

میں نے کہا کہ۔ کیا آپ مجھے یہ دریافت کرنے کی اجازت دیں گے کہ آپ ایک عرصہ دراز تک ایک ایسی قوم کے ملک اور ایسے دیار میں رہے ہیں جن کے مردوں اور عورتوں کے درمیان حجاب و شرم کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے تو کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا واقعہ بھی محفوظ ہے۔ جس میں کسی دن کچھ عورتوں سے خلا ملا کے دوران آپ کے دل میں یہ ہوس پیدا ہوئی ہو کہ ان کے شوہروں یا عزیزوں کی غفلت و لاعلمی میں ان کے شیشہ عصمت کو آپ چور چور کریں۔ اور ان کی عفت کو داغ لگائیں۔

انہوں نے کہا، کہ یقیناً ایسا بھی ہوا ہے لیکن اس سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

میں نے کہا، مطلب یہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہاری گھر والی کی عزت پر بھی وہی ڈاکہ نہ پڑے جو تم دوسروں کی عزت و حرمت پر ڈال چکے ہو۔

اس نے کہا۔ شریف عورت مردوں کے درمیان پوری آزادی کے ساتھ رہ کر عفت و عصمت کے ایک حصن حصین اور ایک مستحکم قلعہ کی طرح بن کر رہ سکتی ہے جس کی طرف کسی کی نگاہ بھی نہ اٹھ سکتی ہو۔

یہ سن کر مجھے کچھ ایسی تکلیف ہوئی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ .... اور کہا یہی وہ دھوکہ ہے جو تم جیسے کمزور طبیعت انسانوں کو شیطان بنا دیا کرتا ہے۔ اور یہی وہ سوراخ ہے جس کے راستے تمہارے سروں کے اندر وہ داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہاں سے سرک کر تمہاری عقل اور سمجھ پر چھا جاتا ہے۔ اور اسے عضو معطل کر کے رکھ دیتا ہے

میرے دوست! شرف ایک لفظ ہے جس کا وجود زبان کی لغات اور انسائیکلو پیڈیا کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا، اس لئے اگر ہم اسے لوگوں کے دل و دماغ میں تلاش کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً ناکامی سے دوچار ہوں گے...... نفس انسانی ایک ٹھہرے ہوئے پانی کے تالاب یا کی مانند ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ صاف اور ستھرا رہتا ہے لیکن جب اس میں کوئی پتھر پڑ جاتا ہے تو گدلا اور خراب ہو جاتا ہے اسی طرح عفت بھی نفس کا ایک رنگ ہے۔ اس کا کوئی جوہر نہیں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رنگ آفتاب کی پڑنے والے شعاعوں سے بھی کمتر ہی پائدار ثابت ہوتا ہے۔

اس نے کہا۔ کیا آپ لوگوں کے اندر عفت کے وجود سے انکار کرتے ہیں

میں نے کہا، میں منکر نہیں ہوں اسلئے کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ عفت نیک، بھولے، سادے، کمزور اور سنجیدہ لوگوں میں عام طور پائی ہی جاتی ہے لیکن حجاب کے درمیان سے اٹھ جانے اور ایک کے دوسرے کے روبرو ہو جانے کی حالت میں کسی با اختیار عیار و چالاک مرد اور کسی تیز و طرار اور دل کو باتوں باتوں میں موہ لینے والی عورت کے اندر اس عفت کے وجود کا قائل نہیں ہوں۔

(سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا) آپ اس ملک کی کس فضا اور کس محفل و سوسائٹی میں یہ چاہیں گے کہ آپ کی عورتیں مردوں کے ساتھ آئیں؟ کیا معلموں (استادوں) کی محفل میں؟ جن میں کسی سے پوچھا گیا کہ وہ شادی کیوں نہیں کرتا ہے تو چھوٹتے ہی اس نے جواب دیا کہ میں شادی کس لئے کروں۔ جب کہ ملک کی ساری عورتیں میری بیویاں ہیں۔ یا طلباء کی محفل میں؟ جن میں کتنے

یسے ہیں جن کے بیگ اور بٹنے محبوبہ یا دل پسند عورتوں کی تصویروں یا بتانِ عشوہ گر کے نامہ ہائے عشق اور پیام محبت سے خالی
تو وہ اپنے ہم سنوں اور دوستوں کی صورت نہیں دکھلتے ہیں۔ اور ان سے چھپتے اور کنی کاٹتے پھرتے ہیں
یا چھوٹے لوگوں کی محفل جن میں بیشتر کسی گھر میں ذلیل خادم کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں اور وہاں سے معزز داماد بنکر
لتے ہیں

اس کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ یہ عورت کے بارے میں اتنی دلچسپی اور اس قدر چٹخارے لیکر باتیں بنانے والے اور
کے بارے میں یا اس کے پردے اور بے پردگی یا اس کی آزادی یا اسیری اور قید و بند کے بارے میں ایسا جوش و خروش
انے کی کیا ضرورت ہے، گویا آپ اپنا وہ تمام فرض جو آپ پر قوم کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ پورا کر چکے ہیں اور اب حسرت
تی رہ گیا ہے کہ آپ ان نعمتوں اور بخششوں اور اس فیضیان کو دوسروں تک بھی عام فرما دیں

برادرم! اگر عورتوں کو مہذب بنانے کی خواہش ہے تو پہلے اپنے مردوں کو مہذب بناؤ لیکن اگر تم مردوں کو مہذب بنانے سے
ز ہو تو یاد رکھو کہ عورتوں کو قیامت تک تہذیب یافتہ نہیں بنا سکتے۔

تمہارے سامنے فخر و مباہات کے بہت سے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں جس دروازے کے اندر چاہو داخل ہو
س دروازے کو بند ہی چھوڑ دو تو بہتر ہو، ورنہ اگر تم نے اس دروازے کو بھی چوپٹ کھول دیا۔ تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔
ایسے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا

پھر بھی مجھے کوئی ایسا آدمی بھی دکھا دو جو اپنے بارے میں اس کا یقین رکھتا ہو یا یہ وہم بھی کر سکتا ہو کہ اپنی کسی پسندیدہ
ات کے سامنے اپنی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے۔ اس وقت یہ بھی مان لوں گا کہ کوئی عورت اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے
پسند اور محبوب مرد کے سامنے اپنے جذبات کو روک لے۔

آپ لوگ عورت کو اس چیز سے گرانبار بنانا چاہتے ہیں جس کے تحمل و برداشت کی خود آپ میں طاقت نہیں ہے۔ اور
سے ایسی توقعات رکھتے ہیں جن سے خود محروم اور تہی مایہ ہوتے ہیں۔ آپ اسے زندگی کے ایسے خطرناک معرکہ میں ڈال کر اس
کھیلتے اور اس پر ظلم کرتے ہیں جس کے متعلق آپ کو اس معرکہ میں اتنی کمزور اور سادی جان کو ڈالکر فائدے میں رہنگے
سے ہیں نفع ہوگا یا نقصان۔ مگر میرا یقین ہے کہ آپ اس سودے بازی کے اندر خسارے ہی میں رہیں گے۔ عورت نے تم سے
ظلم کی شکایت نہیں کی اور نہ یہ کہا کہ آپ اس کی بیڑیوں کو کھول دیجئے۔ اور اسے اس قید سے نجات دلانے، پھر کیوں آپ
اس کے ذاتی معاملات میں بلا وجہ مداخلت کرتے پھر رہے ہیں، اور عورت کے قصہ اور گفتگو کی دن رات جگالی کرنے سے
ت نہیں پاتے۔ عورت صرف تمہاری لغویات اور نالائقی کی شکوہ سنج ہے کہ تم نے اس کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ اور اس
آنے جانے، سیر و سفر ہر بات میں ہر جگہ دخیل بنے پھرتے ہو، حتیٰ کہ اس کا عرصۂ حیات اس کے اوپر تنگ کر رکھا ہے
لئے کوئی چارہ نہ پا کر اس نے اپنے کو گھر میں اس سے زیادہ مقید کر لیا۔ جتنا کہ گھر والوں نے اسے قید کرنا چاہا تھا۔
وہ گھر کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہی در کے پردے لٹکا دیئے۔ (گرادے) تم سے چڑھ کر اور تمہاری لغویات سے
رار اختیار کرنے کے لئے۔!

اس لئے سخت حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ اسے قید خود کرتے ہو۔ اور پھر اس کے قید خانے کے دروازے پر کھڑے
لتے روتے ہو۔ اور اس کی بدبختی کا مرثیہ پڑھتے ہو۔

تم اس کا مرثیہ نہیں پڑھتے نہ اس کا نوحہ کرتے ہو۔ بلکہ خود اپنی جہالت کا ماتم کرتے ہو —— تم اس پر نہیں روتے بلکہ ان ایام پر روتے ہوتے ہو جن کو تم نے ایسے دیار میں گذارا جس کے زمین و آسمان بے حجابی اور سو قسم کی ترغیبات کا سیلاب رواں ہے۔ اور جہاں بے حیائی۔ بے شرمی اور آبرو ریزی کا بازار گرم رہتا ہے۔ اور تم اسی زندگی کو ناک کٹا کر یہاں بھی پیدا کرنا چاہتے ہو۔ جس کو تم وہاں چھوڑ آتے ہو۔

ہم اپنی خانگی زندگی میں عفت اور پردہ کی مشک میں مضبوط تسموں اور گھنڈیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ تم نے ہر پردہ ناس میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عفت اس میں سے قطرہ قطرہ کرکے بہنے لگی۔ حتیٰ کہ وہ مشک پچک گئی۔ اور خشک ہو کر ایک گندی ادھڑی کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ پھر تمہیں اس پر بھی صبر نہ آیا۔ اور یہ ارادہ کر بیٹھے کہ اس مشک کے موکھ پر یا سرے پر بندھے ہوئے چند بندھنوں کو بھی کھول ڈالو۔ تاکہ اس میں ایک قطرہ بھی عصمت و عفاف کا باقی نہ رہ جائے ہماری عورتیں ایک مدت تک اپنے گھروں میں مطمئن و پرسکون زندگیاں گذارتی رہیں جو اپنے حال اور اپنے مستقبل دونوں سے مطمئن تھیں۔ وہ ہر قسم کی خوش بختی اس فرض میں محسوس کرتی تھیں۔ جو وہ اپنی ذات کے لئے انجام دیتیں تھیں۔ یا اس قیام و قعود میں محسوس کرتی تھیں، جو اپنے رب کی بندگی اور عبادت گزاری کے لئے کرتی تھیں، یا اس محبت میں محسوس کرتی تھیں جو وہ اپنے بال بچوں سے کرتی تھیں یا اس صحبت میں محسوس کرتی تھیں جو وہ اپنی پڑوسن کے ساتھ بیٹھ کر اپنے دل کا درد اسے سنائے اور اُس کے دل کا درد اس سے کہلوانے کے لئے گرم کرتی تھیں۔

وہ اعلیٰ ترین شرف اپنے باپ کی اطاعت، اپنے شوہر کی فرمانبرداری اس کے احکام کی بجاآوری، اور ان کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرنے میں محسوس کرتی تھیں —— وہ محبت کے معنی تو جانتی تھی۔ مگر عشق کا مطلب بالکل نہیں سمجھتی تھی اس لئے وہ اپنے شوہر سے شوہر ہونے کی حیثیت سے ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی اپنے بچے سے 'اپنا فرزند اور اپنے لخت جگر ہونے کی وجہ سے —— اسی طرح اگر کسی عورت کا یہ خیال ہو تا کہ محبت شادی کی اساس ہے تو اس کا نظریہ اس کے مقابلہ میں یہ ہوتا ہے کہ ..شادی محبت کی اساس ہے " مگر تم نے اس سے کہا کہ یہ لوگ جو تمہاری خانہ آبادی کے سلسلہ میں اپنی رائے سے کام لیتے ہیں وہ تم سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں اور نہ تم سے بہتر رائے رکھتے ہیں اور نہ تمہارے ذاتی مفاد کے بارے میں تم سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے تمہارے بارے میں انھیں کچھ کہنے یا تمہاری ولایت و سرپرستی کا ادعا کرنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا ہے۔ یہ سن کر اس نے باپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اپنے شوہر سے سرکشی کرنے لگی، اور وہ گھر جو کل تک شادمانی و مسرت سے لبریز گوشۂ عافیت اور بقعۂ نور تھا ایک ایسا آتشکدہ بن گیا جس کی آگ بجھنے کو نہیں آتی اور نہ اس کی چنگاری سرد ہوتی ہے، تم نے اس سے کہا کہ تمہارے لئے اپنے شوہر کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ تاکہ تمہارے گھر والے تمہارے مستقبل کی خوشگواریوں میں تمہیں دھوکہ نہ دے سکیں تو اس نے اسے بدتر شوہر کا انتخاب کیا جس کو گھر والے دیکھ کر ترس کھاتے تھے اس سے اس کی کامرانی مسرت و خوشگواری کی عمر ایک دن اور ایک رات سے زیادہ نہ ہوئی جس کے بعد پھر ایک طویل بدبختی اور المناک وحسرت ناک زندگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تم نے اس سے کہا محبت شادی کی اساس ہے۔ تو وہ اپنی نظروں سے مردوں کے چہرے کا جائزہ لینے لگی ان کی طرف نگاہیں اٹھانے اور انھیں گھورنے لگی۔ حتیٰ کہ محبت نے اسے شادی سے ہٹا دیا۔ اور وہ اس شادی سے اس محبت کے لئے سبکدوش ہو بیٹھی۔

پھر تم نے اس سے کہا کہ عورت کی شاد کام زندگی کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ اس کا شوہر اس کا عاشق ہو ــــــ اس سے پہلے وہ جانتی تھی کہ شوہر اس سے کچھ سوا ہوتا ہے۔ اور معشوق سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ یہ سن کر وہ ہر روز نیا شوہر تلاش کرنے لگی جس سے وہ اپنی محبت کی اسی آگ کو اور ہوس و نفس کے اس شعلہ و تپش کو بھڑکا سکے۔ جس کو پرانے شوہر نے خاکستر بنا دیا ہے۔ تو نہ قدیم روش ہی پہ وہ قائم رہی اور نہ ہی نئی ڈگر اس کو راس آئی۔

تم نے اس سے کہا کہ تمہارے لئے تعلیم بہت ضروری ہے تاکہ تم اپنے بچے کی اچھی تربیت کر سکو اور اپنے گھر کا کام کاج کو اچھے طریقہ سے انجام دے سکو

تم نے اس سے کہا کہ ہم اسی عورت سے شادی کرتے ہیں جسے ہم پسند کرتے ہیں۔ اور جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے۔ جس کا مذاق ہمارے مذاق طبیعت کے مناسب اور جس کے احساسات و شعور ہمارے احساسات کے موافق ہوتے ہیں ــــ تو وہ یہ معلوم کرنے میں غرق ہو گئی۔ کہ تمہاری محبت کا ایوان و دلستاں اور تمہاری جنت نگاہ کیا ہے؟ تاکہ تمہاری پسند کے مطابق وہ بناؤ سنگار کر سکے اور شیفتگی و نظر نوازی کا مرکز بن سکے۔ اس کے لئے جب اس نے تمہاری کتاب حیات کا ایک ایک صفحہ کھنگالا تو اس کی ہر نظر میں آبرو باختہ طوائفوں اور عزت کے احساس سے خالی بے غیرت مسخری عورتوں کے اور کچھ نہ پایا۔ لیکن انھیں پر تمہاری گردیدگی کے قصے اور ان کی عقل و ذہانت پر تمہاری ثناء و صفت کی داستانوں کو سنا تو وہ خود بھی ایسی ہی آبرو باختہ بن گئی اور ہر قسم کی شرم و حیا کو خیرباد کہہ کر وہ بھی کھل کھیلی، صرف اس لئے کہ وہ کسی طرح تمہاری خوشنودی و پسندیدگی کو حاصل کر سکے۔ تمہارا دل لے سکے۔ تمہاری محبت کی بازی کو جیت سکے ــــ اس کے بعد تمہاری طرف وہ باریک و شفاف لباس میں بڑھی تاکہ وہ اپنے وجود اپنے نازک جسم کو تمہارے روبرو اسی طرح پیش کر سکے ــــ ــــ جس طرح زنڈیاں اپنے آپ کو بردہ فروشی کے بازار اور نخاس میں پیش کرتی ہیں ــــ لیکن تم نے اس سے گریز کی روش اختیار کی اور اس سے نفرت کے ساتھ دور ہٹ گئے۔ تم نے کہا کہ ہم فاحشہ عورتوں کی شادیاں نہیں کرتے۔ گویا آپ کے گھر کی عورتیں اگر لغزشوں سے بچ جائیں (یا بچی رہیں) تو قوم کی ساری عورتوں کے بدکار و بے حیا ہو جانے کی آپ کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ فوراً وہ الٹے قدم، ناکام، شکستہ دل اور حیرت زدہ غمگین لوٹ گئی ــــ اور اب اپنے سامنے خطاکاریوں کے غمگین گڑھے کے اور کچھ باقی نہ پایا تو اس میں کود پڑی۔ اس طرح تمام قوم کے اندر بدطینتی و بدکرداری پیدا ہو گئی۔ ان کی عورتوں، مردوں، سب کو بدگمانیوں نے کھا لیا اور دونوں فریق ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ بے شمار گھر دیر کلیسا جیسے بن گئے۔ جن میں راہب گوشہ گیر (مردوں) اور شادی شدہ ننوں جیسی عورتوں کے سوا کوئی زندگی کا صحیح معنی و مصداق نظر نہیں آتا ــــــــــــ یہ تھا عورتوں کے حال پر تمہاری غمخواری اور رشک ریزی کا حاصل۔ اے مدعیان ہمدردی نسواں ہم بھی تمہاری طرح یہ جانتے ہیں۔ کہ عورت کو علم کی ضرورت ہے مگر تربیت و تہذیب کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہونا چاہیے۔ کیونکہ تربیت و تہذیب ہر فرد کے لئے علم سے زیادہ نافع ہے۔ ساتھ ہی عورت کے لئے ایک شریف النفس شوہر کے انتخاب کی ضرورت ہے مگر ایسے شوہر کا صحیح و معقول انتخاب ماں باپ ہی کر سکتے ہیں (لڑکی خود نہیں کر سکتی) اب شوہروں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی سوتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ اور اچھا نباہ کریں۔ پھر عورت کو روشنی اور ہوا کی ضرورت ہے۔ جس میں نکل کر وہ زندگی کی نعمتوں سے متمتع ہو اور عورت کے لئے اس کے سرپرستوں کو اس کی اجازت دینی چاہیے۔ البتہ صبح شام کی سیر میں اس عورت کے ساتھ اس کا کوئی ولی قریب ضرور ہونا چاہیے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بکری کے ساتھ اس کا چرواہا کرتا ہے کہ کہیں اس کی غریب بکری کو بھیڑیا نہ اٹھا لے جائے۔ لہٰذا اگر ہم

والدین، بھائی اور شوہروں پر ذمہ داریاں نہیں ڈالتے ہیں تو ہمیں تمام قوم سے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد اپنے ہاتھ دھو لینے چاہیئے۔ کیوں کہ اپنی اصلاح نفس کے لئے مرد سے زیادہ خود کو عورت کبھی بھی قادر نہیں ہے

پھر تمہاری باتوں میں سب سے زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز بات مجھے یہ نظر آتی ہے کہ تم نے ایک چیز کے سوا اور سب کچھ سیکھ لیا ہے حالانکہ اسی چیز کا سیکھنا تمہارے تمہارے لئے سب سے زیادہ ضروری تھا —— اور وہ یہ کہ —— ہر زمین میں الگ الگ پودے اگتے ہیں۔ ہر پودے کا ایک زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ نشو و نما حاصل کرتا رہتا ہے —— تم نے علمائے یورپ کو دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم کے اندر جو اپنی بیشتر ضروریات زندگی میں مطمئن اور فارغ البال ہے۔ علوم عالیہ اور کمالات فنون کی ترویج میں ہمہ تن منہمک ہیں، تو تم بھی انھیں علوم میں یورپ والوں کی اندھی تقلید کرتے ہوئے ایک ایسی قوم کے اندر الجھ گئے۔ جس کا سواد اعظم الف ب سے بھی ناآشنا ہے۔ تم نے یورپ کے فلاسفہ کو دیکھا کہ وہ ایسے بے دین طبقات میں فلسفۂ کفر و الحاد کی تلقین کر رہے ہیں۔ جس کے پاس علم و ادب کا اتنا سرمایہ موجود ہے جو اسے ایمان سے بھی بڑی حد تک بے نیاز کر سکتا ہے۔ تو تم اسی فلسفہ کفر و الحاد کو ایک ایسی شادی ناتواں بے علم قوم میں پھیلانے کے لئے بیٹھ گئے۔ جسے اپنے کمزور ایمان کا بھی کوئی ادنیٰ سا بدل نصیب نہیں ہے۔ اگر یہاں کسی بدل کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

تم نے یورپین مرد کو آزاد و بے قید پایا کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے زندگی گزارتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے نفس اور اپنے اقدامات پر قابو رکھنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ اور پھر وہ بھی اس حال میں جب کہ اس کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے اپنے لئے آزادی کی جو حدیں مقرر کی تھیں اُن تک وہ پہونچ بھی چکا ہے۔ چنانچہ وہ اب ان سے آگے نہیں بڑھتا، نہ اس سے سر مو تجاوز کرتا ہے —— تو آپ بھی اٹھ بیٹھے کہ بعینہٖ وہی حریت و آزادی اس ضعیف الارادہ اور عزم ہمت کے کمزور انسان میں بھی پیدا کر کے رہیں گے جو اپنی اخلاقی زندگی کے بدترین دن اور بری گھڑیاں ایسی چکنی پھسلنی اور ڈھلواں چوٹی پر کاٹ رہا ہے اور اگر اس کا قدم وہاں سے ایکبار بھی پھسل جائے۔ تو لڑھکتے ہوئے غار کی ہولناک اور عمیق منزل ہی کو اپنا آخری ٹھکانا بنا سکے اور پھر وہیں کا ہو کر رہ جائے۔

تم نے اس یورپین شوہر کو دیکھا جس کی غیرت کے دیئے کو اس کے ماحول نے بجھا دیا تھا۔ اور اس کے نفس کی نالش و غیرت کو زائل کر دیا تھا۔ کہ وہ اپنی عزیز رفیقہ حیات اور پیشانی عیش و نشاط کو دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ان کی آغوش محبت میں بیٹھ کر، اس کا پہلو گرم کر کے، غیروں سے یارانہ کر کے، اور رشتہ جوڑ کر تنہائیوں اور خلوتوں میں جس طرح آزادانہ، ان کے لئے سامان عیش و نشاط فراہم کرتی ہے۔ اس شرمناک اور گرجانے والے منظر کے سامنے بھی وہ جامد، بلید اور بت بنا کھڑا رہتا ہے۔ تو تم نے سوچا کہ مشرق کے غیور شعلہ وش انسان بھی یہی شعار اختیار کر سکتے ہیں۔ اس جیسے بے غیرت و بے حس بن سکتے ہیں۔ اور اپنے اوپر اتنا ہی قابو پا سکتے ہیں۔

یا تم نے ایک بیباک جوان اور جوانی کے سے انداز دکھلانے والی یورپین عورت کو بہت سے موقعوں پر مردوں کے ساتھ دیکھا کہ وہ اپنے نفس اور اپنی عزت دونوں کا تحفظ کرلے گئی —— تو ایشیا و افریقہ کی نادان و ناتجربہ کار عورت سے بھی تم نے یہی توقع قائم کی وہ مردوں کے سامنے اسی طرح نکل کر تفریح کر سکتی۔ اور اپنے کو اسی طرح بچا کر رکھ سکتی ہے۔ جس طرح وہ یورپین عورت اپنی عصمت کو بچا سکتی تھی۔ حالانکہ ہر وہ پودا جو غلط زمین میں لگایا جائے گا۔ اور بے وقت و بے محل و بے موسم بویا جائے گا۔ یا تو اسے زمین قبول کرنے سے انکار کر دیگی۔ یا اگر وہ جم گیا تو وہ زمین کو ناکارہ کر کے رہے گا۔ اس لئے۔ ہم آپ کے شرف اور عزت دینی کا واسطہ دلا کر لجاجت سے یہ کہتے ہیں کہ قوم کی ان بچی کھچی مومن عورتوں کو امن و مطمئن ان کے گھروں میں رہنے دیجئے اور انھیں ان کے خوابوں اور آرزوؤں کے بستروں سے مت جھنجھوڑیئے۔ جن عورتوں کو اس بے غیرتی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنا تھا۔

وہ تو۔ چڑھ چکیں۔ اس لئے جنھیں تمہارے فریب کا شکار ہونا تھا وہ ہو چکیں —— اس لئے کہ توم کے ہر زخم کی دوا ہے مگر عزت و شرف اگر مجروح ہو جائے تو اس کا کوئی مداوا ہے، نہ ہو اس کا کوئی بدل ہے۔

اور اگر تم یہی کرنا چاہتے ہو اور اسی پر مصر ہو تو ذرا سا انتظام کر دو۔ یہاں تک کہ زمانہ تمہارے دلوں سے غیرت کی وہ رمق بھی نکال لے جسے تم اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں لے کر آئے تھے۔ تاکہ تم اپنی اس نئی زندگی کی عشرت گاہ میں بے جھجک اور بے خوف و خطر داد عیش دے سکو اور زندگی کے دن لطف کے ساتھ گذارتے ہوئے یہ کہہ سکو، کہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

میری اس عرضداشت کو سن کر میرے نوجوان دوست نے ایک تمسخر آمیز ٹھٹھا لگایا ——— اور کہا

یہی حماقتیں ہیں جن کی اصلاح کے لئے ہم آئے ہیں اس لئے ہمیں ان پر صبر کرنا چاہیئے تاآنکہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے اس پر میں نے کہا کہ بہر حال اپنے بارے میں اور اپنے اہل وعیال کے بارے میں آپ کو اختیار ہے۔ جو چاہے کیجئے۔ مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں آج کے بعد آپ کے گھر میں نہ آسکوں گا۔ اور نہ آپ کی اور اپنی دونوں کی آزادی میں مخل ہونے کی سعی لاحاصل کا مرتکب ہوگا

کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ساعت جس میں میرے ساتھ تمہارے گھر کا کوئی پردہ بھی کھلیگا، مجھے شرم و ندامت سے زمین، میں گاڑ دیگا۔

یہ کہہ کر میں واپس چلا آیا۔ اور یہ میرے اور اس قدیم دوست کے درمیان شاید فراق کی پہلی گھڑی تھی۔

پھر چند ہی دنوں کے بعد جب میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ فلاں شخص نے اپنے گھر میں بے پردگی عام کر دی ہے اور وہ گھر ایسا چکلہ اور قحبہ خانہ بن چکا ہے۔ جس کے دروازوں پر ہر وقت جوتے چٹخنے رہتے ہیں (یعنی آنے جانے والوں کے جوتوں کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے) تو میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ٹپک پڑے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ آنسو ایک لٹی ہوئی عزت، برباد شدہ آبرو پر غیرت وملال کے اشک تھے۔ یا ایک غم نصیب دوست کے اپنے نادان رفیق پر حسرت واندوہ کے آنسو

اس واقعہ پر تین سال گزر گئے جس میں نہ میں ان سے نہ وہ مجھ سے ملا اور اگر راہ چلتے کبھی ملاقات کی نوبت آہی گئی۔ تو میں ویسے ہی سلام کر لیتا تھا جیسے ایک راہ گیر دوسرے کو سلام کر لیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی راہ لیتا ہے۔ اور پچھلی محبت اور دوستانہ کا ذکر تک زبان پر نہ لایا

کل رات پچھلے پہر جب میں اپنے مکان کی طرف آرہا تھا۔ تو میں نے اس کو اپنے گھر نکلتے ہوئے دیکھا۔ فکروں میں ڈوبے ہوئے غلطاں و پیچاں، حیران و پریشان چلا آرہا ہے۔ میں اور اس کے پہلو بہ پہلو پولیس کا ایک سپاہی بھی چل رہا ہے۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھکر نہ رہا گیا۔ قریب جاکر پوچھا کہ بھائی کیا بات ہے۔؟

کہا، کہ مجھے خود بھی اسی سلسلہ میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس سپاہی نے ابھی ایک گھنٹہ پہلے میرے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ آپ کو پولیس چوکی پر بلایا گیا ہے —— اس وقت ایسی طلبی کا سبب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کیونکہ میں ذاتی طور پر کوئی بدکار یا مشتبہ شخص نہیں ہوں —— کیا میں اس وقت آپ جیسے مخلص دوست سے یہ توقع کر سکتا ہوں کہ

آپ سابقہ باتوں کو نظر انداز کر کے اس مصیبت میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ شاید مجھے تھانہ کے پیش آنے والے معاملات میں کچھ مدد لینے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے جواب دیا۔ میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ اور اپنے دوست کے ساتھ ایسی خموشی کے عالم میں۔ گم صم کہ نہ وہ میری موجودگی کا احساس رکھتا تھا۔ اور نہ میں راستہ طے کرتا رہا۔ مگر کبھی کبھی مجھ کو ایسا ضرور محسوس ہوا۔ کہ اس کے ذہن میں کچھ خیالات ہیں۔ جن کو وہ مجھ سے کہنا چاہتا ہے مگر شرم و حیا اس کے اظہار سے مانع ہے اس لئے بیچ میں کر کے اپنے دوست سے بات کی طرح ڈالدی۔ اور کہا کہ آخر پولیس کی طلبی کا کوئی سبب آپ کی بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اس پر اس نے حیرت و پریشانی کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا کہ بھئی سب سے زیادہ اندیشہ تو مجھے اس کا ہے کہ، کہیں میری بیوی پر رات کو کوئی سانحہ نہ گزر گیا ہو۔ اور مجھے اس کے بارے میں اس وجہ سے شک ہو رہا ہے کہ وہ ابتک گھر واپس نہیں آئی ہے۔ حالانکہ اس کی یہ عادت پہلے کبھی نہ تھی۔ میں نے کہا کہ اُس کے ساتھ بھی آخر کوئی گیا تھا۔ ؟

اس نے کہا نہیں۔

میں نے کہا کیا آپ وہ مکان نہیں جانتے جہاں وہ گئی تھیں۔

اس نے کہا۔ جواب دیا نہیں

میں نے کہا پھر کس بات کا آپ کو خوف ہے

اس نے کہا۔ محض یہ اندیشہ ہے کہ وہ غیور مگر احمق عورت ہے۔ ممکن ہے شاید بعض لوگوں نے اس سے راستہ میں چھیڑ چھاڑ کی ہو، وہ ان پر بگڑ گئی ہو۔ اور اس طرح دونوں کے درمیان کشمکش یا نزاع کی صورت پیدا ہو گئی ہو۔ جو جا کر پولیس چوکی پر ختم ہوئی ہو۔

اب ہم چوکی تک پہونچ چکے تھے۔ سپاہی ہمیں تھانہ دار کے کمرے میں لے گیا اور ہم اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے پہلے تھانہ دار صاحب نے اپنے سامنے کے سپاہی کی طرف اشارہ کیا جسے ہم کچھ نہ سمجھ سکے۔ پھر ہمارے نوجوان دوست کو اپنے پاس بلایا۔ اور کہا۔

میرے واجب الاحترام بزرگ میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ خبر دے رہا ہوں کہ رات بدکاری کے فلاں اڈے پر ایک مرد اور ایک عورت کو خلاف تہذیب فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے گرفتار کیا اور اسے تھانہ میں لاتے ہیں —— عورت نے اظہار میں بتایا کہ وہ آپ کی کوئی رشتہ دار ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کو تکلیف دی۔ تاکہ آپ حقیقت واقعہ بیان فرمادیں۔ اگر وہ سچی ہے تو ہم اسے آپ کے احترام میں، اور آپ کے شرف و عزت کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت دیں گے۔ ورنہ وہ تو ایک بدچلن اور آوارہ و بدقماش عورت ہے۔ جس کو ایسی بدکار عورتوں کی سزا کسی طرح نجات نہیں مل سکتی ہے، وہ دیکھئے آپ کے پیچھے وہ دونوں کھڑے ہیں۔ اُن پر نظر ڈال لیجئے۔

اتنے میں بڑے داروغہ کے سامنے کھڑا ہوا سپاہی جا کر، اور ان دونوں کو حوالات سے نکالکر اُن کے پیچھے لا کھڑا کر چکا تھا۔ ہمارے دوست پیچھے مڑے اور کیا دیکھتے ہیں کہ وہ انھیں کی بیوی ہے۔ اس کا آشنا انھیں کا ایک دوست ہے یہ دیکھ کر اس دوست نے اس قدر شدید الم کے ساتھ آہ کی کہ اس کی دردناک آواز سے تھانہ ہل گیا، اور اس کے چاروں طرف کے دروازوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانکنے لگے۔ اس کے بعد وہ غش کھا کر گیا۔ میں نے تھانیدار صاحب سے کہا۔ کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ ان محترمہ کو ان کے باپ کے گھر بھیج دیں۔ چنانچہ تھانیدار صاحب نے یہی کیا۔

اور عورت کے ساتھ اس کے آشنا کو بھی رہا کر دیا۔ ادھر ہم اپنے عزیز دوست کو کسی نہ کسی طرح ان کے گھر لائے، اور فوراً ہی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ شدید دماغی بخار میں مبتلا ہے۔ ان کی بیماری کی تیمارداری ہونا چاہیئے۔ میرے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے وہ پوری شب انھیں کے پاس مختلف تدابیر کرتے ہوئے گزاری اور جب لو کا تڑکا ہو گیا تو کچھ ضروری ہدایات دیتے ہوئے اور یہ وعدہ کرتے ہوئے کہ ضرورت ہوئی تو اطلاع دینے پر میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ اپنے دولتکدہ پر تشریف لے گئے۔ اور میں مریض کے سرہانے بیٹھ کر اس کی حالت پر ترس کھاتا رہا۔ اور اس کا منتظر رہا کہ دیکھیں تقضائے الٰہی اسے کیا دن دکھاتی ہے۔ اتنے میں اس نے کروٹ لینا چاہی۔ اور اپنی آنکھیں بھی کھولدیں۔ اور مجھے سامنے سامنے پاکر میری طرف کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کہہ نہیں سکتا۔ اس لئے میں اس سے ذرا قریب ہو گیا۔ اور کہا کہ میرے دوست کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔؟

بڑی دھیمی آواز میں اس نے جواب دیا۔ کہ ہاں، میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس اور کوئی نہ آئے

میں نے کہا۔ جس کو آپ بلائیں گے وہی آئے گا۔ اس کے سوا کوئی نہ آنے پائے گا۔ پھر وہ تھوڑی دیر غوطہ میں پڑا رہا۔ میں نے جو دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں

میں نے کہا: میرے عزیز دوست! آخر رونے کا کیا سبب ہے۔

کہا۔ اس وقت میری بیوی کہاں ہے۔

میں نے کہا:۔ اس وقت بیوی کو کیا کیجیے گا۔

اس نے جواب دیا:۔ کوئی غرض اس کے سوا نہیں کہ میں اس سے یہ کہدوں کہ میں نے اسے معاف کیا۔

میں نے کہا وہ اپنے باپ کے گھر ہیں

اس نے کہا:۔ خدا اس پر، ان کے باپ اور پوری قوم پر اپنا رحم فرمائے۔ کیونکہ وہ مجھ سے ملنے سے پہلے شریف و معزز تھے۔ لیکن جس دن سے اُن سے میرے تعلقات قائم ہوئے میری وجہ سے وہ ننگ و فساد کا شکار ہو گئے۔ اور ایسا لباس رسوائی پہننے پر مجبور ہو گئے۔ جسے زمانہ کبھی کہنہ نہ کر سکیگا۔ کوئی ان تک میرا یہ پیغام پہونچا دے کہ میں ایک لب گور مریض ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں کہ ان کے خون سے رنگے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ میں اپنے اللہ سے ملوں۔ ساتھ ہی میں اُن سے دست بستہ ملتجی ہوں کہ میری آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ میری، خطائیں معاف کر دیں اور میری لغزشوں سے درگذر کریں

میں نے شادی کے دن اپنی بیوی کے باپ سے قسم کھا کر کہا تھا۔ کہ میں ان کی لڑکی کی آبرو کی حفاظت اپنی زندگی کی طرح کروں گا۔ اور اس کو بھی ان باتوں سے بچائے رکھوں گا جن سے اپنے وجود کو ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں نے اپنی قسم توڑ دی۔ اس لئے وہ میرے گناہ بخش کر میرے رب کے سامنے مجھے سرخرو ہونے کا موقع دے گی۔ یقیناً اس عورت نے مجھے ذبح کر دیا۔ مگر اس کے ہاتھ میں خنجر دینے والا بھی تو خود میں ہی تھا۔ (کوئی دوسرا تو نہ تھا) یہی خنجر تو تھا جسے میں اپنے سینے میں چھپائے پھرتا تھا۔ اس لئے میرے جرم کو اس سے کیوں پوچھئے۔ اسے کیوں مجرم قرار دیجئے۔ گھر میرا گھر وہ میری بیوی۔ اور وہ دوست تو بھی میرا ہی ہے۔ اور میں نے ہی اپنے گھر کے دروازے کو اپنی بیوی سے ملنے کے لئے اس دوست پر (اور اپنے دوستوں کے لئے) کھولا تھا۔ اس لئے مجرم میرے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔ ——

یہ کہتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے وہ خموش ہو گئے۔ میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک کالا بادل سا اس کی پیشانی پر آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جو بڑھ کر اس کے چہرے پر چھا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک دردناک آہ بھری۔ اور میں سمجھا کہ اس کے دل کے پردے چاک ہو گئے۔ وہ سنبھلا

اور آپ ہی آپ کہنے لگا۔

افسوس کتنی شدید تاریکی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور یہ دنیا مجھے کتنی تنگ نظر آرہی ہے۔ اِسی کمرے میں اسی سونے پر اسی چھت کے نیچے، میں ان دونوں کو بات کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ تو میرا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا تھا، اور میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس نے مجھے ایک ایسا باوفا دوست دیا۔ جو میری میری کا بھی اس کی تنہائیوں میں ویسا ہی مونس و دمساز ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر مجھے ایک ایسی صاحبدل، شریف النفس بیوی دی جو میری غیر موجودگی میں میرے دوست سے انتہائی محبت کرتی اور بڑے اخلاق سے پیش آتی ہے۔ اس لئے لوگوں سے یہ کہدو کہ وہ شخص جو کل تک اپنی ذکاوت و ذہانت پر فخر کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ عاقل دانا اور تجربہ کار انسان ہے۔ آج اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ دنیا کا انتہائی ابلہ بلکہ احمق ترین آدمی ہے اور اتنا غبی آدمی ہے کہ جس کے برابر غبی فرد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کاش! میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا۔ اور میرا باپ لاولد رہا ہوتا، اور مجھ جیسا فرزند ان کے مقدر میں نہ لکھا ہوتا۔

شاید لوگ میرے معاملات میں ایسی چیزوں کو بھی جانتے تھے۔ جن سے خود میں ناواقف تھا۔ اور شاید وہ میرے گزرتے وقت ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے ——— اور کبھی میری طرف نظریں گاڑ کر دیکھتے تھے۔ اور بڑی دیر تک دیکھتے رہتے تھے۔ شاید اس لئے کہ احمقوں کے چہروں سے حماقت ٹپکتی رہتی ہے، اور کندہ ناتراش قسم کے لوگوں کے چہروں سے کند ذہنی اور بے وقوفی ظاہر ہوتی ہے۔ اور شاید میرے وہ دوست جو مجھ سے اپنی محبت اور اخلاص کا اظہار کرتے تھے۔ اور میری ہاں میں ہاں ملاتے تھے وہ میرے لئے نہیں بلکہ اُس (عورت) کے لئے، سب کچھ کرتے تھے۔ اور شاید وہ مجھے دیوث، اور میری بیوی کو بیسوا اور میرے گھر کو قحبہ خانہ قرار دیتے تھے۔ اس کے باوجود کہ میں اپنے آپ کو شریف اور عالی خاندان انسان یقین کرتا تھا ——— اس لئے آج کے بعد میں اس زمین پر ایک گھنٹہ کے لئے بھی باقی رہنا نہیں چاہتا۔ اور اس اندھیرے وحشت ناک گوشہ قبر کا شدت سے آرزومند ہوں۔ جو مجھے اپنی تاریکیوں میں لے کر میری برائیوں کو ہمیشہ کے لئے چھپا لے۔ دفن کرلے۔

یہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں پھر بند کرلیں اور اپنے شدید قلبی صدمہ کی غفلت میں کھو گیا۔

اتنے میں کمرے کے اندر اس کے بچے کی کھلانے والی بچے کو اپنی گود میں لئے ہوئی آئی۔ اور اسے بستر کے ایک جانب لٹا کر خود چلی گئی، اِدھر بچہ ہاتھ پیر مارتے کھسکتے گھٹتے اپنے باپ کے سینہ پر پہونچ گیا۔ باپ نے اس کو محسوس کیا، اور آنکھیں کھولدیں۔ بچے کو دیکھکر پہلے وہ مسکرایا، اسے سینہ سے لپٹا لیا، اور اس کا مونھ چومنے کے لئے سر اٹھایا تھا کہ کچھ خیال کرکے لیٹ گیا۔ مونھ پھیر لیا، اور اپنی بشاشت و مسرت کو چھپاتے ہوئے اسے سینے سے الگ کر دیا۔ اور چیخنے لگا کہ اسے میرے پاس سے ہٹاؤ۔ میں اسے نہیں جانتا۔ میرے کوئی بچہ اور کوئی بیوی نہیں ہے۔ اس کی ماں سے پوچھو کہ اس کا باپ کون ہے۔ اور پھر اسی باپ کے پاس اسے لے جاؤ۔ میں اپنی زندگی میں ننگ نہیں برداشت کر رہا۔ اور نہ اپنے پیچھے اپنے دامن پر اسے ایک نہ مٹنے والا داغ چھوڑ جاؤں گا۔ میں اسے اپنا وارث نہیں قرار دوں گا۔ اِدھر انّا (دودھ پلائی) نے بچے کے چیخنے اور رونے کی آواز جو سنی تو دوڑتی ہوئی آئی۔ اور اسے اٹھا کر چلی گئی ——— دایہ کی گود میں بلکتے اور روتے ہوئے اپنے سے دور ہوتے جانے کو محسوس کر کے باپ سے نہ رہا گیا اور اشکبار ہوتے ہوئے بھرآئی ہوئی آواز سے کہا ——— اسے میرے پاس واپس لاؤ۔ انا بچے کو واپس لائی۔ باپ نے انّا کے ہاتھ سے اسے لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے بچے! تیرے باپ نے تیرے لئے یتیمی اور تیری ماں نے تیرے لئے ذلت و عار چھوڑی ہے۔ اس طرح ان دونوں نے تیرے ساتھ جو ظلم اور تیرا جو جرم کیا ہے اسے معاف کر دینا۔ اس لئے کہ تیری ماں ایک کمزور و ناتواں عورت تھی۔ جو قضاو قدر کے صدمات کی تاب نہ لا سکی اور لغزش کھائی ——— اور تیرا باپ اپنے جرم میں نیک نیتی پر تھا۔ مگر جس نقطہ سے وہ بھلائی کرنا چاہتا تھا وہیں سے وہ برائی کر بیٹھا۔

اب خواہ تو میرا جائز بیٹا ہو ——— اے بچے! یا اپنی ماں کی ناجائز اولاد۔ لیکن میں تیری وجہ سے اپنے بہت سے دن خوشی و مسرت میں کاٹ چکا ہوں۔ اس لئے زندگی یا موت کسی حالت میں بھی تیرا احسان نہ بھولوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے بچے کو گود میں لے لیا، اور اس کی پیشانی چوم لی۔ نہیں معلوم یہ ایک شفیق باپ کا بوسہ تھا یا ایک کریم النفس محسن و مربی کا!

اس اثناء میں ہمارے دوست کو کافی تکان پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے اسے دوبارہ بخار ہو گیا۔ اور درجۂ حرارت کے بڑھ جانے کی وجہ سے دماغ پر دوبارہ بہت برا اثر پڑا۔

اس کی طبیعت کی خرابی کی اس رفتار سے مجھے اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے میں نے طبیب کو بھیجا۔ اس نے آتے ہی مریض کے چہرے پر گہری نظر ڈالی اور پھر رنج و اندیشہ سے بھری ہوئی نگاہ ہٹالی۔

اس کے بعد ہمارے دیرینہ رفیق پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگا۔ جس کو سنکر اور دیکھکر آس پاس کا کوئی ایسا سنگدل سے سنگدل انسان نہ تھا جو تڑپ نہ گیا ہو۔

پھر موت نے جب اپنے سیاہ بھیانک پردے اس کی خوابگاہ پر ڈالنا شروع کئے تو بھی میں وہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت سیاہ لباس پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور چند لمحات کے اس غریب مظلوم مہمان کی طرف آہستہ سے بڑھ کر اس کے ایک جانب جھک گئی، اور اس کا ہاتھ جو سینہ پر رکھا ہوا تھا، پکڑ کر بوسہ دیا۔ اور پورے درد و سوز کے ساتھ کہنے لگی۔

"آپ دنیا سے اپنے بچے کے بارے میں شک لے کر نہ جائیے اس وقت جب کہ میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے۔ اور آپ اس دنیا سے بیزار ہو کر ہمیں چھوڑ رہے ہیں —— اس بچہ کی ماں آپ کے سامنے اعتراف کرتی ہے کہ وہ اگرچہ ایک جرم سے دوچار ہو گئی تھی مگر اللہ نے اسے بچا لیا۔ اس لئے آپ اپنے بچہ کی ماں کی جو خطا بھی ہو اسے معاف کر دیجئے۔ اور جب اپنے رب سے ملیں تو میرے لے دعا کیجئے۔ کہ وہ بھی مجھے آپ سے جلد ملا دے۔ کیونکہ اس زندگی میں میرے لئے آپ کے بعد کوئی لذت نہیں ہے۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور پھر وہ اپنے شریف شوہر کے سرہانے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مرنے والے کے شعلۂ حیات سرد ہونے سے پہلے ایک بار بھڑکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنی بیوی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ جو اس کی آخری نگاہ تھی۔ پھر دم توڑ دیا۔

"کارواں کیساتھ چلو"

محمد حفظ الرحمٰن وفا دہلوی

★

حضورِ سرورِ کون و مکاں کیساتھ چلو + قدم قدم شہ ہر دو جہاں کیساتھ چلو
بچھڑ گئے تو ملے گی نہ عمر بھر منزل + اِدھر اُدھر نہ تکو کارواں کیساتھ چلو

زمیں کے ساتھ چلو یا زماں کے ساتھ چلو
رہِ طلب ہے کسی رازداں کے ساتھ چلو
فروغِ نشۂ عرفاں اگر ہے مدِ نظر
خلوصِ قلب سے پیرِ مغاں کے ساتھ چلو

نذرِ عقیدت

ماہر القادری

ہجومِ غم میں بھی توفیق مسکرانے کی
حسینؓ ہی کی طرف تھی نظر زمانے کی
یہ منزلت ہے یہ توقیر اس گھرانے کی
بنی ہے خاکِ شفا خاک آستانے کی
خبر سنی جو شہ کربلا کے آنے کی
در و دو پڑھنے لگیں گردشیں زمانے کی
ہر ایک کو علی اکبرؓ کی موت کا غم ہے
کہ جیسے ٹوٹ گئی شاخ آشیانے کی
لٹے ہوؤں کے ہیں سجادؓ قافلہ سالار
یہ عمر تھی کہیں بارِ الم اٹھانے کی
مرے حسینؓ جہاں کے حسینؓ سب کے حسینؓ
"رضائے دوست" ہے سُرخی ترے فسانے کی

پیام

اگر ہے جراتِ ایماں تو اس سے کام لینا ہے
بتوں کی انجمن میں بھی خدا کا نام لینا ہے
طُلوعِ صبح کی خاطر ہمیں تو جاگنا ہوگا
وہ جائے میکدے میں جس کو لطفِ شام لینا ہے
زمانہ کر چکا ہے تجربہ ایک ایک رہبر کا
ہمیں سے شرق و مغرب کو اب پیغام لینا ہے
کہاں تک مصلحت اندیشیوں کا سلسلہ اے دل
کسی دن میرِ سلطاں کا گریباں تھام لینا ہے

محشر رسول نگری

مثنوی "صحیفۂ فطرت" کا ایک ورق

"استمداد لغیر اللہ شرک ہے"

مردِ کاملِ سیّد والا حسنؓ ‏— سرورِ بُستان شہِ خیبر شکن

آپ کو ملتے تھے بیت المال سے ‏— لاکھ درہم سال بھر کے واسطے

ہوگئی تاخیر اک بار اِس قدر ‏— تنگدستی سے ہوئی حالت دگر

آپ تھے ہر مردِ بیکس کے کفیل ‏— تھے عطائے حق کی اک زندہ دلیل

خود تو تھے شانِ قناعت سر بسر ‏— آپ کو پروا نہ تھی اپنی مگر

دوسروں کی فکر دامن گیر تھی ‏— دوسروں کے واسطے تدبیر تھی

ذاتِ والا تھی ضعیفوں کی ظہیر ‏— آپ نے چاہا لکھیں سوئے امیرؓ

اِس طرف بھی کچھ توجہ کیجئے ‏— زنت پر میرا وظیفہ دیجئے

آپ یہ مضمون جب لکھنے لگے ‏— دفعتاً کچھ سوچ کر پھر رک گئے

خواب میں دیکھا رسولِؐ پاک کو ‏— اپنے نانا گوشہ لولاکؐ کو

آپ نے فرمایا میں قربانِ حق ‏— کیا یہی ہے شیوۂ مردانِ حق

غیرِ حق سے استعانت کا خیال ‏— کس لئے آیا تجھے اے خوشخصال

مانگ اُسی سے تو کہ داتا ہے وہی ‏— ہر کسی کو دینے والا ہے وہی

اپنی جیسی ہی بھلا مخلوق سے ‏— آدمی مانگے تو مانگے کس لئے

آپ نے پھر اک دعا تلقین کی ‏— یعنی توحیدِ خدا تلقین کی

لے گئے تشریف شاہِؐ دوسرا ‏— خواب سے جاگے امامِ اصفیاءؓ

مرسلؐ حق کی دعا پڑھنے لگے ‏— نسخۂ لطف و عطا پڑھنے لگے

ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا ابھی ‏— خود حکومت نے رقم سب بھیج دی

بلکہ پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر دیا ‏— معذرت کا خط بھی حضرت کو لکھا

مسلکِ شبرؓ میں ناداں غور کر ‏— چاہتے تھے اپنا حق مانگیں مگر

پھر بھی قدرت نے اُنھیں تنبیہہ کی ‏— کاش تو سمجھے یہ اسرارِ خفی

ہے ترے دل میں اگر پاسِ ادب ‏— ماسوا اللہ سے نہ کر کچھ بھی طلب

غیر پر تکیہ نہ کرنا چاہیئے

ماسوا کا دم نہ بھرنا چاہیئے

علہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

غزلیں

تسکین قریشی

انجم و مہر و ماہ سے پہلے
جلوہ تھا، جلوہ گاہ سے پہلے

سہل سمجھے نہ کوئی شغلِ فغاں
دم الجھتا ہے آہ سے پہلے

کس قدر دل سے بے خبر تھے ہم
اُن کی پہلی نگاہ سے پہلے

دیدہ و دل بھی تھے فرشِ راہ
ہٹ گئے تم ہی راہ سے پہلے

عشق میں ہر جفائے دوست کے بعد
شکر لازم ہے آہ سے پہلے

دل کو آسودگی کبھی نہ ملی
نگہِ بے پناہ سے پہلے

کسی منزل پہ تھم سکے نہ قدم
عشق کی شاہراہ سے پہلے

اک تجلی سی دل میں ہوتی ہے
اعترافِ گناہ سے پہلے

دل کا بھی اک مقام ہے زاہد
مسجد و خانقاہ سے پہلے

کون سمجھا ترا فریب کرم
میرے حالِ تباہ سے پہلے

پرسشِ حالِ دل ہے بعد کی بات
پوچھ اپنی نگاہ سے پہلے

اہلِ دل دیکھ لیتے ہیں تسکیںؔ
منزلوں دور، راہ سے پہلے

شفقت کاظمی

تعلق اب بھی ان سے کم نہیں ہے
مگر پہلا سا وہ عالم نہیں ہے

ہمیں رونا ہے اپنی بے کسی کا
تری بے مہریوں کا غم نہیں ہے

مرے غم کا اُسے احساس کیوں ہو
مرا ناصح مرا ہمدم نہیں ہے

تجھے دیکھے ہوئے اک عمر بیتی
مگر لطفِ تماشا کم نہیں ہے

کب وہ لوٹیں گے پھر خدا جانے
منتظر ہیں اُداس کاشانے

زیرِ لب کہہ گئے جو دیوانے
آہ وہ ناتمام افسانے

اجنبی ہیں دیارِ دوست میں سب
کون ہم بے کسوں کو پہچانے

جس نے پوچھا نہ آج تک مجھ کو
وہ مرے دل کا حال کیا جانے

تجھ کو بھولے تو اور یاد آئے!
اپنے عہدِ وفا کے افسانے

ذکر آیا تری جفا کا جہاں
اُٹھ گئے اس جگہ سے دیوانے

آہ دنیا میں رہ کے بھی شفقتؔ
ہم نہ دنیا کا رنگ پہچانے

گل ہر رنگ

عروج زیدی

وہ ستم کیجئے جو زیست کا حاصل بن جائے — یہ اضافہ بھی سہی آپ کے احسانوں میں
چشم ساقی کی نوازش سے تہی شاری ہے — اس سے مطلب نہیں ڈھلتی ہے جو پیمانوں میں

نیاز بدایونی

اے امیرِ کاروانِ صبح! آہستہ خرام — آج تیرے ساتھ بیمارِ شبِ ہجراں بھی ہے
پھول بھی کھلتے ہیں اور اذنِ نظارہ بھی نہیں — ہم جہاں رہتے ہیں وہ جنت بھی ہے زنداں بھی ہے
رہنماؤ! مجھ سے میرا حافظہ بھی چھین لو — یاد آتا ہے تمہارا مجھ پہ کچھ احساں بھی ہے

شبنم سجانی

آ ہی گیا ہنگام سحر ...... مٹ ہی گئی تاریکیٔ شب
آپ کا ہر فرمان بجا ...... میری گزارش شوقِ ادب
آج ہوا شمشیر بکف ...... ہیں کہ جو کل تھا جام بلب
تلخ بھی ہے پر کیف بھی ہے ...... ظلمتِ غم تنہائی شب

کیسے نبھے گا اے شبنم!
شوقِ عمل، اور ذوقِ ادب

شاد آگرالوی

ہنگامہ تخریب چمن میرے لئے ہے — بے مہریٔ اربابِ وطن میرے لئے ہے
میں دہر کے ارباب کو سجدہ نہیں کرتا — پیشانیٔ دوراں پہ شکن میرے لئے ہے
مری حیات ہے اک کشمکش کے عالم میں — تمہارا جبر سہوں یا ستم زمانے کا
ڈوبنے والے ہجوم یاس سے بددل نہ ہو — دیکھ تو گرداب کی تہ میں کہیں ساحل نہ ہو
کارواں در کارواں منزل بہ منزل چل دیئے — اب ہماری ہم سفر گردِ رہِ منزل نہ ہو
پردۂ ناز و نیاز اے شاد اٹھنا چاہیئے — حسن میں اور عشق میں کوئی حد فاصل نہ ہو

ضیاء الحق ضیا

ایک دن خاک دل کے ذروں کو — لے اڑے گی ہوا زمانے کی
اگر ذکر چھیڑوں میں اس آستاں کا — زمانہ کو سجدوں پہ مجبور کر دوں
تری یاد، تیرا تصور، ترا غم — کسے پاس رکھوں کسے دور کر دوں
گزرے دنوں کو یاد نہ کر اے دل حزیں — جو دن گزر گئے وہ فراہم کہاں سے ہوں
دوستی کی ہے یہاں اس سے توقع کس کو — کاش! وہ دشمن ارباب وفا ہو جاتے
آنکھوں میں اشک، لب پہ فغاں دل میں اضطراب — آیا ہوں ان کی بزم سے کیا کیا لئے ہوئے
محبت میں عبث ہے اہتمام شعلہ سامانی — یہ آتش خود بھڑک کر اپنا دامن پھونک سکتی ہے

روح انتخاب

بیعتِ خلافت کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی وہ اس طرح تھی۔

"(حمد و ثنا کے بعد) لوگو! قرآن شریف کے بعد ایسی کوئی کتاب نہیں اور آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کسی چیز کو شروع کرنے والا نہیں بلکہ پورا کرنے والا ہوں۔ میں مبتدع نہیں بلکہ متبع ہوں۔ میں کسی حال میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ البتہ میرا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ جو شخص ظالم بادشاہ سے بھاگ جاتے وہ ظالم نہیں ہو سکتا یاد رکھو احکام الٰہی کے خلاف کسی کی اطاعت جائز نہیں۔"

جب آپ سلیمان بن عبدالملک کے کفن دفن سے فارغ ہو کر واپس آرہے تھے۔ تو آپ کے غلام نے کہا کہ آپ بہت غمگین نظر آتے ہیں۔ آپ نے اس کو جواب دیا کہ آج اس دنیا میں اگر کوئی شخص غمگین ہونے کے قابل ہے تو وہ میں ہوں۔ مجھ پر یہ بوجھ کیا کم ہے۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ میرا نامہ اعمال لکھا جائے۔ اور مجھ سے جواب طلب ہو۔ ہر حق دار کو اس کا حق پہونچا دوں! آپ جب اپنے گھر میں بیعت خلافت سے فارغ ہو کر داخل ہوتے تو آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ آپ کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا کہ کیوں خیریت تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خیریت کہاں ہے۔ میری گردن میں امتِ محمدیؐ کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ ننگے، بھوکے، بیمار، مظلوم، مسافر، قیدی، بچے، بوڑھے، کم حیثیت، عیال دار وغیرہ سب کا بوجھ میرے سر پر آن پڑا ہے۔ اسی خوف میں رو رہا ہوں کہ کہیں قیامت میں مجھ سے پرسش ہو۔ اور میں جواب نہ دے سکوں!

خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے اپنی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک سے کہا کہ تم اپنے زیورات بیت المال میں داخل کر دو ورنہ میں تم سے جدائی اختیار کر لوں گا۔ کیوں کہ مجھ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ تم اور تمہارے زیورات جن میں ایک وہ قیمتی موتی بھی تھا جو عبدالملک نے اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ سب مسلمانوں کے لئے بیت المال میں بھجوا دیئے!

مالک بن دینار کا قول ہے کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص زاہد ہو سکتا ہے۔ تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہیں کہ دنیا ان کے پاس آئی۔ اور انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔

آپ کی حرم محترم فرماتی ہیں کہ ایام خلافت میں آپ کی یہ حالت رہی کہ باہر سے آ کر سجدے میں سر رکھ دیتے۔ اور روتے روتے اسی حالت میں سو جاتے۔ جب آنکھ کھلتی پھر رونے لگتے۔ ولید بن ابی سائب کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز سے بڑھ کر کسی شخص کے دل میں خدا کا خوف نہیں دیکھا۔

کسی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ اگر آپ اپنے لئے کوئی محافظ مقرر کر لیں۔ اور کھانے پینے میں احتیاط رکھیں تو بہت اچھا ہو۔ آپ نے فرمایا الٰہی! اگر میں قیامت کے سوا اور کسی چیز سے ڈرتا ہوں تو مجھے اس سے امن میں نہ رکھنا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا لوگو! خدا سے ڈرو اور طلب رزق میں مارے مارے نہ پھرو۔ ازہر کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو خطبہ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ کی قمیص میں پیوند لگے ہوئے تھے ——— تاریخ اسلام حصہ دوم ——— (مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

ہماری نظر میں

امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی

از - ڈاکٹر محمد حمید اللہ ، ضخامت ۵۶ صفحات قیمت ۱۲ر بارہ آنہ

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت ، مقابل مولوی مسافر خانہ ، کراچی نمبر ۱

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے " قانون اسلامی کی تدوین کس طرح کی ؟ اس پر تاریخی پس منظر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے - یہ موضوع ایک بحر بے کنار ہے - اس کوزے (کتابچہ) میں وہ کس طرح سما سکتا تھا - پھر بھی فاضل مصنف نے بعض گوشوں پر عالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے -

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ معصوم نہیں تھے - ان کے نامور شاگردوں نے اپنے استاد کی رائے اور فیصلوں سے اختلاف کر کے " تقلید جامد " پر فیصلہ کن ضرب لگائی ہے - اس اعتراف کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ امام ابوحنیفہ " تفقہ فی الدین " میں اپنی آپ نظیر تھے - سوکن جیسے متقنین ابوحنیفہ کی بلندی کے مقابلے میں " بونے " نظر آتے ہیں !

" ایک دن کسی نے فقہ کا درس اور قیاس آرائی دیکھی تو فقرہ کس دیا کہ قیاس سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا - (مراد یہ تھی کہ خدا نے جب حضرت آدم کو سجدے کا حکم دیا تو آتشی مخلوق کو خاکی مخلوق سے افضل قیاس کر کے ابلیس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا) ابوحنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے - اور کہا بھلے مانس تم نے بے محل بات کہی ہے - ابلیس نے خدا کے حکم کو ٹھکرا دیا تھا - اور ہم ایک مسئلہ کو دوسرے پر صرف اس لئے قیاس کرتے ہیں کہ اسے قرآن یا سنت یا اجماع کے اصول کے تابع کریں - اور اسی کی کوشش کرتے ہیں اور (خدا کے حکم) کی پیروی چاہتے ہیں پھر یہ اور وہ دونوں ایک کیسے ہوتے -

ایک دفعہ انھوں نے قیاس کا اصول یوں بیان کیا تھا کہ قیاس ہر چیز میں نہیں چلتا - قیاس صرف ان چیزوں میں چلتا ہے - جن کا رائے سے ادراک ہو سکتا ہو - قیاس کسی طرح ارکان دین کے ثابت کرنے اور اسباب و علل میں نہیں چلتا - بلکہ صرف احکام کے ثبوت کے لئے چلتا ہے -

ان اقتباسات سے اس کتابچہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے -

تجارت اور کاروائی کاروبار کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام نے بھی عرب میں یمن اور عمان کا کافی طویل سفر کیا تھا صفحہ ۵ ـــــ " کاروائی کاروبار " کتنی بچکانہ ترکیب ہے ـــــــ " آپ جہاں دیدہ تھے " (صفحہ ۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں دیدہ یا تجربہ کار کہنا قطعاً مناسب نہیں نبوت " جہاں دیدگی " اور " تجربہ کاری " سے بہت بلند ہوتی ہے ـــــ " اس میں تخصیص بھی نظر آتا ہے ـــ (صفحہ ۳۰) تخصیص بالاتفاق مونث ہے -

" ڈاکٹر حمید اللہ کا علم و تبحر اپنی جگہ مسلم ہے - کاش ! ان کو انداز بیان کی شگفتگی بھی مل جاتی -

دعوة النظر فی رویۃ النظر

از مولانا عبدالمجید ارشد، ضخامت ۷۲ صفحات - بڑا سائز
قیمت (۶؍) چھ آنے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ الصدیق بیرون بوہڑ دروازہ - ملتان شہر

رویت ہلال کی فقہی تصریحات پر یہ رسالہ ہر اعتبار سے خوب ہے۔ مطلع کا صاف اور ابر آلودہ ہونا دور دراز مقامات میں ثبوت ہلال کی خبر، ہلال رمضان و عید کے ثبوت میں فرق، ہوائی جہاز یا دوربین سے چاند کا نظر آنا۔ عدالت، فسق ظاہر اور مستور الحال کی کیا تعریف ہے؟ تار ٹیلیفون اور ریڈیو وغیرہ کا حکم، استفاضہ کی تعریف، علماء میں اگر اختلاف ہو، منجمین کے لگاتے ہوئے حکم کی حیثیت، اختلاف مطالع —————— ان مسائل کا اس کتاب میں بیان ہے

فاضل مصنف نے عام فہم انداز میں ان مسائل کو پیش کیا ہے۔ اور بڑے کام کی کتاب لکھی ہے۔ عوام ہی نہیں علماء بھی اس کتاب کو پڑھیں گے تو ان کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا!

مسائل رویت ہلال کی بعض جزئیات سے ممکن ہو کسی کو اختلاف ہو۔ مگر مجموعی طور پر کتاب بہت مفید ہے۔ اور مصنف نے بڑی تحقیق کے بعد مسائل مدون کئے ہیں۔ فجزاہ اللہ خیر الجزا

رگ جاں

از - عاصی کرنالی، ضخامت ۱۶۰ صفحات - کاغذ چکنا سفید، کتابت خوشنما - طباعت دیدہ زیب، سرورق حسین و نظر افروز (مجلّد) قیمت دو روپے بارہ آنے -

ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر انسانیت، موچی دروازہ، لاہور

جناب عاصی کرنالی ادبی دنیا میں اتنے متعارف نہیں ہیں۔ جتنا متعارف انھیں ہونا چاہیئے تھا۔ پھر بھی تعمیر پسند جرائد اور پاکیزہ رسالوں کے ذریعہ ان کا جس قدر تعارف بھی ہوا ہے وہ خاصہ وزن رکھتا ہے۔ اور عاصی کرنالی کے کلام کے پڑھنے والے احترام و محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔

عاصی کرنالی کا یہ پہلا مجموعہ کلام منظر عام پر آیا ہے۔ جس پر تعارف مولانا عبدالمجید سالک نے تحریر فرمایا ہے اور "پیش لفظ" ماہر القادری نے لکھا ہے۔ کتاب تین ابواب پر تقسیم کی گئی ہے —— ۱۔ شانۂ صبا (منظومات) —————— محراب حرم (غزلیات بہ طرز اقبال) —————— زہر و تریاق (غزلیات)

عاصی کرنالی ایک مفکر شاعر ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ صرف "غم دوراں" کے ترجمان ہیں، ان کے کلام میں "غم جاناں" بھی ملتا ہے۔ ایک طرف وہ ملت کے نقیب ہیں اور دوسری طرف پاکیزہ محبت کے بھی حدی خواں ہیں۔
"غم دوراں" عاصی کو پسپا نہیں کر سکا۔ کس جرات کے ساتھ وہ اعلان کرتے ہیں۔

یوں غم دوراں کو ہنستے کھیلتے دیجیے شکست
مسکرا دیجے، اگر دل مائل فریاد ہو

"حسن و عشق" کے جذبات کی عکاسی کا یہ رنگ کتنا دلکش اور اثر انگیز ہے۔

جو تجھ سے سہارا نہ ملا، بھول گیا ہوں
جو مجھ سے ہوئی لغزش پایا در ہے گی

"نعت رسول" میں یہ ایک شعر ہی "مکمل تشبیب" ہے ——————

آپ کی الفت میں جو دامن گریباں ہو گئے ✧ میرا ایماں ہے کہ وہ جزو بہاراں ہو گئے

نعت کے ان شعروں کو پڑھئے اور مجسم "صلوٰۃ و سلام" بن جایئے۔

حاصل ہے مجھے سایۂ دامانِ محمدؐ ✧ اب میں نہیں وابستۂ دامانِ دو عالم
بھیگی ہوئی مژگانِ نبیؐ ابر گہر بار ✧ ہنستا ہوا چہرہ چمنستانِ دو عالم
صرف ایک نظر ہے سر و برگِ چمن زیست ✧ صرف ایک تبسم سر و سامانِ دو عالم

کلام کے کچھ اور نمونے ـــ

رباب و چنگ کی جنت میں اونگھنے والو ✧ اٹھو کہ دہر میں تیغ و سناں کا دور ہے اب
جبینِ وقت کے ابھرے ہوئے نقوش پڑھو ✧ تمام دہر ہے آتش بجاں فغاں بر لب

وہی ہے دوست کے رازِ نیاز کا انداز ✧ رسن تو آج بھی موجود ہے گلو ہی نہیں
خریدتے ہیں فقط قہقہوں کی شیشہ گری ✧ اور آنسوؤں کی نزاکت کو بیچ دیتے ہیں
وہ انساں جن کی منزل ماورائے لالہ و گل ہے ✧ وہی سیرِ گلستاں سے بہل جائیں تو کیا ہوگا
مجھے تم خارزارِ رنگ و مستی میں نہ لے جاؤ ✧ وہاں مجروح ہو جائے گا ذوقِ جستجو میرا
بہت ادیب ملیں گے کہ وقت نے جن کا ✧ ضمیر چھین لیا اور قلم خرید لیا
ہو جس کے سامنے بد وی کو جراتِ گفتار ✧ جہانِ نو کو میسر کہاں وہ مردِ خلیق
ہے کشت فکر میں سود و زیاں کی نشو و نما ✧ مرے زمین کے لالے ابھی نہیں بیداغ

نعمتِ دردسے محروم رہا گوشۂ دل ✧ بن گئے لوگ فرشتے مگر انساں نہ بنے
ایسے کتنے ہی گریباں ہیں جو فصلِ گل میں ✧ چاک ہو کر بھی ترا گوشۂ داماں نہ بنے

اب اس بہار میں کانٹوں کا ذکر کیا کیجے ✧ کہ جن کا حق تھا وہ غنچے بھی مسکرا نہ سکے
سرشار ایسے ہیں اک دلِ بے مدعا سے ہم ✧ جی چاہتا ہے کچھ بھی نہ مانگیں خدا سے ہم
ایسی بھولی شکل، قاتل کون کہہ دے آپ کو ✧ اللہ اللہ! اس طرح دامن بچا جاتے ہیں آپ
تری نظر سے اور امید دل نوازی کی ✧ ہم آپ ٹھیس لگاتے ہیں آبگینوں کو
بوالہوس کہہ رہے ہیں دنیا کو ✧ کہیں اس سلسلہ میں ہم تو نہیں

روح کا کرب شبِ ہجر جو بڑھ جاتا ہے
چھیڑ دیتا ہوں غزل نالۂ شب گیر کی جا

عامی نظم و غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں مگر "نظم گوئی" سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ اور ان کے آرٹ کے جوہر "نظم" ہی میں پوری طرح کھلتے ہیں۔

"پھولوں کا ہار" ان کی کامیاب ترین نظم ہے۔ اس نظم نے مشاعرے بھی لوٹے ہیں۔ اور کاغذ پر آکر بھی اس کی تاثیر کم نہیں ہوتی۔ چند شعر۔

شمیم نے مجھے پھولوں کا ایک ہار دیا ٭ متاعِ گلشن و سرمایہ بہار دیا
مہک رہی تھیں گلوں کی لطافتیں اس میں ٭ دمک رہی تھیں شگوفوں کی عصمتیں اس میں
شگوفے نازک و مربوط پھول وابستہ ٭ تمام ہار تھا فطرت کا شعر برجستہ
میں اپنے گھر سے وہ پھولوں کا ہار لے کے چلا ٭ میں اپنے باغ سے فصلِ بہار لے کے چلا

"لال قلعہ" کی چند جھلکیاں۔

تو دوش پہ ڈالے ہوئے عظمت کا دوشالہ
رفعت میں دیا ہے تجھے گردوں نے قبالہ
اللہ یہ ہیبت! کہ ہے دہلی کا ہمالہ
دیتے ہیں مورخ تری شوکت کا حوالہ
اقلیم لطافت میں ترا سکہ رواں ہے
دنیا کی عمارات کا تو شاہ جہاں ہے

یہ قلعہ رہا حسن و تجلی کا شبستاں!
اس بزم میں رہتا تھا چراغاں ہی چراغاں
اک انجمن حسن کہ آرامِ دل و جاں
اک گل کدۂ ناز کہ گل ریز و گل افشاں
اک عیش و طرب، کیف و سکون نکہت و مستی
تھی گردشِ دوراں سے بہت دور یہ بستی

اخلاق جو چمکا تو اسی عرش بریں سے
تہذیب جو مہکی تو اسی خلدِ حسیں سے
برسوں ہوئی اصلاحِ تمدن کی یہیں سے
پیدا کئی گردوں ہوئے اس ایک زمیں سے
پائی ہے یہاں پرورشِ الفاظ و بیاں نے
برسوں اسی قلعہ سے سند لی ہے زباں نے

"اللہ تیری شان ہے" مترنم و رواں قومی نظم ہے۔

اولادِ صدیق و عمر عثمان و حیدر کے پسر
عالی نسب، والا گہر اب ان کے سینے بے شرر
بے مایہ سوزِ جگر محرومِ آدابِ نظر

خوابیدہ شام سحر ؎ نادانف فرداودے

اللہ تیری شان ہے ؎ اللہ تیری شان ہے

دختر تہذیب حاضر سے شاعر خطاب کرتا ہے۔

تو مری نظروں میں فطرت کا صحیفہ ہی مگر ؎ وہ صحیفہ جس کے اوراق پریشاں لٹ گئے

اک لب گل رنگ کی قیمت چکانے کے لئے ؎ بارہا تیرے تبسم کے گلستاں لٹ گئے

• فتنہ انکار حدیث ، پر شاعر کی دینی غیرت چیخ اٹھتی ہے۔

نا اہل ہیں اور دعوی گفتار و قلم ہے ؎ اللہ ترے دین پہ کیا جور و ستم ہے

سنت کی اگر راہ تجھ میں مشعل نہیں ہوتی ؎ انسان کی توحید مکمل نہیں ہوتی

فرقہ کوئی سنت سے اگر برسرکیں ہے ؎ یہ جنگ خدا سے ہے محمدؐ سے نہیں ہے

دوسرا رخ

اے شاہ دو عالم شہ شاہان دو عالم ؎ اے مرکز ارواح فدایان دو عالم (صفحہ ۲۱)

فدائی کی جمع " فدایان " نہیں " فدائیان " ہے

بس ایک ایک لڑی رنگ و بو کا طوفاں تھی ؎ مری نگاہ تو رنگینیوں میں ڈوب گئی (صفحہ ۲۰)

پورا شعر کمزور اور سپاٹ ہے۔

کچھ گانے کی تکرار نہ باجے کا بکھیڑا ؎ ہر شیخ و برہمن حرم و دیر سے بالا (صفحہ ۳۳)

" کچھ کی جگہ " تھی " ہونا چاہیئے تھا ———— " بالا " بھی وجدان کو کھٹکتا ہے۔

قبض و بسط و کرب و مستی ذکر و فکر و ذوق و شوق ؎ یہ طلسمات دل مرحوم میں الجھے ہوئے (صفحہ ۷۰)

" طلسمات دل مرحوم " ——— یہ کیا ترکیب ہے ؟ " دل مرحوم " کا طلسمات ، کیا ہوتا ہے ۔؟؟

خاشاک ہیں اور پنجہ لڑانے کی ہوس ہے ؎ طوفاں کی روایات مٹانے کی ہوس ہے۔ (صفحہ ۸۲)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ " خس و خاشاک ہیں ، مگر طوفان سے پنجہ لڑانے کی ہوس رکھتے ہیں۔ خس و خاشاک کا طوفان سے ٹکر لینا یا نبرد آزما ہونا کہنا چاہیئے تھا ، طوفان سے پنجہ لڑانے میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بس لفظوں کو جوڑ دیا ہے !

خوب سکھلا ؤ اسے دورۂ حاضر کے علوم ؎ ابن آدم کو پلاتے رہو میٹھا زہراب (صفحہ ۹۴)

کیا " دور " اور " دورہ " مترادف لفظ ہیں : " دورہ " زمانہ اور عصر کو نہیں کہتے !

مرے شعور کو لے دوست ! معتبر نہ سمجھ ؎ میں کر رہا ہوں ستاروں کی دھڑکنیں محسوس (صفحہ ۱۰۳)

کیا ستاروں کی دھڑکنیں محسوس کرنے سے شعور نامعتبر ہو جاتا ہے۔ ؟ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے۔

آدمی کے خانۂ دل میں ہے ظلمت کا فراغ ؎ آدمی کے لب پہ روشن ہیں تبسم کے چراغ

" فراغ " قافیہ کی مجبوری کے سبب نظم کیا گیا ہے۔ یہ لفظ شعر میں فٹ کہاں ہوتا ہے۔

نظر میں ذوقِ نظر نہیں ہے جگر میں سوزِ جگر نہیں ہے　　　(صفحہ ۱۰۸)

ذوقِ نظر میں "نظر" اور "سوزِ جگر میں" "جگر" زائد ہیں۔ اور ان کی تکرار بھلی نہیں لگتی! شاعر کی طرف سے اگر یہ کہا جائے کہ اس تکرار سے مفہوم پر زور دینا اور emphasise کرنا مقصود ہے۔ تو اس تکرار کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔

جیتا ہے مسلماں تو بن جاتا ہے عنوان　　٭　　مرتا ہے مسلمان تو بن جاتی ہے روداد　　(صفحہ ۱۳۱)

جس ہنگامہ پرور مفہوم کی ترجمانی کرنی مقصود ہے وہ لفظوں کے دروبست اور اظہار و بیان کے اعتبار سے اثر انگیز نہیں رہا ۔۔ "روداد بنیاد پڑا کرتی ہے" "عنوان نہیں پڑا کرتا"۔

موت تو اس زندگی کی مستقل تنظیم ہے　　٭　　کیسے ناداں ہیں جو کہتے ہیں پریشاں ہو گئی　　(صفحہ ۱۵۸)

مفہوم تو سمجھ میں آگیا۔ مگر مفہوم موزوں الفاظ میں ادا نہیں ہوا۔ اس قسم کے کمزور اشعار عاصی صاحب کو اپنے مجموعہ میں نہیں رکھنے چاہئے تھے

ترے ہی غم میں مجھے موت آگئی ہوتی　　٭　　یہ زندگی تو بہرحال ختم ہی ہوتی　　(صفحہ ۱۶۰)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے کیف ۔۔۔ !!

دامن کو گل افشاں ہونے دو، ترتیبِ گلستاں ہوتی ہے
وحشت کو جنوں فرمانے دو، تکمیلِ بہاراں ہوتی ہے

مفہوم گنجلک سا ہے۔ "وحشت کو جنوں فرمانے دو" نے اور ابہام پیدا کر دیا۔

بھول چوک سے کون بچا ہوا ہے، خود تنقید نگار کو اپنی لغزشوں کا اعتراف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "رگِ جاں" نے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عاصی کے دوسرے "مجموعہ کلام" کا اہلِ ذوق کو انتظار رہے گا۔!

عالم نو
از: خان بہادر عالم خان عالم　ضخامت ۱۲۸ صفحات　قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)
ملنے کا پتہ:- پاکستان بک کمپنی شاہی بازار بہاولپور

خان بہادر عالم خان عالم کا یہ دوسرا مجموعہ کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ "مرقعِ جذبات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عالم صاحب تقسیمِ ہند سے قبل آٹھ سال تک ریاست پاٹودی کے دیوان (چیف منسٹر) رہے ہیں پاکستان آنے کے بعد بہاولپور میں جیل خانہ کے انسپکٹر جنرل اور کاٹیج انڈسٹریز کے ڈائرکٹر کی اہم خدمات انجام دیں۔ ان کے آنے سے قبل جیل کی آمدنی گیارہ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ ان کے زمانہ میں آمدنی تقریباً چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ خود عالم صاحب کا بیان ہے

"دنیا بھر میں صرف یہی ایک جیل تھا۔ جو نہ صرف اپنے تمام اخراجات کا کفیل تھا۔ بلکہ آمدنی دے رہا تھا۔ اور میرے کام چھوڑنے کے فوراً بعد ہی آمدنی ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئی۔"

جناب عالم صاحب کی نظم و نسق کی اس غیر معمولی قابلیت نے اُن کو شعر گوئی میں بھی اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ اُن کی طویل نظموں میں ربط و تنظیم اور انسجام پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو اگر زمانہ فرصت دیتا اور "شعر و ادب" ہی پر وہ اپنی پوری توجہ صرف کرتے، تو وہ صفی لکھنوی جیسے مشاق مُسن اور پرگو شاعروں کی صف میں جگہ پاتے۔ عالم صاحب کے کلام میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سیاسی اور قومی "عنوانات" پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ اور حسن و عشق کی بھی ترجمانی کی ہے۔

جذبات کی شدت اُن کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔

مجاہد سے خطاب -

سر سے کفن لپیٹ کر تیغ کو بے نیام کر ✽ کوس رحیل بج چکا اسپ کو تیز گام کر
وقت جہاد آگیا، چون دچرا کا کام کیا ✽ سینہ سپر ہو تیر کھا، خلد کا اہتمام کر!
وقت بہت ہے مختصر دور دراز ہے سفر ✽ مرکب تیز گام کو، اور بھی تیز گام کر

انقلاب:-

فٹ پاتھ پر پڑے ہیں پردہ نشیں گھرانے ✽ دن یہ بھی دیکھنے تھے اے گردش زمانہ
اک وہ کہ ہوٹلوں میں مصروف عیش و عشرت ✽ اک وہ کہ پٹریوں پر محتاج آب و دانہ

پھول میں رنگ و بو نہیں سبزۂ تر کو کیا ہوا — کتنے نظر نواز تھے شام و سحر کو کیا ہوا
پھانس اک چبھی کسی کے لگتا ہے تیر دل پر — بخشا مرے خدا نے مجھ کو غم زمانہ
فقیرِ بے نوا کی طرح کاٹی زندگی ساری — فلیفہ بن کے کیا آخر لیا فاروقِ اعظم نے

سائل دہلوی مرحوم کی بہت مشہور غزل ہے۔

ـــہ جنابِ شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اس زمین میں عالم کی غزل کا ایک شعر ہے۔

کرم کیجئے نوازش ہے، ستم کیجئے عنایت ہے ✽ ہمارا تو سر تسلیم خم یوں بھی ہے، اور یوں بھی
اب اور دیکھ دیکھ کے ہوتا ہے غم مجھے ✽ رکھو مرے قفس کو کہیں آشیاں سے دور
نکلے نہیں دل کے ابھی ارمان زیادہ ✽ آجاؤ کہ اب جی ہے پریشان زیادہ

کسی کسی نظم میں مزاح و ظرافت کا چٹخارہ بھی پایا جاتا ہے۔

لیڈروں کی بات میں تاثیر آدھی رہ گئی — اس قدر ہوٹنگ ہوئی تقریر آدھی رہ گئی
کچا چٹھا لکھ رہا تھا افسروں کا میں مگر — بل الاٹ اک ہو گئی تحریر آدھی رہ گئی

"شوہر کی موت" اور "وادیٔ مری" اثر انگیز نظمیں ہیں۔!

عالم صاحب کی جوانی غالباً خاصی رنگ رلیوں میں بسر ہوئی ہے۔ اس لئے بڑھاپے کا زمانہ ان پر بہت شاق گزر رہا ہے۔ انھوں نے کتنی نظموں میں جوانی کا ماتم کیا ہے۔ ایک شاعر اور وہ بھی جذباتی شاعر، پھر وہ خوبصورت بھی ہو۔ اس کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ عالم کی شاعری بتاتی ہے کہ ان ہنگاموں سے ان کو سابقہ پڑا ہے۔ اور اب بھی اس آتش دان کی کجلائی ہوئی چنگاریوں میں خاصی گرمی موجود ہے۔

دوسرا رُخ۔

کیا اسلام کو زندہ فقط تیری شہادت نے — بھڑک اٹھے دلِ بے حس بھی سن سن کر بیاں تیرا (صفحہ ۱۰)

"فقط" نے واقعیت میں مبالغہ پیدا کر دیا ہے۔ دین کا احیاء اور تجدید ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔

"دل کا بھڑک اٹھنا" یہاں معنویت کے اعتبار سے محل نظر ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "تیرا بیان سن سن کر بےحس و حرکت دل بھی متحرک ہو جائے۔ اور وہ بھی زندگی اور حرکت محسوس کرنے لگے"۔ یہ خیال لفظوں میں ٹھیک طرح ادا نہیں ہوا۔

کشمیر ہمارا ہے، اور رہے گا رہیں گے ہم ✽ قسمت کے نوشتہ کو ہم آگ لگا دیں گے (صفحہ ۱۷)

کشمیر کے لینے اور "قسمت کے نوشتہ کو آگ لگا دینے" میں آخر ربط کیا ہے؟؟ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ ہم کب تک مقدر پر بھروسا کئے رہیں۔ اور یہ سوچتے رہیں کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا ——— تقدیر پر ایسا اعتماد کاہلی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ آؤ کشمیر لینے کی تدبیر کریں اور جوش عمل سے کام لیں ——— یہ خیال شعر میں ادا نہیں ہو سکا۔

پی پی کے محفلوں میں اب رقص کرتے ہیں ✽ پڑھتے تھے جو نمازیں کل تک بھی پنجگانہ (صفحہ ۳۳)

"بھی" زاید ہے! اور تنہا اس ایک زاید لفظ کے آ جانے سے شعر کسی نومشق کا کہا ہوا سا لگتا ہے۔

آج کل کا دن معین ہے جو ٹالے ٹل نہیں سکتا ✽ یہ وہ افعی ہے جس پر کوئی جادو چل نہیں سکتا (صفحہ ۳۸)

غالباً سہو کتابت کے سبب مصرعہ اولیٰ خارج از بحر ہو گیا ہے! افعی پر جادو نہیں "منتر" چلا کرتا ہے۔

مدد کرتی ہیں پاک روحیں یقیناً ✽ دعا ان کی ہوتی ہے مقبول فوراً (صفحہ ۳۱)

اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے "روحیں" مدد نہیں کرتیں۔ یہ عقیدہ اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا

سوزِ غم پنہاں سے نہیں چین گھڑی بھر ✽ اٹھتا ہے دھواں سا مرے ہر کنج جگر سے (صفحہ ۱۷)

"گوشۂ دل" بولتے اور لکھتے ہیں مگر "کنج جگر" پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ——— یہ ترکیب نامانوس ہے۔؟

کہیں کہیں مصرعے بحر سے خارج نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب سہو کتابت ہی ہو سکتا ہے۔

ماہنامہ "آستانہ زکریا" مدیر اعلیٰ۔ مخدوم زادہ محمد سجاد حسین قریشی رئیس التحریر۔ حسان الحیدری۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ فی پرچہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر آستانہ زکریا سرکلر روڈ۔ ملتان شہر

ماہنامہ "آستانہ زکریا" بڑے اہتمام سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے۔ سرورق رنگین ہے، کاغذ چکنا سفید اور کتابت دیدہ زیب! رسالہ کا نام اپنی لفظی اور معنوی ترکیب کے اعتبار سے چونکا دینے والا ہے لیکن سرورق پر حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی رح کے مزار کی جو تصویر بنی ہے اسے دیکھ کر یہ حیرت دور ہو جاتی ہے!

اس مجلّہ کے اب تک چار شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ جو رنگا رنگ مضامین سے مزیّن ہیں۔ ان میں حکایات صالحین بھی ہیں، توحید خالص پر بھی ایک مقالہ ہے، ملتان کی تاریخ پر بھی ایک مبسوط مضمون ہے۔ خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شمس تبریزی اور امیر خسرو سے لے کر محسن کاکوروی اور مولانا حسن رضا بریلوی تک پر مضامین ہیں! ربیع الاول کا شمارہ "سیرت نمبر" ہے۔ جو پاکیزہ مضامین کا گلدستہ ہے۔ ماہنامہ "آستانہ زکریا" میں نظمیں غزلیں اور افسانے بھی شائع ہوتے ہیں جس کے سبب رسالہ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

ستمبر کے شمارہ میں "مثنوی معنوی" جس مقالہ کا عنوان ہے۔ اس کے صفحہ ۱۰ پر فاضل مضمون نگار نے تصوف کی جن بڑی کتابوں کی فہرست دی ہے۔ ان میں "عوارف المعارف" کا نام چھوٹ گیا ہے۔

فغان حسان، ایک فارسی منقبت ہے۔ جس کا ایک شعر ہے۔

ایکہ امت ہست وردِ قدسیاں ✽ وے درِ تو قبلہ گاہِ انس و جاں

اس شعر میں بہت مبالغہ کیا گیا ہے۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتہلیل کرتے ہیں نہ کہ اولیاء اور صلحاء کے نام ان کے وردِ زباں رہتے ہیں۔ دوسرا مصرعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کی مدح کے لئے سزاوار نہیں۔

اس نظم کے دوسرے شعروں میں اپنے ممدوح سے جو شاعر نے استغاثہ کیا ہے۔ اور ان کو حاجت روائی کے لئے پکارا ہے۔ (حاجتِ حسان کن جملہ روا) اس سے اسلامی توحید مجروح ہوتی ہے۔ پورا قرآن اور احادیث رسولؐ اس پر گواہ ہیں کہ مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہیئے۔ اور وفات پائے ہوئے لوگ کسی کی مدد نہیں کیا کرتے۔

"ماہنامہ" آستانہ زکریا" کی عام روش خاصی محتاط ہے۔ جناب میر حسان الحیدری نے

برکفِ جام شریعت بر کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

کو بڑی حد تک سچ کر کے دکھایا ہے۔ کاش! یہ روش قائم رہے۔ بلکہ اس احتیاط میں اور شدت پیدا ہو جائے!

بعض مضامین سطحی بھی ہیں۔ توقع ہے کہ رفتہ رفتہ رسالہ کا معیار بلند ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ رسالہ اس "خانقاہی تعلیم" سے گریز کرے گا۔ جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی

فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

صحیح ادویہ اور مناسب علاج کی فراہمی کی غرض سے

ہمدرد دواخانہ

کی

بنیاد ہند میں ۱۹۰۶ء میں

اور

پاکستان میں ۱۹۴۸ء میں رکھی گئی

ہمدرد کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ آج اس کی تیار کردہ ادویہ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ مل سکتی ہیں لیکن اس وسعت سے زیادہ اس کی کامیابی کا معیار وہ احتیاط ہے۔ جو ہمدرد کے معملوں اور دوا سازی کے کارخانوں میں دواؤں کی چھان، پھٹک، صفائی، ستھرائی، تحقیق و تفتیش اور قدم قدم پر فنی جانچ پرکھ میں برتی جاتی ہے۔ ان چیزوں سے ہمدرد کا نام اصلی اور خالص ہونے کی ضمانت ہے:

یہ وہ طریق علاج ہے

جس سے ملک کے اسی فیصدی باشندے معالجہ کے لئے رجوع کرتے ہیں!

ہمدرد دواخانہ پاکستان۔ کراچی

طب یونانی کا علمبردار ہے

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ نمبر ۹

فاران

دسمبر ۱۹۵۷ء — ایڈیٹر — ماہرالقادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر مسرور حسین ——— ادبی پریس رابسن روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

نقشِ اوّل

جب کوئی قوم بگڑتی ہے تو اُس کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی بگاڑ سے محفوظ و مامون نہیں رہتا۔ آج ہم مسلمان زوال و تخریب کے انھیں حالات و سانحات سے دوچار ہیں۔ افکار و معتقدات سے لے کر اعمال تک فساد ہی فساد اور ابتری ہی ابتری دکھائی دیتی ہے۔ چھوٹوں بڑوں اور عوام و خواص سب کا ایک ہی رنگ ہے اور سب سے پہلے "نقشِ اول" لکھنے والا اپنی کوتاہیوں اور نفس کی دست درازیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ قوم کی قوم آخرت فراموش اور خدا ناشناس ہوگئی ہے یا بہت ہی محتاط لفظوں میں یوں کہئے کہ ہوتی جارہی ہے۔ دولت، عزت، عیش و مسرت اور شہرت و نمود، ان کے ذریعہ ہر کوئی اپنے نفس کو غذا پہنچانے میں مصروف ہے۔

واعظ منبر پر قال اللہ و قال الرسول کہہ کر سامعین سے داد و ستائش کی تمنا رکھتا ہے، اہلِ قلم مضامین اور کتابیں لکھ کر اپنی تعریف سننے کے لئے گوش بر آواز رہتے ہیں۔ سرمایہ دار کسی رفاہی کام میں چندہ دے کر چاہتے ہیں کہ اُن کے کام کو خوب سراہا جائے اور اُن کی سخاوت و دریا دلی کا زیادہ سے زیادہ چرچا ہو۔ یہاں تک کہ خوش الحان قاری کلام پاک کی تلاوت کرتے ہوئے "مرحبا" "جزاک اللہ" اور "ماشاء اللہ" دوسروں کی زبانوں سے سُننے کی آرزو رکھتے ہیں۔ کسی شخص سے کوئی بھلائی کا کام ہوجاتا ہے تو وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ لوگ اُس کے کام پر خراجِ تحسین ادا کریں۔

سیاسی لیڈروں کو چھوڑئیے کہ اُن کی ساری تگ و دو تو "زندہ باد" کے نعروں کے لئے ہی ہوتی ہے مگر دینی طبقہ کے اکابر خود اپنے نفس کا ایمانداری کے ساتھ جائزہ لیں تو وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں نفس کی

اس چوری کو پکڑ ہی لیں گے ـــ اخلاص و بے نفسی کا جیسا قحط ہمارے اس زمانہ میں پایا جاتا ہے، گزشتہ ادوار میں شاید ہی مسلم قوم پر یہ عالم گزرا ہو کہ وہ اخلاص و وفا اور بے نفسی و للّٰہیت کے دانہ دانہ کے لئے محتاج ہو گئی ہے۔

ملت میں ایسے جری اور بے باک ناقد اور معترض تو بہت پائے جاتے ہیں جو حکومت اور ارکانِ حکومت پر تنقید و احتساب کے معاملہ میں شمشیر برہنہ بن جاتے ہیں مگر عوام کے سامنے اُن کے کردار کی خرابیوں پر ٹوکنے کی ہمت نہیں کرتے۔ یہ جو مسلمانوں کے جلسوں میں ہزاروں کی بھیڑ لگ جاتی ہے ان کی بڑی تعداد وہ ہے جن کے کانوں میں حکومت اور کارکنانِ حکومت کے خلاف نکتہ چینیاں اور گالیاں سن کر رس پڑتا ہے۔ اگر ملت کے رہنما عوام کو ٹوکنا شروع کر دیں تو جلسوں کی یہ چہل پہل بے رونقی سے بدل جائے گی قوم میں ایسے بے لاگ ناقد اور جری محتسب کتنے نکلیں گے جو نہ حکومت سے ڈرتے ہیں اور نہ عوام سے خوف کھاتے ہوں! حکومت کے خلاف لب کشائی سے اگر عوام میں ہر دلعزیزی اور قبولیت حاصل ہونے کا ذرا سا بھی داعیہ نفس کے اندر موجود ہو تو یہ کتنا خوفناک فتنہ ہے۔ اگر کوئی حکومت کا ناقد اور محتسب بن کر عوام کا "جی حضوری" بن جائے تو اس سے اُس کی غلامانہ ذہنیت میں فرق کیا پڑتا ہے۔ حکومت کے عتاب کا ڈر اور عوام کی برہمی اور ناراضگی کا خوف، دونوں برابر ہیں۔ کوئی حکومت کا جی حضوری ہو اور دوسرا عوام کا "جی حضوری" اور "ہاں میں ہاں ملانے والا" تو یہ دونوں غلام ہیں اور ان کی فکر و رائے آزاد نہیں ہیں۔

فکرِ آزاد، نفسِ بے غرض اور زبانِ حق گو وہ رکھتا ہے جس کو تنقید و احتساب میں جذبات کی رعایت مد نظر نہ ہو، اگر کوئی حکومت کے خلاف تقریر کر کے یا مضمون لکھ کر قید خانہ میں جانے کیلئے تیار ہے مگر اظہارِ حق کر کے عوام کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا۔ تو اس کردار، مزاج اور ذہنیت کا آدمی زمانہ ستیز نہیں زمانہ ساز ہے۔ حق پسند، حق شناس اور حق گو کے لئے بادشاہوں کے دربار اور شہر کے گلی کوچے برابر ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے دربار میں حق کا اعلان کر کے جعفر طیارؓ کا پارٹ ادا کرتا ہے اور دوسری طرف عوام میں بلال حبشیؓ بن جاتا ہے کہ محلہ کے لونڈے اور شریر لوگ اُسے گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں مگر اعلانِ حق سے وہ باز نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ کی خشیت کا دل پر غلبہ ہو تو پھر نہ حکومت کے عتاب کا ڈر رہتا ہے اور نہ عوام کی برہمی کا خوف! جس طرح حکومتیں اپنے "جی حضوریوں" کو اعزاز و مناصب عطا کرتی ہیں اسی طرح عوام بھی اپنی مرضی پر چلنے والے لیڈروں کو عزت دیتے ہیں۔ حکومت اور عوام کی دی ہوئی عزت و ذلت سے بلند اور بے نیاز ہو کر جو کوئی حق بات کہے گا اللہ کی رضا اُس کے ساتھ ہو گی۔ جو کوئی حکومت اور عوام دونوں پر بے لاگ تنقید کرے اور ان میں سے کسی سے نہ ڈرے، اس کے بعد بھی اس کو ہر دلعزیزی اور قبولِ عام حاصل ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

اپنے حالات سے نفس کی کمزوریوں اور دل کی بیماریوں سے جتنا خود ہم واقف ہو سکتے ہیں،

اتنا اور کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی اصلاح حال کے لئے خلوص کے ساتھ آمادہ ہو تو اپنے احوال و کیفیات کی بہت کچھ اصلاح کر سکتا ہے۔ نفس کا کوئی مرض لاعلاج نہیں ہے۔ بشرطیکہ اُس کے ازالہ کی فکر کی جائے۔ اور جب ذہن، نفس کی کمزوریوں کی تاویلوں پر اُتر آئے تو پھر دل کی بیماریوں میں نت نئے اضافے ہوتے جاتے ہیں اور دل پر تاریکی اور سیاہی طاری ہوتی جاتی ہے۔ دل کی اسی کیفیت کو قرآن "رین" سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک نہ چھٹنے والی زنگ، نہ دور ہونے والی تاریکی، نہ ٹوٹنے والی مُہر! بس پھر کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی۔

دوسرا رُخ قوم کے بگاڑ کا یہ ایک رُخ تھا جو اوپر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا رُخ بظاہر زیادہ تاریک تر نہ ہوگا مگر نتائج کے اعتبار سے شدید سے شدید خطرات کا حامل ہے۔

مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں کے علماء نے عوام کے شوق و پسندیدگی کی خاطر زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے "تصویر" کے جواز کا فتویٰ دیا، سودی بنک کی اباحت کے لئے اجتہاد فرمایا، عورتوں کی بے حجابی کے خلاف وہاں کے مذہبی طبقہ نے کوئی موثر احتجاج نہیں کیا۔ مکروہ اور ناپسندیدہ حرکات سے چشم پوشی، تساہل اور درگزر کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ برائیاں جڑ پکڑتی اور پھیلتی چلی گئیں۔ تہذیب حاضر کی ہر بُرائی اور معصیت کو مصر نے قبول کیا، اور فسق و فجور کے ان مظاہر کو تہذیب و ترقی اور تنویرِ فکر کا نام دیا گیا۔ مصری حکومت نے اِن تمام لغزشوں کو شہ دی، بلکہ اُن کی سرپرستی کی۔

"اخوان المسلمون" نے پورے خلوص اور جوش کے ساتھ فسق و فجور کو دبانے اور نیکیوں کو پھیلانے کی کوشش کی۔ کوئی شک نہیں کہ مصر کے نوجوانوں میں "اخوان" نے اخلاق و پاکیزگی اور خداشناسی کی ایک برقی رَو دوڑادی۔ اور چند سال "اخوان" کو کام کرنے کا موقع اور مل جاتا تو مصر ہی نہیں پورے مشرقِ وسطیٰ کے وہ زمین و آسمان بدل کر رکھ دیتے۔ مگر فسق و فجور کے آغوش میں تربیت پائے ہوئے فوجی افسروں اور اونچے طبقہ کے لوگوں نے "اخوان" پر وہ وہ دردناک مظالم کئے کہ نیرو، چنگیز، حجاج، اور ابن ہبیرہ کے ظالمانہ کارنامے اُن کے آگے گرد ہوگئے۔ اس صدی کے سب سے بڑے ظالم جمال ناصر نے اسلام کے فداکار۔ "اخوان" کی لاشوں پر اپنا تخت حکومت بچھاکر، مشرقِ وسطیٰ میں اقامتِ دین کی کوششوں کو پامال کردیا۔ اور اب مصر پستی اور گراوٹ کے اُس پاتال تک پہنچ چکا ہے کہ شراب، لحم خنزیر، قمار، بدکاری اور فحاشی وہاں "آرٹ" سمجھے جاتے ہیں۔ اور عیش و عشرت کے تنوع میں تو مصر یورپ سے بھی بازی لے جاچکا ہے۔

مصری عوام لذتوں اور چٹخاروں کے خوگر ہوچکے تھے یا یوں کہئے کہ بنا دیئے گئے تھے۔ اس لئے "اخوان المسلمون" کی پامالی اور بربادی پر وہ کوئی موثر احتجاج نہ کرسکے۔ جس زمانہ میں "اخوان" جور و استبداد کی آتشیں چکی میں پیسے جارہے تھے، جمال ناصر کی حکومت کاک ٹیل پارٹیاں دے کر

اور نیم برہنہ رقص کی محفلیں، جماکر عوام سے کہتی تھی کہ یہ بے ذوق "اخوان" اور خشک مُلّا تم سے یہ لذتیں چھین لینا چاہتے ہیں اور اُن کا تو پروگرام اور مشن ہی یہ ہے کہ مصری عوام کی زندگیاں خشک اور بے کیف بن کر رہ جائیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں یہ مذہبی دیوانے چودہ سو سال پہلے کے شتربانوں کا پسماندہ تمدن واپس لانا چاہتے ہیں۔

ناصر کی حکومت کا یہ فریب مصری عوام پر چل گیا اور نہ کیوں چلتا اس کے لئے پہلے سے زمین ہموار کرلی گئی تھی، مٹھی بھر "افراد" مصر کی فوجی حکومت کا کیا مقابلہ کرتے، ہاں عوام ان مظالم کی روک تھام کر سکتے تھے۔ مگر نفس کی لذتوں کو چھوڑ کر وہ اس ایثار اور مجاہدے کیلئے اپنے کو آمادہ نہ کرسکے اور اقامت دین کی اتنی عظیم الشان تحریک معصیت پروردہ حاکموں کے جبر و استبداد اور عوام کی بے تعلقی، غفلت اور لذتِ نفس کے ہاتھوں تباہ ہوگئی۔

جس ملک میں بھی اقامتِ دین کیلئے جدو جہد کی جائے گی وہاں اوپر کے اس طبقہ کا، جو نظام اسلامی کے قیام میں اپنے اقتدار کی موت دیکھتا ہے یہی رول (role) رہے گا کہ وہ ملک کے عوام کو فسق و فجور اور عیش و لذت کے چٹخاروں کی طرف لے جائے۔ اسلامی اخلاق کو پروان نہ چڑھنے دے، جمہوریت کو ناکام بنانے کیلئے طرح طرح کی چالیں چلے اور سازشیں کرے، اور رفتہ رفتہ ملک کو ابتری کی اس انتہا تک پہنچادے، جہاں "آمریت" کیلئے فضا سازگار بن جائے! مصر میں ناصر کی جابرانہ آمریت کو کھل کھیلنے کا اسی وقت موقع ملا ہے جب اس نے جمہوریت اور اسلامی اخلاق کو مصر سے دیس نکالا دیدیا ہے۔

جائزہ

پاکستان میں معاشرہ پستی کی اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ہم جو باتیں اب کہنے والے ہیں انکی اخلاقی مضرتوں کا احساس تک دلوں میں باقی نہیں رہا۔ اور اس طرف بھولے سے بھی کسی کی نگاہ نہیں جاتی، بلکہ ہمیں تو یہ خوف ہے کہ مغرب زدہ لوگ تو ایک طرف رہے شاید مذہبی طبقہ کے بعض افراد ہمارا مذاق اڑائیں گے اور ہم پر "ملائیت" تنگ نظری اور قدامت پرستی کی پھبتیاں چست فرمائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے ملامت کرنے والوں کی طنز و تشنیع کی کبھی پروا نہیں کی جسے ہم حق سمجھتے ہیں اس کے اظہار سے ہمیں کوئی طاقت باز نہیں رکھ سکتی۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ جو چیز اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ ہے وہ عام انسانیت کے اور خاص طور سے امتِ مسلمہ کیلئے کبھی ذریعہ خیر اور سبب فلاح نہیں بن سکتی! اور نفسیات انسانی کا تجربہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ اخلاق میں بگاڑ کی ابتدا بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی برائیوں کے گوارا کرتے رہنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نفس انسانی پھر ان میں ناگواری محسوس نہیں کرتا اور رفتہ رفتہ دل کے اندر اخلاقی حس اور دینی غیرت باقی نہیں رہتی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "تصویر" کو پسند نہیں فرمایا۔ جب مکہ فتح ہوا ہے تو کعبہ کی دیواروں پر حضرت ابراہیم اور سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام کی جو تصویریں بنی ہوئی تھیں وہ حضور کے حکم سے کھرچ دی گئیں۔ مشاہیر اور بزرگوں کی تصویروں اور مجسموں سے "بزرگ پرستی" (Hero worship) کے جذبہ کے ابھرنے کا امکان ہے چنانچہ آج بھی مسلمانوں میں ایسے متصوف خانوادے پائے جاتے ہیں، جن میں بزرگوں کی تصویروں کو چوما جاتا ہے

اور ان کے حضور اظہارِ عقیدت کیا جاتا ہے اور مندروں کی مورتیوں کی طرح ان کو "بھوگ" دیا جاتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد چوٹی کے لیڈروں کی تصویریں لوگوں نے اپنے مکانوں، دکانوں، دفتروں اور ہوٹلوں میں آویزاں کرنی شروع کیں اور قائداعظم کی "تصویر" کو عام کرنے کیلئے تو خود حکومت نے اپنے ذرائع استعمال کئے اب پاکستان کی عدالتوں، دفتروں، کالجوں، اسکولوں، کارخانوں اور فیکٹریوں، ہوٹلوں اور ڈرائنگ روموں میں ہر جگہ مسٹر جناح مرحوم کی تصویریں نظر آتی ہیں اور ان کی تصویر آویزاں کرنے کو لوگ پاکستان سے اظہار وفاداری اور محبت و عقیدت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں شاہ انگلستان کی تصویریں آویزاں رہتی تھیں، تقسیم ہند کے بعد بادشاہ کی تصویروں کی جگہ قائداعظم مرحوم کی تصویریں آگئیں، اسلام میں جہاں تک تصویر کی ناپسندیدگی کا تعلق ہے۔ اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ کسی کافر کی تصویر ہو تو وہ ناپسند سمجھی جائے اور کسی مسلمان کی تصویر ہو تو اسے پسندیدہ تصور کیا جائے! تصویر کی ناپسندیدگی "نفس تصویر" کے وجود سے وابستہ ہے اس میں کافر و مسلمان کا امتیاز اسلام کا منشا نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تباہی میں شریک فتنۂ رُخ ہی نہیں فتنۂ تصویر بھی ہے

اس "فتنۂ تصویر" کے خلاف پاکستان میں کوئی احتجاج نہیں ہوا اور اس چیز کو جو فسق و فجور تو نہیں ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بہرحال پسند نہیں فرمایا۔ پاکستان کے عوام و خواص نے گوارا کر لیا۔

تاریخ میں کوئی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت تک نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ غیر ملکوں کے وفود باہر سے آنے والے مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مقدس پر پھولوں کی چادریں چڑھایا کرتے ہوں اگر اس احترام و عقیدت کی کوئی قبر مستحق ہو سکتی تھی تو وہ سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر انور تھی مگر پاکستان کی حکومت نے قبروں کی مجاورت کا فرض اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ باہر سے جو کوئی وفد یا سفیر یا بڑا آدمی کراچی میں آتا ہے۔ حکومت کے عمال اسے قائداعظم اور لیاقت علی خاں مرحوم کی قبروں پر لیجاتے ہیں اور پھولوں کی چادریں اور ہار چڑھواتے ہیں، اس کے جواب میں ہمارے وزراء سفراء یا وفود جب دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں، تو انھیں کافروں کی سمادھیوں، قبروں اور یادگاروں پر پھول چڑھانے پڑتے ہیں، ہمارے وزراء بھی صدر مملکت کے روبرو حلف اٹھانے کے بعد پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ ان قبروں پر جا کر حاضری دیتے ہیں اور اس طرح پاکستان سے اپنی وفاداری کی سند حاصل کرتے ہیں۔

قبروں پر گنبد اور مسجدیں بنانے کی ممانعت آئی ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گچ کر کے پختہ قبر بنانے کو منع فرمایا ہے۔ مگر پاکستان کی حکومت کے پیش نظر ان قبروں پر گنبد اور مسجد بنانے کی اسکیم ہے اور سنا ہے کہ ان عمارتوں پر کئی کروڑ روپیہ خرچ کیا جانے والا ہے، یہ خبریں اخباروں میں چھپتی ہیں تو عوام خوش ہوتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا مفید دینی کام ہو رہا ہے اور ہم نے آج تک کسی اخبار میں حکومت کے اس منصوبہ کے خلاف کوئی احتجاج نہیں دیکھا۔

لوگ محسوس نہیں کرتے کہ کس تدریجی ارتقاء کے ساتھ "فتنۂ تصویر" قبر پرستی کے فتنہ تک پہنچا ہے۔ یا یوں کہئے کہ پہنچایا گیا ہے! ہائے وہ اہل توحید جن کے دلوں سے بدعت کی نفرت نکلتی چلی جا رہی ہے۔ اس فتنہ کی زد سے ایمان و یقین کب تک بچے رہیں گے؟

دوسری طرف پاکستان میں فسق وفجور، بے حیائی اور فحاشی کیلئے سہولتیں مواقع اور آسانیاں مہیا کی جاتی رہی ہیں، مینا بازاروں کے ذریعہ عورتوں میں تبرج جاہلیت کو فروغ دیا گیا ہے۔ کلچرل شو اور تفریحی میلے ٹھیلے اس لئے لگائے گئے ہیں کہ عوام کی اخلاقی حس بیکار اور معطل ہو کے رہ جائے! غضب خدا کا مسلمان جوان لڑکیوں کو فوجی وردی پہنا پہنا کر باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ان سے سلامی دلوائی گئی ہے۔ قصر و ایوان میں بادہ ناب کے دور چلتے ہیں! ان منکرات و فواحش کے خلاف کوئی جرأت آزما احتجاج نہیں ہوا، مسلمانوں کی بے حسی اور بے غیرتی کی انتہا ہے کہ بسوں اور ٹراموں کے کرایہ کی تخفیف کیلئے جتنا احتجاج ہوا ہے اس کا سوواں حصہ بھی احتجاج فسق وفجور کے ان مظاہر کے خلاف نہیں ہوا۔

بیگم لیاقت علی خاں کو جب سفیر بنا کر یورپ بھیجا جا رہا تھا تو کسی کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق نہ ہوئی کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ ایک مسلم خاتون کو وجے لکشمی کی سطح پر نہ لاؤ اسلام نے عورت کو بہت بڑا رتبہ دیا ہے۔ مگر اس کو یہ منصب نہیں دیا کہ اسے ایک ایسی ذمہ داری سپرد کر دی جائے جس میں ہر لحظہ نامحرم مردوں سے اس کا میل جول رہے اور اسے تن تنہا یورپ کے معصیت کدے میں بھیج دیا جائے۔

اسکیم یہ ہے کہ اسلام نے خوب و ناخوب کا جو معیار مقرر کیا ہے قوم کی نگاہ میں وہ معیار بے وزن ہو کر رہ جائے اسلام کی دی ہوئی قدریں مسخ ہو جائیں ملت میں سرے سے دینی غیرت ہی باقی نہ رہے۔ یہ سب کچھ جب ہو جائے گا تو "بڑے لوگ" قصر و ایوان میں چین کی بنسی بجائیں گے، پھر نہ تو اسلامی دستور کا مطالبہ ہوگا اور نہ فسق وفجور کا کوئی مظاہرہ پبلک کو کھٹکے گا۔ کوئی دینی جماعت فواحش و منکرات کے خلاف سرگرمی دکھائے گی بھی تو اسے پوری طاقت کے ساتھ کچل دیا جائیگا اور حکومت کے اس جور واستبداد پر عوام چوں بھی نہ کریں گے اور وہ اس لئے کہ طرح طرح کی ناروا لذتوں اور غیر معتدل چٹخاروں کے عوام جب خوگر ہو جائیں گے تو ان کے اندر دینی غیرت اگر باقی رہی بھی تو بس اتنی جیسے اُردو پر سفیدی پس اس مزاج اور ذہنیت کے لوگ کسی دینی تحریک یا جماعت کو پامال ہوتا دیکھ کر مضطرب کیوں ہونے لگے۔

پاکستان میں مسلم عوام کا حافظہ بھی کچھ کمزور ہوتا جا رہا ہے وہ دنیوی لالچ اور نعرہ بازی کے پیچھے دینی تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر شہید سہروردی صاحب ہیں جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ انھوں نے اسلامی دستور سازی کی مخالفت ڈنکے کی چوٹ کی تھی اور اسی شخص کی ہوس اقتدار نے مخلوط انتخاب کا فتنہ کھڑا کیا تھا تاکہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی تائید حاصل ہو سکے، یہی سہروردی صاحب جب پنجاب کے شہروں میں جاتے ہیں تو عوام ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ "ون یونٹ" کی حمایت کر رہے ہیں انکی "اسلام بیزاری" کو بھلا دیا جاتا ہے۔ عوام کی اس روش نے بھی بہت سے ناپسندیدہ کردار کے افراد کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ان کو قیادت کا مقام عطا کیا ہے، عوام اگر مردم شناس ہو جائیں تو ناپسندیدہ لوگ معاشرے میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

اوپر کے طبقہ کا اسلامی اقدار اور دینی رجحانات کے خلاف جو طرز عمل رہا ہے اس نے حالات کو اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ وہ لوگ جو پاکستان کے دشمن ہیں انھیں پر پُرزے نکالنے اور ابھرنے کا موقع مل گیا ہے

پاکستان بننے سے پہلے اسلامی دستور اور اسلامی فکر و اصول کے خلاف کسی بڑے سے بڑے لیڈر کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اب جی۔ ایم سید اور عبدالصمد اچکزئی جیسے صفِ بائیں کے لیڈر اسلام کے بارے میں جو چاہتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں۔

میدانِ عمل میں

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مقصود لوگوں کو بددل اور مایوس کرنا نہیں ہے۔ بددلی، مایوسی اور ہمت ہار کر بیٹھ رہنا یہ مردِ مومن کی شان نہیں ہے۔ حالات کا جائزہ اس غرض سے لیا گیا ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں سے واقف ہو جائیں اور واقعات کی دنیا کا جہاں تک تعلق ہے اندھیرے میں نہ رہیں، زخموں سے دامن اسی غرض سے ہٹایا گیا ہے کہ لوگ اُن کے اندمال اور مداوا کی فکر کریں۔

پاکستان اور قوم کی اصلاح کیلئے آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے یہ کام ہم گنہگاروں ہی کو انجام دینا ہے ہمت عزم، استقلال اور ایمان ویقین کی ضرورت ہے، حالات کا منقلب ہونا امرِ ناممکن نہیں ہے، اب تک ملت میں اللہ کے فضل سے یہ احساس زندہ ہے کہ وہ روٹی کے نعرے کے مقابلہ میں اسلام کے نعرے کو ترجیح دیتے ہیں... اور خدا اور رسول اور کتاب وسنت کے نام پر ہر قربانی دے سکتے ہیں، قوم کے اسی دینی احساس سے کام لینا ہے جن کو قوم کی تباہی کا احساس ہے ــ اور جو تمام دنیا میں اور خاص طور سے پاکستان میں اسلام کی سربلندی چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر حرکت وعمل کے میدان میں آجائیں، دامے، درمے، قدمے، سخنے جو جتنا بھی کرسکتا ہے اتنا کرتا رہے۔

پاکستان میں غیر اسلامی معاشرت، لادینی تہذیب اور فسق وفجور کی جو رَو دوڑ رہی ہے اور جس سیلاب کو جان بوجھ کر یہاں لایا گیا ہے اس کو روکنے کی شدید اور فوری ضرورت ہے۔ پاکستان کے دشمنوں نے تو یہاں "انقلابی کونسل" قائم کرنے کا شوشہ چھوڑ دیا ہے، اور یہ بات یوں ہی بے سمجھے بوجھے نہیں کہی گئی۔ اس کے پیچھے کسی بڑے آدمی (؟؟) کا عزم اور کوئی خوفناک سازش کام کر رہی ہے۔ پاکستان میں صرف اسلامی نظریات ہی اس قسم کے تمام فتنوں کا سدباب کرسکتے ہیں

خان عبدالغفار خاں نے ون یونٹ توڑنے کیلئے سول نافرمانی کی دھمکی دی ہے، کیا اسلام کے شیدائی اور جانباز "سرحدی گاندھی" کے برابر بھی دینی غیرت نہیں رکھتے۔ یہ شخص ایک غلط کار اور باطل مقصد کیلئے اتنا جوش دکھا رہا ہے۔ کیا اسلام پسند طبقہ حق وصداقت کیلئے صرف دعاؤں اور تمناؤں ہی پر قناعت کئے رہے گا؟ باطل کا مقابلہ کرنا مقصود ہے تو خطروں سے بچ بچ کے رہنے کی روش کب تک چل سکے گی، قربانی اور ایثار کے بغیر کوئی عظیم مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اگر آپ کو مال، اولاد، شہرت، راحت و آرام اور جانیں پیاری تھیں تو پھر آپ نے ایمان ویقین کی منزل میں کیوں قدم رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا رسول مان کر یہ اتنی بڑی ذمہ داری قبول کا ہیکو کی تھی، جب یہ ذمہ داری قبول کرلی ہے تو آپ کی شرافت وفاداری اور اخلاق وعزیمت کا یہ فرض اور تقاضا ہے کہ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا کا سماں دکھلا دیں۔ اسی میں آپ کی، پاکستان کی بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی ہے کیونکہ باطل مٹے گا تو اس کے ساتھ ہزاروں فتنے بھی مٹیں گے اور حق آئے گا تو اپنے ساتھ بے شمار برکتیں اور رحمتیں لیکر آئے گا۔

ماہر القادری ۲۶ / نومبر ۵۷ء

مولانا راغب احسن ایم۔ اے

روس میں کیا دیکھا؟

مشاہدات، تاثرات، واقعات، حقائق

تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا کہ پاکستانی علماء کا ایک وفد جمہوریہ چین گیا تھا وہاں سے واپسی کے بعد بدایوں کے ایک مولوی صاحب نے اپنے تاثرات کتابی صورت میں پیش فرمائے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا اور چینی سفارت خانہ نے اس کتاب کی اشاعت میں پوری دلچسپی لی، چینی سفارت خانہ کی اس کتاب سے دلچسپی صرف اس وجہ سے تھی کہ اس سے جمہوریہ چین کے مقاصد اور پروپیگنڈے کو تقویت ہوتی تھی۔

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ چین میں جو انقلاب آیا تھا اس میں زیادہ تر کمیونسٹوں کا ہاتھ تھا اور موجودہ چینی حکومت کمیونزم کے خطوط پر ہی گامزن ہے — روسی حکومت بڑی باخبر اور انتہائی ہوشیار اور مردم شناس حکومت ہے، وہ ہر ملک کے مشہور لوگوں کے حالات و کردار کی خبر بلکہ ان پر نظر رکھتی ہے کہ کس شخصیت سے کیا کام لیا جاسکتا ہے؟ کس پبلک لیڈر کی کیا کمزوری ہے؟ کون ایسا ہے کہ بڑے سے بڑا لالچ بھی اُسے جھکا نہیں سکتا اور کون ایسے بزرگ (؟) ہیں کہ سفر، میزبانی، تفریح اور ہدایا و تحف کا لالچ جن سے وہ کام لے سکتا ہے جو روسی حکومت کو مطلوب ہے — یعنی روس کے اس پروپیگنڈے کی تائید، حمایت اور تقویت کہ روس میں مذہب پر کوئی پابندی نہیں ہے، وہاں دینی مدرسے ہیں، مساجد نمازیوں سے آباد رہتی ہیں! اور وہاں کی رعایا بڑی خوش حال اور آسودہ و مطمئن ہے؟

اسی مقصد کیلئے روسی سفارت خانہ نے انھی مولوی صاحب سے جن کا ذکر شروع میں آچکا ہے گفت و شنید کی کہ وہ علماء پاکستان کا ایک وفد لیکر روس کا دورہ کریں، چند مہینہ تک اس گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا حکومت پاکستان سے بھی ارکانِ وفد کی نامزدگی کے سلسلہ میں ردو کد رہی! اگر روس کا دورہ کرنے والوں کا یہ وفد مولوی صاحب موصوف کی مرضی کے علماء بلکہ یوں کہئے "مولوی صاحبان" سے ترکیب و تشکیل پاتا تو پھر اس وفد کا بیان "زبان میری ہے بات اُن کی" بن کر رہ جاتا، اور روس کے دینی حالات

اور مذہبی آزادی کی ایسی تصویر ہمارے سامنے آتی جو روسی حکومت کی تمناؤں کی آئینہ دار ہوتی مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وفد میں بعض ایسے ارکان بھی شریک کرلئے گئے جنکے دل و دماغ "روسی حکومت" کے تحائف و ہدایا سے گرانبار نہ تھے، اور جنھوں نے وہی کہا جو انھوں نے وہاں دیکھا اور محسوس کیا۔

اس بات کو بھی ذہن میں تازہ کرلیجئے کہ یہ مولوی صاحب جن سے علماء کا وفد لیجانے کیلئے روسی حکومت نے بات چیت کی اور اس "مہم" کیلئے پاکستان کے تمام اکابر علماء کو نظر انداز کرکے انھی کی ذات والا (؟) پر سُرخ حکومت کی نگاہ انتخاب پڑی، اخوان کے قاتل، روس کے حلیف، پاکستان کے دشمن، اور پنڈت نہرو کے دوست جمال ناصر کی حکومت کی دعوت پر مصر کا دورہ بھی فرما چکے ہیں، اور کراچی کے ہوائی اڈہ پر مصر کے انوارالسادات کا انھوں نے خیر مقدم کیا تھا، یہ وہی انوارالسادات ہے جو حجاج ثانی جمال ناصر کا دست و بازو ہے اور "اخوان" کے خون ناحق سے جس کا دامن نہ صرف یہ کہ داغدار بلکہ شرابور ہے ـــــ آہ! اس کردار کے "علماء"؟؟ ـــــ غالب نے تجربہ کرنے کے بعد ہی کہا تھا۔

زینہار ازآں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

یہ مقالہ اس وفد کے ایک ممتاز رکن جناب مولانا راغب احسن (ایم۔اے) کی دس تقریروں سے مقتبس ہے۔ صاحبِ موصوف نے ایک انصاف پسند اور غیر جانبدار سیاح کی نگاہ سے روس کے حالات کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے اُسے جوں کا توں بیان بھی کردیا۔

اس مضمون کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ روس حقیقت میں ایک کانجی ہاؤس، ایک قید خانہ، ایک کال کوٹھری اور مذہب کی قتل گاہ ہے۔ جہاں نہ کسی کو شخصی آزادی میسر ہے اور نہ وہاں اجتماعی حریت کا دور دور پتہ ہے۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ اشتراکی لیڈروں نے جبر و استبداد میں روس کے جابر و ظالم شہنشاہوں کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے، وہاں پالیسی کے معمولی اختلاف پر اپنے رفقاء کار کو گولی مار دی جاتی ہے بیریا کا حشر ہمارے سامنے ہے!

کمیونزم در اصل ایک "عذاب" ہے، اللہ تعالیٰ اس عذاب سے انسانیت کو جلد نجات دلائے! (آمین)

مسال حکومت روس نے ایک پاکستانی مولوی صاحب کے ساتھ طویل پرائیوٹ گفت و شنید کے بعد ان کو یہ دعوت نامہ پیش کیا کہ وہ علمائے پاکستان کے نام سے سات ممبروں کا ایک وفد مرتب کریں جو روس کا دورہ کرے۔ یہ انتہائی غیر معمولی حرکت تھی۔ حکومت پاکستان نے اس پرائیوٹ دعوت کو ناپسند کیا کیونکہ یہ پاکستانی حکومت کے علم و مرضی کے بغیر بالا بالا کی گئی تھی۔ حکومت پاکستان نے روس

نمائندوں کو مسترد کر دیا۔ پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا اور کل ممبران وفد کو خود نامزد کرنے پر اصرار کیا
ری طرف روس کے نامزدہ مولوی صاحب نے پاکستانی حکومت کی نامزدگی کو پسند نہیں کیا۔ مہینوں یہ معاملہ
یں رہا۔ انجام کار جون ۱۹۵۶ء میں ایک سمجھوتہ ہوا اور حکومت پاکستان نے تین ممبروں کو اور روسیوں
پنے نامزدہ مولوی صاحب کے ذریعے چار ڈیلی گیٹوں کو نامزد کیا۔

وفد کراچی سے ۲۷ جون ۱۹۵۶ء کو روانہ ہوا اور کابل میں دو دن قیام کے بعد حضرت امام ترمذی
ہر ترمذ ترکستان میں ۳۰ جون کو طیارے سے اترا اور دورے کے بعد ماسکو سے ۲۲ جولائی کو براہ
کراچی واپس روانہ ہوا۔ یہ دورہ روس کا ۲۲ دن کا تھا جس میں وسط ایشیا کے وسیع و عظیم ممالک
لئے صرف گیارہ دن اور محض ماسکو لینن گراڈ کے دو روسی شہروں کیلئے گیارہ دن رکھے گئے تھے۔
سے زیادہ مضحکہ خیز پروگرام نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ قطعاً آزاد دورہ نہ تھا بلکہ روس حکومت کی سخت نگرانی
مقید دورہ تھا۔ ہم سب سے زیادہ وسط ایشیا کی چھ مسلم جمہوریتوں اور اسلامی تہذیب کے مرکزوں کو
ے کے لئے بیتاب تھے جو تاریخ میں مشہور رہی۔ لیکن ترکستان میں گیارہ دنوں میں ہمیں صرف تاشقند، سمرقند
ستالن آباد دکھایا گیا اور سخت اصرار پر بھی ہمیں بخارا جانے نہیں دیا گیا۔ مسلمان ریاستوں اور علاقوں میں
ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان، آذربائیجان، تاتارستان، بشکریا، مرغینان، اندجان، فرغانہ، خوجند، توقند، خوارزم، داغستان، قازان
ایشیا کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور ۲۲ دنوں میں سے محض گیارہ دن ماسکو اور لینن گراڈ میں برباد کئے گئے۔

ہمارے دورے کا مقصد پانچ چیزوں کا دیکھنا اور معلوم کرنا تھا (۱) کمیونسٹ روس میں مذہب اسلام اور
ان کی حالت (۲) سوویٹ یونین کا معاش و اقتصادی نظام (۳) سوئم سیاسی و قومی حالات (۴) چہارم
علوم کرنا کہ پنچشیلا بقائے باہمی قوموں کی خود ارادیت اور آزادی انسانوں اور قوموں کی مساوات امن اور
ریت کی خود روس کے اندر کیا حقیقت و اصلیت ہے۔ حالانکہ روس آج دنیا میں ان بلند بانگ اصولوں
علمبردار بنا ہوا ہے۔ ہم ان جمہوری رجحان کی اصلیت بھی معلوم کرنا چاہتے تھے جس کا اسٹالن کے بعد
کیا جا رہا ہے۔

ج تحقیق

ہم نے ایک جویائے حق کی حیثیت سے موقع و محل پر حالات کی تحقیق کی اور ہماری دریافت
کے مطابق حقائق یہ ہیں کہ (۱) اولاً سویت یونین کے اندر مذہب کی مطلق آزادی نہیں ہے
نہ وہاں مذہبی آزادی قطعاً ممکن ہے جب تک مارکسی دہریت کمیونسٹ روس کا State Religion
تی مذہب ہے۔ (۲) دوئم تاریخ عالم کی سب سے بڑی ہمہ گیر استبدادی سلطنت کی ساری قہرمانی طاقتوں
ساتھ منظم اور زوردار کوششیں اور کل ممکن تدبیریں مذہب کی بیخ کنی کے لئے کی گئی ہیں۔ لیکن وہ سب ناکام
ی ہیں۔ ایشیائی اور یورپین روس کے لوگوں کے دلوں میں خدا پر یقین اور ایمان زندہ ہے (۳) سوئم یہ کہ
یں نہ مساوات ہے نہ آزادی۔ نئے اونچ اور نیچ طبقات پیدا ہو گئے ہیں روس میں سوشلزم بلکہ نئے
وں اور نئے اشراف و امراء کے ماتحت ریاستی جاگیرداری State Feudalism اور State
Capatals کا دور دورہ ہے۔ فلاح عوام چاہنے والی رفاہی ریاست Welfare State کا کوئی نشان

موجود نہیں ہے. پیدائش خوشحالی اور معیار زندگی آزاد معیشت کے ممالک سے نہایت پست اور بہت پس ماندہ ہے (۵) پنجم عوام الناس میں امن کی سچی پیاس ہے کیونکہ وہ بے جان پرزوں کی مشینی زندگی سے تنگ آچکے ہیں اور خوف اور محتاجی سے آزادی جاننے اور سوچنے اور بولنے کی آزادی، عقیدہ و عبادت کی آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہیں (۶) ششم مختلف الاقوام وفاقیہ روس میں قوموں کو نہ آزادی حاصل ہے اور نہ برابری کیونکہ روسی قوم سامراجی اور استعماری قوم کی کیفیت رکھتی ہے اور مختلف ترکیبوں سے یونین کی سب قوموں پر مسلط ہے وفاقیہ سوفیتائیہ روس کی مختلف قومی جمہوریتوں کو نہ آزادی حاصل ہے اور نہ مساوات۔ وہ محض ماسکو کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ سوویٹ یونین آزاد قوموں کی دولت مشترکہ کامن ویلتھ Commonwealth نہیں بلکہ قوموں کا قید خانہ ہے۔

روس عوام سادہ منکسر المزاج اور گرم دل لوگ ہیں جن کی سیرت پر مشرقیت کا چھاپ نمایاں ہے لیکن روس کی سب قوموں میں تورانی ونسل کی قوم خوبصورت ترین، شریف ترین، بہادر ترین، پاکیزہ ترین، انقلابی قوم ہے جس کا مستقبل روشن اور عظیم الشان ہے۔

مبصر مشرق حکیم الاسلام اقبال کا بیان حقیقت ترجمان ترکستان کے مستقبل کا آئینہ دار ہے فرماتے ہیں:-

ترسم کہ دگر خیزد از خاک سمرقندے
آشوب ہلاکوئے ہنگامۂ چنگیزے

میں نے سوویٹ یونین کا سفر صاف ذہن اور کھلے دماغ کے ساتھ جویائے حق اور پاکستان کی خیرسگالی اور دوستی کا پیغام پہنچانے والے کی حیثیت سے کیا۔ بطور رہنما ہمارے سامنے ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کا تاریخی اعلان اور مسلمانوں کے نام وہ خاص منشور تھا جس کو لینن اور اسٹالن نے اپنے دستخط سے ۱۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو جاری کیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا۔

"روس کے مسلمانو! وادگا اور کریمیا کے تاتارو! ترکستان کے کرغیزو! اور سارٹو! ماورائے قفقاز کے ترکو اور تاتارو اور تمام وہ مسلمانو! جن کی مسجدوں اور عبادت خانوں کو تباہ کیا گیا تھا اور جن کے مذہب اور رسوم کو روس زاروں اور جابروں نے پائمال کیا تھا سنو! کہ آج کے دن سے تمہارے دین اور تمہارے رسوم تمہارے قومی و ثقافتی ادارات کو آزاد مامون اور ناقابل حملہ قرار دیا جاتا ہے۔ اپنی قومی زندگی کی آزادانہ اور بلا روک ٹوک تعمیر کرو یہ تمہارا حق ہے Council of people commisar کاؤنسل پیوپل کامیسار بالشویک حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مختلف قومیتوں کے متعلق اپنے کام کی بنیاد دو اصولوں پر رکھے گی (۱) اولاً روس کی مختلف قوموں کی برابری، اور خود مختاری، حق حاکمیت اور ساورینٹی کا اصول۔ (۲) دوئم روس کی قوموں کے آزادانہ حق خود ارادیت سلف ڈیٹر مینیشن کا اصول جس میں روس یونین سے علٰحدہ ہو جانے کا حق بھی شامل ہے۔"

میں یہ بھی جاننے کا آرزومند تھا کہ لینن کے اس عہد نامے کو کہاں تک پورا کیا گیا۔ میں نے اس

بلند بانگ اعلان کی روشنی میں چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

میں شروع ہی میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سوویٹ روس میں پاکستانی علماء کے وفد کا دورہ آزاد نہیں بلکہ سرکاری نگرانی میں بالکل مقید دورہ تھا۔ روسی سفارت خانہ کراچی نے بار بار ہمیں یقین دلایا تھا کہ دورہ بالکل آزاد ہوگا اور وفد کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے دوروں کا خود پروگرام بنائے حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ ۲۶ جون ۱۹۵۶ء کو کراچی میں روسی چارج ڈی افیر ناظم الامور نے ہمیں بتایا کہ "آہنی پردہ بالکل اٹھا دیا جائے گا" لیکن عملاً اس وعدے کو کبھی پورا نہیں کیا گیا۔ وفد سے مشورے کے بغیر روسی حکومت نے دورے کے ہر جزوی و کلی پروگرام کی پوری تفصیل پہلے سے طے کر رکھی تھی جس میں کسی کی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی در اصل وہ ہمیں کم سے کم چیزوں کو دکھانا اور کھیلوں تماشوں اور ضیافتوں میں زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتے تھے۔

سوویٹ روس میں مسلمانوں کی خاص ریاستیں اور علاقے

(۱) قازستان (۲) ازبکستان (۳) ترکستان (۴) تاجکستان (۵) کرغیزستان (۶) تاتارستان (۷) آذربائیجان (۸) قازان (۹) بشکیریا (۱۰) داغستان فرغانہ مرغیلان خوارزم توقند وغیرہ ہیں۔

ان میں سے ہمیں صرف دو یعنی ازبکستان و تاجکستان کے دارالحکومت اور سمرقند دکھایا گیا۔ انھوں نے دوسری مسلمان ریاستوں علاقوں اور شہروں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

وسط ایشیا میں عام مقولہ ہے:-

سمرقند صیقلِ روئے زمین است بخارا قوتِ اسلام دین است

بنابریں ہم سب سے زیادہ بے چین (اور آرزومند) بخارا کو دیکھنے کے لئے تھے لیکن ہماری ساری کوششوں اور مسلسل پُر اصرار درخواستوں کے باوجود روسیوں نے خاص تدبیر کی کہ کسی حالت میں بھی وفد کو وسط ایشیا میں اسلامی دین و تہذیب کے سب سے بڑے مرکز بخارا میں جانے نہیں دیا جائے ہم محسوس کرتے ہیں کہ روسی حکام ہمیں بخارا دکھانے سے بہت ڈرتے تھے۔ کیونکہ روسیوں نے بخارا کو بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے اور اس کی تباہی کا منظر انتہائی دلدوز ہے نیز اسلامی مدافعت Resistance اور اشتراکیت کی مخالفت کا بخارا بڑا مرکز رہا ہے (وسط ایشیا کا سفر کرنا اور بخارا نہ دیکھنا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا ہیملٹ کا ڈرامہ ہیملٹ کے بغیر دیکھنا)۔

حقیقت یہ ہے کہ دورے کے بائیس دنوں میں سے وسط ایشیا کے لئے صرف گیارہ دن رکھے گئے تھے وہ بھی زیادہ تر تاشقند میں ضائع کئے گئے جو اب ترکی سے زیادہ روسی شہر بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت کا بھی بیشتر حصہ دس گیارہ پرانی مسجدوں اور قبرستانوں کے دکھانے میں صرف کر دیا گیا۔ حالانکہ ان مسجدوں میں صرف چند سفید ریش نہایت بوڑھے نمازی تھے۔ نوجوان نہ ہونے کے برابر تھے اور لڑکے تو بالکل نہ تھے۔

سوویٹ روس میں اسلام اور مسلمان

روس میں میرے ذاتی مشاہدات نے مجھ پر یہ بالکل ظاہر کر دیا کہ

دہریت سوویٹ یونین کا ریاستی مذہب ہے۔ تمام خدا پرست مذہب کے خلاف دائمی جنگ کرنا کمیونسٹ پارٹی کا مقصد ہے۔ مارکسی نظریہ و عمل کے مطابق کمیونسٹ سوسائٹی کے مکمل قیام کیلئے جس میں مذہب ذاتی ملکیت کا انجام کار مکمل خاتمہ کردیا جائیگا۔ سارے مذہبی نظاموں کو رفتہ رفتہ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ کامریڈ خروشیف سکریٹری کمیونسٹ پارٹی سوویٹ روس اعلان کرتا ہے :-

"ہم آج بھی دہریہ ہیں اور ہم لوگوں کے ایک حصہ کو جو مذہبی افیون سے مسحور میں آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مذہبی افیون آج بھی موجود ہے"۔

الما آتا ریڈیو کہتا ہے :-

"سوویٹ یونین سے باہر کے مسلمانوں کے تمام احتجاجوں کے باوجود اسلام سے متعلق سوویٹ روس کی یہ پالیسی بدستور قائم ہے کہ اسلام ایک رجعت پسندانہ تحریک ہے جس کی ایجاد "ترقی" اور قیام لوٹ کھسوٹ کرنے والے سرمایہ دار طبقہ کی رہین منت ہے"۔

بڑی سوویٹ انسائکلوپیڈیا (۱۹۵۳ء۔ ایڈیشن جلد ۱۸) بیان کرتی ہے :-

"سوویٹ روسی یونین کے اندر سوشیلزم کی فتحیابی اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقات کے استیصال کے نتیجہ کے طور پر اسلام کی اجتماعی جڑیں کاٹی جاچکی ہیں"۔

سوویٹ یونین کے حقیقی حالات۔ جو میں نے مشاہدہ کئے ہیں اس سے اس سرکاری پالیسی کے بیان کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے۔

مسلمان مورخین کے بیانات کے مطابق اشتراکی انقلاب کے پہلے ترکستان میں ستائیس ہزار مسجدیں تھیں۔ لیکن ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو مسٹر پوزین وزیر امور مذہبی و صدر کاؤنسل ریلیجنس افیرز سوویت یونین ماسکو نے ہمارے سامنے ایک سوال کے جواب میں بیان کیا آج پورے سوویٹ یونین کے اندر کل ایک سو مسجدیں رہ گئی ہیں۔ ماسکو میں پہلے چار مسجدیں تھیں اب ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ بھی ہفتہ میں صرف جمعہ کی نماز کے لئے کھلتی ہے۔ لینن گراڈ کی مسجد کی تعمیر ۱۹۱۰ء میں امیر بخارا نے کی تھی یہ مسجد بھی صرف جمعہ کو کھلتی ہے۔ حالانکہ ماسکو اور لینن گراڈ میں علی الترتیب چالیس اور تیس ہزار مسلمانوں کی آبادی ہے۔ بائیس دن کے دورہ کے درمیان ہمیں کل انیس مسجدوں اور قبرستانوں کو دکھایا گیا۔ دس تاشقند میں، چار سمرقند میں تین اسٹالن آباد میں ایک ماسکو میں ایک لینن گراڈ میں

جن مسجدوں کو ہمیں دکھایا گیا وہ سب پرانی تھیں جن کی ابھی ابھی مرمت کی گئی تھی صرف تاجکستان میں ہم نے ایک گاؤں میں ایک نئی مسجد دیکھی۔

مسلمان مورخین اور ترکستانی لیڈروں کے بیانات کے مطابق زار کے عہد میں روس میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر تھی خود زار کی حکومت بھی تسلیم کرتی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے اوپر ہے۔ لیکن اب کمیونسٹ روسی حکومت کہتی ہے کہ مسلمان صرف ایک کروڑ ہیں۔ سوال ہے کہ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان

باقی چار کروڑ مسلمان کدھر گئے اور کیا ہو گئے جبکہ اس چالیس سالہ دور کے اندر روسیوں کی تعداد بڑھ کر دگنی ہو چکی تھی۔

سمرقند کے عظیم الشان شاہی مدارس عربیہ مثلاً مدرسہ بی بی خانم۔ مدرسہ ریگستان۔ مدرسہ شیرور۔ مدرسہ الوغ بیگ۔ مدرسہ ذہبیہ طلاکار۔ بند۔ ویران و خراب پڑے ہیں اور تیزی کے ساتھ گرتے جارہے ہیں بخارا میں تین سو پچاس (۳۵۰) مدارس، اسلامیہ عربیہ تھے جس میں چالیس ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے۔ یہ سارے مدارس برباد اور علما و طلبا ذبح کر ڈالے گئے۔ اندجان میں پچاس بڑے مدارس اسلامیہ تھے وہ سب مٹا دیئے گئے بخارا خوارزم اندجان خجند صاحب ہدایہ مرغانی کے شہر مرغنان خواجہ معین الدین چشتی کے آبائی شہر چشت و سنجر، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے شہر اوش اور اسلامی ثقافت و تہذیب کے دوسرے مرکزوں کو خاص طور سے کلی تباہی و بربادی اور انتقامی نسل کشی و قتل عام کا ہدف بنایا گیا۔

وسط ایشیا کی اسلامی زبانیں ترکی، ازبکی، تاتاری، فارسی وغیرہ سب عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور قیمتی لٹریچر رکھتی تھیں۔ لیکن روسیوں نے ان کی کتابیں جلا دیں اور عربی رسم الخط کو خلاف قانون قرار دیکر ختم کر دیا اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی زبانوں کے لئے صرف روسی رسم الخط اختیار کریں۔ تمام اوقاف کو ضبط کر لیا گیا مختصر یہ کہ سارے سوویٹ روس کے اندر مسلمانوں کے پاس ایک بھی چھاپہ خانہ "دارالاشاعت" روزانہ اخبار "جریدہ" و رسالہ و جمعیۃ و مجلس مکتب خانہ یا پرائمری مذہبی تعلیم گاہ اور آمدنی دینے والا وقف نہیں ہے۔

مسلمانوں کیلئے مسلمانوں کی ریاستوں میں بھی کوئی مذہبی تعطیل نہیں ہے حتی کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی تعطیل بھی نہیں ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو قربانی کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ مسلمان مکہ شریف حج کے لئے جانے کی آزادی رکھتے ہیں اور نہ مالی استطاعت۔ جو چند روسی مسلمان حج کے لئے جاتے ہیں ان کو روسی حکومت پروپگنڈے کیلئے اپنے خرچ سے بھیجتی ہے مسلمانوں کو مذہب پر کوئی کتاب چھاپنے اور شائع کرنے یا درآمد کرنے کی اجازت نہیں ہے وہ چالیس سال کے اندر آج تک خود قرآن بھی نہیں چھاپ سکے ہیں دینیات کی پہلی اور قاعدہ بغدادی بھی نہیں چھاپ سکتے ہیں۔

۴ر جولائی ۱۹۵۶ء کو تاشقند میں وفد پاکستان نے مسٹر امین جان قادروف وزیر تعلیم ازبکستان سے ملاقات کی۔ انھوں نے ہمیں صاف بتایا کہ ریاست کسی حال میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ ریاست کی بنیاد مارکسی دہریت پر قائم ہے اور تعلیم ریاست و معیشت ہر چیز مارکسی آئیڈیا لوجی کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ انھوں نے وضح کیا کہ تعلیم مکمل طور پر لا مذہبی بنا دی گئی ہے۔ ابتدائی درجوں کے لئے یہ تعلیم جو مارکس اصولوں پر استوار کی گئی ہے لازمی ہو چکی ہے۔

سارے سوویٹ روس میں ایک عدد قرآنی مکتب یا پرائمری اسکول نہیں ہے جہاں دینیات کی تعلیم دیجاتی ہو۔ تاجکستان کے وزیر اعظم مسٹر ناظر شاہ داد خدایوف نے ہمارے اس معروضے کو بزور طور پر مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کیلئے قرآنی مکتب اور مدرسے کھولے جائیں۔ وزیر اعظم نے اس کو اسٹیٹ کے نظریاتی اصولوں کے خلاف قرار دیا۔

بخارا فرغانہ سمرقند اندجان مرغیناں خوارزم خوجند اور دوسرے مرکزوں میں بہت سے شہرۂ آفاق کتب خانے تھے۔ یہ انمول خزانے سب کے سب جلاکر راکھ کردیئے گئے۔

ہماری درخواست پر مرزا محمود نائب وزیر اعظم ازبکستان نے کہا کہ مسلمانوں کو آئندہ آزادی ہوگی کہ وہ اپنے گھروں اور مسجدوں میں بطور خود مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ لیکن یہ وعدہ محض سراب اور بالکل فریب باطل ہے۔

(۱) اولاً اس لئے کہ ماسکو کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی کبھی اس کی اجازت نہیں دے گی (۲) دوم مسلمانوں کے پاس کوئی اوقاف باقی نہیں رہے جو ان کا خرچ پورا کرسکے (۳) سوئم بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کیلئے نہ ضروری کتابیں ہیں اور نہ استاد و معلم (۴) چہارم قرآن اور اسلام کے مسلمہ رسم الخط عربی کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا ہے (۵) پنجم والدین کیلئے سرکاری کاموں پر حاضری دینا لازمی ہے اور بچوں کے لئے سرکاری اسکولوں کی حاضری جبری ہے۔ اس طرح والدین اور بچوں میں سے کوئی بھی فاضل وقت مذہبی تعلیم کیلئے نہیں بچاسکتا ہے (۶) ششتم زیادہ سے زیادہ بچوں کو ان کے گھروں اور خاندانوں سے بالکل جدا کرکے ریاستی "کودکستانوں" کے حوالے کیا جارہا ہے۔

بنابریں وزیروں کے زبانی وعدے بالکل بے معنی اور ناقابل عمل رہیں گے جب تک مارکسی تعلیم لازمی ہے اور مسلمانوں کے اوقاف مسلمانوں کے حوالے نہیں کئے جاتے۔

روس میں مسلمانوں کی تہذیبی نسل کشی سے پہلے علماء و مشائخ صاحب زمین اور صاحب جائداد کاروباری مسلمانوں کو اور ان تمام لوگوں کو جو ارباب علم و قیادت تھے من حیث الجماعت سماج دشمن طبقہ مجرمین قرار دیا گیا۔ جن کا استیصال کمیونسٹ سوسائٹی کے قیام کی شرط اول ہے۔ ان کی سیاہ فہرستیں تیار کی گئیں۔ ان کو گرفتار کرکے سائبیریا جزائر بحر منجمد شمالی، مثل کیمپ دھوک سیلما، سرحدات چین اور دور دراز علاقوں میں جلاوطن کردیا گیا جہاں ان کو سڑکوں ریلوں اور نہروں کے بنانے کے لئے سخت ترین مشقتوں پر مجبور کیا گیا۔ لاکھوں اس طرح مار ڈالے گئے۔ ایک ۴۷ سالہ ازبکی لیڈر اور مورخ مولانا سید قاسم جان اندجانی نے مجھ کو بتایا کہ اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو روسیوں نے قتل کیا۔ اس بیان کی تصدیق دوزلدرف جرمنی کے جریدہ "ملی ترکستان" نے بھی کی ہے۔

ہر مقام پر ہم دس اور بارہ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں سے ملتے اور سوال کرتے رہے کہ آیا وہ کلمہ اور نماز جانتے ہیں۔ جواب ہمیشہ اور ہر مقام پر نفی میں ملا۔ نئی نسل اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہے ۸ جولائی ۱۹۵۷ء عیدالاضحیٰ کے دن ہم مرزا محمود نائب وزیر ازبکستان سے ملے۔ وفد پاکستان نے وزیر موصوف سے احتجاج کیا کہ تعجب ہے کہ آج عید قرباں کیلئے بھی سرکاری تعطیل نہیں دی گئی ہے۔ مرزا محمود نے کہا کہ مسلمانوں کو نماز عید پڑھنے کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن حکومت کسی مذہبی تہوار کیلئے تعطیل نہیں دے سکتی ہے۔ ہم نے مسلمانوں کو عید قرباں کے دن تاشقند اور اسٹالن آباد میں دیکھا۔ کوئی مسلمان قربانی نہیں کرسکا۔ البتہ جماعت عید میں ہزاروں مسلمان جمع ہوئے جو پاکستان اور عالم اسلام کی آبادی و فلاح کیلئے

رو رو کر دعائیں کر رہے تھے۔

گذشتہ اور موجودہ تاریخ کے واقعات و حقائق کی بنیاد پر پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ سوویٹ یونین میں مذہب کی مطلق آزادی حاصل نہیں ہے اور جب تک مارکس ازم کو بالکل ترک نہ کر دیا جائے۔ مذہبی آزادی ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ سوویٹ یونین کے اپنے سرکاری بیان کے مطابق یونین کے اندر مذہب تحلیل اور استیصال کی حالت میں ہے۔

تاشقند کی نظامت دینیہ ایک بالکل حکومتی ادارہ ہے۔ جس کا مقصد اور مذہبی تعلیم کی ہمت افزائی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ کمیونسٹ روس کی طرف سے مذہب کی نگرانی کرنا ہے۔ مسلمانان روس مکمل طور پر ذہنی علٰحدگی اور تنہائی اور دماغی قید اور حبس کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ نہ باہر کے اخبارات پڑھ سکتے ہیں اور نہ باہر کے لوگوں سے مل سکتے ہیں۔

سیاسی و قومی حالات

میرے ذاتی مشاہدات کے مطابق سوویٹ یونین میں اسٹالن کے بعد جمہوریت نوازی و حریت کے رجحانات حقیقی نہیں بلکہ محض سرابی ہیں۔ مرکزیت آمریت تشدد منافرت انگیزی طبقاتی جنگ اور دین و مذہب کے خلاف غیر مختتم جنگ۔ مارکس ازم اور لینن ازم کے جوہر اور جزولاینفک ہیں اور اسٹالن ازم ان کا فطری اور جائز بچہ ہے۔ اسٹالن کے بعد داخلی و خارجی پالیسی میں معمولی تبدیلیاں محض وقتی داؤں پیچ کی تبدیلیاں ہیں تاکہ مستقل گہری چال اور طریقۂ عمل کے تغیرات مذہب کی آزادی کا پروپیگنڈا، امن پرستی اور بقائے باہمی کا پرشور نقارہ، مظلوم و مغلوب قوموں کی طرف کچھ حریت نوازی کے سلوک کا ڈھنڈورا، اسٹالن ازم اور شخصیت پرستی کی تردید کا اشتہار محض اس اندرونی کمزوری کے باعث جاری کیا گیا ہے جو اسٹالن کی فولادی شخصیت کے اچانک ہٹ جانے کے باعث ظاہر ہو چکی ہے۔ سب سے نمایاں کمزوری مضبوط پیدائش قیادت کا فقدان اور سوویٹ سامراج کی محکوم اور مظلوم قوموں کی بڑھتی ہوئی بےچینی ہے۔ کیونکہ وہ روسی شہنشاہیت و استعماریت کے خلاف بغاوت کر دینے پر آمادہ ہیں اور اُن کو کچھ دے کر رام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

دوسری وجہ آزاد دنیا کی بڑھتی ہوئی تنظیم وحدت اور طاقت ہے جس نے روسی جارحیت کو مشرق و مغرب میں روک دیا ہے۔ تیسری وجہ اسلام اور مسلمان قوموں کے لئے پرفریب ہمدردی دکھا کر مشرق اوسط میں روس کو داخل کرنے اور روسی اثر و نفوذ بڑھانے کی تازہ ترین پالیسی ہے۔ چالیس سال کے بعد قرآن کا چھاپنا مسلمان ممالک سے مختلف وفود کو بار بار بلانا مذہب کی آزادی اور مختلف نظریات و نظامات کی بقائے باہمی کا پروپیگنڈہ کرنا..... ان سب کا مقصود عربی، ترکی، ایرانی، افغانی، پاکستانی مسلم دنیا کو رام کرنا اور اپنانا ہے کیونکہ اسلامی دنیا مشرق و مغرب یورپ و امریکہ اور ایشیا و افریقہ کے درمیان مرکزی اور فیصلہ کن مقام رکھتی ہے۔

سوویٹ یونین کی پندرہ قومی جمہوریتوں میں سے صرف روسی ریاست ہے جس کی حیثیت اور نام فیڈرل Russin Federal SSR ہے محض ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ روسی آبادی کو جائز اور باطل طور پر اصل سے

بڑھا چڑھا کر دکھانے اور اس کو مختلف الاقوام سوویٹ یونین کی سب سے بڑی اکائی دکھلانے کے لئے روسی حکمران قوم نے خاص ترکیب سے تاتارستان، بشکیریا، قادان، استراخان، کریمیا، داغستان، بوریت منقونیہ سائبیریا جیسے دور دست ملکوں اور علاقوں اور بہت سی دوسری قوموں کو جن کا دور کا واسطہ روس قوم سے نہیں ہے روسی جمہوریہ کے اندر شامل کرلیا ہے تاکہ روس ریاست کا رقبہ اور آبادی سب سے بڑھ جائے۔

روسی سامراجیت کا مزید ثبوت تمام قوموں اور اکائیوں کو روسی رنگ میں رنگنے کی تحریک سے ملتا ہے روسی زبان و رسم الخط ابتدائی کلاسوں سے تمام قوموں اور ریاستوں کیلئے لازمی بنا دیئے گئے ہیں۔ روسی رسم الخط کے علاوہ تمام دوسرے رسم الخطوں کو تمام ممنوع الاستعمال کر دیا گیا ہے۔ روسی نوآبادکاری کے باعث تاشقند کی تیس فیصدی آبادی اور ریاست قازقستان کی ۵۳ فیصدی اکثریت روسی بنائی جاچکی ہے۔ بہت سے بڑے بڑے علاقے اور خطے جو قدیم زمانے سے مسلمان تھے آج مکمل طور پر روسی بنائے جا چکے ہیں۔

فیض اللہ خواجوف جمہوریۂ ازبکستان کے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۷ء تک کمیونسٹ وزیر اعظم تھے۔ امیر بخارا کی حکومت کے خاتمہ کرنے اور وسط ایشیا میں کمیونسٹ نظام قائم کرنے کا سہرا فیض اللہ کے سر ہے لیکن فیض اللہ اور دوسرے ازبک لیڈروں نے دیکھا کہ کمیونزم کے ساتھ روسی سامراجیت ان پر مسلط کی جا رہی ہے تو انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی۔ خاص طور سے انھوں نے ازبکستان کو مکمل طور پر روئی کا کھیت بنانے اور ترکستان کو خوراک کے لئے روس کا محتاج محض بنا دینے کی پالیسی کی مخالفت کی۔

فیض اللہ اور ترکستانی لیڈروں نے ماسکو کے پنجسالہ اقتصادی پلان کی مخالفت کی اور ترکستان کیلئے ایک علیحدہ و مستقل پنجسالہ پلان بنانے کی آزادی پر زور دیا۔ ۱۹۳۷ء میں روسیوں نے فیض اللہ اور کمیونسٹ پارٹی ازبکستان کے سکریٹری اکمل اکراموف اور دوسرے لیڈروں کو قتل کر دیا۔

فیض اللہ و اکمل اکرام اور دوسرے ترکستانی لیڈروں کا اصل قصور یہ تھا کہ وہ روسی سامراجیت کی پالیسی کے خلاف تھے اور ازبکستان اور وسط ایشیا کی سیاسی معاشی اور تہذیبی آزادی و خود مختاری کے لئے لڑ رہے تھے۔

یہی حشر ۱۹۳۷-۳۸ء میں تاجیکستان میں تاجک کمیونسٹ وزیروں اور لیڈروں کا ہوا۔ کیونکہ انھوں نے کمیونسٹ روس کی اس سامراجی پالیسی کی مخالفت کی کہ تاجیکستان اور وسط ایشیا کو روسی نوآبادی بنا دیا جائے۔ عبداللہ رحیم بے دف اور شرقی بے وزیر اعظم و صدر تاجیکستان کو دوسرے لیڈروں اور ہزاروں محبان وطن کے ساتھ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

ہم نے لینن گراڈ میں سوویٹ یونین کے مرکزی پریس کو دیکھا جو سارے یونین کے کل اسکولوں اور کالجوں کے لئے نصاب کی ساری کتابیں ایک ہی مرکز سے چھاپ کر تقسیم کرتا ہے۔ یہ پریس گویا سارے سوویٹ روس کی دماغ بندی اور ذہن بندی فکر بندی و فکر سازی کا واحد کارخانہ ہے۔

زمانہ قدیم سے ترکستان تورانی قوموں کا وطن اور نسلی و ثقافتی لحاظ سے ایک ملک رہا ہے۔ وسط ایشیا اور یورپ کے تورانی مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لئے زار کی حکومتوں نے جو مسلسل جنگیں کیں مسلمانوں نے

سختی سے ان کا مقابلہ کیا۔ کئی صدی تک تورانیوں اور روسیوں کی یہ کشمکش جاری رہی سوویٹ روس سٹرکلینٹ ایٹلی کے الفاظ میں الٹی ہوئی زاریت ہے کمیونسٹ روس زاریت سے لاکھ درجے بدتر جابریت ہے۔ کمیونسٹ روس نے نہ صرف مسلمانوں کو غلام بنایا بلکہ مسلمانوں کو مسلمانیت اور قومیت سے محروم کرنے اور پوری طرح روسی بنادینے کے لئے ترکستان کو پارہ پارہ کردیا ہے۔

کمیونسٹ روس نے ترکستان کو (۱) قازقستان (۲) ازبکستان (۳) تاجیکستان (۴) ترکمانستان (۵) کرغیزستان (۶) آذربائیجان اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے جس میں سے ہر ایک ماسکو کا محتاج و غلام ہے

کاغذ پر اور دستور اساسی کے لحاظ سے یہ سب خود مختار (مستقل Sovereign) قومی ریاستیں ہیں قانوناً ان کو ممالک خارجہ میں اپنی جداگانہ سفارتیں قائم کرنے مجلس اقوام متحدہ کا ممبر بننے اور سوویٹ یونین سے علیحدہ ہو جانے کے اختیارات حاصل ہیں۔ چنانچہ یوکرین اور بائیلوروس یو۔ این۔ او کی ممبر ہوچکی ہیں ہم نے تاشقند میں ازبکستان کے وزیر خارجہ مسٹر عبدالغنی سلطانوف ازبکستان پاکستان اور دیگر ممالک میں اپنی سفارتیں کھولے گا۔

لیکن اصل حقائق اس کے برعکس ہیں۔ روس تضاد و تناقض کا ملک ہے۔ یہ چیزیں حقیقت میں ویسی نہیں ہوتیں جیسی دنیا کو دکھائی جاتی ہیں۔ ازبکستان، قازقستان اور دوسری قومی جمہوریتوں کی خود مختاری ساورینٹی (حاکمیت) حقیقی نہیں بلکہ محض خیالی و سرابی ہے۔ ان کی ابتداء و پیدائش طاقت و زندگی کے سرچشمے ان کی قومیں اور عوام نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی ماسکو ہے۔ جو سوویٹ یونین کی ہر معمولی سے معمولی چیز پر حکمرانی کرتی ہے۔ یہ جمہوریتیں اور ریاستیں قومی خواہشات کی نہیں بلکہ کریملن کی مخلوقات اور آلۂ کار ہیں۔ ان کی بقاء و زندگی کمیونسٹ پارٹی کی مرضی و خوشی پر موقوف ہے۔ خود ریاست بھی کمیونسٹ پارٹی کی آلۂ کار ہے۔

صرف کٹر کمیونسٹ حکومتی ادارات پر مقرر ہو سکتے ہیں۔ قومی ریاستوں کی آزادی و خود مختاری کس قدر بے اصل ہے ہم پر اس وقت کھلا جبکہ ہماری ملاقات مسٹر عبدالجبار عبدالرحمٰنوف سے ہوئی۔ یہ صاحب وسط ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ازبکستان کے وزیر اعظم تھے لیکن ماسکو نے ان کو اس قصور پر برخاست کردیا کہ وہ ماسکو کی کپاس کی پالیسی پر پوری طرح عمل نہیں کررہے تھے۔ اب ان کو ماسکو کی زراعتی و صنعتی نمائش میں ازبک اسٹال کا مینیجر بنا دیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہے کہ نہ صرف کسانوں اور مزدوروں کو بلکہ بڑی بڑی قومی ریاستوں کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ اس کا فیصلہ کرسکیں کہ وہ اپنے کھیتوں میں کونسی فصل اگائیں گے۔ ہر شخص کے کام اور ہر کھیت کی فصل کا فیصلہ ماسکو کرتا ہے۔

سوویٹ یونین میں الیکشن محض بوگس اور نمائشی ہوتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی ماسکو سارے امیدواروں کو نامزد کرتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ کسی کو کوئی پارٹی یا جمعیت بنانے کی اجازت نہیں ہے کوئی حزب اختلاف نہیں ہے۔ نہ مخالف اخبار ہے اور نہ کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار کے خلاف امیدوار کھڑا کرسکتا ہے نہ خلاف میں ووٹ ڈال سکتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے سارے امیدوار ہمیشہ بالاتفاق منتخب ہوتے ہیں کیونکہ کسی کو ان کے خلاف کھڑا ہونے کی آزادی ہی حاصل نہیں ہے۔ سوویٹ یونین ایک چٹانی سنگین اسٹیٹ {Monolithic state} ہے۔

سوویٹ یونین میں آزادی کو اس لئے قربان کر دیا گیا تھا کہ برابری حاصل ہو لیکن عملاً آزادی و برابری دونوں کمیونسٹ پارٹی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی ہیں۔ پرانے امراء و اشراف کی جگہ نئے حکمراں اور نئے اونچ و نیچ طبقات پیدا ہو گئے ہیں۔ سوویٹ سوسائٹی میں دوسرے امتیازات کے علاوہ (۱) کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں (۲) روسیوں اور غیر روسیوں (۳) شہریوں اور دیہاتیوں (۴) دماغی کام کرنے والوں اور دستی کام کرنے والوں (۵) صنعتی مزدوروں اور زراعتی مزدوروں کے درمیان نمایاں تفریق و نابرابری ہے۔

سوویٹ روس میں مسلمان علاقوں خصوصاً ترکستان کی آزادی و توحید کی تحریکات جاری ہو چکی ہیں۔ اتحاد سوفیتائیہ اشتراکیہ روس کی سب سے زیادہ مظلوم، غیر مطمئن اور مضطرب قوم مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ وہ آج استقلال و اتحاد ترکستان کے داعیٔ اعظم غازی انور پاشا اور مجاہد اعظم ابراہیم بیگ کے زمانہ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۶ء سے بہت زیادہ خود شعور اور خود شناس منظم و تعلیم یافتہ، اور فوجی تربیت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ترکان ترکستان ایک غیور و جسور بہادر جنگجو اور نہایت مذہبی قوم ہیں جو شاندار روایات و تاریخ اور حیرت انگیز جوش زندگی، قوت کردار اور زبردست احساس قومیت رکھتے ہیں۔ روسی ان کی قومیت کو مٹانے میں پوری طرح ناکام ہو چکے ہیں ترکان روس بحیثیت قوم زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ وہ فخریہ یہ بتاتے ہیں کہ گذشتہ عالمی جنگ میں جب ہٹلر کے سامنے روسی فوجیں پاش پاش بے بس و سرنگوں ہو چکی تھیں ماسکو اور لینن گراڈ بس ساقط ہونے ہی کو تھے کہ وسط ایشیا کے ترک و تاتار آگے بڑھے۔ خالی صفوں کو پُر کیا۔ جرمنوں کے سیل رواں کا منہ پھیر دیا اور نازیت کو شکست فاش دی مارشل زھوخوف اور اسٹالن نے جنگ کے اس نازک ترین مرحلے پر مسلمانوں سے مدد کی بھیک مانگی اور مسلمان قوموں سے وعدہ کیا کہ فتح کے بعد مسلمانوں کو مکمل قومی آزادی اور وحدت قائم کرنے کا موقع دیا جائے گا اور ان کو حق ہوگا کہ وہ روس سے علیحدہ ہو جائیں اسٹالن اور زھوخوف نے ان وعدوں کے لاکھوں مطبوعہ اشتہار ہوائی جہازوں سے مسلمانوں کے درمیان گرائے۔

معاشی حالات روس میں تمام زمینیں جائدادیں اور کار و بار ریاست کی ملکیت ہیں اور ریاست کا مطلب کمیونسٹ پارٹی ہے جو در اصل ریاست کی بھی مالک ہونے کی مدعی ہے۔ یہ "زمیندار اعظم" ہے اور باقی سب اس کی رعیت بالمرضی اور غلام وابستۂ جاگیر ہیں۔ معاشی نظام صاف طور پر ریاستی جاگیرداری State Fendalism کا نظام ہے۔ لوگوں کو قطعی اپنے کام اور ذریعہ زندگی چننے کا اختیار نہیں ہے۔ لوگ فارموں فیکٹریوں اور آفسوں سے بندھے ہوئے غلام ہیں نہ وہ استعفےٰ دے سکتے ہیں اور نہ دوسرے مقامات پر نئی راہ معاش تلاش کرنے جا سکتے ہیں۔ کام چھوڑ دینے کی سزا موت ہے۔ ہر مرد عورت اور بچہ پارٹی کا سرمایہ ہے جو اس کو جس طرح اور جہاں چاہے استعمال کر سکتی ہے۔ فرد کیلئے کوئی اختیار، کوئی آزادی، اور کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔ والدین کو بچوں پر کوئی اختیار نہیں ہے زیادہ سے زیادہ بچوں کو خاندانوں سے جدا کر کے ریاستی کودکستانوں اور نرسری کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

مسلم وسط ایشیا میں ریاستی جاگیرداری State Fendalism کے ساتھ ساتھ روسی استعماریت

ر نو آبادی Colonialism بھی مسلط کی گئی ہے وہاں روسی تمام کلیدی مقاموں پر قابض ہیں۔ قازقستان ازبکستان تاجیکستان ترکمانستان کرغیزستان آذربائیجان تاتارستان داغستان وغیرہ کی ساری معاشیات کی منصوبہ بندی کریملن نے اس طرح کی ہے کہ ان کی مکمل اقتصادیات روس کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہے ہم نے وہاں کوئی گیہوں اور غلے کا کھیت نہیں دیکھا۔ حکام نے بتایا کہ غلہ روس اور یوکرین سے آتا ہے ازبکستان اور تاجیکستان پورا کا پورا کپاس کا کھیت ہے۔ سوویٹ یونین کی اسّی فیصدی سے اوپر روئی ان دو مسلم ریاستوں میں پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن ان ملکوں میں ایک ہی کپڑے کا کارخانہ ہے۔ باقی ساری روئی روس کو جاتی ہے۔

تاجیکستان میں اسٹالن آباد کے قریب ہم نے لینن کولخوز مشترک کھیت دیکھا جس کا رقبہ ۹۸۸۰ ہیکٹر ہے۔ یہاں صرف چند چوبی مکان تھے لیکن ۹۵ فیصدی کسان چھوٹے چھوٹے خس پوش مٹی کے نہایت پست مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہ مکان یقیناً پنجاب و مشرقی پاکستان کے کسانوں کے مکانات سے بہت زیادہ گھٹیا ہیں۔ ان ترکستانوں کا معیار زندگی ماسکو کے قریب لینن میموریل کولخوز کے روسی کسانوں کے معیار سے بہت زیادہ پست ہے کیونکہ ہم نے روسی کسانوں کو چھ اور آٹھ کمروں کے آراستہ چوبی مکانوں میں رہتے دیکھا جو ریڈیو سٹ ٹیلی وژن سٹ اور میز کرسی سے آراستہ تھے۔

تاشقند میں ہم نے دیکھا کہ شہر کے تمام نئے اور بہتر علاقوں پر روس قابض ہیں۔ تاشقند آبادی و تمدن میں ایک روسی شہر بنایا جا چکا ہے۔ مسلمان عموماً گندی بستیوں اور مٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ پھر بھی مسلمان جھونپڑیوں کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ ان کے اپنے گھر ہیں جن کے ساتھ خانہ باغ ہے۔ جہاں پھل اور سبزیاں پیدا کرتے ہیں لیکن اس طرح کی بہت سی آزاد جھونپڑیوں کا صفایا کر کے حکومت فلیٹ بنا چکی ہے جن کو کرایہ پر دیتی ہے۔ اس طرح ذاتی مکانوں اور باغوں کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ آخری منزل ہر قسم کی ذاتی کھیتی باغباتی اور گھر باڑی کو یکسر مٹا کر ہر انچ زمین اور ہر مکان کو ریاستی ملکیت بنا دینا ہے۔

سوشلزم سے کمیونزم کی طرف مارچ کی راہ میں کولخوز (مشترک کھیت) محض ایک عارضی اسٹیج ہے۔ منزل نہیں درمیانی اسٹیشن ہے۔ کامیون ازم کے مطابق انجام کار سب مشترکہ کھیتوں اور ذاتی مکانوں کو سرکاری کھیتوں اور سرکاری مکانوں میں تبدیل کر دیا جائے گا اور کسی قسم کی ذاتی ملکیت، مذہب اور برابری باقی نہیں رہے گی اور ریاست بھی فنا ہو جائے گی۔ کھیتوں اور کارخانوں کے مزدوروں کا معیارِ زندگی آزاد معیشتوں کی بہ نسبت بہت پست ہے۔ ہمارے پنجاب کے کسانوں کی خوراک روسی کھیت مزدوروں سے بہت بہتر مایہ دار تر ہے۔ یقینی طور پر پاکستان اور ہندوستان کی خود کاشتہ زمینوں کے آزاد کسانوں کی زندگیاں روس مشترکہ اور سرکاری فارموں کے غلام مزدوروں سے بہت زیادہ خوشتر ہیں کیونکہ روسی کسان اپنی زمینوں سے بندھے ہوتے ہیں اور اپنے کاموں کو چھوڑ کر بہتر کاموں کی تلاش میں دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔

سب سے حیرت انگیز بات جو ہم پر ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ کارخانوں کے مزدوروں، آفس کے کارکنوں

فنکاروں، کاریگروں اور دوسرے آزاد آمدنی رکھنے والوں کو ماہانہ انکم ٹیکس گھر کا کرایہ اور دوسرے قسم کے ٹیکس دینے پڑتے ہیں۔ بے اولاد اور صرف دو بچے رکھنے والے شہریوں پر خاص ٹیکس عائد ہیں۔ مشترکہ فارم کی پیداوار کا ۷۵ فیصدی حصہ اسٹیٹ لیتی ہے۔ بیج کا ذخیرہ چارہ اور حفاظتی ٹیکس اور دوسرے اخراجات منہا کرنے کے بعد باقی حصہ غریب مزدوروں کو اُن کے کام اور حیثیت کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔ جو مشکل سے پیداوار کا پندرہ ۱۵ فیصدی ہوتا ہے۔

صارفین کے سامان کی ہر جگہ خصوصاً ایشیائی ریاستوں میں انتہائی قلت ہے۔ بہت سی ریاستیں اپنے شہریوں کے لئے کافی خوراک بھی نہیں پیدا کرسکتیں۔ ہر ریاست ایک خاص جنس پیدا کرنے کیلئے مخصوص کردی گئی ہے۔ اس طرح معاشی اور سیاسی لحاظ سے تمام قومی ریاستوں کو روس کی تابعدار نوآبادیاں بنادیا گیا ہے۔ مثلاً قازقستان روس کا غلہ خانہ، ازبکستان تاجیکستان روئی کا کھیت آذربائیجان تیل کا خزانہ اور بشکیریا، تاتارستان دوسرا باکو ہے۔

سوویٹ و معاشیات کی چند خصوصیات واضح ہیں۔ (۱) اولاً ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۷ء تک پرائیویٹ کھیتوں کے توڑنے اور مشترکہ کھیتوں کے بنانے کی تحریک کا خرچہ انسانوں کے قتلِ عام اور مادی سامانوں کی بربادیٔ عام کی شکل میں اس قدر بھاری عظیم اور دوررس ہوا ہے کہ سوویٹ نظام آج تک اس کے تباہ کن اثرات سے صحت یاب نہیں ہوسکا۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان اشتمال آراضی یعنی پرائیویٹ کھیتوں کے جبراً ختم کرنے اور مشترکہ کھیتوں کے بنانے کی تحریک اس قدر بے رحمانہ ظلم کے ساتھ جاری کی گئی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے۔ اسٹالن نے ۱۹۲۹ء میں کسانوں اور کاشتکاروں کو سماج دشمن اور آخری سرمایہ دار قرار دیا۔ اُن کے خلاف مکمل مسلح جنگ کا اعلان کیا۔ ان کو قابلِ استیصال قرار دے کر چن چن کر ہلاک کیا گیا۔ اس آٹھ سالہ جنگ استیصال میں دو کروڑ چھیالیس لاکھ چوہتر ہزار پانچسو مردوں اور عورتوں کا قتل عام کیا گیا۔ کسانوں نے اشتمال آراضی کا سخت مقابلہ کیا اور اپنے مویشیوں اور گھوڑوں کو کمیونسٹوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے کروڑوں کی تعداد میں ذبح کردیا۔ اس ذبح عظیم نے غلہ کپڑے، جوتے، دودھ، مکھن، گوشت اور چمڑے کی وہ عظیم قلت پیدا کی جو آج تک روس کی مصیبت بنی ہوئی ہے۔ کمیونسٹ اخبارات کے اپنے بیان کے مطابق گھوڑوں کی قلت اس قدر شدید اور نازک ہوگئی کہ ایک ایک جوڑے گھوڑے کی جگہ پر اشتراکیوں نے ایک ہل میں تیئیس مردوں اور عورتوں کو جوت دیا۔ جن سے شبانہ روز کام لیا گیا۔ مشینی زراعت کی ترویج کے باوجود یہ قلت اب تک جاری ہے۔

(۲) دوئم شہری صنعت گری قائم کرنے کے لئے زراعت پیشہ لوگوں کی استعماری لوٹ اور غارت گری سوویٹ نظام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ سوویٹ صنعت گری کے واسطے سارا سرمایہ کسانوں کے خون سے جمع کیا گیا۔ کمیونسٹ سرکاری سرمایہ کاری اور سُرخ صنعت گری کی ساری

رت کسانوں کی لاشوں ہڈیوں اور کھوپڑیوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ کسی زمانے اور کسی ملک میں آزاد
انوں کو اتنے بیرحمانہ طور پر نہیں لوٹا گیا اور نہ اتنے مکمل طور پر من حیث الجماعت ہلاک اور
تیصال کیا گیا۔

(۳) سوئم من مانی قیمتیں حکومت مقرر کرتی ہے اور یہ آزاد معیشت ملکوں سے بہت زیادہ اونچی
گراں ہیں۔ حکومت اپنے خریدنے کے لئے چیزوں کے دام بہت سستے مقرر کرتی ہے اسی چیز کا
صارفین کے لئے بہت اونچا رکھتی ہے۔ دیسا ور برآمد کرنے کی چیزوں کے دام بہت کم مگر اسی
دام ملک میں بہت اونچا کرتی ہے۔ زراعتی و دیہاتی جنسوں کے دام۔ صنعتی و شہری جنسوں کے
بلے میں بہت زیادہ کم ہیں در اصل کسانوں کے لوٹنے کا یہ خاص طریقہ ہے۔ شہری صنعتی
دوروں کے لئے سرکار نے روٹی اور دودھ کے دام قدرے کم کر رکھے ہیں۔ لیکن دیہات میں
ورت کی چیزیں سخت کمیاب و نایاب ہیں۔ ماسکو کی راجدھانی میں بھی قیمتیں بہت اونچی ہیں مثلاً
ن اٹھائیس روبل پونڈ ہے اور روبل پاکستانی روپیہ کے برابر ہے۔ مچھلی سولہ روبل۔ چائے
رہ روبل گوشت پندرہ روبل پونڈ ہے۔ جوتے کے دام چار سو پانچ روبل ہیں قمیص سو روبل میں
سوٹ ڈھائی ہزار سے تین ہزار روبل میں ملتا ہے۔ اور بڑے شہرت سے باہر یہ بھی نہیں ملتے۔

(۴) چہارم۔ ہمیں ماسکو میں عورتوں کو اونچے اونچے لکڑی کے تختوں اور مچانوں پر کھڑی ہو کر
مستری کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ یہ عورتیں اینٹ ڈھونے جھاڑو دینے اور
او ٹرام ڈرائیور کا کام کر رہی تھیں۔ بہت سے کارخانوں میں عورتوں کی کثرت ہے۔ لینن گراڈ
سوویٹ یونین کے سب سے بڑے مرکزی چھاپہ خانہ میں نوے فیصدی کارکن عورتیں تھیں ماسکو،
ینن گراڈ اور یورپی روس میں مردوں سے عورتیں دہ گنی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ایک عظیم معاشرتی
ہے لیکن انسانیت کے اصول پر اس کو حل کرنے کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ
یر جنگ کے باعث کروڑوں عورتیں ہیں جو اپنے خاندان کے کمانے اور پرورش کرنے والوں سے
م ہو گئی ہیں۔ روس میں تمام عورتوں کے لئے اپنی روزی کمانے کے لئے کام کرنا ضروری اور لازمی ہے۔
ماسکو کے مضافات میں ہمیں ننگے پیر مردوں، عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو غریب ترین اور قلیل
لباسوں میں دیکھ کر افسوس ہوا۔ بعض اس میں صرف بنیان پہنے ہوئے تھے۔

(۵) پنجم سوویٹ یونین تاریخ عالم کی سب سے بڑی غلام ریاست (Slave State) ہے جس میں
اور سلاطین نہیں بلکہ ایک بے روح استبدادی ریاست سارے شہریوں کی مالک مطلق بنی ہوئی
ے۔ یہاں ہر چیز کی بنیاد غلامی پر ہے۔

(۶) ششم۔ تاریخ عالم میں سوویٹ یونین انسانی دماغ اور روح کا سب سے بڑا تاریک قید خانہ
جس پر آزاد علم و اطلاع؛ فکر و بیان اور اظہار خیال کی روشنی کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔
ں کو دنیا کے واقعات کو جاننے اور غیر ملکی کتابیں اور اخبارات پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

تمام روسی اخبارات پارٹی پروپگنڈہ کے اشتہارات ہیں اور دنیا کی خبروں اور تبصروں کو مطلق شائع نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ خود سوویٹ یونین کی خبریں نہیں چھاپتے۔ تحریر و تقریر اور پریس کی آزادی مطلق نہیں ہے۔ انسان کے دماغ کو پوری طرح مقفل اور بند کر دیا گیا ہے۔

(۷) ہفتم ایک تعجب انگیز تضاد جو ہم نے سوویٹ یونین کے یورپین اور ایشیائی حصہ میں دیکھا وہ اسٹالن کے متعلق ہے۔ ایشیائی ریاستوں کی سڑکوں، باغوں، آفسوں، دفتروں، کھیتوں اور کارخانوں کے ہر کونے میں اسٹالن کے دیو ہیکل فولادی مجسمے لگائے گئے ہیں۔ لیکن ماسکو لینن گراڈ اور یورپین حصوں میں ہم نے کوئی اسٹالن کا مجسمہ نہیں دیکھا جو تھے وہ سب ہٹا دیئے گئے ہم نے محسوس کیا کہ ایشیائی ریاستوں میں اسٹالن کی دیو ہیکل مورتیں محکوم قوموں کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے کیلئے لگائی گئی ہیں۔ کیونکہ سوویٹ اشتراکیت ایک غیر ملکی اور سامراجی مذہب ہے جسکو صرف اسٹالین ازم کے ذریعہ مسلط رکھا جاسکتا ہے۔ اور اسٹالن ازم وحشیانہ بربریت اور دہشت انگیزی محکوم قوموں کی نسل کشی کا دوسرا نام ہے۔

خوف اور بےچینی کی زمین میں زوال کے آثار

سوویٹ یونین میں ہر جگہ مجلس میں چرچا امن کی دعوت کا تھا۔ سوویٹ حکام ہزاروں مرتبہ اور بار بار نکتۂ امن دھراتے تھے ہر تقریب کی ابتدا و انتہا دعوت امن پر ہوتی تھی۔ پاکستانی وفد نے جواباً کہا کہ اسلام کے معنی امن و سلامتی ہیں۔ اسلام مذہب امن اور امن قائم کرنے کا واحد سچا طریقہ ہے۔ پاکستان اسلامی مقاصد کا علمبردار ہے اور سوویٹ یونین اس وقت تک امن و سلامتی استحکام و توازن نہیں قائم کرسکتی جب تک کہ وہ طریقۂ اسلام کی پیروی نہ کرے۔

کمیونسٹ پارٹی کے ماتحت سوویٹ یونین خوف و ہراس اور بےیقینی و لامذہبی کی سرزمین بنائی جاچکی ہے۔ یہ جاسوس اور خفیہ مخبروں کی پولیس اسٹیٹ ہے۔ کھیتوں کارخانوں، فوجوں دفتروں۔ ہر جگہ اور ہر گوشہ میں جاسوس بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نے روس اور وسط ایشیا میں ہر چہرہ پر جلی حرفوں میں "خوف" لکھا ہوا دیکھا۔ ہر شخص آزادی اور صفائی سے بولنے سے ڈرتا ہے۔ وہ اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔ سوویٹ یونین میں چوٹی کے حکمرانوں سے لیکر ادنیٰ ترین مزدور اور ہر شخص دائمی خوف و شک اور بدگمانی کی زندگی گذار رہا ہے۔ کوئی اپنے پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ نہیں بلکہ باپ ماں بھی اپنے بچوں پر اعتبار نہیں کرسکتے۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی بچوں کو ان کے والدین کے خلاف جاسوس مقرر کرتی ہے اور بچوں کو والدین کے خلاف خبر دینے پر انعام دیتی ہے۔ روس اکابر ہر دم اندرونی بغاوت و انقلاب اور بیرونی حملہ کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں پر ہر لحہ اپنے عزیز ترین دوستوں سے غداری اور قریب ترین رشتہ داروں سے بغلی چھری کا خوف سوار رہے۔

غریب مزدور منیجر اور وزیر ہر دم خوف کی زندگی گذار رہے ہیں کیونکہ نہیں جانتے کہ کل انکا حشر کیا ہوگا۔ ہر جگہ بےیقینی اور بےاطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہر شخص ان سیاسی معاشرتی و اقتصادی

حالات سے غیر مطمئن ہے جن کا وہ قیدی اور غلام ہے۔

جنگ کے جھوٹے پروپگنڈے نے عوام کے دلوں میں یہ خوف پیدا کر دیا ہے کہ کوئی بڑی خرابی موجود ہے اور جنگ جہاں سوز کی ہلاکت و تباہی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔

لوگ بس مویشیوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں میں دل نہیں لگاتے کیونکہ کوئی تندرست انسان اپنی غلامی کی بیڑیوں اور اپنی قید و بندش کی زنجیروں کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا روس میں خوف اور محض خوفِ زندگی کی بنیاد ہے" کوئی چیز محبت پر قائم نہیں ہے اور محبت ہی وہ قانون حیات ہے جس نے ہر ذرۂ عالم کو باہم جوڑ کر اس کو مربوط منظم و متحد نظام کائنات کو قائم و استوار رکھا ہے۔

حکیم مشرق علامہ اقبال نے فرمایا ہے:۔

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

کمیونسٹ روس قول اقبال کی مکمل تفسیر ہے روس غلامی اور بے یقینی کا دیس ہے روس کا مرض الموت بے یقینی کا روگ ہے۔ کمیونزم کے مذہب بے یقینی۔ یعنی اللہ رب العالمین بقاء روح حیات بعد الموت نظام اخلاق آخرت/ خالق کے سامنے حساب و کتاب کی جوابدہی پر یقین کے انکار نے ہر چیز میں عام بے یقینی بدگمانی، بے اعتباری، شکوک و شبہات، خوف و ہراس، غداری و خیانت پیدا کر دیا ہے اور زندگی بالکل حیوانی پراگندہ، ناشاد اور غیر متوازن ہوگئی ہے مکمل اخلاقی انارکی ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جو کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ قانون فطرت اور کائناتی نظام اخلاق کے خلاف ہے

میرے مشاہدات کے مطابق کمیونزم کی بنیاد مارکسی "دہریت" مسلمان قوموں میں بہت کم پھیل سکتی ہے نوجوان اگرچہ اسلامی قواعد و آداب مذہب سے زیادہ باخبر نہیں ہیں لیکن اسلام پر یقین کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ ترکان روس کو اپنی قومیت اور مذہب پر فخر و ناز ہے اور یہی ملی و قومی عصبیت ہے جس نے ان کو ابتک کمیونزم کے پیٹ میں ہضم ہونے سے بچا رکھا ہے۔ ذمہ دار حضرات نے ہمیں اطلاع دی کہ وہ چند مسلمان جو وزارت و عہدہ کیلئے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنتے ہیں مرنے کے پہلے اماموں کے ہاتھوں پر توبہ و استغفار کرتے ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، اسلام پر اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں اور مزاج شریعت محمدیہ کے مطابق مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہونے کی درخواست کرتے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ ایک فیصدی مسلمان بھی دہریہ نہیں ہیں چونکہ دہریت مارکسی مادیت کی جڑ اور ام الخبائث ہے۔ بنا بریں روس کی جنگجو تورانی قوموں کے انتہائی ظالمانہ قتل و غارت کے حالات میں بھی اسلام پر ایمان بحال رکھنا اعلیٰ ترین اہمیت کا واقعہ ہے اور ضرور ہے کہ آزاد دنیا بہ کمال توجہ ان کے مستقبل پر نظر رکھے۔

مجھے اس پر مطلق شک نہیں ہے کہ سوویت یونین اور ساری دنیا میں اصلی جنگ نہ صرف غلامی و آزادی کے درمیان بلکہ ربانیت اور دہریت، اخلاقی نظام اور اخلاقی انارکی کے درمیان جاری ہے۔ مسلمانان روس جو سوویٹ یونین کی سب سے بڑی غیر روسی قوم ہیں در اصل مارکسی دہریت اور روسی

سامراجیت کے خلاف "فوجی" نظریاتی و روحانی اعتبار سے سب سے زبردست مخالف طاقت ہیں۔

سوویٹ روس کسی حال میں ترقی و خوشحالی کی دوڑ میں آزاد دنیا کے برابر نہیں آسکتا کیونکہ یہ سرتا سر غلا
کی سلطنت ہے جس سے "آزادی" بالکل شہر بدر کردی گئی ہے، حالانکہ "آزادی" انسان کی انسانیت ترقی و
خوشحالی کی روح رواں ہے۔ چنانچہ روس آج فقدان رجال اور فقدان قیادت کے مرض میں مبتلا ہوچکا
اسٹالن کے بعد روس کے ہر شعبۂ زندگی میں آج تیسرے درجہ کے لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ ایک بھی
اول درجہ کا انسان موجود نہیں ہے جس میں پیدائشی قیادت کا جوہر ہو جیسا کہ لینن گراڈ اسٹالن میں تھ
اور بہ صرف لینن ٹراٹسکی اور اسٹالن جیسے پیدائشی قائدین تھے۔ جو خوف اور بے یقینی کی اس وسیع و
عریض سلطنت کو تاریخ کے اس عظیم ترین غلام کیمپ کو اور مشرق و مغرب کی مختلف نسلوں قوموں، تہذیبوں
اور مذہبوں کے اس "تاریک قید خانہ کو کچھ روز قائم رکھ سکتے تھے۔

ہم نے لوگوں میں احساس کمتری اور زوال کے نمایاں آثار دیکھے ہیں۔ روسی خود اس کا احساس و
کرتے ہیں کہ وہ چینیوں سے ہر اعتبار سے کم ہیں۔

روسی کہتے ہیں کہ چینی خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس ماوزی تنگ اور چواین لائی جیسے لیڈر ا
انکی پیٹھ پر متحدہ پارٹی ہے۔ میں نے یہ احساس کمتری ماسکو میں بھی پایا۔ روس میں آج کوئی نہیں ہے جو اسٹا
کی جگہ لے سکے۔ اور لیڈر کے جانشینوں میں سخت افتراق و انتشار برپا اور شدید بدگمانی اور رقابت
ظاہر ہو چکی ہے۔ مالوتوف مالن کوف شیپی لوف اور کاہنگا نووچ کا حکومت سے ڈرامائی اخراج اس وقت
ہوا جب ہم روس میں موجود تھے۔

یہ داخلی افتراق اور جنگ قیادت کا کھلا مظاہرہ ہے۔ غالباً اس کمزوری کا ذمہ دار خود اسٹالن
کیونکہ وہ نہایت حاسد تھا۔ اُس نے تمام اول درجہ کے لوگوں کو اپنے راستہ کا کانٹا جان کر صاف
کر دیا۔ جو کسی طرح اس سے نمایاں ہو رہے تھے۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ یہ کمزوری خود سوویٹ سسٹم
فطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ یہ انسان کے دماغ، تعلیم، معیشت اور زندگی کی مکمل بندش اور قید کا نظام
جس کے ماتحت اول درجہ کے لوگوں کا ابھار اور اٹھان ناممکن نہیں تو محال ہے۔ زوال اور انتشار
جراثیم خود اس سسٹم کے باطن میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ نظام مکمل طور پر اس صحت مندانہ انفرادیت، آزادی
اور مسابقت کو ختم کر دیتا ہے جو عظمت، قیادت، تغیر و ترقی کی بیج اور بنیاد ہیں۔

سوویٹ یونین کے یقینی زوال اور انتشار کی ایک دوسری وزنی وجہ یہ ہے کہ روس آج نہ صرف انفراد
اور شخصیت کا قبرستان بلکہ قوموں مذہبوں اور تہذیبوں کا قید خانہ بھی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک
آزادی کی جنگ لڑنے کی تیاری کر رہا ہے اور دوسری عالمگیر جنگ کی طرف امید کی نظروں سے د
رہا ہے۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ جنگ روسی آہنی پردہ کو پاش پاش کر دے گی۔ قید خانہ اقوام
دیواروں کو گرا دے گی اور آزادی کی صحت بخش و روح افزا نسیم کی درآمد کا راستہ ان پر کھول د
میری رائے میں سوویٹ نظام کی سب سے بڑی کمزوری جو اس کو اندر سے شکست و ریخت کی

رہی ہے اخلاقی اور روحانی بنیاد کا فقدان ہے۔ یہ کمی سوویٹ نظام کی مارکسی اصل و نہاد کے ث ہے۔ تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ کوئی عمرانی نظام باقی نہیں رہ سکتا تا وقتیکہ اس کی جڑیں آزاد انسانوں دلوں اور ضمیروں میں پیوست نہ ہوں۔ جو نظام زندگی محض اوپری جبر اور زور سے مسلط کیا جاتا ہے جبر اور زور سے ہی فنا ہو جاتا ہے۔ سوویٹ یونین ایک ایسا ہی جابرانہ نظام ہے۔ سوویٹ نظام تمام نمایاں نقائص "کمزوریاں" اور تضاد اس کے مارکسی اصل و بنیاد سے پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں تک نظام مارکسی دہریت اور مادیت پر مبنی ہے۔ یہ انسان کی انسانیت اور فطرت کی مکمل نفی ہے۔

انسانیت اور انسانی فطرت جو (۱) عقلیت (۲) روحانیت (۳) اخلاقیت اور (۴) عمرانیت سے ب ہے اور مارکسیت ان میں سے ہر ایک کے بالکل متضاد اور مخالف ہے۔

سوویٹ نظام نے ایک طرف ہر قسم کی الوہیت کا انکار کیا ہے لیکن دوسری طرف مارکس کو نہ صرف صمت بلکہ الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے مارکس کو نعوذ باللہ اپنا خدا رسول اور پوپ لیم کیا ہے، اور ایک ایسی خلاف عقل جنون پرستی کو فروغ دیا ہے جو ہر قسم کے تعصبات سے بڑھ چکی ۔ روس کیلئے اس وقت تک کوئی امید نہیں ہے جب تک وہ اس مٹی کے جھوٹے خدا کو تخت سے ندھے منہ گرا کر بالکل پاش پاش نہ کر دے۔ جب تک مارکس پرستی کے اس باطنی روگ سے شفا صل نہ ہوگی سوویٹ سسٹم کے بقا کی کوئی امید نہیں ہے۔ داخلی تصادم تضاد اور ٹکراؤ سے اسکا سل سقوط و ہبوط لازمی ہے۔ داخلی یا خارجی حملہ اور سقوط کا خوف سوویٹ قائدین کے ہر خیال و عمل سوار ہے۔ جنگ کے خلاف عالمگیر پروپگنڈا اور تحریک امن کی بنیاد بھی ہلاکت کا خوف ہے لیکن ایک سان جو خود اپنی "خودی" کے ساتھ برسر جنگ ہے یعنی اپنی عقلی اخلاقی عمرانی اور روحانی قوتوں کے خلاف صف آرا ہے، کسی حال میں امن حاصل نہیں کر سکتا۔ "ظاہری" اور خارجی امن کے پہلے طنی" اور "داخلی" امن قائم کرنا ضروری ہے۔ ایک انسان جو اپنی "خودی" کے ساتھ صلح و سلامتی ہیں رکھتا ہرگز دوسروں کے ساتھ صلح و سلامتی نہیں رکھ سکتا اور روس کی تاریخ سے یہ ظاہر ہے اللہ رب العالمین کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بغیر جو بعینہ اسلام ہے امن حاصل نا قطعی ناممکن ہے۔

• ۱۹۳۰ء کے قریب تحریک پاکستان کے محرک اول اور مشرق کے شاعر و مبصر فیلسوف اعظم کٹر سر محمد اقبال نے فرمایا تھا:—

"کہ روس جیسی گہری مذہبیت رکھنے والی قوم کسی مارکسی "دہریت" جیسے ایک منفی عقیدہ پر قانع نہیں رہ سکتی اور انجام کار یا تو کمیونزم روس کو نگل جائے گا یا کمیونزم اسلام کو ہضم کر جائے گا۔ لیکن اقبال نے اعلان کیا ہے اسلام خود تقدیر عالم ہے اور کسی دوسری تقدیر کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

وس اور مشرق اوسط کے مشاہدات سے اس اقبالی پیشین گوئی کی مکمل تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔

آج ایشیا اور افریقہ کے سامنے حقیقی سوال اسلام یا کمیونزم کا سوال ہے اور اس کے فیصلہ پر انسانیت کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔

ختم کرنے سے پہلے روسی عوام کو خراج تحسین ادا کرنا میرا فرض ہے۔ میری تنقید اقوام روس کے خلاف نہیں بلکہ مارکسی دہریت اور جابریت کے خلاف ہے۔

میں روسیوں کی سادگی، مہمان نوازی، پرجوش گرم دلی و مہربانی، خدمت گذاری اور ضبط و ادب، سے بے حد متاثر ہوا۔ روسی عوام قابل محبت قوم ہے۔ ان میں مغربی یورپ کی قوموں جیسا احساس برتری نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ روسی قوم ملحدانہ مارکسی جابریت سے نجات و آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے۔ جو انسانوں کو حیوانیت اور انسانیت سے عاری بنا رہی ہے، اور جو عملاً زاریت اور تاریخ کے تمام قدیم ظالمانہ نظاموں سے ہزار گنا بدتر ہے۔

رضا اللہ خاں رضا ٹونکی

کیا ہے تو

نہ کر گمان کہ عمر گریز پا ہے تو
ثباتِ عالمِ ہستی کا مدعا ہے تو

ترے وجود سے ہے کائنات کی زینت
بیانِ احسن تقویم کی جلا ہے تو

نظامِ عدل کا اجرا ہے تیرے ہاتھوں میں
جہانِ عقل میں سرچشمۂ ھدیٰ ہے تو

جہاں کی راہنمائی ہے تیرا فرض اہم
کہ اک ہدایتِ کامل کا واسطا ہے تو

تری وفا ہے حریمِ جمال میں مقبول
کسے نصیب وہ عالم جو دیکھتا ہے تو

بایں نیاز سر بندگی خدا شاہد
امامِ خلق ہے عالم کا مقتدا ہے تو

ترے ارادہ کے محکوم ہیں زمان و مکاں
کہ ارتقائے دو عالم کی انتہا ہے تو

متاعِ دہر تو پاسنگ بھی نہیں تیری
صفا و صدق کا وہ دُرِ بے بہا ہے تو

کوئی عروج تری دسترس سے دُور نہیں
قدم اٹھا کہ فلک رس ہے برق پا ہے تو

صفائے دامنِ انسانیت کا داغ نہ بن
کہ چشمِ جن و ملائک میں باصفا ہے تو

شعر العرب

محمد بن عباد
(معتصم باللہ کے دربار کا نامور شاعر)

وزھدنی فی النّاس معرفتی بھم
وطول اختیاری صاحباً بعد صاحب

میں نے بہت دنوں تک ایک آدمی کے بعد دوسرے آدمی کا تجربہ کیا، اور لوگوں کو پہچانا، اس چیز نے میرا دل دنیا سے کھٹا کر دیا۔

فلم ترنی الایّام خلاً تسرّنی
مبادیہ الاساء فی العواقب

زمانہ نے مجھے ہمیشہ ایسے دوست دکھائے کہ جن سے مل کر آغاز میں خوشی ہوئی مگر اُن کی دوستی کا انجام بڑا بُرا نکلا

ولا قلت ارجوہ لدفع ملمۃٍ
من الدّھر الا کان احدی المصائب

جب بھی میرے دل میں یہ آیا کہ فلاں دوست میری مصیبت کو دور کر سکتا ہے، مگر ہوا یہ کہ وہ خود ایک مصیبت بن گیا!
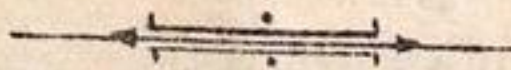
رشید ارشد

.... اللہ اللہ!

زباں پر مری، تیرا نام اللہ اللہ
خوشا میں، یہ میرا مقام اللہ اللہ!

★

اب اس سے بھی دلچسپ کیا بات ہوگی
وطن میں ہے غربت کی شام، اللہ اللہ

★

کہا شیخ نے بس عبادت یہی ہے
رکوع و سجود و قیام، اللہ اللہ

★

یہ بزمِ طرب، رقص، مے، جام و مینا!
حضور آپ کا انتظام، اللہ اللہ!

★

یہ دیوار گلشن ہیں کیسی ہے ارشد
جنوں کی ہے یہ روک تھام... اللہ اللہ!

کوثر نیازی

غزلیں

○

بے غرض، بے لوث پاکیزہ رفاقت چاہیئے!
اے ہجومِ دوستاں! مجھ کو محبت چاہیئے!

کون جانے! کب وہ ٹھہرائیں ہمیں شایانِ لطف
ہر گھڑی اجڑے ہوئے دل کی یہ حالت چاہیئے

حُسن خود نکلے گا بہرِ جستجو دیوانہ وار
اے جنونِ عشق! بس تھوڑی سی غیرت چاہیئے

چند لمحوں کا نہیں ہے۔ عمر بھر کا کام ہے
ہر قدم پر راہِ الفت میں عزیمت چاہیئے

مسکرا کر بس یہ فرما دیجئے ہم کو قبول!
آپ سے نقدِ دل و جاں کی یہ قیمت چاہیئے

ہر نفس آلام آگیں ہیں، ہر گھڑی رنج و محن
اس نظامِ ظلم پرور سے بغاوت چاہیئے

شاعری کوثر نہیں آساں اس کے واسطے
رنگِ اصغر چاہیئے۔ اندازِ حسرت چاہیئے

○

خیالِ ترکِ الفت ہم نشینو! آ ہی جاتا ہے
وفورِ یاس ہو تو آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

ہمیشہ سطحِ دریا ایک حالت پر نہیں رہتی
سفینہ تند موجوں سے کبھی ٹکرا ہی جاتا ہے

تباہی کی گھڑی شاید زمانے پر نہیں آئی
ابھی اپنے کئے پر آدمی شرما ہی جاتا ہے

نہیں ترکِ خرامی کارواں کی بے سبب کوثر!
خموشی سے جو اٹھتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

فردوسِ تغزل

مخمور سعیدی

○

بے نیازِ خلشِ دل نہیں ہونے پاتے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

وسوسے جن سے ہوئیں عقل کی راہیں مسدود
عشق کی راہ میں حائل نہیں ہونے پاتے

تنگِ منزل ہیں وہ منزل پہ پہنچنے والے
جو چراغِ رہِ منزل نہیں ہونے پاتے

حاصلِ زندگیٔ عشق وہی لمحے ہیں
زندگی بھر بھی جو حاصل نہیں ہونے پاتے

جی رہے ہیں جو ترے غم کی نگہبانی میں
عشرتِ زیست پہ مائل نہیں ہونے پاتے

ہم وہ مانوسِ غمِ موجِ تلاطم ہیں کہ جو
خوگرِ عشرتِ ساحل نہیں ہونے پاتے

لاکھ بیگانہ بنیں لاکھ تغافل برتیں
وہ مرے حال سے غافل نہیں ہونے پاتے

فرصتِ عیش تو کیا اب ہے یہ عالم مخمورؔ
غم کے لمحات بھی حاصل نہیں ہونے پاتے

انوار انجم

○

کچھ دن سے تیرے غم میں کمی پا رہا ہوں میں
شاید کہ اب حیات سے اُکتا گیا ہے دل

کس کس کو رازدار بناؤں جہان میں
کس کس کی بزمِ ناز میں دہراؤں حالِ دل

نہ کوئی یاد آتا ہے نہ کچھ اپنی خبر مجھکو
یہ کس منزل پہ لے آیا مرا ذوقِ نظر مجھکو

یہ میری سادگی دیکھو انہی کو دوست کہتا ہوں
فریبِ دوستی دیتے رہے جو عمر بھر مجھکو

ہمیں بھی مسکرانے کی ہے خواہش
مگر حالات سے مجبور ہیں ہم

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ذکرِ بہاراں
کہ اب گلشن سے کوسوں دور ہیں ہم

روحِ انتخاب

افراد میں جاہلی مغربی اخلاق اس طرح سرایت کرتے جارہے ہیں، جس طرح درختوں کے رگ و ریشہ میں پانی اور تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں مغربی مادیت پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، خواہشاتِ نفس کی اندھادھند پیروی، زندگی کی نہ بجھنے والی پیاس اور نہ مٹنے والی بھوک اس قوم میں پیدا ہوتی جارہی ہے جس کے نزدیک آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے، مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت کا خیال روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے اور حیات دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھتی جارہی ہے، اعزاز و فخر و جاہ کے حصول میں اور سربلندی اور سرفرازی کی کوشش میں بلند حوصلہ اور ترقی پسند مسلمان یورپ کے ترقی یافتہ لوگوں کے نقش قدم پر گامزن ہے، اصول و اخلاق پر فوائد اور مصلحتوں کو ترجیح دینے کا مرض پھیل گیا ہے، مادی قوموں کی تقلید میں ظاہری نمائش اور کھوکھلے مظاہر کی گرویدگی بڑھ گئی ہے، انسانوں کی بندگی، قوت اور دولت کے سامنے سرافگندگی اور "شاہ پرستی" میں کہیں کہیں یہ موحد اور مجاہد اُمت مشرک اور غلام طینت قوموں سے زیادہ ممتاز نظر نہیں آتی۔ (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

داعئ دین کے ذاتی اوصاف کے سلسلہ میں ایک آخری اور بنیادی وصف استغناء ہے جس کے بغیر تبلیغ کا وقار اور احترام قائم نہیں رہ سکتا، لالچی اور خود غرض انسان کبھی میدانِ تبلیغ کا مرد نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بے باکانہ تبلیغ کرسکتا ہے، گویا خشیت اللہ کے بجائے خشیت الخلق، درحقیقت لالچ اور طماعی ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور مبلغ کے قلب میں جب اپنے مستفیدوں سے طمع پیدا ہوگئی تو یقیناً وہ اُن کا محتاج ہوگیا اور محتاج انسان کمزور ہوتا ہے، اس لئے اس میں تبلیغ حق کی جرأت پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور نہ وہ مخاطبوں پر اچھا اثر قائم کرسکتا ہے۔

آز بگذار و بادشاہی کن

اس لئے مبلغ کا سب سے بڑا جوہر استغناء اور خودداری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے تبلیغی مساعی کے سلسلہ میں خوف و خشیتِ الٰہی اور اتباعِ رسالت کا وعظ سُنانے سے پیشتر اپنے جس جس وصف کا کھول کھول کر اعلان کیا وہ سوائے استغناء کے دوسری چیز نہ تھی، چنانچہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تبلیغی مواعظ کے سلسلہ میں قرآن نے سب کا ایک ہی قول نقل کیا ہے۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ

میں اِس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(مولانا قاری محمد طیب)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

روس کے شعبدہ باز سائنس دانوں نے "سیارے" فضا میں کیا چھوڑے کہ بیچارے آئزن ہوور کو امریکہ میں اپنی ساکھ باقی رکھنی مشکل ہوگئی، وہاں کے عوام اپنے پریسیڈنٹ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم بھی روس کے "سیاروں" کے جواب میں کوئی "سیارہ" منظر عام پر لاؤ روسی راکٹ، چاند کو چھو کر دم لے گا، تو ہم امریکہ والوں کے "سیارے" کو کم سے کم مریخ و عطارد سے ٹکرا جانا چاہیئے، یہ "سرخ" ہم "سفید فاموں" سے سائنس میں آگے کس طرح بڑھ گئے! ہمارے سائنس داں اب تک خواب خرگوش میں کیوں مبتلا رہے! اس میدان کے شہسوار تو اب تک ہم تھے، اور اب روس کے "دو سیاروں" کی بدولت ہم "پیدل" بنے جا رہے ہیں! یہ آخر ہوا کیا؟ امریکہ کی علمی عظمت کے جھنڈے سرنگوں کیوں ہوگئے! اے واشنگٹن اور ولسن کی روحو! تم اگر ہماری فریاد سن سکتی ہو، تو ہماری کچھ امداد کرو!

امریکہ کے سائنس دانوں کی غیرت بھی سُنا ہے کہ جوش میں آگئی ہے۔ اور بس کوئی دن جاتا ہے، سُن لیجئے گا کہ روس کے نہلے پر امریکہ نے اپنا دہلا دے مارا! روس نے اپنے راکٹ میں "کتے" کو بٹھا کر بھیجا ہے امریکہ اس کے جواب میں "بلّی" کو افلاک کی خبر لینے کے لئے بھیجے گا "کتا" مانا کہ وفادار ہوتا ہے مگر "بلّی" کی طرح چالاک اور بے صبرا تو نہیں ہوتا!

وہ جو کسی شاعر نے کہا تھا:-

بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ ہم اُلو نہ ہوئے

تو روس کے اس "کُتے" کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھ دیکھ کر ختن کے ہرن کجلی بن کے ہاتھی، افریقہ کے ببر شیر ہمالیہ کی ترائی کے بارہ سنگھے اور نہ جانے کون کون جانور حسرت کر رہے ہیں کہ کاش! روس کے اس "کتے" کی تقدیر ہمیں مل جاتی!

اگر یہ تاریخی "کتا" روس میں زندہ واپس آکر مر گیا یا راکٹ ہی میں مردہ پایا گیا تو پھر اس کی قبر پر وہ عظیم الشان مقبرہ بنے گا کہ فنِ تعمیر اُس پر ناز کرے گا!

اگر ایسا ہو گیا تو پھر سُن لینا کہ روسی حکومت پاکستان کے کسی "آئے ہوئے مولوی" کی خدمات حاصل کریگی جو اس تاریخی کتے کے عرس کا بندوبست فرمائیں گے، اور یہ عرس اس دھوم دھام سے سال کے سال ہوا کریگا کہ بڑے بڑے میلے ٹھیلے اس کے آگے دب کر رہ جائیں گے، کتے کی قبر پر چادریں چڑھیں گی، چراغاں ہوگا، قوالوں کی چوکیاں حاضر ہوا کریں گی، "کتے" کے نام پر دیگیں پکا پکا کر لٹائی جائیں گی، اور ماسکو ریڈیو تمام دنیا بھر میں

ڈھنڈورا پیٹے گا کہ جس حکومت میں کتے کی قبر مرجعِ عقیدت بنی ہوئی ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں مذہب اور روحانی اقدار کی حفاظت نہیں کی جاتی!

روس کے راکٹ میں بیٹھ کر قمر و عطارد کی طرف اڑے پرواز کرنے والے کُتے! " تو سب لیڈروں سے زیادہ زندہ باد "

لوگ کہتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مسٹر شہید سہروردی پاکستان بننے کے بعد دو بار " شہید " ہو چکے ہیں، اُن کی پہلی شہادت مسٹر غلام محمد مرحوم کے دورِ آمریت میں واقع ہوئی جب وہ قانون کے وزیر تھے، اور دوسری تازہ ترین شہادت ابھی حال میں رونما ہوئی کہ وزارتِ عظمٰی کی کرسی سے وہ بیدخل کر دیئے گئے! شاید فانی نے انہی سہروردی صاحب کے لئے یہ مصرعہ اب سے کوئی تیس چالیس سال پہلے کہہ دیا تھا:-

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

سہروردی صاحب ہار ماننے اور نچلے بیٹھنے والے نہیں ہیں، وہ سال میں دس بار بھی اس طرح " شہید " ہوتے رہیں کہ منصب اُن کو ملا اور پھر چھن گیا، حکومت کی کرسی پر وہ براجمان ہوئے اور پھر کرسی موتھوں کے غائب یہ کیا اے مظہر العجائب! " کا معاملہ پیش آ گیا ــــ لیکن " کرسی " کی تمنا اُن کے دل سے نکل نہیں سکتی، لیلائے حکومت کے وہ ایسے قیس ہیں کہ بگولوں کو دیکھکر ہی دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ یہ محملِ لیلیٰ ہے جو اُن کی طرف بڑھا جلد آ رہا ہے!

سہروردی صاحب انگریزی زبان کے ایک طرف جادو بیان مقرر ہیں، اور دوسری طرف " ڈانس " میں بُلبُل چودھری اور مس آزوری کے " ہم ذوق " اور " ہم فن " ہیں! لوگوں کے حافظہ سے یہ بات مشکل ہی سے محو ہو سکے گی کہ پاکستان کی وزارتِ عظمٰی کے منصب جلیل پر ایک رقاص وزیرِ اعظم بھی فائز رہ چکا ہے!

پبلک اور اخبار نویسوں کو عوامی لیگ کی سابق حکومت کی ایک ایسی " نازک رگ " ہاتھ آ گئی ہے کہ جس کے ذرا سے چھو جانے سے عوامی لیگ کے بڑے لگ اور چھٹ بھیا سب کے سب تلملا جاتے ہیں بلکہ بوکھلا اُٹھتے ہیں! عوام کا مطالبہ یہ ہے کہ سہروردی صاحب کے دورِ حکومت میں تجارت کے جو پرمٹ اور لائسنس دیئے گئے ہیں، اُن کی تحقیقات کرائی جائے! اس پر عوامی لیگیوں کی طرف سے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ تحقیقات سہروردی صاحب کے دورِ حکومت ہی تک کیوں محدود رہے۔ پاکستان جب سے وجود میں آیا ہے، اُس وقت سے اب تک کی تمام حکومتوں کے کارناموں کی جانچ پڑتال کی جائے! بات بہت معقول اور جواب سونی صدی درست ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس " جواب " میں اقرارِ جرم جھلک رہا ہے۔

ادھر لا ہاتھ، مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

تماشائی عرض کرتا ہے کہ اس قسم کے جواب کو " الزامی جواب " کہتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے

کوئی چوری کا ملزم عدالت میں حاضر ہوکر مجسٹریٹ سے درخواست کرے کہ حضور! میرے مقدمہ کی سماعت کیساتھ تمام اگلے پچھلے چوروں پر بھی فردِ جرم لگنی چاہیئے اس حمام میں میں اکیلا ہی ننگا تھوڑی ہوں! مگر ملزم کی اس نشاندہی سے اُس کے مقدمہ کی سماعت تو ملتوی نہیں کی جاسکتی! انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ "Red-handed" ملزموں کے مقدمات کی سب سے پہلے سماعت کی جائے! کسی چور کے یہ کہہ دینے سے کہ میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی چوری کی ہے، اس "چور" کا جرم تو ہلکا نہیں ہوجاتا!

اب تک شاعروں کے وطن کی اس قسم کی نسبتوں ــــ لیبوی، بھیرڈوی، منٹگمروی، کھیتڑوی، گدوبندری، جمرگنجوی ــــ سے اہل ذوق متوحش تھے کہ پاکستان میں ایک سیاسی لیڈر کے نام کے ساتھ "لونڈخور" کی نسبت دیکھ کر اور سُن کر سامعہ پناہ مانگنے لگا کہ یا اللہ! یہ کیا سُننے میں آرہا ہے! تماشائی نے سب سے پہلے "ٹنڈوآدم" جب سُنا تو ہونٹوں پر بیساختہ مسکراہٹ آگئی مگر "لونڈخور" سننے کے بعد وہ دم بخود ہے کہ کہے تو کیا کہے! سوائے اس کے کہ سُنی کو ان سنی کرے۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے"۔ ایک مسافر نے دریافت کیا

"جی! یہ سڑک کہیں نہیں جاتی، یہیں پڑی رہتی ہے"۔ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

ندیم ہاشمی

وضو کرکے!

ٹن ..... ٹن ..... ٹن شہر کے گھنٹہ گھر نے تین بجائے۔ سیٹھ قاسم علی نے جواب حاجی قاسم علی ہو گئے تھے اپنی ساٹھ سالہ پرانی عینک کو ناک کی ہڈی سے ذرا اونچا کرکے سامنے کی دیوار پر نگاہ ڈالی تو ان کے گھڑیال میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ وقت تنگ ہو رہا تھا۔ میل کو ٹھیک پانچ بجے اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ سیٹھ جی نے منشی جی کو ذرا ترشی سے آواز دیکر کہا۔

"منشی جی"

سیٹھ کی آواز سنتے ہی منشی برکت کے دل کی دھڑکنیں رفتارِ قلم کے ساتھ ساتھ تیز تر ہو گئیں۔ آج نومبر کی بیس تاریخ ہو چکی تھی اور تین روز قبل سیٹھ قاسم اس سے صرف اتنا کہہ کر کراچی روانہ ہو گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس نومبر تک انکم ٹیکس کے لئے حساب بنا کر رکھو۔ منشی برکت سیٹھ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ آہ! آٹھ بچوں کا باپ آج کس آزمائش میں مبتلا تھا۔ مصائب کا طوفان ابھی تھما ہی تھا کہ غریب منشی کی کشتی ایک بھنور میں پھنس گئی۔ پانچ بچے تعلیم کی مختلف منازل کو طے کر رہے تھے بشکیلہ کی شادی سر پر تھی۔ جس پر ہونے والے کم سے کم اخراجات بھی اس بدنصیب کی کمر توڑنے کو کافی تھے۔ دو بچے ابھی معصوم تھے۔ اور اپنے باپ کی مصیبتوں کا اس سے زیادہ کوئی جواب نہ دے سکتے تھے کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سیر کے لئے جا کر اپنی توتلی زبان سے چند معصوم سوالات کرکے اس کا دل بہلا دیا کریں۔ پانی کی طرح روپیہ بہانے کے بعد ڈیڑھ سال سے تپ دق کی مریض بیوی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ جائداد گردشِ زمانہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھی وقت نے گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ عزیز و اقربا، بیسویں صدی کے اس خوفناک طوفان کی نذر ہو چکے تھے، جسے محلات میں بسنے والے ۱۹۴۷ء مبارک دن سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن منشی برکت کے لئے وہ دن اپنے تیس سالہ جوان بھائی صادق کی لاش کو ایک کہنہ درخت کی خزاں رسیدہ شاخ پر الٹا لٹکتے ہوئے دیکھنے کا دن تھا۔ جس کا کٹا ہوا سر خاک پر پڑا "اپنے بھائی" کے آنسوؤں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ منشی برکت کے لئے وہ دن اپنے قریب ہی بہنوئی کے مکان سے بہن کی فلک شگاف چیخیں سننے کا دن تھا۔ جب کہ انسان نما درندے گردوارے سے نکل کر قومی عصبیت کا جنازہ پڑھ رہے تھے۔ منشی برکت کے لئے وہ دن اپنے دو سالہ معصوم بھانجے کی لاش کو پہلے فضا میں نیزے کی نوک پر اور پھر اپنے ہی گھر کے صحن میں گرتا ہوا دیکھنے کا دن تھا۔ جس کے پیٹ سے انتڑیاں نکل کر قومی حمیت کو داد جمود دیتی ہوئی زمین پر پھیل گئیں۔ منشی برکت کے لئے وہ دن اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی سے مایوس ہو جانے کا دن تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے گاؤں

کے چوہدری برکت سے سیٹھ کا منشی برکت بنا تھا، اسے اپنی خوددار طبیعت پر ذلت آمیز چوٹیں سہنا تھیں۔ چوہدری برکت گاؤں والوں کے لئے رحمت تھا لیکن آج اسے دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی کے دن پورے کرنے تھے۔ وہ خوشحال تھا۔ دولتمند تھا۔ صاحب شان وشوکت اور قدر ومنزلت کا مالک تھا۔ لیکن آج اسے نو سال تک دردر کی ٹھوکریں کھا کر سیٹھ قاسم کے درِ دولت پر پیشانی رگڑنا تھی۔ وہ یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کا ہمدرد تھا لیکن آج اسے ایک نفس پرست کے ہاتھوں پر بیعت کرنی تھی۔ اس کا ہاتھ تنگ دستوں پر فراخ اور ضرورت مندوں کی آخری امیدگاہ تھا۔ لیکن آج اسے تنگ دل اور کم ظرف قرضخواہوں کی دھمکیاں اور ملاحیاں سننی تھیں، قادر مطلق نے شاید اسی روز کے لئے اسے خونخوار انسان نما بھیڑیوں کے منہ سے بچایا تھا۔ کاش ان چیتوں نے اسے اسی روز پھاڑ کھایا ہوتا تو آج وہ ان اژدہوں کے منہ میں نہ ہوتا جو انسانیت کو نگل کر اگل دیتے ہیں اور اگل کر پھر نگل جاتے ہیں۔

مگر آہ! مقدر کا ستارہ کسی کی خواہش پر اپنی سمت نہیں بدلتا، عین اس وقت جب کہ سکھ درندے چوہدری برکت کے عزیز واقربا کو جو سب کے سب اس کے بہنوئی کے مکان پر جمع ہو گئے تھے مرغ بسمل کی طرح تڑپتا ہوا چھوڑ کر اس کے مکان کی دیوار پر چڑھ رہے تھے۔ تو کچھ پاکستانی سورماؤں کو اسے بچا لینے کی شرارت سوجھی اور انھوں نے ایک سکھ کو گرا کر باقیوں کو بھگا دیا۔ اور چوہدری کو مع اہل وعیال سرزمین پاکستان میں لے آئے۔ اس وقت اس کے ساتھ پانچ بچے اور ایک بیوی یعنی گھر کے کل سات افراد تھے، وطن سے کچھ زیور اور نقدی بچا کر لائے تھے لیکن وہ پانچ سال کی مسلسل بیکاری کی نذر ہو چکے تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ کسی کے آگے دست سوال دراز کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن چودھری کی غیرت اور خودداری آڑے آئی۔ دو سال کیمپوں میں گذارنے کے بعد بصد مشکل ایک تنگ وتاریک، آبادی سے دور کچے مکان میں سر چھپانے کو جگہ تو مل گئی۔ لیکن وائے قسمت جتنا تھوڑا بہت سرمایہ تھا ہر طرح کی کوشش اور دوڑ دھوپ کے باوجود دکان نہ مل سکی۔ اور چودھری برکت کو نہ معلوم خدا نے کیسی سخت جان دی تھی۔ کہ ہر آزمائش سے گذر گیا۔ ہر ابتلا کا سامنا کیا۔ ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر گیا۔ لیکن اپنی دینی غیرت اور اصول زندگی بیچنے کیلئے تیار نہ ہوا۔ پانچ سال بعد جب سرمایہ ختم ہوا۔ تو کار پردازان حکومت سے لغزش ہو گئی اور سرکاری قلم جنبش میں آ کر چودھری کے نام ایک دکان الاٹ کر گیا۔ لیکن اب تو گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ مجبوراً دکان واپس کر کے نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھرنا پڑا۔ دو ماہ کی فاقہ کشی کے بعد ایک سرکاری ٹھیکیدار کے ہاں سو روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی۔ گھر والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور زندگی اب قدرے سکون سے بسر ہونے لگی۔ لیکن آہ! مصائب کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا۔ کشتی بھنور سے نکلی ہی تھی۔ کہ طوفان باد وباراں نے آگھیرا۔ ابھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ کہ ٹھیکیدار کے پاس کرم خاں ایس ڈی۔ او نے اپنا آدمی بھیجا کہ اسے اپنے یہاں کوئی نہ کوئی ملازمت دے کر ہماری خوشنودی حاصل کرو، بس اب کیا تھا۔ ٹھیکیدار پہلے ہی اپنی بددیانتیوں اور بے اعتدالیوں کی راہ میں چودھری کو رکاوٹ سمجھتا تھا۔ اسے چودھری کے صاف وشفاف آئینۂ حیات میں اپنی بے اصول زندگی کا عکس دیکھنا تو پہلے ہی ناگوار تھا۔ ایس۔ ڈی۔ او کی سفارش نے اسے ابھار دیا۔ اور اس نے فوراً اپنے محنتی اور دیانتدار ملازم کو غلط سلط بے بنیاد الزام لگا کر نکال دیا۔

چودھری کا سفینۂ حیات پھر سے ہچکولے کھانے لگا۔ دنیا اس کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ آزمائشوں پر آزمائش، طوفانوں
پر طوفان، مصیبتوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے پر نہیں آتا۔ حادثاتِ زمانہ نے چودھری کو بہت لاغر کر دیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اندر
دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی سرخی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رخسار پچک گئے تھے۔ عمر اگرچہ چالیس پینتالیس سے زیادہ
نہ تھی لیکن بڑھاپے کے آثار ابھی سے نمایاں تھے۔ البتہ اس کا دل ابھی جوان تھا۔ اس کے لہو میں حرارت باقی تھی۔ وہ
جرأتِ ایمانی کا مجسمہ عزم و ارادہ کی چٹان تھا۔

وہ اپنے مضبوط ارادوں کو لیکر پھر سے تلاشِ روزگار میں نکل کھڑا ہوا۔ اور آج سے ڈیڑھ سال قبل اسی شہر میں
داخل ہوا جہاں اب وہ سیٹھ قاسم کا منشی ہے۔ شہر بھر میں حاجی قاسم علی کی بزرگی، پرہیزگاری اور سخاوت کا چرچا تھا۔
گرد و نواح کے لوگوں پر اُن کے زہد و تقویٰ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ حاجی جی نے شہر میں تین تین چھوٹی چھوٹی اور ایک بہت
بڑی سہ گنبدہ مسجد بنوا کر امیر و غریب کے دل میں مقام حاصل کیا تھا۔ ہر سال محفلِ میلاد کا اہتمام کرتے جس میں ملک کے بڑے
بڑے علمائے حقیقت، پیرانِ طریقت اور طالبینِ معرفت، زہد و تقویٰ کے امام، علمبردارانِ دین بھاری نذرانوں کی پیشکش پر آتے
اور رونقِ محفل کا باعث بنتے۔ خانقاہ روحانیت کے یہ اجارہ دار بھی اپنی احسانمندی، وفا شعاری اور نمک حلالی
کا پورا پورا ثبوت دیتے۔ جلسوں اور تقریروں میں سیٹھ صاحب کے گن گاتے، اُن کی تعریفوں کے پل باندھتے۔ اور خدا و
رسول کی حمد و ثنا سے پہلے سیٹھ قاسم کی حمد و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے۔ سیٹھ قاسم کی کاروں کو
وہ بُراقِ ارضی کا خطاب دیتے۔

اور سیٹھ قاسم کے خاموش اشاروں کو "اسرارِ معرفت" کہتے۔ انہی دنوں میں سیٹھ جی بارھویں شریف کی تقریب
میں شاندار دعوت کا اہتمام فرماتے جس میں بڑے بڑے افسروں اور سرمایہ داروں کو بلایا جاتا، روغنی پر تکلف کھانے
قیمتی موٹروں کی نمائش، افسروں کے لئے سیر و شکار کا انتظام، غرض "صاحب الفقر فخری" کی یاد میں ٹھاٹ باٹ کا پورا پورا
بے حد مظاہرہ کیا جاتا۔

شہر کے قریب ہی خواجۂ دو جہاں فخر الاولیا حضرت غریب نواز پیر شمس الحق تاشقندی کا مزار ہے۔ جن کی حیرت انگیز کرامات
اور بیش بہا برکتوں سے لوگ ایک عرصہ تک ناآشنا رہے۔ آج سے کوئی سات سال قبل سیٹھ قاسم کی نگاہ معرفت اور نگاہِ
لوگوں کو ان سے فیضیاب ہونے کا موقع عطا کیا۔ اور انہی ایام میں جبکہ ہر طرف محفلِ میلاد کے چرچے لوگوں کو کیف و عقیدت
سے لطف اندوز کر رہے تھے سیٹھ قاسم نے مزار کی بے رونق چار دیواری کو ایک عظیم الشان خانقاہ میں تبدیل کر کے
حضرت بندہ نواز کے سالانہ عرس کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ عرس محفلِ میلاد سے متصل تاریخوں میں ہوتا ہے جس کی لاکھوں
روپیوں کی سالانہ آمدنی سیٹھ جی کی تجوری کی زینت بنتی ہے۔ تجارت تو ان کا آبائی پیشہ تھا ہی لیکن اب وہ بہت
بڑے گدی نشین اور بزرگِ دین بھی بن گئے تھے۔ ہر سال ان دنوں میں اشیائے ضرورت کی مہنگائی زوروں پر ہوتی
تھی۔ میلے میں عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی وہ دلچسپیاں! تھیٹروں کا شوق، پیروں اور پیرزادوں کے نذرانے

دن چھپنے کو تھا۔ سورج دن بھر کے سفر سے تھک کر شب کی گود میں پناہ لینے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
اب تک دنیائے حرص و ہوس کو کوئی پیغام سنا تا رہا ہے۔ اور گمراہ انسانیت کو اپنے چشم دید واقعات سنا کر اب مایوس
ہو چکا ہے۔ چہرے کی زردی بتا رہی ہے کہ آدم زادوں کی اس بے توجہی کا انتقام لے کر چھوڑے گا۔ عین ممکن ہے کہ کل

مالک کائنات سے جو پیغام لیکر آئے وہ موت کا پیغام ہو۔ ہلاکت اور تباہی کا پیغام ہو۔ چوہدری برکت عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سیٹھ کی کوٹھی شہر سے باہر تقریباً چھ فرلانگ پر تھی۔ آج سارے دن مطلع ابر آلود رہا۔ آفتاب تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بادلوں کے جھرمٹ سے ظاہر ہوتا رہا لیکن ہر بار ابر رحمت آ کر اس کے چہرے کو ڈھانپ لیتا۔ اب بھی وہ اسی حالت میں چھپ جاتا۔ دن چھپ چکا تھا۔ شام کا دھندلکا تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن چوہدری ابھی تک یہ فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ سیٹھ کے پاس ابھی جانا بہتر ہوگا یا کل۔ آج کا سارا دن وہ شہر میں گھوم کر اور لوگوں سے مشورہ کرنے میں ضائع کر چکا تھا۔ دن کے آخر میں وہ اسی فیصلے پر پہنچا جس کا اسے صبح مشورہ دیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی موسم کی خرابی، راستے سے ناواقفیت، احساس اجنبیت، سیٹھ کی دولت اور عظمت کا رعب، وقت کی نامناسبت اور سفر کی تھکاوٹ نہ معلوم کیا کیا رکاوٹیں تھیں جو اس کے شوق و انتظار کی راہ میں حائل تھیں۔ ادھر معصوم بچوں کی یاد مریض بیوی کا خیال شکیلہ کی جوانی اور جوان لڑکوں کی ناتجربہ کاری رہ رہ کر ستاتی۔ آج روزی کی تلاش میں تین روز سے وہ گھر سے باہر تھا۔ اور اب وہ ایک لمحہ بھی بیکار ضائع کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ اچانک اسے کوئی خیال آیا۔ قریب کی مسجد میں مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے وضو کیا اور تمام نمازیوں کے ساتھ خود بھی اپنے رب کے حضور جھک گیا۔ نماز کے بعد اس نے فیصلہ کیا یہ اس کی روزی بلکہ یوں کہئے زندگی کا معاملہ تھا،

کھٹ. کھٹ... کھٹ. کسی نے رات کے اندھیرے میں کوٹھی نمبر ۲ جس میں سیٹھ قاسم علی رہتے تھے آہنی دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ سنانے کی رات اور سردی اس کڑاکے کی کہ خدا کی پناہ۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی بجلی کے کوندے لپکتے تو یوں محسوس ہوتا کہ سا کنان فلک میں سے کوئی سیاہ بادلوں کی پشت پر شعلہ و شرر کے آتشیں کوڑے برسا رہا ہے۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ عشاء کی اذان بھی ہونے والی تھی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے بجلی کے قمقمے کوئی آدھ گھنٹے ہوا بجھ گئے تھے سیٹھ کی کوٹھی بہت وسیع تھی۔ کوٹھی کی چار دیواری کے اندر کی عظیم الشان عمارت کے گرد اگرد خوبصورت کیاریوں میں رنگارنگ کے پھول لگ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ مگر خوبصورت راستوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوٹھی کی اچھوتی اور جدید طرز تعمیر کسی تجربہ کار اور ذہن نادرہ کار رکھنے والے انجنیئر کا پتہ دے رہی تھی عمارت اور اس کے لوازم کا حسن ترتیب دن کے وقت ہر دیکھنے والے سے داد حسن لیتا تھا۔ لیکن اس وقت تو اس جنت کو رات کے اندھیرے نے چھپا لیا تھا۔ کوٹھی کی چار دیواری میں سر بلند عمارت کے قریب ہی سیٹھ کی بنوائی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ جس میں ایک چراغ ظلمت شب سے برسر پیکار تھا۔ مسجد کی پشت سے متصل مولوی کریم داد امام مسجد کا گھر تھا۔ اور اسی کوارٹر کے کونے پر ایک حجرہ تھا جس میں ایک طالب علم دوست محمد رہتا تھا۔ جسے سیٹھ کے چوکیدار اور دوسرے نوکر چاکر "دوسو ملا" کہہ کر پکارتے تھے۔ دوسو مولوی صاحب کے پاس دورہ حدیث کر رہا تھا۔ موذن کے فرائض بھی اسی کے ذمہ تھے۔ مولوی صاحب سیٹھ کے یہاں تیس روپیہ ماہوار پر امام مسجد تھے۔ علاوہ ازیں سیٹھ صاحب سال بھر میں کبھی ازراہ عنایت گندم کی دو چار بوریاں بھی دیدیتے تھے۔ مولوی صاحب کی ایک بیوی دو بچے کل چار افراد تھے۔ پانچواں دوسو ملا بھی انہی کے ہاں سے کھاتا تھا۔

اور اس کا پانچ روپے ماہوار وظیفہ بھی سیٹھ صاحب مولوی صاحب کے حوالے کرتے تھے۔ سیٹھ کے تیس پینتیس
ملازم بھی ایک ایک دو دو روٹیاں صبح شام دے دیا کرتے، جس سے خاصہ گذارہ ہو جاتا۔ بازار میں خشک
روٹیاں تین آنے سیر میں بک جاتیں اور اس طرح ہر مہینہ مولوی صاحب کی جیب میں پچاس ساٹھ روپے
آجاتے جن سے وہ اپنے بیوی بچوں اور دوسو کی ضروریات کو پورا کیا کرتے۔

اس وقت خلاف معمول پھاٹک پر کسی کی کھٹ کھٹ سن کر چونک پڑے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے

"دوست محمد" مولوی صاحب نے مسجد کی دیوار کے قریب کھڑے ہو کر آواز دی۔

"ہاں جی! کہیئے" دوسو نے مسجد کا نلکا چلاتے ہوئے کہا

"بیٹا کیا کر رہے ہو؟ ذرا چراغ تو لے آنا۔ کمبخت بجلی کو آج نہ معلوم کیا ہو گیا اتنی دیر ہو گئی جلتی ہی نہیں
دیر سے ڈھیلا تلاش کر رہا ہوں ملتا ہی نہیں اور میں استنجے کے لئے سردی میں کھڑا ٹھٹھر رہا ہوں۔" مولوی
صاحب نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"مولی جی۔ ابھی لایا۔ نلکا چلا رہا تھا۔" اور تھوڑی ہی دیر میں دوسو چراغ لے آیا۔

کھٹ ۔۔۔ کھٹ ۔۔۔ کھٹ۔

"اس وقت آج کون آیا ہوگا۔ جب سے میں آیا مجھے یاد نہیں کہ ایسے وقت کوئی سیٹھ کے پاس ملنے
کے لئے آیا ہو۔ کوئی اجنبی ہوگا۔" دوسو نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔"

"کوئی تو ہوگا احمق۔" تم ذرا جلدی سے ڈھیلا ڈھونڈ لاؤ، جاڑے کے مارے میری تو جان پر بنی
توبہ میرے اللہ۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ ہمارے گناہوں کی شامت ہے یہ۔

"لیکن جی وہ تو بیچارہ سردی میں مر جائے گا۔" دوسو نے دو تین ڈھیلے دیتے ہوئے کہا

"میں جا کر چوکیدار کو نہ لے آؤں" دوسو نے ذرا توقف کے بعد بے چین ہو کر کہا۔

"تم بھی نرے احمق ہو۔ ارے پاگل وہ تو بالی دیوانہ ہوگا۔ دن بھر بازار میں پھرتا رہتا ہے۔ رات کو کبھی
کبھی اس طرف آجایا کرتا ہے۔ اگلے روز بھی میں نے اسے مغرب کے بعد بڑے شیشم تلے بیٹھا دیکھا تھا۔ تم جا
جلدی سے اذان دو۔ وقت ہو رہا ہے۔" اور مولوی صاحب ذرا دور جا کر ایک پودے کی اوٹ میں بیٹھ گئے

دوسو نے جلدی سے وضو کر کے اذان دی اور مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ہی وہ پٹھان چوکیدار
کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب فارغ ہو کر آئے تو دوسو غائب تھا۔

"اس جاہل کو کتنی بار سمجھایا کہ اذان کہنے کے بعد مسجد سے باہر چلے جانا مکروہ ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں
کوئی بات ٹکتی ہی نہیں۔" مولوی صاحب نے ڈھیلا پھینکتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ اور پھر وضو کرنے بیٹھ گئے
وضو کر کے بیٹھے ہی تھے کہ بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔

"ہوں! اب آئی کمبخت! جب ضرورت تھی تو اندھیرے میں مرمارتا رہا۔ اب جھک مارنے کے لئے آگئی"
مولوی صاحب رومال سے منہ پونچھتے ہوئے زیر لب بڑبڑائے۔ اتنے میں دوسو خان بابا ایک اجنبی کو ساتھ لے کر
مسجد میں داخل ہوئے۔ اجنبی کے چہرے پر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے اور سردی سے بڑا حال

"السلام علیکم مولانا" نو وارد نے مولوی صاحب کی وجیہہ شکل اور بارعب چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا
ساتھ ہی اپنے پھٹے پرانے سیاہ کمبل کو سنبھالتے ہوئے مولوی صاحب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔
"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کہیئے کیسے آئے۔ کس سے ملنا ہے۔ کیا کام ہے؟"
مولوی صاحب ایک ہی سانس میں چاروں جملے کہہ گئے۔
"مجھے سیٹھ قاسم علی صاحب سے ملنا ہے" اجنبی نے کہا۔
"لیکن وہ تو اس وقت آپ کو نہیں مل سکیں گے۔ آپ صبح تشریف لائیں ہم آپ کو ان کے مینجر سے ملا دیں گے۔
آپ کا پیغام سیٹھ صاحب کے پاس پہنچا دیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی ملاقات ہو جائے۔"
"لیکن میں تو ان سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ وہ نماز پڑھنے نہیں آئیں گے کیا؟" اجنبی نے اپنی پریشانی کو
...ظاہر کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
"نہیں وہ گھر پر ہی پڑھ لیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مسجد میں آ تو جاتے ہیں لیکن آج تو یقیناً نہیں آئیں گے۔"
"یہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ آج وہ نہیں آئیں گے" اجنبی نے پوچھا۔
"آج شام کو مجھے بھی ان سے کچھ کام تھا اور اس کے لئے میں نے ان کے ملازم خاص سے دریافت کیا تو معلوم
ہوا کہ آج ان کی انگلی میں جب کہ وہ اپنے بچے کو پھول توڑ کر دے رہے تھے ایک کانٹا چبھ گیا تھا جس کی انھوں
نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلا کر مرہم پٹی کرائی تھی۔ ڈاکٹر نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔"
"لیکن اس وقت ایک میل پیدل چل کر واپس جانا ان کے لئے انتہائی تکلیف ہوگا۔" دوسو نے فکرمند
ہوتے ہوئے کہا۔
"اچھی بات ہے! آپ خان بابا کو ساتھ لیکر جائیں شاید کام کی کوئی صورت نکل آئے۔" مولوی صاحب نے دوسو کی بات
پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے قدرے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
سیٹھ کے مینجر لطیف کا منشی قاضی کمال مسجد میں آچکا تھا۔ دوسرے چوکیدار، مالی اور خانسامے وغیرہ تو پہلے
ہی کافی دیر سے آئے ہوئے تھے۔ قاضی جی کے آتے ہی مولوی صاحب مصلے پر کھڑے ہو گئے۔
"نماز پڑھ لوں پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیں شاید کوئی صورت نکل آئے۔" ایک اجنبی نے صف میں کھڑا
ہوتے ہوئے کہا۔
"لیکن میرا خیال تھا کہ آپ سیٹھ صاحب کے آرام کرنے سے پہلے جائیں۔" مولوی صاحب نے کچھ مایوسانہ
انداز میں کہا۔ لیکن اجنبی کوئی جواب دئے بغیر اپنے پاؤں ہلانے لگا۔ نماز باجماعت پڑھانے کا فرض ادا کرتے
ہی مولوی صاحب نے سیدھی گھر کی راہ لی۔ البتہ دوسو تھا، چوکیدار، اجنبی اور دوسرے نمازی مسجد میں سنتیں
پڑھنے لگے۔
آج دوسو کو ایک اجنبی کے ساتھ مولوی صاحب کے سلوک پر بہت افسوس ہوا۔ وہ طبعاً نرم دل اور
مخلص و بے لوث تھا۔ لیکن اس کا ذہنی اور علمی معیار اتنا نہیں تھا کہ وہ اس خلافِ توقع سلوک کے پس منظر

اور پیش منظر کی گہرائی تک جا سکتا۔ وہ حیران تھا کہ مولوی صاحب نے اجنبی سے اس کا نام تک نہیں پوچھا لیکن
حیرت و استعجاب سے زیادہ کچھ سوچنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اور نماز سے فارغ ہونے تک یہ سب کچھ اس کے
ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ اور اپنی فطرت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہ اجنبی سے یوں گویا ہوا۔

دوسو۔ اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟ میرا تو خیال ہے آپ صبح ہی ملیں تو اچھا رہے گا۔۔۔۔۔ کیوں
چودھری جی آپ خاموش کیوں ہیں؟

چودھری برکت:۔ لیکن اس وقت جا کر پھر آنا مشکل ہوگا۔ بہتر ہے ابھی مل لوں۔

دوسو:۔ آپ جائیں گے کہاں؟ اگر مناسب سمجھیں تو رات مجھ غریب کی جھونپڑی میں بسر کریں۔ صبح ہوتے ہی
ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔

چودھری: لیکن آپ کو تکلیف ہوگی۔

دوسو:۔ اچھا تو میری خوشی کو آپ تکلیف کہتے ہیں۔ تو کیا میری خوشی اس میں ہے کہ آپ میری خواہش کو
ٹھکرا دیں۔

دوسو کے خلوص میں اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ چودھری نے اس کی بات مان لی۔ مختصر سا بستر
تو چودھری کے پاس تھا ہی۔ رات دوسو کی چارپائی پر گذار دی۔ دوسو نے اپنا بستر چٹائی پر بچھا دیا۔ کھا
آیا تو دونوں نے مل کر کھایا۔ دوسو اپنے مہمان کی خدمت کر کے بہت مسرور تھا۔ اسے مولوی صاحب نے
کئی مرتبہ بتایا تھا کہ حضورؐ اپنے مہمانوں کی بہت خاطر مدارات کرتے تھے، اور کئی کئی دن اس لئے فاقہ کش
میں گذار دیتے کہ گھر میں اپنے حصہ کے سوا مہمانوں کے لئے اور کھانا نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ دل ہی دل
خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ کہ حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کا ایک موقع مل گیا۔ اسے مولوی صاحب کے ہاں
سے اور کھانا منگوانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے کھانے میں سے د
مہمان کو خبر کئے بغیر کم سے کم کھائے۔

صبح نماز سے فارغ ہوتے ہی دوسو نے چوکیدار سے مل کر منیجر لطیف کے ذریعہ سے سیٹھ کو چودھری کی درخو
ملازمت بھجوا دی۔ چودھری کو انتظار گاہ میں بیٹھے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ انتظار کی ایک ایک گھڑی اُسے بڑ
طویل و صبر آزما معلوم ہو رہی تھی، متضاد قسم کے خیالات چودھری کے تصور میں گھوم رہے تھے۔ "ہاں" او
"نہیں"۔ نفی اور اثبات۔ دونوں قسم کے جوابات مجسم شکل اختیار کر کے اسی کے سامنے آتے۔ کبھی
آپ کو سیٹھ کی موہومہ شکل کے سامنے محسوس کرتا۔ پھر وہ خود سیٹھ کی طرف سے کچھ سوالات پوچھتا اور خود
ان سوالات کے جوابات دینے لگتا۔ کبھی نرم کبھی سخت، کبھی امید افزا کبھی مایوس کن غرضیکہ سوالات ک
بوچھاڑ تھی جو ملاقات سے پہلے ہی اس پر ہونا شروع ہو گئی وہ تصورات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ کہ اچانک
ایک بھاری بھرکم۔ موٹا تازہ گورا پٹھان ہلکے فیروزی رنگ کی وردی میں ملبوس اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو
انداز سے تاؤ دیتا ہوا ظاہر ہوا۔ یہ ہیبت خاں " سیٹھ کا خاص اردلی تھا۔

"چاؤدری بارکت کھون ہے"۔

ہیبت خاں نے کمرے کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں خاں صاحب فرمائیے" چودھری نے جلدی میں کرسی سے اپنی پشت ہٹاتے ہوئے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم کو سیٹھ صاحب اندر بلاتا ہے۔"

اتنے میں چودھری اپنے کپڑوں کو جھاڑ پونچھ کر اور بالوں کو ٹھیک کر کے سیٹھ کی حاضری کے لئے تیار ہو گیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی چودھری برکت سیٹھ قاسم علی کے سامنے تھا۔

خوبصورت۔ چوڑی پیشانی۔ بھرا ہوا چہرہ۔ پنکھے کی طرح پھیلی ہوئی چمکدار حنازدہ ڈاڑھی۔ داہنے بازو کی کہنی کے ساتھ گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے اسی ہاتھ میں تسبیح تھی۔ جس کے ہلکے رنگ کے سرخ چمکدار چکنے چکنے دانے سیٹھ کی انگلیوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے کمرے میں قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر بنے ہوئے کہیں سرخ کہیں سیاہ اور کہیں سفید پھول، باغ و بہار کا منظر پیش کر رہے تھے!

"اچھا تو آپ ملازمت کے خواہشمند ہیں۔" سیٹھ نے کہا۔

"جی حضور" چودھری نے سلام کرتے ہوئے جواب دیا

"اگر ملازمت کی گنجائش نہ ہو تو!" سیٹھ نے پھر کہا

"تو پھر حضور جیسے خدا کی مرضی" چودھری نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور اگر تمہیں ملازمت دے دوں تو پھر" سیٹھ نے حیرت سے نگاہیں اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر حضور خدا کا شکر بجا لاؤں گا" چودھری نے جواب دیا۔

"اچھا تو بتاؤ کیا چاہیئے۔" سیٹھ نے تیز لہجہ میں کہا۔

"حضور اپنی محنت سے کمایا ہوا رزق حلال" چودھری نے سیٹھ کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر کہا

"تمہاری باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم ضرورت مندوں میں سے نہیں ہو۔ ہمارے پاس تو روزانہ ضرورتمند آتے رہتے ہیں اور ان کو ہم گنجائش نہ ہونے کے باوجود ملازمت دے دیتے ہیں اگر تم بھی ضرورتمند ہو تو بتاؤ ورنہ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔" سیٹھ نے جھنجھلا کر کہا

"حضور میں ضرورت مند بن کر ہی آیا ہوں البتہ بھکاری بن کر نہیں آیا۔"

"اچھا جاؤ تھوڑی دیر بعد بلایا جائے گا۔ سیٹھ نے اگالدان میں تھوکتے ہوئے کہا۔"

"ہیبت خاں" "فرماؤ جناب" ہیبت خان نے جلدی سے کہا

"مینجر لطیف کو بلاؤ" سیٹھ نے کہا۔ "بوت اچھا حضر۔"

تھوڑی دیر میں مینجر لطیف سیٹھ کے سامنے تھا۔

"مینجر صاحب کیا خیال ہے یہ آدمی تو بہت ہی مغرور معلوم ہوتا ہے" سیٹھ نے ذرا آہستہ سے کہا۔

"نہیں حضور مغرور نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے پہلے کہیں ملازمت نہیں کی میری اس سے گفتگو ہو چکی ہے، آدمی بہت ہی شریف اور دیانتدار معلوم ہوتا ہے۔ البتہ آداب ملازمت سے ناواقف ہے۔

اور یہ بہت جلد سیکھ لیگا ۔" ہاں سیکھ تو لیگا لیکن اگر اسی کی شرافت و دیانت حد سے بڑھ گئی تو پھر کاروبار کیسے چلے گا۔" حضور دیکھ لیجئے آگے چل کر اگر لوہا بہت ہی سخت نکلا تو اٹھا کر پھینک دینے میں کیا حرج ہوسکتا ہے ۔ اس وقت تو ایک ماہ سے منشی کی سخت ضرورت ہے اب اگر اس موقع کو بھی کھودیا تو پھر پورے کام کے معطل ہوجانے کا خطرہ ہے ۔

مینیجر کے مشورے پر سیٹھ نے چوہدری برکت علی کو بلایا اور اسے دوسو روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنا ملازم رکھ لیا۔

اور اب ایک سال سے زیادہ مدت ہوچکی ہے ۔ چوہدری برکت سیٹھ قاسم کا منشی برکت بن چکا ہے۔ دوسو روپے کی معقول تنخواہ ماضی کے واقعات بیوی کی ناگفتہ بہ حالت ۔ بچوں کی تعلیم ، شکیلہ کی شادی ، قرضخواہوں کا دباؤ یہ سب رہ رہ کر منشی برکت کو سوچنے پر مجبور کر رہے تھے ۔ آج صبح سیٹھ قاسم نے کراچی سے آتے ہی منشی برکت کو آخری تنبیہ کردی تھی کہ انکم ٹیکس کے لئے تین بجے تک نقلی حساب تیار کردو ورنہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا ۔

منشی جی کشمکش و پنج میں مبتلا ہوگئے ۔ نفس اور ضمیر کی کشمکش شروع ہوگئی تھی اور وہ بیشمار فائلوں اور رجسٹروں کے گھیرے میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وقت اپنی سست رفتاری کے باوجود آج ان کی قوت ارادی سے پہلے ہی فیصلہ پر پہونچتا معلوم ہوتا تھا ۔ سامنے رکھی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک کمرے کی پُرسکون فضا کو چھیڑ رہی تھی ، قریب ہی باورچی خانے سے ماما عزیزن کے برتن دھونے کی آواز کبھی کبھی شوخ گھڑی کی ہاں میں ہاں ملادیتی ۔ اور کبھی کبھی سیٹھ کی چھوٹی بچی شاہدہ اپنی امی سے عجیب وغریب سوالات کرکے اس خاموشی پر ایک معصوم حملہ کردیتی ۔ لیکن منشی جی دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے دل کی دھڑکنوں میں کھوئے ہوئے تھے!

" اگر مجھے غلط حساب تیار کرنے پر مجبور کردیا جائے تو اس میں میرا کیا قصور سیٹھ قاسم خود ہی سزا بھگتے گا۔" منشی جی کے ماتھے کی شکنیں جو گہرے سوچ کی وجہ سے سکڑ گئی تھیں ۔ اب ذرا کھلنے لگیں ۔ نفس نے ضمیر کے مسلسل کچوکوں سے بچنے کے لئے ایک جوابی سپر اٹھالی تھی " لیکن کیا تم اس بددیانتی میں شامل نہ ہوگے ضمیر کی ایک ہی ضرب نے نفس کی بوسیدہ ڈھال کو پاش پاش کردیا ۔ لیکن شیطان اتنی جلدی شکست ماننے والا کب تھا۔ اس نے فوراً منشی جی کی ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

" کیا تم حاجی صاحب سے زیادہ نیک ہو تمہاری نیکیاں تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں ۔ وہ رات رات بھر مصلّے پر گذارنے والے بزرگ جنھوں نے لاکھوں روپے خرچ کئے اور عظیم الشان مسجدیں تعمیر کرکے اسلام کی خدمت کی جو ہر سال ہزاروں روپے لٹا کر بڑے بڑے مولویوں اور بزرگوں کو بلا کر محبوب خدا کے حضور نذر عقیدت پیش کرتے ہیں جن کی فقیری اور بزرگی کے آگے بڑے بڑے سند یافتہ عالموں نے سر تسلیم خم کیا ہے جس نے کئی کئی دفعہ بیت اللہ اور بیت الرسول کی زیارت کی ہے ۔ جس نے ملک کے جید علماء کی صحبت میں بیٹھ کر زندگی کا بڑا حصہ گذارا ہو ۔ تم اسے درس امانت دوگے ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں آج ہر طرف شیطانی کاروبار چل رہا ہے ۔ پٹواری سے لیکر اوپر کے بڑے افسر تک شیطان کے ایجنٹ ہیں۔

ہر طرف سود ہی سود، رشوت ہی رشوت، دھوکے کا چلن اور فریب و دغا کا بیوپار۔ تجارت کا پیشہ جسے حضور مقبول کی سند پسندیدگی حاصل ہے وہ بھی ایمانداری سے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے حالات میں اگر ایک بزرگ صورت اور بزرگ سیرت مجبوراً بلیک مارکٹنگ کرتا ہے اور مجبوراً رشوت دے کر شیطان پر لعنت بھیجتا ہے اور مجبوراً غلط حساب دکھا کر اپنے کاروبار کو ناکام ہونے سے بچا لیتا ہے تو تم اس کو بددیانتی سے تعبیر کرنے لگتے ہو۔

یہ تھا شیطان کا بھرپور حملہ۔ نفس کا آخری وار۔ منشی جی دل پکڑ کر رہ گئے۔ قلم اٹھا کر کچھ لکھنے ہی لگے تھے کہ ضمیر پھر سنبھلا اور ایک دفعہ پھر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوا۔

"ریاضت و عبادت تو باطنی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ دولت و ثروت اور مادہ پرستی سے بیزار ہو کر خدا سے لو لگانے کا باعث بنتے ہیں۔ حق و صداقت کے لئے بڑے سے بڑے کاروبار کو تج دینے پر تیار کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے فرعون کا ڈر نکال کر دل کو خوف خدا سے معمور کرتے ہیں۔ جو عبادتیں اور سخاوتیں انسان میں یہ اوصاف پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ وہ جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے۔ ریاکاری اور شہرت پرستی ہے۔ اور کچھ نہیں۔" وار خالی نہیں گیا۔ شیطانی لشکر کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔

"ضمیر نے لپک کر نفس کو اپنی آہنی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔"

منشی جی کی آنکھوں سے خوشی کے دو آنسو ٹپک پڑے۔ اب وہ اپنے اندر ایک سرور سا محسوس کر رہے تھے ان کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک سی آگئی تھی۔ قلم اٹھایا اور کمپنی کی آمد و خرچ کا اصل میزانیہ تیار کرنے لگے۔"

اتنے میں کسی نے ترش لہجہ میں آواز دی۔ "منشی جی"۔

منشی برکت نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ٹھیک تین بج چکے تھے۔ اور سیٹھ "قاسم" نے ساتھ والے کمرے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر منشی جی کو بلایا تھا۔ گاڑی کا وقت قریب آ رہا تھا اور سیٹھ جی حساب ساتھ لیکر جانا چاہتے تھے۔

"حضور! ابھی لیکر آتا ہوں۔"

یہ کہکر "منشی برکت" بلند آواز سے رقم شماری کرنے لگا۔ دو اور دو چار اور سات گیارہ اور تین چودہ ——— چودہ اور سات اکیس۔ اکیس[۲۱] اور تین[۳] ہوگئے چوبیس[۲۴] ———

حاصل آیا چار نیچے دو ———

——— دو[۲] اور سات[۷] نو[۹] اور سات[۷] سولہ[۱۶] ——— اور تین[۳] انیس[۱۹] ——— انیس[۱۹] اور سات[۷] چھبیس حاصل آیا چھ[۶] نیچے دو[۲] ———

کل آمد　　۱۸۰۵۷۹۶۴

کل خرچ　　۱۵۳۷۹۳

بقایا　　۱۷۸۰۴۱۷۱ روپے

نقد بچت سال ۱۹۵۶ء

منشی جی نے سیٹھ کی مہر اٹھائی اور ثبت کر کے تمام حساب سیٹھ کے پاس لے گئے۔

"یہ کیا لائے ہو" سیٹھ نے لال پیلے ہو کر کہا

"حضور آپ کی کمپنی کا سال بھر کا آمد و خرچ کا حساب" منشی برکت نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تمہیں کیا لانے کو کہا تھا" سیٹھ نے نسبتاً نرم لہجہ میں کہا۔

"حضور حساب !!" منشی برکت نے کہا

"لیکن یہ تو اصل حساب لے کر آئے ہو۔ میں نے تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک تہائی بچت دکھلانے کو کہا تھا"

سیٹھ نے کہا۔

"حضور وہ کیسے کر سکتا تھا" منشی جی نے اپنے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا

"کیسے کر سکتے تھے" "وضو کر کے"

سیٹھ نے ریا کارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن حضور وضو کر کے تو نماز پڑھی جاتی ہے۔ تلاوت قرآن مجید ہوتی ہے۔ دنیا کا ہر جائز کام کیا جا سکتا ہے

بد دیانتی اور غلط بیانی کو وضو سے کیا تعلق"

"بھائی وضو کر کے ہر کام جائز ہو جاتا ہے۔ اگر تم زیادہ وہمی ہو تو مسجد میں بیٹھ کر حساب کر لو۔ جاؤ اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی پر ترس کھاؤ۔ مجھے تمہاری بیمار بیوی اور بے گناہ بچوں پر رحم آتا ہے۔ آج تو مجھے کراچی ضروری جانا ہے۔ دو روز بعد آ کر میں تم سے حساب لوں گا"

"نہیں حضور میں ابھی وضو کر کے کچھ لاتا ہوں"

اور یہ کہہ کر منشی برکت اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد سیٹھ قاسم کے ہاتھ میں منشی برکت کا استعفیٰ تھا۔

ہماری نظر میں

ریخ اسلام (حصہ دوم)

از :۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ضخامت :۔ ۶۷۲ صفحات۔ مجلد، خوبصورت رنگین گرد پوش کیساتھ (بڑا سائز) قیمت بارہ روپے، مکمل تین حصوں کی قیمت چھتیس روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ نفیس اکیڈیمی بلاسس اسٹریٹ۔ کراچی۔

اس کتاب کے پہلے حصہ پر "فاران" پر تبصرہ ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ خلافت بنو امیہ سے شروع ہو کر دولت
سیہ کے زوال پر ختم ہوتا ہے۔ مگر اس کتاب کے ساتھ ساتھ دوسری حکومتوں (صفاریہ، سامانیہ،
رطیہ، طولونیہ، دیلمیہ، عبیدیہ، ایوبیہ، مرابطین، موحدین، دولت عثمانیہ اور صفویہ وغیرہ) کا اجمالی
رہ بھی ملتا ہے۔ کتابت چھ ابواب اور چند فصول پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر عبرت وبصیرت کا ایک مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حکومت کی خاطر بھائی
بھائی کو قتل کیا ہے۔ بیٹوں نے باپوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ چچاؤں نے بھتیجوں کے خون سے ہاتھ رنگے
۔ انتقام کے جوش میں اپنے مخالفوں کو دیواروں میں چنوایا۔ اور زمین میں زندہ دفن کیا ہے۔ صاحب تاج
ت کے جب برے دن آئے ہیں تو اُسے بوروں میں سی کر لاتوں اور ٹھوکروں سے اتنا زدوکوب کیا ہے
ٹ کر دم نکل گیا ہے۔ بلندی و پستی کی ایسی نیرنگیاں بھی چشمِ فلک نے دیکھی ہیں کہ چرواہے اور خاک نشین تخت و
کے مالک بنے ہیں۔ اور پشتینی بادشاہ نان شبینہ کے لئے محتاج ہو گئے ہیں اور جان بچانے کے لئے کسانوں
مزدوروں کی جھونپڑیوں میں پناہ ڈھونڈتے پھرے ہیں۔ حکومت جب ذاتی اغراض کے لئے استعمال کی جائے
رہ بدترین لعنت بن جاتی ہے۔ اور حجاج اور ابن ہبیرہ جیسے ظالم و سنگدل ظہور میں آتے ہیں، مگر حکومت سے
تعالیٰ کی رضا اور خدمت خلق مقصود ہو تو یہ عین رحمت بن جاتی ہے اور عمر ابن عبدالعزیز اور
دی باللہ جیسے نیک نفس فرمانروا منظر عام پر آکر دنیا کو خیر و برکت سے معمور کر دیتے ہیں۔

"علی اکبر نے دشمنوں پر رستمانہ حملے کئے" (صفحہ ۷۹) "رستمانہ" کی ترکیب بھلی نہیں لگتی۔ مجاہدین و شہدائے
لام کی بہادری اور جانبازی کی "رستم پہلوان" کی بہادری سے تشبیہ دینا ہی نامناسب ہے — "اس نے
ن بن نمیر کو بلا کر اپنی جگہ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور خود مر گیا" (صفحہ ۸۸) "اور خود مر گیا" سے ایک عجیب
کہ خیز مفہوم کی ترجمانی ہوتی ہے — "ایسی چقلش مردانہ دکھائی" (صفحہ ۲۲۹) "چقلش" اردو میں فوجی
آرائی اور جانبازی کے معنی میں نہیں بولا جاتا۔ فاضل مورخ اس لفظ کو کسی جگہ اسی مفہوم کی ترجمانی میں

لائے ہیں ـــــ "اور بنی امیہ اپنی زعم حکومت میں ایسی باتوں کو خاطر میں نہ لاتے" (صفحہ ۲۳۱) "زعم" بالاتفاق مذکر ہے۔

"سلیمان بن ہشام اپنے چچازاد بھائی کو پکڑ کر کوڑوں سے پٹوایا اور ڈاڑھی منڈواکر تشہیر کرایا" (صفحہ ۲۴۲)

یہ جملہ اس طرح لکھنا چاہیے تھا:۔

"سلیمان بن ہشام نے اپنے چچازاد بھائی کو پکڑ کر کوڑوں سے پٹوایا اور ڈاڑھی منڈواکر اُس کی تشہیر کرائی۔" صفحہ ۳۸۰ پر "شدتِ پیاس" پڑھ کر حیرت ہوئی۔ "پیاس کی شدت" یا "شدتِ تشنگی" لکھنا چاہیے تھا۔

ـــــ "نورالدین زنگی نے ملامتانہ خط لکھا" (صفحہ ۶۰۰) "ملامت آمیز خط لکھا" تحریر کرنا تھا ـــــ صفحہ ۴۶۱ پر "ساز و یراق" (ی کیساتھ) کو "ساز و براق" (ب کیساتھ) جو لکھا ہے تو یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اس قسم کی کتابت کی غلطیوں کے سبب طلباء اور معمولی لکھے پڑھے لوگ شدید غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی ادب و تاریخ میں "رافضی" کا لقب کس طرح آیا؟ اِس کا جواب "تاریخ اسلام" کے مصنف کی زبان سے سنیئے:۔

"کوفیوں نے جس طرح حسینؑ ابن علیؓ اور مصعب بن زبیرؓ کو دھوکا دیا تھا اسی طرح زیدؒ بن علیؒ کو بھی دھوکا دیا۔ جب تلوار چلانے اور مردانگی کے جوہر دکھانے کا وقت آیا تو اُنھوں نے زیدؒ بن علیؒ کے ساتھ طالب علمانہ کج بحثی شروع کی۔ اُن سے سوال کیا کہ پہلے آپ یہ فرمایئے صدیق اعظم اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ کیسا سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ میں نے اپنے خاندان میں کسی کو ان دونوں حضرات کی نسبت بُرا کہتے نہیں سُنا۔ کوفیوں نے کہا جب خلافت کے حق دار آپ ہی کے خاندان والے تھے، اور اِن دونوں کے خلافت پر فائز ہو جانے سے وہ ناراض نہ ہوئے تو اب اگر بنو امیہ نے بجائے آپ کے خلافت پر قبضہ کر لیا ہے تو آپ اُن کو کیوں بُرا کہتے ہیں اور ان سے لڑتے ہیں۔ یہ کہہ کر بیعت فسخ کر کے چل دیئے اور زیدؒ بن علیؒ نے اُن کو "رافضی" کا خطاب دیا۔"

اسلامی تاریخ میں ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں:۔

"ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک بزرگ سے کہا کہ آپ مجھے نصیحت کیجیے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ کا کوئی مصاحب ایسا ہو جو خوف دلاتا رہے اور اُس کا نتیجہ بہتر ہو تو وہ اُس مصاحب سے اچھا ہے جو آپ کو خوف سے آزاد کر دے۔ مگر نتیجہ اس کا بُرا ہو۔ ہارون الرشید نے کہا ذرا کھول کر بیان فرمایئے تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ قیامت کے دن آپ کی رعیت کے متعلق سوال ہونے والا ہے۔ آپ خدا سے ڈرتے رہیے تو وہ اُس شخص سے بہتر ہے جو یہ کہے کہ آپ اہل بیت نبوی میں سے ہیں اور بوجہ قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔" یہ سُن کر ہارون الرشید ایسا رویا کہ پاس بیٹھنے والوں کو اُس پر رحم آنے لگا۔"

ایک اور واقعہ:۔

"ایک مرتبہ متوکل نے علماء کو اپنے یہاں طلب کیا، جن میں احمد بن معدل بھی تھے۔ جب سب علماء آگئے

جمع ہوگئے تو اس جگہ متوکل بھی آیا، متوکل کو آتا ہوا دیکھ کر سب علماء تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ مگر احمد بن معدل بدستور بیٹھے رہے اور کھڑے نہیں ہوئے۔ متوکل نے اپنے وزیر عبید اللہ سے دریافت کیا کہ اس شخص نے بیعت نہیں کی ہے، عبید اللہ نے کہا بیعت تو کی ہے مگر ان کو کم نظر آتا ہے۔ احمد بن معدل نے فوراً کہا کہ میری آنکھوں میں کوئی نقصان نہیں ہے مگر میں آپ کو عذاب الٰہی سے بچانا چاہتا ہوں، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے ۔۔۔ متوکل یہ سن کر احمد بن معدل کے قریب آبیٹھا"۔

آج کہاں ہیں ایسے حق گو علماء اور حق کو قبول کرنے والے فرمانروا ؟؟

تاریخ اسلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ابن بویہ دیلمی یعنی معز الدولہ نے ۳۵۲ھ میں اس کا حکم دیا کہ ۱۰ محرم کو :-

"حضرت امام حسین کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند رہیں، بیع و شرا موقوف رہے، شہر و دیہات کے تمام لوگ ماتمی لباس پہنیں اور علانیہ نوحہ کریں۔ عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے چہروں کو سیاہ کئے ہوئے کپڑوں کو پھاڑے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں مرثیہ پڑھتی منہ نوچتی اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی نکلیں ۔۔۔۔۔"

عزاداری کے نام سے جو خرافات کی جاتی ہیں، اہل بیت کا دامن بحمد اللہ اس سے پاک ہے، یہ تو بادشاہوں کی نکالی ہوئی "بدعات" ہیں، جو ایک فرقہ کا افسوس ہے کہ "دین" بن چکی ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ بنو امیہ کے دور میں اہل بیت کرام پر شدید مظالم ہوئے ہیں اور ہماری تمام تر عقیدتیں ان مظلومین کے ساتھ ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں علویوں کو جب بھی موقع اور طاقت میسر آئی ہے انھوں نے خروج کیا ہے اور تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؓ کے پوتے ابراہیم نے یمن میں پہنچ کر بے گناہوں کو قتل کیا کہ ان کا لقب ہی "ابراہیم قصاب" مشہور ہو گیا۔ حسین افطس ایک علوی سردار کے ہمراہیوں نے تو حرم شریف کی جالیوں تک کو توڑ ڈالا، اور زید بن موسیٰ نے بصرہ میں وہ قیامت ڈھائی کہ لوگ اسے "زید النار" کہنے لگے۔

"تاریخ اسلام"، ہر اعتبار سے ایک بلند پایہ کتاب ہے، زبان منجھی ہوئی اور سادہ ہے، تاریخ کے اہم واقعات خاصی تفصیل کے ساتھ کتاب میں آگئے ہیں۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب کی سطح کو بلند کر دیا ہے، نفیس اکیڈمی اس کتاب کی اشاعت پر تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔

سیرت اشرف

مولفہ :- منشی عبدالرحمٰن خاں ضخامت ۷۱۵ صفحات (بڑا سائز) مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت بارہ روپے، ملنے کا پتہ ادارہ نشر المعارف چلیک ملتان شہر۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور حالات پر اب تک کئی کتابیں آچکی ہیں منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی زیر تنقید تالیف ۔۔۔ سیرت اشرف ۔۔۔ ان تمام کتابوں کی جامع ہے اس لئے سب سے زیادہ ضخیم و مفصل ہے، یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، فاضل مولف نے بڑی عقیدت و خلوص کیساتھ "سیرت اشرف"

کو مرتب کیا ہے، اور صاحبِ سیرت کی زندگی اور کمال کے کسی گوشہ کو شرح و گفتگو کئے بغیر نہیں چھوڑا! اس راحت پسند زمانہ میں اس قدر جانفشانی اور تحقیق و عرق ریزی کے ساتھ عام طور پر دورِ حاضر کے مشاہیر کے سوانحِ حیات شاذونادر ہی جمع کئے جاتے ہیں۔

حضرت مولٰنا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی بلاشبہ صوری و معنوی کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کی علمی تصانیف سے لاکھوں بلکہ سچ یہ ہے کہ کروروں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ مولٰنا تھانوی مرحوم نے جو عظیم قلمی کارنامہ چھوڑا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک "ایکیڈیمی" کے کرنے کا کام تن تنہا ایک فردِ واحد نے کس طرح انجام دیا؟ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مولٰنا تھانوی حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی پورا پورا لحاظ رکھتے تھے، اور بندوں کے معاملات میں جن جزئیات تک ان کی نگاہ پہنچتی تھی اس کی مثال پچھلے علماء اور صلحا کی زندگیوں میں بھی کم ملے گی۔

حق شناسی کا یہ عالم کہ اپنی تصانیف و تالیفات کے بارے میں خود اعلان فرمایا:-

"تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصار موہم یا زیادت موہمہ یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں اُن کی اطلاع جزئی طور پر دیتا ہوں اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں، اُن کے لئے دو قاعدے عرض کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری کسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاخر ہو، اُس کی اصلاح کر دی گئی ہو اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے معلوم ہو سکتا ہے اور اُسی سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو اُس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کر لیا جاوے، اور اُن کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جاوے۔ اِسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گذرے اُس میں بھی یہی تقریر معروض ہے۔"

اِس ظرف کے کتنے علماء ہمارے دور میں پائے جاتے ہیں؟ آج تو خود رائی کا یہ عالم ہے کہ ادنیٰ طالب علم بھی اپنی غلطی کی تاویلیں اور اپنی بات کی پچ کرتا ہے۔

مولٰنا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندر "جہاد" کا کس قدر ولولہ تھا، خود اُن کی زبان سے سنیئے:-

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے؟ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اِس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال و جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز، روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اِس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی، قتال ہوا اُس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اٹھا کر دیکھ لو اِس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کا غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز، روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی، اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہوگا اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ

فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔" (آثار رحمت صفحہ ۱۰۴)
مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے ارکان و مبلغین کی نگاہوں سے بھی کاش! مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی یہ عبارت گزر جائے۔

کتاب میں بعض باتیں کھٹکیں بھی۔ مثلاً یہ کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "سوانح حیات" لکھے جانے کے بارے میں یہ فرمایا:-

"اکثر خوش اعتقادوں سے غلو ہو جاتا ہے، اس لئے میں نے بتاکید منع کیا ہے کہ میری سوانح عمری نہ لکھی جائے۔" (صفحہ ۴۴۳)

مگر اس کے ساتھ ہی "اشرف السوانح" لکھنے کی اجازت اس لئے دی کہ اپنے سامنے یہ کام کرانے سے، "روایات میں افراط و تفریط کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تنقید کر سکتا ہے اور اس کی مصلحت کے اہم ہونے میں شبہ نہیں"۔ (صفحہ ۴۴۳)

پھر صفحہ ۴۴۰ پر صاحب تالیف لکھتے ہیں:-

"خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے حضرت تھانویؒ کی جو "اشرف السوانح" مرتب کی تھی اور جس کی خود حضرت تھانوی نے نظر ثانی کی تھی ......"

ظاہر ہے کہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم نے مولانا تھانویؒ کی زندگی پر بے لاگ تنقید تو نہیں کی، اس کتاب میں عقیدت و محبت ہی کی جلوہ آرائی ہے۔ حضرت تھانویؒ کے کمالات و اوصاف ہی کی سادہ انداز میں تصویر کشی کی ہے — تو اپنی "سوانح حیات" پر صاحب سیرت کا خود نظر ثانی کرنا، زیادہ پسندیدہ بات نہیں ہے۔

صفحہ ۴۴۴ پر یہ عبارت بھی نگاہ سے گزری:-

"بعض مذبذبین اس بارہ میں خود حضرت تھانوی سے بھی سوال کر بیٹھتے تھے۔ حضرت مجدد وقت ہیں — ؟؟ ایک مولوی صاحب کے جواب میں آپ نے فرمایا:-

"احتمال تو مجھ کو بھی ہے مگر اس سے زائد نہیں، جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہئے۔ ظن کے درجہ میں گنجائش ہے۔ باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کو نہیں ہوا۔ جس پر جتنا اور جس درجہ فضل ہو جائے ......"

اس کے بعد مولانا تھانوی کے ایک خط کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:-

"...... لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے ....." (صفحہ ۵۵۲)

اس کے بعد یہ اقتباس پڑھئے:-

"وفات سے دو چار روز قبل خواجہ عزیز الحسن صاحب سے معروف قیل و قال رہے، بہت ہی عجیب و غریب مضامین بیان فرماتے رہے اور بالآخر فرمایا کہ:-

خواجہ صاحب! یہ باتیں ہیں لکھنے کی، خواجہ صاحب پھر یہ باتیں سننے میں نہ آئیں گی، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں۔" (صفحہ ۷۰۲)

اور

"میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے اعزہ مجھ سے لاکھ درجہ بڑھ جائیں مگر افسوس ہے کہ اب تک کوئی بڑھا نہیں"[1] — (صفحہ ۲۰۷)

تقاضائے بشریت کے اعتبار سے یہ باتیں کچھ مستبعد نہیں ہیں، انسان فرشتہ تو نہیں ہے، مگر ہم جیسے دنیادار عقیدت مندوں کا دل یہی کہتا ہے کہ کاش مولانا تھانوی کی سوانح حیات میں یہ "دعوے" نہ ملتے۔ یہ "دعوے" خاصے سادہ و بے ضرر سہی مگر پڑھنے والے کے دل میں کھٹک تو پیدا کرتے ہیں۔

فاضل مؤلف کا کتاب لکھتے ہوئے اکثر مقامات پر یہ نقطۂ نگاہ رہا ہے کہ مولانا تھانوی کی ذات سے جس چیز کو بھی نسبت ہے اس میں خرق عادت، روحانیت اور ولایت تلاش کی جائے، تھانہ بھون کے بارے میں لکھتے ہیں

"جس کثرت سے اس علاقہ میں علماء و فضلا اور مشائخ گزرے ہیں، اس کی نظیر ہند و پاکستان کے کسی دوسرے خطہ میں نہیں مل سکتی۔" (صفحہ ۵۳)

حالانکہ علماء و مشائخ کیلئے دہلی، بدایوں، ملتان، اورنگ آباد وغیرہ مقامات مشہور ہیں، تھانہ بھون کے علاقہ کی جو تعریف مؤلف نے کی ہے اس میں خاصہ مبالغہ پایا جاتا ہے!

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو "حکیم الامت" سب سے پہلے محبوب المطابع دہلی کے مالک مولوی مرزا محمد بیگ نے کہا بلکہ پتہ میں لکھ کر بھیجا اس کو لائق مؤلف نے "القاء" سے تعبیر کیا ہے،

اور سنئے۔

"شروع شروع میں اس قصبہ (تھانہ بھون) کے پاس سے ریلوے لائین نہیں گزری تھی، حضرت کی بڑی خواہش تھی کہ ریل ان کے قصبہ کے پاس سے گزرے، تاکہ یہاں آنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ حق تعالیٰ کو چونکہ اپنے اطاعت شعار بندوں کی دلجوئی مطلوب ہوتی ہے در قبول ہوئی اور سہارنپور سے ایک چھوٹی لائن اس طرف سے گزاری گئی۔" (صفحہ ۵۴)

یہ بہت ہی سیدھا سادہ واقعہ ہے، ہر قصبہ اور ہر شہر کے لوگ چاہا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں نقل و حمل کی سہولتیں مہیا ہو جائیں اور ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ تھانہ بھون سے ریلوے لائین گزرنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مولانا تھانوی کی دلجوئی سمجھنا خوش اعتقادی کے سوا اور کیا ہے؟

صفحہ ۵۶ پر "ولایت" کو مولانا تھانوی کی خاندانی وراثت لکھا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ مولانا کے جد اعلیٰ مولانا صدر جہاں تھے، جن کا شجرہ نسب سلطان شہاب الدین غوری سے ملتا ہے جو اولیائے کاملین میں سے تھے۔

مولانا تھانوی کے نانا صاحب کیا تھے؟ اس کا "احوال" منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی زبان سے سنئے۔

"آپ کے نانا پیرجی نجابت علی اعلیٰ فارسی دانی، انشاپردازی، لطیفہ گوئی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بہت مشہور تھے اور ریاست گنج بعدہ میں بعہدہ وکیل ریاست ممتاز تھے اگرچہ

---

[1] آخر یہ کس طرح معلوم ہوا کہ مولانا تھانوی کے اعزا میں سے کسی کو حضرت تھانوی کے درجہ سے آگے بڑھنا نصیب ہی نہیں ہوا! (م - ق)

وہ مولنا شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے خلیفہ خاص سے بیعت تھے۔ نگران پرنظر تربیت حضرت حافظ صاحب
روم کی تھی جس کی وجہ سے ان پر آثار ذکر و شغل کا اس قدر غلبہ ہوا کہ انھوں نے خود کو فکرِ معاش و ادائے حقوق سے
نیاز کرلیا، اس پر حافظ صاحب کو ان کی یہ کیفیت اپنی توجہ سے سلب کرنی پڑی، اگرچہ ان کی وفات کے قریب
زت حافظ صاحب نے اُن پر پھر ایک ایسی نظر ڈالی کہ وہ کیفیت عود کر آئی۔" (صفحہ ۵۷)

غالباً مولف کو یہ معلوم نہیں ہے کہ شاہ نیاز احمد بریلوی تفضیلیہ عقائد رکھتے تھے اور ان کی گدّی کے جانشینو
اِس وقت جو بدعات و خرافات رائج ہیں اگر اُن کا سلسلہ شاہ نیاز احمد صاحب سے چلا ہے، تو پھر اندازہ لگا
ے کہ اِس خانوادہ کے منتسبین کے "عقائد و وارداتِ قلب" کیسے ہوں گے۔؟ پھر ایک نگاہ سے کیفیت سلب کرلینا
دوسری نگاہ سے اُس مسلوب کیفیت کا عود کر آنا ـــــ یہ اگر تصوف کے "اسرار" ہیں تو پھر یہ:-

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

بات ہے، ہم جیسے "عامی" اور اِس کوچہ کے نابلد کہیں تو کیا کہیں!

"سیرتِ اشرف" کے لائق مولف نے آخر میں لکھا ہے کہ مولنا تھانوی کو عشق کی دولت اپنے ننھال سے اور طریقت
ضیلت ددھیال سے ملی تھی ـــــ گویا مولنا کی اپنی ذاتی کوشش برائے بیعت تھی۔ یہ سب کچھ وہبی صفات اور خاندانی
ت ہیں۔ اکتساب اور مجاہدہ کو ایک مدِ فاضل ہی سمجھئے۔

جن لوگوں کے نسب نامے اور خاندانی شجرے اتنے عالی اور مقدس نہیں ہیں وہ بیچارے مولنا تھانوی
س "سیرت" کو پڑھ کر کس قدر مایوس ہوں گے کہ ہم "اشرف علی تھانوی" جیسے بن ہی نہیں سکتے کہ ہمیں یہ کمالات
یں نہیں ملے۔

"صفحہ ۵۸ پر حضرت تھانوی کو شانِ فاروقی اور شانِ علوی کا مظہر لکھا ہے۔ پھر صفحہ ۶۴ پر حضرت کی ایک کرامت
ی ہے کہ "لڑکپن میں حضرت والا کو اتفاق ہوا تو اُس روز ابر ضرور ہوگیا۔ اور بہت راحت کے ساتھ سفر طے ہوا۔
ت فرماتے تھے کہ "مجھے خود بھی گاہے گاہے ایسا ہونا یاد ہے۔"

اِس قسم کے واقعات سے ثابت کرنا یہ مقصود ہے کہ مولنا تھانوی خاندانی اور مادر زاد ولی تھے۔ اور بچپن ہی سے
ں اور خوارق ظہور میں آتے تھے۔

صفحہ ۲۴۲ اور ۲۴۳ پر ایک فہرست حضرت تھانوی کی "صفاتِ فاضلہ" کی دی ہے۔ یہ صفات ننانوے (۹۹)
۔ سوال یہ ہے کہ مولف نے خاص طور پر ننانوے صفات کیوں لکھیں، اِن سے کم یا زائد کیوں متعین نہیں فرمائیں،
نوے کا عدد کیوں ـــــ؟ ہم بدگمانی نہیں کرتے۔ لیکن ذہن اِس طرف جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام
یہ کس قدر خطرناک عددی مشابہت ہے! توبہ!! پھر اِن صفات کا رنگ یہ ہے:-

دلسوزی، وسعت خیال، خوش انتظامی، زندہ دلی

یہ صفات ہر کہ و مہ سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔

دلسوزی کا نمبر ۴۶، وسعتِ خیال کا ۷۵، خوش انتظامی کا ۷۴ اور زندہ دلی کا نمبر ۸۶ مولف نے متعین کیا ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب کو "حکیم الامت" سب سے پہلے محبوب المطابع دہلی کے مالک نے لکھا اور اس لقب کا ان کو القا ہوا تھا۔ کیا عجب ہے کہ آنے والے عقیدت مند سیرتِ اشرف میں صاحبِ سیرت کی ننانوے صفاتِ فاضلہ کو پڑھ کر یہ حکم لگا دیں کہ منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کو بھی مولانا تھانوی کی ان صفات کا القا ہوا تھا اور پھر یہ ننانوے صفات "اسرار و رموز" کا مبحث بن جائیں، عقیدت کی دنیا میں مبالغہ آمیزیوں کے اسی طرح ردّوں پر ردّے رکھے گئے ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت تھانوی کے جنازے کی نماز پڑھاتے ہیں۔ اس کو "بشارت" سے تعبیر فرمایا ہے۔

"مولانا ظفر احمد عثمانی نے جنھیں نماز جنازہ پڑھانے کی پہلے سے بشارت ہو چکی تھی نماز جنازہ پڑھائی"۔ (صفحہ ۷۰۸)

اسی صفحہ پر یہ عبارت نظر آئی۔

"حضرت کے دفن ہونے کے بعد جو رات آئی، اس رات کو حضرت کے ایک مجازِ بیعت نے جن کو فدائیوں سے خاص مناسبت ہے، بعد نصف شب کے حضرت کو خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا۔

"مجھے مردہ نہ سمجھو، میں زندہ ہوں، جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے رہتے تھے، فیض لیتے رہنا، فیض ہوتا رہے گا۔ اور مجھے مقامِ شہداء نصیب ہوا ہی کہدیا جاوے۔"

حالانکہ مولانا اشرف علی مرچکے، اور مرنے کے بعد ان کے جنازے کو دفن کر دیا گیا وہ زندہ نہیں ہیں انکو، ہمیں مردہ ہی سمجھنا چاہئے ۔۔۔ وہ مرنے کے بعد ہمیں رائی کے دانہ کے برابر بھی فیض نہیں پہنچا سکتے، خود سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وفات سے قبل یہ فرمایا تھا کہ میں تمھارے درمیان کتاب وسنت چھوڑتا ہوں ۔۔۔" یہ نہیں ارشاد کیا تھا کہ میں وفات کے بعد تمھیں فیض پہنچایا کروں گا، مقصود یہ تھا کہ میرے بعد کتاب وسنت سے اب تم ہدایت اور روشنی حاصل کروگے! عالم قبر و برزخ سے ارواح کا دنیا والوں کو فیض پہنچانے کا عقیدہ بالکل غلط اور بے سروپا ہے!

مبالغہ آمیز عقیدت اور بے احتیاطی کی چند افسوسناک مثالیں۔

(۱) "مگر میں اس بحرِ ناپیدا کنار کی غواصی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس طرح حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نطق سراپا وحی اور انکا خلق قرآن کی عملی تفسیر اسی طرح حضرت تھانوی کا ہر قول و فعل کتاب و سنت کی تنویر و تفسیر تھا"

(۲) "جس طرح دعائے خلیل اللہ رحمۃ للعٰلمین کو لانے کا باعث ہوئی اسی طرح اس مجذوب اللہ کی دعا بھی کرم عظیم لائی (یعنی مولانا تھانوی ایک مجذوب صاحب کی دعا کی قبولیت بنکر پیدا ہوئے ہیں)۔ ص ۶۰"

(۳) "جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء نزول وحی سے خوف زدہ ہو گئے تھے تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے حضرت کی بہت تسلی فرمائی تھی، اسی طرح غلبۂ ہیبت کے زمانے میں جب پریشانی زیادہ بڑھتی تو حضرت اپنا غم غلط کرنے کیلئے اپنی غم گسار، جاں نثار رفیقہ حیات بڑی بیگم صاحبہ سے اپنے پر درد حالات بیان فرماتے (صفحہ ۲۲)۔

(۴) "جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات " الصلوٰۃ و ما ملکت ایمانہم" تھے اسی طرح حضرت تھانوی کو بھی آخری فکر نماز اور حقوق کی تھی (صفحہ ۷۰۳)

(۵) حضرت کے عدل و مساوات نے عہد نبوی کی یاد تازہ کردی (صفحہ ۱۷۶)

ہم نے دل پر جبر کرکے یہ اقتباسات نقل کئے ہیں اور دل استغفار پڑھتا رہا ہے، توبہ! لاحول ولاقوۃ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات کے ساتھ "اس طرح" کی تشبیہ پہلی بار ہماری نظر سے گزری اور دل لرز لرز گیا! منشی عبدالرحمٰن خاں کو چاہیئے کہ وہ کسی معذرت اور تاویل کے بغیر اللہ کے دربار میں اپنی لفظی بے احتیاطیوں کی معافی چاہیں اور آئندہ ایڈیشن میں ان اذیت کوش جملوں کو کتاب سے یکسر نکلوادیں! یہی وہ مبالغہ آمیز عقیدت ہے جس نے ولیوں کو نبیوں کا مقام دیدیا ہے اور انبیاء کرام کو "الٰہ" بنا دیا ہے! قیامت کے دن صلحاء اور اتقیا اسی قسم کی مبالغہ آمیز عقیدتوں سے اللہ کے حضور اظہار برأت کریں گے کہ بارالہا! ہمارے قلوب میں اس بات کا خطرہ بھی نہیں گزرا یہ تو ـــ ہمارے ان نادان عقیدتمندوں کی کارستانیاں ہیں۔

"تیسرا راز یہ کھلا کہ حضرت تھانوی نے ہی قائد اعظم کے پاس تبلیغی وفود و خطوط بھیج کر انھیں مسنون طریقہ پر پابند نماز بنایا اور ان میں دینی ذوق پیدا کیا۔ یہ جو قائد اعظم پر آخری زمانہ میں اسلامی رنگ غالب نظر آتا تھا یہ سب حضرت تھانوی کے فیضان کا نتیجہ تھا" (صفحہ ۵۴۵)

یہ نفس واقعہ کی کتنی عجیب ترجمانی ہے، کیا لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایسی باتیں پڑھ کر اہل قلم مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی "مذہبیت" کو بحث و مذاکرہ کا عنوان بنائیں۔ اس معاملہ میں مؤلف اس حد تک چلے گئے ہیں۔

"چونکہ قائد اعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت تھی اس لئے آپ نے (یعنی مولانا تھانوی نے) ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیر المومنین کیلئے ضروری ہیں" (صفحہ ۵۵۸)

نہ تو بیچارے قائد اعظم امیر المومنین بننا چاہتے تھے اور نہ مولانا تھانوی نے ان کو "امیر المومنین" کے مقدس منصب کیلئے منتخب کیا تھا۔ یہ مؤلف کتاب کی نری خیال آرائی ہے۔ اور ایسی باتیں کرکے وہ مولانا تھانوی کی پوزیشن کو ہدف تنقید بنوانا چاہتے ہیں!

"حضرت تھانوی ابھی عالم ارواح ہی میں تھے کہ آپ کیلئے اہل اللہ مصروف دعا ہو گئے۔ عالم وجود میں آئے تو نہ صرف اس دور کے بزرگوں کی غائبانہ دعائیں آپ کے شامل حال رہیں بلکہ عالم برزخ والے بھی آپ کی طرف متوجہ ہوئے" (صفحہ ۱۰۶)

ایسی باتوں نے "سیرت اشرف" کو کسقدر ہلکا بلکہ یوں کہئے ایک "اعجوبہ" بنا دیا ہے،

صفحہ ۱۹۸ پر یہ واقعہ بھی نظر آیا کہ مولانا تھانوی کو جب حاجی امداد اللہ مہاجر رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کیا ہے تو حاجی صاحب کی خدمت میں ایک سینی مٹھائی، ایک خوبصورت عمامہ اور پچیس روپے پیش کئے گئے۔ اس ہدیہ کو حاجی صاحب نے قبول فرمالیا! ـــ بیعت کے ان لوازم کیلئے کتاب و سنت اور آثار صحابہ

میں آخر کوئی سند ملتی ہے۔ یہ طریقے اور معمولات کہاں سے آئے ہیں؟؟

کتاب میں زبان کی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔

"حضرت تھانوی مولانا کو ان اختلافات کے باوجود دیوبند ملنے کیلئے تشریف لے گئے" (صفحہ ۸۰) "کو" کی جگہ "سے"، لکھنا چاہئے تھا ــــ "مگر بصیرت باطنی سے بہرہ ور اور پرلے درجہ کے منظم تھے (صفحہ ۸۱) "پرلے درجہ" مذموم صفت کیلئے بولتے ہیں، مثلاً "وہ پرلے درجہ کا بدمعاش ہے" مدح میں یہ لفظ اس طرح (وہ پرلے درجہ کا شریف آدمی ہے) نہیں بولا جاتا۔

"شروع شروع میں وادئی الحاد میں بھٹکتے رہے، کفر کی ڈگری حاصل کی۔ ہوش آئی تو سیج نگار بن بیٹھے۔" صفحہ ۲۴۷) "کفر کی ڈگری حاصل کی" یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے "ہوش تو بالاتفاق مذکر ہے۔ صفحہ ۲۰۳ پر "التہابیہ" کو "الہتابیہ" اور صفحہ ۱۳۷ پر حکیم "سنائی"، کو "حکیم ثنائی"، لکھا ہے اسے کتابت کی غلطی پر ہی محمول کیا جائے گا۔

ان فروگزاشتوں، لغزشوں اور مبالغہ آرائیوں کے باوجود کتاب مجموعی طور پر خوب ہے، مؤلف نے خاصی کاوش سے کتاب کو مرتب کیا ہے اور اپنی عقیدت کے اظہار کا کوئی عنوان باقی نہیں رہنے دیا۔

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ — نمبر ۱

فاران

جنوری ۱۹۵۸ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر مسرور حسین — مطبوعہ ... پریس ... روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

نقشِ اوّل

ہ اب اور کیا ہے ارادہ اس انتقام کے بعد؟؟

ملک کے وہ چند سیاست باز جو شروع ہی سے پاکستان کے مخالف اور اسلامی نظریات کے دشمن رہے ہیں ان کے ہاتھوں پاکستان کا وقار جس طرح خاک میں مل رہا ہے اور پاکستان کی یک جہتی اور سالمیت کو جو پیہم صدمے پہونچ رہے، انھوں نے پاکستان میں پھر شدید سیاسی بحران پیدا کر کے، چندریگر وزارت کو ٹھکانے لگا دیا! ڈیڑھ مہینہ کے اندر اندر ایک جمی جمائی وزارت کا اس طرح اُکھڑ جانا، ملک کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے!

چندریگر وزارت نے آخر کیا قصور کیا تھا، جس کی اُسے یہ سزا دی گئی، اس سے کوئی بدعنوانی سرزد ہوئی، تجارت، غذا، یا معیشت و معاش کا کوئی نازک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، عوام کی طرف سے کسی اضطراب یا بے اعتمادی کا اظہار کیا گیا، اس وزارت نے کوئی ایسی خارجی پالیسی اختیار کی جو پاکستان کے مفاد کے خلاف پڑتی تھی؟ وزارتوں کا اس طرح اچانک ردو بدل کوئی ہنسی کھیل تو نہیں ہے، کہ جب جی میں آیا کوئی وزارت بنوادی، اور جب ترنگ اٹھی بچوں کے گھروندے کی طرح اسے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا، اسی قسم کی حرکتیں وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کو نہ صرف یہ کہ کسی ملک کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہو بلکہ اس ملک میں بگاڑ پیدا کرنا، جن کا مقصود و منتہا ہو!

ساری دنیا جانتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی نے جداگانہ انتخاب کی اساس پر مسلم لیگ، نظام اسلام اور کرشک پارٹی سے معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کے بعد ہی اخلاق و شرافت اور کھلی ہوئی واضح آئینی سیاست کے ساتھ چندریگر وزارت قائم ہوئی کوئی سیاسی چال نہیں، کسی شخصی اور ذاتی مفاد کی کارفرمائی نہیں، ایک واضح اصول اور کھلا ہوا اجتماعی مقصد پیش نظر تھا مگر جب یہ نشیمن بن چکا تو مفسدہ پردازوں نے اس کے ایک ایک تنکے کو بکھیر دیا جیسے یہ آشیاں بندی اسے اُجاڑنے کے لئے ہی کی گئی تھی!

دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے چالباز اور عہد شکن پیدا ہوئے ہیں مگر "ری پبلکن" جس عجیب و غریب ٹولی کا نام ہے اس کے ارکان جیسے طوطا چشم، وعدہ فراموش، بے ضمیر اور عہد سے پھر جانے اور وعدہ کر کے مُکر جانے والے، نہ دیکھنے میں آئے اور نہ سُننے میں! جن کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں، جن کی کسی بات کا کوئی بھروسہ نہیں! جن کو نہ خدا کا خوف ہے اور نہ بندوں کی شرم ہے! حیرت و افسوس کا مقام ہے اس ضمیر، کردار اور ذہنیت کے افراد کے ہاتھوں میں پاکستان کی زمام کار آ گئی ہے!

پاکستان کی سیاست اب ذاتیات کی ان بھول بھلیوں میں داخل ہو چکی ہے کہ ڈاکٹر خاں صاحب اعلان فرماتے ہیں کہ

"میں شہید سہروردی صاحب کو وزیر اعظم رکھنا پسند نہیں کرتا"

اور اس اعلان بلکہ یوں کہئے فرمانِ واجب الاذعان کے بعد چند دن کے اندر اندر سہروردی صاحب کو بصد حسرت
و یاس وزارت سے دستکش ہو جانا پڑتا ہے، پھر چند دیگر وزارت تشکیل پاتی ہے اور ابھی اس وزارت کو پورے دو مہینے
بھی نہیں گزرنے پاتے کہ پھر انہی ڈاکٹر خاں صاحب کے ایماء سے اس وزارت کا شیرازہ بکھیر دیا جاتا ہے! سیاست
کے اس کھیل میں ترپ کا پتہ (TRUMP- CARD) اسی شخص کے ہاتھ میں آگیا ہے، اور اسی شخصیت
کے اردگرد قصر و ایوان کی سازش پروردہ سیاست گھومتی رہتی ہے ـــــ اور یہ وہ بزرگ ہیں جو تقسیم ہند کے
آخری لمحہ تک پاکستان کی مخالفت میں سب سے پیش پیش رہے ہیں، اسلامی نظریات کی حمایت میں ان کے منہ
سے ایک حرف بھی نہیں نکلا، پاکستان بننے کے بعد جن کے سیاسی نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، پٹیل، گاندھی
اور نہرو کے سیاسی نظریات کی روشنی میں جن کے مزاج اور فکر کی تشکیل ہوئی ہے، اور اسی کانگریس زدہ مزاج،
قوم پرستانہ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت نے پاکستانی سیاست کو اس رُخ پر ڈال دیا ہے، جس سے پاکستان کے مقصدِ
وجود کی نفی ہوتی ہے!

روزنامہ "تسنیم" نے بڑی سچی اور پتہ کی بات کہی کہ ڈاکٹر خاں صاحب اور خاں عبدالغفار خاں، ان دونوں
بھائیوں نے "تقسیم کار" کر رکھی ہے، بڑے بھائی حکومت کے معاملات میں دخیل ہو کر انتشار پھیلا رہے ہیں، اور
چھوٹے بھائی باہر رہ کر ملک کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں! ان دونوں بھائیوں کا وجود
پاکستان کی رگِ حیات اور رشتۂ سالمیت و استحکام کے لئے دو دھاری تلوار کا کام کر رہا ہے! جو شخص ڈنکے کی چوٹ
کہتا ہو کہ :- " پٹھانوں پر پنجابی حکومت نہیں کر سکتے "
کیا اس کے مفسدانہ عزائم پاکستان کی یک جہتی، سالمیت اور اتحاد کو تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی رہنے دیں گے
پختونستان کی تحریک پاکستان کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی بلکہ غداری ہے اور حیرت ہے کہ اس غداری کی روک تھام
کے لئے حکومت کی قانونی مشینری میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، شہری حقوق کی زیادہ سے زیادہ آزادی کے ہم حامی
و مؤید ہیں مگر یہ "آزادی" بے حد و بے کراں اور نامحدود نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی منصف سے منصف حکومت
یہ رواداری نہیں برت سکتی کہ اس کا ایک فرد اُس حکومت کے مقصدِ وجود کے خلاف ایک تحریک کھڑی کر دے، اور
ایسے غدار شخص سے کوئی باز پرس نہ ہو!

یہ تو چھوٹے بھائی کا کردار، منصوبے اور عزائم ہیں اور بڑے بھائی ـــ ڈاکٹر خاں صاحب پاکستان کو تباہ
کرنے کیلئے سب سے پہلے یہاں کی "جمہوریت" کا تیا پانچہ کر دینا چاہتے ہیں، "انقلابی کونسل" قائم کرنے کا شوشہ
اسی فرتوت سیاست باز کا چھوڑا ہوا ہے، جب یہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، تو ان کے بلند اقبال صاحبزادے۔
"انقلابی کونسل" کا نعرہ بلند فرماتے ہیں، اس وقت تک انقلابی کونسل کا یہ نعرہ ایک سٹھیائے ہوئے شخص کی
بکواس اور مجذوب کی بڑ معلوم ہوتا ہے مگر اس "بکواس" کو "قول فیصل" بنانے کی خطرناک مہم جاری ہے، جس
کے لئے کوئی خفیہ گروہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ کام کر رہا ہے، کراچی کے در و دیوار پر "انقلابی کونسل" کی تائید و
حمایت میں جو پوسٹر جا بجا نظر آرہے ہیں، وہ آسمان سے فرشتوں نے آکر نہیں لگائے، ان کو پاکستان ہی میں

رہنے اور بسنے والے انسانوں نے دگایا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ کب کیا ہو جائے؟ اس لئے کہ پاکستان کے سیاسی خلفشار اور تذبذب کے پیش نظر یہاں ہر بد سے بدتر انقلاب کے ظہور کا امکان ہے!

پاکستان کے عالی مرتبت صدر جو یہاں کی جمہوریت کے سب سے بڑے محافظ ہیں، ان کا فرض تھا کہ وہ اپنے دوست ڈاکٹر خاں صاحب سے غیر جمہوری مشوروں اور "انقلابی کونسل" کے نعرے پر باز پرس کرتے اور اس قسم کی حرکتیں کرنے سے روکتے، مگر افسوس ہے کہ اس قسم کے کسی احتساب اور باز پرس کی اطلاع عوام تک نہیں پہنچی، ہاں زبانِ راز میں کچھ فرما دیا ہو تو دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر خاں صاحب گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے، اُن کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا تھا ان کو جو شخصیت اور جو گروہ بھی حکومت و اقتدار کی بلندیوں پر لے کر آیا ہے، اور جس نے بھی ڈاکٹر خان کی ذات و شخصیت کے اردگرد ری پبلکن پارٹی کا حصار قائم کرایا ہے، اس نے پاکستان کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کی ہے اور پاکستان کی سرزمین میں انتشار و افتراق کا بیج بو دیا ہے!

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کی مخالفت میں حدِ انصاف سے گزر جائیں، ایمان لگتی کہیں گے ـــــ یہ کہ ری پبلکن پارٹی کے تمام ارکان ڈاکٹر خاں صاحب کے سیاسی نظریات کے حامی نہیں ہیں مگر ذاتی اغراض اور شخصی اقتدار کی ہوس نے انھیں ڈاکٹر خاں کے ساتھ دُم چھلا بنے رہنے پر مجبور کر دیا ہے، مسلم لیگ سے کٹ جانے کے بعد اُن کی سیاسی خودکشی واقع ہو چکی ہے، اُن کے لئے اب کوئی سیاسی پلیٹ فارم باقی نہیں رہا جائیں تو کہاں جائیں، اس لئے ان کو اسی میں اپنی خیر نظر آتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی کے زیرِ سایہ جتنے دن بھی جی سکیں جی لیں بہرحال وہ اپنے اقتدار کی زندگی کے لئے آخری سانس تک ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے ـــــ مانا کہ وہ دل سے ڈاکٹر خاں صاحب کے نظریوں کی کامیابی نہیں چاہتے اور انھوں نے جبر و اکراہ کے ساتھ اس گٹھ جوڑ میں شریک ہونا قبول کیا ہے مگر قلب کی اس بیزاری اور دل کے نہ چاہنے کے باوجود ڈاکٹر خاں صاحب کی پارٹی کا ساتھ دے کر، جو بگاڑ کی صورتیں پیدا ہوں گی، اس کی ذمہ داری سے وہ بچ نہیں سکتے۔! ایسی خود غرضی سے ہزار بار خدا کی پناہ جو کسی کو اُس کے ضمیر کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دے!

پاکستان کے حالات کو بگاڑنا اور یہاں ابتری پھیلانا ڈاکٹر خاں صاحب کا مشن ہے، یہی سبب ہے کہ وہ جان بوجھ کر پرلے درجہ کی بونگی باتیں اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے رہتے ہیں، وہ بکمال صحت ہوش و حواس کے ساتھ کسی جماعت سے معاہدہ کرتے ہیں اور پھر پوری فراست و دانش کے ساتھ اس معاہدہ کو کھٹ سے توڑ دیتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی باتیں کرنے سے عوام میں ان کی ہوا خیزی ہو گی، مگر عوام کا اعتماد حاصل کر کے کوئی تعمیری کام کرنا سرے سے اُن کے پیشِ نظر ہی نہیں ہے، ان کا مقصود تو پاکستان کا "بگاڑ" ہے اس مقصد میں وہ شروع ہی سے کامیاب ہیں! انھوں نے کیسے کیسے متضاد بیانات دئے ہیں، جب چاروں طرف سے شور مچا تو کسی بیان کی کوئی تاویل فرمادی، کسی بیان کے بارے میں کہہ دیا کہ میں نے یہ کہا ہی نہ تھا، اور کسی کے بارے میں چپ سادھ لی، جب وہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے تو انھوں نے ضلعوں اور کمشنریوں کے صدر مقامات سے ذمہ دار عہدہ داروں کے تبادلے اس کثرت کے ساتھ کئے تھے کہ وہاں کا نظم و نسق متزلزل ہو کر رہ گیا تھا! ہم دو ٹوک

بات کہہ دینا چاہتے ہیں —— وہ یہ کہ ڈاکٹر خاں صاحب کی جو کوئی بھی پشت پناہی اور حمایت کر رہا ہے، وہ پاکستان کو تباہی، انتشار اور ابتری کی طرف لیجا رہا ہے!

جائزہ

پاکستان کے گزشتہ حالات کا سرسری جائزہ یہ ہے کہ قائد اعظم مرحوم پاکستان بننے کے بعد زیادہ تر علیل رہے اور انھیں خرابیٔ صحت کے سبب خاطر خواہ کام کرنے کے مواقع نہ مل سکے، لیاقت علی خاں مرحوم کے عہد حکومت میں کچھ کمزوریاں بھی ظہور میں آئیں مگر یہ واقعہ ہے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام کے لئے ان کا خلوص شک وشبہ سے بلند تھا اور جب انھوں نے ملک کی خرابیوں کی اصلاح وتطہیر کا قصد کیا تو انھیں ایک سازش کے تحت شہید کر دیا گیا!

اس کے بعد خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرلی کا عہدہ اپنی مرضی سے غلام محمد مرحوم کو سونپ کر وزارت عظمیٰ کی کرسی پر فائز ہو جاتے ہیں، خواجہ صاحب ذاتی طور پر نیک نفس اور مرنجان مرنج آدمی ہیں اور ان کی طبیعت کا میلان خیر و فلاح کی طرف ہے مگر ایک طرف تو اُن کے مشیروں نے اُن کی سادگیٔ مزاج سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف ممتاز دولتانہ صاحب نے ان کے خلاف زبردست مُہم شروع کر دی، غلام محمد صاحب میں آمریت کی خو بو بسی ہوئی تھی اور وہ ناظم الدین جیسے مذہبی آدمی کو پسند بھی نہ کرتے تھے" ان حالات کی خرابیوں اور در پردہ سازشوں نے ناظم الدین وزارت کے بیڑے کو منجدھار میں نہیں بلکہ سر ساحل ہی غرق کر دیا، جن مشیروں پر خواجہ صاحب اعتماد کرتے تھے، ان میں سے بعض خود مسٹر غلام محمد کیساتھ شریکِ سازش تھے، خواجہ ناظم الدین کو اگر انہی کی طرح نیک، اور مذہبی افراد کی مدد و تائید حاصل ہو جاتی تو وہ تاریخ میں "ناصر الدین محمود ثانی" کے لقب سے یاد کئے جاتے —!

وہ جو پُرانے زمانہ کی مثل مشہور ہے کہ جب کوئی بادشاہ مرجاتا تھا، اور اس کی جگہ تخت پر بٹھانے کے لئے دار الخلافت میں کبوتر اُڑایا جاتا تھا، اور وہ جس کسی کے سر پر بیٹھ جاتا اسی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا جاتا، تو ناظم الدین وزارت کی برطرفی کے بعد مسٹر محمد علی بوگرہ کو کچھ اسی انداز میں امریکہ سے لاکر وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بٹھا دیا گیا! بوگرہ صاحب کو کسی پارٹی کی حمایت حاصل تھی اور نہ وہ خود سیاسی تجربہ اور تدبر رکھتے تھے، اس لئے انھیں غلام محمد مرحوم کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنا پڑا، اور ایک رات تو اُن پر ایسی بھی آئی کہ کراچی ایرپورٹ سے ان کو کشاں کشاں گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا۔ اور دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے کی تجویز پر اُن کی منظوری دھمکیوں کے سایہ میں لی گئی!

مسٹر محمد علی بوگرہ کے بعد چوہدری محمد علی صاحب عنانِ حکومت سنبھالتے ہیں، چوہدری صاحب مذہب سے شغف رکھتے ہیں اور علامہ اقبالؒ کے نظریات سے کافی حد تک متاثر ہیں، ان کا مزاج ہنگاموں کو پسند نہیں کرتا، ان کی ساری زندگی دفتری ماحول میں بسر ہوئی ہے اس لئے پُرسکون ماحول کو وہ پسند کرتے ہیں، ان کے دور کا سب سے بڑا شاندار کارنامہ "دستور" کی تشکیل بعد اس کا آئینی طور پر منظور ہونا ہے، مگر پاکستان کے دستور میں جو خطرناک رخنے رہ گئے ہیں، اُن پر اگر چوہدری صاحب توجہ دیتے تو یہ رخنے دستور میں باقی نہ رہتے، خاص طور سے سربراہ مملکت کو جو نامحدود اختیارات دستور میں دئے گئے ہیں، ان کے صاحب موصوف ہی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ انتخاب کے مسئلہ کو غیر منفصل حالت میں چھوڑ دینا بھی بہت بڑی بے دانشی تھی، دستورِ پاکستان کی منظوری کے بعد چوہدری محمد علی صاحب کو آئینی طور پر ایک بڑی جرأت سے کام لینا چاہئے تھا، مگر وہ ایسا نہ کر سکے، اگر وہ ہمت

کر جاتے تو "انقلابی کونسل" کے خطرہ کی تلوار ہمارے سر پر ہر دم کیوں لٹکتی رہتی!

چوہدری محمد علی صاحب کی سیاسی روش سے بھی مسلم لیگی اکابر کو بجا طور پر شکوہ ہے، کہ وہ برابر ڈبل گیم کھیلتے رہے اور اُن کی اس روش سے مسلم لیگ کو نقصان اور ری پبلکن پارٹی کو فائدہ پہونچا، مسلم لیگ کی اگر وہ کھل کر حمایت کرتے تو ری پبلکن پارٹی کو مسلم لیگ کے اتنے بہت سے باغی ممبر شاید میسر نہ آتے!

ون یونٹ کی تشکیل میں چوہدری محمد علی صاحب سب سے پیش پیش تھے، ملک کے تمام دوسرے تعمیری مسائل کے مقابلہ میں اُن کی سب سے زیادہ توجہ ون یونٹ بنوانے میں صرف ہوئی، اُن کا یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ون یونٹ کے لئے انھوں نے ہر ناپسند سے ناپسند شخصیت سے مصالحت کو گوارا کر لیا، جب وہ لندن اور اُس کے بعد سفرِ حج سے واپس آئے تو کراچی میں مسٹر گریس انسپکٹر جنرل پولیس کے خلاف تحقیقات ہو رہی تھی اور اس کے مظالم اور بدچلنی کی خبریں اخباروں میں پڑھ پڑھ کر کراچی کے عوام اس سفاک اور دنی الطبع انگریز افسر سے بہت زیادہ برہم تھے، چوہدری صاحب یہاں آئے تو بعض عہدیداروں نے اس معاملہ کو کچھ اور رنگ میں اُن کے سامنے پیش کیا۔ اور چوہدری صاحب نے اس کا اثر بھی قبول فرمالیا، اس کے بعد کراچی ایڈمنسٹریشن میں جو تبدیلیاں ہوئیں، اور بد نام انگریز افسر (گریس) کے خلاف جو تحقیقات ہو رہی تھی اس میں تعطل رونما ہوا، اس نے پبلک میں برہمی پیدا کر دی، جہانگیر پارک کے جلسہ عام میں پبلک کی اس برہمی کا مظاہرہ دیکھ کر چوہدری صاحب گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں انھوں نے استعفا پیش کر دیا، ان کی علیحدگی کا پاکستان کے عوام کو افسوس ہوا، ان کی ذات سے اچھی توقعات وابستہ تھیں

اس کے بعد شہید سہروردی صاحب کی دیرینہ تمنّا کی تکمیل کے لئے قدرت حالات کو سازگار بناتی ہے اور سہروردی صاحب مسندِ وزارت پر متمکن ہوتے ہیں! سہروردی صاحب کا سب سے زیادہ سیاہ کارنامہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں سے ساز باز کر کے "مخلوط انتخاب" کو منظور کرانا ہے، ملت اسلامیہ اُن کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کر سکتی! ان کی وزارت رشوت ستانی کے سلسلہ میں جس قدر بدنام رہی ہے، اُس کی مدافعت میں عوامی لیگ کے بعض ارکان نے جو کچھ کہا ہے اس نے معاملہ کو اور زیادہ مشکوک بنا دیا ہے، ان کے دورِ حکومت سے غنڈہ گردی کو بھی منسوب کیا جاتا ہے! اپنے دوست اور حلیف مسٹر گورمانی کے معاملہ میں سہروردی صاحب نے جو کمزوری دکھائی، اس نے ان کی بیباکی اور جرأت آزمائی کی شہرت پر دھبہ لگا دیا! اُن کے بیرونی ممالک کے دورے خاصے کامیاب رہے، اور امریکہ نے ان کی تقریروں کا اچھا اثر قبول کیا۔

اس کے بعد چندریگر وزارت برسرِاقتدار آتی ہے، یہ پہلی وزارت ہے جو ہوس اقتدار نہیں بلکہ ایک اصول کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے، مسٹر چندریگر نے بڑی متوازن تقریریں کیں، نہ تو انھوں نے اپنے پیش روؤں کو بُرا بھلا کہا اور نہ قوم سے لمبے چوڑے وعدے کئے چندریگر صاحب نے اپنی تقریروں میں چوہدری محمد علی صاحب سے بھی زیادہ واضح اور پرزور انداز میں اسلام کا ذکر کیا، اسمبلی ہال پر "یوم جداگانہ انتخاب" کے سلسلہ میں جو ناخوشگوار پیش آیا اس کی چندریگر صاحب نے جس کھلے دل سے مذمت کی ہے وہ ایک مثالی اعتراف ہے، ورنہ اس سے پہلے ڈھاکہ میں اسلام پسند لیڈروں اور علماء کے ساتھ جو حقارت آمیز سلوک کیا گیا، اس کی معذرت میں عوامی لیگ کے اکابر کو ایک حرف بھی کہنے کی توفیق نہیں ہوئی

نظام اسلام پارٹی کے قابلِ فخر نمایندے جناب فرید احمد نے چندریگر وزارت میں شامل ہو کر جس سادگی، فراست و تدبر، اخلاق اور جرأت و حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنی آپ مثال ہے ان کی ایمانی جرأت کا یہ عالم رہا ہے

کہ دہلی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں انھوں نے انگریزی میں اثر انگیز تقریر کی اور اس میں قرآنی آیات کے حوالے سے کر بتایا کہ معیشت و معاش کے مسائل کا فطری حل صرف اسلام پیش کرتا ہے۔ مسٹر فرید احمد پاکستان کے پہلے وزیر ہیں جنہوں نے دلی کے ایک بھاری کرایہ کے ہوٹل کے مقابلہ میں بہت ہی کم کرایہ کے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند کیا! اس ڈیڑھ مہینہ کی قلیل ترین مدت میں اس مرد مومن نے عوام کے دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی! مسٹر فرید نے دفتری نظم و نسق کو چست اور فعال بنانے میں بڑی فرض شناسی کا ثبوت دیا اور سرمایہ داروں کو ٹوکا کہ وہ مزدوروں اور ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں!

مسٹر فرید احمد نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کردیا کہ جب کبھی اللہ کو منظور ہوگا، پاکستان کے دن پھریں گے اور اس ملک کی زمام اقتدار صالح لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ دور نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا کے لئے کس قدر خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ اور وہ دنیا جو آج روس کے مصنوعی سیاروں سے مرعوب ہے، انشاءاللہ اس وقت اسلامی اخلاق سے متاثر ہوگی،

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

چندریگر وزارت کو اگر کام کرنے کا موقع اور وقت ملتا، تو قوم اس وزارت سے بڑی اچھی توقعات رکھتی تھی مگر ری پبلکن کی عہد شکنی اور وعدہ خلافی نے اچانک حالات کو دگرگوں کردیا!

دس سال کی مدت میں مسٹر فیروز خاں نون ساتویں وزیراعظم ہیں، جن کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آئی ہے۔ صاحب موصوف انگریز کے دور میں سر سکندر حیات خاں اور سر محمد یعقوب کی صف کے آدمی تھے، جن کی وفاداری اور نیازمندی پر حکومت برطانیہ پورا اعتماد کرتی تھی اور سر ہارکورٹ بٹلر، میلکم ہیلی اور کننگھم کی طرح ان کو اپنا معتمد علیہ سمجھتی تھی، پاکستان بننے کے بعد وہ مختلف اعلیٰ ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے ہیں، اور پچھلے دنوں انھوں نے مجلس اقوام میں کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان کی اچھی نمائندگی کی ہے، غیب کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ مسٹر فیروز خاں نون اس عظیم الشان ذمہ داری کو کس طرح نباہتے ہیں اور ان کی وزارت کیا کارنامہ انجام دیتی ہے، اگر وہ اپنے کو بدل کر اسلام اور پاکستان کی مفید خدمات انجام دے سکے، تو اللہ کی نصرت اُن کے ساتھ ہوگی اور اس طرح وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں تلافیٔ مافات کرسکیں گے!

اسلامی اتحاد

پاکستان اس وقت سخت خطروں میں گھرا ہوا ہے، وہ تمام قوتیں جن کو پاکستان کا اسلامی حکومت بننا کسی عنوان گوارا نہیں ہے، ایک محاذ پر جمع ہوگئی ہیں، ان کا یہ اتحاد توقعات کے عین مطابق ہے، اسلامی نظام کے قیام میں ان کو اپنے اقتدار کی موت اور اپنے نظریوں کی شکست نظر آتی ہے! پاکستان میں مخلوط انتخاب کی حمایت اور صوبائی عصبیت کے فروغ کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھارت اور روس کی توقعات کی صدائے بازگشت ہے، مخلوط انتخاب کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی امتیازی حیثیت کو فنا کرنے کے لئے، ہندو کا پیسہ اور اس کا دماغ پوری طرح کام کر رہا ہے، نیشنل عوامی پارٹی اشتراکیت کے لئے زمین ہموار کر رہی ہے، یہ جو سننے میں آرہا ہے کہ "مخلوط انتخاب" کو جزو دستور بنانے کی خفیہ سازش کی جارہی ہے، تو ایسا ہونا کوئی امر مستبعد نہیں ہے، ان اسلامی نظریوں کے مخالفین کے پیش نظر اصل اسکیم تو یہ ہے کہ پاکستانی دستور کی اسلامی اسپرٹ کو ختم کردیا جائے، "پاکستانی جمہوریہ" کے ساتھ لفظ "اسلامیہ" دیکھکر یہ لوگ بہت پیچ و تاب کھاتے ہیں، اور ان کو خدانخواستہ موقعہ مل گیا تو پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنا کر دم لیں گے۔

اسلامی نظریات کے علاوہ جمہوریت کے لئے یہاں سب سے بڑا خطرہ ان بڑے لوگوں سے ہے، جن کو عوام پسند نہیں کرتے، اور جن کو خود بھی عوام میں اپنی اس غیر ہر دلعزیزی کا احساس ہے، اس لئے "انتخابات" میں ان کو اپنے

اقتدار اور فرمانروائی کی موت نظر آتی ہے، یہ "بڑے لوگ" "انتخابات" ٹالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور کیا عجب ہے کہ وقت کے وقت کوئی خطرناک قسم کا سیاسی بحران پیدا کر دیں۔

ہم نے پاکستان کی سیاست کا جو جائزہ لیا ہے اس میں کوئی بات ایسی نہیں کہی جس کی صحت پر ہمارا ضمیر مطمئن نہ ہو گیا ہو، ہم کسی خوف سے حق بات کو چھپا بھی نہیں سکتے، اگر ہم سے اظہارِ واقعہ میں کوئی غلطی ہو گئی ہے، اور ہماری غلطی ہم پر واضح کر دی جائے، تو اس کے اعتراف میں ہم ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کریں گے، ہمیں کسی شخص کی ذات سے کوئی کد اور بیر نہیں ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ جب کسی کے قول و فعل کو ہم اسلام، ملت اور پاکستان کے لئے مضرت رساں پاتے ہیں، تو اس وقت ہماری دینی غیرت کا تقاضا ہوتا ہے کہ حق کا اعلان کریں اور غلط کاروں کو بے نقاب کر دیں! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ روس اور مصر کی طرح حق گوئی پاکستان میں ابھی "جرم" قرار نہیں دی گئی!

ماحول بہت تاریک، فضا انتہائی مضطرب اور حالات بہت خطرناک ہیں، مگر انسان کے فکر و تدبر اور ثبات و استقلال کی آزمائش ایسے ہی نازک موقعوں پر ہوتی ہے اسلام پسندوں کے اتحاد کا اس سے زیادہ نازک موقع اور کیا ہو گا، ضرورت ہے کہ اسلام پسندوں کی ایک ایک رمق قوت ایک مرکز پر جمع ہو جائے! اس وقت سامنے کی چیز یہ ہے کہ حکومت پر اس قدر دباؤ ڈالا جائے کہ "انتخابات" کا "ٹالنا" ناممکن ہو جائے" پاکستان میں جمہوریت کا عملاً نفاذ "انتخابات" ہی کے ذریعہ ہو گا۔ انتخابات میں اگر عوام نے مردم شناسی سے کام لیا اور اسلام پسندوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ووٹ دئے، تو پھر کسی ٹکراؤ اور ناخوشگواری کے بغیر آئینی انقلاب آپ ہی آپ آ جائے گا!

اسلام اپنے نفاذ کے لئے گندی سیاست اور غلط طریقوں کو پسند نہیں کرتا، یہ باتیں تو کمیونزم ہی کو زیب دیتی ہیں کہ وہاں اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر بُرے سے بُرے طریقہ اور سازش کو کام میں لایا جا سکتا ہے مگر اسلام اس کی اجازت نہیں دے سکتا، پاکستان میں اسلام پسندوں کو ہر جد و جہد اسلامی اخلاق کے حدود میں رہ کر کرنی چاہیئے، جوش ہو مگر ہوش کے ساتھ! جرأت ہو مگر تدبیر کے سایہ میں! ہر قدم پر اللہ کی رضا اور خوشنودی کا احساس! اخلاص، ایمانی فراست اور پاکبازی و خدا ترسی کے ساتھ فکر و عمل کی قوتوں سے کام لیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ساتھ دے گی اور جسے اللہ کی نصرت میسر آ جائے اس کو غالب اور فتحمند ہی ہونا چاہیئے!

ماہر القادری

۲۲ دسمبر سنہ ۵۷ء

سبط فاروق (ایم۔ اے)

جدید تقاضے اور اسلام

آج انسان دوراہے پر کھڑا ہے، معاشری تاریکیوں میں سماجی بھول بھلیوں میں چشمۂ مقصود کی تمنّا اس کے دل میں موج زن ہے اور اس کی نگاہیں شمعِ ہدایت کی طالب ہیں، اسے راہ کی پہچان، راستہ کی آنکل تک نہیں اور گومگو کے عالم میں وہ تھوڑی دور ہراک راہرو کے ساتھ چلتا اور پھر بھٹک کر، لوٹ کر اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ چلا تھا۔ اس کا ذہن متضاد نظریوں کا شکار ہے اور اس کا جسم معاشری بحران، اور سوشل ابتری کا! حیاتِ جدیدہ کے تقاضے اب تک اسے ایک ایسے دوراہے پر پہنچا سکے ہیں جس کا ایک راستہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے نام سے معنون ہے اور جس کی دوسری راہ اشتراکیت کی نظر فریب وادی سے گذر کر اشتمالیت کے خلا یا خندق پر منتج ہوتی ہے۔

جدید علوم نے انسان کے فکر و نظر کو ضرور جلابخشی ہے، اس کے دل و دماغ برق و رعد کی چکاچوند اور گھن گرج سے ضرور متاثر ہیں، نظری سائنس اور سوشل سائنس ہر دو نے ذہنی اور سماجی حقائق کو ضرور اجاگر کیا ہے، اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انفرادی اور اجتماعی داخلی اور خارجی، فکری اور عملی زندگی کے نت نئے پہلو ابھر کر سامنے آگئے ہیں اور موجودہ صدی کا انسان کنشت و کلیسا کی تنگنائے اور بند گلی میں واپس لوٹنے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں۔ تحیر و تعجب کی جگہ تفکر و تدبر نے لے لی ہے اور اوہام پرستی یا مظاہر پرستی کی اس کے ذہن میں قطعی گنجائش نہیں، اب اس کا لائحہ عمل اکتشافاتِ فطرت، حقیقت کی کھوج ہے اور یہ بنیادی امر جدید ذہنی کلچر کا روشن اور مثبت پہلو ہے۔ فضا میں معلق ریا سے سپٹنیا اور چاند تک پہنچنا اس قسم کے تجربات جنھوں نے ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹیلی وژن تک کو قصہ ماضی بنادیا، انداز نگاہ کی اس اہم تبدیلی کا ثمرہ ہیں۔

مگر اس امر واقعہ اور اس اساسی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تخریب تعمیر پر حاوی ہے۔ جدید انسان نے مظاہر فطرت کو تسخیر ضرور کیا مگر خود ان کا شکار ہوگیا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہے مگر بے بس ہے۔ یہ "جن" تو شیشی توڑ کر اس نے ضرور آزاد کردیے مگر خود یہ جن اب اس کے سر ہیں، روس کا اسپٹنک فضائی تجربہ اور تخفیفِ اسلحہ گفت و شنید کے متعلق اس کا مبدل رویہ اس حقیقت کی ایک چھوٹی مگر سامنے کی مثال ہے۔ اس کے لئے موردِ الزام کوئی مخصوص طاقت یا طاقتیں نہیں بلکہ فرق صرف

زاویۂ نگاہ کا ہے۔ تخریبی اسلحہ کی اس ریس کے پس پشت وہ تخریبی متضاد نظریات زندگی ہیں جنھو
نے اس کائنات کو حاصل کائنات سمجھ لیا ہے اور تسخیر کائنات کے لئے باہم متصادم ہیں، امریکہ
یا روس، برطانیہ ہو یا چین سب تخریبی اسلحہ سازی کی جنگ میں برابر کے شریک ہیں - امن عالم
وظیفہ زبان پر ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ ہائیڈروجن بم یا نائٹروجن بم، راکٹ یا خدانخواس
کوبالٹ بم ہیں، ان متصادم طاقتوں میں سے کوئی طاقت وقتی طور پر دوڑ میں آگے بڑھ جاتی
اس کو غرہ ہو جاتا ہے کہ اب میدان مارا، وہ خواب دیکھنے لگتی ہے کہ اب اپنے نظام کی فتح اور مخالف
نظام کی تباہی یقینی ہے اسی اثنار میں مخالف طاقت زقند لگاکر آگے ہو جاتی ہے اسے بھی اسی قس
گمان ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے اس دوڑ اس ریس کا انجام یہی ہوگا
نہ صرف ہر دو نظام زندگی ختم ہو جائیں بلکہ کل کرۂ عالم تباہ و برباد ہوکر ریزہ ریزہ ہوکر فضا میں گم ہو

یہ تو باہمی چپقلش کا عالم ہے، داخلی طور پر دونوں میں سے ہر اک نظام بغیر کسی استثنار کے انتشار
فساد کا شکار ہے - کیونکہ ہر دو نظام یعنی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتمالیت، کیپٹازم اور کمیونز
میں باہمی کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو ان کے مابین ایک غالب قدر مشترک ضرور رہے، عامیانہ زبان
دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ہر دو کا اصولِ حیات، اتمامی دائرۂ فکر اور اساسی نظریۂ حیا
حیوانیت کے سوا کچھ نہیں اور ان کے مابین وہ لطیف شئے گم ہوگئی ہے جو حیوانیت کو انسانیت کی بل
سطح پر لاتی ہے، اخلاقِ انسانی کا وہ نازک رشتہ ٹوٹ گیا ہے جو آدمی کو بہائم سے ممیز کرتا ہے۔

عملی طور سے، ٹھوس طریقہ سے دیکھئے، سرمایہ دارانہ نظام کو لیجئے سرمایہ داری جب خوف زدہ یا جنگ
آزما ہوتی ہے تو فاشزم، نازی ازم کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور جب حالات پر نسبتاً حاوی ہوتی ہے تو اس
نام پلوتوکریسی یعنی مالدار طبقے کی جمہوریت ہے، یہ سراسر زیادتی یا ایک طرفہ نقطۂ نگاہ ہوگا اگر اس کے ا
پہلو نظر انداز کردئے جائیں۔ جہاں فاشزم سراسر بہیمیت اور درندگی ہے وہاں پلوٹوکریسی سراسر روباہی
مگر اس کے باوجود طبقہ وارانہ حدود میں پلوتوکریسی اندرونی امن یعنی قانون کے قیام و عمل کی علمبردار ہے آزا
آزادیٔ مجلس، آزادیٔ عمل، آزادیٔ اظہار عطا کرتی ہے، پارلیمنٹری یا صدارتی جمہوری اجتماعی کردار مخالف
ساتھ رواداری، تحمل و بردباری کا سبق دیتا ہے اور اس طرح اندرونی اصلاح کے زیادہ مواقع بہم پہنچاتا ہے یہا
کہ اس فضا میں کمیونزم تک کو پروان چڑھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ بیلٹ بکس کے ذریعہ رائے شماری اور پری
پلیٹ فارم کی آزادی سے عوامی شعور نشو و نما حاصل کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر جب یہ سب کچھ ہوتا ہے طبقہ واری حدود میں، مقصد یہی ہوتا ہے کہ اسٹیٹ کے اندر اور باہر ذرائ
پر ایک قلیل طبقہ کا قبضہ و تصرف ہو اور قبضہ و ملکیت بھی اتمامی طور پر اجارہ داری، ڈومنانس کیپٹلزم اور معا
سامراج پر منتج ہوتا ہے اور اس طرح رزق، دولت چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجاتی ہے اور ان
CARtels ، ان جتھوں کی گروہ بندیاں عالمی کساد بازاری، عالمی تجارتی بحران، RADE CYCLES
اقتصادی انتشار، عمومی بے روزگاری، عوامی بدحالی، فتنۂ یہودیت اور بین الاقوامی جنگ جیسی مہیب ڈھکو

ار ہوتی ہیں۔ آج فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے یہودی امریکہ، برطانیہ، فرانس کے وافر سرمایہ پر
رت ہیں وہی گذشتہ جنگ کا ایک بڑا سبب بنے اور ان ہی کے فائننس کیپٹل سے زیادہ تر دنیا کو شکنجے
اپ بجا رکھا ہے۔

یہ سب پلوٹو کریسی، سرمایہ دارانہ جمہوریت کی برکتیں ہیں، اب سکے دوسرے رخ پر نظر ڈالیے۔ اشتراکیت اور
مالیت، سوشلزم اور کمیونزم کو پرکھیے۔ اس کی بنیاد بیان کیا جاتا ہے۔ معاشری انصاف سوشل جسٹس پر
ہے۔ اس نام نہاد معاشری انصاف کی خاطر جمہوریت، عوامیت، آزادیٔ فکر و عمل سب کو قربان گا
ینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ کمیونزم کے اساسی اصول "طبقہ واری جنگ" خونی انقلاب اقتدار مزدوروں کے ہے
ٹرشپ کا قیام اور انجام کار اسٹیٹ کا خاتمہ اور غیر طبقہ وار سماج کا قیام ہیں۔ مارکسزم معاشرے کی اساسی
معاشی حس یا معاشی قدر قرار دیتا ہے وہ روحانیت کا سراسر انکار کر کے اخلاقی قدروں کو معاشی قدر کی
ٹی پر پرکھتا ہے اور اخلاق میں اسے اضافیت ہی نظر آتی ہے یعنی جیسا موقع ویسا رویہ اگر حصولِ مقصد کے
جھوٹ اور فریب سے کام چلے تو مارکسی اخلاقیات میں اس جھوٹ پر اس مکر و فریب پر سچائی اور راستی کو
ن ہو جانا چاہیئے۔ اس لئے موقع پرستی، ابن الوقتی کی خاطر کبھی امنِ عام کے راگ گائے جاتے ہیں اور کبھی سول دا
رونی خانہ جنگی اور عالمگیر جنگ کو سراہا جاتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ مارکسزم اپنے اندرونی داخلی تضادات کا شکار ہے۔ اسی لئے طبقہ واری جنگ جیسے
ے اساسی اصول کو ٹھکرا کر موجودہ فضا میں اندرونی توڑ پھوڑ یا طبقہ واری منافرت نیا اصولِ زندگی بن گیا
۔ کسان مزدوروں کے نام پر خونی انقلاب برپا کیا گیا مگر عملاً کلی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدہ داروں
ری مینجروں، اجتماعی فارموں کے ڈائرکٹروں اور پولیس فوج کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل ایک قلیل بیوروکریسی دفتر
ہی حامل اقتدار ہے اور اس طرح نئے طبقے وجود میں آ گئے ہیں جن پر خوف زدگی اور جنگ آزمائی کے بھوت
ہیں۔ اسٹیٹ بجائے ختم ہونے کے استبداد کا آلۂ کار بن گئی ہے اس استبداد کے پنجے روز بروز مضبوط ہو رہے
اور یہ استبداد چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے جن کی باہمی خانہ جنگی چپقلش، اکھاڑ پچھاڑ نے ضرب المثل
کبھی سابق عظیم باپ اسٹالن کے مردے پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، کبھی ٹراٹسکی، اکامی ناف، بخارین کی
ی آئی، کبھی بیریا کی، کبھی مالوٹوف، شیپی لوف اور مالنکوف کی اور کبھی ژوخوف کی، غرض حال کا عظیم، پیرو
قبل کا عظیم غدار ہے۔

کلاس وار، طبقہ واری جنگ کے مرکز صنعتی مزدور کے بجائے غیر متمدن قبائل یا پس ماندہ زرعی طبقے بن کر
گئے ہیں اور اس طرح مارکسزم [1] کا اساسی اصول ہی یکسر بدل دیا گیا ہے جس کے ذریعہ سب تانا بانا بنا گیا تھا۔
پسندی کا نیا نام DYNANISM انقلابی زاویۂ نگاہ ہے۔
رہا معاشی انصاف۔ یہ ضرور ہے کہ REGIMENTATION اقتصادی جبری نام بندی سے بیروزگاری

---

[1] مگر کارل مارکس کے اساسی اصول میں خود بنیادی خرابیاں موجود ہیں۔ (مدیر)

کا خاتمہ کر دیا گیا ہے مگر اس روزگار نوازی سے کیا حاصل جب ایک ڈبل روٹی کی قیمت چودہ آنے، ایک انڈے کی قیمت سوا روپیہ اور ایک جوتہ کی قیمت مزدور کے ایک ماہ کی تنخواہ ہے اور ایک جوڑے کپڑے کی قیمت تین ماہ کی تنخواہ یعنی کئی سو روپیہ ہے۔ کسان اور مزدور دونوں یکساں محنت کا وقت صرف کرتے ہیں مگر ان کے معیارِ زندگی میں ایک اور تین کی نسبت ہے اور ایک مزدور اور ایک مینجر کی تنخواہ میں تیس چالیس گنا فرق ہے یہ اقتصادی تفاوت خود ہی طبقہ واری معاشرہ کا ضامن ہے۔ نئے مالدار طبقے پیدا ہو رہے ہیں اور یہی مالدار طبقے ذرائع دولت اور سیاسی اقتدار کے بلا شرکتِ غیرے مالک و قابض ہیں اور محنت کش طبقے کسان مزدور جبری غلامی، بیگار اور ظلم وجور کا نشانہ ہیں۔

الغرض کمیونزم نے مادی زندگی کے صرف ایک پہلو یعنی معاشی مسئلہ کو لیا مگر اُسے بھی حل کرنے کے بجائے پیچیدہ تر بنا دیا، مادی زندگی کا دوسرا پہلو جنسی مسئلہ ہے زن وشوہر کا رشتہ یعنی اہلی زندگی بھی اسی قدر اہم ہے جس قدر پیٹ اور بھوک کا مسئلہ۔ جنسی مسئلہ کا حل بھی اسی قدر وزنی سوشل مسئلہ ہے جس قدر تقسیمِ دولت اشتراکیت اس مسئلہ سے سراسر روگردانی کرتی ہے اور اس کو ایک انفرادی پرائیویٹ معاملہ قرار دیکر نظر انداز کرتی ہے نتیجہ جنسی انتشار ہے!

جنسی مسئلہ کا تعلق پورے سوشل نظام جمالیات اور اخلاق سے ہے، اہلی زندگی ہی سے محبت و اخوت، ایثار اور خلوص کے چشمے پھوٹتے ہیں اس کے برعکس پیٹ کی بھوک تو انفرادی خود غرضی، بغض وعناد، حسد، کینہ اور جنگ آزمائی کے لئے مجبور کرتی ہے، اس زن وشوہر کے رشتہ اور تولید و تناسل جیسے سوشل مسائل کو نظر انداز کرنا حقیقت سے دور بھاگنا ہے۔ جو معاشرہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا اور جنسی بے لگامی کی اجازت دیتا ہے وہ اپنے اندر وہ تمام اخلاقی اور سماجی بُرائیاں پیدا کر دیتا ہے جو اسی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں اسی لئے کمیونزم خود غرضی، ظلم وجور، فتنہ وفساد، قتل و خوں ریزی، لاقانونیت، حسد کینہ، جرم وعصیاں مکر و فریب وغیرہ لعنتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔

یہ تو اشتراکی سماج میں مادی زندگی کا حال ہے۔ رہ گیا مذہب، اخلاق اور روحانیت اس کا جو حشر ہوا وہ ظاہر ہے اور اس کے اظہار کے لئے آنکھ میں آنسو، زبان میں قوت اور قلم میں طاقت نہیں۔

الغرض ہر دو جدید نظام ہائے زندگی یعنی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمیونزم، شر وفساد کا منبع ہیں اور اپنے داخلی تضادات اور انتشار سے خود اپنے گورکن پیدا کر رہے ہیں۔ اہلِ فکر یعنی ذہین طبقہ اس فتنہ و شر سے باخبر ہے مگر وہ عجب گومگو کے عالم میں حیران و سرگرداں ہے، اس پر بے یقینی طاری ہے اور بے یقینی معاشرہ کی موت ہوتی ہے۔ اس بے بسی کے عالم میں ذہین طبقہ' (INTELLIGENTSIA) کی دستگیری کر سکتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اسلام تک ذہین طبقہ کی رسائی نہیں۔ باشعور طبقہ صرف اتنا جانتا ہے کہ اسلام روح اور مادہ، دنیا و آخرت، اخلاق اور معاشرت، معاشیات وجنسیات میں ایک حسین امتزاج پیدا کرتا ہے وہ حسین امتزاج کیا ہے یہاں تک اس کی دسترس نہیں، اسے کچھ علم نہیں کہ حقوق العباد کی بنیاد کس طرح عقیدہ توحید و رسالت پر قائم ہے اور دشواری یہ ہے کہ اسلام کی صفوں میں اندرونی انتشار ہے اور رہنمائی

مفقود ہے اس کی نگاہیں طبقۂ علماء کی جانب اٹھتی ہے مگر ذہین طبقہ اور طبقۂ علماء کے مابین ایک وسیع حائل
ہے، جن علوم جدیدہ یعنی سوشل اور نظری سائنس سے یہ ذہین طبقہ بہرہ ور ہے، ان علوم سے علماء
نابلد ہیں اور جن علوم پر علماء کو عبور ہے ان سے یہ طبقہ سراسر بے بہرہ و بے نصیب ہے۔ دونوں طبقوں
میں زاویۂ نگاہ کا بھی فرق ہے۔ علماء کی زیادہ تر توجہ معاد و آخرت پر ہے، ماورائیت پر ہے، نظری
الٰہیات پر ہے، وہ ہر شئے کو یونانی منطق و فلسفہ یا علم کلام کی رو سے دیکھتے ہیں اور ذہین باشعور
طبقہ کی نظر اس[1] دنیا، اس کائنات پر ہے، نظری سائنس سے وہ فضاؤں کا کھوج لگا رہا ہے اور
سوشل سائنس سے اقتصادیات اور سیاسیات کی گتھیاں سلجھانا چاہتا ہے اسے عمرانیات کی جستجو ہے، اور
اس بارے میں اس کو قرآن و حدیث کی ضیا پاشیوں کی ضرورت ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن ایک اساسی و بنیادی
اور تحریر شدہ قانون WRITTEN LAW ہے اس کے ساتھ ہی معاشرہ کو بائی لاز اور کنونیشنوں کی ضرورت
ہوتی ہے قوانین قرآن کی ایسی عملی تشریح و توضیح حدیث میں موجود ہے اور فقہ کی وہی حیثیت ہے جو JUDGE.
MADE LAW ججوں اور ماہروں کے ذریعہ مرتب شدہ قانون کی ہوتی ہے۔ عمومی قانون کا تمام تر دار و مدار
ان تین SOURCES ذرائع پر ہوتا ہے۔ بحمد اللہ قرآن پر ایک حرف میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا حدیث کے
فن میں جو تحقیق و تدقیق کی گئی ہے اس کا اپنا مقام ہے اور فقہ کی باریک بینیاں جزئیات اور فروعات پر حاوی
ہیں۔ یہ ہر سہ ذرائع ہی ذہین طبقہ کو راہ مقصود پر لگا سکتے ہیں اور ان تینوں ماخذ قانون تک جدید ذہین طبقہ
کی رسائی نہیں۔

ظاہر ہے کہ علمائے کرام ہی اس اہم فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ علماء اور ذہین طبقے کے زاویۂ
نگاہ میں ہم آہنگی ہو۔ ذہین باشعور طبقے میں ہزار گونہ برائیاں اور خامیاں ہیں مگر تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس کے
قلب میں خلوص ہے اور اس کی نگاہیں متجسس ہیں وہ چاہتا ہے کہ جدید عمرانیات، جدید سوشل سائنسوں کو مد نظر
رکھتے ہوئے ضروریات وقت کے مطابق انفاق دولت اور پیداوار دولت کے مسائل قرآن و حدیث کی رو
سے واضح کئے جائیں اس کی نگاہیں ایک ایسے نظام کے لئے بے قرار ہیں جس میں پیداوار رزق، پیداوار دولت
میں روز افزوں نشوونما کی ضمانت ہو جس میں سرمایہ کا صحیح مصرف ہو، جس میں معاشی انصاف ہو اور جس میں
سیاست پر شیطانوں یا اجارہ داروں کا قبضہ نہ ہو۔

اب میری رائے میں یہ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد پر بھی تشفی بخش
توجہ فرمائیں، قرآن حدیث اور فقہ کی منور روشنیوں میں علمائے کرام ہی اس اہم فریضہ کی بجا آوری کے اہل ہیں۔
دہر کو پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احیاء کی ضرورت ہے اور علماء ہی مشعل بردار ہو سکتے ہیں۔

---

[1] یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے کہ مسلمانوں کے ذہین و باشعور طبقہ کی نگاہ صرف اسی کائنات پر ہے اور معاد و آخرت
سے وہ غافل ہے کائنات کے وہ مسائل جن کے پیچھے "آخرت" کا تصور و یقین نہ ہو انسانیت کے دکھ کا پورے طور پر
مداوا نہیں کر سکتے، اسی آخرت فراموشی ہی نے ملت اسلامیہ کو اس پستی تک پہونچا دیا ہے۔ (مدیر)

پروفیسر اسرار احمد بہادری

انسانی ارتقاء

آجکل دنیا کے مفکرین کے ذہن میں یہ سوال چکر لگا رہا ہے کہ آیا انسان اپنی فتوحات اور ارتقاء کی آخری حدود تک پہونچ چکا ہے یا ابھی اور آگے بڑھنے کا امکان باقی ہے۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسان اب اس نقطۂ کمال تک پہونچ گیا ہے جہاں پہونچ کر ہر شئے کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور اب انسان خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ اس نے ایسی ایسی خطرناک چیزیں تیار کرلی ہیں جو ذرا سی دیر میں ساری دنیا کو تباہ کر سکتی ہیں۔ لیکن دوسرے طرزِ فکر کے لوگ کہتے ہیں کہ انسانی ارتقاء ابھی جاری رہے گا اور اس کے ابھی بہت دور تک جانے کے امکانات ہیں۔ ابھی ہماری اس دنیا کی مکمل تباہی کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ ابھی ہم کو چاند تاروں میں پہونچنا ہے۔ وہاں اپنی آبادیاں قائم کریں گے۔ وہاں ہماری حکومت قائم ہوگی۔ نیچر کی ہر قوت پر ہم اقتدار حاصل کریں گے اور ان بے پناہ قوتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے۔

ان دونوں طرز ہائے فکر کے لوگ دنیا کو صرف مادی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ترقی اور تنزل صرف مادّے اور جسم سے متعلق ہے۔ اس قسم کی ترقی و تنزل کا ذکر کرتے وقت زندگی کا روحانی یا اخلاقی پہلو ان کی نظروں سے بالکل اوجھل اور پوشیدہ ہو جاتا ہے اور یہیں سے انسانی زندگی میں عدم توازن اور بدحالی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ترازو کا ایک پلہ بہت جھک جاتا ہے اور دوسرا پلہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے بھلا اس قدر نشیب و فراز کی موجودگی میں عدل و توازن کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی ہماری زندگی غیر معتدل ہے۔

در اصل انسانی زندگی کی دو حصوں میں بنیادی تقسیم باوجود انتہائی مادی ترقیوں کے آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اس میں شبہ نہیں کہ مادی لحاظ سے ہم بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور نہ معلوم کہاں تک بڑھتے چلے جائیں گے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہم اخلاقی لحاظ سے ذلت کے عمیق ترین غاروں میں گرتے چلے جا رہے ہیں اور یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اگر ایک چیز اس کو حاصل ہوتی ہے تو دوسری چیز اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ سائنس کی بے پناہ ایجادات ہمارے لئے اس دنیائے آب و گل میں جنت کا سماں پیش کر سکتی تھیں لیکن افسوس کہ اخلاقی اور روحانی انحطاط نے انھیں ایجادات کو ہماری زندگی کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے ہمیں ایک دوسرے کی زندگی۔ آزادی۔ عزت اور خوشحالی کو تباہ کر ڈالنے میں ذرا تامل نہیں ہوتا اور آج دنیا کے بہت سے مفکر چیخ رہے ہیں کہ اگر سائنسی ایجادات پر اخلاقی پابندیاں عاید نہ کیجا سکیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرے گا۔ یہ ایجادات ہمارے لئے اسی وقت

باعثِ خیر ہوسکتی ہیں جبکہ ہم ان کے استعمال پر اخلاقی پابندیوں کی بالادستی قائم کردیں ان کا پورا پورا احترام کریں ورنہ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی ملک ہوسِ اقتدار اور ملک گیری کے شوق میں دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کے لئے ان خوفناک قوتوں کو بروئے کار لے آئے جو ساری دنیا میں بڑی آسانی سے زندگی کا خاتمہ کرسکتی ہیں اور پھر خود بھی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے علامہ اقبال مرحوم نے اس خدشے کو محسوس کر کے یہ پیشین گوئی کی تھی ؎

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی ممالک کے وہ لوگ جو خدا، مذہب اور روحِ انسانی کو فراموش کر چکے ہیں ان کا حیاتِ انسانی کے متعلق نظریہ صرف مادی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جبکہ ایسے لوگ جو کہ خدا کے فضل وکرم سے مسلمان ہیں۔ خدا اور رسول پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ خدا کے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ رسول کی سنت کا اتباع کرتے ہیں وہ بھی مغربی فلسفۂ حیات اور توجیہہ کائنات سے متاثر اور مرعوب ہوکر زندگی کے ایک ہی رخ کو دیکھ کر کوئی حکم لگا دیتے ہیں اور ان کے ہم مشرب وہم مسلک لوگ حیران ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھ سکتے کہ ان کے یک رخے دعاوی کی کیا توجیہہ کریں۔ اسلام پر اس قسم کا ابتلا بہت پہلے سے مسلط رہا ہے کہ دانستہ بیگانوں کے فلسفۂ حیات اور تصورِ کائنات سے متاثر ہوگئے اور اس تاثر کے تحت اسلامی فلسفۂ حیات اور تصورِ کائنات کی تشریح کرنا شروع کردی اور اس طرح عامۃ المسلمین کو ایک چکر میں ڈال دیا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں یونانی فلسفے نے اسلامی عقائد کو بیحد متاثر کیا اور نتیجے کے طور پر متکلمین اور معتزلہ کے فرقے پیدا ہوگئے اور آہستہ آہستہ یہ اثر بڑھتا چلا گیا یہاں تک فارابی۔ ابن سینا۔ امام رازی اور امام غزالی وغیرہ ان کے خیالات وعقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کے بعد دوسرا زبردست ریلا یوروپ سے صنعتی انقلاب کے جلو میں آیا اور ساری دنیا کے مسلم مفکرین کو بڑی حد تک متاثر کر گیا۔ ہندستان میں سرسید مرحوم کی قرآنی تفسیر اور فلسفہ نیچر اس کا بین ثبوت ہیں۔ علامہ شبلی مرحوم بھی اس سے متاثر و مرعوب معلوم ہوتے ہیں چنانچہ "الکلام اور تاریخ علم الکلام" میں اس تاثر کا پرتو بڑی حد تک نمایاں ہے۔ آج ہمارے اپنے زمانے میں بھی بعض مفکرین اور علما موجودہ سائنسی ایجادات سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور بعض اوقات کوشش کرتے ہیں کہ روحانی اور اخلاقی قدروں کی توجیہہ موجودہ سائنس کی روشنی میں پیش کریں۔ ان کی یہ کوشش ہرگز مطعون نہیں ہوسکتی اگر یہ لوگ حد سے تجاوز نہ کر جائیں اور عقائد کی بنیادوں پر تیشہ زنی شروع نہ کردیں۔ سائنس اور فلسفے کے نظریات ہر آن بدلتے رہتے ہیں ان پر مذہب یا اخلاقیات کی بنیاد رکھنے کی کوشش انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے اور اس کا کم سے کم نتیجہ یہ ہوگا کہ ان نظریات کی طرح ہماری دینی، روحانی۔ اور اخلاقی قدریں بھی ہر آن بدلتی رہیں گی اور زندگی کی کسی چیز میں استواری اور استقلال برقرار نہ رہ سکے گا۔ زندگی ایک بدلتا ہوا بہروپ بن کر رہ جائے گی یا سینما کی ہر لمحہ بدلنے والی ریل جو ہر لحظہ ایک نیا رنگ روپ نظروں کے سامنے پیش کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کی کسی چیز کو قیام وثبات کیونکر حاصل ہوسکتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کی طرف سے بددلی بداعتمادی اور مایوسی

پیدا ہوگی اور ذہنی سکون و آسودگی عنقا ہو کر رہ جائے گی۔ میں اس مقام پر ایک فاضل مسلمان فلسفی اور سائنسداں ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی ایک کتاب کے چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے آپ یہ اندازہ کر سکیں گے کہ آجکل کے ہمارے اپنے مسلمان مفکرین جدید سائنسی نظریات اور جدید زندگی کی فلسفیانہ توجیہات سے کس قدر متاثر ہیں اور ان دونوں کی روشنی میں توجیہہ کائنات پیش کرتے ہوئے کس حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب ایک جگہ اس کتاب میں فرماتے ہیں "حالانکہ انسان دوسرے جانداروں کے مقابلے میں تخلیق کا ایک عجیب شاہکار ہے لیکن آج کا انسان مستقبل کے انسان کے مقابلے میں محض ایک جانور کی حیثیت کا مالک ہوگا۔ شعور نے ابھی اپنا ایک ادنیٰ سا حصہ موجودہ انسان کی ذات میں رونما کیا ہے۔ زندگی میں ابھی لاتعداد امکانات اور رجحانات پوشیدہ ہیں جو بروئے کار آنے کے لئے بیقرار ہیں[1]۔"

ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیتے اگر یہ انسان کی مادی زندگی کے متعلق ہوتا۔ بلاشبہ ہماری مادی زندگی میں ابھی بہت سے امکانات اور پوشیدہ قوتیں ظاہر ہونے کے لئے بے قرار ہیں اور اگر زمانے نے مہلت دی تو یہ چیزیں پردۂ ظہور پر رونما ہو جائیں گی لیکن اس دعوے کی ہمہ گیری غیر ذمہ دارانہ معلوم ہوتی ہے اور اس سے اتفاق کرنا ایک صاحب ایمان مسلمان کے لئے ممکن نہیں شاید محترم ڈاکٹر صاحب کو یہ جملہ لکھتے وقت یہ خیال نہ رہا ہوگا کہ روحانی اور اخلاقی حیثیت سے انسان اپنے کمال کی انتہائی بلندیوں تک پہونچ چکا ہے اور اس حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے کردار اور ان کی شخصیتیں ہمارے سامنے ایک بلند ترین معیار پیش کر چکی ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک مسلمان اخلاقی و ایمانی لحاظ سے اس سے زیادہ اور کونسی بلندیوں کا متلاشی ہے اور وہ کس طرح یہ ہمہ گیر دعویٰ کر سکتا ہے کہ مستقبل کا انسان ہر لحاظ سے اتنا ارفع و اعلیٰ ہو جائے گا کہ اپنے اسلاف پر جب وہ نظر ڈالے گا تو وہ لوگ اپنے مقابلے میں اس کو جانوروں کی طرح پست نظر آئیں گے۔ ہمارے خیال سے تو معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوگا اور اب بھی اسلاف اخلاقی میدان میں اپنے اخلاف سے کہیں زیادہ بلند ہیں مسلمانوں کے بارے میں تو ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف مجموعی طور پر ہم سے کہیں زیادہ بلند اخلاق اور صاحب ایمان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کے مقابلے میں ایک مغربی مفکر کے چند جملے بھی پڑھ لیجئے جس میں اس نے موجودہ دور کے انسانوں کے اخلاقی انحطاط کا ماتم کیا ہے "موجودہ تہذیب ہمیں کچھ راس نہیں آرہی ہے کیونکہ یہ ہماری بنیادی فطرت اور اس کے مختلف تقاضوں کو بغیر ملحوظ خاطر رکھے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ تہذیب سائنسی ایجادات کے پیدا کردہ اوہام کے اجزائے ترکیبی سے مرتب کی گئی ہے۔ اس میں انسانی ہوس کاری۔ بے لگام آرزوئیں۔ بے انتہا شہوات۔ اور لاتعداد خود فریبیاں کارفرما نظر آتی ہیں[2]"

دیکھئے کیرل ایک ایسے ملک کا رہنے والا ہے جہاں کے معاشرے میں خدائی احکام کا عملی زندگی میں بہت کم

---

(1) Ideology of the future by Dr. Rafi

(2) Man the unknown by Carel

دخل ہے اور مذہب واخلاقیات کو ہمارے ایشیائی ممالک کے مقابلے میں بہت کم اہمیت حاصل ہے لیکن باوجود اس کے اس کو اپنی قومی بے راہ روی اور بداخلاقی کا اس قدر شدید احساس ہے پھر ہم کو خدائی احکام کی بجا آوری کا دعویٰ ہے اور رسول کے اتباع کا فخر حاصل ہے کس منہ سے یہ غیر مشروط دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انسان آج زندگی کے ہر پہلو کے لحاظ سے ترقی کرتا چلا جارہا ہے اور نہ معلوم کب تک اسی طرح ترقی کرتا چلا جائے گا۔

کیرل اپنی کتاب میں اخلاق کی اہمیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے "اخلاقی انضباط اور روحانی ترقی بھی انسانی زندگی کے لئے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی کہ جسمانی صحت۔ آدمی کو اب اپنے اخلاقی انحطاط کی طرف فوری اور پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ انسان اپنی اخلاقی قدروں کو تباہ کر کے تمام خیر و نیکی کے تصورات اور شرافت کے اجزا کو اپنی معاشرت، سے نکال کر پھینک دے[1]"

محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں ایک اور غیر مشروط سا جملہ لکھ ڈالا ہے جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں "اخلاق کے لئے کوئی بیرونی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شعور خود ہی اپنے لئے قوانین وضع کرتا ہے۔ چونکہ اخلاقی فعل ایک آزادانہ فعل ہے اس لئے اس کے لئے کوئی بیرونی اخلاقی معیار قائم کرنا خواہ وہ معاشرتی ہو۔ افادی ہو یا مذہبی شخصیت کے ارتقاء کو محدود و محصور کرنے کے مترادف ہے۔ پابندی آزادی کی نفی ہے اس لئے قدرتی طور پر وہ اخلاق کی بھی نفی بن جاتی ہے[2]"

اس جملے میں ڈاکٹر صاحب نے شخصیت کو بالکل واضح طور پر مذہبی اصول وضوابط سے آزاد رکھنے کی تلقین کی ہے لیکن مغربی سائنس اور فلسفے سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ موصوف ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں اس لئے ان کی ایمانی قوت نے ان کو یہاں بری طرح جھنجھوڑا ہوگا۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے آگے چل کر اسی کتاب میں اپنی اس غیر ذمہ دارانہ عبارت کو یہ لکھ کر سند جواز مہیا کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول چونکہ کامل ترین شعور کا مالک ہوتا ہے اس لئے اس کی پیروی میں بھی انسان کے شعور پر در اصل کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی کیونکہ رسول کی پیروی بھی در اصل اپنے ہی شعور کی پیروی ہے۔ یہاں آکر ڈاکٹر صاحب کی متضاد عبارتیں ایک چیستان بن جاتی ہیں۔ رسول کی پیروی ہی تو در اصل مذہب ہے پھر رسول کی پیروی کرنے کے بعد انسانی شعور پابندی سے آزاد کس طرح ہوا۔ رسول جو حکم دیتا ہے اس کی ہم خوشی سے پابندی کرتے ہیں خواہ ہمارا شعور اسے پسند کرے یا نہ کرے۔ اور یہی تو ایمان کا امتحان ہے کہ خواہ ہمارا نفس اور شعور کتنی ہی بغاوت کرے لیکن ہم اس کو مجبور کر دیں کہ وہ احکام خدا اور سنت رسولؐ کی پیروی کریں۔ انسان کا شعور کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے لیکن اس میں کبھی کبھی نفسانیت ابھرتی رہتی ہے۔ برائی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے ایسے ہی وقت میں خدا اور رسولؐ کی ہدایت کام آسکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ایسے انسان کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول کی ہدایات اور توفیقات سے بے نیاز ہو کر ایک معیاری۔ متوازن اور پرہیزگاری کی زندگی محض اپنے شعور کے بل بوتے پر گزار لے گیا ہو۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقینی ہے تو پھر وہ ایسی ناممکن الوقوع بات

---

[1] MAN the unknown by Carel

[2] Ideolgy of the Future Dr. RAFE

ہمگر کیوں کمزور طبیعت کے انسانوں کو ایک خطرناک راستے پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ نظریہ تو اس وقت ہی صحیح ہوسکتا ہے کہ آنے والے انسان پچھلے تمام انسانوں حتیٰ کہ ابنیا و صحابہ و صلحا سے اخلاقی اور ایمانی لحاظ سے بہتر پیدا ہوں ورنہ خدائی احکام اور ہدایت کے تو انبیار بھی محتاج رہے ہیں اوران کا کام بھی خالی ان کے شعور سے نہیں چلا۔ اور پھر رسولؐ کے قائم کردہ معیار زندگی کو۔ اس کے عطا کردہ قوانین کو۔ اس کی سنت کی پیروی کو آپ داخلی چیز کس طرح قرار دے سکتے ہیں۔ نہ معلوم ڈاکٹر صاحب بیرونی معیار سے اس قدر کیوں گھبراتے ہیں۔ شاید مغربی فلاسفہ کا یہ قول ڈاکٹر صاحب کے دل میں گھر کر گیا ہے کہ انسان کو اپنی جبلت کی پیروی کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ جبلت میں توازن۔ اخلاقی اور مذہبی قوانین سے ہی پیدا ہوتی ہے ورنہ حیوان اور ایک انسان ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ تہذیب کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسانی جبلت سے وحشت کے آثار زیادہ سے زیادہ مناسب حد تک دور ہو جائیں اور نرمی۔ انس اور رواداری کے آثار پیدا ہوں گو وحشت کو مزاجِ انسانی سے بالکل نکال دینا بھی اس وقت مناسب اور ممکن نہیں ہے کیونکہ دماغ کے لئے اس جذبے کی بھی ابھی بڑی ضرورت ہے لیکن اس میں اعتدال پیدا کر کے صرف ضرورت کی حد تک اس کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ فطرتِ انسانی میں اصول وضوابط ہی جلد پیدا کرتے ہیں اور انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ بعض مغربی حکما کے ایک ہنگم سے دعوے کو برقرار رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب اتنی خطرناک بات کہہ گئے ہیں کہ شعور انسانی کو مذہبی پابندی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر جب مذہبی پابندی کی ضرورت محسوس ہوئی تو گھبرا کر عجیب عجیب توجیہیں کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ رسول کے احکام کی پابندی در اصل پابندی نہیں کیونکہ وہ فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ فطرت کے مطابق ہو یا مخالف پابندی بہر حال پابندی ہے۔ صرف نام بدلنے سے یا کسی کی طرف نسبت دینے سے کسی چیز کی نوعیت نہیں بدلی جا سکتی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کے احکام کی پابندی میں اکثر دل پر کافی جبر کرنا پڑتا ہے نفس کی بغاوت کو دبانا پڑتا ہے اور یہ کوئی بُری بات نہیں تربیت و تہذیب اسی طرح عمل میں آتی ہے پھر انسان کی فطرت کوئی خیر محض نہیں ہے کہ بغیر تہذیب و تربیت کے فرشتہ سیرت بن جائے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اعلیٰ ترین تہذیب و تربیت کے بعد بھی کسی انسانی شعور کو پابندیوں سے بالکل آزاد کر دینا سخت خطرناک ہے کیونکہ انسان کی فطرت کے شر کے قویٰ ہمیشہ ابھرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ان پر مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے۔ کسی شخص سے بھی کسی وقت میں لغزش ہو سکتی ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں کتنے ایسے کامل الشعور انسان پیدا کر سکیں گے جو ہر پابندی سے آزاد ہو کر صالح زندگی گزاریں ایسے لوگ اگر صدیوں میں دو چار پیدا ہو بھی گئے تو محض مافوقی اور استثنائی حیثیت کے مالک ہوں گے۔ استثناد اور مافوقیت پر ایک عام حکم لگا دینا کس طرح مناسب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے استدلال فرمایا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت کی پکار رہے کوئی باہر سے ٹھونسی ہوئی چیز نہیں۔ بجا ارشاد ہے لیکن پھر لا مذہبیت فطری پکار نہ ہوتے ہوئے کس طرح انسان کے دل و دماغ میں داخل ہو کر مسلط ہو جاتی ہے۔ فطری پکار مقابلہ کر کے غیر فطری چیز کو نکال کیوں نہیں دیتی معلوم ہوا کہ فطری پکار کو بھی داخل ہونے کے لئے کسی سہارے اور ذریعے کی ضرورت ہے۔ اور داخل ہو کر غیر فطری پکاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اپنے مستقل قیام کے لئے بھی سعی و کاوش۔ تہذیب و اصلاح

کی ضرورت رہتی ہے اس لئے انسانی شعور کسی حالت میں بھی ان چیزوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی تو دیکھنے کی بات ہے کہ اس فطری پکار میں اختلاف کس قدر رونما ہو جاتا ہے۔ اس حد تک کہ ایک کا پیرو مشرق کو جاتا ہے تو دوسرے کا مغرب کو ایسی حالت میں حق و باطل کا امتیاز اور مقام اوسط کی تلاش بھی ضروری ہو جاتی ہے جو یقینی کچھ قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس فطری پکار کی نیرنگی ملاحظہ فرمائیں کہ اس کی فہرست میں توحید بھی شامل ہے اور شرک بھی۔ لادینی بھی شامل ہے اور دہریت بھی اور ہر رنگ کے کروڑوں پرستار دنیا میں موجود ہیں۔ تو آخر کسی کی فطری پکار نے تو فریب دیا ہی ہے۔ اور انسان دانستہ یا نادانستہ اس فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کیا ڈاکٹر صاحب ان سب کو ایک ہی نظر سے دیکھ سکیں گے اس لئے کہ یہ ان کی فطرت کی پکار ہے۔ یقینی ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ اس کا جواب نفی میں دینے پر مجبور ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے استدلال سے تو حق و باطل کا امتیاز ہی سرے سے مٹ جاتا ہے۔ ہر قسم کی پابندی اٹھا لینے کے بعد انسانی معاشرہ وحشی جانوروں کا معاشرہ بن کر رہ جائے گا۔ انسان کے مزاج میں قدرت نے ضرورتاً وحشت و بربریت کا کافی حصہ دفاع کے لئے رکھ دیا ہے پھر اس کے نفس کے لاتعداد مطالبات ہیں جو تکمیل کے بعد قوت اور تعداد کے لحاظ سے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اگر ان کی تہذیب و تربیت اخلاقی اور مذہبی قوانین کے ذریعے نہ کی جائے تو انسان از خود دیانت اور انصاف کی طرف ہرگز مائل نہیں ہو سکے گا۔ انسانی مزاج کی تربیت ہی کی وجہ سے تو اس کے معاشرے میں تہذیب و تمدن کا ظہور ہوا ہے ورنہ تو یہ ہمیشہ ایک کندۂ ناتراشس ہی رہتا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ بغیر کسی پابندی کے کس طرح ایک معیاری معاشرہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں پابندی کے سلسلے میں ایک مشہور امریکن فلاسفر میکڈوگل کے چند جملے پیش کر دوں تاکہ میری بات کی تھوڑی سی تائید بھی ہو جائے اور یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ چوٹی کے مغربی حکما بھی اب اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ انسانی جبلت اور شعور کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ "آج تمام ماہرین نفس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انضباط ہی کا دوسرا نام تہذیب ہے بغیر انضباط اور پابندی کے۔ بغیر خیر و شر میں امتیاز کے اور بغیر قوانین و روایات کے دنیا میں سوائے وحشت و بربریت کے کچھ باقی نہیں رہ سکتا۔"

عتاب نامہ

دوسرے رسالوں کی طرح "فاران" میں اگر کوئی خط شائع ہوتا، تو اُسے "فاران" اور مدیر "فاران" کی مدح ومنقبت پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا، مگر ہم نے اب تک اس باب میں اس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ "فاران" کے خاص شماروں (سیرت نمبر اور توحید نمبر) پر رسالوں اور اخباروں نے جو شاندار تبصرے کئے ہیں، ان کے اقتباسات تک "فاران" میں نہیں چھاپے! ہم اتنے بے نفس نہیں ہوگئے ہیں کہ کسی کی مدح و ذم سے ہمارا قلب کوئی اثر ہی قبول نہیں کرتا، اس اخلاص اور بے نفسی کا ہمیں دعویٰ نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عام طور پر طبیعت اس سے ابا کرتی ہے کہ ہم اپنی مدح وستائش کا خود اعلان کریں!

اب کی بار "فاران" میں ایک صاحب کا "عتاب نامہ" شائع ہو رہا ہے، اس خط کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے، اس قسم کی تحریریں اپنے اندر کوئی افادیت نہیں رکھتیں! اس مکتوب کے پڑھنے سے قارئین "فاران" کو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ رسالوں کے ایڈیٹروں کی ذمہ داریاں کس قدر نازک اور پُر پیچ ہیں، اور حق بات کہنے پر انھیں کیا کیا سُننا اور برداشت کرنا پڑتا ہے؟

اگر نفسِ معاملہ پر روشنی نہ ڈالی گئی تو تو یہ تمہید پڑھنے والوں کے لئے ایک پہیلی اور معمہ بن کر رہ جائے گی۔

بات یہاں سے چلتی ہے کہ احمد آباد سے ایک صاحب (جمال قریشی) نے اپنے "سلاموں" کا مجموعہ (جمالِ کربلا) "فاران" میں ریویو کے لئے بھیجا تھا اس کو تقریباً ایک سال ہونے کو آیا اُن کے دو تین خط بھی آئے جن میں "ریویو" کے لئے یاد دہانی فرمائی گئی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ اپنی کتاب پر "فاران" کے تبصرے کا اُنھیں انتظار ہے!

اکتوبر ۵۷ء کے "فاران" میں "جمالِ کربلا" پر تبصرہ کر دیا گیا، اُسے پڑھ کر انھوں نے جو "عتاب نامہ" روانہ فرمایا ہے اُسے جوں کا توں ہم یہاں درج کر رہے ہیں!

"فاران" جن حضرات کی نگاہ سے گذرتا رہتا ہے وہ **"ہماری نظر میں"** کی اہمیت اور افادیت سے واقف ہیں کہ "فاران" میں کتابوں پر تبصرے کس قدر احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور اس کام میں ہمارا کتنا وقت صرف ہوتا ہے! ہم اس کا دعویٰ نہیں کرتے کہ ہماری رائے سو فیصدی درست ہوتی ہے اور ہم جس چیز کے خوب وناخوب ہونے کا جو حکم لگا دیں وہ (معاذ اللہ) وحی والہام کا درجہ رکھتا ہے، اور ہماری رائے غلطی سے پاک ہوتی ہے! اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم اس غلط اندیشی اور خود بینی میں مبتلا نہیں ہیں! ہم بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں، کوئی فرشتہ نہیں ہیں، ہم سے بھی بھول چوک ہوتی رہتی ہے! اگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے دانستہ طور پر کسی ادیب، ناقد، مورخ، افسانہ نگار اور شاعر کے ساتھ

نا انصافی نہیں کرتے، اپنے نزدیک جس بات کو ہم حق اور قرین صواب سمجھتے ہیں، اس کا ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں، ہم نے کسی کے کمال پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور ہم کسی کے محاسن کے اعتراف میں بخل کرنے کو ادبی خیانت سمجھتے ہیں!

"تنقید کو ہم نے "تحسین و ستایش" سمجھا ہے اور نہ "عیب جوئی و نکتہ چینی"! "تنقید" ہماری نظر میں ایک "کسوٹی" ہے جو کھوٹے اور کھرے کو پرکھتی ہے! ہمارے ذوق، وجدان اور علم و مطالعہ کی "کسوٹی" جو کچھ پرکھ کر بتاتی ہے اس کے اظہار میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور اظہارِ حق میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی ہمیں پروا نہیں ہوتی! یہ تو ہوسکتا ہے کہ ہماری رائے غلطی کر جائے مگر دانستہ طور پر ہم نہ تو خوب کو ناخوب کہتے ہیں اور نہ کسی کی کمزوری پر تحسین و ستایش کا ملمع چڑھاتے ہیں! یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے تبصرے عام طور پر کافی سے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں اور بعض اربابِ نظر کا بہت دنوں سے اصرار ہے کہ "فاران" کے تبصرے کتابی شکل میں شائع کئے جائیں! ہم نے بعض اوقات ایک ایک شمارے میں بیس بیس بائیس بائیس صفحات پر کتابوں کے تبصرے شائع کئے ہیں اور "فاران" مطالعہ کرنے والوں نے کسی اکتاہٹ کے بغیر ان "RE-VIEWS" کو پڑھا ہے اور پسند کیا ہے، "فاران" کے تبصرے پڑھ کر ہی ہمارے یہاں ناشرین اور مصنفین کی طرف سے اس کثرت سے کتابیں وصول ہوتی رہتی ہیں کہ بعض دوسرے رسالوں کے یہاں اس کثرت کے ساتھ کتابیں شاید وصول نہ ہوتی ہوں، اس وقت رسالوں کے "خاص نمبروں" کے علاوہ چھوٹی بڑی سو سے زیادہ کتابیں تبصرے کے لئے موجود ہیں اور دس پندرہ دن کے وقفہ سے ایک نہ ایک کتاب ریویو کے لئے آتی ہی رہتی ہے! بعض اہل قلم ہمارے تبصرے پڑھ پڑھ کر "زبان" کی صحت کے معاملہ میں محتاط ہوگئے ہیں "فاران" کے غیر جانبدارانہ اور دیانت دارانہ تبصروں سے انفرادی طور پر بعض شاعروں اور ادیبوں کی ممکن ہے کہ دل شکنی ہوگئی ہو مگر مجموعی طور پر لکھنے پڑھنے طبقہ کو ان سے فائدہ پہونچا ہے! اب رہا "دل شکنی" کا معاملہ تو اس کی نوعیت یہ ہے کہ اگر ہر شخص کی طبیعت، مزاج اور رجحان کی رعایت رکھی جائے تو دنیا میں اصلاح و انقلاب کی کوئی کوشش ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی!

"فاران جب نکلنا شروع ہوا تھا تو انہی دنوں میں کراچی سے ایک ماہنامہ "گرد و پیش" نکلتا تھا، وہ جب ہمارے یہاں تبصرے اور تبادلے کے لئے آیا تو ہم نے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے خود اپنی ایک نظم پر تنقید کی کہ:-

"ماہر القادری کی نظم میں لفظ "نگاہ" "چشم" کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے جو محلِ نظر ہے۔"

مجلّہ "گرد و پیش" کے ایک کارکن نے اس تبصرہ کو پڑھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ ایک شاعر خود اپنی نظم کی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے اور اُسے اپنے رسالہ میں چھاپتا ہے!

جگن ناتھ آزاد نے "لتاڑنا" — "پامال کرنے" کے معنیٰ میں نظم کیا تھا، ہم نے ان کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس لفظ پر گرفت کی، مگر ایک صاحب نے توجہ دلائی کہ قدیم شعراء نے یہ لفظ (لتاڑنا) "پامال کرنے" کے معنیٰ میں نظم کیا ہے، ہم نے اس کی تصدیق کے لئے اردو لغات دیکھے تو پتہ چلا کہ یہ لفظ

(لتاڑنا)[1] آجکل "پامال کرنے کے" معنیٰ میں تو بیشک متروک ہے مگر اس کی اصل ملتی ہے"۔ اس علم و اطلاع کے بعد ہم نے "فاران" میں اس کا اعلان کیا۔

بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوگا کہ "فاران" میں کتابوں پر تبصرہ کرنے کے لئے ہمیں کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے، اور اس معاملہ میں ہم ذمہ داری کا کس قدر شدید و نازک احساس رکھتے ہیں ——— حیدر آباد دکن سے دیوانِ غالب کی ایک شرح آئی ہوئی ہے، ہم اس پر چاہتے تو ادھر اُدھر سے صفحات دیکھکر چلتا ہوا ریویو کرسکتے تھے، مگر ہم ابھی تک اس کتاب کے ایک تہائی حصہ کو پڑھ پائے ہیں دوسری "شروح" سے کلام غالب کی اس شرح جدید کا مقابلہ کر رہے ہیں اور "تنقید" کے لئے نشانات لگاتے جاتے ہیں، اس کتاب کو آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا مگر اُس پر تبصرہ کی نوبت ابھی تک نہیں آئی ——— اہلِ حدیث کے بعض علماء کی کتابوں پر ہم نے پڑھ کر نشانات لگا لئے ہیں، مگر حنفی فقہ کے بعض مسائل کی جن پر انھوں نے اعتراض کئے ہیں ہم تحقیق نہیں کرسکے، اس لئے اُن کتابوں پر بھی اب تک تبصرہ نہیں ہوسکا۔

اس تمام محنت و عرق ریزی اور احساسِ ذمہ داری کے باوجود ہم سے بھول چوک بھی ہوجاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ کسی کتاب کی نہ کوئی "خوبی" ہماری نگاہ سے چھپی رہتی ہے اور نہ کوئی کمزوری چھوٹنے پاتی ہے، چند سطروں یا چند صفحوں میں کسی کتاب پر تنقید کا پورا پورا حق ادا بھی تو نہیں ہوسکتا!

زیر بحث مکتوب درج کرنے سے قبل ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جو حضرات ہمارے یہاں کتابیں ریویو کے لئے بھیجتے ہیں، وہ ضبط وصبر سے کام لیں، اُن کی کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ضرور کیا جائے گا۔ تبصرے کی تاخیر سے وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اُن کے ساتھ جان کر تساہل ہوتا جا رہا ہے، ریویو کی تاخیر کے بہت سے اسباب و وجوہ ہوسکتے ہیں ——— اور وہ صاحبان جو اس کی توقع رکھتے ہیں کہ فاران میں اُن کی صرف مدح سرائی کی جائے گی اور جو اپنے اوپر تنقید برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے، اور جن کا ظرف ذرا سی جنبش سے چھلک جاتا ہے، بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی کتابیں ہمارے پاس نہ بھیجیں ——— (م - ق)

مکرمی ماہر القادری صاحب

السلام علیکم!

"چند دن ہوئے اکتوبر کا فاران ملا تھا شکریہ "جمالِ کربلا" پر ہندوستان و پاکستان کے مقتدر اخبارات و رسائل میں بڑے اچھے اچھے تبصرے ہوچکے ہیں لیکن مجھے آپ کے تبصرے کا خاص طور پر انتظار تھا اور اُمید تھی کہ آپ کا تبصرہ سب سے اچھا ہوگا آپ میری اس کاوش کو سراہیں گے جو میں نے روایتی عزائی شاعری سے ہٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آپ کا تبصرہ شروع سے لیکر آخر تک مہمل اور انتہائی ناروا لب و لہجہ پر مبنی ہے ایک طرف آپ خدا و رسول کی

---

[1] آج کل "لتاڑنا" ڈانٹ ڈپٹ کرنے (TO REBUKE) کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

باتیں کرتے ہیں خود کو بڑا شاعر اور صاحبِ فن سمجھتے ہیں دوسری طرف آپ کا یہ عالم ہے کہ آپ نے کتاب کے محاسن کے سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گویا اس میں معائب ہی معائب ہیں ایکسو بارہ صفحات کی کتاب میں جب آپ کو علمی وفنی اغلاط نہ ملیں آپ نے ایک دو جگہ "حشو" و "زوائد" اور ایک جگہ کتابت کی غلطی کی بات نکال دی آخر میں مجھے بالکل ننھا بچہ قرار دے کر یہ بزرگانہ مشورہ بھی دیا کہ مجھے اپنی نظمیں کتابی شکل میں چھپوانے کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے تھی کیوں؟ کاش یہ بھی آپ لکھ دیتے۔ یہ عرض کردوں کہ جسے آپ بچہ سمجھ رہے ہیں وہ گجرات کا بتیس ۳۲ سالہ شاعر ہے۔

"جمالِ کربلا" پر برہان دہلی، معارف اعظم گڈھ، ہماری زبان علیگڈھ، ساقی کراچی، نگار لکھنؤ، سب رس حیدرآباد، قومی آواز لکھنؤ، شاعر بمبئی، اور دیگر اردو و گجراتی اخبارات و رسائل میں انتہائی اچھے تبصرے آچکے ہیں اور سب نے "جمال کربلا" کو عزائی شاعری میں ایک اضافہ قرار دیا ہے اس کی نظموں سلاموں اور قطعات کو سراہا ہے مولانا نیاز فتحپوری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے (فاضل دیوبند) پروفیسر خلیل الرحمان اعظمی۔ شاہ معین الدین ندوی۔ اعجاز صدیقی، مولانا حبیب الرحمن غزنوی وغیرہ آپ کے خیال میں بالکل معمولی اور ناسمجھ لوگ ہیں گویا علم وفن کے تمام اسرار و رموز سے صرف آپ ہی واقف ہیں ماہر صاحب دوسروں کو بیوقوف سمجھنے کی کوشش میں کچھ تو پاس ولحاظ ہونا چاہیئے۔ ارباب علم وفن آپ کے تبصروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے سب جانتے ہیں کہ محض اپنی فن دانی کے اظہار کی خاطر آپ کتابوں پر تبصرہ کرتے اور آپ کی نظریں سب سے پہلے لکھنے والوں کی غلطیاں تلاش کرتی ہیں جدید تنقید و تبصرے سے آپ بہت دور ہیں پھر جس انداز سے آپ لکھتے ہیں وہ اتنا دل آزارانہ ہوتا ہے کہ برداشت نہیں کیا جاسکتا اکثر و بیشتر آپ کے اعتراضات نہایت معمولی ہوتے ہیں آخر یہ کہاں تک مناسب اور ادبی سنجیدگی کے مطابق ہیں یہ تو کوئی شرافت و انسانیت اور ادبیت نہیں ہوئی۔ ذیل میں آپ کے اعتراضات کا جواب پیش کر رہا ہوں۔

(۱) ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ "تلاطم" "ط" سے کتابت کی غلطی ہے میں آپ کی کتابوں اور رسالہ میں کتابت کی ایسی بیچاسوں غلطیوں کی نشان دہی کرسکتا ہوں آپ کو اتنا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظم کے کسی منفرد شعر پر اسے دوسرے شعروں سے الگ کرکے اس طرح اعتراض نہیں کیا کرتے جس طرح آپ نے کیا ہے ؎

(۲) اُمتِ محمد کی مشکلیں ہوئی آساں تیری ایک ٹھوکر سے

آپ نے فرمایا ہے ٹھوکر کا یہاں کیا محل تھا۔ میں عرض کروں گا کہ آپ کے اس بیجا اعتراض کا کیا محل تھا؟ حضرت امام حسین نے حق کی حمایت میں ہر چیز کو ٹھکرا دیا تھا اور یہ امت محمدی کے لئے حد درجہ فائدہ بخش ثابت ہوا "کردارِ حسین" کی تقلید نے مسلمانوں کی بہت سی مشکلات کو دور کردیا آپ کہتے ہیں یورشوں میں حیات کا ڈوبنا یہ کیا اندازِ بیان ہے۔ جی!

میرے نزدیک تو یہ اندازِ بیان پڑھے لکھوں کا ہے۔ یورش کے معنیٰ حملہ، چڑھائی، اور دھاوا ہیں
غم کے بہت سے حملوں میں کیا نہیں ڈوبا جاسکتا آپ شاید کنوئیں سمندر، دریا، ندی اور نالے
ہی میں ڈوبنے کو ڈوبنا سمجھتے ہیں شاید فراوانیٔ رنج و خوشی نور و ظلمت وغیرہ میں ڈوبنا جن
لوگوں نے لکھا ہے وہ سب جاہل تھے۔ ماہر صاحب۔ اردو کا گلا نہ گھونٹیے ملائیت کو ادبیت
سے دور ہی رہنا چاہئیے کسی ماہر فن سے پوچھیے کہ ؎

تلاطمِ غم کی یورشوں میں حیات ڈوبی ہوئی ملے گی

درست اندازِ بیان ہے یا نہیں طوفان غم کے حملوں میں حیات ڈوب سکتی ہے یا نہیں۔

تاریکیٔ بزمِ عالم بھی طلعت سے تری ضوبار ہوئی

میں، آپ "بھی" کو "حشو و زوائد" کہتے ہیں اگر تنہا "حشو" کہتے تو کیا حرج تھا؟ کاش آپ یہ
ہی بتا دیتے کہ یہ "حشو" کی کونسی قسم ہے "حشو" ملیح بھی تو ہوتا ہے رہا اعتراض تو میں عرض
کروں گا کہ "بھی" ہرگز زائد نہیں ہے، "بھی" کہہ کر میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماہِ نبوت
کسی ایک قوم اور کسی ایک خطۂ زمین کے لئے طلوع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ پوری دنیا کے لئے۔ اب
فرمائیے "بھی" "حشو" ہے یا ضروری؟

تسلیم و رضا کے مسلک سے ... سیت کا سندیسہ ٹھکرا کر

ہائے!! سندیسہ پر آپ نے اعتراض کر کے اردو شاعری کے مزاج سے عدم واقفیت کا پورا پورا ثبوت
دیا ہے۔ ایک نہیں سیکڑوں شعر اس قسم کے پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں ہندی کے آسان
الفاظ عربی فارسی الفاظ کے ساتھ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں یہ اہل ذوق ہی جان سکتے ہیں کہ میرے
مصرعہ میں سندیسہ کتنا بھلا معلوم ہو رہا ہے ہاں ایسے الفاظ لانا ناروا ہیں جو سماعت پر بار ہوں
سندیسہ پیغام سے بہت اچھا ہے یہ کہہ دینا تو بہت آسان بات ہے کہ فلاں لفظ شعر کی معنویت
سے ہم آہنگ نہیں ہے میرے مصرعہ ؎

کچھ اور بڑھا دی تھی تو نے اسلام کی زینت کیا کہنا

میں زینت شعر کی معنویت سے کیوں ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کی بھی آپ نے تشریح کر دی
ہوتی یہاں وقعت بھی ہو سکتا تھا لیکن زینت میں جو ہمہ گیری اور واقعیت ہے وہ اپنی جگہ
بہت اہم ہے کیا از کار بیعت نے ایسے اسباب پیدا نہیں کئے جن سے اسلام کی سجاوٹ اور
آرائش ہوئی۔ جو لوگ تاریخ اسلام سے واقف ہیں وہ میری تائید کریں گے۔

اللہ اللہ سجدۂ عالی کا یہ حسنِ نیاز ہو گئے میداں کو بنایا کعبۂ ثانی حسین

آپ کہتے ہیں سجدے کی صفت عالی اور اسفل نہیں ہو سکتی اگر ذرا سی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے
تو میں بحیثیت مسلمان آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت
امام حسین کا سجدہ ماہر القادری کے سجدے جیسا تھا؟ کیا ان کی عبادت اور ان کا استغراق عمومی تھا

اگر ہمارے سجدوں اور ان کے سجدوں میں کوئی فرق ہو سکتا ہے ارکانِ نماز کی حیثیت سے نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے تو حسینؓ کے سجدے کو سجدۂ عالی کہنا نہ صرف علمی اعتبار سے بلکہ حسینؓ کی عظمت و بزرگی کے پیشِ نظر مناسب اور موزوں سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے سجدوں کو حسینؓ کے سجدوں کا ہم پلّہ سمجھتے تو سمجھیں۔ میں تو یہ جراُت نہیں کر سکتا ہم دن رات معمولی لوگوں سے پوچھتے ہیں کہئے مزاج کیسا ہے؟ جب کسی بڑی شخصیت کے سامنے ہوتے ہیں تو صرف مزاجِ عالی کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ جناب اور جنابِ عالی بھی شخصیتوں کے اسی فرق کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ کہہ دیں کہ جناب نہ اسفل ہوتا ہے نہ عالی۔ تو اس کا کیا علاج۔ آپ نے میرے اشعار پر صرف پانچ چھ اعتراضات کئے ہیں شکر ہے کہ آپ کی "خوئے اعتراض" کو ایکسو بارہ صفحات کی کتاب میں اس سے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن میں انھیں اعتراض برائے اعتراض سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتا میں تو بشریت کے تقاضوں اور اپنی بے مائگی کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھتا تھا کہ اہلِ علم کو زیادہ خامیاں نظر آئیں گی اور میں نے "عرضِ حال میں" اس کے متعلق لکھا بھی ہے میں اپنی واقعی غلطیوں کو ہر وقت ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن خواہ مخواہ کے اعتراضات کو اپنی خام کاریوں سے منسوب نہیں کر سکتا پھر مجھے اس ذاتِ گرامی پر بھی ناز ہے جس کی نظر سے میرے غزائی کلام کے بعض حصّے گذرے ہیں۔

آخر میں مجھے جس بات پر سب سے زیادہ احتجاج کرنا ہے وہ ہے آپ کا یہ جملہ "علامہ اقبال کی کتابوں پر جس طرح لکھا ہوتا ہے جملہ حقوق اخذ و نقل و ترجمہ و طباعت محفوظ۔ اسی طرح جمال قریشی نے بھی یہ عبارت درج کرائی ہے اس خوش فہمی کا کوئی جواب ہے" یہ آپ نے میری ذات پر انتہائی ناروا اور ناقابلِ برداشت حملہ کیا ہے۔ میری عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ آپ کی یہ طنز ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے بھولایا جا سکے یا آپ کو معاف کیا جا سکے تا وقتیکہ آپ اپنا یہ جملہ واپس نہ لے لیں۔ آپ نے نہایت معمولی بات کو خواہ مخواہ علامہ اقبال تک لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اور اسے اپنی جگہ میری خوش فہمی سمجھا ہے حالانکہ یہ سراسر آپ کی کم فہمی اور طعنہ طرازی کی دیرینہ عادت ہے یہ خلا میں تیر چھوڑنے کا آپ کا وہ مسلک ہے جس نے پڑھے لکھوں کی نظر میں آپکی عزت اور وقعت کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے اور آپکے ایک مخلص کی حیثیت سے مجھے بھی اس کا بڑا افسوس ہے۔

سُنیئے میں گجرات کا شاعر ہوں اور گجرات میں گجراتی زبان کے شاعر رسائل، اخبارات بغیر پبلشرز اکثر اردو کی چیزوں کو استعمال کر لیتے ہیں اسی لئے مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اپنی کتاب پر جملہ حقوق اخذ و نقل و ترجمہ و طباعت محفوظ لکھوں۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا حاشا میرے وہم و گمان میں بھی وہ بات نہ تھی جو آپ کے دل و دماغ نے پیدا کی ہے ایسی باتیں آپ ہر شاعر ادیب اور مصنف پر تبصرہ کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ آپ نے پرستارانِ اقبال کے سامنے مجھے ذلیل اور بدنام کرنے کی شرمناک کوشش کی ہے میں آپ کا یہ آخری جملہ پڑھکر تڑپ اٹھا مجھ پر رنج و غم کا ایک عالم طاری ہو گیا اس لئے کہ میں آپ سے زیادہ علامہ اقبال کا پرستار ہوں۔ ان سے ایک والہانہ محبت رکھتا ہوں اگر آپ کے تبصرے

میں یہ دل دکھانے والی بات نہ ہوتی تو میں آپ کے معمولی اعتراضات کا ہرگز جواب نہ دیتا اگر آپ مسلمان ہیں ایماندار ہیں خدا اور رسول کا خوف آپ کے دل میں ہے جماعتِ اسلامی کے اصولوں پر کاربند ہیں دین و دانش کی باتیں کرنے کا ادعا ہے شریعت کے پیرو ہیں سچائی کے پرستار ہیں اور آپ میں اخلاقی جرأت بھی ہے تو میرا یہ خط از ابتدا تا انتہا بجنسہ لفظ بہ لفظ فاران کی آئندہ اشاعت میں چھاپ دیجئے تاکہ جن لوگوں کی نظر سے آپ کا دل آزار تبصرہ گذر چکا ہے وہ میری معروضات بھی دیکھ سکیں۔ اگر آپ نے میرا یہ خط فاران میں نہ چھاپا تو میں اس خط کو ہندوستان اور پاکستان کے لاتعداد پرچوں میں چھپواؤں گا ایک کتابچہ شائع کروں گا اس میں آپ کے اُن غلط اعتراضات کو دکھاؤں گا جو آپ نے دوسروں پر کئے ہیں ان تمام اعتراضات کو ایک جگہ جمع کروں گا جو آپ کے مجموعۂ فردوس پر ہوئے ہیں۔ فردوس کی دوسری فنی اور معنوی غلطیوں پر اربابِ علم و فن سے لکھواؤں گا تاکہ آپ کی ادبیت اور فن دانی کے پردے چاک ہوسکیں۔ آئندہ آپ دوسروں کے سینے میں اس طرح چھریاں نہ بھونک سکیں۔ میں خاموش نہیں بیٹھوں گا آپ کو اس سے زیادہ نقصان پہنچاؤں گا۔ جتنا آپ نے مجھے پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے دوسروں کو بے عزت کرنا شاید مذاق سمجھا ہے تنقید و تبصرہ کی کچھ تو حدود و قیود ہوتی ہیں۔ یقین کیجئے اگر آپ میرے ایک ایک شعر کو ہدفِ اعتراض بنا لیتے تو مجھے اتنا رنج و افسوس نہ ہوتا جتنا آپ کی آخری بات سے ہوا ہے۔ آپ کے آخری جملہ کا لب و لہجہ کتنا زہرناک ہے خدا کی پناہ مجھے فوراً لکھئے کہ آپ میرا یہ خط چھاپ رہے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں کوئی دوسرا انتظام کروں اگر آپ نے میرا یہ خط نہ چھاپا تو پاکستان کے ادبی اور مذہبی حلقوں میں اس ناانصافی کے خلاف بیحد و بے انتہا احتجاج ہوگا میں ایک بار پھر آپ کی نوازش بیجا کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔"

خادم جمال قریشی (احمد آباد)

جواب:—

سلامِ مسنون کے بعد جواباً عرض ہے کہ:—

(۱) آپ میرے لئے بالکل نئے ہیں اس لئے آپ کی ذات سے مجھے کسی قسم کی پرخاش نہیں ہوسکتی، میں آپ کو شعر و ادب کے میدان میں آپ کو اپنا حریف و رقیب بھی نہیں سمجھتا، اس کا وہم بھی میرے ذہن و دماغ میں نہیں گذر سکتا کہ آپ کی "شہرت" مجھ ہیچمدان کی ذات اور حقیر شخصیت پر اثرانداز ہوسکتی ہے، یا آپ کے نام و نمود سے میں دب کر اور گمنام ہو کر رہ جاؤں گا، میں نے آپ کا مجموعہ کلام پڑھکر جو اثر قبول کیا، اُس کا اظہار کر دیا ہو سکتا ہے کہ میری رائے نے غلطی کی ہو، میری کم نگاہی کے سبب آپ کے کلام کے محاسن مجھے نظر نہ آئے ہوں ——— مگر میں نے آپ کے کلام پر تنقید حاشا و کلا آپ کو مطعون کرنے کے لئے نہیں کی! اور آپ کو گرا کر میں ذرا بھی بلند نہیں ہوسکتا! کاش!

اس تصحیح کے بعد آپ کی غلط فہمیاں دُور ہو سکیں!

(۲) آپ کی اس جھنجھلاہٹ اور عتاب کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنا مجموعہ کلام اس توقع کے ساتھ بھیجا تھا کہ میں آپ کے کلام کی لامحالہ تعریف کروں گا بلکہ آپ کے محاسنِ کلام کے اعتراف میں دوسرے تنقید نگاروں سے بڑھ جاؤں گا ——— "فاران" کا تبصرہ پڑھ کر جب آپ کی توقع پوری نہیں ہوئی تو آپ کو طیش آگیا اور یہ طیش کاغذ پر پھیل کر ایک خاصہ طویل "عتاب نامہ" بن گیا! شعر و ادب اور نقد و محاکمہ کی دنیا میں اس قسم کی توقعات قائم نہیں کیا کرتے، اپنے سراہے جانے کے داعیہ اور جذبہ پر توقعات کی عمارت قائم کرنا ہی نفس کی بنیادی کمزوری ہے!

عزیز من! اللہ رکھے! آپ کو ابھی زندگی کی بہت سی منزلوں اور وادیوں سے گزرنا ہے. اس قسم کی توقعات سے آئندہ گریز کیجئے! عربی کی مشہور ضرب المثل ہے:

مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ

(جس نے کوئی چیز لکھی اور تصنیف کی، اسے ہدف (تنقید) ضرور بننا پڑا) تصویر کے اس رخ کو بھی سامنے رکھیئے!

(۳) آپ نے جن رسالوں کے نام لکھے ہیں، انھوں نے جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے آپ کے مجموعہ کلام کو واقعی سراہا ہوگا مگر میں کسی کتاب پر تبصرہ دوسرے رسالوں اور اخباروں کی تنقید میں پڑھ پڑھ کر نہیں کرتا، کتاب پڑھنے کے بعد میرا ضمیر اور وجدان جو فیصلہ کرتا ہے، میں اس کا اظہار کرتا ہوں!

رسالوں میں جو عام طور پر تبصرے ہوتے ہیں اُن کا بعض اوقات یہ رنگ بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ ایک شاعر کے مجموعہ کلام میں بعض اشعار بحر اور وزن سے خارج ہیں مگر اُس کتاب کو سراہا جا رہا ہے اور زبان کی فاحش بلکہ سامنے کی غلطیوں تک پر گرفت نہیں کی جاتی! ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک کتاب کی "فاران" میں تعریف کی گئی ہے مگر دوسرے رسالہ کی "تنقید" پڑھ کر پتہ چلا کہ اس کتاب کی بعض شدید قابل اعتراض باتوں پر ہماری نگاہ نہیں گئی!

ہندوستان میں "اردو" کے ساتھ جو دردناک سلوک ہو رہا ہے اور اُردو داں طبقہ کو جو گوناگوں مشکلات پیش آرہی ہیں، ممکن ہے کہ ان تمام نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے وہاں کے اُردو رسالوں اور اخباروں کی یہ پالیسی ہو گئی ہو کہ نئے لکھنے والوں کا دل بڑھانے کے لئے ان کی کتابوں پر تحسین آمیز انداز ہی میں تبصرے کئے جائیں!

(۴) آپ نے مجھ پر الزامات وارد کئے ہیں کہ ——— میں دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہوں، میں اپنی فن دانی کے اظہار کے لئے کتابوں پر تبصرہ کرتا ہوں میرے تبصرے دل آزارانہ ہوتے ہیں. اُن میں شرافت انسانیت اور ادبیت نہیں ہوتی ——— آپ کی نظر سے "فاران" کے تبصرے یقیناً گزرتے رہے ہیں، جب آپ کو میری "تبصرہ نگاری" کی یہ تمام خامیاں معلوم تھیں تو پھر آپ نے اپنی کتاب "فاران" میں تبصرے کے لئے کیوں بھیجی اور آپ پر جب اچھی طرح روشن تھا کہ میں تمہ

شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں کے صرف تاریک رُخ ہی پیش کیا کرتا ہوں، تو پھر آپ کو اپنے سلاموں کے مجموعہ کے بارے میں یہ خوش فہمی آخر کس بنا پر تھی کہ میں جو دوسرے شاعروں ادیبوں کی ہجو کرتا ہوں آپ کے کلام فصاحت التیام سے مسحور و مرعوب ہو کر آپ کی قصیدہ خوانی کے لئے مجبور ہو جاؤں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی نگاہ میں میری تنقید نگاری کی وقعت تھی، آپ "فاران" کے تبصرے پڑھتے رہے ہیں اُن کی اہمیت کا نقش آپ کے ذہن وفکر پر ثبت تھا۔ آپ نے "فاران" کو ایک وقیع رسالہ سمجھ کر ہی اپنی کتاب ریویو کے لئے بھیجی تھی، آپ نے دو یا تین خط بھی یاد دہانی کی غرض سے بھیجے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ "فاران" کے تبصرہ کا آپ کو شدید انتظار ہے، مگر اپنی توقعات کے خلاف "فاران" کا تبصرہ پڑھ کر آپ جھنجھلا گئے، اور بس اُس کے بعد سے میرے محاسن آپ کی نگاہ میں معائب بن گئے ـــــ آپ نے جو الزامات مجھ پر لگائے ہیں، اُن کی اس طرح ہاتھ کے ہاتھ تردید ہو جاتی ہے۔

(۵) "فاران" میں جو چند اعتراضات آپ کے کلام پر کئے گئے ہیں، ان کے آپ نے جو جوابات اپنے خط میں دئے ہیں وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتے۔ آپ نے سامنے کی غلطیوں کو آپ نے ماننے کے بجائے اُن کی تاویلیں کرنے کی سعئ رائیگاں اور کوشش بیجا کی ہے،

میں نے "طلاطم" کے سلسلہ میں صرف اتنا لکھا تھا ـــــ "طلاطم غم کی یورشوں میں حیات ڈوبی ہوئی ملے گی (صفحہ ۸۶) صحیح املا "تلاطم" ہے۔ میں نے جان کر اس بات کو مبہم رہنے دیا کہ یہ غلطی کاتب کی ہے یا مصنف کی ہے! مگر اب میں کھل کر کہتا ہوں کہ اس الزام کو آپ بجائے کاتب کے سر نہیں منڈھ سکتے، آپ کے اس مکتوب میں جو آپ نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے املا کی دو غلطیاں موجود ہیں، آپ نے "بزرگانہ مشورہ" کو "بزرگانا مشورہ" (ہ کے بجائے الف کے ساتھ) اور "چُھریوں" کو "چھوریوں" لکھا ہے، "چھوری" تو ہندی میں بچی کو کہتے ہیں، یعنی جسے عربی میں "آنسہ" اور انگریزی میں Miss بولتے ہیں! "چھری" میں "پیش" ہے واؤ نہیں ہے!

پھر آجکل نئے ادیب و شاعر عام طور پر "تلاطم" کو "طلاطم" اور "غیظ" کو "غیض" لکھتے ہیں اکثر کتابوں اور رسالوں میں ان دو لفظوں کی حد تک املا کی غلطیاں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں، اور آپ بھی یقیناً اس غلطی میں مُبتلا تھے!

آپ کے اس مصرعہ :- اُمتِ محمد کی مشکلیں ہوئیں آساں، تیری ایک ٹھوکر سے

کے بارے میں عرض ہے کہ یہاں "ٹھوکر" واقعی بے محل ہے، آپ نے اس کی جو توجیہ کی ہے کہ "حضرت امام حسینؓ نے حق کی حمایت میں ہر چیز کو ٹھکرا دیا تھا، اور یہ اُمتِ محمدی کے لئے صد درجہ فائدہ بخش ثابت ہوا، کردارِ حسینؓ کی تقلید نے مسلمانوں کی بہت سی مشکلات کو دور کر دیا" اس سے "ٹھوکر" کے بے محل ہونے کا اعتراض رفع نہیں ہوتا! "ٹھوکر" استعمال کرنے کے دو قرینے ہیں۔

"اس نے ایک ٹھوکر میں باطل کے قلعہ کو پاش پاش کر دیا"

اس میں "ٹھکرانے کے فعل کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے،

مگر ـــــ " اس نے ایک ٹھوکر میں مشکلوں کو آسان کر دیا " اس میں کسی باطل یا ناخوشگوار شے کو بے وقعتی کے ساتھ " ٹھکرانے " کا مفہوم پنہاں نہیں ہوتا ۔

تلاطم غم کی یورشوں میں حیات ڈوبی ہوئی ملے گی ۔

اس پر میرا اعتراض یہ تھا کہ :- " یورشوں میں حیات کا ڈوبنا " یہ کیا اندازِ بیان ہے ؟ " اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے ـــــ

" میرے نزدیک تو یہ اندازِ بیان پڑھے لکھوں کا ہے ، یورش کے معنی حملہ ، چڑھائی اور دھاوا ہیں ، غم کے بہت سے حملوں میں کیا نہیں ڈوبا جا سکتا ، آپ شاید کنوئیں ، سمندر ، دریا ، ندی اور نالے ہیں ڈوبنے کو ڈوبنا سمجھتے ہیں ، شاید فراوانی رنج و خوشی ، نور و ظلمت وغیرہ میں ڈوبنا جن لوگوں نے لکھا ہے ، وہ سب جاہل تھے ، ماہر صاحب اردو کا گلا نہ گھونٹئے ملائیت کو ادبیت سے دور ہی رہنا چاہیئے ۔"

یہ کس بخت نے کہا تھا کہ غم میں ڈوبنا اور عیش و مسرت میں غرق ہونا درست نہیں ہے !

اعتراض اس پر تھا کہ : " غم کی یورشوں میں ڈوبنا " نہیں بولا جاتا " یورشوں میں ڈوبنا اور غرق ہونا " زبان و محاورہ کے خلاف ہے " حملہ اور دھاوے میں ڈوبنا " کبھی نہ کانوں نے سُنا اور نہ آنکھوں نے دیکھا ! شعر و ادب میں لفظ و بیان ہی کا تو سارا کھیل ہے ، نازک سے نازک خیال کی نزاکت اور لطافت غیر متوازن لفظوں کے قالب میں ڈھل کر غارت ہو جاتی ہے یہ کوئی " ملائیت " کی بات نہیں ہے ، یہ زبان اور معانی و بیان کے مسلمہ اصول ہیں ۔

آپ کے اس مصرعہ میں :- ؎ تاریکیٔ بزم عالم بھی طلعت سے تری ضوبار ہوئی !

" فاران " میں یہ تنقید کی گئی تھی ـــــ

" بھی حشو و زائد ہے " تاریکیٔ بزم عالم کو روشنی سے بدلنے کے لئے ہی تو مہر نبوت طلوع ہوا تھا ۔"

اس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں ـــــ

" بھی " ہرگز زائد نہیں ہے ، " بھی " کہہ کر میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماہ نبوت کسی ایک خطۂ زمین کے لئے طلوع نہیں ہوا تھا ـــــ "

خوب !! مگر زمین کا جو خطہ بھی ہوگا وہ " بزم عالم " ہی میں شامل ہوگا ، " بزم عالم " تمام کائنات کو محیط ہے ! اس لئے آپ کے مصرعہ میں " بھی " بالکل " زائد " استعمال ہوا ہے !

آپ کے اس مصرعہ ؎

تسلیم و رضا کے مسلک میں[1] بیعت کا سندیسہ ٹھکرا کر

میں " سندیسہ " جو خالص ہندی کا لفظ ہے ، " تسلیم رضا مسلک اور بیعت " جیسے عربی لفظوں کے ساتھ بھلا نہیں لگتا ! میرے اس ٹوکنے پر بھی آپ کو یہ لفظ (سندیسہ) نہیں کھٹکا تو پھر اس کے

---

[1] " میں " بھی یہاں ٹھیک استعمال نہیں ہوا ۔

یہ معنی ہیں کہ آپ یا تو کج بحثی پر اُتر آئے ہیں یا پھر آپ کے وجدان کی صحت مشتبہ ہے اور آپ کے "ذوق" کو مشکل ہی سے "سلیم" کہا جا سکے گا!

آپ نے اپنے اس مصرعہ : ؎

کچھ اور بڑھادی تھی تو نے اسلام کی زینت کیا کہنا!

کے بارے میں "زینت" کی عجیب توجیہہ فرمائی ہے :

" یہاں "وقعت" بھی ہو سکتا تھا، لیکن زینت میں جو ہمہ گیری اور واقعیت ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے! کیا انکارِ بیعت نے ایسے اسباب پیدا نہیں کئے جس سے اسلام کی سجاوٹ اور آرائش ہوئی "

اپنی بات کی پچ ہی جب منظور ہو تو ہر بے تکے لفظ کی مہمل سے مہمل تاویل کی جاسکتی ہے مگر یہ اندازِ بیان کیا ایک "اعجوبہ" سے کم ہے کہ حضرت حسینؓ کے انکارِ بیعت سے اسلام کی سجاوٹ اور آرائش ہوئی!!

آپ کے اس شعر پر :— ؎

اللہ اللہ سجدۂ عالی کا یہ حُسنِ نیاز ہو کے میداں کو بنایا کعبۂ ثانی حسین!

"فاران" میں یہ تنقید کی گئی تھی کہ : " عالی" بالکل زائد لفظ ہے "سجدہ" کی کوئی صفت "عالی" اور "اسفل" نہیں ہے "

آپ نے اپنے خط میں اس اعتراض کی جو تردید کی ہے، وہ کتنی کمزور اور ناقابلِ قبول ہے؟ یہ کون کہتا ہے کہ ماہر القادری کا سجدہ اور حضرت حسینؓ کا "سجدہ" دونوں کا ایک مقام ہے! مگر نماز، رکوع، سجدہ اور قومہ و قیام کو "عالی" اور "اسفل" نہیں کہہ سکتے! ہاں! "پُرخلوص" "نازِ عبادت" وغیرہ صفات اس سے منسوب کی جاسکتی ہیں!

زبان کا زیادہ تر انحصار "سماع" پر ہے "قیاس" پر نہیں ہے "جناب عالی" اور "مزاجِ عالی" تو بیشک بولا جاتا ہے مگر اس ترکیب کو سامنے رکھکر کوئی یوں کہے کہ ـــ "آپ کا دلِ عالی" کیسا ہے؟" تو زبان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہوگا!

اس ایک ہی نظم میں جس کا یہ شعر ہے، آپ نے کتنی بہت سی غلطیاں کی ہیں اور ٹھوکریں کھائی ہیں؟ سب سے نمایاں عیب تو "شتر گربہ" کا ہے کہ ایک ہی مسلسل نظم میں آپ نے اپنے ممدوح کو "آپ" اور "تو" سے خطاب کیا ہے ـ

ایک یہ مصرعہ : ؎

کیا لُٹے گی آپ کی یہ جلوہ سامانی حُسین ؑ

اور دوسرا یہ مصرعہ :—

کر رہے ہیں لوگ تیری مرثیہ خوانی حُسینؓ

یہ بھی اک اعجاز ہے تیرے طریقِ کار کا غیر فانی کر دکھائی ہستیٔ فانی حسینؓ !

" طریقِ کار" نے شعریت کا خون کر دیا ! " اخباری زبان " !

منزلِ صبر و رضا میں دیکھکر ثابت قدم بخش دی خوش ہو کے حق نے عمرِ لافانی حسینؓ

کہنا چاہیے تھا " حیاتِ جاودانی " اور کہہ گئے " عمرِ لافانی " ! شہادت کے بعد شہیدوں کی " عمر " ختم ہو جاتی ہے، ہاں ! پھر اللہ تعالیٰ " حیاتِ جاودانی " عطا فرماتا ہے !

اس نظم کی ردیف (حسین) میں کہیں تخاطب ہے (اے حسین !) اور کہیں یہ رنگ ہے :

اپنی ناکامی کا اُس کو آج بھی احساس ہے
پانی پانی آج بھی ہے شرم سے پانی حسینؓ

ردیف (حسین) نے " مدح " میں ذم کا بھی اشتباہ پیدا کر دیا ہے، اور یہ دلیل ہے شاعر کے ناپختہ کار ہونے کی !

مجھے اس کی فرصت کہاں ہے کہ آپ کے کلام کی تمام غلطیوں کی نشاندہی کروں غلطیوں کا ایک انبار ہے جو آپ کے کلام سے فراہم کیا جا سکتا ہے ! اور آپ ہیں کہ رسالوں کے تبصرے پڑھ کر یا اپنے بعض دوستوں اور ہم نشینوں کی داد و ستائش سے متاثر ہو کر اس خوش اندیشی میں مبتلا ہیں کہ آپ نے اپنے سلاموں کا مجموعہ چھپوا کر اردو ادب کو کیا کچھ دے دیا ہے اور اپنے " عزائی سلاموں " کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک نیا باب کھول دیا ہے !

آپ کی شاعری ابھی زیادہ سے زیادہ " عالمِ مراہقت " میں ہے جسے آپ نے " بلوغ " سمجھ لیا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ خوش فہمی آپ کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں نہ بن جائے !

آپ کے سینکڑوں شعروں میں کچھ شعر اچھے بھی ہیں، مگر زیادہ شعر ایسے ہیں، جن میں ناپختگی بھرتی، جھول اور بہت سی شاعرانہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں ! چند سال کے بعد جب آپ کے کلام میں پختگی پیدا ہو جائے گی تو اس وقت آپ کو اس زمانہ کی شاعری کی کمزوریاں محسوس ہوں گی کہ جن نظموں کو آپ " شاہکار " سمجھتے تھے، وہ تو بہت ہی معمولی سی نظمیں تھیں : اب اُس وقت نہ جانے اپنی کتنی نظموں اور غزلوں سے اپنی ذات کے ساتھ نسبت بھی گوارا نہ کریں گے !!

جو لوگ آپ سے زیادہ تجربہ اور مشق رکھتے ہیں اور جتنی آپ کی عمر ہے اس سے زیادہ مدت اُن کی دشتِ شعر و ادب کی سیاحی میں گزری ہے، ان کی باتوں کو یوں ہی چٹکیوں میں نہ اڑا دیجئے ——
میں اپنے ایک واقعہ کا یہاں تذکرہ کرتا ہوں !

اب سے اکتیس سال پہلے کی بات ہے کہ بدایوں (یو۔ پی) کے ایک عُرس میں مشاعرہ تھا، میری شاعری اُس وقت دورِ آغاز میں تھی، شہرِ بدایوں سخنوروں اور سخن سنجوں کا ہمیشہ مرکز رہا ہے، حضرت امیر خسرو کے استاد شہاب الدین مہمرہ اسی خاک سے اُٹھے، فانی اور قمر اسی چمن کے طائرانِ خوش نوا تھے، سچ تو یہ ہے کہ شعر و ادب بدایوں کی خاک سے سبزہ کی طرح اُگتے ہیں، بدایوں کے اس مشاعرے میں مجھ سے سامعین نے اصرار

کرکے کئی غزلیں سُنیں، وہ جو میرؔ نے کہا ہے کہ :   سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں۔
تو میں شباب کے اُس دور میں مشاعرے سے داد و تحسین کا ایک سرور لیکر رخصت ہوا، درگاہ کے سامنے چھولداریوں میں باہر سے آئے ہوئے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، حضرت احسنؔ مارہروی مرحوم حیات تھے، وہ میری قیام گاہ کی طرف آتے دکھائی دئیے، میں چھولداری سے باہر آیا، احسنؔ مرحوم نے اپنی بزرگانہ شفقت سے میرا دل بڑھانے کے لئے فرمایا :-

"میاں! خوب کہتے ہو ۔۔۔ ہاں، ذرا وہ شعر تو سناؤ، جس کا "غلط انداز" قافیہ ہے۔"

میرا یہ شعر تھا :-

ہو چکی بیمارِ اُلفت کو تسلّی ہو چکی
اک نگاہِ واپسیں وہ بھی غلط انداز ہے

اس پر مشاعرے میں بہت واہ واہ ہوئی تھی مگر جناب احسنؔ مرحوم کے تیوروں سے میں تاڑ گیا کہ میرے اس شعر میں کوئی نہ کوئی سُقم ضرور ہے، ایک سیکنڈ میں ذہن اس طرف گیا کہ "نگاہِ واپسیں" تو مرنے والے کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں، اور میں نے اس شعر میں "نگاہِ واپسیں" محبوب کی نگاہ کو کہا ہے، اس خیال کے آتے ہی اللہ تعالیٰ نے ایک بات سُجھا دی اور پھر میں نے اس شعر کو خود ہی "اصلاح" کرکے پڑھا :-

ہو چکی بیمارِ الفت کو تسلّی ہو چکی
ایک دزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے

اس پر احسنؔ مرحوم نے مجھے بہت غور سے دیکھا، اُن کی اس نگاہ میں ستائش سے زیادہ حیرت کی آمیزش تھی!

اس واقعہ کے یہاں بیان کرنے کا مقصود یہ ہے کہ ۔۔۔ عوام کی نگاہیں باریک بین نہیں ہوتیں، وہ بعض اوقات ایک عیب دار شعر پر بھی سر دُھننے لگتے ہیں ۔۔۔ شاعر چاہے وہ نوآموز ہی کیوں نہ ہو اس کو اس قدر ذہین اور طباع ہونا چاہیئے کہ کسی ناقد کا ذرا سا اشارہ پاکر اپنی غلطی کا احساس کرلے اور اپنی بھول چوک کی تاویلیں نہ کرے۔ اپنے سے زیادہ تجربہ کار لوگوں کی "باتیں" اس کی مستحق ہوتی ہیں کہ اُن پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے ۔۔۔ کمال کی بلندی پر پہونچنے کے بعد بھی اپنی "بے کمالی" کا احساس رہنا چاہیئے وہ اس لئے کہ پستی کی تو کوئی نہ کوئی حد ہے مگر بلندی، حسن و خوبی اور کمال کی کوئی حد نہیں، یہاں تو "خوب" کے بعد "خوب تر" کی تلاش و جستجو ہوتی ہے۔

(۶) میری اتنی سی تنقید کا کہ

"علامہ اقبال کی کتابوں پر جس طرح لکھا ہوتا ہے ۔۔۔ "جملہ حقوقِ اخذ و نقل و ترجمہ و طباعت محفوظ ہیں" اسی طرح جمال قریشی نے بھی اپنی کتاب پر یہ عبارت درج کرائی ہے، اس "خوش فہمی" کا کوئی جواب ہے"۔

آپ نے اس قدر بُرا مانا ہے، وہ غصّہ کیا ہے، اس قدر جھنجلاہٹ دکھائی ہے کہ پناہ بخدا! جیسے میں نے آپ کو خدانخواستہ گالی سُنا دی تھی، یا میں نے آپ کی ذات کو کسی پیغمبر سے نسبت دیدی تھی اور آپ کی شاعری کو اللہ کے کلام کا مشابہ ٹھیرا دیا تھا!

میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ اپنے کو علامہ اقبال کا ہمسر سمجھتے ہیں، یا آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ آپ کے سلاموں کا مجموعہ بانگِ درا، بال جبریل اور ضربِ کلیم کی ٹکر کا ہے! میں نے تو صرف یہ لکھا تھا کہ اقبال کی کتابوں پر جس طرح

"جملہ حقوق اخذ و نقل و ترجمہ طباعت محفوظ"

لکھا ہوتا ہے، اسی کی دیکھا دیکھی آپ نے بھی اپنی کتاب پر یہ عبارت درج کرائی ہے! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "بانگِ درا" کے سب سے پہلے ایڈیشن پر صرف "حقوق طباعت بحق مصنف محفوظ" سے ملتی جلتی کوئی عبارت درج تھی "اخذ و نقل و ترجمہ ..." تو اقبال کی بعد کی کتابوں پر لکھا گیا ہے، جب اُن کی شہرت معراجِ کمال کو پہنچ چکی تھی، شروع شروع میں تو اقبال کی بعض نظموں (شکوہ، جواب شکوہ وغیرہ) کو کتب فروشوں اور تاجروں نے اُن کی بغیر اجازت دھڑا دھڑ چھاپا ہے!

علامہ اقبال کی ایک ایک کتاب کے کم از کم پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن چھپے ہیں اور ان کی چند کتابیں تو تعدادِ اشاعت میں ایک لاکھ سے بھی آگے پہنچ گئی ہیں، برسوں سے کالجوں کے کورس میں اُن کی کتابیں داخل ہیں، ریڈیو میں اُن کے کلام کا معاہدہ (contract) ہے عوام و خواص میں اُن کے کلام کی مانگ ہے، دنیا کی مختلف زبانوں میں اُن کے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے اقبال کو اُن کی کتابوں پر کافی رائلٹی ملی ہے اور ان کی وفات کے بعد سے اب تک ان کی اولاد اپنے شہرۂ آفاق باپ کی کتابوں سے کیا عجب ہے کہ مجموعی طور پر کئی لاکھ روپیہ کا فائدہ اُٹھا چکی ہو لہٰذا اقبال کی کتابیں اس کی مستحق ہیں اور اُن کتابوں کو زیب بھی دیتا ہے کہ

"اخذ و نقل و ترجمہ کے حقوق محفوظ"

اُن پر درج کیا جائے ——— مگر آپ کا تو شاید پہلا مجموعہ کلام مارکیٹ میں آیا ہے آپ نہ عوام میں مشہور ہیں اور نہ خواص آپ کو جانتے ہیں، آپکے مشہور ہونے کے لئے تو اس کی خاص طور سے ضرورت ہے کہ آپ کے کلام کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو، مگر آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ اس قدر مشہور ہو چکے ہیں اور آپ کی کتاب کی مارکیٹ میں اس قدر مانگ ہوئی کہ اگر اس پر

"حقوق طباعت و اخذ و نقل و ترجمہ محفوظ"

لکھ کر ناشرین کتب کو نہ روکا گیا، تو آپ کی کتاب کو کتب فروش ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر اور بیچ کر اپنا گھر بھر لیں گے اور آپ اس سے محروم رہ جائیں گے، اور نہ جانے کس کس زبان میں آپ کے کلام کا ترجمہ شائع ہوگا، اور کس کس عنوان سے اُسے "اخذ و نقل" کیا جائے گا! یہ آپ خوش فہمی اور سادہ مزاجی کی آخر کس جنت میں رہتے ہیں؟

(۷) آپ نے اپنے مکتوب گرامی میں اس خاکسار کو جو دھمکیاں دی ہیں، انھیں پڑھ کر آپ کی بچگانہ خفگی پر ہنسی آگئی، کہ "ازیں بُوئے شیر می آید" بھائی! میں نے کب اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ میرا کلام اغلاط سے پاک ہے "فردوس" سے قبل میرے کلام کے چار مجموعے جو ہندوستان میں چھپے ہیں، ان کو اب اپنے اہتمام سے میں چھپواؤں تو شاید آدھے کے قریب حصہ حذف کرنا پڑے گا "فردوس" پر رسالوں نے بڑے اچھے تبصرے کئے ہیں، ماہنامہ "شاعر" نے بعض خامیوں کی البتہ گرفت کی ہے، مگر میں نے رسالہ "شاعر" کی اس تنقید کا برا نہیں مانا اور میں نے اپنے رسالہ میں ایک لفظ بھی "شاعر" کی اس تنقید کے جواب میں نہیں لکھا۔

میں نے حاشا وکلا آپ کو گرانے اور مطعون کرنے کی رتی برابر کوشش نہیں کی، یہ آپ کو وہم ہوگیا ہے جو مجھ پر ایسی تہمت جوڑتے ہیں، اگر اس پر بھی آپ کے دل کا غبار دور نہ ہو تو آپ میرے گرانے کے لئے ہر امکانی تدبیر کرکے دیکھ لیں، اس "کارِ خیر" میں آپ کو ہندوستان اور پاکستان میں کچھ ہم نوا بھی مل جائیں گے، آپ سب لوگ مل جل کر مجھے گرانے کے لئے زور لگائیں۔ اور دل کی یہ حسرت بھی نکال لیں! آپ میرے خلاف شوق سے پاک وہند میں مہم شروع کردیں بلکہ طوفان اٹھادیں، عزت و ذلت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے!

آپ کے "عتاب نامہ" کے بعض جملوں سے مجھے تکلیف ہوئی مگر میں آپ کو معاف کرتا ہوں

...بدم گفتی، عفاک اللہ نکو گفتی :- مدح وستائش کے ہنگامہ میں اس طرح کے "عتاب نامے" کبھی کبھار ملتے رہیں تو اس سے نفس کی سرزنش ہوتی رہے گی!

اللہ تعالیٰ پندارِ نفس سے محفوظ رکھے!

ماہرالقادری
کراچی
۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء

ماہر القادری

تاثرات

"پچھلے مہینہ کراچی میں اسلامی جمعیتہ طلبہ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا جس کے عام جلسے میں یہ چند اشعار میں نے خود پڑھ کر سُنائے تھے! حقیقت یہ ہے کہ ان خود غرض سیاسی لیڈروں اور شاطروں سے قوم ناامید ہو چکی ہے، ان کے ہاتھوں ملک و ملت کی اصلاح اور بہتری شاید ہی ہو سکے! اللہ تعالیٰ کی مدد اور دستگیری کے بعد ان اسلام پسند نوجوانوں سے ملک و ملت کی بھلائی کی اُمیدیں وابستہ ہیں، پاکستان میں دیر یا سویر کوئی صالح اور تعمیری انقلاب جب بھی آئے گا، اُس کے نقیب یہی اسلام پسند نوجوان ہوں گے!

میں جب کبھی ان نوجوانوں سے ملتا ہوں یا ان کے کسی مجمع میں ہوتا ہوں تو دل میں اقامت دین کی اُمنگ جاگ اٹھتی ہے، ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ سب ہمارے دست و بازو، اور رفیق کار اور شریک سفر ہیں، ان کی پاکیزہ نوجوانیوں کو دیکھ کر مجھے اپنی حالت پر شرم آنے لگتی ہے! سوچتا ہوں کہ فسق و فجور کے اس اندھیرے میں اخلاق و نکوکاری کی یہ شمعیں روشن نہ ہوتیں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا!

حیا آنکھوں میں، دل میں نور ایماں لیکے آئے ہو
اندھیری رات میں شمعِ فروزاں لیکے آئے ہو

کراچی کی فضا اخلاق کے پھولوں سے مہکی ہے
بہاریں بن کے آئے ہو، گلستاں لیکے آئے ہو

جوانی اور پھر اس کا تبسم اتنا پاکیزہ
جزاک اللہ! نویدِ صبحِ خنداں لیکے آئے ہو

تمہارے تیوروں سے کچھ پتہ باطن کا ملتا ہے
کہ تم سینوں میں اک خاموش طوفاں لیکے آئے ہو

جگر مرادآبادی

سوزِ جگر

(تازہ ترین)

محبت زندگی ہی زندگی ہے
مگر تجھ بن مرے کس کام کی ہے

وہی ساقی وہی دریا دلی ہے
وہی میں ہوں وہی لب تشنگی ہے

شہیدانِ محبت سو رہے ہیں
مگر روحِ محبت جاگتی ہے

ہشیار رستے سے اے شیخ و برہمن!
مرے دل نے مجھے آواز دی ہے

زمانہ چاہتا ہے زندگی کو
مگر خود زندگی کیا چاہتی ہے

دردِ دل

نسیم بیگ دل تاج محلی (آگرہ)

(غیر مطبوعہ)

دردِ دل سوزشِ مستور تمہیں کیا معلوم
اِن بلاؤں سے ہو تم دور تمہیں کیا معلوم

میری مجبوری کا احساس نہ کرنے والو
تم بھی ہو سکتے ہو مجبور تمہیں کیا معلوم

مسکراتے ہوئے لب دیکھ لئے ہیں تم نے
دل میں ٹیسیں ہیں بدستور تمہیں کیا معلوم

تم فقط نیم نگاہی جسے کہتے ہو ـــ
تھا وہی وار تو بھرپور تمہیں کیا معلوم

تم نہیں جلووں سے معمور حقیقت یہ ہے
تم سے خود جلوے ہیں معمور تمہیں کیا معلوم

دل میں آؤ تو دکھائیں تمہیں دل کی دنیا
تم تو رہتے ہو بہت دور تمہیں کیا معلوم

عروج زیدی

غزلیں

ہمیں تک ہیں محبت کے قرینے
کہاں دھڑکن! کہاں پھولوں کے سینے

کچھ ایسی کروٹیں لیں زندگی نے
نگینے بن گئے جھوٹے نگینے

اسی دنیا کو جو خلدِ بریں تھی
جہنم کر دیا ہے آدمی نے

اجل تو دشمنِ ہستی نہیں ہے
مجھے دھوکا دیا خود زندگی نے

بہر لحظہ غمِ دل بڑھ رہا ہے
مجھے یہ زندگی دے گی نہ جینے

تلاطم سے ہراساں ہونے والو
سرِ ساحل بھی ڈوبے ہیں سفینے

عبث رہزن کے سر الزام آیا
ہمیں لوٹا فریبِ رہبری نے

ہمارے مشربِ غم دوستی نے
دکھائے اوجِ انسانی کے زینے

ہمیں سرمایۂ ظلمت دیا ہے
جبینِ وقت کی تابندگی نے

حجابِ درمیاں اٹھے نہ اٹھے
وہ ذوقِ جستجو مجھ سے نہ چھینے

تبسم کی حدوں تک زندگی ہے
چٹک کر یہ کہا گل سے کلی نے

فرشتے تو نہ اترے آسماں سے
ستایا آدمی کو آدمی نے

سہارا پا کے تیری بے رخی کا
کہانی ختم کر دی زندگی نے

جنوں پابندِ قید و حد نہیں ہے
خودی کی لاج رکھ لی بیخودی نے

خوشا میری محبت کی لطافت
ہوسکاری کو آتے ہیں پسینے

خرد ہے مصلحت اندیش لیکن
پتے کی بات کہہ دی بیخودی نے

عروج! اس روشنی کے گیت گاؤ
اندھیرے بھی دئے جس روشنی نے

★

نیّر جہلمی

کرنیں

جس کو دنیا کے حوادث سے بچا لایا تھا میں — ایک وہ آنسو سرِ محشر مرے کام آگیا

کس قدر دشوار تھی یہ رہ گزارِ زندگی — بارہا سنبھلا مگر میں پھر بھی ٹھوکر کھا گیا

انسان ہوں میں وسعتِ عظمت مری نہ پوچھ — کونین پر ہوں سایۂ داماں کئے ہوئے

پھر مائلِ نشاط ہوا جا رہا ہے دل — جی چاہتا ہے چھیڑ کریں آسماں سے ہم

سچ ہے کہ ان کی یاد سے رکھیں نہ واسطہ — لیکن دلِ ایسا مانگ کے لائیں کہاں سے ہم

میں جادۂ فنا میں مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں — شاید مجھے پکارے گذرا ہوا زمانہ

اپنے وجود کو بھی سمجھتا رہا فریب — یوں مبتلائے گردشِ دوراں رہا ہوں میں

کیوں جبیں سائی پہ مجبور ہے انساں آخر — بت میں کیا بات ہے ایسی جو برہمن میں نہیں

ہزاروں منزلیں طے کر چکا ہوتا ہے وحشت کی — وہ اک دیوانہ جو آسودۂ منزل نہیں ہوتا

شفقت کاظمی

جذباتِ شفقت

جہاں ان سے ملاقاتیں رہی ہیں — وہاں ہر رنگ کی باتیں رہی ہیں

نگاہِ یار سے باتیں رہی ہیں — کبھی یوں بھی ملاقاتیں رہی ہیں

جہاں تدبیر کی چلتی نہ دیکھی — وہاں تقدیر سے باتیں رہی ہیں

کبھی اُن کے تصور کی بدولت — عجب صبحیں عجب راتیں رہی ہیں

وہاں سویا کیا بے فکر کوئی — یہاں شب بھر مناجاتیں رہی ہیں

نرالی تھی یہ تقسیمِ ازل بھی — وہاں صبحیں یہاں راتیں رہی ہیں

چلا یاروں میں جب ذکرِ محبت — مرے قصے تری باتیں رہی ہیں

جو بیگانہ ہیں شفقت آج ہم سے
کبھی ان سے ملاقاتیں رہی ہیں

محشر بدایونی

فردوسِ تغزّل

نہ عشق کم ہے پریشاں نہ حُسن کم ہے اداس
اِدھر غم ایک صدا ہے اُدھر غم اِک احساس

ستم کہ خوئے ستم بھی انھیں نہ آئی راس
اداس کر کے مجھے خود وہ ہو گئے ہیں اداس

نہ تھا خزاں میں بھی محرومیوں کا کم احساس
بہار آ کے مجھے اور کر گئی ہے اُداس

یہ بزم بزمِ ہم اہلِ وفا کے دم سے تھی
ہوا یہ بزم کو لیکن ہمارے بعد احساس

یہ کشمکش ہے تو کس طرح زندگی گذرے
نہ تجھ سے دور ٹھہرتا ہے دل نہ تیرے پاس

میں اپنی تشنگیٔ لب بُجھا تو لوں محشر
مگر جو دل کی طلب ہے مگر جو روح کی پیاس

مخمور سعیدی

دہر میں پھیل گیا ہے غمِ دوراں ہو کر
ہم کہاں جائیں ترے غم سے گریزاں ہو کر

عمر بھر کو غمِ دوری سے ہم آغوش ہوئے
ہم گھڑی بھر کو ترے قرب سے شاداں ہو کر

زندگی بھی نہ رہی جب ترا ارماں نہ رہا
زندگی مجھکو ملی تھی ترا ارماں ہو کر

میری آشفتہ نگاہی پہ نہ کر طنز اتنا
رہ نہ جائیں ترے جلوے بھی پریشاں ہو کر

شکوۂ غم پہ ہے اب دل کو خجالت کیا کیا
کیا کیا یہ تری نظروں نے پشیماں ہو کر

شفیق احمد

ستارے
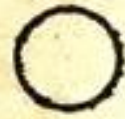
پاس ناکامیٔ صیاد نے روکا ورنہ ... میں گرفتار ہی رہنے پہ تو مجبور نہ تھا
ہر شکایت پہ حکایت کا گماں کرتے ہو ... تم سے پہلے کبھی محفل کا یہ دستور نہ تھا

آرائشِ جمال کرے گی حیات کیا ... آئینۂ یقین پہ خرد کا غبار ہے
ملتی ہیں خود پرست کو دنیا کی نعمتیں ... اور حق پرست ہو تو سزاوار دار ہے
ہر سانس پہ تجدیدِ وفا ہوتی ہے غافل ... ہوں گوش بر آواز تو غنچہ بھی جرس ہے
رضائے دوست سے حسنِ طلب ہے وابستہ ... فراق و وصل سے آگے بھی ایک منزل ہے
نیازِ کوہکن سے نازِ شیریں کا تعلق تھا ... نہ چھیڑ اب داستانِ حیلۂ پرویز اے ساقی
وجودِ کفر ہے لازم فروغِ دیں کے لئے ... بڑھی ہے زلف سے عارض کی دلکشی کیا کیا
سوزِ نغمہ کہاں، ابھی تو ہمیں ... سازِ محفل درست کرنا ہے
رتبے میں مہر و ماہ سے بھی ہم زیادہ ہیں ... ہمرازِ عشق و ہم نفسِ جام بادہ ہیں
حریفِ عشق بنے یہ خرد کی تاب کہاں ... چراغِ مردہ کہاں، شمعِ آفتاب کہاں
نرگس بھی مست، لالہ بھی پیمانہ گیر ہے ... اک ہم ہی کیا، زمانہ تمہارا اسیر ہے
معاذ اللہ حقائق کی یہ کثرت ... فسانہ بن گئی ہے زندگانی
دنیا والو مقصدِ دل بے رنج و محن کب ملتا ہے ... لاکھوں کانٹے اُگ آتے ہیں جب پھول کہیں اک کھلتا ہے
متاعِ لعل و گہر اپنے پاس بھی ہے مگر ... پرکھنے والی نظر ایک بھی نہیں ملتی
اب آبروئے لالہ و گل تیرے ہاتھ ہے ... اے ابرِ لطف کچھ تو چمن کا خیال کر
زلفِ گیتی ہے تماشا خانۂ بادِ خرد ... شانۂ دستِ جنوں کو آزمانا چاہیئے
اس کا معاملہ ہے، کیا لکھ سکے گا خامہ ... فی بعدہا عذابٌ فی قربہا الندامہ
ہجر میں کام آسکی نہ شراب ... فَاتَّقُوا اللّٰہَ یَا اُولِی الْاَلْبَاب۔

روح انتخاب

صحابۂ کرام بیدار ہوتے ہیں۔ خوف الٰہی سے لرزاں وترساں۔ لیکن ان کے قلوب رحمتِ حق سے مطمئن ہوتے ہیں۔ ہر ایک گھر کے مرد، عورتیں اور بچے نماز کی تیاری میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

بلالؓ مکبّر سے اُتر کر حجرۂ نبویؐ کے دروازہ پر کھڑے ہوکر عرض کرتے ہیں۔ "حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح" الصلوٰۃ یارسول اللہ"

صبح کی روشنی پھیلنے لگتی ہے اور نمازیوں کے گروہ جوق درجوق مسجد کی طرف چلے آتے ہیں۔

یہاں جسے چاہو دیکھ سکتے ہو۔ ادھر ایک جماعت اپنے گھروں سے نکل کر مسجد کی طرف جارہی ہے یہ گندم گوں میانہ قد اور بڑی آنکھوں والے علی بن ابی طالبؓ ہیں۔ جو حجرۂ فاطمہ سے نکل کر آرہے ہیں۔

اور وہ دراز قد، گداز جسم، سر کے اُڑے ہوئے بالوں والے عمر فاروقؓ ہیں اور یہ گندم گوں، خوشرو، گداز شانوں، سر پہ گھنے بالوں اور بڑی ڈاڑھی والے عثمانؓ ذوالنورین ہیں۔

صدیق اکبرؓ بیت نبوی میں قیام پذیر تھے۔ وہ جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے آرہے ہیں۔ یہ سفید رنگ، نحیف الجثہ اور کشادہ رُو ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی ہیں، رخساروں پر زیادہ بال نہیں اور شانے جھکے ہوئے ہیں۔

قبیلۂ بنی زہرہ کے گھروں سے جو مسجد کی ایک سمت واقع ہیں تین اور اصحاب آرہے ہیں، ان میں سے ایک پستہ قد، فربہ اندام، موٹی موٹی انگلیوں اور گھنے بالوں والے ہیں جو سیاہ خضاب بھی لگاتے ہیں، یہ سعد بن ابی وقاصؓ ہیں۔

اور دوسرے گندمی والے، دُبلے پتلے، پستہ قامت، جن کے بال کانوں کی لو تک ترشے ہوئے ہیں، جن کے نہایت سفید براق لباس سے بوئے عطر مہک رہی ہے اور جو نہایت متانت و وقار سے آرہے ہیں عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور تیسرے صحابی جو گداز جسم، دراز قد اور کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے ہیں مقدادؓ بن اسود ہیں۔

ادھر دو اور صحابہ کو دیکھو یہ دراز قامت اور جسیم خالدؓ بن ولید ہیں اور یہ دوسرے پستہ قامت، کشادہ رو، بڑی اور سرمگیں آنکھوں والے عمرو بن العاصؓ ہیں۔ اور ان سے کچھ فاصلہ پر خوش رو، عظیم الجثہ، سرمہ بچشم، ہاتھ زیادہ ہلا ہلا کر چلنے والے معاویہؓ بن ابی سفیان ہیں۔ وہ ایک نحیف الجثہ، دراز قامت، کشادہ رو، چھوٹی ڈاڑھی، صاف عارض اور سامنے سے دو شکستہ دانتوں والے ابو عبیدہؓ بن الجراح ہیں۔

ادھر مشرقی میدان کی طرف سے بھی دو اصحاب آرہے ہیں۔ ان میں ایک قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذؓ اور دوسرے قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہؓ ہیں اور یہ طویل القامت، نحیف الجثہ، گھنے بالوں والے

صاحب جن پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہیں سلمان رضؓ فارسی ہیں۔ ان کے عقب میں ایک میانہ قد بہت سُرخ و سفید رنگ اور بڑے بڑے بالوں والے جو حنا کا خضاب لگائے ہوئے ہیں صہیب رومیؓ ہیں۔ تم اس اجتماع میں طلحہؓ، زبیرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور ابوایوب انصاریؓ کو بھی دیکھ سکتے ہو۔

اِدھر سے فرزندانِ صحابہ بھی آرہے ہیں یہ دراز قامت اور سُرخ چہرے والے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ اور یہ دراز قد زردی مائل گورے رنگ والے خوبصورت صبیح و ملیح صاحبزادے عبداللہ بن عباسؓ ہیں اور یہ صاحبزادے جو ابوبکر صدیقؓ کے مشابہ ہیں عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔ بلالؓ اقامت کہتے ہیں اور رسول اللہ صفوں کو سیدھا اور درمیان میں خالی جگہوں کو پُر کر کے تکبیر تحریمہ فرماتے ہیں اور مقتدی بھی "اللہ اکبر" کہتے ہیں۔

یہ تکبیر تمام عالم کے بے ہنگام شور و غوغا کے درمیان ایک منظم و مرتب نغمۂ حیات اور دنیا کے باطل او جھوٹے دعاوی کے درمیان حق و صداقت کی دعوتِ عام بن کر پھیل جاتی ہے۔

یہی تکبیر بعض قلوب کے حق میں طمانیت اور بعض کے لئے لرزہ اضطراب کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی تکبیر ایک قوم کے حق میں اُمید اور دوسروں کے حق میں خوف بن کر انحاءِ عالم میں گونجتی ہے۔

یہی تکبیر کمزوروں اور مظلوموں کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کی خوش خبری سُناتی اور جابر و ظالم ہستیوں کو اس کے منصفانہ قصاص سے ڈراتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ظالموں کے طبقوں کو انہی صفوفِ صلوٰۃ نے منتشر اور پارہ پارہ کر دیا تھا نہ کہ صفوفِ جنگ نے اور جابروں کے ایوان ہائے مملکت میں اسی تکبیر نے زلزلہ ڈال دیا تھا نہ کہ تیر و سناں کے حملوں نے۔

رسول اللہ پہلی رکعت میں سورۂ نور کی آیات تلاوت فرماتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّالحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اللہ پر ایمان لانے والوں اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین پر اپنا نائب بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے مومنین کو بنایا تھا۔

ولیمکنن لھم دینھم الّذی ارتضیٰ لھم۔

اور اللہ تم مسلمانوں کے لئے ان کے اس دین کو مستحکم بنا دے گا جسے اس نے اس کے لئے پسند فرمالیا ہے۔

ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدونی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون۔

اور اللہ انسانوں کے خوف و دہشت کو ضرور امن و سکون سے بدل دے گا تاکہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں۔ اور کسی کو اس کا شریکِ ذات نہ بنائیں۔ اس کے بعد بھی جو کفر اختیار کریں گے تو وہ فاسق و فاجر ہوں گے۔

دوسری رکعت میں آنحضرتؐ سورۂ حج کی آیات تلاوت فرماتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

انّ اللہ یدافع عن الّذین اٰمنو

اللہ تعالیٰ مومنین کی ہر مصیبت میں ان کی مدافعت فرماتا ہے۔

ان اللہ لا یحب کل خوان کفور۔

اللہ کسی خائن و ناشکر گزار سے محبت نہیں کرتا۔

الذین مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

مومنین وہ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار و حکومت عطا کر دیں تو نماز ادا کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکیوں کی ہدایت کریں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور تمام امور کا حسن خاتمہ اور انجام خدا ہی کے لئے ہے۔

یہ وہ جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کا وارث بنانے کے لئے منتخب فرمالیا ہے۔ اسی کی وہ تعلیم و تربیت فرماتا ہے۔ تاکہ ان لوگوں کے درمیان انصاف الٰہی جاری کرے۔ عبادت گزاروں کی یہی صف تمام روئے زمین کے خلفاء، امراء، قضاۃ اور حاکموں، معلموں، رہبروں اور لشکر پر مشتمل ہے۔

زاہدوں کا یہی مختصر گروہ عنقریب ملوکِ عالم کے تخت و تاج کا وارث ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا رزق دنیا میں انہی کے ہاتھوں تقسیم فرمانے والا ہے۔ اور انہی کی زبانوں سے روئے زمین پر اپنا حکم جاری کرنے والا ہے۔

یہی وہ مختصر جماعت ہے جسے آج دو وادیوں کے درمیان ایک تنگ خطۂ ارض گھیرے ہوئے ہے لیکن کل یہی مشرقین و مغربین میں پھیل جائیں گے اور عنقریب تمام روئے زمین ان کے عدل سے قرار پائے گی۔ اور ان کے نور ایمان سے منور ہو جائے گی۔ ——— نماز ختم ہوئی اور نمازی منتشر ہو گئے۔

یقیناً صرف ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندۂ خاص کی مدد فرمائی اس کے لشکر کو غالب فرمایا، اسی جماعت کے ہاتھوں اقصائے عالم فتح کئے گئے، اسی کے ذریعے امصار و بلاد آباد کئے گئے۔ یہی عمرؓ شام میں رومی حکومت کو مٹا کر خود وہاں تشریف لے گئے تاکہ معاہدوں کو پورا فرمائیں۔ اور رعایا کے حال کی نگرانی کریں۔ اور یہی بلالؓ لشکر مجاہدین میں بحیثیت غازی شریک ہوئے۔ عمر فاروقؓ بلالؓ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور مؤذنِ رسول اللہ کی اذان سننے کے متمنی ہیں۔ عوام امیر المومنین سے عرض کرتے ہیں کہ "کاش آپ بلالؓ سے اذان دینے کی خواہش فرماتے"۔ عمرؓ بلالؓ سے اذان دینے کی فرمائش کرتے ہیں ——— اور اس کی تعمیل میں یہ ستر سالہ بزرگ حسب سابق اذان دینے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور اطراف و اکناف میں یہ کلمات گونجنے لگتے ہیں"

اللہ اکبر اللہ اکبر۔

(ڈاکٹر عبدالوہاب عزام۔ از ماہنامہ ثقافت)

ماہر القادری

مس یا مسز

"میں اپنی سہیلیوں کو دعوت دے چکی ہوں، سعیدہ کی سالگرہ گیارہ دسمبر کو ہوگی اور ضرور ہوگی، یہ تقریب کسی عنوان ٹل نہیں سکتی ——— حمیدہ نے قدرے تند و تیز لہجہ میں کہا

بیٹی! ہمارے گھرانے میں تو آج تک کسی بچہ کی سالگرہ نہیں ہوئی، میری نانی اللہ رکھے سو برس کی ہیں، وہ صبح سویرے کہہ رہی تھیں کہ ہمارے دادی، پردادی اور بڑے بوڑھوں میں سے کسی نے بھی اپنے کسی بچہ کی سالگرہ نہیں کی، اس حمیدہ نے بیٹھے بٹھائے کیا شوشہ چھوڑ دیا ہے ——— حمیدہ کی ماں نے پان کی گلوری بناتے ہوئے جواب دیا

ہمارے بڑے بوڑھوں کے گھروں میں تو مٹی کے چراغ جلا کرتے تھے، انہی کی ہو بہو پیروی کرنی ضروری اور لازمی ہے تو لِلّٰہ کہہ کے توڑ دیجئے ان بجلی کے قمقموں کو! اور ان کی جگہ لے آئیے مٹی کے دیئے، جن میں ہتھیلیوں سے بٹ بٹ کر روئی کی بتیاں اور سرسوں کا تیل ڈال کر، بڑے بوڑھوں کا نام روشن کر دیجئے! اماں جان! کسی بات کا اگلے زمانہ میں نہ ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ بات چونکہ پہلے کبھی نہیں ہوئی اس لئے بری ہے، معیوب ہے، خاندان کے نام کو اس سے بٹہ لگ جائے گا! یہ مکھی پر مکھی مارنے اور لکیر کے فقیر بنے رہنے کی رسم آخر کب تک چلتی رہے گی ——— حمیدہ نے اپنے بالوں کی لٹ کو انگلی میں گھماتے ہوئے کہا، اور اس کی ماں کے ہونٹ جواب دینے کے لئے ہلے ہی تھے کہ پڑوسن لمبی لمبی ڈگیں بھرتی ہوئی آ دھمکی، اور حمیدہ کے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ پکڑاتے ہوئے بولی:

"ابھی ابھی ڈاکیہ نے یہ تار لا کر دیا ہے، بیٹی! بسم اللہ کر کے اسے پڑھنا تو! اللہ اپنوں اور پرایوں کو خیر سے رکھے!

حمیدہ تار پڑھنے لگی، پڑوسن کی نگاہیں حمیدہ کے ہونٹوں پر جمی تھیں کہ ان سے نہ جانے کیا بات نکلتی ہے۔ حمیدہ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھرنے لگیں

بیٹی! خیر تو ہے ——— پڑوسن نے بے صبری کے انداز میں کہا

چچی جان! اس میں لکھا ہے کہ میں خیریت سے پہونچ گیا مگر...... (بڑبڑاتے ہوئے......) ان پوسٹ آفس والوں کے جناتی خط ہوتے ہیں، کس بے پروائی کے ساتھ گھسیٹ لکھتے ہیں.... تو یہ..... اور..... ہاں..... جی!..... یہ کہ...... اور..... پہلی بات تو وہی کہ میں خیریت سے پہونچ گیا..... مگر، (قدرے رک کر) انکل (UNCLE) کا ابھی تک انتظار ہے (یہ انکل بنکل کیا بلا ہے؟ پڑوسن بیچ میں

بول پڑی ——— حمیدہ مسکرا کر کہتی ہے " انکل" چچا کو کہتے ہیں)! (حمیدہ پھر بڑبڑاتی ہے !... اوہو! ڈاک کے بابو صاحب نے یہ Sealkot. تحریر فرمایا ہے ایس (S) عین مین مرغے کی چونچ، آئی (I) ٹھیک لکھی ہے مگر اے (A) کا سر نہ پیر اور باقی کے حروف، سبحان اللہ! جیسے کوئی چیونٹا کسی گیلے کاغذ سے گزر جائے! تاروں کی عبارت زیادہ تر انکل سے پڑھی جاتی ہے ....)

پڑوسن حمیدہ کو دعائیں دینے لگی بلکہ تعریفیں کرنے لگی، حمیدہ شرما سی گئی مگر اس شرما جانے میں خود شناسی کا احساس بھی پنہاں تھا، حمیدہ کی ماں پڑوسن کی زبان سے بیٹی کی تعریف سن کر فخر سا محسوس کر رہی تھی کہ پاس پڑوس کی عورتیں حمیدہ کے "علم" کی محتاج ہیں اور اس کی بیٹی سینکڑوں کوس سے آئے ہوئے تاروں کو فر فر پڑھ کر اس کا مطلب اپنی زبان میں بیان کر دیتی ہے۔

سعیدہ کی سالگرہ کے مسئلہ نے شیخ احمد حسین کے گھرانے میں اچھی خاصی کشمکش کی صورت اختیار کر لی، کئی دن تک خوب گرما گرم بحث ہوتی رہی، سعیدہ اس کی ماموں زاد بہن انجم اور اس کا چچیرا بھائی آفتاب یہ تین ایک طرف اور سارا گھر دوسری طرف! بڑی بوڑھی عورتیں کہتی تھیں کہ ہم اپنے گھر میں ترستانوں کی رسمیں اور تقریبیں قیامت تک نہ ہونے دیں گے،

حمیدہ اس پر اڑی تھی کہ گھر کی بڑی بوڑھیوں کا احترام سر آنکھوں پر مگر ان کی دقیانوسی باتیں اب ہمارے گھر میں نہیں چل سکتیں، زمانہ ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہونچ گیا اور یہ ہمارے گھر والے ہیں کہ اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور ڈوبے ہوئے ستاروں کی پوجا کر رہے ہیں!

اس نزاع میں حمیدہ کامیاب رہی، اس کا کہنا سب کو ماننا پڑا، حمیدہ کے باپ سب سے زیادہ سخت مزاج تھے مگر جوان بیٹی کے آنسوؤں کی لڑیاں دیکھ کر وہ بھی نرم پڑ گئے، حمیدہ کا بارہا کا تجربہ تھا کہ ایسے موقعوں پر اس کے آنسو ہی سدا اس کے کام آئے ہیں اور یہ حربہ کبھی ناکام نہیں ہوا!

گیارہ دسمبر کو سعیدہ کی سالگرہ بڑے دھوم دھام سے ہوئی، گھر کی دوسری عورتیں یہ تو نہیں کر سکتی تھیں کہ اس دن گھر چھوڑ کر کسی کے یہاں چلی جاتیں، اوپرے دل ہی سے سہی، گھر کی اس تقریب میں انھیں بھی بہر حال شریک ہونا پڑا!

حمیدہ کے سلیقہ نے گھر کو سجا کر دلہن بنا دیا تھا، بڑے کمرے کی چھت میں رنگ برنگ کاغذوں کے کترے ہوئے پھولوں کی وہ پھبن، اور میزوں پر گلاب کے تازہ و شاداب گلدستوں کی وہ بہار! کمرہ اتنا صاف ستھرا کہ جس کے دیکھنے سے دکھتی آنکھیں اچھی ہو جائیں، ہر چیز قرینہ سے رکھی ہوئی ہر بات میں سلیقہ، خوش نمائی، دیدہ زیبی اور رعنائی!

بر مغرب مہمان عورتیں آنا شروع ہوئیں سب سے پہلے ایک سوکھی پتلی دبلی عورت وارد ہوئی پچپن سال کے لگ بھگ عمر، گال پچکے ہوئے، آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے، ٹھگنا قد، سیدھی جانب کا کوٹھا اوپر کی طرف ابھرا ہوا، اس حلیہ پر بناؤ سنگھار کا وہ عالم کہ کوئی نئی نویلی دلہن کیا سنگھار کرے گی؟ ناخنوں کی کوروں سے کر کنپٹی کے بالوں تک ہر چیز پر فیشن کی ملمع کاری! وہ اس کا سینہ تان کر چلنا، چلنے میں لچک لچک

جانا اور

اس نزاکت پہ یہ شمشیر ادا
آپ سے کیوں کر سنبھالی جائے گی

کا مصداق بننے کی مضحکہ خیز کوشش کرنا، بس یوں سمجھئے کہ بوڑھی بھیڑ نے اپنے کو نوخیز ہرنی سمجھ رکھا تھا! یہ کالج کی استانی صاحبہ تھیں، اخلاقیات کی پروفیسر، طالبات کے ہوسٹل کی نگراں بھی! یہ ابھی تک مس miss کہلاتی تھیں، عربی زبان میں جسے "آنسہ" کہتے ہیں، ہندی میں "کنیا"! ان مس صاحبہ کی کوئی آدھے درجن منگیتروں سے کورٹ شپ ہو ہو کر رہ گئی، دلہن بننا اور بیاہے جانا ان کی قسمت میں لکھا ہی نہ تھا، ہوسٹل کی خوبصورت لڑکیوں کو بک بک پرے جانے کا انھیں بہت شوق تھا، اور ان کے اسی شوق نے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور کر رکھی تھیں!

رات کے آٹھ بجے تک آنے والیوں کا تانتا بندھا رہا، برقعہ پوش تعداد میں تہائی سے بھی کم تھیں! غالب تعداد بے پردہ لڑکیوں کی تھی! اتنی بہت سی بیباک جوانیاں جہاں جمع ہو جائیں، وہاں جتنی بھی چہل پہل ہو کم ہے حمیدہ کا گھر سچ مچ نگارستان بنا ہوا تھا، بلکہ بعض وقت تو اُن کی چھیڑ چھاڑ اور چہلوں کو دیکھ کر ایسا سماں پیدا ہو جاتا تھا کہ بس کوئی دم میں اس گھر سے قیامت اُٹھنے والی ہے! ان سب میں کم شوخ حمیدہ ہی تھی! شاید گھر کی بڑی بوڑھیوں کی موجودگی نے اُس کی شوخی میں سنجیدگی پیدا کر دی تھی، اس کا لباس بھی زیادہ بھڑکیلا نہ تھا. مگر اس سادہ لباس میں بھی وہ انتہائی دیدہ زیب دکھائی دیتی تھی، اس کی سرو قامتی کے آگے بعض بعض نوجوان لڑکیاں ببول کے پودوں کی طرح اُجاڑ اور بے رونق نظر آتی تھیں،

سال گرہ کی تقریب کا آغاز سعیدہ کی گلپوشی سے ہوا، پھر ڈیڑھ فٹ چوڑا اور ایک فٹ اونچا کیک کاٹا گیا ساتھ ہی آٹھ موم بتیاں روشن کی گئیں، یہ اس کی علامت تھی کہ سعیدہ کی یہ آٹھویں سالگرہ ہے! پھر مہمانوں نے سعیدہ کو تحفے دیے! کسی نے بچی کی بلائیں لیں، کوئی اس کی گردن میں پڑے ہوئے ہاروں کو ہی چوم کر رہ گئی کسی نے اس کے گال کو آہستہ سے سہلایا! اس کے بعد تفریحی پروگرام شروع ہوا۔

سب سے پہلے کالج کی دو لڑکیوں نے مل کر فلم کا ایک گیت گایا، اس کے بعد ایک لڑکی نے ہکلے کی نقل کی، تیسری لڑکی نے مٹی کا کورا گھڑا بجا کر اس پر ایک دادرا سنایا، اور آخر میں کالج کی ایک استانی نے تقریر کی، پھبھے دار تقریر، جس کے ایک ایک جملہ پر تالیاں بجائی گئیں! پھر کھانا ہوا اور رات کے گیارہ بجے کے قریب یہ محفل ختم ہو گئی. ہر محفل اُجڑنے کے لئے ہی جمتی ہے، قہقہے اپنے بعد سکوت ہی چھوڑ جاتے ہیں، ؎

خوشی جاودانی، نہ غم جاودانی

تھوڑی سی دیر میں ساری چہل پہل رخصت ہو گئی سعیدہ کے گلے سے ہار اُتارے گئے، تحفوں کو الماری میں رکھا گیا! حمیدہ اس تقریب کی کامیابی پر پھولی نہ سماتی تھی مگر اس گھر کی دوسری عورتوں پر ایک عالم افسوس و حیرت طاری تھا ہونٹوں پر مہر سکوت، چہرے نڈھال، آنکھیں خشک ...... کہ

؎ یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

وہ ایک دوسرے کا منہ تکتی تھیں کہ ہیں! یہ کیا ہوا؟ ان آنکھوں کی قسمت میں یہ زخم کھانے بھی لکھے تھے

شیخ جی کی حویلی میں یہ چنڈال چوکڑی آئی تو کیسے آئی ! ان لڑکیوں کی بے باکی کو دیکھ دیکھ کر ہمارے تو شرم کے مارے کپڑے اترے پڑتے تھے ! یا اللہ ! اب زمانہ اتنا نیچ ہوگیا ہے ؟ کالجوں میں یہی کچھ سکھایا جاتا ہے تو اے پروردگار ! وہاں کی پرچھائیں سے بھی شریف خاندانوں کو بچاتے رہنا ! ہم الزام کس کو دیں جبکہ اپنی گھر کی بیٹی ہی کا یہ سب کچھ کیا دھرا ہے !

سالگرہ کی اس تقریب کے بعد گھر کے لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ حمیدہ کو انھوں نے تعلیم کے لئے ایک عجیب قسم کے ماحول میں بھیج دیا ہے، خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے، اس مزاج اور روش کی سہیلیوں میں رہ کر، حمیدہ بالکل اُن جیسی نہ بنی، پھر بھی ان کی تھوڑی بہت خوبو تو آہی جائے گی ! ان تمام شکوک شبہات اور توہمات کا واحد علاج یہی تھا کہ حمیدہ کو کالج سے اٹھا لیا جاتا، مگر ایسا کرنے کی اُن میں جرأت نہ تھی، عورت کو آزادی اور چھوٹ دے کر، پھر اُسے واپس لے لینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے نسوانی آزادی کی راہ میں قدم اٹھکر پھر مشکل ہی سے مڑتے ہیں ! حمیدہ سے پورا گھر مرعوب تھا !

اس دن کے بعد سے اتنا ضرور ہوا کہ اب حمیدہ کی نقل و حرکت کو نگاہِ تجسس سے دیکھا جانے لگا حمیدہ کا بڑا بھائی رفیق اس معاملہ میں پیش پیش تھا اور کیوں نہ ہوتا یہ اس کی بہن کی عزت و آبرو کا مسئلہ تھا، بال سے باریک اور تلوار سے تیز !

اس جستجو کی ابتدا، حمیدہ کی کتابوں سے کی گئی، وہ کالج چلی جاتی تو رفیق اس کی کتابوں، کاغذوں اور صندوقچوں کا جائزہ لیتا حمیدہ کی طرف سے ابھی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی تھی، مگر جانچنا یہ مقصود تھا کہ اس کا رجحانِ طبع کیا ہے ؟

حمیدہ کی کتابوں کی الماری میں کورس کی کتابوں کے علاوہ کچھ ادبی اور علمی کتابیں بھی تھیں مگر زیادہ تر عشق و محبت کے ناول، ٹیڑھی لکیر سے لیکر HOT KISS تک ! ان ناولوں میں شبلی کی " الفاروق" بھی پائی گئی، مگر دست کور کی رعنائی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ مجھے انسانی ہاتھوں نے بہت ہی کم چھوا ہے ۔ پڑھنے والی کی راتیں تو ان ناولوں اور افسانوں کے سہارے گزرتی ہیں !

حمیدہ کی ایک چھوٹی سی بیاض بھی دیکھنے میں آئی، اس میں اُس کے پسندیدہ اشعار درج تھے .... یہ کہ :

اچھا ہوا کہ تم نے فراموش کر دیا	وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
محبت کا زمانہ آرہا ہے	گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں	بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا	وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہیں بہ اندازِ دگر یاد آیا	آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا

اور اس شعر :-

تمہاری چٹکیوں نے نیل اتنے دل پہ ڈالے ہیں ÷ کہ جن کو گنتے گنتے دکھ گئی ہیں انگلیاں میری
کے سامنے کئی سوالیہ نشانات (؟؟؟) بنے ہوئے تھے، اور ایک جملہ بھی لکھا تھا جسے لکھ کر کاٹ دیا گیا تھا کہیں کہیں سے حرف پڑھنے میں آتے تھے، مثلاً دل کا "لام" "تصور" کی "صاد" جدائی کی "ی"!

حمیدہ کی آٹوگراف بک میں شاعروں، ادیبوں اور لیڈروں کے دستخطوں کے علاوہ کرکٹ اور ٹینس کے کھلاڑیوں، یہاں تک کہ فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے بھی اوٹوگراف تھے، امریکہ کی ایک رقاصہ نے بڑے بڑے شہروں میں اپنے ناچ کے کرتب دکھائے تھے یہ "لے" اتنی بڑھی کہ گرلس کالجوں میں بھی اس نامور رقاصہ کو بلایا گیا، حمیدہ کی آٹوگراف بک میں، اس ڈانسر نے یہ جملہ اپنے قلم سے لکھا۔

"DANCE IS LIFE"

حمیدہ کی سہیلیوں نے بھی اس کی کتاب میں محبت بھرے جملے تحریر فرمائے تھے، اپنے دست خاص سے اخلاص و محبت کا نشان ثبت کرتے ہوئے! یہ جملے:-

— مجھے حمیدہ سے زیادہ اس کے گلابی رخساروں سے محبت ہے —

— پک نک کی رنگین دوپہر کی یاد میں —

— FORGET ME NOT EVEN IN HONEY MOON —

اب سے پہلے حمیدہ کی سہیلیاں اس سے ملنے کے لئے آتیں تو کوئی پروا بھی نہ کرتا کہ اُن کے درمیان کیا باتیں ہوتی ہیں، کون کس لئے قہقہہ لگاتا ہے، کون کس سے کیا کہتا ہے؟ مگر اب ایک ٹوہ کام کر رہی تھی ہر سراغ معاملہ کو مشکوک تر بناتا چلا جا رہا تھا! حمیدہ کے بڑے بھائی رفیق نے حمیدہ کے کمرے کے دروازے کی آڑ سے اس کی سہیلیوں کی باتوں کو سُنا تو اس کا چہرہ فرطِ غیرت و غضب سے تمتما گیا! بہانہ یہ کہ امتحان کی تیاری مل جل کر ہو رہی ہے اور باتیں ایسی ایسی رومان آفریں کہ سنئے اور چٹخاروں کے درمیان پہروں جھولا جھولتے رہیے! ایک لڑکی کی زبان سے یہ تک سُنا گیا کہ:-

"وجے کمار ایکٹر کے بھرے ہوئے بازو تو مجھے پسند ہیں، کاش! اس کی ناک ستواں ہوتی....."!

اب اس سلسلہ کی کڑیوں کا ملنا کچھ مشکل نہ تھا، رفیق کو یہاں تک پتہ لگ گیا کہ اُستانیوں کے یہاں جو دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی ہیں اُن میں چوری چھپے بعض اوقات گانے بجانے تاش کے کھیل دکھانے، نقلیں بھرنے اور لطیفے سنانے کی غرض سے شوقین نوجوان بھی ان میں شریک ہوتے ہیں، اور حمیدہ نہ گانا جانتی ہے اور نہ اداکاری کا فن اُسے آتا ہے مگر خوبصورتی کی وجہ سے ہر محفل اور پارٹی میں اس کی پوچھ ہوتی ہے! اور کالج کے میگزین میں پرنسپل صاحبہ کے چھوٹے بھائی واصل شیرازی کی جو نظم: "غزالہ کے نام"

چھپی ہے، اُس کا موضوع حمیدہ کی ذات ہے! معاملہ صرف تفریح اور پک نک پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا، بات بہت دور تک پہونچ چکی ہے!

حمیدہ کی نقل و حرکت پر گھر والوں نے چند دن سے پابندیاں لگا دی تھیں، حمیدہ کے لئے روک ٹوک کے یہ گھونٹ بڑے کڑوے کسیلے تھے مگر اُسے پینا پڑے، اُس نے کوئی نمایاں احتجاج نہیں کیا، جیسے وہ اپنی کسی داخلی کمزوری کے سبب اپنے کو اس روک تھام کا مستحق سمجھتی ہے! اب وہ چپ چاپ رہنے لگی مجرمانہ خاموشی، ملامت آمیز جمود، ایک ایسی اندرونی بھنّاوٹ جس کی وہ خود بھی مدافعت نہ کرسکتی تھی، وہ اس پرندے کی طرح تھی جسے شوخ ہمصفیروں کے چہچہوں کے درمیان سے اٹھا کر قفس میں بند کر دیا جائے! پھیکی مسکراہٹ، زہر خند جیسی ہنسی! اس کا چہرہ سُت گیا تھا اور آنکھوں کی چمک دھندلا سی گئی! یا تو وہ عالم کہ ہر وقت بنی ٹھنی اور نوک پلک سے درست رہتی اور اب یہ کیفیت کئی کئی دن تک آنکھیں سُرمہ سے اور بال کنگھی سے محروم رہتے! گھر والے، حمیدہ کی اس سوگواری سے خوش تھے کہ اس طرح اس کا تزکیہ نفس ہو رہا ہے!

جاڑے کی رات تھی، شام ہی سے بوندا باندی ہونے لگی، ہوا کافی سرد تھی، لوگ لحافوں رضائیوں اور کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے، سارے شہر پر ایک گہرا جمود طاری تھا، گلیوں میں کبھی کسی کتے کی آواز اس سکوت میں ذرا سی دیر کے لئے حرکت پیدا کر دیتی مگر ٹھٹھرے ہوئے کتے کی آواز میں دم ہی کیا ہوتا ہے، مدھم سُروں میں "ٹخ ٹخ" کی اور چپ ہو گیا!

حمیدہ کے یہاں سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے، بوڑھی ماما سوتے میں کبھی کبھار خُرخُر کرنے لگتی. اس کے سوا اور کوئی آواز کہیں سے نہ آتی تھی، چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا! آدھی رات گئے، چور گلی میں سیڑھی لگا کر بڑے دالان کی چھت پر چڑھے اور نیچے آکر صدر دروازے کی کنڈی کھول دی گئی! چوروں نے بڑے محتاط انداز میں دیا سلائیاں جلا جلا کر الماریاں اور صندوقوں کو کھولنا شروع کیا، چیزوں کے ٹٹولنے اور اٹھانے میں مدھم سی آواز ضرور ہوتی تھی مگر لحافوں میں لپٹے ہوئے کان اُسے سُن نہ سکتے تھے، اور یوں بھی سوتا اور مرا آدمی برابر ہوتا ہے!

حمیدہ کا بھائی اور بھاوج جس کمرے میں سو رہے تھے، اس کی الماری سے ایک چور کی ذرا سی بے احتیاطی کے سبب کانچ کا بڑا مرتبان جو فرش پر گرا، تو بم کے گولے کی طرح دھماکہ ہوا اور اس کی آواز سے مکان کے لوگ جاگ اٹھے، حمیدہ کا بھائی رفیق ہڑبڑا کر اٹھا اور بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں اجالا کر دیا، چور بدحواسانہ انداز میں بھاگنے لگے پورے گھر میں جاگ ہو گئی، سب لوگ "چور چور" چلانے لگے، کسی کسی کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی، بوڑھی ماما گھبرا کر پاخانہ میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی لگا لی، جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، حمیدہ کی نانی ہمت کر کے پلنگ سے اٹھیں مگر فرش پر رکھے ہوئے پاندان کی ٹھوکر جو لگی تو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح زمین پر گر پڑیں!

حمیدہ بھاگ کر بھائی کے کمرے میں آ گئی، رفیق نے بڑی ہمت دکھائی، ایک چور کے بھاگنے کا آگے سے راستہ روک لیا، مشہور کہاوت ہے کہ چور کے کتنے پاؤں! ذرا پتہ کھڑ کا اور چور صاحب یہ جا وہ جا! مگر جب چور گھر جاتا ہے تو بڑا خوفناک ہو جاتا ہے، چور نے راہِ فرار نہ پا کر دَن سے بندوق کا فیر کر دیا۔

گولی رفیق کے کان پر سے ہوتی ہوئی حمیدہ کے لگی اور وہ زمین پر تڑپنے لگی! چور ایک ایک کرکے بھاگ چکے تھے، پاس پڑوس کے لوگ شیخ جی کے مکان پر امداد کے لئے ٹوٹ پڑے!

حمیدہ بیہوش ہو چکی تھی، جسم سے تتے لہو کی تلیاں چھوٹ رہی تھیں، سب لوگوں نے مل جل کر ایک پلنگڑی پر اسے ڈالا اور ڈولی ڈنڈا کرکے ہسپتال لے گئے ہسپتال میں اس کی مرہم پٹی ہوئی، ڈاکٹروں نے کہا کہ زخم بہت کاری آئے ہیں، گولی کوھے کو توڑتے ہوئے ناف تک پہونچی ہے ہم اپنی ہر تدبیر کر رہے ہیں مگر شفا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے!

دوپہر کے وقت سول سرجن نے مریضہ کے نام کے کارڈ پر "

MISS HAMIDA "

لکھا دیکھ کر، تعجب کے لہجہ میں کہا "مس حمیدہ" شاید لکھنے میں غلطی ہوگئی کہ "مسز حمید" کی جگہ "مس حمیدہ" لکھ دیا گیا۔

جی! مریضہ کا نام ٹھیک لکھا گیا ہے، مریضہ میری چھوٹی بہن ہے اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی — رفیق نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

خوب! آپ کی غیر شادی شدہ بہن چھ مہینہ بعد ایک بچہ کی ماں بننے والی ہیں، کچھ بسنت کی خبر بھی ہے، a most wonderful case سول سرجن یہ کہتے ہوئے دوسرے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

اس خبر نے گھر والوں کو اور نڈھال کر دیا، اور اب تک جو وہ حمیدہ کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے، اس میں ایکایکی بریک لگ گیا، اب ان کی محبت نفرت سے بدل چکی تھی، ماں کی ماتا تک پر اوس سی پڑ گئی!

تیسرے پہر کے بعد حمیدہ کی سانس اکھڑنے لگی، شام کے وقت اسے ہوش آیا، اس نے بڑی مشکل سے بوجھل پپوٹوں کو اٹھا کر آنکھوں کو کھولا۔

"امی! کہاں ہیں —— اس نے کراہتے ہوئے کہا اور آس پاس نظر دوڑائی، وہاں اس کے گھر کی ماما کے سوا اور کوئی جانا پہچانا چہرہ نہ تھا پھر اس نے آنکھیں مُوند لیں۔

"بی بی! مجھے پہچانا، میں تمہاری نوکرانی عیدن ہوں —— ماما نے بھرائی آواز میں کہا۔

"عیدن! میں چلی! خدا ...... اور "حافظ" آخری ہچکی میں گھل مل کر رہ گیا، بس پھر کوئی آواز نہ آئی!

ہماری نظر میں

آسمانی دستور

از:- لطف خلیلی ضخامت ۲۵۶ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- مصنف سے 'الکہف' بہار کالونی کراچی

جناب لطف خلیلی علمی دنیا کے لئے بالکل نئے آدمی ہیں ان کی شاید یہ پہلی کتاب منظر عام پر آئی ہے موصوف کی یہ کتاب پڑھ کر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے خلیلی صاحب دینی مسائل میں مخصوص فکر رکھتے ہیں انھوں نے قرآن میں تدبر کیا ہے اور اظہارِ خیال کا ڈھنگ انھیں آتا ہے، اُن کی یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے جس کے چند اہم ابواب یہ ہیں:-

آسمانی دستور کے ذرائع ـــ صالح حکومت کے قیام کی بنیادی تدبیر ـــ تشکیل ریاست ـــ خلافت کے بنیادی اصول ـــ ترتیب حکومت ـــ تقسیم کار ـــ پاکستان اور آسمانی دستور۔

فاضل مصنف نے قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا ہے کہ "دستور سازی" کے لئے ہمیں اور کہیں سے روشنی اور ہدایت لینے کی ضرورت نہیں ہے، قرآنِ پاک ہر مرحلہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، اس لئے آسمانی دستور بغیر لکھا ہوا (UN-WRITTEN) نہیں ہے بلکہ تحریر کیا ہوا ہمارے پاس موجود ہے، موصوف نے کوئی شک نہیں بڑے خلوص کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے، اور اُن کی دلی تمنا ہے کہ پاکستان میں آسمانی دستور عملاً نافذ ہو، اس اسلامی حکومت کا "اقتدارِ اعلیٰ" اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو تسلیم نہ کیا جائے اور حکومت کے کارکن اللہ تعالیٰ کے خلیفہ، یعنی نائب (VICEROY) کی حیثیت سے آسمانی دستور کے مطابق حکومت کو چلائیں، اور حکومت کے ان کارپردازوں کا صالح اور صاحب تقویٰ ہونا ضروری ہے!

مصنف نے کمالِ دردمندی اور بڑے اخلاص کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اور بعض اُن گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عوام کیا شاید بعض خواص کی نگاہ سے بھی چھپے رہتے ہیں، اس اعتراف کے بعد ہمیں اس کا بھی اظہار کرتا ہے کہ اس کتاب کے بعض مقامات پر ہمارے دل میں خاصی کھٹک پیدا ہوئی مثلاً:-

> "اور آج انسان کو اس بات کا مشکل سے یقین آئے گا کہ وید یا قرآن، توریت ہو یا انجیل جو بھی آسمانی کتاب صحیح معنوں میں ہے، وہ سب کی سب ایک ہی مضمون اور ایک ہی کتاب کی چند اشاعتیں ہیں" (صفحہ ۳۰)

اصل مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ جن انبیاء کرام کے نام قرآنِ پاک میں آئے ہیں اُن کے علاوہ دوسرے مصلحین مثلاً کنفیوشس، زرتشت، کرشن جی وغیرہ کو ہم قطعی طور پر "نبی" یا "رسول" نہیں کہہ سکتے اسی

طرح قرآنِ پاک میں جن آسمانی کتابوں کا ذکر نہیں آیا ان کو بھی ہم قرآن، توریت، انجیل، اور زبور کا درجہ نہیں دیکتے اس لئے "وید" کو ان آسمانی صحائف کے ساتھ ملانا، احتیاط کے خلاف ہے، اور اس سے بڑے مفاسد پیدا ہونے کا امکان ہے!

خلیلی صاحب فرماتے ہیں "صلوٰۃ ــــ کے معنی مسلمانوں میں آج صرف ارکانِ نماز کے لئے محدود کر دئیے گئے ہیں" ص ۱۰۰

"عبادت" کا مفہوم تو بیشک وسیع ہے، جس میں "صلوٰۃ" بھی داخل ہے، اور زندگی کے کسی شعبہ کو "عبادت" سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا مگر جہاں تک "صلوٰۃ" کا تعلق ہے وہ اپنے ارکان کے اعتبار سے وہی ہے۔ جو مسلمانوں میں معروف ہے اور جسے وہ ہر دور میں تواتر کے ساتھ ادا کرتے آئے ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی "صلوٰۃ" کے یہی معنیٰ سمجھے تھے اور حضور نے رکوع، سجود اور قومہ کے ساتھ جو "صلوٰۃ" ادا کی تھی، وہی آج تک چلی آرہی ہے! مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے اور مردِ مومن کو زندگی کے ہر شعبہ میں ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کرنی چاہیئے مگر قرآنِ پاک نے "صلوٰۃ" کے لئے اوقات مخصوص کئے ہیں اور جنگ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ترکیب تک بتائی ہے!

قرآن پاک یقیناً آسمانی دستور اور ضابطۂ حیات ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ دستور کسی کتاب میں لکھکر عرب کے کسی پہاڑ پر نہیں اُتار دیا، بلکہ اسے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اور پھر جس پر یہ صحیفہ مقدس اللہ تعالیٰ نے نازل کیا، اس کی حیثیت صرف ایک پہنچانے والے کی نہ تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی کتاب کا تلاوت کرنے والا، کتاب و حکمت کا معلم اور تزکیہ نفس کرنے والا بنا کر بھیجا، آپ کی اطاعت کو منصوص قرار دیا، اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو تمام انسانیت کے لئے معیار اور نمونہ (MODEL) ٹھہرایا یہی قرآن جسے خلیلی صاحب "دستورِ آسمانی" کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور اُسے عملاً نافذ کر کے دکھایا ہے۔ اس لئے لازمی طور پر "اسلامی دستور" کا ماخذ کتاب اللہ کے ساتھ سنّتِ رسولؐ بھی ہے! کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اُسے عملاً نافذ کرنے کے لئے ہم مہبطِ قرآن (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی سُنّت کے محتاج ہیں، اللہ کے دین کی عمارت کتاب و سنّت ـــ ان دو ستونوں پر قائم ہے، لہٰذا زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سنّتِ رسولؐ سے قطع نظر ممکن نہیں، جو کوئی قرآن فہمی کے زعم میں اپنی فکر و دانش پر اعتماد کرتا ہے اور سُنّتِ رسولؐ سے اعراض برتتا ہے وہ گمراہی سے بچ نہیں سکتا، اس مزاج اور ذہنیت کا آدمی عقل کے تیر تکے لڑا کر خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا!

صحابۂ کرام اور ائمہ فقہ نے دین کے مسائل کو جس طرح سمجھا اور برتا ہے، ان کی دین میں حیثیت "نظائر" کی ہے اور ہمارے لئے ان نظائر میں روشنی اور بصیرت ہے! جو کوئی صرف قرآن کی مدد سے "اسلامی دستور" کی تشکیل و تنقید کرنے کا مدعی ہے وہ بہت بڑا دعویٰ کرتا ہے، جسے مسائل کی تفصیلات و جزئیات میں نباہ نہیں سکتا!

فاضل مصنف نے قرآنی آیات کو عنوان بنا کر ان سے تفصیلات پیدا کی ہیں اور استنباط فرمایا ہے یہاں تک کہ قرآن کی چند آیات کا مفہوم مصنف کی تفصیل و تشریح میں پھیل کر کئی سو صفحوں تک پہونچ گیا ہے! اس اپنی کتاب کا نام مصنف نے "آسمانی دستور" رکھا ہے حالانکہ اس کتاب میں قرآنی آیات تو چند ہیں، زیادہ تر مصنف کے استنباطات اور تشریحات ہیں، جب مصنف کو قرآنی آیات کی تشریح و استنباط کا حق حاصل ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی آیات کی قولی اور عملی تشریح و تنفیذ کا حق حاصل نہیں تھا! اور کیا خلافتِ راشدہ "آسمانی دستور" کا مثالی نمونہ نہیں تھی؟

اسلامی دستور کو جو غیر تحریر شدہ (UNWRITTEN) کہا جاتا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ اسلامی دستور: (۱) کتاب (۲) سنت (۳) خلفائے راشدین کے عمل اور (۴) ائمہ کے اجتہادات میں پھیلا ہوا ہے، ایک جگہ لکھا ہوا نہیں ہے، یہ جب کتابی شکل میں دفعہ واری مدون ہو جائے گا تو پھر اس پر (WRITTEN CONSTITUTION.) کا اطلاق ہوگا! اور اس میں نئے اجتہادات بھی شامل ہوں گے۔

صلا پر " وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ " کا یہ ترجمہ: "عبادت کرو اپنے رب کی یہاں تک کہ تم کو یقین حاصل ہو جائے" درست نہیں ہے! "یقین" کا ترجمہ "موت" کرنا چاہیئے تھا قرآن میں ایک دوسری جگہ بھی یہ لفظ "یقین" موت ہی کے معنی میں آیا ہے:

" كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ، حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ " (المدثر)

(ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک ہم پر (وہ یقینی چیز) موت آپہونچی)

جمہورِ سلف نے اس آیت میں "یقین" کو "موت" کے معنی میں لیا ہے اور ٹھیک لیا ہے ــــ اور یہ جو بعض صوفیا نے "یقین" کی ترجمانی "کیفیت قلب" سے کی ہے، وہ درست نہیں ہے، اس غلط ترجمانی نے یہ فساد پیدا کیا کہ بعض متصوفین کے حالات میں ملتا ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے، اور ان کے معتقدین ان کے "ترکِ صلوٰۃ" جیسے عظیم گناہ کی یہ توجیہ کرتے تھے کہ حضرت کو مرتبہ "یقین" حاصل ہو گیا تھا اس لئے قرآنی حکم کے مطابق ان پر سے نماز ساقط ہو گئی! حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کو مرتبۂ یقین حاصل ہو سکتا ہے، مگر حضورؐ نے دمِ آخر تک نماز ادا فرمائی ــ

لائق مصنف جو "دستورِ آسمانی" کی تحریک لے کر اٹھے ہیں انھیں اس آیت کا متصوفانہ انداز میں ترجمہ نہیں کرنا چاہیئے تھا، کتاب میں کہیں کہیں قرآنی آیات کی کتابت غلط ہوئی ہے، آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہونی ضروری ہے۔

قرآنی شمعیں

از: حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی؛ ضخامت ۴۳۲ صفحات

ملنے کا پتہ: دائرۃ التبلیغ پورہ ہیراں سیالکوٹ شہر

یہ کتاب بدعت و شرک کے رد میں لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر بہت کامیاب بلکہ شاندار کتاب ہے، قرآنی آیات اور احادیث کے حوالوں اور عقلی دلیلوں کے ساتھ بدعت و شرک کا پُرزور رد کیا گیا ہے، اگر قبولِ حق کی دل میں صلاحیت ہو تو کٹر سے کٹر بدعتی اس کتاب کو پڑھ کر اپنا مسلک بدلنے پر مجبور ہو جائے گا!

زبان سلیس وسادہ اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے:

ایک اقتباس:-

"مولوی صاحب فرماتے ہیں بلہار جاؤں محبوب پاک حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے جنہوں نے میری درخواست کو بارگاہِ رسالت میں اپنی سفارش سے منظوری دلوائی"۔

"گویا مولوی صاحب نے حج کی درخواست خواجہ نظام الدین اولیا کے حضور میں کی انھوں نے اس پر سفارش لکھ کر رسولِ خدا کی خدمت میں پہونچادی اور حضور نے سفارش مان کر درخواست قبول کرلی' اور دعوت نامہ بھیج دیا' جب حضور نے دعوت نامہ بھیجا تو اللہ نے ارادہ پورا کردیا"

خواجہ نظام الدین رسول خدا کے پاس سفارشی اور رسولِ خدا اللہ کے پاس سفارشی ہوئے یعنی:-

"هٰؤلاءِ شفعاءُ نا عند اللہ" کی طرح یہ عقیدہ ہے درگاہوں قبروں روضوں اور عرسوں پر جانے والے لاکھوں مسلمانوں کا"۔

فتاویٰ بزازیہ کی یہ عبارت:- مَنْ قَالَ اِنَّ الْاَرْوَاحَ الْمَشَائِخِ حَاضِرَۃٌ تَعْلَمُ یَکْفُرُ

جو یہ کہے کہ بزرگوں کی روحیں حاضر و ناظر ہیں اور (وہ لوگوں کے احوال) جانتی ہیں وہ کافر ہوجاتا ہے۔

بحر الرائق کا یہ فتویٰ:-

"من ظَنَّ اَنَّ المَیِّتَ یَتَصَرَّفُ فِی الْاُمُوْرِ دُوْنَ اللہِ وَاعْتَقَدَ بِذٰلِکَ کَفَرَ"

"جس نے یہ سمجھا اور عقیدہ رکھا کہ فوت شدہ بزرگ اور ولی ہمارے کاموں میں تصرف کرسکتے ہیں اور نقصان پہونچا سکتے ہیں' وہ کافر ہوگیا"۔

احناف کی مستند فقہی کتابوں کے اقتباسات کو دیکھ کر بھی کوئی یہی کہے جائے کہ "یہ وہابیوں کے عقائد ہیں" تو ایسے ہٹ دھرم سے اللہ کی پناہ!

"یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے روز امت کی سفارش کرنی ہے" صفحہ (۶۸) "نے" جگہ جگہ غلط استعمال ہوا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے ہمیں :: کہ بشر کی زد میں ہے یہ گنبد افلاک (صفحہ ۱۹۲)

اثر تو بے شک دوا و دعا میں ہے :: لیکن شفا مریض کی دست خدا میں ہے (صفحہ ۲۱۶)

یہ دونوں شعر "ناموزوں" لکھے گئے ہیں! اس غلطی کا ذمہ دار کون ہے کاتب یا مصنف!

اس کتاب میں "توحید خالص" کو نکھرے ہوئے انداز میں پیش کیا گیا ہے' مصنف نے شرک و بدعت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں'

کتاب کے آخر میں جو "تقلید" کا رد کیا گیا ہے اسے پڑھ کر مقلدین (اہل سنت والجماعت) بھڑک جائیں گے' اور اس طرح خوف ہے کہ بعض طبیعتیں اس کتاب کا وہ اثر قبول نہ کرسکیں گی جس قبول و اثر کی یہ کتاب مستحق ہے!

سیرت نمبر اور توحید نمبر کے بعد

"فاران"

کا

معرکہ آرا

خلافت نمبر

جلوہ گر ہوگا،

تیاریاں شروع کردی گئی ہیں، اور اکابر اہل قلم

مقالے لکھ رہے ہیں!

"خلافت نمبر" کے مضامین ایمان افروز بلند و باوقار

ہوں گے، فاران کا یہ عظیم الشّان خاص شمارہ محبّت و رافت

کی بشارت بن کر نمودار ہوگا

خلافت نمبر دلوں کے دھندلے آئینوں کو چمکائے گا اور فکر و دماغ کی کجی نکال کر، افکار و خیالات اور معتقدات میں محبت کی رُوح پیدا کرے گا۔

"خلافت نمبر"

"برہانِ قاطع" بن کر طلوع ہوگا

ابو منظور شیخ احمد (ناندیڑ دکن)

استدراک

توحید نمبر کے صفحہ ۳۳۰ پر مدیر فاران نے ایک نوٹ تحریر کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :-

"آجکل اولیاء اور صلحاء کی قبروں پر عام طور پر لوگ نذر و نیاز گزراننے اور استمداد کی نیت ہی سے حاضر ہوتے ہیں عرس کے علاوہ بعض قبروں پر دن رات میلہ سا لگا رہتا ہے، ان حالات میں جناب شیخ احمد صاحب جیسے صحیح عقیدے کے لوگ قبروں پر جاتے ہیں تو انھیں وہاں "حاضر" (؟) دیکھ کر اہلِ بدعت یہی سمجھتے ہیں کہ جن معتقدات اور مرادوں کو لیکر ہم "مزارِ اقدس" پر آئے ہیں، اسی کام کے لئے یہ صاحب بھی آئے ہیں۔ ان دنوں اولیاء و صلحا کی قبروں کی زیارت اگر اس "فتنہ" میں اضافہ کر رہی ہو، تو کیا کیا جائے! افہم فتدبر!"

مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب فاضل مدیر خود جانتے ہیں اس لئے اگر وہی اپنے نوٹ میں اسکی توضیح فرما دیتے تو ہر طرح مناسب تھا مگر انھوں نے اس طرح سوال کیا ہے گویا میری تحریر سے انھیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے اور اسی کی بنیاد پر میرے طرزِ عمل سے متعلق انھوں نے ایک رائے قائم کرلی ہے میں نہیں سمجھتا کہ میرے مضمون سے اس قسم کی غلط فہمی کا کیا امکان پایا جاتا ہے۔ تاہم انھوں نے خصوصیت کیساتھ خاکسار کا نام لیکر اسکا ذکر کیا ہے اس لئے میں یہ چند سطریں سپردِ قلم کر رہا ہوں میں ان کی فہم و تدبر کی دعوت کے لئے ان کا شکرگذار ہوں لیکن الحمدللہ مجھے اس مسئلے میں کبھی کوئی الجھن پیش نہیں آئی ہے اس لئے میرا اپنا طرزِ عمل بھی فتنۂ مذکورہ میں اضافہ کرنے سے پاک رہا ہے اور میں تمام صحیح العقیدہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ عرسوں اور میلوں ٹھیلوں کے دنوں میں اولیاء و صلحا کی قبروں کی زیارت کو نہ جائیں۔ زیارتِ قبور کا فائدہ دوسرے طریقوں سے بھی با تعین وقت حاصل کیا جاسکتا ہے، چنانچہ میرے مضمون کی ساری تفصیلات اور خصوصاً "عوام کی قبریں" کے زیرِ عنوان لکھی جانے والی سطریں انشاءاللہ ان کے لئے ازدیادِ بصیرت کی موجب ہونگی البتہ وہ چاہیں تو کبھی کبھار اولیاء و صلحا کی قبروں کی زیارت بھی کرلیں۔ اگر اس موقع پر "نذر و نیاز گزراننے اور استمداد کی نیت سے آنے والے" چند لوگ بھی وہاں حاضر ہوں تو مجرد "حاضری" "فتنے" میں کوئی اضافہ نہیں کرتی کیونکہ دونوں کے طریق حاضری میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ناسمجھ سے ناسمجھ آدمی بھی اس فرق کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں صحیح العقیدہ لوگوں کو اس درجہ غلوئے احتیاط سے بھی کام نہ لینا چاہئے کہ صحیح طریق کار کے عملی مظاہرے سے بھی باز رہ جائیں۔

مدیر فاران ایک اور حاشیے میں علامہ اقبال مرحوم کی نسبت فرماتے ہیں :-

"اُن کے ہر قول و فعل کو فقیہ یا محدث کے قول و فعل کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اقبال نے اپنے کلام میں موضوع حدیثوں تک کو نظم کردیا ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت میں انھوں نے یہاں تک کہدیا ہے ؎ مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا! حالانکہ کوئی ولی کسی نبی سے بلند نہیں ہوسکتا۔ یہ اقبال کی "مزلات" ہیں، ان پر نگاہ رہنی چاہیئے" (ص ۳۳۱)

الحمدللہ اقبال کے ہر شعر اور مصرع مصرع پر میری نگاہ ہے اور اُن کے "مزلات" بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں یہاں تک اگر کوئی فرمائش کرے تو میں ان کے سارے "مزلات" جمع کرکے پیش کر سکتا ہوں لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ اس موقع پر مدیر فاران نے یہ تنبیہ کیوں کی ہے جبکہ میں نے اپنے مضمون میں نہ اقبال کے ہر قول و فعل کو فقیہ یا محدث کے قول و فعل کا درجہ دیا ہے اور نہ ان کے کلام سے وہ اشعار نقل کئے ہیں جنمیں انھوں نے موضوع حدیثوں کو نظم کیا ہے یا کسی ولی کو کسی نبی سے بلند بتایا ہے؟ غالباً ان کا روئے سخن ان تمام لوگوں کی طرف ہے جو بزرگوں کی عقیدت میں اتنا غلو کر جاتے ہیں کہ اُن کے اقوال و افعال میں رطب و یابس کی تمیز نہیں کر پاتے اور ان کا کام اور کلام ہی معیارِ ردّ و قبول بن کر رہ جاتا ہے ۔ اگر بات یہی ہے تو میں اس معاملے میں مدیر فاران کا بالکل ہمنوا ہوں لیکن انکی یہ بات نہایت ناقص ہے کہ "اقبال کے ہر قول و فعل کو فقیہ و محدث کے قول و فعل کا درجہ نہیں دیا جاسکتا" حالانکہ خود فقہاء و محدثین کے اقوال و افعال بھی معیارِ ردّ و قبول نہیں ہیں کھلی بات ہے کہ خدا کے ارشادات اور رسولِ خدا کے اقوال و افعال ہی وہ معیار ہیں جس پر کس کر دیکھنے کے بعد جو چیز کھوٹی ثابت ہوگی وہ رد کردی جائیگی چاہے وہ اقبال کے قول و فعل میں ہو یا فقیہ و محدث کے قول و فعل میں۔

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ نمبر ۱۱

فاران

فروری ۵۵ء ۱۹ ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ - - - آٹھ آنے

مقامِ اشاعت
دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر مسرور حسین ادبی پریس ابن روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"نقشِ اوّل"

ہمارے نام ایک خط :—

محترم ماہر صاحب ! مدیر فاران، کراچی

" سلام مسنون ۔ صدقِ جدید مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء میں " مغفوریت[1] " اہلِ کبائر کے عنوان سے مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا ایک مضمون آیا ہے۔ چونکہ اس قسم کے مضامین کی اشاعت معاصی پر جرأت کا سبب بن سکتی ہے اس لئے حسب ذیل معروضے کے ساتھ آپ کی توجہ اس مضمون کی طرف مبذول کراتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ آپ ایسے مضامین کی اشاعت کے متعلق اپنا نقطۂ نظر واضح فرمائیں گے ۔

اگر " فجزاءہ جهنم خالدًا فيها " کی تعبیر کو اخباری تعبیر ہونے کی بنا پر قانون کی حیثیت دی جا رہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے اختیاراتِ فضل وکرم کی نفی نہیں ہوجاتی تو " إنّ الذين كفروا (الآیہ)" اور " انّ الله لا يغفر ان يشرك به " (الآیہ) کی تعبیرات بھی تو آخر اخباری ہی تعبیریں ہیں ۔ نحوی اعتبار سے جس طرح " من قتل مومنا " (الآیہ) کلام خبری ہے اسی طرح " ان الذين كفروا " (الآیہ) اور " ان الله لا يغفر " (الآیہ) بھی کلام خبری ہی ہیں اور کوئی کلام خبری بھی فاعلِ مختار کے اختیارات کی نفی نہیں کرتا ۔ ہٰذا " اِنّ الذین کفروا " (الآیہ) اور " ان الله لا يغفر ان يشرك به " (الآیہ) کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اعلان مشیت اور شئے ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیاراتِ عفو وفضل اور شئے ۔ اور جس طرح ایک " قانون " حاکم کے خصوصی

---

[1] یہ کیا زبان ہے ؟ کیا مغفرت اہلِ کبائر اس مفہوم کو ادا نہیں کرتا ۔ جو خواہ مخواہ " مغفور " سے ایک مصنوعی مصدر مغفوریت بنایا گیا ۔ ممکن ہے مضمون نگار کا مذاق اردو اس کو گوارا کرے لیکن کسی عربی کے طالب علم کے لئے اس کا گوارا ہونا سخت دشوار ہے ۔

اختیارات کی نفی پر دلالت نہیں کرتا اسی طرح مشیت وارادے کے کسی ایک پہلو کا اعلان قادر و مختار حاکم کے اختیارات کو دوسرے پہلو سے سلب نہیں کر لیتا۔ نیز خلف فی الوعید کے جواز اور امکان نظیر کے مسائل کو اختیاراتِ عفو و فضل کے منتفی نہ ہونے پر بین ثبوت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر عموم اختیار اور عموم قدرت کی بنا پر "مغفوریت" اہل کبائر کی کھلے بندوں یوں اشاعت کی جا سکتی ہے اور "من قتل مومناً متعمداً" کو امیدوار کرم بنا کر سفاکِ دم کی جرأت دلائی جا سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ "ان الذین کفروا" کو اس خوانِ کرم سے تمتع کا موقع نہ دیا جائے۔ اور شاید اسی عموم اختیار اور اطلاق قدرت کے پیش نظر حضرت گیلانی اور حضرت تھانوی سے صدیوں پہلے شیخ سعدی نے فرمایا تھا ؎ اگر در دہد یک صلائے کرم :: عزازیل گوید نصیبے برم اور شیخ اکبر محی الدین ابن العربی نے فرعون کو بھی سزاوار مغفرت و جنت ٹھہرا دیا تھا۔ اور شاید انہی بزرگوں سے متاثر ہو کر علامہ سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے کافروں کے "خلود فی النار" کا وہی مفہوم ذکر فرمایا جس کو خوش قسمتی سے آج مولانا عبدالباری کی کاوشوں سے تھانوی پروانہ بھی حاصل ہو گیا ہے۔

کاش یہ پروانہ چند برسوں پہلے منصۂ شہود پر آجاتا تو مولانا عبدالماجد دریابادی کو سیرت النبی جلد چہارم پر تقریظ حوالہ قلم فرماتے وقت کافروں کے "خلود فی النار" کے مسئلے پر سید سلیمان صاحب مرحوم کے بیان کو "پائے طاؤس" کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بلکہ اس "پروانہ تھانوی" کے ہاتھ آتے ہی اہل کبائر کی طرح اصحاب کفر کو بھی کلید جنت بخش دیتے۔

ایک ہی قسم کی باتیں جن کے حاصلِ مفہوم، نتائج اور بنیادیں، الغرض جن کے مبانی و معانی میں کوئی ذاتی وحقیقی تغائر و امتیاز تو درکنار اعتباری فرق پیدا کرنا بھی سعی لاحاصل ہے۔ صرف بولنے والوں کی شخصیت کے اختلاف کی وجہ سے کتنی مختلف حیثیتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک بات جب سید کے منہ سے نکلتی ہے تو "پائے طاؤس" ہونے کی وجہ سے قابل اخفا اور ناقابل اشاعت قرار پاتی ہے۔ لیکن جب وہی بات حضرت تھانوی کی زبان مبارک سے ادا ہوتی ہے تو اہل کبائر کے لئے بشارت جنت وامید مغفرت بن کر قابلِ اظہار ہی نہیں بلکہ ضروری الاشاعت بھی ثابت ہوتی ہے۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است فقط "

نیاز مند محمود مرزا۔ ۳۱ فریر روڈ کراچی

اس ایک خط میں کتنے ہی مسائل آگئے ہیں، ان میں کا ہر مسئلہ طویل الذیل اور وسیع الاطراف ہے، یہاں ہر مسئلہ پر گفتگو کی گئی تو "فاران" کی پوری اشاعت بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی! اجمالاً عرض ہے کہ شیطان کے موحد ہونے اور فرعون کے ایمان و مغفرت کے بارے میں جس کسی نے بھی شوخیٔ فکر دکھائی ہے، اس نے ایک فتنہ کا خواہ مخواہ دروازہ کھولا ہے؛ اسی طرح حجاج بن یوسف جیسے سفاک، جابر اور ظالم کی "مغفرت" کے لئے دلیلیں لانا اور نکتے پیدا کرنا اور پھر انھیں رسالوں اور اخباروں میں چھپوانا گویا ظالموں اور فاسقوں کو ان کے معاصی

پر دلیر بناتا ہے!

اس مکتوب میں مولٰنا عبدالماجد صاحب دریابادی (مدیر "صدق") کی جس دُورخی روش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ اہل حق کو زیب نہیں دیتی، بات یہ ہے کہ مولٰنا موصوف "ضد" کے مرضِ مزمن میں مبتلا ہیں، صدقِ جدید کے صفحات اس کے شاہد ہیں کہ مولٰنا عبدالماجد صاحب قبلہ قادیانیوں کی مدح و توصیف کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی ہجو و ذم کے خاکوں میں بھی تعریف کا رنگ بھر دیتے ہیں، اس کے برخلاف جماعت اسلامی اور ابوالاعلیٰ مودودی کے اچھے سے اچھے کام پر بادلِ ناخواستہ کوئی تعریفی جملہ قلم سے نکل بھی جاتا ہے، تو آخر میں کوئی نہ کوئی چوٹ کر کے رنگ میں بھنگ ملا دیتے ہیں!

اب رہی حضرت مولٰنا اشرف علی تھانوی برد اللہ مضجعہ کی ذاتِ گرامی تو اس کے احترام سے ہمارے قلوب لبریز ہیں، مولٰنا تھانوی کے قلم اور زبان نے کم و بیش ساٹھ سال تک دین کی خدمت انجام دی ہے، اور ان کی شخصیت اپنے دور میں ذکر و شغل اور وعظ و ارشاد کا مرکز و منبع تھی! مگر افسوس ہے کہ مولٰنا تھانوی کے بعض عقیدت مندان کی شان میں ایسے "غلو" سے کام لے رہے ہیں، جو شریعت کی رُو سے بڑی بے احتیاطی کی بات ہے "غلو" کا یہ وہ فتنہ ہے جس نے انبیاء کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنایا ہے اور اولیاء و صلحا کو نبیوں اور رسولوں سے بڑھا دیا ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی کا یہ لکھنا:

"حضرت گیلانی کے حجاج ابن یوسف کی انشاء اللہ تعالیٰ امیدِ مغفوریت کا ایک تھانوی پروانہ بھی ہاتھ آگیا"

مولانا تھانوی کی شان میں "غلو" کی بری مثال ہے! اس عبارت کا یہ پہلا ٹکڑا ہی:-

"حضرت گیلانی کے حجاج ابنِ یوسف"

بڑا عجیب اور وحشتناک ہے! اس سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے "حجاج ابن یوسف" مولٰنا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی نگاہ میں کوئی محبوب شخصیت تھی (معاذ اللہ) ہمیں کسی طرح یقین نہیں آتا کہ مولٰنا گیلانی حجاج جیسے شقی کی ذات سے کوئی دلچسپی اور لگاؤ رکھتے تھے، اور اس سفاک کی طرف سے اُن کے دل میں نفرت کے بجائے محبت اور دردمندی کے جذبات موجزن تھے۔

اس عبارت کا دوسرا ٹکڑا ہے:

"حجاج ابنِ یوسف کی انشاء اللہ امید مغفوریت۔"

زبانِ حال سے بول رہا ہے کہ صاحب تحریر کو حجاج ابن یوسف کی ذات سے خاص ہمدردی ہے۔ اور اسکی "مغفوریت" کی وہ بڑی تمنا اور آرزو رکھتے ہیں! ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تصوف اور تزکیۂ نفس کا یہ کونسا مقام ہے، جہاں حجاج جیسے ظالم و سفاک کے لئے دل میں اتنی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کے بخشے جانے کی تمنائیں کی جاتی ہیں!

اس عبارت کا سب سے زیادہ خطرناک ٹکڑا ــــ "امید مغفوریت کا ایک تھانوی پروانہ" ہے! نجات و مغفرت کے پروانے (تذکرات غُفران PAPAL DISPENSATION) تو عیسائیوں کے پادری لکھا کرتے ہیں، مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ کوئی انسان کسی شخص کو "پروانۂ مغفرت" دے سکتا ہے،

یہ منصب تو انبیاء کرام کو بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ جس کو چاہیں مغفرت کی سند اور بخشش کا پروانہ عطا فرما دیں۔

اس سلسلہ میں حضرت خارجہ ابن زیدؓ کی روایت سے ایک حدیث یہاں درج کی جاتی ہے، جو صحیح بخاری کی "کتاب الجنائز" میں منقول ہے:۔

"ان ام العلاء، امرآۃ من الانصار بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبرتہ انہ اقتسم المہاجرون قرعۃً فطار لنا عثمان بن مظعون فانزلناہ فی ابیاتنا فوجع وجعہ الذی توفی فیہ فلما توفی وغسل وکفن فی اثوابہ دخل رسول صلی اللہ علیہ وسلم فقلت رحمۃ اللہ علیک ابا السائب! فشہادتی علیک لقد اکرمک اللہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومایدریک ان اللہ اکرمہ فقلت بابی انت یارسول اللہ! فمن یکرمہ اللہ تعالیٰ فقال اما ہو فقد جاءہ الیقین واللہ انی ارجولہ الخیر واللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یُفعلُ بہ قالت فواللہ لا ازکی احداً بعدہٗ ابداً!"

(ام العلاء جو انصار میں سے ایک خاتون تھیں، اور جنہوں نے حضور سے بیعت کی تھی، انھوں نے راوی کو خبر دی کہ مہاجرین پر انھیں تقسیم کرنے کے لئے قرعہ ڈالا گیا، ہمارے حصہ میں عثمان ابن مظعون نکلے، پس ہم نے انھیں اپنے گھروں میں اتارا (اس کے بعد) وہ اس بیماری میں مبتلا ہوئے، جس میں ان کی وفات ہوئی، جب وہ وفات پا گئے اُن کو غسل دیا گیا اور ان کے کپڑوں میں اُن کو کفنایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، میں نے میت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے ابا السائب! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو! میں تجھ پر گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے عزت دے دی"

اس پر حضورؐ نے (ام العلاءؓ سے) فرمایا کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں (یعنی عثمان بن مظعون کو) عزت دے دی، میں نے کہا میرے باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ اگر اللہ ان کو عزت نہ دے گا تو اور کسے دے گا! حضور نے فرمایا اُسے موت آ گئی خدا کی قسم میں اس کے لئے خیر کی اُمید رکھتا ہوں، واللہ! میں اگرچہ اللہ کا رسول ہوں مگر مجھے نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا پیش آئے گا! یہی صحابیہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد میں کسی کا تزکیہ نہیں کرتی تھی (یعنی کسی میت کے بارے میں ایسی بات نہیں کہتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس میت کو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت ملی ہے، اور اس کی خطائیں معاف کر کے اللہ تعالیٰ نے اسے بالکل پاک وصاف (مزکّی) بنا دیا ہے۔ مذم")

حضرت عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ بڑے درجہ کے صحابی تھے، جب وفات پا جانے پر اُن کے بارے میں صحابیہ کے اس اظہارِ خیال پر کہ:۔

"لقد اکرمک اللہ ۔۔۔ اللہ نے تجھے عزت دے دی"

حضور نے تنبیہ فرمائی اور انہیں ٹوکا، تو پھر کسی عالم، صالح اور ولی و متقی کے بارے میں قطعی طور پر کون حکم لگا سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اُسے یقینی طور پر اللہ تعالیٰ نے عزت دے دی ہے!

مولانا تھانوی مرحوم کے بارے میں ہم اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت اور رحمت کی امید رکھتے ہیں مگر قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ خود ان کے ساتھ برزخ میں کیا معاملہ کیا جا رہا ہے؟ مولانا تھانوی کے ساتھ برزخ و آخرت میں کیا معاملہ پیش آئے گا؟ جب اس پر قطعیت کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا تو یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اُن کی کسی تحریر کو حجاج جیسے ظالم کے لئے :-

"اُمیدِ مغفوریت کا تھانوی پروانہ"

کہا جائے، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ منصب ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ اُن کا قول کسی کے لئے "مغفرت کا پروانہ" بن جائے، بلکہ وہ تو خود اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے بھکاری اور اُس کی رحمت کے محتاج ہیں! اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن احتساب فرمائے گا تو بڑے بڑوں کو پسینہ آجائے گا، یہاں تک کہ معصومین کے امام و پیشوا اور شافع یوم النشور حضرت سیدنا محمد ابن عبداللہ نبی الامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بخشش بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی فرمائے گی!

بزرگوں سے یقیناً عقیدت و محبت رکھنی چاہیئے مگر اس عقیدت کی کچھ حدود ہیں! اگر یہ حدود ٹوٹ جائیں تو بزرگوں کی یہ عقیدت و محبت نفع بخش ہونے کے بجائے اُلٹی وبال بن جاتی ہے! جو لوگ اپنے پیروں، استاد و ں اور بزرگوں سے وافر عقیدت و محبت رکھتے ہیں، ان کے اپنے حالات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے کہ اُن کو اللہ اور اس کے رسول کی باتوں میں زیادہ لطف آتا ہے یا اپنے پیروں اور بزرگوں کے اقوال میں زیادہ کیف محسوس ہوتا ہے، اُن کے خیال و تصور میں اپنے پیر و بزرگ بسے رہتے ہیں یا اللہ اور رسول! وہ اپنی تحریر و تقریر میں خدا اور رسولؐ کا زیادہ ذکر کرتے ہیں یا اپنے پیر و مرشد کا!

سندھ کے بعض "پیر پرست جہلاء" کے بارے میں یہ روایت ہم تک پہونچی ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی جھوٹی قسمیں بڑی آسانی اور بے پروائی کے ساتھ کھا جائیں گے مگر "پیر بادشاہ" (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) کی جھوٹی قسم کھانے کے لئے کسی عنوان آمادہ نہ ہوں گے، یہ لوگ جتنا شیخ جیلانیؒ سے ڈرتے ہیں، اتنا اللہ اور رسولؐ سے نہیں ڈرتے! ـــــ اس عقیدہ سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ!

وہ اہلِ علم جو پیری مریدی کا ذوق رکھتے ہیں، اُن سے ہم متوقع ہیں کہ وہ اس دورِ فتنہ و فساد میں عقیدت و محبت کے آداب و حدود کا لحاظ رکھیں، اور اپنے لئے خوب و ناخوب کا معیار "کتاب و سنت" کے سوا اور کسی کے اقوال و افعال کو نہ بنائیں، بس پھر کوئی کھٹکا نہیں! اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق شناسی حق گوئی اور حق کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے! (آمین)

یہ بغض و عناد!

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ ۲۷ر دسمبر کا "صدقِ جدید" نظر سے گزرا اور اُس کے شذرہ "دین اور سیاست" کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اس دور میں مُدعیانِ تقویٰ (؟) اور علمبردارانِ تصوف نے شاید اپنے ذمہ اس فرضِ کفایہ کو لے لیا ہے کہ دین کے مخلص خدمت گزاروں پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑیں، اُن کو نئے نئے عنوانوں سے بدنام کریں اور اقامتِ

ان کی چلتی ہوئی تحریک کی راہ میں اتنی دشواریاں پیدا کردیں کہ چلنے والوں کو قدم قدم پر سنگِ گراں سے واسطہ پڑے!
ایک مجہول الحال اور مرفوع القلم قسم کے بزرگ ؟ صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری ہیں، جن کی تحریریں "صدقِ جدید"
میں چھپتی رہتی ہیں، اُن کی تحریروں کے بارے میں خود مدیر "صدقِ جدید" کا یہ ریمارک ہے :-

"صوفی کاشمیری صاحب کی شخصیت کچھ ایسی مختلف فیہ واقع ہوئی ہے کہ کثرت سے
ناظرینِ صدق ان کے مخالف ہی ہیں بلکہ بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے اُن کے نام سے
اس درجہ بیزار ہیں کہ اُن کی تحریریں پڑھنا ہی گوارا نہیں کرتے۔" (صدق جدید ۲۱ دسمبر ۵۶ء)

یہی صوفی کاشمیری صاحب جن کے نام سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بیزار ہیں اور "صدقِ جدید" پڑھنے والوں کی کثرت
ان کے مضامین کو ہیچ و پوچ سمجھتی ہے، اور شاید اسی احساس اور علم و اطلاع کے بعد صوفی صاحب موصوف کے مضامین
"صدقِ جدید" میں آنا بند ہو گئے، مگر اب چند دن سے اُن کا ایک طویل مضمون "صدقِ جدید" میں قسط وار چھپ رہا ہے
اور وہ صرف اس کے لئے کہ یہ مولٰنا دریابادی کے خاص مذاق کی چیز ہے، انھیں سب سے زیادہ لطف مولٰنا مودودی
کی صلاحیاں سنا کر اور اُن کی مخالفت میں مضمون چھاپ کر آتا ہے!

صوفی نذیر احمد کاشمیری کا یہ مضمون انتشارِ ذہنی، احساسِ کمتری، علمی خیانت اور ذہنی افلاس کا عبرت خیز نمونہ ہے۔
فکر و نظر کے دیوالیہ پن، غلط بینی اور بغض و عداوت کی حد ہو گئی کہ مودودی صاحب کو مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ)
کا مشابہ قرار دینے کے لئے کیسی کیسی مضحکہ خیز دلیلیں فراہم کی گئی ہیں!

ہم نے ان "خرافات" کو پڑھا، مگر لکھنے والے کی پست دماغی اور سطحیت کے مدِ نظر ہم نے ان بے تکی باتوں کو
قابلِ غور اعتنا نہیں سمجھا، مگر یہ دیکھکر ہمارے افسوس و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مولٰنا عبدالباری ندوی صاحب
جیسے ثقہ اور سنجیدہ شخص نے صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری کے اس مضمون کی ان لفظوں میں تحسین و ستائش کی ہے:-

"..... جناب مودودی کے عقائد و افکار کی تحسیں و تحقیق تو اس لائق ہے کہ حضرت صوفی
کو "ڈاکٹریٹ" پیش کی جائے۔"

مولٰنا عبدالباری ندوی "مکتبی ملا" نہیں ہیں، جو "ڈاکٹریٹ" کی خصوصیات و امتیازات سے واقف نہ ہوں، موصوف عثمانیہ یونیورسٹی
میں برسوں فلسفہ کے پروفیسر رہے ہیں، جس شخص کی نگاہ ڈیکارٹ اور ہیوم کے فلسفہ پر ہو، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ "ڈاکٹریٹ" کس سطح کے تحقیقی
مقالوں اور علمی کتابوں پر دی جایا کرتی ہے، صوفی کاشمیری کا یہ مقالہ ابھی ناتمام ہے، اس کی صرف دو قسطیں "صدقِ جدید" میں چھپی ہیں
جو پانچ چھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں! آج تک سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی اہلِ قلم کو پانچ صفحہ کے وہ بھی ناتمام
مقالہ پر "ڈاکٹریٹ" پیش کی گئی ہو! کیا اہلِ علم کو ایسی "اچھی" باتیں زیب دیتی ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے ابوالاعلیٰ مودودی
کی طرف سے مولٰنا عبدالباری صاحب قبلہ بہت پُر دل تھے، بلکہ بھرے بیٹھے تھے، ادھر صوفی نذیر احمد صاحب نے مودودی
صاحب کی ہجو و مذمت کا نقارہ بجایا، ادھر مولٰنا ندوی صاحب خوشی کے مارے اُچھل پڑے کہ اُن کے دل کی بات صوفی صاحب
کے نوکِ قلم پر آگئی، مولٰنا مودودی کے خلاف جن جذبات کو وہ دل میں لئے بیٹھے تھے، اور جن کے اظہار کی کسی سبب سے
شاید وہ جرأت نہ کرسکتے تھے، کشمیر کے ایک "صوفی" نے وہ کارنامہ انجام دے دیا!

وہ شخص جس کے ہوش و حواس مسلوب ہو گئے ہوں یا وہ دشمنی میں اخلاق و انصاف کی تمام حدود سے گزر گیا ہو

وہی ایسا کرسکتا ہے کہ مولنا مودودی کو مرزا غلام احمد قادیانی کا مشابہ ٹھیرا دے، خدا کے ضرورت سے زیادہ نیک بندو! ایسی باتیں کرتے ہوئے نہ تم خدا سے ڈرتے ہو اور نہ بندوں سے شرماتے ہو! شاید تمہیں اپنی نیکیوں پر ناز ہے کہ تم جو چاہو ظلم کر گزرو، تمہاری نیکیاں اس ظلم کا کفارہ ادا کردیں گی!

مسلم عوام میں مرزا غلام احمد قادیانی ــــ راجپال، کالی چرن اور شردھانند سے کم مبغوض نہیں ہے، اس لئے صوفی نذیر احمد جیسی ذہنیت کے لوگ جان بوجھ کر مودودی صاحب کی مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ تشبیہ و تمثیل دے کر مودودی صاحب سے مسلمانوں کو متنفر اور بیزار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ "قاتلانہ حربہ" انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے کہ اس سے ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت ہی مرے سے ختم ہوجائے گی! کسی مسلمان کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کا جوڑا ایک مرتد مدعی نبوت سے ملا دیا جائے! نتائج اور اذیت کے اعتبار سے اس طرح "قتلِ شخصیت" کی کوشش "قتلِ نفس" سے زیادہ شدید اور سنگین ہے!

جو اہلِ خانقاہ اور صاحبانِ تصوف، حجاج ابن یوسف جیسے سفاک، وظالم کی ذات سے دلچسپی رکھتے ہوں، ان کے قلوب جتنے سخت ہوجائیں کم ہے! پاکستان کے مرحوم گورنر جنرل مسٹر غلام محمد کو دنیا جانتی ہے کہ وہ کیا تھے؟ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں "اسلامی دستور" کو پاس ہی نہیں ہونے دیا، یہاں تک کہ دستور ساز اسمبلی ہی کو توڑ دیا ــــ "ملائیت" کی آڑ میں اس شخص نے اسلامی اقدار پر چوٹیں کیں! عقائد کی خرابی کا یہ عالم کہ قبروں پر جاکر سرِ نیاز خم کرنا اور مرادیں مانگنا غلام محمد صاحب کا محبوب ترین شغل تھا! انہی صاحب کے دورِ فرمانروائی میں مولنا مودودی کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا ــــ مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کو انہی مسٹر غلام محمد مرحوم نے یاد فرمایا، مولنا موصوف کراچی تشریف لائے، اور گورنر جنرل ہاؤس میں چند دن مہمان رہے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پاکستان کے عوام غلام محمد مرحوم کو پسند نہیں کرتے، اور ہر حلقہ میں ان کے خلاف خاصی برہمی پائی جاتی ہے مگر مولنا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار میں جن "تاثرات" کو پیش فرمایا، اس میں "مدحِ شاہانہ" کا عنصر غالب تھا، کچھ اس قسم کا اظہار جیسے مسٹر غلام محمد مرحوم پاکستان کی کوئی محبوب شخصیت ہیں اور اس مرکزِ ملت کے ارد گرد پاکستانیوں کو جمع ہوجانا چاہئے! اور شاید لوگوں کو یہ معلوم کرکے اور زیادہ حیرت ہوگی کہ دریاباد سے کراچی تک فرسٹ کلاس کے دو تین ٹکٹوں اور گورنر جنرل ہاؤس کی چند دن کی مہمانی کے صلہ میں یہ قصیدہ خوانی اور مدح سرائی فرمائی گئی!

جمال ناصر نے مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی دینی جماعت "اخوان المسلمون" کو جس طرح تباہ و برباد کیا ہے، اس کے ارکان کو طرح طرح کی دردناک اذیتیں دی ہیں اور اس کے اکابر کو قتل کیا ہے، وہ اسلامی تاریخ کی بہت دردناک "ٹریجڈی" ہے ان اندوہناک حالات کو جس نے بھی سنا، اس کا دل دہل گیا، مگر مولنا عبدالماجد دریابادی نے اپنے جریدہ گوہربار "صدق جدید" میں جمال ناصر کے جرم کو ہلکا کرنے بلکہ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور "اخوان" کی مظلومیت کو انہ مطعون کیا، اس پر مولنا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے مرنجان و مرنج مردِ صالح اور سنجیدہ مزاج اور حلیم الطبع مفکر سے بھی ضبط نہ ہوسکا، وہ چیخ اٹھے کہ:-

"کاش ان لفظوں (جو مولنا دریابادی نے "اخوان" کے متعلق کو اپنے اخبار میں ثبت فرمائے تھے) کو اپنے خون سے محو کرسکتا"

اس ذہنیت کو کیا کہئے کہ جو جابر فرمانرواؤں اور سفاک حاکموں کو تو شدتِ احتساب کا "الاؤنس" دیتی ہے مگر دین کے مخلص خدمت گزاروں کی سرفروشیوں اور قربانیوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ان گردن زدنیوں نے لامحالہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ پیدا کی ہوگی، جبھی تو طبعِ شاہانہ کو جلال آگیا، اور "جلالِ شاہانہ" کا لازمی نتیجہ قید و بند کی عقوبتیں اور دار و رسن کی خونچکانیاں ہی ہونی چاہئیں!

تہمتیں! ایک عالم جانتا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی ذات کی طرف لوگوں کی طرف نہیں بلا رہے ہیں بلکہ خدا و رسول کی طرف بلا رہے ہیں وہ "بے دینی" کے نہیں "دین" کے مبلغ "منکرات" کے نہیں "معروف" کے داعی ہیں، مگر مولانا عبدالباری صاحب ندوی جیسی ذہنیت و مزاج کے بزرگ مودودی صاحب کے کام کو دین کا کام ہی نہیں سمجھتے، کیونکہ مودودی کو ان کے اکابر سے شرفِ انتساب حاصل نہیں ہے: یہاں کام کی نوعیت اور اس کے فوائد نہیں دیکھے جاتے، بلکہ نظر اس پر رہتی ہے کہ فلاں بزرگ کی عقیدت و نسبت کی چھاپ اس "طریقِ کار" پر لگی ہوئی ہے یا نہیں! اور وہ عالم یا اہلِ قلم اپنی کتابوں اور مقالوں میں ہمارے "حضرت" کا ذکر بھی کرتا ہے؟ اور اس ناشدنی مودودی کی سب سے بڑی بدنصیبی اور کوتاہ نظری بلکہ بے بصری تو یہ ہے کہ اس نے ہمارے "حضرت عظیم البرکت" کو اپنے زمانہ میں پایا، مگر اُن سے فیض حاصل نہیں کیا، یہاں تک کہ اُن کے خدام کی فہرست میں اُس کا نام تک درج نہ ہو سکا، جب "حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ" کے فیض و تربیت ہی سے وہ محروم رہا تو اب وہ دین کا جو بھی کام کرے گا وہ اول تو گمراہی سے پاک نہ ہوگا اور ہوا بھی تو اس میں ریا اور دنیا طلبی شامل ہوگی، یہ وہ گروہی عصبیت ہے، جس نے مولانا مودودی کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ قائم کرا دیا ہے، اور اس محاذ پر سب سے زیادہ چستی کے ساتھ دیوبند کے بعض منتسبین سرگرمی دکھا رہے ہیں، حد ہو گئی بغض و عداوت کی کہ دیوبند میں "ردِ مودودیت" کے نام سے باقاعدہ ایک شعبہ قائم ہے!

حالانکہ دیوبند کے اکابر (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے یہ نہیں کہا تھا کہ جس کسی کا ہم سے تصوف و طریقت میں انتساب نہ ہو یا جس نے ہمارے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا ہو، اس کی نہ دینی فکر معتبر ہے، اور نہ اُس کے "علم و دانش" کی کوئی حیثیت ہے! یہ تصورات تو ان کے معتقدین کے قائم کئے ہوئے ہیں!

اور یہ دھاندلی اور سینہ زوری بھی ان آنکھوں نے دیکھی ہے کہ جن کے علم و تقویٰ کے ڈنکے بج رہے ہیں، اُن تک نے مولانا مودودی کی تحریروں میں "کتر بیونت" کی ہے اور اُن کی بالکل سادہ اور عام فہم سلجھی ہوئی عبارتوں کو وہ وہ مفہوم و معنیٰ پہنائے ہیں کہ جو لکھنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ مودودی صاحب کی طرف سے تردید شائع ہوتی ہے کہ حاشا و کلا میرا مفہوم یہ نہیں تھا، اس پر معترضین و معاندین کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کرتے، بلکہ اُلٹا اصرار فرماتے ہیں کہ مولانا مودودی کی تحریر کا جو مفہوم ہم نے اخذ کیا ہے، اسی کو درست ماننا پڑے گا! ایک بہت بڑے شیخ طریقت نے تو یہاں تک فرما دیا کہ مودودی صاحب دین کے ستونوں کو ایک ایک کر کے گرا رہے ہیں، ان صاحب نے مکہ اور مدینہ تک میں مولانا مودودی کے خلاف پوسٹر تقسیم کئے ہیں!

گروہی عصبیت اور رشک و حسد نے بیچارے مودودی کے خلاف ایک طوفان بپا کر رکھا ہے، احتساب و تنقید کی یہ اعجوبگی کہ:-

تم نے اپنی کنیت "ابوالاعلیٰ" کیوں رکھی ہے! جواب دیا گیا کہ جس طرح مولانا آزاد نے اپنی کنیت "ابوالکلام"

رکھی ہے، اس طرح مودودی صاحب کی یہ خود ساختہ "کنیت" نہیں ہے، ان کے باپ نے ان کا یہ نام رکھا تھا، ان کے دو بھائیوں کے نام ابو محمد اور ابو الخیر ہیں ــــ اور تم جس جماعت کے امیر ہو اُس کا نام "جماعت اسلامی" کیوں رکھا گیا ہے، کیا تمام دوسری جماعتیں "غیر اسلامی" ہیں ــــ اس کے جواب میں عرض کیا گیا یہ جو "مسلم کالج" "مسلم یونیورسٹی" "اسلامی یتیم خانے" وغیرہ نام پائے جاتے ہیں، کیا ان پر کسی نے کبھی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان اداروں کے علاوہ مسلمانوں کے اور دوسرے ادارے "غیر مسلم" اور "غیر اسلامی" ہیں؟ ــــ پھر اعتراض جڑا گیا کہ تم اپنے اور جماعتِ اسلامی والوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے ــــ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اگر جماعتِ اسلامی والے اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو "مسلمان" نہ سمجھتے تو اُن کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھتے، اُن میں شادی بیاہ کا ہیکو کرتے، مودودی صاحب کی تحریریں بھی پیش کی گئیں، جن میں واضح کیا گیا تھا کہ "جماعتِ اسلامی" سے باہر رہ کر بھی لوگ دین کا کام کر رہے ہیں، وہ بھی دین ہی کا کام ہے، جس کسی کو ہمارے طریق کار پر اطمینان ہو، وہ جماعت اسلامی میں شامل ہو کر کام کرے، ورنہ جس دینی جماعت پر اس کا اطمینان ہو، اس کا ساتھ دے!

یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ مودودی صاحب "گناہِ کبیرہ" کے مرتکب کو خوارج کی طرح "کافر" سمجھتے ہیں ــــ اس کی تردید بھی مولانا کی تحریروں سے کی گئی کہ انھوں نے تو "تفہیم القرآن" میں اس مشہور رباعی تک کو نقل کیا ہے:

ایں درگہہ ما درگہہ نومیدی نیست،
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

معاندین کا یہ وار بھی اوچھا پڑا، تو یہ کہا گیا مولانا مودودی عنقریب مجددیت، مہدویت یا نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہیں، اُن کے اندازِ تحریر سے کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے ــــ اور مودودی صاحب کم وبیش پچیس سال سے اقامتِ دین کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں مگر خدا کے اس نیک بندے نے آج تک کوئی دعویٰ نہیں کیا، حالانکہ یہ واقع ہے کہ "فتنۂ معاصرت" نے پاکستان وہندوستان میں اُن کی علمی شخصیت کا واقعی تعارف نہیں ہونے دیا، لیکن مسلمانوں کی آئندہ نسلیں مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ کر اس کا اعتراف کریں گی کہ اس شخص نے چودھویں صدی میں تجدید دین اور احیاء سنت کا شاندار کارنامہ انجام دیا تھا، چنانچہ گذشتہ سال مولانا موصوف جب دمشق تشریف لے گئے تھے، تو حکومت شام کے وزیر معارف اور عربی زبان کے بہت بڑے ادیب مصطفےٰ زرقانے مودودی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"مودودی، غزالی اور ابن تیمیہ کے سلسلہ کی شخصیت ہے"

مولانا مودودی پر ایک تہمت یہ لگائی گئی کہ وہ "بزرگانِ دین" کی توہین واستخفاف کرتے ہیں ــــ حالانکہ یہ تہمت بھی دوسرے الزاموں کی طرح بے اصل ہے، کسی پچھلے عالم یا صوفی کے کسی قول یا نظریہ سے اختلاف کرنے کو یہ معترضین "بزرگوں کی توہین واستخفاف" سمجھتے ہیں، ان کا یہ خود تراشیدہ تصور ہی اپنی جگہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، اگر متقدمین کے قول وفعل پر متاخرین سے تنقید کا حق چھین لیا جائے، تو اسلام بھی باباؤں اور پروہتوں کا مذہب بن کر رہ جائے گا، معترضین کے اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے سر اپنے استاد کی توہین واستخفاف کا الزام آتا ہے، جنھوں نے بہت سے فقہی مسائل میں امامِ اعظم سے اختلاف کیا ہے، اختلاف خود رہے-

"تصوف" کے معاملہ میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بعض اساطین کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے، حالانکہ ان لوگوں کا اس کے علاوہ اور کوئی قصور نہیں ہے کہ تصوف کے جن نظریوں کی تائید میں انھیں کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے آثار میں دلیلیں نہیں ملیں، اُن پر دو ٹوک انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا! کسی ایک یا چند مسئلوں میں کسی متقدم عالم شیخِ وقت یا بزرگ سے اختلاف شریعت کی رُو سے کوئی ناجائز فعل نہیں ہے، پچھلوں نے اگلوں کی باتوں سے اختلاف کیا ہے، اور اس قسم کے اختلافات اور تنقید و احتساب سے کتابوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں! حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ پر کتنی سخت گرفت کی ہے مگر اس شدید تنقید کے باوجود ان کی ذات سب کے نزدیک محترم ہے، اور یہ کسی نے نہیں کہا کہ امام اعظم پر تنقید کے بعد امام بخاری کے ایمان میں فرق آگیا یا ان کی تمام نیکیوں پر پانی پھر گیا! حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرۃ العزیز نے محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کے نظریۂ "وحدت الوجود" کو نادرست اور باطل قرار دیا ہے اور "ما را نص در کار است نہ کہ فص" فرما کر شیخ اکبر کی معرکہ آرا تصنیف "فصوص الحکم" پر بھرپور وار کیا ہے! اسی طرح حضرت مجدد صاحب کے "تصورِ شیخ" کے نظریہ پر جماعت اسلامی کے بعض اکابر نے گرفت کی، اس لئے کہ یہ حضرت مجدد صاحب کے ذاتی ذوق اور تجربہ کی بات ہے، کتاب وسُنّت اور آثار میں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی!

جماعتِ اسلامی کے منشور کی اس دفعہ پر کہ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کو معیارِ حق نہ مانے" یہ اعتراض وارد کیا گیا کہ اس سے صحابہ کرام کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ صحابہ کرام یقیناً مخلص تھے مگر "کسوٹی" نہ تھے، "کسوٹی" ذاتِ رسالتمآب تھی، مجسم حق یا اہلِ حق —— اور "معیارِ حق" کے فرق کو اُڑا دیا جائے تو پھر ایسا کرنے سے نبوت کی امتیازی خصوصیت ہی ختم ہو جاتی ہے، اس ضمن میں شاید یہ ایک اشارہ بہت کافی ہے، اور اس اجمال سے تفصیل پیدا کی جاسکتی ہے کہ بدر و اُحد کے لئے بیشک اُمت کو تیار رہنا ضروری ہے مگر جمل وصفین کا اُمت کو اہتمام نہیں کرنا چاہیئے!

معترضین نے اس بحث کو بھی اُٹھایا ہے کہ مودودی صاحب نے کس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سند حاصل کی تھی؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اسناد کے طول و عرض اور دستارِ فضیلت کے پیچ وخم سے اہلِ علم اور اربابِ فکر کی حیثیت کو ناپتے ہیں، حالانکہ مولانا مودودی کی ایک ایک کتاب اُن کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، دقتِ فکر، دینی فراست سب سے بڑھکر دماغی سلجھاؤ اور اصابتِ رائے کا بولتا ہوا ثبوت اور زندہ سند ہے! اُن کے قلم نے بڑے بڑے عقدوں کی گرہ کشائی کی ہے، اور بعض مسائل میں تو ان کی مجتہدانہ بصیرت کو اس دور کے لئے غالباً "مثالی بصیرت" کہا جاسکتا ہے۔

؟

توحید، رسالت، معاد و آخرت اور ارکانِ دین کا کونسا ایسا بنیادی مسئلہ ہے، جس میں مولانا مودودی جمہور امت سے کوئی اپنی علیحدہ اور مختلف رائے رکھتے ہیں، اگر وہ دوسرے متفرنجین کی طرح "تجدد پسند" ہوتے تو پردہ، سود، ضبطِ ولادت (BIRTH CONTROLE)، تعددِ ازواج وغیرہ مسائل میں ان کا وہی نقطۂ نگاہ ہوتا، جو دورِ حاضر کے "متجددین" کا ہے! بنک کے سود کے مسئلہ میں تو مصر کے بعض علماء تک متزلزل ہو گئے ہیں مگر مودودی صاحب نے "سود" کی عمومی حُرمت پر جو معرکہ آرا کتاب لکھی ہے، اس نے تجدد پسندوں کے دلائل

کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں، "پردہ" پر اُن کی کتاب اس قدر جامع، دل نشین، اثر انگیز، دلائل کے اعتبار سے مُسکت اور انشا
کے لحاظ سے ادبی شاہکار ہے کہ اردو تو کیا عربی لٹریچر میں بھی اس پایہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے!

گزشتہ دور میں مسلمانوں کے بعض اہلِ قلم اور اونچے درجہ کے مفکرین تک جہاد کا ذکر "معذرت" (APOLOGY
آمیز انداز میں کرتے ہیں، مگر ابو الاعلیٰ مودودی نے کھل کر کہا اور دلائل و براہین کے ساتھ کہا کہ "جہاد" انسانیت کے سا
ظلم نہیں عین انصاف ہے اور دُنیا کے کسی مذہب، قوم و ملت اور حکومت کا قانونِ جنگ اسلام کے قانونِ جنگ کا مقا
نہیں کر سکتا، یہ کتاب (الجہاد فی الاسلام) جو اپنے موضوع پر اس وقت تک تو "حرفِ آخر" ہے، مودودی صاحب کے
دورِ شباب کی لکھی ہوئی ہے اس وقت ان کی عمر بہت سے بہت پچیس سال کی ہوگی!

ان کا تفقہ دیکھنا ہو تو رسائل و مسائل کا مطالعہ کیجئے کس وقتِ نظر اور تعمق و تفکر کے ساتھ انھوں نے فقہی
مسائل کا تجزیہ کیا ہے "تفہیم القرآن" مولانا مودودی کی "قرآن فہمی" کی زندہ شہادت ہے، جن مقامات پر انھیں محسوس
ہوا ہے کہ شاید بعض قارئین کے ذہن میں کوئی کھٹک پیدا ہوگی۔ وہاں انھوں نے "آیت" کی اس قدر دل نشین اندا
میں شرح کی ہے، کہ ذہن میں کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی، اور زبان سے بے اختیار "مرحبا" و "آفریں" نکل جاتی ہے!

اردو زبان کے وہ پہلے عالم ہیں، جن کی بعض کتابیں عربی، انگریزی، ہندی، کنڑی، ملیالم، تامل، تلنگی، بنگالی
پشتو، گجراتی، سندھی، ترکی، اور انڈونیشائی —— تیرہ زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں، اور پڑھنے والوں نے ان کا اثر قبول ک
ہے! اب کوئی مولانا مودودی کی اس مقبولیت کو دیکھ کر جلنے لگے کہ اس کا مجھ "شیخِ طریقت" "مدظلہ العالی" "راس المحق
اور "قدوۃ السالکین" کی شخصیت پر اثر پڑ رہا ہے، یا یہ کہ ہمارے پیرانِ کرام کی موجودگی میں اور ہمارے مُرشدانِ عظام کی نف
کے ہوتے ہوئے اس مودودی کی کتابوں کی اتنی مانگ کیوں ہو رہی ہے؟ —— تو اس کا بیچارے مودودی کے پاس کیا
علاج ہے؟ سوائے اس کے وہ اپنی تمام کتابوں کو دریا بُرد کر دے، اور دینی مسائل میں تفکر و تدبر اور اس کے اظہار سے
دست بردار ہو جائے!

اس کو کیا کیا جائے کہ مودودی صاحب کے معترضین اور معاندین خود بھی اور اُن کے بعض ممدوحین بھی قدیم علوم پ
تو نگاہ رکھتے ہیں، مگر "جدید علوم" سے بڑی حد تک بے خبر ہیں، مولانا مودودی نے قدیم و جدید علوم کا مطالعہ کیا ہے" اس
دورِ حاضر کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھ کر وہ دین کی حمایت کرتے ہیں اور مغرب زدہ اہلِ فکر کی دلیلوں کو انہی کے "علم کلام
سے توڑتے ہیں، اسی چیز نے اُن کی تحریروں کو بہت کچھ وزنی، باوقار، دل نشین اور اثر انگیز بنا دیا ہے، یہی سبب ہے
کہ اُن کی تحریریں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اپیل کرتی ہیں، اور ہندوستان و پاکستان میں اسلام پسند تعلیم یافتہ طبقہ کا امیر
اور نقیب "یہی" "مودودی" ہے"!

وہ عالم اشتراکیت کا کیا رد کرے گا، جو نہ تو ہیگل کے "جدلیاتی نظریہ" سے واقف ہے اور نہ کارل مارکس کی تعلیما
پر اُس کی نظر ہے۔ جب تک دورِ جدید کی اقتصادیات پر کسی کی نگاہ نہ ہو، وہ "سُود" کی حرمت کے جواز کے لئے ایسی دلیل
کہاں سے لائے گا، جو ذہن جدید کو مطمئن کر سکیں!

ہم نے کراچی کے بام گرد و ہوٹل میں مولانا مودودی کی "اسلامی دستور" پر تقریر سُنی ہے، بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں ا
وکلاء کا مجمع تھا، اور ہائی کورٹ کے ایک دو جج بھی تھے، اسلامی دستور قانون کی کس عالمانہ انداز میں وضاحت فرمائی!

اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے کس کس گوشہ کو واضح کیا تقریر کس قدر ٹھوس، وزنی اور جاندار تھی، قانون داں طبقہ کو شاید پہلی مرتبہ اس کا احساس ہوا کہ کتاب وسنت کے سایہ میں نشوونما پائی ہوئی فکر کس قدر رسا، باریک بیں اور ہمہ گیر ہوتی ہے!

یہ جو ایک ایک گوشہ سے آج آوازیں آرہی ہیں کہ اسلام ایک مستقل ضابطۂ حیات اور مکمل دستور زندگی ہے، سیاست کو دین سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اور مسلمان کو مسجد سے باہر بھی نمازی (عبادت گزار) رہنا چاہیئے —— یہ سب مولنٰا مودودی کے صریر خامہ کی صدائے بازگشت ہے!

اللہ تعالیٰ کا دین مکمل ہو چکا، اس میں رائی کے دانہ کی برابر بھی نہ کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ترمیم کی جا سکتی ہے مولنٰا مودودی کا نہ یہ منصب ہے نہ ان کی مجال ہے کہ وہ دین میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات کہہ سکیں، انھوں نے دینِ خالص ہی کو اچھے اسلوب کیساتھ پیش کیا ہے اور اس دور کے مسائل اور تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا ہے، مسلمانوں پر بہت دن سے جو ذہنی جمود طاری ہے، اُس نے ہمارے ذہنوں سے دین کے بعض تقاضوں کو قریب قریب محو سا کر دیا ہے، اس لئے مولنٰا مودودی جب دین کے اُن تقاضوں کو پیش کرتے ہیں اور اُن حقیقتوں کو دُہراتے ہیں تو لوگوں کو یہ باتیں اجنبی سی لگتی ہیں، اور بعض لوگ اس طرح پر سوچتے ہیں کہ یہ بات اس انداز میں ہمارے "حضرت قبلہ" نے چونکہ بیان نہیں فرمائی، اس لئے مودودی کی یہ بات لامحالہ نادرست اور دین کے لئے کوئی "فتنہ" ہی ہوگی، اگر یہ نکتہ سُوجھتا تو ہمارے "پیر و مرشد" کو سوجھتا جن کی ذات شریعت و طریقت کی جامع تھی، یہ مودودی جس کا نہ کوئی پیر ہے اور نہ کسی سلسلۂ طریقت سے اس کو انتساب حاصل ہے، اس کو یہ نکتہ کیسے سُوجھ گیا؟ اور اُسی کی کہی ہوئی بات بالفرض درست بھی ہو تو ہم اُس کی بات مان کر کیا اپنے "حضور پیر طریقت" پر اس مودودی کو ترجیح دیدیں —— یہی احساسِ کمتری اور ذہنی خلجان ہے، جس نے بعض اچھے خاصے سمجھدار اور ثقہ لوگوں کو مولنٰا مودودی کا مخالف بلکہ معاند بنا دیا ہے۔!

بعض لوگ کتنا ڈرتے ہیں کہ اگر کسی فقہی امام کے اجتہاد و قیاس سے بال برابر بھی تجاوز ہو گیا، تو ایسا کرنے سے ہم تقلید کے دائرہ سے نکل جائیں گے اور پھر دین کی خیر نہیں! یا کسی صوفی اور شیخ طریقت کے کسی قول اور معمول سے ہم نے اختلاف کیا تو ایمان ثابت رہنا مشکل ہے، مولنٰا مودودی نے اس "خوف بے سبب" اور "وہم بے بنیاد" کو دلوں سے نکالا، اور بتایا کہ دین میں اصل اعتبار "کتاب وسنت" کا ہے، ہر کسی کے قول وفعل کو اسی کسوٹی پر جانچنا چاہیئے جو چیز اس کسوٹی پر پوری نہ اُترے، اس کو چھوڑ دینا چاہیئے، اور ایسا کرنا دین و ایمان کے ضعف کی نہیں، بلکہ قوی ہونے کی علامت ہے!

مولنٰا مودودی پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہے کہ اُن کے "قال" کو لاکھوں مسلمانوں کے لئے "حال" بنا دیا گیا ہے، اُن کی کتابوں نے لاکھوں آدمیوں کی زندگیوں کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لگایا ہے، پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر شہر اور قصبہ میں اس کی زندہ و محسوس شہادتیں ملیں گی کہ مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ پڑھ کر کتنے بہت سے نوجوان کمیونزم، دہریت، مغرب زدگی، اور تشکیک و بے یقینی کے اندھیروں سے نکل کر اخلاق و نیکوکاری اور ایمان و یقین کی روشنی میں آئے ہیں جو کبھی نماز روزے کا مذاق اُڑاتے تھے، وہ اب تہجد و اشراق تک کے پابند ہو گئے ہیں، جن کو روزی کمانے میں حرام و حلال کی پروا نہ ہوتی تھی، انھوں نے ہزاروں روپیہ کا نقصان محض اس لئے گوارا کر لیا ہے کہ تقویٰ کے اعتبار سے یہ کمائی مشتبہ تھی!

جس شخص کے علم سے، صلاحیت سے اور زبان و قلم سے دین کو اتنا فائدہ پہونچ رہا ہو، اور افراد کی ایسی اچھی دینی تربیت ہو رہی ہو، اس کے کام کی اہمیت کو گھٹانا بلکہ اس پر "بے دینی" کے فتوے جڑنا، جس نے ختم نبوت کی تائید و حمایت اور قادیانیت کی تردید میں رسالہ لکھ کر، سزائے موت کا حکم سنا ہو، اس کو مرزا غلام احمد قادیانی کے مشابہ ٹھیرانا، علم و تقویٰ اور دیانت و اخلاق کا کتنا بڑا حزینہ ہے!

آنے والے لوگ، تصوف و اخلاق اور علم و پاکبازی کے ان دعویداروں کو کن ناموں سے یاد کریں گے، جو تاریخ میں یہ پڑھیں گے کہ اللہ کے ایک نیک بندے نے اپنی زندگی اقامتِ دین کے لئے وقف کردی تھی مگر اس کے کام میں وہی لوگ روڑے اٹکا رہے تھے، جن سے زیادہ سے زیادہ تائید و رفاقت کی امید تھی، اور اپنے ہی کیمپ کے ایک سرفروش مجاہد کو وہ اپنا دشمن اور مدمقابل سمجھ بیٹھے تھے! کسے خبر تھی کہ سعدی کا یہ شعر چودھویں صدی میں ایک حقیقت بن جائے گا! اور ابوالاعلیٰ مودودی نام کے ایک شخص کی مظلومیت زبانِ حال سے پکارے گی:-

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ آنچہ کرد با من آشنا کرد

کیسے کیسے اونچے درجہ کے شیوخ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں مولانا مودودی کی مخالفت کا توشہ کا لیکر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ کاش! ان کے جانشین منتسبین اور نام لیوا، اس مخالفت کو "سنتِ شیخ" کا درجہ دے کر، اس خلیج کو پاٹنے کے بجائے اور زیادہ وسیع نہ کردیں!!

جماعتِ اسلامی کے تربیتی کیمپ حقیقت میں تزکیہ نفس کا وہ عظیم الشان کام انجام دیتے ہیں، جو شروع کے زمانہ میں کتاب و سنت کے متبعین صوفیائے کرام کی خانقاہیں انجام دیتی تھیں! مدرسوں کے نصاب کے لئے جماعت اسلامی کی طرف سے جغرافیہ اور ریاضی کی جو کتابیں مرتب ہوئی ہیں، ان تک میں دین کو ممزوج کردیا گیا ہے! اس دینی لگن، اللہ اور رسول کی محبت، نیک بننے کی کوشش اور اقامتِ دین کی جدوجہد پر مذہبی طبقوں کی طرف سے طنز و تشنیع کی جب بوچھار ہوتی دیکھتے ہیں، تو دل سراپا فریاد بن جاتا ہے!

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کب تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

یہ ظلم بھی چند دن سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کو جو شخص دین کا ستون سمجھتا ہو اور جس کی کتابیں سنتِ رسول کے مبارک ذکر سے لبریز ہوں اور دین کے ہر مسئلہ میں سب سے پہلے جو یہ سوچتا ہو کہ کتاب و سنت میں اس کا کوئی ثبوت ہے کہ نہیں ہے، اور فلاں معاملہ میں حضورؐ نے کیا فرمایا ہے اور سرکارؐ کا کیا عمل رہا ہے؟ اس داعیٔ سنت پر "منکرِ سنت" کی پھبتی چست کی جائے، اور ایسا کرتے ہوئے لوگ ذرہ برابر نہ شرمائیں کہ ہم اس طرح ایک طرف تو صریحی غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور دوسری طرف "انکارِ سنت" کے فرنٹ کو کمک پہونچا رہے ہیں

اس اعتراف کے بعد ہم کھل کر اعلان کرتے ہیں کہ مولانا مودودی سے فکر و رائے کی غلطیاں بھی ہوئی ہیں، وہ انسان ہیں، اور ہم ہی جیسے انسان ہیں کوئی فرشتہ نہیں ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کی زبان و قلم سے جو لفظ بھی نکل جائے، بس وہی "حق" بن کر رہ جائے! مودودی صاحب کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہے، ان پر ہر کوئی نقد و احتساب کا حق رکھتا ہے!

ان کی غلطیوں پر اُن کو ٹوکا بھی جا سکتا ہے"

مولانا مودودی کو جو حضرات ہدفِ تنقید بناتے رہتے ہیں کیا اُن کے اکابر و مشائخ سے غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں مگر ان غلطیوں کے باوجود، اُن اکابر کا احترام ہی کیا جاتا ہے تو یہ کس قدر ناانصافی اور ظلم کی بات ہے کہ دوسرے اکابر غلطیاں کریں، تو ان کا احترام، ان کا دینی منصب اور ان کی شخصیت علیٰ حالہٖ قائم و ثابت رہے مگر مودودی صاحب سے غلطی سرزد ہوجائے، تو انھیں "گمراہ" سمجھا جائے!

اور یہ بات بھی ہم دو ٹوک انداز میں کہ دینا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی طرح اور کسی کا اسوہ معیارِ کامل اور آخری نمونہ نہیں ہے، یہ مقدس زندگی بالکل بے داغ ہے، اس میں تل برابر کور کسر نہیں، اللہ تعالیٰ کو اسی مقدس سیرت کی ہُو بہُو اطاعت منظور ہے، جس نے "سنّت" سے اعراض برتا، اُس نے اللہ کی کتاب سے اعراض برتا حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس زندگیاں ہمارے لئے دلیلِ راہ ہیں، یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں، جو: ــــــ

"انعمت علیہم"

کے مصداق ہیں ـــــ مودودی صاحب خیر پسند طبیعت اور پسندیدہ اخلاق رکھتے ہیں مگر اُن کی زندگی کو ہم معیاری زندگی نہیں سمجھتے، اور بشری کمزوریوں سے تو صحابۂ کرام تک محفوظ نہ تھے، پھر بیچارے مودودی کیا چیز ہیں، وہ تو اُن کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہونچ سکتے، اس لئے مولانا مودودی کی کسی کمزوری کو دیکھکر ہم یہ رائے قائم نہیں کر لیتے کہ ان کی ذات سے خیر کی اُمید ہی باقی نہیں رہی! ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مودودی کو تقویٰ و پاکیزگی کے مطلوبہ معیار سے ہمکنار بنادے۔

ہم اس پر پوری طرح سے مطمئن ہیں کہ مجموعی طور پر مولانا مودودی کی ذات سے دین و ملت کو فائدہ پہونچ رہا ہے وہ اور اُن کے رُفقاء دین کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں، دین کا غلبہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا ان کی کوششوں کا مقصود ہے، نیکی سے انھیں محبت اور بُرائی سے نفرت ہے، اُن کی عین تمنا یہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک خطہ میں ہی نہیں بلکہ چار دانگ عالم میں اللہ کا کلمہ بلند ہو، دنیا خیر و فلاح سے معمور ہو جائے، اور دنیا کے خزاں دیدہ گلشن میں پھر وہ بہارِ رفتہ لوٹ کر آجائے۔ جس میں صدیق و فاروق اور عثمان و علی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے انفاس کی خوشبو بسی ہوئی ہے!

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کی کتابیں "توحید خالص" کو پیش کرتی ہیں، اور اُن سے متاثر ہونے کے بعد کوئی شخص شرک و بدعت کی طرف پھٹک بھی نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان و متفقین ایک طرف مُشرکانہ رسوم اور بدعات سے گریز کرتے ہیں اور دوسری طرف تجدد پسندوں کی "اباحیت" سے مجتنب ہیں!

اسلام اور حکومت

مولانا مودودی پر حصولِ اقتدار اور جاہ طلبی کا جو الزام لگایا گیا، اس کے بارے میں اس کے سوا ہم اور کیا کہیں یہ حضرات "کشفِ قلوب" کی کرامت رکھتے ہیں، اور انھوں نے کسی غیبی طاقت یا اپنے صفائے قلب کے زور سے مودودی صاحب کی نیت کا پتہ لگا لیا ہے! یہ الزام اسی قسم کا ہے، جیسے کوئی شخص کسی محلہ میں مسجد تعمیر کرانے کی تحریک لیکر کھڑا ہو، تو اس پر یہ الزام وارد کیا جائے کہ اس شخص کی نیت میں اخلاص نہیں ہے، یا تو یہ مسجد کا پیش امام بننا چاہتا ہے، یا اس کی مجلسِ انتظامیہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کا قصد رکھتا ہے اور

کیا عجب ہے کہ مسجد کے چندہ میں خُرد بُرد کرنے کا بھی ارادہ ہو' !

فرض کر لیجئے مولنٰنا مودودی اور جماعتِ اسلامی والے حصولِ اقتدار کی تمنا رکھتے ہیں' اللہ کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ ان کی یہ تمنا پوری ہو جاتی ہے' اور وہ عنانِ حکومت سنبھال لیتے ہیں! ہم معترضین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونے کے بعد مودودی صاحب اور اُن کے رفقاء کیا بالکل بدل جائیں گے؟ یعنی اس وقت جو "اسلامی معاشرہ" کے قیام کا وہ نعرہ لگا رہے ہیں' کیا حکومت ملنے کے بعد وہ "جاہلانہ معاشرہ" کو فروغ دیں گے' آج وہ "کتاب وسنت" کے لئے مرے جا رہے ہیں کیا حاکم ہوتے ہی معاذ اللہ "کتاب وسنت" کو پس پشت ڈال دیں گے؟ ہم مولنٰنا مودودی اور اُن کے رفقاء کو فرشتہ نہیں سمجھتے مگر اُن کے بارے میں اس قسم کی بدگمانیوں کا خطرہ تک ہمارے قلب میں نہیں آتا' ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ لوگ "معروف" کو قائم کریں گے اور "منکرات" کو مٹائیں گے' ان کی کوششوں سے اللہ کا کلمہ بلند ہوگا اور کتاب وسُنت ایک ایک شعبۂ حیات پر غالب اور اثر انداز ہوں گے ــــ ہاں! یہ ضرور ہے کہ جس کسی کے دل میں جاہ وحکومت سے متمتع اور لطف اندوز ہونے کی جتنی طمع ہوگی' اُسی کے بقدر اللہ کے یہاں اُس کا ثواب کم کر دیا جائے گا!

مولنٰنا مودودی بے شک یہ کہتے ہیں بلکہ اُن کا یہ مشن ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ کو ہم دین سے خارج نہیں کر سکتے دین پوری زندگی پر حاوی ہے' اور علوم وفنون معیشت ومعاشں' سیاست وتجارت اور صنعت وحرفت کا کوئی ایسا صیغہ یا شعبہ نہیں ہے جس کو دین سے خارج اور منفک کیا جا سکے! اسلام دین کامل ہے اس لئے پوری کی پوری زندگی اس دائرے میں شامل ہے! اور ایک مسلمان جس طرح مسجد میں اللہ کی عبادت کرتا اور طہارت ونظافت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے' اسی طرح مسجد کے باہر بھی چاہے وہ دفاتر ہوں' یا تجارت گاہیں یا حکومت کے ایوان وہاں بھی اُسے اللہ تعالیٰ کی بندگی' اطاعت فرمانبرداری اور تسلیم ورضا کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیئے!

اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا ہے' اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے دین کو صرف اپنی قوتِ قاہرہ سے ہر وقت غالب کر سکتا ہے مگر اُس نے یہ فرض اسلام کے ماننے والوں پر عائد کیا ہے' اور اس میں اُن کے لئے آزمائش رکھی ہے' کہ وہ اپنے اخلاص' درد مندی' جدوجہد اور تگ ودو سے اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں اور کہاں تک ایثار و قربانی سے کام لیتے ہیں!

قرآنِ پاک میں جن چند نبیوں اور رسولوں (علیہم السلام) کے نام اور حالات آئے ہیں' اُن میں سے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے صرف عوام کی اصلاح تک فریضۂ رسالت کو محدود نہیں رکھا' بلکہ اللہ تعالیٰ کے ان اولوالعزم رسولوں نے بادشاہوں کے دربار میں جا کر اُن کے روبرو کلمۂ حق بلند کیا ہے!

حضرت یوسفؑ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت سے نوازا تھا' قرآن کہتا ہے:-

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ ....

اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا۔

تو سلطنت وحکومت کوئی نفرت کرنے کی چیز نہیں ہے' اور نہ یہ خالص دنیا داری کا کام ہے' اگر "حکومت" کوئی قابل نفرت چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں کو اس سے کاہیکو نوازتا؟ قرآن بتاتا ہے کہ:-

(۱) وقت کے جابر حاکموں اور خدا کے نافرمان فرمانرواؤں کو اُن کی غلط کاریوں پر ٹوکنا اور اُن سے جدال و نزاع کرنا۔

اور

(۲) (اللہ کا دین غالب کرنے کے لئے) حکومت کے کاروبار کو سنبھالنا

یہ

"انبیاء کرام" کی سنت رہی ہے اور سب سے بڑھ کر حضور خاتم الانبیاء و المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرت ہمارے سامنے ہے کہ حضورؐ نمازیں امامت بھی فرماتے تھے' جمعہ کا خطبہ بھی دیتے تھے' نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے مگر ساتھ ہی اللہ کے باغیوں کے ساتھ جنگ بھی کرتے تھے' قبیلوں کے وفود کو بھی شرفِ باریابی بخشتے تھے' مجرموں پر حد بھی جاری فرماتے تھے' بادشاہوں کے نام فرمان بھی بھیجتے تھے' مخالف طاقتوں سے معاہدے بھی کرتے تھے بازاروں میں جاکر غلّہ کے ڈھیروں پر بھی نگاہ رکھتے تھے' اور صوبوں اور علاقوں پر نظم و نسق کے لئے "عمال" کا بھی تقرر فرماتے تھے ——— یہ پورا نظام "حکومت" کا نظام نہ تھا تو اور کیا تھا' اسی اسلامی حکومت کے حضورؐ "صدر" تھے! اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے حکومت کے کاروبار کو سنبھالا' اور دسیوں برس تک اسلامی حکومت منہاجِ نبوت پر چلتی رہی! پس حکومت کا نام آتے ہی ناک بھوں چڑھانا اور یہ سمجھنا کہ یہ کوئی بہت ہی گھٹیا درجہ کا دنیاداری کا کام ہے' اگر دینداری کا تقاضا ہے تو اس دین داری میں رہبانیت کی آمیزش ہے اور یہ وہ امن پسند اور خاموش و جامد "دینداری" ہے جو اللہ کے دین کو شاید کبھی "قوتِ قاہرہ" نہیں بننے دے گی اس قسم کی دین داری مذہبی گوسفندوں کا تو ہمیشہ اضافہ کرتی رہتی ہے مگر "اللہ کے شیر" اس کی کوششوں سے شاذ و نادر ہی وجود میں آتے ہیں!

سیرت و کردار کی انفرادی تعمیر اور اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت اور افادیت سے کسے انکار ہے' مگر حکومت کو صالح اور مسلم بنانا اسی لئے تو ہے کہ حکومت کے تمام جائز ذرائع کو کام میں لاکر معاشرہ کی اصلاح کی جائے' اس طرح برسوں کا کام مہینوں میں انجام پا سکتا ہے!

اللہ کی زمین کے جائز اور حقیقی وارث اللہ تعالیٰ کے نیک بندے (صالحین) ہیں' پس جہاں کہیں بھی زمین کے کسی خطہ کا نظم و نسق غیر صالح افراد کے ہاتھ میں ہے' وہ "مغصوبہ زمین" ہے' اور مغصوبہ زمین کی بازیابی کے لئے جدوجہد کرنا کوئی ناپسندیدہ کام اور خلافِ تقویٰ فعل نہیں ہے۔

کوئی شک نہیں "دولت و حکومت کی ذمہ داری بہت نازک ہے" اسے اسلام کے تقاضوں کے مطابق چلانا اور نباہنا ہر شخص کا کام نہیں ہے' تاریخ بتاتی ہے کہ جب زیادہ تر نفس کی لذت ہی مطلوب رہی ہے تو "حکومت" نے حجاج اور یزید جیسے ظالموں کو جنم دیا ہے مگر جب "حکومت" سے اقامتِ دین کا کام لیا گیا ہے تو حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ جیسے نفوسِ قدسیہ وجود میں آئے ہیں! "حکومت" کے بارِ ذمہ داری نے عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلے سے اور زیادہ متقی اور نیکوکار بنا دیا۔

وہ تقویٰ کس قدر بے رُوح ہے' جو کتاب و سنت کے مخالف قانونی فیصلوں پر ذرا سی بھی تنگی اور بھجاوٹ اپنے اندر نہیں پاتا' اور کافرانہ نظامِ حکومت کے زیر سایہ بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ چلّے کھینچتا اور ہزار دانہ تسبیحیں گھماتا رہتا ہے' "کتاب و سنت" کا اس طرح معطل پڑے رہنا کسی غیرت مند مسلمان کو کس طرح گوارا ہو سکتا ہے!

ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ درپیش آیا کہ پاکستان کی حکومت کو غیر مذہبی (سیکولر) ہونا چاہیئے یا دینی! مولانا مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے اپنی تمام کوششوں کو پاکستان کے "دینی اور اسلامی حکومت" بنائے جانے کے لئے وقف کر دیا، اور "اسلامی حکومت" کے نعرے کو اس زور و شور سے بلند کیا کہ پاکستان کے زمین و آسمان گونج اُٹھے! اس جُرمِ صداقت کی پاداش میں مولانا مودودی اور اُن کے بعض دوسرے رُفقاء کو قید و بند کی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، اُن پر معاش کی راہیں بند کی گئیں، ان کو طرح طرح سے بدنام اور مطعون کیا گیا، کبھی یہ کہ جماعتِ اسلامی کے لئے امریکہ اور بھارت سے روپیہ آتا ہے ـــــ کبھی یہ کہ جماعت اسلامی والے "خوارج" کی طرح اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت و عدمِ اطاعت کا جذبہ رکھتے ہیں ـــــ کبھی یہ کہ یہ لوگ "ملّا" ہیں ان کی مرضی کے مطابق پاکستان کو "دینی حکومت" بنایا گیا تو یہاں لوگوں کو رجم کیا جائے گا اور عوام کے ہاتھ کاٹے جائیں گے!

جماعتِ اسلامی نے ان تمام چرکوں، کچوکوں اور اذیتوں کو برداشت کیا، اور امتحان و ابتلاء کے کسی سخت سے سخت مرحلہ میں بھی اللہ کے فضل سے اُن کے قدم نہیں ڈگمگائے، یہاں تک کہ ٹری لیت و لعل اور ٹال مٹول کے بعد پاکستان کو "اسلامی حکومت" تسلیم کرنا پڑا اور دستور میں اس کا اعلان کیا گیا کہ یہاں کوئی ایسا قانون جو کتاب و سنّت کے مخالف ہو رائج نہ ہوگا، کوئی شک نہیں کہ دوسری دینی جماعتوں نے بھی اس جدوجہد میں حصّہ لیا مگر یہ واقعہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کا رول سب سے نمایاں اور ممتاز رہا ہے!

"کتاب و سُنّت" کو پاکستان کے دستور و قانون کی اساس تسلیم کئے جانے کی جدوجہد، کیا دنیاداری کا کام تھا؟ کیا یہ تمام تگ و دو اور دوڑ دھوپ اپنی ذات کے لئے کی گئی ہے یا اللہ کی رضا کے لئے! اس جدوجہد نے پاکستان میں دینی تصور کو اُبھارا ہے یا دبایا ہے؟ "اقامتِ دین" کی جس تحریک کی قیادت جماعتِ اسلامی نے کی ہے، اُس کے سبب زبانوں پر اور کاغذ پر بار بار "اللہ اور رسولؐ" اور "کتاب و سنّت" کا نام آیا ہے، کیا اس "تکرار" پر "ذکر" کی تعریف صادق نہیں آتی! اور کیا اس پوری جدوجہد میں اللہ اور رسولؐ دل و نگاہ میں نہیں بسے رہے!

اگر بعض مذہبی افراد کے "اکابر" کے ملفوظات و ارشادات میں "اسلامی حکومت" کے قیام کی جدوجہد کے واضح نشانات نہیں ملتے یا ان بزرگوں کو یہ مرحلے پیش نہیں آئے تو اس کے یہ معنیٰ تو نہیں ہیں کہ یہ ساری جدوجہد دنیاداری اور جاہ طلبی کی جدوجہد ہے اور یہ سارا مجاہدہ "تزکیہ" کی ضد ہے!!

اللہ کے جو صاحبِ عزیمت بندے ساری دنیا میں "کتاب و سنّت" کا چلن، اللہ کے دین کا غلبہ اور زندگی کے ہر شعبہ پر اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی چھاپ دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، نوافل سے بھی غافل نہیں ہیں، وہ حلال و حرام میں اتمیاز بھی کرتے ہیں، اُن کو منکرات سے نفرت اور معروف سے محبت بھی ہے! جو لوگ ذکر و شغل اور وظائف و اوراد میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں؟ وہ اپنے اذکار و اشغال اور چلّوں کے پیمانوں سے ان کی "عزیمت" کو ناپتے ہیں، تو اُن کو "اقامتِ دین" کی اس منظم جدوجہد میں "تقویٰ" کا خلا نظر آتا ہے، اور زبان اعتراض جھٹ سے حرکت میں آجاتی ہے، کاش! یہ لوگ اس کا احساس کر سکتے کہ "عزیمت" احسان و تقویٰ سے خالی نہیں ہو سکتی اور "بدر و حُنین" کا مقام "صفہ" سے کسی طرح گھٹ کر نہیں ہے!۔

ماہر القادری

۲۱ر جنوری ۱۹۵۸ء

عزیز زبیدی

مسئلہ نسواں یا خاتونِ اسلام

آیاتِ قرآنی

۱۔ مرد کے ہمراہ عورت بھی جنت میں رہی یا صرف مرد جنت کا اجارہ دار نہیں، عورت بھی حقدار ہے یا بہشت! مرد کے ہمراہ عورت کا بھی دیس رہا ہے۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (پ۱ع۴)

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو۔ اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ۔

۲۔ بشرط وفاداری دونوں جنت میں رہے۔

وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (پ۱ع۴)

مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے

۳۔ دونوں ابلیس کے داؤں میں آگئے یا روزِ اول دونوں نے ہی ٹھوکر کھائی۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا (پ۱ع۴)

آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا

۴۔ دونوں کو وہاں سے "کالے پانی" بھیجا گیا۔

فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝

اور انھیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا، جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ اب تم یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے۔

۵۔ اگر تم پھر سنبھل گئے تو اسی کو تمہارے لئے جنت بنا دوں گا۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (پ۱ع۴)

ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ

میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔"

۶۔ اگر یہی بدعہدی رہی تو پھر سزائیں دو آتشہ ہوتی جائیں گی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (پ۱ ع۴)

اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے

نوٹ: قرآن کے اس اسلوب بیان نے ان تمام افسانوں کے پردے چاک کردئے ہیں۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ سب سے پہلے شیطان کے داؤں میں اماں حوا آئیں پھر انھوں نے حضرت آدم کو بہکایا۔ اور ان کی ان کارستانیوں کی وجہ سے ان کو جنت سے نکلنا پڑا۔ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وحی الٰہی کے مخاطب بھی دونوں یکساں ہیں اور دونوں ہی بقدر استعداد اس کے جوابدہ ہیں

۷۔ عورت سے اپنی غرض اور مطلب کے لئے رواداری برتنا فراعنہ کی روش ہے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ (پ۱ ع۶)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی۔ انھوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

۸۔ میاں بیوی میں پھوٹ ڈالنا شیطانی کارستانیاں ہیں یا ٹونکے ٹوٹکوں سے ان میں تفریق پیدا کرنا بے حقیقت شعبدہ بازی ہے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (پ۱ ع ۱۲)

.... پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔

۹۔ جو اس کاروبار میں منہمک ہیں کاش ان کو انجام کا پتہ ہوتا یا میاں بیوی میں بگاڑ پیدا کرنے کا کاروبار سخت خسارے کا کام ہے

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (پ۱ ع۱۲)

مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔ اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا! کاش! انھیں معلوم ہوتا!

۱۰۔ اگر میاں بیوی کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے تو ان کو بہتر صلہ ملتا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (پ۱ ع ۱۲)

اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لئے زیادہ بہتر تھا، کاش! انھیں خبر ہوتی؟

احادیث

۱۔ عورت سب کچھ سہی لیکن مرکزِ ہجرت نہیں یا عورت سب کچھ سہی لیکن دعوتِ ہجرت نہیں یا عورت کے لئے صحرانوردی، اور طورِ سینا کی سیر نہیں۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عليه وسلم يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ (بخاری)

"میں نے حضور سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے دنیا کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی، اس کی ہجرت بھی اسی امر کے لئے سمجھی جائے گی جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔"

۲۔ بے چین گھڑیوں میں انسان بیوی کی طرف لپکتا ہے یا گھبراہٹ کے عالم میں بیوی بہترین ڈھارس ہوتی ہے۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهٗ فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ (بخاری)

(سب سے پہلی وحی کے نزول کی حیرت زا کیفیت کا سامنا کرنے کے بعد) ان آیات کو لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے۔ آپ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسی عالم میں آپ اپنی بیوی حضرت خدیجہ کے پاس تشریف لائے۔ اور گھبرا کر کہا، مجھے کپڑا اڑھادو مجھے کپڑا اڑھادو۔ چنانچہ انھوں نے آپ کو کپڑا اڑھا دیا یہاں تک کہ آپ سے وہ گھبراہٹ جاتی رہی۔

۳۔ دل کا دکھ درد بیوی سے کہا جاتا ہے۔

فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ. لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ (بخاری)

تب آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اور فرمایا، مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا ہے۔

۴۔ دانا بیوی حکمت آمیز انداز میں دلجوئی کرتی ہے:

فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری)

اس پر حضرت خدیجہ نے فرمایا، بخدا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، عاجز کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کو، کردیتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور حادثوں میں آپ حق و صداقت کی مدد کرتے ہیں

۵ - بیوی کا درد مند دل درماں کی تلاش کرتا ہے یا باوفا بیوی شوہر کی فکر میں سرگرداں ہوتی ہے۔

فَانْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ حَتّٰى اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى ابْنَ عَمِّ خَدِيْجَةَ ..... وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ لَهٗ خَدِيْجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اِسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ (بخاری)

اس کے بعد آپ ان کو لے کر وہاں سے چل دیں، یہاں تک کہ اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے آئیں۔ یہ بہت سن رسیدہ اور نابینا ہو چکے تھے ان سے کہا ....

اے میرے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنو (سن کر بتاؤ! ماجرا کیا ہے؟)

۶ - (ا) شرم وحیا ایمان کی نازک شاخ ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ (بخاری)

حضور نے فرمایا، ایمان کی ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

(ب) اس میں عورت کو درجۂ کمال حاصل ہے یا شرم وحیا میں عورت اپنی مثال آپ ہے۔ یا پیغمبر اور پاکباز خاتون کی شرم وحیا میں معصومانہ مماثلت ہے۔

عن اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَيَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا (شمائل ترمذی)

یعنی حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شرم وحیا میں کنواری لڑکی سے جو اپنے پردہ میں ہو کہیں زائد بڑھے ہوئے تھے۔

۷ - احسان فراموش عورتیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُ النَّارَ فَاِذَا اَكْثَرُ اَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ قِيْلَ اَيَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ قَالَ اَوْ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدٰهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَاَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ (بخاری)

فرمایا، مجھے جہنم دکھایا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں اکثر عورتیں ہیں کیونکہ وہ کفر کرتی ہیں — عرض کی گئی کہ کیا وہ اللہ کا انکار کرتی ہیں، فرمایا شوہر کا کفر کرتی ہیں احسان فراموش ہوتی ہیں اگر آپ ان میں سے کسی ایک پر زمانہ بھر احسان کرتے رہیں اور پھر آپ سے کبھی ایک آدھ دفعہ ایسی ویسی بات دیکھ جائے، تو اسی وقت پکار اٹھے گی کہ میں نے تو آپ سے کبھی بھی بھلائی نہیں دیکھی

۸ - دوسرے کی ماں کو گالی دینا جاہلیت ہے یا صرف اپنی ہنیں سب کی مائیں اپنی مائیں ہیں یا صرف اپنی نہیں، سب کی مائیں قابل احترام ہیں۔

عَنِ الْمَعْرُوْرِ قَالَ لَقِيْتُ اَبَا ذَرٍّ بِالرَّبْذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلٰى غُلَامِهٖ حُلَّةٌ فَسَاَلْتُهٗ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنِّىْ سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهٗ بِاُمِّهٖ فَقَالَ لِى النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَا اَبَا ذَرٍّ اَعَيَّرْتَهٗ بِاُمِّهٖ اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ ...... الحدیث (بخاری)

حضرت معرور کہتے ہیں، ربذہ کے مقام پر میں حضرت ابوذر سے ملا، انھوں نے ایک نیا جوڑا پہن رکھا تھا اور آپ کے غلام نے بھی۔ میں نے اس مساوات اور یکسانیت کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا میری ایک شخص سے گالی گلوچ ہوئی، تو میں نے اس کو اسکی ماں گالی دی۔ حضور نے (یہ سن کر) فرمایا، اے ابوذر! تم نے اس کو ماں کی گالی دی ہے۔ تم تو ایسے شخص معلوم ہوتے ہو جس میں ابھی تک جاہلیت باقی ہے۔ الحدیث

۹۔ بیوی سے بے تکلفی اور دلجوئی یا میاں بیوی کی معصومانہ شوخیاں۔

عَنْ عَائِشَةَ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ يُبَادِرُنِىْ وَاُبَادِرُهٗ حَتّٰى يَقُوْلَ دَعِىْ لِىْ وَاَنَا اَقُوْلُ دَعْ لِىْ (نسائی)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، میں اور رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کیا کرتے تھے۔ بس ہم ایک دوسرے سے پانی لینے میں عجلت کرتے، آپ مجھ سے فرماتے میرے لئے پانی چھوڑو بھی! — میں آپ سے کہتی! میرے لئے بھی پانی چھوڑو نا!

۱۰۔ بے سلیقہ اور غیر محتاط عورت اچھوت کی مانند ہے

عَنِ الْحَكَمِ بْنِ عَمْرٍو الْغِفَارِىِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نَهٰى اَنْ يَّتَوَضَّاَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طَهُوْرِ الْمَرْاَةِ (ابوداؤد وغیرہ۔ نیل الاوطار)

حضور نے منع کیا ہے کہ عورت کے بچے ہوئے پانی سے کوئی آدمی وضو کرے۔

۱۱۔ سلیقہ مند اور محتاط خاتون کا لعابِ دہن بھی شیریں اور پاک ہے۔

(۱) عن ابن عباس اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُوْنَةَ (مسلم)

یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت میمونہ کے بچے ہوئے پانی سے نہایا کرتے تھے

(ب) عَنْ شُرَيْحٍ عَنْ عَائِشَةَ سَاَلْتُهَا هَلْ تَاْكُلُ الْمَرْاَةُ مَعَ زَوْجِهَا وَهِىَ طَامِثٌ قَالَتْ نَعَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم يَدْعُوْنِىْ فَاٰكُلُ مَعَهٗ وَاَنَا عَارِكٌ وَكَانَ يَاْخُذُ الْعَرْقَ فَيُقْسِمُ عَلَىَّ فِيْهِ فَاَعْتَرِقُ مِنْهُ ثُمَّ اَضَعُهٗ فَيَاْخُذُهٗ فَيَعْتَرِقُ مِنْهُ وَيَضَعُ فَمَهٗ حَيْثُ وَضَعْتُ فَمِىْ مِنَ الْعَرْقِ ۔ وَيَدْعُوْ بِالشَّرَابِ فَيُقْسِمُ عَلَىَّ فِيْهِ قَبْلَ اَنْ يَّشْرَبَ مِنْهُ فَاٰخُذُهٗ مِنْهُ فَاَشْرَبُ مِنْهُ ثُمَّ اَضَعُهٗ فَيَاْخُذُهٗ

فَيَشْرَبُ مِنْهُ وَيَضَعُ فَمَهُ حَيْثُ وَضَعْتُ فِيَّ مِنَ الْقَدَحِ (نسائی)

حضرت قاضی شریح کہتے ہیں، میں نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ ایام ماہواری میں بیوی اپنے شوہر کے ہمراہ کھانا کھاسکتی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ جب میرے یہی دن ہوتے تو حضور اسی وقت (بھی) مجھے بلاکر اپنے ہمراہ کھلاتے تھے۔ آپ گوشت والی ہڈی ہاتھ میں لے کر مجھے اس کے کھانے کے لئے قسم دیتے، میں اسے لیکر کھاتی پھر رکھ دیتی۔ حضور اسی کو اٹھاکر گوشت کھاتے۔ اور اپنا منہ بالکل اسی جگہ رکھتے جہاں میں نے رکھا تھا۔ پھر آپ کوئی پینے کی چیز منگواتے اور ہاتھ میں لیکر مجھے پینے کے لئے قسمیں دیتے۔ میں لیکر اسے پیتی اور رکھ دیتی۔ آپ اس کو اٹھا لیتے پھر پیتے۔ اور پیالے کی اسی طرف اسی جگہ منہ رکھتے جس طرف یا جگہ پر میں نے رکھ کر پیا ہوتا تھا۔

یہ محبت نوازادائیں اور یہ دل نواز باتیں، میاں بیوی کے لئے نہ صرف مباح، بلکہ ان کے حسنِ تعلقات کی معراج کمال ہیں۔ اس حسین چمن کی رنگ و بو کی آبروئیں، اس گلستان حیات کا حاصل ہیں، ایک صحت مند باذوق دل کی تمناؤں کا مطلوب جوہر ہیں۔

ان چند آیتوں اور حدیثوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو معاشرے میں کیا مقام عطا کیا ہے! اور اس کی ذات کو کس قدر محترم اور محبوب بنایا ہے، اسلام کی نگاہ میں عورت نہ تو "گڑیا" ہے اور نہ "تتلی" ہے! عورت اسلامی معاشرے میں تہذیب وحیا کا پیکر اور تدبیر تمنزل کی ملکہ ہے اور "ماں" کی خدمت کرکے ایک مسلمان جنت حاصل کرسکتا ہے!

اس دورِ تہذیب و تمدن میں علامہ اقبال کا یہ شعر مسلم خاتون کے لئے دلیلِ راہ بن سکتا ہے۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

محمد لقمان اعظمی ندوی

شوقی عربی کا ایک جدید شاعر

فضائے شعر و ادب پر سناٹا چھایا ہوا تھا، علمی و ادبی حرکت میں جمود و تعطل تھا، قدر شناسان علم و ادب کی آنکھیں متنبی اور ابوالعلاء المعری کو رو چکنے کے بعد جب عربیت کے زوال و انحطاط کو دیکھتی تھیں تو پھر اشکبار ہو جاتی تھیں چنانچہ حافظ کا یہ شعر:-

أیهجرنی قومی عفی الله عنهم الی لغة لم تتصل برواة

"کیا میری قوم مجھے چھوڑ کر ایک ایسی زبان کو اختیار کرے گی جو روایت کے سلسلہ سے محروم ہے"

عربیت کی کسمپرسی کا آئینہ دار ہے، انھیں حالات میں اللہ تعالیٰ نے نئے افق سے ایک نیا آفتاب نکالا جس کی طرف اہل ذوق و نظر نے آنکھیں مل مل کے دیکھنا شروع کیا اس آفتاب نے اپنی تابندگی سے قلب کی افسردگی دور کر کے سعی و عمل کی روح پھونک دی اور نوجوانوں کے اندر ایک امنگ و ولولہ پیدا کر دیا۔ یہ بدر کامل جو شہرت نصف النہار پر احمد بک شوقی کے نام سے چمکا جس کی شاعری نے قوم کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا،

۱۸۰۱ء میں جب مصر فرانسیسیوں کے چنگل سے آزاد ہوا تو وہاں بہت سے انقلابات ظہور پذیر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۵ء میں محمد علی پاشا نے مصری حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور فوجی تنظیم، علم و ادب، قوم و وطن کی خدمت میں مشغول ہو گئے، محمد علی پاشاہ کے بعد عباس اول اور سعید کے زمانے میں اس علمی ترقی کی رفتار پھر تیز ہوئی، علم و ادب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوئے، مدارس و مطابع کثرت سے قائم کئے گئے، ترجمے اور کتابیں شائع کی گئیں، جرائد و مجلات کی طرف خصوصی توجہ کی گئی۔ نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لئے یوروپ بھیجے گئے، ان طلبہ نے یورپ میں تحصیل علم کی، اہل یورپ کے تمدن ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا گہرا مطالعہ کیا اور واپسی کے بعد علم و حریت فکر، وسعت نظر اور بلندیٔ خیال کی روح پھونکی، اور عربی ادب میں زندگی پیدا کی یہیں سے مصر میں نئی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے، سیاسی و اجتماعی حالات کے اختلاف کی وجہ سے اس میں بہت سے تغیرات ظہور پذیر ہوئے، جس نے ذہن و قلب علم و ادب سب کو متاثر کیا، فرانسیسی حملے سے لیکر انگریزوں کے زمانے تک جو ۱۸۸۲ء اعرابی بادشاہ کی بغاوت کے بعد واقع ہوا اس نے مصر کی کایا پلٹ دی، مصریوں نے کروٹ لی اور ان کے جسم میں نئی زندگی پھونک دی۔ اسلامی تہذیب کو فائدہ پہونچا، اور عربی ادب میں جدت و قوت، روانی و سلاست پیدا ہوئی۔ اسی سیاسی و اجتماعی حوادث نے سامی باشا البارودی، اسماعیل باشا صبری اور احمد بک شوقی اور حافظ جیسے بڑے شعرا پیدا کئے ان میں البارودی کو ان سب کی رہنمائی اور اولیت کا درجہ حاصل ہے، اسی نے حافظ و شوقی کی اصلاح کی اور انکی شاعری کو راہ پر لگایا۔

انیسویں صدی کے آخر میں وہ باکمال اور ہردلعزیز شاعر جن کا نام شوقی ہے مصر کے سرسبز و شاداب اور مردم خیز خطے قاہرہ میں پیدا ہوئے، اور اسماعیل باشا کے زیر سایہ رہ کر ترقی کی اس لئے وہ اس سے زیادہ قریب تھے جو اجتماعی و سیاسی اسباب کے جولانگاہ تھے، اور انھیں چیزوں نے اس کی شاعری پر کافی اثر ڈالا، شوقی نے ابتدائی تعلیم قاہرہ کے مختلف مدرسوں اور مکتبوں میں حاصل کی، اس وقت مصر میں دو قسم کی درسگاہیں تھیں، ایک تو دینی طرز کے مدارس جیسے ازہر جس میں خالص مذہبی کتابیں اور مشرقی علوم جو اسی قدیم طریقہ سے پڑھائے جاتے تھے دوسرے وہ کالج اور اسکول جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید کتابیں اور مغربی علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی، شوقی نے مغربی طرز کی تعلیم کو ترجیح دی، اپنی ذکاوت و ذہانت اور غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے ہمیشہ ہونہار لڑکوں میں شمار ہوتے تھے، اور پندرہ سال کی عمر میں نمایاں کامیابی کے ساتھ تجہیزی مدرسہ سے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد عربی کے ایک کہنہ مشق شاعر شیخ محمد البسیونی کی تربیت میں شعر و شاعری کی مشق کرتے رہے، شیخ محمد البسیونی خدیوی توفیق کے خاص شاعر تھے، ان کی شاعری قصر و شاہی سیاست کے لئے وقف تھی ہر تہنیت و تبریک کے موقع پر خدیو توفیق کی مدح و ثنا میں طول طویل قصیدے لکھتے شائع ہونے سے قبل شوقی کو غور کرنے کے لئے دیتے، رفتہ رفتہ شوقی بھی محمد البسیونی کی شاعری اور ان کے سیاسی ذوق سے متاثر ہونے لگے اور کچھ دنوں بعد بالکل اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے لگے، اور ان کی شاعری اور قوت متخیلہ کی جولان گاہ بھی قصر تک محدود ہو کر رہ گئی اور اس طرح ان کو اپنے استاد کی پیروی نے اس کی فطری صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت اور قوت شاعری کو زبردست نقصان پہونچایا، یہی وجہ ہے کہ شوقی کے ابتدائی کلام میں وہ جوش و خروش، وہ قوت و رونق جو ایک فطری و محب و مخلص شاعر میں ہونی چاہیئے نہیں ہے، اگر شوقی ابتدا ہی سے اپنے کلام کو خود اپنے خیالات و جذبات کا ترجمان بناتے تو وہ آج عرب کے ممتاز ترین شعرا میں شمار ہوتے۔

شوقی کی طبیعت میں ذکاوت و طباعی کا مادہ خداداد تھا اس لئے ابتدا ہی سے اس کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے، اور خدیو توفیق نے اس کے مستقبل کی درخشندگی اور تابناکی کو تاڑ لیا اور اس کو اپنے خرچ سے تکمیل تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیا۔ جہاں اس نے پیرس یونیورسٹی میں قانون کا فن اختیار کیا اور اس میں داخلہ لے کر پورے چار سال طالب علمانہ طرز پر بسر کئے اور اسی اثنا میں فرانسیسی زبان و ادب کا بھی خاصہ مطالعہ کر لیا اور قریب کے مشہور علاقوں انگلینڈ، مونٹپلیہ، جزائر کی خوب سیاحی کی۔ یہ سفر شوقی کے لئے فال نیک ثابت ہوا مغربی ماحول یورپ کی زندگی۔ وہاں کی جدت پسندی، اور علمی ترقی اور فرانسیسی اور ترکی شعراء و ادباء کا مطالعہ اور سب سے بڑھ کر حکومتوں کے انقلاب اور تاریخ کے مڑتے ہوئے دھارے نے اس کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور اب اس کی شاعری قصر کے قید و بند سے آزاد ہو کر وسیع فضا میں آگے بڑھنے لگی، اور اب اس کے کلام میں صرف مصریوں کی تمنائیں اور امیدیں اور قصر و شاہ کی سیاست نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں وہ امیدیں بھی ظاہر کی جاتی تھیں، جو مسلمانوں کے دلوں میں موجزن ہوتی تھیں اور اب اس کی زبان میں پہلے سے کہیں زیادہ حلاوت و شیرینی جدت و روانی تھی۔ کیونکہ زبان ہمارے ذہن و احساس کی ترجمان ہے اس لئے جب کسی قوم کی ذہنیت

میں انقلاب رونما ہوگا تو لازماً اس کی زبان اور اسی کے ساتھ انداز بیان میں بھی تبدیلیاں ہوں گی نئے تجربات، نئے معلومات نئے نظریے اپنے ساتھ نئے الفاظ، نئے محاورے اور نئے اسالیب بیان بھی لاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شوقی کے اشعار کے مطالعہ کرنے والے کو شوقی دو مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔

پہلی صورت اس کی شاعری کی ابتدائی دور کی ہے جس میں وہ ایک عیش پرست انسان دنیا کی لذتوں اور محفلی مسرتوں کا دلدادہ اور بادشاہوں کا مصاحب معلوم ہوتا ہے دوسری صورت میں وہ ایک مسلمان اور مخلص قوم اور محبِ وطن معلوم ہوتا ہے، جو اخلاص سے لبریز، اخوت اسلامی کا علمبردار اور خلافت عثمانی کا شیدا جس کی مصیبتیں اور مسرتیں ہمیشہ اس کو شعر گوئی پر آمادہ کرتی ہیں۔

بعض سیاسی حالات اور جنگی نزاکتوں کے سبب شوقی کو اپنا محبوب وطن مصر دوبارہ چھوڑنا پڑا اور کچھ دنوں تک سرزمین اندلس کی خاک چھاننی پڑی، وطن کی محبت، سفر کی مصیبت اور اندلس کی تاریخی یادگاروں نے شاعر کے جذبات کو چھیڑ دیا اور اس کے مجروح دل نے سوز وساز کے غم گین لحن سے مصریوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ جنگ سرد ہونے کے بعد شوقی جب دوبارہ مصر واپس آیا تو وہ اب ایک جمہوریت کا علمبردار وطنیت اور اسلامیت کا پرستار اور عربوں کا غمخوار اور عالم اسلامی کا غمگسار شاعر تھا، اب وہ عربوں کی آواز اور ان کی زبان تھا عربوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ جہاں بھی جاتا تھا اس کا عظیم الشان اور غیر معمولی استقبال ہوتا تھا، اور نوجوان طلبہ اس کے قومی وملی ترانوں کو گلی گلی گاتے پھرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں وہ مجلس الشیوخ کے رکن منتخب ہوئے تو اس سلسلہ میں ایک تکریمی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تمام عرب ممالک کے مندوبین شریک ہوئے، شریک ہونے والوں میں کرد علی، امین الحسینی، اور امیر شکیب ارسلان قابل ذکر شخصیتیں تھیں۔ اس جلسہ میں حافظ نے جو کہ شوقی کا معاصر تھا اور جس کو عباس محمود العقاد اور طہٰ حسین نے بعض حیثیتوں سے شوقی پر فضیلت دی ہے، شوقی کی امامت اور اس کے امیر الشعراء ہونے کا اعلان اپنے اس جستہ شعر سے کیا ہے:- امیرالقوافی قد اتیت مبایعًا والذی وفود الشرق قد بالعت لھی

اے شعر گوئی کے بادشاہ جس نے جناب کی امامت وامارت کو تسلیم کیا اور یہ سارے مشرقی وفود بھی بیعت کرتے ہیں۔

حافظ شوقی کے دور کا ممتاز شاعر تھا اس کے کلام میں سادگی وبے تکلفی عربیت وسلاست شوقی سے زیادہ ہے نیز فن ہیراثی اور عوام کے جذبات واحساسات کی عکاسی اور ان کی ہمدردی میں حافظ کا پلہ شوقی سے کہیں بڑھا ہوا ہے حافظ اپنے استاد البارودی کا خاص شاگرد تھا اور اس نے اس کی پوری طرح پیروی کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن بر عکس شوقی کے یہاں حاضر گوئی اور اشعار کے مختلف انواع واقسام پر قدرت، امثال ومحاورات کی کثرت اور معانی پر زور زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ شوقی کو لوگ ابو تمام اور متنبی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

شوقی کو ترکوں کے ساتھ بیحد عقیدت ومحبت تھی یہ محبت غلو کی حد تک تھی جہاں اس نے ترکی اور خلافت عثمانیہ پر نظمیں کہی ہیں وہاں اس نے اپنی اس محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے، اس والہانہ عقیدت وتعلق کا داعی بھی دینی غیرت اور قومی وملی حمیت کی ہے، مصر جب انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور صلیبی جنگ نے تمام عالم اسلامی کو ایک انتہائی ہولناک اور پریشان کن صورت میں مبتلا کر دیا تھا اس وقت ترکوں نے مصر کی حمایت کی اور وہی

مسلمانوں کے خلیفہ ہوئے اور مصر ان کی قیادت وسیادت میں تھا، اسی لئے وہ ترکوں کا شیدائی اور خلیفہ کا فدائی تھا اور اس نے اپنے مشہور قصیدے صدی الحرب میں خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے

بسیفك یعلو الحق والحق اغلب وینصر دین اللہ الا ان تضرب

"تیری تلوار سے حق بلند ہوتا ہے اور حق ہی سب سے غالب عنصر ہے اور جہاں کہیں تو جاتا ہے اللہ کا دین فتحمند ہوتا ہے۔"

پھر آگے چل کر ترکوں کی مدح اور ان کی شجاعت وجانبازی پر ایک لمبا قصیدہ کہا ہے جو ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے

فلا زلت کهف الدین والهادی الذی الی اللہ بالزلفی له فتقرب

"تو ہمیشہ دین کا ملجا وماوی رہا، اور ایسا ہادی رہا جس کے واسطے سے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا رہا۔"

شوقی مصر کی گزشتہ شان وعظمت پر ناز کرتا ہے، اسلامی عروج کو جوش وفخر کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اس کے انحطاط وپستی پر قوم کو ملامت کرتا ہے، اور عربوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑتا ہے، اور آنے والی نسلوں کو ابھارتا ہے کہ وہ مصر کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کریں چنانچہ وہ خلیفہ کو حج کے ایام میں زیارت قبر رسولؐ کے موقع پر مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے۔

اذا زرت یا مولای قبر محمدؐ وقبلت مثوی الاعظم العطرات

وفاضت من الدمع العیون مهابة لاحمد بین الستر والحجرات

فقل لرسول اللہ یا خیر مرسل ابثك ماتدری من الحسرات

شعوبك فی شرق البلاد وغربها کاصحاب کهف فی عمیق سبات

بایمانهم نوران ذکر وسنة فما بالهم فی حالك الظلمات

وذلك ماضی مجدهم وفخارهم فما ضرهم لو یعملون لآتی

"اے میرے آقا! جب آپ قبر محمدؐ کی زیارت کے لئے جائیں، اور حضورؐ کے مرقد معنبر کو بوسہ دیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں، احمدؐ کے جلال سے پردوں اور حجروں کے درمیان اس وقت رسول اللہ سے عرض کیجئے گا کہ اے خیر رسل! میں آپ کے پاس جیسا کہ آپ کو معلوم ہے بڑی حسرتوں کے ساتھ آیا ہوں آپ کی قوم مشرق ومغرب میں اصحاب کہف کی طرح بڑی گہری نیند میں پڑی ہوئی ہے ان کے ایمان میں دو نور کتاب وسنت کے ہیں، تو اس پر وہ کس لئے انتہائی تاریکیوں میں سرگرداں ہیں اور ان کا ماضی تو اس قدر شاندار ومفتخر رہ چکا ہے، تو اب وہ مستقبل کے لئے جد وجہد کرتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔"

اور اسی سلسلہ میں وہ چاند کو خوش آمدید کہتے ہوئے لکھتا ہے۔

امم الهلال مقالة من صادق والصدق الیق بالرجال مقالا

هذا الطریق لکم تکفل بالهدی هل تعلمون مع الهلال ضلالا

سرت الحضارة حقبة فی ضوءه ومشی الزمان بنوره مختالا

وبنی له العرب الامجاد دولة کالشمس عرشا والنجوم رجالا

"اے ہلال کی قومو! (یعنی اے مسلمانو!) تمہارے سامنے ایک سچا آدمی اپنی بات پیش کر رہا ہے اور سچائی ہی

مردوں کا قول بن سکتی ہے ۔ یہ تمہارا ہلال ہدایت اور رہنمائی کا ذمہ دار بن چکا ہے کیا تم نے ہلال کیسا تھ کبھی گرمی دیکھی ہے۔
تمدنوں نے مدتوں اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کیا ہے اور زمانہ فخر کرتا ہوا اُس کی روشنی میں نازکے ساتھ چلتا ۔ اور اس کے لئے
عرب ایسی حکومت بنائی ہے، جس کا عرش آفتاب تھا اور نجوم اس کے پہرہ دار تھے "۔

شوقی کے اشعار میں جابجا دینی جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

فلم أر غیر حکم الله حکما ولم أر دون باب الله بابا

"میں نے اللہ کی حکومت کے سوا کوئی حکومت نہیں دیکھی اور میں نے اللہ کے دروازے کے سوا کوئی دروازہ نہیں دیکھا

اس قسم کی مقصدی اور جذبات اُبھارنے والی شاعری بھی شوقی کی ایک نمایاں صفت وخصوصیت ہے جس
میں وہ بہت سے شعراء سے ممتاز نظر آتا ہے۔

ہر شخص کو اپنے وطن اور مولد ومنشاء سے محبت اور قلبی لگاؤ ہوتا ہے اور اسی فطری اور قلبی لگاؤ کا نام وطن
کی محبت ہے، شوقی اصلاً مصری نہیں ہے۔ لیکن اس کی پرورش اور نشو ونما مصر ہی میں ہوئی اس لئے اس کو مصر
سے ایک خاص عقیدت ومحبت ہے اور عربوں میں خصوصیت کے ساتھ وطنیت کا غلبہ ہوتا ہے، اسی بناء پر اس
پر کبھی کبھی جذبہ حب وطن کا جذبہ طاری ہوتا ہے۔ اور وہ اشاروں ہی اشاروں میں اپنے ہم سفروں کو خواب وغفلت
سے بیدار کرتا ہے اور اپنی تیز حدی خوانی سے محمل کی گراں باری کو کم کرتا ہے ذیل کا ترانہ اسکی وطنیت کی عکاسی
کرتا ہے۔

الیوم نسو وبوادینا	ونعید محاسن ماضینا
ویشید العز بأیدینا	وطن نفدیه ویفدینا
وطن بالحق نؤیده	ولعین الله نشیده
نحسنه ونزینه	بمآثرنا ومساعینا
سعیاً سعیاً	لأثیل المجد والعلیا
ولنجعل مصر هی الدنیا	ولنجعل مصر هی الدنیا

" آج ہم اپنی وادی کے ذریعہ دنیا پر غالب آئیں گے اور ہم اپنے ماضی کے محاسن کو لوٹالیں گے اور ہمارا وطن ہمارے
ہاتھوں سے عزت کے قصر کی تعمیر کرے گا، وطن ہم پر فدا ہے اور ہم وطن پر !

وہ وطن جسکی تائید ہم حق کے ساتھ کرتے ہیں اور اللہ کی نظروں کے سامنے اس کو بناتے ہیں۔

اور ہم کو زیب وزینت دیتے ہیں اپنے کارناموں اور کوششوں کے ذریعہ !

دوڑو ! دوڑو ! پائیدار مجد اور سر بلندی کی طرف،

اور ہمیں چاہیئے کہ ہم مصر کو دُنیا بنادیں اور ساری دنیا کو مصر بنادیں "۔

جس طرح وہ مصریوں کا محبوب اور آنکھوں کا تارا تھا اسی طرح شامی بھی اس کے فدائی اور شیدائی تھے
اس لئے وہ صرف مصر نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کا شاعر سمجھا جاتا تھا، اس کے پاس ایک تڑپتا ہوا دل تھا
جس کا اس کے اشعار میں لوگوں نے مطالعہ کیا اور اسی سے وہ ان میں ہردلعزیز ہوگیا۔ وہ ان کے درمیان اتحاد و

واخوت کا داعی سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ اس کا قصیدہ جو اس نے مجمع العلمی العربی میں پڑھا تھا شامیوں نے بہت پسند کیا:

لولا دمشق لما کانت طلیطلة	ولا زهت ببنی العباس بغدان
مررت بالمسجد المحزون رساله	هل فی المصلیٰ والمحراب مردان
تغیرت المسجد المحزون واختلفت	علی المنابر احرار وعبدان
فلا الاذان اذان فی منارته	اذا تعالیٰ ولا الاذان آذان

"اگر دمشق نہ ہوتا تو طلیطلہ نہ ہوتا، اور نہ بنوعباس بغداد پر فخر کرتا۔"

میں مسجد محزون سے گزرا، یہ پوچھتا ہوا کہ آیا مصلے یا محراب میں مروان ہے!

مسجد محزون کی بدل گئی، اور اس کے منبروں پر آزاد اور غلام آتے رہے اور

اب ان کے مناروں پر چڑھ کر جو کوئی اذان دیتا ہے تو نہ تو پہلی سی وہ اذان ہے اور نہ وہ سننے والے کان ہیں۔

اس میں اس نے شام کی گزشتہ عظمت وشاندار ماضی کی تعریف کی ہے اور بنی امیہ کے تاریخی کارناموں کو یاد کر کے اس کی روحوں کو آواز دی ہے۔

اسی طرح شام کے قدرتی مناظر اور دلکش اور حسین باغوں اور چشموں سے متاثر ہو کر اس نے کہا ہے

آمنت باللہ واستثنیت جنته	دمشق روح وجنات وریحان
دخلتها وحواشیها زمردة	والشمس فوق لجین الماء عقیان
والحور فی دمر حول هامتها	حور کواشف عن ساق وولدان

"میں اللہ پر ایمان لایا اور اس کی جنت کو مستثنیٰ کہہ کر یہ کہتا ہوں کہ دمشق ۔۔۔ گلگدوں اور خوشبوؤں کا مجموعہ ہے۔

میں دمشق میں داخل ہوا تو اُس کے اطراف زمرد ہی زمرد تھے اور آفتاب اس کے سیمیں پانی پر پارہ کی طرح تھا!

اور حور وغلماں تھے جن کی پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں"

اس پورے قصیدے میں اس نے دمشق کی حسین وجمیل وادیوں اور دلکش و وجد آفریں چشموں اور قدرتی مناظر کی مصوّری کی ہے۔

اسی طرح جب شام پر فرانسیسیوں کے سنگین و جانسوز حملے ہوئے اور ہر طرف گولوں کی بارش ہوئی اور شامیوں کے خون سے سڑکیں سرخ نظر آنے لگیں اور کشمکش اور جنگ کا میدانِ کارزار گرم ہوا، اس وقت اس نے اپنے اس قصیدے سے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

سلام من صبا بردی ارق — ودمع لا یکفکف یا دمشق

"سلام ہوائے دمشق نہر بردہ کی لطیف ہواؤں کا اور ان آنسوؤں کا جو کسی طرح نہیں رک رہے ہیں۔"

شوقی عربی، فرانسیسی اور ترکی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا اس لئے اس کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے عربی اور مغربی ادب کو غور سے پڑھا ہے۔ تاریخ وسیر کے معلومات اور اس کے خود ذاتی خیالات واحساسات سے اس کے اشعار لبریز ہیں۔ شوقی کی طبیعت میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے وہ جب شعر پر مائل ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک موزوں الفاظ کا دریا بہہ رہا ہے یا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔

بدیہہ گوئی میں تو شوقی کو یدِطولیٰ حاصل تھا مختلف زبانوں کے مطالعہ سے اس نے عربی شاعری میں نئی راہیں نکالیں اور نئے نئے اسلوب پیدا کئے۔ شوقی ایک ہی واقعہ کو طرح طرح سے بیان کرتا اور ایک ہی مشروب کو مختلف پیمانوں میں ڈھال دیتا، اسی لئے اس کو تمثیلی شاعری کا مُوجد کہتے ہیں، اس نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک سوتی ہوئی قوم کو بیدار کیا اور زوال کے زمانہ میں عروج کا خواب دکھایا شوقی کی شاعری نے عربی زبان و ادب کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے بھر دیا ہے اور یہ وہ پھول ہیں جو سدا بہار ہیں۔

منشی عبدالرحمن خاں

کثیر الازدواجی

(یہ مضمون منشی عبدالرحمن خاں صاحب کی زیر کتابت معرکہ آرا تصنیف "عورت انسانیت کے آئینہ میں" کے باب "عورت کے حقوق" کا ایک ورق ہے۔ جسے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اسی باب کا دوسرا مقالہ "پردہ" پیش کیا جائیگا)

کثیر الازدواجی جسے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے معاندین ایک موثر حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اسلام کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا رواج اسلام سے بہت پہلے ہر مذہب میں عام تھا۔ ہندؤں کے ہاں اس کا ثبوت کرشن جی کے حرم، راجہ دسرتھ کی بیویوں کے تنازعات اور دیو راجہ ثانی کی موت پر اس کی بارہ ہزار بیویوں میں سے دو تین ہزار بیویوں کا اس کے ساتھ ستی ہوجانے سے ملتا ہے۔ اور اس پر سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری بھی شاہد ہے کہ جس کی رو سے ہندوستان کے ایک ہزار ہندو آبادی میں آٹھ خاندانوں میں کثیر الازدواجی رائج تھی۔ اور مسلمانوں کا تناسب اس سے کم تھا۔

اسلام کو کثیر الازدواجی ورثہ کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں سے ملی ہے جو آج بھی بائیبل کے پرانے عہد نامہ کو اپنی مقدس کتاب اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ کو اللہ کا مقدس نبی مانتے ہیں۔ ان سب انبیاء کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کی دو۔ حضرت یعقوبؑ کی چار۔ حضرت ایوبؑ کی چھ، حضرت داؤدؑ کی سو، اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں تھیں۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس دیرینہ رسم پر نکیر نہیں کی اس لئے عیسائیوں کے ہاں کثیر الازدواجی عام تھی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ:۔

"مشرقی رومی سلطنت کا قریباً ہر بادشاہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا تھا۔ ان بادشاہوں کی فہرست دراز ہے۔ اور مشرقی رومی سلطنت یعنے بازنطین حکومت کی کسی تاریخ سے اس امر کا ثبوت مل سکتا ہے کہ شہنشاہ ویلینٹیاس اور کونسٹین ٹیس جو کونسٹنٹائن اعظم کا بیٹا تھا کئی بیویاں رکھتے تھے۔ کلوتیرا شاہ فرانس ہیری برتوس، وہائی پیرکس اس کا بیٹا سب کثیر الازدواج تھے۔ پیپن و شارلمین مشہور صلیبی مجاہد شاہ فرانس کو بھی اس فہرست میں شامل کرلینا چاہیئے۔ سینٹ اسپرگنس شاہ شارلمین کی کئی بیویوں کا ذکر آتا ہے۔ ارنالفس ہفتم شہنشاہ جرمنی۔ فریڈرک باربروسہ، فلپ تھیوڈاتس شہنشاہ فرانس مشہور بادشاہ ہیں۔ اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ فرینک بادشاہوں کی پہلی

نسل میں اکثر بادشاہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔" (اسلامی روایات کا تحفظ ص۹۰)

کثیرالازدواجی صرف خواص کے لئے ہی مخصوص نہ تھی عوام کو بھی اس کی اجازت تھی۔ چنانچہ تاریخ ایسے بہت سے قبائل کا پتہ دیتی ہے۔ جس کے افراد ۱۰ سے ۳۰۰ تک بیویاں رکھتے تھے۔

قبل از اسلام جس طرح بیویوں کے حقوق متعین نہیں تھے اس طرح ان کی تعداد بھی مقرر نہیں تھی۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جتنی عورتوں سے چاہے شادی کرے۔ مگر اس پر یہ پابندی نہیں تھی کہ وہ سب کے حقوق بھی پوری طرح ادا کرے۔ جس کی وجہ سے عورتیں گوناگوں مصائب میں گرفتار تھیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اسلام نے عورت کو اس بے اعتدالی اور بے انصافی سے بچانے اور اسے معاشرہ میں معزز بنانے کے لئے شادی و نکاح کو مشروط و محدود بنا دیا۔ اس نے ہر تندرست مرد پر لازم قرار دیا کہ وہ ایک عورت کو اپنے حبالۂ عقد میں لا کر اس کے نان و نفقہ کا ذمہ دار بنے۔ اور اسے راحت و عزت کے ساتھ رکھے۔ لیکن اگر وہ اس کے جائز حقوق ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر عورت کو نکاح میں لانے کی بجائے روزے رکھے اور اس طرح خود کو محاسبہ اور مواخذہ سے بچائے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے مردوں کے لئے بیویوں کی تعداد بھی مقرر کر دی۔ کہ ہر مرد بیک وقت چار سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اور چار عورتوں سے بھی صرف اس وقت شادی کر سکتا ہے جب کہ بیویوں کے درمیان امور اختیاریہ میں مساوات معاملات قائم رکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی استعداد و استطاعت نہیں رکھتا تو پھر چار شادیوں کی اجازت خود بخود ساقط ہو جائے گی اور اسے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اس ارشادِ ربانی سے ظاہر ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (النساء ۱/۴)

"لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (مابین ازدواج) عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی (بیوی) پر بس کرو۔ یا جو کنیز تمہاری ملک میں ہو اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔"

گویا اسلام نے چار شادیوں کا حکم نہیں دیا، صرف اجازت دی ہے۔ اور وہ بھی مشروط کہ:۔

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (پ ۵/۱۹)

"کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔"

کیونکہ جو شخص دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے ساتھ نفقہ، معاشرت اور تعلقات زن و شوہر میں یکساں برتاؤ نہیں کرتا وہ ظالم ہے زیادتی کرنے والا ہے اُسے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ دوسری بیوی یا بیویاں رکھنے کے باوجود ان کی حق تلفی کرے تو عورت کو دادرسی کے لئے قانون کے دروازے پر دستک دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اس طرح اسلام نے ہر قسم کی ذمہ داری مردوں پر ڈال کر عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا زیادہ پختہ انتظام کر دیا ہے جو عورتوں کے لئے سراپا رحمت ہے زحمت نہیں۔ مگر ان معاندین اسلام نے جن کے اپنے ہاں کثیرالازدواجی کی حدود و شروط مفقود ہیں اسلام کو بدنام کرنے اور نظام اسلام میں انارکی پھیلانے کے لئے چار تک شادیوں کی اجازت کو عیاشی اور عورتوں کی حق تلفی پر محمول

کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اسلام نے مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت عیاشی کے لئے نہیں دی۔ بلکہ اس نے تو پہلی شادی کی اجازت بھی عیاشی کی خاطر نہیں دی۔ محض افزائش نسل کے لئے دی ہے، اور اس کے ساتھ بھی یہ پابندی لگا دی ہے کہ:۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ۔

"تم پر (حرام شدہ عورتوں کے سوا) سب عورتیں حلال کر دی گئی ہیں بشرطیکہ تم انھیں اپنے مال (مہر) کے ذریعہ بیوی بنانے کے لئے طلب کرو۔ صرف مستی ہی نکالنا مقصود نہ ہو" (النساء ع ۵)

اسلام ایسا دین فطرت انسان کو عیاشی کی اجازت دے ہی کیسے سکتا تھا اور اگر اس کا مقصود یہی ہوتا تو خالق کائنات دنیا میں عورتیں مردوں سے چار گنا پیدا کرتا۔ لیکن عالمی اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ عام حالات میں قریباً ہر زمانہ میں عورتوں اور مردوں کی تعداد برابر رہی ہے۔ اور اس اجازت سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد دو تین فی صدی سے زیادہ نہیں رہی۔ چنانچہ "نفسیات جنسی" کا مصنف ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ:۔

"چونکہ مردوں اور عورتوں کی تعداد کم و بیش ہر زمانہ میں مساوی رہتی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ہر مرد کو دو بیویاں نصیب ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں تعدد ازدواج رائج ہے وہاں بھی صرف ایک محدود مگر خوشحال طبقہ کے لوگ اس رواج سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ ہماری تہذیب میں چند مستثنیٰ اشخاص کو چھوڑ کر کوئی مرد ایک سے زائد بیویاں کرنا چاہتا ہے اول تو بہت سی مجبوریاں اور مشکلات ایسی ہیں جن کی وجہ سے اکثر مرد دو شادیوں سے گھبراتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے تو یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ دو مردوں کے تحت دو مختلف گھر چلائیں۔ اس لئے انھیں تو لازماً ایک ہی مرد پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔"

اس کی تائید ویسٹر مارک کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:۔

"جن قوموں اور تہذیبوں نے تعدد ازدواج کی اجازت دے رکھی ہے۔ ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ بالعموم ایک بہت ہی مختصر اقلیت اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں مردوں کی بہت بڑی اکثریت ایک ہی بیوی پر قناعت کرتی ہے۔ میک گریگر کے مشاہدات کی رو سے ایران میں صرف دو فی صد اشخاص ایک سے زائد نکاح کرتے ہیں۔ ۱۹۰۱ء کی ایک رپورٹ کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر ایک ہزار شوہروں کی ایک ہزار بیویاں ہوتی ہیں۔" (اسلام میں حیثیت نسواں ص ۱۶۸)

مغربی مفکرین کے یہ مشاہدات اور واردات اس نظریہ کی صاف طور پر تردید کرتے ہیں کہ تعدد ازدواج کی اجازت نفس پرستی اور شہوانیت کا دروازہ کھولتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو اسلام نے نفس پرستی اور شہوانی انارکی کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہی تعدد ازدواج کی محدود پیمانہ پر اجازت دی ہے۔ مثلاً

۱۔ چونکہ عورت کو مردوں کے مقابلہ میں بعض دوسری قسم کے فرائض بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لئے

ان فرائض کے لحاظ سے فاطر فطرت نے عورت کا مزاج سرد وتر بنایا ہے۔ مزاج کی برودت[1] قوائے شہوانی کو بالخصوص اور دیگر قوای کو بالعموم کمزور کر دیتی ہے۔ اور رطوبت (تری) قوتوں کو ڈھیلا اور نیم مردہ بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے مرد کی نسبت عورت میں جنسی خواہش کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے مرد کا مزاج گرم خشک ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی قوت جنسی عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسے عورت کی نسبت جنسی ہیجان و انتشار جلد اور زیادہ ہوتا ہے۔ اور اسے عورت کے قریب جانے کی جلد ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ایسے حالات میں اس کے لئے وہ زمانہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے جیسا کہ

الف۔ خانگی تنازعات کی وجہ سے ازدواجی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور ربط وضبط کے وہ امکانات جن سے میاں بیوی کی خوشگوار زندگی عبارت ہے ختم ہو جاتے ہیں یا

ب۔ عورت حمل، حیض، نفاس یا کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو جاتی ہے یا

ج۔ اُسے کوئی اور معذوری ہوتی ہے۔

تو مرد ایام معذوری میں دوسری بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں وہ بعض اوقات ناجائز طریقوں سے اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتا ہے۔ اس لئے پوپ گری گوری نے فتویٰ دیا تھا کہ:-

"اگر ایک بیوی ایسی بیمار ہو کہ وہ شادی کے تعلقات کے فرائض انجام نہ دے سکے تو اس کا خاوند ایک اور بیوی بیاہ سکتا ہے" (اسلامی روایات کا تحفظ ص۲۷)

۲۔ جس طرح خالق کائنات نے ایک ہی خمیر کی پیداوار اور ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوئے انسانوں کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف بنائی ہیں اسی طرح ان کے اعضا، قویٰ اور مزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف بنائے ہیں۔ کسی کے اعضا قوی ہیں کسی کے کمزور۔ کسی کا مزاج دموی ہے کسی کا صفراوی۔ طبی نقطۂ نظر سے جن کے اندر غیر معمولی حرارت غریزی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ طبعاً ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتے اور انھیں اپنی طبعی اور فطری غیر معمولی جنسی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک سے زیادہ عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے نکاح میں موجود نہ ہوں تو اضطراری حالت میں اسے لازماً ناجائز وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر رابنس لکھتا ہے کہ:-

"بیشتر مردوں کے لئے ایک بیوی پر قناعت کرنا دشوار اور بعض صورتوں میں ناممکن ہے۔"

۳۔ بعض مرد فطرتاً تنوع پسند ہوتے ہیں۔ اور بعض ذواقیت کا شکار رہتے ہیں۔ اور وہ لذت کشی کے لئے نئے نئے شکار پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایک بیوی سے ان کی طبیعت نہیں بھرتی۔ اور وہ جنسی تسکین حاصل کرنے کے لئے ناجائز تعلقات کا سہارا لیتے ہیں۔

۴۔ بہت سی عورتیں فطرتاً اتنی سرد مزاج ہوتی ہیں کہ وہ مردوں کی جنسی خواہش کی کماحقہ تکمیل سے قاصر

---

[1] اگر عورت کے مزاج میں یہ برودت اور رطوبت نہ رکھی جاتی تو پیدائش و افزائش نسل کا نظام مختل ہو کر رہ جاتا۔ پھر نہ رحم کے اندر بچے کی شکل بن سکتی نہ وہاں اُسے خوراک پہنچ سکتی، بعد پیدائش اُسے ماں کا دودھ نصیب ہوتا نہ عورت کے اندر خون حیض جمع ہو کر اپنے فرائض منصبی ادا کر سکتا۔ اور نہ عورت خانہ نشین ہو کر مہمات خانہ داری سرانجام دے سکتی۔

اور ان کے مردوں کو مجبوراً کوئی دوسرا انتظام جنسی سکون کے لئے کرنا پڑتا ہے۔

۵۔ بسا اوقات خوں ریز جنگیں بہت بڑی تعداد میں مردوں کو موت کی نیند سُلا دیتی ہیں جس کی وجہ سے بیشمار عورتیں خاوندوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان کی معاشرتی حالت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر ان کو بروقت دوسرا خاوند نہ ملے تو پھر وہ بھی اپنی معاشرتی اور جنسی ضروریات پوری کرنے کے لئے مردوں کی تلاش میں رہتی ہیں اور اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مرد عورتوں کی فاضل آبادی کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ تاکہ وہ بے راہ روی سے بچ جاویں۔ چنانچہ ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے کہ:۔

"تعدد ازدواج سے بہت سی معاشرتی خرابیاں رفع کی جاسکتی ہیں مثلاً پیشہ ورانہ عصمت فروشی، امراض خبیثہ، اسقاط حمل، ناجائز بچوں کے مصائب اور ان ہزاروں لاکھوں عورتوں کی تکالیف جو مردوں کی آبادی میں کمی کے باعث غیر شادی شدہ رہنے پر مجبور ہیں۔"

یہ تو وہ حالات ہیں جو تعدد ازدواج کی ضرورت و اہمیت بتلاتے ہیں۔ ورنہ یہی حالات معاشرہ میں فتنہ و فساد اور شہوانی انارکی پھیلانے کے لئے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ بانجھ عورت کی موجودگی میں اولاد کے خواہشمند مردوں اور اولاد مادینہ ہونے کی صورت میں اولاد نرینہ کے خواہاں مردوں کے لئے بھی بسا اوقات دوسری شادی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسان کے فطرت شناس، خالق نے توحد ازدواج کے حکم کے ساتھ تعدد ازدواج کی بھی اجازت دے دی تاکہ جو لوگ بعض فطری طبعی ضرورتوں یا معاشری و معاشرتی مجبوریوں کی بناء پر ایک سے زائد بیویوں کے خواہشمند ہوں تو وہ سفاح کی بجائے نکاح پر حصر کریں۔ اور دو دو یا تین تین یا چار چار شادیاں کریں۔ بشرطیکہ وہ اختیاری امور میں مابین ازدواج مساوات معاملات قائم رکھیں۔ کیونکہ جس طرح اسلام کو مردوں کی ضروریات کا خیال ہے اسی طرح اسے عورتوں کے حقوق کی بھی فکر ہے کہ مرد اپنی ضرورت پوری کرتے کرتے عورتوں کی حق تلفی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو حاکم حقیقی نے غیر معمولی حالات میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا بھی غیر معمولی انتظام کر دیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب یا شریعت میں ملنی محال ہے۔

اسے قدرت کا انتظام سمجھئے یا انتقام کہ آج تک جو لوگ تعدد ازدواج کی بنا پر اسلام کو بدنام کرتے رہے آج ان کے اپنے مفکرین و مدبرین تعدد ازدواج کو بشری تقاضوں اور فطری ضرورتوں کے عین مطابق بتا رہے ہیں۔ اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے اسے بطور نسخہ تجویز کر رہے ہیں۔ جیسا کہ مغرب کے مشہور و معروف فلسفی اور محقق سر طامس مور کے اس بیان سے ظاہر ہے:

"مرد کے لئے ایک سے زیادہ عورتوں کو مباح کر دیا جائے۔ یہی ایک دوا ہے جو تمام مہلک امراض کے حق میں تریاق ہے۔ اور یہی وہ تیر بہدف نسخہ ہے جو سوسائٹی کے زہریلے جراثیم کو تباہ کر دیتا ہے۔ یورپ میں سب سے بڑی بیماری اور متعدی بلا یہ ہے کہ یہاں کے مردوں نے محض ایک عورت پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہی وہ تہدید ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے اور برسر بازار زنا اور فحش کاری کرنے غرضیکہ دنیا بھر کی برائیوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بننے کے لئے آمادہ کر دیا ہے۔"

شہرۂ آفاق متمدن عالم ہربرٹ اسپنسر، مشہور ماہر جنسیات کیتھ واکر اور دنیائے مغرب کے دوسرے مشہور محققین ومبصرین سب تعدد ازدواج کی ضرورت کے قائل ہیں۔ اور ان کا قائل ہونا محض نظریات وتصورات کی بنا پر نہیں بلکہ تجربات ومشاہدات کی بنا پر ہے۔ کیونکہ مغرب میں ان ہی کے بھائی بندوں نے تعدد ازدواج پر پابندیاں لگا کر توحد ازدواج (MONOGAMY) پر زور دیا تھا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ فطرتِ بشری نے اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وہاں جنسی تسکین کی نئی نئی راہیں پیدا کریں جن کے باعث وہاں ناجائز بچوں اور بے سہارا عورتوں کی ایک ایسی نیم انسانی مخلوق پیدا ہوگئی جس کے متعلق مرد اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور جن کی وجہ سے وہاں ایسی معاشری ومعاشرتی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں کہ جب تک وہ تعدد ازدواج کو نہ اپنائیں یہ الجھنیں نہیں سلجھ سکتیں۔ اور اب تو وہاں عورتوں نے بھی اس ضرورت کی اہمیت کو بعد از خرابیٔ بسیار محسوس کر لیا ہے۔ وہاں کی معزز خواتین برملا اس ضرورت کا اظہار کر رہی ہیں جیسا کہ برطانیہ کی محترم خاتون مسز فسنٹنڈ کے اس تازہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

"جب ہم مغرب کے شہروں میں رات کے وقت سڑکوں پر مجمع لگائے ہزارہا بدبخت عورتوں پر نظر کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مغرب کس منہ سے اسلام کے تعددِ ازدواج کی خدمت میں زبان درازی کرتا ہے۔ عورت کے حق میں یہ بہتر بھی ہے معزز تر بھی ہے اور راحت انگیز بھی ہے کہ وہ اسلامی تعدد ازدواج کی قید میں رہے۔ صرف ایک شوہر کے ساتھ منکوحہ ہو کر رہنا اور جائز بچہ اپنی گود میں لے کر پھرنا اس سے بہتر ہے کہ عورت سے آشنائی کی جائے۔ اور پھر اسے سڑکوں پر آوارہ گردی کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ جو ناجائز بچے لئے ہوئے قانون کے دائرے سے باہر۔ بے گھر بے در ہو کر ہر راہ گیر کی ہدف بنے اور ہر ایک کی نظر میں ذلیل ہو" (صدقِ جدید)

غرضیکہ اہل مغرب تو تعدد ازدواج پر پابندی لگا کر پچھتا رہے ہیں۔ مگر مشرق کے مغرب زدہ "مجتہدین" تعدد ازدواج پر پابندیاں لگوانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ گویا وہ یہاں بھی مغربی دنیا کے سے حالات پیدا کر کے عورت کو انسانیت کی حدود سے نکال کر حیوانیت کی راہ پر لانا چاہتے ہیں

مولانا محمد لطف اللہ

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبوری دور کے نبی ہیں؟

پرویز کی اسلامی تعلیمات میں نئی تحریف

یاہوش بخیر!

پاکستانی مجدد پرویز صاحب نے لاہور کے اسلامی مذاکرہ میں اپنے اصلی عقائد کا اظہار ان الفاظ میں کردیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات خیرات وصیت وغیرہ عبوری دور کے لئے ہیں آج تک تمام اسلامی دنیا اپنے سینکڑوں نظری اختلافات کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو آخری اور مکمل شریعت مانتی ہے خود قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ میں نے اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارا دین مکمل کردیا لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کے بہت سے احکام عبوری دور کے لئے ہیں جبتک دنیا اشتراکیت کے نکات سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کرلیتی اس وقت تک ان عبوری احکام پر عمل ہوتا رہیگا مگر اصل نظام اسلامی پر اس وقت عمل ہوگا جب زمین اور سرمایہ مشترکہ ملکیت ہو جائیں گے اور اس وقت تکمیلی دور شروع ہو جائیگا۔

اس ضمن میں ہم پرویز صاحب سے چند سوالات کرتے ہیں!

(۱) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے بعد مارکس اور لینن کے زمانہ یعنی ۱۳ سو سال تک انسان اصل اشتراکی مسئلہ کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا تو مناسب یہ تھا کہ کسی وقتی شریعت والے پیغمبر کو بھیجا جاتا جس طرح باقی پیغمبروں کو وقتی شریعتیں اور محدود تعلیمات دی گئی تھیں۔ اور نبی آخرالزمان کو مارکس اور لینن کے بعد بھیجا جاتا جب عالم میں اشتراکیت کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ آپ کے خیال کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، اور مسلمانوں کا پورا ہزار سالہ دور عبوری دور تھا جبکہ قرآن کریم کی اصلی تعلیمات پر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی!

(۲) یہ عبوری دور کیا اس وقت ختم ہوگیا جب پرویز صاحب پر یہ قرآنی نکتہ منکشف ہوا؟ یا اس وقت ختم ہوگیا یا پاکستان کے بننے پر یہ دور ختم ہوا؟ اگر یہ دور صدیوں پہلے شروع ہوگیا ہے تو پرویز صاحب بتائیں کہ جب سے یہ دور شروع ہوا ہے اس وقت سے آج تک جن مسلمانوں نے ان پر عمل نہیں کیا کیا وہ سب جہنمی ہیں؟ اور اگر یہ دور پرویز صاحب کے ظہور پر پورے شروع ہوا ہے تو کیا قرآن میں پرویز صاحب کے زمانہ کی طرف کوئی اشارہ موجود ہے؟

(۳) کسی اور عالم یا مفکر پر بھی یہ نکتہ منکشف ہوا ہے یا پرویز صاحب پر تنہا یہ حقیقت کھلی ہے؟

(۴) قرآن کریم نے کس جگہ یہ اشارہ کیا ہے کہ میرے احکام ابدی نہیں صرف مشترکہ ملکیت کے زمانہ تک ہیں؟ اس اشارہ کو اقصائے عالم میں کوئی اور مسلمان بھی سمجھ سکا ہے یا نہیں؟

(۵) کیا اس حقیقت کے انکشاف کے بعد قادیانی بھائی یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ عبوری دور تھا اور اب حقائق کی تکمیل کا دور آگیا ہے اور ذہنی طور پر بھی انسان اس قدر مفکر ہوگیا ہے کہ پرویز صاحب جیسے انسان اب اصلی دین "اسلام" کو سمجھنے لگے ہیں تو اس دور کے لئے عملی طور پر اصلی اسلام کے اجرا کے لئے نبی کیوں نہ بھیجا جائے؟

کیونکہ کسی شریعت کو ایک ایسے زمانہ میں بھیجنا جبکہ دنیا اس کے لئے تیار نہ ہوا ایک مضحکہ انگیز فعل ہے اور نبی کو ایک ایسے وقت میں مبعوث کرنا جب دنیا اصل مذہب کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی ایک فعل عبث ہے۔ اور تعجب اس پر ہے کہ قرآن نے اس عبوری دور کے احکام تو تفصیل سے بتلائے اور اصل دور کے احکام سے بالکل ساکت ہے۔

(۶) آج تو پرویز صاحب صرف ملکیت کے احکام کو عبوری دور کے احکام بتاتے ہیں جو اب بیکار ہوگئے ہیں۔ اگر بہائی فرقہ یہ کہدے کہ قرآن کریم کے تمام احکام عبوری دور کے ہیں اور اب جب کہ دنیا دماغی طور پر بہت ترقی کرگئی ہے تو اب زنا۔ شراب۔ اور لحم خنزیر تمام حلال ہونے چاہیئے تو مسلمان اس کا کیا جواب دیں گے۔؟

میں تمام برادرانِ اسلام کو متنبہ کرتا ہوں کہ پرویز صاحب کی یہ تعلیم نہ صرف ختم نبوت پر حملہ ہے بلکہ اس کے بعد اسلام کے تمام احکام کو منسوخ کرنے کا راستہ پرویز صاحب تیار کر رہے ہیں اسی وجہ سے نہ صرف کمیونسٹ اخبارات مثلاً امروز وغیرہ بلکہ امریکن نمک خوار گروپ بھی پرویز صاحب کو اچھال رہے ہیں۔ اور ہماری حکومت نے بھی اسی غرض کے لئے ان کو لاء کمیشن میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا ہے ایک دفعہ جب یہ عبوری چکر شروع ہوگا تو پہلے تو صرف پرویز صاحب مالی احکام کو عبوری مسائل بناکر منسوخ کردیں گے۔ اس کے بعد نکاح اور صوم وصلوٰۃ وغیرہ کل احکام قرآنی کو عبوری دور کے مسائل کا نام دے کر ختم کردیا جائے گا جس کی طرف لاہور کے مذاکرہ میں امریکن اور انگریز مشرکین نے اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں کوئی قانون بھی دائمی نہیں۔ تو اسلام کا قانون کس طرح دائمی ہوسکتا ہے۔ اور آخر میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ دہری گروپ صاف کہدے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت اور کلمۂ توحید وغیرہ تمام اصول عرب جہلا کو منظم کرنے کے لئے بتلائے تھے (نعوذ باللہ من ذٰلک) جنت اور دوزخ سے تو ابھی سے پرویز صاحب نے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے کہ جنت سے مراد دنیاوی ترقی اور عیش ہے جس طرح اہل امریکہ کو حاصل ہے اور دوزخ سے مراد بھی دنیاوی رنج وتکلیف ہے جس میں آجکل مسلمان مبتلا ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آئزن ہاور اور خروشیف آجکل اہل جنت کے سردار ہیں اور پچھلے زمانہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ، چنگیز خاں لارڈ کلائیو۔ یزید اور فرعون جنتی تھے ـــــ اس طرح پرویز صاحب نے دہریت کے لئے ایک راستہ بنادیا ہے اور "قرآن" ہی کے نام پر قرآن کو اور اسلامی تعلیمات کو مسخ اور محرف کرنے کی خطرناک تحریک کھڑی کردی ہے۔

حسین عارف

عبد القادرؒ عودہ شہید کی یادیں!

(۱)

قتیلِ راہِ محبت شہیدِ جادۂ حق! لکھا ہے خون سے تاریخ نو کا تُو نے ورق!
خوشا وہ جراتِ بیباک جسکی شوخی سے جبینِ عظمتِ باطل پہ آگیا ہے عرق!
فنا کے بعد بقائے دوام ملتی ہے! یہ دے گئی ہے تری موت زندگی کو سبق!

رہِ حبیب میں جب قتل تو ہوا ہوگا!
وہ لمحہ حاصلِ ہر آرزو ہوا ہوگا!

(۲)

شبِ سیاہ میں منزل کا مل گیا ہے سراغ! کہ تیرے خون کے روغن سے جل اُٹھے ہیں چراغ!
بُھلا سکیگی نہ تاریخ تیری عظمت کو!!!! کہ تیری فکر سے پائیں گے راہ اہلِ دماغ!
بڑھے گی اور بھی دیوانگیٔ اہلِ جنوں! نہ بجھ سکے گا کبھی اپنی آرزو کا چراغ!

ترے لہو میں تو بوئے شکستِ باطل ہے!
یہ موت موت نہیں زندگی کا حاصل ہے

کوثر نیازی

نوائے تازہ

ہم سے آشفتہ دماغوں پہ نہیں ہے موقوف
اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں۔
صرف باتیں نہ بناؤ کہ محبّت والے!!
سر کو محبوب کا نذرانہ بنا دیتے ہیں
دل تو پھر دل ہے۔ کوئی اتنی بڑی چیز نہیں
لوگ کعبے کو بھی بُت خانہ بنا دیتے ہیں
آج وہ لوگ ہیں "معمارِ جہاں" اے کوثرؔ!
بستیوں کو بھی جو ویرانہ بنا دیتے ہیں۔

تسکین قریشی

گلگونہ

وفا ہی کیا تھی، جو ہم دعوئ وفا کرتے
تجھی سے تیری محبت کی التجا کرتے

اُٹھے نہ دستِ دعا ورنہ یہ دعا کرتے
کہ اہلِ حسن بھی درد آشنا ہوا کرتے

گدا سمجھتے ہیں دنیا کے تاجداروں کو
تیرے فقیر کسی سے سوال کیا کرتے

کمالِ عشق کا وہ دور بھی قیامت ہے
کہ اہلِ حسن خود آتے ہیں التجا کرتے

جب آکے خود ہی ساحل اُلٹ گئی کشتی
تو کیا شکایتِ تدبیرِ ناخدا کرتے

نہ دیکھ گزری ہوئی منزلوں کو اے تسکیں
طریقِ عشق میں ایسا نہیں کیا کرتے

منظر کلیمی

جذبات

نگاہ پُرغم، دلِ درد آشنا کچھ بھی نہیں شاید
متاعِ حسن جز ناز و ادا کچھ بھی نہیں شاید

نگاہوں سے نگاہیں بدگماں دل دل سے [illegible]
زمانے میں رہ و رسمِ وفا کچھ بھی نہیں شاید

نہ غنچوں میں دلآویزی نہ [illegible] میں ہے رنگینی
گلستاں میں بجز آب و ہوا کچھ بھی نہیں شاید

○

کر دیا بیٹھے بٹھائے دل کی اُلجھن بڑھ گئی
پھر تری زلفِ رسا کے پیچ و خم یاد آ گئے

الحفیظ و الاماں اے پاسبانانِ وطن
دیکھتے ہی آپ کو فغفور و جم یاد آ گئے

کس محبت سے بتاتے تھے طریقِ میکشی
میکدے میں آج شیخِ محترم یاد آ گئے

دیکھ کر حالِ عرب، سن کر خیالاتِ عجم
پھر مجھے شاہِ عرب، میرِ عجم یاد آ گئے

لرزہ بر اندام ہے منظر حریمِ سومنات
غزنوی کو پھر در و بامِ حرم یاد آ گئے

○

ہے ان کا ایک تبسم میرے لئے سب کچھ
ہزار درد سہی، رنج [illegible] سہی

تری نگاہِ کرم ہاں تری نگاہِ کرم
بس ایک بار سہی صرف ایک بار سہی

غمِ حبیب کی دولت تو دل میں رکھتا ہوں
میں خالی ہاتھ پریشان روزگار سہی

روحِ انتخاب

جو شخص بزعمِ خود اپنے کو فلسفی کہتا ہے اور وہ شریعت سے انکار کرتا ہے، درحقیقت وہ معانی فلسفہ کے جہل کی وجہ سے اور غرض و معانی شریعت کے جاننے سے بُعد کی وجہ سے کرتا ہے، کیا باجماع فلاسفہ، فلسفہ فضائل کو رذائل سے واضح نہیں کرتا، کیا وہ اُن دلائل سے واقف نہیں جو حق و باطل میں فرق کرنے والی ہیں، لامحالہ اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔

جو یہ کہتا ہے کہ ہم نے کوئی شئے ایسی نہیں دیکھی جو کسی شئے سے یا کسی شئے میں پیدا نہ ہوئی ہو اس سے بحول اللہ وقوتہ پوچھنا چاہیئے کہ کیا تمہارے نزدیک کسی شئے کی حقیقت کا بغیر طریقِ رویت و مشاہدہ ادراک کیا جاسکتا ہے یا حقائق میں سے کسی شئے کا ادراک بغیر رویت و مشاہدے کے ہو ہی نہیں سکتا؟

اگر وہ یہ کہیں کہ بغیر طریق رویت، و مشاہدے کے بھی حقائق کا ادراک ہوسکتا ہے تو انھوں نے آپ ہی اپنا استدلال ترک کر دیا اور اُسے باطل کر ڈالا کیونکہ انھوں نے وجود اشیاء کو بغیر طریق رویت و مشاہدے کے مان لیا، حالانکہ اس سے قبل وہ اس کی نفی کر چکے تھے، وہ جب استدلال کی طرف رجوع کریں گے، اس باب میں مناظرہ کیا جائے گا مگر ان کی دلیل تو بحمداللہ باطل ہوگئی۔

اگر وہ کہیں کہ نہیں بلکہ شئے کا ادراک بغیر مشاہدے کے بھی ہوسکتا ہے تو ان سے کہا جائے "آیا کبھی تم نے ازلی چیز کو بھی دیکھا ہے" لامحالہ وہ "ہاں" کہیں گے یا "نہیں" کہیں گے، اگر "نہیں" کہیں تو انھوں نے سچ کہا مگر اپنا استدلال بھی خود باطل کر دیا اگر "ہاں" کہیں تو انھوں نے عقل کی مخالفت کی، اور کسی ایسی چیز کا دعویٰ کیا جس کے مشاہدے کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ اس قول کے قائل کا مشاہدہ ایک ایسی چیز کا ہے، جو بے شبہ تمام اشیاء کے لئے ذات اول ہے اور جس کا کوئی اول ہو تو وہ چیز ازلی نہیں ہوسکتی، کیونکہ ازلی وہی ہوسکتی ہے جس کا کوئی اول نہ ہو، اور یہ ناممکن ہے کہ ایسی ذات جس کا کوئی اول ہو۔ اس ذات کا علی الاتصال مشاہدہ کرسکے جس کا اول نہ ہو، الحمدللہ یہ استدلال بھی ہر طرح باطل ہوگیا۔

میں نے ایک ملحد کو جس کا نام ثابت بن محمد الجرجانی تھا اسی برہان سے الزام دیا تھا کہ اس نے یہ چاہا تھا کہ بقائے باری عزوجل اور ہمارے وجود میں اس برہان کا عکس کر دے، میں نے اُسے آگاہ کیا کہ فریب ضعیف و مضمحل اور ساقط ہے، اس لئے باری تعالیٰ نہ زمانے میں ہے اور نہ اُس کے لئے کوئی مدت ہے، کیونکہ ہر زمانی چیز کی حرکت کو یا اس کے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہونے کو یا مکانِ واحد میں اس کے ساکن رہنے کی مدت کو زمانہ کہتے ہیں، باری تعالیٰ نہ متحرک ہے نہ ساکن، نہ وہ کسی زمانے میں ہے، نہ اس کے لئے کوئی مدت ہے، نہ کسی مکان میں ہے، نہ جرم (جسم) ہے نہ جوہر ہے، نہ عرض ہے نہ عدد، نہ جنس ہے نہ نوع نہ فصل نہ شخص، نہ متحرک نہ ساکن، سوائے اس کے کہ وہ اپنی ذات میں حق ہے، موجود مطلق ہے، اس معنی میں کہ وہ معلوم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، واحد ہے کہ اس کے سوا عالم میں کوئی واحد نہیں، وہ تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے، مخلوق کے کسی وجہ سے بھی مشابہ نہیں ہے!

(الملل والنحل، علامہ ابن حزم)

طالوت

اسمِ اعظم

یہ سرزمینِ مصر کی کہانی ہے۔
کونسا مصر؟
جہاں خدائے اقدس کی خدائی کے باوجود فرعون بھی خدا بن کر خداوندی کا ڈھونگ رچاتے رہے۔
جہاں موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر کی پیغمبری کے باوجود قلوپطرہ بھی پیمبر جمال بن کر عشوہ فروشی کے معجزات دکھاتی رہی۔
جہاں ہر سال دریائے نیل میں طغیانی لانے کے لئے ایک نہ ایک دوشیزہ کا حسنِ طغیان آور قربان کیا جاتا رہا۔
جہاں شاہ فاروق جیسے دل پھینک بادشاہ مدتوں دادِ عیش و بیدادِ حکمرانی میں مصروف رہے۔
جہاں نجیب جیسے اولوالعزم فاتح کو دودھ کی مکھی اور مکھن کے بال کی طرح نکال پھینکا گیا
جہاں ناصر کی نصرت آفرینیوں نے اپنے پرائے ہر ایک کے گلے کی پھانسی کے پھندے سے تواضع کی
ہاں یہ اسی سرزمین کی کہانی ہے۔
جہاں وقت کی قلوپطرائیں فراعنہ و نمارده کی یادگاروں کے رخساروں پر طمانچے مارنے کی عادی ہیں
جہاں ام کلثوم اور سمیعہ جمال جیسی ننگِ انسانیت و ننگِ آدمیت رقاصائیں وجود میں آئیں۔
جن کے جاہ و جلال کا یہ عالم ہے کہ کعبہ کے محافظ بھی ان کے آستان کو قبلۂ آمال تصور کرتے ہیں۔
جہاں آج پیرس و لندن سے زیادہ ہوسنائیوں کے مناظر راہ گیروں کے دامن پکڑ کر جنت نگاہ یا فردوسِ گوش کی دعوتیں دیتے ہیں۔
جہاں آج دین پر دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے۔
جہاں چپے چپے پر ع
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔
کے نظارے آپ ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔

ہاں یہ اسی سرزمین مصر کی کہانی ہے۔
وہاں ایک بہت بڑے بزرگ رہتے تھے۔ بہت ہی بڑے۔ جن کی شہرت مصر سے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور ان کے پاس ہر طرف سے لوگ استفادہ و استفاضہ کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن ایک بڑی لمبی داڑھی اور عجیب و غریب شکل والے ایک صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جن کے پاس ٹھیک طور پر پہننے کے کپڑے تھے اور نہ اوڑھنے کے۔ انہوں نے آتے ہی بے تکلفی سے السلام علیکم کہا اور براجمان ہوگئے۔
ان بزرگ نے ایک حقیر سی نظر نووارد پر ڈالی اور ان کی ہیئت کذائی کو تقریباً ناپسند کرتے ہوئے وعلیکم السلام کہا۔ مگر اس

ناپسندیدگی کو سوائے مستغرقانہ نظر کے اور کوئی ذریعۂ اظہار نہ مل سکا۔ کیونکہ فقیر ہمیشہ صلح کل اور اپنے نفس کی مغرورانہ خواہشات کے خلاف ہی جہاد میں مصروف رہتے ہیں۔

باوجود دلی کراہت کے اس بزرگ نے اس مسافر کا خانقاہ میں رہنے کا انتظام فرمایا اور خانقاہ کے خدام کو حکم دیا۔ کہ اس کی خبرگیری کیا کریں۔

مسافر بھی بے تکلف خانقاہ میں رہ پڑا وقتاً فوقتاً اُن بزرگ کی خدمت میں بھی حاضری دیتا رہا۔

وقت گذرتا گیا۔ اور نووارد مسافر اس بزرگ کی خانقاہ کا ایک فرد شمار ہونے لگا۔

اتفاق سے ایک دن ایک فلسفی عالم کا ادھر سے گذر ہوا۔

تو وہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اس بزرگ سے تبادلۂ خیال کی خاطر بے محابا خانقاہ میں چلا آیا۔

فلسفیوں کو آپ جانتے ہیں۔ روحانیت سے بھلا کیا تعلق؟

ہر چند اس بزرگ نے بحث و مباحثہ سے پہلوتہی کی۔ مگر وہ جو کہا گیا ہے۔

فلسفی آں باشد کہ خاموشش نشود

فلسفی صاحب نہ مانے اور مسائل پر رائے زنی ہونے لگی۔

کچھ دیر تک تو اس بزرگ نے فلسفی عالم کے ساتھ مغز زنی کی۔ مگر ان کی تفلسف آمیز باتوں اور کج بحثیوں کے آگے آخر انھیں سپر انداز ہونا پڑا۔

فلسفی نے بڑے تعلّی آمیز لہجے میں بحث کو اور بڑھانا چاہا۔ اور مصر کی روایتی فرعونیت کا کیڑا اس کے دماغ میں اور زیادہ کلبلانے لگا۔

ادھر ہر فرعونے را موسیٰ والا کلیہ بروئے کار آیا۔

اور اس ریش دراز مسافر نے آگے بڑھ کر فلسفی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

بحث پھر زور شور سے شروع ہوگئی۔

فلسفی نے دلائل کے انبار لگا دیئے۔

مسافر نے ان دلائل کو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور و ضعیف ثابت کر دیا۔

فلسفی نے براہین کی کڑیاں فولادی الفاظ سے پھر جکڑ دیں۔

مسافر نے اعتراضات کے ہتھوڑے سے انھیں پھر الگ الگ کر ڈالا

فلسفی نے فلسفہ چھانٹا۔

مسافر نے علم کلام کا زور دکھایا۔

فلسفی مغالطوں پر اُتر آیا

مسافر نے اس کی ایک ایک غلطی کو الم نشرح کر کے اسے اضحوکۂ حاضرین بنا ڈالا

فلسفی کی فرعونیت خاک میں مل گئی۔

مسافر کے حق و باطل کے امتیاز نے گردن اونچی کی۔
فلسفی ہار کر دم دبا کے بھاگ گیا۔
مسافر نے جیت کر گردن جھکالی

..—— .. ——..

مسافر خانقاہ میں جب اپنی قیامگاہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا۔
خانقاہ کے سربراہ بزرگ اس کی طرف چلے آرہے ہیں
اس خلاف معمول آمد پر اسے تعجب بھی ہوا۔ اور اپنے دل میں اس نے اس پر فخر بھی کیا۔
آخر اس نے اپنی اہمیت کو آج اہل خانقاہ کے دل پر ثبت کر ہی دیا۔
اس بزرگ کی آمد اس اہمیت کے اقرار کا سب سے بڑا ثبوت تھی
دو قدم آگے بڑھ کر اس نے خانقاہ کے سربراہ کا استقبال کیا۔
بزرگ نے آتے ہی اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور فرمایا؛
افسوس! ہم لوگ آپ کے تبحر علمی سے ناواقف تھے۔ اور آج تک آپ سے آپ کے مرتبے سے فروتر سلوک ہوتا رہا۔
میں اس بات کی معافی خواہی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔
مسافر نے سر تواضع جھکا کر کہا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟
یہ سب آپ کا فیض صحبت ہے۔ ورنہ بندہ میں اتنی لیاقت کہاں تھی؟
بزرگ نے فرمایا: ان رسمیات کو رہنے دیجئے، آپ نہ ہوتے تو آج خانقاہ کی بہت بدنامی ہوتی۔ گذشتہ کی معافی عطا فرمائیے اور آئندہ کے لئے آپ میری رہائش گاہ کے قریب‌ترین کمروں میں سے جسے پسند کریں۔ وہاں تشریف لے چلیں تاکہ آپکی خدمت میں آئندہ کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔
مسافر کے لیت و لعل کے باوجود اسے اس بزرگ کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں منتقل ہونا پڑا۔ اور اب اسکی خدمت اس طرح ہونے لگی۔ جس طرح وہ بھی خانقاہ کے مخدوم ہیں۔

..—— .. ——..

مسافر کو آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چلا تھا۔
اور اب اس نے خانقاہ کے ہر فرد کے دل میں عزت و احترام پیدا کر لیا تھا۔
اس مباحثہ کے بعد سے خانقاہ کے سربراہ بھی ہمیشہ اسے عزت آمیز نگاہوں سے دیکھتے اور متبسمانہ اس کا استقبال کرتے۔
ایک دن جبکہ وہ بزرگ بہت مسرور و مُبتہج تھے۔ اس مسافر نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔
حضور! سال بھر میں یہاں مقیم رہا۔ اور ہر روز میں یہ سوچتا تھا کہ آج اپنا ما فی الضمیر بیان کر ڈالوں۔
مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ آج انتہائی مسرور دیکھکر میں عرض مدعا کی اجازت چاہتا ہوں
انتہائی خندہ جبینی سے ان بزرگ نے فرمایا: کہئے کہئے میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں
مسافر نے کھنکار کر گلے کو صاف کیا اور کہا:

حضور کے پاس اسم اعظم کا عمل ہے۔ اور میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور وہ مجھے بھی سکھا دیں۔

بزرگ نے مسکرا کر فرمایا:۔ دوست! یہ تم نے بڑا ٹیڑھا سا سوال کر دیا۔ خیر ہم چونکہ تمہارے علم کے قدر دان ہیں۔ اس لئے ہمیں اس معاملہ میں کچھ بخل سے کام نہیں لینا۔ مگر.......

مگر کہہ کر وہ بزرگ کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

مسافر نے ارشاد فرمایا:۔ مگر یہ کہ آپ جانتے ہیں کہ ٹکے کی ہانڈی خریدی جاتی ہے۔ تو بھی اسے خوب ٹھونک بجا کر لیا جاتا ہے۔ اور یہ تو اللہ کے اسم اعظم کا معاملہ ہے۔

مسافر نے کہا:۔ حضور میں ہر طرح کے امتحان کے لئے حاضر ہوں۔

بزرگ نے متحیرانہ اچھا کہہ کر بات کو ختم کر دیا۔

چھ ماہ اور گذر گئے اور کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

مسافر متواتر خانقاہ میں مقیم ہے اور ہر طرح اس کی عزت و توقیر کی جا رہی ہے۔

مسافر کو اُمید ہے۔ کہ وہ جلد اپنے مطلب میں کامیاب ہوگا۔ امتحان و متحان کی بات کو وہ بھول ہی چکا ہے۔

اور پھر یاد دہانی کی تیاریوں میں مشغول و مستعد نظر آتا ہے۔

اچانک ایک دن بزرگ نے یاد فرمایا۔

مسافر نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ بندہ حاضر ہے۔ کیا ارشاد ہے؟

بزرگ نے ایک ڈبہ اس کے ہاتھ میں دے کر فرمایا۔ فسطاط میں میرے ایک دوست ہیں۔ انھیں میں ایک تحفہ بھیج رہا ہوں۔ تم سے زیادہ امین اس خانقاہ میں اور کون ہے؟

اس لئے ذرا تکلیف کر کے یہ انھیں پہنچا آؤ۔

مسافر نے ڈبہ لیکر امتثال امر کی ہامی بھری اور وہاں سے چل دیا۔

تھوڑی دور گیا۔ تو ڈبے میں کوئی زندہ چیز پھدکتی معلوم دی۔ ذہن نے اکسایا۔

کہ کھول کے دیکھ لو۔ مگر عقل نے سمجھایا یہ امانت ہے امانت میں خیانت جائز نہیں۔

دو چار قدم ہی اُٹھائے ہوں گے کہ ڈبے میں پھر سرسراہٹ ہوئی۔

ذہن کی اکساہٹ پھر عود کر آئی۔ آخر یہ کیا راز ہے؟

عقل نے سمجھایا۔ کوئی بھی راز ہو۔ تمہیں تو یہ ڈبہ ان بزرگ کے دوست تک پہنچانا ہے۔

ڈبہ میں کسی زندہ چیز کی حرکت برابر اس کے دل کی حرکت کو تیز کر رہی تھی۔

اور قدم قدم پر یہ داعیہ پیدا ہوتا تھا کہ کھول کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟

اور آخر میں جب یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں میرے ساتھ کوئی مذاق تو نہیں کیا گیا۔

تو پھر آگے چلنا دشوار ہو گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ڈبہ کھول ہی لیا۔

ڈبے کا کھلنا تھا کہ ایک چوہیا پھدک کر زمین پر آ رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئی۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی غصے سے مسافر کا دماغ کھول اُٹھا۔
اور وہ ڈبہ لیکر جلدی واپس خانقاہ میں پہنچ گیا!
خانقاہ میں پہنچتے ہی سب سے پہلے جس شخص سے اس کی ملاقات ہوئی وہ وہی بزرگ تھے۔ جنھوں نے اسے فسطاط کی طرف بھیجا تھا اور وہ یوں انکی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ یہاں کھڑے ہو کر اسی کا انتظار کر رہے تھے۔
مسافر نے مجرمانہ طور پر غصے کے ساتھ ان کی طرف نظر اُٹھا کر السّلام علیکم کہا۔
اُن بزرگ نے فرمایا۔ وعلیکم السلام۔ تم واپس آگئے؟
مسافر نے کہا: واپس نہ آتا تو اور کیا کرتا؟
بزرگ نے فرمایا، ڈبہ ہمارے دوست کو پہنچایا نہیں؟
مسافر نے غصہ آمیز لہجہ میں کہا: ڈبے میں جو تحفہ تھا وہ پہنچایا کیسے جا سکتا تھا؟
گویا تم نے ڈبہ کھول کر دیکھ لیا۔ ان بزرگ نے متعجبانہ انداز میں کہا۔
اور ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے فرمایا:۔
جب ایک ادنیٰ سی چوہیا کے بارے میں تمہاری امانت و دیانت کا یہ حال ہے۔ تم پر "اسم اعظم خداوندی" کے سنبھال کر رکھنے میں کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ علم بیشک تمہارے پاس ہے۔ مگر علم تو اس فلسفی کے پاس بھی تھا۔ جس کے ساتھ تم مناظرہ کرتے رہے تھے۔ تمہارا امتحان ہو چکا، تم اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے آج ہی بلکہ ابھی خانقاہ کو اپنے وجود سے پاک کردو۔ اس کام کی خاطر تمہارا یہاں رہنا اب بالکل فضول اور بے معنی ہے۔
اللہ کا نام سیکھنے کے لئے تو سب سے پہلی شرط امانت و دیانت ہے۔ جس کی تمہارے ہاں کمی ہے۔ اگر یہ گوہرِ گراں کبھی پھر تمہارے ہاتھ آجائے۔ تو اس خانقاہ کے دروازے بھی تمہارے لئے پھر کھولے جا سکتے ہیں۔
فی الحال "خدا حافظ"........

——— ... ———

یہ کہکر وہ بزرگ تو تشریف لے گئے اور مسافر عرقِ خجالت میں تر ہو کر امتحان کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ اس نے سوچا ...حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا نام لینے کا حق صرف انھیں لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے احسان وحسن اخلاق کی راہیں ...کر کے امانت و دیانت جیسے گوہرِ گراں مایہ کو حاصل کر لیا ہے۔ معاً انھیں تاریخ میں پڑھا ہوا یہ واقعہ یاد آگیا کہ کیسے ...شخص مصائب و آلام کی گھاٹیاں اور دور دراز کی مسافت طے کر کے ایک دوسرے صاحب کے پاس پہنچے۔ جن ...انھیں ایک حدیث رسولؐ کے حصول کی اُمید تھی۔ مگر جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بکری بھاگ گئی ہے۔ اور ...دامن پھیلا کر اُسے یہ جھانسہ دے رہے ہیں کہ گویا ان کے پاس دانہ ہے۔ اور وہ اسے ابھی کھلائیں گے۔ اور اس طرح ...بکری کو اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً دامن میں دانہ وانہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ رنگ دیکھکر آنے والے بزرگ ...واپس ہو گئے۔ اور ان سے حدیث نہ لی۔ اور فرمایا جو شخص ایک جانور سے سچائی کا برتاؤ نہیں کرتا۔ اس سے ...امید کیسے کی جائے کہ وہ دوسرے معاملات میں سچائی برتے گا۔
یہ واقعہ یاد آتے ہی اس پر اسلامی اخلاق کے رموز منکشف ہو گئے۔ اور اپنے امتحان میں فیل ہو جانے پر

اسے افسوس ہونے لگا۔ مگر اب چونکہ تیر جستہ واپس کمان میں نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس لئے خانقاہ کو چھوڑ کر وہ چلا گیا........

اس مسافر کا نام یوسف بن حسین تھا۔ اور وہ بزرگ جنھوں نے اس کا امتحان لیا تھا۔ حضرت ذوالنون مصری تھے۔ یہ واقعہ علامہ ابی محمد عبداللہ یافعی نے اپنی مشہور کتاب روض الریاحین میں تحریر فرمایا ہے۔

ماہر القادری

بابل کے کھنڈروں میں

میں نے ۱۹۳۳ء میں عراق کا سفر کیا تھا اور عتبات عالیہ کی زیارت کی تھی اس وقت بعض مذہبی معتقدات کچھ اور تھے طرز انشا اب سے بالکل مختلف تو نہ تھی مگر ظاہر ہے کہ چوبیس سال کی مشق کے بعد تحریروں میں جو رنگ پیدا ہو جانا چاہیئے وہ پہلے کہاں تھا، شباب کا زمانہ تھا اور شاعری کا یہ رنگ تھا

وہ بھی تڑپ نہ جائے تو اس عاشقی پہ خاک　　مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

اور اب اللہ کے فضل و کرم سے جذبات میں یہ نکھار پیدا ہوگیا ہے:-

سر سے آنچل ڈھلک گئے بھی تو کیا　　تو مگر دامن نظم کو سنبھال

اس مضمون کی تاریخی معلومات اُسی زمانہ کی تلاش و تحقیق کا ماحصل ہیں، میں نے اس ضمن میں مزید تحقیق نہیں کی!

۱۹۳۳ء میں اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ انگریز خود اپنی طرف سے ہندوستان چھوڑنے کی ایک تاریخ مقرر کریگا اور اس معینہ تاریخ پر بوریہ بستر سمیٹ کر انگلستان کی راہ لے گا، ہندوستان اس طرح آزاد ہوگا کہ ایک خطہ کا نام "بھارت" اور دوسرے حصہ کا نام پاکستان ہوگا، یہ آزادی یوں ہی نہیں مل جائے گی اور ملک کا یہ بٹوارہ خاموشی کے ساتھ عمل پذیر نہیں ہوگا، اس کیلئے برصغیر ہند کے رہنے والوں کو آگ اور خون کے خوفناک دریا سے گزرنا ہوگا لاکھوں قتل ہوں گے، کروروں آدمیوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑے گا۔ دھن دولت ہی نہیں عصمتیں بھی لٹیں گی، مسجدوں خانقاہوں، مندروں اور گور دواروں کو تباہی اور غارت گری دیکھنی نصیب ہوگی، اس خون خرابہ کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان آئیں گے، اور انگریز ہندوستان سے جاتے جاتے بھی مسلمانوں پر وار کر جائیگا۔

۱۹۳۳ء میں زائر عراق کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ اُسے ہمیشہ کیلئے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر سندھ کے بندرگاہ کراچی کو اپنا مستقر بنانا پڑے گا اور اسے ایک ایسا فلیٹ رہنے کیلئے ملے گا جس پر پہنچنے کیلئے دس بیس نہیں بیس کم سو (یعنی اسّی) سیڑھیاں طے کرنی ہوں گی اور وطن کی یاد اس طرح منظوم فریاد بن جائے گی۔

نہ وہ خلوتوں میں لذت نہ وہ لطفِ انجمن ہے — اسی غم کا نام شاید غمِ دوریِ وطن ہے

یہ سب کچھ ہو کر رہا ان گناہگار آنکھوں نے انقلاب روزگار کی کیسی کیسی نیرنگیاں دیکھ لیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اور کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی ہنسی ہنسی میں آنسو بھی نکل آئے۔ مدیر "فاران" کے اس حزن و ملال میں قارئین فاران کیوں شریک ہوں، لیجئے میری اب سے چوبیس سال پہلے کی ایک تحریر کو پڑھئے...... اور......

سرزمین عراق کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی مستقل تاریخ ہے۔ انقلابات کے بہت سے طوفان اس وادی سے گذرے ہیں اور نہ جانے کتنے بہت سے تمدنوں کی قبریں اس سرزمین میں بنی ہوئی ہیں۔ عراق کا ایک گوشہ نمرود کی جھوٹی خدائی کے افسانے سنا رہا ہے تو دوسری طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درس حقانیت کی صدائیں آتی ہیں۔ کہیں کلدانیوں کی سطوت کے مٹے ہوئے نقوش کی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔ تو کسی پردے سے اہل نینوا کی عمرانیت و تہذیب کی شمع کشتہ کا دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شہر حلہ کے قریب سے گذریئے تو بابل کے کھنڈروں کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی پر جی کھول کر ماتم کیجئے۔ سلمان پاک کے قریب جائیے تو طاق کسریٰ کے شکستہ حصہ کو دیکھ کر مدائن کی سطوت رفتہ سے عبرت حاصل کیجئے۔ وہ بغداد عروس البلاد جہاں عباسیوں کے اقبال کا پرچم اڑتا تھا۔ اس کے مشہور دریا۔ دجلہ کے قریب۔ جنرل موڈ کا مجسمہ آپ کو نظر آئے گا۔

میں نے سرزمین عراق کے بابلی کھنڈروں میں کیا دیکھا؟ اس کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل چاہتا ہوں کہ بابل کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے پیش کردوں تاکہ میری عینی مشاہدات اور تاریخی پس منظر مل جل کر حال و ماضی میں ایک خاص رابطہ قائم کرسکیں۔

تاریخی پس منظر

بابل کا سب سے پہلا بادشاہ نمرود تھا، مشرق کے بہت سے فرمانروا اس کے باجگذار تھے نمرود بچپن ہی سے انانیت کا پتلا اور نخوت و غرور کا مجسمہ تھا۔ شہنشاہی کی مسند پر بیٹھ کر اس کا دماغ اور بھی خراب ہوگیا اور اس نے اپنی خدائی کا اعلان کردیا۔ اس زمانہ میں اگرچہ کواکب پرستی عام ہوگئی تھی اور توحید خالص کے تصورات میں مرکزیت باقی نہ رہی تھی۔ مگر پھر بھی ایسی سعید روحیں موجود تھیں جو خدا کے نام میں ایک خاص لذت محسوس کرتی تھیں اور غیر اللہ کی پرستش کے تصور سے ان کو دکھ ہوتا تھا۔ اس قسم کے لوگوں نے نمرود کے اعلان خدائی سے انحراف کیا اور ان کو شاہی احکام کی خلاف ورزی کے جرم میں سخت سزائیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان سزاؤں کا حلقۂ عمل قیدخانہ کی کوٹھریوں سے لیکر پھانسی کے تختوں تک پھیلا ہوا تھا۔ نمرود جب طلوع آفتاب کے وقت محل سرا کے جھروکے سے جھانکتا تو ہزاروں انسان سر کے بل زمین پر زمین پر سجدے میں گر پڑتے...... اگر سچے خدا کے حکم نے جھوٹی خدائی کے اس چراغ کو گل کر دیا۔

نمرود کے جانشینوں نے کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی نمرود شہنشاہی کی جس بساط کو بچھا گیا تھا وہ

اس کو سنبھالے بیٹھے رہے نمرود کی اولاد میں سب سے زیادہ شہرت "اور خامس" کو حاصل ہوئی۔ محکمہ اکتشافات اثری کی کوششوں کی بدولت بعض ایسی اینٹیں برآمد ہوئی ہیں جن پر مسماری خط میں "اور خامس" کا نام لکھا ہوا ملا ہے "اور خامس" کے بعد خاندان نمرود کا شیرازہ بکھر گیا پہلے تو آس پاس کے باجگزاروں نے خود مختاری کا اعلان کیا اس کے بعد عراق کے جنگجو امراء نے اپنی اپنی سیادت الگ قائم کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل نمرود کی شہنشاہی کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں اور ایران کے بادشاہ نے آل نمرود کو شکست دے کر بابل کو فتح کرلیا۔ تقریباً سوا دو سو سال تک بابل ایرانی حکومت کے زیر نگیں رہا۔ ایرانیوں اور بابلیوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے تھے۔ بابلی ہمیشہ ایرانیوں کا تخت سیادت الٹنے کی فکر میں لگے رہے۔ رعایا کی بد دلی اور بغاوت کا مقابلہ آسان بات نہیں ہے۔ لہذا ایرانیوں کو بھی بابل سے دست کش ہونا پڑا اور ۲۲۲۵ء قبل مسیح میں بابل میں ایک اور سلطنت قائم ہوگئی جس کا نام "ایلامی" تھا اسی خاندان کے ایک بادشاہ کودولامرا سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے مقابلہ فرمایا تھا۔ اور آپ فتح یاب ہوئے۔

انقلابات

تقریباً ۲۰۰۰ء قبل مسیح میں بابل پر کلدانیوں نے قبضہ کیا اور ساڑھے چار سو برس تک ان کا پرچم حکومت لہراتا رہا مگر انقلابات عالم کی آندھیوں نے اس پرچم کو بھی سرنگوں کردیا۔ اور کلدانیوں کی جگہ مصریوں نے حاصل کرلی۔ مصری ۱۳۱۴ء قبل مسیح تک حکمراں رہے اور اس کے بعد اشوریوں نے مصریوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اشوری اللہ میاں سے ہمیشہ حکومت کرنے کا فرمان تھوڑی لکھا کر لائے تھے۔ ان کو بھی اپنے پیشروؤں کی طرح فنا و بربادی کا منظر دیکھنا پڑا۔ ۵۳۸ء قبل مسیح میں کوائش شاہ ایران نے اشوریوں کو تباہ و برباد کردیا۔

بابل اور نینوا میں ہمیشہ سے رقابت چلی آتی تھی۔ بابلی فرمانروا کا آفتاب اقبال جب نصف النہار پر تھا تو نینوا کے ارباب حل و عقد دل ہی دل میں گھٹتے رہے اتنی بڑی شہنشاہی سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کرسکے۔ مگر بابل کے کمزور بادشاہوں کو دیکھ کر اہل نینوا نے بابل پر ہلہ بول دیا اور ۶۲۵ء قبل مسیح میں بابل فتح کرلیا۔ اہل بابل اپنے پرانے رقیب کی غلامی پر کس طرح راضی ہوسکتے تھے انھوں نے ساز باز کرکے ایرانیوں کو بلالیا اور تازہ دم ایرانیوں کی مدد سے ۶۰۶ قبل مسیح میں نینوا والوں کو بابل سے باہر نکالدیا۔ اہل نینوا کو بابل سے نکال دینے کے بعد بھی بابلیوں کا جوش انتقام ٹھنڈا نہ ہوا انھوں نے نینوا پر شدید یورش کی۔ اہل نینوا ابھی اپنی شکست ہی سے نہ سنبھال پائے تھے کہ دوسرا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا انھوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن مست ہاتھیوں کا زخمی بطیں کیا مقابلہ کرسکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نینوا والوں کو شکست ہوئی اور اہل بابل نے نینوا کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

بابل کی تعمیر

نینوا کے بعد ہی بخت نصر منظر عام پر آیا۔ نینوا کی حکومت جو بابل کی پرانی رقیب تھی تباہ ہوچکی تھی۔ ایرانیوں سے بھی اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی "سقوط نینوا" کے بعد وہ بھی دوست ہوگئے تو نینوا کی ساری دولت بابل میں آچکی تھی۔ امن و امان کا زمانہ تھا۔ بخت نصر نے بابل کی ازسر نو تعمیر کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بابل کو اس طرز پر تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ دنیا نینوا کی شان و شوکت

کو بھول جائے بابل کی تعمیر شروع ہوئی - نینوا کے قیدیوں اور معماروں سے یہ کام لیا گیا اور شداد ثانی بخت نصر نے عراق کے مرغزاروں میں ایک دوسری "ارم" کھڑی کردی۔

مشہور سیاح و مورخ ہیروڈوٹس نے بابل کی سیاحت کی تھی، وہ لکھتا ہے کہ شہر کے وسط میں دریا بہتا ہے۔ شہر بیس میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ چاروں طرف ۳۵۰ فٹ بلند ۸۷ فٹ چوڑی شہر پناہ ہے۔ اس میں پیتل کے سو پھاٹک ہیں۔ پھاٹک کے ستون اور چھتیں بھی پیتل کی ہیں۔

شہر بابل اپنے زمانہ کا حسین ترین اور سب سے زیادہ آباد شہر تھا۔ مسقف بازار، خوشنما باغیچے، تفریح گاہیں حمام سب کچھ تھا۔ مگر اب ــــ

کچھ نقش رہ گئے ہیں وہ بھی مٹے ہوئے سے

بہرحال جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اسے میں آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں۔

کھنڈروں میں ہم نجف اشرف کی زیارت سے مشرف ہوکر کوفہ آئے اور کوفہ سے ذوالکفل پیغمبر کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے حلہ پہنچے۔ حلہ چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن بارونق اور پر فضا۔ یہاں پر عراق حکومت کا متصرف (کلکٹر) رہتا ہے۔ حلہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر بابل کے کھنڈر واقع ہیں جب ہماری موٹر بابل کے قریب پہنچی تو ایک کمسن عراقی لڑکے نے بطور رہبر اپنے آپ کو پیش کیا۔ ہمارے اس نوخیز گائیڈ کی عمر بمشکل دس گیارہ سال کی ہوگی نیچا کرتہ پہنے ہوئے تھا جو بہت میلا تھا۔ چہرہ گرد آلود تھا۔ ہاتھ میں ایک ٹیڑھی سی لکڑی تھی۔ سر پر رومال باندھے ہوئے تھا۔ لیکن اس ہیئت کے باوجود ذہانت کا پتلہ اور فطانت کا مجسمہ تھا۔ عربی تو خیر اس کی مادری زبان تھی۔ انگریزی اچھی خاصی بولتا تھا اور اردو سے بھی واقف تھا۔ ہر چیز کی تفصیلات اس کو ازبر تھی۔ یہ بیچارہ کھنڈروں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ جب کوئی سیاح ادھر آنکلتا ہے تو اس کی راہبری کے فرائض انجام دے کر کچھ پیدا کرلیتا ہے۔

وہ بابل جو پہلے زمانہ کا حسین ترین شہر تھا۔ اب خاک کے تودوں میں تبدیل ہوگیا ہے۔ کئی میل تک ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ شہر کے بازاروں کارواں سراؤں اور تفریح گاہوں کا ایک دھندلا سا نقش بھی باقی نہیں رہا۔ پہلے بابل کے وسط میں دریا موجیں مارتا تھا اور اب ریل کی پٹری گذرتی ہے اور ریل کا انجن دھواں اڑاتا ہوا ان شاہی محلوں کے قریب سے گذر جاتا ہے جہاں بڑے بڑے بادشاہوں کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتے تھے۔ ایوان شاہی کے آس پاس مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں محکمۂ الکشافات اثری کی سعی و توجہ سے قبل یہ کھنڈر مٹی میں دبے ہوئے تھے بڑی کوشش کے بعد ان آثار کو نکالا گیا ہے۔

•

چاہ بابل چاہ بابل کا نام بچپن سے سنتے آئے تھے۔ ہاروت ماروت کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ فرشتے بابل کے کسی کنوئیں میں قید کردئے گئے۔ اب تو یہ کنواں گرد سے اٹ گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین گز گہرا ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو مصلحتاً بند کردیا گیا ہے۔ اس بیئر معطلہ میں کیا اسرار بند ہیں اس کا علم خدا کے سوا اور کس کو ہو سکتا ہے۔

شاہی حمام چاہ بابل سے تھوڑے فاصلہ پر "حمام" ہے۔ بخت نصر شاہ بابل کے عہد میں یہ حمام بنہ جانے کیا کچھ ہوگا۔ اس وقت تو صرف ایک زینہ باقی ہے۔ جو نیچے زمین تک چلا گیا ہے۔ پانی اب تک دکھائی دیتا ہے۔ مگر استعمال نہ ہونے کے باعث گدلا ہو گیا ہے۔ زینہ کے پہلو میں بعض شکستہ دیواریں نظر آتی ہیں جو حمام کی عمارت ہی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ حمام کے کمروں کی دیواریں ہیں جہاں نازنینانِ حرم لباس تبدیل کرتی ہوں گی۔ اُس زمانہ کی عورتوں کو بناؤ سنگھار کا بڑا شوق تھا۔ کیا عجب ہے کہ یہ عمارت "آرائش گاہ" کا کام دیتی ہو۔

ایوانِ خاص حمام سے چند قدم فاصلے پر قصرِ خاص ہے۔ جو اِس وقت عظیم الشان خاک کا تودہ ہے۔ صرف ایک دو چبوترے اور ایک آدھ شکستہ دیوار باقی رہ گئی ہے۔ یہ چبوترے شاہی تخت کا کام دیتے تھے جس پر بیش بہا قالین بچھے رہتے تھے۔ یہ قصر بادشاہ کا خاص محل تھا۔ جہاں عیش و عشرت کا بازار گرم رہتا تھا۔ نوجوان چھوکریاں ساقی گری کرتی تھیں۔ کافوری شمعوں کی کثرت سے رات میں دن کا سماں نظر آتا۔

باغہائے معلق ایوان خاص سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر معلق باغیچے ہیں۔ جن کے شکستہ ستون باقی رہ گئے ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے اپنی بیوی کو خوش کرنے کیلئے یہ طلسمی باغ بنوائے تھے۔ بابل کے یہ معلق باغ اُس زمانے کے عجائبات میں شمار کئے جاتے تھے۔ ہوشیار انجینیروں نے اس ترتیب کے ساتھ پشتے لگاکر ستون بنائے تھے کہ ان کی چھتوں کے پودے معلق نظر آتے تھے۔ آبشاروں، فواروں اور خوشنما روشوں کا معقول انتظام تھا۔ گرمی کے زمانے میں یہ باغیچے پہاڑی مقامات کا کام دیتے تھے۔

شاہی عبادت گاہ شاہی مسجد کی صرف چند شکستہ دیواریں باقی رہ گئی ہیں۔ ان دیواروں پر بعض ایسے خونخوار درندوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جو اِس وقت دنیا میں نہیں پائے جاتے۔ ایک درندے کی زبان سانپ کے پھن کی طرح ہے۔ شاید اس جانور کو Dragon کہتے ہیں اینٹوں پر رنگ روغن کرکے یہ تصاویر مرتب کی گئی ہیں۔ رنگ روغن اب بھی نظر آتا ہے۔

شیر کا مجسمہ معبد کے بعد غاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو حقیقت میں شاہی عمارتوں کے آثار ہیں۔ بعض غار بہت گہرے ہیں۔ ان غاروں کے بیچ میں شیر کا مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ یہ مجسمہ سیاہ پتھر کا ہے۔ شیر کے نیچے ایک عورت کا مجسمہ ہے جو چت لیٹی ہوئی ہے۔ نہ معلوم اس مجسمہ کا منشا کیا ہے؟ جب محکمہ آثار قدیمہ نے بابلی کھنڈروں کی کھدائی کی تو یہ مجسمہ مٹی کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اب اس کو ایک اونچے چبوترے پر رکھ دیا گیا ہے۔

شارعِ خسروی معبد اور قصر کے قریب ہی ایک فراخ و وسیع راستہ کے نشان پائے جاتے ہیں جو بادشاہ کی سواری کیلئے مخصوص تھا۔ یہ راستہ اسقدر چوڑا ہے کہ دس بارہ گھوڑے اس پر سے بیک وقت گذر سکتے ہیں۔ اس پر جو سیاہ مسالہ بچھا ہوا ہے وہ "کولتار" سے بہت ملتا جلتا ہے۔

عبرت اس عبرت کدے کو دیکھنے کے بعد اپنے نوخیز گائڈ کو چند عراقی سکے دیئے۔ اُس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے "خدا حافظ" کہا اور ہم وہاں سے بغداد شریف کے لئے روانہ ہو گئے۔

بخت نصر کو کیا خبر تھی کہ اُس نے جس طلسمی عمارت پر بے شمار دولت صرف کی تھی اس کا آئندہ چلکر یہ مصرف ہوگا کہ ایک عراقی چرواہا اس کے شکستہ آثار دکھا کر چند پیسے پیدا کر لیا کرے گا۔

ہماری نظر میں

تفسیر ابن کثیر اردو

:- ہدیہ فی پارہ ایک روپیہ آٹھ آنہ ۔ ملنے کا پتہ :- نور محمد کارخانہ کتب آرام باغ، کراچی۔

علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۷۴ھ) آٹھویں صدی ہجری کے نامور مفسر گزرے ہیں اپنے زمانے کے متعدد اکابر علماء کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) سے بھی انھوں نے اکتساب علم کیا تھا! علامہ ابن کثیر بڑی جامع شخصیت کے حامل تھے، تفسیر کے علاوہ حدیث، فقہ، نحو اور تاریخ میں بھی علامہ موصوف نہ صرف یہ کہ درک بلکہ قابلِ ذکر بصیرت رکھتے تھے۔

علامہ ابن کثیر قدس سرہ کی تفسیر کے بارے میں حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے بہت وقعت رکھتی ہے :۔ ـــــ

لم یولف علےٰ نمطہ مثلہ (اس نہج پر دوسری تفسیر نہیں لکھی گئی)

علامہ ابن کثیر سے پہلے بعض تفاسیر میں اسرائیلیات کی کافی آمیزش پائی جاتی تھی، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اسرائیلیات کا بہت سا حصہ حذف کر دیا! تفسیر ابن کثیر ہر طبقہ اور ملک کے علماء کے نزدیک قابلِ اعتماد ہے! اسی مشہور و مقبول تفسیر کا اُردو ترجمہ "نور محمد کارخانہ تجارت کتب" نے شائع کیا ہے، ترجمہ کی زبان آسان اور سہل ہے، اُردو داں طبقہ کے لئے تو یہ ترجمہ نعمت غیر مترقبہ ہے!

تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ دوم)

از :- مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۴۰۸ صفحات، قیمت چھ روپیہ آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :- دار المصنفین اعظم گڑھ (یو۔پی۔بھارت)

مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی شخصیت اس قدر مقبول و محبوب اور جامع ہے کہ اُن کے لئے بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے ـــ کہ اللہ تعالیٰ ان جیسی بہت سی مثالیں اُمتِ مسلمہ میں پیدا فرما دے ـــ متعنا اللہ بطول حیاتہٖ! (آمین)

مولٰنا موصوف کی معرکہ آرا تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پہلی جلد کے بعد دوسری جلد کا شدت سے انتظار تھا، اب یہ جلد ثانی خاصے اہتمام کیساتھ "دار المصنفین" نے شائع کی ہے جس کیلئے یہ نامور ادارہ تبریک و تحسین کا مستحق ہے!

یہ پوری کی پوری کتاب شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و حالات پر مشتمل ہے، ذیلی عنوانات تو سینکڑوں ہیں، مندرجہ ذیل "ابواب" سے کتاب کی جامعیت اور اہمیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ابن تیمیہ کے حالاتِ زندگی ـــ نمایاں صفات و کمالات ـــ تصنیفی خصوصیات ـــ مخالفت کے اسباب ـــ شیخ الاسلام ایک عارف باللہ اور محقق ـــ تجدیدی و اصلاحی کام ـــ فلسفہ و منطق و علم کلام کی تنقید ـــ غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید ـــ ردِ عیسائیت ـــ ردِ شیعیت ـــ علوم شریعت کی تجدید ـــ فکر اسلامی کا احیاء ـــ فقہیات کا ماخذ کتاب و سنت ـــ تلامذہ و منتسبین۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ حقیقت میں "سیف اللہ المسلول" (اللہ تعالیٰ کی برہنہ شمشیر) تھے، اُن میں بے شک شدت تھی مگر اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی حفاظت کے واسطے! شرک و بدعت کی انھوں نے اس شد و مد کے ساتھ تردید کی کہ آج بھی اہلِ بدعت "ابن تیمیہ" کا نام سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں وہ توحیدِ خالص اور دین صافی وحقیقی کے داعی اور علمبردار تھے، اس تنہا شخص نے تقلیدِ جامد کے مستحکم قلعوں میں سچ تو یہ ہے کہ شگاف ڈال دیے، کتاب وسنت کی اطاعت کے ساتھ آج مسلمانوں میں جتنی بھی حریت رائے اور تنویر فکر پائی جاتی ہے، اس میں افکارِ ابن تیمیہؒ کی بہت کچھ جھلک ملتی ہے، "تجدیدِ دین" کی قبا تو اُن کے قامتِ موزوں پر اس قدر راست آئی کہ جیسے اسی قامتِ زیبا کے لئے یہ مقدس قبا تیار ہوئی تھی!

مولانا علی میاں کا قلم اور علامہ ابن تیمیہ کی سیرت، اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب میں کتنی دلکشی، جاذبیت اثر آفرینی اور ایمان کے لئے کس قدر تازگی ہوگی! یہ حقیقت ہے کہ جناب علی میاں نے سوانح نگاری کا حق ادا کر دیا ہے تاریخی پس منظر، مستند واقعات، علمی محاکمہ، نازک مباحث کا تجزیہ یہ تمام خوبیاں اس کتاب میں ملیں گی" اور سب سے بڑھ کر لکھنے والے کا اخلاص، اور دل کا درد و سوز! زبان معیاری، اندازِ بیان باوقار ہونے کے علاوہ شگفتہ بھی ہے! ایک اقتباس :-

"امام ابن تیمیہ نے اپنے حافظۂ خداداد سے اس پورے علمی ذخیرہ پر عبور حاصل کیا، اور اس کو فکری طور پر ہضم کر لیا، اور اس سے اپنی تصنیفات میں پورا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کی بے چین اور مواج طبیعت، ان کا نکتہ آفریں دماغ اور اُن کا سیال و رواں قلم اس پر قانع نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ صرف نقل و روایت اور شرح و تلخیص یا انتخاب پر اکتفا کریں۔ قرآنِ مجید کا گہرا علم، مقاصدِ شریعت سے گہری واقفیت اور اصول فقہ اور اصول تشریع کا ملکۂ راسخہ ان کی ہر تصنیف کا رفیق ہے، وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اس میں اپنے تازہ علم سے جان ڈال دیتے ہیں، ان کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہوگی جس میں کچھ نئے علمی حقائق، علمی نکتے، ناقدانہ بحثیں اور جدید اصولی مباحث نہ ملیں، اور قرآن مجید کے فہم کی ایک نئی راہ اور شریعت کے مقاصد سمجھنے کا نیا دروازہ کشادہ نہ ہو ——"

مولانا علی میاں نے بڑی سچی بات کہی ہے :-

"... مذاہب فقہیہ کے آہنی سانچے بن گئے تھے، جن میں لوچ نہیں تھا، یوں کہنے کو حق کو مذاہب اربعہ میں دائر مانا جاتا تھا لیکن عملاً ہر مذہب کے پیرو حق کو اپنے مذہب و مسلک کے اندر محدود مانتے تھے ....." (صفحہ ۳۰)

ایسی سے ملتی جلتی بات اگر مولانا مودودی یا جماعتِ اسلامی کے کسی عالم کے قلم سے نکلتی ہے تو معترضین کی زبان بے لگام ہو جاتی ہے!!

"..... لوگوں میں اس خبر سے ایک اضطراب پیدا ہوا، نمازوں میں قنوتِ نازلہ

کا اہتمام کیا گیا اور بخاری شریف کا ختم ہوا۔" (صفحہ ۴۸)

یہ "بخاری شریف" کا ختم کیا چیز ہے؟ اس کے لئے کوئی سند، کوئی ثبوت اور حجت ...؟ ظاہر ہے کہ کتاب وسنت، آثارِ صحابہ اور باقیاتِ تابعین میں تو "ختم بخاری" کے لئے کوئی ثبوت مل ہی نہیں سکتا کہ "صحیح البخاری" اس وقت تک مدون کب ہوئی تھی، اور اس بات کی کوئی سند دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی کہ صحابہ کرام یا تابعین نے مصیبت کے کسی نازک اور سخت وقت میں حضور کی "احادیث" کی اس نیت سے قرأت کی ہو کہ ان کے پڑھنے سے یہ مصیبت ٹل جائے گی! حامیانِ بدعت کے یہاں اور "ختم بخاری" حیرت بالائے حیرت۔!؟

کتاب کے آخر میں علامہ ابن تیمیہؒ کے بعض مشہور تلامذہ و منتسبین مثلاً حافظ ابن قیمؒ، ابن الہادیؒ، ابن کثیرؒ حافظ ابن رجبؒ اور علامہ ابو اسحٰق شاطبیؒ رحمہم اللہ تعالیٰ کے بھی مختصر حالات درج ہیں۔

"صحت نامہ" سے پہلے سولہ صفحات پر مشتمل اسماء و کتب کا اشاریہ (انڈکس) ہے! یہ کتاب اس قابل ہے کہ بار بار پڑھی جائے اور اُردو داں گھرانوں میں اسے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے!

جناب علی میاں نے یہ معرکہ آرا کتاب لکھ کر اُردو داں مسلمانوں پر احسان کیا ہے اور اردو ادب میں اس کتاب کی بدولت ایک جاندار گرانقدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے۔

ماہنامہ "مقامِ رسالت"

مدیر ــــ محمد سلیم الدین شمسی۔ قیمت فی پرچہ چھ آنہ، سالانہ چار روپے۔
ملنے کا پتہ: "مقامِ رسالت" ۱۳۲ بریٹو روڈ، کراچی نمبر

ماہنامہ "مقامِ رسالت" پر ہمیں اب سے بہت پہلے تبصرہ کرنا چاہئے تھا، مگر نہیں کیا گیا، اپنی اس کوتاہی کا ہمیں اعتراف ہے، ظاہری خوش نمائی (گیٹ اپ) کے اعتبار سے بھی یہ مجلہ خوب ہے، کرنا فلی سفید کاغذ، کتابت واضح اور دیدہ زیب، طباعت اس سے زیادہ خوب تر! سرورق رنگین!

پاکستان بننے کے بعد یہاں جہاں دوسرے فتنے اُٹھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ "انکارِ حدیث" کا ہے، مسٹر پرویز اسی فتنہ کے قائد اور اس ٹولی کے سرغنہ ہیں۔ ماہنامہ "مقامِ رسالت" کا موضوع ہی احادیثِ نبوی کی تائید وحمایت اور "انکارِ حدیث" کی تردید ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اپنے مقاصد وعزائم میں یہ رسالہ ہر اعتبار سے کامیاب ہے:

"مقامِ رسالت" کے فاضل مدیر مولانا محمد سلیم الدین شمسی اور ان کے رفیقِ کار جناب مولانا افتخار احمد بلخی کے مضامین اس رسالہ میں سب سے زیادہ نمایاں رہے ہیں! اور ان میں سے بعض مضامین تو اس قابل ہیں کہ اُنھیں علیحدہ کتابی صورت میں چھپوا کر مفت تقسیم کیا جائے اور گھر گھر پہونچایا جائے۔

پرویز کی قرآنی تحریفیں، دینی تصورات کی مسخ شدہ تعبیریں، اس کی تحریروں کا تضاد اسلام کو "تجدد و الحاد" کے قالب میں ڈھالنے کے لئے اُس کے حیلے اور نکتے، ان سب کی قلعی "مقامِ رسالت" میں کھولی گئی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اندازِ بیان شریفانہ اور با وقار ہے اور جذباتیت سے زیادہ دلائل و براہین کی فراوانی ہے:

ماہنامہ "مقامِ رسالت" زیادہ سے زیادہ تعاون کا مستحق ہے، اس کے کارکنوں کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجرِ جزیل عطا فرمائے گا کہ وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود اس قدر استقامت کے ساتھ فتنۂ انکارِ حدیث کا مقابلہ کر رہے ہیں!

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۹ نمبر ۱۲

فاران

مارچ ۱۹۵۸ء ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ ... چھ روپے

فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر محمود حسین ——— ادبی پریس برنس روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اسلام اور صرف اسلام ہی "دینِ فطرت" ہے، اس لئے عیسائیت کی طرح اسلام سائنس کی ترقیوں کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا، تہذیب و تمدن اور علم و فن کی ہر وہ ترقی جو انسانی معاشرہ کے لئے فلاح و بہبود کا سبب بن سکتی ہے، اسلام اس سے ہم آہنگ ہونے کی لچک اپنے اندر رکھتا ہے، اسلام اپنی ذات سے امن و سلامتی واقع ہوا ہے، افادیت اس کی فطرت اور خیر اس کا مزاج ہے، اس لئے خیر و فلاح کی جہاں سے بھی کوئی آواز اٹھتی ہے اسلام اس پر "لبیک" کہتا ہے، حاتم طائی اور نوشیرواں مسلمان نہ تھے مگر اسلامی ادب میں ان کا نام ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا گیا ہے! ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ مسلمان علماء تھے، جنھوں نے یونان و روما کے فلسفہ کو دنیا سے روشناس کرایا، اگر مسلمان فلسفہ کی سرپرستی نہ کرتے تو افلاطون و ارسطو کا نام تو شاید کتابوں میں باقی رہ جاتا مگر ان کا "کام" گمنامی کے گرد و غبار میں دب کر رہ جاتا! اسلام نے اپنے ماننے والوں میں ترقی کی ایک برقی رو دوڑا دی تھی، یہی سبب تھا کہ ایک زمانہ میں علم و فن اور ایجاد و اختراع کی زمامِ قیادت مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں تھی اور تہذیب و تمدن کے خاکوں میں مسلمان ہی رنگ بھرتے تھے!

مسلمانوں نے علم و فن کو، سائنس اور تمدن کو اس لئے آگے نہیں بڑھایا کہ وہ دنیا کو مرعوب اور خوف زدہ کرنا چاہتے تھے، اور ان ایجادات و اختراعات اور ترقیوں کی بنیاد اس جذبہ پر نہ تھی کہ ساری دنیا اُن کی برتری کی قائل ہو جائے اور لوگ اُن کی علمی ترقیوں کو دیکھکر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں، مسلمانوں نے دنیا کے ساتھ ایسا اچھا برتاؤ اور ظالمانہ سلوک کبھی نہیں کیا، انھوں نے علم و فن کو آگے بڑھایا اور سائنس میں ایجاد و اختراع بھی کی، مگر کس لئے؟ اس لئے کہ مخلوقِ خدا کو اس سے فائدہ پہونچے، اور دنیا اس سے تمتع حاصل کرے! مسلمانوں نے علوم و فنون کو جو ترقی دی، اس کی بنیاد خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے جذبہ پر تھی اور وہ اپنے نبیؐ اور انسانیت کے محسنِ اعظم کے اس ارشاد کی بنا پر کہ "الخلق عیال اللہ" (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے)

خلقِ خدا کی محبت اور خیر خواہی کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں!

مگر ہم نے اپنے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے علم و فن کا یہ حزنیہ اور سائنس کی یہ ٹریجڈی بھی دیکھ لی کہ سوویٹ روس نے

اپنا نابکار سیارہ (اسپٹنک) خوف و دہشت کی ایک علامت بنا کر فضا میں اُڑایا، اور اپنے حریفوں کو چیلنج دیا کہ وہ چاہے تو اس قسم کی ہیبت ناک اور تباہ کن ایجادات سے بڑے سے بڑے فاصلہ کی آبادیوں کو تباہ و برباد بلکہ خاک سیاہ کر سکتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹوں نے دنیا کو تباہ و بربادی کے سوا اور دیا ہی کیا ہے، انتشار، بدامنی، نزاع اور تخریب یہ چیزیں کمیونزم کی مزاج اور سرشت میں داخل ہیں، یہی سبب ہے کہ کمیونسٹ عالموں اور سائنس دانوں کے دل بھی گداز سے محروم ہوتے ہیں، پتھر سے بھی زیادہ سخت، جن میں مروت کی نرمی اور رواداری کی کوئی لچک نہیں! بس یہی ایک دُھن اور لگن کہ کارل مارکس اور لینن کی خدائی کا تخت ساری دنیا پر بچھ جائے، چاہے اس کے لئے انسانوں کی بستیاں آگ اور لہو کی نذر ہو کر کیوں نہ رہ جائیں!

جہاں تک "نظریاتی جنگ" کا تعلق ہے، کمیونزم اس میدان میں شکست کھا چکا ہے، دنیا اس کے فریب سے باخبر ہو چکی ہے، خود روس کے لوگ کمیونزم کا مزہ چکھ کر اور اس نظام کا تجربہ کرنے کے بعد اس سے انتہائی بیزار ہیں روس کے دوست اور حلیف پنڈت نہرو اور جمال ناصر تک نے "کمیونزم" سے اپنی بے تعلقی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، خود چین کے کمیونسٹ لیڈر کمیونزم کی مقبولیت کے لئے چین میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں مگر چونکہ وہ جانتے ہیں کہ کمیونزم سے لوگ بیزار، خوف زدہ اور متنفر ہیں، اس لئے وہ "کمیونزم" کو دوسرے ناموں سے پیش کرتے ہیں اور باہر کے وفود اور سیاحوں کے سامنے کمیونزم کا نام تک نہیں لیتے اور اپنے عزائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں!

روسی ڈکٹیٹروں نے کمیونزم کی اس عدم مقبولیت اور غیر ہر دلعزیزی کو دیکھ کر یہ تدبیر سوچی ہے کہ سائنس کی ہیبت ناک ایجادوں سے دنیا کو مرعوب اور خوف زدہ بنا دیا جائے، اور اسی رعب اور خوف کے بل بوتے پر کمیونزم کو زندہ رکھا جائے! اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی دنیا میں "خوف و دہشت" کو اہمیت حاصل ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ جس نظریہ کی بنیاد خوف و دہشت پر ہوتی ہے، وہ نظریہ اور نظام زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا، راکٹوں سے لوگوں کو مرعوب تو کیا جا سکتا ہے، مگر راکٹ، لوگوں کے دلوں میں کسی نظریہ کو اُتار نہیں سکتے! دنیا میں تحریکوں اور نظریوں کی مقبولیت اور کامیابی کا تعلق دلوں کی رضامندی سے ہے، کہ کسی دنیوی لالچ، دباؤ اور خوف کے بغیر لوگ اسے قبول کریں اور فارس سے سلمانؓ، رُوم سے صہیبؓ اور حبش سے بلالؓ کھنچے چلے آئیں!

جرأت کی کمی

دوسری طرف مرعوبیت، بزدلی اور احساس کمتری کا یہ منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھ لیا کہ روس کے "اسپٹنک" نے امریکہ میں کھلبلی پیدا کر دی اور وہاں کے لوگ ڈر کر اور سہم کر رہ گئے، امریکہ کے سائنس دانوں نے جیسے تیسے اپنا بھی ایک "سیارہ" فضا میں چھوڑ ہی دیا ورنہ آئزن ہاور کی صدارت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا! امریکہ والوں کی اس مرعوبیت، بدحواسی اور گھبراہٹ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عیش و راحت کے آغوش میں نشو و نما پانے والی قوم خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور سرمایہ داروں میں جرأت برائے نام ہوتی ہے! جو حکومتیں امریکہ کی حلیف ہیں ان کو اس حقیقت سے غافل نہیں رہنا چاہئے کہ امریکہ کے پاس مال و دولت اور ہتھیاروں کی بے شک بہتات ہے مگر جرأت کی کمی ہے! مال و دولت کی محبت اور عیش و راحت کی ہوس اور جرأت و بہادری ایک دل میں مشکل ہی سے جمع ہو سکتی ہیں! بزدل پیسہ والے کی دوستی امن و اطمینان کے

زمانہ میں تو فائدہ مند ثابت ہوتی ہے لیکن جنگ کے دوران میں خطرہ سے خالی نہیں کہ نہ جانے کس مرحلہ میں راہِ فرا
اختیار کر جائے اور کب سپر انداختہ ہو جائے۔

ہیروشیما میں امریکہ نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ سرمایہ دار جب اپنے حریف کو کمزور پاتا ہے
پھر بڑے سے بڑے ظلم پر اُتر آتا ہے، مگر اپنے سے قوی اور طاقتور کے مقابلہ میں کان دبائے رہتا ہے!

سرمایہ دار ذہنیت کا یہ بھی خاصہ ہے کہ وہ ڈبل گیم کھیلتی ہے اور موافق و مخالف دونوں کو خوش رکھنے
کی کوشش کرتی ہے، اور کسی جرأت مندانہ اقدام کی اسے کم ہی توفیق نصیب ہوتی ہے! کشمیر کے مسئلہ میں
امریکہ کی پالیسی کا ہم برسوں سے تجربہ کر رہے ہیں، امریکہ کا سفیر ہندستان میں کچھ کہتا ہے اور پاکستان میں ان
نمائندہ کا اندازِ گفتگو بدلا ہوا ہوتا ہے، کشمیر کے مسئلہ میں جس طرح روس نے کھل کر بھارت کی تائید کی ہے
اس کا دسواں حصہ بھی امریکہ نے پاکستان کی موافقت میں اپنی رائے عزم اور فیصلہ کا اظہار نہیں کیا! امریکہ نے
مسئلہ کشمیر میں پاکستان کی تائید میں جب بھی کچھ کہا ہے تو چبا چبا کر بات کی ہے، دبا ہوا لہجہ، ایسی دو طرفہ محتاط
گفتگو کہ پاکستان بھی خوش ہو جائے اور ہندستان بھی ناراض نہ ہو!

دُنیا کس طرح فلاح پا سکتی ہے؟؟

بات میں بات نکل آئی، مسئلہ کشمیر پر گفتگو مقصود
نہ تھی کہ یہ اپنی جگہ خود ایک مستقل موضوع ہے، بار
تو کہنا یہ ہے کہ آج کی دنیا روس اور امریکہ کی حریفانہ نزاع کے درمیان کراہ رہی ہے، اب معاملہ اس نوبت تک آ
پہونچا ہے کہ روس نے اپنا ایک "سیارہ" فضا میں اُڑایا، تو دوسری طرف سے امریکہ نے اپنا راکٹ چھوڑ دیا دونوں
حکومتیں اپنے رعب اور دبدبہ کو برقرار رکھنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی ہیں، نیتیں دونوں کی اچھی نہیں ہیں
روس کی روش امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین اس لئے ہے کہ اسی زمانہ میں جب کہ اُس نے فضاؤں
میں "سیارے" چھوڑ رکھے ہیں، رُوس کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ خدا کے تصور نے دنیا کی ترقی کو روک رکھا ہے
اس لئے اس "تصور" (ایمان باللہ) کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

انسانیت کی فلاح و بہبود کی توقع نہ روس سے ہے اور نہ امریکہ سے! ان دونوں طاقتوں کی باہمی کشمکش
خلقِ خدا کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذات کے فائدے کے لئے ہے! ان حکومتوں میں سے کسی کا بھی نظام حق و
انصاف، اور پاکیزگی و نیکوکاری کی اساس پر مرتب نہیں ہوا، یہ انسانوں کے بنائے ہوئے دستور اور خود ساختہ نظام ہیں
اُن انسانوں کے جو ریت کے ایک ذرہ کی تخلیق کا بھی صحیح علم نہیں رکھتے، اور جن کی فکر و نگاہ کو قدم قدم پر ٹھوکریں
لگتی ہیں!

انسان اپنے آپ تو پیدا نہیں ہو گیا، اور نہ "حیات" اپنی خالق آپ ہے، انسان اور زندگی کو جس نے
پیدا کیا ہے، وہی انسان کے لئے اور زندگی کے واسطے "ضابطہ" اور دستور و آئین نازل کرنے کا حق رکھتا ہے،
اُس نے جس طرح انسان کو دنیا میں بھیجا، تو اُس کی زندگی کے لئے ہوا، پانی، غذا اور لباس کے سامان بھی مہیا کر دئے،
اسی طرح یہ کیسے ممکن تھا کہ جس خالق نے انسان کے جسم کی بقاء کے لئے ایک پورا نظام قائم کیا، وہ اس کی روح جذبات،
تصورات بلکہ یوں کہئے "اصل حیات" کے لئے کوئی ضابطہ آئین اور نظام نازل نہ فرماتا، اگر اللہ تعالیٰ انسان

کو پیدا کرکے آزاد چھوڑ دیتا کہ خوب و ناخوب کا فیصلہ وہ خود کرے، اور ہدایت و ضلالت کے درمیان اپنی عقل کے بل بوتے پر خطِ فاصل کھینچے، تو اس سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ملہ پر حرف آتا اور دوسری طرف خود انسان مشکلات کی دلدل میں پھنس جاتا!

اللہ تعالیٰ کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کو خلق کیا تو اس کی زندگی کے لئے ایک "ضابطہ" بھی نازل فرما دیا جس طرح انسان "فطرت" پر پیدا کیا گیا ہے، اور تمام انسان اپنی بنیادی جبلت اور اساسی فطرت کے اعتبار سے "ایک" اور "کنفس واحدہ" ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسلام کو جو دینِ فطرت ہے تمام انسانوں کے لئے ضابطۂ حیات بنایا کہ یہی خوب و ناخوب کا معیار ہے، یہی کھرے اور کھوٹے کی کسوٹی ہے۔ اور یہی ہدایت و ضلالت کے درمیان حدِ فاصل ہے! اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں سے بہترین لوگ اس منصب کے لئے منتخب فرمائے، جو ہر دور میں اس "ضابطۂ حیات" کو دنیا کے سامنے ٹھیک اُسی شکل میں پیش کرتے رہے جس شکل میں یہ ضابطہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر اُتارا تھا، یہاں تک کہ عرب کے ایک اُمّی مُعلّم اخلاق اور اللہ تعالیٰ کے آخری اور سب سے بڑے "نائب اور نمائندے" نے اس دینِ فطرت اور ضابطۂ حیات کو مکمل ترین شکل و صورت میں پیش فرما کر، اس پر مہر لگا دی کہ اس ضابطہ کے اساسی اصولوں میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی ممکن ہے!

یہ جو آج سارے عالم میں ابتری و انتشار برپا ہے اور دُنیا کے ہر گوشہ میں اضطراب اور بدحالی پائی جاتی ہے، اس کا اصل سبب ہدایت کے راستہ سے لوگوں کا ہٹ جانا ہے، صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے کہ افراد اور قومیں خاک چھانتی اور ٹھوکریں کھاتی پھریں، اور اُن کو سرگشتگی و حیرانی اور نامرادی کے دھکّوں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے!

دنیا کو اگر امن و آشتی مطلوب ہے، فوز و فلاح کی تمنا ہے، اور لوگ واقعی عام حالات کی ابتری سے تنگ آ چکے ہیں، تو پھر اُن کے تمام دکھوں کا علاج "اسلام" اور صرف "اسلام" ہے۔ یہ وہ دینِ فطرت ہے، جو انسانوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے گُر بتاتا ہے، جو دلوں کو خیر و فلاح کے لئے اُبھارتا ہے، اور قوموں اور ملکوں میں بٹی ہوئی دنیا کو "ایک کلمہ" پر جمع کرتا ہے ——— انسانی تاریخ میں کوئی شک نہیں کہ بڑے بڑے انسان پیدا ہوئے ہیں، جن کے احترام سے ہمارے قلوب لبریز ہیں مگر "انسانِ کامل" بس ایک ہی پیدا ہوا، اور اسی کی زندگی تمام دنیا کے لئے معیار ہے، کسوٹی ہے اور نمونہ ہے، جس زندگی میں اس نمونہ اور اُسوۂ حسنہ کی جھلک نہیں، وہ زندگی انسان کی نہیں، حیوان کی زندگی ہے اگر لوگوں کو وہ زندگی، اور بربریت چھوڑ کر "انسان بننا ہے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر چارہ نہیں! دنیا کے اندھیرے کو مٹانا ہے تو اسی "سراجِ منیر" سے روشنی لینی ہوگی، کائنات کو رحمت و رافت سے معمور کرنا ہے تو "رحمۃ اللعلمین" کی رحمت اور خلقِ خدا سے آپ کے ہمدردی کے جذبہ کو رہنما بنانا ہوگا، مزدوروں غریبوں اور محتاجوں کے مسائل کو فطری توازن کے ساتھ حل کرنا ہے، تو اس کملی والے انسانِ کامل کی زندگی میں ان مسائل کی کلید ملے گی، جس نے بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلایا ہے، اور جس کے فقر کے سامنے شہنشاہی

متاعِ حقیر نظر آتی ہے:

توبہ و انابت کا وقت

روس اور امریکہ کے درمیان جو "سیارہ بازی" ہو رہی ہے، اس نے اللہ کے فضل سے ہمیں ذرہ برابر مرعوب نہیں کیا، اور نہ ہمیں اپنی جان کی کوئی فکر لاحق ہوئی، یہی وہ نازک مواقع ہیں جہاں خدائے قادر و برتر کی ذات پر اعتماد کام آتا ہے! اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور جبروت کے مقابلہ میں ہر بڑی سے بڑی طاقت حقیر دکھائی دیتی ہے! موت ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے وہ آکر رہے گی، اگر راکٹوں ہی کے ذریعہ ہماری موت کا آنا لکھ دیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کا لکھا پورا ہو کر رہے گا" اور کوئی تدبیر اس نوشتہ کو بدل نہیں سکتی! ہمارا فرض تو یہ ہے کہ نفسِ واپسیں اور آخری دم تک اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں، اور اس حقیقت پر ہمارا یقین ایک لمحہ کے لئے بھی ذرہ برابر متزلزل نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہماری جانوں کو خرید چکا ہے، اور مشتری جب چاہے اپنی امانت کو واپس لے سکتا ہے، ہماری دیانت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی امانت میں خرد برد نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے خیانت کاروں کی طرح نہیں بلکہ دیانت داروں اور امانت کی حفاظت کرنے والوں کی حیثیت میں حاضر ہوں!

ممکن ہے کہ اب سے چند صدی قبل بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہو کہ قیامت جب نازل ہوگی تو قرآن کی زبان میں پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے اور لوگ پتنگوں کی طرح اُڑے اُڑے پھریں گے مگر بیسویں صدی عیسوی میں "ایٹم" کی زبان سے اس کی شہادت دلوا دی گئی کہ یہ سب کچھ ممکن ہے بلکہ ہو کر رہے گا!

تو جب کہ

یہ حالات امکانی حدود سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، زمانہ غفلت و سرشاری کا نہیں بلکہ توبہ و انابت، استغفار و توجہ الی اللہ اور بیدار رہنے کا ہے! اور اب سچ مچ وہ وقت آگیا ہے کہ:-

خواہم کہ خار از پا کشم ــــ صد سالہ راہم دور شد

اگر اپنے فرضِ عبدیت کا صحیح احساس اور خاطر خواہ شعور ہو تو زندگی میں فرصت کہاں میسر آسکتی ہے عمل اور پیہم عمل!

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

آخرت کی فکر اگر دل میں جاگزیں ہو جائے تو اپنے سے زیادہ خوشحال لوگوں کو دیکھ کر نہ تو رشک، و منافرت کا جذبہ پیدا ہو، اور نہ اپنے سے کمتر انسانوں پر نظر ڈال کر فخر و غرور کے لئے طبیعت آمادہ ہو یہ آخرت فراموشی ہی تو ہے" جو آدمی کو عیش و تفریح کے طوفانوں میں غوطے دیتی رہتی ہے اور آدمی ان جنجالوں سے کسی طرح سیر نہیں ہو پاتا اور اس کی نفسانی خواہشیں ہر وقت "الجوع" اور "العطش" پکارتی رہتی ہیں، اسلام کے پاس "یادِ آخرت" کا ایسا نسخہ ہے، جو انسان کے اردگرد تقویٰ اور نیکوکاری کا حصار باندھ کر اسے بہت سی

برائیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھتا ہے، جس زندگی کے اردگرد یہ حصار نہیں، وہاں بھلائی نہیں ——— وحشیوں اور بن مانسوں جیسی زندگی!

حق نہیں بدلتا!

سائنس کی کارفرمائیوں بلکہ یوں کہئے معجز نمائیوں کے ہم منکر نہیں ہیں، مگر اس شخص کے حال پر رحم آتا ہے، جس کے دینی اعتقادات روس اور امریکہ کے "سیاروں" کا شہرہ سن کر اپنی جگہ ہل گئے ہوں، اور "مادے" نے جس کی نگاہ میں عظمت و احترام کا غیر معمولی مقام حاصل کرلیا ہو! جو لوگ خدا کی ذات پر ایمان نہیں رکھتے، ان سے ہم اس موضوع پر خطاب ہی نہیں کرتے، ہاں! جو افراد اللہ کو مانتے ہیں، ان کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ روس اور امریکہ کے سائنس داں جنھوں نے محیر العقول "تابکار سیارے" بنائے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے اور اسی کی دی ہوئی عقل، فراست اور دانش کے بل بوتے پر ایسی ایجادات کا انھیں فخر حاصل ہوا ہے ——— پس سائنس کی اس تمام ترقی و اختراع کا اصل کریڈٹ تو اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے حمد و شکر کی مستحق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ اتنے ذہین اور مفکر و مخترع دماغوں کو اس نے خلق کیا ہے، اور جس کی مخلوق اتنی حکمت و بصیرت رکھتی ہے اُس کا خالق کس قدر حکیم و بصیر اور عظیم و اکبر ہو گا!

سائنس داں جو کچھ ایجادیں کرتے ہیں، اس کے لئے مسالہ اور مواد تو وہ اسی دنیا سے حاصل کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے، وہ بیشک موجد اور مخترع (INVENTOR) ہیں مگر "خالق" (CREATOR) نہیں ہیں، ساری دنیا کے مشاہیر سائنس داں مل جل کر بھی کوشش کریں تو گھانس کے ایک ذرا سے تنکے اور مکھی کے ایک پر کو بھی خلق نہیں کرسکتے. سائنسدانوں کے پاس جو عقل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے اور جس مسالہ، مواد اور عناصر سے وہ اشیاء بناتے ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے تو ہر حیرت انگیز سے حیرت انگیز ایجاد کو دیکھ کر مرد مومن کے اندر ایمان و ایقان اور زیادہ راسخ اور مستحکم تر ہو جانا چاہئے نہ یہ کہ اُس کے اعتقادات ڈانواڈول ہو جائیں!

مانا کہ بعض مادہ پرست سائنس داں خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اُن کے ایمان نہ رکھنے سے اللہ کے وجود کی تو نفی نہیں ہو جاتی، ذرے اگر آفتاب کے وجود سے انکار کردیں، تو کیا اُن کا یہ انکار وجودِ آفتاب کی تردید کرسکتا ہے! اب رہا زندگی کے بنیادی حقائق اور اساسی مسائل کا معاملہ، تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی ایجاد سچائی کی کسی قدر کو نہیں بدل سکتی، اور ایک کروڑ راکٹ بھی سچ کو جھوٹ کا مقام نہیں دے سکتے، اگر انسان مریخ و عطارد اور ماہ و مشتری میں بھی جاکر بس جائے، یا وہاں انسانوں کی کسی بستی کی دریافت ہو جائے، تو وہاں بھی اللہ کا قانون اسی طرح چلے گا جس طرح اس ارضِ خاکی پر چلتا ہے! برِ اعظم امریکہ کی دریافت نے کتاب و سنت کی پیش کی ہوئی کس حقیقت کو بدل دیا ہے جو چاند کی نئی دریافت کے بعد بدل جائے گی! اللہ کا قانون ہمہ گیر اور ازلی و ابدی ہے، زمان و مکان کے تغیرات اس کی بنیاد کے ایک ذرہ کو بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کرسکتے! زمانہ کی نئی نئی ہواؤں سے متاثر ہو کر بعض کمزور فطرت انسان تو بدل جاتے ہیں مگر اللہ کا قانون ہرگز نہیں بدلتا، اگر کسی میں انقلاب سے مقاومت کی سکت نہ ہو اور وہ اپنی کمزوری اور پست ہمتی کے سبب اپنے موقف سے ہٹ جائے اور اس اپنی تبدیلی کو بنیاد

بنا کر، اللہ کے قانون میں تبدیلی کا مطالبہ کر بیٹھے یا اس کی ضرورت محسوس کرے تو ایسا مطالبہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا! اگر تتلیاں اور بھونرے اپنی نادانی سے یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ بہار و خزاں کے نظام میں ہماری تمناؤں کے مطابق تبدیلیاں کردو، پودوں اور پھولوں کی ساخت بدل دو اور موسموں کو کچھ سے کچھ بنادو ـــــ تو کیا یہ مطالبہ کسی اعتنار، اور توجہ کا مستحق قرار پا سکتا ہے!

جو کوئی اس انتشار و اضطراب، الحاد و انکار اور تشکیک و تذبذب کے دور میں اللہ اور رسولؐ کے ایمان پر جما رہے گا، وہ آخرت میں اتنے بڑے اجر کا مستحق ہوگا کہ جس کی کمیت اور کیفیت کا اس عالم اسباب اور جہانِ آب و گل میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتا، وہ منکرین جن کی شہرت اور بڑائی کے آج ڈنکے بج رہے ہیں، آخرت میں پچھتائیں گے کہ کاش ہم دنیا میں ایک سوئی اور آلپین بھی چاہے نہ بناتے مگر ایمان اور عملِ صالح کی دولت ہم کو مل جاتی، تو آج یہ نامرادی ہمارے حصہ میں کاہے کو آتی!

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حشر اُن نیک لوگوں کے ساتھ کرتے جن کو اللہ تعالیٰ نے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ـــ کی نوید و بشارت دی ہے (آمین)

فاران کا معرکۃ آرا

"خلافت نمبر"

ایک عظیم الشان تاریخی دستاویز ہوگا،

جس میں کتاب و سنّت کے حاملینِ اولین (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)

کی مقدس زندگیاں پیش کی جائیں گی،

"شمارۂ خاص" ـــــ محبت اور نفرت ـــ کے درمیان خطِ امتیاز قائم کرے گا

ایمان افروز مقالے ـــ بلند و باوقار نظمیں

منشی عبدالرحمن خاں (ملتان)

پردہ

کثیر الازدواجی اور طلاق کے بعد پردہ ہی اسلام کا ایک ایسا قانون ہے جس کی بنا پر "مہذب و متمدن" مغرب کے مفکرین و مدبرین نے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور غضب یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کی حیرت انگیز ترقی سے مرعوب اور مغرب کے صدیوں کے غلام مشرق نے وہاں کی تمام مادی ترقیوں کو بے حجابی و بے حیائی کی کرامت سمجھ رکھا ہے اور اسی لئے ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

اسی تقلید و نقالی میں آج وہی ملک پیش پیش ہیں۔ جن سے کسی زمانہ میں اسی مغرب نے تہذیب و تمدن کا سبق پڑھا تھا۔ اور جس کا اعتراف تہذیب جدید کے بانی اور مرکز فرانس کے مشہور و معروف محقق اور مورخ ڈاکٹر لیبان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"مسلمانوں نے یورپ کی ان وحشی قوموں کو انسان بنایا جنھوں نے رومیوں کی سلطنت کو فتح کیا تھا۔ مسلمانوں نے یورپ میں علوم و فنون۔ ادب و فلسفہ کا دروازہ کھول کر احسان کیا جس سے ہم یوروپین قطعاً ناواقف تھے۔ مسلمان چھ سو برس تک مشرق سے مغرب تک سارے یورپ کے استاد رہے۔ عربوں کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا۔ عربوں کی معاشرت اور تقلید نے یورپ کے امرا کی عادتوں کو درست کیا۔ اور انھیں بہتر اخلاق و عادات سکھائے۔ اور انہی کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا۔ (مشہور انگریز سائینسدان) راجر بیکن (موجودہ طریق حساب کا بانی) لیونارڈ۔۔۔ ویل نوکا آرنو۔ ریمانڈلل۔ سینٹ ٹامس۔ البرٹ بزرگ اور قسطنطنیہ کا الفانس دہم یہ سب عربوں کے شاگرد تھے۔ یا ان کی تصنیفات کے نقل کرنے والے تھے" تمدن عرب۔ بصفحات، مختلف)

عورت کی عفت و عصمت کے محافظ پردہ کی بنیاد اسلام نے نہیں رکھی۔ بلکہ اس کا رواج عہد قدیم سے چلا آرہا ہے۔ جہاں جہاں بھی زنا عام ہوتا گیا۔ وہیں پردہ کی ضرورت پیدا ہوتی گئی۔ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دول مغرب کی مہذب و متمدن ماں رومن ایمپائر میں بھی پردہ کا اسی قسم کا رواج موجود تھا جس قسم کا یہاں آج کل پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کی مندرجہ ذیل تحریر سے ظاہر ہے:۔

"رومانیوں کی عورتیں بھی اسی طرح کام پسند کرتی تھیں جس طرح مرد پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے گھروں میں کام کرتی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر اور باپ بھائی صرف میدانِ جنگ میں سرفروشی کرتے رہتے تھے۔ خانہ داری کے کاموں سے فراغت پانے کے بعد عورتوں کے اہم کام یہ تھے کہ وہ سوت کاتیں اور ان کو صاف کر کے اس کے کپڑے بنائیں۔ رومانی عورتیں نہایت سخت پردہ کیا کرتی تھیں۔ یہانتک

کہ ان میں جو عورت دایہ گری کا کام کرتی تھی۔ وہ اپنے گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ
چھپا لیتی اور اس کے اوپر ایک موٹی لمبی چادر اوڑھتی۔ جو ایڑی تک لٹکتی رہتی پھر اس چادر پر بھی ایک
عبا اور اوڑھی جاتی جس کے سبب سے اس کی شکل کا نظر آنا تو کیا۔ جسم کی بناوٹ کا بھی پتہ لگنا مشکل
ہوتا تھا۔" (مسلمان عورت صفحہ ۱۶۵)

رومن ایمپائر کی مہذب و متمدن بہن سلطنت ایران میں تو یہ پردہ اتنا سخت تھا۔ کہ ایرانی حرم میں نرگس کے پھول
بھی نہیں جاسکتے تھے۔ کیونکہ نرگس کی آنکھ مشہور ہے۔ روما اور ایران کی طرح یونان، شام اور عرب میں بھی پردہ کا
سخت رواج تھا۔ آفتاب نبوت کے طلوع ہونے سے قبل بعض کفار بھی کشف وجہ یعنی منہ کھولنے کو برا سمجھتے تھے۔
چنانچہ کتاب حماسہ اور شعرائے جاہلیت کے دواوین میں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے وہاں کے رواج پردہ کی تفصیل
معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً نابغہ ذبیانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ جو متجردہ زوجہ نعمان بن منذر شاہ حیرہ کی تعریف میں کہا ہے۔ جبکہ
ایک موقع پر اس شاہزادی کا دوپٹہ اتفاق سے گر گیا تھا۔ اور اس نے فوراً ہاتھ سے چہرہ کو چھپا لیا۔ پھر دوپٹہ اٹھا لیا۔

سقط النصیف ولم ترد اسقاطها فتناولته واتقتنا بالید

یعنی اس کا دوپٹہ گر گیا۔ مگر اس کا قصد نہیں تھا کہ وہ گر جائے پھر ہاتھ منہ پر رکھ لیا
کہ ہم سے چھپ جائے اور اس دوپٹہ کو اٹھا لیا۔" (کشف النقاب عن مسئلۃ الحجاب صفحہ ۵)

قاعدہ نزول حجاب (ذی قعدہ ۵ھ) سے قبل بدوی عورتیں بھی ایسا پردہ کرنے کی عادی تھیں۔ جس میں ان کا
چہرہ چھپا رہتا تھا۔ جنگ بدر اور جنگ احد واقعہ ۳ھ سے قبل جب ایک عورت منہ پر نقاب ڈالے بنی قینقاع
کے یہودیوں کے بازار واقع بیرون مدینہ منورہ میں ایک سنار کی دکان پر کسی زیور کے سلسلہ میں بیٹھی تو یہودیوں نے
اسے منہ کھولنے پر مجبور کیا۔ عورت کے انکار پر انھوں نے کوئی ایسی شرارت کی کہ جس سے اس کا پردہ کھل گیا۔ اور
یہودی ہنسنے لگے۔ باغیرت خاتون نے اس پر چیخ ماری جسے سن کر ایک مسلمان نے اس یہودی کا کام تمام کردیا۔ اور
یہودیوں نے اٹھ کر اسی مسلمان کو شہید کردیا۔ جس کی خبر پاکر حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے سات سو
یہودیوں کا جن میں تین سو مسلح تھے محاصرہ کرلیا۔ حضور نے ایک سفارش پر ان کو قتل کرنے سے تو درگزر فرمایا۔ لیکن
مسلمانوں کو حکم دیا۔ کہ وہ ان یہودیوں[1] کے اموال بطور غنیمت لوٹ کر باہم تقسیم کریں۔ اور ان کو ملک بدر کردیا جائے۔
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور تمام یہودیوں کو مدینہ طیبہ سے ایک ایک کرکے جلا وطن کردیا گیا۔

جس کی تفصیل سیرۃ ابن ہشام۔ تاریخ کامل ابن اثیر و دیگر کتب تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے غرضیکہ دور تہذیب و
تمدن اور دورِ جاہلیت، دونوں میں ایک ہی نوع کا پردہ رائج تھا۔ جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا ہوتا تھا اسلام
امن وسلامتی کا ضامن اور فتنہ وفساد کا دشمن بن کر آیا تھا۔ اس لئے اس نے سب سے بڑا اور سنگین جرم،

---

[1] ان یہودیوں کی صرف یہی ایک خطا نہ تھی کہ ایک عزت مند خاتون کو انھوں نے چھیڑا تھا بلکہ وہ اسلام کے خلاف مسلسل
سازشیں کر رہے تھے۔ اور ان کے وجود سے قوی خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ وہ مدینہ میں کوئی بڑا ہنگامہ پیدا نہ
کردیں (م۔ ق)

فتنہ کو قرار دیا:۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرۃ ۲۴) فتنہ تو قتل سے بھی سخت تر ہے۔

حالانکہ دوسری اقوام اور مذاہب میں قتل کو سنگین جرم سمجھا جاتا ہے لیکن چونکہ قتل کی صورت میں ایک دو جانوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ اور فتنہ کی صورت میں قوموں کی قومیں مٹ جاتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے فتنہ کو قتل سے سخت قرار دیا ہے قرآن کے نزدیک :۔

"ہر وہ چیز جو انسانوں کی عقل اور اس کے عزم کے لئے وجہ امتحان و آزمائش ہو۔ فتنہ ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل وضمیر اور اس کے عزم و استقامت میں ضعف کا باعث ہوں۔ اور جن کی بنا پر حق وصداقت کی راہ پر قائم رہنا دشوار ہو جائے فتنہ ہیں" (معارف)

فتنوں میں سب سے پہلا اور خطرناک فتنہ شیطان کا ہے جس نے انسان کی ضلالت و نجاست کی مہم کا آغاز ہی بے پردگی اور بے حجابی سے کیا۔ اور اسے ورغلا پھسلا کر اس کا لباس تقویٰ اتروا دیا جس سے ان کے بدن کے وہ مستور و محفوظ حصے جو ان کے جنت میں رہنے کے ضامن تھے۔ ننگے ہو گئے انھوں نے ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھ لی۔ اور اس کی پاداش میں انھیں جنت میں رہنے کے قابل نہ سمجھ کر اس دنیا میں پھینک دیا گیا۔ جس کی وہ آجتک خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اسی واقعہ سے عبرت پکڑنے کے لئے حق تعالیٰ نے انسان کو واضح لفظوں میں خبردار کیا تاکہ وہ پھر اپنے ازلی دشمن کے فریب و فتنہ میں نہ پھنسے۔

يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا سَوْآتِهِمَا ۝ (اعراف ۲)

"اے اولادِ آدم! کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح فتنہ میں مبتلا کر دے۔ جس طرح تمہارے والدین کو اس نے جنت سے نکلوا دیا۔ کہ ان دونوں کا لباس اتروا دیا تھا جس سے ان دونوں کو ان کا ستر دکھائی دینے لگا۔"

اس لئے خالق کائنات نے انسان کی ستر پوشی کے لئے لباس بھی پیدا کیا۔ تاکہ دنیا کے مختصر قیام کے دوران میں یہ اپنے ستر کو ڈھانپے رکھے جیسا کہ اس ارشادِ ربانی سے صاف ظاہر ہے :۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۖ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ (اعراف ۲)

اے بنی آدم۔ ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے جسم کی ستر پوشی کرتا ہے۔ اور موجب زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

تقویٰ کے لباس کو ستر پوشی کے لباس پر کئی گنا فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ تقویٰ کا لباس جنت کا لباس ہے۔ اس کے اتارنے کی پاداش میں انسان جنت بدر کیا گیا۔ حق تعالیٰ انسان کو اس کی روز اول کی گرفتاری آلام و مصائب کا واقعہ یاد دلا کر اسے نصیحت کی کہ جنت کی طرح اس دنیا میں بھی تمہارے لئے دونوں قسم کے لباسوں کا انتظام کر دیا گیا ہے کہ یہاں بھی شیطان اور شیطانی قوتیں تمہارا لباس ستر اور لباس تقویٰ اتارنے کی کوشش کریں گی ان سے ذرا بچ کر رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وہ تمہیں جنت سے نکلوانے کے بعد کسی اور عذاب میں مبتلا کرا دیں۔

شیطان کے فتنوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک فتنہ نگاہ کا ہے۔ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ :-

"نگاہ شہوت کی قاصد اور پیامبر ہوتی ہے اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرمگاہ اور شہوت کی حفاظت ہے۔ جس نے نظر کو آزاد کر دیا۔ اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے۔ جس میں انسان مبتلا ہوتا ہے۔ کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے۔ پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے اور فکر شہوت کو اُبھارتی ہے۔ شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے۔ ارادہ قوی ہو کر عزیمت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عزیمت میں مزید پختگی ہو کر فعل واقع ہوتا ہے۔ جس سے اس منزل پر پہونچ کر، اس وقت کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ جب کوئی مانع حائل ہو" (الجواب الکافی ص۲۰۰)

اس لئے اسلام نے بدکاری کے انسداد کے لئے نظروں پر پابندی لگائی ہے اور زنا سے بچنے کے لئے حصار نکاح قائم کیا ہے اور حصار نکاح کے روزن اور سوراخ بند کرنے کے لئے مختلف قسم کے پردے لٹکا دئے ہیں تاکہ نظروں کی سرچ لائٹ حصارِ نکاح کے اندر نہ جا سکے۔ اور عورت کی عفت وعصمت محفوظ رہے۔ اس غرض کے لئے اسلام نے ستر اور پردہ کی حدود متعین کر دی ہیں۔ تاکہ کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہی نہ رہے۔ شریعت اسلام نے مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنہ تک کا حصہ قرار دیا ہے۔ جس کا پوشیدہ رکھنا مرد کے لئے ضروری ہے۔ اور اپنی بیوی کے سوا اسے اور کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور عورت کا ستر چہرہ اور ہتھیلیوں کو چھوڑ کر سارا جسم قرار دیا ہے جسے وہ اپنے خاوند کے سوا اور کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی۔ لیکن لباس تقویٰ کے لئے۔ چہرہ اور ہتھیلیاں بھی داخل ستر ہیں۔ کیونکہ صانع فطرت نے عورت کے جسم کی زینتوں میں سے زیادہ حصہ زینت چہرہ کی ساخت میں رکھا ہے۔ اور وہی عورت کے حسن وجمال کا مظہر اتم ہے اور حقیقی جذب وانجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ ہے۔ جو نگاہوں کو دعوت دیتا اور جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ گویا مرد کو عورت کی طرف رغبت اور شہوت دلانے کا سب سے بڑا محرک اور فتنوں کا سرچشمہ، چہرہ ہے، اس لئے ہر وہ طریقہ جو چہرہ کو چھپانے کی راہ میں آسانی پیدا کرے صحیح اور جائز ہوگا خواہ اس کی صراحت کتاب وسنت میں موجود ہو یا نہ ہو۔

لیکن موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ فتنہ کی اہمیت اور چہرہ کی خاصیت کو نظر انداز کر کے اس کو کھلا رکھنے کا آرزو مند ہے۔ اور اپنی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیات پیش کرتا ہے۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (نور ع۴)　　عورتیں (غیر محرموں کے سامنے) اپنی زینت وزیبائش اظہار نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے

یہ آیات قرآن کے اس حصہ کی نہیں۔ جس میں مسئلہ حجاب بیان کیا گیا ہے۔ کہ عورت کن حالات میں باہر نکلے یا سیر وسیاحت کرے۔ بلکہ یہ آیات قرآن کے اس حصہ کا جزو ہیں۔ جس میں محض شر اور فتنہ کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ عورت اپنے گھر کے اندر رہے یا باہر اس کو اپنے بدن کا کونسا حصہ کس کے سامنے اور کن حالات میں کھلا رکھنا جائز ہے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کی آزادی اور آسانی کے لئے ان حالات کو قید نہیں کیا۔ اور اس بات کا فیصلہ اس نے عورت کے تقویٰ پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ وہ خود اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کرے کہ اسے کب اور کس حد تک چہرہ کھلا رکھنا چاہیئے اور فساد وفتنہ کے موقع پر اسے چہرہ کو چھپانے کی

کونسی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔

اگر ذرا دقت نظر سے کام لیا جائے۔ تو ان آیات سے وہ مقصد قطعاً حاصل نہیں ہوتا۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے آجکل ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے۔ کیونکہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ جو غیر اختیاری طور پر خود بخود ظاہر ہو جائے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ عورت ارادتاً اظہار زینت نہ کرے اور نہ خواہ نخواہ زینت کے مواقع کو کھلا رکھے۔ البتہ اگر دوپٹہ یا چادر چہرہ پر سے گر پڑے یا نقاب اُلٹ جائے تو یہ امر مجبوری ہے۔ اور ناقابل مواخذہ، اس کی تائید مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے۔ جن میں بوڑھی عورتوں کے متعلق احکام درج ہیں۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِیْنَةٍ ۚ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ۚ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ (نور ۸)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو گھروں میں بیٹھ رہی ہیں جس کو (بوجہ بڑھاپے کے) نکاح کی کوئی توقع نہیں۔ ان کو کپڑے اتار رکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ مگر اس طرح کہ اپنی زینت و زیبائش نہ دکھاتی پھریں اور اس سے بھی بچیں۔ تو ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

یعنی جب قرآن سن یاس کو پہونچی ہوئی بوڑھی عورتوں کو زینت کے مواقع کھولنے کی اجازت نہیں دیتا تو وہ جوان عورتوں کو مَا ظَهَرَ کے خواہ نخواہ کھلا رکھنے کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی اجازت دینا تو تقویٰ کے سراسر خلاف ہے جس پر قصر اسلام کی بنیاد استوار کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اکثر عورتیں با نقاب جاتی تھیں۔ اور شدید ضرورت کے بغیر نقاب نہیں اُٹھاتی تھیں۔ چنانچہ نزولِ حجاب سے قبل جب ہندہ بن عتبہ قریشیہ کے نکاح کی نوبت آئی تو انھوں نے اپنے والد سے کہا کہ میرا کسی سے نکاح نہ کرنا۔ جبتک اس شخص کے خصائل سے مجھے آگاہ نہ کر دیا جائے۔ آخر باپ نے اس سے دو آدمیوں کا ذکر کیا جس میں سے ایک موجودہ زمانہ کے مروجہ پردہ کا حامی تھا۔ ہندہ کے باپ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ شدید الغیرۃ۔ شدید حجاب القبۃ یعنی بڑی غیرت والا ہے اور گھر کے گہرے پردے کا حامی ہے۔ یہ حضرت ابو معاویہؓ کے والد ماجد حضرت ابو سفیانؓ تھے چنانچہ ہندہ نے حضرت ابو سفیانؓ کو پردہ کا حامی ہونے کی بناء پر پسند کیا۔ اور اپنی پسندیدگی کا ان الفاظ میں اعلان کیا:۔

واما الاخرۃ فبعل الحرۃ الکریمۃ و فی الاخذہ بادب البعل مع لزوم قبتی وقلۃ تلفتی۔

یہ دوسرا اس قابل ہے کہ شریف بی بی کا خاوند بنے اور میں ایسے خاوند کے تمام آداب ملحوظ رکھوں گی اور اپنے گھر میں پردہ کے اندر رہوں گی اور غیروں کی طرف نگاہ نہ کروں گی۔

بعد نکاح جب ۸ھ میں وہ تائب ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئیں۔ تو اس وقت بھی ان کے چہرے پر نقاب تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل طبقات ابن سعد ۱۷۰؁ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس قسم کا دوسرا واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں جس کی تفصیل ابو داؤد اور نسائی میں موجود ہے کہ ایک عورت نے اپنے آپ کو ازسر تا پا پردہ کے پیچھے چھپا کر ایک خط آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ تو حضور نے ہاتھ کھینچ لیا۔ کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا کیونکہ اس عورت نے حضور کے سامنے بھی اپنا چہرہ بے نقاب نہ کیا تھا۔ ابو داؤد کے باب

فضل قتال الروم میں ایک اور واقعہ درج ہے :-

"ایک عورت بنام اُم خلاد نقاب پہن کر حضورؐ کے پاس آئی۔ تاکہ اپنے شہید لڑکے کا حال پوچھے۔ کسی نے کہا کہ اس حالت میں بھی نقاب منہ پر ڈالے ہوئے ہو (کیونکہ ایسی پریشانی کی حالت میں تو انسان بے اختیار ہو جاتا ہے) وہ کہنے لگی کہ بیٹے کی مصیبت آگئی تو کیا ہوا۔ کیا حیا کا پردہ بھی اتار دوں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ تیرے بیٹے کو دو اجر ملیں گے۔ کیونکہ اہل کتاب (عیسائیوں) نے اسے جنگ میں شہید کیا ہے"۔

اسی ابوداؤد کے باب الحج میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور روایت موجود ہے کہ حج کے موقعہ پر :-

"سوار لوگ ہمارے سامنے گزرتے تھے جب کہ ہم حضورؐ کی معیت میں احرام باندھے ہوئے تھیں۔ اب جب وہ لوگ بالکل ہمارے سامنے آنے لگتے تھے۔ تو ہم میں سے ہر ایک عورت اپنی چادر کو سر سے سرکا کر اپنے چہرہ پر ڈال دیتی تھی پھر جب وہ لوگ گزر جاتے تھے۔ تو ہم چہرہ کو کھول دیتی تھیں"۔

غرضیکہ اس نوع کے بہت سے واقعات کتب حدیث و سیر میں موجود ہیں۔ جن سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ خود عہدِ رسالت مآب میں چہرہ پر نقاب ڈالنے کا رواج موجود تھا اور حضورؐ نے کبھی عورت کے نقاب اوڑھنے پر نکیر نہیں فرمائی تھی۔ بلکہ حضورؐ نے تو عورتوں کو اندھوں سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جیسا کہ اُم سلمہؓ کی روایت اور ابن کلثومؓ کے مشہور وا[قعہ] سے ظاہر ہے۔ پردہ کے مخالفین حضورؐ کے سامنے بعض عورتوں کے بے نقاب آنے کی جن چند روایات پر انحصار کر[تے] ہیں۔ ان میں بعض تو نزول حجاب سے قبل کی ہیں۔ اور بعض مرسل وضعیف ہیں جن کی تفصیل کشف النقاب عن مسئلۃ الحجا[ب] (مصنفہ پروفیسر مولانا محمد کریم بخش صاحب ایم اے) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ستر کے بعد پردہ کا درجہ آتا ہے۔ جسے نگاہ اور زنا کے فتنہ کے مواقع پیدا ہونے کی راہ میں حائل ہونے کے [لئے] اسلام نے بھی بحال رکھا۔ لیکن اسلام نے احتیاط یہ کی۔ کہ عہد گزشتہ کے دورِ تہذیب و تمدن یا دورِ جاہلیت کے سخت پردہ کی طرح اس کا صرف عورتوں کو ہی پابند نہیں بنایا بلکہ عورتوں کی طرح مردوں کی رفتار و گفتار، اور لباس و پوشاک پر بھی اس قسم کی پابندیاں عاید کر دیں جن سے زن و مرد کا بلا ضرورت میل ملاپ اور خواہ مخواہ یکجائی و اختلا[ط] نہ ہو سکے۔ اس غرض کے لئے عورتوں کو تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ :-

(۱) اپنی زیب و زینت کی چیزوں کا مردوں پر اظہار نہ ہونے دیں۔

(۲) اپنے زیورات کی آواز تک غیر محرموں کے کان میں نہ جانے دیں۔

(۳) خوشبو، عطر یا سینٹ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلیں۔

(۴) مردوں سے گفتگو کرتے وقت لب و لہجہ اور آواز میں نزاکت پیدا نہ کریں۔

(۵) راہ چلتے یا مرد سے باتیں کرتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

(۶) ایسے راستہ سے نہ گزریں۔ جہاں پر مردوں کی ریل پیل ہو۔ بلکہ کنارے ہو کر گزریں!

(۷) گھر سے نکلنے کے بعد اپنی چال ڈھال میں حیا کو مقدم رکھیں

(۸) نماز یا جنازہ میں شرکت کے وقت مردوں کے پیچھے کی صف میں کھڑی ہوں۔

(۹) جب جماعت میں شریک ہوں تو مردوں کے سر اٹھانے سے پہلے سجدہ سے نہ اٹھیں۔ تاکہ ان کی نظر

...وں کی شرمگاہوں پر نہ پڑے۔

(۱۰) کسی غیر عورت کی عفت اپنے خاوند سے بیان نہ کریں۔

(۱۱) کسی غیر محرم کے ساتھ سفر نہ کریں۔ خواہ حج کا ہی سفر کیوں نہ ہو۔ اور

(۱۲) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

...سے اسلام نے عورت کی عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے مردوں پر پابندیاں لگادی ہیں کہ وہ :۔

(۱) شرم وحیا کی سختی سے پابندی کریں۔

(۲) عورت پر بالارادہ نظر نہ ڈالیں۔

(۳) بے نقاب عورت کے سامنے آنے پر نظریں نیچی کرلیں۔

(۴) عورت سے اگر کوئی چیز مانگنی ہو۔ تو اوٹ میں کھڑے ہو کر مانگیں

(۵) عورت کے پاس تنہائی میں نہ بیٹھیں۔ اگرچہ وہ قرآن پڑھانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔

(۶) کسی اجنبیہ کے ساتھ سفر نہ کرے خواہ وہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو۔

(۷) کسی ایسی عورت کے ساتھ مصافحہ نہ کریں جس کے ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو۔

(۸) اپنی بیوی کے خلوت کے راز کسی پر افشاء نہ کریں۔

(۹) کسی کے گھر میں بلا اذن داخل نہ ہوں۔

(۱۰) پردہ دار مکان یا جگہ میں تاک جھانک نہ کریں۔

(۱۱) گفتگو کرنے میں غیر عورت کے ساتھ ہنسی دل لگی کی باتیں نہ کریں۔

(۱۲) اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتے رہیں۔

...ت خداوندی کچھ ایسی ہے۔ کہ جب وہ کسی شئے کو حرام قرار دیتا ہے۔ تو اس تک پہونچانے والے تمام ذرائع ووسائل ...ی ممنوع قرار دے دیتا ہے۔ تاکہ اس حرام شئے کی تحریم مضبوط اور مستحکم ہوجائے اور لوگ اس کے پاس نہ پھٹکنے پائیں ...تک کہ اس نے ایسے جائز فعل کو بھی ممنوع قرار دیا ہے جس سے کوئی مفسدہ پیدا ہوتا ہے اور وہ جواز کی مصلحت ...مقابلہ میں زیادہ اہم ہو۔ جیسے حکم آیا کہ :

...لا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ ... فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ	جن لوگوں کو یہ لوگ اللہ کی بجائے پکارتے ہیں۔ ان کو گالیاں نہ دو کہ یہ دشمنی سے بے سمجھے بوجھے خدا کو گالیاں دیں گے۔

...معبودانِ باطل (جو کسی عزت واحترام کے مستحق نہیں) کو برا کہنا ظاہر ہے کہ خدا پرستانہ حمیت اور شرک ...نفرت کی بناء پر ہی ہوگا یہ مقصود برا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے اس لئے منا ہی کردی۔ کیونکہ یہ اللہ کی ...میں گستاخی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح حق تعالیٰ نے عورت کی عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے مردوں ...طرح کی پابندیاں لگادیں تاکہ عورتوں سے آزادانہ میل جول کے مواقع پیدا ہی نہ ہوں۔ جو رغبت وشہوت پرستی ...سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تاریخ۔ احادیث اور آثار میں کہیں بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ جس سے یہ ثابت ...خاندانِ رسالت یا صحابہٴ کرام یا عام مسلمانوں کی عورتیں بے حجابی۔ بیباکی اور آزادی کے ساتھ سیر وتفریح یا

عیش و نشاط کے لئے یا مذہبی اور سیاسی یا سوشل اور رفاہی کاموں میں حصّہ لینے کے لئے آجکل کی طرح بن سنور کر اور دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے باہر نکلتی تھیں۔ یا انھوں نے کبھی عہدِ رسالت یا خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں مذہبی سیاسی اور تمدنی اجتماعات میں آزادی اور تبرج کے ساتھ مردوں کے شانہ بشانہ حصّہ لیا تھا۔ بلکہ انھیں تو عین حرم مبارک کے اندر اور خود آنحضرت صلعم کے زمانے میں طوافِ کعبہ کے وقت مردوں سے بالکل الگ رکھا جاتا تھا اور ان کو غیر مردوں کے ساتھ کسی قسم کے میل جول کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ مسجد نبوی میں عورتوں کے لئے ایک دروازہ مخصوص کر دیا گیا تھا حالانکہ اس زمانہ میں بھی عورتوں کو معاشی کاروبار یا جنگی ضروریات کے لئے اور نرسنگ وغیرہ کے لئے باہر نکلنے کی اجازت ہوتی تھی۔

پردہ کی یہ ساری پابندیاں محض عورت کو مرد کی شہوانیت اور بربریت سے بچانے کے لئے لگائی گئیں۔ جس کو مبدارِ فطرت سے عورت کے مقابلہ میں رغبت و شہوت کا زیادہ مادہ ملا ہے۔ اور جسے اس سرمایۂ تسکین حیات کے استعمال کی ساری قوتیں بخشی گئی ہیں۔ جو عورت کے پاس محفوظ ہے ان تمام فضیلتوں کے باوجود عورت کے اردگرد پردہ کی آہنی دیواریں اس لئے کھینچ دی گئیں کہ کہیں مرد درندگی پر نہ اتر آئے۔ جیسا کہ آجکل عام دیکھنے میں آتا ہے اب تو اغوا بالجبر اور زنا بالجبر کے واقعات اتنی کثرت سے ہونے لگے ہیں کہ عورتوں کے لئے چہرہ چھپا کر باہر باہر نکلنا اور سفر کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ایسے معاشرہ میں جہاں غنڈہ گردی اتنی عام ہو گئی ہو کہ ان کے انسدادی قوانین اور افسروں کے عہدوں کے نام بھی غنڈہ ازم کی نسبت سے رکھے جانے لگے ہوں۔ عورتوں کو پردہ اتار دینے کی ترغیب دینا۔ عورتوں کی خیر خواہی نہیں۔ بلکہ دشمنی اور نفس پرستی ہے۔ عورت کی عفت و عصمت کی قدر و قیمت اسی طرح گرانا ہے۔ جس طرح طبقۂ نسواں کی آزادی و بے حجابی کے حامیوں نے یورپ میں گرادی ہے اور اتنی گرادی ہے کہ ذوقِ جنسیت اتنی تیزی سے ہم جنسیت میں بدل رہا ہے کہ برطانیہ میں سماجی برائیوں کی چھان بین کرنے والے کمیشن نے گورنمنٹ سے سفارش کی ہے۔ کہ بالغ افراد نابالغ بچوں کو اپنی شہوت رانی کا شکار نہ بنائیں۔

اِن ہی حالات سے متاثر ہو کر علم طبعیات کی ماہر مسز ہڈسن نے حال ہی میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:۔

"ہماری (مغربی) تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے۔ اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوندِ خاک ہو جائے۔ ہم گزشتہ کئی سال سے دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بقا کی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی لگا دی جائے۔ کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات آزاد جنسی تعلقات قحبہ گری اور عصمت فروشی مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں اس سے ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس معاملہ میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جیسے مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا۔ انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویشناک ہے۔ جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بدترین آثار اور نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے آثار و شواہد ہیں۔ یا اس کے اسباب؟ میری رائے یہ ہے کہ یہ آثار و شواہد

بھی ہیں اور اسباب بھی۔" (انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام ص۵۲ و ص۵۳)۔

اسلام نے پردہ کے فطری رواج کو اہم اصلاحات کے ساتھ رائج کر کے عورت کی عزت و عظمت میں جو اضافہ کیا ہے۔ اس کی نہ صرف مہذب دنیا میں پیدا شدہ حالات تائید و تصدیق کر رہے ہیں بلکہ مغرب کے منصف مزاج مفکرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں مثلاً ہملٹن لکھتا ہے کہ:۔

"اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں۔ جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کی بے حرمتی و ایذا رسانی سے محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔ اسلام نے پردہ کے باب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے۔ بلکہ اس نے عزت و مروت کے اسباب کا لحاظ رکھا ہے۔" (اسلام کا نظام حیات ص۱۸۹)

وان ہیمر کا قول ہے کہ:۔

"پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام قرار دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو فنا کر دیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے۔ ان کے ناموس کی حفاظت و احترام کا، اور ذریعہ ہے ان کی رسوائی کی روک تھام کا درحقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا جو درجہ و مقام ہے۔ وہ یقیناً قابل رشک ہے۔"

فرید الدین قریشی

عربی خطابت دورِ جاہلیت میں

(الجمعیۃ العربیۃ کی سالانہ تقریب پر پڑھا گیا)

عربوں کے علوم و فنون کے بیان میں شاعری کے بعد جس چیز کا ذکر ملتا ہے وہ ان کی خطابت ہے۔ علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں۔
"عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائے ہیں۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہلِ عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو عرب اور دنیا کی تمام قوموں کو عجم کہکر پکارا"

سیرت النبی کے اس جلیل القدر مصنف کے مذکورہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ صحرا نشینانِ عرب کو قوت گویائی میں وہ کمال حاصل تھا اور فن خطابت میں وہ اس نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے جہاں دوسری قوموں کے سحر بیان خطیب ژولیدہ بیان اور گونگے نظر آتے ہیں۔ اگر اس بیان کو مبالغہ نہ سمجھا جائے بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو آسانی سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عرب کے ریگ زار میں پلنے والی قوم کی صلاحیتیں صرف شراب کے جام، اونٹوں کی مہار اور تلوار کے دستوں تک محدود نہ تھیں، بلکہ ہر بادیہ نشین شکم مادر سے وہ قوت گویائی لیکر آتا تھا جس میں شیرینیِ بیان، لطافتِ خیال اور شستگیِ الفاظ کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہوتے تھے۔ عربوں کی خطابت کی تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان عربوں کے نزدیک نثر کے خطبوں کی اتنی ہی اہمیت تھی جتنی اہمیت شعرا کے رنگین کلام کی وہ ایک خطیب کے الفاظ سے ویسا ہی اثر قبول کرتے تھے جیسا ایک شاعر کے ابیات سے۔ چنانچہ جنگ کے بھڑکتے شعلوں کو ہوا دینے یا خاک و خون کے سیلِ تند کو روکنے کے لئے خطیب کے سحر انگیز خطبے، عرب قوم کی تاریخ میں اہم مقام کے حامل ہیں۔

عربوں کی اولین ثقافتی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ دورِ جاہلیت سے موسوم ہے اور دوسرے حصے کو عہد اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔ ادوار کی اس تقسیم کے لحاظ سے عربوں کی خطابت کی تاریخ بھی زمانۂ جاہلیت اور دورِ اسلام دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ دورِ جاہلیت کے خطبا میں قدامت کے لحاظ سے کعب بن لوئی کا نام آتا ہے جو افصح العرب سید العرب و العجم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جدِ اعلیٰ تھے اور تاریخ خطابت میں اقدم الخطباء کے لقب سے مشہور ہیں۔ کعب کے علاوہ زمانہ قبل از اسلام میں جن خطبا نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، ان میں قیس بن خارجہ، ولید بن عمرو المنطقانی، قسّ بن ساعدۃ الایادی اور اکثم بن صیفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عربوں کی سرشت میں تیز مزاجی کو دخل تھا۔ یہ درشتیِ مزاج اس حد تک موجود تھی کہ محض گھوڑوں کو دوڑانے اور جانوروں کو پانی پلانے پر خون خرابہ ہو جاتا تھا۔ یہ جنگیں ایک مرتبہ شروع ہونے کے بعد چالیس سال تک ختم ہونے کا

کا نام نہ لیتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر افراد کو جوش دلانے اور انتقام پر برانگیختہ کرنے کے لئے سحر بیانی یعنی خطابت سے کام لیا جاتا تھا۔ اور پھر جب صلح کا وقت آتا تو اس کے لئے بھی خطیبوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ عرب قبائل جب کسی دوسرے قبیلے کے سرداروں یا کسی ملک کے بادشاہ کے پاس سفارت بھیجتے تو عوام الناس کو حکمراں طبقہ سے اپنے قبیلہ کو متعارف کراتے اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنے کے لئے بھی خطابت سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عربی تمدن میں ایسے مواقع بھی پیش آتے رہتے تھے، جن میں خطبہ لازمات سے تھا، چنانچہ بیاہ شادی کے وقت "خطبہ" بہت ضروری تھا، ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اپنے کارناموں کو سراہنا یہ خطیبوں کی خطابت کے خاص موضوع ہوتے تھے۔

عربوں کی فطرت کو پیش نظر رکھئے، پھر چشمِ تصوّر سے صدیوں قبل کی عرب دنیا کا جائزہ لیجئے آپ کو دورِ جاہلیت میں "ذی قار" کا میدانِ جنگ نظر آئے گا۔ ایسے وقت میں جبکہ تلواریں چمک رہی ہیں۔ اعضاءِ انسانی کٹ کٹ کر گر رہے ہیں۔ اور زمین خون سے لالہ زار ہو چکی ہے، قبیلہ بکر کے جوانوں کے حوصلے پست ہوتے جا رہے ہیں۔ قریب ہے کہ حریف اپنے آخری حملہ سے بنو بکر کی عظمت کو خاک میں ملا دے، ہانی بن قَبِیصَۃ الشیبانی اپنی اونٹنی دوڑاتے میدانِ جنگ کے اس حصے پر پہنچا ہے جہاں آلِ بکر کی صفوں میں انتشار اور کم ہمتی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ابن قبیصۃ کی زبان کھلی، جذبات کا ایک سمندر ہے جو موجیں مار رہا ہے۔ آلِ بکر کا یہ خطیب چند جملوں پر مشتمل ایک خطبہ دے کر غنیم کی صفوں میں تلوار سونت کر غایب ہو جاتا ہے۔ ابھی چند لمحے پیشتر جس قبیلے کے سر پر شکست کی ذلت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اب وہاں فتح و ظفر کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، ہانی نے جو خطبہ دیا، اگرچہ اس کی روح تک عربی داں ہی پہنچ سکتا ہے لیکن عام قارئین اس کے ترجمے سے ہی بہت کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

یَا مَعْشَرَ بَکْرٍ. هَالِكٌ مَعْذُورٌ. خَيْرٌ مِنْ نَاجٍ فَرُوْرٍ. إِنَّ الْحَذَرَ لَا يُنْجِي مِنَ الْقَدَرِ. وَإِنَّ الصَّبْرَ. مِنْ أَسْبَابِ الظَّفَرِ. الْمَنِيَّةُ وَلَا الدَّنِيَّةُ. إِسْتِقْبَالُ الْمَوْتِ خَيْرٌ مِنَ الْاسْتِدْبَارِ. الطَّعْنُ فِي ثُغَرِ النُّحُورِ. أَكْرَمُ مِنْهُ مِنْ فِي الْأَعْجَازِ وَالظُّهُورِ. يَا آلَ بَكْرٍ! قَاتِلُوا! فَمَا لِلْمَنَايَا مِنْ بُدٍّ.

("ترجمہ:۔ اے قبیلہ بکر! کسی عذر سے ہلاک ہونے والا جان بچا کر بھاگنے والے سے بہتر ہے۔ احتیاط تقدیر سے نجات نہیں دلا سکتی۔ صبر کامیابی کے ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہے موت آ جائے مگر ذلت نہ آئے موت کا استقبال کرنا، اس سے پیٹھ موڑنے سے بہتر ہے۔ وہ نیزہ جو دشمن کے حلقوم میں پیوست ہو۔ زیادہ باعثِ شرف ہے اس نیزے کی نسبت جو دشمن کے کولھے اور پیٹھ میں جا لگے۔ اے آلِ بکر! جنگ کرو کیونکہ موت کے سوا چارہ نہیں۔")

اب دوسری طرف آئیے۔ تلواریں نیاموں سے نکلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ میدانِ جنگ میں سرفروش جوانوں کی صفیں صرف اشارے کی منتظر ہیں۔ قریب ہے کہ وحشت و بربریت کا طوفان نسلِ انسانی کو بہا لے جائے کہ یکایک طرفین کے سردار اور کچھ دور اندیش قسم کے بوڑھے صلح کے متلاشی نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن ان جوانوں کا کیا کیا جائے

جن کے سینے انتقام کی آگ سے سلگ رہے ہیں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ جنگ کا جوالا مکھی پھٹنے کے قریب ہے۔ خطیب کے الفاظ کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ خطابت کی سحر انگیزی پل بھر میں فضا کو متغیر کر دیتی ہے۔ جنگ صلح میں انتقام، دوستی میں اور غصہ ترحم میں بدل کر رہ جاتا ہے۔ نیاموں سے کھینچی ہوئی تلواریں پھر نیاموں میں چلی جاتی ہیں اور سب کچھ ایک خطیب کے چند الفاظ کا اعجاز ہے۔ مرثد الخیر نے اس موقع پر جب کہ سبیع بن الحارث اور میثم بن مثوب (طرفین کے دو سردار) جنگ کے نازک موقع پر صلح کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ یہ خطبہ دیا:-

"قَدْ عَرَفْتُمْ اَبْنَاءَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنَ العرب۔ ممن عصى النصيح، وخالف الرشيد۔ وَ اَصْغىٰ اِلَى التقاطع۔ وَ رَاَيْتُمْ مَا آلَتْ اِلَيْهِ عَوَاقِبُ سُوْءِ سَعْيِهِمْ۔ وَكَيْفَ كَانَ صَيُّورُ اُمُوْرِهِمْ۔ تَتَلافُوا الْقَرْحَةَ قَبْلَ تفاقُمِ الثَّاىِٔ۔ وَاستفحالِ الراء۔ واعواز الدواء۔ فَاِنَّهٗ اِذا سُفِكَتِ الدماءُ واستحكمت الشحناءُ۔ واذا استحكمتِ الشحناءُ۔ تَقَضَّبَتْ عُرَىَ الابقاء۔ وَ شَمِلَ البلاءُ۔

ترجمہ:- "تم اپنے سے پہلے آنے والے ان عربوں کے حالات سے آگاہ ہو، جنھوں نے ناصح مشفق کی نافرمانی کی، رہ حق کی مخالفت کی، اور باہمی تعلقات قطع کرنے کی آواز پر کان دھرے۔ اُن کی نامبارک کوشش جس انجام کو پہنچیں۔ اور ان کے اعمال کے جو نتائج رونما ہوئے، وہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ تمہیں چاہیئے کہ زخم کو مندمل کرنے کا تدارک کر لو پیشتر اس سے کہ اس کا فساد حد سے بڑھ جائے اور بیماری احتیاط سے باہر ہو جائے اور علاج محال ہو جائے۔ اس لئے کہ جب خون ریزی ہو تو بغض و عناد جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ اور جب بغض و عناد جڑ پکڑ جائیں تو بقائے حیات کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور تباہی عام ہو جاتی ہے۔"

صلح و جنگ سے متعلق خطبات کے ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے صرف صلح و جنگ کے مشہور موقعوں پر ہی ایسے خطبات دیئے گئے ہوں۔ اور باقی خطبات میں ایسی شان نہ نظر آتی ہو۔ لیکن یہ محض خیال ہے، صلح و جنگ کے علاوہ دوسرے موقعوں پر خطبوں میں بڑا جوش اور صداقت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں وہ تاریخی خطبہ درج کیا جاتا ہے جو ابو طالب بن عبدالمطلب نے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ آنحضرت کے نکاح کے وقت، دیا تھا۔ اس کو پڑھنے سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ نکاح کے وقت کس قسم کے خطبے دیئے جاتے تھے۔ ابو طالب عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خطاب فرمایا:-

"الحمد الله الذى جعلنا من ذرية ابراهيم۔ و زرع اسمٰعيل، وجعل لنا بلدًا حرامًا وبيتًا محجوبًا، وجعلنا الحكام على الناس، ثم ان محمد بن عبدالله ابنِ اَخِىْ ممن لا يوازَنُ بِهٖ فتىً مِنْ قريشٍ الا رَجَحِ عليهِ برًّا و فضلًا، وَكرمًا وعقلًا۔ ومجدًا و نُبلًا۔ وان كان فِى المَال قلَّ فَاِنَّ المَالَ ظِلٌّ زائلٌ۔ وعارية مُسْتَرْجَعَة، ولَهٗ فِىْ خُدَيجة بِنْتِ خُوَيْلِدْ

رغبة - ولها فيه مثل ذالك - وما احببتم من الصداق فعلی -

ترجمہ "اللہ حمد ہے اس اللہ کی جس نے ہمیں (سیدنا) ابراہیمؑ کی اولاد سے بنایا۔ اور اسماعیلؑ کی نسل میں پیدا کیا۔ ہمیں ایک شہر عطا کیا جس میں فتنہ وفساد ممنوع ہے اور ایسا عطا کیا جہاں لوگ آکر زیارت کرتے ہیں۔ اور ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ وہ ہے کہ اس کا موازنہ قریش کے جس نوجوان سے کیا جائے وہ (محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نیکی اور فضل، فیاضی اور عقل، شرافت اور نجابت میں اس پر بھاری ہوگا، باوجودیکہ وہ قلیل المال ہے۔ مال و دولت تو ڈھلتا ہوا سایہ ہے اور عارضی پونجی ہے خدیجہؓ بنت خویلد اور یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں! جس قدر حقِ مہر تم پسند کرو وہ میرے ذمہ ہے۔")

قُس بن ساعدۃ الایادی دورِ جاہلیت کے خطباء میں بلند پایہ حیثیت کا مالک ہے۔ سُوق عکاظ کا یہ مشہور خطیب شستگی الفاظ، رفعت خیال، اور قوت تاثیرہ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ یہ وہ شخص ہے جو شرک وبُت پرستی کے دور میں معبود حقیقی کا پرستار اور توحید کا طالب نظر آتا ہے۔ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا وہ مشہور خطبہ سُنا جو اس نے عکاظ کے میلے میں دیا تھا تو آپ نے اس کی رفعتِ خیال کی تعریف فرمائی۔

"ایھا الناس! اسمعوا وعُوا - مَنْ عاشَ ماتَ - ومَنْ ماتَ فاتَ وکلُّ ماھُوَ آتٍ آتٍ، لیلٌ داجٍ، ونھارٌ ساجٍ وسماءٌ ذاتُ ابراجٍ - ونجومٌ تزھرُ، وبحارٌ تزخرُ - وجبالٌ مُرساۃٌ، وارضٌ مُدحاۃٌ، وانھارٌ مُجراۃٌ - اِنَّ فِی السّماءِ لَخبرًا، واِنّ فی الارضِ لَعِبَرًا - مَا بالُ النّاسِ یَذھبونَ وَلایرجعُونَ؟ أرضُوا فَاقاموا؟ أمْ تُرکوا فناموا؟ یُقسِمُ قُسٌّ باللہِ قَسَمًا، لا اثمَ فیه: اِنَّ لِلّٰہِ دِینًا ھُوَ ارضی لکم وافضلُ مِن دِینِکمُ الّذی انتم علیهِ - اِنّکم لَتاتونَ مِنَ الامرِ مُنکرًا"

ترجمہ "(اے لوگو! سنو اور محفوظ کرلو۔ جسے زندگی ملی اُسے موت ضرور آئے گی۔ جس پر موت آگئی وہ چل بسا جو چیز مقدر ہے آکے رہے گی۔ رات تاریک ہے، دن پُرسکون ہے۔ آسمان میں کئی برج ہیں۔ ستارے درخشاں ہیں۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ پہاڑ زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔ زمین بچھونا بنائی گئی ہے۔ اور اس میں دریا بہائے گئے ہیں۔ آسمان میں دلائل و براہین ہیں۔ اور زمین میں درسِ عبرت لوگوں کو کیا ہوا کہ جاکر پھر نہیں آتے۔ کیا انھیں وہ زندگی پسند آئی کہ وہیں کے ہو رہے یا انھیں نظرانداز کردیا گیا کہ پڑکر سو رہے۔ قُس اللہ کی ایسی قسم کھاتا ہے جس پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ کا ایک دین ایسا ہے جو تمہارے اس دین سے جس پر تم عمل پیرا ہو، لیکن زیادہ پسندیدہ اور فضیلت والا ہے۔ تم ہر فعلِ بد کے مرتکب ہوتے ہو۔")

دورِ جاہلیت کے خطیبوں میں ایک اور جلیل القدر خطیب اکثم بن صیفی ہے، جو حسب ونسب کے اعتبار سے شریف، قوم میں ذی مرتبہ، اور صائب الرائے شخص تھا۔ جاہلیت کے خطیبوں میں اکثم کا خاص مقام ہے انساب

کا ماہر اور امثال و اخبار کا یہ حافظ ان لوگوں میں سے ہے جسے نعمان بن منذر نے کسریٰ کے دربار میں سفارت کی
غرض سے بھیجا تھا۔ اس صیفی کے لڑکے کو ان سب پر سردار مقرر کیا گیا تھا۔ ظہور اسلام کے بعد اکثم نے اپنی قوم
کو اسلام کی ترغیب دی۔ خود اس کے اسلام لانے کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ اس کے مقبول عام
خطبوں میں سے ایک وہ خطبہ جو اس نے کسریٰ کے دربار میں دیا تھا:-

"إنّ أفضلَ الأشياءِ أعاليها۔ وأعلى الرجالِ ملوكُهم۔ وافضل الملوك
عمّها نفعاً، وخيرُ الأزمنةِ أخصبُها۔ وافضل الخطباء أصدقُها۔ الصدق
منجاةٌ۔ والكذبُ مهواةٌ، والشرُّ لجاجةٌ، والحزم مركبٌ صعبٌ والعجزُ
مركبٌ وطئٌ۔ آفةُ الرّأي الهوى۔ والعجز مفتاح الفقر۔ وخيرُ الأمورِ
الصبر۔ وحسنُ الظنِّ ورطةٌ، وسوءُ الظنِّ عصمةٌ۔ اصلاحُ فسادِ الرعيةِ
خيرٌ من اصلاحِ فسادِ الرّاعي۔ من فسدت بطانتُه كان كالغاصِّ
بالمآءِ۔ شرُّ البلادِ بلادٌ لا اميرَ بها۔ شرُّ الملوكِ من خافه البريُّ۔
المرءُ يعجزُ لا المحالةُ۔ افضلُ الاولادِ البررةُ، خيرُ الاعوانِ من
لم يُراءِ بالنصيحةِ، أحقُّ الجنودِ بالنصرِ، من حسنت سريرتُه۔
يكفيكَ من الزّادِ ما بلّغكَ المحلّ۔ حسبُكَ من شرٍّ سماعُه۔
الصمتُ حكمٌ وقليلٌ فاعلُه۔ البلاغةُ الايجازُ۔ من شدّدَ نفّرَ۔
ومن تراخى تألّفَ۔"

ترجمہ:- بہترین اشیاء وہ ہیں جو سب سے بلند و بالا ہیں۔ بادشاہ ہی لوگوں میں ارفع و اعلیٰ ہیں۔ بادشاہوں
میں سب سے فضیلت والا وہ ہے جس کی بھلائی عام ہے۔ بہترین زمانہ وہ ہے جو بخت و اقبال کا ہو۔
بہترین مقرر سب سے زیادہ سچ بولنے والا ہوتا ہے۔ سچائی باعث نجات ہے اور جھوٹ ہلاکت ہے۔
لڑائی کی بنیاد جھگڑا اور فساد ہے، پامردی، سرکشی اور ناتوانی، نرم خو سواری ہے۔ عقل کی آفت
خواہش ہے۔ اور بے دست و پائی فقر کی کلید ہے۔ سب سے اچھا رویہ صبر ہے۔ اور حسن ظن دلدل ہے۔
اور سوء ظن رکاوٹ ہے، رعایا کے بگاڑ کی اصلاح حاکم کے بگاڑ کی اصلاح سے بہتر ہے۔ جس کے دوست
بگڑے ہوئے ہوں۔ وہ ایسا ہے جیسا پانی سے دم گھٹ کر مرجانے والا۔ بدترین ملک وہ ہے جس کا کوئی
حاکم نہ ہو۔ اور بدترین بادشاہ وہ ہے جس سے معصوم کو اندیشہ ہو۔ انسان تھک ہار جاتا ہے لیکن تدبیر
نہیں تھکتی۔ بہترین اولاد وہ ہے جو نیک ہو۔ سب سے اچھا مددگار وہ ہے جو دکھاوے کے لئے مشورہ
نہ دے۔ فتح کی سب سے زیادہ مستحق فوج وہ ہے جو پاک طینت ہو۔ تیرے لئے اسی قدر زادِ راہ کافی ہے
جو تجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ تیرے لئے برائی کے متعلق سُن لینا ہی کافی ہے۔ خاموشی حکمت ہے
مگر اس کو عمل میں لانے والے نایاب ہیں۔ بلاغت اختصار میں ہے۔ جو بہت سخت گیر ہوا۔ اس نے لوگوں
کو متنفر کر دیا۔ جو نرم خو ہوا، اُس نے لوگوں کی محبت جیت لی۔" ؎ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ!

عربی خطابت کے یہ تو چند نمونے ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں، اور حقیقت میں عربی خطابت کے دورِ جاہلیت ...سانہ اتنا عجیب اور اس قدر طویل ہے کہ اس کو اگر قلمبند کیا جائے تو ایک خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

جاہلیت کے عرب خطبا، اپنی خطابت کے زور سے آگ لگانا بھی جانتے تھے اور بجھانے کے فن سے بھی ...ف تھے، انھوں نے قبیلوں کو خون خرابہ کے لئے بھی ابھارا ہے اور ساتھ ہی انسانی حقوق بھی یاد دلائے ہیں ...وں نے جذبات کے فولاد کو تپا کر "انگارہ" بھی بنایا ہے اور اُسے پگھلا کر پانی بھی کر دیا ہے! جو لوگ عربی زبان ...ب کا ذوق رکھتے ہیں، عربی خطابت سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں دوسری زبان کے ترجمہ میں آ کر ...ں تحریر کا زور بہت کچھ کم ہو جاتا ہے!

عبداللہ المسدوسی

یہودی مذہب

"جناب عبداللہ المسدوسی دکن کے مشہور قومی کارکن اور اسلامیات اور قانون کے عالم ہیں، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ انھوں نے برسوں کام کیا ہے اس انقلاب میں سقوطِ دکن کے بعد اُنھیں بھی ہجرت کرکے پاکستان آنا پڑا، ان دنوں موصوف اردو کالج میں شعبۂ قانون کے پروفیسر ہیں!

جناب مسدوسی نے اپنی کتاب "مذاہب عالم" کا ایک باب "فاران" میں چھپنے کے لئے عنایت فرمایا ہے اس کتاب میں دنیا کے مشہور زندہ مذاہب کے ـــــ رقبہ، آبادی، ممالک، سیاسی طاقت ـــــ سے بحث کی گئی ہے، اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے، جس کے عربی اور انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوں گے، صاحبِ موصوف کی یہ معرکہ آرا تصنیف کتابت کے مرحلے میں ہے چھپنے کے بعد مکتبۂ خدام ملت فریر روڈ کراچی سے مل سکے گی۔ (م۔ق)"

یہودی مذہب کی حقیقت اور اس کی تعلیم اور تاریخ کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد ۱۳ اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس جلد ۷ سے مدد لی گئی ہے۔

یہودی مذہب کی تعریف

یہودی مذہب کو عقیدۂ توحید کی ایک خالص صورت کہا جاتا ہے، یہودی مذہب عقیدہ سے زیادہ ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کی فکر اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے یہ وہ مذہب ہے جس کی تلقین حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی تھی۔ یہ دنیا کے موجود مذاہب میں سب سے پرانا (قدیم) مذہب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی مذہب اُن دو عظیم الشان مذاہب، اسلام اور عیسائیت کا پیش رو ہے جو کرۂ ارض کے بیشتر حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی تعلیمات میں ابراہیمی مذہب کے وہ اصول اور عقائد بھی پائے جاتے ہیں جن پر یہودی مذہب کا بڑی حد تک دار و مدار ہے، لیکن یہودیت کی رسمی اور معین تعریف کیا ہے؟ اس کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"یہودیت کی کوئی معین اور معروف تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کم سے کم اور قطعی طور پر کس چیز کا اقرار ضروری ہے، تاہم یہودیت دو اصولوں پر مبنی ہے خدا کی وحدانیت اور بنی اسرائیل کی پسندیدہ اور منتخب اُمت ہونا، یہودیت بُت پرستی اور متعدد خداؤں کی پوجا یعنی شرک کو مسترد کرتی ہے۔ وہ ایک رب العالمین پر

عقیدہ رکھتی ہے"۔ (جلد ۷۔ صفحہ ۵۸۱)

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا کے مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ

"یہودیت کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو توحید خالص پر اعتقاد رکھتا اور اس عقیدہ کے زندگی پر عملی اثر کو تسلیم کرتا ہے"۔ (جلد ۱۳ صفحہ ۵)

"لیکن وہ اس میں تنہا نہیں ہے۔ وہ عالم کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اچھی جگہ ہے انسان تکمیل ذات کا اہل اور اپنے ارادے کا مختار ہے اس لئے وہ اپنے افعال کا جواب دہ ہے وہ کسی درمیانی واسطے نیز بدی کی طاقت کا بھی منکر ہے۔ انسان آزاد ہے وہ شیطان کا تابع نہیں۔ اور زندگی کی مادی نعمتیں بذات خود بُری نہیں۔ اس لئے دولت ایک نعمت بھی ہوسکتی ہے اور لعنت بھی، انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اس لئے وہ دیگر خدائی تخلیقات کی طرح معزز اور محترم ہے نیز اسی وجہ سے تمام انسان مثالی طور پر بھائی بھائی ہیں کیونکہ وہ ابتدا (ازل) میں متحد تھے اور وہ ابد میں بھی باہم متحد ہوجائیں گے اور اسرائیل کی مدد سے آسمانی بادشاہت میں ایک دوسرے کے قریب ہوجائیں گے۔ یہودی مذہب کا منصب یہ ہے کہ وہ سارے عالم میں امن اور مفاہمت پھیلائے"۔

(صفحہ ۵۸۱، جلد ۷، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھیکس)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

"اگرچہ یہودی مذہب میں تبلیغ مذہب کا دروازہ کھُلا ہوا ہے تاہم اس میں قربانئ ذات کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کے باعث اب وہ غیر تبلیغی مذہب ہوگیا اور دنیا کی اقلیت کا مذہب ہے"۔

یہودی مذہب کے آغاز کی تاریخ

"یہودی مذہب کی تاریخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آٹھ صدی پہلے شروع ہوتی ہے"۔ (جلد ہفتم صفحہ ۷۰۸)

یہودی مذہب کی تعلیمات اور قانون

"یہودی مذہب کی تعلیمات اور قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک تحریری قانون، دوسرا زبانی قانون

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وادئ سینا میں جس قانون کا الہام ہوا تھا اُس کے احکامات پورے طور پر واضح نہیں ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کوہ طور پر چالیس دن تک مقیم رہے اور اس حالت میں اُن کو ہدایات ملتی رہیں۔ جو تحریری (مکتوبی) قانون کی تشریح ہیں۔ یہ زبانی قانون کہلاتی ہیں۔ اور ان کو وادئ سینا میں موسیٰ علیہ السلام پر عطا شدہ قانون کہا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ زبانی قانون بعد کے مذہبی رہنماؤں کی من گھڑت باتیں ہیں اور کسی حد تک یہ قول صحیح ہے، کیونکہ واقعہ تو یہ ہے کہ زبانی قانون کا بڑا حصہ قدیم یہودی روایات ہیں جن کا ایک حصہ بلاشبہ سامی یہودیوں نے سامی نسل کے مشترکہ رسوم و قانون سے حاصل کیا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا صفحہ ۱۶۶ جلد ۱۳)

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ یہودی مذہب تین سامی مذاہب، اسلام، عیسائیت، یہودیت کے منجملہ ہے ان تینوں مذاہب کا سلسلہ ابراہیمی مذہب سے ملتا ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی تھی، یہودی مذہب کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے مطابق دی۔ وہ خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے جن کو توریت (صحیفۂ آسمانی) دی گئی تھی اس طرح یہ مذہب غیر سامی مذاہب کے برخلاف ایک الہامی مذہب ہے جو سامی مذاہب کی ایک مشترکہ خصوصیت ہے۔ بلحاظ قدامتِ زمانہ یہ نہ صرف اپنے ہم خاندان مذاہب (عیسائیت اور اسلام) سے مقدم ہے بلکہ وہ مشرق کے دیگر غیر الہامی مذاہب سے بھی قدیم ہے۔ چاہے وہ آریائی ہوں یا غیر آریائی۔ چنانچہ بیان ہوچکا ہے کہ یہودی مذہب کی بنا آٹھ صدی قبل مسیح میں پڑی لیکن مشرق کے قدیم مذاہب یعنی بدھ مت، کنفیوشی مت اور تاؤ مت کی ابتدا پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان قدیم مذاہب سے بھی یہودی مذہب تقریباً تین سو سال پرانا ہے۔

یہودیوں کی تعداد

رسالہ 'LIFE' (لائف) کا بیان یہ ہے کہ دنیا میں یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ ہے۔ ان کے منجملہ نصف تعداد امریکہ میں ہے۔ صرف ممالک متحدہ میں وہ پچاس لاکھ ہیں (لائف صفحہ ۳۹ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۵ء)

اس کے بیشتر پیرو یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جدول ذیل سے اس کی بخوبی وضاحت ہوگی یہ اعداد کتاب THE BRITANICA BOOK OF THE YEAR 1956 سے ماخوذ ہیں۔

یہودیوں کی آبادی جدول نمبر

ملک	آبادی	ملک	آبادی	ملک	آبادی
شمالی امریکہ	54,30,000	یورپ	34,39650	افریقہ	6,77,750
جنوبی امریکہ	6,31,730	ایشیا	16,29,240	اوسیانا	58,250

میزان 1,18,66,620

ذیل میں ہم ایشیا و افریقہ کے بعض ممالک سے متعلق جو اعداد مل سکے ان کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے بعض ممالک میں یہودیوں کی تعداد

نشان سلسلہ	نام ملک	آبادی	حوالہ
۱	فلسطین	12,70,000	اٹلس
۲	حبش	60,000	ISLAM IN ETHOPIA, P15
۳	عراق	1,00,000	BRIDGE TO ISLAM صفحہ ۲۹
۴	شام	29,770	" صفحہ ۱۴۲
۵	لبنان	5,666	" " "
۶	ہندوستان	22,680	مردم شماری ہند 1951ء
۷	پاکستان		" پاکستان 1951ء

یہودیوں کی اجتماعی حالت

توریت کے احکام اور خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی نافرمانی نیز حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب کی بنا پر یہودی دنیاوی اقتدار سے محروم اور غضبِ الٰہی میں مبتلا ہو گئے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآؤُا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۝ (الٓمٓ ۔ بقرہ آیت ۶۱)

ترجمہ:- اُن پر ذلت و بے چارگی طاری کی گئی اور وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

چنانچہ ۷۱ء عیسوی میں، جب (Titus) ٹیٹس نے اُن کو فلسطین سے نکال باہر کیا اور ان کا معبد تباہ کر دیا تو پھر وہ دربدر کی خاک چھاننے لگے اور ہزاروں سال سے دنیا کے دُور دراز ممالک میں منتشر اور بسے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اُنھیں بمشکل کہیں چین نصیب ہوا۔ ہر جگہ وہ دیگر اقوام اور مذاہب کے مظالم اور تشدد کا شکار رہے۔ مثلاً ڈاکٹر آرنلڈ اپنی کتاب 'دعوتِ اسلام' کے صفحہ ۹۲ پر لکھتے ہیں۔

"ساڑھے تین سو برس تک سلطنتِ انگلستان نے یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہیں دیا لیکن یہودیوں کی قوم بڑی سخت جان تھی کہ دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے تشدد کے باوجود وہ اپنے آپ کو باقی رکھ سکی اس کوشش میں ان کو مسلمانوں کی رواداری سے کافی سہارا ملا۔"

تمام غیر جانبدار (جن میں عیسائی مصنفین بھی داخل ہیں) اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مغرب کی نشأۃ ثانیہ سے پہلے عیسائیوں کے متعصبانہ اور متشددانہ برتاؤ کے مقابلے میں صدیوں تک اُنھیں صرف اسلامی مملکتوں میں پناہ مل سکی۔ چنانچہ ایک عیسائی 'اڈورڈ عطیہ' اپنی کتاب THE ARABS کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھتا ہے۔

"جیسا کہ ہم اس کتاب کے پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں یہودیوں نے اُن علمی اور سائنٹفک مساعی میں بڑا خوش آیند اور ممتاز حصہ لیا تھا، جنھوں نے بغداد اور اسپین کے خلفاء کے تحت عرب تہذیب کو پیدا کیا تھا۔ عربوں اور ترکوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں عرب ممالک میں یہودی اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ جب یورپ میں یہودیوں کو ہدف ظلم و ستم بنایا جا رہا تھا تو انھیں صرف مسلمانوں کی حکومت میں پناہ ملی۔"

لیکن جب عیسائیت کا جوشِ انتقام کم ہوا تو اپنی ذہنی برتری اور کاروباری صلاحیت کے باعث یہودی، عیسائی ممالک میں بھی بااثر ہو گئے۔ دوسری طرف عالم اسلام کے سیاسی زوال کے باعث مغرب کا اس پر معاشی اور سیاسی تسلط عام اور مستحکم ہو گیا نیز مغرب میں قومیت کا غلبہ ہو گیا تو یہودیوں کی سیاسی اُمنگیں تازہ ہو گئیں اور اُنھوں نے اولاً ایک قومی وطن اور پھر ایک قومی مملکت کا خیال پکانا شروع کیا۔ چنانچہ 'بھومن' اپنی کتاب (BRIDE TO ISLAM) میں لکھتا ہے کہ

"صیہونیت کی پہلی چنگاریاں (LEOPINSKER) لیوپنسکر نے ۱۸۸۲ء میں روشن کیں جو ایک روسی یہودی تھا۔ اور یہ ۱۸۸۱ء میں الکزنڈر دوم، زار روس کے قتل کے بعد پیش آیا۔ PENSKER نے ایک کتاب لکھی جو "خود مختاری" (AUTO EMANSPATION) کے نام سے

موسوم ہے تھیوڈر ہرزل نے اپنی کتاب یہودی مملکت کے ذریعہ ان چنگاریوں کو ۱۸۹۶ عیسوی میں ایک شعلہ بنادیا ۱۸۹۷ء میں بارسل کے مقام پر پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہرزل نے اپنی تجاویز کو بروئے کار لانے کے لئے وقت وسعی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ پہلے پہلے یہودیوں کی آبادکاری کے لئے کوئی مخصوص ملک پیش نظر نہ تھا۔ ارجنٹائن یوگنڈا اور کینیا کے بارے میں خیال آرائی تھی، لیکن بہت جلد مشرقی یہودیوں کا اثر محسوس کیا جانے لگا جنھوں نے اپنے قدیم وطن فلسطین کا مطالبہ شروع کیا۔ وہ کسی اور ملک پر راضی نہ تھے لیکن ۱۹۱۱ء تک صہونیوں کا خیال صرف ایک صیہونی گھر (وطن) کا قیام تھا نہ کہ صیہونی مملکت بابسل کے مقام پر ۱۹۱۱ عیسوی میں جو دسویں کانفرنس منعقد ہوئی تو صدر نے حسب ذیل بیان دیا۔

"صیہونیت کا مدعا یہودی قوم کے لئے سرکاری طور پر تسلیم شدہ اور قانونی طور پر حاصل شدہ فلسطین میں ایک وطن کا قیام ہے یہودی مملکت کا نہیں بلکہ ہمارے آباواجداد کی قدیم سرزمین پر ایک گھر بنانا ہے جہاں ہم بغیر کسی جبر و تعدی کے ایک یہودی زندگی گزار سکیں ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین میں داخل ہونے والے تارک الوطن کو بغیر کسی تحدید کے ایک شہری کے حقوق حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ یہودی رسم و رواج کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے زندگی گزار سکیں، یہی اور صرف یہی ہمارا مقصد ہے۔"

ان توقعات کی حقیقی تکمیل کا پہلا قدم اُٹھایا گیا جبکہ ڈاکٹر چیم ویزمن سے (انگلستان کے حق میں اس کی قیمتی خدمت کے معاوضہ میں یعنی جو اُس نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں ایجاد کی تھی) برطانوی حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتی ہے یہ نومبر ۱۹۱۷ء کا مشہور اعلان بالفور ہے۔ جس میں کہا گیا ہے

"ملک معظم کی حکومت یہودی قوم کے لئے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کو ہمدردی سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اپنی بہترین کوششوں کو استعمال کرے گی لیکن یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے گی جو فلسطین کے موجودہ غیر یہودی قوموں کے موجودہ دیوانی اور مذہبی حقوق یا دوسرے ملک میں یہودی کو حاصل شدہ حقوق یا سیاسی مرتبہ کے خلاف ہو۔"

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان امریکہ کے مشورہ اور رضامندی سے ہوا تھا۔

"صدر امریکہ نے بالفور DECLARATION کے وجود میں لانے میں کافی حصہ لیا اور ۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومن کے تحت ممالک متحدہ امریکہ نے اسرائیل کی آزاد مملکت کے وجود میں لانے میں کافی امداد کی۔" (MOSLEMS ON THE MARCH صفحہ ۲۸۸)

اعلان بالفور کے ذریعہ یہودی قوم کے لئے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ قطع نظر اس امر کے کہ عربوں کے ساتھ "میک موہن وعدہ" (MACK MOHAN PLEDGE) اور متحدہ برطانوی و فرانسیسی اعلان مورخہ ۷ نومبر ۱۹۱۸ء (دیکھیے ضمیمہ) کے مطابق نہیں سمجھا جاسکتا وہ صدر ولسن کے

"چودہ نکات" کے پہلے اُصول کے بھی خلاف تھا نیز اُس میں کہیں بھی یہودی سلطنت کے قیام کا صراحتاً وعدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن ۱۹۱۸ عیسوی سے لے کر ۱۹۴۸ عیسوی تک تیس سال کی مدت میں ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ مقامی

آبادی (مسلمانوں اور عیسائیوں) کی مرضی کے خلاف یہودی سلطنت قائم کی گئی۔ اس تیس سالہ دور میں کس طرح یہودی سلطنت کے قیام کا راستہ صاف کرنے کے لئے یہودیوں کی آبادی کو فلسطین میں ٹھونسا گیا اس کا یوں اندازہ ہوگا کہ

اعلانِ بالفور سے پہلے یہودی فلسطین کی آبادی میں ایک لاکھ تھے۔

"عرب دنیا کا ایک غیر منفک جز تھا جو شام سے غیر ممیز تھا اور اس کی آبادی نوے فی صد عرب آبادی تھی"۔ (THE ARABS ۹۴ صفحہ)

لیکن آج حال یہ ہے کہ یہ تناسب معکوس ہوگیا ہے اور یہودی نوے فی صد سے زائد اور عرب دس فی صد سے کم ہیں۔ یہ نتیجہ خلافِ توقع نہیں، کیونکہ شروع ہی سے صیہونی یہودیوں کے عزائم یہی تھے کہ فلسطین پر بیرونی یہودیوں کو لاکر بسایا جائے اور مقامی عرب آبادی پر غلبہ حاصل کیا جائے، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جو کمیشن (کنگ کرین کمیشن KING CRANE COMMISSION) بٹھایا تھا وہ اس سے واقف ہوچکا تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۲ء جو (HAYCRAFT COMMISSION) ہیکرافٹ کمیشن، برطانوی حکومت نے بٹھایا تھا اس کے سامنے بھی یہودی گواہوں نے ان عزائم کا اظہار کردیا تھا۔ اس طرح یہودیوں سے فلسطین میں "قومی وطن" کے قیام کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بداہتاً عربوں کے فطری اور قومی حقوق کے معارض تھا اور اس طرح یہودیوں اور عربوں کے متضاد مفادات اور حقوق میں مصالحت کی کوشش خود فریبی اور دھوکہ تھا جس کو محسوس کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۲۹ء تک عربوں اور یہودیوں میں مسلسل فسادات ہوتے رہے جو بالآخر ۱۹۲۹ء میں خونریز لڑائی ہوئی اس کے مدنظر ۱۹۳۰ء میں مسٹر ریمزے مکڈانلڈ کی مزدور حکومت کو اس مسئلہ کے متعلق دوسری مرتبہ برطانوی حکومت کی پالیسی کا اعلان کرنا پڑا لیکن برطانیہ میں یہودیوں کے اثر کے باعث یہودیوں کو مزدور حکومت سے اپنے رویہ میں تبدیلی اور یہودیوں کے حق میں اس نئی دستاویز کے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی جس کو عرب سیاہ دستاویزی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد چونکہ جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار آگئے اور انھوں نے یہودیوں کی خبرلینی شروع کی اس لئے یہودی جرمنی سے بھاگ کر فلسطین میں جمع ہونے شروع ہوئے اور یہ رفتار یوماً فیوماً ترقی کرتی گئی تاآنکہ سالانہ ساٹھ ہزار کی خطرناک حد پر پہونچ گئی، یہ سلسلہ چار سال (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء) تک جاری رہا اور اس طرح چار سال کی قلیل مدت میں دو لاکھ سے زائد یہودی فلسطین کے چھوٹے سے ملک میں جس کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ تھی داخل ہوگئے اور انھوں نے اپنی قوت کو مستحکم کرلیا۔ اس خطرناک صورتِ حال سے مجبور ہوکر ۱۹۳۶ء میں عربوں نے مقاطعہ کا آغاز کیا جو دو ماہ جاری رہا اور عرب مجاہدین نے یہودیوں کا مسلح مقابلہ شروع کیا جس کو دبانے کے لئے بیس ہزار ہزار برطانوی فوج موجود تھی لیکن دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک عربوں کی مسلح مقاومت کو کچلا نہ جاسکا کیونکہ عرب صاف طور پر یہ دیکھ رہے تھے کہ کس طرح یہودی فلسطین میں آئینی آبادی کے غلبے کا سامان کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لئے کس طرح نازیوں کے مظالم کے واقعات اور افسانوں سے عالمی رائے عامہ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور یہودیوں کی معاشی ترقی سے ملک کے معیارِ زندگی میں اضافہ کے فائدے کو اچھال رہے ہیں اور اس طرح بتدریج فلسطین میں اپنے اثر کو بڑھاکر اپنے سیاسی اقتدار کا سامان کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک عربوں کی اس مقاومت کے نتیجے میں ۶۹ برطانوی، ۹۲ یہودی، ۴۸۶ عرب سویلین اور ۱۱۳۸ عرب مجاہدین کی جانیں ضائع ہوئیں۔ (THE ARABS ۱۳۰ صفحہ)

اس صورتِ حال کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے ایک رائل کمیشن اس غرض سے روانہ کیا کہ فلسطین کے فسادات کے اسباب کی دوبارہ تحقیقات کرے اور ان کا حل پیش کرے کیونکہ اب برطانوی حکومت پر پورے طور سے

یہ واضح ہو چکا تھا کہ صیہونی آرزوؤں اور عربوں میں مصالحت ناممکن ہے جب پر وہ اعلان بالفور کے بعد سے کاربند تھی کمیشن نے فلسطین کی دو حصوں میں تقسیم کی تجویز پیش کی جس کو یہودیوں کے طاقتور دعایہ نے منصفانہ ثابت کرنے کے لئے مغرب میں بڑا کام کیا اور یہی بالآخر ۱۹۴۷ء میں متحدہ اقوام کی تجویز تقسیم کی بنیاد بنا۔ عربوں نے اس کی سخت ناراضی سے مخالفت کی کیونکہ انھیں یہودی وطن کے بارے میں اپنے بدترین مگر مبہم اندیشے پورے ہوتے نظر آئے کہ ان کے قلب میں ایک بیرونی مملکت قائم ہوگی تمام عرب ممالک اور حکومتوں میں اس تجویز کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا اور مجاہدین کی جدوجہد آزادی اور بڑھ گئی عربوں کے دو مطالبات تھے کہ یہودیوں کا داخلہ بند کیا جائے اور تقسیم کی تجویز مسترد کر کے مقامی آبادی کو آزادی دی جائے چونکہ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں یورپ پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے اور مغربی طاقتیں عربوں کو اپنا دشمن نہ بنانا چاہتی تھیں اس لئے انھوں نے اس تجویز کو ملتوی کر دیا۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی اور یہودیوں کے قومی وطن کے ادعا کی تردید کی۔ اس کے بعد ووڈ ہیڈ کمیشن (WOOD-HEAD COMMISSION) قائم کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے متعلق معین تجاویز پیش کرے۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۳۹ء میں حکومت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں حکومتِ برطانیہ نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ اندرون دس سال ایک آزاد فلسطین مملکت قائم کرے گی جس میں عربوں اور یہودیوں کو اس طرح حکومت میں حصہ دیا جائے گا کہ وہ ہر قوم کے مفادات کی ضمانت ہو نیز دس سال کے درمیان میں ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو ملک میں داخل کیا جائے گا۔ اس طرح تقسیم کے ذریعہ فلسطین میں یہودی سلطنت کے قیام کے ارادے کو ۳۹ء تک مسترد کیا جاتا رہا لیکن یہودیوں کے دباؤ کے تحت یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ اس اثناء میں چونکہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی تھی۔ اس لئے اس سے یہودیوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں کی مدد کے بہانے یہودی اپنی ایک مستقل بریگیڈ بنانے میں کامیاب ہو گئے جن کا اپنا جداگانہ جھنڈا تھا اور اس کو برطانوی افواج کا جز بنا دیا گیا جب جنگ ختم ہوئی تو صدر ٹرومن کے اصرار پر برطانوی حکومت، یورپ کے مزید ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل کرنے پر مجبور ہوئی۔ کیونکہ

"برطانیہ میں صیہونی طاقتور تھے لیکن وہ ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ طاقتور تھے یہاں نیویارک اور ایلیناس (ILLINOIS) میں انتخابی رائے میں ان کا فیصلہ کن حصّہ تھا جو صدارت کے انتخاب کو بدل سکتا تھا اس لئے وہاں ان کے درپردہ مذاکرات ارکانِ کانگریس اور دونوں پارٹیوں کے گورنروں پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔" (THE ARABS PAGE 172)

"لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام سے کچھ پہلے لیبر پارٹی انگلستان میں برسراقتدار آگئی جس نے فلسطین میں یہودیوں کے غیر محدود داخلہ کی قرارداد منظور کی اور کہا کہ "یہودیوں کے فلسطین میں داخل ہونے اور عربوں کے فلسطین سے باہر جانے کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے۔" (THE ARBS. ۱۷۲ صفحہ)

اس کے بعد ایک مشترکہ (برطانوی اور امریکی کمیٹی) قائم ہوئی جس نے مزید یہودیوں کے داخلہ کی سفارش کی، گو اس کا بھی اظہار کیا گیا کہ "آبادی کے دوسرے طبقات کے حقوق اور موقف کو متاثر نہیں ہونے دیا جائے گا" اس کے بعد عربوں نے انتداب کے ختم کرنے، انگریزوں کے چلے جانے اور جمہوری بنیادوں پر ایک آزاد فلسطینی حکومت کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران میں برطانوی

حکومت نے اصرار کیا کہ "برطانوی اور امریکی حکومتوں کی مقرر کردہ کمیٹی کی سفارش کے مطابق مزید یہودیوں کے فلسطین میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ یہودی 'دہشت پسندی ختم کی جائے اور ان کی زیر زمین تنظیمیں ختم کی جائیں" اس پر یہودیوں نے ایک طرف غیر قانونی داخلہ جاری رکھا اور دوسری طرف دہشت پسندی میں شدت پیدا کی۔ چنانچہ بیت المقدس کے (KING DAVID HOT'AL) کنگ ڈیوڈ ہوٹل کے ایک بازو کو اڑا دیا۔ اُس کے بعد پھر برطانوی اور امریکی حکومتوں نے ایک اور تجویز پیش کی کہ "یہودیوں اور عربوں کی دو آزاد مگر وفاقی حکومتیں بنائی جائیں، لیکن یہودیوں نے اس کو بھی مسترد کر دیا کیونکہ وہ ملک کا بہترین اور ۶۵ فی صدی حصہ چاہتے تھے" اس کے بعد برطانوی حکومت نے ۱۹۴۷ء میں ایک کانفرنس میں عرب حکومتوں کو مدعو کیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا بلکہ اس دوران میں یہودیوں کا غیر آئینی داخلہ اور خفیہ فوجی تیاریاں جاری رہیں۔ ۱۹۴۷ء کے موسم بہار میں متحدہ اقوام نے ایک کمیٹی بٹھائی جس کی اکثریت نے تقسیم فلسطین اور ایک یہودی اور ایک عرب مملکت کے قیام کی سفارش کی۔" جس میں ملک کی ایک تہائی یہودی آبادی کو ملک کا بڑا اور زیادہ زرخیز حصہ دیا گیا نیز ساحلی میدانوں کا مفید ترین حصہ اور تنہا عمدہ بندرگاہ دی گئی اور اس طرح عرب موثر بحری مواصلات سے کٹ گئے، نیز اُن کی آبادی کا نصف یعنی ۵ لاکھ عرب یہودی سلطنت میں چھوڑ دیئے گئے" (THE ARABS صفحہ ۱۷۷)

لیکن "برطانیہ نے اس اسکیم کے تعمیل کنندہ کے منصب کو ادا کرنے پر رضامندی سے انکار کیا اور انتداب سے دست برداری کا اعلان کیا اور اپنی غیر جانب داری ظاہر کرنے کے لئے اس اسکیم کے مباحث میں حصہ لینے سے انکار کیا"۔ لیکن متحدہ اقوام کی اسمبلی نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی جس میں ممالک متحدہ امریکہ کا بڑا حصہ ہے۔ اس واقعہ کو منچسٹر گارڈین نے بھی تسلیم کیا ہے جو ہمیشہ سے صیہونیت کا کھلا موئید ہے۔ اسی طرح TIMES نے یہ تنقید کی کہ:

"نمائندوں کا عام احساس یہ تھا کہ تقسیم کی تجویز سوائے نیویارک کے کسی اور شہر میں منظور نہ کی جا سکتی تھی کیونکہ اس شہر میں یہودیوں کا اثر ہے" (صفحہ ۱۷۹)

انگلستان کے اس اصرار کے بعد کہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو وہ اپنا انتداب ختم کر کے فلسطین سے اپنی فوجیں واپس بلائے گا، متحدہ اقوام کی طرف سے فلسطین میں امن برقرار رکھنے کے لئے کوئی بندوبست نہ کرنے کے باعث یہودیوں کو اس امر کا موقع مل گیا کہ وہ بزور قوت ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں اپنی حکومت قائم کریں:

"چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب کے ختم ہونے سے چند گھنٹے پہلے یہودیوں نے مملکتِ اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا اور صدر ٹرومن نے فوراً اُس کو تسلیم کر لیا" (صفحہ ۱۸۰)

یہودیوں کی اس ناجائز حکومت کے قیام اور اُس کے اقتدار سے بچنے کے لئے عربوں نے جو مقاومت کی، اُس کی ناکامی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ الغرض اس طرح تمام سابقہ بین الاقوامی مواعید کے برخلاف یہودیوں نے اپنے بین الاقوامی اثر، مالی قوت، اور بہتر اسلحہ کی مدد سے مقامی عرب آبادی کی مرضی کے خلاف فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کی" جس میں یہودیوں کو متحدہ اقوام کے جنگ بند کرنے کے فیصلہ سے بڑی مدد ملی کیونکہ عربوں کو ہوائی برتری حاصل تھی ورنہ یہودی بیت المقدس کے نئے حصے میں ہتھیار ڈالنے کو تھے" (صفحہ ۱۸۱ THE ARABS)

یہودی سلطنت کے قیام کی افسوسناک تاریخ کا خلاصہ اڈورڈ عطیہ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اس طرح وقتی طور پر تاریخ کا المناک ترین باب ختم ہوا ایک ایسا باب جو اُس کے تمام شرکاء پر بشمول عربوں کے جو ان کے ہدف میں بُری روشنی ڈالتا ہے۔ صیہونیوں نے ایک مجنونانہ خواب کو آگے بڑھایا جو صرف عربوں کو کاری زخم پہنچا کر پورا کیا جاسکتا تھا۔ برطانیہ نے تیس سال تک اس خواب کی تعبیر کے لئے مسلسل اعانت کی۔ اور اس کے لئے مسلسل عربوں کو طفل تسلی دیتا رہا اور اُن سے وعدہ خلافی کرتا رہا۔ امریکہ نے متحدہ اقوام سے تقسیم کی تجویز منظور کرانے کے لئے قابلِ اعتراض محرکات اختیار کئے ثالث کی حیثیت سے خود متحدہ اقوام کی ناکامی الم نشرح ہے جس نے اسرائیل کو اپنی قراردادوں کو بغیر کسی عقوبت کے توڑنے کی اجازت دی۔ ان سب پر مستزاد مغرب میں عربوں کے ایک سچے دوست کے الفاظ میں عرب اپنے مفاد کی حفاظت کے اہل ثابت نہ ہوئے کیونکہ کسی مفاد کا اخلاقی حیثیت سے ناقابلِ شکست ہونا بذاتِ خود فتح کی ضمانت نہیں اور باوجود اُن تمام بین الاقوامی اثرات کے جو اُن کے خلاف مجتمع ہوگئے تھے۔ عرب فلسطین کی لڑائی جیت سکتے تھے بشرطیکہ خود اُن کے اندر کوئی خرابی یا نقص موجود نہ ہوتا۔" (THE ARABS. صفحہ ۱۸۵)

...یلی مملکت کا قیام بین الاقوامی مواعید کے خلاف تھا

اعلانِ بالفور کے بعد ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء تک جب کہ برطانوی انتداب ختم ہوا برطانوی ...ت کی طرف سے ذمہ دارانہ طور پر مسلسل یہی کہا جاتا رہا کہ اعلانِ بالفور کے ذریعہ یہودی سلطنت کے قیام کا کوئی ... نہیں کیا گیا تھا۔ قدامت پرست پارٹی کے مسٹر چرچل نے حکومت کی طرف سے صیہونیوں کے اس ادعا کی تردید ... "فلسطین ایسا ہی یہودی ہونا چاہئے جیسا کہ انگلستان انگریزی ہے" اسی طرح سنہ ۱۹۳۰ء میں مزدور پارٹی کے ...ر مسٹر میکڈانلڈ کی حکومت نے بھی یہودیوں کے ادعا کو مسترد کیا۔

نیز اپریل ۱۹۴۶ء میں برطانوی اور امریکی کمیٹی تحقیقات نے بھی اپنے اس ایقان کا اظہار کیا تھا کہ فلسطین میں یہودی سلطنت نہیں قائم کی جائے گی۔ چنانچہ کمیٹی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہم اس امر کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ فلسطین میں یہودی عربوں پر غالب نہ ہوں اور نہ عرب یہودیوں پر غالب ہوں۔ اور فلسطین میں نہ یہودی مملکت ہو اور نہ عرب مملکت۔ فلسطین میں آخرکار ایک ایسی مملکت ہو جو مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے حقوق اور مفادات کی مساوی طور پر نگہبان ہو .... ہم نہایت پُرزور طریقہ سے اعلان کرتے ہیں کہ فلسطین ایک مقدس سرزمین ہے جو عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے نزدیک برابر محترم ہے اور چونکہ یہ ایک مقدس ملک ہے۔ اس لئے فلسطین ایسا ملک نہیں ہوسکتا جس پر ایک نسل یا ایک مذہب اپنے تنہا دعوے کو منصفانہ خیال کرے .... واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک مقدس سرزمین ہے اور وہ دوسرے ممالک سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اور وہ انسانی برادری کے

تصورات اور اعمال کے لئے مختص ہے، نہ کہ تنگ نظر قومیت کے لئے۔"

(THIS AGE OF CONFLICT صفحہ ۸۶۲)

یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ لارڈ مین (LORD MOYNE) برطانوی وزیر مملکت برائے مشرق وسطیٰ کو قاہرہ میں اسی کی پاداش میں ۱۹۴۴ء میں یہودی دہشت پسندوں نے قتل کیا۔ اور اسی طرح سینکڑوں برطانوی عہدہ داروں کو قتل کیا کیونکہ وہ ۱۹۴۴ء کے برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض کے اس فیصلہ کے حامی تھے کہ

"ملک معظم کی حکومت یقین رکھتی ہے کہ انتداب کے مصنفین جس میں اعلان بالفور کو شامل کیا گیا ہے، یہ ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ فلسطین کو ملک کی عرب آبادی کی مرضی کے خلاف ایک یہودی سلطنت میں تبدیل کر دیا جائے۔"

(THIS AGE OF CONFLICT ۲۵۴ صفحہ)

لیکن ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانوی انتداب کے ختم ہوتے ہی یہودی عارضی حکومت نے اسرائیلی سلطنت کے قیام کا اعلان کیا جس کو فوراً ممالک متحدہ امریکہ نے اور اس کے چند ہی دنوں بعد سویٹ یونین نے تسلیم کر لیا۔ اور اس طرح بین الاقوامی مواعید کے خلاف ورزی میں اسرائیلی مملکت کا قیام عمل میں آیا اور اس کی مقاومت کے لئے اردن، عراق، شام، مصر اور لبنان نے جو کوششیں کیں ان کو اُن ہتھیاروں کی مدد سے جو بڑی تعداد میں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے جمع کی تھیں یا جمہوری افواج کے ذخائر سے چرائی تھیں، یہودیوں نے ناکام بنا دیا۔ اس لڑائی کو بند کرانے کے لیے متحدہ اقوام نے سویڈن کے کونٹ برناڈ کو بھیجا لیکن ان کو بھی ستمبر ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے قتل کر دیا۔

"اسرائیلی حکومت نے متحدہ اقوام کے جنگ بند کرنے کے احکام کو ٹھکرا دیا۔"

(THE ARABS. صفحہ ۱۷۴) ؟

اُس کے بعد ۱۹۵۵ء تک وہ فلسطین کے مغصوبہ علاقہ پر قابض رہے اور فروری ۱۹۵۵ء میں اچانک مصر کے مقبوضہ علاقہ 'غازہ' پر بے رحمانہ حملہ کیا اس کا نتیجہ طرفین کی تسلیح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو فرانس کی شہ پر اسرائیل نے مصر کے خلاف حملہ کر دیا۔ اور اُدھر برطانوی اور فرانسسی حکومتوں نے اسرائیل اور مصر کو جنگ بند کرنے کا الٹی میٹم دے کر مصر کے خلاف حملہ کر دیا۔ لیکن متحدہ اقوام کی مداخلت نیز معاہدہ بغداد کے مسلم ارکان کے سخت طرز عمل کے باعث جنگ بند ہوئی اور برطانیہ و فرانس کو نہر سویز کے علاقہ اور اسرائیل کو 'غازہ' کا علاقہ چھوڑنا پڑا۔

اس طرح تیس سال کے عرصہ میں فلسطین میں یہودی اپنی آبادی کو ایک لاکھ سے چودہ لاکھ تک بڑھانے اور مقامی عرب (دس لاکھ) آبادی کے منجملہ نو لاکھ کو ملک بدر کرنے میں بظاہر کامیاب ہو گئے لیکن کیا یہ اسرائیلی مملکت جو بین الاقوامی مواعید کی خلاف ورزی اور ظلم و زیادتی پر مبنی ہے باقی رہ سکے گی؟

اسرائیل کا قیام مشکوک اور غیر یقینی ہے۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ دس سال میں دو مرتبہ اسرائیلی

حکومت، عربوں کے ہاتھوں شکست سے محفوظ رہی ہے لیکن اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو MIDDLE EAST CRISIS کے مصنف کے حسب ذیل خیال میں جھلکتی ہے۔

"ایک معمہ یہ ہے کہ یہودی جن کے متعلق توقع تھی کہ وہ معاشی تنظیم میں نام پیدا کریں گے اور مشکوک سپاہی ثابت ہوں گے وہ واقعہ کے طور پر اول درجہ کے سپاہی اور دوسرے درجہ کے کاروباری آدمی ثابت ہوئے۔" (MIDDLE EAST CRISIS، صفحہ ۵۵)

یہ نتیجہ اُن کے اعلیٰ تر ہتھیار، اور اُس قیمتی حربی معلومات، مواقع جنگ، اور اوقات جنگ کے صحیح علم پر مبنی ہے جو اُنھیں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے سیاسی اور ڈپلومیٹک حلقوں میں شریک ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ مناسب اور موزوں وقت پر اُن اعلیٰ تر ہتھیاروں کی مدد سے حملہ کرتے ہیں جو اُن کے سوا کسی مشرقی ملک کو مہیا نہیں ہے اُن کی معاشی ناقابلیت بھی حقیقی نہیں، بلکہ اسی کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کی سرکاری اور غیر سرکاری امدادوں کو بے دریغ فوجی تیاریوں کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے اُنھیں ایک اور فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ اپنی معاشی مشکلات کا حوالہ دے کر اپنے دولت مند بھائیوں اور ہوا خواہوں سے بے انتہا دولت بٹور سکتے ہیں۔ گذشتہ دس سال میں جس آسانی سے اور جس کثیر مقدار میں اسرائیل کے اس چھوٹے سے ملک اور یہودیوں کی چند لاکھ کی آبادی کو بیرونی مالی امداد ملی ہے اُس کا عشر عشیر بھی ہمسایہ عرب ممالک کو نہ مل سکا۔ لیکن اس سارے جتن کے باوجود پھر بھی یہ سوال باقی ہے کہ کیا یہ غیر فطری اور بیرونی مملکت مشرق وسطیٰ میں باقی رہ سکے گی؟ ہم اس کا جواب خود دینے کے بجائے غیر مسلموں اور اسرائیل کے دوستوں کی زبانی دیں گے۔

(۱) فرناؤ اپنی کتاب MUSLIMS ON THE MARCH کے صفحہ ۲۹۱ پر لکھتا ہے۔

"اسرائیل ایک چھوٹی سی مملکت ہے جس کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے عربوں اور مسلمانوں کے سمندر میں وہ ایک جزیرہ ہے مآل کار اسرائیل کا وجود اُس کی اس صلاحیت پر مبنی ہے کہ وہ مشرق قریب کی مملکتوں کے نظام میں کس طرح اپنے آپ کو بٹھاتی ہے وہ غیر معین طور پر ایک مخالف ہمسایوں کی دنیا میں ایک جزیرہ کی طرح برقرار نہیں رہ سکتی۔"

(۲) MIDDLE EAST CRISIS کے مُصنفین لکھتے ہیں کہ

"اسرائیل نے تمام عربوں کو ایک مرتبہ اور مصریوں کو دو مرتبہ شکست دی ہے شاید وہ ایک اور مرتبہ بھی ایسا کر سکے، لیکن کوئی مملکت باقی نہیں رہ سکتی اگر اس کو ہر پانچویں یا چھٹے سال اپنے سے زیادہ تعداد سے لڑنا پڑے۔ نتیجہ میں چار کروڑ عرب، ساڑھے بارہ لاکھ اسرائیلیوں پر غالب آجائیں گے بشرطیکہ وہ پختہ عزم کریں متحد ہو جائیں اور کسی قدر کم ناکارکرد ہوں۔" (MIDDLE EAST CRISIS۔ صفحہ ۱۲۱)

(۳) ایڈورڈ عطیہ، اپنی کتاب THE ARABS کے صفحہ ۲۲۸ پر لکھا ہے:

"وہ (عرب) خود اسرائیلیوں کی طرح جانتے ہیں کہ اسرائیل خوش حال اور زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی رسائی عرب بازار تک نہ ہو۔ اس رسائی کے بغیر وہ امریکی صیہونیوں"

عملی حالت ایک بار ہوگی جو ابھی تک اس ملک اسرائیل کو زندہ رکھنے کے لئے امداد پر امداد دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی صیہونی کب تک اپنی امداد کے ذریعہ اسرائیل کو باقی رکھنے کا عزم رکھیں گے اُن کو توقع ہے کہ اگر وہ اپنے بازاروں کو اسرائیل کے لئے بند کردیں تو اسرائیل کو پست معیارِ زندگی پر مجبور کریں گے اور ترکِ وطن کی رفتار اُلٹی ہوجائے گی یعنے یہودی ملک میں داخل ہونے کے بجائے ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ جیسا کہ فی الواقع جرمنی میں نازیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے فوراً پہلے کے برسوں میں پیش آیا تھا۔ اُن کو یاد ہے کہ بیت المقدس کی لاطینی حکومت ایک سو سال تک باقی رہنے کے بعد بھی ختم ہوگئی۔ عربوں کے نزدیک اسرائیل بھی ایک اسی قسم کا مصنوعی وجود ہے' ایک ایسا ٹھونسا ہوا وجود ہے جس کا عرب دنیا میں کوئی مقام نہیں وہ ایک ایسا پتھر ہے جو عرب پہاڑ کی ڈھلانوں پر کشش ثقل کی قوت کے برخلاف آگے ڈھکیلا گیا ہے۔ صرف مشرقِ وسطی کے عربوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے اور اسرائیل پندرہ لاکھ اس کو اگر علیحدہ اور اس علاقہ کی مقامی جماعتوں سے باہر رکھا جائے تو وہ بالآخر عرب ممالک کی بڑھتی ہوئی دولت' قوت اور استحکام کے مقابلے میں دیرپا ثابت نہ ہوگی۔ وہ درآمد شدہ تنہ جس کی جڑیں نیویارک میں ہیں سُوکھ جائے گا' جو پتھر کششِ ثقل کی قوتوں کی مزاحمت کر رہا ہے وہ زور سے وادی کی گہرائیوں میں گر پڑے گا"

اسرائیلی مملکت کا قیام

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسرائیل کا قیام مغربی (عیسائی) اقوام کی ان دُہری کوششوں کا حصہ ہے جن میں سے ایک کا منشا یہودی سرمائے کی منظم و موثر طاقت سے پیچھا چھڑانا اور دوسری کا منشا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ یہودیوں کے ظالمانہ اور شرمناک سلوک کا بدلہ لینے کے لئے ان کو مسلمان کے غیظ و غضب اور انتقام کے حوالے کرنا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت فراہم کرنا مشکل ہے اس کے برخلاف ایک دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول کے غیر معمولی اور بحرانی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب کو فلسطین میں اولاً یہودی وطن اور بعد ازاں قومی مملکت کے قیام پر راضی کرکے یہودیوں نے عیسائیوں سے ان کے صدیوں کے مظالم کا بدلہ لیا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف صف آرا کردیں گے۔ اور اس طرح صلیب و ہلال کی تاریخی آویزش کو تازہ کرکے وہ عیسائیوں سے بدلہ بھی لیں گے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں عیسائیوں کے طرزِ عمل کو یاد کرتے ہوئے یہ رائے قرین صورت معلوم ہوتی ہے کہ عیسائی دنیا تاریخ کے ایک نئے موڑ پر اپنے دوست نما دشمن کے چکمے میں آکر پھر مسلمانوں سے اپنے تعلقات کو بگاڑنے پر مائل کردی گئی ہے۔ بہرحال چاہے یہ قیاس بھی غلط ہی کیوں نہ ہو اس سے انکار تو قطعاً ممکن نہیں کہ اسرائیل کا قیام بین الاقوامی سازشوں اور استعمار کی پیداوار ہے اس لئے استعمار کے زوال کے ساتھ اس کی موت بھی یقینی ہے۔ فلسطین میں اسرائیلی مملکت کے قائم نہ رہ سکنے کا دوسرا بڑا قرینہ متبدلہ بین الاقوامی صورت حال ہے' بیسویں صدی میں جو بین الاقوامی خلفشار پیدا ہوا اور جس کے نتیجہ میں دو بڑی عالمگیر جنگیں ہوئیں اُن سے پورا پورا فائدہ اُٹھا کر یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس میں انھیں دو عوامل سے بڑی مدد ملی' پہلا عامل مغربی استعمار

تھا، لیکن اب وہ عامل باقی نہیں رہا ہے۔ مغرب اب بڑی حد تک استعمار سے دست بردار ہو چکا ہے اور مشرق اور مسلمانوں سے تعاون کی نئی بنیادیں تلاش کر رہا ہے۔ اس لئے وہ دیر یا سویر اس ناانصافی کو برقرار رکھنے میں دلچسپی باقی نہیں رکھ سکتا جو اس کے نئے نقشے اور ارادوں میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اور جس کی وجہ سے ایک طرف مشرقِ وسطیٰ اور مشرقی ممالک میں اس کے جائز مفادات خطرے میں پڑ گئے ہیں تو دوسری طرف اس کے نظریاتی دشمن کو مخالف پروپگنڈا کرنے اور مشرقِ وسطیٰ کے اہم خطہ میں داخل ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ نے صیہونی مملکت کے قیام کی مخالفت کی، ایمانداری کی بات یہ ہے کہ آخری مراحل میں برطانیہ کا ایجابی طور پر یہودی سلطنت کے قیام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگرچہ منفی طور پر وہ ذمہ دار ہے کہ اعلانِ بالفور کے مصنف اور انتدابی حکومت کی حیثیت سے اس نے یہودی سلطنت کے قیام کی ناانصافی کو روکنے میں اپنا فرض تندہی سے انجام نہیں دیا قانون اور انصاف کے اس مسلمہ اصول سے کیسے انکار ممکن ہے کہ فعل (commission) کی طرح ترکِ فعل (omission) بھی مساوی جرم ہے۔ دوسرا بڑا عامل، نازی دور میں یہودیوں پر جرمنی میں مظالم کا سلسلہ ہے جس سے متاثر ہو کر فلسطین میں یہودیوں کے توطن کی ہمت افزائی کی گئی، حالانکہ یہودیوں کے عزائم ظاہر ہو چکے تھے کہ وہ خانماں برباد یہودیوں کے لئے صرف ٹھکانا نہیں چاہتے بلکہ اصل عرب آبادی کے جائز اور قدرتی حق کو غصب کرنا چاہتے ہیں، بہرحال یہودیوں کے ہمدردوں کی تائید میں اگر انتہائی فیاضانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جائے تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نازی دور کی بے رحمانہ سفاکی کے علاج کی ایک نہایت ہی بھونڈی اور غیر دانش مندانہ سعی تھی جو پچھلے قرن کے ان غیر معمولی حالات میں سوچی گئی۔ جب کہ استعماری ذہنیت، قوت فیصلہ کو مفلوج بنائے ہوئے تھی کیونکہ دوسری جنگِ عظیم کے نتیجہ میں متعدد ممالک اور دنیا کے اہم حصوں میں جو بڑے اور اہم و پیچیدہ مسائل اور سوالات پیدا ہو گئے تھے ان کے دباؤ اور ان کے کسی قابلِ عمل حل کی تلاش کی مشکلات میں فلسطین کے مسئلہ میں (بغیر اس کے نتائج اور عواقب پر غور کئے ہوئے) جلد بازانہ فیصلہ کر دیا گیا جس کا سب سے بڑا اور قطعی ثبوت یہ ہے کہ یہودی سلطنت کے تسلیم کرنے میں امریکہ اور روس نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ دونوں کسی بڑے مسئلہ پر پچھلے دس سال میں کبھی متفق نہیں ہو سکے۔ بالشویک روس کی تائید قابلِ فہم ہے کیونکہ مسلمانوں اور اسلام سے متعلق اس کا نظریہ اور عمل واضح ہے لیکن امریکہ کی تائید اس کی پوری قومی تاریخ کے مخالف ہونے کے باعث قابلِ فہم نہیں، کیا یہودی سرمایہ کا امریکہ میں اثر یا یہودی رائے دہندوں کا امریکہ کی سیاسی جماعتوں کے انتخاب میں اہم عنصر ہونا امریکہ کو ان شاندار اصولوں سے روگرداں کر سکتا ہے جو بیسویں صدی کی تاریخ انسانیت کا روشن باب ہے امریکہ نہ صرف اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ ایسی مثال سیاسی و معاشی برتری کے باوجود استعمار کا مریض نہیں رہا بلکہ اس حیثیت سے بھی مشہور ہے کہ بیسویں صدی میں دو مرتبہ اس نے ظلم و تعدی کے خلاف اپنی قوت، دولت اور اثر کو استعمال کر کے نوعِ انسانی کو تباہی سے بچایا ہے اس طرح اب بھی وہ دنیا میں امن اور خوش حالی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی عظیم طاقت اور عظیم تر سرمایہ کو بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔ کیا وہ صرف چند لاکھ یہودیوں کی رضامندی یا ان کی انتخابی رائے کی خاطر اپنے اس شاندار ریکارڈ کو برباد کرے گا؟ کیا وہ اپنے پچھلے قابلِ تعریف رویہ کو یہودی سلطنت کی ناانصافی سے داغدار بنانے کو گوارا کرے گا نیز مسلمانانِ عالم کی سچی دوستی کو قربان کر دے گا، اور کیا اس فیصلہ کے

وقت وہ اس امر کو بھی نظر انداز کر دے گا کہ اُس کے بہترین اور قابلِ اعتماد حلیف (پاکستان، ایران، عراق اور ترکی) بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، جن سے بہتر حلیف شاید مغرب میں بھی اس کو نہ مل سکے گیں۔

امریکہ کی تاریخی روایات اس کی جمہوریت پرستی اور عاقبت بینی کی بنیاد پر کیا یہ توقع بے جا سمجھی جا سکتی ہے کہ بالآخر انصاف پسندی اور ضمیر کی آواز یہود نوازی پر غالب آئے گی اور ظلم و ناانصافی کی پیداوار (اسرائیل) سے امریکہ اپنا ہاتھ دھولے گا؟ ان سوالات کا قطعی اور یقینی جواب تو مستقبل ہی دے گا لیکن کسی حد تک کتاب The Britanica, book of the year 1956 صفحہ ۲۴۹ کے حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:۔

"ممالک متحدہ امریکہ سے تعلقات (اسرائیل کے) کسی حد تک سرد ہو گئے ہیں جو عرب مملکتوں سے اس کے بڑھے ہوئے تعلقات کا نتیجہ ہے۔"

یہودی سلطنت کا وجود مشرق اور عالمِ اسلامی میں کمیونزم کی سب سے بڑی فتح اور جمہوریت کی سب سے بڑی شکست پر منتج ہو گا اور مستقبل میں ایک نئی دنیا کی تشکیل کے اس عظیم الشان تصور کو برباد کر دے گا جو سب کو عزیز ہے اس نیک کام میں ایک عالمی قوت کی حیثیت سے مسلمان سب سے بڑے مددگار اور ساتھی ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ انسانیت کو غیر منقسم سمجھتے اور مساوات، جمہوریت کے اُن سچے اور قیمتی اقدار کے حامی ہیں جو الہامی مذاہب (اسلام اور عیسائیت) کے سرچشمے سے سیراب ہیں لیکن کیا یہودی مملکت باہمی تعاون کی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نہیں ہے؟

ہمیں یقین ہے کہ موجودہ عہد کے سب سے بڑے مغربی مورخ اور دور بین مفکر (ٹائن بی) کی وہ آواز صدا بصحرا نہ ثابت ہو گی جو ٹوکیو (دارالخلافہ جاپان) میں بیرونی نامہ نگاروں کے کلب میں بلند ہوئی تھی۔

"اسرائیلی مملکت عربوں کے ساتھ ناانصافی پر قائم کی گئی ہے جنگ زدہ یورپ کے پناہ گزینوں کو عرب دنیا میں ٹھونسا گیا اور بعض عربوں کو اپنا گھر بار چھوڑنے نیز کہیں اور پناہ تلاش کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انھوں (ٹائن بی) نے یہ بھی کہا کہ مشرقِ وسطیٰ کی چپقلش کی جڑیں بہت گہری ہیں اُن کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ مغربی طاقتوں نے عرب ممالک پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کیا، عرب بڑی اور سخت ناانصافیوں کا شکار ہوئے ہیں وہ ایسے جانباز لوگ ہیں جو ان ناانصافیوں کو دُور کرنے کے لئے کسی قسم کی مدد تلاش کر سکتے ہیں۔"

(DAWN مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء)

آج کی مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال اس پیشگوئی کا آغاز ہے نہ کہ انجام

خلاصہ

آبادیٔ عالم	یہودیوں کی آبادی	فی صد
2,40,00,00,000 ارب	1,18,00,000	·05
دو ارب چالیس کروڑ	ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ	

———★———

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

علی اختر مرحوم

ایک غم دوسرے غم کو تازہ کر دیتا ہے، اور ایک بات دوسری بات کو یاد دلا دیتی ہے، علی اختر مرحوم کا ذکر نکلا تو حافظہ نے اب سے ستائیس سال پہلے کی یادداشت کے اوراق اُلٹ دئے اور اُس زمانہ کی ایک ایک یاد اور ایک ایک صحبت نگاہوں کے سامنے مجسم ہوگئی!

سنہ ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے میرا حیدرآباد دکن جانا ہوا تو شروع شروع میں کئی مہینہ مولانا مفتی عبدالقدیر صاحب بدایونی کے ساتھ مہمانداری اور دعوتوں میں گزرے، مولانا موصوف بدایوں چلے آئے تو مرتضیٰ احمد صاحب انصاری وکیل ہائی کورٹ کے بنگلہ میں میرا قیام رہا، وہ اُس زمانہ میں جام باغ میں رہتے تھے، خاصہ آرام دہ مکان تھا، ان کی آمدنی اور حالات کا جزرومد بڑا پُرلطف تھا، کبھی روپیہ کی وہ ریل پیل کہ جیسے آسمان سے ہُن برس رہا ہے اور کبھی "خشک سالی" کا سماں! انہی دنوں مولانا حمید الدین قمر فاروقی سنبھلی سے ملاقات ہوگئی، قمر صاحب نے ابھی تک "ادارۂ شرقیہ" قائم نہیں کیا تھا، صدر محاسبی میں ملازم تھے اور جدید ملک پیٹ کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے! ان سے اتنا ربط ضبط بڑھا کہ انصاری وکیل کے بنگلہ سے اُٹھ کر انہی کے یہاں آگیا چند دن مہمانی میں گزرے، پھر مشترکہ میس (MESS) کا بندوبست ہوگیا، کئی دوست مل کر کھانا کھاتے تھے، سستے کا زمانہ، یار دوستوں کا جمگھٹا بے تکلفی کی صحبتیں، خوب مزے سے گزرتی تھی!

مولانا قمر کے یہاں ایک دن اُن کے ایک دوست آئے، اُن کے ہاتھ میں بہت سے رسالے دیکھ کر میں نے پوچھا تو بولے:۔

"علی اختر صاحب کے یہاں سے یہ رسالے لایا ہوں، رسالے والے تو اُن کے مرید ہیں۔۔۔"

ؔ مولانا حمید الدین قمر فاروقی سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں، اور دیوبند کے فارغ التحصیل عالم! پنجاب یونیورسٹی کے "مولوی فاضل"! حضرت فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں، حیدرآباد دکن میں ان کے قائم کردہ "ادارۂ شرقیہ" نے برسوں علوم شرقیہ کی خدمت انجام دی اور سینکڑوں طلبار کو ادیب فاضل اور منشی فاضل بنادیا، فن تعلیم اور درس وتدریس میں یدطولیٰ رکھتے ہیں، سیر چشم اور حوصلہ مند دوست ہیں، تعدد ازدواج کے معاملہ میں "شاردا ایکٹ" کے عملی مخالف بلکہ "قانون شکن"! تقسیم ہند کے بعد سے دکن کی جمعیۃ علماء کی زمام کار کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

جناب علی اختر کی نظمیں رسالوں میں پڑھی تھیں مگر یہ اُسی دن معلوم ہوا کہ وہ اسی محلہ (جدید ملک پیٹ) میں رہتے ہیں، اور ہمارا ان کا ابھی تک "چراغ تلے اندھیرا" والا معاملہ ہے! اس کے بعد میں علی اختر مرحوم کے یہاں پہونچا، ملے اور بڑے تپاک سے ملے، بس پھر مسلسل ملنا جلنا ہوتا رہا، اور تعلقات بڑھتے اور استوار ہی ہوتے چلے گئے!

یہ وہ زمانہ تھا کہ میری نومشقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور دوسرے دور کو شروع ہوئے بھی دو تین سال گزر چکے تھے، اس وقت میری شاعری کا یہ رنگ تھا :-

میں محوِ خودی ہوں کہیں ایسا تو نہیں ہے
اپنے پہ مجھے یار کا دھوکا تو نہیں ہے
ہاں! ماہرِ ناشاد سے کچھ تم نے کہا تھا
تم بھول گئے ہو، کہیں ایسا تو نہیں ہے

اور اس دور میں مشاہیر شعراء اور اہل فکر و نظر کی صحبت سے استفادہ کا ارادہ کئے بغیر بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہونچ ہی جاتا ہے، علی اختر مرحوم اپنی تازہ غزلیں اور نظمیں مجھے سُناتے اور اپنی محبت سے میرا تازہ کلام بھی فرمائش کر کے سنتے، ایک بار میں نے اپنی نئی غزل سُنائی جس کا مقطع تھا :-

حیات ماہر حزیں رہینِ دردِ عشق ہے
وگرنہ مشتِ خاک کی، اساس کیا نمود کیا؟

میری اس غزل کی انھوں نے بہت تعریف کی، نیاز فتحپوری ان دنوں بلدہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے، ان سے بھی میری اس غزل کا تذکرہ کیا، علی اختر مرحوم کی حوصلہ افزائی نے مجھے ابھارا اور میں نے یہ غزل رسالہ "ہمایوں" میں چھپنے کے لئے بھیج دی اور دوسرے مہینہ ہی میری غزل "ہمایوں" میں شائع ہو گئی!

ایک بار انھوں نے اپنی ایک مسلسل غزل :-

"سحر کل رات کو ـــــ خیر و شر کل رات کو"

سُنائی، اس کے بعد میں نے اسی زمین میں غزل کہی اور ہمایوں میں یہ چھپ بھی گئی "ہمایوں" میں میری اس غزل کو پڑھ کر علی اختر صاحب بولے :-

"بھئی! تمھاری غزل خوب رہی، مگر میں نے اپنی غزل اس کے بعد چاک کر دی، کیونکہ جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ سب تم نے اپنی غزل میں بیان کر دیا۔۔۔"

علی اختر مرحوم کا مکان میرے گھر سے بہت قریب تھا، ایک فرلانگ سے بھی کم، دن رات اُن کے یہاں اُٹھنا بیٹھنا رہتا، اس دلچسپی اور ہم جلیسی میں "برج" کا شوق بھی شامل تھا۔ تاش کھیلنے کی آج کل جیسی لت، حضرت جگر مرادآبادی کو ہے، اتنی تو نہ تھی مگر علی اختر کے یہاں بعض دن آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے مسلسل "برج پارٹی" کا جماؤ رہتا وہ بڑے انہماک کے ساتھ پتے کھیلتے اور ان کے ساتھی (PARTNER) سے پتہ چلنے میں چوک ہو جاتی تو اس پر بہت بگڑتے، اور کبھی کبھار بدمزگی کی نوبت آجاتی! حضرت فانی بدایونی سے حیدرآباد دکن میں میری پہلی ملاقات اس عالم میں ہوئی کہ ہوش بلگرامی اُن کو لیکر آئے۔ اور نیاز فتحپوری، علی اختر اور میں "برج" (کنٹ ترکٹ) کھیل رہے تھے!

علی اختر مرحوم پرسوز انداز میں ترنم سے شعر پڑھتے، مشاعروں کے وہ مردِ میدان شروع ہی سے نہ تھے، پنڈت

دتاتریہ کیفی ایک بار حیدرآباد دکن گئے، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ نے اُن کے اعزاز میں بڑے دھوم کا مشاعرہ کیا، طرحی مصرعہ تھا:-

ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اس مشاعرے میں وہ شریک ہوئے اور غزل پڑھی، مشاعروں کی ہنگامہ آرائی سے اُن کا جی اُکھتا تھا!

مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے نانا نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج علی اختر کے حقیقی چچا تھے، داغ دہلوی سے تلمذ تھا، حکومت دکن میں کلکٹر تھے، بڑے دوست نواز، ملنسار، خوش مزاج اور خوددار! اُن کا دیوان "کیفیاتِ مزاج" چھپ چکا ہے، جس پر میرا مقدمہ ہے نواب صاحب مرحوم سے میرے اس قدر محبت وخلوص کے روابط تھے کہ اسے "مثالی دوستی" کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا، نواب صاحب مرحوم اور علی اختر کے درمیان کئی سال سے کشیدگی تھی، میری کوشش سے یہ کھچاوٹ اور تناتنی دور ہوئی، اور چچا اور بھتیجے میں ملاپ ہوگیا۔

اب سے چند دن قبل ایک رسالہ میں علی اختر کو باغ سنبھلی کا فرزند لکھا ہوا دیکھا یہ التباس مضمون نگار کو تخلص (باغ) کے سبب ہوگیا، وہ باغ سنبھلی کے نہیں سید کاظم علی باغ کے بیٹے تھے، باغ مرحوم کو جہاں استاد داغ دہلوی سے نسبت تلمذ تھی، سادات کا یہ خاندان مغلیہ بادشاہوں کے دور میں سبزوار سے ہندوستان آیا اور مغلیہ حکومت نے کاسگنج ضلع ایٹہ کے قریب دو تین گاؤں اُن کو جاگیر میں عطا کئے، سید کاظم علی باغ کی پیدائش علی گڈھ میں ہوئی ریاست رامپور اور ریاست گوالیار سے ملازمت کا تعلق رہا، پھر دکن چلے گئے، وہاں ٹھیکیداری کرتے تھے، داغ کے رنگ میں کامیاب غزل گو تھے، مشاعرے میں بڑے ٹھاٹ کے ساتھ غزل پڑھتے، خوش طبع، خوش لباس، خوش خوراک اور شاہ خرچ تھے، علی اختر مرحوم کا مولد رامپور ہے، حیدرآباد دکن جب وہ یو۔ پی سے گئے ہیں تو میٹرک پاس کرچکے تھے، اُن کی ملازمت کی ابتدا محکمۂ آبکاری سے ہوئی مدراس میں (غالباً) ٹریننگ حاصل کی اور پھر محکمہ آبکاری کے انسپکٹر ہوگئے! اس محکمہ میں "دستِ غیب" کے قدم قدم پہ مواقع تھے، وہ چاہتے تو ہزاروں نہیں لاکھوں روپے پیدا کرلیتے مگر وہ اس دلدل میں کنول کی طرح رہے، حالانکہ وہ کثیرالاولاد تھے اور تنخواہ میں کسی طرح گزر نہ ہوتی تھی، اکثر پریشان بلکہ قلاش رہتے۔ ان کی درد انگیز نظم ــــ فاقہ کی ایک شام ــــ اسی زمانہ کی یادگار ہے، اور یہ جگ بیتی نہیں سچ مچ آپ بیتی ہے!

حیدرآباد دکن میں ہوش بلگرامی مرحوم (نواب ہوش یار جنگ) سے علی اختر مرحوم کا بڑا یارانہ تھا ہوش صاحب نے بھی اپنی دوستی کا حق ادا کردیا، ہوش بلگرامی جب محکمہ (تعمیرات) کے معتمد (سکریٹری) تھے، علی اختر پنشن کے وقت اسی محکمہ میں مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) تھے، ایک ہزار روپیہ ماہوار سے اوپر تنخواہ ملتی تھی، یہ ان کا سب سے زیادہ خوشحالی کا دور تھا، مگر۔ ع

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

علی اختر دفتری صلاحیت میں اپنی آپ مثال تھے، قلم کے دھنی اور معاملہ فہم! اُن کے لکھے ہوئے مسودوں

میں ادبیت بھی ہوتی تھی، ہوش بلگرامی کے مضامین اور اُن کے نام سے چھپی ہوئی مثنوی میں علی اختر کی فکر و کاوش کا بہت کچھ ہاتھ تھا، ڈیڑھ دو سال نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں مسلسل حاضر باشی رہی اور دس بیس نہیں سینکڑوں غزلیں ان کی "نذر" کردیں!

اُردو دنیا میں علی اختر مرحوم کا تعارف رسالہ "نگار" کے ذریعہ ہوا، اُن کی خاصی طویل نظمیں "نگار" میں برسوں چھپتی رہی ہیں، نیاز فتحپوری ان کی شاعری سے بہت متاثر تھے، ایک بار نیاز صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہاں تک لکھ دیا۔

"علی اختر آج بھی جوش ملیح آبادی سے زیادہ اچھا شعر کہتے ہیں"۔

اس پر ادبی حلقوں میں، خاصی چہ میگوئیاں رہیں۔!

نیاز فتحپوری نے حدیث و فقہ کے خلاف جو طوفان اٹھایا تھا، اس سے شروع شروع میں علی اختر بھی متاثر ہوگئے، مجھ سے کئی بار اس ضمن میں گرما گرم بحث ہوئی مگر اللہ کے فضل سے یہ رنگ بہت جلد اُتر گیا پھر تو وہ مذہب میں غرق ہو کر رہ گئے، اور رہ کہاں گئے! یوں کہئیے ساحلِ مراد تک پہونچ گئے!

جہاں تک مجھے علم ہے، علی اختر مرحوم کو شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا، اُن کی ابتدائی غزلوں کا یہ رنگ تھا:

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبضِ دل دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

پھر تغزل میں "نظم" کا رنگ پیدا ہوگیا:-

عوض لہو کے اگر بجلیاں نہ رقصاں ہوں
تو وہ شباب کا اک وہم ہے شباب نہیں

علی اختر کو زندگی کی شدید کشمکش سے سابقہ پڑا، اُن پر بڑے سخت وقت آئے، اس چیز نے اُن کو دنیا سے بہت بیزار کر دیا، اُن کی بیسیوں نظموں میں دنیا سے بیزاری کی نمایاں جھلک ملتی ہے، اور بعض نظموں میں تو وہ نرے "سوفسطائی" نظر آتے ہیں کہ اُن کی نگاہ میں ہر "حقیقت" ایک فریب اور دنیا کی ہر لذت سراب اور ہر تصور و خیال ایک دھوکا معلوم ہوتا ہے! زندگی کے اسی مسلسل کرب نے ان کے جذبات میں سرور و نشاط پیدا ہونے نہیں دیا وہ دراصل ایک مفکر شاعر تھے، اور جذبات پر اُن کی فکر کا غلبہ تھا، ان کے کلام میں جذبات ہیں مگر شریفانہ جذبات! سنجیدہ اور متوازن شاعری، بلند افکار! وہ اونچی فضا میں پرواز کرتے ہیں اور کہیں کہیں اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ اقبال کی لے میں لے ملا دیتے ہیں! جوش ملیح آبادی کی نظم "حرفِ آغاز" کے جواب میں "قولِ فیصل" بڑے معرکہ کی نظم کہی!

ان کے کلام کے دو مجموعے ____ اسرار اور انوار ____ شائع ہو چکے ہیں۔ افسوس ہے پاکستان کے کسی پبلشر کو اُن کے مجموعۂ کلام کو چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی! اُن کے ہزاروں اشعار (نظمیں، غزلیں، رباعیات قطعے) ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں! اس اعتبار سے وہ خوش قسمت تھے کہ اپنے جیتے جی اپنے فرزند نظر حیدر آبادی کی شہرت دیکھ لی! دوسروں کا کیا گلہ کیجئے خود ہم اُن کے دوستوں اور شناساؤں نے اُن کی خاطر خواہ قدر نہیں

اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، تو محسوس ہوا کہ کتنی بڑی دولت کو ہم نا قدروں نے کھو دیا، "قدرِ نعمت بعدِ زوال" ضرب المثل سچ ثابت ہوئی!

حیدر آباد دکن کی تباہی کے بعد وہ بھی ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے، اور یہ سات آٹھ سال کا زمانہ بیماری ہی میں گزرا، ان کی صحت کئی برس سے جواب دے چکی تھی آخر میں بینائی تک جاتی رہی، اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، آنکھوں کا آپریشن کرانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر نے کہا کہ ان کی کھانسی کو جب تک آرام نہ ہو جائے، آپریشن خطرہ سے خالی نہیں، ان کی علالت کے دوران میں ایک بار مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی بیمار پرسی کے لئے آئے، مولٰنا موصوف سے اُن کی حیدر آباد کی ملاقات تھی، جناب جوش ملیح آبادی اُن کے یہاں اکثر آتے رہتے اور اپنی دوستی آخر وقت تک نباہتے رہے!

مذہب سے تو اُن کو ہمیشہ شغف رہا مگر پاکستان آنے کے بعد وہ سرتا پا رکوع و سجود بن کر رہ گئے، کس خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے کس عاجزی کے ساتھ دعا مانگتے، فجر کی نماز کے وقت سے جو اوراد و وظائف اور نوافل کا سلسلہ شروع ہوتا تو نو بجے جا کر کہیں ختم ہوتا، اُن کی نماز دیکھ کر مجھ تن آسان اور آوارہ مزاج کو اپنی بے دلی کی نماز پر شرمندگی ہوتی اور اُن کی حالت پر رشک آتا، شاعروں میں ایسی خشیت اور توجہ الی اللہ کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی!

میں جب بھی جاتا، مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے، اور گھنٹوں گفتگو رہتی، میں جانے کے لئے جلدی کرتا تو اصرار کر کے روک لیتے، اُن کے یہاں جانے میں تاخیر ہو جاتی تو دوسروں سے میرا تذکرہ کرتے اور میرے آنے کے منتظر رہتے، اُن سے آخری ملاقات اُن کے مرنے سے دس بارہ دن پہلے ہوئی! نظر حیدر آبادی نے اپنے یہاں صبح سویرے آنے کے لئے کہا، نہاری کی دعوت تھی، میں اُن کے یہاں آٹھ بجے کے بعد پہونچا، حیدر آبادی ذائقہ کی نہاری کھائی، پھر میں علی اختر مرحوم کے کمرے میں آ گیا، نو بجے ہوں گے مگر وہ ورد و وظائف میں مشغول تھے، اس سے فارغ ہوئے تو ناشتہ کے لئے آواز دی، ناشتہ آنے میں ذرا سی تاخیر ہوئی، تو آئے ہوئے ناشتہ کو پھیر دیا، مریض کی طبیعت یوں بھی نازک ہوتی ہے اور وہ تو شاعر بھی تھے! اندر سے اصرار ہوا تو پھر ناشتہ کیا، دودھ میں کورن فلیک (CORN FLAKES) بھیگے ہوئے، یہ ان کا ناشتہ تھا! کہنے لگے معدہ جواب دے گیا ہے۔ پھر مجھ سے محبت آمیز شکایت کی:-

"ماہر! بہت دن کے بعد آئے ـــ"

باتوں باتوں میں کہنے لگے:

"اس جوش (ملیح آبادی) سے میں نے بارہا کہا ہے کہ خدا کے بندے اب تو توبہ کر لے، راہ راست پر آ جا ـــ"

میں نے کہا حضرت علیؓ کی شان میں تو وہ قصیدے کہتے ہیں مگر خدا کا اور اسلام کا مذاق اُڑاتے ہیں اس پر وہ چونک کر بولے: "یہ رفض ہے"! اتنے میں اُن کے شاگرد سالک صاحب آ گئے۔

چلتے وقت مجھ سے دوبارہ جلد آنے کا وعدہ لیا، میں سوچتا ہی رہا کہ آج جاؤں، کل جاؤں، اسی عرصہ

میں صبح سویرے اخبار میں ان کی موت کی خبر پڑھی جو غیر متوقع نہ تھی، مگر دل کو دھچکا لگا، اُسی وقت ان کے یہاں پہونچا، چند احباب تعزیت کے لئے آئے ہوئے تھے، نظر حیدر آبادی اُداس بیٹھے تھے اور راغب مراد آبادی رو رہے تھے، اُن کا کمرہ بند تھا، اب میں دستک کیوں دیتا، جن سے ملنے کے لئے آیا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لئے اس مکان ہی سے نہیں اس دنیا سے جا چکے تھے پنچھی اڑ گیا اور پنجرے کو لوگوں نے پیوند زمین کر دیا۔ بہے نام اللہ کا (اللّٰھم اغفرلہ) جانے والے! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو، ہم بھی تیرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں، بس اویر سویر کا معاملہ ہے، منزل سب کی یہی ہے، اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ اُٹھائے اور آخرت کی رسوائی سے بچائے (آمین)

مخمور سعیدی

نعتِ رسولؐ

اے زہے مرتبہ و شانِ رسولِ عربی
خود خدا بھی ہے ثنا خوانِ رسولِ عربیؐ

دیکھ سکتی ہے نظر جلوۂ عرفانِ خدا
دل کو ہو جائے جو عرفانِ رسولِ عربیؐ

سارے عالم نے کیا کسبِ سعادت اُن سے
سارے عالم پہ ہے احسانِ رسولِ عربیؐ

چھوڑ دے آرزوِ دولتِ دارین اے دل
تھام لے گوشۂ دامانِ رسولِ عربیؐ

بندگی میں بھی وہ آزادیٔ انساں کے امیں
کس نے دیکھے ہیں غلامانِ رسولِ عربیؐ

ان کے مرہونِ کرم ہم سے گنہ گار بھی ہیں
کس قدر عام ہے فیضانِ رسولِ عربیؐ

کجکلاہی پہ سرافرازِ شہنشاہوں کی
مسکراتے ہیں گدایانِ رسولِ عربیؐ

ہم کو خورشیدِ قیامت کا نہیں ڈر کوئی
ہم پہ ہے سایۂ دامانِ رسولِ عربیؐ

وہی فرماتے تھے جو حکمِ خدا ہوتا تھا
حق کا فرمان ہے فرمانِ رسولِ عربیؐ

نعمتیں کون و مکاں کی ہیں انھیں کو تو نصیب
وہ جو ہیں بے سروسامانِ رسولِ عربیؐ

سر وہ ہے جس میں ہو سودائے محبت ان کا
دل وہ ہے جس کو ہو ارمانِ رسولِ عربیؐ

رہا وہ لفظوں میں ہے اظہارِ عقیدت مخمور
کب مرے شعر ہیں شایانِ رسولِ عربیؐ

ماہر القادری

○

یہ بزمِ آب و گل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمد کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

قیامت میں مری فردِ عمل پر ہے نظر اُن کی
طلوعِ مہر سے خود جذبِ شبنم ہوتی جاتی ہے

آپ کیا آئے کہ حق کا بول بالا ہو گیا
ساری دنیا میں اُجالا ہی اُجالا ہو گیا

شفیق احمد

○

گلستاں کو صحرا دیکھتا ہوں
گل و بلبل کو رسوا دیکھتا ہوں

ملی ہے کرگسوں کو شاہبازی
پرِ شاہیں شکستہ دیکھتا ہوں

فضا پر تیرگی سی چھا رہی ہے
دنوں میں بھی اندھیرا دیکھتا ہوں

جہاں تک کام کرتی ہیں نگاہیں
فقط دھوکا ہی دھوکا دیکھتا ہوں

نمائش کو بھلا کیوں حسن کہہ دوں
کہیں تو اصلِ اشیاء دیکھتا ہوں

تنزل پر ہے معیارِ ترقی
مذاقِ اہلِ دنیا دیکھتا ہوں

…ج قادری

○

بلندیوں کا تصور بھی کر نہیں سکتا
تری گلی کا جو انساں غبار ہو نہ سکا

طلسمِ رنگ و بہار آشنا نے مجھ کو
شکار کرنا تو چاہا، شکار ہو نہ سکا

جسے یقین تھا حاصل کسی کی رحمت کا
وہ شاکیٔ ستمِ روزگار ہو نہ سکا

سمجھ میں آ گیا رستہ تو بے قرار ہوئے
قدم بڑھا ہی دئے انتظار ہو نہ سکا

نیر جہلمی

شیطان کا اعترافِ شکست

(۱)

میں نے سوچا تھا یہ مٹی کا ہیولا ! انساں
ذہنِ یزداں کے تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف معصوم فرشتوں کو تھا حیران کرنا
ورنہ تخلیق کا مقصود تھا کیا؟ کچھ بھی نہیں

(۲)

اس کی تخلیق پہ تھا ناز خدا کو کتنا
ایک بے نور سا بت جس میں لطافت نہ جمال
اور اس پیکرِ گِل پہ یہ تفاخر، یہ غرور
اس کو سمجھا گیا وہ اپنی خدائی کا کمال

(۳)

پھونک دی رُوح تو جنّت کی سکونت بخشی
جنسِ ناچیز کو مسجودِ ملائک بھی کیا
خاص کر علم ہر اک چیز کا بخشا اس کو
پھر کہا ارض پہ یہ ہوگا خلیفہ میرا

(۴)

بس کہ استادِ ملائک تھا، بڑا عالم تھا
اِس نئی خلق کی عظمت کو نہ مانا میں نے
اس قدر علم و عبادت پہ مجھے غرّہ تھا
حکمِ خالق کی حقیقت کو نہ جانا میں نے

(۵)

کیا خبر تھی کہ مجھے راندۂ درگہ ہو کر
ابنِ آدم کے مقابل ہی پھر آنا ہوگا
آخری عمر میں انساں کی سیاست کے طفیل
اپنی آنکھوں سے مجھے خون بہانا ہوگا

(۶)

میں تو سمجھا تھا ابھی عقل ہے ناقص اِس کی
میری تدبیر بہر گام گرائے گی اِسے
اس کے قدموں پہ جھکائی تھی فرشتوں نے جبیں
اِس کی طینت مرے قدموں پہ جھکائے گی اِسے

(۷)

میں نے سوچا بھی نہ تھا اصل حقیقت کیا ہے
یہی انسان خدا کا بھی نہ قائل ہوگا
اور قدرت کا اُڑائیگا یہ ہنس ہنس کے مذاق
اپنے خالق کا بھی اِک روز مخالف ہوگا

(۸)

بندہ اللہ کا اللہ کا ہمسر بن کر
فکر سے اپنی تراشے گا نئے ماہ و نجوم
اِک طرف قدرتِ خالق کا بھی منکر ہوگا
اِک طرف یہ بھی کہے گا وہ ہے حی و قیوم

(۹)

فکرِ شیطان نے انسان سے کھائی ہے شکست
اس نے کھولا ہے مری عظمت و شوکت کا بھرم
اس کے قدموں پہ جھکاتا ہوں ندامت سے جبیں
آج کھاتا ہوں میں انسان کی عظمت کی قسم

عروج زیدی

گُلِ صد برگ

توفیقِ جہد پائیں جو عزمِ جواں سے ہم
ذرّوں کو روشناس کریں کہکشاں سے ہم

اُٹھے اگر تو مر کے اُٹھیں گے یہاں سے ہم
یہ عہد کر چکے ہیں ترے آستاں سے ہم

ایثار ہی سے عشق کا پرچم بلند ہے
بے گانہ ہیں تصورِ سُود و زیاں سے ہم

یارانِ قافلہ تو رفاقت نہ کر سکے
اب کھیلتے ہیں گردِ پسِ کارواں سے ہم

اذنِ کلام پا کے بھی تابِ سخن نہیں
گویا حضورِ حُسن میں ہیں بے زباں سے ہم

اس سادگی کی داد کوئی مہرباں دے
اُمیدِ لُطف رکھتے ہیں نامہرباں سے ہم

ماحول سازگار نہیں پھر بھی اے عروج
رکھتے ہیں عشق خدمتِ اردو زباں سے ہم

○

کوثر اعظمی

کوثر! نہ اگر دل میں ہو تابشِ ایمانی
چارہ گرِ غم کب ہے دعوائے مُسلمانی

دل میں ہو تو آتش ہے آنکھوں میں مگر پانی
کیا جانیئے کیا شے ہے سوزِ غمِ پنہانی

شیشہ ہو کہ پیمانہ وہ رقص ہو یا نغمہ
اسبابِ تباہی ہیں، اسبابِ تن آسانی

○

مرزا وسیم بیگ دلؔ

کچھ نہ کچھ تو دل کے بہلانے کی صورت چاہیئے
کوئی افسانہ بہ عنوانِ محبت چاہیئے

دونوں عالم ہیں ترے ہی واسطے تیرے لئے
مانگنے والے ذرا دامن میں وسعت چاہیئے

آدمی سے کیا نہیں ہوتا بہ ایمان و عمل
آدمی کیا کر نہیں سکتا ہے جرأت چاہیئے

شکوۂ کوتاہیٔ پرواز کیوں کرتے ہیں لوگ
بال و پر کیا چیز ہیں اے دوست ہمت چاہیئے

○

قمر جلالوی

یہ حقیقت ہے کہ فرق اس میں ہر مُو بھی نہیں
جس قدر ہم ہیں پریشاں ترے گیسو بھی نہیں

○

اشک رامپوری

اک دن وہ مِل گئے تھے سرِ رہ گذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عُمر بھر کہیں

○

حسرت ترمذی

کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں
اے شامِ بیکسی! مری منزل تو دیکھنا

○

اقبال شاہد

بیاں کرتی رہی رازِ نہانی
زبانِ بے زباں کی بے زبانی

وطن کی صبح ہے کتنی فروزاں
وطن کی شام ہے کتنی سہانی

شہیدانِ وطن کے خون سے ہے
قبائے لالہ و گُل ارغوانی

عطا کر یا الٰہی وہ خموشی
کرے جس کی تمنّا خوش بیانی

مری آہِ سحر گاہی سے شاہد
بھڑک اُٹھے چراغِ زندگانی

غزلیں

شفقت کاظمی

کیا کیا تھے محوِ لذتِ جورِ حیات ہم — تیری طرف بھی کر نہ سکے التفات ہم
یاروں نے اُس کے لاکھ فسانے بنا دیئے — تجھ سے جو کہہ گئے تھے کبھی ایک بات ہم
آلامِ روزگار سے فرصت نہ مل سکی — ہر چند پا گئے تیرے غم سے نجات ہم
محرومیٔ جواب کا کھٹکا لگا رہا — اُن کے حضور کہہ نہ سکے دل کی بات ہم

○

جام و مینا سنبھال رکھ ساقی! — تیری محفل سے بادہ خوار چلے
یاد رکھیں گے ہم کو اہلِ چمن — ہم بھی کچھ دن یہاں گزار چلے
غنچۂ دل میں وہ نمو نہ رہی — اب نسیم و صبا ہزار چلے
اے خوشا زندگی کا وہ حصہ — جو تری یاد میں گزار چلے
خلق نکلی ہے پیشوائی کو — جس طرف تیرے خاکسار چلے

○

کیا شکایت تری جدائی کی — مجھ سے قسمت نے بیوفائی کی
دل قفس میں نہ کس طرح لگتا — کس کو اُمید تھی رہائی کی

○

عنوان چشتی

ہر اک دل کیفیاتِ عشق کا حامل نہیں ہوتا — ہر اک پردہ جہاں میں پردۂ محمل نہیں ہوتا
وہ انساں کامگارِ زیست ہو جاتا ہے دنیا میں — جو اپنے فرض کی تکمیل سے غافل نہیں ہوتا
بہت دشوار ہے اے ناخدا موجوں سے ٹکرانا — بھنور میں ڈوب جانا تو کوئی مشکل نہیں ہوتا
محبت کے اندھیروں سے نہ گھبرانا کبھی عنواںؔ — محبت کا کبھی تاریک مستقبل نہیں ہوتا

○

غمِ حیات نے یورش تو کی محبت پر — یہ اور بات کہ آندھی میں بھی چراغ جلے
قدم قدم پہ نشیب و فراز ملتے ہیں — رہِ حیات میں انساں بہ احتیاط چلے
جسے نہیں ہے غمِ روزگار سے فرصت — سکوں ملیگا اسے خاک گیسوؤں کے تلے

○

یہ انساں اور بھی انسانیت بیزار ہو جائے — اگر مجبور سے بڑھکر کہیں مختار ہو جائے
ذرا رکھئے تری زلفوں کے سائے خواب آور ہیں — مگر مجھکو یہ دھن ہے زندگی بیدار ہو جائے
حوادث ہی کو ہم نے تازیانہ کس لئے سمجھا — اگر احساس ہو تو ہر نفس تلوار ہو جائے
گلستاں کے فقط نقشے بدلدینے سے کیا ہوگا — وہ کوشش کر کہ اک اک خار خلد آثار ہو جائے
ہجومِ غم میں عنواںؔ مسکرانا چاہیئے تم کو — وہ انساں کیا جو غم میں زیست سے بیزار ہو جائے

روحِ انتخاب

(لاہور کا بین الاقوامی کلوکیم)

اِس مجلس مذاکرہ کے انتظام میں زیادہ تر وہی لوگ دخیل تھے جو مغرب، اُس کی اقدارِ حیات، اس کے افکار و تصورات، اس کی طرزِ معاشرت، اور تہذیب و تمدن سے نہ صرف مرعوب ہیں بلکہ مغلوب بھی ہیں۔ ان حضرات کے خیالات کچھ ڈھکے چھپے نہیں کہ ملک کے باشندے ان سے ناواقف ہوں۔ ان کی "تجدد پسندانہ" کوششیں سب لوگوں کے سامنے ہیں۔ اس لئے اس ملک کے عوام یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ یہ لوگ جس مجلسِ مذاکرہ کو ترتیب دے رہے ہیں اُس میں یہ اور اُن کے مغربی رفقا مِل جل کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ نئے فتنے کھڑے کریں گے۔

پھر ان حضرات نے شروع ہی سے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ بڑا غیر دانش مندانہ تھا۔ انھوں نے اس کلوکیم میں بہت سے ایسے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو اسلام پر اتھارٹی کے ساتھ گفتگو کرنے کے اہل ہیں اور، اُن کی جگہ ان لوگوں کو مدعو کیا گیا جو اسلام کے علم سے کورے اور اپنے گمراہ کُن نظریات کی وجہ سے مسلم قوم میں اچھے خاصے بدنام ہیں۔ اگرچہ کلوکیم کمیٹی کے ایک دو صحیح الخیال ارکان نے اُنھیں اس غلطی سے روکنے کی کوشش کی، اور انھیں اسلام کے صحیح نمائندوں کو بلانے کا مشورہ دیا، مگر اختیارات جن کے ہاتھ میں تھے وہ اپنی اسکیم بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے پیشِ نظر تو یہ مظاہرہ کرنا تھا کہ پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی دنیا بھر کے مفکرینِ اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کرنے پر متفق ہیں۔

یہی چیز مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کم نہ تھی کہ اس پر ایک اور حماقت یہ کی گئی کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو بھی مجلسِ مذاکرہ میں شرکت کی دعوت دے دی گئی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ رہا کہ اس مجلس کے حق میں عام لوگوں کے اندر کسی حسنِ ظن کی گنجائش باقی رہ جاتی۔

کلوکیم کے افتتاح کے موقع پر صدرِ ریاست نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ عام مسلمانوں کے لئے مزید غم و غصے کے محرک ثابت ہوئے۔ صاحب صدر نے تجدد پسندوں کا وہی پُرانا ہتھکنڈا استعمال کیا جو اس مشرب کے لوگوں کا چلتا ہوا داؤں ہے کہ ایک طرف اسلام کی "ترقی پسندی" کو خوب دل کھول کر داد تحسین دی جائے اور دوسری طرف اُس "ملا" کو آڑے ہاتھوں لیا جائے جو اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کرنے میں سب سے بڑی مانع قوت ہے۔ یہ تھوڑے لوگ سامنے آکر خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے کچھ کہنے کی تو جراٰت نہیں رکھتے البتہ اپنے دل کی بھڑاس علماء کو ہدف بنا کر وقتاً فوقتاً نکالتے رہتے ہیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام

اور مسلمانوں کے لئے یہی لوگ اصل وجہ مصیبت ہیں، حالانکہ اسلام آج جتنا کچھ بھی باقی ہے انہی علماء کی کوششوں قربانیوں اور محنتوں سے باقی ہے، ورنہ غیر ملکی سامراج کے آگے جو لوگ نقد دل وجان ہار چکے تھے، اور جنھوں نے اپنی دنیا بنانے کے لئے مغربی آقاؤں کی چاکری ہی نہیں ذہنی غلامی تک قبول کرلی تھی ان کے ہاتھوں دین کا جنازہ کبھی کا اُٹھ چکا ہوتا۔ یہ بات تو ایک معمولی عقل کا انسان بھی سوچ سکتا ہے کہ دین اگر اس سرزمین میں باقی رہا ہے تو ان لوگوں کی بدولت رہا ہے۔ جنھوں نے مسجدیں آباد رکھیں، جو قرآن اور حدیث پڑھتے پڑھاتے رہے، جن کی زبانیں خدا اور رسول کے ذکر میں شب و روز مشغول رہیں، نہ کہ ان لوگوں کی بدولت جنھیں کبھی جمعہ کی نمازوں تک میں نہ دیکھا گیا، جن کے گھر میں جانماز تک نہیں پائی جاتی، بلکہ جن کے گھروں میں کوئی یہ بتانے والا تک نہیں ملتا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے۔ اس قسم کے لوگ جب اسلام کی ترقی کا ڈھنڈورا پیٹنے کیلئے مُلّا پر برستے ہیں تو عام مسلمان لازماً اس سے یہ اثر لیتے ہیں کہ شاید یہ حضرات کچھ اسی طرح کا ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں جس کی شان ان کی اپنی زندگیوں میں نظر آتی ہے، اور مُلّا پر یہ سارا غصہ اس لئے آرہا ہے کہ یہ کم بخت اس راستے میں حائل ہے۔

صدر محترم کی بات اس وجہ سے اور بھی عام مسلمانوں کو ناگوار گزری کہ اسی موقع پر نہیں، اکثر مواقع پر جب وہ مُلّا پر برستے ہیں تو "مجتہد" اور "ذاکر" حضرات کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی زبان سے آج تک کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ اس مذہبی طبقے کا بھی قصور ہے یا نہیں۔

اس مجلس مذاکرہ کا انتظام و انصرام جن ہاتھوں میں تھا انھوں نے بھی نہایت گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ ایک تو انھوں نے اس کلوکیم میں بعض ایسے مقالات پڑھنے کی اجازت دے دی جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم تھے دوسرے انھوں نے محض دوستی اور دھڑے بندی کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بھی مدعو کیا جن کی اسلام شناسی کا یہ حال تھا کہ قرآن پاک کی آیات تک صحیح نہ پڑھ سکتے تھے۔ اس سے نہ صرف غیر مسلموں کو اسلام کی تضحیک کا موقع ملا بلکہ پاکستان کا وقار بھی سخت مجروح ہوا۔ تیسرے ان حضرات نے جو روش صحیح اسلامی ذہن رکھنے والے اہل علم کے ساتھ اختیار کی وہ سخت ناپسندیدہ تھی۔ تجدد پسند اصحاب جو "رطب و یابس" کہنا چاہتے انھیں پورا پورا موقع بہم پہونچایا جاتا اور جب کوئی اللہ کا بندہ ان کے گمراہ کن افکار پر تنقید کے لئے اجازت طلب کرتا تو اس کے راستے میں مختلف قسم کی مزاحمتیں پیش کی جاتیں۔ کبھی اسے یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ وقت کی گنجائش نہیں اور کبھی بجلی اور لاؤڈ سپیکر بند کر دینے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کی گئی۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے حربے ہر اس شخص کی زبان بندی کے لئے اختیار کئے گئے جس نے ان باطل افکار پر ذرا سختی سے گرفت کی۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بھی عجیب و غریب ہیں۔ وہی ذات پاک ہر کام میں اپنی مخصوص مصلحتوں کو جانتی ہے۔ اس کے انداز نرالے ہیں اور انسان کا ناقص ذہن اُن کو سمجھنے سے بسا اوقات قاصر ہوتا ہے۔ اُس کی حکمت بالغہ اکثر اوقات اُن چیزوں میں بھی لاتعداد پہلو خیر کے پیدا کر دیتی ہے جن میں بظاہر کسی بھلائی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز میں سراسر بھلائی دیکھتے ہیں مگر وہ نتائج کے اعتبار سے یکسر بُرائی ہوتی ہے۔

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ)

شاید تمہیں ایک چیز بُری معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز بھلی معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔

عدو شرے برانگیزد کہ خیر مادر آں باشد — ذوالامعاملہ اس اسلامی مجالس مذاکرہ کا بھی ہوا۔ اُس کی ظاہری شکل و صورت تو یہ بھی کہ اس میں غالب اکثریت غیر مسلم مستشرقین اور تجدد پسند و آزاد خیال مسلمانوں کی تھی اور ان میں ایسے لوگ بہت تھوڑی تعداد میں تھے جن کو صحیح معنوں میں علمائے اسلام کہا جا سکتا ہو۔ اس انتظام سے امیدیں یہی کچھ وابستہ کی جا سکتی تھیں کہ یہاں بین الاقوامی پیمانے پر اسلام کا ایک نیا ایڈیشن اچھی طرح تیار ہو سکے گا اور اس میں "ملّا" کی آواز دب کر رہ جائے گی۔ ایسی ہی کچھ نشان دہی صدر محترم کا افتتاحی خطبہ کر رہا تھا۔ پھر ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ صرف پاکستان کے علما ہی "تنگ نظر" اور "تاریک خیال" ہیں اور اس بنا پر مغربی اقدار کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک کے اہل علم کا یہ حال نہیں ہے۔ وہ اپنے افکار و تصورات اپنے نظریات و معتقدات کے اعتبار سے بالکل "ماڈرن اور ترقی پسند" ہیں اس لئے جب اسلام کا جدید ایڈیشن اُن کے سامنے پیش کیا جائے گا تو نہ صرف پوری گرم جوشی سے اس کام کا استقبال ہو گا بلکہ یہ لوگ اس کے جاں نثار، فدائی اور پُر جوش مبلغ بن کر جائیں گے اور پھر اپنی حیات ہائے مستعار کے بقیہ لمحات اسی کی تبلیغ او اشاعت میں صرف کریں گے۔ اس طرح پاکستان کے تجدد پسند اصحاب کو ایک طرف دنیائے اسلام کی قیادت اور رہنمائی کا منصب خود بخود حاصل ہو جائے گا اور دوسری طرف اہل پاکستان پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ "یہ دقیانوسی مُلّا" جو چودہ سو سال پہلے کا پرانا اِسلام تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے، اور تمہیں اس کے اتباع کی ہر وقت نصیحت کرتا ہے اسے تو سارے اسلامی ممالک بھی ترک کر چکے ہیں، آخر تم اس "نعش" کو کیوں اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کیوں نہیں اسے دفن کر دیتے اور اس کی جگہ اس اسلام کو قبول کر لیتے جو دانائے فرنگ اور اس کے مقلدین نے تمہارے لئے اختیار کیا ہے؟

مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی حکمتِ بالغہ سے نتائج اس کے بالکل برعکس برآمد ہوئے

اس مجلس نے ایک بار اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ امت اسلام کی کسی ایسی تعبیر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی جو ماضی سے بغاوت پر مبنی ہو۔ وہ اگرچہ انحطاط میں مبتلا ہے لیکن دین کے معاملے میں اس کی حس ابھی تک بالکل صحیح اور درست ہے اور اس کا ضمیر ہر اُس چیز سے ابا کرتا ہے جس سے دین کو نقصان پہنچے۔ اُسے اپنے اسلاف سے گوناگوں محبت اور عقیدت ہے اور اُن کے علمی کارناموں کو وہ نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انھیں دریا برد کر دینے پر وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کی نظر میں آج بھی اصل معیارِ انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی ہے اور جس چیز کے بارے میں اُسے یقین ہو جائے کہ وہ حضور کی طرف سے پہنچی ہے اُسے قبول کرنے ہی میں وہ اپنی اور پوری نوعِ انسانی کی نجات سمجھتی ہے۔ اُس کا ایمان اُسی دین پر ہے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جس کے بہترین نمونے حضور کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین تھے۔ قرآن مجید کی وہی تعبیر اُس کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے جس کی تائید سُنتِ رسول اور آثارِ صحابہ سے ہوتی ہو۔ دین میں جس طرح قرآن حکیم کے احکام حجت ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ثانیہ بھی حجت ہے اور اگر کوئی شخص سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن حکیم

کو ماخذ دین ٹھیراتا ہے تو وہ گمراہ ہے۔

جن حضرات کو کولوکیم میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ پاکستان کے سوا کسی اسلامی ملک کا کوئی نمائندہ ایسا نہ تھا جس نے اسلام کے بارے میں ان بدیہی حقائق کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اس معاملے میں باہر کے مسلم نمائندوں کے احساسات تو یہاں تک نازک تھے کہ وہ کوئی ایسی بات سننے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے جو قرآن وسنت کی مسلّم تعلیمات کے خلاف ہوتی تھی، یا جس میں دین کی شکل بگاڑنے کی کوئی جھلک پائی جاتی تھی، حالانکہ وہ بھی اکثر وبیشتر ہمارے پاکستانی نمائندوں کی طرح مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے بلکہ اس معاملہ میں ان سے چند قدم آگے ہی تھے۔ ان سب حضرات نے مختلف ممالک کے نمائندے ہونے کے باوجود جس وحدتِ فکر کا ثبوت دیا وہ اہلِ پاکستان کے لئے باعثِ رشک ہے۔ پاکستان کے چند آزاد خیال لوگوں کی رائے سُن کر اُنھیں سخت تعجب ہوا اور ان کے لئے یہ باور تک کرنا محال تھا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلائے اور پھر اس قسم کے خلافِ اسلام خیالات کا اظہار بھی کرے۔

اس معاملے میں خوشی کے ساتھ غم و افسوس کا پہلو اگر کوئی ہے تو یہ کہ ساری دنیائے اسلام میں صرف پاکستان ہی تھا جس کی طرف سے یہ بدنما مظاہرہ کیا گیا۔ دوسرے مسلمان ملکوں کے پاس ملاحدہ اور تجدد پسندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ چاہتے تو اپنے ہاں سے بھی ایسے نمائندے بھیج سکتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی دنیا بھر کے سامنے اپنی بُری نمائندگی پیش کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شامی اور مصری علماء کے مقالات کو دیکھنے سے ہمیں ایک اور خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ اُن کا اسلام کے متعلق زاویۂ نگاہ ہمارے ہاں کے بہت سے روشن خیال اصحاب کی طرح اعتذار پسندانہ نہیں۔ انھیں اسلامی تعلیمات پر پورا پورا ایمان اور یقین ہے اور وہ پورے وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ خالص اسلام ہی دنیا کے دکھوں کا مداوا اور علاج ہے وہ اسلامی اور غیر اسلامی اقدار کو ملا کر ایک ملغوبہ تیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو ایک ہمہ گیر اور باطل شکن تحریکِ فکر وعمل سمجھتے ہیں اور اس بات کی پوری توقع رکھتے ہیں کہ اس تحریک کو اب اس دنیا میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے سربلند ہونا ہے، دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کا راستہ روک سکے۔ اُن کا دین کے بارے میں تصور وہی ہے جس کا دین ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ وہ دین کو خالق و مخلوق کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسا نظامِ حیات خیال کرتے ہیں جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہو۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق یہ دین انسانیت کو رہنمائی نہ دیتا ہو۔

(ترجمان القرآن)

ہماری نظر میں

ارغام ہاذر بجواب نقشِ ماہر

از :- مولٰنا مفتی محمد عبدالحفیظ حقانی ضخامت ۲۰۸ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ :- سید سعادت علی قادری، مدرسہ انوار العلوم، کچہری روڈ، ملتان شہر۔

"فاران" کے آغازِ اشاعت سے لیکر اب تک صرف دو "خاص نمبر" شائع ہوئے ہیں ـــــ سیرت نمبر اور توحید نمبر ـــ اللہ کے فضل سے یہ دونوں "خاص شمارے" ہماری توقع سے زیادہ مقبول ہوئے! مشرکانہ رسوم و بدعات کی مسلمانوں میں جو گرم بازاری ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہمارا اندازہ تھا کہ "توحید نمبر" شاید ایک مخصوص طبقہ میں پڑھا جائے گا، اس لئے ہم نے پہلے ایڈیشن کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرا ایڈیشن ڈرتے ڈرتے چھپوایا، اور اس کے بعد پریس کی جو پلیٹیں ہم نے رکوا دی تھیں، وہ کٹوا دیں، مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا "توحید نمبر" "سیرت نمبر" سے کہیں زیادہ مقبول ہوا، دوسرا ایڈیشن چھپتے ہی ختم ہو گیا، اور اس وقت سے لیکر اب تک اس کے لئے سینکڑوں آرڈر آچکے ہیں اور "فاران" میں "توحید نمبر" کے ختم ہو جانے کا اعلان کرنے کے باوجود اس کے لئے فرمائشیں آتی ہی رہتی ہیں!

"توحید نمبر" کا نقشِ اول کتابی صورت میں تو شہرہ سے چھپ چکا ہے، ہندوستان میں بھی مدراس کے ایک صاحب خیر نے "نقشِ اول" کو علیحدہ چھپوایا ہے۔ بنگلور کے ایک ناشر نے "توحید نمبر" چھاپنے کی ہم سے اجازت لی ہے! بلا مبالغہ سینکڑوں خطوط "توحید نمبر" کی تعریف میں موصول ہوئے ہیں، مگر ہم نے ان میں سے ایک خط کو بھی نہیں چھاپا، ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ "توحید نمبر" پڑھنے سے ہمارے عقاید کی اصلاح ہو گئی! چند خطوط تو "فاران" میں چھپنے کے لائق تھے مگر جب ہم اُن کو چاک کر چکے، تو اس کا احساس ہوا!

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نے مدیر "فاران" اور "توحید نمبر" کے فاضل مقالہ نگاروں کی کوششوں کو اس قدر موثر اور مفید بنا دیا، اور شرک و بدعت کے بڑے بڑے ایوان اللہ تعالیٰ کی توحید کے غلغلے سے ہل گئے! "توحید" کی یہ آواز پاکستان اور ہندوستان ہی نہیں افریقہ، بحرین، قطر، سنگاپور، شام، نیاسالینڈ، اور انگلستان بھی پہونچی ہے؟

اسی "توحید نمبر" کے نقشِ اول" کا جواب :-

"ارغام ہاذر"

کے نام سے مولٰنا عبدالحفیظ صاحب حقانی نے دیا ہے، جو کتابی شکل میں اس وقت ہمارے سامنے ہے! "ارغام ہاذر" کے نام کی اعجوبگی اور "ابوالہولیت" ہی سے سمجھ لیجئے کہ لکھنے والے کی فکر کس سطح کی ہے! یہ وہ بزرگ ہیں، جو میلاد کی محفلوں میں چیخ چیخ کر فرمایا کرتے ہیں کہ وہابی انبیاء اور اولیا کو "یا" کیساتھ پکارنے اور خطاب کرنے پر طنز کرتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ "یا" (یا ایھا الکافرون ـــــ یا ایھا الذین آمنوا ـــ) کا استعمال

فرمایا ہے! بس اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ اس قسم کی دانش و بصیرت اور فہم و دانش دینی مسائل کے ساتھ کیا سلوک کر سکتی ہے۔ اور سوچنے کا یہ انداز اپنے اندر کس قدر کجی رکھتا ہے!

"ارغام ہاذر" میں جو کچھ کہا گیا ہے، اور جس نقطہ نگاہ اور جن عقاید کی ترجمانی کی گئی ہے، اُن کا مجموعی طور پر "توحید نمبر" میں موجود ہے، مولانا عبدالحفیظ صاحب نے قریب قریب انہی دلائل کو دُہرا دیا ہے، اور انہی عقاید کے اثبات کی ناکام کوشش کی ہے، جن کی تردید "توحید نمبر" میں کی گئی ہے!

اہلِ بدعت کتاب و سنّت کے ساتھ جو مذاق کرتے ہیں؛ اللہ کی کھلی ہوئی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے جس طرح کھیلتے ہیں اور اپنے مزعومہ عقاید کے اثبات کے لئے آیتوں اور حدیثوں کو جو عجیب و غریب معنی پہناتے ہیں، اس کی بکثرت مثالیں "ارغام ہاذر" میں ملیں گی، شرک و بدعت کی حمایت اور اس سے ذوق و شوق رکھنے کا ایک مسلمان پر یہ وبال اس دنیا میں پڑنا چاہیئے کہ کتاب و سُنّت کا علم رکھنے کے باوجود، اس کے بعض عقاید و اعمال کتاب و سنّت کے مخالف ہوں، اور اپنے پیروں اور اُستادوں کی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کتاب و سنّت کے معانی و مفاہیم کو وہ بالکل اُلٹ کر رکھ دے!

قرآن کی اس آیت :- " فاستغاثه الذی وھو من شیعته علی عدوه"

اور

اس حدیث :- من اغاث ملھوفاً کتب اللہ ثلثا وسبعین مغفرة ــــــ"

سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت انبیاء اور اولیاء کی ارواح سے استغاثہ جائز ہے، اور ہم وفات پائے ہوئے بزرگوں کو پکاریں تو وہ قبر و برزخ سے ہماری فریاد اور پکار سن لیتے ہیں اور پکار سُنتے ہی امداد فرماتے ہیں؛ زندگی میں نبی اور ولی کیا، اپنے دوست اور عزیز یہاں تک کہ اپنے ملازم سے ایک آدمی مدد چاہتا ہے، مگر اُس دوست کے مرنے کے بعد ہمارے ذہن میں اُس سے مدد چاہنے کا خطرہ بھی نہیں گزرتا، اب کوئی یہ کہے کہ جس طرح تمہارے دوست زندگی میں تمہاری فریاد سُن کر تمہاری مدد کیا کرتے تھے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی تمہاری مدد کر سکتے ہیں، اور تم ضرورت کے وقت اُن کو پکارا کرو، تو یہ پوری منطق جہالت اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ کرام حضور سے دینی مسائل پوچھتے تھے، غریب اور محتاج لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرتے تھے اور آپ اُن کی مدد فرماتے تھے، اور کاشانۂ نبوت میں جو کچھ موجود ہوتا تھا، مانگنے والوں کو دیدیا کرتے تھے، صحابہ آپ سے دعائیں کراتے تھے، مگر حضور کی وفات کے بعد مدینہ کے محتاج اور فقراء حضور کو امداد کے لئے نہیں پکارتے تھے اور نہ روضۂ رسولؐ پر آکر استغاثہ کرتے تھے، اور نہ آپ سے مسائل پوچھتے تھے، اور نہ کسی صحابی کے دل میں اس کا خطرہ بھی گزرتا تھا کہ حضورؐ ہماری فریاد سُن سکتے ہیں اور ہماری دستگیری فرما سکتے ہیں؛ حضور کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعائے استسقاء میں آپ کے توسل کے بجائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا نام لینا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کی وفات کے بعد دعا میں نبی کی ذات کے توسل کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مناسب نہیں سمجھا! اور پھر "اللہ تعالیٰ نے حضور کو تمام اختیارات عطا فرما دئے ہیں" تو بارش کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی، صحابہ کرام کو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنا چاہیئے تھا:-

"یا رسول اللہ! خشک سالی نے تباہ کر رکھا ہے، آپ مینہ برسا دیجئے"! صحابۂ کرام اس قسم کے معاملات میں جن کا اللہ تعالیٰ کے اختیارات سے تعلق ہے حضورؐ سے "استغاثہ" نہیں کرتے تھے، اور نہ حضورؐ کی زندگی میں دور دراز مقامات سے آپ کو پکارتے تھے، اور نہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم جہاں سے بھی حضور کو پکاریں گے، آپ ہماری پکار کو سُن لیں گے اور نہ حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر حاضر ہو کر آپ سے "استغاثہ" کرتے تھے یہاں تک کہ دُعائیں بھی اللہ تعالیٰ سے آپ کے "توسل" کے بغیر ہی مانگتے تھے، ایک وہ عاشقانِ رسول تھے، جو ہر معاملہ میں کتاب وسنّت پر نظر رکھتے تھے، اور ایک یہ عشقِ رسولؐ کے مدّعی ہیں، جن کو سب سے زیادہ لطف کتاب و سنّت کی مخالفت میں آتا ہے، اور "بدعت" جیسی قابلِ نفرت چیز جس کو حضور نے "ضلالت" فرمایا ہے ان کی نگاہ میں محبوب ترین شئے بن کر رہ گئی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں قبروں پر چراغ جلانے والے پر لعنت فرمائی ہے مگر اس کے جواب میں "ارغام ہاذر" کے فاضل مصنّف، عبدالغنی نابلسی کے والد ماجد کا قول پیش فرماتے ہیں کہ ــــ

"قبروں کے پاس چراغ بدعت ہے اور اتلافِ مال، ایسا ہی فتاویٰ بزازیہ میں ہے، یہ اُس وقت جب کوئی فائدہ نہ ہو، لیکن وہاں اگر سجدہ ہو، یا راستہ پر ہو یا وہاں کوئی بیٹھا ہو، یا کسی ولی یا عالم کی قبر ہو تاکہ اطلاع ہوجائے کہ یہ ولی ہے، لوگ آکر برکت حاصل کریں، وہاں خدا سے دعا کریں۔ تاکہ قبول ہو یہ روشنی جائز ہے، ممنوع نہیں ہے، اعمال کا دار و مدار نیتّوں پر ہے"۔

حضور کے صریح قول کے مقابلہ میں جناب نابلسی کے باپ کی یہ تصریح اور نکتہ آفرینی پر کاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتی، مگر اہلِ بدعت کتاب وسنّت کے مقابلہ میں اس قسم کے نکتوں، حیلوں اور مغالطوں کو پیش کرتے رہتے ہیں، اور سنّتِ رسول کی اس کھلی ہوئی مخالفت کے باوجود، اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ "عشقِ رسول" کا حق ادا کر رہے ہیں!

توحید نمبر کے "نقشِ اول" میں ہم نے لکھا تھا کہ:-

"صحیحین میں بھی ایک واقعہ ملتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام آدمی کی شکل میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال وجواب کرتے رہے، اور جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو حضور کو بتایا گیا کہ یہ جبریل تھے"۔

اس پر تنقید کرتے ہوئے صاحب "ارغام ہاذر" فرماتے ہیں:-

"..... بالکل غلط جھوٹ، افترا، بہتان، بکواس خبط الحواسی، ماہر صاحب صحیحین یا اور کسی کتاب میں یہ واقعہ نکال دو، تو دو سو روپیہ انعام میں دوں گا"۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:-

قال ثم ادبر الرجل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردوا علی الرجل فاخذوا لیردوہ فلم یروا شیئاً فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذا جبریل جاء یعلم الناس دینھم.

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی روایت کے دوسرے طریق میں ہے:-

قال ثم قام الرجل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردوہ علی فالتمس

فلم یجدوہ فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ھذا جبریل اراد ان تعلموا اذلم تسألو!

صحیح بخاری میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ ثم ادبر فقال ردوہ فلم یروا شیئاً فقال ھذا جبریل جاء یعلم الناس دینھم" (بخاری، برحاشیہ فتح الباری)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کو جبریل سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے جبریل ہونے کا علم نہیں ہوا تھا، جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تب آپ کو اس کا علم ہوا۔ اور یہ استنباط ہم اپنی طرف سے نہیں کر رہے ہیں، یہی حدیث جو دوسرے طُرق میں دوسری کتب حدیث میں پائی جاتی ہے، اس میں اسکی صراحت ملتی ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ حدیث متذکرہ بالا کے اطراف کے سلسلہ میں ابو فروہ کی روایت سے مندرجہ ذیل الفاظ نقل کرتے ہیں۔

والذی بعث محمداً بالحق ما کنت باعلم بہ من رجل منکم وانہ لجبریل

"قسم اس ذات کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں بھی تم میں سے کسی شخص سے زیادہ اس کے بارے میں علم نہیں رکھتا، اور بے شک یہ جبریل تھے"!

ابو عامر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

ثم ولی فلما لم نر طریقہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ! ھذا جبریل جاء لیعلم الناس دینھم، والذی نفس محمد بیدہ، ماجاء نی قط الا وانا اعرفہ الا ان تکون ھذہ المرۃ

(.... پھر اس نے (یعنی جبریل نے) پیٹھ پھیری، جب ہم نے اس کا راستہ نہ پایا، تو حضور نے فرمایا کہ سبحان اللہ! یہ جبریل تھے، اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کو اُن کا دین بتائیں قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے جب کبھی یہ میرے پاس آئے ہیں، میں اُن کو جان گیا، سوائے اس دفعہ کے!)

سلیمان کی روایت کے یہ الفاظ اس سے بھی زیادہ واضح ہیں:۔

"فوالذی نفسی بیدہ ماشبہ علی منذ اتانی قبل مرتی ھذہ وما عرفتہ حتی ولی

(قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس بار سے پہلے جب بھی وہ آئے، مجھے اُن کے بارے میں شبہ نہیں ہوا، (مگر) اب کی بار جب تک وہ پیٹھ پھیر کر نہ چل دئے، میں انھیں پہچان سکا)

ان تمام طرق کے بعد حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:۔

دلت الروایات التی ذکرنا علی ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم ما عرف انہ جبریل الا فی آخر الحال (فتح الباری)

(یہ تمام روایات متذکرہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ حضور نے جبریل کو نہ پہچانا مگر آخر میں جاکر۔)

حدیث کی ان تمام روایتوں اور حافظ ابن حجر کی اس تصریح کو پڑھ کر قارئین "فاران" فیصلہ فرمائیں، کہ ہم نے خدانخواستہ کوئی "جھوٹ" اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر دیا تھا؟! مولانا عبدالحفیظ صاحب کا انعام تو انھی کو مبارک رہے وہ اپنی تعلّی پر دل میں پشیمان ہی ہو جائیں تو غنیمت ہے! اس قدر زور کے ساتھ چیلنج دینے سے پہلے "حضرت علامہ

حقانی مدظلہ" حدیث کی کتابوں کا مطالعہ تو فرما لیتے کہ بعد میں پشیمانی کی نوبت نہ آتی!

"مادری ما یفعل بی ولا بکم" اس آیت کو جو منسوخ بتایا گیا ہے، اس پر ہمیں بڑی حیرت ہوئی! "نسخ" احکام میں ہوتا ہے نہ کہ عقاید اور "اخبار" میں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بقول و دلیل مصنف اگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے نام بتا دیئے تھے اور آپ پر خود اپنے اور صحابہ کے پیش آنے والے بعض واقعات بھی منکشف ہو گئے تھے، تو اس سے قرآن کی آیت منسوخ کیسے ہو گئی! اس وقت کی حالت جب وہ آیت یا آیتیں نازل ہوئی ہیں، اپنی جگہ مسلم اور ثابت ہے! اس کو اس ایک مثال کے ذریعہ (بلا تشبیہہ) سمجھئے، کوئی شخص کہتا ہے:

"زید کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے" ——— پھر وہی شخص بعد میں کہتا ہے یا لوگوں کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ زید کو ہزاروں روپیہ مل گیا۔

تو کیا پہلا قول، دوسرے قول یا واقعہ سے منسوخ ہو گیا؟ دونوں قول اپنی جگہ مسلم ہیں کہ دو "حالتوں" کا ان سے اظہار ہوتا ہے، ان دونوں اقوال میں نہ کوئی قول ناسخ ہے اور نہ منسوخ ہے! کاش! مولانا حقانی کو قرآن میں تدبر و تفکر کی توفیق نصیب ہوتی! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو اس شخص کو قرآن کے معانی و مفاہیم کے بارے میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے جو "ناسخ و منسوخ" کا علم نہ رکھتا ہو!

"ارغام ہاذر" ——— پوری کی پوری کتاب اس قسم کی کمزور دلیلوں، پوچ باتوں اور لفظی مغالطوں سے بھری ہوئی ہے! اس قسم کے مغالطوں کا بعض سادہ مزاج لوگ آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں، اس کے لئے ہم انشاءاللہ عنقریب ایک مفصل مضمون لکھیں گے، جو "فاران" ہی میں شائع ہو گا!